

افسوں جان

اول



عاشا کوثر سردار

عکس در عکس.....!

”افسوس، جان“ عشنا کوثر سردار کی زندگی کا سفر اور اس کا دوسرا پڑاؤ۔ اس ناول کے پارے میں اتنا ہی کہنا چاہوں گی کہ یہ ناول پہلے ناول ”اے شمع کوئے جاناں“ کے بعد ایک نیا ”مہر کہ“ تھا۔ مجھے اس پہلے ناول کی مقبولیت کا اندازہ تھا سوا سے ہر طور اس سے بہت مختلف اور کچھ خاص جدت سے ہمکنار کرنا تھا۔

”اے شمع کوئے جاناں“ کی مقبولیت اپنی جگہ۔۔۔ میرے پڑھنے والوں کی پسندیدگی اپنی جگہ مگر اس ناول کے کردار اور کہانی اس ناول سے کہیں زیادہ گہرائی لئے ہوئے ہے۔ کرداروں کا بیان، طرز زندگی، ان کی فطری طبیعت اور مزاج کا عکاس ہے۔

ہمارے ارد گرد ہر طرح کے کردار ملتے ہیں اور آنکھیں کئی طرح کے کرداروں کو دیکھتی ہیں، ان سے ملتی ہیں۔ اس ناول کے کردار جیتے جاگتے تھے۔ انہیں میں نے اپنی سوچ میں اپنے آس پاس۔۔۔ اپنے ساتھ ساتھ۔۔۔ اندر کہیں چلتے ہوئے دیکھا۔

یہ کردار اس معاشرے میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔۔۔ اپنے فطری رنگوں کے ساتھ۔ میں نے حقیقت سے الگ ہو کر کچھ نہیں لکھا۔ آج بھی جہاں خواتین رائٹرز کا نام لیا جاتا ہے وہیں حقیقت سے بہت دور۔۔۔ خیالی ہواؤں سے باتیں کرتی ہوئی کہانیاں یاد آتی ہیں۔ پڑھنے والوں کے ذہن سے خواتین رائٹرز کی رومانوی کہانیوں کا اثر بھی ٹوٹ نہیں پایا۔۔۔ نہ ہی وہ تاثر بدل پایا کہ ایک لڑکی کا قلم حقیقت سے منسلک باتوں کو بھی زیر قلم لا سکتا ہے۔

محبت میری ہر کہانی کا ”جز“ بھی ہوتی ہے اور ”کل“ بھی۔ میں محبت کے بنا سانس نہیں لے سکتی۔ سو میرے قلم کا ناٹھ محبت سے نہ ٹوٹ سکتا ہے نہ ٹوٹے گا۔ اس ناول کے کردار محبت سے گندھے ہیں۔ محبت کہتے ہیں۔ محبت سنتے ہیں۔ محبت لکھتے ہیں۔ محبت پڑھتے ہیں۔

پہلے ناول کی طرح اس ناول کا ”کل“ اور ”جز“ بھی محبت ہی ہے۔

”افسوس، جان“ ایسا افسوس جو جان سے لپٹا رہے۔ اور ایسا جادو صرف محبت ہے۔ شاید کہیں کہیں پڑھنے والوں کو اس ناول کے کردار کچھ اُلجھے دکھائی دیں تو محبت ایسی ہی ہے۔ کچھ اُلجھی۔۔۔ کچھ سلجھی۔

معیاری اور خوبصورت کتابیں
با اہتمام..... محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراؤل _____ 2007ء

منبع _____ نیر اسد پریس

کیوزنگ _____ کلائنگس گرافکس

قیمت _____ 350/- روپے

مکمل سیٹ _____ 700/- روپے

اس ناول کے کیریکٹرز اس دائرے سے باہر بھی آتے ہیں، جہاں محبت ایک پل میں سلجھ
دکھائی دیتی ہے۔
کبھی جلتی — کبھی بجھتی —

محبت ہے —!

میں نے محبت کو دیکھا ہے

میلوں دُور تک چلتے ہوئے

تنگے پاؤں جلتے ہوئے

میں نے محبت کو دیکھا ہے —!

خود اپنی راہ پر چلتے ہوئے

کچھ نہ کہتے ہوئے —

نہ سنتے ہوئے —

خود اپنی ہی آگ میں جلتے ہوئے —

محبت کو میں نے دیکھا ہے

چپ چاپ ہاتھ ملتے ہوئے

کچھ کہتے ہوئے

نہ سنتے ہوئے —!!

محبت کو میں نے دیکھا ہے —!!

"Love is a most beautiful thing of this world,
that I do believe!"

اور ایسا غلط بھی نہیں ہے — بہت سے اور بھی ہوں گے جو محبت کو میرے زاویے سے
سوچتے ہوں گے — میری آنکھوں میں دیکھتے ہوں گے — بہت سے رنگ ہیں اس
کے — بہت سے شیڈز — اور ”فسوں جان“ انہی رنگوں کا بیاں ہے۔ محبت ہر کیریکٹرز
میں بولتی ہے۔ ہر کردار کے اسرار و بھیدا اسی محبت سے کھلتے ہیں۔
وہ ”ساہیہ“ ہو یا میرب سیال — سردار سبکتگین حیدر لغاری ہو یا اذہان حسن بخاری۔
محبت ہر کیریکٹرز کا جز بھی ہے اور کل بھی۔

کئی بار سوچا کیا محبت کوئی گرداب ہے — یا پھر کوئی ”غلام گردش“ مگر سمجھ نہیں آیا۔ مگر
ناول کے کردار صاف یہ بھید کھولتے ہیں کہ ”محبت“ کیا ہے؟

میرے لکھنے کا ڈھنگ یہ ہے کہ میں اپنے قلم کو آزاد چھوڑ دیتی ہوں۔ میں اپنے کرداروں کو

نہیں لکھتی — میرا قلم میرا ”کیریکٹرز“ خود اپنی مرضی سے لکھتا ہے اور میں نے اپنے قلم کے
ساتھ کبھی کوئی زور بردستی نہیں کی۔ میں نے ان کرداروں کو اپنے اپنے رُخ پر — اپنی
سوچوں کے ساتھ موڑنا نہیں چاہا۔

پتہ نہیں اور لکھنے والے ایسا کرتے ہیں کہ نہیں — مگر میں کبھی اپنے کرداروں کو اپنے
”حکم نامے“ کا پابند نہیں بنا پاتی۔ میرے کیریکٹرز اپنا آپ کچھ تراشتے ہیں — شاید وہ
میرے لاشعور میں اسی طور بستے ہیں۔ مگر بہت بار میں خود نہیں جان پاتی وہ میرے اندر تھے یا
میں نے انہیں کہیں باہر سے اپنے اندر منتقل کیا۔ یہ گہرائی میرے اندر کی ہے یا نگاہ میں وسعت
ہی اتنی ہے کہ ستاروں سے آگے بھی نگاہ دیکھ پاتی ہے۔ بہر حال سب کچھ بھی رہا ہو مگر میں اپنے
کرداروں کو اپنے رنگ ڈھنگ سے موڑ نہیں پاتی۔ وہ جیسے ہیں، اپنے آپ کو لے کر آگے خود
بڑھتے ہیں۔

When routine bites hard

And ambitions are high,

And resentment ride high,

But emotions won't grow

And we're changing our ways,

Talking different roads

Then love, Love will tear us apart again!

Joy Division نے کسی ایسے ہی موقع کے لئے لفظوں کو زبان دی ہوگی۔

محبت اتنا پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے —

محبت ”حل“ ہے۔

اس ناول کے ہر کردار میں یہ پیچیدگی بھی دکھائی دے گی اور پھر اسی پیچیدگی کا ”حل“ بھی۔

سن رکھا ہوگا آپ نے —

کسی کا حل، کسی کا مسئلہ ہے

محبت اپنا اپنا تجربہ ہے

سو ہے — آپ سطر سطر میں خود کو پائیں گے — کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی تجربہ آپ

کو اپنا لگے گا — کوئی کیریکٹرز جب بولے گا تو آپ کو اپنی زبان لگے گی — یہ کوئی جادو

نہیں ہے — یہ محبت ہے۔ محبت میں، محبت کی کہانیوں میں نیا پن کہیں نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی

ہر کہانی پہلے سے زیادہ دلچسپ لگتی ہے۔

محبت کتنی بھی پرانی ہو، اپنے اندر نیا پن رکھتی ہے۔
اور اس نئے پن کا، جنت کا حصہ ہر کردار بھی ہے۔

اور ان کرداروں کا حصہ آپ بھی یقیناً بننا چاہیں گے۔ پہلے کی بات اور تھی، میں کچھ بھی ایک حد سے آگے دیکھ نہیں پاتی تھی۔ مگر ایک وقت آتا ہے جب نگاہ مظاہر دیکھنے اور دکھائی دینے والے مناظر سے بہت آگے دیکھنے لگتی ہے۔

میں نے اس اندر کی آنکھ سے ان کرداروں کو بہت دور سے دیکھا مگر مجھے سب کچھ بہت دواڑ دکھائی دیا۔

گمان نہیں یقین ہے۔۔۔ جب آپ ان کرداروں کو پڑھیں گے تو آپ کی دلچسپی آخر تک برقرار رہے گی۔ آج اس ناول کی بات تھی شاید کل کسی اور ناول کی بات میں آپ سے کر رہی ہوں۔ کڑی سے کڑی ملتی ہے۔ مگر محبت کی یہ کہانیاں نہ ختم ہونے والی ہیں۔ سو میرے اندر کی نگاہ ان کرداروں کو دیکھتی رہے گی اور آپ تک پہنچاتی رہے گی۔ اب تک کا سفر۔۔۔ یہیں تک۔۔۔ کل تک کی کسی نئی بات کے لئے۔

عشنا کوثر سردار

5/4/2007

ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیاں بالیاں بڑے مدھر نثر بکھیر رہی تھیں۔ گا ہے بگا ہے ہنسی کے جلتنگ نضا کو مزید پُر کیف کر رہے تھے۔ گھر کی آرائش کے لئے استعمال کئے گئے تازہ موگرے اور گیندے کے پھولوں کی مہک سے چار سمت ایک جادو سا پھیلا ہوا تھا۔ فارحہ مختلف امور کی ادائیگی کے سبب بڑی جلت میں یہاں سے وہاں آ جا رہی تھیں۔ ابھی کچھ ہی دیر میں اکلوتی بیٹی کی رسم مایوں تھی۔ مگر ان کے چہرے پر خوشی اور شادمانی کی بجائے آنکھوں میں ایک گہرا سکوت ٹھہرا ہوا تھا۔

بڑے نپے تلے قدم اٹھاتی، وہ تمام امور انجام دیتی ہوئی ایک رسمی سی مسکراہٹ سجائے سب سے مل رہی تھیں۔ مگر اس سے قبل کہ وہ کچھ کہیں، رشتے کی ایک بزرگ نے ان کے قریب آ کر اپنا چہرہ کان کے قریب لا کر کوئی مدہم سی سرگوشی کی تھی۔ فارحہ کے چہرے کی کیفیت پل کے پل میں متغیر ہوتی تھی۔ اس سے قبل کہ سید اذہان حسن بخاری ماں کی جانب متوجہ ہوتا یا اس کی کیفیت کو سمجھتا، کوئی لیونگ روم میں داخل ہوا تھا۔ فارحہ کی چھرائی نظریں اس جانب تک رہی تھیں۔ آنے والے کے قدموں کی آہٹیں چار سمت پھیلے شور میں کہیں مدغم ہو گئی تھیں مگر اس کے باوجود دیکھنے والی کتنی نظریں اس سمت اٹھی تھیں۔ کتنے چہرے حیرت سے تکتے چلے گئے تھے۔ ہر نگاہ کیسی ساکت تھی۔

سید اذہان حسن بخاری نے ساکت نظروں سے اپنے سے چند قدم کے فاصلے پر ر کے لیے چوڑے تنومند جسمت کے مالک سید سعد حسن بخاری کی جانب دیکھا تھا۔ پُر تیر نگاہ یقین سے خالی تھی۔ کس قدر حیرت سے وہ اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ سامنے کھڑا وجود اجنبی نہ تھا۔ نہ ہی وہ اس حقیقت سے آنکھیں پھیر کر چہرے کا رخ بدل سکتا تھا۔ حقیقت کڑوے سچ کی مانند اس کے سامنے تھی۔ کتنا قریبی تعلق تھا۔ کس قدر مضبوط رشتہ۔ مگر وہ غرور سے تنی گردن، وہ تقاخر سے بھری آنکھیں کس قدر اجنبی تھیں اس گھڑی۔ کسی رتی بھر ملال کا شائبہ تک نہ تھا۔ پہلو میں کھڑا پیکر کس قدر دلبر تھا۔ سنگ مرمر سا تراشیدہ جسم، شیفون کی سرخ ساڑھی میں ملبوس، قیامت سی قیامت تھی کوئی۔ ٹگفتہ چہرہ، خوشبو سا پیکر، چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں، قاتل ادائیں۔ عمر میں سید سعد حسن سے آدھی تو ضرور تھی مگر سعد حسن بخاری کا سر کیسے فخر سے تاتا ہوا تھا۔ جیسے وہ ایک عالم کو فتح کر چکے ہوں۔ ایک جہان ان کی مٹھی میں ہو۔ کیسی چمک تھی آنکھوں میں۔
فارحہ ایک ٹک تکتی جا رہی تھیں۔

سید اذہان حسن بخاری کی سرخ رنگ آنکھیں کس قدر حیرت سے اس گھڑی اپنے باپ کو دیکھ رہی تھیں جیسے یہ سب اس کی توقع کے برخلاف ہوا تھا۔ پیشانی کی رگیں کس درجہ تن گئی تھیں۔ مگر اس سے قبل کہ وہ کوئی اقدام کرتا یا پیش قدمی کرتا ہوا باپ کے مقابل چاٹھتا، اس کے پہلو میں کھڑی فارحہ یکدم لڑائی

تھیں۔ اس نے فوراً ماں کو سنبھالا تھا۔ شادی والے گھر میں یکدم ایک سکوت سا چھا گیا تھا۔

ڈھولک کی آواز دم توڑ گئی تھی۔ تھقبے سناٹوں کی زد میں آ گئے تھے۔ سہاگ کے گیت کہیں حلق میں تو گھٹ گئے تھے۔ تازہ موگرے اور گیندے کے پھولوں کی خوشبو پل میں ماند پڑ گئی تھی۔ رسم اُٹھان کی منتظر ماں کی نظریں جیسے پتھر گئی تھیں۔ اذہان حسن بخاری ماں کے وجود کو اٹھا کر ایک پل میں کمرے میں آیا تھا اور پھر دو بجے ہی پل پلٹ کر انتہائی سرعت سے فیملی ڈاکٹر کا نمبر ملانے لگا تھا۔ خاندان بھر کی خواتین فارحہ کا ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگی تھیں۔ ساتھ ساتھ چہ میگوئیاں بھی جاری تھیں۔

”ہائے، ہائے۔۔۔ ایسی کہانی تو سنی نہ دیکھی۔ تو بہ استغفار۔“ کسی خاتون نے کہا تھا۔

”بے شری کی حد ہے۔۔۔ سعد بھائی کو کم از کم اپنی عمر کا ہی لحاظ کرنا چاہئے تھا۔“ کسی دوسری خاتون نے بھی حصہ لیا تھا۔

”انتہائی اقدام اور وہ بھی عین بیٹی کی شادی والے دن۔۔۔ تو بہ، تو بہ۔ غیرت مرگئی باپ کی تو۔“ ایک مزید اظہارِ افسوس ہوا تھا۔

”اللہ میری تو بہ۔۔۔ اتنی جواں سال ڈلہن۔۔۔ اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی سے بیاہ کرنے سے پہلے سعد حسن بخاری کو چلو بھر پانی نہ ملا۔“ ایک مزید ہمدردی۔

”ارے جانے کیا سلسلہ چلتا رہا۔۔۔ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ یہ جو آج ہوا یکدم تو نہ ہوا ہوگا۔ پیچھے کتنی طویل کہانی ہوگی۔ مگر کسی کو کانون کا خبر نہ ہوئی۔“ ایک بزرگ عورت نے دور کی کوڑی ڈھونڈی۔

”اے ہاں۔۔۔ یہ جو فارحہ بیگم گھنی بنی بیٹھی تھیں، کچھ بہتی سنتی تو آج یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔ جانے کیا کھیر پکائی ماں بیٹے نے اندر ہی اندر۔ اب بھگت رہے ہیں ناچپ چاپ۔“ ایک مزید آشرف۔

”اے خالہ! بھلا اس میں فارحہ کا کیا قصور۔۔۔ بے چاری کتنی اُجھی اُجھی سی دکھائی دے رہی تھی اتنے دنوں سے۔ دریافت کیا بھی تو مسکرا کر ٹال گئیں۔ اب اپنے گھر کی بدنامی کون چاہتا ہے؟۔۔۔ وہ بے چاری تو مجبوراً چپ سادھے ہوئے تھی شاید۔“ کسی ایک خاتون نے ہمدردی کی۔

”اے ہاں۔۔۔ قبر کا حال تو مرده ہی جانتا ہے۔۔۔ کیسی ہنسی ہنسی گھر گھر ہستی تھی۔ کون جانتا تھا ایسا بھی دیکھنا ہوگا۔“

”فارگا ڈسک۔۔۔ چپ کریں گی آپ؟“ ماہانے ماں کو ہوش میں لانے کی تدبیر کرتے ہوئے ان سب خواتین کو دیکھا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز اور برہم نظروں میں گہرا اضطراب تیر رہا تھا۔ بولنے والی خواتین چپ ہو گئی تھیں۔

”آپ لوگ پلیز باہر جائیے۔“ اذہان حسن بخاری نے آگے بڑھ کر قدرے مدہم لہجے میں کہا تھا۔ خواتین نے اس پر سکوت چہرے والے لڑکے کو دیکھا پھر باری باری اٹھ کر باہر نکلنے لگی تھیں۔ کمرہ خالی ہو گیا تھا۔ ماہانے سر اٹھا کر بھائی کو دیکھا تھا۔ آنکھیں لبالب پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اذہان حسن بخاری نے بہن کو دیکھا تھا پھر دو قدم آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اپنا بھاری مضبوط ہاتھ اس کے سر پر دھر دیا تھا اور خاموشی سے اس کا حوصلہ بندھایا تھا۔ مگر پانی ایک تو اتر سے پلکوں کے بند توڑتا ہو

پر نکلتا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے پرتاؤ چہرے اور بچھنے ہوئے ہونٹوں سے ماں کو دیکھا تھا جن کی پلکیں ولے ولے ہو لے لرز رہی تھیں۔ یقیناً وہ ہوش میں آ رہی تھیں۔

دونوں بہن بھائی دو بجے ہی لمبے ماں پر جھکے تھے۔

”مٹی!۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟“ اذہان حسن بخاری کی بھاری آواز ابھری تھی۔ فارحہ نے خاموش نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ بہت چپکے سے ان کی آنکھوں کے کناروں سے آنسو نکل کر نیچے میں

بند ہو گئے تھے۔ اذہان حسن بخاری کی آنکھوں کا اضطراب دو چند ہو گیا تھا۔ بہت ہولے سے وہ عجب بے بسی کے ساتھ ماں پر سے نگاہ ہٹا گیا تھا۔ تبھی فیض بخاری، ڈاکٹر عزیز کے ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔

اذہان حسن بخاری، چاچا کی آمد پر پلٹا تھا۔ فیض بخاری نے لمبے جوڑے بچھنے کے کندھے پر فقط ہاتھ رکھ کر حوصلہ بندھایا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے فقط خاموشی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ فیض بخاری کی آمد سے

اسے کسی قدر ڈھارس بندھی تھی۔ ڈاکٹر عزیز فارحہ کا چیک اپ کرنے لگا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے ایک خاموش نظر ماں پر ڈالی تھی۔ ایک لمحے میں ہی وہ نڈھال سی لگ رہی تھیں۔ ماں کی حالت پر اس کا دل جیسے

کٹ کر رہ گیا تھا۔

”پریشانی کی تو کوئی بات نہیں عزیز؟“

”نہیں۔۔۔ مگر میں کچھ دوا نہیں لکھ رہا ہوں۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

عزیز اس کا دوست تھا۔ اپنے سے قریب لوگوں کو اس لمحے اپنے سامنے پا کر اسے قدرے ڈھارس ہوئی تھی۔ تبھی وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔ اس کا انداز کسی قدر جاہلانہ تھا۔ فیض بخاری نے اسے

دیکھا تھا پھر اس کے پیچھے ہی باہر نکل آیا تھا۔

”اذہان! تم کوئی ایسا اقدام نہیں کرو گے جس سے مزید کوئی تماشائے۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ان سے خاصے فاصلے پر تھا، جب وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے قریب پہنچے تھے۔ مگر اذہان حسن بخاری نے

کئی انہنی کر دی تھی۔ اس کی آنکھوں سے انگارے نکل رہے تھے جیسے وہ ساری دنیا کو جلا کر خاکستر کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے چہرے پر حد درجہ تناؤ تھا۔ فیض بخاری نے اسے اس سے قبل اس حالت میں کبھی نہیں

دیکھا تھا۔ یقیناً اس کی خاموشی میں بہت سے طوفان پل رہے تھے۔ ایک الاؤ میں اس کا سارا اندر جل رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے بیٹا باپ کے مقابل کھڑا ہو اور صورت حال مزید بگڑ جائے۔ تبھی اسے اس اقدام

سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہتے تھے۔

”اذہان! تم جوش سے کام لے رہے ہو۔۔۔ بھائی کی حالت تم دیکھ رہے ہو؟ کیا تم چاہتے ہو کہ صورت حال مزید بگڑ جائے؟“ اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ بولے تھے مگر اذہان حسن بخاری نے جیسے کچھ سنائی نہیں تھا۔

”اذہان! تمہیں بھائی کی قسم ہے۔۔۔ تم ایسا کچھ نہیں کرو گے جس سے بھائی کو مزید دکھ پہنچے۔“

اذہان حسن بخاری کے قدم تھمے تھے اور وہ عجب ایک بے بسی کے ساتھ خون رنگ آنکھوں سے چاچا کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ فیض بخاری نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ دھر دیا تھا اور

پھر اسے بغور تکتے ہوئے بولے تھے۔

”اذہان! میرے بچے! غصہ یا پھر کوئی شدید رد عمل اس لمحے کا تقاضا نہیں ہے۔ بھائی جی نے جو بھوک اچھا نہیں کیا۔ مگر اب تمہارے ان کے سامنے ڈٹ جانے یا پھر غم و غصہ دکھانے سے کیا اس کا ازالہ ہو گا؟ جبکہ تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ تمہارے مد مقابل آنے کا ہی ایک شدید رد عمل ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا تم نے غلط کیا۔ یقیناً تم بھی حق پر تھے۔ کوئی بھی جوان، خردمند بیٹا ایسا ہی رد عمل ظاہر کرتا۔ لیکن بھائی نے بھی حد کر دی۔ یہ تناؤ مزید بڑھے گا اذہان! کیونکہ یہ اپنا پرستی اور ہٹ دھرمی کی جنگ ہے۔ جس پر یہ جی حق پر نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو حق پر محسوس کر رہے ہیں۔ اور المیہ یہ ہے کہ ہم ان کی اس سور نظریے کو قطعاً نہیں بدل سکتے۔ اس لئے نہیں کہ وہ غلط ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ اس لمحے وہ سمجھتے ہوئے سمجھ نہیں پا رہے اور دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہے ہیں۔ عقل اندھی ہو چکی ہے ان کی اور ایسا سب ا لڑکی کے باعث ہے۔ عشق کا بھوت سوار ہے ان کے سر پر۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی بھی باپ ایسا کوئی اقدام کرنے کے متعلق سوچتا جیسا انہوں نے کیا۔“

اذہان حسن بخاری، چاچا کے مدہم لہجے پر بہت ہولے سے چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔ اس کے انہ میں ایک عجیب طرح کی بے بسی تھی اور آنکھوں کی ویرانیاں مزید بڑھ گئی تھیں۔ دشتیں دو چند ہو گئی تھیں فیض بخاری نے نتیجے کے تھہرا ڈالنے والے انداز کو دیکھا تھا، پھر قدرے ملاحت سے بولے تھے ”بہت قوی اعصاب کا مالک ہے میرا بچہ۔ مجھے امید ہے تم اس تمام صورت حال پر قابو پا لو۔ اور تمام معاملات کو اپنے ہاتھ میں کر لو گے۔ میں نے بھائی جی سے بات کر لی ہے۔ وہ یہاں نہیں رہے۔ فی الحال یہی ان کے اور تمہارے حق میں بہتر ہے۔ آگے کی صورت حال پر ماہا کی شادی کے سوچیں گے۔ پہلے یہ فریضہ بخیر و عافیت سرانجام پا جانے دو۔ باپ نے نا سچی کا ثبوت دیا مگر تم بھائی ہر صورت حال کو سنبھال سکتے ہو۔ سوچو تو اس وقت بھائی جی تم ہو اور باپ بھی۔ اپنے حقوق کی مناد سے بھائی جی ہاتھ کھینچ چکے ہیں تو یہ فرض تم پر عائد ہوتا ہے کہ تم مکمل عقل مند ہی سے ان معاملات کو نمٹاؤ اذہان حسن بخاری ایک لمبا چوڑا شخص، عجب بے بسی سے سر جھکائے اس گھڑی چاچا کے سامنے تھا۔ عزیز فرسٹ ایڈ باکس لئے چلتا ہوا راہداری میں کھڑے فیض بخاری اور اذہان حسن بخاری کے قریب رکھا تھا۔

”ابنی براہم عزیز۔۔۔؟“ فیض بخاری نے اس کی سمت دیکھا۔

”نو بھائی جان!۔۔۔ میں نے نیند کا آنکیشن دے دیا ہے۔ بھائی سوری ہیں۔ کچھ اسٹرا تھی۔ انہیں سکون کی ضرورت ہے۔“ عزیز نے کہتے ہوئے دوست کی جانب دیکھا تھا۔ وہ باہر کا بندہ تھا، تھا کہ اس سے کچھ چھپایا جاتا۔ اُن کا قریبی عزیز تھا۔ وہ تمام صورت حال سے واقف تھا۔ بچپن سے ا گھر میں آ جا رہا تھا۔ سید اذہان حسن بخاری کی زندگی کا کوئی صفحہ اس سے پوشیدہ نہ تھا۔ اس گھڑی بھوک کچھ کہے اس نے اذہان کے کندھے پر ہاتھ دھرا تھا، آنکھوں سے ہمت بندھائی تھی مگر وہ کچھ نہیں بولا نہ تھی عزیز نے اجازت چاہی تھی۔

”چلتا ہوں۔۔۔ بھائی کو دو باقاعدگی سے دینا اور ضرورت پڑے تو فون کر لینا۔ ورنہ فیض بھائی تو یہاں پر۔“ عزیز اجازت طلب کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ اذہان اس گھڑی وہیں رکا ہوا تھا جب رشتے کی ایک خالہ وہاں آئی تھیں۔

”فارحہ ٹھیک ہیں اب؟“

”جی بس دواؤں کے زیر اثر سو رہی ہیں۔ آپ۔۔۔۔۔“ فیض بخاری ابھی کچھ بولنے والے تھے جب مغربی خالہ انہیں ایک طرف لے گئی تھیں۔ پھر قدرے مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

”فیض بھائی! صورت حال تو مزید بگڑ گئی ہے۔۔۔ جو کچھ بھی ہوا اچھا نہیں ہوا۔ جس گھڑی سعد بھائی اپنی نئی نوپلی ڈلہن کے ساتھ یہاں موجود تھے سبھی ماہا کی سرال رسم کے لئے آ گئی اور خاندان کی خواتین سے خدا کی پناہ۔ انہوں نے ساری صورت حال ان لوگوں کے گوش گزار کر دی ہے۔ ماہا کی ساس اور دیگر سرالی شدید ترین غصے میں ہیں۔ خاندان کے تمام بزرگ حضرات اور مرد انہیں سمجھانے اور قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں مگر وہ ہیں کہ غصے کا اظہار کئے جا رہے ہیں۔ ہم اپنے طور پر صورت حال سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ آپ لوگوں کو بھی اس لئے مطلع نہیں کیا کہ فارحہ کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ پھر ہمیں صورت حال کے اس درجہ بگڑنے کی امید بھی نہ تھی۔ ماہا ہماری بھی بچی ہے۔ ہم ان لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جو کچھ بھی ہوا اس میں بچی کا کوئی قصور نہیں۔ وہ معصوم ہے۔ مگر وہ لوگ سمجھنے کو قطعاً تیار نہیں۔ کہتے ہیں جب باپ کے اس عمر میں ایسے تیور ہیں تو ان موصوف کی بیٹی میں کیسے ممکن ہے کہ ان کے وصف نہ شامل ہوئے ہوں۔ بہت کوشش کی سب نے مگر بات سنبھل نہیں رہی ہے۔“ صغریٰ خالہ کا لہجہ اگرچہ بہت مدہم تھا مگر اذہان حسن بخاری تمام صورت حال سمجھ چکا تھا اور جواباً دوسرے ہی لمحے اس کے قدم لیونگ روم کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں سے دو خاندانوں میں ہونے والے مذاکرات کی آوازیں بہ خوبی آرہی تھیں۔ اس کے چہرے کا تناؤ اس گھڑی مزید بڑھ گیا تھا۔ فیض بخاری نے بھی اس جانب قدم بڑھا دیئے تھے۔

”سعد بھائی نے اچھا نہیں کیا۔۔۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ذرا سی غلطی سے بچی کی زندگی نہ بگڑ جائے کہیں۔“ صغریٰ خالہ حد درجہ متفکر تھیں۔

”بھائی جی کہاں ہیں؟ رخصت ہو گئے یا۔۔۔۔۔“ فیض بخاری نے مدہم لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”ارے کہاں۔۔۔ جب آپ سمجھا سمجھا کر اندر گئے وہ بدستور وہیں نکلے رہے اور ارد گرد بیٹھی خواتین کی چہ میگوئیاں بڑھتی چلی گئیں۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ بات ماہا کی سرال سے پوشیدہ رہ پاتی؟“ صغریٰ خالہ پریشان تھیں۔ مگر فیض بخاری مزید کچھ نہیں بولے تھے۔ ان کے قدم تیزی سے آگے کی سمت بڑھ رہے تھے۔



خزاؤں نے جیسے منظروں کے ساتھ ساتھ اس کے دل کے اندر بھی اپنا ڈرا ڈال دیا تھا۔ سارے زمانے زرد رنگ موسموں جیسے ہو گئے تھے۔ سارے جذبے ان ویرانوں سے بھر گئے تھے۔ دل کی دھڑکنیں

ان خشک زرد رنگ پتوں کی صورت ادھر ادھر بکھرتی چلی گئی تھیں۔

اسے ان ویران موسموں سے جیسے عشق تھا۔

اپنے کئی ضروری کام چھوڑ کر وہ ان موسموں کے سنگ سفر کرنے لگتی تھی۔

گھنٹوں ان خشک رنگ پتوں کو ٹوٹتے، بکھرتے اور ہواؤں کی زد پر اڑتے ہوئے دیکھتی رہتی تھی اس کے اندر ان خاموش لحوں میں گھنٹوں اک شور ہوتا رہتا تھا۔ کتنی دیر تک وہ اپنے اندر ہونے والے شور کو سنتی رہتی تھی۔ پہروں اس کے اندر کوئی بولتا رہتا تھا اور پہروں وہ ٹورنٹو کی سڑکوں پر انجانی پر چھائی کے پیچھے سرگرداں دوڑتی، بھاگتی رہتی تھی۔ اور جب تھک جاتی تو سنی بروک پارک میں آن ٹھہرتی تھی اور پہروں اس کے سامنے خزاں رنگ موسم، اپنے سوگوار جذبوں کے راگ مدہم سڑوں میں الاپتے رہتے۔ اور وہ ان سڑوں کے تال اپنے دل سے ملنے محسوس کرتی تھی۔

رت بدلتے انہی منظروں میں۔۔۔ ان بھاگتے دوڑتے لحوں میں، ایک دن اچانک ہی وہ اس۔۔۔ آن ملتا تھا۔

ہاں بس یونہی اچانک۔

سراہ چلتے ہوئے جب خزاں اپنے رنگ تمام ستوں میں بکھیر رہی تھیں اور جب ہر منظر ایک سوگوار اور اوڑھے کوئی مدہم، انجانا راگ الاپ رہا تھا اور ان پُر وحشت موسموں میں خشک زرد رنگ پتے کی ما سرگرداں ”گی“ کتنی دیر تک اپنی ویران رنگ آنکھوں سے اسے کتنی رہی تھی۔

پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

سراہ کبھی ایک دو بجے سے ٹکرائے بھی نہیں تھے۔

لیکن اس کے باوجود ”گی“ کو لگا تھا جیسے وہ اس چہرے سے صدیوں سے آشنا ہو۔۔۔ ان خدو خا سے برسوں سے شناسا ہو۔۔۔ جیسے یہ آنکھیں اس کے لئے اجنبی نہ ہوں یا وہ لہجہ اس کے لئے نیا نہ ہو سردار سبکدین حیدر لغاری کو کتنے لحوں تک وہ ساکت نظروں سے چپ چاپ کتنی رہی تھی اور اس۔۔۔ اس کے اندر کیسی مدہم سرگوشیاں گونجتی رہی تھیں۔ مگر ان کے معنی و مفہوم کیسے انجان رہے تھے اس سے۔۔۔ اس کے باوجود وہ خود کو اس تک بڑھنے سے روک نہ سکی تھی۔

”سنی بروک پارک“ ان خزاں رنگ موسموں میں گھرا وہی سوگوار گیت الاپ رہا تھا جن کی صدائیں اپنے اندر ہوتی سنتی تھی۔

”خزاں اپنی تمام تر ادا سی اور سوگوار سمیت کتنی پُر کیف ہے نا۔۔۔ دل کو چھوتی ہوئی، گھر کر ہوئی۔“ اس لہجے چوڑے شخص کے قریب آ کر کہتے ہوئے وہ مدہم لہجے میں بولی تھی اور جہاں پہلے وہ چو تھا وہیں دو بجے ہی پل بہت مدہم انداز میں مسکرا دیا تھا۔

”تمہیں خزاں کا یہ موسم پسند ہے؟“ بھاری لہجہ اس سے دریافت کر رہا تھا اور وہ بلا تردد سر اثبات بنا بلانے لگی تھی

”ہاں۔۔۔ یہ سوگوار موسم اور اس کے سارے اداں سر میرے اندر اترتے ہوئے گھر کر لیتے ہیں

اور پھر تا دیر میں اپنی دھڑکنوں کو ان سڑوں کے سنگ گونجتے ہوئے سنتی رہتی ہوں۔“ اس کا لہجہ دھیمہ مگر پُر تاثیر تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس جاپانی خدو خال والی لڑکی کو بغور دیکھا تھا۔ نگاہوں میں یکدم ہی دلچسپی کا تاثر اُبھر آیا تھا۔ اس گھڑی سامنے کھڑی وہ لڑکی یقیناً دلچسپی سے خالی نہ تھی۔

”تم انڈین ہو؟“ وہ دھان پان سی لڑکی شستہ انگریزی بول رہی تھی۔

”نہیں، پاکستانی۔۔۔ سردار حیدر لغاری۔“ مختصر تعارف دیا تھا۔ وہ بہت دھیمے سے مسکرا دی تھی۔

”گی۔۔۔ GEE!“

”گی۔۔۔؟“ مختصر نام کو دلچسپی سے دہرایا۔ وہ مسکرا دی۔

”گی کا مطلب سورج کبھی کا پھول ہے۔“ بہت ہولے سے آگاہ کیا۔

”اوہ۔۔۔ ویری انٹرسٹنگ۔ ٹورسٹ ہونا یہاں؟“ دریافت کیا۔

وہ مسکرائی، پھر نفی میں سر ہلانے لگی۔

”نہیں۔۔۔ میں یہیں رہتی ہوں۔۔۔ یہی میرا وطن ہے۔“

”دیکھیں تمہارے خدو خال؟“ سبکدین چونکا اور وہ مسکرا دی۔

”دراصل میں دو تہذیبوں کا ملاپ ہوں۔۔۔ میرا باپ کینیڈین ایئر فورس میں تھا اور میری ماں

یہاں سیاحت کے لئے آئی تھی پھر ان دونوں کے دلوں پر محبت نے دستک دی تو تمام فرق ایک طرف دھرا رہ گیا اور ان دونوں نے شادی کر کے گھر بسا لیا۔۔۔ مگر جب میری پیدائش عمل میں آنے والی تھی تبھی

میرے ڈیڈ کو ایک حادثے میں لقمہ اجل بن جانا پڑا۔ میری ماں بہت وفادار بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے اپنے محبوب کی سر زمین کو اپنا اوڑھنا بچھونا کر لیا اور میری پرورش کرتے ہوئے اپنی باقی ماندہ زندگی اسی

محبوب کے نام پر بسر کر دی۔۔۔ تم جانتے ہو یہ محبت تھی۔ بڑی قوی اور مضبوط شے ہوتی ہے یہ محبت بھی۔ دلوں میں گھر کرتی ہے تو وجود کے گرد ایک اسم پھونک کر آہنی دیوار اٹھا دیتی ہے۔“

وہ بولتے بولتے یکدم چونکی۔ سبکدین اس کی سمت تکتا ہوا بغور مسکرا رہا تھا۔ وہ چپ ہوئی، پھر مسکرا دی۔

”تم اس طرح مسکرا کیوں رہے ہو؟“ وہ جیسے لمحہ بھر کو خفا ہوئی۔

”بس ایسے ہی۔“ سبکدین نے سرنفی میں ہلایا۔ پھر قدرے سنجیدہ ہوتا ہوا بولا۔ ”تم باتیں بہت دلچسپی سے کرتی ہو۔ بطور خاص تمہاری آنکھیں۔۔۔ جب تم بولتی ہو تو تمہاری آنکھیں بھی اس گفتگو میں شامل ہو کر باتیں کرتی ہیں۔ کیسے کر لیتی ہو تم اس قدر دقیق، بھاری بھر کم باتیں؟“

گی نے اُسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔ پھر کوئی جواب دیئے بغیر خاموشی سے سر جھکا گئی تھی۔ پھر کچھ ثانیوں بعد بہت ہولے سے گویا ہوئی تھی۔

”سبکدین! تم کوئی پہلے شخص نہیں ہو جس نے یہ بات کہی ہے۔“

”اچھا۔۔۔ کیا تم اس بے وقوفی کا مظاہرہ پہلے بھی کر چکی ہو؟“ وہ قدرے پُر مزاح انداز میں مسکراتے ہوئے گویا ہوا تھا۔ مگر گی کے لبوں پر ایک جامد خاموشی اپنا ڈیرا جما چکی تھی۔ چند ثانیوں تک وہ

پُر وحشت خشک زرد رنگ پتوں کو ادھر ادھر اڑاتا ہوا دیکھتی رہی تھی، پھر بہت مدہم لہجے میں ہولے سے کہہ ہوئی تھی۔

”سنو تو — یہ موسم شاعری کرتا ہے۔ دیکھو کتنی صدائیں میرے اندر گونج رہی ہیں۔ کتنی سرگوشیاں کی بازگشت میرے اندر ہے اس سے اور.....“ وہ جیسے اس لمبے خود کلامی کا شکار تھی۔ پھر دھیان آیا ایک دم ہی لب بچھنچ کر سرفی میں ہلانے لگی تھی۔

”تم کتابیں پڑھتی ہو؟“

”نہیں۔۔۔ وقت نہیں ملتا۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”یونہی۔“ سبکگین حیدر لغاری نے شانے اچکائے تھے۔

”میری گفتگو سے لگا؟“ وہ یکدم مسکرائی تھی۔ سبکگین نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ اس کے سیاہ رنگ بالوں سے ہوا ہولے ہولے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ کتنی شری لیں بار بار چہرے پر جمول جاتی تھیں جنہیں پکڑ کر وہ دوسرے ہی لمحے کان کے پیچھے اڑس لیتی تھی۔ دو مختلف تہذیبوں کی جھلک اس کے خدو خال میں واضح طور پر نظر آتی تھی۔ وہ عام جاپانی لڑکیوں سے قطعاً مختلف تھی۔ خواہ باضابطہ وہ کسی بھی جاپانی لڑکی سے نہیں ملتا تھا مگر اس نے بار بار جاپانی لڑکیوں کو دیکھا تھا اور گی ان جیسی بالکل بھی نہ تھی۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا جب وہ اپنے مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

”جاپانی لڑکیاں اپنی وفاؤں میں بڑی کھری ہوتی ہیں۔۔۔ بہت وفادار محبوبہ اور بہت وفادار بیوی ثابت ہوتی ہیں۔“

”لیکن تم تو کینیڈین ہونا غالباً؟“ وہ قدرے شرارت سے مسکرایا تھا اور وہ بھی مسکرا دی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بڑی دلربا تھی جیسے ان خزاں رنگ لمحوں میں تمام منظروں پر لمحہ بھر کو بہار نے اپنے ڈیرے ڈال دیئے ہوں۔ سردار سبکگین حیدر لغاری اسے بغور دیکھ رہا تھا جب وہ گویا ہوئی تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

”تمہاری مسکراہٹ بہت تروتازہ سی ہے۔ جیسے بہار کا کوئی دلربا رنگ۔“

”ہاں شاید اس لئے کہ میں عام جاپانی لڑکیوں اور خواتین کی طرح اپنی مسکراہٹ کو دبانے یا چھپانے کے لئے مسکراتے سے چہرے پر اپنا ہاتھ نہیں دھرتی اور کھل کر مسکرائی ہوں۔ کینیڈین لوگوں کی طرح۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”باقی جاپانی لڑکیاں کیا کھل کر نہیں مسکراتیں؟“ اسے حیرت ہوئی۔

”نہیں۔۔۔ وہ اپنی مسکراہٹ کا گلا چہرے پر مسکراتے وقت ہاتھ رکھ کر گھونٹ دیتی ہیں جیسے میری

ماں۔ پہلے میں بھی ایسے ہی کرتی تھی۔ مگر پھر کسی کے کہنے پر یہ عادت ترک کرنا پڑی۔“

”کسی کے کہنے پر۔۔۔؟“ سبکگین چونکا۔ ”کون تھا وہ؟“

بات پکڑے جانے پر گی نے لمحہ بھر کوچپ ہو کر اس کی جانب دیکھا پھر چہرے کا رخ پھیر کر جیسے خود کلامی کے انداز میں بولی۔

”تھا کوئی۔۔۔ بہر حال تم نے مجھے اپنے بارے میں تو بتایا ہی نہیں۔۔۔ تمہارا نام بہت لمبا چوڑا ہے مگر بہت بارعب بھی۔“

اس کے اظہار خیال پر وہ دھیسے سے مسکرا دیا تھا۔

”پاکستان میں کچھ اراضی ہے۔ وہیں پر کھرائی کا وصف ورثے میں ملا ہے۔ میرے بابا میرے بچپن میں ہی گزر گئے تھے، جب کسی شے کا شعور تک نہ تھا۔ تبھی بابا کی جگہ دستار بندی ہوئی تھی میری۔ اور ان کا تمام اختیار مجھے ورثے میں منتقل ہو گیا تھا۔۔۔ مائی اماں یعنی میری والدہ کو مجھے جدید زمانوں کا باسی بنانے کا شوق تھا۔ سوانہوں نے کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں لگائی مجھ پر اور مجھے پڑھنے کو سات سمندر پار بھیج دیا۔ مگر میں کچھ نہیں بھول سکا۔ نہ اپنی دستار بندی، نہ ذمے داریاں، نہ وہ تہذیب و تمدن۔ سب کچھ اذہر ہے مجھے۔ میں جانتا ہوں بہت سی ذمہ داریاں ہیں میرے کاندھوں پر جنہیں نبھانے مجھے اس دلس جانا ہے۔۔۔ اس تمام منصب کی ادائیگی کرنی ہے جو مجھ پر فرض ہے۔“

”اوہ۔۔۔ تبھی تم شکل سے اتنے مغرور لگتے ہو۔ بردبار، سنجیدہ اور بارعب۔“

وہ مسکرائی تھی اور ایک دھیمی سی مسکراہٹ سردار سبکگین حیدر لغاری کے لبوں کو بھی چھو گئی تھی۔ تبھی گی نے چونکتے ہوئے گھڑی دیکھی تھی۔ پھر اس کے لبوں پر وہ بہار رنگ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”کیا ہم دوبارہ کبھی مل سکتے ہیں؟“ بہت مدہم لہجے میں وہ دریافت کر رہی تھی اور سردار سبکگین حیدر لغاری نے چند لمحوں کو سوچتے ہوئے شانے اچکائے تھے۔

”کیوں نہیں۔“

گی کی آنکھوں میں ٹھہرے تمام خزاں رت منظر و شنیوں سے بھر گئے تھے۔

اس کے لبوں پر وہی بہار رنگ مسکراہٹ تھی۔ دلربائی عروج پر تھی اور ان خزاں رنگ موسموں کی ذہلیق شام میں وہ بہت ہولے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”کل پھر یہیں ملیں گے۔۔۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ آنا ضرور۔“ مدہم لہجے میں کوئی درخواست سی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری کچھ نہیں بولا تھا۔ تبھی اس کے گداز لب بہت ہولے سے بلبے تھے۔

”سیونا را گڈ بائے۔“ آواز سرگوشی جیسی تھی۔ اور پھر وہ پلٹی تھی اور چلتی ہوئی ہواؤں کی صورت دور جاتے منظروں کے سنگ ہوئی تھی۔ سردار سبکگین چند لمحوں تک اس سمت تکتا رہا تھا۔ پھر اٹھا تھا اور واپسی کے راستوں پر قدم بڑھانے لگا تھا۔

گی یقیناً ایک دلچسپ لڑکی تھی۔

ری مہرئی، دین آئم گون اوے۔

گون فار اوے۔ ٹودی سائلٹ لینڈ۔

ری مہرئی۔

بہت تھکن زدہ سے انداز میں ایک سادہ کاغذ پر اس نے انتہائی بے دھیانی کے ساتھ دو جملے گھسیٹے تھے

اور پھر اسی انداز میں سر کرسی کی پشت سے نکا کر کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورنے لگی تھی۔ کرسٹینا روزنی ان دو لائسنوں کی بازگشت کتنی بار اس نے اپنے اندر سنی تھی۔ کتنی بار طویل سناٹوں میں اس کے اندر ایک گور سائی دیتی رہی تھی۔

فیصلوں کی صلیب پر لٹکتے رہنا بہت تکلیف دہ امر ہے۔ اور اس صورت میں تو اور بھی جب کم فیصلے کا کوئی اختیار بھی آپ کے پاس نہ ہو۔

وجود کے کسی علاقے میں چپ چاپ سناٹوں میں کیا کچھ دن ہوتا چلا جاتا ہے مگر اس کے باوجود جانے کیوں اس کی سوچوں کے تسلسل میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔ جب بھی نہیں جب سیف کمرے میں داخل ہوا اور پھر چلتا ہوا اس کے قریب آن رکا۔ وہ اس وقت بھی نہیں چونکی تھی۔ سیف نے اس کے آگے سے پیچھا اٹھا لیا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے مسکراتے ہوئے اس کی سمت تکتے لگا تھا۔

”نہیں جا رہی ہوتی؟“

اُس کے دریافت کرنے پر وہ چونکی تھی پھر خاموشی سے چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”شادی کوئی ایسا امر تو نہیں کہ تم اتنی خوفناک ترین وصیتوں کے انبار لگا دو۔ تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو خوشی سے پاگل ہو گئی ہوتی۔“ وہ یقیناً اسے چھیڑ رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود ایک سکت چپ اس کے لبوں پر رہی تھی۔

”اس طرح خوشخوابہ ٹینشن لینے سے بھلا کیا ہوگا۔ اگر دل نہیں مان رہا تو انکار کر دو نا۔ وہ کسی شاعر نے کس درجہ خوبصورتی سے کہا ہے نا۔“

اگر تم میں ہے ہمت تو بے مات کر دو

ورنہ جہاں ماں باپ کہتے ہیں شادی کر لو

میرب سیال نے سراٹھا کر دیکھا تھا۔ سیف الرحمن مسکرا رہا تھا۔ وہ شانوں پر بکھرے بالوں کو سمیٹنے لگی تھی۔

”سیف الرحمن! تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں سوائے فضول بولنے کے اور کوئی کام نہیں آتا؛“ وہ جیسے اکتا کر گویا ہوئی تھی۔ مگر پھر دو بے ہی پل چپ سادھ لی تھی۔ سیف نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر بہت دھیسے سے مسکرایا تھا۔

”تصور یہ تو دکھا دو، موصوف ہیں کیسے؟ نام تو خاصا بارعب ہے۔ سردار سیکٹین حیدر لغاری! تمہاری مام کے ری لیٹو ہیں غالباً۔ سنا ہے اپنی سلطنت کے آپ بادشاہ ہیں موصوف۔ چلو اچھا ہے۔ اسی بہانے کچھ اختیارات تمہارے ہاتھ بھی آ جائیں گے۔ ظاہری ہی بات ہے بھئی، ملکہ جو ہو جاو گی۔“ وہ نان اسٹاپ بول رہا تھا۔

”سیف! پلیز۔“ میرب سیال نے اکتائے ہوئے انداز میں اُس کی طرف دیکھا تھا۔ ”میں کوئی فضول بات سننا نہیں چاہتی۔“ پلیز لیوی الون۔“

”تاکہ تم اپنے ان ریاستی شہزادے کے متعلق سوچ سوچ کر محفوظ ہو سکو۔“ سیف الرحمن کے لبوں پر

م مسکراہٹ تھی اور میرب سیال اس کی سمت دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”تمہیں پسند نہ آنے کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟“

”سیف! پلیز۔ میں بہت پریشان ہوں۔“ اس نے سردوں ہاتھوں پر گرایا تھا۔

”سردار سیکٹین حیدر لغاری کی وجہ سے؟“ وہ بدستور چھیڑ رہا تھا۔

”پاپا کی وجہ سے۔“ اُس نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔ ”سیف! میرا دل بہت ڈرتا رہتا ہے۔“

یک خرف لہ لہ میرا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ میں سونہیں پاتی۔ مجھے اس

س کا قطعاً کوئی ملال نہیں کہ انہوں نے میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ میری مرضی کے بغیر طے کر دیا۔ مجھے

ال اس بات کا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت عجیب صورت حال میں ہو رہا ہے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا

نا، میں پاپا کو اس طرح دیکھوں گی۔ یا پھر.....“

اُس کی آنکھوں میں نمی آن ٹھہری تھی اور وہ یکدم ہی اپنے گداز لب پہنچ کر اس کی کواپنے اندر کہیں ضم

کرنے لگی تھی۔ سیف نے اسے خاموشی سے دیکھا تھا پھر بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھر دیا

نا۔ انداز حوصلہ بندھانے والا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی میں لہ بھر میں متفرق واقع ہو گیا تھا اور ایک

لوفان جیسے بند تو زکر بہہ نکلا تھا۔

”سیف! پاپا نے اس صورت حال میں میری جان بھی مانگی ہوتی تو میں ان کے حوالے کر دیتی۔ مگر

سیف! یہ فیصلہ بہت بڑا ہے۔ وہ ایک انجانا شخص ہے۔ ان دیکھا۔ کیسے سوچوں میں اس کے متعلق؟ پھر

تب کہ میں یہ جانتی ہوں کہ زوباریہ انہیں مس گائیڈ کر رہی ہیں۔ وہ ان کی بیماری کو ایک قیمتی لہ جان کر

کیش کر وار رہی ہیں۔ وہ کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھیں اور یہ موقع انہیں پاپا کی بیماری کی صورت

بتیاب ہو گیا۔ سارے راز منکشف ہیں مجھ پر۔ جانتی ہوں، زوباریہ کبھی میری خیر خواہ نہیں ہو سکتیں۔ وہ

پاپا کے سامنے اچھی ماں ہونے کا ڈھونگ کرتی ہیں اور پاپا.....“ وہ جملہ ادھر زچھوڑ کر سر جھکا کر بیٹھ گئی

تھی۔

”سیف! میں اپنی ساری زندگی کو زوباریہ کے ایک فیصلے کی نذر کرتے ہوئے بے ثمر نہیں ٹھہرا سکتی۔“

لیکن..... لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔“

سیف اسے چند ثانیوں تک خاموشی سے تکتا رہا تھا۔ پھر دھیسے سے گویا ہوا تھا۔

”تمہیں یہ خدشہ کیوں ستاتا رہتا ہے کہ زوباریہ تمہارے ساتھ سنہیر نہیں یا وہ تمہیں سن پوز کرنا چاہتی

ہے؟“

”کیونکہ یہ سچ ہے سیف! اور یہ بات تم بھی جانتے ہو، وہ میری ماں نہیں ہیں۔ سوتیلی کبھی ماں نہیں ہو

سکتی۔ وہ بس ایک موقع چاہتی تھی اور وہ موقع اسے پاپا کے باعث مل گیا۔ وہ مجھے ٹھکانے لگا کر اپنی راہ

بیشے کے لئے ہموار کرنا چاہتی ہے۔“

”ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔۔۔۔۔۔ زوباریہ آنٹی ایسی لگتی نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ ایک سرد مہری کی دیوار جو

درمیان میں تھی ہے وہ فقط تمہارے باعث ہی ہو۔ تم نے ہی کبھی کوشش نہ کی ہو انہیں سمجھنے کی، جاننے کی۔“

وہ دروازے کے قریب جا کر رکا تھا۔ مڑ کر اسے دیکھا تھا پھر ایک مسکراہٹ اس کے لبوں کا اٹھائی تھی۔

”تم ایسا کرو، شادی کر لو۔ اس طرح کم از کم مجھے بھی کچھ ریلیف ملے گا۔“

مگر اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی میرب سیال نے ایک کٹن زوردار طریقے سے اسے کھینچا تھا۔ جس سے بچنے کے لئے اس نے فوراً دروازہ بند کر دیا تھا اور میرب سیال دروازے کی سمت تکتا ایک بار پھر دونوں ہاتھوں پر سر گرا گئی تھی۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں

حادثہ ایک دم نہیں ہوتا!

چار سو ایک پُر وحشت سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

تازہ موگرے اور گیندے کے پھول جا بجا کھڑے ہوئے تھے۔ ایک ہو کا عالم تھا۔ ابھی تھوڑی دیر میں گھر میں ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے گیت گونج رہے تھے، اسی گھر میں اس لمحے سوگ کا سا عالم مہمانوں سے بھرا گھر اب خالی ہو چکا تھا۔

گندھے ہوئے اُٹن کی خوشبو سے پورا گھر مہک رہا تھا۔ مگر فضاؤں میں وہ تازگی و شادابی باقی نہ تھی۔

ابھی تھوڑی دیر قبل کی رسم اٹن کی منظر ڈہن کی آنکھوں میں حد درجہ ویرانی تھی۔

ابھی کچھ دیر قبل شادی کے لئے سجایا جانے والا گھر جیسے ماتم کدہ بن چکا تھا۔

سسرال سے اُٹن آیا تھا مگر اس کی خوشبو سے ڈہن کے پورے پورے مہکے تھے۔

شادی کی ابتدائی رسم وقوع پذیر ہونے سے قبل ہی اختتام پذیر ہو گئی تھی۔

کوئی فیصلہ کن موڑ آیا تھا اور اپنا فیصلہ رقم کر گیا تھا۔

کوئی پل آیا تھا اور لٹھوں کا سارا حسن اپنے سنگ سمیٹ لے گیا تھا۔

کئی دیکھ لے تھے۔ مقدمہ کتنی دیر چلا تھا۔ کتنی تاویلیں دی گئی تھیں۔ کتنی وضاحتیں۔ مگر سب بے سود رہا۔

اقدام بہت بڑا تھا شاید۔

کتنے سمجھانے بھانے والے تھے مگر حاصل صفر رہا تھا۔ شادی آغاز سے قبل ہی اختتام پذیر ہو گئی تھی۔

ایک بیٹی کو باپ کے کئے کی بڑی بھیانک سزا دی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سارے خواب بے دردی نوج لئے گئے تھے۔

اس کی اُمگلیں، اُس کی انا، اُس کے سارے جذبات روند دیئے گئے تھے۔

وہ جو شام تک شہنائیوں کی آوازوں سے اپنی ساعتوں کو بچتا دیکھ رہی تھی اب ایک پُر وحشت سکون

چپ چاپ کمرے میں بند جمیل رہی تھی۔ خواب قطرہ قطرہ اس کی آنکھوں سے بہ رہے تھے۔

سید اذہان حسن بخاری چپ چاپ دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ دوسری طرف سعد حسن بخاری

ہاتھوں پر گرائے بیٹھے تھے اور ان دونوں کے درمیان فیض بخاری دیوار بنے کھڑے تھے۔

ابھی تھوڑی دیر قبل کی جو صورت حال تھی اس میں نئی نو ملی ڈہن کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس کی طبیعت کے

سبب اور کچھ قصداً سعد حسن بخاری نے بیگم کو ڈرا بیور کے ساتھ گھر واپس بھجوا دیا تھا۔ جب کہ خود وہاں ماہا

کی سسرال کے سامنے مقدمے کی بیرونی کو موجود رہے تھے۔ اپنی شادی کو وجہ بنانے پر کس قدر غم و غصے کا

انہار کیا تھا انہوں نے اور اس سے صورت حال بجائے سنوارنے کے مزید بگڑ گئی تھی۔ وہ اپنے طور پر

وضاحتیں دے رہے تھے، سمجھا بھجھا رہے تھے مگر سب کچھ فضول تھا جیسے۔

سب معمولی نہ تھا۔ قصہ نظر انداز کئے جانے کے قابل نہ تھا۔ بات چھوٹی نہ تھی۔ سوساری وضاحتیں رد

ہو گئی تھیں اور پہلی بار ایک باپ کے باعث بیٹی کی شادی انجام پذیر ہونے سے روٹی گئی تھی۔

ایک باپ کی شادی کے باعث، بیٹی کی شادی ادھوری رہ گئی تھی۔

خواب دیکھنے والی آنکھیں ویرانیوں سے بھر گئی تھیں۔

مگر اس تمام صورت حال کے باوجود باپ کو اپنی غلطی ماننے کی بجائے اپنی بات رد کئے جانے کا ملال

زیادہ تھا۔

”بے وقوف لوگ ہیں۔ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ میرا معاملہ سراسر الگ ہے اور میری بیٹی کا الگ۔

میں کیا کرتا ہوں، کیا نہیں یہ میرا پرسل انیئر ہے۔ جس میں کم از کم کسی اور کی مداخلت میں برداشت نہیں کر

سکتا۔ خواجواہ کا ایشو بنا رہے ہیں لوگ۔ بھلا میری شادی سے کسی کا کیا نقصان ہوا ہے؟ اور شادی

کرنا کون سا گناہ ہے۔ کتنے لوگ شادیاں کرتے ہیں۔ میں نے دوسری شادی کر کے کون سا گناہ کر لیا۔

گناہ تو جب ہوتا جب میں شادی کے بغیر کوئی تعلق قائم رکھتا۔ یہ ایک شرعی شادی ہے۔ پھر دنیا سے

قبول کرنے سے کیوں کترا رہی ہے؟ لالچی لوگ ہیں کجخت، اپنا اٹو سیدھا رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے تو

یہاں تک پوچھ لیا کیا چاہئے، گاڑی، بگلہ، کیا کیا چاہئے۔ مگر وہ بھی ڈھاک کے تین پات بنائے

بیٹھے تھے۔ ایک ہی جواز لئے لیکر پٹینے رہے۔ اچھا ہوا جلد اصلیت کھل گئی۔ گھٹیا لوگ کل جانے کون سے

تیور دکھائے۔“ وہ جیسے اس گھڑی خود کلامی کر رہے تھے۔

سید اذہان حسن بخاری نے بے تاثر چہرے سمیت باپ کی سمت نگاہ کی تھی۔ پھر چاچا کی طرف دیکھا

تھا اور رسائیت سے پُر لہجے میں بولا تھا۔

”چاچو! ان سے کہئے ہمارا ان سے اب کوئی رشتہ نہیں ہے۔ براہ مہربانی چلے جائیں یہ یہاں سے۔“

فیض بخاری نے جوان بیٹے کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”تم جاؤ اندر۔۔۔ میں بات کرتا ہوں۔“ نری سے سمجھانے والا انداز اختیار کیا تھا۔ جانتے تھے

ایک آنچ دکھانے والی بات تھی اور سارا منظر خاکستر ہو جاتا تھا۔ وہ جوان خون کے اندر ایک لاوا پکتے ہوئے

محسوس کر رہے تھے تھی احمیاط سے کام لیتے ہوئے اسے وہاں سے ہٹانا چاہتے تھے۔ مگر سعد حسن بخاری

پھٹ پڑے تھے۔

”سارا معاملہ اس کا بگاڑا ہوا ہے۔۔۔ اسے مطلع کر دو فیض! یہ گھر قانونی طور پر میرا ہے۔ اس کی

ایک ایک شے میری بنائی ہوئی ہے۔ اس گھر پر حکم بھی میرا چلے گا۔ اسے میرے یا اس گھر کے معاملات میں بولنے کا قطعاً کوئی حق نہیں۔ یہی بات فارحہ سے بھی کہی گئی تھی میں نے۔ مگر اس نے اسے میرے مد مقابل ا کھڑا کیا۔ اس سے پوچھو کیا شناخت ہے اس کی؟ کیا پہچان و مقام ہے سوسائٹی میں؟ کتنے لوگ اسے جانتے ہیں اور جانتے بھی ہیں تو کس حوالے سے؟ کیا ہے جو اس کا اپنا ہے؟ سب کچھ میرے دان کیا ہوا ہے۔ آج اگر یہ اپنے قدموں پر جم کر کھڑا ہے تو میری بدولت۔ دو چار لوگ جانتے ہیں، جھک کر سلام کرتے ہیں تو فقط میرے حوالے سے۔ دنیا میں اگر کوئی عزت و مرتبہ ہے تو فقط میرے باعث۔ یہ نام، یہ مقام میرا دیا ہوا ہے۔ اور آج یہ میرے مقابل کھڑا ہو کر مجھے ہی للکار رہا ہے۔ یہ سب کچھ فارحہ کا کیا دھرا ہے۔ اپنا وکیل بنایا ہے اس نے اسے۔ میں نے باور کرایا تھا اسے، بات خود تک محدود رکھو گی تو سب کچھ ٹھیک رہے گا۔ مگر اس نے اسے پٹی پڑھا کر اپنی ڈھال بنالیا۔ بیٹی کی شادی کا مجھے بھلا کوئی خیال نہ تھا؟ مگر یہ سب کیا دھرا ان دونوں ماں بیٹے کا ہے۔“

سید اذہان حسن بخاری عجب اک ضبط سے سر جھکائے کھڑا رہا تھا۔ کمرے میں فقط سعد حسن بخاری کی آواز گونج رہی تھی۔

”مجھے اس انتہائی اقدام پر ان دونوں نے مجبور کیا۔ کہہ دیا تھا میں نے، ایسا کر گزروں گا اگر ان دونوں ماں بیٹے نے مجھ سے مخالفت کی تھانی۔ بے وقوف عورت سمجھی نہیں۔ اس سے قبل بھی جب اس نے یہ معاملہ اٹھایا تھا۔ میں نے فارحہ سے کہا تھا ان موصوف اور مجھ میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو۔ بیٹا چاہئے یا شوہر؟ مگر تب اس نے آئندہ کسی ایسی مداخلت کے نہ ہونے کی یقین دہانی کرائی تھی۔ مگر ایسا ہوا نہیں۔ ہمت دیکھو ان موصوف کی، مجھ سے باز پرس فرمائی اور ان اقدام میں ماں صاحبہ پیش پیش رہیں۔ خوش کیوں نہ ہوتیں۔ ایک وکیل جو ہاتھ آ گیا تھا۔“

بیٹے کے لئے ان کا لہجہ حد درجہ زہر خند تھا۔ فیض بخاری بہت پُر افسوس انداز میں بھائی صاحب کو دیکھ رہے تھے۔

سید اذہان حسن بخاری بدستور سر جھکائے کھڑا تھا۔ پُر تناؤ چہرہ کسی بھی طرح کے تاثر سے عاری تھا۔ خاموشیوں میں کیا کیا طوفان نہ پل رہے تھے۔ فیض بخاری نے نتیجے کو دیکھا تھا پھر بہت دھیمے لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

”تم اندر چلو۔ میں ہوں یہاں۔“

”اسے اندر کیوں بھیج رہے ہو؟۔۔۔ اسی کا تو سارا مقدمہ ہے۔ وکالت نہیں کرنے دو گے اسے؟“

سعد بخاری دباڑے تھے۔ جس سرد جنگ کا آغا چند دن پہلے باپ بیٹے کے بائین ہوا تھا وہ سرد جنگ اب انتہائی شدت اختیار کر چکی تھی۔ فیض بخاری نے اذہان کا شانہ تمام کر ضبط قائم رکھنے کی جیسے درخواست کی تھی۔

اذہان حسن بخاری نے قدم اندر کی جانب بڑھائے تھے۔ جیسی عالم مدہوشی میں چلتی فارحہ دہلیز پر آن رکی تھیں۔ خالی خالی نظروں سے منظروں کو نکلتی جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بو جھل آنکھیں ویرانیوں

سے بھری ہوئی تھیں۔ سید سعد حسن بخاری اٹھ کر ان کے سامنے جا کر کھڑے تھے۔ کچھ دیر تک اسے خاموشی سے تکتے رہے تھے پھر بہت سخت لہجے میں بولے تھے۔

”صبح کیا تھا ماں نے تمہیں۔۔۔ انجام کی ذمے دار تم خود ہو۔“ الزام بہت کڑا تھا مگر وہ خالی خالی نظروں سے ان کی سمت تکتی چلی گئی تھیں۔

”تم فارحہ بیگم! تم..... تم نے بیٹے کو فوقیت دی شوہر پر۔ جو کچھ بھی ہوا اس کی ذمے دار تم خود ہو۔“ اُسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا تھا۔ ”آج جو کچھ بھی ہوا تمہارے اس بیٹے کی وجہ سے ہوا۔ یہ ہنستا ہنستا گھر، یہ خوشیاں، جو کچھ بھی تم سے روٹھ گیا سب اس بیٹے کی بدولت۔ تمہاری بیٹی کا گھر بے بستی جو رہ گیا فقط اس بیوٹ کے باعث۔ تم نے اسے چھوٹ دی، باپ سے باز پرس کرنے کی، اس کے نئی معاملات میں ٹانگ اڑانے کی اور میرے اور اپنے درمیان آنے کی۔ اور آج نتیجہ تم دیکھ چکی ہو۔ تمہاری بیٹی کی شادی جو آج ٹوٹ گئی ہے تو میرے باعث نہیں۔ میری شادی یا میں اس کی وجہ قطعاً نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جو کچھ بھی ہوا وہ عمل نہیں، رد عمل تھا۔“

سعد بخاری کا زہر خند لہجہ چہار سمت گونج رہا تھا۔ اس کے ہاتھ فارحہ کے شانوں پر تھے اور وہ جو ساکت بت بنی کھڑی تھی، یکدم ہی لڑکھرائی تھی اور زمین پر آ رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری اور فیض نے فوراً ہی فارحہ کی جانب پیش قدمی کی تھی۔

”مئی..... مئی.....“ عجب ہذیبانی انداز میں اذہان حسن بخاری نے پکارا تھا مگر دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ سید اذہان حسن بخاری نے سر اٹھا کر لہورنگ آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا تھا۔

”اگر میری ماں کو کچھ ہو گیا تو میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔“ سخت لہجے میں کہہ کر اس نے فوراً ہی ماں کو اپنے مضبوط آہنی بازوؤں میں بھرا تھا اور باہر کی سمت نکلنے لگا تھا۔ فیض بخاری نے بھی ساتھ ہی پیش قدمی کی تھی۔

سعد حسن بخاری وہیں کھڑے تکتے رہ گئے تھے۔

اچانک ہونے والے واقعات کو نہ ذہن قبول کرتا ہے نہ دل۔

اور وہ اگرچہ دل کے احکامات پر کان دھرنے والوں میں سے نہ تھی مگر اس کے باوجود کئی دنوں سے ایک بے چینی مسلسل اس کا گھیراؤ کئے ہوئے تھی۔ وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے ہر طرف سے غافل ہونے کے جتن سوچ رہی تھی۔ اپنے طور پر اس تمام صورت حال سے بھاگ رہی تھی یا بچنے کی سہی کر رہی تھی۔ مگر اس صبح جب وہ کیسپس جانے کی تیاری کر رہی تھی، فانی نے کمرے میں آ کر اطلاع دی تھی کہ پاپا اسے بلا رہے تھے اور اس کا دل جیسے مٹی میں آ گیا تھا۔

کتنی دیر تک وہ ہمیشہ برش ہاتھ میں لئے ساکت بیٹھی خود کو اس صورت حال کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنے کے جتن کرتی رہی تھی۔ مگر اس کے باوجود جیسے صورت حال اختیار سے باہر تھی۔ مگر یہ فعل بھی ناگزیر

تھا۔ سچی وہ ہوتی بھیجے ہوئے سے انھی تھی اور باہر نکل آئی تھی۔ پاپا ناشتے کی ٹیبل پر اس کے منتظرانہ زواریہ شاید فانی کو سکول جانے کے لئے تیاری میں مدد دے رہی تھیں۔ وہ مردہ قدموں سے چلتی ٹیبل آن بیٹھی تھی۔ پاپا نے ڈان کے صفحات پر سے دھیان ہٹا کر اس کی سمت نگاہ کی تھی پھر دھیمے لہجے گویا ہوئے تھے۔

”بریک فاسٹ لو۔“ اور میرب سیال مرے دل سے اپنے لئے چائے اٹھیلنے لگی تھی۔ پاپا کچھ دیر خاموشی سے اپنا ناشتہ لیتے رہے تھے پھر اس کی سمت دیکھا تھا۔

”میرب! آپ بہت انڈر اسٹینڈنگ بچے ہو میرے۔ صورت حال کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہو۔ معاملہ اتنا سنگین نہیں مگر میں اپنی زندگی میں اپنے بچوں کو سیکورڈ دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہر باپ کی طر میری بھی یہی خواہش ہے کہ میرے بچے خوش اور پُر تحفظ رہیں۔ ہر باپ اپنے بچوں کے لئے ان مستقبل کو سامنے رکھ کر خواب وضع کرتا ہے۔ میرے بھی بہت سے خواب تھے مگر زندگی کا کوئی بھرو نہیں۔“ پاپا تمہید باندھتے ہوئے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہے تھے اور کتنی چپ چاپ اس کی آنکھوں۔ پانی نکل کر قظروں کی صورت ٹیبل کی سطح پر بکھرنے لگا تھا۔ پاپا نے بہت ہوئے سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ دھرا تھا۔

”ڈونٹ بی فوش میرب! زندگی کو بہت بہادری سے فیس کرتا ہے تمہیں۔ میں اپنے بچوں کو کزن ہرگز نہیں دیکھنا چاہتا۔ مجھے افسوس ہے ہم نے تمہاری رائے جانے بغیر تمہاری بات پکی کر دی۔ مگر یہ اقدام غیر مناسب قطعاً نہیں۔ یہ تمہاری بہتری کے لئے ہے۔ والدین کبھی اپنے بچوں کے لئے برا نہیں چاہتے حمیدہ بیگم، زواریہ کی کزن ہیں۔ قابل بھروسہ لوگ ہیں۔ برسوں پرانی جان پہچان ہے۔ اس کے باوجود میرے لئے یہ فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ میں جانتا ہوں آپ کی اسٹڈی پر بھی اثر پڑے گا۔ مگر میرے پاپا اس سے بہتر فیصلہ نہ تھا۔ حمیدہ بیگم نے ہمیں اپنے فارم ہاؤس پر آنے کی دعوت دی ہے۔ سبکنگین لغاری چند ہی دنوں میں واپس لوٹ آئیں گے۔ آپ مل لیجئے گا ان سے۔ فی الحال فقط نسبت ملے ہوگی۔ حمیدہ آپا فوراً شادی کرنا چاہتی ہیں مگر میں یہ فریضہ اتنی جلد سرانجام دینے کے حق میں اس لئے نہیں کہ کوئی نا انصافی نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں آپ کی مرضی بھی اس میں شامل رہے۔ منگنی سے شادی تک عرصہ انڈر اسٹینڈنگ کے لئے ہوگا۔ اگر آپ کو ہمارے فیصلے پر کوئی اعتراض ہو تو آپ انکار کر سکتے ہر جانے سے قبل میں یہ فریضہ اپنے ہاتھوں سرانجام دے جانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے آپ مجھے حق سے محروم نہیں کرو گے اور میری خواہش کا احترام کرو گے۔“

مظہر سیال کے لہجے میں ایک مان تھا اور میرب سیال سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔ آنکھوں سے پانی قطرے ایک تو اتار کے ساتھ ٹیبل کی سطح پر گرتے رہے تھے۔ مظہر سیال بات جاری رکھتے ہوئے بو تھے۔

”حمیدہ بیگم کے ساتھ ملے پایا ہے کہ جب تک ہم علاج کی غرض سے بیرون ملک مقیم رہیں گے، آ۔ ان کے ہاں قیام کریں گی۔“

پاپا کا حکم عجیب تھا۔ تبھی شاید اس تمام عرصے میں پہلی بار سراٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

”میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“

”بچوں جیسی باتیں نہیں کرتے بیٹا! زواریہ ہوگی تا میرے ساتھ۔“ مظہر سیال نے کسی قدر تیزی سے کہا تھا پھر شاید اندازہ ہونے پر بہت مدہم انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولے تھے۔

”پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر تمہاری پڑھائی کا بھی حرج ہوگا۔ تم بہت سا پڑھو، بہت قابل انسان ہو۔ یہ میرا خواب ہے۔“ مظہر سیال اسے بچوں کی طرح پچکارے ہوئے اپنی خواہشات کا انبار لگا رہے تھے اور وہ سر جھکائے میز کی گیلی سطح کو تکی رہی تھی۔ پھر ان کے چپ ہونے پر یکدم سراٹھایا تھا۔

”میں کسی کے گھر نہیں رہوں گی۔“ کہنے کے ساتھ نفی میں سر ہلایا تھا۔

”تو کیا مجھے پریشان کرو گی؟“ پاپا نے اسے وضاحتی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ نوری طور پر کچھ نہ بولی تھی۔ تبھی وہ بولے تھے۔

”دیکھو بیٹا! بات چند روز ہے۔ اور حمیدہ آپا کوئی اجنبی نہیں۔“

”نہیں..... نہیں..... نہیں۔“ دل بولے جا رہا تھا۔ مگر اس کے لبوں پر کئی قفل پڑے تھے۔ مظہر سیال نے اسے بخور دیکھا تھا۔

”پرستل..... کہیں اور وابستگی ہے آپ کی؟“ وہ اعتراض کی وجہ جاننا چاہتی تھی۔

”نہیں۔“ اس نے سرنفی میں ہلایا تھا۔

”پھر؟“

مگر وہ چپ رہی تھی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ دوسرے ہی پل اٹھی تھی اور شو لڈر بیگ کا دھسے پر ڈال کر باہر نکل آئی تھی۔ ایک روشن صبح اس کے سامنے روشنی کا سفر کر رہی تھی۔ بہت سی چمکیلی روشنی اس کے ارد گرد بکھری تھی مگر اندر کہیں بہت زیادہ گھپ اندھیرا تھا اور وہ اس اندھیرے میں خود کو تلاشتی پھر رہی تھی مگر سرا کہیں بھی نہیں تھا۔

”محبت اپنی شباتیں ڈھونڈتی ہے۔ آتے جاتے موسموں میں، گزرتے لمحوں میں، مختلف رنگوں میں، مختلف چہروں میں، مختلف آنکھوں میں۔ محبت کا یہ وتیرہ ہے۔ اظہار ہوں سنگ، زرد پتوں کی طرح بے سمت اڑنا اور منزلوں کا تعاقب کرنا۔ تغیرات زمانہ کے باوجود یہ بے خودی تھمتی نہیں ہے۔ یہ شوق سفر زکاتا نہیں ہے۔ محبت اپنی کھوج جاری رکھتی ہے۔ نا کامیوں سے بے پرواہ اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔“ گی کا دمدم لہجہ فضاؤں میں خوشبو کی صورت بکھرتا جا رہا تھا۔ ٹورنٹو اب بھی انہی فضاؤں کی زد پر تھا۔ سنی بروک پارک میں خشک زرد پتے اسی انہماک سے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری خاموشی سے اس کی سمت تکتا رہا تھا پھر جانے کیوں ہوئے سے مسکرا دیا تھا۔ گی اس کے مسکرانے پر اسے دیکھنے لگی تھی۔ شاید اسی لئے وہ وضاحتی انداز میں گویا ہوا تھا۔

”لڑکیاں شاید ساری ایک جیسی ہوتی ہیں۔“ اس کے تجزیے پر وہ اسے خاموشی سے دیکھنے لگی تھی پھر

”تم بہت بے تاثر ہو۔ سرد، جامد، خود کو فقط پوز کرتے ہو یا پھر ہوگی؟“ وہ اس کے متعلق شاید کوئی تاثر قائم نہ کر پائی تھی سبھی دھمے لہجے میں گویا ہوئی تھی اور سبکگین حیدر لغاری کے لبوں پر اس لمحے جانے کیوں مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

”میرے بارے میں جاننے کی متلاشی ہو؟“ عجب سوال تھا۔

گی نے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔ شاید اس کے چہرے سے کچھ اخذ کرنا چاہا تھا مگر پھر ناکام ہو کر سرٹی میں ہلانے لگی تھی۔

”تم کوئی عام آدمی ہرگز نہیں ہو۔“ بہت تھکے ہوئے لہجے میں جیسے وہ اعتراف کرتی ہوئی چہرے کا رخ پھیر گئی تھی اور اس لمحے سردار سبکگین کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”تم یہ اعتراف کرنے والی پہلی لڑکی نہیں ہو۔“ ایک ازلی تمکنت اس گھڑی نہ صرف لہجے میں تھی بلکہ آنکھوں سے بھی یہ احساس ہو پیدا تھا۔ مگر گی کچھ نہیں بولی تھی۔ کچھ دیر تک ان کے درمیان طویل خاموشی رہی تھی۔ سرسراتی خنک ہوا میں ہولے ہولے بہت سی مدہم سرگوشیاں کرتی پاس سے گزرتی رہی تھیں مگر ان مدہم سرگوشیوں پر نہ گی نے کان دھرے تھے نہ ہی سردار سبکگین نے۔ بہت سے لمحے خاموشی سے دبے پاؤں گزر گئے تھے۔ پھر انہی خاموش لمحوں میں سردار سبکگین لغاری نے اس دھان پان سی لڑکی کی جانب دیکھا تھا اور قدرے دھمے انداز میں مسکراتا ہوا گویا ہوا تھا۔

”کیا تمہیں مجھ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی؟“

”نہیں۔“ گی اس کی جانب دیکھے بغیر بولی تھی۔ سبکگین بغور اس کی سمت تکتا رہا تھا۔ لبوں کی مسکراہٹ اس گھڑی گہری ہو گئی تھی۔

”جھوٹ بول رہی ہو؟“ دھمے لہجے میں دریافت کیا تھا۔

گی چند ثانیوں تک خاموش رہی تھی، پھر ہولے سے گردن پھیر کر اس کی سمت دیکھا تھا اور اسی قدر ابھگی سے گویا ہوئی تھی۔

”ہاں۔“

بہت برجستہ اعتراف تھا۔ سردار سبکگین اسے دیکھنے لگا تھا۔ مگر وہ مزید کچھ نہیں بولی تھی۔ شاید جو بولی تھی وہی بہت کافی تھا۔ سردار سبکگین کے لبوں پر بہت ہولے سے مسکراہٹ ابھری تھی۔

”تم پہلی لڑکی نہیں ہو جو ایسا اعتراف بلا تامل کر رہی ہو۔“

گی نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ہی نہیں لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ یقیناً وہ اسے چھیڑ رہا تھا اور اس لمحے گی کے گداز لبوں پر بھی مسکراہٹ بہار کے سارے رنگ اپنے ہمراہ لے دے پاؤں اتر آئی تھی جسے چھپانے کے لئے اس نے روایتی جاپانی لڑکیوں کی طرح نہ تو چہرے پر ہاتھ دھرنے کی کوشش کی تھی نہ ہی کس تروتازہ مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش کی تھی بلکہ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ مسکراتی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

”تمہیں کبھی محبت نہیں ہوئی؟“

”تمہیں کیا لگتا ہے؟“ سبکگین نے الٹا سوال داغ کر اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ لبوں پر پھلپھلی

ہولے سے گویا ہوئی تھی۔

”کیا مشرقی لڑکیوں کی سوچ ایسی ہی فطری ہوتی ہے؟“ اور وہ ہنس دیا تھا۔ پھر قدرے لاپرواہی سے

شانے اچکا دیئے تھے۔

”پتہ نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ گی کی جانب سے استفسار ہوا تھا۔

”میں پاکستان میں زیادہ رہا نہیں۔ دس برس کا تھا جب مائی اماں نے بڑھنے کی غرض سے برٹین بچہ دیا۔ عرصہ دراز تک وہیں رہائش پذیر رہا۔ کبھی کبھار پاکستان جانا ہوتا رہا۔ مگر وہ ڈیوریشن بہت کم رہا پڑھائی سے فراغت ہوئی تو خاندانی امور کی ذمہ داریاں کندھوں پر آن پڑیں۔ کاروبار کا آغاز ہوا۔ ملکوں ملکوں سفر کرنے لگا اور کسی اور طرف کا دھیان ہی نہیں رہا۔“

”اس کا مطلب ہے تم لڑکیوں سے کبھی وابستہ نہیں رہے؟“ گی کو کسی قدر حیرت ہوئی اور وہ مسکرا دیا۔

”نہیں، ایسی بات نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اس لمحے تمہارے سامنے نہ ہوتا۔ میں ایک عام سائبند

ہوں۔ فطری تقاضوں سے خود کو بچا نہیں سکتا۔ یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ ہاں یہ ہے کہ مشرقی لڑکیوں سے میرے

سابقہ اس طور نہیں پڑا۔ بہت سی کزنز ہیں۔ مگر انہیں میں نے کبھی ایسی نظر سے نہیں دیکھا۔“ اس نے کما

بھی مبالغہ آرائی کے بغیر صاف گوتی سے کہتے ہوئے شانے اچکائے تھے اور جواباً گی بہت سی بے یقین

آنکھوں میں بھرے اسے تکتے لگی تھی۔

”یعنی مغرب میں تمہاری وابستگی لڑکیوں سے رہی؟“

جانے اُس نے کیا جانا چاہا تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے اپنی ازلی تمکنت سے اس کی سمت نگاہ نہ تھی اور دھان پان سی نظر آنے والی گی اس لمحے اپنے چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

اس چہرے کے رنگوں میں ایک تغیر کی سی کیفیت تھی۔ ان فضاؤں کو مات دیتے لبوں پر خاموشیوں

پہرہ تھا۔ سبکگین لغاری اس کی سمت سے دھیان ہٹا کر چہرے کا رخ پھیر گیا تھا مگر اس لمحے اس کے لبوں

بڑی دھمی سی مسکراہٹ اترتی تھی۔

”تمہیں اچھا نہیں لگا؟“

”کیا؟“ گی چہرے کا رخ پھیرے پھیرے بولی تھی۔

”ہی، میری لڑکیوں سے وابستگی۔“ انداز سرسری تھا مگر لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ گی کچھ نہ

بولی تھی مگر سرسراتی پاگل ہوائیں بہت چپکے چپکے کچھ دھیمی سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

”کیا کسی سرد خانے سے کوئی بے خودی ہولے ہولے سر اٹھا رہی ہے؟“ بہت ہولے سے جھک

سبکگین لغاری نے ایک مدہم سی سرگوشی کی تھی۔ شرارت سے بھر پور لہجے میں گویا ہوا تھا۔ گی یکدم جو تہ

ہوئے اسے دیکھنے لگی تھی۔ مگر وہ جس سرعت سے گویا ہوا تھا اس سے کہیں زیادہ سرعت سے اس کے اند

میں تغیر واقع ہوا تھا۔ چہرہ کسی قدر بے تاثر اور انداز لاپرواہیانا تھا۔ شرارت کرنے والا۔ اس کی جانب ق

اس گھڑی متوجہ نہ تھا۔ گی اسے دیکھتے ہوئے چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ گی کے اس سوال سے حد درجہ محظوظ ہوا ہے۔ گی نے سرسری انداز میں شا۔ اچکائے تھے۔ انداز لاپرواہ سا تھا۔ سبکگین نے یکدم ہاتھ بڑھا کر اس صبح چہرے سے پہرہ دیتی ان شرار لٹوں کو چھوا تھا۔ گی ایک پل میں جیسے بیدار ہوئی تھی۔ بے ارادہ ہی ذرا پیچھے ہٹ گئی تھی۔ بس کوئی انگارہ جیسے۔ مگر سبکگین کی جویت قطعاً نہیں ٹوٹی تھی۔ وہ اسی طور اس کی سمت تکتا رہا تھا۔

”تم بہت خوب صورت ہو گی!“ لہجہ مدہم تھا۔ مگر گی کچھ نہیں بولی تھی۔ چند لمحوں تک خاموشی ان۔ درمیان ستر کرتی رہی تھی۔ پھر اچانک گی نے سر اٹھا کر اس لیے جوڑے شخص کو دیکھا تھا۔

”تم اب تک یہ بات کتنی لڑکیوں سے کہہ چکے ہو؟“

”اتنی ہی جو تمہارے جتنی خوبصورت تھیں۔“ وہ مسکرایا تھا۔

گی جانے کیوں اسے بغور نکتے لگی تھی۔ پھر مدہم لہجے میں بولی تھی۔

”اور ان خوب صورت لڑکیوں میں اتنی خوب صورت کتنی تھیں جو تمہارے دل کو چھو سکیں؟“ سبکگین

کچھ نہیں بولا تھا۔ بس فقط اسے دیکھتے ہوئے چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔ گی کچھ دیر تک اسے نکتی رہی تھی، پھر بول اٹھی تھی۔

”جو بہت کم کم مسکرانے والے ہوتے ہیں وہ جب مسکراتے ہیں تو مسکراہٹ ان کے چہرے پر بہتر بھلی لگتی ہے۔ ایسے ہی جیسے تمہارے چہرے پر۔“ اس کا تجزیہ بہت برجستہ تھا۔ سبکگین اس کی سمت نکتے آ تھا۔

”تمہیں کیسے لگا کہ میں کم کم مسکراتا ہوں؟“

”تمہارے چہرے سے۔ بہت تناؤ کی سی کیفیت ہے۔ بہت حد تک سرد و جامد اور بے تاثر۔ شاید بہت اچھے ہونڈر سے۔ مگر تمہارا چہرہ اس بات کی ترجمانی نہیں کرتا۔“

اور وہ ہنس دیا تھا۔

”اپنی رائے تبدیل کر رہی ہو؟“

”نہیں۔ بہتر انداز میں واضح کر رہی ہوں۔“ وہ سر جھکا گئی تھی۔ وہ اس کی سمت نکتے لگا؛

فقط خوب صورت ہی نہیں بہت زیادہ ذہین لڑکی تھی۔ وہ لمحہ لمحہ اس پر پھیلیوں کی صورت میں کھل رہی شاید اسی لئے اس کے ساتھ بات کر کے سبکگین کو لطف آ رہا تھا۔

”تمہیں کبھی محبت نہیں ہوئی؟“ وہ بہت چوکتے ہوئے سر اٹھا کر اس کو نکتے لگی تھی۔ وہ بغور ا

سمت دیکھ رہا تھا اور اس لمحے ان خواب خواب آنکھوں کے رنگ یکدم بدلنے لگے تھے۔ کتنی دیر انیا کرنے لگی تھیں اور گی اس کی سمت سے چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ بالکل غیر ارادی طور پر۔ وہ اس

اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں موجود انگلی کو گھما لگی تھی۔ انداز بے حد منظر آری تھا۔ سبکگین بغور دیکھ رہا تھا۔

”اس نے تم سے بے وفائی کی؟“ وہ کسی نتیجے پر پہنچتا ہوا گویا ہوا تھا۔

وہ یکدم سر لٹی میں بلانے لگی تھی۔

”کیا بہت چاہتی تھیں تم اُسے؟“ اُسے کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔

گی کچھ نہیں بولی تھی۔ تبھی جیسے وہ اس کی عقل پر ماتم کرتا ہوا گویا ہوا تھا۔

”محبت اس زمانے کی شے نہیں۔ کرتے ہوں گے کوئی بے وقوف جن کے پاس عقل کا فقدان ہوتا ہوگا بروقت کی فراوانی۔ مگر آج کے دور میں قطعاً نہیں۔ وقت کس کے پاس ہے۔ کتنی گہما گہمی ہے، افراتفری اور ایسے میں محبت۔ نان سنس۔“

”ایسا مت کہو۔ محبت کوئی فضول شے نہیں ہے۔“

”تو تم واقعی محبت پر اس درجہ ایمان رکھتی ہو۔ بے وقوف لڑکی! تبھی تمہاری آنکھیں اس قدر دیرانیوں، بھری پڑی ہیں۔“ وہ اُسے ڈانٹتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر اُسے پاور کرانے والے انداز میں بولا تھا۔ نوا یہ فقط بے وقوفی ہے۔ یہ بس دماغ کا غلط ہے۔ حقیقت کچھ نہیں ہے اس کی۔“ وہ کہہ کر رک کا تھا۔ گی ہنکائے پیٹھی رہی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ۔ کتنی بے وقوف ہوتی ہیں یہ ساری لڑکیاں۔ سنو! وہ جو کوئی بھی تمہاری زندگی سے جا تم پر زندگی کے دروازے بند نہیں ہونے چاہیں۔ تمہیں بھی اپنے حصے کی خوشیاں سمیٹنے کا اتنا ہی حق ملے جتنا کہ اسے۔ بھول جاؤ اسے۔ تم بھی خوش رہو۔ اپنے حصے کی خوشیاں تلاشو۔ جس طرح کہ وہ سا دور کر رہا ہوگا۔“ وہ بہت جذباتی انداز میں بول کر چپ ہو گیا تھا۔ مگر گی تب بھی کچھ نہیں بولی تھی۔ خاموشی کے ساتھ ابھی تھی اور تھکے ماندے قدموں سے واپسی کا سفر طے کرنے لگی تھی۔ سبکگین حیدر کتنی ہی دیر تک بیٹھا اس سمت تکتا رہا تھا۔

تقریب تو فقط مگنی کی تھی مگر کلاس اور اسٹینس کے تحت اقدامات انتہائی ہڈ وقار تھے۔

ہر شے معمول پر تھی۔ عفتان علی خان دوستوں میں گھرا کھڑا تھا۔ ابھی کچھ دیر میں اس لڑکی کے ساتھ مائتیت طے ہونے جا رہی تھی جس کے لئے اس نے اپنی عقل کے ساتھ عنبر دیا تھا۔ ماں اور بہنیں تدریج جوش تھیں اس کے لئے لڑکی ڈھونڈنے کے لئے۔ مہینوں اس مہم پر صرف ہوئے تھے۔ اس کی جاننے کے کتنے قصد ہوئے تھے۔

’گھنے ہو بڑے۔ پھر مت کہنا پھنسا دیا۔ کوئی ہے تو بتا دو۔ ابھی تیرکان میں ہے۔‘ بڑی بہن شادی بیٹھ اپنے دو سالہ غازی کو سنبھالتے ہوئے بولی تھیں۔ مگر وہ فقط مسکرا دیا تھا۔

یقین نہیں آتا بھائی! اتنی عمر گزارنے کے بعد بھی آپ نے کہیں دھواں دھار قسم کا عشق نہ فرمایا ہو۔“ اوشہ بہت دیر کی سوچ بچار کے بعد گویا ہوئی تھی۔

دیکھیں، کوئی ہے تو فوراً بتا دیں۔ یاد نہیں پڑ رہا تو خوب سوچ لیں۔ یادداشت کو کھنگالیں۔ کہیں تو وگی۔ نہیں تو کوئی نظر آئی ہوگی۔“ آنکھوں میں شرارت بھرے وہ دریافت کر رہی تھی اور اس نے

سر پر چپت لگا دی تھی۔

تینوں کا وقت دیا گیا تھا مگر وہ کیا فیصلہ کرتا۔ کوئی کہیں تھا ہی نہیں۔

”اتنی جلدی کیا ہے تم لوگوں کو؟“ کچھ نہ بن سکا تو اعتراف کر ڈالا۔

”اکھوتے ہو دو بہنوں کے۔ کتنے چاؤ ہیں دل کے، کتنے ہی نہیں ہو۔“ عریشہ نے ڈینا تھا۔

”اور کیا۔۔۔ آئے دن کتنی شادیاں ہوتی ہیں خاندان میں۔ چائے، ملنے والوں میں۔ او میری سہیلیاں چٹ پٹے انداز میں روداد سناتی ہیں۔ یہ نئے کپڑے پنتے ہیں، لمبی شادنگو ہوتی ہیں، مزے آتے ہیں نا۔“ انوشہ کی رائے بھی اہم ترین تھی۔

”تم لوگوں کو قربانی کا بکرہ میں ہی ملا ہوں۔“ وہ انتہائی معصومیت سے احتجاج کرتا۔

فیضان علی اور فاطمہ علی خان بچوں کی نوک جھونک پر مسکراتے رہتے۔ کتنے عرصے تک وہ بہنو فرمائش کو ٹالتا رہا۔ کبھی کاروباری مصروفیت کے بہانے، کبھی کسی اور بہانے۔ مگر آخر کب تک۔ بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑے جب انہوں نے لامعہ حق کی تصویر اس کے سامنے ڈال دی۔

”یہ کٹ کھٹی بلی۔“ وہ بری طرح چونکا۔ نہ چہرہ نیا تھا نہ نام۔ کتنے پرانے فیملی ٹرم تھے۔ بابا کے پارٹنر وہ چکے تھے تو قیر حق صاحب۔ برسوں پرانی جان پہچان تھی۔ برسوں پرانے تعلقات تھے۔ کوئی آ؟ نہ تھی وہ اس کے لئے۔

”عصفان علی خان صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ بھائی تو آپ ہمارے اکھوتے ہیں مگر ہم حتیٰ ط کہتے ہیں کہ اس لڑکی کے سوا تمہیں کوئی لڑکی نہ سمجھ سکتی ہے نہ برداشت کر سکتی ہے۔“ عریشہ باور کر ہوئے ہوئی تھی۔ وہ سرد دونوں ہاتھوں میں تھام کر رہ گیا تھا۔

”سر پیٹو، چاہے جو مرضی کرو۔ اب اور بہانے نہیں چلنے والے۔ انس انف لامعہ حق آخری چ ہے۔“

”پہلی کون سی تھی؟“ وہ بے چارگی سے بولا تھا۔ عریشہ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی تھی۔

”اچھا، اچھا۔۔۔ اب زیادہ بے بی بی بچے مت بنو۔ بس ہم نے لامعہ حق کو سلیکٹ کر لیا ہے۔“ اسے سوچنے کے لئے وقت دیا گیا تھا اور اس کے پاس کوئی اور فیصلہ نہ تھا۔

”تمہیں کبھی تو کسی سے محبت ہوئی ہوگی۔“ عریشہ بڑی تھی مگر سارے لحاظ بالائے طاق رکھتے گویا ہوئی تھی۔ مگر وہ سرنی میں ہلانے لگا تھا۔

”کبھی کوئی ہلکا سا کرش بھی نہیں؟“ عریشہ نے مزید کر دیا تھا اور عصفان علی خان کا دل اپنا سر پینا کو چاہا تھا۔

تہنائی کے کتنے لمحوں میں اس نے لامعہ حق کے متعلق سوچا تھا مگر دل کیسا چپ چاپ سا تھا اور تہ نے فرد کو وکیل کرتے ہوئے فیصلہ دے دیا تھا۔ لامعہ حق کوئی اجنبی تو نہ تھی اس کے لئے۔ عادات کبھی کبھی منکشف تھا۔ سب خوش تھے اور اس نے ان خوشیوں پر اپنی رضامندی کی مہر ثبت کر دی تھی۔ لامعہ حق کتنی حیران رہ گئی تھی۔

”عصفان علی خان! کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی؟“ جیسے ہی فیصلے کے متعلق اسے علم ہوا وہ نے جھٹ فون کر ڈالا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کی تھی پھر مسکراتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

”قطعاً نہیں۔ بلکہ یہ تمہارے خوابوں کی تعبیر ہونے جا رہی ہے۔“

”عصفان علی خان! میں نے کبھی تمہیں اس زاویے سے نہیں دیکھا۔“

”اس زاویے سے تو یقیناً سوچا ہوگا۔“ وہ برجستگی سے بولا تھا مگر وہ قطعاً برا منائے بغیر مسکرا دی تھی۔

”ہب تو ایسے ویسے ہرزادے سے دیکھوں گی۔ اب ہمیشہ کے لئے میرے ہونے جا رہے ہو۔“ وہ سر در تھی اور عصفان علی خان بھی مسکرا دیا تھا۔ منگنی کی تاریخ طے ہوئی تھی اور بالآخر یہ دن بھی آن پہنچا تھا۔

لامعہ حق تنہائی کے لئے پارلر گئی ہوئی تھی اور اس کے انتظار میں تقریب تاخیر سے دو چار تھی۔ خدا خدا کر کے لامعہ حق تیار ہو کر پہنچی تھی۔

”ان فضول قسم کی رسموں میں وقت کے زیاں کا بالکل بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔“ رسم کے لئے جب وہ اس کے قریب تھی، عصفان علی خان نے خالصتاً کاروباری انداز میں کہا تھا اور وہ اسے گھورنے لگی تھی۔

”فارگاہ ڈیک عصفان علی خان! اسے بھی کوئی برس اس اسائنٹ جان کر صبر کر لو۔“ وہ اس کے جلے پھنے انداز پر مسکرا دیا تھا۔ بغور اس پر نگاہ کی تھی۔

”متہ میں سے ہوا خارج کر دو۔ پھولا ہوا چہرہ قطعاً اچھا نہیں لگ رہا۔“ اور وہ جو اب گھورنے لگی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ”تمہیں پرواہ ہے کوئی؟“

”اچھی لگ رہی ہو۔“ عصفان علی خان نے کان کے قریب بڑی مدہم سی سرکوشی کی تھی اور پھر اسی سرعت سے سیدھا بھی ہو گیا تھا۔ لامعہ حق اس کی سمت تکتے لگی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اطراف پر نگاہ دوڑا رہا تھا مگر مخاطب وہی تھی۔

”نظریں جھکاؤ۔۔۔ لڑکیاں اتنی بے پائی سے دیکھتی اچھی نہیں لگتیں۔“ وہ چڑانے والے انداز میں گویا ہوا تھا۔ لامعہ گھورتی ہوئی سر جھکا گئی تھی۔ جی فاطمہ نے بیٹے کو منگنی کی رنگ تھائی تھی۔

”رسم شروع کر دینا!“

عصفان علی خان نے جھلملی ڈیبے کو ہاتھ میں لے کر بیش قیمت رنگ برآمد کی تھی۔ پھر ڈراڈیر کو یونہی انگوٹھی کو دیکھا تھا۔

”سوچ کیا رہے ہو؟۔۔۔ پہنچا بھی۔“ لامعہ حق شرارت سے مسکراتی ہوئی گویا تھی۔ مگر اس نے کسی ندر تجیدگی سے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ پھر بہت ہولے سے اس کا محروطی ہاتھ تھام لیا تھا۔ خرد کا فیصلہ تھا۔ عقل نے مہر ثبت کی تھی۔ دماغ ساتھ تھا اور دل خاموش تھا۔ عصفان علی خان نے بہت ہولے سے رنگ لامعہ حق کی محروطی انگلی میں پہنانی شروع کی تھی۔ نگاہ اسی سمت سامنے اٹھی تھی اور نظر ساکت رہ گئی تھی۔

چار سمت سے اٹھنے والے شور نے اعلان کر دیا تھا کہ بندھن بندھ چکا تھا۔ کئی دھڑ دینے والے قریب آ رہے تھے اور اس لئے عصفان علی خان کو چونکنا پڑا تھا۔ مگر نظر تھی کہ بار بار اسی سمت اٹھ رہی تھی۔

وہ اب بھی مسکراتی ہوئی تالیاں بجا رہی تھی۔ سفید لباس میں شانوں پر سیاہ بال بکھرائے، ترو تازہ چہرے پر دو جگنوئی آنکھیں لئے بہت عام ہی ہونے کے باوجود کوئی بات تھی جو اسے خاص کر رہی تھی۔

عصفان علی خان کیسا بے خود سا اسے دیکھے گیا تھا۔ اب وہ باقاعدہ ہاتھ ہلا کر روش کر رہی تھی۔ شاید لامعہ کی

کہیں اندر سے یکدم آواز اٹھی تھی اور لفظ بازگشت ہو گئے تھے۔

الامعد حق کچھ اور بھی کہہ رہی تھی۔ وہ جادوسی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ وقت خواب خواب گزر رہا تھا اور وہ خاموش تھا۔ نگاہ لحو بھر کو چرائی تھی۔

اندر کہیں پھر متواتر شور ہونے لگا تھا۔ مگر وہ جیسے خود پر بند باندھتے ہوئے دانستہ اس وجود سے نظریں چرا رہا تھا۔

وہ مکمل بے تاثر تھا۔ دوستوں کے ساتھ مصروف تھا۔ مگر ہر کوشش جیسے رایگاں تھی۔

کتلی مدھم مدھم سرگوشیاں اس کے اندر ہونی رہی تھیں۔

اور وہ ان کیفیت کو نہ سمجھتے ہوئے کتلی دیر تک حیران سا رہا تھا۔ لیکن سمجھ جیسے ان آنکھوں نے رہن رکھ تی تھی۔ کچھ اختیار ہی نہ رہا تھا۔

اور بے اختیار ہی نہ سمجھتے ہوئے آئے وانی تھی۔

ورد کے محلے کتنے کٹھن تھے۔ گزرتا ایک ایک پل جیسے صدیوں پر محیط تھا۔

کتلی قیامتیں گزر رہی تھیں دل پر۔ مگر ضبط کس قدر لازم تھا۔ دل جیسے پھنسا جا رہا تھا۔ کاڈیو ویسکیولر ڈیزیز وارڈ میں وہ کتلی بار ماں کے پاس دے قدموں آیا تھا۔ فارحہ کے لئے اسے تنگن سے چور دیکھنا محال تھا۔ دل کا درد کس قدر بڑھنے لگا تھا۔ ماہی کی حالت الگ غیر تھی۔ اس کے لئے خالہ کو اس نے گھر چھوڑا تھا مگر خود ایک لحو بھی ماں کے پاس سے نہ بٹا تھا۔

دو روز گزرنے کے بعد فارحہ کی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی۔ مگر ہارت ایک کے باعث ساری توانائی جیسے گزرا رہی تھی۔ ترو تازہ نظر آنے والا چہرہ اس گھڑی حد درجہ بے رونق سا تھا۔ ایک ہی دن سے جیسے پیرے کی ساری شان دانی چھین لی تھی۔

ذہان حسن بخاری کی دیر تک ماں کا ہاتھ تھامے بیٹھا رہا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھیں۔

ذہان حسن بخاری بہت آہستگی کے ساتھ سر جھکا گیا تھا اور تب بہت آہستگی کے ساتھ اندر پل پل بہتا ہوا ذہان کی صورت آنکھوں کے کنارے توڑتا ہوا ہر نکلے لگا تھا۔ اگرچہ وہ کسی بھی صورت کمر و نہیں پڑتا جانتا تھا مگر کچھ لمحے ایسے بھی ہوتے ہیں جب خود اپنے آپ پر ضبط کے بند باندھنا آسان نہیں ہو کر رہتا۔ ایسے ہی لمحے کا سامنا ذہان حسن بخاری کو بھی تھا۔ فارحہ خالی خالی نظروں سے بیٹے کو دیکھتی رہی تھیں اور گرم سیال پلکوں کے کناروں سے چپ چاپ باہر کی سمت گامزن رہا تھا۔

ذہان حسن بخاری نے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا تھا، پھر بہت پر عزم انداز میں گویا ہوا تھا۔

”میں ہوں نا۔ آپ تمہاری ہیں می!“

شاید وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر آنسوؤں کا کوئی گولہ جیسے طلق میں اٹک گیا تھا اور وہ چپ ہو کر برے کارخ پھیر گیا تھا۔ چند ثانیوں تک اسی طرح چپ چاپ اندر کے درد کو باہر منتقل کرتا رہا پھر ایک

کوئی جاننے والی تھی۔ اردگرد ہجوم تھا۔ شاید اس لئے اب تک آگے بڑھ کر مبارک باد نہ دے سکی تھی۔ اردگرد کی لوگ تھے۔ کئی چہرے تھے۔ مگر جیسے بے اختیار ہی غالب آتی جا رہی تھی۔

پہلی بار ایک اضطرابیت نے دے پاؤں وجود کے علاقے میں قدم دھرے تھے۔ شاید پہلی بار وہ اتنا بے خود ہوا تھا۔

شاید پہلی ہی بار دل دھڑکنے کی صدا آئی تھی۔

کتنے حسین چہرے دیکھے تھے۔

کتنے دلربا بیکر نظروں سے گزرے تھے۔ پھر ایسا خاص کیا تھا اس میں؟

عفتان علی خان نے کتلی بار سرسری جان کر نگاہ چرائی چاہی تھی۔ تمام تاثر کو جھٹکنا چاہا تھا سارے اقدامات ریت کی دیوار ثابت ہوئے تھے۔

نظریں بار بار اسی سمت اٹھ رہی تھیں۔ اسی زاویے پر ٹھہر رہی تھیں اور وہ جیسے تمام تر کوشش باوجود بے بس تھا۔ انوشہ بول رہی تھی۔ وہ اس کی سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ ان کی سمت بڑھی

”دھیٹکس گاڈا! مجھے بھی تظار میں جگہ ملی۔“ وہ لامعد حق کو دوش کرتے ہوئے مسکرائی تھی۔ لامعد کے ہاتھ سے یکے لے کر ایک طرف دھرا تھا اور اسے گھورتے ہوئے بولی تھی۔

”تمہیں کہا بھی تھا میرے قریب رہنا۔ مگر تم ان سے تلو۔ یہی ہیں موصوف عفتان علی خان۔“

ناپینڈہ؟“ لامعد حق کی کوئی قریبی شاسا تھی۔ شاید بھی وہ تعارف بھی انتہائی غیر رسمی انداز میں دے رہا تھا۔

جواباً جانے اس نے ہولے سے کیا کہا تھا کہ لامعد حق کا خوشگوار قبضہ فضا میں پھیلتا چلا گیا تھا۔ علی خان اس گھڑی دانستہ بے تاثر بننے کی کوشش کرتے ہوئے کسی اور سے مخاطب تھا۔ چونکا تب لامعد نے متوجہ کیا۔

”یہ اتنا بیہ شاہ ہے۔۔۔ میری بیٹ فرینڈ۔ میرے لئے یہ بے حد اہم ہے۔ سو تمہارے۔“

اس کی حیثیت اسی طور ہوئی چاہئے۔“ لامعد مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ ترو تازہ چہرے والی لڑکی گھڑی عفتان علی خان کی جانب متوجہ تھی اور بڑی شکفتہ سی مسکراہٹ اس کے گداز لبوں کا احاطہ کئے؛ تھی اور اس کی جگہ توئی آنکھیں کتلی آب و تاب سے چمک رہی تھیں۔

اس چہرے پر ایسا خاص کیا تھا؟

کیا کیش تھی جو نظروں کو اپنے سنگ باندھ رہی تھی۔

کچھ اس درجہ خوبصورت بھی نہ تھی وہ۔

پھر؟۔۔۔ دل سے سوال ایک بار پھر اٹھا تھا۔

نظریں ایک بار پھر ازسرنو اس کا جائزہ لینے لگی تھیں اور نگاہ لحو بھر میں اس کی چمکتی آنکھوں پر ٹپک آئی تھی۔

اس کی آنکھیں بتاؤں کیسی ہیں
تھیل سیف الملوک جیسی ہیں

عزم سے ماں کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”میری ہمت آپ ہیں می! میں اور ماہا آپ کے بغیر بالکل ادھورے ہیں۔ کمزور، بے ہمت ہیں۔ آ۔ کی ضرورت ہے۔ اتنی ہی جتنی آپ کو ہماری ضرورت ہے۔“ جوان اولاد کس قدر انتشار کا شکار تھی۔ فار بے بسی سے بیٹے کو ٹوٹے پھوٹے کے اس عمل سے گزرتا دیکھ رہی تھیں۔

”می! پلیز۔“ اذہان نے ہاتھ بڑھا کر ماں کے بالوں میں جذب ہوتے قطروں کو اپنے مضبوط ہاتھ سے پونچھا پھرا ہی قدر آہستگی سے بولا تھا۔

”می! آپ نے ہی کہا تھا کہ زندگی میں کوئی بھی نقطہ، نقطہ اختتام نہیں ہوتا ہو سکتا ہے جس اسٹاپ آپ فل اسٹاپ تصور کر رہے ہیں وہیں اس سے آگے ایک نیا پیرا گراف شروع ہوتا ہو۔ می! آپ کی بتا ہوئی وہی چھوٹی سی بات آج میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں۔ دوسروں کے لئے رشتوں کے منہا بدل سکتے ہیں۔ ہمارا رشتہ آپ سے شروع ہو کر آپ پر ہی ختم ہوتا ہے۔ آپ نے جو درس دیا وہ مجھے۔ ابھی ازبر ہے۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود میں نے کہیں بھی رشتے کے کسی تقدس کو پاہال نہیں ہونے دیا شاید غلطی میری ہی تھی۔ یہ سب کچھ میرے ہی باعث ہوا۔ مجھے بابا کے اور آپ کے درمیان نہیں آنا چاہئے تھا۔ اگر میں مداخلت نہیں کرتا تو شاید صورت حال ایسی نہ ہوتی۔“ اس کا دھیمالہجہ احساس جرم سے چو تھا۔ سر جھکائے وہ بول رہا تھا۔

”میں خود کو آپ کا، ماہا کا مجرم خیال کرتا ہوں۔ شاید میں خود کو کبھی معاف بھی نہ کر سکوں۔ مگر یقین کیجئے، مجھے آپ سے بے حد محبت ہے۔ مجھے آپ کی خیر خواہی مقصود تھی می! میں اس آشیانے کو ٹوٹا نہیں دیکھنا چاہتا تھا جس کا حصہ میں بھی ہوں۔ مجھے بھی وہ گھر اسی قدر عزیز ہے۔ یہ اقدام خیر خواہی کے لئے تھا۔ مگر آئی ایم سوری می! میں آپ کا گھر نہیں بچا، اپنی بہن کو تحفظ نہیں دے سکا۔ اس کی خوشیوں قائم نہیں رکھ سکا۔ میں آپ کا بہت نالائق بیٹا ہوں می! بہت برا بھائی ہوں۔“

ٹوٹے لہجے میں حد درجہ شکستگی تھی۔ فارحہ چپ چاپ بیٹے کو کھتی رہی تھیں۔ آنکھوں سے سحر اثر بہتا پانڈ اندرونی کیفیت کا غماز تھا۔

”می! مجھے نہیں معلوم تھا، صورت حال اس درجہ شدت اختیار کر جائے گی۔ اگرچہ یہ معاملہ اسی قدر سنگین تھا۔ جب مجھے اپنے دوستوں کے ذریعے بابا کے متعلق پتہ چلا تو مجھے اچھا نہیں لگا۔ ہم نے اپنے والدین کے لئے عزت و مرتبے کے بہت بلند درجات مقرر کر رکھے ہوتے ہیں اور اگر ان درجات سے ایک انچ بھی وہ رشتہ گرنے لگے تو ہمیں سے حد برا لگتا ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ بابا کے بارے میں مجھے کسی اور سے پتہ چلا۔ وہ شکایتیں جو والدین کو جوان اولاد سے متعلق ملتی ہیں وہ مجھے اپنے باپ سے متعلق موصول ہوں۔ یہ میرے لئے کم نہیں تھامی! جب میں نے آپ کو مطلع کیا تو مجھے کہہ کر یقین تھا کہ صورت حال کتنی دل میں آجائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور ہوا تو اس کے برعکس۔ میں بیٹا صوت حال سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا، حالات اتنے اختیار سے باہر ہوتے چلے گئے۔ مگر تمہیں کہنا ہوا مجھے آپ دونوں کے درمیان سے ہٹ جانا چاہئے تھا اور جس طرح بابا چاہتے تھے گھر چھوڑ دینا چاہئے تھا۔

آپ نے مجھے روک کر اچھا نہیں کیا می! آپ کو مجھے نہیں روکنا چاہئے تھا۔ میرے گھر سے نکل جانے سے آپ سے یا ماہا سے رشتہ ختم قطعاً نہیں ہو جاتا۔ مگر میرے ایسا کرنے سے آپ کا گھر ضرور بچ جاتا۔ بابا ایسی انتہائی راہ اختیار نہ کرتے جو انہوں نے اب اختیار کی۔“

وہ بہت آرام سے سارے الزام اپنے سر لے رہا تھا۔ وہ سارے جرم بھی جو اس سے سرزد نہیں ہوئے تھے۔ وہ بھی جن میں سرے سے اس کا کوئی قصور ہی نہیں نکلتا تھا۔

فارحہ خاموش تھیں۔ مگر خاموشی متواتر اس بات کی نشی کر رہی تھی۔ وہ اگر ایسا سب نہ کرتا تو بھی شاید صورت حال بہتر نہ ہوتی۔ سعد بخاری نے جس طرح اس کے انتشار پر واضح انداز میں اس تعلق کی تصدیق کرتے ہوئے اسے قبول کیا تھا اور اپنی دیوانگی کا گراف بتایا تھا وہ اس کے لئے کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ اسے اپنے گھر کی بنیادیں اسی دن کھولیں ہوتی نظر آگئی تھیں۔ اس کے بعد تو جو بھی ہوا تھا وہ فقط اس گھر کو بچانے کی سعی تھی۔ مگر جو مکان ریت پر بنا ہوا اس کی بنیاد چند روزہ ہوتی ہے۔ اسے دکھ اس بات کا تھا جو ایک طویل رفاقت کے تحت نہیں رہا تھا۔ اس مان کا تھا جو اس رشتے کے باعث قائم تھا۔ سارا دکھ اس بات کا تھا کہ وہ اس رفاقت کو مضبوط ترین خیال کرتی تھیں اور ایسا تھا بھی تو ایک زمانہ گواہ تھا۔ لوگ مثالیں دیتے تھے۔ پھر اچانک یہ کیسی آدھی اٹھی تھی؟ کیسا طوفان آیا تھا اچانک؟

کیسے ایک مضبوط ترین گھر کی بنیادیں پل میں کھوکھلی ہو گئی تھیں۔ کیسے ایک پل میں سب کچھ ڈھیر ہو گیا تھا۔ سب کچھ خاک میں مل گیا تھا۔ شاید اس وقت زیادہ دکھ ہوتا ہے جب توقعات حد سے زیادہ ہوں۔ لیکن اس معاملے میں بھی دل متواتر جھٹلا رہا تھا۔ توقعات غلط تو تھی۔ معاملہ دوطرفہ تھا۔ بس ایک نیا آیا تھا اور اپنے سنگ سب کچھ بہا لے گیا تھا۔

بہت زیادہ یقین بھی ڈبوتا ہے۔ ایسا ہی یقین اسے اس رفاقت پر تھا۔ اپنے گھر پر تھا۔ اس کی بنیادوں پر تھا۔ مگر سب کچھ پل کے پل میں ڈھیر ہو گیا تھا۔

”می! آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں بابا سے معافی مانگ لوں گا۔ ہمارا گھر پھر سے آباد ہو جائے گا۔ بابا اگر چاہیں گے تو میں اس گھر کو بھی خیر باد کہہ دوں گا۔ مگر پلیز، می! پلیز آپ ٹھیک ہو جائیں۔“ سید اذہان حسن بخاری کا انداز جس قدر شکستہ تھا اس قدر اس کا اندر شکستہ تھا۔ ان ٹوٹے پھوٹے لمحوں میں وہ بالکل بچوں جیسی باتیں کر رہا تھا۔ حالانکہ یہ بات دونوں پر منکشف تھی کہ ایسا کچھ بھی ہونا ممکن نہیں۔ جس طرح تیر کمان سے نکلنے کے بعد واپس نہیں پلٹ سکتا اسی طرح اس اقدام کا بھی کوئی ریٹرن نہ تھا۔ یقیناً گزرنے والے کسی لمحے کا کوئی ریٹرن نہیں ہوتا۔

سید اذہان حسن بخاری مداوا چاہتا تھا، از الہ کرنا چاہتا تھا مگر ایسا کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔ یہ بات فارحہ بھی جانتی تھیں اور خود اذہان حسن بخاری بھی۔ مگر دونوں اک دو بے کو آسرا دے رہے تھے۔

مائی اماں نے بہت ہنگامی حالت میں فون کر کے اسے بلایا تھا۔ وہ آتے ہوئے گی سے بھی نہ مل سکا

تھا۔ مگر اس کے ٹیکس پر اس نے اچانک چلے آنے کی وجہ لکھ بھیجی تھی۔ اسے امید تھی، اس کی چند روزہ دوست اس معاملے کو انڈر اسٹینڈ کرے گی۔

مائی اماں نے اپنی طبیعت کی خرابی کا کہہ کر اسے بلوایا تھا اور یہاں آکر وہ ان کا مدعا سن کر ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا تھا۔

”مائی اماں! آپ جانتی ہیں ابھی ان سب باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ نے ہی کہا تھا کہ میری دستار بندی جب دس برس کی عمر میں ہوگی تھی تو اس سے وابستہ بہت سی ڈے داریاں بھی آپ ہی آپ میرے ڈے لگ گئی تھیں۔ اور اب جب ان ڈے داریوں کی مٹھی کا وقت آیا ہے تو آپ مجھے ان فضول معاملات میں الجھا رہی ہیں۔“ اس کا انداز کسی حد تک بے زار تھا۔

حمیدہ بیگم بیٹے کو دکھ کر رہ گئی تھیں۔

سر دار سبکگین حیدر لغاری کو یقیناً ماں کے جذبات و احساسات کی پرواہ تھی۔ تبھی بہت ہولے سے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ دھرے تھے۔

”مائی اماں! یہ کام کرنے کے لئے ساری عمر بڑی ہے۔ آپ پلیز ان بیڑیوں سے فی الحال مجھے آزاد رہنے دیجئے۔“ مدہم لہجے میں ایک بار پھر انکار کیا تھا۔ حمیدہ بیگم خفگی سے دیکھنے لگی تھیں۔

”مجھے ماں کے جذبات کا بھی کوئی پاس نہیں۔ کیسا سلس ساوڑنی پتھر سینے پر دھرا تجھے بھیج بھیج کر۔ کتنا طویل درد سہا۔ خود سے تجھے جدا دیکھنا کتنا محال تھا میرے لئے۔ مگر میں نے یہ سب کیا۔ تیری خوشی کے لئے، تیری آنے والی زندگی کی بہتری کے لئے۔ میں چاہتی تھی تم دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھو۔ جینے کا ڈھنگ سیکھو۔ مگر میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ تم ایک ماں کے جذبات کو چیل دو۔“ حمیدہ بیگم کسی قدر جذباتی انداز میں گویا تھیں۔ سبکگین حیدر ماں کو دکھ کر رہ گیا تھا۔

”قول دے چکی ہوں میں۔ آزاد فضاؤں میں پل بڑھ کر قول کا پاس تم بھول چکے ہو گے مگر تمہاری ماں نہیں۔ میں ان لوگوں کو بلوا چکی ہوں۔ اپنی زو بار یہ ہے نا، اس کے شوہر کی پہلی بیوی سے بیٹی ہے۔ خوب صورت اور خوب سیرت ہے۔ میں نے بلوایا ہے فارم ہاؤس پر۔ کچھ اچھے دن ساتھ گزار لیں، یہی مقصد تھا میرا۔ اس سے کسی قدر سمجھنے میں آسانی رہے گی اور تم لڑکی کو دیکھ بھی لو گے۔ باپ بیمار ہے بیچارا۔ باہر علاج کی غرض سے جا رہا ہے۔ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔“

”آپ نے سوشل ورک کے کام گھر میں بھی شروع کر دیئے۔ ان فلاحی کاموں کے لئے ضروری ہے کہ آپ اپنے بیٹے کی قربانی دیں۔ پیسے کی ضرورت ہے تو دے ڈالئے۔ دس، بیس، تیس کتنے لاکھ درکار ہیں انہیں؟“

”سبکگین حیدر!“ حمیدہ بیگم نے بلند آواز سے ڈانٹا تھا۔ وہ خاموش ہو کر سر جھکا گیا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے گویا ہوا تھا۔

”معدرت چاہتا ہوں مائی اماں! لیکن آپ کو مجھ سے پوچھے بغیر حالی نہیں بھرنی چاہئے تھی۔“

حمیدہ بیگم چند ثانیوں تک پراموس انداز سے بیٹے کو تکتی رہی تھیں پھر دھیمے لہجے میں بولی تھیں۔

”وہ کوئی غریب، بے سہارا، کم اوقات لڑکی نہیں ہے جسے تمہاری امداد کی ضرورت ہو۔ مظہر سیال ملک ڈائریسٹر پلسٹ ہے۔ نام و مقام ہے اس کا۔ اکلوتی بیٹی ہے اس کی۔ ایم بی اے کر رہی ہے۔ کسی طرح سے کم نہیں ہے۔ لغاری خاندان کے نام و مرتبے کا پوری طرح احساس ہے ہمیں۔ جانتے ہیں ہم محل ہاٹ کا بیونڈ کبھی لگانے کی غلطی نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس گھر کے لئے کسی ایسی ہی لڑکی کی ضرورت تھی جو رو باندھ کے رکھ سکے۔ اسے سنبھال سکے، سنوار سکے۔ سب سے بڑھ کر تمہیں سنبھال سکے۔“ حمیدہ ہالچو مضبوط ارادوں کی ترجمانی کر رہا تھا اور سبکگین حیدر لغاری کچھ نہیں بولا تھا۔

”تم نے جو چاہا وہ کیا سبکگین حیدر! ہم نے کبھی کسی مقام پر کوئی بند باندھنے کی کوشش نہیں کی۔ کہیں میں نہیں ٹوکا۔ کہیں تمہیں محدود یا باندھ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس لئے نہیں کہ تم اختیار رکھتے تھے۔ اب اس لئے کہ ہم تمہیں تمہاری زندگی خود آپ جینے کی آزادی دینا چاہتے تھے۔ مگر اس کا مطلب ہرگز بس ہوتا کہ اس بے جا آزادی سے خاندانی رسم و رواج یا نام و مرتبے کی حیثیت کا احترام قرار پاگئی۔ ہم نے اپنی اختیارات کا ناجائز فائدہ قطعاً نہیں اٹھارے۔ جو کچھ بھی ہونے جا رہا ہے وہ تمہاری بہتری کے لئے ہے۔ ماں سے بڑھ کر کوئی خیر خواہ دنیا میں دوسرا نہیں ہوتا۔ تم جان جاؤ گے کہ ہمارا انتخاب بھی غلط نہیں ہے۔“

”لیکن مائی اماں! میں کوئی بھاگ تو نہیں رہا کہیں۔ یہیں ہوں۔ خدا آپ کو زندگی دے۔ یہ ب بعد میں بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن اتنی جلدی۔“ سبکگین حیدر لغاری نے کچھ دبا دبا احتجاج کیا تھا۔ ”مائی اماں! مجھے آپ کے انتخاب پر مکمل اعتماد ہے، بھروسہ ہے۔ لیکن ابھی فی الحال آپ اس تمام معاملے کو ملتوی کر سکتیں؟“ سبکگین حیدر لغاری نے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا تھا۔ وہ دھیمے سے مسکرا دی تھیں۔

”سبکگین حیدر! جب تمہارے بابا کی شادی ہوئی تھی تو ان کی عمر سترہ برس تھی اور آج جب ہم یہ اقدام کرنے جا رہے ہیں، تم پورے بیس کے ہو چکے ہو۔ کو یہ رعایت کافی نہیں ہے تمہارے لئے؟“

”مائی اماں! وہ وقت اور تھے۔ زمانے اور تھے۔“ بڑا کمزور سا لہجہ تھا۔

”مگر قدریں تو یہی تھیں۔ کہو تم ان تمام سے انحراف برتنا چاہتے ہو؟“ مائی اماں نے اسے چاروں سمت سے گھیر لیا تھا اور سبکگین حیدر لغاری فقط خاموشی سے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ مائی اماں نے مسکراتے ہوئے اس کے مضبوط شانے پر ہاتھ دھر دیا تھا۔

”کوئی ڈھسور ڈھسور نہیں ہو، بیٹے ہو میرے۔ وہ بھی اکلوتے۔ تمہارے حق میں کوئی غلط فیصلہ کرنے کے لئے سوچ بھی نہیں سکتی ہوں۔ کیسے سوچ رہے ہو تم کہ جو ہونے جا رہا ہے وہ کچھ غلط ہے؟ اپنی ماں پر اعتبار نہیں ہے تمہیں؟“

سبکگین حیدر لغاری سر جھکا گیا تھا اور دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

”مائی اماں! میں آپ سے اختلاف کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ انحراف کرنے کی بات رہی ہیں۔“ کسی قدر شرمندہ سا انداز تھا۔ مائی اماں کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ ہتھیار ڈال دینے لگے تھے اور یہ کم نہ تھا۔ بہت بڑی جیت تھی۔ اسی لئے مائی اماں مسکراتے ہوئے گویا ہوئی تھیں۔

ہر سہ اسی خیال کا پہرہ تھا۔ ہر جز اس کی روشنی سے پر تھا۔ وہی نور تھی۔ وہی کل۔ جیسے ہر شے پر اس کا اختیار تھا۔ جیسے وہ ہر شے پر قدرت رکھتی تھی۔ جیسے وہی مختار کل تھی۔ اور عفنان علی خان کس قدر حیران تھا۔

عقل نے کس قدر مزاحمت کی تھی۔ خرد نے کس قدر ہاتھ پیر مارے تھے۔ کس قدر جھٹلایا تھا اس نے ہر خیال کو، سوچ کو، اس تصور کو، ان آنکھوں کو، ان آنکھوں سے پھوٹی روشنی کو، ان آنکھوں سے بہتے ان رنگوں کو، روشنی کی ان حصار میں لیتی لہروں کو۔

عفنان علی خان ڈھیروں سمجھ بوجھ رکھتے ہوئے مکمل خرد مند ہوتے مکمل طور پر بے بس تھا جیسے۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ کبھی کوئی آئے گا اور سب اچھاپنے بس میں کرنے گا۔ فقط ایک بل میں ساری دنیا بدل دے گا۔ کیسے — کیسے ہوا تھا یہ سب؟ اور وہ بھی اس لمحے جب وہ ایک نئے تعلق کی ابتداء کرنے جا رہا تھا۔ ایک نئے بندھن کو رقم کرنے جا رہا تھا۔ جب وہ عقل کے طے کئے فیصلوں پر مہر ثبت کر رہا تھا تو کیوں دھڑکا تھا دل اس لمحے؟ کیوں، کس لئے؟ کہاں تھی وہ اب تک۔ کیوں اب ہی سامنے آئی تھی۔

عفنان علی خان دن چڑھے بیدار ہونے پر آنکھیں کھولے ایک تک چھت کو تکتا جا رہا تھا جب فون کی بیل نے اسے بیدار کر دیا تھا۔ اس نے بے حد کسمندی سے کروٹی لٹی تھی اور ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا تھا۔

”کہاں تھے تم؟ لائن پک کیوں نہیں کر رہے تھے؟“ دوسری طرف لامع حق حقیقت کے طور پر منکشف تھی اور وہ جو ابھی تک ایک سحر کے حصار میں تھا یہ مشکل خود کو اس جادو کے قلعے سے باہر لایا تھا۔

”رات بھر مارے خوشی کے ساتویں آسمان پر رہا ہوں۔ اب کیا نیند بھی پوری نہ کروں؟“ وہ بائیں ہاتھ سے سر دباتا ہوا جیسے یہ مشکل مسکرایا تھا۔

”ہیں — تمہیں کیا واقعی اس قدر خوشی تھی اس انگیج منٹ کی؟“ لامع حق جیسے بے ہوش ہونے کو تھی۔

”اس سے بھی کہیں زیادہ۔“ لہجہ ہی نہیں، انداز بھی مسرور تھا اور لامع حق ہنس دی تھی۔

”تو موصوف سونے نہیں شب بھر۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ حیرت ہے، مجھے کیوں نہ اندازہ ہوا؟“

”ور کتنے گئے ہو تم محترم عفنان علی خان! پہلے تو کبھی بتایا نہیں۔ اور اب ایک لمحے میں اتنی دیوانگی دکھا رہے ہو؟“

”تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہو رہی ہے کہ یہ دیوانگی تمہارے لئے ہے؟“ وہ مسکرایا تھا۔

”عفنان علی خان!“ لامع کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا اور وہ ہنس دیا تھا۔

”تم بہت برے ہو عفنان علی خان! تمہیں تو دل رکھنا بھی نہیں آتا۔“ لامع حق انتہائی خشکی سے بولی تھی۔

”جانتی تو ہو تم، تمہارا انتخاب کیوں عمل میں آیا کہ تم مجھ جیسے کائیاں شخص کو جھیل سکو۔ عریضہ اور انوشے کی رائے میں تمہارا اسٹیمنا خاصا اسٹرونگ ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے چھیڑ رہا تھا۔

”میں نے اسی لئے ان لوگوں کو فارم ہاؤس پر آنے کی دعوت دی ہے — مل بیٹھے سے بڑھتی ہے۔ جان پہچان میں مضبوطی آتی ہے، تعلقات پائیدار ہوتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں تم بھی ذہنی پر تیار ہو جاؤ۔ لڑکی کو دیکھ لو، مل لو، بات کر لو۔ وہ بھی تمہیں سمجھ لے۔ گو پرانے زمانوں کے لوگ ہر جدید زمانوں سے قدم ملا کر چلنے کے قائل ہیں۔ مگر اپنی قدروں کی ہم آہنگی کے ساتھ۔ منظر میاں دل عارضے میں مبتلا ہیں۔ علاج کی غرض سے بیرون ملک جا رہے ہیں۔ اپنی اولاد کے فرض سے اپنی زر میں سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ ہم بیٹی والے نہیں مگر ان والدین کے جذبات سمجھ سکتے ہیں جو بیٹی والے ہیں۔ جب تک منظر میاں اور زواریہ ملک سے باہر نہیں گئے، وہ بچی بیٹھیں رہے گی اور تم بھی عرصے میں کسی بزنس اسائنمنٹ کو لے کر ملک سے باہر نہیں جاؤ گے۔ میں چاہتی ہوں تم دونوں اچھی ط ایک دوسرے کو جان لو، سمجھ لو۔ گو سمجھنے کے لئے پوری زندگی پڑی ہے مگر شادی سے پہلے کا یہ عرصہ اس اہم ہوتا ہے کہ اس کے بعد نئی زندگی جو شروع ہونے جا رہی ہے، اس تعلق کو سمجھنے میں، نبھانے میں ہمدردی ہے۔ وہ پیچیدگیاں جو انجانے ہوتے ہوئے فیس کرنا پڑتی ہیں، وہ باہمی انڈر اسٹینڈنگ کے باع بہت حد تک حل ہو جاتی ہیں۔“

کتنے حکم نامے تھے مائی اماں کے — اور وہ بس سر جھکائے سن رہا تھا۔

اس کی آنکھیں بتاؤں کیسی ہیں؟
جھیل سیف الملوک جیسی ہیں

اضطراب نے اس طور دل پر پہرہ ڈال دیا کہ اب تک کی ساری حقیقتیں پل بھر میں منکشف ہو گئی تھیں۔ اک بے قراری کس طور وجود کے سارے علاقے میں پھیل چمکتی ہے، یہ سب اس پر فقط ایک شب میں کھلا تھا۔

کیسے رازوں سے شناسائی پا گیا تھا دل۔

بس ایک شب میں کیسی کایا پلٹ ہوئی تھی۔ کیسے سارے منظر بدل گئے تھے۔
دل کتنے مختلف انداز میں دھڑک رہا تھا۔ کیسے ساز تھے۔ کیسے نر۔
اک جادو سا اندر باہر پھیل رہا تھا۔

آج سے پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ پھر آج کیوں؟
عقل و خرد اک کونے میں کیسے حیرانی سے ایک تک حکمتی جا رہی تھی۔
دل کیسا مسرور تھا۔

اور وہ خود کس قدر حیران سا تمام منظر نامے کو تکتا چلا جا رہا تھا۔

ساری سوچیں جیسے اس ایک نقطے پر ٹنگ گئی تھیں۔ وہی ایک نقطہ پھیل کر سارے وجود پر محیط ہو گیا تھا۔ ساری عقل مات ہو گئی تھی۔
سوچ کے ہر جز پر وہ تھی۔ وہی آنکھیں تھیں۔

”ہاں۔۔۔ مگر اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم میرے دل کو بری طرح پکڑ دو اور مجھے درد بھی نہ ہو عفتنان علی خان! میں ایک عام سی لڑکی ہوں۔ بہت ہی عام سے خواب ہیں میرے۔ جدید زمانے کے پروردہ ضرور ہوں مگر اندر سے وہی فطری پن بھٹکتا ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر تم مجھے جان لو۔“ وہ بہت مدد لہجے میں بولی تھی اور وہ مسکرا دیا تھا۔ پھر ہولے سے گویا ہوا تھا۔

”جان پہچان تو اب ہو ہی جائے گی۔ آغاز سفر جو ہو گیا۔“

”تمہارا پر اہلم یہ ہے عفتنان علی خان! کہ تم چاروں سمت سے آنکھیں بند کر کے چلتے ہو۔ بالکل ناک کی سیدھ میں۔“ وہ جو اب بولی تھی اور وہ ہنستا چلا گیا تھا۔

”چلو، اب تم ساتھ ہونا۔ راستوں کا اور منزلوں کا تعین کرتی جانا۔ میں آنکھیں بند کر کے قدم دھرتی جاؤں گا۔“

”ہاں۔۔۔ اتنے ہی تو اچھے ہوتا تم۔“

”سنو، یہ تم سب کی رائے میرے متعلق اتنی متضاد کیوں ہے؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”غلط تو نہیں ہے۔“ وہ کسی قدر خفگی سے بولی۔

”اچھا چلو، باقی کی ناراضگی پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھو۔ یہ بتاؤ اتنی صبح ہی صبح فون کیوں کیا تھا؟“

اور لامعہ کا دل چاہا تھا اپنا سر پیٹ لے۔ واقعی کتنا عجیب بندہ تھا نا یہ۔

”محترم عفتنان! پہلی بات تو یہ کہ مروٹ بھی کسی شے کو کہتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ دوپہر کے بارہ بجے کوچھ ہرگز نہیں کہتے۔“

لامعہ نے کہا تھا اور وہ دھم سے مسکرا دیا تھا۔

”اب بولو، کیا کروں؟ سنو لامعہ حق! مجھے عام مردوں والے رنگ ڈھنگ نہیں آتے۔ اب ایسا ہی ہوں میں اور یہ بات جانتی ہوں تم۔“ گویا وہ صاف لفظوں میں واضح کر رہا تھا کہ مجھ سے توقعات لگانا فضول ہوگا اور وہ جو اسے بہت اچھی طرح سے جانتی تھی، جانتے ہوئے کیسے پل میں ایسی بے وقوفی کر بیٹھی تھی۔ ایک لمحے میں ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ سچی وہ بولی تھی۔

”میں تم سے کوئی توقعات وابستہ نہیں کر رہی عفتنان علی خان! لیکن اس تعلق سے متعلق جو بھی ذمہ داریاں ہیں تمہیں انہیں سمجھنا ہوگا۔ شام کے لئے انوشے اور میں نے پی سی میں ڈنر کا پروگرام بنایا ہے۔ برائے مہربانی تم وقت نکال کر آ جانا۔ رات آٹھ بجے۔“ یہ کہہ کر اس نے فوراً ہی فون دھر دیا تھا اور عفتنان علی خان ہونٹ بھیج کر فون کو دیکھنے لگا تھا۔

خواب کیا تھے۔ اور حقیقت کیا تھی۔

ایک لمحے میں جھیل سیف الملوک جیسی آنکھیں اس کے دل کے پار تھیں۔ عفتنان علی خان سر جھٹکتا ہوا ہر سوچ کو باطل قرار دیتا ہوا اٹھا تھا اور واٹس روم میں گھس گیا تھا۔

کتنے دلربا منظر آنکھوں کے سامنے تھے۔ کتنے بارونق چہرے تھے اس کے ارد گرد۔ پایا خوش تھے۔

یہ مسکرا رہی تھیں۔ فانی ہنس رہا تھا۔ کچھ نئے چہرے تھے۔ خوشیوں کا سفر ہر جانب محو سفر تھا اور جانے اتنا کچھ ہونے کے باوجود اسے اپنا اندر بچر ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

جانے یہ کیسی بے سکونی تھی۔ کیسی گھٹن تھی کہ دم تک گھٹ رہا تھا۔ آزاد فضا میں تھیں۔ ہر سمت بڑھ رہا تھا۔ اپنے عروج پر تھا۔ منظروں میں رنگ تھے۔ ایسے میں تو روح تک مہک جانی چاہئے تھی۔ مگر ایسا نہیں اس کا اندر جیسے گر رہا تھا۔ ویرانیاں بڑھ رہی تھیں۔ جانے کیسے انجانے خدشے تھے۔ کیسے انجانے تھے جو اسے اندر ہی اندر مار رہے تھے۔

اسے کسی بہت انجان شخص سے ملوایا گیا تھا جس کے ساتھ اس کی زندگی کا تانا بانا جڑنا تھا۔ جس کے س کی ڈور آتا تھی۔ جس کے ساتھ اسے اپنی آئندہ کی ساری زندگی گزارنا تھی اور کیسا سرسری تھا اس کا۔ کتنا سرد تھا اس کا انداز جیسے سرے سے کوئی سرد کار نہ ہو۔ جیسے وہ کوئی غیر اہم وجود ہو۔ بہ مشکل پانچ دو اس کے پاس بیٹھا تھا۔

کیا نام ہے؟ کیا مشاغل ہیں؟ اور بس۔

ت چندر کی قسم کے سوالوں سے آگے نہ بڑھی تھی اور پوچھتے سے انداز ایسا تھا جیسے یہ سب کسی بڑے نٹ کا حصہ ہو اور اس کے اندر بھی کہاں کوئی امنگ تھی۔ کب کوئی شوق تمنا تھا۔ اس کی آنکھیں تو بس ندر سے اچانک اُگ آنے والی دیرانیوں پر نکلی تھیں۔ سماعتیں فقط ان سناٹوں پر لگی تھیں جو روح تک سال کر رہے تھے۔ کتنی عجیب تھی کیفیت۔ کتنی عجیب تھی صورت حال۔ جانے کیوں وہ سمجھ نہ پا رہی یا پھر سب کچھ واقعی نہ سمجھ میں آنے والے اسرار تھے۔ مگر یہ کیسے بھید تھے جو روح کو گھائل کر رہے ندر کے اطمینان کو نگل رہے تھے۔ اسے کیوں ان دیکھے وہموں نے آن گھیرا تھا؟ انجانے خدشات رے وجود کو محصور کر دیا تھا اور ایسا کیوں کر تھا؟ کچھ بھی تو سمجھ نہ پا رہی تھی وہ۔

س کی خالی خالی نظریں عجیب پر وحشت انداز میں منظروں کو دیکھ رہی تھیں جیسے وہ اس ماحول کا حصہ نہ جیسے اس کی دنیا کوئی اور تھی۔ جیسے باہر کے مناظر سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ کیسا عجیب تھا۔

یہی نہ سمجھ میں آنے والی کیفیات تھیں۔

آنے والے وقت کے لئے کتنے لمحوں تک کچھ بولتے رہے تھے۔ اس کے شانے کے گرد اپنا ہاؤ بہت محبت سے کچھ کہہ رہے تھے۔ جانے کون سے لفظ ان کے لبوں پر تھے۔ جانے کیا کہہ رہے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ سماعتیں سنتے ہوئے بھی نہ سن رہی تھیں۔ سارے احساسات کیسے رہے تھے۔ ساری حسیں کیسے نیم جاں ہو رہی تھیں۔

اسے پایا کے چہرے کی مطمئن مسکراہٹ کسی قدر اطمینان دے رہی تھی۔ وہ انہیں خوش بتاتی تھی۔ انہیں خوشیاں دینا چاہتی تھی۔ مطمئن دیکھنا چاہتی تھی۔ یہی رضا تھی اس کی۔ تبھی تو وہ ان اس فارم ہاؤس پر چلی آئی تھی۔ جدیدہ بیگم متواتر اس کے لئے التفات کے مظاہرے کر رہی تھیں۔ تا سے اسے اپنے ساتھ بھیج رہی تھیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھ رہی تھیں۔

نوازشوں کی بارش ہو رہی تھی۔ مگر وہ خوش نہیں تھی۔
اندر کہیں اطمینان نہیں تھا۔ بے چینی حد سے بہت سواتھی اور وہ کسر انجان تھی۔ سردار بیکٹین حیدرا
یا حمیدہ بیگم سے اسے کوئی انٹرسٹ نہ تھا۔ رتی بھر دلچسپی نہ تھی۔ وہ اگر یہاں تھی تو فقط پاپا کی وجہ سے۔

”میرب! خود کو یہاں اجنبی خیال مت کرو۔ ہم سب کو اپنا سمجھو۔“ حمیدہ بیگم اسے کھوٹی کھوٹی
کر بولی تھیں۔ مگر وہ جو اپنا کچھ نہیں بولی تھی۔ جانے کیوں اس سارے ماحول میں اس کا دم گھٹ رہا
بھاگ جانا چاہتی تھی۔ ان تمام منظروں سے پچھا چھڑا لینا چاہتی تھی۔ لیکن ایسا کچھ ممکن نہ تھا۔ اسے
تھا جیسے اسے تختہ دار پر لٹکانے کی تیاری کی جارہی ہو۔ اس کی موت کے سامان ہو رہے ہوں۔
جیسے زندگی ختم ہو رہی ہو۔ جیسے سب کچھ فنا کی جانب گامزن ہو۔

زوباریہ، پاپا اور حمیدہ بیگم اسے بیکٹین حیدر لغاری کے ساتھ وقت گزارنے کے مواقع فراہم کر
تھے اور اس کے لئے جیسے یہ سب کچھ سوہان روح تھا۔
وہ سنگت، وہ قربت جیسے اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ سرپٹ دوڑتی ہوئی وہاں سے نکل
چاہتی تھی مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ایسا کچھ بھی ممکن نہیں۔ سو بے حس بت بنی اس تمام صورت حال
گزرتی رہی تھی۔

سردار بیکٹین حیدر لغاری کے لئے بھی جیسے یہ سب کچھ بہت مشکل تھا۔ یہ ساری رسمیں
روادریاں قائم رکھنا شاید اسے بھی بہت گراں گزر رہا تھا۔ ناگواری کی لکیریں اس کے چہرے پر
قدر و راسخ انداز میں رقم تھیں۔ مگر میرب سیال کب یہ سب جاننا چاہتی تھی؟ کب اسے کو
سے، کسی چہرے سے دلچسپی تھی؟ اس کی نظریں تو اپنے اندر کی ویرانیوں سے اُلجھی ہوئی تھیں۔
خاموش بہر ان دونوں کے بیچ بات کئے بنا بسر ہوئے تھے۔ چپ چاپ گزر رہے تھے۔ دونوں کے
لمحے بوجھ تھے۔ دونوں کے لئے جیسے بوجھ کو ڈھونا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ دونوں جیسے اس صورت
کے لئے تیار نہ تھے۔

وہ سات دن جو وہاں بسر ہوئے تھے کتنے ہولناک تھے۔
پاپا کے جانے کی تیاری مکمل تھی۔ زوباریہ امریکہ میں اپنے بھائی سے مسلسل رابطے میں تھیں۔
وہ کمرے میں بے سدھ سی پڑی تھی جب زوباریہ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تھا۔
”میرب! تم تیار ہو جاؤ۔ تمہاری رسم ہونے والی ہے۔“ اس کے سامنے ایک پیکٹ ڈالا تھا۔ اس
اسے اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ زوباریہ چند لمحوں تک اسے خاموشی سے دیکھتی رہی تھیں پھر دو قدم آگے
آئی تھیں اور بے حد نرمی سے بولی تھیں۔

”دیکھو میرب! منظر کی خواہش ہے یہ۔ ایک اچھی بیٹی ہونے کے ناتے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے۔
ان کی خواہش کا احترام کرو۔ کل کیا ہوتا ہے یہ کسی کو پتہ نہیں۔ ہم فقط اچھے کی امید رکھ کر دعا
سکتے ہیں۔ مگر آنے والے کل کو نہ تو جان سکتے ہیں نہ ہی اپنی مرضی سے بدل سکتے ہیں۔“
زوباریہ جانے کیا کہنے جارہی تھیں۔ کس لئے اتنی لمبی تمہید باندھ رہی تھیں۔ وہ کسی قدر خالی



ٹھہرا ہوا بہت سا پانی یکدم ہی باڑ بھلا نک کر باہر آیا تھا اور چہرہ چپ چاپ بھگتا چلا گیا تھا۔ اس نے خود کو روکا نہیں تھا۔ اس لادے کو چپ چاپ آنکھوں کے راستے پہننے کی اجازت دے دی تھی۔

اذہان حسن بخاری نے بہن کی پشت کو دیکھا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے آگے بڑھ کر بہن کے شانے پر بہت دھیرے سے ہاتھ دھرا تھا۔ وہ یکدم ہی پلٹی تھی اور پھر بھائی کے مضبوط شانے پر سر رکھ کر دھواں دھار رونے لگی تھی۔ اذہان حسن بخاری کتنی ہی دیر اسے ہولے ہولے چھکتا رہا تھا۔ چپ چاپ اسے تسلی دیتا رہا تھا۔ شاید اس لمحے لفظوں کی ضرورت نہیں تھی یا پھر لفظ کسی بھی بات کا ازالہ نہیں کر سکتے تھے یا پھر جو کچھ ہوا تھا اس کے لئے لفظ ناکافی تھے۔ کتنی دیر وہ دونوں بہن بھائی خاموش کھڑے رہے تھے۔ ماہا کے دل کا غبار کسی قدر چھٹ گیا تھا اور اب وہ خاموشی سے کھڑی سر جھکائے کسی قدر شرمندہ سی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے بہن کی طرف دیکھا تھا پھر بہت ہولے سے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے سر پر دھر دیا تھا۔

”مجھے معاف کر دو ماہا! میں تمہارا مجرم ہوں۔“ بہت آہستگی کے ساتھ اس نے اپنا گناہ قبول کیا تھا۔ مگر ماہاسرئی میں ہلانے لگی تھی۔

”نہیں۔۔۔ میں ایسا نہیں سمجھتی۔ آپ خواجواہ خود کو قصور وار مت ٹھہرائیں۔ جو کچھ ہوا وہ میری قسمت میں درج تھا۔ مجھے اس کا قطعاً کوئی احساس نہیں۔ اچھا ہوا رشتے کی ناپائیداری وقت سے بہت پہلے ہی کھل گئی۔ اگر بعد میں کچھ ہوتا تو یقیناً اچھا نہیں ہوتا۔ میں قسمت کے اس فیصلے پر قطعاً افسردہ نہیں ہوں۔ افسردہ ہوں تو فقط آپ کے اور مئی کے باعث۔“ اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئی تھیں۔ اذہان حسن بخاری اس گھڑی جیسے مزید پتیبوں میں گھر گیا تھا۔ دل پر اور بھی بوجھ آن پڑا تھا۔ شاید تبھی وہ کچھ بولا نہیں تھا۔ پلٹا تھا اور چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ ماہا کتنی ہی دیر بھیگی آنکھوں سے اس سمت کتنی رہی تھی۔

یہ تعلقات بھی عجیب شے ہیں۔ وابستگی ہوئی نہیں اور توقعات کا سلسلہ دور تک جا پھیلتا ہے۔ چاہے کوئی امید دلائے یا نہ دلائے۔ کوئی کچھ کہے نہ کہے مگر یہ سلسلہ رکنے والا نہیں۔ یہ خود بخود اندر سے اٹھنے والا جذبہ ہے، جس پر کوئی روک ٹوک نہیں، کوئی بندش نہیں۔

لامع حق کو بھی کوئی یقین نہیں دلایا گیا تھا۔ کوئی وعدہ بھی پیہم نہ تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنے ایک خاص دن پر کسی بہت اپنے کی، کسی بہت دل کے قریب فرد کی توقع کر رہی تھی۔ اس کی آمد کی، اس کی توجہ کی، اس کی کسی نوازش کی منظر تھی۔ دل انسون انتظار سے بندھتا چلا گیا تھا۔ حالانکہ عفتان علی خان نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ ایسا کوئی یقین نہیں دلایا تھا مگر وہ پھر بھی اس کی منتظر تھی اور ایک لا حاصل انتظار کئے جا رہی تھی۔

صبح آنکھ کھلی تھی تو پہلا احساس یہ جاگا تھا کہ ابھی اس کا فون آئے گا۔ ابھی وہ کوئی پیام بھیجے گا۔ کوئی فون آہٹ ہوگی، کوئی در پر ہوگا، وہ دروازہ کھولے گی۔ وہ نہ سہی، کوئی اس سے وابستہ فرد ہی سہی، کوئی اس کا بیابا ہی سہی، کوئی خبر تو لائے گا۔ کوئی پیام تو بھیجے گا وہ۔ کچھ نہ کہے گا تو فقط پھولوں میں اپنی تمام رسک، اپنی تمام شدتیں سمو کر بھیج دے گا۔ ایک چھوٹا سا کارڈ ہی سہی، اس کی خوشبو تو سنگ لائے گا۔

سید اذہان حسن بخاری ماں کو ہسپتال سے گھر لے آیا تھا۔

ہر جانب ایک طویل جامد سناٹا تھا۔ گھر کے تینوں نفوس ایک دوسرے سے نگاہیں ملانے سے کتر تھے۔ تینوں اپنے اندر کے بھید اپنے اندر لئے معمول کے کاموں میں مصروف تھے۔ شاید کوئی دم مقصود تھا۔ خود کو بھی اور اپنے سے منسوب لوگوں کو بھی۔ یا پھر چپ رہ کر ایک دوسرے کی ڈھارس چاہتے تھے۔ خود کو مضبوط ظاہر کر کے کسی کو اس احساس جرم سے بچانا چاہتے تھے یا پھر خود کو بے م کے کسی اور کا حوصلہ بندھانا چاہتے تھے۔

اذہان حسن بخاری جب تک ہسپتال میں مصروف رہا تھا اسے کسی اور طرف دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ ماں کے ساتھ اس کی توجہ اس قدر بڑی ہوئی تھی کہ وہ کسی اور سمت دیکھ ہی نہ سکا تھا۔ اور اسے گھر لوٹا تھا تو ماہا پر نگاہ لگی تھی۔ چپ چاپ اپنے معمول کے کاموں میں مصروف، بے تاثر چہرہ، نظریں، متحرک ہاتھ اور جامد آنکھیں۔

وہ بری طرح احساس جرم میں گھر گیا تھا۔ نگاہ جھک گئی تھی۔ اندر دور تک ایک خاموشی پھیلا تھی۔ وہ تو اب تک فقط ایک محاذ پر لڑ رہا تھا۔ فقط ایک جانب دیکھ رہا تھا۔ ساری توجہ ایک طرف تھی۔ وہ تو جان ہی نہ پایا تھا کہ کسی اور کو بھی اس کی ضرورت ہے۔ کسی اور کو بھی اس کا شہ ہے اور وہ بھی وہ، جس کا سب سے عظیم نقصان ہوا تھا۔ وہ ہستی جو اسے بے حد عزیز تھی۔ جس کا ماں اس دل پر کیا قیامت نہ گزری ہوگی۔

کسی سے کچھ نہ کہا تھا۔ کتنا درد ٹھہرا ہوگا اندر۔۔۔ کتنی ٹھٹھن ہوگی اندر۔

ماہا اس کے سامنے چائے رکھ رہی تھی۔ جب وہ ہولے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ پلٹنے لگی تھی۔ نے آواز دی تھی۔

”ماہا۔۔۔!“

ماہا کی تھی مگر پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ شاید آنکھوں میں یکدم ہی بہت سی نمی آن ٹھہری تھی اور کمزور لہجوں میں اپنی کمزوری کو بھائی پر عیاں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر مضبوط نظر آنے کا یہ انداز بہت فقط ایک مخلص آواز آنے پر ہی وہ خود پر باندھے گئے ضوابط کی فیصلوں کو قائم نہ رکھ پائی تھی۔ آنکھ

تحریر ہی میں سہی، اس کے ہاتھ کالس تو ہو گا نا، جسے وہ چھو سکے گی، محسوس کر سکے گی۔
مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

صبح سے دوپہر اور پھر دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی تھی مگر جس سمت سے ایک آس تھر
سمت سے کوئی روئل نہیں آیا تھا۔

ماما پاپا کو اس کی خوشی عزیز تھی۔ سو انہوں نے ایک چھوٹی سی تقریب کا انعقاد گھر کے لان میں کر
تھا۔ کئی عزیز واقارب آئے تھے، کئی دوست مدعو تھے۔ مگر وہی نہیں تھا جسے ہونا چاہئے تھا۔

انا بیہ شاہ آئی تھی اور اس کا اترا چہرہ دیکھ کر کتنی دیر تک چھبڑتی رہی تھی۔
”تجھی تو کہتے ہیں بندہ امیر کی بجائے غریب زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ امیر کے پاس وقت ہی نہیں

نہ آپ کو سہانے کے لئے، نہ اقرار کے لئے، نہ نکرار کے لئے۔ جب کہ ڈل کلاس کے بہت مزے
عیش ہی عیش ہوتا ہے۔ بندے کے پاس وقت بھی ہوتا ہے اور ایک درد مند دل بھی۔ خیال بھی رکھتا ہے
محبت بھی کرتا ہے۔“ انا بیہ شاہ مسکراتے ہوئے یقیناً اُسے چھبڑ رہی تھی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا
مسائل منتظر نظروں سے امد و لے راستوں پر کھتی رہی تھی۔

”کوئی فائدہ نہیں ہے۔۔۔ موصوف نہیں آنے والے۔ نظریں ہٹا لو راستوں سے اب۔“ انا بڑ
مسکراتی تھی اور لامعہ کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

انا بیہ شاہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ پھر بغور اس کی سمت دیکھتے ہوئے قدرے طامحت سے
تھی۔

”کم آن یار! ڈونٹ ٹیک اٹ سیریس۔ مذاق کر رہی تھی میں تو۔“

”میں تمہارے مذاق کی وجہ سے پریشان نہیں۔“ لامعہ نے نمی کو اپنے اندر اتارتے ہوئے کسی قدر
بہورتے ہوئے کہا تھا۔ تقریب اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی۔ مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے

”ٹھیک کہا ہے کسی نے۔“ انا بیہ کے اتاری لبوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ تھی۔

”کیا؟“ لامعہ نے اس کی جانب دیکھے بغیر پوچھا تھا۔

”بے قدروں سے کر کے پیار، قدر گوانی دل کی یار۔“ انا بیہ شاہ سچ سچ اس کی کیفیت سے محظ
رہی تھی۔ لامعہ نے اُسے فقط خاموشی سے دیکھا تھا۔ بولی کچھ نہیں تھی۔

مہمان بالآخر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تھے۔

”اے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔“ کتنے کرب سے بولی تھی لامعہ۔ انا بیہ شاہ نے اب کے بغور
سمت دیکھا تھا۔ پھر دوسرے ہی پل اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”اور تمہیں بھی تو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”کیا..... کیا، کیا میں نے؟“ لامعہ حق کسی قدر حیران ہوئی تھی۔

”ختم نے حد کر دی ہے لامعہ حق! انا بیہ شاہ کسی قدر افسوس سے بولی تھی۔“ ”تمہیں کم از کم ما
کو ایک فون کر دینا چاہئے تھا۔ ذمب کال ہی سہی۔ چاہے کچھ نہ کہتیں۔ مگر ان حضرت کو خبر تو ہو جا

کچھ باور کرانا چاہتی ہو۔“

مگر لامعہ پر افسوس انداز میں سر نہی میں بلانے لگی تھی۔

”اس کے پاس ایسی کوئی حس نہیں ہے۔“

”اور تم۔۔۔؟“

اس نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر پھر جانے کیا سوچ کر لب بھینچ لئے تھے اور خاموشی کے ساتھ سر جھکائے
بہی لامعہ کو دیکھنے لگی تھی۔ لان میں کئی روشنیوں کا بسیرا اب بھی تھا مگر مہمانوں کی رخصت کے بعد ایک

عجیب طرح کا سکوت اب چار سو پھیلا ہوا تھا اور اس طویل سناٹے کو محسوس کرتے ہوئے انا بیہ شاہ یقیناً
یہ لفظوں کی متلاشی تھی جو اس کی دوست کے دل کو راحت دے سکیں۔ کسی قدر دلاسہ دے سکیں۔ مگر وہ

س کوشش میں سراسر ناکام تھی۔ اسی تک و دو میں وہ سر جھکائے بیٹھی تھی جب لامعہ کی آواز اس کے کانوں
میں پڑی تھی۔

”اس شخص نے مجھے حد درجہ ڈس اپوائنٹ کیا ہے انا بیہ! میں اس کی غافل طبیعت سے سدا کی واقف
ہوں مگر مجھی تھی۔۔۔ لیکن اُسے تو دل رکھنا بھی نہیں آتا۔ زندگی کے پہلے ہی اسٹیپ پر کس درجہ بے

ردی سے پانی بھیرا ہے اس نے میری امیدوں پر۔ بے حد ظالم ہے وہ۔“

حد درجہ پر افسوس انداز میں وہ کہنے کے ساتھ ہی اُٹھی تھی اور بہت تھکے ماندے قدموں سے اندر کی
باناب بڑھنے لگی تھی۔ انا بیہ شاہ تا دیر اس کی سمت تنکتی رہی تھی۔ پھر ایک گہری سانس خارج کر کے سر اٹھا کر

آسمان کی طرف تنکنے لگی تھی۔ تقریب کا آغاز ایک اُمید پر ہوا تھا اور اختتام میں وہی امید دل کے کسی نہاں
مانے میں دفن ہو گئی تھی۔ یقیناً لامعہ بہت زیادہ ڈس اپوائنڈ تھی اور اس کی یہ کیفیت یقیناً اس کے دل پر بھی

یسا ہی اثر کر رہی تھی۔ بہترین دوست تھی وہ اس کی۔ اس کی کیفیت پر اس کا دل بھی اسی قدر ملول ہو گیا
غا۔

رات خاصی بیت چکی تھی۔ لان میں چار سمت خاموشی و ویرانی کا ڈیرہ تھا۔ رات ہولے ہولے بھگ
ہی تھی۔ ہر سمت اوس کے قطروں کا چہرہ تھا۔ فضا میں ایک نمی سی تھی۔ وہ ابھی اٹھنے کا قصد کر رہی رہی تھی

سب نگاہ آسمان کی سمت سے ہٹانے پر اس نے اپنے سامنے اک عجیب ہی منظر دیکھا تھا۔ کوئی بہت اپنے
پ میں گن، پڑو قار انداز میں مضبوط قدم اٹھاتا اس کی سمت چلا آ رہا تھا۔ قدموں میں بڑا اعتمادی حد درجہ

جی جیسے وہ دنیا فتح کرنے کا عزم رکھتا ہو۔ اپنے فاتح ہونے کا یقین اس کے قدموں کی مضبوطی سے بہ
دل لگایا جا سکتا تھا۔ انا بیہ شاہ چونکے بغیر اس سمت تنکتی چلی گئی تھی۔ شاید بہت محظ وہ لامعہ کی کیفیت پر۔

بھی نہ تو چونکدار کے گیت واکرنے کی سمت توجہ مبذول کر سکی نہ ہی گاڑی پورچ میں رکنے کی آواز پر کان
ٹھکائی۔ اور دیکھنے پر بھی وہ کبھی تھی کہ آنے والے کے قدموں کا رخ اندر کی سمت ہو گا۔ مگر ان مضبوط
ردموں کو مسلسل اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ کسی قدر حیران ضرور ہوئی تھی۔

آنے والا اسی پر اعتمادی اور وقار سے چلتا ہوا اس کے قریب آن رکا تھا۔ نگاہ بغور اس پر تھی۔ آنکھوں
لے عجیب ایک انجانی کیفیت تھی۔ جیسے اس کی آنکھیں اس گھڑی کوئی جادوئی قاعدہ تھیں اور کسی کا عکس لکھ

لرنا جانتا تھا۔

انابہ شاہ کسی درجہ حیرت سے اس کی سمت تکتے لگی تھی۔ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔ رات یکدم ہی جادوئی سی ہوئی تھی۔ اک طلسم سا ہر سمت پھیلتا چلا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں واقعی کوئی جادوئی قلعہ تھیں جن کے اندر اس کا عکس مقید ہوتا چلا گیا تھا۔ شاید وہ کوئی جادوگر تھا۔ کوئی شہیدہ گر تھا۔ کتنے زرا لے انداز تھے اس کے۔ وہ یکدم چونکی تھی اور نگاہ پھیر گئی تھی۔ وہ اٹھنا چاہ رہی تھی مگر اسے ایسا کرنا ناممکن لگا تھا۔ سارا وجود پتھر ہو رہا تھا۔ اپنا تاثر برقرار رکھنے کو وہ دھیمے سے مسکرائی تھی۔ اخلاق نبھایا تھا۔ اس کے سوا جیسے کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ پہلی ملاقات تھی اور وہ کمزور پڑنا قطعاً نہیں چاہتی تھی۔ شاید یہی بات بنانے کو بولی تھی۔

”لامعہ بہت پریشان ہو رہی تھی۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ قصور اس کا بھی نہیں۔ شاید رشتوں میں تو قعات اپنے آپ عود کر آتی ہیں۔ بہت خاص دن تھا اس کا اور آپ نے یاد نہ رکھ کر یقیناً اچھا نہیں کیا۔ بہت طول بھی وہ — رورہی تھی۔ آپ کو نہیں آتا تھا تو مطلع کر دیا ہوتا۔ فقط فون پر ہی دو لفظ کہہ بیٹے ہوتے۔ لامعہ کا دل تو رہ جاتا۔“ اپنی دانست میں اس نے بڑی بات کی تھی مگر اس شخص کا کوئی رد عمل اس کے سامنے نہ آیا تھا۔ عجب بے تاثر انداز تھا جیسے اس نے سن کر بھی نہ سنا ہو۔ مگر اس کے بغور دیکھنے کی نوبت قطعاً نہیں ٹوٹی تھی۔ وہ اب بھی دھیمے سے مسکراتا ہوا اس کی سمت تک رہا تھا۔

”آپ کی آواز بھی بہت ٹھنکی ہے۔ ایسے جیسے منوں کے حساب سے شہد گھلا ہو۔ بتایا نہیں آپ نے، کس دیس سے آئی ہیں آپ؟“ وہ بدستور شرارت پر آمادہ تھا۔ وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے دھیان پھیر گئی تھی۔ عجب طلسمی رات تھی۔ کبھی گرفت میں لینے والی باتیں تھیں اس کی۔

”عجب شخص ہیں آپ۔ مگر ایک بات ہے، لامعہ کا انتخاب غلط نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی قطعی نہیں کہ آپ ہماری پیاری سی لامعہ کی جان عذاب میں مبتلا کر دیں۔ نخرے دکھائیں بھی، لیکن ذرا پیار سے۔ ماری لامعہ کے دل کو نہیں پہنچنی چاہئے۔“ کہتے سے اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی تھی، پھر سکرانی ہوئی اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”چلوں گی اب — اچھا ہوا آپ سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع مل گیا۔ لامعہ کو بتاؤں گی تو بڑی نسل ہوگی اسے۔ ناراض ہے کسی قدر۔ اب آئے بھی تو کیا آئے ہیں۔ خیر منتظر تو وہ اب بھی ہوگی۔ ازالہ ممکن تو ہے۔ بہر حال کوشش کر دیکھئے، تھوڑی کڑوی ضرور ہے مگر دل کی بری نہیں۔ اور ان حالات میں تو ہل بھی اس کا ہر اقدام جائز ہوگا۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔“

وہ ہولے سے اٹھی تھی۔ مقابل اسے اب تک بغور تک رہا تھا۔ کس درجہ محویت تھی۔ وہ اب کے نہ تو بونگی تھی نہ ہی حیران ہوئی تھی۔ دو قدم بڑھا کر اس کے قریب پہنچی تھی۔ اس کی خوشبوؤں کا پہرہ اس گھڑی نفاذ میں تھا۔ ماحول میں چار سمت جیسے ایک مقناطیسی حصار بندھا ہوا تھا اور سارا کچھ اسی جادو کے زیر اثر تھا۔ وہ متاثر نہ تھی مگر کسی قدر حیران ضرور ہوئی تھی۔ وہ جس طرح بغور اسے دیکھ رہا تھا، اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا، وہ کیا تاثر دے۔ تبھی شاید وہ دھیمے سے مسکرائی تھی۔ قصد الوداعی تاثر دینے کا اور ہل میں قدم اٹھا کر آگے بڑھ جانے کا تھا۔ مگر مقابل کھڑے شخص نے یکدم ہی ہاتھ بڑھا کر اس کے نازک ہاتھ کو گرفت

ان میں محصور ہو رہا تھا۔ انابہ شاہ ان آنکھوں کے متواتر دیکھنے پر کسی قدر چونکی تھی۔ مگر تکتے دانے کی بڑ ٹوٹی نہیں تھی۔ وہ اس لمحے سر اٹھا کر جیسے سیاہ گھور آسمان کی وسعتوں میں کچھ تلاشنے لگا تھا۔ انداز کمزور دلفریب تھا۔ وہ دلچسپی سے اسے تکتے لگی تھی۔

”کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟“ وہ کسی قدر حیرانی سے اس کی سمت تکتی ہوئی بولی تھی۔ مقابل کھڑا شخص اگوچونکا تھا پھر بغور اس کی سمت تکتے لگا تھا۔

”چاند — مگر وہ آج آسمان پر کہاں۔“ انداز پُرفسوس تھا۔

”کیوں؟“ وہ چونکی تھی۔

مقابل نے اسے بہت دلفریبی سے دیکھا تھا۔ پھر ایک جادوئی مسکراہٹ اس کے لبوں کا حصار تھی۔

”وہ آج زمین پر جو آ گیا ہے۔“ اس کے جادوئی قلعے جیسی آنکھیں اس گھڑی شاید مسکرا رہی تھیں اور دل کی حس مزاح یقیناً بہت عمدہ تھی۔ وہ ایک دم ہی مسکرائی تھی۔

”باتیں بنانا یقیناً آپ کو بہت اچھی آتی ہیں۔ مگر دل رکھنا۔“ لامعہ کے متعلق سوچ کر وہ بولنے جا تھی مگر پھر یکدم ہی رک گئی۔

”دل —؟“ وہ کسی قدر حیران ہوا تھا پھر نگاہ اس پر سے ہٹا کر اپنے سینے پر بائیں جانب مرکوز تھی۔ دینر سیاہ کوٹ کا کالر ہٹا کر اندر جھانکا تھا۔ پھر کسی قدر مایوسی سے دائیں ہاتھ سے سینے کے بائیں کوٹھلا تھا۔ انابہ شاہ کسی قدر دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ یقیناً یہ سامنے کھڑا شخص دلچسپی سے خالی تھا۔ شاید کچھ اہم تھا اس میں، اس کی آنکھوں میں، اس کی باتوں میں۔ سچی تو وہ ان لوگوں کے حصار مقید ہو کر یہ تک بھول گئی تھی کہ رات خاصی بیت چکی ہے اور اسے واپس بھی پلٹنا ہے۔ اس لمحے اس کی شخص پر بھی بغور دیکھ رہی تھی۔

”یہاں تو ایک ہی دل تھا، سو وہ بھی نہیں رہا۔ آپ غالباً مغالطہ آرائی سے کام لے رہی ہیں۔ آپ اپنا دل تا حال مجھے نہیں سونپنا۔“ تمام تر تسلی کر لینے کے بعد وہ لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ لئے گویا ہوا تھا پہلے جہاں وہ چند ثانیوں تک ساکت سی اسے تکتی چلی گئی تھی پھر یکدم ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”رات بارہ بجے کے بعد سے عقل و خرد سر پر پاؤں دھر کے بھاگ جاتی ہے۔ ٹھیک کہا ہے کسی نے۔ وہ یقیناً محظوظ ہوئی تھی۔“

جواباً موصوف دھیمے سے مسکراتے اسے تکتے چلے گئے تھے۔

”یہاں تو دل نہیں رہا اور آپ فقط عقل و خرد کی بات کرتی ہیں۔“ وہ یقیناً اس گھڑی سنجیدہ نہ تھا۔ اس شاہ اسے دلچسپی سے تکتے ہوئے ہولے سے مسکرائی تھی۔

”پروف ہو گیا، آپ ہی محترم عرفان علی خان ہیں۔ لامعہ آپ کے متعلق ٹھیک ہی کہتی ہے۔“

”زمانے کی جانے دیجئے، آپ اپنی کہتے۔ کس دیس سے آئی ہیں — کس درجہ نور پھیلا ہوا ہر سمت۔ کتنا بہت سا جادو ہے ہر طرف۔ سچ — سدھ بدھ گھوبنچھا میں تو۔“ وہ شخص واقعی مقابل کو

”پاپا، زوباریہ، فانی سب چلے گئے تھے اسے تنہا چھوڑ کر۔ اس برف کے زمانے میں، اسے برف ہونے کو۔ اور وہ تھی کہ کوئی مزاحمت بھی نہ کر پار ہی تھی۔“

مائی اماں اس کا کتنا خیال رکھ رہی تھیں۔ محل سے بھی بڑا گھر تھا سردار سبکگین حیدرلناری کا۔ کتنی اونچی فصیلیں تھیں اس کی۔ کتنے اہتمام سے سجایا گیا تھا اسے۔ کتنی پُر تیش آرائش و زیبائش تھی اس محل سے بھی بڑے گھر کی۔ نوکروں کی ایک فوج تھی، ہر لمحہ، ہر آن مستعد۔ مگر نفوس بہت تھوڑے تھے۔ وہ تو ابھی اس مخصوص کمرے سے ہی باہر نہ نکلی تھی جسے رہائش کے لئے اسے سوچنا گیا تھا۔ وہی کمرہ اس قدر بڑا اور بڑا آسائش تھا کہ اسے خود پر کسی ریاست کی شہزادی ہونے کا گمان گزر رہا تھا۔ پورا گھر جانے کتنا بڑا ہوگا۔ وہ کھوجنے کی مہم پر نکلتی تو خود کھوج جاتی۔ ریاستی محل تھا کوئی اور وہ تو تمام زمانوں کی مکین تھی۔ ایک عام سی لڑکی تھی۔ کب عادت تھی اسے راج کماریوں کی طرح زندگی گزارنے کی۔ اس کے پاپا جانے مانے انڈسٹریلسٹ تھے۔ آنکھ کھولتے ہی اس نے گھر میں ہر آسائش پائی تھی۔ ہزار گز پر بنا گھر تھا۔ گھر میں اپنا پن تھا۔ مگر اس محل سے بھی بڑے گھر کے سامنے اسے اپنا گھر بہت چھوٹا لگا تھا۔ وہ اٹھوٹی تھی۔ آسائش سے پُر زندگی گزار چکی تھی۔ اس کی خواہش سے بھی پہلے ہر شے اس کی دسترس میں تھی۔ اسے کبھی کسی شے کے لئے کہنا نہیں پڑا تھا۔ مگر اس موجودہ حیثیت کے سامنے اسے اپنا آپ بھی بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ اندر سے کہیں کھور ہی تھی۔ ان بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو رہی تھی۔

ایسے کسی ریاستی شہزادے کا تو تصور بھی موجود نہ تھا اس کے ذہن کے کسی خانے میں۔ اب تک تو اس نے کبھی کسی جیون ساتھی کا خاکہ ہی نہ تراشا تھا۔ اب تک کی زندگی تو فقط کتابوں اور تعلیمی اداروں کے ارد گرد گزراں تھی۔ ابھی تک تو اس نے کسی ایسے تصور کے متعلق سوچا بھی نہ تھا۔ شاید عام سے ہی خواب بھی تھے اور سردار سبکگین حیدرلناری تو کسی اور ہی دنیا کا شخص تھا۔ ایسا جیون ساتھی تو اس نے کبھی بھی نہ سوچا تھا۔

وہ تو عام زمانوں میں رہتی تھی۔ عام لوگوں میں بستی تھی۔ کسی خاص وجود کے خیال کا بھی وہاں گزرنہ تھا۔ پھر کیا ہوا تھا اس کے ساتھ۔ اس کا ذہن قطعاً قبول نہ کر پار رہا تھا۔ دل مان نہیں رہا تھا۔

نہ اس سارے ماحول کو، نہ اس نئے بندھن کو، نہ اس صورت حال کو۔ اُسے تا حال اس گھر میں اپنی پوزیشن کا تعین کرنا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ وہ کوئی مہمان نہ تھی۔ کچھ دنوں تک قیام پذیر ہونے والی کوئی شخصیت بھی نہ تھی۔ مگر سب کچھ اپنا بھی نہ تھا۔ دو ہفتے سے زائد کا عرصہ یہاں گزر چکا تھا اور اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی قید خانے میں ڈال دی گئی ہو۔ کسی سنہری پنجرے میں بند کر دی گئی ہو۔ جہاں سے اس کی رہائی ناممکن ہو۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی تھی۔ اپنے اندر کی گھٹن کو قدرے کم کرنا چاہتی تھی۔ مگر کسی دروازے میں جیسے کوئی درز نہ تھی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ اس کا اندر کبھی اتنی وحشتوں سے بھر جائے گا۔

میں لے کر جیسے سارے لمحوں کو روک دیا تھا۔ وہ ٹھنکی تھی۔ اس اقدام پر قدرے حیرت سے مقابل کی۔ تنکنا چاہتا تھا مگر دوسری جانب محویت عجب دیوانگی لے ہوئے تھی۔ وہ کچھ سمجھ نہ پائی تھی۔ مگر مقابل کھڑا اسے متوازن تنکنا چلا گیا تھا۔ کتنی قربت تھی۔ اس کی خوشبو کتنی قریب تھی۔ سانسوں کی تپش سے جیسے سارا سلگنے کو تھا۔

”اس کی آنکھیں بتاؤں کیسی ہیں

جھیل سیف الملوک جیسی ہیں“

کتنے ہوئے سے اس کے لب ہلے تھے اور پوری فضا جیسے کسی جادو سے بھرتی چلی گئی تھی۔ انا بیہ جیسے پل میں بیدار ہوئی تھی۔ لمحہ بھر میں اس نے اپنا سر میں ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرنا چاہا۔ مقابل مسکرایا تھا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی بہت آہستگی سے مسکراتے ہوئے اس ہاتھ کو اپنی گرفت آزاد کر دیا تھا۔ مگر زیر لب مسکراتے ہوئے اس کے لبوں پر پھر وہی خوشبوی بات تھی۔

”اس کی آنکھیں بتاؤں کیسی ہیں

جھیل سیف الملوک جیسی ہیں“

اس کی آنکھوں میں کتنا یقین بول رہا تھا۔ انا بیہ شاہ ساکت سی نکتی ہوئی لمحہ بھر میں اُلٹے قدموں پیچ چلی تھی۔ وہ اسی طور تنکنا ہوا، اسی قدر دلچسپی سے مسکرا رہا تھا۔ قدم جیسے من من بھر کے ہونے کو تھے گا یکدم ہی رخ پھیرتے ہوئے پلٹی تھی اور وہاں سے بھاگتی چلی گئی تھی۔

عجب تبدیلی آئی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود عقل اور دل بہت چپ چاپ سے اُکونے میں دیکے بیٹھے تھے۔ سارے وجود میں اک سکوت سا تھا۔ اتنی چپ تھی کہ اگر ایک سُوئی بھی گزرا ارتعاش سارے بدن میں پھیل جاتا۔ ذہن تھا کہ قبول ہی نہ کر پار رہا تھا۔

اس کی زندگی کی حیثیت بدل گئی تھی۔ حقیقت بدل گئی تھی۔ وہ پل میں کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ سارے حوالے بدل دیئے تھے وقت نے۔ نئے بندھنوں میں لا باندھا تھا۔ مگر وہ خود کو اور بھی تنہا محسوس کر رہی تھی۔ جیسے کوئی اپنا آپ نہ تھا۔ جیسے سب اجنبی تھے، غیر تھے، پرانے تھے۔ اور ان پرانے لوگوں۔ درمیان کتنی سشدردی رُکی کھڑی تھی وہ۔ پتہ نہیں اپنے ہونے کا یقین چاہ رہی تھی یا کوئی نئی پہچان مانا رہی تھی۔ ان لوگوں سے یا پھر شاید وقت سے، مگر ہر جانب اک سکوت تھا۔ کہیں سے کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ وقت شاید بے رحم تھا۔ تبھی تو وہ اپنوں سے دور ہو گئی تھی۔

انجانے منظر دوں میں قید ہو گئی تھی۔

بیگانے لوگوں میں آن گری تھی۔

کتنی سرد مہری تھی نگاہوں میں کسی کی۔ کتنے سرد لہجے تھے اور اس رخ بستی سے اس کا سارا وجود سن رہا تھا۔ وہ اندر تک سے سرد پڑ رہی تھی۔

پاچھے ہیں جب تک تم یہاں ہو اس گھر کو، اس کے طور طریقوں کو اور سب سے بڑھ کر سبکدوش حیدر لغاری کو سمجھ لو۔ مانا جو بھی ہوا بہت جلدی میں ہوا مگر اب وقت ہے کہ تم ایک دوسرے کو جانو، سمجھو اور اپنا مانو۔ ایک دوسرے کی عادات و اطوار، پسند ناپسند اسی کا نام ذہنی ہم آہنگی ہے نا۔ میں چاہتی ہوں تم اس گھر کو پنا جانو اور قبول کرو، دل سے۔ مع سبکدوش حیدر لغاری کے۔ کیونکہ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔“

وہ بول رہی تھیں جب کہ اس کی نگاہ عین سامنے اٹھی تھی۔ کوئی بڑی تمکنت سے قدم اٹھاتے ہوئے یہ اتر رہا تھا۔ چال میں بہت اعتماد اور وقار تھا۔ بلیک سوٹ میں مردانہ وجاہت قابل دید تھی۔ یہ وجود اس کے وجود سے منسوب تھا، اس کے وجود کا حصہ تھا۔ مگر میرب سیال بڑے بے تاثر انداز میں نظریں جھکا گئی تھی۔ کوئی اسی تقاضا سے چلتا ہوا قریب آیا تھا۔ ایک لمحے کو نظر اس پر پڑی تھی مگر بڑی سرسری سے۔ دوسرے ہی پل وہ معمول کے انداز میں مائی اماں سے مخاطب تھا۔

”مائی اماں! میں باہر جا رہا ہوں۔ رات تک لوٹ آؤں گا۔“ بھاری لہجہ اس کے ارد گرد جیسے ایک حصار ماباندھ گیا تھا۔ مگر اس نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ چونکہ تب تھی جب مائی اماں بولی تھیں۔

”بیٹا! ٹھیک ہے۔۔۔ مگر میرب کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ بہت دنوں سے گھر میں بند ہے۔ ذرا موڈ مل جائے گا اس کا بھی۔“ مائی اماں کے کہنے پر سبکدوش حیدر لغاری نے اس کی طرف نگاہ کی تھی۔

”لیکن اماں! میں ایک ضروری کام سے جا رہا تھا اور ممکن ہے واپسی پر دیر بھی ہو جائے۔“ اس نے لمبل طور پر تعرض برتا تھا۔ میرب سیال کو حد درجہ سبکی محسوس ہوئی تھی۔

”سبکدوش! کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جو میں کہہ رہی ہوں وہ زیادہ اہم ہے۔ میرب سیال اس گھر کا حصہ ہے اب۔ تم سمجھ رہے ہونا؟“ مائی اماں نے بارعب انداز میں جیسے سب کچھ باور کرایا تھا۔ وہ لمبا بڑا شخص ہولے سے سر اثبات میں ہلا گیا تھا۔

”جی۔۔۔ جو حکم مائی اماں!“ ماں کے حکم سے اس نے انحراف نہیں کیا تھا۔ ”میں زیر کے ساتھ کچھ م فائلز دیکھ لیتا ہوں۔ جب تک آپ انہیں تیار کرنا کر بھیج دیجئے۔“ اس پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے۔ وہ کسی قدر سپاٹ لہجے میں گویا ہوا تھا اور پھر دوسرے ہی پل چلتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا۔ مائی اماں ساکے جانے کے بعد اس کی جانب تھکنے لگی تھیں۔

”جاؤ بیٹا! تم تیار ہو جاؤ۔“

وہ اگرچہ ایسا کچھ نہیں چاہتی تھی مگر جانے کیوں اس لمحے وہ بھی اس حکم سے منحرف نہیں ہو سکی تھی۔ خاموشی سے اٹھی تھی اور ضروری اقدامات کرنے کو چل پڑی تھی اور دل جانے کیوں اس گھڑی اور بھی اکت ہو گیا تھا۔

وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ بڑے سے بڑے گھاؤ بھر دیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اندر کہیں ایک پناہ نام سادہ باقی رہ جاتا ہے۔

دن گزر رہے تھے اپنی مخصوص رفتار سے اور ان دنوں میں کہیں کوئی مداوا نہیں تھا۔ گھاؤ پر وقت کا اک

اس شام اس نے مائی اماں سے یونیورسٹی جانے کی بات کی تو وہ مسکرائیں۔

”اس کے لئے تمہیں اجازت طلب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم بلاشبہ اپنی تعلیم چا سکتی ہو۔ مجھے اندازہ تھا۔ لیکن میں تمہاری ذہنی پریشانی کی وجہ سے تمہیں ریلیکس دیکھا چاہتی تھی اچھا ہے کچھ وقت سکون سے بسر کر لے۔ دراصل بیٹا! تم جس کیفیت سے گزر رہی ہو اس کا ہمیں طرح سے اندازہ ہے۔ یقیناً پاپ زندگی میں تمام رشتوں میں بہت معتبر حیثیت رکھتا ہے اور.....“

بولنے جا رہی تھیں مگر اس کی جھکی آنکھوں کے کنارے بھیگتے دیکھ کر انہوں نے اپنی بات درمیان چھوڑ دی تھی۔ پھر بہت پیار سے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھاما تھا اور اس کی روشن پریشانی پر اس کی مہر ثبت کرتے ہوئے دھیسے سے مسکرائی تھیں۔

”یہ رشتہ، یہ تعلق تمہاری زندگی میں یقیناً ایک دم تبدیلی لایا ہے۔ میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتی ہوا جانتی ہو، تم میرے لئے کتنی اور کس قدر خوشیاں لائی ہو؟“ گوا بھی فقط نکاح کی رسم ہوئی ہے یہاں پر عارضی طور پر رہائش پذیر ہو۔ مگر تم نے ابھی سے میرا گھر روشنیوں سے بھر دیا ہے۔ میں وقت کے لئے بے صبری سے انتظار کر رہی ہوں جب تمہارے مئی، پاپا آئیں گے اور میں تمہیں ارا مانگ کر ہمیشہ کے لئے اس گھر میں لے آؤں گی۔“ ان کی آواز خوشی سے لبریز تھی۔ مگر وہ اسی طر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔ نہ تو نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا نہ ہی کچھ بولی تھی۔

”تمہیں ہر طرح کی آزادی ہے اس گھر میں۔ تم جب تک یہاں ہو، جو چاہو کر سکتی ہو۔ اس گھر تمہاری حیثیت ایک مالکن کی ہے۔ بہو ہو تم اس گھر کی۔ سب کچھ تمہارا ہے۔ تمہارا اپنا۔ سبکدوش حیدر یہ اس کا چہرہ بہت ہولے سے اٹھا کہ وہ دھیسے سے مسکرائی تھیں۔ مگر میرب سیال کچھ نہیں بولی تھی کی اس شگفتہ سی بات پر بھی اس کے چہرے پر کوئی رنگ نہیں آیا تھا۔ کوئی رسمی تیور بھی نہ اُبھرا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور مائی اماں اس کے چہرے، اس کی آنکھوں کو بخور سکتے ہوئے چپے کے اندر کی کیفیت پا گئی تھیں۔

”میرب بیٹا! جانتی ہو، میں نے تمہیں ہی اس گھر کے لئے کیوں چنا؟ کیونکہ مجھے تمہاری آنکھوں روشنی بڑی صاف و شفاف لگی تھی۔ مجھے لگا تھا تم وہ ہو جو اس گھر کے لئے، سبکدوش حیدر کے لئے موزا ترین ہو۔ مظہر سیال اور زویبارہ سے یہ بات فقط منگنی کے لئے ہوئی تھی۔ مگر جب تم ہمارے فارم ہاؤس آئیں تو میں تمہیں دیکھ کر اپنے فیصلے پر قائم نہ رہ سکی۔ دراصل بیٹا! میں کسی بھی صورت تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ میرے کہنے پر ہی مظہر سیال اور زویبارہ کو اپنے فیصلے میں ترمیم کرنا پڑی۔“

میرب تمام باتیں فقط خاموشی سے سن رہی تھی۔ مائی اماں مسکرائی تھیں۔

”ہمارے وقت تو بڑے مختلف تھے۔ والدین ڈھور ڈنگروں کی طرح بنا پوچھے رشتے طے کر دیا کرتے تھے۔ پندرہ سولہ برس لگے نہیں اور لڑکی پرانی ہوئی نہیں۔ یکدم اماں باوا کا گھر چھوڑ کر ایک نئے دیس، ا نئے گھر سدھار جانا پڑتا۔ ایسے میں کے فکرتھی کہ باہمی ہم آہنگی کسی چیز یا کا نام ہے۔ مگر ہم اس زما کے ہوتے ہوئے اور تمام ادوار کو برتنے کے باوجود نئے زمانے کے تقاضوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔

کھرٹو تو آ رہا تھا مگر اندر کہیں درد کی ٹیسیں اب بھی اسی طرح اندر کو ہلا کر رکھ رہی تھیں۔ گھر کے زندگی بسر کر رہے تھے۔ مگر اک دوسرے سے کترائے کترائے، نظریں چرائے، جیسے وہی اک دو کے سب سے بڑے مجرم ہوں۔ اور سید اذہان حسن بخاری کی کیفیت ان سب سے سوا تھی۔ وہ تو اس واقعی مرتکب تھا۔

فارحہ کو اس بات کا احساس تھا مگر جانے وہ کیوں کچھ نہیں بول رہی تھیں۔ چپ چاپ ساکت سو صورت حال کو خاموش نظروں سے نکلتی جا رہی تھیں۔ سعد حسن شاہ بخاری کا تعلق اس گھر سے، اس گھر کیونوں سے چاہے کتنا ہی واجب سہی مگر وہ اس گھر میں آنے جانے سے باز نہیں آئے تھے۔ مہینے میسر آدھ چکر لگایا لیا کرتے تھے اور اس اقدام میں بھی انہیں قصور انہی کا نظر آ رہا تھا۔

”دیکھو فارحہ! میں ایسا نہیں چاہتا۔ سارا قصور تمہارا ہے۔ تمہاری سردمہری نے میرے لئے 11 میں آنے کے دروازے ڈھا دیئے ہیں۔ میں اس گھر سے یا اس گھر کی ذمے داریوں سے سبکو ڈٹا نہیں چاہتا۔ مگر تم بہت اجنبی ہو رہی ہو اور ایسا کر کے تم اپنے حق میں برا کر رہی ہو۔ یہ گھر میرا ہے یہاں چاہوں تو روز آ جا سکتا ہوں۔ مگر تمہاری آنکھوں کی سردمہری عجب الزام دیتی ہوئی سی ہے۔ ایسا کب تک چلے گا؟۔۔۔ بچی نہیں ہو تم۔ صورت حال کو سمجھ لینا چاہئے۔ اور انہونی کیا ہوئی ہے نے کیا عجب کیا ہے؟ شادی ہی تو کی ہے۔ اور میں تم سے یا بچوں سے کب دستبردار ہو رہا ہوں؟۔۔۔ مجھے اب بھی تم سے محبت ہے۔ تم سب کا احساس ہے۔ تم سب کی فکر ہے۔ کسی نئے تعلق کے باندہ سے پرانے رشتے ختم تو نہیں ہو جاتے فارحہ! ان کی حیثیت مٹ تو نہیں جاتی۔ سمجھتا ہوں میں سب نہیں ہوں۔ مجھے اپنے فرائض کا علم ہے اور اس میں کوتاہی قطعاً نہیں برت رہا۔ تم سمجھاؤ اپنے بیٹے کو یکدم ہی باپ بننے کی کوشش کر رہا ہے وہ۔ جانتی ہو کتنے دن سے آفس نہیں آیا۔ میں نے یہ کہہ لیا تو موصوف میرے مخالف گروپ آف کمپینز کے ڈائریکٹر سے ہاتھ ملارہے ہیں۔ اب وہ میری جزیر چاہتا ہے۔ مجھے کھوکھلا کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں اس میں ہم سب کا فائدہ ہے کے لئے کر رہا ہوں میں یہ سب دوڑ دھوپ۔ انہی کے لئے نا۔ پھر کیوں نہیں سمجھ رہا ہے وہ یہ با سمجھاؤ اسے۔ اپنے باپ کا باپ بننے کی کوشش نہ کرے۔ شاہ گروپ آپ کمپینز میں ایم ڈی کی پوسٹ لئے آج اخبار میں اشتہار دوں تو امیدواروں کی لائن لگ جائے۔ مگر میں اپنے بیٹے کے حق کو ختم نہیں چاہتا۔ یہ سب کچھ اسی کا ہے۔ پرسوں بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہے اور میں چیز مین ہونے کے اس کی غیر موجودگی کے لئے جواب دہ ہوں گا۔ فکر مجھے اس جواب دہی کی نہیں ہے فارحہ! فکر مجھے اس مستقبل کی ہے۔ اسے کہو، اپنا مستقبل اپنے ہاتھوں تباہ نہ کرے۔ لندن سے برنس کی ڈگری کے لئے آ بڑا تیس مارخان بن گیا۔ یہ باپ اس کی پشت پر تھا ورنہ اپنے ملک میں رہ کر کتنے نوجوانوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا دھبر ہو جایا کرتا ہے۔ کجا اتنے پائے کی برنس ڈگری لینا، وہ بھی لندن جیسے بڑے۔ یہ مگر ہوا تو فقط میرے باعث۔ اس کے باپ کے باعث۔ ورنہ آج وہ بھی اپنے ہاتھ میں آ دی لئے ڈٹ پاتھوں کی خاک چھان رہا ہوتا۔ اسے اپنی مہیالی پلٹ میں دھری دھرائی ٹی ہے

لئے دماغ چڑھ گیا ہے۔ باور کراؤ اسے، اپنے باپ کے بغیر وہ کچھ نہیں ہے۔ شاہ گروپ آف کمپینز کے چیئر مین کی حیثیت سے میں تو با آسانی کسی کو بھی بٹھا کر ایم ڈی کی سیٹ مل اب کر دوں گا پھر اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ سرٹیکس ناپے گا وہ۔ خاک چھانے گا۔ اسے باور کراؤ فارحہ! اسے بنا کسی تجربے کے فقط شاہ گروپ آف کمپینز میں ہی ایم ڈی کی سیٹ مل سکتی ہے۔ کیونکہ شاہ گروپ آف کمپینز اس کے باپ کی ہے۔ یہ رعایت ہر کوئی نہیں دے سکتا۔ بچہ نہیں ہے وہ۔ مگر انتہائی جذباتیت سے کام لے رہا ہے۔ گھر کی بات کو، گھر کے معمولی بھنگڑے کو لے کر وہ دنیا بھر کے سامنے تماشا بنا رہا ہے۔ اس کی آفس سے غیر موجودگی پر کیسی کیسی تاویلیں پیش کرنا پڑ رہی ہیں مجھے، اس کا اسے یا تمہیں قطعاً کوئی اندازہ نہیں فارحہ! ایک چھوٹی سی بات کو لے کر وہ اس قدر ہاتھ پیر ہو رہا ہے۔ یہ انتہا پسندی اسے بہت نقصان پہنچائے گی۔ سمجھاؤ اسے، اس کا دماغ ٹھکانے لگاؤ۔ ماں ہو تم اس کی اور وہ فقط تمہاری بات سمجھتا ہے۔“

”نہیں۔۔۔ وہ آپ کی بات بھی سمجھتا تھا۔“ فارحہ نے بہت آہستگی سے لب کھولتے ہوئے سید سعد شاہ بخاری کی سمت دیکھا تھا اور وہ تنے ہوئے چہرے سے اسے دیکھتے ہوئے یکدم پھر گئے تھے۔

”یہی بات۔۔۔ فارحہ! یہی بات تو تم نے اس کے دماغ میں ڈال دی ہے۔ یہی جتا کر تم نے اسے اپنے ساتھ کیا ہے، میں تم سب کا دشمن ہوں۔ یہی کہہ کر تم نے اسے اپنے ساتھ کیا ہے اور ایسا کر کے تم قطعاً اچھا نہیں کر رہی ہو۔ میں اس کا باپ ہوں۔ اس کے ساتھ مخلص ہوں یا نہیں یہ الگ بات ہے۔ مگر تم۔۔۔ فارحہ! تم ماں ہو کر اس کے ساتھ قطعاً مخلص نہیں ہو۔ تمہارا یہ اقدام سر اے جانے کے لائق ہرگز نہیں ہے۔ ایسا کر کے تم اس کے پاؤں پر خود کلہاڑا مار رہی ہو۔ اکلوتا بیٹا ہے وہ ہمارا اور تم فارحہ! دوسری شادی ہی کی ہے نا میں نے فقط۔ اور کیا جرم ہے یہ؟ مذہب، قانون سب اس کی اجازت دیتا ہے۔ کوئی بیج فعل سر انجام نہیں دیا ہے میں نے۔ مجھے خود اپنی اور میری نظروں میں مجرم ثابت مت کرو۔ اور ایسے میں جب کہ میں اس خاندان کے اور تمہارے حقوق اسی طور پر پورے کر رہا ہوں۔ جرم یہ تب ہوتا نا جب میں تم سے یا بچوں سے دستبردار ہوتا۔ ہمیشہ کی طرح وہ بنا فارحہ کی سنے بولتے چلے گئے تھے اور فارحہ خاموشی سے سر جھکا گئی تھی۔ آنکھوں میں کتنی بہت سی ہی یکدم ہی آن ٹھہری تھی۔ سید سعد حسن بخاری نے اسے رک کر لکھ بھر کو خاموشی سے دیکھا تھا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ کو تھام لیا تھا۔

”اوہ فارحہ! پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ دیکھو، میری طرف نگاہ اٹھاؤ۔ دیکھو میں اب بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ تم۔۔۔ بچے اب بھی میری پہلی ذمے داری ہو۔ اب بھی میری پہلی ترجیح تم اور بچے ہو۔ کہاں بھاگ رہا ہوں میں، کہاں بھاگ سکتا ہوں؟ میں تو یہاں بھی فقط اس لئے کم آتا ہوں کہ مجھے تمہاری سرد مہری اچھی نہیں لگتی۔ اپنے بچوں کی بیگانگی اچھی نہیں لگتی۔ کیا مجھے تم سب کا احساس نہیں؟۔۔۔ یا مجھے تم سب سے پیار نہیں؟ یا پھر مجھے ماہا کے ساتھ اس طرح پیش آنے والے واقعے کا ادراک نہیں؟۔۔۔ آئی ٹیل لگتی۔ ریکٹی میں بھی اسی قدر درد سے گزرا ہوں۔ جو میری بچی کے ساتھ ہوا اس کا مجھے بھی اسی طور احساس ہے۔“ سعد حسن بخاری کا لہجہ دھیما اور جذباتی تھا۔

فارحہ نے بہت ہولے سے سراٹھا کر دیکھا تھا۔ مگر بولی کچھ نہیں تھیں۔

اس کی آنکھیں بتاؤں کیسی ہیں
جھیل سیف الملوک جیسی ہیں

وہاں سے لوٹنے کے بعد کتنی دیر تک اک گرفت میں لینے والی آواز اس کے ارد گرد گونجتی رہی تھی۔ مدھر بازگشت اس کے گرد اپنا حصار باندھے رہی تھی۔ بلا ارادہ وہ سوچتی رہی جو وہ چاہتی نہیں تھی۔ مگر فسوں ساز لہجہ، وہ جادو بھری آواز اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔

پتہ نہیں کہنے والے کے دل میں کیا سمائی تھی، عجب شخص تھا اور کیسی عجب باتیں کر رہا تھا۔ لامعہ کا فیا اسے واقعی بہت عجیب لگا تھا۔ وہ دوسری بار ملی تھی اس سے۔ پہلی ملاقات تو بڑی سرسری سی تھی لامعہ کی کی تقریب میں۔ جب کہ دوسری ملاقات۔۔۔ اور کتنی لالینی باتیں کرتا تھا وہ۔ کیسے لہجوں میں بولتا تھا وہ۔

جیسے وہ سب موسم، سب رنگ، سبھی ساز اپنے سنگ باندھ سکتا ہو۔

کتنا عجیب تھا وہ۔ اس کی تو باتیں ہی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔

کیسی مخنی گفتگو کرتا تھا وہ۔ کیسا عجیب دیوانہ لہجہ تھا اس کا۔

شاید یہی فطرت تھی اس کی۔ یہی مزاج تھا اس کا۔

مگر وہ کس قدر حیران تھی۔

اس کے تیور، اس کے انداز اسے بھلائے نہ بھول رہے تھے۔ عجب گہیر تھا سب کچھ۔ اس کے انداز، سبھی تیور۔ شاید یہی مزاج تھا اس کا۔

کتنا مختصر سا تجربہ تھا اس کا۔ ایسے بھی یقیناً لوگ ہوتے ہوں گے۔ پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف جانے والے۔ چھیڑ چھاڑ کرنے والے۔ اور یوں بھی اس کا تعلق تو اس شخص کے لئے کچھ دلچسپی کا باء بھی تھا۔ لامعہ کی بیٹھ فریڈ تھی وہ۔ شاید وہ اسی باعث اسے چھیڑ رہا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے خود کو کسی قدر مطمئن کرنا چاہا تھا۔ مگر ایک لمحے میں جادوئی قلعوں سی لگا ہیں اس کے سامنے آگئی تھیں۔

کیمپس سے آنے کے بعد، ایک لمبی نیند لینے کے بعد وہ جاگئی تھی تو اٹھ کر فریش ہو کر دادا ابا کے پاس آن بیٹھی تھی۔ یہاں آنے سے قبل اس نے کچن میں سر ڈال کر اندر جھانکا تھا۔ کباب اور پکوڑے۔ چائے کی بڑی زبردست خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ماہوش ملازم کے ساتھ مصروف تھیں۔ وہ ہولے سے مسکرتھی۔

”ماما! میری ضرورت تو نہیں؟“

وہ پلٹ کر جواباً مسکرائی تھیں۔

”ہاں ہے نا۔۔۔ کھانے کے لئے۔“

وہ ہنس دی تھی۔

”اوکے۔۔۔ اس میں، میں آپ کی ہیلپ ضرور کر سکتی ہوں۔ مگر پلیز! اگر ساتھ میں گرم گرم چائے بھی ہوتی۔“

ماہوش مسکرائی تھیں اور سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”تم ابا کے پاس جا کر بیٹھو۔۔۔ میں آ رہی ہوں۔“

”اوکے۔۔۔ مگر ذرا جلدی۔“ وہ ایک پکوڑا اٹھا کر منہ میں رکھتی ہوئی دادا ابا کی طرف آگئی تھی۔ بریگیڈیئر اعظم رحمان شاہ ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی اپنی پوتی اور بہو کے ساتھ گزار رہے تھے۔ ایسے میں ان کے پاس بہترین مصروفیت جیس کھیلنا تھا اور وہ ان کے ساتھ بہت اچھا جیس کھیلتی تھی۔ بہت چھوٹی سی تھی جب بابا ایک حادثے میں گزر گئے تھے۔ اس نے اپنے ارد گرد ہمیشہ دو مخلص ہستیوں کو پایا تھا جنہیں خود سے بڑھ کر اس کا خیال تھا۔

ماما انیسویں ڈیزائزر تھیں۔ کسی قدر مصروف رہتی تھیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس کے معاملے میں انہوں نے کوئی کوتاہی برتی ہو۔ ایک چھوٹا سا گھر انہوں نے جو مہنتوں سے بندھا تھا اور وہ اس میں خوش تھی۔ وہ خوشیوں کی قدر کرنا جانتی تھی۔ کیونکہ سمجھتی تھی کہ یہ بہت مشکل سے ملنے والے خزانے ہیں۔ ابھی بھی وہ ماما اور دادا جی کے ساتھ چائے کے ساتھ می کے مختلف قسم کے لوازمات سے مکمل طور پر انصاف کرتے ہوئے مختلف چیکے بنا رہی تھی۔ اسی وقت ہی لامعہ کا فون آ گیا تھا۔

”تم کیمپس نہیں گئیں آج؟“

”گئی تھی۔۔۔ اور میں ابھی جانتی ہوں کہ تم آج کیمپس نہیں آئی تھیں۔“ انا بیہ شاہ مسکرائی تھی۔ ”ابنی دین، اب کیسے مزاج ہیں جناب کے؟“

”ارے امیڑنگ۔ تم نے تو کچھ زیادہ ہی ٹھکانے لگا دیا موصوف کو۔ خاصے سدھرے لگ رہے تھے رات کو۔“ لامعہ جواباً بولی تھی۔

”موصوف۔۔۔ کس کی بات کر رہی ہو تم؟“ انا بیہ شاہ قدرے چوکی تھی۔

”عفتان علی خان کی۔“ لامعہ مگن سی مسکرائی تھی۔

”میں تمہاری بابت دریافت کر رہی تھی۔“ انا بیہ نے مسکراتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔ ”اوکے۔۔۔“ لامعہ یکدم ہنس دی تھی۔ ”ہاں، میں بھی ٹھیک ہوں۔ مگر وہ عفتان علی خان کچھ زیادہ ہی ٹھیک ہو گیا ہے۔ ایک دم بی با بچہ بن گیا ہے۔ کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا تمہارا نام لے کر۔ لیکن ایسا کیا کہہ دیا تم نے اسے؟“

انا بیہ شاہ قدرے حیران رہ گئی تھی۔ سماعتوں میں یکدم ہی کسی کی مدہم سرگوشیاں گونجنے لگی تھیں۔ کوئی جادو چارو پھیلنے لگا تھا۔

اس کی آنکھیں بتاؤں کیسی ہیں

جھیل سیف الملوک جیسی ہیں

ابھی ابھی اس کا دھیان آیا تھا۔ یا پھر وہ کوئی شے تھی، اور وہ اسے سیٹ پر رکھ کر بھول گیا تھا۔

”تم..... تم نہیں اترو گی؟“ کسی قدر سراسیمگی سے وہ بولا تھا اور تب میرب سیال نے بہت ہولے سے حرکت کی تھی اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تھی۔ ماربل کے چکنے فرش پر اپنے بھاری مضبوط قدم اٹھاتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا تھا۔ وہ بہ مشکل اس کے ساتھ چل پاری تھی۔ اس کے قدم مخصوص مقام کی جانب اٹھ رہے تھے۔ کتنے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا خود میں مگن وہ چلتا جا رہا تھا۔ میرب سیال کچھ نہ سمجھتی ہوئی فقط اس کے حکم پر سر تسلیم خم کرتی ہوئی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ آنکھیں بند کر کے اس کے کہے پر عمل کر رہی تھی۔

”گر یہ کیا؟۔۔۔ یہ کہاں لے آیا تھا بکنگٹین حیدر لغاری اُسے؟ کتنا ہجوم تھا وہاں۔ کتنے جسم تھرک رہے تھے بلند و بانگ میوزک پر۔ کتنی الگ دنیا تھی یہ۔ وہ ساکت نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کتنے دلربا پیکر تھے جو بکنگٹین حیدر لغاری کی سمت بڑھ رہے تھے اور وہ کسی درجہ بولڈنیس کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ وہ وہیں کونے میں رک گئی تھی۔ وہ گھر سے ساتھ چلے تھے۔ گاڑی میں تا دیر ہمسفر رہے تھے مگر اس مقام پر آ کر ان کی راہیں جدا جدا تھیں۔

کیسے ہم سفر تھے یہ؟۔۔۔ کیا سفر تھا یہ؟

کہاں راہیں مڑتی تھیں؟۔۔۔ کہاں قدم پڑنے تھے؟ کچھ خبر نہ تھی۔ وہ بس ساکت سی اسی کونے میں کھڑی تھی۔

تو حقیقت یہ تھی، بکنگٹین حیدر لغاری کی حقیقت کچھ اور تھی۔

اس کا روپ بہ روپ کچھ اور تھا۔

وہ اس گھڑی کسی پری رنخ کے کس قدر قریب تھا۔ کتنی سرشاری تھی لڑکی کے چہرے پر۔ جیسے وہ اس شخص کی بانہوں میں خود کو دنیا کی خوش نصیب ترین لڑکی محسوس کر رہی تھی۔ اور بکنگٹین حیدر لغاری.....

وہ یکدم آنکھیں میچ کر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ جانے کیسے ایک لمحے میں ہی اس کے اندر ایک لوفان اٹھا تھا۔ آنکھوں میں مرجھیں سی چھینے لگی تھیں۔

تو یہ تھا اس کے لئے کیا گیا انتخاب!

وہ جو اس لمحے انتہائی بے باکی سے کسی اور کی بانہوں میں تھا۔ کسی اور کے قریب تھا۔ وہ جو زندگی میں کسی شراکت کے باوجود اس کے سامنے اس کے حصے کے لمحے کسی اور کو سونپ رہا تھا، کس قدر دیدہ دلیری سے اس کے سامنے۔

آنکھوں میں کتنے سمندر ٹھانٹیں مارنے لگے تھے۔ مگر وہ تمام نبی پلکیں جھپک جھپک کر کہیں اندر ہی مدغم کرنے لگی تھی۔ قریب سے ویٹر گزرا تھا، اسے ڈرنک کی پیشکش کی تھی مگر اس نے سرنفی میں ہلا دیا تھا۔ کتنے بد مزہ مانے کے پروردہ لوگ تھے سب۔ کتنے ماڈرن لمبوسات۔ اور وہ ایسے میں اپنے شانے کے گرد پھیلا نینوں کا سفید دوپٹہ بلا ارادہ ہی ہاتھ بڑھا کر ٹھیک کرنے لگی تھی۔ اتنے لوگوں میں اس کی نگاہ فقط اس ایک شخص پر اٹھی تھی۔ جو اسے اپنے ساتھ نہ چاہتے ہوئے بھی لے آیا تھا۔ سارا غصہ اسی بات پر آ رہا تھا۔ وہ

میں نہ آیا تھا کہ کیا کرے۔ اس کی مرضی کو اس تمام عرصے میں قطعاً کوئی دخل نہیں رہا تھا۔ اگر اسے اذیت جاتا تو یقیناً وہ ایسے کسی مرحلے سے گزرنے کو تیار نہ ہوتی مگر سارا افسوس اسی بات کا تھا کہ اسے استعمال کرنے کو نہ دیا گیا تھا۔ فقط مسلط کیا گیا تھا اس پر، اپنا حکم نامہ، اپنی مرضی۔ اور ایسے میں ذات کہیں دب کر رہ گئی تھی۔ اور اب آئندہ کی صورت حال میں جیسے مزید دقتی جا رہی تھی۔ اس شخص سنگت میں اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے اسے ماننا پڑا تھا کہ اس نے پایا بازو بارہ کا حکم مان کر اچھا نہیں خود اپنے ساتھ بہت برا کیا ہے اور اس پر مزید چپ سادہ کروہ مزید برا کرے گی۔ اپنی ذات کی نفی خود سے منکر کر دے گی۔ جس طرح اسے اور دیگر لوگ کر رہے تھے۔ وہ خود بھی ایک دن خود کو جھٹلائے کیونکہ بے معنی اور فضول شے کی ہر کوئی نفی کرتا ہے اور وہ خود کو ایک بے معنی اور فضول شے بنا رہی تھی۔

گاڑی میں سردار بکنگٹین حیدر لغاری کے پرسٹل سیل کی پیپ سے اس ساکت ماحول میں یکدم ہی ارتعاش ہوا تھا۔ وہ چونکتے ہوئے اس کی سمت تینے لگی تھی مگر بکنگٹین حیدر لغاری جانے کیوں کال کرنے میں تعرض برت رہا تھا۔ پیپ ہوتی چلی گئی تھی اور تب جیسے سردار بکنگٹین حیدر لغاری کے لئے کال کو ریسیو کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ بنا اس کی جانب دیکھے اس نے اپنا سیل فون کان سے لگایا تھا۔ دوسری جانب بولا تھا۔ خاموشی اتنی تھی کہ مدہم آواز اس سکوت کو توڑتی چلی گئی تھی۔

”تم ہو کہاں بکنگٹین حیدر! پچھلے ایک گھنٹے سے میں تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اور نا کہ۔۔۔ اچھا بتاؤ۔ اب آ رہے ہو کہ نہیں؟ دیکھو، بہت رنگ ہے یہاں۔ اب انکار مت کرنا۔ ورنہ تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔“ عجب محتاط تھا۔ بولنے والی کی آواز میں کتنی مٹھاس تھی۔ میرب سیال سننے کا قصد کرتے ہوئے بھی اس گناہ کی مرتکب ہو گئی تھی۔

بکنگٹین حیدر لغاری نے لمحہ بھر کو ایک ترچھی نگاہ اس پر کی تھی۔ وہ چہرے کا رخ پھیر کر دوسری سمت تینے لگی تھی۔ تبھی اس کی بھاری آواز نے اس کے گرد حصار باندھا تھا۔

”او کے۔۔۔ میں پہنچ رہا ہوں۔“ کہہ کر اس نے فون بند کیا تھا اور ڈیش بورڈ پر اچھا دیا انداز کس قدر جارحانہ تھا۔ کسی بات کا کوئی شدید رد عمل تھا یہ۔ مگر کیا، وہ جان نہ پائی تھی۔ مگر اس گھڑی کے اندر کوئی انتشار تھا اور وہ اس بات کو ضرور سمجھ رہی تھی۔ بکنگٹین حیدر لغاری نے گاڑی کا رخ یکدم بدلا تھا اور گاڑی کو کسی مخصوص سمت پر ڈال دیا تھا۔ انداز کسی قدر جارحانہ تھا۔ جیسے وہ سب کچھ جس نہر دینا چاہتا ہو بل بھر میں۔ ڈرائیونگ بھی کسی قدر ریش تھی۔ اس کا یہ رد عمل میرب سیال کی سمجھ سے باہر تھا۔ مگر وہ اسے دیکھ بغور رہی تھی۔ اس کی پرواہ کئے بغیر کہ وہ اسے قطعاً نہیں دیکھ رہا۔ اس کا ہونا، نہ اس کے لئے بے معنی ہے۔

کسی قدر اُلجھن کا شکار، اپنے دائیں بازو کو کھڑکی پر ٹکائے دوسرے ہاتھ سے ڈرائیونگ کرتا ہوا وہ اس کے لئے مکمل طور پر ایک گھبراتا تھا۔ انتہائی تیز رفتاری جیسے کوئی احتجاج تھا۔ مگر وہ کیا سمجھتی۔ ذہن تو بے مفلوج ہو رہا تھا اس گھڑی۔ چونکہ تو وہ تب تھی جب گاڑی ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے رکھی تھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اترتے ہوئے یکدم ہی چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا جیسے ا

اس پر اس کی مرضی کے خلاف مسلط کر دی گئی تھی۔ اس کے سر تھوپ دی گئی تھی۔

وہ ایک ان چاہا وجود، ایک ان چاہا ہم سفر۔

زبردستی کا سودا۔ سراسر زبردستی۔

داہنے ہاتھ میں ڈرک تھامے باباں ہاتھ اس مرمر میں کمر کے گرد حائل کئے وہ اس گھڑی مکمل طور سرور تھا۔ نہ تو اسے یہاں لاکر وہ اسے اب باور ہی تھی اور نہ ہی وہ اسے یاد رکھنا چاہتا تھا۔ ایک مسلا گئی ہستی تھی وہ اس پر۔ ایسا رویہ روار کھنا تو واجب تھا اس پر۔

وہ آنکھوں کی ساری نمی اپنے اندر اتارتی ہوئی جیسے اس گھڑی وہاں ٹھہرے رہنے پر پابند تھی۔ متحرک ماحول میں تھرکتے وجودوں کے بیچ، ایک جدید ماڈرن دور کی پارٹی میں وہ مکمل طور پر مشرق تصویر بنی کھڑی ایک بھونڈا مذاق لگ رہی تھی۔

اپنی نفی کا لیے جو اس کے لئے ایک عظیم تجربہ تھا۔

انتہائی مختصر لباس میں جدید تہذیب کی نمائندہ اس لڑکی کی نگاہ یکدم اس پر پڑی تھی اور وہ اک ادا ساتھ سبکدوش حیدر لغاری کے کان کے قریب اپنے اناڑی ہونٹ لے جا کر کوئی سرگوشی کرنے لگی تھی۔ سبکدوش حیدر لغاری نے اسے ایک نظر دیکھا تھا مگر وہ نگاہ بڑی سرسری اور کبھی قدر اکتائی ہوئی تھی۔ دوسرے ہی پل وہ اس کی جانب سے رخ پھیر کر اس نازک وجود کی کمر کے گرد بازو حائل کر کے دھیسے دھیسے کرنے لگا تھا۔ وہ نگاہ جھکائے بغیر ساکت سی اس سمت تکتی چلی گئی تھی۔ کتنے وجود اس کے دلر با پیکر کو دیکھتے ہوئے اسے تنہا کھڑا دیکھ کر اس کی سمت بڑھے تھے مگر اس نے سرنئی میں ہلا دیا تھا اور بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ سر جھکا کر اپنے اس ہم سفر کا انتظار کرنے لگی تھی۔

یہ تھا اس کا ہم سفر!

اس کا جیون ساتھی۔

جس کے ہاتھ اس کی ڈور تھی۔

جس کے سنگ اسے قدم قدم چلانا تھا۔

یہ تھا وہ شخص، جس کے نام اس نے اپنی تمام عمر لکھ دی تھی، اپنے سارے خواب لکھ دیئے تھے، ا

سارے دن، اپنی ساری راتیں لکھ دی تھیں۔ یہ تھا وہ شریک سفر جس کی منزلوں کا جنوں کچھ اور تھا۔

وہ جس کا شوق سفر کسی اور رنگ میں رنگا تھا۔

وہ جسے نئی نئی منزلوں کا شوق تھا۔

وہ جسے ایک جگہ ٹھہرے رہنے سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔

کتنے لمحے گزر گئے تھے۔ وہ سر جھکائے کھڑی رہی تھی۔ بالکل ایک اچھی بچی کی طرح اس نقطے پر کھڑی تھی جہاں سردار سبکدوش حیدر لغاری اسے کھڑا کر گیا تھا۔ وہ سر اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ آج اسے سر جھکا لینے کی عادت اپنانا تھی۔ کیونکہ ایسا اس کے لئے اس کے بڑوں نے سوچا تھا۔ یہ حکم اس نامے میں شامل تھا۔ جو فیصلہ اس پر صادر کیا گیا، اس میں درج تھا اور وہ انحراف کیسے کرتی؟

کتنی دیر گزری تھی۔ سارا وجود شل ہونے کو تھا جب قدموں کی آہٹ اس کے قریب آ کر تھی تھی۔ کوئی اس کے قریب آ کر رکھا تھا۔ اس نے اپنا سر اٹھایا تھا۔ سردار سبکدوش حیدر لغاری اس کے عین سامنے کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا تھا مگر وہ دوسرے ہی لمحے نگاہ پھیر گیا تھا۔ تھپی ڈاننگ فلور سے وہی لڑکی تقریباً بھاگتی ہوئی اس کی سمت لپکی تھی۔

”سبکدوش!“ قدرے قریب آنے پر اس نے پکارنے کے ساتھ ہی اپنی بانہیں بھی اس کے گرد حائل کر دی تھیں۔ وہ اب کے درمیان میں سے خود کو ہٹانہ سکتی تھی۔

”سبکدوش! اپنا وعدہ یاد نہیں ہے شاید تم کو جو تہا واپس پلٹ رہے ہو۔“ ایک ادا سے مسکراتے ہوئے وہ بولی تھی۔

سردار سبکدوش حیدر لغاری ہولے سے مسکرا دیا تھا۔

”آج نہیں۔۔۔ پھر کبھی۔“ قدرے مدہم لہجے میں کہہ کر اسے ٹالا تھا۔

”اور تم جو پھر بھول گئے تو؟“ عجیب انداز سے وہ اٹھلائی تھی۔ میرب سیال کی پرسنالٹی اس گھڑی جیسے

اپنے وجود کا احساس کھو بیٹھی تھی۔ اس کا ہونا نہ ہونا بے معنی تھا جیسے۔

”تم یاد دلا دینا۔“ وہ دھیسے سے مسکرایا تھا اور وہ اک ادا سے تھکلا کراہنس دی تھی۔

”آج کوئی اور..... ہاں.....“ اک انداز دلربائی سے نگاہ کا زاویہ پھیر کر اسے دیکھا گیا تھا۔

جو اب سردار سبکدوش حیدر لغاری نے بھی میرب سیال پر اک نگاہ کی تھی۔ پھر دوسرے ہی پل وہ نگاہ پھیر کر گویا

ہوا تھا۔

”پارٹی ادھوری چھوڑ کر جا رہا ہوں۔۔۔ مگر جانا ضروری ہے۔“

”اوکے۔“ دونوں میں اختتامی کلمات کے ساتھ پھٹڑے سے کچھ ضروری امور بھی انجام پائے تھے۔

میرب سیال نگاہ پھیر گئی تھی۔ ساتھ ہی رخ بھی پھیر لیا تھا۔ چند ٹائپوں بعد سردار سبکدوش حیدر لغاری بھی

پلٹ کر اس کے ساتھ ہولیا تھا۔

”چلو۔۔۔“ عجب سپاٹ لہجے میں کہا گیا تھا اور وہ تو حکم کی منتظر تھی جیسے۔ ایک لمحے میں قدم

اٹھانے لگی تھی۔ مگر قدموں کی رفتار بہت سست اور تھکی ماندی سی تھی۔ جیسے وہ برسوں کی تھکن اپنے ساتھ لے

کر چل رہی ہو۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے اپنے تھکے ماندے وجود کو کسی حد تک ریلیکس کرنے کی غرض سے سیٹ کی

پشت سے سر نکایا تھا اور آنکھیں موند لی تھیں۔

دھاگے کی ڈور ایک بار الٹھ جائے تو پھر وہ الجھتی چلی جاتی ہے۔ رشتوں کی حقیقت بھی بالکل ویسی ہے۔ ایک بار ڈور الٹھ جائے تو پھر لاکھ ڈھونڈتے رہو، سرائیں ملتا۔ فارغہ بھی اپنے گھر، اپنے رشتوں کی ڈور اسی مانند، اسی بیچ پر دیکھ چکی تھی۔ جہاں کوئی سرا اس کے ہاتھ نہ تھا اور پیچیدگیاں تھیں کہ بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔

اپنے طور پر اس نے بہت احتیاط سے اذہان حسن بخاری کو سمجھانا چاہا تھا۔ مگر رشتوں کے درمیان بہت وسیع ہو گئی تھی۔ اتنی کہ وقت نے سارے نقش اتنی تفاوت پر لا کھڑے کئے تھے کہ چہروں کے عکس تاثر کھو بیٹھے تھے۔

”مئی! آپ اب بھی ان کی بات مانتی ہیں۔ ان کی طرف داری کر رہی ہیں۔“ وہ کسی قدر خفگی سے اٹھا کر انہیں دیکھنے لگا تھا اور وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔

”مئی! جانتی ہیں جو انہوں نے کیا، اس کا کوئی ازالہ نہیں ہے۔“

”اور جو تم کر رہے ہو اس کا بھی تو کوئی سبب نہیں ہے۔ مانا جو کچھ ہوا، غلط ہوا مگر.....“ وہ قطعاً اس میں ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے قدرے تحمل سے گویا ہوئی تھیں۔

”دیکھو اذہان! یہ میری اور تمہارے پاپا کا کئی معاملہ ہے۔ میں نہیں چاہتی تم اس میں کوئی مداخلت کرو۔ ان کی مزید مخالفت مول لو۔“

”مئی!“ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔ نظروں میں بہت رنج تھا۔ ”آپ خود کو مجھ سے الگ رہی ہیں؟“

”نہیں، میں تمہیں صحیح اور غلط کا فرق سمجھا رہی ہوں۔“ وہ کسی قدر متانت سے گویا ہوئی تھیں۔ وہ جھکائے کسی قدر مضحل نظر آ رہا تھا۔ فارحہ نے بیٹے کو اس کیفیت میں دیکھا تھا، پھر بہت ہولے سے اس کے مضبوط ہاتھ پر ہاتھ دھر دیا تھا۔

”دیکھو بیٹا! تمہاری عمر بڑی جذباتیت والی ہے۔ اور صورت حال کو ہمیشہ عقل سے جانچا جاتا ہے۔ تمہارا رد عمل ہے وہ اپنی جگہ، میں جانتی ہوں تم اپنی ماں سے، مجھ سے بہت محبت کرتے ہو۔ لیکن بیٹا تمہاری ماں بھی بہت محبت کرتی ہے تم سے۔“ مدہم لہجے میں کہتے ہوئے اس لمحے آنکھوں میں کتنے سنبھلے آن پھڑکے تھے۔ اذہان سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”ہاں اذہان! مجھے تمہاری فکر ہے۔ تمہارے اچھے مستقبل کی فکر ہے۔ مانا تمہاری ماں کے ساتھ نا انصافی ہوئی ہے، تمہاری بہن کو زک پہنچی ہے۔ مگر اذہان بیٹا! مسئلے کا یہ حل نہیں ہے کہ تم اپنے حق سے دستبردار ہو جاؤ۔ میں اپنے کسی بھی قول و فعل سے تمہیں تمہارے باپ کے خلاف اکسانا نہیں چاہتی۔ باپ اپنے بچے کے لئے اچھا سوچتا ہے، اچھا چاہتا ہے۔ سعد بخاری کو بھی بہت فکر ہے تمہاری۔ بہت پیار کرتا ہے تم سے۔ تمہارے مستقبل کو تاریک دیکھنا نہیں چاہتا۔“ کتنے بہت سے آنسو رخساروں پر بہہ نکلے تھے۔ اذہان حسن بخاری ماں کو بخور سکتا چلا گیا تھا۔

”اپنی ماں پر بھروسہ ہے نا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہارے لئے کوئی غلط فیصلہ لے سکتی ہے؟“ اس کے چہرے کو ہاتھوں سے تمام کر دریافت کیا تھا مگر وہ بہت ہولے ہولے سرنفی میں ہلانے لگا تھا۔

”آپ بے جا طرف داری کر رہی ہیں ان کی۔ بے جا حمایت کر رہی ہیں۔ انہیں میرے مستقبل زیادہ اپنی شاہ گروپ آف کمپنیز کی فکر ہو رہی ہے۔ زمانے کی فکر متا رہی ہے۔ وہ لوگوں کی انگلیوں۔ خوفزدہ ہو رہے ہیں جو ان کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ اس شکست سے ڈر لگ رہا ہے جو انہیں مستقبل میں۔“

والی ہے۔“ دھیمے لہجے میں وہ بولا تھا اور فارحہ ساکت نظروں سے اسے تنگنے لگی تھیں۔

”تو کیا تنہا کر دینا چاہتے ہو تم انہیں؟ بدلا لینا چاہتے ہو ان سے؟ ساری نا انصافیوں کا حساب لینا چاہتے ہو؟“ ان کے مدہم لہجے میں کتنے خوف بول رہے تھے۔ اذہان حسن بخاری کچھ نہیں بولا تھا۔

”نہیں اذہان! میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔ کبھی بھی نہیں۔ تمہیں کل ہی سے شاہ گروپ آف کمپنیز میں بطور ایم ڈی اپنی ذمے داریاں سنبھالنا ہیں۔“ ان کا لہجہ ٹھوس تھا۔

”لیکن مئی.....“ اس نے کچھ کہنے کو لب کھولے تھے مگر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کچھ بولنے سے باز رکھا تھا۔

”یہ تمہاری ماں کا حکم ہے۔“ قطعاً لہجے میں وہ بولی تھیں اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ اذہان حسن بخاری، ماں کی سمت تکتا رہ گیا تھا۔

کتنی دیر اسی طرح ساکت بیٹھے گزر گئی تھی۔ پھر وہ ہونٹ کھینچے اٹھا تھا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔

تو پاپا اس طرح اپنا کام نکلا رہے تھے۔ مئی کو بھی اب ان کی فکر تھی۔ اب بھی ان کا حکم ان کے لئے معتبر تھا۔ اس کا ذہن سلگ اٹھا تھا۔

کتنی بھولی تھیں مئی جو ان کے پر پز کے لئے اپنے بیٹے کو امیدوار کر رہی تھیں۔ حالانکہ وہ جانتی تھیں ایسا کر کے وہ فقط سید سعد حسن شاہ بخاری کی ذات کو تقویت دے رہی تھیں۔

کتنی دیر وہ اپنے اندر انتشار لئے، بے سمت راستوں پر سفر کرتا رہا تھا۔ پھر بالآخر تھک کر عزیر کی طرف چلا آیا تھا۔ وہاں کوئی گیٹ نو گیدر چل رہی تھی۔

”آئی ایم سوری، مجھے علم نہیں تھا۔“ وہ کسی قدر شرمندہ ہوا تھا۔

”کم آن یار! کوئی بڑی پارٹی نہیں ہے۔ زیر ہیمیا کے چھوٹے بیٹے نومی کی برتھ ڈے تھی۔ پھر ایگینے بھی آگئی تھیں، سو، سوچا کہ ایک گیٹ نو گیدر رینج کر لی جائے۔ اسی بہانے مل بیٹھنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ ٹوسنا، بڑا مضحل سا لگ رہا ہے، خیریت تو ہے؟ کہیں عشق و شوق تو نہیں کر بیٹھا کسی سے؟“ عزیر چھیڑ رہا تھا۔

وہ بہ مشکل مسکرایا تھا۔ ارادہ واپس پلٹنے کا تھا مگر فوری طور پر ایسا ناممکن ہی تھا۔ سو وہ چپ چاپ عزیر کے ساتھ آگے بڑھنے لگا تھا۔

”ایگینے کب آئیں؟“

”کل رات ہی، پورے پانچ برس بعد۔“ عزیر مسکرایا تھا۔ ”تمہیں یاد ہے ان کی شادی پر ہم نے کس قدر غل غپاڑا کیا تھا، کس قدر انجوائے کیا تھا۔ کل رات ہم ایگینے کی شادی کی مووی دیکھ رہے تھے۔ تمہارا بھنگڑا بڑا زبردست لگا۔ دیر تک ہنستے رہے، مخلوظ ہوتے رہے۔ سات برس پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ اس وقت کتنے بدھوتے ہم۔ انتہائی اسٹوپڈ۔ نہ کسی بات کا ہوش تھا نہ کسی

کام کی فکر۔“ عزیز مسکرا رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ چھوٹے ہونے کے سارے زمانے اچھے ہوتے ہیں۔ بے شعوری، بڑی بھلی ہے۔“ اذہان حسن بخاری بھی مسکرا دیا تھا۔

”اور اگینے کو کس قدر تنگ کیا تھا ہم نے۔ حالانکہ ہم دونوں اس وقت بھی ان سے بہت چھ تھے۔“ عزیز ان گئے دنوں کی بیٹھی یادوں کو دہرا رہا تھا اور اذہان حسن بخاری کا موڈ بھی کسی قدر ہلنے لگا۔

”ان کے شوہر نامدار کیسے ہیں؟۔۔۔ ساتھ آئے ہیں کیا وہ بھی؟“

”نہیں۔ وہ تو ساتھ نہیں آئے۔ مگر اگینے بتا رہی تھیں کچھ دنوں میں شاید وہ بھی آجائیں۔ بائے وے اگینے تمہیں بہت من کر رہی تھیں۔ ان کے خیال میں تو تم اب بھی وہی دبلے پتلے، کمزور و نحیف نو عمر لڑکے ہو۔ تمہیں دیکھیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔“

”جیسے تمہیں دیکھ کر ہوئی تھیں۔“ وہ یکدم مسکراتے ہوئے بولا تھا اور عزیز ہنس دیا تھا۔ سید اذہان حسن بخاری کا موڈ کچھ بدل گیا تھا۔

وہ اور عزیز بچپن کے دوست تھے۔ کالج تک ساتھ رہے تھے۔ اگینے عزیز کی بڑی بہن تھیں۔ جب کالج میں تھے تب ہی اگینے کی شادی طے ہو گئی تھی اور ان کے لئے وہ موقع بہت ایکساٹنگ تھا۔ اذہان حسن بخاری کے لئے تو یہ پہلا موقع تھا اور عزیز کے ساتھ مل کر اس نے بہت سی اوٹ پٹانگ حرکت کی تھیں جو اسے اب یاد بھی نہ تھیں۔ عزیز انہی باتوں کو سوچتے ہوئے اسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ عزیز کے ساتھ کھڑا تھا بھی اگینے وہاں آگئی تھیں۔

”پچھانے تو بھلا کون ہے یہ؟“ عزیز، اذہان کی سمت اشارہ کرتے ہوئے مسکرایا تھا۔ اگینے مرتقا آنکھوں میں کسی قدر حیرت بھر کر اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگی تھیں۔ مگر وہ باوجود کوشش کے ناکام رہے تھیں۔ اذہان حسن بخاری دلچسپی سے ان کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

”اذہان۔“ عزیز نے اگینے کی مشکل حل کی تھی۔ مگر ان کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

”اذہان؟۔۔۔ یو مین وہی اذہان؟“ وہ چونکی تھیں اور اس کے ساتھ ہی کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھیں۔ ”ویری اسٹریٹ۔۔۔ تم تو بہت بدل گئے ہو بھی۔ اور شاید کچھ بڑے بھی ہو گئے ہو۔“ مسکراتے ہوئے اس کے شانے پر بڑے پن سے ہاتھ دھرا تھا۔ اذہان حسن بخاری بغور تنکے لگا تھا۔ کھلکھلا کر ہنسنے کے باعث اگینے کی آنکھوں میں اس سے کئی جگنو جھللا رہے تھے۔

”کیسے ہو تم؟ اور کیا کر رہے ہو آج کل؟۔۔۔ سنا ہے بڑی پوسٹ سنبھالے بیٹھے ہو، ذمے داریاں نبھا رہے ہو۔“

”جی، وقت کے ساتھ ساتھ یہ ذمہ داریاں تو اٹھانا ہی پڑتی ہیں۔ آپ سنا ہیے، کیسی ہیں؟ بہت عرصے بعد نہیں لوٹیں؟“ اذہان نے جواباً دریافت کیا تھا اور اگینے ہولے سے مسکرا کر لب بھینچ گئی تھیں۔

”بس مصروفیت ہی اس قدر رہی۔ اپنی وے، تم انجوائے کرو۔“ وہ مسکراتے ہوئے یکدم ہی پلٹ گئی تھیں۔ اذہان حسن بخاری تا دیر اس سمت تنکٹا رہا تھا۔

”اگینے بدل نہیں گئیں کچھ؟“ مدھم لہجے میں وہ بولا تھا۔

”ہوں۔۔۔ اور ہم بھی تو کتنے بدل گئے ہیں۔ تم لندن سے پڑھ لکھ کر بزنس کی ڈگری لے آئے ہو۔ شاہ گروپ آف کمپنیز میں ہولڈنگ پوزیشن سنبھال چکے ہو۔ میں بھی اپنے حصے کی کامیابیاں سمیٹ چکا ہوں۔“

مگر اذہان سرنٹی میں ہلانے لگا تھا۔

”مگر اگینے نہیں بدلیں شاید۔“

”کیا مطلب؟“ عزیز چونکا تھا۔

”مطلب یہ کہ اگینے اتنا نہیں بدلیں جتنا ہم بدل گئے ہیں۔ اگینے نے اپنے معاملے میں وقت کو روک لیا ہے۔ ان کے چہرے پر آج بھی اتنی ہی شادابی ہے مگر فطرتاً وہ کچھ بدل گئی ہیں۔ پہلے وہ خاصی سنجیدہ سی ہوا کرتی تھیں اور اب۔۔۔۔۔۔“

”ظاہر سی بات ہے یار! خوش ہیں وہ۔ نیو یارک میں رہ رہی ہیں۔ روٹیل بھائی کس قدر خیال رکھتے ہوں گے ان کا۔“ عزیز نے جواب دیا تھا اور وہ مسکرا دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔“ اس کی نگاہ اگینے پر جا ٹھہری تھی۔ مسکراتی ہوئی اگینے کی طرف۔ اور کیسا شگفتہ سا تھا ان کا چہرہ۔ کتنی شادابی تھی ان کے چہرے پر اب بھی۔ وقت جیسے ان کے لئے واقعی تھم گیا تھا۔ کتنا پُرحسب کر دیا تھا وقت نے انہیں۔ کوئی انجانی سی کشش بھردی تھی اس میں۔ تبھی تو شاید اذہان حسن بخاری کی نگاہ بھی بلا ارادہ اس جانب اٹھ رہی تھی۔

وہ لامعہ کے ساتھ کیفے ٹیریا میں بیٹھی اسائنمنٹ براہم ڈسکشن کرتے ہوئے سوڈے کے سب لے رہی تھی جب یکدم سامنے اس کی نگاہ اٹھی تھی اور وہ چونک گئی تھی۔

عصفان علی خان بڑے پُر اعتماد قدموں سے چلتا ہوا ان کی سمت بڑھ رہا تھا۔ وہ مسکراتی تھی۔ پھر لامعہ کی جانب دیکھا تھا جس کی اس جانب پشت تھی۔

”لامعہ! عصفان علی خان۔“

”ہاں۔۔۔ ابھی کچھ دیر قبل فون آیا تھا ان کا۔ لیکن سراسر احسان الحق کی کلاس کے باعث کال مسڈ کال بن گئی۔“ لامعہ کا انداز پُرانسوس تھا۔

”ہاں۔۔۔ لیکن ابھی موصوف خود چلے آ رہے ہیں۔“ وہ مسکراتی تھی۔

”کیا؟“ وہ چونکی تھی۔ پھر پلٹ کر نگاہ کی تھی مگر تب تک عصفان علی خان سر پر پہنچ چکا تھا۔ وہ جو یکدم اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اس کے یہاں پہنچ جانے پر جربز ہو گئی تھی۔ وہ وہاں سے ہٹنا چاہ رہی تھی مگر اس کی آمد سے قبل۔ لیکن وہ شخص بھی ایک کانیاں تھا۔

”تم کہیں بھاگ رہی ہو؟“ لامعہ سے ہیلو ہانے کرنے کے بعد وہ بڑی بے تکلفی سے اس سے مخاطب ہوا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”کیسے ہیں آپ؟“

”پرفیکٹ۔ اور تم؟“

”پرفیکٹ ٹو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے شانے اچکائے تھے۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

”پھر تو بہت خوب جنے گی ہماری۔“ وہ حسب معمول شوخ تھا۔ اس نے لامعہ کی طرف دیکھا تھا بھی مسکرا ہی تھی۔ اس کے لب بھی ہولے سے پھیل گئے تھے۔

”بیٹھو نا تم بھی۔“ اسے بدستور کھڑے دیکھ کر کہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ مجھے کچھ کام ہے۔“ وہ وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔ تبھی سہولت سے کہتے ہوئے مسکراتی تھی۔

”انا بیہ شاہ! ہم کوئی خاص راز و نیاز نہیں کرنے والے۔ بیٹھو تم۔“ لامعہ نے اب کے ڈنچا تھا۔ اس دیکھا تھا۔ وہ شخص اسے بنور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت ہولے سے بیٹھ گئی۔

”میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ سو چاتم سے ملتا چلوں۔“ عفتان علی خان نے جواز دیا تھا۔

”اچھا کیا۔“ مجھے بھی بہت زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ اور کیشٹین کا اسٹف کھانے کا میرا کوئی موا تھا۔“ لامعہ جواباً مسکراتی تھی۔

”اسے کہتے ہیں دل سے دل کو راہ ہونا۔“ انا بیہ شاہ مسکراتی تھی اور جہاں لامعہ ہنسی تھی وہیں وہ شخا مسکراتے ہوئے اسے بنور دیکھنے لگا تھا۔

وہ مسکرا رہا تھا اور اسے ان آنکھوں کے رنگ آج بھی ویسے ہی لگے تھے۔ وہی لپکتی نظر، وہی وارڈنگ وہی دیوانہ پن۔

وہ یکدم ہی نگاہ پھیر گئی تھی۔

”لامعہ! تمہاری دوست کی آنکھوں کے رنگ بہت خوب صورت ہیں۔ اس سے قبل جانتی ہو میں۔ ایسی آنکھیں کہاں دیکھی تھیں؟“ عفتان علی خان بہت گن سا بول رہا تھا۔

”عفتان! تم میرے سامنے کسی اور کی تعریف کر رہے ہو؟“ لامعہ نے مصنوعی خنگی سے اسے گھورا تھا مگر وہ اسی قدر دلچسپی سے مسکرا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ مگر ان آنکھوں نے مجھے شربت گلا کی یاد دلا دی ہے۔“

”شربت گلا؟ ہو ارش؟“ لامعہ نے گھورا تھا۔ مگر وہ ہنس دیا تھا اور بنور انا بیہ شاہ کی سمت نکتے لگا تھا۔

”شاید تم نہیں جانتی۔ ایک افغانی خاتون تھیں۔ سیون ٹیز میں جب مہاجرین کا ایک غول بائیکریٹ کم کے پاکستان آیا تھا، بھی اس نے بھی سرحدوں پر لگنے والے ایک کیپ میں قیام کیا تھا۔ وہیں کسی انگریز فری لانس فوٹو گرافر نے اس کی آنکھوں کو، اس کے چہرے سمیت کلچر کیا تھا۔ اس کی آنکھیں بے جا خوبصورت تھیں۔ وہاں سے وہ شبیہ نکل کر دنیا بھر میں پھیل گئی۔ مختلف رسائل کی فرنٹ پر اسے جگہ ملی۔

قالینوں، غالیچوں پر اسے نقش کیا گیا۔ بی لیومی، آج اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی آنکھوں کا ریسرچ کی جا رہی ہے۔ امریکن یونیورسٹیز میں ان آنکھوں کے رنگوں پر اور ان آنکھوں سے نکلنے

شاعروں پر ریسرچ کی جا رہی ہے مگر اب تک سب ناکام ہیں۔ سننے میں آیا ہے اس کی آنکھوں سے ست رنگی شعاعیں نکلتی ہیں جو دیکھنے والی نگاہ کو نہ صرف جکڑتی ہیں بلکہ اسے حیران بھی کر دیتی ہیں۔ ہے نا امیزنگ اسٹوری؟“ وہ ایک گہرے راز سے پردہ اٹھاتا ہوا مسکرا رہا تھا۔ تبھی لامعہ مسکراتے ہوئے بنور اس کی آنکھوں کو دیکھنے لگی تھی۔

”حیران کن۔ میں نے آج تک کیوں غور نہیں کیا؟“ انا بیہ شاہ موضوع گفتگو بننے پر کسی قدر الجھن کا شکار نظر آ رہی تھی۔

”آنکھیں تو واقعی خوب صورت ہیں تمہاری انا بیہ شاہ! پھر تو شربت گلا کی طرح تمہاری آنکھوں پر بھی ریسرچ ہونی چاہئے۔“ لامعہ مسکراتے ہوئے اسے چھیڑ رہی تھی۔

وہ جیسے اس لمحے زبردستی مسکرائی تھی اور مکمل خود اعتمادی کے ساتھ عفتان علی خان کی سمت نکتے لگی تھی۔

”آپ کی تاج تو خاصی کمال کی ہے۔ میں تو سمجھی تھی آپ فقط تاج ہی بنا سکتے ہیں۔“

”جو شخص جدید دور کی شربت گلا کو کھوج سکتا ہے وہ یقیناً بہت کچھ اور بھی کر سکتا ہے۔“ وہ بہت مضبوط لہجے میں کہتا ہوا مسکرایا تھا۔ انداز ٹھوس اور مدلل تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت سی رہ گئی تھی۔

”اٹھو اب فوراً۔۔۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ لامعہ یکدم بولی تھی۔ ساتھ ہی انا بیہ کی سمت دیکھا تھا۔

”تم بھی چلو۔ اس روز بھی تم نے ٹال دیا تھا۔“ انا بیہ شاہ نے سامنے بیٹھے شخص پر اک نظر کی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے وہ نظریں اک آس سے اسے دیکھ رہی ہوں۔ شاید پھر کوئی وہم۔ پھر کوئی گمان۔

مگر وہ نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔

”نہیں۔۔۔ مجھے لائبریری میں کچھ کام ہے۔“ سہولت سے منع کرنے کے ساتھ ہی وہ مسکرائی تھی۔

”ایکسکیوز می۔“ ان کے اٹھنے سے قبل ہی وہ اٹھی تھی اور چلتی ہوئی کیفے ٹیریا سے نکلتی چلی گئی تھی اور اسے جانے کیوں لگا تھا کہ کوئی نظر اس کا تعاقب کر رہی ہو۔ بنور اسے دیکھ رہی ہو، جانچ رہی ہو۔ وہم تو نہ تھا شاید مگر یقین کرنے کو وہ پلٹ کر دیکھ بھی قطعاً نہ سکتی تھی۔

شربت گلا، ہی آنکھیں۔

”جانتی ہو میں نے ایسی آنکھیں کہاں دیکھی تھیں؟“ اک گن سا لہجہ۔ مگر وہ ہر تاثر کو جھٹکنے لگی تھی۔ پھر کبھی کبھ نہ سوچنے کے لئے۔



اس دن کے بعد سے اس نے جتنی بار بھی اس واقعے کے متعلق سوچا تھا اسے وہ اک خواب لگا تھا۔ بھیا تک ترین خواب۔ مگر ایسا ہرگز نہیں تھا۔ وہ کچھ سوچ کر خود کو بہلانے لگتی تھی۔ کوئی دلاسہ دے کر خود کو سہے وجہ مطمئن نہیں کر سکتی تھی کوئی تسلی دل کے لئے نہیں تھی۔ کیونکہ جو نظر نے دیکھا تھا وہ کوئی خواب نہ تھا، حقیقت تھی۔ اٹل سچائی۔ اور وہ چاہتی بھی تو نہ تھی ہٹا سکتی تھی نہ ہی اسے فراموش کر سکتی تھی۔ کتنی سوئیاں

سارے بدن میں چھ رہی تھیں۔ کسی سزا کی مستحق ٹھہری تھی وہ۔

وہ تو کسی اور دنیا کا شخص تھا۔ اس کے رنگ ڈھنگ تو کچھ اور تھے۔ وہ تو کچھ اور طرح کے خواب دیکھا تھا۔ کتنی شاہانہ تھی اس کی طبیعت۔

اور وہ تو عام زمانوں میں بسنے والی، عام سی لڑکی تھی۔ عام سے خواب رکھنے والی۔ کتنا بے جوڑ میل وہ ان کا۔۔۔ کتنا غلط فیصلہ تھا وقت کا۔

کتنی دیر تک وہ اپنی قسمت پر ماتم کرتی رہی تھی۔ بے آواز آنسو بہاتی رہی تھی۔ کل رات پاپا سے بات ہوئی تھی۔ وہ اس کی بابت پریشان ہو رہے تھے۔ اس نے کسی طرح کا کوئی تاثر انہیں نہیں دیا تھا۔ یہی ظاہر کیا تھا کہ سب ٹھیک ہے۔ ان کی بابت بے حد پریشان تھی وہ۔ اتنی تقادوتوں پر وہ پہلے ہی بے حوصلہ ہو رہے تھے۔ ان کی آواز کی کمی کو وہ دل سے محسوس کر رہی تھی۔

”پاپا! آپ رورہے ہیں نا؟“ کہتے ہوئے اس کی خود کی آواز بھرا گئی تھی۔
”نہیں بیٹا! مگر تم اپنا خیال رکھو۔“

”جی۔۔۔ مگر آپ کو اجنبی کیسری کی ضرورت زیادہ ہے پاپا! اور میرب کو آپ کی بہت فکر ہے۔۔۔ نہ چاہنے کے باوجود اس کی پگلیں بھگتی چلی گئی تھیں۔

”نئی رپورٹس آئیں پاپا؟“ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑ کر یکدم دریافت کیا تھا۔
”ہوں، ہاں۔۔۔ آگئی ہیں۔“ وہ چونکے تھے۔

”کیا کہتے ہیں ڈاکٹرز پاپا؟“

”ایوری تھنگ از فائن بیٹا!“ وہ مسکرائے تھے۔

”پاپا!“ وہ خود پر اختیار نہ رکھ سکی تھی۔

”میرب!“ اتنے فاصلوں پر پاپا نے جیسے اسے تنبیہ کی تھی مگر بہت سے آنسو چپ چاپ رخساروں پر بہتے چلے گئے تھے۔

”ڈاکٹرز نے سرجری کے لئے کب کی ڈیٹ دی ہے پاپا؟“

”ابھی نہیں دی۔ مگر تم رونا نہیں میرب!“

وہ جانتی تھی اس کے اس طرح رونے سے پاپا کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ تبھی وہ آنکھیں رگڑتے ہوئے زوہاریہ اور فانی کے متعلق دریافت کرنے لگی تھی۔

”تم خوش ہونا بیٹا؟“ پاپا نے یکدم اس سے دریافت کیا تھا۔ وہ چونکی تھی۔ پاپا یقیناً اس سے اس نئے رشتے، اس نئے حوالے کی بابت دریافت کر رہے تھے۔ وہ سر اثبات میں ہلانے لگی تھی۔

”جی پاپا!“

”حمیرہ بیگم خیال رکھ رہی ہیں نا تمہارا؟۔۔۔ تمہیں وہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟“ وہ متفکر تھے۔

”نہیں پاپا! سب ٹھیک ہے۔“ اس نے پاپا کو مطمئن کیا تھا مگر خود اندر تک ایک بے اطمینانی پھیلنے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ چاہتے ہوئے بھی اس کے لئے یہ کڑوا گھونٹ پینا بے حد مشکل ہو رہا تھا۔

سیمپس جانا شروع کر دیا تھا مگر سیف الرحمن سے اس کے متعلق کوئی بات نہ کی تھی۔

”کیا بات ہے۔۔۔ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟“

”نہیں تو۔“ وہ زبردستی مسکرائی تھی اور سیف الرحمن بخور اس کا چہرہ تکتے لگا تھا۔

”میرب سیال! تمہاری یہ آنکھیں جھوٹ کہنے کے فن سے واقف نہیں ہیں۔ تم انہیں بچ بولنے سے باز رکھنے میں قطعاً ناکام ہو۔ بتاؤ کیا بات ہے؟“

”نہیں۔۔۔ کوئی بات نہیں ہے۔“

”منگنی سے خوش نہیں ہو؟“ اس نے پکڑا تھا۔

”یہی بات نہیں ہے۔“ اس نے اس کی سمت دیکھنے سے اجتناب برتنا تھا۔

”تو پھر؟“ وہ بھند تھا۔

”میری کلاس ہے سیف الرحمن!“

”جان چھڑا رہی ہو مجھ سے۔۔۔؟“ وہ مدلل لہجے میں بولا تھا اور وہ جو اب چپ سادھ کر اس کی جانب دیکھنے لگی تھی۔

”بہت پریشان ہونا۔ پھر کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کیوں نہیں کر رہی ہو؟“ وہ اک نگاہ میں اس کے اندر تک کو پڑھ گیا تھا۔ کتنے سمندر آن تھے اس کی آنکھوں میں۔ مگر وہ ان تمام پانیوں کو اپنے اندر کہیں ٹم کرنے کے جتن کرنے لگی تھی۔

”میرب! میں سننا چاہتا ہوں، کیا ہوا ہے تمہیں؟ اور کیا تم وہیں اپنے مگتیر کے گھر قیام پذیر ہو ابھی تک؟“

وہ سر جھکا گئی تھی۔ پھر ہولے سے بولی تھی۔

”ہوں۔۔۔ دراصل مجھے فقط منگنی کے لئے کہا گیا تھا مگر منگنی کی جگہ یکدم ہی نکاح کر دیا گیا۔۔۔۔۔۔ وہ اس کی سمت دیکھنے سے گریزاں تھی۔

”اور؟“ سیف الرحمن اسے بخور دیکھ رہا تھا۔

”اول۔۔۔ ہوں۔۔۔“ مگر وہ لٹی میں سر ہلانے لگی تھی۔

”میرب!“

اور اس کی آنکھوں کے کتنے بند اس دوستی سے بڑے لہجے پر ٹوٹے چلے گئے تھے۔ سیف الرحمن نے وقتاً بوقت اس سے دیکھا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھر دیا تھا۔

”میرب!“

”مجھے پاپا بہت یاد آ رہے ہیں سینی! مجھے سب اپنے بہت یاد آ رہے ہیں۔“ اس نے اپنے آنسوؤں کا انکڑا رسا جواز دیا تھا۔ سیف الرحمن اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ کچھ تھا۔ مگر فی الحال اس سے کہنا نہیں چاہ رہی تھی۔ سو اس نے بھی کریدنا مناسب خیال نہیں کیا تھا۔

میرب کچھ دیر تک سر جھکا کر بیٹھی رہی تھی۔ سینی نے اپنا رومال دیا تھا۔ اس نے چہرہ پونچھا تھا اور

”کوئی سردار سبکتگین حیدر لغاری صاحب بلاتا ہے تم کو۔ باہر گاڑی رکی ہے۔ وہ انتظار کر رہا ہے تمہارا۔“

”شاید لینے کے واسطے آیا ہے۔“

جہاں سیف الرحمن چونکا تھا، وہیں وہ بھی قدرے حیرت سے اس کی طرف تکتے لگی تھی۔

”لو۔۔۔ تم تو کہہ رہی تھیں انڈراستینڈنگ نہیں۔ یہاں تو کیسپس کے اوقات تک ازبر ہیں۔“ وہ

یکدم مسکرایا تھا۔ وہ فائل اور دیگر اشیاء سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

پارکنگ میں سردار سبکتگین حیدر لغاری کی سیاہ مرسدیز کھڑی تھی۔ مگر فرنیٹ سیٹ آل ریڈی کسی نازک

اندام حسینہ کے وجود سے پڑ تھی۔ وہ تھکے ماندے قدموں سے چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس چارکی تھی۔

کسی خاص حکم کی منتظر!

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے سیاہ سن گلاسز آنکھوں سے ہٹائے بغیر اسے دیکھا تھا۔

”بیٹھو۔“ حکم صادر ہوا تھا اور وہ چپ چاپ، بنا کوئی تعرض برتے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی

تھی۔ بہت سادھواں آنکھوں میں بھرنے لگا تھا۔

کیا پھر وہی اس رات والا منظر ری پیٹ ہونے جا رہا تھا؟

وہ سردار سبکتگین حیدر لغاری کی پشت کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ گاڑی کا ماحول اس گھڑی

بزار دانگ ہو رہا تھا۔ بڑی مدھر مہک پھیلی ہوئی تھی۔ دھیمی آواز میں بڑا سینٹی مینٹل سا ویسٹرن میوزک بج

رہا تھا۔ شاید بہت دھیمے سُر میں کوئی اک دو جے سے مخاطب بھی تھا۔ قصہ موضوع بحث تھا۔ کوئی

داستان خاص چھڑی ہوئی تھی مائین۔

منظر اس رات سے کچھ میل کھاتا ہوا تھا۔ مگر چہرہ آج نیا تھا۔ شاید سردار سبکتگین حیدر لغاری کو یکسانیت

پسند نہ تھی۔

شاید اس نگاہ کو نئے منظروں کی بڑی جستجو تھی۔

وہ ہونٹ بھینچے جانے کیوں ساکت سی اس سمت تکتی چلی گئی تھی۔ حالانکہ اس کا تو کوئی حق بھی نہیں تھا۔

حق تو شاید سوچنے سے ہوتا ہے، دینے سے ہوتا ہے۔

اور اسے ابھی تک ایسی کوئی یقین دہانی نہیں کرائی گئی تھی۔

کوئی اقرار نہیں سونپا گیا تھا۔

مگر اس کے باوجود وہ ٹھہری نگاہ بڑی ساکت سی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسی لمحے قدرے چوکتے ہوئے بیک مرر سے اسے دیکھا تھا مگر اپنی

چوڑی پکڑے جانے پر وہ قطعاً غلج نہیں ہوئی تھی۔ بس نگاہ پھیری تھی اور کھڑکی کے اس پار دیکھنے لگی تھی۔

اوڑتے بھاگتے منظر۔

اور ان کی طرف بے ساختہ لپکتی نگاہ۔

اس کی حقیقت بھی تو یہی تھی۔۔۔ سینٹی نے کہا تھا خوشیاں سو جو، خوشیاں غماش کرو، آنکھوں میں

خوابوں کو آنے کی جگہ دو۔۔۔ اور وہ کیسے پکڑتی ان بھاگتے دوڑتے منظروں کو؟۔۔۔ کسے تعاقب

چہرے کا رخ پھیر کر بولی تھی۔

”سینٹی! یہ چیخ زندگی میں بالکل اچانک آیا ہے۔ میں ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہیں تھی۔ میر

کبھی اپنے لئے کسی جیون ساتھی کا کوئی تصوراتی خاکہ بھی نہ بنایا تھا۔ عام لڑکیوں کی طرح کوئی پیکرا

تراشا تھا۔ مجھ سے یہ تبدیلی ہضم نہیں ہو رہی۔“

”میرب! کتنی لڑکیاں ہیں جن کی اسی طرح بیٹھے بٹھائے اچانک شادیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ تم

بھی خوش نصیب ہو۔ فقط نکاح کے بندھن میں بندھی ہو ابھی۔“ اس نے ماحول کی کشاف کو مسکرا کر

چاہا تھا۔ میرب بھی جیسے اس کا دل رکھنے کو مجبوراً مسکرائی تھی۔

”ہیں کیسے موصوف؟“ قدرے توقف سے اس نے دریافت کیا تھا۔ وہ بے طرح چوکتی تھی

اثبات میں سر ہلانے لگی تھی۔

”بہت اچھے ہیں۔“

”کس قدر انڈراستینڈنگ ہوئی؟“

”فقط تیس دن تو گزرے ہیں۔ اور اتنے دنوں میں کہاں انڈراستینڈنگ ہوتی ہے۔ اتنے تو

رہتے ہیں وہ۔ ملکوں ملکوں سفر رہتا ہے۔ بس ایک آدھ بار بات ہوئی ہے۔ وہ بھی سرسری سی۔“

”سرسری سی؟“ اس نے چھیڑا تھا۔ وہ ہنس دی تھی۔

”اب اریخ شادیوں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”تمہیں کیسے لگتے ہیں موصوف؟“

”پتہ نہیں۔۔۔ ابھی تو بغور دیکھا بھی نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرائی تھی، مسلسل۔

”میرب! تم اتنی دقیقہ نوسی خیالات کی حامل تو کبھی نہ تھیں۔ لیکن سنو، اچھا وقت ہے یہ۔ جب

کے یہاں قیام پذیر ہو۔ کوشش کرو اس کے مزاج کو سمجھ لو۔ ایک اچھی گھر داری میں یہ باتیں بڑی

ثابت ہوتی ہیں۔“

”اب تم مجھے گھر داری کے سنہرے اصول سمجھاؤ گے۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”مجبوری ہے۔۔۔ اس وقت کوئی بزرگ تمہارے قریب موجود نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے

تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ تبھی وہ گویا ہوا تھا۔

”یہاں سب کو کبھی کچھ نہیں ملتا میرب! لیکن کچھ ضرور مل جاتا ہے۔ سو جومل جائے اسے سنبھ

رکھو۔ عظیم جانو۔ یوں بھی خوشی کی ساری لالچک ہمارے اندر سے اٹھتی ہے۔ ہم سوچیں گے ہمیں خوش

ہے تو تبھی ہم درحقیقت خوش رہ بھی پائیں گے۔ تم بھی خوشیوں سے متعلق سوچنا شروع کر دو اور

وقت پر ڈال دو۔ جب جو ہوگا بہتر ہوگا۔ اپنے سارے خدشے، سارے ڈنوسے کہیں دفن کر

آنکھوں میں خوابوں کو آنے کی جگہ دو۔۔۔ مجھے امید ہے کسی قدر افاقہ ہوگا۔“ وہ کہتے کہتے یکدم

تھا۔ وہ بھی مسکرائی تھی۔

تبھی واقع میں نے آکر اطلاع دی تھی۔

کرتی ان کا؟

دوڑتے بھاگتے منظر تو شاید خواب ہوتے ہیں جو کبھی ہاتھ نہیں آتے۔ کبھی مٹیوں میں نہیں دب سکتے۔ اور پھر وہ ایسی بے حاصل کوشش کیسے کرتی، جب یقین کا اک لمحہ بھی نہ تھا۔ گاڑی اپنی رفتار سے چلتے چلتے یکدم رکی تھی۔

اس نے چونک کر دیکھا تھا۔۔۔ وہ پری رن وجود مسکراتے ہوئے سردار بیکنگین سے اجازت چاہا تھا۔ کوئی امراء کی گلی تھی، اسٹریٹ کی دونوں جانب وسیع و عریض بیڑنگلوز بنے ہوئے تھے۔

وہ وجود ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان وجود کے قریب تھا۔ انداز میں شوق تھا، لگن تھی، کوئی گہری تھی۔ دونوں میں اختتامی کلمات کے ساتھ علاقہ سیما بھی ادا ہوئی تھیں اور بالآخر وہ پری رن گاڑی دروازہ کھول کر باہر نکل کر کھڑی ہوئی تھی۔ میرب سیال نہ چاہتے ہوئے بھی کنکھیوں سے اُن تاپسند منظر کو دیکھ رہی تھی۔

اب وہ پری رن کھڑکی میں جھک آئی تھی۔ انداز میں حد درجہ بے قراری تھی۔
”رات تم آرہے ہونا؟“ باہر کھڑے ہونے کے باعث وہ پہلے کے مقابلے میں قدرے بلند آواز میں بولی تھی۔

”ہوں۔“ سردار بیکنگین حیدر لغاری نے اثبات کی مہر ثبت کی تھی۔
”اوکے۔“ وہ لڑکی بڑی ہی دل ربانی سے مسکرائی تھی، پھر کھلے گیٹ سے اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔ میرب چہرے کا رخ پھیرے کھڑکی سے ادھر مکتی رہی تھی۔
وہ پری رن چلی گئی تھی مگر گاڑی نہ چلی تھی۔ مگر میرب قطعاً چونکی نہ تھی۔ شاید کچھ اور ہونا باقی تھا ابھی شاید کوئی اقدام خاص۔

”سنو۔“
وہ خود میں لگن بیٹھی تھی جب بھاری لہجے میں اسے پکارا گیا تھا۔ وہ بے طرح چونکی تھی۔ کسی قدر حیرت سے اس شخص کی جانب دیکھا تھا۔

”آگے آ جاؤ تم۔“ ایک مزید حکم صادر ہوا تھا۔ وہ ساکت سی چند ثانیوں تک بیٹھی رہی تھی، پھر دروازہ کھول کر اتری تھی اور اس خالی کی گئی سیٹ پر بہت ہولے سے بیٹھ گئی تھی۔
سردار بیکنگین حیدر لغاری نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

گویا اس کا حصہ یہ تھا۔
چیز اس کے مصرف میں بھی آنا تھی مگر!
کچھ لمحے اس کے نام بھی تھے مگر!
مگر شاید باقی بچ جانے کے بعد۔

اس کا شمار بھی ہونا تھا۔
مگر شمار ہو جانے والے تمام سطوہ نمبروں کے بعد۔

دل

آہ..... کتنی ہی ٹیسس اٹھی تھیں اندر کہیں۔ کتنا درد اٹھا تھا۔ کیا پالیا تھا اس نے؟ کیا گنوا دیا تھا؟
شاید اپنا آپ، شاید سب کچھ!

کن بے قدرے ہاتھوں میں آئی تھی وہ!

کس مقام پر فٹ کیا گیا تھا اسے، جہاں پہلے سے سارے منظر بھرے ہوئے تھے۔ جہاں اس کی رے سے کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔

کتنے سناٹوں کا پہرہ وجود کے ارد گرد بنتا چلا گیا تھا۔ کتنی مشکوں میں گھر گیا تھا دل۔ کتنی خاموشیوں سٹ گئی تھی جاں۔

اور تدارک کیا تھا؟

کیا تھا وہاں؟

کس قدر جلجت میں بنا کوئی چھان پھٹک کے، اس کے نصیب کا فیصلہ سنا دیا گیا تھا۔

اتنا بڑا فیصلہ.....!

کیسے ہمدرد تھے اس کے، کیسے اپنے تھے؟

کتنے مضبوط بندھن میں باندھ گئے تھے اسے۔ کتنی مضبوط زنجیروں میں جکڑ گئے تھے اسے کہ وہ ہتی بھی تو آزاد نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن کیا اس بندھن کی جگہ اگر فقط ایک انگوٹھی اس کی انگلی میں ہوتی تو وہ اس سے خود کو نکال پاتی؟ اس بندھن سے خود کو آزاد کرا لیتی؟
شاید نہیں۔

وہ تب بھی اسی قدر کم زور ہوتی۔۔۔ اسی قدر بزدل اور ڈرپوک ہوتی۔ کیونکہ اس کا سر محتوبوں کے سنے جھکا تھا۔ مجر یوں کے سامنے بے بس ہوا تھا وجود۔ اس نے اپنے چاہنے والوں کے لئے اپنی قربانی مانگی۔ اس کی خوشی کو مقدم جانتے ہوئے آنکھیں بند کر کے اس اندھے کونوں میں چھلانگ لگا دی تھی۔ من بندھنے سے قبل بھی سب کچھ غنی تھا اس پر مگر کچھ بے نام سے خدشے اندر سر اٹھانے لگے تھے۔ اس اچھٹی حس مسلسل اسے کسی آنے والے خطرے سے متعلق مطلع کر رہی تھی مگر اس نے پھر بھی کوئی آواز نہ مانگی۔ کسی حکم سے تاب نہیں ہوئی تھی وہ۔ اس پر تبھی منکشف تھا۔

کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی۔

لیکن اس وقت ”کچھ بھی“ کے معنی اس قدر واضح نہ تھے۔

کتنی خاموشی تھی چارنو۔۔۔ شاید ساری اپچل اس کے اندر ہی تھی۔ ساری وحشتیں فقط اس کے اندر امنڈلا رہی تھیں۔

سردار بیکنگین حیدر لغاری کس درجہ خاموشی سے ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔ بھولے سے بھی اس کے در پر اک نگاہ نہ ڈالی تھی۔ بھولے سے بھی اسے نہ دیکھا تھا، جیسے وہ اس کی موجودگی کی نفی کر رہا تھا۔ جیسے اس کے لئے اس کا ہونا نہ ہونا ایک ہی معنی رکھتا تھا۔

میرب سیال نے اک نگاہ کی تھی اس طرف۔ اسے اک لمحے کو بغور دیکھا تھا۔

کس قدر پروجاہت تھا وہ شخص۔

کس قدر تمکنت تھی اس کے سبھی تیروں میں۔

کس درجہ خود اعتمادی تھی۔

کتنی خصوصیات کا حامل تھا وہ اور کس قدر کشش تھی اس میں۔ اک زمانہ دیوانہ تھا اس کے ۱۰ ماہہ نہیں پاگل تھیں، اس کی اک نگاہ کی منتظر۔ کیسی شان رکھتا تھا وہ۔ کیسا اک انجانا سا غرور اس کے پر تھا۔

وہ بلاشبہ بے انتہا کشش کا حامل تھا۔ بہت وجاہت تھی اس میں۔ اس کی بے تاثر نگاہ کے تیور ہم لٹا دینے پر مائل کرتے تھے۔

مگر اس کے باوجود کس قدر نفرت اٹھ رہی تھی اس کے لئے میرب سیال کے دل سے۔

اس کا سارا اندر اس ایک انتہائی متاثر کن وجود کی بھرپور نفی کر رہا تھا۔ کوئی ایک جذبہ بھی نہیں اس کے اندر اس شخص کے لئے۔ کتنا مضبوط تعلق مابین تھا مگر وہ اسے مسلسل رد کر رہی تھی۔ کیونکہ اس اندر اس کے خلاف جا رہا تھا۔

اور لڑکیوں کی ترجیحات کیا ہوتی ہیں۔۔۔ ان کے خواب کیا ہوتے ہیں، وہ نہیں جانتی تھی۔ مگر سبکدین حیدر لغاری اس کی ترجیح قطعاً نہ تھا۔ اگر اسے اختیار دیا جاتا تو وہ سو بار رد کرتی۔ کیونکہ وہ ترجیح قطعاً نہیں تھا۔ بڑے نوابوں کی خصوصیات لئے، ریاستی شہزادوں جیسی آن بان رکھنے والا شخص اس کی ترجیح نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ شاید مسلسل بلا ارادہ سردار سبکدین کی طرف تکتی جا رہی تھی۔ ایک پل کو نگاہ کی تھی مگر خود میں ابھی ہوئی تھی کہ نگاہ ساکت رہ جانے کا احتمال ہی نہ ہوا تھا۔ نگاہ ہٹانا یا دہی نہ رہا تھا۔

سردار سبکدین حیدر لغاری نے ایک پل کو ونڈا اسکرین سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا تھا۔ اور تب وہ فوجی تھی اور فوراً چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”مائی اماں نے حکم دیا تھا تمہیں گھر پہنچا دوں۔“ اس کی بھاری آواز یکدم اس کے اطراف پھیلنا وہ پہلی بار اس کی توجہ کا مرکز ہوئی تھی، مگر دل میں کہیں کوئی امنگ، کوئی ترنگ نہ جا گی تھی۔ وہ فقط خاندانوں سے اس شخص کی جانب تکتے لگی تھی۔

”تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“ شاید مائی اماں کی کسی تاکید پر وہ دریافت کر رہا تھا۔

میرب سیال نے بہت ہولے سے سرٹنی میں ہلایا تھا مگر اس نے بنا کان دھرے گاڑی ”چلو کے سامنے روک دی تھی۔ وہ خاموش نظروں سے اس شخص کی جانب تکتے لگی تھی۔ سردار سبکدین حیدر نے بھی اس پر نگاہ کی تھی۔

”اترو۔“ حکم صادر ہوا تھا۔ وہ چند ثانیوں تک اسی طرح سرسیمہ سی تکتی رہی تھی۔ پھر چہرے

پھیر کر اپنی طرف کا دروازہ کھولا تھا اور خاموشی سے اتر گئی تھی۔ اس کے باوجود کہ وہ ایسا کچھ نہیں تھی۔ مگر وہ سردار سبکدین حیدر کے کسی حکم سے اب تک جانے کیوں منحرف نہ ہو سکی تھی۔

کتنی دیر تک وہ اسے شاپنگ کرتا رہا تھا۔

کتنی بہت سی اشیاء۔۔۔ جن کی اسے ضرورت بھی نہ تھی اور جن کے لئے اس نے کوئی خواہش بھی ہرنہ کی تھی، وہ اس کے لئے منتخب کرتا جا رہا تھا۔ لیکن کچھ بھی لینے سے قبل وہ اک نظر اس کی طرف دیکھتے تھے اتنا ضرور کہتا تھا۔

”ٹھیک ہے؟“

اور وہ سرٹنی میں ہلانا جیسے بھول گئی تھی۔

پتہ نہیں اس شخص کا رعب تھا یا پھر وہ کمزور ہی اتنی ہو گئی تھی۔ وہ آج تک کوئی انکار کر ہی نہ سکی تھی۔ کتنی لگتی تھی وہ اتنے تھوڑے دنوں میں۔

کتنی ڈھیر ساری شاپنگ کی سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کے لئے۔ بالکل اپنے شایان شان۔ حاجت کے مطابق۔ وہ معمولی اشیاء کی سمت تکتا ہی نہ تھا۔ بے تاثر چیزوں پر اس کی نگاہ ٹھہرنی ہی نہ نا۔ اس کی نگاہ انتخاب بڑی بلند تھی۔

”تو کیا اس کے معاملے میں بھی؟“ کیسا سوال اٹھا تھا یکدم۔

اس کے متعلق سوچتے سوچتے یکدم خود اپنی ذات پر آگئی تھی۔ مگر اندر بہت خاموش تھا، بڑا ساکت۔

”تمہیں بھوک تو ضرور لگی ہوگی۔“ چھین دن سے نکل کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے آنکھوں پر بارہ سیاہ سن گلاسز چڑھاتے ہوئے وہ اس سے مخاطب تھا۔ اور اب کے وہ کس قدر حیرت سے اس کی تکتی چلی گئی تھی۔ نہ تو سر اثبات میں ہلایا تھا نہ ہی نفی میں۔ مگر سردار سبکدین حیدر لغاری نے گاڑی اپنے لمبہ راستوں پر ڈال دی تھی۔

شاید آج کے تمام ”اقدامات“ کے لئے مائی اماں کی جانب سے بطور خاص ”تاکید“ ہوئی تھی۔

آج کا دن اس کے نام لکھ دیا گیا تھا تو اس میں بھی کوئی جواز تھا۔ شاید وہ مائی اماں کی کوئی بات ٹال بس سکتا تھا۔ کوئی بات رد نہیں کر سکتا تھا۔ اور شاید بھی ایک لمحے میں اس کی سوچ خود اپنے آپ پر تھی تو سا کا انتخاب بھی کسی ایسے ہی حکم نامے کی طرح تھا۔

مائی اماں کی مرضی، ان کی پسند اور فقط ان کا حکم۔ وہ یقیناً سردار سبکدین حیدر کی ترجیح نہ تھی۔ ہو بھی نہیں تی تھی۔ کیونکہ وہ اس ”ٹائپ“ کی تھی ہی نہیں۔ وہ تو اس کی فقط ”مجبوری“ تھی۔ جس طرح وہ اس کی ”مجبوری“ تھا۔

تو کیا دونوں فقط ”مجبوریوں“ کا بندھن بٹھا رہے تھے؟

سردار سبکدین حیدر لغاری نے گاڑی ایک ”میریٹ“ کے سامنے روک دی تھی۔

”اترو۔“ ایک بار پھر حکم صادر ہوا تھا اور میرب سیال بہت خاموشی سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئی تھی۔ شاید اب اسے تا عمر ایسے ہی احکامات کی تابعداری کرنا تھی، بنا زبان کھولے، بنا اپنی مرضی جانے فقط سر اثبات میں ہلانا تھا اسے۔ کیونکہ یہی اس کی ”مجبوری“ تھی۔

دن بھر وہ ایک پروجاہت ترین شخص کے ساتھ رہی تھی۔



کتنے خوب صورت اور قیمتی لمبے بختے تھے کسی نے اسے۔ مگر اس کے اندر پھر بھی ویسے ہی۔ پہرہ تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ ان تمام اقدامات کی حقیقت جانتی تھی۔ وہ شخص جس کی قربتوں کی ہزار رحمتیں فقط خواہش کرتی ہیں۔

وہ آج دن بھر اس کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ مگر کیسا بے تاثر سا لگ رہا تھا سب کچھ۔ کس قدر سہ شام جب اس نے اسے ”لغاری ہاؤس“ کے باہر چھوڑا تھا اس اختتامی لمحے میں بھی وہ کس تاثر تھی۔ کس قدر سناٹے تھے اندر۔ کہیں کوئی آہٹ نہیں تھی۔

اور کتنی کوشش کی تھی کہ اس دیوانگی پر وہ قابو پالے۔ وہ سامنے آئے تو وہ اس کی جانب نہ دیکھے۔ نگاہ میں وہ دیوانگی، وہ وارفتگی نہ اُٹے۔ مگر عفنان علی خان مکمل طور پر بے بس رہا تھا۔ کتنا بے خود کر دیتی تھی اسے وہ ”شربت گلا“۔ کتنا اضطراب بھردیتی تھی ساری جان میں۔

وہ جادوسی ست رنگی آنکھیں کتنے اسرار رکھتی تھیں اپنے اندر۔ کتنے بھید چھپے تھے ان میں۔ وہ بلا ارادہ ہی جیسے ان رازوں کو پانے کو بے خود ہو جایا کرتا تھا۔ اک پل میں وہ اپنے سارے اختیار، سارے ہوش کھودیتا تھا۔

بٹھے بٹھائے دل نے کیسے روگ لگائے تھے، کن منزلوں کا جنون دل میں آن سلایا تھا، کن راہوں کی لگن آنکھوں میں جاگنے لگی تھی۔

ذہن و دل کیسے پل میں مفلوج ہو جاتے تھے۔

کیسے کوئی تدبیر ہو ہی نہ پاتی تھی۔

وہ جانتا تھا یہ ٹھیک نہیں۔ مانتا تھا دل کہ وہ اس کے لئے ”شجر ممنوع“ ہے جس تک اس کی رسائی قطعاً کبھی ممکن نہیں۔ اس کے راستے کوئی اور ہیں اور اس کے راستے کوئی اور۔ جب کہ وہ ایک نئے راستے کا تعین اپنے لئے کر چکا ہے، ایک نئی راہ اپنا چکا ہے۔

کسی بندھن کا پابند ہو چکا ہے، کسی نئے تعلق میں بندھنے کی ابتدا کر چکا ہے، پھر یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔

مگر دل سمجھ نہ پا رہا تھا۔

اس روز جب پی سی میں اسے دیکھا تھا تو قدموں کو اس کی سمت بڑھنے سے قطعاً نہ روک سکا تھا۔ قدم ٹپتپے اور وہ چلتا ہوا اس کے سامنے جا رہا تھا۔ اور وہ کس قدر حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

”آپ؟“ اس کی نظروں میں کس قدر حیرت تھی۔ شاید وہ اس پل مروتا مسکرائی تھی۔

”کیسی ہو تم؟“ وہ ایسے مخاطب ہوا تھا جیسے صدیوں کی پہچان رکھتا ہو۔ لہجے میں اتنی اپنائیت تھی جیسے وہ رسول سے اس سے واقف رہا ہو اور ایسا اول دن سے تھا۔ انا بیہ شاہ کے لب ایک بار پھر مروتا پھیلے تھے۔

”ٹھیک ہوں۔ اور آپ؟“

”پرفیکٹ۔“ وہ اسی بے خودی سے مسکرایا تھا۔

”ایک ورکشاپ اٹینڈ کرنا تھی۔“ انا بیہ شاہ نے شاید مروتا مسکراتے ہوئے جواز دیا تھا۔



وہ بخور دیکھنے لگا تھا۔

”لامعہ نہیں آئی؟“

”نہیں۔۔۔ شاید وہ کہیں اور مصروف تھی۔“

”اینڈ کری و رکشاپ؟“ بخور تکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ انا بیہ نے رسمی سی مسکراہٹ کے اثبات میں ہلایا تھا۔ ایسا قطعاً ممکن نہ تھا کہ وہ اس کے سامنے سے یونہی ایک پل میں ہٹ جاتی۔ ما گہرے مراسم نہ تھے، کوئی وابستگی نہ تھی، کوئی گہری آشنائی بھی نہ تھی، مگر ایسا بھی نہ تھا کہ سرے سے تعلق ہی موجود نہ ہو۔ لامعہ حق کا حوالہ رکھنے کے قابل تو نہ تھا۔ شاید تھی وہ تمام تر مروت سلیقے سے نبھارہی تھی۔ عفنان علی خان نے اس سراپا سے کسی کھڑی لڑکی کو بخور دیکھا تھا پھر بہت سے اظہار مدعا کیا تھا۔

”کیا ہم کہیں بیٹھ سکتے ہیں؟“ عجب خواہش لیوں پر چل گئی تھی۔ جانے مقابل کا رد عمل کیا ہوگا۔ سنگ مرمر سا تراشیدہ بیکر جانے کس وصف سے پیش آتا۔ جانے وہ گداز لب کیا کہتے۔ مگر یہ سچ تھا کہ ایک لمحے میں وہ خود پر اختیار نہ رکھ پایا تھا۔ مگر اب جب ہوا تھا تو وہ اس صبح چہرے سے اپنا دھیان ہٹا۔ مگر اس گھڑی وہ چمکتی آنکھیں اس کی سمت اٹھی تھیں اور وہ تراشیدہ لب مسکرائے تھے۔

”ڈنر کروانے کے چکر میں ہیں؟“ کسی قدر شگفتہ انداز میں کہا گیا تھا۔ یقیناً وہ اس گھڑی ایک تعلق کو لے کر سما مسکرا رہی تھی۔ حالانکہ مذاق کا کوئی خاص تعلق درمیان استوار نہ تھا۔ عفنان علی بخور سے دیکھ رہا تھا۔

”موسم سرد تو ہے۔۔۔ آئی تھنک، کافی، بہتر رہے گی۔ دراصل میں لامعہ کو شکوے کا کوئی موقع دینا چاہتی۔ اگر اسے پتہ چل گیا کہ میں آپ سے یہاں ملی تھی اور میں نے ڈھنگ سے آپ کو ٹریٹ کیا تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔“ مسکراتے ہوئے اس نے وضاحت کی تھی اور اس کے انداز عفنان علی خان مسکرائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

”تو آپ لامعہ کے ڈر سے مجھے اچھی طرح مل رہی ہیں؟“ اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ کسی قدر شکوہ انداز میں مسکرایا تھا۔

”نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں۔“ وہ اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے مسکرائی تھی۔

”کب سے جانتی ہیں آپ لامعہ کو؟“ کافی کا آرڈر دینے کے بعد وہ اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔

”اسکول سے۔۔۔ ہماری اسکولنگ ساتھ ہوئی تھی۔“ انا بیہ شاہ کا جواب بڑا مختصر تھا۔ اور وہ حمہ سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

”پھر اس سے قبل کیوں نہ ملیں آپ؟“ مسکراتے ہوئے شکوہ ہوا تھا۔

”اس سے قبل کبھی آپ نے منگنی بھی تو نہیں کی۔“ جواب بے حد برجستہ اور انداز شگفتہ تھا۔ وہ مسکرایا بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے رنگ اس گھڑی بڑے شوخ سے تھے۔ وہ یقیناً مذاق کر کے یہ ملاحظہ ہوئی تھی۔

”ویری انٹرسٹنگ۔ آپ کانسٹنٹ آف ہیومر خاصا اچھا ہے۔ آپ بہت مختلف ہیں۔“

”کس سے؟“ استفہامیہ انداز میں اس کی جانب تکتے ہوئے گویا ہوئی۔ عفنان علی خان مسکرایا تھا، پھر بہت آہستگی سے گویا ہوا تھا۔

”ہر کسی سے۔“ انداز بے حد مسرور تھا۔ انا بیہ شاہ قدرے حیرت سے اسے تکتے لگی تھی۔

انا بیہ شاہ کافی کے کپ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو بخور تکتے لگی تھی۔ عفنان علی خان کو شاید اپنی حد درجہ بے قراری کا ادراک ہوا تھا سچی وہ لب بھینچ کر مسکرایا تھا۔

”لامعہ سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ آئی مین کیسے دوستی ہوتی ہے تم دونوں میں؟“

انا بیہ نے کافی کے فلیور سے ملاحظہ ہوتے ہوئے عفنان علی خان کی طرف دیکھا تھا۔ پھر بڑی متانت سے مسکرائی تھی۔

”دوستی یا انڈر اسٹینڈنگ کے لئے ایک جیسا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ آئی بلیو۔۔۔ کبھی ایک جیسے سائن ایک دوسرے کو انٹریکٹ نہیں کرتے۔ بیڑی بھی تہی چارج ہوتی ہے جب ایک سائن گنیٹو اور دوسرا پوزیٹو ہو۔“ انداز بے حد مدلل تھا۔ عفنان علی خان اسے بخور تکتا ہوا مسکرایا تھا۔ یقیناً مقابل کی بات قائل کر گئی تھی۔

”درست کہتے ہیں۔۔۔ حسن چاروں شانے چت کر سکتا ہے۔“ دھیسے سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ انا بیہ شاہ جو کافی کا سب لے رہی تھی، اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہیں؟“ اس کی آنکھوں کو بخور تکتے ہوئے کافی کا سب لیا تھا۔ اور وہ جو کسی قدر خود میں گمن تھی، چونک پڑی تھی۔ پھر قدرے دھیسے انداز میں مسکراتے ہوئے اس مقابل بیٹھے شخص کو دیکھا تھا۔

”آپ کو کیسے خبر ہوئی کہ میں کچھ سوچ رہی ہوں؟“

”آپ کی آنکھیں سارے بھید کہہ جاتی ہیں۔“ وہ دھیسے سے مسکرایا تھا۔ انا بیہ شاہ بجائے کنفیوز ہونے کے مکمل اعتماد کے ساتھ عفنان علی خان کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”لامعہ کا قیاس آپ کے متعلق خاصا مختلف ہے۔“ گداز لبوں پر بڑی دھیمی مسکراہٹ تھی۔ عفنان علی خان دلچسپی سے تکتے لگا تھا۔ وضاحت قطعاً نہیں چاہی تھی نہ ہی کوئی اختلاف رائے تھا۔ بس فقط مسکرایا تھا۔

”آپ کیا کہتی ہیں؟“ مکمل اعتماد سے اس کی سمت تکتے ہوئے دریافت کیا گیا تھا اور انا بیہ شاہ جو مکمل بڑا اعتمادی کے ساتھ اس کی سمت دیکھ رہی تھی، کچھ بھی کہے بغیر نظریں پھیر گئی تھی۔ تہی عفنان علی خان کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”آپ کو کافی پسند ہے؟“ عجب سوال دریافت کیا گیا تھا۔

”ہوں۔۔۔“ انا بیہ نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”اس کا ٹیسٹ کڑوا اور کیلا ہے اس لئے؟“ جانے وہ کیا پروف کرنا چاہ رہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ اس میں چاکلیٹ اور کریم ہے اس لئے۔“ وہ مکمل غیر سنجیدگی سے مسکرائی تھی۔ اس کے غیر سنجیدہ انداز پر عفنان علی خان نے اسے دیکھا تھا، پھر مسکرایا تھا۔

جب بھی تم سے ملا ہوں سیر
ایک نئی لڑکی لگی ہو تم
ایک سب تلخ، ایک سب شیریں
میری کافی میں گھل گئی ہو تم

کافی کے کپ کے کناروں پر شہادت کی انگلی پھیرتے ہوئے زیر لب مسکرایا تھا۔ لہجہ دھیمہ تھا، آواز مدہم تھی، جیسے یہ کوئی مدہم سرگوشی ہو، کوئی خود کلامی ہو۔ مگر ایسا ہرگز نہیں تھا کہ وہ مدہم لہجہ کسی دوسرے کے کانوں تک نہ پہنچا ہو۔ انا بیہ شاہ نے یقیناً اس آواز کو سنا تھا مگر کسی بھی طرح کارڈ عمل ظاہر کئے بغیر چہرے پر رخ پھیر گئی تھی جیسے وہ بھی سنی ان ہی کرنا چاہتی تھی۔

”ایک بات کہوں؟“ بہت ہولے سے اظہار مدعا ہوا تھا۔

انا بیہ شاہ نے فقط خاموشی سے اس شخص کی سمت دیکھا تھا، کوئی اجازت نہیں دی تھی مگر وہ بولنے سے باز نہیں رہا تھا۔

”آپ کی ان آنکھوں میں رنگ باتیں کرتے ہیں۔ سبھی موسم بولتے ہیں۔“ عجب انکشاف تھا۔ انا بیہ شاہ نے سادگی سے اس شخص کو دیکھا تھا، وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”تھینکس فور دی کافی۔“ قدرے رسمی انداز میں مسکراتے ہوئے مقابل کو دیکھا تھا۔ اس کے خلاصی کرانے والے انداز پر عرفان علی خان نے مسکراتے ہوئے پُر شکوہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”تو کیا ہم ساتھ باہر تک بھی نہیں جاسکتے؟“ بظاہر وہ نظریں پُر شکوہ تھیں مگر منظور ہونے کی کیفیت بے حد واضح تھی۔ وہ یقیناً اس گھڑی منظور ہو رہا تھا۔ انا بیہ شاہ نے قدم اس کے ہمراہ آگے بڑھادیئے تھے۔ بہت سے کام کبھی سبھی نہ چاہتے ہوئے اور محض رکھ رکھاؤ کے لئے بھی کرنا پڑتے ہیں۔ اور وہ بھی رسمِ دوستی بھاری تھی۔ عرفان علی خان خاموش تھا مگر آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ کس درجہ سرشار تھا۔

کوئی سنگ تھا، ہمراہ تھا۔

گردل کے لئے یہ چند لمحے بھی قیمت تھے۔ سنگت مختصر سی مگر پُر لطف تھی۔

بہت سے کام دوسروں کی خوشی کے لئے کرنا پڑتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسا کرنے میں بہت کچھ چپ چاپ اندر ٹوٹتا ہے، بکھرتا ہے اور دفن ہوتا چلا جاتا ہے۔ سید اذہان حسن بخاری کے لئے بھی ماں کے حکم پر سر جھکانا جیسے ایک لازمی جزو تھا۔ انکار اس کے لئے ناممکن تھا۔ سو اس نے سر جھکا دیا تھا۔ کیونکہ وہ سب کچھ کر سکتا تھا مگر اس ایک رشتے کی نفی نہیں کر سکتا تھا۔

سید سعد شاہ بخاری کو شاید اس کے آفس آنے کی اطلاع مل گئی تھی، تبھی وہ اس کے روم میں چلے آئے تھے۔

سید اذہان حسن بخاری میں اب بھی اتنا احساس تھا کہ وہ سامنے کھڑے باپ کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پُر خائف نگاہِ خشکی لئے ہوئے تھی، قدرے اجنبی تھی، وہ ان کی طرف سے مکمل طور پر غافل تھا، ان کی طرف

دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ سعد حسن شاہ بخاری نے مضبوط جسامت کے مالک بیٹے کو دیکھا تھا۔ اس لئے چوڑے قد کا کٹھ میں وہ آج بھی ویسی ہی فطری معصومیت کا حامل تھا۔ سید سعد حسن شاہ بخاری کو وہ آج بھی کوئی چھوٹا سا بچہ ہی لگا تھا۔ وہ اس کے قریب آگئے تھے، اسے بغور دیکھا تھا اور اس کے مضبوط شانے پر بہت ہولے سے ہاتھ دھر دیا تھا۔ مگر سید اذہان حسن بخاری تب بھی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔

”مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔“ میں جانتا تھا۔“ دونوں ہاتھوں سے اس کے مضبوط شانوں کو تھامتے ہوئے وہ مسکرائے تھے۔ سید اذہان حسن بخاری نے بہت ہولے سے گردن پھیر کر انہیں دیکھا تھا پھر بہت آہستگی سے گویا ہوا تھا۔

”یقیناً آپ کو خود پر نہیں، اس ہستی پر تھا جسے آپ نے اپنے عزائم کے لئے استعمال کیا۔“ اس کا لہجہ سہاوا تھا۔ سعد حسن شاہ بخاری نے بیٹے کو دیکھا تھا۔

”چلو۔۔۔ کسی کے لئے سہی۔ تمہیں شاہ گروپ آف کمپنیز کا خیال تو آیا۔“

”خیال مجھے شاہ گروپ آف کمپنیز کا نہیں، اس کی گرتی ہوئی ساکھ کا تھا۔ میری می بھی تو اس کمپنی کی پچاس پریسنٹ کی شیئر ہولڈر ہیں۔ اور اگر میں کوئی نقصان شاہ گروپ آف کمپنیز کو پہنچاتا تو یقیناً میری ماں کو ایک اور نقصان سہنا پڑتا اور میں اپنی ماں کو کم از کم کوئی زک نہیں پہنچا سکتا۔“ اذہان حسن بخاری کا لہجہ متانت سے پُر تھا۔ سید سعد حسن اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔ پھر چہرے کا رخ پھیر کر پُر افسوس انداز سے سر نفی میں ہلانے لگے تھے۔

”تم میرے اس حد تک خلاف جاسکتے ہو، مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ میرا بیٹا، میرا خون۔“ وہ عجیب بے بسی کے ساتھ بیٹے کی سمت نکلنے لگے تھے۔ ”تم کیا سمجھتے ہو۔۔۔ کس کے لئے کر رہا ہوں میں یہ سب کچھ، کس کے لئے؟ تمہارے لئے نا، اور کون ہے میرا۔ اور تم ایک پل میں۔۔۔۔۔۔“ دھیمہ لہجہ کسی قدر کرب سے دوچار تھا۔ ”کس کے لئے ہے یہ میرا سب کچھ۔ تمہارے لئے نا۔ یہ دوڑ دھوپ، یہ محنت، یہ کامیابیاں، یہ دولت کی ریل پیل، یہ نام یہ مرتبہ۔“ اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑا تھا مگر وہ بے تاثر کھڑا رہا تھا۔

”آپ نے مخالفت خود مول لی ہے پاپا!۔۔۔ آپ نے یہ صلح کی راہ خود منتخب کی ہے۔“ سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے وہ چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔ چہرے کی رگیں بے حد تنی ہوئی تھیں۔ خود پر ایک جبر ناقابل بیان تھا۔

”کیا تم اس بات، اس۔۔۔ کو بھلا نہیں سکتے؟“ عجب بے بسی سے کہتے ہوئے بے حد مضبوط قد و قامت کے مالک بیٹے کو دیکھا تھا جو بہت مضبوطی سے اس گھڑی ان کے سامنے ڈٹا کھڑا تھا اور اس گھڑی کس درجہ بے یقینی سے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا وہ سب بھولنے کے قابل ہے؟۔۔۔ پاپا! آپ نے ہمیں ناقابلِ طمانی نقصان پہنچایا ہے۔ مئی کا کیا تصور تھا، اتنی طویل رفاقت کا کیا صلہ دیا آپ نے انہیں؟ اور ماہا۔۔۔ اُس کا کیا تصور تھا؟ آپ کو اس کا بھی خیال نہیں آیا۔“ کس قدر دھیمے انداز میں وہ مخاطب تھا اس گھڑی۔ مگر آنکھوں کی سرخی

بتا رہی تھی کہ اندر بہت سے طوفانوں کا مقابلہ اس کے لئے آسان نہیں ہے۔ وہ یقیناً اس وقت بہت بند باندھے کھڑا تھا۔

”پاپا! آپ کو لگتا ہوگا کہ آپ ایسا کر کے حق پر ہیں۔ مگر میں اپنی ماں یا اپنی بہن کو کوئی زک نہیں پوسکتا، نہ ہی کوئی مخالف سمت اختیار کر سکتا ہوں۔ آپ کے لئے اتنا کافی ہے کہ میں اب شاہ گروپ آؤ کمپنیز کے ساتھ ہوں۔ شاید آپ کو احساس نہیں ہے کہ آپ نے کیا کچھ کھو دیا ہے؟ اور میں آپ کو اس احساس دلانا بھی نہیں چاہتا۔ شاید میری طرف سے کوئی کوتاہی ہوئی ہو۔ آئی ایم سوری، لیکن میں آپ کو معاف نہیں کر سکتا پاپا! مجھے اپنے سے وابستہ تمام رشتوں سے پیار ہے اور آپ نے نقصان میرا نہیں، مج سے وابستہ رشتوں کا کیا ہے۔“ مدہم لہجے میں بہت کچھ کہہ گیا تھا۔ کہنے کے ساتھ ہی وہ پلٹا تھا اور مضبوط قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ سعد حسن شاہ بخاری بیٹے کو کھلتے رہ گئے تھے۔

ڈاکٹر نے پاپا کی سرجری کی ڈیٹ دے دی تھی۔ اور جب سے اس نے یہ خبر سنی تھی اس کا دل بیٹھا رہا تھا۔ جانے کیوں اسے بے حد ڈر لگ رہا تھا۔ بہت سی خاموشی اندر پھیل رہی تھی اور آنکھیں کیسے ارادہ برس رہی تھیں۔ وہ ٹیرس کی میزبوں پر بیٹھی گھنٹوں پرسردہرے اس وقت خاموشی سے اپنے اندر کے غبار کو دھو رہی تھی، جب سردار سبکتگین حیدر لغاری مضبوط قدموں سے زینہ طے کرتا دکھائی دیا تھا۔ اس نے بلا ارادہ نگاہ کی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری بھی شاید بے ارادہ رکھا تھا، اسے بغور دیکھا تھا پھر بے حد سہاٹ لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”اپنی پرابلم؟“

میرب سیال نے اسے دیکھا تھا، پھر بیگلی بیگلی آنکھوں کی تمام نمی کو ہاتھ کی پشت سے رگڑتے ہوئے سر نفی میں ہلا گئی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے چند ثانیوں تک اسے اسی طرح خاموشی سے دیکھا تھا، پھر بڑے بے تاثر انداز میں مضبوط قدم اٹھاتا ہوا اس کے پاس سے گزر گیا تھا اور میرب سیال کے اندر کی خاموشی مزید گہری ہوتی چلی گئی تھی۔

یہ تھا اس کا ہم سفر، اس کا رفیق زندگی۔

اس نے اس کے ایک لمحے کی بھی خبر نہ لی تھی۔

ایک لمحے کے ایک غم کو بھی نہ بانٹا تھا۔ اس سے وہ کسی خوشی کی امید کیا کرتی۔ اسے تو وہ حرف تسلی تک میسر نہ تھے۔ ایک شانہ مہربان نصیب نہ تھا۔ کس درجہ تھا وہ۔ کس درجہ اکیلی۔ وہ اٹھی تھی اور نیم جاں قدموں سے چلتی کرے میں آگئی تھی۔ کتنی دیر تک وہ چپ چاپ بیڈ پر لیٹی خالی خالی نظروں سے چھت کی سطح کو ککتی چلی گئی تھی۔ اچانک آہٹ ہوئی تھی مگر وہ چونکی نہیں تھی، دھیان نہیں پھیرا تھا۔ مائی اماں نے دلہیز پر رک کر اسے دیکھا تھا، پھر اندر چلی آئی تھی۔ وہ تب بھی نہیں چونکی تھی۔

”میرب! میرے بیٹے! کیا ہوا؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے خود خبر نہ لی تھی مگر سوالی کرنے کو کسی

برکوفرو سبج دیا تھا۔ شاید کسی قدر انسانیت اس میں اب بھی باقی تھی۔ مائی اماں اس کے قریب بیٹھے دئے اس کی پیشانی کو چھو کر دیکھنے لگی تھیں۔

اس نے اچانک اٹھ کر بیٹھے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

”ٹھیک ہوں، میں — آپ نے خواہواہ زحمت کی۔“ اس کا لہجہ دھما مگر کسی قدر سرد تھا۔

مائی اماں نے اسے دیکھا تھا، پھر بہت محبت کے ساتھ اسے اپنے ساتھ بھینچ گئی تھیں۔

”کیسی عجیب، باتیں کر رہی ہو تم؟ — کیا کسی غیر گھر میں ہو؟ بیٹا! کیا تمہیں ہم سے کوئی شکایت ہے؟ — سبکتگین حیدر نے کہا ہے کچھ؟ مجھے بتاؤ، طبیعت ٹھکانے لگا دوں گی اس کی۔“

مگر وہ نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔ آنکھیں یکدم ہی پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ وہ سر جھکا گئی تھی۔

”میرب! مائی اماں نے بہت آہستگی سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تھا۔ بھی اس کی آنکھوں میں ٹھہرے مندر چھلک پڑے تھے۔

”ڈاکٹر نے پاپا کی ہارٹ سرجری کی ڈیٹ دے دی ہے۔“ سر جھکا کر وہ بولی تھی۔ مائی اماں نے اسے دیکھا تھا پھر بہت آہستگی سے اپنے ساتھ لگایا تھا۔

”بیٹا! اس میں پریشانی والی کیا بات ہے؟ — انشاء اللہ سرجری کامیاب ہوگی اور مظہر صاحب درست ہو کر وطن واپس لوٹیں گے — تم بس ان کی تندرستی کے لئے دعا کرو۔ خدا بیٹیوں کی دعائیں بھی رازیاگن نہیں کرتا۔“ انہوں نے حوصلہ بندھایا تھا۔ مگر دل کو پھر بھی ڈھارس نہیں ہوئی تھی۔

”اگر تم زیادہ پریشان ہو تو میں سبکتگین سے کہتی ہوں، وہ تمہیں ان کے پاس لے جائے۔“

”نہیں مائی اماں! اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ یقیناً سبکتگین حیدر لغاری کو کسی قسم کی تکلیف دینا نہیں ہوتی تھی۔ مائی اماں نے خاموشی سے اسے دیکھا بھی وہ آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔

”ابھی فون پر بات ہوئی ہے میری ان سے۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گے انشاء اللہ۔“ اس نے جیسے خود کو عارک دی تھی۔ اپنے اندر کے خشوں کا گلا گھونٹا تھا۔ حمیرہ بیگم اسے دیکھنے لگی تھیں۔

”تم خود کو، اس گھر میں پریشان بھتی ہو نا؟“

”نہیں..... نہیں، ایسی بات نہیں۔“ میرب سیال نے فوراً نفی کی تھی۔

”تو پھر اپنا دکھ، اپنی تکلیفیں چھپاتی کیوں ہو ہم سے؟ — تمہیں لگتا ہے میں تمہاری ماں نہیں ہوں؟“ مائی اماں نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لیا تھا۔

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں مائی اماں! دراصل میں.....“ اور اس سے آگے اس سے کوئی بہانہ بن نہ پڑا۔ شاید بھی وہ چپ سادہ گئی تھی۔ مائی اماں نے اسے دیکھا تھا پھر اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا۔

”جس قدر اس گھر پر سبکتگین حیدر کا حق ہے، اسی قدر تمہارا بھی ہے۔ جتنی میں اس کی ماں ہوں، اتنی باری بھی ہوں۔ خدا تمہیں سکھ ہی سکھ دے۔ لیکن اگر کوئی پریشانی ستائے تو تم اپنی اس ماں سے بیان رسکتی ہو۔“

”جی ضرور مائی اماں!“ سبکتگین حیدر لغاری کی طرح وہ بھی دانستہ نادانستہ حمیرہ بیگم کو مائی اماں کہنے لگی

وہ سوچوں میں غلطاں تھا جب اس کا پرنسپل سیل چیخ اٹھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈیلیٹ بورڈ سے نوٹ اٹھایا تھا۔ نوٹ کی اسکرین پر واضح طور پر ”لامعہ“ لکھا ہوا تھا۔ اُس نے کال پک کر لی تھی۔

”کہاں ہو تم اس وقت؟“ لامعہ نے پہلی فرصت میں دریافت کیا تھا۔

”سن سٹ بولو ارڈ لے رہا ہوں۔“ اس نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔ انداز قدرے بجا بجا سا

فان۔ مگر لامعہ نے جیسے محسوس ہی نہ کیا تھا۔ فوراً بولی تھی۔

”پھر تو تم صحیح سمت آرہے ہو۔“

”عصفان علی خان نے کبھی اپنی عقل و خرد سے غلط سمت اختیار نہیں کی۔“ وہ دھیسے سے مسکرایا تھا۔ انداز

کسی قدر چوٹ کرتا ہوا تھا۔ جانے وہ اس لمحے کس پر تھا تھا۔ خود پر، اپنی تقدیر پر، اس وقت پر یا لامعہ حق

”آئی نو۔۔۔ میں جانتی ہوں۔ میرا انتخاب غلط نہیں ہے۔“ لامعہ حق مسکرائی تھی۔ ”ایسا کرو اگر تم

ن سنٹ بولو ارڈ لے چکے ہو تو ناک کی سیدھ پر آ جاؤ۔ ہم ”لبرٹی“ پر ہیں۔ میں نے ڈیویڈ کو واپس بھیج

یا تھا۔ دراصل ماما کو گاڑی کی ضرورت تھی۔ ان کی گاڑی درکشاپ میں تھی۔ مجھے علم نہیں تھا موسم ایسا ہو

ہائے گا۔ فی الحال تو فقط بوند اباندی ہے مگر اعتبار کچھ نہیں۔ ہم یہیں فورم پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ آ

جاؤ۔“

”اوکے۔“ اس نے جیسے مجبوراً سر ہلایا تھا۔ وہ فون بند کرنے والا ہی تھا مگر تبھی لامعہ بولی تھی۔

”موسم انجوائے کر رہے ہو؟“ وہ اس کے لہجے کی تھکن محسوس کرتی ہوئی دھیسے سے مسکرائی تھی۔ ارادہ

ناید اس کی کسی قدر دل جوئی کا تھا مگر اس جانب کیسے کیسے نیچے نہ اڈھڑے گئے تھے۔ مرو تا ایک مسکراہٹ

ہوں پر لاتے ہوئے انداز قدرے خوش گوار اختیار کیا تھا۔

”آف کورس۔۔۔ موسم بہت خوب صورت ہے۔“

”مگر مجھ سے زیادہ نہیں، ہے نا؟“ لامعہ کھلکھلائی تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔“ جھوٹ بولنا کسی قدر محال لگا تھا۔ مگر جیسے لامحالہ خلاصی کرائی تھی۔

”سنو۔“ لامعہ نے ایک بار پھر اسی چاشنی سے پکارا تھا۔

”ہوں۔“ ادھر انداز سرسری تھا۔

”سیٹ بیٹ باندا ہے نا؟“ لامعہ کے لہجے میں کتنی فکر تھی۔

”ہاں۔۔۔“ ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

”اوکے۔۔۔ دین ڈیویڈ کیسے فلی۔“ نصیحت کی تھی۔ ”آئی ایم ویٹنگ فور یو۔۔۔ دھیسے سے

مضمون خاص کہا تھا مگر اس جانب سے فقط ”اوکے“ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

گاڑی فورم کے سامنے روکتے ہوئے اسے اندازہ نہ تھا کہ لبرٹی میں لامعہ کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا۔

شاید تھی اسے سامنے پا کر یکدم اپنے اندر سے اٹھتی ہوئی سرشاری کو دبانہ نہ سکا تھا۔

اسکاٹی بلیو شیفون کے جدید تراش خراش کے ملبوس میں وہ آج بھی جیسے ایک چادو تھی۔ وہ جمیل آنکھیں

تھی۔ شاید ان کے ہاں رسما ماں کو مائی اماں بلایا جاتا تھا اور وہ لاشعوری طور پر ان سب رسوں کو تو

رہی تھی۔ ان رشتوں کو قبول کر رہی تھی۔

”چلو اٹھو۔۔۔ فوراً فریش ہو جاؤ۔ میں سبٹیکن حیدر سے کہہ دیتی ہوں، وہ تمہیں کہیں با؛

جائے۔“

”نن۔۔۔۔۔ نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔“ میرب سیال نے ایک لمحے میں نفی کرتے ہوئے سر ہلا

ذہنی طور پر وہ پہلے ہی بہت ڈسٹرب تھی اور مزید کوئی پریشانی مول لینا قطعاً نہیں چاہتی تھی۔ اور

سبٹیکن حیدر لغاری کے ساتھ کہیں جانے کا مطلب تھا اپنے لئے ایک نیا دروس ڈھونڈنا۔ سو اس۔

اماں کے اس فیصلے کو ایک لمحے میں رد کیا تھا۔

مائی اماں نے اسے بغور دیکھا تھا۔

”سبٹیکن حیدر سے کوئی شکایت ہے تمہیں؟“

”نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔ میں بس آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے دھیان ان کی سمت

ہٹاتے ہوئے کہا تھا اور تب مائی اماں اس کے چہرے کو ہولے سے تھپکتے ہوئے اٹھی تھیں اور باہر نکل

تھیں۔

اور اس کے بعد میرب سیال کتنی دیر تک لٹنی خالی خالی نظروں سے چھت کی سطح کو گھورتی چلی گئی تھی

مکمل ادراک تھا اسے۔ وہ تمام صورت حال مکمل طور پر ”اختیار“ میں رکھنا چاہتا تھا۔ مگر ایک

اختیاری، اس کی جان نہیں چھوڑ رہی تھی۔ جانتا تھا وہ کچھ بھی ممکن نہیں مگر وہ بے ارادہ اٹھتے ہوئے قدر

کورک نہیں پارہا تھا۔ وہ جب بھی سامنے آتی تھی، پہلے سے زیادہ مشکل میں ڈال جاتی تھی۔ جان

سے بھی زیادہ مشکل میں گھر جاتی تھی۔ جانے کیا جادو تھا ان شرعی آنکھوں میں، جانے کیسے بھید تھے

آنکھوں کے۔ دیکھتی تھی تو بے خود سا کر جاتی تھی۔

جیسے وہ سب اختیار رکھتی ہو، سارے مشر از بر تھے، اسے اپنے بس میں کرنے کے۔

کیسی عجب تھی وہ۔

کیسی عجب تھیں وہ آنکھیں۔ اور وہ خود۔!

ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے گاڑی کا گیسر بدلا تھا۔ اپنی بے بسی پر بڑا غصہ بگ

تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا یا اس نے خود کو سمجھانے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ کئی بار

کرایا تھا مگر لاکھ سمجھانے پر بھی افاقہ قطعاً نہ ہوا تھا۔ وہ سامنے آتی تھی اور سارے منظر اپنے رنگ با؛

لیتی تھی۔

شہر کی سڑکوں پر اس وقت خاصی رونق تھی۔ شام کا وقت تھا، موسم بھی دلربا تھا۔ بوند اباندی

رہی تھی۔ تمام منظر ہیگ رہا تھا۔ مگر اس کے اندر وہی دو آنکھیں جھانک رہی تھیں۔

سیف الملوک جیسی۔

آج بھی اتنا ہی فسوں طاری کر رہی تھیں۔ وہ سارے رنگ آج بھی اسی طور اپنے حصار میں باندھ رہے تھے۔ لامعہ نے فرنٹ ڈور سیٹ سنبھالی تھی جبکہ وہ بہت آہستگی سے پیچھے کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ لہجہ تو تمہارا بڑا بجا بجا سا لگ رہا تھا۔ ٹھیک تو ہوتا؟“ لامعہ نے اسے سامنے سے سرے سے حال دریافت کیا تھا۔ وہ گاڑی سردس روڈ سے نکالتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”کچھ تھکن ہو گئی تھی۔ مگر اب بہتر ہوں۔ تمہیں دیکھ لیا ہے نا۔“ نگاہوں میں کسی قدر شوخی بھر کر فرمایا گیا تھا۔ لامعہ اسے دیکھتی ہوئی مسکرائی تھی۔

”یو چیئر۔۔۔ خواجواہ مجھے پریشان کر دیا۔ تم سے بات کر کے میں مسلسل اتنا بیہ شاہ کے کان پر رہی کہ کہیں میں نے تمہیں خواجواہ ڈسٹرب تو نہیں کر دیا؟ اور تم ہو کہ کتنے فریش نظر آرہے ہو اس وقت بنورا سے دیکھتے ہوئے وہ بولی تھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیا تھا۔ بیک مرر سے ایک نظر پیچھے کے منظر پر ڈالتی تھی۔

”آئی ایم پرفیکٹلی آل رائٹ۔ بائے دی وے، یہ تم نے اتنی موٹی موٹی کتابیں کس لئے خرید لیں تمہارا دارماغ تو پہلے ہی خاصا کمزور سا ہے۔ کیوں ظلم کر رہی ہو اتنا اس پر؟“ بڑا شگفتہ سا مذاق ہوا تھا۔ لامعہ مصدوعی خنگی سے گھورنے لگی تھی، ساتھ ہی مسکرائی تھی۔

”شٹ اپ عرفنان علی خان! یہ میری نہیں، اتنا بیہ شاہ کی ہیں۔“

”اوہ۔۔۔ تمہی میں نے سوچا تمہارا ذوق کب سے اتنا عمدہ ہو گیا۔“ اس نے پھر چھیڑا تھا۔ ساتھ ہی ایک اچھتی سی نظر پیچھے کے منظر پر بھی ڈالی تھی۔

موسم سے قطع نظر، ہر طرف سے بے نیاز اس گھڑی، چاروں سمت سے آنکھیں چرائے ایک کتاب چہرے کے گرد پھیلائے وہ جیسے کسی خواب کی منتظر تھی۔ ”مصروفیت“ اگرچہ خوب تھی مگر عرفنان علی خان کی لبوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ پھیل گئی تھی جیسے وہ ان ”فرار لمحوں“ کا بھید پا گیا تھا۔ جیسے اس نے قصہ اختیار کی گئی مصروفیت کا بھید پالیا تھا۔ شاید وہ ان لمحوں میں جان بوجھ کر غافل رہنا چاہتی تھی۔

لامعہ ساتھ تھی، سو اس کی نگاہ کسی قدر محتاط تھی۔

”یہ تم فوراً گاڑی گھر کی طرف لے جا رہے ہو۔“ لامعہ نے اسے ٹوکا۔

”کیوں۔۔۔ تمہیں کہاں جانا ہے؟“ عرفنان علی خان نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

”تمہیں جلدی ہے کیا؟“ بڑے اختیار سے ڈپٹا گیا تھا۔ عرفنان علی خان نے مسکراتے ہوئے سر تسلیم فرمایا تھا۔

”جناب حکم کریں تو گاڑی اسی موڑ پر روک دوں اور تا عمر کھڑا رہوں۔“ سعادت مندی کی حد تھی۔ لامعہ مسکرائی تھی۔

”زیادہ بی بی بے نیچے مت بنو۔ اتنا بیہ شاہ بھی ساتھ ہے۔“

”اوہ، تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔“ عجب شرارت سی تھی لہجہ میں۔

”تمہیں اتنی بڑی، اتنی اہم میری دوست دکھائی نہیں دی؟“ لامعہ نے ڈپٹا تھا۔ ساتھ ہی مسکرا

رخ پھیر کر اتنا بیہ شاہ کی طرف نگاہ کی تھی۔

”دیکھو اتنا بیہ! یہاں تمہیں یکسر فراموش کیا جا رہا ہے اور تم ہو کہ منہ سے بول تک نہیں رہی ہو۔ کم از کم اتنی احتجاج ہی کرو۔“

اتنا بیہ نے کتاب نظروں کے سامنے سے ہٹا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

”مجھے معلوم تھا تم مجھے ڈی فنڈ کر لو گی۔“ دھیمے انداز میں مسکرائی تھی۔ ”مجھے پہلے گھر چھوڑ دو۔ ماما جان ہو رہی ہوں گی۔“ اس نے درخواست بالواسطہ کی تھی۔ اس کی مخاطب اس گھڑی فقط لامعہ ہی تھی۔

”تم بھی کتنی بورنگ ہونا۔ میں تو سوچ رہی تھی آس کریم کے لئے چلتے ہیں۔ اتنا خوب صورت موسم ہے۔ اور ایک تم ہو۔ کتنی بڑھی روح ہے نا تم میں۔ اس موسم میں بھی اتنی خشک کتاب میں سردیے ہو۔ کم از کم ان بھگتے منظروں کو ہی ایک نظر دیکھ لو۔ وجود میں یل میں ایک تو نائی سی بھر دیتے ہیں یہ تم۔ اور تم ہو کہ۔“ لامعہ حق نے پُر افسوس انداز میں سر نیٹی میں بلایا تھا۔

عرفنان علی خان نے ایک نظر پیچھے کی طرف ڈالی تھی۔ نگاہ لہجہ بھر کو ملی تھی مگر دوسری نگاہ اسی قدر بے تاثر رہی۔ ”ابجی ہو گئی تھی۔“

”عرفنان! مجھے تم بعد میں چھوڑ دینا، پہلے اتنا بیہ کو چھوڑ دو۔“ لامعہ حکم صادر کر کے سیدھی ہوئی تھی اور ن بورڈ پر دھری کپٹس دیکھنے لگی تھی۔ چند لمحوں کی چھان پھنگ کے بعد اس نے ایک کیسٹ اٹھا کر پلیئر ڈال دی تھی۔

جے ٹوں اکھیاں دے سامنے نہیں رہنا!

تے بی با ساڈا دل موڑ دے!

جے ٹوں اکھیاں دے سامنے نہیں رہنا!

تے بی با ساڈا دل موڑ دے!

استاد نصرت فتح علی خان کی آواز اطراف میں پھیلتی ہوئی سارے ماحول کو اپنے سنگ باندھ گئی تھی۔ ہزاروں ساہونے لگی تھی۔ جان مشکل میں گھرنے لگی تھی۔ مگر وہ جادو سا پیکر اسی طور خائف تھا۔

جے ٹوں اکھیاں دے سامنے نہیں رہنا!

تے بی با ساڈا دل موڑ دے!

جے ٹوں اکھیاں دے سامنے نہیں رہنا!

تے بی با ساڈا دل موڑ دے!

اندر باہر قیامتیں ہی قیامتیں تھیں۔ مگر بظاہر وہ خود پر مکمل اختیار قائم کئے ان تیزی سے بھگتے ہوئے بڑوں والے راستے پر گاڑی دوڑائے جا رہا تھا۔

سید اذہان حسن بخاری بہت تھکن زدہ سا گھر پہنچا تھا، جب اگینے می کے پاس اسے بیٹھی دکھائی دی۔

”آپ یہاں؟“ تھکن زدہ چہرے پر مسکراہٹ یقیناً بہت مشکل سے آئی تھی۔

وہی حیثیت رکھتی تھیں جو عزیز کے لئے۔ بچپن سے ان کے گھر آتا جاتا تھا۔ وہ انہیں کسی خاص حوالے میں بلا تا تھا۔ بس فقط ”اگینے“ کہتا تھا۔

”آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں اگینے؟“ اسے بغور اپنی طرف تکتا پا کر بولا۔ اگینے نے اسے خاموشی سے ماتھا، پھر دھیسے سے گویا ہوئی تھیں۔

”تم مجھے اجنبی خیال کرتے ہو اذہان حسن بخاری؟“

”کیوں؟“ آپ کو کیونکر لگا؟“ وہ قدرے چونکا تھا۔ وہ جو اب خاموشی سے چہرے کا رخ پھیر گئی تھی ملازم چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لے کر آ گیا تھا۔ وہ دونوں لمحہ بھر کو خاموش ہی رہے تھے نے چائے بنا کر کپ اس کی سمت بڑھایا تھا، ساتھ ہی مسکرائی تھیں۔

”جب میں شادی کر کے گئی تھی تو تب تم نجیف و کمزور سے نوعمر لڑکے تھے۔ تب تم فقط ایک چمچ لشکر تھے۔ میں نے اسی انداز سے شکر ملا دی ہے۔ یقیناً تمہارا ٹیسٹ اب بھی دیا ہی ہو گا۔“ قیاس بہت تھا۔ وہ دھیسے سے مسکرا دیا تھا۔ کپ تھام کر لبوں سے لگایا تھا، ایک سب لیا تھا، پھر دوبارہ اگینے کو اتھا۔

”آپ کچھ کہہ رہی تھیں؟“ سلسلہ کلام وہیں سے جوڑنا چاہا تھا۔ اگینے کے شکستہ چہرے پر یکدم ہی کی پھیل گئی تھی۔ وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔ پھر سر جھکا کر کپ سے اٹھنے والے دھوئیل کو لگی تھیں۔

”سعد بھائی نے یقیناً اچھا نہیں کہا۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن مجھے افسوس اس بات کا بھی تم نے مجھے اس ضمن میں کچھ نہیں بتایا۔ آج آئی ہوں تو بھائی سے علم ہوا۔“

سید اذہان حسن بخاری کے چہرے کا تناؤ جو کسی قدر معدوم ہوا تھا اب پھر اسی صورت دوبارہ موجود پھرے کی رگیں کسی قدر تن گئی تھیں اور وہ خاموش ہو کر بے تاثر انداز میں چائے کے سب لینے لگا تھا۔ لوکی قدر افسوس ہوا تھا۔ تبھی دھیسے سے بولی تھیں۔

”آئی ایم سوری۔“

سید اذہان حسن بخاری چند ثانیوں تک کچھ نہیں بولا تھا۔ دونوں چپ چاپ چائے کے سب لیتے رہے اگینے شاید اس گھڑی خود کو مجرم محسوس کر رہی تھیں۔ تبھی خاموشی سادھ لی تھی۔ جبکہ اذہان حسن بخاری بہت مختلف تھی۔ شاید اسے صورت حال کا اندازہ تھا تبھی وہ دھیسے سے مسکرایا تھا۔

”آپ سنائیے۔۔۔ کیسی ہیں؟ شوہر نامہ کیسے ہیں آپ کے؟ ساتھ نہیں آئے آپ کے؟“ رسمی قسم راہٹ کے ساتھ رسمی گفتگو کا آغاز ہوا تھا۔ اگینے نے اسے دیکھا تھا، پھر دھیسے سے مسکادی تھیں۔ سب کچھ اپنی جگہ، مگر تم بہت بدل گئے ہو۔“ بغور تجزیہ کرنے کے بعد کہا گیا تھا۔ ”بہت ذمے دار ہو۔ بڑے لگنے لگے ہو۔“ قصد مذاق ہوا تھا۔

بڑا ہونے لگا تو گیا ہوں اور آپ.....“ جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ اس کی ویسی کی ویسی ہوں۔“ وہ دھیسے سے مسکرائی تھیں۔ وہ بغور تکتے لگا تھا۔ پھر پُر خیال انداز میں سر

”کیوں۔۔۔ میں یہاں نہیں آسکتی؟“ تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ یہ گھر میرے بڑے بھائی کا بھی ہے اور میں رشتے میں تمہاری پھوپھی بھی ہوں۔“ اگینے مسکرائی تھیں۔ مگر اس کے چہرے پھر عود کر آیا تھا۔ باب کے رشتے کے حوالے نے شاید اسے زیادہ خوش نہیں کیا تھا۔ فارحہ نے اسے اتھا، پھر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”نہیں امی! آپ بیٹھے۔“ اس نے ماں کے آرام کے خیال سے قصداً تعرض برتا تھا۔ فارحہ کر بیٹے کو دیکھا تھا۔

”صورت دیکھو اپنی۔ کتنی اتزی ہوئی ہے۔۔۔ میرا خیال رکھتے ہو، مجھے اپنا خیال نہیں کر گے۔“ انہوں نے مانتا سے شانے پر ہاتھ دھرا تھا۔ اگینے بغور دیکھتی ہوئی مسکرا دی تھیں۔

”آپ کی حد درجہ اسٹارٹس اور خوبصورتی کی وجہ آج سمجھ میں آئی ہے بھابی! آپ تبھی بچوں کی بجائے بڑی بہن دکھائی دیتی ہیں۔ اتنا خیال جو رکھتے ہیں بچے آپ کا۔“ سچ کلر کی تھریڈ ورک شیفون کی ساڑھی کا پلو شائے پر درست کیا تھا، پھر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”تم دونوں باتیں کرو، میں آتی ہوں۔“ کہنے کے ساتھ ہی فارحہ چلتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ اذہا بخاری کھویا کھویا سا ماں کی طرف تکتا چلا گیا تھا۔ اگینے نے بغور اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

”فارحہ بھابی بہت لگی ہیں۔۔۔ انہیں تم جیسا تا بعدار بیٹا خدا نے دیا ہے۔“

”نہیں۔۔۔ لگی میں ہوں، جو مجھے ان جیسی ماں ملی ہیں۔ یونو اگینے! میں می کے لئے کچھ بھی ہوں، کچھ بھی۔ مجھے ان کی آنکھ میں آنے والا ایک نی کا قطرہ بھی برداشت کرنا محال لگتا ہے۔“

”تبھی تو کہہ رہی ہوں، بھابی خوش قسمت ماں ہیں۔ ہر کسی کو اتنی نیک اور سعادت مند اولاد نکلے جبکہ والدین سارے ہی محبت کرنے والے اور اپنے بچوں کا خیال کرنے والے ہوتے ہیں۔“

سید اذہان حسن بخاری کچھ نہیں بولا تھا۔ خاموشی سے کوٹ اتار کر صوفے کی پشت پر دھرا تھا، کی ٹاٹ بھی قدرے ڈھیلی کر دی تھی۔ انداز خاصا تھکا ماندہ تھا، جیسے اس کے وجود پر برسوں کی محکم اگینے اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

”بہت تھک گئے ہو؟“

”نہیں۔“ وہ جو صوفے کی پشت پر سر دھرے، آنکھیں موندے ہوئے ہوئے لے کنپٹیوں کو دبا، یکدم ہی چونک کر آنکھیں کھولتا ہوا سیدھا ہو گیا تھا۔ البتہ بایاں بازو اب بھی صوفے کی پشت پر اپنے ذمے میں پھیلا ہوا تھا۔ اگینے نے فقط اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔ سید سعد حسن بخاری کی رشتے کی کڑا

وہ۔ خاندان ایک تھا۔ سو یہ کیسے ممکن تھا کہ خاندان میں ہونے والی کوئی بات پوشیدہ رہ پائی۔ وہ یقیناً اس اسٹریس کی وجہ سمجھ رہی تھیں مگر کچھ کہنا مناسب نہ جانا تھا۔ اگرچہ وہ عمر میں اس سے خاصی بڑی تھی

اس نے کبھی انہیں اپنے باپ کے حوالے سے نہ لیا تھا۔ عزیز اس کا بیٹ فریڈ تھا اور اگینے اس کا

ہلایا تھا۔

”ہوں..... آپ ویسی کی ویسی ہیں۔ بتایا نہیں آپ نے کب آرہے ہیں آپ کے صاحبزادی کے ساتھ۔“

”کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ دیکھو کب آتے ہیں۔ میں دیکھتی ہوں فارحہ بھابی کیا کر رہی ہیں اب آرام کرو، بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔“ کھڑے ہوتے ہوئے گویا ہوئی تھیں۔ پھر دوسرے چلتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔ سید اذہان حسن بخاری جانے کیوں اس سمت تکتا رہا تھا۔

سینٹی نے کہا تھا، خوشی کی ساری لاجک ہمارے اندر سے اٹھتی ہے۔ ہم سوچیں گے رہنا ہے تو ہم درحقیقت خوش رہ بھی پائیں گے۔ تم بھی خوشیوں کے متعلق سوچنا شروع کر دو اور وقت پر ڈال دو۔

اور اس نے خود کو وقت کے دھارے پر ڈال دیا تھا مگر اس کے باوجود جانے کیوں وہ خوش لاجک پر عمل نہیں کر سکتی تھی۔

”تم یونہی خائف ہو۔ بندہ تو خاصا پیئڈم ہے۔ نام کچھ لمبا چوڑا اور اولڈ فیشن ہے مگر با رب ہے۔ نام سمیت خاصا امیر ہو لگتا ہے۔ ہے نا؟“ سیف الرحمن نے چکن سینڈویچ کے بڑے بائٹ لیتے ہوئے بڑے دلچسپ انداز میں مسکراتے ہوئے میرب سیال کو دیکھا تھا۔ انداز کسی قدر تھا۔ مگر میرب سیال کو اس ”انکشاف“ سے کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی۔

سیف الرحمن بنا کسی پریشانی کے اسے مسلسل دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

”ویسے تمہیں اعتراض کس بات پر ہے؟ موصوف کے حد درجہ پیئڈم ہونے پر یا بے تحاشا ہونے پر؟“

”سینٹی! تم چپ نہیں رہ سکتے ہو؟“ میرب نے قدرے اکتائے ہوئے انداز میں سرسنتی میں ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

”میں بھی تو کام ہی کی بات کر رہا ہوں۔ ویسے کہیں ایسا تو نہیں کہ کہیں تم خود...“

”اب چپ کیوں ہو گئے ہو؟“ دیکھے بغیر تیزی سے غلم چلا تے ہوئے کہا تھا۔

”میرا بولنا بھی تو تمہیں اچھا نہیں لگتا۔“ سیف الرحمن نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے شکوہ کیا

وہ دھیمے سے مسکراتی تھی۔ ”چلو اٹھو فوراً۔ مجھے کچھ میزائل کلیٹ کرنا ہے۔“

وہ تیزی سے اٹھ کر کینے ٹیریا سے باہر نکل رہے تھے جب اس کے ایک کلاس میٹ نے مطلع کیا تھا کہ یہیں کے باہر کوئی اس کا ویٹ کر رہا ہے۔ اس نے بلا ارادہ سیف الرحمن کی طرف دیکھا تو وہ شوخی سے لڑکھائی کرتا تھا۔

موصوف ان پہنچے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ ایک پیپر پر اپنا تمام تر شیڈول لکھ کر موصوف سردار سنگھن حیدر لغاری کو تھا دو تا کہ انہیں کم از کم اس انتظار سے تو چھٹکارا مل جائے۔ وہ یقیناً سنجیدہ نہ تھا۔

”شٹ اپ سینٹی!“ وہ ہونٹوں پر در آنے والی مسکراہٹ کو ہونٹ بچھڑ کر دبا گئی تھی۔ مگر دل یکدم ہی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ مگر ان دھڑکنوں میں کوئی بھی آہنگ خاص نہ تھا۔ ایک ناگواری اور بندیدگی کا تاثر زیادہ غالب تھا۔

”سینٹی! تم یہیں ہونا۔ پلیز میرے ٹاپک سے ریلیٹیو میزائل نکال دینا۔“

”اوکے۔ اوکے۔ آئی کنفیڈر۔“ اس نے فوراً میرب سیال کا جملہ کاٹ کر کہا تھا۔ میرب سیال نے اسے ایک نظر دیکھا تھا، پھر بہت سست رو قدموں سے باہر نکل آئی تھی۔

میرب سیال کے نیم مردہ قدم جیسے بہ مشکل اس کے وجود کا وزن سہارے ہوئے تھے۔ اس نے بنا رادھ دیکھے پیچھے کا دروازہ کھول کر خود کو نشست پر ڈال دیا تھا۔ اسے یہ جانے کا قطعاً کوئی شوق نہ تھا کہ گے فرنٹ سیٹ خالی ہے یا کہ نہیں۔ وہ اپنا مقام جانتی تھی۔

سردار سنگھن حیدر لغاری نے آنکھوں پر سیاہ سن گلاسز چڑھائے، شیشے سے پیچھے کا منظر دیکھا تھا۔

میں پر سیاہ گلاسز ہونے کے باعث تاثرات کسی قدر محفوظ رہے تھے۔ میرب سیال نے نگاہ اٹھا کر منے کی زحمت نہیں کی تھی۔ نگاہ مکمل طور پر بے نیاز تھی، انداز لاطعلق تھا۔ وہ بیٹھ چکی تھی۔ مگر سردار سنگھن حیدر لغاری نے گاڑی آگے نہیں بڑھائی تھی۔

میرب سیال نے جانے کیوں اس گھڑی نگاہ اٹھا کر اس کی پشت کو دیکھا تھا۔

”تم آگے آکر بیٹھ سکتی ہو۔“ کسی قدر سپاٹ نے میں حکم صادر ہوا تھا۔

اس نے قدرے چونک کر نگاہ اس لمحے پہلی بار فرنٹ سیٹ پر کی تھی۔ ”خالی بین“ اس کے لئے کسی قدر ت کا باعث تھا۔ سردار سنگھن حیدر لغاری اس لمحے اس کا منظر تھا۔ میرب سیال نے چند ثانیوں تک

چاپ اس سمت دیکھا تھا، پھر بہت ہول سے دروازہ کھول کر وہ اترتی تھی اور سردار سنگھن حیدر لغاری کے ساتھ آن بیٹھی تھی۔

سردار سنگھن حیدر لغاری نے جانے کیوں چند ثانیوں تک اسی انداز سے خود کو روکے رکھا تھا، پھر یکدم

کی آگے بڑھا دی تھی۔ میرب سیال پہرے کارن مکمل طور پر موڑے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

کی میں خاصا سکوت تھا۔ اس دن والی بدھم سرگوشیاں نہیں تھیں۔

بس فقط خاموشی ہی خاموشی تھی۔

شاید ایسا اس لئے تھا کہ دونوں طرف سے یہ ایک جبری فعل تھا، ایک جبری عمل۔

وہ جانتی تھی اس اقدام کے لئے مائی اماں نے اسے اپوز کیا ہوگا۔ اور وہ نہ چاہتے ہوئے مجھ اقدام کو سرانجام دینے پر مجبور ہو گیا ہوگا۔ اور کس قدر برا لگتا ہے کبھی کبھی اپنا کسی پر مسلط ہونا۔ کسی کا چاہتی ہستی بننا، ناپسندیدہ فرد رہنا۔ بہت تکلیف دہ تھا یہ۔ یقیناً بہت بڑا اجر تھا یہ۔

وہ اسی طرح دم سادھے بیٹھی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری کی موجودگی، اس کی خوشبو چار سو پھیلی تھی اور یقیناً یہ بات اسے اس ماحول سے غافل نہیں ہونے دے رہی تھی۔

”مائی اماں بتا رہی تھیں آپ کچھ ڈسٹرب تھیں۔“ گاڑی کے پُرسکون ماحول میں یکدم اس کی آواہ ایک ارتعاش برپا کر دیا تھا۔ وہ یکدم چونکی تھی۔ نگاہ اس سمت کی تھی۔ شاید یقین کرنا چاہا تھا، مخاطب تھی۔ اس گھڑی سردار سبکگین حیدر لغاری بہ نفس نفیس اسی سے مخاطب تھا۔ میرب سیال کوئی انور سمجھا آیا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ شاید تھی اس نے فقط خاموشی سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

”ابنی پر اہلم؟“ اسی دن والا پوچھا گیا مختصر سا سوال اس نے اس بار پھر دہرایا تھا۔ میرب سیال اس کی جانب سے نگاہ ہٹائی تھی پھر بہت ہولے سے سرفنی میں ہلا دیا تھا۔

”سیال صاحب کیسے ہیں اب؟“ اس سے وابستہ اہم ترین شے کی مد میں پہلی بار دریافت کیا مگر کس قدر سرسری انداز تھا۔ لافلتنی کتنی واضح تھی۔ اس کے لئے اس کا تعلق معتبر تھا، مائی اماں معتبر تھیں اس کے لئے اس کے والد فقط سیال صاحب تھے۔ میرب سیال نے فقط سر ہلایا تھا۔ سردار سبکگین حیدر لب دوبارہ بھیج گیا تھا۔ شاید وہ بولنا چاہتا تھا، بات کرنا چاہتا تھا مگر شاید اسے مناسب الفاظ نہ مل تھے۔

میرب سیال نے اس صورت حال کو فقط خاموشی سے دیکھا تھا۔ وہ اس شش و پنج کو آج بھی سمجھ تھی۔ شاید جیسا وہ سمجھ رہی تھی، ویسا نہیں تھا۔ سب قیاس تھا۔

”ڈونٹ بی سکیئر۔ انشاء اللہ سب اچھا ہوگا۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری کی آواز نے یکدم خیالات کی دنیا سے باہر لا پنچا تھا۔ ایک خفیف سی دل جوئی تھی شاید۔ ایک بہت دھانسو سا دلا سر تھا۔ سیال نے اس کی جانب نگاہ نہیں کی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری نے ایک نوازش اور کی تھی۔ گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روک دو آج کے دن کے پھر کچھ لمے اس کے نام ہونے جا رہے تھے۔ جبراً ہی سہی، کسی کے کہنے پر ہی سہی، پھر پابند تھا اسے چند لمے دینے کو، چند نوازشیں کرنے کو۔ میرب سیال اس کی جانب دیکھنا چاہتی تھی میں ہلانا چاہتی تھی، عمل طور پر انکار کرنا چاہتی تھی مگر ہمت جیسے ناپید تھی۔ وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ واقعی اس شخص میں اتنا رعب تھا یا پھر وہی حد سے زیادہ خود کو دباتی جا رہی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری نے اس کی جانب دیکھا تھا۔ اس نے بھی خاموشی سے نگاہ کی تھی۔ مقابلہ نگاہ میں کوئی خاص حکم تھا۔ وہ بہت ہولے سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتری تھی۔ وہ اس گھڑا کے مقابل تھا، ہمراہ تھا، ہم قدم تھا۔ مگر اندر کوئی احساس سرشاری نہ تھا۔ شاید کہیں سے کوئی ستاشی ٹا رہی ہو، کوئی نظر کہیں سے سراہ رہی ہو، کوئی حسد بھرا جملہ کہیں سے ابھرا ہو، کوئی تعریفی فقرہ کسی لب۔

جانے کتنی نظریں بے ارادہ اٹھی ہوں۔ مگر میرب سیال کو خبر نہ تھی۔ شاید وہ خبر رکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کہنے کو سب اس کا تھا، ہر شے پر قادر تھی وہ، مکمل دسترس میں تھا سب کچھ۔ وہ کہنے کو مختار کل تھی، ہر شے پر استحقاق رکھتی تھی مگر وہ جانتی تھی یہ سب فقط ایک خواب کی صورت تھا۔ سب کچھ گمان کی صورت تھا رقیقت کچھ نہ تھی۔

”اب کیسا لگ رہا ہے سب کچھ؟“ وہ اپنے ہی خوابوں اور خیالوں میں گم تھی جب سردار سبکگین حیدر اری نے آواز کا ایک ٹکڑا پھینک کر اس کی ساری دنیا میں اچھل سی چا دی تھی۔ اس نے بے طرح چونک کر بیٹھا تھا۔ وہ بخور اس کی سمت دیکھ رہا تھا، اس کے متوجہ ہونے پر وہ آنکھوں میں کوئی تاثر خاص دیئے بغیر ررے دھیسے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”ہاؤ آر یوفیلنگ ناؤ؟“ وہ ایسے دریافت کر رہا تھا جیسے اس کی توجہ کے چند لمحوں نے میرب سیال کی ندگی میں عجب انقلاب برپا کر دیا ہو۔ وہ ایک پل میں کوئی عظیم تاریخ مرتب کر گیا ہو۔ میرب سیال پر اس نے کوئی عظیم احسان کر دیا ہو۔ اس کا دل چاہا تھا وہ خوب زور سے ہنسے اور اس کے سارے خواب پل میں سمار کر دے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ فقط سر کو ہولے سے آگے پیچھے ہلا دیا تھا اور اس احسان کو پل میں ابر کر دیا تھا۔ سردار سبکگین نے اسے لمحہ بھر کو خاموشی سے دیکھا تھا پھر ہولے سے گویا ہوا تھا۔

”میرب سیال! مائی اماں چاہتی ہیں کہ تم اپنا خیال رکھو، خود کو پُرسکون رکھو۔“ بھاری لہجے میں عجب رمانش تھی۔

”اور تم — تم کیا چاہتے ہو؟“ ایک ننھا منسا سوال یکدم دل میں ابھرا تھا مگر لمبوں پر قطعاً نہ آیا تھا۔ میرب سیال نے اسے فقط خالی خالی نظروں سے جواباً دیکھا تھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا، جانے کیسا ہمدرد تھا اس کا کہ جس کے لہجے میں کوئی اپنائیت نہ تھی۔ جس کے انداز میں کوئی تاثر کسی پہچان کا نہ تھا۔ اس برف جیسے سرد لہجے میں کہیں کوئی خاص گرم جوشی نہ تھی۔ کہیں کوئی ہلکی سی چاشنی نہ تھی۔ کوئی ذرہ برابر کیر نہ تھی اور وہ کیا چاہتی تھی؟ اس نے ایک گہری سانس خارج کر کے چہرے کا رخ موڑ لیا تھا۔

سردار سبکگین حیدر لغاری نے اسے بخور دیکھا تھا۔

”ایوری تھنگ از دی پارٹ آف لائف۔ یو وٹڈ کنڈیرا،“ کتنی اہم باتیں تھیں۔ کس درجہ خاص معنی تھی ہو سکتے تھے اگر انداز بھی اسی قدر خاص ہوتا۔

واقعی — فقط لہجے بات کی اہمیت کو کتنا بدل دیتے ہیں۔ الفاظ کچھ نہیں ہوتے۔ زندگی انہیں لہجے بنتے ہیں، اپنے مختلف جذبات و احساسات کے ساتھ۔ وہ اسی طرح خالی خالی نظروں سے سردار سبکگین حیدر لغاری کی سمت تکتی چلی جا رہی تھی اور وہ جانے اس لہجے کیا سمجھا تھا۔ تھی اپنے سپاٹ ترین لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”کیا تم جانا چاہتی ہو وہاں؟“

”کہاں؟“ اس کے لب بہت ہولے سے ہلے تھے۔ شاید وہ سمجھ نہیں سکتی تھی، وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا یا کیا کہنا چاہتا تھا۔



دل

ہوئے دعوت دی گئی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری لب بھیج گیا تھا۔

”اوں ہوں۔۔۔ آج نہیں، میں تمہیں کھوٹ کٹ کر دوں گا۔“ دھیسے لہجے میں قدرے گریز پائی تھی۔ شاید وہ نازنین اشارہ سمجھ گئی تھی بھی مسکرائی تھی۔

”اوکے، بھول نہ جانا۔“ ایک شگفتہ سی سرگوشی کی تھی اور پھر اسی شگفتہ سی مسکراہٹ کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے والٹ جیب سے نکال کر ایک خطیر رقم ٹیبل پر دھری تھی، پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اشارہ اٹھنے کا تھا اور وہ تو پہلے ہی منتظر تھی۔ فوراً ہی اٹھی تھی اور اس کے ہمراہ چل پڑی تھی۔ مگر قدم سن سن بھر کے ہو رہے تھے۔ چال میں ایک تھکن بے حد واضح تھی۔

اسے خود سے گفتگو کرنے کا خط کبھی نہ رہا تھا۔ اسے خود کلامیوں سے شغف بھی کبھی نہیں ہوا تھا۔ مگر اب جیسے اس کے لئے ہر شے کے معنی بدل گئے تھے۔

ہر بات کا مفہوم بدل گیا تھا۔

کتنی باتوں کے مفہوم بدل دیئے تھے۔

وہ ہمیشہ سے ایک خالی گھر تھا۔

مگر اس نے اس ”خالی پن“ کا شدید ترین احساس دلایا تھا۔ اس ”خالی پن“ کی اہمیت کو دو چند کر دیا تھا۔

اس وقت اس کی اس روز والی کتاب اس کے ہاتھ میں تھی جو شاید وہ جلدی میں اس کی گاڑی میں ہی بھول گئی تھی۔ عرفان علی خان کتنی دیر تک اس کتاب کو ہاتھ میں لئے اس کے لمس کو محسوس کرتا رہا تھا۔

دانتہ اس کی موجودگی کو تلاش تھا۔ دانتہ اس لمس کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ بے خودی کا یہ لہجہ کتنا پُر کیف تھا، عرفان علی خان کو اس کا اندازہ اس طور پر آج ہوا تھا۔ اس نے، اس کی زندگی کو واقعی اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔

کچھ اپنے جیسا کر لیا تھا۔

”مسٹر عرفان علی خان! بہت برے پھنسے ہو تم تو۔۔۔ کچھ زیادہ ہی اسٹوڈنٹس بن گئے؟“ دایاں ہاتھ منہ پر پھر کے پُر خیال انداز میں سوچا تھا۔ پھر جانے کیوں مسکرایا تھا۔

”اُس انف مسٹر عرفان علی خان! انف۔ انف۔“ اندر سے یکدم ایک آواز ابھری تھی اور اس کے چہرے کے تاثرات یکدم بدل گئے تھے۔ یقیناً یہ اس کی راہ نہیں تھی۔ اسے اس جانب سفر نہیں کرنا تھا۔

اس طرح سوچنا بھی نہیں تھا۔ اس سے قبل بھی تو کئی بار باور کرایا تھا خود کو۔ مگر دل تھا کہ مانتا ہی نہ تھا۔

تاروں بھرے کھلے آسمان کو دیکھتے ہوئے وہ کتنی دیر تک اس ایک خیال کو سوچتا رہا تھا۔ موسم میں ٹھنڈک کا عجب بڑھ گئی تھی ان دنوں۔ اس کے سامنے کافی کا بھاپ اڑاتا کپ تھا۔ جانے کس خیال کے پیش نظر

”نیو یارک۔۔۔ سیال صاحب کے پاس، ان کی خیریت دریافت کرنے کے لئے؟“ وہ نظر گھڑی اس پر تھیں۔ وہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا مگر کوئی خاص بات کہیں نہیں تھی۔ بڑا بے

تھا۔ بڑا پھیکا انداز۔ اسے لگا تھا جیسے وہ کوئی ریلوٹ ہو، کوئی مشینی انداز کا انسان جس کے اندر کسی کی، کسی احساس کی کوئی رشتہ نہ ہو اور جو کسی انسانی قاعدے قانون سے سرے سے واقف ہی نہ ہو۔

میرب سیال نے بہت ہولے سے سرنفی میں بلایا تھا اور نگاہ جھکا گئی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری لب بھیج گیا تھا۔ کچھ لمبے اسی خاموشی میں گزرے تھے۔ پھر وہ قدرے توقف سے گویا ہوا تھا۔

”اگر آپ جانا چاہیں تو یہ ناممکن نہیں ہے۔ ہماری خدمات حاضر ہیں۔ دراصل مائی اماں آپ دیکھنا چاہتی ہیں۔ انہیں آپ کی بہت فکر ہو رہی ہے۔ آپ سوچ لیجئے، جانا ہو تو بتا دیجئے گا۔“ فطرت رکھاؤ لہجے میں عود کر آیا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر کے لئے بھی شاید یہ ایک نٹھن مشت تھی۔ میرب سیال

کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اس ٹیبل سے فقط اس کے اٹھنے کی منتظر تھی۔

”ارے۔۔۔ سبکتگین! تم یہاں؟۔۔۔ وہاں اے پلیزینٹ سر پرائز۔“ ایک بہت کھلکھلائی آواز سامعوں سے یکدم کمرائی تھی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ اُس رات پارٹی والی لڑکی اس لئے سبکتگین حیدر لغاری کے بے حد قریب تھی۔ وہ بھی اس کی جانب متوجہ تھا، آنکھوں میں یکدم ہی چمک

تھی۔ چہرے پر شگفتہ سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ اس گھڑی آس پاس سے یکسر بے خبر تھا۔

”اتنے دن سے کہاں غائب ہو تم؟۔۔۔ یا پھر دانتہ بھاگ رہے ہو۔ کہیں توجہ کا مرکز بدل تو گیا؟“ کھلکھلاتا ہوا لہجہ اس گھڑی دریافت کر رہا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری کے کیونوں کے رنگ حد دل فریب سہی مگر اس کی نگاہ منظروں سے کتنی جلد اکتا جاتی ہے، یہ بات سب پر منکشف تھی۔ شرارت۔ لہجے میں انکشاف تھا کوئی مگر وہ برابر مسکرا رہا تھا۔

”پھیکے، بے رنگ منظر اس نگاہ میں چتے نہیں۔ جانتے ہیں بھی مگر اب ایسی بھی کیا گریز پائی۔“ شکوہ تھا اس نازنین کے لہجے میں۔ پُر شوق نگاہ میں کسی چمک تھی۔

میرب سیال چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”کم آن تزئین! میں آؤں گا کبھی۔“ سردار سبکتگین حیدر قدرے دھیسے لہجے میں لیوں پر شگفتہ مسکراہٹ سجائے عذر دے رہا تھا۔

”کچھ مصروفیت رہی پچھلے دنوں؟ تبھی کسی طرف کا ہوش نہیں رہا تھا۔“ وہ ماہِ رُخ بہت پُر شکوہ نظر سے دیکھتے ہوئے لب بھیج گئی تھی۔ دونوں کو اس کی موجودگی کا احساس قطعاً نہ تھا یا پھر وہ اس بات کا اعتراف کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

”تم تو ہمیشہ ہی مصروف رہتے ہو سردار سبکتگین حیدر لغاری!“

”اب کیا سارے شکوے اسی ٹیبل پر کھڑے کھڑے کرو گی؟“

”نہیں۔۔۔ شام میں کنٹری کلب جانا ہے، میں پارکر کے لئے نکلی تھی۔ بھوک نے ستایا تو یہاں آئی۔ اندازہ نہ تھا تم سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ مل رہے ہونا پھر آج شام؟“ ایک اداس مسکرا

اس نے کپ کے بیرونی کناروں پر شہادت کی انگلی کو ہونے سے پھیرا تھا۔

جب بھی تم سے ملا ہوں میں یکسر

ایک لڑکی لگی تھی ہو تم!

ایک سپ تلخ، ایک سپ شیریں

میری کافی میں کھل گئی ہو تم!

اپنی ہی دیوانگی سے پُر مدہم سرگوشی خیالوں میں گونجی تھی اور وہ لب بچھنے بچھنے اس لمحے جیسے خود پر مسکاتا تھا۔

”ہاؤ اسٹو پڈ یو آر مسٹر عرفان علی خان! کہاں کے مجھوں بننے چلے ہو تم؟“ کہاں کے رونا پال لینے کی خو ہے؟ خرد مند کی کا دامن چھوڑے کس دیوانے دیس بھاگے چلے جا رہے ہو؟“

اندر سے ایک آواز اٹھی تھی اور اس سے قبل کہ خرد مندی اس دلیل کو قبول کرتی، دل بہت پُر زور اند میں لٹی کرتا چلا گیا تھا۔

”جانتا ہوں، مانتا ہوں، ساری حقیقت منکشف ہے خرد پر۔ مگر دل کو بہلانا آسان تو نہیں۔ نہ مانے کیا کروں؟“

عجب دیوانگی اختیار کئے وہ اس گھڑی آسمان کی سمت نکلے جا رہا تھا جب اس کے پرسنل سیل کی رنگ ٹون نے اس کی سوچوں کے تسلسل کو یکدم ہی توڑ دیا تھا۔ اس نے اسکرین پر نگاہ کی تھی، کوئی اجنبی نمبر تھا عرفان علی خان نے کال پک کر لی تھی مگر ایک مانوس آواز سن کر وہ حیران رہ گیا تھا۔

”جیلو، مسٹر عرفان علی خان۔ آپ سن رہے ہیں نا؟ میں انابیہ شاہ بول رہی ہوں۔“ شاید اسے باور کرانے کو وہ ایک بار پھر بولی تھی۔

”آپ کون کر بندہ کھو سکتا ہے، سو نہیں سکتا۔ آپ بولتی رہے۔“ فطری شوخی ایک لمحے میں عود کر آئی تھی۔ انابیہ شاہ جس نے کسی خاص مقصد کے تحت فون کیا تھا، لمحہ بھر کولب بھینچ گئی تھی۔ موصوف خاص میڈیا

کھیر تھے اور اس کی یقیناً شامت ہی آئی تھی جو اس نے ”آئیل مجھے مار“ کے مصداق اسے فون کر لیا تھا۔

”مسٹر عرفان علی خان! دراصل میری کچھ ضروری کتابیں شاید آپ کی گاڑی میں رہ گئی ہیں۔ میں سمجھا تھی لامعہ نے انہیں لے لیا ہو گا مگر اس سے رابطہ کیا تو اس نے انکار کرتے ہوئے آپ کا نمبر تھا دیا۔ کیا میں تلی کروں کہ میری کتابیں آپ کی گاڑی میں ہی ہیں؟“

”آں۔ اچھا، تو وہ اسٹف آپ کا تھا۔“ بے خبری کا یہ انداز بڑا مضحکہ خیز تھا۔ مگر عرفان علی خان کے لبوں پر اس گھڑی بدستور بڑی دھیمی مسکراہٹ تھی۔

”اوہ۔۔۔ آئی سی۔ میں بھی سوچ رہا تھا یہ کون کوئی سقراط، بقراط اسے میری گاڑی میں رکھ گیا لامعہ حق کے پاس تو سرے سے دماغ ہے ہی نہیں۔ وہ یقیناً ایسی غلطی کبھی نہیں کر سکتی۔“ وہ موصوف شاہ

بات کو بے وجہ طول دینے میں ماہر تھے۔ انابیہ شاہ نے ایک گہری سانس خارج کی تھی پھر مروتا لہجے کا قدرے خوشگوار کیا تھا۔

”بہت شکریہ مسٹر عرفان علی خان! بہت مشکور ہوں گی اگر آپ انہیں لامعہ حق تک پہنچادیں۔“

”آپ تک کیوں نہیں؟ چیز تو آپ کی ہے۔“

”اس تک پہنچ گئی تو سمجھئے مجھ تک پہنچ گئی۔“ خاصا لیا دیا انداز تھا۔ عرفان علی خان نے محسوس کیا تھا،

اس دن کے بعد سے اس کے انداز میں ایک واضح کچھو کچھو تھا۔ اس سے قبل کسی قدر لگی لپٹی مروت تھی مگر جس

دن وہ اسے پی سی میں ملی تھی، اس کے بعد سے ایک عجیب سی بھجک، ایک گریز رویے میں در آیا تھا۔ شاید

وہ دانستہ ایسا کر رہی تھی۔

”آر یوسٹنگ می عرفان علی خان؟“ اس کا کوئی رسپانس نہ پا کر وہ دوبارہ گویا ہوئی تھی۔ عرفان نے

ایک گہری سرد قسم کی سانس خارج کی تھی۔

”نہیں۔۔۔ آئی ایم لستنگ یو۔“

”اوکے۔۔۔“ اس نے شاید دوسری سمت سے فون بند کرنا چاہا تھا، جب بہت ہولے سے اس نے

پکارا تھا۔

”انابیہ شاہ!“

”ہوں۔۔۔؟“ وہ بری طرح چونکی تھی۔

”آج آپ نے آسمان دیکھا؟“ عجب سوال تھا۔ شاید اسے خود اندازہ نہ تھا۔

”جی۔۔۔؟“ انابیہ شاہ کی حیرت یقینی تھی۔

”آپ کو دیکھنا چاہئے۔۔۔ آج چاند آسمان پر ہے۔ میلوں کی، صدیوں کی دوری پر۔ مگر اس

دوری، مجبوری میں بھی نگاہ اسے صاف دیکھ رہی ہے۔ دید کا عالم بدلنا نہیں ہے، شوق تھا نہیں ہے۔ کچھ اور

سوا ہو گیا ہے۔ جنوں اور بھی بڑھ گیا ہے۔“ اس کا لہجہ دھیمہ تھا۔ بالکل خود کلامی سا۔ جیسے وہ اس گھڑی مدہم

سرگوشیوں میں اس لمحے خود اپنے آپ سے مخاطب ہو۔۔۔ بے خودی عروج پر تھی مگر دوسری جانب کوئی

کھلکھا کر ہنس دیا تھا۔

”اس ٹوچ عرفان علی خان! آپ کا مزاج تو خاصا شاعرانہ سا ہے۔ اور آپ فرما رہے تھے کہ

آپ کو کتابوں سے کوئی شغف نہیں۔ حیرت انگیز۔ لیکن سیں، بہت برے پھنسنے ہیں آپ۔ لامعہ حق کو وہ اتنی

ان باتوں سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔۔۔ وہ تو کتابوں کے نام سے ہی الرجک ہے۔ کتنے مختلف مزاج ہیں

آپ دونوں کے۔ میں لامعہ حق کو سمجھاؤں گی کہ وہ اب کتابیں پڑھنا شروع کر دے۔ کیونکہ موصوف

خاصی ٹیلیکچر سیکل باتیں کرنے کے عادی ہیں۔“ وہ شاید دانستہ اس کی بات کو مذاق میں اڑا رہی تھی۔ عرفان

علی خان نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

”مجھے امید ہے آپ میری کتابوں کا اسٹف لامعہ حق تک پہنچادیں گے۔ بہت شکر گزار رہوں گی۔“

اور دوسرے ہی لمحے اس کی آواز کا سلسلہ سماعتوں سے جدا تھا۔

عرفان علی خان کتنی دیر تک اپنے پرسنل سیل کو تکتا رہا تھا۔ پھر جانے کیوں بہت ہولے سے مسکرا دیا

تھا۔

ہاکی آنکھوں کو دیکھا ہے؟ — پوچھا ہے وہ کیا چاہتی ہے؟ — کیا مرضی ہے اس کی؟ آپ پھر اس کی زندگی کی ڈور اس شخص کے ہاتھ میں سونپ رہی ہیں جس نے ایک بار پہلے اسے دنیا کے سامنے تماشاً کر دیا تھا۔ اس شخص کے فیصلے کی منتظر ہیں جس کے باعث ایک بار پہلے بھی ہم نقصان اٹھا چکے ہیں۔ می! آپ کیوں اسی غلطی کو ایک بار پھر دہرا رہی ہیں؟ — کیوں ایک بار پھر ماہا کے لئے مشکل کری ایٹ کر رہی ہیں؟ میں کم از کم اب کوئی فیصلہ ماہا کے خلاف نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے اس سب کا از الہ کرنا ہے، جو دنیا ہو چکا ہے۔ اب میں کسی کو ماہا کی زندگی سے کھیلنے کا موقع قطعاً نہیں دوں گا۔ مدہم لہجے میں کہا تھا مگر لہجے کی مضبوطی بے حد واضح تھی۔ فارحہ نے اسے خاموشی سے دیکھا تھا پھر اپنا ہاتھ بہت آہستگی سے اس کے مضبوط شانے پر دھر دیا تھا۔

”میں بات کرتی ہوں — تمہارے پاپا بھی ہیں وہاں۔ انشاء اللہ اب کچھ غلط نہیں ہوگا۔“ انہوں نے سہولت سے اسے روک دیا تھا۔ سید اذہان حسن بخاری نے خاموشی سے ماں کو دیکھا تھا۔ وہ ہلکی تھیں اور ہر اندر کی جانب بڑھ گئی تھیں۔

سید اذہان حسن بخاری نے بہت اچھے ہوئے انداز میں کوٹ اتار کر بائیں بازو پر دھرا تھا۔ اسی متصل انداز میں ٹائی کی ٹاٹ قدرے ڈھیلی کی تھی، اوپر کا بن کھولا تھا اور پھر لہجے صحیح کر ایک گہری سانس خارج کی تھی۔ شاید اندر کی بے چینی کو زائل کرنے کی ایک کوشش کی تھی۔

ماہا چلتی ہوئی اس کے سامنے آن کر تھی۔

”اپنے سامنے کھڑے لہجے چوڑے بھائی کو چند لمحوں تک خاموشی سے دیکھا تھا۔ پھر بہت آہستگی کے ساتھ آگے بڑھی تھی اور اپنا سر اس کے شانے پر دھر دیا تھا۔ سید اذہان حسن بخاری نے بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر دھر دیا تھا، کہا کچھ نہیں تھا۔

”بھائی! میں اب یہ تعلق دوبارہ نہیں چاہتی تھی۔ مگر پایا نے یہ ڈی سی ٹن لیا۔ بھائی! اب کے میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود آپ کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے یہ شادی نہیں کرنا ہے۔ مجھے وقت چاہئے، اپنے آپ کو اس ڈگر پر واپس لانے کے لئے۔ پھر اسی طور جینے کے لئے۔“ مدہم سسکی میں ایک گزارش تھی۔

اذہان حسن بخاری چند لمحوں تک اسی طرح کھڑا رہا تھا۔ پھر بہت ہولے سے اسے خود سے الگ کیا تھا اور اس کے چہرے کو بنور دکھا تھا۔ نمی آواز اور لہجے میں ہی نہ تھی، اس کی آنکھوں میں بھی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اپنا مضبوط ہاتھ بڑھا کر بہت ہولے سے اس کی آنکھوں سے اس نمی کو سمیٹا تھا، پھر بہت رسائیت سے گویا ہوا تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم فکر مت کرو، یہ بھائی ہے نا۔“ اس کے شانے کو تھامے شاید اسے کوئی دلاس دینا چاہ رہا تھا۔ مگر چہرے کی تپتی رنگیں صاف بتا رہی تھیں کہ اس کے اندر سوچوں کے زیر و بم کا سلسلہ نہ تھمنے والا ہے۔

”تم میرے لئے جا کر اچھی سی چائے بناؤ، میں ابھی آتا ہوں۔“ اس کے شانے کو ہولے سے تھپتھا

سید اذہان حسن بخاری نے گھر میں قدم دھرا تو مہمانوں کو دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ یاسر اور فیلی بھلا اب کیا لینے آئی تھی۔ ماہا کو اس طرح رنجیکٹ کر کے بھلا اب کیا نانا یا تعلق باقی بچا تھا۔ آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر تہمی تیزی سے فارحہ اس کے پاس آگئی تھی۔

”اذہان! یاسر اور اس کے گھر والے آئے ہیں — تمہارے پاپا بھی موجود ہیں۔“ دونوں خبریں حیران کن تھیں اس کے لئے۔ شاید تہمی وہ اسی طرح ساکت انداز میں ماں کی تکتے لگا تھا۔ وہ اس کی جانب دیکھتی ہوئی ہولے سے گویا ہوئی تھیں۔

”اذہان! وہ اپنے کئے پر شرمندہ ہیں۔ سب سے بڑھ کر یاسر ہے، جسے بے حد افسوس ہے۔ یہ اس لمحے ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر گھر والوں کے ہاتھوں مجبور کر دیا گیا۔ پھر صورت حال بھی تو ایسی تھی انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک گہری سانس خارج کی تھی اور پھر بیٹے کو بنور دیکھا تھا۔ اذہان بخاری خاموشی سے ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

فارحہ کے لب بہت ہولے سے ہلے تھے۔

”اذہان! تمہارے پاپا ان سے بات کر رہے ہیں۔ یقیناً اس گزرے لمحے کا کوئی تدارک نہیں۔ لہجہ واپس آ سکتا ہے نہ وہ عظمت۔ مگر یاسر انہیں قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے اپنی فیلی کا احساس دلایا ہے کہ ماہا کے ساتھ انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ یقیناً وہ اس سلوک کی مستحق نہیں تھی۔“

”اور پاپا۔۔۔؟“ اس نے مدہم لہجے میں کہا تھا۔ اور می دوسرے ہی پل خاموش ہو کر اس کی تکتے لگی تھیں۔ چند لمحوں تک وہ خاموش رہی تھیں۔ پھر بہت آہستگی سے گویا ہوئی تھیں۔

”اذہان! سعد بخاری تم دونوں کا دشمن نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے اگرچہ اچھا نہیں کیا۔ نے مجھے رُک پہنچانے کے ساتھ ساتھ نادانستہ طور پر بیٹی کو بھی نقصان پہنچایا ہے مگر یقیناً اس نے اس نہیں چاہا ہوگا۔ کبھی کبھی حالات و واقعات ہمارا ساتھ نہیں دیتے، ہمارے خلاف چلے جاتے ہیں۔ مگر میں ساری خطا ہماری ہی نہیں ہوتی۔“

وہ ایک بار پھر سید سعد حسن بخاری کی طرف داری کر رہی تھیں اور وجہ ناپید تھی۔ یا پھر اذہان بخاری ہی سمجھنے سے قاصر تھا۔

”آپ کیا چاہتی ہیں می؟ — کیا ماہا کا رشتہ دوبارہ ان لوگوں کے ساتھ جوڑنا چاہتی ہیں؟“ نے یکدم سوال کر کے می کو ساکت کر دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی سمت دیکھنے لگی تھیں۔ بھی وہ ایک گم سانس خارج کرتا ہوا بہت رسائیت سے گویا ہوا تھا۔

”می! پاپا چاہے جو بھی سوچ رہے ہوں مگر میں اب ماہا کے ساتھ مزید کوئی نا انصافی نہیں ہونے دوں گا۔ اگر ان لوگوں کو پہلے کوئی احساس ہوتا تو وہ رشتہ اس طرح ختم ہی نہ کرتے اور یہ یاسر کی عقل بھی کیا اچھا لگا ہے۔ آپ — می! آپ پھر اپنی بیٹی کا فیصلہ ایک پتہ چائیت کے حوالے کر آئی ہیں۔ پھر آہ خاموش نظروں سے کسی فیصلے کی منتظر پاپا کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ ماما کی رائے جانی ہے آپ نے؟“

کر وہ اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ عزائم یقیناً طے تھے۔ قدموں کی مضبوطی بتا رہی تھی کہ وہ فیصلہ کر اور اب فقط اس پر مہر ثبت کرنے جا رہا ہے۔ اندر سے آوازیں متواتر آرہی تھیں۔ مذاکرات کو جاری تھی اور ان آوازوں میں سید سعد حسن بخاری کی آواز کسی قدر نمایاں تھی۔

”دیکھیں، ہمیں اعتراض اس رشتے پر قطعاً نہیں ہے۔ یقیناً اس رشتے کی ڈور دوبارہ جڑ بھی سا مگر آپ لوگوں کا رویہ کسی قدر غیر ذمہ دارانہ ہے۔ آپ لوگوں کو سوچنا چاہئے تھا کہ اس میں تھ قطعاً کوئی نہیں ہے۔ یہ خالصتاً ہمارا نجی معاملہ تھا۔ اس میں آپ لوگوں کی کسی قسم کی کوئی مداخلت نہ چاہئے تھی۔ اب جبکہ خاصے دن بھی گزر چکے ہیں اور بات کی نوعیت بھی قدرے بدل چکی ہے۔ میں رشتے کی دوبارہ بات یقیناً خوش آئند ہے۔ کم از کم آپ لوگوں کو احساس تو ہوا کہ آپ نے کچھ غلط کیا۔“ سعد بخاری بڑی سہولت سے کچھ کہنے جا رہے تھے جب سید اذہان حسن بخاری نے کمرے میں قدم دھر دیئے تھے۔

فارحہ نے یکدم اس کی سمت دیکھا تھا۔ آنکھوں میں اچانک ہی ایک استعدا عود کر آئی تھی۔ سے کوئی نصیحت کی تھی، کوئی درخواست کی تھی۔ مگر اس کے قدم تھمے نہیں تھے۔ وہ اسی قدر مضبوطی کرے کے عین وسط میں جا رہا تھا۔ سید سعد حسن بخاری اب بھی متواتر بول رہے تھے۔

”آپ نے اچھا کیا جو چلے آئے۔ غلطی بہت سے لوگوں سے ہوتی ہے مگر ہر ایک کو اپنی احساس نہیں ہوتا۔ یہ یقیناً آپ لوگوں کا بڑا پین ہے، جو بات چیت دوبارہ کرنے کو چلے ہیں۔ ہمیں آمد سے یقیناً خوشی ہوئی ہے اور یقیناً ان باہمی مذاکرات سے کوئی اہم پیش رفت ہوگی، کوئی نتیجہ سامنے آئیں گے۔ عقل اور دانشمندی کا تقاضا یہی ہے۔“

”جی ہاں۔ عقل اور دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنی سابقہ غلطیوں پر نظر کر۔ انہیں دوبارہ نہ دہرائے۔“ سید اذہان حسن بخاری نے ٹھوس اور مدلل انداز میں بات کو یکدم آگے تھا۔

سید سعد حسن بخاری نے بیٹے کی طرف چونک کر دیکھا تھا۔ فارحہ کی نظروں میں بھی ایک خوف تھا۔ یقیناً صورت حال اختیار سے باہر ہونے کو تھی۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ایک بار پھر باپ ا مد مقابل تھے اور ایسا ہی تو وہ نہیں چاہتی تھی۔ مگر سید اذہان حسن بخاری مضبوط لہجے میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ ”میں باور کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اتنے زور و شور سے اس ڈرائنگ روم میں بیٹھے کسی سیاسی نوعیت مذاکرات نہیں کر رہے کہ دھواں دھار تقریریں جھاڑی جائیں اور نتیجہ صفر پر رہے۔ یہاں موضوع کوئی خارجی مسئلہ نہیں، فقط ایک فرد ہے۔ کسی ملکی یا خارجی مسئلے پر بھی حکمران بات چیت کرنے بیٹھیں تو عوام کی خواہشات اور مرضی کے ایجنڈے کو اپنے مابین ہونے والے مذاکرات میں شامل رکھتے ہیں۔ لوگ تو پھر اس وقت ایک زندہ وجود کی بات کر رہے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس لمحے اس کی مرضی انداز کر دیا جائے؟“ بڑے ہی ٹھوس اور مدلل لہجے میں وہ اس گھڑی گویا تھا۔

سید سعد حسن بخاری بہت ناپسندیدہ انداز میں اس لمحے بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔

فارحہ اس لمحے بے یقینی کا شکار تھی۔ ساکت نظروں میں فقط سکوت تھا۔ مذاکرات کے لمحے آئے ہوئے مہمانوں کے تاثرات یکسر تبدیل ہو چکے تھے۔

ماحول میں اک سکوت سادہ آیا تھا اور یقیناً یہ سکوت کسی طوفان کا پیش خیمہ ہی تھا۔

فارحہ نے نظروں ہی نظروں میں بیٹے کو تنبیہ کی تھی، درخواست کی تھی مگر آج اس نے ہر درخواست رد کر دی تھی۔

”جو کچھ بھی ہو چکا ہے وہ ایک الگ بات ہے۔ مگر جو کچھ بھی ہونا ہے وہ ہمارے اختیار میں ہے۔ خرد مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ان مذاکرات کو یہیں اسی موڑ پر اختتام پذیر کر دیں۔ آئندہ پھر بھی نہ ہٹس کرنے کے لئے۔ کیونکہ ماہا ایسا نہیں چاہتی تھی۔ شاید آپ لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہے۔ جو نا انصافی ہوئی اس کا ادراک ہے۔ مگر ماہا اس غلطی کو دوبارہ دہرانا نہیں چاہتی۔ آپ کو شاید افسوس ہو مگر آپ کو یہ نشست ہمیں برخواست کرنا ہوگی۔“

فارحہ ششدر سی بیٹے کی سمت تکتی چلی جا رہی تھیں۔

سید سعد حسن شاہ بخاری کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات بے حد واضح تھے۔ نگاہوں میں حد درجہ غصے کی کیفیت تھی۔ مگر اذہان حسن بخاری کو جیسے اس لمحے کسی بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اسی قدر مضبوطی سے اپنے قدموں پر جما کھڑا تھا۔ آنکھوں میں عزم اسی طور برقرار تھا۔ چہرے پر وہی پرسکون کیفیت تھی۔ وہی سمندر سا ٹھہراؤ تھا۔

”ہمیں آپ کے جذبے کی قدر ہے۔ آپ کا اقدام یقیناً قابل تحسین ہے۔ مگر مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ آپ لوگ تشریف لے جا سکتے ہیں۔“ بے حد مضبوط انداز میں کہتے ہوئے اس نے ایک نظر فارحہ کی طرف دیکھا تھا۔ ان پر سکوت نظروں میں اس لمحے کوئی کیفیت نہ تھی۔ وہ بس پُر تھیر انداز سے اس کی سمت تکتی جا رہی تھی۔ سید اذہان حسن بخاری کی نظروں میں کسی طرح کا کوئی احساس جرم نہ تھا۔ جیسے وہ اس گھڑی حق پر تھا۔ جیسے کسی اقدام کے لئے غلط اقدام سرزد نہ ہوا تھا۔ جیسے وہ کسی بات کے لئے ذمے دار نہ تھا۔

فارحہ خالی خالی نظروں سے بیٹے کی سمت تکتی چلی گئی تھیں۔

سید اذہان حسن بخاری پلٹا تھا اور پھر باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ سعد حسن بخاری نے سردنوں ہاتھوں سے تمام لیا تھا، کہنے سننے کو جیسے اب کچھ باقی نہ رہا تھا۔

نشست برخواست ہو گئی تھی۔ مہمان اٹھ کر رخصت ہو گئے تھے۔ اس لمحے کمرے میں فقط دو نفوس تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے نظریں کترائے بیٹھے تھے۔ کمرے کا ماحول سہاک و چاند تھا۔ ارد گرد بے حد خاموشی تھی۔ بالکل ویسا سکوت جو کسی طوفان کے آنے سے قبل ہوتا ہے۔

یا پھر جانے کے بعد!

ایک انہونی تو ہو چکی تھی۔ ایک واقعہ رونما ہو چکا تھا۔

تو کیا کوئی اور طوفان بھی ابھی آنا باقی تھا؟

کتنی سرد مہری تھی اس گھڑی رویوں میں۔

کتنی برف جمی تھی۔

اور برف جب پگھلتی تھی تو کتنے بند ٹوٹ جانے کا احتمال تھا۔

فارحہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

سید سعد حسن بخاری بنا کچھ کہے، بنا اس کی جانب دیکھے، بنا کوئی الزام دینے، کوئی فیصلہ ہولے سے اٹھے تھے، نگاہ فارحہ سے یکسر اجنبی تھی۔ جیسے وہ اس کے لئے یکسر کوئی اجنبی ہو، غیر کوئی سلسلہ کبھی رہا ہی نہ ہو۔

فارحہ دم سادھے اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی تھیں۔ سید سعد حسن بخاری نے بہت آہستگی اٹھائے تھے اور وقت اس لمحے میں فاصلوں کی کہانی رقم کرتا چلا گیا تھا۔ خاموشی کچھ اور بھی بڑھ کر سکوت نے ماحول کو چاروں سمت سے لپیٹ کر اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

کچھ کہا نہیں گیا تھا۔

کچھ سنا نہیں گیا تھا۔

کہیں کوئی فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا۔

بس اک خاموشی تھی۔ طویل خاموشی۔

اور اس چپ کے کتنے اسرار تھے۔

سید سعد حسن بخاری بہت خاموشی سے رخ موڑے کمرے سے نکلتے چلے گئے تھے۔ فارحہ کی میں یکدم ہی نمی گھر کرنے لگی تھی۔



رات بہت سرد تھی۔
بچ بستہ ہوائیں رگوں میں خون منجمد کئے دے رہی تھیں۔ مگر وہ کسی طرح کے احساس سے ماورا اس لٹری ٹیرس پر تھی۔ شانوں پر شمال نہ تھی۔ نہ یہ خدشہ تھا کہ کوئی آئے گا اور بہت ہولے سے شانے پر اپنا ررد ہاتھ دھرے گا اور ان ہاتھوں کی پیش سمیٹ لے گی سب کچھ۔ سارے خدشات، سارے دوسوے، ارے خوف جن لے گا، سارے مخنی احساس، ساری کلکتیں بانٹ لے گا۔
وہ بڑی سادگی سی کھڑی تاروں سے بھرے آسمان کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔

آف ہائٹ شیفون آنچل بڑا بے ترتیب سا ہوا کے سنگ لہرا رہا تھا۔ خود میں اس قدر گم تھی کہ نہ کان بی آہٹ سن سکے نہ کسی چاپ کو محسوس کر سکے۔ یا پھر آنے والا ہی بہت دے قدموں آیا تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس قطعاً بے تاثر نظر آنے والی کو بہت سرسری انداز میں دیکھا تھا۔ نگاہ ی بے تاثر تھی۔ پھر بہت آہستگی سے قدم اس کی جانب بڑھا دیئے تھے۔ دو مضبوط بھاری قدموں کی ہٹ اس کی سمت تھی۔ مگر وہ اسی قدر غافل تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے اہل آن رکا تھا۔ میرب سیال اس لمحے بھی نہیں چونکی تھی۔ فاصلہ بہت زیادہ بھی نہیں تھا۔ فقط چند قدم کی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری نے بچ بستہ ہواؤں کے رخ پر کھڑی اس یکسر غافل لڑکی کو دیکھا تھا جو خود بے ہی نہیں، اپنے ماحول سے بھی اجنبی تھی۔

شاید آنے والے کو پہچان کے حوالے از بر نہ تھے۔ آ تو گیا تھا مگر مخاطب کیا ہونا چاہئے تھا، یہ معلوم نہ۔ شاید اسی لئے ان لبوں پر جامد چپ تھی۔ رویوں میں کسی درجہ سرد مہری سی مگر کچھ تاثر ان قربتوں میں نہ تھا کہ میرب سیال یکدم ہی چونکی تھی۔ نگاہ اس سامنے کھڑے شخص پر اٹھی تھی، انداز کسی قدر چونکنے والا تھا۔ کچھ حیرت بھی شامل تھی ان آنکھوں میں۔ مگر سامنے کھڑے شخص کی نگاہ ہی نہیں، چہرہ بھی بہت حد تک بے تاثر تھا۔ میرب سیال کے متوجہ ہونے پر وہ لمحہ بھر کو اپنی نگاہ اس پر سے ہٹا گیا تھا۔ پھر اسی سرد مہر انداز میں اس کے لب چلے تھے۔

”میں کل نیویارک جا رہا ہوں۔“ اطلاع دی گئی تھی۔

”تو پھر؟“ لبوں سے کچھ نہ کہا تھا مگر نگاہوں نے اس شخص کی سمت نکلتے ہوئے استفسار ضرور کیا تھا۔

سردار سبکدین حیدر لغاری نے چند لمحے اسی طرح خاموشی کے ساتھ ان بچ بستہ ہواؤں کو محسوس کیا تھا۔

میرب سیال اسی قدر خاموشی سے کسی نئی اطلاع کے لئے منتظر تھی۔ تبھی وہ گویا ہوا تھا۔
 ”مائی اماں کا حکم تھا آپ کو بھی اپنے ہمراہ لے لوں۔۔۔ ضروری تیاری کر لیجئے آپ۔
 یارک جا رہے ہیں۔“

”کیا۔۔۔؟“ وہ بے طرح چونکی تھی۔ مگر وہ بنا اس کی سمت دیکھے اس استفسار کی کوئی تا
 بغیر چل دیا تھا۔

میرب سیال حیران سی اس شخص کی چوڑی پشت کو تک رہی تھی جو اس گھڑی لمبے لمبے ڈگ؛
 خاموشی سے اس کے اور اپنے مابین فاصلوں کی کہانی رقم کر رہا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ اس حکم پر خوش ہو، اطمینان غار کرے، اسے اپنا دوست، اپنا
 ہم نفس جانے، اس کے اس اقدام پر اسے سراہے یا پھر اس اقدام کو بیگانگی جانے۔ فوری طور پر وہ
 ظاہر کے بغیر اسی طرح کھڑی رہی تھی۔ جو بھی تھا، کسی کو اس کا خیال تھا یا نہیں تھا، یہ بات تسلی بخش
 پایا کو دکھ سکے گی۔ ان لمحوں میں ان کے قریب ہوگی جب انہیں اس کی ضرورت ہے۔ شاید اس
 نے کوئی تعرض نہیں برتا تھا بلکہ کسی قدر اطمینان نے دل میں ڈیرا ڈال دیا تھا۔

وہ بہت آہستگی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی تھی۔ جانے سے قبل سیفی سے
 تھا۔ اس سے بھی تو بات کرنی تھی۔ اسے مطلع بھی تو کرنا تھا۔
 ”ہنی مون پر جاری ہو؟“

اس نے نیند سے بیدار ہوتے ہی حیرت کا زبردست اظہار کیا تھا۔ میرب سیال کے ہاتھ۔
 چھوٹے چھوٹے پچا تھا۔

”شٹ اپ سیفی!۔۔۔ ڈونٹ بی اسٹوپڈ۔“ پُر خفت انداز میں اسے ڈپٹا تھا مگر دوسری طر
 مسکرا دیا تھا۔

”معاملہ کیا ہے؟“
 ”تم پہلے اچھی طرح بیدار ہو جاؤ۔“ میرب نے ایک بار پھر ڈپٹا تھا۔
 وہ مسکرا دیا تھا۔

”وہ تو میں ہو جاؤں گا۔۔۔ مگر تم کس خوشی میں جاگ رہی ہو اب تک؟ آخر شاری کرنے کا
 لیا ہے کیا؟۔۔۔ یا پھر شب بیداری کا ارادہ ہے؟“ وہ فطعی طور پر غیر سنجیدہ تھا اور میرب سیال کا
 سر پیٹ لینے کو چاہا تھا۔

”سیفی! میں نیو یارک پاپا سے ملنے جا رہی ہوں۔“
 ”اور محترم سردار صاحب؟“ سیفی کی شوخی بدستور قائم تھی۔

”وہ میرے ساتھ جا رہے ہیں۔“
 ”تم ان کے ساتھ جاؤ یا وہ تمہارے ساتھ جائیں، بات تو ایک ہی ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے
 ساتھ جا رہے ہو۔“

”سیف الرحمن! اب جاگ جاؤ۔“

”خوشی ہو رہی ہے؟“ سیفی بدستور مسکرا رہا تھا۔

”دس بات کی خوشی ہوگی؟۔۔۔ پاگل ہو گئے ہو تم؟۔۔۔ سیفی! تم جانتے ہو میں کس قدر نرس
 اور نہیں ہری ہری سو جھ رہی ہے۔“ میرب سیال نے تلخی سے کہا مگر وہ ہنس دیا تھا۔

”میرب سیال! جو بھی کہو، سردار صاحب ہیں۔ واقعی کمال شخص۔ تمہیں یاد ہے بے جی، ہمیں ایک کہانی
 لرتی تھیں۔ سردار سبکدین نامی ایک بادشاہ کی، جنہیں ہرن کے شکار سے خاصا شغف تھا۔ جو روز خوب
 ت ہرنیوں کا شکار کیا کرتے تھے اور ایک دن جب۔۔۔۔۔۔“

”شٹ اپ سیف الرحمن!“ میرب سیال کے صبر کا پیمانہ یکدم لبریز ہوا تھا۔
 ”سنو تو۔“ سیف الرحمن نے اصرار کیا۔

چند ثانیوں تک خاموش رہا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے پُر خیال انداز میں گویا ہوا تھا۔
 ”کہیں تمہارے سردار صاحب بھی تو ایسی کسی ہانی کے شائق نہیں؟“

”سیف الرحمن!“ میرب سیال نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا مگر دوسری جانب سیف الرحمن کو کوئی
 فکر نہ تھی۔

”جو بھی کہو، بی ایم ڈبلیو اور لیوزن میں گھومنے والا شخص اتنا بی با اور شریف ہو نہیں سکتا۔“
 ”کیوں۔۔۔ تمہیں سب کچھ اتنا مشکوک کیوں لگ رہا ہے؟ ہوش کے ناخن لو سیف الرحمن! بے جی
 بتی ہیں، تمہاری عقل ٹخوں میں ہے۔“

”درازدقد تو سردار صاحب بھی ٹھیک ٹھاک ہیں، ان کے متعلق کیا خیال ہے تمہارا؟“ وہ مسلسل پھیر رہا
 میرب سیال خاموشی سادھ گئی تھی۔ تبھی وہ دوسری طرف سے گویا ہوا تھا۔

”واپس کب لوٹو گی؟“
 ”کچھ ہی دنوں میں۔ سیف! تم دعا کرنا۔“

”لو۔۔۔ یہ بھی کوئی کہنے والی بات ہے؟ میں تو ہمیشہ ہی تمہارے لئے دعا گو رہتا ہوں۔ خدا تمہاری
 سلامت رکھے۔ دو دھوں نہا پوتوں پھلو۔“ وہ ایک بار پھر پیڑی سے اتر چکا تھا۔ میرب سیال کچھ نہیں
 نا مگر دوسری جانب اس کی ہنسنے کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔

”میرب سیال! اتنی دور جا رہی ہونا۔۔۔ تمہارا موڈ اچھا کرنا چاہ رہا تھا۔ انشاء اللہ سب اچھا ہو گا۔
 اخیال رکھنا۔“

”بے جی کسی ہیں؟“ میرب سیال نے ثانی کے متعلق دریافت کیا تھا۔
 ”ٹھیک ہیں۔۔۔ تمہیں یاد کر رہی ہیں۔ دراصل مظہر انکل کے رویے نے انہیں کچھ زیادہ خوش نہیں
 عاثر پھینچو کے بعد انہوں نے فاصلوں کی بہت وسیع تلخ رشتوں کے درمیان استوار کر دی ہے۔ یقیناً
 مانگیں ہے۔ ہم انہیں بلیم نہیں کر سکتے۔ مگر بے جی اس معاملے کو لے کر خاصی افسردہ رہتی ہیں۔
 ما اب جب کہ میرب! تم ہمارے ہوتے ہوئے اس وقت کہیں اور قیام پذیر ہو۔ بے شک وہ اب

تمہاری سسرال ہے۔ مگر بے جی کو یہ چیز بہت پریشان کر رہی ہے۔ مظہر انکل نے ایسا کر کے یہ اور ہمارے خاندان کی نفی کی ہے۔ جو تعلق تم میں اور ہم میں موجود ہے اسے قطعاً جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ مظہر انکل اس معاملے میں ہمیں خاصا اجنبی تصور کرتے ہیں۔ ہم تو پھر بھی اس صورت حال کو فہم نہیں مگر بے جی خاصی حساس ہیں اس معاملے میں۔ کیوں نہ ہوں، ان کی نواسی ہوتی۔ وہ بھی اکا سکے تو کبھی آکر ان سے مل جاؤ۔“ سیف الرحمن جس قدر سنجیدگی سے اس لمحے بات کر رہا تھا، لگ رہا تھا کہ یہ وہی سیف الرحمن ہے جو کچھ لمحے قبل اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔

میرب سیال نے ہونٹ بھینچ کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”ہوں۔۔۔ میں آؤں گی۔ تم میری طرف سے بے جی کو پوچھ لینا۔“

دوسری طرف سیف الرحمن خاموش رہا تھا۔ وہ بھی چند ثانیوں تک چپ رہی تھی پھر بہت آہٹا گویا ہوئی تھی۔

”دراصل میں بھی کبھی اس بے وجہ بے مہری کی وسیع ترین خلیج کو سمجھ نہیں سکی۔ ماما کی موہ ایکسڈنٹ تھا اور اس کے لئے ماموں پاپا کو تسلیم کرتے تھے اور پاپا ماموں کو۔ پاپا، ماما کو لے کر پوہیو تھے اور ماموں اپنی جگہ۔ تصور ماموں کا بھی نہیں تھا، غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ بہر حال ماما اس معاملے میں تصور وار نہیں ہیں۔ رشتوں میں دراڑ تو پہلے ہی موجود تھی، ماما کی موت نے تو اس مزید وسعت دی ہے۔ ممکن ہے شاید ایک دن سب بہت اچھا ہو جائے۔ مجھے یہ وقت، یہ زندگی میں نہیں آئی سیٹی! شاید ہی میں تمام معاملات اس وقت کے حوالے کر دیتی ہوں جب ایک دن سب بہت اچھا ہو جائے۔ فی الحال میں پاپا کے لئے بہت پریشان ہوں۔ سیٹی! تم بے جی سے کہنا ان دعا کریں۔ بعض اوقات غلطیاں معاف کر دینے سے کسی کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ پاپا کو اگر دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔“ اس کا لہجہ بہت دھیمہ تھا۔

”میرب! پریشان نہ ہو۔۔۔ مظہر انکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”انشاء اللہ۔“ میرب نے فون دھردیا تھا مگر دل پر جانے کیوں اک انجانا سا بوجھ عود کر آیا تھا۔

بات ساری یہ تھی کہ دل بہت مشکل میں تھا۔ جان پر بنی ہوئی تھی۔ راہ کوئی نہ تھی۔ بھائی کچھ رہا تھا۔ ایسے میں جو بھی ہوتا، وہ ایک ضروری اقدام ہوتا۔ اس ایک لمحے سے بچ نکلنے کا، جان کئی گنا میں کوئی کیا کرتا ہے، کیا کر سکتا ہے؟ فی الفور اس نے بھی یہی کیا تھا۔

اس کے گھر کی ڈور بیل پر ہاتھ دھرتے ہوئے اسے علم نہ تھا کہ اس سے اگلا لمحہ کیا ہوگا، کیسا ہوگا ایک لمحہ جو اس کے ہاتھ آیا تھا وہ اسے ہارنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک، دو، تین۔۔۔ چند تائے ہی گزرے تھے شاید۔ گیٹ کھلا تھا اور دوسرے ہی لمحے کوئی مقابل تھا۔ عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”السلام علیکم۔۔۔ مس انابہ شاہ ہیں؟“

سامنے کھڑے بریگیڈیئر اعظم رحمن شاہ نے اسے سر تاپا بخوردیکھا تھا۔ کسی کے گھر میں پہلی بار آنے کا فی شاید ای قدر کنفیوژ کرتا ہے۔ عفتان علی خان جیسا شخص اس لمحے خود کو خاصا چند محسوس کر رہا تھا۔

”آپ؟“ اپنے سامنے کھڑے سوئڈ بوئڈ شخص کو بریگیڈیئر صاحب نے بغور دیکھا تھا۔ وہ لب بھینچ کر اس لمحے زبردستی مسکرایا تھا یا پھر محض راہ و رسم کو۔

”جی میں۔۔۔ میں عفتان علی خان ہوں۔“

”تو اس میں اتنا کنفیوژ ہونے کی کیا بات ہے؟“ بریگیڈیئر صاحب دھیمے سے مسکرائے تھے۔

عفتان علی خان حیران ہو کر تکتے لگا تھا۔ کبھی وہ مسکرا دیئے تھے۔

”اندر آ جاؤ برخوردار! تم صحیح مقام پر پہنچے ہو۔۔۔ میں انابہ کا دادا ہوں۔“

عفتان علی خان نے سکون کا گہرا سانس لیا اور ساتھ ہی ان کے ساتھ قدم اندر بڑھا دیئے تھے۔

”ساتھ پڑھتے ہو؟“ سرخ بجزی کی روش پر چلتے ہوئے اور داخلی دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بریگیڈیئر صاحب نے دریافت کیا تھا۔

عفتان علی خان چونکا تھا، پھر مسکراتے ہوئے سرٹٹی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں، پڑھ چکا ہوں۔ آج کل بزنس کر رہا ہوں۔ لیکن اتنا جانتا ہوں پڑھنے والی لائف جتنی ایزی اور کھل ہوتی ہے، اتنی ہی ٹھٹ اور ہارڈ بھی ہوتی ہے۔ موٹی موٹی خنگ کتابوں سے سرکھپانا یقیناً آسان نہیں۔ لیکن اس کے باوجود سب کچھ بہت انٹرسٹنگ ہے۔“ مسکراتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا۔ بریگیڈیئر صاحب اسے دلچسپی سے سنتے ہوئے مسکرا دیئے تھے۔

”انابہ سے کب ملے تم؟“

”مگنہ کی پر۔“ بہت بے ارادہ منہ سے پھسلا تھا۔

”مگنہ کی پر؟“ بریگیڈیئر صاحب چونکے تھے۔ عفتان علی خان کو اپنی بدحواسی کا یکدم ادراک ہوا تھا۔

بھی لب بھینچ کر بڑی رسائیت سے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ ساتھ ہی بہت ہولے سے گویا ہوا تھا۔

”آئی مین، ایک تقریب میں۔ انابہ گھر پر ہیں نا؟“ ان کی طرف نکلتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

بریگیڈیئر صاحب مسکرا دیئے تھے۔

”یقیناً“ گلاس ڈور کھولتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئے تھے۔ اسے ایک وسیع و عریض ویل ڈیکور بیڈ رانگ روم میں بٹھایا تھا۔ پھر نوکر کو آواز دے کر انابہ کو بلانے کا حکم دیا تھا اور خود اس کے مقابل آن بیٹھے تھے۔

”برخوردار! خاصے اچھے وقت پر آئے ہو تم۔۔۔ آج ہمارا برتھ ڈے ہے اور انابہ کو نت نئے گریڈز دینے کی عادت ہے۔ یہ جو تم گھر میں کچھ سجاوٹ دیکھ رہے ہو اسی کے باعث ہے۔ ایک بھی کس کٹنے ہی والا ہے۔ تقریب ہر سال اسی سادگی سے انجام پاتی ہے۔ اس 65 برس کی عمر میں بھی انابہ نے مجھے بچہ بنا کر رکھا ہوا ہے اور میں اس کی خوشی میں خوش ہوں۔“ بریگیڈیئر صاحب مسکرا رہے تھے۔

عفتان علی خان بھی مسکرا دیا تھا۔ ساتھ ہی کچھ بڑا لہجہ انداز میں ہونٹ بھینچ کر شانے بھی اچکا کے
”لیکن میں تو آپ کے لئے کوئی گفٹ نہیں لایا۔“

”کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ تمہارے ہاتھ میں پیکٹ تو ہے نا۔“ بدستور اس کے ہاتھ
ہوئے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وہ چونکا تھا۔ پھر مسکرا دیا تھا۔ اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا۔ تبھی وہ پیکٹ ٹیبل پر دھر دیا تھا۔

”یہ انا بیہ کے لئے ہے۔“ دھیمے سے مسکراتے ہوئے مطلع کیا تھا۔

”لیکن انا بیہ کی تو آج برتھ ڈے نہیں ہے مہترم!“ بریگیڈیئر صاحب رجسٹروں بولے تھے۔

عفتان علی خان نے چونک کر ان کی سمت دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں اس لمحے ایک نرم سادہ
اور لبوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔ یقیناً یہ ایک دوستانہ اقدام تھا۔ وہ یقیناً دوستانہ مزاج رکھتے
اسے انا بیہ کا دوست جانتے ہوئے خصوصی رعایت دے رہے تھے۔ عفتان علی خان مسکرا رہا تھا، پکا
سے گویا ہوا تھا۔

”جانتا ہوں۔ یہ ان کی کتابوں کا کوئی اسٹف ہے جو میری گاڑی میں رہ گیا تھا۔ وہ بھول گئی
مطلع کرتے ہوئے یکدم اس کی نظر سامنے کی طرف اٹھی تھی، جہاں وہ تھی۔ یقیناً اپنے گھر میں اس
سامنے دیکھ کر وہ کسی قدر حیران ضرور ہوئی تھی۔ نظروں میں کسی قدر حیرت کا احساس بھی چھا
بریگیڈیئر صاحب نے پلٹ کر اس کی طرف نگاہ کی تھی۔

”آؤ، آؤ۔۔۔ تمہارا کوئی مہمان آیا ہے۔“ انا بیہ جو صوفے کی پشت پر تھی اس کی سمت نکلنے
دھیمے سے مسکرائی تھی۔

”کیسے ہیں آپ؟“ مروا تا احوال دریافت کیا تھا۔

”پرفیکٹ۔۔۔ آپ کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہوں۔“ وہ اخلاقاً مسکرائی تھی۔ دادا ابا دونوں کو بخوردیکھ رہے تھے۔

”یہ آپ کا ضروری اسٹف تھا۔ میں نے لامعہ سے رابطہ کیا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر ریفریوز کر دیا
کے پاس وقت نہیں۔ تب میں نے بذات خود انہیں آپ تک پہنچانا ضروری خیال کیا۔“

”آپ نے اچھا خیال کیا۔“ وہ مسکرائی تھی۔ یقیناً وہ اس کی وضاحت کے انداز سے مخلوط ہوڈ
یہ دادا پوتی اسے خاصا ایزی لے رہے تھے۔ یا پھر وہی اس قدر چند لگ رہا تھا۔ چند تانیوں تک اپنے

تک جھانکا تھا۔ یقیناً یہ حماد آسان نہ تھا۔ کیسے ہوں گے سر بہت سے معرکے۔ پائی ہوگی فتح بہت
مقامات پر۔ مگر یہ مقام کوئی اتنا غیر اہم تو نہ تھا۔ وہ یونہی تو اس قدر ہونٹ نہ لگ رہا تھا۔ اندر کے توجہ
کچھ کم مختلف نہ تھے۔ مقام خاص تھا۔ تبھی تو اس قدر کمزور واقع ہو رہا تھا۔ یونہی خاموش رہ کر اس۔

ہمتوں کو بچھ کیا تھا۔ پھر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”آپ نے مجھے دادا جی کی برتھ ڈے کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ اب دیکھئے نا، میں اس اہم ترین
کوئی گفٹ تک نہیں لایا۔“ شکوے کا انداز خاصی اپنائیت لئے ہوئے تھا۔ جہاں وہ حیران ہوئی تھی

ادا ہا مسکرا دیے تھے۔

”ڈونٹ وری۔ اس کی ضرورت نہیں۔ تم آگے ہو، یہی کافی ہے۔“

”یعنی مینی پی ریٹرنز آف ڈی ڈے۔“ عفتان علی خان نے وٹس کیا تھا۔ وہ دھیمے سے مسکرا دیے۔

”تھینکس۔ تم لوگ بیٹھو، میں آتا ہوں ابھی۔“ وہ یقیناً دانستہ وہاں سے اٹھے تھے۔ ”لیکن ہاں، ایک

نزد رکھا کر جانا۔ بذات خود تمہیں دعوت دے رہا ہوں۔ جانتا ہوں اگر نہیں دوں گا تو میری پوتی میری
ہاں کو آجائے گی۔“ وہ یقیناً اس لمحے شگفتہ انداز میں مذاق ہی کر رہے تھے۔

عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔ انا بیہ کے لبوں پر بھی اس لمحے دھیمی مسکراہٹ تھی۔ دادا ابا کے جانے پر
وہ ہتکی سے چلتی ہوئی اس کے سامنے آن بیٹھی تھی۔

”ہائڈ مت کیجئے گا۔ میرے دادا ابا کی طبیعت عام روش سے ہٹ کر ہے۔ وہ عام بزرگوں کی طرح
ہیں، وہ میرے اچھے دوست ہیں۔ ان کی موجودگی میں مجھے کبھی کسی دوست کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔“

”اس معاملے میں تو خاصے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں دادا ابا۔ یقیناً مایہ، کچھ حد محسوس ہونے لگا
ہے اس گھڑی ان سے۔“ وہ شگفتگی سے مسکرا رہا تھا۔ انا بیہ شاہ بھی مسکرا دی تھی۔

”اب یہ مت کہئے گا۔ میرے پاس ایسا کوئی حق محفوظ نہیں۔“ اس کی سمت دیکھتے ہوئے دھیمی
سکراہٹ کے ساتھ وہ گویا ہوا تھا۔ انا بیہ شاہ اس لمحے جیسے اخلاقاً مسکرائی تھی۔ پھر اسی انداز میں گویا ہوئی

ٹی۔

”دادا ابا واقعی بہت اچھے ہیں۔ بابا کے بعد وہی ہمارے لئے سب کچھ ہیں۔ اس گھر کے نفوس
بہت تھوڑے ہیں۔ میں، ماما اور دادا ابا۔ مگر اس مثلث کے تینوں کونوں میں محبت کی بانڈنگ بڑی
ٹرونگ ہے۔“ وہ کسی قدر اپنائیت سے اپنی فیملی کے متعلق مطلع کر رہی تھی۔

”اس معاملے میں تو آپ نے خاصا بر کیا۔ مجھے مطلع کر دیتیں تو آج ایک قابل فخر دوست میرے
لئے احباب میں شامل ہو جاتا۔ مجھے دلی افسوس ہے کہ میں یہاں ہوں اور دادا ابا کے لئے کوئی گفٹ نہیں لا

کا۔“

”دوست فقط مادی اشیاء کے لین دین کے اصول پر استوار نہیں ہوتے۔ کچھ اور وصف بھی اس
عاطلے میں درکار ہوتے ہیں۔“

”مثلاً؟“ اسے دلچسپی سے تکتے ہوئے پوچھا۔ انا بیہ شاہ چونکی تھی، پھر ہونٹ بھینچ کر دھیمے سے مسکراتے
وٹے شانے اچکا دیے تھے۔

”ڈیپینڈ کرتا ہے۔ سینا یو کہا ہے۔“

”بتائیں گی نہیں؟“ بغور دلچسپی سے تکتے ہوئے استفسار کیا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”نہیں۔“ صاف انکار کیا تھا۔ اسے کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔

”کیوں؟“ آگاہی چاہی تھی۔ ان جاوڈی قلعوں میں اس وقت کسی قدر بے چینی سمٹ آئی تھی۔ انا بیہ
نناہ پیرے کا دھیان پھیر گئی تھی۔

”اس لئے کہ ایسی باتیں بیان نہیں کی جاتیں، سمجھی جاتی ہیں۔“

”اور اگر کوئی قطعاً جاہل مطلق ہو تو؟“ آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے استفسار کیا؛ شاہ نے اس مقابل بیٹھے شخص سے نگاہ یکدم ہی ہٹالی تھی۔ ساتھ ہی بڑے بے تاثر انداز میں بڑے دیئے تھے۔

”سکھائیں گی نہیں مجھے؟“ مدہم دھمے لہجے میں کوئی گزارش تھی۔ استدعا سے یہ نظر بڑی فرسہ اس کی سمت تک رہی تھی۔ انا بیہ شاہ نے اس کی سمت ایک نگاہ سرسری انداز میں کی تھی۔

”کیا؟“ لہجہ بھر میں اس کی زبان سے پھلا تھا۔ نظروں میں کسی قدر حیرت در آئی تھی۔ مقنا شخص چند ثانیوں تک خاموشی سے تکتا جیسے محظوظ ہوتا رہا تھا۔ پھر بہت دھمے سے مسکرایا تھا۔

”بہت انوکھے بھید ہیں کیا؟“ شاید بھی آپ عام کرنے سے گریز برت رہی ہیں۔ صبح کھوا تو شوق جنوں بڑھنے لگا ہے۔“

انا بیہ شاہ لب پہنچ کر مسکرایا تھی۔

”لامعہ سے بھی بات ہوئی تھی۔ میں نے اسے آنے کے لئے کہا تھا۔ شاید وہ بھی آجائے۔“ ذکر کیا تھا مگر مقابل شخص کا انداز کسی قدر بے تاثر ہو رہا تھا۔ بلکہ انداز کسی قدر بچہ گیا تھا۔ کچھ لمبے قبل شوق اس لئے معدوم ہو چکا تھا۔ اس بات کا کوئی جواب دیئے بغیر وہ چہرے کا زاویہ بدل گیا تھا۔ اس کے ہاتھ کا بیک کیا ہوا بلیک فورسٹ نے آئی تھیں۔ انا بیہ نے عفتان علی خان کو ماما سے متعارف تھا۔

”بیٹا! لامعہ نہیں آئی تمہارے ساتھ؟“ ماما نے دریافت کیا تھا۔ وہ جواباً جانے کیوں انا بیہ شاہ کی تکتے لگا تھا۔

”عفتان علی خان میری بکس کا اسٹف لوٹانے آئے تھے ماما! لامعہ شاید کچھ بڑی ہے۔ میں بات ہوئی تھی میری۔ کہ تو رہی تھی آئے گی۔“ جانے کیوں اس لمحے میں اس نے اس شخص کی ناصحت کر دی تھی۔ وہ اس لمحے اس کی سمت تکتے لگا تھا۔

برتھ ڈے ایک کٹ گیا تھا۔ اپنے دادا ابا کے ساتھ مسکراتی ہوئی، سرشار سی وہ لوہو گھڑی خاصی مختلف لگ رہی تھی۔ اس کا یہ روپ خاصا نیا اور انوکھا تھا۔ عفتان علی خان کی نظریں اسے دیکھ رہی تھیں۔ انا بیہ شاہ کو یا تو ان نظروں کی اضطرابی کیفیت سے کوئی سروکار ہی نہ تھا یا؛ جان بوجھ کر ان نظروں کے حوالوں سے بچنا چاہ رہی تھی۔ جو بھی تھا، یہ لمحے بیش قیمت تھے۔ ایک گید رنگ میں اس گھڑی وہ شامل تھا۔ اس خاندان کا حصہ تھا۔ سب سے بڑھ کر وقت جن فرجوا داستان رقم کرنے سے گریزاں تھا، وہی تریں اس لمحے میں چپکے چپکے اپنے بھید کھول رہی تھیں۔ نظریں اس سے گریزاں تھیں۔

وہ چہرہ اس سے انجان تھا۔

وہ سرپا ان نظروں سے بیگانگی برت رہا تھا۔

مگر یہ احساس کم نہ تھا کہ وہ اس گھڑی، اس لمحے میں شامل تھا جب وہ اس کے ساتھ تھی۔ جب وقت اس کے ساتھ تھا۔ آج کا ایک ایک لمحہ اس کا تھا اور وہ اس پر سرشار تھا۔ انا بیہ شاہ حیران تھی، ان مختصر سے لمحوں میں اس نے دادا ابا سے خاصی دوستی کر لی تھی۔ اور جب جاتے سے وہ اسے اخلاقاً دروازے تک چھوڑنے کے لئے آئی تھی تو وہ مسکرا رہا تھا۔

”سراٹھا کر آسمان کی طرف دیکھو۔ آج چاند پھر آسمان پر نہیں ہے۔“ کھلے آسمان تلے اس کے سبک کھڑا وہ بہت آہستگی سے گویا ہوا تھا۔ وہ کسی قدر حیرت سے اس کی سمت تکتے لگی تھی۔ وہ بخور اس کی سمت تک رہا تھا۔ نظروں میں کسی قدر شرارت تھی اور لبوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ۔

”ہو بھی نہیں سکتا۔ آج پھر چاند زمین کے سفر پر ہے۔“ مدہم سی سرگوشی میں شاید کوئی اہم تھا یا پھر اس کی حیرت ہی دو چند تھی۔ ایک ننگ اس کی سمت تکتی چلی گئی تھی۔

عفتان علی خان نے اس کی حیرت سے حظ اٹھایا، ایک الوداعی نگاہ اس پر ڈال کر پلٹ گیا تھا۔ انا بیہ شاہ اسی طرح کھڑی رہی تھی۔ نظریں اس کی چوڑی پشت پر تھیں۔ وہ اسے اسی طرح تکتی چلی گئی تھی۔ وہ چلا گیا تھا۔ ارد گرد اب کوئی نہ تھا۔ لان میں رات کی رانی اور گلابوں کی مہک عجب جادو سا جگا رہی تھی۔ جانے کیا ہوا تھا۔ اس نے بہت ہولے سے سر کھلے آسمان کی سمت اٹھایا، متلاشی نظریں بادلوں میں یکدم ہی الجھنے لگی تھیں۔ بہت سے چمکتے تاروں بھرے تھاں میں اس لمحے کسی شے کی کمی تھی۔ بادلوں نے بہت کچھ چھپا یا تھا یا پھر واقعی کچھ غیر موجود تھا۔ نگاہ لہجہ بھر کو ہٹکتی تھی۔

”سراٹھا کر آسمان کی طرف دیکھو۔ آج چاند پھر آسمان پر نہیں ہے۔“ ہو بھی نہیں سکتا۔ آج پھر چاند زمین کے سفر پر ہے۔“ مدہم سرگوشی نے یکدم اس کے گرد اپنا حصار باندھا تھا۔ وہ لہجہ بھر میں جیسے بیدار ہوئی تھی۔ سردوبارہ جھکا یا تھا اور دوسرے ہی پل پلٹ کر اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

دراڑ جب دلوں پر پڑتی ہے تو فاصلے صدیوں پر محیط ہو جاتے ہیں۔

فارحان لحوں میں فاصلوں کو صدیوں کی طرح پھیلتے ہوئے چپ چاپ دیکھ رہی تھیں۔

غلط سوچا تھا انہوں نے۔ غلط قیاس کیا تھا۔ کوئی طوفان آئے گا اور اپنے سنگ سب کچھ بہا لے جائے گا۔ یہاں تو سب کچھ سناٹوں تلے دیتا چلا جا رہا تھا۔ خاموشیوں میں دن ہو رہا تھا۔ بیگانگی مزید بڑھتی چلی گئی تھی اور ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ قصور وار کسے ٹھہرائیں۔ باپ کو، بیٹے کو، خود کو یا پھر اس وقت کو؟

ازبان حسن بخاری جب اسے میڈیسن دینے آیا تھا تو وہ کتنی دیر تک اسے چپ چاپ تکتی چلی گئی تھیں۔ ”مئی پلیئر! دو انہ چھوڑا کیجئے۔ آپ کے لئے بہت ضروری ہے یہ۔ آپ کو شاید یاد نہیں، صبح آپ کو جبک آپ کے لئے بھی جانا ہے۔ آپ تیار ہو جائے گا، میں آپ کو لے جاؤں گا۔“ دودھ کا گلاس ہاتھ میں پکڑے اسے گھڑی وہ میڈیسن لے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

فارحان نے بہت خاموشی سے دودھ کا گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا اور ساری میڈیسن باری باری

چھوٹی تکلیفوں پر بے چین ہو جایا کرتی تھیں۔ اس لئے تو وہ ایک کڑے امتحان میں مبتلا تھا۔
 ”دمی! آئی لو یو! آئی لو پاپا ٹو۔ مجھے اپنے گھر کو مکمل دیکھنے کی عادت رہی ہے۔ پاپا کو ہمیشہ
 لڈنگ پوزیشن پر دیکھتا رہا ہوں۔ مجھے کس اسکول میں جانا ہے، کون سا سبیکٹ چوز کرنا ہے، میرے لئے
 ہلتھی ایکیویٹی کون سی ہے۔ مجھے کون سا گیم کھیلنا چاہئے، کیسے جو گرز پہننے چاہئیں کہ میرے پاؤں
 کے لئے آرام دہ رہیں۔ مجھے کن کاموں سے راحت ملتی ہے، کن چیزوں سے مجھے خوشی مل سکتی ہے، کتنے
 کھلونے، کتنے بہت سے کھلونوں کا ڈھیر میں نے ہمیشہ اپنے کمرے میں دیکھا۔ کتنی بہت سی اشیاء جن کی
 مجھے ضرورت بھی نہیں تھی، کیسے وہ میرے آگے ڈھیر کرتے چلے جاتے تھے۔ کیسے میری ایک خوشی کے لئے
 ہزاروں جن کیا کرتے تھے۔ کتنا اہم جانا انہوں نے ہمیشہ مجھے۔ کیا کچھ نہ کیا میرے لئے۔ کتنی چھوٹی
 چھوٹی باتوں کے لئے میری کیئر کی، میرا خیال رکھا۔“ کتنی آہستگی سے اس کی آنکھوں کے کناروں سے گرم
 گرم پانی نکل کر پھسلتا ہوا فارحہ کی گود میں جذب ہو رہا تھا۔

”مجھے یاد ہے! جب ایک بار میں ٹیس کی سیڑھیوں سے پھسل کر گر گیا تھا تو ان کی جان پر بن آئی
 تھی۔ اور جب میں جوئیر کیمبرج میں اپنی مخالف ٹیم سے باسکٹ بال کا میچ ہار گیا تھا تو وہ میرے لئے کتنے
 افسردہ ہو رہے تھے۔ مجھے یاد ہے۔ مجھے یاد ہے! وہ اپنی تمام تر مصروفیات کو پس پشت ڈالے اگلے
 کئی دنوں تک مجھے جم لے جا کر پریکٹس کراتے رہے تھے جب تک کہ میں بال باسکٹ تک لے جانے میں
 پرفیکٹ نہیں ہو گیا تھا۔ کتنا ضروری اور اہم کام تھا وہ ان کے لئے۔ میری معمولی سی خالی جگہ ان سے
 برداشت نہیں ہوتی تھی۔ کیسے وہ مجھے ہر عیب سے، ہر کمی سے ماورادیکھنا چاہتے تھے۔ میری اکاؤنٹس کی
 ٹیوٹر جب اچانک ہی بیمار پڑ گئی تھیں تو پاپا کی کیسی جان پر بن آئی تھی۔ کیسے وہ آفس سے آنے کے بعد
 گھنٹوں مجھے پریکٹس کرایا کرتے تھے۔ میں پرفیکٹ نہیں تھا مگر! بہت سی خامیاں تھیں مجھ میں۔ بہت سے
 عیب تھے مجھ میں۔ مگر پاپا کی تعمیر نے کیسے مجھے ایک کوالٹی پرسنالٹی بخش دی۔“
 فارحہ کی آنکھوں کا پانی بہت ہو لے ہو لے رخساروں پر پھیل رہا تھا۔

”مئی! مئی! مجھے یاد ہے۔ سینئر کیمبرج میں غلط لڑکوں کی صحبت میں جب پہلی بار میں نے
 سگریٹ کو چھوا تھا تو وہ کس قدر ٹینس رہے تھے۔ کتنے دنوں تک انہیں یہی فکر ستانی رہی تھی۔ نو عمری میں
 اکثر ایڈوچر میں لڑکوں سے شرارتیں سرزد ہوتی ہیں۔ لیکن میں جب کیمپس پبلک میں ایک بار سمندر کی
 لہروں کی زد پر آیا تھا تو کتنی دیر تک وہ مجھے خود سے لپٹانے بچوں کی طرح آنسو بہاتے رہے تھے۔ حالانکہ
 یہ بات منکشف تھی ان پر کہ میں ایک اچھا سوئمر ہوں۔ لیکن کس قدر خوزدہ انداز میں انہوں نے اپنا چوڑا سا
 ہاتھ میرے سامنے پھیلا کر مجھ سے پراس چاہا تھا کہ آئندہ میں کبھی پانی میں نہیں جاؤں گا۔ میں جانتا تھا
 ان کے خوزدہ ہونے کی وجہ مجھ سے ان کی بے تحاشا صحبت تھی۔ وہ مجھے کسی معمولی تکلیف میں بھی نہیں دیکھ
 سکتے تھے۔ سو میں نے چپ چاپ ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھر دیا تھا اور پھر کبھی ان کے کہنے کے مطابق پانی
 کے تریب نہیں گیا تھا۔“ مضبوط لہجہ اس گھڑی بے حد شکستہ تھا۔ بہت سی مئی آواز میں تھی اور آنسو تو فارحہ کی
 آنکھوں سے بھی بہ رہے تھے۔

نگل لی تھیں۔ مگر اذہان حسن بخاری اب بھی بدستور ایک سعادت مند بیٹے کی طرح ان کے سامنے
 تھا۔ فارحہ نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ وہ اس گھڑی بنور ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شفاف آنکھیں پُر
 تھیں۔ روشن چہرے بے تاثر تھا۔ پیشانی پر کوئی شکن نہ تھی۔ مگر وہ جانتی تھیں، سب کچھ پھر بھی اپنے معمو
 نہ تھا۔ وہ لمبا چوڑا شخص اس گھڑی بچوں کی طرح مضطرب تھا۔ فارحہ کے دیکھنے پر بہت آہستگی سے اس
 اپنا سر ماں کی گود میں دھر دیا تھا۔ وہ اس لمحے واقعی آزرده تھا۔ فارحہ بیٹے کو چپ چاپ ہکتی رہی تھیں
 بہت ہو لے سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ دھر دیا تھا۔

”آئی ایم سوری مئی!“ بہت ہو لے سے اس کے لب ہلے تھے۔ انداز بہت تھکا ہوا تھا۔ فک
 خوردہ۔ فارحہ کی آنکھوں میں یکدم ہی نمی اترنے لگی تھی۔

”دمی! میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ آپ نے ہی تو کہا تھا، ایک ٹھیک وقت میں تمہیں جو صحیح نظر آ
 اس کے لئے کام کرو اور مستقبل کو اللہ کے حوالے کر دو۔ ماہا مجھے بے حد عزیز ہے مئی! میں اسے
 مزید سامنے کی نذر نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی مزید رزک پہنچنے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک بھائی ہونے کے نا
 اس لمحے اس کے لئے اسٹینڈ لینا مجھ پر فرض تھا۔ میں نے جو بھی کیا میرے خیال سے وہ غلط نہیں ہے
 اور.....“

”نہیں اذہان! تم نے واقعی کچھ غلط نہیں کیا۔ لیکن شاید کبھی کبھی بہت کچھ اختیار میں نہیں
 کرتا۔ جیسے وقت اس گھڑی ہماری مخالف سمت چل رہا تھا۔ بہت دھیمے لہجے میں کہا تھا۔
 ”لیکن مئی! سبھی قصور وقت کا بھی تو نہیں۔ ہم سبھی کچھ وقت کے سر تو نہیں ڈال سکتے۔“ بہت آہستہ
 سے وہ گویا ہوا تھا۔

”لیکن ایک دوسرے کو الزام دینے سے بھی تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“
 ”دمی! کیا سب کچھ پہلے جیسا نہیں ہو سکتا؟ کیا وہ سارے سنگھ واپس نہیں آسکتے؟ وہ سارے
 اچھے دن، جو ہم نے مل کر ایک ساتھ گزارے؟“ اس کا لہجہ پڑمردہ تھا۔

فارحہ خاموش رہی تھیں۔ مگر بہت خاموشی کے ساتھ پلکوں پر سے دو شفاف قطرے ٹوٹے تھے اور
 رخساروں پر سے پھسلنے ہوئے دوپٹے میں کہیں مدغم ہو گئے تھے۔ اذہان حسن بخاری اسی طور سر ماں کی گود
 میں دھرے بیٹھا رہا تھا۔

”مئی! جب میں چھوٹا تھا اور کبھی بہت ڈس ہارٹن ہوتا تھا تو مجھے آپ کی آغوش میں سر چھپا کر بہت
 سکون ملتا تھا۔ ایک عجیب سے اسٹرنٹہ ملتی تھی۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں ہر طرح کے خطرے سے محفوظ ہوں اور
 پوری جانفشانی سے اب دنیا کا سامنا کر سکتا ہوں۔“ دھیمی آواز کسی قدر آزرده تھی لیکن فارحہ کچھ نہیں بولی
 تھیں۔ چپ چاپ اس کے چہرے کو نکتی رہی تھیں۔ وہ اس لمحے کوئی معصوم بچہ تھا۔ دنیا کے سامنے تن کو
 کھڑا ہونے والا لمبا چوڑا، مضبوط ڈیل ڈول کا مالک شخص اس لمحے بے حد نحیف تھا۔ جیسے وہ اس گھڑی بچہ
 کوئی بچہ تھا۔ فارحہ کا ہاتھ اس کے سر پر تھا۔ اس انتشار سے پُر کیفیت میں اسے دیکھنا فارحہ کو یقیناً تکلیف
 دے رہا تھا۔ اسے شکستہ حال دیکھنا ایک مشکل تجربہ تھا۔ اکوتا پینا تھا وہ۔ کس قدر عزیز تھا۔ وہ تو اس کی چھوٹی

”مئی! جب میرا قد ان کے قد کے برابر آیا تھا تو وہ مجھے اپنے ساتھ کھڑا کر کے قد کی لمبائی کو ہونے کس قدر مسرور ہوئے تھے۔ کتنی خوشی ہوئی تھی انہیں، ان کا بیٹا ان کے قد کے برابر ہو گیا۔ آپ بے وہ کیا کہہ رہے تھے اُس روز، مضبوط بازو ہوں میں ان کا۔۔۔ کیسے بول رہے تھے وہ آپ دیکھو فارحہ! میرا بیٹا جوان ہو گیا ہے۔ اس کا قد میرے قد کے برابر آ گیا ہے۔ اب مجھے کسی طرح کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں بس اتنی فکر ضرور کرنی ہے کہ میں اب کچھ بڑا ہو گیا ہوں۔ آئیے خود کو دیکھ کر وہ کس درجہ سرشاری سے مسکرا رہے تھے۔ کتنی خوشی ہوئی تھی انہیں میرے بڑے ہونے کی

میں نے کیا، کیا مئی!۔۔۔ کتنی تکلیف پہنچائی انہیں۔ وہ بچپن میں میری کوئی ناجائز بات بھی رو نہیں کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بے تکلی، بے معنی باتوں کو سنتے ہوئے گھنٹوں گزار دیتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا شکر کرتے رہنا ان کی عادت تھی۔ مجھے ہر طرح سے خوش رکھنے کی ذمہ داری تھی جیسے ان کی۔ مجھے آ دیکھنا سو ہاں روح تھا ان کے لئے۔ مگر میں۔۔۔ مئی! میں نے کیا، کیا ان کے لئے؟۔۔۔ کیا، کیا کے ساتھ؟ مجھے تو مضبوط بازو بننا تھا ان کا۔ انہیں خوش رکھنا تھا۔ ان کا ہر طرح سے خیال رکھنا تھا۔

طرح انہوں نے میرا ہمیشہ رکھا۔ جس طرح مجھے ہمیشہ اہم جانا، مجھے بھی تو مئی!۔۔۔ مئی! میں تو، نالائق بیٹا ہوں۔ آپ کا بھی اور۔۔۔۔۔ اور پایا کا بھی۔ نہ میں آپ کو خوش رکھ پایا نہ انہیں۔ میں تو۔۔۔ کو ہی ٹوٹنے سے، بکھرنے سے نہیں بچا پایا۔ پایا نے مجھے سب کچھ سکھا دیا، سب کچھ۔ مگر یہ نہیں یہ جب گھر ٹوٹنے لگتا ہے تو اس کی بنیادوں کو کیسے بننے سے بچاتے ہیں۔۔۔ کیسے اس مضبوط گھر کو گ سے باز رکھ سکتے ہیں؟۔۔۔ جب دل سے دل دور جانے لگتے ہیں اور فاصلے صدیاں بننے لگتے، کس طرح ان فاصلوں کو سمیٹا جا سکتا ہے۔ کس طرح صدیاں بننے سے روکا جا سکتا ہے۔ ایسا ٹنڈر انہوں نے۔ انہوں نے نہیں بتایا کہ جب دلوں میں میل آ جائے تو اسے کس طرح دھویا جا سکتا ہے۔

آئیے میں آئے ہال کو کس طرح مٹایا جا سکتا ہے؟۔۔۔ کیسے وقت کی سیاہی کو دھویا جا سکتا ہے۔ نہیں بتایا انہوں نے۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے مجھے رول ماڈل تو بنا دیا مئی! ہر طرح سے پرفیکٹ ایک کوالٹی پرستائی بھی دے دی۔ مگر اتنی اہم باتوں کو مجھ سے مخفی رکھ کے انہوں نے میری اندرونی بنیاد کو کسی قدر کمزور کر دیا ہے۔ مجھ سے بیگانگی برت کر، خود سے دور کر کے مجھے بہت تنہا اور اکیلا کر دیا۔

بہت زیادہ کمزور کر دیا ہے۔ اور ایسے میں کیسے لڑوں میں؟ کوئی تنہا کب تک اور کیسے لڑ سکتا ہے؟ اور اپنے آپ سے لڑنا۔۔۔ بہت مشکل ہے نامی! یہ تو۔۔۔ پایا نے مجھے کبھی خود اپنے آپ سے لڑنے کی ترغیب تو دی ہی نہیں۔ کبھی اپنے آپ سے جنگ کرنا سکھایا ہی نہیں۔ اور وہ تو۔۔۔ وہ تو میرا اپنا آپ ہیں۔ بتاؤ،

جب اپنے اندر سے بے ہوشی! کس سے لڑوں میں، کیسے لڑوں؟ لڑا بھی کیسے جا سکتا ہے؟ مجھ میں تو جوہ ہی نہیں۔ بچ کہوں، مارنے لگا ہوں میں۔۔۔ شاید ہار چکا ہوں۔“ اس مضبوط شخص کی آنکھیں اس ا بھیک رہی تھیں۔ کتنے ممکن سمندر اس لمحے ماں کی آنکھوں میں چپ چاپ مدغم ہو رہے تھے۔

”میرا پر اہم یہ ہے مئی! میں آپ دونوں کو ایک ساتھ دیکھنے کا عادی رہا ہوں۔ ایک ساتھ خفا دیکھتا رہا ہوں۔ مجھے آپ دونوں کی ایک ساتھ کی خوشی دیکھنے کی عادت رہی ہے۔ میں آج بھی

دل

دونوں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری اسزرتھ آپ دونوں ہیں۔ اور میں تبھی مضبوط ہوں گا جب آپ دونوں ایک ساتھ مجھے نظر آئیں گے۔ میں آپ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی آرزو نہیں کر سکتا، شکستہ نہیں کچھ سکتا۔ لیکن۔۔۔ لیکن مئی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ پتہ نہیں ایسا ہو بھی پائے گا یا نہیں۔ اور اگر ہو گا تو کیسے اور کیونکر۔ کوئی تدارک ہے بھی یا کہ نہیں۔ وہ ٹوٹا اعتبار، وہ ٹوٹا گھر، وہ سارے ٹوٹے مان کیسے جزیں ہے؟۔۔۔ کس طور؟“

شکستہ لہجہ واضح طور پر نچی سے پڑھا اور فارحہ کے پاس اس لمحے کوئی تدارک نہ تھا ماسوائے اپنا مانتا سے ہاتھ اس کے سر پر دھرے رکھنے کے۔ وہ اس گھڑی کچھ کر نہیں پائی تھی۔ شاید اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی ہیں سکتی تھی۔

میرب سیال نے ہدایت کے مطابق اپنا ضروری سامان پیک کر لیا تھا۔ نیویارک کے کلائے میٹ سے واقف تھی۔ سو بھاری تعداد میں گرم کپڑے بھی رکھ لئے تھے۔ گوا سے کوئی لمبا چوڑا قیام نہیں کرنا۔ سردار سٹیگنن حیدر لغاری کا بازو ٹوڑا تھا۔ اس کا اپنا ایک شیڈول طے تھا۔ یقیناً اس کا ارادہ با ضابطہ اسے ساتھ لے کر جانے کا نہ تھا۔ اس کی ہمراہی یقیناً ماں کی بدولت عمل میں آئی تھی۔ جو بھی اس کے لئے اہم یہ تھا کہ اس وقت میں جب پایا کے پاس اس کی موجودگی ضروری تھی، وہ ان کے پاس جا رہی تھی۔ اگرچہ وہ اس پر مسلط ہونا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ سو اس نے سامان سفر باندھ لیا تھا۔

جاتے وقت وہ بے جی سے بات کرنا نہیں بھولی تھی۔ وہ کسی قدر آرزو تھیں اور اگر وہ ان کو ایسے میں بتائے بغیر چلی جاتی یا پھر اس کے جانے کی اطلاع سیف الرحمن سے بہت رکی انداز میں ملتی تو شاید انہیں افسوس ہوتا۔ تبھی اس نے ان سے بات کرنا ضروری خیال کیا تھا۔

”خوش تو ہے نا انو؟“ انہوں نے شاید ایک نئے تعلق کے متعلق فکر مندی سے اس سے دریافت کیا تھا۔ وہ جیسے اس گھڑی مجبوراً مسکرائی تھی۔

”ہاں بے جی! سب ٹھیک ہے۔“ انہیں مطمئن کرنا چاہا تھا۔

”لڑکا تو اچھا ہے نا۔۔۔ تجھے پسند تو ہے نا؟“ ان کی فکر اور انداز فطری تھا۔

”ہاں بے جی! کہا نا، سب ٹھیک ہے۔ میں آؤں گی تو آپ کی طرف چکر لگاؤں گی۔ آپ پایا کے لئے دعا کیجئے گا۔ اور ہو سکے تو ان کی خطاؤں کے لئے انہیں معاف کر دیجئے گا۔“

بے جی یقیناً دوسری طرف رونے لگی تھیں۔

”بے جی! پلیز آپ روئیں نہیں۔“ اس نے ان کا حوصلہ بندھانا چاہا تھا۔ تبھی فون دوسری طرف سے سیف الرحمن نے لے لیا تھا۔

”سننی! بے جی کا خیال رکھنا۔“ اس نے ان کی کیفیت کے پیش نظر تاکید کی تھی۔

”ہاں۔۔۔ وہ تو میں رکھ لوں گا۔ مگر تمہارا خیال کون رکھے گا؟“ دوسری طرف وہ یقیناً شرارت سے

”ہوں۔“ اس نے میرا کئی انداز میں سر اٹھاتے میں بلایا تھا۔ سردار سنکینگین حیدر لغاری نے اسے سرسری انداز میں سمجھتے ہوئے سر بلایا تھا اور پھر اس پر سے اپنا دھیان ہٹایا تھا۔ میرب سیال نے ایک نظر دیوار پر ملے قیمتی وال کلاک پر ڈالی تھی پھر بہت آہستگی سے اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”سین۔“ پہلا مخاطب تھا یہ۔ اس تعلق کے استوار ہونے سے اب تک پہلی بار اس نے حیدر لغاری سے کچھ کہا تھا۔ پہلی بار بذات خود اسے خود اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ وہ جو جانے کے لئے پلٹنے کو تھا، اس کی ایک دھیمی آواز پر یکدم ہی پلٹ کر سوالیہ انداز میں اس کی سمت دیکھنے لگا تھا۔ شاید پہلی ہی بار وہ دانستہ اس کی مت دیکھنے پر مائل ہوا تھا۔ پہلی ہی بار باضابطہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اس گھڑی اپنی پوری توجہ سے اس کی سمت تلکتا ہوا اسے یقیناً بڑا عجیب لگا تھا۔ اسے متوجہ کر کے وہ یقیناً کنفیوژ ہوئی تھی۔ پتہ نہیں واقفی اس شخص میں اتنا رعب تھا یا پھر وہ ہی اسے اتنا سر پر سوار کر رہی تھی۔ اس کے یکدم نگاہ جھکا لینے اور خاموشی بادلہ لینے پر وہ کسی قدر اکتاہٹ کا شکار ہوا تھا۔ شفاف آنکھوں میں کسی قدر ناگواری کی جھلک عود کر آئی تھی۔ میرب سیال کو بھی اپنی کمزور کیفیت بے حد بری لگی تھی۔ تبھی وہ سر اٹھا کر کسی قدر اعتماد سے اس شخص کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”ابھی کچھ وقت ہے۔ میں اپنی بے جی سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟“ پہلی درخواست تھی۔ اس خاص تعلق کے حوالے سے پہلی گزارش تھی۔ اس کی پابند تو نہ تھی، تا حال کوئی قیود ہری جانب سے بھی عائد نہ کی گئی تھیں۔

سردار سنکینگین حیدر لغاری اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس خاموشی پر شاید مایوس ہو کر سر جھکا گئی۔ بے جی جس طرح آزرہ ہو رہی تھیں، اس کے پیش نظر اس نے ایسا ضروری جانا تھا۔ لیکن اب اپنی سا گزارش کے بے قدر ہو جانے کا شدید ترین احتمال ہوا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹنے والی تھی جب وہ گویا ہوا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن زیادہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔“ پہلی اجازت تھی یہ۔ پہلی باضابطہ گفتگو تھی ان دونوں کے مابین۔ پہلا حکم تھا شاید۔ جسے صادر کرنے کے بعد وہ پلٹا تھا اور وہاں سے چلا یا تھا۔ میرب سیال نے چند ثانیوں تک جانے کیوں اس شخص کی چوڑی پشت کو دیکھا تھا۔ پھر ضروری امان لینے کر کے کی طرف چل دی تھی۔ لوٹی تھی تو گاڑی سے ٹیک لگائے وہ اس کا منظر تھا۔ مائی اماں ماکی تا کیدی تھیں، ضروری ہدایات تھیں۔ جنہیں سنتے ہوئے وہ مسلسل اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ سردار سنکینگین حیدر لغاری کا انداز بھی ہمیشہ کی طرح خاصا سرد تھا۔ کسی قدر لا تعلق اور لیادیا۔ مکمل توجہ جانے والی تھی اس کا موم اور لوگوں کے لئے وقف تھی۔ اس لئے چوڑے شخص کی سمت بلا ارادہ نکلتی ہوئی وہ گاڑی سا بیٹھی تھی۔ سردار سنکینگین حیدر لغاری جیسے اس کے اس فعل کا منظر تھا۔ فوراً ہی مائی اماں سے مل کر وہ اپنی رُف کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ آن بیٹھا تھا۔ ڈرائیور نے حکم پر گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ میرب ال نے دھیان کھڑکی کی سمت پھیرنے سے قبل براہ راست ڈرائیور کو بے جی کا ایڈریس بتانے کے لئے ضروری ہدایت دے دی تھی۔ سردار سنکینگین حیدر لغاری نے اس کی سمت اس لمحے ایک بے تاثر نگاہ اٹھائی اور چہرے کا رخ پھیر لیا تھا۔

مسکرا رہا تھا۔

میرب نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔ تبھی وہ گویا ہوا تھا۔

”اتنی سرد سرد آہیں خارج مت کرو۔۔۔ موسم پہلے ہی کافی سرد ہے۔ اور میرا فریز ہو۔ ارادہ نہیں۔“

”تم فضول باتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے؟“

”خوش ہونا؟“ جانے کیا اگلوانا چاہا تھا۔ وہ اس کی شرارت سمجھ کر مسکرا دی تھی۔

”نہیں ہونا چاہئے کیا؟“

”کیوں نہیں۔۔۔ مجھ سے بڑھ کر بھلا کون خیر خواہ ہوگا تمہارا؟“

”حد کی بو کیوں آرہی ہے پھر؟“ میرب سیال نے جواباً چیخڑا تھا۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”میں حد کر کے کیا کروں گا؟ اگر مجھے ایسے سردار صاحب مفت میں بھی ملیں تو میں نہ لوں لوں بھی تو پہلی فرصت میں بیچ کر ریوڑیاں کھالوں۔ وہ ان موصوف سے یقیناً زیادہ سود مند ہوں گے۔“ سینفی۔۔۔ اس نے ڈانٹنا چاہا تھا۔ مگر اس کے باوجود ہی اس کے لبوں پر آچکی تھی۔ تم بیچ گئی تھی۔

”میرب!“ اس نے سنجیدگی سے پکارا تھا۔

”ہوں۔“

”اپنا خیال رکھنا۔“

”اور کیا؟“

”اور اس موقع کو کسی قدر اوہل کرنے کی کوشش کرنا۔ موسم اچھا ہے۔ دل پر اثر پذیر بھی ہو سکتا تم اسے اجازت دو۔ سردار صاحب کی سنگت کچھ اتنی بری بھی نہیں ہوگی۔ اب اپنے احساس پیدا دل ملنے کے کئی مواقع میسر ہوں گے۔ بشرطیکہ تم چاہو۔“

”سینفی! تم اپنے دادی اماؤں جیسے مشورے اپنے پاس نہیں رکھ سکتے؟“

”سچا خیر خواہ ہوں تمہارا۔“

”اگر ایسا ہے تو بے جی کا خیال رکھنا۔ وہ رو تو نہیں رہیں اب؟“

”اتنی فکر ہو رہی ہے تو آکر چکر لگا جاؤ۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ ابھی کچھ بولنے جا رہی تھی جب اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو نے تبھی باقی کی بات اندر ہی دبا لی تھی اور گویا ہوئی تھی۔

”سینفی! میں تم سے پھر بات کروں گی۔ اوکے؟“

سردار سنکینگین حیدر لغاری بنا کسی سبب کے اس کے قریب نہیں آتا تھا۔ یقیناً اس گھڑی بھی وہ ا۔ ضروری ہدایت دینا چاہتا تھا۔ میرب نے پنٹ کر اس کی سمت نگاہ کی تھی۔

”آریوڑی ناؤ؟“ مکمل توجہ سے سنتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

ان کے پاس وقت واقعی زیادہ نہ تھا۔ وہ جانتی تھی، اس کے اس اقدام پر وہ شخص کچھ خاص حوٹا ہوا تھا۔ شاید یہی جب گاڑی بنے جی کے گھر کے سامنے رکھی تھی تو اس نے سردار سبتکین حیدر لغاری گاڑی سے اترنے کی اور اپنے ساتھ چلنے کی درخواست نہیں کی تھی۔

رشتہ اس کا تھا۔ تعلق اس کا تھا۔ وہ کچھ کبھی بھی کیونکر۔ اس تعلق، اس رشتے کی ابھی تک خود لئے ثانوی حیثیت تھی۔ پھر وہ کسی اور کو اس سلسلے میں انوالو کیوں کرتی۔ خاموشی سے اپنی طرف اٹھ کھول کر وہ گاڑی سے باہر نکلتی تھی اور ابھی چلی بھی نہیں تھی جب دوسری سمت کا دروازہ کھلنے کی آم اسے کسی قدر چونکا دیا تھا۔ سردار سبتکین حیدر لغاری اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اس لئے گاڑی نکل کر کھڑے ہوئے اس کے ہمراہ چلنے کا منتظر تھا۔ اس کی حیرت دو چند تھی۔

کوئی خوش آئند تہدیلی تھی یہ۔

یا پھر وقتی مصلحت کے تحت کوئی وقتی اقدام تھا۔

لیکن سردار سبتکین حیدر لغاری کب سے مصلحتوں کا پابند ہونے لگا، وہ کیونکر دوسروں کی خاطر اپنی فنی کرنے لگا تھا۔ کیا کچھ مروت اس میں بھی باقی تھی؟ مصلحت، مردوانا افعال سرانجام دینا اسے بھی آ میرب سیال نے اس کی سمت ایک سرسری نگاہ کی تھی۔ پھر قدم اندر کی جانب بڑھا دیئے تھے۔

”ماشاء اللہ، دولہا تو بڑا سوہنا ہے تیرا۔“ بے جی اس سے ملنے کے بعد اس لئے سردار سبتکین لغاری سے مل رہی تھیں۔ کس قدر بی بے بچوں کی طرح اس لئے وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ مائی اما بہت انیسیت تھی اسے۔ بزرگوں سے ادب و آداب سے ملنا یقیناً اسے آتا تھا۔ بے جی کی فطری تعریف وہ شاید دھیمے سے مسکرایا بھی تھا۔ میرب سیال کو بڑی خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

”خدا جوڑی سلامت رکھے۔۔۔ دل کو بڑی راحت ملی ہے تم دونوں کو سامنے دیکھ کر۔ بڑا ہوا تھا جی۔“ بے جی نے محبت سے اسے سکتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اس گھڑی جیسے مصلحتاً مسکرائی تھی۔

”سیال سے بڑا گلہ تھا مجھے۔۔۔ مگر تیرا دولہا دیکھ کر ساری کلفتیں دھل گئیں۔ ساری عمر کے عجز دیئے اس نے۔ اب مر بھی جاؤں گی تو میری قبر بڑی ٹھنڈی رہے گی۔“

”خدا نخواستہ بے جی!“ میرب سیال فوراً بولی تھی۔ ”خدا آپ کو لمبی عمر دے۔“

”بیٹا! کیا کروں گی لمبی عمر لے کر؟۔۔۔ اس عمر میں تو اپنی خواہش کم، بچوں سے زیادہ وابستہ ہے۔ خدا تم لوگوں کو خوش رکھے۔ اس سے زیادہ کی خواہش ہے نہ حاجت۔“ بے جی اسے اپنے ساتھ

سردار سبتکین حیدر لغاری کی سمت سکتے لگی تھیں جو اس لئے گھڑی کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”بے جی! ماموس، مائی اور سینی وغیرہ نظر نہیں آ رہے؟“

”سینی تو کسی کام سے باہر گیا ہے۔۔۔ البتہ باقی سب لوگ ایک تقریب میں گئے ہیں۔ ہوا اپنی ٹھیال اس تعلق کے بعد۔ سبتکین بیٹا کیا سوچ رہا ہوگا، کوئی خاطر داری بھی نہیں کی۔“

”نہیں بے جی!۔۔۔ ایسی بات نہیں۔ کچھ کیلی ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں تھا۔ مجھے ہر

فکر ہو رہی تھی۔ آپ اپنا خیال رکھئے گا۔“

سردار سبتکین حیدر لغاری نے کچھ نہیں کہا تھا مگر اس کی نگاہ بدستور اس کی طرف تھی۔ وہ اس کے گھڑی نگاہ کرنے سے ہی جان گئی تھی کہ وہ اس لئے کیا چاہ رہا ہے۔

”بیٹا! مجھے اپنی اکلوتی نواسی بہت عزیز ہے۔ بہت خیال رکھنا ہے اس کا۔ یوں سمجھو اس گھڑی ہماری ان تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ جی جان سے عزیز رکھنا اسے۔ کبھی کوئی آزار مت آنے دینا۔“ بے جی نے سردار سبتکین حیدر لغاری کے سر پر ہولے سے ہاتھ دھرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جانے کیوں اس لئے اس کی جانب متوجہ تھی۔ بے جی کی ہدایت پر وہ اس کی سمت نکلے لگا تھا۔ وہ دھیان پھیر گئی تھی۔ سردار سبتکین حیدر لغاری دھیمے سے مسکرایا تھا۔

”جی۔۔۔ آپ بے فکر رہئے۔“

”ایک درخواست اور کروں گی۔“

”جی، ضرور۔ مگر درخواست نہیں، حکم کیجئے۔“ سعادت مند ی بلا کی تھی۔ میرب سیال بری طرح چونکی۔ اس جانب نگاہ بھی کی تھی مگر وہ اس گھڑی اس کی جانب متوجہ نہیں تھا، مکمل توجہ سے بے جی کی سمت بڑھا تھا۔

”بہت ترسی ہوں میں ہمیشہ میرب کے لئے۔ میری اکلوتی بیٹی کی نشانی ہے یہ۔ مگر حالات کچھ ایسے ہے کہ سیال نے اسے ہم سے زیادہ ملنے نہیں دیا۔ خیر ہمیں اس سے کوئی گلہ نہیں۔ جو اس نے چاہا سو با۔ مگر بیٹا اب جب کہ میرب کی زندگی کے وارث تم ہو، میں تم سے امید رکھوں گی کہ تم اسے ہم سے لے آتے جاتے رہا کرو گے۔ بہت ترپا ہے دل اپنی بچی کے لئے۔ اب اور کی ہمت نہیں۔ عمر کی نقدی اہونے کو آن پہنچی ہے۔ کب بلاوا آجائے، کسے خبر۔ بس تم سے امید کروں گی کہ تم اسے محبت سے رکھو، ہا کا خیال کرو اور کبھی کبھار ہم سے ملوانے لاتے رہا کرو۔“ بے جی کی درخواست پر اس نے دھیمے سے لراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ پھر دھیان پھیر کر میرب سیال کی سمت دیکھا تھا۔

”چلیں۔۔۔“ وہ جانتی تھی وہ اس کا توقع سے زیادہ وقت لے چکی تھی اور وہ یقیناً توقع سے زیادہ

ات کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ سبھی اس نے فوراً قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔ سردار سبتکین حیدر لغاری اس گھڑی کے ہمراہ تھا۔ اس کے ہم قدم تھا۔ ابھی تو ڈیڑھ قبل اس نے اس کا بہت انوکھا روپ دیکھا تھا۔ جس تعلق یقیناً کم از کم وہ قیاس نہیں کر رہی تھی۔ سبھی شاید حیرت بھری نگاہ اس لئے اس کی سمت اٹھی تھی۔

اس کے اپنی جانب دیکھنے پر وہ قدرے چونکا تھا۔

”کیا؟“ مختصر استفسار ہوا تھا۔ میرب سیال نے فوراً سر نیچے میں ہلایا تھا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر فوراً دیکھنے لگی تھی۔ سردار سبتکین حیدر لغاری نے دوسرے ہی لمحے اس پر سے نگاہ ہٹائی تھی اور اپنی طرف کا ازہ کھول کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ ڈرائیور نے حکم پر گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ میرب سیال چہرے میں پھیر کر کھڑکی سے باہر نکلنے لگی تھی۔

اس شام کے بعد سے اس نے ہر خیال کو سرسری لیا تھا۔ یکسر فراموش کر دیا تھا سب کچھ۔ اور کچھ

سوچنے لائق تھا بھی کیا۔۔۔ کوئی بات اس قدر معمول سے ہٹ کر بھی واقع نہ ہوئی تھی۔ شام میں جب وہ گرم گرم کافی کے سپ لیتی ٹیرس پر کھڑی اس سرد موسم کو انجوائے کر رہی چوکیدار کے گیٹ واکر نے اور اندر پورچ میں آ کر رکنے والی گاڑی نے اسے چونکا دیا تھا۔ ا تھا کہ وہ اس سے قبل بھی یہاں کا پیکر شاید لگا چکا تھا۔ ورنہ چوکیدار کسی اجنبی یا نو وارد کے آ۔ اس طرح واہر گز نہیں کرتا تھا۔

وہ اسی جانب اسی طرح دیکھ رہی تھی جب عفتنان علی خان نے گاڑی سے باہر نکل کر ہاتھ ادا وں کیا تھا۔ اخلاق کا تقاضا یہی تھا کہ جو باہر بھی ہاتھ ہلا دیتی اور وہ اس قدر ان میٹرز قطعاً نہیں آئے مہمان سے بدسلوکی کی روداد بنتی۔ سولہوں پر دھیمی سی مسکراہٹ سجا کر اس نے بہت آہستگی ہلا دیا تھا۔ عفتنان علی خان ہاتھ میں ایک پیکٹ لئے ٹیرس کی بیرونی سیڑھیاں چڑھتا ہوا آ رہا تھا۔ شاہ کو اب مہمان نوازی کے کچھ اور تقاضے بھی پورے کرنے تھے۔

سیڑھیاں چڑھ کر اس لمحے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔ چند ہی ثانیوں کے مقابل تھا۔

”یہاں سے گزر رہا تھا۔۔۔ سوچا دادا ابا سے ملتا چلوں۔“ حال احوال کے بعد مدعا بیان یقیناً وہ دادا ابا سے دوستی کا ٹھہ چکا تھا۔

وہ جو ابار سہا یا پھر شاید اخلاقاً مسکرائی تھی۔ دھیان اس کے ہاتھ میں تھے پیکٹ کی سمت گیا تھا ”یہ کیا ہے؟“

انا بیہ شاہ کے دریافت کرنے پر وہ چونکا تھا۔

”دادا ابا کے لئے گفٹ ہے۔ اس روز میں انہیں کوئی گفٹ نہیں دے رکھا تھا۔“

”موصوف کو تعلقات استوار کرنے کے سارے گر شاید از بر تھے۔“

”کیا ہے یہ؟“

”جیسے بورڈ۔“

”جیسے بورڈ؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔ تو کیا وہ دادا ابا کی دلچسپیوں سے بھی واقف تھا؟ وہ اگر ا متاثر نہ ہوتی تو یقیناً اس سامنے کھڑے بندے کی ایفٹ کے ساتھ نا انصافی ہوتی۔ شاید یہی وہ مسکرا ”کھینچنے سے واقف ہیں؟“ بغور تکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”حرج تو کوئی نہیں۔“

”کھینچنے میں یا ہارنے میں؟“ وہ یقیناً محظوظ ہو رہی تھی۔

”دونوں میں۔ کھینچنے کے نہیں تو جیتنے کے کیسے؟ اور ہاریں گے نہیں تو سیکھیں گے کیسے؟ کے لئے کھینچنا تو بہت ضروری ہے نا۔“ موصوف کی فطرتی خاصی کمال کی تھی۔

”پھر تو لامعہ کے لئے زندگی خاصی دھوار اور مشکل ہوگی۔ جیسے کھینچنے والے، دماغ سے چلنے۔“

”ہاں۔“ قیاس آرائی کی تھی۔ مگر مقابل نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ہاں لبوں کی مسکراہٹ

تھی۔

”دادا ابا لاؤنج میں ہیں۔“ اطلاع دی تھی۔

”بہنائی نہیں کریں گی؟“

”لامعہ کو انگی تھام کر چلنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے۔“ اس کے ساتھ چلتے ہوئے مسکرا کر مطلع کیا تھا یا در کر آیا تھا لیکن عفتنان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”تجربہ ہر گھڑی لامعہ نامہ الاپنے کی عادت کیوں ہے؟“ وہ یکدم پٹری سے اتر ا تھا۔ وہ چلتے چلتے رکی تھی۔ عفتنان علی خان بغور تکتا رہا تھا پھر مسکرا دیا تھا۔ انا بیہ شاہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔ تبھی عفتنان علی کی جیبی سے اسے دیکھتا ہوا گویا ہوا تھا۔

”دادا ابا خاصے اچھے دوست ہیں۔۔۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا۔“

”وہ جیسے پلیئر بھی بہت عمدہ ہیں۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”ڈرار ہی ہیں آپ مجھے؟“ وہ بغور اس کی سمت تکتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”نہیں۔۔۔ مطلع کر رہی ہوں۔ وہ سامنے دادا ابا موجود ہیں۔ آپ جا سکتے ہیں۔“ اسے لاؤنج میں لروہ واپس پلٹ گئی تھی۔ عفتنان علی خان مسکرایا تھا، پھر آگے بڑھ گیا تھا۔

عشق مانگے امتحان کیا کیا۔

بابہ کافی لے کر آئی تھی جب خاصائف میج جاری تھا۔ عفتنان علی خان اور دادا ابا مکمل توجہ سے شطرنج دل کو گھور رہے تھے۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”دادا ابا! اگر لامعہ کو کبھی لگا کہ اس کا منگیتر بہت ذہین و فطین ہے تو اس کا سہرا یقیناً آپ کے سر ہوگا۔“

”کے مک ان کے سامنے رکھتی ہوئی وہ یقیناً ان کی کیفیت سے محظوظ ہوئی تھی۔ عفتنان علی خان نے فقط گاہ کی تھی۔ کہا کچھ نہیں تھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی جب ماما نے اسے آواز دی تھی۔

”بٹا! تمہارا فون ہے۔“

”آ رہی ہوں ماما!“ ماما کو آواز دے کر وہ عفتنان علی خان کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

شطرنج واقعی خاصا مشکل کھیل ہے۔ ہے نا؟“ اپنی مستدرائے دے کر وہ بنا اس کا جواب سنے پلٹ ا۔ عفتنان علی خان اسے فقط دیکھ کر رہ گیا تھا۔

ابہ شاہ کو اس شخص کی کیفیت یقیناً محظوظ کر رہی تھی۔ دادا ابا پچھلے پچاس برسوں سے جیس کھیل رہے نہیں ہرانا یقیناً آسان نہ تھا۔ وہ بھی عفتنان علی خان جیسے قطعی نا بند شخص کے لئے، جسے جیس کی ابجد لوم نہ تھی۔

”مسکرائی ہوئی فون اسٹینڈ کی طرف آئی تھی۔ دوسری طرف اوزی کی آواز سن کر وہ بری طرح چونک ا۔

”اوا! اوزی! تم؟“ ماما نے مجھے بتایا تک نہیں۔ کتنے بے ایمان شخص ہو تم۔ یقیناً یہی لسانے سے باز رکھا ہوگا۔“

دوسری طرف اوزی ہنس دیا تھا۔

”بتا دیتا تو تمہارے ایکساٹمنٹ کیسے دیکھتا؟“

”بہت مزہ آتا ہے تمہیں مجھے پریشان کر کے۔“

”یقیناً۔۔۔ لیکن تمہیں خوش دیکھ کر مجھے زیادہ لطف آتا ہے۔“ اوزی دوسری طرف مسکرایا

”ماچسٹر کا موسم کیسا ہے؟۔۔۔ زیادہ ٹھنڈ تو نہیں؟۔۔۔ اور تم اپنا خیال رکھ رہے ہو یا نہیں

”ایوری تھنگ از فائن اینڈ ان کنٹرول۔ تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟۔۔۔ پچھلی بار

کہیں اس بار بھی فیل تو نہیں ہو گئیں؟“

”اوزی! میں فیل نہیں ہوئی تھی، فقط میرے مارکس کم آئے تھے۔ میں تمہاری طرح کوڑھ

ہوں۔“ اس نے اپنا دفاع کیا تھا۔ دوسری طرف اوزی ہنستا چلا گیا تھا۔

”اچھا سنو!۔۔۔ تمہارے لئے کیا لاؤں؟“

”تم آرہے ہو؟“ وہ حیرت سے چہچہائی تھی۔ دادا ابا اور عفتان علی خان نے بیک وقت اس کی

تھاگردہ اس گھڑی بے حد مگن تھی۔ کسی بھی رسمی انداز کے بغیر اس کے چہرے پر اس لمحے بڑے

احساسات تھے۔ وہ اس گھڑی جس سے بھی مخاطب تھی، بہت دل سے مخاطب تھی۔

”اوہ گاڈ۔۔۔ اوزی! تم آرہے ہو؟“

”تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ میں سدا جوگ لے کر یہیں پڑا رہوں گا؟“

”ارادہ تو خیر تمہارا کچھ ایسا ہی تھا۔۔۔ اب اگر آرہے ہو تو جی کزاکر کے آنا۔“

”میرا حوصلہ بندھانے کے لئے تم ہوتا۔“

”تمہیں ہر مرض کی دوا میں کیوں نظر آتی ہوں؟“

”کیونکہ تم مجھ سے زیادہ جینٹلس ہو۔“

”کیا لاؤ گے میرے لئے؟“

”کیا لاؤں؟“

”تم خود آ جاؤ۔“

”اتنی رعایت۔۔۔ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔“ اوزی کا ماتھا ٹھٹکا تھا۔ وہ ہنس دی تھی۔

”کب آرہے ہو؟“

”یہ نہیں بتاؤں گا۔“

”ہر بار کی طرح اس بار بھی سر پرائز دو گے۔۔۔ پچھلی بار بھی ساری رات بیٹھی جاگتی رہا

جب تم آئے تھے تو پانی کی پوری بالٹی میرے اوپر اڈیل کر اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ بہت استونہ

پچھلے برس کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا منہ کسی قدر کڑوا ہوا گیا تھا۔ لیکن دوسری طرف اوزی ہنس دیا

”چلو، پراس کرتا ہوں۔ اس بار پانی کی پوری بالٹی نہیں اڈیلوں گا۔“

”یعنی تم پھر کسی دھماکے دار سر پرائز کے ساتھ وارد ہو گے۔۔۔ ماما کو آگاہ کر دیتی ہوں میں

نہیں میں۔ قطعاً نہیں جاگوں گی اب۔ مزید بے وقوف نہیں بننا ہے مجھے۔“

”مزید کیا مطلب؟“ اوزی کا قبضہ بڑا بے ساختہ تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”ہنس ڈوچ اوزی!۔۔۔ فون پر ہواں لئے لحاظ کر رہی ہوں۔ ورنہ۔۔۔۔۔۔۔۔“

”ورنہ کیا؟۔۔۔ دیکھو پچھلی بار کی طرح اس بار بٹے کا استعمال مت کرنا۔ کہنے کو تم ایک دھان پان

، نازک لڑکی ہو۔ مگر شارٹ لگانے میں تمہارا انداز بالکل انضمام والا ہے۔“ اوزی نے دہائی دی تھی۔

یہ شاہ ہنس دی تھی۔

”پچھی تو کہہ رہی ہوں، شرافت سے وقت بنا کر آؤ۔ اچھا سا استقبال کروں گی۔“

”اس ویک میں کسی بھی دن۔۔۔ اس سے زیادہ نہیں بتاؤں گی۔“

”اوکے۔۔۔ لیکن اسی ڈیوریشن میں آ جانا۔ میں ماما کو مطلع کر رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ دادا ابا کو میرا سلام دینا۔“

”اوکے۔“ وہ فون رکھ کر سر شارٹ مڑی تھی۔

”ماما! اوزی آرہا ہے۔ دادا ابا! اوزی آرہا ہے۔“

”اچھا۔۔۔ کب؟“ دادا ابا جہاں متوجہ ہوئے تھے وہیں عفتان علی خان نے بھی بغور اس کی جانب

بھاٹا۔ خوشی اس لئے چہرے سے پھلک رہی تھی۔ جو بھی تھا، اس کے آنے کی خوشی اس کے چہرے پر دم

ن۔ انا بیہ شاہ کی نظر اس پر پڑی تھی۔ بھی وہ لحو بھر کو ساکت ہوئی تھی۔ یقیناً اس ایک لمحے میں وہ ٹیکس

بل گئی تھی کہ اس لمحے اس گھر میں ایک قدرے اچھی شخص بھی براجمان ہے۔ شاید بھی اس نے اپنی

بالٹمنٹ پر کسی درجہ قابو پایا تھا اور دھیسے سے مسکرائی تھی۔

”اسی ویک۔۔۔ اسی ویک میں۔ حسب معمول سر پرائز دے کر آئے والا ہے وہ۔“ دادا ابا کو مطلع

کے اس نے جیس بورڈ پر نگاہ کی تھی۔ جہاں باڑی اختتام پذیر ہو چکی تھی۔

”ہو از دی ویز؟“ سوالیہ نظروں سے دادا ابا کی طرف دیکھا تھا۔ جتنی کیم ابھی ہوئی تھی اس کے

بتی اتنی جلد نتیجہ متوقع نہیں تھا۔ یہ بات اس کے لئے یقیناً حیرت کا باعث بنی تھی۔

”عفتان علی خان۔“ دادا ابا مسکرائے تھے۔

”عفتان علی خان؟“ زبر لب مسکراتے ہوئے انا بیہ شاہ کو شدید ترین حیرت ہوئی تھی۔ عفتان علی خان

ت کا خوشی کے ساتھ بیٹھا بخور اس کی سمت تکتا رہا تھا۔ انا بیہ شاہ نے حیرت سے اس پر نگاہ کی تھی۔ اس

ٹٹ کی آنکھوں میں اس لمحے ایک خاص چمک تھی۔ لبوں پر بڑی دھیمی مسکراہٹ تھی۔

”نئی از اے ریٹی جینٹس پرسن۔ یقیناً عفتان علی خان شطرنج کا ایک ماہر کھلاڑی ہے۔“ دادا ابا کے

ٹٹ اس کے تقاضا میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ انا بیہ شاہ کی حیرت برحق تھی۔ وہ واقعی ایسا ایکلیکٹ

ن کر رہی تھی۔ دادا ابا نماز پڑھنے کے لئے جانے سے قبل اُسے سراہنا نہیں بھولے تھے۔

”میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔۔۔ آتے جاتے رہا کرو۔ یقیناً خوب جھے گی ہماری تمہاری۔“

انا بیہ شاہ ایک ٹک اس کی سمت تکتی جا رہی تھی۔

دادا ابا کے جانے کے بعد عرفان علی خان مسکرایا تھا۔

”خواب و خیال کی کیفیت سے باہر آ جاؤ۔ یہ خواب ہی آنکھیں جو دیکھ رہی ہیں وہ یقیناً خواہ ہے۔“ مذہم لہجے میں ایک خاص تفاخر تھا۔ آنکھوں میں واضح چمک تھی۔ لبوں کی دھیمی مسکراہٹ بتا کہ وہ اس گھڑی اپنی جیت پر کس درجہ سرشار تھا۔ اس کی سمت بغور تکتا ہوا بہت ہولے سے گویا ہواؤ اس کی آنکھیں بتاؤں کیسی ہیں جھیل سیف الملوک جیسی ہیں

وہ مکمل طور پر مسرور تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل دھواں دھار بولنے والی لڑکی کی زبان اس قدر گنگ تھی۔ ”تمہارے وصف تو زالے ہیں۔۔۔ ان آنکھوں کی ایک جنبش سے ہی فقط دنیا زیر و زبر ہے۔ تمہیں افعال و اعمال سے کیا غرض؟ تمہاری کرشمہ سازیاں تو اس سے بھی سوا ہیں۔ کتنے اہمیدوں سے واقفیت ہے تمہاری۔ ایک عام سے بندے کی سوچ کی تو رسائی بھی تم تک ممکن نہیں انوکھے جہانوں میں ہستی ہوتی؟۔۔۔ کتنے انوکھے ٹھکانے ہیں تمہارے۔“ عرفان علی خان کی ذہنی شاید بھٹک رہی تھی۔ وہ اس گھڑی پھر شاید پٹری سے اتر رہا تھا بلکہ شاید اتر چکا تھا۔ انا بیہ شاہ اب اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔

”کھانا کھا کر جانے کا ارادہ ہے؟“

وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اسے بغور دیکھتے ہوئے سر نہنی ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ پھر کبھی سہی۔ آج تو فقط جیت سے سرشار ہوں۔“ وہ اسی طرح کھڑا تھا جب ماہ آئی تھیں۔

”تم کھڑے کیوں ہو بیٹا! بیٹھو نا۔۔۔ کھانا کھا کر جانا۔“

”نہیں آئی! پھر کبھی سہی۔“ وہ بولا تھا۔ پھر ایک نگاہ اس کی طرف کی تھی، دھیمے سے مسکرایا تھا پلٹ کر قدم بڑھا دیتے تھے۔

”بھابی! کتنی عجیب بات ہے۔۔۔ آپ نے سردار بکتگین حیدر لغاری کی شادی کر کے لہن اسے ہنی مون کے لئے بھی بھجوا دیا اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ وہ تو اس روز عرفان نے اسے ہونٹ مٹا تو تب حقیقت کھلی ورنہ شاید آپ تو اپنی بیٹی سے یہ بھی مخفی رکھتیں۔“ فاطمہ خان نے مائی اماں سے کہا تھا۔ وہ بڑی رسائیت سے مسکرا دی تھیں۔

”بھلا ایسی باتیں بھی کبھی مخفی رہ سکتی ہیں فاطمہ؟۔۔۔ بتایا تو تھا تمہیں سیال صاحب کی پیمانہ متعلق۔ انہی کی اکلوتی بیٹی سے میرب۔ وہ علاج کی غرض سے باہر جا رہے تھے سو یہاں چھوڑ گئے۔“ اور وہ جو عرفان کو خود بکتگین نے مطلع کیا؟“ فاطمہ خان نے استفسار کیا تھا۔

”یہی تو بتا رہی ہوں۔۔۔ سیال صاحب کو علاج کی غرض سے بیرون ملک جانا تھا۔ اگرچہ بات تو اس سے قبل ہی چلی تھی مگر انداز سرسری تھا۔ سیال صاحب جب جا رہے تھے تو ان کا ارادہ

تھا۔ مگر مجھے میرب اس قدر پسند آئی تھی کہ میں اسے ہرگز کھونا نہیں چاہتی تھی۔ سو میں نے ان کے لئے نکاح کی تجویز رکھی تو انہوں نے بھی انکار نہیں کیا۔ اس طرح میرب بکتگین کی منکوحہ ہو گئی۔ ابھی با ابطہ کچھ کیا کہاں ہے۔ پھر کاہے کا ڈھنڈورا پیٹنا۔ سیال صاحب صحیح سلامت لوٹیں گے تو پھر با ضابطہ اس کا اعلان کریں گے۔ فی الحال تو وہ دونوں سیال صاحب کی عیادت کو ہی گئے ہیں۔ میرب بہت آزرہ رہی تھی۔ بکتگین حیدر بھی بڑا نرس ٹور پر جا رہا تھا۔ میں نے میرب کو بھی ساتھ کر دیا۔“

”بکتگین حیدر نے عندیہ دے دیا تھا نکاح کے لئے؟“ فاطمہ پھوپھی تھیں۔ بھتیجے کے مزاج سے اچھی ج واقف تھیں۔ تبھی کسی قدر حیرت سے دریافت کیا تھا۔

”مائی اماں مسکرا دی تھیں۔

”فاطمہ! گھوڑا چاہے لاکھ سرش ہو، اپنے سائیس سے سر کشی نہیں کر سکتا۔ چاہے لاکھ ہاتھ پیر مارے مگر نہیں جانتا ہے کہ اسے کس طرح قابو کیا جا سکتا ہے۔“

”سردار بکتگین حیدر لغاری کو پسند تو ہے نالڑکی؟“ فاطمہ خان کو تشویش ہوئی تھی۔

”مائی اماں مسکرا دی تھیں۔

”میرب میں ناپسند کرنے والی کوئی بات نہیں۔ سب سے بڑھ کر مجھے اس لڑکی میں بہت خاص شے آئی ہے فاطمہ! بہت سی لڑکیوں کو دیکھا ہے میں نے۔ مگر میرب کو دیکھ کر جانے کیوں مجھے لگا کہ یہی وہ لی ہے جو میرے بکتگین حیدر لغاری کو سمجھ سکتی ہے۔ سب کچھ اپنے رنگ میں رنگ سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ ایک دن ایسا سب کر گزرے گی۔“ مائی اماں کا لہجہ پُر یقین تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے بھابی! مگر بکتگین حیدر.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔ مائی اماں نے انہیں لڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔

”تمہارے خدشے بے جا نہیں ہیں فاطمہ! کسی قدر فکرمند میں بھی تھیں۔ مگر اب مجھے لگنے لگا ہے کہ یقیناً ہو سکتا ہے۔ وہ لڑکی بڑی کرشمہ ساز ہے۔ وہ حالات کو اپنے بس میں کر سکتی ہے۔ پہلے پہل مجھے بھی لگا تھا میں نے کسی معصوم لڑکی کے ساتھ نا انصافی کی ہے۔ لیکن اب مجھے ایسا کوئی پچھتاوا نہیں۔ لہذا مجھے لگتا ہے یہ وہی لڑکی ہے جس کی ضرورت بکتگین حیدر جیسے شخص کو تھی۔ یہی وہ لڑکی ہے جو سے مکمل کر سکتی ہے۔“

فاطمہ خان نے سر ہلایا تھا۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“

تبھی مائی اماں نے ان کی سمت نکلتے ہوئے کہا تھا۔

”تم سناؤ۔۔۔ بیٹے کی شادی کب کر رہی ہو؟“

”اچھی کہاں بھابی!۔۔۔ آپ تو جانتی ہیں آج کل کے بچوں کے مزاج کو۔ عرفان بھی کہاں حق

مانگتا تھا جلدی شادی کے۔ وہ تو بہنوں کے اور میرے کہنے پر ممکن کی زنجیر پیروں میں پکین لی۔“

”تو زبردستی کیوں کر رہی ہو بچے پر؟۔۔۔ عرفان علی خان تو ماشاء اللہ خاصا سلجھا ہوا بچہ ہے۔ اس

معاملے میں تم تو ایک خوش نصیب ماں واقع ہوئی ہو۔ کر دو جہاں کہتا ہے۔ میرے سبکدوش حیدر! سے معاملہ ہی مختلف تھا۔ ورنہ کیا عجب کہ جس لڑکی کے لئے کہتا میں اسے بہو بنا کر گھر نہ لے آ کر آہ کے ساتھ مائی اماں گویا تھیں۔ فاطمہ نے بھابی کے ہاتھ پر بہت ہولے سے ہاتھ دھر دیا تلی دینے والا تھا۔

”ماشاء اللہ۔۔۔ بہت سمجھ دار اور سعادت مند تو اپنا سبکدوش حیدر بھی ہے۔ بس آزاد مو کچھ بگاڑ اس کی شخصیت میں بھی آ گیا ہے۔ خیر چھوٹی موٹی خامیاں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں سے پاک تو صرف خدا کی ذات ہے۔ اور پھر یہ چھوٹی موٹی خامیاں تو دور کی جاسکتی ہیں۔ ان تر کے برعکس سبکدوش حیدر میں بہت سی عمدہ صفات بھی موجود ہیں جو شاید کسی دوسرے شخص میں ناپہ عفتان علی خان، سبکدوش حیدر کے کچھ برعکس واقع ہوا ہے۔ آپ پسند کی شادی کی بات کر رہی ہیں تو پوچھ پوچھ کر ہار گئیں مگر اس نے مجال ہے جو ایک بھی لڑکی کا نام لیا ہو۔ سر سے اس کی زانو کوئی موجود ہی نہیں تھی۔“

”تجھی تو بہنوں اور ماں کی مشترکہ پسند پر چپکے سے سر جھکا دیا۔“ فاطمہ خان مسکرا رہی تھیں۔ ”خیر لامعہ بچی ہے تو اچھی۔ منگنی کی تقریب میں خوب سچ رہی تھی عفتان کے ساتھ۔“ مائی ا سراہا تھا۔

”بس بھابی! خدا سے یہی دعا ہے کہ وہ جوڑی سلامت رکھے۔ اس تعلق کو سدا بنائے رکھے۔“

”آمین۔“ مائی اماں نے بھی اس دعا کی قبولیت کے لئے لب کھولے تھے۔

”اگینے! آپ نے کبھی معجزے ہوتے دیکھے ہیں؟“ اذہان حسن بخاری نے گرم کافی کا سہ ہونے کھلے آسمان کی وسعتوں کو دیکھا تھا۔

اگینے نے اس کی سمت بغور دیکھا تھا پھر مسکرا دی تھی۔

”شاید۔“ بولی تو آواز بہت دھیمی تھی۔ اذہان حسن بخاری کافی کا بھاپ اڑاتا کپ ہاتھ میں کی سمت پر خیال نظروں سے نکلنے لگا تھا۔

”شاید کبھی کہیں کسی زمین پر ہوتے ہوں، ہوئے ہوں۔ مگر میں نے کبھی اپنی آنکھوں سے ایسا سا زیاں نہیں دیکھی۔“ اگینے مدہم لہجے میں کہتی ہوئی مسکرائی تھی۔ اذہان حسن بخاری بھی مسکرا دیا۔ اگینے مزید گویا ہوئی تھی۔

”شاید معجزے چاند پر ہوتے ہیں۔۔۔ گماں، میں حسین تر، ولفریب ترین۔ دیکھو، خوب سوچیں تو دلکش ترین ہوتی ہیں۔ مگر..... مگر رسائی سے بہت پرے، دسڑس سے کہیں باہر ہوتی ہیں کہوں، میں نے تو آج تک کوئی تارا بھی ٹوٹے نہیں دیکھا۔ جن کے ٹوٹنے پر کوئی دعا بروقت سوچا جاسکے کہ اس ایک قیمتی لمحے میں مانگی جانے والی وہ دعا پوری ہو جائے۔“

اذہان حسن بخاری نے شاید اس کی بات کے ہی ضمن میں اس لمحے بے دھیانی میں سر اٹھا

آہان کو بغور دیکھا تھا پھر بہت آہستگی سے مسکرا دیا تھا۔

”سچ کہوں۔۔۔ آج تک میں نے بھی کوئی تارا ٹوٹے نہیں دیکھا۔ اس ضمن میں یقیناً ہمیں ناسا والوں کی خدمات لینے چاہئیں۔ آخر یہ بھید کھلے، ایسا ہے بھی یا کہ نہیں۔ سچ میں کوئی ایسا تارا ہے کہ جس کے ٹوٹنے پر کوئی خواہش پوری ہونے کی یقین دہانی ہو سکے؟“ وہ مسکرا رہا تھا۔

اگینے ہنس دی تھی۔ اذہان حسن بخاری اسے بغور نکلنے لگا تھا۔ اگینے نے کافی کاسپ لیا تھا، اس پر نگاہ کی تھی اور لب بھینچ کر مسکرائی تھی۔

”زندگی کی الگ کہانی ہے۔ زندگی چاند تاروں میں نہیں بستتی، زندگی میں بستنی ہے۔ بہلاوے بہت خوب صورت سہمی، مگر دل کو، دماغ کو باور کرانا بہت مشکل ہے۔ حقیقت کا ادراک بہت برا ہوتا ہے۔ آگاہی بہت بری ہوتی ہے۔ آنکھیں بند کر کے چلنا آسان ہے۔ اندھیرے میں کسی بات کا احساس نہیں ہوتا۔ سب رنگ ایک جیسے لگتے ہیں۔ مگر..... مگر آگاہی ان سب باتوں کی مکمل فہم کرتی ہے۔“

”آپ کو ایسا لگتا ہے؟“ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے بغور اسے دیکھا تھا۔ اگینے نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر مسکرا دی تھی۔

”تم سے بڑی ہوں۔ جھوٹ تو قطعاً نہیں بول سکتی۔“

”کس نے بتایا آپ کو؟“ ناسا والوں نے یا خود آپ نے؟“ جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ شگفتگی سے مسکرایا تھا۔

”وہ کم آن۔۔۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ اذہان حسن بخاری خاموشی سے اس کی سمت تکتا رہا تھا۔ اگینے نے کافی کاسپ لیا تھا پھر اس کی سمت نگاہ کی تھی۔

”ہماری عمر کے ہولو۔ پھر پوچھیں گے۔ ابھی بہت چھوٹے ہوتم۔ اور تجربہ وقت کے ساتھ آتا ہے۔ اس کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے۔“

اذہان حسن بخاری نے کافی کاسپ لیتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”شاید آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔“ وہ ایک لمحے میں ہم خیال ہوا تھا۔ اگینے خاموشی سے سر جھکا کر کافی کے سب لینے لگی تھی۔ تجھی اذہان حسن بخاری کے پرسنل ڈسجٹ پل پر رنگ ٹون بجی تھی۔

”ایکسیوزی۔“ اس نے ایک لمحے میں معذرت کرتے ہوئے موبائل کان سے لگایا تھا۔

”جی چاچو! کیسے ہیں آپ؟“ دوسری طرف فیض چاچو تھے۔

”پرنیکلٹی آل رائٹ۔ تم کیسے ہو؟“ باقی سب لوگ کیسے ہیں؟“

”سب ٹھیک ہیں چاچو! کب آرہے ہیں آپ واپس؟“ اس نے دریافت کیا تھا۔

”صبح بھائی سے بات ہوئی تھی تو وہ بھی کان کھینچ رہی تھیں۔ سیمینا تو کب کا نٹ چکا۔ انہیں بھی تشویش ہو رہی تھی کہ کہیں میں نے یہیں یو ایس اے میں قیام کا ارادہ تو نہیں کر لیا۔ انہوں نے تو یہاں تک پوچھ لیا کہ کہیں میں اپنے ساتھ کوئی گوری دوری تو نہیں لا رہا۔“ فیض چاچو بہت فریبنڈی تھے۔ اس لئے بھی وہ ہنس رہے تھے۔ اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”میری عمر 35 برس ہو چلی ہے اور موصوف مجھ سے تو چند برس بڑے ہی ہیں۔ جب میں پرائمری میں تھی تو انہوں نے نینتھ اسٹینڈرڈ پوزیشن کے ساتھ پاس آؤٹ کیا تھا۔“ وہ فون پر اس کی گفتگو ایک طرفہ طور پر ہی سمی، سن چکی تھی۔ اتنی سمجھ دار تھی کہ لفاظی دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ سکتی تھی۔ وہ اس کا موڈ بھی بھانپ سکتی تھی شاید۔ تبھی ماحول کی اور اس کے اندر کی کشاف شاید معدوم کرنے کو اس گھڑی بے معنی گفتگو بھی خاصہ انہماک سے کر رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”فیض چاچو تو خاصے ہینڈسم تھے ان دنوں۔ بہت سی لڑکیاں فدا تھیں ان پر۔ آپ نے کبھی انہیں اس زاویے سے نہیں دیکھا؟“ دوستانہ انداز میں دریافت کیا تھا۔ اگینے کلکلا کر ہنس دی تھی۔ اذہان حسن بخاری بغور اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”بہت تک جڑھا اور خبیثی تھا وہ ان دنوں۔ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا تھا۔ مجھے اسے چھٹڑ کر بڑا لطف آتا تھا۔ بہت بنتا تھا وہ کہ ذہن ہوں، پوزیشن ہولڈر ہوں، ڈاکٹری پڑھ رہا ہوں، کچھ کچھ ہینڈسم بھی ہوں۔ موصوف کی گردن ہمیشہ یوں تیری رہتی تھی۔ لیکن میرے سامنے اس کی ساری کلف اتر جاتی تھی۔ تباچہ کہہ کر چھپتی تھی اسے۔“ وہ مسکراتی ہوئی گزشتہ وقت کے پردے چاک کر رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری کلکلا کر ہنستا چلا گیا تھا۔

”اگینے! میرے چاچو اچھے خاصے معقول شخص ہیں۔“ دفاع کیا تھا۔

”ہاں، تو میں کب انکاری ہوں؟“ میں بھی بیچ کہہ رہی ہوں۔ تم ان سے پوچھ سکتے ہو۔“ اگینے بولی تھی اور وہ مسکرا دیا تھا۔ اگر اگینے کا مقصد اس کی ٹینشن ریلیف کرنے کا تھا تو وہ یقیناً اس ضمن میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس لمحے اذہان حسن بخاری کے چہرے پر بڑی شفاف مسکراہٹ تھی۔ اسے مطمئن دیکھ کر اگینے کو خوشی ہوئی تھی۔

میرب سیال نے اپنے وہاں پہنچنے کی پیشگی اطلاع نہیں دی تھی۔ تبھی زوہاریہ اسے دیکھ کر قدرے حیران ہوئی تھی۔

”اچھا کیا آگئی ہو تم۔ لیکن تمہیں اطلاع تو دینی چاہیے تھی۔“ زوہاریہ کا انداز ہمیشہ کی طرح کسی قدر سرد تھا۔ میرب سیال انہیں فقط دیکھ کر رہ گئی تھی۔ سبکیں حیدر لغاری نے ایک نگاہ کی تھی اس پر پھر زوہاریہ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”میں ایک برنس اسٹینٹ کے لئے آ رہا تھا۔ مائی اماں کا خیال تھا اس وقت انہیں بھی سیال صاحب کے پاس جانا چاہیے۔ مجھے مائی اماں کے خیال سے اختلاف نہیں ہوا۔“ مضبوط لہجے میں کہتا ہوا شاید وہ اسے ذی فدا کر رہا تھا۔ میرب سیال نے کسی قدر چونک کر اس کی سمت نگاہ کی تھی۔ مگر اس لمحے وہ اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ وہ بہت خاموشی کے ساتھ سر جھکا کر آگے بڑھ گئی تھی۔

پاپا اس سے مل کر خوش تھے۔ کتنے لمحوں تک اسے اپنے ساتھ لگائے بیٹھے رہے تھے۔ اور ان کا لمس اس لمحے بھی تو کتنے دنوں بعد محسوس کیا تھا۔ کس قدر سکون مل رہا تھا۔ آنکھوں سے بہت خاموشی کے ساتھ گرم

”پھر کیا کہا آپ نے؟“

”مجھے تو بہت سی گوریاں پسند آگئی ہیں۔ مگر معاملہ یہ ہے کہ میں بھی ان کو پسند آ جاؤں۔“ وہ کلکلا ہنس رہے تھے۔

”چاچو! کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ آپ کسی جارج کلونی سے کم ہیں کیا؟“ اس کا موازنہ بہت مزہ تھا۔ تبھی فیض چاچو کلکلا کر ہنس دیئے تھے۔

”آف کورس۔ اگلے تیس برسوں تک میں بھی ٹاپ موسٹ ایلیجبل پیچر گائز میں شمار ہوں گا۔“

اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔ تبھی انہوں نے قدرے سنجیدہ ہو کر دریافت کیا تھا۔

”بھابی سے میں نے کچھ دریافت نہیں کیا۔ مگر مجھے بڑی فکر ہو رہی تھی۔ سعد بھائی کی طرف سے ہر کچھ ٹھیک ہے نا؟“ وہ اصل مدعا پر آئے تھے۔ اذہان حسن بخاری لب بھینچ گیا تھا۔ چند ثانیوں تک خامو رہا تھا پھر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”سب ٹھیک ہے چاچو!“ لہجہ مدہم تھا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو؟“ فیض بخاری کا انداز کسی قدر فکر مندانہ تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ تبھی بولے تھے۔

”میں یہاں آنا نہیں چاہ رہا تھا۔ ان دنوں جو اس گھر کی حالت تھی، یقیناً اس میں سب کچھ چھوڑ کر جا بہت آکورد لگ رہا تھا۔ مگر فارحہ بھابی نے امیوز کیا تو مجھے آنا پڑا۔ بات تو کچھ دنوں کی تھی مگر میرا سا دھیان اسی طرف لگا رہا۔ فیملی کراسس میں ہو تو پھر شاید چھوٹی چھوٹی باتوں اور واہموں میں دل کو اُلٹنے سے باز نہیں رکھا جاسکتا۔ اور میری فیملی تو درحقیقت مشکل میں ہے۔“ فیض بخاری بہت پریشان لگ رہے تھے۔

”نہیں چاچو! یہاں سب ٹھیک ہے۔ آپ کب آ رہے ہیں؟“

”بہت جلد جان! تم اپنا اور بھابی کا خیال رکھنا۔“ بہت محبت سے وہ گویا تھے۔

”جی چاچو!“ سلسلہ منقطع کر کے اس نے اگینے کی سمت دیکھا تھا جو اس لمحے اسی کی سمت بغور دیکھ رہا تھی۔ وہ جانے کیوں نظر پھیر گیا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب کا فون تھا؟“ فیض بخاری کے متعلق دریافت کیا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

”ہوں۔“

”موصوف مشہور و معروف ہارٹ اسپیشلسٹ بن چکے ہیں۔“ متاثر کن انداز میں شانے اچکا کر تجویز کیا تھا۔ اذہان نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ہوں۔“

”ابھی تک شادی نہیں کی؟“ اسے شاید حیرانی ہوئی تھی۔ اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”کہیں جوگ ہوگ تو نہیں لے لیا؟“ مسکراتا ہوا انداز یقیناً تفتیشی ہی تھا۔ اذہان حسن بخاری نے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ تبھی وہ گویا ہوئی تھی۔

گرم پانی بہہ رہا تھا۔

”بچے! ٹھیک ہے سب کچھ۔ تم کیوں رو رہی ہو؟“ پاپا نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر ہوئے دھبے سے مسکرا کر کہا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ سبھی منظر سیال گویا ہوئے تھے۔

”ایوری تھنک از فائن بیٹا! — دیکھو میری طرف، لگ رہا ہوں نا تندرست؟ اچھا یہ بتاؤ آ خوش تو ہوتا؟ — سبکدین خیال تو رکھ رہا ہے نا تمہارا؟ حیدہ بیگم سے کہہ دیا تھا میں نے، اپنی امانہ سونپ کر جا رہا ہوں۔ تندرست ہو کر لوٹوں گا تو بڑی دھوم دھام سے خود اپنے ہاتھوں سے آپ کو سونپ گا۔ تب تک وہ میرے بچے کا خیال رکھیں۔“ وہ شاید اس کا دھیان بنانا چاہ رہے تھے۔ مگر وہ بہت آزا سی سراٹھا کر ان کی طرف تکتے لگی تھی۔

”پاپا! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”کیوں؟“ اسے بچوں کی طرح پچھارتے ہوئے وہ مسکرائے تھے۔ ”بیٹا! ٹھیک تو ہے سب۔“ اس کے باور کرانے پر بھی اس کے اندر کی کیفیت نہیں بدلی تھی۔ سبھی اس کے ہاتھ تھام کر منظر سیال آ ہوئے تھے۔

”ان چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے جب بچپن میں تم میرے لئے دعا کیا کرتی تھیں تو میں ہر تکلیف سے نکل آیا کرتا تھا۔ مجھے یقین ہے اگر آج بھی میری بیٹی میرے حق میں دعا کرے گی تو وہ رازیاں بننا جائے گی۔“ پاپا کے حوصلہ بندھانے کے باوجود اس کی آنکھوں سے نمی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”ابھی تو بہت جینا ہے مجھے۔ اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرتا ہے۔ فانی کی دلہ لگو کر لانا ہے۔ نواسے نو اسیوں، پوتے پوتیوں کو گود میں کھلانا ہے۔ ابھی اتنی جلد ہرگز نہیں جاتا ہے مجھے تم ہر طرح کی فکر دل و دماغ سے نکال دو۔“ پاپا نے اس کی پیشانی پر بہت آہستگی سے اپنے پیار کی مہر شہد کی تھی۔ اس کے آنسوؤں کی شدت اور بھی بڑھ گئی تھی۔

یکدم آہٹ ہوئی تھی۔ شاید کوئی اس کے قریب تھا۔ خوشبو ٹھنوں میں گھسی تھی۔ تاثر بڑا جانا پیمانہ تھا۔ ”ہمت سے کام لیں۔ اس طرح آپ سیال صاحب کا حوصلہ نہیں بڑھا سکتیں۔“ کوئی اس کے قریب کھڑا مخاطب تھا۔ اس کے حواس لحد بھر میں بیدار ہوئے تھے۔ یقیناً یہ آواز، یہ لہجہ سردار سبکدین حیدر لغاری ہی تھا۔ وہ بہت آہستگی سے پاپا سے الگ ہوئی تھی۔

”ٹھہرے کہاں ہو تم لوگ؟“ پاپا نے دریافت کیا تھا۔

”ہوٹل میں۔“ میرب نے بہت آہستگی سے جواب دیا تھا۔ سبھی زو بار یہ بولی تھی۔

”تم ہمارے ساتھ بروک لین میں کیوں آ کر نہیں رہتے؟ یہ زیادہ بہتر رہے گا۔“

زو بار یہ کی پیشکش یا پھر مشورے پر اس نے بلا ارادہ سراٹھا کر سردار سبکدین حیدر لغاری کی سمت نکلا کی تھی۔ وہ بہت بے تاثر سا چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔ یعنی فیصلہ اس کے ہاتھ ٹھہرا تھا۔ تمام حق وہ محفوظ رکھتی تھی۔ تمام مرضی اس کی تھی۔ ایک لمحے میں اسے فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے بہت آہستگی سے سر نیچا مٹا دیا تھا۔

دہنیں۔ ہم زیادہ دنوں کے لئے نہیں آئے۔ دو ایک دن میں شاید ان کا کام نٹ جائے اور

اسیں واپس لوٹنا پڑے۔ آپ کو خواجواہ زحمت ہوگی۔“ اس نے زو بار یہ سے کہتے ہوئے ایک نگاہ سردار سبکدین حیدر لغاری کی سمت کی تھی۔ لیکن وہ شخص ہمیشہ کی طرح بے تاثر تھا۔ اس کا دھیان قطعاً اس کی سمت بہتا اور ایسا کوئی فیصلہ کر کے اسے اس کی حمایت یا ستائش تو قطعاً حاصل نہ کرنی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری سے اس کے تعلقات اگر بہت سرد مہری لئے ہوئے تھے تو زو بار یہ سے بھی کوئی خاص انسیت نہ تھی۔ او پہلے ہی بہت ہنس تھی۔ مزید کوئی اسٹریس لینا نہیں چاہتی تھی۔ اور زو بار یہ کے ساتھ رہنے کا مطلب تھا اپنے لئے لحد لہجہ نئی ٹینشن کری ایٹ کرنا۔

پاپا سے ملنے کے بعد سردار سبکدین حیدر لغاری کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔ دنوں خاموشی سے چلتے ہوئے گاڑی تک آئے تھے۔

”ٹھیکس۔“ میرب سیال نے گاڑی میں بیٹھ کر اس کی سمت نگاہ کر کے بہت آہستگی سے کہا تھا۔ وہ چوکتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی سمت تکتے لگا تھا۔

”فور سپورٹنگ نی۔“ اس کے ساتھ وہ چاہے جو رویہ رکھتا مگر وہ قطعاً نہیں چاہتی تھی کہ وہ پاپا کے سامنے کسی طرح کی بیگانگی یا سرد مہری کا مظاہرہ کرے۔ سبھی بہت مشکوری اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری نے چہرے سے بھر پور تاثر دیتے ہوئے بے نیازی سے شانے اچکا دیئے تھے۔ لیکن میرب سیال نے اس کی سمت سے نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔

”آج پاپا سے مل کر مجھے جو راحت ملی وہ فقط آپ کے باعث ممکن ہوئی۔ اگر آپ مجھے ہمراہ نہیں لاتے تو شاید اس وقت میں پاپا سے مل نہیں پاتی جس لمحے انہیں میری ضرورت تھی۔“ وہ مشکوری بول رہی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری کچھ نہیں بولا تھا۔

”یہ رشتے بہت عجیب ہوتے ہیں۔ جتنے دل کے قریب ہوتے ہیں، اتنا ہی کمزور بھی کر دیتے ہیں۔ ایک وقت یہ دو احساسات سے دوچار کرتے ہیں۔ مضبوطی اور کمزوری سے۔“

اس شخص سے اس کا تعلق بڑا اواجبی سا تھا۔ سرد مہری میں لپٹا۔ بے تاثر انداز لئے۔ پھر جانے کیوں وہ اس سے اتنی خاص نوعیت کی گفتگو کر رہی تھی۔ شاید وہ واقعی اس کی مشکور تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری بھی شاید مروت کے تقاضوں سے واقف تھا۔ متواتر اس کی سمت توجہ سے نکلتا رہا تھا۔ شاید وہ اس کی جانب سے مزید کچھ بولنے کا منتظر تھا۔ مگر میرب سیال اب کے کچھ نہیں بولی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری بہت آہستگی سے نگاہ پھیر گیا تھا۔ بہت مختصر سا تعلق تھا اس کا۔

بہت مختلف دنوں کا ساتھ تھا۔

کتنا کچھ جان پائی تھی وہ اس کے متعلق۔ کتنا متکشف ہوا تھا وہ اس پر۔ اگر کوئی قیاس کرتی تو یقیناً غلط ہوتا۔ یا پھر جو بھی تھا وہ بے مہر نہیں تھا۔ بے تاثر نظر آتا بھی تھا تو شاید تھا نہیں۔ یا پھر وہ محض انسانیت کے نامے اس لمحے بنا کسی غرض کے اس کے ساتھ تھا۔ میرب سیال اس کی سمت سے نگاہ ہٹا گئی تھی۔

سبھی بھاری آواز اس کی سامتوں سے ٹکرائی تھی۔

”پریشانیوں کے متعلق سوچنے سے، پریشانیاں مزید بڑھتی ہیں۔ سو ڈونٹ بی سکیئر۔ انشاء اللہ ٹھیک ہوگا۔“ بہت مدغم لہجے میں کہتا ہوا وہ اس لمحے اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔ میرب سیال ساکت کی سمت دیکھ رہی تھی۔ وہ بغور اس کی سمت نکتا ہوا گویا ہوا تھا۔

”اگر آپ کو سیال صاحب کی ہمت بندھانا ہے تو خود آپ کو مضبوط نظر آنا ہوگا۔ آنسو انسان کو کمزور کر دیتے ہیں۔ خود کو بھی اور اسے بھی جس کا حوصلہ بندھانا مقصود ہو۔ آپ کو اپنی ہمت توڑنا چاہئے۔ اس سے سیال صاحب کو یقیناً تکلیف ہوگی۔“ لفظ بہت نرم تھے مگر انداز بہت دوستانہ نہ تھا۔ ان آنکھوں میں کسی قدر زری ضرورت تھی۔

میرب سیال خاموشی سے نکلتی رہی تھی۔
کوئی رسم دوستی نہیں تھی۔ فقط مروت تھی۔

اور وہ کچھ زیادہ ایکسپیکٹ بھی نہیں کر رہی تھی۔ شاید بھی وہ خاموش ہوا تھا۔ وہ بھی بہت آہستگی چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

دل بہت سنبھلا نہ تھا۔

مگر اس دل جوئی پر کسی قدر ڈھارس ضرور بندھی تھی۔ وہ بہت خاموشی سے بیٹھی تھی جب یکدم سبکیگین حیدر لغاری کا پرنسپل سیل بجا تھا۔

میرب سیال کا دل یکبارگی دھڑکا تھا۔

ایک لمحے میں اس نے سردار سبکیگین کی سمت نگاہ کی تھی۔ وہ کسی سے مخاطب تھا۔

صورت حال کڑی ہو تو ایک پتھر کے پر بھی دل بہت تیزی سے دھڑکتا ہے۔ پایا اس وقت ہاتھ تھے اور سردار سبکیگین حیدر لغاری کے پرنسپل سیل کے بچنے پر وہ یہی سمجھی تھی کہ فون شاید ہسپتال سے ہوا کی دھڑکتیں معمول پر نہیں رہی تھیں۔ لیکن سردار سبکیگین حیدر لغاری بڑی رسائیت سے اس گھڑی کسی مخاطب تھا۔ فون یقیناً ہسپتال سے نہیں تھا۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ وہ سلسلہ منقطع کرنے کے بعد اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ وہ اب بھی حواس باطن کی اس کی سمت دیکھ رہی تھی اور نہ جانے اس لمحے میں کیا تھا کہ سردار سبکیگین حیدر لغاری نے بہت آہستگی سے اپنا مضبوط ہاتھ بڑھا کر اس کے نازک سے ہاتھ پر دھر دیا تھا۔ شاید وہ اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا اور کمزور لہجوں میں اس کا حوصلہ بندھانا مقصود تھا۔

میرب سیال چند ثانیوں تک خالی خالی نظروں سے اس کی سمت نکلتی رہی تھی۔ پھر ہونٹ بھیج کر اس کی سمت سے دھیان ہٹا گئی تھی۔ تب اس لمحے سردار سبکیگین حیدر لغاری بھی مزید کچھ نہیں بولا تھا۔



سید اذہان حسن بخاری سر جھکائے فائل دیکھ رہا تھا۔ جب سعد بخاری نے اس کے آفس میں قدم بھرا تھا۔

”تمہیں کتنا عرصہ ہوا ہے برنس کرتے ہوئے؟“ کسی قدر درشت لہجے میں ان کا مخاطب وہی تھا۔ اذہان حسن بخاری نے چونک کر سر اٹھائے ہوئے کسی قدر حیرت سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ یقیناً ان کا مخاطب وہی تھا۔ مگر وہ کس دشمن میں اس سے دریافت کر رہے تھے، وہ یہ نہیں سمجھ پایا تھا۔ بھی فقط خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ سعد بخاری چند ثانیے تک خاموشی سے اسے نکتے رہے تھے پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کسی قدر اکتاہٹ سے پُر لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

”جاتے ہو، جتنی تمہاری عمر ہے اتنا میرا تجربہ ہے۔“ بھر پور انداز میں جتایا تھا۔ مگر وہ بڑی رسائیت سے مسکرا رہا تھا۔

”یقیناً۔۔۔ آپ کو میرے والد محترم ہونے کا شرف جو حاصل ہے۔“ شانے اچکانے کا انداز صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس معاملے میں مکمل طور پر ہیپ لیس ہے۔

سید سعد شاہ بخاری نے ایک گہری سانس خارج کر کے جیسے اس لمحے کی ساری کوفت کو رفع کرتا چاہا تھا اور کسی قدر زبردست سکون انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔ پھر اسی قدر رسائیت سے گویا ہوئے تھے۔

”پوچھ سکتا ہوں فہیم صاحب کے ساتھ ہونے والی مینٹگ کو تم نے ماتوی کیوں کر دیا؟“ بغور اس کی جانب نکتے ہوئے وہ اس سے مخاطب تھے۔

اذہان حسن بخاری نے سامنے دھری فائل بند کر دی تھی۔ پھر سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا اور بہت آہستگی سے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”کیونکہ میں جانتا ہوں یہ سب بے سود ہوگا۔ فہیم صاحب فقط اپنی کمپنی کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالانا اپنے کسی غرض سے ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ ان کی دیوالیہ ہوتی کمپنی ہمارے کسی کام کی نہیں۔ شاہ گروپ آف کمپنیوں کی اپنی ایک ساکھ ہے۔ ایک نام و مقام ہے۔ معاملہ مارکیٹ ریپویشن کا ہے۔ آج ہماری کمپنی کے شیئرز کس قدر بلند ہیں، یہ بات سب پر منکشف ہے۔ ترقی اور کامیابی کا اوپر جانا ہوا اگر سب کے لئے کشش کا باعث ہوتا ہے۔ بلندی کی سمت ہر کوئی بڑھنا چاہتا ہے۔ مگر ایسا آسان نہیں۔“

”تم کیا سمجھتے ہو، تمہارے ان کھوکھلے بھلاؤوں میں مجھ جیسا شخص آ سکتا ہے؟۔۔۔ کیا تم مجھ سے

بہتر سمجھتے ہو کہ شاہ گروپ آف کمپنیز کے لئے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں؟“ وہ کسی قدر خائف تھے۔
 ”اس کا فیصلہ تو بورڈ آف ڈائریکٹرز زیادہ بہتر انداز میں کر سکتا ہے۔ آپ چاہیں تو ایک میٹنگ
 کلتے ہیں۔“ اس کا لہجہ پرسکون تھا۔

سید سعد شاہ بخاری بیٹے کو دیکھ کر رہ گئے۔ ایک بار پھر بیٹا ان کے مد مقابل تھا۔ چند ثانیوں تک وہ
 طرح کھڑے رہے تھے۔ پھر چہرے کا رخ پھیر گئے تھے۔

”تمہیں کیوں عادت ہوتی چلی جا رہی ہے ہر جگہ میری مخالفت کرنے کی؟“ ان کا لہجہ مدہم اور
 کسی قدر پُر افسوس تھا۔ اذہان حسن بخاری انہیں دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”ایسا نہیں ہے۔ مجھے دانستہ آپ کی مخالفت سمت چلنے کی عادت نہیں۔ میں مانتا ہوں آپ
 تجربہ بھی مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ آج شاہ گروپ آف کمپنیز جس گراف پر ہے وہ بھی سب آپ

باعث ہے۔ مگر پاپا! جو میں کہہ رہا ہوں وہ بھی غلط نہیں ہے۔ اور پھر یہ کوئی اس قدر سیریس میٹنگ
 نہیں ہے۔ میرا نہیں خیال کہ فیہم صاحب کو یا ان کی کمپنی کو اپنے ساتھ لینے سے یا نہ لینے سے ہمیں
 فائدہ یا نقصان ہو سکتا ہے۔“

”تم جانتے ہو فیہم صاحب ہمارے کتنے پرانے جاننے والے ہیں؟“

”تو کیا ہوا؟“ اس نے شانے بے نیازی سے اچکائے تھے۔ ”پاپا! بزنس، تعلقات کی بیس پر
 چلتے۔ اور جن شرائط پر وہ ہمارے ساتھ ڈیل کرنا چاہتے ہیں ان پر تو قطعاً نہیں۔“ اذہان حسن بخاری
 انداز کسی قدر ٹھوس تھا۔ سعد بخاری خاموشی سے اس کی سمت دیکھ رہے تھے۔

”پاپا! یہاں معاملہ فقط مخالفت برائے مخالفت کا نہیں ہے اور یہاں ٹیلی میٹر سے زیادہ معاملہ کمپنی
 ساکھ کا ہے۔ ہم اگر چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں کو لے کر الجھیں گے اور ایک دوسرے کی مخالفت کریں گے
 یقیناً ایسا ماحول کمپنی کے حق میں سازگار نہیں ہوگا۔ میں ایک بزنس مین کا بیٹا ہوں۔ اتنا تو جانتا ہی ہوں
 جس طرح گھر کی ڈانٹنگ ٹیلی پر بزنس سیکرٹس نہیں ڈسکس ہو سکتے اسی طرح گھر کے مسائل کو ڈسکس
 کرنے کے لئے آفس میں بھی کوئی جگہ نہیں۔“

سید سعد بخاری اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔ کچھ دیر اسی طرح خاموش رہے تھے۔ پھر بہت ہو
 سے پلٹے تھے اور چلتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔ سید اذہان حسن بخاری نے تا دیر نگاہ کو اس سمت
 نہیں ہٹایا تھا۔

”تم ہوتے کہاں ہو آج کل؟“ وہ آفس سے نکل رہا تھا جب لامعہ حق نے اسے آن لیا تھا اور وہ
 پہلے ہی تھکن سے چور تھا اسے دیکھ کر اس کے چہرے پر مظلومیت کی جو کیفیت ابھری تھی وہ بڑی فطرتاً
 تھی۔ لامعہ حق نے اسے بغور دیکھتے ہوئے گھورا تھا۔

”مجھے اپنے سامنے پا کر تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“

”نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ عفنان علی خان تمام تاثریل میں زائل کرنا ہوا کسی قدر

سمرانے کی کوشش کرتے ہوئے گویا ہوا تھا۔
 ”واقعی؟“ لامعہ حق نے جانے کس بات کا یقین چاہا تھا۔
 عفنان علی خان نے اس کی جانب دیکھا تھا۔
 ”ہاں، واقعی۔“

لامعہ حق نے اس کے شانے کو تھامتے ہوئے کسی قدر اطمینان کا اظہار کیا تھا۔

”یوٹو عفنان! تمہاری بے توجہی مجھ سے قطعاً برداشت نہیں ہوتی۔ خواہ تم کتنے بھی مصروف ہو،
 چاہتی ہوں تم مجھے سوچتے رہو، مجھے چاہتے رہو، مجھے اپنی سوچوں میں، خیالوں میں اور.....“ وہ
 دھیمے لہجے میں کسی خواب کی سی کیفیت میں گویا تھی جب عفنان علی خان اس کی سمت نکلتے ہوئے ہنس
 اٹھا۔

”اور کیا لامعہ؟“ اس کے انداز پر لامعہ حق نے اسے دیکھا تھا۔ پھر کسی قدر خفگی سے گویا ہوئی تھی۔

”مذاق اڑا رہے ہو میرا؟“

مگر وہ ہنس دیا تھا۔ پھر داہنا ہاتھ بہت ہولنے سے اس کے سر پر بجا کر سرنفی میں ہلاتے ہوئے گویا ہوا
 ا۔

”حیران ہو رہا ہوں لامعہ! تمہاری طرف سے اس طرح کی امید نہیں تھی نا۔ آئی مین، تم اتنی شاعرانہ
 بیعت بھی رکھ سکتی ہو۔ یہ گہرے گہرے لفظ، یہ بھاری بھاری نقل جملے، یہ ساری رسی باتیں، لامعہ حق کی
 بیعت کا حصہ تو قطعاً نہیں ہو سکتیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ لفٹ کی سمت بڑھ رہا تھا۔ لامعہ حق
 نے اسے کسی قدر خفگی سے دیکھا تھا۔

”عفنان! کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس اٹھارہویں منزل سے کود کر اپنی جان دے دوں؟“
 ”نہیں۔۔۔ لیکن تم ایسا کچھ کرنے کے متعلق غور و خوض کر رہی ہو کیا؟“ وہ یقیناً دھیمے سے مسکراتے
 دئے اسے چھیڑ رہا تھا۔ اس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

”عفنان!“ لامعہ حق نے گھورا تھا۔

”میرے عشق میں جان سے گزرنے کا ارادہ ہے کیا؟“ گراؤنڈ فلور کا مین پیش کرتے ہوئے اس کی
 جانب دیکھا تھا۔ وہ یقیناً اس لمحے سنجیدہ نہ تھا۔

لفٹ گراؤنڈ فلور پر جا کر کھلی تھی۔ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ باہر نکلی تھی۔ عفنان علی خان نے اس
 کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔

”اٹھارہویں فلور سے کودنا اس قدر خوفناک خیال ہے کہ سوچ کر ہی تمہارے رونگٹے کھڑے ہو گئے؟“
 ”تو اتنا چھیڑ رہا تھا۔ لامعہ حق نے اسے فقط گھورا تھا۔ ایک سرسری نگاہ کی تھی۔ پھر دھیان پھیر گئی تھی۔

”تم ساتھ ہو تو میں بیسویں منزل سے بھی کود سکتی ہوں۔“

”الطبعی شرط یہ ہے کہ مجھے بھی تمہارے ساتھ کودنا پڑے گا۔“ وہ کسی قدر خوفزدہ ہوا تھا۔ اداکاری بے حد
 نامزد تھی۔ ”دیکھو۔۔۔ فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ ایسے خوفناک شوق پالنے کا مجھے کوئی شوق

نہیں۔ اگر تمہارا ایسا کوئی ارادہ ہے بھی تو فی الحال ملتوی کر دو۔ عفتان علی خان کے دماغ میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔ وہ مکمل طور پر محفوظ ہو رہا تھا۔ لامعہ حق اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ عفتان علی خان نے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔ اس نے سرٹھی میں ہلادیا تھا اور اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ عفتان نے گاڑی ریورس میں لیتے ہوئے اسے دھیسے سے مسکرا کر دیکھا تھا۔ کچھ کہنا چاہا تھا۔ بھی وہ گویا یہ ”تم سے کسی طرح کی مراد کی امید رکھنا قطعاً فضول ہے عفتان علی خان! تم تو ادا کے امر سے بھی واقف نہیں۔“ انداز کسی قدر پُر افسوس تھا۔

عفتان علی خان فقط مسکرایا تھا، کچھ کہنا نہیں تھا۔ شاید وہ اپنے تاثرات اس ضمن میں محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ لامعہ حق بھی خاموشی کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر ڈیش بورڈ پر دھری گیسٹس کو دیکھنے لگی تھی۔ ”ابھی سے ہمت ہار گئیں۔۔۔ غالباً تمہیں تو بہت طویل سفر کرنا ہے ابھی۔“ جانے وہ کس لیے کہہ رہا تھا مگر لامعہ حق یکدم ہی اس کی سمت جا رہا تھا۔ انداز میں نکتے لگتی تھی۔

”میں بہت سانسفر کر سکتی ہوں عفتان علی خان!۔۔۔ بہت دور تک چل سکتی ہوں۔ بشرطیکہ تم منزلوں کا تعین بھی کر دو۔ کم از کم ان فاصلوں کی ہی حقیقت کھول دو جو تمہارے دل سے میرے دل کے جانک کھڑے ہیں۔ چل سکتی ہوں میں، بہت دور تک، بنا تھکے، بنا زکے اگر تم حدود کا تعین بھی کر دو کسی قدر سنجیدہ ہو۔ مگر عفتان علی خان بہت پُر سکون انداز میں مسکرا دیا تھا۔

”آسانیاں کہاں ہیں اس راہ میں؟۔۔۔ قدم قدم پر روڑے پڑے ہیں۔ ہمت ہو تو چل پڑو متواثر چیخ رہا تھا۔

”عفتان علی خان! جانے ہو ہر رسی ایکشن کے لئے ایک ایکشن بہت ضروری ہے۔ تحریک ہے جب کوئی باعث تحریک بھی ہو۔“ دھیسے لہجے میں جانے اس نے کیا باور کرانا چاہا تھا۔ عفتان نے ایک نگاہ کی بھی اس پر اور فقط مسکرا دیا تھا۔

”آسان نہیں ہے یہ سب کچھ۔ قطعاً آسان نہیں۔“ جانے کیا بتایا تھا۔ جانے کیا جتنا چاہا تھا۔ نہیں سمجھی تھی۔ فقط سپ چاپ اسے سکتی چلی گئی تھی۔

”جانے ہو عفتان علی خان! بہت برے ہو تم۔“ وہ دھیسے یکدم ہمت ہار گئی تھی۔ انداز پُر شکست خوردہ تھا۔ الزام بہت کرا تھا۔ مگر وہ بہت طمانیت سے مسکرا رہا تھا۔

”سر تسلیم خم ہے۔۔۔ مزید کوئی گستاخی نہیں کروں گا۔ کوئی رتی بھر بھی مخالفت کروں گا تو دکھائی دے گی۔“ وہ مکمل طور پر سعادت مند تھا اس لمحے۔ لامعہ حق اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

عفتان علی خان اس کی سمت دیکھتے ہوئے صورت حال سے مکمل طور پر محفوظ ہوا تھا پھر وہ مسکرایا تھا۔ وہ مکمل طور پر مسرور تھا۔

لامعہ حق تھا غصائی چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ تبھی عفتان علی خان نے اس کی سمت نگاہ کی تھی۔ ”بات نہیں کر دو گی تو معلوم کیسے ہو گا کہ میرے سنگ آنے کا مدعا کیا ہے؟“ وہ یقیناً اب بھی

لامعہ حق نے کسی قدر ناپسندیدگی سے اسے دیکھا تھا۔ ”گھر چھوڑ دو مجھے۔“ حکم ہوا تھا۔

”بہتر۔۔۔ لیکن اگر گھر ہی جانا تھا تو یہ کام تو آپ کا ذرا یور بھی بخوبی انجام دے سکتا تھا۔ مجھے دینے کی وجہ سمجھنے سے میں قاصر ہوں۔“

”مسکرا رہا تھا۔ لامعہ حق کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

عفتان علی خان! تم چاہتے ہو کہ میں اسی مصروف شاہراہ پر اتر جاؤں اس گاڑی سے؟“ انداز دو لہا تھا۔

”باخدا، میں نے ایسا نہیں کہا۔“ وہ بہت مطمئن سا مسکرایا تھا۔ ”میں نے تو فقط ارادہ معلوم کرنے کی بات کی تھی۔“ اس کا انداز مکمل طور پر سعادت مند تھا۔ لامعہ نے دیکھا تھا۔ لبوں پر دھیسے سے پھیلتی ہٹ کو وہ روک نہیں سکتی تھی۔

”تم واقعی بہت برے ہو عفتان علی خان!“ اس کے چوڑے مضبوط شانے پر اپنے نازک ہاتھ کاٹکا بنا رہے ہوئے اس نے بھر پور خشکی سے کہا تھا۔ عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔ تبھی وہ گویا ہوئی تھی۔

”مجھے انا بیہ کی طرف چھوڑ دو۔“

عفتان علی خان کے اندر کے معمولات میں ایک لمحے میں تغیر واقع ہوا تھا۔

”خیریت؟“ ایک سرسری سی نگاہ کی تھی۔

”ہوں۔۔۔ ہم کسی کام کے بنا بھی بڑے آرام سے مل لیتے ہیں۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔

عفتان علی خان نے اس کی سمت دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر قبل مسکراتے لبوں پر اس لمحے ہی خاموشی آن ٹھہری تھی۔ تاثرات مکمل طور پر محفوظ تھے۔ لامعہ حق اس کی سمت سے نگاہ پھیر گئی تھی۔ اس کے بعد کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ لمحات بڑے پُر سکوت تھے۔ بہت سے اسرار ان لمحوں میں موجود تھے۔ کی چٹکی کھا رہے تھے۔

”ایہا پرائیٹ“ سے نکلتے ہوئے اس نے میرب سیال کی سمت دیکھا تھا۔

”یہاں سے آپ تنہا بروک لین جا سکتی ہے؟“ اس نے فانی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی جس پر لامعہ حق نے حیدر نزاری نے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ مگر اس کا شیڈول خاصاً مفید تھا۔ وہ جانتی تھی۔ تبھی

ساتھ ملنے کی پیشکش کے بغیر فقط اپنے جانے کا مدعا سامنے رکھا تھا۔

”حیدر نزاری نے حیدر نزاری کسی قدر حیران ہوا تھا۔ ساتھ ہی اس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں بھی واضح پراخ آئی تھیں۔

”آرٹوشیور؟“ وہ اس کے ساتھ یہاں تک آئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس کی ڈسے داری تھی۔

”ہاں باعث وہ کسی قدر فکر مند ہوا تھا۔

”میں۔“ میرب سیال نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”زکوٰۃ میں تمہاری لئے کیب ہائیر کر دیتا ہوں۔“ اس نے کہنے کے ساتھ ہی متلاشی اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔ قطعاً بے تاثر نظر آنے والے شخص کا یہ رویہ خاصا انوکھا تھا۔ اُسے اُس کی فکر وہ اس کے لئے متفکر تھا۔

اس کے لئے سوچ رہا تھا۔

اس لمحے کی کیفیت خاص تھی۔

حقیقت کچھ بھی ہو۔ اس سے قبل اور اس ایک لمحے کے بعد جو بھی ہو لیکن وہ ایک پل اس میں بہت اہم تھا۔

بہت خاص تھا۔

میرب سیال نے اس لمبے چوڑے شخص کو سڑک کے اطراف نگاہ دوڑاتے دیکھ کر یکدم ٹوکا تھا

”آپ کو غالباً دیر ہو رہی ہے۔ آپ چلے جائیے، میں انتظار کر لوں گی۔“

جو اب سردار سبکدین حیدر لغاری نے فقط اس کی سمت خاموشی سے دیکھا تھا۔ کہا کچھ نہیں تھا۔ خاموشی کے ساتھ چہرہ بیچھری گئی تھی۔ چند لمحے سڑک گئے تھے۔ کوئی کیب اب تک ہاتھ نہیں آئی تھی

ہاتھ میں چمڑے کا بیگ لے، بائیں ہاتھ کی کلائی پر بندھی قیمتی رسٹ واچ کو بغور دیکھا وہ شخص اس کیب کو ہائیر کرنے کے جتن کرتا اسے کسی قدر حیران کن لگا تھا۔

”ٹیکسی۔۔۔“ باقاعدہ چند قدم دوڑ کر اس کے لئے تنگ ددو کی گئی تھی۔ کاروں میں سفر کا شخص اس کے لئے اس گھڑی ایک کیب کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ وہ رکھ رکھاؤ سے ہی مرعوب

شخص، انوکھی آن بان رکھنے والا، برنس ٹائیکون، اس لمحے جیسے اپنے نام، اپنے رتبے، اپنی پچھان ماورا تھا۔

ٹیکسی روک کر اس نے اس کی سمت نگاہ کی تھی اور میرب سیال جو اسے بغور دیکھ رہی تھی اُٹھاتی ہوئی اس کی سمت بڑھنے لگی تھی۔

اسے بٹھانے کے بعد وہ دروازہ بند کر کے کھڑکی پر جھکا تھا۔

”کوئی مسئلہ ہو تو فون کر لینا۔ ہوٹل آنے کے لئے میں گاڑی بھجوادوں گا۔ کتنی دیر لگے گی؟“

”زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ۔“ اس نے مطلع کیا تھا۔ سردار سبکدین نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا اور کھڑکی میں سے ہٹ گیا تھا۔ ٹیکسی آگے بڑھنے لگی تھی۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید وہ پہلی بار اس شہر میں آئی ہے۔ شاید اسی لئے اس کی پریشانی دو چند تھی حقیقت اس کے برعکس تھی۔ مگر اس لمحے میں جب وہ اس کے لئے پریشانی کا اظہار کر رہا تھا

اس نے جتنا ضروری خیال نہیں کیا تھا۔ اور پھر اس نے میرب سیال سے دریافت بھی کیا کیا پوچھتا تو وہ ضرور بتا دیتی کہ وہ نیویارک ہی نہیں یورپ کے بھی کئی ٹور پاپا اور فیملی کے ساتھ لگا لگا فانی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ زو بار یہ ہسپتال میں تھی۔

وہ آیا کے ساتھ تھا۔ میرب نے اس کے لئے اس کا من پسند لُچ بنایا تھا۔ وہ دیر تک اس

چھوٹی باتیں کرتا رہا تھا۔

”پاپا ٹھیک ہو کر گھر واپس کب آئیں گے آپ؟“

”بہت جلد۔“

”اب ہم یہیں رہیں گے؟“ اس کے معصوم دل میں کئی سوال تھے۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ پھر اس کے معصوم ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس سے چھوا تھا اور مکمل توجہ سے اس کی سمت تکتی ہوئی بولی تھی۔

”آپ سے کس نے کہا کہ اب ہم یہیں رہیں گے؟“

”ماما نے۔ وہ آیا سے میرے لئے سکول میں ایڈمشن کے لئے بات کر رہی تھیں۔“

اسے کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔ شاید اسی لئے چند ٹائیموں تک اسے ساکت سی تکتی رہی تھی۔ فانی نے اپنے معصوم ہاتھوں سے اس کا چہرہ چھوا تھا۔

”آپ! آپ بھی ہمارے ساتھ یہیں رہیں گی نا؟“

”ماما کیا کہتی ہیں؟“ اس نے زو بار یہ کے متعلق دریافت کیا تھا۔

فانی نے اپنا چھوٹا سا سر ٹی میں ہلا دیا تھا۔

”معلوم نہیں۔۔۔ مگر آپ کے بغیر تو میں اداس ہو جاؤں گا۔ مجھے میرا من پسند لُچ کون بنا کر دے؟ اور وہ مزے مزے کی اسٹوریز کون سنائے گا؟“ وہ معصومیت سے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

ب سیال نے اپنے لبوں کو اس کی پیشانی پر رکھ دیا تھا، اپنے ساتھ لگا کر اسے بھیچا تھا، پھر بہت دھیمے، گویا ہوئی تھی۔

”آپ پاپا کے لئے دعا کرتے ہیں؟“

”ہوں۔۔۔ بہت ساری۔ پاپا کے لئے بہت سی دعا کرتا ہوں اور پھر پھونک مار کر اسے اُڑا دیتا ہوں۔ میری ساری دعا اللہ کے پاس چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ساری دعا پوری کر دیتے ہیں نا؟“ وہ

معصومیت سے دریافت کرتا ہوا اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

میرب نے اس کی سمت تکتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ تبھی اس کی نگاہ وال کلاک پر پڑی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری کو بتایا ہوا وقت یاد آ رہا تھا۔ تبھی وہ فوراً گویا ہوئی تھی۔

”آئی جائیں گی اب۔ آپ اپنا خیال رکھئے گا۔“ اس کے پھولے پھولے گالوں کو چھوتے ہوئے وہ سگرائی تھی۔ فانی کسی قدر پریشانی سے اس کی جانب تکتے لگا تھا۔

”آپ فانی کے پاس نہیں رہیں گی؟“ انداز کسی قدر روٹھا روٹھا سا تھا۔

وہ سگرا دی تھی۔

”پاپا کے پاس جا رہی ہوں نا۔۔۔ پھر آؤں گی۔“

مجھے تمہارا لگے گا۔“ آواز میں عدم تحفظ عود کر آیا تھا۔ اس نے اسے ساتھ لگا لیا تھا۔

”ماریہ ہے نا آپ کے پاس۔ ابھی کچھ دیر میں ماما بھی آ جائیں گی۔“ اسے بہلایا گیا۔

”مجھے ماریہ ابھی نہیں لگتی۔ آپ مانا کو جلد بھیج دیجئے گا۔“ درخواست ہوئی تھی۔

”اوکے۔“ وہ مسکرا دی تھی۔ ایک بار پھر اسے پیار کیا تھا اور ماریہ کو ضروری ہدایت دے کر وہ با آئی تھی۔ اسٹین ہوپ اسٹریٹ سے نکلنے ہوئے اس نے رست واپچ پر نگاہ کی تھی۔ یقیناً اسے دیکھا تھی۔ فانی کے ساتھ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ سردار بکنگھم حیدر لغاری ضرور پریشان ہو گا اس کی بابت۔ وہ تو اسے قطعی نا بلد جان رہا تھا۔ ایسے میں اس کے لئے فکر مند ہونا بیگنی تھا۔ وہ ہوئی چل رہی تھی جب یکدم ہی ایک لمبی سیاہ گاڑی کے ناز اس کے قریب چر جائے تھے۔ وہ ایک میں اچھل کر پیچھے ہٹتی تھی۔ دل بہت تیزی سے دھڑکا تھا۔ اس علاقے میں سیاہ فام گروہوں کی راہ فرار وادراتوں سے واقف تھی، سوساری جان مٹی میں آگئی تھی۔ اس نے تنہا نکل کر یقیناً غلطی کی تھی۔ سردار بکنگھم حیدر لغاری کو فون کر کے مطلع کر دینا چاہئے تھا اور اس نے کہا بھی تھا کہ مجھے مطلع کر دینا۔ وہ دم سادھے کھڑی اپنے حواس بحال کر رہی تھی جب گاڑی کا شیشہ اتارا گیا تھا۔ وہ کسی بھی صورت حال کے لئے مکمل طور پر تیار تھی۔ ذہن پوری طرح بیدار تھا۔ اعصاب مکمل اختیار میں تھے۔ گاڑی کا شیشہ بہت ہولے سے اتارا گیا تھا۔ مکمل اختیار کے باوجود اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ روکنے کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک سنسنی سی جسم میں دوڑ گئی تھی۔

مگر اس نے نگاہ کی تھی اور حیرت دو چند ہو گئی تھی۔ کھڑکی سے جھانکتا چہرہ بہت تھا۔ بہت اپنا نہ سہی مگر اسے دیکھ کر میرب سیال کے سارے حواس، سارے اعصاب ایک پل معمول پر آئے تھے۔ سینے میں رکی ہوئی سانس ایک دم ہی خارج ہوئی تھی۔ دھڑکنیں کسی قدر اعتدال آئی تھیں۔ اندر ایک اطمینان کی سی کیفیت چھانے لگی تھی۔

سردار بکنگھم حیدر لغاری نے اس کی کیفیت کو بغور دیکھا تھا پھر اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا تھا۔ ”او۔۔۔ گاڑی میں بیٹھو۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس کے لئے دروا کر دیا تھا اور وہ جواب تھوڑی دیر قبل مکمل طور پر خوفزدہ تھی اب کسی قدر صورت حال تسلی بخش تھی۔ بہت اعتماد کے ساتھ اس قدم بڑھائے تھے اور سردار بکنگھم حیدر لغاری کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے ہوا سمت بڑھنے لگی تھی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا نا میرا انتظار کر لیجئے گا۔“

(کب۔۔۔؟ ایسا کب کہا تھا؟) اسے کسی قدر حیرت ہوئی تھی اس کے غلط بانی کرنے پر۔ مگر پر چپ رہی تھی۔ فقط خاموشی سے اس شخص کی سمت دیکھا تھا۔ وہ یقیناً چہرے سے تمام کیفیات جان بوجھ کر لہا رہا تھا اور میرب سیال کی کیفیت بھی اس سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ وہ یہاں کے ماحول سے واقف تھی اس کی پریشانی بھی بجاتی تھی۔ شاید اسی لئے اپنے بڑی ترین شیڈول سے وقت نکال کر وہ اسے لے آئے پہنچا تھا۔

”آئندہ احتیاط کیجئے گا۔“ اس نے بے تاثر لہجے کے ساتھ دیکھے انداز میں کہا تھا۔ میرب سیال بہت ہولے سے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”یونی پارک بہت بڑا شہر ہے۔۔۔ یہاں سرداریوں کو کرنا بہت آسان نہیں۔ اگر آپ یہاں کے مقامات واقفیت نہیں رکھتے تو ہر قدم ایک رسک کے مترادف ہے۔“

”جی۔۔۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”آپ کو اگر یہاں گھومنا پھرنا ہے تو میپ ہاتھ میں رکھئے گا۔ یہاں پر اگر کسی سے سر راہ روک کر بھی زیارت کریں گی تو وہ بھی خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ مشینی شہر ہے۔ بہت مشینی سی لائف ہے۔ یہاں تہ بہت کم ہے سب کے پاس۔ بہت کم لمحوں میں قدموں کی رفتار بڑھانے کے جنون میں وقت سے بے لگنا چاہتے ہیں سب یہاں۔ یہاں یوں سفر کرنا آسان نہیں۔“ ایک بہت بڑے ترقی یافتہ شہر کے غلق وہ گوبرا نشانی کرتے ہوئے اسے باور کر رہا تھا۔

میرب نے اس کی جانب نکلنے ہوئے سر بہت ہولے سے اثبات میں ہلایا تھا۔

”جاتی ہوں۔۔۔ پہلے بھی کئی بار آچکی ہوں۔“ وہ بہت آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔

سردار بکنگھم حیدر لغاری نے اسے کسی قدر حیرت سے لمحہ بھر کو دیکھا تھا۔ پھر دوسرے ہی پل چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔ میرب سیال جانے کیوں چند ثانیوں تک اس شخص کی سمت نکتی رہی تھی۔ پھر بہت ہولے سے چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”بھابی! ایسا کب تک چلے گا؟“ فیض بخاری نے بہت دیکھے لہجے میں کہتے ہوئے فارحہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سر جھکا گئی تھیں۔ دانستہ اقدام تھا یہ شاید۔ وہ بہت کچھ مخفی رکھنا چاہتی تھیں۔ خود سے بھی اور درگرد کے لوگوں سے بھی۔

فیض بخاری نے اپنے سامنے بیٹھی فارحہ کو دیکھا تھا پھر کسی قدر رُبلجھن انداز میں گویا ہوئے تھے۔

”بھابی! آپ جانتی ہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ایک تو آپ خود اپنا خیال نہیں رکھ رہی ہیں، دوسرا بھابی! آپ جانتی ہیں آپ ایک سیریس انیک سے گزر چکی ہیں۔“

”تو۔۔۔ تو کیا ہوا؟“ وہ چائے کے کپ کے کناروں پر بہت ہولے سے اٹکی گھماتے ہوئے مسکرائی تھیں۔

”کیا ہوا۔۔۔ بھابی! آپ اس حد تک کیسے لیس ہو رہی ہیں۔ مجھے آپ سے ایسی توقع نہیں تھی۔ اور

سدا بھائی۔۔۔۔۔“ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے وہ لب بلیج گئے تھے۔ فارحہ سر جھکائے رہی تھیں۔

”فیض! فکر مجھے اپنی نہیں، اذہان کی ہے، ماہا کی ہے۔ میں ان کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی۔

انہیں سمولی تکلیف میں مبتلا ہوتا بھی نہیں دیکھ سکتی۔ اپنے بچوں کو ہر تکلیف سے بچانا چاہتی ہوں میں۔ مگر

میں مسلسل ناکام ہوں۔ اذہان اس سارے معاملے کو لے کر انتہائی ڈپرےڈ ہے۔۔۔ کتنے دن گزر گئے

ہیں، میں نے اس کی آنکھوں میں سکون نہیں دیکھا۔ میں نے کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے تھے۔

مگر اب جب وہ میری گود میں سردہرے چپ چاپ آنسو بہاتا ہے تو میرا دامن جیسے جگنے لگتا ہے۔ وہ

میری گود میں کوئی ماورائی قوت ڈھونڈتا ہے جو اسے اس صورت حال سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دے

تھا۔ انہوں نے ایک نظر فیض بخاری کی طرف دیکھا تھا، پھر چہرے کا رخ پھیر کر ایک گہری سانس خارج کی تھی جیسے اب تک کی تمام کثافت کو ایک لمبے میں باہر منتقل کرنا چاہا تھا۔

سید اذہان حسن بخاری اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

”دمی! اوہ، فیض چاچو بھی یہیں ہیں۔ آپ کو تو غالباً اس وقت ہسپتال میں ہونا چاہئے تھا۔“ اس نے فیض چاچو کو سامنے پا کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

فیض بخاری مسکرا دیا تھا۔

”ہسپتال کا نام لے کر مجھے مزید مت ڈراؤ۔ ابھی ابھی تین روزہ سپوزیم سے جان چھڑا کر آ رہا ہوں۔ پہلے یو ایس میں سیدینار، پھر آتے ہی یہاں سپوزیم میں شرکت۔ یہ ڈاکٹر ہونا بھی خاصا جان جوکوں کا کام ہے۔“ وہ زبردستی مسکرا کر جیسے اس لمحہ بھر پہلے کے تاثر کو زائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سید اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔ ساتھ ہی چاچو کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ انداز خاصا تھکا تھکا سا تھا۔ فیض نے بغور دیکھا تھا۔

”دیری بیڈ چاچو! مسیحا ہیں آپ۔ کتنا معتبر نام ہے آپ کا۔“

”ہوں۔۔۔ مگر ایک مسیحا کی پرسنل لائف کی بھی کچھ ضروریات ہوتی ہیں۔ اس کا بھی ایک گھر ہوتا ہے، فیملی ہوتی ہے۔ جسے وقت دینا اسے اچھا لگتا ہے۔ جن کے ساتھ وقت گزارنا اسے اچھا لگتا ہے۔ اب دیکھو کتنے دنوں سے میں اپنے بچوں سے ڈھنگ سے مل نہیں پایا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل جب فارغ ہو کر گھر لوٹا ہوں تو نہ ماہا ہے یہاں نہ ہی تم تھے۔“

”ماہا کہاں گئی ہے؟“ چاچو کی بات پر مسکراتے ہوئے یک دم اسے ماہا کا خیال آیا تھا۔ تبھی فارحہ گویا ہوئی تھیں۔

”دوست کی طرف گئی ہے۔۔۔ گھر میں بیٹھی بور ہو رہی تھی۔ میں نے ہی کہا کہ چلی جاؤ۔ ذرا دل بہل جائے گا۔“

سید اذہان نے کوٹ اتار کر صوفے کی پشت پر دھرا پھر داہنے ہاتھ سے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگا تھا۔

”بھائی! آپ تو ماشاء اللہ گھر داری خوب اچھی طرح جانتی ہیں۔ ماہا کو کچھ سنہری اصول ہی سکھا دیجئے۔ گھر بیٹھی ہے تو کچھ ہاتھ تو آئے۔“ فیض چاچو مسکراتے ہوئے گویا ہوئے تھے۔

”نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے ماہا کا ایڈمیشن گرین وچ میں کرا دیا ہے۔ اب اسے فرانت کے لمبے بہت کم میسر آئیں گے۔ گھر داری سیکھنے کے لئے ابھی عمر بڑی ہے۔ پہلے اس کے لئے جینے کے ڈھنگ سیکھنا بے حد ضروری ہیں۔“ اس کے دھیمے لہجے میں بہت بڑا بین تھا۔ ماہا کے لئے وہ بے حد حساس تھا۔ اس کے متعلق فیصلہ کر کے اس کے چہرے پر بے حد درجہ راحت تھی۔ گہری آنکھوں میں کسی درجہ سکون تھا۔ فارحہ نے اسے بغور دیکھا تھا۔ تبھی فیض چاچو مسکرائے تھے۔

”یہ تو بہت اچھا کیا تم نے۔“

”سکے۔ وہ میری مامتا سے کھوئی ہوئی ہمت چاہتا ہے اور میں..... میں اسے کوئی جھوٹی تسلی بھی مانتی۔ کتنا اچھا دور تھا جب وہ چھوٹا تھا۔ کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے میں اسے بہلا دیا کرتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے اسباب درکار تھے مجھے اسے خوش کرنے کے لئے۔ اور آج۔۔۔“ کتنی بہت کچھ چاہ ان کی آنکھوں میں آن ٹھہری تھی اور وہ لب بلبھیج کر چہرے کا رخ پھیر گئی تھیں۔

فیض چند لمحوں تک اسی طرح خاموشی سے بیٹھے رہے تھے۔ پھر بہت ہولے سے ان کی سر ہوئے گویا ہوئے تھے۔

”بھائی! آپ وہ واحد فریق ہیں جو اس صورت کو اپنے بس میں کر سکتی ہیں۔ اذہان کو ہم ذمہ ٹھہرا سکتے۔ اس نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا۔ وہ جب آپ کو عدم تحفظ کا شکار پاتا ہے تو یہ کیا کے اندر بھی ایک پھل پناہ دیتی ہے۔ جس طرح ماں بچے کے لئے سینہ پھیر جاتی ہے اس طرح بچہ پر آج آتے نہیں دیکھ سکتا اور اذہان کی صورت حال تو خاصی پیچیدہ ہے۔ اس نے گھر کو ہمیشہ گھر ہے۔ سعد بھائی کو ہمیشہ ایک ذمہ دار باپ کی طرح پایا ہے۔ سعد بھائی کے بدلتے رویے نے ایک دھچکا پہنچایا ہے۔ مگر وہ رشتوں کا احترام اب بھی نہیں بھولا۔ اسے اب بھی افسوس ہے۔ کیونکہ بھی ان رشتوں کو معتبر جانتا ہے جن سے وہ جڑا ہوا ہے۔“

”لیکن اس کے باوجود، میں جانتی ہوں وہ حقیقت ماننے کو تیار نہیں۔۔۔ وہ جب بھی اس ذہن میں لاتا ہے، ایک طوفان اس کے اندر اٹھنے لگتا ہے۔ اس کے خاموش لبوں پر ساکت جلد چمک مگر میں جان جانی ہوں وہ طغیانوں میں گھر گیا ہے۔ مگر میں مکمل طور پر بے بس ہوں فیض! میں بھی تو اسے وہ سکون، وہ اعتماد نہیں لوٹا سکتی۔ اسے وہ ایک جڑا ہوا گھر نہیں لوٹا سکتی۔ اسے ایک ہو ایک ساتھ رہنے کے لطف سے بہرہ ور نہیں کر سکتی۔ یہ سب میرے اختیار میں نہیں ہے فیض!“ فارحہ کرب سے سرفنی میں ہلانے لگی تھیں۔

”لیکن یہ تو آپ کے بس میں ہے کہ آپ اپنا خیال رکھیں۔ اس کا خیال رکھیں۔ جو سو ہو چکا۔ اس کا تدارک ممکن نہیں۔ مگر صورت حال کو معمول پر لانے کے جتن تو کئے جاسکتے ہیں۔ آ کی جاسکتی ہے۔ حقیقت تو ہمیشہ ہی بہت کڑوی اور کیلی ہوتی ہے بھائی! حقیقت کو جھٹلانے سے یا کرنے سے حقیقت تبدیل نہیں ہو سکتی نہ ہی اسے فیس کرنے کا خوف اس کے بھیا تک رنگوں کو بڑھاتی ہے۔ جب سب راہیں بند ہوں تو مکمل یکسوئی کے ساتھ عقل و خرد سے مدد طلب کرنی چاہئے۔ نہ کہیں روشنی کی ایک لکیر ضرورتی ہے اور وہی روشنی کی لکیر اس ابھی ہوئی کتھی کا سرا سلجھانے میں ہے۔“ فیض بخاری کہہ رہے تھے اور فارحہ ساکت بیٹھی ان کی سمت تکتی چلی گئی تھیں۔ ان کا ذہن لمحے بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

”مئی! مئی!“ وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھی تھیں جب اذہان کی آواز ان کی سماعتوں سے تھی۔ وہ ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اور یہ وقت تھا جب انہیں خود کو معمول کے مطابق بہت ریلیکس ملا

”ہاں واقعی — تم نے بہت اچھا کیا۔“ فارحہ نے بیٹے کے اطمینان کو اپنے اندر اترا محسوس تھا۔ وہ دھیسے سے مسکرائی تھیں۔

”تم بیٹھو، میں تمہارے لئے چائے لے کر آتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی تھیں۔ تب وہ ان کا ہاتھ تھام کر ہوا تھا۔

”نہیں می! اس کی ضرورت نہیں۔ میں کچھ دیر آرام کروں گا۔ شام میں ہم ڈنر کے لئے جائیں گے۔ چاچو! آپ بھی کہیں مت جائیے گا۔ کوئی اور شیڈول ہو بھی تو اسے کیمنسل کر دیجئے۔ آج کم طور پر فیملی ٹائم ہوگا۔“ وہ مسکراتا ہوا اٹھا تھا اور پلٹ کر چلتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا تھا۔

فارحہ تار دیر اسے حیرت سے مکتی رہی تھیں۔ فیض بخاری مسکرائے تھے۔

”ہمارے بچے ہم سے کہیں زیادہ عقل مند ہیں بھابی!۔۔۔ وہ حالات کو بس میں کرنے کے مار

گر جانتے ہیں۔“

”ہاں۔“ فارحہ کے چہرے پر ایک طمانیت کا احساس بہت واضح تھا۔

لامعہ کو بہت سی باتوں کا خطبہ تھا۔ انہی میں سے ایک شاپنگ کرنا بھی تھا اور کبھی کبھی تو فقط ونڈو شاپنگ اور تب وہ بے تماشیا چرتی تھی۔

”لامعہ! بہت ہی نندیوں والا انداز ہے یہ۔ اشیاء کو دور سے کھڑے انتہائی لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہنا۔ دوسرے لفظوں میں اسے وقت ضائع کرنا بھی کہہ سکتے ہیں۔۔۔ بھئی جب کچھ لینا ہے فوراً اور باہر نکلو۔ یہ کیا کہ گھنٹوں ادھر سے ادھر شاپنگ کے چکر لگاتے اور اشیاء کا پوسٹ مارٹم کرتے گزرتے ہیں۔“

مگر لامعہ کے سر پر اس کے اعتراض کا کبھی کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اور آج تو شکر تھا، اس نے باضاً شاپنگ کی تھی۔

”شکر ہے، تم نے آج ونڈو شاپنگ کو ترجیح نہیں دی۔“ بہت سے بیگ صوفے پر بیٹھے ہوئے اس دہائی دی تھی۔ لامعہ مسکرائی تھی۔

”کتنی بوسیدہ لڑکی ہونا تم۔۔۔ لڑکیاں تو شاپنگ کے نام پر ہی کھل اٹھتی ہیں اور تم۔“

انابییہ شاہ مسکرائی تھی۔

”مجھے بھی شاپنگ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ مگر وہ جو تم گھما پھرا کر تھکا دیتی ہو اس سے جان چاہے میری۔ اب دیکھو، کس قدر تھکا دیا ہے تم نے مجھے۔“ صوفے پر انتہائی ایزی انداز میں ٹانگیں پھیلانے بیٹھے ہوئے اس نے بالوں کو کلپ سے آزاد کرتے ہوئے صوفے کی پشت پر پھیلا دیا تھا۔ لامعہ مسکرائی تھی۔

”اب سو مت جانا۔۔۔ میں افضل سے کہہ کر چائے منگواتی ہوں۔“ اسے آنکھیں بند کرتے دیکھا وہ بولی تھی مگر انابییہ شاہ نے آنکھیں وا نہیں کی تھیں۔ اسی طرح بڑی رہی تھی۔

لامعہ اٹھ کر اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

انابییہ شاہ واقعی بہت زیادہ تھک گئی تھی۔ اس طرح آنکھیں موند کر بہت سکون مل رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا وہیں سو جائے۔ مگر وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ سبھی گہری سانس خارج کرتے ہوئے توت ارادی جمع کرتے ہوئے اس نے آنکھیں وا کی تھیں اور چند قدموں پر ر کے شخص کو دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔ جانے وہ وہاں کب آیا تھا۔۔۔ اور۔۔۔ انابییہ شاہ نے پیروں کو صوفے پر سے اتارتے ہوئے قریب دھرا دوپٹہ اٹھا کر شانے پر ڈالا تھا۔ پھر نظریں جھکا کر دونوں ہاتھ پشت پر لے جاتے ہوئے صوفے کی پشت پر بکھرے ہوئے بال سمیٹنے لگی تھی۔

چند قدم کے فاصلوں پر ر کے عرفان علی خان نے اسے بغور دیکھا تھا پھر دھیسے سے مسکرا دیا تھا۔

”آئی ایم سوری۔۔۔“ بہت ہولے سے چلتا ہوا وہ اس کے قریب آن رکا تھا۔ یقیناً وہ شرمندہ تھا۔ مگر لامعہ کے گھر میں شاید وہ اسے قبول نہیں کر رہا تھا۔ دوسرے غلطی خود اس کی اپنی بھی تھی۔ اس کے تو دھیان میں بھی نہ تھا، اس گھڑی وہاں کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔

”اٹس اوکے۔۔۔“ مکمل پُر اعتمادی سے اس نے سر ہولے سے ہلایا تھا۔

”خیریت؟۔۔۔ اتنی ڈھیر ساری شاپنگ ایک ساتھ؟“ صوفے اور ٹیبل پر ادھر ادھر دھرے بیگز کو دیکھ کر عرفان علی خان نے سوالیہ نظروں سے انابییہ شاہ کی سمت دیکھا تھا۔ وہ دھیسے سے مسکرائی تھی۔

”لامعہ کو ایسے بہت سے شوق لائق ہیں۔۔۔ کب، کہاں، کیا اس کے دل میں سما جائے کسی کو کچھ علم نہیں۔ آپ کے لئے لکھ کر یہ ہے۔ مستقبل میں کچھ خطاط انداز اختیار کرنا خاصا سود مند رہے گا۔“ ریڈ سکتل کی سمت اشارہ کرتی اس وقت وہ خاصی منفرد لگ رہی تھی۔ بڑی بروقت نصیحت تھی مگر اس کے باوجود بہت ناصحانہ نہ تھی۔

عرفان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”کوئی کل ڈھیلی ضرور ہے محترمہ کی۔“ صوفے پر دھرے بیگز اٹھا کر اس نے بڑی سہولت سے میز پر دھرے تھے اور خود جگہ بنا کر بیٹھ گیا تھا۔ ”سال بھر کی شاپنگ ایک ساتھ کر ڈالی۔“ وہ یقیناً حیران تھا۔

انابییہ شاہ مسکرائی تھی۔

”ایٹیکسیو زمی۔۔۔ آپ لامعہ کو کم از کم میرے سامنے برا بھلا نہیں کہہ سکتے۔ اور یہ ایک سال کی شاپنگ قطعاً نہیں ہے۔“ دفاع یقیناً بہت دلچسپ تھا۔ عرفان علی خان کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”تم کب آئے؟“ عرفان کی سمت تکتے ہوئے کسی قدر حیرت سے دریافت کیا تھا۔

”بس ابھی تھوڑی دیر قبل۔ تمہارے پرسل سیل پر ٹرائی کر رہا تھا۔ مگر غالباً تم بڑی تھیں۔“

”ہاں۔۔۔ میں اکثر شاپنگ کے دوران سیل آف کر دیتی ہوں تاکہ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔“

انابییہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے وہ کسی قدر سدلچھے میں بولی تھی۔

عرفان علی خان نے بغور دیکھا تھا اسے۔ اس روز کی ناراضگی ابھی تک برقرار تھی۔

لامعہ نے خاموشی کے ساتھ چائے کا کپ اس کی سمت بڑھایا تھا جسے تھامتے ہوئے وہ مسکرا دیا تھا۔ ”شام کے پانچ بج رہے ہیں۔۔۔ اپنے منہ کے کلاک پر ٹائم ملا لو۔ ابھی تک بارہ بج رہے ہیں۔ لامعہ جو اب گھورنے لگی تھی۔ انابیہ شاہ اس ماحول میں خود کو خاصا مس فٹ محسوس کرنے لگی تھی۔ لامعہ کی سمت دیکھا تھا۔

”لامعہ! اب چلوں گی میں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ ماما انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”بیٹھو۔۔۔ چائے تو پی کر جاؤ۔“

”نہیں۔۔۔ بہت دیر ہو جائے گی۔ تم لوگ پیو۔“ انابیہ مروا مسکرائی تھی۔

”اوہ۔۔۔ تو تم ہم دونوں کے خیال سے اٹھ رہی ہو۔ بے فکر ہو کر بیٹھ جاؤ۔ ایسے کوئی راز و نیاز میں نہیں ہونے والے۔ یہاں لیلیٰ مجنوں والا کوئی چکر نہیں ہے۔“ لامعہ نے اس کا ہاتھ کھینچ کر دوبارہ لیا تھا۔ وہ لب بھینچ کر اس کی سمت تکتے لگی تھی۔ عفتنان علی خان اس تمام صورت حال کو دلچسپی سے دیکھتے مسکرایا تھا۔

”عالم مدہوشی میں دیکھے جانے کا جنوں ہے تو کوئی آتش شوق بھی تو جگانا سیکھو۔“ بڑا ذومعنی اندازاً اس کی مخاطب یقیناً لامعہ ہی تھی۔ انابیہ شاہ جلدی جلدی گرم چائے کے سپ لینے لگی تھی۔

”آتش شوق گریز پائی سے نہیں بھڑکتی۔ بڑے انوکھے وصف درکار ہوتے ہیں اس کے لئے۔ توجہ ضرورت ہوتی ہے، نظر خاص چاہئے ہوتی ہے۔ یہاں تو تم حد درجہ گریزاں ہو۔ نگاہ کتنی اجنبی ہے۔ اب میں کوئی آتش شوق بھڑکے تو کس طور۔“ بظاہر وہ لامعہ کی سمت دیکھ رہا تھا مگر مخاطب کوئی اور تھا۔ صورت حال پر جہاں لامعہ دھیسے سے مسکرائی تھی وہیں انابیہ شاہ نے خود کو بہت آکورد ذلیل کیا تھا۔

”کتنے بڑے ہونا تم عفتنان علی خان!“ لامعہ پورے استحقاق سے اس سے مخاطب تھی۔

”ابھی جانا کہاں ہے تم نے ہم کو۔۔۔ ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ کتنے جہاں آباد ہیں کہیں جوتہاں نگاہ سے دور ہیں۔ کتنی دنیا کی ہیں جنہیں تم دیکھنا ہی نہیں چاہتیں۔ کتنے منظر ہیں جن پر کبھی تم نے نظر ڈالا چاہی ہی نہیں۔“ کیسا شکوہ تھا۔ انداز میں کس درجہ دیوانگی تھی اس گھڑی عفتنان علی خان کے لبوں پر۔ لامعہ کھلکھلا کر ہنستی چلی گئی تھی۔

”انابیہ! اس شخص کی باتیں میری سمجھ میں کبھی نہیں آئیں گی۔ کبھی کبھی تو حد درجہ اجنبی لگتا ہے۔ بیگانہ ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں اس کا سر پھوڑ دوں اور کبھی.....“ لامعہ حق اس کی حد درجہ دیوانگی پر گویا ہوئی تھی۔ انابیہ شاہ کچھ نہیں بولی تھی مگر عفتنان علی خان کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”دل کے معاملات بہت عجب ہیں۔ سمجھنے کے لئے فقط نظر کی نہیں، دل کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ وقت ملے تو مشورہ کرو دل سے بھی۔ سنو تو سہی دل کیا کہتا ہے اس بابت۔“ وہ مکمل طور پر مسرور تھا۔ بظاہر نظریں لامعہ پر تھیں مگر اس کے وصف کا مخاطب کوئی اور ہی تھا۔ شاید یہ بات لامعہ نہیں جانتی تھی۔ جیسا کہ مسکرا رہی تھی۔

”بس، بس۔۔۔ اب اس درجہ بھی خود کو مجنوں ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جانتی ہوں تم

”بچہ ہو۔“ لامعہ نے کباب کی پلیٹ انابیہ شاہ کی سمت بڑھائی تھی جسے اس نے سرٹنی میں ہلا کر رفوز کر دیا تھا۔

”اب چلوں گی میں۔“ کپ میز کی سطح پر دھرا تھا۔

”دیکھا، ڈرا دیا نامیری اتنی اچھی سی دوست کو۔ وہ اسی لئے رکنے سے گریز کر رہی تھی۔“ لامعہ اسے ٹھنھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”اسی گریز کو تو ختم کرنا چاہتا ہوں میں۔“ وہ مدہم لہجے میں گویا ہوا تھا۔ انابیہ شاہ نے عفتنان علی خان کی سمت نگاہ کی تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں کچھ خاص رنگ تھے، کوئی تاثر خاص تھا۔ وہ لمحہ بھر میں نظر پھیر گئی تھی۔

”لامعہ! اب میں چلتی ہوں۔“ اس نے اجازت چاہی تھی۔

”بٹھینیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ عفتنان تمہیں چھوڑ دیتے۔ آخر اتنی جلدی کس بات کی ہے؟“ اسے رخصت کرنے کے لئے لامعہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ انابیہ فقط مسکرائی تھی اور چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ سارے منظر چھپ چھوٹ گئے تھے مگر کچھ منظر ذہن میں پھر بھی باقی رہ گئے تھے۔

کتنا عجیب شخص تھا وہ۔

کس قدر مہمل باتیں تھیں اس کی۔

سمجھ سے کس درجہ بالاتر تھا وہ۔

اب تک وہ اسے سمجھ نہ سکی تھی اور اس کے لئے اس نے کوئی خاص کوشش بھی نہ کی تھی۔ مگر جس طرح وہ نہ بلو اس کی جانب بڑھ رہا تھا وہ سب نظر انداز کئے جانے کے قابل نہ تھا۔

اس نے کئی بار سوچا تھا۔ کئی بار خاص زاویہ فکر اپنانا چاہا تھا۔ مگر خرد سب رد کرتی چلی گئی تھی۔

شاید ویسا سب کچھ نہیں تھا جیسا وہ سوچ رہی تھی۔ شاید اس شخص کا مزاج ہی ایسا تھا۔ اس کی طبیعت ہی

یہی تھی۔ ہاں اگر کچھ سوچنے اور فکر کرنے کے قابل تھا تو اس کا اس کی جانب بڑھنا۔ مگر یہ بھی تو محض اتفاق دکھاتا تھا۔

اس نے تمام تر سوچوں کو جھٹکتے ہوئے کیب کو روکا تھا اور تمام سوچوں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ یقیناً

جب تک وہ یہاں تھی، بڑی باقاعدگی سے متواتر پاپا سے ملنے جا رہی تھی۔ ان کے ڈاکٹر سے بھی بطور اصل ملاقات کی تھی۔ وہ خاصی حد تک پُر امید تھی۔ وہ سردار سبکدین حیدر لغاری کی بھی احسان مند تھی۔ اپنے انتہائی اہم ترین شیڈول میں سے وقت نکال کر وہ اس کے ساتھ ہسپتال ضرور آجاتا تھا اور وہ سمجھتی تھی ہاں کا احسان ہی تھا۔ پاپا نے اس شخص سے اس کا تعلق اپنی مرضی سے جوڑا تھا۔ وہ اس کے ساتھ انفرادی اور پرجیسا بھی سلوک کرتا، اسے قبول تھا۔ اسے اس کی سردمہری سے اتنا گلہ نہیں تھا مگر وہ نہیں چاہتی تھی پاپا اپنے کسی فیصلے پر شرمندگی ہو یا پھر وہ کسی بات کا بوجھ اس حالت میں لیں۔ اگر سبکدین لغاری ایسی

کیفیت میں اس کے ساتھ تعاون نہیں کرتا تو یقیناً وہ بہت مشکل میں گھر جاتی۔ اپنی بات اور تھی مگر حالت میں پایا کے لئے کوئی صدمہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس روز بھی جب وہ ڈاکٹر سے ملنے کے بعد باہر نکلی تھی وہ اس کا منتظر تھا۔ میرب کسی قدر شرمناک لگی تھی۔

”آپ کو تو اہم ترین کام سے جانا تھا کہیں۔“ ابھی جب تھوڑی دیر قبل زو بار یہ اسے رکنے کے رہی تھی تو وہ پایا کی خیریت دریافت کر کے باہر نکل آیا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی شاید وہ چلا گیا ہو۔ باہر نکلی تھی تو اسے موجود پا کر کسی قدر حیران ضرور ہوئی تھی۔

سبکیگین حیدر لغاری جو اب کچھ نہیں بولا تھا۔ اور تب میرب سیال نے بہت ہولے سے دو واڑہ اور اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ پورے سفر میں وہ کچھ نہیں! حالانکہ وہ اس اقدام کے لئے سبکیگین حیدر لغاری کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ مگر جانے کیا ہوا تھا کہ کوئی مناسب لفظ مل نہ پائے تھے۔ شاید اسی لئے وہ چپ سادھے بیٹھی رہی تھی۔ گاڑی ٹائم اسکو سامنے رکی تھی۔ جب سبکیگین حیدر لغاری نے اس کی سمت نگاہ کی تھی۔

”تمہارا گاڑی میں بیٹھنا مناسب نہیں۔۔۔ اگر چاہو تو میرے ساتھ آ سکتی ہو۔“ کوئی حکم نہ یہ۔ فقط ایک مخلصانہ مشورہ تھا۔ اس سفر میں وہ اس کی ذمہ داری تھی اور وہ اسے ساتھ لا کر اپنی ذمہ داری بہت خوبی سے نبھا رہا تھا۔

میرب سیال نے چند ثانیوں تک اسے خاموشی سے دیکھا تھا پھر اس کے ساتھ چلتی ہوئی ٹائم اس عمارت میں داخل ہو گئی تھی۔ سبکیگین حیدر لغاری نے لفٹ میں داخل ہو کر اپنا مطلوبہ نمبر دیا تھا۔ رکنے پر وہ اپنے مطلوبہ فلور پر لفٹ سے باہر نکلے تھے۔ وہ سبکیگین حیدر لغاری کے ہم قدم تھی، اس ساتھ تھی جب ایک بے حد دلکش پیکر کسی قدر حیرت اور خوشی کے طے جملے احساسات کا اظہار کے دوسرے لفظوں میں چننا ہوا سبکیگین حیدر لغاری کی جانب لپکا تھا۔

”ہے۔۔۔ گین۔۔۔ وہاں اے پلینز سر پر اتر۔“ کسی قدر چابانی خند و خال کی ایک حد لہنیں لڑکی تھی۔ کتنی بے قراری سے وہ سبکیگین حیدر لغاری کی سمت بڑھی تھی۔ کتنی سے اس ساتھ لگتے ہوئے ملاقات کے تمام ضروری امور انجام دیئے تھے۔ سبکیگین حیدر لغاری سینا اس لڑکی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ تھی تو اس کی کمر کے گرد ہاتھ دھرے بہت خوش نوائی سے اس ہڑی اس سے کا تھا۔ میرب سیال اس گھڑی جیسے کہیں پس منظر میں رہ گئی تھی۔ کچھ قدم کے فاصلے پر وہ چپ چاپ ان کی سمت دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں بہت رغبت سے ایک دوسرے سے مخاطب تھا۔ وہ اس سے موجودگی کے متعلق دریافت کر رہی تھی۔ سبکیگین حیدر لغاری بہت دلچسپی سے اسے مطلع کر رہا تھا۔

”ٹھہرے کہاں ہو؟“ شستہ انگریزی میں پوچھتے ہیں اسے کسی تیسرے وجود کا سرے سے احساس تھا۔ سبکیگین حیدر لغاری نے مطلع کیا تھا۔

”اور پھر تو مانا مانا ہوتا رہے گا۔“

”تم یہاں کیسے؟“

”میں یہاں اپنی آئی کے پاس آئی تھی۔ یہیں نیو یارک میں ہوتی ہیں وہ۔ امید نہیں تھی تم یہاں مل پاؤ گے۔ اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں ٹھہرا تم نے۔ بڑے بے مروت ہو۔“ بڑی بے تکلفی سے وہ سبکیگین حیدر لغاری کے شانے پر ہاتھ دھرے ہوئے مخاطب تھی۔ کیسی چمک تھی اس لمحے اس پر رخ کی آنکھوں میں۔ کیسی روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ جیسے سر راہ چلتے چلتے یکدم کوئی خزانہ ہاتھ لگا ہو۔ تو حقیقت تھی کہ کہیں کوئی ایک نہ تھا۔

بہت سے دل فرس راہ تھے۔۔۔ بہت سی آنکھیں محو انتظار تھیں۔

کتنی پلکیں بھی ہوئی تھیں۔ اور سبکیگین حیدر لغاری، اسے تو شاید یاد بھی نہ ہوگا۔ گنتی بھی کہاں یاد رہی۔ گی اعداد و شمار کتنا مشکل مرحلہ ہوگا۔

کتنے مقامات تھے۔ کتنی نظریں تھیں۔

کتنے دل اور کتنی داستاںیں۔

اگر ان سب میں کچھ کامن تھا تو فقط سبکیگین حیدر لغاری۔

میرب سیال اسی طرح کھڑی تھی جب اس سرو قامت اور چمکے نقوش والی اور کسی قدر چابانی تاثر دیتی کی کی نگاہ اس پر پڑی تھی۔ اس نے بڑی حیرت سے چوکتے ہوئے دوسرے ہی لمحے سبکیگین حیدر لغاری ہامت دیکھا تھا۔

”یہ کون ہے تمہارے ساتھ؟“ سوال میں بے تحاشا حیرت تھی۔ سبکیگین حیدر لغاری جو اب تک اس کے وجود سے کسی قدر غافل تھا اس گھڑی یکدم ہی گردن موڑ کر میرب سیال کی سمت دیکھا تھا پھر بہت ہولے سے گردن اثبات میں ہلا دی تھی۔

”ہوں۔۔۔“ کسی طرح کی کوئی وضاحت نہیں کی تھی۔ تبھی وہ پر ی رخ اس کی سمت مسکراتے ہوئے بڑھی تھی۔

”ہائے۔۔۔ آئی ایم گی GEE۔“ ہاتھ اس کی سمت بڑھایا تھا۔ جو اب میرب سیال بھی مسکرا دی تھی۔

”میرب سیال۔“

”بہت خوب صورت ہو تم۔ سبکیگین حیدر لغاری۔“ کتنی ہی تمہارے بارے میں نہیں بتایا۔ میں اس کی دست ہوں۔ چابانی نژاد کینیڈین۔ ویسے اگر تم مجھے سبکیگین حیدر لغاری کہو تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔“ گی کے لبوں پر بڑی دستاں سی مسکراہٹ تھی۔ جو اب میرب سیال نے بھی جیسے مسکرا کر فرض تھا۔ گی بہت زندہ دل لڑکی تھی۔ ساری باتیں وہیں کھڑے کھڑے کر لینا چاہتی تھی۔

”تم بہت خوب صورت ہو۔“

میرب سیال نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا جب سبکیگین حیدر لغاری ان کی طرف پلٹا تھا۔

”بہتر نہ ہوگا کہ ہم کہیں بیٹھ کر بات چیت کر لیں؟“

پارسا تو خیر کوئی بھی نہیں ہوتا۔ مگر اس درجہ پذیرائی کا وصف شاید سبکدین حیدر لغاری ہی کا خاصہ تھا۔ مختصر سے دنوں میں وہ اسے بہت زیادہ نہیں جان پائی تھی۔ مگر جتنے دن سے اس کے ساتھ تھی ہر روز کا ایک نیا رنگ اس کے سامنے آ رہا تھا جو پہلے رنگ سے یکسر مختلف اور الگ تھا۔ جانے کتنے رنگ اور اتنے سبکدین حیدر لغاری کی شخصیت کے۔ جانے اور کتنے وصف تھے۔

اسے کھوجنے کی اس قدر جستجو نہ تھی۔ مگر جو کچھ اس کے سامنے آ رہا تھا وہ اس سے اپنی آنکھیں بند بھی کر سکتی تھی۔ بہت کچھ حیران کن تھا۔ بہت کچھ چونکا دینے والا تھا۔ یقیناً ایسی بہت سی حیران کن باتیں، یہ مزید ابھی اس کے سامنے آنا باقی تھیں۔ سبکدین حیدر لغاری کی زندگی یقیناً بہت ایڈوانس تھی۔ بہت دل فحش تھا۔ لطف اندوزی کے بہت نرالے وصف از بر تھے اسے۔ اور وہ یقیناً حیران ہونے کے لئے اب تک کتنے تاثر تھے۔ کتنے چہرے سامنے آئے تھے اور اس پر یہ بھید نہ کھل سکا تھا کہ درحقیقت وہ تھا۔ ابھی وہ ایک منظر ہی سمجھ نہ پاتی تھی کہ منظر بدل جاتا تھا۔ کتنی پر تیں تھیں سبکدین حیدر لغاری کی بت کی۔ وہ نہیں جانتی تھی آنے والے لمحے اس کے لئے کیا لے کر آئے والے تھے۔

اسے آنے والے دنوں میں کیا کرنا تھا۔ وقتی طور پر اس نے تقدیر کا لکھا اسی کو جان کر اکتفا کر لیا تھا۔ ہر بدلتا منظر جس طرح سے اسے چونکا رہا تھا اسے نہیں لگتا تھا کہ وہ زیادہ دن اس ماحول کا حصہ رہا۔

ایسی کوئی خاص جذباتی وابستگی تو نہیں ہوئی تھی ان دنوں میں مگر یہ ہوا تھا کہ اس کے پچھلے کچھ برسے مرگ کی نگاہ سے محض ضرور ہو گئے تھے۔ یا پھر اس نے جان بوجھ کر اس تاثر کو ذہن سے زائل کر دیا۔ راب اس ایک لمحے میں پچھلے سارے منظر پوری شدت کے ساتھ روشن ہوتے چلے گئے تھے اور ان ل کے رنگ اسے کس قدر برے لگ رہے تھے۔

سبکدین حیدر لغاری یقیناً وہ شخص نہیں تھا جس کی خواہش وہ کرتی۔

ہر دو جاہت تھا۔ پُر تاثر تھا۔

خصیت میں سحر بھی تھا۔ بے تحاشا کشش بھی تھی۔ وقار بھی تھا۔ جاہ و جلال بھی۔

کردہ خاص وصف نہیں تھا جو اپنے جیون ساتھی میں وہ تلاشنا چاہتی تھی۔

میں کچھ اچھی عادتیں بھی سبکدین حیدر لغاری میں۔ کچھ اچھی باتیں بھی ضرور تھیں۔ مگر خامیوں کے نوبیوں کا گراف بہت اُن مینلس تھا۔ شاید کچھ خواص مزید بھی سبکدین حیدر لغاری کی پرسنالٹی میں ہوتے مگر انہیں کھوجنے کی، تلاشنے کی جستجو اس میں قطعاً نہیں تھی۔

ب گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے دیکھا تھا۔ سبکدین حیدر لغاری سامنے سے آتا ہوا اس کی سمت آتا تھا۔ وہ اس کے قریب آتا اور اسے اٹھنے کے لئے کہتا، وہ اس سے قبل ہی تمام امور انجام لیتی تھی۔

چلو۔۔۔ وہ بولا تھا۔ پھر یکدم اس کی سمت پلٹا تھا۔ ”تمہیں بھوک تو نہیں؟“

گی نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ ابھی وہ دونوں آگے بڑھنے لگے تھے۔ میرب سیال کے پار ساتھ دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

بہت سی باتوں اور چیزوں کی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پابند تھی۔ جس طرح اس گھڑی نہ چاہتے بھی ان کے ساتھ ہونا۔ یقیناً وہ اس لمحے ان دونوں کے درمیان حائل تھی۔ اگر اسے انتخاب کام جاتا اور کسی قدر لبرٹی دی جاتی تو وہ یقیناً کسی کے بھی درمیان دیوار بننا قبول نہ کرتی۔

گی، سبکدین حیدر لغاری کے بہت قریب تھی۔ اس کے داہنے مضبوط آہنی بازو میں اپنا نازک ڈالے وہ اس گھڑی مکمل طور پر مسرور تھی۔

ناتا کچھ نیا تو نہ تھا۔ حالات بتا رہے تھے، وابستگی کچھ معمولی نہ تھی۔

اسے اس لمحہ انتہائی شرمندگی ہو رہی تھی۔ بہت آکورد فیل کر رہی تھی وہ۔ یقیناً یہ سفر، یہ آسان نہیں تھی۔ جانے کیا راز و نیاز ہو رہے تھے ان میں۔ سرگوشیوں میں بہت سی خاص باتیں تھیں۔ میرب سیال کچھ نہیں سن پاتی تھی۔ شاید وہ کچھ سننا چاہتی بھی نہیں تھی۔ وہ اپنی آنکھیں اس منظر میں لپٹا چاہتی تھی۔ کان بھی بند کر لینا چاہتی تھی۔ وہ لمحے بڑے ثقیل تھے جب گی کے پرسنل سیل پر رنگ بچی تھی۔ جانے کون تھا دوسری طرف۔ لیکن اس کے دوسرے ہی پل اس نے معذرت طلب نظر دیا۔ سبکدین حیدر لغاری کی سمت دیکھا تھا۔

”معذرت چاہتی ہوں۔۔۔ لیکن شام میں ضرور ملاقات ہوگی۔ تم ہوٹل میں ہی رہنا۔“

اختتامی الوداعی رسومات انجام دیتے ہوئے وہ اپنے گداڑ لب سبکدین حیدر لغاری کے کانوں قریب لے جاتے ہوئے بہت دلکشی سے مسکرائی تھی۔ جواباً سبکدین حیدر لغاری کے لبوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔

وہ پری رن چلی گئی تھی اور ”ناٹم اسکوائر“ کی ساری دلکشی جیسے ماند پڑ گئی تھی۔ شاید گی واقعی بہت صورت لڑتی تھی۔ سبکدین حیدر لغاری کی نظریں دور تک اس کا تعاقب کر رہی تھیں اور میرب سیال کو یہ تھا کہ سبکدین حیدر لغاری ابھی تک اس ایک لمحے کے سحر کی گرفت میں تھا اور وہ تاثر ابھی تک ماند نہ چلا اس کی آنکھوں کی چمک کتنی بڑھ گئی تھی۔ وہ بے حد مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ گی چلی گئی تھی مگر اپنے کانوں سے سبکدین حیدر لغاری کے چہرے پر چھوڑ گئی تھی۔ وہ اس کی جانب بخوردیکھ رہی تھی جب وہ اس کی متوجہ ہوا تھا۔

”تم یہاں بیٹھو۔ میں کچھ کام نمٹا کر ابھی آتا ہوں۔“ اسے وہاں چھوڑ کر وہاں سے نکل گیا تھا۔

میرب سیال نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔ نظروں میں پھر گی کا تصور جھلملانے لگا تھا۔ گی ایک بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ خوب صورت تو خیر تمام ہی لڑکیاں تھیں جن سے وہ آج تک سبکدین لغاری کے حوالے سے ملی تھی۔ شاید معاملہ یہ تھا کہ سبکدین حیدر لغاری کی نگاہ واقعی بہت بلند تھی۔ اسے پسند عام نہ تھی۔ عام چہرے اسے بھاتے نہ تھے۔ نام بدلتے تھے، مقام بدلتے تھے مگر اس کی پسند عام بلند رہتی تھی۔

”نہیں۔“ اس نے سرٹھی میں ہلایا تھا۔

”اوکے۔۔۔ چلو پھر۔“ وہ غالباً غلجٹ میں تھا۔ لفت کی جانب بڑھتے ہوئے اس کے خاصی سرعت تھی۔ میرب سیال نے سرٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

”اگر آپ کو کوئی کام ہے تو میں اکیلی ہوٹل چلی جاتی ہوں۔ آپ وہ کام انجام دے لیجئے۔ قناعت کرنا آ گیا تھا۔ سبکدین حیدر لغاری نے فقط اس کی سمت خاموشی سے دیکھا۔ کچھ کہا نہیں اسکو اسے نکل کر اس نے میرب کے لئے ایک کیب ہائیر کی تھی اور اسے بٹھا کر کھڑکی میں ہدایت کی تھی۔

”ہوٹل پہنچ کر مجھے فون کر دینا۔“

یہ ہدایت یقیناً اس کی خیریت کے پیش نظر تھی اور میرب سیال نے بہت ہولے سے سرٹھا دیا تھا۔ ڈرائیور نے نیسی آگے بڑھا دی تھی۔

جب سے سبکدین حیدر لغاری اس کی زندگی میں آیا تھا، اس کا صرف اثبات میں ہلے لگا تھا کرنے کے لمحے زندگی میں کچھ زیادہ میسر نہیں آئے تھے۔ مگر جتنے بھی میسر آئے تھے اسے کبھی انتہائی چغندر انداز میں فقط سرٹھی ہلانا پڑا تھا۔ مگر اب جیسے وہ اس سے زیادہ کی سکت رکھتی ہی زندگی ایسا کیا تھا سبکدین حیدر لغاری میں؟

ایسا کیا تھا اس کی شخصیت میں جو وہ اس کی اس درجہ تابع ہو گئی تھی۔

کتی دیر تک وہ اسی نچ پر سوچتی رہی مگر کچھ خاص سمجھ میں نہ آیا تھا۔

زندگی جتنی بھی مشکل ہو، جینے کی صورت نکل ہی آتی ہے۔ پچھلے دنوں زندگی میں جتنی بھی تھی اس کا کچھ مذاکرہ نہ تھا۔ مگر اب یوں ہوا تھا کہ وہ تاثر اگر پوری طرح زائل نہیں ہوا دھیرے دھیرے واپس اپنے ڈھب پر آنے لگی تھی۔

ماہانے کیسپس جانا شروع کر دیا تھا اور اسے دیکھ کر فارحہ کو بہت اطمینان ہوا تھا۔ وہ نئے جینا شروع کر چکی تھی۔ ایک مقصد آ گیا تھا اس کے ہاتھ۔ بہت حد تک مصروف ہو گئی تھی وہ قناعت والی کوئی کیفیت باقی نہ رہی تھی۔ اسے مطمئن دیکھ کر اذہان حسن بخاری بھی خوش تھا اور ان دنوں فارحہ خوش تھیں۔ سعد حسن شاہ بخاری کا آنا جانا ایک الگ معمول تھا۔ مگر انہوں نے ماہانے کے کرنے پر کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا تھا۔

”سب کچھ بہت بدل گیا ہے۔“ جانے انہوں نے کس ڈھب پر کہا تھا۔ فارحہ بہت دھمکتی تھیں۔

”ہاں۔۔۔ واقعی بہت کچھ بدل گیا ہے۔“ شاید طنز تھا کوئی۔ سعد حسن شاہ بخاری دیکھتے تھے۔

”آپ کو بچوں کو وقت دینا چاہئے۔ انہیں آپ کی ضرورت یقیناً اب بھی ہے۔“ جانے کیا

حسن بخاری کچھ نہیں بولے تھے۔ فقط خاموشی سے اس کی جانب دیکھتے رہے تھے۔

”تقدیر کا باعث کوئی اور تو نہیں۔“ بہت ہولے سے احساس دلایا تھا۔

”تم مجھے میری غلطیوں کی یاد دہانی کرانا چاہتی ہو؟“ سعد حسن بخاری کو شاید آئینہ دکھانا اچھا نہیں لگا

”نہیں۔ فقط یاد کرانا چاہتی ہوں۔ کسی کو الزام دینے سے قبل اسباب پر بھی غور ضرور کر لیجئے۔“ فارحہ لہجے میں بولی تھیں۔ سعد حسن بخاری دیکھ کر رہ گئے تھے۔ فارحہ انہیں اسی طرح ساکت چھوڑ کر باہر آئی تھیں۔ باہر لاؤنج میں اذہان حسن بخاری، اگینے اور عزیر کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

”تم لوگ کب آئے؟“ فارحہ، اگینے اور عزیر سے ملتے ہوئے مسکرائی تھیں۔

”ہاں ابھی ابھی۔“

”ماہا کہاں ہے؟“ کچھ خاطر مدارات بھی کی یا نہیں؟“ فارحہ نے فیروز شیون کی ساڑھی کا ہٹانے ہوئے دریافت کیا تھا۔ تبھی اذہان حسن بخاری گویا ہوا تھا۔

”آپ بیٹھیں می! ماہا گئی ہے کچن میں۔“ تب فارحہ، اگینے کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔

”اذہان بتا رہا تھا سعد بھائی آئے ہوئے ہیں۔“ اگینے نے دریافت کیا تھا۔

”ہاں۔“ فارحہ نے مختصر جواب دیا۔ ایک ہلکی سی رسمی مسکراہٹ لبوں پر پھیلی تھی پھر دوسرے ہی پل دم ہو گئی تھی۔ اگینے نے انہیں بنور دیکھا تھا۔ وہ ان کی کیفیت کسی حد تک سمجھ گئی تھی۔ شاید کچھ دریافت نہیں کیا تھا۔

”بھالی! ہم بلال کی شادی کا کارڈ دینے آئے تھے۔“ اگینے نے کارڈ فارحہ کے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ وہ اذہان سے مسکرائی تھیں۔

”اوہ۔۔۔ اتنی اچھی خبر۔ تم لوگوں نے بنا مطلع کئے سب کام بالائے بالا طے کر ڈالے اور سب کچھ رکے اب ہمیں فقط مطلع کر رہے ہو۔“ فارحہ نے مسکراتے ہوئے بہت اپنائیت سے شکوہ کیا تھا۔ اگینے اڑی گئی۔

”بھالی! آپ کے بغیر ہم بھلا کچھ کر سکتے ہیں؟ سب آپ کے منتظر ہیں۔ سارے کام آپ کے ہی سہانجام پائیں گے انشاء اللہ۔ ردا کے گھر والوں کو کچھ جلدی تھی۔ سو بہت قریب کی ڈیٹ فکس کرنا ہم سب لوگوں کے لئے خود بہت غیر متوقع خبر ہے۔ یہ لڑکیوں نے تو اچھا خاصا دھاوا بول دیا ہے۔ وائٹس خاص تیاریاں جو کرنی ہوتی ہیں۔“ اگینے مسکراتے ہوئے مطلع کر رہی تھی۔ تبھی عزیر گویا ہوا

”اگینے آپا کے قدم بہت لگی ہیں۔ آتے ہی بلال کو ٹھکانے لگا دیا۔ سب سوچ رہے ہیں اگلا نمبر کس کا

”تم قطعاً نہیں ہو گے۔ لکھ کر رکھ لو۔“ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا تھا۔ بہت

بعد وہ عام روٹین کی طرح مسکرا رہا تھا۔ ورنہ وہ تو یہ سب بھول ہی گیا تھا۔ فارحہ اسے دیکھ کر بہت

خوش ہوئی تھی۔

”میں نہیں ہو سکتا، لیکن تم تو ہو سکتے ہونا۔“ عزیر نے جواباً چھیڑا تھا۔ دونوں ہاتھوں پر ہاتھ ہوئے کھلکھلا کر ہنستے چلے گئے تھے۔ اگینے نے مسکراتے ہوئے فارحہ کی طرف دیکھا تھا۔

”میری مائیں تو بھائی! آپ بھی اب اذہان کے لئے کوئی لڑکی دیکھ ہی ڈالئے۔ گھر میں، کچھ سکون آپ کو بھی ملے گا۔ پھر رونق بھی خوب رہے گی۔“

”اگینے! یہ کیا بیٹیاں پڑھا رہی ہیں آپ میری والدہ کو؟“ اذہان حسن بخاری نے اگینے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

”تمہارے بھلے کی باتیں ہی بتا رہی ہوں۔“

”ماشاء اللہ۔ کچھ ہم بھی تو سنیں۔“ اگینے کی سمت بغور نکلتا ہوا وہ مسکرایا تھا۔

”اوئے یار! اگینے تیرے لئے لڑکی دیکھنے کی بات کر رہی ہیں۔ مسجماہم ہیں اور نیکیاں کمانے سوچ رہی ہے۔“ عزیر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اذہان حسن بخاری کھلکھلا کر ہنسنے لگا تھا۔ فارحہ

سمت نکلتی چلی گئی تھیں۔ کیسی آسودگی اتر رہی تھی اندر کہیں۔ کس قدر راحت محسوس کر رہی تھیں وہ۔

”کچھ بھی کہو، لڑکی تو تمہارے لئے اگینے ہی دیکھے گی۔“ فارحہ نے بھی حصہ لیا تھا۔

”مہی! آپ بھی؟“ اذہان حسن بخاری نے ماں کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

”دیکھ لو، اب تو فارحہ بھائی نے بھی گرین گنٹل دے دیا۔ اب آرام سے بتا دو اپنی پسند۔“ درکار ہے تمہیں؟“ اگینے نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے مسکرا کر اگینے کی سمت بغور دیکھا تھا۔

”اوں، ہوں۔“ سرنٹی میں بلایا تھا۔ ”یہ تو میں آپ کو قطعاً نہیں بتاؤں گا۔“ وہ جیسے اس تما

حال سے خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔

”اگینے! اپنے محترم اذہان حسن بخاری کا ارادہ کچھ اور ہے۔ آپ اپنا ارادہ بدل لیجئے۔“ مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں۔ اذہان حسن بخاری کے لئے لڑکی تو میں ہی دیکھوں گی۔ اور دیکھنا یہ خود بھی اسے دیکھ رہے ہیں۔“ اگینے نے دعویٰ کیا تھا۔

”کیوں۔۔۔ اس قدر خوفناک ہوگی وہ؟“ عزیر نے سچ میں لقمہ دیا تھا۔ اذہان حسن بخاری بہت فطری تھا۔ دونوں دوست عرصہ دراز بعد یوں مل کر بیٹھے تھے اور انجوائے کر رہے تھے۔ اگینے کو آنے کی بطور خاص تلقین کی تھی اور پھر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

اذہان حسن بخاری انہیں چھوڑنے کے لئے باہر تک آیا تھا۔ عزیر جب پورچ سے گاڑی نکال اگینے نے اس کی سمت قدم بڑھائے تھے تبھی اس نے بہت ہولے سے پکارا تھا۔

”اگینے!“

”ہوں؟“ اگینے نے گھوم کر اسے دیکھا تھا۔ مدہم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلی ہوئی تھی۔

درجئے لگی تھی۔

”بھینکس۔“ بہت ہولے سے وہ بولا تھا۔

”کس لئے؟“ اگینے حیران ہوئی تھی۔

”آپ کے باعث آج ہم بہت عرصے بعد کھل کر مسکرائے۔ میں نے بہت دنوں بعد می کو اس طرح سکون پایا۔“ اگینے اس کی سمت نکلتی ہوئی مسکرا دی تھیں۔

”شکریہ میرا نہیں بلال کا ادا کرو، جو شادی کر رہا ہے۔ یہ ساری خوشیاں اسی کی شادی کے باعث ہاتھ لی ہیں۔“

”ہوں۔“ اذہان حسن بخاری نے پر خیال انداز میں سر ہلایا تھا۔

”تجھی تو کہہ رہی ہوں اب تم بھی اس ضمن میں سوچنا شروع کر دو۔“ اگینے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اذہان حسن بخاری کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ تجھی عزیر نے ہارن دیا تھا۔ اگینے پلٹنے لگی تھی

ب اذہان حسن بخاری نے اسے پکارا تھا۔

”اگینے!“

”ہوں۔۔۔؟“ وہ ایک بار پھر پلٹی تھی۔

اذہان حسن بخاری نے چند ثانیوں تک خاموشی سے دیکھا تھا، پھر بہت ہولے سے مسکرا دیا تھا۔

”لڑکی آپ جیسی ہونی چاہئے۔“ آنکھوں میں ایک شرارت رکی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً سنجیدہ نہ تھا اس لڑکی۔ اگینے نے اس کی سمت بغور دیکھا تھا پھر مسکراتے ہوئے پلٹ گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری چند

نوں تک وہیں رکا اس سمت تکتا رہا پھر لب بھینچ کر مڑا اور قدم اندر کی جانب بڑھادیئے تھے۔

دن شاید پلٹ رہے تھے۔ زمانہ شاید بدل رہا تھا۔

اسے سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ حالانکہ سب کچھ بدلنا نہ تھا۔ مگر اس کے لئے یہی بہت تھا کہ اس کے لڑکی کھوئی ہوئی مسکرائیں آج دوبارہ لوٹ رہی تھیں۔ اس کی ماں کی آنکھوں میں اطمینان تھا، سکون تھا۔

دل پر مسکراہٹ تھی۔ اور اتنا کچھ بہت کافی تھا اس کے لئے۔ فارحہ صونے پر بیٹھی ہوئی تھیں جب اس نے ہولے ہولے چلتے ہوئے ان تک فاصلہ سمیٹا تھا۔ ان کے قریب رک کر چند ثانیوں تک انہیں دیکھا تھا

رہ بیٹھے ہوئے سران کی گود میں دھر دیا تھا۔ فارحہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی مسکرائی تھیں۔ کہا کچھ ٹل گیا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے بھی فقط مسکراتے ہوئے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا تھا۔ دونوں شاید ایک

سجے کی کیفیت پہ خوبی سمجھ رہے تھے۔

انابہ شاہ اپنے کمرے میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی نینٹ سرفنگ کر رہی تھی۔ باہر لاؤنج میں دادا ابا اور

ترم عثمان علی خان دھواں دھار بحث و مباحثے میں مصروف تھے۔ غالباً ان کا موضوع گفتگو ادب تھا۔ دوسرے متوں میں دونوں حضرات اس لمحے خاصی ادبی گفتگو فرما رہے تھے۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا

دا تھا اور فاصلہ کچھ اتنا زیادہ بھی نہ تھا۔ شاید تبھی ان کی آواز بخوبی اس کی سماعتوں تک پہنچ رہی تھی۔

عفتان علی خان کے آنے سے ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ دادا ابا کو ایک سنگت میر گئی تھی۔ اور وقت خاصا اچھا گزرنے لگا تھا۔ درحقیقت وہ عفتان علی خان کی آمد کے اغراض و مقاصد جانے کرنے سے یکسر قاصر رہی تھی مگر اس نے بطور خاص اس ضمن میں کچھ سوچا بھی نہ تھا۔ دیکھا جاتا تو کا یہ واقعہ تھا بھی نہیں۔ ہاں یہ تھا کہ وہ شخص بہت دوستانہ مزاج رکھتا تھا۔ شاید اسی لئے کسی حد تکلف واقع ہوا تھا۔ یہ اس کی طبیعت کا خاصہ تھا شاید۔ اس کے باعث اس پر کوئی فتویٰ جاری ہو سکتا تھا۔ ہر شخص کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ ہاں یہ بات سوچنے والی تھی کہ اس نے دادا ابا کا دل وا لیا تھا۔ دادا ابا کو بہت کم لوگ متاثر کرتے تھے اور انہی میں ان محترم عفتان علی خان کا شمار بھی تھا۔ اس میں کچھ تو تھا کہ دادا ابا اس کے گردیدہ ہو گئے تھے۔ دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ اتنے کم دنوں پہچان ہے۔

انا بیہ یکدم اپنے کمرے سے اٹھ کر ان دونوں کے پاس آگئی تھی۔

دادا ابا، عفتان علی خان کی معلومات پر اسے سراہ رہے تھے۔ اس کی مدد گفتگو پر اسے اپری شہ رہے تھے۔ وہ پلٹنا چاہتی تھی لیکن یکدم یہ ممکن نہ تھا۔ شاید بھی وہاں کھڑی رہی تھی۔ اور پھر شاید اس مجالت مٹانے کو بہت آہستہ سے جھک کر اپنے بازو دادا ابا کے گرد حائل کر دیئے تھے۔ عفتان علی خان چہرے کو اس گھڑی دانستہ بغور دیکھ رہا تھا۔

”تم تو جابلو بڑی تھیں؟“

دادا ابا نے گردن موڑ کر مسکراتے ہوئے انا بیہ شاہ سے دریافت کیا تھا۔ وہ مسکرائی تو نگاہ عفتان علی خان سے لحوہ بھر کو نکرائی تھی۔ تبھی وہ ہولے سے گویا ہوئی تھی۔

”اتنی دلچسپ گفتگو ہو رہی تھی۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے سوچا چائے، کافی کا پوچھ لوں، ضرورت نہیں؟“

”نہیں۔۔۔ مجھے تو نہیں۔ تم عفتان علی خان سے پوچھ لو۔“ دادا ابا نے مسکراتے ہوئے عفتان علی خان کی سمت اشارہ دیا تھا۔ تبھی وہ اس کی سمت براہ راست نکلنے لگی تھی۔

”ناٹ ایٹ آل۔“ اس نے شانے بے فکری سے اچکائے تھے۔ تبھی دادا ابا گھڑی دیکھتے ہوئے کھڑے ہوئے تھے۔

”بھی برخوردار! بہت اچھی گفتگو رہی تم سے۔ ابھی نماز کا وقت ہو چلا ہے ورنہ مزید نشست دووں بیٹھو، باتیں کرو۔ میں نماز پڑھ لوں۔“

دادا ابا کہنے کے ساتھ ہی چلتے ہوئے لاؤنج سے نکل گئے تھے۔ عفتان علی خان اب خاصے خاصے بغور نکلتے ہوئے اس کی طرف متوجہ تھا۔ وہ ہونٹ ہنسنے لگا تھا۔

”مجھے نہیں علم تھا آپ اتنی ادبی قسم کی گفتگو بھی فرما سکتے ہیں۔“ اس نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کیا تھا۔ عفتان علی خان بہت دلکشی سے مسکرا دیا تھا۔

”کیوں۔۔۔ آپ مجھے اتنا بے ادب جانتی ہیں؟“ جواب بہت بروقت تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”نہیں، ایسی بات نہیں۔ دراصل میں آپ کو قطعاً نابلد سمجھتی تھی۔“ اس نے سچ کہا تھا۔ عفتان علی خان نے بغور نکلتے ہوئے بہت ہولے سے مسکرایا تھا۔

”کس بات سے؟“ اس گھڑی خاصی دلچسپی سے وہ انا بیہ شاہ کی سمت متوجہ تھا۔ روشن آنکھوں میں بڑی ہی چمک تھی۔ جانے کیسا احساس تھا۔ انا بیہ شاہ نظروں کا زاویہ بدل گئی تھی۔

عفتان علی خان اپنے سوال کی جواب دہی کے لئے یقیناً منتظر تھا مگر انا بیہ شاہ کچھ نہیں بولی تھی۔ تبھی ان علی خان بہت ہولے سے مسکرایا تھا۔

”اور کن کن باتوں سے نابلد سمجھتی ہیں مجھے، کبھی سہولت سے وضاحت ضرور کیجئے گا۔“

انا بیہ شاہ ایک بار پھر اس کی سمت نکلتی ہوئی اخلاقاً مسکرائی تھی۔ ساتھ ہی گویا ہوئی تھی۔

”ادب کے اتنے بڑے ناموں پر گفتگو کرنا آسان نہیں۔ اور وہ بھی دادا ابا کے ساتھ۔ دادا ابا ادب کا پھرنا، جیتا جاگتا انسائیکلو پیڈیا ہیں۔“

”اور میں؟۔۔۔ میرے بارے میں کیا خیال ہے؟“ بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سینے پر نکاتے اے اس نے خود اپنے متعلق دریافت کیا تھا۔ انا بیہ شاہ نے لحوہ بھر کو کسی قدر حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔

بہت سہولت سے شانے اچکا دیئے تھے۔ بڑا بے تاثر انداز تھا جیسے وہ تمام تر تاثر محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ عفتان علی خان اس کی سمت بغور نکلتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔ انداز میں ایک خاص احساس تھا۔

اپنے وصف کے متعلق بخوبی جانتا ہو۔ اس گھڑی کتنی آہستگی سے وہ گویا ہوا تھا۔

اُس جان تکلم کو تم مجھ سے تو ملواتے

تسخیر نہ کر پاتا حیران تو کر جاتا!

کتنی دلکش مسکراہٹ اتری تھی اس لمحے اس کے لبوں پر۔ انا بیہ شاہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ تبھی وہ لڑا ہوا تھا۔

”کیا اب بھی دوستی کے لئے ماحول سازگار نہیں ہے؟“ اس کے مد مقابل کھڑے ہوتے ہوئے وہ سے دریافت کر رہا تھا۔ انا بیہ شاہ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکی تھی۔ وہ قدم داخلی دروازے کی

بڑھانے لگا تھا۔ انا بیہ نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

”برف پگھلنے میں اور کتنی دیر لگے گی؟“ لبوں پر بڑی دھیمی مسکراہٹ تھی۔ انداز ذومعنی تھا۔ انا بیہ شاہ تمام بڑھاتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا پھر دھیمی سے مسکرا دی تھی۔

”آپ کا مزاج دادا ابا سے خاصا میٹھ کرتا ہے۔ آپ کی اور ان کی خوب جھجے گی۔“

”اور آپ؟“ دھیمی سے مسکراتے ہوئے اس نے، اس کی سمت اشارہ کیا تھا۔

”میں؟“ وہ اپنی جانب اشارہ کرتی ہوئی مسکرا دی تھی۔ ”میرا مزاج بہت مختلف ہے۔ لامعہ نے بتایا آپ کو۔ میں بہت زیادہ دوست نہیں بناتی۔ اسکول سے لے کر اب تک میری فقط ایک ہی دوست - لامعہ کی شکل میں۔ مجھے افراد کا ہجوم اپنے ارد گرد لگانا اچھا نہیں لگتا۔“

عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔ ساتھ ہی ایک خاص ادا سے شانے اچکائے تھے۔ برا آمدے کی سیرھیان

اتر کر اس نے سر اٹھا کر کھلے آسمان کی سمت نگاہ کی تھی۔ جانے کیا مٹلانے کی کوشش کی تھی۔ انابہہ نے قدر حیرت سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ عفتان علی خان نے دوسرے ہی لمحے دھیان اس کی بر تھا۔

”کاش۔۔۔“ ایک حسرت بہت ہولے سے اس کے لبوں پر دم توڑ گئی تھی۔ انابہہ شاہ قطعاً پائی تھی۔ عجب دیوانہ پن تھا۔ شاید وہ شخص کسی قدر خطی واقع ہوا تھا جو عجیب و غریب حرکتیں کر سکتا تھا خود کلامی کا بھی عادی تھا۔ انابہہ شاہ کے اپنی طرف حیرت سے تکتے پر دھیسے سے مسکرایا تھا۔

”کیا ہوا؟“ سوالیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھا تھا۔ انابہہ نے بہت ہولے سے سرنئی میں تھا۔ تبھی وہ مسکرایا تھا۔

”چلتا ہوں۔۔۔ دادا ابا کو میری طرف سے خدا حافظ کہہ دیجئے گا۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ پلا پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گیا تھا۔ چوکیدار نے گیٹ دیکھا اور جب تک وہ اپنا نکال کر نہیں لے گیا تھا، انابہہ شاہ وہیں ستون کے ساتھ لگی کھڑی رہی تھی۔ پھر وہیں بیٹھیوں پر تھی۔ رات کی رانی کی مہک نے لان کے تمام ماحول کو اپنے سحر میں باندھا ہوا تھا۔

چند ثانیوں تک وہ اسی طرح بیٹھی رہی تھی پھر ایک لمحے کو سر اٹھا کر کھلے آسمان کی طرف دیکھ چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے روشن تھا۔ آسمان کا حسن دوبالا ہو رہا تھا۔

”کاش۔۔۔“ ایک صورت سرگوشی کی مانند اس کے اطراف میں ابھری تھی۔

وہ سرفوراً پہلے والی پوزیشن پر لے آئی تھی۔ چند ثانیوں تک اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔ پھر یکدم اور گلاس ڈور کھول کر قدم اندر کی جانب بڑھا دیئے تھے۔

ہسپتال سے فون آیا تھا۔ بات تو کچھ خاص نہ تھی۔ ڈاکٹر نے چند ضروری امور کے لئے انہیں بلوایا تھا۔ مگر جانے کیوں میرب سیال کا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ یکدم ہی بہت سے خوف سے در آئے تھے۔ صبح ہی تو وہ پایا سے مل کر آئی تھی۔ سب کچھ معمول پر تھا۔ پایا کو وہ اپنی آنکھوں نے چکی تھی۔ ان کی حالت خاصی بہتر تھی لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو یکدم ہی بہت سے اندیشوں سے تھا۔ فوری طور پر کچھ اور تو سمجھ میں نہ آیا تھا، اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور برابر والے کمرے کی جانب پیش قدمی کی تھی۔ سردار بیکینگین حیدر لغاری نے دو الگ الگ رومز قیام کے لئے لئے تھے۔

درجہ ہو کلاہٹ کا شکار تھی کہ اس نے دروازے پر دستک دینے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ہاتھ پٹا دھرا تھا اور ایک ہلکے سے دباؤ سے دروازہ کھلتا چلا گیا تھا۔ اندر کا منظر اس کی توقع کے بہت برخلاف شاید تبھی وہ وہیں دہلیز پر ہی ساکت سی کھڑی رہ گئی تھی۔

سردار بیکینگین حیدر لغاری کی کے بہت قریب کھڑا تھا۔ گی اس وقت اس کی آہنی گرفت میں مضبوط ہاتھ کی کی نازک کمرے کے گرد دھرے ہوئے تھے اور وہ حد درجہ رعبت سے اس گھڑی اس پر کلا کھکا ہوا تھا۔ میرب سیال نے آنکھیں بہت سختی سے میچ ڈالی تھیں۔ یقیناً وہ اس ایک بہت تیزی سے

دل دلی تھی۔ سردار بیکینگین حیدر لغاری کی گرفت کی پر ڈھیلی ہوتی چلی گئی تھی۔ یقیناً ایسے کسی لمحے کا اندیشہ اسے بھی میں تھا۔ گی نظریں جھکا کر چلتی ہوئی قدرے فاصلے پر چارکی تھی۔ سردار بیکینگین حیدر لغاری اس لمحے تھا اس کے سامنے کھڑا اسے کسی قدر ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً اسے یہ مداخلت بہت ناگوار گزری تھی۔

میرب سیال کسی قدر شرمندہ تھی۔ تبھی سر جھکانے کھڑی تھی۔ سختی سے پیچی ہوئی آنکھوں کو بہت ہولے سے دیکھا تھا مگر سر اٹھا کر سامنے کھڑے شخص کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی نگاہیں یقیناً اس گھڑی خشکی میں رہنا بھی چاہئے تھیں۔ اس کا اقدام ایسا ہی تھا۔ یہ کارروائی اپنی کیلئے اور میزز کے سخت خلاف تھی۔

یقیناً ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ شاید اسی لئے اس کے لب بہت ہولے سے ہلے تھے۔

”آئی ایم سوری!۔۔۔“ یقیناً وہ حد درجہ شرمندہ تھی۔ سردار بیکینگین حیدر لغاری اس کی سمت بنور دیکھ اٹھا جب وہ اسی طرح سر جھکانے ہولے سے جانے کے لئے پلٹی تھی۔

”شہر۔۔۔“ سردار بیکینگین حیدر لغاری نے پشت سے پکارا تھا۔ اس کے قدم یکدم ہٹ گئے تھے مگر ب کی بار اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

”کوئی کام تھا؟“

”اول، ہوں۔“ میرب سیال نے لب بھینچ کر سرنئی میں ہلایا تھا۔ پلٹ کے دیکھنے کی ہمت اب بھی نہیں ہوتی تھی۔ گی کچھ فاصلے پر کھڑی اس دھان پان سی لڑکی کو بنور دیکھ رہی تھی۔ اس نے قطعاً نہیں مانا چاہا تھا کہ ان دونوں میں کیا رشتہ تھا۔ اسے یہ جاننے کی اتنی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس کے لئے سب بے معنی تھا۔ اگر کچھ اہم تھا تو فقط وہ شخص۔ شاید اسی لئے اس نے سردار بیکینگین حیدر لغاری سے اس کی متعلق کچھ دریافت نہیں کیا تھا۔ مگر وہ لڑکی اس لمحے جب وہ سردار بیکینگین حیدر لغاری کے بہت بے کھڑی تھی، کیسی عجیب کیفیت تھی اس لڑکی کی آنکھوں میں۔ کتنا بہت سادھواں بھرا ہوا تھا۔ اور اب مادہ کس طرح رخ پھیرے کھڑی تھی۔

سردار بیکینگین حیدر لغاری کس طرح کسی قدر خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس شخص کے چہرے کے زات نہ سمجھ میں آنے والے تھے۔ کتنی بے تاثری تھیں وہ نظریں۔ اور وہ لڑکی کتنی شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

”پھر۔۔۔؟“ وہ یقیناً اس لڑکی سے جواب چاہ رہا تھا اور وہ ایک بار پھر اسی طرح گردن موڑے سر میں ہلا رہی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ مدہم لہجہ کسی قدر شرمندہ سا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

کوئی نیا لمحہ تو نہ تھا۔۔۔ کوئی نئی بات بھی نہ تھی۔ یہ پہلا منظر تو نہ تھا۔ اسے تو یقیناً اب ان سب کے کا عادی ہو جانا چاہئے تھا۔ پھر اس کے اندر بہت سادھواں کیوں بھرنے لگا تھا؟۔۔۔ کیوں اس کا گھٹنے لگا تھا؟۔۔۔ کیوں اس کی آنکھوں میں بہت سی جلن گھر کرنے لگی تھی؟

جب کوئی وابستگی سرے سے تھی ہی نہیں۔

جب سرے سے کوئی استحقاق تھا ہی نہیں تو اسے کیوں ہر بار ایسے منظر بہت پر وحشت بگلتے تھے؟
جب ایسا سب سردار سبکدوش کی طبیعت کا خاصا تھا تو وہ مان کیوں نہیں لیتی تھی؟
کیوں ہر بار اس کی نگاہ حیرانیوں سے بھر جاتی تھی؟
کیوں کبھی وہ بے تاثر نہیں بن پاتی تھیں؟
اس نے تو اس تعلق کو دل سے مانا بھی نہیں تھا۔
کسی استحقاق کو برتا بھی نہیں تھا۔

پھر کیوں ان منظروں کی جلن اس کے من کو سلگانے لگتی تھی؟ کیوں وہ یہ سب دیکھ کر کیا غیر کی مانند اجنبی نہیں بن پاتی تھی؟
اپنے کمرے میں آکر اس نے بیگ شولڈر پر ڈالا تھا اور باہر نکل آئی تھی۔ آنکھوں میں بہت سارا بھر رہا تھا۔ دل کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ سانس سینے میں گھٹ سی رہی تھی۔ مگر وہ تیزی سے چاہوٹل سے نکل آئی تھی۔

کیب میں بیٹھ کر ہسپتال کی جانب بڑھتے ہوئے بھی ذہن اسی طرح جل رہا تھا۔
عجب تو کچھ بھی نہ ہوا تھا مگر جانے کیوں وہ اس صورت حال کو بہت ہار ڈالے رہی تھی۔ یا پھر وہ
وجہ سے ہی پریشان تھی۔ دل بہت ہولے جا رہا تھا۔

جانے کیا ہونے جا رہا تھا۔
جانے کیا ہونے والا تھا۔
بے چینی حد درجہ سوا تھی۔
سانس سینے میں گھٹ رہی تھی۔ اس کے لئے جیسے وہ تمام لمحے کا شامال ہو رہا تھا۔
کیب نے اسے ہسپتال کے سامنے اتارا تھا اور وہ تقریباً بھاگتی ہوئی ہسپتال میں داخل ہوئی تھی۔
ڈاکٹر تیزی سے اس کی سمت بڑھتا دکھائی دیا تھا۔
اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ یقیناً صورت حال بس میں نہ تھی۔
اس کا دل یونہی نہیں گھبرا رہا تھا۔

شاید.....

”آپ میرے ساتھ آئیے۔“ ڈاکٹر بہت عجلت سے بولا تھا اور اس کی نظر ساکت رہ گئی تھی۔
دل جیسے تھمنے لگا تھا۔

پوری روح میں قیامت سی برپا ہو گئی تھی۔ نہ جانے صورت حال کیا تھی؟ نہ جانے کیفیت
تھی؟ فوری طور پر وہ کچھ نہ جان پائی تھی۔ سچی وہ خالی خالی نظروں سے سکتی چلی گئی تھی۔
بحال رکھنا تھا۔ استحکام قائم رکھنا تھا۔ وہ مشکل میں تھی۔
ہیں مکمل طور پر ماؤف تھا۔

وہ تنہا تھی۔ بہت اکیلی۔

کوئی شانہ مہربان بھی نہ تھا۔

مگر اسے اپنے ضبط کو آزمانا تھا۔

خود کو قائم رکھنا تھا۔

حوصلوں کو کھوٹنا نہیں تھا۔

اس نے خود کو اپنے اندر مجتمع کرتے ہوئے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تھا۔

”سب کچھ ٹھیک ہے؟“ شتہ انگریزی میں پوچھتے ہوئے وہ حد درجہ پُر اعتماد نظر آنے کی کوشش کر رہی
تھی۔ ڈاکٹر نے بہت عجلت میں سرنگی میں ہلایا تھا۔ پھر اسی قدر روانی سے گویا ہوا تھا۔

”ایئر چنسی ہے۔ مسٹر سیال کی کیفیت اچانک بگڑ جانے کے باعث ہمیں فوری طور پر ان کو
رجری روم میں لے جانا ہوگا۔ مگر فکر مت کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ڈاکٹر کا انداز پُر عجلت تھا۔

اس کا انداز بدل بھر میں بیٹھتا چلا گیا تھا۔ سارے حوصلے بل بھر میں دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔

”ڈاکٹر! پلیز، میں اپنے والد سے ملنا چاہوں گی۔“ اپنی بھگتی پکوں کی نمی کو اس نے یک دم ہاتھ کی
پشت سے رگڑ کر صاف کیا تھا۔

”نی الحال ایسا ممکن نہیں۔ مگر حوصلہ مت ہاریں۔ ریسپیشن پر کچھ ضروری پیپرز رکھو دیئے ہیں۔ پلیز،
آپ وہ سائن کر دیں۔ ہری آپ۔“ ڈاکٹر تیزی سے سرجری روم کی طرف دوڑے تھے۔ اسی سرعت
سے سامنے کا دروازہ کھلا تھا۔ زسز اور ڈاکٹر زاپا کو اسٹریچر پر ڈالے تیزی سے باہر نکلے تھے۔

میرب سیال ان کی طرف دوڑی تھی۔ بڑی عجلت میں پاپا کا ہاتھ تھاما تھا۔ بھگتی آنکھوں سے ان کا چہرہ
دیکھا تھا۔ وہ ہوش میں نہ تھے۔

”پاپا! پاپا!“ اس نے نم ہوتی آنکھوں سے پکارا تھا۔ مگر جواب کوئی نہ آیا تھا۔ ڈاکٹر اسی تیزی
سے آئین لے کر سرجری روم کی جانب بڑھ گئے تھے۔ اس کے قدم بہت پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ ہاتھ خالی
و گیا تھا۔

فقط اک لمس تھا۔

اس مہربان ہاتھ کا لمس جس کی پیش اس نے لمحہ بھر قبل محسوس کی تھی۔

کیسا کڑا وقت تھا۔

کیسی جاں پر بنی ہوئی تھی۔

کتنا بڑا طوفان تھا۔

اور وہ تنہا تھی۔

یقیناً اسے حوصلہ نہیں ہارنا تھا۔

ہاتھ میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ مگر اسے خود کو کنزور ظاہر نہیں کرنا تھا۔

خود کو ٹوٹنے نہیں دینا تھا۔

چند لمحوں تک وہ اسی طرح کھڑی بیگلی آنکھوں سے سرجری روم کی سمت جاتی ویران راہوں کی تھی۔ پھر ہاتھ آنکھوں تک لے جا کر پلکوں کو رگڑتے ہوئے صاف کیا تھا اور مڑ کر ریسیپشن کے بڑھنے لگی تھی۔

ضروری پیپرز سائن کرنے کے بعد اس نے مکمل حوصلے کے ساتھ زوباریہ سے رابطہ کیا تھا۔
کرنے کے بعد وہ پلٹی تھی۔
لیوں پر بہت سی دعائیں تھیں۔
بہت سی التجائیں تھیں۔

وہ اپنے پورے دل، اپنی پوری جان اور پوری عقل و خرد کے ساتھ اس لمحہ خدا کے سامنے رہی تھی۔ اس کا دل سجدہ ریز تھا اور اسے یقین تھا یہ دعائیں، یہ مناجاتیں رازیں گان نہیں رہیں گی۔ خدا یقیناً اپنے بندوں کی مشکل گھڑی میں ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ جتنی زیادہ صداقت مخاطب کیا جاتا ہے، جتنے دل سے پکارا جاتا ہے، اتنی ہی رغبت سے وہ اپنے بندوں پر اپنی رحمتوں کر دیتا ہے۔ وہ خود کو اس لمحے خدا کے بہت قریب محسوس کر رہی تھی۔
یقیناً خدا اس کی دعائیں سن رہا تھا۔

اس کی آنکھوں سے بہتے پانیوں میں اور بھی روانی آگئی تھی۔
کسی طرح کی کوئی پریشانی نہ تھی اس گھڑی۔
کوئی خدشہ نہیں تھا۔

کیونکہ وہ خدا کے قریب تھی۔ اس سے اپنے پورے دل سے مخاطب تھی۔
وہ تنہا نہیں تھی۔

دل اب پہلے کی طرح ڈر نہیں رہا تھا۔

حوصلے پوری طرح مجتمع تھے۔ وہ پُر اعتماد نظر آ رہی تھی۔



بڑی فطری سی بات ہے۔ شاید کسی بھی شے میں تعطل واقع ہونے سے ساری کیفیت میں اثر پذیر واقع ہو جاتی ہے۔ تسلسل پہلے جیسا نہیں رہتا۔ پہلے جیسی کیفیت باقی نہیں بچتی۔
ترتیل ویسی باقی نہیں رہتی۔

معنی بدل جاتے ہیں، شے سے سانچوں میں ڈھل جاتی ہے، تغیر اپنا آپ منوا کر ثابت کر دیتا ہے کہ بہت کچھ واقع ہو چکا ہے اور اب کچھ پہلے جیسا باقی نہیں رہا۔ گرہ دھاگے میں پڑے یا تعلقات میں، ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ بال آئینے میں آئے یا دل میں، کیفیت ایک سی ہوتی ہے۔ فقط اپنی جانب سے تسلی کر لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ خوش گمانی فقط خود کو باور کرانے کا ایک ڈھونگ ہے۔ فرض کر لینا ایسے ہی ہے جیسے آپ خود کو اپنے ہاتھوں خود بے وقوف بنانے چلے ہوں۔

بڑے بودے رہتے ہیں ایسے سارے اقدامات۔

بڑے ہی کمزور رہتے ہیں ایسے سارے ڈھنگ۔

بڑی متضاد کیفیات جو اب آپ کا منہ چڑا رہی ہوتی ہیں۔ اس سے بل میں ثابت ہو جاتا ہے کہ خود کو بے وقوف بنانے کی آپ کی ساری کوششیں سب رازیں گان رہیں۔

کہوتر کی طرح آنکھیں میچ لینے سے حقیقت چھپ نہیں جاتی۔

خوش فہمی، خوش گمانی بہت بودا بہلاو دا ہے جو یقیناً حقیقت کی بھر پور نفی کرتا ہے۔

ناشتے کی ٹیبل پر جس طرح کا سکوت تھا اسے دیکھ کر فارحہ کو بخوبی اس بات کا احساس ہوا تھا۔ اذہان حسن بخاری ناشتے کے بغیر ہی نکل گیا تھا۔ جب سے ایسی صورت حال ہوئی تھی وہ باپ کے معاملے میں ایسا ہی ہو گیا تھا۔ شاید اسے سعد حسن بخاری کا اس طرح مہمانوں کی طرح آنا، قیام کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس لئے جس دن وہ ناشتے کی ٹیبل پر ہوتے تھے وہ اس دن شاید دانستہ عجلت میں ناشتے کے بغیر نکل جاتا تھا۔

فارحہ ماں تھیں۔ انہیں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بیٹے کی کیفیت اس خاموشی میں بھی سمجھ سکتی تھیں۔

”دیکھی جا رہی ہے تمہاری پڑھائی؟“ سید سعد حسن شاہ بخاری نے ڈان کے صفحات کو اپنے چہرے کے سامنے پھیلاتے ہوئے اور چائے کا پلے لیتے ہوئے ماہا سے دریافت کیا تھا۔

”کیا ٹھیک نہیں ہے؟۔۔۔ وہ جو میں نے کیا یا وہ جو تمہارے بیٹے نے کیا یا پھر وہ جو تم کر رہی ہو؟“
سعد حسن بخاری کا لہجہ کسی قدر زہر خند تھا۔ فارحہ کے لئے یہ سب حیرت کا باعث نہیں ہونا چاہئے تھا مگر جانے کیوں وہ اس گھڑی ساکت سی ان کی سمت تکتے لگی تھیں۔

”کیا۔۔۔ کیا، کیا ہے میں نے؟“ لہجہ بے حد کزور تھا۔ بے یقینی حد سے سوا تھی جیسے انہیں امید نہ تھی کہ سارا کا سارا الزام ان کے سر دھرایا جائے گا۔ جیسے جواب وہی کا یہ لہجہ بہت تکلیف دہ ہو۔

”تم نے اپنے بیٹے کو اپنا وکیل بنایا ہے فارحہ! تم نے اپنے اندر کی ساری کڑواہٹ اس کے اندر منتقل کر دی ہے۔ اپنا سارا زہر تم نے اس کے اندر اٹھیل دیا ہے۔ تم نے میری بے وفائی کا بدلہ میرے بیٹے کو اپنے حق میں کر کے لیا ہے فارحہ! اب کس لئے پُر افسوس ہو؟۔۔۔ کس لئے پریشان ہو؟ اپنا وکیل بنایا تھا تم نے اسے؟۔۔۔ میرے مد مقابل خود آپ کھڑا کیا۔ باہر کون لایا تھا؟ تم نا۔ تم نے اس سارے

قصے کو عام کیا تھا نا۔ پھر اب کیوں روتی ہو؟ یہی چاہتی تھیں نا تم کہ تمہارا بیٹا تمہاری حمایت کرے۔ تمہاری وکالت کرے۔ تمہارا ساتھ دے۔ یہی سب تو ہو رہا ہے۔ پھر دکھ کس بات کا ہے اب؟“

کتنے الزامات تھے جو ایک پل میں ان کے سر ہوتے چلے گئے تھے۔ وہ ساکت سی تھیں۔ آنکھوں میں یکدم تھی کتنی بہت سی نمی آن ٹھہری تھی۔ ایک پل میں وہ کتنی کزور پڑتی چلی گئی تھیں۔ ساری ہمتیں پل میں ڈیر ہوئی تھیں۔

”میں نے؟۔۔۔ یہ سب میرے کیا؟۔۔۔ سعد! تم کتنے آرام سے سارے الزامات میرے سر رکھتے ہوئے بری الذمہ ہو رہے ہو۔ میں نے کیا یہ سب؟۔۔۔ اس گھر کا سکون، اس گھر کا خیال۔“
کتنے پُر افسوس انداز میں انہوں نے سر پر ہاتھ دھرا تھا۔ سارے لفظ جیسے کہیں کھو گئے تھے۔ کتنا تاریک لہجہ تھا۔ کچھ بھائی ہی نہ دے رہا تھا۔ وہ کتنی بے یقین تھیں۔

”اس گھر کو بنانے میں، میں نے اپنی پوری عمر لگا دی سعد! خود کو مٹا دیا۔ اپنی بچپان، اپنی شناخت، اپنی شخصیت، سب کچھ رول دیا۔ اس گھر کو آباد کرنے میں، اسے بنانے، سنوارنے میں خود کو تیاگ دیا میں نے۔ اور تم کہتے ہو میں نے۔۔۔ میں نے کیا یہ سب۔ سعد! دنیا میں ایسی کون سی عورت ہوگی جو اپنے گھر کا سکون اپنے ہاتھوں پر باد کرنا چاہتی ہو؟۔۔۔ اس گھر کو ڈھانا چاہتی ہو جسے بنانے میں اس نے اپنی پوری عمر لگا دی؟“ ان کا مدہم لہجہ کس قدر پُر افسوس تھا۔ کتنا گرم گرم پانی چپ چاپ آنکھوں کے کناروں کو توڑتا ہوا چہرے پر پھیلنے لگا تھا۔ وہ بھگی بھگی آنکھوں سے کتنے بے یقین انداز میں سعد حسن شاہ بخاری کو دیکھ رہی تھیں۔ بے معنی رہا تھا سب کچھ۔ فضول گیا تھا سب۔ ایک عمر کی رفاقت، ایک عمر کا احساس، ایک عمر کی ریاضت، رازیں گاہ رہا تھا سب۔ ساری قربانیاں بے سانس ٹھہری تھیں۔ وہ ایک پل میں خالی ہاتھ تھیں۔ کتنا ویران لگا تھا اس لمحے میں سارا منظر۔ کتنی خاموشی تھی چار سمت اور ان کا اندر کتنا ساکت تھا۔ جیسے کوئی بہت بڑا سانحہ گزر گیا ہو۔ ان پر الزام دھرنے والا شخص اس گھڑی مکمل طور پر خاموش تھا۔

”سعد! تم۔۔۔۔۔“ فارحہ نے کچھ بولنا چاہا تھا جب سعد حسن بخاری اس کی بات کانتے ہوئے گویا ہوا

اس نے پہلے کسی قدر چونکتے ہوئے ماں کی سمت نگاہ کی تھی۔ یقیناً اس کے لئے یہ سوال بہت تھا۔ فارحہ کچھ نہیں بولی تھیں۔ سچی ماہانے بہت ہونے سے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”جی پاپا! بہت اچھی۔“ یقیناً یہ گریز رشتوں میں پہلے نہ تھا۔
”کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“ انداز کسی قدر سرسری تھا۔ نگاہ اسی طرح اخبار پر تھی۔

فارحہ نے چائے کے سب لیتے ہوئے فقط خاموشی سے دیکھا تھا۔
ماہا ایک بار پھر سر نیلی میں ہلا رہی تھی۔

”نہیں پاپا! سب ٹھیک ہے۔“ ماہا کا لہجہ اور انداز دونوں کسی قدر گریز لئے ہوئے تھے۔ زہر معنی شاید پہلے جیسے نہ رہے تھے۔ تعلقات میں دراز آنے سے تسلسل قائم نہ رہ سکا تھا۔

”تمہیں اگر ایڈیشن لینا تھا تو مجھے کہتیں۔ فارن کی کسی یونیورسٹی میں تمہارا داخلہ کرا دیتا۔“
”نہیں پاپا! سب ٹھیک ہے۔“ ماہا نے کہتے ہوئے اک نگاہ ماں کی سمت کی تھی جیسے ان کی مدد

ہو۔ جیسے اس اجنبی ماحول میں فقط وہی ایک ہستی اس کی اپنی ہو۔ مگر فارحہ کچھ نہیں بولی تھیں۔
اس گھڑی خود ہی جواب دہ ہونا تھا۔ سچی وہ بہت آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔

”کھینکس پاپا! لیکن مجھے خود بھی اس معاملے میں علم نہ تھا۔ اذہان بھائی نے بذات خود ایڈیشن مجھے بھی سر پر آرزو دیا ہے۔ لیکن اب میں کافی سہولت محسوس کر رہی ہوں۔ یہاں مجھے کوئی مسئلہ نہیں سعد حسن بخاری نے چائے کے سب لیتے ہوئے ایک نگاہ ماہا پر کی تھی۔ پھر دوسرے ہی پل میں ہلا دیا تھا۔

”میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں رقم منتقل کروا دی ہے۔ پھر بھی کسی شے کی ضرورت ہو تو دینا۔“

”جی پاپا!“ ماہا نے سر ایک بار پھر اثبات میں ہلایا تھا۔ اک نگاہ ماں کی سمت کی تھی پھر فوہ کھڑی ہوئی تھی۔

”میں چلتی ہوں ماما!“ کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھی تھی اور فوراً اس منظر سے ہٹ گئی تھی۔
فارحہ سر جھکائے چائے کے سب لیتی رہی تھیں۔ یقیناً وہ ان رویوں کے تغیر پر غور کر رہی تھیں

سعد حسن بخاری اخبار کی جانب بخور تکتے ہوئے گویا ہوئے تھے۔
”بنا بہت سمجھ دار ہو گیا ہے تمہارا۔۔۔ بہت بڑے بڑے فیصلے کرنے لگا ہے۔“ انداز مٹا

کاٹ تھی۔ فارحہ کا سارا حلق جیسے کڑوا ہو گیا ہو۔ انہوں نے نگاہ اٹھا کر سعد حسن بخاری کی سمت دیکھا
”سرا رہے ہو؟“ بہت دھیمے لہجے میں دریافت کیا تھا۔ ”اگر سرا رہے ہو تو اتنا باور کرانا چاہی

یقیناً یہ تمہارے لئے بھی اسی قدر فخر کا مقام ہے۔ وہ تمہارا بھی بیٹا ہے۔“ انہوں نے رسائیت میں باور کرایا تھا۔ سعد حسن بخاری فقط دیکھ کر رہ گئے تھے۔ فارحہ چند ثانیوں تک خاموشی سے

کتی رہی تھیں پھر بہت مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔
”سعد! یہ ٹھیک نہیں ہے۔“ لہجہ تھکن سے کسی قدر چور تھا۔

اول

وقت گزر رہا تھا، اس کا دل اس کی بھرپور ٹی کرنا چلا جا رہا تھا۔ وہ آنکھیں اپنا تاثر بھر پور طریقے سے قائم کرتی جا رہی تھیں۔ وہ خیال متروک نہ ہو پا رہا تھا۔ یقیناً صورت حال سنگین ہونے چلی تھی اور عفتنان علی خان یقیناً اس ساری کیفیت پر حیران تھا۔ یہ بات چند روزہ نہ رہی تھی۔ کیفیت اب تک برقرار رہی تھی۔ یعنی معاملہ کچھ اور تھا۔

اس کی آنکھیں بتاؤں کیسی ہیں؟
جھیل سیف املوک جیسی ہیں

کتنے ہولے سے ابھریں وہ آنکھیں۔ اندر کہیں اک پل میں اجالا ہوا تھا اور سارا وجود روشنی سے بھر گیا تھا۔

کتنا دور تھا وہ ان باتوں سے۔ کتنا انجان تھا، قطعاً نا آشنا تھا۔ اس کا تو دور کا بھی واسطہ نہ تھا، کجا اس طور مبتلا ہونا۔ دیوانگی کی حد تھی اور وہ اس معاملے میں قطعی طور پر بے بس تھا۔ شاید محبت بہت قوی تھی۔

بے بس کر دینے والی کوئی ماورائی قوت۔ تبھی وہ بے اختیاری کے بہاؤ میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ ورنہ اس نے اس طور تو کبھی نہیں سوچا تھا۔

کوئی اختیار نہیں رہا تھا اس کا خود پر۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس ایک خیال کو سوچنے سے باز نہیں رہ پاتا تھا۔ یقیناً جو ہو رہا تھا وہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ مگر وہ اس معاملے میں مکمل طور پر بے بس تھا۔ کوئی حق نہیں تھا اسے، کوئی سبب نہیں بنتا تھا۔ اور ایسے میں جب کہ وہ خود ایک نئے تعلق میں بندھ چکا تھا اور مزید نئے تعلق میں بندھنے والا تھا۔

یقیناً یہ سب غلط تھا۔ مگر محبت نہیں مان رہی تھی۔ دل نہیں مان رہا تھا۔ وہ چھپنا چاہتا تھا، بھاگنا چاہتا تھا مگر سب بے سود تھا۔ اس کی سوچ کا ہر راستہ دل سے نکلتا تھا اور اس خیال سے جا ملتا تھا۔ وہ جادوؤں سے بھری آنکھیں اسے خود سے بھاگنے نہیں دیتی تھیں اور وہ اسی ایک نقطے پر ساکت و جامد ہو جاتا تھا۔ محبت واقعی ایک قوی شے تھی۔

اس لمحے جب وہ آفس سے نکل رہا تھا تب بھی اس کا خیال اس کے ساتھ تھا۔ جھپٹے کئی دن تک اس نے خود پر دانستہ جبر کیا تھا۔ دانستہ جبر سہا تھا۔ مگر یہ بہت کڑی سزا تھی جیسے حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ ان آنکھوں سے بچ کر نہیں رہ سکتا تھا۔

اس گھڑی موسم بہت خوشگوار ہو رہا تھا۔ آسمان بادلوں سے مکمل طور پر ڈھکا ہوا تھا اور ہلکی ہلکی بوندنا باننی ہو رہی تھی۔ اس نے سراٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ بہت غی بوندیں اس کے چہرے پر آن پڑی تھیں۔

موسم کی پہلی بارش تھی۔

اس لمحے کی نشان دہی کو محسوس کرتے ہوئے اس کے تصور میں اس کا چہرہ تھا۔ وہی جادوئی آنکھیں اس کے لئے تھیں۔ بہت جیسی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری تھی۔ محترم عفتنان علی خان مکمل طور پر محفوظ

اول

کوئی انوکھا کام نہیں کیا تم نے فارحہ! نہ ہی میں نے کچھ عجب کیا ہے۔ نیکی نہیں ہوتی۔ پورا کے تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔ خلاف قانون نہیں سے کچھ بھی۔ جینے کا حق مجھے بھی حاصل ہے پر فیصلے کرنے کا حق رکھتا ہوں میں۔ یہ بات تمہیں کتنی بار یاد کرانی پڑے گی۔ کچھ بھی بدلا ہے۔ کچھ بھی نہیں بدل سکتا۔ جو ہونا تھا ہو چکا، قبول کرو اس حقیقت کو۔ کیوں جاہل عورتوں کی پیٹ رہی ہو۔ کیا فرق آیا ہے تمہاری حیثیت میں؟ کیا بدلا ہے؟ کس بات کا ردنا رو۔ کیوں حالات کو معمول پر آنے نہیں دیتی ہو؟ میرے لئے کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ یہ گھبرا ہے۔ تم میری ہو، بچے میرے ہیں۔ کہاں ذمہ داری سے منحرف ہوا ہوں میں؟ ہاں منحرف ہونے کی کوشش ضرور کر رہی ہو۔ میری حیثیت کو چیلنج ضرور کر رہی ہو۔

”کیا۔۔۔؟“ فارحہ کس قدر بے یقینی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ کیا چاہا تھا انہوں نے اس تھا۔ وہ تو حالات کو معمول پر لانے چلی تھیں۔ سب کچھ بدلنا چاہ رہی تھیں۔ سب طرف سے آگ کے کسی خوش گمانی میں مبتلا ہونا چاہ رہی تھیں۔ انہوں نے تو امن کا پرچم لہرانا چاہا تھا۔ سمیٹنا چاہتے سب کچھ۔ سارے قصے بھول کر اپنے گھر کو پھر اسی ڈور سے باندھنا چاہتی تھیں۔ اور کیا ہوا تھا میں ساری کوششیں ڈھیر تھیں۔ کیسے بے سود رہا تھا سب کچھ۔ ہاں یہ ہوا تھا کہ کچھ نئے الزامات لگے تھے۔

کتنے بہت سے آنسو چپ چاپ ان کی آنکھوں سے بہتے چلے گئے تھے۔

سعد حسن بخاری چیز بنا کر ایک جھکے سے اٹھے تھے اور بنا ان کی سمت دیکھے کمرے سے نکلتے تھے۔ اس ماحول میں تہا خود کو محسوس کرتے ہوئے بھیگتے چہرے کے ساتھ فارحہ کو تسلیم کرنا پڑا بہت کچھ بدل گیا ہے۔

سب ہی سوچیں تھیں۔ بہت سے خیالات تھے۔ کئی رنگ بکھرے پڑے تھے چار سمت۔ لیکن کا محور فقط وہ تھی۔

خیال کا ہر پہلو فقط اس سے نکلتا تھا اور اسی پر ختم ہو جاتا تھا۔

دل اس ایک خیال کا طواف کرتے کرتے پہروں گزار دیتا تھا اور تھکتا نہ تھا اور وہ اس جیسے بالکل بے بار و مددگار تھا۔ بے اختیاری حد سے سوائی۔

اس نے پہلے پہل خیال کیا تھا، فقط چند روزہ کیفیت ہوگی۔

فقط ایک پل کی رغبت۔

اور جیسے جیسے دن گزریں گے، وقت بیتے گا، سب کچھ معمول پر آجائے گا۔

یہ حقیقت تھی کہ وہ دیوانہ نہ تھا۔ کوئی ارادہ بھی نہ تھا اس کا بچوں بننے گا۔ گریباں چاک کر میں صحرا نور دی کرنے کا اسے کوئی شوق نہ تھا۔ ایسا کوئی خلل اس کے دماغ میں واقع نہ ہوا تھا۔

ہوئے تھے اس وقت۔ مکمل طور پر مسرور تھے۔

”موصوف! عقل ٹھکانے نہیں ہے آپ کی؟“ گاڑی میں بیٹھے ہوئے وہ مسکراتے ہوئے خود سے مخاطب تھا۔

”مجھوں بنے جا رہے ہیں آپ۔ بالکل ٹھیک نہیں ہے یہ۔ انجام کی کچھ فکر کیجئے۔ ورنہ زندگی صحراؤں کی خاک چھانتے بسر ہو جائے گی۔“

مگر باور کرانے کی ساری کوششیں بے کار گئی تھیں۔ دل اپنی کیفیت برقرار رکھے اسی طور پر اسے ماسوائے افسوس کرنے کے اور کوئی چارہ نہ بچا تھا۔

اپنے ہی خیالوں میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے عرفان علی خان کی نگاہ ایک لمحے میں چوکی کی شاپ پر گھڑی یقیناً وہ وہی تھی۔ سفید لباس میں ملبوس اس بھیکے منظر میں وہ کوئی ماورائی مخلوق لگ رہا۔ اپنے ہی خیال میں لگن۔

اپنی ہی دھن میں۔

سارا ماحول اس گھڑی اس کے زیر تھا۔ اس کے رنگوں سے بھرا ہوا تھا۔

ہر سمت اس کا جادو بکھرا ہوا تھا اور وہ خود میں گم تھی۔ اپنے آپ میں لگن تھی۔

عرفان علی خان کی نگاہ اس منظر کی گرفت میں تھی۔ گاڑی کی اسپید بہت دھیمی ہو گئی تھی۔

عرفان علی خان نے گاڑی اس کے قریب روک دی تھی۔ وہ بری طرح چوکی تھی۔ بوکھلا

ہاتھوں میں پکڑے تمام وہاٹ ٹیوب روز اس کی گاڑی کے بونٹ پر بکھرتے چلے گئے تھے۔ پر آرہے تھے۔ انا بیہ شاہ نے اس اقدام پر یقیناً کڑے تیوروں سے مقابل کی سمت تلکا چاہا تھا مگر دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے عرفان علی خان کو دیکھ کر وہ جہاں حیران ہوئی تھی وہیں وہ غصہ لگا زائل ہو گیا تھا۔

”آپ یہاں؟“ آپ کو معلوم ہے آپ نے میرا کتنا نقصان کر دیا۔ اگر آپ کی جگہ کو

تو.....“

”تو آپ اسے یقیناً بہت سخت ست سنا تیں۔ خوب خبر لیتیں اس کی۔ ہے نا؟“ وہ مسکرایا

مدرم بوندوں کا تسلسل جاری تھا۔ دونوں اس گھڑی بھیکتے منظر کا حصہ تھے۔

عرفان علی خان کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ کتنی شفاف بوندیں اس کے چہرے

کتنی دکاشی در آئی تھی اس منظر میں۔ ماحول جادو سے کتنا بھر گیا تھا۔

انا بیہ شاہ کسی قدر غلطی سے اس کی سمت تکتی گویا تھی۔

”یقیناً۔۔۔ لیکن آپ سے یہ کس نے کہا کہ میں آپ کی خبر نہیں لوں گی؟“ عرفان علی خان

بغور تکتی وہ گویا تھی۔

”ضرور۔۔۔ میری خواہش ہوگی ایسا ضرور ہو۔“ انداز اور لہجہ کس قدر ذومعنی تھا۔

”کیا؟“ انا بیہ شاہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے یقیناً اس پل حیران تھی۔ عرفان علی خان مسکرایا تھا۔

”ہاں، ام سوری۔ لیکن میں آپ کا نقصان پورا کر سکتا ہوں۔ بائے دی وے، یہ تھے کس کے لئے؟“

کی سمت بغور تلکتا ہوا وہ دریافت کر رہا تھا۔

”آپ کے لئے یقیناً نہیں تھے۔“ اس کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ یقیناً طنزیہ ہی تھی۔ لیکن عرفان علی

نا اس کی سمت تلکتا بہت بھر پور انداز میں مسکرایا تھا۔

”لیکن اس لمحے کھڑے ہوئے تو تمام میری گاڑی پر ہی ہیں۔“ انداز بہت مسرور تھا۔

”یہ فقط آپ کی غلطی کے باعث ہوا۔“ انا بیہ شاہ نے الزام اس کے سر دھرا تھا۔ مگر وہ بہت سرشاری

پر مسکرایا تھا۔

”میں قبول کرتا ہوں۔“ سینے پر دہا ہنا ہاتھ دھرتے ہوئے اپنی غلطی قبول کی تھی اور اس کے ساتھ ہی چلنا

فلاور شاپ کی سمت بڑھ گیا تھا۔ انا بیہ شاہ کسی قدر حیرت سے اس شخص کی پشت کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ چند

دقائق میں وہ واپس پلٹا تھا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں پھول تھے۔

”یہ اتنے سارے؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔ عرفان علی خان بہت دھیمے سے مسکرایا تھا۔

”ہوں۔ ایک تو نقصان پورا کرنے کے لئے اور دوسرے آپ کا موڈ بحال کرنے کے لئے۔“

”کیا مطلب؟“ انا بیہ قطعاً نہ سمجھی تھی۔

عرفان علی خان نے مسکراتے ہوئے شانے اچکائے تھے۔

”سو پہل۔۔۔ ایک آپ کا نقصان پورا کرنے کے لئے ہے یعنی یہ وہاٹ ٹیوب روز۔“ اس نے

ہتے ہوئے بکے اس کے داہنے ہاتھ میں تھمایا تھا اور پھر بہت دھیرے سے مسکراتے ہوئے سرخ گلابوں

بکے پر نگاہ کی تھی۔ ”اور یہ آپ کے لئے۔“ مجھ سے آپ کا نقصان ہوا، اس کی تلانی کے لئے۔“ اس کا

ساتھ ہاتھ تمام کر اس نے وہ بکے اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ برسی شفاف بوندیں ان پھولوں پر اپنی کہانی

تھی چلی گئی تھیں۔ انا بیہ شاہ نے بوندوں سے اٹے چہرے سے قدرے حیرت سے اس کی سمت دیکھا

وہ مکمل مودب سا اس گھڑی اس کے سامنے تھا۔ بغور اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر کسی قدر

سنگ اور خجالت کے تاثرات تھے جیسے واقعی اسے اپنی غلطی پر افسوس ہوا اور واقعی وہ اس لمحے شرمندہ ہو۔

یہ شاہ نے سرخ گلابوں پر نگاہ کی تھی اور اس کے ساتھ ہی گویا ہوئی تھی۔

”لیکن آپ کی خطا اتنی بڑی نہیں عرفان علی خان!۔۔۔ میں یہ نہیں لے سکتی۔“ تھینکس۔“ سرسری اور

نا قدر سپاٹ لہجے میں کہتی ہوئی وہ اس گھڑی کی قدر پر تکلف لگی تھی۔

عرفان علی خان اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”پھول واپس نہیں کئے جاتے۔ آپ کو ضرورت نہ ہو تو ڈسٹ بن میں ڈال دیجئے گا مگر اس طرح

ل کر قطعاً مناسب نہیں۔“ لہجہ اور انداز بتا رہا تھا کہ اسے کسی قدر ناگوار گزرا ہے۔

انا بیہ شاہ نے اس کی سمت نگاہ کی تھی۔ پھر اس کے حوالے پر غور کرتی ہوئی شاید اسے کسی قدر رعایت

نا ہونے کے قبول کر گئی تھی۔

”اوکے۔۔۔ لیکن اب میرا ارادہ اس موسم میں بھیجنے کا قطعاً نہیں ہے۔ میں چلوں گی۔“

نے لگا تھا۔ انا بیہ شاہ نے یکدم نگاہ اس شخص پر کی تھی۔ پھر دوسرے ہی پل سر اٹھا کر آسمان کی سمت دیکھا
بوندوں کا تسلسل اور بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے بھگنے لگے تھے۔ شاید بہت سرعت سے
گئے ہوئے انہوں نے ایک قریبی درخت کے نیچے پناہ لی تھی۔

بارش میں بھگنے کا بھی اپنا ایک لطف ہے۔ ہے نا؟“ عفتان علی خان بہت ہولے سے پتوں سے بچتی
بوندوں کو ہاتھ کی اوک میں جمع کرتے ہوئے مسکرایا تھا۔ انا بیہ شاہ کا چہرہ بے تاثر تھا۔ جیسے وہ ان لہجوں
طوائف سے اکتانگی ہو یا پھر یک دم موسلا دھار رنگ اختیار کرنے والی بارش نے اسے بد مزہ کر دیا

”مجھے بارشوں میں بھیگنا اچھا نہیں لگتا۔۔۔ بہت بچکانہ اقدام ہے یہ۔“ اس نے جیسے اس لئے خود
کی کی تھی۔ عفتان علی خان اس کے بوندوں سے اٹے چہرے کو بغور نکتا چلا گیا تھا۔ کتنے قطرے تھے
انکے بیچ چہرے پر۔

بہت ہولے سے اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا اور بہت آہستگی سے ہاتھ اس کے چہرے کے قریب
جا کر ان گھنی پلکوں پر اٹے موتیوں کو اپنی پوروں پر چن لیا تھا۔ اقدام بہت اچانک تھا۔ انا بیہ شاہ لہجہ
میں جھجکتے ہوئے پیچھے ہٹی تھی مگر وہ اقدام سرزد ہو چکا تھا۔ وہ قدرے حیرت سے اس شخص کو نکتے لگی تھی
اس گھڑی بہت دھیمے انداز میں سرور سا مسکراتا ہوا کسی قدر رغبت سے اپنی پوروں پر چپکتے اس پانی
قطرے کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ کسی قدر ناگوار لہجے میں اس حرکت پر سرزنش کی گئی تھی۔ مگر وہ بہت دھیمے سے مسکرا دیا

”خوشی۔“ نگاہ پوروں پر نکتے اسی ننھے قطرے پر تھی۔ لبوں پر بدستور مسکراہٹ تھی۔

”خوشی؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”ہوں۔“ عفتان علی خان نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ پھر مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھا
پھر اسی قدر آہستگی سے گویا ہوا تھا۔

”آسمان سے اتری ہوئی خوشی۔ جو ان آنکھوں کے لئے بہت سے پیام اپنے سنگ لے کر آئی تھی۔
میں معلوم ہے یہ قطرہ کیا کہہ رہا ہے؟“ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

”کیا؟“ لہجہ اسی قدر پُر حیرت تھا۔ وہ یقیناً حیرت سے اس کی سمت متوجہ تھی۔

”اگر یہ چہرہ، یہ آنکھ مجھے نہیں پاتی تو میں واپس لوٹ جاتا اور اپنے ساتھ وہ سارے اچھے لمبے بھی
ہلے لے جاتا جو میں اس کے لئے لایا تھا۔“ عجب دیوانگی تھی لہجے میں۔ وہ ساکت سی بکتی چلی گئی تھی۔

”دیکھو، یہ اب بھی بول رہا ہے۔۔۔ کہہ رہا ہے تم نے اچھا کیا جو اس لڑکی کو میرے پاس لے
ئے۔ ورنہ میں اسے اس کے سارے سنے کبھی سو نہ پاتا۔ اس کے حصے کی ساری خوشیاں اور خواب
نما عمر کی میں بند پڑے رہ جاتے اور مجھے پھر اگلے موسموں کا انتظار کرنا پڑتا۔ اور یہ انتظار بہت کڑا ہوتا۔
بنا۔“ وہ دم لہجے میں بولا تھا۔ کچھ تو تھا کہ سارا ماحول اس کے زیر آ گیا تھا۔ انا بیہ شاہ کسی قدر حیرت

”آئیے، میں چھوڑ دیتا ہوں۔“ عفتان علی خان نے آفر دی تھی۔

”نہیں۔۔۔ قریب ہی ہے یہاں سے گھر۔ میں چلی جاؤں گی۔ شکر یہ۔“ وہ شاید اظہار
تھی۔ اس کے ساتھ ہی قدم اٹھائے تھے۔ عفتان علی خان نے اس کی پشت کو چند ٹاٹے یونی
گازی لاک کر کے بہت سرعت سے اس کا تعاقب کیا تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ لہجہ بھر میں
قدم تھا۔ انا بیہ شاہ اسے حیرت سے نکتے لگی تھی۔
”آپ؟“

”ہوں۔۔۔“ عفتان علی خان شانے اچکاتے ہوئے مسکرایا تھا۔ ”بارش میں واک کرنا
کرنا چاہتا ہوں۔“

انا بیہ شاہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ پھر دھیمے سے مسکرائی تھی۔

”پاگل ہو گئے ہیں آپ؟۔۔۔ کیا اس سے قبل آپ نے کبھی بارش کا لطف نہیں لیا؟“ انداز
پُر اکتا ہٹ تھا۔ وہ یقیناً زبج ہو چکی تھی۔ مگر مروتا اس کا لحاظ کرنا پڑ رہا تھا۔ عفتان علی خان نے
میں ہلایا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

وہ اس لمحے اس کے ہمراہ چلنے لگا تھا۔ بھینگتے منظروں میں ایک دلکشی در آئی تھی۔ کیونکہ وہ
اس کے ساتھ تھی۔ موسم سرور تھا۔ مہک رہا تھا۔ کتنا مسحور کن احساس تھا۔ ایک سرور سا پھیل رہا
وجود میں۔ کوئی جادو ہولے ہولے اپنے حصار میں لے رہا تھا۔

”موسموں میں واقعی دلکشی ہوتی ہے۔“ کتنے مدہم انداز میں وہ گویا ہوا تھا جیسے آج پہلی بار
بات کا ادراک ہوا تھا۔ جیسے یہ کوئی پہلا احساس تھا۔ انا بیہ شاہ نے اس کے ہمراہ چلتے ہوئے
تھی۔ بھینگتے موسم میں اس کے سنگ چلتے ہوئے وہ یقیناً بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

”آپ نے اس سے قبل کبھی ایسا تجربہ نہیں کیا؟۔۔۔ آئی میں لطف نہیں چکھا؟“ انا بیہ
سے دریافت کر رہی تھی۔

”اول ہوں۔“ عفتان علی خان نے سرنفی میں ہلایا تھا۔ پھر بہت مدہم مسکراہٹ اس کے لبوں
تھی۔ ”اس طور تو کبھی نہیں۔“ انداز، لہجہ بے حد مسرور تھا۔ ذمہ معنویت عروج پر تھی۔ مگر انا بیہ
کچھ رہی تھی۔ شاید بھی اس نے سر بہت ہولے سے نئی میں ہلایا تھا۔

”لیکن مجھے تو بارشوں میں بھیگنا قطعاً بھی مرغوب نہیں۔ اگرچہ اس کے باوجود میں کئی بار بار
بھیگی ہوں جیسے کہ اب بھی نہ چاہتے ہوئے بھیگ رہی ہوں۔“

”نہ چاہتے ہوئے۔۔۔ یعنی تمہیں یہ موسم پسند نہیں؟“ وہ حیران ہوا تھا۔ وہ دھیمے سے
پھر نظر راستوں پر مرکوز کر دی تھی۔

”کیا رکھا ہے ان موسموں میں؟۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔“ لہجہ اور انداز کسی قدر رکھو یا ہوا سا
علی خان نے اسے بغور دیکھا تھا۔ کہا کچھ نہیں تھا۔

ہونا باندی عروج پر پہنچی تھی۔ موسم میں یکدم شدت آئی تھی اور پانی بادلوں سے بھر پور

سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”کیا پاگل پن ہے یہ؟“ شاید اسے ڈپٹنا چاہا تھا۔ مگر لہجہ کسی قدر کمزور تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔
”یہ تو فقط ایک پہلا قطرہ تھا۔ تم چاہو تو ایسے بہت سے قطرے مزید بھی تمہارے حصے میں ہیں۔ شاید تم نہیں جانتیں، ہر قطرے کی اپنی ایک گٹھری ہے۔ اپنے الگ سپنے ہیں۔ الگ خوشیاں الگ رنگ ہیں۔“

انا بیہ شاہ نے ایک دم اس شخص پر سے اپنی نگاہ پھیری تھی۔ دور تک دُھند ہی دُھند تھی۔ سارا دکھ رہا تھا۔ کتنے قطرے اس گھنے پیڑ کی شاخوں سے پختے ہوئے ان پر پڑ رہے تھے۔ وہ اب بھی اس ساتھ ساتھ بھیک رہے تھے۔ وہ متواتر بول رہا تھا۔ وہی مدہم لہجہ تھا اور پورا ماحول اس کے زیرِ قہر تھا۔
”جانتی ہو موسمِ فقط تین ہوتے ہیں۔ مگر دل کے موسموں کا کوئی شمار نہیں۔ ہر ہر پل کی اپنی اپنی ہے، اپنا ایک رنگ ہے۔ اپنا ایک وجد ہے۔ کیا کیا قیامتیں کس طور گزر جاتی ہیں دل پر، کوئی نہیں ہر موسم ہم مل کر بانٹتے ہیں، بل کر ساتھ گزارتے ہیں۔ مگر ان موسموں کی کہانی بہت مختلف ہے۔ ہر داستان کہتا ہے۔“

نہ جانے کیا کہہ رہا تھا وہ۔ نہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا۔ انا بیہ شاہ بنا اس کی سمت دیکھے سرعت سے ہٹی تھی اور دوسرے ہی پل بھاگتے ہوئے جیسے اس ماحول سے دور نکلتی چلی گئی تھی۔
عفتنان علی خان وہیں کھڑا تھا دیر اس سمت تکتا رہا تھا۔ مگر وہ ایک بار بھی نہیں پلٹی تھی۔ جیسے پتھر ہو جانے کا احتمال تھا۔ جیسے وہ حد درجہ خوفزدہ ہو۔

دعا دل سے نکلی ہو تو رائیگاں نہیں جاتی۔ اس کی تمام دعائیں بھی مستجاب ہو گئی تھیں۔ منظرِ ہارٹ سرجری کامیاب رہی تھی اور میرب سیال کے لئے یہ بہت بڑی خوشی تھی۔ گو وہ لمحات بہت کڑے تھے جو دل پر بیٹے تھے۔ رات اس نے آنکھوں میں بسر کر دی تھی مگر اب ایک اطمینان ا پھیل رہا تھا۔ اس نے شیشے کے اس پار بستر پر لیٹے پایا کو دیکھا تھا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا۔
رات گزر گئی تھی۔ قیامت خیز لمحے گزر گئے تھے۔ دل سنبھل گیا تھا۔
مگر کوئی اب بھی نہیں آیا تھا۔

میرب سیال کو انتظار نہیں تھا۔ شاید وہ اس کی جانب سے امید رکھ بھی نہیں رہی تھی۔ مگر وہ جب اس کی بابت دریافت کیا تھا تو وہ فوری طور پر کچھ نہ کہہ پائی تھی یا پھر وہ واقعی کوئی وضاحت اسے گرا نا نہیں چاہتی تھی۔

رات بھر جاگنے کے باعث سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ رونے کے باعث پوٹے سوچ رہی تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وجود جھکن سے شل ہونے کو تھا۔

”تم جا کر آرام کر لو۔ میں ہوں یہاں۔“ زو بار یہ نے مشورہ دیا تھا۔ اس نے سر ہلا دیا تھا۔
”پاپا جب ہوش میں آجائیں تو مجھے فون کر دیجئے گا۔“

اول

”اوکے“ زو بار یہ نے سر ہلایا تھا۔

وہ جھکن سے شل وجود کے ساتھ ہسپتال سے باہر نکل آئی تھی۔

کوئی امید نہیں تھی۔

مگر وہ ذہن کو اس خیال کو سوچنے سے باز نہ رکھ سکی تھی۔

رات گزر گئی تھی اور وہ نہیں آیا تھا۔

”بے حسی کی حد تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ ایسا کیوں سوچ رہی تھی۔ ایسا کیوں چاہ رہی تھی۔ حالانکہ

اس نے تو اس تعلق کو سرے سے قبول ہی نہ کیا تھا۔ دل سے مانا ہی نہ تھا۔ بس زبردستی کا سودا تھا۔ اور کیوں

رکھا وہ خیال۔ کیوں کرتا کوئی احساس۔

اس پر کچھ فرض تو نہ تھا۔

وہ تو آزاد تھا اول روز سے۔ کوئی ذمہ داری اٹھانی ہی نہ تھی۔ نبھانے کی بات تو بہت بعد کی تھی۔ اس

نے ایسی کوئی کٹ منٹ کی ہی نہ تھی۔ پھر کس شے کا انوس کر رہی تھی وہ۔

اس کی زندگی کی لیکر الگ تھی۔ جینے کے راستے اور تھے۔ طور طریقے مختلف تھے۔

کتے ناپندیدہ منظر اس کی نظروں میں گھومتے چلے گئے تھے۔ اس نے جلتی ہوئی آنکھوں میں تیرتے

نملین پانیوں کو اپنے اندر ہی کہیں مدغم کرنا چاہا تھا۔ بہت دُکھتے ہوئے سر کو ہولے سے ہاتھوں سے دبایا

تھا۔

ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رکی تھی۔ اس میں ہمت ناپید تھی، چلنے کی سکت تک نہ تھی۔ سر گھوم رہا تھا۔

آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا سچا رہا تھا۔ مگر وہ بہت پُر اعتماد قدموں سے چلتی ہوئی ہوٹل میں داخل ہوئی

تھی۔ لفٹ سے نکل رہی تھی جب وہ اسے نظر آیا تھا۔ غالباً وہ اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ شاید کہیں جا رہا

تھا۔ اسے دیکھ کر رک گیا تھا اور میرب سیال کے لئے جیسے یہ ایک جبری فعل تھا۔ بہ مشکل وہ اس کے سامنے

رکی تھی۔

”کیا ہوا؟“ جانے وہ اس کی کیفیت کے مد نظر دریافت کر رہا تھا یا پھر صورت حال کے متعلق جاننا چاہ

رہا تھا۔ میرب سیال نے سردار سبکتگین حیدر لغاری کی سمت اک خاموش نگاہ کی تھی۔ بے تاثر اور لا تعلق

نگاہ۔ اور سر بہت ہولے سے نیسی میں ہلا دیا تھا۔

”تم کہاں گئی تھیں؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری باز پرس کر رہا تھا۔ کیا حق رکھتا تھا وہ؟ کیا جانے کا

خواہاں تھا وہ؟

کیا وہ واقعی متشکر تھا اس کی بابت؟

اس کی غیر موجودگی اس کے لئے پریشانی کا باعث رہی تھی؟

آنکھوں سے لگ تو نہ رہا تھا۔ چہرہ کس قدر فریش لگ رہا تھا۔ شب بیداری یا کسی پریشانی کی کوئی ہلکی

کی بھی لکیر نہ تھی۔

میرب سیال نے سردار سبکتگین حیدر لغاری کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ یہ تھا وہ شخص جس کے ہاتھ میں

بازوؤں میں تھام لیا تھا۔ وہ خشکیوں گھورتی ہوئی سرخ آنکھیں بند ہوتی چلی گئی تھیں۔
بے ہوش ہو چکی تھی۔

تنگین حیدر لغاری نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں سنبھالا تھا اور اٹھا کر روم کی سمت بڑھنے لگا

وہ کچھ دیر قبل اپنا غبار اس پر نکال رہی تھی اگر ذرا بھی ہوش و حواس میں ہوتی تو اس گھڑی حیدر لغاری کا بڑھایا ہوا ہاتھ جھٹک دیتی۔ وہ کوئی کمزور لڑکی نہیں تھی۔ مگر کجا یہ تھا کہ وہی مضبوط لڑکی بے ہوش و خرد سے بے گانہ اس لمحے اسی شخص کے بازوؤں پر سوار تھی جس کے سامنے کچھ دیر قبل اس پر مضبوط ظاہر کرنا چاہا تھا۔

تنگین حیدر لغاری نے اسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ غالباً یہ تھا۔ وہ اتنے قریب سے اور دانستہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل کی آگ اگلی آنکھیں اس اندھیل اور وہ مکمل طور پر ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔

تنگین حیدر لغاری نے اسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ غالباً یہ تھا۔ وہ اتنے قریب سے اور دانستہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل کی آگ اگلی آنکھیں اس اندھیل اور وہ مکمل طور پر ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔

تنگین حیدر لغاری نے اسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ غالباً یہ تھا۔ وہ اتنے قریب سے اور دانستہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل کی آگ اگلی آنکھیں اس اندھیل اور وہ مکمل طور پر ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔

تنگین حیدر لغاری نے اسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ غالباً یہ تھا۔ وہ اتنے قریب سے اور دانستہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل کی آگ اگلی آنکھیں اس اندھیل اور وہ مکمل طور پر ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔

تنگین حیدر لغاری نے اسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ غالباً یہ تھا۔ وہ اتنے قریب سے اور دانستہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل کی آگ اگلی آنکھیں اس اندھیل اور وہ مکمل طور پر ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔

تنگین حیدر لغاری نے اسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ غالباً یہ تھا۔ وہ اتنے قریب سے اور دانستہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل کی آگ اگلی آنکھیں اس اندھیل اور وہ مکمل طور پر ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔

تنگین حیدر لغاری نے اسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ غالباً یہ تھا۔ وہ اتنے قریب سے اور دانستہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل کی آگ اگلی آنکھیں اس اندھیل اور وہ مکمل طور پر ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔

تنگین حیدر لغاری نے اسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ غالباً یہ تھا۔ وہ اتنے قریب سے اور دانستہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل کی آگ اگلی آنکھیں اس اندھیل اور وہ مکمل طور پر ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔

تنگین حیدر لغاری نے اسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ غالباً یہ تھا۔ وہ اتنے قریب سے اور دانستہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل کی آگ اگلی آنکھیں اس اندھیل اور وہ مکمل طور پر ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔

تنگین حیدر لغاری نے اسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ غالباً یہ تھا۔ وہ اتنے قریب سے اور دانستہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل کی آگ اگلی آنکھیں اس اندھیل اور وہ مکمل طور پر ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔

اس کی زندگی کی ڈور تھی۔ جس کے ساتھ اسے اپنی باقی ماندہ زندگی گزارنا تھی۔ جس کے نام اسے کچھ کر دینا تھا۔

یہ تھا وہ شخص۔

بے مہر، کج ادا۔

وفا جس کی سرشت میں تھی ہی نہیں۔ اور وہ کیا کیا امیدیں لگانے چلی تھی۔ اپنی عقل پر حدود ہوا تھا۔ وہ بہت تلخی سے مسکرائی تھی۔

”بے فکر رہے سردار سبکتگین حیدر لغاری! میری کوئی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی۔ جس طرح آپ کی زندگی میں غیر اہم ہوں اسی طرح آپ بھی میرے لئے قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ نام آپ کے لئے یہ رشتہ؟ آزاد رہنا چاہتے ہیں نا آپ؟ تمام تر ذمہ داریوں سے بچنا چاہتے ہیں نا؟

ہر واسطے سے۔ تعلقات بوجھ لگتے ہیں نا آپ کو۔ ہر رشتہ بار لگتا ہے نا؟ زنجیروں میں قید ہونا نا آپ کو؟ اپنی آزادی بہت عزیز ہے آپ کو۔ مگر ماسٹر سبکتگین حیدر لغاری! میرب سیال کو لڑکی نہیں ہے۔ بہت غلط قیاس کیا آپ نے اس کے متعلق۔ بہت غلط سوچا۔“ وہ پُر اعتماد انداز کے سامنے تکی کھڑی تھی۔ سبکتگین حیدر لغاری اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ میرب سیال کی سرخ آنکھوں

درجہ ناگواری تھی اور وہ کسی درجہ ناپسندیدہ نظروں سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”بہت غلط قیاس کیا آپ نے سبکتگین حیدر لغاری! میرب سیال کوئی کمزور لڑکی نہیں ہے میرے لئے کوئی تعلق بوجھ نہیں ہے، کوئی رشتہ زنجیر نہیں ہے۔ میرے نزدیک رشتہ ایک کلمہ ہے جسے دل سے قبول کرنا چاہئے اور دل سے نبھانا چاہئے۔ ورنہ.....“ بہت ہولے سے اس میں ہلا دیا تھا۔

”کوئی فائدہ نہیں سبکتگین حیدر لغاری! حیرت ہے، دنیا گھوم چکے ہیں اور فقط اتنی سی بات جانتے۔“ کتنا پُر افسوس تھا میرب سیال کا انداز۔ اپنے اندر کا غبار نکالتے ہوئے اسے اندازہ تک وہ اس وقت راہداری میں کھڑی ہے۔ اور یقیناً ایسی باتوں کے لئے ایسا ماحول قطعاً سازگار نہیں ہوتی ہے ہر بات کی۔ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ اور شاید اس کی حد ٹوٹ چکی تھی۔ برداشت ختم تھی یا پھر واقعی وہ اس قدر ڈیپر لیس تھی کہ کچھ اندازہ نہ تھا کہ کس کے سامنے کھڑی ہے۔ کہاں کھڑی کیا بول رہی ہے۔

سبکتگین حیدر لغاری اس کے مقابل کھڑا بے تاثر چہرے سے سمیت اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ چہرے بات کا کچھ احساس ظاہر نہ تھا۔ کسی جذبے کا کوئی رد عمل درج نہ تھا۔ وہ مکمل طور پر سپاٹ نظر آ رہا تھا جواب نہیں رہا تھا۔ کچھ نہیں بولا تھا۔ بس چپ چاپ کھڑا اس کی سمت تکتا رہا تھا۔ وہ مضبوطی سے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جیسے اس کی سمت سے کچھ اور بولنے کا منتظر تھا۔ میرب سیال نے سرخ آنکھوں کے سامنے اسے دیکھا تھا پھر دوسرے ہی پل آگے بڑھنا چاہا تھا۔ مگر نہ جانے کیا ہوا تھا، آنکھوں کے سامنے میں اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ وہ لڑکھرائی تھی۔ مگر اس سے قبل کہ گرتی، سبکتگین حیدر لغاری نے اسے

سبکتگین حیدر لغاری اس کے مقابل کھڑا بے تاثر چہرے سے سمیت اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ چہرے بات کا کچھ احساس ظاہر نہ تھا۔ کسی جذبے کا کوئی رد عمل درج نہ تھا۔ وہ مکمل طور پر سپاٹ نظر آ رہا تھا جواب نہیں رہا تھا۔ کچھ نہیں بولا تھا۔ بس چپ چاپ کھڑا اس کی سمت تکتا رہا تھا۔ وہ مضبوطی سے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جیسے اس کی سمت سے کچھ اور بولنے کا منتظر تھا۔ میرب سیال نے سرخ آنکھوں کے سامنے اسے دیکھا تھا پھر دوسرے ہی پل آگے بڑھنا چاہا تھا۔ مگر نہ جانے کیا ہوا تھا، آنکھوں کے سامنے میں اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ وہ لڑکھرائی تھی۔ مگر اس سے قبل کہ گرتی، سبکتگین حیدر لغاری نے اسے

سبکتگین حیدر لغاری اس کے مقابل کھڑا بے تاثر چہرے سے سمیت اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ چہرے بات کا کچھ احساس ظاہر نہ تھا۔ کسی جذبے کا کوئی رد عمل درج نہ تھا۔ وہ مکمل طور پر سپاٹ نظر آ رہا تھا جواب نہیں رہا تھا۔ کچھ نہیں بولا تھا۔ بس چپ چاپ کھڑا اس کی سمت تکتا رہا تھا۔ وہ مضبوطی سے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جیسے اس کی سمت سے کچھ اور بولنے کا منتظر تھا۔ میرب سیال نے سرخ آنکھوں کے سامنے اسے دیکھا تھا پھر دوسرے ہی پل آگے بڑھنا چاہا تھا۔ مگر نہ جانے کیا ہوا تھا، آنکھوں کے سامنے میں اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ وہ لڑکھرائی تھی۔ مگر اس سے قبل کہ گرتی، سبکتگین حیدر لغاری نے اسے

سبکتگین حیدر لغاری اس کے مقابل کھڑا بے تاثر چہرے سے سمیت اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ چہرے بات کا کچھ احساس ظاہر نہ تھا۔ کسی جذبے کا کوئی رد عمل درج نہ تھا۔ وہ مکمل طور پر سپاٹ نظر آ رہا تھا جواب نہیں رہا تھا۔ کچھ نہیں بولا تھا۔ بس چپ چاپ کھڑا اس کی سمت تکتا رہا تھا۔ وہ مضبوطی سے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جیسے اس کی سمت سے کچھ اور بولنے کا منتظر تھا۔ میرب سیال نے سرخ آنکھوں کے سامنے اسے دیکھا تھا پھر دوسرے ہی پل آگے بڑھنا چاہا تھا۔ مگر نہ جانے کیا ہوا تھا، آنکھوں کے سامنے میں اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ وہ لڑکھرائی تھی۔ مگر اس سے قبل کہ گرتی، سبکتگین حیدر لغاری نے اسے

سبکتگین حیدر لغاری اس کے مقابل کھڑا بے تاثر چہرے سے سمیت اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ چہرے بات کا کچھ احساس ظاہر نہ تھا۔ کسی جذبے کا کوئی رد عمل درج نہ تھا۔ وہ مکمل طور پر سپاٹ نظر آ رہا تھا جواب نہیں رہا تھا۔ کچھ نہیں بولا تھا۔ بس چپ چاپ کھڑا اس کی سمت تکتا رہا تھا۔ وہ مضبوطی سے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جیسے اس کی سمت سے کچھ اور بولنے کا منتظر تھا۔ میرب سیال نے سرخ آنکھوں کے سامنے اسے دیکھا تھا پھر دوسرے ہی پل آگے بڑھنا چاہا تھا۔ مگر نہ جانے کیا ہوا تھا، آنکھوں کے سامنے میں اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ وہ لڑکھرائی تھی۔ مگر اس سے قبل کہ گرتی، سبکتگین حیدر لغاری نے اسے

سبکتگین حیدر لغاری اس کے مقابل کھڑا بے تاثر چہرے سے سمیت اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ چہرے بات کا کچھ احساس ظاہر نہ تھا۔ کسی جذبے کا کوئی رد عمل درج نہ تھا۔ وہ مکمل طور پر سپاٹ نظر آ رہا تھا جواب نہیں رہا تھا۔ کچھ نہیں بولا تھا۔ بس چپ چاپ کھڑا اس کی سمت تکتا رہا تھا۔ وہ مضبوطی سے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جیسے اس کی سمت سے کچھ اور بولنے کا منتظر تھا۔ میرب سیال نے سرخ آنکھوں کے سامنے اسے دیکھا تھا پھر دوسرے ہی پل آگے بڑھنا چاہا تھا۔ مگر نہ جانے کیا ہوا تھا، آنکھوں کے سامنے میں اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ وہ لڑکھرائی تھی۔ مگر اس سے قبل کہ گرتی، سبکتگین حیدر لغاری نے اسے

سبکتگین حیدر لغاری اس کے مقابل کھڑا بے تاثر چہرے سے سمیت اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ چہرے بات کا کچھ احساس ظاہر نہ تھا۔ کسی جذبے کا کوئی رد عمل درج نہ تھا۔ وہ مکمل طور پر سپاٹ نظر آ رہا تھا جواب نہیں رہا تھا۔ کچھ نہیں بولا تھا۔ بس چپ چاپ کھڑا اس کی سمت تکتا رہا تھا۔ وہ مضبوطی سے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جیسے اس کی سمت سے کچھ اور بولنے کا منتظر تھا۔ میرب سیال نے سرخ آنکھوں کے سامنے اسے دیکھا تھا پھر دوسرے ہی پل آگے بڑھنا چاہا تھا۔ مگر نہ جانے کیا ہوا تھا، آنکھوں کے سامنے میں اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ وہ لڑکھرائی تھی۔ مگر اس سے قبل کہ گرتی، سبکتگین حیدر لغاری نے اسے

فارحہ نے جوتکتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر بہت دھیسے سے مسکرا دی تھیں۔

”سب کچھ ٹھیک ہے بیٹا! تمہیں کیا لگ رہا ہے — کہیں کچھ غلط ہے؟“

اذہان حسن بخاری نے بنور ان کی طرف دیکھا تھا پھر یک دم کچھ کہے بغیر دھیان پھیر گیا تھا۔ فارحہ بیٹے کی سمت دیکھا تھا پھر بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر دھر دیا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت نگاہ کی تھی۔

”سب کچھ ٹھیک ہے — فکر کرنے کے دن تمہارے نہیں ہیں۔ فضول کی سوچوں کو ذہن میں جگہ دو۔ بڑے ہو چکے ہو تم۔ مگر اتنے بھی نہیں کہ ہم بڑھوں کی صحبت اختیار کرو۔ چلو جاؤ اپنی عمر کے لوگوں سے، مسکراتے ہوئے ڈپٹا تھا۔ مگر وہ مسکرایا نہیں تھا۔

”یہ تمہاں بیٹا اتنے ہجوم میں بیٹھے کیا راز و نیاز کر رہے ہو؟“ اگینے تبھی وہاں آئی تھی۔ اذہان حسن مانے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ عزیز تمہیں وہاں ڈھونڈ رہا ہے۔“ اگینے نے مطلع کیا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا

”اپنی پراہم؟“ اگینے نے اذہان حسن بخاری کے چہرے پر نگاہ کی تھی۔

”ہوں، اوں۔“ اس نے اگینے کی سمت نگاہ کی تھی۔ پھر دھیسے سے مسکرایا تھا۔

”پھر؟“ غالباً چہرے پر بارہ بجے کی کیفیت پر اشارہ ہوا تھا۔ وہ مسکرایا تھا۔ نگاہ بنور اس کی سمت دیکھ

لا۔

”اچھی لگ رہی ہیں آپ۔“ جواب بہت متضاد تھا۔ اگینے جہاں لمحہ بھر کو حیران ہوئی تھی وہیں دوسرے مسکرا دی تھی۔

”یہ یقیناً میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“

”ہو بھی نہیں سکتا اگینے!“

”اوکے — تم اب جاؤ یہاں سے۔“ عزیز درنہ پاگل ہو جائے گا۔“ اگینے نے ہاتھ پکڑ کر اسے

تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

تو یقیناً کچھ تھی۔ مگر می جانے کیوں اسے بتانے سے گریز کر رہی تھیں یا پھر اس کا ہی وہم تھا۔ وہ

میں نرو اپنے ہی دھیان میں چل رہا تھا جب ایک آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

”ایسکے کیوزی۔ کیا آپ میری مدد کریں گے؟“ وہ ٹیرس کی سیڑھیوں اترنے کو تھا جب آواز نے اس کا

لیا تھا۔ اس کے پاؤں یک دم ہی تھمے تھے۔ بہت آہستگی سے پلٹ کر اس نے نگاہ کی تھی۔ شیون

یاد دھیان لباس میں میز پر بہت سے دیے اپنے سامنے دھرے وہ یقیناً اسی کی سمت متوجہ تھی۔ سید

میں بخاری نے شاید اس کی سمت دیکھ کر یقین کرنا چاہا تھا کہ پکارنے والی آواز وہی تھی یا پھر.....

”ایسکے کیوزی! کیا آپ میری کچھ مدد کریں گے؟“ وہ بہت دھیسے لہجے میں مخاطب تھی۔ ٹیرس کا وہ حصہ

رائل کے لئے مخصوص تھا تبھی اس جانب سناٹا تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت نہ تھی۔ یوں بھی تمام مہمان

دوسری طرف۔ گی تھی۔ اس نے فون کان سے لگایا تھا۔

”میں سیرن ڈیپٹی میں ہوں گین! انتظار کر رہی ہوں تمہارا۔ تم ابھی تک پہنچے کیوں

قدر شکر اندازہ انداز میں اس سے دریافت کر رہی تھی۔ سبکگین حیدر لغاری نے ایک نگاہ خود

میرب سیال پڑالی تھی۔ پھر ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

”آئی ایم سوری گی! یہ ممکن نہیں آج میرے لئے۔“ مختصر انداز میں تعرض برتا تھا۔

”کیوں — کیا ہوا؟ — بہت مصروف ہو؟“

”ہوں — کہہ سکتی ہو۔ ہم پھر کبھی ملتے ہیں۔“

”شام میں تمہارے ہوئے چلی آؤں؟“ گی جواباً گویا تھی۔

”نہیں — میں خود آ جاؤں گا۔ تم فون کر لینا۔ یا پھر میں تم سے رابطہ کر لوں گا۔“

”گین! کیا ہوا؟ پریشان ہو کچھ۔ کوئی بات ہو گئی ہے؟“ گی نے دوسری جانب جا

موڈ کا اندازہ کر لیا تھا۔

”نہیں ایوری تھنک از فائن۔“

”گین!“ گی نے بہت ہولے سے پکارا تھا اور وہ جو سلسلہ منقطع کرنے کا قصد کرنے

رک گیا تھا۔

”ہوں۔“

”اپنا خیال رکھنا۔“

”اوکے۔“ سلسلہ منقطع کر کے اس نے پلٹ کر میرب سیال کی سمت دیکھا تھا۔ پتہ نہیں

تسلی یا اندازہ کرنے کے لئے وہ کسی قدر جھکا تھا اس پر۔ اسے گھڑی بھر کو بنور دیکھا تھا۔ سا

سے چل رہی تھی۔ وہ پُرسکون انداز میں تھی۔ شاید اس کی تشفی ہو گئی تھی۔ تبھی وہ سیدھا کھڑا ہوا

تک یونہی کھڑا رہا تھا۔ پھر سامنے کاؤچ پر بیٹھ کر اس کے ہوش میں آنے کا یا پھر جانے کا اڈ

تھا۔

یقیناً یہ پہلا تجربہ تھا۔

بہت کڑے لمحے تھے۔ یہ سب آسان نہ تھا۔ مگر سبکگین حیدر لغاری جیسے اس گھڑی اس

دہی پر مامور تھا۔ فرض تھا یہ اس پر اور اسے بہر طور اسے انجام دینا ہی تھا۔

سب کچھ معمول پر تھا۔ سب کچھ بظاہر ٹھیک ٹھاک نظر آ رہا تھا۔ مگر کچھ تھا جو ٹھیک نہیں تھا

تیار سے بلال کے گھر پہنچنے تک سید اذہان حسن بخاری کی نظریں اپنی ماں کی آنکھوں میں پکا

تھیں۔ مگر جتنی دفعہ بھی ان کے چہرے پر نظر پڑی تھی، وہ بہت سی طمانیت چہرے پر لئے دھیسے

ہوئی نظر آئی تھیں۔ مگر اس کا دل جیسے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

”ممی! کیا ہوا ہے؟“ بہت مدہم لہجے میں اس نے دریافت کیا تھا۔

نیچے لان میں تھے۔ شاید ٹیرس کی آرائش کی ذمہ داری اس کے سر تھی یا پھر.....

”ہیلو! کیا آپ مجھے سن رہے ہیں؟“ سید اذہان حسن بخاری سوچوں میں محو تھا جب ایک نے پکارا تھا۔

سید اذہان حسن بخاری نے اس لڑکی کی سمت بغور دیکھا تھا۔ ٹیرس پر روشنی کا انتظام کچھ تھا۔ وہی معمول کا ایک لیپ روشن تھا اور جہاں وہ کھڑی تھی وہ جگہ تو قطعاً تاریک تھی۔ وہ جانب سے منتظر تھی کسی رد عمل کی۔ نگاہیں اس کی سمت تھیں اور اس لمحے اذہان حسن بخاری۔ اس کی سمت بڑھادیے تھے۔ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے وہ چلتا ہوا اس کے مقابل جا رہا تھا۔ کھلے آسمان تلے کھڑی وہ اس لمحے کوئی ماورائی مخلوق لگ رہی تھی۔ چودھویں کا چاند آسمان تھا۔ بہت سی زرد روشنی اس لمحے اس چہرے کا بھرپور احاطہ کئے ہوئے تھی۔

”ماچس ہوگی آپ کے پاس؟“ بہت پر اعتماد انداز میں وہ اس کی سمت نکلتی ہوئی دریافت سید اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت بہ غور سکتے ہوئے بہت آہستگی سے اپنا دہانہ ہاتھ جیب کر لائز برآمد کیا تھا۔ مقابل کھڑی لڑکی کے چہرے پر بہت شگفتہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ اس بالوں کو ہاتھ سے کان کے پیچھے کرتے ہوئے اس کی سمت نگاہ کی تھی۔

”مجھے لگ رہا تھا آپ سگریٹ ضرور پیتے ہوں گے۔ اس سے قبل دس عدد اشخاص کا گرو سے مگر بد قسمتی سے ان میں اسموکنگ کا رجحان ناپید تھا۔ حیرت ہے میڈیا پر ٹویٹو بیکو مانیا اپنی پلا کروڑوں روپے خرچ کر رہی ہے اور اثر خاک نہیں ہو رہا۔ حالانکہ ایڈز تو خاصے دھا کہ خیزہ ایک شخص سمندر کی آخری تہ پر پہنچ کر واپس باہر آ گیا۔ یا پھر کسی دوسرے نے بلند و بالا عمال خوف و خطر چھلانگ لگا دی۔ یا پھر.....“ وہ بولنے کا شاید خطر رکھتی تھی۔

سید اذہان حسن بخاری نے بنا اس کی سمت توجہ دیئے لائز جلایا تھا اور بہت آہستگی کے ساتھ دھرے دیے باری باری روشن کرنا چلا گیا تھا۔ بہت مدہم، دھیمی، پُرفسوں روشنی ماحول کا احاطہ تھی۔

مقابل کھڑی لڑکی نے اسے دیکھا تھا پھر مسکرا دی تھی۔

”تھینکس۔“ بچہ پُر تشکر تھا۔

اذہان حسن بخاری نے مقابل کھڑی نازک اندام لڑکی پر اک نگاہ کی تھی۔ چراغوں کی روشنی اسے اس کا سراپا بہت واضح تھا۔ اس کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ غالباً تشکر کے لئے تھی۔ نگاہ نے جانچا تھا۔ پھر بہت ہولے سے لب وا ہوئے تھے۔

”ائس اوکے مگر میں سگریٹ نہیں پیتا۔“ مطلع کیا تھا۔ مقابل کھڑی لڑکی جو کئی تھی۔ جیسے بولنے کی تمام محنت اکارت گئی تھی۔ وہ لمحہ بھر کلب بھیج گئی تھی۔ پھر دوبارہ بہرہ تاریکی سے مسکرائی۔

”سگریٹ پینا بھی نہیں چاہئے۔ یہ کوئی اچھی عادت نہیں۔ مگر اس لائز کے لئے بہت شکر ہے۔“

اذہان حسن بخاری کے لبوں پر جانے کیوں دھیمی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے

سے دھیان ہٹا کر باقی ماندہ دیئے جلائے لگا تھا۔

”روشنی اچھی ہوتی ہے نا۔۔۔ سارا منظر واضح ہو جاتا ہے۔ سارے رنگ کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔“ پتہ نہیں وہ واقعی زیادہ بولنے کی عادی تھی یا پھر اس لمحے ایسا کچھ ذکر ضروری تھا۔ سید اذہان حسن بخاری نے اسے دیکھا تھا پھر دھیان دوبارہ اسی کام پر مرکوز کر دیا تھا۔

”بعض اوقات بہت سے رنگ پھر بھی واضح نہیں ہوتے۔ بہت سے منظر پھر بھی نگاہ سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔“ شاید اس کی اندرونی شورش کا اثر تھا کہ اس کے لہجے میں اک سکوت در آیا تھا۔

”لیکن اس میں قصور روشنی کا تو نہیں۔ قصور تو اس نگاہ کا ہوا جو فقط چند مخصوص منظروں سے آگے بڑھتی ہی نہیں۔ پوشیدگی در حقیقت خود پوشیدہ نہیں ہوتی۔ نگاہ ڈھونڈنے میں ناکام رہتی ہے کبھی کبھی۔ شے سامنے بھی موجود ہو تو بعض اوقات نظر نہیں آتی۔“ بہت دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ اس کھڑی اس سے مکمل اختلاف برت رہی تھی۔

سید اذہان حسن بخاری نے اسے لمحہ بھر کو نگاہ اٹھا کر بغور دیکھا تھا۔ وہ ذہین تھی۔ گفتگو کا مدلل انداز بتا رہا تھا وہ کوئی معمولی نوعیت کی لڑکی نہیں۔ اذہان حسن بخاری نگاہ پھر پھیر گیا تھا۔ اک اک کر کے کتنے دیئے روشن ہوتے چلے گئے تھے۔

”جو بھی ہو، روشنی اندر ہی امناتی ہے۔ اپنی نگاہ میں نقص ہو تو الزام روشنی پر قطعاً نہیں دھرا جا سکتا۔“ وہ مسکرائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دیا اٹھا کر پلٹی تھی اور ٹیرس کی دیواروں پر دھرنے لگی تھی۔ سید اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”سنجھل کر۔ کبھی کبھی روشنی جلا بھی دیتی ہے۔“

وہ پلٹی تھی۔ پھر مسکرا دی تھی۔

”جانتی ہوں۔۔۔ میرے لئے خدشے اہمیت نہیں رکھتے۔ میری نظر ہمیشہ روشن پہلوؤں پر مرکوز رہتی ہے۔ جلاتی تو اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ الا فقط روشنی اور آگ سے ہی تو نہیں دیکھتے۔ آگ تو اور بھی بہت ہی قسم کی ہوتی ہے۔ جلنے کے اور بھی بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔ ہو سکتے ہیں۔“ کتنے پُر اعتماد انداز میں وہ اس کی سمت نکلتی ہوئی گویا تھی۔ سید اذہان حسن بخاری فقط دیکھ کر رہ گیا تھا۔ شاید حُسن نے اسے لاجواب کر دیا تھا یا پھر وہ مزید کچھ بولنا ہی نہ چاہتا تھا۔ لبوں پر چپ تھی۔ کچھ دیر کا نامکمل کام سر انجام پا چکا تھا۔ تمام دیئے روشن ہو چکے تھے۔ اس نے لائز بند کر کے جیب میں رکھنا چاہا تھا جب وہ ایک دم اس کی سمت پلٹی تھی۔

”آل..... ہاں، پلیز۔۔۔ یہ لائز مجھے دے دیجئے۔ کچھ ہی دیر میں، میں اسے آپ کو لوٹا دوں گی۔ ایک لمبائی لڑکونی دیا ہوا ہے بھگ گیا تو۔“ اس نے خدشے کے باعث گزارش کی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر لائز اس کی سمت بڑھا دیا تھا۔

”انسان چاہے لاکھ خدشات سے بے نیاز ہو مگر خدشات کی حقیقت سے نگاہ نہیں پھیر سکتا۔ اندیشے خود بخود آتے ہیں دل میں، ذہن میں۔“ دھیمی لہجے میں بول کر جانے کیا باور کرانا چاہتا تھا۔ شاید مقابل

ابنہ اختیار کیا جانے والا ہر قدم بے سود رہا تھا۔ کتنے دن تک اس نے کوشش کی تھی۔ اس کی سمت والے راستوں پر نگاہ بھی نہیں کی تھی۔ اس کی سمت چلنے والی ہواؤں کا تعاقب بھی نہیں کیا تھا مگر اس اب میں آتی سرگوشیاں تھی نہیں تھیں اور تب جیسے وہ تھک کر ہار گیا تھا۔

ل نہیں مان رہا تھا۔

ل نہیں لگ رہا تھا اور وہ ایک بار پھر چل پڑا تھا۔

نہی راستوں پر۔

و اس سمت جاتے تھے۔ اس شہر جاناں کی سمت جاتے تھے۔

یہ کیا جنوں سی حالت بنا رکھی ہے؟ خرد مندی سے کوئی واسطہ رکھا ہے یا نہیں؟“ لامعہ کیسپس کی نا میں اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی تھی۔

لرچ سوئڈ بوئڈ تھا مگر شیو بڑھا ہوا تھا۔ جس سے انداز بہت رف سا لگ رہا تھا۔ لامعہ کے کہنے پر ہاہی خان بہت ہولے سے مسکرایا تھا۔ نگاہ اس چہرے کا طواف کرنے لگی تھی جو اس کے عین سامنے نا مگر اس سے یکسر انجان اور بے خبر تھا۔ نگاہ اس کی جانب قطعاً مائل نہ تھی۔ کسی التفات کی امید تو در کی بات تھی۔

تم نے دیوانہ بنا دیا ہے۔ خرد مندی کا دعویٰ تھا مجھے۔ ہوش مندی پر ناز تھا۔ مگر تم نے تو غرور دھول کر دیے۔ ہوش کھو بیٹھا میں تو۔ شب و روز کے گزرتے تسلسل کی کچھ خبر نہیں۔ تمہیں کچھ تو کہو۔“ نظروں نے کتنے چورا انداز سے اس چہرے کا طواف کیا تھا۔

امعہ حیران ہوئی تھی۔ پھر دوسرے ہی پل ہنستی چلی گئی تھی۔

مصطفیٰ علی خان! تم واقعی پاگل ہو گئے ہو۔ کہیں صحرا نوردی کا کوئی ارادہ تو نہیں کر لیا؟“

مصطفیٰ علی خان نے جوں کے سب لیتی انا بیہ شاہ پر ایک نگاہ خاص کی تھی۔ پھر بہت ہولے سے اس لہ پر مسکراہٹ کھری تھی۔

ل سے پوچھتا تو ہے

کیا صلہ و فائوں کا

ہے یہی کدن اور رات

ل کو سوچتے رہتا

ل کو کھوتے رہتا

ل سے پوچھتا تو ہے

کیا یہی محبت ہے

ل کے ہی خیالوں سے

پہنای دعائوں کو

خود ہی بے اثر کرتا

کھڑی لڑکی کی نفی کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ لائٹر تھامتی ہوئی بہت دھیسے سے مسکرا دی تھی۔

سید اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت دیکھا پھر نگاہ پھیری تھی اور اس کے ساتھ ہی پلٹتے ہوئے سے ہٹ گیا تھا۔ میز پر کھڑی اس لڑکی نے اس شخص کی پشت کو قدرے دلچسپی سے دیکھا تھا۔ لیوں ٹگنڈے سی دھیمی مسکراہٹ تھی۔ وہ اس شخص سے مل کر یقیناً محفوظ ہوئی تھی۔

”ساہیہ خان! تم سے ابھی تک یہ چراغ روشن نہیں ہوئے؟“ اتنا بڑا کام تو نہیں سوچنا تمہیں۔ کہہ رہی تھیں کیلگری میں کئی شادیوں کے انتظامات اپنے ہاتھوں سر انجام دے چکی ہو! کہوں، لگتا قطعاً نہیں ہے۔“ وہ دوبارہ بھج جانے والے دیوں کو لائٹر سے روشن کر رہی تھی جب عزرا آیا تھا۔

اس نے سراٹھا کر دیکھا تھا پھر مسکرا دی تھی۔

”کچھ جھوٹ نہیں کہا تھا۔ نہ ہی تمہارے کانوں نے کچھ غلط سنا تھا۔ دیے کب کے روشن ہوتے اگر ماچس تم اپنی جیب میں ڈال کر نہیں لے گئے ہوتے۔ بیسیوں لوگوں سے پوچھا تب جا کر بندے سے یہ لائٹر ملا۔ کتنی بڑی خوش آسند تبدیلی آچکی ہے پاکستان میں۔ حضرات نے غالباً سگریٹ پیکٹ پر درج انتباہ کے باعث سگریٹ نوشی ترک کر دی ہے۔ بہت جلد پاکستان میں کھلی ٹوبیکو دیاوایہ ہو جائیں گی۔“ وہ یقیناً سنجیدہ نہ تھی۔ لیوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ عزرا مسکرایا تھا۔ پھر اس ہاتھ میں تجھے لائٹر دیکھ کر قدرے چونکا تھا۔

”یہ اذہان حسن بخاری کا لائٹر تمہارے پاس کہاں سے آیا؟“ ساہیہ خان نے قدرے چونکتے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”اگر وہ اذہان حسن بخاری تھے تو یہ لائٹر انہوں نے مجھے خود آپ دیا ہے۔ نہ صرف لائٹر دیا ہے دیے روشن کرنے میں میری مدد بھی کی ہے۔“

”اوہ۔۔۔ تو ملاقات ہو گئی تمہاری موصوف سے؟“ عزرا مسکرایا تھا۔ ”کیسے لگے محترم؟“

”کچھ خطلی سے ہیں۔ خواہ مخواہ فلسفہ بگھارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خیر میں نے بھی جواباً کوئی نہیں چھوڑی۔ خوب تاک تاک کر لفظ پھینکے۔ موصوف اب تک محفوظ ہو رہے ہوں گے۔“ وہ شرا سے مسکرا رہی تھی۔ چمکتی آنکھوں میں بہت سے جگنو روشن تھے۔ عزرا سے دیکھتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”ساہیہ! اٹس ٹو نیچ۔ بہت سیدھا سا دہا بندہ ہے وہ۔“

”تو میں نے کب کہا کہ اس کے اشتہار لگے ہوئے ہیں۔“ وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

”مگر تمہیں اسے اس طرح تک نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”تمہیں کس نے کہا میں نے اسے تک کیا ہے؟ ہماری ملاقات خاصی دلچسپ اور ادبی ادبی سی ہوئی ہے۔ ہاں فلسفے کا بگھار کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔“ وہ اب بھی سنجیدہ نہ تھی۔ گداز ہونٹوں پر بڑی مسکراہٹ دہی تھی۔ عزرا سے دیکھتے ہوئے سرفنی میں ہلاتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”بس، بہت ہو گیا۔ ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا۔ آج کے لئے اتنا کچھ کافی ہے۔“ لامعہ حق مسکرائی تھی۔ پھر کب کی خاموش اور قدرے لالعلقی بیٹھی انا بیہ شاہ پر نظر مرکوز کی تھی۔

”انا بیہ! تم جانتی ہو مردوں کے ڈھنگ کتنے عجیب اور وصف کتنے زرا لے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں عورت ایک پہلی ہے۔ اسے آج تک کوئی سمجھ نہیں کا۔ مگر درحقیقت مرد ایک معمر ہے۔ اسے سمجھنے کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔“

”یقیناً“ کب کی خاموش بیٹھی انا بیہ شاہ بہت دھیمے سے مسکرائی تھی۔ انداز پر اعتماد تھا۔ نگاہ اس شخص پر نہیں کی تھی مگر وہ کمزور ہرگز نہ پڑی تھی۔

”مشل مشہور ہے ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور، خواب دکھانا بہت دلفریب ہے مگر خوابوں میں رہنا بہت مشکل۔“ یوں پر دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے عفتان علی خان کو دیکھا تھا۔ وہ اس گھڑی خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”لامعہ! اپنے فیاسی کے لئے کوئی ٹھنڈا وغیرہ منگاؤ۔ موصوف خاصی گرمی سے آئے ہیں۔ باہر کا موسم کیا ہے مشر عفتان علی خان؟ گرمی کچھ زیادہ نہیں؟“ وہ براہ راست اس کی سمت نکلتی ہوئی مسکرائی تھی۔

عفتان علی خان نے حسن کے تہہ کو دیکھتے ہی۔ ان آنکھوں کو دیکھا تھا اور پھر دھیمے سے مسکرایا تھا۔

”کن موسموں کی بات کر رہی ہیں آپ؟۔۔۔ اندر کے یا باہر کے؟“ بنور اسے سکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”میں نے بیرونی موسموں کے متعلق ہی دریافت کیا ہے۔ اندرونی موسموں کی روداد تو آپ کافی سے زیادہ سنا چکے ہیں نا انا۔ وہ سنا رہی تھی اور لامعہ حق ہنسی چلی گئی تھی۔

”ویل سیڈ انا بیہ شاہ! پورا آرتو گنڈ۔ عفتان علی خان کی اتنی باتوں کے جواب میں مجھ سے کوئی ایک جواب بھی بن نہ پڑا تھا۔ مگر تم نے واقعی ان موصوف کو لا جواب کر دیا۔“ لامعہ، انا بیہ شاہ کی ذہانت کی داد دیتی ہوئی مسکرائی تھی۔ عفتان علی خان اس کی سمت بہ غور نکلتا ہوا مسکرایا تھا۔ لب بہت ہولے سے وا ہوئے تھے۔

ہم سے اک بار بھی جیتا ہے، نہ جیتے گا کوئی

وہ تو ہم جان کے کھا لیتے ہیں ماتیں اکثر

”مقابل حسن ہو اور مخاطب بھی ہوتو کچھ ایسی کیفیت ہو ہی جاتی ہے۔“ انا بیہ شاہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ لامعہ گویا ہوئی تھی۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے عفتان علی خان! اور تم جانتے ہو مجھے کینٹین کے لوازمات قطعاً نہیں بھاتے۔“ انا بیہ شاہ نے گھڑی کی سمت دیکھا تھا پھر بیگ اور فائل سمیٹتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”سو رہی!۔۔۔ میری نکلاں کا وقت ہو چلا ہے۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے کچھ سننے کا انتظار نہیں کیا تھا اور ہوا ہو گئی تھی۔ عفتان علی خان نے اس دور جاتی لڑکی کو دیکھا تھا۔ پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یقیناً دل ٹھہرنے کا اب کوئی سامان نہ تھا۔

خود کو بے اثر کرنا

اس سے پوچھنا تو ہے

کتنے مدہم لہجے میں اس نے مدعا بیان کیا تھا۔ لامعہ حق جہاں مسکرائی تھی وہیں انا بیہ شاہ نظر بیکسر بے خبر نظر آنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

”کسی مشاعرے سے شرکت کر کے آرہے ہو؟“ لامعہ نے چھیڑا تھا۔

”بس اسی بات کی کسر رہ گئی ہے ان دنوں۔“ وہ بہت دھیمے سے مسکرایا تھا۔

انا بیہ شاہ نے نگاہ اب بھی اس سمت نہیں کی تھی مگر وہ اپنی سماعتوں کو یقیناً اس سمت سے ہٹا کر پھر یک دم اس نشست سے اٹھ جانا بھی جیسے مناسب نہ تھا۔ یہاں رکنا جیسے اس کی مجبوراً اب بھی کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ لامعہ کے چہرے پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ جیسے وہ بے حد سرشار عالم دیوانگی پر۔ اور وہ سمجھ نہ پائی تھی اس کیفیت کو۔ کسی کا انداز کس قدر بڑھچھا۔ الجھا ہوا۔

”یقین دلانے کا راستہ نہیں ہے کوئی۔ ورنہ بے کیفی کی کیفیت بیان کرنے میں دیر کہاں لگتی۔“

عجب شے ہے یہ دیوانگی۔ بہت نامراد شے ہے یہ جنوں خیری۔۔۔ قدموں سے لپٹنے تو ہر صورت پختی ہی نہیں۔“ لہجہ دیوانگی سے مکمل طور پر پڑھا تھا۔ مگر بھوری آنکھوں میں بہت سی شوخی تھی۔ پتہ نہیں وہ اس گھڑی سنجیدہ تھا یا پھر کوئی مذاق کر رہا تھا۔

”سمندر کو دور سے سکتے رہنے کا نظارہ بہت دلکش ہوتا ہے۔ مگر گہرائیاں ناپنا بہت دقیق کام مشکل میں گھر جاتی ہے۔ اک نہ ختم ہونے والی اضطرابیت وجود میں پھیل جاتی ہے۔ کسی پل چھو کر عالم دیوانگی کو جھیلنا آسان نہیں۔ جان پر بن آتی ہے۔ کبھی تم نے ساحل پر کھڑے ہو کر اسے تعاقب کیا ہے؟ کتنے اضطرابوں کی داستان روج ہوتی ہے ان پر۔ کتنی ان کہی داستانیں وہ چھوڑ جاتی ہیں۔ کتنے انوکھے وصف ہیں محبت کے۔ کتنے عجیب فسانے ہیں۔“ اس کا انداز کس تھا اور لامعہ حق ہنسی چلی گئی تھی۔

”آج کیا ہو گیا ہے تمہیں عفتان علی خان؟۔۔۔ کہیں واقعی تم میرے عشق میں پاگل ہو گئے ہو؟“ وہ واقعی حیران تھی۔ عفتان علی خان نے اس سے برابر بیٹھی انا بیہ شاہ پر اک نگاہ کی تھی۔ پھر مسکرایا تھا۔

”کچھ علم نہیں۔ عالم مدہوشی میں ہوں۔ ارد گرد کا کچھ ہوش نہیں۔ بیدار ہوں گا تو کچھ پتہ نہ چلے گا۔“

تو خواب کی سی کیفیت ہے۔ خواب جیسے منظر ہیں۔ خواب جیسے رنگ ہیں اور خواب جیسے تم ہو۔ کتنا تعاقب کرتا ہوں تمہارا۔ کیسے دیوانوں کی طرح تلاشتا ہوں تمہیں ہر سمت۔ تم میری سمت نہیں۔ مجھ پر اپنی نظر کیوں نہیں کرتیں؟ مجھ میں تو اتنا دریافت کرنے کی بھی سکت نہیں کہ یہ عالم گا بھی کہ نہیں۔ میں اس خواب سے جاگوں گا تو تم کو پاسوں گا کہ نہیں۔ کیا تم میرے لئے نظر نہ رکھو گی؟۔۔۔ دیوانے کا خواب۔“

لہجہ مدہم اور انداز کس قدر خواب آشنا تھا۔

اؤل

عس کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ انداز بہت سرسری تھا۔ کسی طرح کا کوئی احساس اس کے لہجے سے ظاہر نہ تھا۔ میرب سیال نے اس کی پشت کو دیکھا تھا۔ آئینے میں اس کا عکس بہت واضح تھا۔ اور اس لمحے یقیناً وہ اسی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ نصیحت خوب تھی۔ بروقت تھی۔ مگر افسوس، بہت غلط شخص کے لبوں سے تھی۔

اسے لمحہ زنج کرنے والا، اس کی جان سولی پر لٹکانے والا، اس کی تمام پریشانیوں کا جواز، وہ شخص اس لمحے اس تمام معاملے سے کیسا بری الذمہ تھا۔ جیسے وہ اس تمام معاملے کا حصہ تھا ہی نہیں۔ یا پھر جیسے اسے اس بابت کچھ علم تھا ہی نہیں۔ کتنا تعلق نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا وہ۔ یا پھر یہ سب دانستہ تھا۔ ارادی طور پر تھا۔

کیسے سلگاتا تھا وہ اس کی جان۔ اور پھر کیسے بے تاثر بن جاتا تھا۔ شاید یہ بھی ذمے داری سے بچنے کی کوئی ارادی حرکت تھی۔

کوئی منصوبہ ساز پہلو تھا۔

اپنے اندر کے بے بسی کا احساس ایک بار پھر کس درجہ ہوا تھا۔ پورا ذہن پھر سلگنے لگا۔

وہ ناپسندیدہ وجود تھی۔

ناپسندیدہ ہستی۔ جو فقط کسی کے سر مسلط کی گئی تھی اور وہ اس تسلط پر بھی کس درجہ آزاد تھا۔ کیسے آزادانہ طور پر اپنے رویوں کا اظہار کرتا تھا۔ کیسے آزادی سے اپنے ناپسندیدہ پہلوؤں پر احتجاج کرتا تھا۔ پسندیدہ افعال و اقدام کی منجھی کے لئے اسے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ آزاد تھا مکمل طور پر۔

شاید زیادتی اس کے ساتھ ہوئی تھی۔ قربانی کا بکرا فقط اسے بنایا گیا تھا۔ دونوں طرف سے۔

ایک طرف وہ بوجھ تھی۔ ڈسے داریوں کا بوجھ۔ اور دوسری طرف ضرورت۔

ذمے داریوں نے وہ بوجھ اس ضرورت کے دامن میں ڈال دیا تھا۔ اس نے فقط ایک مقام اپنے نام، مقام اور رتبے سے پر کیا تھا۔ ورنہ اس کی حقیقت صفر تھی اور سردار سیکٹین حیدر لغاری یقیناً گھائے میں نہ رہا تھا۔

یقیناً اس مقام کے لئے کسی ایسی ہی لڑکی کی ضرورت تھی۔ اس جیسی بے وقوف، احق جو زیادہ سوال نہ کر سکتی۔ زیادہ وضاحتیں نہ مانگ سکتی۔ بس خاموشی سے سب نکلتی رہتی۔

سردار سیکٹین حیدر لغاری نے میرب سیال کو اپنی سمت ایک تک تکتے دیکھ کر اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ اگرچہ کر لیا تھا مگر پھر بھی تیاری سے ہاتھ روک کر اس نے چونکتے ہوئے اس کی سمت دیکھا ضرور تھا۔

”کیا ہوا؟“

میرب سیال نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ کچھ لمحوں تک اسی طرح تکتی رہی تھی۔ پھر بہت آہستگی سے سر لٹی میں ہلا دیا تھا۔ وہ ٹانگی لگاتے ہوئے اس کی سمت بہ غور دیکھ رہا تھا۔ میرب سیال سر جھکائے کچھ لمحوں تک اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔ شاید وہ اس لمحے بہت خالی ذہن تھی۔ کیفیت کسی قدر غائب دماغی کی

سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ بند ہوتے پپوٹوں کو اس نے جیسے بہ مشکل کھولا تھا۔ کتنی دیر تک ذہر ماؤف رہا تھا۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے کمرے کے چار سمت دیکھتی رہی تھی۔ یہ کمرہ وہ تو نہیں تھا۔

یہ سب۔۔۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ کمرے پر ڈالی تھی۔ واش روم سے پانی گرنے کی رہی تھی۔ وہ کسی قدر چونکی تھی۔ مگر حواس اس قدر بیدار نہ تھے۔ سمجھنے کی کوشش میں اس نے پوری آنکھیں کھول دی تھیں۔ تبھی واش روم کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی اور دوسرے ہی لمحے کوئی اور رو رہا تھا۔

”سردار سیکٹین حیدر لغاری۔ اس کے حواس ایک پل میں بیدار ہوئے تھے۔ وہ ٹاول سے ہال ہوا ایک دم چونکا تھا۔ غالباً اس کے جاگنے پر حیران ہوا تھا۔

میرب سیال ایک دم اٹھ کر بیٹھی تھی۔ شانوں پر بال بڑے بے ترتیب انداز میں بکھرے ہوئے سر جھکائے وہ اس گھڑی یقیناً اس کیفیت سے قبل کے واقعے کے متعلق سوچ کر کسی قدر شرمندہ تھی۔

”آپ اچانک بے ہوش ہو گئی تھیں۔ مجھے فوری طور پر کچھ سمجھ نہ آیا تو آپ کو اٹھا کر اپنے میں لے آیا۔ ڈاکٹر نے آپ کو ریلیکس کرنے کے لئے کہا تھا۔ سو ڈسٹرب نہیں کیا۔ ہاؤ ڈو یو فیٹل سردار سیکٹین حیدر لغاری اس کی اپنے کمرے میں موجودگی کی وضاحت دے رہا تھا۔ لہجے میں کسی کوئی تاثر نہ تھا۔ اس کی ہارٹ ورڈنگ سے متعلق کوئی رد عمل اس کے چہرے پر نہ تھا۔ وہ چہرہ بہت تھا۔ میرب سیال نے ایک لمحے کو اس کی سمت نگاہ کی تھی۔

سردار سیکٹین حیدر لغاری کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ شاید وہ شب بھر سویا نہ تھا۔ اپنی آگ اس گھڑی بائیں ہاتھ سے دہاتا ہوا وہ اس کی سمت متوجہ نہ تھا۔

”کیا ہوا؟“ میرب سیال کے لبوں پر یک دم سوال اُبھرا تھا۔ بڑی غیر ارادی حرکت تھی یہ۔ سیکٹین حیدر لغاری نے اس کی سمت دیکھا تھا جیسے اس مخاطب پر حیران ہوا ہو۔

”شاید کچھ اسٹریس آگئی ہے تک میں۔ صوفے پر سونے کی عادت نہیں نا۔“ سردار سیکٹین حیدر جواب دے کر ہیر ڈرائیو کرنے لگا تھا۔ میرب سیال کے ذہن میں گزرا ہوا تمام منظر گھوم گیا تھا۔

نے معذرت خواہ رنگ قطعاً اختیار نہ کیا تھا۔ وہ کل ہسپتال سے لوٹنے سے اب تک بہت زیادہ سوئی یقیناً یہ دواؤں کا اثر تھا۔ سر اب تک گھوم رہا تھا۔ اس نے وال کلاک سے نگاہ ہٹاتے ہوئے سر کو اس سے قدرے دبا دیا تھا۔

”مجھے ہسپتال جانا تھا۔“ اس نے مدہم لہجے میں جیسے خود کلامی کی تھی۔ سردار سیکٹین حیدر لغاری۔ قدر لہجی ہوئی اس لڑکی کو آئینے میں دیکھا تھا۔

”ہا ئینریشن کے باعث ایسی ادویات دینا ناگزیر ہو گیا تھا۔ یہ تمام فقط ریلیکیشن کے لئے تھا۔ نے کہا ہے یوٹڈ مسٹ ٹیک کیئر آف۔ یور سیلف۔ سٹریس لینا کوئی اچھی بات نہیں۔“ آئینے میں اس نے

اسے کسی قدر چونک کر دیکھا تھا۔ مگر دوسرے ہی پل شاید دانستہ اس لہجے، اس انداز کو یکسر نظر انداز تے ہوئے گویا ہوا تھا۔

”ہری اپ۔ آپ کو ابھی میڈسن بھی لیتا ہیں۔ رات میں فون آیا تھا۔ میں نے دانستہ مائی اماں کو آپ لینیٹ کے متعلق نہیں بتایا ورنہ وہ شاید مزید پریشان ہو جاتیں۔“

میرب سیال بنا اس کی سمت دیکھے، بنا کوئی دھیان دینے کسی قدر اکتائے ہوئے انداز میں لب بچھنچ کر جگہ سے اٹھی تھی۔ مگر تبھی آنکھوں کے سامنے یکدم اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ غالباً اسے چکر آیا تھا۔ وہ رانی تھی جب سردار سبکنگین حیدر لغاری نے کسی قدر مستعد انداز میں آگے بڑھ کر اسے تھام لیا تھا۔

خوشبو کا ایک بھگا اس کے تنھوں میں گھسا تھا۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری اس لمحے اس کے کس قدر بچھا۔ قربت کس قدر تھی۔ مگر سب کس قدر سرسری تھا۔ دھڑکنیں کتنی اعتدال پر تھیں۔ کوئی رتی بھر بھی تو محسوس نہ ہوا تھا۔ قربتوں کا وہ احساس کس قدر سرسری تھا جیسے وہ قربت بس اس وقت کی سرسری رت تھی اور بند آنکھوں کے ساتھ وہ اس فرارخ سینے پر سر دھرے کتنی دیر گہرے گہرے سانس لیتی خود کو ال پر لانے کے جنن کرتی رہی تھی۔ کس قدر کمزور واقع ہوئی تھی وہ۔ مگر یہ کمزوری شاید جسمانی نہ تھی۔ روئی طور پر ہرٹ ہوئی تھی۔ چوٹ اندرونی تھی۔ نہ نظر آنے والی۔ دکھائی نہ دینے والی۔ سردار سبکنگین لغاری اسی طرح اس کے سامنے کھڑا رہا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا، اس کی حالت ٹھیک نہ تھی۔

کتنے لمحوں تک وہ اسی طرح کھڑی رہی تھی۔ پھر اس کے مضبوط شانے پر ہاتھ دھر کے بہت آہستگی ہانسرا اٹھایا تھا۔ چہرہ پسینے سے تر ہوتا تھا۔

”آریو اے؟“ سردار سبکنگین حیدر لغاری کسی قدر متفکر ہوا تھا۔ میرب سیال نے بنا اس کی سمت نگاہ سے اثبات میں ہلایا تھا۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ اس کے نپرسے ہولے سے اپنا ہاتھ ہٹاتی ہوئی وہ قدرے سنبھلتے ہوئے پیچھے ہٹی تھی۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری ہانے کس خدشے کے پیش نظر اس کا شانہ اب بھی اپنے مضبوط ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔

”میں ڈاکٹر کو بلا لیتا ہوں۔“ بغور اس کے چہرے کو تکتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ میرب سیال نے سر بہت ہولے سے نفی میں ہلایا۔ ”میں اپنے روم بانا چاہتی ہوں۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ سردار سبکنگین حیدر لغاری سے قدرے دور ہٹی تھی۔ سردار حیدر لغاری نے بدستور سہارا دینا چاہا تھا مگر اس نے بہت آہستگی سے اس مضبوط ہاتھ کو پیچھے ہٹا دیا

”اس کی ضرورت نہیں۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ کسی قدر مست قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھی تھی رسے سے اٹھی چلی گئی تھی۔

سردار سبکنگین حیدر لغاری خاموشی سے اس سمت دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر کسی طرح کا کوئی تاثر نہ تھا۔ جیسے ام کیفیت سے اس کا کوئی واسطہ رہا ہی نہ ہو۔ جیسے وہ اس معاملے سے مکمل طور پر لاتعلقی ہو۔ یا پھر اس تمام صورت کے وقوع پذیر ہونے سے اسے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ میرب سیال کے جانے سے بس

تھی۔

”مائی اماں کا فون آیا تھا آپ کے لئے۔“ بہت مدھم لہجے میں مطلع کیا تھا۔ میرب سیال اپنی بیٹی رہی تھی۔ نگاہ اٹھا کر اس کی سمت دیکھا نہیں تھا۔ نہ ہی کسی طرح کا کوئی رد عمل ظاہر کیا تھا۔ ہونے کے برابر تھی۔ جیسے اسے اس ذکر کی مطلق کوئی پرواہ نہیں تھی۔ جیسے وہ سنتے ہوئے بھی نہ سن رہے سردار سبکنگین حیدر لغاری نے پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے اس کی سمت اک نگاہ کی تھی۔

”آپ کی خیریت دریافت کر رہی ہیں۔ کسی قدر پریشان ہو رہی ہیں۔ غالباً اب تک آپ سے بات نہیں ہوئی۔ اب کے فون آئے تو بات کر لیجئے گا۔ ان کو فکر ہو رہی تھی آپ کی۔“ سردار حیدر لغاری جیسے اسے اہم ترین ہدایت کر رہا تھا۔

وہ جانے کیوں بُت بنی بیٹی رہی تھی۔ حالانکہ ارادہ تو وہاں سے اٹھ کر بھاگ جانے کا تھا۔ وجود میں اس لمحے ہی نہ رہی تھی۔ دروازہ بہت ہولے سے بجا تھا۔ ویٹر ناشتہ لے آیا تھا۔ وہ نہیں چونکی تھی۔ خالی خالی نظروں سے ساکت بیٹی اس منظر کو کتنی چلی گئی تھی۔ ویٹر ناشتہ سرو کر کے چکا تھا۔ اس کے وجود میں تب بھی کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔

”آپ فریش ہو جائیے۔ ناشتہ آچکا ہے۔“ سردار سبکنگین حیدر لغاری نے جیسے اس لمحے علم میرب سیال نے بہت ہولے سے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ کتنی بار عجب شخصیت تھی۔ یقیناً کوئی مہر ہوتا تو بڑی زیادتی ہوئی۔

شاید اس نے اسی لمحے میرب سیال کو چنا تھا۔ کمزور تھی وہ اس کی دانست میں۔ بے حد کمزور۔ سر جھکائے کھڑی خاموشی سے اس کے احکام کرنا من مانی کے عمل کی مہر ثبت کرتی چلی جاتی تھی۔ کبھی کوئی اختلاف ہوا ہی نہیں تھا اسے محترم سبکنگین حیدر لغاری سے۔ موصوف کو کبھی انکار سننا پڑا ہی نہ تھا۔ شاید وہ جانتا تھا وہ کتنی کمزور تھی۔ بے بس۔

اور اس نے کیا بھی تو ایسا ہی تھا۔ کتنے مواقع تھے جہاں اس نے خود اپنے آپ کی نفی کی تھی۔ فو آپ کو جھٹلایا تھا۔ اور سردار سبکنگین حیدر لغاری کے احکامات کی پیروی کر کے دانستہ یا نادانستہ اس نام نہاد غرور و وقار کو تقویت دی تھی۔ یقیناً سردار سبکنگین حیدر لغاری کامیاب رہا تھا۔ اگر اس کی لانا اسٹریٹیجی تھی تو وہ صد فیصد نفع میں رہا تھا۔

”آپ جلدی سے ناشتہ کر لیجئے۔ پھر غالباً آپ کو ہسپتال بھی جانا ہے۔ کیسی طبیعت ہے اب مس کی؟ مجھے ان کی طرف جانا تھا مگر ان فور چینیٹی۔ اپنی ویز، آپ تیار ہو جائیے، ہم ساتھ چلیں۔ اس نے کسی قدر پُر آنسو انداز میں کہنے کے ساتھ ایک مزید اطلاع دی تھی۔ مگر وہ اطلاع میرب کے لئے قطعاً بھی خوش آئند نہ تھی۔ میرب سیال نے اپنے سامنے کھڑے تک سب سے تیار سردار حیدر لغاری کی سمت دیکھا تھا۔ پھر بہت ہولے سے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ جواب کسی قدر غیر واضح تھا۔ شاید تبھی سردار سبکنگین حیدر

ہی طرح کی جواب دہی سے خوفزدہ تھا وہ۔ تمام معاملہ اس پر ڈال کر بری الذمہ ہونا چاہتا تھا۔

سردار بنگلین حیدر لغاری سے نگاہ ہٹا کر کہنے لگی۔

”مہم کا اثر ہے مائی اماں!“ بہانہ گھڑا تھا۔ مگر مائی اماں شاید مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔

”نون دے تو اسے۔۔۔ ابھی خبر لیتی ہوں۔ اس لئے تو ساتھ نہیں بھجوا دیا تھا کہ وہ تم سے مکمل طور پر

باہر کرانے کام نسا تار ہے۔“

”نہیں مائی اماں! غلطی ان کی نہیں ہے۔“ پتہ نہیں کیسے ایک لمحے میں اس کی زبان سے پھسلا تھا۔

لک اس کا تو کوئی ارادہ نہ تھا اس شخص کو ڈی فنڈ کرنے کا۔ اس لمحے سردار بنگلین حیدر لغاری کسی قدر

لنے ہوئے اس کی سمت تکتے لگا تھا اور وہ خود کتنی حیران ہوئی تھی۔ نادانستگی میں وہ اسے بچا گئی تھی۔

لی جس طرح وہ ہر طرح سے اس کے معاملات سے لاتعلقی نظر آتا تھا، اس سب کو لے کر یہ ممکن تو نہ

ایسا ہونا تو نہیں چاہئے۔ مگر وہ ایک اقدام سرزد ہو چکا تھا۔ سردار بنگلین حیدر لغاری پتہ نہیں کسی تشکر

نڈاز میں اس کی سمت دیکھ رہا تھا یا پھر ایسی کوئی کیفیت اس کی آنکھوں میں تھی ہی نہیں۔ شاید وہ معمول

ارج اس کی جانب متوجہ ہوا تھا اور رتی بھر بھی حیرت ان نگاہوں میں تھی ہی نہیں۔ جو بھی تھا میرب

اس لمحے اس کی جانب سے نگاہ پھیر کر مائی اماں سے مخاطب تھی۔

”پاپا کی سرجی کامیاب رہی ہے۔ میں آپ کو مطلع کرنے والی تھی مگر مصروفیت اس قدر رہی

.....“ وہ کوئی وضاحت دینے جا رہی تھی جب مائی اماں گویا ہوئی تھیں۔

”خدا انہیں زندگی دے۔ ہسپتال جاؤ تو میری جانب سے بطور خاص پوچھنا۔ سیال صاحب سے ہو

ذمہ داری بات کروا بھی دینا۔“

”جی اچھا۔“ میرب سیال کے لئے اس لمحے بولنا جیسے انتہائی مشکل ترین فعل تھا۔ کتنی مشقت کرنا پڑ

لی اسے۔

سردار بنگلین حیدر لغاری نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ جیسے اس لمحے میں اسے اس کی مشکل کا اندازہ ہوا

گیا ہاتھ بڑھا کر فون اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ مائی اماں اس کے کان کھینچنے لگی تھیں۔

”تہا جب جاتے ہو تو ہمیشہ مین ہٹن میں قیام کرتے ہو۔ بہو ساتھ ہے تو ہولٹوں میں خوار کروار ہے

نی ٹریف ہو رہی ہے اس کی آواز۔ ہولٹوں میں گھر جیسا ماحول کہاں ملتا ہے۔ بیمار پڑا دیا نا۔ یہ خیال

ہے ہو تم اس کا؟“ مائی اماں کا لہجہ بہو کی محبت میں چور تھا۔ سردار بنگلین حیدر لغاری کے چہرے پر

مہم سا مہم ابھرا تھا۔ میرب سیال کو یقیناً علم نہ تھا کہ دوسری جانب مائی اماں کیا کہہ رہی ہیں مگر وہ

لئے اس سپاٹ چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر چونکی ضرور تھی۔

اؤکے۔۔۔ آئندہ ایسی کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔“ سردار بنگلین حیدر لغاری اس لمحے سارا الزام

سر لیتا ہوا آئندہ کے متعلق تسلی دے رہا تھا۔

مہم سے پروسی مہم جیسی مسکراہٹ تھی۔ میرب سیال کے اپنی جانب تکتے پر وہ اس کی جانب متوجہ ہوا

اٹھ سلاہ منقطع کرتے ہوئے باضابطہ اس کی جانب تکتے ہوئے مخاطب ہوا تھا۔ اس عرصے میں میرب

ہوا یہ تھا کہ اس نے چند ثانیوں تک اس جانب خاموشی سے ٹکا تھا۔ پھر شاید معمول کے انداز

اسی طرح لب تہینے پلٹنے والا تھا جب اس کے ڈیسک سیل پر رنگ ٹون بجی تھی۔

بنگلین حیدر لغاری نے اسی نے تاثر انداز میں جیب سے موبائل نکال کر کان سے لگایا

”ہیلو۔۔۔ مائی اماں!۔۔۔ کیسی ہیں آپ؟“ تاثرات یکدم تبدیل ہوئے تھے۔

”ٹھیک ہوں۔۔۔ تم کیسے ہو بیٹا؟“

”ٹھیک ہوں مائی اماں!“ وہ دھیسے سے مسکرایا تھا۔

”اور میری بہو۔۔۔ وہ کیسی ہے؟۔۔۔ کہاں ہے وہ؟ میری بات کر دو اس سے۔“

”جی مائی اماں!“ وہ مودب انداز میں بول کر ایک گہری سانس خارج کرتا ہوا آگے بڑھ

کان سے لگایا تھا۔

”تم اس کا خیال رکھ رہے ہو یا نہیں؟“ مائی اماں اپنی بہو کے لئے بہت فکر مند تھیں۔

”جی مائی اماں!“ اس کے پاس سوائے سر ہلانے کے اور کوئی چارہ نہ تھا جیسے۔

”اور تم نے اسے ہولٹوں میں کیوں ٹھہرایا ہوا ہے؟۔۔۔ مین ہٹن والا گھر کس دن کام آ

تم لغاری خاندان کی بہو کو کہیں لے کر گئے ہو اور اس طرح غیروں کی طرح ہولٹوں میں ہی ٹھہرا

رہی ہوگی وہ؟“ مائی اماں کسی قدر جھنجکی سے ڈپٹ رہی تھیں۔ وہ چلتا ہوا میرب سیال کے کمرے

تھا۔ دروازہ کھول کر اندر جھانکا تھا۔ وہ میڈر نیم دراز تھی۔ سردار بنگلین حیدر لغاری نے اس کا

قد می کر دی تھی۔ وہ چونکی تھی۔ نگاہ سردار بنگلین حیدر لغاری کی سمت کی تھی۔ کسی قدر حیرت۔

مگر اس نے بہت رسائیت کے ساتھ اس کی سمت تکتے ہوئے فون بڑھا دیا تھا۔

”مائی اماں تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“ کہنے کے ساتھ ہی فون اس کے ہاتھ میں تھا

لمحے کی اپنی اہم ترین ذمہ داری سے گویا سبد کوش ہو گیا تھا۔

میرب سیال نے فون ہاتھ میں لے کر چند ثانیوں تک خالی خالی آنکھوں سے خاموشی سے

حیدر لغاری کی سمت دیکھا تھا۔ اس گھڑی وہ اس کے چہرے سے دھیان پھیر چکا تھا۔ اور تب

نے فون کان سے لگا لیا تھا۔

”جی مائی اماں!۔۔۔ ٹھیک ہوں۔۔۔ آپ کیسی ہیں؟“ آواز میں نفاہت بہت

تھی مائی اماں چونکی تھیں۔

”کیا ہوا تمہیں؟۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

”جی مائی اماں!۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے باور کرانا چاہا تھا۔ مگر اپنے مہم لہجے

لانے میں یکسر نام کام رہی تھی۔ آواز کی نفاہت بھر پور چٹلی کھا رہی تھی۔

”بیٹا اماں ہوں۔ مجھ سے ایسے بہانے نہیں چل سکتے۔ کیا ہوا ہے؟۔۔۔ بنگلین نے

نہیں بتایا۔“ وہ بے حد متشکر نظر آ رہی تھیں۔ میرب سیال کی نگاہ بلا ارادہ اس شخص کی سمت

اس لمحے اس کی سمت متوجہ نہ تھا۔ شاید یہ گریز دانستہ تھا۔ وہ اس لمحے جان بوجھ کر لاتعلقی

سایاں پھرے کا رخ پھیر چکی تھی۔

”کیا پروگرام ہے اب؟“ وہ شاید آئندہ کے لائحہ عمل کے متعلق دریافت کر رہا تھا۔ میرے اپنے سامنے کھڑے شخص پر ایک نگاہ کی تھی اور پھر بہت ہولے سے سرٹٹی میں بلا دیا تھا۔ سچی وہ ہوئے بولا تھا۔

”اوکے۔۔۔ یوشڈ ٹیک ریست ناؤ۔ شام میں ہسپتال چلیں گے۔“

”نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں ہسپتال جانا چاہوں گی۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ

واش روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔

سردار بنگلین حیدر لغاری اس کی سمت اسی طرح دکھ رہا تھا جب وہ اس لمحے یکدم ہی پلٹی تھی

”میرے لئے آپ کو کسی طرح کا تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ہسپتال چلی جاؤں گا

کے راستے اجنبی نہیں ہیں میرے لئے۔ آپ اپنی روٹین کو ڈسٹرب مت کیجئے گا۔“

اپنے تمام معاملات سے ایک پل میں اسے الگ کرتی ہوئی وہ پلٹی تھی اور واش روم میں گھس گیا

سردار بنگلین حیدر لغاری اس سمت تکتا رہ گیا تھا۔ پھر لب بچھنے پلٹا تھا اور دروازہ کھول کر با

تھا۔



کبھی کبھی کسی شے کے متعلق قیاس کرنا یا فرض کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ احتمال اس بات کا

بھی ہوتا ہے کہ کہیں فرض شدہ نتائج منفی اور لا حاصل نہ رہیں۔ یا پھر یہ بھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ موجودہ

صورت حال کو دیکھ کر جو بات آپ اخذ کر رہے ہوں درحقیقت ویسا کچھ بھی نہ ہو۔ کبھی کبھی نگاہ جو دیکھتی

ہے اور اخذ کرتی ہے ویسا ہوتا نہیں ہے۔ شاید بات کچھ ایسی ہی پیچیدہ تھی یا پھر بہت سیدھی اور صاف۔

عفتنان علی خان کیوگک روم میں دادا ابا کے ساتھ بہت خوشگوار موڈ میں چھس کھیلنے میں مصروف تھا۔ اب

تقریباً یہ معمول بن چکا تھا۔ بات چونکا دینے والی نہیں تھی۔ شاید جیہی زینہ اترتی انا بیہ شاہ چونکی نہیں تھی۔ نہ

ہی اس کے چہرے یا آنکھوں میں کسی طرح کی کوئی حیرت بکھری تھی۔ البتہ عفتنان علی خان نے لمحہ بھر کو نظر

اٹھا کر اسے ضرور دیکھا تھا۔ انا بیہ شاہ پر رسم میزبانی جیسے فرض ہو گیا تھا۔ لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ بڑی

مشکل سے ابھری تھی۔ ایک رسمی انداز انجام دینا کسی قدر مشکل لگا تھا مگر اس کے لئے یہ فعل سرانجام دینا

جیسے ناگزیر ہو گیا تھا۔

”آؤ انا بیہ بیٹا!“ دادا ابا اسے دیکھتے ہوئے مسکراتے تھے۔ ”بھئی تمہارا دوست تو بہت ماہر ہو گیا ہے۔

دیکھو مجھے چاروں شانے چت کر دیا۔“ دادا ابا، عفتنان علی خان کو سراہتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

”آدمی کا پلیئر ہونا ضروری ہے۔ پرفیکٹ اور ماہر کھلاڑی بننے دیر نہیں لگی دادا ابا! اور عفتنان علی خان

تو..... وہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرائی تھی۔ تب عفتنان علی خان اس کی سمت بہ غور تکتا ہوا مسکرایا تھا۔

”آف کورس۔۔۔ آدمی کا کھلاڑی ہونا شرط ہے۔ اگر وہ کھلاڑی نہیں ہوگا تو سوچو کتنی نقصان

والی بات ہوگی، ہے نا۔ کھلاڑی ہوگا تو اس میں اسپورٹس مین اسپرٹ بھی ہوگی۔ شہ اور مات کی فکر بھی

ستائے گی۔ حوصلہ ٹوٹے گا تو بندھانے کی فکر بھی ہوگی۔ ہار کا ڈر ہوگا تو جیتنے کے لئے اقدامات بھی

سوچنے پر مائل ہوگا۔ بہت اچھا اور کام کا پوائنٹ ڈس کور کیا تم نے انا بیہ شاہ! یعنی تم بھی نفع اور نقصان

کے فلسفے سے واقف ہو۔“

کتنی ذمہ معنویت تھی ان جملوں میں۔ کتنے معنی نکلتے تھے ان مخفی باتوں کے۔ ان آنکھوں میں اس لمحے

کوئی خاص بات تو تھی۔ لبوں کی دھیمی مسکراہٹ تو چنکی کھا رہی تھی۔

انا بیہ شاہ نے دادا ابا کی طرف دیکھا تھا پھر بہت دھیمے سے مسکراتے ہوئے شانے اچکا دیئے تھے۔ پھر

مسکراتے ہوئے دادا ابا کی سمت دیکھا تھا۔

”آپ نے تو بہت طاق کر دیا محترم عفتان علی خان کو۔ شاگردی کام آگئی۔“ وہ بھرپور میں گویا متاثر ہوئی تھی۔ ”چلیں، ایک فائدہ تو ہوا۔ لامع حق کو اب یقیناً کوئی گلہ نہیں رہے گا۔ مگر علم ہو گا تو یقیناً اسے خوشی ہوگی کہ محترم عفتان علی خان کی ذہنی صلاحیتوں میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ صرف یہ بلکہ وہ بہت سے علوم سے واقفیت بھی پانگے ہیں۔ کئی مجاہدوں سے آشنائی ہوگئی ہے ان کا خاص ہاتھ آ گیا ہے ان کے۔“ انداز بہت شگفتہ تھا۔ وہ یقیناً بہت مخلوط ہو رہی تھی۔

عفتان علی خان نے دادا ابا کی سمت مسکراتے ہوئے نگاہ کی تھی۔ ہونہار پوتی کے پٹر پٹر بولنے وہ بہت مخلوط ہو رہے تھے۔ شاید ایسی فصاحت، ایسی بلاغت اسے انہی محترم سے ورثے میں ملی تھی۔ ”ٹھیک ہے۔ تم نے ایک دم بجا فرمایا۔ یہ سارے وصف تم سے ملنے کے بعد ہی ہاتھ لگے میرے۔ سارے ڈھنگ تم سے ملنے کے بعد ہی سمجھ آئے ہیں۔ اس آگاہی کا سارا کریڈٹ تمہارے جاتا ہے انابہ شاہ! تم نے ہی تو ملوایا تھا دادا ابا سے مجھے۔ تم مجھ سے نہ ملتیں تو کیسے جان پاتا میں ساری حقیقتیں۔ کیسے منکشف ہوتے مجھ پر ایسے انوکھے وصف، کتنے رازوں سے آشنائی ہوئی نہ پائی۔ کتنی باتوں سے نا آشنا رہتی۔ تم نے تو میری آنکھ کو ضیاء دی ہے۔ روشنی بخشی ہے۔ یہ رمز آشنائی، اعظم تمہارے سبب ہی تو ہاتھ لگا ہے میرے۔ کیسے فراموش کر دوں، کیسے کہہ دوں کہ یہ نفل ہے۔ جھٹلا سکتا میں۔“ کتنی روشنی بھر گئی تھی اس لمحے ان بھوری آنکھوں میں۔ کوئی خاص رنگ تھا، کوئی کیفیت تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

”رنگی دادا ابا! میں آپ سے نہ ملتا تو شاید وہ سب کچھ نہ جان پاتا جو آپ سے ملنے کے بعد کتنے تجربات بولتے ہیں آپ کی باتوں میں۔ کتنی مختصر نشستیں رہیں آپ کے ساتھ۔ مگر محبت کے رنگ سچے ہوں تو بہت گاڑھے چڑھتے ہیں۔ آپ کی مختصر ترین ملاقاتوں میں بھی مجھے سیکھنے اور جاننے کا زیادہ موقع ملا۔“ وہ دادا ابا کو سراہتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ شعبہ باز تھا کوئی۔ مہارت اس کا وصف تھی۔ پل میں سارے رنگوں کو اپنے رنگ میں رنگنا جیسے وتیرہ تھا اس کا۔ دادا ابا اس کے شانے کو چھپتے تھے۔ جوانی کلمات کہتے ہوئے جہاں مسکرا رہے تھے وہیں انابہ شاہ ساکت نظروں سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ یقیناً وہ ایک ماہر کھلاڑی تھا۔ کتنا مسرور دکھائی دے رہا تھا وہ۔ اس لمحے انابہ شاہ کی سمت کئی گنا میں چمک کچھ اور بھی سوا ہو گئی تھی۔ وہ مسکرا ہٹ پہلے سے بھی زیادہ دلکش ہو گئی تھی۔ کتنے اسرار بول رہے تھے ان آنکھوں میں۔ انابہ شاہ فوراً ہی چہرہ پھیر گئی تھی۔

”دادا ابا! مجھے پارک ٹاور جانا ہے۔ گاڑی کب تک آئے گی؟“ وہ اس لمحے یکسر موضوع بدلتے ہوئے دادا ابا سے مخاطب تھی۔ وہ ایک لمحہ بہت لاتعلقی کا تھا۔ عفتان علی خان نے اس چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ آنکھیں اس لمحے اس کے وجود سے یکسر لاتعلقی نظر آنے کی کوشش کر رہی تھیں اور یہ ترڈ یقیناً دانستہ تھا۔ ”بیٹا! ایک گاڑی تو ورکشاپ میں ہے اور دوسری تمہاری ماما لے گئی ہیں۔ تم انتظار کر لو۔“ آتی ہوں۔“ دادا ابا نے کہتے ہوئے اپنی رست واپس دیکھی تھی۔

انابہ شاہ کی آنکھوں کی الجھن جیسے بڑھ گئی تھی۔ کتنی کوفت سے لب بھیجے تھے اس نے۔ تبھی دادا ابا

عفتان علی خان کی سمت دیکھا تھا۔

”تم عفتان کے ساتھ چلی جاؤ۔۔۔ کیوں بیٹا! کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا؟“

”ارے نہیں دادا ابا!“ عفتان علی خان مسکرایا تھا۔

انابہ شاہ نے اپنے سامنے موجود شخص کی جانب دیکھا تھا۔ دادا ابا کی اجازت کے بغیر اس کے لئے کسی طرح کا تعرض برتنا جیسے ناممکن ہو گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا سوائے اس لمحے عفتان علی خان کے ہمراہ ہونے کے۔ بہت خاموشی کے ساتھ عفتان علی خان کی سمت نکلتے ہوئے اس نے قدم آگے بڑھائے تھے۔ عفتان علی خان کے لبوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ اُبھری تھی۔

”شکریہ۔“ بہت مودب انداز میں وہ جبکہ کر دم انداز میں گویا ہوا تھا۔ انابہ شاہ نے قدم اٹھاتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”کس بات کا شکریہ؟“

”میرے ساتھ آنے کے لئے۔۔۔ یہ اعتبار سونپنے کے لئے۔ جانتی ہیں دوستی میں اعتبار کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ پہلی اینٹ کہلاتا ہے یہ۔“

انابہ شاہ نے گلاس ڈور کھولتے ہوئے کسی قدر حیرت سے اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر اسی قدر روڈ انداز میں گویا ہوئی تھی۔

”کون سی دنیا میں رہتے ہیں آپ محترم عفتان علی خان؟ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا آپ اخذ کر رہے ہیں۔“ لہجہ اور انداز کسی قدر لاتعلقی تھا۔ مگر اس کے ہم قدم چلتا ہوا شخص بہت طمانیت سے مسکرا دیا تھا۔ انابہ شاہ خاموشی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔

”ناراض ہیں اب تک؟“ ننگلی ختم نہیں ہوئی اس دن والی؟ حالاکہ میں نے آپ کا نقصان حتیٰ الامکان حد تک پورا کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔“

انابہ شاہ نے اس کی سمت اک نگاہ کی تھی، پھر لب بھیج کر بہت دھیسے سے مسکرائی تھی۔

”لامع حق کے لئے زندگی کسی امتحان سے کم نہ ہوگی۔ میری سیم چھی ابھی سے اس کے ساتھ ہے۔“

”مگر آسانیاں تلاش کرنے والے کسی قدر بزدل واقع ہوتے ہیں۔ راہ متبادل تلاشنا اور راہ بدل لینا دو کسر متضاد چیزیں ہیں۔ تمہیں نہیں لگتا بزدلی، کم ہمتی کی نشانی ہے اور کم ہمتی کوئی قابل ستائش عمل نہیں۔“

جوانا عفتان علی خان نے جانے کیا باور کرانا چاہا تھا۔ آنکھوں کی چمک کسی خاص بات کی نشاندہی کر رہی تھی۔ مگر وہ اس کی سمت سے نگاہ کا زاویہ پھیر گئی تھی۔ وہ اس سے بہت انتہا پسندی والا کوئی رویہ روا نہیں

رکھنا چاہتی تھی۔ رشتے یا تعلق کی کوئی سمت بھی متعین کرنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ ہی دوستی نہ ہی حدود درجہ اجنبیت نہ بہت زیادہ لگاؤ نہ ہی بے زاری۔ وہ اس شخص کے معاملے میں اعتدال پر رہنا چاہتی تھی۔ مگر وہ جانے کیوں ایک لمحے میں صدیاں پھلا گنتا چاہتا تھا۔ شاید اس کا مزاج ہی ایسا تھا۔

یہ دوستانہ مزاج، یہ بے تکلفانہ رنگ، شاید یہ اس کا وصف تھا۔ مگر انابہ شاہ کی اپنی حد بندیوں میں جہنم تک نہ تو خود کراس کرتی تھی نہ ہی کسی اور کو ایسے اقدامات کرتے دیکھ کر سراہ سکتی تھی۔ شاید اسی لئے

عصفان علی خان اس کے لئے کسی قدر ناقابل برداشت تھا۔ مگر وہ اس کا باضابطہ اظہار کرنا نہیں چاہتا وہ لامع حق کے اور اپنے تعلق کے متعلق آگاہ تھی اور عصفان علی خان کے متعلق بھی آگاہ تھی۔ سوچ تو تھی مگر یہ اس کا مزاج تھا۔ وہ اؤل اؤل کی دوستی کو لے کر بہت جلد بے تکلفی برتنے والوں میں سے نہ رہا۔ ”آپ سوچتی بہت ہیں۔“ وہ ڈاکٹرین سے نگاہ ہٹا کر وہ اس کی سمت متوجہ ہوا تھا اور انا بیہ شاہ ہوئے اس شخص کی سمت تینے لگی تھی۔

”خاموشی ایک بات کی بہت واضح اور ٹھوس دلیل ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ بہت سنجیدہ ہیں اور گزارنے سے متعلق بہت مدلل نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ فقط امپریشن قائم کرنا چاہ رہے کہ لوگ آپ کو سنجیدہ اور بردبار جانیں۔ دوسرے معنوں میں عقل مند۔“ وہ بہت شگفتہ انداز میں ہوئے مسکرا رہا تھا۔ انا بیہ شاہ کے لبوں پر بہت ہولے سے مسکراہٹ پھیلی تھی۔

”دیکھ گریٹ۔ میں جانتا ہوں آپ ماشاء اللہ سے خاصی ذہین و فطین واقع ہوئی ہیں۔ بات وارہ تو اسے جتانے کی سعی قطعاً نہیں کرنا چاہئے۔ مد مقابل شخص کو خواہ مخواہ شرمندہ کرنے والی بات ہوتی۔ بہت خوش گوار انداز میں کہتے ہوئے وہ مسکرا رہا تھا۔ انا بیہ شاہ لب بھیج گئی تھی۔ پھر کسی قدر نرم لہجے میں ہوئی تھی۔

”اور جو لوگ بہت زیادہ بولتے ہیں ان کے متعلق کیا خیال ہے آپ کا؟“

”خاصے اچھے ہوتے ہیں۔ کم از کم اتنے پیچیدہ واقع نہیں ہوتے کہ انہیں شاریات کا کوئی سوال دے دیا جائے۔“

”میں شاریات کا کوئی سوال ہوں؟“ انا بیہ شاہ نے اس رائے زنی پر کسی قدر حیرت کا اظہار کیا اور عصفان علی خان نے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”دقیق چیزیں کبھی کبھار بہت لطف دیتی ہیں۔ لگن اور شوق اور بھی سوا ہوا جاتا ہے۔“

”لامع بہت سادہ ہے۔ بہت سادہ چیزیں اچھی لگتی ہیں اسے۔“ پتہ نہیں کیا جتانے کی کوشش تھی۔ وہ بھر پور انداز میں ہنسا تھا۔

”اور مجھے مشکل اور دقیق۔ میرا مزاج اس قدر سادہ نہیں ہے مگر مجھے سادگی اچھی لگتی ہے۔“ اس چہرے کو یہ غور تھا۔ لبوں پر بہت گہری مسکراہٹ تھی۔ ”جو دلکشی اور رعنائی ان سادہ چہروں میں ہوتی۔ بعض اوقات بہت دلکش اور پُر آرائش چہروں میں بھی ہوتی۔ کوئی جادو سی بات ہوتی ہے ان جادو چہروں پر۔ دل خود بخود کھینچنے لگتا ہے ان کی جانب۔ کچھ ایسے کہ اختیار وہ ہی نہیں پاتا خود پر۔“

”مہم لہجے میں کہتا ہوا وہ جانے کیا یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انا بیہ شاہ کچھ سمجھ نہ سکی تھی۔ ہاں عصفان علی خان کی طرف سے بہت دلکش تھی۔ آرائش و زیبائش کرنا، جیسا سنو رانا سے بہت اچھا لگتا تھا۔“

”مجھے جمیل سی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں انا بیہ شاہ اساکت، وسیع اور سبک، کچھ گہری، کچھ خفی سی، کبھی رنگوں میں بہتی ہوئی، کبھی خود سے بھی انجائی، کبھی اتنی پُر سکون، اتنی سادگی کہ سوئی بھی گئے تو آواز آئے آہٹ سے جان میں اک قیامت بچ جائے۔ اور کبھی اتنی پُر بچل کہ اک جہاں میں اضطرابیت بھر جائے۔“

ہاتھی خاموش، اتنی چپ کہ بہت سے رازوں سے واقفیت کے لئے دل مائل ہوں۔ اور کبھی اتنی پُر شور ہاں اس کی آہٹوں سے گونجنے لگیں۔ سارا وجود اس کے مدھر شور سے بھر جائے۔“

کتنا بہم تھا اس کا لہجہ۔ کتنے گہرے انکشافات تھے۔ وہ کیوں کہہ رہا تھا ایسا سب کچھ۔ کیوں انوکھے رہا تھا۔ کیا جانتا مقصود تھا اسے۔ کن رازوں سے واقفیت چاہتا تھا وہ، یا پھر کن باتوں سے روشناس ناچاہتا تھا وہ؟ کیا جتنا چاہتا تھا؟ کیا مقصود تھا اسے اس گھڑی۔

اک دوست سے، اک دوست کی معمولی سی نوعیت کی کوئی بات؟

کیا واقعی وہ اس سے اپنے اندر کی کوئی بات شیئر کر رہا تھا؟ کیا واقعی وہ کوئی دوست ڈھونڈ رہا تھا اس کوئی ایسی ہی روایت درکار تھی جسے رسم آشنائی کہا جاتا ہے، دوستی کہا جاتا ہے۔

”تم شاید مجھے سمجھ نہیں پا رہے انا بیہ شاہ! اور شاید یہ تمہارے لئے آسان بھی نہیں۔ دو چار ملاقاتوں کوئی کھل ہی کتنا پاتا ہے۔ کوئی کسی کو جان ہی کتنا پاتا ہے۔ مگر میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے تمہیں نہ میں کوئی غلطی نہیں کی۔“ وہ اس پر نگاہ کرتا ہوا کسی قدر سنجیدہ انداز میں گویا ہوا تھا۔

”ایسا نہیں ہے کہ لڑکیوں سے کبھی میرا سابقہ نہ رہا ہو۔ مگر انا بیہ شاہ! مجھے کسی نے کبھی اس طور سے نہیں کیا۔ جانے کیوں دل چاہتا ہے کہ تمہیں وہ سب کچھ ہوں جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ جو میرے دل ہے اور جو کوئی نہیں جانتا۔“ بہت مدہم لہجے میں وہ گویا تھا۔ کیا کہنے جا رہا تھا وہ؟ کیا کہنے کے لئے تمہید باندھ رہا تھا؟

”کیا تم لامع حق کو.....“ جانے کیا سوچ کر اس کے لبوں پر ایک خدشہ اُبھرا تھا۔ وہ چونکا تھا، پھر اربا تھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے انا بیہ شاہ؟“

”پتہ نہیں۔ لیکن مجھے اپنی دوست بہت عزیز ہے۔“ اس کے لہجے میں دوستی کی حاجت کو محسوس تے ہوئے اس نے اس کی بات سن تو لی تھی مگر اس کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی دوست لامع حق کے ماکھ الا سیدہ سناستی۔ شاید بھی وہ کسی قدر اچھے ہوئے انداز میں اس کی سمت تکتی ہوئی سرنفی میں نہ لگی تھی۔

”عصفان علی خان! کچھ مت کہنا۔ کم از کم میں اپنی دوست کے متعلق کوئی فضول بات نہیں سنوں گی۔ تمہیں پسند نہیں ہے تو تم یہ سچ اس کے منہ پر جا کر کہو۔ مجھ سے ہرگز نہیں۔“

”وہ کیکم ہنس دیا تھا۔“

”تم سے کس نے کہا کہ میں لامع حق کی کوئی خامی گنوانے والا ہوں؟ بائے دی وے، کیا کوئی خامی اس میں؟“ وہ کسی قدر بیہولین سے مخاطب تھا۔ انا بیہ شاہ کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ اس لئے کس طرح کا ناظہر کرے۔ شاید بھی وہ خاموشی سے اسے تکتی رہی تھی۔

”لامع سے بہت گہری انسیت ہے نا۔ بہت محبت کرتی ہو اس سے؟“

”اس میں کوئی شک نہیں۔ ہم واقعی اچھی دوست ہیں۔“ انا بیہ شاہ نے بلا تردد کہا تھا۔

سکرا رہی تھی۔ آنکھوں میں ایک عجب شرارت بھری ہوئی تھی۔ شاید یہ اس کے مزاج کا خاصہ تھی یا پھر اس کی آنکھوں کا رنگ ہی ایسا تھا۔ یقیناً یہ چہرہ، یہ خدو خال نے نہ تھے اس کے لئے۔ غالباً اجنبی تو قطعاً نہ تھے۔ وہ پہلے بھی اس چہرے کو دیکھ چکا تھا اور تب اس لئے ان آنکھوں میں ایسی ہی شرارت رکی ہوئی تھی۔ شاید یہ شونی، یہ شرارت اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ اذہان حسن بخاری نے خاموشی سے اس چہرے کی سمت دیکھا تھا جب عزیز مسکراتا ہوا بولا تھا۔

”تمہیں یاد ہے ایک لڑکی بڑی شرارتی ہوا کرتی تھی۔ نچلا بیٹھنا اسے آتا ہی نہ تھا۔ مگر اس کی زیادہ تر نراڑوں کا نشانہ تم ہی بنا کرتے تھے۔ یاد ہے ایک بار جب میں بال کا بیچ ہماری ٹیم جیت گئی تھی تو اس نے ہوا بناٹ فورٹ کے مقولے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے تمہاری پائنتلی کو عین سردی کے موسم میں نہلا دیا تھا۔ درود تمہارے چھوٹے چھوٹے معصوم سے نزلت جو اسے انتہائی کمزور و نحیف نظر آتے تھے انہیں صحت عامہ کے زریں اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے واک شاک کرانے کی غرض سے ایک یوگیم میں سے نکال کر ٹیس کر کے پتے ہوئے فرش پر چھوڑ دیا تھا۔ تاکہ ان کی صحت اچھی ہو جائے۔“ عزیز نے مسکراتے ہوئے یقین لایا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے کسی قدر دلچسپی سے اپنے سامنے موجود لڑکی کو بغور دیکھا تھا۔

”آں، ہاں۔۔۔ تو یہ ہے میری دشمن اعظم۔ وہ چوہا۔“ ایک دل فریب مسکراہٹ نے اس کے ہرے کا احاطہ کیا تھا۔ سامنے کھڑی ساہیہ خان کھلکھلا کر ہنستی چلی گئی تھی۔

”ایکسکیوز می۔ اب وہ چوہا نہیں رہی۔ ہاں، مجھے کچھ یاد ضرور آ رہا ہے کہ میں کسی بابا بلیک شیپ سے نرود کھلی ملی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں وہی شرارت تھی۔ پاپا بیچن میں اسے بابا کہہ کر بلاتے تھے اور وہ نرات سے اسے بابا بلیک شیپ بنا دیتی تھی۔ اذہان حسن بخاری ہنس دیا تھا۔

”نزلت کو چہل قدمی کروانے کا شوق ابھی بھی اسی درجہ ہے کہ کچھ کی ہوئی ہے؟“ کسی قدر شگفتگی سے مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ ساہیہ خان ہنس دی تھی۔ عزیز انہیں ملوانے کے بعد وہاں سے ہٹ گیا۔

”وقت کے ساتھ کبھی کبھی بہت کچھ پیچھے چھوٹ جایا کرتا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے تم اب بھی ملی کے پھولنے چھوٹے بچوں کو ابا کے بڑے سے جوتے میں سلاتے ہو گے۔“

اذہان حسن بخاری کا تہقہ بہت بے ساختہ تھا۔

”حیرت ہے۔۔۔ تم نے مجھے اس رات پہچانا نہیں۔“ ساہیہ نے شکوہ کیا تھا۔ تبھی اذہان حسن بخاری اسے بغور دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”شاید تم بہت بدل گئی ہو۔ یا شاید میں بہت بدل گیا ہوں۔ شاید ہم دونوں بہت بدل گئے ہیں۔“

”شاید۔۔۔ مگر تم جانتے ہو میری یادداشت بہت اچھی ہے۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔

”اچھا۔“ وہ چونکا تھا۔ ”تو اس رات تم نے مجھے پہچان لیا تھا؟“

”شاید۔“ انداز کسی قدر شرارت سے پڑھا۔

اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا۔

”اور میں۔“

انابہ شاہ خاموشی سے نکلتی رہی تھی۔ تبھی وہ مسکراتے ہوئے اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔

”مجھے جھیل سی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں انابہ شاہ! اور تم.....“ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے پارک سامنے گاڑی روک دی تھی اور دھیسے سے مسکرایا تھا۔

”لامعہ حق تم جیسی نہیں ہے انابہ شاہ!“ مدہم لہجے میں کہتے ہوئے سر بہت ہولے سے اٹھا تھا۔ انداز کسی قدر پُر افسوس تھا۔ انابہ شاہ کتنی ساکت سی نکلتی گئی تھی اسے۔ پھر یکدم ہی جیسے بیہ اور دروازہ کھول کر باہر نکل کر کتنی سرعت سے چلتی ہوئی وہ آنکھوں سے اوجھل ہوئی تھی۔ شاہ دانستہ تھا۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔

”لامعہ حق تم جیسی نہیں ہے انابہ شاہ!“ مدہم سرگوشی کسی قدر اُلجھی ہوئی تھی۔ کتنی مہم بات تھی۔ اشارہ نہ تھا۔ مگر اس کے اندر ایک لمحے میں جیسے ایک تغیر واقع ہوا تھا۔

شاید..... شاید اس لئے کہ عفتان علی خان نے لامعہ حق کو اس کے سامنے رک دیا تھا۔ اسے

’مجھے جھیل سی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں انابہ شاہ! اور تم.....‘ ادھورے فقرے نے کتنی دیر تک اندر اپنی بازگشت بنائے رکھی تھی۔

”لامعہ حق تم جیسی نہیں ہے انابہ شاہ!“

کیا جتنا مقصود تھا اسے؟ کیا واضح کرنا چاہتا تھا وہ؟ اور پھر وہ اسے لامعہ حق سے کہنا رہا تھا؟۔۔۔ یہ موازنہ کس لئے تھا؟ اور ان دوستوں کے مابین ہی کیوں تھا؟

کیا یہ فقط رائے زنی تھی؟

اک عام سا تجزیہ یا پھر.....

انابہ شاہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ مگر یہ ضرور تھا کہ عفتان علی خان کی اُلجھی ہوئی باتوں بہت اُلجھا سا دیا تھا۔ بہت عجیب شخص تھا وہ۔ بہت عجیب باتیں تھیں اس کی۔ انابہ اب تک اسے تھی۔ لامعہ حق کی کیفیت جانے کیا تھی؟

ساہیہ خان زینہ اتر رہی تھی جب اسے اذہان حسن بخاری، عزیز کے ساتھ کھڑا نظر آیا۔

دل فریب مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر گئی تھی۔ بہت ہولے سے وہ اس کی سمت بڑھی تھی۔

”اے ساہیہ! کہاں جا رہی ہو تم؟“ عزیز نے اس کی سمت دیکھا تھا تو فوراً پکارا تھا۔

وہ مسکراتی ہوئی اس کے مقابل آن رکی تھی۔ اذہان حسن بخاری اس جانب متوجہ ہوا تھا۔

طور پر کوئی تاثر نہ اُبھرا تھا۔ تبھی عزیز نے مسکراتے ہوئے ساہیہ خان کی سمت دیکھا تھا۔

”جانتے ہو اذہان! کون ہے یہ؟“

سید اذہان حسن بخاری نے اس چمکتی آنکھوں والی لڑکی کی سمت نگاہ کی تھی جو اس لمحے بڑی

سایہ ہنس دی تھی۔

”تہ سبھی کے دن شاید بہت بھلے ہوتے ہیں۔ کیا کر رہے ہو آج کل؟ سنا ہے بڑے ذمے دار ہو۔ برنس سنبھال لیا ہے۔“

”ہوں۔“

”اور بال بچے؟“ کسی قدر شرارت سے مسکراتے ہوئے اذہان حسن بخاری کی سمت دیکھا تھا۔

”بال بچے؟“ وہ لہجہ بھر میں چونکا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں کی شرارت نکلتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”اپنے پوتے کے لئے لڑکی تلاش کر رہا ہوں۔ اگلے برس تک شادی بھی کروں گا۔ ویسے تمہاری نظر کوئی اچھی لڑکی ہو تو بتاؤ۔“ وہ زریب مسکراتا ہوا بولا تھا۔

سایہ نے لب بچھڑ کر اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر دونوں یکدم کھلکھا کر ہستے چلے گئے تھے۔

بچے دوست عرصہ دراز بعد ملے تھے۔ کرنے کے لئے بہت سی باتیں تھیں۔ وہ ارد گرد کے ماحول سے پرہیز بہت گن انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ جب اگینے وہاں آئی تھی۔

”لے دوں دوست؟“ کیا ساری جمع شدہ باتیں آج ہی کر لینے کا پروگرام ہے؟“

اتے ہوئے ان دونوں کی سمت دیکھا تھا۔

”بھپو! آپ نے دعویٰ کیا تھا نا کہ میں اذہان کو پہچان نہیں پاؤں گی؟“ سایہ نے کہا۔

”ہاں۔۔۔ مگر میں جانتی ہوں وہ دعویٰ اب رد ہو چکا ہے۔“ اگینے پُر افسوس انداز میں کہتی ہوئی

کی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اگینے کی سمت بہ غور دیکھا تھا۔

اگینے! آپ بھی شامل تھیں اس سارے کھیل میں؟۔۔۔ بائی گاڈ، مجھے آپ سے ایسی توقع نہیں

اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے شکوہ کیا تھا۔

مجھے کچھ زیادہ علم نہیں۔ ہاں، عزیر سے تم اس بابت دریافت کر سکتے ہو۔“ اگینے نے قطعاً لاعلمی کا

باتھا۔

کچھ زیادہ تو نہیں کیا۔ بس لائسنس ہی تو مانگا تھا۔ اور تم، کتنی نقل گفتگو فرما رہے تھے۔ یہ بڑے بڑے

روز۔۔۔ بالکل دادا ابا لگ رہے تھے۔ جو اب کیسی مشکل ہوئی تھی مجھے بھاری بھاری لفظ ڈھونڈنے

سایہ مسکرائی تھی۔ اذہان حسن بخاری بھی ہنس دیا تھا۔

چھاب چلو، وہاں بلال کی رسم ہونے جا رہی ہے۔ تم لوگ اپنی یہ ساری باتیں بعد میں کر لیتا۔“

نہ مسکراتے ہوئے اذہان حسن بخاری کو دھکیلا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے ایک نگاہ کی تھی اگینے پر۔

بڑھ گیا تھا۔

”آپ کے لئے بہت اہم موقع ہے یہ غالباً۔“ اذہان حسن بخاری نے چلتے ہوئے اگینے کی

لجھکتا

دکھ لے؟“ اگینے قدرے حیران ہوئی تھی۔

بس کے مشن امپائل کو سرانجام دینے کے لئے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”تمہیں پہچانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میں دور سے دیکھ کر ہی جان گئی تھی۔ یہ جو موصوفہ افلاطون نظر آنے کی کوشش کر رہے ہیں یہ یقیناً اذہان حسن بخاری ہی ہیں۔“ اس کے انکشاف پر حسن بخاری ہنس دیا تھا۔

”تم اب بھی اسی طرح بے تکان بولتی ہو۔ حیرت ہے، میں نے اس رات تمہیں سن کر بھی کیا پہچانا۔ حالانکہ وہ لڑکی دنیا میں واحد ہو سکتی ہے جو بی باون کی طرح تابز توڑ جملے کرنے میں اپنا ٹاٹا رکھتی۔“

سایہ خان کھلکھا کر ہنستی چلی گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری اس کی سمت بہ غور دیکھ رہا تھا۔ یقیناً والی شاہتوں سے کہیں زیادہ بدل چکی تھی۔

”کب لوٹی ہو کیلگری سے؟“ اذہان حسن بخاری نے دریافت کیا تھا۔

”دو چار روز قبل ہی۔ بلال چاچو کی شادی تھی۔ کیسے نہ آتی۔“

”کیلگری میں سب کیسا چل رہا ہے؟ کیا کر رہی ہو تم وہاں؟ شادی وادی تو غالباً۔۔۔“

حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے جملہ غالباً جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہنس دی تھی۔

”اب تک اتنے ہی منہ پھٹ ہو، اتنا بھی نہیں جانتے، لڑکیوں سے ایسے بے نکتے سوالات چھوڑ نہیں پوچھ لئے جاتے۔“ سایہ خان نے اسے جتایا تھا۔

اذہان حسن بخاری ہنس دیا تھا۔

”پوچھوں گا نہیں تو علم کیسے ہوگا؟ ویسے اتنے سالوں میں تم نے پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ اتنی غلطیاں تھیں ہم سے؟“ بہ غور نکلتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”غالباً نہیں۔ بس مصروفیت کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ وقت ہی نہیں ملا۔“ سایہ نے شانے اچکاتے ہوئے

کسی قدر بے فکری سے کہا تھا۔

”تم کب سے وقت کی پابند ہو گئیں؟ تمہیں تو وقت سے غالباً آگے بھاگنا اچھا لگتا تھا۔ بھول گئے اکثر تم گھر کے لئے دیا جانے والا ہوم ورک وہیں سکول کی لائبریری میں بیٹھ کر سرانجام دے لیا کرتے تھیں۔“

”ہاں۔۔۔ اور تم ہوم ورک کے بغیر بڑی بے فکری کے ساتھ باسکٹ بال کھیلتے رہتے تھے۔ کتابیں ڈال کر کھرتے تھے۔“

اور تم کتنی پڑھا کرتی تھیں۔“ اذہان حسن بخاری کو کہتے ہوئے یکدم یاد آیا تھا۔ سبھی اس نے لمحہ بھر سے پوچھتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تھا۔ نظروں میں کسی قدر شرارت آن رکی تھی۔

”وہ تمہارا موٹا سا چشمہ کہاں گیا؟ وہ تو غالباً تمہاری ذہانت کو پروف کرنے کے لئے اہم ترین مشین تھا۔ یاد ہے جب ہم ایک بار باغ میں امرود توڑ کر بھاگ رہے تھے تو ہم سب دھر لے گئے تھے۔ ماحول تمہارے۔ اور جانتی ہو وجہ کیا تھی؟ یقیناً تمہارا وہ بقراطی چشمہ۔ اکل نعمان کو لگا تھا کہ تم اتنی ذہین تھی

ایسی ویسی کوئی شرارت کر ہی نہیں سکتیں۔“ وہ بڑی دلچسپی سے اس کی سمت نکلتا ہوا مسکرا رہا تھا۔

”جیک گاڑ اور تم نے فون کر کے مطلع بھی نہیں کیا؟“ سیفی نے شکوہ کیا تھا۔
”ہاں تو ہے، کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اب بھی سوچ ہی رہی تھی کہ تمہارا فون آ گیا۔ بے جی کسی
اور باتیں؟“

”اب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ اور تم.....؟“ سیفی نے جملہ ادھورا چھوڑ کر کچھ ٹائٹوں تک خاموشی اختیار کی
۔ جانے کیا کہنے جا رہا تھا وہ جب میرب سیال فوراً بولی تھی۔
”سیفی! تم بے جی کو مطلع کر دینا۔ پایا بہتر ہیں اب اور میں بھی جلد واپس آ رہی ہوں۔“

”اور.....؟“

”اور کچھ نہیں۔“ لہجہ بہت پرتھکن تھا۔

”تم مستقل پریشان ہونا میرب سیال؟“ سیف الرحمن نے جواباً دریافت کیا تھا۔

”ہاں، وہ پایا کی وجہ سے.....“ وہ کوئی جواز دینے جا رہی تھی جب وہ تیزی سے اس کی بات کا ٹاٹا ہوا
نا۔

”یہ ٹھیک نہیں ہے میرب سیال! تم خود کو کہیں بھول رہی ہو۔“

”بھول چکی ہوں۔“ بہت مدہم، شکستہ سا انداز تھا۔ ایک دوست کے سامنے خود کو پوشیدہ نہیں رکھ پائی
۔ شاید اسے بھی کوئی جگہ درکار تھی وئی لیشن کی، جس بے جا بڑھ گیا تھا۔ غبار سے سارا وجود ڈھک گیا
ٹھیک اس کا دم گھٹ جاتا اگر یوں تو تھوڑی دیر چپ رہتی تو۔ کتنی خاموشی سے آنکھوں سے پانی کے
سٹوٹ کر رخساروں پر بہنے لگے تھے۔

”کس کے لئے میرب سیال؟“ کس کے لئے یہ سب، جب تم خوش نہیں ہو۔ جب اندر کہیں
ان ہی نہیں ہے۔“ سیف الرحمن کا دل اس کے ان کہے بھید سے جیسے واقف تھا۔ شاید دوستی کی واضح
لگا ہے۔ ہندہ سو کوس کی دوری پر بھی بیٹھا ہو تو اپنے کسی کا احوال اس کے دل میں خود بخود اترنے لگتا
اور یوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

”کتنی کتنی بہت کچھ سہنا پڑتا ہے سیف الرحمن! دانستہ..... جان بوجھ کر..... جبراً۔“

”تم کیوں یہ جبر سہ رہی ہو؟“ کیا مجبوری ہے میرب؟ تم نے انکل کے باعث یہ فیصلہ کیا تھا
راب تو وہ بہتر ہو چکے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ تم اس شاہ زادے کی قید میں مزید رہو؟ میرب! تم
مجھ سے نہ کہو، چاہے لاکھ پوز کرو مگر میں جان گیا تھا، اول روز سے ہی، تمہاری آنکھیں بہت بھر ہو
گئیں۔ واضح دلیل تھی ان میں کسی اذیت کی۔ مجھے بھی لگا تھا جیسے کوئی معصوم سی، ننھی پری کسی ظالم دیو کی
ماد لگی ہو۔ ہوا کیا ہے؟ کیا اس نے تمہیں ہرٹ کیا ہے؟“ سیف الرحمن دریافت کر رہا تھا۔ مگر وہ
باغیاب کچھ نہیں بولی تھی۔ ایک لاوا چپ چاپ جلتی آنکھوں سے بہتا ہوا سارے وجود کو جلاتا رہا تھا۔
”ایک باشعور لڑکی ہو میرب سیال! اب اپنے فیصلے خود بھی کر سکتی ہو۔“

”کیا..... کیا کروں میں سیفی؟ اس سے کیا گلہ کروں؟ اُبھنیں تو خود آپ میرے اندر ہیں۔ کتنی
ماسے جکڑا ہوا ہے میرا وجود۔“

”مشن امپائل؟“ اگینے چونکی تھی۔ اذہان حسن بخاری بہت دھیمے سے مسکرایا تھا۔
”سنا ہے شادیوں میں لڑکیوں کی بڑی بھر مار ہوتی ہے۔ اور ایسے میں کئی میچ میکر اپنا کام پایا
لیتے ہیں۔“ وہ یقیناً سنجیدہ نہ تھا۔

”اذہان!“ اگینے نے مسکراتے ہوئے تعبیر کی تھی۔

”یہ آپ دونوں کیا کھسر پھسر کر رہے ہیں؟“ ساہیہ نے دونوں کی طرف دیکھا تھا۔ اس
اگینے کوئی وضاحت کرتی، اذہان حسن بخاری نے سرفٹی میں ہلا دیا تھا۔

”بچوں کے سننے کی باتیں نہیں ہیں۔“

”اذہان!“ ساہیہ نے ہاتھ کانٹا کر اس کے شانے پر دے مارا تھا۔

”بڑا ہو گیا ہوں میں۔ ابھی بھی مار رہی ہو۔ تیور نہیں بدلے ہیں۔“

”تیور بدل لوں گی تو تمہیں ٹریٹ کیسے کروں گی؟ تم جیسے بندے سے نمٹنا آسان ہے
یہ بات مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔“

اگینے نے ان دونوں کو مسکراتے ہوئے بے غور دیکھا تھا۔

پایا سے ملنے کے بعد وہ بہت تھکی ماندی سی لوٹی تھی جب سیف الرحمن کا فون آ گیا تھا۔ باؤہ
کمزوری اور تھکن کے وہ اس کے فون کو نظر انداز نہ کر سکی تھی۔

”کہاں غائب ہو؟“ صبح بھی فون کیا تھا۔ اطلاع ملی، تم ہر بیڈوائف دونوں صاحبہ
فکر ہو رہی تھی تمہاری۔ کل رات سردار صاحب سے بات ہوئی تھی۔ فرما رہے تھے کچھ طبیعت
تمہاری کیا ہو گیا؟“ سیف الرحمن نے کسی قدر سنجیدہ ہوتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ وہ چونک گئی
”کب..... کب کال کیا تھا تم نے؟“

”غائباً کل رات۔ کیوں، کیا ہوا؟“ موصوف تمہیں بتانا بھول گئے یا جان بوجھ کر نہیں بتایا؟“
”سیفی! ایسی بات نہیں ہے۔ شاید مصروفیت کے باعث وہ بتانا بھول گئے ہوں۔“ وہ وضاحت

ہوئی بولی تھی۔ تبھی وہ بولا تھا۔

”تمہیں سردار سیکٹنگین حیدر لغاری کو ڈی فنڈ کرنے کی ضرورت نہیں ہے میرب سیال! خیر تم
کیا ہو گیا تھا؟ اپنا خیال نہیں رکھ رہی ہو؟“

”نہیں، سب ٹھیک ہے۔ بس پایا کے باعث بہت پریشان ہوں۔ اب بہتر ہوں۔“ میرب سیال
ہاتھ سے سر کو بہت ہولے سے سہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”تمہیں اپنا خیال رکھنا چاہئے میرب سیال!“ سیفی نے بہت مخلصی سے باور کرایا تھا۔

”ہاں، جانتی ہوں۔“

”انکل کیسے ہیں اب؟“

”پیلے سے بہتر ہیں۔ سرجری کامیاب رہی ہے۔“

مرد انداز میں اس کے سامنے کھڑی تھی اس لمحے۔ بہت مضبوط ہونے کا دعویٰ کرتا ہوا ثابت ہوا تھا۔ کتنا جوتا پہلا وہ تھا۔ ایک دم ڈھکوسلا۔

سردار بنگلین حیدر لغاری آہنی دیوار بنا اس کے سامنے کھڑا تھا کہ کسی طرح کی کوئی مزاحمت بہت بے مہنی لگ رہی تھی۔

”موسموں کے احوال چہروں پر درج ہونے لگتے تو سارے مسئلے جنم ہی کیوں لیتے؟ خاموشیاں فقط الجھنیں بڑھاتی ہیں۔ خواہشوں کی تیلیاں پکڑنے کے لئے عملی اقدام بہت ضروری خیال کئے جاتے ہیں۔ رنگ یونی ہاتھ نہیں آجاتے۔ دکشی اور رعنائی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ جھوٹے دعوے فقط ایک پہلا ہوتے ہیں۔ بارشوں میں بیچکنے کا شوق ہو تو کمرے کے اندر دب کر نہیں بیٹھ جاتے۔ نم ہونے کے لئے قطرے قطرے کا تعاقب کرنا پڑتا ہے۔ شوق تمنا بڑھنے لگے تو لب نہیں ہی لے جاتے۔ آنکھوں کی کہانیاں کوئی کہاں تک پڑھ سکتا ہے؟ بنا کہے سے کہاں تک جان سکتا ہے؟۔۔۔ جلو مان لیا ایسا ہو بھی جائے تو کبھی بھی عقدہ کھلنے میں دیر بھی تو لگتی ہے۔ خوابوں کی حقیقت آنکھوں سے مت پوچھو۔ دل کی دلیلوں پر مگر ہونا کہاں کی عقلمندی ہے، ہوں۔“ بہت آہستگی سے اس سخت چہرے کو چھوتے ہوئے کتنی آہستگی سے وہ اس گھڑی مخاطب تھا۔ میرب سیال کی ساری جان جیسے قیامت کے زیر تھی۔

”کہاں درج ہے کہ کہانیوں کو عیاں نہ کرنے کے بھی ثواب ہوتے ہیں؟ تسلیم درضا کے باب، بنا کسی زرد کے منکشف ہو سکتے ہیں؟“ اس کے چہرے کو شہادت کی انگلی سے قدرے اوپر اٹھاتے ہوئے اس انگل چہرے پر بغور ایک نگاہ کی تھی۔

”علاج چارہ گر کے پاس ہو تو رجوع کرنے میں دیر کرنا کہاں کی دانشمندی کہلاتی ہے؟“ کتنے سوال تھے سردار بنگلین حیدر لغاری کے لبوں پر۔ مگر میرب سیال کے لبوں پر جیسے اس گھڑی چپ سی لگی تھی۔

”چارہ سازی بھی تھی عمل میں آتی ہے جب اندیشہ ہائے فکر ستائے اور غافل تو یہاں کوئی نہیں۔ پھر نئے سارے الزامات۔ ہواؤں کے بھی رخ ہوتے ہیں۔ بنا رخ کے کوئی آئین سازیاں نہیں ہوتیں۔“ بنا گرم گرم سانسوں اس کے چہرے پر منتقل کرتے ہوئے کسی قدر آہستگی سے اسے اپنی گرفت سے آزاد کیا۔ میرب سیال اپنا شل سا وجود لے، آنکھیں نیچے کھڑی رہی تھی۔ بالکل ساکت وجود جیسے پتھر ہو گیا تھا۔ مگر کسی بھی طرح کے نتیجے کی پرواہ کئے بغیر بنگلین حیدر لغاری پلٹا تھا اور بہت رسانیت سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ اپنے اندر کی قیامتوں میں گھری میرب سیال کتنی دیر تک اسی طرح کھڑی رہی تھی۔ قیامت جو بگڑا ہوا تھا وہ کوئی خواب نہ تھا۔ نہ سراپا تھا۔

اس شام عصفان علی خان پھر اس کے سامنے موجود تھا اور وہ کسی قدر آکٹا ہٹ سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ دادا انا نماز پڑھ رہے تھے اور مہمان نوازی کا تقاضہ یہی تھا کہ اسے اچھی طرح سے ٹریٹ کیا جاتا۔ وہ ٹائیٹ سے بیٹھی بی بی دیکھی رہی تھی۔ ماما نے یقیناً اس کی آؤ بھگت کرنا ضروری خیال کیا تھا۔ شاید یہی اس لئے کہ کسی قدر کسلندی سے اپنی جگہ پر جمی بیٹھی رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی مروت کا مظاہرہ کرے مگر اس سے

یکدم آہٹ ہوئی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ دروازے کے بیچوں بیچ سردار بنگلین کھڑا تھا۔ میرب سیال ساکت تھی۔ اس کی سمت جھکتی رہ گئی تھی۔ سردار بنگلین حیدر لغاری نے، سے پیش قدمی کی تھی اس کی سمت اور چلا ہوا اس کے قریب آن رکھا تھا۔ میرب سیال ریسیور کے ساتھ، ساکت ہی اسی طرح اس کی جانب متوجہ تھی جب سردار بنگلین حیدر لغاری نے اسے ملنے، آہستگی سے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کریڈل پر ڈال دیا تھا اور اسے بہ غور تکتے ہوئے سے ہاتھ کو تھام لیا تھا۔ یہ پہلا دانستہ اقدام تھا۔

پہلا دانستہ بخشا جانے والا لمس تھا۔ میرب سیال کا ہاتھ جیسے کسی انگارے نے چھو لیا تھا کیسی بے نام سی تپش سرایت کر گئی تھی اس کے پورے وجود میں۔ کتنا قریب تھا وہ۔ شاید آٹھ سے اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی مخصوص خوشبو سے سارا ماحول بھر گیا تھا۔ میرب سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اس لمحے وہ بغور اس کو دیکھ رہا تھا۔ میرب سیال کی آنکھیں اسی طرح سے بھری ہوئی تھیں جب سردار بنگلین حیدر لغاری نے بہت ہوئے سے ہاتھ بڑھا کر ان کے اپنے پوروں پر لپٹا تھا۔

”التفات کے کون سے روپ دیکھنا چاہتی ہو تم؟۔۔۔ وارنگی کی کون سی حد؟“ کتنے لمحے وہ اس گھڑی مخاطب تھا۔ نگاہ کتنی پر تپش تھی۔ اس کی کلائی اس کی آہنی گرفت میں تھی۔ سارا وہ نگاہوں کی تپش سے جلنے کو تھا۔

”کوئی گلہ تھا تو شکایت کی ہوتی، ازالہ کیا نہ ہوتا؟“ اس کے چہرے کو بغور تکتے ہوئے کہا تھا۔ میرب سیال کتنی گرم گرم سانسوں کو اس لمحے اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ کتنی سارے وجود میں۔ اندر کہیں بھونچال آیا ہوا تھا۔

سردار بنگلین حیدر لغاری کے تیوروں سے واقف کہاں تھی وہ؟ کہاں منکشف تھے اس پرانے کے مخفی رنگ؟ کہاں کوئی عقدہ کھلا تھا اس پر۔

وہ تو ابھی فقط اول اول کی راہوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اس حیرت کدے سے ہی باہر نکلے جو اس شخص نے اس کے سامنے بچھا دیا تھا۔ وہ اس دنیا سے ہی الگ نہ ہو رہی تھی جس سے مرضی کے برعکس جدا کیا گیا تھا۔ وہ تو ابھی تک انہی پہیلیوں میں کھوئی ہوئی تھی جو اس کے اٹھ رہی تھی۔ پھر کیسے۔۔۔ کیسے سمجھ پاتی اس شخص کو؟

اور سمجھنا آسان تو نہ تھا۔

”رنگوں میں کھیلنے کا شوق تھا تو کچھ اظہار مدعا کیا ہوتا۔ یوں بے نام الزامات تو نہ عائد کئے ہاتھ بڑھا کر کتنے ہوئے سے اس کے چہرے کو چھوا تھا۔ میرب سیال کے اندر جیسے قیامتوں تھا۔ نازک وجود بہت ہوئے ہوئے لڑنے لگا تھا۔ شاید وہ بہت خوفزدہ تھی۔ شاید یہ اندازہ ڈھنگ، یہ وہ صف اس کے لئے بہت نئے تھے۔

ان تجربہ بات سے پہلی بار سابقہ ہوا تھا۔ ان رنگوں سے پہلی بار آشنا ہو رہی تھی وہ۔ چہرے

یہ سب نہیں ہوتا تھا۔ کم از کم اس حد تک تو نہیں۔ یقیناً یہ بہت مشکل تھا اس کے لئے۔ مگر عثمان کے لئے فاصلے سینٹا شاید بہت آسان تھا۔

جس طرح اس لمحے وہ چائے کا کپ لئے اس کے قریب آن بیٹھا تھا، اسے سامنے دیکھ کر نظر یقیناً مناسب نہیں تھا۔ شاید کبھی وہ سنبھل کر بیٹھے ہوئے کسی قدر مروٹ کا مظاہرہ کرتی ہوئی مسکرائی۔

”ایک بات بتاؤ؟“ عفنان علی خان چائے کے سب لیتا ہوا بہت دھیمے سے مسکرایا تھا۔

شاید تمہیں بتایا نہیں۔ تم مروٹا مسکراتی ہوئی قطعاً اچھی نہیں لگتیں۔“

”تو پھر؟“ وہ یکدم شرمندہ ہوئی تھی۔ شاید اسی لئے اس لمحے کھل کر مسکرائی تھی۔

”مروٹ کچھ بڑھ گئی ہے ان لمبوں پر۔“ مسکراتے ہوئے کسی درجہ رسائیت سے باور دیا تھا انابہ شاہ لب بھینچ کر رہ گئی تھی۔ پھر شاید اسی بے دھیانی اور خجالت میں جھینٹل تبدیل کرنے لگی تھی۔

”جانتی ہو، ان بے واسطہ، سرد، منجمد لمحوں میں، میں قربتوں کی کہانیاں کیوں لکھ رہا ہوں؟“

”کیوں؟“ انابہ شاہ ٹی وی اسکرین کی سمت نکلتی ہوئی بہت آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔ عفنان اس کی سمت تکتا ہوا بہت دھیمے سے مسکرایا تھا۔

”کیونکہ مروٹوں میں لپٹے موسم مجھے نہیں بھاتے۔ سرد مہریوں میں ڈوبے، کبر آلود منظر بہت لگتے ہیں مجھے۔ رنگوں کا شٹا مجھے قطعاً پسند نہیں۔ منظروں کے بنجر پن سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔“

چہرے، بے رابطہ لہجے، بے رنگ منظر تکتا یقیناً تکلیف دہ فعل ہے۔ اور میری مشکل یہ ہے کہ میں نہیں جھیل سکتا۔ منظروں کو رنگوں سے ڈوبنے سے بچانے کے لئے یہ قصد کرنا ضروری تھا انابہ شاہ اقدام کرنے سے باز نہیں رہا میں۔“

اس کے مدہم لہجے میں کتنے آہنگ تھے۔ مگر انابہ شاہ نے اس کی سمت نگاہ نہیں کی تھی۔ جانے خاموشی کے ساتھ ٹی وی اسکرین کو گھورتی رہی تھی۔ عفنان علی خان نے بہ غور دیکھا تھا اسے پھر آگیا گویا ہوا تھا۔

”قصہ کچھ یوں ہے انابہ شاہ! کہ اختیار کے راستوں پر میرے قدم رہے ہیں اور اضطراروں آ تجربہ بہت نیا ہے میرے لئے۔ گو بہت مشکل صورت حال ہے مگر میں کسی بھی طرح اندھیرے مٹانا چاہتا۔ یہ راستہ، یہ رابطہ، یہ ڈھنگ، یہ سارے فعل سرانجام دینا یقیناً بہت مشکل ہے میرے جانے وہ کہاں کی داستان سن رہا تھا۔ انابہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا۔ بس فقط ایک لمحے کو نگاہ کی تھی۔“

پر کہنیاں لگا بے غور سے دیکھ رہا تھا۔ انابہ شاہ دھیان دوبارہ ٹی وی اسکرین کی جانب مرکوز کر گئی تھی۔

”انابہ شاہ! اس راستے میں، بہت سی کٹھنیاں ہیں۔ مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ اس سے آگے کا ساٹھا گا۔ کسی طرح کا کوئی قیاس نہیں ہے مجھے۔ کسی طرح کا کوئی فرض نہیں کر سکتا۔ مگر یہ سچ ہے کہ ان ڈھ بہت مشکلوں میں گھر گیا ہوں۔“

وہ مدہم لہجے میں بول رہا تھا۔ انابہ شاہ خاموشی سے ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہی تھی جب اچانک آواز ماحول کو اپنے سنگ باندھنے لگی تھی۔

تم میرے سانسوں میں رہتی ہو یولو میں کیا کروں؟

تم میری آنکھوں میں رہتی ہو یولو میں کیا کروں؟

کیا کروں؟

تم میری سوچوں پر بیٹھی ہو یولو میں کیا کروں؟

تم میرے ہونٹوں پر ہنتی ہو یولو میں کیا کروں؟

کوئی کیسے ہو جاتا ہے بے قرار دیا جلتے آجاتا ہے اعتبار

ہر پل لگے وہ کرتا ہے انتظار، دل پر نہ ہوتا ہے اختیار

انابہ شاہ نے عفنان علی خان کی سمت نگاہ کی تھی۔ وہ اس لمحے خاموشی لمبوں پر لئے بہ غور اسے دیکھ رہا

نہ جانے کیسی الجھنیں تھیں، وہ سمجھ نہ پاتی تھی۔ مگر اس لمحے یکدم ہی اس کے چہرے سے نگاہ ہٹاتے

وئے اس نے ریوٹ کا بٹن پیش کرنا چاہا تھا جب عفنان علی خان نے یکدم ہی ہاتھ بڑھا کر ریوٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ انابہ شاہ قدرے چونکی تھی۔ شاید حیران ہوئی تھی۔ مگر وہ بہت اطمینان کے ساتھ

نارٹی اسکرین پر نگاہ جماتے ہوئے یکدم ہی والیوم بڑھانے لگا تھا۔

یہ میرے سینے کی دھڑکنیں تم سے میں کیا کہوں

یہ میری سلجھی سی الجھنیں تم سے میں کیا کہوں

کوئی کیسے ہو جاتا ہے بے قرار، دیا جلتے آجاتا ہے اعتبار

ہر پل لگے وہ کرتا ہے انتظار، دل پر نہ ہوتا ہے اختیار

کتنی گرفت میں لینے والے ڈھنگ تھے۔ کیسے رنگ تھے جو چار سو پھیلنے چلے جا رہے تھے۔ عفنان علی

خان کی بھوری آنکھوں کی چمک اس لمحے کتنی سوا ہو گئی تھی۔ جیسے بہت سے جگنو یکدم ہی کہیں جمل اٹھے

تھے۔ جیسے پل میں سارا ماحول تانناک ہو گیا تھا۔ انابہ شاہ کے لئے وہ صورت حال کس قدر تازہ تھی۔

کتنی حیرت سے وہ اس لمحے اس شخص کی سمت دیکھ رہی تھی۔

یہ دیا جلتا رہے یہ کبھی بھی سمجھ نہ سکے

دنیا میری اب تم سے ہے تم سے ہے دنیا میری

انابہ شاہ کو لگا تھا، اس لمحے عفنان علی خان جیسے عالم مدہوشی میں ہو۔ جیسے اک دیوانگی نے اسے اپنے

نچوں میں جکڑ کر بے بس کر دیا ہو۔ وہ اس کی سمت اسی طرح ساکت سی دیکھ رہی تھی جب وہ اس کی سمت

توجہ ہوا تھا۔ شاید وہ انابہ شاہ کے اپنی طرف متوجہ ہونے پر حیران ہوا تھا پھر مسرور۔ آنکھوں کی بے تحاشا

ہلکے کے ساتھ اس لمحے اس کے لمبوں پر اک و لقریب مسکراہٹ کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

یہ میری عجب خواہشیں تم سے میں کیا کہوں

یہ میری تنہا سی محفلیں تم سے میں کیا کہوں

کوئی کیسے ہو جاتا ہے بے قرار، دیا جلتے آجاتا ہے اعتبار

ہر پل لگے وہ کرتا ہے انتظار، دل پر نہ ہوتا ہے اختیار

تکرار یکدم ہی بڑھنے لگی تھی۔ جانے کیا ہوا تھا، انا بیہ شاہ نے یکدم ہی عزاحت کی تھی اور اٹھا ہوا۔
جب عصفان علی خان نے یکدم ہی اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ انا بیہ شاہ اس گستاخی پر یقیناً حیران ہوا
چونکہ کراسے دیکھا تھا مگر وہ بہت اطمینان کے ساتھ ٹی وی کا ڈائیو کم کرتا ہوا مسکرا دیا تھا۔ انا بیہ
لئے یہ شخص سدا سے ایک الجھن رہا تھا اور اب بھی وہ اسے کسی قدر حیرت سے دیکھ رہی تھی جب
اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے بہت آہستگی سے گویا ہوا تھا۔

”بات سنگین ہے انا بیہ شاہ! مگر اتنی نہیں کہ تم مجھ سے خوفزدہ.....“ بہت دوستانہ مسکراہٹ اس
اس کے لبوں پر تھی۔ پل پل رنگ بدلتا تھا وہ شخص۔ پل پل اپنے اختیار میں کر لیتا تھا۔ کیا تم تھیں
پاس؟ انا بیہ شاہ اسی قدر حیرت سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی جب وہ مسکرایا تھا۔
”اگر مجھے علم ہوتا کہ تم اس قدر خوفزدہ ہو جاؤ گی تو میں وہ بات جو تم سے شیر کرنے جا رہا ہوں
کبھی نہ کرتا۔“ انداز کسی قدر زبردست تھا۔ انا بیہ کے لئے اب بھی وہ شخص، اس کی باتیں معترض
علی خان نے بہ نور نگاہ کی تھی اس پر۔ پھر جیسے ترس آ گیا تھا۔ شاید تھی وہ قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے
کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

”انا بیہ شاہ! معاملہ شاید تمہیں اتنا گہیر نہ لگے مگر ایسا ہونے نہیں سکتا۔ کم از کم اس شخص کے لئے
نہیں جو اس صورت حال سے دوچار ہو۔“ بملہ ادھورا چھوڑ کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔ وہ
حیرتوں میں گھری ہوئی تھی۔ شاید تھی وہ دھیسے سے مسکرایا تھا۔

”چلو بات آسان کے دیتے ہیں۔ تو بات اتنی سی ہے انا بیہ شاہ! کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے
میں، تمہاری ہیپ کی ضرورت ہے۔“ اس نے یکدم اظہار مدعا کیا تھا۔

”کس ضمن میں؟“ انا بیہ شاہ کی ست رنگی آنکھوں میں حیرت بہت واضح انداز میں تیر رہی تھی۔
”دوستانہ امداد، فقط چھوٹی سی رعایت۔“

انا بیہ شاہ نے کسی قدر الجھن سے پُر نظروں سے اسے دیکھا تھا پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر بہت
سے نچی میں ہلا دیا تھا۔

”عصفان علی خان! تمہیں نہیں لگتا، تم بہت پیچیدہ باتیں کرنے کے عادی ہو۔ اب تک تم نے جو
کہا وہ میری سمجھ میں کم از کم بالکل بھی نہیں آیا۔ مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟“ کہنا کیا چاہتے
جو تم کہہ رہے ہو یا پھر وہ جو تم کہہ نہیں پا رہے ہو؟“ کسی قدر زبردست انداز سے وہ اس کی سمت دیکھا
تھی۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، کہہ نہیں پا رہا ہوں۔ لیکن یہ تم
طرح گھور کیوں رہی ہو؟“ اپنی بات وہیں چھوڑ کر وہ یکدم مسکرایا تھا۔ بھوری آنکھوں میں شرارت
واضح تھی۔ جیسے وہ جان بوجھ کر بات کو طول دے رہا ہو۔ انا بیہ شاہ زنج سی ہو کر رخ پھیر گئی تھی جہا
غور اس کی سمت تکتا ہوا بولا تھا۔

”انا بیہ شاہ! جو کچھ بھی ہوا، بہت جلدی میں اور اچانک ہوا۔ میں شاید ابھی اس کے لئے تیار نہ تھا۔“

کے راتے مجھے مرغوب کبھی نہیں رہے مگر اس ضمن میں، میں کوئی لائحہ عمل مرتب نہیں کر پایا اور مجھے ان
بندھوں کا پابند ہونا پڑا جن کے لئے فی الحال میں تیار نہیں تھا۔ دیکھو بڑی کھیل سی بات ہے۔ ایک مرد
ہونے کے نامے مجھے ہر طرح کا حق حاصل ہے مگر تب صورت حال ایسی تھی کہ میرے پاس جیسے کوئی اور
آپشن بچا نہ تھا۔ مگر اب.....“ وہ کسی قدر روانی سے کہتا ہوا یکدم الجھنوں میں گھر گیا تھا۔ انا بیہ شاہ اسے
بہ خورد کھ رہی تھی۔ وہ لب بھینچ کر دھیسے سے مسکرایا تھا۔ پھر انا بیہ شاہ کی سمت مکمل توجہ سے تکتا ہوا بولا تھا۔
”تم سے مدد مانگنے کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ تم بالواسطہ یا بلاواسطہ اس معاملے سے جڑی ہو۔ آئی میں
لامد کی دوست ہونے کے نامے۔ تم دونوں غالباً بچپن سے ساتھ ہو۔ بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ مائین
موجود ہوگی۔ مجھے اسی انڈر اسٹینڈنگ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ انڈر اسٹینڈنگ میرے پاس نہیں ہے۔
میں لامد کے اتنے قریب کبھی نہیں رہا۔ کبھی اس طور سے دیکھا نہیں۔ جاننے کی خواہش کبھی دل میں
ابھری ہی نہیں۔ سو وہ میرے لئے ایک اجنبی دیس کی کوئی اجنبی کہانی جیسی ہے۔ کوئی اجنبی دو چار سرسری
سی ملاقاتوں میں مل کر جتنا کسی دوسرے اجنبی کو جان سکتا ہے اتنا ہی میں لامد حق کے متعلق جان پایا
ہوں۔ یہ بڑی فطری سی کنڈیشن ہے۔ ایسا ہونا کوئی عجب نہیں۔ وہ میرے قریب تھی مگر میں نے اس کی
طرف کبھی دیکھا نہیں، کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ مگر اب..... اب میں چاہتا ہوں انا بیہ شاہ! تم اس
ضمن میں میری مدد کرو۔ تم بہترین دوست ہو اس کی۔ اس کے متعلق تم سے بہتر کوئی اور نہیں جان سکتا۔“ وہ
کہہ کر رکھا تھا۔ انا بیہ جو اسے بہ خورد دیکھ رہی تھی، چونکی تھی۔

”اور.....“

وہ چونکا تھا۔ پھر دھیسے سے مسکرایا تھا۔

”انا بیہ شاہ! زندگی یوں نہیں گزرتی۔ تمہیں نہیں لگتا، بہت مشکل ہے یہ، جس کے متعلق آپ سرے
سے کچھ جانتے ہی نہ ہوں اس کے متعلق کوئی اہم ترین فیصلہ کر لیں۔ زندگی بسر کرنے کی بات تو بہت دور
کی ہے انا بیہ شاہ! میں تو اس کے متعلق سوچتے ہوئے بھی عجب الجھن محسوس کر رہا ہوں۔ تمہاری طرف میں
لڑائی نہیں بڑھا۔ میں چاہتا تھا تم وہ واحد فریق ہو جو یہ گتھی سلجھا سکتی ہو اور تمہیں میری مدد کرنا ہوگی انا بیہ
شاہ! کیونکہ میں اجنبی راستوں پر سفر کرنا نہیں چاہتا۔ بہت مشکل ہو گا یہ میرے لئے۔ لامد حق سے تعلق
فقط ایک فیملی کا فیصلہ تھا۔ میری مرضی، رائے اس میں قطعاً بھی شامل نہیں رہی۔ میں نے بس مہرشت کی
ان فیملیوں پر جو مجھے سنائے گئے تھے۔ اگرچہ یہ جبری اقدام نہ تھا۔ کسی طرح کا دباؤ نہ تھا۔ میں کسی طرح
آزاد تھی تھا مگر بعض اوقات دوسروں کی خوشی کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے اور اب جب کہ فیصلے سرزد ہو
چکے ہیں، مجھے اندیشوں نے آن گھیرا ہے۔ انا بیہ شاہ! مجھے نہیں لگتا ایسا تعلق بہت پائیدار ہو سکتا ہے جس
میں ایک فریق دوسرے فریق کو سرے سے جانتا ہی نہیں۔ پیچیدگیاں تو ہو سکتی ہیں نا۔ اب نہ سبھی بعد میں
کھلی۔ بات ایک عمر کی ہے انا بیہ شاہ! اور یہ زندگی دوبارہ نہیں ہے۔“ بہت ہولے سے اپنا مدعا بیان کر کے
اس نے انا بیہ شاہ کی سمت دیکھا تھا۔ وہ اس لمحے بہ خورد دیکھ رہی تھی۔

”تو پھر میں اس میں کیسے کارآمد ہوں؟ آئی میں، میں کیسے ہیپ آؤٹ کر سکتی ہوں تمہیں؟ میں تو

تمہیں بھی زیادہ نہیں جانتی۔“ شانے اچکاتے ہوئے وہ بولی تھی۔ عفنان علی خان مسکرا دیا تھا۔ پھر آنکھوں میں جھپکتے جگنوؤں کی چمک اور بھی بڑھ گئی تھی۔

”لیکن جان تو سکتی ہونا تم۔ آئی میں، تم لامعہ حق کو تو جانتی ہونا۔ ہم دونوں کے بیچ اسٹینڈنگ ڈی ویلپ کر تو سکتی ہونا۔“ ہولے سے مسکراتے ہوئے درخواست کی تھی۔ انابیاہ شاہ خاموشی اس کی سمت دیکھتی رہی تھی۔ جیسے وہ اس تمام معاملے پر از سر نو غور کر رہی تھی۔ یا پھر شاید صورت حال کے طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عفنان علی خان نے اسے الجھن میں دیکھا تو مسکرا دیا تھا۔

”اس میں مشکل کہاں ہے انابیاہ شاہ؟“

”آسانی بھی تو کہیں نہیں۔“

”یعنی تم اس استدعا پر غور بھی نہیں کرو گی۔؟“ بہ غور سمجھتے ہوئے نگاہوں میں کسی قدر بے چارہ سمٹ آئی تھی۔

”ایسا میں نے کہا نہیں۔“ انابیاہ شاہ نے پہلی بار بہت دھیمے سے مسکراتے ہوئے شانے اچکائے تھے۔

”لیکن کیا ایسا ہو بھی نہیں سکتا؟“

”ایسا میں نے ابھی سوچا نہیں۔“ انابیاہ شاہ سرفنی میں ہلاتے ہوئے مسکرائی تھی۔

”یعنی تم..... تم اس کے متعلق سوچ سکتی ہو؟“

”شاید..... شاید نہیں۔“ وہی بے نیازانہ انداز تھا۔

عفنان علی خان کی آنکھوں میں خدشے ابھر آئے تھے۔

”زفیوز کرو گی؟“

”مجھے کیا کرنا چاہئے کیا نہیں، اس کے متعلق فیصلہ اتنی آسانی سے نہیں ہو سکتا۔“

”یعنی تمہیں لامعہ سے کوئی انیسیت نہیں؟“

”بلیک میل کر رہے ہو مجھے؟“ انابیاہ شاہ یکدم مسکرائی تھی۔

عفنان علی خان نے اس لڑکی کی آنکھوں کو بغور دیکھا تھا۔ پھر مسکرا دیا تھا۔

”بالکل گہری خاموش جھیل جیسی ہوتی۔“ انداز یکدم ہی بدلا تھا۔ انابیاہ شاہ چونکی تھی۔ پھر سرفنی میں سر ہلایا۔

ہوئی مسکرا دی تھی۔

”اور لامعہ حق میرے جیسی بالکل بھی نہیں ہے۔ ہے نا، یہی کہا تھا نا تم نے؟“ عفنان علی خان کی سمت بہ غور سمجھتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھی۔

”عفنان علی خان! تمہارا مجھے اس سے اور اسے مجھ سے کپیئر کرنا میری بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم دونوں اچھے دوست ہیں۔ مگر الگ الگ شخصیتوں کے مالک ہیں۔ اور تم شاید، بہر حال یہ کچھ مشکل ہے۔ لامعہ حق مجھے بہت عزیز ہے۔ اس کی خاطر میں یہ مدد کر سکتی ہوں۔ مگر اس سے قبل مجھے لامعہ حق سے بھی بات کرنا ہوگی۔ یا پھر تم اسے اس سے مخفی رکھنا چاہتے ہو؟“ کھل اعتماد کے ساتھ عفنان علی خان کی سمت دیکھا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ تبھی وہ مسکرائی تھی۔

”تم نے سب کچھ واضح کر کے یقیناً اچھا کیا۔ ورنہ.....“

”ورنہ کیا؟“ وہ چونکا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ اس لمحے بڑی ہلکی پھلکی نظر آرہی تھی۔ اس اظہار مدعا کے بعد یقیناً اس کا یہ نیاروپ اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ کسی قدر مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ شاید اس سے قبل وہ واقعی اس سے کسی قدر ذہزدہ تھی۔ مگر اب اس کا اعتماد بنا رہا تھا کہ وہ اس کا اعتبار حاصل کر چکا تھا۔ اب یقیناً صورت حال اس کے حق میں ہی ہونا تھی۔ وہ ناکام نہیں رہا تھا۔ قربتیں کچھ ہاتھ تو لگی تھیں۔ سب کچھ بھی رہا ہو وہ اس لمحے انابیاہ شاہ کے قریب تو تھا اور فی الحال اس کے لئے یہ احساس کافی تھا۔

سید اذہان حسن بخاری، عزیز کے ساتھ کھڑا تھا جب ساہیہ خان خاصے عجیب و غریب انداز میں اسے اٹکانی بلیو کٹر کا جدید تراش خراش کا لہنگا ہاتھوں سے قدرے ٹنٹوں تک اٹھائے، جو تے ہاتھ میں اٹھائے بڑھیاں اترتی دکھائی دی تھی۔ انداز کسی قدر پر وحشت تھا۔ مگر اذہان حسن بخاری نے کسی قدر دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ بنا ارد گرد کی پرواہ کئے چلتی ہوئی اس کے پاس آن رکی تھی۔ پہلی فرصت میں ہاتھ میں پکڑے جو تے زمین پر ڈالے تھے۔ پھر دوسرے ہاتھ میں تھا چھوٹا سا پرس اس کی سمت بڑھایا تھا۔

”ذرا پکڑو اسے۔ یہ دوپٹہ بھی نا۔“ کسی قدر اکتاہٹ کے ساتھ وہ بھاری کام والے دوپٹے کو شانے پر سے ہٹا کر عجیب وحشت سے گھورنے لگی تھی۔ ”کیا کروں اس کا؟۔۔۔ یہ پھینکو کو بھی جانے کیا سوچھی، نکال کر یہ لہنگا تھا دیا۔ کہاں تجربے ہیں مجھے ایسی ہیوی ڈریسنگ کرنے کے۔ کتنی آکورڈ لگ رہی ہوں نا میں۔ مع بھی کیا تھا مگر مانی ہی نہیں، پکڑ کر مذاق بنا دیا۔ جو کر لگ رہی ہوں پوری۔ اب اگر کہیں لڑکھڑا کر گر گر آئی تو مجھے سنبھالے گا کون؟ یہ پھینکو بھی نامذاق بنانے پر تلی بیٹھی ہیں۔ دکھانا چاہتی ہیں شاید کیلنگری سے یہ عجوبہ آیا ہے۔“ وہ حسب معمول بے تکلف بول رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری اسے دیکھتے ہوئے بے ساختہ ہنسا تھا۔

”ہنس کیوں رہے ہو؟۔۔۔ کیا تمہیں بھی میں عجوبہ لگ رہی ہوں؟“ ساہیہ نے خائف نظروں سے اپنے مقابل کھڑے شخص کو دیکھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے سرفنی میں ہلانے لگا تھا۔ نظریں بہ غور اس چہرے پر تھیں۔

”اب اس دوپٹے کا کیا کروں؟“ وہ سواتین گز سے بھی طویل بھاری بھر کم دوپٹے کو بدستور ہاتھ میں لئے پریشان حال کھڑی تھی۔ یہ نہیں وہ اذہان حسن بخاری سے کوئی حل مانگ رہی تھی یا فقط مشورہ۔ اذہان حسن بخاری نے اسے چند ثانیوں تک بغور دیکھا تھا پھر کسی قدر لامعلی کا اظہار کرتے ہوئے شانے اچکا دیئے تھے۔

”سوری۔۔۔ ہیلپ لیس ہوں اس معاملے میں۔ یکسر انجان اور قطعی نابلد۔ لیکن شاید تمہیں پہلے یہ جوتے پہن لینے چاہئیں۔ اس سے کم از کم یہ ہوگا کہ اس لاگت اسکرٹ کی لمبائی کسی درجہ کم ہو جائے گی۔“ اس نادر و نایاب مشورے پر ساہیہ نے اسے کسی قدر گھورتے ہوئے دیکھا تھا۔

”اذہان! یہ لاگ اسکرٹ نہیں ہے۔ غالباً لہنگا کہتے ہیں اسے۔“ حد درجہ پُر اسکاٹ انداز! اسے مزید گھورنے کا ارادہ موقوف کرتی ہوئی اپنی سینڈل کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ پھر اپنی جانب دیکھی سے تکتے ہوئے اذہان حسن بخاری کی سمت وہ طویل بھاری بھر کم دوپٹہ بڑھایا تھا۔

”تم ذرا اسے پکڑو۔“

اذہان حسن بخاری کے لئے یہ تجربات یقیناً بہت نئے اور انوکھے تھے۔ شاید تھی وہ اپنے ان ہاتھوں کی سمت قدرے حیرت سے دیکھ رہا تھا جن میں ساہیہ خان کا ننھا مناسا پرس اور بھاری بھر کم دوپٹہ تھا تھا۔ مگر اس سب کے باوجود اس کی دلچسپی کا تسلسل ٹوٹا نہیں تھا۔ وہ ساہیہ خان کو جھکے سینڈل ہوئے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ سینڈل پہن کر سیدی ہوئی تھی۔ مسکراتے ہوئے اذہان حسن بخاری کی دیکھا تھا۔

”ٹھیکس۔ آئیڈیا اچھا تھا تمہارا اس لاگ اسکرٹ کی لمبائی کو کم کرنے کا۔ اگر اس میں میرا پاؤں گیا تو؟“ مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ اذہان حسن بخاری بغور اس کی سمت تکتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”اب تم مجھ سے یہ فریاد مت کرنا کہ میں تمہیں تھام لوں۔“

”اذہان!“ اس کی شرارت پر وہ اسے گھورنے لگی تھی۔

”اب اس دوپٹے کا میں کیا کروں؟“ اذہان حسن بخاری نے اپنے ہاتھ میں تھے اسکاٹی بلیو بھاری کم دوپٹے کو کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔ اور تب شاید ساہیہ کو اپنی حماقت کا اندازہ ہوا تھا۔ کسی قدر حیرت سے فوراً اس کے ہاتھ سے دوپٹہ لے لیا تھا۔

”تم نے کبھی لڑکیوں کو دوپٹہ اوڑھے نہیں دیکھا؟“ غالباً اپنی خفت مٹانے کو وہ کسی قدر ڈپٹے والا انداز میں گویا ہوئی تھی۔ اذہان حسن بخاری بہت محظوظ ہونے والے انداز میں مسکرایا تھا۔

”سوری، میں نظر باز قطعاً واقع نہیں ہوا۔“ آنکھوں میں حد درجہ شرارت لئے وہ گویا ہوا تھا۔ ساہیہ سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا پھر اپنے نازک سے ہاتھ کا مکا بنا کر اس کے شانے پر دے مارا تھا۔ اذہان حسن بخاری ہنستا چلا گیا تھا۔ تبھی وہ اپنی خفت مٹاتے ہوئے اسے گھورنے لگی تھی۔

”میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ تم نے یہاں لڑکیوں کو دوپٹے اوڑھے دیکھا ہو گا۔“

”میرا مطلب بھی یہی تھا کہ تم قطعاً ایک نابلد شخص کے سامنے کھڑی ہو۔ شاید تمہیں اسے گلے مار رکھنا چاہئے۔ ایک طرف کا پلو آگے کی طرف اور دوسرا گردن کی طرف سے بل دے کر پیچھے کی طرف بہت ماہرانہ مشورے سے نوازا تھا۔ ساہیہ اس کی ہدایات کو بغور سنتے ہوئے عمل پیرا ہو چکی تھی۔

”کیسے؟ ایسے۔۔۔؟“ خاصے بڑھگئے انداز میں اس نے چادر کی طرح اس آچل کو اپنے گرد لپیٹا تھا۔ اذہان حسن بخاری بے ساختہ ہنسا تھا۔ ساہیہ جیسے زنج ہو گئی تھی۔

”اذہان۔۔۔!“

اور تب اذہان حسن بخاری کے لئے اس کی مدد کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

”یہ پکڑو۔“ اس کا ننھا مناسا پرس اس کے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ پھر اس کے اس دوپٹے کو تھاما تھا اور کچھ اس طرح تہہ کیا تھا کہ سائیڈز کا دلکش پارڈر نمایاں ہو گیا تھا۔ دوپٹے کو اس مہارت سے اس کے بائیں شانے پر گردن کے قریب دھرا تھا۔ پھر بائیں ماندہ دوپٹے کو گردن کے رخ پر گھا کر پیچھے کی طرف ڈال دیا تھا۔ مہرائی دار گردن میں نیلے رنگ کے دوپٹے کی بہت واضح لکیر بن کر ایک دلکشی عطا کر گئی تھی۔ بھاری دوپٹے کو سنبھالنے کی ذمہ داری جیسے اب ختم ہو گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے بہت مہارت سے سمیٹا تھا اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

”اٹ ٹکس بیئر ناؤ۔“ ایک ناقدانہ زاویے سے اسے دیکھتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔ ساہیہ خان بہت اچھے سے مسکرائی تھی۔

”ٹھیکس! تم نے میری مشکل حل کر دی۔ ورنہ اکیسے پھپھونے تو پھنسا دیا تھا مجھے آج۔ اپنی ویز، لگ کسی رہی ہوں میں؟ یہ لپ اسٹک کا شیڈ اس سوٹ کے ساتھ آکر ڈو تو نہیں لگ رہا؟“ وہ کچھ اس انداز سے اس سے دریافت کر رہی تھی جیسے وہ ان کاموں میں مکمل طور پر ماہر ہو۔ اذہان حسن بخاری کا قہقہہ بہت بے ساختہ تھا۔

”کیا ہے۔۔۔۔۔ اس طرح کیوں ہنس رہے ہو؟ فقط دریافت ہی تو کیا ہے۔ ایک ناقدانہ نظر ڈال کر بائیں سکتے۔“

”تم شاید بھول رہی ہو۔ میں تمہارا میل فرینڈ ہوں۔“ مسکراتے ہوئے باور کرایا تھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ دوست تو ہونا۔ اب فی الحال یہاں کوئی اور دستیاب ہے نہیں۔ اور بائے دی وے کیا مل دوست نظر نہیں رکھتا یا پھر سنس لیس ہوتا ہے؟“ وہ کسی قدر ڈپٹی ہوئی بولی تھی۔ اذہان اسے تکتے ہوئے مسکرایا تھا۔ پھر سر تاپا اس پر ایک بھر پور ناقدانہ نگاہ ڈالی تھی۔

”ہوں، ٹھیک ہے۔ ناٹ بیڈ۔“ لب بھیج کر سوچتے ہوئے رائے زنی کی تھی۔ ساہیہ خان جانے کیوں مسکرائی تھی۔

”اگر میں نے تمہاری جگہ ایک فی میل فرینڈ بنائی ہوتی تو یقیناً میں بہت فائدے میں ہوتی۔ اپنی ویز، ٹھیکس نورڈی مچلینٹ۔ میں آئینہ دیکھ لوں گی۔“

”میں جو تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ اس کے متعلق کیا خیال ہے؟“ لب بھیج کر مسکراتے ہوئے وہ سینے پر ہاتھ باندھے مکمل شرارت کے موڈ میں تھا۔ ”چاہو تو آئینہ بنا لو، اپنا ٹکس دیکھ لو، اپنا روپ رنگ سنو، چاہو تو۔۔۔۔۔“

”اذہان! میں تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔“ وہ جھگی سے بھر پور لہجے میں بولی تھی۔ مگر اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہوگی غالباً۔ آئینہ تاب کہاں لاسکے گا اس حسن کرشمہ سازی کی۔ چکنا چور ہو جاؤں گا میں تو اک لمحے میں۔ اگر آئینہ ہوا تو۔“ شرارت اس کی آنکھوں سے ہو رہی تھی۔ ساہیہ نے پہلے تو اسے

”گھور کر کسی قدر خشکی سے دیکھا تھا پھر ہنس ہی تھی۔“
 ”چالاک ہو گئے ہو۔۔۔ باتیں بنا خوب آگئی ہیں۔ بچپن میں تم یقیناً ایسے نہ تھے۔“ جہا
 مسکرا دیا تھا۔
 ”بچپن میں تو تم بھی چوہیا سی ہوا کرن تھیں۔ بقر اعلیٰ چشمے والی چوہیا۔“
 ”اور تم؟“ ساہیہ نے اس کی سمت اپنی شہادت کی انگلی اٹھائی تھی۔
 ”میں اس وقت بھی بہت ہینڈسم تھا۔ یاد ہے، وہ تمہاری بیسٹ فرینڈ سویرا جو مجھے دیکھ کر چل رہا
 کھلے ہوئے گٹڑ میں گر گئی تھی۔“ مسکراتے ہوئے یاد دلایا تھا۔ ساہیہ لب بھینچ کر مسکراتی ہوئی ہنسی
 ہلانے لگی تھی۔

”ایسا اس لئے ہوا تھا اذہان حسن بخاری! کہ تم نے جان بوجھ کر اس کا چشمہ چھپا دیا تھا۔“ اگر
 میں اس کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا مگر وہ بد مزہ ہونے کی بجائے کھلکھلا کر ہنستا چلا گیا تھا۔ ساہیہ خان اس
 ہوئی مسکراتی رہی تھی۔
 ”تم بالکل بھی نہیں بدلے ہو اذہان حسن بخاری!“ سرٹھی میں ہلاتے ہوئے وہ مسکرائی تھی۔
 ”اور تم۔۔۔“ بغور دیکھا تھا۔ پھر بہت مدد ہم لہجے میں گویا ہوا تھا۔ ”یقیناً بہت بدل گئی ہو۔“
 ساہیہ اپنے سلی بالوں کو کان کے پیچھے کرتی ہوئی مسکرا دی تھی۔
 ”چلیں اب۔ باہر لان میں سب منتظر ہوں گے۔“

”ہوں۔“ اذہان سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔
 ساہیہ خان اب بھی اس بھاری بھر کم ڈریس میں کمر ٹیل فیل نہیں کر رہی تھی۔ داہنے ہاتھ
 بھی وہ لائگ اسکرٹ نمائے اس نے قدرے اوپر اٹھائی ہوئی تھی۔ مگر اس کے باوجود جانے کیا ہوا
 پاؤں لڑکھڑا گیا تھا۔ اذہان جو اس کے ساتھ چلتے ہوئے بدستور دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا غائب
 سمت سے کسی ایسی کی حماقت کی توقع کر رہا تھا۔ توجہ اس پر مرکوز تھی۔ تھی فوراً اسے سہارا دے کر قائم
 تھا۔

”تھینکس!“ ساہیہ کسی قدر جھل سی ہو کر سنبھلی تھی۔
 ”اس کی ضرورت نہیں۔ غالباً تمہیں اس کی ضرورت تھی۔ لیکن بی کیئر فل۔ یہاں سے باہر نکل کر
 سنبھالنے والا اتنا مضبوط سہارا دستیاب نہیں ہوگا۔“
 ”کیوں۔۔۔ کہاں جا رہے ہو تم؟“ کسی قدر حیرت سے سراٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اذہان
 بخاری نے اس نازک اندام لڑکی کو یہ غور دیکھا تھا، پھر مسکرا دیا تھا۔
 ”کیوں ساتھ جانا چاہتی ہو؟“ چھوٹی سی شرارت کی تھی۔ ساہیہ نے جواباً گھورا تھا۔
 ”عجب تو کچھ نہیں۔ دل ہی تو ہے۔ چل بھی تو سکتا ہے نا۔ اک سہانے سفر کے لئے، کیا
 رفاقت کے لئے، چاند کے تمنائی انہی زمیٹوں پر ہی تو ہوتے ہیں۔“ وہ ایک بار پھر چھیڑ رہا تھا اور ساہیہ
 گھور کر رہ گئی تھی۔

یہ تعلق کیا تھا؟ درمیان کیا تھا؟۔۔۔ وہ کبھی سمجھ نہ پائی تھی۔ یہ سب تو دور کی بات، وہ شخص کیا تھا؟ وہ
 تو ابھی تک اسے ہی سمجھ نہ پائی تھی۔
 کتنا دیریں تھا وہ، ریاضی کے سوالوں کی طرح الجھا ہوا۔ شاید اس نے باضابطہ اسے سلجھانے کی کبھی

”بعد تم دونوں حاصل کر سکو گے۔“

”زوباریہ! وہ ساکت رہ گئی تھی۔ جانے کیسے اندیشوں نے ایک دم اسے آن گھیرا تھا۔ دل ایک دم لمبی میں آ گیا تھا۔ آنکھوں کی نمی بڑھنے لگی تھی۔“

”زوباریہ! میرے لئے پاپا اور میری فیملی ہی سب کچھ ہے۔ آپ پاپا سے کہہ دیں، ہم مل کر رہیں گے ایک گھر میں، ایک چھت تلے، ہنسی خوشی رشتوں کی ڈور میں بندھے۔ رشتے اہم ہوتے ہیں زوباریہ! چین دولت کسی شے کا ہم البدل نہیں ہو سکتی۔ آپ پاپا کو مع کر دیں۔“

زوباریہ نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر ملائمت سے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھر دیا

فدا

”میرا وہم نے جو کچھ بھی کیا وہ کچھ عجب نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے اور انشاء اللہ ٹھیک رہے گا۔ خدا نہارے پاپا کو سلامت رکھے، زندگی دے۔ مگر میرا! ایسے معاملات ضروری خیال کئے جاتے ہیں۔“

والدین اپنے بچوں کے لئے وہ سب کچھ کرتے ہیں جو انہیں ان کے لئے بہتر لگتا ہے۔ یہ تمہارے پاپا کی خواہش تھی۔ تم اسے ایک باپ کی طرف سے تحفہ سمجھ لو۔ مگر یہ کوئی بیوہ یا جانبدار کی تقسیم نہیں ہے۔ تمہاری

ذمہ داری میں تو ابھی دیر ہوگی، مگر بیٹیوں کی حقیقت تو فقط زبان سے نکالنے تک کی ہوتی ہے۔ کہا نہیں اور پرانی

کہانی نہیں۔ والدین اپنی اولاد کو لے کر جہاں فکر مند ہوتے ہیں وہیں ان کے سہانے اور روشن مستقبل کو

لے کر خواب بچنے اور انہیں تعبیریں بخشنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ سمجھ لو، تمہارے پاپا بھی ابھی سے تمہاری

ذمہ داری کی تیار یوں میں جت گئے ہیں۔ بہت خوشی سے وہ ایک ایک خواب سن رہے ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ تمہیں اس میں کوئی اعتراض ہونا چاہئے۔ تم کل میرے ساتھ چل کر وہ تمام پر اپنی دیکھ لو جو مظہر نے

تمہارے لئے خریدی ہے۔“ زوباریہ کسی درجہ حلاوت سے مخاطب تھی۔

اور وہ تو کبھی اس کے قریب آئی بھی نہ تھی۔ کبھی آنا چاہا ہی نہ تھا۔ بس ایک سرد مہری کی چادر اپنے چار

نوپلے، اس تعلق سے دور بھاگتی رہی تھی۔ دانستہ فرار کی راہیں تلاش ہی تھی۔

”کیا ہوا؟ کچھ پریشان ہو تم؟“ زوباریہ نے اس کے چہرے کو بہت ہولے سے چھوتے

ہوئے پوچھا تھا۔ وہ چونکی تھی پھر بہت ہولے سے سرفی میں ہلا دیا تھا۔

”آپ فانی کا انڈیشن یہیں کروا رہی ہیں؟“

”ہاں۔“ زوباریہ نے بہت مدہم لہجے میں جواب دیا تھا۔ ”دراصل تمہارے پاپا کے باعث ہمیں کچھ

گرمسک سیکس قیام کرنا ہو گا۔ تم تو جانتی ہو پاکستان میں وہ سہولیات حاصل نہیں جو یہاں کے ہسپتالوں

میں ہیں۔ ایک میجر سرجری کے بعد احتیاط کی ضرورت مزید بڑھ جاتی ہے۔ خدا نہ کرے کسی طرح کی کوئی

پہلچرخ واقع ہو۔ مگر احتیاط پھر بھی ضروری ہے۔ زیادہ دیر نہیں مگر جتنا عرصہ یہاں رہیں گے، فانی

فائزر رہے گا اور یہ کسی بھی طرح بہتر نہیں اس کے لئے۔ یہ ڈی سی ٹن بھی تمہارے پاپا کے ہی کہنے پر لیا

ہے میں نے۔“ زوباریہ بہت دھیمے سے مسکرائی تھی۔

مغرب سیال اپنی جگہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔ یقیناً اس کے قیاس غلط ثابت ہوئے تھے۔ اس کی

کوشش نہیں کی تھی۔ نہ ہی ضرورت محسوس کی تھی۔ اگر وہ اس سے ایسا رویہ روا رکھتا تھا تو شاید کبھی

کی بھی تھی۔ اسے کوئی رد عمل ضرور چاہئے تھا۔ اتنا تو جتنا چاہئے تھا کہ وہ کیا ہے اور اس کی زندگی

کی کیا اہمیت ہے۔ مگر اس نے بتایا تو تھا اور کیا انجام ہوا تھا اس کا؟

میرب سیال کی نگاہ اپنی اس کلائی پر گئی تھی جہاں اس کی آہنی انگلیوں کا نشان اب بھی ثبت تھا

اس روز کے متعلق سوچ کر ہی وہ آنکھیں میچ گئی تھی۔ وہ کون سا روپ تھا اس کا؟ کون سا روپ

اسے تو کوئی واقفیت تک نہ تھی۔ اس کے وصف کیسے تھے کبھی جان ہی نہ پائی تھی۔

شاید وہ کسی قدر انتہا پسند تھا۔

شاید بااختیاری کا زعم حد درجہ تھا۔

شاید بھی ساری دنیا اس کے لئے بڑی ثانوی سی اہمیت رکھتی تھی۔

شاید وہ تو اسے اپنی رعایا لگتی تھی۔ بے یار و مددگار۔ اس پر انحصار کرتی ہوئی۔ مکمل طور پر اس کے

میں۔ اور یہ کسی طور سچ بھی تو تھا۔ پاپا کے فیصلے نے اسے اس درجہ محکوم بنا دیا تھا ورنہ وہ مزاحمت کی

رکھتی تھی اور مزاحمت تو اب بھی کر سکتی تھی۔ جس سبب اس نے یہ قید قبول کی تھی اس سزا کو سہنے کا

تھا۔ وہ سبب اب موجود نہ رہا تھا۔ پاپا کے باعث اس نے خود کو پابند کیا تھا اور اب ماشاء اللہ وہ آزاد

تھے۔ ایسے میں وہ کوئی فیصلہ تو کر سکتی تھی۔ ہر طرف سے کان بند کر کے فقط اپنے اندر کی بھی تو سن

کہہ جینے کا حق تو اسے بھی حاصل تھا۔

کم از کم اسے یہ تو سوچنے کا حق تھا کہ وہ اتنی ارزاں نہیں۔ اتنی بے وقعت نہیں۔ اس کی

حیثیت ہے۔

سردار سبنگین حیدر لغاری کا رویہ کچھ بھی رہا ہو، فیصلہ بہر حال اسے لینا تھا۔ وہ مزید کسی آزما

گزرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ کتنی دیر تک وہ اس رشتے کے متعلق سوچتی رہی تھی۔

پاپا سے بھی ملنے گئی تھی تو آنسو خود بخود آنکھوں سے اٹا اٹا آرہے تھے۔

”بیٹا! کیا ہوا پاپا کی جان کو؟“ پاپا نے فکر مند سے پوچھا تھا۔

”او، ہوں۔“ اس نے فوراً سرفی میں ہلاتے ہوئے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑی تھیں۔

”بس آپ کو دیکھ کر پاپا! آئی لو یو پاپا!“ وہ جانے کیوں بہت کم ہمت ہو رہی تھی۔ اندازاً

تھا۔ لیکن وہ پاپا کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی کبھی کبھی دیر بیٹھنے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد

باہر آگئی تھی۔ زوباریہ اسے اہم ترین معلومات دینے لگی تھی۔

”تمہارے پاپا کی خواہش کے عین مطابق تمہارے لئے ورجینیا میں ایک گھر خرید دیا ہے اور

والا اپارٹمنٹ تو آل ریڈی تمہارے نام ہے۔“

”اس کی کیا ضرورت تھی زوباریہ؟“

”ضرورت نہیں، اسے خواہش کہتے ہیں۔“ زوباریہ بہت ہولے سے مسکرائی تھی۔ ”تمہارے

خواہش ہے یہ۔ انہوں نے اپنے سوس اکاؤنٹ کو تم دونوں بہن بھائی کے نام مختص کروا دیا ہے۔“

نہاں جرم مت کیجئے گا۔ تمام ضروری فائلز سائن کر دی ہیں میں نے۔ اہم ترین میٹنگز بھی نمٹائی
اے جانے کس سے مخاطب تھا۔ شاید کسی ماتحت سے — شاید —

میرب سیال نہ جان پائی تھی۔ مگر اس کی ہونے والی گفتگو سے اسے کچھ اسی طرح کا اندازہ ہو رہا تھا
ہاں اہم ترین امور سے رخصت لے رہا تھا۔ مگر کیوں؟

میرب سیال کی نظریں اپنے قریب بیٹھے سیکرٹری حیدر لغاری پر مرکوز تھیں۔ کتنی قربت تھی۔ کتنے قریب
— فقط ایک ہاتھ کا فاصلہ یا شاید اس سے بھی کم۔ ہاتھ بڑھاتی تو بل میں سارے فاصلے سمٹ
لے ہاتھ میں ہاتھ آتا تو کوئی ڈوری باقی بچتی ہی نہیں۔

مگر کتنا ج ادا تھا یہ شخص۔

کس قدر بے مہر تھا۔

زبوں کی کہانیاں لکھنے والے لمحے اس کے اور سردار سیکرٹری حیدر لغاری کے درمیان جیسے خواب تھے۔
خواب جو فقط خواب ہوتے ہیں۔ جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

وہ اسی طرح بدستور اس کی سمت دیکھ رہی تھی جب وہ فون کر کے اس کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس کی کسی انجانی آنکھوں کا پتہ چاہا تھا۔

میرب سیال یکدم چونکی تھی۔ پھر فوراً ہی چہرہ پھیر گئی تھی۔

سردار سیکرٹری حیدر لغاری نے اسے بہ غور دیکھا تھا۔ پھر بہت ہولے سے ہاتھ بڑھا کر اس کے
ہاتھ کو تھام لیا تھا۔ میرب سیال کو جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔ چونک کر وہ اس کی سمت نکلنے لگی تھی۔

سیکرٹری حیدر لغاری اس کی سمت بہ غور دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان روشن آنکھوں کو کبھی اس سے قبل
غور سے نہیں دیکھا تھا۔ کبھی توجہ کی ہی نہیں تھی۔ نظر ملی بھی تھی تو بہت سرسری انداز میں وہ دیکھ کر
پھر لیتی تھی۔ وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ مگر وہ کبھی اس کی جانب اس طرح دیکھ بھی نہ پائی تھی۔ ان

دلوں کو اس طور دیکھ نہ پائی تھی جس طرح آج دیکھ رہی تھی۔ شاید کوئی رنگ خاص تھا ان آنکھوں
میں۔ شاید وہ آنکھیں تھیں ہی ایسی، یا پھر.....

میرب سیال کا دل یکبارگی بہت تیزی سے دھڑکا تھا۔

ب کیا؟

کیا کرنے جا رہا تھا وہ؟

اب کیا ارادے تھے اس کے؟

اے تو آک نگاہ غلط انداز بھی اس پر کرنا گوارا نہ کرتا تھا۔ نگاہ ملتی بھی تھی تو انداز حد درجہ سرسری ہوتا تھا۔
تو..... کس وجہ سے وہ اس کی جانب مائل تھا۔

کس وجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

کیا تھا یہ؟

کوئی گفت؟

سوچوں نے خود رو جھاڑیوں کی مانند اس کے ذہن میں جگہ بنائی اور دوبارہ اس کا چہرہ
تھپتھپاتے ہوئے دھیمے سے مسکرائی تھی اور پاپا کی جانب بڑھ گئی تھی۔ وہ وہیں کھڑی سوچ رہی
ہوٹل واپس جانا چاہئے یا پھر فانی سے ملنے بروک لین۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی جب وہ شخص
دیا تھا۔

سردار سیکرٹری حیدر لغاری مضبوط قدم اٹھاتا ہوا اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔ وہ چلتا ہوا اس کے
رکا تھا۔ چند ثانیوں تک خاموشی سے دیکھا تھا اسے۔ پھر گویا ہوا تھا۔

”میں سیال صاحب سے مل کر آتا ہوں — تم جا کر گاڑی میں بیٹھو۔“ عجب حکم تھا
میں۔ میرب سیال نے اس شخص کی سمت دیکھنا چاہا تھا۔ شاید کوئی رد عمل بھی دینا چاہا تھا۔ مگر وہ
سے آگے بڑھ گیا تھا۔

کتنی دیر وہ وہیں کھڑی رہی تھی۔ بنا کوئی فیصلہ کئے، بنا کسی حکم کو مانے۔ اور کیوں مانتی؟ پاپا
کیا سمجھتا تھا وہ؟ کیا اپنی تھار میں لگی کھڑی مدد جینیوں میں سے کوئی ایک یا پھر اپنی رعایا کا کوئی
کیا تھی وہ اس کے لئے؟

سر جھکا کر کلائی پر نگاہ کی تھی۔ جہاں اس کی آہنی گرفت کے نشان اب بھی اسی طور ثبت
خود میں الجھی کھڑی تھی جب سردار سیکرٹری حیدر لغاری وہاں دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ اسے وہاں ہونے
قدر حیرت سے دیکھا تھا اسے۔ میرب سیال اس کی سمت جانے کیوں تکتا نہیں چاہتی تھی۔

سیکرٹری حیدر لغاری نے اسے بہ غور دیکھا تھا۔ پھر بہت ہولے سے اپنا مضبوط ہاتھ بڑھا کر اس کے
ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میرب سیال نے چونک کر اس کی سمت دیکھا تھا مگر سردار
لغاری بنا اس کی سمت متوجہ ہوئے، اسے لے کر آگے بڑھنے لگا تھا اور وہ جو ایک قدم بھی اٹھاتا

تھی جانے کیوں اس کے سنگ کھینچتی چلی گئی تھی۔

سردار سیکرٹری حیدر لغاری نے اسے لے جا کر گاڑی میں بٹھایا تھا پھر خود بھی اس کے ساتھ
ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

اب کیا ارادہ تھا اس کا؟

کیا کرنے جا رہا تھا وہ؟

اس کے حوالے سے ہر آنے والا بل اسے حیرت سے دوچار کرتا تھا۔
پراسرار تھا وہ شخص اس کے لئے۔ اسے سمجھنے کا دعویٰ تو دور وہ تو اس کے رویوں کو سمجھنے کی

نہ رکھتی تھی۔ کس قدر حیرت سے اس نے سردار سیکرٹری حیدر لغاری کی سمت نگاہ کی تھی۔ مگر وہ
متوجہ نہ تھا۔ سیل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

”تمام ضروری فائلز کو دیکھ لیجئے گا۔ یہ اسائنمنٹ بہت اہم ہے ہمارے لئے۔ سب کام
دیا ہے میں نے۔ میری ساری اپوائنٹمنٹس کھینچ کر وادہ کیجئے۔ نو اپنی میٹنگ۔ نو اپنی بزنس اسٹا
دوں تک آپ مجھے بالکل ڈسٹرب نہیں کریں گے۔ آئی ایم ٹیکنگ لیو فرام اپنی ہیڈکوارٹر“

کہا تو ہے۔ اک نئی دنیا کے سفر پر تھی! اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کون سی بات ہے؟“
میرب سیال چھٹی چھٹی آنکھوں سے اس کی سمت تکتی چلی گئی تھی اور تب وہ اسی درجہ اطمینان سے اس کی
لڑن بکھتا ہوا گویا ہوا تھا۔

”ابنی پر ابلیم؟“
اس نے جیسے میکا کی انداز میں اس کی سمت ایک ٹک تکتے ہوئے سرنلی میں ہلایا تھا۔ عجب ہونٹ انداز
نہ اس کے لئے مکمل طور پر اپنا اعتماد گنوا چکی تھی۔

”آر پو او کے؟“ میرا مطلب ہے اچھا محسوس کر رہی ہو؟“ وہ ایک بار پھر نواز شوں کی بارش کرتا
والہائی دلکش انداز میں گویا تھا۔ جیسے اس سے بڑا اس کا کوئی ہمدرد اس ساری روئے زمین پر نہ ہو۔ اور
میرب سیال کی آنکھوں میں حیرت، ہی حیرت تھی۔ وہ جیسے سمجھ نہ پاری تھی کہ اس لئے میں اسے کس طرح کا
دیکھنا غاہ کرنا چاہئے۔ وہ جیسے اس لئے مکمل طور پر خالی الذہن تھی۔ جیسے تمام کی تمام عقل سر پر پاؤں دھر
کے رخصت ہو چکی تھی۔ پتہ نہیں اس شخص کا، اس کی شخصیت کا رعب ہی اتنا تھا یا پھر صورت حال ہی اتنی
بڑا کن تھی کہ فوری طور پر وہ سمجھ ہی نہیں پائی تھی۔ حالانکہ اتنی بے وقوف یا ہونٹ وہ کبھی بھی نہیں رہی تھی۔
اس شخص کے سامنے جانے کیوں وہ کبھی بھی اپنی شخصیت کا مکمل اعتماد ظاہر نہیں کر پائی تھی۔ جانے وہ
اس معاملے میں مرعوب تھی یا کنفیوژ یا پھر خوفزدہ۔

وہ اسی کیفیت میں سردار سبکدین حیدر لغاری کی جانب دیکھ رہی تھی جب وہ بولا تھا۔
”آر پو سکیر ڈ؟“

تب اس لئے یکدم ہی میرب سیال کا سرنلی میں ہلتا چلا گیا تھا۔ پتہ نہیں وہ اتنی اثر پذیر کیسے واقع
ہوئی تھی۔

”تو پھر؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے بہ غور تکتے ہوئے جواز چاہا تھا اور تب جانے کیوں وہ کچھ
لہری نہ کی تھی۔ جانے کیوں ذہن جیسے ماؤف ہو گیا تھا۔ زبان جیسے قوت گویائی کھو چکی تھی۔ گاڑی
ڈکی سے ایئر پورٹ کی سمت بڑھ رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا تھا۔ کیا ہونے
لا تھا۔

اس شخص کا گلا قدم کیا تھا۔ وہ شاید اخذ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس کی منصوبہ سازی، اس کی سوچ سے بھی سوانھی۔

اس کی سوچوں تک رسائی جیسے ناممکن تھی۔

شب دھوپ چھاؤں سا شخص تھا۔ عجب مزاج تھا اس کا۔ نہ سمجھ میں آنے والا۔ کتنے رنگ تھے اس کے
دہر رنگ پہلے سے کتنا مختلف تھا۔ وہ سوچتی بھی تو کبھی سمجھ نہ پاتی۔ شاید اس شخص کو اس کے لئے ایک معمر
مارہنا تھا۔ وہ اسے کبھی بھی سمجھ نہیں سکتی تھی۔ چاہتی بھی تو نہیں۔ بہت الجھا ہوا شخص تھا وہ۔ ریاضی کے
دالوں سے بھی کہیں زیادہ الجھا ہوا۔

اور وہ..... وہ جیسے بہت زیادہ تھک چکی تھی۔ پورا وجود جیسے اس لئے شل سا لگ رہا تھا۔ ہمت جیسے

کوئی نوازش؟

یا پھر کوئی اور قسم۔

”کیا ہوا؟“ اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“ بہت توجہ

ہوئے باقاعدہ ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی اور چہرے کو چھوا تھا۔ ”ہر طرح کی فکر اور پریشانی
کر لو اور..... اور الجھنوں میں گھرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“ بہت دھیمے سے مسکراتے
مخاطب تھا جیسے برسوں کے مراسم ہوں اور کبھی کسی طرح کا کوئی تفاوت رہا ہی نہ ہو۔ جیسے قرعہ
باب ان کے درمیان درج ہوں اور شناسائی اپنے عروج پر ہو۔ کبھی کوئی سید راہ ان کے درمیان
ہو۔ کوئی فاصلہ مابین رہا ہی نہ ہو اور.....

”زندگی بہت دلکش ہے غالباً۔ اس میں فقط دلکشی ہونی چاہئے، رعنائی ہونی چاہئے۔ ابھی
سلجھانے کو صدیاں پڑی ہیں اور صدیوں تک کون جیا ہے؟ ان آنے والی صدیوں کی فکر کر
بہتر یہ نہیں کہ ان موجودہ لمحوں کو صدیوں پر محیط کر دیا جائے۔ اک اک پل پر، اک اک لمحوں
کہانی لکھی جائے، دلکشی کی، رعنائی کی، لطافتوں کی۔ کیا خیال ہے؟“ اس کے چہرے کو ہولے
ہوئے وہ کسی درجہ توجہ سے مخاطب تھا اس سے۔ سپاٹ چہرے کی کیفیت کتنی مختلف تھی۔

لبوں پر کیسی مسکراہٹ تھی۔

کیا کیا ہونے جا رہا تھا؟

کیا کرنے والا تھا وہ؟

پھر کوئی نیا وار؟

یہ انداز تو نہ تھے اُس کے۔ ایسے تیور تو نہ تھے۔ یہ آج اسے کیا ہو رہا تھا؟ سردار
لغاری کہیں پاگل تو نہیں ہو رہا تھا؟

گاڑی تیزی سے فرمائے بھر رہی تھی۔

”کک..... کہاں جا رہے ہیں ہم؟“ اس نے بدلتے رستوں پر نگاہ کر کے کسی درجہ خوفزدہ
سردار سبکدین حیدر لغاری کی سمت دیکھا تھا۔

وہ بہت رسائیت سے مسکرا دیا تھا۔ پھر بہت توجہ سے اسے دیکھا تھا۔

”ایک نئے جہاں کو ڈسکور کرنے۔ اک نئی دنیا کے سفر پر۔“

سردار سبکدین حیدر لغاری کا لہجہ مطمئن تھا۔ جیسے کوئی معمول کی بات ہو۔ میرب سیال نے
حیرت سے اس شخص کو دیکھا تھا۔

”کیا..... کہاں؟ کہاں جا رہے ہیں ہم؟“ کوشش کے باوجود وہ اپنے اندر کے قہر
سکتی تھی۔ ہر اسالیب اس لئے وہ کسی قدر بے بسی سے سردار سبکدین حیدر لغاری کی سمت دیکھ رہا
کہ اس شخص کا اطمینان ہنوز برقرار تھا۔ کتنی توجہ سے اس لئے اس پر نگاہ کی تھی۔ بہت دھیمے سے

اور پھر اسی درجہ اطمینان سے گویا ہوا تھا۔

ناپید تھی۔ وہ احتجاج تو کیا کرتی وہ تو اس سے نگاہ ملا کر کچھ دریافت کرنے کی ہمت خود میں نہیں پائی
نگاہ حیران کی تھی اور زبان گنگ۔
کتی؟ ہتھی سے اس نے اس لمحے اپنے بے ہمت وجود کو جنبش دے کر سر سیٹ کی پشت پر ڈالا
آنکھیں موند لی تھیں۔

یقیناً وہ مزاحمت نہیں کر سکتی تھی۔
اختلاف رائے نہیں کر سکتی تھی۔
یہ اس کے بس کی بات شاید نہیں تھی۔

محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ شاید تبھی عفتان علی خان کو اپنے سارے اقدام حق پر نظر آرہے
تھے۔ شاید یہ انسانی فطرت ہے۔ یہ بات سائیکس سے ری لیٹ ہے۔ انسان کا پرسنل انٹرنٹ اس کی پہلی
انج تزار پاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب جاں اپنی مشکل میں ہو تو کسی اور طرف کی فکر قطعاً نہیں سنا تی۔
ان جب اپنے گھر میں لگی ہو تو سد باب کے لئے پہلا خیال اپنے ہی گھر کا آتا ہے۔ سارے اقدامات
ان لمحے میں اپنے مفاد کے لئے عمل میں آتے ہیں۔ فکر اس لمحے فقط اپنی ستاتی ہے۔ ہزاروں تدبیریں
اپنی جاتی ہیں فی الفور اس تکلیف اور پریشانی سے نجات کے لئے۔ دنیا کی کوئی فکر باقی نہیں رہتی۔ کہیں
کی کچھ بھی ہو رہا ہو، کسی طرح کی مصیبت آ جائے، کوئی بھی خطرہ عود کر آئے، کوئی انوکھی واردات ہو
لے، کوئی سانحہ گزر جائے، کہیں کوئی قیامت آ جائے۔ مگر فکر پھر بھی اپنے گھر کی ہی ستاتی ہے۔
عفتان علی خان کے لئے بھی اپنی جان کی اضطرابیت کو بھیلنا اور سہنا آسان نہ تھا۔ بہت مشکل میں تھی
ان۔ اور تمام تر نگاہ فقط اپنی جان پر مرکوز تھی۔ پہلی ترجیح اس کی اپنی ذات تھی۔ معاملہ بھی تو دل کا تھا۔ اور
مائنٹ مشکل میں تھا۔ پھر کیسے اقدامات کی فکر نہ ستاتی۔

شاید یہ کسی قدر خود غرضی کے زمرے میں آتا تھا۔ مگر اس کے سوا جیسے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔
غلا اور سچ کی فکر ان معاملات میں قطعاً نہیں رہتی۔ سب ثانوی نظر آتا ہے۔ فقط اپنا آپ صحیح نظر آتا
ہے۔ اور عفتان علی خان کے لئے بھی فقط اپنا آپ اہم تھا۔ اپنا دل اہم تھا۔ اپنی جان اہم تھی۔ باقی سب
کوئی نظر آ رہا تھا۔ کسی جھوٹ پر شرمندگی نہ تھی۔ کسی اقدام پر کوئی پشیمانی نہ تھی۔ سب حق پر نظر آ رہا تھا۔
ان کچھ بھی کہتا اسے قطعاً فکر نہ تھی۔

سمندر کی وسعتوں کو بہ غور تکتے ہوئے وہ یقیناً اس لمحے اس ماحول کا حصہ نہ تھا۔ لامع حق نے اسے
موشی سے دیکھا تھا۔ پھر بہت دھیسے سے بولی تھی۔
”عفتان علی خان! کہاں ہو تم؟“

”ہوں۔“ وہ بے طرح چونکا تھا پھر اس کی سمت تکتے ہوئے سر بہت ہولے سے نفی میں ہلا دیا
ایک رکی سی مسکراہٹ بل میں لبوں کا حصہ ہوئی تھی۔
”سبیل تو ہوں۔“

”پھر میرے ساتھ کیوں نہیں ہو؟“ لامع حق نے مدہم لہجے میں جیسے بتایا تھا۔ عفتان علی خان نے اس
ماست دیکھا تھا پھر بہت ہولے سے مسکرا دیا تھا۔



”مجھے کیا کہنا چاہئے لامعدہ؟“ عفنان علی خان نے انسا سوال کر کے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔

”کچھ بھی۔ مگر کوئی جھوٹ نہیں۔“

”کوئی دلفریب، جاں نسل جھوٹ بھی نہیں؟ دل کچھ تو بہلنا چاہتا ہو گا۔“ زیر لب مسکراتے ہوئے لامعدہ کو دیکھا تھا۔ جواباً لامعدہ نے اسے چند ثانیوں تک اسی طرح دیکھا تھا پھر بہت ہولے سے مسکراتے ہوئے سرئی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں عفنان علی خان! دل ناداں ضرور ہے مگر اتنا بھی نہیں۔ شوق کی منزلیں بے شمار سہی مگر خرد کہتی ہے سب کچھ مان لو۔ یہ ضروری بھی نہیں۔“

عفنان علی خان کو جیسے اس درجہ مدلل جواب کی امید اس کی جانب سے نہیں تھی۔ شاید بھی وہ اس کی مت نکتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”تم کب سے خرد مندی کے اشاروں پر چلنے لگیں لامعدہ؟“ اس کی حیرت یقیناً سواتھی۔

”کیوں۔۔۔ تم مجھے اس درجہ کم عقل جانتے ہو؟“

عفنان علی خان نے لب بھینچ کر چند ثانیوں تک جیسے سوچا تھا۔ پھر مسکراتے ہوئے سرئی میں ہلا دیا تھا۔

”یقیناً نہیں، حُسن کو جھٹلانے کی سعی یقیناً میں نہیں کر سکتا۔ میں ہی کیا، کوئی بھی ایسی غلطی نہیں کر سکتا۔“

”اب یقیناً تم ڈپلومیسی سے کام لے رہے ہو۔“ وہ مکمل اعتماد سے مسکرائی تھی۔

”اوں ہوں۔۔۔ اسے میانہ روی کہتے ہیں۔“ وہ مسکرایا تھا اور پھر ہنس دیا تھا۔ ”بائے دی وے، تم کیا چاہتی ہو؟“

”کہوں تو کیا جان لو گے؟“ وہ شگفتگی سے مسکرائی تھی۔

”شاید۔“ عفنان علی خان نے سر پر خیال انداز میں ہلایا تھا۔

”شاید نہیں۔“ لامعدہ نے مسکراتے ہوئے سرئی میں ہلایا تھا پھر لب بھینچ کر چہرے کا رخ پھیرا تھا اور نگاہ سمندر کی وسعتوں پر جمادی تھی۔

”یہ معاملات بہت عجیب ہوتے ہیں عفنان علی خان! شاید تم جان نہ پاؤ۔ کہنا یا جتنا کبھی کبھی بہت بے وقعت کر دیتا ہے۔ بہت بے معنی لگتا ہے ایسے میں سب کچھ۔“

وہ بہت آہستگی سے اٹھی تھی اور چلتے ہوئے سمندر کی لہروں کے سنگ ہو لی تھی۔ عفنان علی خان نے اسے دیکھا تھا۔ دل اس جانب مائل قطعاً نہ تھا مگر اس لیے توجہ کے در بند رکھنا جیسے اسے روانہ لگا تھا۔ شاید

کمرات کے ساتھ ہی سہی، وہ اس لیے اٹھا ضرور تھا اور چلتے ہوئے اس کے سنگ جا ملا تھا۔

”ہیہی..... یہی نشا تھی نادل کی؟“ اس کی سمت نکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ وہ اس لیے اس کے ہم

قدم تھا۔ مگر لامعدہ نے کسی قدر پُر اُلجھن نظروں سے اس کی سمت دیکھا تھا۔ شاید وہ اس کے جملے سے

کچھ ناخندانہ کر پائی تھی۔ عفنان علی خان بہت بھر پور انداز میں مسکرا دیا تھا۔

”تم قدم رہو۔۔۔ تمہارے ساتھ رہوں۔ قدم قدم سنگ رہوں۔ لمحہ لمحہ سنگ چلوں۔“ وہ جیسے

اپنے کی اسم سے جیسے غیب کے بھید یا گیا تھا۔ لامعدہ نے اس کی سمت دیکھا تھا مگر نظر کے کسی زاویے

”تمہارے ساتھ ہی تو ہوں۔“ لہجہ مدہم اور کھویا کھویا سا تھا جیسے اس لیے اسے خود کی کچھ خبر نہ ہو۔
”تو پھر میرے ساتھ کیوں نہیں ہو؟“ لامعدہ نے بہت مان سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ ہونے شگفتہ پیرے کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ وہ نگاہ پھیرتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا لہجہ بہت مدہم تھا۔ جیسے کوئی بے خبری مدہم سرگوشی۔ لامعدہ نے بے غور نگاہ کی تھی اس پر۔
”کچھ گمشدہ سے لگ رہے ہو؟“

عفنان علی خان اس سوال پر چونکا قطعاً نہیں تھا۔ نہ ہی کسی طرح کی کوئی حیرت اس کے چہرے ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح بے فکری سے سمندر کی وسعتوں پر نگاہ مرکوز کئے رہا تھا۔ مگر اک دم جیسی ہی اس لیے اس کے چہرے کا حصہ ضرور ہوئی تھی۔ اس کی جانب دیکھے بغیر اس کے لب بہت ہولے ہلے تھے۔

میری دیوانگی یہ اس قدر جبران ہوتے ہو میرا نقصان تو دیکھو محبت گمشدہ میری عجب کھویا کھویا سا انداز تھا۔ جیسے اسے اپنے ارد گرد سے کچھ واسطہ نہ ہو۔ جیسے اپنے آپ کی ہو۔ کچھ خبر نہ ہو۔ جانے کس دلیں کا اسیر تھا وہ۔

جانے کن جہانوں میں بس رہا تھا۔
”خیریت؟۔۔۔ کہیں کسی نے چرا تو نہیں لیا تمہیں مجھ سے؟“ لامعدہ نے بہت ڈٹ مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

عفنان علی خان بہت بے فکری سے مسکرا دیا تھا۔
”ایسی سنگین غلطی کوئی نہیں کر سکتا۔ بے فکر ہو۔“
”اور جو اس وقت تمہارے ساتھ ہے؟“ لامعدہ کا سوال بہت واضح تھا۔ عفنان علی خان کا بڑی دلفریب مسکراہٹ بکھری تھی۔

”اسی کے ساتھ تو ہوں۔“ انداز بہت مسرور تھا۔
”اور میں؟“ لامعدہ نے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ مگر سیاہ گھورا آنکھوں میں بہت سے خدشے آئے تھے جن کی یقیناً کوئی فکر محترم عفنان علی خان کو قطعاً نہیں تھی۔ شاید بھی ان لمحوں میں اس شخص کے ہٹھری مسکراہٹ کچھ گہری ہو گئی تھی۔

”کیا۔۔۔ کیا سننا چاہتی ہو تم؟“ وہ اس کی سمت بہت توجہ کے ساتھ تکتے لگا تھا۔ انداز وہ تھا۔ وہ یقیناً اس لیے بہت مخلوط ہو رہا تھا۔
”کیا کہو گے تم؟“ لامعدہ نے بھی دوسری سمت کمزور قطعاً نہیں پڑی تھی۔ لبوں پر وہ دلربا مسکراہٹ طور کی رہی تھی۔

سے نہ لگا تھا کہ وہ کہیں کسی بات سے مرعوب ہوئی ہے یا حیرت نے اسے چار سمتوں سے آن کر لیا ہے۔
بولی بھی تھی تو انداز بہت بے فکر تھا۔

”اس میں عجب بات کیا ہے عفتان علی خان؟ جو تعلق تم میں اور مجھ میں ہے اسے دیکھا جائے
بات کچھ اتنی اٹوٹھی بھی نہیں۔“

اس نے مکمل طور پر اسے رد کیا تھا۔ مگر عفتان علی خان اس کی سمت تکتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”باندھ کر رکھنا چاہتی ہو اپنے پلو سے؟ اپنا پابند رکھنا چاہتی ہو؟“

”آزاد چھوڑ دوں گی تو یہ بھی تو مناسب نہ ہوگا۔“ وہ بہت شگفتگی سے مسکرائی تھی۔ ”تم کیا چاہتے ہو
تمہیں آزاد چھوڑ دیا جائے؟ بندھے ہوئے بندھوں سے کسی قدر نالاں ہو؟ رہائی چاہتے ہو؟ امیر کی
وحشت ہو رہی ہے؟“ انداز بہت سرسری تھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے؟“ عفتان نے پوچھا تھا۔

”مجھے؟۔۔۔ مجھے لگتا ہے عفتان علی خان! تم.....“ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا پھر جانے کیوں
بھینچ کر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ عفتان علی خان بہ غور اس کی سمت تکتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”کہو نا۔۔۔ رک کیوں گئیں؟ میں منتظر ہوں سننے کے لئے۔ کسی سنسنی خیز انکشاف کے لئے۔
الزام کے لئے۔ حوصلہ سے مجھ میں۔“ وہ اس کیفیت سے حد درجہ محظوظ ہو رہا تھا۔

لامدحت نے اب کے کسی قدر سنجیدگی سے اسے دیکھا تھا۔ پھر اسی قدر مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھی۔
”تم بہت مشکل شخص ہو میرے لئے عفتان علی خان! مجھے یقین ہے مجھے گوا کر تمہیں کسی طرح کا
بیچتا و انہیں ستائے گا۔ تم بہت سکون میں رہو گے یقیناً۔“ اس نے جیسے جلے دل کے پھپھولے پھولے
تھے اور اس لئے عفتان علی خان کا تہقہ بہت بے ساختہ تھا۔

”تمہیں کس نے بتائی یہ بات؟“

مگر لامدحت کچھ نہیں بولی تھی۔ چہرے کا رخ پھیرے ساحل کی لہروں کے سنگ چلتی رہی تھی۔
”سنو، کسی نے بہت غلط اطلاع دی ہے تمہیں کہ تم خفا ہو کر غصے میں اچھی لگتی ہو۔“ اس کا موڈ
کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ اسی طرح چہرے کا رخ پھیرے رہی تھی۔

”جانتی ہوں۔“

”کیا؟“ عفتان علی خان نے دلچسپی سے بغور اسے دیکھا تھا۔

”تمہارے دل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں۔“

عفتان علی خان بہت بے ساختہ ہنسا تھا۔

”انسوس، ابھی ایسی کوئی پلاننگ میں نے کی نہیں۔ جب اس کے متعلق سوچوں گا تو سب سے
تمہیں مطلع کروں گا۔ امید ہے تم چانس مس نہیں کرو گی۔ یقیناً ایک گولڈن اپرچونٹی ہو گی یہ جہاں
لئے۔“

وہ سنجیدگی سے اسے منانے پر بعد نظر آ رہا تھا۔

”تم فور بیڈ رومز کا سپر لگژری اپارٹمنٹ بڑے آرام سے بگ کروا سکو گی۔ اس سے زیادہ کے متعلق
سوچنا۔۔۔ دل کے والوز (خانے) اس سے زیادہ ہوتے نہیں۔ سو اس سے زیادہ کی کوئی رعایت میں
نہیں دینے سے قاصر ہوں۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

لامدحت نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ لبوں پر کھرتی مسکراہٹ کو وہ اس لئے روک نہیں سکی تھی۔
”باتیں بنانا تو بہت خوب آتی ہیں۔“

”اس کے علاوہ بھی کئی گڈ کوالٹیز ہیں مجھ میں۔ تم نے شاید کبھی غور نہیں کیا۔ کبھی فرصت ملے تو سوچنا۔“
کس قدر مدہم سرگوٹی کی تھی۔

”میں تمہارے بارے میں سوچوں اور تم؟“

”اوہ گاڈ، یہ لڑکیاں بھی۔ دل کے چار کے چار کمرے تمہیں لکھ کر دینے کو تیار بیٹھا ہوں اور تم اک ذرا
سا اعتبار تک نہیں کر سکتیں۔“

”تمہارا کوئی بھی انداز اعتبار سوچنے والا نہیں ہے عفتان علی خان! ہر اقدام سے کج روی کی جھلک
صاف دکھائی دیتی ہے۔“ لامدحت کا موڈ بحال ہو چکا تھا اور وہ اس لئے مسکرا رہی تھی۔ عفتان علی خان نے
اس کی سمت لب بھینچ کر جیسے ہزار ضبط سے دیکھا تھا پھر اسی خاموشی سے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور گاڑی کی
سمت بڑھنے لگا تھا۔ لامدحت اس اقدام پر حیران ضرور ہوئی تھی مگر بولی کچھ نہیں تھی۔ جو بھی تھا، اس کے
ہاتھ میں اپنا ہاتھ اچھا ضرور لگ رہا تھا۔ دل میں آرزو یہی جاگی تھی، یہ ساتھ ہمیشہ یونہی قائم رہے۔ یہ
ہاتھ یونہی ہاتھ میں رہے اور یہ خواب آسائے کبھی ختم نہ ہوں۔

پتہ نہیں ایسا ممکن تھا بھی کہ نہیں۔

ساہیہ خان اس شور اور ہنگامے کی عادی نہ تھی۔ اگینے کے خیال سے وہ لڑکیوں کے درمیان بیٹھ تو گئی
تھی مگر ڈھولک کی تھاپ اور بے ڈھب آوازوں نے اسے خاصا بد مزہ کر دیا تھا۔ وہ بے دھیانی میں ادھر
ادھر دیکھ رہی تھی جب عین سامنے قدرے کچھ فاصلے پر اسے سید اذہان حسن بخاری، فارحہ کے ساتھ کھڑا
نظر آیا تھا۔ اس طرح جم کر ایک جگہ پر بیٹھنا اس کی فطرت میں نہ تھا۔ سوا سے دیکھ کر ایک لمحے میں اس کے
چہرے پر زندگی دوڑ گئی تھی۔ وہ فوراً اٹھی تھی اور اس کی سمت بڑھنے لگی تھی۔

”تھینک گاڈ! تم نظر آ گئے۔ ورنہ میری برداشت جواب دے چکی تھی۔ چلو فوراً نکلو یہاں سے۔“ اس کا
بازو تھام کر وہ عجلت سے بُرا انداز میں بولی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے ماں کے سامنے نکل سا ہو کر اس کی
سمت دیکھا تھا۔ کبھی شاید ساہیہ خان کو بھی اپنی غلطی کا اندازہ ہوا تھا۔ کسی قدر نکل ہو کر ساہیہ نے فارحہ کی
سمت دیکھا تھا۔

”السلام علیکم انٹی! کیسی ہیں آپ؟“

فارحہ بغور دلچسپی سے اسے دیکھتی ہوئی مسکرائی پھر اس کے گال کو بہت ہولے سے تھپتھپاتی ہوئی گویا
ہوئی تھی۔

”ہم بھیں۔۔۔“ لہو بھر کو سوچا تھا پھر مٹانے بہت بے فکری سے اچکاتے ہوئے سرنگی میں ہلا دیا

”میں ٹھیک ہوں بیٹا! تم کچھ الجھن میں نظر آ رہی ہو۔ خیریت؟“
”جی، وہ بس اچانک سبلی اتنا شور ہضم نہیں ہوتا مجھ سے۔“

”تو سیدھے سے کہو نا، تم آئی کے اس پنڈسم، ڈسٹنگ بیٹے کے ساتھ گھومنے جانا چاہتی ہو
اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ہنس دی تھی۔

”کم آن، اب میری مجبوری سے اتنا زیادہ فائدہ بھی مت اٹھاؤ۔ میں تمہیں کسی طرح کا جھوٹ
کی اجازت قطعاً نہیں دے سکتی اور وہ بھی اتنا بڑا جھوٹ۔“

”جھوٹ؟“ اذہان حسن بخاری بے طرح چونکا تھا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔“ اذہان حسن بخاری کا ارادہ
اسے نکل کرنے کا تھا۔ مگر اس لمحے ساہیہ خان زوج ہو گئی تھی۔

”تم چلو یہاں سے۔ اس کا فیصلہ بعد ہم میں کر لیں گے۔ بائے آئی۔“ اسے کھینچتی ہوئی وہ تیز
وہاں سے نکل آئی تھی۔

باہر نکل کر اس نے کھلی فضا میں ایک گہرا سانس لیا تھا اور ماحول کی تمام لطافتوں کو جیسے اپنے اندر
تھا۔

”تھینک گاڈ۔“ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی وسعتوں کو اک نظر دیکھا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے
کسی قدر دلچسپی سے دیکھا تھا۔

”وہ سب تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن یہ میرا بازو کیا یونہی تھا ہے رہنے کا ارادہ ہے؟“ دھیسے سے
ہوئے دریافت کیا تھا۔

ساہیہ خان نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ تبھی وہ مسکرا دیا تھا۔
”نہیں۔ میں فقط یہ کفرم کرنا چاہ رہا تھا اگر ارادہ بدستور تھا ہے رکھنے کا ہے تو میں ذہنی طور پر
جاؤں۔“ وہ یقیناً سنجیدہ نہ تھا۔ اس لمحے آنکھوں میں ایک شرارت رکی ہوئی تھی۔

ساہیہ خان مسکرائی تھی پھر داہنے ہاتھ کا ایک ٹکا کر اس کے شانے پر دے مارا تھا۔ ساتھ
قد رنجش ہو کر اس کے بازو کو اپنی گرفت سے رہا کر دیا تھا۔

”نہیں۔ میرا مطلب یہ قطعاً نہ تھا۔ بازو تھا ہے رکھ سکتی ہو مگر کتنی دیر؟“ وہ شرارت سے بھرپور
میں مسکرا رہا تھا۔ بلیک سوٹ کے ساتھ ماؤف شرٹ اور ڈارک ٹائی میں وہ اس لمحے خاصا وجیہ لگ رہا
ساہیہ اسے تکتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”اذہان حسن بخاری! تم جالاک ہو گئے ہو۔ مگر یہ اسائنمنٹ یہاں کام نہیں آنے والی۔ ساہیہ خان
لڑکی کم از کم تمہاری باتوں میں نہیں آنے والی۔ یہ حال کہیں اور جا کر بچھاؤ۔“

”اچھا؟“ وہ محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہا تھا۔ قہقہہ بہت بے ساختہ تھا۔
”تمہیں کس نے کہا کہ میں یہاں کوئی جال بچھا رہا ہوں؟“

”تمہاری باتوں نے۔“ ساہیہ خان مسکرائی تھی۔
”اور آنکھیں؟“ اذہان حسن بخاری نے بغور دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔

”ایسا تجربہ مجھے کبھی نہیں ہوا۔“

”کوئی ارادہ بھی نہیں ہے؟“ دھیسے لہجے میں دریافت ہوا تھا۔

”اذہان!“ ساہیہ خان زوج ہو گئی تھی۔ لب بھینچ کر مسکراتے ہوئے اسے گھورا تھا۔

”اب اگر کوئی اول نول کی تو میں تمہا کہیں چلی جاؤں گی۔“ تنگ کرنے پر باقاعدہ دھکی دی تھی۔

”کیسے؟“ تمہیں تو یہاں کے راستوں کی بھی خبر نہیں۔“

”اب اتنی بھی ڈفر نہیں ہوں میں۔ بچپن انہی گلیوں میں گزرا ہے۔“ ساہیہ بے فکری سے مسکرائی تھی۔

”ہاں۔ مگر اب کافی کچھ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ اور پھر تمہیں میرے ساتھ کی عادت بھی تو ہے۔“

”عادت؟“ وہ بے طرح چونکی تھی۔ ”غالبا آپ اس جگہ لفظ ”ضرورت“ استعمال کرنا چاہ رہے تھے۔

”وہ خاصی کمزور ہے آپ کی۔“ اس نے تصحیح کرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ مگر وہ مسکرا دیا تھا۔

”جانا کہاں ہے؟“

”کیا مطلب جانا کہاں ہے۔ کسی بھی پرسکون جگہ۔ گاڑی نکال لو۔ کچھ اور نہیں تو لانگ ڈرائیو کے

تعلق ہی سوچ لو۔ اب کیا یہ سب کچھ بھی تمہیں میں ہی بتاؤں؟“

”نہیں۔ میں دراصل سفر کے متعلق سوچ رہا تھا۔ تمہارا سفر تو یقیناً بہت شاندار کئے گا۔ مگر مجھے کسی قدر

غرضور کرنا پڑے گا۔ اردو والا نہیں، انگریزی والا۔“ آنکھوں میں شرارت لے مسکرا رہا تھا۔

”تمہیں احساس نہیں ہے شاید، اب ہم بڑے ہو چکے ہیں۔“ جانے کیا جتنا چاہا تھا۔ مگر اذہان حسن

غاری مسکرا دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر وہ زمانہ فراموش نہیں کر سکتا جب میں ایک انتہائی معصوم بچہ تھا اور تم مجھے ہمیشہ

ڈیوٹ کیا کرتی تھیں۔“ اس کا جواز بہت بچکانہ تھا۔ ساہیہ خان بے ساختہ مسکرائی تھی۔

”اور سارے حساب کتاب پورے کرو گے؟“

”کیا حرج ہے۔“ اذہان حسن بخاری نے بے فکری سے شانے اچکائے تھے۔ ”موقع ہی اب دیا ہے تم

نے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”میں نے نہیں، تمہیں وقت نے موقع ہی اب دیا ہے۔“ ساہیہ نے وضاحت دی تھی۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔ اب یا تب۔“

”بدل لو گے مجھ سے؟“

”معاف کروں گا تو یقیناً یہ اقدام مناسب نہ ہوگا۔“ گاڑی کی سمت پیش قدمی کی تھی۔

”آہ، تم بچپن کی باتوں کو اب تک دل سے لگائے بیٹھے ہو؟“ ڈرائیونگ سنبھالتے ہوئے اس شخص کو

دیکھا تھا جس کے چہرے پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ رکی ہوئی تھی۔

”تم اتر ہی اتنا گہرا چھوڑ گئی تھیں۔“ اذہان حسن بخاری اس کی سمت متوجہ نہیں تھا مگر اس کے لبوں کی

”پتہ نہیں۔ لیکن یہ خواب گھر وندے بہت لطف ضرور دیتے ہیں۔“ ساہیہ نے اعتراف کیا تھا۔
 ”بے وقوفی۔ سراسر بے وقوفی کے سوا یہ کچھ نہیں۔“

”شاید۔ مگر خوابوں پر اختیار کسے ہوا ہے؟“
 ”تم خواب دیکھتی ہو؟“
 ”ہاں، کبھی کبھی۔“ ساہیہ خان مسکرائی تھی۔ اس کے رخسار کا ڈمپل بہت واضح ہو گیا تھا۔
 ”اور تم؟“ سوالیہ نظروں سے اذہان حسن بخاری کی سمت دیکھا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔
 ”کبھی اتفاق نہیں ہوا۔“ شانے اچکائے تھے۔

”تم نے کوشش نہیں کی یا کسی خواب نے پلکوں پر کبھی دستک ہی نہیں دی؟“

وہ اس سوال پر محتوظ ہوتے ہوئے چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔ ساہیہ خان اس کی سمت بہ غور تکتے لگی تھی۔ پتہ نہیں اس نے گریز کیوں برتا تھا۔ جواب دینے میں تامل کیوں برتا تھا۔ مگر ساہیہ خان نے بھی اس لیے میں اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ وہ اسی طرح خاموش کھڑی سمندر کی وسعتوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب اچانک ہی آسمان پر چھائے ہوئے سیاہ بادلوں سے بوندیں گرنے لگی تھیں۔ ساہیہ نے سر اٹھا کر آسمان کی سمت دیکھا تھا۔ رات گہری تھی۔ سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے۔ چاند تاروں کے چہروں پر ایک دبیز چادر کا پھر تھا۔ ساہیہ خان کے چہرے پر موسم جیسے دلکشی کی ایک نئی کہانی لکھ گیا تھا۔

”آج چاند تاروں کا پہرہ آسمان پر نہیں۔“ بہت مسروری ہو کر اس نے جیسے خود سے ہی کوئی سرگوشی کی تھی۔ اذہان حسن بخاری اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔
 ”انہیں خبر ہوگئی ہوگی کہ آج کوئی اس سمت نکلنے والا ہے۔“ انداز اور لہجہ بہت شگفتہ تھا۔ ساہیہ خان بے ساختہ مسکرائی تھی۔

”باتیں بنانے میں تم اپنا تانی نہیں رکھتے یقیناً۔“

”تمہیں بارش اچھی لگتی ہے؟“

”ہوں۔ اور تمہیں؟“ ساہیہ نے چہرے کا رخ پھیر کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

”بارش کے اچھی نہیں لگتی ہوگی۔“ وہ شانے اچکا تا ہوا بے نیازی سے بولا۔

”مگر میں یہ پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ ایک سحر پھونکتی ہوئی رات میں سمندر کا یہ کنارہ۔ اور اس پر یہ بادلوں سے برستی شفاف پانیوں کی بوندیں، جیسے موسم کوئی دلکشی کی انوکھی داستان وقت کے چہرے پر بولے ہوئے لکھتا جا رہا ہو۔ کتنا افسوس ہے ان منظروں میں۔ ساری جان میں ایک جادو سا بھرنے لگتا ہے۔ کوئی بہت ہی دلکش احساس ہے یہ جو کم از کم لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔“ وہ دھیسے لہجے میں بول رہی تھی۔ جب وہ یکدم ہی ہنسا تھا اور ہنستا چلا گیا تھا۔

”تم بھی ساہیہ خان!۔ تم بھی عام لڑکیوں کی سی سوچ رکھتی ہو؟“

”کیوں۔۔۔ تمہیں حیرت کیوں ہے؟ اس میں عجب کیا ہے؟ کوئی بڑھک نہیں ماری میں نے۔ کوئی انوکھا دعویٰ نہیں کیا۔ پھر تمہیں کیسے لگا کہ میں کوئی انوکھی لڑکی ہوں، عام لڑکیوں سے مراد کر؟“ ساہیہ خان

مسکراہٹ اس لیے کچھ گہری ہو گئی تھی۔ ساہیہ خان جیسی با اعتماد لڑکی نے اسے چند ثانیوں تک دیکھا تھا۔ پھر پھرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”بہت کچھ بدل گیا ہے نا یہاں۔“ شہر کے راستوں کو نکلنے ہوئے غالباً وہ کسی قدر حیراں ہوئی تھی۔
 ”ہاں۔۔۔ مگر اندر کے سارے زمانے اب بھی ویسے ہی ہیں۔ سارے موسم وہیں رہے ہیں۔“

”اذہان!“ وہ جیسے اب ضبط ہار گئی تھی۔

”لے کر کہاں جا رہے ہو؟“

”دور کہیں۔ جہاں کوئی روکنے والا نہ ہو۔ جہاں کوئی ٹوکنے والا نہ ہو۔“

”شٹ اپ اذہان!“ ساہیہ خان کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی تھی۔

”اچھا چلو، تم بتاؤ، کہاں جانا ہے؟ میں کچھ ہوں گا تو پھر ڈانڈو گی۔“

”اتنا وقت گزر گیا ہے۔ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔“ ساہیہ نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

”لیکن مجھے تو سب کچھ یاد ہے۔“ اذہان حسن بخاری نے وندے اسکرین سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا۔
 ”کیا؟“ وہ چونکی تھی۔

”اک بقراطی چشمے والی لڑکی تھی۔ اور وہ مجھے بہت ستاتی تھی۔“ وہ مسکرایا تھا۔ ساہیہ خان ہنس رہی تھی۔
 ”اور تم سارے حساب بے باق کرنے کی کوشش میں ہو۔“

”ہوں۔ زیادہ نہیں۔ مگر کسی حد تک تو۔“ وہ چھیڑنے سے باز نہیں رہا تھا۔

”شیم آن یو اذہان! تمہارے شہر میں مہمانوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک روا رکھا جاتا ہے؟“
 تھی۔ اس کی ہنسی بہت جلتے تگ جاتی ہوئی تھی۔

”کبھی کے ساتھ تو نہیں۔ مگر کچھ خاص دوستوں کے ساتھ۔“ بہ غور نگاہ کی تھی۔

”ابھی کہاں لے کر جا رہے ہو؟“ ساہیہ نے موضوع بدلا تھا۔

”بتایا تو تھا۔“ وہ اسی بے نیازی سے مسکرایا تھا۔ مگر ساہیہ جو اب کچھ نہیں بولی تھی۔ اذہان حسن نے بھی مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ گاڑی سمندر کے کنارے روک دی تھی۔ ساہیہ بے طرح چونکی تھی۔

”تمہیں کس طرح پتہ چلا کہ اس وقت میرا دل سمندر کے لئے چاہ رہا ہے؟“ وہ دروازہ کھولا۔
 نکلی تھی۔

”شاید سنا نہیں تم نے، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ مجھے وہ چھوٹی سی بقراطی چشمے والی لڑکی یاد تھی۔
 جو سمندر کے کنارے بیٹھ کر ریت کے گھر وندے بنایا کرتی تھی۔“

”تم ایک بے رحم اور چالاک، انہیں ایک ہی وار میں ڈھادیا کرتے تھے۔“

کتنا شوق تھا اسے ریت کے کچے گھر وندے بنانے کا۔

اور کتنا تیر تھا اس لڑکے کو ان کچے گھر وندوں سے۔

”تم لڑکیاں ہمیشہ کچے گھر وندے ہی کیوں بناتی ہو؟“ بہ غور تکتے ہوئے دلچسپ سوال داغا تھا۔

نے دریافت کیا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں بولا تھا اور سمندر کی شوریدہ سر لہروں کو بہ غور نکلنے لگا تھا۔
”تمہیں سمندر اچھا لگتا ہے؟“ ساہیہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں۔ کیوں؟“

”کیونکہ۔۔۔۔۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے اس کی سمت نگاہ کی تھی۔ ”کیونکہ یہ وسیع اور گہرا اور محبت؟“ ساہیہ خان نے اس کی جانب مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

”محبت۔۔۔۔۔“ وہ جیسے محظوظ ہوا تھا۔ ”تم محبت کے متعلق کیا جانتی ہو؟“

”کچھ زیادہ نہیں۔ مگر شاید یہ کہیں نہ کہیں ضرور ہے۔ کسی مخفی گوشے میں، کسی پوشیدہ لمحے میں، بھری چپ میں، کسی بادل کے ٹکڑے میں، کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔“

”تمہیں اتفاق ہوا کبھی؟“ اذہان حسن بخاری نے محظوظ ہوتے ہوئے سوال داغا تھا۔

”کس بات کا؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”محبت ڈھونڈنے کا۔ اس کے تعاقب میں جانے کا۔“

”محبت کے تعاقب میں جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ خود بہ خود تعاقب میں آجاتی ہے، ہم لئے یہ وقف ہوتی ہے۔“ اس نے مختصر جملوں میں ایک گہرا رنگ بیان کر دیا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے غور نکتا ہوا بولا۔

”اور اگر یہ تعاقب میں نہ آئے تو؟“

”یہ ہو نہیں سکتا۔ محبت اپنے مطلوب کو ڈھونڈ لیتی ہے۔ اس کے لئے اسے کوئی تردد نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے لئے یہ قطعاً مشکل نہیں۔ جس طرح اور بہت سی چیزوں میں ہمارا حصہ مخصوص ہوتا ہے، اسی طرح ہے۔ محبت اپنا حصہ سوچنے ضرور تعاقب میں آتی ہے اور قسمت کا وہ حصہ سوچنے بغیر واپس چلتی نہیں۔“

”کبھی اس نے تمہارا تعاقب کیا؟“ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا اور اذہان نے گھورنے لگی تھی۔

”یہ تمہیں میں کیوں بتاؤں؟ کتنے منہ پھٹ شخص ہو تم اذہان حسن بخاری! کتنی بڑی بڑی باتیں بے ڈھنگے انداز میں یوں پوچھ جاتے ہو جیسے روزمرہ کے موسم کے احوال کے متعلق دریافت کر رہے ہو۔ ساہیہ خان نے چہرے پر پڑنے والی بوندوں کو ہاتھ کی پشت سے پونچھا تھا۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”تم بتانے سے گریزاں ہو۔“

”شٹ اپ اذہان حسن بخاری! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ایسا اب تک کچھ نہیں ہوا ہے۔“ اذہان نے لڑکی اس لمحے جیسے نکل ہی ہو گئی تھی۔

”کیوں؟۔۔۔۔۔ کسی کی نگاہ نہیں پڑی تم پر یا تم نے کسی پر کبھی کوئی نگاہ نہیں کی؟“

”یہ میں تمہیں کیوں بتاؤں؟“ وہ اپنی دلکش مسکراہٹ چہرے پر۔ لئے اس کی سمت پُر اعتماد اذہان نے نکلنے لگی تھی۔

یعنی محبت ابھی تمہارے تعاقب میں نہیں آئی۔“ وہ باز نہیں آیا تھا۔

”اذہان! اس نے جیسے زنج ہو کر اسے چپ کرانے کی کوشش کی تھی۔

”آں۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔ تو تم یہاں اس لئے آئی ہو؟“ وہ بدستور اسی طرح چھیڑ رہا تھا۔ نگاہوں

مادہ درجہ شرارت رکھی ہوئی تھی۔

”کیا مطلب؟“ وہ یقیناً نہیں سمجھی تھی۔ اذہان حسن بخاری کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”جب محبت تمہیں مطلوب کے تعاقب میں نہیں آتی تو مطلوب کو خود محبت کا تعاقب کرنا پڑتا ہے۔ ہے

”شٹ اپ اذہان!“ وہ مسکراتے ہوئے لب بھینچ کر اسے گھورنے لگی تھی۔

”کہیں تمہیں کسی کی محبت ہی تو نہیں کھینچ لائی؟“ مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”کس کی؟۔۔۔۔۔ کس کی محبت کھینچ کر لائے گی مجھے؟“ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت پُر اعتماد

از میں اس کی سمت نکلنے لگی تھی۔

”ہو سکتا ہے مجھ جیسا کوئی پینڈا سم، یا پھر میں ہی۔“ کوئی انوکھا قیاس کیا تھا اور وہ کھلکھا کر ہنستی چلی گئی

”دہات اے گڈ جوک اذہان حسن بخاری! تم نے سارے دن کی کوفت ایک پل میں رفع کر دی۔ مگر وہ یہ جوک دوبارہ مت سنانا۔ میں بد مزہ ہو جاؤں گی۔“ اس کے چہرے پر شفاف بوندوں کے سنگ وہی نندنی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ ازلی اعتماد اس کی آنکھوں میں تھا اور اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”اُس کریم کھاؤ گی؟“

”تمہارے اتنے اچھے جوک کے بعد یقیناً یہ ایک اضافی ٹریٹ ہوگی۔ کچھ میٹھی سی، کچھ کریمی سی۔“

”تو پھر بیٹھو گاڑی میں۔“ اذہان حسن بخاری نے کہنے کے ساتھ ہی پیش قدمی کر دی تھی اور تب ساہیہ نے بھی قدم اٹھانے شروع کر دیئے تھے۔

”کتی بار آئی تھی وہ ان راستوں پر۔ کتنی بار اس نے ان مقامات کو دیکھا تھا۔ کوئی بھی جگہ نئی تو نہیں ما۔ سارے منظر دیکھے بھالے تھے، یہی یورپ کی گلیاں تھیں۔ مگر تب وہ اس درجہ خوفزدہ نہیں تھی۔ دل مارا درجہ زہر ہوا تھا۔ دھڑکنوں میں اتنا ارتعاش نہ تھا۔ وہ اس قدر خوفزدہ نہ تھی۔ شاید تب وہ اپنی فیملی کے تھکنے اس کے بہت سے اپنے اس کے ساتھ تھے۔ سارے مان دینے والے رشتے، سارے اپنا پن نے والے لوگ۔ اور اب۔۔۔۔۔

غنائیوں کی کس درجہ بھر مار تھی۔ نوازشوں کا سلسلہ نہ تھمنے والا اور حیران کن تھا اور اس کا دل دہل رہا

کوئی قدم قدم اس کے ساتھ تھا۔ اس کا دل بہلانے کے سامان ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے خوش کرنے کے لئے کر رہا تھا اور وہ خوش نہیں تھی۔

التفات کی تیز بارش تھی اور وہ پھر بھی جیسے صحرا کی دھوپ میں ننگے سر کھڑی جل رہی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے تحائف کا ایک ڈھیر اس کے سامنے لگا دیا تھا۔ کتنی ڈھیر سارا تھی۔ ہر جگہ سے اس کے لئے کچھ نہ کچھ وہ لیتا رہا تھا۔

”ہنی! ہاؤ اراٹ؟“ ہرنشے لینے سے پہلے وہ اس کی سمت بہت توجہ سے دیکھتے ہوئے انداز میں دریافت کرتا تھا اور جب وہ جواباً ساکت رہتی تھی تو وہ بہت دھیس سے مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ لگا کر تنقیدی زاویہ سے نکتا تھا۔

”آئی تھنک یہ خاصی سچ رہی ہے تم پر۔ شاید یہ کلر بھی تم نے پہلے کبھی نہیں پہنا۔ تمہیں۔“ فان کلر کا ایک پارٹی ویٹر ایوننگ گاؤن وہ اس کے ساتھ لگا کر تنقیدی نظروں سے دیکھتا تھا اور وہ ساکت سی نکتی ہوئی یکدم ہی رخ پھیر گئی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے کتنی ہی طرح مختلف مقامات سے اس کے لئے لے لی تھیں۔

”ہنی! کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“ بہت توجہ سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے اس نے بار بار خوش نہیں ہو میرے ساتھ؟“ وہ کسی قدر متشکر ہو کر دریافت کرنے لگا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں کہہ سکتا کیوں وہ اتنی بے ہمت ہو رہی تھی یا پھر اس شخص کے انداز ہی اس قدر چونکا دینے والے تھے حیرتوں میں گھر گئی تھی۔

کیسے ڈرامائی انداز میں اس شخص نے اپنے رویوں کا رخ پھیرا تھا۔ کہاں تو وہ اس سے جدا تھا۔ اس کی جانب ایک نگاہ غلط انداز نکتا بھی جیسے کفر جانتا تھا۔

اوروں یہ کرم ایٹوں یہ ستم، کے مصداق وہ اس کی جانب مائل تک نہ تھا اور کہاں اب وہ نوازشوں کی، عنایتوں کی بارش کئے دے رہا تھا۔ کتنی جلدی بدلے تھے اس کے رویے اس کے قدر اچانک۔ آخر کوئی اسرار تو تھا۔ کچھ تو بھید تھا۔ کیا تھا جو وہ سمجھ نہ پا رہی تھی۔

اس وقت وہ سات ہزار فٹ کی بلندی پر بنے ہوئے ہوٹل ماؤنٹین پلاٹس میں تھی۔ ماؤنٹین بنا یہ ہوٹل سوئٹزر لینڈ کے تمام حسین نظاروں کو آنکھوں تک منتقل کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر جاگ رہی تھی۔ ہر حس منجمد تھی۔ وہ اپنے اندر کے اسباب جاننے کی خواہاں تھی مگر باوجود جاننے سے قاصر تھی۔ شاید سردار سبکدین حیدر لغاری کو کچھنا آسان نہ تھا۔ مگر اس کا ذہن جاننے والے خطرے کے لئے مسلسل الارم بجا رہا تھا۔ حالانکہ ایسا ہونا ضروری بھی نہیں تھا۔

نہ بھی ہوتا۔ مگر نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے اندر باہر بے حد خاموشی ہے۔ ایک گرا اور یہ سکوت کسی نہ کسی طوفان کا پیش خیمہ ضرور ہے۔ جیسے ہی یہ سکوت ٹوٹے گا تو ایک طوفان آئے پتہ نہیں یہ فقط وہ ہے تھے، فقط اس کے خدشے تھے یا پھر اس میں کچھ صداقت بھی تھی۔ خوفزدہ ضرور تھی۔ پتا بھی گرتا تھا تو وہ لرز کر رہ جاتی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری جس قدر اس کے قریب آ رہا تھا وہ اس سے اتنا ہی دور بھاگتا تھا۔ اس سے اسی قدر خوفزدہ تھی۔

”ہنی! تمہاری آنکھوں میں یہ خوف کیسا تر رہا ہے؟ کس بات کے اندیشے تمہیں ستا رہے ہیں؟“ اس لطف چیز رہتے جب سردار سبکدین حیدر لغاری نے بہت توجہ سے نکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”یکدم ہی سرٹنی میں ہلانے لگی تھی۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے بہت ہولے سے مسکراتے ہوئے اپنا بایاں بازو اس کے شانے کے گرد دیا تھا۔ میرب سیال کے اندر یکدم ہی حشر برپا ہو گیا تھا۔

”زندگی بہت چھوٹی اور مختصر ہے ہنی! اسے بے کاری فکروں میں ضائع کر دینا کہیں کی بھی دانش مندی کا تمام فکروں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دو۔ دیکھو یہ موسم کیا کہہ رہا ہے۔ یہ سارے دلربا منظر تمہیں کس برت سے دیکھتے ہیں۔“ حسن کو نواکتوں اور لطفانوں کے موسموں میں قیام کرنا چاہئے۔ بے توجہی کے

ہر موسم سے نبرد کر دیتے ہیں اور ترازوؤں والی رتیں اسے تھلسا دیتی ہیں۔ سوان خوب صورت موسموں کو دیکھنا ہی عقل مند کی ہے ہنی! ان منظروں پر نگاہ کرو۔ انہیں اس حیرت کدے سے باہر نکلنے کی

دور۔ دیکھو کس درجہ ساکت ہیں یہ تمہیں دیکھ کر۔ شاید یہ بھی جانتے ہیں زلف پریچ کی طرح ہوا ہوتی کچھ اور بھی سلجھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دلکشی کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ شاید اسی لئے یہ سارے نران حیران سے ہیں۔ کیا تم انہیں ان حیرتوں سے باہر نکلنے کا موقع نہیں دو گی؟“ وہ بہت ہولے سے مسکرا رہا تھا۔

”میرا مشورہ ہے ہنی! تمہیں ان رنگوں سے دوستی کر لینا چاہئے۔ ان منظروں سے بات چیت کرنا ہی ندم ہوگا تمہارے لئے بھی اور ان منظروں کے لئے بھی۔ ورنہ یہ سارے دلربا منظر یقیناً تمہاری طرح

اٹیں گے اور ایسے میں مشکل کچھ اور بھی بڑھ جائے گی۔ کیا تم چاہتی ہو کہ یہ موسموں کی ساری بال نشانیوں سے اٹ جائیں؟ اور ایک منظر، ایک گہری چپ کی چادر اوڑھ لیں؟ کیا یہ ان موسموں

دل کے ساتھ نا انصافی نہ ہوگی؟“ کتنی توجہ سے وہ اس کی جانب نکتا ہوا کہہ رہا تھا۔ قربتوں کے موسم بدلتے۔ نوازشوں کے منظر دلفریب تھے۔ سارا موسم اس دلربائی میں گھر گیا تھا۔ مگر میرب سیال کے

کے سناٹوں پر اسی قدر گہری دھند کی چادر لپٹی رہتی تھی۔ لفت چیز نے جیسے ہی ماؤنٹین کے اختتامی سے کوچ ہوا تو وہ فوراً آتری تھی مگر توازن برقرار رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ لڑکھڑاتی ہوئی گرتی باختر سے دو چار ہوتی، سردار سبکدین حیدر لغاری کی آہنی گرفت نے اسے اپنے حصار میں لے لیا

”یہ راستے بہت پریچ ہیں ہنی! ان گیسوؤں سے بھی زیادہ پریچ۔ جتایا تھا تا کہ یہ بے نیازی سود مند نہ ہو۔“ میرب سیال نے میٹھی ہوئی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا۔ وہ شخص اسے اسی طرح حصار میں لئے لڑکھڑاتا تھا۔ لبوں پر کسی قدر دلفریب مسکراہٹ تھی جیسے وہ اس کی بوکھلاہٹ کی تمام کیفیات سے حد درجہ

ہو رہا ہو۔ میرب سیال نے بہت آہستگی سے بنا کچھ کہے خود کو اس کے حصار سے آزاد کرایا تھا اور

نی کے ساتھ پلٹ کر چلتی ہوئی اس شخص سے قدرے دوری پر جا کر کھڑی تھی۔

اوروش کی بارش کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ مگر وہ حرف سے منکر ہوتی ہوئی یکدم ہی چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔
 ”منکر ہونا ایک بہلاوہ ہے ہنی! اور بہلاوے زیادہ دیر کام نہیں آتے۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے
 اس کے چہرے کو ہولے سے چھتھپاتے ہوئے جیسے اس بچھنے کو رخصت کرنے کی ہدایت دی تھی مگر وہ تب
 ہی کوئی جواب دیئے بغیر چلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی تھی۔ دھڑکنوں کا شور یکدم ہی بڑھنے لگا تھا۔ شاید وہ
 بہت فونزدہ تھی۔ شاید اسے سردار سبکگین حیدر لغاری کے سنگ انجانے راستوں کے سفر پر نہیں آنا چاہئے
 تھا۔ وہ اس وقت Vey Vey شہر میں تھے۔ وہ شہر جو چارلی چپلن کی رہائش گاہ کے طور پر بھی مشہور ہے۔
 وہ ٹھک کر فریڈی مرکری کے اٹیچو کے ساتھ ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی تھی۔ وجود بریکدم ہی
 برسوں کی تھکن آن پڑی تھی۔ وہ خود کو بے حد بے ہمت اور کمزور محسوس کر رہی تھی اور سردار سبکگین حیدر
 لغاری کا ارادہ جانے کیا تھا۔

جانے کون سا کھیل کھیلنے جا رہا تھا وہ؟
 جانے کیا عزائم تھے اس کے۔ وہ قطعاً نہیں جانتی تھی۔ مگر اس کے اندر پھیلے خوف کے سائے کچھ اور
 بھی گہرے ہو گئے تھے۔

کاش وہ یہاں سے بھاگ سکتی۔ بھاگ کر اس شخص سے دور نکل سکتی۔ وہ جتنا اس کے قریب آ رہا تھا،
 اس کی وحشتوں میں اسی قدر اضافہ ہو رہا تھا۔ الجھنیں اور بھی بڑھ رہی تھیں۔ مگر سردار سبکگین حیدر لغاری اتنا
 تیار اعتماد دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس شخص کے مزاج کے تیور یقیناً وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔
 نہ جانے کیا ہونے والا تھا اب اس کے ساتھ؟

انا یہ شاہ اپنے کمرے میں تھی جب ماما نے بتایا تھا کہ اس کا فون ہے۔ وہ بے دھیانی میں چلتی ہوئی
 نیچے آئی تھی۔ فون اٹھا کر کان سے لگایا تھا۔
 ”کیسی ہو ملی؟“

”اوزی! تم؟“ وہ حیرت سے پُر لہجے میں مسکرائی تھی۔ ”تم تو آنے والے تھے۔ اطلاع تو عرصہ دراز
 قبل بخوادی تھی۔ کیا ریڈ کارپٹ استقبال کی توقع کر رہے تھے؟ کچھ سنسنی پھیلانا چاہ رہے تھے یا پھر بے پر
 کی اڑائی تھی؟ ویسے سنو، یہاں بھی کوئی منتظر نہ تھا۔“ بہت کچھ کہنے کے ساتھ اس نے جتایا تھا اور دوسری
 طرف اوزی کھلکھلا کر ہنستا چلا گیا تھا۔

”سنو! یہ آخری بات کچھ چغلی کھا رہی ہے۔ کہہ دو کہ تم جھوٹ بول رہی ہو، میں مان لوں گا۔“ اوزی
 ”سری جانب ہنس رہا تھا۔ وہ بھی مسکرا دی تھی۔

”خوش فکری والی عادت گئی نہیں تمہاری۔ کہا تو آئے کیوں نہیں؟“

”تم انتظار کر رہی تھیں نا؟“

”نہیں۔۔۔ میں جانتی ہوں تم سر پرانز دینے کے عادی ہو۔ کبھی بھی، جب دل میں سائے کی آن
 لگے۔“

سردار سبکگین حیدر لغاری نے اسے چند ثانیوں تک اسی طرح کھڑے دیکھا تھا پھر اس کی ہاتھ
 قدری کر دی تھی۔

”اُٹھن کیا ہے؟ یہ ذہنی رو اس قدر بھگی ہوئی کیوں ہے؟ خطرات ایسے میں اور بھی بڑھ رہے
 جب آپ بے توجہی برتتے لگیں۔“

میرب سیال نے فقط خاموشی سے اس شخص کی نوازشوں کو دیکھا تھا۔ کہا اب بھی کچھ نہ تھا۔
 سبکگین حیدر لغاری نے اس کا ہاتھ کسی بچے کی مانند تھام لیا تھا اور اسے لے کر پٹنے لگا تھا۔ وہ
 میں اس شخص کے ساتھ کھینچتی چلی گئی تھی۔

”خاموشیوں کو یوں پر اس طرح پہروں بٹھائے رکھو گی تو موسموں کو شکوہ تو ضرور ہو گا۔
 موسموں کے دفریب رنگوں کو سمیٹنا ہے تو ہاتھ تو بڑھانا ہو گا۔“ کتنی پیچیدگی اور ذہنیت تھی اس
 میں۔ بہ ظاہر جو کچھ تھا وہ نظر نہیں آ رہا تھا اور جو نظر آ رہا تھا یقیناً ویسا کچھ تھا نہیں۔

کیا یہ شخص سراب سا تھا؟

کوئی سراب تھا۔

یا پھر کوئی حقیقت۔

وہ نظر اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی جب وہ بہت دھیمے سے مسکرایا تھا۔

”کوئی سراب نہیں ہے ہنی! سب حقیقت ہے۔ بہت روشن اور واضح حقیقت۔“ وہ سوچ رہی
 جیسے اس کی سوچیں سطر سطر بڑھ رہا تھا۔ میرب سیال کس درجہ حیرت سے اس کی سمت تکتے لگی تھی
 کی حیرتوں سے کچھ نسبت نہ رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”یہ جان لینا بے حد ضروری ہے ہنی! کہ یہ سب حقیقت ہے۔ یہ میں ہوں۔ یہ تم ہو اور یہ
 نظارے، یہ سب ہمارے لئے ہیں۔ تمہاری یہ آنکھیں، ان کے سارے رنگ، ان کے سارے
 خاص زاویے کے منتظر ہیں۔ کچھ خاص رنگوں کی جستجو میں۔ خاموشیوں کا احتجاج کچھ سوا ہو گیا ہے
 اب بھی ان ساکت جامد خاموشیوں کو توڑنا مناسب خیال نہیں کرو گی؟“

سردار سبکگین حیدر لغاری کا لہجہ مدہم تھا۔ مگر نظریے کے زاویے بہت خاص تھے۔ اس کے ہاتھ
 گرفت یکدم ہی کچھ نئے عنوان درج کرتی چلی گئی تھی۔ حدت کا احساس کچھ اور سوا ہو گیا تھا۔
 معنی مفہوم ایک پل میں بدلنے لگے تھے۔ جیسے وہ لمس یکدم ہی بہت مدہم مدہم سرگوشیاں کرتے
 کے لہو میں دوڑنے لگا تھا۔ پوری جان یکدم ہی ایک قیامت کے زیر آنے لگی تھی۔ وہ یکدم ہی ایک
 ٹیک لگا کر رک گئی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری اسے بہ غور تکتے لگا تھا۔

”میں ان آنکھوں کو بہ غور دیکھ رہا ہوں ہنی! ان کا کوئی بھی رنگ مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ ان
 نقش درج ہیں ان کے مفہوم تم شاید پڑھنے سے قاصر ہو، میں نہیں۔ مجھے ان آنکھوں میں چمکا
 صاف دکھائی دے رہا ہے۔ دیکھو، یہاں میں ہوں، سطر سطر تحریر ہوں، ہر رنگ میں ڈھل رہا
 چمکا چمکا۔ تمہارے ہاتھوں میں کتنے رنگ ہیں۔“

”تم بلواؤ اور دے کر میں تب بھی آ جاؤں گا۔“ وہ دوسری جانب شرارت سے مسکرایا تھا۔
 ”جانتی ہوں کتنے سعادت مند ہو۔ آنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ کیا ابھی تک زخم اتنے ہی گہرے ہیں؟
 وہ مسکرائی تھی۔ اوزی کا قبضہ بڑا بے ساختہ تھا۔

”تم جانتی ہو انا یہ شاہ! دل بہت مضبوط ہے میرا۔ اثر جلد قبول نہیں کرتا۔“
 ”اب جھوٹ تو مت کہو۔ اور وہ بھی اس قدر بڑا جھوٹ۔“ انا یہ شاہ نے جھٹلایا تھا۔

”ہاں۔۔۔ اتنا مضبوط نہیں۔ مگر ہے تو دل ہی نا۔“

”یعنی کہ دل سنبھلا نہیں ابھی تک؟“ انا یہ شاہ نے پھینچا تھا۔

”اور تم دکھانے سے باز نہیں آؤ گی؟“

”رضوں پر نمک چھڑکنے کا بھی اپنا ہی ایک لطف ہے۔“ انا یہ شاہ مسکرائی تھی۔

”سگد کی کی حد ہے۔ اقدام دوستانہ ہرگز نہیں۔“ اوزی نے دوسری جانب دہائی دی تھی۔

”اور تم..... تم نے بھی حد کر دی۔“

”کیا..... کیا ہے؟ شہر بدر ہی تو ہوا ہوں فقط۔“

”اور جو روگ لگایا ہے؟“

”بے فکر رہو۔۔۔ سوگ قطعاً نہیں مٹا رہا۔ بڑے مزے میں گزر رہی ہے۔ ہم لڑکے بہت با
 طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ بہت سے اسٹاپ پڑتے ہیں ہماری زندگی میں اور ہر اسٹاپ پر ایک
 کہانی جنم لے لیتی ہے۔“

”اور پچھلی کہانی؟“ انا یہ شاہ نے وضاحت چاہی تھی۔

”وہ ہیں اسی اسٹاپ پر کہیں پیچھے چھوٹ جاتی ہے۔ جیسے پیچھے چھوٹ جانے والے منظر دھندلا
 جاتے ہیں اور دھندلے منظروں کی سمت کوئی زیادہ دیر نہیں ٹکتا۔ کیونکہ یہ منکشف ہوتا ہے کہ ان کی فتنہ
 کچھ بھی باقی نہیں۔“

”بہت فلسفہ بگھارنے لگے ہو۔“

”تمہیں سوچنے لگا ہوں نا۔“ اوزی دوسری طرف پھر ایک بار کھلکھلا کر ہنس دیا تھا۔

”شٹ اپ اوزی! ایک تو اس عرصہ دراز بعد فون کرتے ہو اور پھر اتنی فضول کی گفتگو بھی کرتے؟“

انا یہ شاہ نے ڈپٹا تھا۔

”چلو اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ تم شادی کب کر رہی ہو؟“

”شادی؟“ وہ بے طرح چونکی تھی۔

”کوئی ملایا اب تک میرا انتظار کر رہی ہو؟“ وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

”شٹ اپ اوزی!“ وہ مسکرائی تھی۔ ”تمہیں اتنی سنگین قسم کی خوش فہمیاں کب سے ہونے لگیں؟“

”جب سے میں تمہاری آنکھوں کے متعلق سوچنے لگا ہوں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسا تھا۔

”وہاٹ ریش۔“ وہ جھینپ کر بولی۔ ”اوزی اسیدھی راہ پر آ جاؤ۔“

”ہر آواز دونا۔ کچی ڈور سے بندھا سیدھا کھنچا چلا آؤں گا۔“ وہ ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ وہ
 لنگی پر کھلکھلا کر ہنستی چلی گئی تھی۔

”اوزی! تم بہت کمال کے شخص ہو۔ باتیں بنانا یقیناً تمہیں خوب آتا ہے۔“

”مگر زندگی کیسے خوب صورت بنائی جا سکتی ہے یہ فقط تمہاری آنکھیں بتاتی ہیں۔“ وہ یقیناً باز آنے والا
 تھا۔ یہ شونی، یہ شرارت اس کی فطرت تھی اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی شاید بھی مسکرا دی تھی۔

”آکب رہے ہو؟“

”مس کر رہی ہو؟“

”اگر کہوں ہاں تو؟“

”تو میں مان لوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں تمہارے دوستوں کی فہرست میں چند گنے چنے نام ہیں

۔ اور ان گنے چنے ناموں میں اوزی کا نام یقیناً پہلا ہے۔“

وہ مسکرا دی تھی۔

”اسی بات کا تو مان ہے مجھے اوزی! میں جانتی ہوں میں اپنے دوستوں کو کس قدر عزیز ہوں۔ انکل اور

بھوکے ہیں؟“

”سب ٹھیک ہیں۔ ماما بہ طور خاص اپنی اکلوتی بھتیجی کو پیار بھجوا رہی ہیں۔“

”ان سے میری طرف سے ٹھیکس کہو۔“

”موتوں کے لئے شکر یہ نہیں کہتے۔“

”ہاں، جانتی ہوں۔ لیکن یہ ٹھیکس تمہارے لئے نہیں، بھیسو کے لئے ہے۔ اب سیدھے سے بتا دو،

بآر ہے ہو؟۔۔۔ بتا کر پھر عاقبت مت ہو جانا۔ تم جانتے ہو مجھے انتظار کرنا کتنا برا لگتا ہے۔“

”تمہی تو بتا نہیں رہا ہوں۔ جلد آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”سامنا کرو گے؟“ وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”نہ بھی کر سکا تو تمہارا آئیٹل تو ہے نا۔“

”مسہ چھاؤ گے؟“ انا یہ شاہ نے پھینچا تھا۔

”اوں ہوں۔۔۔ آنسو اگر آبتار بننے لگے تو پونچھ لوں گا۔“

”گاؤرڈ۔“ انا یہ شاہ نے جیسے طعنہ دیا تھا۔ مگر وہ اسی طرح کھلکھلا کر ہنستا چلا گیا تھا۔

”طنطنے مارنے والی عادت گئی نہیں تمہاری۔“

”یہ تو کچھ بھی نہیں۔ تم آ جاؤ تو دو دو ہاتھ کروں گی۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”نظر دور۔۔۔ بعد شوق۔ انکار کس کافر کو ہے؟“ اوزی شرارت سے اب بھی باز نہ آیا تھا اور تب اس
 نے انتقامی کلمات کے ساتھ سلسلہ منقطع کر کے فون رکھ دیا تھا۔ اوزی کا فون بہت دنوں بعد آیا تھا اور اس
 سے بات کر کے اس کا دل ہمیشہ ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ اچھے دوستوں کی شاید یہی خاصیت ہے۔ وہ مسکرائی
 ابھی کہ وہ فون مڑی تھی جب نظر یکدم عین سامنے جا پڑی تھی۔ وہ یقیناً چوکنے لایق نہ رہ سکی تھی۔ اسے قطعاً

اس بات کی خبر نہ تھی کہ یہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔ جب وہ آئی تھی تو یقیناً اپنی بے دھیالی میں عرفان علی خان کو دیکھ نہ پائی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ دادا ابا کے ساتھ تشریف فرما تھا اور وہ کوئی نوٹس نہ لے پائی تھی۔

محترم عرفان علی خان اس کی سمت دیکھ چکے تھے۔ سواب و ہیں سے پلٹ جانا بھی کسی طرح نہ تھا اور ایسے میں جب کہ وہ اس کی جانب متوجہ بھی تھی تو نظر انداز کر کے چلے جانا مناسب نہ لگا تھا۔ تبھی وہ اس کے متوجہ ہونے پر بہت رگمی مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھی تھی۔ عرفان علی خان کی اس کی سمت تھیں۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ وہ رگمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

”تم بڑی خوش قسمت ہو۔ تمہارے پاس دادا ابا جیسی ہستی ہیں۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ دادا ابا واقعی لڑیچر کا چلنا پھرتا انسانی ٹیکو پیڈیا ہیں۔ بہت معلومات ہیں ان کے پاس۔“ عرفان علی خان بے حد متعجب رہا تھا۔

”تو آپ فیض یاب ہو رہے ہیں دادا ابا کی معلومات سے۔“ انابہ شاہ مسکرائی تھی۔

”وائے ناٹ۔ دادا ابا واقعی بے مثال ہیں۔“ اس نے تعریف کرنے میں کوئی کسر اٹھانیں رگی ابانے جواب اس کی بیٹھ پتھائی تھی۔

”جیتے رہو بیٹا۔“

”تھیک یو دادا ابا! آپ کی صحبت میرے لئے ایک اعزاز ہے۔“ عرفان علی خان یقیناً اپنی جا چاہتا تھا۔ اس لئے دادا ابا مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”یقیناً تم سے مزید نشستیں بھی رہیں گی۔ مگر فی الحال مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے۔ تم ملاقات ہوگی۔“ دادا ابا اٹھے تھے اور وہاں سے چلے گئے تھے۔

عرفان علی خان بہ غور انابہ شاہ کی سمت نکتے لگا تھا۔

”کیا سوچا آپ نے؟“

”کس بات سے متعلق؟“ انابہ شاہ حیران ہوئی تھی۔ عرفان علی خان نے اس کی جانب دیکھا اور مسکرایا تھا۔

”بھول گئیں آپ؟“

انابہ شاہ نے خاموشی سے چند ثانیوں تک دیکھا تھا۔

”کیا مجھے یاد رکھنا چاہئے تھا؟“

”اگر ایسا ہوتا تو اچھا تھا۔“ عرفان علی خان کا لہجہ کچھ دھیما تھا۔

”مگر ایسا ہونہ سکا اور اب یہ عالم ہے.....“ وہ بر جھٹکی سے کہتے ہوئے مسکرائی تھی۔

”نوٹس نہیں تیری جستجو بھی نہیں۔“ عرفان علی خان اس کے ادھورے جملے کو مکمل کرتا ہوا مسکرایا تھا۔ اس کے چہرے کو بہ غور نکتی رہی تھیں۔ لیوں پر ایک قسم جاہد ہو گیا تھا اور وہ بہت ہولے سے

نے لگا تھا۔ ”اور ہوں۔“ مگر ایسا یقیناً نہیں ہے۔“ لہجہ دھیما اور سرگوشی جیسا تھا۔ شاید انابہ شاہ ٹھیک طور پر نہیں پائی تھی سبھی اس کی سمت نکتی رہی تھی۔ جب کہ عرفان علی خان کے لیوں کی مسکراہٹ گہری ہوگی

لا۔ ”تو آپ نے فراموش کر دیا مجھے۔“ عرفان علی خان نے جیسے بڑی فرصت سے اسے دیکھا تھا۔ ”میں نے کب کہا تھا کہ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی؟“ انابہ شاہ نے بے نیازی سے کہتے ہوئے یہ جیسے لاجواب کر دیا تھا۔ وہ متاثر نہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ وہ یقیناً بر جھٹکی اور حاضر جوابی میں اپنا ثانی لیں رکتی تھی۔

”تو آپ میری مدد نہیں کریں گی؟“ عرفان علی خان کی بھوری آنکھوں کی جوت یکدم ہی بجھنے لگی تھی۔ ”کیا میں نے آپ سے ایسا کوئی وعدہ کیا تھا؟“ انابہ شاہ کے پُر اعتماد چہرے پر بہت دھیما مسکراہٹ لہوئی تھی۔ عرفان علی خان کی ساری امیدیں پل میں ڈھیر ہوئی تھیں۔

”تو آپ واقعی میری کوئی مدد نہیں کر رہی ہیں؟“

”اوس..... ہوں۔“ انابہ شاہ نے سرنفی میں ہلایا تھا۔ ”میں نے سوچا تو مجھے لگا یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ بہتر ہے۔ اس سے غلط فہمیاں بھی جنم لے سکتی ہیں۔ میری اور لامعہ کی دوستی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے اور با میں قطعاً نہیں چاہوں گی۔“ انابہ شاہ کی سمت رگی آنکھوں کی روشنی بڑی شفاف تھی۔ ایک اعتماد سا لگ رہا تھا اس کے لہجے سے۔ عرفان علی خان کی ساری ہمت جیسے ڈھے گئی تھی۔ وہ ساکت سا اس کی مت نکتا چلا گیا تھا۔ پھر یکدم ہی سرنفی میں ہلانے لگا تھا۔

”تم..... تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ آئی مین، تم کیسے چاہو گی کہ لامعہ کی زندگی اچھی نہ گزرے۔“

”میں یقیناً ایسا نہیں چاہوں گی اور میں ایسا چاہتی بھی نہیں۔ تبھی تو ایسا اقدام لے رہی ہوں۔ دیکھو عرفان علی خان! میں تمہیں فقط کچھ دنوں سے جانتی ہوں اور یہ جان پہچان بھی بڑی واجبی سی ہے۔ جب کہ معترف کو میں گزشتہ اٹھارہ برس سے جانتی ہوں۔ تب سے، جب مجھے رویوں کی کچھ پہچان بھی نہ تھی۔ اور اُسے تب ایک دوسرے کو جانا اور.....“

”اور انابہ شاہ! مجھے تمہاری اسی انڈر اسٹینڈنگ کی ضرورت ہے۔“ وہ اس کی بات کا ثنا ہوا گویا ہوا لہجہ انابہ شاہ نے اسے بہت اطمینان سے دیکھا تھا۔

”میری اس انڈر اسٹینڈنگ سے تمہیں کیا ملے گا عرفان علی خان؟ میں یہ بات ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکتی۔ تمہیں نہیں لگ رہا چارہ گر کوئی اور ہے اور تم رجوع کہیں اور سمت کر رہے ہو۔“ انابہ شاہ کا رویہ یقیناً اس کے لئے چونکا دینے والا تھا اور وہ یقیناً اس دن کے بعد سے اس سے ایسی کوئی توقع نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ جس طرح اس نے اس سے بات کی تھی، اس سے وہ یہی اخذ کر پایا تھا کہ وہ اس ضمن میں اس کی مدد کرنے کو تیار ہے۔ مگر ایسا یقیناً نہیں تھا۔ انابہ شاہ یقیناً ایک ذہین لڑکی تھی جو عقل و خرد سامنے رکھ کر فیصلے کرنے کا

گر جانتی تھی اور عفنان علی خان نے یقیناً اسے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ وہ اس کے رویے پر حیران تھا۔ تبھی چند ثانیوں تک کچھ بول ہی نہ پایا تھا۔ فقط خاموشی کے ساتھ اس کی سمت نکلتا رہا تھا۔

”عفنان علی خان! لامع حق سے جو میری انیسیت یا نسبت ہے اس کے لئے میں تمہیں تو سمجھنے سے روکتی ہوں مگر تمہارے لئے قطعاً بھی کسی طرح سود مند ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگر یہی بات مجھے لامع حق شاید میں ایسا آنکھیں بند کر کے گزرتی، مگر تمہارے لئے۔“ وہ بہت ہولے سے سرنئی میں بلا تھی۔ ”ایسا ممکن نہیں ہے عفنان علی خان! تم سے میری کوئی نسبت نہیں ہے۔ کوئی حوالہ ہے بھی تو فقط حق کا۔ میں تمہیں لامع حق کے توسط سے دیکھتی ہوں، اس کے توسط سے ملتی ہوں، اس کے توسط سے جانتی ہوں، اس سے زیادہ تم میرے لئے کچھ نہیں ہو۔ میں چند لمحوں کی فقط جان پہچان کے لئے طویل عمر کی رفاقت اور دوستی کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔ یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے۔“ وہ مکمل طور پر اٹھ اٹھی اور عفنان علی خان جہاں کچھ دیر قبل کسی قدر حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا اب شاید کسی قدر سنبھلا تھا۔ تبھی اس لمحے اس کے لیوں پر ایک دھیمسا تھم کھیل گیا تھا۔

”انا بیہ شاہ! میں تمہیں کوئی انتہائی اقدام اٹھانے کو نہیں کہہ رہا۔ مسئلہ فقط یہ ہے کہ میں لامع حق چاہتا ہوں اور اس میں تمہاری اتنی ہی مدد چاہتا ہوں جتنی کہ کوئی ایک بہترین دوست، کسی دوسرے کی کر سکتا ہے۔ میں تم سے کوئی فیور نہیں چاہ رہا۔ نہ ہی کوئی شرط درمیان رکھ رہا ہوں۔ کسی طرح غلط بیانی بھی میں نے ہرگز نہیں کی۔ اگر مجھے تمہاری کوئی مدد درکار ہے تو اس میں کچھ جھوٹ نہیں ہے واقعی تمہاری ضرورت ہے انا بیہ شاہ! تمہاری انڈر اسٹینڈنگ کی ضرورت ہے۔ تم جتنا لامع حق کو چاہتی یقیناً مجھے نہیں جانتیں۔ اس کی اور تمہاری طویل رفاقت بھی ہے مگر میں تم سے کیا چاہ رہا ہوں انا بیہ شاہ مانگ رہا ہوں؟ کچھ زیادہ تو نہیں، جسٹ لٹل کیئر۔ جسٹ لٹل ہیلپ۔ وہ بھی اس لئے کہ میں، لامع اس طور نہیں جانتا اور چاہتا ہوں۔ میں نہیں جانتا تم اس چھوٹی سی بات کو اتنا ہارڈ لی کیوں لے رہے حالانکہ اس میں اتنی عجیب بات کیا ہے؟ کیا ایک انسان کی مدد کرنا غلط ہے؟ کیا ایک انسان کو کچھ کم برائی ہے؟ اور تم سے میں کیا چاہتا ہوں، یہی نا کہ تم مجھے لامع حق کے متعلق بتاؤ، مطلع کرو۔ وہ کیسا پسند کرتی ہے، کیا ناپسند کرتی ہے، اسے کیا اچھا لگتا ہے کیا نہیں اور اس میں انوکھی اور عجیب بات انا بیہ شاہ؟“ عفنان علی خان نے بہت مدھم لہجے میں جیسے احتجاج کیا تھا۔ مگر انا بیہ شاہ بہت ہولے دی تھی۔

”یہ بات تمہیں جتنی آسان نظر آ رہی ہے درحقیقت اتنی آسان ہے نہیں عفنان علی خان!“

”تم ڈر رہی ہو؟“

”نہیں۔۔۔ یقیناً نہیں۔ اس میں ڈرنے والی کوئی بات ہے بھی نہیں عفنان علی خان! بس نہیں کر سکتی، وہ بات میں نے تمہیں باور کرا دی۔ جو نہیں ہو سکتا، نہیں ہو سکتا، ممکن، ناممکن کے اپنے پیمانے ہوتے ہیں اور میرا دل، میرا دماغ مجھے جس بات کی اجازت نہیں دیتا وہ میں کبے ہوں۔ اس کے لئے چاہے تم مجھے بزدل کہو یا ڈرپوک مگر میں جانتی ہوں، میں ایسا ڈی سی ڈن کہتا ہوں۔“

لے لے رہی ہوں۔ میں کوئی غلط کام نہیں کر سکتی۔ میری اپروچ بہت فینر ہے۔ تم نے مجھے ابھی جانا ہی کہاں ہے۔ اس لئے اگر کچھ بزدل یا ڈرپوک کہتے بھی ہوتے مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جانتی ہوں، جو مجھے جانتا ہے وہ ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔“ اس کی سمت پُر اعتماد نظروں سے نکلتی ہوئی وہ اس گھڑی بیٹانہ اعتماد تھی۔

عفنان علی خان مسکرا دیا تھا، جانے کیوں۔ اور انا بیہ شاہ کسی قدر مروت رکھتی تھی۔ کرٹسی اس کے مزاج کا حصہ تھی شاید حق پر ہوتے ہوئے بھی اور اسے انکار کے بعد بھی وہ کسی مروت سے اس کی سمت نکلنے لگی تھی۔

”آئی ایم سوری عفنان علی خان!“ بہت ہولے سے وہ بولی تھی اور پھر پلٹ کر چلتی ہوئی زینہ طے کرنے لگی تھی۔ عفنان علی خان بہ غور اس لڑکی کی پشت کو نکلتا رہا تھا۔ پھر بہت تھکے ہوئے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لیوں پر ایک گنگفٹ سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔



اگینے نے اذہان حسن بخاری کے سر ڈسے داری لگائی تھی کہ وہ ساہیہ خان کو شہر کی سیر کرائے۔ اگرچہ ساہیہ خان کا بچپن اسی شہر میں گزرا تھا مگر اگینے کا کہنا ماننا اذہان حسن بخاری پر جیسے فرض تھا۔ سو وہ بنا کوئی زور دئے اسے لے گیا تھا اور کتنے ہی مقامات دکھا ڈالے تھے۔

”یہ شہر، اس کے خدو خال، گلیاں، سڑکیں، سب کچھ کتنا بدل گیا ہے۔“ ساہیہ خان کسی قدر حیران تھی۔ ”خود کو دکھو، مجھے دکھو ساہیہ خان! جب ہم اتنے بدل گئے ہیں تو یہ شہر کیوں نہ بدلا ہو گا۔“

ساہیہ خان نے اسے بہ غور دیکھا تھا۔

”تم بدل گئے ہو اذہان حسن بخاری! میں تو اب بھی ویسی ہی ہوں۔“

”اچھا؟ لیکن مجھے تو کسی طرے سے بھی تم وہ ساہیہ نہیں لگ رہیں۔“

”کیوں؟ تمہیں میں کس طرح وہ ساہیہ نہیں لگ رہی؟“

”اچھا یہ بتاؤ، کیا تبدیلیاں آئی ہیں مجھ میں؟“ وہ یکدم رک کر دلچسپی سے اسے دیکھتی ہوئی دریافت کرنے لگی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”کم آن اذہان! چلو زیادہ نہیں ایک، دو، تین، چار، پانچ فقط پانچ تبدیلیاں گنوا دو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے انگلیوں پر گنواتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا پھر یکدم اس کی سمت کسی قدر رازداری سے جھکی تھی۔

”سنو، فقط پوزٹو تبدیلیوں کی بات کرنا۔ نیگیٹو کی بات تو.....“ دھمکی دینے والے انداز میں وہ کہہ کر مسکرائی تھی۔

”تمہارا یہ دھونس دینے والا انداز نہیں بدلا ہے۔“

”یہ پوزٹو تبدیلی ہے؟“ اس نے مصنوعی خشکی سے گھورا تھا۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”یہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے والی عادت نہیں گئی ہے۔“

ساہیہ نے ہاتھ کا ایک مکا بنا کر اس کے شانے پر دے مارا تھا۔

”یہ..... یہ عادت بھی نہیں گئی۔“

”یہ تو ساری کی ساری نیکیوں باتیں ہی گنوائی ہیں تم نے۔ چلو خیر، میں تمہیں تمہاری اچھی باتوں ہوں۔ نمبر ایک تم پہلے سے زیادہ پینڈسم اور ڈشنگ ہو گئے ہو۔ نمبر دو بہت ڈسے دار ہو گئے ہو، نمبر بہت غیر ڈسے دار تھے۔“ وہ بتاتے ہوئے مسکرائی تھی۔ ”نمبر تین سنجیدہ اور بردبار ہو گئے ہو، نمبر کیئرنگ اور لوگنگ ہو گئے ہو اور لاسٹ بٹ ناٹ دی لیسٹ، ڈیڈی کیڈ بہت ہو گئے ہو۔“

ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا۔ ”ایم آئی رائٹ؟“

”اس میں عجب کیا ہے؟۔۔۔ وقت کے ساتھ اتنی تبدیلیاں تو آ ہی جاتی ہیں اگر تیرا اگر تیرا ہوں تو اس میں کوئی خاص بات مجھے نظر نہیں آتی۔ تم بتاؤ اب کہاں جانا ہے؟“

”گھڑی دیکھو اذہان! تمہارا نہیں خیال یہ کھانے کا وقت ہو رہا ہے اور ہمیں کھانے کے مٹا چاہئے۔“ ساہیہ خان نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور تب اذہان حسن بخاری چوکتے ہوئے بولا۔

”اوہ، اچھا یاد دلایا۔“ اذہان نے کہنے کے ساتھ ہی گاڑی میریٹ کی طرف موڑ دی تھی۔

”تمہاری زندگی میں کیا واقعی کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی؟“ میریٹ میں کینڈل لائٹ ڈنکرنا وہ یکدم مسکرائی تھی اور اذہان حسن بخاری کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی سمت تکتے لگا تھا۔

”کیا مطلب؟ کس طرح کی تبدیلی کی بات کر رہی ہو تم؟“

اور تب وہ شرارت سے مسکرائی تھی۔ اس کی دلکش آنکھوں میں یکدم ہی جگنو چمکنے لگے تھے۔

”کوئی لڑکی وغیرہ۔“ وہ اسی شرارت سے مسکرائی تھی۔

”لڑکی وغیرہ؟“ وہ شاید سمجھنا نہ تھا۔

”اس سے زیادہ سیدھی بات کیسے ہو سکتی ہے۔ یقیناً میں نہیں جانتی۔“ وہ خشکی سے تکتے لگی تھی۔

”آں..... آں..... آں..... تو تمہارا اشارہ اس طرف تھا۔“ وہ یکدم چونکا تھا۔

”اور تم کیا سمجھے تھے؟“ وہ مسکرائی تھی۔

”کچھ نہیں۔“ اذہان حسن بخاری نے شانے اچکاتے ہوئے بے تاثر انداز اختیار کیا تھا۔

نظروں سے اس کی جانب تکتے لگی تھی۔ تبھی اذہان حسن بخاری بھی انجوائے کرتا ہوا مسکرایا تھا۔

”لڑکی۔۔۔ کوئی ایسی خاص چونکا دینے والی لڑکی اب تک آئی نہیں زندگی میں۔“

”میں بھی نہیں؟“ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے آنکھیں دکھائی تھیں۔

”تم؟۔۔۔ تم تو خاصے سے زیادہ چونکا دینے والی ہو۔“ وہ جیسے ہنسی میں ٹال گیا تھا۔

”صحیح بتاؤ نا۔“ ساہیہ نے اصرار کیا تھا۔

”بتا تو رہا ہوں۔ تمہارے علاوہ کوئی نہیں۔“

”بے ایمان! کتنے جھوٹے ہو تم۔“ ساہیہ نے اسے گھورا تھا۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”لٹ ہی تھک۔“ وہ ذہن پر کسی قدر زور دیتے ہوئے سوچنے لگا تھا۔

”اس میں اتنا سوچنے والی بات کیا ہے اذہان؟ جس لڑکی نے تمہیں کرش کیا ہو گا وہ بھولی تو نہ ہوگی۔“

”کرش۔۔۔ تو تم اس زاویے سے پوچھ رہی تھیں۔ پہلے بتانا تھا نا۔“ وہ یقیناً اسے چھیڑ رہا تھا۔

”میں گھورنے لگی تھی۔ تبھی وہ مکمل توجہ سے اس کی سمت تکتے ہوئے بولا۔

”تم۔۔۔“

”کیا۔۔۔؟“ وہ چونکی تھی۔ ”شٹ اپ اذہان!“ وہ جیسے بد مزہ ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً اس کے انداز سے مفلوظ ہوا تھا۔

”اور تم؟“

”میں، کیا؟“ وہ اپنی طرف شہادت کی انگلی رکھتے ہوئے چونکی تھی۔

”تم نے اپنی طرف کسی کو آنے نہیں دیا یا کسی نے کبھی زحمت ہی نہیں کی؟“ وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے دریافت کر رہا تھا اور وہ گھورنے لگی تھی۔

”تمہیں نہیں لگتا اذہان حسن بخاری! کم از کم تمہیں لڑکیوں سے اس درجہ صاف گوئی سے سوالات پوچھنے کا سلسلہ منقطع کر دینا چاہئے۔“

”تم نے جواب نہیں دیا۔“ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا۔ ساہیہ نظریں اٹھا کر اس کی سمت تکتے لگی تھی۔

”تم نے پوچھا تھا اور میں نے اس کا جواب دے دیا ہے اذہان!“

”ہاں۔ لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہاری زندگی کسی نئے عنوان سے منبکی یا کہ نہیں؟“

”یہ میں تمہیں کیوں بتاؤں؟“ وہ شرارت سے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ ”تم اس روز بھی کچھ ایسا ہی پوچھ رہے تھے۔ ارادہ کیا ہے؟“ عجب اک شرارت کے ساتھ مسکراتے ہوئے وہ اس سے دریافت کر رہی تھی اور اذہان حسن بخاری ہنس دیا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے ساہیہ! کہ تم جیسی مرد مار لڑکی کے متعلق کوئی کافر اس زاویے سے سوچ بھی سکتا ہے۔ کم از کم مجھ پر تو ابھی اتنا برا وقت نہیں آیا کہ اپنی شامت کو خود سے آواز دوں۔“ وہ یقیناً اس لمحے اسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ ہنس دی تھی۔

”ٹھیک کہا تم نے مرد مار لڑکی۔ وہاں کیلگری میں ہمارے پڑوس میں ایک ایٹن لڑکا تھا۔ ایک دن اس بے چارے نے مجھے صبح میں جو گنگ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد تو اس نے گویا اپنا معمول ہی بنالیا۔ بہانے بہانے سے، یونو، تو وہ تو لڑکوں کا خاص انداز ہوتا ہے۔ نام کیا ہے جی؟ کرتی کیا ہیں؟

نہری ہائیر یہ ہیں۔ تو کیا ہم شام میں مل سکتے ہیں وغیرہ۔ اور تم جانتے ہو میں نے اس بے چارے کو کیسے دبا کر کھا گئے پر مجبور کر دیا؟ حالانکہ موصوف اچھا خاصا پینڈسم تھا۔“

وہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔

”نام کیا تھا اس کا؟“ اذہان نے پتہ غور تکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”علی۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

کسی بھی دن، کسی بھی مہینے۔

کسی بھی ماہ و سال۔

کسی جگہ میں، کسی کونے میں، کسی کونے میں۔

تم میرے ساتھ کی تمنا کرو۔

مجھے سوچو، اتنا کہ تمہارے خیال کے تمام زاویے میرے رنگوں میں رنگنے لگیں۔

مجھے جانو، اتنا کہ میں تم میں تمہارے لگوں اور تم تم نہ رہو۔

مجھے چاہو، اتنا کہ کوئی حد باقی نہ رہے۔

مجھے اپنی جاں میں رکھ لو، اپنے اندر کہیں چھپا لو۔

میں تم میں تم ہو جاؤں اور تم مجھ میں۔

کوئی تمہیں، ہمیں کھوجنے بھی آئے تو کوئی نشان باقی نہ ملے۔

مجھے خود میں ضم کر لو۔

میں تمہارا سامان خاص ہوں۔ زاوراہ ہوں۔ مجھے اپنے سنگ لے لو اور اپنا ہمسفر کر لو۔

میرا ہاتھ، ہاتھ میں تمام لو اور مجھے کبھی تنہا مت چھوڑو۔ مجھے سنگ رہنا ہے تمہارے۔ قدم قدم ساتھ

چلا ہے۔ میں جادو ہوں۔ مجھے اپنے وجود پر چھانے دو۔ مجھ کو اپنا کر لو۔ یا مجھے اپنا ہونے دو۔

وہ دھم دھم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ کیسے خواب ناک حروف تھے اور کیسا جادو سا تھا اس کا لہجہ۔

”ہیں، اسی پچھیل میں، یہیں پر مجھے ایسا لگا تھا کہ کہیں کوئی میرا منتظر ہے۔ میرا انتظار کر رہا ہے۔ شاید

کئی دنوں سے، شاید مہینوں سے، شاید سالوں سے، یا پھر شاید صدیوں سے۔ تب میرا ایمان ایسی

باتوں پر نہیں تھا۔ اور.....“

”اور اب؟“ میرب سیال کے لب جانے کیسے یکدم وا ہوئے تھے۔ وہ چونکا تھا۔ اسے لمحہ بھر کو دیکھا

تھا۔

”پتہ نہیں۔“ شانے عجب ایک بے نیازی سے اچکائے تھے۔ ”مجھے نہیں معلوم۔ شاید یہ سب فضول

باتیں ہوں۔ جن پر کم از کم میں یقین نہیں رکھتا۔ مگر اس قلعے کے متعلق مشہور ہے کہ یہاں محبت باتیں کرتی

ہے اور گمشدہ وجود کے حصوں کو تلاشتی ہے۔ تب میں تنہا تھا اور یقیناً یقین کرنے والی کوئی بات تھی بھی

نہیں۔ مگر مجھے لگتا ہے کچھ بے ضرور جو نہ سمجھ میں آنے والا ہے۔ مگر بہت اہم اور خاص ہے۔ اس کے بعد

میں اس بار ہاں اس قلعے میں آیا۔ مگر تنہا نہیں۔“

”اور اس کے بعد وہ آواز نہیں آئی؟“ میرب سیال کی آواز خود اس کے لئے اجنبی تھی۔

”نہیں۔“ سردار سیکٹین حیدر لغاری اس قلعے کے متعلق، اس کے فرنیچر اور تصویر سے متعلق معلومات

میں پوچھنے لگا تھا۔ وہ پچھیل کے وسط میں کھڑی دیواروں پر نقش آرٹ کے حسین نمونوں کو دیکھ رہی تھی جب

سردار سیکٹین حیدر لغاری نے اس کا ہاتھ یکدم ہی گرفت میں لیا تھا۔ وہ چونکی تھی مگر اس سے بھی زیادہ

عزت کے ساتھ سردار سیکٹین حیدر لغاری نے ایک جھٹکے سے بچھڑ کر اپنے قریب کیا تھا۔

”تمہیں جواب تک یاد ہے اس میں کچھ خاص بات تو ہوگی۔“ اذہان مسکرایا تھا۔ وہ ہنس دی گئی

”اسے یاد رکھنے والی ایسی دیکھی کوئی بات نہیں۔ وہ بھی تم نے اصرار کیا تو مجھے یاد کرنا پڑا۔“

قول تمہارا نام بوائے امیج کے ساتھ کسی کی ہمت ہو ہی نہیں سکتی کہ قریب سے بھی گزر جائے۔“ وہ مسکرائی

”یاد ہے تمہیں بچپن میں تمہاری کینسی بری پٹائی لگا یا کرتی تھی۔“

اذہان حسن بخاری اس ذکر پر شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ پھر قدرے توقف سے اس کی جانب بڑھ

ہوئے بولا۔

”ویسے اب تو خاصی تبدیل ہو چکی ہوتی۔ اور خوب صورت تو یقیناً ہو۔“

”اوہ، ریکلی؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”آف کورس۔“ اذہان حسن بخاری نے دل پر ایک ادا سے ہاتھ رکھ کر جیسے کوئی حلف اٹھایا تھا

یکدم مسکرا دی تھی۔

”جھوٹے کہیں کے۔“

اذہان حسن بخاری ہنس دیا تھا۔

وہ اس وقت جرنی میں تھے۔ کتنے ہی مقامات گھومنے کے بعد وہ اس وقت ہائیڈل برگ میں

سردار سیکٹین حیدر لغاری اس کی سمت نکلتے ہوئے بہت دھیمے سے مسکرایا تھا۔

”اس ہائیڈل برگ کیسیل کے لئے ایک بات مشہور ہے کہ یہ جگہ بے حد روٹینک ہے اور یہ کہہ

تہا نہیں جانا چاہئے۔ اس لئے لور پیس۔ محبت کرنے والوں کو اپنے لودینس کے ساتھ اس قلعے میں

چاہئے۔“ شاید وہ یہاں پہلے بھی آچکا تھا۔ کس کے ساتھ؟ یہ وہ نہیں جانتی تھی اور شاید جانتا بھی نہیں

تھی۔ مگر وہ بول رہا تھا۔

”ایک بار پہلے میں یہاں آیا تھا اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ۔ جب وہ سب قلعے کے باہر

میں تب تنہا اندر چلا گیا تھا اور جانتی ہو تب کیا ہوا تھا؟“ وہ پُر جوش لہجے میں بتاتے ہوئے یکدم

میرب سیال کو جاننے کا بھلا کیا شوق ہو سکتا تھا؟ وہ تو سن بھی بے دلی کے ساتھ رہی تھی۔ دھیان

کی سمت لگاتا ہی کب چاہتی تھی وہ۔ مگر وہ بھی نہ جانے کیوں اسے اس لئے اس ہائیڈل برگ کیسیل

داستان سنانے پر بضد تھا۔ اس کے رکنے پر میرب سیال نے فقط سوائیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھا

دریافت قطعاً نہیں کیا تھا۔ مگر شاید یہ اشارہ ہی سردار سیکٹین حیدر لغاری کے لئے کافی تھا کہ وہ حریف

لگا تھا۔

”میں اس قلعے کے پچھیل میں تھا جب مجھے کوئی جادو خود کو زیر کرتا لگا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے کوئی

اندر ہو اور ہولے ہولے مجھ میں باتیں کر رہا ہو۔ وہ لہجہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں اس زبان سے

شاید واقف نہیں تھا۔ مگر میرے اندر جو سرور اس لمحے تھا اس سے قبل میں نے محسوس نہیں کیا تھا

جیسے کوئی میرے اندر ہے اور کہہ رہا ہے، مجھے تم سے ملنا ہے، کہیں، کسی روز۔

ماحول میں محبت باتیں کر رہی تھی۔

اک جادو چار سو پچیس رہا تھا۔

ایک فسوں، جان کو اپنے بس میں کر رہا تھا۔

فضا میں ایک نشہ تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ دل پر اس جادو کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

کتی مشکل میں گھر گئی تھی جان۔ کیسا بھونچال سا آگیا تھا سارے وجود میں۔ ایک قیام

تھی۔ دھڑکنوں نے یکدم ہی حشر مچا دیا تھا۔ اس کا وجود ایک عجیب جنونی گرفت میں تھا۔

سائیس اس کے چہرے کو جھلسا رہی تھیں۔

میرب سیال کی جان فنا ہونے کو تھی۔ اس لمبے مزاحمت کیسی بے معنی لگ رہی تھی۔ وہ جوڑ

حشر اٹھا دینے کو تھا۔

میرب سیال نے ایک جھٹکے سے اس حصار سے خود کو رہا کر لیا تھا اور پھر بھاگتی ہوئی اس کی

چلی گئی تھی۔

ہول میں آکر وہ اپنے کمرے میں دیک کر کتنی دیر تک گہری گہری سانسیں لیتی رہی تھی۔

دل ایک عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ بڑا بے ہنگم شور تھا۔ اس کا پورا وجود جیسے کسی بھون

میں تھا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ وہ ایک لمحہ جیسے قیامت کو چھو کر گزرا تھا۔ سارے وجود میں جس کا

تک وہ محسوس کر رہی تھی۔ آنکھوں میں جانے کیوں اس لمبے بہت سی نمی آن ٹھہری تھی اور پلک

ہولے بھگنے لگی تھیں۔

سردار سبکگین حیدر لغاری اس کے وہاں سے اس طرح چلے آنے پر پریشان سا اس کے

جب وہ بیڈ پر اوندھے منہ بڑی ہولے ہولے لرز رہی تھی۔

دروازے میں رک کر اس نے میرب سیال کو دیکھا تھا۔ پھر بہت ہولے سے پیش قدمی

اسے چند ثانیوں تک دیکھا تھا، پھر بہت آہستگی سے کسی قدر جھٹکے ہوئے اس کے شانے پر اپنا

تھا۔ میرب سیال کو لگا تھا جیسے اس کے وجود کو کوئی انگارہ چھو گیا ہو۔ وہ یکدم اٹھ بیٹھی تھی۔ بھگی

ایک خاص طرح کا سحر تیر رہا تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے اس کی سمت بہ غور دیکھا تھا۔

قریب بیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

اس گرفت میں، اس لمس میں کوئی خاص آہنگ تھا۔

کوئی بے خودی تھی۔

اور میرب سیال کی جان ہوا ہونے لگی تھی۔ کتنا خوف سمٹ آیا تھا اس کی آنکھوں میں۔ گرم

حیدر لغاری کو مطلق پرواہ نہ تھی۔ ہاتھ بڑھا کر کس قدر آہستگی سے اس کے چہرے کو چھوا تھا۔

پیشانی سے نڈاز لیوں تک شہادت کی انگلی سے ایک صراط بنائی تھی۔ میرب سیال آنکھیں

ہر شخص اس کے قریب تھا۔ بے حد قریب۔ اس کی قربت سے اس کا سارا وجود جیسے جل جانے کا

گرم گرم دہکتی سانسوں کو وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی اور اس کا سارا وجود شل ہونے کو

ہت ہو رہی تھی وہ اس گھڑی۔ کس قدر کمزور۔

”محبت زندگی ہے ہنی! اور زندگی بہت مختصر ہے۔“ وہ مدہم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ جب یکدم ہی میرب

یال کے بے جان وجود میں ایک قوت آن سائی تھی۔ ہمت جیسے یکدم ہی بیدار ہوئی تھی۔ میرب سیال کا

ہاتھ اٹھا تھا اور سردار سبکگین حیدر لغاری کے چہرے پر اپنے نشان ثبت کر گیا تھا۔ کمرے کے سناٹے میں

ایک شور ہوا تھا اور سارا منظر ساکت رہ گیا تھا۔

سردار سبکگین حیدر لغاری نے کس قدر سلگتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ پھر اسی قدر جارحانہ انداز

سے اس کے بالوں کو ہاتھ کی گرفت میں جکڑ کر اس کے چہرے کو سلگتی نظروں سے دیکھا تھا۔

میرب سیال نے ایک جھٹکے سے خود کو اس سے آزاد کر لیا تھا اور اسے گھورتی ہوئی دیوار سے جا لگی تھی۔

”کیوں..... کیوں کر رہے ہو تم یہ سب میرے ساتھ؟ کس لئے؟ کیوں؟“ کتنے آنسو اس کے

رخساروں کو بھگوتے چلے گئے تھے۔ کچھ محوں قبل تک کا خوف جیسے اس کے اندر سے کہیں معدوم ہو گیا تھا

اور اس لمبے وہ اپنے سامنے موجود شخص کو کس قدر پُر اعتماد نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”محبت تم جیسا شخص قطعاً نہیں کر سکتا۔ تم جیسے شخص کے نصیب میں محبت ہو بھی نہیں سکتی اور ہوگی بھی

نہیں۔ تم محبت کے قابل نہیں ہو۔ تمہاری بد نصیبی پر مجھے ترس آتا ہے۔ میں بلاوجہ تم سے خوفزدہ ہوتی رہی۔

تم..... تم جیسا شخص جو خود..... خود سے نظریں نہیں ملا سکتا، وہ کسی دوسرے کو کتنا نقصان پہنچا سکتا ہے۔

مجھے اس بات کا اندازہ کر لینا چاہئے تھا۔ اب تک بہت سی لڑکیوں سے ملے ہو گئے تم۔ بہت سی لڑکیوں کو

پہنچا کر دیدہ کیا ہو گا۔ بہت کو اپنے حصار میں باندھا ہو گا۔ مگر سب لڑکیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں سردار

سبکگین حیدر لغاری! حیرت ہے، مجھے تمہاری سمجھ اتنی دیر میں کیوں آئی۔ تم جو جال بن رہے تھے اس کی

نہ تو مجھے سمجھی ہو جانی چاہئے تھی جب تم مجھے یہاں لے کر آ رہے تھے۔“ کتنی پُر اعتماد سی وہ اس کے

سامنے گھڑی تھی۔

اور سردار سبکگین حیدر لغاری اسے ایک تک دیکھ رہا تھا۔

”انسوں ہو رہا ہے مجھے۔ میں نے تم پر اعتبار کیا، تم پر۔ سردار سبکگین حیدر لغاری! ترس آ رہا ہے مجھے تم

پر۔ تم تو بہت چھوٹے ہو۔ دلوں سے کھیلتے ہو نا۔ مگر یاد رکھنا، تمہارا دل کبھی آباد نہیں ہو گا۔ ترسو گے محبت کو۔

اور نہیں ایک بوند بھی نہیں ملے گی۔ محبت کبھی تمہیں ملی نہیں ہے۔ اس لفظ سے تمہارا سابقہ کبھی پڑا نہیں۔ سو

مجھ سے خوب دکھانا بند کر دو۔ خود کو دیکھو، تمہیں خود پر بہت ترس آئے گا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری! محبت

جیسے لفظ سے نا آشنا ہوتی۔ اور انسوں نا آشنا ہی رہو گے۔“

اس کی آنکھوں میں کتنی ہونئی وہ بولی تھی۔ اور پھر اس بھیکے چہرے اور آنکھوں کے ساتھ اس کمرے سے

نفسی چلی گئی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری کتنی دیر تک ساکت سا اپنی جگہ پر کھڑا رہا تھا۔

یقیناً جو کچھ ہوا تھا وہ بے حد غیر متوقع تھا۔

سردار سبکگین حیدر لغاری کو اس بات کی امید شاید قطعاً نہ تھی۔

وہ بھی میرب سیال جیسی لڑکی سے۔

چہرے کی رنگیں بے حد تنگ گئی تھیں۔ تناؤ بے حد بڑھ گیا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا اس کے ساتھ کسی لڑکی نے اس کے وجود کی نفی کی تھی۔ پہلی بار کسی اقدام پر اسے اس طرح کے چارحانہ روئے دکھنا پڑا تھا۔ ورنہ زندگی کس قدر آسان رہی تھی اس کے لئے۔ جب، جو چاہا ہاتھ آ گیا تھا۔ جس ہاتھ بڑھا کر تھامنا چاہا تھا وہ دسترس سے دور نہ رہی تھی۔ اور آج اس کی منکوحہ، اس کی زندگی میں ایک بزدل اور انتہائی خوفزدہ سی نظر آنے والی لڑکی اس کی نفی کر گئی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری کے اندر انتشار یکدم ہی بڑھ گیا تھا۔ وہ باہر نکلا تھا اور اپنے کمرے گیا۔ اس کے اندر ایک الاؤ دہک رہا تھا۔ احساس توہین سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ یقیناً جو ہوا تھا وہاں کئے جانے کے قابل نہ تھا۔ اس کی نفی کے ساتھ اس کی تذلیل بھی کی گئی تھی۔ یقیناً یہ احساس بھلا یا سکتا تھا۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری کے اندر کی کیفیت اس کے چہرے پر درج تھی۔ اگر اس گڑبگڑی وہاں سامنے ہوتی تو وہ یقیناً اس کے وجود کو تہس نہس کر چکا ہوتا۔



میرب سیال تنہائی کے ایک گوشے میں بیٹھی کتنی دیر تک آنسو بہاتی رہی تھی۔ کتنی دیر تک اس کے ہزاروں آنسوؤں کی صورت اس کے گھٹنوں میں جذب ہوتا رہا تھا۔ کیا سمجھتی تھی وہ اس شخص کو اور کیا نکلا تھا اس کے سامنے جو صورت حال تھی، جس طرح سبکتگین حیدر لغاری اپنا تیج بنا رہا تھا وہ سمجھ نہ پا رہی تھی۔ رہانے کیوں اسے کبھی نہیں لگا تھا کہ وہ شخص اس کے لئے بھی کسی طرح کی کسی پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے۔ وہ کبھی ایک لمحے کو بھی سوچ نہیں سکتی تھی کہ وہ کسی طرح کا کوئی نقصان اسے بھی پہنچا سکتا ہے۔ شاید لائے بھی کہ جس طرح وہ اس سے لائق نظر آ رہا تھا، نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے باعث وہ کبھی اس سوچ کے ساتھ لے ہی نہیں سکتی تھی۔ شاید اسی لئے وہ اس کے سنگ چل پڑی تھی۔ بنا کسی خوف، مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنے ہی گھر میں نقب زنی کرے گا۔

آخر ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ اس اقدام پر مائل ہوا۔

میرب سیال نے از سر نو صورت حال کا جائزہ لینا شروع کیا تھا۔ کیونکہ یہ توجہ، یہ قرب کا احساس، یہ نے کی تمنا، دسترس میں لینے کی خواہش، رسائی پانے کی لگن، محبت تو قطعاً نہ تھی اور اس سے قبل سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس سے محبت کا کبھی کوئی دعویٰ کیا بھی نہیں تھا۔ دعویٰ کرنا تو دور کی بات اس کے لئے اقدام سے الفت کی یا محبت کی کوئی رمت بھی نہیں ملتی تھی۔ التفات یا نظر کرم کی بات بھی دور کی تھی۔ وہ اس کے معاملے میں اس درجہ تک بے نیاز تھا کہ اس کے وجود تک کی خبر نہ تھی۔ جیسے اس کے لئے اس کا ایسا نہ ہونا، ایک سا ہو۔ وہ اس کے ساتھ ہوتی بھی تھی تو اس کی توجہ یا دلچسپی کے معیار کے پیمانے شاید مختلف تھے۔ جن پر کم از کم وہ پوری نہیں اترتی تھی۔ پھر کیسے ہوا تھا یہ سب، کس باعث؟

جب وہ سردار سبکتگین حیدر لغاری کی منظور نظر نہ تھی۔ جب کوئی واسطہ بھی نہ تھا۔ تو پھر اس اجنبیت کے اچانک، ایسے کیسے مہربان ہوا تھا وہ؟

اسے دن پہلے بھی تو وہ اس کے ساتھ تھی۔ تب تو کچھ نہ ہوا تھا۔ اگر سردار سبکتگین حیدر لغاری کا ضبط اتنا زور ہوتا تو وہ پہلے ہی ہار گیا ہوتا۔ مگر یقیناً ایسا نہیں تھا۔ یقیناً وہ پہلے اس کی توجہ کا مرکز نہیں تھی اور راتوں رات کوئی چارو نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی چاروئی بات نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ایک لمحے میں سردار سبکتگین حیدر لغاری کے دل سے ڈالمانی انداز میں چرالے لگتی اور وہ فطری عاشقوں کی طرح محبتوں کی انتہائی معراج کو چھونے پاؤسے۔ یقیناً ایسا کوئی خوش کن لمحہ بھی ان کے درمیان نہیں آیا تھا۔ ایسا کوئی حادثہ بھی نہیں ہوا تھا کہ

پل بھر میں جنگل کا جنگل ہرا ہونے کی کیفیت سمجھ میں آسکتی۔
میرب سیال آنسو بہاتے بہاتے یکدم چوکی تھی۔

”آں۔۔۔ تو تم اس لئے قریب آئے میرے۔ اس لئے ان التفات کی بارشوں کو منگوا
آئے کہ مجھے نئے رنگوں سے آشنا کر سکو۔ تم یہ سمجھے کہ میں التفات کی خواہش مند ہوں، تمہاری جاہ
محبت چاہتی ہوں، تمہاری نظر کرم کی منتظر ہوں۔ سو تم ایک مہربان بادل بن گئے۔
تم یقیناً سینی کے ساتھ ہونے والی گفتگو کو سن چکے تھے اور اس کی باتیں تمہیں تپا گئی تھیں۔ تم
کہ مجھے تمہاری نوازشوں کی ضرورت ہے اور میں تمہاری جانب سے کسی پیش قدمی کی منتظر ہوں۔
اور تم مہربان بادل بن گئے۔ التفات کی بارش برسانے کو چل پڑے اور میں سمجھ نہ پائی کہ یہ اتنا
شدید رد عمل بھی ہو سکتا ہے۔ میں سمجھ ہی نہیں پائی اور تم آگے بڑھتے چلے گئے۔ تو تم یہ سمجھے مرد
حیدر لغاری! کہ میں قطرہ قطرہ بھینکنے کی خواہش مند ہوں۔ میں بارشوں کا تعاقب کرنا چاہتی
خواہشوں کی تتلیاں پکڑنا چاہتی ہوں۔ تم سمجھے کہ میں منتظر ہوں۔ کسی دلربائی کی، تمہاری جانب
پذیرائی کی۔ تم سمجھے کہ میں بھی ایک عام سی لڑکی ہوں اور فطرت کے تقاضوں سے روشناس ہوں
ہوں۔ تو یہ تمام صورت حال ایک رد عمل تھا۔ تم سن چکے تھے کہ سینی کیا کہہ رہا تھا، میں کیا کہہ رہی
خوش نہیں تھی تم سے، اور تمہیں خوش کرنے کا انداز یہ نظر آیا کہ مجھے ایسے رنگوں سے رنگ دو جو تمہا
طرح جھوٹے اور کچے ہیں۔

چند روزہ رفاقت، چند روزہ التفات۔

چند روزہ مہربانی اور پھر ایک طویل سیاہ رات۔

تم سمجھے کہ میرے فطری تقاضے بھی وہی ہیں۔ وہی توجہ چاہتی ہوں میں۔

تمہارے احساس کی وہی تپش، وہی حدت، وہی گرم جوشی، وہی احساس پذیرائی اور تم!

میرب سیال یکدم ابھی تھی اور چلتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی تھی۔ تیزی سے سارا سامان ہونا

میں بھرا تھا اور پرس شولڈر پر ڈال کر سوٹ کیس گھسیٹی ہوئی باہر نکل آئی۔ کاؤنٹر پر چائی دی تھی

آؤٹ کر کے باہر نکل آئی تھی۔ یقیناً اب اسے اس شخص کے ہمراہ نہیں رہنا تھا۔ اس کے بعد تو کھانا

وہ اس قدر گر سکتا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو اس سے بہت خوفزدہ تھی۔ کتنا رعب تھا اس کا

متاثر تھی۔ وہ تو اس کی سمت نگاہ اٹھا کر دیکھنے سے بھی ڈرتی تھی۔ کتنا بلند لگتا تھا وہ اسے اور کسے

میں ڈھیر ہوا تھا سب کچھ۔

ایک چھوٹی سی معمولی سی بات کا کیسا شدید رد عمل دیا تھا اس شخص نے۔ ایک تو دو دوستوں کے

ہونے والی گفتگو اخلاقیات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سنی، پھر اس کے خلاف اقدامات بھی کر

اور وہ بھی اس قدر انتہائی اور جارحانہ اقدام۔ تو نیاز مند کرنا چاہتا تھا وہ اسے۔ جب خبر ہوئی تھی

خائف ہے، خوش نہیں ہے، اس رفاقت سے اس کی وابستگی اس طور نہیں ہے تو وہ تپ گیا تھا۔

وہ اس کی جانب سے کچھ اقدام خاص کی توقع رکھتی ہے اور وہ اسے نیاز مند کرنے چلا تھا۔ کچھ

نے اسے۔ کتنی کتنی سلی سی ہو گئی تھی۔ کتنا عام، سطحی مرد بن گیا تھا وہ۔

اس کی سوچ کتنی سطحی ہی نظر آتی تھی۔ اپنے ہی نظروں میں۔ جانے سردار سیکنگٹین حیدر لغاری کی نظروں میں وہ کس مقام پر ہو

بڑھانا انتہائی اقدام اٹھانے کا مرتکب ہوا۔

کیا سمجھ رہا ہو گا وہ اسے۔

اس کا وقار، اس کا شخص، اس کی اتنا، اس کی خودداری جیسے پل میں سب ڈھیر ہو گیا تھا۔ کیسا پست لگ

غائب کچھ۔

بہت سی ہی آنکھوں میں بھر رہی تھی مگر وہ چلتی چلی جا رہی تھی۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ ذہن

اڑا تھا مگر وہ چل رہی تھی۔ اس شخص سے، اس کی پرچھائیں سے بھی دور نکل جانا چاہتی تھی۔ نفرت

وہی ہو رہی تھی اسے اس شاہ فطرت شخص سے۔ بلندیوں پر رہنے کا کتنا ڈھونگ کرتا تھا وہ اور درحقیقت

درجہ پست تھا۔

وہ سوچتی بھی تو شاید سمجھ نہ پاتی۔ کبھی کبھی اخذ نہ کر پاتی۔ اس کی سوچ کی رسائی اس مقام تک آئی ہی

نا۔ مگر ایسا تھا اور یہ سچ تھا۔ وہ شخص بلند نظر تھا، بلند قامت تھا۔ مگر درحقیقت اس درجہ بلند تھا نہیں۔

نی چوکر بھی نہیں گزرا تھا اسے۔

دو سوچ رہی تھی اور دو اپنی نظروں میں گر رہی تھی۔ آخر کیا سوچ کر اس نے پیش قدمی کی تھی۔

اس درجہ وقعت اور ارازاں۔

کیا یہی حیثیت تھی اس کی سردار سیکنگٹین حیدر لغاری کی نظروں میں؟ کیا یہی مقام تھا اس کا اس

زندگی میں؟

دوریوں اور مجھوروں کی کہانی بہت جاں گسل تھی۔ وہ جتنا وقت کی فصیلوں کو پانے کی کوشش کرنا چاہتا

فاصلے اتنے ہی صدیوں پر محیط ہوتے چلے جا رہے تھے۔

عفتان علی خان درمیان موجود تمام فاصلوں کو ایک لمحے میں مٹانا چاہتا تھا اور دوسری جانب فاصلے تھے

مہیاں بنتے جا رہے تھے۔ ایسے میں کوئی تدبیر کارگر ہوتی تو کس طرح؟

وقت متواتر اس کی مخالفت کر رہا تھا۔ دل بھد تھا۔

مگر اقدام منفی نتائج ڈا رہا تھا۔

فاصلوں کی لکیر کو مٹانے کی ہر کوشش جیسے رائیگاں تھی۔ وقت کے ہاتھوں وہ ٹکست خورہ تھا مگر دل

مان رہا تھا۔ مسلسل کسی ضدی بچے کی مانند ضد کئے جا رہا تھا۔

اس شام امام موع کا نون آیا تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ پی سی میں ان کا کوئی سیمینار ہے۔ وہ یکدم چونکا تھا۔

”تم جاؤ گی؟“

”ہوں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ مگر میرا تو کچھ اور پروگرام تھا۔“

”کیا..... کیا پروگرام تھا تمہارا؟“ لامعہ چونکی تھی۔

”تم تو غالباً بڑی ہو آج شام۔ ہم ڈنر کی اور وقت کے لئے اٹھا رکھے ہیں۔“

”اوہ، تم نے مجھے کیوں بتایا کہ تم ایسا کوئی پروگرام بنانے والے ہو؟“

”سرپرائز ڈیرا! وہ مسکرایا تھا۔“

”تو آجاؤ، ہم وہیں ڈنر ساتھ کر لیں گے۔“

”وہاں غالباً تمہارے فیوز کی گیدرنگ ہوگی۔ تم خواہ مخواہ ڈسٹرب ہوگی۔“ تعرض برتا

”ارے نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہم ڈنر سیمینار کے بعد کریں گے۔ تم اس وقت آنا۔

چاہو تو ٹھیک ہے۔ بصورت دیگر تمہارے پاس عین ڈنر کے وقت پہنچنے کا آپشن تو موجود۔

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ بہتر رہے گا۔“ اس نے سرسری لہجے میں کہا تھا۔ مگر اندر کہیں بہت

گئی تھی۔ اور اس شام وہ کتنی اہم ترین آپائنٹمنٹس اور مینٹنگز سینسل کرتا ہوا پی سی میں تھا۔

سیمینار کے اختتام پر لامعہ اسے نظر آئی تھی مگر پھر یکدم اس کی ایک دوست اسے کھینچ

تھی اور تب وہ منتظر نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔

مضطرب نظریں، بڑی بے قراری سے اس ایک آشنا چہرے کو کھوج رہی تھیں۔ جب

تھی۔ ایک اطمینان دل کے کسی کونے میں پھیلنے لگا تھا۔

عفتان علی خان نے اس کی جانب پیش قدمی کر دی تھی۔ انابیہ شاہ کی نگاہ بھی اس کی

شاہد تھی وہ اس کی سمت نکلنے لگی تھی۔

”آپ یہاں؟۔۔۔۔۔ حیرت ہے۔ لامعہ نے ایسا کچھ نہیں بتایا تھا۔“ بات کا آغا

بہانہ درکار تھا۔ سو اس سے مناسب کچھ اور نہ لگا تھا۔ انابیہ شاہ نے اس کی سمت دیکھا تھا

دی تھی۔

”لامعہ اکثر ایسی باتیں بھول جاتی ہے۔ بائی دی وے، آپ یہاں کیسے؟ کہیں آپ

کرنے تو نہیں آئے؟ حیرت ہے، لامعہ نے ایسا کچھ نہیں بتایا تھا۔“ وہ جیسے ایک لمحے میں

رہی تھی۔

عفتان علی خان مسکرایا تھا۔

”گڈ، انٹریٹنگ۔“ وہ جیسے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ لبوں پر بڑی جاہل مسکراہٹ

انابیہ شاہ بہت پُر اعتماد نظروں سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”آپ کو غالباً لامعہ نے انوائٹ کیا ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں نے اسے انوائٹ کیا ہے۔ اچھی سی ہمارا ڈنر کا پروگرام تھا۔ لامعہ

کا کوئی سیمینار ہے۔ میں نے کہا چلو ڈنر کا پروگرام اس کے بعد رکھ لیتے ہیں۔“

”خاصے انڈر اسٹینڈنگ ہیں آپ۔ آپ تو اچھا خاصا سمجھنے لگے ہیں لامعہ کو۔“ انابیہ شاہ

”کیا ہم کہیں بیٹھ سکتے ہیں؟“ وہ جواباً بولا تھا۔ انابیہ شاہ نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”کیوں نہیں؟“ اور سچی وہ چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے تھے۔

”میں نے کہا جب کوئی دوست مدد کرنے کو تیار نہیں تو خود ہی کیوں نہ صورت حال کو قابو کرنے کے

لئے مذہب ڈھونڈی جائے۔“ وہ بہت اعتماد سے مسکرایا تھا۔

”ڈیش گریٹ۔“ انابیہ شاہ نے جیسے داد دی تھی۔ ”بہت اچھا سوچا آپ نے۔ زندگی کی ناؤ اپنی ہو تو

بے کسی اور کے حوالے نہیں کرتے۔ چلانے کی کوشش آپ کرتے ہیں۔ دیر یا سویر، کوشش کرنے سے چپو

نے آجاتے ہیں۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”وہیے ایک بات بتاؤ، دل کے تالاب میں چپوؤں والی کشتی نہیں چلتی۔ اگر چلائی جائے تو سارا پانی

چمک جاتا ہے اور فقط خالی ریت پر کشتی چلتی نہیں۔“ وہ ہنسی تھی۔ ہنسی بڑی کھلکھلائی ہوئی تھی۔ عفتان

خان بہ غور اس کی سمت نکلنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے سینکڑوں جگنو چمکنے لگے تھے۔

عفتان علی خان نے ٹیبل پر اپنے مقابل بیٹھے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ ویٹر دھواں اڑاتی کافی سرو کر گیا

راں کی توجہ کافی سے زیادہ اس چہرے پر تھی۔

”ایک بات بتاؤ گی؟“ انداز سرسری تھا۔

”ہوں۔“ انابیہ شاہ نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”تم نے کبھی محبت کی ہے؟“ وہ انتہائی اطمینان سے سوال پوچھ گیا تھا۔

”کیا؟“ وہ یکدم چونک پڑی تھی۔

عفتان علی خان کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”یہ کیسا سوال ہے؟“ انابیہ شاہ نے جواب دینے سے تعرض برتا تھا۔ وہ ہنس دیا تھا۔ محظوظ ہونے کا

بڑا لہجہ تھا۔ انابیہ شاہ سر جھکا کر کافی کے سب لینے لگی تھی۔

”اظہار کے کون سے طریقے کارگر ہو سکتے ہیں؟ یقین دلانے کے راستے کیا ہو سکتے ہیں؟“ بہت

گتھ میں کئے گئے سوال میں ہزاروں معنی پنہاں تھے۔

”ویٹر آر لاس آف ویٹنری ٹیننگ۔“ انابیہ شاہ نے شانے اچکاتے ہوئے اسے ایک نظر دیکھا تھا۔

”کیا کہوں اور کیسے، کیا کہہ دوں کہ..... کہ میں تمہیں ہر سمت سے اپنے قبضے میں کر لینے کا خواہاں

راں ستوں میں حسد بھی شامل ہے۔ کاش..... کاش میں تمہاری خواب گاہ کا ورڈ روپ ہوتا، کاش

میں اپنے سارے خواب رکھتیں۔ تمہارے کئی خوابوں تک میری رسائی ممکن ہوتی۔“

”تمہیں میں وہ کافی کے کپ کو بغور دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اور انابیہ شاہ ساکت سی بیٹھی اس کی سمت

آنکھیں لگا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

”کیا ایسا کہنا مناسب ہوگا؟“ یہ غور اسے تکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”یہ شاہ نے اس کی آنکھوں کی سمت دیکھا تھا پھر شانے اچکاتے ہوئے سرنفی میں ہلا دیا تھا۔ پھر اسی

الہجہ میں بولی تھی۔

سردار سیکٹین حیدر لغاری چت اپنے بیڈ پر بڑا تھا جب یکدم ذہن میں ایک جھماکا ہوا تھا اور وہ تیزی سے اٹھ کر باہر کی سمت دوڑا تھا۔ پہلی فرصت میں اس کے کمرے کا دروازہ بجایا تھا مگر کمرہ لاک تھا۔ یقیناً وہ یہاں نہیں تھی۔ وہ بڑی عجلت میں ریسپشن پر پہنچا تھا۔ اس کی بابت دریافت کیا تھا۔

”جناب! وہ تو ابھی تھوڑی دیر قبل چیک آؤٹ کر گئی ہیں۔“ ریسپشن نے ششہ انگریزی میں مطلع کیا تھا اور دوسرے ہی لمحے سردار سیکٹین حیدر لغاری نے باہر کی سمت دوڑ لگا دی تھی۔ نگاہ بہت بے قراری سے اسے دیکھ رہی تھی لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ باہر کی سمت دوڑا تھا۔ تبھی وہ اسے دور سے دکھائی دی تھی۔ سردار سیکٹین حیدر لغاری نے بڑی سرعت سے اس کی جانب پیش قدمی کی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی جب وہ اس کے سامنے جا رکا تھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ موسم خراب تھا۔ میرب مال نے نگاہ اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔ بیگی پلکوں پر بہت سے موتی اب بھی چمک رہے تھے۔ سردار سیکٹین حیدر لغاری نے اس کے ہاتھ سے سامان لینا چاہا تھا مگر وہ مزاحمت کرتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی تھی اور سردار سیکٹین حیدر لغاری کا بھاری ہاتھ اٹھا تھا اور میرب سیال کے چہرے پر اپنا نشان ثبت کر گیا تھا۔ برب سیال ساکت سی اس کی سمت تکتے لگی تھی۔

بوندا باندی کے تسلسل میں یکدم ہی تیزی آگئی تھی۔ تیز بوجھاڑ انہیں بھگونے لگی تھی۔ سردار سیکٹین حیدر لغاری انتہائی خشکیوں نظروں سے تکتا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ میرب سیال کی ساکت نظریں کسی جذبہ سے اس کی سمت اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اسی طرح ساکت و جامد کھڑی تھی۔ جب سردار سیکٹین حیدر لغاری نے اپنا مضبوط آہنی ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی کو تھاما تھا۔ مگر وہ مزاحمت کرتی ہوئی چیخ پڑی تھی۔

”مجھے نہیں رہنا ہے تمہارے ساتھ۔۔۔ کیوں کر رہے ہو تم میرے ساتھ ایسا؟ کیا سمجھتے ہو تم؟ کیا تم با اختیار ہو؟ سب کچھ روارکھ سکتے ہو، جو چاہو کر سکتے ہو، حاکم و مختار ہو، دنیا کو اپنی مٹھی میں لئے رہتے ہو، جب چاہو، جو چاہو کر سکتے ہو۔ لیکن میں نہیں ڈرتی ہوں تم سے۔ سنا تم نے۔ کوئی خوف نہیں مجھے تمہارا۔ تم کس حد تک جا سکتے ہو، جان گئی ہوں میں۔ کتنا بلند جانا تھا میں نے تمہیں مگر بہت کھوکھلے۔“

بارش میں بیگی ہوئی انتہائی نفرت سے سردار سیکٹین حیدر لغاری کی سمت تکتی وہ چیخ رہی تھی۔ لہجہ اور نرے خوف تھا۔ اگرچہ میرب کی کلائی اب بھی اس آہنی گرفت میں تھی۔ سردار سیکٹین حیدر لغاری فٹن کھڑا سے دیکھ رہا تھا۔ میرب سیال کی آنکھوں سے بہت تیزی سے آنسو بہہ رہے تھے اور انتہائی قدرتی سے بارش کے پانیوں میں مل کر ضائع ہو رہے تھے۔

”کیا سمجھتے ہو تم؟ تمہاری قربتوں کی مستلشی ہوں میں۔ تم جیسے شخص کی ہمراہی کی خواہاں ہوں۔ کیا اخذ کرنے۔ کیا چاہتی ہوں میں تم سے، ایسی قربت، ایسی محبت، ایسا التفات، ایسا کرم، کیا سمجھتے تم سردار حیدر لغاری! کیا اخذ کر کے تم نے ایسا اقدام اٹھایا؟ کسے تمہیں لگا کہ میں تمہاری سردمہری سے عاجز نا ہوں اور تمہاری کسی گرم جوشی کی خواہاں ہوں۔ تم کتنے سطحی مرد ہو، یہ اچھی طرح جان گئی ہوں میں۔ میں کیسے لگا کہ میں ایک اتنی ارزاں سی لڑکی ہوں جسے حاصل کرنا تمہارے لئے اتنا آسان رہے گا۔ تو

”کہنے کے لئے بے تماشائے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔“
”تو پھر؟“ وہ مسکرایا تھا۔

”پتہ نہیں۔ شاید میں نہیں جانتی۔“ وہ نگاہ پھیر گئی تھی۔
”لامعہ کی دوست ہو اور اتنی ہی مدد نہیں کر سکتیں۔“

”تمہیں ہر بار یہ کیوں لگتا ہے کہ میں کوئی خدائی فوج دار ہوں۔ یا پھر کوئی ہیلپ لائن نے جواز چاہا تھا۔“

عصفان علی خان ہنس دیا تھا۔

”مجھے ایسا ہرگز نہیں لگتا۔ مگر میں مدد کس سے مانگوں۔ تم جھیل سی گہری ہو اور ایسے لوگ بہ کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کی سوچ بھی اسی قدر وسعت رکھتی ہے۔“

”اور لامعہ حق جھیل سی گہری نہیں ہے نا؟“ وہ اس کی سمت دیکھتی ہوئی مسکرائی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی۔
”میں ایسی باتیں نہیں بھولتی۔“

”اور کیا کیا یاد ہے تمہیں؟“ بے غور تکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”وہ سب کچھ جو میں یاد رکھنا چاہتی ہوں۔“
”تھینکس۔“ وہ بہت دلکشی سے مسکرایا تھا۔

”نور و ہاٹ؟“ وہ چونکی تھی۔

”تم نے مجھے اپنی سوچوں میں زندہ رکھا، یادوں میں تازہ رکھا۔“ وہ ہنسا تھا۔ ”تم باتیں اٹھو شاید مجھے پہلی بار ادراک ہو رہا ہے کہ خوب صورت لڑکیاں باتیں بھی خوب صورت کرتی ہیں۔“

”یہ اعتراف ہے یا سیکٹین اعتراف؟“ وہ بنا متاثر ہوئے گویا ہوئی تھی۔ عصفان علی خان مسکرا کر
”اعتراف..... اعتراف شکست کہوں تو شاید زیادہ مناسب لگے۔“ جملہ ذومعنی تھا۔ گئی تھی۔

تھے۔ انا یہ شاہ نگاہ کا زاویہ پھیر گئی تھی۔

”بتایا نہیں تم نے۔“

”کیا؟“ وہ چونکی تھی۔

”تمہیں کبھی محبت ہوئی یا نہیں؟“

”بہت فضول سوال نہیں یہ؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بہت پر اعتماد انداز میں پھر یکدم رست و انج پر نگاہ ڈالتے ہوئے اس کی سمت تکتے لگی تھی۔

”تھینکس نور یور کانی۔ لامعہ کو آنے میں شاید دیر لگے گی۔ مجھے جانا ہو گا اب۔“ وہ کہنے لگی۔
اس کی سمت ایک مرد سے دیکھتی ہوئی مسکرائی تھی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

عصفان علی خان تادیر اس پر اعتماد قدم اٹھائی لڑکی کو تکتا رہا تھا۔

اس لئے لائے تھے تم مجھے یہاں۔ اس مقصد کے لئے۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری! مجھے تمہارے تو کربھی گھن آ رہی ہے۔ حیرت ہے، تمہیں احساس تک نہیں۔ تم نے مجھے انہی لڑکیوں کی قطار میں کھڑا کیا جن کا گزر مجھ سے قبل تمہاری زندگی میں تھا۔ میں تمہارے قریب تھی۔ تمہارے نام سے تھی اور تمہیں لگا میں سہل اھصول ہوں۔ تمہارے اختیار میں ہوں۔ مکمل استحقاق رکھتے ہو تم۔ جو رہ سکتے ہو۔“

بارش زوروں پر تھی۔ موسم میں خنکی بڑھنے لگی تھی مگر اسے احساس تک نہ تھا، اس کا چہرہ زرد پڑا سردار سبکتگین حیدر لغاری کے ہاتھ میں موجود اس کا ہاتھ بالکل بخ ہو رہا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری سمٹ اٹھی نظروں میں نفرت تھی اس لئے۔ اور یہ پہلا احساس تھا جو اس نے برتا تھا۔ اس سے کبھی اس بات کا تجربہ نہ ہوا تھا۔ بے تاثر چہرے اور سانس آنکھوں کے ساتھ وہ اسے دیکھتا ہوا یکدم اسے کھینچتے ہوئے آگے کی سمت بڑھنے لگا تھا۔

انداز جارحانہ تھا۔ آنکھیں بے تاثر تھیں۔ مگر شاید اس سکون کے پیچھے کوئی بہت بڑا طوفان چھپا ہوا تھا۔ ان خاموشی کی تہوں میں کوئی ضرورت تھا۔ کہیں کوئی انتشار ضرورت تھا جو بے ظاہر نظر نہیں آ رہا تھا مگر کہیں موجود تھا ضرور۔

وہ میرب سیال کی کلائی پر اسی درجہ مضبوط گرفت رکھے آگے بڑھا تھا اور میرب سیال اس کے کھینچتی چلی جا رہی تھی۔ میرب سیال کا دل جیسے تھمنے کو تھا۔ دھڑکنیں جیسے مدھم مدھم پڑتی محسوس ہو رہی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ سارا وجود سرد پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ ہمتیں جیسے ٹوٹ رہی اس میں دو قدم چلنے کی بھی جیسے سکت نہ تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری بازو سے تھامے گھینٹا چلا جا رہا جب یکدم ہی اس کی ہمتیں جواب دے گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا تھا اور وہ ہونی اس کے بازوؤں میں آ رہی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کے ہوش و خرد سے بیگانہ چہرے کی سمت ایک نگاہ کی تھی بانہوں میں موجود اس جھولنے ہوئے وجود کو دیکھا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل جو دھواں دھار اس کے بول رہی تھی اس گھڑی وہ اس کی پناہ میں ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے ہوئے ہونٹوں اور بے تاثر آنکھوں کے ساتھ اس وجود کو دیکھا تھا۔ پھر بہت ہولے سے اس کے ہونٹوں کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر قبل جن آنکھوں سے نفرت پھوٹ رہی تھی وہ بند تھیں۔ جس زبان سے زہر اٹھا تھا وہ چپ تھی۔ وہ وجود ہوش و خرد سے بیگانہ اس کے رحم و کرم پر تھا۔ سارے دعوے بے کار رہ گئے اس لئے وہ اسی کے بازوؤں میں تھی جس کے لئے اس کے اندر حد درجہ کدورت تھی، نفرت تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری اس کے نازک وجود کو بازوؤں میں لئے ہوئے کی سمت بڑھ رہا تھا۔

مہندی کی تقریب تھی۔ سب میوزک پر بھنگڑا کر رہے تھے۔ ساہیہ خان بھی پیش پیش تھی۔

مہندی تھی۔ بلکہ حوا ترا سے بھی کھینچ رہی تھی۔ مگر اذہان حسن بخاری مسکراتے ہوئے سرنئی میں ہلا رہا تھا۔ ”کیا ہے؟“ کتنے کے مشرقی ٹائپ مرد ہوتے۔ وہ چھپڑ رہی تھی۔ مگر وہ ہنس دیا تھا۔

”میرے لئے تم اتنا سا بھی نہیں کر سکتے ہو؟“ ساہیہ نے گھورا تھا۔

”مجھے یہ سب بالکل بھی نہیں آتا۔“

”لیکن اکیٹنے کی شادی پر تو تم نے خوب ہلا گلا کیا تھا۔“ جتایا تھا۔

وہ حیران ہوا تھا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ تب تو تم یہاں پر تھیں بھی نہیں۔“

”تم کیا سمجھتے ہو، یہاں پر نہیں ہوں گی تو کیا یہاں سے ناواقف بھی ہوں گی؟“ وہ مسکرائی تھی۔

وہ چونکا تھا۔

”یعنی تم یہاں کی برابر فرر رکھے ہوئے تھیں۔“

”ہاں۔“

”اومیری؟“ وہ مسکرایا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے سرنئی میں ہلانے لگی تھی۔

”بطور خاص تمہاری نہیں۔“

”لگ تو یونہی رہا ہے۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”خللا لگ رہا ہے۔ خوش فہمی زیادہ ہونے لگی ہے تمہیں۔ علاج کراؤ۔“ ساہیہ خان شرارت سے مسکرائی۔ مگر وہ ہنس دیا تھا۔

”ایسے ایک کونے میں گھسے کھڑے رہو گے تو تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو گا۔ کل کوئی تمہاری شادی مانی بھنگڑا نہیں کرے گا۔“ مسکراتے ہوئے جتایا تھا۔

”اچھا؟“ وہ کلکھلا کر ہنستا چلا گیا تھا۔

”نہومت۔ کوئی جوک نہیں ہے یہ۔ پہلی بار کسی لڑکے کو شرماتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔“ طعنہ دے کر پھیر لیا تھا۔

اذہان حسن بخاری نے اپنے سامنے کھڑی اس لڑکی کو دیکھا تھا پھر اس کو شانوں سے تھام کر رخ اپنی طرف پھیر لیا تھا۔ چند ثانیوں تک بہ غور دیکھا تھا۔ پھر بہت دھیما سانس لیاں لیں۔ بہ غور اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ ساہیہ خان اس کے انداز پر اسے چند ثانیوں تک یونہی تکتی رہی تھی۔ پھر چہرے کا رخ پھیر کر اڑی گئی۔

”شرماتے، گھبرانے والوں کو اور کیا کہتے ہیں اذہان حسن بخاری؟“ انداز چھپڑنے والا تھا۔ وہ مسکرائی۔ رخسار پر پڑنے والا ڈھیل بہت بھلا لگ رہا تھا۔ وہ شاید پھر کسی شرارت کے موڈ میں تھی۔ اسے ساہیہ نے دجہ نہ تھا۔

اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا پھر دایاں ہاتھ بڑھا کر شہادت کی انگلی سے اس کے چہرے کو بہت ہولے سے اپنی طرف پھیرا تھا اور بہت دھیمے سے مسکراتے ہوئے بہ غور اس چہرے کو

دیکھا تھا۔

”شرمانے، گھبرانے والوں کو جو بھی کہتے ہوں مگر اذہان حسن بخاری قطعاً نہیں کہتے۔“

”تو پھر کیا کہتے ہیں؟“ ساہیہ خان نے شرارت سے چھیڑا تھا۔ اذہان حسن بخاری اسے چہرہ تک خاموشی سے نکتا رہا تھا۔ پھر یکدم اس کا نازک ہاتھ تھام کر اس جہوم کی سمت بڑھنے لگا تھا۔

اوہ لے گئی میری بانہہ پھڑ کے

اوہ لے گئی میری بانہہ پھڑ کے

گانے والے کی آواز فضا میں گونج رہی تھی اور اذہان حسن بخاری کے قدم اس ردھم میوزک کے ہونے لگے تھے۔ وہ نہ صرف خود جہوم رہا تھا بلکہ ساہیہ خان کو بھی اپنے سنگ بھنگڑا کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ساہیہ خان جہاں حیران ہوئی تھیں وہیں مسکرا بھی رہی تھی۔

”بہانے تو ایسے بنا رہے تھے جیسے سرے سے واقف ہی نہیں۔ قطعاً نابلد ہو۔“

”تمہیں آزار رہا تھا۔“

”اور میں تو جیسے بے وقوف بن گئی تھی۔“

”لگ تو ایسے ہی رہا تھا۔“

”اور اگر میں کہوں کہ میں فقط چھیڑ رہی تھی تو؟“ شرارت سے بہ غور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرائی تھی۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

جوش نال پاؤ بھنگڑا

جوش نال پاؤ بھنگڑا

میوزک مکمل طور پر ردھم میں تھا۔

”اور اگر میں کہوں کہ میں جانتا تھا، تو؟“

”تو میں کہوں گی یہ غلط ہے۔ ایسا نہیں تھا۔“ اسے رد کیا تھا۔

”پھر..... پھر کیا تھا؟“ وہ جاننے پر بے حد ہوا تھا۔ ساہیہ مسکرائی ہوئی گھولی تھی۔

جوش نال پاؤ بھنگڑا

جوش نال پاؤ بھنگڑا

اس کی توجہ غالباً مکمل طور پر اس جانب نہ تھی۔ پاؤں یکدم مڑا تھا، وہ لڑکھرائی تھی، تبھی اذہان بخاری نے انتہائی سرعت سے اسے اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔

اک خوشبو کا گھیراؤ بہت دلربا تھا۔ بات لمحے بھر کی تھی مگر ساہیہ خان کی دھڑکنوں میں یکدم ارتعاش سا ہوا تھا۔ کتنی گرم گرم سانسوں کو اس نے اپنے چہرے پر محسوس کیا تھا۔ جان یکدم ہی ایک میں گھرنے لگی تھی۔ ایک مشکل اس افسوں کو اور بھی بڑھانے لگی تھی۔

”آریو آل رائٹ؟“ اذہان حسن بخاری نے اسی طرح اسے اپنے حصار میں تھامے ہوئے شانہ انگلی سے اس کے جھکے ہوئے چہرے کو قدرے اوپر اٹھا کر مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ ساہیہ خان

ت میں ہلایا تھا اور پھر دھیان پھیرتے ہوئے بہت آہستگی سے اس کے حصار سے نکلنا چاہا تھا۔ مگر اس کی طرف اذہان حسن بخاری جیسے شرارت پر مائل تھا۔ بازوؤں کا گھیرا کھولنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے کسی قدر شرارت سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ ساہیہ خان نے نگاہ اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔ وہ ابراہان۔ آنکھوں میں شرارت رکی ہوئی تھی۔

”پھوڑو مجھے۔“ دھیسے لہجے میں جیسے کوئی درخواست ہوئی تھی۔

”اگر میں کہوں، نہیں۔“ وہ شرارت سے مدھم سی سرگوشی کرتا ہوا مسکرایا تھا۔

”اذہان حسن بخاری!“ ساہیہ نے سراٹھا کر کسی قدر خشکی سے بھرتے ہوئے ڈپٹا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیا ہاتھ ہی بازوؤں کا گھیرا کھول کر اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔ ساہیہ نے نچل سی ہو کر ہاتھ کا ٹکا سا بنا کر اس کے شانے پر دے مارا تھا اور سر جھکا کر یونہی زرتار بلیو دوپٹے کو درست کرنے لگی

ساہیہ خان کے چہرے کی حالت کچھ متغیر تھی۔ وہ اس کی سمت سے نگاہ اب بھی پھیرے ہوئے تھی۔

ایک بات کہوں؟“ اذہان حسن بخاری اس کے چہرے کی کیفیت کو بہ غور دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”ہوں۔“ ساہیہ نے خود کو معمول پر ظاہر کرنے کو چہرے پر ایک اطمینان بھری دھیمی سی مسکراہٹ سجا کر سمت دیکھا تھا مگر اذہان حسن بخاری کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”تم شرارتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔“ عجب انکشاف تھا۔ ساہیہ حیران رہ گئی تھی۔

اذہان!

ردہ شرارت پر بے حد نظر آ رہا تھا۔ قدرے جھکا تھا۔

”کاکہ رہا ہوں۔“ یقین نہ ہو تو آئینہ دیکھ لو۔ تکلف کی ضرورت نہیں، میری آنکھیں حاضر ہیں۔ انہی اپنا عکس دیکھ کر اندازہ لگا سکتی ہو۔“ مدھم لہجے میں کی گئی پیشکش عجب دلربا تھی۔ وہ ساکت سی ہنستی لگتی تھی۔

”کی بات کا؟“ بے دھیانی میں جیسے لبوں پر سے پھسلا تھا۔

”اذہان حسن بخاری کے لبوں کی دھیمی مسکراہٹ یکدم ہی قہقہے میں تبدیل ہو گئی تھی۔

”اکی بے وقوف لگ رہی ہو۔“

”ہاں!“ وہ جیتتی تھی۔ مگر وہ ہنستا چلا گیا تھا۔ تبھی وہ جانے کے لئے آگے بڑھی تھی مگر تبھی عین اسی ناسخن بخاری نے اس کے نازک سے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ساہیہ خان گردن کا رخ مائل سمت کیلئے لگی تھی۔

یہ بھنگڑا نہیں کرو گی میرے ساتھ؟“ لبوں پر ٹھہری مسکراہٹ میں عجب ایک شرارت تھی۔ ساہیہ دیکھا تھا، پھر اس کا فطری اعتماد خود کو آ رہا تھا۔

”اگر تم یہ شوق تھا پورا کر لو۔“

”نہاں پر آنے کے لئے تبھی نے مجبور کیا تھا۔ احساس دلایا تھا۔“

”آپ سی گہری آنکھوں والے جب ساحل پر آتے ہیں
 لہریں شور مچاتی ہیں لو آج سمندر ڈوب گیا
 میں سوچ رہا تھا اگر چاند کی آنکھیں ہوتیں تو وہ کیسا نظر آتا؟“ اس نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کیا تھا۔
 انابہ شاہ اس کی بات پر اب کے چونگی نہیں تھی، ہاں کسی قدر حیران ضرور ہوئی تھی۔
 ”چاند کی آنکھیں؟ — چاند کی آنکھیں کس طرح ہو سکتی ہیں؟ یہ خیال تمہارے ذہن میں کیسے

”آہ؟“
 ”ہوئی۔ ویسے اگر ایسا ہو تو کتنا بھلا لگے۔ بائے دی وے تم نے کبھی ایسا سوچا ہے؟“
 ”اوں، ہوں۔ غالباً میں ایسی فضول باتیں نہیں سوچتی۔“ انابہ شاہ نے پُر افسوس لہجے میں کہتے ہوئے
 رٹلی میں ہلایا تھا۔ تبھی وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا تھا۔
 ”میں نے دیکھا ہے۔“ انداز سرور تھا۔

”کیا؟“ وہ چونگی تھی۔
 ”چاند کے چہرے پر دو خوب صورت آنکھوں کا پہرہ
 آپ کی صورت سے ملتا ایک چہرہ دیکھا ہے
 نیلے گہرے آسمان میں، روشنی کا اک جزیرہ دیکھا ہے۔“
 وہ عمل طور پر مسرور نظر آ رہا تھا۔ باتیں سرگوشیوں جیسی تھیں۔ لہجہ اور انداز پُر فسوں تھا۔ اور انابہ شاہ
 کی قدر حیرت سے اس کی سمت نکلتی رہی تھی۔
 ”آپ خود کلامی کے مرض میں مبتلا ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ غالباً مجھے خود سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ مگر اس لمحے میرا مخاطب چاند ہے۔ آسمان
 کی دُور وسُوتوں میں وہ ایک چاند جو حسین ہے۔ بے حد حسین۔ دلفریب اتنا ہے کہ دل اسے پانے کو پل
 ہر مٹھل جمل جائے۔ ہاتھ تھامنے کو ایک لمحے میں اٹھ جائیں۔ آنکھیں اسے دیکھیں اور دیکھتے رہنے کے
 اراد میں جلا ہو جائیں۔ خواہشیں بے انت سمندر ہو جائیں اور سارے لمحے خواب خواب لگنے لگیں۔ مجھے
 اس چاند کے متعلق سوچنا اچھا لگتا ہے۔ باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ وہ میرے سارے حوالوں میں ہے،
 ساری باتوں میں ہے۔ میرے سارے قصے اسی سے منسوب ہیں۔ ساری کہانیاں اسی سے وابستہ ہیں۔
 مجھے اچھا لگتا ہے اسے دیکھنا، اسے دیکھتے رہنا، اسے سوچنا اور پہروں سوچتے رہنا۔ اس کا ذکر لہو لہو خود سے
 کرنا اور اسے کبھی جتنا نہیں، اسے خوابوں میں ملنا، پانا اور لہو لہو کھوجنا۔ مجھے اچھا لگتا ہے اس کے
 سنگ رہنا، تکیں ترین لمحوں میں ملنا۔ کبھی فقط ایک لمحے کا دیکھنا۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ یہ دوری اور
 مجھری کی کہانی بڑی پُر لطف اور دلفریب ہے۔ شاید باتوں میں، میں اسے بیان نہ کر سکوں۔ نہ تم سمجھ سکو۔“
 وہ اس کی سمت تکتا ہوا مسکرا رہا تھا۔ وہ اب کے بہت دھیمے سے مسکراتی تھی۔

”لامعہ سے پوچھوں گی۔“
 ”کیا؟“

”اڈہان حسن بخاری! میں نے جتنا ساتھ دینا تھا، دے دیا۔ اب تم اکیلے ہی انجوائے کرو۔ اور
 کر سکتے ہو تو کسی اور کو تلاش کر لو۔“

”اوہ۔۔۔ کیا واقعی تلاش کر لوں؟“ سوالیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھا تھا۔ وہ ہنس دلی تھی
 ”آف کورس۔“ اجازت دی تھی۔
 ”تمہیں برا تو نہیں لگے گا؟“

”مجھے..... مجھے کیوں برا لگے گا؟“ اور جواباً اس کا قبضہ بے حد برجستہ تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسنے
 تھا اور تبھی سایہ خان ہاتھ چھڑا کر وہاں سے نکلنے چلی گئی تھی۔

عفتان علی خان دادا ابا سے مل کر نکل رہا تھا جب انابہ شاہ اسے تالاب کے کنارے بیٹھی نظر آئی
 رات کا پہر اور اس پر چودھویں شب کا چاند آسمان کے عین وسط میں، حُسن ایسے میں کچھ اور گھر سا
 مدہم روشنی میں وہ ایک عجب تاثر دے رہی تھی۔ چاند کی پہلی روشنی کا عکس اس کے چہرے پر تھا
 وقت دو چاند اپنا عکس تالاب کے پانی پر چھوڑ رہے تھے۔ تالاب کا پانی اس لمحے روشنی اور نور سے بچ
 تھا۔ ایک عجب سی روشنی پھوٹ رہی تھی اس پانی سے۔ سارا پانی جیسے سونا ہو گیا تھا۔

عفتان علی خان نے پھر قدم اس کی سمت بڑھادیے تھے۔
 ”عجب مجزہ ہے یہ۔ آنکھوں کو یقین نہیں ہوتا۔ کیسی کیسی کرشمہ سازیاں ہو سکتی ہیں۔ سوچو تو سنا
 رہ جاتی ہے۔“ بہت ہولے سے وہ گویا ہوا تھا۔

انابہ شاہ جو کسی قدر محو تھی، قدرے چوکتے ہوئے اس کی سمت تکتے لگی تھی۔
 ”کچھ کہہ رہے تھے آپ؟“

”کہہ چکے۔ غالباً اب کچھ باقی بچا نہیں۔“

انابہ شاہ نے فقط اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔ کہا کچھ نہیں تھا۔ تبھی وہ گویا ہوا تھا۔

”حُسن اور افسوں ایک ساتھ پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ شاید تبھی اس قدر حیران ہوں۔“ وہ مسکرا رہا
 انابہ شاہ حیران ہوئی تھی۔ شاید تبھی کسی قدر چوکتے ہوئے اس کی سمت نگاہ کی تھی مگر وہ مسکراتے ہوئے
 نفی میں ہلانے لگا تھا۔

”حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں چاند کی بابت بات کر رہا ہوں۔ چاندنی راتوں کے فضول
 متعلق اس سے قبل فقط سوچا تھا، سنا تھا۔ دیکھا کبھی نہیں تھا۔ یہ واقعی حیران کن ہے۔ یہ چاند پہلے
 عکس، یہ بیٹھی بیٹھی سی روشنی، آنکھیں خیرہ کیوں نہ ہوں۔“ بہت بہم سا مسکرایا تھا۔ ”شاید تم اسے پہلے
 تھیں۔“

انابہ شاہ اس کی سمت سے نگاہ پھیر گئی تھی مگر وہ اس چہرے کو بہ غور تکتا رہا تھا۔

”کچھ کہہ رہے ہیں آپ؟“

عفتان علی خان بہت ہولے سے مسکرایا تھا۔

”وہ کیسے ہضم کر لیتی ہے اتنی مشکل باتیں؟“ وہ مسکرائی تھی۔
 عفنان علی خان کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔
 ”شاید اس لئے کہ اسے کبھی کچھ سننے کا اتفاق ہوا ہی نہیں۔“
 ”یعنی؟“ وہ چونکی تھی۔

”مشکل باتیں اس کی عقل میں ذرا کم ہی آتی ہیں۔“ وہ اس ذکر سے جیسے خوش نہیں ہوا تھا۔
 ختم کرنا چاہی تھی۔ مگر انا بیہ شاہ مسکرا دی تھی۔
 ”لامعہ کو پتہ چلے کہ تم اس کے متعلق ایسا سوچتے ہو تو یقیناً نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔“ عفنان علی خان
 دیا تھا۔ پھر اس کی سمت بہ غور نکلنے لگا تھا۔
 ”تم مجھے جتنا رہی ہو یا ڈر رہی ہو؟“

”کیا تم ڈر رہے ہو؟“ وہ محظوظ ہوتی ہوئی مسکرائی تھی۔
 وہ کھلکھلا کر ہنس دیا تھا

”تمہیں میں اس درجہ چکن ہارٹ نظر آتا ہوں؟“
 ”یہ نہیں۔“ انا بیہ شاہ نے بے نیازی سے شانے اچکائے تھے۔ ”میں کوئی قیاس نہیں کر سکتی۔“
 ”کوشش بھی نہیں کرو گی؟“

”میں فضول قسم کے کاموں کے لئے وقت صرف نہیں کرتی۔ تم غالباً لامعہ کے متعلق بات کر رہے
 تھے۔“ انا بیہ شاہ نے اسے یقین دلایا تھا۔

”اوں، ہوں۔“ سر بہت ہولے سے نفی میں ہلایا تھا۔ ”میں غالباً چاند کے متعلق بات کر رہا تھا۔ ہم
 موضوع گفتگو یہ پُرفسوں چاند تھا۔ جس کا عکس پانی میں ہے۔“ نگاہ تالاب کی سمت کر کے اشارہ دیا
 جہاں انا بیہ شاہ کے چہرے کا عکس چاند کے عکس کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔
 انا بیہ شاہ حیران ہی ہو کر تالاب کے پانی کی سمت نکلنے لگی تھی۔

”اوہ۔۔۔ مگر یہ تو فقط عکس ہے۔ فقط ایک شبابت۔ اور شبابتوں کی حقیقت کچھ خوش آمد نہیں
 ہوتی۔“ انا بیہ شاہ نے جیسے اسے ڈرایا تھا۔ مگر وہ مسرور سا مسکرا دیا تھا۔
 ”تم نے کبھی خواب دیکھے ہیں انا بیہ شاہ؟“

”خواب دیکھنا اور بات ہے عفنان علی خان! اور خوابوں میں جا کر رہنا اور بات۔ بہت سے لوگ
 خوابوں میں زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ مجھے خواب دیکھنا تو اچھا لگتا ہے مگر خوابوں میں عمر گزار
 نہیں۔ میں اس مقولے پر عمل کرتی ہوں۔“

خواب ہوتے ہیں دیکھنے کے لئے

ان میں جا کر مگر رہا نہ کرو“

”دلچسپ۔“ وہ متاثر ہو کر مسکرایا تھا۔ ”میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔“
 ”کیا؟“

”یہ خوب صورت لڑکیاں اتنی ذہین کیوں ہوتی ہیں۔“

”شاید اس لئے کہ کوئی انہیں بے وقوف نہ بنا سکے۔“

”لیکن ہر خوب صورت لڑکی کا ذہن ہونا بھی شرط نہیں۔“

”اپنے کہے کو خود آپ جھٹلا رہے ہیں عفنان علی خان!“

”اوں، ہوں۔“ وہ مسکرایا تھا۔ ”عالمگام میں ایک وضاحت دینا بھول گیا تھا۔“

”لامعہ حق کی ہمت کی داد دینا پڑے گی۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”تم ہر بات میں بے چاری لامعہ حق کو کان سے پکڑ کر کیوں کھینچ لاتی ہو؟“

”کیوں، تمہیں اچھا نہیں لگتا؟“ انا بیہ شاہ نے چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ جواب دیئے بغیر تالاب کی
 اُور ڈھکی سے نکلنے لگا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ انا بیہ شاہ کو تشویش ہوئی تھی۔

”اپنے چاند کو۔“ وہ مسرور سا مسکرایا تھا۔

”داد دینے کی ہمت نہیں یا برداشت نہیں؟“ وہ مسکراتے ہوئے جیسے چھیڑ رہی تھی۔ وہ بہ غور اس کی
 نکتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”ہمت تو ہے۔ مگر ڈرتا ہوں۔“ مدھم لہجے میں کئی بھید چھپے تھے۔

”کس بات سے؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔ وہ چند ثانیوں تک اس کی سمت نکتا رہا تھا پھر بہت دھیسے سے
 داریا تھا۔

”چاند برامان جائے گا۔“ جواب بہت غیر متوقع تھا۔ شاید تبھی انا بیہ شاہ مزید کچھ نہیں بولی تھی بلکہ اس
 سے مت نگاہ بھی پھیر گئی تھی۔ عفنان علی خان اس کی سمت نکتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”چلتا ہوں۔“ ایک نگاہ خاص اس کے چہرے پر ڈالی تھی اور پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے پلٹ کر
 لڑھکنے لگا تھا۔ انا بیہ شاہ یکدم ابھی تھی اور اندر کی سمت بڑھنے لگی تھی۔

ہر برب سیال نے آنکھیں کھول کر کمرے کے ماحول کو دیکھا تھا۔ فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا۔ مگر
 فز و فہم منظر آنکھوں کے سامنے واضح ہونے لگے تھے۔ ساتھ ہی ذہن کے تمام طبق بھی روشن ہو
 گئے۔ وہ یکدم ہی اٹھ بیٹھی تھی۔

برادر سنگین حیدر لغاری کمرے میں نہیں تھا اور وہ اس وقت یقیناً اُس کے کمرے میں تھی۔

ایک شدید طور کا احساس عدم تحفظ اس کے اندر ابھرا تھا۔ دل یکدم ہی کسی خوف سے بھر گیا تھا۔ اس
 یک طائرانہ نظر کمرے پر ڈالی تھی۔ عجب سکوت سا تھا کمرے میں۔ شاید سردار سنگین حیدر لغاری اس
 کمرے میں نہ تھا۔ وہ کچھ دیر تک اسی طرح بیٹھی خالی ذہن اور خالی خالی نظروں سے ہر شے کو دیکھتی
 تھی۔ عجب ایک وحشت سی اس کے اندر اس لمحے پھیلی ہوئی تھی۔ دل وہاں سے لمحہ بھر میں بھاگ جانے
 لگا تھا۔ مگر شاید ایسا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ زندگی نے اسے عجب ایک دورا ہے پر لاکھڑا کیا تھا۔

پہرے میں لے آیا تھا۔ ہیٹر آن کر کے، اپنا کبل اس کو اوڑھایا تھا۔ وہ یقیناً اس کے قریب تھا۔ مگر وہ انہیں جانتی تھی۔

میرب سیال رات والی اور اب کی کیفیت میں واضح فرق محسوس کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی رات کیا بنایا گیا ہوا ہوگا۔ مگر اب جب ابھی تھی تو سردار سبکدین حیدر لغاری کو اپنے مقابلہ دیکھ کر اس کی پھر وہی رات تھی جو رات میں بے ہوش ہونے سے قبل تھی۔

”کیا ہوا؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ انداز اور لہجہ سیاٹ تھا۔ مگر میرب سیال کچھ نہیں بولی تھی۔ ایک نگاہ بھی اس کی سمت نہیں کی تھی۔ یہ دیکھنا تک گوارا نہ سمجھا تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر بہت ہولے سے اس بات کا اظہار کیا کہ اس کی سمت بڑھایا تھا۔ چہرے کا رخ کسی قدر اپنی طرف پھیرا تھا۔ شاید وہ اس کی توجہ نہ تھا۔ میرب سیال کی بے توجہی اسے کسی قدر کھل رہی تھی۔ یا پھر وہ کسی قدر راری ٹیٹ ہو رہا تھا۔ مگر اس ام پر کوئی خوش آئند رد عمل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ میرب سیال بدک کر کچھ اور بھی پیچھے ہٹ گئی تھی۔ جیسے اسے اپنا کارڈ نے چھو لیا ہو۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کی سمت نگاہ کی تھی، بہت بے تاثر اور سرد تھی۔ کسی طرح کا کوئی احساس اس نگاہ میں نہ تھا۔ کسی طرح کا کوئی تاثر اس کے چہرے سے واضح نہ تھا۔ شاید اسے میرب سیال کے اس انداز پر کسی قدر غصہ آ رہا تھا۔ یا پھر اسے اس کا اس طرح ری ایکٹ ہونا اور گزر رہا تھا۔ مگر اس طرح کی کسی بات کا اظہار اس کے چہرے پر نہ تھا۔

”شاید تم نے سنا نہیں۔ میں نے کہا ہے تمہیں ناشتہ کر لینا چاہئے۔“ بے حد سرد مہر لہجے میں وہ باہر نکلا۔ میرب سیال نے جب بھی اس کی سمت نگاہ نہیں کی تھی۔ ہاں آنکھوں میں یکدم ہی سمندر آنے لگے اور غطیانی اتنی بڑھی تھی کہ لمحہ بھر میں پیانے چھلک پڑے تھے۔ وہ چہرے کا رخ پھیرے اسی رات ٹپٹی تھی جب آنکھوں سے گرم سیال پانی کے قطرے بہہ کر رخساروں کو جلانے لگے تھے۔

سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کی سمت خاموشی سے دیکھا تھا۔ وہ یقیناً اس لمحے خود کو بے حد بے بس محسوس کر رہا تھا۔ میرب سیال اس شخص کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر جیسے کسی بات پر اس کا تیار نہ رہا تھا اور فضول کا کوئی بندہ بانہٹنا چاہتی بھی نہیں تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری چند ثانیوں تک اسی طرح اسے بیٹھا دیکھتا رہا تھا پھر بے حد ناگواری سے گویا تھا۔

”جانتی کیا ہو تم؟“ کیا قیامت آگئی ہے جو یوں واویلا مچا رہی ہو؟ آسمان تو ٹوٹ کر نہیں گر پڑا، شام سلامت ہو تم۔ ثابت و سالم ہو، ٹھیک ٹھاک ہو۔ ایک رات گزر جانے کے بعد کیا تمہیں اندازہ نہیں لگتا کہ میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا کچھ نہیں۔“ دم لہجے میں جیسے انگارے ہی انگارے تھے۔ میرب سیال نے چہرے پر پھمیری اس کی نگاہوں سے جیسے شعلے لپک رہے تھے۔

میرب سیال اس بات کا اب تک اندازہ نہیں ہوا کہ میں کس درجہ اختیار رکھتا ہوں۔ میں کیا کر سکتا تھا اور اسے کیا نہیں کیا۔ تم رات میرے رحم و کرم پر نہیں۔ اگر مجھے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا ہوتا تو کون

جہاں پر کھڑی وہ عجب اُلجھن میں تھی۔ ہر سمت جیسے تاریکی کے گہرے سائے تھے اور اس کی گھونٹ رہا تھا، کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔ جانے اس سے آگے کی راہ کیا تھی۔ فی الحال تو سارے صحنہ ڈھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ وہ نہ اس راہ پر آگے بڑھ سکتی تھی نہ ہی واپس پیچھے پلٹ سکتی تھی۔ کوئی بھی فیصلہ کرنا جیسے اس کے لئے آسان نہ تھا یا پھر صورت حال ہی اتنی پیچیدہ تھی کہ اسے

مل نہ رہی تھی، کوئی سراہا تھا نہ رہا تھا، کوئی گرہ کھل نہ رہی تھی۔ وہ بس حواس باختہ سی تاریکیوں میں کھڑی تھی۔ لیکن یہ طے شدہ بات تھی کہ اسے ان تاریکیوں میں سدا نہیں رہنا تھا۔ اسے یہاں سے راہ سوچنا تھی۔ یہاں سے نکلنے کی تدبیر سوچنا تھی اور یقیناً یہ آسان نہ تھا۔ مگر اسے اسی مشکل کو حل اپنی پوری عقل کے ساتھ، پورے ذہن کے ساتھ، کھلے ہوش مندی اور خرد مندی کے ساتھ، کوئی بات نہ تھی۔ سو کوئی جذباتی قسم کا فیصلہ نہیں کرنا تھا اسے۔ اگرچہ جس طرح کی صورت حال درپیش تھی وہ فی الفور اس سے نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر یقیناً ایسا ممکن نہ تھا۔ اسے یہاں سے نکالنا پوری خرد مندی اور عقل کو بیدار رکھتے ہوئے۔

وہ اسی طرح خالی خالی آنکھوں سے مناظر کو دیکھ رہی تھی جب کمرے میں آہٹ ہوئی تھی۔ اس کی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری ناشتے کی ٹرے لئے اس کے سامنے موجود تھا۔ جانے کب دروازہ اور کب وہ اندر داخل ہوا تھا۔ وہ خود میں اتنی گم تھی کہ جان ہی نہ پاتی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری چلتا ہوا اس کے پاس آ کر رکھا تھا۔ میرب سیال نے سراٹھا کر اس کی نہیں دیکھا تھا۔ بہت ہولے سے چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے ناشتے کا بیڈ پر دھرتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا اور پھر خود بھی اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔

”میرے خیال میں تمہیں پہلے ناشتہ کر لینا چاہئے۔ باقی کے تمام ضروری امور اس کے بعد لے اٹھا رکھنے چاہئیں۔“ وہ اس کی سمت نکلتا ہوا بہت دھمے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

میرب سیال نے اس کی سمت نہیں دیکھا تھا، نگاہ پھیرے رکھی تھی۔ مگر دل میں یکدم ہی جانے بہت سا خوف بھر گیا تھا۔ دھڑکنیں معمول پر نہ رہی تھیں۔ یکدم ہی ایک ارتعاش سا سارے وجود میں تھا۔ یقیناً یہ کیفیت خوف کی تھی، عدم تحفظ کی تھی۔ وہ اس پناہ میں، اس قرب میں خود کو محفوظ نہیں جانا تھی۔ کوئی احساس خوف بن کر رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری اس کے ہاتھ بیٹھا تھا۔ انداز بے تاثر تھا۔ کوئی اقدام ناپید تھا۔ کچھ ہونے یا نہ ہونے کا احتمال بھی نہ تھا مگر اس کے ہاتھ میرب سیال کی دھڑکنوں میں خوف کی ایک واضح نشاندہی مل رہی تھی۔

رات کے متعلق وہ نہیں جانتی تھی۔ بے ہوشی میں سارے احساس جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ کسی بات کچھ ہوش نہ رہا تھا۔ مگر اب وہ کیفیت باقی نہ رہی تھی۔ اب وہ خرد مندی سے پورے ہوش و حواس رکھے اس شخص کے سامنے تھی۔ مگر اس کے باوجود خورزدہ تھی۔ شاید یہ سارے خوف اسی بیداری کے

رات وہ اس کے رحم و کرم پر تھی۔ ہوش و خرد بے پیمانہ ہو کر اس کی ہانہوں میں جھول گئی تھی۔

روک سکتا تھا مجھے، تم؟ جسے خود کا بھی کچھ ہوش نہ تھا۔ کیا سمجھتی ہو تم، کس بات نے مجھے مضطرب
مجبور کیا؟ تمہارے ان مگر چمچہ کے آنسوؤں نے، یا پھر تمہارے اس بے وقوفانہ ڈر اور خوف نے
سبکدین حیدر لغاری دھیسے لہجے میں کہتا ہوا یہ غور میرب سیال کو دیکھ رہا تھا جو اس لئے بھی اس
پھیرے ہوئے تھی۔

”میں چاہتا تو کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اور تم کیا کر لیتیں؟ — ماسوائے آنسو بہانے کے، روہ
کے اور خوفزدہ ہونے کے، تمہیں آتا ہی کیا ہے؟ رات تم نے بہت کچھ کہا اور میں نے سنا اور تمہارا
یاد رکھو، سردار سبکدین حیدر لغاری نے سننا سیکھا نہیں ہے، فقط حکم صادر کرنا جانتا ہے۔ یہ روٹھنے
چوٹیلے چھوڑ دو، مجھے ان باتوں کا کچھ خاص تجربہ نہیں ہے۔ سو بے سدر ہے گا یہ سب۔ یہ ڈرامہ
بند ہو جانی چاہئے۔ کوئی قیامت تو آئی نہیں ہے نہ ہی آسمان سر پر کر پڑا ہے۔ کیا تمہیں اب یہ سب
گا کہ تم ایک اہم ترین رشتے میں منسوب ہو اور تمہیں اب اس طرح کی بچکانہ حرکتوں کو تڑپ
چاہئے۔“

کتنے بار عجب لہجے میں وہ کہہ رہا تھا۔ انداز میں کھل استحقاق بول رہا تھا جیسے وہ ہر بات کا
ہو۔ جیسے واقعی ساری دنیا اس کی مٹھی میں ہو اور وہ جس سے جو چاہے سلوک روا رکھ سکتا ہو۔ مگر میرب
اس کی سمت متوجہ نہیں تھی۔ نگاہ پھیرے اس سے صاف طور پر لاعلمی نظر آ رہی تھی۔
سردار سبکدین حیدر لغاری نے ایک بار پھر شہادت کی انگلی سے اس کے چہرے کا رخ اپنی سمت
کچھ دیر تک بغور دیکھا تھا۔ پھر اسی سرد لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”مجھے باتوں کو بار بار دہرانے کی عادت نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں تم بھی ایک بار اس
پیرا ہونے کی عادت اپنالو۔ آئی تھک یہ فائدہ مند رہے گا تمہارے لئے۔ بہ صورت دیگر مجھے پنا
نبھانے خوب آتے ہیں۔“ سرد و جامد لہجے میں ایک واضح وارننگ تھی۔ اور میرب سیال اس کی
تکلیف لگی تھی۔

”آئی ہیٹ یو سردار سبکدین حیدر لغاری! — نفرت ہے مجھے تم سے۔ بہت کھوکھلے ہو تم۔
بڑے بڑے دعوے کرتے قطعاً ایچھے نہیں لگتے۔ مجھے کچھ جتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے
کمزور مجھے سمجھ رہے ہو، غالباً میں اتنی کمزور ہوں نہیں۔ تم نے یقیناً غلط قیاس کیا ہے۔ میرب سیال
ہرگز نہیں ہے۔ اگر تم اختیار رکھتے ہوئے اپنے وصف جتاننا اور نبھانا جانتے ہو تو میرب سیال بھی اتنا
رکھتی ہے کہ وہ ان تمام ناپسندیدہ مناظر سے خود کو الگ کر سکے۔ آئی ہیٹ دس پویشن — آئی
دس لائف — آئی ہیٹ یو سردار سبکدین حیدر لغاری! — میرب سیال تم سے نفرت کرتی ہے؟
اسے قطعاً بھی ایسا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔“ میرب سیال زہر خند لہجے میں بولی تھی۔ جب
سبکدین حیدر لغاری نے یکدم ہی ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کے چہرے کو
جارحانہ انداز میں اپنے قریب کیا تھا۔ میرب سیال کے چہرے کو اس کی گرم گرم سانسوں کا گارڈن
چھونے لگی تھیں۔ کس قدر قریب تھا وہ۔ مگر سب کچھ کس قدر تکلیف دہ تھا۔ قربت کے ان لمحات

بھی کوئی خوش آئند بات نہ تھی۔ کوئی بھی مہربان لمحہ نہ تھا۔ میرب سیال تکلیف سے کراہ کر رہ گئی تھی۔
سردار سبکدین حیدر لغاری اس کے چہرے کو خوشگین نظروں سے سمکتا رہا تھا۔ پھر بنا کچھ کہے اس کے
بالوں کو جھٹکنے سے آزاد کر دیا تھا۔ اٹھا تھا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا تھا۔

وہ بہت گہری نیند سو رہی تھی جب کسی نے اس پر پانی کا جگ اُلٹ دیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔
جس لمحہ بھر میں بیدار ہوئے تھے، نگاہ اٹھی تھی اور وہ چیخ پڑی تھی۔
”اوزی کے بچے! —“ وہ خطرناک تیروں سے چھلانگ لگا کر بیڈ سے اترتی تھی۔ مگر اس سے قبل
ہی اوزی مسکراتے ہوئے دوڑ لگا چکا تھا اور اس لئے وہ ماما کے پیچھے چھپ رہا تھا۔
”اوزی کے بچے! باہر نکلو۔ میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔“ وہ چیختی تھی۔
”تمہارے ہاں مہمانوں کا استقبال اس طرح ہوتا ہے؟“ وہ ماما کے پیچھے سے سر نکال کر مسکرایا تھا۔
”ہمارے ہاں مہمان اس طرح کی حرکتیں بھی نہیں کرتے۔“
”یعنی ٹٹ فورٹیٹ۔“ وہ مسکرایا تھا۔
انا بیہ شاہ اسے گھورنے لگی تھی۔

”ایک تو بے وقت آتے ہو، اس پر عجیب و غریب حرکتیں بھی کرتے ہو۔“ وہ کسی قدر نرم پڑی تھی۔ تبھی
وہ ماما کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا تھا۔ دونوں ہاتھ کانوں تک لے جا کر معافی نامہ دائر کیا
تھا۔

انا بیہ شاہ نے درخواست پر غور کیا تھا اور مسکرا دی تھی۔ تبھی اوزی نے اسے تھام کر ساتھ لگا لیا تھا۔
”بچوں والی حرکتیں گئی نہیں ہیں تمہاری۔“ وہ مسکراتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔
”تمہیں کس نے کہا کہ میں بڑا ہو چکا ہوں؟“
”میں نے آج تک چھٹ کا کوئی بچہ نہیں دیکھا۔“ انا بیہ شاہ نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا تھا اور
اوزی کھٹکھٹا کر ہنستا چلا گیا تھا۔

”دیکھ کی ویسی تمہارا مریج جیسی ہو۔“
”تا کر نہیں آسکتے تھے؟ — کم از کم ایک فون ہی کر دیتے۔“
”تم کیا کرتیں؟ کیا باہم درجہ جانتیں؟“
”شاید نہیں۔ مگر میری نیند تو تباہ نہ ہوتی۔“ وہ مسکرائی تھی۔ اوزی گھورنے لگا تھا۔
”عجب سلیفش لڑکی ہو۔ میں اتنی دور سے تمہارے لئے آیا ہوں اور تم نین سے نین نہیں ملارہی ہو۔“
اس کا انداز ایسا تھا کہ انا بیہ شاہ کو ہنسی آگئی تھی۔

”تم اس قابل ہو کہ تم سے نین ملائے جائیں؟ ہائے دی وے، آئے کب ہو؟“
”تمہاری ذہنی قیامت نے بتایا تھا تم سو رہی ہو ہمیشہ کی طرح۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔
”اور تم نے سوچا ہمیشہ کی طرح اس کی نیند برباد کر دی جائے۔“ انا بیہ شاہ اس کی بات کا ٹٹی ہوئی

ہاں بجز لعلی اور اس شخص سے دور بھاگ جاتی۔ اس نے اپنی نفرت کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔

مالات جوں کے توں سردار سبکتگین حیدر لغاری کے ہاتھ رہے تھے۔ وہ مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر مالاں کا یہ جتنا کہ وہ سردار سبکتگین حیدر لغاری سے نفرت کرتی ہے، کچھ خاص کارآمد ثابت نہ ہوا تھا۔

سبکتگین حیدر لغاری پر اس کا کچھ خاص اثر نہ پڑا تھا۔ اس نے اگلے کئی دنوں میں بھی وہ یہی جتائی اور باور کرائی رہی تھی۔ مگر اس کا نتیجہ صفر ہی رہا تھا۔ جنہیں کیا لگتا ہے، کیا تمہیں میں خود سے محبت کے لئے مائل نہیں کر سکتا یا مجھ میں اتنی اہلیت ہی ہے؟ اس روز جب وہ اسے باہر لے جانا چاہ رہا تھا اور وہ مسلسل انکاری تھی، سردار سبکتگین حیدر لغاری کی کلائی کو جب جنونی انداز میں تھام کر گویا ہوا تھا۔ وہ بے تاثر سردار سبکتگین حیدر لغاری کے چہرے پر کچھ نہیں اور میرب سیال چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ اور جب سردار سبکتگین حیدر لغاری اس کے چہرے پر کچھ جھک آیا تھا۔ شہادت کی انگلی سے اس کی پیشانی سے لے کر یوں تک ایک سرایت کھینچی تھی، پھر مسکرا دیا

”میرے لئے یہ قطعاً مشکل نہیں ہے ہنی! مجھے ہواؤں کے رخ بدلنے آتے ہیں۔ مجھے وہ سارے ازر ہیں جن سے بند تالے کھلتے ہیں۔ شاید تمہیں خبر نہیں، میں وہ فسوں بھی جانتا ہوں جو ایک بول ہاتھ مارے قفل کھولتا چلا جاتا ہے۔ مجھے سمتوں کو بدلنا آتا ہے سوئیٹی! میں رنگوں کو اپنے رنگ میں رنگتا ہوں۔ مجھے علم ہے منظروں کو کب، کہاں اور کیسے اپنے اختیار میں کرنا ہے۔ کب گریز پانظاروں کو اختیار میں کرنا ہے اور کب سارے منظروں کو جل قفل کرنا ہے۔ یہ حقیقت مجھ سے پوشیدہ نہیں ہنی!“

اسے سے وہ مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں سے ایک عجب روشنی پھوٹ رہی تھی اور میرب سیال کی ساری جان جیسے بوجھ نچال آ گیا تھا۔ وہ نظریں جھکا کر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ مگر وہ حصار اسی طور اس کے ارد گرد ہوا تھا۔ وہ پناہ اسی طور اسے تھام رہی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری کی نظریں اس کے چہرے کو بہ غور دہی تھیں۔

”مجھے گریز پانظاروں کو برتنے کے سارے ڈھنگ آتے ہیں۔ مجھے علم ہے کیسے بادل بنتا ہے اور قطرہ اترتا ہے۔ میں آسمان کی وسعتوں سے بھی باخبر ہوں۔ مجھے علم ہے، گرد منظروں کو دبا دیتی ہے۔ سوہ نام بھونکتا ہے کہ جادو کا ایک قلعہ سا بن جائے۔“ لہجہ اور انداز بہت دھیمہ تھا۔ جیسے کوئی مدہم سرگوشی۔

”بس کچھ بھولا نہیں ہوں سوئیٹی! مجھے کچھ باور کرانے کی کوشش مت کرو۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری دل پر مسکراہٹ تھی۔ ایک مدہم، پراسرار مسکراہٹ۔

میرب سیال چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے چند ثانیوں تک اس چہرے کو جھکا کر بہت آنکھیں سے اس کی کلائی پر سے اپنی گرفت ہٹائی تھی۔

میرب سیال اس کی سمت تکتی ہوئی دیوار سے جا لگی تھی۔ چہرہ حواس باختہ ہو رہا تھا۔ وہ لاکھ خود کو مضبوط کر رہی تھی مگر یہ سچ تھا کہ وہ مضبوط تھی نہیں۔ مگر وہ اس صورت حال سے نکلنا ضرور چاہتی تھی اور اس

مسکرائی تھی۔

”یار! سال کے تین سو پینٹھ دن تو تم آرام سے سوتی ہو۔ کیا ہوا جو آج جلدی بیدار ہو گیا دیوے، موسم کیسا ہے یہاں کا؟“ اوزی کی آنکھ ایک ادا سے دبا ہوا مسکرایا تھا۔

انا بیہ شاہ کے لبوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”موسم بدل چکا ہے اوزی! اب پہلے جیسی کوئی بات نہیں رہی۔ یہ بات شاید تم اچھی طرح جانتے ہو۔ یعنی موسم بدلنے کے کوئی چانسز نہیں۔“ اوزی کا لہجہ کچھ بگڑ گیا تھا۔ انا بیہ شاہ نے اس کے انفسوں پر اسے دیکھا تھا۔ پھر بہت دھیمے سے مسکرائی تھی۔

”کبھی کبھی ہواؤں کے رخ بدلنے بھی پڑتے ہیں اوزی! اگر تم میں دم ہو تو موسموں کو اپنے میں کر لو۔“

”تم جانتی ہو، یہ خاصا مشکل ہے۔ اور میرے وجود پر خاصی تھکن کا بوجھ لدا ہے۔ ایک لونا ایک بے نام سی تھکن بھی اپنے سنگ لایا ہوں۔ مسافتوں کا بوجھ بکا نہیں تھا انا بیہ شاہ! پاؤں گروسے ہوئے ہیں۔ آنکھوں میں تھکن ہے اور چہرے پر مسافتوں کی کوفت۔ ایسے میں، میں موسموں کو اپنے میں کرنے کے فقط خواب دیکھ سکتا ہوں۔ عملًا نہیں۔“ اوزی کی آنکھوں میں کئی اجالے ہوئے ہوئے تھے۔ انا بیہ شاہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھر دیا تھا۔ تبھی وہ مسکرایا تھا۔

”یہ کافی مشکل ہے انا بیہ شاہ!“

”مشکل تو مشکل ہی ہوتی ہے۔ اسے آسان کرنا پڑتا ہے۔“

”میرا ایک کام کرو گی؟“ اوزی ہوئے سے مسکراتے ہوئے اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”کیا؟“ وہ چونکی تھی۔

”موسموں سے کہہ دو، مجھے وہ سارے نقش لوٹا دیں جو وہ اپنے سنگ لے گئے ہیں۔ وہ سارے پناہ وہ سارے راستے جو گرد سے اٹ گئے ہیں، انہیں پھر سے انہی رونقوں سے بھر دیں۔ میں سارے پناہ کی تعبیریں لے آؤں گا۔ بس یہ موسم وہ اسم اعظم بول دیں جن کے کہنے سے سارے بند دروازے کھلے جائیں اور سارے منظر روشن ہو جائیں۔“ وہ مسکرا رہا تھا اور انا بیہ شاہ ہنس دیتی تھی۔

”اوزی! صبح صبح اتنی ثقل گفتگو۔ ناشتہ نہیں کرنے دو گے کیا؟ میرا پیٹ تو تمہاری فلسفیانہ باتوں سے بھر جائے گا۔“ انا بیہ شاہ نے کہا تھا اور وہ ہنس دیا تھا۔

”پوچھو گی نہیں تمہارے لئے کیا لایا ہوں؟“

”کیا لائے ہو؟“ وہ پوری توجہ سے پوچھنے لگی تھی۔

”خود آ گیا ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں؟“ وہ یکدم کھلکھلا کر ہنس دیا تھا۔ انا بیہ شاہ نے ہاتھ کاٹا تھا۔ اس کے شانے پر دے مارا تھا۔

صورت حال تسکین بخش نہیں تھی میرب سیال کے لئے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ فوری طور پر ان حالات

کے لئے راستہ بھی سوچ رہی تھی۔ مگر فی الحال اسے کوئی راہ بھائی دے نہیں رہی تھی۔

”کتنا وقت لوگی تم تیار ہونے میں؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری اس کی سمت نکلتا ہوا دریافتی اور میرب سیال یکدم ہی سرٹھی میں ہلانے لگی تھی۔

”تم میرے ساتھ زبردستی قطعاً نہیں کر سکتے سردار سبکدین حیدر لغاری! تم کہتے ہی دعوے کرنا سے ڈرنے والی نہیں۔ تمہاری کسی بات نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ سنا تم نے سردار سبکدین حیدر لغاری سے قطعاً بھی مرعوب نہیں ہوئی۔ تم اپنا تاثر قائم کرنے میں ناکام رہے ہو۔“ وہ دھیسے مگر سخت کیم بولی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”بہت معصوم ہو تم۔ بے حد بھولی بھالی۔ مجھے بعض اوقات تم پر غصہ بالکل بھی نہیں آتا۔ کیوں؟ کیونکہ میں نے اس سے قبل اتنی بھولی صورت دیکھی ہی نہیں۔ شاید تم نے بھی سردار سبکدین حیدر لغاری جیسا کوئی شخص مجھ سے قبل نہ دیکھا ہو۔ مگر یہ سچ ہے، تم جتنی معصوم اور بھولی بھالی ہو، سردار حیدر لغاری اسی قدر اپنے وعدوں اور ارادوں میں اٹل ہے۔ آئی تھک تم تجربہ کرنا ضروری خیال لگی۔“ وہ اسے بچوں کی طرح ٹریٹ کر رہا تھا۔ یہ کیسا روپ تھا اس کا؟ یہ کیسا رنگ تھا؟ وہ شخص کی بدلتا تھا اور ہر رنگ پہلے رنگ سے مختلف ہوتا تھا۔ جانے اس کا حقیقی رنگ کیا تھا اور کس طور پر بدلتا کرتا تھا؟ اس کے تیور میرب سیال کی سمجھ میں نہ آنے والے تھے۔ وہ واقعی اسے سمجھ نہ پائی تھی چاہتی بھی نہیں تھی۔ شاید وہ واقعی سردار سبکدین حیدر لغاری سے نفرت کرتی تھی۔ شاید وہ واقعی اس بھاگتا چاہتی تھی اور کوئی متبادل راہ نہیں پاتی تھی۔ پھر ایسا اس کے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔

کبھی کبھی وقت بہت بے بس کر کے رکھ دیتا ہے اور میرب سیال کو لگ رہا تھا کہ وقت نے ان قدموں میں بیڑیاں ڈال کر اسے اپنا پابند کر لیا ہے اور اب وہ چاہے بھی تو اس قید سے رہائی نہ لے سکتا۔ شاید مجبور یوں کی زنجیر پیروں میں ڈالے اسے یونہی ان فیصلوں میں قید رہنا تھا۔ شاید اس کی سزا انہی دیواروں سے سریشٹے ہوئے گزر جاتی تھی۔

شاید اسے یونہی عمر بھر روتے رہنا تھا۔ شاید یونہی عمر بھر قید و بند میں بسر کرنا تھی۔ یہ ایک طویل سزا تھی جس کی مدت مہین نہ تھی۔ شاید اسے جب تک جینا تھا، انہی سزاؤں کو سہنا تھا۔ شاید یہ سزاؤں کے لئے تھیں۔ سو پھر یہ احتجاج بھی فضول تھا شاید۔

شاید اسے اس قید و بند سے سمجھوتہ کر لینا چاہئے تھا۔ شاید اسے ان بیڑیوں سے دوستی کر لینی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری شاید یہی تو سمجھا رہا تھا۔ اور غلط کہاں کہہ رہا تھا وہ؟ شاید وہ درست تھا کہ حرف سچا تھا۔ وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا۔ وہ اس کی زندگی پر مکمل اختیار رکھتا تھا۔ جتا رکھتا سفید کا مالک تھا۔ کیونکہ اس کا سارا جیون اس شخص کے نام لکھا تھا اور یہ بات فراموش کئے جاتا نہ تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری کے حرف میں سچائی تھی اور وہ شاید پاگل تھی جو دیواروں

بھی تھی۔ اسے سمجھوتہ کر لینا چاہئے تھا۔ ٹھیک اس طرح جس طرح اس سے قبل کیا تھا۔ شاید اسے یہ سب اس طرح برداشت کرتے رہنا چاہئے تھا جس طرح کہ اس سے قبل برداشت کرتی رہی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

وہ اس سے کٹ کر نہیں جی سکتی تھی۔ اس کے بنا اس کی زندگی کا مفہوم بے معنی تھا۔ کیونکہ سب ایسا ہی خیال کرتے تھے۔

اس کی نظروں کے سامنے پایا کا چہرہ آیا تھا۔ کتنے خوش تھے وہ اس بندھن سے۔ اس کی ذمہ داری بھاگتا کر رہے بے حد مطمئن تھے۔ سردار سبکدین حیدر لغاری کا اسے یہاں ان سے ملوانے کے لئے لانا اور کئی دن تک وہیں رکھنا یقیناً ایک سرا ہے جانے لائق اقدام تھا۔ اور پایا کتنا خوش ہوئے تھے۔ وہ واقعی سردار

سبکدین حیدر لغاری کے محترف ہو گئے تھے۔ ان کے دل میں اس کی جگہ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اور ایسے میں اُردو اس سے علیحدہ ہو جاتی یا کسی سے ذکر بھی کر دیتی تو شاید یہ بسا بسا سکون ایک بل میں تھس تھس ہو پاتا۔ سارا اطمینان جاتا رہتا۔ اور شاید کچھ باقی نہ رہتا۔ اور ایسا ہی تو وہ نہیں چاہتی تھی۔ یہی ایک بات تو تھی جو اس کی سب سے بڑی دکھتی رگ تھی۔ اس کی سب سے بڑی مجبوری۔ اور شاید سردار سبکدین حیدر لغاری اس دکھتی رگ سے بخوبی واقف تھا۔ تبھی تو اس طرح کا انداز اختیار کئے ہوئے تھا۔ اور وہ بھی تو ہانتی تھی اس کی مجبوری کیا ہے۔ وہ بھی تو واقف تھی کہ اس کی کمزوری کیا ہے۔ پھر کیا حاصل تھا اس چون و چاہے۔

وہ خاموشی سے چلتی ہوئی وارڈ روم کے سامنے جا رہی تھی اور ایوننگ پارٹی کے لئے ڈریس منتخب کرنے لگی تھی۔ شاید اسے سردار سبکدین حیدر لغاری کے اشاروں پر ناپنے والی کٹھ پتلی بن جانا چاہئے تھا۔ بنا کوئی آگومنٹ کئے اس کی ہر بات چپ چاپ مان لینی تھی کہ وقت کا تقاضا یہی تھا۔

کیونکہ وقت اس کے ساتھ نہیں تھا۔

اور جانے کب تک اس کے مخالف ہی رہنا تھا۔

وہ چپ چاپ تیار ہونے لگی تھی۔ جب یکدم ہی فون کی بیل ہوئی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری غالباً کمرے میں نہیں تھا۔ اس نے فون اٹھا لیا تھا۔ دوسری طرف مائی اماں تھیں۔

”کیسی ہے میری بیٹی؟“ مائی اماں بہت محبت سے اس کی خیریت دریافت کر رہی تھیں۔ وہ تمام ہمتوں کو بچھڑاتے ہوئے بہت دھیسے سے مسکرائی تھی۔

”جی مائی اماں! ٹھیک ہوں میں۔ آپ..... آپ کیسی ہیں؟“ کتنی مشکل صورت حال تھی۔ اسے اپنے دل میں کو فائدہ پہنچانا تھا اور اس کے لئے خود کو کھلم کھلا مارنا تھا۔ آواز حلق سے یہ مشکل نکل رہی تھی مگر اسے بولنے کا سلسلہ موقوف نہیں کرنا تھا۔

”سبکدین حیدر کہاں ہے؟“ کیسا ہے وہ؟“

”جی وہ بھی ٹھیک ہیں مائی اماں! دراصل.....“ وہ ابھی کچھ بولنے ہی جا رہی تھی جب کسی نے ایک لمحے میں فون اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا تھا۔ وہ حیرت زدہ سی چلی تھی۔ اس کے بے حد قریب سردار

ل
میر پرتوجہ سے نکتے ہوئے وہ دریافت کر رہا تھا اور ساکت نظروں سے نکتی میرب سیال کے پاس اس لئے
کئی جواب نہ تھا۔

”تم بھول رہی ہو شاید، یہ عرصہ باہمی انڈر اسٹینڈنگ کے لئے ہے۔ اور تم اتنا تو سمجھ گئی ہو گی کہ مجھے
بازوں کو دہرانا قطعاً اچھا نہیں لگتا اور یہ کہ سردار سبکگین حیدر لغاری اپنے وعدوں اور ارادوں میں کس درجہ
اٹل ہے۔ کیا اب تک نہیں سمجھی ہو کہ سردار سبکگین حیدر لغاری اپنی چیزوں سے دستبردار ہونا پسند نہیں کرتا۔
جو شے اس کی ہے وہ اس کی ہے۔ خوابوں میں نہیں، حقیقت میں زندگی بسر کرتا ہے یہ شخص۔ سو تم بھی اب
پہنچنے کی ساری باتیں چھوڑ دو، اپنی اس بچکانہ سوچ سے باہر نکل آؤ۔ سردار سبکگین حیدر لغاری اپنی واقف
ہے۔ تم از کم اس طرح کے بچکانہ اقدامات کی توقع نہیں کرتا۔“ بہت ہولے سے ہاتھ بڑھا کر اس کے
ہرے کو تھپتھپایا تھا جیسے وہ اس لمحے کسی بچے سے مخاطب ہو۔

”شاباش، اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ یقیناً ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ بارعب لہجے میں حکم صادر کیا تھا
اور پھر پلٹ کر چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔
میرب سیال نکتی دیر تک کھڑی اس سمت نکتی رہی تھی۔



سبکگین حیدر لغاری کھڑا تھا۔ اس کی سمت خوشگین نظروں سے نکتتا ہوا۔ غالباً اسے خدشہ تھا کہ وہ کون
اگل دے اور مائی اماں کے سامنے اس کا مایج خراب نہ ہو جائے۔ اُس نے اُس کے ہاتھ سے فون
کچھ دیر بات کی تھی اور پھر سلسلہ موقوف کر کے اس کی سمت دیکھا تھا۔

میرب سیال کی آنکھوں میں ایک لمحے میں سمندر آن ٹھہرا تھا۔
”نہیں کر سکتی میں یہ سب۔ نہیں رہنا ہے مجھے تمہارے ساتھ۔ نہیں جھیلنی ہے مجھے یہ لہجہ کی
بہت جان لیوا ہے یہ میرے لئے۔ پلیز مگر جاؤ میرے وجود کی حقیقت سے۔ فراموش کر دو مجھے
دو آزاد مجھے۔ جینا چاہتی ہوں میں۔ سانس لینا چاہتی ہوں۔ تمہاری قربتوں میں دم گھسنے کا
میرا۔۔۔ مرجاؤں گی میں۔ نہیں رہ سکتی میں تمہارے ساتھ۔“ عجب ہذیبانی انداز میں چیخ رہی تھی اور
سردار سبکگین حیدر لغاری ایک لمحے میں اس کی سمت بڑھا تھا۔

بہت توجہ کے ساتھ اس چہرے، ان آنکھوں کو دیکھا تھا جن میں کئی سمندر ٹھہرے ہوئے تھے۔ پلکوں
کئی پانیوں کا بوجھ اٹا ہوا تھا۔ کچھ خیر، کچھ خوف اپنے اندر سمیٹے وہ آنکھیں اس لمحے ساکت تھیں۔
سردار سبکگین حیدر لغاری نے ہاتھ دیوار پر ٹکاتے ہوئے جیسے ان حیرتوں سے پر آنکھوں کو اس لئے
اور بھی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ فرار کے سبھی راستے جیسے مسدود ہو گئے تھے۔

میرب سیال پانیوں سے بھری آنکھوں سے اسے ساکت سی نکتی چلی گئی تھی۔ اس شخص کی آنکھوں
چہرے سے کسی طرح کے تاثر کا اظہار نہ مل رہا تھا۔

وہ لہجہ پھر جیسے کسی قیامت کی پیش قدمی کا اعلان کر رہا تھا۔
میرب سیال کی ساکت آنکھوں میں خوف ہی خوف تھا۔ مگر سردار سبکگین حیدر لغاری نے ایسا
اطمینان سے دایاں ہاتھ اس کے چہرے کی سمت بڑھایا تھا۔ شہادت کی انگلی سے ان پلکوں پر گئے موزوں
اپنی پور پر لیا تھا۔ بہ غور دیکھا تھا اور پھر ایک پل میں ہوا میں اڑاتے ہوئے بہت محظوظ ہونے والے انداز
میں مسکرا دیا تھا۔

”مورت کے آنسوؤں میں بہہ جانے والی شے کو جانتی ہو کیا کہتے ہیں؟“ دلچسپی سے میرب سیال نا
سمت دیکھتے ہوئے سوال دریافت کیا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی اور سردار سبکگین حیدر لغاری کے لبوں کی
مسکراہٹ اس لمحے کچھ اور بھی گہری ہو گئی تھی۔

”مرد“ وضاحت بہت دلچسپ تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی اور میرب سیال کی آنکھیں ساکت تھیں۔
مگر سردار سبکگین حیدر لغاری بہت اطمینان کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔

”مقولہ بہت مشہور ہے۔ شاید تمہیں بھی از بر ہو۔ مگر یہاں ایسی کوئی علامت نہیں ملتی۔“ بہت سہول
سے جتایا تھا۔ ”مجھ پر ان نمکین سمندروں کا جادو کچھ زیادہ اثر نہیں کرے گا میرب سیال! سو یہ سارا نکملا
بہت بے کار رہے گا۔ شاید یہ سن کر تمہیں بھی کچھ افسوس ضرور ہو، یہ بالکل بے سود ہے۔“ لبوں پر مسکراہٹ
بدستور قائم تھی۔

”بے سود کام کر کے شاید تمہیں بھی کچھ زیادہ خوشی نہیں ہو گی۔ سو وقت برباد کرنے سے ناگوار

ذرا سن۔“ وہ مسکرایا تھا۔

کچھ عجیب و غریب سا ڈیزائن نہیں یہ؟“ وہ چونکی تھی۔

اس سے کئی درجہ بہتر ہے جو تم اس سے قبل بنا رہی تھیں۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”یہ تو لگ رہا ہے پورا باغ لگانے کے موڈ میں ہو تم۔ بس گلے بنانے کی کسر رہ گئی ہے۔ تم نے ان کے لئے تو جگہ چھوڑی ہی نہیں۔ اب گلے کہاں بناؤ گے؟“ وہ یقیناً اس لئے شرارت آنکھوں میں لئے چھیڑ رہی تھی۔

”تم نے اس سے قبل کبھی مہندی لگائی ہے؟“

”ہاں۔ بچپن میں۔“

”اور وہ کس نے لگائی تھی؟“

”تم نے۔“ وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔ ”تم ایک کام کیوں نہیں کرتے؟“

”کیا؟“

”یہ بزنس ورنس چھوڑ کر اسی فیلڈ میں کیوں نہیں آ جاتے؟“ — خالص ماہر لگ رہے ہو۔“ وہ یقیناً چھیڑ رہی تھی۔

”شٹ اپ ساہیہ!“ وہ نچل سا ہو گیا تھا۔ لبوں پر پُر خفت سی مسکراہٹ تھی۔ ساہیہ ہنس دی تھی۔ ”رنگ اچھالانے کے لئے کیا کرنا ہوگا؟“

”پینڈ نہیں۔ لیکن اگلے اس روز بتا رہی تھیں۔“ وہ شرارت سے سراٹھا کر اس کی سمت نکلنے لگا تھا۔

”کیا؟“

”یہی کہ رنگ گہرا آنا محبت کرنے والے پر ڈی پینڈ کرتا ہے۔ وہ جتنی زیادہ محبت کرتا ہے، رنگ اتنا لگا آتا ہے۔ اب مجھے تو یہ پتہ نہیں کہ تمہاری زندگی میں داخل ہونے والا تم سے کتنی محبت کرتا ہے۔

یقیناً یہ بات تم زیادہ بہتر انداز میں جانتی ہو گی۔“ وہ آنکھوں میں بہت سی شرارت لئے اس لئے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

ساہیہ خان اس کی جانب دیکھنے لگی تھی۔ پھر یکدم اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا تھا۔ وہ یکدم ہنس اٹھا۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ سرٹھی میں ہلانے لگی تھی۔ پھر بہ غور اس ہتھیلی کو دیکھنے لگی تھی۔

”تمہیں خدشہ ہے کہ رنگ اچھا نہیں آئے گا؟“ وہ بدستور شرارت پر مائل تھا۔

”تمہیں فکر کیوں ستا رہی ہے اذہان حسن بخاری؟“

”دوست ہوں۔ تمہیں کسی مشکل میں کیسے دیکھ سکتا ہوں؟“ اس نے شانے بے نیازی سے اچکائے تھے۔ ساہیہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”میرے بارہ کیوں بن رہے ہیں؟“ اذہان حسن بخاری نے اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

ساہیہ خان مہندی کی کون ہاتھ میں لئے عجیب و غریب انداز میں اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری وہاں آیا تھا۔

”اگلے کہاں ہیں؟“

”پھپھو؟“ — پتہ نہیں، شاید اوپر ٹیرس پر ہوں۔ فارحہ آئی بھی وہیں ہیں۔“ وہ عجیب سر ہریا میں بتاتے ہوئے کون میں سے ہن نکال کر ہتھیلی پھیلا کر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگی تھی۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟“ اذہان حسن بخاری نے اسے کسی درجہ دلچسپی سے دیکھا تھا۔

”مہندی لگا رہی ہوں۔“ سرسری انداز میں بنا اس کی سمت دیکھے مطلع کیا تھا۔ اذہان حسن بخاری اسے دیکھا تھا، وہ اسی طرح عجیب بے ڈھنگے انداز میں ہتھیلی پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اس کی جانب پیش قدمی کر دی تھی۔

”لاؤ۔“ اس کے عین سامنے بیٹھتے ہوئے ہاتھ بڑھایا تھا۔

”کیا؟“ وہ چونکی تھی۔

”مہندی ایسے نہیں لگاتے۔“ مسکراتے ہوئے آگاہ کیا تھا۔

”تو پھر؟“ وہ حیرت زدہ سی دیکھنے لگی تھی۔

اذہان حسن بخاری نے ہاتھ بڑھا کر کون اس کے ہاتھ سے لے لی تھی۔

”تم؟“ ساہیہ خان کسی درجہ حیرت سے اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ مگر اذہان حسن بخاری نے اعتماد کے ساتھ مسکراتے ہوئے کون اس کے ہاتھ سے لے لی تھی۔ پھر ٹشو سے اس کی ہتھیلی سے انہی ترچھی لکیروں کو صاف کیا تھا۔ ساہیہ بہت غور سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔

”مہندی لگانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔“ وہ بہت مستند انداز میں اسے باور کرا رہا تھا۔

”اچھا۔“ وہ مرعوب ہوئے بغیر نہ رہی تھی۔

”مہندی لگانے کے لئے کون کون سا طرح پکڑنا پڑتا ہے۔“ وہ سمجھا رہا تھا۔

”اوہ۔۔۔ ویری ٹاکس۔“ ساہیہ خان پھر متاثر ہوئے بغیر نہ رہی تھی۔

اذہان حسن بخاری اس کی ہتھیلی کو ہاتھ میں لئے دوسرے ہاتھ سے بہت آہستگی کے ساتھ پھول بنا رہا تھا۔

”یہ کیا بنا رہے ہو؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”اظہارِ افسوس کے لئے اس سے بہتر کوئی طریقہ شاید نہ ہو۔“
”اسوس کی کیا ضرورت ہے۔ میں ہوں نا۔“ بھرپور شرارت سے مسکراتے ہوئے ساہیہ
طرف دیکھا تھا۔

”شٹ اپ اذہان!“ وہ مسکراتی ہوئی گھورنے لگی تھی۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”تمہاری پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔“ وہ بدستور شرارت پر مائل تھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر اس کے لئے تمہیں قربانی کا بکرا بننے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”آریوشیور؟“ اذہان حسن بخاری نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے
کا ایک مکابنا کر اس کے شانے پر جڑ دیا تھا۔ پھر ہتھیلی پر بے پھول بوتے دیکھنے لگی تھی۔
”تم نے مہندی واقعی اچھی لگائی ہے۔“

”لیکن فائدہ کیا؟۔۔۔ رنگ تو آئے گا نہیں۔“ وہ چھیڑتے ہوئے مسکرایا تھا۔ ساہیہ خانہ
تھی۔

”ہاں۔۔۔ مگر پھر بھی یہ ایک اچھا تجربہ ہے۔ جو دل چاہے کر لیتا چاہئے، سوچنا نہیں چاہئے کہ کیا ہوگا
کیا نہیں۔ نفع نقصان تو بزنس کے لئے سوچے جاتے ہیں، چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور راحتیں سیٹلے کے
نہیں۔“

”ہوں۔۔۔ شاید ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ لیکن تم دل کی کچھ زیادہ ہی نہیں مانتی ہو؟“ اذہان حسن بخاری
نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تھا۔

”ہاں۔ تمہارے خیال میں یہ گڈ سائن ہے یا نہیں؟“

اذہان حسن بخاری نے جواباً اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔ تبھی وہ مسکراتے ہوئے سرفی میں ہلانے
تھی۔

”مجھے نہیں پتہ اذہان! اور لوگ کس طرح سوچتے ہیں یا کیا کرتے ہیں۔ مگر میرا اپنا ایک جینے کا
ہے اور مجھے اسی طرح جینا اچھا لگتا ہے۔ اس سے اور کچھ شاید نہ ملتا ہو مگر راحت بہت ملتی ہے۔ اور
راحت بہت معنی رکھتی ہے۔ شاید تمہیں یہ بہت امپور سا لگے، شاید تم افسوس بھی کر دیر ہی عقل پر۔ مگر
اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”ہاں۔۔۔ میں جانتا ہوں۔“ اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ وہ چونکی تھی۔

”یہی کہ تم ایسی ہی ہو۔“ وہ مسکرایا تھا۔ وہ ہنس دی تھی اور اس کے رخسار کا ڈمپل اس لمحے واضح
بہت بھلا لگنے لگا تھا۔ اذہان حسن بخاری اس کی سمت بہ غور دیکھنے لگا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ چونکی تھی۔

”تمہارے چہرے کے رنگ دیکھ رہا ہوں۔ بہت نچرل ہے سب کچھ۔ بے ریا، بے فکر اور
صاف۔“

”دل سے جینے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”ایک کام کرو۔“ اذہان حسن بخاری کے لہجے میں ایک درخواست تھی۔

”کیا؟“ وہ چونکی تھی۔

”مجھے بھی جینا سکھا دو۔۔۔ کچھ اپنے جیسا بنا دو۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کی سمت بہت توجہ سے
دیکھتے ہوئے بولا تھا اور وہ ہنستی چلی گئی تھی۔

”مذاق کر رہے ہو اذہان حسن بخاری!“

”نہیں، میں مذاق نہیں کر رہا۔۔۔ تم واقعی بہت اچھی ہو۔“

ساہیہ خانہ جواباً مسکرا دی تھی۔

”یہ اعتراف شاید تم نے زندگی میں پہلی بار کیا ہے۔“

”شاید۔“ اذہان حسن بخاری بہت دھیمے سے مسکرایا تھا۔

”شاید؟“ وہ جواباً مسکرائی تھی۔

”اور شاید تمہیں یہ اچھا بھی لگا ہے۔“ وہ اب ٹیڑھ کرنے پر مائل تھا۔ ساہیہ خانہ نے اس کی سمت دیکھا

”تم ہاڑ نہیں آؤ گے اذہان! قطعاً نہیں سدھ سکتے تم۔“

”تم کوشش کر دیکھو۔۔۔ شاید تم کامیاب ہو جاؤ۔“ وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔

”یہ پیش کش تمہاری ضرورت ہے یا مجبوری؟“

”عجب بے ڈھنگی لڑکی ہو۔۔۔ ساری بات کا مزہ کر کر کر دیا۔ اچھی خاصی خواہش کو ضرورت اور
بڑی کے خانوں میں ڈال رہی ہو۔“ وہ براسامہ بنا کر بولا تھا اور ساہیہ خانہ ہنستی چلی گئی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ تبھی وہاں اگینے آئی تھی۔ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے اپنا مہندی والا ہاتھ اس کے
انڈے کر دیا تھا۔

”اذہان مجھے مہندی لگانا سکھا رہا تھا۔“

”سکھائیں رہا تھا بلکہ یہ مہندی میں نے ہی لگائی ہے۔ اگینے! سچ بتائیے گا، کیسی لگ رہی ہے؟“ وہ
کراتے ہوئے اگینے کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

”تم یہ کام بھی کر سکتے ہو؟۔۔۔ حیرت ہے۔“ اگینے مسکرائی۔

”اگینے! آپ داد دے رہی ہیں یا واقعی حیرت کا اظہار کر رہی ہیں؟“ وہ بہ غور دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں داد دے رہی ہوں، یقیناً۔ اور پر جاؤ، بلاں کو تم سے شاید کوئی کام ہے۔“ اگینے نے ساڑھی کا
پلاں درست کرتے ہوئے کہا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے ایک نظر ان کی سمت بہ غور دیکھا تھا، پھر اٹھ کھڑا
اتھا۔

”اگینے!“ جاتے جاتے وہ یکدم پلٹا تھا۔

”ہوں؟“ اگینے چونکی تھیں۔ وہ پھر بہت مدھم لہجے میں بولا تھا۔

”اچھی لگ رہی ہیں آپ۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ پلٹ کر تیزی سے وہاں سے نکل گیا تھا۔ مسکراتی ہوئی پلٹ کر سایہ سے بات کرنے لگی تھی۔

اس شام وہ اوری کے ساتھ لاؤنج میں تھی جب عرفان علی خان آیا تھا۔ اُسے لگا تھا، وہ اس گھر میں فریڈ کو دیکھ کر شاید کسی قدر حیران ہو گیا پھر کسی قدر حیرت کا اظہار کرے گا، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ دادا سے ملنے کے بعد ان کی طرف بڑھا تھا۔ اوزی نے بھی اس کی سمت کسی قدر چوکتے ہوئے دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

دونوں مقابل کھڑے ایک دوسرے کو چند ثانیوں تک تکتے رہے تھے، پھر یکدم ہنستے ہوئے ہنسنے لگے تھے۔ اور انا بیہ شاہ کسی قدر حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

”وہاں اے سر پرانز یارا! تو یہاں کہاں؟“ اوزی مسکراتے ہوئے اس کے چوڑے شانے مارے ہوئے عجب انداز سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ ایک لمبی داستان ہے۔۔۔ تو سنا، تو واپس کب لوٹا مائیکسٹر سے؟ اور شادی وادی تو نہیں کہیں؟ ان دنوں بڑا مجنوں ہو رہا تھا تو کسی پاکستانی گوری کے لئے۔ کیا ہوا اس کا؟ کہیں کوئی اور لے لے لے لے؟“ عرفان علی خان کا انداز بھی اسی قدر دوستانہ تھا اور اوزی کھلکھلا کر ہنستا چلا گیا تھا۔

”بس چھوڑ یارا! اس عمر کے قصے خواب ہوئے۔ اس عمر کی باتیں جانے دو۔ تو سنا، تو کب لوٹا تیرے تو دور دور تک ارادے نہ تھے۔“

”بس لوٹا پڑا۔ یا یوں سمجھو یہی ضروری بھی تھا۔ شاید نہ لوٹتا تو بہت کچھ گنوا دیتا۔“ عرفان علی خان نے کہا۔

انا بیہ شاہ کی سمت ایک نگاہ ڈال کر مسکرایا تھا۔

”یعنی بہت کچھ پالیا ہے تم نے یہاں آ کر۔“

”نہیں خیر، ابھی پایا تو نہیں مگر خواہش ضرور ہے۔ اپنی وے، یہاں کہاں؟“ عرفان علی خان نے ہونے دریافت کر رہا تھا۔

اوزی نے ایک نگاہ انا بیہ شاہ کی سمت دیکھا تھا پھر مسکرا دیا تھا۔

”شی ازمانے کزن۔۔۔ اور تم؟“

”فرینڈز۔“ عرفان علی خان نے انا بیہ شاہ کی سمت دیکھتے ہوئے بہت دھیمے لہجے میں انکشاف کیا۔

وہ دیکھ کے رہ گئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ساتھ بیٹھے دھواں دھار بول رہے تھے اور دونوں کے فلک شکاف تہمتے ہنسنے رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا وہ دونوں پہلے سے اچھے دوست تھے۔ مگر انا بیہ شاہ پھر بھی کسی قدر حیرت میں اٹھ کر وہ لان میں چلی آئی تھی اور پائپ لگا کر کیاروں کو پانی دینے لگی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا؟۔۔۔ یہ ماٹن کب سے بن گئیں؟“ اوزی، عرفان علی خان کے ساتھ وہاں سے

”تم کہیں جا رہے ہو؟“ وہ اوزی سے مخاطب ہوئی تھی۔

”ہاں۔۔۔ میں عرفان کے ساتھ جا رہا ہوں۔ رات کے کھانے پر کوئی اہتمام مت کرنا، میں کھانا اپنی کھاؤں گا۔“

”ہاں پوچھیں تو کیا بتاؤں؟“ وہ سرسری انداز میں گویا تھی۔ عرفان علی خان اس چہرے کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔

”یہی کہ میں عرفان کے ساتھ ہوں۔ ویسے اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میں نے دادا ابا کو مطلع کر دیا ہے۔ تم پھر بھی آئی کو بتا دینا۔“

”اوکے۔“ اس نے سرانبات میں ہلایا تھا اور یوں توجہ سے پودوں کو پانی دینے لگی تھی۔

”ایک بات بتاؤ۔“ اوزی گیا نہیں تھا۔

”دو چنگی تھی۔ اس کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ نگاہ عرفان علی خان سے بھی ٹکرائی تھی جو اس لمحے کی جانب متوجہ تھا۔

”تم نے بتایا نہیں کہ تم عرفان علی خان کو جانتی ہو۔“ اوزی نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ وہ اس کی سمت دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”مجھے خواب نہیں آیا تھا۔ نہ ہی الہام ہوا تھا کہ تم کسی محترم عرفان علی خان کو اس سے قبل بھی جانتے ہو۔“ اس کا انداز بے حد لائق لگنے لگے ہوئے تھا۔ اوزی مسکرا دیا تھا۔ جب کہ عرفان علی خان بہت دلچسپی سے اس چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”انا بیہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ انہیں جاننے کا دعویٰ میں کر سکتا ہوں، یہ نہیں۔“ مختصر جملے میں ہزار معنی بڑھاتے۔

”ہے انا بیہ! غالباً یہ تعلق میری ہی جانب سے ہے۔ دادا ابا سے دوستی میں نے اپنی مرضی سے ہی کی تھی۔ یہ میری ہی خواہش تھی۔ انا بیہ تو اس سے واقف بھی نہیں۔ یا اگر ہیں بھی تو کسی درجہ لائق ہیں۔

لیڈیر لائق ان کے مزاج کا حصہ ہے۔“ وہ بہت دلچسپی سے اس کی جانب دیکھتا ہوا اظہار مدعا کر رہا تھا۔ انا بیہ شاہ چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ اوزی بہت دلچسپی سے سنتا ہوا مسکرا رہا تھا۔ انا بیہ شاہ نے اپنے ٹخن کی سمت ایک نگاہ کی تھی پھر بہت رسائیت سے مسکرا دی تھی۔

”سوری، میں واقعی تمہیں بتانا بھول گئی۔ میری بہت ہی کلوز فرینڈ کے فیانیسی ہوتے ہیں۔ شاید تم اسے جانتی ہو، وہی لامعہ حق۔“ بہت پرسکون لہجے میں مطلع کرتے ہوئے بھی وہ جیسے جنگل میں آگ لگا گئی۔ اوزی کے چہرے کے تاثرات ایک لمحے میں بدلے تھے۔ ایک سایہ سا آ کر گزر گیا تھا اور وہ پھر سے کارن پھیر گیا تھا۔ تبھی عرفان علی خان نے اس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے یاد دہانی کرائی۔

”ہم لٹ ہو رہے ہیں اوزی! شاید تم بھول رہے ہو۔“

”نالا، ماں۔۔۔ چلو۔“ اوزی یکدم مسکرا رہا تھا اور پھر فوراً ہی بلیٹ کر عرفان علی خان کے ساتھ آگے

بڑھنے لگا تھا۔ انا بیہ شاہ کسی قدر پُرفسوس انداز میں اوزی کو جاتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔ وہ اسے نہیں چاہتی تھی مگر جانے کیسے وہ بول گئی تھی اور اب ایک احساس ندامت نے اسے گھیر لیا تھا۔ اس کے اندر پھینکنے لگا تھا۔ مگر شاید اس کا مداد اس کے پاس نہ تھا۔

یہ سچ تھا، اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر جیسے مر رہی تھی۔ لمحہ لمحہ جیسے ایک اذیت مٹا رہا تھا۔ مگر وہ ان قرتوں سے دور نہیں بھاگ سکتی تھی۔

ایک لمحہ نہیں، ایک پل نہیں، وہ ایک ثانیہ بھی اس کے سنگ بسر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر یہ اختیار میں نہ تھا۔ کیا عجب بے بسی کی گھڑی تھی کہ فیصلے کا کوئی اختیار اس کے ہاتھ میں نہ تھا۔ وہ تھی۔ مکمل طور پر بے بس۔ وہ شخص جیسا سلوک چاہتا، اس سے روار کھتا۔ جو چاہتا تھا، کرتا تھا۔ کاروبار یہ غیر مساوی تھا۔ مگر اس نے طے کر لیا تھا، اسے کیا کرنا ہے۔

اس شام جب وہ اس کے پاس آئی تھی وہ کسی کے ساتھ فون پر بڑی تھا۔ شاید دوسری طرف کا وٹس ہی تھی۔ اس کا لہجہ بہت شہد آگیا تھا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی مگر وہاں کھڑا رہنا منظور نہ تھا۔ وہ چلتی ہوئی ہاتھ پرکل آئی تھی۔ کچھ دیر وہیں کھڑی اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہی تھی، پھر کمرے میں آگئی تھی۔ جی بہت برا ہو رہا تھا۔ رونے کو بے حد چاہ رہا تھا۔ مگر وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے ان آنسوؤں سے سردار سبکگین حیدر لغاری کو نفرت تھی۔ اور وہ بھی ان آنسوؤں سے نفرت کرتا تھا۔ اس کی کمزوریوں کو اس شخص پر عیاں کر دیتے تھے۔ اور یہ یقیناً ٹھیک نہ تھا۔ جب کسی پر آپ کی عیاں ہو جائیں تو تب وہ کچھ اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی کمزوریوں سبکگین حیدر لغاری کو اور بھی طاقت ور کر دیں۔ تبھی اس نے تیزی سے ہیگٹی پلکیں ایک لمحے میں بے دردی سے ہاتھ کی پشت سے رگڑتے ہوئے پونچھ دی تھیں۔ پھر اٹھی تھی اور الماری کھول کر ایک پیک کرنے لگی تھی۔ آنکھوں میں بے حد جلن تھی۔ وہ اس شخص کے متعلق سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ چاہے نہیں چاہتی تھی مگر ذہن اس طرف سے ہٹ نہیں رہا تھا۔

”میں اہمیت دینا چاہتی میں تمہیں کوئی۔ قطعاً بھی نہیں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی سینڈل پُروخت انداز میں اچھالا تھا۔ دروازے کی سمت اس کی پشت تھی۔ وہ دیکھ نہیں پائی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری کمرے میں داخل ہوا تھا اور تیزی سے اپنی سمت آتی ہوئی سینڈل کو جس قدر و تشویش سے دیکھا تھا اسی قدر سرعت سے ہاتھ بڑھا کر کھینچ بھی لیا تھا۔

”اتنی الجھن میں کیوں ہو؟۔۔۔ جو دل کہتا ہے اسے مان لینے میں حرج کیا ہے؟“ میرب سیال نے کہا۔ اور میرب سیال بے طرح چونک پڑی تھی۔ ایک لمحے میں رخ پھیر کر دیکھا تھا۔ سردار حیدر لغاری ہاتھ میں اس کی سینڈل لئے بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اس کی کیفیت درجہ محفوظ ہو رہا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس پر کل رہی تھی۔ جتنا مخفی رکھنا چاہتی تھی خود کو اس لئے وہ اس کے زمانوں سے اسی درجہ شناسائی رکھتا تھا۔

میرب سیال نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا پھر دوسرے ہی لمحے چہرے کا رخ پھیر کر آنکھوں کو ڈالا تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری چلتا ہوا آگے بڑھ آیا تھا۔ اس کے مقابل کھڑا ہوا تھا۔ چند ثانیوں تک اس سے اسے دیکھا تھا، پھر سینڈل والا ہاتھ اس کی سمت بڑھا دیا تھا۔

”مخفی کا بہترین حل یہ ہے کہ غصے کو آنے ہی نہ دیا جائے۔ الجھنوں میں گھرے رہنا مسئلے کا حل قطعاً نہیں ہے۔“ وہ یقیناً محفوظ ہو رہا تھا۔

میرب سیال نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا، ہاتھ بڑھا کر پلکوں سے نمی کے ایک قطرے کو چہن لے لی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے اسے بغور دیکھا تھا۔

”کچھ کہنا چاہتی تھیں تم؟“ بہ غور دیکھتے ہوئے وضاحت چاہتی تھی۔ میرب سیال کچھ نہیں بولی تھی مگر اس نے اس کی طرف سے ہاتھ بڑھا کر پلکوں سے نمی کے ایک قطرے کو چہن لے لی تھی۔

”میرب سیال شاید یہی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔“

”بہت مشکل سے اظہار مدعا کیا تھا۔ آنکھیں رگڑ ڈالی تھیں۔“

”کیا ضرورت ہے اتنے بند باندھنے کی؟۔۔۔ خود پر اتنے ستم ڈھانے کی؟ جو ہوتا ہے، ہو جانے دے۔“

”میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔“ اس کی کہی ان سنی کر دی تھی۔

”کیوں؟۔۔۔ میرا کسی اور جانب مائل بہ کرم ہونا اچھا نہیں لگ رہا؟“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے کہا۔

”میں نے بیگانہ کر لی ہے۔۔۔ اگر آپ کو کام ہے تو آپ رک جائیے۔ مگر میں مزید نہیں رکھتی۔“

”وہ بنا اس کی سمت دیکھے بولی تھی اور سردار سبکگین حیدر لغاری کا قبضہ اس کے اطراف گونجی چلا گیا۔“

اداری ہے۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جب تم میرے ساتھ رہو۔“ وہ جیسے اسے جتا رہا تھا۔ بہت کچھ باور کرا
 لیا۔ میرب سیال خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرب سیال! یقیناً تم میری بات سمجھ رہی ہونا؟“ وہ مسکراتے ہوئے یقین چاہ رہا تھا اور میرب
 بال چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”ہم یہاں سے کب جائیں گے؟“ مدھم لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”جب تم کہو گی۔“ وہ اسے مکمل لبرٹی دیتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”تو پھر میں آج ہی جانا چاہتی ہوں۔“ میرب سیال نے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”بہتر۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے مسکراتے ہوئے شانے بہت بے نیازی سے اچکائے تھے۔

میرب سیال سر جھکائے تیزی سے پیکنگ کرنے لگی تھی۔

ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔

ساتھ خان کے لئے یہ سب بہت دلچسپ تھا۔ تبھی وہ لان میں آ کر بچوں کے ساتھ کھیلنے لگی تھی۔ بوند
 ادنیٰ آہستہ آہستہ بارش میں بدلنے لگی تھی۔ مگر اس کا شوق نہ تھا تھا۔ اگینے کب سے آوازیں دے رہی تھی
 گردن کر نہ دے رہی تھی۔

”ساہیہ! فون کروں گی تمہاری ماما کو۔۔۔ شکایت لگاؤں گی باقاعدہ، یہاں آ کر بگڑ رہی ہو۔“ اگینے
 نے دھکی دی تھی مگر وہ ہنستی چلی گئی تھی۔

”اگینے! بگڑنے میں اور انجوائے کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اور میں اس وقت انجوائے کر رہی
 ہوں۔ ریلی، بہت مزہ آ رہا ہے۔ میری مایے تو آپ بھی آجائے۔“ اس نے با آواز بلند کہتے ہوئے فٹ
 بال بچوں کی طرف اچھالا تھا۔ مگر فٹ بال بچے کی جگہ اذہان حسن بخاری کے ہاتھ میں جا پہنچا تھا۔
 ”اذہان! تم کب آئے؟“ ساہیہ خان اسے دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ وہ مسکرایا تھا۔

”بس ابھی ابھی۔ تم سناؤ۔“

سونا بوند ساوہ شخص بنا پراہ کئے وہاں کھڑا تھا۔ بارش تیزی سے اسے بھگو رہی تھی۔ مگر اس گھڑی اسے
 مجھے احساس تک نہ تھا۔ وہ اس گھری سٹھری شفاف سی لڑکی کو چہرے پر بہت شگفتگی لئے زندگی سے بھرپور
 رنگوں میں رنگے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

وہ تیز بارش میں بھگتی بہت دلربا لگ رہی تھی۔

اذہان حسن بخاری تیز بارش میں بھگتا ہوا اسے دیکھتا رہا تھا۔

”وہ آج کل بہت پائے جا رہے ہو یہاں۔ بہت فارغ وقت ہاتھ آ گیا ہے کیا؟“

”نہیں۔۔۔ وقت نکال رہا ہوں۔ وہ بھی بطور خاص تمہارے لئے۔ اگر ایسا نہیں کروں گا تو پھر تم ہی
 گھڑو گی۔“ مسکراتے ہوئے جواز دیا تھا۔

”اچھا بہانہ ہے۔“ ساہیہ مسکرائی تھی۔

میرب سیال نے سر اٹھا کر سردار سبکگین حیدر لغاری کی سمت دیکھا تھا۔

”میں جتنا جان گئی ہوں، وہ بہت کافی ہے سردار سبکگین حیدر لغاری! اس سے زیادہ
 نہیں چاہتی۔ میں اس معاملے پر بات کرنا ضروری خیال نہیں کرتی۔ یوں بھی میں لفظوں سے
 اقدامات پر یقین رکھتی ہوں۔ فی الحال میں یہی کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے یہاں سے جانا ہے۔ آج
 کچھ مدد کریں گے یا نہیں؟“ بہت اعتماد سے بولتی میرب سیال کی سمت سردار سبکگین حیدر لغاری۔

متاثر ہونے والے انداز میں دیکھا تھا۔ پھر گویا ہوا تھا۔

”جانے کی اتنی جلدی کیا ہے؟۔۔۔ ابھی ہی تو وہ لمحے میر آئے ہیں جب کچھ کھلنے لگے۔
 مشکف ہونے لگا ہے کچھ۔“ وہ جانے کیوں مسکرا رہا تھا۔ شاید میرب سیال کی کیفیت سے مدد
 رہا تھا۔

”آج میری کچھ مدد کریں گے یا نہیں؟“ میرب سیال نے قطعی لہجے میں دریافت کیا تھا۔

سردار سبکگین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔

”مجھ سے زیادہ تمہارا خیر خواہ اور کون ہو گا میرب سیال؟“

میرب سیال اس شخص کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”اسی بات کا تو احتمال ہے مجھے۔“ دھیسے لہجے میں باور کرایا تھا۔

سردار سبکگین حیدر لغاری ہنس دیا تھا۔

”خوف زدہ ہو مجھ سے؟“

”نہیں۔۔۔ مجھے آپ سے ڈر نہیں لگتا، یہ بات بتا چکی ہوں میں آپ کو۔ ڈر مجھے لگتا ہے
 سیاہ بختی سے۔ سارا قصور اسی کا ہے۔ یہی ہے جس نے مجھے اتنا کمزور کر دیا ہے اور آپ کو بہت
 ”انٹرسٹنگ۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔ ”تو مجھ سے الگ ہونے کے متعلق سوچو۔
 میرب سیال نے کسی قدر حیرت سے اس کی سمت دیکھا تھا۔ تبھی وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا تھا۔
 ”تمہاری سوچیں تک پڑھنے پر قادر ہوں میرب سیال! اور کہاں تک یقین دلاؤں کہ تمہیں
 سمجھتا ہوں یا سمجھنے لگا ہوں؟“ وہ بے حد دلچسپی سے میرب سیال کی سمت دیکھ رہا تھا۔
 ”میرے خیال میں ہم بہت بہترین جیون ساتھی ثابت ہوں گے۔ یہی ساری کوششیں تو درکنار
 اچھے جیون ساتھی بننے کے لئے۔ ایک دوسرے کو جاننا، ایک دوسرے کے دل کی بات جاننا
 دوسرے کی کیئر کرنا، خیال کرنا۔ یہی نا، اور کیا۔۔۔ اور کیا میرب سیال، ہاں؟“ سردار سبکگین
 مسکرا رہا تھا۔
 میرب سیال اس کی سمت دیکھ کر رہ گئی تھی۔
 ”یعنی مجھے خود ہی کچھ کرنا ہو گا۔“ اس نے جیسے ایک لمحے میں اخذ کیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے
 ہلانے لگا تھا۔
 ”نہیں میرب سیال! تم اب میری ذمہ داری ہو۔ تمہارا خیال رکھنا، تمہارے متعلق

”بہانہ؟۔۔۔۔۔ یہ بہانہ ہرگز نہیں ہے۔ میں واقعی تمہارے لئے وقت نکال رہا ہوں۔ بطور مثال مسکرایا تھا۔

”ایک بات بتاؤں۔۔۔ تم بھیگ رہے ہو۔“ آگاہ کیا تھا۔ وہ مسرور سا مسکرا دیا تھا۔

”بھیک چکا ہوں۔ مجھے چیک کر رہی تھیں تم، میں حاضر دماغ ہوں یا نہیں؟“ وہ ہنس دی تھی۔

”میں کتنی بریٹی ہوں، جانئے ہو تم۔“

”جانتا ہوں۔۔۔۔۔ سچی تو ہمیشہ حملوں کے لئے تیار رہتا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”یعنی آزما کر لیتے ہیں۔“

”یہ میں نے ابھی نہیں کہا۔“

”کہا نہیں مگر پروف تو ہو گیا۔“

”پروف؟ لیکن ابھی تو میں نے تمہیں آزما ہی نہیں۔“

”تو آزماؤ نا، پلیز۔“ عجب لجاجت بھرے انداز میں درخواست ہوئی تھی۔

”اتنی جلدی کیا ہے اذہان حسن بخاری؟۔۔۔ وقت تو آنے دو، فیصلہ آپ ہی ہو جائے گا۔“

”آزمانے کے لئے وقت کی تندر رکھنے والے چور ہوتے ہیں۔“ اذہان حسن بخاری شرارت سے ممتحن تھا۔

”چور؟“ وہ مسکراتی ہوئی کسی قدر حیرت سے چوکی تھی۔ ”تم مجھے چور کہہ رہے ہو؟“

اذہان حسن بخاری بے ساختہ ہنسا تھا۔

”اسے کہتے ہیں چوری کا داڑھی میں تنکا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ کسی قدر جارحانہ انداز میں وہ گھورتی ہوئی جانے کے لئے تیزی سے اٹھی۔

مگر وہ توازن برقرار نہ رکھ پائی تھی۔ بھاگتے ہوئے پاؤں مڑا تھا۔ وہ گرنے کو تھی جب یکدم ٹپا پڑا۔

حد سرعت کے ساتھ اذہان حسن بخاری نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا تھا۔ ساہیہ خان کو لگا تھا جیسے اسے

انگڑے لے چھو لیا ہو۔ ایک لمحے میں سنبھلتے ہوئے اس کی گرفت سے نکلتا چاہا تھا مگر وہ اس کے گرد باندھے

باندھے بہت شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

”کتنا رومیٹک موسم ہے۔۔۔ کہو تو ایک آدھ ڈویٹ گالیں؟“

”شٹ اپ اذہان!“ اس نے مسکراتے ہوئے اس کے شانے پر ٹکا جڑا تھا۔

”فلموں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“ اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا۔

”لیکن ہم کسی فلم کا حصہ نہیں ہیں۔“ ساہیہ خان نے ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا تھا۔ وہ چلی تھی

تجسسی پاؤں مڑا تھا اور وہ گرتی چلی گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اسے زمین پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا

دیکھ کر ہنستا چلا گیا تھا۔

”شٹ اپ اذہان! اٹھاؤ مجھے۔“ ساہیہ خان نے اب کے خود ہاتھ بڑھایا تھا۔ اذہان حسن بخاری

”بڑھے ہوئے ہاتھ کو مسکراتے ہوئے تھام لیا تھا۔ وہ اٹھی تھی مگر کراہ کر رہ گئی تھی۔ شاید چوٹ شدید لگی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا تھا۔ ساہیہ خان نے قدم اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر قدم بھی نہ چل سکی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ وہ خاصے ہیلپ لیس انداز میں کھڑی اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ شاید پاؤں میں موج آئی تھی اور چلنا یقیناً ممکن نہیں رہا تھا اس لئے۔“

اذہان حسن بخاری نے بہت سہولت سے جھک کر اسے ہانپوں میں اٹھالیا تھا۔

”ہی۔۔۔۔۔ یہی چاہ رہی تھیں نا تم؟“ مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”میں نے ایسی کوئی درخواست نہیں کی تھی۔“ انداز شرارت سے پڑھا۔

تیز برتی ہوئی بارش میں وہ اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھائے چلا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

”درخواست نہیں کی تھی۔ مگر اس روٹی بسورتی صورت میں، تم جانتی تھیں، ایسا ہی ہو گا۔ کیسا لگ رہا

ہائے ہینڈس سے بندے کی ہانپوں میں سفر کرنا؟“ وہ یقیناً اس کا موڈ بحال کرنے کو خوشگوار انداز میں

بارا تھا۔ ساہیہ خان تکلیف کے باوجود مسکرا دی تھی۔

”تم بہت خوش فہم ہو اذہان حسن بخاری!“

”نہیں خیر، کچھ اتنا زیادہ بھی نہیں۔ لیکن ایک بات کہوں، تمہارا وزن خاصا زیادہ ہے۔ کل سے بیلنس

بن لینا شروع کر دو۔ ورنہ عنقریب سلنگ کلب جو انن کرنا پڑے گا۔“ وہ چھیڑ رہا تھا اور وہ ہنس دی

تھی۔

”نسومت۔۔۔ مذاق نہیں ہے یہ۔ تمہارا وزن واقعی کافی زیادہ ہے۔ دیکھو میرا سانس پھول رہا

ہے۔ وہ اب بھی سنجیدہ نہ تھا۔

”شٹ اپ اذہان!“ وہ ہنس دی تھی۔ ”اچھے خاصے تو چل رہے ہو۔ اور یوں بھی لڑکیوں کی عمر اور

ناپ کبھی بات نہیں کرنی چاہئے۔ وہ دونوں کے ہی معاملے میں بہت کوششیں ہوتی ہیں۔“

”ہاں، جانتا ہوں۔ لیکن مجھے جھیلنا پڑ رہا ہے، سو بول رہا ہوں۔ اگینے کے ہاتھ کے بنے گا جبر، مٹر،

ٹی، آلو کے پراٹھے کھانا بند کر دو۔“ اذہان حسن بخاری اسے لے کر اندر بڑھتے ہوئے بولا تھا اور وہ

اٹھی تھی۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں ان تمام قسموں کے پراٹھے نوش کر رہی ہوں ان دنوں؟“

”اگینے سب کو ایسے ہی کھلاتی ہیں۔ اور جانتی ہوں ان کی خوب صورتی کا اصل راز یہی ہے۔ وہ دوسروں

کا کھانا کھانا کر دیتی ہیں مگر خود ہرگز نہیں کھاتیں۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”اچھا؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے اسے؟“ لاؤنج میں بیٹھے سب لوگ اسے اس طرح اذہان حسن بخاری کی ہانپوں میں

کر چوسکے تھے۔ اگینے فکر مندی میں پیش پیش تھی۔ ”کہا بھی تھا بارش میں مت کھیلو، مگر مانی ہی نہیں۔

بھگت لیا۔ دکھاؤ مجھے کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں اگینے! خالی سوچ ہے شاید۔ آپ بام لگا کر پٹی باندھ دیں۔ کل تک ٹھیک ہو جائے۔“ اذہان حسن بخاری نے اسے صوفے پر بٹھاتے ہوئے مشورہ دیا تھا۔ مگر اگینے کی فکر کم نہیں ہوئی تھی۔

”لگوائی ناچوٹ؟ اب مزہ آگیا؟۔۔۔ تب جب منع کر رہی تھی تو سن کر نہیں دے رہی تھی۔“

ڈپٹے ہوئے وہ مزیر کا نمبر مل رہی تھی۔

”ہاں، عزیز!۔۔۔ کہاں ہو تم؟۔۔۔ جلدی گھر پہنچو۔ ساہیہ کو پاؤں میں شدید چوٹ لگ چکی ہے۔ نہیں، اتنی انجری نہیں، غالباً تم دیکھ لو آ کر۔ اگر ضرورت ہوئی تو ہم ہسپتال لے جائیں گے۔“

تو آ جاؤ۔“ گھر کے ڈاکٹر کا بھی فائدہ تھا۔ جہاں کہیں بھی ہوتا تھا فوراً دھر لیا جاتا تھا۔ اب بھی دور دورہ کے ساتھ تھا مگر آپا کی بات کہاں ٹال سکتا تھا۔ اگینے جانتی تھی ابھی تھوڑی دیر میں وہ یہاں ہو گا۔ اطمینان سے آ کر اس کا پاؤں دیکھنے لگی تھی۔

اذہان حسن بخاری بہ غور دلچسپی سے اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اگینے کو اس طرح پریشان ہوئے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہے پھپھو؟۔۔۔ آپ بھی بس۔ اور یہ چاچو کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اتنی سیر بس انجری نہیں ہوئی ہے۔ معمولی سی موج ہی تو ہے۔ اذہان ٹھیک کہہ رہا تھا، آپ بام ل کر پٹی لگا دیں، ٹھیک ہو جائے گا کل تک سب۔“

اگینے نے سنی ان سنی کرتے ہوئے ہیٹر آن کیا تھا۔ پھر کسی قدر ناپسندیدگی سے اس کے گلے پڑا دیکھا تھا۔

”افو، یہ گلے کپڑے۔“

”اگینے! انی الحال اسے چنچ کرنے کا آرڈر مت دیجئے گا۔ یہ چل پھر نہیں سکتی۔ اور خدا خواستہ زیادہ یا کمپلیکٹ ہوئی تو مسئلہ ہو جائے گا۔“

”ہاں، مگر تمہارے ساتھ تو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا نا۔ پھر تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟“ اگینے نے پلٹا اس کی جانب دیکھا تھا۔ وہ چونک گیا تھا۔ اگینے بہت نرمی سے مسکرائی تھی۔

”تم تو جا کر کپڑے چنچ کر سکتے ہو نا۔ اس طرح سوئٹ بونڈ، بھیکے ہو۔ بیمار پڑ گئے تو؟۔۔۔ چوٹ کے کمرے میں جا کر کپڑے چنچ کر دو۔ میں تمہارے لئے گرم گرم کافی تیار کرتی ہوں۔“ اگینے بولی گئی۔ مسکراتے ہوئے پلٹ کر عزیر کے کمرے کی سمت بڑھنے لگا تھا۔

”شادی کے دن سر پر ہیں اور تم چوٹ لگوا کر بیٹھ گئی ہو۔ اب خاک انجوائے کر دو گی۔ چاچا کی دیکھنے آئی تھیں اور خود چوٹ لگوا کر بیٹھ گئیں۔ اب اٹھنا مت، بیٹھی رہو یہیں، جب تک عزیر نہیں آتے۔ میں تمہارے لئے کافی بنانے جا رہی ہوں۔ ہیٹر چل رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر تک کپڑے سوکھ جائیں گے۔“ اگینے نے اسے ہدایت کی تھی۔ اس نے اچھے بچوں کی طرح سر ہلایا تھا اور اگینے تب پلٹ کر سمت بڑھ گئی تھی۔

”یہ پھپھو بھی نا۔۔۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتی ہیں۔ مگر.....“ یکدم اپنا بارش

بلا

ایا تھا۔ فٹ بال کھیلنا یاد آیا تھا اور پھر دھڑام سے گرنا۔ وہ یکدم مسکرا دی تھی۔

اوزی بیڑیوں پر قدرے نیم تاریکی میں بہت چپ چاپ بیٹھا تھا۔ جب انا بیہ شاہ چلتی ہوئی اس کے پاس جا پہنچی تھی مگر وہ تب بھی چونکا نہیں تھا۔ نہ ہی انا بیہ شاہ کی طرف دیکھا تھا۔ انا بیہ شاہ نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھر دیا تھا۔

”میرا مقصد تمہارا دل دکھانا ہرگز نہیں تھا۔“ وہ دم مہم لہجے میں بولی تھی۔ اوزی نے اس کو دیکھا تھا۔ پھر بہت جیسے سے مسکرایا تھا۔

”تمہیں کس نے کہا انا بیہ شاہ! کہ تم نے میرا دل دکھایا ہے؟“

انا بیہ شاہ کچھ نہیں بولی تھی۔ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی تھی۔ تبھی وہ مسکرایا تھا۔

”قصور کسی کا نہیں ہے انا بیہ شاہ! اس دل کو دکھنا ہی تھا، سو دکھ گیا۔ اوزی کا دل بہت کمزور ہے۔ اسے بات بات ہو چکی ہے ایسے معاملات کی۔“ وہ مسکرایا تھا، بات جیسے مذاق میں اڑانا چاہتی تھی۔ ”تم سناؤ،“

”میں کیوں نہیں ہو اب تک؟“

”میں اتنی جلدی نہیں سوئی اوزی! اور تم.....“ وہ کچھ بولتے بولتے رہ گئی تھی۔ خاموش ہو کر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ اوزی نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر اس کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے دوستانہ انداز میں مسکرایا تھا۔

”سنو اچھی لڑکی! ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر اوزی کے دل کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم بے کار میں خود کو گنٹی نلامت کرو۔ میں جانتا تھا، یہ ہو چکا ہے۔ سب کچھ بھی ہو، اس سے فرق نہیں پڑتا۔“

”اوزی! انا بیہ شاہ نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر وہ سرنٹی میں ہلاتے ہوئے مسکرایا تھا۔“

”سنا ہو گا تم نے زندگی سفر ہے، موڑ بہت سے پڑتے ہیں۔ ہر موڑ منزل نہیں ہو سکتا۔ ڈونٹ وری۔ اوزی ازاو کے۔“

انا بیہ شاہ چپ رہی تھی۔ تبھی وہ بولا تھا۔

”تم مجھ سے سب کچھ چھپانا چاہتی تھیں نا؟“ لبوں پر مسکراہٹ تھی اور انا بیہ شاہ فقط اسے دیکھ کر رہ گئی تھی اور وہ ہنس دیا تھا۔

”اوزی کو اتنا کمزور سمجھتی ہو؟“

”مجھے نہیں پتہ تھا تم عرفنان علی خان کو پرسنل اتنی اچھی طرح جانتے ہو۔“ انا بیہ شاہ کا لہجہ مدہم تھا اور وہ مسکرایا تھا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے انا بیہ شاہ؟۔۔۔ یہ تم نے منہ پر بارہ کیوں بجا رکھے ہیں۔ ویسے بائے دل و سہ، وقت کیا ہوا ہے؟“

”اچی رسٹ واج پر دیکھو۔“

”اوہ ہاں، میں بھول ہی گیا تھا کہ میں وقت کو اپنے ہاتھ میں لئے گھومتا ہوں۔“ وہ اس کی یاد دہانی پر

مسکرایا تھا۔ انا بیہ شاہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ اوزی اس کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

”تم — انا بیہ شاہ! تم کہاں تک پہنچی ہو؟“

”میں؟“ وہ چونکی تھی۔ ”کیا مطلب؟“

اوزی مسکرا دیا تھا۔

”زندگی سفر ہے نا۔ کہیں تم بھی برداشت تو نہیں کر رہی ہیں؟“

انا بیہ شاہ کچھ نہیں بولی تھی۔ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی اور اوزی پتہ نہیں اس کی خاموشی سے سمجھا تھا۔

”تمہیں اپنے بارے میں سوچنا چاہئے انا بیہ شاہ!“

انا بیہ شاہ پہلے چونکی تھی، پھر بہت دھیمے سے مسکرا دی تھی۔

”ہاں — میں اپنے بارے میں سوچتی تو ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو، کیا میں اتنی ہی کیرلیس ہوں؟“

اوزی نے اسے دیکھا تھا، پھر مسکرا دیا تھا۔

”نہیں — اس سے بھی کہیں زیادہ۔“

”کیا مطلب؟“

”انا بیہ شاہ! خود کو اہمیت دینا سیکھو۔ تم خود اپنے لئے کس قدر اہم ہو۔ اس بات کا ادراک تمہیں بہن سکون دے گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟ — فقط ادراک سکون کیسے دے سکتا ہے؟ ادراک سے زیادہ دیگر اقدامات کی تو ضروری ہوں گے۔“ انا بیہ شاہ نے بات کو مذاق میں اڑانا چاہا تھا اور اوزی بھی مسکرا دیا تھا۔

”بہی تو..... یہی تو کہہ رہا ہوں کہ خود کو کچھ اہمیت تو دو۔“

”تمہیں کیا لگتا ہے اوزی! میں خود کو اہمیت نہیں دیتی؟ میرا خیال ہے ہر کوئی اپنے آپ کو اہمیت ضرور

دیتا ہے۔ یہاں بات میری نہیں، تمہاری ہو رہی تھی اور یہاں میرے خود کو اہمیت دینے سے زیادہ ضرور بات یہ ہے کہ تم خود اپنے اس جعلی خول سے باہر نکل آؤ۔ بہت کھوکھلے لگتے ہو کبھی کبھی۔“ وہ جواباً مسکرائی ہوئی بولی تھی اور اوزی ہنستا چلا گیا تھا۔

”ہنس کیوں رہے ہو؟ — میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“

”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم ٹھیک نہیں کہہ رہی ہو۔ جانتی ہو، کبھی کبھار چیزیں جیسی نظر آتی ہیں ویسی ہوتی

نہیں ہیں اور درحقیقت جیسی ہوتی ہیں ویسی نظر نہیں آتیں۔“

”یہ فلسفیانہ باتیں خدا کے لئے اپنی بنیادی میں بند رکھو اوزی! تم جانتے ہو اتنی مشکل باتیں میری سمجھ میں قطعاً نہیں آتی ہیں۔“

”تمہاری سمجھ میں تو اور بھی بہت کچھ نہیں آتا انا بیہ شاہ!“ وہ مسکرایا تھا۔ انا بیہ شاہ اسے دیکھ کر روک

تھی۔

”تم عفنان علی خان کو کب سے جانتی ہو انا بیہ شاہ؟“ قدرے توقف کے بعد اوزی نے دریافت کیا۔

اور انا بیہ شاہ نے بہت چونک کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

”تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو اوزی؟“ اس کا لہجہ مدہم تھا۔

اوزی نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔

”نہیں، ایسے ہی۔“ انداز ٹالنے والا تھا۔

”وہ کچھ کہہ رہا تھا تم سے۔“ انا بیہ شاہ نے اس کی سمت بہ غور دیکھا تھا۔

”نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں یوں ہی پوچھ رہا تھا۔ دراصل وہ تمہاری دوست کا فیائسی ہے نا، سو تم اس کے متعلق کیا سوچتی ہو؟“

”میں؟ — میں اس کے متعلق کیا سوچوں گی اوزی؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“

”ریلیکس۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔“ اوزی نے سر فنی میں ہلایا تھا۔

”تو پھر..... پھر کیا تھا؟“ انا بیہ شاہ نے اسے کسی قدر ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔ اوزی نے بہت

آہستگی سے اس کا ہاتھ تھا تھا اور پھر اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”انا بیہ شاہ! تم بہت اچھی ہو۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”یہ بات میں جانتی ہوں اوزی! اب زیادہ مکھن مت لگاؤ۔“

وہ مسکرائی تھی۔ وہ ہنس دیا تھا۔ تبھی وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

”وہ دادا ابا کا اچھا دوست بن گیا ہے اوزی! دادا ابا شاید اس سے قبل بہت تنہائی محسوس کرتے تھے۔

اکڑو کتابوں میں اٹھے نظر آتے تھے۔ میں اور ماما شاید انہیں زیادہ وقت دے نہیں پاتے تھے۔ مجھے اس

بات کا اندازہ ہے اوزی! تبھی جب عفنان علی خان ان سے ملنے کی غرض سے یہاں آنے لگا تو میں نے

کئی قدر غم نہیں لگائی۔ اس کی وجہ سے دادا ابا کا وقت اچھا گزر جاتا ہے اوزی! مجھے دادا ابا بہت عزیز

ہیں۔“

”اور عفنان علی خان؟“ اوزی یکدم گویا ہوا تھا۔ وہ حیران ہو کر اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”عفنان علی خان؟“

”ہاں — میں کہہ رہا تھا، عفنان علی خان اس لحاظ سے خاصا معقول اور مناسب شخص ہے۔ وہ

جس قدر اچھا نظر آتا ہے اس سے کہیں زیادہ دل کا اچھا ہے۔ یقیناً دادا ابا اس کے ساتھ اچھا محسوس کرتے

ہوں گے۔“ اوزی مسکرا رہا تھا اور انا بیہ شاہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ پھر قدرے توقف سے بولی تھی۔

”تم عفنان علی خان کو کب سے جانتے ہو؟“

”یہ چھوڑو، میں اسے جانتا ہوں کیا یہ کافی نہیں ہے؟“ پھر کسی قدر تشویش سے اس کی جانب دیکھنے لگا

تھا۔ ”اے، کہیں تم اپنی دوست کو لے کر تو اپری ہینسو نہیں ہو رہی ہیں؟“

وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ مگر اوزی ہنس دیا تھا۔

”تمہاری دوست کو ایک اور جنم ملے اور وہ چراغ لے کر کبھی ڈھونڈے تب بھی اسے عفنان علی خان

نہیں بنا کر نہیں ملے گا۔“



”یہ تم کہہ رہے ہو اوزی؟“ انا بیہ شاہ نے اس کی جانب کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔ وہ مسکرایا
”جول گیا ہے اسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اسے بھول جا۔“ وہ اپنی لاجب بیان کر رہا تھا اور انا بیہ شاہ
دیکھ کر رہ گئی تھی۔ وہ یکدم اٹھا تھا۔ ابھی انا بیہ شاہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اوزی اس کی سمت دیکھا
تھا۔ انا بیہ شاہ نے اسے یہ غور دیکھا تھا، پھر مدھم لہجے میں بولی تھی۔

”بھولنا واقعی کیا اتنا آسان ہے اوزی؟“

اوزی نے اس کی سمت دیکھا تھا، پھر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”گڈ ٹائٹ — تم بھی سو جاؤ اب۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا اور اہم

اس کی جانب دیکھ کر رہ گئی تھی۔

ایک طوفان کے بعد ایک سکون بہت لطف دیتا ہے۔

اس نے نیو یارک پہنچ کر جیسے سکون کا سانس لیا تھا۔ اپنوں کے درمیان ایک تحفظ کا احسان
اندر اُبھرا تھا اور سردار سبکنگین حیدر لغاری نے اس کے چہرے کی پرسکون کیفیت کو یہ غور دیکھا تھا۔
”مجھے پایا سے ملنے جانا ہے۔“ میرب سیال نے اظہار مدعا کیا تھا۔

”ضرور — مگر وہ تو ہاسٹل سے ڈسچارج ہو چکے ہیں غالباً۔“ دھیسے لہجے میں باد کر لیا تھا۔

میرب سیال دیکھ کر رہ گئی تھی۔ پھر ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”جانتی ہوں — آج ان سے ملنے کے بعد مجھے اپنے جانے کے متعلق بھی مطلع کرنا ہے۔

روز گزر گئے ہیں، سینی کا فون آیا تھا۔ میری اسٹڈی کا بھی بہت حرج ہو رہا ہے۔ سمسٹرز سر پر ہیں اور
وہ بول رہی تھی جب یکدم ہی سردار سبکنگین حیدر لغاری نے اس کی بات کاٹی تھی۔

”اور تم؟“

وہ کچھ نہیں بولی تھی اور سردار سبکنگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”تم بھی کوئی معمولی کام تو نہیں کر رہے ہو؟ غالباً تم تو سب سے بڑا کام کر رہی ہو۔“

سمجھ رہی ہو۔ اس کے اسرار، اس کے عہد سمجھ رہی ہو اور یہ کوئی معمولی کام تو نہیں ہے۔“

”ہاں شاید۔“ اس نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے اس
سے دنوں میں جتنا زندگی کو سمجھا ہے، جانا ہے وہ واقعی بہت زیادہ ہے۔“

”اس کے لئے تمہیں میرا شکر یہ ادا کرنا چاہئے۔ یقیناً یہ میری بدولت ہی ممکن ہوا۔“ وہ جانے

مسکرا رہا تھا۔

”ہاں — اس کے لئے میں واقعی آپ کی ممنون ہوں۔ آپ نے مجھے واقعی زندگی کا ایک
دکھایا ہے۔ شاید میں ساری زندگی میں جو نہ دیکھ پاتی، جو نہ محسوس کر پاتی، آپ نے مجھے اس احساس

دوچار کیا ہے۔“ وہ بہت خوب صورتی سے طنز کر رہی تھی۔ مگر سردار سبکنگین حیدر لغاری بہت رسانیہ

مسکرا دیا تھا۔

”تیار ہو جاؤ۔“ مجھے فورٹین وال اسٹریٹ جانا ہے۔ وہاں سے ہو کر میں تمہیں تمہاری ٹیلی کی
فون چھوڑ دوں گا۔“ پینکشن کی تھی۔ مگر میرب سیال نے سر ٹی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ اتنی انجان نہیں ہوں یہاں کے راستوں سے۔“

اس نے تعرض برتا تھا اور سردار سبکنگین حیدر لغاری اس کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

”مجھے اپنی چیزوں کی حفاظت کرنا اچھا لگتا ہے میرب سیال! میرا انداز اپنی چیزوں کے متعلق بہت

بیرنگ ہے۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔“ دھیسے مسکراہٹ بتا رہی تھی وہ میرب سیال کی کیفیت سے
غلطابور ہا تھا۔

میرب سیال چپ چاپ اٹھ کر وارڈ روم کے سامنے جا کر تھی۔ جب وہ تیار ہو کر نکلی تھی، سردار

سبکنگین حیدر لغاری اس کا منتظر تھا۔ اب اسے پھر اس ناپسندیدہ سنگت کو جھیلنا تھا اور برداشت کرنا تھا۔ خود

کو رہنا تھا اور جبر کرنا تھا۔ اتنے دنوں میں بہت سی مجبوریوں کے باوجود وہ اب تک اس جبر کی جانے کیوں

مانی نہیں ہوئی تھی۔ اور شاید وہ کبھی عادی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ ابھی اپنے طور پر اس نے فیصلہ کر لیا تھا اور

لے لیا تھا کہ اسے اس فیصلے سے ہٹانے نہیں تھا۔

یہ شخص، اس کی قربت، خود اس کا جبر سب وقتی تھا۔

چند روزہ تھا۔

وہ یقیناً اسے غلط سمجھا تھا۔

خود پر اپنا اس کا زعم بہت بودا تھا اور یہ میرب سیال نے اسے سمجھانا تھا۔

وہ اپنی دسترس پر بہت خوش گمان تھا۔ اپنی دولت، اپنے حسب نسب، نام، مرتبے پر نازاں تھا۔ اس کی

لطیبت میں تسلط ہی تسلط تھا مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ میرب سیال ایک جیتا جاگتا وجود ہے، کوئی مفتوح علاقہ

نہیں۔ بہت خوش گمان تھا وہ۔ شاید کسی قدر اندھیرے میں تھا اور میرب سیال کو اسے اس اندھیرے سے

بہرانا تھا۔ اس کی خوش گمانی کو دور کرنا تھا۔

وہ آج کے دور کی لڑکی تھی۔ اپنے حقوق سے بخوبی واقف تھی اور اپنے حق کے لئے لڑنا جانتی تھی۔

سردار سبکنگین حیدر لغاری اگر اسے کمزور سمجھے کی غلطی کر رہا تھا تو یقیناً وہ بہت غلطی پر تھا۔ گاڑی فورٹین

وال اسٹریٹ پر رکھی تھی۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری نیو یارک اسٹاک ایکسچینج کے اندر گیا تھا اور وہ بزنس کیپٹل

دلکے نام سے جانی جانے والی فورٹین وال اسٹریٹ کی عمارت کو یہ غور دیکھنے لگی تھی۔ امریکہ کی وہ

عمارت جس کے باعث وہ ساری دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب وال

اسٹریٹ کو چھینک آتی ہے تو امریکہ کی پوری اکانومی کو نمونیا ہو جاتا ہے۔ میرب سیال کی نظریں اس وقت

ان ٹکی پر تھیں جس کے سینکڑوں پر امریکن اکانومی کا گراف نمایاں تھا۔ ٹکی کے سینکڑوں پر تھے، یعنی امریکہ

کی اکانومی کا گراف ان دنوں بلند تھا۔ اگر وہ سینکڑوں نیچے ہوتے تو یقیناً امریکہ کی اکانومی کو نمونیا ہو گیا ہوتا۔

وہ یہ سوچ کر ہی مسکرائی تھی، جب یکدم اس کی نظر عمارت سے باہر نکلتے سردار سبکنگین حیدر لغاری پر

پڑی تھی۔ وہ تہانہ تھا۔ کوئی اس کے ساتھ تھا اور وہ گئی تھی۔ وہی گی، جس کی ڈربائی قیامت خیز تھی اور سردار

سبکدین حیدر لغاری جس کی دلربائی کا اسیر تھا۔

اس کا جواب میں تمہیں دوں گی۔ مگر ایک شرط پر۔“

اس گھڑی بھی وہ اس کے ساتھ بہت خوش گوار موڈ میں تھا۔ دونوں جانے کیا بات کر رہے میرب سیال کی نگاہ ساکت تھی۔ وہ اس کی سمت جھک رہا تھا۔ میرب سیال یکدم ہی چہرے کا رنگ اٹھاتی تھی۔ پھر پینہ نہیں کیا ہوا تھا، وہ یکدم دروازہ کھول کر اتری تھی اور تیزی سے چلتی ہوئی وہاں سے دو لگی تھی۔ بنا اس کی پرواہ کئے کہ سردار سبکدین حیدر لغاری اس کی غیر موجودگی میں کس درجہ پریشان ہوا اسے کچھ پرواہ نہیں تھی۔ بس اس کے اندر جیسے ایک طوفان اٹھا تھا اور وہ وہاں سے بھاگ کھڑا تھی۔ بہت سی ہی اس کی آنکھوں میں آن رکی تھی۔ مگر وہ رکی نہیں تھی، قریب سے گزرنے والی کیسا کیا تھا اور پھر فوراً دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی، سردار سبکدین حیدر لغاری کیا سوچتا کرے گا۔ اسے اس کے متعلق پرواہ نہیں تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے اسے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ کیب فرمائے بھرنے لگی اور وہ آنکھیں رگڑنے لگی تھی۔

اگینے اور دیگر لوگ ساہیہ خان کو متواتر ڈانٹ ڈپٹ رہے تھے اور وہ جانتی تھی اس کا قصور تھا۔ سو جھکائے بیٹھی تھی۔

”شادی کتنی نزدیک ہے اور تم..... لوگ کیا کہیں گے، یہ ہے دو لہے کی وہ بہن جو کیلگری تھی۔“ اس کے چلنے پھرنے پر پابندی تھی۔ حالانکہ معمولی سی سوچ بھی مگر سب کا نزلہ اس پر گر رہا تھا۔ اذہان آیا تھا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”خوش ہوا ب؟“ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ وہ وہی شکستہ لہی ہنسی تھی۔

”ہاں بہت۔ کم از کم انجوائے بھی تو میں نے ہی کیا ہے نا۔ اور یہ معمولی سادہ اس کے سامنے کیا ہے۔“

اذہان حسن بخاری نے اسے بہ غور دیکھا تھا۔ یہ لڑکی واقعی بہت زندہ دل تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر ساہیہ نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”زندگی۔“ وہ بہت آہستگی سے مسکرایا تھا۔

”زندگی؟“ وہ چونکتے ہوئے مسکرائی تھی۔

”ہاں۔۔۔ زندگی، دلکشی اور.....“ جملہ مسکراتے ہوئے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

”اور.....؟“ ساہیہ خان مسکرائی تھی۔

”رعنائی۔“ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے جملہ مکمل کیا تھا۔ وہ ہنس دی تھی۔

”رینکی ساہیہ خان! کبھی کبھی مجھے تم پر حیرت ہوتی ہے۔ تم زندگی سے اتنے خوش گوار رنگ کیسے ہو؟

کیسے ڈھونڈ لیتی ہو اتنے کھلتے ہوئے موسم؟“ اذہان حسن بخاری نے دریافت کیا تھا اور چلی گئی تھی۔

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ تمہیں مجھے آکس کریم کھلانے لے جانا ہوگا۔“ ساہیہ خان نے فرمائش کی تھی اور وہ ہنس دیا

”سوچ لو، بارش ہو رہی ہے آج بھی۔ کیا آج بھی بازوؤں پر اٹھانا پڑے گا؟“

”انٹالو گے تو کوئی حرج بھی نہیں۔“ وہ مسکرائی تھی۔ ”تو پھر تم لے جا رہے ہوتا؟“

”اگینے سے پوچھنا ہوگا۔“ اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا۔

”وہ تو کبھی بھی اجازت نہیں دیں گی۔“ ساہیہ نے منہ بسورا تھا۔

”تو پھر؟“

”کہہ دو، میں لے جانا چاہ رہا ہوں۔“ مسکراتے ہوئے مشورہ دیا تھا۔ وہ مسکرایا تھا۔ پھر بہت آہستگی

لے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ مانگا تھا۔ ساہیہ خان نے اس کی سمت دیکھا تھا، پھر مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ

اس کی جانب بڑھا دیا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے اس کا ہاتھ تھام کر سہارا دے کر اسے کھڑا کیا تھا۔ ساتھ

کا تدرے فاصلے پر دیگر خواتین کے ساتھ بیٹھی ضروری امور پر تبادلہ خیال کرتی اگینے کی طرف دیکھا تھا۔

لہر آواز بلند مطلع کیا تھا۔

”اگینے! ہم آکس کریم کھانے جا رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ جلدی آ جانا۔“ اگینے کا جواب تھا اور اذہان حسن بخاری اسے لے کر آگے بڑھنے

کا تھا۔

”لے کر تو جا رہا ہوں۔ مگر سنو، میرے سہارے کی عادی مت ہو جانا۔“ اذہان حسن بخاری نے چھیڑا

فلا۔ وہ مسکرائی تھی۔

”تمہاری ایک پراہلم ہے اذہان حسن بخاری! پتہ ہے کیا؟ تم خوش فہم بہت جلد ہو جاتے ہو۔“

”اُدھ، رینکی؟“ وہ مسکرایا تھا۔ ”ایک خوب صورت لڑکی میرے اتنے قریب ہوگی تو بولو اور کیا ہوگا؟“

اُدھ پھٹنے سے باز نہیں رہا تھا اور ساہیہ خان کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

”تم کچھ بھی کہو اذہان حسن بخاری! میں نے تمہیں بدل دیا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

”اُدھ کیسے؟“ وہ حیران ہوا تھا۔

”تم میرے رنگ میں رنگنے لگے ہو۔“ ایک گہرا انکشاف ہوا تھا اور وہ ہنس پڑا تھا۔

”اچھا۔۔۔ کیا واقعی؟ مجھے اس بات کا پتہ نہیں تھا۔“ وہ محفوظ ہوا تھا۔

”بس تو پتہ چل گیا نا؟“ ساہیہ مسکرائی۔

”ہاں۔“ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ گاڑی کا درازہ کھول کر اسے بٹھایا پھر دوسری طرف سے گھوم

کر آرا بونگ سیٹ پر آن بیٹھا تھا۔

”تم لڑکیاں اتنی بے وقوف کیوں ہوتی ہو؟“

”تم ایسا سمجھتے ہو۔۔۔ میں ایسا نہیں سمجھتی۔ لڑکیاں تو خدا کی بنائی ہوئی خاصی عقل مند لڑکیاں ہیں۔“
 ”مگر اذہان حسن بخاری ہنس دیا تھا۔“
 ”تم مسکرا رہے ہو؟“ ساہیہ کو جیسے اُچھن ہوئی تھی اور وہ ہنس دیا تھا۔
 ”تو اور کیا کروں؟“ ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

”یعنی تم ڈٹائے کر رہے ہو؟“ وہ کسی قدر تنگی سے بولی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے
 نفی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں، کم از کم میں اتنی خوب صورت لڑکی سے اختلاف نہیں کر سکتا۔“ اس کا انداز شرارت سے تھا۔
 اور ساہیہ خان مسکرا دی تھی۔ بہت آہستگی سے چہرے کا رخ پھیر لیا تھا۔ اذہان حسن بخاری وڈا کر
 گرتی پانی کی بوندوں کو تھپتھپتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”بارش ہو رہی ہے ساہیہ!“ پتہ نہیں اس نے اطلاع دی تھی یا پھر سوال کیا تھا۔ وہ سمجھی نہیں تھی۔
 شاید کسی قدر حیرت سے اس کی سمت دیکھا تھا۔
 ”ہاں، تو پھر؟“ دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر تھی مگر آنکھوں میں حیرت بہت واضح تھی۔

”بارش۔۔۔ ساہیہ! تم لڑکیوں کو بارش اتنی پسند کیوں ہوتی ہے؟“
 ”بارش؟“ وہ چونکی تھی۔ پھر مسکرا دی تھی۔ ”شاید اس لئے کہ ہم اپنے اندر بہت زیادہ لاشی اور
 رکھتے ہیں۔“

اذہان حسن بخاری ہنس دیا تھا۔
 ”مجھے تم سے ایسے ہی کسی جواب کی توقع تھی ساہیہ خان!“
 ”جب توقع تھی تو پھر پوچھا کیوں؟“

”تصدیق، ساہیہ خان! تصدیق چاہتا تھا میں۔“
 ”تو اب ہو گئی تمہاری تصدیق؟“ وہ مسکرائی تھی۔
 ”ہاں۔“ اس کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”ایک بات کہوں ساہیہ؟“ اجازت طلب کی تھی۔
 ”ہاں کہو؟“ وہ کھڑکی سے باہر برستی بارش کو بغور دیکھ رہی تھی۔
 ”تم بالکل اس بارش جیسی ہو۔“ عجب انکشاف تھا۔ ساہیہ خان نے بہت چونک کر اس کی سمت
 دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

”شٹ اپ اذہان! ابھی ایسے دعوے مت کرو۔ ابھی تمہیں موسموں کی کچھ خبر نہیں۔ ابھی
 جاننے لگے ہوتے رنگوں کو، موسموں کو۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔“ ساہیہ خان نے کھڑکی کی سمت چہرہ پھیرنے
 بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”اور؟“ اذہان حسن بخاری نے نگاہ وڈا کر اس کی سمت منتقل کی تھی۔ ساہیہ خان نے
 کے مدہم لہجے پر اس کی سمت دیکھا تھا پھر بہت اعتماد کے ساتھ مسکرا دی تھی۔

”مگر یہ بچپان اڈل اڈل کی تو نہیں۔“ اذہان حسن بخاری مسکرا ہوا تھا۔ ساہیہ خان اس کی سمت دیکھتی
 تھی۔

”اڈل اڈل کے تعلقات سے بھی کچھ زیادہ پیچیدہ سی بات ہے۔ اذہان حسن بخاری! ہم تب ملے تھے
 ہمارا کوئی پر سنائی ڈی ویلپ ہی نہ ہوئی تھی۔ وہ بچپن تھا۔ جب سب منظر اچھے لگتے ہیں اور سارے
 خوب صورت۔ وہ دور بڑانا سمجھی کا دور تھا۔ سراسر حماقتوں کا دور۔ اور حماقتوں کو یاد رکھنا اور یاد کرنا کوئی
 بات نہیں۔ ہم یقیناً اب اتنے احمق نہیں رہے۔“

”یعنی اب اس سے زیادہ احمق ہو گئے ہیں۔“ اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا۔ وہ بھینچے لبوں کے ساتھ
 بولا تھا۔

”مگر جو ساہیہ خان! اب اس مزید احمق پن کے ساتھ ایک دوسرے کو سمجھنا تو اور بھی دشوار ہو گا نا۔“
 ”تم کتنا فضول بولتے ہو نا اذہان حسن بخاری!“
 ”پتہ نہیں۔ مگر اتنا جانتا ہوں مجھے بولنا تم نے سکھایا ہے۔“ اس نے اعتراف کیا تھا۔ وہ حیران ہوئی

تھی۔
 ”یعنی اس سے قبل تم جیسے بولتے ہی نہیں تھے۔“
 اذہان حسن بخاری نے گاڑی آکس کریم پارلر کے سامنے روک دی تھی۔

”نہیں بولتا تھا۔“ اعتراف کیا تھا۔ لبوں پر بہت دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ ساہیہ کی سمت بہ غور دیکھتے
 ہوئے وہ چہرے کا رخ پھیر کر اس کے لئے آکس کریم کا آرڈر دینے لگا تھا اور ساہیہ خان اس کی سمت بہ
 اور دیکھنے لگی تھی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے ساہیہ خان! اس آکس کریم میں ایسی کیا بات ہے جو بندے کے موڈ کو پچی پشی کر
 لیتا ہے؟“ آکس کریم اس کی سمت بڑھاتے ہوئے وہ بولا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔
 ”اس میں کریم ہے، مٹھاس ہے اذہان حسن بخاری! اور یہ دونوں چیزیں محبت کی علامت ہیں۔“

”آ۔۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔۔“ وہ ہنس دیا تھا۔
 ”تمہیں نہیں معلوم تھا؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔
 اذہان حسن بخاری نے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔ مگر تم نے بتا کر بہت اچھا کیا۔“ اس نے کہتے ہوئے جھک کر اس کی آکس کریم میں سے ایک
 اپنے لئے لیا تھا۔

”واقعی، میٹھی اور کریمی تو ہے۔“ پُر خیال انداز میں کہتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

”جانتے ہو، آئس کریم سب کے ساتھ شیئر نہیں کرتے۔“ ساہیہ خان نے ایک انکشاف کر دیا۔

”کیا مطلب؟۔۔۔ پھر کس کے ساتھ شیئر کرتے ہیں؟“ اذہان حسن بخاری نے سوالیہ نظر اٹھایا۔

اس کی سمت دیکھا تھا۔ ساہیہ خان نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر مسکرا دی تھی۔

”اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے منہ بوم تم مجھ سے پوچھتے ہوئے بہت اسٹوپڈ لگتے ہو اذہان حسن بخاری۔“

اور وہ کھلکھا کر ہنس دیا تھا۔

”جس بات کے متعلق پتہ نہ ہو اس کے متعلق پوچھ لینے میں، میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی۔“

خان!“ باور کرا دیا تھا۔ ”شاید تم بتانا نہیں چاہ رہی تھیں یا واقعی تمہارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔“

مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”میں کوئی بھی بات بلا جواز نہیں کرتی اذہان حسن بخاری!“ ساہیہ خان مسکرائی تھی۔

”تو پھر بتاؤ نا، تم کیا کہہ رہی تھیں؟“

”کس بات سے متعلق؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”آئس کریم سے متعلق۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”تم اتنی کریوٹیٹی کیوں محسوس کر رہے ہو اذہان حسن بخاری؟“

”اور تم چھپانا کیوں چاہ رہی ہو؟“

”میں چھپانا نہیں چاہ رہی مگر کچھ باتیں خود آپ بھی سمجھنا چاہئیں اذہان حسن بخاری اور میں۔“

خیال کہ تم نا سچی کی اتج میں ہو۔“ وہ جتاتی ہوئی مسکرائی تھی۔

اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر جھک کر اس کے کپ میں سے آئس کریم لے کر منہ میں رکھی تھی، پھر مسکرا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت شرارت تھی اور ساہیہ خان اسے دیکھ کر ہنس پڑی۔

”تم سیدھی سادھی باتوں کو کتنا پیچیدہ کر دیتی ہو ساہیہ خان!“ وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

خان اسے گھورنے لگی تھی۔ مگر وہ ہنستا چلا گیا تھا۔

بلکی بلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔ وہ اوزی کے ساتھ ساحل کے کنارے کھڑی تھی۔ جب لہا لہا

اوزی کو کوئی پرانا دوست مل گیا تھا۔ وہ معذرت کرتا ہوا اس کے سنگ بڑھ گیا تھا۔

انا بیہ شاہ تنہا ساحل کی لہروں کے سنگ کھڑی سمندر کی دستوں کو دیکھنے لگی تھی۔ بوند باندی

پکڑنے لگی۔ وہ بھینگنے لگی تھی۔ اس نے نگاہ اس سمت کی تھی جہاں اوزی گیا تھا۔ وہ اب تک

رخ پھیر کر ساحل پر لہروں کے سنگ کھیلنے بچوں کو بہ غور دیکھنے لگی تھی۔

برستی ہوئی بوندیں اسے بھگونے لگی تھیں۔ مگر تب اچانک ہی کسی نے اس پر چھتری کا سایہ

کسی کی موجودگی کے احساس نے اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عفتان علی خان

ڈھال بنا کھڑا تھا۔

”وہ چونک گئی تھی۔ آواز میں حیرت بہت نمایاں تھی۔“

”میں ہاں تنہا کھڑی کیا کر رہی ہو؟“ وہ اس کے مقابل آن کھڑا ہوا تھا۔

”میں تنہا نہیں ہوں۔ اوزی بھی ہے۔ اس کا کوئی فرینڈ مل گیا تھا، وہ اس کے ساتھ گیا ہے۔ آپ کو کیا

پتہ ہے کہ ہم یہاں آنے والے ہیں؟“ وہ مسکراتی ہوئی بولی تھی۔

”ہاں، مگر شاید اسے دل سے دل کورا ہونا کہتے ہیں۔ ویسے کیا تم ایسا نہیں سمجھتیں؟“

”ہاں، شاہ سرنئی میں ہلانے لگی تھی۔“

”ہاں، میرا تجربہ تو کبھی کا تجربہ بالکل مختلف ہے۔“

”ہاں، میرا تجربہ تو کبھی کا تجربہ بالکل مختلف ہے۔“ عفتان علی خان مسکرایا تھا۔ وہ جواب اس کی سمت

دیا تھا، پھر بہت دبیسی سے مسکرا دی تھی۔

”آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔ تنہا کیوں ہیں؟۔۔۔ اس موسم میں تو لامعہ کو آپ کے ساتھ ہونا چاہئے

عفتان علی خان نے اس کے سوال پر اس کی سمت دیکھا تھا پھر شانے اچکا دیئے تھے۔ انداز کسی قدر

ہلکا تھا۔

”تمہیں یقیناً حیرت ہوئی ہوگی اوزی کے اور میرے تعلق پر۔“ وہ جیسے بات جاری رکھنے کو بولا تھا۔

”ہاں، اس کی سمت دیکھا تھا پھر سرنئی میں ہلا دیا تھا۔“

”کچھ خاص نہیں۔“ انداز سرسری تھا اور عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”اوزی تمہیں بہت اچھی طرح سے جانتا ہے۔“

”آپ کو کس طرح پتہ چلا؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”ذکر کر رہا تھا۔۔۔ یوں ہی باتوں میں اکثر وہ تمہارا ذکر کر دیتا ہے۔“

عفتان علی خان! اچھے اور پرانے دوستوں کی یہی خصوصیت ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے اچھی

آوازوں ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کا ذکر برملا کرتے ہیں۔ ”شاید وہ باور کرا رہی تھی۔ عفتان علی

خان مسکرا دیا تھا۔“

”بلیڈ۔“ اس کا انداز کسی قدر بے تاثر تھا۔

”کیوں۔۔۔ آپ کو کبھی اندازہ نہیں ہوا؟“ انا بیہ شاہ نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے دریافت کیا

عفتان علی خان نے چند ثانیوں تک خاموشی سے دیکھا تھا۔ پھر سرنئی میں ہلا دیا تھا۔

”ہاں، وہ مسکرا دیا تھا۔ انا بیہ شاہ اسے حیرت سے دیکھتی ہوئی شانے اچکا گئی تھی۔ پھر نگاہ پھیر کر

عفتان علی خان کی طرف دیکھی۔ عفتان علی خان اسی طرح اس پر چھتری تانے کھڑا تھا جب وہ احساس

کرتی تھی اور اس کی سمت دیکھا تھا۔

”آپ بلینڈ، میری نگر نہ کریں۔ مجھے بارشوں میں بھگنے سے ڈر قطعاً نہیں لگتا۔ اوزی کو بہت شوق ہو

تا ہے اسے بھی بارشیں بہت پسند ہیں۔ ایک بوند بھی گری تو وہ کمرے میں یا گھر کے اندر دبک کر نہیں

”کیا ہوا؟“ کچھ پتہ چلا؟“ گی نے شستہ انگریزی میں سردار سبکتگین حیدر لغاری سے دریافت کیا
 نے سرتی میں ہلا دیا تھا۔ چہرے پر عجب طرح کا ایک کھنچاؤ تھا۔ پیشانی کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ گی
 اس سے زیادہ پریشان شاید پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”ہو سکتا ہے وہ کسی ضروری کام سے کہیں چلی گئی ہو۔“ گی نے اسے تسلی دینا چاہی تھی۔ مگر سردار
 حیدر لغاری جب بھی کچھ نہیں بولا تھا۔ بہت خاموشی کے ساتھ جیب سے سیل فون نکالا تھا اور کوئی نمبر
 کرنے لگا تھا۔

”گین! انڈر اسٹینڈ۔ وہ بچی نہیں ہے۔ اور پھر تم بتا رہے تھے نا وہ یہاں پہلے بھی آتی رہی ہے۔ تب تو
 وہ یہاں کے راستوں اور مقامات سے واقف ہو گی۔“ گی اس کا حوصلہ بندھانا چاہتی تھی مگر وہ سوائے
 خاموش نگاہ اس پر ڈالنے کے کچھ نہیں بولا تھا۔ اس کا ڈائلڈ نمبر سپانس ہو گیا تھا۔

دوسری طرف زوباریہ تھی۔
 ”ہلو، جی میں سردار سبکتگین حیدر۔ کیا میرب اس طرف پہنچ گئی ہے؟“ بہت شائستگی سے دریافت کیا تھا۔
 زوباریہ کی قدر حیران ہوئی تھی۔

”نہیں، ابھی نہیں۔ کب نکلی تھی وہ یہاں آنے کے لئے؟“
 ”جی توڑی دیر قبل۔ اپنی وے، ڈونٹ وری۔ شاید وہ راستے میں کہیں رک گئی ہو۔“

”ہاں۔ مگر تم اتنا کیوں پریشان ہو رہے ہو؟ وہ بچی نہیں ہے۔ پھر یہاں کے راستے اور مقامات بھی
 کے لئے نہیں ہے۔ وہ طویل عرصہ یہاں گزار چکی ہے۔ اس کی اسکوٹنگ یہیں ہوئی تھی۔ تم فکر
 نہ کرو۔ شاید کوئی پرانے دوست مل گئے ہوں گے۔ انہی کے ساتھ رک گئی ہو گی۔“ زوباریہ نے اسے
 بھر کرنا چاہا تھا۔ وہ یقیناً اس معاملے کو بہت سرسری لے رہی تھیں۔ مگر سبکتگین حیدر لغاری جانتا تھا یہ
 لباس قدر سرسری تھا نہیں۔

”جی شائد، بہر حال جیسے ہی وہ وہاں پہنچے، پلیز آپ میری اس سے بات کروادیتجئے گا۔“
 ”اوکے۔ مگر ڈونٹ وری، ہاں۔“ زوباریہ مسکرائی تھی۔
 ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ بس آپ میری اس سے بات کروادیتجئے گا۔ مجھے مائی نااں کا ایک ضروری
 اے دینا ہے۔“

”اوکے۔“ زوباریہ نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔
 سردار سبکتگین حیدر لغاری کے چہرے کی رگیں اور بھی تن گئی تھیں۔ یقیناً اس کی پریشانی مزید بڑھ گئی
 نہ۔ وہ وہاں بھی نہیں گئی تھی تو پھر کہاں گئی تھی؟

وہ یقیناً پریشان تھا اور اسے ہونا بھی چاہئے تھا۔ اس نے ہاتھ میں تمباہوا سیل فون دیوار پر دے مارا
 لہذا شاید اس سے زیادہ غصہ اسے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ میرب سیال بے حد پچھتا رہتی تھی اپنی طبیعت میں
 اسے کبھی بات ہمیشہ خائف رکھتی تھی۔

بیٹھ سکتا۔“ وہ مسکراتی ہوئی مطلع کر رہی تھی اور اس گھڑی بارش میں اور بھی شدت آگئی تھی۔ وہ خود
 تھا مگر انا بیہ پر مسلسل چھتری تانے ہوئے تھا۔

”آپ دوستوں میں کیا یہ بات کامن ہے؟“ وہ دلچسپی سے اس کی جانب دیکھنے لگا تھا۔
 ”نہیں، بالکل نہیں۔ مجھے بارش کچھ زیادہ اچھی نہیں لگتی۔ مگر اوزی تو دیوانہ ہے۔ وہ مسکرائی ہوا
 کی سمت دیکھ رہی تھی۔ جب یکدم ایک لہر نے اس کے قدم ہلا دیئے تھے۔ وہ لڑکھرائی تھی اور اس
 قبل کہ گرتی، عفتنان علی خان نے بہت سرعت کے ساتھ اسے تھام لیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی
 دو لہروں پر جاگری تھی۔

انابیہ شاہ کو ایک لمحے میں جیسے کچھ سمجھ نہ آیا تھا۔ حواس لہو بھر کو جیسے مفلوج ہو گئے تھے۔ بس ایک
 ایک احساس سا سارے وجود کو چھوڑ گیا تھا۔ ایک لمس نے جیسے سارے وجود میں ایک ہلچل مچا دی
 وہ تنبھلی تھی۔ بنا اس کی سمت دیکھے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کر لیا تھا۔ پھر سنبھل کر کھڑے ہوئے
 دو لہروں پر نگاہ کی تھی۔

”وہ آپ کی چھتری۔“
 عفتنان علی خان نے ایک نگاہ لہروں پر بہتی ہوئی چھتری کو دیکھا تھا، پھر انابیہ شاہ کی سمت نگاہ کی
 ”تم چاہتی ہو میں وہ چھتری لینے جاؤں؟“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور اس
 مسکرا دی تھی۔

”آپ ہر بات میں میری رائے جاننے کے لئے کیوں بضد ہوتے ہیں؟ چھتری آپ کی ہے
 بھی آپ کی ہونی چاہئے۔“ وہ بے نیازی سے شانے اچکاتی ہوئی بولی تھی۔ انداز لاطعلق سا تھا۔
 عفتنان علی خان نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ بہ غور ایک نگاہ۔ اور پھر یکدم ہی لہروں کی سمت
 تھا۔ انداز میں ایک جنوں خیزی تھی، اشتعال تھا اور انابیہ شاہ اس کی سمت دیکھتی رہ گئی تھی۔ عفتنان
 کے قدم شوریدہ سر لہروں کی سمت بڑھ رہے تھے اور چھتری مزید آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

عفتنان علی خان یقیناً خطرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ انابیہ شاہ کے اندر یکدم ہی خوف سرایت
 تھا۔ وہ بے حد پریشانی کے ساتھ اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ تیز بارش کے باعث سمندر کی لٹپٹائی
 بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ لہریں اور بھی شوریدہ سر ہو رہی تھیں۔

”عفتنان علی خان!“ اس نے آواز دے کر اسے آگے جانے سے باز رکھنا چاہا تھا مگر اس نے
 ان سنی کر دی تھی۔

”عفتنان!“ وہ چیختی تھی مگر وہ نہیں رکا تھا۔ کتنی شوریدہ سر لہریں تھیں۔ عفتنان علی خان جتنا آگے
 تھا وہ مزید اس سے دور جا رہی تھی۔ وہ اس سے کتنی دور جا چکا تھا۔ تیز لہروں کا شور تھا۔

”عفتنان!“ وہ چیختی تھی۔ ایک بڑی لہر اس کی سمت بڑھ رہی تھی۔ مگر اس کی جنوں خیزی پر
 ”عفتنان!“ لہر نے اسے خود میں ضم کر لیا تھا۔ انابیہ شاہ کی پڑوشت آنکھیں اسے ڈھونڈتی
 ”عفتنان! پلیز ہیلپ۔“ وہ چیختی چلی گئی تھی۔

وہ اس تعلق سے قبل بھی جانتا تھا کہ ان دونوں کی سوچوں میں زمین آسمان کا فرق ہوگا، ذہن نہیں ملے گا، ذہنی سطح نہیں ملے گی۔ وہ اسے دیکھتے ہی جان گیا تھا، وہ بے حد امپجور ہے۔ وہ بہت کچھ لکھ کرے گی اس سے اور اس کی سوچوں تک کبھی رسائی حاصل نہ کر سکے گی۔

وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔ مگر وہ یہ بات مائی اماں کو نہ سمجھا سکا تھا۔ وہ کچھ سننے کو، ماننے کو نہیں۔ بس اپنی خواہشیں نظر آرہی تھیں انہیں اور وہ اس لمحے ان کی خواہشوں کو کسی طرح بھی روک سکا جوصلہ خود میں نہیں پارہا تھا۔ اس نے خود کو رد کر کے ان کا فیصلہ مان لیا تھا مگر وقت اسے رو نہیں کرنا وہی ہوا تھا جو اس نے اخذ کیا تھا۔ وہ لا ابالی پن کی اتج میں تھی جہاں خوابوں کے شہر بسائے جاتے ہیں خوابوں کے محل بنائے جاتے ہیں۔

وہ خوابوں، خیالوں میں زندگی بسر کرنے والی لڑکی تھی اور وہ حقیقتوں کو کھلی آنکھ سے دیکھنے والا۔ میچور شخص۔

یہی تضاد ان دونوں کے بیچ کے فاصلے سمیٹ نہ سکا تھا اور یقیناً ایسا کبھی ہوتا بھی ناممکن ہی تھا۔ اس تعلق کو اب کسی بوجھ کی طرح اتار کر پھینک بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اس کی سرشت میں نہ تھا۔ وہ چاہتا تو اس کا حسب نسب، خاندانی وقار سے اس بات کی اجازت نہ دیتے۔ سواب یہ تعلق خواہ بوجھ کی طرح سبکدین حیدر لغاری کو اسے ڈھونا ضروری تھا۔ خواہ عمر بھر سہی۔ مگر وہ میرب سیال سے کسی بھی طرح دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا، وہ اس سے بھاگ رہی تھی، رہانی چاہتی تھی۔ مگر وہ چاہتے ہوئے اتنی چھوٹ نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اپنے حقوق کی کوئی جنگ لڑے یا پھر اس سے علیحدگی کے متعلق بھی اور خواہ اسے اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑتا۔ کچھ بھی۔

”گین! پلیز ڈونٹ بی ایموشل۔“ گی نے بہت آہستگی سے اس کے شانے پر اپنا بازو تھام لیا تھا۔ ”گین! یول فائنڈ آؤٹ ہر۔“ اس کے لہجے میں یقین تھا اور جی سردار سبکدین حیدر لغاری کا کھڑا ہوا تھا۔

”کہاں جا رہے ہو تم؟۔۔۔ رکو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“ گی نے پیشکش کی تھی۔ مگر نے تھے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کی سمت دیکھتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اسے کوئی بھی اقدام کرنے سے رکھا تھا۔ سائینڈ ٹیبل پر سے گاڑی کی چابی اٹھائی تھی اور باہر نکل گیا تھا۔

گی نہیں جانتی تھی وہ کہاں گیا ہے۔ مگر وہ دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں حد درجہ وحشت نظر آ رہی تھی۔ وہ یقیناً اس وقت بے حد فشار کے زیر تھا۔ اس کے چہرے کا تناؤ اس کے اندر کی غمازی کر رہا تھا۔ اس کی تپتی رگوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اس لمحے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا ہے۔ کوئی بھی



نیویارک کوئی چھوٹا شہر نہ تھا جہاں وہ اسے آسانی سے ڈھونڈ پاتا۔ اسے سنگ ہوئے تین چار گھنٹے ہو چکے تھے اور سبکدین حیدر لغاری پاگلوں کی طرح گاڑی نیویارک کی ان پر دوڑاتا اسے کھوج رہا تھا جو خود اپنی مرضی سے مسنگ ہوئی تھی۔ کوئی ٹھکانہ علم میں نہ تھا جہاں کے متعلق قیاس ہوتا کہ وہاں جانے کا احتمال ہوگا اور وہاں وہ مل بھی سکتی۔

کہیں وہ واقعی راہ تو نہیں بھٹک گئی؟ ایک لمحے کو اس کے ذہن میں خیال آیا تھا مگر وہ سرے ہی لمحے مانے اسے رد کر دیا تھا۔ یقیناً ایسا نہیں تھا اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کوئی پتی نہ تھی۔ اور پھر اس شہر ماں کے مقامات اور راستوں سے نا آشنا بھی نہیں تھی۔

فیضان جہاں بھی گئی تھی، اپنی مرضی سے گئی تھی اور یہ فرار ارادی تھا۔ اس نے جان بوجھ کر یہ قدم اٹھا پھر بھی اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اس کے گمشدہ ہونے کی رپورٹ کسی پولیس اسٹیشن پر کارڈ تیا۔

کتنے ہی مقامات دیکھنے کے بعد اس نے سوچا تھا۔ اس کی تصویر ہاتھ میں لئے کئی لوگوں سے اس کے زب پوچھا تھا۔

”اس لڑکی کو دیکھا کہیں آپ نے؟“

”نہیں۔“

اب تک وہ کتنے مقامی لوگوں کو روک کر پوچھ چکا تھا مگر فائدہ کچھ نہ ہوا تھا۔ یہاں کی زندگی اتنی تیز تھی کہ لوگوں کو خود اپنی شکل بھی شاید یاد نہ رہتی ہوگی۔ کچا کسی اور کی خبر رکھنا اور خود وخال دیکھنے کے بعد لڑکھانا۔ یقیناً یہ ناممکن ہی تھا۔

اس وقت وہ سینٹرل پارک میں تھا۔ فانی کو لے کر اکثر وہ اس پارک میں آتی رہی تھی۔ اسے گمان تھا کہ فریڈرک میں وہ اسی طرف نکل آئی ہو۔ یقیناً اس ڈیپریشن کے بعد اسے سکون کی تلاش ہوگی۔ شاید اسے فوری طور پر فرار کے بعد اس نے اس طرف کا رخ کیا ہو۔ وہ ذہنی سکون کی مستلاشی ہوگی اور یہ اس چیز کے لئے انتہائی موزوں تھا۔ قدرت نے جتنی خوب صورتی انسان کو بخشی ہے وہ ساری اس سے منال جاتی ہے۔ اس شہر میں بڑے جنگل میں وہ کتنی دیر تک اس کی تصویر ہاتھ میں لئے پاگلوں کی ناسے ڈھونڈتا رہا تھا۔

سبکتگین حیدر لغاری بہت شکستہ سا اٹھا تھا۔ یقیناً اس کی تلاش آسان نہ تھی۔ بنا پولیس کی مدد کرنا ناممکن ہی تھا اور اسے ہر صورت پولیس کی مدد لینا ہی تھی۔ اگر زیادہ وقت گزر جاتا تو یقیناً صورت بھی سنگین ہو سکتی تھی اور وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

روک فیلر سینٹر کے متعلق سوچ کر وہ یکدم چونکا اور پھر گاڑی اسی سمت دوڑا دی۔

یہاں پر سردیوں کے لئے اسکیٹنگ پلیس بنائی جاتی ہے اور گرمیوں میں یہاں پر ریٹائرمنٹ ملتا ہے۔ سردیوں میں یہاں پر کرکس کے موقع پر سب سے بڑا کرکس ٹری بھی لگایا جاتا ہے جسے دیکھنے والے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ مگر فی الحال ایسا نہیں تھا۔ کیونکہ ابھی دسمبر کی آمد میں کچھ کرکس یہاں پر نہ تو اسکیٹنگ کے لئے اہتمام نظر آ رہا تھا اور نہ ہی کسی اور طرح کی کوئی تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ گاڑی روک کر روک فیلر سینٹر کی جانب بڑھنے لگا تھا۔ تبھی اس کی نظر پشت کے بٹھے اس ٹاؤک پر پڑی تھی۔ شاید اس نے اپنا سر گھٹنوں پر دھرا ہوا تھا۔ شاید وہ پُر ملال ہو رہی تھی۔ سبکتگین حیدر لغاری رک کر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اسے دیکھا تھا، پھر کچھ سوچتے ہوئے قدم آگے بڑھا رہا تھا۔ یقیناً یہ صورت حال ایسی نہ تھی کہ اس سے کسی سخت لہجے میں باز پرس کی جاتی یا پھر ڈانٹا جاتا ہے۔ حیدر لغاری میں اتنا سنس تو تھا کہ وہ موقع کی نوعیت کو سمجھ سکتا تھا۔ اپنا سارا غصہ، اکٹھا ہٹ، ساری دماغی طاقت اس نے ایک گہری سانس کے لئے کر رف کی تھی اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ مگر وہ اسی طرح گھٹنوں پر سر دئے بیٹھی رہی تھی۔ نہ چونکی تھی نہ سر اٹھایا تھا نہ اس کی طرف دیکھا تھا۔

سبکتگین حیدر لغاری نے اس کی سمت بہ غور دیکھا تھا۔ پھر بہت ہولت سے جبکہ گھٹنوں کے کنارے کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ نظریں بہ غور اس چہرے پر تھیں۔ اسی طرح توجہ سے دیکھتے ہوئے بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھرا تھا۔ میرب سیال یکدم چونک گئی تھی۔ بے حد حیرت سے بیگی پلکوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ تاثر آنکھوں سے کچھ واضح نہ تھا مگر اس لمحے وہ بہ غور اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

کیسے آگیا تھا وہ یہاں؟ کیسے خبر ہو گئی تھی اسے اس کی؟ میرب سیال ایک نظر اس سمت دیکھنے کے بعد نگاہ پھیر گئی تھی۔

”کوئی ایسے بھی کرتا ہے؟“ سبکتگین حیدر لغاری نے مدھم لہجے میں دریافت کیا تھا۔ نظریں بہ غور اس کے چہرے پر تھیں۔ ”اگر آتا تھا تو کم از کم بتا ہی دیا ہوتا۔ جانتی ہو میں کس قدر پریشان ہو گیا تھا؟“

کہاں نہیں ڈھونڈا تمہیں اور تم.....“ بے حد دھیمے لہجے میں کچھ دیر قبل والا کوئی تاثر نہ تھا۔ نہ وہ کہہ نہ ہی وہ تباؤ۔ شاید وہ خود پر قیاب پانے کے سارے گزر جانتا تھا۔ خود پر اس کا اختیار واقعی تو ہی تھا اور نہ خود کو سنبھالنا اور موقع کے مطابق ڈھالنا ناممکن ہی تھا۔ یقیناً وہ خود پر اختیار رکھتا تھا۔ تبھی اس لمحے چہرے پر ملاحت لے لے اس کی طرف متوجہ تھا۔

میرب نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت غصے میں ہوگا۔ اس کے وہاں سے وہ یہ سمجھ رہا ہوگا کہ وہ فرار ہو گئی ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ چند لمحے اپنے ساتھ پانا چاہتی تھی۔

”میں خود سے ملنا چاہتی تھی اور بس۔ مگر اس کی سوچ کے مطابق کچھ نہ ہوا تھا۔ اس شخص کے چہرے پر اتنا تباؤ نہ تھا۔ کوئی تباؤ نہ تھا۔ ہاں، تھا تو صرف ٹھہراؤ تھا۔“

”میرب! شاید میں نے واقعی کچھ برا کیا ہے جو شاید مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مگر تم خود سوچو، کوئی اتنی غصے سے بدل سکتا ہے؟ ایک عرصہ میں نے ان فضاؤں میں گزارا ہے۔ میں جانتا ہوں تم بطور ہم سفر بہت ہی کوئی دیکھنا چاہتی ہو مجھ میں۔ اس طرح میں بھی تم میں بہت سے پہلو تلاشتا ہوں۔ دراصل شاید ہم دونوں ہی ابھی تک ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پارے ہیں۔ مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں میرب! کہ ہم فوری طور پر کوئی بھی فیصلہ لے لیں۔ تم سمجھ رہی ہونا میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟ یقیناً یہ عرصہ کافی نہیں ہے جو ہم سنا ایک دوسرے کے سنگ گزارا۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے کبھی کبھی ایک عمر بھی ناکافی ہوتی ہے۔ یہ

”سورہ! میں نے تمہیں پریشان کیا۔“ فقط ایک جملہ، ایک مدھم سرگوشی جیسے اس سب کا ازالہ کر گئی تھی۔ میرب سیال کی آنکھوں سے بہت آہستگی سے نمٹنیں پانی کے قطرے ٹوٹ کر گرے تھے۔

”میں نہیں چاہتا تمہیں کوئی تکلیف پہنچے۔ مگر دانستہ یا نادانستہ ایسا ہو جاتا ہے۔ دراصل میرب! یہ سب ارادہ نہیں ہے، میں خود جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں تمہارا دل بہت نرم ہے اور میں اسے تکلیف پہنچانا ہرگز نہیں چاہتا۔ تمہیں دکھ دینا یا دکھی کرنا ہرگز بھی میری مشائشا نہیں ہوتی۔ اتنی اچھی لڑکی کا دل کون دکھانا چاہے گا۔ تم سمجھتی ہو، اتنا بے حس ہوں میں؟۔ اتنا سنگدل؟“

میرب بہت خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

تو فقط کچھ عرصہ تھا۔ اگر ہم ایک دوسرے کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں تو ضروری تو نہیں کہ فوری طور پر فیصلہ لے لیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے میرب! خامیوں یا خوبیوں کی میعاد کبھی بھی کل وقتی نہیں ہوتی۔ تبدیلیوں سے متعلق ایک پروسس ہے جس میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ تم اگر مجھے اپنے ذہن سے دیکھنا چاہتی ہو یا میں تمہیں اپنی سوچ کے مطابق دیکھنا چاہتا ہوں تو اس کے لئے ہم دونوں کو کسی وقت ایک دوسرے کو دینا ہوگا۔ راتوں رات ایسے انقلابات نہیں آتے میرب! سوچو، میں کیوں اپنا زندگی اٹھا کر فقط تمہارے لئے تبدیل کر دوں گا؟ یا پھر تم کیوں اپنا سب کچھ فقط میرے لئے بدل دو گے؟ میں سے کسی کے لئے بھی اپنا آپ بدل دینا آسان نہیں ہوتا میرب! ایسا کرنے کے لئے اسباب ملتے ہوتے ہی۔ سب سے بڑھ کر وقت درکار ہوتا ہے میرب! جو شاید تم نہیں سمجھ رہی ہو۔ بہت مدد ملے گی کہہ رہا تھا وہ اور میرب سیال اس شخص کو بھیگی آنکھوں سے بغور دیکھ رہی تھی۔

”یہ تعلق، یہ عہد بھر کے رشتے، کوئی پل بھر کی بات نہیں ہوتی۔ انہیں سمجھنے کے لئے اور استوار کرنے کے لئے صدیاں لگ جاتی ہیں اور ایسا عموماً آرٹسٹ میر جرز میں ہوتا ہے جہاں فریقین ایک دوسرے کے بارے میں سرے سے واقف نہیں ہوتے۔ وہاں ایسا ہی ہوتا ہے عموماً۔ مگر باہمی انڈر اسٹینڈنگ سے سب کچھ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم میرے لئے اپنا سب کچھ بدل دو۔ نہ ہی میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں تمہارے لئے اپنا سب کچھ بدل دوں گا۔ یقیناً یہ دعویٰ بہت غلط ہوگا۔ لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ شاید ایسا ہو بھی جائے۔ شاید اس لئے کہ ایک طرف طور پر کچھ نہیں ہوتا میرب! یہ تعلق، یہ ربط و ربط ہے۔ ایک ہاتھ دو ایک ہاتھ لو۔ ہم نے کوئی جنونی سی محبت یقیناً نہیں کی تھی کہ تم اپنا سب کچھ میرے لئے بدل دو۔ یا پھر میں خود کو تمہارے مطابق ڈھال لوں۔ ایسا ہو سکتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ گہرا ہو گیا ایسا ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ جس طرح تمہیں مجھ میں کچھ برا لگتا ہے اسی طرح مجھے بھی تمہاری عادات ناپسند ہیں۔ ہو سکتا ہے میں بھی تمہیں اپنی زندگی میں لا کر خوش نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے میں بھی بڑی خوشی نل نہ کر رہا ہوں۔ مگر میں شادی کو بچوں کا کھیل نہیں سمجھتا۔ جو اسے بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں وہ اتنے آگے بڑھانے میں میسر ناکام رہتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ ہم اس معاملے میں ناکام ہوں۔ جس طرح تمہاری کچھ مجبوریاں رہی ہیں اسی طرح میری بھی کچھ مجبوریاں رہی ہوں گی۔ ہم دونوں ٹھیک بھی ہوئے ہیں اپنی جگہ پر اور دونوں غلط بھی۔ مگر ہمیں اس تعلق کو مجبور یوں کے خانے سے نکال کر محبتوں کے خانے میں لانا ہے اور یہ نتیجہ بھی ممکن ہوگا جب تم مجھ سے تعاون کر دو گی اور میں تم سے۔ یہ بات بات پر رونا دہانا کرنا بچوں جیسی باتیں ہیں۔ سمجھ دار بنو۔ شاید اب تک میں بھی تمہارے ساتھ خوش نہیں ہوں مگر میں غصہ ہونا چاہتا ہوں اور یہ اعتراف اس لئے کر رہا ہوں کہ تم بھی اس بات کو سمجھ لو کہ ہم دونوں کو کیا کرنا ہے۔ صاف گوئی سے سارے معاملات پر روشنی ڈال رہا تھا اور میرب سیال خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ غلط تو نہیں کہہ رہا تھا وہ۔ کوئی ریا کاری اس کی آنکھوں میں نہ تھی۔ اس کا لہجہ خالص تھا۔ یقیناً اسی طرح کے مسائل اسے بھی درپیش تھے اور اب تک وہ فقط اپنے حوالے سے سوچ رہی تھی۔ وہ اس نقطے پر سوچ رہی تھی کہ سبکدین حیدر لغاری کی بھی کوئی مجبوری ہو سکتی ہے۔

بش جتنی شدید تھی، لہروں کی طغیانی میں اتنا ہی اضافہ ہو چکا تھا۔ جہاں تھوڑی دیر قبل عفتان علی خان نظر آ رہا تھا۔ اب وہ ان لہروں میں غائب ہو چکا تھا۔

انا بیہ شاہ ساکت نظروں سے اس بڑے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ کتنے لوگ تھے سمندر کے کنارے۔ ٹرکوں کی بھی اس وقت مدد کے لئے ان لہروں کی سمت جانے کو تیار نہ تھا۔ وہ جو اتنا چیختی تھی، چلائی تھی تو سب بے سو رہا تھا۔ اوزی بھی جانے کہاں تھا اور عفتان علی خان۔ اُس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے وہ سمندر کی سمت نگاہ کی تھی۔ کتنی تیزی سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اس شخص کے لئے جس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق خاص بھی نہ تھا۔ وہ شخص جسے وہ ٹھیک سے جانتی بھی نہ تھی۔ جس کے ساتھ اس کا کوئی خاص حوالہ بھی نہ تھا۔ اس کی ڈبڈبائی نظر اٹھی تھی اور وہ ساکت رہ گئی تھی۔ وہ چھتری ہاتھ میں تھامے، لہروں پر تیزی سے تیرتا ہوا کنارے کی طرف آ رہا تھا۔ سب لوگ حیرت زدہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”عفتان!“ اُسے جیسے یقین نہ آیا تھا۔ ڈبڈبائی آنکھوں کو زور سے رگڑا تھا۔ مگر وہ منظر خواب نہ تھا۔ اس لئے کنارے پر پہنچ جانے والا وہ عفتان علی خان ہی تھا۔ وہ ساکت سی اس کی سمت نکلتی گئی تھی۔ وہ لہروں پر چلا ہوا اس کے مقابل آن رکا تھا۔ کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا تھا پھر مسکراتے ہوئے چھتری والا ہاتھ اس کی سمت بڑھا دیا تھا۔

”ڈرگئی تمہیں؟“ یہ غور سکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”شٹ اپ! شٹ اپ عفتان علی خان!“ وہ اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے چیختی تھی مگر وہ مسکرا دیا تھا۔

”ڈرگئی تمہیں تاکہ میں مر جاؤں گا؟“ وہ جیسے محظوظ ہو رہا تھا۔

”آئی سے شٹ اپ۔ زندگی مذاق ہے تمہارے لئے؟“ کیوں کیا تم نے ایسا؟ تمہیں کچھ ہو رہا تو کیا جواب دیتی میں لامعہ کو؟ اور تم.....“ اس کی آنکھیں تیزی سے پھٹتی چلی گئی تھیں۔ ”کیا سمجھتے ہو، زندگی اتنی فضول شے ہے؟“ اس کے ہاتھ میں تھی ہوئی چھتری کو ایک جھٹکے سے تھما تھا۔

”یہ..... فقط یہ..... اسے تھامنے کے لئے تم نے زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ کیا سمجھاتے نے خود کو اور کوئی بیروہ جو ایسے انوکھے کام کر کے کسی بھی لڑکی کو امیر لیس کر لو گے؟ وہ داد دیتے ہوئے تمہیں کسی کا کیا معرکہ سر کیا ہے تم نے۔ مگر سن لو، انا بیہ شاہ امی لڑکی نہیں ہے۔ یہ، اسے تھامنے کے لئے تم ان لوہوں سے لڑنے گئے تھے نا؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑی چھتری کی سمت اشارہ کیا تھا اور پھر ایک جھٹکے سے ہاتھ بلند کرتے ہوئے اسے سمندر کی لہروں پر اچھال دیا تھا۔

”تم بیروہ ہونا، تو اب جاؤ، پھر پکڑ لاؤ اسے جا کر۔“ وہ کہہ کر مڑی تھی جب عفتان علی خان مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ انا بیہ شاہ نے بہت چونک کر اسے پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

”تم تو ہو گی نہیں، پھر کیا فائدہ؟ امیر پس تو مجھے تمہیں کرنا ہے نا۔ اور تم ہی چلی جاؤ گی تو پھر یہ بڑا فائدہ۔“ وہ بات کو جیسے مذاق میں اڑاتا چاہ رہا تھا۔ مگر انا بیہ شاہ اسے خفگی سے دیکھتی ہوئی چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ نامہ حق تم جیسے بندے کے ساتھ گزارا کیسے کرے گی؟ تم تو وہ میں نہ آنے والے ہو۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ابھی تھوڑی دیر قبل جو کیا، وہ سوائے پانگل پن کے اور کچھ تھا۔“ وہ تھک کر جیسے چپ ہو گئی تھی۔ مگر عفتان علی خان مسکراتا ہوا بہ غور اسے تکتا رہا تھا۔

”تم نے خود ہی تو کہا تھا، جاؤ پکڑ لاؤ۔“

”تم غلط بیانی کر رہے ہو۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔“

”مگر تم مجھے چیخ چیخ کر پکار تو رہی تھیں نا۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”میں چاہتی تھی تم فتح جاؤ۔“ وہ کہتی ہوئی دھیان پھیر گئی تھی۔

”اور اگر میں پھر بھی نہیں بچتا تو؟“ وہ جیسے محظوظ ہوا تھا مگر وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ تبھی عفتان علی خان اس کے چہرے کو دلچسپی سے تکتا ہوا مسکرایا تھا۔

”اچھا بتاؤ، اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو تم کیا کرتیں؟“

”میں اتنی بے حس نہیں ہوں کہ کسی کے مرنے پر خوشی مناؤں۔“ وہ اسی انداز سے بول کر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”تو پھر کیا دیکھنا تمہیں؟“ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

”تم جانتے ہو یہ لہریں، یہ سمندر روز کتنے لوگوں کو نگل جاتا ہے۔ مذاق ہے یہ سب تمہارے لئے اگر تمہیں واقعی کچھ ہو جاتا تو؟ کیا پروف کرنا چاہتے تھے تم، بہت گڈ سوکر ہو تم؟ اور خدا بخیر! ایسا نہ ہو پاتا تو؟ تم سنجیدہ نہیں تھے، مذاق کر رہے تھے مگر یہ بات یہ سمندر نہیں جانتا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی۔“

”مگر ہوا تو نہیں نا۔“ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر تسلی دیتا ہوا مسکرایا تھا۔ ”اور رہی اس سمندر کی بات تو یہ بات بھی جانتا ہے جو کوئی اور نہیں جانتا۔ اس پر میری دیوانگی کے راز منکشف ہیں۔ تبھی تو واپس باہر اچھال دیا۔“ مسکراتا ہوا اسے مطمئن کرنے کو وہ بولا تھا مگر وہ چلتی ہوئی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔

عفتان علی خان بارش میں کھڑا بھینگتا ہوا اس دور جاتی لڑکی کو دیکھتا رہا تھا۔

”اب لوگ ہال کمرے میں بیٹھے تھے جب اذہان حسن بخاری اندر داخل ہوا تھا۔

”آ جاہیرے یارا بڑی دیر کر دی۔ کہاں تھا تو؟“ عزیر اسے دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ وہ ساہیہ خان کو سب کے درمیان مرکز نگاہ بنا دیکھ کر کسی قدر حیران ہوا تھا۔ اس

ہاتھ میں اس وقت ٹیرو کارڈز تھے اور وہ حسب عادت کوئی سنسنی پھیلانے بیٹھی تھی۔ تمام بنگ پارٹی

کامات ہی بیٹھی تھی۔

”ٹیرو کارڈز بھائی۔ سب کو اپنے احوال جاننے کی فکر ستا رہی ہے۔“ عزیر مسکرایا تھا۔

”اور تم مجھے تو یہ ٹھیک ہو گا؟“ وہ کسی قدر حیرت سے مسکرایا تھا۔ ساہیہ خان کی نگاہ اس پر تھی اور وہ

گڑی اسے یہ غور دیکھ رہی تھی۔

”تم یقین نہیں کرتے؟“ وہ کسی قدر حیران ہوئی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اس کی طرف دیکھا تھا

بلائی بے نیازی سے شانے اچکا دیئے تھے۔

”ہاں۔ میں یقین نہیں کرتا۔ بس ایک فن ہے اور بس۔“

”اور تم سے یہ کب کہہ رہے ہیں اس پر یقین کرو۔“ ساہیہ خان وہی شرارت آنکھوں میں لئے

پنظری انداز میں مسکرا رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں، تم مجھ سے ایسی کوئی فرمائش نہیں کرو گی۔“

”تمہارا پشپن رونگ بھی تو ہو سکتا ہے۔“ ساہیہ خان مسکرائی تھی اور اذہان حسن بخاری اسے بہ غور

نہنے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”یعنی تم مجھ سے کوئی ایسی فرمائش کرنے والی ہو؟“

”تمہیں کیا لگتا ہے اذہان حسن بخاری؟“ وہ مسکرائی تھی۔

اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔ پھر شہادت کی انگلی سینے پر رکھی تھی۔

”مجھے لگتا ہے ساہیہ! میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔“

”یعنی تم اس سے زیادہ بے وقوف ہو۔“ ساہیہ خان نے برجستہ کہا تھا اور سب ہنسنے لگے تھے۔

”تم ساہیہ سے نہیں جیت سکتے۔ مان لو یارا!“ عزیر نے اپنی نیک سی بھر پور سائیڈلی تھی۔

”جہاں مان لے وہ اذہان حسن بخاری نہیں۔“ وہ بہ غور دلچسپی سے اس چہرے کو تکتا ہوا مسکرا رہا تھا۔

”اسنے دعوے مت کرو اذہان حسن بخاری! کہ بعد میں شرمندہ ہوتا پڑے۔“ وہ مسکرا رہی تھی اور وہ

نہایت تھا۔

”ساہیہ خان! تمہارے آگے گھٹنے ٹیکنے سے بہتر ہے میں خودکشی کر لوں۔“

”اسنے سنجیدہ نہ ہو، کھیل لو، گیم ہی تو ہے۔“ عزیر نے شانہ تھپتھپایا تھا۔

مگر بہت خطرناک کھیل ہے یہ۔ اور اذہان حسن بخاری خطرات جان بوجھ کر مول نہیں لیتا۔ انجانے

بھیدوں پر پردہ پڑا ہے تو بہتر ہے۔ کھل جائے تو سب بے وقعت ہو جاتا ہے۔ میں ان باتوں کو سمجھتا۔“

”بے وقوفی نہ کر اذہان! چلو سلیکٹ کرو اپنے کارڈز۔“ ساہیہ نے اس کے سامنے کارڈز تھے۔

”اتنے شوٹے چھوڑنے کی عادت بدلی نہیں تمہاری۔ تم کبھی نہیں بدلو گی۔“ اذہان حسن بظان مسکراتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ ”لیکن سنو، کوئی فضول بات مت کرنا۔“ وارننگ دی تھی۔

”چٹ پٹی باتیں سننے کی بڑی عادت ہے تمہاری۔“

”تم نے عادی بنا دیا ہے۔“ اذہان حسن بخاری بہ غور نکلتا ہوا بڑی برجستگی سے کہتا ہوا مسکرا رہا تھا۔

”سارے الزام ایک طرف، فی الحال کارڈز چوز کرو۔“ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے حکم جاری کیا۔

”کچھ آتا داتا کبھی ہے یا فقط بے وقوف بنا رہی ہو؟“ اذہان حسن بخاری نے دریافت کیا تھا۔

نکال کر اس کے سامنے دھر دیئے تھے۔ ساہیہ خان بنا اس کی بات کا کوئی جواب دیئے بہ غور ٹیو کا دیکھنے لگی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اتنی کھو کیوں گئیں تم؟“ وہ اس کی سمت دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔ ساہیہ خان اسے ہوئی مسکرا دی تھی۔

”بڑے چھپے رستم ہوتم۔ یہ عشق و شوق کے چکر میں کب سے پڑ گئے؟“

اذہان حسن بخاری کا ہتھ بے حد بے ساختہ تھا۔

”ایسا اس میں درج ہے۔“

”کیوں، یہ جھوٹ ہے؟“ ساہیہ خان بہت یقین سے اس کی سمت دیکھتی ہوئی مسکرائی تھی۔ اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا۔

”پلیز، کیری آن، انٹرسٹنگ۔ اب واقعی مجھے مزہ آرہا ہے۔ ہاں، تو میں مجنوں بن چکا ہوں۔ جلدی سے میری لیلیٰ کا چہرہ دیکھ کر خدو خال بھی بتا دو۔ یہ تو پتہ چل جائے کہ وہ مجھ جیسے ڈسٹنگ بندے ساتھ سوٹ بھی کرے گی یا کہ نہیں۔“

”اٹس ناٹ جوک اذہان حسن بخاری! ویری بیڈ۔“ عزیز نے اسے باز رکھا تھا کیونکہ وہ ساہیہ کا ہوا چہرہ دیکھ چکا تھا۔ اذہان مسکرایا تھا۔

”چلو بتاؤ شاباش! میں سننے کے لئے بہت بے قرار ہوں۔ کم از کم یہی بتا دو کہ آج کے دن تمہارا کوئی ڈیٹ ویٹ ہے کہ نہیں اس کے ساتھ؟“ آنکھوں میں شرارت لئے وہ مسکراتا ہوا ساہیہ خان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ساہیہ خان اس کی سمت دیکھتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”کتنا شوق ہے نا جاننے کا اور ابھی تھوڑی دیر قبل کہہ رہے تھے، آئی ڈونٹ بیلو ویٹ۔“ اذہان کی نقل اتاری تھی۔ سب ہنسنے لگے تھے۔ اذہان حسن بخاری بہ غور دلچسپی سے نکلتا ہوا مسکرایا تھا۔

”مجھے نہیں پتہ تھا یہ سلسلہ اتنا انٹرسٹنگ ہوگا۔ ہائی دی وے، یہ ٹیو کارڈ پڑھنا سیکھا کہاں؟“

”کنیڈا میں ہماری نمبر تھیں، ایک آئی۔ انٹی سے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”تم مجھے سکھا دو گی؟“ وہ شرارت سے اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

ساہیہ خان مسکرا دی تھی پھر کارڈز کی سمت دیکھتے ہوئے اسے بتانے لگی تھی۔

”آج کی شام اچھی گزرے گی۔ اسی خاص ہستی کے ساتھ گزرے گی اور تمہارے دل کو بہت راحت پہنچے گی۔“

”مسالہ کچھ کم ہے۔ پلیز کچھ اور بڑھاؤ نا۔“ وہ درخواست کرتا ہوا مسکرایا تھا۔ سب ہنسنے لگے تھے۔

”تم سنجیدہ نہیں ہو گے تو میں قطعاً نہیں بتاؤں گی۔“

”بتاؤ گی نہیں تو میں یہ نیب کی باتیں کیسے جان پاؤں گا؟“ اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا۔ ”اچھا چلو، آگے بڑھاؤ بات۔ مزید کیا ہے ان ٹیو کارڈز میں؟“

ساہیہ خان مسکرا دی تھی۔

”جتنے اچھے برنس مین ہو، اتنے اچھے اور قطعاً نہیں ہو۔ کاروباری طور پر تو آج یقیناً تم نے بہت بڑی ذیل سائن کر کے اپنی کامیابی کو یقینی بنا دیا ہے۔ مگر ان دوسرے قسم کے معاملات میں تم قطعاً نا تجربہ کار واقع ہو گے۔“

”یعنی؟“ اذہان حسن بخاری چونکا تھا۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ یقیناً وہ بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

”یعنی وہ موصوفہ آج تمہیں بالکل بھی گھاس نہیں ڈالیں گی۔“ ساہیہ کا انداز پُر افسوس تھا۔

”چل بھی، حیرتی نیا تو ڈوبی سمجھ۔“ عزیز نے مسکراتے ہوئے بھرپور ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔

”یعنی تو نہیں لگنے والا پار۔ پہلا عشق اور وہ بھی اتنا نا کام۔“ ایک اور کزن نے مزید ہمدردی کی تھی۔

تیسری اذہان حسن بخاری نے ساہیہ خان کی سمت دلچسپی سے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

”اس معاملے میں کامیاب کیسے ہوا جاسکتا ہے، یہ نہیں لکھا تمہارے ان ٹیو کارڈز میں؟“

”مذاق اڑا رہے ہو اذہان حسن بخاری؟“ ساہیہ خان نے تنگی سے دیکھا تھا۔

”تم نے تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیئے۔ اب میں کیا مذاق بھی نہیں کر سکتا؟“ بے حد برجستگی سے وہ بولا تھا اور سب ہنسنے چلے گئے تھے۔

”کی بھی قسم کی پیش قدمی کرنے سے اجتناب برتنا۔ ورنہ بات بگڑ سکتی ہے۔“ ساہیہ نے ہدایت نامہ جاری کیا تھا۔ وہ سعادت مندی سے گردن ہلانے لگا تھا۔

”یعنی میں کچھ بھی کر لوں، عشق میں نا کام ہونا طے ہے۔“ پُر افسوس انداز میں کہتے ہوئے ساہیہ خان کو دیکھا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”یہ صرف آج کے دن کے لئے تھا۔“ اس کا حوصلہ بندھایا تھا۔

”انٹرسٹنگ۔ یعنی کل کی باتیں جاننے کے لئے پھر تم سے رجوع کرنا پڑے گا۔“ اذہان حسن بخاری

مسکرایا تھا۔ ”ویسے اس سے قبل تو تم نے مجھے نہیں بتایا کہ تمہیں کوئی اس طرح کا علم بھی آتا ہے۔“

”ابھی تم نے ساہیہ خان کو جانا ہی کتنا ہے اذہان حسن بخاری!“

”تمہیں پانے کے لئے کیا روز روز تم سے ٹیر کارڈز پڑھوانا ضروری ہے؟“ وہ اب بھی سنجیدہ نظر

”سٹ اپ اذہان!“ وہ ڈپٹے لگی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے بھی؟“ تبھی اندرا کی نے رضی داخل ہوئی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے نگاہ اٹھا کر

کی سمت دیکھا تھا پھر مسکرایا تھا۔

”آجائے اگینے! بہت انٹرسٹنگ کارڈز پڑھتی ہے اپنی ساہیہ۔ غیب کی باتوں سے کمال کی واقف ہے اس کی۔“

”نہیں بھی، مجھے تو معاف ہی رکھو۔ یہ بچوں کے کام بچوں کو ہی اچھے لگتے ہیں۔“ اگینے مسکرائی تھی۔

”یعنی آپ بھی میری طرح ان باتوں پر بیلو نہیں کرتیں اگینے؟“ اذہان حسن بخاری بہ غور دیکھتا ہوا

تھا۔

”بالکل نہیں۔“ اگینے نے مسکراتے ہوئے شانے بے نیازی سے اچکائے تھے۔ ”اپنی دوسری عزیبت

سج کے انتظامات کے لئے بڑے بھائی سے مل لو۔“

”جی ہاں۔“ عزیز فوراً اٹھ گیا تھا۔

اگینے نے ان سب کی طرف دیکھا تھا پھر ملائمت سے مسکرائی تھی۔

”تم سب اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟ شادی والا گھر ہے۔ کوئی ہلا گلا کرو بھی۔ اور ساہیہ! یہ تم کیا

ٹیر کارڈز کے ذریعے لوگوں میں سنسنی پھیلا رہی ہو۔“

”یہی بات اگینے! بالکل یہی بات میں نے بھی ساہیہ کو سمجھائی تھی۔“ اذہان حسن بخاری مسکرایا

ساہیہ بھی مسکرائی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے پھپھو! ہم خاصا انجوائے کر رہے ہیں۔ ویسے آپ ہمارے لئے چائے کے ساتھ

کچھ بھجوادیں تو لطف اور بھی دو بالا ہو جائے گا۔“ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور اگینے سر ہلاتی ہوا

باہر نکل گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اگینے کے جانے کے بعد اس کی سمت دیکھا تھا۔

”کتنی فضول لڑکی ہو تم۔ بجائے اگینے کی ہیپل کرنے کے تم اتنا ان سے کام کروا رہی ہو۔“

ساہیہ مسکرائی تھی۔

”پاؤں۔ اذہان! اس زخمی پاؤں کے ساتھ کوئی کام کیسے کر سکتا ہے؟“

”تو کس نے کہا تھا بارش میں بیگ کر پاؤں زخمی کرو۔“

”اب تو یہ ہو گیا نا۔“ وہ مسکرائی تھی۔ آنکھوں میں وہی شرارت تھی۔ چہرے پر وہی شگفتگی۔ اور انداز

اس کی سمت دیکھا ہوا مسکرایا تھا۔

”کبھی نہیں سدھرو گی تم۔“

تھی کبھی تو یہ جتنی بھی ہو، مرہم کتنی بھی ہمدردی کے ساتھ رکھا گیا ہو، زخم نہیں بھرتا۔ وہ سوچ رہی تھی

جاسوچ رہی تھی اتنا ہی مزید الجھ رہی تھی۔ وہ واقعی اس شخص کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر

نا اس حد تک بدل سکتا تھا یا بدل گیا تھا، وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اور اگر یہی اس کا اصل رنگ تھا تو پھر وہ

ناہو اس نے ہیڈل برگ میں کیا تھا؟

اس لمحے وہ پاپا کے سامنے بیٹھا کتنے سعادت مند انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ زوباریہ بھی اس کی قائل ہو

تھی۔

”ہم میرب کی طرف سے یقیناً اب اتنے پریشان یا فکر مند نہیں رہے۔ تم جس طرح میرب کا خیال کر

تے ہو وہ ہمارے لئے بہت تسلی کا باعث ہے۔ سیال صاحب ہمیشہ مشکور رہا کرتے تھے یہ سوچ کر کہ

ہم سرفریا ہو گا۔ اکلوتی بیٹی کے معاملے میں شاید کوئی بھی والد ایسی طرح جذباتی ہو سکتا ہے۔ مگر تم

یقیناً ان تمام خدشوں کو دور کر دیا ہے۔“ زوباریہ کہہ رہی تھی اور میرب سیال، سردار سبکتگین حیدر لغاری

مٹ بے ساختہ دیکھنے لگی تھی۔ وہ بھی اس لمحے اسی کی جانب متوجہ تھا۔ میرب سیال بہت آہستگی سے

بے کارغ پھیر گئی تھی اور فانی کے ساتھ مصروف ہو گئی تھی۔

کبھی کبھی اپنی کمزوریوں کی خبر جنہیں نہیں بھی کرنا چاہتے جب انہیں تک وہ خبر جا پہنچتی ہے تو اچھا نہیں

لگتا۔ وہ بھی نہیں بتانا چاہتی تھی اس شخص کو کہ وہ کتنی کمزور ہے۔ اس کے تمام رشتے، ناتے اسے کتنا کمزور بنا

ہے ہیں۔ ان کی محبت اسے کتنا کمزور کر رہی ہے۔ ہاں یہ محبت ہی تو تھی جس نے اسے اس قدر کمزور کر دیا

کہ وہ اس جیسے ہم سفر کے ساتھ زندگی گزارنے کو تیار ہو گئی تھی۔

دو شخص جس کی سنت میں کوئی ہوش مند لڑکی چند لمحے بھی گزارنا قبول نہ کرتی۔ اس نے جانتے بوجھے

لگرائیں اس کے نام کر دی تھی اور وہ جانتا تھا یہ بات، وہ کس قدر کمزور ہے، کس قدر پسا ہے۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ کچھ پریشان لگ رہی ہو۔“ پاپا نے بہت ملائمت سے پوچھتے ہوئے اس کا ہاتھ

اتھا۔ وہ مسکرائی تھی۔

”نہیں پاپا! میں تو بہت خوش ہوں۔“ نظر خود بہ خود سردار سبکتگین حیدر لغاری کی سمت اٹھ گئی تھی جو اس

نا اس کی سمت بہ غور دیکھ رہا تھا۔

”فوق کیوں نہیں ہو گی۔ اتنا اچھا خیال کرنے والا، چاہنے والا ہم سفر جو ملا ہے۔ جو اس کا خیال ہم

بہی زیادہ رکھ رہا ہے۔“ زوباریہ کافی سرو کرتی ہوئی مسکرائی تھی۔

”اس کے چہرے کی شگفتگی اور تازگی گواہ ہے اس بات کی۔“ زوباریہ نے اسے کپتھا کر مسکراتے

سے اس کے گال کو بہت ہولے سے تھپتھپایا تھا۔ میرب مسکرائی تھی۔ مگر وہ مسکراہٹ بہت بے کیف اور

فانی تھی۔ اور زوباریہ کہہ رہی تھی۔

”تمہارا یورپ کا ٹور یقیناً بہت اچھا رہا ہے۔ چہرہ بہت کھلا کھلا سا لگ رہا ہے۔ یعنی تمہیں سبکتگین کے

تھو جانے کے لئے پرمٹ کر کے یقیناً ہم نے اچھا کیا۔ ورنہ یہاں رہ کر اور اپنے پاپا کے متعلق سوچ

نفا کر جو تمہارا حال تھا وہ دیکھنے کے لائق تھا۔ منہ پر بارہ بج رہے تھے۔“ زوباریہ مسکرائی تھی اور اس کے

لئے ایک مجلسی جسم چہرے پر جانا جیسے فرض ہو گیا تھا۔

اوسے، ایزبوش۔“ اس کی بات کھل ہونے سے قبل ہی سردار بنگلیں حیدر لغاری نے مسکراتے ہوئے ہونے کی مہر شبت کر دی تھی اور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اوسے پاپا! اب اجازت دیجئے۔“ بہت سعادت مندی سے وہ پاپا سے اجازت مانگ رہا تھا۔
”بھی تو تم لوگوں کے جانے میں کچھ دن ہیں نا۔ میں چاہ رہی تھی ہم فیملی پکنک کا کوئی اہتمام کریں۔“
”بے رائے دی تھی۔“
”بے ٹاٹ؟“ وہ مسکرایا تھا۔

”چھا خیال ہے نامیرب؟“ سردار بنگلیں حیدر لغاری اس کی سمت دیکھتے ہوئے اس کی رائے چاہ رہا رہا جہاں چونکی تھی وہیں فوراً اثبات میں سر بھی ہلا دیا تھا۔

”جی..... جی ضرور۔“ انداز کھویا کھویا سا تھا۔ ”جی زو باریہ نے اس کی سمت دیکھا تھا۔
”میرب! بنگلیں کو باہر تک چھوڑ کر آؤ۔“ زو باریہ کے یاد دلانے پر وہ سر اٹھا کر سردار بنگلیں حیدر لغاری کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ بنگلیں آگے بڑھ گیا تھا۔ میرب سیال کو جو برا پیش قدمی کرنی پڑی تھی۔ سردار

بن حیدر لغاری غالباً دانستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میرب اس کے پیچھے چل رہی تھی جب وہ یکدم ہی جانے لگا تھا۔ میرب سیال اور اس کے درمیان کے فاصلے یکدم ہی سمٹ گئے تھے۔ میرب سیال کا سر اس سے جا لگا تھا اور یہ بالکل غیر دانستہ طور پر ہوا تھا۔ یقیناً یہ سردار بنگلیں حیدر لغاری کے اس یکدم بدلنے کے باعث ہوا تھا کہ میرب سیال اپنے اوسان بحال ہی نہ رکھ پائی تھی۔ مگر اس لمحے نہ وہ

رہائی تھی نہ ہی گری تھی۔ کیونکہ ایک مضبوط حصار اسے اپنی پناہ میں لے چکا تھا۔
اس بے تحاشا قربت پر یقیناً حواس بحال رکھنا ناممکن رہا تھا۔ ایک خوشبو کا احساس رگ و پے میں اترتا لگتا۔ میرب سیال کی دھڑکنوں میں یکدم ہی زیر و بم آیا تھا شاید اسی لئے اس نے سر اٹھانے کی

تکلیف نہیں سہیے رکھی تھی۔
سردار بنگلیں حیدر لغاری نے اس کے چہرے کو گردن جھکا کر دیکھتے ہوئے بہت آہستگی سے اس کے

سے پرانی ہوئی بالوں کی لٹوں کو ہٹایا تھا۔ اس لمس کے احساس نے میرب سیال کے اندر ایک پل میں نئی بجائی تھی۔ اس نے ایک پل میں پیچھے سر کنا چاہا تھا مگر ہانہوں کا حصار اس کے گرد مضبوط تھا۔
سب سے نظریں جھکا کے عجب بے بسی سے جیسے خود کو اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ یقیناً کوئی بھی مزاحمت نہ کی۔ سردار بنگلیں حیدر لغاری کے چہرے پر کیا اثر تھا، وہ جان نہ پائی تھی کہ نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی

تڑپ سے تباہ تھی اس میں۔ مگر ایک پُرپیش حصار وہ اپنے ارد گرد بدستور محسوس کر رہی تھی۔ اتنے

میرب بنگلیں کی سانسوں سے اس کا سارا وجود جلنے کو تھا۔
سردار بنگلیں حیدر لغاری نے اس چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے اچانک بہت ہونے سے جھک کر اس کی

پٹائی ہانک مہر شبت کی تھی۔ میرب سیال کی جان اس لمحے اور بھی مشکل میں گھر گئی تھی۔ وہ آنکھیں بہت

لگتی تھی۔ مگر بھی سردار بنگلیں حیدر لغاری کی بھاری آواز اس کی سماعتوں میں پڑی تھی۔
”بہت ڈر لگتا ہے نہیں مجھ سے؟“ جانے کس خیال کے تحت وہ پوچھ رہا تھا۔ میرب سیال نے بہت

سردار بنگلیں حیدر لغاری اس لمحے پاپا کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پاپا غالباً کافی کے لئے اٹھ کر کھڑے
بیٹھنا چاہ رہے تھے جب سردار بنگلیں حیدر لغاری نے بہت توجہ کے ساتھ ان کے شانوں کو پاپا کے
ہاتھوں سے تھام کر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ پھر ان کی پشت پر کٹن رکھتے ہوئے کافی کا کپ ان کے
میں تھمایا تھا۔ اس کا انداز بہت کیمرنگ تھا اور میرب سیال جانے کیوں دیکھتی چلی گئی تھی۔ سردار
حیدر لغاری نے اس لمحے اس کی سمت نگاہ کی تھی اور مسکرایا تھا۔

”پاپا! آپ کی بیٹی خاصی بگڑی ہوئی ہے۔ بہت تنگ کیا اس نے مجھے۔ جب تک بھی وہاں رہنے
نے ناک میں دم کئے رکھا۔ اور محترمہ بات پر روتی تو اس طرح ہیں کہ آبتار بھی کیا ہی پیو
گے۔“ وہ یقیناً خوش گوار موڈ میں فقط چھینڑ رہا تھا۔ دوسرے مہنوں میں پاپا سے اس کی شکایت لگا کر
کا کوئی گہرا رنگ نمایاں کر رہا تھا اور پاپا اور زو باریہ جہاں مسکراتے تھے وہیں وہ اس کی سمت دیکھ
تھی۔

”بیٹا! یہ ایسی ہی حساس ہے۔ تمہیں اس کا بہت خیال رکھنا ہوگا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو عام
کے لئے کوئی معنی بھی نہیں رکھتیں انہیں لے کر پریشان ہونا اس کی عادت ہے۔ پھر مجھ سے تو اس
منٹ بہت زیادہ ہے، تبھی تو ماحول بدلنے کے لئے اسے تمہارے ساتھ بھیج دیا تھا۔ یہاں رہتی تو
تھا یونہی پریشان رہتی۔“ پاپا نے مسکراتے ہوئے سردار بنگلیں حیدر لغاری کے شولڈر پر اپنا ہاتھ دھرا
اس لمحے مسکرا رہا تھا۔ اپنائیت کے کتنے رنگ تھے اس کے چہرے پر اور میرب سیال کس طرح حیران

”بیٹا! ابھی چھوٹی ہے یہ۔ شاید اپنی ذمے داریوں کو اور زندگی کے نشیب و فراز کو اس انداز
سمجھتی جس طرح کہ سمجھنا چاہئے۔ یقیناً ابھی جذباتی ہے۔ فوری طور پر سوچتی ہے اور ایک کرتی۔
عمر کے ساتھ ایک ٹھہراؤ بھی آجائے گا۔ میں چاہتا ہوں آپ اسے انڈر اسٹینڈ کرو۔ آپ کا تعاون
یقیناً اس میں مثبت تبدیلیاں بہت جلد رونما ہوں گی اور وہ اپنی ذمے داریوں کو سمجھنے لگی۔“ پاپا
ملاحمت سے کہہ رہے تھے اور وہ ان کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”پاپا! بچی تھوڑی ہوں میں۔ اور آپ.....“ اس نے سردار بنگلیں حیدر لغاری کی سمت دیکھا
بہت نارمل انداز میں مسکرا دی تھی۔ ”آتے ہی میری شکایتیں لگانا شروع کر دیں۔ میرے می پاپا
خلاف کر کے اپنے حق میں کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ایسا قطعاً نہیں ہوگا۔“ وہ بہت محکمگی سے مسکرایا
پاپا کے چہرے پر اس لمحے کیسی آسودگی پھیل رہی تھی۔ سردار بنگلیں حیدر لغاری بہ غور اس کی سمت
دیکھتا تھا۔

”چلیں؟“ اس کی سمت دیکھتے ہوئے رائے جاننا چاہی تھی۔ میرب سیال نگاہ اٹھا کر اس کی
دیکھنے لگی تھی۔ وہ پوری توجہ سے اس کی جانب متوجہ تھا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں کچھ وقت اپنی فیملی کے ساتھ گزار سکوں؟“ آئی میں، میں
یہاں رہنا چاہتی ہوں جانے سے پہلے۔“

کہہ کیاں بند ہیں، دیواروں کے سینے ٹھنڈے
پہ پھیرے ہوئے دروازوں کے پہرے چپ ہیں
بزرگی ہیں کہ خاموشی کے دھبے جیسے
نزش میں ڈفن ہیں آہیں سارے دن کی
مارے ماحول پہ تالے سے پڑے ہیں چپتے کے
تیزی آواز کی اک بوند جو مل جائے کہیں
آزخی سانسوں پہ ہے رات
یہ بچ جائے گی

عفتان علی خان بیڈ پر چپت لیتا تھا۔ نگاہ چھت پرتھی بظاہر۔ مگر سوچوں سے چپکی ہوئی دو بھگی آنکھیں
کی طرح نہ رہی تھی۔

اس کے لئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ پریشان تھی۔ یہ خیال دل کو بہت تقویت
دے رہا تھا۔ پہلی بار اس کی سمت سے کچھ منکشف ہوا تھا۔ پہلا احساس تھا جو فقط اس کے لئے ظاہر ہوا تھا۔
پہلا راز تھا جو ظاہر ہوا تھا۔ شاید پہلا عقدہ تھا جو کھلا تھا۔ گو بہت واضح نہ تھا مگر کچھ ایسا ہوا ضرور تھا۔ جانے
کیا تھا اس چہرے میں، ان آنکھوں میں کہ وہ کبھی خود کو روک ہی نہ پایا تھا۔ اس نے بار بار سوچا تھا، محبت
کی کہ ہوئی تھی۔ وہ اس کی سمت کیونکر راغب ہوا تھا۔ ایسا کیا خاص تھا اس میں۔ مگر یہ عقدہ کبھی نہ کھلا تھا۔
تھایا اس کا خوب صورت ہونا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا تھا کہ کئی خوب صورت چہرے اس سے قبل بھی نگاہ سے
گزرے تھے۔ مگر دل اس طور دھڑکا نہ تھا۔ شاید محبت کے واقع ہونے کے لئے کسی خاص جواز کی ضرورت
نہیں ہوتی۔

کوئی مخصوص موسم نہیں ہوتا۔

محبت اپنا جواز خود ہے۔ اسے کرنے کے لئے جواز ڈھونڈنے نہیں پڑتے۔ سو دل جب مبتلا ہوا تھا تو وہ
آہ بے بس ہو گیا تھا۔

شاید محبت ایسی ہی بے بس کر دینے والی قوت ہے۔

وہ اسی طرح لیتا اس احساس کے متعلق سوچ رہا تھا جب اوزی کا فون آ گیا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں یار! جسٹ ٹیکنگ ریٹ۔“ وہ بہت دھم سے مسکرایا تھا۔

”سنا ہے، بہت بڑے حادثے سے بچے ہو؟“

”ہاں۔“ عفتان علی خان نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

”یہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینا بند کرو اور اس طرف آ جاؤ۔“ اوزی نے حکم نامہ جاری کیا تھا۔

آہستگی سے سر اٹھایا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری بہ غور اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں میں خوشی
اس کی پناہ میں عجب اک تحفظ کا احساس تھا۔ دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش تھا مگر اس شور میں، اس
پہل میں کوئی خوف کہیں پوشیدہ نہ تھا۔ جس گرفت میں وہ تھی اس میں ڈالہا نہ پین تھا۔ اس لمس سے
قیامت ہی سارے وجود میں تھی۔ مگر شاید کوئی خوف کہیں نہ تھا۔ اس کا جھک کر پیشانی پر کسی قدر
سے مہر ثبت کرنا یقیناً اسے برا نہیں لگا تھا۔ تب ہی اس نے سر بہت ہولے سے لفی میں ہلایا تھا اور
سبکتگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”ڈرنا سا بھی نہیں؟“

”نہیں۔“ میرب سیال نے بہت مدہم لہجے میں کہتے ہوئے نگاہ جھکا لی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری
جانے کیوں مسکرا دیا تھا۔

”خوف بھی نہیں؟“

”نہیں۔“ میرب سیال نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے
انکشاف پر کسی قدر چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔

”اس تبدیلی کی وجہ جان سکتا ہوں؟“ مدہم لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”کیا یہ ضروری ہے؟“ میرب سیال نے بہت آہستگی سے کہا تھا۔

”اوں..... ہوں۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے سر بہت ہولے سے لفی میں ہلایا تھا۔
شاید یہ اچھا لگا ہے۔ بہت آہستگی سے کہا تھا۔

”کیا؟“ میرب سیال نے گردن اٹھائے بغیر مدہم لہجے میں دریافت کیا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری
نے بہت ہولے سے اس کا چہرہ اٹھایا تھا۔

”تمہارا مجھ پر اعتبار کرنا، ٹھیکس اے لاٹ۔“ مدہم لہجے میں کہتے ہوئے اس کے چہرے کو بچھو
تھا۔

”کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“ جانتا چاہا تھا۔

”کیا؟“ میرب سیال کے لئے ان قربتوں کو جھینا جیسے دو بھر ہوا تھا۔ لہجہ مدہم اور آواز کسی قدر
ہوئی تھی۔

”شاید تم نے مجھ پر اعتبار کر لیا ہے۔“ بہت دھم سے وہ مسکرایا تھا۔ مگر میرب سیال نے کوئی
دینے بغیر چہرے کا رخ پھیر لیا تھا۔

”شاید تمہیں مجھ پر اعتبار آنے لگا ہے۔ کسی قدر ہی سہی، مگر یہ تبدیلی خوش آئند ضرور ہے۔
وہی ری لائے۔“ سردار سبکتگین حیدر نے قدرے گردن جھکا کر اس روشن پیشانی پر ایک جلا ہوا
تھا اور پھر بہت آہستگی سے اسے اس خوشبو کے حصار سے رہا کر دیا تھا۔

”گڈ بائے۔“ بہت آہستگی سے ہاتھ ہلاتا ہوا وہ پلٹا تھا۔

میرب سیال نے سر اٹھا کر اسے جاتا ہوا دیکھا تھا پھر یکدم ہی پلٹ کر قدم اندر کی جانب

”کیا کام ہے؟“ عفتان علی خان کا لہجہ بہت تھکا ماندہ سا تھا۔

”اچھا، تو ابھی مجھے تم سے ملنے کے لئے جواز ملنا شروع ہوں گے۔“

”نہیں، آ رہا ہوں۔“ عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اوزی کے سامنے تھا اور وہ اس کی اچھی خاصی خبر لے رہا تھا۔

”مجھے تم سے اس درجہ حماقت کی امید نہیں تھی۔ اگر تمہیں واقعی کچھ ہو جاتا تو؟“ اوزی ڈپٹ رہا تھا۔

”تو تم نے ڈانٹنے کے لئے مجھے یہاں بلایا ہے۔“ عفتان علی خان نے مسکراتے ہوئے اس کی بات

ثالی تھی۔

”یہ کیا کم ہے عفتان علی خان؟“ اوزی حیران ہوا تھا۔ ”تم اکلوتے بیٹے ہو اپنے والدین کے

اکلوتے بھائی ہو۔ تم نے ایک بار بھی سوچا نہیں یہ حماقت کرنے سے قبل؟“

”سوچتا تو شاید کرتا نہیں۔“ عفتان علی خان بہت اطمینان سے مسکرا رہا تھا اور اوزی اسے دیکھ کر

تھا۔

”تمہیں انا بیہ شاہ نے کچھ زیادہ ہی بتا دیا ہے۔ اتنا کچھ خاص ہوا نہیں تھا۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”شٹ اپ عفتان علی خان! تم اس درجہ دیوانے ہو سکتے ہو، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اس سے قبل

نے کبھی تمہیں اس طرح کی حرکتیں کرتے نہیں دیکھا۔“

”اس سے قبل اس طرح کے حالات بھی تو زندگی میں درپیش نہ آئے تھے۔“ عفتان علی خان بہت

سے مسکرا رہا تھا اور اوزی اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”مجھو بن کر تاریخ میں نام لکھوا جائے؟ کیا کرتے، ہاں؟ اگر کچھ ہو جاتا تو؟“ اپنے بار

میں نہیں تو اپنے سے وابستہ لوگوں کے متعلق ہی سوچا ہوتا۔ زندگی اتنی ارزاق شے ہے تمہارے لئے

اوزی کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا مگر عفتان علی خان اسی درجہ اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ انا بیہ شاہ بھی ان لوگوں

کے لئے کافی لے کر آگئی تھی۔ عفتان علی خان نے کپ تھامتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”اپنے کزن کو کیا بتا دیا ہے تم نے؟“ اس کا پارہ نیچے نہیں اتر رہا۔ وہ مسکرایا تھا۔ مگر انا بیہ

نے کوئی تاثر دیے بغیر پلٹ کر دوسرا کپ اوزی کی سمت بڑھا دیا تھا اور پھر اسی خاموشی سے پلٹ کر

نکل گئی تھی۔

عفتان علی خان اس کی پشت کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ اوزی نے گہری سانس خارج کی تھی۔

”عفتان علی خان! تم جیسے ٹول بندے سے میں اتنی انتہا پسندی کی امید قطعاً نہیں کرتا۔“

”خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو تم۔ دیکھو، کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔ ٹھیک ٹھاک ہوں بالکل۔“

سالم۔ اور تم جانتے ہو تا میں کتنا گڈ سوئمر ہوں۔“

”یہ بات دل کی تسلی کے لئے کافی نہیں ہے عفتان علی خان! یقیناً تم ہمیں عزیز ہو۔“

مگر تبھی عفتان علی خان چونکا تھا۔

”ہمیں؟“ یہ ہمیں میں کون کون شامل ہیں تمہارے علاوہ؟“ مسکراتے ہوئے دریافت کیا

نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر مدھم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

انا بیہ شاہ بہت حساس لڑکی ہے عفتان علی خان! تمہارے اس اقدام نے یقیناً اسے بہت حد تک

اگر دیا تھا۔ وہ گھر آ کر بھی بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ تمہیں اس کے سامنے اس طرح کی حرکتوں

غائب برتنا چاہئے۔ یقیناً اس کا دل دکھا ہے۔“ اوزی مطلع کر رہا تھا۔

اچھا، مجھے نہیں پتہ تھی یہ بات۔“ اس نے بر ملا حیرت کا اظہار کیا تھا اور اوزی اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

عفتان علی خان کافی کا کپ رکھتا ہوا اٹھا تھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ اوزی چونکا تھا۔

”ہمیں میں شامل دیگر لوگوں سے معذرت کرنے۔“ بہت دھم سے مسکرایا تھا۔ پھر پلٹ کر باہر نکل

گیا۔ انا بیہ شاہ باہر بیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ جب وہ بہت آہستگی سے چلا ہوا اس کے قریب آن بیٹھا تھا۔

انا بیہ شاہ چونکی نہیں تھی نہ ہی اس کی سمت نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی زحمت کی تھی۔ شاید ایسا اس نے دانستہ

رکھا تھا۔ عفتان علی خان نے اس کی جانب دیکھا تھا۔

”اوزی بتا رہا تھا تم ناراض ہو مجھ سے؟“ انداز بہت دوستانہ تھا مگر انا بیہ شاہ نے جیسے سنی ان سنی کر دی

عفتان علی خان نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر مسکرا دیا تھا۔

”ہلو، معذرت کرتا ہوں میں۔ آئی ایم سوری۔“ یہ غور توجہ سے تھا مگر وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ اسی

خاموشی سے کارخ پھیرے بیٹھی رہی تھی اور وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”دراصل مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمہارا دل اتنا کمزور ہے۔ میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ اپنی وے، اگر

میں اس طرح کے مذاق اتنا خوفزدہ کرتے ہیں تو آئندہ کے لئے تو یہ کرتا ہوں، ہرگز نہیں کروں گا۔

اوزی نے بھی اچھا خاصا ڈانٹ ڈپٹ لیا ہے اور اس پر تم بھی۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کی سمت

نگاہ کرتا تھا۔

”یہ مجھے نہیں پتہ تھا کہ تم میری اتنی اچھی دوست ہو کہ مجھے کچھ ہونے سے تمہیں کچھ فرق پڑتا

نہیں۔“ مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ تم غالباً غلط سمجھ رہے ہو۔“ وہ اسی قدر روڈ انداز میں گویا ہوئی

مگر عفتان علی خان مسکرا رہا تھا۔ پھر بہت توجہ سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

”انا بیہ شاہ! بعض لمحے بہت بھاری ہوتے ہیں۔ جھیلنا آسان نہیں ہوتا انہیں۔ جو جھیل رہا ہو اس کا

زور اسے ہی ہوتا ہے۔ وہ کمزور نظر آ رہا ہو تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ درحقیقت کمزور ہے۔ وہ

ذہنیت حادی ہونے والے ہوتے ہیں۔ اگر چاہے بھی تو اس حقیقت سے منکر نہیں ہو سکتا کوئی۔“

مگر انا بیہ شاہ کچھ بولی نہیں تھی۔ عفتان علی خان نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس

خارج کی تھی۔

”خائف ہونے کے جواز ڈھونڈنے والے یہ نہیں جانتے کہ بعض اسباب کس درجہ بھاری ہوتے

نہیں، یہ الگ بات ہے کہ اس کا اندازہ کوئی اس طور کر نہیں پاتا۔“ مکمل توجہ سے اسے دیکھا تھا۔

”میں جانتا ہوں انا بیہ شاہ! تمہارے خائف ہونے میں اسباب دکھائی دیتے ہیں۔“
اختیاری بعض اوقات اختیار نہیں رہنے دیتی انا بیہ شاہ! لہجہ بہت مدہم تھا اور انا بیہ شاہ اسی طرح
رخ پھیرے پیشی رہی تھی۔ عفنان علی خان لب بھیج کر ایک گہری سانس خارج کر رہا تھا اٹھ کھڑا ہوا
”کاش، میرے اختیار میں ہوتا کہ میں تمہیں وہ سارے جواز سوئپ سکتا انا بیہ شاہ! بہت مدہم
میں کہتا ہوا وہ مسکرایا تھا۔

”کاش کہہ پاتا وہ باتیں جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ مگر افسوس کبھی باتیں کہیں کھو جاتی ہیں اور کبھی
اور کبھی دونوں ہی ساتھ نہیں دیتے۔ وقت سے شکوہ اس لئے نہیں کروں گا کہ جانتا ہوں ایک دن ہم
مجھے اسے اپنے بس میں کر لیتا ہے۔ اور تب سب ویسا دیا ہو گا جیسا جیسا میں چاہوں گا۔“ کتابچہ
اس کا لہجہ اور انداز۔ انا بیہ شاہ اس کی سمت دیکھتی رہ گئی تھی۔

”ابھی تک تیار نہیں ہوئی ہوتی؟“ اذہان حسن بخاری نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تھا۔ ساہیہ
نے نشے میں سے اسے دیکھا تھا پھر مسکرا دی تھی۔
”لڑکیاں تیاری میں وقت لیتی ہیں اذہان حسن بخاری!“ اس نے بلش آن لگاتے ہوئے مگر
ہوئے جتایا تھا۔ اذہان حسن بخاری اندر بڑھا آیا تھا۔
”فائدہ؟“ فرق تو پھر بھی کچھ نہیں پڑے گا۔“ مسکراتے ہوئے آئینے میں بہت دلچسپی سے اس
عکس دیکھا تھا۔

ساہیہ خان بہت بے ساختہ ہنسی تھی۔
”کے۔۔۔ اذہان حسن بخاری پر پھر کبھی دیکھنے والے پر؟“
”شاید دونوں پر۔“ اذہان حسن بخاری کے لبوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔
”ویسے کرتی کیوں ہوتی لڑکیاں یہ بناؤ سنگھار؟“
”تاکہ خوب صورت نظر آسکیں۔“ ساہیہ لب اسٹک لبوں پر پھیرتی ہوئی مسکرائی تھی۔
”خوبصورت نظر آسکیں یا ہم لڑکوں کو بے وقوف بنا سکیں؟“ اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا اور
خان رخ پھیر کر اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ نگاہوں میں بہت سی شرارت آن رکھی تھی اور گلا ڈال
مسکراہٹ۔

”اذہان حسن بخاری! اس کام کے لئے تیز کانٹوں سے لیس ہونا ضروری تو نہیں۔“
اذہان حسن بخاری بے ساختہ ہنس دیا تھا۔
”ذہین لڑکیوں کی ایک بات بہت اچھی ہوتی ہے۔ خود کو ڈیفنڈ بہت بہتر انداز میں کر پاتی ہیں۔“
”اور تمہیں جی بات اچھی نہیں لگتی۔“ ساہیہ خان مسکرائی تھی۔ اذہان حسن بخاری بے غور دلچسپی سے اسے
دیکھنے لگا تھا۔

”کس نے کہا تم سے؟“

”کس نے کہا تم سے؟“

”کس نے کہا تم سے؟“

”کس نے کہا تم سے؟“

”کس نے کہا تم سے؟“

”اب یہ مت کہہ دینا کہ انہیں تمہیں پہنا بھی دوں۔“

”کیوں۔۔۔ تم میری اتنی چھوٹی سی فرمائش پوری نہیں کر سکو گے؟“ وہ اپنی مخصوص شرارت نگاہ میں لئے کھلکھلاتے ہوئے ہنسی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے سرٹنی میں ہلاتے ہوئے اس کی کلائی کو تھپاتا ہوا کہ ”کیسے کیسے کام کروانے لگی ہو تم مجھ سے۔“

”لگی دن۔ اسی بہانے ایک خوب صورت لڑکی کی قربت تو میسر آ رہی ہے۔“ وہ شرارت سے مسکراتی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر مسکرا دیا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”ساہیہ خان! میں اگر تم سے اختلاف کروں گا تو تمہیں یقیناً برا لگے گا۔“ بہت سہولت سے گجرا تاڑک کلائی میں پہناتے ہوئے اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا۔

اور ساہیہ خان مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگی تھی۔

”نہیں۔۔۔ مجھے قطعاً برا نہیں لگے گا۔ مگر حسن کو جھٹلانا آسان نہیں ہے۔ اتنا دھیان میں رکھنا۔“

”اوہ، ریلی۔“ اذہان حسن بخاری نے یہ غور اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ اس کی کلائی پر اس کی گرفت کچھ مضبوط ہو گئی تھی۔ ساہیہ خان جو اس کی سمت بہت پُر اعتماد انداز سے دیکھ رہی تھی یکدم نظر میں جھکا گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری کے لبوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”حسن کو شکست دینا مشکل نہیں ہے ساہیہ خان! نہ ہی جھٹلانا آسان۔ صرف مشکل ہے تو حسن! شکست خوردہ دیکھنا۔“

ساہیہ خان بنا اس کی سمت دیکھنے اپنی کلائی کو دیکھنے لگی تھی۔ پھر یکدم مسکرا دی تھی۔

”اذہان حسن بخاری! یہ دونوں گجرے ایک ہی کلائی میں پہناتے دو گے تو دوسری کلائی میں کیا پہناتے گے؟“ اس کا اعتماد ایک لمحے میں اس کے لہجے میں تھا۔

”یہ تو تمہیں بتانا چاہئے نا۔“ اپنی غلطی ہرگز ماننے کو تیار نہ ہوا تھا اور ساہیہ خان مسکرا دی تھی۔

”جلدی کرو اذہان! ابھی تمہیں مجھے نیچے جانے کے لئے بھی ہیپ آؤٹ کرنا ہے۔“

”تم کچھ زیادہ ہی ایکسپٹ نہیں کر رہی ہو مجھ سے؟“ اذہان حسن بخاری نے سر اٹھا کر اسے مسکرانے ہوئے دیکھا تھا۔

”آئی تھنک سو۔“ ساہیہ خان مسکرائی تھی۔ ”مگر غالباً یہ میری مجبوری ہے۔ اس انجری کے بعد دنیا میرے لئے خود سے چلنا مشکل ہے۔“

اذہان حسن بخاری نے گجرے دونوں کلائیوں میں پہنا کر تنقیدی نظروں سے اس کی کلائیوں کو دیکھا تھا۔

”کیسی لگ رہی ہیں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ اگر یہ گجرے کسی خوب صورت کلائی میں ہوتے تو ان کی خوب صورتی شاید کچھ بڑھ گئی ہوتی۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”کیا مطلب ہے، یعنی میری کلائیوں خوب صورت نہیں ہیں؟“ ساہیہ خان نے اسے شکل سے دیکھا۔ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا تھا۔

”چلو، ورنہ وہ سب ہمیں چھوڑ کر دلہن لینے روانہ ہو جائیں گے۔“ مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ ساہیہ خان نے اسے دیکھا تھا اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر دھر دیا تھا۔

اذہان حسن بخاری نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا تھا پھر لے کر آگے بڑھنے لگا تھا۔

”کیا سوچا ہے تم نے، شادی یہیں پاکستان میں کرو گی یا وہاں کیلگری میں؟“

ساہیہ خان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ عجب شرارت آنکھوں میں لے کر اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ ساہیہ خان مسکرا دی تھی۔

”یہ میں تمہیں کیوں بتاؤں اذہان حسن بخاری؟“

”اس لئے کہ میں تمہارا بہترین دوست ہونے کے ناتے سب سے بڑا خیر خواہ ہوں۔“ اذہان حسن بخاری نے جواز دیا تھا۔

”مگر اس کے باوجود مجھے تم سے خیر خواہی کی قطعاً کوئی امید نہیں ہے اذہان حسن بخاری!“ ساہیہ خان نے کسی قدر افسوس انداز سے کہا تھا اور وہ مسکرا دیا تھا۔

”میری خیر خواہی پر شک کر رہی ہو؟“

”نہیں۔۔۔ مگر میں فی الحال تم پر اعتبار نہیں کر سکتی اذہان حسن بخاری!“ اور وہ ہنس دیا تھا۔

”میری نیک نیتی پر اس قدر شک۔“

”شک نہیں اذہان! اسے حفظ ماتقدم کہتے ہیں۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”یعنی تم مجھ پر بعد میں اعتبار کر لو گی۔“ وہ اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔

”ایسا میں نے کب کہا؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”مگر یہ تو کہانا فی الحال نہیں یعنی بعد میں ضرور ایسا ہو گا۔“ اذہان حسن بخاری مسکرا رہا تھا اور ساہیہ خان اسے دیکھتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

”تقریب اعتبار منعقد کرنا اس قدر آسان نہیں اذہان حسن بخاری! اس سے قبل کسوٹی پر پرکھنا بھی بے ضروری ہوتا ہے۔“

”اوہ ریلی۔ تو پلیز پرکھو نا۔ مجھے اچھا لگے گا اگر یہ تقریب اعتبار جلد منعقد ہو جائے۔“ اذہان حسن بخاری نے جد بڑھتی ہوئی شکل سے بولا تھا اور وہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

پتہ نہیں، واقعی سب ٹھیک ہو گیا تھا یا پھر ایسا بہ ظاہر نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پاری تھی۔ سردار سنگھین بزرگاری کا مزاج کیا تھا، وہ اب تک سمجھ نہیں پائی تھی۔

کبھی وہ شعلے جیسا تھا اور کبھی شبنم۔ کبھی اتنی دہشت اندر بھر دیتا تھا کہ وہ سانس تک لینا محسوس ہوتا اور کبھی اتنا مہربان بن جاتا تھا کہ اس سے بڑا کوئی دھمک نہ لگتا تھا۔ وہ واقعی اسے اب تک سمجھ نہیں پایا اور سبکدین حیدر لغاری بھی تو یہی کہہ رہا تھا۔ ابھی انہیں ایک دوسرے کو سمجھنا چاہئے۔ وہ مڑی تھی۔ جب سردار سبکدین حیدر لغاری کو اپنے سامنے دیکھ کر چونک گئی تھی۔

”آپ؟“

”یہاں سے گزر رہا تھا، تمہارا دھیان آ گیا، سو چلا آیا۔ کیا میں نے ٹھیک نہیں کیا؟“ اسے اپنا مزاج حیرت سے تنکٹا پا کر وہ گویا ہوا تھا اور میرب سیال فوراً ہی سرفٹی میں ہلانے لگی۔

”ایسا نہیں ہے۔ دراصل میں.....“

”میرے متعلق سوچ رہی تھیں؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے بہت مدہم لہجے میں کہا تھا اور وہ کبے بغیر دیکھتی رہ گئی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا اور میرب سیال بہت آہستگی سے سر جھکا دیا تھا۔

”کیا ہم کچھ وقت ساتھ گزار سکتے ہیں؟“ آئی مین، کہیں باہر جا سکتے ہیں؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے دریافت کیا تھا اور میرب سیال کسی قدر حیرت سے اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ پھر بہت آہستگی سے سرفٹی میں ہلا دیا تھا۔

”پاپا..... پاپا سے پوچھنا ہو گا۔“

”اب تک پاپا کی انگلی تمام کر چلی ہو؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے کسی قدر محفوظ ہوتے ہوئے غور دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ جھل سی ہو گئی تھی۔ یقیناً وہ کچھ زیادہ ہی محنتوں کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اسے اتنا زیادہ پزل ہونے کی ضرورت قطعاً نہیں تھی اور وہ بھی سردار سبکدین حیدر لغاری کے سامنے اسے بہت مضبوط نظر آنا چاہئے تھا تاکہ وہ اسے آسانی سے کوئی زک نہ پہنچا سکے اور؟“

وہ چونکی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری بہت آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا اور اس لمحے اس کے قریب کھڑا بہت توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”غالباً پاپا تو اس سے قبل ہی اپنی اس بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے چکے ہیں۔ اصولاً تو تمہیں اب میری انگلی تمام کر چلنا چاہئے۔“ وہ جیسے اس کی بوکھلاہٹ سے محفوظ ہو رہا تھا۔ لبوں پر بڑی دہشتانہ مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی اور نگاہیں بہ غور اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

”میں..... میں انگلی تمام کر چلنے کی اسٹیج سے نکل چکی ہوں۔“ اس نے اعتماد بحال کرنے کو کسی قدر مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے سر اٹھا کر سردار سبکدین حیدر لغاری کی سمت دیکھا۔ شاید اپنی دانستہ بات سے مرعوب کرنا چاہتی تھی مگر وہ قطعاً متاثر نہ ہوتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”ادو، ریلی؟“ مگر مجھے تو لگتا ہے تم اب بھی میری انگلی تمام کر چلنا چاہتی ہو۔ کہیں میں نہیں؟“ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ گویا تھا اور میرب سیال یکدم ہی چہرے کا رخ پھیر کر سردار سبکدین حیدر لغاری نے بہت آہستگی سے اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف کیا تھا اور پھر یہ

بولتا تھا۔ ”تمہیں مت پھیرو میرب سیال! ان پلکوں کی جنبش کے مفہوم سمجھنے کا خاص حق محفوظ رکھتا ہوں۔ کیا تم مجھے ان آنکھوں میں کبھی تحریر پڑھنے سے محروم کر دو گی؟“ کیا رنگ تھے لہجے کے۔ کیا تیور تھے آنکھوں کے۔ میرب سیال بہت زور سے لب بھینچ کر نگاہ پھیر گئی تھی۔

”آپ..... آپ غالباً کہیں لے جانا چاہ رہے تھے۔“ یاد دہانی کرائی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری بولتا تھا۔

”میرب سیال! اس نگاہ کے تیور جاننے کا موقع نہیں دو گی، اس چہرے کو پڑھنے نہیں دو گی تو کسے سمجھ سکیں گے تمہیں؟ تمہیں نہیں لگتا کہ تم میرے ساتھ نہیں خود اپنے ساتھ نا انصافی کر رہی ہو؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری مسکرا رہا تھا۔ مگر اس مسکراہٹ میں کوئی ریا کاری نہ تھی۔ ان آنکھوں میں کسی نئی سازش کا جال بنا لگن آ رہا تھا۔

”تو کیا واقعی موسم رنگ بدل رہا تھا؟“ منظر رگوں میں رنگ رہے تھے؟ کیا واقعی آسمان ران ہو کر زمین پر جھک آیا تھا؟

”میرب سیال اسے سر اٹھائے خاموشی سے دیکھ رہی تھی جب وہ بہت اپنائیت سے مسکرایا تھا۔

”کیا ہو؟“ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“

”میرب سیال نے سر بہت ہولے سے نفی میں ہلا دیا تھا۔

”آپ اندر چل کر پاپا کے پاس بیٹھیں، میں تیار ہو کر آتی ہوں۔“ وہ یکدم ہی ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھ ناچی اور تھوڑی دیر بعد جب وہ تیار ہو کر باہر نکل تو سردار سبکدین حیدر لغاری اس کا منتظر تھا۔ وہ آہستگی سے نکلے ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری اس کے ہم قدم تھا اور شاید یہ احساس کچھ خاص لے لے ہوئے تھا۔

”ایک بات کہوں؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری بہت مدہم لہجے میں بولا تھا۔

”میرب سیال نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کے چہرے کے تاثرات واضح تھے۔

”مجھے زندگی میں کبھی خود کو بدلنے کا خیال اس سے قبل نہیں آیا تھا۔“ وہ بہت دھیمے سے مسکرایا۔ ”میں نے ابھی اس رخ کے متعلق سوچا بھی نہ تھا۔ یہ نئے بندھنوں میں بندھنا، نئے تعلق استوار کرنا، ان کی جنمات کو پورا کرنا، ان کی توقع پر پورا اترنا، کچھ ماننا، کچھ منوانا، ان باتوں کے متعلق کبھی نہیں سوچا تھا میں نے شاید۔ اتنی جلد میں ان سب چکروں میں پڑنا بھی چاہتا تھا۔ یہ زندگی بہت سی ڈیمانڈز کرتی ہے۔

انٹس ہے کہ میں ڈے دار یوں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ دراصل اس زندگی کی ڈے داریاں بہت سی باتوں کا تقاضا کرتی ہیں۔ بہت سی توقعات، بہت سی خواہشات بنا کسی پذیرائی کے، بنا کسی سبب کے بھی جنم لے لیں۔ اور اگر گاگا اس پر پورا نہ اترے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ کوئی مالال دل کو گھیرنے لگتا ہے۔ سو میں نے سوچا لیا تھا جب تک ان سب ڈے دار یوں کو ٹھیک طور پر پورا کرنے کے قابل نہیں ہو جاتا، اس کے

متعلق نہیں سوچوں گا۔ مگر مائی اماں کی خواہش پر سر جھکانا پڑا اور ان دنوں میں انوکھے تجربات سے گزر رہی ہوں۔ وہ بہت دھیمے سے مسکرا رہا تھا۔ جب میرب سیال اس کے ساتھ چلتے ہوئے سر اٹھا کر اس کا ہاتھ دیکھنے لگی تھی۔

”آپ پچھتا رہے ہیں مجھ سے تعلق جوڑ کر؟“ جانے کیا سوچ کر دریافت کیا تھا۔ سردار سینگین نے سر اٹھا کر کہا۔

”تم ایسا سمجھ رہی ہو؟“ اس نے انسا سوال کر کے میرب سیال کے لئے مشکل پیدا کر دی تھی۔ میرب سیال اس کی سمت دیکھتی ہوئی سر نہی میں ہلانے لگی تھی۔

”بات غالباً آپ کے متعلق ہو رہی تھی۔“ یاد دہانی کرائی تھی۔ مگر سردار سینگین حیدر لغاری بہت دل سے اس کی سمت تکتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ تو نہیں۔“ جانے کیا جتنا چاہا تھا۔ میرب سیال قطعاً متاثر ہو گیا۔ بغیر اس کی سمت دیکھنے لگی۔

”آپ نے بتایا نہیں، پچھتا رہے ہیں مجھ سے تعلق جوڑ کر؟“

”تمہیں ایسا کیوں لگا؟“ مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ میرب سیال چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”آپ کے لہجے میں کوئی ریگرت صاف بول رہی ہے۔“ مدہم لہجے میں انکشاف کیا تھا۔

”اچھا؟“ سردار سینگین حیدر لغاری حیران ہونے سے زیادہ شاید محظوظ ہوا تھا۔ لبوں پر مسکراہٹ بگھڑ گئی تھی۔

”کیا ایسا غلط ہے؟“ میرب سیال نے قطعاً متاثر ہوئے بغیر وضاحت چاہی تھی۔

”ہاں۔“ سردار سینگین حیدر لغاری نے بنا کسی تعرض کے جواب دیا تھا۔ میرب سیال نے چونک کر اس کی سمت نگاہ کی تھی۔ وہ بہت اعتماد سے اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”اگر ایسا نہیں ہوتا تو آج میں تعلقات کی راہ اتنی ایمانداری اور جانفشانی سے بحال نہ کر رہا ہوتا غالباً تم اب بھی مجھ پر شک کر رہی ہو۔“ کسی قدر پُرفسوس انداز میں کہا تھا۔ میرب سیال سر نہی میں ہلا گئی تھی۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔“

”تو پھر کبھی بات ہے؟“ سردار سینگین حیدر لغاری نے بہ غور دلچسپی سے اس کی سمت دیکھا تھا۔

میرب سیال کچھ نہیں بولی تھی، اس کے سنگ چلتی ہوئی بہت آہستگی سے چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ سردار سینگین حیدر لغاری گویا ہوا تھا۔

”شاید تم نے بھی مجھ جیسے بیون ساتھی کے خواب نہیں دیکھے ہوں گے۔ ٹھیک اسی طرح، بیون خیالوں میں بھی کوئی تم جیسی لڑکی نہیں تھی۔“ بے حد صاف گوئی سے کہتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”یہ سچ ہے میرب سیال! ہم اچانک ایک دوسرے سے آن لے ہیں۔ دو الگ الگ ستوں کے درمیان جنہیں وقت نے ایک سمت میں چلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ایسے میں ہمیں زیادہ دوا دینا نہیں کرنا چاہئے۔“

”ہاں۔“

”لیں۔۔۔ بٹ مائے پرس۔“ اس نے تیزی سے بھاگتے ہوئے اس شخص کی سمت اشارہ کیا تھا۔ سردار سینگین حیدر لغاری نے اس کا شانہ تھپتھپایا تھا۔

”ڈونٹ وری۔ تم یہیں رکو۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ تیزی سے اس پرس اچکنے والے چور کی سمت بھاگنے لگا تھا۔ چور نے اسے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر اور بھی تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔

”سینگین!“ میرب سیال نے اسے باز رکھنے کو آواز دی تھی مگر وہ سنی ان سنی کرتا ہوا اس چور کے پیچھے بھاگنے لگا تھا۔

”سینگین!“ ایک تیز رفتار ٹراٹر تیزی سے اس کی سمت بڑھتا دیکھ کر اسے خبردار کرنے کو وہ چیختی تھی۔ مگر سردار سینگین حیدر لغاری اس سے بہت فاصلے پر ہونے کے باعث غالباً اس کی آواز سن نہ سکا تھا۔

”ٹراٹر تیزی سے اس کی سمت بڑھا تھا۔“

”سینگین!“ وہ چیختی تھی۔

”ٹراٹر بہت تیزی سے کسی وجود سے ٹکرایا تھا۔ ایک دلخراش چیخ ابھری تھی اور میرب سیال کو سارا منظر تاریکی میں ڈوبتا لگا تھا۔“



برب یال نے سراٹھا کر بھیگی بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ تبھی وہ اس کی جانب بنور نکلتے ہوئے
 ہوئے دوبارہ بولا تھا۔
 ”ب کچھ ٹھیک ہے۔۔۔ سب کچھ۔“ مضبوط لہجے میں تسلی دیتے ہوئے باور کرایا تھا اور اسے حثام
 ہاتھ لگا لیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں پولیس وہاں پہنچ چکی تھی اور معمول کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ یہ خدا کا شکر تھا کہ
 ہاتھ میں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ وہ چور فقط زخمی ہوا تھا۔ ریسکیو کی ٹیم موقع پر پہنچ کر اسے
 ہاتھ لے لے چکی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ مگر میرب سیال بہت ہم سہی گئی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری کو
 اٹھانا تھی ضروری کارروائی کے بعد وہ اسے لے کر گھر واپس آ گیا تھا۔

کمرے میں اندھیرا کئے وہ گھٹنوں پر سر دھرے ساکت بیٹھی تھی جب اوزی نے دروازہ کھول کر اندر
 آنا دیکھا۔ مگر وہ تب بھی نہیں چوکی تھی۔ اوزی چلتا ہوا اس کے قریب آن رکا تھا۔ چند ثانیوں تک اسے
 روشنی سے تکتا رہا تھا پھر اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر لیب روٹن کیا تھا۔
 ”زندگی روشنی سے عبارت ہے انا بیہ شاہ! کیونکہ روشنی میں سبھی منظر بہت واضح ہو جاتے ہیں اور سبھی
 اعمال دکھائی دیتے ہیں۔“

اوزی کا لہجہ نرم تھا اور انا بیہ شاہ سراٹھا کر اسے خاموشی سے دیکھنے لگی تھی۔ اوزی نے بہت آہستگی سے
 لہجہ ہلکا کر کے ہاتھ پر دھرا دیا تھا۔

”انا بیہ! زندگی میں بہت کچھ ہوتا ہے۔۔۔ بہت کچھ۔ مگر جو پل گزر جاتا ہے وہ اپنے ساتھ بہت
 لے لے جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی نہیں۔“ اس کا لہجہ مدہم تھا۔ مگر بہت کچھ باور کراتا ہوا۔
 انا بیہ شاہ بہت آہستگی سے نظریں پھیر گئی تھی۔

”مجھے معلوم تھا انا بیہ شاہ! ایسا ہی ہو گا۔ تمہارا یہ خوف، یہ ڈپریشن پھر سے عود کر آئے گا اور تم پھر انا بیہ
 ہر حال میں گھر جاؤ گی۔ مگر انا بیہ شاہ! ایسا کرنے سے کیا سب کچھ بدل جائے گا؟ تم جینا چھوڑ دو گی تو
 انا بیہ زندگی رک جائے گی؟“

اوزی اس کی طرف مکمل توجہ سے تکتا ہوا دریافت کر رہا تھا مگر انا بیہ جواباً خاموش تھی۔ اس کی ساکت
 نظریں میں بہت سے گہرے سائے رکے ہوئے تھے۔ چہرہ پُرسکون سا تھا۔ اوزی نے اسے بنور دیکھا تھا،
 انا بیہ آنکھوں سے کتنی خاموشی سے نمکین پانیوں کے قطرے ٹوٹ کر چہرے کو بھگونے لگے تھے۔ اوزی کی
 آنکھوں کے قریب دھری اس تصویر پر پڑی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس تصویر کو اٹھایا تھا جہاں کوئی بہت
 کچھ سے کراتا ہوا، زندگی سے بھر پور دکھائی دے رہا تھا۔ زندگی کے سارے رنگ اس چہرے پر تھے۔
 انا بیہ نے اس کی آنکھوں میں تھے اور اوزی نے انا بیہ شاہ کی سمت دیکھا تھا۔

انا بیہ شاہ کی آنکھوں سے بہت آہستگی سے نمکین پانی کے قطرے ٹوٹ کر رخساروں پر بہ رہے تھے۔
 انا بیہ ساکت بیٹھی تھی۔ اوزی کچھ بھی کہے بغیر چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔ عجب اک بے بسی سی انداز میں۔
 ”کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔“

یہ سب اتنی سرعت سے ہوا تھا کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی تھی۔ کتنی دیر حواس باختہ سی وہیں کھڑی رہی
 ساکت نظریں اس منظر پر مرکوز تھیں جہاں کوئی حادثہ یقیناً ہو چکا تھا۔
 اس کا وجود جیسے پتھر ہو گیا تھا۔
 کتنے لمحوں تک وہ اسی طرح ساکت کھڑی رہی تھی۔ پھر قدم بڑھانے لگی تھی۔ سارے حواس اس
 منجمد تھے اور وہ چلتی چلی گئی تھی۔ اس جگہ کی جانب جہاں کوئی حادثہ رونما ہو چکا تھا۔ کیسی پتھری تھی اس
 نگاہیں۔ قدم رکے تھے اور وہ ساکت رہ گئی تھی۔
 کوئی سڑک پر پخت پڑا تھا اور اس کا سانس رکنے لگا تھا۔ مگر وہ چہرہ، وہ خدو خال ویسے تو نہ تھے
 کوئی اور ہی تھا۔ اور تب اس کی نگاہ اپنی جانب سے رخ پھیرے کھڑے شخص پر پڑی۔ لانا بقا، چہرہ
 شانے۔۔۔ میرب سیال سرعت سے اس کی جانب بڑھی تھی۔
 وہ خدو خال، وہ چہرہ اجنبی قطعاً نہ تھا۔ اس کے سامنے کھڑی وہ کتنی حیرت سے اسے تکتی رہی تھی۔
 سردار سبکدین حیدر لغاری جو زمین پر پڑے اس وجود کو کسی قدر تاسف اور افسوس سے دیکھ رہا تھا
 گھڑی چوسکتے ہوئے اس کی جانب دیکھنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور چہرہ حواس باختہ
 ”میرب!“ بہت آہستگی سے اس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے اسے پکارا تھا۔ مگر وہ تب بھی
 چوکی تھی۔ اسی اجنبی انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے
 اپنے ہاتھ سے چھیرا تھا جیسے وہ اس کے ہونے کا یقین چاہ رہی تھی۔ عجب بے خود سا انداز تھا۔ سردار
 حیدر لغاری نے اس کے اس ہاتھ کو تھام کر لبوں سے لگایا تھا۔

”میرب! کیا ہوا میرب؟“ بہت بے قراری سے دریافت کیا تھا۔ یقیناً وہ اس کی کہیں
 نہیں پایا تھا۔ مگر میرب اسے اسی طرح خالی خالی نظروں سے دیکھتی ہوئی یکدم ہی اس کے فرانگ سے
 دھر کر رونے لگی تھی۔

”میرب! کیا ہوا؟“ اس نے اس کے گرد اپنے بازو حائل کرتے ہوئے کسی قدر فکر مندا
 دریافت کیا تھا۔ مگر وہ بنا کچھ کہے اسی طرح روتی چلی گئی تھی۔ اور تب ساری بات جیسے اس کی سمجھ
 تھی، وہ اس کی طرف سے فکر مند ہوئی تھی۔ اس کے متعلق سوچ کر پر ملال ہوئی تھی۔
 سردار سبکدین حیدر لغاری لب سمجھنے کر مسکرا رہا تھا۔ پھر اسے خود سے الگ کرتے ہوئے دیکھا
 ”کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔“



کتی دیر وہ اسی طرح چپ چاپ بٹھارہا تھا اور اتنا یہ شاہ کی آنکھوں سے چپ چاپ آنسو بہتے رہے۔
 ”انا بیہ شاہ! زندگی میں سے جو لوگ چلے جاتے ہیں وہ کبھی واپس نہیں آتے۔ تمہیں یہ بات چاہئے اور ہاں لینی چاہئے۔“ اوزی نے مدہم لہجے میں بنا اس کی طرف دیکھے باور کرانا چاہا تھا۔
 آنکھوں سے نمکین پانی اسی طرح بہتا رہا تھا۔

”انا بیہ شاہ! جن کا ساتھ جتنا ہوتا ہے، وہ اتنا ہی ہونا لٹے ہوتا ہے۔ اس میں کسی کی مرضی کوڑا ہوتا۔ ہم نہ تو اپنی مرضی سے ان لوگوں کو بڑھا سکتے ہیں نہ گھٹا سکتے ہیں نہ ہی اپنی مرضی سے ان لوگوں کو لاسکتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے انا بیہ شاہ! بالکل بھی ممکن نہیں۔“
 انا بیہ شاہ چپ چاپ بیٹھی کسی غیر مرئی نقطے کی جانب نکلتی رہی تھی۔

”انا بیہ شاہ! غازی کا اور تمہارا ساتھ اتنا ہی تھا۔ وہیں تک کا تھا جہاں تک تم دونوں ساتھ چلے آگے کا موڑ آخری تھا جسے نہ تم بدل سکتی تھیں نہ ہی غازی۔“ اوزی کا لہجہ مدہم تھا۔

”انا بیہ شاہ! غازی ایک گزر جانے والا موڑ ہے۔ جسے گزر ہی جانا تھا۔ اس میں تمہارا کسی اور قصور نہیں۔ تم اگر چاہتیں بھی تو اسے روک نہیں سکتی تھیں کیونکہ اسے بہر حال جانا ہی تھا اور اسے لے جانے والوں کو روکا نہیں جاسکتا۔ انا بیہ شاہ! خود کو اس منظر نامے سے باہر لاؤ۔ میں جانتا ہوں عفتا خان کے مذاق میں کئے گئے ایک اقدام نے تمہیں پھرو ہیں پر لے جا کھڑا کیا ہے جہاں سے تم لوٹ کر ایک بار پہلے آئی تھیں۔ مگر تمہیں خود کو باور کرانا ہے انا بیہ شاہ! کہ یہ فقط مذاق تھا اور مذاق فقط ہی ہوتا ہے۔ اس میں نقصان کسی کا نہیں ہوا۔ نہ ہی عفتان علی خان کا مقصد کسی کی دل آزاری تھا۔ شاہ! تمہیں خود کو باور کرنا ہے کہ غازی کے واقعے کا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایک الگ واقعہ تھا اور یہ الگ نوعیت کا اور یہ کہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔“ اوزی کا انداز بہت کچھ ہاروا والا تھا اور انا بیہ شاہ اسے سن رہی تھی۔ اوزی نے بہت آہستگی سے اس کا ہاتھ تھاما تھا پھر بغور توجہ سے نکتا ہوا گویا ہوا تھا۔

”ان دونوں واقعات میں قطعاً بھی کوئی مماثلت نہیں انا بیہ شاہ! تمہیں خود کو اس سیاہ دائرے سے لانا ہے انا بیہ شاہ! جس کے اندر رہ کر تمہیں تمام رنگ سیاہ دکھائی دیتے ہیں۔ تمہیں خود کو باور کرنا۔ زندگی صرف رنگوں سے اور روشنی سے عبارت ہے اور باقی سب رد کئے جانے کے قابل۔“

انا بیہ کی آنکھوں کے نمکین سمندر اسی طرح طغیانیوں سے پڑتے اور اوزی اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”غازی جا چکا ہے انا بیہ شاہ! اور اسے لوٹ کر واپس نہیں آتا ہے۔ اس کے لئے تم خود کو مت ازم میں تو تمہیں اس بات کی اجازت قطعاً نہیں دوں گا۔“ بہت ہولے سے ہاتھ بڑھا کر اس کے نمکین پانیوں کو سمیٹا تھا۔ اس کا انداز کسی ہمدرد کا سا، جو صلے بندھانے والا تھا۔ وہ ایک مہربان انسان کے سامنے تھا اور یہی انا بیہ شاہ اس کے شانے پر سدھرتے ہوئے رونے لگی تھی۔ اوزی نے اسے تھما پھر اس کے شانے کو بہت ہولے سے تھپتھپانے لگا تھا۔

”بہار انور کچھ زیادہ طویل نہیں ہو گیا؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ کہیں یہ سب ان بھائی صاحبہ کا ہمت تو نہیں؟“ عفتان علی خان مسکرایا تھا۔

بہری جانب کوئی ہنستا چلا گیا تھا۔

”بہنیں لگتا ہے ایسا ہے؟“

”نہیں۔ مگر ایسا بھی تو ہو سکتا ہے نا، گین صاحب! آپ جیسے بندے میں بیٹھے بٹھائے تبدیلیاں رونما ہی سکتیں۔ ضرور اسباب کچھ خاص ہی ہیں۔ بائے دی وے، بھالی کی تصویر ہی ای میل کر دو یا راز کے موز میں تو تم نظر نہیں آ رہے ہو۔ چپکے چپکے نکاح کیا، چپکے چپکے رخصت بھی ہو گئے۔ نہ بتایا، نہ بھلا کیا۔ مجھے تو لگتا ہے تم بھالی جی کے عشق میں ڈوب چکے ہو۔“ عفتان علی خان نے فتویٰ جاری باور دوسری طرف گین صاحبہ سے دئے تھے۔

”اں، بس پانی گردن تک آیا ہی چاہتا ہے۔ تم سناؤ۔ پھپھو سے بات ہوئی تھی، بتا رہی تھیں تم آج کل شکل میں ہو؟“

”ایسا کہا انہوں نے تم سے؟“ عفتان علی خان حیران ہوا تھا۔

گین اس دیا تھا۔

”کیا غلط کہا غلط پھپھو نے؟“

”نہیں۔“ عفتان علی خان مسکرایا تھا۔ ”آئی ایم ریلی ان ٹریل۔ کچھ ہے جو کچھ نہیں آ رہا ہے۔ کچھ دکھائیں پارہا ہوں۔ کچھ ہے جو بہت الجھا ہوا سا ہے۔“ مدہم لہجے میں کہتے کہتے وہ یکدم چونکا تھا۔ ہاتھ آ رہے ہو؟“

”کیوں۔ کیا ہوا؟ معاملہ کچھ زیادہ سنگین ہے کیا؟“ گین دوسری طرف متشکر ہوا تھا۔

”ہاں۔“ عفتان علی خان نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

”کتنے عشق و شوق کے چکر میں تو نہیں پڑ گئے؟“ گین کو دوسری طرف تشویش ہوئی تھی۔ عفتان علی مسکرایا تھا۔

”تم آ جاؤ تو پھر بات کریں گے۔“

”اگلی کیوں نہیں؟“

بھالی کے ساتھ بڑی ہوتا۔ یار! بات کرنا بھالی سے۔ ہم بھی تو دیکھیں جنہوں نے اپنے محترم بھائی حیدر لغاری کو قابو میں کر لیا وہ درحقیقت ہیں کیسی۔“ عفتان علی خان مسکرایا تھا۔

گین اس دیا تھا۔

”اگلی تریب نہیں ہے۔ آئی مین میرے ساتھ نہیں ہے۔ کل ایک ایکسٹنٹ ہو گیا تھا۔ اسی کے لئے پھر سڑکی۔ میں نے اس کے پیرٹس کے ہاں چھوڑ دیا۔“

”کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟“ عفتان علی خان نے تشویش سے دریافت کیا تھا۔

”نہیں، خدا کا شکر ہے، سب ٹھیک رہا۔ مگر تم جانتے ہونا لڑکیوں کی سائیکلی، کس درجہ بہادر ہوتی

ہیں۔ بس یہی بہادری کام آگئی۔“ سردار بنگلین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔ ”ابنی وے، تم کچھ تارے
عفتان علی خان چونکا تھا۔

”ہاں..... نہیں، تم آ جاؤ پھر بات کریں گے۔“ دھیمے سے مسکرایا تھا۔

”اور تب تک پانی سر سے گزر گیا تو؟“ سردار بنگلین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔

”کیا ہو سکتا ہے۔ جو ہونا ہے وہ تو بہر حال ہونا ہی ہے۔“ وہ بہت نیم جان انداز میں مسکرایا
سردار بنگلین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔

”یعنی معاملہ خاصا سنگین ہے۔“

”کیا ہو سکتا ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب تو کوئی سدباب بھی ممکن نہیں رہا۔“ عفتان علی خان
سے مسکرایا تھا۔

سردار بنگلین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔

”یعنی جنوں بن گئے ہو۔“

عفتان علی خان مسکرایا تھا۔ مگر بڑی بے جان سی مسکراہٹ تھی۔

”یار گین! تمہیں کبھی عشق نہیں ہوا؟ اتنی لڑکیوں سے ملاؤ، اتنی لڑکیوں کی قربت میں ہا
دل فریب، دلربا ہجوم تیرے ارد گرد بنے رہے۔ کبھی..... کبھی نہیں لگا..... کہیں..... کسی ایک لڑ
ایک چہرے کے لئے رک جانا چاہئے۔ یہ چلنا پھرنا، بھاگنا، یہ سفر در سفر، یہ منزلوں کا جنوں، یہ پان
کبھی ڈال ڈال کا سلسلہ اب موقوف ہو جانا چاہئے۔“ عفتان علی خان کا لہجہ مدہم تھا۔

اور سردار بنگلین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔

”میرے یار! تو میری بات چھوڑ، اپنی سنا۔ تیرا یہ حشر اس انگیج منٹ والی نے کیا ہے یا معاملہ
ہے؟“

عفتان علی خان مسکرایا تھا۔ پھر ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

”یار گین! مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔ یار سمیٹ دو اپنا یہ سلسلہ۔ مجھے تمہیں بہت کچھ
مشورہ کرتا ہے۔“

”یہ راتوں رات پانی سر کو کیسے آ گیا؟۔۔۔ بات اتنی نئی تو نہیں لگتی۔ جب میں وہاں تھا
کیوں نہیں کیا؟“ سردار بنگلین حیدر لغاری کو حیرت ہوئی تھی۔

”تب مجھے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ خود اس طور نہیں تھا۔“ عفتان علی خان دھیمے سے مسکرایا

”نام کیا ہے؟“

”گین! اب تم اتنے تھوڑے سے دنوں میں میرا نام بھی بھول چکے ہو؟“ عفتان علی خان کو حیرت
تھی۔

”شٹ اپ یار! میں اس لڑکی کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔“ سردار بنگلین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔

”تم آ جاؤ نا بار! پھر بات کریں گے۔“

کچھ زیادہ سیریس نہیں ہو گئے تم؟“ سردار بنگلین حیدر لغاری کو تشویش ہوئی تھی۔ عفتان علی خان
ابا تھا۔

”یار گین! تیرا میرا معاملہ بہت مختلف ہے۔ تو ہمیشہ چلتا رہا ہے اور کبھی کسی موڑ پر زکا ہی نہیں۔ اور
”وہ دھیمے سے مسکرایا تھا۔“ میں کبھی چلا ہی نہیں۔ کبھی کوئی سفر کیا ہی نہیں۔ مگر ایک لمحے میں جب چلا
روں کا سفر کر آیا ہوں۔“ ایک جملے میں ہزار ہا داستانیں پوشیدہ تھیں اور سردار بنگلین حیدر لغاری متاثر
بے بغیر نہیں رہا۔ کا تھا۔

”جن محترمہ سے منسوب ہوا نہیں خبر ہے کہ محترم کہیں اور منسوب ہو چکے ہیں؟“
عفتان علی خان مسکرایا تھا۔ ”نہیں۔“

”اور ان محترمہ کو خبر ہے جن کے باعث آپ اس کیفیت کو پہنچ چکے ہیں؟“
”نہیں، اسے بھی خبر نہیں ہے۔“ عفتان علی خان کا لہجہ دھیمہ تھا۔

”تم نے اسے کبھی بتایا نہیں؟“ سردار بنگلین حیدر لغاری کی انویسٹی گیشن شروع ہو چکی تھی۔ عفتان
ان چونکا تھا۔

”یار گین! تمہیں نہیں لگتا یہ انویسٹی گیشن قبل از وقت ہے؟ سردار صاحب! آپ کسی جھگڑے کے حل
لے نہیں بیٹھے ہیں۔ یہ عفتان علی خان کی زندگی کا معاملہ ہے۔“ مسکراتے ہوئے یقین دہانی کرائی
سردار بنگلین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔

”زندگی کا نہیں، محبت کا معاملہ ہے۔“ سردار بنگلین حیدر لغاری نے بتایا تھا۔
”ہاں۔۔۔ تو اس میں فرق کیا ہے؟ بات ایک ہی ہے۔ کبھی محبت کی ہو تو خبر بھی ہونا۔“ بتایا تھا۔

سردار بنگلین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔
”چلو اب آ کر تم سے سیکھوں گا۔“

”مجھے تمہیں کچھ سکھا کر یقیناً خوشی ہوگی۔“ عفتان علی خان نے مسکراتے ہوئے فون کا سلسلہ منقطع کر
پلٹ کر دیکھا تھا۔ فاطمہ علی خان دروازے میں کھڑی تھیں۔

”ماما! آپ؟“ وہ مسکرایا تھا۔
”گین کا فون تھا؟“ فاطمہ علی خان مسکرائی تھیں۔

”جی۔“
”کب آ رہا ہے وہ؟۔۔۔ اور اس کی دلہن کیسی ہے؟“

”تو تھو آرقائن ماما!“ عفتان علی خان مسکرایا تھا۔
”میرے علی خان چلتی ہوئی اس کے قریب آن رکی تھیں۔ پھر اس کے چہرے کو بہت محبت سے تھام لیا

اور تم میری جان! تمہیں کیا ہوا ہے؟“ ان کا لہجہ لگے مند تھا اور عفتان علی خان ان کے ہاتھوں کو
نہوئے مسکرایا تھا۔

”مجھے کیا ہونا ہے مانا؟ آئی ایم پرنکلی آل رائٹ۔ اچھا تو گین کوچھی آپ نے ہی مطلع کیا تھا۔ اس نے مجھے فون کھڑکا دیا۔ مانا! سب ٹھیک ہے۔ بس کام کا کچھ برڈن تھا اس لئے۔ اور آپ غراہ پریشان ہو گئیں۔“ مطمئن کرنا چاہا تھا۔ مگر فاطمہ خان سرفنی میں ہلانے لگی تھیں۔

”خواہ مخواہ نہیں میرے بچے! ماں کی نگاہ کبھی بھی کچھ غلط نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے فیضان سے بھی پوچھا، ان کے مطابق آفس میں کوئی اتنی بڑی پر اہم نہیں ہے کہ تم اس طرح گھبرائے پھرتے نظر آؤ۔“ فاطمہ خان مطمئن نہ ہوئی تھیں اور عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”اوہ کم آن مانا! سب کچھ ٹھیک ہے۔ آپ نے خواہ مخواہ پایا کوچھی پریشان کر دیا۔ دیکھیں میں آپ کو ٹھیک نہیں لگ رہا؟۔۔۔ اپنی ویز، انوشے کہاں ہے؟ اسے نہیں ایک کپ کافی میرے کپ میں بھجوادے۔ مجھے ایک میننگ کے لئے چاہنا ہے اور آئی ایم آل ریڈی لیٹ۔“ بہت عجلت سے وہ ہلکا وارڈروب کی سمت بڑھا تھا۔ تبھی فاطمہ بولی تھیں۔

”تم جاؤ، ہاتھ لو۔ میں کپڑے نکال دیتی ہوں۔“

اذہان حسن بخاری اور سابیہ خان ایک ساتھ کھڑے تھے۔ دونوں میں یقیناً کوئی نوک جھوک ہو رہی تھی۔ فارحہ انہیں دور سے دیکھتی ہوئی مسکرائی تھیں۔ بیٹے کی زندگی میں آنے والی یہ تبدیلی یقیناً خوش آتی تھی۔ انہیں اچھا لگا تھا۔ ورنہ جس طرح کی سچویشن سعد حسن بخاری نے کری ایٹ کر دی تھی اسے دیکھ کر تھا حالات کبھی معمول پر نہ آسکیں گے اور زندگی میں ایک تناؤ بدستور قائم رہے گا۔ مگر..... فارحہ ایک ایک سانس خارج کرتی ہوئی مسکرائی تھیں۔

خدا کا شکر تھا ایسا نہیں ہوا تھا اور بہر طور سب کچھ زندگی کی طرف واپس لوٹنے لگا تھا۔ اذہان بخاری بھی۔ انہوں نے بیٹے کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے سو فٹ ڈرنک کا پل لیا تھا۔ کوئی ان کے قریب آن رکا تھا۔ فارحہ چونکی تھیں۔ ان کے بہت قریب کوئی اور نہیں، سعد حسن کھڑے تھے اور ان کے پہلو میں ان کی کمن بیگم عریبہ بھی موجود تھیں۔

فارحہ کے چہرے سے سارا اطمینان ایک لمحے میں رخصت ہوا تھا۔ مسکراتے لب بچھ گئے تھے اور ان کی جگہ ایک تناؤ نے لے لی تھی۔ وہ اس تقریب میں کسی طرح کی کوئی بد مزگی نہیں چاہتی تھیں۔ ان کی سمت سے نگاہ پھیر کر آگے بڑھ جانا چاہا تھا۔ مگر سعد حسن بخاری اس لمحے ان کا ہاتھ تھامنے سے روک دیئے تھے۔ فارحہ نے بہت چونک کر ان کی سمت دیکھا تھا۔ وہ جیسے ان کی اس کیفیت سے حد ہونے لگی تھی۔

”ہمیشہ بہت جلدی میں رہتی ہو فارحہ! کبھی تو فرصت کے اوقات نکال کر ہم سے بھی دو گھڑی لیا کرو۔“

فارحہ نے بہت خاموشی نگاہ اس چہرے پر ڈالی تھی اور رخ پھیر گئی تھیں۔

”اوہ کم آن۔ اس طرح انہی سمت ہو۔ میری بیوی سے طو۔ یہ عریبہ، عریبہ بخاری۔“

”یہ باتم اس سے۔“ سعد حسن بخاری کے لبوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ تھی۔ اگر وہ انہیں کوئی زک دیکھنا چاہتے تھے تو وہ ایسا کر چکے تھے۔ فارحہ کے چہرے کی کیفیت بہت متغیر تھی۔

”کیوں لائے ہو تم اسے یہاں سعد حسن بخاری؟ یہ دکھانے کے لئے کہ تم کتنی جوان بیوی ہو جاؤ گی۔“

”میں نے تم سے کچھ نہیں کہا۔“ سعد حسن بخاری نے کہا۔ ”میں نے فیضان سے بھی پوچھا، ان کے مطابق آفس میں کوئی اتنی بڑی پر اہم نہیں ہے کہ تم اس طرح گھبرائے پھرتے نظر آؤ۔“ فاطمہ خان مطمئن نہ ہوئی تھیں اور عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”ٹٹ اپ فارحہ! اپنی حدود میں رہو۔“

”میں اپنی حدود ہی میں ہوں۔ لیکن تم اپنی حد میں نہیں۔“ فارحہ مضبوط لہجے میں کہتی پہلی بار بہت ہاتھ نہیں۔ ”تم جو زہر میری زندگی میں گھول چکے ہو سعد حسن بخاری! اسے میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ مگر پلیز اس طرح کی حرکتیں کر کے مجھے اب مزید پریشان مت کرو۔ سکون سے رہنے دو مجھے میرے بچوں کے لئے۔ تمہاری زندگی سے مجھے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا، میں اسے قبول کر چکی ہوں۔ مگر اب مجھ میں اب بھی نہیں کہ تمہارے بار بار کے ان حملوں کا مقابلہ کروں۔“ سعد حسن کی سمت سے اظہار ہوئے وہ بہت نیم جاں نظر آ رہی تھیں۔ ویران آنکھوں میں ایک لمحے میں ایک انجانی سی بات آن رہی تھی۔

”میں تمہارے ان فضول کے ہتھکنڈوں سے تنگ آ چکی ہوں۔ کچھ نہیں چاہتی ہوں میں تم سے۔ بس میرے بچوں کے ساتھ۔ میرے لئے میرے بچوں کا سکھ اور میرے گھر کا سکھ بہت معنی رکھتا ہے۔“ فارحہ چہرے کا رخ پھیرے پوری طرح مضطرب نظر آ رہی تھیں۔

سعد حسن بخاری مسکرا دیئے تھے۔

”کون سا گھر فارحہ!۔۔۔ کون سے گھر کا سکھ؟۔۔۔ وہ گھر تو کب کا ٹوٹ چکا جس کے سکھ کی بات کر رہی ہو۔ تمہیں نہیں لگتا یہ بہلا وہ بہت بودا اور فضول ہے؟“

فارحہ نے سعد حسن بخاری کی سمت دیکھا تھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ پہلو میں کھڑے چہرے کی دلربائی لہ رہی تھی۔

”میں بات جتانے کے لئے تم اسے یہاں لائے ہو؟“ مدہم لہجے میں شگفتگی بے حد واضح تھی۔ آنکھوں کے کنارے جھینگنے لگے تھے۔

”میں بات سعد حسن!۔۔۔ یہی بات جتانے کو تم یہاں اس کے ہمراہ آئے ہونا کہ میرا سب کچھ نہ کھو چکا ہے اور اب میں خالی ہاتھ ہوں۔ کچھ نہیں رہا میرے پاس اب اور۔“ ان کے حوصلے جیسے ٹوٹنے لگے تھے۔ شاید تبھی وہ بغیر مزید کچھ کہے چپ ہو کر سرفنی میں ہلانے لگی تھیں۔ پھر ہمت کر کے

”میں سعد حسن بخاری! میں اب بھی اتنی ہی مضبوط ہوں، اتنی ہی با حوصلہ ہوں۔ کیونکہ میرے پاس سب کچھ ہیں جو میری سب سے بڑی طاقت ہیں۔ مگر تم..... تم بے حد کمزور ہو میری نظر میں سعد حسن!

کیونکہ میں تمہیں خالی ہاتھ دیکھ رہی ہوں۔ تمہیں نہیں لگتا سعد حسن! تم یہاں میرے پاس اپنے اہلکار ایسی ہی غلطی کی تسکین کرنے آئے ہو۔“

”شٹ اپ فارحہ! — آئی سے شٹ اپ۔“ سعد حسن بخاری نے مدہم مگر کسی قدر سخت لہجے کہا تھا۔ چہرے کا تناؤ بہت بڑھ چکا تھا۔ دونوں کے درمیان کی تکرار بڑھ رہی تھی۔ جب انہیں بخاری کی نگاہ ان کی سمت اٹھی تھی۔ اسے موقع کی نوعیت سمجھنے میں قطعاً بھی دیر نہیں لگی تھی۔ بہت ہر سے وہ آگے بڑھا تھا۔

”وہاٹ سپینڈی؟“

مگر فارحہ کچھ نہیں بولی تھیں۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھا تھا پھر فوراً ہی منکر وہاں نکلتی چلی گئی تھیں۔

انہاں حسن بخاری نے باپ کی طرف فقط خاموش نظروں سے دیکھا تھا اور بنا کچھ کہے وہاں سے گیا تھا۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا جب اس کے قریب آن بیٹھی تھی۔ اس کا دل کافی کاگ بڑھایا تھا۔ پھر بہت دھیسے سے مسکرا دی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ شہتہ انگریزی میں دریافت کیا تھا۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے جواباً اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے سر نگیں میں بلا دیا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ لبوں پر بڑی رسمی سی مسکراہٹ تھی۔ ”تمہیں لگا میں کچھ سوچ رہا ہوں؟“ براہ راست

کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ گی نے اس کی سمت بہ غور دیکھا تھا پھر مسکرا دی تھی۔

”میرے بارے میں سوچ رہے تھے؟“ انداز میں کسی درجہ شرارت تھی اور سردار سبکتگین حیدر لغاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”کیا تم سمجھتی ہو کہ مجھے تمہارے متعلق سوچنا چاہیے؟“

”نہیں سوچنا چاہتے ہو؟“ انسا سوال کر دیا تھا۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”نہیں۔“ صاف انکار تھا۔

مگر گی اس کی سمت بہ غور دیکھتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”آر یوشیور؟“

”آف کورس۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے بڑے بے تاثر انداز میں شانے اچکا دیئے تھے۔

مسکرا دی تھی۔

”تھینک یو دیری مچ۔ یعنی دل کی گہرائی سے شکریہ۔“ وہ وضاحت دیتی ہوئی مسکرائی تھی۔

”مگر یہ شکریہ تھا کسی بات کے لئے؟“

گی نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر دلکشی سے مسکرا دی تھی۔ ”مجھے نہ سوچنے کے لئے۔“ مدہم لہجے میں ہلکے شانے اچکائے تھے۔ انداز کسی قدر بے نیازانہ تھا۔ اور سردار سبکتگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”مسکرا کیوں رہے ہو اب؟“

”سوچ کر کہ جس نے تمہیں چاہا وہ کیسا ہوگا؟“

”گی کے لبوں کی مسکراہٹ ایک لمحے میں معدوم ہوئی تھی۔ آنکھوں کی جوت ایک لمحے میں بھیجی تھی۔

”اپ بپ ہوئی تھی وہیں بہت آہستگی سے چہرے کا رخ بھی پھیر گئی تھی۔

”بہت چاہتی ہو اسے؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے بہ غور اس کے چہرے کو پڑھا تھا۔ گی نے ایک سے دیکھا تھا پھر نگاہ پھیر لی تھی۔

”گین! بہتر نہ ہوگا اگر ہم اس سلسلے میں کوئی بات نہ کریں؟“

”تم اس ذکر سے بچنا چاہتی ہو؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے بہ غور دیکھا تھا۔ وہ کچھ بھی

بارے بغیر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ تبھی سردار سبکتگین حیدر لغاری بہت دھیسے سے مسکرا دیا تھا۔

”ڈرٹی ہو؟“ دھیسے لہجے میں دریافت کیا تھا۔ گی نے اس کی جانب دیکھا تھا پھر بہت آہستگی سے سر

ت میں بلا دیا تھا۔

”ہاں۔ کہیں ٹوٹ کر نکھر نہ جاؤں۔“

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کی سمت دیکھا تھا، پھر مسکرا دیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ گی چونکی تھی۔

”سوچ رہا تھا۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔

”کیا؟“ گی نے سوالیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

”یہی کہ محبت کا کیا واقعی کوئی وجود ہے؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری کی آنکھوں میں جہاں حیرت تھی

بلاؤں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی اور گی نے اسے بہت حیرت سے دیکھا تھا۔

”تم محبت پر واقعی یقین نہیں رکھتے گین؟“

اور سردار سبکتگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”تم کیا سمجھتی ہو؟ کیا محبت کی واقعی کوئی وقعت ہے اس زمانے میں گی؟ آئی مین اس دور میں؟“

”تمہیں کیا لگتا ہے گین؟ کیا نہیں ہے؟“ گی نے کسی درجہ حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ سردار

سبکتگین حیدر لغاری نے اس کی جانب دیکھا تھا پھر شانے بہت بے نیازی سے اچکاتے ہوئے مسکرا دیا

”میں نہیں جانتا۔ مگر میں نے محبت کو کبھی بھی یہاں وہاں اپنے ارد گرد چلتے پھرتے نہیں دیکھا۔ کیا تم

نہ دیکھا ہے؟“ وہ غیر سنجیدہ انداز میں مسکرا رہا تھا اور گی تاسف سے سر نگیں میں ہلانی لگی تھی۔

”مجھے یقین نہیں ہو رہا گین! کیا تم واقعی محبت سے منکر ہو؟“ وہ واقعی حیران ہی اور سردار سبکتگین حیدر

لغاری جانے کیوں اس کے انداز پر مسکرا دیا تھا۔

اور مجھے حیرت ہو رہی ہے، تم محبت کی اس درجہ حامی ہو۔ مجھے تو لگ رہا ہے تم میں جو ایسی

آگئی ہے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ ”اور مجھے لگتا ہے کہ مجھے اب تم کوگی کی بجائے جو لیت کہہ کر بلانا ہوگا۔ گلیوں میں بال کھولے پھرتی بے قرار کتھاسی لڑکی۔ محبت کی انگلی تھامے، دور تک چلتی ہوئی سوچ کر ہی محظوظ ہو رہا تھا۔ مگر گی اس کی شرارت پر مسکرائی نہیں تھی۔ تبھی وہ بولا تھا۔

”کم آن گی! نکل آؤ اس دیوانے پن سے باہر۔ کیونکہ روم کی گلیوں میں آنکھوں میں دیرانی لے کر کھولے، بے قراری سے گھومتا پھرتا اور رویو رویو پکارتا وہ کریکٹر اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ صرف شیکسپیر جیسے دیوانے اور جذباتی شخص کے ذہن کا شاخسانہ تھا۔“ وہ اپنی دانست میں اس کی نظروں دور کر رہا تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

”میں تمہاری بات مان بھی لوں گین! تو کیا فرق پڑتا ہے؟ حقیقت جو ہے وہ بدل تو نہیں جائے گی اس کا انداز کسی قدر ہڑتاسف تھا اور سردار سبکتگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”نہیں ماننا تو مت مانو۔ مگر تم میری سوچ نہیں بدل سکتیں۔“

گی نے اسے بہ غور دیکھا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ وہ مسکرایا تھا۔ گی بھی جواباً مسکرا دی تھی۔

”دیکھ رہی ہوں سردار سبکتگین حیدر لغاری! کیا.... کیا واقعی تمہیں کبھی محبت نے نہیں گھیرا، کبھی ان۔ تمہارے اندر پڑاؤ نہیں ڈالا؟“

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے کوئی وضاحت نہیں دی تھی۔ مگر گی مسکرا دی تھی۔

”کہیں یہ تمہاری شخصیت کا رعب تو نہیں کہ محبت تمہارے قریب کبھی پہنچی ہی نہیں؟ سردار سبکتگین حیدر لغاری! خود کو اتنا بھی مت بناؤ کہ تم زندگی کے اصل رنگ کو ہی نہ سمجھ سکو۔ خاص بننے کا اپنا ہی ایک لطف ہے۔ مگر کبھی کبھی عام بن جانا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔“

اور سردار سبکتگین حیدر لغاری جواباً مسکرا دیا تھا۔ گی نے بہ غور اس کے چہرے کو دیکھا تھا، پھر مسکرا دیا تھا۔

”ایک بات پوچھوں گین؟“

”ہوں۔“

”وہ کون ہے جس کے لئے تم اس روز اتنا پریشان ہو رہے تھے؟“

گی کا سوال بہت غیر متوقع تھا۔ شاید تبھی سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے کسی قدر چونک کر دکھا تھا۔

”تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”تمہیں اچھا نہیں لگا؟“ گی نے اسے ندامت سے دیکھا تھا۔ ”دراصل میں نے تمہارے چہرے ساتھ دیکھا ہے۔ میں نے کبھی اس سے قبل پوچھا نہیں اور شاید مجھے جاننے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مگر جس طرح تم اس روز اس کے لئے پریشان ہو رہے تھے وہ بہت حیران کن تھا۔ ایسا کوئی کس کی بہت

لے ہی کر سکتا ہے۔“

گی کہہ رہی تھی اور سردار سبکتگین حیدر لغاری بہت بے تاثر انداز میں چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔

گی نے اسے جب ہو کر دیکھا تھا۔ تبھی سردار سبکتگین حیدر لغاری اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”جا رہے ہو؟“ گی نے مدہم لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”ہوں۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ گی نے اسے کسی قدر بے قرار نظروں سے دیکھا تھا۔

”کچھ کہنا چاہتی ہو؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری جیسے اس نگاہ کو پڑھ رہا تھا۔

”گردن بہت ہولے سے نفی میں ہلی تھی۔ خود کلامی کا سا کوئی انداز تھا اور اگرچہ سردار سبکتگین حیدر

لغاری اس لفظ کا مفہوم نہیں جانتا تھا مگر جانے کیوں مسکرا دیا تھا۔ گی چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”مت جاؤ، ابھی کہہ رہی ہو اور نظریں بھی پھیر رہی ہو۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے کہا تھا اور وہ

پران ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔ مسکراہٹ کچھ گہری ہو گئی تھی۔

”جا رہا ہوں۔ مگر پھر آؤں گا۔ مجھے خدا حافظ نہیں کہو گی؟“ اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

”بیونا۔“ گی کا لہجہ مدہم اور بجا بجا سا تھا مگر سردار سبکتگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”گلدباؤ۔“ ہولے سے ہاتھ ہلا کر وہ پلٹا تھا اور پھر باہر نکلنے لگا تھا۔

عفتان علی خان، اوزی سے مل کر نکل رہا تھا۔ جب بیرونی بیڑھیوں پر ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھی

انابہ شاہ پر نگاہ پڑی تھی۔ قدم خود بہ خود رک گئے تھے۔ وہ بہت آہستگی سے اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

انابہ شاہ نے کسی قدر چونک کر اسے دیکھا تھا۔ عفتان علی خان بہت رسمی سے انداز میں مسکرایا تھا۔

”اچھے دوستوں کو کوئی اس طرح پریشان کرتا ہے؟“ مدہم لہجے میں دریافت کیا تھا۔ انابہ شاہ بہت

بے گتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔

”پریشان؟ میں نے کسے پریشان کیا ہے؟“ مدہم لہجے میں حیرت بہت واضح تھی۔ وہ اس لمحے عفتان

لغاری کی سمت دیکھ رہی تھی اور عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”اوزی کو۔ انابہ شاہ! تمہیں نہیں لگتا تم اس کے ساتھ کچھ غلط کر رہی ہو؟“

انابہ شاہ نے اسے خاموشی سے دیکھا تھا پھر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”اوزی کی عادت ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہونے کی۔“

”اور تم؟“ عفتان علی خان نے اس کی سمت اشارہ کیا تھا۔ انابہ شاہ نے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”تمہیں کس نے کہا عفتان علی خان! کہ میں پریشان ہوں؟“

”انہما تو تم پریشان نہیں ہو؟“ وہ مسکرایا تھا۔ انابہ شاہ لب بلبھیج کر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ خاموشی

پہر چلنے لگی تھی۔ عفتان علی خان نے اسے دیکھا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ پر اپنا مضبوط

پہر کر دیا تھا۔

”آئی ایم سوری انا بیہ شاہ! لہجہ مدہم تھا۔

اور وہ بے حد چونک کر اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ انا بیہ شاہ کچھ نہیں بولی تھی اور عفتان علی خان کی سمت خاموشی سے دیکھتا ہوا نظر پھیر گیا تھا۔

”ابھی تک ہمارے درمیان کوئی رشتہ استوار نہیں ہوا ہے انا بیہ شاہ! کوئی ربط نہیں بنا ہے۔ جوہر کا کوئی نام بھی نہیں ہے۔ نہ دوستی، نہ ہی دشمنی۔ مگر انا بیہ شاہ! میں پھر بھی تمہارے لئے کچھ حاصل کر لوں۔ تمہارے متعلق خاص رنگ سے سوچتا ہوں۔ تمہیں خاص زاویے سے دیکھتا ہوں۔ تمہارے ہاتھ، تمہارے ڈکھ، تمہاری ہنسی، تمہاری خوشی، تمہارا افسردہ ہونا یہ سب بہت معنی رکھتا ہے میرے لئے۔ شاہ! میں اس ربط کا کوئی مفہوم سمجھ نہیں پاتا مگر اس ربط کو بہت واضح انداز میں محسوس ضرور کرتا ہوں۔“ لہجے میں وہ کیسے کیسے انکشافات کر رہا تھا اور انا بیہ شاہ اسے چپ چاپ دیکھ رہی تھی۔

”انا بیہ شاہ! مجھے وہ سارے رنگ بھی سمجھ میں نہیں آتے۔ مگر میں انہیں اپنے ارد گرد دیکھتا ہوں ضرور ہوں۔ سب زاویے، سبھی حاشیے، انا بیہ شاہ! ان سب کا سلسلہ تم سے کیوں جاملتا ہے؟ میں تمہارے متعلق خود کو سوچنے سے باز نہیں رکھ پاتا۔“ اس کا مدہم لہجہ کتنے رنگوں سے بھرا ہوا تھا اور انا بیہ شاہ کس درجہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم جب میری کچھ لگتی بھی نہیں ہو، ہمارے درمیان کوئی ربط، کوئی تعلق ہے ہی نہیں تو پھر یہ انا بیہ شاہ؟۔۔۔ پھر یہ سب کیوں؟۔۔۔ ایسا کیوں انا بیہ شاہ؟“ کتنے سوال تھے اس لہجے میں۔ آنکھوں کی پیش کس درجہ بڑھ گئی تھی۔ کتنی بے قراری ہو کر آئی تھی اور انا بیہ شاہ ایک پل میں چہرے کا پھیر گئی تھی۔ عفتان علی خان بہت دھیسے سے مسکرا دیا تھا۔

”میرے پاس اس رشتے کو دینے کے لئے کوئی نام نہیں ہے انا بیہ شاہ! اور میں جانتا ہوں تم کو معاملے میں خود کو بہت بے بس پاتی ہو گی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس ربط کا کوئی نام نہیں یا یہ ربط معنی ہے۔ بعض اوقات بہت سی چیزوں کے مفہوم سمجھ میں نہیں آتے۔ بہت سی باتیں عام فہم نہیں ہوتیں وہ بے معنی نہیں ہوتیں۔ انہیں یوں بے سبب جان کر چھوڑ دینا دانش مندی نہیں۔ بہت سی چیزیں مانگتی ہیں، وقت چاہتی ہیں، اپنا آپ منوانے کے لئے اور باور کرانے کے لئے۔ دوستی اور دشمنی کو لگانا دینا چاہئے۔ وقت دینے سے بہت سے مدہم رنگ بھی گہرے ہو جاتے ہیں اور وہ کچھ بھی واضح ہو جاتا جو اس سے قبل واضح نہیں ہوا ہوتا۔ بہت مدہم سی مسکراہٹ عفتان علی خان کے لبوں پر تھی۔ مگر انا بیہ شاہ چہرے کا رخ پھیرے خاموشی سے بیٹھی رہی تھی۔ عفتان علی خان نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر مسکرا دیا تھا۔

”پتہ نہیں تمہاری لوجک کیا ہے انا بیہ شاہ! مگر میں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ شہزادہ خواہش اپنے اندر پاتا ہوں۔ دوستی نہیں، دشمنی بھی نہیں مگر اس خاموشی میں بھی کچھ کہنے کو دل چاہتا ہے شاید تمہیں مجھے سننا اچھا نہیں لگتا ہو گا مگر مجھے تم سے کہنا بہت اچھا لگتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے انا بیہ شاہ تم سے بہت سی باتیں کروں۔ بہت سی باتیں۔ معنی، بے معنی بہت سی باتیں۔ کچھ کو تم سمجھو، کچھ نہ سمجھو۔“

”کہنا چلا جاؤں۔“ وہ عجب دیوانگی سے کہتے ہوئے مسکرایا تھا پھر سرنگی میں ہلانے لگا تھا۔ انا بیہ شاہ اس لئے ہے کہ اوزی کی طرح میرا کوئی اتنا اچھا دوست نہیں ہے۔ اوزی از رنگی اے لگی ہم اس کی دوست ہو۔ اس کے ساتھ ہو۔“

انا بیہ شاہ اس کی سمت خاموشی سے دیکھنے لگی تھی۔ عفتان علی خان نے اس کی سمت رنگی آنکھوں کو دیکھا پھر مسکرایا تھا۔

انا بیہ شاہ اسے کسی درجہ حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ عفتان علی خان اسے اس طرح ساکت چھوڑتا ہوا اٹھا تھا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔ انا بیہ شاہ کتنی ہی اس طرح بیٹھی رہی تھی۔

فارحہ سر جھکائے چپ چاپ سی بیٹھی تھیں جب اذہان حسن بخاری ان کے قریب آن رکھا تھا۔ فارحہ بھی نہیں چونکی تھیں۔ اسی طرح بیٹھی رہی تھیں۔ اذہان حسن بخاری نے انہیں دیکھا تھا پھر بہت آہستگی بگھوں کے بل جھک کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔ تب فارحہ چونکی تھیں اور اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”تم سوئے نہیں؟“ بہت مدہم لہجے میں دریافت کیا تھا مگر اذہان حسن بخاری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا تھا۔ تب فارحہ جانے کیوں بہت خاموشی کے ساتھ چہرے کا رخ پھیر گئی۔ اذہان حسن بخاری نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا تھا۔

”کی!۔۔۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ خود کو تنہا کیوں محسوس کر رہی ہیں؟ میں آپ کی اسٹریٹھ اپناتا ہوں می! میں آپ کو بے حوصلہ نہیں دیکھ سکتا۔“

فارحہ نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ دھر دیا تھا۔ ”میں جانتی ہوں میں کمزور نہیں ہوں۔ کیونکہ میرا بیٹا میری طاقت ہے۔ تم نے یہ سوچا بھی کیسے کہ میں زور پڑ رہی ہوں؟“

اذہان حسن بخاری نے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا تھا۔ پھر ان کی گود سے سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ عا کر ان کی آنکھوں کی نمی کو اپنے ہاتھوں سے پونچھے لگا تھا۔

”ایک طرف آپ مجھے اپنی طاقت بھی کہہ رہی ہیں اور دوسری طرف رو بھی رہی ہیں می؟“ ”رونے کے لئے فقط یہ جواز نہیں ہوا کرتا کہ کوئی کمزور ہے۔ رونے کے لئے بعض اوقات اور بھی تمنا سب بن جایا کرتی ہیں۔“ مدہم لہجے میں وضاحت دی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے ماں کی طرف دیکھا تھا پھر بے حد بے بسی کے ساتھ دوسرے ہی پل چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔

”کی! آپ کو لگتا ہے کہ رونے سے کسی مسئلے کا کوئی حل نکل سکتا ہے؟ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ یہ انا بیہ شاہ اپنے سے وہ درد باقی نہیں رہے گا؟“ مدہم لہجہ بہت شکستہ سا تھا۔

فارحہ بہت آہستگی سے نظریں پھیر گئی تھیں۔

”ہاں، اعتبار۔ یہی پوچھ رہی تھیں نا تم؟“ اس کی آنکھوں میں جھماکا تھا۔ ”نہیں، اعتبار تو واقعی تم کرنے لگی ہو اور مجھے اس بات کی خوشی بھی ہے میرب سیال! مگر تمہارا یا تو فیس ایسا ہے یا پھر تمہیں تاثرات چھپانے پر ملکہ حاصل ہے کہ کبھی کبھی کچھ مجھ میں نہیں آتا۔ میں تمہارے چہرے کو ٹھیک طور پر نہیں پاتا۔ اس کے باوجود کہ میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ تم ایسا کرو اپنے چہرے کو کسی قدر آسان کر لو۔ کبھی جو ایک پریشر کچھ میں نہیں آتے تو بہت اُٹھن ہوتی ہے۔“ سردار بنگلین حیدر لغاری نے انکشاف کیا پھر اعتراف، وہ کچھ نہیں پاتی تھی۔ شاید اسی لئے چند ثانیوں تک چپ چاپ ہی اس کی سمت دیکھتی رہی۔ سردار بنگلین حیدر لغاری نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر بہت آہستگی سے چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔ ”اس انداز سے مت دیکھو۔ ابھی توجہ کی اتنی پکی عادت نہیں پڑی ہے۔ کسی قدر کچا پکا بنا ہے۔“

میرب سیال نے دیکھا تھا، اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ یقیناً سنجیدہ نہ تھا۔ سردار بنگلین لغاری کا یہ کوئی نیا ہی روپ تھا جو اس گھڑی اس کے سامنے آ رہا تھا۔ وہ کسی قدر حیران کی چہرے کا پھیر گئی تھی۔

”ایک بات کہوں؟“ سردار بنگلین حیدر لغاری نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ میرب سیال نے اس سمت نگاہ نہیں کی تھی مگر انداز شاید اجازت دینے والا تھا۔ تبھی سردار بنگلین حیدر لغاری دھبے لہجے میں ہوا تھا۔

”مجھے اچھا لگا۔“

میرب سیال نے کسی قدر چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”کیا؟“ دھم لہجے میں دریافت کیا تھا۔

سردار بنگلین حیدر لغاری اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”تمہارا اپنے لئے پریشان ہونا، فکر مند ہونا۔“ دھم لہجے میں گہرے اسرار تھے اور میرب سیال اس سمت دیکھتی ہوئی بہت ہولے سے نگاہ پھیر گئی تھی۔ سردار بنگلین حیدر لغاری نے ایسا مضبوط ہاتھ بڑھا بہت آہستگی سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

”تھینکس..... تھینکس آلات۔“ لہجہ سرگوشی جیسا تھا۔ میرب سیال نے اس کی سمت دیکھا تھا۔

شاید رسم مسکرا دی تھی۔

”میں رشتوں پر اعتبار کر رہی ہوں سردار بنگلین حیدر لغاری! مجھے نہیں پتہ کہ آگے کیا ہونے والا ہے کیا ہوگا، مگر میں صرف اس اعتبار پر اعتبار کر رہی ہوں جو مجھے آپ نے اس روز روک فیملز پر ڈالا تھا۔“ دھم لہجے میں اس نے انکشاف کیا تھا۔ سردار بنگلین حیدر لغاری اس کی سمت چند لمحے خاموشی سے رہا تھا، پھر دھبے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ یہ سب ٹھیک نہیں، یا ایسا کر کے تم کوئی غلطی کر رہی ہو؟“ گہری آنکھیں اس

کو یہ غور دیکھ رہی تھیں۔ میرب سیال نے اس کی سمت ایک نگاہ کی تھی پھر بہت دھبے سے مسکراتے ہوئی میں ہلا دیا تھا۔

”میرب انہیں خیال کہ اعتبار کوئی غلطی ہے۔ اگر یہ غلطی ہوتی تو میں اسے قطعاً نہ دہراتی۔“ مختصر سا جملہ بچکانے کو تھا۔ سردار بنگلین حیدر لغاری لب بھینچ کر چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے گزری باتوں کو دہرا کر کچھ حاصل ہو سکتا ہے؟“ سردار بنگلین حیدر لغاری کا لہجہ پھر اہوا ہوا میرب سیال بہت دھبے سے مسکرا دی تھی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”سر برانز۔“ وہ اس کی سمت دیکھتا ہوا مسکرا دیا تھا۔ ”اعتبار ہے نا؟“ دھم لہجے میں دریافت کیا تھا اور میرب سیال سرانثات میں ہلاتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

”نہی گاڑی رکھی تھی اور سردار بنگلین حیدر لغاری نے اسے اترنے کا اشارہ کیا تھا۔“

”گاڑی ایک انتہائی خوب صورت گھر کے سامنے رکھی تھی اور اس کی نگاہیں خیرہ ہونے لگی تھیں۔ وہ محل لہجے، بہت سے پھولوں سے ڈھکا، سفید دودھیسا سا، وہ جیسے کسی خواب میں سفر کرنے لگی تھی۔ سردار بنگلین حیدر لغاری اس کے قریب آن رکھا تھا۔

”یہ.....!“ کسی قدر حیرت سے چونک کر اس نے اس گھر کی سمت اشارہ کیا تھا۔ سردار بنگلین حیدر لغاری نے اس کا رخ پھیر دیا تھا۔

”اے گھر میں قدم نہیں رکھو گی؟“

”ابنا گھر؟“ وہ دوسری بار چونکی تھی۔ سردار بنگلین حیدر لغاری اس کا ہاتھ تھامتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”اس پر رہنی!“ کہنے کے ساتھ ہی وہ اس کا ہاتھ تھام کر اندر بڑھنے لگا تھا اور وہ جیسے کسی خواب میں لہنے لگی تھی۔ اتنا بڑا گھر تھا اور اتنا ذلیل فرشتہ کہ وہ ساکت رہ گئی تھی۔

”اچھا لگا تمہیں؟“ سردار بنگلین حیدر لغاری ڈور پر سے پردے سرکاتے ہوئے مسکرایا تھا۔ بارش کے آگے لہنی بوندیں اس شیشے پر تھیں۔ شیشے سے باہر نظر آنے والا لان کا سبز بہت بھلا تاثر دے رہا تھا۔

”تھینکس! مگر اس کی کیا ضرورت تھی؟“

سردار بنگلین حیدر لغاری نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر وہ قدم کا فاصلہ عبور کرتا اس کے قریب آن رکھا۔

”میں رشتوں پر اعتبار کر رہی ہوں سردار بنگلین حیدر لغاری! مجھے نہیں پتہ کہ آگے کیا ہونے والا ہے کیا ہوگا، مگر میں صرف اس اعتبار پر اعتبار کر رہی ہوں جو مجھے آپ نے اس روز روک فیملز پر ڈالا تھا۔“ دھم لہجے میں اس نے انکشاف کیا تھا۔ سردار بنگلین حیدر لغاری اس کی سمت چند لمحے خاموشی سے رہا تھا، پھر دھبے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ یہ سب ٹھیک نہیں، یا ایسا کر کے تم کوئی غلطی کر رہی ہو؟“ گہری آنکھیں اس

”میرب انہیں خیال کہ اعتبار کوئی غلطی ہے۔ اگر یہ غلطی ہوتی تو میں اسے قطعاً نہ دہراتی۔“ مختصر سا جملہ بچکانے کو تھا۔ سردار بنگلین حیدر لغاری لب بھینچ کر چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے گزری باتوں کو دہرا کر کچھ حاصل ہو سکتا ہے؟“ سردار بنگلین حیدر لغاری کا لہجہ پھر اہوا ہوا میرب سیال بہت دھبے سے مسکرا دی تھی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”سر برانز۔“ وہ اس کی سمت دیکھتا ہوا مسکرا دیا تھا۔ ”اعتبار ہے نا؟“ دھم لہجے میں دریافت کیا تھا اور میرب سیال سرانثات میں ہلاتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

”نہی گاڑی رکھی تھی اور سردار بنگلین حیدر لغاری نے اسے اترنے کا اشارہ کیا تھا۔“

”گاڑی ایک انتہائی خوب صورت گھر کے سامنے رکھی تھی اور اس کی نگاہیں خیرہ ہونے لگی تھیں۔ وہ محل لہجے، بہت سے پھولوں سے ڈھکا، سفید دودھیسا سا، وہ جیسے کسی خواب میں سفر کرنے لگی تھی۔ سردار بنگلین حیدر لغاری اس کے قریب آن رکھا تھا۔

”یہ.....!“ کسی قدر حیرت سے چونک کر اس نے اس گھر کی سمت اشارہ کیا تھا۔ سردار بنگلین حیدر لغاری نے اس کا رخ پھیر دیا تھا۔

”اے گھر میں قدم نہیں رکھو گی؟“

”ابنا گھر؟“ وہ دوسری بار چونکی تھی۔ سردار بنگلین حیدر لغاری اس کا ہاتھ تھامتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”اس پر رہنی!“ کہنے کے ساتھ ہی وہ اس کا ہاتھ تھام کر اندر بڑھنے لگا تھا اور وہ جیسے کسی خواب میں لہنے لگی تھی۔ اتنا بڑا گھر تھا اور اتنا ذلیل فرشتہ کہ وہ ساکت رہ گئی تھی۔

”اچھا لگا تمہیں؟“ سردار بنگلین حیدر لغاری ڈور پر سے پردے سرکاتے ہوئے مسکرایا تھا۔ بارش کے آگے لہنی بوندیں اس شیشے پر تھیں۔ شیشے سے باہر نظر آنے والا لان کا سبز بہت بھلا تاثر دے رہا تھا۔

”تھینکس! مگر اس کی کیا ضرورت تھی؟“

سردار بنگلین حیدر لغاری نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر وہ قدم کا فاصلہ عبور کرتا اس کے قریب آن رکھا۔

”میں رشتوں پر اعتبار کر رہی ہوں سردار بنگلین حیدر لغاری! مجھے نہیں پتہ کہ آگے کیا ہونے والا ہے کیا ہوگا، مگر میں صرف اس اعتبار پر اعتبار کر رہی ہوں جو مجھے آپ نے اس روز روک فیملز پر ڈالا تھا۔“ دھم لہجے میں اس نے انکشاف کیا تھا۔ سردار بنگلین حیدر لغاری اس کی سمت چند لمحے خاموشی سے رہا تھا، پھر دھبے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ یہ سب ٹھیک نہیں، یا ایسا کر کے تم کوئی غلطی کر رہی ہو؟“ گہری آنکھیں اس

”محبت کوئی مہربانی نہیں میرب سیال! کہ اس کے لئے تعرض برتا جائے یا پھر مشکور ہوا جائے۔ ایک حق ہے، جسے بہت اعتماد کے ساتھ قبول کرنے کا فن آنا چاہئے۔“

پتہ نہیں فضا میں خشکی بہت زیادہ تھی یا پھر اس شخص کی قربت ہی میں کوئی اسرار تھا کہ وہ کسی قدر نگاہ تھی۔

سر جھکائے کھڑی وہ اس لئے سردار سبکدین حیدر لغاری کی توجہ کا مرکز تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری اس کے گرد اپنا حصار کچھ اور بھی تنگ کر دیا تھا۔ اس کی سانسوں کی تپش وہ اپنے چہرے پر محسوس کر تھی۔

”تمہیں نہیں لگتا موسم کچھ بدل رہا ہے اور محبت کا آغاز اب ہوا ہی چاہتا ہے؟“ یوں پراسکر اہٹ لئے وہ اس سے مخاطب تھا اور میرب سیال اپنی آنکھیں بہت زور سے میچ لگی تھی۔ اندر اپیل سی برا ہو گئی تھی۔ سارا وجود جیسے کسی طوفان کی زد پر آ گیا تھا۔ اس قربت سے جیسے سارا وجود چھٹا تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کے چہرے کی سمت بہ غور دیکھا تھا پھر جانے کیوں اس کے گرد اپنا حصار بہت آہستگی سے ہٹاتے ہوئے اسے اس قربت سے آزاد کر دیا تھا۔

میرب سیال نے اس کے اس اقدام پر کسی قدر شکھ کا سانس خارج کیا تھا۔ مگر نگاہ اٹھا کر دیکھی ہمت اس میں اب بھی نہ تھی۔

”میرب!“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے نگاہ شیشے کی سمت پھیرتے ہوئے باہر کا جل تھل نظر دیکھا تھا۔

”جی؟“ بہت مشکل سے اس نے حلق سے آواز برآمد کی تھی۔

”کیا تم اب بھی مجھ سے ڈرتی ہو؟“ مدھم لہجے میں پوچھا گیا سوال بہت آن ایکسیکلیڈ تھا۔ شاید میرب کی قدر چونک کر اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”اگر تمہارا ڈر کچھ دور ہو گیا ہو تو بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لئے کافی لے کر آتا ہوں۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری گویا ہوا تھا اور پھر یکدم ہی سڑک باہر نکل گیا تھا۔

میرب سیال سر جھکائے اسی طرح کھڑی رہی تھی۔

کیسا تھا وہ شخص۔۔۔ وہ کیوں اسے سمجھ نہیں پارتی تھی۔

”مجھے حیرت ہے اوزی!۔۔۔ تم میں اتنی بھی ہمت نہیں؟“ انا بیہ شاہ نے کسی قدر حیرت سے انا بیہ شاہ سے دیکھا تھا مگر اوزی چونکے بغیر مسکرا دیا تھا۔

”نہیں۔ میں کم ہمت نہیں ہوں انا بیہ شاہ! مگر میں کسی قدر محتاط ضرور ہوں۔ حالات میرے ہیں انہیں ہو سکے اس لئے انہیں میں مزید الجھانا نہیں چاہتا۔“ ایک نیم جاں سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر انا بیہ شاہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔

”کم ہمت اور بزدل، اور کسے کہتے ہیں اوزی؟“

بڑی ہنس دیا تھا۔

وہ جو عمل طور پر کاورڈ ہو۔ میں مصلحت پسند ہوں اس لئے تم مجھے کسی قدر رعایت دے سکتی ہو۔“ وہ بہا تھا اور انا بیہ شاہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”اتنے کم ہمت ہو کہ کسی کا سامنا بھی نہیں کر سکتے۔“

بڑی ناز بے لگت لئے تھے، اسے دیکھا تھا اور پھر بہت ملاہمت سے مسکرا دیا تھا۔

”تم چاہتی ہو کہ سب کچھ پہلے سے بھی زیادہ کھم جائے؟“

”نہیں۔۔۔ میں ایسا نہیں کہہ رہی۔ مگر فقط ایک رکی سی ملاقات کی ہمت تو تم میں ہونی چاہئے۔ یہ میں بڑی ہے اتنی ہی مختصر بھی ہے۔ کبھی کبھی ہم جن سے بچنے کے لئے بھاگتے ہیں نا دانستگی میں انہی سے بھاگتے ہیں اور تم تو پھر زیادہ فاصلے پر نہیں ہو۔ ایک ملک ہے، ایک شہر ہے اور.....“ انا بیہ شاہ گرج رہی تھی۔

بڑی مسکرا دیا تھا۔

”اور بچنے اور گھٹنے تو دوبارہ رنوگری کون کرے گا؟“ کسی قدر غیر سنجیدہ انداز سے اسے دیکھا تھا۔ مگر انا بیہ شاہ نے کارخ پھیر گئی تھی۔ اوزی شرارت سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”اگر رنوگری کا وعدہ کرو تو میں پیش قدمی کرنے کو تیار ہوں۔ لیوں پر مسکراہٹ تھی اور انا بیہ شاہ اسے دیکھنے لگی تھی۔

”ٹٹ اپ اوزی!“

گروہ ہنس پڑا تھا۔

ایسا ایک بات تو کفرم ہے، یہ لڑکیاں رنوگری بہت اچھی کرتی ہیں۔ چاہے رکھنے میں انہیں کمال ہے۔ زخمیوں میں ٹھیک ہوتا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔“

”ہم ایک اہم پہلو پر بات کر رہے تھے اوزی!“ انا بیہ شاہ نے اسے کسی قدر ناگواری سے دیکھا تھا اور اسے ہونے سے دیکھنے لگا تھا۔

”ہاں۔۔۔ تو کیا کروں؟ جاؤں اور گھٹنے ٹیک دوں؟ تمہارا ڈال دوں یا پھر فرار ہو جاؤں؟۔۔۔“

”اور زیادہ ہی غلط قسم کے مشورے نہیں دے رہی ہو تم مجھے؟ کسی دوست ہو تم، میری ریپوٹیشن خراب نہ لگے چکر میں ہو۔“ اوزی شرارت سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی اوزی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا اور بہت توجہ سے دیکھتے ملاہمت سے بولا تھا۔

”میری دوست! میری اچھی سی ہمدرد! ایسے نہیں ہوتا ہے۔ جو بیت گیا سو بیت گیا۔ دبی راکھ کو بولنے سے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ ہم اجنبی ہی بنے رہیں تو اچھا ہے۔ اس اتنے بڑے، اجنبی دیں میں تمہاری جگہ میں، اجنبی سے مقام میں۔ اگر کہیں بھولے سے مل بھی جائیں تو اجنبی بن کر، بنا کچھ کہے سب پر نگاہ کئے گزر جائیں۔ یہی مناسب ہے۔ چیز اپنی ہو تو استحقاق جمانا بھی اچھا لگتا ہے اور

دھونس جمانا بھی۔ مگر شے پرانی ہو تو اس کے جلوے بھی پرانے ہوتے ہیں۔ تمہاری سمجھ میں یہ آتی ہے بات نہیں آتی۔“ مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہلکے سے چپت لگائی تھی اور انا بیہ شاہ اسے دیکھ کر تھی۔ تبھی وہ مسکرایا تھا۔ ”پرانے مال پر نظر رکھنا کوئی اچھی بات تو نہیں انا بیہ شاہ! کتنی بری باتیں نکو ہوتی تھیں۔“ انداز شرارت سے پُر تھا۔ وہ غالباً ان ساری باتوں کو مذاق میں اُڑانا چاہ رہا تھا۔ انا بیہ شاہ اسے چپ چاپ دیکھا تھا، کہا کچھ نہیں تھا۔

اوزی نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے مسکرا کر شانے اچکائے تھے۔

”جو موڑ گزر گیا سو گزر گیا۔ پلٹ کر دیکھنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ دیکھوں گا بھی تو سارے منظر اور دھواں دھواں ملیں گے۔ پھر فائدہ؟“

”کس بات سے فائدہ نہیں؟“ دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے جب ایک تیسری آواز نے انہیں چو تھا۔ دونوں نے نگاہ کی تھی۔ عفنان علی خان ان کی سمت دیکھتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”تم لوگ کچھ خاص ڈسکس کر رہے تھے؟“

”ارے نہیں یارا! ہم میں ایسا کچھ خاص نہیں کہ کچھ خاص ڈسکس کریں۔ تم سناؤ، یہ چپکے چپکے کیسے مار دیا؟ آج شام کا تمہارا شیڈول تو خاصا صاف تھا نا۔ آئی سے بات ہوئی تھی صبح، تیار ہی نہیں آئیٹس جانا تھا؟“

عفنان کرسی کھینچ کر مسکراتے ہوئے بیٹھ گیا تھا۔ پھر ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

”ہاں۔۔۔ جانا تو تھا۔ مگر پاپا نے وہ اسائنمنٹ اپنے ذمے لے لیا۔ یونو ایکسپریس ازلدی گیم۔ سو ہم رد ہو گئے اور پاپا جی کو اپنی عمر اور تجربے کا فائدہ مل گیا۔“ وہ مسکرایا تھا۔

نگاہ اس چہرے پر گئی تھی۔ انا بیہ شاہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی اور عفنان علی خان کے لبوں کی ہلکا گہری ہو گئی تھی۔

”چائے کافی کچھ نہیں ملے گی؟“ براہ راست دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ انا بیہ شاہ نے اس کا دیکھا تھا۔ اٹھنے کا قصد کیا تھا تب ہی اوزی نے روک دیا تھا۔

”تم بیٹھو، کافی میں بنا کر لاتا ہوں۔“

”اپنی دوست کا اتنا خیال۔“ عفنان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”یارا دوست ہے نا۔ اور اس کی طبیعت یوں بھی ان دنوں کچھ بہتر نہیں۔ اگر کافی کی جگہ کچھ اور بنا تو؟“ اوزی مسکراتا ہوا پلٹا تھا اور اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔

عفنان علی خان اس کی سمت یہ غور دیکھنے لگا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس کی طبیعت کے متعلق غالباً تشریح ہوئی تھی۔

انا بیہ شاہ نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر سرٹلی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں، ایسا کچھ نہیں۔ ٹھیک ہوں میں۔ اوزی تو بس خواجواہ۔“ اس کا انداز سرسری تھا۔

مگر عفنان علی خان کی نظریں اس چہرے کا طواف کرنے لگی تھیں۔

بنا خیال رکھا کرو۔۔۔ خود سے اس درجہ لا پرواہی اچھی نہیں ہوتی۔“ مشورے سے نوازا تھا۔ وہ براکتائے ہوئے انداز میں اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

اوزی کی عادت ہے۔ کچھ نہیں ہوا مجھے۔ غور سے دیکھئے اور بتائیے، آپ کو لگتا ہے کہ مجھے کچھ ہوا ہے یا اکتائے ہوئے انداز میں کہا تھا اور عفنان علی خان مسکرا دیا تھا۔ نظریں یہ غور اس چہرے کو پڑی تھیں۔

”کیسے ممکن ہے کہ کسی پر ایک نگاہ کرو اور اس کے اندر کوئی طوفان برپا نہ ہو، وہ اپنا آپ نہ بھلا اس کی رو پھر بیکنے لگی تھی اور انا بیہ شاہ تھک کر جیسے چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”نہیں نہیں لگتا عفنان علی خان! تم بے معنی اور لالچی باتیں زیادہ کرتے ہو؟“ کسی قدر اکتائے انداز میں دریافت کیا تھا مگر وہ اس کی سمت دیکھتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”کیا کروں۔۔۔ ہوش باقی ہی نہیں رہتے۔ کچھ سوچوں تو با معنی بات بھی کروں۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ جو کد رہا ہوتا ہوں اس کی بھی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ جو دیکھ رہا ہوتا ہوں وہ بھی سب خواب خواب سا ہے۔ دل چاہتا ہے یہ خواب کبھی نہ ٹوٹے۔ یہ بے خودی سدا یونہی بنی رہے۔ مگر میں جانتا ہوں ایسا لٹا۔ سچ پوچھو تو یہ ہوش مندی کے لئے زیادہ ظلم ہیں۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ انداز بے حد غیر سنجیدہ تھا۔ انا بیہ شاہ کھینچ کر نظروں کا رخ پھیر گئی تھی۔

”تم نے سوچا کبھی؟“ بہت آہستگی سے دریافت کیا تھا۔

”کیا؟“ انا بیہ شاہ بے طرح چوکی تھی۔ عفنان علی خان نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر مسکرا دیا تھا۔

”ہمارے مابین کیا ہونا چاہئے۔۔۔ دوستی یا پھر دشمنی؟“ انداز میں شرارت تھی اور انا بیہ شاہ مسکرا دی

”مجھے کبھی کسی سے دشمنی رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور دوستی کے لئے میں بہت وقت لیتی

”تلاوت؟۔۔۔ دو، چار، چھ یا پھر دس، کتنے سال؟“ وہ مسکرایا تھا۔ انا بیہ شاہ اس کے انداز پر کی تھی۔

”لی الحال وقت کا تعین ممکن نہیں عفنان علی خان! زندگی بڑی ان پری ڈکنبل ہے اور دوستی اور دشمنی بھی زیادہ۔“ انا بیہ شاہ بولی تھی اور وہ اس کی سمت دیکھتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”اس میں اوزی کافی تیار کرتے ہوئے زور و شور سے گنگنا رہا تھا۔

اور جتنا بھی شو مجھ سے

لنا تیرے میں

باتو عادت سی ہے ایسے جینے میں

لکڑی سے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے

باتو زندہ ہوں میں اس نیلے آسمان میں“

عفتان علی خان اس کی سمت بہ غور دیکھنے لگا تھا۔ انا بیہ شاہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”دور جتنا بھی تو مجھ سے

پاس تیرے میں

اب تو عادت سی ہے ایسے جینے میں“

اوزی کی آواز متواتر ان تک پہنچ رہی تھی۔ عفتان علی خان نے بہت آہستگی سے اپنا مضبوط ہاتھ

کر اس کے نازک سے ہاتھ پر دھر دیا تھا۔ انا بیہ شاہ نے بے حد چونک کر دیکھا تھا۔ مگر عفتان علی خان عادت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان ست رنگی آنکھوں کو بہ غور دیکھنے لگا تھا۔

”میں اکثر سوچتا ہوں اس گزرتے ہوئے ماہ و سال میں کہیں کوئی دن ایسا ہے بھی کہ نہیں جوا

سنگ کچھ نئے رنگ باندھ کر میری طرف آئے گا اور مجھ سے کہے گا کہ لو جو کچھ تمہارا تھا وہ تمہیں آج

دیا، رکھو اپنی امانت اپنے پاس اور مجھے جانے دو۔ مگر میں پھر لوٹ کر آؤں گا، تمہارے لئے اس سے

کہیں زیادہ اپنے سنگ سمیٹ کر سوچتا ہوں ایسا ہونا بھی ہے یا کہ نہیں۔ ایسا ہو گا بھی کسی دن یا کوئی

کہیں یہ میرے خواب، میری خواہش سب بے معنی ہی نہ ہوں۔ یہ جو میں سب دیکھتا ہوں، سوچتا

سب کہانیاں ہی نہ ہوں کہ آنکھ کھولوں اور کچھ باقی بچے ہی نہ۔“ وہ تھک کر جیسے چپ ہو گیا تھا۔ پھر

دھیسے سے مسکرایا تھا۔

”انا بیہ شاہ! جو جہان خیالوں میں، خوابوں میں آباد ہوتے ہیں وہ حقیقت میں آباد کیوں نہیں ہوتے

ناممکن تو کچھ بھی نہیں۔ پھر اتنا کچھ بے معنی کیوں رہتا ہے؟ کیوں جاں سکتی ہے اور کچھ بھائی نہیں دیتا

انا بیہ شاہ سر بھکا کر بیٹھی تھی اور عفتان چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔ اوزی کا کافی لے آیا تھا۔

”ہیلو۔۔۔ کہاں غائب ہو تم دونوں؟۔۔۔ ایک ساتھ ہوتے ہوئے بھی اتنی خاموشی

مسکراتے ہوئے کافی کے کپ ان کے سامنے رکھے تھے۔ عفتان علی خان نے ان ست رنگی آنکھوں کو

تھا پھر مسکرایا تھا۔

”کبھی کبھی جو جتنا قریب نظر آتا ہے درحقیقت اتنا ہی دور ہوتا ہے۔ یہ حقیقت نہ سمجھ میں آئے

ہے۔“

عفتان علی خان اٹھا تھا اور پھر پلٹ کر وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔ اوزی نے انا بیہ شاہ کی سمت

تھا۔ مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

گھر دیکھنے کے بعد وہ واپس لوٹ رہے تھے جب سردار سبکتگین حیدر لغاری اس کی سمت دیکھنے

لگا گیا ہوا تھا۔

”تمہیں نہیں لگتا تم کچھ زیادہ ہی خاموش رہتی ہو۔۔۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں تو بہت بولنے والی ہوتی

ہیں۔“ اس کا تجزیہ کمال کا تھا۔ میرب نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر دھیسے سے مسکرا دی تھی۔

”ضروری تو نہیں کہ تمام لڑکیاں ایک جیسی ہی ہوں۔“

سبکتگین حیدر لغاری نے اس کی بات پر کچھ سوچتے ہوئے ہر خیال انداز میں سر ہلایا تھا۔

”ہاں۔۔۔ جیسے سبھی لڑکے بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ لیکن تم اتنی چپ چپ، کم صدم کم صدم ہو گی تو ہم

بہرے کو جانیں گے کیسے؟۔۔۔ تم میرے بارے میں کیسے جانو گی؟“

میرب سیال مسکرائے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

”ہاں کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

سبکتگین حیدر لغاری نے اس کی سمت دیکھا تھا، پھر سوچتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”تم سوال کر سکتی ہو۔“

”کیسے سوال؟“

”ایسے سوال جن کی مدد سے تمہیں جاننے میں مدد ملے۔“

”کیا ایسا کرنے سے ایک دوسرے کے متعلق جانا جا سکتا ہے؟“ میرب سیال کو کسی قدر حیرت ہوئی

تھی۔

”نہیں۔۔۔ شادی شدہ زندگی کا یہ میرا بھی پہلا ہی تجربہ ہے۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے

لہجے سے کہا تھا اور دونوں ہی مسکرا دیئے تھے۔ سبکتگین حیدر لغاری قدرے سنجیدگی سے گویا

کہا۔

”میرا نہیں خیال کہ میوچل انڈر اسٹینڈنگ کے لئے ان سب باتوں کا سہارا لینا ضروری ہے۔ یہ خود

لگا اٹھ ہوتی ہے۔ جیسے کہ میں تمہیں کسی قدر سمجھنے لگا ہوں۔ اسی طرح تم بھی یقیناً مجھے کسی قدر سمجھنے

لگاؤ گی۔“

میرب سیال کچھ نہیں بولی تھی۔ فقط خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

”تمہیں گفت پسند آیا؟“ براہ راست آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ہاں۔“ میرب سیال نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”اور میں؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری کا انداز کسی قدر مختلف تھا۔ لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی اور

الٹا میں۔۔۔۔۔۔ وہ یکدم ہی نگاہ چراگئی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی

تھی۔

”جھاؤ گی نہیں تو پتہ کیسے چلے گا؟“

”آپ کو یہ بات جاننے کی جلدی ہے۔۔۔؟“ میرب سیال نے جواباً ہر اعتماد انداز سے اس کی

تھا دیکھا تھا۔

”نہیں۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے سر نفی میں ہلایا تھا۔ سبکتگین حیدر لغاری نے

کہا۔

”مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔“

اس کی سمت دیکھا تھا پھر بہت ہولے سے نظر پھیر گئی تھی۔

”ایسا میں نے نہیں کہا اور یقیناً ایسا ہے بھی نہیں۔ بٹ اٹ ٹیکس ٹائم۔“ وہ پُر اعتماد لہجے میں بولی اور سردار سیکٹنگین حیدر لغاری اس کی سمت دیکھتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”تم جتنی پُر اعتماد بولنے میں نظر آتی ہو، خاموشی میں نہیں لگتی ہو۔“ تجزیہ کیا تھا۔ وہ کسی قدر حیرت۔ اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”آپ مجھے اس قدر بے وقوف اور کم عقل جانتے ہیں؟“ کسی قدر افسوس ہوا تھا کہ وہ اس کے تصور ایسا سوچتا ہے۔

سردار سیکٹنگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔ لیکن سمجھنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ لیکن تم چپ رہنے سے بولنا میں زیادہ عقل مند لگتی ہو۔“ عجیب رائے تھی۔ میرب سیال کے لبوں پر مسکراہٹ کھڑ گئی تھی۔

”کیا اب مجھے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں ذہن ہوں، بولتے رہنا ہوگا۔“

”ہاں۔۔۔ اس لئے بھی کہ مجھے تمہیں سننا اچھا لگے گا۔“

سردار سیکٹنگین حیدر لغاری نے سنجیدگی سے کہا تھا اور وہ حیران سی اس کی سمت نکلنے لگی تھی۔ مگر ہوا سیکٹنگین حیدر لغاری اس کی سمت سے نگاہ پھیر چکا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟۔۔۔ اتنے چپ چپ سے کیوں ہو؟“ ساہیہ خان نے اس کے ساتھ پتلے ہوا اسے بہ غور دیکھا تھا۔

اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت نہیں دیکھا تھا اور اسی طرح خاموشی سے چلتا رہا تھا۔

”اذہان حسن بخاری! کبھی کبھی خاموش رہنے سے اُلجھنیں اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ اور میں نکل چاہتی کہ تمہارے معاملے میں ایسا کچھ ہو۔“

اذہان حسن بخاری تب بھی کچھ نہیں بولا تھا۔ ساہیہ نے اس کی سمت نگاہ کی تھی۔

”زندگی میں بہت کچھ ہوتا ہے اذہان حسن بخاری! مگر اس طرح طاری کر لینے سے مسائل حل نہیں آجاتے۔ تم اگر مجھے کچھ نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ۔ مگر اس طرح چپ رہ کر مجھے اُلجھن میں بھی مبتلا کر دو۔“

اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت دیکھا تھا، پھر بہت دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔

”جانتے ہو اذہان حسن بخاری! جب میں یہاں آئی تھی اور پہلے دن تمہیں دیکھا تھا تو تم اس روز مجھے ایسے ہی لگے تھے۔ زندگی سے بہت ڈور۔۔۔ زندگی سے بہت خالی۔ مجھے لگا تھا رنگوں سے کبھی تھکا

واسطہ رہا ہی نہیں۔ رنگوں کو کبھی تم نے دیکھا ہی نہیں۔۔۔ بہت بے رنگ اور خالی لگے تھے تم مجھے۔ اور یہاں دل چاہا تھا، بہت سے رنگ بھر دوں تم میں۔ تمہارے اندر نئے احساس جگا دوں۔ تمہیں ایک نئے ذائقہ

دے دیکھنا سکھا دوں۔ نئے سلیقے برتنا سکھا دوں۔“ ساہیہ خان بولی تھی اور اذہان حسن بخاری اس کی

مسکرا دیا تھا۔

”ساہیہ خان! رنگ کتنے بھی گہرے ہوں، بالآخر اپنا تاثر کھو ہی دیتے ہیں۔ کیونکہ زندگی ان رنگوں کی ہمیشہ زیادہ گہری ہے۔ بے حد گہری، اپنے ہر موڑ پر بے طرح چونکا دیتی ہے۔“

مگر تم اسی طرح زندگی کے سامنے کم ہمت پڑتے رہو گے تو کیا مشکلات کا حل نکل آئے گا اذہان بخاری؟“ ساہیہ خان نے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”اذہان حسن بخاری بہت آہستگی سے چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔

”ساہیہ! مجھے کبھی نہیں لگا کہ میں کم ہمت اور کمزور ہوں۔۔۔ مگر جب میں خود سے وابستہ افراد کو کسی میں دیکھتا ہوں تب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کس قدر بے بس اور کمزور ہوں۔ میں ان لمحوں میں

کسی شے کا تدارک نہیں کر پاتا ہوں تو اور بھی شکستہ ہو جاتا ہوں۔ ایسا ہونا مجھے اور بھی توڑ جاتا ہے۔

یہ بھی کھرجاتا ہوں۔۔۔ خود اپنی جان پر مشکل ہو تو جھیلنا آسان ہے۔ مگر اپنے کسی بہت پیارے

انگلیف میں دیکھنا بہت مشکل ہے۔“ اس کا لہجہ مدہم اور کسی قدر شکستہ تھا۔

”ساہیہ نے اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔

”میرا اول چاہتا ہے ساہیہ خان! میرے پاس کوئی مٹر ہو۔۔۔ کوئی اسم ہو۔۔۔ میں اسے اس دم

لا دوں سب کچھ اچھا ہو جائے۔ کوئی جادو کی چھڑی ہو، اسے وقت پڑنے پر گھماؤں اور سب کچھ ٹھیک

کئے اور کوئی مشکل باقی نہ رہے۔“

”ساہیہ خان نے اسے دیکھا تھا۔ پھر مسکرا دی تھی۔

”اذہان حسن بخاری! کبھی کبھی تم مجھے بہت بچے سے لگتے ہو۔ بہت انوینٹ سے۔ جو دنیا کے

لوگوں سے خوفزدہ ہے اور ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ مگر جب کرنیں پاتا تو بہت ڈس

ہوتا ہے۔ یہ نہیں ایسا ہے بھی کہ نہیں مگر میں اتنا ضرور جانتی ہوں اگر ایسا نہیں بھی ہے تو ہر انسان

کو ایک بچہ ہوتا ہے جو خوفزدہ بھی ہوتا ہے اور وقت پڑنے پر بہادر بھی ہونا چاہتا ہے۔ اگر آپ بہادر

آگ ہیں تو صرف ایسا سوچنے سے ہی ہو سکتا ہے۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔

”اذہان حسن بخاری نے اپنی اس ہمدرد کو دیکھا تھا اور جانے کیوں مسکرا دیا تھا۔

”مجھے کچھ زیادہ ہی کیوں نہیں لے رہی ہو؟“

”اگر میں تمہیں نارمل بھی لوں گی تب بھی کچھ خاص فرق نہیں پڑے گا۔“ وہ شرارت سے مسکرائی تھی۔

”خوشی اس کا موڈ بحال ہو جانے کی تھی۔

”اذہان حسن بخاری نے اسے دیکھا تھا پھر بہت دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔

”ساہیہ خان! میں ہمیشہ سے ایسا نہیں ہوں۔“

”ہاں۔۔۔ تم ہمیشہ سے جیسے ہو، میں جانتی ہوں۔“ ساہیہ خان مسکرائی تھی اور اس کی سمت چاکلیٹ

پکڑ کر کھا رہا تھا۔

”پھر میں لینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ لو، چاکلیٹ کھاؤ اور کسی قدر ریلیکس ہو جاؤ۔“ اس کا انداز

بدستور شوخ تھا۔ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے چاکلیٹ لے لیا تھا۔
 ”اب یہ مت کہنا کہ اتنا میٹھا کھاتی ہوں اسی لئے موٹی ہو رہی ہوں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں میں ہوں
 ہرگز نہیں ہوں۔ اس لئے تمہارے چھینرنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ وہ مسکرائی تھی اور اذہان حسن
 بخاری کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”تمہیں کوئی بات زندگی میں مشکل نہیں لگتی؟ تم ہر شے کو اتنا ایزی کیسے لے لیتی ہو؟“

”کیونکہ میں جانتی ہوں اذہان حسن بخاری! میرے ایسا نہ کرنے سے بھی چیزیں اور ان کی نوبت
 جوں کی توں رہے گی۔ سو میرے خواہ مخواہ کے برڈن لینے اور پریشان ہونے سے جب کوئی فرق پڑنے
 نہیں ہے تو پھر میں ان باتوں کو اتنا ہیوی کیوں لوں؟ سو میرے دوست! ٹیک اسٹ لائٹ اینڈ میک
 لائف برائٹ۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ ہنس، مسکراؤ اور سب کچھ بھول جاؤ۔ یاد رکھو صرف وہ باتیں جو کام
 ہیں۔“ وہ چاکلیٹ کی بائٹ لیتے ہوئے مسکرائی تھی۔

اذہان حسن بخاری نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ تبھی اس کا پرسنل ڈسچٹ سیل بجا تھا۔ اس
 فوراً کال ریسیو کی تھی۔

”ہیلو۔۔۔ ماہا! کیا ہوا؟“

”بھائی وہ.....“ ماہا دوسری طرف بہت پریشان لگ رہی تھی۔

”ماہا!۔۔۔ ہیلو ماہا!۔۔۔ ٹیل می، کیا ہوا ہے؟ تم رو کیوں رہی ہو؟“

اذہان حسن بخاری کا سارا سون ہوا ہو چکا تھا۔

دوسری طرف ماہا بہت پریشان لگ رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری کے چہرے کی کیفیت یکسر بدل
 تھی۔

”ماہا! ڈونٹ وری۔ میں آ رہا ہوں۔“ بہت سرعت سے اذہان حسن بخاری نے سیل فون کا سلسلہ

کیا تھا اور اسی تیزی سے گاڑی کی سمت بڑھا تھا۔

”اذہان! کیا ہوا ہے؟“ ساہیہ خان نے اسے بہت پریشانی سے دیکھا تھا۔ اذہان حسن بخاری:

پلٹ کر اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر سرنٹی میں ہلا دیا تھا۔

”پتہ نہیں۔ مگر ماہا بہت پریشان ہے۔ میرا گھر پہنچنا بہت ضروری ہے۔“

”میں بھی ساتھ چلوں؟“ ساہیہ نے غلٹ سے اس کی سمت بڑھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ مگر ان:

دروازہ کھولتے ہوئے سرنٹی میں ہلایا تھا اور پھر اسی سرعت سے گاڑی میں بیٹھا تھا اور گاڑی بھاگنے

تھا۔ ساہیہ نہیں جانتی تھی کہ دوسری طرف صورت حال کیا تھی مگر وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔ یقیناً

جس کے باعث ماہا اتنی پریشان تھی۔



کبھی کبھی ذہن جتنا سوچتا ہے، اتنا ہی الجھتا جاتا ہے اور وہ دانستہ طور پر کچھ بھی سوچ کر الجھنا نہیں
 سکتی مگر بعض باتوں پر اختیار نہیں ہوا کرتا۔ اور وہ بھی سوچوں کے اس چال سے خود کو بچا نہیں پارہی
 رہ رہ کر ذہن اس طرف جارہا تھا۔ رہ رہ کر سارے منظر نگاہ میں گھوم رہے تھے۔ رہ رہ کر ساری باتیں
 ذہن بکڑ رہی تھیں۔ وہ لمحے بھر کی قرتیں، وہ حدتیں، وہ شدتیں، بھلائے نہیں بھول رہی تھیں۔ اور
 ہر بیالیس بجھ نہیں پارہی تھی کہ ایسا کیوں ہے؟
 شاید وہ شخص اسے کسی قدر حیران کر رہا تھا۔ وہ اس کی باتوں، اس کی پرسنالٹی کے سحر میں کچھ الجھ رہی
 تھی۔ کچھ تھا جو باعث اضطراب تھا۔

وہ رات کے اس پہر، واک کرتے ہوئے پلٹی تھی جب اپنے سامنے سردار سبکتگین حیدر لغاری کو کھڑا
 دیکھا کہ حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ یقیناً اسے یہ خواب کا کوئی سلسلہ لگا تھا یا پھر اپنا کوئی وہم۔ تبھی سر جھٹکتے ہوئے
 اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ جانا چاہا تھا جب اس شخص نے بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ کو اپنی
 طرف میں لے لیا تھا۔ میرب سیال بری طرح چونکی تھی۔ ٹھٹکی تھی۔ چند ثانیوں تک یونہی کھڑی رہی تھی۔
 بہت آہستگی سے نگاہ پھیر کر اس کی سمت دیکھا تھا اور اس کے روبرو ہونے کا یقین کیا تھا۔

”آب؟“ وہ حیرت سے بولی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری بہت دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔

”تمہیں نہیں لگتا، مجھے خواب جان کر تم کوئی غلطی کر رہی ہو؟“

میرب سیال نے سردار سبکتگین حیدر لغاری کی سمت دیکھا تھا پھر بہت مدہم انداز سے مسکرا دی تھی۔

”میں حقیقتوں کو خواب سمجھنے والوں میں سے نہیں۔ میرا خیال ہے مجھے خواب اور حقیقت میں امتیاز کرنا

فرب آتا ہے۔“ خود کو پر اعتماد ظاہر کرنا چاہا تھا مگر سردار سبکتگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”میں جانتا ہوں تم بہت سیانی ہو۔ خوابوں کو حقیقت سمجھنے کی غلطی تم یقیناً نہیں کر سکتیں۔“

”یہ تعریف سے کوئی یا پھر.....؟“ میرب سیال نے مسکراتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

”اگر آؤ ان کہوں تو کیسا لگے گا؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری جو اب مسکرایا تھا اور میرب سیال لب بھینچ

لگا رہا تھا۔

”مجھے حیرت نہیں ہوگی۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کوئی بھی رائے قائم کرنے میں ہر فرد آزاد ہے۔“

واقعی حیران کر رہا تھا۔ وہ تقریباً اعتبار متعقد کر رہی تھی۔ اس پر اعتبار کر رہی تھی۔ مگر اس درجہ، وہ
اسی کھڑی تھی۔ جب سردار سبکتگین حیدر لغاری اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر نیوں تک
پٹا تھا اور ایک خاص لمس نے اس کے اندر بہت سے احساس ایک ساتھ بیدار کر دیئے تھے۔
”وہ گھر تمہارے لئے ہے میرب! میرے سارے خوابوں سمیت۔“ کیسا یقین بول رہا تھا اس کے
ہم۔ مگر میرب سیال جانے کیوں اس لمحے چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”ہاں میرب! اب میں خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے بارے میں خواب۔ کیا مجھے تم
زنت دوگی کہ میں تمہارے متعلق کوئی خواب دیکھ سکوں؟“
سردار سبکتگین حیدر لغاری کی قریبیں کچھ ٹی کہاں کہاں کہہ رہی تھیں اور میرب سیال اس لمحے آنکھیں بہت
اٹکھتی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا پھر دھیسے سے مسکرا دیا تھا۔ اس پر سے
گرفت ہلکی کر دی تھی۔ میرب سیال کی جیسے جان میں جان آئی تھی۔
اس نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

”میرب! یہ غور سکتے ہوئے پکارا تھا۔

”ہوں۔“ میرب سیال نے دیکھے بغیر کہا تھا۔

”ایک بات کہوں؟“

”جی۔“

”اعتبار آنے میں چاہے دیر لگے مگر یہ اعتبار بہت مضبوط ہونا چاہئے۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری کی
لڑن اس صبح چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے مسکرائی تھیں۔ ”میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ ہم اب چلیں
لے تم اپنی پیکنگ مکمل کر لو۔ کچھ شاپنگ وغیرہ کرنا ہو یا دوستوں کے لئے گفتگو لینے ہوں تو فہرست بنا کر
ٹھنڈول سے آگاہ کر دینا۔ اوکے؟“ بہت کیرنگ انداز میں دریافت کیا تھا۔

”اوکے۔“ میرب سیال بہت دھیسے سے مسکرا دی تھی۔

اسے خدشہ تھا کہ کچھ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ اور یہی ہوا تھا۔ پاپا نے وہی کیا تھا اور می کی طبیعت یکدم ہی
بلونے لگی تھی۔

اڑھان حسن بخاری صورت حال تو نہ جانتا تھا مگر اسے معلوم تھا وہی معمول کی کوئی چٹرب ہوگی اور
انرا تعداد اس حد تک بڑھا ہوگا کہ می کی برداشت جواب دے گئی ہوگی۔ پاپا بھی وہیں تھے مگر وہ فوری طور
بالک سے کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ مگر یہ ضرور ہوا تھا کہ اس کے اندر کا تناؤ بے حد بڑھ گیا تھا۔ فیض چاچومی کو
لڑنٹ دے کر باہر نکلے تھے، تبھی وہ ان کی سمت بڑھا تھا۔

”چاچو!“ اس کا اندازہ بہت تھا کہ ماندہ تھا اور فیض حسن بخاری نے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ دھر دیا تھا۔
”سب کچھ ٹھیک ہے۔ ڈونٹ وری۔ بی بی کچھ بڑھ گیا تھا۔ مگر اب سب کچھ انڈر کنٹرول ہے۔“

سردار سبکتگین حیدر لغاری چند ثانیوں تک اسے خاموشی سے بلکہ کسی قدر دلچسپی سے دیکھتا رہا تھا۔
”تمہارے متعلق کوئی بھی رائے حتمی طور پر قائم نہیں کی جاسکتی۔ جو بھی اخذ کرتا ہوں، بہت جلد
مسترد کرنا پڑتا ہے۔ تم بہت ان پری ڈکٹبل ہو۔“
”ان پری ڈکٹبل یا انفلکچوئیکل؟“ میرب سیال بہت ملامت سے مسکرائی تھی۔ پُر اعتماد آنکھوں
بہت اعلیٰ روشنی کا ڈیرہ تھا۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے دیکھا تھا، پھر مسکرا دیا تھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے۔ تم زیادہ حیران کن ہو یا پھر زیادہ ذہین؟“

”ہر ذہین، حیران کن ہی ہوتا ہے۔“ اس نے کہا تھا اور سردار سبکتگین حیدر لغاری ہنس دیا تھا۔
سیال کو اس شخص کو اس طرح ہنستا دیکھ کر کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔ بھی شاید وہ اس کی سمت دیکھتی رہی
مگر سبکتگین حیدر لغاری نے حیران ہونے یا چوکنے بغیر اس کی سمت دیکھا تھا۔

”سیانے کہتے ہیں گرل فرینڈ چاہے جیسی بھی ہو، بیوی ہمیشہ ذہین ہونی چاہئے۔ مجھے خوشی ہے کہ
بیوی ذہین ہے۔ بے قوف محبوب کی طرح اس کے سامنے بین نہیں بجانا پڑتی۔“ وہ قطعاً سنجیدہ نظر میں
تھا اور میرب سیال مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”بے قوف محبوبہ کے سامنے بین بجانے کی ضرورت یوں بھی پیش نہیں آتی کہ وہ ان باتوں سے
کر اپنی انگلی پر نچانا خوب جانتی ہے۔“ میرب سیال نے اس کے جملے کو گویا مکمل کیا تھا اور سردار
حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔ میرب کچھ نہیں بولی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری بھی چند ثانیوں تک خاموشی
اسے دیکھتا رہا تھا، پھر گویا ہوا تھا۔

”تمہیں گھر پسند آیا؟“

”ہوں۔“ میرب سیال نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”میرب! میرا یہ خواب تھا، میرا ایک گھر ہو اس گھر میں کوئی ایسا، جس کے سامنے میں مودب رہوں
اس کی مانوں، اس کی سنوں، اس کے سنگ سنگ چلوں۔ اور یہ سفر کبھی ختم نہ ہو، محبت بڑھتی رہے
باقی کسی شے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ مجھے وقت نے کچھ ایسا سفر میں رکھا کہ کبھی کسی جگہ رک کر
گھڑی قیام نہیں کر سکا۔ چہرے بہت سے دیکھے، لہجے بہت سے سنے، مگر کسی میں زندگی کی بازگشت
نہیں دی میرب سیال! سب بہت رسمی سا تھا۔ بہت بے کیف اور کسی قدر بے مزہ۔ سچ کہوں، مجھے کسی
خاص کی چاہ کبھی نہیں تھی۔ کسی خاص چہرے کو دیکھنے کے متعلق میں نے کبھی نہیں سوچا، کبھی کوئی خواہش
تھی کہ ایسا ہو جائے کہ باقی سب کچھ ماند پڑ جائے، ساری چمک دمک، ساری ظاہری وضع قطع اور
سردار سبکتگین حیدر لغاری رکھا تھا پھر اس کے چہرے کو بغور سکتے ہوئے مسکرایا تھا۔ ”میرب! میں نے
خوابوں پر اعتقاد نہیں کیا۔ کبھی خواب نہیں سنے۔ مگر تمہارا ساتھ اب مجھے اچھا لگنے لگا ہے میرب! بہت
در بدر۔ اب ایک جگہ رکنے کو دل چاہتا ہے۔ تمہارے ساتھ میرب! تمہارے ساتھ چلنے کو دل چاہتا ہے
سردار سبکتگین حیدر لغاری کہہ رہا تھا اور میرب سیال اسے کسی قدر حیرت سے دیکھتی رہ گئی تھی۔“

فیض بخاری نے اس کا حوصلہ بندھایا تھا مگر وہ کچھ نہیں بولا تھا۔

”کیا بچوں کی طرح پریشان ہو رہے ہو۔۔۔ کہا تو ہے سب کچھ ٹھیک ہے۔“ بہت ہولے سے لہجے کا چہرہ چھپتھپاتھا۔ مگر وہ مسکرایا نہیں تھا۔

”چاچو! کیا میں می سے مل سکتا ہوں؟“

”نہیں۔۔۔ ابھی نہیں۔ میں نے میڈیسن دی تھی، وہ اب آرام کر رہی ہیں۔ یہ ان کے لئے بہتر ضروری ہے۔“

”چاچو! کوئی پریشانی کی بات تو نہیں؟“ وہ فکرمندی سے بولا تھا۔

”میں ڈاکر ہوں۔ مگر اس سے قبل تمہارا چاچو بھی ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں تم سے کچھ جھوٹ کوں گا؟“ وہ دھیسے سے مسکرائے تھے۔ ”مگر ایک پارٹ پشٹنٹ کے لئے اس حد تک بڑھا ہوا پی پی میرے خیال میں کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ ہمیں ان کا خیال رکھنا ہوگا۔ اور تم جیسے سعادت مند بیٹے سے میں یہ امید کر سکتا ہوں کہ تم ان کا بہت خیال رکھو گے۔“ انہوں نے بہت ملامت سے کہتے ہوئے اس کا موڈ بحال کر چاہا تھا مگر وہ تب بھی نہیں مسکرایا تھا۔

”اوہ۔۔۔ میں چلتا ہوں۔ کوئی پریشانی کی بات ہو تو مجھے فون کر دینا۔“ فیض چاچو دوبارہ ہنسنے کے لئے نکل گئے تھے اور اس وقت کمرے میں صرف وہ دونوں باپ بیٹا رہ گئے تھے۔ کئی دیر خاموشی چار اطراف پھیلی رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے نگاہ اٹھا کر باپ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی سعد حسن بخاری کچھ بولے تھے۔

ماہا کافی لے کر آئی تھی۔ جب پایا لے نئی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے جانے کے متعلق آگاہ کیا تھا۔ اذہان حسن بخاری گویا ہوا تھا۔

”ماہا! ان سے کہو میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

ماہا نے باپ کی سمت دیکھا تھا اور حیرت تو سعد حسن بخاری کی نگاہوں میں بھی تھی۔ جواباً انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر اذہان حسن بخاری نے بھی قدم اٹھاتے ہوئے باپ کی سمت پیش قدمی کی تھی۔

”ماہا! تم باہر جاؤ۔“ مدھم لہجے میں کوئی تنہم تھا۔ ماہا نے ایک نظر باپ اور بھائی کی سمت دیکھا تاہم باہر نکل گئی تھی۔ سعد حسن بخاری بہت حیرت سے بیٹے کی سمت دیکھ رہے تھے۔ چہرہ۔۔۔ عین کسی ٹراکھل کی سرخی اس کے اندر کے انتشار کی بھرپور غمازی کر رہی تھی۔ وہ کسی قسم کے سوال و جواب کے موڈ میں تھے۔ لیکن اس لہجے یہ جیسے ناگزیر تھا۔ اذہان حسن بخاری باپ کی سمت بہ غور دیکھ رہا تھا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں می کی اس کیفیت سے قبل کیا واقعہ رونما ہوا تھا؟“ ایک بار پھر بیٹا، باپ کے مقابل تھا۔ ایک بار پھر تباہی کی کیفیت حد درجہ بڑھ چکی تھی۔

سید سعد حسن بخاری کے چہرے اور آنکھوں میں حد درجہ ناگواری در آئی تھی۔

”میرا نہیں خیال کہ میں تمہیں کسی طرح کی جواب دہی کا پابند ہوں۔“ ان کا انداز بے حد سخت تھا۔ اور یہ سن کر بخاری انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

”ہپ نے جو چاہا وہ کیا۔ جو آپ کو مناسب لگا وہ آپ نے روارکھا۔ پھر اب دوسروں کو ان کے حال میں نہیں چھوڑ دیتے؟ کیوں جینے نہیں دیتے؟“ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ زندگی پر صرف آپ کا حق ہے۔ گزارنے کی لبرٹی صرف آپ کو حاصل ہے اور باقی سب ایک سانس لینے کے لئے بھی آپ کے لئے نہیں؟“ اذہان حسن بخاری کا لہجہ مدھم تھا۔ مگر سعد بخاری بیٹے کی گستاخی پر سخت طیش میں آگئے تھے۔

”کیا ایسی فضول سی گفتگو کے لئے تم میرا اتنا نام بردار کرنا چاہتے ہو یا پھر کوئی نئی بات بھی ہے جسے پاس کرنے کے لئے؟“ کسی قدر درشت انداز میں کہتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”جی جی باتیں عمل میں لانے کی ریت تو آپ نے اپنے سر لے لی ہے۔ ایک بار چونکا دینے والی بہت حال عمل میں لا کر جو داغ نیل آپ نے ڈالی تھی وہ اب آپ کی عادت ہو چکی ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ جب آپ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی خود کو حق پر سمجھتے ہیں تو پھر باقی لوگوں نے کیا تصور کیا؟ آپ ان کو ان کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ کیوں ہر روز ایک رانی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں؟ جب کچھ وہ ہو رہا ہے جو آپ نے چاہا ہے تو پھر مسئلہ کیا ہے؟ آپ خوش ہے نا اپنی مرضی کر کے تو پھر باقی اپنی مرضی سے خوش کیوں نہیں رہ سکتے؟ آخر کس بات کی سزا دے رہے ہیں آپ اس عورت کو؟“

یہ انکاروں پر گھسیٹ رہے ہیں آپ اے۔۔۔ کیا تصور ہے اس کا؟ کس شے کی کمی رکھی ہے اس بناپ کی زندگی میں؟ سبھی کچھ تو دیا ہے۔ ایک گھر، سکون، بچے۔ پھر کیا چاہتے ہیں اب آپ اس سے؟ لہذا آپ کے لئے سیکری فائس تک کر لیا۔ ایک عظیم قربانی کی امید رکھی ہوگی نا آپ نے ایک عورت سے لے کر اتنے ان سے۔ انہوں نے تو اس کا بھی ثبوت دے دیا۔ کوئی داویلا نہیں کیا، کوئی شور نہیں مچایا۔

لیڈی مات چپ چاپ سہہ گئیں وہ۔ پھر اب کیا چاہتے ہیں آپ ان سے؟“ کوشش کے باوجود بھی وہ پتے لہجے کو سخت ہونے سے نہیں باز رکھ سکا تھا اور سعد حسن بخاری ساکت سے اپنے مقابل کھڑے بیٹے کو ٹھونڈتے تھے۔

”ثبث اذہان! تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ تم کس سے مخاطب ہو۔“

”معلوم ہے۔۔۔ معلوم ہے۔۔۔ سبھی تو۔۔۔ سبھی تو میرا لہجہ اب بھی اتنا ہی دھیمانہ اور انداز اتنا ہی

ہلکا ہے جس عورت کو آپ اپنی زندگی سے خارج کر چکے ہیں اس نے ایسے آداب تو سکھائے ہی نہیں لیکن کہ اپنے سے وابستہ رشتوں میں تمیز کر سکیں۔ آپ یہ مت سمجھنے کہ میں آپ سے کسی طرح کی بدتمیزی کر رہا ہوں، بلکہ کسی بات کی تسکین کرنا چاہ رہا ہوں یا آپ کے مد مقابل کھڑا ہوں کہ آپ سے اپنی ماں کے ساتھ اپنے والدی نا انصافی کا بدلہ لے رہا ہوں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں اگر آپ سے کچھ چاہتا ہوں تو صرف ان کیلئے نہیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔ کیونکہ جینے کا حق جتنا آپ کو ہے، ہمیں بھی ہے۔ بہت بہت اچھے

ہال ہے ہماری زندگی آپ کے ایک چھوٹے سے اقدام سے۔ ہم دونوں تک کوشش میں لگے رہتے ہیں مگر یہ سب بات معمول پر نہیں آتی۔ اور جب صد ہزار کوششوں سے پلٹ کر اس مقام پر آتے ہیں آپ پھر بولتے ہیں میں سب کچھ ایک لمحے میں بکھیرنے۔ اور آپ۔۔۔ آپ کا ایک اقدام ہمیں پھر سے دیں پر جا رہا ہے۔ کیوں۔۔۔ کیوں کرتے ہیں آپ ایسا؟“ آخر کس بات کی سزا دے رہے ہیں آپ

ہمیں؟ آپ یہی کیوں چاہتے ہیں کہ صورت حال سدا کنٹرول میں رہے۔ گیند ہمیشہ آپ کے کورٹ میں رہے۔ مئی، ماہا۔ کیا بگاڑا ہے ہم سب نے آپ کا؟۔ کیوں میٹلی مار چکرے آپ ہمیں؟۔ کیا آپ بھول گئے ہیں کہ ایک باپ کے کیا فرائض ہوتے ہیں۔ ایک شوہر ہونے کے ذمے داریاں تو آپ بھلا ہی چکے ہیں۔ کیا باپ ہونے کے فرائض بھی فراموش کر چکے ہیں؟۔ ان کے مقام سے ہٹا ہی چکے ہیں، کیا آپ کی زندگی میں سے ہمارا مقام بھی خارج ہو گیا ہے؟۔ حسن بخاری کا مدغم لہجہ سعد حسن بخاری کو ساکت کر گیا تھا۔ کتنی دیر تک وہ اسے اسی طرح ساکت نظر سے دیکھتے رہے تھے۔ پھر بہت سخت انداز میں گویا ہوئے تھے۔

”تمہیں مجھ سے اس انداز سے مخاطب ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ نہ ہی ہم میاں بولی کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق ہے۔ تم شاید بھول رہے ہو کہ میں وہی باپ ہوں جس نے تمہیں اس مقام تک پہنچایا ہے۔ تم جو کچھ بھی ہو میری وجہ سے ہو۔ مجھ سے کٹ کر تمہاری کوئی عقیدت ہے۔ ماننا ہوں بڑے ہو چکے ہو تم، مگر اتنے بڑے قطعاً نہیں ہوئے کہ اپنے باپ کے مقابل آکر کھڑے ہو سکو۔ میں اپنے باپ ہونے کا کوئی فرض بھولا نہیں ہوں۔ تم مجھے کچھ بتانے کی کوشش مت کرو۔ یہی کرانے کی۔ میں اپنی ذمے داریوں سے خوب واقف ہوں۔ تم آج ہر بات کے لئے مجھے تسلیم کرو۔ اپنے باپ کو۔ مجھے، جس نے تمہیں آج اس قابل بنایا۔ حالانکہ اگر تم غور کرو تو اس سبب تم خود ہو۔ تم اذہان! تم نے یہ سارا معاملہ بگاڑا۔ تم اپنے باپ کے مقابل آن کھڑے ہوئے؟۔ بھی ہوا، آج تک جو بھی معاملہ پیش رہا اس کا سبب تم تھے۔ تم۔ معاملہ ہم دونوں کا تھا، بلوگ تھا۔ مگر تم نے اسے بڑھا دیا۔ وکیل بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماں کے سپورٹرز بن گئے اور مجھے دشمن فرض کر لیا۔ حالانکہ غور کرو تو جان جاؤ گے کہ دوست کون ہے اور دشمن کون؟۔ بیٹے ہونے کی تیز آواز سے ہو، میں نہیں۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ تم میرے بیٹے ہو۔ یاد رکھو! بیٹا جتنا بھی بڑا ہو جائے باپ سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ میں نہیں بھولا ہوں۔ سو تم بھی یاد رکھو۔“

سعد حسن بخاری نے مدغم لہجے میں باور کرایا تھا اور پھر فوراً ہی پلٹ کر وہاں سے نکل گئے تھے۔ اذہان حسن بخاری کتنی دیر تک خاموشی سے وہیں کھڑا اس سکوت میں کھوئے لفظوں کے منہمک رہا تھا۔

کبھی کبھی کسی صورت حال سے بچنے کی سعی کرنے کے سارے اقدامات دھرے کے دھرے ہیں۔ بھاگنے کی جتنی کوشش کی جائے، راستے قدموں سے بندھ جاتے ہیں۔ اور اگرچہ اس نے کئی سی تو دانستہ نہیں کی تھی مگر اس کے باوجود جب لامعہ حق اس کے سامنے آئی تھی تو وہ کتنی دیر بجا ساکت ساد دیکھتا رہا تھا۔

”میںے اوزی! وہاں اسے پلیزینٹ سرپرائز۔ کب لوئے تم؟“ بے حد گرجوٹی سے اسے اپنے لگائے ہوئے وہ کتنی دیر، تقریبی سے مسکرا رہی تھی اور اوزی فوری طور پر کچھ نہیں بول سکا تھا۔ انا

”پر نقطہ مسکرانے کے اس کے پاس جیسے کوئی چارہ نہ تھا۔“ وہاں آگے ہو اور بتایا تک نہیں۔ ایسی لائق کی امید تم سے نہیں تھی اوزی! بڑے بے مروت ہو کر لامعہ حق کے تو۔“ لامعہ حق مسکراتے ہوئے شکوہ کر رہی تھی اور اوزی مسکرا دیا تھا۔ ”تم نے بھی تو لائق کی حد کر دی۔ منگنی کر لی اور جریمہ نہیں ہونے دی۔“ اوزی نے جواباً شکوہ کیا تھا لامعہ حق ہنس دی تھی۔

”تم آن۔۔۔ اس میں چھپانے والی کوئی بات نہیں۔ تم تو جانتے ہو، لامعہ حق ہر کام ڈنکے کی چوٹ زدن کی عادی ہے۔ تم سناؤ، تنہا لوٹے ہو یا اپنے ساتھ کوئی گوری دوری بھی لائے ہو؟“ لامعہ حق اسی ڈنگی کے ساتھ مسکرا رہی تھی اور اوزی بھی مسکرا دیا تھا۔

”ہمارے ایسے نصیب کہاں۔۔۔ کیا ساری باتیں اسی شاپنگ مال میں کھڑے کھڑے کر لوگی؟“ لامعہ حق کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”آج بھی ملنے کے بہانے اسی کثرت سے ڈھونڈتے ہو۔ ٹھہرے کہاں ہو؟“ لامعہ حق نے اس کے نواگے بڑھتے ہوئے کہا تھا۔

”انابہ کے یہاں۔“ اوزی نے مسکراتے ہوئے مطلع کیا تھا۔

”انابہ کے یہاں؟“ لامعہ حق چونکی تھی۔ ”لیکن اس نے تو ایسا کچھ نہیں بتایا مجھے۔ حالانکہ ہماری بات تو اترا ہو رہی ہے۔“ لامعہ حق کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔ ”کہیں تم نے اسے خود تو منع نہیں کیا ٹھکانے سے؟“ لامعہ حق نے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے کسی قدر چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

”آج بھی بے سبب الزام عائد کرنے کی عادت نہیں گئی تمہاری۔“

”کب سے ہو یہاں؟“ لامعہ حق نے ریٹورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔“

”اور کب تک قیام کرو گے؟“ لامعہ حق نے ٹیبل منتخب کی تھی۔

اوزی اس کی سمت دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”کہاں؟“ آنکھوں میں کسی درجہ شرارت آن رکھی تھی۔

لامعہ حق ہنس دی تھی۔ وہی تقریبی ہنسی جو زندگی کے سارے احساس چگانے کا گراپے اندر رکھتی تھی۔ ”تمہاری باتیں آج بھی اتنی ہی اُلجھی ہوئی ہیں۔ اور نظریں اتنی ہی متلاشی۔ لگتا ہے تمہاری تلاش؛“

”ہاں نہیں۔“ مسکراتے ہوئے تجزیہ کیا تھا۔

اوزی مسکرا دیا تھا اور پھر بہ غور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا تھا۔

”میں کو لبس نہیں ہوں کہ ایک حیران کن جگہ کی تلاش پر نکلوں اور راستے میں ہی پڑاؤ ڈال کر اسی پر متکرموں اور اسی مقام کا ہو رہوں۔ مجھے جن جہانوں کی تلاش ہے ان سے کم پر اکتفا کرنا مجھے نہیں آتا۔“

لامعہ حق نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر ایک دلچسپ مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر گئی تھی۔

”یہ عادت کچھ اتنی اچھی نہیں اوزی! انسان کو کسی قدر کپور و ماہرنگ ہونا چاہئے۔ ایسا ہونے سے سی آسانیاں ہو جاتی ہیں۔“

”آسانیاں تو انہیں اچھی لگتی ہیں لامع حق! جو مشکلات سے نظریں چراتے ہوں۔ جنہیں زندگی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی عادت ہی نہ ہو۔ اور میرے متعلق تو جانتی ہو تم۔“ اوزی مسکرائی اور لامع حق اس کی سمت دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”تمہیں اچھا لگتا ہے یوں در بدر بھگتا؟“ بہ غور دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”مجھے کیا اچھا لگتا ہے، اس کے متعلق کبھی کسی نے جاننے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔“ اوزی کہتے ہوئے جیسے اسے لا جواب کر دیا تھا۔ لامع حق اس کی سمت دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”ضروری تو نہیں کہ تمہیں جو اچھا لگتا ہے اوزی! وہی سب دوسروں کو بھی اچھا لگتا ہو۔“ لامع حق مصلحت سے پُر انداز اختیار کیا تھا۔

”بدلی نہیں ہو تم۔ آج بھی قابل کرنے کے سارے گر آزمانا جانتی ہو۔“

”اور تم بھی تو نہیں بدلے ہو۔ آج بھی اسی طرح جھٹلانا جانتے ہو۔“

”مسن کو جھٹلانے کی سعی کوئی کافر ہی کر سکتا ہے۔“ اوزی مسکرایا تھا اور لامع حق بھی مسکرا دی تھی۔ آرزو سر و کر کے چلا گیا تھا۔

”تم نے بتایا نہیں کب تک قیام کرو گے اس شہر میں؟“ لامع حق نے مسکراتے ہوئے اس کی دیکھا تھا اور اوزی کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”تم اگر شہر کی وضاحت نہ بھی کرتیں تب بھی میں سمجھ سکتا تھا کہ تم شہر میں قیام کی ہی بات کر رہی اس کی آنکھوں میں بہت سی شرارت رکی ہوئی تھی اور لامع حق اس لئے ہنس دی تھی۔

”تم جیسے بندے کے سامنے یہ سب بہت ضروری ہو جایا کرتا ہے اوزی! تم کسی بھی بات کا ما کہاں سے کہاں لے جاتے ہو۔“

”ہاں۔۔۔ مگر کبھی کبھی بہت سی وضاحتیں اور تاویلیں بھی کسی بات کے واقع ہونے کو نہیں سکتیں لامع حق! شاید تم یہ بات نہیں جانتی ہو۔“ اوزی کا انداز باور کرانے والا تھا اور لامع حق اسے

رہ گئی تھی۔

”کبھی کبھی سفر پر چلنے سے قبل اس بات کا تعین کر لینا بہت ضروری ہو جاتا ہے اوزی! کہ ہاں صحیح بھی ہے یا کہ نہیں۔ آیا یہ رستہ فقط رستہ ہی ہے یا پھر اس کی کوئی ڈگر منزل کی طرف بھی جاتی ہے۔“

”شوق جنوں جب حد سے سوا ہو جائے تو اس بات کا کوئی ہوش رہتا ہی کب ہے لامع حق! اس کا تعین تو جب ممکن ہوتا ہے نا جب کچھ ہوش باقی رہے۔ کیا تمہیں ابھی تک اس بات کا انداز نہیں آیا اوزی کا لہجہ مدہم تھا اور لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ۔ مگر اس کے باوجود لامع حق اس کی سمت متوازی

سکتی تھی۔ کبھی اوزی مسکراتا ہوا اس کو دیکھنے لگا تھا۔

”تمہارے فیاضی محترم سے ملاقات ہوئی تھی۔ موصوف خاصی توپ شے واقع ہوئے ہیں۔“

”تم ملے ہو ان سے؟ کہاں؟ اور بائے دی وے، تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ میرے فیاضی وہی ہیں؟“

”کو حیرت ہوئی تھی اور اوزی مسکرا دیا تھا۔

”نہیں ہوئی ہوتی اگر موصوف میرے دوست واقع نہ ہوئے ہوتے۔“

”اوت؟۔۔۔ تم عفنان علی خان کے دوست ہو؟ حیرت ہے، عفنان نے بھی مجھے کبھی کچھ نہیں لامع حق کو شہید حیرت ہوئی تھی۔

اس نے تو تمہیں اور بھی بہت کچھ نہیں بتایا لامع حق! اس کے بارے میں تو تمہیں کبھی اس درجہ نہیں ہوئی۔“ انداز بہت عام تھا مگر لہجہ بہت خاص۔ اور لامع حق کے لبوں کی مسکراہٹ ایک لمحے

جب ہوئی تھی۔ اوزی نے اس چہرے کو بہ غور دیکھا تھا۔

”غالباً اس تعلق کے متعلق دریافت کیا تھا۔ لامع حق نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر بہت اسے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”ہاں۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا تمہیں کوئی ڈاؤٹ ہے؟“

”نہیں۔۔۔ تمہارا خیال ہے لامع حق! انداز باور کرانے والا تھا اور لامع حق مسکراتے ہوئے سر نفی

انے لگی تھی۔

لمبری فکر کرنا چھوڑ دو اوزی! مجھے اپنی فکر کرنا خود آتا ہے۔ اور میں تمہیں اس کیسے کے لئے تھینکس بھی

کہوں گی۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔ اور اوزی ہنس پڑا تھا۔

”تم آج بھی اتنی ہی بے مروت ہو۔“

اوپر بے لحاظ بھی۔ تم جانتے ہو مجھے بے وجہ کر ٹی دکھانا اچھا نہیں لگتا۔ اپنی وے۔ عفنان علی خان کو

سے جانتے ہو؟“

”کیوں، ارادہ کہیں اس کے متعلق انویسٹی گیشن کرنے کا تو نہیں؟“

”جن سے محبت کی جاتی ہے ان کے متعلق بذات خود جانا جاتا ہے۔ شہر کی ہواؤں سے یا چہروں سے

لگن جاتا۔“ بتایا تھا اور اوزی لب بچھنچ کر مسکرا دیا تھا۔

”کھامٹ بی اے لگی گائے؟“ لہجے میں کوئی حسرت بول رہی تھی۔

”ہی از۔“ لامع حق کے لہجے میں یقین ہی یقین تھا۔ لبوں پر وہی دلفریب مسکراہٹ۔ اوزی اس

کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

کبھی کوئی واقعہ اس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے کہ اس کے اثرات اگلے کئی لمحوں تک زائل نہیں ہو

سکتے۔ انہیں حسن بخاری کے اندر جس خلیفہ نے سر اٹھایا تھا وہ سلسلہ ابھی تک تھما نہیں تھا۔ بلکہ انتشار کچھ

ابھی چلا گیا تھا۔ وہ جتنا سوچتا تھا، خود کو اتنا ہی بے بس پاتا تھا اور یہ صورت حال اسے اور بھی ڈگر گوں

دلی تھی۔ آفس سے جانے کے بعد وہ بجائے اندر جانے کے وہیں لان میں سگی بیٹھ گیا تھا۔

ملاقات نیم جاں کر دینے والے ہوں تو انسان فرار کے راستے خود بہ خود ڈھونڈنے لگتا ہے۔ مگر اس

کے پاس کوئی راہ فرار نہ تھی اور یہ کیفیت اس انتشار کو اور بھی بڑھا رہی تھی۔ کوٹ بازو پر دوسرے دو چوڑے چپ وہاں بیٹھا تھا جب ساہیہ خان چلتی ہوئی اس کے پاس آن رکی تھی۔

”کہاں تھے تم؟“ آئی اتنی پریشان ہو رہی تھیں۔ اور تم نے اپنا سیل کیوں آف کر دیا تھا؟ ساہیہ خان نے دریافت کیا تھا۔ مگر اذہان حسن بخاری کچھ نہیں بولا تھا۔ نہ ہی اس کی سمت دیکھنے کی زبردستی کی تھی۔ اسی طرح ساکت سا بیٹھا رہا تھا اور ساہیہ خان اسے بہ غور دیکھنے لگی تھی۔

”اذہان! یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں تمہیں کم از کم اتنا دیکھ نہیں سکتی تھی۔ تم ماہا اور فارحہ آئی کو سنبھالو۔“

بجائے خود اس صورت حال سے منہ چھپانے فرار کے راستے تلاش کر رہے ہو۔“

”تو کیا کروں میں۔۔۔ کیا کروں؟“ وہ کسی قدر برہمی سے کہتے ہوئے اسے دیکھنے لگا تھا۔ ساہیہ خان اس کے درشت انداز اور بلند آواز پر اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اسے دیکھا تھا۔ بہت آہستگی سے سرنئی میں ہلانے لگا تھا۔ انداز پر افسوس تھا۔

”آئی ایم سوری ساہیہ!“ مدہم لہجے میں کسی قدر ندامت تھی۔ مگر ساہیہ جواباً کچھ نہیں بولی تھی۔ بس خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری اس کی طرف سے نگاہ پھیر گیا تھا۔ پھر مدہم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ساہیہ! میں کیا کروں؟ جو ہو رہا ہے میں نے اس کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے یا میری فیملی کو اس طرح کی کیفیت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جب زندگی ایک سوالیہ نشان بن کر رہ جائے گی اور ہم سب اٹھنے والے سوالات کے جواب میں دوسرے کی شکلیں دیکھتے رہ جائیں گے۔“ اذہان حسن بخاری کا انداز بے حد بے بسی لے ہوئے تھا۔

”ساہیہ! میں نے کبھی بھی زندگی میں خود کو اتنا بے بس نہیں پایا۔ جو صورت حال درپوش ہے کہ تدبیر کام آگئی ہے تو سبھی یہ عقده کھلتا ہے کہ صورت حال پہلے سے بھی نہیں زیادہ پیچیدہ ہو ہے۔“ اس کا لہجہ مدہم تھا اور انداز تھا کہ ماندہ۔ ساہیہ خان نے بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ دھڑ دیا تھا۔

”اذہان! شکست مان لینا دانش مندی نہیں۔۔۔ بہت سی باتوں کے اسرار نہ سمجھ میں آنے والے ہوتے ہیں۔ مگر یہی عہد اپنے اندر بہت سے سوالوں کے جواب رکھتے ہیں۔ تمہیں ہمت سے کام لےنا چاہئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تمہیں جو کچھ نظر آ رہا ہے اسے قبول کرو۔ حقیقت کو مان لینے سے کبھی بہت سے سوالوں کے جواب خود بہ خود مل جاتے ہیں۔ تمہارا پر اہم یہ ہے اذہان! کہ تم اپنی حقیقت کو ہی تسلیم نہیں کر پا رہے ہو۔ اور یہی سب سے بڑا سبب ہے تمہاری جھٹکن کا۔ تمہارا ذہن اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے کبھی قبول نہیں کر پا رہا اور یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے اذہان! کبھی تمہاری حقیقت کو تسلیم کر لینے سے ہی بہت سی باتوں کا جواب مل جاتا ہے۔ کچھ اور نہیں تو کم از کم اس صورت

بکواسد باب ہی سمجھ میں آ جاتا ہے۔

”بہنہاری بات کو مسترد کرتا ہوں۔“ اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ اس کے تمام الفاظ کو ایک لمحے میں رد کیا تھا۔ ”بس ساہیہ خان! رو کر تھوڑے سا ہنسنا سب کتابی باتیں ہیں۔ تم یہ سب اس لئے کہہ رہی ہو کیونکہ تم اس طوفان کا حصہ نہیں ہو ساہیہ! اذہان میں ہوں۔ تم اس طوفان کی شدت کو اس طرح سے محسوس بھی نہیں کر پا رہی ہو جس طرح کہ میں ہوں۔ پھر تم کوئی حل کیونکر پیش کر سکتی ہو جب تمہیں کسی بات کا اندازہ ہی نہیں۔“ اس کا لہجہ، سب کس قدر اچھی تھا اور ساہیہ خان اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ نظروں میں حد درجہ بے یقینی تھی۔ گویا اذہان حسن بخاری سے ایسے کسی اقدام کی توقع نہیں تھی۔

”تو کیا کروں وہ اسے اسی طرح ساکت ہی دیکھتی رہی تھی۔ پھر کسی درجہ تاسف سے سرنئی میں ہلانے لگی تھی۔ اذہان! یہ ٹھیک ہے کہ مجھے ان باتوں کا ادراک نہیں ہے اور جس کیفیت سے تم گزر رہے ہو اسے کبھی نہیں سمجھا۔ مگر یہ غلط ہے کہ میں اسے اس طرح سے محسوس نہیں کر رہی ہوں۔ تم نے تمہیں نے مجھے ایک لمحے میں خود سے الگ کر دیا۔ پر ایسا کر دیا۔“ اس کا لہجہ مدہم تھا اور انداز پر گرا اذہان حسن بخاری اس کی سمت سے نظریں پھیر گیا تھا۔

”کئی کئی طوفان میں گھرے ہوئے شخص کو صورت حال کا اندازہ اس انداز سے نہیں ہو پاتا جس طور کہ ہمارے دیکھنے والے کو ہوتا ہے۔ جو دور سے دیکھ رہا ہوتا ہے وہ زیادہ بہتر طور پر اندازہ کر پا رہا ہوتا ہے کہ وہاں کئی سنگین ہے۔“ وہ انہی تھی اور پھر بنا اس کی سمت دیکھے، چلتی ہوئی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔

”تم آج لامعہ حق سے ملے تھے؟“ انا بیہ شاہ نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے حسنی انداز میں کہا تھا اور تھوڑے جھانک رہا تھا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”تمہیں کیسے خبر ہوئی؟“

”تمہارے چہرے پر لکھا ہے اوزی!“

”اچھا۔۔۔“ وہ حیران ہوا تھا۔ ”تو کیا ایسی ساری باتیں چہرے پر آن درج ہوتی ہیں؟“ اس کا لہجہ مدہم تھا۔ مگر انا بیہ شاہ مسکراتے ہوئے لب بھینچ گئی تھی۔

”آگ کوں۔۔۔ لیکن تم نے بتایا نہیں کیا ہوا، کیا وہ حیران تھی؟“ انا بیہ شاہ نے گفتگو کا سلسلہ پھر وہیں سے لے کر لیا تھا اور جواباً اوزی کے لبوں پر بہت بھٹی بھٹی مسکراہٹ ابھری تھی۔

”جب سب کچھ میرے چہرے پر درج ہے تو پھر پوچھ کیوں رہی ہو؟“

”انا بیہ شاہ نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر مسکرا دی تھی۔“

”اگرچہ تمہاری حالت خاصی دگرگوں ہو رہی ہے۔ مگر ایک فطری تجسس بھی تو ہوتا ہے نا۔“

”تمہیں لطف لینا چاہتی ہو میری کیفیت سے۔ کسی شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے۔“

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر رہی

دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات میں“

اس کا انداز زہابی دیتا ہوا تھا اور انابییہ شاہ ہنس پڑی تھی۔ تبھی اوزی نے مسکراتے ہوئے اس کی دیکھا تھا۔

”دوسروں پر ہنسا کتنا آسان ہے نا۔“

”ہاں ہے۔ مگر ہمدردی کے پھاپے بھی تو میں ہی رکھتی ہوں نا۔“ انابییہ شاہ بہت دنوں بعد مسکرائی، ترو تازہ لگی تھی۔ اوزی اس کی سمت بہ غور دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔

”اچھی لگ رہی ہواتے دنوں بعد کھل کر مسکراتی۔“ اوزی نے کہا تھا اور وہ لب بھینچ کر چہرے کا پھیر گئی تھی۔

”میں نے یہ تعریف اس لئے نہیں کی کہ تم اپنے مسکراتے لب اس قدر سختی سے بھینچ لو۔“ اوزی اسے باور کرایا تھا۔

”تم نے بتایا نہیں ملاقات کیسی رہی؟“

”کیسی رہ سکتی ہے تمہارے خیال میں۔ وہ گریزاں گریزاں، ہم پریشاں پریشاں۔ ایسے میں انداز کیا ہو سکتا ہے؟ وہی جو اول ملاقات میں رہا، اس سے کچھ زیادہ مختلف تو نہیں تھا۔“ وہ پُر مزاج انداز کہتا ہوا مسکرایا تھا۔

”زیلی۔۔۔ اس لڑکی سے مجھے مل کر کبھی نہیں لگا کہ میں اسے پہلے بھی کہیں مل چکا ہوں یا اسے سے جانتا ہوں۔ اس سے جتنی بار بھی ملا ہوں ہر ملاقات وہی پہلی سی لگی ہے۔“ اوزی کا انداز بہت ہاتھ تھا۔ وہ تمام باتیں اس طرح بیان کر رہا تھا جیسے روزمرہ کی خبروں سے مزین کوئی اخبار پڑھ کر سنا رہا، انابییہ شاہ نے اُسے بہ غور دیکھا تھا۔ شاید بھی اس کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اوزی اس کی سمت دیکھتا ہوا پوچھنے لگا تھا۔ تبھی وہ مسکراتی ہوئی اس کی سمت سے نکلی گئی تھی۔

”مجھے اکثر لگتا ہے تم روزمرہ کی خبروں سے مزین کوئی اخبار پڑھ کر سنا رہے ہو۔۔۔ خود اپنی زندگی سے متعلق۔ تمہارا انداز بڑا ہی کیڈول ہوتا ہے۔“ انابییہ شاہ نے تجزیہ کیا تھا اور وہ مسکرایا تھا۔

”محبت کی ہے تم نے کبھی انابییہ شاہ؟“ مدہم لہجے میں دبا جب سوال تھا اور انابییہ شاہ جو مسکرائی بے حد چونک کر اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”یہ کیسا سوال ہے؟“

اوزی اس کی سمت تکتا ہوا مسکرایا تھا۔

”انابییہ شاہ! آسان شے نہیں ہے محبت۔ اسے کرنے والا خود ایک خبر بن جاتا ہے۔“ باور کرایا تھا۔

انابییہ شاہ اس کی سمت سے نگاہ پھیر گئی تھی۔

”انابییہ! اوزی نے بہت مدہم لہجے میں پکارا تھا۔

”ہوں؟“ انابییہ شاہ نے اس کی سمت دیکھنے سے دانستہ گریز کیا تھا۔

”ہاں محبت بہت آسان شے نہیں مگر یہ اتنی مشکل بھی نہیں کہ چہرے پر ہوائیاں اڑ جائیں۔“ انداز نے والا تھا۔ انابییہ شاہ نے اس کی سمت مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر قریب پڑا کٹن لسنے کھینچ مارا

”وہیے جب تمہیں محبت ہو تو مجھے ضرور بتانا۔“

”کیوں؟“ انابییہ شاہ نے کسی قدر ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔ مگر وہ مسکرایا تھا۔

”دونوں مل کر اختر شاری کریں گے۔“ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی اور انابییہ مسکرا دی تھی۔

”مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔“ اس نے سرسری انداز سے کہنے کے ساتھ ہی ریوٹ اٹھا کر ٹی وی بن کی جانب اپنی توجہ مبذول کی تھی۔ اوزی نے اسے بہ غور دیکھا تھا۔

”انابییہ! دلچسپی حد سے سواتھی۔“

”ہاں۔“ انابییہ کا انداز سرسری تھا۔

”جس طرح تم محبت کے نام پر شنائے ہوتی ہو اس سے مجھے صاف کچھ گڑ بڑ نظر آتی ہے۔“

”اوزی! انابییہ شاہ نے اسے گھورا تھا مگر وہ ہنس دیا تھا۔

ڈور ٹیل ہوئی تھی۔ ماما نے کچن سے پکار کر اسے دروازہ کھولنے کی ہدایت کی تھی۔

”انابییہ! دیکھو کون ہے باہر؟“

انابییہ نے جواباً اوزی کی سمت دیکھا تھا۔

”جاؤ، دیکھو جا کر، ساتھ والے انکل اکبر ہوں گے۔ دادا ابا سے ملنے آئے ہوں گے۔ انہیں دادا ابا کمرے میں پہنچا دینا۔ اور سنو، واپسی میں میرے لئے کافی بھی بنا لانا۔“ اس نے دو تین آرڈر ایک دوسرے تھے۔ اوزی نے ہاتھ میں پکڑا کٹن اس کی سمت اچھالا تھا اور گھورتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ

ناقصہ سے ٹی وی اسکرین کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

کچنوں کے توقف سے اس کے قریب آہٹ ہوئی تھی۔

”کون تھا اوزی؟“ وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولی تھی۔ مگر دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں آیا

”اوزی! تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟ کون تھا؟“ انابییہ شاہ نے ٹی وی کا ولیم کم کرتے ہوئے

وزی کی سمت کی تھی اور اوزی کی جگہ کسی اور کو کھڑا دیکھ کر چونک پڑی تھی۔

”آپ؟“

عفتان علی خان اس کی سمت دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔

”کافی لینے گیا ہے وہ، غالباً تم نے اسے آرڈر کیا تھا؟“ اس کے دیکھنے پر وضاحت کی تھی۔ ”بیٹھنے کے لئے نہیں کہو گی؟“ عفتان علی خان نے بہ غور اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

”اوزی کے مہمان ہیں۔۔۔ اس کے آنے تک انتظار کر لیجئے۔“ وہ شرارت سے مسکرائی تھی۔ یہ پہلا

نکتہ تھا جب وہ کسی قدر معمول سے ہٹ کر بولی تھی۔

عفتان علی خان نے ان سمت رنگی آنکھوں کو دیکھا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

”یعنی میں آپ کا مہمان نہیں ہوں۔“ وہ اس کے اجازت نہ دینے کے باوجود اس کے عین سامنے بیٹھ گیا تھا۔ انابہ شاہ کو خاموشی کے ساتھ ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”مجھے خواہش ہو چلی ہے یہ جاننے کی کہ تم اپنے مہمانوں کو کیسے ٹریٹ کرتی ہوگی۔“

انابہ شاہ نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر ٹی وی آف کر کے ریٹائرڈ ایک طرف رکھ دیا تھا۔

”آپ کو میرے متعلق اتنا تجسس کیوں ہے؟ مانا ہوتا ہے ہر انسان کو تھوڑا بہت تجسس کسی دوسرے انسان سے متعلق۔ مگر اس درجہ۔ آپ کیوں خیال کرتے ہیں کہ میں کسی اور پلیٹ سے آئی ہوں اور میرے ٹریٹمنٹ دیگر انسانوں کے ساتھ آپ سب سے کچھ مختلف ہے؟“ وہ بولی تھی اور عفتان علی خان مسکرا رہا تھا۔

”اپنے بارے میں تم بہت اچھی اور مزیدار رائے رکھتی ہو۔ غالباً میں نے تمہارے متعلق ایسا کچھ خیال نہیں کیا تھا۔ مگر تم نے بتا کر مجھے لا جواب کر دیا ہے۔“ عفتان علی خان محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

انابہ شاہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”مجھے آج اچھا لگا ہے انابہ شاہ! آج تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم اچھا بول سکتی ہو۔ مجھے تمہارا خاموشیوں سے بہت وحشت ہوتی ہے اور.....“

”مجھے یہ جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے عفتان علی خان! کہ آپ کو کیا شے اچھی لگتی ہے اور کیا نہیں۔ لیکن مجھے آپ میں بہت کچھ ہے جو پسند نہیں ہے۔“ وہ اس کی سمت پُر اعتماد انداز سے دیکھتی ہوئی بولا

تھی۔ مگر عفتان علی خان ہنستا چلا گیا تھا۔

”اوہ، رینیٹی۔ کیا واقعی ایسا کچھ ہے؟ اگر ہے تو پلیز ٹیل می، میں اپنے متعلق تم سے سننے کے لئے منتظر ہوں۔ اچھی یا بری، کچھ بھی۔ مگر کچھ سمجھ تو آئے کہ دوسری طرف ہے کیا۔ بہت گزر گئی خاموشیوں میں۔ اب تو اس سچید کو کھل جانا چاہئے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں شرارت رکھی ہوئی تھی اور انابہ شاہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

اوزی تبھی کافی لمے کر آ گیا تھا۔

”یہ اتنی خاموشی کیوں چھائی ہوئی ہے؟“ ان دونوں کو خاموش دیکھ کر اسے کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔

انابہ شاہ کچھ نہیں بولی تھی۔ جب کہ عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”ہو سکتا ہے ہم اس مقولے پر عمل کر رہے ہوں کہ خاموشی بھی گفتگو کرتی ہے۔“

”ویل سیڈ۔“ اوزی نے مسکراتے ہوئے اسے داری تھی۔ ”خاموشی کبھی کبھی واقعی باتیں کرتی ہے۔ مگر کبھی کبھی باتیں اس خاموشی سے کہیں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ کیا خیال ہے؟“ اوزی مسکرایا تھا اور عفتان علی خان جانے کیوں ہنس پڑا تھا۔

”شاید ہم میں سے کوئی اس حقیقت کو نہیں جانتا۔ یا پھر جانتے بوجھتے نظر انداز کر رہا ہے۔ ان دونوں سے کہیں اہم یہ بات ہے کہ میرے فارم ہاؤس پر ایک گیٹ ٹو گیدر ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ

ایسا سمیت تم سب بھی شرکت کرو۔“ عفتان علی خان نے مسکراتے ہوئے انابہ شاہ کی سمت دیکھا

اپنی بوپ کہ تم سب ضرور آؤ گے۔“

انابہ شاہ کچھ کہے بغیر اٹھی تھی اور پھر اسی خاموشی سے چلتی ہوئی وہاں سے نکل گئی تھی۔ عفتان علی خان اس نے ڈور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

بچے بہت خاموش سی بیٹھی تھی۔ فارحہ اس کے سامنے تھیں۔ مگر دلجوئی کے سارے لفظ جیسے کہیں کھو

اپنی طرح کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا مجھ میں کوئی بہت بڑی تبدیلی رونما ہو گئی ہے؟“ فارحہ اس کے موڈ کو

رہنے کے لئے بہت دھیس سے مسکرائی تھیں اور اگینے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”بھائی! آپ کو نہیں لگتا آپ کا دل گنجائش سے بہت زیادہ بڑا ہے؟“

اور فارحہ جانے کیوں مسکرا دی تھیں۔

”اگینے! ایسا ہونا بھی ضروری ہے۔ اسپیشلی ایک عورت کے لئے۔ کیونکہ اسے بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے

بلایا بھی پڑتا ہے۔“

اگینے نے خاموشی سے فارحہ کی سمت دیکھا تھا۔

”بھائی! آپ کو لگتا ہے کہ ایسا کر کے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے؟“

”فائدہ۔۔۔۔۔۔ فائدے اور نقصان کے متعلق سوچنا عبت ہے اگینے! میں نے اب تک کی زندگی میں

ایسا اس میں کبھی بھی کسی فائدے کی امید نہیں رکھی۔ آج سعد مجھ سے بدظن ہے۔ ہزار ہا گلے ہیں

مجھ سے۔ مگر میں یہ بات جانتی ہوں، میں نے اس کے لئے، اس گھر کے لئے کتنی قربانیاں دی

تھیں۔ فارحہ کا لہجہ افسردہ تھا۔ ”آج وہ ان قربانیوں کا صلہ کسی اور کو دینا چاہتا ہے۔ تم جانتی ہو اگینے! اب

فائدے سے کیا چاہتا ہے؟“ فارحہ نے نگاہ اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

”اگینے! وہ چاہتا ہے ہماری کمپنیز کے تھرٹی پرسنٹ شیئر وہ اس کے نام کر دے۔ اپنی ٹی شریک حیات

ام۔ اور ایسا کرتے ہوئے اسے اس بات کا قطعاً کوئی احساس نہیں کہ کیا کر رہا ہے اور کیونکر کر رہا

ہے۔ فارحہ کے ہجے کی خوشیاں تو وہ کسی اور کو دان کر ہی چکا ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اب وہ اپنے

ناؤگی فراموش کر رہا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اسے قطعاً احساس نہیں کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ کتنی

انصافی کر رہا ہے۔ مگر میں..... میں یہ نا انصافی قطعاً بھی اپنے بچوں کے ساتھ نہیں ہونے دوں

سکتا۔ لہذا مقام تو شیئر کر سکتی ہوں، اپنے ہجے کی خوشیاں بھی کسی تیسرے وجود کو سونپ سکتی ہوں مگر اپنے

لگاؤ کو نہیں بانٹ سکتی۔ سعد جانتا ہے اس کمپنی کی پچاس پرسنٹ کی شیئر ہولڈر میں ہوں۔ بقیہ کے

ان کے نام ہیں اور وہ انہیں بھی اپنے بچوں کی بجائے دوسروں میں بانٹ دینا چاہتا ہے۔“ فارحہ کی

آنکھیں نم تھیں۔ یقیناً وہ سنجیدہ تھیں۔ اگینے کے پاس ان کی تسلی کے لئے شاید کوئی لفظ نہ تھے۔ بھی شاید وہ

ان سے ان کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

فارحہ نے بھیگی آنکھوں سے اگینے کو دیکھا تھا۔

حیدر لغاری نے اس چہرے کو بہ غور دیکھا تھا پھر بہت آہستگی سے اس روشنی پیشانی پر جلا ہوا بھرپور ہاتھ رکھا اور میرب سیال کی رگوں کا سارا خون جیسے اس کے چہرے پر آن ٹھہرا تھا۔ سینے میں کہیں

بے چین حیدر لغاری نے جیب میں سے ایک پیکٹ نکالا تھا پھر اس میں سے ایک چمکتا ہوا، نازک

لہذا کمال کر اس کی گردن کی سمت بڑھایا تھا۔

ہاہوت ہے؟“ اس کے کسی قدر حیرت سے دیکھنے پر غالباً سردار سینگین حیدر لغاری نے مسکراتے

اس کی سمت دیکھا تھا۔ میرب سیال نے ناچار سر اثبات میں ہلا کر نظریں جھکا لی تھیں اور تب سردار

حیدر لغاری کے ہاتھ اس کی نازک گردن میں اس قیمتی نمکس کو پہنانے لگے تھے۔

انہوں کی یہ کہانیاں ہزار ہا جاں گسل سہی، وہ لمحے کتنے بھی دلفریب سہی، مگر یہ سب میرب سیال کے

بہاہوت دشوار ہو رہا تھا۔ لیکن وہ جیسے مکمل طور پر بے بس تھی۔

حیدر سینگین حیدر لغاری نے اس کی گردن میں وہ موتیوں سے مزین قیمتی نمکس پہنا کر ایک تعقیدی

نظر سے اسے دیکھا تھا اور پھر مسکرا دیا تھا۔

ہٹ ٹویڈ۔“

دو پہر میں سردار سینگین حیدر لغاری کا فون آیا تھا۔ آج کا ڈنر وہ اس کے ساتھ کرنا چاہتا تھا اور اس

پاس انکار کا کوئی جواز نہیں تھا۔ شاید اسی لئے وہ شام میں تیار ہونے لگی تھی۔

سردار سینگین حیدر لغاری جب آیا تھا تو اسے دیکھ کر کچھ لمحوں تک ساکت سا ٹکٹا رہا تھا، پھر

”اگینے! میں نے ایسا کیا تو کیا غلط کیا؟ کیا تو کیا عجب؟ وہ مجھے مورد الزام ٹھہرا رہا۔“

فارحہ ضبط ہار گئی تھیں۔ اور بھی اگینے نے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بہت آہستگی سے

سر ہلاتے ہوئے فارحہ کی سمت دیکھا تھا۔

”بھائی! پلیز، اگر آپ ہی حوصلہ ہاں رہے گی تو باقی لوگوں کو کون سنبھالے گا؟ ان حالات میں

ثابت قدم رہنا چاہئے۔ وقت سب سے بڑا منصف ہے۔ آپ سب کچھ خدا کے حوالے کر دیجئے۔

بہتر کرے گا۔ ایک دن سعد بھائی کو اپنی غلطی کا اندازہ ضرور ہوگا۔“ اگینے نے ملائمت سے بڑے

فارحہ کو تسلی دی تھی۔ فارحہ سر جھکائے بیٹھی تھیں جب ماہا پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اندر داخل

”مئی! بھائی!..... بھائی اپنے کمرے میں پیننگ کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا

وہ مجھے کچھ بتائیں رہے۔“

فارحہ اس اطلاع پر بھونچکا رہ گئی تھیں۔ اگینے اور انہوں نے ایک ساتھ اذہان حسن بخاری کے

کی سمت پیش قدمی کی تھی جہاں اذہان حسن بخاری تیزی کے ساتھ پیننگ میں مصروف تھا۔

دو پہر میں سردار سینگین حیدر لغاری کا فون آیا تھا۔ آج کا ڈنر وہ اس کے ساتھ کرنا چاہتا تھا اور اس

پاس انکار کا کوئی جواز نہیں تھا۔ شاید اسی لئے وہ شام میں تیار ہونے لگی تھی۔

سردار سینگین حیدر لغاری جب آیا تھا تو اسے دیکھ کر کچھ لمحوں تک ساکت سا ٹکٹا رہا تھا، پھر

سے دیکھا تھا۔ میرب سیال چوکی تھی اور فوراً ہی سرنئی میں ہلا دیا تھا۔
”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“

”آریو انجوائنگ وومی؟“ سردار سبکنگین حیدر لغاری نے جانے کس خدشے کے پیش نظر دریافت
اور وہ یکدم ہی مسکرا دی تھی۔

”آف کورس۔“

”تو پھر تم اتنی گم صم ہی کیوں ہو؟“

”نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔“ میرب سیال نے مسکراتے ہوئے سرنئی میں ہلایا تھا۔

”کیا میں تمہیں خوش رکھنے میں ناکام ہو رہا ہوں؟۔۔۔ کیا میں اس کوشش میں بیکر ناکام ہو
سردار سبکنگین حیدر لغاری نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے یہ سب
مدھم لہجے میں اظہار کیا تھا۔

”کیا؟“ سردار سبکنگین حیدر لغاری جیسے کچھ نہ سمجھا تھا۔

”یہ سب..... یہ سب کچھ جو آپ میرے لئے کر رہے ہیں۔ یہ رات، یہ ڈنر، یہ سارا
اور.....“

”اور میں..... میرب؟“ سردار سبکنگین حیدر لغاری نے اس کے جھلے کو درمیان میں سے اچکا با
وہ چونکتے ہوئے اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ مگر سردار سبکنگین حیدر لغاری اس کی آنکھوں میں اسی انداز
دیکھتے ہوئے دریافت کر رہا تھا۔

”اور میں..... میرب سیال؟ تم نے بتایا نہیں، میرے متعلق کیا خیال ہے تمہارا؟ کیا سوچتی ہو
سردار سبکنگین حیدر لغاری کا سوال شاید بہت مشکل تھا۔ یہی میرب سیال کتنی دیر تک خاموشی سے اس
کتی رہی تھی پھر جیسے بے بسی سے نظریں پھیر گئی تھی۔

”آپ..... آپ بھی اچھے ہیں۔“ اس نے جیسے زبردستی وہ ایک جملہ ادا کیا تھا اور سردار سبکنگین
لغاری کے چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”صرف اچرا؟“ نگاہیں کچھ اور بھی وضاحت چاہ رہی تھیں۔ مگر میرب سیال چہرے کا رخ
تھی۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری کو جیسے اس پر جم آ گیا تھا۔ یہی مسکرا دیا تھا۔

”چھینکس۔ مگر بات اچھا لگنے سے کچھ آگے بڑھنے کی اشد ضرورت ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، ہا
کچھ اتنی تسلی بخش تو نہیں؟“ کسی قدر ملامت لہجے میں وہ اظہار مدعا کرتا ہوا اس کی رائے جاننا چاہتا ہوا
وہ کچھ نہیں بولی تھی۔

فلور پر کئی کپل دھیمے آکر سٹرا پر اپنی اپنی جگہوں کے جہاں آباد کئے ہوئے تھے۔ سردار سبکنگین
لغاری نے اس جانب ایک نگاہ کی تھی پھر مسکراتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا اور یہی بہت
ساتھ اپنا چوڑا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا تھا۔ میرب سیال کسی قدر حیرت سے اس کی سمت دیکھنے لگا۔

”آؤ۔۔۔ میں تمہارے ساتھ کچھ دیر قرض کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اجازت ہے نا؟“ مدھم لہجے میں گئی
پس میں اور میرب سیال ساکت ہی اس کی سمت نکلتی ہوئی سر یکدم ٹہنی میں ہلا گئی تھی۔
”مجھے اس سب سے کچھ شغف نہیں۔“

”مجھ سے تو ہے نا؟“ مدھم لہجے میں پوچھے گئے سوال میں کیا کیا نہ تھا۔ میرب سیال خاموشی سے اس
مت دیکھ رہی تھی۔ جب سردار سبکنگین حیدر لغاری نے اس کے نازک سے ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھ کی
نت میں لیا تھا اور وہ اس لمحے جانے کیوں کوئی قرض ہی نہ برت سکتی تھی۔ اٹھی تھی اور اس کے سگ چل
گئی۔

دل کو کسی ایسے ہی لمحے کی آرزو تھی۔ کسی ایسے ہی مضبوط رفیق سفر کی خواہش تھی جو اپنی پناہ میں لیتا تو
لاکڑی ڈر بانی نہ رہتا جو اس کے ہاتھ کو تھامتا تو لگتا ساری دنیا اس کی مٹھی میں آگئی ہو۔ وہ جس کے
پہلی تو لگتا کہ ساری دنیا اس کے ساتھ چل رہی ہو۔ جس کی قربتوں میں اسے یہ زمین بھی آسان لگتی۔

ایسا ہی تو ہوا تھا۔ وہ شخص اس کے قریب تھا۔ وہ اس کی پناہ میں تھی۔ اس کی مضبوط بانہوں نے اس کے
اڑھتا ہوا تھا۔ مگر جانے کیوں دل پھر بھی جیسے مطمئن نہ تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

سبکنگین حیدر لغاری کی قربتیں کیا کیا کہانیاں نہ کہہ رہی تھیں۔ وہ اس کی زلفوں پر جھکا جانے کیا کہہ رہا
اسے تو بس اپنا وہ شانہ اس حدت سے جلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ سارا وجود جیسے کسی آتش کے زیر تھا۔

سردار سبکنگین حیدر لغاری کے لب اس کے گیسوؤں پر ہولے ہولے پلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔
وہ کچھ سرگوشیاں کر رہا تھا۔ مگر میرب سیال کے خود اپنے اندر کا شور اس قدر تھا کہ وہ کچھ بھی سن نہیں پا
گئی کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بس اسے اپنا آپ کسی الاؤ کے حصار میں لگ رہا تھا۔ حدت اتنی تھی کہ
اڈوڈوم روم سلگتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے یہ سب؟۔۔۔ کہاں جا رہے ہو تم؟“ فارحہ نے کسی قدر حیرت سے دریافت کیا تھا۔
انہاں صن بخاری نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اسی طرح سامان نکال کر غصے کیس میں رکھتا رہا تھا۔
دسے پیش قدمی کی تھی اور اس کے عین سامنے جا کر کھیں۔

”میں پوچھ رہی ہوں کیا ہو رہا ہے یہ سب؟۔۔۔ کیا کر رہے ہو تم یہ؟“

انہاں صن بخاری نے ماں کی طرف ایک نظر دیکھا تھا۔ پھر چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔

”تھک گیا ہوں میں۔۔۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب میری برداشت سے باہر ہے۔ تھک چکا ہوں
اور روز ٹوٹ پھوٹ کر اور سیٹ سیٹ کر۔ اسی لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اب یہاں نہیں
لاؤں گا۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ واپس ایشیٹس۔“ انہاں صن بخاری نے مطلع کرنے کے ساتھ ہی

ان دوبارہ سوٹ کیس میں رکھنا شروع کر دیا تھا اور فارحہ اور اگینے اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھیں۔ پھر ایک
انہاں صن بخاری نے پیش قدمی کی تھی اور اس کے ہاتھ سے سب کچھ لے کر بیڈ پر ایک طرف اچھال دیا تھا۔

”کیا کر رہے ہو یہ تم؟۔۔۔ تم ہمیں چھوڑ کر جاؤ گے؟۔۔۔ ہم سب کو؟“ اس کی سمت دیکھا تھا۔

مگر اذہان حسن بخاری ان کی سمت سے نگاہ چرا گیا تھا۔ کچھ لمحے یونہی کھڑا رہا تھا پھر قدرے توقف۔ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے فارحہ کی طرف دیکھا تھا۔

”مئی! یہ بات آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ یہ سب بدلنے والا نہیں ہے۔ یہ تنازعہ روز بڑھنے والا ہی ہے اور بڑھتے ہوئے تنازعات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ یہ بات آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی جانتا ہوں مئی! جب کچھ ختم ہونے والا ہی نہیں تو پھر فائدہ؟“ اذہان حسن بخاری کا لہجہ تھا کماندہ تھا۔ فارحہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھیں۔ کتنی خاموشی سے چلوں کے کنارے سے نمکین پانی کے قطرے ٹوٹ بکھرتے چلے گئے تھے اور اذہان حسن بخاری ہاتھ میں تھمے ہوئے کپڑے ایک طرف پٹخ کر ان کی سر دیکھنے لگا تھا۔

”کیا کروں میں — بتائیے آپ، کیا کروں؟“ اس کا انداز بے بسی سے پڑ تھا۔ ”جب میرا یہاں رہنے سے کچھ بدل ہی نہیں رہا تو پھر میرے یہاں ہونے سے فائدہ؟ مئی! آپ کیوں روری ہیں میں آپ کو تو بلیم نہیں کر رہا۔ اور.....“ وہ تمام ارادے توڑتا ہوا آگے بڑھا تھا اور فارحہ کی آنکھوں کو ہاتھوں سے صاف کرنے لگا تھا۔ اگینے، ماں بیٹے کی محبت کا منظر بہ خورد دیکھ رہی تھی۔

”جھے..... مجھے چھوڑ کر جانا چاہتا ہے تو؟ اپنی ماں کو؟ اتنا بڑا بوجھ ہو گئی ہے آج تیرے لئے ماں کہ اسے چھوڑ کر جانا چاہتا ہے تو؟“ فارحہ کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روری تھیں اذہان حسن بخاری نے چوڑے ہاتھ سے ان کی آنکھوں کی نمی کو پونچھا تھا پھر انہیں تھام کر ساتھ لگا لیا تھا۔ ”میں نہیں جانا چاہتا آپ کو چھوڑ کر۔ بہت مشکل ہے یہ میرے لئے۔ لیکن کیا کروں، آپ بیٹے بتائیے کیا کروں؟ جب یہاں رہ کر میں صورت حال کو اپنے بس میں ہی نہیں کر پا رہا تو پھر میرے یہاں رہنے سے فائدہ؟ جب آپ دونوں کو یونہی ایک دوسرے سے رس کشی کرتے رہنا ہے تو پھر کیا فرق پڑے کہ ہے میں یہاں رہوں یا نہیں۔“ اس کا لہجہ مدہم تھا اور فارحہ اس کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

”مجھے فرق پڑتا ہے اذہان! تیری ماں کو فرق پڑتا ہے۔ تو کیوں اپنی ماں کو مزید دکھی کرنا چاہتا ہے اذہان کی سمت بہ خورد دیکھتے ہوئے سرٹھی میں بلایا تھا۔ ”ٹھیک ہے، ماں لوں گی میں وہ سب کچھ چپ چاپ جو سعد حسن بخاری کہتا ہے۔ کوئی مخالفت نہیں کروں گی۔ مگر تم..... تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“ آنسوؤں کی آنکھوں سے متواتر بہ رہے تھے۔ ”سناتم نے — تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“ ان کے کڑور لہجے میں ایک ایک حکم تھا۔ اور اذہان نے انہیں ہانہوں میں سمیٹ کر اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

”مئی! آپ سب کے بغیر میری زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ میں آپ سب کے بغیر نہیں سکتا ہوں۔ میرے لئے یہ سوچ بھی جان لیوا ہے مگر.....“ اس نے تھک کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ یہ نہیں کہتا مئی! کہ سرخڑا آپ کریں یا کسی کی غلط بات کو چپ چاپ مانتی چلی جائیں۔ میں یہ سب نہیں چاہتا۔ مگر مئی! میں آپ کو اس طرح ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ میرے لئے یہ سب بہت تکلیف دہ ہے۔ میں فرار آپ سے نہیں چاہتا۔ فرار میں اس صورت حال سے بھی نہیں چاہتا۔ فرار چاہتا ہوں تو بس اس شکست و ریخت کے عمل سے، جو میں دیکھ نہیں پا رہا ہوں۔ میں آپ کو اس کیفیت میں نہیں

نہی اپنا کوسجھانیں سکتا کہ وہ سب کچھ فراموش کر کے ہاتھ بنائیں جو زندگی کی طرف لوٹتا ہو۔ میں ملت پر ہائل نہیں کر سکتا اور شاید میں انہیں قائل بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہر بار آپ کو توڑیں گے، ہاتھ اور میں کبھی بھی کوئی احتجاج نہیں کر سکوں گا۔ مگر میرے لئے یہ سب کچھ دیکھنا بھی بہت مشکل ہے۔ ہر بار آپ کو ڈی فنڈ کرنے کے لئے ان کے سامنے جا کھڑا ہوں گا اور انہیں ہر بار میں خود کا بھی برا دشمن لگوں گا۔ وہ غلط ہوتے ہوئے بھی خود کو غلط نہیں سمجھتے۔ انہیں لگے ہے کہ میں ان کی کر رہا ہوں یا آپ کو ڈی فنڈ کرنے کے لئے ان کے مقابل کھڑا ہو رہا ہوں۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کرنے میں بھی اگر آپ کو چھوڑ دوں گا تو آپ کتنی تمہارہ جائیں گی۔ میں دانستہ ان کی مخالفت نہیں کرنا چاہتا اور رد کرنا میرے بس میں نہیں۔ مجھ سے یہ کبھی نہیں ہو سکے گا اور نہ ہی میں آپ کو آپ کا مقام واپس دلا پاؤں گا۔ یہ فاصلوں کی طبع بڑھتی چلی جائے گی۔“ اذہان حسن بخاری کا لہجہ بخورہ تھا۔

مئی! گھر، گھر کے افراد سے بنتا ہے۔ گھر میں بسنے والوں سے بنتا ہے۔ میں نے ہمیشہ ایک بسا ہوا بیکار ہے۔ وہ سنکھ دیکھا جو عظیم تر تھا۔ لیکن اب جب میں اسی بے ہوئے گھر کو ٹونا چھوٹا دیکھتا ہوں تو یہ برداشت نہیں ہوتا۔ اس گھر کی بنیادیں میرے سامنے کھولتی ہو رہی ہیں اور میں کچھ کر نہیں پا رہا۔ غور شاید کسی کا بھی نہیں ہے مئی! تصور شاید اس وقت کا ہے جس نے ہم سب کو اس دوراے پر لا لیا ہے جس پر نہ ہم چل کر آگے بڑھ پارہے ہیں نہ ہی اس سے پلٹ پارہے ہیں۔ مئی! ہم میں سے کون جانتا کہ اس سے آگے کا موڑ کیا ہے۔ یا پھر اس سے آگے کی راہ کیا ہو گی۔“ اذہان حسن بخاری لوں کے کنارے بہت آہستگی سے بھینگ رہے تھے۔ وہ انتشار کے مرحلے سے چپ چاپ گزر رہا تھیں کی آنکھیں بھی بھینگنے لگی تھیں۔

اردھیلی آنکھوں سے سراخا کر بیٹے کی سمت دیکھنے لگی تھیں۔

مسا تھے اپنے ساتھ باندھ کر رکھنا نہیں چاہتی اذہان! مگر میں تجھ سے جدا ہو کر بھی نہیں جی سکتی۔ لانا، کیا کروں، مجبور ہوں دل کے ہاتھوں، اپنی مانتا کے ہاتھوں۔ اس لئے تجھے بھی مجبور کر رہی ہوں اس مشکل صورت حال میں بھی میرے ساتھ رہے۔ میرے ساتھ جئے۔ کچھ خود غرضی ہے۔ مگر ہر ماں ہی خود غرض ہوتی ہے“ فارحہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ بولی تھیں اور اذہان حسن بخاری نے اذہان کو سران کے سامنے جھکا دیا تھا۔

مئی! میں آپ سے الگ ہرگز نہیں ہوں۔ یہ جان آپ کی ہے، مانگئے تو وہ بھی دے دوں گا۔“

لکنا باتیں کر کے اپنی ماں کو اور ڈھکی مت کر۔ ورنہ بہت پٹائی لگاؤں گی۔“ فارحہ نے ہاتھ اٹھا کر بددھمکی دی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے ماں کی سمت دیکھا تھا پھر انہیں اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا۔

نئے سے پہلے کی ایک شام وہ سردار سینکین حیدر لغاری کے ساتھ سب کے لئے گفٹس خرید رہی تھی۔ مالدار کا فون آ گیا تھا۔ سردار سینکین حیدر لغاری بہت خوش دلی سے بات کر رہا تھا۔

”جی مائی اماں! سب ٹھیک ہے یہاں۔۔۔ جی، آپ کی بہو بھی۔“

مائی اماں نے غالباً اس کی بابت پوچھا تھا اور وہ مسکراتے ہوئے اس کی سمت دیکھنے لگا تھا۔
”جی، آ رہے ہیں ہم کل کی فلائٹ سے۔ لیجئے، اپنی بہو سے بات کیجئے۔“ اس نے سیل فون کی
سمت بڑھا دیا تھا۔ میرب سیال نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر فون اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔
”السلام علیکم مائی اماں!“

”وعلیکم السلام بیٹا! کیسی ہو؟“ مائی اماں محبت سے مخاطب تھیں۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”جی، ٹھیک ہوں۔۔۔ آپ کیسی ہیں مائی اماں؟“

”ٹھیک ہوں بیٹا! میں نے سوچا تم دونوں تو مجھے یاد کرو گے نہیں، میں ہی کر لوں۔“

”ارے یہ کیسے سوچ لیا آپ نے؟ ایسا بھلا ہو سکتا ہے؟ ہم آپ کو کیسے بھول سکتے ہیں؟“ میرب
نے مودب انداز میں کہا تھا۔

”جانتی ہوں جان! میں تو مذاق کر رہی تھی۔ یہ بتاؤ، سبکنگین حیدر لغاری خیال تو رکھ رہا ہے نا تمہارا
”جی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سردار سبکنگین حیدر لغاری کی سمت دیکھا تھا۔

”بیٹا! وہ بظاہر جو نظر آتا ہے ویسا ہے نہیں۔ دیکھنے میں لگتا ہے وہ سخت گیر ہے۔ جسے شاید دوسرا
جذبات کا قطعاً کوئی احساس نہیں۔ وہ شاید دوسروں کے متعلق سوچتا بھی نہیں، مگر ایسا نہیں ہے۔
حیدر ایک دردمند دل رکھتا ہے۔ تکلیف میں تو وہ کسی جانور کے ننھے سے بچے کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔
صرف مورائی کی نہیں ہے بیٹا! وہ واقعی ایک حساس طبیعت کا مالک لڑکا ہے۔ بس کھلتے میں کچھ فرق
ہے اسے سمجھنا کسی قدر دشوار ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ وہ کسی سے خائف ضرور رہ سکتا ہے، لائق ضرور
سکتا ہے مگر کسی کو دکھ نہیں پہنچا سکتا۔“ مائی اماں سردار سبکنگین حیدر لغاری کے متعلق کہہ رہی تھیں اور
سیال بے دھیانی میں اس شخص کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری اس کی سمت بہت اہل
سے دیکھ رہا تھا۔

”میں یہ تو نہیں جانتی بیٹا! کہ تم اسے کس حد تک سمجھ پائی ہو۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ تم اسے اثر
کر سکو۔ اسے سمجھنا اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔ بس اسے دل سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ تم سمجھ رہی
میری بات؟“ مائی اماں نے اس سے دریافت کیا تھا اور اس نے سر بے دھیانی میں اثبات میں ہلانا
”جی۔“

”بات یہ ہے بیٹا! جب ہم کسی کو کسی حد تک سمجھنے لگتے ہیں تو پھر مشکلات کسی قدر کم ہونے لگی
بہت سی پریشانیوں ہماری اپنی تیار کر دہی ہوتی ہیں۔ اس میں تصور صرف دوسرے کا ہی نہیں ہوتا بلکہ
اس لئے نہیں کہہ رہی بیٹا! کہ میں تمہاری ساس ہوں اور سبکنگین حیدر لغاری کی ماں۔ ایسا بالکل ٹھیک
میں اس سے زیادہ تمہاری خبر خواہ ہوں۔ اس لئے میں چاہتی تھی کہ تم دونوں کے درمیان ایک باہمی
اسٹیٹمنٹ ہو جائے۔ تم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سے سمجھ لو۔ میرا خیال ہے یہ عرصہ اس
خاص اور مندا ثابت ہوا ہوگا، ہے نا؟“ مائی اماں نے پوچھا تھا اور اس نے سر ایک بار پھر اثبات میں

”جی۔“

”اچھا، کیا واقعی تم ایک دوسرے کو سمجھنے لگے ہو کسی قدر؟“ مائی اماں کو کسی قدر خوشی ہوئی تھی۔
وہ سردار سبکنگین حیدر لغاری کی سمت دیکھتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”جی کسی قدر پیش رفت ہوئی تو ہے۔ شاید اسے شناسائی ہونا ہی کہتے ہیں۔“

”شکر ہے خدا کا۔ میں دل سے دعا گو تھی تم دونوں کے لئے۔“ مائی اماں نے باقاعدہ شکر ادا کیا تھا۔
اہل دراصل یہ ہے کہ نئی زندگی کا یہ عرصہ بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اس میں اس سے بھی زیادہ
اہم یہ ہے کہ سارا کا سارا کردار ایک عورت یا پھر لڑکی ہی ادا کرتی ہے۔ تم اسے اچھا کو یا پھر برا مگر نئی
کی کے اس باب میں سمجھ لو جھ سے کام ایک لڑکی کو ہی لینا پڑتا ہے۔ سچی ایک ہستی ہستی زندگی وجود میں آ
نا ہے۔ ایک ہنسا ہنسا گھر بن سکتا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“

”جی مائی اماں!“ میرب سیال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”بیٹا! بات نصحتوں کی نہیں ہے۔ نصیحتیں بڑے بوڑھے بزرگ کرتے ہیں۔ تو مجھے اپنی ساس مت
وہاں سمجھ اور ماں سے بڑھ کر ایک دوست۔ میں سبکنگین سے زیادہ تجھے اپنی غلط لگوں گی۔ یہ مت
نا کہ میں کہیں کسی مقام پر اپنے بیٹے کی حمایت کروں گی یا خواہ مخواہ اسے فوراً کروں گی۔ نہیں، میں اسے
ہاؤونے کی رعایت بالکل نہیں دوں گی اگر وہ کوئی غلطی اس ضمن میں کرے گا۔ تم اس بات کا یقین کر لو
سبکنگین حیدر کو بھی سمجھا دو۔ جب سے گیا ہے، کاروبار میں الجھا ہوا ہے۔ ایک بار بھی ڈھنگ سے بات
ہوئی۔“ مائی اماں بولی تھیں اور وہ مسکرا دی تھی۔

”آپ ان سے بات کر لیجئے۔“

”اس سے بات تو میں کروں گی ہی مگر پہلے مجھے اتنا کہنے دو کہ اپنا بہت خیال رکھنا اور سبکنگین حیدر کا
تمہارے پاپا کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ آپ سبکنگین حیدر سے بات کر لیجئے۔“ وہ فون اسے تھا کر ایک گفٹ شاپ
مت بڑھ گئی تھی۔ اور جب وہ ایک کرسٹل ہارٹ ہاتھ میں لئے اسے جانچ رہی تھی تبھی سبکنگین حیدر
لاہل آ گیا تھا۔ میرب سیال نے چونک کر اس کی سمت دیکھا تھا مگر سردار سبکنگین حیدر لغاری اسے
نکا بجائے پوری توجہ سے اس کرسٹل ہارٹ کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

”جی ٹل۔“ سردار سبکنگین حیدر لغاری نے اس آسٹم کو بھر پور سراہا تھا۔

”میرب سیال مسکرا دی تھی۔“

”اچھا ہے نا؟“

”ہاں بہت۔“ سردار سبکنگین حیدر لغاری نے ہاتھ بڑھا کر وہ گفٹ آسٹم اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔
”ان انداز میں اس کرسٹل ہارٹ کو دیکھتے ہوئے اپنی توجہ شاپ کپیر کی سمت مبذول کی تھی اور اسے فوراً
لے لے لیا تھا۔“

میرب سیال اسے سینی کے لئے لینا چاہتی تھی۔ مگر اب بے بسی سے اسے صرف دیکھ کر رہ گئی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری شاید اس کی مشکل سمجھ گیا تھا۔ تبھی بہت ملاحت سے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کو اپنے بھاری مضبوط ہاتھ سے بچوں کی طرح چھتھپایا تھا۔

”تم کچھ اور لے لو۔ شاباش۔“ اور میرب سیال اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ جانے کس کے لئے منتخب کیا؟ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کرشل ہارٹ کو۔ اسے قلق اس بات کا نہ تھا کہ اس نے اس کے ہاتھ سے اسے لے کر اپنے لئے پیک کر دیا تھا۔ بات اس سے بھی کہیں یہ کاٹ رہی تھی، سردار سبکدین حیدر لغاری نے اسے کس کے لئے بطور خاص منتخب کیا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے گفتگوں دیکھ رہی تھی جب سردار سبکدین حیدر لغاری اس کے قریب کھڑے ہوئے پوچھنے لگا تھا۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ مائی اماں نے ایسا کیا کہہ دیا کہ تمہارا موڈ بگڑ گیا؟“

وہ ایک لمحے میں چونکی تھی۔

”نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔“ اس نے سرفنی میں ہلایا تھا اور سردار سبکدین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”شیور؟“ بہ غور اس کی سمت دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کی سمت سے نگاہ پھیر گئی تھی۔

”مائی اماں کیا کہہ رہی تھیں؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری کو جانے کیوں جانے کا شوق ہوا تھا اور میرب سیال اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”کچھ خاص نہیں۔ بس رسی سی باتیں ہو رہی تھیں۔ آپ کو کچھ خاص تخیس نہیں ہو رہا جانے کا؟“ مسکراتی ہوئی پُر اعتماد نظروں سے اس کی سمت دیکھتی ہوئی بولی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کی سمت بہ غور دیکھا تھا پھر جانے کیوں مسکرا دیا تھا۔

”ہو سکتا ہے ہم میں بہت پرشل باتیں ڈسکس ہوئی ہوں۔ جن کے متعلق کسی اور سے شہر کرنا مانگا ہو۔“ میرب سیال نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور سردار سبکدین حیدر لغاری کو اس کے پُر اعتمادانہ پر کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔

”ادہ، ریلی؟“ غالباً وہ محظوظ ہوا تھا۔

”ہاں۔“ میرب سیال مسکراتی ہوئی اس کی جانب سے توجہ ہٹا کر گفتگو پیک کر دے لگی تھی۔

”میرب!“ ہولے سے پکارا تھا۔

”جی۔۔۔“ وہ پلٹی نہیں تھی۔ اسی طرح کھڑے کھڑے جواب دیا تھا۔ اس کی پشت پر کھڑا بیٹھکا

حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”جانتی ہو، ہز بیڈ وانف میں کچھ بھی پرشل نہیں ہوتا۔“ جتایا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”ہوتا ہے۔“ اسے رد کیا تھا۔ انداز کمال کا پُر اعتماد تھا۔ مگر سبکدین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔ ”وانف میں کچھ بہت کچھ پرشل ہوتا ہے۔ جیسے ابھی آپ نے وہ کرشل ہارٹ پیک کر دیا تو میں نے

پہا نکل نہیں پوچھا کہ وہ آپ نے کس کے لئے پیک کر دیا ہے۔“ ”ادہ۔۔۔ تو یہ بات ہے۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری حیران ہونے سے زیادہ محظوظ ہوا تھا۔ مگر میرب سیال مزید کچھ بھی کہنے بغیر آگے بڑھ گئی تھی۔ اور تب اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے سردار سبکدین حیدر لغاری کو بھی پیش قدمی کرنا پڑی تھی۔

کچھ دن گزر گئے تھے۔ وہ اس روز کے بعد اس کی طرف نہیں آئی تھی۔ اور اسے بھی مصروفیت اس قدر ہی تھی کہ وہ اس سے بات تک نہ کر سکا تھا۔ مگر اس کے باوجود اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے ناراض بارودہ دیا جانتا تھا، غلطی بھی اسی کی تھی۔ تبھی شام میں وہ اس کی طرف آ گیا تھا۔ وہ ٹیس پر تھی۔ اسے بے غی منہ پھیر کر وہاں سے نکل جانا چاہا تھا مگر اذہان حسن بخاری نے بہت سرعت سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی سمت دیکھتا ہوا مسکرا دیا تھا۔ ساہیہ خان کسی قدر ناگواری سے اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ مگر بہت مودب انداز میں سر جھکا گیا تھا۔

”میں جانتا ہوں، غلطی میری تھی۔ سو آئی ایم سوری۔“ مدہم لہجے میں کہا تھا اور ساہیہ خان اس کی سمت ہلکے سے ہلکی تھی۔

”نہیں، غلطی تمہاری نہیں تھی اذہان حسن بخاری! غلطی میری ہی تھی۔ میں تمہیں اپنا سمجھی تھی۔ تبھی بالکل دل جوئی کرنے پہنچ گئی تھی۔ مگر مجھے نہیں پتہ تھا کہ تم اسے اپنی زندگی میں مداخلت سمجھو گے۔“ اذہان نے کسی قدر لائق لہجے میں کہا تھا۔ مگر اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”اکی سڈ آئی ایم سوری، مجھے اپنی غلطی کا اندازہ ہو گیا تھا تب ہی۔“

”لیکن تب تو تم نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔“ ساہیہ خان نے اس کی سمت پُر شکوہ نظروں سے دیکھا تھا۔ اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”تب تم نے پوچھا ہی نہیں تھا۔ یاد ہے، نور اہی انھی تھیں اور چلی آئی تھیں۔“ یاد دلایا تھا۔ مگر ساہیہ خان اس کی سمت سے رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”ساہیہ! پلیز ٹرائے نو انڈر اسٹینڈ می۔“ اس کے سین سامنے کھڑے ہوتے ہوئے مدہم لہجے میں اس کی سمت کی طرف اشارہ کیا۔

”اذہان حسن بخاری! میں جانتی تھی تم کس درجہ مشکل میں گھرے ہوئے ہو۔ مجھے تمہاری کیفیت کا تقابلی میں نے تمہیں دیگر دوستوں سے ہٹ کر ٹریٹ کیا۔ مجھے معلوم تھا تمہیں دلجوئی کی ضرورت

مگر میں یہ بھی جانتی تھی تمہیں ہمدردی کا کوئی عام انداز نہیں بھائے گا۔ شاید تم اس ہمدردی کو اچھا خیال کر لو گے۔ اس لئے میں نے تم سے ایک مختلف رویہ اپنایا۔ مقصد فقط یہی تھا کہ تم کسی قدر سنبھل جاؤ۔

میں نے ایک عام دوست سے ہٹ کر تمہاری دلجوئی کی۔ مگر تم اذہان! تم بہت برے ہو۔“ وہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”واقعی بہت برا ہوں۔ مگر کیا کروں؟۔ ایسا ہی ہوں میں۔ کیا تم مجھے اس طرح قبول کرنا ہو؟“

ساہیہ خان نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر ایک دھیمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی تھی۔
”اذہان! تمہارا پرانہلم پیٹہ ہے کیا ہے؟ تم اپنے دوستوں کو بہت ہی کیوں لیتے ہو اور ایسا کر ہوئے تم ان کے جذبات کو کبھی کسی قدر ہرٹ کر جاتے ہو۔“

”لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ میں اپنے دوستوں کو کھونا قطعاً بھی نہیں چاہتا۔ سو ہاؤ کین آئی لوزر۔ بیسٹ فرینڈ ناؤ۔“ اذہان حسن بخاری نے اپنا چوڑا ہاتھ اس کی سمت پھیلا دیا تھا۔ ساہیہ خان نے اس سمت دیکھا تھا پھر اپنا ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ پر دھر دیا تھا۔
”چھینکس۔“ اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا۔ ساہیہ خان بھی مسکرا دی تھی۔

”میں تم سے ناراض نہیں اذہان! میں ایک دوست کی کیفیت کو سمجھ سکتی ہوں۔ میں جانتی تھی تم ڈپرینڈ تھے۔ اور ایسے میں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں بس تمہیں کچھ وقت دینا چاہتی تھی تاکہ تم اس صور حال کو خود آپ سمجھ سکو اور قبول کر سکو۔“ ساہیہ خان نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ اذہان حسن بخاری اس سمت دیکھتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”ساہیہ خان! تم میری بہت سمجھ دار اور عقل مند دوست ہو۔ تم نے واقعی ٹھیک کہا تھا کہ جب تک اس صورت حال کو قبول نہیں کر لوں میں اس سے نہیں نمٹ سکتا۔ اور اب میں نے صورت حال کو قبول شروع کر دیا ہے۔“

”تمہیں ایشیٹس دوبارہ جانے کا ڈرامہ رچایا؟“ ساہیہ خان نے مسکراتے ہوئے اس کی سمت دیکھا۔
اذہان حسن بخاری بہت دھیمے سے مسکراتے ہوئے چہرے کا رخ پھر گیا تھا۔

”تو ساری خبریں رکھی جا رہی تھیں۔ اتنی فکر تھی تو خود کیوں نہیں آگئیں؟“
”روکنے؟“ ساہیہ خان نے وضاحت چاہی تھی مگر وہ کچھ بولے بغیر مسکرا دیا تھا۔

”میں جانتی تھی تم نہیں جاسکو گے اذہان!“
”کیوں؟۔ تمہیں یہ یقین کیونکر تھا؟“ اذہان حسن بخاری کو کسی قدر حیرت ہوئی تھی اور ساہیہ

مسکرا دی تھی۔
”اذہان حسن بخاری! جو شخص محبتوں میں بندھا ہو، وہ کبھی کہیں نہیں جاسکتا۔ میں جانتی تھی، خود

وابستہ رشتوں کی محبت تمہیں کہیں جانے نہیں دے گی۔ بہتر ہو گا تم بھی اس بات کا یقین کر لو اور آ فارحہ آئی کو پریشان کرنے کا ارادہ نہ کرو۔“

”فارحہ آئی کو نہیں مگر ان کی منظور نظر اس جیسی لڑکی کو پریشان کرنے کا ارادہ تو کر سکتا ہوں۔“
اسے شانوں سے تھامتا ہوا مسکرایا تھا۔ ساہیہ خان مسکرا دی تھی۔

”اذہان! فارحہ آئی بہت پریشان ہیں۔ پلیز تم واقعی انہیں آئندہ پریشان مت کرنا۔ بہت سی باتیں

اپنی اس لڑکی کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

مجھے بے وقوف سمجھتے تھے اذہان؟“ اس کے اس طرح دیکھنے پر وہ مسکرائی تھی۔

”ایسی بات نہیں ہے۔ مگر میں تم سے اس قدر سمجھ داری کی باتیں ایکسپکٹ نہیں کر رہا تھا۔“

”کیا سمجھتے تھے، ساہیہ خان کو صرف ہنسی مذاق ہی کرنا آتا ہے؟“

”نہیں، میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ تم ہر رنگ میں کتنی خوب صورت ہو۔“ آنکھوں میں شرارت لے لیا تھا اور ساہیہ خان ہنس دی تھی۔ وہی اپنی فطری ہنسی۔

”بڑا ہمیشہ میرے ساتھ رہنا، اسی طرح۔“ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے مدہم لہجے میں کہا تھا اور وہ سر اثبات میں ہلاتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”مگر تمہیں ایک پراس کرنا ہو گا۔“

”اس؟“ وہ چونکا تھا۔

”یہ وہ یہ کہ آئندہ کتنا بھی بڑا کر اس کیوں نہ زندگی میں آجائے، تم اسے اتنا ہیوی نہیں لو گے۔“
”نکلے دماغ سے سوچ کر اس صورت حال سے نمٹو گے۔“ ساہیہ خان نے اپنا نازک سا ہاتھ

ملا تھا۔

”آئی ڈو پراس۔“ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے اپنا بھاری ہاتھ اس کے ہاتھ

ملا۔

لال خان کو کوشش کے باوجود نیند نہیں آرہی تھی۔

بے فکری تھی۔ ایک اضطراب تھا جو دل کو چار اطراف سے گھیرے ہوئے تھی اور وہ بے بس تھا۔

بے بس۔

بے بس۔

بے بس۔

بے بس۔

بے بس۔

بے بس۔

بے بس۔

”کونسا نہیں پایا تھا ان آنکھوں میں ایسا کیا جادو تھا؟۔ اس چہرے میں کیسی کشش تھی کہ وہ اس

کونسا نہیں پایا تھا۔ کچھ سوچ ہی نہ پاتا تھا۔ کیا عہد تھا ان آنکھوں میں۔

کونسا نہیں پایا تھا۔

کونسا نہیں پایا تھا۔

کونسا نہیں پایا تھا۔

ہی خود کو مجرم سمجھنے لگا ہوں۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ مگر اس کے باوجود ایک احساسِ جرم ہندوں سے ہر گھڑی لپٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ماما! آپ جانتا چاہتی ہیں نامیں کس لئے پریشان رہتا وہ کون سی بے چینی ہے جو مجھے ستاتی رہتی ہے؟“

بہنو! اضطراب سے بھری آنکھوں کو وہ ماں کی سمت اٹھائے کہہ رہا تھا۔ اور فاطمہ خانہ ساکت سی بیٹھے کوئی نہیں۔

مجھے خوابوں سے کبھی کوئی شغف نہیں رہا ہلہا! — مجھے کبھی کوئی بے قراری نہیں تھی۔ مگر اس کی ہانپنے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا منظر اسی کے رنگ میں رنگ گیا۔ ماما! اس کی ایک زندگی مجھے زندگی کے ہزار ہا رنگ دکھائے، ہزار ہا معنی بتائے۔ وہ باتیں بھی سمجھائیں جو میں اس سے قبل نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو لگا زندگی بس وہ ہے اور باقی سب خواب۔ ماما! اس کی خواب آنکھوں میں عجب ایک بات ہے جو ہوش بھلا دیتی ہے۔ اور..... اور مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔ میں نے سامنے ہوتا ہوں تو کچھ اور دیکھ ہی نہیں پاتا، کچھ اور سوچ ہی نہیں پاتا۔ صرف..... صرف اسے ہوں اور اسے سوچتا ہوں۔ عجب بے خود کر دیتی ہے وہ مجھے۔ کچھ ہوش باقی نہیں رہنے دیتی۔ — اس کے سامنے ہار جاتا ہوں۔ عجب ایک پدپائی ہوتی ہے میرے انداز میں اور اسے کچھ خبر نہیں۔ اس کی جادوئی آنکھیں میرے اندر کئی خواب جگانے لگتی ہیں اور میں بے بس سا، خالی خالی اس کے چہرے کو تکتا رہتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ماما! — میں اس سے دور بھاگتا ہوں مگر پاؤں بندھ جاتے ہیں۔ میں نہیں دیکھنا چاہتا ان رنگوں سے، خوابوں سے بھری آنکھوں کو مگر ان رنگوں سے عجب ایک انسیت سی ہو چلی ہے کہ کچھ تدبیر کام نہیں آتی۔ اور تب تب مجھ پر کھلتا ہے لہ میں کبھی اس سے دور ہونے کی سعی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آئی لو ہر — آئی لو ہر ماما! — میں نے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ماما! ہر بندھن توڑ دوں گا۔ میں ان زنجیروں میں بندھ کر نہیں رہ سکتا۔“ عفتان

ان کا انداز شکستہ اور نڈھال تھا اور فاطمہ خانہ ساکت سی بیٹھے کو دیکھ رہی تھیں۔

”م گھنے لگا ہے میرا۔ اب میں وہ سب کر جاؤں گا جو مجھے اس سے ملا سکے۔ کیونکہ مجھے احساس لگتا ہے ماما! کہ اس کے بنا کوئی راستہ نہیں۔ نہ چینی کا، نہ ہی.....“ وہ یکدم اٹھا تھا اور چلتا ہوا وہاں ٹٹ گیا تھا۔

فاطمہ خانہ کتنی دیر تک وہاں بیٹھی سر سر ہاتی ہواؤں کے شور کو سنتی رہی تھیں۔



زندگی سے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے

اب تو زندہ ہوں میں اس نئے آسمان میں
کتنی باتیں تھیں جو ان کہی تھیں۔ کتنی کہانیاں تھیں جو کبھی بیان نہ ہو سکی تھیں، جنہیں کبھی وہ اس کہہ ہی نہ سکا تھا۔ کیسی بے اختیاری تھی اس دل میں اور کیسی بے بسی تھی اس کی۔

چاہت ایسی ہے تیری بڑھتی جائے

آہٹ ایسی ہے یہ تیری جھ کو ستائے

یادیں گہری ہیں اتنی کہ دل ڈوب جائے

اور آنکھوں میں یہ غم غم بن جائے

اب تو عادت ہے مجھ کو ایسے جینے میں

کبھی لمحے ہیں

کبھی باتیں ہیں

بھلا دو انہیں

مٹا دو انہیں

اچانک اس کے پیچھے آہٹ ہوئی تھی۔ اس نے پلٹ کر دھیان کیا تھا۔

”عفتان!“ ماما کو اسے اس وقت جاگتا دیکھ کر کسی قدر حیرت ہوئی تھی بھی وہ چلتی ہوئی آگے ہاتھیں۔ ”تم سوئے نہیں ابھی تک؟“ ماما نے دریافت کیا تھا اور اس نے بنا جواب دئے نظر پڑا تھا۔ سرخ آنکھوں میں کوئی گہرا اضطراب بول رہا تھا۔ فاطمہ خانہ نے کسی قدر فکر مندی سے باپیشانی پر ہاتھ دھرا تھا۔ عفتان علی خان بہت دھیسے سے مسکرا دیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں ماما!“ وہ ہولے سے کہہ کر سر جھکا گیا تھا۔ فاطمہ خانہ نے بیٹے کو بہ غور دیکھا ماما بیٹے کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔

”کیا بات ہے؟ تم پریشان لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو؟ اس روز میں نے پوچھا تھا مگر تم ٹال گئے تھے۔ تم کیا سمجھتے ہو، ماں سے صھوٹ بولنا اس قدر آسان ہے؟ کیا یہ نہیں دیکھ رہی؟“

”کیا؟“ وہ مسکرایا تھا مگر انداز بہت بچھا بچھا سا تھا۔ ”کیا دیکھ رہی ہے آپ کی نگاہ؟“ فاطمہ خانہ کچھ نہیں بولیں مگر وہ بیٹے کی جانب بہ غور دیکھ رہی تھیں۔ عفتان علی خان نے ماں کا ہاتھ دیکھا تھا پھر بہت دھیسے سے مسکرا دیا تھا۔

”ماما! میں نے آپ سے کچھ چھپایا ہے۔“

”کیا؟“ فاطمہ خانہ چونکی تھیں۔

”بہت کچھ ماما!“ وہ سر جھکا گیا تھا۔ انداز بے حد بچھا بچھا سا تھا۔ ”بہت کچھ۔“ وہ ان کی سمت لگا تھا۔ ”لیکن اب میں مزید کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ آپ جانتی ہیں میں کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوں۔“

”ہمیں یاد کر رہی ہیں۔ کچھ زیادہ دن نہیں لگا دیئے تم نے؟“
 ”ہاں۔ مگر اب تمہارے انتظار کی یہ مدت ختم ہو رہی ہے۔ میں واپس آ رہی ہوں۔“
 ”اوہ، ریلی؟ لیکن کب؟“

”بہت جلد۔“ میرب سیال کے لبوں پر بہت مطمئن مسکراہٹ تھی۔ ”سینی! میں جانتی ہوں میں اسٹڈی بہت کچھ مس کر چکی ہوں۔ پلیز، تم میرے لئے نوٹس تیار رکھنا اور مجھے اس میں تمہاری ہیلپ کی بھی ضرورت پڑے گی۔ تم ایسا کرنا.....“

”میرب!“ وہ تیزی سے بول رہی تھی جب اپنے پیچھے آہٹ کے ساتھ ایک بھرپور لہجہ سنائی دیا تھا۔ وہ ہم ہی پلٹ کر دیکھنے لگی تھی۔ سردار سیکٹین حیدر لغاری اس کے قریب کھڑا اس کی توجہ کا منتظر تھا۔
 ”سینی! میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کیا تھا اور سردار سیکٹین حیدر لغاری کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”تم مصروف تھیں؟“ سردار سیکٹین حیدر لغاری اس کی طرف پوری توجہ سے دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔
 ”نہیں۔ آپ کو کوئی کام تھا؟“

”کام؟“ مسکراتے ہوئے بھرپور انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ ”کیا تم سے ملاقات کے لئے کام جیسے حوالوں کی ضرورت ہے؟“

”نہیں۔“ میرب سیال نے بنا تعرض سرفنی میں ہلا دیا تھا اور اس لئے سردار سیکٹین حیدر لغاری نے اس کے ہرے کو بغور دیکھا تھا، پھر بہت دھم سے مسکرا دیا تھا۔

”تمہارے چہرے پر کسی شے کی کمی ہے میرب!“ لہجہ دھیمہ تھا۔ میرب سیال بے طرح چونکی تھی۔ بے لگی میں ہاتھ چہرے کی جانب چلا گیا تھا۔ بہت آہستگی کے ساتھ اس نے اپنے چہرے کو چھوا تھا۔
 رول میں کسی قدر حیرت تھی۔

”کی؟“ کس چیز کی کمی؟“ اس کا لہجہ بھی حیرت سے بھرپور تھا اور سردار سیکٹین حیدر لغاری مسکرا اٹھا۔ بہت آہستگی سے قدم اٹھا کر اپنے درمیان کا فاصلہ سمیٹا تھا اور اس کے قریب آ کر رکھا تھا۔ اسے بہت دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو بہت آہستگی سے چھوا تھا۔ میرب سیال اس کے اقدام پر کی قدر جھج کر نظریں جھکا گئی تھی۔ مگر وہ مسکرا دیا تھا۔

”یور اسائل۔۔۔۔۔ ہنی! آئی ایم مسنگ یور اسائل! ان یور فیس۔“ مدہم لہجے میں کہتے ہوئے وہ بغور اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ میرب سیال کی دھڑکنوں میں ارتعاش یکدم ہی برپا ہوا تھا۔ مسکراتی تو وہ کیا، تو نگاہ اٹھا کر اس کی سمت اس لئے دیکھ بھی نہ سکی تھی۔ سردار سیکٹین حیدر لغاری کی نگاہوں میں اس گھڑی دلی تپش تھی۔

”میں بہت سے رنگ اس چہرے پر نکھرے دیکھنا چاہتا ہوں ہنی! مجھے اچھا لگتا ہے جب تم مسکراتی ہو۔ مجھے وہ سبھی رنگ اچھے لگتے ہیں جو اس لئے تمہاری ان آنکھوں سے پھوٹتے ہیں۔ مجھے وہ چمک بہت لگتی ہے جس کے باعث تمہارا چہرہ کچھ اور بھی نکھر سا جاتا ہے۔“ کتنی میٹھی سی، مدہم سرگوشی تھی۔ ”سوال

میرب سیال اپنی بیکنگ کر رہی تھی۔ جب سینی کا فون آ گیا تھا۔
 ”سینی تم؟“ تم اتنے عرصے بعد؟ کہو، کیسے یاد آگئی میری؟“ وہ حیران ہونے کے ساتھ کہنے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ مگر سینی ہنس دیا تھا۔

”تمہارے تھانیدار صاحب کا ڈر تھا۔ بس اسی لئے باوجود چاہنے کے بھی کال نہیں کر سکا۔“
 ”تھانیدار؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔
 ”محترم سردار سیکٹین حیدر لغاری صاحب۔“ سینی نے وضاحت دی تھی اور وہ حیرت سے چونک رہی تھی۔

”انہوں نے اس بابت کچھ کہا تھا تم سے؟“
 ”ارے نہیں۔ کہا تو کچھ نہیں کہی۔ مگر موصوف کی دہشت ہی اتنی ہے کہ مجھ جیسا بندہ ہم کر جائے۔“ وہ بدستور مذاق کے موڈ میں تھا۔

”سینی!“ اس کے ہنسنے پر میرب سیال نے اسے ڈپٹا تھا۔
 ”ہیں کہاں اس وقت محترم؟“ لگتا ہے پہرہ کچھ کم ہوا ہے، جو تم مجھ سے بات کر رہی ہو۔“
 دوسری طرف مسکرا رہا تھا۔ ”ویسے خوشی مجھے اس بات کی زیادہ ہے کہ میں تم سے بات کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی تھی۔ یعنی سینی اس سے قبل بھی اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔
 ”کیا ہوا؟“ کیا سوچنے لگیں تم؟“ سینی نے جیسے اسے جھنجھوڑا تھا۔
 ”نہیں، کچھ نہیں۔ تم بتاؤ، یہاں کا نمبر کہاں سے ملا؟ تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ میں پاپا کے ساتھ ہوں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے خود کو معمول پر رکھنا چاہا تھا۔

”زوار یہ سے بات ہوئی تھی۔ سچی خبر ہوئی کہ تم یہاں ہو۔ کیا ہوا؟“ یہ معجزہ کیسے ہوا؟ برا صاحب نے اتنی نرمی کیسے کر دی؟“ سینی ہنس رہا تھا۔

”شٹ اپ سینی! اب وہ اتنے بھی جلا نہیں ہیں۔ تم تو خواہ مخواہ۔“
 ”اوہو۔۔۔۔۔ یعنی اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ تم انہیں ڈی فنڈ بھی کرنے لگی ہو۔“ سینی مسکرا اٹھا۔
 میرب سیال مسکرا دی تھی۔

”سینی! میرے پاس تمہیں کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ بے جی کے متعلق بتاؤ، کیسی ہیں وہ؟“

ویرا سائل ہنی!

”آپ — آپ شاید کچھ کہنے آئے تھے؟“ اس کی گرم گرم سانسوں کی حدت سے گھبرا کر میر سیال نے چہرے کا رخ پھیرا تھا اور سردار سبتکین حیدر لغاری کے لبوں پر بہت گہری مسکراہٹ اس اتری تھی۔

”کوئی ضروری بات؟“ کہنے کے ساتھ اسے بہ غور دیکھتے ہوئے اس کے صبح چہرے پر آئی ہوئی زلف پریشان کو بہت آہستگی سے چھوا تھا جو اس گھڑی اس کے چہرے پر آ کر اس کی خوب صورتی کو اور بڑھا رہی تھی۔

”ضروری بات تو میں اب بھی کر رہا ہوں ہنی! کیا تمہیں لگتا ہے کہ یہ کسی قدر بے معنی اور فہم ہے؟“ یہ غور اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور میر سیال نے یکدم ہی سرفی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں — غالباً میں نے ایسا نہیں کہا۔“

”لیکن تمہاری آنکھیں تو کہہ رہی ہیں ہنی!“ وہ بھر پور انداز میں مسکرایا تھا۔

”کبھی کبھی بہت سی باتوں کو سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے۔ شاید آپ بھی سمجھنے میں کوئی غلطی کر رہے ہیں۔“ اس نے وضاحت دی تھی مگر سردار سبتکین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”تمہاری ساری باتوں کے مفہوم میں سمجھ سکتا ہوں۔ وہ بھی جو تم کہتی ہو اور وہ بھی جو تم نہیں کہتی ہو۔“ سردار سبتکین حیدر لغاری کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور انداز بتانے والا تھا۔

میر سیال جانے کیوں مسکرا دی تھی۔

”مجھے سمجھنے کا دعویٰ کر رہے ہیں؟“

”نہیں۔“ یکدم مسکراتے ہوئے سرفی میں ہلایا تھا۔ ”فقط کوشش کر رہا ہوں ہنی! کیونکہ کوشش کامیاب ہو جاتی ہیں۔“

”جانے کے متعلق کنفرم ہے نا۔ آپ کی پیکنگ مکمل ہو گئی؟“ میر سیال نے اس کی توجہ کا رخ بلام موڑا تھا اور سردار سبتکین حیدر لغاری اس اقدام پر مسکرا دیا تھا۔ پھر اسے دیکھتے ہوئے سرفی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔ اور یہی بات میں تمہیں بتانے آیا تھا۔ تم بھی ابھی پیکنگ مت کرو۔“

”کیوں؟“ میر سیال جو کئی تھی۔

”وہ اس لئے کیونکہ فی الحال ہم نہیں جا رہے۔“

”نہیں جا رہے؟“ وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”ہاں — ارادہ تو مکمل تھا۔ مگر کل اچانک ہی مسٹر چاولہ نے انعام کیا کہ ایک نئے پلانٹ اسائنمنٹ کے باعث ہم جا نہیں پائیں گے۔ بات اگر معمولی ہوتی تو اسے مسٹر چاولہ بھی ہینڈل کر سکتے تھے۔ مگر یہ اسائنمنٹ بہت بڑا ہے، سو میرا یہاں موجود ہونا بے حد ضروری ہے۔ تم اب تسلی کے ساتھ ہاؤس کے ساتھ رہ سکتی ہو اور ان کی دیکھ بھال کر سکتی ہو۔ ویسے مائی اماں کا فون آیا تھا اور ان کی خاص ہدایت تھی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں، وہاں اس نے گھر میں جو میں نے بطور خاص تمہارے لئے لیا ہے۔“

”یہاں تک نہیں کروں گا جب تک تم یہ خواہش خود ظاہر نہیں کرو گی۔“ سردار سبتکین حیدر لغاری اس چہرے کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔

”مجھے اچھا لگتا ہے میرب سیال! تمہارے لئے دیوانہ بنا۔ تمہارے لئے دیوانگی ظاہر کرنا۔ مگر ہنی! یہی چک تمہاری آنکھوں میں بھی دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔ تمہیں جتنا نہیں چاہتا ہنی! مگر زندگی کچھ بھد پر چلتی ہے۔ اگر میں کچھ کیئر دیتا ہوں تو کچھ کیئر جواباً واث بھی کرتا ہوں۔ اور میرا نہیں خیال کہ ہائی طرف سے کچھ ایسا ایکسپکٹ کرنا کچھ عجیب ہے یا غلط۔“ مدہم لہجے میں کہتا ہوا وہ اس نے چہرے کو زرد کر رہا تھا۔ بھر پور توجہ سے۔

”کیا ایسا سوچ کر میں کچھ غلطی کر رہا ہوں ہنی؟“ مخاطب دلفریب تھا۔ اور میرب سیال کی دنیا میں بالکل ہی سچی ہوئی تھی۔

”نہیں۔“ بہت آہستگی سے اس نے سر جھکا کر جواب دیا تھا۔ سردار سبتکین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”یہ چھوٹی سی بات تم میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بھی تو کہہ سکتی ہونا ہنی؟“

میرب سیال نے سراٹھا کر دیکھا تھا۔ ان آنکھوں میں کسی قدر شرارت تھی۔ مگر میرب سیال اس لمحے نہیں کہہ سکی تھی۔ سردار سبتکین حیدر لغاری نے اس لمحے اس کی سمت دیکھا تھا۔ شاید اسے اس پر کسی قدر لگا گیا تھا تھی وہ لب بھینچ کر مسکرا دیا تھا۔

”اوکے — تم اپنا پیک کیا ہوا سامان کھول دو اور ریلیکس کرو۔ میں پھر چکر لگاؤں گا۔“ وہ جانے ارادہ کر کے پلٹا تھا۔

”سنیں۔“ میرب سیال نے یکدم جانے کیوں پیچھے سے پکارا تھا۔

”ہوں؟“ وہ پلٹ کر دوسرے ہی پل اس کی طرف پوری توجہ سے دیکھنے لگا تھا۔

”چائے..... چائے پی کر جائے گا۔“ میرب سیال نے کہا تھا۔ مگر سردار سبتکین حیدر لغاری اس کی توجہ دیکھتا ہوا بھر پور انداز میں مسکرا دیا تھا۔

”تمہارے لہجے اور باتوں کی شیرینی کافی ہے۔“ وہ بولا تھا اور پھر پلٹ کر فوراً ہی چلتا ہوا وہاں سے لگا تھا۔ میرب سیال ایک گہری سانس خارج کرتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

زندگی میں کبھی کبھی سمجھوتے بہت ناگزیر ہو جایا کرتے ہیں۔ خواہ یہ کتنے بھی مشکل کیوں نہ ہوں۔

فائدہ چائے کا کپ ہاتھ میں لئے بہت خاموشی سے شوہر کے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔

”فائدہ! زندگی میں جو بات سنی دے اسے کرنے سے گریز کرنا چاہئے۔ تمہارے اور میرے رشتے کو ملے گھر میں، بچوں میں جوٹیشن ہے اس کا اندازہ مجھے ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ ایسا ہو ہی اٹا ہے جس کے باعث کھینچاؤ کری ایٹ ہو ہی جاتا ہے۔“ سعد حسن بخاری کا انداز وضاحت دینے والا تھا فائدہ کے پاس جیسے بولنے کو کچھ نہ تھا۔

”فائدہ! مجھے تمہارا، بچوں کا، اس گھر کا خیال ہے۔ تم اور بچے اب بھی میرے لئے پہلی ترجیح ہو۔ تم یہ

کیسے سمجھ سکتی ہو کہ میں ان کے ساتھ کسی طرح کی کوئی نا انصافی کر سکتا ہوں۔ عریبہ تھرٹی پرسنٹ چاہتی۔ مگر اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ میں اپنے شیئرز کے تھرٹی پرسنٹ دے بھی دوں۔ مجھے یہ بات معلوم۔ کہ میرا ایک بیٹا ہے، بیٹی ہے۔ ان کا حصہ ان کے حصے کی ذمہ داری میں کیسے بانٹ سکتا ہوں؟ تم بڑا مجھے غلط سمجھتی ہو۔ ہمیشہ الزام دیتی ہو۔“

فارحہ سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

”میں نے کبھی کسی طرح کا کوئی الزام نہیں دیا آپ کو۔ میں نے صرف آپ سے یہی کہا تھا کہ میرے بچوں کے سلسلے میں کوئی نا انصافی برداشت نہیں کروں گی۔ مگر خیر، اب میں ان باتوں کو بھی دہرانا نہیں چاہتی۔ آپ کو جو کرنا ہے کیجئے۔“ فارحہ کا لہجہ لاطعلق تھا اور سعد بخاری اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔

”تمہارا پرابلم یہ ہے کیا ہے فارحہ! تم صورت حال اور حالات کو اپنے بس میں جب ہوتا نہیں پاتی ہو تو بچوں کی طرح ہار مان کر سر پیٹنے لگتی ہو۔ تم کیا سمجھتی ہو، تم اگر حقیقت نہیں مانو گی تو کیا سب کچھ بدل جائے گا؟ ایک صرف تمہارے نہ ماننے سے ہر بات کا مفہوم تبدیل ہو جائے گا؟ یقیناً ایسا نہیں ہے فارحہ! اب تمہیں بھی یہ بات خود کو یاد کر ادینی چاہئے۔“

فارحہ بہت دھیسے سے مسکرا دی تھیں۔ عجب ایک طنز تھا اس انداز میں۔

”میں خود کو یہ بات بہت پہلے یاد کر چکی ہوں۔“

سعد بخاری نے خاموشی سے ان کی سمت دیکھا تھا۔

”مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ بچوں سے متعلق۔“ بہت مدہم لہجے میں مدعا بیان کیا تھا اور فارحہ بہت چونک کر سعد بخاری کی سمت دیکھنے لگی تھیں۔

”کیسی بات؟“ انداز حیرت سے پڑھا اور سعد حسن بخاری انہیں دیکھنے لگے تھے۔

”بچوں کے مستقبل سے متعلق۔“

اور فارحہ دیکھتی رہ گئی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ یہ منہ پر بارہ کیوں بچے ہوئے ہیں؟ صبح گھڑی نہیں ملائی تھی کیا؟“ اوزی اُسے کال کا کپ تھماتے ہوئے مسکرایا تھا اور انابیہ شاہ مسکرا دی تھی۔

”بعض چہرے ہوتے ہی ایسے ہیں، کچھ بھی کرو، فرق نہیں پڑتا۔“

”یعنی تمہارا چہرہ واقعی اس خراب گھڑی جیسا ہے جو بارہ سے آگے کبھی نہیں بڑھتی؟“ اوزی مسکرایا تھا۔ انابیہ شاہ لب بھینچ کر مسکرا دی تھی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے اوزی! زندگی کیا ہے؟“

”کچھ بھی ہو، مگر صبح کا اخبار تو ہرگز نہیں ہے۔“ اوزی شانے اچکا تا ہوا مسکرایا تھا۔

”صبح کا اخبار؟“ وہ کسی قدر حیران ہوتے ہوئے مسکرائی تھی۔

”آف کورس یارا! زندگی صبح کا اخبار ہرگز نہیں ہے کہ اس میں روز ایک طرح کی خبریں شائع ہوں۔“

نہیں لگتا، ہمیں روز ایک نئے احساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک نئی امگ، ایک نئی ترنگ کی۔ اگر طرح طرح کی خبریں اور ایک طرح کے واقعات زندگی میں واقع ہونے لگیں تو پھر زندگی بار میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ ہے نا۔“ اوزی وضاحت دیتا ہوا مسکرایا تھا۔

”ہاں، شاید۔“ انابیہ شاہ کافی کاسپ لیتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

”کیا پروگرام ہے؟“ اوزی نے دریافت کیا تھا۔

”بس سے متعلق؟“ انابیہ شاہ چونکی تھی۔

”صفتان انوی ٹیشن دے کر گیا تھا نا۔ بھول گئیں تم؟“ اوزی نے یاد دلایا تھا اور انابیہ شاہ لب بھینچ کر

کارخ پھیر گئی تھی۔

”کیا کرنا ہے؟“ اوزی نے دریافت کیا تھا اور انابیہ شاہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ پھر بہت

ٹٹی سے بولی تھی۔

”ابھی کچھ طے نہیں ہے۔ جب ہوگا تو بتا دوں گی۔“ آواز مدہم تھی۔

”انابیہ!“ اوزی نے بہت آہستگی سے پکارا تھا۔

”ہاں۔“ وہ اس کی سمت دیکھے بغیر بولی تھی۔

”تمہیں نہیں لگتا تم بہت زیادہ زندگی سے بھاگتی ہو؟“

”ہاں، شاید۔“ وہ جانے کیوں ہنس دی تھی۔

”شاید نہیں، یقیناً۔ تم واقعی زندگی سے فرار چاہتی ہو لیکن تمہیں نہیں لگتا ایسا کر کے تم کچھ غلط کر رہی

تھیں۔“ اوزی نے کہا تھا اور انابیہ شاہ لب بھینچ کر مسکرائی تھی۔

”غلط یا صحیح، اس سے کیا فرق پڑتا ہے اوزی!“ وہ جھجے جھجے سے انداز میں بنا اس کی سمت دیکھے بولی۔

”فرق..... فرق پڑتا ہے انابیہ! تمہیں نہیں لیکن آئی کو، نانا جی کو اور مجھے انابیہ! میں اس طرح اپنی

ت کو ضائع ہوتے ہوئے نہیں.....“

”تم بھی تو اوزی! تم بھی تو ضائع ہو رہے ہو۔ خود کو ضائع کر رہے ہو۔“ انابیہ شاہ نے

الک بات کاٹ دی تھی اور اوزی اس کی سمت دیکھتا ہوا بولا تھا۔

”ہاں۔“ یہ تو ہے۔ مگر کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن سنو، تمہیں میری فکر کرنے کی اس قدر ضرورت نہیں

ہے تم ہم لوگوں کو نہیں جانتی ہو۔ ہم بہت کھنے ہوتے ہیں۔ کچھ بھی ہو جائے، ہماری فطرت نہیں بدل

مانہم انجوائے منٹ کے بہانے کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ کیا کریں، اس کے

دھارا گزارہ نہیں ہوتا نا۔“ انابیہ شاہ ہنس دی تھی۔

”تم دنیا کے پہلے مرد ہو جو مردوں کے خلاف اتنی کثرت سے بولتے ہو۔ ورنہ تو مرد اکثر اپنے متعلق

لہذا جاننے والا نہیں تھا مگر اس گھڑی انابیہ شاہ لب بھینچ کر یکدم ہی چہرے کارخ پھیر گئی تھی۔

”رات بہت ہو گئی ہے۔ ہمیں اب سو جانا چاہئے۔ گڈ نائٹ۔“ کہنے کے ساتھ ہی ملٹی تگر چلتی ہوئی رینے کی سمت بڑھنے لگی تھی۔ اوزی نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس خارج تھی پھر چلتے ہوئے اپنے کمرے کی سمت بڑھنے لگا تھا۔

”تم بزنس کرو گی؟“ اذہان حسن بخاری کی حیرت اس کے لہجے میں ہی نہیں اس کی آنکھوں اور چہرے سے بھی صاف عیاں تھی۔ اور حیرت سے زیادہ غالباً وہ محظوظ ہوا تھا۔ کیونکہ لیوں پر مسکراہٹ بھی تھی۔ ساہیہ نے اسے کسی قدر پائندہ انداز سے دیکھا تھا۔

”اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے؟ کیا لڑکیاں بزنس نہیں کر سکتیں یا نہیں کر رہی؟ مسٹر اذہان حسن بخاری! آپ کی عقل یقیناً بہت ناٹھ ہے۔ یا پھر آپ ان مردوں میں سے ہیں جو کورا کوا ب بھی سترہویں یا پھر اٹھارہویں صدی میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ آج کی لڑکی سب کچھ کر ہے۔“ وہ خفا خفا سے لہجے میں بولی تھی اور اذہان حسن بخاری ہنس دیا تھا۔ جیسے اسے چڑا کر وہ بہت ز محظوظ ہوا تھا۔

”تم مانویا نہ مانو۔ میں اب بھی لڑکیوں کے گھر میں بیٹھ کر کام کاج کرنے کے حق میں ہوں۔ کپڑ دھونا، ڈش واشنگ کرنا، کلنگ کرنا، ان سب کاموں سے فارغ ہو کر کسی فرد خاص کے لئے جینا سونرا بیٹھ کر بے تابی سے کسی آنے والے کا انتظار کرنا۔ اور پھر جب وہ آجائے تو مسکرا کر اسے وش کرنا اورا کے لئے کھانا گرم کر کے نکالنا۔“ وہ طویل فہرست گنوانے کے موڈ میں تھا۔ مگر ساہیہ خان نے تھی۔ ا نوک دیا تھا۔

”شٹ اپ اذہان! مجھے کم از کم تم سے یہ توقع نہیں تھی۔“ وہ غصے سے بولی تھی اور اذہان حسن بخا ہنس دیا تھا۔ ساہیہ خان منہ پھلا کر دوسری سمت دیکھنے لگی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اچھا، دکھاؤ مجھے یہ فائل، کیا پروجیکٹ تیار کیا ہے تم نے۔“ فائل لینے کو ہاتھ بڑھا مگر ساہیہ خان نے جھٹک دیا تھا۔

”رہنے دو۔۔۔ میں کر لوں گی۔ نہیں ضرورت ہے مجھے تمہاری اور تمہاری مدد کی۔“

”ساہیہ! جسٹ کڈنگ یارا! میں جانتا ہوں تم میں کتنا پوٹنشل ہے کام کرنے کا۔ ویسے یہ نوڈ پلان آئیڈیا تمہیں ملا کہاں سے؟“

”آئیڈیا نہیں ملا، میں اس سے قبل کام کر چکی ہوں کینیڈا میں۔ اور میں جانتی ہوں ہاڈ ڈرا ورک۔“ ساہیہ خان نے باور کرایا تھا اور اذہان حسن بخاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا تھا۔

”مگر اس سے پہلے تم نے کبھی نہیں بتایا تھا اس سے متعلق۔“

”تم نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔ یا پھر جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ تم شاید مجھے ایک بے وقوف ٹالوا سمجھ رہے تھے۔“ ساہیہ خان مسکرائی تھی اور اذہان حسن بخاری ہنس دیا تھا۔

”اب اگر سمجھ رہا تھا تو کیا عجب تھا۔ ٹائٹلی ٹائن پرسنٹ لڑکیاں ایسی ہی تو ہوتی ہیں۔“ وہ کھل کر

سے موڈ میں تھا۔ ساہیہ نے اسے دیکھا تھا، پھر فائل اور پرس سمیٹ کر اٹھنے والی تھی تبھی اذہان حسن نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ساہیہ خان نے کسی قدر خشکی سے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”ہاتھ چھوڑو میرا۔“

”خفا ہو کر جا رہی ہو؟“ اذہان حسن بخاری نے بھر پور انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ نہیں۔ مگر میں اس سلسلے میں انکل سے بات کر لوں گی۔“ وہ بولی تھی اور اذہان حسن بخاری کے لیوں لراہٹ یکدم جو غائب ہوئی تھی سو ہوئی تھی، ساہیہ خان کے ہاتھ پر اس کے ہاتھ کی گرفت بھی یکدم بجلی ہوئی تھی اور دوسرے ہی لمحے اس کا نازک ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ کی گرفت سے آزاد تھا۔

ساہیہ خان نے اس کے چہرے کی یکدم بدلتی کیفیت کو دیکھا تھا پھر ایک گہری سانس خارج کرتی ہوئی کے سامنے دوبارہ بیٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ بس اسے فقط خاموشی سے دیکھا تھا جو لہجہ سے دھیان پھیرے بیٹھا اس لمحے بہت اجنبی نظر آیا تھا۔

”اذہان!“ بہت آہستگی سے اسے پکارا تھا۔ ”دیکھو، اگر تم میری طرف دیکھو گے نہیں، بات نہیں کرو یہاں میرے رکنے کا کوئی جواز نہیں رہے گا۔“ مسکراتے ہوئے اس کا موڈ بحال کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ نہیں مسکرایا تھا۔

”اذہان!“ ساہیہ خان نے اسے تنبیہ کرنے والے انداز میں دیکھا تھا۔ مگر اذہان نے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”اذہان! اٹس ناٹ اے گڈ سائن۔ تم اپنے پاپا سے اس قدر نفرت کرتے ہو کہ ان کا نام آتے ہی راموڈ لیکر تبدیل ہو گیا۔“ ساہیہ خان کے لہجے میں حیرت تھی۔ مگر اذہان حسن بخاری کی توجہ اس کی نہیں تھی۔

”اذہان!“ نے کہا تھا تم بدل رہے ہو، حقیقت کو تسلیم کر رہے ہو۔ کیا یہ سب اس کا ثبوت ہے؟ نا! ایسا کب تک ہے گا؟ کیا واقعی تم انکل سے اتنی نفرت کرتے ہو کہ ان کا نام بھی نہیں سن سکتے؟“

”نہیں۔“ اذہان حسن بخاری نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ خود غم لگاتار پڑھا ہر کرنے کو اس کی سمت دیکھنے لگا تھا۔ ساہیہ خان نے اسے بغور دیکھا تھا۔

”اذہان! یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔“ کسی قدر پر افسوس انداز میں کہتے ہوئے سرفنی ٹیرا ہلایا تھا۔ تبھی نے اس کے ہاتھ سے فائل لی تھی اور یہ غور دیکھنے لگا تھا۔

”یہ پروجیکٹ تم اشارت کہاں سے کرنا چاہتی ہو؟ کچھ پلان کیا ہے تم نے؟ پھر جٹ، ریسٹورنٹس کے انویسٹمنٹ۔۔۔ میرا خیال ہے تمہیں اس پر اچھا خاصا ہوم ورک کرنا ہو گا۔ اچھا ہو گا تم ایک بار پاپا کی

کے بھی لے لو۔ ان فیکٹ ان کا ایکسپیرٹنس مجھ سے بہت زیادہ ہے اور وہ تمہیں مجھ سے زیادہ اچھی

یے ماشورہ بھی دے سکیں گے۔“ اس کی سمت سنجیدگی سے دیکھتا ہوا وہ بول رہا تھا اور ساہیہ خان اسے دیکھ رہی تھی۔

”اذہان حسن بخاری! بالکل بھی اچھے نہیں لگ رہے ہو۔ پلیز، یہ دکھاوے کا خول مت چڑھاؤ اپنے

چہرے پر۔“

اذہان حسن بخاری نے اس رائے کو سنتے ہوئے اسے بہ غور دیکھا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

”ساہیہ خان! کبھی کبھی کسی کی کسی کے ساتھ اس حد تک انڈر اسٹینڈنگ ہونا بھی اچھا نہیں لگتا۔ تم! اس گھڑی بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی ہو۔ کیونکہ تم میرے سامنے بیٹھی مجھے بہ غور دیکھ رہی ہو اور سطر پڑھ رہی ہو۔ مجھے تمہارا یہ اپنے اندر اس طرح جھانکنا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا۔“ اذہان حسن بخاری لہجہ مدہم اور انداز جتانے والا تھا اور ساہیہ خان مسکرا دی تھی۔

”کیا اب تم مجھ سے بھی فرار چاہتے ہو؟“ مدہم لہجے میں دریافت کیا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت بہ غور دیکھا تھا، پھر دھیمے انداز میں مسکرا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ مگر مجھے یہ سب اچھا بھی نہیں لگ رہا۔“ بہت آہستگی سے سرفی میں ہلایا تھا۔

”کیا اچھا نہیں لگ رہا؟ اذہان! میں تو ہمدرد ہوں تمہاری۔ ایک سنسز فرینڈ۔ پھر تمہیں میرے سامنے یوں منتشر ہونا اور کھرتا برا کیوں لگ رہا ہے؟ میں جانتی ہوں بعض لمحوں میں ہم اس قدر شکستہ ہوتے ہیں کہ خود سے بھی چھپنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کوئی سدباب نہیں ہے۔ سدباب یہ ہے کہ حوصلہ مندی سے اور بہادری سے ان حالات کا سامنا کریں۔ مجھے بھی اچھا نہیں لگ رہا کہ میرا بہتر دوست میرے سامنے اس قدر شکستہ ہو رہا ہے۔ تم پلیز کسی قدر سنبھالو، بدلو خود کو۔ کیونکہ یہ سب ٹھیک نظر ہے۔“ ساہیہ خان نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھایا تھا اور اذہان حسن بخاری اس کی سمت دیکھتے ہوئے دیکھتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”چلو اٹھو اب فوراً۔“ دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے حکم دیا تھا۔

”کہاں جانا ہے؟“ اذہان حسن بخاری حیران ہوا تھا۔

”بچ کے لئے۔“ ساہیہ خان مسکرائی تھی۔ ”وقت ہے نا؟“ کسی قدر تشویش سے اس کی سمت دیکھا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت دیکھا تھا، پھر مسکرا دیا تھا۔

”ہوں۔“

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ایک بات برملا کہہ لینے سے بہت سکون ملتا ہے اور کوئی فیصلہ لے کر اس کی نتیجے پر پہنچ کر اس سے زیادہ۔

عفتان علی خان کو بھی اپنے اندر ایک اطمینان سامحوس ہو رہا تھا۔ ماں کو اپنی رائے سے آگاہ کرنے کے بعد اسے کسی قدر سکون ملا تھا۔ اب تک وہ فقط خود اس آگ کی پلیٹ میں تھا اور کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مگر اب یہ ہوا تھا کہ اپنی رائے دینے کے بعد اسے اس قدر یقین تھا کہ ماں اس کی رائے کو قطعاً رو نہیں کریں گی۔ وہ اس کو پاسکتا تھا یا کہ نہیں، یہ سب بعد کی باتیں تھیں۔ فی الحال یہ تسکین کافی تھی کہ وہ ایک دوغلی زندگی سے باہر آ رہا تھا۔ منافقت سے باہر نکل رہا تھا اور یہ بات کسی قدر اطمینان بخش تھی۔ صبح وہ معمول کے مطابق آفس کی طرف جا رہا تھا جب سڑک کے کنارے انا بیہ شاہ اسے کھڑی نظر آئی۔

عفتان علی خان نے گاڑی روک دی تھی۔ انا بیہ شاہ نے اس کی سمت کسی قدر چوکتے ہوئے حیرت چکھتا تھا مگر اس نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے اس کے لئے دروازہ کھول دیا تھا۔ اور تب جیسے باہر کے لئے گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

ہوڑی سے کہا ہوتا، تمہیں ڈراپ کر دیتا۔“ عفتان علی خان اس کا خیال کر کے بولا تھا۔

وہ سو رہا تھا۔ اور میں نے اس کی نیند ڈسٹرب کرنا ضروری خیال نہیں کیا۔ اچانک علی میں ماما کے ساتھ انہیں ضروری کام سے جانا تھا۔ سو میں نے انہیں یہیں تک ڈراپ کرنے کا کہہ دیا۔ میری گاڑی باپ میں ہے۔ اپنی ویز، مجھے ان چھوٹی چھوٹی پرابلمز کو لے کر اتنی پریشانی نہیں ہوتی۔“ وہ بولی تھی اور عفتان علی خان اس کی سمت دیکھتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”آپ غالباً واحد لڑکی ہیں جو پرابلمز کو لے کر کسی قدر پریشان نہیں ہوتیں۔ ورنہ تو لوگ خاصا گھبرا رہے ہیں۔ ان فیکٹ، ان کے ہاتھ پاؤں کے طوطے اڑ جاتے ہیں پریشانی کو دیکھ کر۔“ انا بیہ شاہ مسکرا دی تھی۔

”کیا ان میں آپ بھی شامل ہیں؟“ اس کی آنکھوں میں کوئی گہری شرارت تھی اور عفتان علی خان مسکرا رہا تھا۔ ”نہیں۔“ بہ غور اس کی سمت نگاہ کی تھی۔ ”غالباً میں بھی اس معاملے میں کچھ کچھ تمہارے جیسا ہوں۔“ پرابلمز سے نمٹنا آتا ہے۔“

”میرا نہیں خیال کہ یہ کوئی اتنی بڑی کواٹھی ہے۔“ انا بیہ شاہ نے شانے کسی قدر بے نیازی سے اچکاتے ہوئے کہا تھا اور عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں سے ذات میں اتنی خوب صورتی گھر کر جاتی ہے کہ بڑی بڑی باڈی ہوٹل نے کی نوبت ہی نہیں آتی۔“ انداز جتانے والا تھا۔ انا بیہ شاہ جو مسکرا رہی تھی، اس کی سمت ٹاڈ دیکھ کر لب بھینچتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ چہرے کا رخ پھیرے پھیرے بولی تھی۔ انداز کسی قدر لاطعلقی لئے ہوئے عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”تمہیں نہیں لگتا انا بیہ شاہ! اتنی عجلت میں رہنا ٹھیک نہیں۔ زندگی بہت دھیان اور سمجھ بوجھ سے دیکھنے والی چیز ہے۔“

انا بیہ شاہ نے چہرے کا رخ پھیر کر عفتان علی خان کو دیکھا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

”تمہارے دیکھنے کا انداز بتا رہا ہے انا بیہ شاہ! کہ تم مجھ سے اتفاق رائے نہیں رکھتی ہو۔“

اس سے کیا فرق پڑتا ہے عفتان علی خان! کہ میں تم سے اتفاق رکھتی ہوں یا کہ نہیں۔ یہ مسئلہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے متعلق سوچ کر الجھا جائے۔ دنیا میں بہت سے لوگوں کا پوائنٹ آف ویو اکثر ایک سے مختلف ہی ہوتا ہے۔ انا بیہ شاہ نے سرسری سے انداز میں باہر کر لیا تھا۔

ال۔۔۔ مگر اس کے باوجود ایسے بہت سے لوگ ایک ساتھ چلتے ہیں۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔

ساتھ رہنے کے لئے پوائنٹ آف ویو یا سوچوں کا ملنا ضروری نہیں، دلوں کا ملنا ضروری ہے۔ انما از کرانے والا تھا۔ مگر وہ سمت رنگی آنکھیں کسی قدر لائق کا اظہار کرتی ہوئی اس پر سے ہٹ گئی تھیں۔ انا بیہ شاہ لائق بنی ہی بیٹھی رہی تھی۔ توجہ کی کوئی نگاہ اس سمت نہیں کی تھی۔

”انا بیہ! میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کچھ۔“ مدھم لہجے میں اظہار مدعا ہوا تھا۔ مگر انا بیہ شاہ نے اس سمت نہیں دیکھا تھا۔ نہ اس بابت کچھ دریافت کیا تھا۔ عفتان علی خان نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر تھی، پھر مسکرا دیا تھا۔

”چلو رہتے دو۔ بات کچھ وقت چاہتی ہے اور یہ سارے لمحے بہت عجلت بھرے ہیں۔ پھر میں کسی فرصت کے لمحے میں بات کریں گے۔ اس وقت تو لمحے بھی بھاگتے دوڑتے سے ہیں اور تمہیں بھی جلدی ہے۔“ عفتان علی خان نے گاڑی اس کے کیسپس کے سامنے روک دی تھی۔ انا بیہ شاہ نے اسے دیکھا تھا۔

”دیکھو نکس۔“

”فور و ہاٹ؟“ عفتان علی خان مسکرایا تھا۔ انا بیہ شاہ نے لب بھینچ کر اسے دیکھا تھا پھر فوراً ہی ہلٹی چلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی تھی۔ عفتان علی خان نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے گاڑی آگے بڑھادی تھی

کہوں گا تم سے وہ حرف سارے

جو روز خوابوں کی سرزمین پر

میں چپکے چپکے سے چن رہا ہوں

جو کہہ رہا ہے یہ دل میرا

وہ ساری باتیں بھی سن رہا ہوں

سنجال رکھے ہیں خواب سارے

جو تم نے میری پلکوں پر بودیے تھے

بے دھیانی میں بے خیالی میں

عجب کچھ حرف تم نے جو کہہ دیئے تھے

سنجال رکھے ہیں میں نے جب تک

سوچتا ہوں

فرصت کے کسی لمحے میں

تم سے ملوں گا تو کیا کہوں گا

عفتان علی خان کے چہرے پر بہت دھیمی سی مسکراہٹ اتری تھی اور وہ ایک تصور کو دیکھ کر مسکرا گیا تھا۔



سردار سنگین حیدر لغاری کے اس اچانک فیصلے نے اسے زیادہ پریشان نہیں کیا تھا۔ شاید اس نے

بہنوں کے ساتھ تھی۔ ان کے بہت قریب تھی۔ اس کی پوری فیملی یہاں تھی اور پھر اس کے بعد کسی اور ضرورت کیا باقی رہ جاتی تھی؟ ہاں، یہ تھا کہ اس کی اسٹڈی کا کچھ حرج ہو رہا تھا۔ مگر وہاں جا کر پڑھائی نہ کر سکتی تھی۔ فی الحال اس فیصلے سے اسے یوں بھی تقویت ملی تھی کہ پاپا کے پاس رہنا وہ بھی

سنگین حیدر لغاری اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود اسے وقت دینا نہیں بھولتا تھا اور اس توجہ

الفاظ پر میرب سیال کی سمجھ میں بالکل نہیں آتا تھا کہ وہ کیسے ری ایکٹ کرے۔ وہ ایسے لوگوں

نہیں تھی جو کسی کی خطاؤں کو معاف نہیں کر سکتے اور تا عمر یاد رکھتے ہیں۔ ایسا بالکل نہیں تھا کہ وہ

سنگین حیدر لغاری کی خطاؤں کو اب تک یاد رکھے ہوئے تھی یا اسے معاف نہیں کر سکتی تھی۔ مگر یہ بھی

کسی قدر ایسی ہیمنو ضرور تھی۔ وہ اس کے موڈ کو، اس کے مزاج کے توروں کو اب تک سمجھ نہیں پائی

ب پارہ صفت مزاج رکھتا تھا وہ۔ وہ ایک رنگ کو دیکھتی تھی اور اس کا تاثر قائم بھی نہیں ہو پاتا تھا کہ

اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والا ہوتا تھا اور وہ حیرت زدہ ہی اسے دیکھتی رہ جاتی تھی۔ اور اب

سنگین حیدر لغاری کا اوقات مکمل طور پر اس کی سمت تھا۔

ہریان تھا مگر وہ جو اب اسے وہ سب کچھ لوٹا نہیں پارہی تھی جس کی خواہش وہ کر رہا تھا۔

جاتی تھی ارش میربز میں سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں مگر جس صورت حال کا سامنا اسے تھا، اس کے

کوئی تیاں تا حال کر نہیں پارہی تھی۔

اور واقعی بدل گیا تھا؟

واقعی اس کے لئے سنسیر تھا؟

اشام وہ اس سے ملنے آیا تھا تو وہ کتنی ہی دیر خاموشی کے ساتھ اس کی سمت دیکھتی رہی تھی۔ شاید وہ

چہرے، اس کی آنکھوں میں اس کی اندر کی کوئی کیفیت تلاشنا چاہ رہی تھی۔ جب سردار سنگین حیدر

نے اس کے قریب آ کر کھڑے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں

اس سے قریب کیا تھا اور ایک لمس خاص سوچتے ہوئے بہ غور اس کی طرف دیکھا تھا۔

چہرہ، یہ آنکھیں دیکھنے سے کیا ہو گا سوچی! بعض اوقات یہ سب بہت سرسری اور رسمی سا ہوا کرتا

ن اگر کچھ پڑھتا ہے تو اس دل کو پڑھو۔ شاید تمہیں وہ بھید مل جائے جس کی کھوج تمہاری آنکھوں

مدھم لہجے میں ایک اسم خاص اسے بتایا تھا اور میرب سیال اس لمحے جانے کیوں چہرے کا رخ

سردار سنگین حیدر لغاری نے اس کے چہرے کو ہاتھ بڑھا کر اپنی سمت کیا تھا اور پھر پور توجہ سے

نگاہا۔

انجزوں پر استحقاق بتایا جاتا ہے۔ کیا تمہیں یہ بھی معلوم نہیں؟“ ان آنکھوں میں اپنائیت تھی اور

یک دوستانہ مسکراہٹ۔ میرب سیال نے آنکھیں اٹھا کر ان اپنائیت کا احساس دیتی دو آنکھوں کو

”دیکھو ہنی! — بخور دیکھو — پرکھو، سب اجازت ہے تمہیں۔“ مدھم سرگوشی میں کوئی نہ بات ضرورت تھی۔ میرب سیال کی پلکیں اس لئے خود بہ خود جھکتی چلی گئی تھیں۔ سردار بنگلیگین حیدر لغاری لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”اتنی جلدی ہمت ہار جاؤ گی ہنی! تو تمہیں اس عہد سے شناسائی کیسے ملے گی، جس کی سائز تو تمہیں ہے؟ اس طرح تو تم کچھ بھی جان نہیں پاؤ گی کبھی۔“ انداز کسی قدر محفوظ ہونے والا تھا اور میرب چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ اندر ایک شور سا رہا تھا اور آوازیں صاف سماعتوں تک آرہی تھیں۔ ایسے میر کیا کہتی، سنتی۔ سردار بنگلیگین حیدر لغاری اس کی مشکلات میں یقیناً اضافہ کر رہا تھا۔ وہ جس قدر بٹھما پاتا تھی اسی قدر الجھ جاتی تھی۔

”ہنی! سوچ سوچ کر اتنا مت الجھو کہ میں بے اختیار تمہیں سلجھانے کی کوئی تدبیر کرنے کی کوشش نہیں۔“ وہ خود سے اُبھرتی تھی۔ جب سردار بنگلیگین حیدر لغاری کی بھاری آواز اس کی سماعتوں سے گزرتی۔ وہ نگاہ اٹھا کر اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ مگر انداز بے حد ہوتی تھا۔

سردار بنگلیگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”ٹیل می یور پرائلم ہنی؟“

”پرائلم؟“ وہ چونکی تھی۔ پھر سرفی میں ہلایا تھا۔ ”نہیں — کوئی پرائلم نہیں ہے۔“ اس نے بار بار کہا مگر سردار بنگلیگین حیدر لغاری اسے کسی قدر تشویش سے دیکھنے لگا تھا۔

”اگر کوئی پرائلم نہیں تو پھر یہ آنکھیں اس قدر پریشان کیوں ہیں؟ — یہ اس چہرے پر اس قدر جیوتوں کا چہرہ کس لئے ہے؟“

میرب سیال کچھ بولے بغیر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی اور سردار بنگلیگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”کوئی تشویش ہے تو اسے لبوں سے بیان کرو ہنی! چپ رہنے سے تو اُبھنیں اور بھی بڑھ جاتی ہیں باہمی مشاورت سے بڑے مسائل سلجھ سکتے ہیں۔ دلوں کی ابھنوں کو سلجھانے کا یہ سب سے بہترین طریقہ ہے۔ یقین نہ ہو تو آزما دیکھو۔“

”نہیں — ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں پریشان نہیں ہوں۔ نہ ہی ایسی کوئی ابھن مجھے گہرے ہوئے ہے۔“ میرب سیال نے وضاحت دے کر سردار بنگلیگین حیدر لغاری کو مطمئن کرنا چاہا تھا۔

”اگر کوئی ابھن نہیں تو پھر اس خاموشی کا سبب کیا ہے؟ کچھ چاہئے؟ کسی شے کی ضرورت ہے؟“ بتاؤ، کیا چاہئے؟“ وہ آسمان وزمین اس کے قدموں میں دھرنے کو تیار تھا۔ انداز ایسا تھا کہ میرب سیال کے لبوں پر مسکراہٹ اتر آئی تھی۔

”مجھے بتاؤ، تمہیں کیا چاہئے؟“ سردار بنگلیگین حیدر لغاری کہہ رہا تھا۔

”کچھ نہیں چاہئے مجھے۔“ میرب سیال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرفی میں ہلایا تھا۔

”کچھ نہیں؟“ سردار بنگلیگین حیدر لغاری نے اس کی آنکھوں میں بہ غور دیکھا تھا۔

”نہیں۔“ میرب سیال کی پلکیں اس لہجے پر جو لڑبڑ جھکی تھیں وہیں چہرے کی مسکراہٹ بھی اتر آئی تھی۔

سردار بنگلیگین حیدر لغاری نے اس کے چہرے کو شہادت کی انگلی سے قدرے اوپر اٹھاتے ہوئے بہ غور نگاہ ڈالی اور مدھم لہجے میں بولا تھا۔

”کیا میرا یقین بھی نہیں؟“

میرب سیال بے حد چونک کر اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ تبھی سردار بنگلیگین حیدر لغاری نے اپنا جملہ ادھر لیا تھا۔

”کیا میرا یقین بھی نہیں ہنی؟ — میرا اعتبار بھی نہیں؟ — کیا میرا پیار بھی نہیں؟“ مدھم سرگوشی ناصحت تھی اور انداز میں کس قدر شدت۔ میرب سیال کے حواس خطا ہونے لگے تھے۔ اس نے خود بطور پر بے بس محسوس کیا تھا۔

”لو میرب سیال! کیا میرا پیار بھی نہیں؟“ اس کے جھکے ہوئے سر کو اٹھا کر مسکراتے ہوئے بھر پور توجہ لے کر چہرے کو دیکھا تھا۔ میرب سیال نے اس کی پرتیش نظروں میں دیکھا تھا، پھر بہت آہستگی سے

ت میں ہلادیا تھا اور سردار بنگلیگین حیدر لغاری کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”کبھی کبھی لفظ بہت ضروری ہو جایا کرتے ہیں میرب! تم ایسا کرو مجھے سوچ کر جواب دے دینا۔ مجھے تمہارے جواب کی ضرورت نہیں ہے۔“

”گیا..... کیا مطلب؟“ میرب سیال حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”کیونکہ.....“ سردار بنگلیگین حیدر لغاری نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں کو بہ غور دیکھا تھا، پھر اپنی رکھتے ہوئے بولا تھا۔ ”کیونکہ میرب! میں ان آنکھوں کی زبان اب سمجھنے لگا ہوں۔ مجھے پڑھنا ہے ہنی! اور جب پڑھنا آجائے تو پھر نظروں سے کوئی بھی مفہوم چھپا نہیں رہ سکتا۔“ باور کرایا تھا اور

سیال اسے دیکھ نہیں سکی تھی۔ جانے کیوں۔

ابو شاہ کا موڈ قطعاً کہیں جانے کا نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کسی کو کسی طرح کی کوئی خاص تقویت دینا چاہتی تھی۔ مگر اس شام چائیک ہی فون آ گیا تھا جسے اوزی نے ریسیو کرنے کے بعد اس کی سمت ریسیور

اٹھا۔

”کون ہے؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”بات کر لو۔“ اوزی بولا تھا اور پھر وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ ابابہ شاہ نے ریسیور کان سے لگا لیا تھا اور طرف ایک یکسر اجنبی آواز سن کر وہ کسی قدر حیران رہ گئی تھی۔

”بٹا، کیسی ہوتم؟“ کوئی خاتون بہت محبت سے دریافت کر رہی تھیں۔

”کی ٹھیک ہوں۔ مگر آپ.....؟“ اس نے قصداً جملہ ادھر اور چھوڑ دیا تھا۔

”میں قاطعاً علی خان ہوں۔“ عقنان علی خان کی مٹی۔“

”لو..... کیسی ہیں آپ؟“ اس نے حیران ہونے کے ساتھ اخلاقاً قار یافت کیا تھا۔

”اب آپ اصرار کر رہی ہیں تو میں انکار بھی تو نہیں کر سکتا نا۔“ سعادت مندی سے کہتا ہوا مسکرایا تھا۔
”مذاق نہیں اذہان! ٹھیک سے بتاؤ، تمہاری پسند کیا ہے؟ کیسی لڑکی پسند ہے تجھے؟“

”آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟“ اذہان نے مسکراتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ فارحہ نے مسکراتے ہوئے سر اشارت میں ہلایا تھا۔

”ہاں۔“

”یعنی اب آپ روایتی ماؤں کی طرح گھر گھر جا کر حور پر یوں کی تلاش شروع کرنے والی ہیں؟ اذہان کو کسی قدر تشویش ہوئی تھی۔

”نہیں۔“ فارحہ مسکرا دی تھیں۔ ”میرا ارادہ ایسا کچھ کرنے کا نہیں ہے۔ تجھی تو تم سے تمہاری بڑی دریافت کر رہی ہوں۔ ویسے میرے پاس ایک لڑکی ہے۔“

”کون؟“ وہ چونکا تھا۔

”یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتی ابھی۔ لیکن تم اگر چاہتے ہو کہ لڑکی تمہاری من چاہی ہو تو۔ دے دے تمہیں ماہ

خان کیسی لگتی ہے؟“ انہوں نے سرسری انداز میں کہتے ہوئے بیٹے کی طرف دیکھا تھا۔ اذہان حسن بخارا بے طرح چونکا تھا، پھر مسکرا دیا تھا۔

”ساہیہ۔۔۔ آپ اس کے متعلق سوچ رہی ہیں؟ می! پلیز، آپ ایسا سوچنے کا مجھ سے مت مجھے اپنے گھر کو تیسری جنگ عظیم کا میدان نہیں بنانا ہے اور نہ ہی میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے بیرونی ناگاساکی کی کوئی مخلوق لگیں۔“ وہ برجستہ بولا تھا اور فارحہ مسکرا دی تھیں۔

”اب ایسی بھی تو پ صفت نہیں ہے وہ۔“

”تو پ؟۔۔۔ یہ مثال اس کے لئے بہت چھوٹی ہے می! اسے تو آپ مدد ہم کہئے۔“ وہ بر ملا بولا

اور فارحہ ہنس دی تھی۔

”مگر مجھے تو پسند ہے وہ۔ اور تمہارے پاپا کو بھی۔“ فارحہ بے دھیانی میں بولی تھیں اور اذہان م بخاری کے چہرے کے تاثرات ایک لمحے میں بدلے تھے۔ ایک پل میں مسکراہٹ غائب ہوئی تھی اور اس کی جگہ ایک سختی نے لے لی تھی۔ فارحہ بیٹے کی اس کیفیت کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

”میں سونا چاہتا ہوں۔۔۔ آئیے، میں آپ کو آپ کے کمرے تک چھوڑ دوں۔“ لہجہ بے حد ہلکا تھا اور فارحہ کے لئے یہ بات کسی تشویش سے کم نہیں تھی۔

کبھی کبھی بہت سی چیزوں کی، باتوں کی امید نہیں ہوتی اور جب وہ وقوع پذیر ہو جاتی ہیں تو بہت اہم لگتا ہے۔ عفتان علی خان کا دل بھی اسی ایک خوشی سے بھر گیا تھا۔

وہ چہرہ اپنے سامنے دیکھ کر وہ جیسے بت بن گیا تھا۔

امید کہاں تھی کہ وہ آئے گی۔ دل نے سو بار کہا تھا مگر وہ ماننے کو تیار ہی نہ تھا۔ کتنی تاویلیں دلی تھیں اس نے۔ اس کی سرد مہری کو لے کر کتنی وضاحتیں دی تھیں مگر دل کا کہا رد نہ ہوا تھا اور وہ چہرہ اس

ہوا۔ دل کی مراد بر آئی تھی۔ خواہش پوری ہوئی تھی۔ مگر وہ کتنا ساکت سا اسے دیکھتا جا رہا تھا اور ایسا نہ ہوئے اسے ارد گرد کے لوگوں کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ ایک میکانکی انداز میں چلتا ہوا وہ اس کے چہرہ کا تھا۔ عجب دیوانگی سے بڑا انداز تھا۔ انا بیہ شاہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”ہلکے بوزی!۔۔۔ کیا میں آپ کا ہاتھ تھام سکتا ہوں؟“ سعادت مندی سے درخواست کی تھی۔ شاہ کچھ نہیں بولی تھی۔ مگر اسی لمحے عفتان علی خان نے بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کا نازک سا ہاتھ لیا تھا۔ انا بیہ شاہ کسی قدر حیران ہوئی تھی مگر وہ اطمینان سے مسکرا دیا تھا۔

”دراصل مجھے اب یقین آ گیا ہے کہ تم واقعی میرے سامنے ہو۔ ورنہ میں تمہیں کوئی خواب سمجھنے کی پریشانی۔“ اس کا انداز سرشاری سے پڑھا اور انا بیہ شاہ نے ایک نظر ادھر ادھر متوجہ لوگوں پر ڈال کر ذرا خیالات سے اسے دیکھا تھا۔

”عفتان علی خان!“

”ہاں۔“ وہ جی جان سے متوجہ ہوا تھا۔

”میرا ہاتھ۔“

عفتان علی خان چونکا تھا، پھر مسکرا دیا تھا۔

”اوہ، ہاں۔“ ایک خواب سے بیدار ہونے کے ساتھ ہی انا بیہ شاہ کا ہاتھ اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا اور اس لمحے انا بیہ شاہ خود کو مکرور ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تجھی کسی قدر اعتماد سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”لامعہ کہاں ہے؟“

”لامعہ؟“ وہ ایسے چونکا تھا جیسے اس نے کوئی انوکھی، بھولی برسی داستان اس کے سامنے پھینک دی ہو۔ لامعہ نہیں آئی کیا؟۔۔۔ تم نے اُسے انوائٹ نہیں کیا؟“ انا بیہ شاہ کو تشویش ہوئی تھی۔ مگر وہ بہت لاسے مسکرا دیا تھا۔

”سوری۔۔۔ اس معاملے میں مجھے کوئی اطلاع نہیں۔ یہ ڈیپارٹمنٹ ماما کے ہاتھ تھا۔“ اس کا انداز بنا تھا۔ انا بیہ شاہ نے اسے کس قدر حیرت سے دیکھا تھا۔ تجھی فاطمہ خان وہاں آ گئی تھیں۔

”ماما! انا بیہ شاہ۔“ عفتان علی خان نے ماں کی توجہ مبذول کروائی تھی۔ فاطمہ خان بہت گرجوٹی سے شاہ سے ملی تھیں۔

”ہائی لوگ نہیں آئے؟“

”جی آئے ہیں۔ وہ اوزی کے ساتھ وہاں ہیں۔“ اس نے نجوم کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”لوگ۔۔۔ میں ان سے مل لوں۔ عفتان! تم انا بیہ کو اندر لے کر جاؤ۔“ فاطمہ خان نے بیٹے کو حکم دیا۔ سعادت مندی سے سر ہلاتا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ انا بیہ شاہ نے ناچار قدم آگے بڑھا

تھے۔

”ایک بات کہوں؟“ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”ہوں۔“ انا بیہ شاہ نے اجازت دی تھی اور عفتان علی خان کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

سردار بنگلین حیدر لغاری نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ گی مسکرا دی تھی۔

”بعض اوقات ایسا ہوتا ہے گین! اور ایسا صرف محبت میں ہوتا ہے۔ محبت چہروں میں چہروں ڈھونڈتی ہے۔ شباحتوں میں شباحتیں تلاشتی ہے۔ یہ محبت کی بڑی فطری سی کہانی ہے۔ محبت کی نظر بہ اضطرابیت لئے ہوئے ہوتی ہے۔ گمشدہ چہروں کو چہروں میں ڈھونڈنا اس کی مجبوری ہے۔ اور گمشدہ لہجوں اکثر لہجوں میں تلاشتا اس کی عادت۔ محبت کی یہ کہانی میں تمہیں کیسے سمجھاؤں گین! اگر سمجھانے کی کوشش کروں تو شاید سمجھا نہیں پاؤں گی۔ کیونکہ گین! وجہ یہ نہیں کہ مجھے سمجھانے کا گرنہیں آتا بلکہ معاملہ سراسر ہے کہ تمہارے اندر ایسا کوئی دیار روشن ہی نہیں۔ نہ امید کا، نہ ایمان کا۔ اور ایسے میں محبت کی اُلجھی باتوں تمہیں سمجھاؤں گی تو یہ سر پتھر سے پھوڑنے والی بات ہی ہوگی۔“

گی کسی قدر پُر شکوہ انداز میں بولی تھی اور سردار بنگلین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”بی بیو لائیک اے نارل انابیہ! تمہارے انداز کی بیزاری تمہارے چہرے پر صاف نظر آ رہی ہے۔“ اوزی نے اُسے بہت دبے دبے سے لہجے میں ڈپٹا تھا اور وہ چہرے کا رخ پھیر کر جھوم کی سر دیکھنے لگی تھی۔

”انابیہ! مانا تم یہاں پر اپنی مرضی کے برخلاف آئی ہو۔ مگر کیا ضرورت ہے اس طرح بے زار نظر کی بھی؟ تمہیں نہیں لگتا تم انتہائی آدم بے زار لڑکی ہو۔ نارل لوگ بھلا کیا کہیں آتے جاتے نہیں؟ کاتے ملتے ملتے نہیں؟“ باقاعدہ ڈپٹا تھا اور انابیہ شاہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔

”اوزی! مجھے پوز کرنا نہیں آتا۔ میری سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ جو کچھ میرے اندر ہے وہی باہر بھی۔“

”اور دنیا میں چینی کے لئے یہ عادت کچھ اتنی اچھی نہیں ہے انابیہ شاہ! نارل لوگ ایسے بی بیو لہ کرتے ہیں۔“ اوزی نے باقاعدہ ڈپٹا تھا۔

”تو تمہارا خیال ہے میں ابتارل ہوں؟“ وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ تجھی نگاہ سامنے اٹھی تھی۔ عفتان علی خان، لامعہ حق کے ساتھ کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔ دونوں کس قدر قریب تھے۔ لامعہ حق کا ہانک ہاتھ عفتان علی خان کے مضبوط شانے پر تھا اور گداز لیوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔ بہت آہستگی سے ہاتھ پھیر کر وہ دوسری سمت دیکھنے لگی تھی۔

اوزی نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔ پھر مسکرا دیا تھا۔

”محبت زندگی میں ہزار ہارنگ لے کر آتی ہے اور آنکھوں کے لئے بیش بہا خواب۔ جن آنکھوں مانا کوئی رنگ نہیں، کوئی خواب نہیں ان پر صد افسوس۔“ جانے کیوں اسے جتایا تھا۔ مگر انابیہ شاہ کچھ نہیں مانا تھی۔ چہرے کا رخ پھیرے کھڑی رہی تھی۔

”موسموں کو آنکھوں سے باتیں کرنے دینا چاہئے انابیہ شاہ! ورنہ واقعی خواب آنکھوں سے روٹنے پانے ہیں۔“ اوزی کا لہجہ مدہم تھا اور اس بل انابیہ مسکرا دی تھی۔ پھر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ماتے تلخ تجربات کرنے کے بعد بھی تم اس طرح کی رائے رکھتے ہو اوزی! کمال ہے۔ صد آفرین تم پر۔“ انداز داد دینے والا تھا اور اوزی مسکرا دیا تھا۔

”محبت بڑا حوصلہ دیتی ہے انابیہ شاہ! چاہے ساتھ رہے نہ رہے، ہاتھ آئے نہ آئے۔ مگر محبت اپنی اپنی بہت خوبی سے خود آپ کرتی ہے۔“ اوزی کا لہجہ بے حوصلہ نہ تھا۔ وہ لامعہ حق کی طرف بہ غور دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں اس گھڑی کئی جگنو چمک رہے تھے۔

انابیہ شاہ مسکرا دی تھی۔

”اوزی! کیا محبت میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ اپنے مطلوب فرد کو کسی اور کے ساتھ دیکھ سکے؟“ اوزی مسکرا دیا تھا۔

”میں نے کہا نا انابیہ! محبت بہت حوصلہ دیتی ہے۔“

انابیہ شاہ مسکرا دی تھی۔

”حوصلہ یا صبر اوزی؟“

”دونوں ہی۔“

”بڑی فطری بات ہے۔ جب کوئی شے دسترس سے باہر ہو تو نفسیاتی طور پر دل و دماغ کو صبر آ ہی جاتا ہے اس میں اتنا عجب کیا ہے؟“ انابیہ نے کسی قدر اختلاف کیا تھا۔

”ایسا نہیں ہے انابیہ شاہ! نارسائی کا کرب بڑا جان لیوا ہے۔ مگر محبت میں سب جھیلنا آ جاتا ہے۔“

”یہ تو بالکل ایسے ہی ہوا کہ جب سر پر پڑتی ہے تو سب کچھ میں آ جاتا ہے۔“ انابیہ شاہ مسکرائی تھی۔ تجھی شے وہاں آئی تھی۔

”انابیہ! آپ کو مئی بلار ہی ہیں۔“ اطلاع دینے کے ساتھ ہی وہ تیزی سے پلٹ گئی تھی۔

”اوکے، میں آتی ہوں۔“ وہ اوزی سے کہہ کر چلتی تھی اور چلتی ہوئی اندر کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

باری میں قدم دھرا تھا تجھی اس کا ہاتھ کسی نے گرفت میں لے کر تیزی سے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ وہ خاطر کسی وجود سے جا کرا لئی تھی۔ فوری طور پر سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ آنکھیں بہت سختی سے میچے اس نے بہت تیزی سے چلتی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔ مگر حواس بحال ہونے والے انہی لمحوں میں سے احساس ہوا تھا کہ وہ کسی کے بہت قریب ہے۔ کسی کی گرم گرم سانسوں کی تپش اسے اپنے چہرے پر مائل ہوئی تھی۔ تجھی اس نے بہت آہستگی سے آنکھوں کو کھول کر سر اٹھایا تھا اور اپنے سامنے موجود وجود کو بلکھا تھا۔

عفتان علی خان اسے بہ غور دیکھ رہا تھا اور اس گستاخی پر وہ ساکت رہ گئی تھی۔ اسی بل عفتان علی خان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو بہت ہولے سے چھوا تھا۔

”انتظار..... انتظار..... انتظار..... ایک لامتناہی انتظار۔“ مدہم لہجے میں بے پناہ شدت تھی اور مائل سمت دیکھتی آنکھوں میں بے انتہا تپش۔

”کبھی سوچا ہے تم نے؟..... کبھی غور کیا ہے، یہ انتظار کس قدر جان لیوا ہو سکتا ہے۔ محبت کرنے

والوں کے نصیب میں تو یوں بھی کئی عذاب اترتے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ خود محبت کرنے والے بھی ان کو خود آپ دعوت دیں؟“ مدہم لہجے میں بے قرار یوں کی ہزار ہا داستانیں تھیں۔ انابہ شاہ اس کے چہرے پر کسی قدر حیران سی اسے دیکھنے لگی تھی۔ مگر عرفنان علی خان مسکرا دیا تھا۔ اس کی کلائی پر اس کی گرفت جھوننا تھی۔

”عرفنان علی خان!“ بے حد درشت لہجے میں کہتے ہوئے اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا مگر توجہ عرفنان علی خان نے اسے ٹوکتے ہوئے ہاتھ بڑھا کے بہت آہستگی سے اس کے لبوں پر رکھ دیا تھا۔

”شی۔“ سر بہت آہستگی سے نفی میں ہلایا تھا۔ ”آج کچھ مت کہو۔ کچھ نہیں انابہ شاہ! میں نے ان لہجوں کے لئے بہت انتظار کیا ہے۔ بہت صبر سہا ہے میں نے اس دل پر۔ ہزار ہا اضطرابوں کو جھیل ہے۔ پلیز، آج نہیں۔“ مدہم لہجے میں کوئی درخواست سی تھی۔ اس کا ہاتھ بدستور اس کے لبوں پر تھا۔ جیسے اسے خدشہ تھا کہ وہ اسے بولنے نہیں دے گی۔

”میں تمہاری ضرور سنوں گا۔ مجھے بھی بہت چاہ ہے انابہ شاہ! تمہیں دیکھنے کی، تمہیں سننے کی۔ مگر آج نہیں۔ آج تم مجھے اجازت دو کہ میں تم سے کہہ سکوں، تمہیں سنا سکوں۔ وہ داستان جو تم نے آج تک نہیں سنی۔ وہ تمام لفظ جو میں آج تک نہیں کہہ سکا۔“ وہ اس کے چہرے کو بے غور دیکھ رہا تھا اور انابہ شاہ کی کیفیت عجیب تھی۔ ذہن اس ہمت پر بے حد ماؤف سا تھا۔

”جنہیں آج تک تم نہیں سن سکیں، وہ تمام حرف انابہ شاہ!۔ سوچنا ہوں، شروع کہاں سے کروں۔ تمہاری ایک نگاہ نے مجھے قیامتوں کی نذر کر دیا تھا یا جب میں اپنا آپ گنوا بیٹھا تھا۔ کب سے انابہ شاہ؟۔۔۔ کہاں سے بتاؤں؟ یہ داستان تو صدیوں پر محیط ہے اور مجھے اک پل ہزار ہا صدیوں کے برابر لگا ہے۔“ عرفنان علی خان کا لہجہ بھاری اور جھل تھا۔ کتنی شدت تھی اس میں اور انابہ شاہ اس کا اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونق انداز سے دیکھنے پر وہ بہت ہولے سے مسکرایا تھا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر ان کی آنکھوں کو بہت آہستگی سے چھوا تھا۔ انابہ شاہ پلکیں میچ گئی تھی۔

عرفنان علی خان کا لہجہ بھرا ہوا تھا اور وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

”ان آنکھوں نے انابہ شاہ!۔۔۔ تمہاری ان آنکھوں نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ لوٹ جا سب، وہ بھی جو میرا تھا اور وہ بھی جو میرا نہیں تھا۔ ان آنکھوں نے مجھے واقعی کہیں کا نہیں چھوڑا۔ تمہاری ایک نظر نے عجب اثر کیا۔ جہاں کئی اضطرابوں کی نذر کیا، وہیں بہت حسین احساس سے بھی روشناس کرایا۔ اور مجھے پہلی بار لگا کہ یہ زندگی بے حد حسین ہے۔ تمہاری طرح، تمہاری ان آنکھوں کی طرح۔ بے انتہا دلکش اور دل فریب۔ انابہ شاہ! تمہاری ان آنکھوں کا چہرہ میرے دل پر تب سے ہے جب تم پہلی بار مجھے دکھائی دی تھیں۔ تمہاری شابہتوں کا ڈیرہ تب سے میرے اندر ہے۔ میرے لبوں میں، میری رگ رگ میں دوڑتا ہے جب سے تم نے ایک بے خبر سی نظر مجھ پر کی تھی۔ ایک سرسری نگاہ۔ مگر وہ نظر میرے اندر قیامتیں بنا کرنے کو کافی تھی۔ پہلی بار انابہ شاہ! پہلی بار میں نے خود کو بے حد بے بس پایا۔ پہلی بار اتنا مضطرب۔“

جیسے یہ اسیری بہت اچھی لگی انابہ شاہ! ”پڑپڑ لہجے میں کسی کسی کہانیاں نہ تھیں۔

شاہ! شاید میں تمہیں کبھی نہیں بتا سکوں گا۔ کبھی سمجھا نہیں سکوں گا کہ میں تمہارے لئے کس طور پر کرتا ہوں اور کیا فیصل کرتا ہوں۔ مگر میں اتنا یقین ضرور دلا سکتا ہوں کہ میں تمہارے لئے سب کچھ کروں گا۔ ہر شے، جو ناممکن ہے، اسے بھی ممکن کر سکتا ہوں۔ اور اب میں ایسا کر کے دکھاؤں گا۔ یو

”انابہ شاہ!“

”انابہ شاہ! یقین لہجے میں وہ کہتا ہوا، اس پر ایک نگاہ خاص ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا اور انابہ شاہ حیرتوں پر ایک نگاہ لئے اسے بت دیکھتی رہ گئی تھی۔

غافل میں ایک تاثر انگیز آواز کا چہرہ دور تک تھا۔ ایک بازگشت اس کے اندر باہر تھی۔ چاروں طرف

بارود ساکت سی کھڑی تھی۔

”کیا تمہ نے اس کے شانے کو بہت ہولے سے چھوا تھا۔ وہ یکدم ٹھنکی تھی۔ اوزی اس کے سامنے کھڑا اس کی اجنبی سی کیفیت پر اسے بے غور دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ بہت فکر مندی سے دریافت کیا تھا۔

”انابہ شاہ کچھ نہیں بولی تھی۔ بہت آہستگی سے اس کے شانے پر اپنا سر دھر دیا تھا اور بہت سا گرم گرم لہجے کی لہجوں کے بند توڑتا ہوا بہت کراؤزی کے شانے میں جذب ہونے لگا تھا۔

”مجھے یہاں سے جانا ہے اوزی! ابھی، اسی وقت۔“ اس نے مدہم لہجے میں درخواست کی تھی اور اوزی

انسان حسن بخاری میٹنگ سے باہر نکلا تھا جب ساہیہ خان کا فون آ گیا تھا۔ دوران میں ٹنگ بھی اس فون کا لڑائی تھیں، کئی ایس ایم ایس بھی موصول ہوئے تھے مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ایس ایم ایس پر اس کی رائے لینا چاہتی تھی مگر وہ اس قدر تھک چکا تھا کہ اس کا موڈ بالکل بھی ساہیہ سے بات کرنے کا نہ تھا۔ وہ گھر کی طرف ڈرائیو کرنے لگا تھا۔ انداز کسی قدر پُر سکوت تھا اور چہرہ بالدرے تاثر۔

”پہاس کر دو، تم آئندہ کبھی زندگی میں کسی موقع پر کزنو نہیں پڑو گے۔“ ایک بہت مختص، پُر خلوص لہجہ

”کون؟“

”اس کے قریب کونجا تھا اور جانے کیا سوچ کر اس نے سیل سوچ آن کر دیا تھا۔ دوسری طرف ساہیہ خان اس کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ سیل آن کرنے کے بعد پہلی کال اسی کی تھی۔ سو بالکل کی اسکرین پر ساہیہ خان ایک رہا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے بہت بے دلی سے کال ریسیو کی تھی۔

”ان! کہاں غائب ہو تم؟ اتنے ایس ایم ایس کئے، فون کا لڑکیں اور تم ایک بار بھی

”کون؟“ دوسری طرف ساہیہ خان بھر پور شکوہ کر رہی تھی۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح نہ ہی مسکرایا

”کیا کام ہے؟“ بہت سرسری سے سردہر لہجے میں دریافت کیا تھا اور دوسری طرف ساہیہ

”ان! کہاں رہ گئی تھی۔“

”کام؟“ اذہان حسن بخاری! کیا میرا تمہارا تعلق صرف کام کا ہے؟ اور یہ کس لمحے میں بار رہے ہوتے تھے؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟“

”جھکن ساہیہ خان!“ اذہان حسن بخاری نے وسیع تارکول کی سڑک پر نظر جمائے ہوئے ایک نو سی وضاحت دیتے ہوئے گہری سانس خارج کی تھی۔ ”ایک اہم ترین مینٹگ تھی۔ پاپا کہیں اور تھے، سوسپ کچھ مجھے ہی پینڈل کرنا پڑا۔ اپنی ویز، تم کچھ کہہ رہی تھیں؟“ وہ مدعا پر آیا تھا اور ساہیہ چونک پڑی تھی۔

”آریو آل رائٹ اذہان حسن بخاری؟“

”آف کورس۔“ اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ ”بس شیڈول بہت ٹف تھا آج کا۔ تمہیں کیا تھا؟ ایسا کرو سارا ایجنڈا تیار کر کے رکھو۔ ملتے ہیں تو بات کرتے ہیں۔“ اس کا انداز بہت سرسری سا تھا۔

”اذہان!“ ساہیہ خان نے بہت ہولے سے پکارا تھا۔

”ہاں؟“ اس کا لہجہ بہت مدہم اور انداز بہت بجا بجا سا تھا۔

”تم مجھے اگنور کر رہے ہو، جان بوجھ کر؟“ ساہیہ نے دوسری طرف دریافت کیا تھا اور اذہان بخاری جواباً کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

”اذہان حسن بخاری! مجھے یقین تھا تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکو گے۔“ ساہیہ خان کا لہجہ یقین پُر تھا اور اذہان حسن بخاری بولا تھا۔

”تم غلط سمجھ رہی ہو ساہیہ! میں گھر پہنچتا ہوں تو بات کرتے ہیں۔ میں ڈرائیو کر رہا ہوں۔“ سبب کیا تھا اور ساہیہ دوسری طرف کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

”اوکے؟“ اذہان حسن بخاری نے اجازت چاہی تھی۔

”اوکے۔“ ساہیہ نے دوسری طرف سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

اذہان حسن بخاری خاموشی کے ساتھ ونڈ اسکرین سے اس پار نظر آنے والی سیاہ تارکول کی سڑک اس پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھنے لگا تھا۔ انداز بہت الجھا الجھا سا تھا۔

گھمبیر چپ میں کئی کہانیاں تھیں۔

کچھ بھی بے معنی نہ تھا۔ اسباب لاتعداد تھے۔

مگر اذہان حسن بخاری کے لبوں پر ایک گہری چپ تھی۔

”تم بہت لکی ہو میرب! تمہیں سبکٹین جیسا جیون سا تھی ملا ہے۔ کتنا ٹف شیڈول ہے اس کا۔ مگر نے باوجود وہ تمہارے لئے وقت نکالنا نہیں بھولتا۔ ایسے میں جب بندہ کئی ضروری کام بھول جاتا۔“

سبکٹین حیدر لغاری کو تمہاری یاد رہتی ہے۔“ زوباریہ اس سے مخاطب تھی اور مظہر سیال مسکرا دیئے تھے۔

”اپنی بیٹی کا یہی سٹکھ میں چاہتا تھا اور اب اپنی زندگی میں ہی اسے خوش اور مطمئن دیکھ چکا ہوں۔“ پاپا کے لہجے میں ڈھیروں ڈھیروں ڈھیر اطمینان تھا۔ اور وہ...

لڑھکی تھی۔

مردہ کافی بنانے کے لئے اٹھ گئی تھی۔ اور جب واپس لوٹی تھی تو سردار سبکٹین حیدر لغاری اس کی لہجے سے ہنسنے لگا تھا۔ میرب سیال نے اپنے حصے کی کافی کا بنایا ہوا کپ اس کے سامنے رکھ

”میں کافی نہیں لوں گا۔ تم لے لو۔“ اسے سرسری انداز میں کہنے کے بعد وہ پاپا کی طرف

”میں بزنس کے سلسلے میں شکاگو جا رہا ہوں۔ مائی اماں سے بات ہوئی تھی۔ ان کی ہدایت تھی میرب کو

”ہاتھ لے لوں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو.....“ بہت سعادت مندی سے وہ مظہر سیال سے دریافت

”پاپا! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ شیور۔“ وائے ناٹ۔ آپ میرب سے پوچھ لو۔“ پاپا

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟“ بھلا میرب کو کیا اعتراض ہو گا؟“ زوباریہ نے میرب کی فطری

”میرب! تم تیاری کر لو۔ غالباً سبکٹین کو دیر ہو رہی ہوگی۔ تمہیں آج ہی نکلتا ہے نا گین؟“ زوباریہ

”ہی۔“ سردار سبکٹین حیدر لغاری نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”میرو! جلدی پیکنگ کرو۔ ٹھنڈ بہت ہوگی۔ تم گرم کپڑے زیادہ پیک کرنا، چلو میں تمہاری ہیلپ کرتی

”اچھا! زوباریہ اس کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے تک جاتے ہوئے میرب سیال کا ذہن مزید

”اچھا! زوباریہ نے اس کی مدد کی تھی اور اگلے کچھ ہی لمحوں میں وہ سردار سبکٹین حیدر لغاری کے ساتھ تھی۔

”تم تھک تو نہیں گئی ہو؟“ اگر تھک گئی ہو تو ہم کچھ دیر ریٹ کر سکتے ہیں۔ لیکن میرے پاس

”ہاں۔ یہاں رکنا میں انور ڈونہیں کر سکتا۔“ اپنی مجبوری بیان ہوئی تھی اور وہ کسی قدر حیرت سے اس

”میرب! تم تیاری کر لو۔ غالباً سبکٹین کو دیر ہو رہی ہوگی۔ تمہیں آج ہی نکلتا ہے نا گین؟“ زوباریہ

”میرب! تم تیاری کر لو۔ غالباً سبکٹین کو دیر ہو رہی ہوگی۔ تمہیں آج ہی نکلتا ہے نا گین؟“ زوباریہ

میرب سیال پر کسی قدر ترس آ گیا تھا جو اس نے سینٹ لوکس میں ہی خیمہ زنی کی پیش گوئی کر دی تھی اور افسوس
فقط اسی کے لئے تھا۔ میرب کو اگر کسی قدر ٹھکن تھی بھی تو وہ اب سینٹ لوکس کے حسین موسم کے باعث
ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی ہواؤں اور بارش نے اس کا استقبال کیا تھا اور اس کے مزاج کی ساری کلفتیں اور
زاری دھل گئی تھی۔ وہ ایک دم فریش ہو چکی تھی۔ سینٹ لوکس میں سردار سبکدین حیدر لغاری کے قیام کا فیہ
میرب سیال کو پسند آیا تھا اور پہلی بار اس نے اسے سراہا تھا۔ ہونٹ کے روم میں کھڑکی سے باہر بارش
بوندیں گرتے دیکھ کر وہ بہت سکون محسوس کر رہی تھی۔ ٹھنڈے حد تھی۔ کمرے میں بیٹھ آن تھا۔ مگر
شیشے سے باہر کا منظر دیکھ کر اس ٹھنڈا اندازہ پورے طور پر ہو رہا تھا۔ مگر اسے یہ سب بہت اچھا لگا
تھا۔ وہ بہت مگن سی کھڑی باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ شاید یہی اسے سردار سبکدین حیدر لغاری کے وہاں آنے
علم نہیں ہوا تھا۔ وہ چونکی تھی، نہ ہی پلٹ کر دیکھا تھا۔ غالباً وہ واقعی محو تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری چلا
اس کے پیچھے آن رکھا تھا، پھر بہت آہستگی سے دونوں بازو پھیلا کر اسے اپنے حصار میں بھر لیا تھا۔

میرب سیال کو جیسے کوئی کرنٹ سا چھو گیا تھا۔ وہ بے طرح چونکی تھی۔ گردن کا رخ پھیر کر دیکھا
سردار سبکدین حیدر لغاری اس کی پشت پر کھڑا چہرہ اس کی گردن پر جھکا نے بہت ہوئے ہوئے کچھ کہہ
تھا۔ اس کے لمس کی حدت سے میرب سیال کو اس سرد موسم میں بھی اپنا سارا وجود جلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔
”یہ لمحے زندگی کا احساس اپنے سنگ لارے ہیں ہنی! تم سوچو تو محسوس کرو گی کہ زندگی
لحوظ میں ہی ہے۔ مگر میرے لئے زندگی کا احساس جس قدر دلکش ہے، تمہارا احساس اس سے کتنا
دل پذیر اور دلکش ہے۔“

وہ حواس باختہ سی آنکھیں بہت زور سے میچ گئی تھی۔ اس اچانک توجہ اور انکشاف کا کوئی مطلب وہ
نہیں پائی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری رات کے اس پہر اس کے قریب تھا۔ اس کے کمرے میں تھا
میرب سیال کی دھڑکنوں کا ارتعاش کا ارتعاش بڑھتا چلا گیا تھا۔ وہ بے جان بت بنی اس لمحے اس کے بازوؤں
حصار میں تھی۔ اس میں اتنی ہمت بھی باقی نہیں تھی کہ وہ کوئی مزاحمت ہی کر سکتی۔ حواس کھل طور پر
تھے۔ ایک بار پھر وہ سردار سبکدین حیدر لغاری کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کی زندگی کی ڈور اس کے ہاتھ تھی۔
اس کے ساتھ تھی، اس پر قناعت کر رہی تھی۔ اور اب وہ چاہے جیسا بھی سلوک روا رکھتا۔

”بہت سی باتیں نہ کہی جائیں یا نہ باور کرائی جائیں تو ان کے مفہوم دھندلانے لگتے ہیں۔ اور اتنی
تمہارے اور اپنے معاملے میں قطعاً ایسا نہیں چاہتا ہوں۔ مجھے بہت سے مفہوم دھندلانے سے قائل
واضح کرنے ہیں۔ بہت سی باتوں کی خوشبو تمہاری سانوں سے چننا ہے، بہت کچھ کہنا ہے، بہت کچھ
ہے۔ جو وقت کو گنوا دیتے ہیں، میری دانست میں وہ عقل مند نہیں ہوتے۔ اور مجھے ان لحظوں کو اپنی گردن
میں بھرنے ہے۔“ اس کی زلفوں پر اپنی کتھی پڑپوش سانوں کی حدت منتقل کرتے ہوئے وہ اس گھڑی
لہجے میں کہہ رہا تھا اور میرب سیال کی حالت ان نوازشوں پر ایسی تھی کہ کالو تو بدن میں لہو نکلس۔

”مجھے یہ کہنے دو ہنی! کہ زندگی تمہارے ساتھ کچھ اور بھی دلکش ہو جاتی ہے۔ یہ لمحے تمہارے حسن
بہت سے رنگ چرا کر اپنے ساتھ بانٹھ لیتے ہیں اور مزید دل فریب ہو جاتے ہیں۔ تم اتنے بہت سے

بے سنگ رکھتی ہو کہ میں حیران سا ہو جاتا ہوں۔ جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں تم مجھے ہی لگتی ہو۔“
میرب کو شیاں کتنی بہت سی حدتیں اس کے اندر بھر رہی تھیں۔ کتنے نئے احساس چگا رہی تھیں۔ وہ
بہت اچھے بیچے کھڑی تھی۔ جب سامنے دیوار پر لگے کاک نے الارم بجایا تھا اور سردار سبکدین حیدر
لغاری نے بہت آہستگی سے اس کا رخ اپنی طرف پھیرا تھا۔

”میری ہنسی! مٹی مٹی پی ریٹرز آف دی ڈے۔“ دھڑکنوں کا شور اتنا بڑھا تھا کہ
پورے پھٹنے لگے تھے۔ اپنی تمام تر بے بسی کو محسوس کرنے کے باوجود وہ اس لمحے حیران تھی۔ سردار
سبکدین حیدر لغاری کو اس کی زندگی کے وہ خاص ترین لمحے کیسے یاد رہے تھے؟ کیسے علم ہوا تھا
اس نے تو اسے کبھی مطلع نہیں کیا تھا۔

اس نے چاہتا تھا ہنی! تمہاری زندگی کے ان لمحوں کو تم میرے ساتھ۔ صرف میرے ساتھ بسر
ان لمحوں کی ساری دلکشی کو میں تمہارے چہرے پر دیکھوں، تمہیں سنوں، محسوس کروں۔ صرف میں
ان لمحوں میں تمہارے قریب ہوں اور تمہارے سارے رنگ اور ساری دلکشی صرف میرے لئے ہو۔ میرے
لہجے کوئی دیکھے، نہ سنے۔ بس تم ہو، میں ہوں اور محبت۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری کا لہجہ دھیمہ تھا۔
اس لہجے میں موجود حدتوں اور شدتوں کو مکمل طور پر محسوس کر رہی تھی۔ اس کے اندر جیسے ایک ہلچل سی

ڈانڈان دی ایئر ہنی! اینڈ آئی کین ہیئر دی واؤس آف لو۔ کیا تمہیں کچھ سنائی نہیں دے رہا؟“ یہ غور
انگھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا اور میرب سیال نے اس لمحے خود کو بے حد بے بس محسوس

کا عجیب حال تھا۔ کتنی قیامتوں کے زیر تھا سب کچھ۔ وجود کے تمام علاقوں میں ایک ہلچل سی تھی۔
نئے تجربات سے روشناس کر رہی تھی اسے وہ نگاہ خاص۔ کتنے نئے زاویوں سے سوچنا سکھا
مگر اس کے لئے اس طرز عمل کو جھیلنا آسان نہ تھا۔ کجا کہ اس کو کھٹنا یا اس سے اخذ کرنا۔ وہ اس
لہجے میں اس کے سامنے دم سادھے کھڑی تھی۔

ان لمحوں کے ان موسموں کی پذیرائی کے لئے دل کے دروا کرنا بہت ضروری ہو جاتا ہے میرب
تمہارے لمحے، یہ منظر، یہ تمہارے میرے درمیان حائل خاموشیاں، سنو تو کیا کچھ نہیں کہتے۔“
میں حیدر لغاری کے لبوں پر بہت دھیمی مسکراہٹ تھی۔

مجھے نہیں لگتا کہ لطفوں کے موسموں کی کہانیوں کو تمہیں سمجھانے کی اس درجہ ضرورت ہے۔ تمہیں کیا
ہے، کیا سارے معنی اس قدر ہی دقیق ہیں کہ پذیرائی کوئی راہ نہ پاسکے؟ یا پھر نوازشوں کی مزید کوئی
بائی باقی ہے؟“ اس کے مدہم لہجے میں کتنے سوال سلگ رہے تھے کہ وہ ان کی پیش صاف محسوس کر

نوازشوں کی بات فی الحال ہم ایک طرف اٹھا رکھتے ہیں۔ خواہشیں بھی تو لامحدود ہوتی ہیں۔ آسمان
کھاتیں صحیفوں کی طرح اس طرح اترتی ہیں کہ دل ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر ایسے میں کس

یقین کی بات کی جائے؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری کے لیوں پر مسکراہٹ تھی اور میرب سیال میں اس کی طرف دیکھتے رہنے کی ہمت ناپید تھی۔ دل میں انتشار تھا اور سانسوں میں زبردہم۔ وہ ان لمحوں کی طوارف پر کوئی احتجاج نہیں کر سکتی تھی، نہ ہی انہیں سمیٹ کر راہ فرار اختیار کر سکتی تھی۔ اس سامنے کھڑے شخص نے چہرے پر، آنکھوں میں فتح مندی کی عجب سرشاری تھی۔ اور میرب سیال اپنی بے بسی خوب جانتی تھی۔

”اتنی بندشوں کا پابند خود کو کرنا بہت فضول لگتا ہے ہنی! کھل کر سانس لینے سے جو تروتازگی اندر مزید کرتی ہے اس کی لذت ناقابل بیان ہے۔ جب اتنے حقائق سامنے ہوں تو اپنے اندر سے گھٹن زدہ لگاؤ بوسیدہ ماحول کو نکال دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی خود سے، اپنے آپ سے انحراف کر کے، اپنے اندر دبی دبی آواز کو بھی سن لینا چاہئے۔ دیکھنا تو چاہئے کہ دل کیا کہتا ہے۔ بلاوجہ کے واہموں میں خود کو الجھا کہاں کی عقل مندی ہے۔“ اس کے ملائم ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھ میں لے کر ایک خاص انداز سے دیکھتے ہوئے وہ مسکرا رہا تھا۔

”نانا اندیشوں کی فکر بھی کرنا چاہئے۔ مگر ہر وقت یہ سلسلہ جاری رہے، کوئی اتنا ضروری بھی نہیں۔ کبھی عقل و خرد کو دل کی سمت آنے والی راہوں پر آنے سے روک دینا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ اور ہم یہ اقدام خاص انجام دینے سے قطعاً بھی دیر نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ دل کے وصف جتنے نرالے ہیں بہر حال اتنے دل پذیر بھی ہیں۔ اور زندگی کو بہر طور لطافتوں کی ضرورت ہرگز، باقی رہتی ہے۔ کیا حرج۔ اگر کبھی دل کو صرف دل کے اختیار میں دے دیا جائے اور کھل اختیار سونپ کر اسے آزاد چھوڑا جائے۔ اب یہ اتنا سرکش بھی نہیں کہ لوٹ کر واپس ہی نہ آئے۔ دل، دل ہی تو ہے۔ کچھ نرم، کچھ گم بالکل اپنے پر لطف احساسات کی طرح۔ کیا تمہیں لگتا ہے کہ کہانی کچھ اس سے الگ اور ہٹ کر ہے؟ کتنی بھر پور توجہ سے وہ اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے دریافت کر رہا تھا اور میرب سیال کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ لاجواب ہو گئی تھی بلکہ وہ حیرتوں میں گنگھی اور بلا پرچپ کے ہزار تالے پڑے تھے اور ایسے میں وہ بولتی بھی تو کیا؟

سردار سبکدین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔ شاید اس پر کسی قدر ترس آ گیا تھا۔

”حسن واقعی کرشمہ ساز ہے ہنی! گرفت میں لینے والے سارے تیرا سے ازر ہوتے ہیں۔ مگر اب یہاں کچھ سمجھنے اور سمجھانے کی نہیں ہو رہی، نہ ہی جتانے کی۔ بات تو ہے دل کو منانے کی۔ اور بے شک بے حد ضروری ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تم اس حقیقت سے کوئی انحراف کرو گی یا کسی طرح کی پہلو پر تمہیں کوئی اتنا گیری گھیرے میں لے گی۔ کیونکہ یہ بات میں بھی جانتا ہوں اور تم کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ دلوں میں بننے والے سارے سلسلوں میں درحقیقت صرف محبت کو سفر کرنا چاہئے۔ صرف اور صرف محبت کو۔ باقی کسی بات کی گنجائش نہیں۔“ انداز باور کراتا ہوا تھا۔ مگر میرب سیال نے اپنے سامنے کھڑے شخص کی سمت دیکھنے سے کھل کر گر بڑھ گیا تھا۔

سردار سبکدین حیدر لغاری نے ہاتھ بڑھا کر اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کے نازک شانوں کو تھام لیا۔ میرب سیال کے نازک وجود میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ کسی ممکنہ خطرے کو بھانپ کر وہ آنکھیں پٹی

سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس چہرے کو بغور دیکھا تھا پھر اس وجود کو اپنے بازو کے حصار میں لے کر جہازی ساز کے بیڈ کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ میرب سیال کے لئے یہ سارے لمحے قیامت بھری لمحوں کے زبردہم سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ قدم من من بھر کے لگ رہے تھے لے آگے بڑھنا دشوار ترین تھا۔ مگر کوئی مزاحمت اس کے لئے محال تھی۔ سردار سبکدین حیدر نے قدم مطلوبہ مقام پر پہنچنے کے بعد تھکے تھے۔ بہت آہستگی سے اسے بیڈ پر بٹھایا تھا۔ میرب سیال نے افعال جیسے ناچار سرانجام دے رہی تھی۔ دم سادھے اس کی سمت دیکھنے سے مکمل طور پر گر گیا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے مکمل اختیار سے اسے اٹھا کر اس پر کھل ڈالتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور پانچا۔

آج کی شب کی صبح کیسی ہو گی، اس کی خبر نہیں۔ مگر آج کے ولوں کے سارے خواب تمام ہوئے۔ لی ہے کہ جس طور بسر کرنے کی خواہش تھی، اس طور ہی دن بسر ہوا۔ گڈ ناچٹ، اب تم سو جاؤ۔ صبح کیا ہے اس کا فیصلہ غالباً صبح بر ہی چھوڑ دینا کافی ہو گا۔“ مسکراتے لیوں پر ایک ملامت تھی۔ نظروں میں آت، مگر ایک پر تعظیم انداز، جیسے اس کی پرواہ رکھتی ہوں۔

”اگر تازہ“

فنی آہستگی سے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کی پیشانی پر ایک مہر خاص ثبت کرتا ہوا اٹھا تھا اور پلٹ کر دے باہر نکل گیا تھا۔ اور میرب سیال اس سرد موسم میں جل اٹھنے والے الاؤ میں گھری، نرم بستر پر ڈیر تک اس لہجے کی تپش میں جلتی رہی تھی۔ نگاہیں کتنی حیرت سے اس بند دروازے کو کھتی رہی۔ جسے ابھی تھوڑی دیر قبل سردار سبکدین حیدر لغاری بند کر گیا تھا۔ مگر اس ایک دروازے کو بند کرنے اور خیالات کے کتنے دروہ انجانے میں وا کر گیا تھا یا پھر دانستگی کے سارے اقدامات تھے۔



بزار کا بھید پا گئی تھی اسی لئے دوسرے دن وہ اس کے سامنے تھی۔

”وجہ تو نہیں جانتی، مگر مجھے لگ رہا ہے اذہان! جیسے تم مجھ سے دانستہ بھاگنا چاہ رہے ہو۔ مجھے بتاؤ، ایسا کیا ہے؟“ ساہیہ خان کی آنکھوں میں الجھن نظر آرہی تھی۔ مگر اذہان حسن بخاری نے بہت سرسری انداز میں ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ کیا بات کرنے والے تھے ہم؟ کچھ ورک آؤٹ کیا تم اپنے پروجیکٹ کو لے کر؟“ اذہان حسن بخاری کا لہجہ کسی قدر بے تاثر تھا اور ساہیہ کی نگاہوں میں بے یقینی ابھری۔

”اذہان! یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ تم مجھ سے کس لہجے میں بات کرنے لگے ہو؟ ایسے اجنبی تو نہ تھے ہم؟“ اذہان حسن بخاری کے لبوں پر بہت بے جان مسکراہٹ ابھری تھی۔

”ساہیہ خان! تمہیں عادت ہو چلی ہے بلاوجہ شک کرنے کی۔ ایک بات طے ہے، تمہارے ہر بیٹہ کی بھاری گزرنے والی ہے۔ تم تو ناک میں دم کر دو گی اس کا۔“ تجزیہ کمال کا تھا۔ مگر ساہیہ خان قطعاً محظوظ نہ ہوئی تھی۔

”کیسی رسمی اور مروت سے لبریز باتوں کی جگہ تو ہمارے درمیان پہلے نہیں تھی۔ کہیں تم..... اوہ، ہاں تو تم کیا بات کو لے کر اب تک اتنے ڈپرے ہو۔ لیکن کہا تو تھا وہ سب مذاق تھا۔ مانا انکل کی ایڈوائز میرے نام ہے۔ مگر جب میں تم پر بھروسہ کر رہی ہوں تو مجھے اس بات کا یقین ہے کہ یہ غلط ہرگز نہیں ہے۔ لیکن اذہان حسن بخاری! تم ایسے کیسے ہو سکتے ہو؟ اور وہ بھی میرے ساتھ؟“ ساہیہ خان کا لہجہ ہی نہیں، نگاہ بھی اتنی بے یقینی سے بڑھتی۔ مگر اذہان حسن بخاری چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔ کوئی وضاحت نہیں دی تھی۔ ساہیہ خان اسے خاموشی سے دیکھا تھا پھر پلٹ کر آگے بڑھنے لگی تھی۔ اور اسی لمحے اذہان حسن بخاری نے نجانے اس کے نازک سے ہاتھ کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے لیا تھا۔ ساہیہ خان نے اس کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔

”اذہان! پلیز، اب کوئی وضاحت دینے کی کوشش مت کرنا۔ میرے لئے ٹولریٹ کرنا آسان نہیں ہو گا۔“ لہجے میں کہا تھا مگر اذہان حسن بخاری نے اس کے ہاتھ کو چھوڑے بغیر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”نہیں ساہیہ! میں کسی قسم کی کوئی وضاحت دینے کی کوشش نہیں کر رہا۔ ایسا کروں گا بھی تو شاید یہ بہت اذہان فضول لگے گا۔ میں تمہیں کسی طرح کی زک نہیں پہنچانا چاہتا۔ اگر تمہیں میری کوئی بات بری لگی ہو تو بات تم بیٹھو۔“ اس کا ہاتھ بہت آہستگی سے چھوڑ دیا تھا۔ ساہیہ خان نے پلٹ کر اذہان حسن بخاری کی طرف دیکھا تھا، پھر مسکرا دی تھی۔

”اذہان حسن بخاری! مجھے لگتا ہے اگر میں یہاں رکوں گی تو تمہاری الجھنوں میں مزید اضافہ کروں گی۔ تم مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ تمہیں جو بھی مشکل درپیش ہے اس میں کہیں نہ کہیں میرا کوئی حصہ ضرور ہے۔“

”یہ خان کا انداز پُر اعتماد تھا اور اذہان حسن بخاری نگاہ پھیر گیا تھا۔

”کیسی کیا بات ہے اذہان حسن بخاری! جو تم مجھ سے نگاہ نہیں ملا پارہے ہو؟“

انابیہ شاہ کے اندر جھکڑ سے چل رہے تھے۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک قیامت کا لمحہ آ کر گزر گیا ہے۔ مگر ایسا ہو چکا تھا اور خرد و عقل کو یہ بات از بر تھی۔ مگر اسے جھیلنا پھر بھی دشوار ترین تھا۔ کسی لمحے ہیٹ چکے تھے اس بات کو مگر اس کا وجود اب تک کا پڑ رہا تھا۔ اس لہجے کی بازگشت وہ اپنے ارد گرد محسوس کر رہی تھی۔

”ان آنکھوں نے..... انابیہ شاہ! تمہاری ان آنکھوں کا پہرہ میرے دل پر تب سے ہے جب تم پہلی بار مجھے دکھائی دی تھیں۔ تمہاری شاہتوں کا ڈیرہ تب سے میرے اندر ہے میرے لبوں میں، میری رگ رگ میں دوڑ رہا ہے جب سے تم نے ایک بے خبر سی نظر مجھ پر کی تھی۔ ایک سرسری سی نگاہ۔ مگر وہ میرے اندر قیامتیں برپا کرنے کو کافی تھی۔ پہلی بار میں نے خود کو بے حد بے بس پایا۔ انابیہ شاہ! شاید میں تمہیں کبھی نہیں سکوں گا۔“ اس لہجے میں کتنی شدتیں تھیں۔ اپنے ارد گرد گونجتی اس بازگشت میں اسے ایک الاؤ سا محسوس ہو رہا تھا اور اس الاؤ میں اس کا سارا وجود جل رہا تھا۔

ناممکن تو نہ تھا سب کچھ۔

اسرار اور بھید تو اول روز سے محسوس ہو رہے تھے۔ مگر وہ اپنے طور پر بند باندھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی مگر سراسر ناکام رہی تھی۔

عفتان علی خان کا جنون، اس کی محبت ایک پھر ہوا اسقدر تھا جو اپنے اندر بہت سے تلاطم رکھتا تھا؟ کے اندر ہزار ہا طغیانیاں تھیں اور ہزار ہا طوفان۔

غلطی اس کی تھی شاید۔ وہ ممکنہ خطرات کو بھانپ کر بھی کوئی مناسب حکمت عملی وضع نہ کر سکی تھی۔

اپنی آنکھوں، اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اس کا انداز کس قدر بے وحشت تھا۔

”ان آنکھوں نے انابیہ شاہ!..... تمہاری ان آنکھوں نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔“ گئے دنوں کی باتوں میں اس طوفان کے شواہد ملتے تھے۔ پھر وہ کیسے نہ سمجھ سکتی تھی؟ کیسے نہیں؟

”میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ ہر شے، جو ناممکن ہے، اسے بھی ممکن کر سکتا ہوں اور۔“

ایسا میں کر کے دکھاؤں گا۔ اور تم دیکھو گی انابیہ شاہ! ایک بے حد بے عزم لہجے کی بازگشت اس کے اندر تھی۔ اس نے قریب رکھا گلہ دان اٹھا کر اس آئینے پر دے مارا تھا جس میں اس کا عکس تھوڑی دیر قبل جھلملا رہا تھا۔

اذہان حسن بخاری نے وعدہ تو کر لیا تھا مگر وہ اس پر عمل درآمد نہیں کر سکا تھا۔ اور ساہیہ خان اسے

مگر اذہان حسن بخاری نے اس کی طرف تب بھی نگاہ نہیں کی تھی۔

”اوہ۔۔۔ مائے گاڈ۔ اذہان! تمہاری چپ مجھے کیوں کسی بات کی صاف چٹلی کھاتی لگ رہی ہے۔ تم مجھے نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی۔ مگر سنو، اگر تمہاری اس چپ کے باعث کہیں کسی جگہ میری ڈار کو کوئی زک پہنچی تو اس کے لئے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے خاموشی سے اسے دیکھا تھا۔

”تمہیں اگر مجھ سے کچھ کہنا ہو تو مجھ سے رابطہ کر لینا۔ اب میں یہاں بالکل نہیں آؤں گی۔“ خفا تھا۔ انداز سے کہہ کر وہ وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی اور اذہان حسن بخاری کے پاس ماسوائے اسے خاموشی سے جا رہے ہوئے دیکھتے رہنے کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔

بہت عرصے بعد وہ جیسے پُرسکون نیند سو گیا تھا۔ صبح کا سورج بیدار ہو کر اس کی کھڑکیوں پر اپنی دستک دے چکا تھا مگر آج عصفان علی خان کا اٹھنے کا کوئی موڈ نہ تھا۔ شاید وہ اور کچھ دیر اسی طرح پڑا رہتا لیکن فون کی مسلسل ہونے والی بیل نے اسے کسی قدر ڈسٹرب کر دیا تھا۔ کسی قدر اکتائے ہوئے انداز میں اس نے کال ریسیو کی تھی۔

”ہیلو۔“ لہجہ نیند کی خماری سے بھرا تھا اور آنکھیں بدستور مُندی ہوئی تھیں۔

”عصفان! لامعحق ازمیر۔۔۔ ویز آریو؟۔۔۔ اور یہ تم نے اپنا سیل کیوں آف کر رکھا ہے؟“

”اوہ۔۔۔ تمہارا راجی آپ۔۔۔“ عصفان علی خان کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ ”کیا خیال ہے آپ کا۔۔۔ بندہ اس وقت کہاں ہو سکتا ہے؟“ لہجہ کی قدر تپا ہوا تھا مگر لامعحق بنا پر واہ کئے ہوئی تھی۔

”جاگے نہیں ہو کیا اب تک؟“

”جاگ چکا ہوں۔۔۔ تم شام میں کیا کر رہی ہو؟“

”کیوں۔۔۔ تمہارا پروگرام مجھے ڈیٹ پر لے جانے کا ہے؟“ لامعحق نے دوسری طرف چہرہ اٹا کر وہ قطعاً مخلوط نہیں ہوا تھا۔

”تم شام میں مجھے شگھر بلا میں ملو۔“ حکم دیا تھا۔

دوسری طرف لامعحق مسکرا دی تھی۔

”خیریت؟۔۔۔ یہ آج اس قدر مہربانی کس لئے؟“

”تم ملو۔۔۔ خود جان جاؤ گی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں نے فون تمہیں اس لئے کیا تھا، وہ پایا کی کوئی اہم ترین فائل تمہارے پاس ہے۔ پلیز تم وہ ان تک ضرور پہنچا دینا۔ اور مینیس فور انوائٹنگ می۔ میں شام میں شگھر بلا پہنچ جاؤں گی۔ مگر دیکھو آج پھر تم کوئی جگہ کا منع مت کر دینا۔ تمہارا کوئی اعتبار بھی نہیں ہے۔“

”یقین رکھو۔۔۔ آج کا شیڈول قطعاً بھی تبدیل نہیں ہوگا۔“ عصفان علی خان کا لہجہ یقین دلاتا ہوا تھا۔

دوسری طرف لامعحق نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ وہ آج عرصہ دراز بعد بہت مسرور سا اٹھا تھا۔

”جیسے کوئی بوجھ ہو لے ہو لے سرک رہا تھا۔ وہ پُرسکون لگ رہا تھا۔ لیوں پر ایک دہمی سی مسکراہٹ بڑھ رہی تھی۔ مگر سائینٹی پر کوئی شوخ سی دھن بجا رہا تھا۔

”جھ لے کر نکلا تھا جب سردار بنگلیں حیدر لغاری کا فون آ گیا تھا۔ اسکرین پر اس کا نام دیکھ کر عصفان علی مسکرایا تھا۔ پھر کال ریسیو کر کے سیل کان سے قریب کر لیا تھا۔

”جو آخر کار آپ کو یاد آگئی ہماری۔ ہمیں تو آپ کا انتظار تھا۔ آپ نہ آئے۔۔۔ سو یہ کال بھی غنیمت لگی۔“ عصفان علی خان نے شکوہ کیا تھا۔

”دوسری طرف سردار بنگلیں حیدر لغاری ہنس دیا تھا۔“ مصروفیت اچانک بڑھ گئی تھی۔ ورنہ تم جانتے ہو، دار بنگلیں حیدر لغاری وعدے کا کس قدر پابند ہے۔“

”میں تو سمجھ رہا تھا شریک سفر کی محبت نے لحوں کو طوالت پر مجبور کر دیا ہے۔“ ایک لطیف سا مذاق کیا ملا اور جواباً سردار بنگلیں حیدر لغاری کا قہقہہ بہت جان دار تھا۔

”ہاں، وہ بھی ہے۔۔۔۔۔۔ مگر کام زیادہ اہم ہے۔“

”شریک سفر کو خوش رکھنا اور اسے وقت دینا بھی تو ایک اہم ترین فریضہ ہے۔ اب تو بھائی کو دیکھنے کا دن دو چند ہو گیا ہے۔ سردار بنگلیں حیدر لغاری کی زندگی میں انقلاب برپا کرنے والی لڑکی معمولی ہرگز نہیں لگتی۔“ مسکراتے ہوئے انکشاف کیا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ دیکھو، اب بھی میں شکاگو میں ان محترمہ کا ہتھ ڈے سیلی بریٹ کرنے میں لگا ہوں۔“ سردار بنگلیں حیدر لغاری مسکرایا تھا۔

”سب کام کاج چھوڑ کر؟“ عصفان علی خان کو شدید ترین حیرت ہوئی تھی۔

”غالباً۔“ سردار بنگلیں حیدر لغاری کا جواب قریباً مثبت تھا۔

”گریٹ۔۔۔“ عصفان علی خان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ”تو آخر کار جگہ جگہ وفاداریاں ملنے والا سردار بنگلیں حیدر لغاری ایک جگہ ٹھہر ہی گیا۔ کیا میں ان عظیم خاتون سے بات کر سکتا ہوں جنہوں نے اتنا بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہے؟“ عصفان علی خان نے خواہش ظاہر کی تھی اور سردار بنگلیں حیدر لغاری ہنستا اٹھا تھا۔

”ویل سیڈ۔ میں اس وقت باہر ہوں، وہ ہوٹل میں ہے۔ آج بھی تمہاری بات اس سے نہیں ہو سکتی۔

ملائی بنا کہاں تک پہنچی؟ کنارے لگ گئی یا اب تک سچ منجھ ہار میں ہی پھنسی ہوئی ہے؟“

”یہ محبت کی ناؤ ہے میرے بھائی! اتنی آسانی سے پار نہیں لگتی۔ ہزاروں طوفانوں کا مقابلہ مردانہ وار کرنا ہے تب بھی یہ ناؤ ڈولتی ہی رہتی ہے۔“ عصفان علی خان نے دردناک لہجے میں کہا تھا اور بنگلیں حیدر لغاری ہنس دیا تھا۔

”اور کس نے کہا تھا محبت کرو؟“

عصفان علی خان کا قہقہہ بہت فطری تھا۔

اگر بنا دیا گیا ہاں سب کچھ جس نہیں ہو گیا۔ آج اس گھر کی اینٹ اینٹ گرتی ہوئی دیکھ رہی ہوں اور مجھے
نہ دکھ ہو رہا ہے۔“ اواز میں ایک کرب تھا اور اذہان حسن بخاری اس لمحے شرمندہ ہو گیا تھا۔ ماں کے گرد
ہا ہا زور پھیلا دیا تھا اور لے کر چلتا ہوا صوفے کی سمت آ گیا تھا۔

”ہی! آنی ایم سوری۔ میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا قطعاً نہ تھا۔ دراصل..... میں واقعی تھک گیا تھا.....
“ وہ بولا تھا جب فارحہ نے تیزی سے اس کا جملہ کاٹا تھا۔

”تھک تو میں بھی گئی ہوں اذہان! مگر میں کس سے کہوں، بتاؤ کس سے؟“ ان کا لہجہ قدرے اداؤں تھا۔
”ہاں جواباً کچھ نہیں بولا تھا۔ فارحہ کی آنکھوں میں نمی بھر آئی تھی۔ چہرے کا رخ پھیرتے ہوئے ان کا لہجہ
پہلکت خوردہ تھا۔

”تھک تو میں بھی گئی ہوں..... یولو..... میں کیا کروں؟..... کہاں جاؤں؟..... میرے لئے تو
بلا جائے پناہ بھی نہیں ہے۔ کوئی دوسری راہ بھی نہیں ہے۔ میں کتنی بے بس ہوں۔ کتنی شکست خوردہ اور
زور ہوں..... کے بتاؤں میں، کے کہوں کہ میں ہار گئی ہوں؟“

مدھم لہجے میں ایک کرب تھا۔ کتنے ہی آنسو، آنکھوں سے ٹوٹ کر بکھرتے چلے گئے تھے۔ اذہان حسن
ماں نے ماں کی طرف دیکھا تھا پھر ہاتھ بڑھا کر ان کی آنکھیں اپنے ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے مدھم لہجے
بولا تھا۔

”پلیز می! میرا مقصد آپ کو تنہا کرنا نہیں تھا۔ نہ ہی میں آپ کو ناخوش کر سکتا ہوں۔ میں آپ سے اجنبی
نہیں ہو سکتا۔ کچھ بھی ممکن نہیں ہے میرے لئے۔“
فارحہ نے بیٹے کو دیکھا تھا۔

”تو پھر مجھ سے بھاگ کیوں رہے ہو؟ اس گھر سے۔ اس گھر کے لوگوں سے؟ کیا میں
لنا جانتی تھی؟ تو کیوں وہ بات مجھے نہیں بتا رہا جو تجھے کاٹ رہی ہے؟ ایسا کیا ہے جو تجھے
بہنچن کر رہا ہے؟ ہمارے درمیان اس روز رشتے کی بات ہوئی تھی نا، تو ٹھیک ہے۔ تمہیں پسند نہیں تو نہ
لا۔ ہم دوبارہ اس پر کبھی بات نہیں کریں گے۔ مگر تو..... تو خود پر کوئی جبر نہ کر..... خود کو کوئی سزا نہ
لا۔“ فارحہ کا لہجہ بلجاہت لئے ہوئے تھا اور اس لمحے اذہان حسن بخاری نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا تھا۔

”نہیں می! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ چاہتی ہیں نا، ساہیہ سے میرا تعلق جڑے۔ تو ٹھیک
ہا، آپ ایسا کر سکتی ہیں۔ مگر پلیز، آئندہ کبھی ان آنسوؤں کو ان آنکھوں سے بہنے مت دیجئے گا۔ آپ کے
پٹکے لئے آپ کے احساسات، جذبات بہت معنی رکھتے ہیں۔“ لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ فارحہ کی قدر حیرت
میں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”اذہان! مجھے بتاؤ، پرابلم کیا ہے؟ تم کیوں مجھ سے بات کرنے میں پس و پیش سے کام لے رہے ہو؟
انہی ماں ہوں میں۔ کیا اپنے دل کی بات تم مجھ سے بھی نہیں کہہ سکتے؟ ساہیہ خان میرے خیال
متمہارے لئے سب سے بہتر لڑکی تھی، تمہارے لئے وہ ایک بہترین شریک سفر ہو سکتی تھی۔ مگر ایسا صرف
مانے سوچا یا پھر تمہارے پاپانے۔ تم چاہو تو اس سوچ کو، اس پسند کو رد بھی کر سکتے ہو۔ مگر اس طرح نہیں

”کسی نے بتایا ہی نہیں تھا میرے دوست! کہ یہ اتنا جان جو کھوں کا کام ہے۔ اب سر پر پڑی۔
جھیلنا آئی جائے گا۔“

”اور نتیجہ کیا رہا؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے دریافت کیا تھا۔
”متیہ تو معلوم نہیں۔ مگر کوششیں سنا ہے کامیاب ہو جاتی ہیں۔“
”تو تم کوششیں کر رہے ہو۔ گڈ، میں تمہاری کامیابی کے لئے دعا کروں گا۔“

”بھابی کا اسی طرح خیال رکھنا۔“ عفتان علی خان مسکرایا تھا۔
”تم سے تو بے فائدہ ہے۔ ہاں، بھابی سے بات کرنا واقعی سود مند ہوگا۔ فارغ ہو جاؤ تو ان سے
بات ضرور کرانا۔ مجھے یقین ہے بہت سی گر کی باتیں ہاتھ لگیں گی۔“ انداز چھیڑنے والا تھا۔ سردار سبکتگین
حیدر لغاری ہنس دیا تھا۔

بہت بے دلی کے ساتھ گاڑی پورچ کرنے کے بعد وہ اندر داخل ہوا تھا۔ انداز بے حد ٹھکن لئے ہوئے
تھا۔ کوٹ اتار کر بائیں کلائی پر دھرا تھا، دائیں ہاتھ سے ٹائی کی ناٹ ڈھسلی کرتے ہوئے قدم اپنے کمرے کے
طرف بڑھا رہا تھا جب فارحہ کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

”آج آنے میں تم نے اتنی دیر کر دی؟“ فارحہ زینے کے آخر پر کھڑی تھیں۔ اذہان حسن بخاری نے مزہ
کر دیکھا تھا، سامنے ماں موجود تھی۔ مگر اس استفسار پر وہ کسی قسم کی کڑسی کا مظاہرہ نہیں کر سکا تھا۔
”کام کچھ زیادہ تھا آج۔“ بولا تھا تو انداز بہت سرد تھا۔

”تھک گئے ہو؟“ بغور دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے کچھ کہے بغیر سر اثبات میں
بلا دیا تھا۔
”اتنے تھک گئے ہو کہ کھانا کھائے بغیر اپنے کمرے میں جا رہے ہو؟“ فارحہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

”وہ..... میں نے کھالیا تھا۔“ لہجے میں اس کی آنکھوں میں ہی نہیں، اس کے لہجے اور آواز میں بھی صاف
چھٹک رہی تھی۔ ”آپ..... آپ نے کھانا کھایا؟“
”اس گھر کا ایک اصول رہا ہے اذہان!۔ جب تک سارے افراد اکٹھے نہ ہو جائیں، کھانا نہیں کھایا
جاتا۔“ فارحہ کا لہجہ سپاٹ تھا جیسے وہ اس سکوت میں چھپے بھید کے معنی سمجھنا چاہ رہی تھیں۔

اذہان حسن بخاری شرمندہ سا دوبارہ اتر آیا تھا اور چلتا ہوا فارحہ کے سامنے آن رکھا تھا۔
”می! آپ.....“

”اذہان!“ اذہان نے بولنا چاہا تھا مگر فارحہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا تھا اور اسے
پڑھکوہ نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی تھیں۔
”مجھے تمہارے رویے میں کوئی بڑی تبدیلی نظر آ رہی ہے اذہان! میں نے یہ گھر بہت مشکل سے بنایا تھا
اور مجھے خود پر بہت فخر محسوس ہوتا تھا کہ میں نے اینٹ اینٹ جوڑ کر محبت کی ایک عمارت تعمیر کی ہے۔ اس
عمارت کے باسیوں میں محبت کا بئیرا میرے ان ہاتھوں سے ہوا تھا۔ یہ گھر میری زندگی بھر کی کمائی تھا۔“

اذہان!۔۔۔ مجھ سے تمہارا یہ اُلجھن سے بھرا وہ برداشت نہیں ہو رہا۔ تم اگر ساہیہ سے صرف اس ہاتھ کھینچنا چاہتے ہو، صرف اور صرف اس لئے دور بٹنا چاہتے ہو کہ ساہیہ خان تمہارے پایا کی بھی پسند۔ یہ جواز بہت چمکانہ ہے اذہان!۔۔۔ صرف اس جواز کو لے کر تمہیں اپنی زندگی بگاڑنے کا حق میں کبھی نہیں دوں گی۔ اور رہی بات یہ کہ تم اس فیصلے سے اس لئے ناخوش ہو کہ اسے تمہارے پایا نے تمہارے لئے پسند اور تم ان سے نفرت کی حد متعین کرتے ہوئے کسی شدت پسندی کا ثبوت دینا چاہتے ہو تو یہ بھی میرے ناقابل قبول ہوگا۔ کیونکہ اذہان! تم میرے بیٹے ہو۔ مگر اپنے ہنزینڈ سے نفرت کی اجازت میں تمہیں تو نہیں دوں گی، نہ ہی مخالفت کرنے کی۔ ان کے اور میرے درمیان کیا ہوتا ہے؟ کیوں ہوتا ہے؟ یہ تمہارا ہاں سر نہیں۔ تم اپنے معاملات میں اس رشتے کی کسی کڑواہٹ کو لانے کی کوشش مت کرو۔ اپنی زندگی کو اپنی ہوا اور عقل سے اور نقصان کے تعین کے ساتھ پرکھنا سیکھو۔ اگر ساہیہ تمہیں پسند ہے اور تم اسے صرف اس کھونا چاہتے ہو کہ وہ تمہارے پایا کی پسند کردہ لڑکی ہے تو یہ سراسر غلط ہوگا۔ اور اگر کوئی اور وجہ بھی ہے تو یہ چاہوں گی تم اسے دل میں رکھنے کی بجائے کہہ دو۔ کیونکہ اُلجھنیں دل میں رکھنے سے اور بھی بڑھتی ہیں، کلم نہیں۔“ فارحہ، بیٹی کی سمت جواب طلب نظروں سے دیکھ رہی تھیں مگر اذہان حسن بخاری کچھ بھی کہنے کے بغیر چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔

”اذہان! ساہیہ خان اتنی اچھی اور پیاری ہے کہ کوئی بھی اسے ٹھکرا نہیں سکتا۔ تمہارے دل میں کیا ہے میں نہیں جانتی۔ مگر ساہیہ جیسی لڑکی میرے بیٹے کی بہترین شریک سفر ہو سکتی ہے۔ ایسا میں سوچتی ہوں۔ اسے رد کرنے والا کوئی احمق ہی ہوگا۔“

اذہان حسن بخاری نے ماں کی طرف دیکھا تھا پھر مسکرا دیا تھا۔

”مئی! مجھے پسند پر کوئی اعتراض نہیں۔“ لبوں پر بہت دھیمی مسکراہٹ تھی۔ فارحہ نے بیٹے کو کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے ماں کے ہاتھ کو ہاتھ میں لیا تھا اور ان کی طرف دیکھے گا تھا۔ ”آپ کو لگتا ہے تو ٹھیک لگتا ہے مئی!“ اس نے عندیہ دیا تھا۔ فارحہ اسے اسی طرح دیکھ رہی تھی جب اذہان حسن بخاری نے اپنا سر فارحہ کے شانے پر دھر دیا تھا۔

”آپ ساہیہ خان کو میری زندگی کا حصہ کر سکتی ہیں۔“ مدہم لہجے میں کہہ کر وہ یکدم اٹھا تھا اور چلا ہوا بیڑھیاں پھلانگ گیا تھا۔

عفتنان علی خان، لامعہ حق کے سامنے بیٹھا تھا اور دونوں کے درمیان خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے نظریں پھیرے بیٹھے تھے۔ لامعہ حق کے چہرے پر ایک بے یقینی کی کیفیت تھی اور آنکھوں میں ایک انجانائی سی ویرانی۔

عفتنان علی خان نے اس کی طرف دیکھا تھا اور مدہم لہجے میں بولا تھا۔

”لامعہ حق! زندگی میں منافقت ہونا اچھا نہیں۔ جو دل میں ہو وہی افعال و اعمال میں بھی ہونا ضروری ہے۔ مجھے کہنے دو لامعہ حق! کہ دلوں کے درمیان فقط محبت کو ربط بن کر رہنا چاہئے، کسی سمجھوتے کو نہیں۔“

یعنی بہت نازک اور پُر پیچ ہوتے ہیں۔ ان پر محبت کی ناؤ تو چل سکتی ہے مگر کوئی سمجھوتہ ٹرین ہرگز نہیں۔ ایسی کوئی راہ دلوں میں نہیں پڑتی جس پر سمجھوتے اپنی راہ بناتے ہوں۔ دل سے دل تک صرف محبت ہی ہے، کوئی سمجھوتہ نہیں۔ مصلحت کے تقاضے دور یا تیش تو مان سکتی ہیں مگر دو دل قطعاً نہیں۔ دل کسی بات کی ٹھیل پر آ بھی جائیں تو بات فقط احساسات کی ہوتی ہے، محبت کی ہوتی ہے۔ محبت اپنے مفادات کے نہیں چلتی۔ مگر محبت سے کم پر قناعت بھی نہیں کر سکتی۔ محبت کی قناعت بھی صرف محبت ہے۔“

لامعہ حق نے اس کی سمت دیکھے بغیر اپنے ہاتھ کی تیسری انگلی سے ٹیش قیمت رنگ نکالی تھی اور ٹھیل پر اسے منے رکھ دی تھی۔

”میں جانتی ہوں عفتنان علی خان!۔۔۔ دلوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ ٹرین نہیں چل سکتی، فقط محبت ہی ہے۔ اور محبت، تمہارے میرے درمیان نہیں۔“ ایک بے جا ہی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ کر ٹوٹی۔ وہ عفتنان علی خان کی طرف دیکھنے سے کھل کر بڑھ کر رہی تھی جیسے وہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ ضبط کے زادوں سے گزر رہی ہے۔

”مجھے تمہاری فیئر اپروچ پسند آئی عفتنان علی خان!۔۔۔ کم از کم تم میں سچ بولنے کی ہمت تو ہے۔ کچھ نہیں تو وہ بھی نہیں ہوتی۔ ساری زندگی دل کے منافی گزار دیتے ہیں۔ عمر بھر منافقت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن احساس جرم تک نہیں ہوتا۔ تمہاری ہمت تو قابل داد ہے۔ کم از کم تم عام مردوں کی طرح نہیں ہو۔۔۔۔۔ شاید یہی مجھے تم اچھے لگتے ہو۔“ آنکھوں کے کناروں کی نمی کو انگلیوں کے پوروں سے پونچھتی ہوئی نائی تھی۔ ”شکر ہے ہم نے ساری زندگی اس دھوکے میں نہیں گزارا۔ بہت سے لوگوں سے ہم پھر بھی ابتر ہیں۔ ہم نے سراسر منظروں کو دیکھتے دیکھتے عمر نہیں گزارا۔“

عفتنان علی خان نے خاموشی سے اسے دیکھا تھا۔ تسلی کا کوئی لفظ اس گھڑی اس کے لبوں پر نہ تھا۔ اس کی لہجہ میں کوئی ملال نہ تھا۔ مگر لامعہ حق کے لئے یہ گھڑی کسی قدر ملال کی تھی۔

عفتنان علی خان! مجھے بہت ملال ہے۔ کیونکہ میں تم جیسے خالص شخص کو کھور ہی ہوں۔ کاش تمہاری محبت کے لئے ہوتی..... میری ہوتی۔“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی مگر اس کی آنکھوں کے کنارے نم تھے۔ ہے، اگر تم دلوں کے مابین سمجھوتے کر لیتے تو ہم دونوں جنتی ہوتے۔“ وہ مسکرائی تھی۔ ”تم مجھے دیکھ کر تے اور میں تمہیں دیکھ کر شکر۔ اور صابر اور شاگردوں جنتی ہیں۔“ وہ مسکرائی تھی۔ مگر عفتنان علی خان نے مسکرائی نہیں سکا تھا۔ شاید اسے لامعہ حق کے دکھ کا احساس تھا اور شاید اسی لئے اس نے اپنا مضبوط لہجہ گھڑی اس کے نازک سے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ مگر لامعہ حق اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی سرٹھی میں لگی تھی۔

”کچھ مت کہنا پلیز۔ کچھ بھی مت کہنا۔ مجھے اس لڑکی سے یقیناً بہت جلیسی محسوس ہوگی۔ اس لئے ناگ بھی نہیں کہہ دو کون ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں وہ جو کوئی بھی ہے، یقیناً بہت لگی ہے۔“ لامعہ حق کراتے ہوئے جتا ہوا اور عفتنان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”مئی تم بھی نہیں ہو لامعہ حق!“

”ہاں۔۔۔ مگر اس سے اچھی ہرگز نہیں۔“ وہ جانے کیوں اس لمحے کو بہت لائٹ لینا چاہ رہی تھی۔
کے لبوں کی مسکراہٹ دیکھ کر عفتان علی خان چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر اس سے اچھی ہرگز نہیں۔“ وہ جانے کیوں اس لمحے کو بہت لائٹ لینا چاہ رہی تھی۔
کے لبوں کی مسکراہٹ دیکھ کر عفتان علی خان چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔

”لامع حق! دل کے کھیل بہت عجب ہیں۔ اس میں پیدل مات ہوتی ہے۔ مجھے اپنی جیت کا کوئی امکان
نہیں ہے مگر میں یہ رسک لے رہا ہوں۔ کیونکہ محبت میرے ساتھ ہے اور مجھے دلاسہ دے رہی ہے کہ وہ
دل اس دل کی ضرور سنے گا۔ وہ مجھے ملتی ہے یا نہیں، یہ میں نہیں جانتا۔ مگر وہ نہیں تو کوئی اور بھی نہیں۔ بس
وہ منافقت والی زندگی کبھی نہیں گزاروں گا۔ وہ ہوگی تو اس کے ساتھ جیوں گا۔ وہ نہیں بھی ہوگی تو زندگی
کے لئے ہوگی۔۔۔ شہ یا مات۔“

اذہان حسن بخاری جانتا تھا، اس کی رضامندی کے بعد می در نہیں کریں گی۔ وہ پہلی فرصت میں
اڈل لے کر ساہیہ خان کے گھر ہوں گی اور یقیناً ایسا ہی ہوا تھا۔

ساہیہ خان کا فون آیا تھا۔ خاصی علی کئی سنار ہی تھی مگر وہ مسکرا رہا تھا۔
”تمہاری ہمت کیسے ہوئی اذہان بخاری! یہ سب کرنے کی؟“

”کیا مطلب ہے تمہارا، ہمت کیسے ہوئی؟ بھئی جی دار بندے ہیں۔ ہر کام ڈنکے کی چوٹ پر
تے ہیں۔“ وہ مسکرا رہا تھا مگر آنکھوں میں ایک عجب ویرانی کا تاثر تھا۔ اس کا لہجہ بھی اس بات کی چھٹی
ن لکھا رہا تھا۔

”اذہان! ایشٹ اپ۔ تم جانتے ہو یہ سب جو ہو رہا ہے ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ عجب شش و پنج میں تھی۔
”کیا ٹھیک نہیں ہے؟“ اسے چھیڑنے کا قصد کیا تھا مگر وہ ڈپٹے لگی تھی۔

”کیا ٹھیک نہیں ہے۔“ باقاعدہ اس کی نقل اتاری گئی تھی۔ ”اتنے ہی تو بچے ہونا تم..... دیکھ نہیں رہے
کتنے اہم کام سرانجام دینے جا رہی ہوں میں۔ برنس اشارٹ کرنا بچوں کا کھیل تو نہیں ہوتا۔ اور تم.....“
بہ لوکلہاٹ میں بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”بچوں کا کھیل نہیں۔ یہی بات تو تمہیں سمجھنا ہے ساہیہ خان! ایک پرفیکٹ برنس ٹائیکون کی
ف کے لئے برنس کرنا زیادہ آسان رہے گا۔ وہاٹ ڈو تو تھنک؟“ مسکراتے ہوئے چھیڑا تھا اور وہ شیشا
دھ لگی تھی۔

”اذہان! آر یومیڈ؟۔۔۔ واپس لو اپنا پرو پوزل۔“
”سوری سوئی! تم اپنے پیرٹنس سے خود بات کرو یا پھر خود ہمت ہے تو انکار کرو۔“ اذہان حسن بخاری
لکھا تھا۔

”میں..... میں انکار کروں؟ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے تمہارا؟“ وہ جل کر بولی تھی۔
اذہان حسن بخاری ہنس دیا تھا۔

”زبردستی کوئی نہیں ہے۔ میں تو خود سے تڑوا رہا ہوں، تم سے زیادہ مظلوم ہوں۔ میں۔ تمہیں تو پھر بھی
لا پسند ہوں۔ مگر اس طرف تو ایسے بھی کوئی شواہد نہیں دستیاب۔“
”پھر تو تمہارے لئے انکار کرنا زیادہ آسان ہوگا۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”نہیں۔۔۔ میں کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں۔ کسی کام نہیں آئی۔ تم ٹرائی کرو۔۔۔ شاید کامیاب
ہو۔“

اس کا لہجہ مضبوط تھا۔ پر عزم تھا۔ اور لامع حق مسکرا دی تھی۔

”ایک بات بتاؤ گے؟۔۔۔ اس نے تمہارے اندر جگہ مجھ سے پہلے بنائی تھی یا میرے بعد؟“ بظاہر
لب مسکرا رہے تھے مگر ان آنکھوں میں اس لمحے ایک اُداسی تھی اور لہجے میں ایک حسرت۔

عفتان علی خان نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔
”کیا فرق پڑتا ہے۔ مدت کتنی کثیر ہے یا کتنی قلیل، وہ میرے اندر ہے اور پل پل ہے۔ میں لحو لحو
سوچتا ہوں۔ وہ قدم قدم میرے ساتھ چلتی ہے، اہم صرف یہ ہے۔ کب سے ہے، یہ نہیں۔“

”تمہاری دیوانگی اس پر منکشف ہے؟“ عجب سوال تھا اور عفتان علی خان کے لبوں پر ایک پُر مرمز
مسکراہٹ نے دم توڑا تھا۔
”نہیں۔“

لامع حق نے اسے شدید ترین حیرت سے دیکھا تھا۔ تبھی وہ بولا تھا۔

”اہل مقصد یہ نہیں کہ وہ مجھے چاہتی ہے یا نہیں۔ میں اسے چاہتا ہوں، اصل بات یہ ہے۔ محبت
جو اب محبت سے آئے یہ ضروری نہیں۔“

لامع حق مسکرا دی تھی۔ لہجے میں حیرت بے حد نمایاں تھی۔

”اور تم یہ جو اس کے لئے ٹھیل رہے ہو؟“ جانے کیا جتنا چاہا تھا اسے۔ شاید کسی اندیشے کی طرف توجہ
مبذول کرانا چاہتی تھی وہ۔ مگر عفتان علی خان ایک عزم سے مسکرا دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ کیونکہ محبت کو شہ اور مات سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔“ چہرے پر حد درجہ سکون تھا۔ جیسے
اپنے فیصلے سے مطمئن تھا۔

”اگر وہ لڑکی میرے سامنے ہوتی تو شاید میں اسے قتل کر چکی ہوتی۔“ لامع نے مسکراتے ہوئے
انکشاف کیا تھا۔ وہ چونکا تھا۔

”حسد کی وجہ سے؟“ وہ حیران ہوا تھا۔

لامع حق نے سر اثبات میں بلایا تھا اور وہ مسکرا دیا تھا۔

”اودہ مانے گا۔۔۔ اتنی انتہا پسندی اچھی نہیں ہوتی۔ اس شدت پسندی کو کسی اور کے لئے سنبھال
رکھو۔ کیونکہ زندگی میں کوئی ایک ایسا ضرور ہوتا ہے جس کے لئے ایک زندگی ناکافی لگتی ہے۔ اور مجھے یقیناً

جاؤ۔ فائدہ تو دونوں کا برابر ہوگا۔“ وہ قطعاً سنجیدہ نظر نہ آ رہا تھا۔

”اذہان!“ اس نے ٹوکا تھا مگر وہ ہنستا چلا گیا تھا۔ ”سچ بتاؤ نا۔“ اصرار ہوا تھا۔
”کیا؟“

”یہ سب، یہ تعلق، یہ رشتہ تمہاری مرضی اس میں شامل ہے کہ نہیں؟“

”یہ بات تو مجھے تم سے پوچھنی چاہئے۔ یہ خاصا لڑکوں والا جملہ ہے۔ تمہیں تو مشرقی لڑکی کی ہا گھونگھٹ میں منہ چھپا کر صرف شرمانا چاہئے۔“ چھیڑا تھا۔ مگر دوسری طرف ساہیہ خان مسکرائی نہیں تھی۔
”اذہان حسن بخاری! تم میرے سامنے نہیں ہو۔ میں دیکھ بھی نہیں رہی ہوں۔ مگر مجھے جانے کیوں رہا ہے جیسے.....“

”جیسے.....؟“ وہ چونکا تھا۔

”تم سوچ لو اذہان حسن بخاری! مجھے لگتا ہے یہ سب بہت جلدی ہے۔ ابھی یہ عمر ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی نہیں ہے۔ اور ابھی ہم ایک دوسرے کو بھی اچھی طرح سے نہیں جانتے ہیں۔ ہمیں ایک اچھی زندگی گزارنے کے لئے اچھی انڈر اسٹینڈنگ کی ضرورت ہوگی اور یہ فی الفور نہیں ہوگی۔ وقت درکار ہوگا اس لئے۔ ہم اس دور میں یقیناً نہیں ہیں اذہان حسن بخاری! جہاں زندگی تجربات کی نذر کر دی جاتی تھی۔“ سنجیدہ تھی۔ مگر اذہان حسن بخاری جو اب کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

”ہیلو۔۔۔ تم مجھے سن رہے ہونگا؟“

”ہاں۔“ وہ جیسے بیدار ہوا تھا۔ ”لسن ساہیہ! ہم بعد میں بات کرتے ہیں۔ اس وقت مصروف ہوں۔“
”اوکے۔“ ساہیہ خان نے دوسری طرف فون رکھ دیا تھا۔

اذہان حسن بخاری نے سر چیڑی پشت سے نکا دیا تھا اور ایک وحشت سے چھت کی سمت تکتے لگا تھا۔

ساتھ رہنے اور ساتھ ہونے میں واضح فرق ہوتا ہے۔ اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ جس شخص کے ساتھ زندگی درحقیقت اس کے ساتھ تھی بھی یا کہ نہیں۔

وہ قدم قدم اس کے ساتھ تھا۔ اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ اس کی پسند ناپسند کو اہم جان رہا تھا۔ اس کی زندگی کے اہم ترین دنوں کو سیلی بریٹ کر رہا تھا۔ مگر یہ سب دل سے بھی تھا، وہ نہیں جانتی تھی۔ مگر وہ اب کچھ سمجھنے کی بات کہ معاملہ زندگی بھر کا تھا اور اریج میر جزیوں تو ہوتا ہی ہے، سمجھو تو کرنا ہی ہے سو وہ بھی اس انڈر اسٹوڈ کپیر و ماٹز کو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ تم پریشان نظر آ رہی ہو؟“ اس کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں دکھ کر سردار سبکد

حیدر لغاری نے دریافت کیا تھا اور میرب سیال سرفٹی میں ہلاتی ہوئی ایک مروت سے مسکرا دی تھی اور سردار سبکدین حیدر لغاری اس کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا تھا۔

”اپنے اس چہرے کو، اپنی ان آنکھوں کو مروت کی نذر مت کیا کرو۔ کئی رنگ بچھنے لگتے ہیں۔“ مسکرائے
لوں سے ایک انکشاف کیا تھا جو کہ میرب سال کے لئے کسی قدر چونکانے کا باعث بنا تھا اور سردار سبکدین

پارٹی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا تھا۔

”میں نہیں ہو رہا؟“ مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

میرب سیال نے سرانکار میں ہلاتے ہوئے چہرے کا رخ پھیر لیا تھا۔

”کیا ہم باہر جا سکتے ہیں؟“ اس کی خواہش اس سرد موسم میں یقیناً عجیب تھی تھی تو گرم گرم کافی کے سپ سے سردار سبکدین حیدر لغاری نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔

”یہاں کیا اچھا نہیں لگ رہا؟“

”سوال سن کر وہ خاصی بد مزہ ہوئی تھی۔ تبھی ہال میں یہاں سے وہاں نگاہ دوڑانے لگی تھی۔

یہ ناممکن نہیں ہے۔ مگر باہر موسم خاصا ٹھنڈا ہے اور بارش بھی ہو رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہہیں تم بہار نہ پڑا اس کے خدشے کی نشاندہی کے باوجود وہ ضدی بچوں کی طرح خفا سی چہرے کا رخ پھیرے بیٹھی رہی
بھی وہ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

اوکے، اٹھو۔“ اس کی خواہش اس کے لئے مقدم تھی یا نہیں، وہ نہیں جانتی تھی مگر اس گھڑی وہ فوری طور
پر تھی۔ شاید کسی قدر حیرت تھی اس شخص کے اقدام پر۔ وہ اسی طرح بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی جب
سین حیدر لغاری نے اس کا نازک ہاتھ پکڑ کر یکدم اسے کھینچ لیا تھا۔ وہ لمحہ بھر کو لڑکھائی تھی مگر ایک
صدارت سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ خوشبو کا ایک ڈفریب احساس ہوا تھا۔ وہ دوسرے ہی لمحے
لی اور اس کی سمت دیکھے بغیر چلنے لگی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اسے دیکھا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

واقعی ٹھنڈ بہت زیادہ تھی اور اس پر مستزاد بارش..... اس کی ضد نے سردار سبکدین حیدر لغاری کو رین
پلنے کی بھی اجازت نہیں دی تھی۔

”م نے رین کوٹ بھی لینے نہیں دیا۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے شکوہ کیا تھا۔

”سے کیا ہوتا؟“ وہ اس لمحے اس کی ایک بھی سننے کو تیار نہ تھی۔

اس میں اپنے خواب رکھتے۔ اس کی پائلٹس میں ان بھیکے بھیکے لمحوں کی حدت کو، شدت کو کہیں چھپا
یا پھر رکھ کر بھول جاتے اور گرم پرتمازت موسموں میں پہروں ان میں سے وہ پل نکال کر محظوظ
ر مسکراتے رہتے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”ماڈرن زور و مانگ نا.....؟“ اس کی رائے چاہی تھی۔ اس شخص کی آنکھوں میں اس لمحے شرارت تھی
دم ہی اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ بھیکے موسم کی خوشبو سے ساری
عطر تھیں۔ اور میرب سیال اس خوشبو کو اپنے اندر بھر لینے کا قصد کر رہی تھی۔

ان سے بڑے موتیوں کے کئی قطرہوں کو وہ اپنی تھیلیوں پر جمع کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر مسلسل ناکام
بار سبکدین حیدر لغاری نے اس کی اس خواہش کو دیکھا تھا اور پھر ملتے ہوئے اس کے قریب آن رکھا تھا۔
طہا تھا اس کے ہاتھوں کے گرد دائرہ بناتے ہوئے اسے ایک نظر بطور خاص دیکھا تھا اور مسکرا دیا تھا۔
ڈبل کر خواب جمع کریں۔“ مختصر جملہ بہت کچھ باور کرانے اور واضح کر دینے کو کافی تھا۔ میرب
اس شخص کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

ن اوقات صورت حال اتنی تیزی سے بدلتی ہے کہ فوری طور پر کوئی سدباب نہیں ہو پاتا۔
ہی اپنے ہی اندر سے نبرد آزما ہونے میں لگی ہوئی تھی کہ وقت اسے اور بھی آزمائش میں ڈال گیا تھا۔
حق اس کے سامنے تھی اور انا بیہ شاہ اسے خالی خالی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ اس کے کچھ
بکھر تھی۔ مگر لامع حق کچھ نہیں بولی تھی۔ چپ چاپ اس کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا تھا اور اس کے
مہرگم لاوا اس کے شانے کو جلانے لگا تھا۔

انا بیہ شاہ ساکت سی بیٹھی اس لمحے کے فوری سدباب کے متعلق سوچنے لگی تھی۔ غبار تو اس کے اندر
روہ کہاں جاتی؟ کس سے کہتی؟

پہاں! ہارنگی۔ ہارنگی میں۔ سب کچھ۔ اس کے شانے پر آنسو بہاتے ہوئے لامع حق
مئی اور اس کے اندر کئی طوفان سر اٹھانے لگے تھے۔ صورت حال کا اندازہ اسے نہیں تھا مگر وہ اخذ
تھی کہ شاید عفتان علی خان نے اس کے متعلق مطلع کر دیا ہے یا پھر اسے کہیں اور سے.....

بیہ! آئی ہیٹ ڈیٹ گرل..... آئی ہیٹ ہر انا بیہ!..... وہ جو کوئی بھی ہے اس کے باعث میں
لے میں رہی ہوں۔ وہ مجھ سے سب کچھ چھین چکی ہے۔ کچھ نہیں چھوڑا اس نے میرے پاس.....
لے لیا اس نے۔ لامع حق کسی کے متعلق کہہ رہی تھی اور اس انکشاف پر وہ اسے ساکت بیٹھی دیکھ
اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ اس سے پوچھ سکتی کہ مدعا کیا ہے۔

یہ اس نے مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اسے قتل کر
لی۔ آئی کل ہر۔ آج جو کچھ بھی ہوا ہے، صرف اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ ساری ہار
ہوئی ہے۔“

نا؟ کس کی بات کر رہی ہو تم؟“ انا بیہ شاہ نے اپنے اندر کی تمام ہمتیں جمع کرتے ہوئے
تھا۔

جو اس کے دل میں ہے۔ جو اس کے اندر ہے اور اُسے مجھ سے ڈور کر رہی ہے۔ لامع حق بہت
ارہی تھی۔ اس کا لہجہ مدہم تھا مگر اس کے اندر کا سارا کرب اس کے لہجے میں تھا۔

فتا ہے بہت حوصلہ ہے مجھ میں، جھیل سکتی ہوں میں سب کچھ بہت آرام سے۔ مگر ایسا نہیں
ہا۔ میں بہت کمزور لڑکی ہوں۔ بے حد کمزور۔ اُس کے سامنے میں جھپٹ کے
رہی۔ مگر میرا سارا اندر طوفانوں کی زد پر رہا۔ اور اُسے اس بات کا احساس تک نہیں
تفاخو غرض ہے وہ۔ یہ ساری دنیا اتنی خود غرض کیوں ہوتی ہے انا بیہ شاہ؟ اور میں
میں ہوں نا۔ ہم سب خود غرض کیوں ہوتے ہیں؟“ وہ اسے شانوں سے تھامے پوچھ رہی تھی۔
اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے فقط اسے دیکھ رہی تھی۔

شاہ! تم..... تم تو ایسی نہیں ہو۔ تم تو کسی کی خوشی کے لئے اپنا سب کچھ بھی دان کر
معوق اس کا شانہ بھیکتی ہوئی مسکرائی تھی۔ ”تم سے تو کوئی تمہاری جان بھی مانگے تو تم ہنسی خوش
تھی کر لسی ہے تم میں..... مگر سب..... سب ایسے نہیں ہوتے انا بیہ شاہ! ساری دنیا ایسی نہیں

”کیا دکھائی دے رہا ہے؟“ مسکراتے ہوئے اپنی آنکھوں کی بابت دریافت کیا تھا۔ میرب سیا
ہی چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”اس موسم میں لوگ ہمیں بھیگتا دیکھیں گے تو دیوانہ ہو جائیں گے۔ انہیں شاید خبر نہیں، محبت
والوں سے سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

میرب سیال نے یکدم ہی اپنے ہاتھ بھینچ لئے تھے۔ اس روز کی قربت کے بعد اس کی جھجک کچھا
بڑھ گئی تھی۔ حالانکہ سردار سبکگین حیدر لغاری کا انداز بہت پروٹیکٹیو ہوتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ اس
سے دور بھاگتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس سے خوفزدہ تھی، ایسا بالکل نہیں تھا۔ خوفزدہ وہ اپنی دھڑکنور
تلاطم برہوتی تھی۔

”تمہیں یہ سب کیسا لگتا ہے میرب؟“ اس کی طرف بغور توجہ سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا اور
تعرض مسکرا دی تھی۔

”یہ محبت، یہ کیمر، یہ پروٹیکشن کے بری لگ سکتی ہے؟“ اور اس کے جواب نے سردار سبکگین حیدر
کو حیران کر دیا تھا۔ وہ اس کی طرف سے یقیناً کسی ایسے جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ آسمان سے برسی
ان بوندوں میں بھیگتے ہوئے اس کے چہرے کو وہ بخوردیکھ رہا تھا۔

”سو۔۔۔ وہاٹ گرل وانٹ ریلی؟“ سوال ہوا تھا اور میرب سیال نگاہ جھکا گئی تھی۔

”جسٹ لو اینڈ پروٹیکشن۔“ مختصر جواب نے سردار سبکگین حیدر لغاری کو بہت محظوظ کیا تھا۔ تیز ہو
جسم سے آر پار ہو رہی تھیں۔ برستی بارش اس خشکی کو اور بھی بڑھا رہی تھی۔ مگر میرب سیال بے پرواہ ہی
کر ان برستی بوندوں سے چہرے کو تروتازہ کرنے لگی تھی۔ ٹھنڈ کی شدت انتہا پر تھی مگر وہ عجب بے خودی
اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔

”میرب۔۔۔!“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے اسے مدہم لہجے میں پکارا تھا مگر وہ اتنی گن تھی کہ
نہیں تھی۔

”میرب!“ اسے شانے سے تھام کر یکدم ہی اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا۔ میرب سیال اس اچانک انداز
بھونچکا رہ گئی تھی۔ اپنے وجود کو حد توں میں پا کر نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ عجب ایک تشویش نظروں
لئے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آر یو آل رائٹ؟“

”ہوں۔“ میرب سیال نے سر اثبات میں ہلانے کے ساتھ ہی اس پر حدت گرفت سے خود کو علیحدہ
تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے اپنا اوور کوٹ اتار کر ایک لمحے میں اس کے شانوں پر ڈال دیا تھا۔

”چلیں؟“ اجازت طلب نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

”ہاں۔“ میرب سیال نے اس کی سمت سے نگاہ ہٹائی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری اسے لے کر
بڑھنے لگا تھا۔

ہے۔ ایسا کیوں ہے انا بیہ شاہ؟“ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی اور انا بیہ شاہ نے اہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ کب کار کا ہوا غبار پلکوں کے کنارے توڑ کر یکدم باہر نکلا تھا اور اس کا بھینکا چلا گیا تھا۔ انداز میں عجب ایک بے بسی تھی۔ اس کی بیسٹ فرینڈ مشکل میں تھی۔

”معاملہ کیا ہے لامع حق؟“ کیا ہوا ہے تمہیں؟“ اس کی طرف توجہ سے دیکھتے ہوئے دم میں دریافت کیا تھا اور لامع حق ہنس دی تھی۔ عجب ایک باگل پن اس کے انداز میں دکھائی دے رہا انا بیہ شاہ اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی جب وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”انا بیہ شاہ! اُس نے مجھے چھوڑ دیا کسی اور کے لئے۔“ مدہم لہجے میں کیا گیا انکشاف کسی قیامت نہ تھا۔ انا بیہ شاہ اسے ساکت سی دیکھ رہی تھی جب لامع حق نے اس کے سامنے اپنا خالی ہاتھ کر دیا تھا اور ایک پاگل پن سے مسکراتی ہوئی بولی تھی۔

”دیکھو، خالی ہے اب یہ ہاتھ۔ کچھ نہیں ہے اس میں۔ یہ انگلی بھی خالی ہے اب۔ میں نے عفتنا خان کو اُس کے رنگ کے ساتھ ہر رشتہ بھی ٹوٹا دیا ہے۔ اور اب عالم یہ ہے کہ میں بالکل تنہا رہ گئی ہوں۔ دم اکیلی۔“ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی اور انا بیہ شاہ اتنی خالی تھی کہ اسے تسلی دینے کو اس کے دو لفظ بھی نہ تھے۔ ہمتیں انتہائی پست تھیں۔ وہ اپنے آپ کو بہت شکست خوردہ محسوس کر رہی تھی۔ بہت تھکی ہوئی۔

لامع حق کے آنسو اسے اپنے آنسو لگ رہے تھے اور اس کی ہار اپنی ہار۔ مگر اس بات کو جتانے کو اسے پاس کوئی لفظ نہ تھے، فقط آنسو تھے جو خاموشی سے رخساروں کو بھگور رہے تھے۔

”جب کوئی آپ پر کسی اور کو قوت دیتا ہے تو قطعاً اچھا نہیں لگتا۔ روح اندر سے کٹنے لگتی ہے۔ عجب احساس کرب اندر جاگتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس لمحے بہت بے بسی محسوس ہوتی ہے۔“ لامع حق نے عجب انکشافات کر رہی تھی۔ ”کتنی عجیب بات ہے نا..... اُس نے لامع حق کو اپنی زندگی سے کیا، کسی اور کے لئے، کسی اور کی محبت کے لئے۔ شی مسٹ بی اے لکی گرل..... آئی ایچ آر شی ایٹ ہر بٹ آئی کانٹ لائیک ہر۔ مجھے اس سے شدید ترین جلن محسوس ہو رہی ہے انا بیہ شاہ!..... شاید حد۔ اس میں ایسا کیا ہوگا جو لامع حق میں نہیں؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہو سکتی ہے؟ زیادہ دلکش ہو سکتی ہے؟ کیا..... کیا خاص بات ہوگی اس میں؟“

بھیگتی آنکھوں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی مگر اس کے کسی سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ لامع حق یکدم مسکرائی تھی، پھر ہنس دی تھی۔ انداز عجب دیوانگی لئے ہوئے تھا۔

”میں تو بھول ہی گئی۔ شاید وہ پوری کی پوری ہی بہت خاص ہوگی۔ یا پھر عفتنا علی خان کی جہاں سے خاص بنا دیا ہوگا۔“ وہ ایک پکٹ کر رہی تھی۔ انا بیہ شاہ نے اُسے تھاما تھا اور اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور آنکھوں سے آنسو اور بھی تو اتار سے بہنے لگے تھے۔

”انا بیہ شاہ! مجھے نفرت عفتنا علی خان سے کرنی چاہئے یا اس لڑکی سے؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ قصہ روز زیادہ کوان، سرور مجھے خالی کرنے میں، کس کا زیادہ ہاتھ ہے۔ اس لڑکی کا جسے عفتنا علی خان

عفتنا علی خان کا جو باوجود میری توجہ کے، محبت کے، میرا وفادار نہ رہ سکا۔ کسی کی ایک نگاہ سے مار کر اس کے شانے پر سے سر اٹھاتے ہوئے وہ مسکرائی تھی اور ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑتے ہوئے

اب وجود کوشش کے میں عفتنا علی خان سے نفرت نہیں کر سکتی۔ اس کا کوئی اقدام مجھے برا نہیں لگتا۔ اب اقدام قتل ہی کیوں نہ ہو۔ کچھ بھی ہو، بندہ جی دار ہے۔ ہمت ہے اس میں۔ بہت سے لوگوں میں تو ابید ہوتی ہے۔ عفتنا علی خان کی صاف گوئی مجھے اچھی لگی۔ میرے دل میں گھر کر گئی۔ اُس نے کہا۔ دلوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ ٹرین ہرگز نہیں چلائی جاسکتی۔ دلوں کے مابین راستے اتنے پُر نیچا ہیں کہ کسی ناؤ ہی چل سکتی ہے یا پھر محبت..... جو دل سے دل کو باہم پیوست کرتی ہے، جوڑتی ہے اور..... ایسی کوئی محبت کا حوالہ ہم دونوں کے بیچ نہ تھا۔“ وہ اپنی ہاتھ کی لکیروں کو بغور دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

اچھا ہی ہوا اس نے مجھے دھوکا میں نہیں رکھا۔ سب کچھ بتا دیا، ابھی تو وقت اور حالات ہمارے بس میں پیہات اگر کل مجھے معلوم ہوتی تو شاید میں توجی ہی نہ پاتی۔ مار دیتی، خود کو، عفتنا علی خان کو یا پھر اس کا اچھا ہی ہوا عفتنا علی خان نے دیگر مردوں کی طرح مجھے دھوکا نہیں دیا۔ وہ سچ کا قائل ہے، اس کا ہے، منافق نہیں ہے وہ۔ اور سب سے بڑھ کر بہت چاہنے والا ہے۔ بے حد، بے حساب۔ مگر میرا ہے، بس یہی بات بہت بری ہے۔“

انا بیہ شاہ جواب تک اسے ساکت سی بیٹھی دیکھ رہی تھی، اس لمحے بہت آہستگی سے چہرے کا رخ پھیرا اور بہت مدہم لہجے میں بولی تھی۔

”تم جانتی ہو وہ کون ہے؟“

نکل۔ اور میں اسے جانتا بھی نہیں جانتی۔ ایسا کرنے سے میری نفرت، میرا حسد اس کے لئے لگے گا۔ کیونکہ وہ مجھے احساس دلاتی ہے کہ میں شکست خوردہ ہوں..... ری جیکلڈ ہوں..... کسی کی سے اس کے باعث خارج ہوں۔ اور میں جانتی ہوں اس کے متعلق اگرچہ میرا تجسس بہت زیادہ ہے ہے جانتا میرے لئے اسی قدر تکلیف دہ ہوگا اور میں اپنی تکلیف کو یقیناً بڑھانا نہیں چاہوں گی۔ اور اس لڑکی کا پڑتا ہے، کوئی بھی ہو، وہ، میں تو نہیں ہوں نا۔“ اور انا بیہ شاہ اس سے نظر ملانے بغیر نہ رہ سکی لال کے اندر کتنے طوفان سر اٹھا رہے تھے۔ کتنے جھک چل رہے تھے۔ لامع حق کہہ رہی تھی۔

جاتی ہو، عفتنا علی خان کو یہ بھی علم نہیں کہ وہ اسے چاہتی بھی ہے کہ نہیں۔ مگر اس کے باوجود اس نے کھکھداؤ پر لگا دیا ہے۔ شی مسٹ بی اے لکی گرل نا..... عفتنا کہہ رہا تھا اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ لگے ہے کہ نہیں، میں اسے چاہتا ہوں، یہ بات اہم ہے۔ میں اس کے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔ وہ نہیں تو لگتی نہیں، اس کے ساتھ جیوں گا، اس کے لئے جیوں گا۔ وہ نہیں بھی ہوگی تو زندگی اسی کے لئے ہو

انصافت والی زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔ اسٹریج نا..... دنیا کے ٹانگی نائن پرسنٹ مردوں سے مختلف ہونے والوں آن رہنے کی بجائے نئی تاریخ رقم کرنا چاہ رہا ہے۔“

انا بیہ شاہ کے لئے یہ سارے انکشافات قیامت سے کم نہ تھے۔ کسی کی شدتوں کی کہانی وہ چپ چاپ رہی تھی اور اس میں ہمت ناپید تھی یہ بتانے کی کہ وہ لڑکی جس سے لامع حق نفرت کرنا چاہتی ہے اور جس متعلق متوجس ہے وہ کوئی اور نہیں، انا بیہ شاہ ہے۔ اس کی اپنی بیسٹ فرینڈ۔ وہ اپنے اندر کے طوفان اور سامنا چپ چاپ کر رہی تھی جب لامع حق پر افسوس لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

”دیکھا جائے تو عرفان علی خان خاصا قابل ترس ہے۔ مجھ میں اور اس میں کوئی فرق نہیں۔ میں یکطرفہ محبت کے عذاب میں مبتلا رہی اور وہ بھی اسی یکطرفہ راہ پر گامزن ہے بے چارا..... قابل ترس۔ میرے لئے کیونکہ مجھ پر اس یکطرفہ محبت کا عذاب منکشف ہے۔ انا بیہ شاہ! ہر محبت کا جواب محبت کیوں ہو سکتا؟ کیوں ہم اپنی بے پناہ محبت سے کسی دل کو اپنے آہنگ سے نہیں دھڑکا پاتے؟..... کیوں ہم تنہا رہتے ہیں اور باوجود شدت سے چاہنے کے کوئی دوسرا قدم ہمارے ساتھ نہیں اٹھتا۔ کوئی ہاتھ، ہاتھ میں ہوتا؟“

لامع حق کی نظروں میں کتنے سوال تھے۔ مگر ان میں سے کسی کا جواب بھی انا بیہ شاہ کے پاس نہ تھا فقط اسے خالی خالی آنکھوں سے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

ساہیہ خان اس شام شگھر ملا میں اس کے ساتھ تھی اور اسے کسی قدر الجھن سے دیکھ رہی تھی۔ اذہان بخاری نے اس کے چہرے کو دیکھا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

”بات کیا ہے ساہیہ خان؟“

ساہیہ خان نے اس کے چہرے پر سے اپنی نگاہیں ہٹائی تھیں اور ایک اکتائی ہوئی سانس خارج کر ہوئے انتہائی الجھن سے پیشانی پر ہاتھ دھرا تھا اور اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”اذہان! تم تو یوں لاتعلقی ہو رہے ہو جیسے تمہارا اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔“ ساہیہ خان حیران تھی۔ اذہان بخاری مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا تھا۔

”چاہتی کیا ہو تم؟..... بیٹھے بٹھائے اتنا پنڈت کم لڑکا تمہیں مل رہا ہے۔ اور کیا چاہئے؟ غالباً تمہارا دل کی مراد بر آئی ہوگی۔“ بات کو مذاق میں اڑانا چاہتا تھا اور ساہیہ خان کسی قدر حیرت سے اسے دیکھتی تھی۔

”تم اذہان حسن بخاری! وہ مسکرائی تھی۔“ تم تو مجھے مفت ملو تب بھی نہ لوں۔ منہ دھو رکھو، دل کی مراد آئی ہے۔“ باقاعدہ اس کی نقل اتاری تھی۔

اذہان حسن بخاری کا تہہ بہ بہت فطری تھا۔

”پراہلم کیا ہے تمہارے ساتھ؟“

”پراہلم؟..... پراہلم تم ہو اذہان حسن بخاری!“ ساہیہ خان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اذہان حسن بخاری کی قدر جو نکلتا تھا، پھر مسکراتے لب پہنچ کر نگاہ کا زاویہ بدل گیا تھا۔

”میں؟“ لہجے میں کسی قدر حیرت تھی۔

ان تم اذہان حسن بخاری!..... تم..... مجھے تمہارے انداز میں عجب طرح کی ایک الجھن نظر آ رہی تھی۔ تمہیں تنگ کر رہی ہے۔ تم پریشان ہو اور ایسا میں اب سے نہیں پچھلے کئی دنوں کی کر رہی ہوں۔“ ساہیہ خان کا لہجہ پریلین تھا اور اذہان حسن بخاری اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا

اب کچھ نہیں ہے۔“ اذہان حسن بخاری نے باور کرانا ضرور نہ خیال کیا تھا۔ ”ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ اذہان قاضی؟“ ساہیہ خان نے اسے بھرپور اعتماد سے دیکھا تھا۔ ”اگر ایسا ہے تو پھر مجھے تمہاری نظروں کی دیکھائی کیوں نہیں دے رہا؟ کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ تم فرار کے راستے تلاش کر رہے ہو؟ بظاہر تو بے سامنے ہو مگر تمہاری آنکھیں مجھ سے کتر رہی ہیں۔ شاید کچھ کہنا چاہ رہے ہو مگر کہہ نہیں پا رہے چوکتی ہوں وہ کیا بات ہے؟“ ساہیہ خان اسے ہمیشہ حیران کر جایا کرتی تھی اور اب بھی وہ کسی قدر سے اسے دیکھ رہا تھا مگر یہ حیرت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی تھی اور اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”کی ٹھیک کہتی ہیں۔ تم سے بہتر شریک سفر مجھے مل ہی نہیں سکتا۔ تم میرے لئے بہترین چوائس ہو۔“ دلفریب تھا۔ مگر ساہیہ خان مطمئن ہوئے بغیر بولی تھی۔

اور تم اذہان حسن بخاری؟..... تم کیا خیال کرتے ہو؟ غالباً یہ رائے تو میرے لئے تمہاری می کی ہے۔“ اس کا اذہان پر اعتماد تھا اور اذہان حسن بخاری جہاں چند ثانیوں تک اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا،

پھر بے ہی بل مسکرا دیا تھا۔

یہ تمہیں میں قبل از وقت کیوں بتاؤں؟..... وہ لمبے تو آنے دو جب یہ انکشافات ہو سکیں، میں کہہ اور تم سن سکو۔“ یوں پر مسکراہٹ دلفریب تھی۔ ”بس ایک ذرا انتظار..... سن صدائیں دے رہی ہے یاد کی۔“ انداز شرات سے بڑھا مگر ساہیہ خان مسکرائی نہیں تھی۔

”تم نے کہا تھا فارحہ آئی مجھے تمہارے لئے بہترین شریک سفر خیال کرتی ہیں۔“

”ہاں..... تو پھر.....؟“ اذہان حسن بخاری سمجھ نہیں سکا تھا۔ کبھی شاید سرسری انداز اختیار کرتے بات کو مذاق میں اڑانا چاہتا مگر وہ مکمل سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

اذہان! مجھے تمہارا شریک سفر نہیں بنا۔“ انکشاف کیا تھا۔

”فہم.....؟“ وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”ہاں..... مجھے تمہارا شریک سفر نہیں بنا اذہان حسن بخاری! کیونکہ میں تمہاری جیون ساتھی بنا چاہتی ہوں۔ شریک سفر کبھی بھی، کسی موٹر پر راہ چلنے کا ارادہ کر سکتا ہے۔ کسی بھی موٹر پر ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھ سکتا ہے۔ جیون ساتھی سانس سے سانس کا بندھن ہے جو آخری سانس تک باقی رہتا ہے۔ اور ساہیہ خان کسی نا جیون ساتھی بنا تو قبول کر سکتی ہے، شریک سفر نہیں۔“ اصطلاح تھوڑی عجب ضرور تھی مگر بات میں کسی ضرور تھا۔ شاید تھی اذہان حسن بخاری متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

”شریک حیات تو بن سکتی ہوتا۔ یہ تو زندگی سے اور سانسوں سے خاصا قریب ہے۔“ انداز میں کسی قدر تگمگی اور ساہیہ خان مسکرا دی تھی۔

”تم بات کا پسندیدہ کونا کہیں سے بھی کھینچ کر لے جا سکتے ہو۔ مگر تم مجھے ٹال نہیں سکتے ہو۔“
بخاری!..... جب تک مجھے اصل سبب نہیں بتاؤ گے، میں ماننے والی نہیں ہوں۔“

”کیا بچکانہ باتیں ہیں ساہیہ خان! میں ایگری ہوں۔ سچی تو یہ پروپوزل مئی لے کر تمہارے
ہیں۔“ اذہان حسن بخاری نے باور کرنا چاہا تھا مگر وہ اسے کھوجتی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ اذہان حسن بخاری نے اس کے دیکھنے پر استفسار کیا تھا۔

”ان آنکھوں میں مجھے اپنے لئے کہیں کوئی محبت دکھائی نہیں دے رہی اذہان حسن بخاری!
تشویش بجاتھی شاید۔ اذہان حسن بخاری اس کے چہرے کی طرف سے نگاہ پھیر گیا تھا۔

اور اس لمحے ساہیہ خان کی حیرت سوا ہو گئی تھی۔ کتنی دیر خاموشی سے وہ اسے دیکھتی رہی تھی،
ہولے سے سرنئی میں ہلانے لگی تھی۔ وہ اسی طرح بیٹھی تھی جب اذہان حسن بخاری کی آواز ابھری تھی
”یہ سچ ہے، مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔“ اذہان حسن بخاری کا انکشاف کسی دھماکے سے کم نہ تھ
خان ساکت سی اسے ہنسی رہ گئی تھی۔

”ہاں، یہ سچ ہے ساہیہ خان!..... مجھے تم سے محبت نہیں ہے اور مجھے تم سے محبت ہو یہ بھی ضرور
ہے۔“ اذہان حسن بخاری کے لہجے میں عجب ایک سکوت تھا اور ساہیہ خان اسے حیرتوں میں ڈوب رہ
دیکھے جارہی تھی۔ پھر یکدم وہاں سے اٹھی اور چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

انابیہ شاہ کا عجب حال تھا۔

وہ پے در پے انکشافات سے نکل نہیں پارہی تھی۔ عجب سائے رونما ہو رہے تھے اور اس کی سو
کی جیسے ساری ہمت سلب ہو گئی تھی۔ مگر اس حیرت اور پریشانی میں کسی نے مزید اضافہ کرنا ضروری
تھا اور اس طغیانی میں اضافہ دو چند ہو گیا تھا۔

عفتان علی خان نے اس کے یہاں اپنا پروپوزل بھیج دیا تھا۔

اس کے لئے..... یعنی انابیہ شاہ کے لئے۔

اس نے سنا تھا تو جیسے ایک آسمان اس کے سر پر آن گرا تھا۔

کتنی دیر تک وہ حیرتوں میں ڈوبی ساکت بیٹھی رہی تھی۔

اذہان حسن بخاری کے قریب آن بٹھا تھا مگر جیسے اس کے پاس بھی اسے کہنے کے لئے کچھ نہ تھا۔

”اذہان! مجھے کہیں جانا ہے۔“ انابیہ شاہ نے تمام ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے اذہان کی طرف دیکھا

”کہاں جانا چاہتی ہو تم؟“ اذہان نے دریافت کیا تھا۔

”تم میرے ساتھ چلو گے یا نہیں؟“ انابیہ شاہ کا لہجہ قطعی تھا۔

”انابیہ! تم مینٹلی بہت ڈسٹرب ہو اور میں تمہیں اس کیفیت میں کہیں نہیں لے جا سکتا۔ انا

آرام کرنا چاہئے۔ نانا اور آئی پہلے ہی بہت پریشان ہیں تمہیں لے کر۔“

”انابی پریشانیوں کو تو کم کرنا چاہتی ہوں میں اوزی!“

”تمہیں اس وقت ریٹ کرنا چاہئے۔ یہ ڈپریشن تمہارے لئے اچھا نہیں ہے۔“ اوزی نے اس کے
ہانے پر ہاتھ دھرا تھا اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہت آہستگی سے بہنے لگے تھے۔

”انابیہ!“ اوزی کے لئے یہ صورت حال کسی قدر پریشانی کا باعث تھی۔ ”دیکھو اگر تم چاہتی ہو کہ

ہمارے اس بھائی کو کوئی دکھ نہ ہو تو پلیز اسٹاپ کرائینگ ناؤ..... اور کسی کو فرق پڑتا ہو یا نہ ہو، مگر مجھے اہم

ہیں کارونا بہت تکلیف دیتا ہے۔ تم جانتی ہو تم جب بچپن میں بھی رویا کرتی تھیں تو میں اپنے کھلونے تمہیں

دے کر بہلانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس وقت تو اتنا سنسن بھی نہیں تھا..... اور اب تو..... انابیہ! سب

کس قدر چاہتے ہیں تمہیں..... اور تم جو اب ایسی تکلیف دے رہی ہو ہم سب کو..... تمہارا یہ رویہ کسی طرح

بھی مناسب نہیں ہے۔ تم کیوں خود کو مجرم سمجھ رہی ہو؟ محبت ہی کرتا ہے تاکوئی تم سے..... عجب کیا ہے

انابیہ! کوئی گناہ تو نہیں ہے یہ..... نہ ہی وہ ایسا کر کے کوئی گناہ کر رہا ہے۔ حیرت ہے، ہم کسی کی غیبت

کرتے ہوئے نہیں ڈرتے، چوری کرتے ہوئے نہیں ڈرتے، کسی کو بے عزت کرتے ہوئے بھی ہمیں عجب

محسوس نہیں ہوتا، حتیٰ کہ قتل کرتے ہوئے بھی نہیں ڈرتے..... ڈاکہ مارتے ہوئے بھی نہیں ڈرتے۔ مگر

محبت کرتے ہوئے، کسی کو دل سے محبت کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ کیا محبت کرنا اتنا ہی برا کام ہے؟ کسی کو

پاہنا، دل سے محبت کرنا اتنا ہی برا گناہ ہے؟ کبھی نہیں سمجھ سکا ہوں میں۔ یہ سب کچھ اتنا ٹھیک ہے تو ہم اسے

مظاہر کیوں سمجھتے ہیں؟“ اوزی اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور وہ سر دونوں ہاتھوں پر گرا کر اس کی طرف

سے رخ پھیر گئی تھی۔

”اوزی! مئی اور دادا کی نظروں میں سر اٹھانے کے قابل نہیں رہی میں۔ لامعوض کے آنسو مجھے جینے نہیں

دے رہے۔ اور.....“ کتنی آہستگی سے اس کی آنکھیں پھر چھلکنے لگی تھیں۔

اوزی نے اس کے گرد بازو پھیلا کر اسے خود سے قریب کر لیا تھا اور بہت کیرنگ انداز میں بولا تھا۔

”تمہیں عادت ہو چکی ہے انابیہ! دنیا بھر کی فکر کرنے کی۔ کبھی تم نے اپنے دل کی سننے کی کوشش کی ہے،

دل کیا کہتا ہے؟ کبھی غور کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے تم نے؟ غازی کے بعد تم نے خود پر زندگی کے

دروازے کس طرح بند کر لئے ہیں، یہ سب جانتے ہیں۔ مگر تم..... تمہیں اس کے باوجود کوئی فکر نہیں ہے کہ

سب اگر تمہاری وجہ سے جلتے کڑھتے ہیں تو کیوں۔ نانا، آئی اور میں..... تمہیں کسی کی کوئی پرواہ نہیں

انابیہ!..... تمہیں نہیں لگتا نہ تم اچھی پوتی ہو نہ اچھی بیٹی اور نہ اچھی بہن۔ کس قدر پریشان کرتی ہو تم

ہمیں..... تم جانتی ہو نانا..... تم پہلے بھی ایک مشکل سے گزر چکی ہو..... یہ ابلجھنیں، یہ بیکار کے مسئلے مسائل

تمہیں کیا دیں گے انابیہ؟..... سوائے تمہاری مشکلات کو بڑھانے کے۔ تم جانتی ہو ڈاکٹر ابھی بھی تمہیں

ایڈوائز کر کے گیا ہے، نہ تو تم نے میڈیسن لی ہے اور نہ تم ان نفضول کی باتوں کو سوچنے سے باز رہی ہو۔ یہ

ڈپریشن تمہارے لئے کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے، جانتی ہو نا تم؟“

انابیہ اس کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی تھی اور اوزی اس کا شانہ تھپتھپانے لگا تھا۔

”میں چاہا ہوں انابیہ! تم اپنے اندر کا سارا غبار دھو دو اور پھر کبھی دوبارہ مت روؤ۔“

”اوزی! مجھے لگ رہا ہے میں سب کی مجرم ہوں..... سب کی نظروں سے گر گئی ہوں۔“ وہ آنسوؤں

کے درمیان بول رہی تھی۔

”ایسا کیوں لگتا ہے تمہیں؟ تمہارا اس میں کیا تصور ہے؟ تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ اور تم کسی کسی اقدام سے باز بھی نہیں رکھ سکتی ہو۔ عفنان علی خان اگر تم سے محبت کرتا ہے تو کیا تم اسے ایسا کرنے سے منع کر سکتی ہو؟ یقیناً نہیں۔ خواہ مخواہ کی فکریں مت پالو۔“ اوزی نے فیصحت کی تھی۔ دروازے پر کھٹکا ہوا تھا۔ اوزی نے سر اٹھا کر دیکھا تھا، وہاں آئی کھڑی تھیں۔

”عفنان علی خان آیا ہے۔ انا بیہ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

انا بیہ نے سر اٹھا کر می کی طرف دیکھا تھا مگر وہ اسی لمحے مڑ کر باہر نکل گئی تھیں۔

”تم ملنا چاہتی ہو اس سے؟“ اوزی نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ انا بیہ شاہ شمال سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

عفنان علی خان لیونگ روم میں اس کا منتظر تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے سامنے جا رہی تھی۔ عفنان علی خان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا، پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ انا بیہ شاہ بھینتی آنکھوں سے اسے چپ چاپ دیکھتی چلی گئی تھی۔

عفنان علی خان کے لئے اس کا یہ روپ، یہ حالت بہت تکلیف کا باعث بنی تھی۔ اس کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

”انا بیہ!“

”شٹ اپ عفنان علی خان! شٹ اپ!..... اب میں تمہاری کوئی بکواس نہیں سنوں گی۔ میں صرف تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ مجھے تمہارا پروپوزل قبول نہیں ہے۔ دیش آل.....“ وہ کہہ کر پلٹی تھی جب عفنان علی خان نے یکدم ہی اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ انداز بے حد جونی تھا اور اس کی آنکھوں سے اس لمحے عجب شعلے نکل رہے تھے۔ انا بیہ شاہ نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا پھر بہت مضبوط لہجے میں بولی تھی۔

”مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنا ہے۔ بہتر ہو گا تم اس وقت کوئی بحث نہ کرو۔“ اپنا ہاتھ چھڑانا چاہتا تھا مگر عفنان علی خان نے اسے دونوں شانوں سے تھام کر چھوڑ ڈالا تھا۔

”میں اپنی زندگی کو تمہارے اس ایک فیصلے کی نذر نہیں کر سکتا انا بیہ شاہ!..... میں ساری کشتیاں جلا کر آیا ہوں اور اب پیچھے قطعاً نہیں ہٹوں گا۔ اب چاہے تم میری پذیرائی کرو یا نہ کرو، میں اپنے فیصلوں میں ترمیم کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ اور جو میں طے کر چکا ہوں اس سے منحرف نہیں ہوں گا۔ تم چاہے میرا ساتھ دو یا نہ دو۔ چاہے مجھے چاہو یا نہ چاہو، میرا ہاتھ تمہاں نہ تھا۔ مو۔ بٹ آئی کانٹ اسٹاپ لوگ۔ یو انا بیہ شاہ! انڈو میری طرف سے یہ محبت تم ہو سکتی ہے نہ ہی ختم ہو سکتی ہے۔ میں تمہیں یہی باور کرانے اور سمجھانے آیا ہوں۔ تمہارے لئے جو میرے دل میں جگہ ہے وہ کبھی بھی کم نہیں ہوگی۔“ انتہائی مضبوط لہجے میں باور کرانے ہوئے اسے دیکھا تھا اور پھر اس کے شانے پر اس کے مضبوط آہنی ہاتھوں کی گرفت یکدم ہی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر یکدم پلٹا تھا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔

انا بیہ شاہ بھینتی آنکھوں سے اس دھندلے منظر کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

وہ نیند میں تھی، جب مائی اماں کا فون آیا تھا۔

کل بارش میں بھینکنے کی وجہ سے اس کی طبیعت واقعی بگڑ گئی تھی اور سردار سبکنگین حیدر لغاری اگلے دن اس کی کیئر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ڈپٹ بھی رہا تھا۔

”کہا بھی تھا نا..... بارش میں مت بھگو۔ مگر عجب ضدی ہو تم۔“

میرب سیال نے اس شخص کی طرف دیکھا تھا اور اس لمحے جانے کیوں اس کی کیئر کرنا سے اچھا لگا تھا۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری نے اس کی طرف بغور دیکھا تھا۔

”کیا ہوا؟“ غالباً وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کے ڈپٹے پر برامان گئی ہے۔ میرب سیال نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے منہ تک کھیل اوڑھ لیا تھا۔

”سو جانا۔ مگر سونے سے قبل یہ کافی پی لو۔“ اس کے چہرے پر سے کھل ہٹاتے ہوئے حکم جاری کیا تھا۔ میرب سیال نے بادل نخواستہ اٹھ کر اس کے ہاتھ سے کافی لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا۔ نازک ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ سے لمحہ بھر کو ٹکرایا تھا اور سردار سبکنگین حیدر لغاری کو لگا تھا جیسے اسے کوئی انگارہ سا چھو گیا ہو۔ کسی قدر تشویش سے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی کو چھوا تھا۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی۔

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ وہ فون اٹھا کر کسی ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کرنے لگا تھا جب میرب سیال نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ یہ حرکت یکدم ہی سرزد ہوئی تھی۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری نے اسے دیکھا تھا۔ میرب سیال نے یکدم ہی اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا اور اس کی طرف سے نظر پھیر گئی تھی۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ معمولی بخار ہے، آپ فکر نہ کریں۔“ میرب سیال کی نظر گریزاں تھی۔

”شیور.....؟“ سردار سبکنگین حیدر لغاری نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ میرب سیال نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”اوکے۔“ وہ پلٹا تھا اور دراز میں سے چند ٹیبلٹس نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی تھیں۔

”تم یہ لے لو۔ اور اگر پھر بھی کیفیت برقرار رہے تو مجھے انفارم کرنا مت بھولنا۔“ ہدایت کی تھی۔ میرب سیال نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ٹیک کیئر۔“

”اوکے۔“

سردار سبکنگین حیدر لغاری باہر نکل گیا تھا۔ وہ سو گئی تھی۔ مگر اب مائی اماں کی کال نے اسے یکدم ہی بیدار کر دیا تھا۔ طبیعت خراب ہونے کے باوجود اس نے بہت خندہ پیشانی سے ان سے بات کی تھی۔

”سبکنگین حیدر کہاں ہے؟ میری بات کراؤ۔“

”آپ نے ان کے سیل پر ثرائی نہیں کیا؟“ اسے حیرت ہوئی تھی۔

”کیا ہے۔“ مگر وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے اور سیل اس کا غالباً بند ہے۔ کئی بار ٹرائی کیا مگر رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ اس کے کمرے میں دیکھو جا کر، ٹھیک تو ہے وہ؟“ مائی اماں کی تشویش بجا تھی۔ مگر اس وقت..... رات کے چار بجے وہ سبکدین حیدر لغاری کو ڈسٹرپ کیسے کر سکتی تھی؟ اور پھر.....

”آپ کو ضروری کام ہے کوئی؟“

”ہاں۔۔۔ کام بھی ہے۔ مگر..... اچھا ایسا کرو تم پتہ کرو، میں تھوڑی دیر بعد کال کرتی ہوں۔“

”جی بہتر۔“ میرب سیال نے بستر چھوڑتے ہوئے فون رکھا تھا اور باہر نکل آئی تھی۔ مائی اماں کا حکم تھا، اس کے لئے رد کرنا آسان نہ تھا۔ مگر چار بجے کے قریب.....! یہ بھی ٹھیک نہ تھا کہ کسی کو ڈسٹرپ کر دیا جائے۔ اور سبکدین حیدر لغاری کے مزاج سے تو وہ واقف تھی۔ جانے وہ کیسا رول عمل ظاہر کرتا..... اس سے کچھ بعید بھی نہ تھا۔ پل پل موسم بدلتا تھا اس کا مزاج۔

پل میں موسم، پل میں شعلہ تھا وہ۔۔۔ اور۔۔۔

وہ چلتی ہوئی اس کے روم کے باہر جا کر تھی۔ بہت ڈرتے ڈرتے دستک دی تھی مگر کوئی رسپانس نہیں ملا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پھر ہمت کی تھی مگر دوبارہ بھی کوئی رسپانس نہیں آیا تھا۔ غالباً وہ گہری نیند سونے کا عادی تھا۔ مگر مائی اماں کا حکم بھی تو ماننا ضروری تھا۔

اس نے ایک بار پھر دستک دی تھی مگر جواب نہ پا کر اس نے یونہی دروازے کے پینڈل پر ہاتھ دھرا تھا۔ کمرہ لاکڈ نہیں تھا، کھلتا چلا گیا۔

میرب سیال کی نظر عین سامنے کمرے پر پڑی تھی اور اس کی نگاہ ساکت رہ گئی تھی.....!

سردار سبکدین حیدر لغاری اپنے کمرے میں نہیں تھا۔

میرب سیال کی نگاہ متحیر رہ گئی تھی۔ آہستگی سے چلتی ہوئی وہ آگے بڑھی تھی۔ واش روم کا دروازہ کھول کر دیکھا تھا مگر کوئی وہاں نہ تھا۔

”سبکدین!“ میرب سیال نے پکارا تھا۔ نظروں نے یہاں وہاں اسے تلاشا تھا۔

”سبکدین!“ پریشانی لہجے میں غود کر آئی تھی۔ مگر اس کے کمرے میں کوئی نہ تھا جو اس کو جواب دیتا۔ اس کی نیند پوری طرح سے اڑ چکی تھیں۔ نیند کی شماری سے بھری ہوئی آنکھیں مکمل طور پر کھل چکی تھیں۔۔۔ سراسیمہ سی کمرے کو ایک طائرانہ نگاہ سے دیکھتی پلٹی تھی اور باہر نکل آئی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری کہاں تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ مگر یہ بات کسی تشویش سے کم نہ تھی۔ پریشانی واضح طور پر اس کی آنکھوں میں در آئی تھی۔

وہ کوئی بچہ نہ تھا۔ مگر رات کے اس پہر اس کا اس طرح کمرے سے غائب ہو جانا یقیناً باعث تشویش ہی تھا۔



”میں ساری کشتیاں جلا کر آیا ہوں اور اب پیچھے قطعاً نہیں ہوں گا۔ اب چاہے تم میری پذیرائی کرو یا نہ چاہے مجھے چاہو یا نہ چاہو۔ میرا ہاتھ تھا مویا نہ تھا مویا لیکن تمہیں نہیں چھوڑ سکتا انا بیہ شاہ!“

عنان علی خان کا لہجہ ابھی تک اس کی سماعتوں میں گونج رہا تھا۔ پچھلی شب کا اثر جوں کا توں تھا۔ وہ اس کے لئے، اس مجنونانہ لہجے کو اور ان پرجنون آنکھوں کو فراموش ہی نہیں کر پارتی تھی۔

وہ سب جیسے ایک تاثر خاص بن گیا تھا۔ اگلے دن وہ کیسپس بھی نہیں جا سکی تھی۔ لامعہ کا فون آیا تھا مگر بننے بات نہیں کی تھی۔ اس کی ہمتیں جیسے ٹوٹ چکی تھیں۔

بیل سارا دن بجتا رہا تھا۔ اسکرین پر ایک نمبر اُبھرتا رہا تھا مگر اس نے ایک بار بھی کال ریسیو نہیں کی تھی۔ ہالک کر دیا تھا۔ مگر جب دوسرے دن سوچ آئے کیا تھا تو بیل ایس ایم ایس سے بھرا پڑا تھا۔

”پلیز ٹاک ٹومی۔“

یہ اور اس جیسے کتنے ہی میسجز اسے مزید پریشان کر رہے تھے اور شام میں عنان علی خان پھر اس کے لئے موجود تھا اور وہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”فیظ کو آزمانا چاہتی ہو؟“ عنان علی خان اس کی آنکھوں میں بہ غور دیکھ رہا تھا۔ کل کی یہ نسبت آج وہ بالکل اعتماد دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے پر پرسکون کیفیت تھی۔ جیسے وہ صورت حال کو اپنے بس میں کر چکا

”آزمانا چاہتی ہو مجھے یا پھر خود کو؟..... انا بیہ شاہ! کیا یہ اتنا آسان ہے؟..... آسان ہے یوں نگاہ لیا..... یا پھر اجنبی بن جانا؟..... تمہیں نہیں لگتا تم نے عنان علی خان کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔“

لاستے ہوئے وہ مکمل طور پر پُر اعتماد دکھائی دے رہا تھا۔

”کیا سمجھتی ہو؟ اتنی جلد ہی تمہیں ہار سکتا ہے کوئی؟..... اتنی جلد حوصلہ ہار سکتا ہے؟“ بہ غور دیکھتے

سائمنی میں بلایا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

”جو جی جانا، غلط جانا، غلط سمجھانا۔ انا بیہ شاہ!۔۔۔ جو ایک پل بھی اپنی سمت بدل لے وہ محبت نہیں۔ عنان علی خان تم سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ کیا سمجھتی ہو تم، مجھ سے اجنبی

لڑو گی تو میں ہر راہ بدل لوں گا، پلٹ کر لوٹ جاؤں گا..... پھر کبھی تمہاری سمت نہ آنے کے لئے؟ کیا ان علی خان اتنا کمزور ہے یا پھر اس کی محبت اتنی کھوکھلی ہے؟ بولو انا بیہ شاہ! کیا لگتا تمہیں؟“ مدھم لہجہ کسی ہنوں اپنے اندر رکھتا تھا۔

”دل کو سنبھالنا اتنا ہی آسان ہے۔ سمجھنے اور سمجھانے کی باتیں کب تک ہمارے ماتین ہوتی رہیں گی انابہ شاہ! کب تک ہم وقت گناتے رہیں گے؟ کیوں نہیں سوچتی تم؟ لمبے فیتی بھی تو ہو سکتے ہیں۔ گزر گئے پلٹ کر واپس کب لوٹیں گے۔ تمہیں اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک چھوٹی سی بات۔ عمر جیسے کو تو ہر ہے اور تم محبت کے لمبے گنوار ہی ہو۔ کیا کروں میں انابہ شاہ! تمہارا۔ کیسے سمجھاؤں کہ دل کی اپنی طرف ہوتی ہے اور دماغ کی اپنی۔ دل اور دماغ کبھی ایک راہ پر نہیں چل سکتے۔ تبھی تو تمہارے معاملے میں دل سمجھا نہیں پاتا۔ اور تم ہو کہ یہ بات سمجھتی ہی نہیں ہو۔ سمجھنا بھی نہیں چاہتی ہو۔ بس لکیریں کھینچنے جارہی ہو دائرے بناتی جارہی ہو۔ اپنے اور میرے درمیان فاصلے بڑھاتی جارہی ہو اور سمجھتی ہی نہیں کہ یہ فاصلے دل سے کتنی دور لے جائیں گے۔ طفل بھی اپنے فائدے اور نقصان کی بات کو بخوبی سمجھتا ہے۔ مگر تم انابہ شاہ!..... تم تو..... کیسے بتاؤں میں تمہیں؟ کیسے سمجھاؤں؟“

”کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ انابہ شاہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی تھی اور انجانی لہجے میں باور کراتے ہوئے بولی تھی۔ ”کچھ بھی باور کرانے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں عرفان علی خان! کیونکہ اپنا اچھا برا، نفع نقصان، سب خوب سمجھتی ہوں۔ سو پلیز، اپنا اور میرا وقت برباد مت کرو۔ میں اپنے نفع کے مطلع کر چکی ہوں اور بار بار دہرانے اچھا نہیں لگتا۔ اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم ایسی بے گلی باتیں کرنا مجھے قائل کر لو گے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔“

انابہ شاہ کہہ کر آگے بڑھنے لگی تھی جب بہت سرعت سے عرفان علی خان نے اس کے نازک سے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ انابہ شاہ نے کسی قدر حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ آنکھوں میں لگاؤ اور غصہ بہت واضح تھا۔ مگر دوسری طرف عرفان علی خان بہت مطمئن سا مسکراتا نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بہ غور جھانکتا ہوا وہ جیسے اپنی محبت کا بھر پور اعتراف کر رہا تھا۔

”یہ فرار، یہ بھاگنا دوڑنا، یہ حقیقتوں کو جھٹلانا، سب سے چہرہ چھپانا، کب تک؟۔۔۔۔۔ ہاں، کب تک انابہ شاہ؟“ مضبوط ہاتھ شانوں پر دھرتے دریافت کیا تھا اور انابہ شاہ ساکت سی اس کی سمت دیکھتی رہی تھی۔ جیسے وہ اس گھڑی قطعاً بے بس تھی یا پھر حیران و ششدر۔ اور عرفان علی خان کہہ رہا تھا۔

”دیوار اٹھانا چاہتی ہو تو اتنا جان لو، کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوگی۔ راستوں کو علم ہے۔ درمیان محبت ہے اور سفر جہذ بوں کو کرنا ہے۔ سو فاصلے اپنا آپ سمیٹ لیں گے۔ تمہیں کوئی اور راہ نکالنا ہوگی انابہ شاہ! مگر اس کے لئے بھی ضروری نہیں کہ تم کامیاب بھی ہو۔“ بہت دھیمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر تھی۔

”سنا ہو گا تم نے، محبت سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ مگر اس پیچیدہ مسئلے کا حل بھی صرف اور صرف محبت ہے۔ سو جو بھی اقدام اٹھاؤ جان لینا کہ یہ سر جھکا ہوا ہے اور ہمیشہ جھکا رہے گا۔ تلوار اٹھاؤ اور دیدہ دل بہلا کر دو، دل حاضر ہے۔ مگر یہ کھیل فیئر ہونا شرط ہے۔ بساط جب بچھ ہی چکی ہے تو پھر ڈر کیسا۔ ہار ہوا ہوتا کیا فرق پڑتا ہے۔ محبت تمام خساروں کا مداوا بہت خوبی سے کرنا جانتی ہے۔ سو کھیل لینے میں کیا حرج ہے۔ آئی ایم ریڈی ٹو لے۔ وہاٹ اباؤٹ یو، ول پے اور ناٹ؟“ مسکراتی نگاہ میں کچھ خاص رنگ تھے اور انابہ شاہ کی حیرت سواتھی۔ کچھ نہیں بول سکی تھی وہ۔

”دہنم کشتیاں جلا کر آیا ہوں۔ واپس پلٹنے کی تو کوئی راہ ہی نہیں ہے۔ دل کو اس راہ پر چلانا ہی نہیں جو مجھے تجھ سے جدا کرتی ہے۔ آزمانا ہو تو آزما لو۔۔۔۔۔ جانچنا ہو تو جانچ لو۔ کوئی راہ تبدیل نہیں ہوگی۔“

”مہم لہجے میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔ وہ مہموت کی کھڑی تھی جب عرفان علی خان اسی پر اعتماد انداز بنکر اتنا ہوا پلٹا تھا اور پھر وہاں سے نکلنا چلا گیا تھا۔

بے تاثر بن جانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اور ان معاملات میں تو قطعاً بھی نہیں جو براہ راست آپ سے لے ہوں۔

گو ہوا کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ ایکسپکٹ کر رہی تھی۔ مگر اسے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ اس کے ہر وہی وہ اس نقطے پر اب تک خود کو ساکت و جامد محسوس کر رہی تھی۔

”ساہیہ! کیا ہوا؟“ اگینے چلتی ہوئی اس کے پیچھے آن رکی تھی۔ مگر ساہیہ خان چونکی نہیں تھی۔ نہ ہی پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ ساکت نگاہ غلاؤں میں کہیں یونہی اٹھی رہی تھی۔

”ساہیہ!“ اگینے اس کے سامنے آن رکی تھی۔ بہ غور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے جیسے صورت حال کو جانچا ہوا تھا مگر اس کا چہرہ اس لمبے کھلی کتاب نہ تھا۔ اگینے کے اس طرح جانچنے پر وہ مسکرا دی تھی اور انداز بجا لگایا مگر وہ جیسے تمام صورت حال اپنے بس میں کرنے کا اختیار رکھتی تھی۔

”جہابی کب سے تمہیں کھانے کے لئے بلوا رہی تھیں۔ تم نے سنا نہیں۔“ اگینے نے کسی قدر جانچتی لڑوں سے اسے دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ ساہیہ خان نے سرفٹی میں ہلا دیا تھا۔

”جھوک نہیں۔۔۔۔۔ ماما سے کہئے، جب ہوگی کھا لوں گی۔“

”کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں پھپھو!“ کب بہت ہولے سے مسکرائے تھے۔

”کسی نے کچھ کہہ دیا؟“

”کون..... کون کہے گا کچھ مجھ سے؟“ مسکراتے ہوئے نگاہ چراہی تھی۔

”انہاں..... انہاں نے کچھ کہہ دیا؟“ اگینے کسی نقطے پر پہنچی تھی اور ساہیہ خان ساکت سی اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ بولی کچھ نہیں تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ وہ کیا کہے گا کچھ مجھ سے۔ وہ میرا اچھا دوست ہے اور دوستوں میں کچھ عجب کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ خواہ مخواہ مسکرائی تھی۔

”تمہیں یقین ہے؟“ اگینے نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”قطعاً۔“ ساہیہ خان مسکرائی تھی۔

”آپ کو کیا لگا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے ہم میں؟“ نظریں جراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ اگینے اس

کے چہرے کو بغور نکتی رہی تھی۔

”خود کو اور دوسروں کو بے وقوف بنانا کوئی اچھی بات نہیں۔“ اگینے بولی تھی۔ انداز باور کرانے والا تھا۔ مگر ساہیہ خان مسکرا دی تھی۔

”پھچھو! آپ کو کیا لگتا ہے، اذہان کو اور مجھے لے کر جو ہونے جا رہا ہے، آئی میں جو تعلق بننے جا رہا ہے وہ کتنا صحیح ہے؟“ اگینے نے بھرے لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”تو تم اس بات کو لے کر پریشان ہو؟“ اگینے جیسے حتی نتیجے تک پہنچی تھی۔ ساہیہ کچھ نہیں بولی تھی۔ ایک نے دو قدم آگے بڑھ کر اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت سے دیکھا تھا اور نرمی سے مسکرا دی تھی۔

”ساہیہ! آنے والے دنوں کی فکریں، آنے والے دنوں پر ہی چھوڑ دینا اچھا ہوتا ہے۔ ایسا کرنے سے بہت سے مسائل جنم نہیں لیتے۔ یہ ایک اچھا حل ہے اپنے آپ کو ریلیکس رکھنے کا۔“

”مگر پھچھو! صرف آج ریلیکس رہنے کے لئے میں اپنے آنے والے کل کو اندیشوں میں مبتلا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ آج پر ہی آنے والے کل کو میں کرنا ہے۔ سو آج سے ہی کل کی فکر کرنا ضروری ہے۔“

”جب میں تمہاری عمر میں تھی تو بالکل بھی ایسا نہیں سوچتی تھی۔ خاصی بڑھوں والی سوچ ہے۔“ اگینے نے مذاق میں ڈالنا چاہا تھا اور وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ ساہیہ خان مسکرا دی تھی۔ مگر یہ مسکراہٹ لئیل لیلوں کی تھی۔ چند لمحوں بعد ہی وہ ہونٹ بھینچ کر اسی ڈگر پر تھی۔

”پھچھو! رابطوں میں پذیرائیاں بھی ہوں، کیا یہ ضروری ہے؟“ بات بہت گہری تھی شاید تبھی اگینے چونک پڑی تھی۔ مگر ساہیہ خان کو اس بات کا احساس ہونے نہیں دیا تھا۔

”کن رابطوں کی بات کر رہی ہو تم؟۔۔۔ رابطے تو کئی طرح کے ہوتے ہیں۔“

”ہاں، ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔“ ساہیہ خان لاجواب ہو کر مسکرا دی تھی۔ ”رابطے تو کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ہر رابطہ میں پذیرائی بھی ہو، یہ ضروری نہیں۔ اور ضروری تو یہ بھی نہیں کہ اتنے بے تکے موضوعات پر بے تکی بات بھی کی جائے۔“

”رابطے تو کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ مگر ساہیہ! ہر رابطے سے ہم ہر طرح کی توقعات نہیں رکھ سکتے۔ کچھ خاص لوگوں سے ہی خاص توقعات وابستہ کی جاتی ہیں۔“

”اور کتنا بڑا پاگل پن ہے نایہ پھچھو! کسی کی سنا، نہ کہنا، بس پاگلوں کی طرح اپنی طرف سے توقعات لے بیٹھنا، اپنے آپ کو کتنا بے قیمت کرنے والی شے ہے نا۔ کوئی سمجھتا ہی نہ ہو، جانتا ہی نہ ہو اور آپ نے بے جا لکھے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے وہ ایک دم ہی بات ادھوری چھوڑ کر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ اگینے اس کے انداز کو محسوس کر رہی تھی مگر واضح طور پر کچھ پوچھنا مناسب نہیں جانا تھا۔

”تم آؤ۔۔۔ کھانا کھا لو۔۔۔ بھائی کو بہت فکر رہے گی ورنہ۔“

”پھچھو!“ ساہیہ خان نے جواباً کچھ بولنے کو لب کھولے تھے مگر پھر بولے بغیر بھینچ گئی تھی۔ اگینے نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے گاندھوں پر رکھتے ہوئے بہت نرمی سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

یہ عمر خواہ خواہ کی فکروں میں گھرنے کی نہیں ہے۔ اور تمہاری عمر تو یوں بھی ابھی بہت کم ہے۔ انجوائے کرو۔ یہ الجھاؤوں کے جال بڑے ہی ظالم ہوتے ہیں۔ ایک بار اگینے تو سلجھنے کی کوئی نئی ہی نہیں۔ مجھے بہت عزیز ہو، سو مشورہ یہی دوں گی کہ جو ہو رہا ہے، جو ہونے جا رہا ہے ہو جانے

یہ تو تم وقت کو روک سکتی ہو نہ وقت کے کسی اقدام کو۔ تو کیا بہتر نہیں کہ ہم خواہ خواہ کے الجھاؤوں کی پکریں اور الجھنوں کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں کہ بعض اوقات آنکھیں میچ لینا ہی سب سے بڑا

ہے۔ اب چاہے یہ اقدام کسی خوف کے سبب ہی کیوں نہ ہو یا پھر کسی مصلحت کے تحت، مسکراتے

اپنے چہرے کو تھپتھپاتا تھا۔

”اچھا، کھانا ٹھنڈا ہو گیا تو مزہ نہیں آئے گا۔“ انداز بہت سرسری تھا اور ساہیہ خان انہیں دیکھ کر رہ گئی تھیں بے سبب تو نہ تھی۔ کیسے وہ نظر انداز کرتی اور کیسے آنکھیں پٹی۔

بازبان حسن بخاری ایزی چیز پر آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ کمرہ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ دل کے ہر کئی خیالوں کی آہٹیں تھیں۔ کئی آوازیں دنگلیں دے رہی تھیں۔ دو آنکھوں کا چہرہ دل پر تھا۔ دو

لب کپکپا رہے تھے۔ کچھ حرف تھے شاید۔

لے پھوٹے، بے ربط، بے آہنگ۔

بہتی، مگر ہزار ہا معنی اپنے اندر سمیٹے۔

انجراں تھی، کچھ ویراں۔ لمبی دراز پلکیں کچھ کپکپا رہی تھیں۔ اک انجان سا بوجھ ان پر لدا تھا۔ سمندر

آنکھوں کے کنارے چپکے چپکے بھگ رہے تھے۔

وہ گداز لب ساکت تھے۔ عارض بھگ رہے تھے۔ سارے لمبے پانیوں کی زد پر تھے اور وہ خاموش

نے خود سے الگ کبھی مت ہونے دینا۔ یہ احساس سپردگی، یہ نیا پن، یہ احساس محبت، دل ڈرتا ہے۔

انہ جانے سب۔ اذہان! میرے رہو گے نا؟

لہذا ہم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ گداز لب کپکپا رہے تھے۔ سمندر آنکھیں طغیانیوں میں گہری تھیں اور وہ

بہل نہ چپک سکا۔ بس ساکت سا تکتا رہا تھا۔

لہ جو کھو جاؤں تو کیا کرو گے اذہان؟

نظروں کا۔۔۔ تلاشوں کا۔۔۔ دنیا کے ایک نقطے سے دوسرے تک۔ اک کنارے سے

تک۔ صدائیں دوں گا۔۔۔ تمہارا نام لوں گا۔

اکا انا لہجے بے قرار تھا۔ مدہم، جنوں خیز۔

ایسا کرنے سے میرے خیالوں تک رسائی پاسکو گے؟ کیا ڈھونڈ لو گے مجھے؟ وہ بھیگی آنکھیں اس کی

ناکھیں اور اس کا اک جہاں جیسے قیامتوں میں گھر گیا تھا۔

نواؤں کے اذہان حسن بخاری؟ وہ نگاہ بے قرار تھی۔

بچے کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

یاد تھا۔

یہی تو تھی۔

لمحے میں سب کچھ متزلزل ہوتا لگا تھا۔

بچوں کھدروں میں چھپے خوف ایک لمحے میں پھر سراٹھانے لگے تھے۔

بگین حیدر لغاری اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اسے خالی خالی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

ہاتھ ہوں تم پریشان ہو گئی تھیں۔ مگر تمہاری طبیعت خراب تھی، سو میں نے تمہیں ڈسٹرب کرنا نہیں چاہا اور تم.....“ سردار بگین حیدر لغاری نے وضاحت دینا چاہی تھی۔ میرب سیال خاموشی میں رہی تھی اور سردار بگین حیدر لغاری مزید کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

بگین حیدر لغاری نے بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے شانے پر دھرا تھا۔ میرب سیال نے ہمت دیکھنے سے عمل گریز برتا تھا۔ یہ انداز بگین کا اقدام غالباً دانستہ تھا۔ وہ نگاہ جھکائے کھڑی رہی۔ لمحے وہ ہاتھ اس کے شانے پر آیا تھا اس نے اپنا نازک سا ہاتھ بڑھا کر بہت آہستگی سے اس کے شانے پر سے ہٹا دیا تھا۔

بگین حیدر لغاری کو اس اقدام پر بہت حیرت ہوئی تھی۔

پہا تم.....“ کچھ بولنے کو لب کھولے تھے مگر پھر کچھ بولے بغیر لب بھینچ گیا تھا۔ کچھ لمحوں کے اندر بولا تھا تو لہجہ بے حد مضبوط تھا۔

بگین حیدر لغاری نے کہا، کہاں گیا تھا میں آدھی رات کو اٹھ کر۔ اعتبار نہ کرنے کی عادت ہو گئی ہے تمہاری۔ کیا ہمارے پلو کا امیر ہو گیا ہوں میں؟ باندھ کر رکھ لیا ہے تم نے مجھے؟ تمہاری مرضی کیا تک نہیں لے سکتا؟ میرب سیال! تم.....“ غصے میں بولتے بولتے یکدم وہ مٹھیاں بھینچ کر باقاعدہ پھر ہاتھوں سے بالوں کو کسی قدر اُچھٹن سے بھینچے ہوئے اس کی طرف کسی قدر غصے سے

پہا تم اپنے اور میرے رشتے کے بیچ پھر خواہ خواہ کی دیوار اٹھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ایسا کچھ بھیہما تم سمجھ رہی ہو۔ آئی واژ جسٹ بڑی ووددی ورک۔ اینڈ ڈیش آل۔ پلیز ٹرائے ٹو میک سنس ایک ٹرسٹ۔ ایسے کیسے چلے گا؟ تم بیوی ہو میری، پلیز ماں بننے کی کوشش مت کرو۔ میں بہت سزاوار اعتبار جیتنے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم..... تم پھر مجھے اسی ڈگر پر دھکیل رہی ہو۔ کیا تم ہمارے درمیان وہ دیوار پھر سے کھڑی ہو جائے؟ وہ سارے فاصلے پھر سے عموڈ کر آئیں؟“ اسے اچھوڑتے ہوئے کسی قدر ایگریو انداز میں کہا تھا۔

بگین نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے سر نئی میں ہلا دیا تھا۔

بگین نے کہا کہ رہی ہوں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔“ باور کراتے ہوئے چلتی ہوئی دور جا

نہیں، کوئی اپنی زندگی کیسے گنوا سکتا ہے؟ میں جینا چاہوں گا۔ زندگی کے ساتھ، تمہارے

بے قرار لہجہ احساسِ محبت سے بھر پور تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھوں کے تمام آنسو اپنی پوروں پر تھے۔ وہ کاہتا، کمزور لہجہ، مدہم آواز اس کے گرد حصار باندھ رہی تھی۔ مضطرب نگاہ اس کے چہرے پر تھی۔ مجھے سمیٹ لو۔ اپنی پناہ میں لے لو۔ میں زندگی ہوں تو مجھے جی کیوں نہیں لیتے؟ باندھ

دھڑکنوں میں۔۔۔۔۔ سانسوں میں بسا لو۔۔۔۔۔ مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے، تمہارے لئے تمہاری زندگی ہوں میں۔ تمہارے لئے ہوں۔ احساس سے چھو لو، مجھے کوئی اندیشہ باقی نہ رہے سارے پل سمیٹ کر گرفت میں باندھ لو۔ میں تم سے گھڑنا نہیں چاہتی۔ یہ لمحے مجھے ڈرار ہے رہے ہیں، یہ گزر گئے تو کچھ باقی نہیں رہے گا۔ تم ان خدشوں کو مٹا کیوں نہیں دیتے؟ سانسوں کو ہوں تو مجھے اپنے رنگوں میں رنگ کیوں نہیں لیتے؟ میں تمہارے اختیار کے دائروں میں ہوں۔ اختیار میں رہنے دو۔ تمہارے بغیر، تمہارے بنا زندگی باقی نہیں رہے گی۔ وہ گہرے سمندر پھر طغیان پڑا کرتے۔

اور اذہان حسن بخاری کے لبوں پر گہری چپ تھی۔

تمہاری چپ میں اک سکوت ہے اذہان حسن بخاری! اور مجھے یہ سکوت بہت ڈرا رہا ہے۔ مضبوط ہاتھوں سے ان نازک ہاتھوں کو ہولے سے تھام لیا تھا۔ گرم لمس یہ جتانے کو کافی تھا کہ سنگ ہوگی۔

میں حالات کو اپنے بس میں کر لوں گا۔ تمہارے لئے سب کچھ کروں گا۔ اس بند لئے، اس رفاقت کے لئے، سب کچھ۔ بس مجھے کچھ لمحے دو۔ میں ہر وہ اقدام کروں گا جو تمہیں مجھ سے کر دو۔ فقط چند دن۔۔۔۔۔ چند روز۔۔۔۔۔ چند لمحے۔ میں سب کچھ بدل دوں گا، سب کچھ۔ دم سا لہجہ یقین دلاتا ہوا تھا۔

محبت کا احساس ہو تم۔ تمہاری آہٹوں نے مجھے زندگی بخشی ہے۔ تمہارے اک لمس نے مجھے کیا ہے۔ سرگوشیوں میں شدت تھی اور وہ بھیگی نگاہ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اذہان!..... اذہان! کوئی پکار رہا تھا شاید۔ کوئی ہاتھ، ہاتھ سے چھوٹ رہا تھا۔ کوئی نگاہ پلٹ رہی تھی۔ وہ لڑتی چلیں گریزاں ہو رہی تھیں۔ وہ گداز لب کچھ کہہ رہے تھے۔ قدرے ہولے ہولے بچھے رہے تھے اور اس کا دل ایک گہرے اضطراب میں گھرا جا رہا تھا۔ دھڑکنیں پاتالوں میں کھوری جھانک سانسیں رک رہی تھیں۔ دل جیسے دھڑکنے کا بھول رہا تھا۔

اذہان!..... اذہان!“ کسی نے اس کا شانہ ہلا کر اسے جیسے جھوڑا تھا۔ اس نے ایک لمحے آنکھیں وا کی تھیں۔

اذہان! کیا ہوا؟“ مٹی اس کے سامنے کھڑی پریشانی سے دریافت کر رہی تھیں۔

اذہان حسن بخاری نے کھوئے کھوئے انداز میں خالی خالی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔ پھر نون لٹا دیا تھا۔

جب کچھ نہیں ہے۔ مگر اگر میں تمہارے علاوہ کسی اور کے متعلق سوچوں گا تو برا تو تمہیں ہی لگے گا نا۔“

لہا ہوا تھا۔

”راکھوں نے اسے عجب خنگی سے دیکھا تھا۔“

”کھلکا کر ہنس دیا تھا۔“

”پھر وہ خفا خفا سارخ پھیر گیا تھا۔ اسے خنگی کا احساس ہوا تھا اور اس کے چہرے کو بہت آہستگی سے اپنی ہوا ڈالنا اور بہت مدہم لہجے میں بولا تھا۔“

”مجھے صرف تم اچھی لگتی ہے اور صرف تم ہی اچھی لگتی ہو۔ تمہارے سوا اور کچھ نہیں۔“ سرگوشی میں انداز لے ڈالا تھا۔ ”تم مسکراتی ہو تب اچھی لگتی ہو۔ جب میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتی ہو بہت اچھی لگتی ہو اور نگاہ پھیر کر اجنبی بن جاتی ہو تب تو اور بھی اچھی لگتی ہو۔ مجھے تم میں جو بھی ہے، سب اچھا لگتا ہے۔ تمہارا چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جانا، ہر بات کی فکر کرنا، بات بے بات روٹھ جانا اور پھر بے پروا مان جانا۔ تمہاری تمام خامیاں، تمام خوبیاں، تمام کمزوریاں سب بہت اچھا لگتا ہے۔“

”بولا تھا اور وہ کھلکا کر ہنستی چلی گئی تھی۔“

”انہاں حسن بخاری نے ڈائری کو کھولا تھا۔ کئی نقش از سر نو تازہ ہو کر اس کے ارد گرد چمکنے لگے تھے۔“

”میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”کیا؟“

”کہ دوں؟“

”ہاں۔“

”تم میری خواہشوں میں ہو۔“

”پاکل۔“

”یہ بات میں نے تم سے آج تک نہیں کہی تھی۔ سنبھال کر رکھے تھے سارے لفظ۔ مگر تم یہ کتاب تو بند کر

لو کر دی بند۔ پھر۔“

”مجھے اپنے دل میں رہنے دو۔“ وہ شرارت پر آمادہ ہوا تھا۔

”ٹھاپ اذہاں! انس سوچیپ اینڈ ویری فلیسی۔“ وہ ہنس پڑی تھی۔

”میں تم سے عام لفظ کہنا نہیں چاہتا تھا۔“

”مگر ان اذہاں! فضول کی مت ہانگو۔ بہت ضروری کام کر رہی ہوں میں۔ سو پیلیز ڈسٹرب مت کرو۔“

”نانے اسے دیکھا تھا اور وہ مسکرا دیا تھا۔“

”ان حسن بخاری نے کچھ صفحے مزید پلٹ دیئے تھے۔“

”میں آنکھیں پھرا اسکے سامنے تھیں۔“

رکی تھی۔

”سردار سبکگین حیدر لغاری نے اس کی طرف دیکھا تھا پھر مسکرا دیا تھا۔“

”میرب! تم بالکل بچوں سا مزاج رکھتی ہو۔ ذرا سی بات ہوئی نہیں اور تم روٹی نہیں۔“

”ہوئے اس کی پشت پر جار کا تھا۔“ ”ابنی وے، آج کا کیا پروگرام ہے؟ ہمیں شام کہاں گزارنی چاہئے کے دونوں شانوں کو تمام کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا۔ مگر میرب سیال کچھ نہیں بولی تھی۔ بس نا، نگاہ اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا اور سردار سبکگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔“

”ابنی ویز، تھینکس۔“

”نور وہاٹ۔۔۔؟“ میرب سیال چونکی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری کے لبوں کی مسکراہٹ

ہو گئی تھی۔

”تمہارا یہ روپ پہلی بار میرے سامنے آیا ہے تو جانا ہے کہ شاید اسی کا نام محبت ہے۔ شاید کہتے ہیں۔ ایک دو بے کسو چنا، فکر کرنا، ایک دوسرے کے لئے پریشان ہونا، یہ سب محبت ہی ہے خوشی ہے کہ ہم دونوں کے بیچ محبت جنم لے چکی ہے۔ اگر آج ایسا نہ ہوتا تو تم مجھ سے اس قدر گریز آتیں۔ یہ روٹھا روٹھا سا انداز بنا رہا ہے کہ تمہیں میری کتنی فکر ہے۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری کا اند ڈگر پر تھا۔ وہی رنگ تھے۔ وہی ڈھنگ۔ لہجے میں وہی چاشنی تھی اور نظروں میں وہی تاثر خاص۔ میرب سیال اس کی سمت دیکھتی چلی گئی تھی۔

”کیا اب بھی ناراض ہو؟“ بہ غور اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا مسکرایا تھا۔ میرب سیال

چہرے کا رخ پھیرا تھا وہیں لہجے میں سر ہلا دیا تھا۔

”میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ ناراض نہیں تھی۔“

”اور اس کے باوجود تم میری طرف اس وقت نہیں دیکھ رہی ہو۔ گریزاں ہو اور مجھے نظر انداز

اسے ناراضگی نہیں تو اور کیا کہیں گے؟“ سردار سبکگین حیدر لغاری کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

میرب سیال کچھ بولے بغیر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

Piano کی ساری Black Keys ایک ایک کر کے ٹوٹ چکی ہیں۔ جدائی کا جوگت

بھیج رہا ہوں وہ میں نے سارے کا سارا White Keys پر Compose کیا ہے۔ یہ سوچ کر کہہ

Shawl کے بغیر بھی White Dress میں بہت خوب صورت لگتی ہو۔

کھلی کتاب کے کسی سرے سے ایک سوکھا گلاب یکدم ہی نیچے جا گرا تھا۔ اذہاں حسن بخاری

کر اس سوکھے پھول کو اٹھایا تھا اور بہ غور تنکے لگا تھا۔

”تمہیں لڑکیوں میں سب سے اچھی بات کیا لگتی ہے؟“

”لڑکیوں میں؟“ اس کی آواز حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”کیوں۔۔۔ اس سوال میں اتنا عجب کیا ہے؟“

گدازلب پکیا رہے تھے۔

بہت کچھ کہنے کی خواہش تھی مگر لبوں پر کوئی ایک لفظ بھی نہ تھا۔ سر بہت ہولے ہوئے لٹی میں مل رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں نے اس چپکتے چاند سے چہرے کو اپنے حصار میں لیا تھا۔ بھگتی پلکوں کی لرزش بگھو اور بھی بڑھ گئی تھی۔

”یہاں جا رہے ہو؟ کھانا لگ چکا ہے۔“

”نہیں می! اپاپا کا فون آیا ہے۔ ایک اہم میٹنگ ہے۔ مجھے جانا ہوگا۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ تیزی سے ل گیا تھا۔

اعتبار و اعتباری کے درمیان لٹکے رہنا آسان نہ تھا۔ اس سے کہیں بہتر تھا کہ وہ اس تمام معاملے کو ایک طرف رکھ دیتی اور زندگی کو پھر سے ایک ڈگر پر لانے کی سعی کرتی۔ اس نے ایک بار خود کو پھر سجھایا اور کرایا تھا۔ سبھوتوں میں اس طرح تو ہوا ہے۔ زندگی میں اس طرح کی مشکلیں تو سہنا تھیں۔ پھر کرنے سے اور جلنے کڑھنے سے فائدہ۔

حمام کا اہتمام لازم تھا۔ حکم تھا۔ سو وہ تھوڑی سی تیاری کے بعد باہر نکل آئی تھی۔ مگر سردار سبکدین حیدر ل نہیں تھا۔

”جانتی ہوئی اس کمرے تک آگئی تھی۔ چند لمحوں تک اسی طرح ساکت کھڑی رہی تھی۔ عجب شش و پنج کا انداز تھا۔“

”دروازہ کھولے یا نہ کھولے۔ اندر جائے یا کہ نہ جائے۔“

دل کے اندر لچر بھر کو ایک سکوت کا احساس ہوا تھا۔

اس نے اس قلیل لمحے میں جیسے سوچا تھا اور پھر کسی نقطے پر پہنچتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا۔ مگر آنکھیں ناکندہ خوف کے پیش نظر بہت زور سے میچ لی تھیں۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ اس نے بہت آہستگی سے چھی لوں کو کھول کر کمرے پر نگاہ کی تھی۔ کمرے میں کسی ممکنہ خطرے کا دور دور تک نام و نشان تک نہ تھا۔ بلکہ نظر گاہ نے دیکھا تھا اسے دیکھ کر کسی قدر حیرت نے گھیر لیا تھا۔

سردار سبکدین حیدر لغاری بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور اپنا ہاتھ دبانے کا اندھے پر رکھا ہوا تھا۔ چہرے کے تاثرات ظاہر تھا کہ وہ بہت تکلیف میں ہے اور بہت مشکل سے جھیل رہا ہے۔ وہ بہت سرعت سے آگے بڑھی تھی ایک لمحے میں اس پر جھکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”کیا ہوا؟ آریو آل رائٹ؟“

سردار سبکدین حیدر لغاری نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ٹیس۔ آئی ایم آل رائٹ۔ ڈونٹ یو وری۔“

سردار سبکدین حیدر لغاری نے اپنے معاملات سے اسے جیسے علیحدہ رکھنا چاہا تھا۔ میرب سیال کسی قدر نکل میں آگئی تھی۔

”کچھ بتائیں گے آپ مجھے؟ ہوا کیا ہے آپ کو؟“ وہ پلٹی تھی اور بہت سرعت کے ساتھ کوئی نمبر لے لگی تھی۔

”کیا..... کیا کر رہی ہو میرب؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے یکدم اس کا ہاتھ حمام لیا تھا۔ میرب لانے اس کی سمت دیکھا تھا اور بہت رسائیت سے بولی تھی۔

”اڈہان حسن بخاری اوقت گزر رہا ہے۔ یہ ٹیل بیت گئے تو کچھ لمحے ہاتھ سے سرک رہے تھے۔“

”اڈہان حسن بخاری نے تصویر ہاتھ میں لے لی تھی۔ ایک چہرہ اس کے سامنے تھا۔ تابنا کی بلا کی تھی۔ مگر اس کے تصور میں انہی دو بھگی پلکوں کا پہرہ تھا۔“

”یہ لمحے جب تم میرے سامنے ہو، میرے پاس ہو، میرے قریب ہو۔ یہی لمحے میرے لئے زندگی ہیں۔ مجھے جی لینے دو۔ ان آنکھوں میں لحوہ کوئی سہی۔ میں اپنے عکس کو تمہاری آنکھوں میں دیکھتا رہتا ہوں۔ تمہارا چہرہ میرے سامنے ہوتا مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔ یہ آنکھیں کچھ یاد نہیں رہنے دیتیں۔ میں انکھوں میں جینا چاہتا ہوں۔ مجھے جی لینے دو۔ لحوہ کوئی سہی۔ حسین اور دل پذیر ہوں۔ اپنے سارے رنگ لحوں میں جینا چاہتا ہوں۔ مجھے جی لینے دو۔ لحوہ کوئی سہی۔ میں انکھوں کو روک لینا چاہتا ہوں۔ اپنے آنکھوں کو بخش دو۔ دان کر دو اپنی ساری دکھی اس وقت کو۔ میں انکھوں کو روک لینا چاہتا ہوں۔“

”میں آسمان کے تمام تارے چن لینا چاہتا ہوں۔ یہ اپنی آنکھوں کے جگنو مجھے سوئپ دو۔ تمہارا لحوہ کی یاد اپنے دل میں محفوظ کر لینا چاہتا ہوں۔ مجھے اجازت دو۔“ ایک جنوں فضا میں ڈوب اُبھر رہا تھا۔

وقت کی ساعتیں تھم گئی تھیں۔ نبضیں جم گئی تھیں۔ سانسیں رک گئی تھیں۔ تمام منظر جم گئے تھے۔ وہ مہبوت سا کھڑا تھا۔

پرسنل سیل یکدم ہی بجنے لگا تھا۔ اڈہان حسن بخاری جیسے ایک گہرے خواب سے بیدار ہوا تھا۔ تصویر ڈائری میں رکھی تھی اور ڈائری بند کر کے سائیڈ کی دراز میں ڈال دی تھی۔

”ہیلو۔ جی، آئی ایم ریڈی ٹو میٹنگ۔ جی، آپ بات کر لیں۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکلا۔

گیا تھا۔ کچھ دیر قبل والا ہر تاثر چہرے سے معدوم ہو چکا تھا۔ فارحہ نے بیٹے کو میٹرھیال اترتے دیکھا تھا۔

”میں ڈاکٹر کو کال کر رہی ہوں۔“ ہاتھ بدستور اس کے ہاتھ پر تھا۔ سردار بنگلیں حیدر لغاری نے بے دیکھتے ہوئے سرٹنی میں ہلایا تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر سے کنسلٹ کر چکا ہوں اور میڈیسن بھی لے چکا ہوں۔ آرام آنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔“ وضاحت دیتے ہوئے بھی اس کا نازک ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ پر تھا۔

میرب سیال نے خاموشی سے اس کی سمت دیکھا تھا۔ سردار بنگلیں حیدر لغاری نے اسے بہت آہستگی سے اپنے پاس بٹھالیا تھا۔ تکلیف کے آثار اب بھی اس کے چہرے پر تھے۔

”ٹھیکس فورس کیمر۔ مگر اب میں ٹھیک ہوں۔ پہلے سے کہیں بہتر۔ تم آگئی ہونا۔“ تکلیف بھی شرارت سے باز نہیں رہا تھا۔ مسکرایا تھا۔ مگر میرب سیال کے لبوں پر خاموشی تھی۔

”تم نے دروازہ اتنا ڈرتے ڈرتے کیوں کھولا؟۔ مجھ پر کیا اب تک اعتبار نہیں آیا؟ خدشہ ا قدر تھے کہ دل کی مانگا گوارہ نہیں کیا؟“ سردار بنگلیں حیدر لغاری اپنے سامنے موجود چہرے کو بغور دیکھا ہوئے دریافت کر رہا تھا۔

مگر میرب سیال کچھ نہیں بولی تھی۔ اسی سادگی چپ کے ساتھ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی اور آہستگی بولی تھی۔

”ایسا پہلی بار ہوا ہے یا اس سے قبل بھی یہ کیفیت رہی ہے آپ کی؟“

”مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟“ مدہم لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”اگر تکلیف تھی تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ میرب سیال نے اس کی سمت دیکھے بغیر کہا تھا۔ سردار بنگلیں حیدر لغاری نے اس کے چہرے کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کا رخ اپنی سمت کر لیا تھا۔

”مجھ پر اعتبار تو نہیں تھا۔ تم کیا سمجھ رہی تھیں، کیا میں کسی کے ساتھ بڑی تھا؟“ براہ راست اس آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ میرب سیال نگاہ چراگئی تھی۔ کچھ نہیں بولی تھی۔ سردار بنگلیں حیدر لغاری نے اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے لیا تھا۔

”کیا وہ اعتبار اتنا کچا تھا میرب سیال؟۔ کیا وہ محبت اتنی کمزور تھی؟“ مدہم لہجے میں کوئی ٹکانہ تھی۔ مگر میرب سیال چہرے کا رخ پھیرے بیٹھی تھی۔

”آپ نے بتایا نہیں، آپ کو یہ مسکولر پن کب سے تھا؟“

سوال بالکل مختلف سمت کا تھا اور سردار بنگلیں حیدر لغاری کے لبوں پر بہت دہمی سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

”اتنی فکر ہے تو پھر یہ گریز کیوں میرب سیال؟“ لہجہ مدہم تھا۔ کسی سرگوشی سا۔ ”اتنی محبت ہے تو پھر یہ اتنی دوری کیا ہے میرب سیال؟ کیوں میں پلٹ کر تمہاری طرف دیکھتا ہوں تو تمہیں میلوں کی نہیں، صدیوں کی دوری پر کھڑا پاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے پاس نہیں ہو، میرے ساتھ نہیں ہو۔ ایسا کیوں ہے؟“

ایسا اس لئے ہے؟ اسباب واضح کرو تو کوئی تدبیر بھی کی جائے۔ مگر تم خاموشیوں میں گھری کھڑی ہو۔ چپ کے ساتھ۔ مجھے بتاؤ، نشانہ ہی کرو میرب سیال! میں تخمینہ لگاؤں گا۔ کوئی سدباب ڈھونڈوں میں کروں گا وہ سارے گلے دور کر سکوں۔ شکوے مناسکوں۔ صرف ایک بار کہو۔ فقط ایک بار بتاؤ۔

دل تک جانے والے رستوں پر میری رہنمائی کرو۔ میں تمہارے دل کو چھونا چاہتا ہوں۔ اترنا چاہتا ہمارے دل میں۔ اپنے دل تک آنے والے راستوں کا تعین کرو میرے لئے۔ مجھے سمجھاؤ، کیسے جیتوں میں یہ دل؟ کیسے تمہیں پاس رکھتا ہوں؟ میں تم سے روح کا رشتہ چاہتا ہوں میرب سیال! دل کا تعلق ہوں۔ بتاؤ مجھے، تمہارے دل تک پہنچنے کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟۔ کتنے آگ کے دریا پار نہ ہوں گے؟۔ کتنے سمندر پارٹنے ہوں گے؟“ مدہم لہجے میں ہزار ہا خواہشیں تھیں اور لاتعداد

مگر میرب سیال خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔

”تمہیں کیا لگا میرب سیال! میں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں؟“ بہ غور اس کی سمت دیکھتے ہوئے سوال کیا وہ کچھ نہیں بولی تھی۔

ایک بات کہوں میرب؟“ بہت آہستگی سے پکارا تھا مگر وہ نگاہ پھیرے رہی تھی۔

پلیز، میک ٹرسٹ، آئی ایم یور۔ ایک مدہم سرگوشی تھی۔ ایک یقین تھا۔ میرب سیال نے اس کی سمت دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مگر سردار بنگلیں حیدر لغاری نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”آپ..... آپ کو آرام کرنا چاہئے۔“ ملنے بغیر کہا تھا۔

اور تمہیں اعتبار۔“ سردار بنگلیں حیدر لغاری مسکرایا تھا۔ میرب سیال نے چہرے کا رخ پھیر کر اس کی دیکھا تھا۔ سردار بنگلیں حیدر لغاری بہ غور اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”کیوں یو گیوی، جسٹ ون لٹل فیور؟“ مدہم لہجے میں دریافت کیا تھا۔ میرب سیال چونک پڑی تھی۔

”کیوں یو اسائل۔ اسائل فورنی؟“ سردار بنگلیں حیدر لغاری کے لہجے میں ایک درخواست تھی۔

میرب سیال نے اس کی سمت دیکھا تھا اور پھر بہت دہمی سے مسکادی تھی۔

”سوئیٹ تھینکس! ناؤ یو لک لائیک اے مائے پرنس۔“

”آپ کو آرام کرنا چاہئے۔“ تھوڑی دیر بعد ہم ڈر ساتھ کریں گے۔“ میرب سیال نے مدہم لہجے میں کہا تھا۔

”شکوے اور شکایتوں کے ساتھ؟“ سردار بنگلیں حیدر لغاری مسکرایا تھا۔ میرب سیال نے اس کی طرف دیکھا اور دونوں ہنس دیئے تھے۔

”ایک بات کہوں۔“

”ہاں۔“

”مجھے تمہارا ہنسا، اس طرح اچانک ہنسا بہت اچھا لگتا ہے۔ تم اس لمحے میری آنکھوں میں دیکھ کر جان لو کہ تمہارا چہرہ دلکشی سے کتنا بھر چکا ہے۔“ سردار بنگلیں حیدر لغاری بولا تھا۔ میرب سیال نے مسکراتے

لب بھینچ لئے تھے اور پھر بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال کر باہر نکل آئی تھی۔

عجب ایک احساس جرم اُسے ہو رہا تھا۔ عجب ایک احساس گناہ اُسے ستا رہا تھا۔ حالانکہ غلطی اس کی کہیں بھی نہیں تھی۔ کہیں پر بھی اس سے کوئی مس ٹیک نہ ہوئی تھی۔ مگر اس کے باوجود خمیازہ وہ بھگت رہتی تھی۔ وہ سر بھکائے بیڑھیوں پر خاموش بیٹھی تھی جب اوزی چپتا ہوا اس کے پاس آن بیٹھا تھا اور کان کی کپ مکرراتے ہوئے اس کی سمت بڑھا دیا تھا۔

”آج بہت روز بعد تم کیپس لگی تھی نا؟“

انا بیہ شاہ نے اس کی سمت دیکھا تھا اور لب بھینچ کر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”یہ نہیں۔۔۔ مجھے تو ہر دن ایک سزا کی طرح ہی لگتا ہے۔“

”لامعقن ملی تھی؟“ اوزی نے دریافت کیا تھا اور انا بیہ شاہ نے سر نہی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ میں نے کوشش ہی نہیں کی اس سے ملنے کی۔ گئی تو وہ کہیں آگے کی رو میں تھی اور اب میں اتنی بڑی ہو گئی کہ سر اٹھا کر دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ کئی روز کے لیکچر مسنگ تھے اور بہت ڈیجر کام جمع تھا۔“ وہ ڈھیروں وضاحتیں دیتے ہوئے یکدم ہی تھکنے لگی تھی۔ اوزی نے اس کی سمت دیکھا تھا مسکرا دیا تھا۔

”تم اتنی چھوٹی سی بات ہنس کر نہیں کہہ سکتیں کہ تم میں ہمت نہیں تھی اس کا سامنا کرنے کی؟“ اس کا دلایا تھا۔ انا بیہ شاہ نے اس کی سمت جیسے چونکتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر عجب ایک وحشت سے مسکرا دی تھی۔

”ہاں، غالباً اسے بڑی اور کم ہمتی ہی کہتے ہیں۔“ عجب ایک بے بسی اس کے چہرے پر تھی مگر وہ رہی تھی۔

”ایسا کب تک چلے گا انا بیہ شاہ؟“ تمہیں نہیں لگتا اب تمہیں کسی قدر بہادر اور دلیر ہو جا چاہئے؟“

”ہاں۔“ وہ یکدم مسکرا دی تھی۔ ”میں بھی یہی سوچتی ہوں۔ مجھے آج غازی کی بہت یاد آرہی ہے۔“

اکثر کہتا تھا، جو لوگ خود سے اور دوسروں سے ڈرتے ہیں ان کی ساری زندگی بھاگتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ اور وہ غلط قطعاً نہیں کہتا تھا۔ وہ جیسے اعتراف کر رہی تھی۔ اوزی نے اسے خاموشی سے دیکھا تھا اور اس کا

چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔

”اوزی! مجھے احساس گناہ ستا رہا ہے۔ مجھے ہر کسی کی نگاہیں اترام دیتی لگ رہی ہیں اور ایسا صرف ایک شخص کے باعث ہے۔ اس نے ایسا کیوں کیا اوزی؟“ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟

وہ بہت آزرده لگ رہی تھی۔ عجب اُلجھی اُلجھی سی۔

اوزی اس کا موڈ بدلنے کو مسکرا دیا تھا۔

”کہیں باہر چلیں؟“ آؤنگ پر؟“

انا بیہ نے سر نہی میں ہلا دیا تھا اور چہرے کا رخ پھیرتے ہوئے بولی تھی۔

ایسا کب تک چلے گا اوزی؟ کب تک میں لوگوں سے بھاگتی رہوں گی اور ڈرتی رہوں گی؟ مجھے یہ ہی کرنا ہوگا۔ اور ایسا بہت جلد ہو جائے تو اچھا ہے۔“ اس نے جیسے ایک نقطے پر بچتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے تمام صورت حال کو بس میں کرنا ہوگا اوزی!۔۔۔ مجھے سب پہلے جیسا کرنا ہوگا اور میں ایسا نہی کروں گی۔“ اس کا لہجہ عزم اور مضبوط تھا۔

انا بیہ شاہ! بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ کوئی انسان لائیک اے ڈش نہیں ہوتا کہ تم اسے گارنٹ کر کے کے بھی دسترخوان پر رکھ دو۔ انسان، انسان ہوتا ہے اور اس کی اپنی مرضی اور خواہش بھی ہو سکتی ہے۔ ہولی سی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی ہے؟“ اوزی نے اُسے باور کرایا تھا۔

”تم کسی کو بھی اپنی مرضی کے مطابق نہیں چلا سکتی ہو انا بیہ شاہ! ایسا ممکن نہیں ہے۔ بات اگر عقل و خرد کی ہے۔ یہ برین واشنگ ممکن ہو سکتی ہے۔ مگر بات اگر دل کی ہو تو کیا کرو گی تم؟ کیا زبردستی کسی کو مجبور کر

کر کوئی اپنی سمت بدل لے یا کسی اور کی سمت لوٹ جائے۔ اگر اسے وہاں رہنا ہوتا تو وہ وہاں سے کوچ ہی کیوں؟ خیمے اکھڑنے کی کوئی تو حقیقت ہوگی انا بیہ شاہ! اتنی چھوٹی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی کیا تمہیں کرو گی تم؟ تمہیں نہیں لگتا یہ تمہاری مزید حماقت ہوگی اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے تو کہیں ہو گا تم صورت حال کو جیسی ہے جہاں ہے اسی طرح، اسی حالت میں چھوڑ دو۔ بعض اوقات اس طرح بہت سی باتوں کا حل نکل آتا ہے۔“

”اور لامعقن؟ اس کا کیا کروں میں؟۔۔۔ میں اس کا سامنا نہیں کر پارہی ہوں۔ اس کے معقول کیا ہے تم؟“

”اس کے سوا کچھ نہیں انا بیہ شاہ! کہ تم حماقتوں پر حماقتیں کر رہی ہو۔ جو شے تمہارے بس میں نہیں ہے کرنے کی کوششیں مت کرو۔ دریاؤں کو اٹلے بہاؤ پر بہنے کے لئے کبھی مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ہی لے کر رخ بدلے جاسکتے ہیں۔“

”اور یہی بات انا بیہ شاہ سمجھ نہیں رہی ہے۔“ ان دو کے علاوہ ایک تیسری آواز ابھری تھی اور دونوں پڑے تھے۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا تو عفنان علی خان کو وہاں موجود پایا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا، پُر عزم سا آگے آیا تھا۔

”دریاؤں کو اٹلے بہاؤ پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ہی ہواؤں کے رخ بدلے جاسکتے ہیں انا بیہ شاہ! تمہیں سمجھ لینی چاہئے۔“

انا بیہ شاہ کو اس لمحے اس کی وہاں آمد کی توقع نہ تھی۔ شاید یہی وہ کسی قدر حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ناٹلی خان اس کی سمت دیکھتے ہوئے بہت دھیمے سے مسکرایا تھا۔

”محبت ایسا دریا ہے

کہ بارش روٹھ بھی جائے

تو پانی کم نہیں ہوتا

محبت موم ہے انا بیہ شاہ!۔۔۔ دل میں بس یہی ہے تو دل کو بھی موم سا کر دیتی ہے۔ موم کو اپنی مرضی سے

موزا توڑا تو جاسکتا ہے مگر فقط محبت کے منتر کے ساتھ۔ جسے یہ ام آتا ہوگا اسی سے یہ دردا ہوگا۔ بصورت دیگر کوئی بھی امید رکھنا عیب ہے۔ کئی اسرار و حید ہیں محبت کے۔ کہاں تک سمجھاؤں تمہیں، کہاں تک بتاؤں کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ دل کو اپنے حاشیوں اور زادیوں پر چلانا ناممکن نہیں ہے۔ محبت ایک شوریدہ سبز ہے اور سمندر اپنے راستے خود آپ بناتا ہے۔ اپنی سمت خود آپ طے کرتا ہے۔ نہ تو تم کوئی سمت متین کرنا ہونہ ہی اسے کسی سمت بننے سے روک سکتی ہو۔ تو پھر یہ بے وجہ کی حماقتیں کیوں؟“ بہت کچھ باور کر والے لہجے میں کہتے ہوئے انا بیہ شاہ کو دیکھا تھا۔

انا بیہ شاہ یکدم ہی اٹھی اور چلتی ہوئی اندر کی سمت بڑھ گئی تھی۔ عفتنان علی خان اسی عزم سے مسکراتا تھا۔

دل کو اس راہ پر چلنا ہی نہیں
جو مجھے تجھ سے جدا کرتی ہے

اذہان حسن بخاری نے سگریٹ سلگا کر ڈیسر سا دھواں فضا میں منتقل کیا تھا اور اس دھوئیں میں کتے جا پھینکنے لگے تھے۔

”پاس ہوں نا۔ تمہارے ساتھ ہوں نا، اس لئے کوئی قدر نہیں ہے۔ تمہیں احساس تب ہوگا اذہان م بخاری! جب میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گی۔“ وہ چہرہ کچھ خفا خفا سادیکھ رہا تھا اور وہ مسکرا دیا تھا۔

”کیوں۔۔۔ کہاں جا رہی ہو تم؟“ انداز کچھ شرارت سے پڑھا مگر وہ خفا خفا سا چہرہ کچھ نہ بولا تھا۔

”دیکھو گی بھی نہیں میری طرف؟“

”تمہیں کیا لگتا ہے اذہان حسن بخاری! لمبے تمہاری گرفت میں ہیں؟ جادو کی چھڑی ہے تمہارے ہاتھ میں؟ تم جب چاہو گے چھڑی گھماؤ گے اور سب کچھ تمہارے بس میں ہوگا؟“ انداز ڈپٹے والا تھا مگر وہ مسکرا دیا تھا۔

”وقت ہی تو ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہاتھ میں چند لمبے بھی ہوں تو انہیں صدیوں پر محیط کر لوں گا۔“ گھڑیاں نواز دو، پھر دیکھو اذہان حسن بخاری کیا کچھ کر سکتا ہے۔“

”تم چاہتے ہو میں تمہیں آزماؤں؟“ وہ مسکرائی تھی۔

”چاہو تو آزماؤ۔ حرج کیا ہے؟ نتائج تو حسب نشا اور تمہارے حق میں ہی نکلتا ہیں۔“ وہ سر ہلانے اچکا تا ہوا بولا تھا اور وہ ہلکھلا کر ہنستی چلی گئی تھی

”تم چاہتے ہو الزام بھی آئے تو میرے سر آئے۔“

”ایسا میں ہونے نہیں دوں گا۔ تمھی تو شرط ہے۔ آزماؤ۔“

”سوچ لو۔۔۔ وقت پڑنے پر کہیں بدل تو نہیں جاؤ گے؟“

”جو بدل جائے وہ اذہان حسن بخاری نہیں ہوگا۔“ وہ دعوئی کر رہا تھا۔

وہ مسکرا دی تھی۔ پھر سرٹنی میں ہلانے لگی تھی۔

۔۔۔ آزمائش پر یقین نہیں رکھتی۔ محبت میں یہ شرط نہیں آنا چاہئے۔ یہی کیا، محبت کو تو ہر شرط سے اڑھانا چاہئے۔ محبت باندیوں سے آزاد ہونی چاہئے۔ ایسے ہی جیسے یہ ہوا، جیسے یہ پانی اور.....“

”اور جیسے یہ تمہاری مسکراہٹ۔ تمہاری ہنسی تمہارے لبوں سے آزاد ہوتی ہے تو کتنے پھول چار سمت کھلا ہے۔“ وہ مسکرایا تھا اور وہ ہلکھلا کر ہنس دی تھی۔

”ہاتھیں بنانا تو کوئی تم سے کیسے۔“

”اور محبت کرنا؟“

وہ لہجہ بھر کر کی تھی، پھر سر ہلاتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”ہاں، محبت کرنا بھی۔ صرف تم سے۔“ مدہم لہجہ اعتراف سے پڑھا اور وہ سرشار سا مسکرا دیا تھا۔

”ایک بات بتاؤ گے؟“

”پوچھو۔“

”تم نے کبھی سوچا ہے، اگر ہم نہ طے تو دنیا کیسی ہوگی؟“

”نہیں۔۔۔ میں یہ سوچنا نہیں چاہتا۔ اور تم بھی مت سوچو۔ ابھی تو یہ سب مسکراتے ہوئے کہہ رہی جب جبر پھیلنا پڑے گا تو علم ہوگا، محبت آسان نہیں ہے۔“

وہ جتا رہا تھا اور وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

”کیا پتہ، کہیں کوئی تم سے بھی زیادہ چاہئے والا میری راہ تک رہا ہو۔ کہیں کوئی ہو جسے صرف میرا انتظار.....“

اور اس کی بات ختم ہونے سے قبل ہی اذہان حسن بخاری نے اپنا ہاتھ اس کے لبوں پر رکھ دیا تھا۔

”ایسی بات مذاق میں بھی نہیں، ہاں۔ اس دنیا میں بہت سے چہرے، بہت سے نام ہوں گے مگر اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک میں فقط ایک نام ہی پکاروں گا۔ میرے جہانوں میں یہاں سے ایک صرف ایک نام کی بازگشت ہوگی اور وہ نام صرف اور صرف تمہارا ہوگا۔“ ان نازک شانوں پر ہاتھ نہ ہونے وہ باور کر رہا تھا۔

”راستوں کو علم ہے، ہمیں جس سمت جانا ہے۔ ہمارے قدموں سے لپٹے ہوئے تمام راستوں کو خبر ہے نہیں منزلوں پر ختم ہونا ہے۔ سو تم بھی اس دل کو فکروں سے آزاد کر لو۔ یہ آنکھیں اتنی شفاف آئینہ سی ہیں ان میں تیرے خدشے کچھ اچھے نہیں لگتے۔“ وہ بولا تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

”مجھے لگتا ہے اذہان حسن بخاری! تم پاگل ہو، جو سنتے کم ہو اور بولتے زیادہ ہو۔“

”ہاں، پاگل تو ہوں۔ مگر صرف تمہارے لئے۔“ سر تسلیم خم کیا تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

”اذہان!“

”ہاں؟“

”اذہان!“ کسی نے اسے جیسے بیدار کر دیا تھا۔ یادوں کا سرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ اس نے مار کر دیکھا تھا۔ کمرے میں ایک سکوت تھا اور ساہیہ خان اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”اذہان! کیا ہوا؟ ویز آریو؟“ اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔ اذہان سیدھا ہوا بیٹھا تھا۔
 ”تم سموکنگ کر رہے تھے؟“ کمرے میں اس قدر دھواں بھرا ہوا تھا۔ اس سے قبل تو تم نے بڑا
 سموکنگ نہیں کی۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟ اور یہ تم مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس قدر حیران کیوں ہو؟“ اور اذہان
 حسن بخاری نے جیسے اس گھڑی زبردستی مسکرائے کی کوشش کی تھی۔
 ”تم کب آئیں؟“

”کیا مطلب کب آئیں۔ کیا تم سو رہے تھے؟“ وہ مسکرائی تھی۔ ”ویسے کیا سمجھ رہے تھے تم؟
 نے کہہ دیا تم مجھے چاہو گے، نہیں تو کیا میں تمہیں چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاؤں گی؟“ وہ اپنے مزاج کے مطابق
 شے بہت لاسٹ لے رہی تھی۔

”بائے دی وے، مسئلہ کیا ہے؟ آئی بنا تاری تھیں تم بہت پریشان نظر آ رہے ہو ان دنوں۔ کہیں مجھ
 وحت تو نہیں ہوگی تمہیں؟“ وہ ٹھکانے سے مسکراتے ہوئے دریافت کر رہی تھی۔ انداز شرارت سے پڑتا تھا
 اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔
 ”مئی نے بلایا ہے تمہیں؟“

”ظاہری بات ہے۔ تمہیں تو یہ توفیق ہو نہیں سکتی تھی۔ دوست ہونے کا دعویٰ کرتے ہو اور کوئی بات نہ
 شیر نہیں کرتے۔ روٹھ گئی تو پلٹ کر پوچھا تک نہیں۔ کہا ہو گا اچھا ہوا جان چھوٹ گئی۔ کتنا تنگ کرتی تھی۔
 وہ بے ٹکان بول رہی تھی اور اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”سایہ خان نے چولے ہوئے منہ کے ساتھ خنگی سے پُر نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے نازک سا ہاتھ
 بڑھا کر اس کی پیشانی کو چھوا تھا۔
 ”بخارو خار تو نہیں ہے۔ دیکھنے میں بھی ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہو۔ پھر پر اہلم کہاں ہے؟ کہیں دائر
 تمہارے دماغ میں خلل تو واقع نہیں ہو گیا؟“ اس کی سمت دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ اذہان حسن بخاری
 مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔
 ”خلل..... خلل کیا؟“

”وہی جو چچا غالب نے فرمایا تھا۔ کیا تمہیں علم نہیں؟“ یکدم وہ چونکی تھی۔ کسی قدر حیرت سے اس کا
 سمت دیکھا تھا اور اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”میں پریشان ہوں۔ مجھے اور پریشان نہ کرو۔“ عجب شاعرانہ انداز میں وہائی دی تھی۔ سایہ خان
 گھورنے لگی تھی۔

”تم مرد بہت گھنے ہوتے ہو۔ دل میں کچھ، زبان پر کچھ۔ معاملہ ایسا تھا تو دل میں دبانے کا کیا
 ضرورت تھی؟ فارحہ آئی سے کہہ کیوں نہیں دیا؟“ سیدھا ساحل بتایا تھا۔
 ”کیا نہیں کہہ دیا؟“ وہ مسکرایا تھا۔

”ارے۔“ وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ ”اب کیا یہ بھی میں ہی بتاؤں؟ ایسے ہی تو چوزے ہوا
 تم۔ اندر ہی اندر کچھ پکڑی پکڑی ہے اور اب دیکھو کیسے معصوم بن رہے ہو۔ اچھا ہوا تم میرے پلے لیاں

ساری زندگی روتے ہوئے گزر جاتی میری تو۔ بالکل ناریل جیسے ہو۔ دھوکے باز۔ باہر سے کچھ
 ہے کچھ۔“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔
 ”تو تم نے دریافت کیا تھا۔“ سایہ خان چونکتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔ بات اپنی بابت کر رہا تھا۔ وہ سمجھ
 گیا۔
 ”کیا مجھے کبھی کوئی اختیار تھا؟“ الٹا سوال کر دیا تھا۔

اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔
 ”اختیار قائم کرنا چاہتی ہو؟“ شرارت آنکھوں میں لے بہ غور دیکھا تھا۔
 ”اختیار تو درم پر؟ مجھے جنسی لوگوں کو بھگتنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ کھسکے ہوئے لوگ اپنا سکون، اپنی زندگی تو
 نہ کرتے ہی ہیں دوسروں کا جینا بھی دو بھر کر دیتے ہیں۔ اور میں ابھی زندگی سے اتنی عاجز نہیں آئی
 یہ خدا کا شکر ہے، دماغ بھی بالکل درست ہے میرا۔ الٹا سیدھا کوئی اقدام کرنے کی نہیں ٹھان سکتی۔“
 اب بھی خنگی لے ہوئے تھا۔

”یعنی تم میں پاگلوں والی کوئی بھی نشانیاں نہیں۔ پھر تو بہت مشکل ہو جائے گی۔“ وہ بہ غور مسکراتے
 بشرارت سے گویا ہوا تھا۔
 ”کس معاملے میں؟“ وہ چونکی تھی۔

”تمہارے ساتھ بسر کرنے میں۔“ وہ بر ملا بولا تھا۔ سایہ خان کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں۔
 ”منووائے شخص! مجھے نہ تو خطرات سے کھیل کر گینٹر بک میں اپنا نام لکھوانے کا کوئی شوق ہے نہ ہی میں
 کوئی ایڈونچرس واقع ہوئی ہوں۔ تم اگر ماؤنٹ ایورسٹ بھی ہوتے تب بھی میں تمہیں سر کرنے کے
 اگلی نہ سوچتی۔“ وہ باور دہا کرتے ہوئے بولی تھی اور اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ملاحظہ ہوئے
 مارہ سکا تھا۔

بائے دی وے، میں باہر ہوں۔ فارحہ آئی کے پاس۔ تم تھوڑی دیر میں فریش ہو کر باہر آ جاؤ۔“ وہ کہہ
 لے لگی تھی جب اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
 اس کے باوجود بھی کہ میں دماغی خلل رکھتا ہوں اور ناریل کی طرح دھوکے باز ہوں، اندر سے کچھ،
 کچھ؟“ براہ راست آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

ہاں۔۔۔ اس کے باوجود۔“ وہ مسکرا دی تھی۔ ”اب جیسے بھی ہو، دوست ہو میرے۔ اور میں اپنے
 اوتھان نہیں چھوڑ سکتی۔ چاہے تم مجھ سے کچھ کہو یا نہ کہو۔ کچھ شیر کرو یا نہ کرو دگر میں جانتی ہوں دوست کو
 بل میں ایک دوست کی شدید ضرورت ہو سکتی ہے۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“ وہ کہتی ہوئی باہر
 گئی اور اذہان حسن بخاری اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

روکھو! کچھ ضرور تھی مگر کسی کی توجہ نے اس ڈور کو پھر سے کھٹکا دیا تھا۔ کسی قدر ہی سہی، زندگی پھر اس
 اہل آگ لگی تھی۔

”جو بل تمہارے ساتھ ہوتے ہیں، مجھے وہ سارے لمحے زندگی جیسے لگتے ہیں۔“ سردار بنگلیں لغاوی کہہ رہا تھا اور میرب سیال مسکرا دی تھی۔

”یوٹھ ٹیک ریٹ۔ ابھی ڈاکٹر سے میری بات ہوئی ہے۔ میڈیسن لینے کی اور بیڈ ریٹ لینے سے تاکیدی ہے۔“ انداز کسی قدر اپنائیت کا خاص آہنگ رکھتا تھا۔ سردار بنگلیں حیدر لغاری نے میڈیسن کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اسے بغور دیکھا تھا۔

”ایسے کیا دکھ رہے ہیں؟“ میرب سیال کی قدر چوگی تھی۔

”جمہاری آنکھیں۔“ سردار بنگلیں حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”آنکھیں؟“ میرب سیال حیران ہوئی تھی۔

”تم نے غالباً آج آنکھوں میں کچھ لگایا ہے۔“ بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔ میرب سیال نے اسے دیکھا تھا۔ پھر دھیان پھیر کر میڈیسن دراز میں رکھنے لگی تھی۔

”ہاں۔ غالباً کاجل کہتے ہیں اسے۔“

”کاجل۔“ وہ حیران ہوا تھا۔ ”تم نے آج سے قبل غالباً اس کا استعمال نہیں کیا۔ ہے نا؟“

”ہاں۔ آپ ڈر نہیں لے لیں گے اپنے روم میں یا پھر.....“ وہ روانی سے کہہ رہی تھی جب بنگلیں حیدر لغاری نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میرب سیال کی زبان وہیں اسی نقطے پر تالو سے جا چکی تھی۔ نگاہ یکدم ہی بھکتی چلی گئی تھی۔ انداز میں کچھ گریز در آیا تھا۔

”ایک بات پوچھوں؟“ بغور اس کے چہرے کو نکتے ہوئے کہا تھا۔

”جی۔“ میرب سیال کے دل کی دھڑکنیں یکدم ہی ارتعاش میں گھرنے لگی تھیں۔

”تمہیں یہ سب کیسا لگ رہا ہے؟“

”کیا؟“ ایک جھکی جھکی سی نظر سردار بنگلیں حیدر لغاری پر ڈالی۔

”بہی، میرے ساتھ رہنا، وقت گزارنا۔“ سردار بنگلیں حیدر لغاری نے اس کے چہرے پر آئی بالا ایک شریسی لٹ کو مضبوط ہاتھ سے کسی قدر پیچھے سرکایا تھا۔ میرب سیال کے دل میں یکدم ہی زبردوم اٹھا ہوا تھا۔ ”میرب سیال کی آواز کسی قدر دبی دبی سی تھی۔ سردار بنگلیں حیدر لغاری نے لمحہ بھر کورک کر دیکھا تھا۔ پھر جانے کیوں مسکرا دیا تھا۔

”یہ ضروری ہے کہ ملیں تو ساری رسی سی باتیں کریں، رسی موضوعات پر بات کریں؟ کیا ہم دوسرے کی بات نہیں کر سکتے؟ ایک دوسرے کے دل کی بات نہیں کر سکتے؟ تمہیں کیا اچھا لگتا ہے، کیا نہیں لگتا، کون سی باتوں پر تمہیں خوشی ہوتی ہے، کون سی باتوں پر اُنجھن ہوتی ہے، غصہ آتا ہے۔ تم نے کچھ نہیں بتایا۔“ سردار بنگلیں حیدر لغاری نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے مدہم لہجے میں کہا تھا۔

میرب سیال نے نگاہ اٹھا کر سردار بنگلیں حیدر لغاری کی سمت دیکھا تھا۔

”یہ باتیں کئی نہیں جاتیں۔ نہیں جاننے کی سعی بذات خود کرنا ہوتی ہے۔“ اظہار مدعا کیا تھا۔

سردار بنگلیں حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”ہاں، شاید۔“ وہ جیسے ہم خیال ہوا تھا۔ ”تم نے نہیں بتایا تمہیں مجھ میں کیا اچھا لگتا ہے۔“ دریافت کیا اور دوسرے ہی لمحے سرٹنی میں ہلاتے ہوئے وہ مسکرا دیا تھا۔

”تمہیں مجھ میں کوئی شے اچھی لگ سکتی ہے۔ غالباً یہ اپنے متعلق سب سے بڑی غلط فہمی ہوگی۔ تمہیں بھی کوئی بات مجھ میں اچھی لگی ہو۔ یا..... شاید..... کوئی بھی نہیں۔“ بے تاثر انداز میں شانے اچکانے

میرب سیال پر خیال انداز میں اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”کچھ اچھا نہیں لگتا؟“ سردار بنگلیں حیدر لغاری مسکرا رہا تھا۔ چہرے پر کسی قدر مصعومیت تھی۔ میرب ہاں لمحے خود کو مسکرانے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ سردار بنگلیں حیدر لغاری بھی مسکرا دیا تھا۔

”میں تمہارے چہرے پر اسی مسکراہٹ کو تلاش کر رہا تھا۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ تم جو خاموش رہتی ہو تو اس لٹ کے بھی کئی بھید ہیں۔ غالباً تم بہت مدبر ہو۔ ہر بات کو خاموشی سے سنی ہو، سوچتی ہو، نتیجہ اخذ کرتی گراے صیخہ راز میں رکھنا زیادہ اہم خیال کرتی ہو۔ سوچنے سمجھنے کا یہ انداز بھی اچھا ہے۔ مگر اس میں ان کا احتمال بھی ہے۔ تمہارے لئے تو نہیں، مگر ہم جیسے غیر مدبر لوگوں کے لئے۔ جو بات کو سوچے سمجھے پانچ سے منہ پر کہہ دیتے ہیں۔“ سردار بنگلیں حیدر لغاری کا انداز بہت اپنائیت لئے ہوئے تھا۔ لبوں پر اہٹ تھی۔ میرب سیال بہت دھیمے سے مسکرا دی تھی۔

”ابھی کچھ نہیں ہے۔“

”تو پھر کیسا ہے؟“ سردار بنگلیں حیدر لغاری نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ میرب سیال کچھ نہیں کہی۔

”میرب! کیا تم جانتی ہو، میں تمہارے لئے کیا سوچتا ہوں؟“

”میرا خیال ہے آپ کو اب آرام کرنا چاہئے۔“ میرب سیال نے بات کو اپنی مرضی کا اختتام دینے کا اٹھ جانا مناسب خیال کیا تھا۔ مگر سردار بنگلیں حیدر لغاری ان لمحوں کو جیسے ایک نیارنگ دینا چاہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھر دیا تھا۔ وہ جو اٹھنے والی تھی، چونک کر اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”یہ گریز، یہ انداز بیگانگی، یہ خاموشی، میرب سیال! اسے میں کیا سمجھوں؟ کیا نام دوں اسے؟ تمہارے ہا جو چپ کی کہانیاں ہیں انہیں میں کیا نام دوں؟ یہ تمہاری نگاہ کی انجھنیں، یہ پلکوں پر لدی اجنبیت، کیا نام دوں؟ یہ سب دانستہ ہے، کسی مصلحت کے پیش نظر ہے یا..... میرب سیال! تمہیں نہیں لگتا تم نے اور گرد خواہ خواہ کی بہت سی دیواریں اٹھا رکھی ہیں۔ خود کو بے مقصد کے الجھاؤوں میں الجھا رکھا ہے۔ تب بھی تمہارے پچھلے کو تکتا ہوں، مجھے تم ہزار ہا فکر میں گھری نظر آتی ہو۔ تمہاری یہ نگاہ مجھے کوئی شکوہ اٹھاتی دیتی ہے۔ تمہارے یہ لب، ان پر میں نے کسی خاموشی میں لپٹنے کئی سوال دیکھے ہیں۔ ان لمحوں کی چلتے سوال سننے ہیں۔ کئی شکایتیں سنیں ہیں۔ مجھے بار بار لگتا ہے میرب سیال! جیسے تم اپنے آپ ناخاموشیوں میں دفن کر رہی ہو۔ اور ایسا دانستہ ہے۔ کیا میرب سیال! کیا..... کیا بات ستاتی ہے؟ کس بات کی انجھن تمہیں اس گریز پر مائل رکھتی ہے؟ کیا بات ہے کہ تمہیں مسکراتا ہوا ہوتا ہے؟

ہنسنا یا دنیں رہتا۔ کیا تم اس درجہ میرے خوف کے زیر ہو؟ اس قدر ڈرتی ہو تم مجھ سے؟ یا پھر میں یا میرا تو تمہارے لئے اس قدر ناپسندیدہ ہے کہ تم.....“

”نہیں..... نہیں..... ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ یکدم باور کرانے کو بولی تھی۔ لحد بھر کو خاموشیاں کے درمیان پھیلنے لگی تھیں۔

میرب سیال خاموش ہو کر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں صرف زندگی کو برتنے کے انداز دیکھ رہی ہوں۔ آپ۔ آپ۔ آپ رویے، آپ سے منسوب سبھی باتیں، میرے لیے یہ سب ایک نیا تجربہ ہے۔ اور کسی بھی لڑکی کے لئے معاملات کو لے کر ایڈجسٹ کرنا آسان نہیں ہوتا۔“ وہ حقیقت حال کھتی ہوئی چہرے کا رخ پھیر گئی تو سردار سبتگین حیدر لغاری اس کے صبح پھرے کو یہ غور دیکھ رہا تھا۔

”یعنی تمہاری ساری الجھنیں میرے ہی باعث ہیں۔“ سردار سبتگین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔ ”تم؟“

اعتبار کرنے سے اب بھی ڈر رہی ہو۔ مجھے آزمانے سے خوف زدہ ہوا اور.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر دیا تھا۔

”کیا لگتا ہے تمہیں میرب سیال! کوئی دھوکا دوں گا تمہیں؟“ اس کی آنکھوں میں براہ راست جما ہونے دریافت کیا تھا اور میرب سیال کے پاس سوائے خاموشی کے اور کوئی جواب نہ تھا۔ نگاہوں میں حیرت در آئی تھی۔ گویا وہ اس کے مزاج کے موسموں کو سمجھنے لگا تھا۔

”حیران کیوں ہو یہ جان کر کہ میں تمہارے مزاج کے تمام موسموں تک رسائی رکھتا ہوں۔“ جانتا ہوں یا جاننے لگا ہوں۔“ وہ بہت سی اپنائیت اپنے لہجے میں سمیٹ کر رہا تھا۔ میرب سیال نے حیر مزید اظہار کرنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے نگاہ پھیر لی تھی۔

”تمہیں سردار سبتگین حیدر لغاری کیسا لگتا ہے میرب سیال؟“ سوال بہت واضح اور اچانک تھا۔ سبتگین حیدر لغاری جیسے تمام الجھنوں کی وضاحتیں آج ہی ڈھونڈ لینے کے درپے تھا۔

”کیا لگتا ہے، سردار سبتگین حیدر لغاری کیا ہے؟ کیا سوچتی ہو تم، بہت دھوکے باز ہے، کوئی بہت بڑا ہے، کیا جھوٹا ہے، مکار ہے، ظالم ہے، کنگ ہے؟“

”نہیں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”ہاں یا نہیں۔۔۔ میں تمہارا واضح جواب سننا چاہتا ہوں۔ کیا سوچتی ہو تم سردار سبتگین حیدر لغاری متعلق؟۔۔۔ جتنا عرصہ ہم ساتھ رہے ہیں، جتنا وقت ساتھ گزارا ہے اس سے کچھ تو اخذ کیا ہو گا تم کسی کو جاننے کے لئے، اپنا کچھ ماننے کے لئے اتنا نام کافی ہے۔ پھر تم..... تم کیسے ایسے الجھی رہ کر مجھے لگتا ہے میرب سیال! میں کوئی ظالم جا دوں کر ہوں جس نے تمہیں زبردستی اپنی قید میں بند کر رکھا، تمہارے سپنوں کو باندھ رکھا ہے۔ تمہاری آنکھوں کو نئے خواب پر دئے سے باز رکھا ہے۔ پند کر رہا تمہیں اپنا۔ جیسے یہ ریلو، یہ تعلق، یہ رشتہ سب زبردستی کا ہو۔۔۔ جیسے یہ تعلق نہ ہو، کوئی سمجھو تو سمجھو وہ جو دل پر کسی بوجھ کی طرح لدا ہو۔ میں اکثر سوچتا ہوں ریلوں میں ایک طرف جی ہے تو اس کا کوئی

راہ یا کوششوں کے باوجود اگر تم میری طرف نہیں دیکھتی ہو یا اگر براں ہو تو اس کے پس پردہ کوئی ہوگی۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ اس سب کا اصل سبب کیا ہے؟۔۔۔ میں اچھا ہم سفر بننے کی کوشش۔۔۔ چھوٹا اچھا ہم سفر بن نہیں پوارہ یا پھر کہیں کوئی کوئی بنا ہی مجھ سے سرزد ہو رہی ہے؟ میں مانتا ہوں میں نے ہی غلطیاں کی ہیں۔۔۔ بہت سی غلطیاں مجھ سے سرزد ہوئی ہیں۔ بہت سی غلطیوں کو میں نے بار بار اپنے منکر کیا۔۔۔ کیا کسی بات کا کوئی سدباب ممکن نہیں؟ باور کر دیا تھا میں نے کہ میری طرف سے جذباتی وابستگی فی الحال نہیں ہے۔ مگر آگے جا کر بھی نہیں ہوگی۔ کیا ایسا کہا تھا میں نے؟۔۔۔ میں فی کوئی بننے کی، قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ ایسا نہیں کہا تھا میں نے؟ پھر کیا میرب سیال! کیا نے کوشش نہیں کی تمہیں خوش رکھنے کی، تمہیں پیار دینے کی، تمہیں جاننے کی، تمہیں سمجھنے کی، تمہیں اپنانے اپنانے کی؟۔۔۔ بولو کیا سب کچھ نہیں کیا میں نے؟ کیا نہیں قدم بڑھایا ہمیشہ تمہاری طرف؟ کیا کوشی پذیرائی یا نہیں دینے پر لطف لگے یا تربیت.....؟“

ابول رہا تھا۔ جب میرب سیال نے اس کی بات کو کاٹنا چاہا تھا۔

”ایسا یقیناً ہوا ہے مگر.....“

سردار سبتگین حیدر لغاری نے اس کے شانے پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے تھے۔

”چپ رہو تم میرب سیال! فی الحال میری سنو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں، کیا کہا چاہتا ہوں۔ سنو یہ اور محسوس مجھے لگتا ہے تم جان بوجھ کر میری ہر کوشش کو ناکام بنانا چاہتی ہو۔ تم یہ کچھ دماڑ کرنا ہی نہیں چاہتیں۔“

لئے الزام دم تو ڈر رہے تھے سردار سبتگین حیدر لغاری کے لبوں پر اور میرب سیال حیرت سے گلگ اس کی دیکھ رہی تھی۔

”..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ میرب سیال کی آواز جیسے کسی پاتال سے آئی تھی۔

سردار سبتگین مسکرایا تھا۔

”بات اتنی مشکل تو نہیں کہ تمہاری سمجھ میں نہ آسکے؟“

”مجھے کی ہی تو کوشش کر رہی ہوں۔۔۔ آپ اتنے ہراساں الزام ایک طرف طور پر برائے اخذ کر کے ہر کیسے دھر سکتے ہیں؟۔۔۔ آپ نے کیوں سوچ لیا کہ میں اس تعلق کو قائم رکھنا نہیں چاہتی یا آگے نکل جا ہتی؟“ بہت سے سوالوں کی وضاحتیں مانگتے ہوئے وہ پُراعتاً نظر آ رہی تھی۔

سردار سبتگین حیدر لغاری کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی تھی۔

”تم حسین ہی نہیں، پُراعتاً ہی ہو میرب! اب خود ہی بتاؤ، بندہ قائل ہو کر نہیں؟“

”آپ بات کو مذاق میں ٹال رہے ہیں؟“

”نہیں ایسا لگ رہا ہے؟“ سردار سبتگین حیدر لغاری کے لبوں پر بدستور مسکراہٹ تھی۔

لگتا آسان ہے نا الزام عا کر کر دینا۔ کسی کی سنے بغیر، جانے بغیر، بڑے مزے سے ایک ایسی حتی لے دینا۔ کیا لگتا ہے سردار سبتگین حیدر لغاری! کچھ بزدلی نہیں یہ؟“ لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ لئے وہ نظر آ رہی تھی۔

”میرب!“ وہ چیخ پڑا تھا۔ عجب ایک جنونی انداز میں اسے شانوں سے قہام کر چھوڑ ڈالا تھا اور انتہائی غصے سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے باور کرایا تھا۔

”آئندہ یہ بات پھر مت کہنا۔“

میرب سیال نے اس کے ہاتھ بہت آہستگی سے اپنے شانوں پر سے ہٹا دیئے تھے۔ اور بہت رسائیت سے بولی تھی۔

”بے بنیاد اور بے سبب الزام پر غصہ اسی طرح آتا ہے نا؟ آپ کیوں سمجھتے ہیں کہ ہر بات کا اتنا صرف آپ کو ہی حاصل ہے۔ لبرل ہیں نا۔ کچھ براڈ مائنڈ بھی ہو جائیے۔ اگر آپ شوہر ہو کر الزام عائد کر سکتے ہیں تو میں بیوی ہو کر ان سوالوں کی بلکہ ان الزاموں کی وضاحت بھی مانگ سکتی ہوں۔ غصہ صرف مہنتی نہیں آسکتا۔ ایک عورت کو بھی آسکتا ہے۔“

سردار سبٹنگین حیدر لغاری نے بہت جارحانہ انداز میں اسے دبوچا تھا۔

آنکھوں میں حد درجہ اشتعال دکھائی دے رہا تھا۔ وہ واقعی اس لمحے شدید ترین غصے میں تھا۔ میرب بہت اطمینان کے ساتھ اس کی سمت دیکھتی رہی تھی۔ سردار سبٹنگین حیدر لغاری ماسوائے اسے دیکھنے کے کچھ کر سکا تھا۔ دانت چھیچھی کر غصے کی انتہائی کیفیت کو ایک لمحے میں دباتے ہوئے اس کے بازو کو ایک جھلکے چھوڑا تھا اور کمرے سے نکل گیا تھا۔



یہ آج کل کہاں ہوتے ہو تم؟ — کیا وہ بات واقعی سچ ہے؟“ آکس کریم لیتے ہوئے ساہیہ لڑائی تھی۔

”یوں ہی بات؟“ وہ چونکا تھا۔

وہی دماغ کے خلل والی۔ کہیں واقعی تم.....“ ساہیہ خان نے شرارت سے مسکراتے ہوئے جملہ پھوڑ دیا تھا۔

”لیکن کوئی بات نہیں ہے۔“ اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”لیا ہو بھی نہیں سکتی؟“ ساہیہ متواتر شرارت کے موڈ میں تھی۔ اذہان حسن بخاری ہنس دیا تھا۔

”ہوگا دینا زیادہ آسان ہوتا ہے ساہیہ خان! یاد دھوکا کھانا؟“

”نہیں — کبھی اتفاق نہیں ہوا۔“ شانے اچکا دیئے تھے۔ ”مگر میں جو دیکھ رہی ہوں وہ کسی اہکائی زیادہ باعث حیرت ہے۔“

”لیا؟“ اذہان حسن بخاری چونکا تھا۔

”تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

لی چوری، چپکے چپکے کے سوچتے رہتے ہو اذہان حسن بخاری؟“

ماہیہ! ہوا میں تیر مت چلاؤ۔“ وہ محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

یہ خان ہنس پڑی تھی۔

”واہ! تیر نہ چلاؤں تو اور کیا کروں؟ تم نے مجھے بتایا بھی تو کچھ نہیں؟“

”اس کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں کہ یومیک گیسز لائیک اے فول۔“ اذہان حسن بخاری نے دہائی

”تم جو سب کو فول بنا رہے ہو، اس کا کیا؟“

لی کسی کو بے وقوف نہیں بنا رہا۔“ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے وضاحت دی تھی۔ مگر لی مسکرا دی تھی۔

لی چاہ رہا ہے اذہان حسن بخاری! ایک پوری تحقیقاتی کمیٹی بنا کر تمہارے پیچھے لگا دوں۔ کتنے پورے ہو ان دنوں تم۔ احساس ہے تمہیں؟“

اذہان حسن بخاری مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”تمہیں اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے، اگر کچھ ہے بھی تو۔“

”کیا نہیں ہونی چاہئے؟ دوست ہو تم میرے۔ تمہاری فکر میں نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا؟“

”اور کون کرے گا؟“ اسی کے انداز میں وہ کہتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”وہی کرے گی نا، جسے کرنا چاہئے۔ جسے تم اپنے خیالوں میں دیکھ رہی ہو۔“ انداز کسی قدر شرار

سے پڑ تھا۔ ساہیہ خان ہنس دی تھی۔

”تم نے یہ سوچا بھی کیسے؟“ حیران ہوا تھا۔

”کیوں — تم محبت نہیں کر سکتے؟“ ساہیہ نے آنکھوں میں براہ راست دیکھا تھا۔ اذہان

بخاری کچھ سوچتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے، محبت یونہی چلتے پھرتے ہو سکتی ہے؟“ وہ اب بھی سنجیدہ نہ تھا۔

”میرا نہیں خیال محبت کرنے کے لئے کسی لمبی چوڑی پلاننگ کی یا فرصت کی ضرورت پیش آ سکتی۔“

”تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ — تم نے تو کبھی محبت کی بھی نہیں۔“ اس نے بات کو مذاق میں اڑانا

تھا۔ ساہیہ خان ہنستی چلی گئی تھی۔

”سچ بتاؤ اذہان! مجھے جو رد کر رہے ہو تو اس کے پیچھے واقعی کوئی ایسا ہی ریزن تو نہیں؟“

”اگر ہو بھی تو کیا ہو سکتا ہے؟ تمہیں عادت ڈالنا ہوگی۔“

”برداشت کرنے کی؟“

”آف کورس۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہو گا تا تمہارے پاس۔“ اذہان حسن بخاری ہنس دیا

”تم سیریس مت ہو جانا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر لے لینے کی عادت ہے تمہاری۔“

”عادت نہیں، تم نے عادی بنا دیا ہے۔ تم ہمیشہ چونکا دینے والی باتیں کرتے ہو۔ بندے کا دل

ہوتے ہوتے رہ جائے۔ لکھ کے رکھ لو، وہ جو کوئی بھی ہے بہت بری گزرنے والی ہے اس بے چارے کی

اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”تمہارا بزنس پلان کہاں تک پہنچا؟ بہت دنوں سے کچھ ڈسکس نہیں کیا تم نے۔“

”بہت دنوں سے تم نے وقت ہی کب دیا ہے؟“

”ہاں، سوری۔ شاید میں ہی بہت بزی رہا۔ مجھے بھی دھیان ہی نہیں رہا۔“

”کس کا؟ — میرا یا میرے بزنس پلان کا؟“ ایک لطیف سا طنز ہوا تھا۔ اذہان حسن بخاری

تھا، پھر مسکرا دیا تھا۔

”دونوں کا۔ اس اعتراف پر تم کوئی جرمانہ لگانا چاہو تو لگا سکتی ہو۔“

”تم اتنی بہادری سے سچ بولتے ہو کہ سننے والا حیران رہ جائے۔ مگر جب حیرت سے باہر نکلے تو

داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ تم واقعی ناریل جیسے دھوکے باز ہو۔ اندر سے کچھ باہر سے کچھ۔“

اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔



بھاری آنکھوں سے میری آنکھوں تک

لپٹے بنتے ہیں جو

وہ بننے دو

رابطے بنتے ہیں جو بننے دو

دلوں کے درمیان دیواریں اٹھنے سے

بہت سے خواب رُوٹھ جاتے ہیں

ہاتھ سے ہاتھ چھوٹ جانے سے

ناہے دل بھی ٹوٹ جاتے ہیں

غواب رُوٹھ جاتے ہیں

غواب کی مسافت کو

دل سے دل تک لانے کو

مجھ کو ایک لمحہ دو

”تمہیں نہیں لگتا، معاملہ بہت زیادہ الجھا دیا ہے تم نے؟“ اوزی نے کہا تھا اور عفنان علی خان مسکرا دیا

”کیا کروں اب جو الجھ گیا ہے سب۔ دلوں کے معاملات میں ایسا تو ہوتا ہی ہے میرے بھائی؟“

”یہ ٹھیک نہیں ہو عفنان! بہت قلیل لمحوں میں تم سب کچھ اپنے بس میں کرنے کے خواب دیکھ رہے

عفنان علی خان ڈراؤ کرنا ہوا رسائیت سے مسکرا دیا تھا۔

”تو کیا یہ غلط ہے؟ — ہاں، دیکھ رہا ہوں میں خواب۔ مگر سب کے سب اتنا بیہ شاہ کے حوالے

بہت قلیل لمحوں میں ٹپتی تھی وہ مجھ سے۔ بہت قلیل لمحوں میں، میں نے اُسے جانا اور انہی قلیل لمحوں

بنی ساری زندگی اس کے نام کر دی۔“ عفنان علی خان کا لہجہ عزم سے پڑ تھا۔

اوزی مسکرا دیا تھا۔

”عفنان! مجھے یقین نہیں ہو رہا، تم جیسا بندہ ایسا بھی سوچ سکتا ہے، ایسے اقدامات بھی کر سکتا ہے۔ تم

ہوتا جس نے بزنس کے علاوہ کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا آج تک۔ جسے اشاک اکیچینج کے اکاؤنٹی

ل کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہ تھا۔ معلوم ہی نہ تھا کچھ۔“

”ہاں، نہیں معلوم تھا کچھ۔“ عفنان علی خان نے ایک لمحے میں اوزی کی بات رد کی تھی۔ ”ہاں، نہیں

معلوم کچھ بھی نہیں جانتا تھا میں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ مگر اُس کی ایک نگاہ بے خبر نے سب بتا دیا۔

ایسا سب کچھ۔ وہ بھی جو میں سمجھتا تھا اور وہ بھی جو میں نہیں سمجھتا تھا۔ تمہیں کیوں لگ رہا ہے اوزی!

نئے کچھ غلط کیا، کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ میں نے اتنا بیہ شاہ سے محبت کر کے کچھ غلط کیا ہے؟“ عفنان

علی خان نے دریافت کیا تھا۔

”تمہارے تمام سوالوں کے جواب تمہارے انہی سوالوں میں چھپے ہیں عفنان! — تم اپنے پر غور کرو تو جان پاؤ گے کہ تمہارے لہجے میں کسی خدشے کا کوئی شائبہ تک نہیں ہے۔ کچھ واسطہ نہیں ہے کہ کچھ نفع ہاتھ آئے گا یا صرف خسارہ۔ مگر عفنان! میں یہ سوچ رہا ہوں اگر تم واقعی ہار گئے تو کیا ہوگا، سوچا ہے تم نے؟“

عفنان علی خان کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی تھی۔

”انجام کی فکر کرتا تو شاید آج یہ سب نہیں کر پاتا۔ میں جانتا ہوں، اس وقت خالی ہاتھ ہوں میں کچھ پاس نہیں ہے میرے۔ مگر مجھے یقین ہے ایک دن یہ ہاتھ خالی نہیں رہے گا۔ ایک دوسرا ہاتھ اس ہاتھ میں آئے گا اور تمام تر سپردگی سوچتے ہوئے اس ہاتھ کو ہمیشہ کے لئے تھام لے گا۔“

اوزی کچھ نہیں بولا تھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے اوزی! کیا ہوگا؟“ عفنان علی خان نے اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے ہوئے کسی قدر مخلوط ہونے والے انداز میں مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”چینہ نہیں۔ کوئی پری ڈکشن میں کر نہیں سکوں گا۔“

”مجھے ناامید نہیں کر سکو گے، اس لئے؟“ عفنان مسکرایا تھا۔

”نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ میں کیا، شاید کوئی بھی اس کے متعلق پری ڈکٹ نہ کر سکے۔“

عفنان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”محبت کے لئے کبھی بھی کوئی پری ڈکشن نہیں کی جاسکتی اوزی! تم کیا، کوئی بھی پری ڈکٹ نہیں کرنا کہ محبت کا اگلا موڑ کیا ہوگا۔ محبت بہت حیران کن ہے۔ مگر اسی قدر نتائج سے بے پرواہ۔ کبھی تجربہ ہوا آپ جان جاؤ گے۔“

اوزی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”افسوس عفنان! میں تمام تر قائل ہونے کے باوجود تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ نہ ہی کسی طرح کا کوئی ٹڈی اینٹن۔“

”کیا میں تم سے کوئی مدد مانگ رہا ہوں؟“ عفنان علی خان حیران ہوا تھا۔ تم نے یہ سوچا بھی کیسے کہ میں کچھ توقع کر رہا ہوں تم سے۔ میں جو کرنا چاہوں گا خود کروں گا۔“ عفنان علی خان کے ارادے اٹال کے لہجے میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اوزی مسکرا دیا تھا۔

”تم مصلحت پسندی کی کوئی راہ نہیں دیکھ سکے۔“

”تم چاہتے ہو تمہارا دوست کا ورڈ کھلائے؟“ عفنان نے مذاق میں ٹالا تھا۔

”نہیں۔ مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم کہیں سے جا کر خالی ہاتھ واپس آؤ۔“

”کیا اتنا ہی مشکل ہے یہ مجاز؟“

”شاید۔“

”اوزی! تم مجھے یہ مشورے دے رہے ہو اور تمہیں معلوم ہے لڑکیوں کو چوہے اچھے نہیں لگتے۔“

”آئی ایگری۔ شیر اچھے لگتے ہیں انہیں۔ مگر تم شاید بھول رہے ہو۔ شادی کے بعد سارے شیر خود بہ چوہے ہو جاتے ہیں۔“ اوزی نے کہا تھا۔ عفنان علی خان کا تہتہ بہت فطری تھا۔

”مگر وہ ایک ایک معاملہ ہے اور ایک الگ بحث۔ فی الحال مجھے شیر رہنے دو۔ بعد کی کہانی بعد میں ہی لے گے۔“

”ایک بات پوچھوں؟“ اوزی نے دریافت کیا تھا۔

”پوچھو۔“ عفنان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”تمہیں اتنا ہیہ میں کیا اچھا لگا تھا؟“

”کیا یہ ضروری ہے کہ کوئی بات اچھے لگے تبھی محبت ہو؟“ عفنان علی خان نے جواباً سوال کر دیا تھا۔ لیکن کچھ نہیں بولا تھا۔

”اوزی! محبت خوبیوں، خامیوں یا گڈ اینڈ بیڈ کو نہیں دیکھتی۔ نہ چہروں اور ناموں سے ہوتی ہے۔ میں چاہوں بھی تو تمہیں سمجھانہ پاؤں۔ محبت بس ہو جاتی ہے۔ کیسے اور کیونکر ہوتی ہے یہ میں خود بھی

نا سمجھ سکا۔ بس کوئی لمحہ ہوتا ہے جو سب کچھ لے کر بہت کچھ دے جاتا ہے۔ اور وہی لمحہ محبت ہے۔ تم رہے تھے، میرے پاس کچھ نہیں ہے اور میں خالی ہاتھ ہوں۔ جب کہ میں ایسا سمجھتا ہی نہیں۔ میرے

اس کی باتیں، اس کی سوچیں، اس کی یادیں، بہت کچھ ہیں۔ اس کا احساس مجھے کچھ اور سوچنے ہی یاد دیتا۔ وہ بے خبر رہے، انجان رہے مگر میں اپنے دل کو اس کے لئے دھڑکنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ وہ

رہیانی سے دیکھے بھی تو کئی جگنو میری مٹیوں میں دے جاتی ہے۔ اس کے قدم میرے ساتھ نہ اٹھیں، ہرے ساتھ چل رہی ہوتی ہے۔ وہ بات کرے نہ کرے مگر وہ میری گفتگو میں ہوتی ہے۔ اپنی تمام تر

توجہی کے باوجود وہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ ہر لمحہ پاس پاس رہتی ہے۔ تم خود کہو میرے دوست! اگر مارہ ہے تو پھر نفع کے کہیں گے۔“ عفنان علی خان کے لبوں پر سوال تھا اور اوزی اس گھڑی

لا جواب تھا۔

وہ خود حیران تھی۔ جانے کیسے اتنی ڈھیر ساری ہمت آگئی تھی اس میں۔ کیسے وہ اس کے مد مقابل رہی ہو کر، اتنا کچھ کہہ سکی تھی۔ شاید بات یہ بھی تھی کہ ہدف اس کی ذات کو بنایا گیا تھا۔ براہ راست لارٹھی کی گئی تھی اور یہی وہ لمحہ تھا جب وہ چپ نہیں رہ سکی تھی۔ کچھ بھی تھا لیکن وہ سردار سیکینگین حیدر لی کو اس بات کا حق نہیں دے سکتی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی اس نے اچھا کیا یا کہ برا۔ مگر وہ شرمندہ نہیں تھی۔ نہ ہی خوفزدہ۔ اُسے کسی بات کی فکر نہیں تھی، نہ پرواہ تھی اس شخص کا رد عمل کیا ہو گا یا وہ جواباً اس سے کیسا برتاؤ کرے گا۔ اس کے ساتھ

بہ رہنے ایک بات کی خبر ہو گئی تھی اسے۔ وہ جتنی چلک کا مظاہرہ کرے گی، وہ اسے اتنا ہی توڑنے کے لئے کی کوشش کرے گا۔ مصلحت پسندی کے تقاضے اور سہی مگر وہ اپنے ہاتھوں خود کو اس مقام سے نیچے

نہیں لاسکتی تھی۔ اصولوں سے آگے کی دنیا یقیناً ناقابل قبول تھی۔

اگلا پورا دن وہ اسے دکھائی نہیں دیا تھا۔ کہاں گیا تھا، یہ بھی بتا کر نہیں گیا تھا۔ وہ پریشان نہیں تھی۔ نہ ہی اپنے کئے پر کوئی پچھتاوا تھا۔ سبھی معمول کے مطابق ڈنر کے لئے نیچے آگئی تھی۔

سوچوں سے اچھے ذہن کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی وہ اپنے آپ میں مگن اپنا میل لینے کے لئے بہ تھی، جب اچانک ہی اس کی نظر اٹھی تھی اور وہ حیر سے بھر گئی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری کچھ ہی فاصلے کی ٹیبل پر تھا۔ سوڈ خوشگوار تھا۔ چہرے پر ہوجانے والی کسی بات کا شائبہ تک نہیں تھا۔ کچھ بدلا بدلا سا گرا رہا تھا جیسے وہ، وہ نہ تھا یا پھر میرب سیال کو ہی ایسا لگا تھا۔ کوئی ساتھ تھا اس کے۔ کوئی حسین بیکر، کوئی ڈر با۔ سردار سبکدین حیدر لغاری مگن تھا۔ سرور نظر آ رہا تھا۔

”تو کیا۔۔۔۔۔ یہ کوئی رد عمل تھا؟“

کیا وہ اپنے پہلے والے رنگ میں تھا؟

ایک لمحے میں بدل دیا گیا تھا پھر سب؟

سارے لمحے خواب ہوئے تھے۔

اور ساری باتیں خیال سی۔

کیا واقعی دھواں ہو گیا تھا سب کچھ؟

میرب سیال حیرتوں سے بھری نگاہ لئے اس جانب دیکھ رہی تھی جب سردار سبکدین حیدر لغاری کی ٹا اس پر پڑی تھی۔ مگر جیسے کوئی اتفاق نظر کسی اجنبی پر پڑ جاتی ہے۔

تو..... تو..... کیا وہ پھر اجنبی ہو گئی تھی؟

سردار سبکدین حیدر لغاری پھر سے بیگانہ ہو چکا تھا اس سے؟

اس کی آنکھوں میں جیسے مرجھیں سی چھینے لگی تھیں۔ ایک لمحے میں سارا اندر دھواں دھواں لگا تھا۔ جانے کیوں نگاہ کے سامنے کے منظر دھندلانے لگے تھے۔ وہ اٹھی تھی اور چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آگ گئی تھی۔

وہ حوصلہ ہارنا نہیں چاہتی تھی مگر سارے بند جیسے ریت کی دیوار ثابت ہو رہے تھے۔ طغیانیاں اس قدر تھیں، شور بیدہ سری اتنی تھی کہ ہر باڑھ ٹوٹی چلی گئی تھی۔

غبار ابھی پوری طرح ڈھلا بھی نہیں تھا، ڈھند ابھی چھٹی بھی نہیں تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور دوسرے ہی پل کوئی اندر تھا۔ وہ چونک پڑی تھی۔ جان گئی تھی، کوئی آگیا ہے۔ قدموں کی چاپ اس کے کان سن چکے تھے۔ گویا اس کا یہ انداز بھی اب فاش ہونے کو تھا۔

کوئی اگر محظوظ ہونا چاہتا تو یہ لمحہ بہت خاص تھا۔

بھاری قدموں کی چاپ اس کے قریب آ کر تھی تھی۔ وہ ساکت سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ جھکا سر اٹھ نہ سکا تھا۔ بھنگی نگاہوں نے کسی قدر چوری سے آنے والے کی خبر گیری کرنا چاہی تھی۔ مگر یہ عقدہ کھل چکا تھا کسی پر۔ آنے والے نے مد مقابل کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے اس چہرے کو دیکھا تھا اور شاید اس سے بھی

نہیں نہ ہوئی تھی کہ مضبوط ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو کسی قدر اوپر اٹھا دیا تھا اور بہ غور دیکھتے ہوئے گرا دیا تھا۔

”بس اتنا ہی تھا حوصلہ؟“ کوئی واقعی محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

میرب سیال نے نظریں اٹھا کر اس لمحے چوری سے نہیں، دیدہ دلیری سے دیکھنا چاہا تھا۔ مگر کوئی مسکرا اٹھا۔ نگاہ کی چمک اور بھی سوا ہو گئی تھی۔

”ضبط آزمانے کا اتنا شوق کیوں تھا میرب سیال! جب حوصلہ تھا ہی نہیں۔۔۔۔۔؟“ کوئی اس پر دہس کر رہا تھا۔

اور میرب سیال خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا کر سکتی تھی وہ؟ کیا تھا اس کے اختیار؟

سردار سبکدین حیدر لغاری نے ان بھنگی آنکھوں پر اٹکے موتیوں کو بڑے آرام سے اپنی انگلیوں کی ڈال پر لپٹا اور ایسا کرتے ہوئے لبوں کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی تھی۔

”سچ کہو، حاسد ہو رہی ہونا تم؟ جلن ہو رہی ہے نا بہت؟“ سوال کیا گیا تھا۔ مگر میرب سیال کے پاس لمحے کوئی جواب نہ تھا۔ اس کے چہرے کو بھر پور توجہ سے دیکھتے ہوئے چھوڑا تھا۔

”عشق، محبت، پیار، اُلفت سب نصول کی چیزیں ہیں۔ ایک دم بے کار۔ سردار سبکدین حیدر لغاری تو اسی ہے، تمہیں کس نے کہا تھا کہ دل لگاؤ اور بے خبر ہو جاؤ، ہاں۔“ وہ جیسے اس لمحے سے بھر پور حظ اٹھا تھا۔ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک صاف کہہ رہی تھی۔

میرب سیال جیسے منوں مٹی تلے جا پڑی تھی۔

کیسا وار تھا۔

”بھول گئی تھیں تم، سردار سبکدین حیدر لغاری نے موسموں کا عادی ہے۔۔۔۔۔ ٹھہرے ہوئے، پرانے راز سے زیادہ دیر نہیں بھاتے۔ کسی ایک جگہ پڑاؤ کرنا اس کی سرشت میں نہیں۔ ناممکن۔ بالکل ن ہے اس کے لئے دنوں تک ایک ہی راہ پر چلتے رہنا۔ تمہیں کیا لگتا تھا، بدل جائے گا وہ؟ بدل دوگی اسے اپنی وقتا نوی، رسی سوچ سے؟ کیا لگتا تھا، رنگ لوگی اپنے رنگ میں اور دوبارہ وہ رنگ اتر ہی نہ گا؟“ وہ، میرب کتنی بھولی بھالی، مصحوم یا پھر ڈفرے وقف ہو تم۔“ اظہار مدعا کرتے ہوئے وہ بہ غور

دیکھ رہا تھا۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی اور میرب سیال کی وہ کیفیت تھی کا ٹوٹو بدن میں ابھو نہیں۔

کتنا کند وار تھا یہ۔ کیسے بیٹھی چھری سے کاٹی گئی تھی وہ۔

کیا وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا؟

اس کا وہ روپ، وہ نرمی، وہ دوستانہ مزاج، وہ اپنا پن، کیا واقعی،..... کیا واقعی سب دھوکا تھا؟..... اسب خواب تھا؟

”معاملہ یہ ہے میرب سیال! سردار سبکدین حیدر لغاری کوئی آسان محاذ نہیں ہے۔ اسے سر کرنے نیاس آرائیاں عبت ہوں گی اور جیتنے کے سارے ارادے ذمیت کے ڈھیر۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری

مسکراتے ہوئے سرفی میں ہلاتے ہوئے جیسے افسوس کر رہا تھا۔

”حیف، حیف میرب سیال! خرد مندی کا بڑا دعویٰ تھا تمہیں۔ تو پھر اس لمحے یہ نگاہ اتنی حیرتوں مگر ڈوبی ہوئی کیوں ہے؟ کیا اب بھی یقین نہیں آیا کہ سردار سبکگین حیدر لغاری وہ ہے جسے تم دیکھ رہے ہو یا پھر وہ جسے تم دیکھ رہی تھیں؟ حیران کیوں ہو؟ اتفاقاً وہ لمحہ نہیں تھا جب تم میرے قریب آ کر تھیں۔ اتفاقاً یہ لمحہ ہے میرب! جس نے تم پر بہت کچھ کھول دیا ہے۔ کندھتھل کی لڑکی کہوں تمہیں یا پھر کہ میرب سیال؟ کبھی سوچا ہے تم نے، کبھی کوشش کی ہے نور کرنے کی کہ کتنی گھٹن ہے تمہاری سوچوں میں اور کتنا جس ہے تمہارے اندر۔ ایسے میں اگر سمندر کو بھی دیکھو گی تو وہ بھی جو ہڑ ہی لگے گا۔ کوششیں تو کی تھیں میں نے اپنے زاویہ نظر سے تمہیں دنیا دکھانے کی، تمہاری سوچوں کو بدلنے کی۔ ایک چھوٹی سی کوشش تمہاری بوسیدہ، گھٹی گھٹی سوچ کو بدلنے کی۔ مگر نہیں۔ رہیں تم وہی کی وہی، چھوٹے سے دماغ والی چھوٹی سی لڑکی۔ نہ میرے دکھائے منظروں کا کوئی اثر ہوا نہ دکھائی گئی دنیا کو دیکھ کر کوئی نظر یہ بدلا۔ اور شاید ایسا ہونا بھی ناممکن ہی ہے۔ شاید میں ہی غلط سمجھا تھا کہ تم یا تمہاری سوچ بدل سکتی ہے۔ دنیا دکھا کر میر تمہارے دماغ کو کھول سکتا ہوں یا منظر تمہاری سوچ پر کوئی اثر ڈال سکتے ہیں۔ کنوئیں کے مینڈک کبھی بارش ہو بھی جائے تو بھی کنوئیں سے باہر نہیں آ سکتے۔ باہر کی دنیا، انہیں بہت نئی نئی اور ناقابل قبول ہی لگتی ہے۔ اور نتیجتاً وہ دوبارہ کنوئیں کے اندر کی دنیا میں مٹ گشت کر رہے ہوتے ہیں۔“ پُر سکون انداز میں کہہ ہوا مسکرا رہا تھا۔

مگر میرب سیال کی نگاہ ساکت تھی۔ سر اٹھائے وہ اُسے صرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر یہ غور دیکھا تھا۔

”میرب سیال! کیا لگتا ہے تمہیں، سردار سبکگین حیدر لغاری تمہارا پیار ہو سکتا ہے؟ اس سیاہ زلف گرہ گیر کا اسیر ہو سکتا ہے؟ کیا لگتا ہے، یہ چمکتی نگاہ سردار سبکگین حیدر لغاری کے دل کے آ رہا ہو سکتی ہے؟ بیڑیاں ڈال سکتی ہے میرے قدموں میں؟ یہ زلف، یہ نظر، یہ گداز لب کیا بھلا سکتے ہیں ساری دنیا کو؟ کیا لگا تھا تمہیں میرب سیال؟ قریب آؤ گی تو جا دو کر دو گی؟ بس میں کر لو گی سب اپنے؟ دن کو رات کہوں گی تو کوئی رات کہے گا۔ پاگل۔“ لب مسکرائے تھے۔

”پاگل ہونا تم۔ سورج کو چھونے چلی تھیں۔ سوچا تھا چھوٹی سی ماچس کی ڈبیہ میں بند کر کے اپنے دوپٹے کے پلو سے باندھ کر رکھ لو گی۔ کیا لگا تھا میرب! کر لیا سب کچھ تم نے؟ باندھ لیا سورج کو اپنے دوپٹے کے پلو سے؟ سر کر لیا تم نے سب کچھ؟ پاگل ہونا۔ جو بھی جانا، غلط جانا۔ جو بھی سمجھا فضول۔ کب بدلو گی تم خود کو؟ کھلی آنکھوں سے دنیا کو دیکھنا سیکھو میرب سیال! دنیا تمہارا دو چار اچ کا فٹنسی ورلڈ نہیں ہے۔ نگاہ اٹھا کر دیکھو گی تو نگاہ کھلی کی کھلی رہ جائے گی۔ اور جہاں تک رعبی بات سردار سبکگین حیدر لغاری کی تو وہ وسعتوں کا عادی ہے۔ اور سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ سردار سبکگین حیدر لغاری تمہارا پیار ہرگز نہیں ہے۔ ہرگز بھی نہیں ہے۔ وہ سورج بھی نہیں ہے جسے تم چھوٹی سی ماچس کی ڈبیہ میں بند کر کے اپنے پلو سے باندھ کر رکھ سکو۔“

سے ہر لطف انداز میں مسکرا رہا تھا وہ۔ کیسا تھا خرقہ۔ انداز کیسا فاتحانہ سا تھا۔

فاتح ہی تھا وہ۔ فاتح ہی تو رہا تھا۔

مسرور تھا تو عجب کیا تھا۔

گھٹکت خورہ تو وہ بھی تھی۔ تیر بھری نگاہ کتنے پائیوں سے بھرتی چلی گئی تھی۔ مگر وہ اسی طرح مسرور سا لگا رہا تھا۔

”یہ معصوم، بھولا بھالا چہرہ، اس پر یہ بھگتے سمندری آنکھیں۔ ایسے قاتلانہ عزائم۔ ارادے کیا ہیں؟ لہو تو ترشش کا کوئی تیر بجا کر رکھنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟ تمہیہ کر لیا ہے کہ اپنے دام سے نکلنے نہیں دو گی۔“

کتنے سمندر ایک پل میں چھلکے تھے۔

کتنے بند ایک لمحے میں ٹوٹے تھے۔

وہ محظوظ ہوتے ہوئے بڑے پُر افسوس انداز میں سرفی میں ہلانے لگا تھا۔

”نہیں۔ آج نہیں۔ آج تو بالکل بھی نہیں۔ کوئی جا دو آج نہیں چلے گا۔ کوئی تیر نہیں، سردار سبکگین حیدر لغاری کا دل کوئی کاغذی گھوڑا نہیں جانا! کہ ان نمکین سمندروں میں بہہ جائے۔ آج سارے منتر پے سو رہیں گے اور ساری تدبیریں رائیگاں۔“ اس کے چہرے کو بہت ہولے سے تھپتھپایا تھا۔

”کچھ بھی کر لو، آج نہیں دل ٹھہرنے کا۔ دل کے بہلاؤوں کو آج تسلیاں بھی کام نہیں آئیں گی۔“

لاہوں سے جاگ چکی ہیں آنکھیں۔ تم بھی اب سنے دیکھنا بند کر دو۔ کھیل بند۔ کھیل ادھورے ہی اچھے دتے ہیں کہ جیت کی خوشی نہ ہار کا نم۔ بھول جاؤ سب۔ سردار سبکگین حیدر لغاری کو خسارے پسند نہیں۔

ہمارے لئے یہ جان لینا بہت ضروری ہے۔ انڈر اسٹینڈ؟“ مسکراتے ہوئے اسے کسی بچے کی طرح پچکارا

لا۔ اور پھر اسے اسی طرح حیرتوں میں ڈوبا چھوڑ کر وہاں سے نکلنا چلا گیا تھا۔

میرب سیال کتنی دیر تک ایک تک اس سمت کتی رہی تھی۔

ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ مگر اس صورت حال سے باہر تو آنا تھا۔ کب تک وہ ان جھمیلوں میں رہتی۔

مسئلہ براہ راست اس کی ذات سے منسوب نہ ہوتے ہوئے بھی اب مکمل طور پر اسی کو گھیر چکا تھا۔

دوسرے فریقین کی کیفیت کیا ہو گی، وہ نہیں جانتی تھی۔ مگر اس کی خود کی جان بہت مشکل میں تھی۔

ان کے باوجود بھی کہ وہ براہ راست اس معاملے کا حصہ نہ تھی اور اسے گھیر گھا کر انوا لو کیا گیا تھا۔ مگر اب حقیقت یہ تھی کہ تمام مسئلہ اسی کے باعث تھا۔ وہ تجزیاتی نگاہ سارے معاملے پر ڈالتی تھی تو خود کو ہی مجرم پاتی تھی۔

خرد مندی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ بے سمت سوچ سوچ کر الجھنے سے بہتر کوئی پوزیشن سائیڈ چنتی اور اس مسئلے سے خود کو باہر نکالتی۔ گویا کسی قدر مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں۔

بہت ریلیکس ہو کر، غیر جانبدار ہو کر اس نے رات بھر سوچا تھا اور پھر عرفان علی خان کا سیل نمبر ملا ڈالا تھا۔ دوسری طرف بے قراری کی حد تھی۔ پہلی رنگ پر ہی کال کنیکٹ تھی۔

”ہیلو۔“ عفتنان علی خان کی بھاری آواز اس کی سماعتوں سے لکرائی تھی۔ مگر ادھر یہ خاموش تھی عفتنان علی خان مزید گویا نہیں ہوا تھا۔ جیسے وہ منتظر تھا یا پھر کال کرنے والے کو موقع دے رہا تھا۔

انا بیہ شاہ نے خشک لبوں پر زبان پھیری تھی۔

”ہیلو۔ انا بیہ شاہ ہیئر۔“

”نہیں، میں جانتا ہوں۔“ دوسری طرف ایک لطف سی شرارت ہوئی تھی۔ ادھر وہ کچھ کہہ نہ سکی تھی۔

”انا بیہ! آئی ایم ویننگ۔“

رد عمل گرم جوشی لئے ہوئے تھا۔ مگر انا بیہ شاہ کو جیسے ان پذیرائیوں سے کچھ شغف نہ تھا۔ وہ بولی تھی

لہجہ بہت سپاٹ تھا۔

”عفتنان علی خان! ملنا چاہتی ہوں میں تم سے۔“

”انٹرنسٹنگ۔۔۔ بٹ ناٹ ساؤنڈز گڈ۔“ وہ دوسری طرف مسکرایا تھا۔ ”تمہاری اس خواہش یہ کسی مصلحت پسندی کی بو آ رہی ہے۔ انا بیہ شاہ! سچ کہو۔ میری ایک شرط ہوگی۔“

”شرط؟“ وہ چونکی تھی۔

”درخواست کروں گا ایک تم سے۔“ وہ سنجیدہ نہ تھا اور انا بیہ شاہ لب بھینچ کر رہ گئی تھی۔

”عفتنان علی خان کی شرائط بھی محبت سے متعلق ہیں۔ سارے نظریے، سارے زاویے، سبھی حاشیے محبت اور صرف محبت۔ اب کہو، کہاں تک بھاگو گی؟ اور کہاں تک انکار کی سعی کرو گی؟“ عفتنان علی خان دھیمبا لہجہ سے پتا گیا تھا۔

”عفتنان علی خان! میں نے تمہاری خواہشوں کو تکمیل دینے کے لئے یہ میٹنگ نہیں رکھی۔“

”تو پھر کہو، مدعا کیا ہے؟۔۔۔ مجھے تو محبت کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ کیا تمہارے اور ہمارے مابین کوئی اور مسئلہ بھی ڈسکس ہو سکتا ہے؟“ سوال ہوا تھا مگر ادھر انا بیہ شاہ کچھ نہیں بولی تھی۔ عفتنان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”اصول تو یہ ہے انا بیہ شاہ! جب مذاکرات کی میز پر آئیں تو چیدہ چیدہ مسائل میں سے سب سے اہم اور بڑے مسائل زیر بحث آئیں۔ اور میرے اور تمہارے سچ تو صرف ایک ہی مسئلہ ہے۔ وہی مسئلہ سب سے بڑا بھی ہے اور سب سے اہم بھی۔ تمہارا کیا خیال ہے، کیا سوچ رہی ہو تم؟“

عفتنان علی خان شاید ہارنا نہیں جانتا تھا۔ اور ادھر انا بیہ شاہ سچ و تاب کھا کر رہ گئی تھی۔

”مجھے تمہیں جھیلنے کا کوئی شوق نہیں ہے عفتنان علی خان!“

”اوہ، ریٹکی۔ تو پھر اس وقت اپنا اور میرا وقت کیوں برباد کر رہی ہو؟“ وہ بات کو قطعاً سنجیدہ نہ لیتا ہوا مسکرا رہا تھا۔

”عفتنان علی خان! ملاقات کے جواز اپنی مرضی کے مطابق ڈھونڈو گے تو خود کو دنیا کا احمق ترین شخص پاؤ گے۔“

مگر دوسری طرف وہ بے فکری سے ہنس دیا تھا۔

منسلک لیا ہے انا بیہ شاہ! تمہیں کس بات کی فکر ستا رہی ہے؟۔۔۔ اگر میرا معاملہ ایک طرف ہے تو ان اور الجھاؤوں میں تم کیوں گھر رہی ہو؟ تمام باتوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر چین کی نیند کیوں بوجا تیں؟“ لطف اندوزی کی حد تھی۔

انا بیہ شاہ دانت بھینچ کر رہ گئی۔

”منسوہ میں فوراً تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ بتاؤ ہاں یا نہیں؟“

عفتنان علی خان لمحہ بھر کو خاموش ہوا تھا۔ پھر مسکرا دیا تھا۔

”ہاں۔ مل سکتی ہو۔ اینڈ یور ڈی زازرز؟“

”ہاں میں صرف یہی سننا چاہتی تھی۔“

”اور کچھ نہیں؟“ عفتنان علی خان نے مدھم لہجے میں ایک آس سے دریافت کیا تھا۔

”اور کیا عفتنان علی خان؟ کس بات کی امید رکھتے ہو تم مجھ سے؟“

”پذیرائی کرو اور دل سے کرو۔ اس سے آگے کی تمام اسٹریٹجی بناؤ تو وہ بھی دل سے۔ چاہو، اپنا بناؤ اور صرف دل سے۔“

”ڈیوانے ہو عفتنان علی خان! تم اب بھی ایسا سوچتے ہو؟“

”گیا کروں۔۔۔ تمہارے بغیر کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ کچھ بھی کروں، کچھ بھی سوچوں، تمام راہیں آپ تم سے جا ملتی ہیں۔ اسے تم محبت نہیں کہو گی تو اور کیا کہو گی، ہاں۔“ وہ سنجیدہ نہ تھا اور ادھر انا بیہ نے پٹاخ سے فون بند کر دیا تھا۔

دوسری طرف عفتنان علی خان مسکرایا تھا اور اس کا نمبر ملانے لگا تھا۔ انا بیہ شاہ کے سیل پر نمبر چکا تھا اور پتے ہوئے بھی وہ کال ریسیو کر گئی تھی۔

”میں تم سے ملنے کو تیار ہوں۔۔۔ جگہ اور وقت تمہاری پسند کا ہوگا۔ ایک بات کہوں، تم نے مجھے باہ خوشی دی ہے۔ بھر دیا ہے میرا دل مسرت سے۔ یہاں سے وہاں تک دل بلیوں اچھل رہا ہے۔

الکیا ہوگا؟ یہ تو میں نہیں جانتا۔ مگر اس انفرادی کے زمانے میں وقت سے کچھ لمحے چرا کر ہم ایک بے کے سامنے ہوں گے۔ یہ احساس بہت دل پذیر ہے۔ مجھے تو یہ سوچ بھی اتنی اچھی لگ رہی ہے

اور برو ہوں گے۔ پھر اس کے بعد جو ہوسو ہو۔“ عفتنان علی خان کے سارے زمانے ایک ہی مرکز ت گھومتے تھے۔ انا بیہ شاہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی تھی۔

”تمہارا پر اہم کیا ہے، جانتے ہو تم؟ تم لٹو بنے ایک ہی چکر میں گھومتے رہنا چاہتے ہو عفتنان علی باور کرایا تھا۔

”گیا کروں۔۔۔ میرا مرکز تم جو ہو۔“ وہ مخلوظ ہوا تھا۔ ”تم سے تم تک فاصلے، رابطے مجھے اچھے

ہیں۔ خواہ لٹو کی طرح گول گول گھوموں، چاہے مسافتوں کے ساتھ سفر کروں۔ مگر نقطہ ایک ہی ہے، تم۔ تم۔ معاملہ بندس والا کوئی راستہ نہیں ہے یہاں۔ انا بیہ شاہ! اقدامات کرو تو سوچ کر اور بہ نوردیکھ

رہ۔ مجھے تم ندامتوں میں گھری بالکل اچھی نہیں لگو گی۔“

وہ شرارت پر مائل تھا۔ لیوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مگر انابہ شاہ کی برداشت جواب دہ تھی۔ ایک ہی لمحے میں وہ سلسلہ منقطع کر چکی تھی۔

عفتان علی خان مسکرا رہا تھا۔

”معاملہ کچھ بھی ہوا انابہ شاہ! تم راہ پر تو آئیں۔ اب قائل کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔“

تمہارے آخری خطوں کی

سطروں میں.....

عجب کچھ اسرار پنہاں تھے

کچھ خواب جو تم نے

آدھے آدھے بانٹ کر

میری آنکھوں میں رکھ دیئے تھے

وہ خواب ابھی تک جاگ رہے ہیں

گلاب کی جس ہنسی پر تم نے

اپنے پیار کا ہاتھ دھرا تھا

وہ لمس ابھی تک تازہ ہے

تیرے احساس کی خوشبو کی طرح

بارش کی بوچھاڑ میں

بھیگتی اس لڑکی کا چہرہ

اب تک میں دیکھ رہا ہوں

آدھے سُوکھے آدھے گیلے خوابوں والی

اس لڑکی کو

بے خود سا چپ چاپ سا تکتا

کہیں اپنے اندر ڈھونڈ رہا ہوں

اذہان حسن بخاری بھیگتے منظروں کو تکتا چپ چاپ کھڑا تھا۔ بارش بہت سی کٹاؤں کو دھو گئی تھی۔

کچھ بو جھل پل تھا جو اسی طرح برقرار تھا۔ کوئی جگہ، کہیں تھی جہاں گلشن اب بھی باقی تھی اور.....

”یہ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو اسنو پڑا! میں تمہیں بھیگتا ہوا موسم دیکھنے کو کہہ رہی ہوں

دیکھو سب کچھ کتنا صاف شفاف سا لگ رہا ہے۔ سارے منظر کیسے دھل گئے ہیں۔ یہ بارش بھی کتنی کتنی

ہوتی ہے نا۔“

”عجیب نہیں، خوبصورت۔“ اس نے سرنفی میں ہلاتے ہوئے اس خوشبو کے لہجے کی نئی کی تھی۔

”اذہان! تم مجھے ڈٹائے کر رہے ہو۔ میری مخالفت۔“ وہ دھمکی دیتی ہوئی مسکرائی تھی۔ وہ مسکرا دیا

”اں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں تم خوب صورت ہو۔“ انکشاف کیا تھا۔ وہ چہرہ مسکرا دیا تھا۔

”اذہان! میں بارش کی بات کر رہی ہوں اور تم.....“

”ہائے دی دے، میں بھی بارش کی بات ہی کر رہا ہوں۔ تم۔ تم۔ تم بھی تو بارش ہی ہو۔ شفاف،

پورل پذیر۔ ان بوندوں کی طرح۔“

”اذہان!“ وہ پُرافسوس انداز میں اسے دیکھنے لگی تھی۔ ”تمہیں لڑکیوں میں صرف خوب صورتی دکھائی

چہ۔ اگر میں خوب صورت نہ ہوتی تو تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟“

”نہیں۔“ مسکراتے ہوئے سرنفی میں ہلایا تھا۔ اس نگاہ میں حیرت واضح تھی مگر وہ ہنس دیا تھا۔ ”آئی

ہیں کرتا۔ محبت نہیں کرتا، بہت زیادہ محبت کرتا۔ بالکل مجنوں والی۔ سچی، سچی محبت۔“ انداز میں

باتی۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”کم آن یار! اچھی یا بری، تم جیسی بھی ہوتیں۔ تم، تم ہی ہوتیں۔ یہ تم لڑکیوں کو شک کرنے کی

ایوں ہوتی ہے؟ بندہ محبت میں ڈوبا، بے بس اور لاچار ہوگا اور تم پھر بھی شک کر رہی ہوگی۔“

اچہرہ مسکرا دیا تھا۔

”شک نہیں کر رہی۔ تمہیں اپنے بس میں کر رہی ہوں۔ بالکل ناریل جیسے ہو تم۔ دھوکے باز۔

کچھ، اندر سے کچھ۔ کوئی اور حسین صورت دیکھ کر بدل گئے تو؟“

ب الزام آیا تھا۔ مگر وہ ہنس دیا تھا۔

”تھی عجیب ہوتی ہو تم لڑکیاں بھی۔ تعریف نہ کرو تب بھی گلہ ہوتا ہے اور اگر کرو تب بھی خوش نہیں

ہے۔“

”انڈاٹ اذہان بخاری! تعریف تم میری نہیں، اس بارش کی کر رہے تھے۔“

اں، کر رہا تھا۔ مگر یہ کہہ کر کہ یہ بارش تمہارے جیسی ہے۔ اور میں اس پر اب بھی قائم ہوں۔ کٹ

ماکی طرح پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہو۔“

چہرہ کھلکھلا کر ہنسا تھا۔

”میں مذاق کر رہی تھی اذہان حسن بخاری!“

”بس، آئی نو۔“ وہ بولتا ہوا مسکرایا تھا۔

”اذہان! واہٹ یونو؟“ ایک لہجہ اس کے گرد ابھرا تھا اور وہ حیران رہ گیا تھا۔ ایک لمحے میں وہ اُس

سے اس دنیا میں تھا۔

ماہیہ خان اس کے قریب کھڑی تھی۔ اسے حیرت سے دیکھتی ہوئی۔

”کیا ہوا؟۔ بتایا نہیں تم نے۔ کیا جانتے ہو تم؟“

”ذہان حسن بخاری کچھ نہیں بولا تھا۔ چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔ انداز کسی قدر خجل سا تھا۔ ساہیہ خان

سے بہ غور دیکھا تھا۔

”تو اب خود کلامی کی بھی عادت پڑ گئی تمہیں اذہان حسن بخاری! بائے دی دے، مخاطب کس سے

تھے؟ کوئی قریب تھا کیا؟“ انداز سراسری تھا اور یوں پرمسکراہٹ۔ مگر اذہان حسن بخاری اس سوال کی کوسجھ سکتا تھا۔ بے دھیانی میں وہ جانے کیا کہہ گیا تھا۔ مگر اس لمحے وہ نہ تو کمزور پڑتا چاہتا تھا نہ ہی شرمناک ہوتا۔ تبھی بھرپور اعتماد سے مسکرایا تھا۔

”تم..... تم ساہیہ خان! یہاں سے جانے کے بعد بھی تم اپنا خیال یہاں کیوں چھوڑ گئی تھیں؟“ دیکھو، اب مجھے باتیں کرنے کی عادت ہو گئی ہے نا۔ بگاڑ دیا تم نے اذہان حسن بخاری کے مزاج اب شکوہ مت کرنا۔ ایسے اقدامات کے جواب میں یہ دیوانگی جنم نہیں لے گی تو اور کیا ہو گا ساہیہ خان وہ بات کو مذاق کارنگ دے کر نارمل نظر آنے کی سعی کر رہا تھا اور ساہیہ خان شاید نہیں چاہتی تھی کہ اس کوئی قلمی کھلے۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”تو میرا خیال یہاں تمہارے پاس رہ گیا تھا۔ اسٹریچ، ویری اسٹریچ..... مجھے خبر ہی نہیں ہوئی نے میرا خیال مجھ سے چرایا۔ چور کہیں کے، کچھ لینا تھا تو پوچھ کر لیتے۔ اس طرح چرانے کی کیا ضرورت تھی؟“ انداز دوستانہ تھا۔ لیوں پرمسکراہٹ تھی۔ رکی ہی سہی۔ وہ اس لمحے پردہ داری کی خواہاں نہ جانے کیوں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس لمحے شرمندہ ہو۔ مگر اس لطیف سی شرارت پر بھی اذہان حسن بخاری بہت بچھے بچھے سے انداز میں مسکرایا تھا۔

”ساہیہ! ایک بات کہوں؟“

”ہاں کہو۔“

”تم بہت اچھی ہو۔“

”یہ بات میں جانتی تھی۔“ ساہیہ مسکرا دی تھی۔ ”مگر اس بات کی صداقت پر یقین مزید پختہ ہو گا جب تم اس موسم میں مجھے آکس کریم کھلانے کی ہامی بھرو گے۔ تو لے کر جا رہے ہو نا تم اپنے مجھے؟“ مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”ہاں۔“ اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا۔

خواب چلتے ہیں میری آنکھوں میں
دلربائی کے موسم میں
دشمنوں کی عجب کہانی ہے
تیری آنکھوں نے جو کبھی کبھی
وہ کوئی کھٹا، متروک وفا ہونے کو ہے
سوچوں بھی تو دل لرزتا ہے
عجب اک حادثہ ہونے کو ہے
میرب سیال کے لئے کوئی قیامت تھی جیسے۔ کیسے کیسے انکشافات تھے۔ اس کی آنکھیں سمندر
تھیں۔ جتنا ملال کرتی، تھوڑا تھا۔

اس وہ اپنے کمرے میں پڑی رہی تھی۔ وجود سے جیسے ساری قوت کسی نے کھینچ لی تھی۔ ساری

ب دے چکی تھی۔

انہا تجربہ ہائے وفا۔

انسو کام نہ آیا تھا۔

فی تدبیر کارگر نہ ہوئی تھی اور وہ ڈھیر تھی۔

ہی موڑ پر تھا دل اور اسی موڑ پر تھی وہ۔

عجب رہا تھا کہ سفر جہاں سے شروع ہوا تھا پھر وہیں پر آ کر تھم گیا تھا۔ مگر اس قلیل ترین عرصے کی تکلیف کچھ بڑھ گئی تھی۔

ہل گئی تھی۔

ناید ہار بھی گئی تھی۔

آنسو بے تھے۔ اور اب تو آنسو بھی باقی نہ بچے تھے۔

ریسٹنگین حیدر لغاری کا وہ روپ سج تھا یا پھر وہ جو وہ اسے کچھ عرصہ پہلے تک دکھاتا رہا تھا۔

تیار، کامران، شادمان..... نہ پیشانی پر کوئی سلوٹ نہ چہرے پر کوئی شکن۔

ب یہ کیا تھا؟

وہ سورج نہیں ہوں جسے تم چھوٹی سی ماچس کی ڈبیہ میں بند کر کے اپنے پلو سے باندھ کر رکھ

پانہا؟

ابوہ کچھ دنوں تک دیکھتی رہی تھی یا پھر یہ جسے اس نے اب دیکھا اور سنا تھا۔ سردار ریسٹنگین حیدر

نے ایک ہی لمحے میں کیسا پینترا بدلا تھا۔ کیسا روپ دکھایا تھا۔ وہ واقعی دنگ رہ گئی تھی۔ اتنی کہ

میں اندھیرا کیے دھواں دھار آنسو بہاتے ہوئے اس نے پہروں گزار دیئے تھے۔

ماج ادا کے لئے، اس بے وفا کے لئے۔

پراوندھی پڑی تھی۔ نقاہت اور کمزوری اتنی تھی کہ اٹھنے تک کی ہمت نہ تھی۔

لاڑے پر دو چار بار شاید دستک ہوئی تھی۔ وہ سن نہ سکی تھی۔ آنے والے نے غالباً کسی دوسری کی کا

کرتے ہوئے دروازہ وا کر لیا تھا اور قدم اندر رکھ دیئے تھے۔

ازہ کھنے کی آواز پر میرب سیال نے سوچے ہوئے پپوٹوں کو اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر سب

گول داروں میں گھومتا دکھائی دیا تھا۔

ار ریسٹنگین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔ ہاتھ میں ٹرے تھی۔ شاید ایک کیئرنگ لونگ اور فیٹھ فل ہنز بیٹڈ

س کی کیئر کرنے آیا تھا۔

ایک سمت رکھ کر، جھک کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے ہاتھ سے گیسوؤں کو ہٹایا تھا اور مسکرا

”ہائے، وہاںس اپ۔۔۔ کیسی گزر رہی ہے؟ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے نا؟ کتنا خیال ہے تمہارے دیکھو کھانے کے لئے لایا ہوں تمہارے لئے۔ رورو کر کتنا برا حال کر لیا ہے اپنا۔ ڈارلنگ! تم اپنا بالکل خیال نہیں رکھتی ہو۔ اپنا نہیں تو کم از کم اپنے اس وفادار شوہر کا ہی کچھ خیال کر لو۔ چلو اٹھو شاباش! پا لو۔ آئی نو، تم ازجی لیس ہو رہی ہو اور مجھ سے یہ دیکھا نہیں جا رہا۔ چلو اٹھو، شاباش۔“ مسکراتے ہو۔ اسے جیسے بچوں کی طرح پچکار رہا تھا۔

میرب سیال نے بہت ہمت سے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ انداز میں ناگواری واضح تھی سردار سبکنگین حیدر لغاری کو جیسے مطلق پرواہ نہیں تھی۔ چہرے کی تروتازگی کے ساتھ ساتھ مزاج بھی بڑا بٹاش تھا اور لہجہ اس سے بھی توانا۔

”مسز میرب سبکنگین حیدر لغاری! اٹھئے شاباش، ابھی بہت ہمت درکار ہوگی آپ کو۔ مقابلہ کرنا عینا بہت ضروری ہے اور جینے کے لئے کھانا بہت ضروری ہے۔ بوڑھے کہتے ہیں کھانے سے ا مدافعت خاصی بڑھ جاتی ہے اور دماغ چاق و چوبند ہو جاتا ہے۔“ اسے اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھ مگر کاندھے پر دھر لیا تھا میرب سیال نے جھٹک دیا تھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”گڈ۔“ سردار سبکنگین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔

میرب سیال اٹھ کر بیٹھ گئی تھی مگر کسی شے کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ کھانے کی ٹرے اس کے سامنے جو توں پڑی تھی۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”مسز میرب سبکنگین حیدر لغاری! کیا ارادہ ہے؟ کیا آپ اپنے ہز بیٹڈ کے ہاتھوں کھا۔ خواہش رکھتی ہیں؟“

میرب سیال نے اس کی سمت ایک نگاہ ڈالی تھی۔ جس میں ناپسندیدگی بہت واضح تھی۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا اور سوپ کا پیالہ اٹھا لیا تھا۔

”مسز سبکنگین حیدر لغاری! شوہر مجازی خدا ہوتا ہے۔ خدمت کرتے ہیں، کرواتے نہیں۔ آپ سے سمجھ دار ہیں۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو سمجھانے کی ضرورت تو نہیں پڑنی چاہئے۔“ سوپ کا پیالہ اس کے منہ کی طرف بڑھا دیا تھا۔ میرب سیال نے منہ نہیں کھولا تھا مگر سردار سبکنگین حیدر لغاری خام ٹرمنٹ واقع ہوا تھا۔

”مسز لغاری! منہ کھولے، پلیز۔“ اور میرب سیال کے پاس دوسرا دستہ نہ بچا تھا۔

”گڈ۔۔۔ دیش ٹائس۔ آپ کی یہ بات بہت اچھی ہے مسز لغاری! آپ خاصی انڈر اسٹینڈ ہیں۔ جلد انڈر اسٹینڈ کر لیتی ہیں۔ اس خاصیت کے باعث بہت سی باتوں کی بچت ہو جاتی ہیں۔ سے بڑی بات بندہ کسی اندھیرے میں نہیں رہتا۔“ ایک مزید پیچ اس کی سمت بڑھاتے ہوئے وہ سر آ رہا تھا۔

مگر میرب سیال نے بجائے منہ کھول کر اس کے ہاتھ سے سوپ لینے کے لئے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے لینا چاہا تھا۔ ہاتھ سے ہاتھ لگرایا تھا۔

پ سیال نے اس اتفاق پر اس شخص کی جانب سے نظریں پھیر لی تھیں۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری اٹھا۔

اپ میں ہمت نہیں ہے مسز لغاری! بو آر فیلنگ ناٹ ویل رائنٹ ناؤ۔“ اپنے طور پر وہ خود کو یاد دہا رہا۔ اس کے منہ میں سوپ ڈالنے لگا تھا۔

لغاری کے لئے جیسے کسی بات کا احتجاج کرنا بے حد دشوار تھا۔ شاید اس گھڑی واقعی ہمت ناپید آتی بھی نہیں کہ وہ اپنے قاتل کی مدد لیتی۔

لیڈر، میں لے لوں گی۔“ سردار سبکنگین حیدر لغاری سیون اس کی طرف بڑھا رہا تھا جب اس نے اٹھا۔

وہ، اچھا۔۔۔ اتنی ہمت آگئی ہے آپ میں۔ گڈ۔۔۔ اچھی بات ہے۔“ میرب نے پیالہ لینے ہاتھ بڑھایا تھا جسے سردار صاحب نے بخوشی اس کی سمت بڑھا دیا تھا۔

لڈ پیچ۔۔۔ وہ اُسے سوپ اپنے ہاتھوں سے لیتا دیکھ کر سراہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میرب نے اسے نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔

کچھ کہنا چاہتی ہیں مسز لغاری؟“

میں۔۔۔۔۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ آئی وانٹ ٹو بیک۔“

وہ۔۔۔۔۔ یو وانٹ ٹو بیک۔“ پُر خیال انداز میں سوچا تھا۔ ”مگر مسز لغاری! اس ناٹ پوسٹیل۔ ٹ آل۔ نی الحال ارادہ پوسٹ پون کر دو۔ یہ ناممکن ہے۔“

مگر کیوں؟“ وہ احتجاج کے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

وقت مسز لغاری! ایک اچھا وقت ہے میرے ہاتھ میں۔ اکنامی کلی بھی اور ایموشنلی بھی۔“

کیا مطلب؟“ وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ لفظوں سے زیادہ استفسار آنکھوں میں تھا۔ مگر سردار سبکنگین حیدر لغاری نے اسے مسکرایا تھا۔

یعنی، مسز لغاری! غالباً اُس روز دیکھا تھا آپ نے اُسے میرے ساتھ۔ غالباً پراہلم یہ ہے مسز کہ میں کچھ وقت اجنبی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ اچھا لگ رہا ہے۔ شی از اے انٹرنٹنگ گرل فونڈر۔“

میرب سیال کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

اگر آپ نہیں جانا چاہتے تو مجھے پرواہ نہیں۔ مگر میں جاؤں گی۔“ انداز اور لہجہ درشت تھا۔ مگر سردار حیدر لغاری بہت اطمینان سے مسکرا دیا تھا۔

مکن نہیں ہے مسز لغاری! سوری، ایسا بالکل بھی ممکن نہیں ہے۔ آپ کو میرے ساتھ ٹھہرنا ہوگا۔ ایک ریز بیٹڈ کے فرائض میں بھار ہا ہوں۔ ایک سعادت مند بیوی کے حقوق آپ پر بھانا فرض ہیں۔

”لب مسکار ہے تھے اور وہ ہنوز چپ تھی۔“

اور مجھے جانا ہوگا۔ ایک اہم اپائنٹمنٹ ہے۔ آپ یہ سارا کھانا کھا لیجئے گا۔ رات میں ملاقات رہے

گی۔ آپ کا انزیک ہونا بہت ضروری ہے۔“ گھڑی دیکھتے ہوئے وہ یکدم اٹھا تھا اور ایک بھر پور نگاہ پر ڈالتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا اور میرب سیال کسی بت بنی بیٹھی تھی۔

وہ چہرہ اس کے سامنے تھا اور عفتان علی خان خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ انا بیہ شاہ کے چہرہ ناگواری کا تاثر بہت واضح تھا۔ جیسے وہ ان ناپسندیدہ لمحوں کو مجبوراً جھیل رہی تھی۔

”تم کچھ کہنا چاہ رہی تھیں؟“ عفتان علی خان نے بہت نرمی سے کہتے ہوئے اس کی توجہ کا درست سمت میں موڑا تھا۔

انا بیہ شاہ بے حد اکتائے ہوئے انداز میں نظروں کا زاویہ پھیر گئی تھی۔

”عفتان علی خان! تم کوئی بچے نہیں ہو کہ میں انگی پکڑ کر کوچ اور غلط کے متعلق بتاؤں۔ میرے خود بھی لائف کا کوئی اتنا بڑا تجربہ نہیں ہے۔ مگر میں رائٹ اور روگ کے متعلق جھٹ کر سکتی ہوں۔ یہ لے یہ مشکل نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے یہ صلاحیت میرے پاس بھی ہے۔“

”تو تم کیا چاہتی ہو؟“ عفتان علی خان نے یکدم دریافت کیا تھا۔

”ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی ہے عفتان علی خان!“ انا بیہ شاہ نے ایک گہرا سانس خارج کر کے اپنے اندر کے تاثرات پر جیسے قابو پانا چاہا تھا۔

عفتان علی خان جیسے اس کی ٹینشن سے واقف تھا۔ تھپی کچھ بھی بولے بغیر خاموشی سے اسے دیکھا۔

”عفتان علی خان! تم جو کر رہے ہو وہ غلط ہے۔ سراسر بے وقوفی۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں اسے جاری رکھو یا ترک کر دو۔ مگر پلیز اس بات کا احساس ضرور کرو کہ اس حماقت کے باعث کیا زندگی بری طرح ڈسٹرب ہو رہی ہے۔ ایک نہیں دو تین۔ تم پوری تین زندگیاں تباہ کرنے پر تے! مجھے مطلق فکر نہ ہوتی اگر ان میں سے ایک میری خود کی زندگی نہ ہوتی۔ تم مجھے نقصان پہنچا رہے ہو۔ کوئی حق نہیں پہنچتا عفتان علی خان! کہ تم اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی کو بھی ڈسٹرب کر دو۔“

انداز درشت تھا۔ مگر وہ بہت اطمینان سے مسکرا دیا تھا۔

”میں بہت فیئر بندہ ہوں انا بیہ شاہ! معلوم نہیں تمہیں کس بات نے اتنا ہانپ کر دیا ہے۔ یا لو بات تمہارے دل پر گراں گزری ہے۔ میں نے تمہارے ہاں پروپوزل بھجوا یا، تمہیں چاہا، پسند کیا، چاہا حق تمہیں دیا۔ تم نے ری جیکٹ کر دیا۔ میں نے ریزن نہیں مانگا۔“ وہ باری باری انگلیوں پر گنوا رہا تھا۔

”تم نے فون کیا، ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ بلوایا، میں چلا آیا۔ کیا سٹا شنا چاہتی ہو تم، اتنا کچھ گنوا یا۔ سبھی کچھ تو فیئر اینڈ پوزیٹو ہے۔ پھر تم مزید کیا چاہتی ہو مجھ سے انا بیہ شاہ؟“ اس سے زیادہ کیا امید ہے؟ کیا تم مجھے بتا سکو گی؟“ عفتان علی خان بہت اطمینان سے مسکراتا ہوا اُسے لا جواب دیا۔

انا بیہ شاہ اس لمحے خاموشی سے اسے دیکھنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔

”مزید کیا انا بیہ شاہ؟ کیا چاہتی ہو تم مجھ سے؟“ عفتان علی خان نے دوبارہ دریافت کیا تھا۔

ناہی برداشت کی حد جواب دے گئی تھی۔ مزید وہاں بیٹھ کر اس کی فضول کھواس سننے سے اس نے اسے اٹھ جانا مناسب جانا تھا۔ مگر یہ سچی سچی بھی ناکام رہی تھی۔ اس نے ارادہ کیا تھا اور یہ اقدام ہونے ل ہی وہ نگاہ بھانپ چکی تھی۔ نتیجتاً اس کا مضبوط ہاتھ اس کے نازک ہاتھ پر تھا۔ انا بیہ شاہ نے سلگتی ن سے اسے دیکھنا چاہا تھا مگر اس شخص کے لمحوں پر بہت پُر سکون مسکراہٹ تھی۔ بہت دھمکے لہجے میں دہا تھا۔

”کیوں چاہتی ہو تم ایسا انا بیہ شاہ؟ کیوں۔۔۔ کیوں مجھے خود سے دور کر دینا چاہتی ہو؟ اگر میں چاہ رہا ہوں تو یہ میرا پرالہم ہے۔ سراسر میرا ہیڈک۔ تم مجھے اس سے باز رکھنا چاہتی ہو؟ کیوں انا بیہ“

”میرے پاس تمہارے ان فضول سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے عفتان علی خان! تم ایسا کیسے کر رہے بہت پُر افسوس انداز میں سرٹنی میں ہلایا تھا۔ مگر وہ مسکرا دیا تھا۔ مضبوط ہاتھ اب بھی میز کی سطح پر ہے اس کے نازک ہاتھ پر تھا۔“

”تم کچھ بھی کرو، کچھ بھی کہو، کوئی بھی تلخ بات، تلخ اقدامات۔ میں جھیل سکتا ہوں انا بیہ شاہ! کیونکہ اسے محبت کرتا ہوں۔ تم سے محبت..... صرف محبت۔“ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ٹھوس انداز لیتے ہوئے اسے باور کرایا تھا۔

”صرف محبت انا بیہ شاہ! اور تم اسے بدل نہیں سکتی ہو۔ نہ ہی سمت موڑ سکتی ہو۔ تمہیں اتنی چھوٹی سی مجھ میں کیوں نہیں آتی؟ کتنی بار کہوں میں، کتنی بار سمجھاؤں؟ کیا لگتا ہے تمہیں، اجتن ہوں میں؟ تو انا بیہ شاہ! یہ بھی قبول ہے مجھے۔ سب کچھ کر سکتا ہوں میں تمہارے لئے۔ سب کچھ سہہ سکتا ہوں مگر۔“ سرٹنی میں ہلانے لگا تھا۔ ”یہ نہیں ہو گا مجھ سے انا بیہ شاہ!“ تم محبت کے یہ آپشنز بدل دو، سے نہیں ہو سکے گا یہ۔ بالکل بھی نہیں۔“ انداز مدہم مگر مدلل تھا اور انا بیہ شاہ چپ تھی۔ پھر یکدم وہ اٹھی اور چلتی ہوئی وہاں سے نکل گئی تھی۔

مذاکرات ناکام رہے تھے۔

انا بیہ شاہ کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ نمکین پانی بہہ جانے کو بے تاب تھا۔

دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھی تھی۔ اوزی نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔

”کیا ہوا؟“ مگر انا بیہ شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اوزی نے اسے دیکھتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دیا۔

”ٹپ..... ٹپ..... ٹپ.....“

کتنے آنسو آنکھوں سے باہر تھے۔ چہرہ بھیگتا چلا گیا تھا۔ اوزی نے اسے دیکھا تھا اور ٹشو اس کی سمت دیا تھا۔

توہر بدل گئے تھے۔ رویہ یکسر بدل گیا تھا اور جانے اب اور کیا ہونا باقی تھا۔ میرب سیال نہیں جانتی

تھی۔ مگر وہ اس شخص سے اب ہر شے کی امید کر سکتی تھی۔ جو ہو چکا تھا وہ کافی تھا۔ مزید بد مزگی وہ نہ چاہتی تھی اور ایسے میں تو بالکل بھی نہیں جب کہ وہ دیار غیر میں تھی۔ اور اپنوں سے دور مصلحت کی انگلی تو کر رہنا سو مند تھا۔ سو وہ اعتراف نہیں کر سکتی تھی۔ حالات کو اپنے بس میں رکھنے کے لئے یہ بہت ضرور تھا۔

اس کی بات مان کر وہ اس کے ساتھ شام کی تقریب کے لئے تیار کھڑی تھی۔ سردار سبکدین د لغاری آیا تھا۔ اسے دیکھا تھا اور چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔

”از اٹ یومز لغاری؟“ مسکراتے ہوئے آنکھوں میں حیرت بہت واضح تھی یا پھر وہ کوئی طنز کر تھا۔ میرب سیال سمجھ نہ سکی تھی۔ مگر کسی قدر بے توجہی سے نظریں پھیر گئی تھی۔

”آں..... مصلحت پسندی..... تو مسز لغاری! سیانی ہو گئی ہیں آپ اب۔ دانش من سے قابو پانا چاہتی ہیں صورت حال پر۔ تدبیر اچھی ہے۔ مسز لغاری قائل ہو گئے آپ کی عقلمندی۔ رینی امپریٹڈ۔“ وہ اس کیفیت سے مخلوظ ہوتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ ”طفل جان رہی ہیں نا آپ! ہز بیڈ مسز سبکدین حیدر لغاری کو۔ ایک ضدی خود سر بیچے سے نبرد آزما ہونے اور نمٹنے کے اقدامات کر رہے ہیں نا آپ۔ بہلانے کے یہ اسلوب بہت بچکانہ نہیں مسز لغاری؟“ اس کے چہرے پر آئی ایک شریرا چھوتے ہوئے وہ یقیناً اُسے زچ کرنا چاہتا تھا اور میرب سیال یہی نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنی اس کوشش کامیاب ہو۔ اسی لئے بغیر کوئی رد عمل ظاہر کئے وہ اس کے سامنے خاموشی سے کھڑی رہی تھی۔ گو یہ نہ تھا مگر میرب سیال کو یہ ممکن کرنا تھا۔

”چلیں۔“ وہ پُرسکون انداز میں بولی تھی اور مسز لغاری حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

”تو ٹھان لی آپ نے۔ ایک سعادت مند بیوی بن کر رہیں گی۔ گڈ۔ انٹرننگ۔“

متاثر ہوا تھا۔

میرب سیال کچھ کہے بغیر اس کی ہمراہی میں چل پڑی تھی۔ ایک ایک لمحہ دل پر بھاری تھا مگر نہ نہ کرتے کے مصداق یہ بوجھ تو ڈھوننا ہی تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی سردار سبکدین حیدر لغاری اسے پارٹی میں کیوں لایا تھا۔ کیونکہ وہاں وہ اسے اُکونے میں کسی فالتوشے کی طرح چھوڑ کر خود کسی اور کے ساتھ بڑی ہو چکا تھا۔

کون تھی وہ؟

شاید جینی۔ اُسے تو اس کا چہرہ بھی یاد نہیں تھا۔ کتنا سرسری انداز تھا اس کا دیکھنے کا۔ توجہ تو اس قدر تھی ساری۔ بس یہ نظر آیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی تھی۔ کون تھی؟ کیسی صورت تھی؟ کیا نام تھا؟ جانتی تھی وہ۔ کتنی دیر سبکدین حیدر لغاری ان موصوفہ کے ساتھ بڑی رہا تھا۔ میرب سیال کے لئے دشوار تھا۔ چہرے کا رخ پھیر لینے کے باوجود وہ بے تاثر نہ بن سکی تھی۔ اندھی بہری بنی وہ اسی طرح تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری اس لڑکی کو لئے اس کے قریب آیا تھا۔

”شی از چارلی۔ دی موسٹ بیوٹی فل گرل آف دی ایوننگ۔“ انداز ستائش سے بھر پور تھا۔ مگر

۔ ص متاثر نہیں ہوئی تھی۔ سب دیکھتے ہوئے اندھی اور سنتے ہوئے بہری تو جی ہی تھی، اب یہ طور پر لوگوں کی بھی ہو گئی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری کے ساتھ رہنا تھا تو ایسا کرنا ہی تھا۔

”کیا ہوا تمہیں؟ چارلی پسند نہیں آئی؟“ وہ چھیڑ رہا تھا۔

میرب سیال غصے سے دانت بھینچ کر رہ گئی تھی۔

”جینی، شی، پینی ہو یا چارلی شارلی مجھے اس سے قطعاً کوئی غرض نہیں ہے۔ اس چھٹی ناک والی رلی کی جگہ اگر آپ چارلی تھیرون کو بھی لے آئیں تب بھی مجھے خاص فرق نہیں پڑے گا سردار سبکدین

د لغاری! کیونکہ میں دیکھتے ہوئے بھی اندھی بن گئی ہوں اور سنتے ہوئے بہری۔ اگر آپ مجھے بولنے پر اٹھائیں تو میں لوگوں کی بن کر بھی رہ سکتی ہوں۔ کیونکہ میں سمجھ گئی ہوں کہ اگر مجھے آپ کے ساتھ کو جھیلنا

ہے، ایک ناپسندیدہ رفاقت کو برداشت کرنا ہے تو یہ سب کرنا بہت ضروری ہو گا۔ سو جینی۔ شی۔ پینی یا چارلی۔ شارلی یا چارلی تھیرون۔ آئی ڈونٹ کیئر۔“

کسی قدر درشت انداز میں وہ گویا ہوئی تھی۔ مگر سردار سبکدین حیدر لغاری بجائے ہانپہر ہونے کے یا تھال میں آنے کے مسکرا دیا تھا۔

”اب تم خالص مسز لغاری لگ رہی ہو۔“ انداز چڑانے والا تھا۔ مگر میرب سیال نے اس کی جانب یلنے کی سعی نہیں کی تھی۔ شاید یہی ایک طریقہ تھا خود کو مخلوظ اور نارمل رکھنے کا۔ یقیناً اس کی کوشش یہی تھی، لف کو زیر کرنے کا نیا ڈھنگ سوچ رہا تھا۔ کوئی چال بن رہا تھا اس کے لئے اور وہ بہتر یہی محسوس کر لگی کہ انجان بن جائے۔

”مسز لغاری! شاید میں آپ کی وائف کو پسند نہیں آئی۔“ چارلی کسی قدر اظہارِ افسوس سے بولی تھی۔

”انگریزی میں لہجہ متاثر کن تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری کی چواکس اور معیار کی وہ قائل نہ ہو جاتی تو نا مانا ہوتی۔“

”وائف؟۔۔۔ ہو از وائف؟۔۔۔ شی از اوٹی اے گرل فرینڈ آف مائن۔“ سردار سبکدین حیدر لری کا جواب اُسے چونکا گیا تھا۔

”اوہ، سو سیڈ۔ میں نے سوچا شاید یہ آپ کی وائف ہیں۔“ چارلی نے ایک بار پھر شتہ انگریزی میں ہار افسوس کیا تھا۔

”مجھے میرے معیار اور پیانے سے گرا کر اس طرح لٹ ڈاؤن کر کے تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو دار سبکدین حیدر لغاری؟۔۔۔ یہی کہ تم کتنے کمزور ہو یا پھر یہ کہ مجھے قبول کرنا اور زیر کرنا تمہارے لئے ناڈشوار ہے۔“ اس نے پُر اعتماد انداز میں ایک تیرا اُچھالا تھا۔

سردار سبکدین حیدر لغاری کی پُرسکون سمندر آنکھوں میں یکدم ہی ایک طفیانی آئی تھی۔ پیشانی پر کئی نیل ایک ساتھ واضح ہوئی تھیں۔ بہت جارحانہ انداز میں اس کو شانوں سے تھاما تھا۔ سکتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا تھا مگر پھر کچھ کہے بغیر چھوڑ دیا تھا اور چارلی کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گیا تھا۔

میرب سیال کا دل اپنی تھنیک اور تڈیل پر رونے کو چاہ رہا تھا۔ کیا حیثیت تھی اس کی اس شخص کی

زندگی میں۔ ایک خود پسند شخص کی زندگی میں — کج رو، کج ادا، بے وفا۔ ایک جگہ ٹھہرنا جس کی سرشت میں نہ تھا اور وہ اس میں وفا ڈھونڈ رہی تھی۔ تھی ناقابل انوس بات۔

آنکھوں میں سمندر تیرنے لگے تھے۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر ان آنسوؤں کو اندر ہی اندر کہیں دُور کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ مگر ہر جتن بے سود لگ رہا تھا۔ بھر بھری ریت کی دیوار کی مانند وہ بے بس تھی۔

تیرے میرے رستوں میں
ایک بھی موڑ ایسا نہیں

جو کسی روز یونہی اتفاقاً

کر دے رو برو ہم کو

تیری میری آنکھوں میں

کوئی بھی رنگ ایسا نہیں

کر دے جو کوئی سرگوشی

یا کوئی مدہم سی آہٹ کہ جس سے

اس بھید بھری چپ کی قلعی کھل جائے

بہ ظاہر جو انجان بنے پھرتے ہیں

اس پُر لطف اتفاق پر چوکیں تو

جانیں ہم تم

گنوا دیا ہے جو ہم نے وہ پل

وہ ایک پل اپنا تھا

وہ ایک پل کتنا قیمتی تھا

”یہ کیا کر رہے ہو تم؟ کہیں جا رہے ہو کیا؟“ ساہیہ خان اندر داخل ہوئی تھی۔ جب اسے پہنچ کر تے دیکھ کر چونک گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اس کی جانب بغیر دیکھے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ہاں، اپنی ڈریم گرل کو ڈھونڈنے۔“ لیوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شرارت۔ اور ساہیہ خان حیران ہونے کے ساتھ مسکرائی تھی۔

”اوہ، ریلی۔۔۔ اس ڈریم گرل کو جس سے تم تنہائی میں باتیں کرتے ہو؟“

”آف کورس۔“ وہ تصدیق کرتا ہوا مسکرایا تھا۔

ساہیہ خان نے اسے کسی قدر اچھبے سے دیکھا تھا اور پھر یکدم کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ اذہان حسن بخاری بھی ہنس دیا تھا۔

”میں کچھ ہیپ کر دوں تمہاری؟“

”نہیں یار! میں خود کر لوں گا۔ تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”کیا مطلب اس وقت یہاں کیا کر رہی ہوں۔ دوست ہو تم میرے۔ کوئی کام پڑے تو پوچھے بنا آ رہوں۔“ دھونس جمانی تھی۔ مگر اذہان حسن بخاری شرارت سے اسے دیکھتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”کسی لڑکی کو میں نے اتنی دیدہ دلیری سے اپنی ہونے والی سرال میں گھومتے پھرتے نہیں دیکھا۔“

”تو اب دیکھ لو۔ تمہیں کس نے کہا ہے کہ یہ میری ہونے والی سرال ہے؟۔۔۔ یہ میرے انکل کا

رہے اور میں جب چاہے بے دھڑک آ جاسکتی ہوں۔“

”یعنی تمہیں اپنے انکل کا یہ گھر بطور سرال قبول نہیں؟“ انداز کسی قدر شرارت سے پُر تھا۔ مگر ساہیہ خان کے چہرے کی مسکراہٹ ایک لمحے میں غائب ہوئی تھی۔

”اذہان! تم میرے لئے کیا لاؤ گے؟“

”تمہارے لئے؟۔۔۔ سوچنے دو۔ تمہارے لئے تو نہیں مگر میں اپنے لئے ایک میم ضرور لاؤں

۔“ وہ ہنستا تھا۔ ”کم آن یار! میں تم جیسی دلہنی لڑکی کو سنبھال لوں، یہی بہت ہے میرے لئے۔ تم ایک بہ بہتری ہو۔“ ایک دلچسپ سی بات بہت سرسری انداز میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔ ساہیہ خان اس کی

پل اٹھا کر چپ چاپ سوٹ کیس میں رکھنے لگی تھی۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ تمہیں اچھا نہیں لگا میرا تمہیں ترجیح دینا؟“ اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا۔

ساہیہ خان جیسے زبردستی مسکرائی تھی۔

”اذہان! پلیز، میں اس معاملے کو ڈسکس کرنا نہیں چاہوں گی۔“ لہجے میں چھپی پس پردہ درخواست

بی خاص ساعت نہیں ہوئی تھی۔

”تو پھر کیا جا ہو گی تم ساہیہ خان؟ مجھے بس میں کرنا، قابو میں کرنا یا منٹھی میں بند کرنا؟“ انداز میں

رت نمایاں تھی۔ مگر ساہیہ خان مسکرائی نہیں تھی۔

”کیا ہے یار! اس روز کی ایک چھوٹی سی بات دل سے لگا کر بیٹھ گئی ہو۔ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتی ہو

صرف مذاق تھا۔ تمہارے علاوہ کسے چاہوں گا یار! میری ویران زندگی میں پہلی اور آخری آنے والی لڑکی

ہی ہو۔“

”جھوٹ کی اچھا تھی۔ ساہیہ خان مسکرائے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

”اوہ، اچھا۔ تو تم نے یقین کر لیا۔ مگر ایک مزے کی بات بتاؤں، یہ بھی ایک مذاق تھا۔“ وہ ہنستا تھا۔

یہ خان نے ہاتھ میں پکڑی شرٹ کا گولہ سا بنا کر اسے دے مارا تھا۔

”جی چاہے تو اتھ لے لو۔ میں حلف اٹھانے کو تیار ہوں۔ اس سے زیادہ یقین دلانے کا کوئی طریقہ

نہیں ہے۔ بطور خاص توجہ سے تنکے ہوئے سوال کیا تھا۔ مگر ساہیہ خان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”تم لڑکیوں کی ایک خرابی ہے۔ یقین نہیں کرتی ہیں۔“

”تمہیں کیسے تجربہ ہوا، تمہاری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی تو میں ہوں نا۔“ مسکراتے

نے ری مانڈ کر دیا تھا۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”کچھ بھی ہو۔ میں تم سے شادی قطعاً نہیں کروں گی۔“ اس نے برملا کہتے ہوئے اذہان حسن بخاری دیکھا تھا۔

”میرے اوتھ لینے کے باوجود بھی نہیں؟“

”نہیں۔“ سرنئی میں ہی ہلا تھا۔

”کیوں؟“ لیوں پر مسکراہٹ تھی۔

”اس لئے کہ تم مجھے سوٹ نہیں کرتے ہو۔ ایک جھوٹے بندے کو میں اپنے لئے نہیں چن سکتی شرارت سے مسکرائی تھی۔ اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”تم سنجیدہ نہیں ہوتا؟“

”تم سے کس نے کہا؟“

”تمہاری آنکھوں نے۔“

”آنکھیں بڑھنے کا فن آگیا ہے آپ کو؟“

”دیکھنا پڑا۔ تمہیں عمر بھر جھینے کا قصد جو کر بیٹھا ہوں۔“ انداز میں شرارت واضح تھی۔ مگر ساہیہ نے سرنئی میں ہلا دیا تھا۔

”اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا اذہان حسن بخاری! اتنے بڑے فیصلوں کے لئے قلیل لمحے ہوتے ہیں۔“

”تو تم کثیر لمحوں کی تلاش میں ہو؟“ براہ راست آنکھوں میں جھانکا تھا۔ ساہیہ خان سر جھکا کر کیس میں اس کی ضروری اشیاء رکھنے لگی تھی۔

”یہ اتنے سارے پرفیوم لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ غالباً تم تو کسی خوشبو کے تعاقب رہے ہونا؟“ چھیڑا تھا۔ مگر اذہان حسن بخاری کی سوتی وہیں اٹکی تھی۔

”تم نے جواب نہیں دیا۔“

”کس بات کا؟“ وہ بیکسر انجان بنی تھی۔

”ساہیہ! میں تمہیں کثیر لمحے دینے کو تیار ہوں۔ تم بہ غور جانچ پڑتال کر سکتی ہو۔“ ایک پیشکش ہوئی تھی۔ ساہیہ خان نے چونکتے ہوئے سر اٹھایا تھا اور مسکرا دی تھی۔

”جا کہاں رہے ہو؟“

”اس کو چھوڑو۔ کہاں جانا چاہتا ہوں یہ دریافت کرو۔“

”اور کہاں جانا چاہتے ہو؟“ وہ اس کی سنجیدگی پر مسکرائی تھی۔

”تمہارے دل تک۔“ جواب مختصر اور انداز مدلل تھا۔

ساہیہ خان ساکت رہ گئی تھی۔ اس لہجے، اس انداز کی اُمید نہیں تھی اور وہ بھی ان لمحوں میں۔ و کی تو قعات کو زیر کر رہا تھا۔

”حیران ہونے سے زیادہ ضرورت تعاون کرنے کی ہے ساہیہ! کچھ زیادہ نہیں تو صرف تمہارا

لی ہی کر دو۔“ وہ واقعی سنجیدہ تھا۔ ساہیہ خان نے اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا تھا مگر کچھ سمجھ نہ پائی اذہان حسن بخاری چلتے ہوئے اس کے قریب آ گیا تھا۔

”وہ مت دیکھو ساہیہ! جو دکھائی دے رہا ہے۔ وہ دیکھو جو دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ زیادہ خاص باور کرایا تھا۔ اس کا ہاتھ تھا تھا تھا۔ ساہیہ خان اس نئے تجربے پر کسی قدر حیران رہ گئی تھی۔

”میں چاہتا ہوں ساہیہ! میں واپس آؤں تو تم مجھے اپنے متعلق سوچتی ملو۔ ایٹ لیٹ تم کسی فیصلے پر مبنی ہو۔ میں تمہارے متعلق سنجیدگی سے سوچ چکا ہوں۔ بہتر ہو گا تم بھی سنجیدگی سے میرے متعلق شروع کر دو۔“

”شروع کر دو۔“

”یک خاص بات۔“

”یک خاص انداز۔“

”یک خاص توجہ کے ساتھ۔“

ساہیہ خان کے لئے بدستور اس کی سمت دیکھتے رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ یکدم ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکالا چلتی ہوئی سرعت سے باہر نکل گئی تھی۔ فوری طور پر یہ اقدام غنیمت لگا تھا۔

کبھی کبھی جس معاملے کو سلجھانے کی جتنی زیادہ کوشش کی جائے وہ اتنا ہی اُلجھتا چلا جاتا ہے۔ اتنا ہی کے ساتھ صورت حال کچھ مختلف نہیں تھی۔ دل کچھ بوجھل سا تھا۔ مگر اب اس نے قصد کر لیا تھا کہ وہ

کے کئے کی سزا خود کو اور اپنی فیملی کو نہیں دے گی۔ تبھی وہ فریض ہو کر باہر آ گئی تھی۔ می پکن میں تھیں۔

”می! چائے ملے گی۔“ خوشگوار موڈ شاید می کے لئے بھی حیران کن تھا۔ وہ چونکے بغیر نہیں

تھیں۔

”کیا ہوا می؟ آپ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟“

”نہیں، ایسا نہیں ہے۔“

”پہنچ اچھا نہیں؟“

”نہیں، بہت اچھا ہے۔“ می مسکرائی تھیں۔ ”تم دادا جی کے پاس جا کر بیٹھو، میں تمہارے لئے اور کچھ اسٹیکس لے کر آتی ہوں۔“

”اوزی کہاں ہے؟“

”پتہ نہیں، کسی کام سے شاید باہر گیا ہے۔ تمہیں اس موڈ میں دیکھے گا تو اسے بھی خوشی ہوگی۔ بہت رتی ہو تم ہم سب کو۔“

”مجھے اندازہ ہے می! مگر پراس، اب اور نہیں۔“ یقین دلایا تھا۔

”اچھی بات ہے، تمہیں احساس ہو گیا۔ اب کم از کم ہم اپنی بیٹی کو اچھے موڈ میں دیکھ سکیں گے۔ خوش پہلی والی اتنا بیہ شاہ۔“

”میں بھی یہی سوچتی ہوں می! سب کچھ فراموش کر کے پہلی والی اتنا بیہ شاہ بن جاؤں۔ اپنی ویز، آپ

جلدی سے چائے بھجوا دیں۔ میں دادا ابا کے پاس ہوں۔“ انا بیہ شاہ کہہ کر نکل آئی تھی۔
دادا ابا کپیوٹر پر بڑی تھے۔

”دادا ابا!“ کمرے کا دروازہ کھول کر جھانکتی ہوئی وہ مسکرائی تھی۔

”اوہ، مائے جیننس چائلڈ۔“ دادا ابا اسے دیکھ کر مسکرائے تھے۔ وہ آگے بڑھ آئی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے؟ کسی سے چیٹ ویٹ؟“ بھرپور شرارت سے مسکرائی تھی۔ دادا ابا مسکرا دیئے تھے۔

”نہیں، کچھ ضروری کام تھا۔ تم بتاؤ، یہ آج اتنا بدلاؤ کیسے آ گیا؟۔۔۔ وہ روتی بسورتی انا بیہ شاہ

کہاں چلی گئی؟“

”وہیں، جہاں سے آئی تھی۔ آج آپ کا چیس کھیلنے کا موڈ نہیں جو یہاں بیٹھے ہیں۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”چیس کھیلنے کے لئے ایک عدد ایٹلیکچوٹیل پارٹنر کی ضرورت پڑتی ہے اور میرے پاس وہ ناپید ہے کچھ

دنوں سے۔“ دادا ابا مسکرائے تھے۔

”تو سمجھے آج وہ مل گیا۔ کم آن، اٹھئے۔ آج میرا آپ کو ہرانے کا موڈ ہو رہا ہے۔ بہت دنوں سے

اس دماغ سے کام نہیں لیا میں نے۔ پڑے پڑے کہیں رنگ ہی نہ لگ جائے۔“ مسکراتے ہوئے ان کا

چیزیں سیٹنی تھیں۔ دادا ابا مسکرا دیئے تھے۔

”تو تم نے واقعی پروگرام بنالیا ہے مجھے ڈی فیٹ کرنے کا؟“

”آف کورس دادا ابا! آپ اسے مذاق سمجھ رہے ہیں؟“ وہ مسکرائی تھی۔ دادا ابا اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔

”ایک بات صاف ظاہر کرتی ہے کہ تم میری پوتی ہو۔ تم میں اسپورٹس مین اسپرٹ ہے۔ کچھ دن

اندھیرے میں رہ کر بالآخر اس بات کا احساس کر لیتی ہو کہ اس سے باہر کیسے نکلا جاسکتا ہے؟“

”یہ تو گڈ اور ہلدی سائن ہونا دادا ابا! آخر ایک بریگیڈیئر کی پوتی ہوں۔ یہ سارے گلنس مجھ نما

نہیں ہوں گے تو اور کس میں ہوں گے؟“ انا بیہ شاہ عرصے بعد مسکرائی ہوئی خود کو تروتازہ محسوس کرتی

تھی۔

میرب سیال کو نے میں چپ چاپ کھڑی تھی۔

چار سو ہنگامہ تھا۔ ہجوم تھا۔ شور تھا۔ سب انجوائے کر رہے تھے۔ ایک وجہ تھی جو پانی سے بھری

آنکھوں سے دھندلے دھندلے منظر کو کسی قدر ایسٹ سے دیکھ رہی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری کسی جینی پینی مینس یا پھر چارلی شارلی کے ساتھ ڈانسنگ فلور پر بڑی تھا۔ کئی

اور کئی بانہوں میں، کسی اور کی سنگت میں، کسی اور کے اتنے قریب۔ اسے دیکھنا خاصا برا تجربہ تھا۔ میرب

سیال اس سمت دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر نظر تھی کہ بار بار اسی سمت اٹھ رہی تھی۔ وہ شخص مسرور دکھائی دے

رہا تھا۔ زندگی جینا جیسے جانتا تھا وہ۔ اور ایک وہ تھی، اپنی زندگی کی نیچ برجیران کھڑی تھی۔ جسے نہ تو آگے

بڑھ جانے کے متعلق کچھ پتہ تھا نہ پلٹ جانے کے متعلق کوئی اور اک۔ وہ خود نہیں جانتی تھی وہ کیا چاہتا

بنداز سراسیمہ سا تھا۔ وہ شاید واقعی حیران تھی۔ زندگی پر، فوری طور پر بدلنے والے رنگوں پر اور شاید

اپنے۔

”ہیلو سونی! گڈ بو ڈانس ددی آن دی فلور؟“ وہ خود میں اتنی گن تھی کہ کسی کے پاس آ کر رکنے اور

ل پوچھنے پر مطلق نہ چوکی تھی۔ چونکی تب تھی جب اس شخص نے ششہ انگریزی میں اپنا سوال دوبارہ

پوچھا۔

”کیا ہم اس حسین شام میں ایک دوسرے کی بانہوں میں جھول سکتے ہیں؟ اس رنگین شام کو مزید

پن بنا سکتے ہیں ایک ساتھ وقت بچا کر؟“ وہ ساکت رہ گئی تھی۔ سرٹنی میں ہلاتے ہوئے دھیان سردار

پن حیدر لغاری کی طرف گیا تھا جو بہت مصروف دکھائی دے رہا تھا۔

”نو، ٹھیکس۔“

”اتنی دلکشی، اتنی رعنائی اور اس پر تہائی؟ کیا معاملہ ہے؟“ کوئی افسوس کرتا ہوا حیران تھا۔ ”کوئی فکر

بات نہیں۔ ہم ہیں ناسرا بننے والے اور تمہاری اس اُداسی کو مٹانے والے۔ کم آن۔۔۔ مائے آرمز آر

ہا۔“ مقامی شخص نے ششہ انگریزی میں کہتے ہوئے شانوں سے تمام کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا۔

ب سیال کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ بے بسی بھی بہت واضح تھی۔ وہ آواز دیتی تو کسے۔

رنی تو کسے۔ اپنا کون تھا یہاں؟ وہ تو کھلے آسمان کے نیچے ننگے سرتن تھا کھڑی تھی۔

”نن۔۔۔۔۔ نہیں، آئی سیڈ نو۔۔۔۔۔ ٹھیکس۔۔۔۔۔ مجھے نہیں جوائن کرنا آپ کو۔ گواوے۔“ میرب سیال

نا احتجاج کرنا چاہا تھا۔ اس بڑے ہوئے ہاتھ کو جھٹکا تھا۔ آنکھیں پانیوں سے بھری تھیں اور پل بھر میں

لٹی چلی گئی تھیں۔ تنہا تھی وہ ایک دم۔ اکیلی، وقت کے رحم و کرم پر۔

”کم آن بیب! مائے آرمز آراوین فور یو۔“ سامنے کھڑا شخص بدستور پیشکش پر مائل تھا۔

”میرب سیال کے لئے صورت حال کو سنہالانا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ اسے جھٹک رہی تھی مگر وہ شخص باز

لما رہا تھا۔ شاید وہ جان گیا تھا وہ کتنی کمزور تھی، تنہا تھی۔

میرب سیال کی بھگتی آنکھوں کے سامنے سارے منظر دھندلا رہے تھے۔

کسے پکارتی؟ کون آتا اس کی مدد کو؟

وہ تو ابھی کچھ دیر قبل کہہ گیا تھا۔

”شی از اوٹلی اے گرل فرینڈ آف مائن۔“

وہ جو بے توقیر کر گیا تھا، اسے معیار سے گرا گیا تھا۔

”ٹلس انجوائے بے بی! ڈس لائف اڈ سوچ یوٹی فل۔ ایز لایک یو۔ کم آن۔“

نگین پانیوں سے لبالب بھری آنکھوں سے اس نے ایک بار پھر وہ ہاتھ جھٹکا تھا۔

”سب۔۔۔۔۔ سبک۔۔۔۔۔ سبکگین۔۔۔۔۔!“ بے ارادہ پکارنا چاہا تھا۔ مگر ہمت اتنی ناپید تھی کہ نام گلے میں

انگلی گھٹ کر رہ گیا تھا۔ آنسوؤں کے گولے کے ساتھ۔

وہ حد سے زیادہ بے یار و مددگار تھی۔

شاید اس شام وہ واقعی تھا، وقت کے رحم و کرم پر تھی۔ جو چاہتا سو کرتا۔

اپنی بے بسی پر ٹوٹ کر رونا آ رہا تھا۔

چہرہ متواتر بھیکتا چلا جا رہا تھا۔

کسی بھی طرح کی امید اس شخص سے رکھنا عبث تھا۔ اپنوں سے دور ایک پرانے دیس میں وہ پرا لوگوں کے رحم و کرم پر تھی۔

بھیگتی آنکھوں کے آگے جیسے ایک دھند سی تھی۔ منظر بھی واضح طور پر دکھائی نہ دے رہا تھا اور جو دکھا دے رہا تھا اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کوئی اس کی مدد کو پہنچ چکا تھا۔ کوئی آ گیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل مقامی شخص اس کے قریب کھڑا اُسے زچ کر رہا تھا اس گھڑی وہ اسے کسی سے بری طرح زد و کوب ہو دیکھ رہی تھی۔

میرب سیال نے پانیوں سے بھری آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کسی قدر بے یقینی سے سردار سبکگلین، لغاری کو دیکھا تھا۔ جس کا انداز بے حد جارحانہ اور مشتعل تھا۔ اس لمحے وہاں موجود سیورٹی گارڈز کا قابو کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے مگر بری طرح ناکام تھے۔

میرب سیال ساکت سی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ چند سیورٹی گارڈز اس بیٹے والے مقامی شخص وہاں سے لے گئے تھے۔ مگر سردار سبکگلین حیدر کی نظروں میں اب بھی اتنی ہی خفگی تھی۔ سیورٹی گارڈز حراست سے نکل کر اس کی سمت آتے ہوئے اس کے چہرے کی کیفیات بہت متضاد تھیں۔

میرب سیال بے دم سی سانس رو کے کھڑی تھی جب وہ اس کے مقابل آن کھڑا ہوا تھا۔ میرب اسے ناپسندیدہ انداز سے دیکھا تھا۔ سردار سبکگلین حیدر لغاری نے آہنی ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھامنا تھا مگر میرب سیال نے وہی ہاتھ اس کے چہرے پر دے مارا تھا۔ ایک لمحے کو ایک سکوت سا چھا گیا، سردار سبکگلین حیدر لغاری اسے سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ شدت جذبات سے بھرا تھا۔ آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ جیسے وہ خود پر حتی الامکان قابو پانا چاہتا تھا۔ میرب سیال کورتی بھر گرنے لگی تھی۔ اسے بچانے آنے کی یہ قیمت بہت کڑی تھی۔

”بیوی..... بیوی نہیں ہوں میں تمہاری..... یہی..... یہی کہا تھا تم نے؟ گرل فرینڈ بنا کر لا۔ تمہارا تم مجھے یہاں؟ تو پھر اب کیوں آئے؟ کیوں نہیں چھوڑ دیا مجھے انہی درندوں کے رحم و کرم پر؟“

گرل فرینڈ کے ساتھ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ تمہیں کیا پتہ کہ بیوی کیا ہوتی ہے..... اس کی عزت کیا ہے۔ کبھی رشتے بنائے ہوں، نبھائے ہوں تو کچھ خبر بھی ہو..... نام کے رشتے بنا کر رشتے برتنا نہیں جاتے۔ بیوی کی جگہ کیا ہوتی ہے اور گرل فرینڈ کی کیا؟ تم ابھی تک نہیں سمجھے ہو۔ اور سمجھو گے بھی نہیں۔ جب تم بیوی کو محفلوں میں لا سکتے ہو..... اس کے سامنے کسی کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر انجوائے سکتے ہو تو کوئی تمہاری بیوی کی سمت بھی اسی خواہش سے بڑھ سکتا ہے۔ عجب تو کچھ نہیں ہوا۔ پھر کیا اتنے براہم دکھائی دے رہے ہو مسٹر سردار سبکگلین حیدر لغاری.....؟“ آنکھوں میں دیکھتی ہوئی درشت انداز میں وہ دریافت کر رہی تھی۔ مگر اس نے پونچھنے کھڑے سردار سبکگلین حیدر لغاری نے اپنا مضبوط آہنی ہاتھ

آ کر یکدم ہی اس کا ہاتھ گرفت میں لیا تھا اور جارحانہ انداز میں کھینچتا ہوا اس ماحول سے نکل آیا تھا۔ وہی وہ کوئی بھرا ہوا شیر لگ رہا تھا جو اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش میں تھا۔ میرب سیال کو اب خوف نہیں تھا۔ اسے نتائج کی پروا نہیں تھی۔ اُسے اُس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا تھا..... ہر قسم کے خوف سے دامن چھڑا چکی تھی وہ..... جو ہوتا سو ہوتا..... اپنا ہاتھ آہنی گرفت لے جارحانہ انداز میں اسے لے کر آگے بڑھتے شخص کو، اس کی پشت کو وہ دیکھ رہی تھی۔ مگر اب نہ میں ہی آنسو تھے، نہ ہی کسی قسم کا کوئی خوف۔ جیسے اب وہ جینا سیکھ چکی تھی۔



کلام

لے آپ سے محبت نہیں کر سکتا، یہ جھیلنا آسان نہیں ہے۔“
بچے ساکت رہ گئی تھی۔

”پھوپھو! وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ اس کی خواہشوں میں کوئی اور ہے..... اور.....“
ایسا تم سے اذہان نے کہا؟“ اگینے کا لہجہ دھیما تھا۔ کسی قدر حیرت سے بھرا۔
نہیں۔ میں بے وقوف نہیں۔ میں یہ بات جانتی ہوں۔“
تو پھر۔ کیا طے کیا تم نے؟“

بچی۔ یہی تو براہِ علم ہے پھوپھو! میں کسی نتیجے پر ہی پہنچ نہیں پارہی ہوں۔“ وہ مسکرائی تھی۔ ”شاید
لذرا تے اسی قدر کٹھن اور مشکل ہوتے ہیں۔“ بچے میں ایک یا سیت تھی۔ مگر اگینے کچھ نہیں بولی
بڑاس لئے نظروں میں ایک گہرا کرب دکھائی دے رہا تھا۔

انا بیہ شاہ!۔ زندگی کو چینی کی صورت اور ہوتی ہے اور بسر کرنے کی اور۔ چینی کے ڈھنگ
نے پڑتے ہیں اور بسر کرنے کے طریقے خود سے وضع کرنے پڑتے ہیں۔ اور میں دوسری کیفیت کو
اپنے والوں میں سے ہوں۔ میرے خیال میں زندگی کا کوئی فریزنگ پوائنٹ نہیں ہوتا۔ ہو بھی نہیں
سکتا ساتھ چلے نہ چلے۔ رہے نہ رہے۔“
مصدق سوٹ ڈریک کے سپ لٹینی ہوئی بہت بڑا اعتماد دکھائی دے رہی تھی۔ انا بیہ شاہ کے پاس
نشاید کچھ نہ تھا۔

جو باب بند، سو بند۔ میں کسی معاملے کو دوبارہ ہوا نہیں دینا چاہتی۔ اس لئے پلیز تم یہ مصالحت
نے کے طریقے سوچنا بند کر دو۔ میں جانتی ہوں، یہ ساری کوششیں ناکام ہونے والی ہیں۔“
لامعنا تم جانتی ہو وہ لڑکی کون ہے؟“ بھگی نظروں میں کوئی ندامت سی تھی۔
مصدق مسکرا دی تھی۔ انداز بجا بجا سا تھا۔

کیا فرق پڑتا ہے؟۔ کوئی بھی ہو۔ مسائل کم تو نہیں ہیں جو مزید بڑھائے جائیں۔ تم نے بتایا
اگر تم جانتی تھیں تمہارے لئے کوئی پروپوزل آیا ہے۔ اور تم اسے مسلسل ریجیکٹ کر رہی ہو۔
ہاں؟۔ بہت گھنی ہو تم۔ مجھ سے بھی چھپانے لگی ہو؟“ لامعنا حق کا لہجہ معمول کا سا تھا۔
یہ شاہ نظر میں چرا گئی تھی۔

میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں لامعنا“
کیا؟۔ بتاؤ نا۔“ وہ مسکرائی تھی۔ مگر تبھی اس کے پرسنل سیل پر ایس ایم ایس کی مخصوص ٹون بجی
اور اس پر ساری توجہ صرف کرتی ہوئی مسکرائی تھی۔ اور اس کی طرف معذرت طلب نظروں سے
اٹھی۔

وری یارا!۔ ہم پھر بات کریں گے۔ مگر آئی سٹ سے۔ خواہ مخواہ کی فکریں پالنے کی
بھلی ہے۔ اگر لڑکا اچھا ہے تو فوراً اُسے ہاں کہہ دو۔ رفیوز کرنے کا آپشن پھر کسی وقت اور

دل اور دماغ جب دو مختلف سمتوں پر ہوں، انہیں ایک سمت میں لانا آسان نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس
میں کی جانے والی کوشش کامیاب.....!
پتہ نہیں وہ اس ضمن میں واقعی کامیاب تھی بھی یا کہ نہیں۔ مگر یہ سب کرتے ہوئے دل
مشکل میں تھا۔

وہ اندھیرے میں کھڑی تھی۔ اگینے اسے دیکھ کر کسی قدر پریشانی سے اس کی طرف بڑھی تھی۔
”ساہیہ! کیا ہوا؟۔ اس طرح اندھیرے میں کیوں کھڑی ہو؟“
”پھوپھو! آپ کو وہ طریقہ معلوم ہے جس میں سب کو خوش رکھنے کے ساتھ ساتھ خود کو مطمئن رکھ
آتا ہو؟“ ساہیہ مسکرائی تھی۔ مگر لبوں پر بڑی ہی بھگی بھگی مسکراہٹ تھی۔
”کیوں، کیا ہوا؟۔ تم اس طرح کیوں سوچ رہی ہو؟“

”کیونکہ۔۔۔ کیونکہ پھوپھو!۔ مجھے لگ رہا ہے میں باوجود کوشش کے ویسا نہیں کر پارہی
جیسا کرنا چاہتی ہوں۔ دل و دماغ دو مختلف سمتوں پر چلنے کو مائل ہیں اور.....“ بات ادھوری چھو
ہوئے وہ خاصی الجھن میں دکھائی دی تھی۔ اگینے نے اس کے شانوں پر ہاتھ دھر دیئے تھے۔
”یہ ہماری ساہیہ، جس کے پاس ہر مشکل کا حل موجود ہے، ہر تالے کی، کی موجود ہے آج اتنی
کیوں دکھائی دے رہی ہے؟۔ تم تو اپنی ایک مسکراہٹ سے کسی دشمن کا بھی دل جیت سکتی ہو۔
درد مند، حساس دل رکھتی ہو۔ پھر اتنی مایوس کیوں ہو؟“ اس کے چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے اگینے
مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”پھوپھو! دل جیتنا الگ بات ہے اور دل میں گھر کرنا دوسری بات۔ اور آپ کی ساہیہ اس بار
نا کام رہی ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ خواہشوں کے الاؤ اسے چلانے لگے ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے؟
جذبات سے دامن چھڑ نہیں پارہی ہے۔ بھول نہیں پارہی ہے کہ وہ بھی ایک لڑکی ہے اور ایک دل
ہے۔ اور اس دل میں لاتعداد خواہشیں جو کروں کی طرح، جو کہ مار کر اور مسکرا مسکرا کر وہ دوسروں کے
پر مسکراہٹ تو لاسکتی ہیں۔ انہیں مطمئن و پُر سکون تو کر سکتی ہے مگر اس سب میں وہ خود کہاں ہے؟“
ذات کہاں ہے؟“ مدہم لہجہ بجا بجا سا تھا۔

اگینے کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔
”پھوپھو! کوئی آپ کو نہیں چاہتا، محبت نہیں کرتا، یہ سننا جھیلنا آسان ہے۔ مگر کوئی کسی اور سے جہا

ایسے میں، میں اپنے نضیال نہیں آؤں گی تو اور کس کے پاس جاؤں گی؟“ سیفی مسکرا دیا تھا۔ بے جی سے چپت لگائی تھی۔

دیکھو! خواہ مخواہ چھپڑ رہا ہے۔ میرا ڈٹو سنا، وہاں سب ٹھیک تو ہے نا؟“ مظہر کی طبیعت پہلے تر ہوئی یا نہیں؟“

جی۔۔۔ بہت بہتر ہیں پہلے سے۔“

مظہر بھائی نے تو حد کر دی۔ سارے ریلوے ہی توڑ دیئے۔ اتنی دوری آن پڑی ہے درمیان کہ حال پوچھنے سے بھی گئے۔“ جھلی ممانی نے شکوہ کیا تھا۔ لہجے میں ایک افسوس تھا۔

کیا ہو سکتا ہے؟۔۔۔ بندہ تو کوشش کر سکتا ہے، سو ہم نے کی تھی۔ مگر وہی ماہل نہیں رہے کبھی۔“

ماموں اشتیاق کے لہجے میں بھی افسوس تھا۔

بے جی خاموشی سے جیسے کچھ سوچنے لگی تھیں۔ وہ جانتی تھی اس لمحے ان کے ذہن و دل میں کیا سوچیں گی ہوں گی۔ سوان کی طرف دیکھتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

ناؤ! میں نے وہاں ایک شے کو بہت زیادہ مس کیا۔ آپ جانتی ہیں کیا؟۔۔۔ آپ کے ہاتھ سے لی دیکھی سوئیوں کو۔ سچ، بہت یاد آئیں۔“ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ ناؤ مسکرا دی تھیں۔ پھر سے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

میں تو تیرا ہی چہرہ دیکھ کر جی رہی ہوں۔ تیرے مین نقش مجھے گمشدہ رشتوں کا احساس دیتے ہیں۔ تو ہے تیری شکل ہو بہو اپنی ماں جیسی ہے؟“

ہاں۔۔۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ماما کی شکل آپ سے بھی بہت ملتی تھی۔“ میرب سیال ناگھی۔

ہاں۔ مگر عادتیں اُس کی ساری کی ساری اپنے باپ جیسی تھیں۔ مجال ہے جو کسی بات کو برامان کر دل الے۔ ہر دم مسکراتا چہرہ۔ دشمن نے بھی دل دکھا دیا تو جواباً اُسے سکھ ہی دیا۔“ بے جی پرانی یادوں کی دکھائی دے رہی تھیں۔

پھر تو اپنی میرب صاحبہ بھی بالکل انہی پر گئی ہیں۔ یہ بھی اپنے دشمنوں کو کشادہ دلی سے نہ صرف کرتی ہیں بلکہ دل سے برداشت کرنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔“ سیفی مسکرا رہا تھا۔ مگر میرب سیال ل پر کسی طرح کی کوئی مروت سے بھری مسکراہٹ بھی نہ آسکتی تھی۔ وہ کسی طرح کی مروت کا مظاہرہ نہ میں یکسر نا کام رہی تھی۔

میری تو خواہش تھی اپنے سیفی کے لئے مظہر بھائی سے تمہیں مانگتی۔ مگر خیر جو خدا کو منظور، خدا نصیب رہے۔“ بڑی زیب ممانی نے خواہش کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ بے جی نے انہیں کسی قدر خشکی سے غا۔

انصیبوں کے کھیل ہیں سارے۔۔۔ جو لکھا ہو، وہ ہو کر رہتا ہے۔ خدا نے جس کے ساتھ اس کا نایا ہے، خدا جوڑی بنائے رکھے۔“

موقع کے لئے اٹھا رکھو۔ اوکے۔۔۔ پھر ملیں گے تو بات کریں گے۔“ لامعہ حق عجلت میں اسے چھوڑ نکل گئی تھی۔ مگر وہ تادیر وہیں بیٹھی اپنی الجھنوں کو لے کر الجھتی رہی تھی۔ جانے کب یہ سلسلہ تھمتا تھا کہاں جا کر تھمتا تھا۔ تھمتا بھی تھا یا کہ نہیں؟

وہ مکمل طور پر شکست خوردہ دکھائی دے رہی تھی۔۔۔ قصور اس کا کہیں بھی نہیں تھا۔ مگر وہ خود کو پھر؛ مجرم سمجھ رہی تھی۔ حالات سبھی کے سبھی اس کے مخالف تھے اور وہ سدباب ڈھونڈتے ڈھونڈتے وا بڈھاں تھی۔

کچھ پھول چننے

کچھ خواب چننے.....

چلے تھے تو قدم مگر.....

راستوں نے پیروں میں بچھے تمام رستوں کو

اور دور کر ڈالا.....

خاک میں ملا ڈالا

کھو گئے سبھی رستے

رنگ شہر بھی اُجڑ گیا

نگاہ سے نگاہ کا واسطہ.....

ہر رابطہ.....

فاصلوں سے اٹ گیا.....

سارا سفر ختم ہو گیا تھا۔۔۔ راستے ختم ہو گئے تھے اور قدم گرد سے اٹ گئے تھے۔ جہاں سے

تھے قدم، بڑاؤ دوبارہ وہیں آن پڑا تھا۔

سیفی، سبھی دوسرے کزنز، بے جی اسے دیکھ کر حیران تھے۔

”تم اس طرح مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟“ سیفی کے دیکھنے پر وہ تمام صورت حال کو

کنٹرول“ ظاہر کرتے ہوئے مسکرائی تھی۔

”میں تمہاری آنکھوں میں وہ رنگ تلاشنے کی کوشش کر رہا ہوں جو تم اپنے لہجے میں ظاہر کر

کوشش کر رہی ہو۔“ سیفی مسکرایا تھا۔ میرب سیال لمحہ بھر کو ساکت رہ گئی تھی۔ پھر مسکراتی ہوئی شکوہ

نظروں سے بے جی کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”ناؤ! دیکھ لیں۔۔۔ کیسی فضول باتیں کر رہا ہے یہ سیفی کا بچہ۔“

”سیفی!۔۔۔ بری بات ہے بچے۔ بہن کو اس طرح نہیں ستاتے۔“ ممانی نے سیفی کو گھر کا

مسکرا دیا تھا۔

”مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ اتنے دنوں بعد یہاں واپس آئی ہوں میں۔ پاپا اور دیگر لوگ تو نا

”آمین۔ یوں بھی مجھے ایسے انوکھے لوگوں کو جھیلنے کی عادت نہیں۔“ سیفی مسکرایا تھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر تم جمیل تو اب بھی رہے ہو۔“ میرب نے بات کو مذاق میں نالٹا چاہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر اس طرح سے جھیلنے میں اور اُس طرح سے جھیلنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس کا مطلب کم کم تم تو سمجھ ہی سکتی ہو۔“ سیفی مسکرایا تھا۔ بات اگرچہ مذاق میں تھی مگر میرب کے لبوں پر کوئی مسکان بھی کھلی تھی۔

”بہو! لیکن میں دیکھ لو ذرا۔ رات کے کھانے میں اہتمام رکھنا۔ داماد پہلی بار آ رہا ہے۔ میرا کبر کہا تھا سبکتگین نے آنے کا؟“

”وہ نانو!..... کہا تو رات کا ہی تھا مگر.....“

”اگر مگر کیا؟..... ٹھیک سے بتاؤ نا۔۔۔ موصوف آنے والے ہیں یا کہ نہیں؟ ہاتھ میں سل نو ہے۔ کال کر کے کنفرم کر لو۔ اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہو؟“ سیفی نے کہا تھا۔

وہ ناچار نمبر ملانے لگی تھی۔ مگر دوسری جانب رسپانڈ نہیں کیا گیا تھا۔ نتیجتاً وہ سلسلہ منقطع کر کے ان سر کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”غالبا بڑی ہیں۔“

”اور اگر وہ لینے بھی نہ آئے تو؟“ کزن حور عین نے چھیڑا تھا۔

”تو کیا۔۔۔ ہم نے اپنی بیٹی کو گھر سے تو نہیں نکالا ہوا۔ وہ تو مظہر بھائی ہی نے گڑ بڑ کر دی۔ بیڑ نکاح کے دو بول پڑھوا کر رہنے کے لئے سسرال میں چھوڑ دیا۔ اتنی بڑی انھیال کے ہوتے ہوئے، پرا۔ گھر کا انتخاب کیا بیٹی کے رہنے کے لئے۔ بات اگر چند دن کی بھی تھی تو انھیال کیا برا تھا؟ مظہر بھائی نے ایک طرح سے طمانچہ مارا ہے ہمارے منہ پر۔“ بڑی ممانی صاف گوئی سے بولی تھیں۔ بے جی جو ابابا خاں رہی تھیں۔

”بھائی ثمنینہ ٹھیک کہہ رہی ہے بے جی! لوگ انگلیاں اٹھا رہے ہیں ہم پر۔ مظہر سیال نے ایسا کر ٹھیک نہیں کیا۔ سگی انھیال پر اعتبار نہیں، غیر لوگوں پر بھر پورا اعتماد ہے۔ اس سے زیادہ ذلت ہماری اور کیا گی؟“ سمیح ماموں نے بھی دبا دبا احتجاج کیا تھا۔ میرب سیال کے پاس سوائے خاموشی سے سر جھکا جا کے اور کوئی راہ نہ تھی۔

”آؤ، ہم ٹیرس میں چلتے ہیں۔ یہاں کچھ گھٹن سی ہو رہی ہے۔“ ہادیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑی تھی۔ اور اسے اس بو جھل بو جھل ماحول میں وہ لمحہ غنیمت لگا تھا۔

ڈھیر سارے کزنز کے جھرمٹ میں۔۔۔ خوشگوار ماحول میں بھی اسے کئی طرح کی کشائون کا سا تھا۔ شاید یہ موسم اس کے اندر کے تھے۔ سیف نے اُسے خاموشی سے دیکھا تھا مگر کچھ دریافت نہیں کیا تو

”کتنے دن ہو گئے نا ہمیں ڈھنگ سے کچھ انجوائے کئے۔۔۔ نہ کوئی آؤٹنگ نہ بلاوجہ کاٹا آؤٹ، نہ شاپنگ، نہ کوئی اور مصروفیت۔ کوئی لطف نہیں۔“

لامع حق کا لہجہ اس کے اندر کی صاف چٹلی کھا رہا تھا۔ حالانکہ اس کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ کرتی ہوئی وہ بہت پُر اعتماد دکھائی دے رہی تھی۔ مگر انا بیہ شاہ اس کے اندر کے تمام انتشار جیسے دیکھ لیتی تھی۔

”لامع!۔۔۔ تمہاری اس کیفیت سے میں خوش نہیں ہوں۔ تمہاری یہ کیفیت مجھے اندر سے بہت رعبی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے میرا اندر بھر پور تمازتوں میں گھر گیا ہے۔ سارا وجود جل رہا ہے۔“

”اور دور تک چھاؤں کہیں نہیں ہے۔“ لامع حق نے معمول کے انداز میں مسکراتے ہوئے اس کا جملہ مل کیا تھا اور بس دی تھی۔

”انا بیہ!۔۔۔ تمہاری دوست اب اتنی کمزور بھی نہیں ہے۔ اور تم جانتی ہو مجھے بے کار کے روتے روتے چہرے بہت برے لگتے ہیں۔“ انا بیہ مسکرا دی تھی۔

”انا بیہ! میں اپنی اس پرانی دوست کو بہت مس کر رہی ہوں جو تمام غموں سے، دکھوں سے واقعی دوستی مل رکھی تھی۔ جسے بلاوجہ کے واہموں اور خدشات سے کچھ واسطہ نہ تھا اور جو زندگی کو جینا جانتی تھی۔ مگر

اب بہت اچھی سی انا بیہ کے ساتھ۔“ لامع حق مسکرا دی تھی۔ مگر انا بیہ شاہ ایسی کوئی کرٹسی نہیں دکھا سکی تھی۔ ت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے اسٹریٹنگ پر دھرے نازک ہاتھ پر دھر دیا تھا۔

”لامع! میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔“ انا بیہ شاہ نے مضبوط لہجے میں کہا تھا

”کیا؟“ لامع حق سننے پر مائل نظر آ رہی تھی۔ مگر انا بیہ لہجہ بھر کے لئے کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔ شاید بہت ت اور کار تھی۔ مگر اُسے یہ سب کہنا تھا۔ کم از کم وہ اپنی بہترین دوست کو کسی قسم کے اندھیرے میں رکھنا

مل چاہتی تھی۔ نقصان پہنچانا نہیں چاہتی تھی اور اس کے لئے کہنا ہے حد ضروری تھا۔

”لامع! میں تم سے چھپانا نہیں چاہتی۔ نہ ہی اب چھپاؤں گی۔ عفتان علی خان کی زندگی میں آنے

لا دوسری لڑکی کوئی اور نہیں، میں ہوں۔“ انا بیہ شاہ نے سچ کہا تھا۔ ایک لمحہ سکوت رہا تھا۔ لامع حق کی

اڑی کو یکدم بریک لگے تھے اور وہ بے حد حیرت کے ساتھ اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”لامع! پلیز۔۔۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری خیر خواہ نہیں ہوں یا تمہاری مخلص نہیں ہوں۔ مجھے

لا نہیں پتہ یہ سب کیونکر اور کیسے ہو گیا۔ کیسے عفتان علی خان میری محبت میں اس درجہ گرفتار ہوا۔ مگر میں

نہ ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔ اور اسی لئے میں نے کبھی بھی اس کی کسی طرح سے کوئی پذیرائی

ملی۔ اگرچہ وہ تم سے تعلق توڑ چکا ہے مگر میں اب بھی یہی چاہتی ہوں کہ وہ تمہاری طرف لوٹ جائے،

مے پروپوزل بھجوانے والا کوئی اور نہیں، عفتان علی خان ہی ہے۔ مگر میں نے اس کے پروپوزل کو رد کر دیا

ہ۔ میں اس سے کسی طرح کا کوئی ریلیشن شپ نہیں چاہتی۔ اس کے برعکس میں اس کے اور تمہارے

بلاں پل کا کام کرنا چاہتی ہوں۔ میری کوشش ہے تم دونوں کے بیچ پھر سے وہی تعلق قائم ہو جائے۔“

ایہ شاہ مخلصانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔ مگر لامع حق جیسے کسی عالم سکوت میں تھی۔

انا بیہ شاہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی، اپنا کوئی قصور نہ پاتے ہوئے بھی شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

”لامع! آئی ایم سوری، اگر تمہارا دل میری وجہ سے دکھا ہے۔ مگر میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا۔“ ناکردہ

جرائم کی وضاحت دیتی ہوئی وہ بہت مشکل دکھائی دے رہی تھی۔

لامعہ حق نے اس کی سمت دیکھا تھا اور جانے کیوں مسکرا دی تھی۔

”اسٹریٹج — ویری اسٹریٹج“ وہ ابھی تک حیرت میں تھی۔ لہجہ متاسف تھا۔ ”مجھے ابھی تک یقین نہیں ہو رہا — اور وہ تم تھیں۔“

انابہ شاہ کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔ اور لامعہ حق ہنس دی تھی۔ عجب ایک پاگل پن کا سا انداز تھا۔ وہ ہنسے سرٹنی میں ہلارہی تھی۔

”نہیں انابہ شاہ! تم وہ ہرگز نہیں ہو جس سے میں نفرت کر سکوں یا نفرت کروں۔ بالکل بھی نہیں، کوئی اور ہوتا تو بات بھی تھی۔ مگر تم..... تم سے میں چاہوں بھی تو نفرت نہیں کر پاؤں گی۔ سچ کہوں تو میں ابھی

تک یقین بھی نہیں کر پارہی ہوں کہ وہ تم ہی ہو۔ میری اپنی دوست، میری انابہ۔ ایک ساتھ، ایک دوسرے کے کھلونوں سے کھیلنے بیچین گزرا۔ کبھی تم میرے گھر اور کبھی میں تمہارے۔ کبھی کوئی تفریق

درمیان رہی ہی نہیں۔ اور آج۔“ وہ مسکرا دی تھی۔ ”تمہیں یاد ہے انابہ! ہم بیچین میں ایک جیسے کھلونوں اور چیزوں کی طرف ایک ساتھ مائل ہوا کرتے تھے۔ جو شے تمہیں اچھی لگتی تھی وہی مجھے بھی اچھی لگتی تھی۔ اور

اس بات کو لے کر اکثر ہم میں جھگڑا بھی ہو جایا کرتا تھا۔ مگر ہم زیادہ دیر تک دور نہیں رہ پایا کرتے تھے اور نتیجتاً پھر ساتھ ہوتے تھے۔ اور آج.....“ وہ ایک تاسف سے شانے اچکاتی ہوئی ونڈ اسکرین سے پار

دیکھنے لگی تھی۔ انابہ شاہ خاموش نہیں رہ سکی تھی۔

”تم غلط سمجھ رہی ہو لامعہ! میرا عفتان علی خان میں کبھی کوئی اسٹریٹج ڈی ویلپ نہیں ہوا۔ اور نہ ہی ہوگا۔“

”ہاں۔۔۔ میں جانتی ہوں۔ مگر میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں جانتی ہوں تم مجھ سے اور میں تم سے کتنے سنہیر ہیں۔ میں جانتی ہوں تمہارا کبھی کوئی قصور اس میں رہا نہیں ہوگا۔ میرا یقین تم پر مجھ سے بہت

زیادہ ہے۔“ لامعہ کے لبوں پر دھیمسا تبسم تھا اور انابہ شاہ کی نظروں میں بے یقینی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولنا چاہے تھے مگر اس سے قبل ہی لامعہ حق اس کے ہاتھ پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولی تھی۔

”ڈونٹ تنہک اپنی مور انابہ! آئی سینڈ ڈیٹ آئی بلیو۔ یقین ہے تو پھر کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ تو لیکھ نہیں نا، ساری بات ان کی ہے۔ یوسٹ بی اے کی گراں۔“ تبسم بجا بجا سا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے مزید کچھ کہے بغیر گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

انابہ شاہ گھر آنے تک خاموشی سے بیٹھی رہی تھی۔ کہنے سننے لائق کچھ باقی نہ بچا تھا جیسے۔ اس کے گھر کے باہر گاڑی رکھی تھی اور انابہ شاہ نے لامعہ حق کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اسی دوستانہ انداز میں مسکرا دی تھی۔

”کل میرا شاپنگ کاموڈ ہو رہا ہے۔ اگر وقت ہو تو فون کر دینا۔ ہم پروگرام ڈن کر لیں گے۔“ انابہ شاہ نے سر ہلا دیا تھا۔ لامعہ حق نے مسکراتے ہوئے گاڑی بڑھادی تھی۔

انابہ شاہ تادیر وہیں کھڑی رہی تھی۔

ظہور اس کا کہیں نہیں تھا۔ گراس کے اندر ایک گلٹ پھر بھی تھا۔ وہ گلی فیل کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی لامعہ حق کی وہ مسکراہٹ، وہ تبسم جھوٹا تھا اور یہ بات اسے لامعہ سے کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

”پتہ نہیں فارحہ بھالی! مجھے یہ بات کہنا بھی چاہئے یا نہیں۔ مگر مجھے جانے کیوں ساہیہ اور اذہان اس بارے خوش دکھائی نہیں دیتے۔ انہوں نے مجھ سے ایسا کچھ کہا تو نہیں، مگر بہت سی باتوں کے کہنے

لئے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے اگینے! اذہان نے خود اس رشتے کے لئے مجھے اپنی رضامندی دی ہے۔ اور رہی ساہیہ کی، تو لڑکیاں عموماً اس معاملے کو لے کر کسی قدر اپری ہنسو ہوتی ہیں۔ شاید اس لئے بھی کہ وہ احساس ہوتی ہیں۔ ساہیہ اور اذہان کو چھوڑو، تم اپنی بات کرو۔ واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے؟ کتنا

مگزر گیا، روجیل نے پلٹ کر خبر کیوں نہیں لی؟ تم دونوں کے درمیان سب ٹھیک تو ہے نا؟“ مسکراتے اور بظاہر نارمل انداز میں دریافت کیا تھا۔ مگر اگینے کے چہرے کی کیفیت ایک پل میں متغیر ہوئی تھی اور

ظہوریں چرا گئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ برامان گئیں؟ میں تو صرف مذاق کر رہی تھی۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا۔“ فارحہ نے ذہرت چاہی تھی اور اگینے جیسے اس لئے ایک کرسی سے مسکرائی تھی۔

”ایسی بات نہیں ہے بھالی! آئی ڈونٹ مائنڈ ڈیٹ۔“

”تو پھر اگینے! مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ جیسے ان آنکھوں میں کچھ ہے۔ کوئی ایسی بات جو تم سب سے ہانا چاہ رہی ہو۔ حتیٰ کہ خود سے بھی۔“

فارحہ کا انکشاف اگینے کو حیران کر دینے کو کافی تھا۔ وہ کچھ بول نہیں سکی تھی۔

فارحہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ پر دھر دیا تھا اور بہت ملامت سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی

”اگینے! کبھی کبھی بھید کو بھید بنانے رکھنے سے زیادہ مشکل بھید کو سنبھالنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی بات تمہیں بیان کر رہی ہے تو تم مجھ سے شیر کر سکتی ہو۔“ لہجھاؤں کو زیادہ دیر تک نہ سلجھایا جائے تو پیچیدگیوں

لگنے لگتی ہیں۔“ مشورہ مخلصانہ تھا مگر اگینے کچھ نہیں بولی تھی۔

خداشات کبھی کبھی درست بھی ہوتے ہیں۔ میرب سیال کو جو لگا تھا وہ درست ہی تھا۔ سردار سیکنگین حیدر لغاری اسے نہیں لینے آیا تھا۔ غالباً بائی

ال نے ڈرائیور بھجوا دیا تھا۔ نانو، ماموں، ممانیوں نے کوئی وضاحت نہیں مانگی تھی مگر وہ اپنی جگہ جیسے چوری بن کر رہ گئی تھی۔ لوٹی تھی تو وہ محل نما گھر اسی قدر ویرانیوں میں ڈوبا ملا تھا۔ دو دن پہلے جب وہ لوٹی تھی تو تب بھی اس نے اس گھر میں ایسا ہی سناٹا دیکھا تھا۔ یا پھر اس کے اندر

ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔“

پھر کیا بات ہے؟ جب سے ٹو لوٹی ہے، خوش دکھائی نہیں دے رہی۔ جانے سے قبل بھی تیرے پریشانی والی کیفیت تھی۔ مگر یہ کیفیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ کوئی بات ہوئی تھی بے حد ناگوار گزری ہے۔ مگر تو اسے چپ چاپ جھیل رہی ہے۔ مجھے بتا، کیا ہوا؟ سبکدین حیدر نے کچھ کہا ہے؟“ بات سچ تھی۔ وہ کوئی وضاحت نہیں کر سکتی تھی۔ مائی اماں کی نگاہ واقعی جہانم دیدہ تھی اپنے بیٹے سے بہت اچھی طرح واقف تھیں۔

پھر وہ میرے بیٹے! یہ جو وقت تم دونوں کو ساتھ گزارنے کو دیا گیا تھا صرف اسی بات کے لئے تھا کہ ان ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ اور جان سکوں۔ حالانکہ ایسا کچھ ضروری بھی نہیں تھا۔ ہمارے ہاں تو

بت ہے کہ بس شادی ہو گئی تو نباہنا شروع ہو گیا۔ مگر میں نے ایسا اسی لئے چاہا تھا کہ میں سبکدین حیدر راج سے اچھی طرح واقف تھی اور ہوں۔ میں جانتی ہوں اس میں کتنی خامیاں اور کتنی خوبیاں ہیں۔

ہا نظر بچے کی ساری کیوں کو دیکھ سکتی ہے اور میں بھی گین کے متنی پہلوؤں سے ناواقف نہیں ہوں میں جانتی ہوں کسی عام لڑکی کا گزارہ اس کے ساتھ ناممکن ہوتا۔ یکناسن بھی کوئی خاص معنی نہ

اسے قائل کرنے اور زیر کرنے کے لئے حسن اور غفلت کی بیک وقت ضرورت تھی اور مجھے ایسے میں انتخاب بہترین لگا۔ بیٹا! یہ مت سمجھنا کہ میں خود غرض ہوں اور گین کے مزاج کو جانتے بوجھتے میں

ی لڑکی کو عذاب میں مبتلا کیا۔ تم مجھے اپنی بیٹی کی طرح عزیز ہو۔ میں گین سے بڑھ کر تمہیں

اہوں اور ہر معاملے میں میری فوقیت گین سے بڑھ کر تم ہو۔ اور تم ہی ہو گی۔ ایسا یقین دلا کر میں

باکمی سبز باغ نہیں دکھا رہی۔ اگر تم اسے خود غرضی بھی کہو تو یہ صرف اتنی ہے کہ میں اپنے بیٹے کو راہ

ت پر دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم یہی کہو گی کہ کسی کا پیدا کیا گیا بگاڑ میں کیوں سدھاروں۔ میں کیوں

انوں یا عذاب بھیلوں؟ تو بیٹا! میں صرف اتنا کہوں گی، عمل کوئی شخص بھی نہیں ہوتا۔ گین کی پر سنائی

ہو خامیاں آگئی ہیں وہ دور ہو سکتی ہیں اور ایسا صرف تم کر سکتی ہو۔ مجھے تم پر کامل یقین ہے۔“

مائی اماں یہ نہیں واقعی سچ کہہ رہی تھیں یا کر نہیں۔ میرب سیال کا سر جھکا ہوا تھا اور آنسو بہت خاموشی

کا موسم ہی اتنا پر وحشت تھا کہ سب کچھ اسی رنگ میں رنگا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اتنے عرصے کی دور کے باوجود مائی اماں کو بھی زیادہ وقت نہیں دے سکی تھی۔ اور آج صبح بھی جب وہ نکل رہا تھا وہ خاموشی۔ گاڑی میں آن بیٹھی تھی۔

”نانو سے ملنے جانا ہے۔“ مگر اس سے زیادہ کچھ کہنے کی زحمت گوارا نہیں کرنا پڑی تھی اور کوئی یا اجنبی بن کر اس کی طرف سے توجہ کا ہاتھ کھینچ چکا تھا۔

بس لمحہ بھر کی بات تھی اور وہ نگاہ پھر سے اجنبی تھی۔ اور غالباً وہ لمحہ بھر کو جو نگاہ دانستہ اس پر ڈالی گئی تھی وہ بھی بوجہ التفات نہیں بلکہ اس میں استفسار کا عنصر زیادہ غالب تھا۔ میرب سیال کوئی شکوہ کرنے کا 7 محفوظ نہیں رکھتی تھی۔ سو چپ چاپ اس کی طرف سے نگاہ پھیر گئی تھی۔

”میرب!“ وہ بے دھیانی میں زینہ طے کر رہی تھی جب مائی اماں کی آواز اس کی سماعتوں سے گرا تھی۔ وہ پلٹی تھی۔

”جی مائی اماں؟“

”بیٹا! اگر مناسب لگے تو کچھ وقت ہم ساتھ گزار لیں؟“ وہ پوچھ رہی تھیں اور میرب سیال کو انکا مناسب نہ لگا تھا۔ حالانکہ اس وقت وہ کسی سے بھی بات کرنے کے موڈ میں نہ تھی۔ مگر وہ بے مروتی

مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی اور چلتی ہوئی ان کی طرف آگئی تھی۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ بہت تھک گئی ہو؟“ مائی اماں نے مسکراتے ہوئے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر

پوچھا تھا۔ وہ ایک مروت سے مسکراتی تھی۔ کوئی جواب نہ تھا۔

”تم واپس کیا آئی ہو، میرے گھر کی تو جیسے روشنی لوٹ آئی ہے۔ زندگی تم ہی تو ہو۔ ٹھیک کہتے ہیں بیٹیوں کے دم سے ہی گھر میں رونق ہوتی ہے۔ بیٹوں کا کیا ہے، نکلے نکلے، نہ نکلے گھر پر..... ہزار ہا

وجہ کی مصروفیات پال رکھی ہوتی ہیں۔ مگر بیٹیاں..... بیٹیاں ماں باپ کا بے حد خیال رکھتی ہیں۔ اپنے وقت میں سے وقت نکال کر ماں باپ کو دیتی ہیں۔ ان میں بیٹوں کی یہ نسبت سخت مندی بھی زیادہ ہوتی

ہے اور مروت بھی۔“ مائی اماں غالباً فقط اس خاموشی کو توڑنا چاہتی تھیں۔ سبھی بے معنی گفتگو بھی جاری رکھ کر

چاہتی تھیں۔ اور میرب نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراتے ہوئے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”سبکدین حیدر تو یوں بھی زیادہ اس گھر میں نہیں رہتا۔ میرے دیور اور نندوں کی چھیاں بچے ہیں جو اکثر چھٹیوں میں آ جاتے ہیں اور تب اس گھر میں قدرے رونق ہو جاتی ہے۔ مگر اب مجھے ان کے آنے کا بالکل بھی کوئی انتظار نہیں۔ جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ اب میری بیٹی جو میرے پاس آگئی ہے، سارا سال میں ان بچوں کی چھٹیوں کا انتظار کرتی رہتی تھی کہ کب ان کی چھٹیاں ہوں اور کب وہ یہاں رہنے کے لئے آئیں اور اس گھر کی خاموشی کچھ کم ہو۔“ مائی اماں اپنی تنہائی اور اس گھر کی وحشت سے وابستہ کہانیاں بیان کر رہی تھیں۔ مگر دوسری طرف میرب سیال خاموش تھی۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ بور ہو رہی ہے تو؟۔۔۔ میری باتیں لطف نہیں دے رہیں؟“ مائی اماں نے ناہانہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ میرب سیال نے فوری طور پر سرفی میں ہلا دیا تھا۔

ان بھر کی خواری کے بعد لامعہ حق نے اسے واقعی بہت تھکا دیا تھا۔ مگر اتنا ہیہ کو خوشی تھی کہ اس نے ایک

اچھا دن لامعہ حق کے ساتھ گزارا تھا۔ اور وہ بھی ایک عرصے کے بعد۔ لامعہ کی بہت سی خوشیوں میں صرف اس کی خاطر، اس کے لئے شریک ہوتی تھی۔ اور ایسا کر کے اسے خوشی ہوتی تھی۔

”کیا ہوا؟“ تھک گئی ہو؟“ ماما نے اسے دودھ کا گلاس تھماتے ہوئے پوچھا تھا۔

”نہیں ماما! بس ذرا سر میں درد ہو رہا ہے۔“

”اچھا لاؤ، میں سر میں تیل ڈال دوں۔“

”نہیں ماما! آپ پلیز زحمت نہ کریں۔“ اس نے تعرض برتا تھا۔

”زحمت کیسی؟“ بچوں کے کام کر کے کبھی کبھی ماں کو زحمت ہوتی ہے؟“ ماہوش شاہ بیٹی کے

میں تیل ڈالنے لگی تھیں۔

”ماما۔۔۔!“

”ہوں۔۔۔؟“

”آپ کو کیا لگتا ہے، جو میں کر رہی ہوں یا جو میں نے کیا، وہ ٹھیک ہے؟“

ماہوش شاہ کے ہاتھ لہو بھر کو تھمے تھے اور پھر وہ دیکھنے سے مسکرا دی تھیں۔

”دیکھو بیٹا! ہم نے اپنے بچوں کی جیسی تربیت کی ہے، جیسی زندگی کے اصول سمجھائے ہیں، ان کی بنا پر ہمیں کھل یقین ہے کہ ہمارے بچے کبھی کوئی غلط فیصلہ کر ہی نہیں سکتے۔ اسی یقین کو لے کر ہم نے تمام

فیصلے کا حق اپنے بچوں کے ہاتھ سونپ دیا ہے۔“ ماہوش مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

”لیکن ماما۔۔۔!“ اس نے گرن موڑ کر ماں کی طرف بے بسی سے دیکھا تھا۔

”تم مطمئن ہونا۔۔۔؟“ ماما نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”ہوں۔۔۔“ عجب ایک الجھن میں انابیہ شاہ نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”جب مطمئن ہو تو یقیناً تم نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ باقی کے وہموں اور خدشوں کو دل میں جگہ دینے کا

ضرورت باقی نہیں رہتی۔ میرے لئے لامعہ اور تم برابر ہو۔۔۔ میں لامعہ کو تمہاری طرح ہی عزیز رکھتا

ہوں۔ پھر میں ایک بیٹی کے لئے اچھا اور دوسری کے لئے برا کیسے چاہ سکتی ہوں؟ جب فاطمہ علی خان

عقنان کا پروپوزل لے کر آئی تھیں، مجھے پتہ تھا تمہارا فیصلہ کیا ہوگا۔ اس لئے میں نے یا اباجی نے

کوئی مداخلت نہیں کی اور فیصلے کا اختیار تمہارے ہاتھ دے دیا۔ مجھے اور اباجی کو یقین تھا کہ تم کیا فیصلہ کر

گی۔ اور تم نے کتنا ٹھیک کیا، اسے تم نے ثابت کر دیا۔“ ماہوش بول رہی تھیں اور انابیہ رخ ان کی طرف

پھیرے خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”اتنا بھروسہ مجھ پر؟۔۔۔ اور اگر میں آپ کے بھروسے پر پوری نہیں اترتی تو؟“

”ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ اور ایسا ہوا بھی نہیں۔“ ماہوش مسکرا دی تھیں۔ ”دیکھو بچے! عقنان کتنا ہونہار

قابل لڑکا ہے یہ بات ہم بھی جانتے ہیں اور تم بھی۔ مگر یہ پروپوزل دنیا کا کوئی آخری پروپوزل نہیں ہو سکتا

نہ ہی تھا۔ یہ بات تم بھی جانتی تھیں اور ہم بھی۔ ہم اگر لامعہ کی بجائے اپنی بیٹی کی فیور کرنے کو

یقیناً خود غرضی ہوتی۔۔۔ عقنان علی خان کیا، اس جیسے لاکھوں لاکھوں کی پسند اور ترجیح تم جیسی لڑکی ہی

ہے اور ہوگی بھی۔ مگر انابیہ شاہ کی ترجیح کیا ہوگی، یا کیا ہو سکتی ہے وہ اچھی طرح جانتی ہے۔“ ماہوش

پہرے پر دم سہم سہم تھا اور آنکھوں میں یقین۔ انابیہ شاہ نے مسکراتے ہوئے ماں کے گلے میں ہاتھیں

لڑی تھیں۔

”ماما! میں نے ساری حقیقت لامعہ سے کہہ دی ہے اور اس کے بعد میں بہت مطمئن ہوں۔ میں نے

یہ کیا تھا؟“

”ہوں۔۔۔ بالکل صحیح۔ ایسا کر کے تم نے بہت سے خدشوں اور واہموں کو اپنے ہاتھوں دفن کر دیا

ساتھ ہی ان غلط فیصلوں کے انبار کو بھی جنہیں وقت کے ساتھ جنم لینا تھا اور سنگین ہونا تھا۔“ ماہوش نے

لا کے چہرے کو بہت پیار سے تھپتھپایا تھا۔ وہ بہت ہلکے پن کے ساتھ مسکرا دی تھی۔ یقیناً بہت سا بوجھ

دل سے سرک گیا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے یہ؟۔۔۔ اکیلے اکیلے محبتیں سمیٹی جا رہی ہیں۔“ اوزی نے دروازے میں سے سر اندر

دل کر دریافت کیا تھا۔ ماہوش اور انابیہ مسکرا دی تھیں۔

”آ جاؤ!۔۔۔ میں ماما سے تمہاری شکایتیں کر رہی تھی۔“

”مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی۔ ایک بری خبر ہے۔۔۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ اس لئے اب

میں کوئی مزید تنگ نہیں کریگا۔“ اوزی مسکراتے ہوئے ایک بری خبر دے رہا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی بیٹا! اتنی جلدی؟“ ماہوش شاہ نے شکوہ کیا تھا۔

”اور جلدی سے بھی زیادہ اچانک۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“ انابیہ نے کسی قدر خشکی سے دیکھا تھا۔

”زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی دو دن ہیں۔ مئی کا فون آیا تھا، وہاں نئے بزنس

مانٹس کے سلسلے میں میری ضرورت ہے۔ تم فکر مت کرو۔۔۔ جلد فارغ ہو کر تمہاری شادی میں

بکٹ کے لئے دوبارہ واپس آؤں گا۔“ اوزی مسکرا دیا تھا۔

”ماما کے لئے ایک لڑکا دیکھا ہے۔ بہت اچھا نوجوان ہے۔ اپنا بزنس اشارٹ کر رہا ہے۔

اکے لئے بہت معقول رہے گا۔“ ڈائنگ ٹیبل پر بیٹھے ڈنر کرتے سعد حسن بخاری نے مطلع کیا تھا اور

اندھیرا رہ گئی تھیں۔

”کون ہے؟۔۔۔ خاندان کیا ہے؟۔۔۔ ٹیلی بیک گراؤنڈ۔۔۔ چال چلن؟“

”اس سب کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تمہیں۔ سب چھان بین کر چکا ہوں میں۔ ہر طرف سے

مطمئن ہو کر ہی میں نے بات کرنا مناسب خیال کیا ہے۔“ سعد حسن بخاری نے جتانے والے انداز میں

مطلع کیا تھا۔

”پھر بھی۔۔۔ کچھ تو پتہ چلنا چاہئے۔ اتنا بڑا فیصلہ ہم یونہی تو نہیں کر سکتے۔ بیٹی کا معاملہ ہے، ہم

لہو اسی تو نہیں کر سکتے۔ ایک نتیجہ ہم ہلکت کر دیکھ چکے ہیں۔ مزید کی گنجائش نہیں نکلتی ہے۔“

”فارحہ!۔۔۔ تم مجھے اپنے بچوں کا دشمن سمجھتی ہو۔ یہ کیا زہر کے بیج بو رہی ہو تم میرے ظلاف

میرے بچوں کے دلوں میں؟۔ میں کیا ان کے لئے برا سوچوں گا؟“ سعد حسن بخاری کا انداز اور عائد کرنا ہوا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں کر رہی ہوں میں۔ میں صرف کچھ باتوں کی وضاحت چاہ رہی ہوں۔ جن ضرورت بھی ہے۔ آپ نے اذہان کے لئے فیصلہ کیا تو میں نے اسے تسلیم کیا۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ بات کو تسلیم کرنے کے لئے میں پابند ہوں۔ اذہان کا اور ساہیہ کا معاملہ اور تھا۔ ساہیہ کے خاندان کو جانتے ہیں۔ وہ اپنے ہیں۔ مگر اب جس لڑکے کے متعلق آپ بات کر رہے ہیں اس کا کوئی ایک بھی جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ اور میں اپنی بیٹی کو کسی بھی اندھے کنوئیں میں نہیں دھکیل سکتی۔ وہ اتنی ڈسٹر ہے کہ ابھی تک پہلے ہی کی کیفیت سے باہر نہیں نکل پارہی ہے۔ کسی لڑکی کی شادی ٹوٹ جانا معمولی بار نہیں ہوتی۔ آپ کی بیٹی پر کیا گزری، اس کا احساس آپ کو چاہے نہ ہو مگر مجھے بخوبی ہے۔“ فارحہ نے مد لہجے میں باور کرایا تھا۔

سعد حسن بخاری کی آنکھوں میں ناگواری واضح طور پر اتر آئی تھی۔

”مجھے احساس ہے فارحہ بخاری!۔ مجھے احساس ہے۔ تمہی تو یہ قدم اٹھا رہا ہوں۔ عربیہ کا فرس کزن ہے وہ۔ اور عربیہ نے ہی مجھے اس کے متعلق بتایا ہے۔ میں ملا ہوں اس سے۔ اور مجھے وہ کے لئے ہر لحاظ سے مناسب لگا ہے۔“ سعد حسن بخاری نے وضاحت دی تھی اور فارحہ اپنی جگہ ساکت گئی تھی۔

”وہ دوسری عورت۔۔۔ وہ اب فیصلے کرے گی میرے بچوں کی زندگی کے متعلق؟ اور آپ..... فارحہ سے مارے صدمے کے کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا۔ شدت جذبات سے ان کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھ گئی تھی اور پورا وجود کانپنے لگا تھا۔ مگر سعد حسن بخاری کو اس کی مطلق پرواہ نہیں تھی۔

”تم حماقتوں کے مظاہرے کر سکتی ہو، میں نہیں۔ ایک بار بیٹی کی شادی ختم ہو جانے کے بعد کون ہے جو اسے قبولے گا؟ تم یہ بات کیوں نہیں سمجھ رہی ہو؟“ سفاکی کی حد تھی۔

”آپ..... آپ یہ بات کہہ رہے ہیں..... کیا آپ نہیں جانتے کہ اس کا سبب کیا تھا؟ غلطی آپ کی تھی۔ اس معصوم بیٹی کی نہیں، اس کے باپ کی تھی۔ جو باپ اپنے لطف کو دیکھتے ہیں ان کے بچوں کو ایسی ہی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“

”فارحہ! سعد حسن بخاری کا لہجہ پُریش تھا۔

”چلائیے مت۔۔۔ سچ سننے کی ہمت رکھئے اپنے اندر۔ آپ..... آپ اتنے سفاک ہو سکتے ہیں مجھے یقین نہیں ہو رہا۔ اپنی ہی بیٹی کے لئے، اپنی ماہا کے لئے آپ نے ایسی بات کی۔ وہ ماہا جو آپ کے لئے کبھی آپ کی ننھی پری تھی۔ وہ ننھی پری جسے آپ اتنا پیار کرتے تھے، آج آپ کے لئے.....“ ہنگامی آنکھوں کے ساتھ فارحہ مزید کچھ بول ہی نہ سکی تھی۔

”تم جو بھی کہو۔۔۔ مگر میرا فیصلہ پھر بھی وہی رہے گا۔ مجھے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں اپنے بچوں سے کتنا سنسر ہوں۔ میں جو کر رہا ہوں وہ ان کی بھلائی کے لئے ہی ہے۔“ سعد

بخاری کا انداز حتمی تھا۔ وہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور فارحہ ساکت سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔ اور وازے کے کنارے پر کھڑی ماہا کا دل جیسے کسی نے ٹھکی میں لے لیا تھا۔

فیضان اور فاطمہ علی خان بچوں کے ساتھ ڈنر پر انوائٹ تھے۔ فاطمہ بطور خاص بیٹھے اور بہو سے ملنے آئیں۔ میرب ان کو بہت پسند آئی تھی۔

”ماشاء اللہ۔۔۔ میری بہو اتنی خوبصورت ہوگی۔ میں نے تو سوچا بھی نہ تھا۔“ فاطمہ نے سراہا۔

”گین یار! تمہارا تو واقعی جیک پوٹ لگ گیا ہے۔ اس لئے تم وہاں سے واپس آنے کو تیار نہ تھے۔“ ان علی خان نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

میرب سیال کی نظر عین سامنے بیٹھے سردار سبکتگین حیدر لغاری پر پڑی تھی۔ کوئی خوشگوار تاثر چہرے پر نہ رہا تھا۔ وہ مردوتا بھی مسکرائیں سکی تھی۔ وہ مردوت بھائی بھی تو کس لئے۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری بھی ہر سمری نگاہ ڈالنے کے بعد اجنبی ہو چکا تھا اور عرفان علی خان اس سے قطع نظر دریافت کر رہا تھا۔

”بھائی! آپ کو پتہ نہیں ہے، آپ نے کمال کیا ہے۔ ایک اچھے خاصے بے راہ رو بندے کو راہ بال دیا ہے۔ اس کمال کے لئے آپ کا نام تو گینتر بک میں آنا چاہئے۔ کیوں سردار صاحب! کیا اتنے ہیں آپ؟“ عرفان علی خان نے رائے چاہی تھی اور سردار سبکتگین حیدر لغاری نے ایک نظر خاص رائیبر سیال پر ڈالی تھی۔

”درست فرماتے ہو۔۔۔ شک کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔“ جملہ خاص سہی، مگر تاثر خاص نہ تھا۔

بسیال نے اس کی سمت دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ انوشے نے اس کا ہاتھ بہت پیار سے تھاما تھا۔

”ہم بھی عرفان بھائی کے لئے لڑکی دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ اپنے ہی جیسی کسی خوبصورت لڑکی کو ناہیں تو پلیز ہمیں بتا دیجئے۔ ہماری جوتیاں گھسنے سے بچ جائیں گی۔ کیوں عرفان بھائی! ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں نا؟“ انداز میں کچھ شرارت تھی۔ عرفان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ کیونکہ عرفان آل ریڈی اپنے لئے لڑکی دیکھ چکا ہے۔“ بڑی عریشہ اپنے گپلو سے بیٹے کو گود میں سنبھالتے ہوئے مسکراتے ہوئے عرفان کو دیکھا تھا۔

”عریشہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہم نے واقعی عرفان کے لئے ایک اچھی سی لڑکی دیکھ لی ہے۔ ماشاء اللہ، بصورت بھی ہے اور خوب سیرت بھی۔“ فاطمہ نے وضاحت دی تھی۔

”کون ہے وہ؟۔۔۔ کیا ہم جانتے ہیں؟“ مائی اماں نے دریافت کیا تھا۔

”ہاں، غالباً۔ وہ بریگیڈیئر اعظم رحمان شاہ۔ جن کے بیٹے اور پوتے کی موت سمندر میں ڈوب واقع ہو گئی تھی۔ جن کی بہو انٹریڈیز انسٹر ہے۔“

”اوہ ہاں۔۔۔ یاد آیا۔۔۔ ان کی تو بہت پیاری سی بیٹی تھی۔ کیا نام تھا اس کا.....“ مائی اماں ناپرزور دیتے ہوئے بولی تھیں۔

مجھے بغیر کہ اس نگاہ میں کیا تاثر تھا۔ میرب سیال پلٹی تھی اور تیزی سے آگے بڑھنے لگی تھی۔

”یہ کیا تک ہے اتنی اچانک جانے کی؟“ انابہ بہت خفا خفا نظر آ رہی تھی۔ مگر اوزی مسکرا دیا تھا۔
 ”یار! کہا تو ہے، تمہاری شادی پر واپس آ جاؤں گا۔ مجھے پتہ ہے، ایک بھائی کے کیا فرائض ہوتے ہیں۔ تمہیں مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“
 ”شٹ اپ اوزی!۔۔۔ فضول کی بکواس نہیں۔“

”کم آن یار!۔۔۔ عزت کرو، تم سے بڑا ہوں میں۔“ اوزی نے تیزی سے بینگ کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ انابہ اسی تنگی سے نظریں پھیر گئی تھی۔
 ”او کے اوزان سید صاحب!۔۔۔ کیا آپ رک نہیں سکتے؟“ انابہ نے دوبارہ دیکھا تھا۔ اوزی مسکرا دیا تھا۔

”یار! ہمیشہ کے لئے تھوڑی جا رہا ہوں؟ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ مجھے پتہ ہے یہاں میری کتنی ضرورت ہے۔ اچھا اب یہ اپنا پھولا ہوا چہرہ درست کرو۔ ورنہ میں گیا تو بالکل بھی واپس نہیں آؤں گا۔“ اوزی نے دھمکی دی تھی۔ انابہ ناچار مسکرائی تھی۔

”میری پیاری گڑیا! تم ہنسی اچھی لگتی ہو۔“ اوزی نے اسے شانوں سے تھام کر مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ انابہ کے لبوں کی مسکراہٹ معدوم ہو چکی تھی۔ اور وہی اُداسی آنکھوں میں تھی۔ اس نے اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا تھا۔

”اوزی! آج مجھے غازی کی بہت یاد آ رہی ہے۔“ نی اُس کی آنکھوں میں ہی نہیں، اس کے لہجے میں بھی تھی۔

اوزی نے ایک چپت اس کے سر پر لگائی تھی اور مسکرا دیا تھا۔

”پاگل!۔۔۔ میرے ہوتے ہوئے؟“ اُس کے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے اُسے ڈپٹا تھا۔ ”میں نے آج تک تمہیں محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں غازی نہیں ہوں، یا غازی ہم سب کے درمیان نہیں ہے۔ مانتا ہوں میں تمہارا ماں چاہا نہیں ہوں۔ مگر ایک بات تم شاید بھول رہی ہو۔ میں تمہارا رضاعی بھائی ہوں اور میں تمہارے لئے غازی جیسا ہی ہوں۔ کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتی ہو کہ غازی نہیں رہا تو تمہارا دوسرا بھائی تمہارے ساتھ موجود ہے جس کے لئے تم اہم ہو۔ بے حد اہم۔ جو تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ جسے تمہارے چہرے کی اُداسی اچھی نہیں لگتی۔ جو صرف تمہارے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہے۔ جس کے شانے پر سر رکھ کر تم رو سکتی ہو۔ کیا میں وہ بھائی نہیں ہوں؟“ اوزی پر شکوہ نظر دلا سے دیکھتا ہوا دریافت کر رہا تھا۔ ”کیا میں تمہارا غازی نہیں بن سکتا؟“ اک آس سے دریافت کیا تھا۔

”نہیں۔“ انابہ نے سر ہولے سے لٹنی میں ہلایا تھا۔

اوزان سید کی آنکھوں میں ایک بے چینی چھلکنے لگی تھی۔

”کیونکہ تم آل ریڈی میرے اوزی بھائی ہو! غازی پاسٹ ہے اور تم پریڈنٹ۔ گزرا کل نوٹ کرنا

اور آج اہم ترین ہے۔“ انابہ نے آنسو پونچھے تھے اور مسکرا دی تھی۔

اوزان سید نے اس کی ناک دبائی تھی اور مسکرا دیا تھا۔

”جاؤ، اب میرے لئے جا کر اسٹابری ٹیک بنا کر لاؤ۔ کتنی ازبجی ویسٹ کر دی ہے تم نے۔“ اوزی اتھا اور وہ مسکراتے ہوئے سر ہلاتی ہوئی پلٹ کر چکن کی طرف آ گئی تھی۔

انابہ شاہ کپیوٹر آف کرنے کے بعد اٹھی تھی اور بیڈ کی طرف آتے ہوئے کلائی سے رسٹ واپج نکال کر اینڈ ٹیبل پر ڈالی تھی۔ عین اسی لمحے سائینڈ ٹیبل پر پڑا اس کا پرسل سیل بج اٹھا تھا۔ اُس نے اسکرین عفنان علی خان کا نام دیکھا تھا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچنے کو کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو۔۔۔“

”انابہ! عفنان، ہیر۔“ دوسری طرف سے مطلع کیا گیا تھا۔

”آل رائٹ۔۔۔ کہنے کے لئے کچھ نئی تازی ہے آپ کے پاس؟“ پُر اعتماد لہجہ حیران کن تھا۔

”نئی تازی؟۔۔۔ ویل، نئی تازی تو کچھ نہیں ہے۔ مگر آج مجھے ایک بات پتہ چلی۔ جو کہ مجھے آج قبل نہیں معلوم تھی۔“ عفنان علی خان سنجیدہ ہو چکا تھا۔

”کیا؟“ انابہ چونکی تھی۔

”انابہ! کچھ اور نہ سہی، مگر نہ چاہنے کے باوجود ایک خواہش دل میں جنم لیتی ہے۔ محبت نہ سہی، مگر کیا اس قابل بھی نہیں کہ کچھ چھوٹی چھوٹی باتوں کے ساتھ اپنے سٹک ڈکھ، اپنی کامیابیاں، ناکامیاں، بردیاں، مضبوطیاں، کیاں بھی شیئر کر سکیں؟۔۔۔ مانا ہم میں کوئی تعلق نہیں مگر کیا مروت کا وہ رشتہ بھی ماہن سکتا کہ ہم چند باتوں کو ہی شیئر کر سکیں؟ مل بیٹھیں تو چند لمحوں میں بے غرض باتیں کر سکیں؟“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ چونکی تھی۔

”انابہ! مجھے آج غازی کے متعلق پتہ چلا، تمہارے پاپا کے متعلق پتہ چلا اور مجھے بہت افسوس ہوا۔ لا، بیلیو می، مجھے ان کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ تم نے کبھی بتایا ہی نہیں۔ اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ اپنے لب بانٹ سکو۔۔۔۔۔“ وہ مدہم لہجے میں اظہار افسوس کر رہا تھا۔

”پلیز عفنان!“ انابہ نے اسے مزید بولنے سے باز رکھا تھا اور مدلل لہجے میں بولی تھی۔

”کچھ کہنے سننے کی ضرورت وہاں پیش آتی ہے جہاں کوئی ربط درمیان ہو، جہاں کوئی تعلق ہو۔ اور سستی سے یا پھر بد قسمتی سے میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں ہے جسے رہم ایک دوسرے سے کہہ سکیں۔ اور یوں بھی مجھے اپنے ڈکھ سٹکھ کہنے کے لئے تمہاری قطعی ت نہیں ہے۔ تمہاری کیا، شاید مجھے اپنی فیملی کے علاوہ کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے جن سے میں کچھ ناکستی ہوں۔ وہ تمام رشتے خوش قسمتی سے میرے پاس ہیں اور مجھے مزید کی ضرورت نہیں ہے۔ اور تک رہی بات تمہاری، جب میں تمہارا پروڈوزل ریٹوز کر چکی ہوں تب مجھ سے بات کرنے کا تمہارا

کوئی ریزن باقی بچتا نہیں ہے۔ تمہیں نہیں لگتا کہ ہم بے حاصل سفر کر رہے ہیں؟“ بے تاثر لہجے میں دریافت کیا تھا اور عفتنان علی خان اس کی سفاکی پر مسکرا دیا تھا۔

”انا بیہ! تم میں اور مجھ میں یہی تو فرق ہے۔ جیسا تم سوچتی ہو ویسا میں نہیں سوچتا۔ اگر سوچتا ہوتا تو یہ ربط توڑ نہ دیتا؟“ جذبات سے پُر لہجے میں جتایا گیا تھا۔ عفتنان علی خان کے لہجے میں ہنوز اطمینان برقرار تھا اور آنکھوں میں ایک خاص طرح کا ٹھہراؤ۔

انا بیہ شاہ کو بے حد ناگوار گزارا تھا۔

”تم یہ بات سمجھ کیوں نہیں لیتے عفتنان علی خان! کہ انا بیہ شاہ تمہارے لئے نہیں ہے۔ تمہارا کوئی تعلق اس کے ساتھ نہیں بن سکتا۔ جتنی بھی کوشش کر لو، خواہش کر لو، تم مجھ تک رسائی نہیں پاسکتے ہو۔“

”انا بیہ! کہا تو ہے جس طرح تم سوچتی ہو، اگر میں سوچتا ہوتا تو آج تم سے بہت دوری پر نکل چکا ہوتا۔“ انداز جتانے والا اور اپنے اندر کسی قدر تاسف لئے ہوئے تھا۔ ”کہا تو تھا تم سے، عفتنان علی خان ہارنے والا نہیں ہے۔ شکست ماننے والے اور ہوتے ہوں گے۔ عفتنان علی خان اپنے ارادوں میں کتنا اٹا ہے یہ تم تب جان جاؤ گی جب تم میری دنیا میں قدم رکھو گی۔ محبت تمہاری منتظر ہوگی ہر ہر گام پر اور تم خود دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کرو گی۔ ایسا ایک دن ہو گا اور ضرور ہو گا۔ میری محبت تمہیں تم سے زیادہ لے گی۔“ عفتنان علی خان کا لہجہ پُر یقین تھا۔ مگر انا بیہ بہت اطمینان سے مسکرائی تھی۔

”عفتنان علی خان! میں نے تم سے زیادہ اہم شخص اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھا۔ کچھ بھی نہیں ہاتھ میں تمہارے اور پھر بھی اتنے پُر یقین دکھائی دے رہے ہو۔ ایسا پوز کر کے تم کسے دھوکا دے رہے؟ خود کو یا پھر دوسروں کو؟۔ بھول جاؤ سب کچھ۔ لوٹ جاؤ واپس اپنی دنیا میں۔ یہاں تمہیں کچھ ہونے والے۔ یہ راہیں یکطرفہ راستوں کی سمت بڑھ رہی ہیں جن کے اختتام پر کوئی منزل نہیں۔ اتنی دور آؤ کہ لوٹنا دشوار ہو جائے۔ احمقوں کی جنت میں رہنا بند کر دو۔ کچھ حاصل نہیں ہے اس کا۔ ذمہ فہمیاں کچھ نہیں دیں گی تمہیں۔ کیونکہ انا بیہ شاہ تم سے محبت نہیں کرتی۔ نہ ہی تم اس کی ترجیح ہو سکتے ہو انا بیہ شاہ کا انداز باور کرانے والا تھا۔ مگر عفتنان علی خان مسکرا دیا تھا۔ انداز رسائیت سے پُر تھا۔

”مجھے فائدہ پہنچتا ہے یا کہ نقصان، مگر نہ کرو، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں کیا کر رہا ہوں، کیا کر رہا ہوں، یہ تمہارا در دیر نہیں ہے اور اس سے تمہیں کوئی فرق بھی نہیں پڑنا چاہئے۔“

”پاگل ہو تم۔ کیا کر رہے ہو؟ کچھ خبر نہیں ہے تمہیں۔ کس احساس میں جی رہے ہو تم۔ ایک رد کر دیا ہے میں نے تمہیں۔ پھر اور کس بات کی خوش فہمی ہے تمہیں؟۔ کیا سوچ رہے ہو تم؟ لونا آؤں گی میں تمہاری سمت؟ تو کس لئے؟۔ جب میں تمہیں چاہتی ہی نہیں ہوں تو پھر یہ یقین کیا یہ احمق پن نہیں تو اور کیا ہے؟“ انا بیہ برہم دکھائی دے رہی تھی۔

”چاہتی نہیں ہو، مگر چاہو گی بھی نہیں، یہ ضروری تو نہیں۔ میں سب کچھ بدل دوں گا، سارے پراس۔ ایسا بہت جلد ہو گا۔“ عفتنان علی خان کے لہجے کا عزم قابل رشک تھا۔

”عفتنان علی خان! افضول کی بکواس بند کرو۔ کیوں جاہوں گی میں تمہیں، ہاں۔“

میں کسی اور کو آل ریڈی چاہتی ہوں۔ کس خوش فہمی میں ہو تم؟۔ میرے لئے یہ میسر نہیں ہے کہ مجھے کتنا چاہتا ہے۔ میرے لئے یہ اہم ہے کہ میں کیا چاہتی ہوں اور کسے چاہتی ہوں۔ میں تم سے محبت نہیں کرتی ہوں کیونکہ میری ترجیح کوئی اور ہے۔ سن رہے ہو تم۔ میں کسی اور سے محبت کرتی کرتی تھی۔ اور کرتی رہوں گی۔ کیسے بدلو گے تم اسے؟“ انا بیہ شاہ ترش لہجے میں کہہ رہی تھی اور ان علی خان دوسری طرف ساسکت کھڑا تھا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ لبوں پر ساسکت، چاند چپ اور انا بیہ شاہ کہہ رہی تھی۔

”میں نے تم سبے وقوف شخص ساری زندگی میں نہیں دیکھا۔ میں تم سے اسے شکر کرنا بھی نہیں چاہتی مگر تم..... تم سے چھکارہ پانے کا ایک یہی راستہ تھا میرے پاس۔ اب تو تم سمجھ گئے ہونا کہ انا بیہ شاہ میں کیوں ٹھکرا رہی ہے؟“

”کو..... کون ہے وہ.....؟“ عفتنان علی خان کو اپنی آواز خود کی کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”جو بھی ہو..... مگر وہ تم نہیں ہو، نہ ہی ہو سکتے ہو۔ دوبارہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش مت کرنا۔ اسٹینڈ؟“ انا بیہ شاہ نے سخت گیر لہجے میں کہتے ہوئے فون رکھ دیا تھا۔

دوسری طرف موجود عفتنان علی خان کی کیفیت اشتعال انگیز تھی۔ آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ تان گئی تھیں۔ کیسا سنگین انکشاف کیا تھا اس نے۔ یہ سچ جھیلنا بے حد دشوار لگا تھا۔ ایک لمحے میں انفراریز لگا لگا تھا۔ روح میں قیامت سی جگ گئی تھی۔ ساری جان اس عذاب میں گھر گئی تھی۔

انا بیہ شاہ تیزی سے سلاکس کے بائٹ لیتی ہوئی دوسرے ہاتھ سے کپ میں چائے انڈیل رہی تھی۔ ”قتی جلدی کیا ہے؟۔ آرام سے ناشتہ کرو۔ ابھی تو کافی باقم ہے۔“ مہوش شاہ نے ڈبٹا تھا۔ مگر لبوں میں ہلانے لگی تھی۔

”ایکسٹرا کلاس کا آرٹج منٹ ہے۔ دیر سے پہنچی تو سب سر پر سے گزر جائے گا۔ چپیس منٹ ہیں بے پاس۔ اور حسب عادت ہماری مرٹلڈیز آرام فرمانے کو درکشاپ میں پڑی ہے۔ ماما! آپ اسے کیوں نہیں دیتیں؟ کتنے خخرے برداشت کرنے پڑتے ہیں ہمیں ان موصوفہ کے۔“ انا بیہ اس پرانی ماسے بے حد عاجز تھی۔

”لاا ابا مسکرا دیئے تھے۔“

”بیٹا! وہ گاڑی تمہارے پاپا کی نشانی ہے۔ تمہاری ماما کو دیا جانے والا پہلا گفٹ۔ اور گفٹس تمہارا کر رکھے جاتے ہیں۔“

”ان محترمہ کو کہاں اندازہ ہو گا ان باتوں کا۔ جب خود بھکتیں گی تو پھر پتہ چلے گا کہ یادیں کیا ہیں اور یادگاریں کیا۔“ اوزی نے سلاکس پر مار جریں لگاتے ہوئے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”اوزی! بیٹا! ایسا نہیں کہتے۔ خدا خواستہ، اللہ نہ کرے جیسی میری قسمت ہے ویسی انا بیہ کی

ہو۔ خدا اس کے بخت روشن رکھے۔ اسے کبھی یادگاروں کو سنبھالنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔“ ماما نے اپنی سائینڈلی تھی اور وہ مسکرا دی تھی۔

”دیکھا۔۔۔ ماں، ماں ہوتی ہے اور بھائی.....“

”کہہ دو اب، بھائی قصائی ہوتا ہے۔“ اوزی بھر پور طور پر ملاحظہ ہوتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”ہاں۔ کوئی شک نہیں۔ بھائی قصائی ہی ہوتا ہے، بھائی کے آجانے کے بعد۔“ انا بیہ مسکرائی تھی۔

”اچھا، اب ترکی بہ ترکی لڑنا بند کرو۔ آج ویسے بھی مجھے چلے جانا ہے۔“

”اب یہ الزام مت عائد کر دینا کہ مجھے تمہارے جانے سے کوئی خوشی ہو رہی ہے۔“ انا بیہ مسکرائی تھی

”ایسا کچھ میں نے نہیں کہا۔“ اوزی مسکرایا تھا۔

”قصہ تو کرنے والے تھے۔ میں نے ہی روک دیا۔“ حملہ برابر کا تھا۔ بریگیڈیئر صاحب اور ماہ

شاہ بچوں کی محبت بھری لڑائی مسکراتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

”جلدی سے اٹھ جاؤ۔ چھوڑ دوں تمہیں۔ ورنہ کلاس مس ہو جائے گی۔“ چائے کے سپ لیتے ہو

اوزی نے آفری تھی۔ ”اور ہاں۔۔۔ جلدی آ جانا، ہم مل کر گھومنے چلیں گے۔ می نے فون کر کے ا

لسٹ بتوائی ہے، کچھ شاپنگ بھی کر لیں گے۔“ اوزی بولا تھا اور وہ شرمندہ ہی ہو گئی تھی۔

”سوری۔۔۔ مجھے آج چھٹی کرنا چاہئے تھی نا۔ مگر یہ کلاس۔۔۔ اچھا پراس، میں جلدی آ جا

گی۔“ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بیگ شولڈر پر ڈالا تھا۔ اوزی نے اس کی خاطر غلجٹ میں گھونٹ بھرا

”تم بیٹھو۔۔۔ میں چلی جاؤں گی۔“

”نہیں۔۔۔ میں زحمت قطعاً نہیں کر رہا۔ تم اتنا تکلف ہرگز مت کرو۔“ اوزی نے گاڑی کی چا

اٹھائی تھیں۔ مگر انا بیہ شاہ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر دباؤ ڈالتے ہوئے اس

چوڑے شخص کو ہٹانا چاہا تھا۔

”تم واقعی زحمت مت کرو۔۔۔ بیٹھ کر ماما کے ساتھ اس لسٹ کو ڈیکس کر لو۔ میں آ جاؤں گی ا

فوراً شاپنگ کے لئے نکل جائیں گے۔ یوں بھی تمہیں آج چلے جانا ہے اور اس کے باعث تم

مصروفیت بڑھ جائے گی۔ میری فکر مت کرو۔ نہ ہی میری عادتیں بگاڑو۔ تم کل نہیں ہو گے تو میں کیا کر

گی؟“ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”دیکھا آئی! یہ لڑکی۔“ اوزی نے شکوہ کرنا چاہا تھا۔ مگر انا بیہ مسکراتی ہوئی ہاتھ ہلاتی ہوئی پلٹ گئی

”ہائے ماما!۔۔۔ ہائے دادا جی! تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔“

”گڈ بائے۔“ ماما اور دادا جی بولے تھے اور وہ مسکرا دیا تھا۔

”یہ لڑکی بھی نا۔۔۔“ وہ دوبارہ کرسی کھینچ کر بیٹھا تھا۔

ماہوش شاہ مسکرا دی تھیں۔

”ٹھیک کہہ رہی تھی وہ۔ تمہیں آج جانا ہے اور کئی ضروری کام نمٹانے ہیں۔ تم مجھے دہلے

دکھا دو۔ تاکہ تمہیں سہولت ہو جائے۔“ وہ نرم لہجے میں بولی تھیں۔

میں اس گھر میں پیدا کیوں نہیں ہوا؟“

”یہ کیا بات ہوئی؟ تم کیا ہمارے بیٹے نہیں ہو؟ اور تمہارا تو اس گھر سے وہ رشتہ ہے جس کے

نہیں کسی طرح کا شکوہ یا شکایت رہنی ہی نہیں چاہئے۔“ ماہوش نے محبت سے ڈپٹا تھا۔ اوزی مسکرا دیا

”آئی! مجھے انا بیہ کی بہت فکر ہے۔ وہ بہت حساس ہے۔ اس کا خیال رکھئے گا۔“

”یہ بات بھلا کہنے والی ہے؟ اور تم کون سا ہمیشہ کے لئے جا رہے ہو۔ انا بیہ کی شادی پر لوٹنے

لئے تو پراس کیا ہے نا تم نے۔“

”ظاہری بات ہے۔ میری بہن کی شادی میرے بغیر کس طرح ہو سکتی ہے؟ ویسے آپ نے کوئی لڑکا

ماں کے لئے؟“

”نہیں۔۔۔ ابھی تو نہیں۔ مگر دو ایک سے کہہ رکھا ہے۔ آگے تو نصیب کی بات ہے۔ مگر جلد ہی کوئی

لڑکا مل جائے گا تو ہم بات آگے بڑھا دیں گے۔“ ماہوش شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”اور تو سب ٹھیک ہے۔ بس اس کٹ کھنی ٹی کی مرضی معلوم کر لیجئے گا۔“ اوزی نے مسکراتے

لئے کہا تھا اور ماہوش مسکرا دی تھیں۔

”ہاں، ضرور۔۔۔ اس کی مرضی کے بغیر تو کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”انا بیہ! تم سوچ رہی ہو گی شاید میں نے وہ سب سن کر تمہاری طرف سے دل میں کوئی غلط بات بٹھالی

ہوئی بالکل غلط ہے۔ مجھے حیرت ضرور ہوئی ہے۔“

ڈیومٹین کا سپ لیتی انا بیہ شاہ لمحہ بھر کھٹکی تھی۔ جانے لامعہ حق کیا کہنے جا رہی تھی۔ مگر وہ ملاحت سے

لڑائی تھی۔

”انا بیہ شاہ! میں تم سے نفرت نہیں کر سکی۔ تم وہ لڑکی نہیں ہو جس سے میں نفرت کر سکوں۔ میں نے کہا

ہوا چاہتا تھا۔ اگر اس لڑکی کے متعلق مجھے علم ہو جائے تو شاید میں اسے زندہ نہ چھوڑوں، میں اس کے

لا سے نفرت کرتی تھی جس نے عرفنان علی خان کو مجھ سے چھینا، ڈور کیا۔ مگر جب تم نے بتایا کہ وہ تم ہو تو

ملا مجھے بہت سے لمحوں تک یقین ہی نہیں ہوا تھا۔ میری واقعی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ مجھے تم سے کیسا

پرکھنا چاہئے یا کیسا برتاؤ کرنا چاہئے۔ مگر انا بیہ! تم اتنی اچھی ہو، اتنی پیاری ہو کہ میں کوئی زک تمہیں

بٹھائے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ تو پھر نفرت کیسے کرنی؟۔۔۔ کتنا بڑا ہے تمہارا دل۔ میں بہت بری ہوئی

تمہارے متعلق کچھ غلط سوچتی تھی۔“ لامعہ حق نرم دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھی اور انا بیہ شاہ اسے خاموشی

بٹھائی دیکھ رہی تھی۔

”سب سے بڑھ کر انا بیہ! تمہاری یہ صاف گوئی۔ اگر تمہارے دل میں کوئی چور ہوتا تو بھلا تم مجھ سے

کام کچھ کہہ پاتیں؟ تم یقیناً یہ راز چھپانا چاہتیں اور عرفنان علی خان سے فوراً کوئی تعلق باندھ لیتیں۔ مگر

ننان علی خان کے اتنے التفات اور نظر عنایت کے باوجود تم نے ایسا نہیں کیا۔ تم ایک سنسیر فرینڈ ہو اور تم

نے عقنان علی خان کے پروپوزل کو ریفر کر کے ایسا ثابت بھی کر دیا ہے اور ایسا دیکھ کر تمہاری اہمیت میری نظروں میں، میرے دل میں اور بھی بڑھ گئی ہے انا بیہ! تم جانتی ہو، تم اب مجھے پہلے سے بھی کہیں زیادہ عزیز ہو چکی ہو۔“ لامعہ حق کا لہجہ جذباتیت سے بڑھا اور انا بیہ شاہ دھیمے سے مسکرا دی گئی۔

”تھینکس۔۔۔ مجھے اسی بات کا خدشہ تھا کہ تم کہیں ان ساری باتوں کو غلط نہ سمجھو اور میں یہ اسے برسوں کی دوستی، یہ محبت، یہ تعلق کہیں کھو نہ دوں۔“

لامعہ حق مسکرا دی تھی اور ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

”پاگل!۔۔۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ لامعہ حق اور انا بیہ شاہ کی دوستی اتنی کمزور نہیں کہ اس میں بھونٹی چھوٹی، معمولی باتیں کوئی دراڑ ڈال سکیں۔ میں نے کہا نا، میں یہ سب جان کر تم سے اور بھی قریب ہو گئی ہوں۔ تم مجھے پہلے سے کہیں زیادہ عزیز ہو گئی ہو۔ مگر تم نے عقنان علی خان کو ریفر کر کے اچھا نہیں کیا۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور کس قدر کرتا ہے، مجھ پر یہ بات منکشف ہے۔ جب میں تمہارا نام بھی نہیں جانتی تھی اور صرف عقنان کے منہ سے اس کا ذکر سنا تھا میں تب بھی اس پر رشک کرتی تھی۔“ لامعہ حق نے مسکراتے ہوئے ایک گہری سانس لی تھی۔

”انا بیہ! ڈونٹ ریفرزم ایسی امور۔ میں محبت کر چکی ہوں۔ جانتی ہوں، نارسائی کا کرب کیا ہوتا ہے۔ ان خوابوں کا عذاب کیا ہوتا ہے جو محبت کی آنکھ میں تعبیر پائے بغیر ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ عقنان علی خان کی تم سے محبت کی طرف ہی سہی مگر اس میں شدت ہے۔ اگر تم اسے گواہی تو تم دنیا کی بہت بری لڑکی ہو گی۔“

”لامعہ! تم.....“ انا بیہ نے بولنے کے لئے لب کھولے تھے مگر لامعہ حق نے اسے بولنے سے قطعاً با رکھا تھا۔

”انا بیہ!۔۔۔ جو جس کے لئے ہوتا ہے اسے ہی ملتا ہے۔ اس کھیل میں زبردستی نہیں ہو سکتی۔ عقنان علی خان کو اگر میں زبردستی حاصل کر بھی لیتی تو وہ میرے لئے کس کام کا ہوتا؟ اس کے دل میں تو تم ہونے اور میں شاید زبردستی کوشش کر کے بھی وہ جگہ نہ لے پاتی۔ یہ محبت ہے انا بیہ شاہ! جو کسی سے زبردستی نہیں جاسکتی نہ ہی زبردستی کسی کے دل میں گھر کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہی تو خاموشی سے اپنے آپ دلوں میں اتر کر تیر کر رہی ہے۔“ لامعہ حق مدھم لہجے میں کہہ رہی تھی اور انا بیہ شاہ ساکت تھی۔

”پاگل لڑکی!۔۔۔ کسی کے خوف سے خوابوں کا ناتا اپنی آنکھوں سے جڑنے سے مت روکو۔ بلا جانے دو اس سلسلے کو۔ جو دل تمہارے لئے ہے اس میں تم ہی رہو گی۔ تمہارے جھٹلانے یا رد کرنے سے وہاں، میں یا کوئی اور جگہ نہیں لے سکتا۔ چاہ کر بھی نہیں۔“ لامعہ کے لبوں کی مسکراہٹ بہت چھلکی تھی۔

”عقنان علی خان باور دار کر چکا ہے۔ وہ جس سے محبت کرتا ہے وہ اسے ملنے ملنے یہ بات اس کے لئے بہت سیکندری ہے۔ وہ ہر صورت میں اسے ہی چاہتا رہے گا۔ اس کے ساتھ۔۔۔ یا اس کے بغیر۔۔۔ مگر اس کے سوا کوئی نہیں۔۔۔

بیلوی۔۔۔ اور کسی کو اس کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔ تم میری پرواہ مت کرو۔ میرا یقین ہے، ایک کے لئے کوئی کہیں نہ کہیں موجود ہے اور جس کے دل میں، میں رہوں گی وہ ایک دن میرے ساتھ

ن کھڑا ہو گا اور میرا ہاتھ تھام کر اپنی ساری محبت مجھے سونپ دے گا۔ آئی بیلوی، ایسا ہو گا۔ عقنان از اوٹلی ہو۔ تم ایک دوسرے کے لئے ہی بنے ہو۔“ لامعہ حق کا لہجہ باور کراتا ہوا تھا۔ اور عین اسی لمحے انا بیہ شاہ کی نظر اپنی رست و انجام پر پڑی تھی اور وہ فوراً معذرت کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”سوری لامعہ!۔۔۔ اوزی کو آج جانا ہے۔ اور میرا جلدی گھر پہنچنا بے حد ضروری ہے۔ اوکے، نے۔“ کتابیں اور فائل سنبھالتی ہوئی، بیگ شولڈر پر ڈالتی وہ عجلت سے کہتے ہوئے اٹھی تھی۔

”جاؤ گی کیسے؟ رکو، میں تمہیں ڈراپ کر دیتی ہوں۔“ لامعہ حق نے آفر دی تھی۔ وہ ملاحت سے مسکرا

تی تھی۔

”نہیں، تھینکس۔ آئی ول ٹیچ۔“ کہتے ہوئے وہ پلٹی تھی اور تیزی سے کیسپس سے باہر نکلے لگی تھی۔



کتنی عجب بات تھی۔

انا بیہ شاہ سمجھ رہی تھی، لامعہ حق سب کچھ سن کر اس سے بدظن ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ کس درجہ کشادہ دلی سے وہ اسے عقنان علی خان کو اپنانے کا مشورہ دے رہی تھی۔

’بے وقوف! انا بیہ شاہ کے لبوں پر ایک پھیلکی سی مسکراہٹ نے دم توڑا تھا۔

’لامعہ حق!۔۔۔ بظاہر تم جو بھی کہو، مگر کیا میں نہیں جانتی کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ تم مجھ سے کیسے چھا سکتی ہو؟۔۔۔ تم تو اپنی معمولی معمولی چیزوں کے لئے اتنی جذباتی ہوا کرتی تھیں اور۔۔۔ کہاں تم اپنی محبت دان کرنے چلی ہو۔ اور کیا سمجھتی ہو، میں سب قبول کر لوں گی؟ تم جب میرے متعلق اتنی کسرن ہوتی کیسے دھوکا دے سکتی ہوں تمہیں؟۔۔۔ تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ انا بیہ شاہ بھی دوستی کو نباہنا جانتی ہے۔ اور اس دوستی کے لئے ہزاروں عقنان علی خان رد کر سکتی ہے۔‘

دور تک سنسان، ویران سڑک پر چلتے ہوئے وہ کسی کیب کی تلاش میں تھی۔ سوچتے ہوئے آنکھیں تلاش تھیں۔ وہ لامعہ کے متعلق ہی سوچ رہی تھی جب اس کا پرس میں موجود سیل بجنے لگا تھا۔ انا بیہ شاہ نے اسی طرح چلتے ہوئے سیل بیگ سے برآمد کیا تھا اور اسکرین پر اوزی کا نام دیکھتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

”کیا ہے؟۔۔۔ انتظار نہیں ہو رہا؟۔۔۔ آ رہی ہوں بھی۔“

”یار! سٹ کو میں نے سمجھ لیا ہے۔ مگر ایک شے سمجھ میں نہیں آ رہی۔ یہ گلاب بند کیا ہوتا ہے؟“

”گلاب بند؟۔۔۔“ انا بیہ شاہ بے طرح چونکی تھی۔ ”اوہ۔۔۔ ڈفر۔۔۔ گلاب بند نہیں۔۔۔ یہ ضرور

گلاب بند ہو گا۔“ مسکراتے ہوئے وضاحت دی تھی۔ ”اپنی آردو درست کرو۔ رومن میں لکھو گے تو ایسا ہی ہو گا۔ ایک طرح کا ٹیکس ہوتا ہے جو عورتیں گلے میں پہنتی ہیں۔ اگر تم اسے گلاب بند کہو گے تو قیامت ہو جائے گی۔“

”گلاب بند یا گلاب بند۔۔۔ واٹ اپور۔۔۔ بس تم جلدی سے آ جاؤ یار!۔۔۔ میں سٹ دیکھ دیکھ کر

پیشان ہو رہا ہوں۔ مٹی نے جانے کیا کیا لکھوا دیا ہے۔“ اوزی اپنی خجالت مٹانے کو بولا تھا۔

”آئی کا بھی ضروری فون آ گیا تھا۔ ان کو بھی جانا پڑ گیا۔ اب فلائٹ میں چند گھنٹے رہ گئے ہیں اور

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ آئی نے جلد واپس آنے کا کہا ہے۔ مگر کیا پتہ وہ نہ آسکیں۔ تم کہاں ہو؟“
انا بیہ مسکرا دی تھی۔

”میں اس وقت ٹھنڈی سڑک پر منگشت کر رہی ہوں اور ایک عدد کب کو تلاش کر رہی ہوں۔ بہر حال تم پریشان مت ہو، میں جلد پہنچ جاؤں گی۔ یہ بتاؤ، یہ گھوم بند لینے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“ کہیں آئی تمہاری شادی کا پروگرام تو نہیں بنا رہی؟“ انا بیہ چلتی ہوئی شرارت سے مسکرائی تھی۔
اوزی ہنس دیا تھا۔

”ایسی کوئی بات فی الحال نہیں ہے۔ اور سنو میری اچھی سی انا بیہ! تم آنے میں زیادہ دیر کرو گی تو میں اور میری پریشانیوں واقعی بڑھ جائیں گی۔ تم ایسا کرو جہاں ہو، وہیں رکو۔ میں تمہیں لینے پہنچ رہا ہوں۔“
انا بیہ نے بھی سانسے سے آنے والی کب کو ہاتھ کا اشارہ دیتے ہوئے روکا تھا۔
”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کب میں بیٹھ رہی ہوں۔ تم بھی اب پریشان ہونا بند کر دو اور بیٹھ کر آرام سے میرا انتظار کرو۔ کچھ ہی دیر میں، میں پہنچ رہی ہوں۔ اوکے۔“

”اوکے۔“ اوزی مسکرایا تھا اور انا بیہ نے بھی کب کا دروازہ بند کرتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔
”پاگل۔ گلابند۔“ ایک نئی ایجاد پر وہ مسکرائے بنا نہیں رہ سکی تھی۔
”بھائی! ذرا جلدی۔ فیرون کی طرف چلنا ہے۔“ ہدایت دیتے ہوئے وہ سہل دوبارہ بیگ میں ڈالتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

”اوزی بیٹا! انا بیہ کا سیل ٹرائے کرو۔ میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ ابھی تک پہنچی کیوں نہیں وہ۔ کتنے بچے اس کی بات ہوئی تھی تم سے؟“

”یہی کوئی تقریباً سوا بارہ بجے۔ آپ فکر مت کیجئے، میں دیکھتا ہوں۔“ پریشان تو اوزان سید کا دل بھی تھا مگر وہ ماہ و ش آئی کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے بہت رسائیت سے اس کا نمبر دو چار بار ٹرائی کیا تھا۔ مگر سیل مسلسل آف ل رہا تھا۔
ماہ و ش اور دادا ابا بے حد متفکر نظر آرہے تھے۔

”ایسا آج تک نہیں ہوا۔ اس کی تو کوئی دوست بھی نہیں۔ اور اگر کہیں جانا بھی ہو تو وہ پہلا گھر میں انفارم کرتی ہے۔ اتنی غیر ذمے دار وہ ہے نہیں۔ پھر آج کیا ہو گیا۔ اوزی بیٹا! ذرا لامعہ کا نمبر لگانا۔“
”جی آئی۔“ یہ مطلع کئے بغیر کہ انا بیہ کا سیل رسائیت نہیں کر رہا، وہ لامعہ کا نمبر ملانے لگا تھا۔ جالبابہ آئی کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

گلوکوڑی کے سب لیتی ماہ و ش واضح انداز میں کانپ رہی تھیں۔ اوزی مرد تھا، خود پر قابو تھا۔ اگرچہ وہ بھی اسی قدر پریشان تھا۔

”ہیلو، لامعہ!۔ اوزی بات کر رہا ہوں۔ انا بیہ تمہارے ساتھ ہے؟“ عجلت بھرے انداز میں دریافت کیا تھا۔

”انا بیہ؟“ لامعہ چونکی تھی۔ ”نہیں، وہ تو تقریباً بارہ بجے ہی میرے پاس سے اٹھ کر کیپس سے چلی گئی۔ کیا ہوا؟۔۔۔ ابھی تک گھر نہیں پہنچی؟“
”ہاں۔“ اوزی کی پریشانی دو چند ہونے لگی تھی۔

”مگر وہ تو یہ کہہ کر نکل گئی تھی کہ تم اس کا انتظار کر رہے ہو اور وہ گھر ہی جا رہی ہے۔ ہو سکتا ہے، راستے میں میں رک گئی ہو۔ تم اس کے سیل پر ٹرائی کر کے دیکھو نا۔“ لامعہ حق نے مشورہ دیا تھا۔

”اس کا سیل رسائیت نہیں کر رہا۔ اور یہاں سب بہت پریشان ہو رہے ہیں۔ تم اس کے دیگر فرینڈز سے واقف ہو۔ پلیز کونفرم کرو، وہ کسی اور کی طرف تو نہیں نکل گئی؟“

”ڈونٹ وری۔ میں ابھی کونفرم کر کے تمہیں فون کرتی ہوں۔ تم پریشان نہیں ہو۔ اور آئی اور دادا ابا کو بلا دو۔ انا بیہ کہیں نہیں جاسکتی۔ وہ ایک سمجھ دار اور ذمہ دار لڑکی ہے۔ اور یوں بھی ابھی زیادہ وقت لڑا نہیں کہ اتنی پریشانی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ ٹریفک جام میں گھر گئی ہو۔ معاملہ معمولی بھی ہو سکتا ہے۔ خواہ لڑکی کی پریشانی کری اسٹٹ کرو۔ کراچی جیسے شہر میں سڑکوں پر اتنا وقت لگ جانا کوئی عجیب بات نہیں۔“
لامعہ اُسے مطمئن کرنے کو بولی تھی۔

”خدا کرے سب ٹھیک ہی ہو۔“ وہ دانستہ کم آواز میں بات کر رہا تھا۔ آئی کا خدشہ تھا، کہیں وہ یہ سب ناکر مزید پریشان نہ ہو جائیں۔

”تم کونفرم کر کے مجھے فون کرو۔ آئی ایم ڈیننگ۔“

”آل رائٹ۔۔۔ مگر تم آئی اور دادا ابا کو مزید پریشان مت کرو۔ ہم کسی بھی حادثے کا خدشہ نہ ہی مانیں لائیں تو بہتر ہے۔ گواہی تاخیر ہو جانا معمولی بات ہے۔ مگر یہ کال دے کر تم نے مجھے بھی پریشان کر لیا ہے۔ خدا اُسے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ اوزی نے کہتے ہوئے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا اور لامعہ کی کال کا انتظار کرنے لگا تھا۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ انا بیہ، لامعہ کے ساتھ بھی نہیں ہے؟“ ماہ و ش نے پوچھا تھا۔
”نہیں آئی! وہ اس کی طرف سے بارہ بجے نکل آئی تھی۔ غالباً وہ ٹریفک میں پھنس گئی ہے کہیں۔“

زلی نے انہیں مطمئن کرنے کو کہا تھا۔ مگر ایسا کہتے ہوئے اس کا اپنا دل بے حد پریشان تھا۔ انا بیہ کو اب لگ گھر پہنچ جانا چاہئے تھے۔ اس کے کیپس سے یہاں تک کا فاصلہ کچھ اتنا زیادہ بھی نہ تھا۔ بیس منٹ کی بات تھی۔ ٹریفک جام ہوتی تو زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ لگ جاتے۔ مگر اب تو.....

اس نے گھڑی دیکھی تھی اور اس کی پریشانی دو چند ہو گئی تھی۔ دوسری طرف آئی کا برا حال تھا۔ اوزی نے بھی سوچنے سے قبل لامعہ کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ اور لامعہ کا فون آ گیا تھا۔

”ہیلو لامعہ!۔ کیا ہوا؟“ اوزی نے جلت سے دریافت کیا تھا۔

”اوزی! انا بیہ کہیں نہیں ہے۔ شاید وہ کسی حادثے کی نذر.....“

”لامعہ! پلیز۔۔۔ اوزی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

عفتان علی خان نے کال کا سلسلہ منقطع کیا تھا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر انتہائی سرعت سے باہر نکلا۔ کیفیات پر قابو پانے کی ساری کوششیں رائیگاں ہو رہی تھیں۔ ذہنی انتشار بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ مگر علی خان کو خود پر بے حد اختیار رکھنا تھا۔ جب تک کہ وہ اسے تلاش نہ کر لیتا۔ اُسے ایک کڑے کی ضرورت تھی۔ اور وہ یہ بات جانتا تھا۔



”اوزی! پلیز، میں انابیہ کی دوست ہوں۔ اُس کی اس طرح کشدگی میرے لئے بھی اتنی ہی پریشان کن ہے۔“ لامعہ حق نے وضاحت دی تھی۔
”لامعہ حق! ابھی تک انابیہ کی کشدگی کنفرم نہیں ہوئی ہے۔ پھر تمہیں کیسے پتہ چل گیا کہ وہ گم شدہ ہو چکی ہے۔ تم نے یہ کہا بھی کیسے؟“ اوزی کا لہجہ اشتعال انگیز تھا۔

”کول ڈاؤن۔۔۔ میرا مطلب وہ نہیں تھا اوزی! میں بھی اتنی ہی پریشان ہوئی ہوں یہ خبر سن کر جتنا کہ تم۔ اپنی ویز، میں وہاں آ رہی ہوں۔ تم فوراً ہاسپٹلو اور دیگر مقامات میں فون کر کے پتہ کرو۔ ساتھ ہی پولیس کو خبر کرو۔“ لامعہ نے عجلت میں فون بند کر دیا تھا۔ مگر اوزی کی پریشانی مزید بڑھ چکی تھی کہ انابیہ کہیں کسی دوست کی طرف نہیں تھی۔ تو پھر وہ کہاں تھی؟۔۔۔ کہیں واقعی وہ کسی ایکسیڈنٹ کی نذر تو نہیں..... مگر اس سے آگے اس سے کچھ سوچا ہی نہیں گیا تھا۔

صورت حال بہت مشکل تھی۔ آئی کا برا حال تھا اور وہ دلاسہ دینے کی کوشش میں مسلسل ناکام تھا۔ وہ دل میں مسلسل دعائیں مانگ رہا تھا کہ انابیہ ساتھ خیریت کے ہو۔ ہاسپٹلو کے نمبرز ملا تے ہوئے اس کے ہاتھ واضح انداز میں کانپ رہے تھے۔
آئی مسلسل رورہی تھیں۔

”انابیہ۔۔۔ میری بچی۔۔۔“

اوزان سید کے چہرے سے پریشانی واضح طور پر چھلک رہی تھی۔ انابیہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ آئی کا برا حال تھا۔ دادا جی بھی پریشان تھے۔ مگر وہ مرد تھے۔ کڑے حالات میں بھی ضبط رکھنا جانتے تھے۔
اوزان سید تمام تر اندرونی کیفیات پر بھرپور انداز میں قابو پاتے ہوئے عفتان علی خان کا نمبر ملانے لگا تھا۔

”عفتان! کہاں ہو تم؟“

”آفس میں ہوں۔۔۔ کیوں، کیا ہوا؟“ اس کے لہجے کی پریشانی بھانپتے ہوئے عفتان علی خان نے دریافت کیا تھا۔

”مجھے اس وقت تمہاری بہت ضرورت ہے۔“ اوزان سید کا انداز بے حد الجھا ہوا تھا۔ پریشانی سے پریشانی کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔

”ہوا کیا ہے؟۔۔۔ تم اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو؟“

”انابیہ از مسنگ۔“ اوزان سید کا لہجہ جب نیم جاں تھا۔

”وہاٹ۔۔۔؟“ عفتان علی خان کے سر پر جیسے کسی نے بم پھوڑ دیا تھا۔ ”پاگل تو نہیں ہو گئے تم؟“
”عفتان! یہ وقت بحث کرنے کا نہیں ہے۔ تم آ جاؤ۔۔۔ مجھے تمہاری فوری ضرورت ہے۔ انابیہ کا واقعی کچھ پتہ نہیں ہے۔ میں ہر جگہ پتہ کر چکا ہوں۔ یہاں پر صورت حال واقعی تشویش ناک ہے۔ تم فوراً پہنچو۔ ہمیں فوری طور پر تھانے میں رپورٹ کرنا ہے۔

”میں..... میں آ رہا ہوں۔ پریشان نہ ہو۔ انشاء اللہ انابیہ کو کچھ نہیں ہو گا۔“ بے حد عجلت میں کہتے

توجہ کے وصف کیا بدلے تھے، سارے مظہر دھندلے سے ہو کر رہ گئے تھے۔ دل سوچتا بھی تھا تو سارا زمانہ خواب سا لگتا تھا۔

وہ زینہ اتر رہی تھی، جب سردار سبکتگین حیدر لغاری کو زینے کے آخر میں کھڑے پر پشل سیل پر کسی سے جو گفتگو پایا تھا۔ موڈ خاصا خوشگوار تھا۔ دوسری طرف کوئی بھی ہوتا مگر جو بھی تھا، سردار صاحب کے دل کو مطلوب ترین تھا۔ خاصا بلند قہقہہ کانوں میں پڑا تھا۔ وہ آخری زینے پر قدم رکھتے ہوئے اپنی ساری توجہ اس شخص پر مبذول کئے ہوئے تھی۔ نتیجتاً پاؤں مڑا تھا اور قریب تھا کہ وہ گر جاتی۔ سنہلنے کے لئے اس کا مضبوط شانہ غنیمت لگا تھا۔ بے دھیانی میں ہاتھ اس کی پشت پر پڑا تھا۔ مگر سنہلنے سنہلنے بھی اس کی پیشانی اس کی مضبوط پشت سے جا کھرائی تھی۔ فقط پیشانی ہی کیا وہ پوری کی پوری اس وقت سردار سبکتگین حیدر لغاری کی چوڑی پشت سے کسی تیل کی مانند لپٹی ہوئی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس آفتِ ناگہانی پر مڑ کر بڑی حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ لمحہ بڑی خجالت کا تھا۔ وہ نگاہ ملانا تو دوسری بات، سر تک نہ اٹھا سکی تھی۔ نگاہیں ایسی چورتھیں جیسے اس نے کوئی ڈاکہ ڈال دیا ہو۔ شرمندگی اس قدر تھی کہ دھڑکنوں کے اندر ایک انتشار برپا ہونے کے ساتھ سارا وجود بھی کانپ رہا تھا۔ قرتوں کی کہانی عجیب تھی۔ دھڑکنوں میں آہنگ تو تھا مگر آہنگ نہیں۔ قرتوں کے اس لئے میں حدت ضرور تھی مگر شدت ہرگز نہیں۔ ایک مخصوص خوشبو اس کے اطراف تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری گردن کا رخ موڑے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

میرب سیال نے لرزتی پلکوں کے ساتھ ایک چوری نگاہ ڈالی تھی اور بہت آہستگی سے اپنا نازک ہاتھ جو اس لمحے سردار سبکتگین حیدر لغاری کے مضبوط شانے پر دھرا تھا، اسی طرح جھکی جھکی پلکوں سے ہٹایا تھا اور دھڑکنوں کے زیر و بم پر قابو پاتی وہ پیچھے ہٹی تھی۔ محذرت کا کوئی لفظ رسماً بھی لبوں پر لانے کی ہمت اس میں ناید تھی۔ اگلے دو قدم چلتی وہ سر جھکائے اسی طرح دور ہتی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری اسی طرح گردن کا رخ موڑے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر کوئی بھی تاثر واضح نہ تھا۔

”آئی..... ایم..... سوری!..... وہ اچانک..... پاؤں.....“ وضاحت دینے کے لئے لفظ تلاشنے چاہے تھے مگر سب بے سود تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری اس کی تمام تر ہمت اور محنت پر پانی پھیرتا، تیل فون کان سے لگاتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پلٹا تھا اور زینہ طے کرنے لگا تھا۔ میرب سیال کے لئے یہ اقدام خاصا چونکا دینے والا تھا۔

وہ چند لمحوں تک اسی طرح ساکت سی کھڑی رہی تھی۔ پھر چلتی ہوئی مائی اماں کے کمرے کی طرف آگئی۔ چہرہ یوں تپ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو۔ وہ لمحہ بھیلنا آسان نہ تھا۔

”شدید ترین تھیک محسوس ہوئی تھی۔“

”کیا ہوا؟“ ایسے چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے؟“ مائی اماں نے بھرپور تشویش کے ساتھ اس کا چہرہ ہاتھوں سے لے کر دریافت کیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔“

”پھر۔۔۔؟“ مائی اماں نے توجہ سے سبب دریافت کیا تھا۔ وہ کچھ نہیں بول سکی تھی۔ مگر مائی اماں نے بہت محبت کے ساتھ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

”میری جان!۔۔۔ گھر والوں کی یاد آرہی ہے۔ ہے نا؟“

”میں کچھ دنوں کے لئے نانو کے گھر جانا چاہتی ہوں۔“ میرب سیال نے انکشاف کیا تھا اور مائی اماں کی نظروں میں واضح طور پر تشویش ابھری تھی۔

”خیر ہے؟۔۔۔ یہاں کوئی تکلیف ہے تو مجھے بتاؤ؟۔۔۔ کوئی بات بری لگ گئی کسی کی؟“

”نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل میری اسٹڈی کا بہت حرج ہوا ہے اور اسے کور کرنا بہت ضروری ہے۔ سینی سے میری بات ہوئی تھی۔ میں اگر وہاں جا کر کچھ دن رہ لوں گی تو بہت مدد مل جائے گی۔“ اس نے مدعا بیان کیا تھا۔

مائی اماں کے چہرے پر کسی قدر اطمینان کی لہر دوڑتی نظر آئی تھی۔

”اچھا۔۔۔ میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ واقعی، تجھے اگر کوئی پرالیم ہے تو تو چلی جا۔ اس لئے امتراض والی بھلا کون سی بات ہے؟“ مائی اماں نے بلا تردد کہا تھا۔

”تو تھیک ہے۔۔۔ میں آج ہی چلی جاتی ہوں۔ سینی کو فون کر دیتی ہوں، وہ مجھے لے جائے گا۔“

میرب اٹھی تھی۔

”تھیک ہے بیٹا! لیکن وہاں جا کر اپنی مائی اماں کو مت بھول جانا۔ ریلے میں رہنا۔ ورنہ مجھے فکر ہے گا۔“ مائی اماں نے ہدایت جاری کی تھی۔ ”اور اپنا بہت خیال رکھنا۔“

میرب مسکرا دی تھی۔

”آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے میں سات سمندر پار جا رہی ہوں۔“

مائی اماں نے اٹھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا اور محبت سے اس کے چہرے کو دیکھتی ہوئی بولی تھیں۔

”میرے لئے تو تیرا جانا ایسا ہی ہے۔۔۔ ماں ہوں نا۔۔۔ فکر تو رہے گی۔ اگرچہ وہ گھر تیری خیال کا ہے۔“

میرب مسکرا دی تھی۔

”میں چلوں گی۔ چھوٹی موٹی بیکنگ بھی کرنا ہے۔“

”ہاں — ٹھیک ہے۔“ مائی اماں نے اجازت دی تھی اور میرب ساتھ چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

دو قدم بھی نہ چل پائی تھی جب اس کا ہاتھ یکدم ہی کسی آہنی گرفت میں آ گیا تھا۔ گرفت اس قدر مضبوط تھی

کہ تکلیف کا ایک واضح احساس اس کے چہرے پر ابھرا تھا۔ کسی نے اسی قدر سرعت سے جارحانہ انداز

میں اس کا رخ اپنی سمت موزا تھا۔ سنبھلنے کی کوشش یقیناً بیکارتھی۔ کوشش کرتی بھی تو توازن برقرار نہ رہ

پاتا۔ شاید اسی لئے نتیجتاً وہ اس لئے اس شخص کے اتنے قریب تھی کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس

کے وجود کی خوشبو اور وہ قربت حواس باختہ کرنے کو کافی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اس کی دھڑکنوں کی آواز بھی سن رہی

تھی۔ اس نے بہت آہستگی سے سر اٹھایا تھا۔ کوئی اس کی سمت بہت خشکیوں نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس

کے متوجہ ہونے پر اُسے بہت جارحانہ انداز میں شانوں سے تمام کر پُرپیش نظروں سے دیکھا تھا۔

”نگاہ اگر اجنبی ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ نظر مائل نہیں۔ تم نے یہ سوچا بھی کیسے کہ تم اپنے طور

پر فیصلے لینے کے لئے اتنی آزاد ہو؟ اور تمہیں کسی کی اجازت کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی؟“ دریافت

کرنے کا انداز درشت تھا اور آنکھوں سے جیسے الاؤ نکل رہے تھے۔

سردار سبکنگین حیدر لغاری کا یہ احتجاج اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس کی آہنی گرفت سے اس کے شانے

بُری طرح ڈکھ رہے تھے۔ انگلیاں جیسے گوشت میں کھب رہی تھیں۔ میرب سیال نے اُسے بہت ناگواری

سے دیکھتے ہوئے ایک لمحے میں اس کے ہاتھ اپنے شانوں پر سے جھٹکے تھے اور دو قدم چلتی ہوئی اس کے

حصار سے پیچھے ہٹ گئی تھی اور اس کی سمت مائل خود اعتمادی سے دیکھتی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

”میں کیا کرتی ہوں، کس لئے کرتی ہوں، کیوں کرتی ہوں، اس سب کی خبر رکھنے کی ضرورت آپ کو

قطعاً نہیں۔ نہ ہی فکر کرنے کی۔ انڈراستینڈ؟“ اجب، انداز سب اعتماد سے پُر تھا۔ اور سبکنگین حیدر لغاری اس

کی ہمت پر حیران تھا۔

وہ ایک نظر بھر پور ناگواری سے ڈالتی ہوئی پلٹی تھی۔ جب سردار سبکنگین حیدر لغاری نے بے حد جارحانہ

انداز میں اُسے سرعت سے تمام کر اپنی طرف کھینچا تھا۔ میرب سیال کے لئے اس کا یہ جونی پن کچھ نیا نہیں

تھا۔ کوئی نئے قیاس سے باہر نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی سردار سبکنگین حیدر لغاری اپنے سامنے اسے کھڑا دیکھ کر

یونہی مشتعل ہوگا۔ وہ اُس کے پُر اعتماد نظر آنے پر اسی طرح تملائے گا۔ اور سب کچھ اس کے اندازے

کے مطابق ہوا تھا۔ اسی لئے شاید سردار سبکنگین حیدر کے اس اقدام پر بھی وہ حواس باختہ نہیں ہوئی تھی۔ اس

کی اتنی قربت پر بھی بولکھائی نہیں تھی۔ وہ جس طرح تیخ بانظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، جو اب اس کا انداز

اسی قدر مطمئن اور تسلی بخش تھا۔ اور یہ اطمینان یقیناً سردار سبکنگین حیدر لغاری کے لئے نسل بخش نہیں تھا۔

”تم — کہیں نہیں جاؤ گی۔“ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے باور کرایا گیا تھا۔ نگاہوں

کی پیش ابلی تھی کہ جیسے اُسے جلا کر خاستہ کر دے گی۔ یقیناً ایسا کوئی انداز اس سے قبل اس کے سامنے نہیں

آیا تھا۔ یہ سردار سبکنگین حیدر لغاری کا کوئی نیا ہی روپ تھا۔ سرخ آنکھوں میں جانے کیا تھا۔ میرب

سیال جس متواتر دیکھنے کا قصد کے بیٹھی تھی، یکدم ہی نظر میں پھیر گئی تھی۔

”انڈراستینڈ۔۔۔؟“

سے ایک جھٹکے سے چھوڑتے ہوئے وہ بھاری قدم زمین کے سینے پر رکھتا ہوا، مضبوط قدموں سے چلنے

کے بڑھ گیا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ اس زمین کے سینے کو روند دینا چاہتا ہو۔ کیسا انتہا پسند دکھائی دیا

اس لمحے۔

ابھی تو اس شخص سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہیں تو یہ حال تھا۔ کوئی جذباتی وابستگی بھی نہیں دی تھی۔

فی توجہ، ذرا ساتفات — کچھ بھی نہیں تھا اور وہ اس حد تک جاتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اگر کوئی دلی

فی ہوتی تو وہ شخص کس حد تک جاتا؟

میرب سیال ساکت ہی کھڑی سوچ رہی تھی۔

بھڑکنوں کے زیر و بم میں اس پُرپیش چہرے کے ساتھ وہ اب بھی اسی سمت دیکھ رہی تھی جس سمت وہ

تھا۔ ایک جلتا ہوا لمس اس کی کلائی پر اب بھی موجود تھا۔ انگلیوں کے نشان جیسے پوست ہو گئے تھے۔

تو یہ انداز بیگانگی تھا۔

اجنبیت تھی۔

انجانا پن تھا۔

ناپسندیدگی تھی۔

اگر سب کچھ اس کے برعکس ہوتا تو کیا ہوتا؟

تشویش بڑھ چکی تھی۔

لئے بھر بھری ریت کی طرح ہاتھ سے سرکتے جا رہے تھے۔ اور ہرگز تامل اپنے ساتھ مزید وحشتیں لا

فلا۔

وہ گھر جہاں اتابہ شاہ کے وجود سے زندگی دوڑتی تھی، وہ گھر اتابہ شاہ کے بغیر ایک ویران کھنڈر لگ رہا

اتنی وحشت تھی کہ جیسے کوئی صف ماتم بچھی تھی۔ گھر کے مکینوں کے چہرے آنسوؤں سے تر تھے اور

میں دلہیز پر لگی ہوئی تھیں۔

”اوزی! تم دروازہ بند کیوں کر رہے ہو؟“ اتابہ کو آتا ہے ابھی۔ اور یہ کمرے کی لائٹس جلا دو۔

ہانتے ہو۔ وہ اندھیرے سے کس قدر خوفزدہ ہوتی ہے۔“ ماہوش پر عجب پاگل پن سوار تھا۔ بیٹی کی

ٹانگی نے گہرا صدمہ دیا تھا۔ حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔

اوزی نے انہیں تمام کراپنے ساتھ سمجھنے لیا تھا۔ آنکھوں سے بہت خاموشی کے ساتھ نمکین پانی

بانظرے ٹوٹ کر ماہوش کے شانوں پر جذب ہوئے تھے۔

”آپ — کیا سمجھتی ہیں مام! کیا مجھے کوئی دکھ نہیں؟“ کیا مجھے کوئی فکر نہیں کہ وہ کہاں

لاؤر کس حال میں ہوگی۔ ہمیشہ اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھنے والا بھائی آج کتنا بے بس

نزد کے آنسو سمیٹ رہا تھا۔ خود دل کتنے طوفانوں کی زد پر تھا۔ مگر وہ دوسروں کو مسکراتے ہوئے بہلا

اپنی جان مشکل میں تھی۔ روح پر کوئی عذاب آتا ہوا تھا۔

سانس تک لینا دشوار تھی۔

ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔

مگر وہ مسکرا رہا تھا۔

”آپ انابیہ کو تو جانتی ہیں نام!۔۔۔ وہ آپ کو تو کچھ نہیں کہے گی لیکن میری اور اوزی کی خیر نہیں

یہ جان کر کہ ہم دو دو ہٹنے کے لڑکوں نے آپ کا خیال نہیں رکھا، وہ بہت برہم ہوگی۔۔۔ اوزی کو

بھی پھر بھی وہ کوئی رعایت دے کر بخش دے مگر میں؟۔۔۔ مجھے اپنی خیریت کے متعلق کوئی اتنا یقین

نہیں۔۔۔“ نام کے منہ میں نوالے رکھتے ہوئے وہ مسکرانے کی کوشش میں عجب بجا بجا سا دکھائی دے رہا تھا۔

”دادا جی! آپ ہی بتائیے۔۔۔ میں غلط ہوں یا صحیح؟۔۔۔“ عین سامنے بیٹھے دادا جی کی رائے

مانگتی تھی۔ مگر وہ کچھ نہیں بول سکے تھے۔ ہاتھ میں تھا ہوا نوالہ وہیں پلیٹ میں رکھ دیا تھا اور عفتان علی خان

پیسے ساری محنت اکارت ہو گئی تھی۔ بہت خاموشی سے وہ اٹھا تھا اور چلتا ہوا ششے کی دیوار کے پاس جا

تا۔۔۔ کمرے میں اس وقت چار نفوس موجود تھے۔۔۔ مگر خاموشی قبرستان جیسی تھی۔

عفتان علی خان بڑھال سا کھڑا تھا۔ جب فون بجا تھا۔ اوزی نے سرعت سے پیش قدمی کی تھی۔ مگر اس

بھی زیادہ جلدی کا مظاہرہ عفتان علی خان نے کیا تھا اور فون اٹھالیا تھا۔

”ہیلو۔۔۔“ کسی بھی متوقع خبر کو سننے کے لئے وہ ہر طرح سے تیار تھا۔

”ہیلو عفتان!۔۔۔ میں لامعرات کر رہی ہوں۔“

”اوہ۔۔۔“ عفتان علی خان کا سارا ہنسن دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ ایک سرد سانس خارج کرتے

لے وہ جیسے صبر آزما لمحے سے گزرا تھا۔

”کہو۔“

”میں انابیہ کے متعلق پوچھنا چاہ رہی تھی۔ کچھ پتہ چلا اس کا؟۔۔۔ کوئی خبر؟“ لامعہ حق کا لہجہ

انی سے بھر پور تھا اور آواز میں نقاہت واضح تھی۔

”نہیں۔۔۔ اب تک تو نہیں۔“ عفتان علی خان کا لہجہ سرد تھا۔

”خدا کرے وہ خیریت سے ہو جہاں بھی ہو۔۔۔ مجھے تو اس کی بہت فکر ہو رہی ہے۔ ماما اور پاپا بھی

پریشان ہیں اس کی گمشدگی کو لے کر۔ میں تو اس خبر کو لے کر اتنی اپ سیٹ ہوں کہ ہا پھر ٹینشن کری

ہو گئی ہے۔ ابھی ابھی ڈاکٹر دیکھ کر گیا ہے۔ میڈیسن کے زیر ہوں۔ مگر انابیہ کی فکر پھر بھی نہیں جا

آئی ہے میری طرف سے معذرت کر لینا۔۔۔ میں جانتی ہوں مجھے اس وقت وہاں ہونا چاہئے

میر میری حالت ایسی نہیں۔ میرے لئے اس صورت حال کو فیس کرنا آسان نہیں۔“

اس کی لمبی چوڑی وضاحت اور تردید عفتان علی خان بہت ہمت سے سن رہا تھا۔

لامعہ طرف غالباً لامعہ واقفی رو رہی تھی۔ لہجہ بھرا رہا تھا۔

ہے۔ کڑے ترین حالات میں۔ جب کہ اس کی بہن مشکل میں ہے اور اسے اس کی شدید ضرورت ہے

وہ اسے ڈھونڈ نہیں پا رہا ہے۔ جان نہیں پا رہا ہے کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔۔۔ میرے

پر کیا گزر رہی ہے، یہ میں کسے بتاؤں؟“ ماہوش کو تسلی دیتے ہوئے وہ خود بھی ٹوٹ کر پھگر گیا تھا۔ عفتان

خان جو قدرے فاصلے پر تھا، چلتا ہوا اس کے قریب آیا تھا اور اس کے شانے پر ہاتھ دھر دیا تھا۔ تسلی کا

ایک خاموش سا اظہار تھا اور اوزان سید کے لئے ان کڑے لمحوں میں اس کا ساتھ غنیمت تھا۔ ایسے

جب کہ وہ بے حد تنہا محسوس کر رہا تھا خود کو، عفتان علی خان نے اس کے ساتھ آ کر اس کی بھر پور

بڑھائی تھی۔

”تم مام کو کھانا کھلا دو۔۔۔ دادا جی نے بھی کچھ نہیں کھایا۔۔۔ یہ ٹھیک نہیں ہے اوزی!۔۔۔

کوشش کر رہے ہیں۔۔۔ پولیس بھی سرگرم عمل ہے۔ امید ہے بہت جلد انابیہ کا پتہ چل جائے گا۔ تم

مت کرو۔۔۔ میں نے اوپر بات کی ہے۔ نیچے کے افسران کو کڑی ہدایت جاری کی گئی ہے۔ اگلے

گھنٹوں میں انابیہ ہمارے درمیان ہوگی۔ انابیہ کو کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ بلیو می۔۔۔ میں اُسے کچھ ہو

نہیں دوں گا۔۔۔ اُسے آج بھی آئی تو تمہیں نہیں کر کے رکھ دوں گا سب کچھ۔ اطمینان رکھو۔۔۔

جلد ہم میں ہوگی۔ یہاں، ہمارے درمیان۔۔۔ فقط بارہ گھنٹے۔۔۔ میں نے پایا اور گین۔

بات کر لی ہے۔ وہ بھی اپنے اثر و رسوخ استعمال کر رہے ہیں۔ اگلے چند گھنٹوں میں انابیہ کی کچھ خبر نہ

یہ ممکن نہیں۔“

عفتان علی خان کے لہجے میں عجب ایک یقین بول رہا تھا۔ اپنے مضبوط ہاتھوں کی پوروں سے ماہوش

کی آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے بہت بڑا اعتماد دکھائی دیر ہا تھا۔

”آئیے مام! کھانا کھا لیجئے۔ آپ کو مجھ پر یقین ہے نا؟۔۔۔ انابیہ کو میں کچھ ہونے نہیں دوں گا

اب تو آپ کھانا کھا لیجئے۔“

ماہوش ضبط کا یارا رکھنے کی کوشش میں پھر رونے لگی تھیں۔ دادا جی الگ چپ چاپ سے بیٹھے تھے۔

عفتان علی خان ماہوش کو شانوں سے تھام کر کھانے کی ٹیبل تک لایا تھا۔

”اوزی! تم دادا جی کو لا کر ٹیبل پر بٹھاؤ۔ کم آن یارا!۔۔۔ اگر تم بھی یوں حوصلہ ہار دو گے تو

صورتحال سے کون نئے گا؟“ کونے میں بڑھال کھڑے اوزان سید کو گھر کا تھا۔ اوزان سید آہستگی سے

ہوئے دادا جی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ قدم بے حد بڑھال اور چال میں واضح تھکن تھی۔

عفتان علی خان نوالے بنا کر ماہوش کے منہ میں رکھنے لگا تھا۔

ماہوش اگر کچھ کھانا نہیں چاہ رہی تھیں مگر وہ انہیں بچوں کی طرح بہلاتے ہوئے مسلسل کھلا رہا تھا۔

”آپ کھانا نہیں کھائیں گی تو انابیہ بہت ناراض ہوگی۔“ مسکراتے ہوئے وہ غالباً اُن کا دھیان

سمت کی طرف ڈالنا چاہ رہا تھا۔ حالانکہ اس کی اپنی آنکھیں اس لئے جلتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں

کناروں پر سرخی پھیلی ہوئی تھی جیسے وہ اپنے اندر کی طغیانیوں پر مشکل قابو پانے ہوئے تھا۔ چہرہ متھکا

انداز پر وحشت اور بڑھال سا تھا۔ اُس کے وجود کو دیکھ کر برسوں کی تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ مگر وہ اس

نئے سے بھرے اس ماحول میں سوئی بھی گرتی تو آواز دُور تک جاتی۔
گھڑی کی سوئیوں کی آواز خاموشی میں دُور تک پھیل رہی تھی۔ رات کے اس پہر جب بہت سی
خوابوں کی دنیا میں سفر کر رہی تھیں، کچھ آنکھیں جاگ رہی تھیں اور مسلسل جل رہی تھیں۔
نین رستوں پر لگے تھے۔ مگر آنے والے قدموں کی چاپ کہیں دُور تک بھی سنائی نہیں دے
پاتی تھی۔

گھڑی کی سوئیاں آہستہ آہستہ آگے سرکتی جا رہی تھیں۔
قرباً چار بجے کا وقت تھا جب عفتان علی خان کا سیل فون بجا تھا۔ اسکرین پر سبکدگین حیدر لغاری کا نام
پلٹتے ہوئے عفتان علی خان نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

”ہیلو گین!۔۔۔ واہٹ پنڈ۔۔۔ اپنی پروگر لیں؟“ عفتان علی خان کا لہجہ بے چینی سے پر تھا۔
دوسری طرف سے جانے سردار سبکدگین حیدر لغاری نے کیا کہا تھا، عفتان علی خان تیزی کے ساتھ پیر
لم گھینٹے لگا تھا۔ غالباً سردار سبکدگین حیدر لغاری کوئی اہم ترین انفارمیشن دینے کے ساتھ کوئی ایڈریس بھی
ٹ ڈاؤن کروا رہا تھا۔ شاید مشکل کا حل نکلنے کے قریب تھا۔ جان پر بھاری لمحے تلنے کا وقت آن پہنچا
ادب پر قیامت برپا کرنے والے لمحے اپنے پیر سمیٹ رہے تھے۔

عفتان علی خان نے سرعت سے پیر کھینچ کر جیب کے اندر رکھتے ہوئے سیل فون پر گنگو کا سلسلہ منقطع
پاتھا اور اوزی کی طرف دیکھا تھا۔

”سبکدگین حیدر لغاری کو کمشنر صاحب کی کال موصول ہوئی ہے۔۔۔ انابییہ سے متعلق پولیس کو کچھ
اہلے ہیں۔ اور پولیس اس وقت اس علاقے میں موجود ہے۔ کسی بھی ممکنہ کارروائی کی غرض سے۔ مجھے
لانا جانا ہوگا۔“ عفتان علی خان کی آنکھوں کی پریشانی مزید بڑھ گئی تھی۔ دیرایاں اور بھی سوا ہو گئی تھیں۔
بے اس کے پر ہوتے تو وہ ایک لمحے میں وہاں اُس جگہ پر پہنچ چکا ہوتا۔ اوزان سید کو اس کے انداز میں
ت نظر آئی تھی۔ یہ خبر اتنے دل دہلا دینے والے سہکتوں میں ایک ارتعاش بن کر آئی تھی۔ سنائے
ایک شور سنائی دیا تھا۔ خوش آئند تھا یا کہ نہیں، یہ وہ دُور نہیں جانتے تھے۔ مگر دُوروں کے لئے صرف
اس لینا کافی تھا کہ انابییہ کے متعلق کوئی خبر ہاتھ لگ گئی تھی۔ یہ ازیت اگر تھی بھی تو اس ازیت سے
میں بہتر تھی جو وہ انابییہ کی گمشدگی سے لے کر اب تک چھیل رہے تھے۔

”کو عفتان! میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ اوزان سید نے کہا تھا۔

عفتان علی خان نے مڑ کر صوفے کی پشت سے سر لگائے سوئے دادا جی اور ماہوش کی طرف دیکھا تھا۔
”مگر دادا جی اور ماہوش ماما۔۔۔؟“ عفتان علی خان نے کسی خدشے کے پیش نظر اوزان سید کی
ب دیکھا تھا۔ ”میرے ہوتے ہوئے انابییہ کو کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ بیلو می۔۔۔ انابییہ جتنی اس گھر کو
پڑ ہے اس سے کہیں زیادہ مجھے عزیز ہے۔ انابییہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ اگر ہوا تو اس کی تمام تر ذمے داری تم بلا
دھجھ پر عائد کر دینا۔ میں ہر الزام اپنے سر لینے کے لئے تیار ہوں گا۔“ عفتان علی خان کا لہجہ مضبوط اور
دل سے بھر ا ہوا تھا۔

عفتان علی خان غالباً اس کے خاموش ہونے کا منتظر تھا۔

”میں لڑکی ہوں۔۔۔ سمجھ سکتی ہوں ایک لڑکی کی عزت کسی آئینوں سی ہوتی ہے۔۔۔ ایک را
گھر سے باہر گزری نہیں اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

”لامعہ! پلیز۔“ عفتان علی خان کے لئے اُسے مزید سننا دُشوار ہو گیا تھا۔ لہذا تمام تر صروت اور ا
بالائے طاق رکھتے ہوئے ناگواری سے گویا ہوا تھا۔

”تم لڑکی ہو اور یہی نہیں سمجھ رہی ہو کہ اس صورت حال میں ایک لڑکی اور اس کی ساری فیملی کتنی مشا
میں ہو سکتی ہے۔ انابییہ جہاں بھی ہے، یقیناً اپنی مرضی سے نہیں ہے۔ اور ایک لڑکی ہونے کے نائے تر
بات یقیناً بہت اچھی طرح سے سمجھ سکتی ہو۔“ انتہائی کھر دے لہجے میں کہتے ہوئے وہ انابییہ شاہ اور اس
فیملی کا سب سے بڑا خیر خواہ لگا تھا۔

لامعہ کے آنسو اور بھی تو اتار سے بہنے لگے تھے۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو عفتان! اس کڑے وقت میں انابییہ کی فیملی کو اور انابییہ کو ہماری ہمدردی کی ہر
ضرورت ہے۔ تم انابییہ کی فیملی کے لئے اتنا کر رہے ہو۔“

”بس یا کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہو تم؟“ عفتان علی خان کا لہجہ حد درجہ بیزار تھا۔

”جیسے ہی کوئی خبر ملے، پلیز مجھے ضرور انفارم کرنا۔“ لامعہ حق کے آنسوؤں کی رفتار میں اضافہ ہو

تھا۔ ”انابییہ۔۔۔ میری دوست۔۔۔ میری بہن۔۔۔ جانے کس حال میں ہوگی؟۔۔۔ اب تک
نہ جانے کیا کچھ ہو چکا ہوگا اس کے ساتھ۔۔۔ بارہ گھنٹے گزر گئے۔۔۔ اور اس کا کچھ پتہ نہیں۔ ایک
اس شہر کی پولیس کو بھی جانے کیا ہو گیا ہے۔ کبھی وقت پر۔۔۔ کام نہیں کرتی۔۔۔ کسی لڑکی کی گمشد
اس کی فیملی کے لئے کتنی پریشان کن ہو سکتی ہے، انہیں کاش اندازہ ہو جائے اور وہ بروقت کوئی اقدام
سکیں۔“ لامعہ حق کا بولنا اور عفتان علی خان کا سننا خاصا مشکل تھا۔ مگر عفتان علی خان کی طرف سے افلا
کا بھر پور مظاہرہ تھا۔

”سمجھ میں نہیں آ رہا انابییہ کی گمشدگی ہوئی کیونکہ۔۔۔ اُس معصوم لڑکی کی تو کسی کے ساتھ کوئی دشمن
بھی نہیں تھی۔ وہ بہت اچھی تھی۔“

”عفتان!۔۔۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے تا کہ وہ کہیں اپنی مرضی سے۔۔۔ اپنی مشا سے۔۔۔ کسی کے
ساتھ۔۔۔!!“

”لامعہ!۔۔۔ ہم یہاں ضروری فون کال کا انتظار کر رہے ہیں۔ تم اپنی یہ ہمدردی اور خیر خواہی ہم
کبھی دکھا لینا۔ خدا حافظ۔“ عفتان علی خان نے پناخ سے ریسیور کر پڈل پر پرخ دیا تھا اور جلتی ہوئی کینپیل
کو انگلیوں کی مدد سے دباتے ہوئے گلاس ڈور کے پاس جا رکھا تھا۔ اضطراری کیفیت میں جیب میں ا
ڈالتے ہوئے سگریٹ کا پیکٹ اور لاسٹر برآمد کیا تھا اور اس سیشن زدہ ماحول سے ریلیف کے لئے سگریٹ
سلاک کر دھوئیں کے مرغولے بنا کر فضا میں منتقل کرنے لگا تھا۔

اوزان سید پلٹتے ہوئے اس کے قریب آ گیا تھا اور تلی کے لئے اس کے چوڑے شانے پر ہاتھ رکھا

اوزی نے اُسے بغور دیکھا تھا۔ وہ ابھی اُلجھن میں تھا۔ تھپی ماہوش کی آنکھ کھلی تھی۔

”کیا ہوا؟“ تم لوگ اس طرح کیوں کھڑے ہو؟“ انابہ کی کوئی خبر آئی؟“ انہوں نے دریافت کیا تھا۔ اور اوزی اُن کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”جی مام!۔۔۔ ہم آپ کو یہی بتانا چاہ رہے تھے۔ اچھا ہوا آپ جاگ گئیں۔۔۔ فون آیا ہے۔ اور ہم وہیں جا رہے ہیں۔ آپ پلیز، اپنا اور دادا جی کا خیال رکھئے گا۔ ہم بہت جلد آجائیں گے۔ انابہ کو واپس لے کر۔۔۔ ہماری اپنی انابہ کو۔“

اوزی نے ان کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے انہیں دیکھا تھا اور پھر عرفنان علی خان کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا۔

عرفنان علی خان کے بھاری قدم آگے ضرور بڑھ رہے تھے مگر ہر قدم من من بھر کا لگ رہا تھا۔ جانے کیوں، دل بہت بو جھل سا لگ رہا تھا۔

اضطراب۔۔۔ بے چینی۔۔۔ کچھ مزید بڑھ گئی تھی۔ جانے کس حال میں تھی انابہ؟

کیا گزر رہی تھی اُس پر۔۔۔ جانے کس نے اُسے کڈنیپ کیا تھا؟ اور کس خاص مقصد سے ایسا سب کیا تھا۔۔۔

کتنے چلتے ہوئے سے سوال تھے دماغ میں۔ مگر ان کا جواب فی الحال کسی کے پاس نہ تھا۔ اور پتہ نہیں انابہ زندہ بھی تھی یا کہ۔۔۔۔۔۔

اس سے آگے کی سوچ دل کی دھڑکنوں کو روکنے کے لئے کافی تھی۔ وہ ایسا کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خیریت کی کتنی ہی دعائیں اس نے دل ہی دل میں مانگ لی تھیں۔ آنکھیں مسلسل جل رہی تھیں۔ مگر

دل سے مسلسل ایک ہی صدا آرہی تھی۔ انابہ جہاں کہیں بھی ہو، خیریت سے ہو۔۔۔ زندہ اور صحیح سلامت ہو۔

کمرے میں مکمل طور پر اندھیرا تھا۔

انابہ شاہ کا نیم جاں وجود کمرے کے عین وسط میں ماربل کے فرش پر چت پڑا تھا۔ اُس کے دونوں طرف کی کلائیاں کٹی ہوئی تھیں اور ان سے خون بہت تیزی سے بہہ کر پورے کمرے کے فرش، پھیلا ہوا تھا۔ وہ اس وقت ہوش و حواس سے بیگانہ تھی نہ اس درد پر کوئی سکھی نہ کوئی آہ۔

زندگی کے احساس کی کوئی رمت جیسے اُس میں ناپید تھی۔ اندھیرے کمرے میں سناٹا ہی سناٹا تھا۔ پولیس نے گھر کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا اور ممکنہ افراد کی تلاش شروع کر دی تھی۔ مگر

اس کمرے میں ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ عرفنان علی خان کی کیفیت وہاں پہنچ کر عجب نیم جاں سی تھی۔ جسم سے ساری ہمت جیسے کسی نے ایک پل میں چوڑی تھی۔ جانے کیوں اُس کا دل مسلسل کسی خطرے کا شعل

دے رہا تھا۔ دل کو جانے کیوں کچھ ہو رہا تھا۔ کیفیت ایسی تھی کہ وہ خود آپ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ یوں لگا

بے جسم سے جان جانے کو تھی۔ جیسے جسم بے روح ہو رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے لڑکھڑایا تھا جب سبکگین حیدر نے اُسے سہارا دیا تھا۔

”گین! مجھے لگ رہا ہے۔۔۔ یہاں کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میرا دل میرے ساتھ نہیں ہے۔ عجب برا ہٹ سی ہو رہی ہے۔ جیسے روح جسم سے نکل رہی ہو۔“

سردار سبکگین حیدر لغاری نے اس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے خاموشی سے اُسے حوصلہ دیا تھا۔ عرفنان علی خان گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا مگر پھر یکدم ہی عجب اضطرابی انداز میں یہاں سے

نکلنے لگا تھا۔ اوزی قدرے فاصلے پر ایس پی سے کچھ ڈسکس کر رہا تھا۔ ”حوصلہ رکھو۔۔۔ سب ٹھیک ہوگا۔ پولیس کارروائی کر رہی ہے۔ چند لمحوں میں صورتحال بس میں ہو

گا۔ اتنا یقین رکھو۔۔۔ انابہ یہیں کہیں ہے، اسی گھر کے اندر۔“ گین کا لہجہ یقین تھا۔ عرفنان علی نے عجب بے چینی سے چل کر آتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ دھر دیا تھا۔

”گین! میں اندر جانا چاہتا ہوں۔۔۔ پلیز، ایس پی سے بات کرو۔ میرا دل گین!۔۔۔ بیلیوی، ہاں کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ دیکھو، سنو میرے دل کی آواز۔۔۔ یہ دھڑک نہیں رہا ہے۔ انابہ ٹھیک نہیں

ہے۔ گین!۔۔۔ پلیز۔۔۔ ان سے بات کرو۔ مجھے اندر جانا ہے۔“ وہ عجب جنونی انداز میں چیخا تھا۔

سردار سبکگین حیدر لغاری نے سر ہلاتے ہوئے ایس پی کی طرف دیکھا تھا۔ ”میں بات کرتا ہوں۔۔۔ مگر اس میں تمہاری اپنی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سب تمہاری سیٹی

لے لئے ہی تھا۔ اندر جا کر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جو کوئی اندر ہے، وہ یقیناً تمہاریوں سے ایس بھی ہوگا۔ میں اسی طور پر تمہارے لئے کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔۔۔ یہ بات سمجھنے کی کوشش کرو تم۔“ سردار سبکگین

حیدر لغاری نے نرم لہجے میں سمجھانا چاہا تھا۔ مگر عرفنان علی خان کا ضبط اس گھڑی جواب دے گیا تھا اور وہ باپڑا تھا۔

”کیا۔۔۔ کیا صبر کروں میں؟ کیا سمجھوں؟ میری جان چاہی ہے۔۔۔ روح نکل رہی ہے

مک سے۔۔۔ اور تم کہہ رہے ہوں میں سمجھوں۔ گین! نرائے ٹوائٹر اسٹینڈ!۔۔۔ جان چلی جائے گی

انہی کیا رہے گا۔ ہاں۔۔۔ کیا رہے گا پانی؟ تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو؟ مجھے ہانے دو۔۔۔ پولیس اپنی کارروائی کرے۔۔۔ مگر میں اُسے خود دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ اس

گھر میں ہے تو میری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔“ اس کا انداز عجب جنونی تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے اس لمحے لمبے چوڑے، ٹڈھال، نیم جاں

نکل کر دیکھا تھا اور پھر سرشاریات میں بلا دیا تھا۔ ”گو۔۔۔ گو ان سائیڈ ڈی ہاؤس۔۔۔ بیٹ بی کیئر فل!۔۔۔ تمہاری جان ہمارے لئے بہت

مکھی ہے۔“ ہدایت خاص تھی۔ مگر سننے کی فرصت غالباً عرفنان علی خان کے پاس نہیں تھی۔ وہ سرعت سے مڑا

نکل اور بھاگتا ہوا گھر کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ اوزی نے عرفنان علی خان کو گھر کے اندر جاتے ہوئے دیکھا

تھا اور پھر سیکٹین حیدر لغاری کی طرف آ گیا تھا۔

”یہ عفنان کیوں اندر چلا گیا؟“

”خدا۔۔۔ اُس کا دل خدی بچہ بن گیا ہے۔۔۔ اور میں اُسے روک کر اس خدی بچہ پر کوا
قدغن لگانا نہیں چاہتا۔۔۔ اگر میرے ایسا کرنے سے اس کے جنونی پن کو کچھ سکون میسر آسکتا ہے او
اس کی اضطرابیت میں کچھ آفاق ہو سکتا ہے تو اس کا اندر چلے جانا ہی بہتر ہے۔ اگر تم بھی چاہو تو اندر جا سکتے
ہو۔ مجھے امید ہے تم عفنان کا خیال رکھو گے۔“

سردار سیکٹین حیدر لغاری کا مشورہ اس لمحے دل کے لئے راحت کا باعث بنا تھا۔ اوزان سید نے پیڑ
قدی کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس کے قدم تیزی سے اندر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ چارست کمر
ہی کمرے تھے۔

اوزان سید بھاگتے ہوئے عفنان علی خان کا تعاقب کرنے لگا تھا۔ ہزار گز کے اس گھر کے راستے او
کے لئے یقیناً اجنبی تھے۔ عفنان عجب دیوانے پن سے ایک ایک کمرہ کھول کر جھانک رہا تھا۔ جانے کب
سے بند پڑا تھا یہ گھر۔ ماحول میں عجب ایک گھٹن سی تھی۔

عفنان نے ایک کمرے کی بتی جلائی تھی اور ساکت رہ گیا تھا۔ اوزان سید ایک ایک کمرے میں
جھانک رہا تھا جب یکدم ہی نظر عفنان علی خان پر پڑی تھی۔ اُسے ایک کمرے کے دروازے پر ساکت
کھڑا دیکھ کر وہ تیزی سے اسکی جانب بڑھا تھا۔ عفنان علی خان عجب بت بنا کھڑا تھا۔

اوزان سید نے اس کے عقب سے اندر جھانکا تھا اور وہ بھی اسی طرح ساکت رہ گیا تھا۔ اندر دکھائی د
جانے والا مظہر وحشت ناک تھا۔ انابہ شاہ کمرے کے عین وسط میں۔۔۔ فرش پر نیم جاں پڑی تھی۔
کمرے کا فرش اس کے خون سے نہایا ہوا تھا۔ عفنان علی خان کے پتھر سے وجود میں بہت آہستگی سے

حرکت ہوئی تھی اور نیم جاں قدموں سے چلتا ہوا انابہ کی سمت بڑھا تھا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے
مضبوط ہاتھ بڑھا کر بہت آہستگی سے اس کے چہرے کو چھوا تھا۔ انابہ کا سر دھڑکا اور وجود زندگی کی رمت سے
جیسے عاری تھا۔ اوزی کی کیفیت بھی عفنان علی خان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ بہت تھکے تھکے قدم دلہن
کے اندر پڑے تھے اور چلتے ہوئے انابہ کے پاس آن کر کے تھے۔ جھک کر اس کی ناک کے آگے ہاتھ رکھ
کر یقین کرنا چاہتا تھا۔

”عفنان! یہ زندہ ہے۔۔۔ سانس لے رہی ہے۔۔۔ ہری اپ۔۔۔ ڈونٹ ویسٹ دی ٹائم“

اپنی مور۔۔۔
اس کی مدھم پڑتی سانسوں کی رفتار پر اوزان سید بیچنا تھا۔ اور وہ ایک ڈونٹا لمحہ جیسے عفنان علی خان کے
تھکے ماندے، ہارے ہوئے وجود میں ایک زندگی کی رمت ڈال گیا تھا۔ اس کے شکستہ حوصلہ یکدم ہی زندگ
سے بھر گئے تھے۔ اُس نے سرعت سے اس کے بے جاں پڑتے، سرد وجود کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا
تھا اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا تھا۔

پولیس بھی ان کے گرد جمع ہو چکی تھی۔ پورے گھر میں انابہ کے علاوہ کسی وجود کے شواہد نہیں ملے تھے۔

لوٹی تھا بھی تو وہاں سے جا چکا تھا۔۔۔ غالباً اُسے پولیس کے آنے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ پولیس کے ہاتھ
بھوث لگے تھے جنہیں انہوں نے محفوظ کر لیا تھا۔

عفنان علی خان نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ چلتے ہوئے انابہ کا وجود گاڑی میں ڈالا تھا۔ اوزان
پر اسی تیزی سے فرنٹ ڈور کھول کر اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور عفنان علی خان نے طوفانی انداز میں گاڑی
لگے بڑھا دی تھی۔

اس لمحے اُسے کسی خدشے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

کوئی حادثہ ہو جاتا تو ہو جاتا۔۔۔

اس کی بلا سے۔۔۔ دنیا فنا ہو جاتی۔۔۔ اُسے کچھ پرواہ نہیں تھی۔ پرواہ تھی تو فقط اتنی کہ انابہ کو کچھ
ہیں ہو۔ وہ بچ جائے۔

اُس کی ذوقی سانسیں بحال ہو جائیں۔

اور وہ زندگی سے بھر جائے۔

اوزان سید کی کیفیت بھی اسی جیسی تھی۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ انابہ اس کے لئے کچھ اور حوالہ رکھتی تھی
اور عفنان علی خان کے لئے کچھ مختلف۔

مگر دونوں کا مقصد فقط انابہ کی جان بچانا ہی تھا۔

کیونکہ دونوں کو ہی وہ زندگی اپنی زندگی سے بھی زیادہ پیاری تھی۔

گاڑی اس رات کے پہر میں سناٹوں کو چیرتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اوزان سید بار بار
ہٹ کر جھکتے ہوئے انابہ کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا اور جسم ٹھنڈا۔

عفنان علی خان کے لئے وہ لمحے جیسے قیامت کے سے تھے۔

”ہاؤ۔۔۔ ہاؤ ازشی۔۔۔؟“ عفنان علی خان کی آواز جیسے کسی کنوئیں سے آئی تھی۔ عجب شکستہ سا
لہجہ تھا۔

”ڈونٹ وری۔۔۔ شی ول بی فائن۔۔۔ خدا جانتا ہے۔۔۔ یہ ہمیں کتنی عزیز ہے۔ اسے کچھ
نہیں ہو گا۔ اوپر والا ہمارے ساتھ کوئی نا انصافی نہیں کر سکتا۔ تم حوصلہ رکھو۔“ ایسے میں جب اپنے

حوصلے پست ہو رہے ہوں کسی اور کو حوصلہ دینا نہایت دشوار تھا۔ مگر وہ دونوں اس وقت باری باری ایسا کر
رہے تھے۔ کیونکہ گاڑی کی کچھیلی سیٹ پر پڑا نیم جاں ہوتا وجود دونوں کو ہی بے حد عزیز تھا۔ وہ۔۔۔

زندگی کی بجلی کی رمت اپنے اندر لئے لڑکی۔ اگر اس لمحے دیکھتے تو جان جانی کہ کوئی اُسے زندگی سے
بھی بڑھ کر عزیز جانتا ہے۔

کسی نظر خاص کے لئے وہ کتنی خاص اور کسی دل کے لئے وہ جاں کی مانند ہے۔

یہ انکشاف انابہ شاہ کے لئے یقیناً حیران کن ہوتا!

ہاسپٹل پہنچنے پر جس پریشانی اور تاخیر کا سامنا ہو سکتا تھا وہ سردار سیکٹین حیدر لغاری اور اس کے ایس پی

دوست کے باعث نہیں ہوا تھا اور انا بیہ کو بروقت ٹریٹمنٹ مل رہی تھی۔

دونوں طرف کی کئی ہوئی کلاسیوں کے باعث بلیڈنگ بہت تیزی سے اور بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ بہت بات بہت بڑی تشویش کا باعث تھی۔ انا بیہ شاہ کو اس لئے مصنوعی سانس دی جا رہی تھی۔ مگر اس کی ذوق سانس عفتان علی خان کا دل دہلائے جا رہی تھیں۔ گلاس ڈور کے اس پار سے اُسے اکھڑے اکھڑے سانس لیتے دیکھ کر جیسے اس کا دل خود بھی ڈوب رہا تھا۔ کتنی بہت سی دعائیں اُس کے لئے دل نے خاموشی میں خدا سے مانگی تھیں۔

ابھی تھوڑی دیر قبل وہ انا بیہ کے لئے اپنا بلڈ ڈونٹ کر کے آیا تھا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اس کا بلڈ گروپ انا بیہ سے میچ کر گیا تھا۔ ورنہ اوٹو ٹرانسفیوژن کے بلڈ ملنے میں یقیناً رات کے اس پہر بہت ڈشوارڈ ہوتی۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم اس پر چھکی اسے زندگی کی طرف واپس لانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ اوزان سید میں بہن کی یہ کیفیت دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ ضبط سے لب بچھنے، سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ پلٹا تھا اور راہداری کے ایک کنارے پر جا رکھا تھا۔ مرد تھا۔ لیکن اس حالت میں ضبط رکھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ گرم گرم سیال بادہ آنکھوں کے کناروں کو توڑ کر نکلا تھا اور چہرہ بھگوتا چلا گیا تھا۔ عفتان علی خان کی نظریں اس گھڑی جیسے پتھر اگئی تھیں۔ ذہن کچھ سوچ نہ رہا تھا۔ نظریں صرف اس منظر پر جمی تھیں جو وہ ششے کے اس پار سے دیکھ رہا تھا۔

انا بیہ غالباً سانس نہیں لے پا رہی تھی۔ اس کی سانسیں غالباً ٹوٹ رہی تھیں۔ ڈاکٹر اس پر جھکے ہوئے تھے۔ کوششیں جاری تھیں اسے زندگی کی طرف لانے کی۔ یہ نہیں کیا لکھا تھا اس کے نصیب میں۔ عفتان علی خان کتنا درد سا اٹھتا محسوس کر رہا تھا سینے کے بائیں طرف۔ جیسے اُس کی جاں اس گھڑی سخت مشکل میں گھر گئی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس کی سمت بڑھا تھا اور اس کی پشت پر کھڑے ہوتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے شولڈر پر رکھ دیا تھا۔

”شی ول بی فائن۔ ڈونٹ ڈری۔“ دلاسا دیا تھا۔ مگر عفتان علی خان کے بت بے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ عجب مجنونانہ سا انداز تھا۔ عجب جنوں خیزی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری کے لئے کسی کی فیلنگو دیکھنا بہت حیران کن تجربہ تھا۔ اُس نے غالباً کبھی اس سے قبل ایسی کوئی کیفیت نہ تو کما کے لئے محسوس کی تھی نہ کسی اور کی سمت سے اس کا عملی مظاہرہ دیکھا تھا۔

کیا واقعی کوئی اتنا اہم کسی کے لئے ہو سکتا ہے؟

کیا واقعی کوئی اس قدر رگ جاں کے قریب ہو سکتا ہے؟

اتنا عزیز۔ اتنا قریب کہ اس کے بغیر سب بیچ لگے۔ اس کے نہ ہونے سے کوئی فرق پڑے اور دل کو کچھ ہونے لگے۔ کوئی قیامت ہی روح پر اترنے لگے۔

وہ کتنی حیرت سے عفتان علی خان کی پتھرائی آنکھوں کے سرخ رنگ کناروں کو طغیانی میں گھر اہوا دیکھ رہا تھا۔ کتنی خاموشی سے ممکن سمندر بند توڑ کر رہے جا رہے تھے۔

کیا محبت واقعی کوئی ایسی شے ہے؟ اتنا زور آور جذبہ ہے؟

کیا محبت اب بھی باقی ہے؟ اب بھی لوگ دیوانے ہوتے ہیں؟ کیا خرومندی سر پر

رکھ کر اب بھی رخصت ہو جاتی ہے جب عشق کا خلل دماغ میں واقع ہوتا ہے؟

سردار سبکگین حیدر لغاری کس درجہ حیران تھا۔ وہ تو کوئی حوصلہ دینا چاہتا تھا عفتان علی خان کو۔ اُس کے دو بول بولنا چاہتا تھا۔ مگر وہ کیسا لاجواب سا اس لئے کھڑا اسے صرف خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

کیا محبت جیسی چیز اب بھی دنیا میں وقوع پذیر ہو سکتی ہے؟

ہو رہی ہے؟

لوگ محبت کی انگلی تھامے، دل کے اشاروں پر اب بھی چلتے ہیں؟ کیا اب بھی ایک جاں دو

ب والا کوئی قصہ پارینہ ہونے سے رہ گیا ہے؟

داستان عشق کیا اب تک متروک نہیں ہو سکی؟ کیا اہل دل اب بھی باقی ہیں، دل کے اشاروں پر قدم

اچھلنے کے لئے؟؟

وہ یہ تو جانتا تھا عفتان علی خان کسی لڑکی کے لئے سنجیدہ تھا۔ اس قدر اور اس طرح اس نوعیت تک، یہ وہ

ہی جانتا تھا۔

عفتان علی خان کی نظریں ششے کے اس طرف منظر پر لگی تھیں جہاں انا بیہ شاہ زندگی اور موت سے لڑ

رہی تھی۔

عفتان علی خان کی آنکھوں کے کنارے بہت خاموشی سے بھیک رہے تھے۔

”اُسے کچھ نہیں ہوگا۔ بیلومی۔ شی ول سروائیو۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری کے مدھم لہجے

میں یقین ہی یقین بول رہا تھا۔

”جس لڑکی کو کوئی اتنا چاہتا ہو، اس کے ساتھ کی اتنی تمنا رکھتا ہو، اسے کیسے کچھ ہو سکتا ہے؟ خدا

تمہارے دل کی آواز سن رہا ہے۔ بس۔ تمہارا ایمان کامل ہوگا۔ اُمید رکھو۔ محبت

میں رہے گی۔ تمہارے آس پاس، تمہارے دل میں۔ ہمیشہ کے لئے۔ ہمیشہ تک۔“

اس لمحے کی کوئی کرشمہ سازی تھی۔ یا کچھ اور۔ سردار سبکگین حیدر لغاری شاید خود نہیں جانتا

تھا کہ وہ کیا بول رہا تھا۔ اُس کا وہ جذبہ جسے اس نے کبھی خود برتا ہی نہیں تھا وہ اس لمحے اس کے حق میں صدا

بلند کر رہا تھا۔

ایمان نہیں تھا اُسے محبت پر۔ پھر یہ کیسی اُمید محبت کی آبیاری کر رہی تھی؟

”یقین رکھو۔ شی ول بی فائن۔ اینڈ ول بی یور۔“

عفتان علی خان جیسے اس گھڑی کچھ نہ بن رہا تھا۔ اس کی نظریں صرف انا بیہ پر تھیں جہاں ڈاکٹر کی

مسلل کوششوں کے بعد اس کی حالت سنبھل چکی تھی۔ اُسے اطمینان سے سانس لیتا دیکھ کر صد شکر

کے ساتھ عفتان نے اپنی آنکھیں میچی تھیں اور ایک گہری سانس خارج کی تھی جیسے ایک پہاڑ دل پر سے

عفتنان علی خان، اوزی کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھنے لگا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے سیل پر انا بیہ کے گھر کا بلا تے ہوئے مام کو خیریت کی اطلاع دینے لگا تھا۔

”جی مام! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہمیں مل گئی ہے۔“ عفتنان علی خان کے لہجے اطمینان چھلک رہا تھا۔ مگر دوسری طرف ماہوش جہاں یہ خبر سن کر لحو بھر کو خوش ہوئی تھیں، وہیں دوسرے ہاتھ پر ایک متضاد کیفیت دوڑ گئی تھی۔

”کہاں تھی وہ؟“ اور اب کہاں ہے؟“ لہجہ بجا بجا سا تھا۔ وہ بیٹی جس کے لئے وہ کئی گھنٹوں مسلسل پریشان رہی تھیں، مسلسل ایک ذہنی انتشار میں رہی تھیں، اب مل گئی تھی تو جانے کیوں لہجہ بجا سا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ کئی گھنٹے گھر کی دہلیز سے باہر گزر چکی تھی۔

عفتنان علی خان تمام تفصیلات سے انہیں آگاہ کر رہا تھا۔ مگر دوسری طرف ماہوش خاموش تھیں۔



بہت تھکے ماندے قدموں سے سردار سبکگین حیدر لغاری گھر کے اندر داخل ہوا تھا۔

صبح کی مخصوص سرگرمیاں گھر میں جاری تھیں۔ مائی اماں ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھیں۔ غالباً میرب ال کے کیپس جانے کی تیاری زوروں پر تھی۔ بطور خاص بہو کے لئے ناشتہ تیار ہو رہا تھا۔ اور جس کے لئے ناشتہ تیار کیا جا رہا تھا اور خاص لگاوٹ کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا وہ اس لمبے فون اسٹینڈ کے قریب کھڑی ن رکسی سے گفتگو میں مصروف تھی۔

سبکگین حیدر لغاری نے ایک نگاہ ڈالی تھی۔

”سبکگین حیدر! آگے تم بیٹا؟“ کہاں رہے رات بھر؟“ کم از کم فون ہی کر دیا ہوتا۔“ مائی پریشانی سے گویا ہوئی تھیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے انداز میں مسکرا دیا تھا۔

”بس مائی اماں! کچھ مشکل صورت حال پڑ گئی تھی۔ سو موقع ہی نہیں ملا۔ اور سچ کہیں تو دھیان بھی نہیں اب ماحول خاصا شش تھا۔“ سرخ ڈوروں سے بھری آنکھوں سے وضاحت دینا چاہی تھی۔ جب میرب ال کی آواز کانوں میں پڑی تھی۔

”جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے۔“ اگر ہوتے تو بیچارہ صاف پکڑا جاتا۔ جب باز پرس ہی نہیں کی جا تی تو پھر اسے جھوٹ کا سہارا لینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“

سردار سبکگین حیدر لغاری نے مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ غالباً کسی سے فون پر گفتگو کر رہی تھی۔ چوٹ یقیناً اس میں تھی۔ گفتگو کا لب لباب اس کے کسی اپنے موضوع سے متعلق تھا۔ مگر سردار سبکگین حیدر لغاری کو جانے کیوں لگا تھا کہ کوئی اس پر صاف طنز کر رہا ہو۔ چہرے پر ایک ناگواری نظر آئی تھی اور آنکھوں میں کسی ررخص۔

”آؤ بیٹھو! چائے لو۔“ ناشتے میں کیا لو گے تم؟“ مائی اماں نے دریافت کیا تھا۔ مگر پھر سبکگین حیدر لغاری کے کچھ بولنے سے قبل ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”تم بیٹھو، میں تمہارے لئے ناشتہ بخواتی ہوں۔“ وہ چلتی ہوئی لیکن کی سمت بڑھتی تھیں۔ سبکگین حیدر

سر کا تھا۔

”تھینک گاڈ!“ ایک زکی ہوئی سانس خارج ہوئی تھی۔ ڈاکٹرز کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر وہ سردار سبکگین حیدر لغاری کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری ملائمت سے مسکرا دیا تھا۔

”میں نے کہا تھا نا۔۔۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔“

عفتنان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”میں اوزی کو بتا دوں۔۔۔ وہ گھر فون کر دے۔۔۔ مام اور دادا جی کو ہم نے اب تک کچھ نہیں بتایا۔ وہ یقیناً پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اور تم۔۔۔ تمہیں بھی اب گھر چلے جانا چاہئے۔ مائی اماں اور بھابی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ ٹھینکس۔“ لب بھینچ کر وہ مشکور ہوا تھا۔ سبکگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”تم پریشانی میں تھے۔۔۔ کیسے تمہیں چھوڑ کر چلا جاتا؟ اپنی ویز۔۔۔ مجھے فون کر کے انا بیہ کے متعلق بتاتے رہنا۔۔۔ تم ابھی زکو۔ ڈاکٹرز باہر آ رہے ہیں۔ ان سے بات کر لینا ضروری ہے۔ پتہ چل جائے گا کہ انا بیہ کی کنڈیشن اب کیسی ہے۔۔۔ کہیں اس کی حالت اب بھی تشویش ناک تو نہیں۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے حدش ظاہر کیا تھا۔

ڈاکٹرز کی ٹیم باہر نکلی تھی اور عفتنان علی خان انا بیہ کے متعلق پوچھنے لگا تھا۔

”ہاؤ ازشی۔۔۔ ڈاکٹرز۔۔۔؟“

”یوری تھنک از فائن اینڈ انڈر کنٹرولڈ۔۔۔ مگر پھر بھی اگلے بارہ گھنٹوں تک انہیں انڈر او بزریشن رکھنا ضروری ہے۔ ہم بلڈ دے رہے ہیں۔ مگر بلڈنگ بہت زیادہ ہو جانے کے باعث اب بھی بلڈ کی ضرورت مزید باقی ہے۔ فرسٹ آف آل، آپ بلڈ کا بندوبست کیجئے گا۔ فی الحال آپ کا ڈومینٹ کیا گیا بلڈ موجود ہے ہمارے پاس۔ مگر وہ پینٹ کے لئے ناکافی ہے۔ حیرت کی بات ہے، غالباً ہم اسے کوئی فری کل ہی نہیں گے۔ اتنا بلڈ ضائع ہو جانے کے بعد کسی کا بیج جانا کوئی معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔ ایسی ہی باتیں ہیں جو خدا پر بندے کا ایمان مضبوط کرتی ہیں۔“ ڈاکٹر مسکرا رہے تھے۔

”کوئی پریشانی کی بات تو نہیں نا ڈاکٹر؟“ عفتنان علی خان مطمئن نظر نہ آ رہا تھا۔

”بس۔۔۔ شی از او کے۔۔۔ دو چار دن میں آپ اسے گھر بھی لے جا سکیں گے۔ مگر فی الحال

کچھ ٹریٹمنٹ ضروری ہے۔ آئی تھنک یو انڈر اسٹینڈ۔“ ڈاکٹر ملائمت سے مسکرائے تھے۔

”ٹھینکس ڈاکٹر!“ عفتنان مشکور نظر آ رہا تھا۔

”نو نیڈ فور وس مائے سن! جسٹ ٹھینکس ٹو گاڈ۔“ اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ عفتنان علی خان، سردار سبکگین حیدر لغاری کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”میں چلتا ہوں اب۔۔۔ صبح چھوٹ چکی ہے۔ گھر میں داخل ہوں گا تو نا معلوم کتنی کہانیاں جنم لے رہی ہوں گی۔“ سبکگین حیدر لغاری ملائمت سے مسکرا رہا تھا۔ ”پریشانی میں گھر فون کر کے بتائیں گا۔

سیل بھی سوچو آف تھا۔ تشویش خطرناک حد تک ہوگی۔ اپنی دے۔۔۔ چلتا ہوں۔ مجھے فون کرنے

رہنا۔“ اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے سردار سبکگین حیدر لغاری آگے بڑھ گیا تھا۔

لغاری بجائے بیٹھنے کے اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ نظریں جانے کیوں کچھ تفاوت پر کھڑے وجود کے سرا میں اُلجھتی رہی تھیں۔

”صبح میں کوئی وضاحت سننے کے موذ میں نہیں ہوں۔ نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ تم تمام باتیں سمجھا کر رکھو۔ جب میرا موڈ ہوگا، تمہیں بتا دوں گی۔ کہہ دینا۔ مگر یہ نہیں۔“ میرب بہت شگفتگی سے مسکرائی تھی۔ اُس کے شفاف چہرے پر بہت اُجلا پن تھا۔ جیسے صبح کے چہرے پر کھل رہی تھی۔ وہ سردار سبکنگین حیدر لغاری کی موجودگی سے یقیناً واقف تھی۔ مگر اندازے یا اور سرسری سا تھا۔ جیسے اسے کوئی پروا نہ ہو۔ کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ کوئی اچھی سی نگاہ بھی اس جانب نہ اُٹھ تھی۔ غالباً وہ دانستہ اس شخص کو نظر انداز کر رہی تھی۔ اس لمحے مسکراتی ہوئی وہ جیسے اس ماحول کا حصہ بھی تھی۔ یا جیسے سردار سبکنگین حیدر لغاری اس کے لئے وہاں موجود ہی نہیں تھا۔

”سبکی پلینز۔۔۔ میں آ رہی ہوں ناکیپس۔ جو بات کرنا ہے، وہیں کر لینا۔ اور وہ سب باتیں ہم جو تم۔۔۔“

سردار سبکنگین حیدر لغاری کو جانے کیا ہوا تھا۔ جانے کب، کیوں اور کیسے قدم میرب سیال کی طرف اٹھے تھے۔ اس کے قریب رکے تھے۔ بنور توجہ سے دیکھا تھا اور ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا میرب سیال اسے حرمت سے تنگ لگی تھی۔ مگر سردار سبکنگین حیدر لغاری نے ریسیور کر ڈیل پر ڈال کر اس سے مکمل طور پر اجنبی انداز برتا تھا۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ کیا تیزیری ہے؟۔۔۔ آپ کا ایسا کرنے کا کیا حق بنتا ہے؟ کیا، کیا ہے آپ نے یہ؟ میرب سیال کی ہمت قابل دید تھی۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری کے لئے یہ لمحہ یقیناً حیران کن تھا۔ کئی ناگوار نظر آئی تھی ان سرخ آنکھوں میں۔ سرنخی مزید بڑھ گئی تھی۔ کس وجہ بے نیازی تھی دوسری طرف۔ لالچ اور کس درجہ زعم۔۔۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری نے آہنی ہاتھ بڑھا کر اس نازک شانے پر دھرا تھا اور اس کے ایک سمت دانستہ مزے ہوئے چہرے کے رخ کو ہاتھ بڑھا کر اپنی سمت موڑا تھا۔ میرب سیال کے لئے، صبح یہ افتاد یقیناً ناگہانی اور ناقابل قبول تھی۔ مگر افسوس، اس لمحے وہ وہاں سے فوری طور پر چاہتے بھی تو ہٹ نہیں سکتی تھی۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری آنکھوں میں بہت سی ناپسندیدگی اور ناگواری لئے اسے دیکھ رہا تھا۔ میرب دانستہ نظریں پھیر گئی تھی۔

”باز پرس کرنا چاہتی ہو؟ نظر رکھنا چاہتی ہو؟ تو پھر اس طرح نظر پھیرے کیوں کھڑی ہو؟۔۔۔ نظر اٹھاؤ۔ دیدہ و دل پر وار کرو۔ حوصلہ ہے سہنے کا۔۔۔ جتنے تیر ترش میں ہیں سب آزالو۔ کوڈ قید و بند نہیں ہے۔ مگر اٹ شڈ بی اے فیئر گیم۔۔۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری کو پیچھے سے چھپ کر وا کرنے والے لوگ انتہائی ناپسند ہیں اور انہیں ان موصوف کی ڈکٹری میں کاؤڈ کہا جاتا ہے۔ اور بزدلوں کے لئے میری زندگی میں دوستی یا دشمنی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔“ اس کے آہنی ہاتھ کی گرفت اس کے شانے پر خطرناک حد تک سخت تھی۔ آواز بھی مدہم تھی۔ مگر لہجہ کسی قدر درشت تھا۔

میرب سیال کے لئے وہ لمحے قیامت خیز تھے۔ وہ جتنا ان قربتوں سے بھاگتی تھی، وہ لمحے اتنے تو

زی سے اس کے تعاقب میں آتے تھے۔ اس لمحے بھی وہ نظر پھیر گئی تھی۔ اس کے باوجود کہ اسے بزدل نہ جانے کیسے کیسے خطابات سے نوازا گیا تھا۔

”توجہ اور کرم کے پہلو وہاں نکلنے ہیں جہاں نگاہ میں تماشوں کا ڈھیر دکھائی دے۔ خواب لحوں کے ناقب میں آگے کا شوق اس قدر ہوتا نگاہ کو روشن رکھنا اور قدموں کو صحیح سمت پر ڈالنا احد ضروری ہے۔ بے سمت یا غلط سمت چلنے والے قدم منزل پر یا تو پہنچتے ہی نہیں۔ یا بہت دیر سے پہنچتے ہیں۔“ جانے وہ کیا بھانا چاہ رہا تھا۔ جانے کیا سمجھا تھا وہ۔ جانے کیا اخذ کیا تھا؟

میرب سیال حیران تھی۔ مگر وہ جانتی تھی یا تو وہ غلط سمجھ رہا تھا یا پھر تمام لفظوں، معنوں اور رنگوں کو صرف اپنے رنگ میں دیکھنا چاہتا تھا اور اپنے رنگ میں ہی دیکھتا تھا۔ اس کی ایک غلط فہمی یہ بھی تھی کہ وہ میرب سیال کو اپنے تابع اور رعایا کا حصہ سمجھتا تھا۔ مگر وہ اس کے حاکمانہ مزاج سے بغاوت کرنے کو تیار کھڑی تھی۔

اس کی سمت بھرپور اعتماد سے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے شانے پر سے ہٹایا تھا اور اسی قدر اعتماد سے مڑی تھی اور چلتی ہوئی ناشتے کی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی تھی۔ سبکی مائی اماں ملازم کے ساتھ سردار سبکنگین حیدر لغاری کا پسندیدہ ناشتہ لئے اندر داخل ہوئی تھیں۔

”فارغ ہو گئیں تم؟۔۔۔ چلو جلدی سے ناشتہ کر لو۔ اور گین! تم وہاں کہاں کھڑے ہو؟۔۔۔ چلو آؤ یہاں، ناشتہ کر لو۔ پھر آرام کر لینا۔ اور آج برانس کے بکھیڑوں کو کچھ سائیز پر رکھ دینا۔ چہرے سے ہی بھگے ہوئے لگ رہے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر قبل فاطمہ سے بات ہوئی تھی۔ اُسی نے بتایا انا بیہ کے متعلق۔ تم بات بھر وہاں تھے تو خبر کیوں نہیں کی؟۔۔۔ اب کیسی ہے وہ؟۔۔۔ تم لوگوں سے فارغ ہو جاؤ تو ابھی نکلوں گی اس کی طرف۔ ہوا کیا تھا اُس کے ساتھ؟۔۔۔ فاطمہ بتا رہی تھی کوئی کڈ پیٹنگ کا کیس تھا؟ مدد شکر کہ وہ بازیاب ہو گئی۔ مگر۔۔۔ کیا پتہ، کیا کیا گزری اس بیچاری پر۔۔۔ بتا رہی تھی، عفنان بہت ذہت میں رہا اسے لے کر۔“ مائی اماں سلاکس پر جیم لگاتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھیں۔

مگر سردار سبکنگین حیدر لغاری کچھ بھی کہے بغیر اندر کی سمت بڑھ گیا تھا۔ میرب سیال کو اس شخص کے معاملات سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اور کوئی سروکار وہ رکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

وہ کیا سمجھ رہا تھا؟۔۔۔ میرب سیال اُس کی فکر میں ڈبلی ہوئی جا رہی ہے؟ اُس کے متعلق۔۔۔ اس کے معاملات سے متعلق اتنی کنسرن ہے؟۔۔۔ سوچ خاصی شرمندہ کر دینے والی تھی۔ جبکہ ایسا کچھ تھا ہی نہیں تو پھر سردار سبکنگین حیدر لغاری اتنا خوش فہم کیوں ہو رہا تھا؟ کیوں سوچ رہا تھا کہ وہ اس کے متعلق پرواہ کرتی ہے اور فکر مند ہے۔ اور اسے اس کے معاملات سے انتہائی حد تک لگاؤ ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ وہ اجنبی بننا چاہتی تھی اور لالچ نظر آنا چاہتی تھی۔ اس کی یہ سوچ میرب سیال کے لئے کسی قدر تشویش کا باعث تھی۔

مگر سردار سبکنگین حیدر لغاری کی کوئی کل ڈھیلی ضرور تھی۔ عجب کھسکا ہوا شخص تھا۔ اور وہ اس کے متعلق سوچ کر یقیناً اپنا وقت برباد کر رہی تھی۔ اسے جو سوچنا تھا، وہ سوچنا رہتا۔ میرب کی بلا سے۔

دل میں کوئی آج ہی سکتی ہوئی اب بھی باقی تھی۔

کوئی دبی دبی سے چنگاری اب بھی رکھ کے نیچے دبی تھی۔

بس اک ذرا ہوا لگنے کی دیر تھی اور چنگاری کو آتش بننے دیر نہ لگتی۔

مگر اُسے خود پر اختیار تھا۔

بے حد۔۔۔ بے حساب!۔

اور وہ خود یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا۔

سو تمام تر اضطراب، تمام بے چینی، روح کے اندر کی افراتفری، دل کے اندر کی طغیانی، بے کیف دل کی شوریدہ سری دل جھیلتا تھا۔۔۔ اور اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ سننے کے لئے کچھ بے چینی نہیں بچا تھا۔

اگر سب کچھ عیب تھا تو وہ کیوں چل رہا تھا اس راہ پر۔

کیوں مسلسل اس بے کلی کے ساتھ جی رہا تھا۔

اندر سے کئی سوال اٹھتے تھے۔ مگر وہ کچھ بھی ترک نہیں کر سکتا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی نہیں۔

ایک ایک نقش کو دیکھتے ہوئے وہ جیسے اس ماحول کے اندر تھا۔ ان لمحوں میں جی رہا تھا۔

”کیوں..... کیوں کر رہے ہو تم میرے ساتھ ایسا؟ کیوں..... کس لئے؟“ کسی لہجے میں درجہ بے چینی تھی۔ مگر وہ نگاہ اچھی سی تھی۔

”اگر تم سوچ رہے ہو کہ میں تمہارے اس طرح اچھی ہو جانے سے تم سے اچھی ہو جاؤں گی تو تم غلطی بواذہان حسن بخاری! تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“ دھمکی آمیز لہجہ تھے۔

”کیا..... کیا کرو گی تم؟ بولو، کیا؟“ اذہان حسن بخاری نے اسے شانوں سے تھام کر جھوڑا

”جان..... جان دے دوں گی میں اپنی..... انڈر اسٹینڈ؟“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مٹی ہوئی وہ مضبوط لہجے میں گویا ہوئی تھی۔ مگر اذہان حسن بخاری نے سر نہئی میں ہلا دیا تھا۔

”یہ کرنا آسان نہیں ہے..... اور تم ایسا کچھ کرو گی بھی نہیں..... انڈر اسٹینڈ؟“ مضبوط لہجے میں رکارتے ہوئے اسے ایک جھٹکے سے چھوڑا تھا اور چلتا ہوا قدرے دور چارکا تھا۔

”تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو؟ کیوں نہیں..... کہ ہمارے راستوں کی کوئی منزل نہیں ہے۔“

”اور کیا تم مجھے بھول سکو گے؟“ وہ چلتی ہوئی اس کے قریب آن رکی تھی۔ آنکھیں پانیوں سے لہریں ل۔ ایک ہانچل سی تھی ان سمندروں پر۔

”تمہیں اندازہ ہے اذہان حسن بخاری!..... تم کیا کر رہے ہو؟“

مگر رخ پھیرے اذہان حسن بخاری کے لبوں پر کوئی جواب نہ تھا۔ فقط ایک چپ تھی۔ ساکت، چپ۔

”اذہان! میرے بغیر تم کیا کرو گے؟..... یہ دن..... یہ رات..... یہ لمحے، تمہیں نہیں لگتا ان

میرب سیال نے ہر طرف کی سوچوں کو ایک طرف ڈالتے ہوئے چائے کا کپ اٹھایا تھا اور نیوز پیپر پر بخور نظریں جماتے ہوئے چائے کے سپ لینے لگی تھی۔

میرا کچھ سامان

تمہارے پاس پڑا ہے

وہ سامان کے کچھ بھیکے بھیکے دن

رکھے ہیں

اور میرے اک خط میں لٹی

رات پڑی ہے

وہ رات بچھاؤ

میرا وہ سامان لوٹا دو!

بت جھڑ ہے کچھ..... ہے نا

بت جھڑ میں کچھ پتوں کے

گرنے کی آہٹ

کانوں میں اک بار

پاہن کے لوٹائی تھی

بت جھڑ کی شاخ اچھی

تک کانپ رہی ہے.....

وہ شاخ گرا دو.....

میرا وہ سامان لوٹا دو.....

بات مصروفیات کے لمحوں کی نہیں تھی..... زندگی کچھ اتنی فراغت سے بھری بھی نہ تھی۔

مگر عجب کہانی تھی کہ ہر لمحہ اُس کی یادوں سے بھرا تھا۔ وہ جیسے سارے لمحے اپنے نام کرنا جانتی تھی۔ یا پھر وہ خود ہی دامن پچانا نہیں چاہتا تھا۔ نہ ہی چھڑانا..... عجب اک دور تھی۔

ان دیکھی..... ان جانی!

مگر دل سے ایسی بندھی تھی کہ رابطہ ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ رابطہ بظاہر نہ سی..... کوئی سلسلہ بھی نہ سی..... مگر کچھ تھا..... یک طرفہ سی..... مگر اذہان حسن بخاری اس سلسلے کو توڑ نہیں سکا تھا۔ وہ کتنے لمحے ساکت

سایا بیٹھا اس کی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ لیوں پر کوئی سوال نہ تھا۔

نہ کوئی شکوے..... نہ شکایت!۔

نہ جھوٹ موٹ کی جھنگلی..... نہ ناراضگی۔

بس وہ چپ چاپ ان خدو خال کو دیکھ رہا تھا۔

سب کا پل پل قیامت ہو گا کاٹنا۔ کیا سوچ رہے ہو تم؟ — یہ نصیلیں کیوں اٹھا رہے ہو تم اپنے اور میرے درمیان؟ — کیوں رکھ رہے ہو یہ صدیوں کی تفاوتیں اپنے اور میرے بیچ؟ — فاصلے آکر گے تو صدیاں بن جائیں گے اذہان! تمہاری یہ نظر، تمہاری یہ نگاہ دوبارہ کبھی مجھے دیکھ نہیں پائے گی۔“

”پھر کیوں — کیوں چاہ رہے ہو تم ایسا؟ — وہ بھی دانستہ؟“ ان بے چین بھگتی آنکھوں میں اضطراب ہی اضطراب تھا۔ مگر ان سوالوں کا کوئی جواب اذہان حسن بخاری کے پاس نہ تھا۔

حسن سراپا احتجاج تھا۔ مگر اذہان حسن بخاری اسی طرح پشت پھیرے کھڑا رہا تھا۔

”ہمارے درمیان یہ فاصلے دانستہ ہیں۔ بہتر یہی ہے تم سب کچھ بھلا دو۔ فراموش کر دو۔ زندگی میں بعض باتیں بھلا دینا ہی ضروری ہوتی ہیں۔ ورنہ ان کی کک جینے نہیں دیتی۔“ رخ پھیرے پھیرے دو مدہم لہجے میں بولا تھا۔

”تمہیں یقین ہے اذہان! تم سے الگ ہو کر میں جی رہی ہوں گی۔ یا تم جی رہے ہو گے۔ کیوں — کیوں بانٹ رہے ہو تم خود کو اور مجھے ٹکروں میں؟ — یہ ٹکروں میں جینا آسان تو نہیں ہو گا۔ نہ تمہارے لئے، نہ میرے لئے۔“

خیالوں کا تمام سلسلہ ایک لمحے میں منقطع ہوا تھا۔

اذہان حسن بخاری کا سیل فون بج رہا تھا۔ وہ چونکا تھا اور تمام چیزیں وہیں چھوڑ کر کال ریسیو کرتے ہوئے ٹیرس کی طرف نکل گیا تھا۔ کمرے کا ماحول عجب ہو رہا تھا۔ کھٹن ہی کھٹن تھی ہر طرف۔ اذہان حسن بخاری کے لئے سانس لینا تک دشوار ہو رہا تھا۔ آفس سے ضروری کال تھی۔ بات کرنا ضروری تھا۔ ورنہ وہ کسی سے بات کرنے کے موڈ میں اس وقت نہ تھا۔ ٹیرس پر کھڑے بات کرتے ہوئے اذہان حسن بخاری کو اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت اس کے کمرے میں کوئی آ بھی سکتا ہے اور ان نکھری چیزوں کو، ان تمام یادوں کو دیکھ بھی سکتا ہے۔ وہ وہیں ٹیرس پر مصروف گفتگو تھا جب ساہیہ وہاں، اس کے کمرے میں آئی تھی۔

”اذہان! — دروازے میں رک کر پکارا تھا۔ مگر جواب نہ پا کر اندر بڑھ آئی تھی۔

”اذہان! — دوسری آواز دیتے ہوئے بھی وہ غالباً یہی اخذ کر رہی تھی کہ وہ واش روم میں ہے۔ کمرے کے اندر قدم رکھتے ہوئے وہ یکدم چونکی تھی۔ بیڈ پر یہاں سے وہاں کئی Souvenir بکھرے پڑے تھے۔ کئی یادیں — کئی تصویریں — کئی خدو خال — اور ساہیہ خان نے جھک کر ایک تصویر اٹھائی تھی۔ نظر ساکت رہ گئی تھی۔ دل جیسے لمبے لمبے بھر کو دھڑکنے لگا ہوا تھا۔

ساہیہ اسی طرح تصویر پر نظریں جمائے کھڑی تھی جب اذہان حسن بخاری اندر داخل ہوا تھا اور ساہیہ خان کو وہاں موجود پا کر ساکت رہ گیا تھا۔

ساہیہ خان نے بہت آہستگی سے نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

”اذہان! — یہ —“

مگر اذہان حسن بخاری کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ شاید کہنے کو اس کے پاس تھا بھی نہیں۔ ساہیہ خان اس تصویر کو وہیں ڈال کر بہت سرعت سے مڑی تھی اور چلتے ہوئے اس کے قریب سے نکل جاتا چاہا تھا مگر تھی

اذہان حسن بخاری کی گرفت میں آ گیا تھا۔

ساہیہ خان رک گئی تھی۔ مگر پلٹ کر اس کی سمت دیکھ نہیں سکی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اسے یہ غور ہا تھا۔ اس کی سمت سے رخ پھیرے کھڑی یقیناً ان کھوں میں بہت دل گرفتہ تھی۔

”کچھ کہو سونگی نہیں؟ — کوئی وضاحت نہیں مانگو گی؟“ مدہم لہجے میں دریافت کیا تھا۔ مگر ساہیہ نے اس کی سمت دیکھے بہت آہستگی سے ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھ گئی اور اذہان حسن بخاری کھڑا اپنے اس ہاتھ کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

ساہیہ خان گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھی تھی اور گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ آنکھیں تیزی سے ہیگ رہی تھیں اور اس کے ساتھ ارد گرد کے تمام منظر بھی بھگتے دکھائی دے رہے تھے۔

ایک اکیلی چھتری میں

جب آدھے آدھے ہیگ رہے تھے

آدھے سوکھے آدھے کیلے.....

سوکھا تو میں لے آئی تھی

گیلامن شاید بستر کے پاس

پڑا ہوا.....!

وہ بھجوا دو.....!!

میرا وہ سامان لوٹا دو.....

ایک سو سولہ تاک کی راتیں

ایک تمہارے کا ندھے کاٹوں

گیلی مہندی کی خوشبو

جھوٹ موٹ کے شکوے کچھ

جھوٹ موٹ کے وعدے بھی

یا درلا دو.....

سب بھجوا دو.....

میرا وہ سامان لوٹا دو.....

میرا کچھ سامان

تمہارے پاس پڑا ہے

وہ ساون کے کچھ بھیکے بھیکے دن رکھے ہیں

وہ میرے اک خط میں لپٹی رات پڑی ہے

وہ رات بھجوا دو.....

میرا وہ سامان لوٹا دو.....!

کہیں نہ کہیں اس کا اپنا مطلب ضرور ہوگا۔ سردار سیکٹین حیدر لغاری بنا مقصد اور مطلب کے کوئی کام کر گزرتا، امپائل۔ اپنے کنسرن کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھاتا تھا۔ اس کے ساتھ رہتے رہتے وہ اتنا توجان ہی گئی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے میرب سیال نے اسے بنور دیکھا تھا۔

مگر سردار سیکٹین حیدر لغاری کو غالباً اس کی سمت سے کوئی فکر لاحق نہ تھی۔ نہ ہی وہ اس کے موڈ کے اس قدر تابع تھا کہ اس کی اس درجہ پرواہ کرتا۔ اسکو تھ اینڈ سیف ڈرائیو کرتے ہوئے سردار سیکٹین حیدر لغاری نے اپنے خوشگوار اور بھرپور موڈ کا احساس دیا تھا۔ اور ہاتھ بڑھا کر پلیئر آن کر دیا تھا۔

بھئی سی اک رات یہ

لے آئی کیا ساتھ یہ!

دھڑکنیں جو ہمیں

کہنے لگی تھیں

خاموشی کے درمیاں

کب چاہی تھی بات یہ

دھڑکنیں جو ہمیں

کہنے لگی ہیں

نہ کہو..... نہ سنو.....!

خاموشی گفتگو ہونے لگی ہے

زندگی خواب میں کھونے لگی ہے!!!

سردار سیکٹین حیدر لغاری اور یہ تیور — یہ شغف کب تھے اُسے؟

کتنا مسرور دکھائی دے رہا تھا وہ اس لمحے — ڈرائیو کے دوران ایک بار بھی اس کی سمت نہ دیکھا تھا۔ مگر چہرے کا اطمینان قابل دید تھا۔

نہ کہو

نہ سنو

خاموشی گفتگو ہونے لگی ہے

زندگی خواب میں کھونے لگی ہے

مغنی کی آواز دلربا تھی۔ ایک سحر باندھتی ہوئی۔ مگر اس سب کی ضرورت یہاں کہاں تھی؟ — اور کس لئے؟ میرب سیال اگر حیران نہ ہوتی تو یقیناً قیامت ہوئی۔ وہ اس شخص کو سمجھنے کا جتنا دعویٰ کرتی تھی، کھلتا بھی تھا کہ وہ کچھ نہیں سمجھی — کچھ بھی نہیں — اُسے عمل طور پر سمجھنا غالباً ناممکن تھا۔ اور اب یہ صورت حال — ایسا کر کے وہ میرب سیال کو یقیناً چڑانا چاہ رہا تھا۔ مگر کیوں؟ — کس لئے؟

وہ تو مطلوب نہیں تھی نا اسے —؟

سے کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اس کے لئے دل میں۔

تو پھر یہ سارے بہانے کس بات کے لئے تھے؟ — کس لئے تھے؟

وہ کچھ نہ سمجھی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر کیسٹ پلیئر آف کر دیا تھا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ سوال براہ راست پوچھا تھا۔ مگر دوسری سمت سے جواب دیئے بغیر دو بارہ زآن کر دیا گیا تھا۔

تقدیریں لے آؤں میں

تم سینے دے دو مجھے

ایسا کیا ہے

اتنے کیوں اچھے لگتے ہو مجھے

تم ہی جیون کی آرزو

نہ کہو

نہ سنو

خاموشی گفتگو ہونے لگی ہے

زندگی خواب میں کھونے لگی ہے.....!!

میرب سیال نے سردار سیکٹین حیدر لغاری کو تشویش بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ جیسے واقعی اسے اس کی حالت پر شبہ ہو۔ ہاتھ بڑھا کر پھر پلیئر آف کر دیا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ — ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ تیز لہجے میں دریافت کیا تھا۔ سردار سیکٹین حیدر ی اس کی طرف دیکھے بنا اطمینان سے مسکرا دیا تھا۔ رسائیت سے رُ انداز تھا اور بولا تھا تو اتنا ہی بے لہجہ تھا۔

”کہاں؟ — وہیں جہاں سب لوگ جاتے ہیں۔“ ایسے بچکارا تھا جیسے کسی بچے کو۔

”کہاں؟ — سب کہاں جاتے ہیں؟“ میرب نے اسے تشویش سے دیکھا تھا اور وہ مسکرا دیا تھا۔

”اے گھر — ہوم سویٹ ہوم۔“ مسکراہٹ دل جلانے والی تھی۔ اور میرب حیراں تھی۔

”اپنا گھر ہونے ہوئے کہیں باہر قیام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کہا تو تھا تم سے، کہیں مت چانا۔ پھر تم نے — حالانکہ تمہیں سمجھ لینا چاہئے تھا کہ عادت پڑ چکی ہے تمہاری — تم نہیں ملو گی تو تب ابرا لگے گا۔ مگر تم بھی نا۔“ وہ ایسے بول رہا تھا جیسے دنیا کا بہترین کیس رنگ ہنزینڈ ہو۔

”تو آپ نے ان سب کے سامنے وہ تھوٹ کیوں بولا؟ — اور میرا وہ سامان —“ میرب کا

بم جاں تھا۔ وہ ایک بار پھر شکست خوردہ تھی اور وہ شخص پھر فاتح دکھائی دے رہا تھا۔

”کسی شے کی فکر کرنے کی ضرورت آپ کو قطعی نہیں ہے سویٹ ہارٹ! — میں ہوں نا — کا تا بعد از، فرمانبردار ہنزینڈ۔ میں نے تو آپ کے لئے ہر سبکیٹ کے لئے الگ الگ ٹیوٹرز کا

بست بھی کر دیا ہے۔ تمہیں پریشانی قطعاً نہیں ہوگی۔ ہو تو بندہ حاضر ہے۔“

یہ کیا انداز تھا؟ — یہ کیا تیور تھے؟ — میرب سیال اس کے انداز پر حیران تھی اور اُٹھی اور حیرت سے باہر بھی نہیں نکلی تھی جب اس کے کانوں میں سردار سبکگلین حیدر لغاری کی آواز پڑی تھی۔

”مقابلے کے لئے نظروں کے سامنے رہنا بہت ضروری ہوا کرتا ہے مسز لغاری! — آپ غائب بات بھول گئی تھیں۔ دشمن سامنے ہو تو لڑنے کا لطف دو بالا ہو جایا کرتا ہے۔ کہا تو تھا آپ سے، بھاگے والے بزدل لوگ مجھے پسند نہیں۔ پھر بھی آپ کبھی نہیں۔ صد حیف — کتنا سمجھاؤں آپ کو؟

اوہ — تو یہ تھا ڈرامہ۔

سردار سبکگلین حیدر لغاری اپنے شکار کو نظروں سے دور نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دشمن کو نظروں کے سامنے رکھنے کی عادت تھی اس کی اور وہ.....

میرب سیال بہت تھکے ماندے انداز میں چہرے کا رخ کھڑکی کی سمت پھیر گئی تھی۔ وہ کیوں نہیں سمجھ رہا تھا کہ اس کے مقابل دشمن خاصا ڈرا سہما، نڈھال اور بے ہمت تھا۔ لڑتا تو کس پر؟ — سردار سبکگلین حیدر لغاری نے ایک بھر پور نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تھی اور انتہائی فاتحانہ انداز میں مسکرا دیا تھا۔



عصفان علی خان گہری نیند میں تھا۔ جب اس کے سیل فون کی مسلسل بجتی رنگ ٹون نے اسے بری ح ڈسٹرب کر دیا تھا۔

وہ رات بھر سو نہیں سکا تھا۔ غالباً دو راتوں کی نیند تھی اور اتنی ہی تھکن — سرخ آنکھیں کھل نہ رہی۔ اُس نے مُندی آنکھوں سے ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھایا تھا اور کال ریسیور کے کان سے لگایا تھا۔

”ہیلو.....!“ لہجہ نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔

”ہیلو عصفان! — میں اوزی بول رہا ہوں۔“

”ہاں اوزی! بولو۔“

”عصفان! اتا بیہ.....“

”اتا بیہ — کیا ہوا اتا بیہ کو؟“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ ساری نیند ایک لمحے میں اڑ چکی تھی۔

”اتا بیہ کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ وہ ہوش میں آگئی ہے۔“ دوسری طرف سے اوزی نے مطلع کیا تھا اور نان علی خان کی رُکی ہوئی سانس بحال ہوئی تھی۔ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے بالوں کا ہاتھ پھیرا تھا۔

”تھینک گاڈ! — تم نے مجھے ڈرا دیا تھا۔“

”ڈرا تو اتا بیہ نے مجھے بھی دیا تھا جب رات کے آخری پہر اچانک ہی اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔“

.....

”تم..... تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ عصفان نے کسل ہٹاتے ہوئے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

ی۔

”تم تھکے ہوئے تھے عصفان! پھر تم نے ان دونوں میں جو کیا وہ تم نہیں ہے۔ میں نے تمہارے آرام کی غرض سے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں جانا۔ بہر حال، پہلے سے بہتر ہے وہ۔ رات میں ڈاکٹرز کی بری اینٹیشن کے باعث اس کی کیفیت پر قابو پالیا گیا تھا۔ اب وہ خطرے سے باہر ہے۔ جسم کا سارا خون سب نچڑ جائے تو پھر ویکنس تو ہوتی ہی ہے۔ دوسرے نیا بلڈ ایڈجسٹمنٹ میں کچھ وقت تو لیتا ہے۔ حالت سنبھلنے سنبھلنے ہی سنبھلے گی۔“ اوزان سید، اتا بیہ کی کیفیت کے متعلق مطلع کر رہا تھا۔ عصفان علی خان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

تھیک ہے — میں آ رہا ہوں۔“

”عصفان! زیادہ جلدی نہیں ہے۔ تم آرام سے آنا۔ میں اتابیہ کے پاس ہوں۔“
عصفان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”میں اپنی نیند پوری کر چکا ہوں۔ وہاں اتابیہ کے پاس ہے کوئی تمہارے علاوہ؟“
”نہیں۔۔۔ ماما تھیں۔ مگر میں نے انہیں گھر بھجوا دیا ہے۔ اصل میں بہت پریشان تھیں۔ ان کی سوجھ بوجھ میں تو یہ تک نہیں آ رہا کہ وہ کیا کریں۔ عصفان! اتابیہ کا یوں گم شدہ ہونا معمولی بات نہیں ہے۔“ اوزان سیاہ نے کہا تھا۔ چند ثانیوں تک عصفان علی خان کچھ بول نہیں سکا تھا۔

”تم آرہے ہو پھر؟“ دوسری طرف سے اوزان سید نے جیسے اسے بیدار کیا تھا۔
”ہاں۔۔۔ آرہا ہوں میں۔“ عصفان علی خان نے سلسلہ منقطع کیا تھا اور چند ثانیوں تک اسی طرز چپ چاپ سا کھڑا رہا تھا۔ پھر سیل فون سائز میبل پر دھرا تھا اور پلٹ کر دوش روم میں گھس گیا تھا۔

نیو یارک سے پایا کا فون تھا۔ خیریت دریافت کر رہے تھے۔
”وہ کیا کہتی؟ کیا باتی؟ کس حال میں ہے؟ کیسی ہے؟۔۔۔ لیوں پر جتنے بھی لفظ تھے سب جھوٹے تھے۔ رواداریوں میں رنگے ہوئے، مصلحتوں میں ڈوبے ہوئے۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ خود بھی تو ڈوب رہی تھی۔ دل اندر ہی اندر بیٹھ رہا تھا۔ زویا بیہ سے بھی بات ہوئی تھی۔ وہی مخصوص سوال تھے۔ وہ خوش تو ہے۔۔۔؟“

”وہ کیا کہتی؟۔۔۔ خوشی کا مفہوم وہ بھول گئی تھی جب سے سردار سبکتگین حیدر لغاری سے تعلق بنا تھا۔ اس کے اندر صرف ایک جال بنا تھا۔ پریشانیوں کا۔۔۔ فکروں کا۔ اس نے صرف سمجھوتے کئے تھے۔ خود کو فقط مصلحتوں کا پابند کیا تھا اور سردار سبکتگین حیدر لغاری۔۔۔؟
کیا تھا وہ شخص؟۔۔۔ کیسا تھا؟۔۔۔ کیسے سوچتا تھا وہ؟۔۔۔ کیسے جیتتا تھا؟۔۔۔ اپنے قاعدے، اپنے اصول اور صرف اور صرف اپنی من مانی!۔۔۔ نہ کسی دوسرے کی کوئی فکر نہ پرواہ۔ جانا ہے تو کوئی بھاڑ میں جائے، اس کی بلا سے۔“

کیسا خود پسند شخص تھا۔ کیسی خود غرضی تھی اس میں۔ اور تیور، مزاج ساتویں آسمان پر رہتے تھے۔ شاید اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کیا کیوں کر رہا ہے؟ کس کے لئے کر رہا ہے؟۔۔۔ میرب سیال نے کئی بار سمجھوتوں کی بنیاد پر اس شخص کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ کبھی نہیں جان سکی تھی کہ وہ درحقیقت کیا ہے اور کیا چاہتا ہے۔ ساری کوشش۔۔۔ ساری ہمتیں۔۔۔ ساری محنت۔۔۔ ایک دم فضول تھے۔ سب بے کار گئے تھے۔۔۔ پتہ نہیں اس تعلق کو لے کر سردار سبکتگین حیدر لغاری کی کیا سڑ بھئی تھی۔ کیا لاکھ عمل تھا؟ کیا سوچا تھا اس نے؟۔۔۔ آخر کب تک اسی طرح چلتے رہنا تھا؟ اگر یہ رشتہ اتنا ہی ناپسندیدہ تھا، بوجہ تھا تو پھر سردار سبکتگین حیدر لغاری جیسا عقل مند بندہ اسے مسلسل ڈھوئے کیوں جا رہا تھا؟۔۔۔ فون کریڈل پر ڈالتے ہوئے کتنا تمکین پانی آنکھوں سے باہر تھا۔ وہ پلٹی تھی جب اپنے مقابل کھڑے شخص کو دیکھ کر ٹھنک گئی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ میرب نہیں چاہتی تھی کہ اس کی کمزوری کسما پر عیاں اس مقصد سے چہرے کا رخ سوز لیا تھا۔ مگر سردار سبکتگین حیدر لغاری جیسے اُن کمزور لمحوں کو گرفت میں لینے کا خواہاں تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف موڑا تھا اور دلچسپی سے بغور نکتے لگا، وقت کمزوریوں کو ہوا دینے کے درپے تھا۔ میرب سیال تمام تر بند باندھنے میں ناکام رہی تھی۔ آنکھوں کناروں سے تمکین قطرے ٹوٹ کر گرے تھے اور سارے راز فاش کر گئے تھے۔ اُس کا رہا سہا بھرم بھی ا رہا تھا۔ چہرے کا رخ سردار سبکتگین حیدر لغاری کی سمت تھا لیکن وہ ہینکتی پلکیں سخت اُلجھن میں گھری منے کھڑے شخص سے گریزاں ہی تھیں۔ انداز سے صاف لگ رہا تھا وہ ایک لمحہ بھی وہاں مزید کھڑے سا رہنا چاہتی۔ اگر اسے موقع ملے تو وہ پہلی فرصت میں راہ فرار اختیار کرے گی۔ نظریں پھیرے وہ ل طور پر اجنبی نظر آ رہی تھی۔ مگر وہ ہینکتی پلکیں تمام بھیدوں کی قلبی کھول رہی تھیں۔ سارے راز افشا رہے تھے۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری کو اس کیفیت نے جیسے بلاشبہ محظوظ کیا تھا۔ ہاتھ بڑھایا تھا اور پلکوں پر نکلے موتی کو اپنی پور پر لے لیا تھا اور بغور جائزہ لیتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔
”وقت، موسم، حالات کچھ بھی ہو، تمہارے حق میں نہیں ہے۔ اور دوسرے تم خود اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہو۔۔۔ یہ اذیت پسندی نہیں تو اور کیا ہے؟“ انداز بھر پور محظوظ ہونے والا تھا۔ مگر وہ نہیں جانتا کہ ایسا کر کے وہ شعلوں کو ہوادے رہا ہے۔

میرب سیال کا سارا ضبط جواب دے گیا اور وہ پھٹ پڑی تھی۔
”تم۔۔۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری!۔۔۔ تم کب میری زندگی میں دخل دینا بند کرو گے؟۔۔۔ میں ایک پرستانی ہے۔ کب سمجھو گے تم کہ تمہیں میری زندگی میں کم از کم انٹرفیر نہیں کرنا چاہئے۔ بڑے مائینڈ بننے ہو۔۔۔ بہت توپ شے۔۔۔ مگر اتنی سی بھی تمیز نہیں ہے تمہیں۔ اتنے ادب و اب اور میٹرز بھی سکھانے پڑیں گے تمہیں؟۔۔۔ اور ہائے دی وے، تمہارا پراہلم کیا ہے؟۔۔۔ ہتے کیا ہو تم؟۔۔۔ مجھے نہیں چاہئے ہونا؟۔۔۔ میں پسند نہیں ہوں نا تمہیں؟۔۔۔ قصہ ختم۔ پھر ملہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟۔۔۔ ناپسندیدہ چیزوں کی طرف تو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ پھر اری ناپسندیدگی کا پیمانہ کیا ہے؟۔۔۔ کیوں میرے لمحے لمحے کی خبر گیری کرتے ہو؟۔۔۔ جب ارا میرا کوئی واسطہ ہی نہیں تو پھر تمہاری بلا سے۔۔۔ میں چیوں یا مروں، تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ جب مزاج ساتویں آسمان پر ہے تو پھر سر جھکا کر بار بار زمین کی طرف کیوں دیکھتے ہو؟ ضرورت با ہے نیچے دیکھنے کی؟۔۔۔ سچ بات تو یہ ہے سردار سبکتگین حیدر لغاری! عادت ہو چکی ہے تمہاری سروں کی زندگی میں دخل اندازی کرنے کی۔ اپنی زندگی تو تم بہت سکون کے ساتھ، بڑے آرام کے تھ گزرتا چاہتے ہو اور گزار رہے ہو۔ مگر دوسرے اپنی زندگی کیسے جیتے ہیں۔۔۔ یا کیسے جینا چاہتے، اس بات کی پل پل خبر رکھتے ہو تم۔ اور مجھے تو آج تک یہی سمجھ میں نہیں آیا کہ تم چاہتے کیا ہو خود سے۔۔۔ اس رشتے کو نباہنا چاہتے بھی ہو یا کہ نہیں؟۔۔۔ تم جیسا اٹلی چوٹیل قسم کا بندہ اگر سچ

میں لکے تو بڑا افسوس ہوتا ہے یہ جان کر۔ فیصلے کا اختیار جب ہاتھ میں ہو تو اس طرح وقت کو نالے بے وقوفی کے ہی زمرے میں آتا ہے۔ اپنی تیزی سے پہنچتی آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر پونچھتا۔ سردار سنگٹنگین حیدر لغاری ساکت کھڑا اُس دیکھ رہا تھا۔

”کسی اور کا پیدا کیا گیا بگاڑا سردارنا آسان نہیں ہوتا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ سردار سنگٹنگین حیدر لغاری اور تمہاری زندگی جتنی بے ترتیب ہے اسے لے کر تم تو کیا ہی کسی کے ساتھ رہنے یا نہ رہنے کا فیصلہ کرو گے کوئی اور بھی تمہارے ساتھ جینا نہیں چاہے گا۔ میرے لئے یہ انتہائی مشکل اقدام ہے جو میرا سر انجام دے رہی ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میری منشا اس میں شامل ہے۔ صرف اس لئے کہ میرے بیڑے میں نے ایسا چاہا۔ اس کا مطلب جانتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے سردار سنگٹنگین حیدر لغاری اتم گے پڑا وہ ڈھول ہو جسے بچانا صرف میری مجبوری ہے۔ جانے کیا کچھ اخذ کئے بیٹھے ہو تم خود اپنے بارے میں۔ جانے کن خوش فہمیوں میں ہو۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ تم قطعاً ایسے شخص نہیں ہو جس کی تمنا کوئی بھی لڑکی کرے۔ نہ تو تم اچھے انسان ہو، نہ ہی اچھے جیون ساتھی بننے کے لائق ہو۔ جن جہانوں میں آباد ہیں فکر آئیے وہاں سے۔ خود کو دیکھئے، سامنا کیجئے اپنا اور دنیا کا۔ یہی بہتر ہوگا آپ کے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔“ میرب سیال اسے بہت سی حقیقتوں کا ادراک دیتی، دوسرے معنوں میں آئینہ دکھاتی ہوئی پلٹی تھی اور وہاں سے نکلنے چلی گئی تھی۔

سردار سنگٹنگین حیدر لغاری ساکت سا کھڑا تھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جیسے ضبط انتہائی مشکل تھا۔

اوزان سید، انا بیہ کے پاس تھا جب عرفان علی خان وہاں پہنچا تھا۔ اوزی بہن کو پوری توجہ سے سُوپ پلا رہا تھا۔

”آگے تم۔۔۔؟“ اوزی اُسے دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔

عرفان علی خان بھر پور توجہ سے انا بیہ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ مگر انا بیہ شاہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

شاید ایسا دانستہ تھا۔ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی تھی۔

”کیسی ہے اب انا بیہ؟“ عرفان علی خان کو اس پر وہ پہلی توجہ ظاہر کرنا قدرے مشکل لگا تھا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ پہلے سے بہت بہتر۔ اچھا ہوا تم آگے۔ ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تم یہاں

موجود رہو گے تو مجھے تسلی رہے گی۔“

عرفان علی خان نے بنا کچھ کہے سُوپ کا پیالہ لینے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ وہ نظر اب بھی اپنے اندر اتنی ہی گریز پائی رکھتی تھی۔ اوزی اُسے ضروری ہدایات سونپ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ عرفان علی خان انا بیہ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

بعض اوقات بہت سی چیزیں سمجھ میں نہیں آ رہی ہوتیں اور بہت سے لمحوں میں پتہ نہیں چلتا کہ بندہ کیا کرے۔ بڑی گولم گول سی کیفیت ہوتی ہے۔ رکے یا آگے بڑھے یا پلٹ جائے۔

عرفان علی خان سُوپ کا پیالہ لے کر اس کی سمت آ گیا تھا۔ اسپون میں سُوپ بھر اٹھا اور اسپون اس

کے منہ کی طرف بڑھا دیا تھا۔ مگر وہ یکدم ہی نظروں کے ساتھ چہرے کا رخ بھی پھیر کر مزید اجنبی ہو گئی تھی۔ عرفان علی خان کے لئے یہ رویہ کچھ اتنا غیر متوقع بھی نہ تھا۔ چند لمحوں تک پھر بھی نہ جانے کیوں وہ اسی طرح کھڑا رہا تھا۔ پھر اپنا دہنا ہاتھ بڑھا کر انا بیہ کے چہرے کا رخ اپنی طرف موڑا تھا اور سُوپ کا سچچ بھر کر اس کے منہ میں ڈال دیا تھا۔

وہ لمحے بڑے پرسکوت تھے۔ گریزاں گریزاں۔ خاموش خاموش۔ اور بو جھل بو جھل۔

سٹاف سے بھرے ماحول میں عرفان علی خان کے لئے سانس لینا آسان نہ تھا۔ مگر وہاں سے چلنے جانا بھی آسان نہ تھا۔

دو تین اسپون مزید لینے کے بعد انا بیہ شاہ نے نظر ملانے بغیر ہاتھ روک کر اُسے منع کر دیا تھا۔ عرفان علی خان نے سُوپ کا پیالہ ایک طرف رکھ کر سائیڈ پر دھرا تو لیہ اٹھا کر اس کا منہ صاف کیا تھا۔ انا بیہ شاہ کا انداز اس کے ساتھ کبھی بھی لگاؤ سے بھر پور نہ رہا تھا۔ مگر اس لمحے وہ اس سے مکمل طور پر اجنبی دکھائی دے رہی تھی۔ کوئی سرسری سی، بے خبری، بے دھیانی میں ڈالی جانے والی ایک نگاہ تک نہ تھی۔ بھولے بیٹکے سے بھی نظر اس کی سمت نہ اٹھتی تھی۔ لب ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ عرفان علی خان اس کی کیفیت یقیناً سمجھ سکتا تھا۔ ایک لڑکی کے لئے اُس کی سیلف رسپکٹ کی امانی رکھتی ہے وہ سمجھ سکتا تھا۔ انا بیہ کے ساتھ جو ہوا تھا اس کے بعد یقیناً سب کوفیس کرنا آسان نہ تھا اور بالخصوص اُسے، جس کے سامنے وہ ہمیشہ سر اٹھا کر کھڑی ہوتی تھی۔ کبھی جھکی نہ تھی۔ مگر اس لمحے اس کا وہ غرور، وہ تمکنت، وہ نسوانی وقار سب مٹی کا ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔ اور یہی بات تھی جو انا بیہ شاہ کو نظر نہیں اٹھانے دے رہی تھی۔

عرفان علی خان نے کچھ کہے بغیر اُسے لٹا کر اس پر مکمل ڈال دیا تھا۔ انا بیہ چند ثانیوں تک کھلی آنکھوں سے چھت کی سمت نکلتی رہی تھی۔ جانے اب آنکھوں کے اندر ڈھیروں ڈھیروں کا ہوا نمکین پانی پلکوں کے کنارے توڑ کر باہر نکلا تھا اور نیکے میں جذب ہو گیا تھا۔ انا بیہ شاہ آنکھیں میچ گئی تھی۔

عرفان علی خان جو اس کی سمت سے رخ پھیرے کھڑا تھا، سست، نیم جاں قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

عرفان علی خان کے قدموں سے تھکن واضح طور پر ظاہر تھی۔ آنکھوں میں عجیب دھواں سا بھرا تھا۔

جانے کیا تھے ٹوٹی تھی اندر۔ آہٹ تک نہ ہوئی تھی۔ اسی انداز سے چلتا ہوا وہ باہر نکل آیا تھا۔

جانے کیوں ہمیشہ وہی ہوتا تھا جو وہ نہیں چاہتا تھا۔

صورت حال اس کے اختیار میں کبھی نہیں رہی تھی۔ حالات کبھی بس میں نہیں رہے تھے۔ مگر آج ایسا

ہوا تھا تو ملال کسی قدر مزید دو چند تھا۔

ایک درد ایک بار کے لئے ہی کافی ہوتا ہے۔ بار بار ہوتو برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔ وہ ایک بار جو

جھیل چکا تھا، دوبارہ نہیں چاہتا تھا۔ مگر ایسا جانے کیوں بار بار ہو رہا تھا۔

اڑبان حسن بخاری دانستہ طور پر ایسا نہیں چاہتا تھا۔ ساہیہ خان جب سے زندگی میں آئی تھی وہ اس سے

کوئی ایک بات بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکا تھا۔ اور یہ بات بھی چھپانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر جانے کیوں کبھی کبھار نہ سکا تھا۔

بس اپنے دل ہی دل میں سوچ رکھا تھا۔ ایک دن ملے گا تو سب کچھ کہہ دے گا، سب کچھ بتا دے؟ ساری باتیں جو راکھ کے ڈھیر میں دبی تھیں۔ جو یادیں کر دل میں اتنی کی طرح کھبی ہوئی تھیں۔ مگر ایک پھر وقت اس کے حق میں نہ رہا تھا اور وہ ایک بار پھر خالی ہاتھ کھڑا تھا۔

اسی وقت فارحہ چلتی ہوئی اس کے پیچھے آن رکی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ ٹو اس طرح کیوں کھڑا ہے؟“

اذہان نے فی الفور پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ فارحہ چلتی ہوئی بیٹے کے سامنے آن رکی تھیں۔ بغور چہرہ کو دیکھا تھا۔

”کوئی پرابلم ہے اذہان؟“

”نہیں مئی!“ اذہان حسن بخاری نے ٹٹی میں سر ہلاتے ہوئے ماں کو دیکھا تھا اور مسکرا دیا تھا۔ ”آہ سوئی نہیں اب تک؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ اور تم..... تم بھی تو نہیں سوئے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ مجھے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔“ اذہان کے لبوں پر بڑی عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

”آپ..... آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔“ ماں کو بغور سمجھتے ہوئے پوچھا تھا۔

فارحہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھیں۔

”کبھی وہ وقت تھا اذہان! جب تمہاری ماں نے کسی پریشانی کا منہ تک نہ دیکھا تھا۔ ازدواجی زندگی کے ہزار ہا مسائل ہوتے ہیں مگر میں بہت لگی رہی۔ میں نے اپنے گھر کی بنیادوں کو مضبوط تر کرنے کے لئے اپنی ساری قوت خرچ کر دی۔ مگر..... اچانک صرف ہوا کے ایک جھونکے کے آجانے سے وہ ساری مضبوطی دھری کی دھری رہ گئی اور میرا سارا بھرم مٹی میں مل گیا۔۔۔۔۔ خواب ٹوٹ جائیں تو آنکھوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے اذہان! پتہ نہیں مجھے تم سے اس بات کا شکوہ کرنا چاہئے یا نہیں؟ اور تمہیں بھی یہ بات مجھ سے چھپانی چاہئے تھی یا کہ نہیں؟“

”کون سی بات مئی؟ کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟“ اذہان حسن بخاری چونکا تھا اور فارحہ نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا تھا۔

”بہکی..... بہکی سب چھپا رہا تھا نا تو مجھ سے اور خود سے؟۔۔۔۔۔ یہی بات تھی نا جو تجھے سوئے نہیں دے رہی تھی؟“

اذہان حسن بخاری اپنے سامنے موجود تصویر کو دیکھ کر ساکت رہ گیا تھا۔ فارحہ پائیوں سے بھری آنکھوں کے ساتھ سر نفی میں ہلانے لگی تھیں۔ بولی تھیں تو لہجہ بہت شکست خوردہ تھا۔

”اذہان!۔۔۔۔۔ اتنے بچے، اپنی ماں سے یہ سب کچھ چھپایا۔ بتایا کیوں نہیں کہ تو کیا چاہتا ہے اور یہ.....“ تصویر کا رخ اپنی طرف سوڑ کر بھگی آنکھوں سے تصویر کو دیکھا تھا اور پھر ہاتھ نیچے گرا

تھا۔

”اذہان!۔۔۔۔۔ بچے!۔۔۔۔۔ ٹو نے میرے لئے۔۔۔۔۔ اس گھر کے لئے اپنی خوشیوں کی قربانی دے دی۔ اس وقت کیوں نہیں بتایا؟۔۔۔۔۔ کیوں اتنا کمزور پڑ گیا تو؟ کیوں جانے دیا خواہوں کو اپنی لہروں سے؟۔۔۔۔۔ رنگوں سے کیوں ہاتھ کھینچ لیا؟۔۔۔۔۔ جانتے ہو جتے تم نے ایسے کیا۔۔۔۔۔ حالات بننے کڑے تو۔۔۔۔۔ تھے۔ ایک بار۔۔۔۔۔ صرف ایک بار مجھ سے کہا ہوتا، میں کبھی ایسا نہ ہونے دیتی۔“

”مئی! پلیز۔۔۔۔۔ جو ہو چکا ہے میں اس پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ جو ہونا چاہئے ہمیں بات صرف نا پر کرنی چاہئے۔“ اذہان حسن بخاری رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”میں ساہیہ کے متعلق سوچنا چاہتا ہوں مئی! اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہ اس وقت میرے سامنے ہے میرے لئے اس کی اہمیت باقی سب باتوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ نگاہ کے سامنے کا کوئی منظر اہم ہے۔ نہ گزشتہ نہ پیوستہ۔ بس وہ اور صرف وہ۔۔۔۔۔ میں ایمانداری سے اس سے تعلق باندھنا چاہتا ہوں۔“ لہجہ مدہم تھا اور آواز بوہل۔

فارحہ نے بیٹے کی پشت کو بغور دیکھا تھا۔

”اور تمہارے خواب؟۔۔۔۔۔ تمہاری آنکھیں؟“

”سب فضول ہے مئی!۔۔۔۔۔ کسی کی کچھ اہمیت نہیں۔ سب بے کار ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں مئی! جو سانپ گزرنے کے بعد لکیر پینتے رہ جاتے ہیں۔ جو لکیر مٹ چکی، سو مٹ چکی۔۔۔۔۔

نا کی کوئی حقیقت جب باقی ہی نہیں تو پھر اس کے متعلق سوچنے سے فائدہ؟“

فارحہ کے دل کا بوہل پن کچھ مزید بڑھ گیا تھا۔ وہ ہلٹی تھیں اور چلتی ہوئی زینہ اتر گئی تھیں۔

زندگی میں کیا ہوا تھا؟۔۔۔۔۔ کیا ملا تھا؟۔۔۔۔۔ ساری زندگی وفاداری کے نام کر کے کیا ہاتھ آیا تھا؟ لہر کا سگھ، نہ بچوں کا سگھ۔ دونوں بچے کیسا عجیب نصیب لئے بیٹھے تھے۔ بے رنگ خوابوں کا جیون، ملی ہاتھ اور صرف پیاس۔ کیوں ہوا تھا ایسا؟۔۔۔۔۔ کس لئے؟۔۔۔۔۔ اس کا جواب شاید کسی کے پاس ملی تھا۔

اذہان حسن بخاری پلٹ کر ماں کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ وہ شکست خوردہ سی چلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں اور وہ خود، ارادے ہزار ہا مضبوط سہی، انداز اور لہجہ پھر پورا اتنا کبھی مگر اندر کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی جگہ لوٹی شے بہت کمزور ضرور واقع ہوئی تھی۔ وجود کا وہ علاقہ بہت دیران سا تھا۔ مگر اس بات کی خبر اسے رفا اپنے تک محدود رکھنا تھی!



پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا اُسے؟

جانے کیوں وہ اتنا زیادہ بول گئی تھی۔

بیٹھ ایک سبک ندی کی طرح، ایک سبک بہاؤ جیسا مزاج رکھنے والی لڑکی۔۔۔۔۔ جانے کیسے اپنی داشت کھو گئی تھی۔ اب سوچ رہی تھی تو کسی قدر چھٹاوا ہو رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ سردار بنگلیں حیدر

”آپ — آپ کیوں؟ — میں چلا جاتا ہوں نا۔“
 ”نہیں، تم نہیں۔ تمہیں یہاں پہلے ہی بہت مصروفیت ہے۔ اور یوں بھی میں نہیں چاہتی کہ تم ان سب
 بھینڑوں میں پڑو۔ یہ مسئلے بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ تمہیں ان باتوں کا کوئی تجربہ بھی نہیں۔ ہم برسوں سے
 لیے مسئلے دیکھتے آئے ہیں اور حل بھی کرتے آئے ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم اپنی ولایتی تعلیم کو لے کر
 وکام کر رہے ہو وہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ اسی کو لے کر دن رات ایک کر دیئے ہیں۔ نہ ہمارے
 لئے وقت ہے نہ ہی اپنے لئے۔ ان بھینڑوں میں الجھو گے تو اور بھی مشکل ہو جائے گی۔“ مائی اماں
 نے اُسے قصداً روکا تھا۔

”لیکن مائی اماں.....“ سبکیگین حیدر نے بولنا چاہا تھا مگر مائی اماں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا
 نا۔ اور طاقت سے مسکراتے ہوئے گویا ہوئی تھیں۔

”گین! — تم یہاں رہو۔ تمہاری ضرورت یہاں زیادہ ہے۔ کچھ نئے رشتے جو تمہاری زندگی میں
 نئے ہیں انہیں اپنا حصہ بنانے کے لئے تمہیں خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے بچے! کیا یہ ایسی باتیں
 بن کر بار بار انہیں دہرایا جائے؟“ بیٹے کی طرف دیکھا تھا۔ گین کچھ نہیں بولا تھا۔ مگر میرب کے لئے یہ خبر
 ایسی قدر پریشانی کا باعث ضرور تھی کہ اب وہ تنہا، یہاں صرف اور صرف اس شخص کے رحم و کرم پر ہوگی۔
 براں سے کچھ اچھی امید اسے نہیں تھی۔

سننے میں دل ایک خوف سے دھڑکا تھا۔ ایک پریشانی کی لہر اٹھی تھی اور بے چینی سارے وجود میں
 راہت کر گئی تھی۔

”میرب! کیا ہوا؟ — تم اس طرح سر جھکائے اپنے ناشتے کو کیوں گھورے جا رہی ہو؟“ مائی
 ان نے اسے جتایا تھا تو اسے اپنی حماقت کا بھرپور احساس ہوا تھا۔

”نہیں — ایسی بات نہیں۔“ میرب سیال نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنے سامنے
 وجود شخص پر ایک نگاہ قہر اٹھی مگر دوسری طرف انداز بالکل سرد اور اجنبی تھا۔ جیسے کوئی تعلق مابین موجود
 نام نہ ہو۔ میرب سیال اس — بیٹھنے کی منتظر تھی کہ مائی اماں کی ہدایت کے مطابق جانا تو اسی کے ساتھ تھا۔
 ”کب جانا ہے آپ کو ماں! —“ سردار سبکیگین حیدر لغاری ماں سے مخاطب تھا۔

”آج ہی — تم جلد آنا۔“ بیٹے کو ہدایت کی تھی۔
 میرب کچھ شرمندہ سا ہو گیا تھا۔

”پھر تو میرا جانا بھی کچھ ضروری نہیں مائی اماں! — آپ جا رہی ہیں اور —“
 ”نہیں، ایسی بات نہیں۔ تم چلی جاؤ، اگر تمہارا جی چاہ رہا ہے۔ میں نہیں چاہوں گی تم اس سے متعلق
 ولی جبر کرو۔“ مائی اماں مسکرائی تھیں۔

”خبر؟ — کب میر مائی اماں؟ — کیا میں اس گھر کا حصہ.....“ وہ بولے جا رہی تھی مگر تبھی
 سردار سبکیگین حیدر پیر پھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور جانے کیوں میرب سیال کو وہ ٹھہر بھر پورا احتجاج کا حصہ لگا
 نا۔ وہ اسی طرح منہ کھولے بیٹھی تھی جب مائی اماں نے اٹھ کر صحبت سے اس کے گرد اپنی بانہیں پھیلا دی

لغاری سے خوفزدہ تھی، اس کے کسی شدید رد عمل سے ڈرتی تھی۔ اُسے اس بات کا خوف نہ تھا
 بدلے کے طور پر کوئی سنگین ترین اسٹریجی اختیار کرے گا۔ اُسے ان باتوں کی مطلق پرواہ نہیں تھی۔ اگر
 قدر شرمندہ تھی بھی تو اس باعث کہ اُس نے آج تک کسی کے ساتھ اس انداز سے بات نہ کی تھی۔ اس
 سخت لفظ استعمال نہ کئے تھے۔ افسوس تھا تو اس بات کا کہ وہ سردار سبکیگین حیدر لغاری کو، اس کے حراز
 ٹھکانے لگانے کے لئے اپنے معیار سے کس قدر نیچے آگئی تھی۔ جو آج تک نہ کیا تھا وہ کر دیا تھا۔ شام
 جاتی تھی کہ رشتوں کے گھاؤ بھر جانے والے ہوتے ہیں۔ مگر باتوں اور زبان کے گھاؤ کبھی نہ بھرنے وا
 ہوتے ہیں۔ پھر سردار سبکیگین حیدر لغاری کے باعث وہ جو سہ رہی تھی، اس کے ساتھ کچھ ویسا ہی کرے
 اس کا کیا اسے لوٹانا نہیں چاہتی تھی۔ پھر کیا فرق رہ جاتا اس میں اور سردار سبکیگین حیدر لغاری میں۔
 وہ ناشتے کے لئے ٹیبل پر آئی تھی تو نظر بھی بھیجی ہی تھی۔

”کیا ہوا؟ — آج کیسے جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟ — بہت دیر سے جاگی ہو کیا؟ اور
 تمہاری آنکھیں؟“ مائی اماں نے اس کے لئے چائے اٹھاتے ہوئے چوکتے ہوئے اسے بہ غور دیکھا
 میرب سیال اپنی جگہ چوری ہو گئی تھی۔ بے ارادہ نگاہ اٹھی اور عین اپنے سامنے بیٹھے سردار سبکیگین
 لغاری سے جا ملی تھی۔ دوسری طرف کوئی بے ارادہ ہی نظر بھی نہیں تھی۔ بے تاثر چہرہ، سرد نگاہ۔ مگر توجہ کا
 پہلو جن سے نہیں نکلتا۔

”جی — وہ — رات دیر تک اسٹڈی میں بڑی رہی۔ اس لئے۔“ میرب سیال نے بہانہ ترا
 تھا۔

”چلو — جلدی سے ناشتہ کرو۔ ورنہ پھر کیسے کے لئے دیر ہو جائے گی۔“ مائی اماں نے چا۔
 کا کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے اسے محبت سے دیکھا تھا۔

”نہیں مائی اماں! آج میں کیسے نہیں جاؤں گی۔ مجھے تانہ کے گھر جانا ہے۔“ دھیمی آواز میں اظہار
 دی تھی۔ سردار سبکیگین حیدر لغاری کے چہرے پر کوئی ری ایکشن نہ اُبھرا تھا۔ مائی اماں مسکرائی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ گین تمہیں ڈراپ کر دے گا۔ خیریت ہے نا سب؟ — وہاں سب ٹھیک
 ہے؟“ مائی اماں کے لہجے میں تشویش تھی۔

”جی — سب ٹھیک ہے۔ بس یونہی دل چاہ رہا تھا۔“ میرب کا لہجہ بجا بجا سا تھا۔ مائی اماں
 اسے اور پھر گین کو بہ غور دیکھا تھا۔

”شام تک لوٹ آؤ گی نا — یا پھر —؟“ مائی اماں شاید اس سکوت کو کسی قدر توڑنا چاہ رہی
 تھیں جو اس وقت وہ اس ماحول میں محسوس کر رہی تھیں۔ سردار سبکیگین حیدر لغاری اس وقت نیوز پیپر دیکھ رہے
 تھا۔ توجہ اس ماحول پر یا گفتگو پر بالکل بھی نہیں تھی۔

”گین! — مجھے زمینوں پر جانا ہوگا — تمہارے چاچا کا خون آیا تھا — زمینوں کے انتقال کو لے
 کر کچھ مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جنہیں بروقت حل کرنا بہت ضروری ہے۔“ مائی اماں نے اطلاع دی
 تھی۔ سردار سبکیگین حیدر لغاری چونک پڑا تھا۔

تھیں۔

”تم جاؤ۔۔۔ بچے اپنی ماں کے ساتھ اس قدر راہ و رسم نبھاتے اچھے نہیں لگتے۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ گین ہو گا ناپہاں۔۔۔ اور میرے لئے تم میں اور گین میں کوئی فرق نہیں۔“

مائی اماں کا انداز محبت سے لبریز تھا۔ اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے وہ ملائمت سے مسکرائی تھیں۔ میرب سیال کے لئے اس لگاؤ کے بعد جیسے کوئی راہ نہ بنی تھی۔ وہ اٹھی تھی اور چلتی ہوئی سردار سنگلیں حیدر لغاری کے پیچھے چل پڑی تھی۔

وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے اس کا منتظر تھا۔ گاڑی کے قریب رک کر وہ چند لمحے گوگو کی کیفیت میں کھڑی رہی تھی پھر دروازہ کھول کر سردار سنگلیں حیدر لغاری کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ سردار سنگلیں حیدر لغاری نے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

درمیان کوئی لگاؤ، کوئی جذباتی پن پہلے بھی نہ تھا۔ مگر اب کے خاموشی ہی خاموشی تھی۔ وہ اس رشتے کو کبھی سمجھ نہ پائی تھی۔ اس کے اور سردار سنگلیں حیدر لغاری کے درمیان جو جوتا آیا تھا اور جو ہو رہا تھا وہ سب سمجھ سے باہر تھا۔

وہ شخص عجب مزاج رکھتا تھا۔ اس روز کی سختی کے بعد اچانک ہی نرمی در آئی تھی۔ اسے اپنے ساتھ واپس لے آنا۔۔۔ شاید فضا کوئی نیا گیت سنانے کو تھی۔ مگر پھر یکدم ہی موسم بدلا تھا اور وہ تیز دھوپ میں تنہا کھڑی تھی۔

تمازت سے سارا وجود جھلس رہا تھا اور ہوا سانس لینے کو جیسے ناکافی تھی۔ دم گھٹ سا رہا تھا۔ کیسی زندگی ملی تھی اسے۔ کیسے ماحول میں جینا پڑ رہا تھا اسے۔

ابھی یہ حال تھا اور جب کبھی یہ رشتہ باضابطہ طور پر اسے بنانا پڑتا، تب کیا ہوتا؟۔۔۔ کیسی صورتحال ہوتی؟ حالات اس سے تو کچھ بڑھ کر ہی پیچیدہ ہوتے۔ اب یہ بندھن ایسا بوجھ لگ رہا تھا تو تب۔۔۔ ایک چوری نظر غیر دانستہ طور پر اس شخص پر پڑی تھی۔

اس کے وجود سے بے خبر وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس شخص کو اور اس سے وابستہ تعلق کو لے کر کبھی نہیں لگا تھا کہ اس کا کوئی واسطہ اس شخص سے ہے بھی۔ عجب انداز تھے اس کے۔۔۔ پتہ نہیں کیا دل میں تھا اس کے۔ اول دن سے لے کر اب تک وہ اس کے لئے ایک سوالیہ نشان رہا تھا اور۔۔۔۔۔

اس کی سوچوں کو بریک لگے تھے۔ سردار سنگلیں حیدر لغاری گاڑی روکے اس کے وہاں سے نکل جانے کا منتظر تھا۔ نگاہ پھیر کر دیکھا تھا تو سامنے بانو کے گھر کا گیٹ دکھائی دیا تھا۔ عجب بے خبری، اٹھانے پن میں سارا سفر بسر ہوا تھا۔ وہ سمجھ ہی نہ پائی تھی اور شاید ایسی ہی بے خبری میں ساری عمر اسے جتا دینی تھی۔

خدا شات سنگین تھے۔ مگر سید باب کوئی نہیں تھا۔

میرب سیال اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تھی اور ابھی کوئی بیٹنگی ہدایت جاری کرنے کو بیٹھی ہی

فی کہ سردار سنگلیں حیدر لغاری گاڑی زن سے لے اڑا تھا۔ دُھواں دُھواں سے منظر کو وہ زیادہ دیر نہیں بچھ سکتی تھی۔ اور ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو گرتی ہوئی گیٹ کی جانب بڑھ گئی تھی۔

فضا میں عجب تناؤ سا تھا۔ پتہ نہیں اتنی سوگواری کس بات کی تھی۔ حالانکہ جس شے کی اتنی تلاش کی ہے وہ مل جائے تو خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ مگر اس معاملے کو دیکھتے ہوئے جانے کیوں صورتحال بہت اہل سی لگ رہی تھی۔ ساری فضا دُھواں دُھواں ہی تھی۔

انا بیہ کو ڈسپانچ کر دیا گیا تھا۔ ایک ہفتہ گزرا تھا۔ صرف سات دن۔۔۔!

مگر سارے منظر پہلے سے حد درجہ مختلف لگے تھے۔ لامعہ اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ بھر پور دلجوئی کر رہی تھی۔ مگر انا بیہ اسی طرح چپ تھی۔ ماہوش نے بیٹی کا دھیان رکھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ مگر لیوں بائیک طویل خاموشی تھی۔ دادا جی الگ چپ چاپ سے تھے۔۔۔ اوزی الگ نظریں چرا رہا تھا۔ نظر قی تھی تو بڑی رکھی سی مسکراہٹ لیوں پر ہوئی تھی۔ بڑی مروت لئے ایک بھاری سا انداز جو بھینا آسان میں لگتا تھا۔

سب بظاہر انا بیہ کا بھر پور خیال رکھ رہے تھے۔ بھر پور توجہ دے رہے تھے۔ مگر اس شام چائے کی ٹیبل وہ اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ اوزی چونک پڑا تھا۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ دیکھو!۔۔۔ میں نے یہ تمہارا بکٹ واپس تمہاری پلیٹ میں رکھ دیا ہے۔ میں تو اتن کر رہا تھا۔ کیا ہوا؟“ بھر پور لگاؤ سے ہاتھ اس کے گرد پھیلاتے ہوئے جھک کر دریافت کیا تھا۔ مگر ایک دم ہی اس کا ہاتھ جھٹک کر روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اوزی نے ماہوش کی طرف دیکھا۔ مگر وہ نظریں پھیر گئی تھیں۔

”ماما! یہ سب کیا؟۔۔۔ آخر کب تک؟۔۔۔ کب تک، ہاں؟۔۔۔ وہ کب تک اسی طرح چپ پگھٹی رہے گی؟۔۔۔ آپ کو نہیں لگتا، ہمیں اس کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔“ اوزی کا انداز بہن کی ت میں چور تھا مگر ماہوش بخاری کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اوزی چیخ کر اٹھا تھا جب دادا جی نے سے روک دیا تھا۔

”اوزی، بیٹا! اسے رو لینے دو۔۔۔ اگر تم اس کے آنسو پونچھ دو گے تو وہ بہت کمزور پڑ جائے گی۔

اسے اس کا کھویا ہوا اعتماد واپس لوٹانے کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔“ دادا جی اپنی دانست میں شاید مت کہہ رہے تھے۔ مگر اوزان سید کو نہیں لگتا تھا کہ یہی مسئلہ کا حل تھا۔ شاید حالات کے پہلے جیسے ہونے بہت بہت وقت درکار تھا اور وقت گزرنے کے بعد بھی کچھ پتہ نہ تھا کہ صورتحال بہتر ہوتا تھی یا مزید خراب ہوتا تھی۔ اس کے لئے انا بیہ کو اس کیفیت میں دیکھنا قابل قبول نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اسے

نی زک نہیں پہنچنے دی تھی۔ وہ اس کا ٹھیک اسی طرح خیال رکھ رہا تھا جس طرح کہ غازی کو رکھنا چاہئے۔ انا بیہ کے ساتھ اس کا رشتہ اسے دنیا بھر سے زیادہ عزیز تھا۔ مگر چاہ کر بھی وہ اس کے لئے کچھ کر نہیں پا تھا۔ شاید یہی کیفیت باقی سب کی بھی تھی۔ وہ سب بھی انا بیہ کو اسی قدر چاہتے تھے۔ مگر چاہ کر بھی اس

کے لئے کچھ کر نہیں پارہے تھے۔

”صورت حال اب پہلے جیسی نہیں رہی اوزی! — تم شاید نہیں سمجھ پارہے ہو کہ انا یہی ہے ساتھ جو ہو ہے وہ کسی بھی طرح سے معمولی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کچھ ہوا ہے یا نہیں — کسی کے لئے یہ بات جاننا ضروری نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے، یہ بات سب کے لئے موضوع گفتگو ہے اور دلچسپی باعث ہے۔ جب ہم گھر والے ہو کر اس بات کو سمجھ نہیں پارہے، برداشت نہیں کر پارہے تو باقی سب لوگوں کی کیفیت کیسی ہوگی؟ — وہ ہمارا حصہ ہے جب کہ ہمیں اس کی پاک دامنی پر کوئی شک نہیں ہے۔ مگر ہم پھر بھی اس سے گریزاں ہیں۔ روٹیوں میں عجب تناؤ سا ہے۔ رشتے میں تناؤ در آیا ہے تو پھر باہر صورت حال کیا ہوگی؟ — میں اس کی ماں ہوں۔ مگر میں جانتی ہوں انا یہی اب پہلے کی طرح دنیا کو فیس سمجھی نہیں کر پائے گی۔ وہ اس اعتماد سے سر اٹھا کر دوبارہ پھر کبھی نہیں چل سکے گی۔ کسی لڑکی کا کڈنیپ ہو جانا معمولی بات نہیں۔ سب کی نظروں کے ساتھ ساتھ وہ خود اپنی نظروں سے بھی گر جاتی ہے۔ عزت جانے کے لئے گھر کی دلہیز سے پار ایک رات بسر ہو جانا کافی ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں، انا یہی ہے ساتھ کچھ برائیاں ہوا۔ نہ ہی اب تک اس کے کڈنیپ ہونے کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں آئی ہے۔ مگر — یہ پل جو اس نے اس گھر کی چھت سے باہر گزارے وہ معمولی نہیں ہیں۔ نہ ہی کسی طرح نظر انداز کئے جانے کے قابل ہیں۔“ ماہوش کا لہجہ بیٹی کے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔

اوزی کچھ بولے بنا مڑ کر باہر نکل گیا تھا۔ ماہوش دادا ابا کی طرف مڑی تھی۔

”اباجی! آپ دیکھ رہے ہیں — آپ کی لاڈلی بیٹی پر ہی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اتنا کچھ — اتنا کچھ ہو گیا اور ہم کچھ کر نہیں پائے — کیا منہ دکھائیں ہم زمانے کو؟ — اور کیا چہرہ لے کر باہر جائے گی وہ؟ — زندگی کی جنگ وہ جیت کر تو لوٹ آئی — موت کو تو شکست دے دی۔ مگر زندگی سے ہار جائے گی — نہیں جیتے دے گی اسے یہ زندگی — آپ جانتے ہیں، جب وہ ہاسپتال میں تھی تو میں نے ایک دعا مانگی تھی۔ وہ دعا جو شاید دنیا کی کوئی ماں اپنے بچے کے لئے نہیں مانگتی۔ میں نے مانگا تھا کہ وہ اپنی تم شدہ سانسوں میں ہی کہیں گم ہو جائے اور وہ مر جائے — ہاں، میں نے اس کے لئے یہ دعا مانگی تھی کہ میری بیٹی — میری بیٹی مر جائے۔“ ساکت آنکھوں سے چپ چاپ لاوا بہہ رہا تھا۔

دادا ابا سر جھکائے بیٹھے تھے۔ مگر ماہوش کو اپنا غبار دھونے کی کوئی تو جگہ دکھا رہی۔

”کتنی ظالم ہاں ہوں نا میں — دنیا کی کتنی ظالم ماں — مجھ جیسی تو کوئی ڈانٹ بھی نہ ہوتی ہو گی۔ کیسی دعا مانگی تھی میں نے اس کے لئے — مگر آپ جانتے ہیں کیوں؟ — صرف اس لئے کہ میں اپنی بیٹی کا دکھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کتنے ناز و نعم سے پالا تھا میں نے اسے۔ اور اب — اب وہ زمانے کی ٹھوکروں میں ہوگی۔ اسی — اسی دن کے لئے میں نے اسے پلکوں پر بٹھایا تھا؟ — وہ میری ننھی پری جسے کبھی زمانے کے سرد و گرم نہیں لگنے دیئے، وہ — وہ آج ننگے سر کھلے آسمان کے نیچے کھڑی ہے — تمازتوں میں جھلس رہی ہے۔ اور میں جانتی ہوں یہ تمازتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔“

نے تاکر وہ گناہوں کی پاداش میں ہمیشہ جلتی رہے گی — اس کو ان سوالوں کا سامنا ہو گا جن کے بے اسے خود بھی معلوم نہیں — اسے وہ جتایا جائے گا جو جرم اس نے کبھی کیا ہی نہیں — ایسا ہو — اور میں، آپ یا اوزی — ہم کچھ کر نہیں پائیں گے — یونہی چپ چاپ کھڑے تماشہ لہنے رہیں گے — ایسا ہی ہوگا۔“ عجب دیوانوں جیسا انداز تھا۔ ماہوش پلٹی تھیں اور کمرے سے نکل آئیں۔ دادا ابا سر جھکائے بیٹھے رہے تھے۔

موسم یکدم ہی بدلا تھا اور ہر طرف منظر تیزی سے بھیک رہے تھے۔

میرب کے لئے بات باعث تشویش تھی۔ کتنی دیر ہو گئی تھی اور اسے گھر سے لینے کوئی نہیں آیا تھا۔ یہاں لاکوئی مرد حضرات ابھی تک نہ لوٹے تھے۔ اور تو اور فیضی تک ناپید تھا۔

میرب سیال نے گھڑی دیکھی تھی اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی مانی اماں کے جاتے ہی، منظر ہنسنے ہی وہ کچھ ایسا ہی رنگ دکھائے گا، ایسے ہی رویے کا مظاہرہ کرے گا۔ وہ اس سے کچھ اچھا لپکٹ بھی نہیں کرتی تھی۔ مانی، ممانیاں اور کرنز اسے روکتی رہ گئی تھیں مگر وہ چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ ڈن بہت تیز تھی اور موسم واقعی اچھا نہیں تھا — اس کا اندازہ اسے باہر آ کر ہوا تھا۔ جو اس نے کیا وہ زف ایک جذباتی اقدام تھا اور صرف حماقت — اس کے سوا کچھ نہیں۔

تیز بارش میں ایک فٹ آگے کا منظر تک ٹھیک سے دکھائی نہ دے رہا تھا۔

سڑک دور تک دیران تھی اور وہ اس سڑک پر چلنے والی واحد فرد۔ دل میں خوف نہ بھرتا تو اور کیا ہوتا! جانے کیوں آج کل وہ سارے فیصلے غلط کر رہی تھی۔ حماقت پر حماقت سرزد ہو رہی تھی اس سے۔ ایک لے بعد ایک غلط کام ہو رہے تھے اس کے ہاتھ سے — کل گین سے وہ بد مزگی — بلکہ بد مزگی بھی ہاں؟ — وہ تو سرے سے کچھ بولا ہی نہ تھا۔ فقط ایک سوال ہوا تھا اس کی جانب سے اور وہ بے نقط اتنی چلی گئی تھی۔ جانے کیسے وہ آج کل اتنی جلد نپیر لوز کر رہی تھی۔ نپیر امنٹ تو نہ تھا اس کا — پھر کیوں در ہا تھا سب اُس سے؟ — وہ پہلے عمل کر رہی تھی اور پھر پچھتا رہی تھی — شاید سوچے سمجھے بغیر فائے گئے اقدامات پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے کہ وہ اس وقت سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی تیز بارش میں لپکتی ہوئی تن تھا کھڑی تھی۔ انداز اس قدر کھویا کھویا تھا کہ وہ سامنے سے آتی ہوئی گاڑی کا ہارن تک سن سکتی تھی۔ خیالوں میں اس قدر لگن اور سوچوں میں اس حد تک الجھی ہوئی تھی کہ گاڑی کی تیز ہیلڈ لائٹس ابھی اندازہ تک نہ ہوا تھا۔

گاڑی میں موجود شخص غالباً اس کو دیکھ چکا تھا اس لئے فوراً ہی بربیک لگائے تھے۔

میرب سیال گاڑی کے نائز چرچرانے پر چونکی تھی اور اپنے سامنے کھڑی گاڑی کو کسی قدر حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔ سردار بیکٹین حیدر نغاری گاڑی کا دروازہ کھولتا اور چلتا ہوا میرب سیال کے مقابل جاڑ کٹا ہے۔ نظریں اسے کسی قدر حیرت سے دیکھ رہی ہیں — وہ یقیناً اُسے اس موسم میں اس طرح تنہا اس بک پر کھڑا ایکسپکٹ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ایسا حقیقتاً تھا۔ وہ اس خطرناک موسم میں وہاں تنہا موجود

تھی اور ایسا یقیناً صرف اس سے بدلہ لینے کے لئے تھا۔ وہ جانتی تھی، ایسا کر کے وہ اسے یعنی سردار بنگلے حیدر لغاری کو نیچا دکھا سکتی تھی۔

میرب سیال کسی قدر حیرت سے اس لمحے اپنے سامنے موجود اس کھڑے شخص کو دیکھ رہی تھی جو بارش کی مطلق پرواہ کئے بغیر اس وقت اس کے مقابل کھڑا اُسے بری طرح سے گھور رہا تھا۔ یقیناً یہ تیسرا یا پسندیدہ فعل کا تھا کہ اس نے یکدم ہاتھ بڑھا کر میرب سیال کی نازک سی کلائی کو اپنی مضبوط آہنی گرفت میں لیا تھا اور کھینچتے ہوئے گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔ میرب سیال اس لمحے اس سے کسی ایسے ہی اقدام کی توڑ کر رہی تھی اور ایسا ہی ہوا تھا۔ اُس کے سرعت سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے اور جارحانہ انداز میں گاڑی آگے بڑھانے سے صاف ظاہر تھا کہ اس وقت وہ شدید غصے میں تھا۔ اگرچہ اس سے کچھ باز پرس نہیں کی تھی مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ اس کی طرف سے اپنا دل صاف کر چکا ہے۔ ڈرائیونگ ریش انداز اس کے اندر کی اضطرابیت کو صاف ظاہر کر رہا تھا۔ میرب سیال چپ چاپ دم سادھے بیٹھی تھی۔ کسی طرح کی وضاحت کی ہمت اس میں یکسر ناپید تھی۔ وہ مانتی تھی، اس نے تہا باہر نکل کر غلط کیا تھا۔ سردار بنگلے حیدر لغاری یقیناً اسے لینے ہی آیا تھا۔ جو بھی تھا وہ اس کی ذمہ داری تھی۔ عزت تھی۔ اور اس معاملے میں اس نے کبھی کوئی کوتاہی نہیں برتی تھی۔ ہر ادا، ہر انداز چیخ چیغ کر کہتا تھا کہ ”یو بی لوگ ٹوی! یو آر مان!“ اپنا یہ استحقاق اس پر اپنی مہر ہونے کا تھا یا واقعی وہ اپنی عزت کا پاس رکھنا جانتا تھا، میرب نہیں جانتی تھی مگر وہ اس لمحے کسی قدر شرمندہ ضرور تھی۔

لغاری ہاؤس کے وسیع پورچ میں گاڑی رکھی تھی تو وہ فوری طور پر اتر نہیں سکی تھی۔ سردار بنگلے حیدر لغاری چند لمحوں تک اس کی سمت بنا دیکھے اس کے باہر نکلنے کا منظر ہا تھا۔ غالباً اسے گھر چھوڑ کر واپس کہیں جانا تھا۔ مگر میرب سیال اس قدر سوچوں میں اُبھی ہوئی تھی کہ اپنی سوچ کے تانے بانے بٹنے میں احساس ہی نہ ہوا تھا کہ سردار بنگلے حیدر لغاری اس لمحے اس سے کیا چاہ رہا ہے۔ غالباً وہ معذرت کے لفظ ڈھونڈنا چاہ رہی تھی مگر فوری طور پر یہ سب بہت مشکل لگ رہا تھا۔

عجب گوگو کی سی کیفیت تھی۔ جب سردار بنگلے حیدر لغاری نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر چلتے ہوئے اس کی جانب کا دروازہ کھولا تھا اور اسے کلائی سے پکڑ کر نیچے کھڑا کر دیا تھا۔ ”کبھی بیچ سڑک پر کھڑے، کبھی گاڑی میں بیٹھے کھوئے کھوئے اور سوئے سوئے رہنے کی عادت ہوگی تمہاری۔ مگر میں اپنی اشیاء کے معاملے میں بالکل بھی کیئر لیس نہیں ہوں۔ اس لئے بہتر ہو گا تم بیدار ہونا سکھ لو۔ میری شے کو یا مجھ سے وابستہ کسی شے کو کوئی معمولی سی بھی زک پہنچے، یہ بات مجھے قطعی قابل قبول نہیں۔ اور تم میری بیوی ہو۔ خود کو سنبھالنے کی ذمہ داری اگر تم بہتر طور پر اٹھانے کے قابل نہیں ہو تو مجھے سب باب کے طریقے اچھی طرح سے ازبر ہیں۔ اپنی شے کو کس طرح سے سنبھال کر رکھا جاتا ہے یہ بات میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ بہتر ہو گا تم بھی یہ بات گہ سے باخبر ہو۔ اظہر اشہر؟“ انتہائی سخت گیر لہجے میں کہتے ہوئے اسے سرخ رنگ آنکھوں سے گھورا تھا۔

میرب سیال نے سر اٹھا کر اپنے مقابل کھڑے شخص کو دیکھا تھا جو اس لمحے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ

ضبوطی سے جمائے بہت مدلل انداز میں اپنا حق اس پر جتا رہا تھا۔ میرب سیال کچھ نہیں بولی تھی۔ سردار بنگلے حیدر لغاری چند ثانیے تک اسے انہی خشکیں نظروں سے دیکھتا رہا تھا پھر یکدم اسے جھکے سے چھوڑا۔ فائور گاڑی میں دوبارہ بیٹھ کر گاڑی ریورس گیر میں ڈال کر زن سے اُڑا لے گیا تھا۔ میرب سیال کی قدر ماکت سی اس برستے موسم میں کھڑی اس کے اس اقدام پر دیکھتی رہ گئی تھی۔

رد عمل شدید ہوگا، وہ جانتی تھی۔ مگر اس قدر۔۔۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی۔

شب بھر کی بیداری کے بعد عفتان علی خان بہر حال ایک فیصلے پر پہنچ گیا تھا جس کا مدعا اس نے صبح اشے کی ٹیبل پر سب کے سامنے بیان کر دیا تھا۔

”ماما! پاپا! میں انا بیہ سے فوری طور پر شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں آپ وگ یہ پروپوزل لے کر ایک بار پھر ان کے گھر جائیں۔“

فاطمہ خان نے بیٹے کو یہ غور دیکھا تھا۔

”تم نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے؟“ کہیں اس میں کوئی جذباتی پہلو تو غالب نہیں؟“ پاپا نے ماما کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

عفتان علی خان نے سرفی میں ہلا دیا تھا۔ بھی فاطمہ خان بولی تھیں۔

”عفتان! تم انا بیہ کے لئے کس درجہ سنجیدہ تھے، یہ بات ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ مگر پہلے کی بات اور تھی۔ اور تب بھی ان لوگوں نے ہمیں انکار کر دیا تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس صورتحال کے ساتھ اس پروپوزل کے لئے یہ حالات سازگار ہیں؟“ اور اس بار ہمیں شرمندہ ہونا نہیں پڑے گا بیٹا! ہمیں ملال اس بات کا بھی نہیں کہ ہمیں دوبارہ انکار کر دیا جائے گا۔ میں صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ کیا اب بھی تم انا بیہ کو وہ پہلا سا مقام دے سکو گے؟“ کہیں تمہارا یہ فیصلہ تمہیں کل کی پچھتاوے میں مبتلا نہ کر دے۔“ فاطمہ علی خان نے تمام پہلو بیٹے کے سامنے رکھے تھے۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“

آپ جانتی ہیں ماما! میں جذباتی واقع ہوا ہوں۔ مگر اس قدر نہیں۔ میں وہ فیصلے کرتا ہوں جنہیں میں ٹھانے کی اہلیت اور سکت رکھتا ہوں۔ اگر مجھے خدشہ ہوتا کہ میں کل پچھتاؤں گا تو شاید میں یہ فیصلہ کرتا ہی نہیں۔ میں انا بیہ کا ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں۔“ عفتان علی خان کا لہجہ اٹل تھا۔

”انتا کچھ ہو جانے کے بعد بھی؟“ فاطمہ خان نے بیٹے کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

”ہاں۔“ عفتان علی خان کا جواب بہت ٹھوس تھا۔

”بیٹا! ہم چاہیں گے تم ایک بار پھر بھی سوچ سمجھ لو۔ اب وقت بدل چکا ہے اور انا بیہ پہلے جیسی نہیں رہی ہے۔“

”ماما! انا بیہ پہلے جیسی ہی ہے۔ آپ پلیز اس پروپوزل کو لے کر جانے کی تیاری کریں۔ آپ لوگوں نے جب اس فیصلے کا حق میرے ہاتھ میں دیا ہے تو پھر اس درجہ متذبذب کیوں ہیں؟ اور جہاں تک

رہی بات اتا بیہ کی تو وہ میرے لئے اب بھی پہلے جیسی ہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ آپ پلیز، آج ان کے ہاں جانے کی تیاری کیجئے۔ اس سے زیادہ میں کچھ اور کہنا نہیں چاہتا۔“ عفنان علی خان چیئر ہٹا کر اٹھ تھا اور چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ وہاں بیٹھے نفوس ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے تھے۔

لامعہ حق اپنا زیادہ تر وقت اتا بیہ کے ساتھ بسر کر رہی تھی۔ مگر اس کی کیفیت اب بھی پہلے جیسی ہی تھی۔ وہی چپ چپ۔ گم صم، گم صم سا انداز۔ نہ بلانے پر متوجہ، نہ کوئی بات، نہ کسی سوال کا کوئی جواب۔ پتہ نہیں وہ بولنا چاہتی نہیں تھی یا واقعی اس کے پاس بولنے کو کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

”اتا بیہ! کچھ تو بولو۔ تم کب تک یوں چپ سادھے بیٹھی رہو گی؟ کیا اپنی لامعہ سے بھی بات نہیں کرو گی؟ دیکھو، میں کب سے تمہاری آواز سننے کی منتظر ہوں۔ تم پلیز! بات کرو۔ مجھ سے۔ آخر تم خود کو اور ہم سب کو کس بات کی سزا دے رہی ہو؟ ہم سب جانتے ہیں تمہارے ساتھ جو ہوا وہ محض ایک حادثہ تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم جینا چھوڑ دیتی۔ اتا بیہ! تمہیں خدا نے ایک نئی زندگی دی ہے۔ اس کا مقصد سمجھو۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ، خدا کا شکر ہے تم محفوظ رہیں۔ ایسا کچھ غلط تمہارے ساتھ نہیں ہوا۔ پھر اس خاموشی کا سبب کیا ہے؟ تم اپنے ساتھ ساتھ اپنے پیاروں کو بھی سزا دے رہی ہو اور یہ صحیح نہیں ہے۔ میں تمہیں قطعاً بھی اس بات کی اجازت نہیں دوں گی۔“ لامعہ حق متواتر بول رہی تھی۔ مگر اتا بیہ شاہ ایزی چیئر پر بیٹھی سر اٹھائے چھت کی طرف چنپ چا پ دیکھ رہی تھی۔ مگر آنکھوں کے کنارے بڑی خاموشی سے ہیک رہے تھے۔

لامعہ حق تھک کر اٹھی تھی اور چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ ماہوش نے اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔ لامعہ حق نفی میں سر ہلاتی ہوئی ان کے پاس جا رہی تھی۔

”کوئی فائدہ نہیں ہے آئی! اتا بیہ شاہ کا فوری طور پر اس فیئر سے باہر آنا قطعاً ناممکن ہے۔ اسے وقت درکار ہے اور ہمیں اس کے ساتھ کوئی زور زدہ دوسری نہیں کرنی چاہئے۔ اس کی جو کیفیت ہے اس سے صرف وہ خود باہر آ سکتی ہے۔ صرف اپنی کوشش سے۔ ہماری جتنی بھی کوششیں ہوں گی، وہ بے کار رہیں گی۔ میں سوچ رہی ہوں کیوں نا ہم اتا بیہ کو کچھ دنوں کے لئے کسی پُر فضا مقام پر لے جائیں۔ شاید اس سے کچھ افادہ ہو جائے۔ بعض اوقات ارد گرد کے منظر بدلنے سے اندر کا موسم بھی بدل جاتا ہے۔“ لامعہ حق نے مشورہ دیا تھا مگر ماہوش نے سرنفی میں ہلا دیا تھا۔

”میرا نہیں خیال یہ کوئی بہترین حل ہے۔ اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ اتا بیہ کو کسی بیرونی تبدیلی سے زیادہ اندرونی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے اس کا اپنوں کے درمیان رہنا بہت ضروری ہے۔“

”ہاں۔۔۔ یہ بھی ہے۔“ لامعہ حق نے پُر خیال انداز میں سر ہلایا تھا۔ پھر آئی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی تھی۔

”آئی! کیوں نہ ہم اتا بیہ کی شادی کروادیں؟“

”شادی۔۔۔؟“ ماہوش بخاری چونکی تھیں۔

”ہو سکتا ہے اس سے کوئی اثر اس کی زندگی پر پڑ جائے۔ اتا بیہ اس وقت اپنے اندر کا وہ بھر پور اعتماد

تھوچکی ہے۔ وہ سمجھ رہی ہے کہ اس کی زندگی کے سارے رنگ رخصت ہو گئے ہیں اور اب اس کی زندگی میں کچھ باقی نہیں رہا۔ ایک چھوٹے سے کڈنپ کے بعد وہ خود کو دنیا کی نظر سے کہیں نیچے محسوس کر رہی ہے۔ وہ صورتحال کو فیس نہیں کر پار رہی ہے۔ اور ہمیں اس کا کھویا ہوا اعتماد لوٹانے میں مدد کرنا ہو گی۔“

”مگر شادی اس کا حل کس طرح ہے؟ اور پھر اس صورتحال میں کون اتا بیہ کے لئے تیار ہوگا؟“ ماہوش کا انداز شکرانہ تھا۔

”میں۔۔۔ میں تیار ہوں۔“ ایک بھر پور شاسا آواز اُبھری تھی۔ لامعہ حق اور ماہوش نے بیک وقت چونک کر دیکھا تھا۔ دلہیز کے بیچوں بیچ عفنان علی خان کھڑا تھا۔

”تم۔۔۔؟“ لامعہ حق کو شدید ترین حیرت ہوئی تھی اور ماہوش بخاری بھی کچھ کم حیران نہیں تھیں۔ مگر عفنان علی خان بھر پور اعتماد سے چلتا ہوا ان کے قریب آن رکھا تھا۔

”میں اتا بیہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اظہار مدعا براہ راست ہوا تھا۔

ماہوش نے بے یقینی سے عفنان علی خان کو دیکھا تھا۔

”عفنان بیٹا! تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”جی۔۔۔ بہت اچھی طرح سے۔ میں نے ماما، پاپا کو بھی اس بات سے آگاہ کر دیا ہے اور وہ بطور خاص آج پروپوزل لے کر آپ کے پاس آئیں گے۔ اور مجھے امید ہے آپ آج مجھے دوبارہ روٹیں کریں گے۔“

”عفنان بیٹا! تم۔۔۔ تم شاید نہیں جانتے ہو تم کیا کرنے جا رہے ہو۔ شادی کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اور اتا بیہ۔۔۔ انہوں نے روانی سے کہتے ہوئے یکدم رک کر اسے دیکھا تھا۔ پھر

ایک گہری سانس خارج کی تھی اور بہت اطمینان سے اسے دیکھا تھا۔

”بیٹا! عمر بھر کے فیصلے یوں اتنی جلد بازی میں نہیں ہوتے۔ اور میں نہیں چاہتی کل تک میری بیٹی جس شخص کے سامنے سر اٹھائے کھڑی بات کرتی تھی آج اس کے سامنے رکے تو اس کی نظریں زمین کی سمت

جھکی ہوں۔ تم پلیز اپنے چیئرس کو منع کر دو۔ میں فی الحال اتا بیہ کی ٹائی نہیں بھی کرنا نہیں چاہتی، جب تک کہ وہ اس فیئر سے باہر نہ آجائے اور اپنا کھویا ہوا اعتماد خود دوبارہ بحال نہ کر لے۔ تم

وہ شخص ہو جو اس کے تب بھی طلب گار تھے۔ میں جانتی ہوں تم اس سے محبت میں مبتلا تھے۔ مگر اب اس زندگی میں، اس رفاقت میں وہ محبت کتنی باقی رہے گی؟ پھر پھرے گی بھی یا کہ نہیں۔ اس کے بارے میں مجھے کوئی خاص یقین نہیں ہے۔ اور میرا خیال ہے اس کے متعلق تم بھی کوئی یقین دہانی قبل از

وقت کروا نہیں پاؤ گے۔“ ماہوش بخاری کا لہجہ مضبوط تھا اور عفنان علی خان کی نظروں میں یکدم ہی بے چینی در آئی تھی۔

”آپ یہ سمجھ رہی ہیں۔ میں ان حالات میں اتا بیہ پر ترس کھا رہا ہوں؟ مجھے اس اقدام پر کوئی ہمدردی قابل کر رہی ہے؟“

ائق کو سامنے رکھ کر کرنا ہوگا۔ یہاں لڑکیوں کے رشتوں کے لئے ہزار ہا مسائل پہلے سے ہی موجود ہیں۔ رانا بیہ تو پھر.....“ اوزی کہتے کہتے رک گیا تھا۔

”دادا جی! ہم سب کو انا بیہ عزیز ہے اور ہمیں اس کی خوشیوں کو پھر سے اس کی زندگی میں لانا ہوگا اور نانا سے بہتر جیون ساتھی اس کے لئے کوئی اور نہیں ہوگا۔ میں عفنان کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ وہ اپنے ارادوں میں اٹل ہے۔ جو کمنٹ کرتا ہے اسے آخر تک نبھاتا ہے۔ انا بیہ کا ہاتھ اگر وہ اٹتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کبھی انا بیہ کا ہاتھ بیچ راہ میں نہیں چھوڑے گا۔ ہمیں انا بیہ کو ہر صورت اس پر پوزل کے لئے قائل کرنا ہوگا۔“

ماہ وش سر جھکا گئی تھیں۔

”سچھتی تو میں بھی ہوں مگر.....“ آنکھوں میں یکدم پانی آن رکا تھا۔

”شام میں عفنان کے پیرٹس آرہے ہیں اور میں اس بار خود بھی ان لوگوں کو انکار نہیں کرنا چاہتی۔ مگر بیہ.....“

”ماما! آپ کو انا بیہ سے بات کرنا ہوگی۔ آپ ہی ہیں جو انا بیہ کو قائل کر سکتی ہیں۔“ اوزان سید نے زور دیا تھا۔ ماہ وش نے سر ہلایا تھا اور پلٹ کر وہاں سے نکلتی چلی گئی تھیں۔

اذہان حسن بخاری چلنا ہوا سا بیہ خان کے مقابل جا رہا تھا۔

ساہیہ خان نے اس کی جانب نگاہ کئے بغیر قریب سے نکل کر آگے بڑھ جانا چاہا تھا، جب اذہان حسن بخاری نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ساہیہ خان رک گئی تھی مگر اس کی سمت نگاہ اب بھی نہ کی تھی۔ نظر جھکی سی تھی۔ عجب خائف سا انداز تھا۔

اذہان حسن بخاری اسے بنور نکلنے لگا تھا۔

”اس درجہ خائف ہو کہ میری جانب دیکھو گی بھی نہیں؟“ مدہم لہجے میں شکوہ کیا تھا۔

ساہیہ خان نے اس کی جانب دیکھا تھا اور سرفی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں اذہان! میں تم سے خائف نہیں ہوں۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔“

”تو پھر اس قدر گریزاں کیوں ہو؟“ مجھے تمہارے تیور ابھی کیوں لگ رہے ہیں؟ یہ فضا اتنی بھل سی کیوں ہے؟“ اذہان حسن بخاری نے دوستی کی اس فضا کو بھر پور طور پر مس کیا تھا۔ ساہیہ اس کی رف متواتر نہیں دیکھ سکی تھی۔

”اسی کوئی بات نہیں۔ ہم اب بھی اچھے دوست ہیں۔“

”اچھے دوست ہیں تو تم اس طرح مجھ سے نظریں چرائے کیوں کھڑی ہو؟“ اذہان حسن بخاری نے اس کے کہے پر اسے بردت پکڑا تھا۔ ساہیہ خان فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔ چند ثانیوں تک ماموشیاں ان کے درمیان ڈیرہ ڈالے رہی تھیں اور بالآخر اذہان حسن بخاری نے اس خاموشی کے سکوت کو ٹڑا تھا۔

”کیا ایسا نہیں ہے؟“ ماہ وش نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ پھر بہت اطمینان کے ساتھ گرائس خارج کرتے ہوئے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ دھر دیا تھا۔

”دیکھو بیٹا!۔۔۔ ہمدردی تمام عمر نہیں بنا ہی جاسکتی۔ تم شاید سمجھ نہیں رہے ہو۔ مگر میں وقت اپنی بیٹی سے زیادہ تمہاری منگھنوں ہوں۔ میں نہیں چاہتی تم کل کو کسی پیچھتاوے میں مبتلا ہو۔ کیونکہ میرا اور چیز ہے اور ہمدردی ایک الگ شے.....“

”میں انا بیہ سے ہمدردی نہیں کر رہا۔ اور کس نے کہا کہ اسے کسی ہمدردی کی ضرورت بھی ہے؟۔۔۔ وہ اب بھی میرے لئے اسی قدر اہمیت رکھتی ہے اور میں اب بھی اسے اسی طرح دیکھتا ہوں۔ نہ اسے دیکھنے کے لئے سر اٹھانے کی ضرورت ہے نہ ہی مجھے اسے دیکھنے کے لئے سر جھکانے کی ضرورت۔ فضا کی تاویلوں میں آپ نہ ہی الجھیں تو بہتر ہوگا۔ میں انا بیہ کو چاہتا ہوں اور اسے اپنی زندگی میں شامل دیکھا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد اگر آپ کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو آپ مجھے اس کے لئے بلیم کر سکتی ہیں۔ مگر قبل از وقت اس بات کو لے کر پریشان ہونا کوئی بہترین حل نہیں۔ شام میں ماما، پاپا آرہے ہیں اور میرا چاہوں گا، اب کے آپ سب کا جواب پوزیو رہے۔ انا بیہ اور اس کی خوشیوں کی ضمانت میں آپ کو دوزخ ہوں۔“ عفنان علی خان مضبوط لہجے میں اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے بولا تھا اور پلٹ کر وہاں سے نکل چلا گیا تھا۔

لامعحق اور ماہ وش اُسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ مگر جہاں لامعہ کی نگاہ ساکت تھی اور حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی وہیں ماہ وش بخاری کی نظر گہری سوچوں میں دکھائی دے رہی تھی۔

”انا بیہ کے لئے عفنان کا پروپوزل؟۔۔۔ آگین؟۔۔۔ آئی تھنک یہ ایک اچھا چیلنج ہے۔ ہمیں واقعی انا بیہ کی شادی کے متعلق سوچنا چاہئے۔“ اوزی نے پُر خیال انداز میں کہا تھا۔

دادا ابا نے بھی پُر خیال انداز میں سر ہلایا تھا اور ماہ وش بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

”عفنان علی خان اچھا لڑکا ہے بیٹا!۔۔۔ مجھے خوشی ہے وہ اس صورت حال کو سمجھ بھی رہا ہے اور انا بیہ کو ان حالات میں قبول کرنے کو بھی تیار ہے۔ ہمیں اس بار اسے رد کرنا نہیں چاہئے۔ پہلے کی بات اور تھی۔ لامعہ اور عفنان کا رشتہ ٹوٹنا ایک اہم ترین پہلو تھا۔ مگر اب ہماری بیٹی کی کیفیت کو لے کر ہمارے پاس کوئی راہ نہیں ہے۔ اس بار عفنان علی خان کو ٹھکرانے کی غلطی یقیناً حماقت ہوگی۔“

”مگر ابا جی! انا بیہ۔۔۔ انا بیہ نہیں مانے گی۔ میں جانتی ہوں اسے۔ وہ کبھی بھی اس فیصلے کے لئے ہاں نہیں کرے گی۔ عفنان علی خان کو قبول کرنا اس کے لئے آسان نہیں ہوگا۔“ ماہ وش بخاری نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”کیا آسان ہوگا اور کیا نہیں۔۔۔ اس وقت یہ پہلو اہم نہیں۔ اہم انا بیہ کی کیفیت اور یہ سارے حالات ہیں۔ اور اب عفنان علی خان کو رد کر دیا جاتا ہے تو کیا گارنٹی ہے، انا بیہ کو کوئی اچھا جیون ساتھی مستقبل میں مل سکے گا؟۔۔۔ ہم اس کے خیر خواہ ہیں، اس کی بہتری کا فیصلہ ہم سب کو مل جل کر اور تمام

.....

”ساہیہ! تم نے جو بھی دیکھا وہ — وہ صرف میرا پاسٹ ہے۔ صرف ماضی۔ اور ماضی کبھی حال اور مستقبل کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ ایک ذی شعور شخص یہ بات بہت اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہے۔ کیا مجھے ضرورت ہے کچھ باور کرانے کی؟“ اس کے چہرے کا رخ اپنی جانب پھیر کر بہ غور دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ مگر ساہیہ کے لبوں پر صرف خاموشی تھی۔

”ساہیہ! تم تو مجھے سمجھنے کی دعویٰ کرتی تھیں نا! — مجھے میری خاموشیوں میں سمجھانا تم نے۔ تو پھر اب لفظ کیوں نہیں سمجھ رہی ہو؟ — مجھے تمہاری اور صرف تمہاری ضرورت ہے۔“ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے یقین دلانے کی کوشش موثر ترین تھی۔ ساہیہ چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔

”ساہیہ! ایسا نہیں ہے کہ پاسٹ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ہوتی ہے۔ یقیناً ہوتی ہے۔ مگر اتنی نہیں کہ وہ پریڈنٹ یا فوچر کو انیکٹ کر سکے۔ زخم پرانے ہو جائیں تو صرف داغ باقی رہ جاتے ہیں۔ ان میں درد باقی نہیں رہتا۔ مگر دیکھنے والے کو وہ داغ بخور دکھائی دیتا ہے۔ نظر پڑے تو پوچھتا ضرور ہے، کیا ہوا تھا؟ — یہ داغ کیسے پڑا؟ — کوئی چوٹ لگی تھی؟ — حالانکہ یہ بات بڑی انڈرا سٹوڈ ہے کہ اگر داغ دکھائی دے رہا ہے تو یقیناً اس جگہ کبھی چوٹ بھی ضرور لگی ہوگی۔ مگر کیرڈ نے کیا یہ انداز صرف اس تجسس کو ظاہر کرتا ہے۔ لوگوں کو ایسا تجسس ہوتا ہے دوسروں کے متعلق۔ مگر کوئی یہ نہیں سوچتا کہ یہ صرف داغ ہے اور داغ میں کہیں کوئی درد باقی نہیں رہا ہے۔ یہ صرف میرا پر اہم نہیں ہے ساہیہ! ایسے بہت سے داغ ہر شخص کی زندگی میں ہوتے ہیں۔ میں تمہیں خود اس کے متعلق بتانا چاہتا تھا۔ کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا تھا تم سے۔ مگر ایک خاص وقت پر۔ لیکن اس سے قبل تم نے خود کسی قدر جان لیا۔ اگر تم مجھے سوچ دیتیں تو میں ایک ایک پہلو، گزشتہ زندگی میں گزرا ایک ایک گوشہ تمہیں ضرور دکھاتا — خود آپ مطلع کرتا اور اب بھی کروں گا۔ تم جو سوال پوچھنا چاہتی ہو پوچھ سکتی ہو — میں اس کے لئے تیار ہوں۔

میں اپنی زندگی کا ایک ایک گوشہ تم پر منکشف کر دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ کل تمہیں کسی بات کی باز پرس کسی اور سے نہ کرنا پڑے۔ تم کچھ اور دیکھو، کچھ اور جانو تو کسی خدشے میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ اس لئے میں اپنی زندگی کی گزری ہوئی کوئی بات تم سے مخفی نہیں رکھوں گا۔ گزرے ایک ایک میل کا گوشہ وہ دینے کو تیار ہوں میں۔ تمام حقیقتوں کا اندراج اس میں شمار ہوگا۔ مگر اس کے لئے تمہیں یقین کرنا ہوگا۔ ایک بھر پور اعتبار۔ مجھ پر — میری باتوں پر اور ساری حقیقتوں پر۔“ عرض مدعا کیا تھا۔ ساہیہ نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

”کیوں؟ — ایسا کیوں چاہتے ہو تم کہ میں وہ سب گوشہ دیکھ لوں اور جان لوں؟ — جو گزرا، وہ سب تمہارا ہے۔ اس کی جانچ پڑتال کرنے کی ضرورت مجھے کیوں ہو؟“ ساہیہ کا لہجہ بے باک تھا۔ اذہان حسن بخاری نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے تھے اور بھر پور توجہ سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

”کیونکہ ساہیہ! تم — تم میری بہترین دوست ہو اور تمہیں مجھ سے وابستہ ہر بات کی خبر ہو، یہ بہت ضروری ہے۔“ انداز ٹھوس اور لہجہ پورا اعتبار دیتا ہوا تھا۔

”نہیں — اس کی ضرورت نہیں ہے اذہان! میں تمہیں جتنا جانتی ہوں وہی میرے لئے کافی ہے۔ انسان کی زندگی کے کچھ مخفی گوشے ہوتے ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ تم اسے میرے سامنے عیاں کرو۔ تم برے دوست ہو اور یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں صرف وہ باتیں جس کی ضرورت ہے — اس سے زیادہ کچھ نہیں — جس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ اس کے بارے میں بات کرنے سے بھی کیا حاصل۔“ ساہیہ خان نے قصہ ختم کیا تھا۔

”نہیں — اس کی ضرورت ہے ساہیہ!“ اذہان حسن بخاری نے سر ہولے سے نفی میں ہلایا تھا۔ ”ایسا نہیں ہے کہ یہ سب بہت فضول ہے۔“

”فضول نہیں اذہان! مگر اس کی اہمیت اتنی نہیں ہے — تم کیوں چاہتے ہو کہ میں وہ سب کچھ جان لوں جو تم کبھی بسر کر چکے ہو؟“ ساہیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

اذہان حسن بخاری نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور مدہم لہجے میں گویا ہوا تھا۔ ”کیا تم اپنی آئندہ زندگی میرے ساتھ بسر کرنا نہیں چاہو گی؟“ سوال اگرچہ اتنا دقیق نہیں تھا مگر ساہیہ خان فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔ مگر وہ اس کی سمت متواتر دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ پہلے رخ موڑا تھا اور پھر پلٹ کر دو چار قدم دور جا کر کی تھی۔

”اذہان! — بہتر ہوگا کہ ابھی ہم اس موضوع کو لے کر کوئی بات نہ کریں۔ فی الحال میں بھی اپنے بزنس پر کنسٹرٹ کرنا چاہتی ہوں اور تم بھی۔ تمہیں بھی کچھ وقت درکار ہوگا یقیناً تمام صورتحال پر قابو پانے کے لئے۔ ہمیں اس فیصلے کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھنا چاہئے۔ اور شاید فیصلہ وقت کے ہاتھ ہی چھوڑ دینا مناسب ہے۔ بعض اوقات جن فیصلوں میں ہمیں بہت مشکل درپیش ہوتی ہے، وقت انہیں کسی قدر آسان کر دیتا ہے۔“ ساہیہ خان شاید وقت چاہتی تھی۔ اذہان حسن بخاری لب بلب بھینچے اس کی پشت کو دیکھتا رہا تھا۔

”ساہیہ! کیا تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے؟“ مدہم لہجے میں کسی قدر اضطرابیت تھی۔ ساہیہ خان فی الفور کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔ اذہان حسن بخاری چلتا ہوا اس کے سامنے جا رکھا تھا۔ کچھ کہے بنا بخور اس کے چہرے کو نکلنے لگا تھا پھر اسے شانوں سے تھام کر اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف پھیرا تھا اور مدہم سرگوشی میں دریافت کیا تھا۔

”کیا اعتبار نہیں مجھ پر؟ — بولو، کیا یقین نہیں رکھتی ہو مجھ پر؟“

ساہیہ کی آنکھوں میں یکدم ہی سمندر آن ر کے تھے۔

”کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہیں کوئی دھوکا دوں گا؟ — کوئی فریب؟“ ایک مزید سرگوشی بوجھل فضا میں تھی۔ ساہیہ خان کی ٹھہری نظروں سے بہت آہستگی سے قطرے ٹوٹ کر چہرے کو بھگو گئے تھے۔

”ساہیہ! کیا تمہیں لگتا ہے کہ اذہان حسن بخاری تمہیں تمہارے حصے کی خوشیاں نہیں دے سکے گا؟“

ایک سرگوشی پھر بازگشت ہوئی تھی۔ مگر اس کا جواب صرف ساہیہ خان کے گرم گرم ہتھ پتھے ہوئے آنسو تھے۔ جنہیں وہ ضبط کئے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”کیا سہیہ! بولو کیا؟ کیا ہے تمہارے دل میں؟ بتاؤ مجھے۔ میں جانتا چاہتا ہوں تم کیا سوچتی ہو۔ کیا چاہتی ہو؟ میرے لئے تمہاری منشا، تمہاری مرضی جانتا بے حد ضروری ہے۔ تم کہو، میں سننا چاہتا ہوں۔ سننا چاہتا ہوں وہ آواز۔ وہ آواز جو تمہارے دل میں چھپی ہے۔ کوئی زبردستی نہیں ہوگی۔ کوئی فیصلہ مسلط نہیں ہوگا تم پر۔ تم بتاؤ، کیا ہے تمہارے دل میں؟ کیا اتنی ذرا سی بھی جگہ نہیں تمہارے دل میں میرے لئے؟ اتنی سی بھی گنجائش نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیا تم اتنی سی جگہ اپنے دل میں میرے لئے بنا بھی نہیں سکتی ہو؟“

اذہان حسن بخاری کے مدغم لہجے میں عجب درخواست بھی یا اپنے اندر کا بوجھل پن ہی اتنا تھا کہ ساہیہ خان کے لئے اپنے آپ کو سنبھالنا دشوار ہو گیا تھا۔ تمام تر ضبط ہار کر اس نے اذہان حسن بخاری کے شانے پر سر دھرا تھا اور دھواں دھار روئے لگی تھی۔

اذہان حسن بخاری نے اپنے شانے پر دھرے اس کے سر کو دیکھا تھا اور پھر اپنا حصار اس کے گرد باندھ دیا تھا۔



اناہیہ شاہ سر جھکائے خاموش سی بیٹھی تھی۔ جب ماما اس کے سامنے بیٹھی مدعا بیان کر رہی تھیں۔

”اناہیہ! ہمارے پاس انکار کے لئے اب کوئی راہ نہیں ہے۔ کوئی راستہ بچا ہی نہیں ہے۔ کبھی تمہارے فیصلے پر میں نے ہی تمہیں سراہا تھا اور کہا تھا کہ عفنان علی خان یقیناً تمہارے لئے دنیا میں آخری شخص نہیں ہے۔ تم کسی بھی شخص کی خواہش ہو سکتی ہو۔ مگر مجھے آج لگ رہا ہے بیٹا! عفنان علی خان ہی وہ شخص ہے جو آج مجھے دنیا میں تمہارے لئے آخری مگر بہترین انتخاب لگ رہا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے یا وہ تمہارے ساتھ بیٹے ہوئے سانچے پر تم سے ہمدردی کر رہا ہے۔ بلکہ وہ آج بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ ویسی ہی محبت جیسی وہ تم سے پہلے کرتا تھا۔ تم جانتی ہو، تم اپنی ختم ہوتی سانسوں سے لڑ کر اس دنیا میں واپس آئی ہو؟ شاید اس لئے کہ عفنان علی خان نے تمہارے ساتھ کی تمنا بہت شدت سے کی تھی۔ آج اگر تم زندہ ہو، ہم سب کے سامنے ہو تو صرف اس کی کوشش کے ہی باعث تمہیں بازیاب کرانے سے بروقت ہاپٹل پہنچانے تک ہر فعل اسی نے سرانجام دیا۔ تمہاری زندگی بچانے میں خدا کے بعد اس کا ہاتھ ہے۔ ہوتا تو سب خدا کی مرضی سے ہی ہے۔ مگر کچھ ویلے زمین پر بھی بنتے ہیں۔ اور یہ سچ ہے عفنان علی خان تمہاری زندگی بچانے کا سبب بنا ہے۔ کوئی اگر اتنی خواہش سے تمہارا ساتھ چاہ رہا ہے تو وہ یقیناً تمہاری قدر بھی کرے گا۔ سب سے بڑی بات، اس کے لئے تمہارے ساتھ ہونے والے سانچے کی کوئی وقعت نہیں۔ شاید محبت کرنے والوں کا دل بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس میں گنجائش دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنی پوری مرضی کے ساتھ، اپنے پورے دل کے ساتھ اب بھی تمہارا طلب گار ہے۔“

اناہیہ شاہ کی ٹھہری ہوئی آنکھوں سے بہت آہستگی سے چند قطرے نمکین پانی کے ٹوٹ کر گرے تھے۔ ماہ و ش نے بیٹی کو تھام کر ساتھ بھینچ لیا تھا۔

”بیٹا! کبھی کبھی زندگی میں ایسے موڑ پڑتے ہیں جب ایک راہ کے آگے کوئی دوسری راہ دکھائی دیتی ہے۔ بس وہی موڑ آخری لگتا ہے اور اس کے آگے سارے راستے بند دکھائی دیتے ہیں۔ مگر درحقیقت باہوتا نہیں ہے۔ بات فقط چند قدم آگے بڑھا دینے کی ہوتی ہے اور پھر اس آخری موڑ سے آگے کے اتنے بھی واضح دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ زندگی کی وہ حقیقت ہے جو صرف برت کر ہی سیکھی جاسکتی ہے۔“ ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

کتی تیزی سے آنکھیں بھینکنے لگی تھیں۔ اناہیہ یکدم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اس کا پورا وجود زلزلہ تھا اور ماہ و ش بیٹی کو ہولے ہولے تسلی دے رہی تھیں۔

شاید اناہیہ شاہ اس زندگی کے موڑ سے آگے کی حقیقت جان گئی تھی یا پھر تمام بند راستوں کی کہانی اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔



عفنان علی خان کا پروپوزل قبول کر لیا گیا تھا۔ وہ خواہش جو کبھی ناممکن دکھائی دیتی تھی، آج پوری ہونے کو تھی۔ وہ اس کی ہونے کو تھی۔

وہ چہرہ۔

وہ آنکھیں۔

وہ لب و رخسار۔

جنہیں دیکھنے کی اس نے کبھی صرف حسرت کی تھی۔ خواہش کی تھی۔ آج عمر بھر کے لئے اس کے سنگ ہونے کو تھے۔ وہ اس کی ہم قدم ہونے کو تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں کوئی خوشی کی رت دکھائی نہیں پڑ رہی تھی۔ عجب سکوت سا تھا ان آنکھوں میں۔

چہرہ بہت بے تاثر سا تھا۔ اس واقعے کے بعد وہ بطور خاص کبھی بھی اناہیہ سے نہیں ملا تھا۔ دو ایک بار آیا بھی تھا تو صرف دور سے دیکھا تھا، بات نہیں ہوتی تھی۔ اور بات ہوتی بھی کیسے؟ وہ اس سانچے کے بعد جیسے بولنا ہی بھول چکی تھی۔ اسے کسی نے بھی بولتے نہیں سنا تھا۔ جیسے وہ لفظوں کے معنی بھول گئی تھی۔

عفنان علی خان، دادا ابا اور ماہ و ش سے تھینکس کہنے آیا تھا۔ مل کر پلٹ رہا تھا جب اوزان سید نے پیچھے سے صدا بلند کر کے پکار لیا تھا۔

”عفنان۔“

عفنان علی خان نے مُر کر دیکھا تھا۔ اوزی اس کی سمت چلتا ہوا آ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟ اتنی جلدی واپس جا رہے ہو؟ اب تو اس گھر سے تمہارا تعلق اور بھی مضبوط ہو گیا ہے۔ اب بھی اتنی جلدی بھاگ رہے ہو؟“ شاید اس بوجھل فضا کو اوزی کسی قدر ہلکا کر دینے کا خواہاں تھا جیسا دھیسے پن سے مسکرایا تھا۔

عفنان علی خان اس پر لطف جملے پر فوری طور پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کر سکا تھا۔ اوزی نے اسے بغور

دیکھا تھا اور پھر اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔
’تھینکس۔۔۔‘ لہجہ مشکور تھا۔

’نور وہاٹ۔۔۔؟‘ عفتان علی خان چونکا تھا۔

’انا بیہ کے لئے اتنا کچھ کرنے کے لئے اور اس کے لئے اتنا بڑا اسٹینڈ لینے کے لئے۔ تم نے ہمارے لئے، انا بیہ کے لئے بہت کچھ کیا۔ اور اس تاریکی میں ڈوبے فیئر میں جب انا بیہ بے حد برے دور سے گزر رہی تھی، تم نے اس کا ہاتھ تھامنے کا فیصلہ لے کر ہم سب پر۔۔۔۔۔‘

’کوئی احسان نہیں کیا۔‘ عفتان علی خان نے یکدم ہی اوزی کی بات کاٹ دی تھی۔ اوزی خاموش سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ عفتان علی خان کے لبوں پر بڑی بے جان سی مسکراہٹ نے دم توڑا تھا۔

’یہ کوئی احسان نہیں ہے اوزی!۔۔۔ اور یہاں کوئی بھی کسی پر احسان نہیں کرتا۔ انا بیہ ازاں سے پرفیکٹ گرل۔ وہ کل بھی مکمل تھی اور آج بھی مکمل ہے۔ میں نے صرف یہ ثابت کرنا چاہا۔ اس کا ہاتھ تھامنے کا فیصلہ کر کے، اسے زندگی میں شامل کرنے کی ٹھان کر میں نے کسی پر کوئی نہ تو احسان کیا ہے نہ ہی کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا، تم سب ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟‘ عفتان علی خان کا لہجہ اکتایا ہوا تھا۔

’تم اسی لئے انا بیہ سے بھی نہیں ملے؟‘ اوزی نے ایک اہم پہلو کی طرف نشاندہی کرائی تھی اور عفتان علی خان چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔

’یہ سچ ہے، آج میں اس سے دانستہ ملنا نہیں چاہتا۔۔۔ اس لئے نہیں کہ میں اس کا سامنا کرنے کی سکت نہیں رکھتا یا وہ اس قابل نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں تم سب جیسا سوچ رہے ہو وہ بھی ویسا ہی سوچ رہی ہے اور میں تم سب کو جب سمجھا نہیں پا رہا ہوں تو اس کی سوچ کو کیسے بدلوں گا؟۔۔۔ جبکہ میں اسے جب بھی قابل نہیں کر پایا تھا جب وہ مجھ سے اس درجہ بدظن نہیں تھی۔ اب تو معاملہ ہی اور ہے۔ خیر، ملنا تو اب سب سے ہی ہے اور یہ ملن عمر بھر کے لئے ہے۔ میں کہیں بھاگ نہیں رہا ہوں۔ اسے سامنے بٹھا کر تمام احوال کہوں گا اور ساری غلط فہمیاں منادوں گا۔ تب شاید یہ میرے لئے اتنا مشکل نہیں ہوگا جتنا کہ آج مجھے دکھائی دے رہا ہے۔ شاید تم سمجھ رہے ہو گے میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں یا کیا کہنا چاہتا ہوں۔‘ عفتان علی خان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا اور پھر یکدم ہی پلٹ کر چلتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا۔ اوزی تادیر کھڑا اُسے دیکھتا رہا تھا۔ جانے کیوں اُسے عفتان علی خان کے انداز میں وہ پہلے ہی بات دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

پتہ نہیں واقعی ایسا تھا یا پھر اوزان سید کو ہی ایسا لگ رہا تھا۔

عجب تھکن بھرا سا لہجہ تھا اس کا اور عجب سرد سا انداز۔

جیسے وہ کسی کڑے دور سے چپ چاپ گزر رہا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اس کی خبر کسی اور کو بھی ہو۔

پتہ نہیں یہ سچ بھی تھا کہ صرف اوزی کو ایسا لگا تھا۔ اوزی پلٹا تھا اور پھر اندر کی جانب بڑھنے لگا تھا۔

انا بیہ جتنی کمزور اور شکستہ آج تھی، شاید پہلے کبھی نہیں تھی۔

آج شاید وہ تعلق عفتان کو ایک مجبوری لگ رہا تھا یا پھر اوزی ہی کچھ غلط سمجھ رہا تھا اور ویسا کچھ تھا نہیں۔

میرب سیال کے قیاس کس قدر سچ تھے۔ وہ اب جان چکی تھی۔ مائی اماں کے گھر میں ہونے سے جو بے دکھاوے کی کیس تھی وہ بھی اب باقی نہیں رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان سرے سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔

سردار سبٹنگین حیدر لغاری کا جب دل چاہتا تھا، وہ آتا تھا۔۔۔ جب دل چاہتا تھا چلا جاتا تھا۔ اکثر نت گھر سے باہر گزرتا تھا موصوف کا۔ اور اگر چہ اسے اس سے کچھ سروکار نہیں تھا مگر اتنے بڑے خالی گھر میں اس کا وقت گزارنا انتہائی دشوار ہو چلا تھا۔ مگر اس کی شکایت وہ اس شخص سے نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا ملازم بھی تو ایسا تھا جیسے کوئی واسطہ سرے سے ہی نہیں۔

کہاں تو حق جتایا جا رہا تھا۔ اپنے رشتے کی دلیلیں دے رہا تھا۔ اہمیت سمجھا رہا تھا اور کہاں ب خود یاد نہیں تھا کہ وہ اس سے وابستہ بھی تھی۔ جی رہی تھی تو کس حال میں؟۔۔۔ کچھ کھا بھی رہی تھی یا نہیں؟۔۔۔ ہمیشہ سے بھرے پرے گھر میں فیملی کے ساتھ رہنے کی عادی رہی تھی مگر اب یہاں، کتنے دن ہوئے تھے اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ زبان جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ بس اسی روز آخری بار اس قدر بولی تھی جب سردار سبٹنگین کو کھری کھری سنائی تھیں اور اس کے بعد ایسی خاموش ہوئی تھی کہ کچھ بول ہی نہ سکی تھی۔

اس نے گھڑی کی سمت دیکھا تھا۔

کتنا وقت ہو چلا تھا اور محترم سردار سبٹنگین حیدر لغاری کا کچھ ات پتہ نہ تھا۔۔۔ پتہ نہیں کب آتا تھا اسے؟ اور اس نے اب تک کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس کا انتظار کر رہی تھی یا دل میں اس کے ساتھ کھانے کی کوئی خواہش تھی۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔ مگر یہ ضرور تھا کہ وہ تنہا کھانے کی عادی نہیں تھی۔ صبح بڑیک فاسٹ بھی نہیں لیا تھا۔۔۔ دوپہر کا کھانا وہ پھر گول کر گئی تھی۔ شام میں کافی کے کپ کے ساتھ صرف اسٹیکس لئے تھے۔

اور اب رات کے اس پہرے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ ملازم کھانا بنانے کی ہدایات چاہ رہے تھے لیکن اس وقت وہ اتنے برے موڈ میں تھی کہ ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔ پتہ نہیں انہوں نے کچھ بنایا بھی تھا کہ نہیں۔ وہ بیڈ سے اٹھی تھی جب گیٹ کھلنے اور گاڑی پورچ میں آ کر رکنے کی آواز آئی تھی۔ شاید سردار صاحب تشریف لے آئے تھے۔ وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گئی تھی۔ اس کے سامنے کچن کی طرف جانا کچھ مناسب نہیں لگا تھا۔ چند لمحوں تک اس کے اپنے کمرے میں جانے کی منتظر بیٹھی رہی تھی۔ پھر اٹھی تھی اور چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ مگر جب بیڑھیوں پر تھی تبھی عین اسی لمحے اچانک لائٹ چلی گئی تھی۔۔۔ میرب سیال کی فطری بزدلی ایک لمحے میں عود کر آئی تھی۔ وہ اس کے خیال سے چیختی نہیں تھی۔ خود پر کسی طرح سے قابو پا کر بس بچکانہ اقدام سرزد ہونے سے خود کو روک لیا تھا۔ مگر آنکھیں بند کر کے وہ اسے پکارنا

نہیں بھولی تھی۔

”گین! گین پلیز! اپنے کمرے میں سے باہر آؤ۔۔۔ میں یہاں زینے پر پھنس گئی ہوں پلیز، مجھے خوف آرہا ہے۔۔۔ یہاں اندھیرا بہت ہے۔ آپ یہاں باہر آکھڑے ہوں گے؟“ آنکھیں بند کر کے ایک ایسی درخواست کی تھی جو وہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کبھی کبھی دل پر پتھر رکھ کر بہت سے اقدام سرانجام دینے پڑتے ہیں اور بحالت مجبوری اسے پکارنا بھی اس کے لئے ناگزیر ہو گیا تھا۔ قدموں کو چاب سماعتوں میں اب تک نہیں ابھری تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے منتظر کھڑی تھی۔ دوبارہ پکارنے کو ہمت ناپید تھی۔ مگر خوف سے دھڑکنوں میں ایک زیروم سا تھا اور بحالت مجبوری وہ دوبارہ بول رہی تھی۔

”گین!۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ یہاں آکر کھڑے ہوں گے۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یہاں بہت اندھیرا ہے۔ آپ۔۔۔ آپ سن رہے ہیں نا؟۔۔۔ کیا آپ میرا سیل مجھے پکڑا سکتے ہیں؟ میں یہاں زینے پر تہا کھڑی ہوں۔ اندھیرے میں آگے بڑھ جانا ممکن نہیں لگ.....“

باقی کی درخواست زبان تلے دبائی پڑی تھی۔ عین اس کے سامنے سے بلکہ بے حد قریب سے لائٹر جلنے کی آواز آئی تھی اور روشنی کی ایک لکیر نے سارا منظر واضح کر دیا تھا۔ جسے آنکھیں بند کئے وہ دیوانہ وار کہیں اندر سے پکار رہی تھی وہ اس لمحے اس کے سامنے تھا۔ غالباً وہ اسی لمحے زینہ چڑھنے کی سعی میں تھا جب لائٹ چلی گئی تھی۔ وہ بھی اسی جگہ رک گیا تھا۔ مگر میرب سیال کی طرح اس نے کوئی شور نہیں مچایا تھا۔

میرب سیال کی نظر ساکت رہ گئی تھی۔

تو وہ اس کے اتنے پاس تھا۔

اس قدر قریب اور وہ اسے دیوانہ وار کہیں اندر سے پکار رہی تھی۔

سردار بسکٹگین حیدر لغاری لائٹر جلانے اس کے عین سامنے کھڑا اس کے چہرے کو بے غور دیکھ رہا تھا۔ میرب سیال جو کچھ لکھوں قبل اسے پکار رہی تھی اس لمحے اس کے اس درجہ قریب ہونے پر اس کی جانب دیکھنے کی سعی نہیں کر سکتی تھی۔ مگر ایک اطمینان سارگ و پے میں دوڑتا محسوس ہوا تھا۔

”وہ..... لائٹ..... نہیں تھی..... اور.....“ سر جھکا کر وضاحت دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر سردار بسکٹگین حیدر لغاری نے اس کی سنے بغیر چہرے کا رخ پھیر کر بارعب انداز میں نوکر کو پکارا تھا۔

”فاضل!۔۔۔ فاضل!“

”جی سرکار!“۔۔۔ مؤدب ملازم ایک لمحے میں بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوا تھا۔ سردار بسکٹگین حیدر لغاری نے خشک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”ابھی تک جزیئر آن کیوں نہیں ہوا؟۔۔۔ خود کار نظام ہے نا۔۔۔ تو پھر پراہلم کیا ہوا ہے؟“

”جناب! کوئی ٹیکنیکل فالٹ ہے۔۔۔ میں نے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور جلد قابو پانے کی ہدایت کر دی ہے۔ چند لمحوں میں لائٹ بحال ہو جائے گی۔“ فاضل نے مؤدب انداز میں یقین دلایا تھا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ تم جاؤ۔ اور ہاں، سنو۔۔۔ بی بی کو جہاں جانا ہے ان کی رہنمائی کر دو اور

ایمر جنسی لائٹ یا کینڈل کا بندوبست بھی کر دو۔“ ہدایت خاص ہوئی تھی۔

”جی بہتر۔“ فاضل مؤدب انداز میں پلٹ گیا تھا۔ سردار بسکٹگین حیدر لغاری نے اس کی طرف نظر کی تھی۔ زبان خاموش تھی مگر میرب کو صاف لگا تھا جیسے اس کی نظر پوچھ رہی ہو۔

”بس یا کچھ اور؟۔۔۔ سب ٹھیک ہے نا۔۔۔؟“

”دھینکس!“ میرب نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ مگر سردار بسکٹگین حیدر لغاری کچھ نہیں بولا تھا۔ اس کا ہاتھ تھا تھا۔ پکڑ کر اوپر تک لایا تھا۔ اپنے ہاتھ میں تھا لائٹ اس کے ہاتھ میں تھا یا تھا اور قریب سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا۔

میرب سیال اس خوشبو کے احساس کو اپنے ارد گرد محسوس کرتی ہے ارادہ ہی پلٹ کر اس شخص کے عقب میں دیکھنے لگی تھی۔ فاضل چمکیوں میں ہدایت پر عمل کرتا ہوا ایمر جنسی لائٹ لے آیا تھا۔

”جی بی بی جی!۔۔۔ کہاں جانا ہے؟“ فاضل رہنمائی کرنے کو تیار تھا۔ مگر میرب سیال نے سرنفی میں ہلا دیا تھا اور پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف سفر کرنے لگی تھی۔ مگر عین اسی لمحے اس کے کانوں میں سردار بسکٹگین حیدر لغاری کی بھاری آواز پڑی تھی۔

”فاضل!۔۔۔ اپنی بی بی سے پوچھ لو، ڈنر وہ اپنے کمرے میں کریں گی یا باہر ڈائننگ ہال میں؟ جہاں یہ کہیں، کھانا لگوا دو۔۔۔ گھر میں کچھ پکا بھی ہے آج یا نہیں؟“

میرب سیال نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ مگر قدم آگے نہیں بڑھ سکے تھے۔ سردار صاحب غالباً رابداری میں ہی تھے۔

”مائی نہیں تھیں صاحب!۔۔۔ چھوٹی بی بی نے بھی کوئی خاص ہدایت نہیں دی۔ بہت عام سامنیو ہے۔ آپ حکم کریں تو میں باہر سے آرڈر دے کر منگوا لوں؟“

سردار بسکٹگین حیدر لغاری نے کچھ فاصلے پر کھڑی میرب سیال کی پشت کو دیکھا تھا۔ ایمر جنسی لائٹ کی روشنی میں سارے منظر بہت واضح تھے۔

”اپنی چھوٹی بی بی سے پوچھ لو۔۔۔ جو کہیں، وہی کرو۔۔۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔۔۔ رائٹ؟“

”جی بہتر۔“ فاضل نے مؤدب انداز میں سر ہلایا تھا۔

سردار بسکٹگین حیدر لغاری نے ٹائی کی ٹائٹ ڈھیلی کرتے ہوئے میرب سیال کی پشت کو بغور دیکھا تھا۔ میرب نے دانستہ طور پر پلٹ کر اس کی سمت نگاہ کی تھی۔ نگاہ ایک لمحے کو ملی تھی مگر دوسرے ہی لمحے سردار بسکٹگین حیدر لغاری اجنبی بن کر وہاں پلٹ گیا تھا۔

میرب سیال وہاں کھڑی چند ثانیوں تک اسی سمت کھتی رہی تھی۔

”بی بی جی!۔۔۔ یہ لائٹ آپ کے کمرے میں رکھ دوں؟“ فاضل ایمر جنسی لائٹ ہاتھ میں پکڑے اس کی ہدایت کا منتظر تھا۔

میرب سیال نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا اور اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ فاضل

لائٹ رکھ کر پلٹ گیا تھا۔

میرب سیال تھا کمرے میں چھتے کو تکتے ہوئے بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ اور اس لمحے آنکھیں جانے کیوں
بھینکنے لگی تھیں۔

انا بیہ شاہ چپ چاپ ہی اپنے کمرے میں بیٹھی ہاتھ پھیلائے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ رہی تھی جو
مہندی کی تہہ کے پیچھے تیزی سے چھپ رہی تھیں۔

یہ مہندی کوئی عام مہندی نہ تھی۔

شگن کی مہندی تھی۔ کسی کے نام کی مہندی تھی۔!

جس کے خواب ہر لڑکی دیکھتی ہے۔

اور خالی خالی آنکھوں میں ہزار ہا نیکین سمندر آن رکے تھے۔

ماہ و ش اس کی کیفیت دیکھ رہی تھیں۔ دانستہ اس کے قریب نہیں آئی تھیں۔ مگر لامعہ کو اس کی سمت
اشارہ کر کے اس کے پاس جانے کے لئے کہا تھا۔ لامعہ چلتی ہوئی اس کے قریب آن بیٹھی تھی۔ ہاتھ بڑھا
کر اس کی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کو سمیٹا تھا اور اس کا چہرہ اوپر اٹھائے اسے دیکھتے ہوئے ملائمت
سے مسکرائی تھی۔

”کتنی بری بات ہے انا بیہ! آج کے دن تم روری ہو۔۔۔۔۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ خوشیوں کے
پل جب زندگی میں آئیں تو انہیں مسکراتے ہوئے سمیٹنا چاہئے۔ اس طرح روتے ہوئے، ادا اس ہو کر
نہیں۔“ انا بیہ نہ تو اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ نہ ہی اس کی آنکھوں کے بہتے اشک رکے تھے۔

”کیا ہو رہا ہے یا راتم کوئی واحد لڑکی تھوڑی ہو جس کی شادی ہو رہی ہے؟۔۔۔۔۔ دنیا میں تمام لڑکیوں
کی شادیاں ہوتی ہیں۔ مگر تم۔۔۔۔۔“ لامعہ حق نے مسکراتے ہوئے اس کا چہرہ قدرے اوپر اٹھایا تھا۔

”تم واقعی ایک لکی گرل ہو۔۔۔۔۔ تم خود اپنے بارے میں غلط سلط سوچنا بند کر دو۔۔۔۔۔ تم دنیا کی
پرفیکٹ لڑکی ہو جس میں کوئی خامی ہے نہ برائی۔ عفتان علی خان جیسا بندہ تمہارا ہاتھ تھام رہا ہے۔ اس سے
بڑا شجوت اور کیا ہوگا؟“ اس کا مدغم لہجہ کسی قدر حسرت لئے ہوئے تھا۔

انا بیہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ لامعہ حق کچھ دیر تک لب بھینچے اسے دیکھتی رہی تھی پھر اٹھی اور چلتی
ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

شادی بہت سادگی سے سرانجام پاری تھی۔ زیادہ ہنگامہ نہیں تھا۔ فضا میں سہاگ کے گیتوں کا شور تھا۔
بزرگ خواتین کچھ گنگنا رہی تھیں۔ مگر انا بیہ شاہ اپنے اندر کے سناٹوں سے نکل نہیں پاری تھی۔ صرف اپنے
اندر ہی نہیں اسے ساری فضا میں ایک سکوت سناٹی دے رہا تھا۔ شاید یہ سکوت اس کے اندر کا تھا۔

کسی کام سے لامعہ اس کے پاس سے گزری تھی۔ جب وہ بولی تھی۔

”لامعہ۔۔۔۔۔!“ یہ پہلا لفظ تھا جو اس روز کے بعد سے اس کی زبان سے ادا ہوا تھا۔

لامعہ رک گئی تھی۔ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔؟“

انا بیہ چند ثانیوں تک اسے دیکھتی رہی تھی۔ پھر چہرہ پھیر گئی تھی۔

”میں عفتان علی خان سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”کیا؟۔۔۔۔۔ اس وقت؟“ لامعہ حق بے طرح چونکی تھی۔ ”اس وقت کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟۔۔۔۔۔“

”اب تم اس سے کیا کہنا چاہتی ہو؟“

انا بیہ کچھ نہیں بولی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اوزی نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”انا بیہ، عفتان سے ملنا چاہتی ہے۔“

”تم نے کیا کہا؟“ اوزی نے دریافت کیا تھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ مگر اگر وہ چاہتی ہے تو ہمیں اسے عفتان سے ملنے دینا چاہئے۔ اسے روکنے سے

کیا حاصل ہوگا؟۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ عفتان سے واقعی کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہو۔“ لامعہ نے اخذ
کیا تھا۔

اوزی نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

”نی الحال ایسا ممکن نہیں۔۔۔۔۔ میں خود سمجھتا ہوں اسے۔“ اوزی چلتا ہوا اس کی سمت بڑھ آیا تھا۔

انا بیہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اوزان سید کچھ دیر تک یونہی کھڑا رہا، پھر گھٹنوں کے بل

جھک کر اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“

انا بیہ نے سر اٹھا کر بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا اور پھر یکدم ہی اس کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ
کر رونے لگی تھی۔

”اوزی!۔۔۔۔۔ انا بیہ بے وقعت ہو گئی۔ اتنی بے وقعت کہ خود اپنے آپ سے بھی نظریں نہیں ملا

سکتی۔ بہت گر گئی ہوں تا میں نے کبھی بہت ارزاں ہو گئی ہوں۔ اتنی بوجھ کہ تم سب بھی اسے اپنے

کاندھوں پر ڈھونڈ نہیں سکتے؟۔۔۔۔۔ اتنا بھینکنا چاہتے ہو مجھے ایک ناپسندیدہ بوجھ کی طرح۔ اتنی غیر اہم اور

بے وقعت ہو گئی ہوں میں؟۔۔۔۔۔ پڑے کیوں نہیں رہنے دیا ایک کونے میں مجھے کسی میرا ہم شے کی

طرح؟۔۔۔۔۔ کیا لے رہی تھی میں تم سب کا؟۔۔۔۔۔ کیوں مجھے نکال رہے ہو اس گھر سے؟۔۔۔۔۔

کیوں بے دخل کر رہے ہو مجھے میرے اس گھر سے؟۔۔۔۔۔ کیا واقعی اب میں تم سب کے لئے پہلے جیسی

نہیں رہی؟۔۔۔۔۔ نہیں رہی نا؟۔۔۔۔۔ تو گلا کیوں نہیں گھونٹ دیا میرا؟۔۔۔۔۔ کیوں؟۔۔۔۔۔ زندہ دن

کیوں نہیں کر دیا؟۔۔۔۔۔ تب جب مر رہی تھی تب مرنے کیوں نہیں دیا؟۔۔۔۔۔ کیوں بچا لیا آج کے

دن کے لئے؟۔۔۔۔۔ سب اپنی اپنی سوچ رہے ہیں۔ اپنی اپنی تھوپ رہے ہیں۔ کسی نے یہ

بھی سوچا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ میں کیا سوچ رہی ہوں؟۔۔۔۔۔ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے؟

ان۔۔۔۔۔ ان کڑے حالات میں، میں کیا کرنا چاہتی ہوں، کسی نے یہ نہیں سوچا۔۔۔۔۔ کسی نے یہ نہیں

پوچھا۔ کیا اس واقعے نے مجھ سے میری زندگی پر اختیار بھی چھین لیا؟ — کیا اب میں اپنی زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کی اہل نہیں رہی؟ — کیوں کیا تم سب نے میرے ساتھ ایسا؟ — ایک پل میں — صرف ایک پل میں پرایا کر دیا۔ نکال پھینکا مجھے اپنی زندگیوں سے باہر — یہی حق تو میرا اس گھر پر؟ — تم سب پر —؟“ آنسو کتنی تیزی سے آنکھوں سے بہ رہے تھے۔ لبوں پر کتنے سوال تھے۔ مگر اوزی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اسے چند ثانیوں تک اسی طرح دیکھتا رہا تھا پھر اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا اور اس کی اپنی آنکھیں بھی بھینکنے لگی تھیں۔

”انا بیہ! — تم ہمارے لئے بوجھ نہیں ہو — ہم تمہاری خوشیوں کے خواہاں ہیں۔ خوشیوں کے لئے ہیں اس کا اندازہ تمہیں آج نہیں، لیکن کل ضرور ہوگا۔“ بھینگتی آنکھوں کے ساتھ اوزان سید کہہ رہا تھا۔ مگر انا بیہ شاہ مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔

بقیہ واقعات کے لئے جلد دوئم کا مطالعہ کیجئے



پاک سوسائٹی

ڈاکٹر

کلام

دوم

افسوں جان

عشقا کو زسرا



میرب سیال ناشتے کی ٹیبل پر تھی۔ جب اطلاع ملی تھی کہ جناب سردار سبکگین حیدر لغاری صاحب فیلنگ ناٹ ویل۔

”کیا ہوا؟“ اس نے ملازم سے دریافت کیا تھا۔

”قلو اور بخار ہے۔۔۔ رات حالت کچھ زیادہ خراب تھی بخار بہت تیز تھا جس کے باعث ڈاکٹر کو کال کر کے گھر بلانا پڑا۔“ ملازم نے اطلاع دی تھی۔ وہ چونک پڑی تھی۔

”رات کو؟۔۔۔ اور تم لوگوں نے مجھے نہیں بتایا“ حیرت ہوئی تھی۔ یقیناً گین نے منع کیا ہوگا۔۔۔ ذہن میں پہلا خیال آیا تھا۔

”صاحب نے منع کیا تھا؟“ اس نے کریدا تھا۔

”نہیں جی۔۔۔ وہ تو ہوش میں ہی نہ تھے۔۔۔ میں آپ ساری رات ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہی ہوں۔“ فاضل کی بیگم زلیخا نے اطلاع دی تھی۔

وہ اپنی جگہ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔ چیئر کھینچ کر اٹھی تھی۔ مگر عین زینے کے درمیان ہی جانے کیوں قدم رک گئے تھے۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ وہ واپس پلٹی تھی۔ زلیخا کو گین کے ناشتے کے لئے خاص ہدایت دی تھی اور فون کی اطلاع آ گئی تھی۔ ریسیور کان سے لگا کر نمبر ملانا چاہا تھا مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

مائی اماں یقیناً اکلوتے بیٹے کی کیفیت پر پریشان ہو جاتیں اور یہ ٹھیک نہ ہوتا۔ یہی سوچ کر اس نے فون رکھ دیا اور چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ چار سو سرخ گلاب کے پھولوں کی جیسے جھاڑی لگی تھی۔ مالی پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ وہ بے ارادہ ہی چلتی ہوئی اس طرف آ گئی تھی۔

”بی بی جی! آپ؟“ مالی اسے دیکھ کر مودب ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔

میرب سیال نے سرخ گلابوں کو بغور دیکھا تھا۔

”مجھے یہ پھول چاہئیں۔“ مدعا بیان کیا تھا۔

”بہتر بی بی جی!۔۔۔ میں آپ کے لئے توڑ دیتا ہوں۔“ مالی نے عملی اقدام کرنے کو قدم اٹھایا تھا۔

مگر تبھی میرب نے اسے روک دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ میں خود کر لوں گی۔۔۔ تم جاؤ یہاں سے۔“ حکم دیا تھا۔ مالی کسی قدر تشویش سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

”بی بی جی!۔۔۔ یہ بہتر نہیں ہے۔۔۔ پھولوں کے ساتھ بہت نوک دار کانٹے بھی ہیں۔ اور اگر

آپ کو کوئی زخم لگا تو بڑی بی بی اور صاحب تو ہمیں نوکری سے چٹا کر دیں گے۔ میں آپ کو پھول نکال دیتا ہوں۔ آپ صرف اشارے سے بتادیں، کون کون سے درکار ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں۔۔۔ تم ہٹو یہاں سے۔۔۔ جو جو چاہئے ہوگا، میں خود نکال لوں گی۔ اور ہاں۔۔۔ کسی کو اس کے متعلق مت بتانا۔۔۔ ورنہ نوکری سے نکال دوں گی۔“ دھمکی دی تھی۔ مالی بے چارہ فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ میرب آگے بڑھی تھی اور سرخ گلابوں کے کج سے اپنی پسند کی ٹہنیاں نکالنے لگی تھی۔ مالی اُسے کھڑا دیکھ رہا تھا۔

ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔!

کتنے لاتعداد پھول ایک گلدستے کے لئے۔۔۔ اور کتنے زیادہ زخم ہاتھوں اور کلائیوں پر صرف ان پھولوں کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں، اس کو تب احساس نہ ہوا تھا۔ مگر جب تمام ٹہنیوں کا گلدستہ بنا کر پٹی تو کلائیوں سے رستا خون دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ وہاٹ دوپٹے کے پلو سے رگڑ کر ان خون رستے زخموں کو صاف کیا تھا اور بکے ہاتھ میں لے کر اندر کی طرف چل پڑی تھی۔

”زیلنا! صاحب کو ناشتہ پہنچایا؟“ زینے کے آغاز پر رک کر زیلنا کو آواز دے کر دریافت کیا تھا۔

”جی بی بی جی!۔۔۔ ناشتہ کرا دیا ہے۔۔۔ مگر وہ دوا نہیں لے رہے۔“

”اوکے۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ میں دیکھتی ہوں۔۔۔ مائی کا فون آئے تو ان کو صاحب کے متعلق کچھ مت بتانا۔ ورنہ وہ پریشان ہو جائیں گی۔ تم سمجھ رہی ہونا؟“ بھرپور مالکانہ انداز سے زیلنا کو دیکھا تھا۔

”جی بی بی جی!“ زینا نے سر اثبات میں ہلایا تھا اور اس کے ہاتھوں اور کلائیوں کو بغور دیکھا تھا۔

”بی بی جی!۔۔۔ آپ کے ہاتھوں اور کلائیوں پر سے خون رس رہا ہے۔۔۔ لائیے، میں مرہم پٹی کر دوں۔۔۔ مائی کو خبر ہوئی تو بہت سخت کتے کہیں گی۔“

”نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں جو کہا ہے تم صرف وہ کرو۔“ وہ بولی تھی اور سرعت کے ساتھ میزریاں چڑھ کر اوپر آگئی تھی۔ سردار سبکگلین حیدر لغاری کے کمرے تک جانے تک اس کی سانس پھول چکی تھی۔ دروازے کے باہر رک کر اس نے چند لمحوں تک اپنی سانس بحال کی تھی پھر ہاتھ سے دروازہ ہلکے سے بجایا تھا۔ اندر سے کوئی آواز فوری طور پر نہیں آئی تھی۔ میرب نے دوبارہ دستک دی تھی۔ کوئی جواب تب بھی نہیں آیا تھا۔ اور تب اس لمحے اس نے بہت آہستگی سے ہینڈل پر دباؤ ڈال کر دروازہ کھول دیا تھا۔ سردار سبکگلین حیدر لغاری غالباً سو رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ دیز پر دے گئے ہوئے تھے اور لائٹس آف تھیں۔ میرب نے اس کے آرام کی غرض سے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب خیال نہیں کیا تھا۔ ایک قدم اندر رکھا تھا اور ہاتھ بڑھا کر بائیں جانب لگے بٹن میں سے ایک بٹن دبا کر زیرو وولٹ کا نشانہ سابلیم روشن کر دیا تھا۔

کمرے میں ایک مدہم سی روشنی پھیل گئی تھی۔ اس روشنی سے ہوا یہ تھا کہ اب کمرے کے منظر کسی قدر غیر واضح ہی سہی مگر دکھائی ضرور دینے لگے تھے۔ میرب سیال بکے والا ہاتھ پشت پر کئے چند لمحوں تک

یوں ہی دروازے کے قریب کھڑی سردار سبکگلین حیدر لغاری کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ آنکھوں پر بازو دھرے وہ یقیناً اس لمحے سو رہا تھا۔

بقول ملازمین کے رات بھر وہ سو نہیں پایا تھا۔ وہ سوچ کر آئی تھی کہ اسے دوا کھلا دے گی۔ مگر اب اس کے آرام میں خلل نہ لانے کی غرض سے وہ اسے صرف دور سے کھڑی دیکھ رہی تھی۔

میرب سیال کا دل بہت نرم تھا۔ دوست اور دشمن کے لئے یکساں، ایک سوٹ کارزر رکھتا تھا۔ اس کے لئے کسی سے بھی بدنظر رہنا ناممکن تھا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی تھی۔ یہی نرمی تھی کہ وہ اس روز اسے سخت ستانے کے بعد بہت گھٹی فیمل کر رہی تھی اور کسی طرح اس کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔ سردار سبکگلین سے معذرت کر کے پھر کسی بھی طرح کا نرم رویہ یا سلوک روا رکھ کر۔ وہ یہ نہیں دیکھ رہی تھی کہ سردار سبکگلین حیدر لغاری اس سے کس طرح کا بی ہو کر رہا تھا۔ وہ اسے سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کا ظرف تھا۔

اور جو اس سے ہو سکتا تھا اسے وہ کرنا تھا۔ شاید اسی کے باعث آج وہ زخمی کلائیوں اور ہاتھوں کے ساتھ پشت پر سرخ گلابوں کا بکے چھپائے سردار سبکگلین حیدر لغاری کے کمرے میں تھی۔ چند لمحوں تک یونہی کھڑے وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ پھر ہمت کر کے قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔ قدم دانستہ طور پر دے دے سے تھے۔ وہ کوئی آہٹ اس لئے نہیں چاہتی تھی کہ کہیں وہ ڈسٹرب ہو کر اٹھ نہ جائے۔ دیز کار پٹ پر

دے پاؤں چلتے ہوئے انداز عجب چوروں کا سا تھا۔ ہاتھ اسی طرح پشت پر باندھے وہ چلتی ہوئی اس کے بیڈ کے قریب جا رہی تھی۔ سردار سبکگلین حیدر لغاری کو قریب سے دیکھ کر پشت پر باندھے دونوں ہاتھ آگے گئے تھے اور سرخ گلابوں کو بغور دیکھتے ہوئے ان پر اپنی چند گرم سانسوں کا لمس چھوڑا تھا اور پھر بہت آہستگی سے وہ بکے سردار سبکگلین حیدر لغاری کے سر ہانے کے پاس رکھ دیا تھا۔ لب بھینچ کر چند لمحوں تک اس شخص کو دیکھا تھا۔ پھر جیسے ہی جانے کو پٹی تھی ایک آواز نے اس کے بند اسی جگہ پر باندھ دیئے تھے۔

”آئی ہو۔۔۔ اور ملے بغیر جا رہی ہو؟۔۔۔ حال احوال نہیں پوچھو گی؟“ ایک بھاری آواز ابھری تھی۔ میرب سیال نے ڈرتے ڈرتے چہرے کا رخ پھیر کر دیکھا تھا اور دل اُچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

کوئی اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ پوری کی پوری توجہ اسی کی طرف تھی۔

میرب سیال نے اپنی سانسوں میں اٹھتے زیرو بم کو واضح طور پر خود بھی محسوس کیا تھا۔ سینے میں دل واقعی بہت بری طرح دھڑک رہا تھا۔

آگے بڑھ جانے کی کوئی راہ نہیں تھی۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھنا اس کے لئے انتہائی دشوار تھا۔

”وہاں کھڑی رہو گی؟۔۔۔ قریب نہیں آؤ گی؟“ ملائم لہجہ ابھرا تھا۔

میرب سیال نے ڈرتے ڈرتے رخ پھیرا تھا۔ نیم اندھیرے میں منظر مکمل طور پر واضح نہ تھے۔ مگر جس قدر واضح تھے ان سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی اس کی سمت مکمل توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

میرب سیال کے لئے وہاں سے بھاگ نکلنے کی جیسے کوئی راہ نہیں تھی۔ وہ بہت آہستگی سے پلٹی تھی۔ نیم تاریکی میں نظر آتا چہرہ اسے بخور دیکھ رہا تھا۔ بہت مرے مرے قدموں سے وہ آگے بڑھی تھی۔ سائینڈ ٹیبل پر دھڑے پھول اٹھائے تھے اور کانپتے ہاتھوں سے اس کی سمت بڑھا دیئے تھے۔ سامنے موجود شخص کا چہرہ

کسی قدر واضح دکھائی دے رہا تھا۔ اس لمحے وہ تکیوں کے سہارے نیم دراز سا تھا۔

کیا تھا۔۔۔۔۔ پتہ نہیں، بیماری کا اثر تھا یا پھر کچھ اور۔۔۔۔۔ سردار سبکگلین حیدر لغاری کا مزاج بہت نرم ہوا تھا۔ تبدیلی حیران کن تھی۔

میرب سیال کے لئے یہ انداز خاصا انوکھا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ دھیان بوکلاہٹ کے ساتھ پھولوں پر جاٹھرا تھا۔

”آپ۔۔۔۔۔ آپ لے لیجئے۔۔۔۔۔ یہ آپ کے لئے ہیں۔“ سانسوں کے زبردوم پر قابو پانے کی ناکام کوشش ہوئی تھی۔

”میرے لئے؟۔۔۔۔۔ میرے لئے ہیں تو اتنی دور کیوں کھڑی ہو؟۔۔۔۔۔ کچھ اور قریب آ جاؤ۔“ دھیسے لہجے میں عجب سی درخواست تھی۔ میرب نے چار پانچ قدم کے فاصلے کو قدرے مختصر کرنے کو دو قدم مزید بڑھا دیئے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے گلدستہ آگے بڑھایا تھا۔

سردار سبکگلین حیدر لغاری نے ہاتھ بڑھا کر بے اس طرح تھما تھا کہ میرب کے ہاتھ بھی اس کے ہاتھ میں آگئے تھے۔ میرب سیال بھونپکی رہ گئی تھی۔ اقدام بہت غیر متوقع تھا۔ سردار سبکگلین حیدر لغاری داہنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھامے، بائیں ہاتھ سے پھول ایک طرف رکھتے ہوئے اس کی خون رسی کلائیوں کو ہاتھوں میں لئے بغور جانچنے لگا تھا۔

میرب سیال یوں نگاہ چراگئی تھی جیسے کوئی چور چوری پکڑے جانے پر کرتا ہے۔ عجیب مجرم سا انداز تھا۔ ہمیشہ کوشش کرتی تھی کہ وہ اس شخص پر منکشف نہ ہو۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ ہمیشہ کوششیں ناکام ہو جاتی تھیں۔ سردار سبکگلین حیدر لغاری اس گھڑی بھی کمرے کی مدہم روشنی میں میرب سیال کی کلائیوں کے زخموں کو بغور توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

”اتنے زخم؟۔۔۔۔۔ اور وہ بھی میری خاطر؟۔۔۔۔۔ یہ ہوا اچانک ائی سمت کس طرح چل پڑی؟“ لبوں پر خفیف سا تبسم تھا۔ پتہ نہیں طنز تھا یا ستائش یا پھر حیرت؟۔۔۔۔۔ میرب سیال کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ مگر وہ اپنی کلائیوں اس کے ہاتھ سے کھینچ لینا چاہتی تھی۔ مگر سردار سبکگلین حیدر لغاری کی گرفت تیار ہی تھی کہ ایسا ناممکن تھا۔

”ہمدردی میں اتنی دور جایا نہیں جاسکتا اور۔۔۔۔۔ مروت و اخلاص کا وہ زمانہ رہا نہیں۔۔۔۔۔ پھر بھید کیا ہے، اس بات کا پتہ کیسے چلے گا؟“ سردار سبکگلین حیدر لغاری اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔ انداز بھرپور مخلوظ ہونے والا تھا۔ میرب نے کلائیوں کھینچنا چاہی تھیں مگر سردار سبکگلین حیدر لغاری شاید اسکے لئے ابھی نی الغور تیار نہ تھا۔ نظر جھکا کر بہ غور زخموں کو دیکھنے لگا تھا۔

”زخم خاصے گہرے لگے ہیں۔۔۔۔۔ مرہم پٹی ضروری ہے۔ کم از کم یہی سوچ لیا ہوتا کہ مجھے تو مرہم پٹی کا بھی کوئی تجربہ نہیں۔“ لبوں پر خفیف سا تبسم تھا۔ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا تھا۔ میرب کے لئے یہ اقدام کسی قدر جبراً تھا۔ بیٹھ کر وہ نگاہ ملانے کا قصد نہیں کر سکتی تھی۔ ایک بیڈ پر۔۔۔۔۔ قربت، خاصی جان لیوا تھی۔

سردار سبکگلین حیدر لغاری ہاتھ کے اشارے سے اسے ”ویٹ“ کا سائن دینا مڑا تھا اور بیڈ پر لیٹے لیٹے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر ایک فرسٹ ایڈ باکس برآمد کیا تھا اور واپس اپنی پوزیشن پر آ گیا تھا۔ جس قدر وہ میرب سیال کے اقدام پر حیران تھا اسی قدر میرب سیال اس کے اقدام پر حیران تھی۔ گردن موڑے اسے جب تک بہ غور دیکھتی رہی تھی جب وہ فرسٹ ایڈ باکس برآمد کر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ مڑا تھا، وہ واپس اپنی پہلی پوزیشن میں آگئی تھی۔ غالباً بیماری میں یہ تبدیلی حیران کن تھی۔ سردار سبکگلین حیدر لغاری کا دل خاصا نرم ہو گیا تھا۔ جیسے کایا پلٹ گئی تھی۔

میرب سیال اس جیسے شخص سے یہ توقع نہیں کرتی تھی۔

اتنی ہمدردی!

اتنی توجہ!

اتنی اہمیت!۔۔۔۔۔ اس شخص سے اگر ملتی تو یقیناً صورتحال اتنی ہی غیر متوقع لگتی۔

”بتایا نہیں تم نے، اتنے زخم میرے لئے کیوں؟۔۔۔۔۔ پھول ہی چننے تھے تو کسی سے کہہ دیا ہوتا۔ اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔۔۔۔۔ دل میں کچھ جگہ چاہئے تھی تو کچھ اور کیا ہوتا۔“ الزام تھا یا کوئی طنز۔۔۔۔۔ یا پھر کوئی تنقید؟۔۔۔۔۔ میرب سیال فوری طور پر کچھ نہیں پائی تھی۔ وہ بیمار کا حال پوچھنے آئی تھی۔ مگر کچھ پوچھنے کی سکت ناپید تھی۔ الٹا بیمار اس کی تیمارداری کرتے ہوئے ہوش ٹھکانے لگا رہا تھا۔

”میں۔۔۔۔۔ میں صرف آپ کا احوال پوچھنے آئی تھی۔“ مدہم آواز میں بالآخر وضاحت دے ڈالنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

سردار سبکگلین حیدر لغاری بیٹنج کرتے ہوئے جانے کیوں مسکرا دیا تھا۔

”اچانک، اتنی فکر؟۔۔۔۔۔ اتنی توجہ؟۔۔۔۔۔ اتنا خیال؟“

ایک ساتھ پتہ نہیں سوال تھے یا پھر الزام۔ میرب سیال بیٹنج ہوتے ہی یکدم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اگر بیماری میں اس شخص کا دماغ اتنا چلتا تھا تو پھر ہوش مندی یا تندرستی میں کیا عالم ہوتا ہوگا؟

”کیا ہوا؟۔۔۔۔۔ اتنی جلد حال احوال معلوم ہو گئے؟۔۔۔۔۔ میں نے ابھی تو کوئی جواب بھی نہیں دیا۔“ میرب سیال کو اندازہ ہوا تھا، اس کا ہاتھ سردار سبکگلین حیدر لغاری کے ہاتھ میں ہی رہ گیا تھا۔ عجب ہوش انداز میں وہ پلٹی تھی۔

سردار سبکگلین حیدر لغاری دوسرے ہاتھ سے ان تازہ گلابوں کے بکے کو لیتے ہوئے چہرے کے قریب لے گیا تھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ کچھ خوشبو تو ہے۔ شاید تمہاری چند سانسیں اس پر رہ گئی ہیں۔ کچھ گرمی بھی ہے۔ شاید نہارے ہاتھ کالس ان شاخوں پر اب بھی باقی ہے۔ مگر ان کی تردد بازی مجھ سے ایک شکایت کر رہی ہے۔ باقی ہو کیا؟۔۔۔۔۔ تم نے کچھ شاید چرا لیا ہے۔۔۔۔۔ شاید نہیں، یقیناً تم نے کچھ چرا لیا ہے۔“ مدہم سرگوشی اس جیسے کوئی جاود تھا۔ بڑا انوکھا انداز تھا۔ ایک تو کمرے کی نیم تاریکی عجب اسرار پھونک رہی تھی اس پر یہ ایک خاص آہنگ۔۔۔۔۔ جانے کیا چاہتا تھا یہ شخص اب اس سے!

اس کی سنگت میں تو ہر لمحہ ہی قیامت تھا۔
میرب سیال نے کسی قدر اُلجھن سے اس شخص کو دیکھا تھا۔
”آپ..... خدارا، میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے۔“

سردار سبکدین حیدر لغاری مسکرایا تھا اور پھر حکم کی ایسے تعمیل کی تھی جیسے وہ اس پر ہی مامور ہو۔
”جاتے ہوئے دروازہ بند کرنی جانا۔ میں ان پھولوں سے اور بہت سی باتیں سننا چاہتا ہوں۔
بھی جو تم نے نہیں کہی ہیں۔“

وہ پلٹی تھی جب ایک مزید دھماکہ ہوا تھا۔ میرب سیال نے گردن کا رخ پھیر کر دیکھا تھا مگر وہ اس اُجائے ان گلاب کے سرخ رنگ پھولوں پر اپنی ساری توجہ مرکوز کئے ہوئے تھا۔
میرب سیال پلٹی تھی اور دروازہ بند کرتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ سانسوں کی رفتار معمول سے کچھ ہٹا
ہو رہی تھی۔

بہت سی باتوں کے ملال نہ سونے دیتے ہیں۔ نہ ہی چین سے جینے دیتے ہیں۔
انابیہ کی جان بے حد مشکل میں پھنسی تھی۔ وہ اس وقت ایسے مقام پر تھی جس کے آگے تمام راستے
دکھائی دے رہے تھے۔ آگے بڑھ جانے کو کوئی راہ نہ تھی اور نہ واپس مڑ جانے کو کوئی راستہ۔ ایک ایسا ما
جس کے آگے صرف تاریکی تھی اور تاریکی میں سارے منظر تاریک تھے۔
”میں اس بندگی میں رہنا نہیں چاہتی۔“ انابیہ بہت ہولے سے بڑبڑاتی تھی۔

”میں اس بندگی میں جینا نہیں چاہتی۔“ وہ چیختی تھی۔ اور پھر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر دھواں
رونے لگی تھی۔ جانے کتنی دیر تک یونہی بیٹھی روتی رہی تھی۔ پھر اٹھی تھی اور عفنان کا نمبر ملا ڈالا تھا۔ مگر
کہہ نہیں سکی تھی۔ خاموش۔ چپ چاپ۔ بہت سا پانی آنکھوں کے کنارے سے بہتا رہا تھا۔
دوسری طرف عفنان علی خان بھی چپ تھا۔ جانے کیوں۔

”مجھے..... مجھے آپ سے..... بات کرنی ہے۔“ انابیہ نے عرض مدعا کیا تھا۔

عفنان علی خان کچھ نہیں بولا تھا۔ چپ چاپ فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

انابیہ فون پختے ہوئے چلائی تھی۔

”کیوں..... کیوں بات نہیں کر سکتے ہو تم مجھ سے؟“ کیوں ہمت نہیں ہے تم میں؟
حوصلہ نہیں ہے، تو کیوں بن رہے ہو پھر مسیحا؟“ کیوں بھارے ہو یہ روادار یاں؟“ کیوں
کس لئے؟“ آنسوؤں کے درمیان وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ ”کیوں سمیٹ رہے ہو دنیا بھر کی داد؟ کیوں
کر رہے ہو یہ دکھاوے کی مہربانیاں؟“ سچ تو یہ ہے کہ تم ایک دو غلے انسان ہو عفنان علی خان!
اندر سے کچھ ہے، باہر سے کچھ۔ کیوں نہیں سن سکتے میری؟ جب مجھ میں حوصلہ ہے تو پھر تم میں کیوں
نہیں؟“ وہ چیخ رہی تھی۔

کمرے کے دروازے پر کھڑے اوزان سید نے اسے دیکھا تھا۔ وہ گھٹنوں پر سر دھرے رو رہی تھی

اوزان چپ چاپ پلٹا تھا اور وہاں سے چلا گیا تھا۔
دوسری طرف عفنان علی خان خاصا مضطرب دکھائی دیا تھا۔
”کیا ہوا؟“ فاطمہ نے بیٹے کو بغور دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

عفنان علی خان چونکا تھا، پھر سرفٹی میں ہلا دیا تھا۔

”تم نے انابیہ سے بات کیوں نہیں کی؟“ فاطمہ نے بیٹے کو سخت اُلجھن میں محسوس کیا تھا۔ وہ اس لمحے
اگرچہ ماں سے رخ پھیرے کھڑا تھا مگر وہ جان سکتی تھیں کہ اس کے اندر کس قدر انتشار ہوگا۔

”عفنان! بہت سے لمحوں کے سوال، اپنے جواب اپنے اندر ہی پوشیدہ رکھتے ہیں۔ ان جوابوں کو
جاننے کی سعی کرنا اس لمحے ضروری نہیں ہوتا۔ وقت کے ساتھ وہ آپ ہی کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔
اگرچہ انتظار دشوار ترین عمل ہے مگر بہت سی باتوں سے روشناسی کے لئے کبھی کبھار یہ ضروری ہو جایا کرتا
ہے۔ تم فی الفور خود سے اُلجھنے کی کوشش ترک کر دو۔ ان باتوں سے زیادہ اور کوئی ضروری کام
نہیں اس وقت۔“

عفنان علی خان پلٹا تھا۔ اس کی آنکھیں جیسے دھواں دھواں تھیں۔

”میں انابیہ سے اب بھی اتنی ہی محبت کرتا ہوں مانا!۔۔۔ اب بھی اتنی ہی محبت کرتا ہوں میں اس
سے۔ مجھے نہیں پتہ، یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟“ میں صرف ایک بات جانتا ہوں، وہ اگر اس
صورت حال کو برداشت کر رہی ہے تو میں خوش نہیں ہوں۔ میں نے اسے پانے کے خواب ضرور دیکھے ہیں
مگر ان لمحوں میں مجھے لگ رہا ہے میں شاید کسی قدر خود غرض ہو رہا ہوں۔ پتہ نہیں مانا! میں ٹھیک کر رہا ہوں
یا غلط؟“ میں نہیں جانتا۔ محبت کوئی جبری عمل نہیں ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ انابیہ اس معاملے میں
خود پر کوئی جبر کرے یا پھر کوئی سمجھوتہ کرے۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں چاہتا ہوں
اسے جبر نہ کرنا پڑے۔ آزاد کر دوں اسے ہر جبر سے۔ آزاد کر دوں ہر بندھن سے۔ ختم کر دوں یہ سارے
جبری رشتے جنہیں ڈھونڈنا اس کے بس میں ہے نہ میرے بس میں۔ میں جانتا ہوں کہ میں ایسا نہیں
کر سکتا گا۔ ایسا نہیں ہو سکے گا مجھ سے۔“ وہ سرفٹی میں ہلانے لگا تھا۔ ”یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے۔
کیونکہ میرے اندر وہ ہے۔ ہر جگہ وہ ہے۔ اور اسے نظر انداز کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ نہ بھولنا، نہ
راموش کرنا۔ شاید یہ خود غرضی ہے۔ مگر میں کیا کروں؟“ میں اس سے محبت کرتا ہوں، بے انتہا
محبت۔ اور یہ محبت نتیجے سے بے پرواہ ہے۔“

وہ پلٹا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔ فاطمہ خان بیٹے کی کیفیت پر کٹ کر رہ گئی تھیں۔

”ساہیہ!۔۔۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ اذہان حسن بخاری نے مدہم روشنی میں کھانا کھاتے
نے کہا۔

”کیا؟“ اس خواب سے ماحول میں ساہیہ نے نگاہ اٹھا کر اذہان حسن بخاری کو دیکھا تھا۔

”شکریہ!“ اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا۔ ”بعض اوقات جب کوئی آپ کو بتا کہے سمجھ لیتا ہے تو بہت

اچھا لگتا ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے ساہیہ! تم نے مجھے میرے تمام رنگوں سمیت دیکھا، جانچا اور قبول کیا۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جن پر اپنا آپ منکشف کرنے کو دل چاہتا ہے۔ بہت کم لوگوں سامنے خود کو کھولنا غیر مناسب نہیں لگتا۔ مگر تم سے مجھے اپنے متعلق کچھ نہیں کہنا پڑا۔ کبھی بھی نہیں۔ ہیڈ نے مجھے خاموش موسموں میں خود سے دریافت کیا۔ میں کب، کہاں تنہا ہوں، کب مجھے کسی بہت اپنے ساتھ کی، اس کی تسلی کی ضرورت ہے یہ تم نے ہمیشہ بنا کہے جانا۔ ”بہت آہستگی سے ہاتھ اس کے ہاتھ رکھا تھا۔

ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”اذہان! مجھے تمہاری یہی بات اچھی لگتی ہے۔ تم خود سے زیادہ دوسروں کی فکر میں جیتے ہو۔ تم نے خود اپنی فکر نہیں کی۔ کبھی اپنی خوشی کے متعلق نہیں سوچا۔ مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ کافی نقصان بھی سکتا ہے ایسی حرکتوں سے۔ بہت محتاط رہو۔ دوسروں کی فکر میں جینا اچھی بات ہے مگر خود ہمارا بھی پر کوئی حق ہوتا ہے۔ جو پورا کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔“

”مگر تم ہونا میرا خیال رکھنے کو۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”اذہان! چلتے چلتے آگے بڑھ جانا اس زندگی کا حصہ ہے۔ مگر آگے بڑھتے بڑھتے خود کو بڑھ جانا بہت بری بات ہے۔ مرد کیئر لیس ہوتے ہیں، یہ بات میں جانتی ہوں۔ مگر اتنے، اس ہوتے ہیں، یہ بات تم نے جتنی ہے۔“ لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ”اذہان! میں بے ترتیبی کی عادی ہوں۔ مجھے زندگی میں ہر شے اپنی جگہ پر اچھی لگتی ہے۔ میں ہنستی ہوں، مسکراتی ہوں، روتی بھی ہوا وقت ملے تو خواب بھی دیکھتی ہوں۔“ ساہیہ خان کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ ”بڑا دلچسپ ہے یہ۔ کبھی بے دھیانی میں بہت سی افراتفری کے درمیان آنکھیں بند کر کے ڈاڈیر کو بیٹھو۔ اور صرف بات سوچو جو تمہیں اچھی لگتی ہے۔ جس کے بارے میں تمہیں سوچنا اچھا لگتا ہے۔ پھر دیکھنا تمہیں ایک میں زندگی کتنی بھلی لگے گی۔ کتنی تازگی بھر جائے گی تمہارے اندر۔“ جینے کی ایک نئی امنگ.....“

”تم کس کے متعلق سوچتی ہو؟“ وہ روانی سے بول رہی تھی جب اذہان حسن بخاری نے بول کر ا لمحہ بھر کو حیران کر دیا تھا۔ ساہیہ اس ایک پل میں بہت ہونق لگی تھی۔ اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”تم نے بتایا تھا، تم کس کے متعلق سوچتی ہو؟“

”بہت سی باتیں ہیں۔“ ساہیہ نے گریز پائی برتی تھی۔ نظر چرا گئی تھی۔

”جیسے؟“ اذہان حسن بخاری کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ جیسے وہ محظوظ ہو رہا تھا۔

”جیسے۔۔۔ جیسے رنگ، جیسے خواب، جیسے موسم، جیسے.....“ تاویل بہت غیر مناسب لگی تھی۔ اذہان حسن بخاری کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ پوری توجہ سے دیکھتے ہوئے اپنا مضبوط ہاتھ بڑھ اس کے نازک سے ہاتھ کو گرفت میں لیا تھا۔

”ساہیہ! کیا مجھے یہ باور کرانا ضروری ہے کہ ہمیں یہاں بات کس کی کرنا ہے؟“ مدہم سرگوشی میں رنگ تھے۔ کسی قدر حدت بھی نظروں میں۔ ساہیہ خان جیسی بڑا عوامی لڑکی اس لیے نظریں ملائے۔

سکی تھی۔

”ساہیہ! رنگ، خواب، موسم، سب زندگی کا حصہ ہیں۔ مگر یہ سب بھی کوئی معنی رکھتے ہیں جب کوئی ہمارے ساتھ ہو۔ وہ ایک، جس کی ضرورت دل محسوس کرتا ہے۔ جس کے ہونے سے، نہ ہونے سے بہت فرق پڑتا ہے ساہیہ! اگر وہ ساتھ زندگی کا حصہ ہو تو ہر شے میں رنگ آپ ہی آپ بھر جاتے ہیں۔ ورنہ یہی موسم جان کو آجاتے ہیں اور یہی خواب آنکھوں کے لئے عذاب بن جاتے ہیں۔“ اذہان حسن بخاری نے بہت کچھ جتانے کی کوشش کی تھی۔ ساہیہ خان کے لبوں پر بہت دھیما سا مسکراہٹ تھا۔

”تو سمجھنے لگے ہو تم بھی زندگی کو؟“

”سمجھوں گا کیسے نہیں؟۔۔۔ زندگی ان دنوں میرے ساتھ جو ہے۔“ اذہان حسن بخاری نے جیسے اقرار کیا تھا۔

”اذہان! زندگی واقعی بہت خوب صورت ہے۔“ ساہیہ اپنی دانست میں بولی تھی۔

”ہاں۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری بات سے اتفاق کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ کیا کروں، اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔“ اذہان کے لبوں پر گہری مسکراہٹ تھی۔ ساہیہ کسی قدر زچ ہوتے ہوئے اسے دیکھنے لگی تھی۔

”اذہان۔۔۔ ا“

مگر اذہان مسکرا دیا تھا۔

لامعہ حق مسلسل اسی گھر میں تھی۔ اناہیہ کی شادی کی تیاریوں میں پیش پیش تھی۔ ماہوش کو غالباً اس بات کا احساس تھا کہ کچھ غلط ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہئے۔ اسی خیال سے انہوں نے لامعہ کو پاس بلایا تھا۔

”لامعہ!۔۔۔ بچے! تم۔۔۔“ کچھ کہنا چاہا تھا مگر لفظوں نے ساتھ ہی نہ دیا تھا۔ لامعہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”مجھے پتہ ہے، یہاں ہر کوئی گلی فیل کر رہا ہے۔ مگر ایسا اگر نہ ہو تو بہتر ہے۔ ہم سب کو حقیقت کو سمجھنے کا عادی ہونا چاہئے۔ جو گزر چکا ہے اسے بھول جانا ہی مناسب ہے۔ اور جو ہو رہا ہے وہی آج کی حقیقت ہے۔ سب سے بڑی حقیقت۔“ لامعہ کا لہجہ بہت دھیما تھا اور وہ دانستہ نظریں چرا رہی تھی۔ ”وہیے بھی میں بہت خوش ہوں۔ اناہیہ میری سب سے اچھی دوست ہے۔ اس کی زندگی سنوارنے کی سب سے زیادہ خوشی مجھے ہی ہوگی۔ اس نے جس طرح کی صورت حال کا سامنا کیا، وہ معمولی بات نہیں ہے۔ کر عفتان کی صورت اسے ایک کیئرنگ اینڈ لوگ ہنز بیڈنٹل جائے تو میں خوش کیوں نہیں ہوں گی؟ اور بس بھی عفتان علی خان سے کسی حوالے سے میرا بھی کوئی رشتہ تھا، ہے نہیں۔ جو شے ٹوٹ جائے اس کی تھت نہیں رہتی۔“

لامعہ اس ہجوم کے اندر سر جھکائے کھڑی تھی۔

ماہوش نے ہاتھ بڑھا کر بہت محبت سے اس کا چہرہ تھاما تھا۔

”لامعہ! بچے! میرے لئے انا بیہ میں اور تم میں کبھی کوئی فرق نہیں رہا۔ تم جانتی ہو۔ ماہوش نے اس کا چہرہ تھاما تھا۔ ہر شے دیکھ سکتا۔ ہر شے دیکھ سکتی ہے یہ نظر۔ تم کچھ بھی کہو، مگر میں سمجھتی ہوں ا کیفیت کو تم جس سے گزر رہی ہو، میں اسے دیکھ رہی ہوں۔“

لامعہ نے سرفنی میں ہلایا تھا۔

”نہیں ماما!۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں خوش ہوں۔“ وہ مسکرائی تھی۔ ”میں واقعی بہت خوش ہوں اور خوش کیوں نہ ہوں۔۔۔ انا بیہ کی ساری خوشیاں مجھے اتنی ہی عزیز ہیں جتنی کہ انا بیہ خود۔۔۔ وہ ہے، مسکراتی ہے تو میں کبھی خود کو اندر سے اتنا ہی خوش محسوس کرتی ہوں۔ وہ خوش نہیں ہے تو میں بھی خوش نہیں ہوں۔ اس کا یہ درد مجھے بھی اندر سے اتنا ہی کاٹ رہا ہے۔ میں اس کے لئے دعا کر رہی ہوں، آ کے بعد اسے پھر کبھی رونا نہ پڑے۔ اداسی کی، پریشانی کی اس کی یہ آخری رات ہو۔۔۔ کل سے وہ ایک نیا جیون، ایک نئے رنگ، نئے ڈھنگ سے شروع کرے۔ اور مجھے یقین ہے ایسا ہی ہوگا۔ عفتنا سے بہت خوش رکھے گا۔“ آنکھوں کے کناروں سے نمکین پانی کے چند قطرے بہت خاموشی سے ٹوٹ پلکوں سے گرے تھے اور لامعہ حق تیزی سے پلٹ کر اس کمرے میں موجود ہجوم میں غائب ہو گئی تھی۔

کچھ دور فاصلے پر کھڑے ہوئے اوزان سید نے اسے بغور دیکھا تھا۔ ماہوش اس کی سمت پلٹی تھیں۔

”اوزان! وہاں باہر لان میں لائٹنگ کروادی تم نے؟“

”جی۔۔۔“ اوزان نے بہت آہستگی سے سر ہلایا تھا۔ دھیان اب بھی اس طرف تھا جس طرف لامعہ گئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ ماہوش نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔ مگر اوزان سید کچھ نہیں بولا تھا۔

”سوجتی ہو تو مجھے خود بھی عجیب لگتا ہے۔ کل وہ تعلق لامعہ کی زندگی کا حصہ تھا اور آج۔۔۔“

انا بیہ اس سے جڑنے جا رہی ہے۔ سوچو تو یہ بات معمولی نہیں۔ نہ ہی نظر انداز کئے جانے کے قابل۔ لا اس صورتحال سے بہت آرام سے نہیں گزر رہی۔۔۔ یقیناً اس کے اندر کہیں بہت کچھ ہو رہا ہے۔ جس

بھید وہ ہمیں نہیں دینا چاہتی۔ جب کہ یہ انا بیہ کی عادت تھی۔ چپ چاپ اپنے اندر کی باتوں کو چھپانا لیتا۔ وہ اپنی کوئی بات مجھ سے بھی کبھی ڈھنگ سے نہیں کہہ پاتی۔ میں اسے خود سے سمجھتی تھی۔

لامعہ۔۔۔ لامعہ بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر چیخ چیخ کر رونے لگتی تھی اور اٹینشن چاہتی تھی۔ صورتحال سے گزر رہی ہوتی تھی سب کو بتانا چاہتی تھی۔ مگر آج۔۔۔ آج مجھے اس کے اندر ایک سکا

تیرتا دکھائی دے رہا ہے۔ اور میں جانتی ہوں اس کی وجہ کیا ہے۔ وہ چپ چاپ اپنے اندر کہیں گم ہو ہے۔ آج میں انا بیہ کی چپ سے زیادہ اس کی چپ سمجھ رہی ہوں۔ اس خاموشی کے سارے اسباب

میں مجھے۔ ماں ہوں نا، کسی ایک بچے کی تکلیف بھی نہیں جمیل سکتی میں۔ ایک وقت میں اپنے سار بچوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔“ ماہوش بہت جذباتی انداز میں کہہ رہی تھیں۔ مگر اوزی کا چہرہ ساٹ

وہ شاید اس وقت کچھ اور سوچ رہا تھا۔ نگاہ اب بھی اسی سمت تھی جہاں لامعہ حق گئی تھی۔

وہ کہیں سے لوٹی تھی تو گھر میں غیر معمولی ہلچل تھی۔ تمام ملازم یہاں سے وہاں بھاگتے ہوئے خانے سے مستعد دکھائی دے رہے تھے۔

”کہیں مائی اماں واپس تو نہیں آگئیں؟“ میرب سیال نے سوچا تھا اور آگے بڑھ آئی تھی۔ مگر مائی اماں کے آنے کے شواہد ناپید تھے۔

اس نے قریب سے گزرتی زینخا کو روکا تھا۔

”زینخا! یہ کیا ہو رہا ہے؟۔۔۔ مائی اماں آچکی ہیں کیا؟“

زینخا مسکرا دی تھی۔

”نہیں جی۔۔۔ مائی اماں تو واپس نہیں آئیں۔ مگر ایک بہت خاص مہمان آ رہا ہے صاحب کا۔ خاص ہدایت کی جا رہی ہے۔ پورے گھر کو نئے سرے سے صاف ستھرا کرنے کا آرڈر دیا ہے۔ پورے گھر کے نوکروں کو تو جیسے پر لگ گئے ہیں۔“ زینخا مسکراتی ہوئی کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی۔

میرب سیال نے کسی قدر حیرت میں گھر کر سوچا تھا۔

’کون۔۔۔؟‘ تجسس نہ ہونا عجب تھا۔ مہمان یقیناً سردار سبکگین حیدر لغاری سے ہی تعلق رکھتا تھا۔ تبھی تو مائی کے نہ ہونے کے باوجود وہ اتنا مستعد ہو رہا تھا۔

’مگر کون۔۔۔؟‘ وہ سوچتی ہوئی اپنے ہی دھیان میں آگے بڑھی تھی جب کسی سے ٹکرائی تھی۔ سنبھل کر دیکھا تھا۔ نظروں کے عین سامنے سردار سبکگین حیدر لغاری تھا۔

”کیا ہوا سوٹی؟۔۔۔ کہاں گم ہو؟“ اس کے چہرے کو ہاتھ میں لے کر بغور توجہ سے دیکھتے ہوئے یوں دریافت کیا تھا جیسے وہ دنیا کا سب سے اچھا شوہر ہو۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی جیسے وہ اس کی کیفیت سے

حد درجہ محفوظ ہو رہا تھا۔

میرب سیال نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کی گرفت سے نکلنے کی ایک سعی کی تھی۔ مگر سردار سبکگین حیدر لغاری ابھی اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ غور توجہ سے اس کے چہرے کو تکتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”اتنا بے خبر اور انجان رہنا اچھی بات نہیں سوٹی!۔۔۔ خود کو بیدار رکھا کرو۔ اپنے خوابوں کی حفاظت کرتے رہنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔ بہت ضروری ہے کہ تم ان خوبصورت آنکھوں کو

خندشوں سے، بے کار کے واہموں سے آزاد کرو۔ ایک خوبصورت تجربے کے طور پر یہ سہی، کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟“ مدہم لہجے میں کوئی اسم پھونکنا چاہتا تھا اس پر۔ میرب سیال اس کی گرفت میں پھر پھڑا

کر رہ گئی تھی۔ اس شخص کے تیور نہ مجھ میں آنے والے تھے۔

اس کے چہرے پر جھکا وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

”تمہارا پرانم یہ ہے کہ تم اپنے اندر کی خبر کسی کو ہونے دینا نہیں چاہتی ہو۔ مگر کوئی نگاہ ان تیور کو بھی نہیں مانتی۔“ کتنی گرم گرم سانس اس کے چہرے پر تھیں۔ حدت سے وہ جلتے کو تھی۔

”توڑ دو یہ فضول کی دیواریں — یہ حد بندیاں — نکل کر دیکھو ان سے باہر۔ جان پاؤ گی کہ زندگی کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے اور جینے کا لطف کیا — جو تمہاری طرح فکروں سے بندھے رہتے ہو دو دن بھی ڈھنگ سے جی نہیں پاتے۔ اپنے آپ کو جینے دو — مائل کرو کہ جینا بہت ضروری ہے۔ ایک بل میں ہزاروں لمحے سمیٹ لینے کا ہنر سیکھو — جان لو کہ ہزار لمحوں میں زندگی نہیں ہوتی کبھی فقط ایک ایک لمحہ جینے کے لئے اپنے اندر کئی صدیاں رکھتا ہے۔ تجربہ کرو کبھی اور جان لو، ان شب و روز حقیقت کیا ہے — ایک لمحے کے لئے نہیں، ایک پل کے لئے بھی نہیں، صدیوں کے لئے۔ صدیوں رازوں بھری بات جان لو۔ اور مان لو کہ تم غلط ہو۔ قبول کرو کہ تم نے کبھی وہ لطف آگہی اور رمز آشنائی ہی نہیں۔ چانا ہی نہیں۔ بھی خود کو کھوجا ہی نہیں۔ کھوج لیتیں تو جان پاتیں کہ تم بے رنگ، پھیکے رنگوں جی رہی ہو اور اس زندگی کی حقیقت کچھ نہیں۔ تیار ہو جاؤ، فاطمہ پھپھو کے ہاں عرفان کی شادی کی تقریب ہے، وہاں جانا ہے۔ اس کے بعد نئے لمحوں کا سوا گت ہمیں بھی اسی قدر جوش و خروش سے کرنا ہے۔ اگر انتظار طویل ہے اور صبر آزمایا —“

”لامعہ! مجھے یہ احساس واقعی جینے نہیں دے گا۔ میں جب تک عرفان علی خان کے ساتھ جیوں گی، مجھے یہ بات مارتی رہے گی کہ میں نے تمہارا، اپنی دوست کا حق غضب کیا۔ میں نے تمہیں — لامعہ! تم.....“ انابہ شدت جذبات سے چپ ہو گئی تھی۔ لامعہ نے بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا تھا اور باہر نکل آئی تھی۔ مگر اپنے عین سامنے کھڑے اوزی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اوزی نے اسے بغور دیکھا تھا۔ لامعہ نظریں چرا گئی تھی۔ اوزی نے بہت آہستگی سے بنا کچھ کہے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ لامعہ کسی قدر حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ اوزی کی نظریں بدستور اس کے چہرے کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔

”اوزی! — تم —“ لامعہ نے کسی قدر الجھن سے اسے دیکھا تھا۔

”شادی کرو گی مجھ سے؟“ اوزان سید نے بغور دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

لامعہ حق اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔

”میں کہہ رہا ہوں — مجھ سے شادی کرو گی؟“ اوزان سید نے اپنا سوال دہرایا تھا۔

لامعہ حق اب بھی اسی قدر حیران تھی۔ زبان گنگ تھی۔ جیسے اس کے پاس بولنے کو لفظ نہ تھے۔

”میں تمہیں اپنا نا چاہتا ہوں — اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں — بولو، کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟“ اوزان سید نے اپنی بات کو آگے بڑھایا تھا۔

”یہ..... کیا عجیب سوال ہے؟“ لامعہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ واضح انداز میں کنفیوژڈ دکھائی دے رہی تھی۔

”سوال عجیب نہیں ہے لامعہ! بہت بروقت اور مناسب ہے — تم یہ مت سمجھو کہ یہ کوئی بہت جلدی کا فیصلہ ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“

”مگر — میں — اتنی جلدی — اوزی! تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو؟ — پاگل ہو گئے ہو

تم — یہاں انابہ کو لے کر اتنی ٹینشن رہی اور اب جبکہ اس کی شادی ہو رہی ہے تو تم — کہیں تم بھی

”توڑ دو یہ فضول کی دیواریں — یہ حد بندیاں — نکل کر دیکھو ان سے باہر۔ جان پاؤ گی کہ زندگی کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے اور جینے کا لطف کیا — جو تمہاری طرح فکروں سے بندھے رہتے ہو دو دن بھی ڈھنگ سے جی نہیں پاتے۔ اپنے آپ کو جینے دو — مائل کرو کہ جینا بہت ضروری ہے۔ ایک بل میں ہزاروں لمحے سمیٹ لینے کا ہنر سیکھو — جان لو کہ ہزار لمحوں میں زندگی نہیں ہوتی کبھی فقط ایک ایک لمحہ جینے کے لئے اپنے اندر کئی صدیاں رکھتا ہے۔ تجربہ کرو کبھی اور جان لو، ان شب و روز حقیقت کیا ہے — ایک لمحے کے لئے نہیں، ایک پل کے لئے بھی نہیں، صدیوں کے لئے۔ صدیوں رازوں بھری بات جان لو۔ اور مان لو کہ تم غلط ہو۔ قبول کرو کہ تم نے کبھی وہ لطف آگہی اور رمز آشنائی ہی نہیں۔ چانا ہی نہیں۔ بھی خود کو کھوجا ہی نہیں۔ کھوج لیتیں تو جان پاتیں کہ تم بے رنگ، پھیکے رنگوں جی رہی ہو اور اس زندگی کی حقیقت کچھ نہیں۔ تیار ہو جاؤ، فاطمہ پھپھو کے ہاں عرفان کی شادی کی تقریب ہے، وہاں جانا ہے۔ اس کے بعد نئے لمحوں کا سوا گت ہمیں بھی اسی قدر جوش و خروش سے کرنا ہے۔ اگر انتظار طویل ہے اور صبر آزمایا —“

”لامعہ! مجھے یہ احساس واقعی جینے نہیں دے گا۔ میں جب تک عرفان علی خان کے ساتھ جیوں گی، مجھے یہ بات مارتی رہے گی کہ میں نے تمہارا، اپنی دوست کا حق غضب کیا۔ میں نے تمہیں — لامعہ! تم.....“ انابہ شدت جذبات سے چپ ہو گئی تھی۔ لامعہ نے بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا تھا اور باہر نکل آئی تھی۔ مگر اپنے عین سامنے کھڑے اوزی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اوزی نے اسے بغور دیکھا تھا۔ لامعہ نظریں چرا گئی تھی۔ اوزی نے بہت آہستگی سے بنا کچھ کہے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ لامعہ کسی قدر حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ اوزی کی نظریں بدستور اس کے چہرے کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔

”اوزی! — تم —“ لامعہ نے کسی قدر الجھن سے اسے دیکھا تھا۔

”شادی کرو گی مجھ سے؟“ اوزان سید نے بغور دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

لامعہ حق اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔

”میں کہہ رہا ہوں — مجھ سے شادی کرو گی؟“ اوزان سید نے اپنا سوال دہرایا تھا۔

لامعہ حق اب بھی اسی قدر حیران تھی۔ زبان گنگ تھی۔ جیسے اس کے پاس بولنے کو لفظ نہ تھے۔

”میں تمہیں اپنا نا چاہتا ہوں — اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں — بولو، کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟“ اوزان سید نے اپنی بات کو آگے بڑھایا تھا۔

”یہ..... کیا عجیب سوال ہے؟“ لامعہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ واضح انداز میں کنفیوژڈ دکھائی دے رہی تھی۔

”سوال عجیب نہیں ہے لامعہ! بہت بروقت اور مناسب ہے — تم یہ مت سمجھو کہ یہ کوئی بہت جلدی کا فیصلہ ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“

”مگر — میں — اتنی جلدی — اوزی! تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو؟ — پاگل ہو گئے ہو

تم — یہاں انابہ کو لے کر اتنی ٹینشن رہی اور اب جبکہ اس کی شادی ہو رہی ہے تو تم — کہیں تم بھی

”توڑ دو یہ فضول کی دیواریں — یہ حد بندیاں — نکل کر دیکھو ان سے باہر۔ جان پاؤ گی کہ زندگی کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے اور جینے کا لطف کیا — جو تمہاری طرح فکروں سے بندھے رہتے ہو دو دن بھی ڈھنگ سے جی نہیں پاتے۔ اپنے آپ کو جینے دو — مائل کرو کہ جینا بہت ضروری ہے۔ ایک بل میں ہزاروں لمحے سمیٹ لینے کا ہنر سیکھو — جان لو کہ ہزار لمحوں میں زندگی نہیں ہوتی کبھی فقط ایک ایک لمحہ جینے کے لئے اپنے اندر کئی صدیاں رکھتا ہے۔ تجربہ کرو کبھی اور جان لو، ان شب و روز حقیقت کیا ہے — ایک لمحے کے لئے نہیں، ایک پل کے لئے بھی نہیں، صدیوں کے لئے۔ صدیوں رازوں بھری بات جان لو۔ اور مان لو کہ تم غلط ہو۔ قبول کرو کہ تم نے کبھی وہ لطف آگہی اور رمز آشنائی ہی نہیں۔ چانا ہی نہیں۔ بھی خود کو کھوجا ہی نہیں۔ کھوج لیتیں تو جان پاتیں کہ تم بے رنگ، پھیکے رنگوں جی رہی ہو اور اس زندگی کی حقیقت کچھ نہیں۔ تیار ہو جاؤ، فاطمہ پھپھو کے ہاں عرفان کی شادی کی تقریب ہے، وہاں جانا ہے۔ اس کے بعد نئے لمحوں کا سوا گت ہمیں بھی اسی قدر جوش و خروش سے کرنا ہے۔ اگر انتظار طویل ہے اور صبر آزمایا —“

”لامعہ! مجھے یہ احساس واقعی جینے نہیں دے گا۔ میں جب تک عرفان علی خان کے ساتھ جیوں گی، مجھے یہ بات مارتی رہے گی کہ میں نے تمہارا، اپنی دوست کا حق غضب کیا۔ میں نے تمہیں — لامعہ! تم.....“ انابہ شدت جذبات سے چپ ہو گئی تھی۔ لامعہ نے بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا تھا اور باہر نکل آئی تھی۔ مگر اپنے عین سامنے کھڑے اوزی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اوزی نے اسے بغور دیکھا تھا۔ لامعہ نظریں چرا گئی تھی۔ اوزی نے بہت آہستگی سے بنا کچھ کہے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ لامعہ کسی قدر حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ اوزی کی نظریں بدستور اس کے چہرے کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔

”اوزی! — تم —“ لامعہ نے کسی قدر الجھن سے اسے دیکھا تھا۔

”شادی کرو گی مجھ سے؟“ اوزان سید نے بغور دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

لامعہ حق اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔

”میں کہہ رہا ہوں — مجھ سے شادی کرو گی؟“ اوزان سید نے اپنا سوال دہرایا تھا۔

لامعہ حق اب بھی اسی قدر حیران تھی۔ زبان گنگ تھی۔ جیسے اس کے پاس بولنے کو لفظ نہ تھے۔

”میں تمہیں اپنا نا چاہتا ہوں — اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں — بولو، کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟“ اوزان سید نے اپنی بات کو آگے بڑھایا تھا۔

”یہ..... کیا عجیب سوال ہے؟“ لامعہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ واضح انداز میں کنفیوژڈ دکھائی دے رہی تھی۔

”سوال عجیب نہیں ہے لامعہ! بہت بروقت اور مناسب ہے — تم یہ مت سمجھو کہ یہ کوئی بہت جلدی کا فیصلہ ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“

”مگر — میں — اتنی جلدی — اوزی! تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو؟ — پاگل ہو گئے ہو

تم — یہاں انابہ کو لے کر اتنی ٹینشن رہی اور اب جبکہ اس کی شادی ہو رہی ہے تو تم — کہیں تم بھی

سب لوگوں کی طرح یہی تو محسوس نہیں کر رہے کہ میرے ساتھ.....؟“ لامعہ نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”دیکھو اوزان سید! میرے ساتھ ایسا ویسا کچھ غلط نہیں ہو رہا یہاں۔ اور تم — تم نے یہ کہا بھی کیسے؟ تم جانتے ہونا، میں ایک بار پہلے بھی تمہیں انکار کر چکی ہوں۔ اور پریوز کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟ اس طرح سچ راہ کھڑے، اچانک افراتفری میں راستہ روک کر؟ رشتے اتنی ہی آسانی سے بنتے ہیں کیا؟ مذاق سمجھ رکھا ہے تم نے شادی کو؟“ لامعہ نے سختی سے کہتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”نہیں — میرے نزدیک شادی مذاق نہیں ہے لامعہ! تبھی تو تمہیں پریوز کر رہا ہوں۔ وقت ہے تمہارے پاس — تم مجھے سوچ کر جواب دے سکتی ہو۔ مگر میرا نہیں خیال کہ تمہارے پاس انکار کا کوئی جواز ہوگا۔ پھر بھی میں تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گا۔“

اوزی پلٹا تھا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔ لامعہ حق کتنی دیر تک کھڑی اس سمت دیکھتی رہی تھی۔

زندگی لمحہ لمحہ سفر کرتی ہے اور ہر قدم اپنے ساتھ ایک نیا تجربہ لے کر آتا ہے۔ وہ تجربہ جو اس سے قبل نہیں کیا ہوتا۔ نظر وہ رنگ دکھاتی ہے جو اس سے قبل نہیں دیکھا ہوتا۔

انابیہ رخصت ہو کر ایک نئی دنیا باس نے عفتان علی خان کے گھر آ گئی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ نہ دل میں کوئی اُمٹنگ تھی نہ تنگ۔ جلد عروسی میں وہ بُت بنی چپ چاپ بیٹھی تھی جب عفتان علی خان دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ تب بھی نہیں چوکی تھی۔

عفتان علی خان نے دروازہ بند کیا تھا اور چند لمحوں کے لئے عجب ایک متذبذب میں وہیں کھڑا رہا تھا۔ انابیہ شاہ بنا گھونگھٹ کے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ عفتان علی خان کے اندر داخل ہونے پر وہ چوکی نہیں تھی۔ بس چپ چاپ اٹھی تھی اور چلتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جاڑی تھی۔ آہستہ آہستہ سارے زیوروں سے خود کو آزاد کیا تھا اور زرتار سرخ آپٹل بیڈ پر اچھالتے ہوئے چلتی ہوئی ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

عفتان علی خان ان اقدامات کو چپ چاپ کھڑا دیکھ رہا تھا۔ کہنے کو، بولنے کو کچھ نہ تھا۔ اور کہتا بھی کس سے؟ درود یوار سے بات کرنے کا اُسے کوئی جنون نہ تھا۔ پاگل تھا کسی کے عشق میں۔ مگر اب اتنا بھی نہیں کہ — کیسے کیسے خواب نہ بجائے تھے۔ مگر آج تو سب دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔

یہ وقت —

یہ لمحے —

جیسے کبھی خواب تھے۔

انابیہ کا ملنا — اپنی زندگی میں آنا اُسے ناممکن لگتا تھا۔ مگر آج — آج وہ اس کی زندگی میں تھی — ایک چھت — ایک کمرے میں — ایک درود یوار کے ساتھ، اس کے ساتھ موجود تھی۔ قرب تھا، اختیار تھا۔

استحقاق جمانے کے سارے حق وہ محفوظ رکھتا تھا۔ مگر جیسے قدم بندھے ہوئے تھے اور دل..... شاید..... اب وہ بھی مر چکا تھا۔

وہ کچھ دیر تک ویسے ہی کھڑا رہا تھا۔ پھر آگے بڑھ آیا تھا۔ تبھی ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول کر انابیہ باہر نکلی تھی اور نظر اس پر پڑی تھی اور چونک کر رک گئی تھی۔ کچھ دیر تک خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔ عفتان علی خان کچھ نہیں بولا تھا۔ غالباً وہ اس صورت حال پر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کا رویہ کیسا ہونا چاہئے۔ وہ چپ چاپ کھڑا دیکھ رہا تھا جب انابیہ چلتی ہوئی اس کے قریب آن رکی تھی۔

”توجیت گئے تم؟“ بالآخر فاتح رہے تم۔ جو چاہا، حاصل کر لیا۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر کسی کی انا بوجھ ہو رہی ہو۔ کسی کو سنا کر بنا پڑ رہا ہے، یا پھر کوئی بے موت مر رہا ہے یا مر مر کر جی رہا ہے۔ عفتان علی خان! تمہیں تو جینتے کی عادت ہو چکی ہے۔ اور اپنی اس جیت کے لئے تم کچھ بھی کر سکتے ہو — کسی بھی حد تک جا سکتے ہو۔ اور ایسا میں دیکھ چکی ہوں۔“ انابیہ کا لہجہ ٹھوس مگر دھیمہ تھا۔ عفتان علی خان اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا — کیا دیکھ چکی ہو تم؟“ میں نہیں سمجھا — کیا دیکھا ہے تم نے؟“

”تم — تم نہیں سمجھتے ہو عفتان! کہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟ تم نہیں سمجھتے ہو کہ میں کیا بات کر رہی ہوں اور کیوں کر رہی ہوں؟“ انابیہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے چیختی تھی۔

”تم — کیا سمجھتے ہو عفتان! تم اتنا کچھ کر گزرو گے اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ کوئی عقل نہیں رکھتا تمہارے علاوہ یہاں؟ کیا سب اندھے ہیں یہاں؟ نہ کوئی دیکھ سکتا ہے نہ ہی سمجھ سکتا ہے؟“

عفتان علی خان کے چہرے کی کیفیت متغیر ہو گئی تھی۔ بہت غصے سے اس وقت انابیہ کو دیکھا تھا۔

”انابیہ! تم جو کہنا چاہتی ہو اس پر اچھی طرح سے غور کر لو — میں تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ اور میرا خیال ہے ابھی تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں یہیں ہوں سننے کے لئے۔ تم کہتی رہنا، میں سنتا ہوں گا۔ فی الحال تم آرام کرو۔“ ساٹ لہجے میں کہہ کر وہ پلٹا تھا جب انابیہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کے سامنے آن رکی تھی۔

”کیا سمجھتے ہو تم — بہت اسارٹ ہو، بہت بڑے کھلاڑی ہو؟ جب، جس طرح چاہو گے کھیلتے رہو گے؟“

عفتان علی خان کا ضبط جواب دینے کو تھا۔ مگر وہ سختی سے لب بھینچ گیا تھا۔ پھر ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے اسے شانوں سے تھام کر بخور دیکھا تھا۔

”انابیہ! تمہیں آرام کی شدید ضرورت ہے۔“

”کیا — کیا سمجھتے ہو تم؟“ پاگل ہوں میں؟ کیا سمجھتے ہو تم، اتنی بدھو اور بے وقوف ہوں کہ تم نے جو کیا وہ سمجھ ہی نہ پاؤں گی؟“ انابیہ چیختی تھی۔

”عفتان! — زندگی تاش کا کھیل نہیں ہے کہ تم اپنی مرضی کے پتے اٹھا اٹھا کر اپنے ہاتھ میں رکھتے

جاؤ اور جیت ہار بارتہاری ہی ہو۔ میں صرف تمہیں اتنا بتانا چاہتی ہوں کہ تم کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ کیونکہ اس بارتہم جیت کر بھی نہیں جیت سکو گے۔“

”کیا۔ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ عفتان علی خان نے اُسے شانوں سے تھام کر جھجھوڑا تھا۔ ”بولو، کیا سمجھ رہی ہو تم؟ اور کیا سمجھانا چاہ رہی ہو تم مجھے؟ کیا، کیا ہے میں نے؟ بولو، کیا کیا ہے میں نے؟ کون سی جیت کو تم میری جیت کہہ رہی ہو؟ کہاں فاتح رہا ہوں میں؟ تم یہاں اس کمرے میں میرے سامنے ہو تو کیا یہ میری جیت ہے؟ پاگل! ایسا تو میں بہت پہلے بھی کر سکتا تھا۔ کیا مشکل تھا میرے لئے۔ میری محبت کو میری کمزوری مت سمجھو۔ اگر آج تم یہاں اس کمرے میں موجود ہو تو صرف اس لئے کہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ کوئی احسان نہیں کیا میں نے تم پر۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں خود تم سے دستبردار ہو جاتا، یہ سن کر بھی کہ تم کسی اور کے متعلق سوچتی ہو۔ کسی اور کو چاہتی ہو، تمہیں اپنی زندگی میں داخل کر لینا آسان نہیں تھا میرے لئے۔ اور تم ہو کہ اب بھی۔“ ایک جھٹکے سے اسے چھوڑتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ضبط کی برداشت کی جیسے یہ حد تھی اُس کی۔

”پتہ نہیں کیا کیا سوچ رہی ہو تم۔ کیا کیا الزام لگا رہی ہو۔ لیکن میں۔ میں شاید کبھی کسی شے کی وضاحت نہیں کر سکوں گا۔ کسی شے کی صفائی نہیں دے سکوں گا۔ کبھی کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکوں گا۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج تک میں اپنی محبت کو تم پر ثابت نہیں کر سکا۔ ایک ایک بل، ایک ایک دن، ایک ایک رات، کس قدر، کس طرح سوچا نہیں۔ کس طرح چاہا۔ مگر تم آج تک، اسی ایک عہد کو نہیں پاسکیں تو آج۔ آج کیا سمجھ پاؤ گی؟“ مدھم لہجے میں افسوس ہی افسوس تھا۔ ”تمہیں جو سوچنا ہے، سوچتی رہو۔ جو الزام لگانا چاہتی ہو لگاتی رہو۔ میرے پاس کسی الزام کے لئے نہ تاویل ہے نہ کوئی وضاحت، نہ کوئی صفائی، نہ ثبوت۔ جو کرنا چاہتی ہو تم کو۔ جرم ثابت کرنے کے لئے جو کر سکتی ہو کر لو۔ میرے پاس تب بھی یہی جواب ہو گا۔ ہر صفائی یہی ہو گی کہ میں نے تم سے پیار کرنے کا جرم کیا ہے۔ اور وہی جرم مسلسل کر رہا ہوں۔ نہ کبھی خود کو اس سے روک سکا ہوں نہ ٹوک سکا ہوں۔“ اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔

”بارہا۔ بارہا سوچا۔ بارہا دیکھا تمہیں۔ اور پھر سوچا، ایسا کیا ہے تم میں؟ ایسا کیا؟ کیوں اس قدر پاگل ہو رہا ہوں میں؟ مگر نہیں۔“ سرفہمی میں ہلاتے ہوئے نگاہ پھیر گیا تھا۔ ”کبھی نہیں سمجھ سکا۔ کبھی کوئی جواز تمہارے خلاف نہیں رہا۔ کجخت یہ دل بھی کبھی تمہارے خلاف نہیں رہا۔ اب کیا کروں، جب میرا دل ہی میرے ساتھ نہیں تو پھر کسی اور سے کیا شکوہ کروں؟ تم تو پھر کوئی اور ہو۔ مجھ سے الگ ہو۔ مجھ سے جدا۔ نہ رابطہ، نہ واسطہ، کچھ نہیں۔ صرف ایک سکوت۔ اور سکوت کو سمجھنے کی تم کبھی کوشش نہیں کر سکتیں۔“ وہ جانے کو آگے بڑھا تھا۔

”تم اس طرح خود کو بچا کر نہیں جاسکتے ہو۔ نہ ہی تم اتنے انجان ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ تم اس معاملے میں ملوث رہے ہو۔ جب کچھ اور نہ بن سکا تو یہ راہ اپنائی۔ مجھے اغواء کرایا، پھر بازیا ب کرایا۔ جھوٹی

ہمدردی جتنی اور موڑ توڑ کر راہ وہاں تک لا کر ختم کی کہ تمہارا سارا مطلب پورا ہو گیا۔ میرے لئے زندگی کے درد اڑے بند کر کے تم نے اپنے لئے زندگی کی نئی راہیں کھولی ہیں۔ تم ایک خود غرض شخص ہو۔ جو صرف اپنا مفاد دیکھتا ہے اور بس۔ اپنے فائدے کے لئے جو کچھ بھی کر سکتا ہے وہ سب تم نے کیا۔ سب کی نظروں میں ہمدردی بھی سیٹی، مجھ پر احسان بھی کیا اور وہ سب پا بھی لیا جس کی کبھی تنہا کی تھی۔ کتنے فراڈ شخص ہو تم۔ کتنا بڑا دھوکا ہو۔ یہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ صرف مجھے پانے کے لئے تم اس حد تک گر سکتے ہو، صرف ایک جسم کے لئے۔“ اس کا لہجہ زہر خند تھا۔

عفتان علی خان نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھاما تھا۔ انداز انتہائی پُر اشتعال تھا۔ جیسے اتنا ہیہ نے اس کے اندر ایک الاؤ دہکا دیا تھا۔ آنکھوں میں سرخی ہی آڑ آئی تھی۔ لب سختی سے بھینچے اُسے دیکھتے ہوئے وہ جیسے ہزار ضبط کی راہ سے چپ چاپ گزر رہا تھا۔

”تم جو ثابت کرنا چاہتی ہو کرو، میں وہاں جا کر بھی یہی کہوں گا جو یہاں اس بند کمرے میں تم سے کہا۔ تم جو ثابت کرنا چاہتی ہو کر لو۔ جہاں جانا چاہتی ہو چلی جاؤ۔ جو بھی گناہ ثابت کرنا چاہتی ہو کر لو۔ میں تیار ہوں۔“ مدھم لہجہ اپنے اندر جیسے ہزار ہا طوفان چھپائے ہوئے تھا۔

”تم جو کرنا چاہتی ہو، کر لو۔ شاید ایسا کر کے تم کچھ سمجھ لو جو اب تک نہیں سمجھی ہو۔ مگر میں تم سے اپنی وضاحت کے لئے کچھ نہیں کہوں گا۔ کوئی صفائی نہیں، ایک لفظ بھی نہیں۔ پچھتا رہا ہوں آج میں۔ بہت غلط جگہ ڈوبا ہوں میں۔ صرف جسم.....“ چلتی ہوئی آنکھوں سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اُس کے آہنی ہاتھوں کی گرفت خود بہ خود ہی اس کے نازک کندھوں پر سخت ہو گئی تھی۔ شعلہ برساتی نظریں اس لمحہ اتنا ہیہ کے چہرے پر گر گئی تھیں۔

”کیا۔ کیا سمجھتی ہو تم؟ صرف جسم۔ اور اس سے آگے کچھ نہیں۔ بہت چھوٹا سوچتی ہو تم۔ بہت چھوٹی عقل ہے تمہاری۔ تم یا تمہارا جسم میرے لئے پانا کبھی کوئی پرالتم تھا ہی نہیں۔ بولو، کب میں بے اختیار تھا؟ کب میں تمہیں نہیں پاسکتا تھا؟ ہزار ہا لمحے تھے میرے پاس۔ میں ایسا جنب چاہتا کر سکتا تھا۔ میرے لئے تمہیں یا تمہارے جسم کو حاصل کرنا مشکل نہیں تھا۔ تم ہی کیا، کوئی بھی لڑکی، جب چاہتا، جہاں چاہتا حاصل کر سکتا تھا۔ مگر صرف محبت کی مالا جپتا رہا میں۔ آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی میری۔ اندھا ہو گیا تھا تمہاری محبت میں۔ بہت کمزور پڑ گیا تھا اپنی اس محبت کے ہاتھوں۔ تم، تمہارے خیال، تمہاری محبت سے باہر کبھی نکل ہی نہیں سکا۔ اس سے آگے کبھی کچھ سوچ ہی نہیں سکا۔ ورنہ کیا مشکل تھا میرے لئے۔ اور بقول تمہارے، تمہارا اغواء بھی میں نے ہی کیا۔ تو پھر کیا مشکل تھا تمہیں وہاں بھی پالینا۔ ایسا تو میں وہاں بھی کر سکتا تھا۔ آخر تمہیں اغواء کرنے میں کچھ تو فائدہ نکلتا میرا۔ یونہی کلاسیاں کاٹ کر کیوں چھوڑ دینا؟“ انتہائی درشتی سے کہتے ہوئے اسے ایک جھٹکے سے چھوڑا تھا۔

”کچھ نہیں سمجھتی ہو تم۔ کچھ نہیں۔ فضول ہے تم سے سر پھوڑنا۔ تم سدا اسی ڈگر پر چلتی رہو گی۔ اور اسی طرح سوچتی رہو گی۔“ لب سختی سے بھینچ کر وہ پلٹا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔ اتنا ہیہ پانیوں سے بھری آنکھوں سے اسی جگہ بیٹھتی چلی گئی تھی۔

کیا عذاب آزا تھا اب کے آنکھوں پر —
 نہ چین تھا، نہ قرار تھا۔
 عجب مشکل میں تھی جان۔

شادی کی تقریب میں شرکت کے بعد میرب سیال خاصی تھک گئی تھی۔ ایک خاص رشتے کے ساتھ، خاص حوالے کے ساتھ۔ یہ سب تجربے بڑے انوکھے اور نئے تھے۔ انوشے وغیرہ اسے کئی حوالوں سے چھیڑ رہی تھیں اور سوائے مسکرانے کے اس کے پاس کوئی آپشن نہ تھا۔ اتنا مسکرائی تھی کہ جڑے تک دکھنے لگے تھے۔

ہاتھوں سے چہرے کو دونوں طرف سے دباتی ہوئی، زینہ چڑھ رہی تھی تبھی کچھ آوازوں کے ساتھ اپنے پیچھے اُسے کچھ آہٹیں سنائی دی تھیں۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری تقریب میں اُسے تہا چھوڑ کر کسی ضروری کام سے نکل گیا تھا۔ وہ واپس ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی۔ غالباً وہی لوٹا تھا۔ اُس نے کسی قدر اطمینان سے چہرے کا رخ پھیر کر اپنے پیچھے ہال میں دیکھا تھا۔ مگر نگاہ ساکت رہ گئی تھی۔

ہال کا منظر نامہ خاصا مختلف تھا۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری وہاں کسی کے ساتھ موجود تھا۔ میرب سیال کی نگاہ ساکت رہ گئی تھی۔ دور کھڑی مسکرائی ہوئی 'گی' کو دیکھا تھا۔

گی نے اُسے دیکھ کر اپنا ہاتھ بلایا تھا۔ وہ فوری طور پر کوئی رد عمل ظاہر نہ کر سکی تھی۔ مگر وہ اس لمحے اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ بغور توجہ سے گی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تو یہ ہے وہ خاص مہمان۔

یہ تھی وہ شخصیت جس کا انتظار اتنے جوش و ولولے سے کیا جا رہا تھا۔

اور وہ سردار سبکتگین حیدر لغاری کا ولولہ۔ وہ بے قراری۔ وہ سب خاص تیاریاں صرف اس ایک فرد کے لئے تھیں؟

تو کیا گی اتنی اہم تھی اس شخص کے لئے؟

اس قدر اہم تھی کہ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کے لئے دن گن گن کر کاٹے تھے۔ وہ شوق، وہ لگن صرف اس چہرے کے لئے تھی؟ تو پھر اس سے اس کی وہ لگاؤ، وہ توجہ کس لئے تھی؟

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے پھر کیا پینتزا بدلا تھا ایک لمحے میں کہ اس کے لئے کہانی کو سمجھنا پہلے سے زیادہ دشوار ہو گیا تھا۔ اب کیا کھیل تھا، کس طرح کھیلا جا رہا تھا؟ یہ سمجھنا اسے انتہائی دشوار لگا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری کو سمجھنا یقیناً آسان نہ تھا۔ وہ کوششیں کر کر کے ہار گئی تھی۔ اور یہ کھلا تھا کہ سب ناممکن ہے۔

کتی پھٹی پھٹی حیرت سے بھری آنکھوں سے وہ ساکت بُت بنی کھڑی ان دونوں کی سمت دیکھ

رہی تھی۔

کیا ہو رہا تھا یہ؟
 کیوں ہو رہا تھا؟

سردار سبکتگین حیدر لغاری کیا کر رہا تھا یہ؟

وہ اُس کی منگوحہ تھی، اس کی دسترس میں تھی اور وہ نئے جہانوں کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ یہی مزاج تھا اُس کا۔ پھر میرب کیوں نہیں سمجھی تھی؟ کیوں نہیں اسے لگا تھا کہ سب اگر ویسا ہی ہے اور ویسا ہی رہتا ہے تو وہ کیوں خود کو اس درجہ ڈھال رہی ہے؟ اس کے ماحول میں، کیوں رنگ رہی ہے ایک نئے ڈھنگ، نئے رنگ میں؟ کیوں سمجھوتوں کے پیل باندھ رہی ہے؟ اس کے اور اپنے درمیان پڑنے والی دیواریں ڈھار رہی ہے۔

پاگل۔ بالکل پاگل تھی وہ۔

جو سمجھ رہی تھی کہ سردار سبکتگین حیدر لغاری کبھی بدل بھی سکتا ہے۔ وہ ایک نئے زاویے میں۔ نئے رنگ میں ڈھل سکتا ہے۔

بالکل غلط قیاس کیا تھا اس نے۔ وہ مڑی تھی۔ پلٹنے لگی تھی جب سردار سبکتگین حیدر لغاری کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

”میرب! سنو۔“ وہ زکنا نہیں چاہتی تھی مگر جانے کیا ہوا تھا کہ قدم آگے بڑھ ہی نہ سکے تھے۔ اسی جگہ پر جم گئے تھے۔ کسی میکانکی انداز میں وہ پلٹی تھی۔ لبوں سے بولی کچھ نہیں تھی۔ بس چپ دیکھا تھا۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری بہت دکاشی سے مسکرایا تھا۔

”زلیخا کو آرڈر کر کے بھجوا دو۔ کچھ اچھا سا۔ تم سمجھ رہی ہونا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ مسکراتے ہوئے بدستور نگاہ اس کے چہرے پر تھی۔ میرب سیال کسی قدر دوری پر تھی مگر اس کے باوجود وہ اس شخص کی آنکھوں کے رنگ کو پڑھ سکتی تھی اور جان سکتی تھی کہ اس گھڑی وہ کس درجہ محظوظ ہو رہا تھا اور کس

درجہ سرشار تھا۔ مائی کے جانے کے بعد اس کے یہ رنگ بہت انوکھے تھے۔ آج سے پہلے کچھ بھی تھا، سردار سبکتگین حیدر لغاری کسی لڑکی کو کبھی اس طرح گھر کی دلہنیز پار کر اندر نہیں لایا تھا۔ مگر آج، مائی کے گھر پر نہ ہونے سے وہ ساری حد بندیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ جوان دیکھی ایک دیوار تھی وہ اب نہیں رہی تھی۔

”میرب!“ اُسے چپ چاپ بُت بنا کھڑا دیکھ کر سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اُسے پکارا تھا۔

وہ چونکی تھی۔

”جی۔۔۔؟“ عجب سعادت مند انداز تھا۔ جیسے وہ واقعی اُس کی خادم تھی اور اس کی خدمت پر نامور تھی۔

”پھر جاؤ۔“ عجب حکم صادر ہوا تھا۔ صوفے پر گی کے کسی قدر قریب بیٹھا وہ بہت دھیمے سے مسکرا رہا تھا۔ وہ پلٹی تھی جب آواز ایک بار پھر تعاقب میں آئی تھی۔

”میرب۔۔۔!“

اُس کی برداشت کی حد تھی مگر کسی کے سامنے وہ کسی طرح کی کوئی بد مزگی نہیں چاہتی تھی۔ اپنا کسی اور تماشہ بنوانا مقصود نہ تھا۔ سبھی بہت سعادت مندی سے دوبارہ پلٹی تھی۔

”جی۔۔۔ کچھ اور؟“ بہت ضبط سے مسکراتے ہوئے وہ یوں بولی تھی جیسے وہ اس گھر کی ملازمہ ہو۔ گی نے اس کے کان کے قریب اپنے گدازب کر کے کچھ کہا تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری مسکرایا تھا میرب سیال اب بھی منتظری، تابعدار کھڑی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری غالباً اُسے وہیں روک کر بھول چکا تھا۔ میرب سیال نے کچھ دیر ضبط کے بند باندھتے ہوئے اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔ پھر بول پڑی تھی گین اپنی منظور نظرگی کے ساتھ کچھ زیادہ ہی مصروف نظر آ رہا تھا۔

”سردار سبکگین حیدر لغاری! کیا میں جاؤں؟“ اجازت نامہ پیش ہوا تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری۔ جو نکتے ہوئے سراثت میں ہلا دیا تھا۔

میرب سیال پلٹی تھی اور آگے بڑھنے لگی تھی۔ اندر کہیں بہت سادھوں بھر رہا تھا۔ بہت بے عزتی محسوس ہو رہی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے حد کر دی تھی۔ واقعی کسی ملازمہ کی طرح پیش آ رہا تھا اس سے اپنی نظروں میں گنتی بے وقعت سی لگی تھی وہ۔۔۔ تذلیل کے احساس سے آنکھیں جلنے لگی تھیں اور جل جانے اور بھی کیا کچھ کہاں کہاں رہا تھا۔ مگر یہ جاننے کی فرصت کسے تھی۔

”مائی! آپ کیوں گئیں؟۔۔۔ خدا را واپس آ جائیں۔“ زینبا کو محترم سردار سبکگین حیدر لغاری کی ہدایت خاص پہنچا کر وہ اپنے کمرے کی طرف آ رہی تھی تو بے ساختہ دل سے نکلا تھا۔ اور ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ نکلے تھے۔

کیسا جیون ساتھی ملا تھا؟

جس کے ساتھ ہر لمحہ ایک نیا امتحان تھا۔ ہر لمحہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اور ہر تجربہ پہلے سے زیادہ مختلف تھا اس مختصر سے عرصے میں اتنے نئے رنگ دیکھ لئے تھے تو چنانچہ عمر بھر کتنے تجربوں کے رنگ دیکھنا باقی تھے۔ وہ کس سے کہتی؟۔۔۔ کس سے سنتی؟۔۔۔ کوئی پرسان حال بھی تو نہ تھا۔

اذہان حسن بخاری نے فیصلہ کر لیا تھا، ایک نئی زندگی میں داخل ہونے کا۔ نئے رفیق، نئے ہم سفر کے ساتھ۔ سو گزشتہ عہد کی باتوں کو فراموش کر دینا بھی اتنا ہی ضروری تھا۔ اگر چہ نئی انور ایسا ممکن نہ تھا مگر وہ جانتا تھا، ساہیہ کی محبت ایسا کر دے گی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی قدر مطمئن نظر آ رہا تھا۔

رات کے کھانے پر چیئر کھینچ کر بیٹھے ہوئے وہ بہت ملامت سے مسکرایا تھا۔

فارحہ نے اسے بغور دیکھا تھا اور مسکرا دی تھیں۔

”کچھ مختلف لگ رہے ہو آج۔ کوئی خاص بات؟“

اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”مئی! آپ وہ واحد نظر رکھتی ہیں جو میرے اندر جھانک لیتی ہے۔“

”ہاں۔ مگر اب مجھے لگ رہا ہے ان دنوں.....“ فارحہ نے بیٹے کو چھیڑا تھا۔ اذہان مسکرا دیا تھا۔

”مجھے معلوم تھا آپ جان چکی ہیں۔“ فارحہ نے مسکراتے ہوئے سرٹھی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ تم بتاؤ نا، معاملہ کیا ہے؟۔۔۔ کوئی نیا کاروباری معاہدہ کیا ہے یا کچھ اور؟“

اذہان ہنس دیا تھا۔

”مئی! آپ بھی نا۔۔۔ لڑکی دیکھ لی ہے میں نے آپ کی بہو بنانے کے لئے۔“

”اچھا۔۔۔ کون ہے وہ؟“ فارحہ مسکرائی تھیں۔

”آپ کی پسند، ساہیہ خان۔ اور کون۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے جیسے ہتھیار ڈالے تھے۔

فارحہ مسکرا دی تھیں۔

”تو بالآخر کسی فیصلے پر پہنچ گئے تم۔“

”ہاں۔۔۔ میں نے سوچا، اور مجھے لگا، واقعی ساہیہ وہ لڑکی ہے جو مجھے چھیل سکتی ہے۔ جو مجھے ایک اچھی زندگی دے سکتی ہے۔“ وہ مسکرایا تھا۔ ”اس کی رفاقت مجھے ایک نیا احساس دلا سکتی ہے۔“

”یعنی اب میں تمہارا رشتہ باضابطہ لے کر ساہیہ کے گھر جا سکتی ہوں؟“ فارحہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے سراثت میں ہلا دیا تھا۔

”ہاں!۔۔۔ یہ باقی سب لوگ نظر نہیں آ رہے۔ ماہا، چاچو؟“

”فیض تو خیر تھکا ہوا ہے، اپنے کمرے میں آرام کر رہا ہے۔ ماہا پڑھ رہی ہے۔“ ماہا کے نام پر فارحہ کا چہرہ کسی قدر بچھ کر رہ گیا تھا۔

”کیوں، کیا ہوا؟ آپ اس طرح پریشان کیوں ہو گئیں؟۔۔۔ کوئی پریشانی؟“ اذہان نے دریافت کیا تھا۔

فارحہ فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکی تھیں۔ اور اذہان سمجھ گیا تھا کہ کوئی بات ضرور ہے۔

”مئی! آپ پھر مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔“ چانچتی نظروں سے ماں کو دیکھا تھا۔

”نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ دراصل۔۔۔ تمہارے پاپا۔۔۔ ایک رشتہ ماہا کے لئے لائے تھے۔ تم کچھ دنوں سے یوں بھی پریشان تھے کہ میں نے تمہیں پریشان کرنا ضروری خیال نہیں کیا۔“

”رشتہ۔۔۔ کیسا رشتہ؟۔۔۔ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ کون ہے؟۔۔۔ کیا کرتا ہے؟“ اذہان نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

”تمہارے پاپا کے کوئی جاننے والے ہیں۔“ فارحہ نے دانستہ چھپایا تھا۔

”جاننے والے؟۔۔۔ پاپا کے ایسے کون سے جاننے والے ہیں جن کے متعلق میں نہیں جانتا؟ آپ بتائیے، مجھے ضرور علم ہوگا۔ آپ نے بتایا نہیں، لڑکا کیا کرتا ہے؟“

”سعد بتا رہے تھے، اپنا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنے والا ہے۔۔۔ اُن کی دوسری بیوی کا کوئی رشتہ دار ہے۔“

چہرے کو بنور گھورتے ہوئے وہ انتہائی سخت لہجے میں بولا تھا۔ مگر انا بیہ مسکرا دی تھی۔
 ”اپنی کمزوریوں کو دبانے کی عادت ہو چکی ہے تمہاری۔ کبھی کسی خول تے، کبھی کسی خول تے۔ سچ تو یہ ہے عفتان علی خان! کہ تم مصلحتوں کے عادی ہو تے جا رہے ہو۔ کیونکہ تمہارے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ جو صورت حال کو اپنے بس میں نہ کر پاؤ، وہ جھنجھلا کر یونہی تاویل میں تلاش تے ہیں۔ بودے اور غیر موثر جواز ڈھونڈ تے ہیں تاکہ اپنی ذات کی قلعی نہ کھل جائے اور بات کسی قدر بنی رہے۔“ انا بیہ شاہ رشت لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتی ہوئی بولی تھی۔

عفتان علی خان کا ہاتھ اٹھا تھا مگر جانے کیوں ہوا میں ہی مطلق رہ گیا تھا۔ اُس نے انتہائی جارحانہ انداز میں سرخ آنکھوں کے ساتھ اس کی سمت دیکھتے ہوئے اٹھا ہوا ہاتھ پیچھے ہٹایا تھا اور اسے ایک جھٹکے سے پھوڑتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

انا بیہ خاموشی سے دروازے کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر مسکرا دی تھی۔
 ”یہ پہلا دن ہے۔ آج کے دن کی ابتداء کے لئے یہ کافی ہے۔ شام ہوگی تو پھر سوچیں گے، کیا ح رہا کیا نقصان۔ کیا سود رہا، کیا خسارہ۔ مگر آج کی شروعات اچھی رہی۔ بیٹ آف لک مسٹر ننان علی خان! اگرچہ آپ کا برا وقت شروع ہو چکا ہے۔“ ایک شدید ترین کیفیت کے ساتھ لب بھینچ کر وہ انا تھی اور واش روم میں گھس گئی تھی۔

موسم اچانک ہی بدلا تھا۔
 شدید ترین بارش ہو رہی تھی۔ جب اذہان حسن بخاری کا فون بجا تھا۔ وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔
 ”جی می؟“

”اذہان! وہ ماہا۔۔۔ ماہا گھر پر نہیں ہے۔“
 ”گھر پر نہیں ہے؟ کہاں گئی؟“ اذہان کے لئے خبر جیسے دھماکا تھی۔
 ”مجھے نہیں پتہ۔ شام تک اپنے کمرے میں تھی۔ فیض اُس کے پاس تھا۔ دونوں کتنی دیر بیٹھے باتیں تے رہے تھے۔ میں مطمئن ہو کر چکن کی طرف آگئی تھی مگر دوبارہ جھانک کر اس کے کمرے میں دیکھا تو ہاں نہیں تھی۔“

”فیض چاچو کہاں ہیں؟ ان کو ماہا کے متعلق کچھ پتہ ہے؟“ اذہان نے دریافت کیا تھا۔
 ”نہیں۔ وہ تو ہسپتال کے لئے نکل گیا تھا شام کی چائے کے بعد ہی۔ ابھی فون کیا ہے، وہ بھی واپس آ رہے۔ کچھ میں نہیں آ رہا، آخر وہ جا کہاں سکتی ہے؟“ اذہان! ماہا کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ تم جانتے (دونوں مجھے کس قدر عزیز ہو۔“ فارحہ دوسری طرف رونے لگی تھیں۔ اذہان کے لئے صورت حال کو انا دشوار ہو گیا تھا۔

”مئی! آپ فکر نہ کریں۔ میں دیکھتا ہوں۔ وہ کہیں نہیں جاسکتی۔ میری بہن ہے وہ۔ میں اُسے ہوں۔ آپ خدارا حوصلہ رکھیں۔ اور فیض چاچو آ جائیں تو مجھے اطلاع دیں۔ میں راستے میں ہوں۔“

چہرے کو بنور گھورتے ہوئے وہ انتہائی سخت لہجے میں بولا تھا۔ مگر انا بیہ مسکرا دی تھی۔
 ”اپنی کمزوریوں کو دبانے کی عادت ہو چکی ہے تمہاری۔ کبھی کسی خول تے، کبھی کسی خول تے۔ سچ تو یہ ہے عفتان علی خان! کہ تم مصلحتوں کے عادی ہو تے جا رہے ہو۔ کیونکہ تمہارے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ جو صورت حال کو اپنے بس میں نہ کر پاؤ، وہ جھنجھلا کر یونہی تاویل میں تلاش تے ہیں۔ بودے اور غیر موثر جواز ڈھونڈ تے ہیں تاکہ اپنی ذات کی قلعی نہ کھل جائے اور بات کسی قدر بنی رہے۔“ انا بیہ شاہ رشت لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتی ہوئی بولی تھی۔

عفتان علی خان کا ہاتھ اٹھا تھا مگر جانے کیوں ہوا میں ہی مطلق رہ گیا تھا۔ اُس نے انتہائی جارحانہ انداز میں سرخ آنکھوں کے ساتھ اس کی سمت دیکھتے ہوئے اٹھا ہوا ہاتھ پیچھے ہٹایا تھا اور اسے ایک جھٹکے سے پھوڑتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

انا بیہ خاموشی سے دروازے کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر مسکرا دی تھی۔
 ”یہ پہلا دن ہے۔ آج کے دن کی ابتداء کے لئے یہ کافی ہے۔ شام ہوگی تو پھر سوچیں گے، کیا ح رہا کیا نقصان۔ کیا سود رہا، کیا خسارہ۔ مگر آج کی شروعات اچھی رہی۔ بیٹ آف لک مسٹر ننان علی خان! اگرچہ آپ کا برا وقت شروع ہو چکا ہے۔“ ایک شدید ترین کیفیت کے ساتھ لب بھینچ کر وہ انا تھی اور واش روم میں گھس گئی تھی۔

موسم اچانک ہی بدلا تھا۔
 شدید ترین بارش ہو رہی تھی۔ جب اذہان حسن بخاری کا فون بجا تھا۔ وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔
 ”جی می؟“

”اذہان! وہ ماہا۔۔۔ ماہا گھر پر نہیں ہے۔“
 ”گھر پر نہیں ہے؟ کہاں گئی؟“ اذہان کے لئے خبر جیسے دھماکا تھی۔
 ”مجھے نہیں پتہ۔ شام تک اپنے کمرے میں تھی۔ فیض اُس کے پاس تھا۔ دونوں کتنی دیر بیٹھے باتیں تے رہے تھے۔ میں مطمئن ہو کر چکن کی طرف آگئی تھی مگر دوبارہ جھانک کر اس کے کمرے میں دیکھا تو ہاں نہیں تھی۔“

”فیض چاچو کہاں ہیں؟ ان کو ماہا کے متعلق کچھ پتہ ہے؟“ اذہان نے دریافت کیا تھا۔
 ”نہیں۔ وہ تو ہسپتال کے لئے نکل گیا تھا شام کی چائے کے بعد ہی۔ ابھی فون کیا ہے، وہ بھی واپس آ رہے۔ کچھ میں نہیں آ رہا، آخر وہ جا کہاں سکتی ہے؟“ اذہان! ماہا کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ تم جانتے (دونوں مجھے کس قدر عزیز ہو۔“ فارحہ دوسری طرف رونے لگی تھیں۔ اذہان کے لئے صورت حال کو انا دشوار ہو گیا تھا۔

”مئی! آپ فکر نہ کریں۔ میں دیکھتا ہوں۔ وہ کہیں نہیں جاسکتی۔ میری بہن ہے وہ۔ میں اُسے ہوں۔ آپ خدارا حوصلہ رکھیں۔ اور فیض چاچو آ جائیں تو مجھے اطلاع دیں۔ میں راستے میں ہوں۔“

تھا۔ عفتان علی خان نے مُڑ کر اس کی طرف بغور دیکھا تھا۔
 یہ تھی وہ لڑکی۔ جس سے اس کے خیال آباد تھے۔ دل آباد تھا۔ اور اس نے ایک غلطی کر دی تھی۔ اس کے ساتھ اپنا گھر بسانے کا خواب بھی دیکھ لیا تھا۔ مگر یہ خواب پورا ہو کر بھی جیسے پورا تھا۔ وہ آج اس کے ساتھ تھی۔ مہرا تھی۔ مگر یہ سب ہو کر بھی جیسے کچھ نہ تھا۔ سارے خواب جل گے اور سارا منظر دھواں دھواں تھا۔

”رشتہ ہوتا کبھی نہیں ہے۔ رشتہ بنانا پڑتا ہے۔ مگر تم شاید اس بات سے ناواقف ہو۔ ہر باتوں کی طرح تم کبھی یہ بات بھی سمجھ نہیں پاؤ گی۔“ عفتان علی خان کا لہجہ پُر افسوس تھا۔
 ”ایسی بات کہتا ہوا وہ شخص اچھا نہیں لگتا جو خود انجان نہ ہو۔ رشتے بہت خالص ہوتے ہیں اور چیزوں کے بارے میں ہی لوگ باتیں کرتے اچھے لگتے ہیں جو خود بھی اسی قدر خالص ہوں۔ بے ایر اور دھوکے باز یوں پر رشتے قائم کرنے والے صرف جھوٹے ہوتے ہیں۔ اور جھوٹے لوگ حق اور بات کرنے کا بھی کوئی حق نہیں رکھتے۔“

انا بیہ شاہ کا لہجہ زہر خند تھا۔
 عفتان علی خان جواباً اُسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔
 ”میرا آج کسی بھی طرح کی تقریب میں شرکت کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ بہت تھک چکی ہوں آرام کروں گی۔ ولیمہ ملتوی کر دو۔“ انا بیہ کا لہجہ ہٹ دھری لئے ہوئے تھا۔
 ”کیا؟“ عفتان علی خان حیران رہ گیا تھا۔ ”تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟“
 ”ہاں۔۔۔“ انا بیہ کا لہجہ مطمئن اور پُر اعتماد تھا۔ ”جب کوئی رشتہ ہے ہی نہیں تو میں یہ دکھاؤ۔ کیوں کروں؟“

”دکھاؤ؟“ عفتان علی خان کا لہجہ بے یقینی لئے ہوئے تھا۔ جیسے اُسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس حد تک بھی جاسکتی ہے۔
 ”تم انہیں دکھاؤ گئی ہو؟۔۔۔ یہ رشتوں کا احساس ہے۔ یہ رئیس ہی تو ہیں جو دلوں کو دلوں باندھتی ہیں۔ مگر میں یہ سب باتیں تمہیں کیوں بتا رہا ہوں جبکہ تمہیں اس سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ عفتان علی خان نے کسی قدر افسوس سے سرفی میں ہلایا تھا۔
 انا بیہ مسکرا دی تھی۔ جیسے وہ اس شخص کو چڑانا چاہتی تھی۔

”تمہارا ایک مسئلہ ہے عفتان!۔۔۔ تم بہت جذباتی واقع ہوئے ہو۔ مردوں کو اس درجہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں صرف لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ اگر دماغ سے کام لیتے تو آج شاید صورت تمہارے حق میں ہوتی۔“ انداز عجب تپانے والا تھا۔ اور عفتان علی خان جیسا جھنڈا مزاج شخص اس انتہائی جارحانہ انداز میں اس کی سمت بڑھا تھا اور اسے شانوں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔
 ”عفتان علی خان کو اتنا کمزور مت جانو۔ اگر میں چپ ہوں، کچھ چھیل رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اتنا کمزور ہوں۔ یہ میری ناکامی، یہ میری کمزوری صرف جزوقتی ہے۔ مصلحتاً ہے۔“ انا

جن جگہوں کے بارے میں مجھے معلوم ہے، وہاں دیکھتا ہوں۔ آپ بھی ماہا کی دوستوں کے گھرنون کر یا جیسی صورت حال چل رہی تھی، اسے لے کر ایسا تو ہونا ہی تھا۔ آخر عاجز آگئی تھی نا وہ۔ پایا کو بھر کر دیتے۔ شاید اب انہیں کچھ خیال آجائے اور ان کی آنکھیں کھل جائیں۔“ اذہان کو رہ رہ کر سعد بخاری پر غصہ آ رہا تھا۔ آخر سب کیا دھرا انہی کا تو تھا۔ ماہا گھر چھوڑ کر یونہی تو کہیں نہیں چلی گئی تھی ”بے وقوف لڑکی۔ مجھ سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ بھائی کے ہوتے ہوئے، ایسے بے وقوف اقدام۔“ اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے وہ کسی قدر جھنجھلایا تھا۔ ماہا نے یقیناً غلط کیا تھا۔ مگر وہ اب پریشان ہو چکا تھا۔

زندگی میں پے در پے پریشانیوں اور صرف مسائل تھے۔ چین کی کوئی گھڑی اب تک نہیں آئی تھی۔ لے ڈرائیو کرتے ہوئے ساہیہ کا نمبر ملایا تھا۔ ”ساہیہ! ماہا گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ تم اگینے کے ساتھ گھر چلی جاؤ۔ می پریشان ہیں خدا را ان کی ہمت بندھاؤ۔ مجھے پتہ ہے ماہا کہاں گئی ہوگی۔“ ”مگر ماہا نے گھر چھوڑا کیوں؟۔۔۔ ہوا کیا ہے؟“ ساہیہ نے کسی قدر تشویش سے دریافت کیا ”بہت لمبی کہانی ہے یہ۔ اس وقت سنانا ممکن نہیں ہے۔ مگر بس یہ سمجھ لو، یہ اس واقعے کی ایک کڑی جس کے تحت ماہا کو پہلے بھی نشانہ بنایا جا چکا ہے۔ ہمارے والد صاحب۔ انہیں صرف اپنا مفاد ہے۔ نہ اولاد عزیز ہے نہ گھریار۔ عجیب شخص ہیں۔ پتہ نہیں کب سمجھیں گے۔“ اذہان انداز جھنجھلایا ہوا تھا۔

”تم پریشان مت ہو۔۔۔ میں اگینے پھینچو کے ساتھ ابھی نکل جاتی ہوں۔ پریشان مت ہو، ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ بہتر ہی کرے گا۔ بس تم پریشان مت ہو۔“ ساہیہ نے اس کا حوصلہ بندھایا تھا۔ ”شکر ہے۔“

”اپنا خیال رکھنا۔ موسم ٹھیک نہیں ہے۔ گھر کی فکر مت کرنا۔ میں سب سنبھال لوں گی۔“ نے فکر مندی سے کہا تھا۔ اذہان شدید ترین ذہنی دباؤ میں تھا۔ ”بہتر۔“ کہہ کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا اور پوری توجہ ڈرائیونگ پر مبذول کر دی تھی۔ ذہن مہلچہ رہا تھا۔ وہ پھر ایک گردان میں تھا۔

نیویارک سے پایا کا فون تھا۔ حسب معمول وہ انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”آپ سب کب واپس آئیں گے؟۔۔۔ میں بہت تنہا محسوس کر رہی ہوں۔“ میرب نے آنسو کے درمیان کہا تھا۔

”تم فکر مت کرو۔ ہم جلد آجائیں گے۔ بس تمہارے پایا کے کچھ ٹیسٹ مزید ہو جائیں۔ ڈاکٹر مطمئن ہو جاتے ہیں تو ہم واپس آجائیں گے۔ اگر تم زیادہ اُداس ہو تو کچھ دن کے لئے چلی آؤ۔ دوبارہ نے کہا تھا۔

وہ سرفی میں ہلانے لگی تھی۔

”نہیں۔۔۔ پہلے ہی پڑھائی کا بہت حرج ہو چکا ہے۔ بس آپ پایا کا خیال رکھیں۔“ ”اور تم اپنا۔“ دوبارہ نے اسے تاکید کی تھی۔

”ہاں، میں رکھوں گی۔۔۔ مگر سچ کہوں۔۔۔ آپ سب کے بغیر یہاں کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“ ”میرب ہار رہی تھی۔ دل بھر بھر آ رہا تھا۔

”ارے گین کے ہوتے ہوئے بھی؟“ دوبارہ نے چھیڑا تھا۔ مگر میرب اس کے باوجود نہیں مسکرائی۔ ”نہیں۔۔۔ فون رکھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے کو آگے بڑھی تھی جب اپنے پیچھے کچھ دہلی دہلی آوازیں سنائی دے گئیں۔

وہ چونک کر مڑی تھی۔ اندھیرے میں کچھ فاصلے پر کوئی تھا۔ باتوں کے دبے دبے انداز بتا رہے تھے۔ ”اسرار ہے۔۔۔ میرب سیال دو قدم آگے بڑھی تھی۔ لاؤنج کی مدھم روشنی میں منظر کسی قدر واضح لہے تھے۔

گی، سردار سبکدین حیدر لغاری کے بہت قریب کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں تیزی سے بھگ رہی تھیں۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ فاصلہ کچھ زیادہ تھا، لفظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ میرب دبے قدموں کچھ اور آگے ہی تھی اور ستون کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”گین!۔۔۔ میں کیسے اس پریشانی سے نکلوں؟۔۔۔ میرے لئے تمہارا مراحل سے گزرنا بہت ارہے۔ ایک تنہا، ایکلی عورت یہ سب نہیں سہہ سکتی۔ تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو؟۔۔۔ بغیر شادی کے بننا اور اس کے بعد کی پیچیدگیاں سہنا آسان نہیں ہے۔ میں اس وجود کو دنیا میں لانا چاہتی ہوں، مگر مکمل تحفظ بھرے احساس کے ساتھ۔ کیا یہ اتنا ہی مشکل خواب ہے کہ جو پورا نہیں ہو سکتا؟۔۔۔ کیا چاہ رہی ہوں میں؟۔۔۔ کیا غلط سوچ رہی ہوں؟۔۔۔ ہر ماں یہی تو چاہتی ہے کہ اس کا بچہ ایک پورا اعتماد کے ساتھ سر اٹھا کر بنے، دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے تو اسے کوئی شرمندگی نہ ہو۔ یہ غلط ہے کہ اگر میں اپنے بچے کے نام کے ساتھ..... تاکہ وہ بھر پورا اعتماد کے ساتھ سر اٹھا کر بنے۔ دنیا ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے تو اسے کوئی شرمندگی نہ ہو۔ میں اپنے بچے کے نام کے ساتھ ایک بھر پور دیتا ہوا نام بھی جڑا دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا یہ خواہش اتنی ہی عجیب ہے کہ پوری نہ ہو سکے؟“

آوازیں بے حد واضح تھیں اور میرب سیال کو لگا تھا اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ گی جو رہی تھی، وہ ایک کہانی تھی اور اس کہانی کا سرا صرف گی سے ہی نہیں ملتا تھا، اس کا دوسرا سرا یقیناً سردار حیدر لغاری سے جڑتا تھا۔ تبھی تو وہ اس وقت رات کی تاریکی میں اس کے اتنے قریب کھڑی مدعا کر رہی تھی۔

میرب سیال کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ یقین کر لیتا چاہتی تھی کہ جو اس نے سنا وہ طرح سے غلط تھا یا پھر اس کی سماعتوں کا دھوکا تھا، یا پھر جو اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہی کوئی تھا۔

میرب سیال نے اپنی سمندر بنی آنکھوں سے اس شخص کی سمت دیکھا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے مرکز اس کی سمت ابھی پیش قدمی کی ہی تھی کہ وہ سرعت سے مڑی تھی اور تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف آگئی تھی۔ بند دروازے سے لگ کر وہ کتنی دیر تک سر اٹھائے چپ چاپ چھت کو گھورتی رہی تھی۔ پھر وہیں بیٹھتی ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے دروازہ بجایا تھا۔

”میرب! میرب!“ دو چار آوازیں بھی دی تھیں مگر میرب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ شاید مایوس ہو کر سردار سبکتگین حیدر لغاری واپس پلٹ گیا تھا۔

میرب کی سسکیاں تا دیر کمرے میں گونجتی رہی تھیں۔ جانے کتنی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھی روتی رہی تھی۔ پھر یکدم اٹھی تھی اور اپنا تمام ضروری سامان نکال کر ایک سوٹ کيس میں بھرا تھا اور تیزی سے بھاگتی ہوئی آنکھیں تختی سے ہاتھ کی پشت سے رگڑتی ہوئی وہ سوٹ کيس اٹھائے باہر نکل آئی تھی۔ مگر عین سامنے سردار سبکتگین حیدر لغاری اس کا منتظر تھا۔

”کیا تماشہ ہے یہ؟ کیا ہوا ہے؟ یہ کیا کر رہی ہو تم؟ یہ سوٹ کيس — یہ سب کیا ہے؟“

مگر میرب سیال کچھ نہیں بولی تھی۔ چپ چاپ اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے سوٹ کيس اس کے ہاتھ سے چھین کر دوڑ دھکیل دیا تھا۔ میرب نے تب اکیلے ہی آگے بڑھنے کی ٹھانی تھی۔ مگر سردار سبکتگین حیدر لغاری نے سختی سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میرب سیال مڑی تھی اور اپنے نازک ہاتھوں کے کتنے ہی کئے اس کے سینے پر برسائے تھے۔

کتنے ہی کئے برسائے ہوئے وہ چیخے جا رہی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کے نازک سے ہاتھوں کو بجائے روکنے کے اس کے نازک سے وجود کو اپنے مضبوط آہنی بازوؤں کے حصار میں سمیٹ لیا تھا۔ میرب سیال دھواں دھار ہو رہی تھی۔

”چھوڑ دو مجھے — چھوڑ دو۔“ میرب سیال نے اس کے آہنی حصار سے خود کو ایک جھٹکے سے آزاد کر لیا تھا۔

”تم یہاں سے نہیں جا سکتی ہو۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے سختی سے حکم صادر کیا تھا۔

”کون — کون رو کے گا مجھے، تم؟ کون لگتے ہو تم میرے؟ — کیا رشتہ ہے میرا تم سے؟ صرف ایک کاغذی رشتہ۔ اس کے سوا کیا حیثیت ہے میری؟ — یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی۔ بہت سزا کر لیا میں نے۔ اب میں اور مزید نہیں.....“

”میرب! تم میری بات سنو۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھوڑا تھا۔

”کچھ نہیں سننا چاہتی میں۔ خدا را تم میری راہ چھوڑ دو۔ ورنہ — ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی۔“

میرب جیسے ہوش و حواس میں نہ تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچے ہوئے کسی قدر خشکیوں نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”دگین! — بتاؤ مجھے، کیا کروں میں؟ — میں اس بچے کا گلا دنیا میں آنے سے قبل ہرگز گھونٹ سکتی۔ میں اتنی ظالم نہیں ہوں۔ مگر میں اتنی بہادر بھی نہیں ہوں کہ تنہا اس کی ساری ذمے دار اٹھا لوں۔ جس طرح کی بے تحفظ زندگی میں نے بسر کی، میں نہیں چاہوں گی کہ میرا بچہ بھی ویسے ہی اچھے۔ میں اس کے لئے ایک الگ دنیا بنانا چاہتی ہوں۔ وہ دنیا جو میری زندگی اور میری دنیا سے مختلف ہو لو گین! — یہ کیسے ممکن ہو سکے گا؟ — تم چپ کیوں کھڑے ہو؟ — کچھ بولتے کیوں؟ کیا میں سمجھوں کہ واقعی میں اس کھلے آسمان تلے تنہا کھڑی ہوں اور میرے ساتھ کوئی نہیں؟“

”جذبانی مت ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بچے کی پیدائش تک ہمیں میرے پاس رہو۔ کچھ کوشش کرتا ہوں۔ تب تک کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔ تم روؤ نہیں — سب ٹھیک ہو گا۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کی خواب ناک آنکھوں سے گرتے گرم گرم اشک چھتے ہوئے مضبوط لہجے میں تسلی دی تھی۔

میرب سیال کا دل جیسے ایک لمحے کو دھڑکننا بھول گیا تھا۔ وہ ساکت سی کھڑی تھی۔

”دگین! تم جتنا آسان لے رہے ہو معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔ تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو؟“

”ہاں جانو! فی الحال میرے لئے یہ تھوڑا مشکل ہے۔ مگر میں تمہیں اس بات کی تسلی دیتا ہوں کہ جلد صورت حال بس میں ہو جائے گی۔ تب تک تو تم یہاں میرے پاس رہ سکتی ہو نا۔ بغیر کسی ڈراؤ کے۔“ دگین اس کی آنکھیں پونچھتے ہوئے مسکرایا تھا۔ غالباً وہ گی کا موڈ بحال کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر گی نہیں مسکرائی تھی۔

”اچھا بتاؤ — بچے کا نام کیا رکھو گی؟“ دھیان بھیرا تھا۔

”پتہ نہیں۔ بچے کا نام تو باپ رکھتا ہے۔ اور تم.....“ گی نے اُلجھن سے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اس بات کی فکر کرنے کی بھی فی الحال ضرورت نہیں۔ ابھی تو اس ہے۔ تم خواہ مخواہ کی فکریں مول مت لو جانو! تمہیں اپنا بہت زیادہ خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔“

”ہاں — مگر تم —“ گی کے آنسو پھر تو اتر سے بہنے لگے تھے۔

”اپنی دوا لی تم نے؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے بھرپور توجہ سے دریافت کیا تھا۔ گی نے سر میں ہلایا تھا۔

”میں نے اس ملک کی سب سے بہترین گائنی سے بات کر لی ہے۔ کل تمہارا چیک اپ ہے۔ ہے، میرے پاس وقت نہ ہو۔ تم ڈزا نیور کے ساتھ ضرور چلی جانا۔“ انداز خیال رکھنے والا تھا۔ میرب نے اس سے قبل سردار سبکتگین حیدر لغاری کا یہ رویہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ گی کے لئے اور اس دنیا میں والے بچے کے لئے انتہائی پریشان ہو رہا تھا۔

میرب سیال کی دنیا ایک پل میں گھومی تھی۔ وہ اسی طرح ساکت سی کھڑی تھی جب گی کی نظر پڑی تھی۔ اس نے سردار سبکتگین حیدر لغاری کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس نے رخ پھیر کر دیکھا تھا اور سیال کو کچھ فاصلے پر کھڑا پا کر چونک گیا تھا۔

”ہائی کے آنے تک تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔ کہیں نہیں جاسکتی تم۔“ سخت لہجے میں کہا تھا۔ میرا جیسے آج کسی پھری ہوئی شیرینی کی سی ہو رہی تھی۔ عجب طاقت کے ساتھ اسے دھکیلنا چاہا تھا جب کہ سبکدین حیدر لغاری کا ہاتھ ایک لمحہ میں اٹھا تھا اور اس کے چہرے پر اپنے نشان ثبت کر گیا تھا۔

”لحہ بھر کو چاروں طرف سنانا چھا گیا تھا۔ میرب سیال نے اسے بے یقینی سے دیکھا تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری اس کی سمت دیکھتے ہوئے نفوس لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”میں تم سے صرف ایک بات کہہ رہا ہوں۔ تم نہیں جاسکتی۔ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ سن لیا؟“ جانتی ہو، اصولوں کے معاملے میں، میں کس قدر پابند واقع ہوا ہوں۔ مجھے اپنی حکم عدولی قطعاً منظور نہیں ہے۔ کہہ دیا، سو کہہ دیا۔ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ نہ اب۔۔۔۔۔ نہ پر سوں۔ سمجھ گئی؟ تم یہیں رہنا ہے۔ اسی گھر میں، میرے ساتھ۔۔۔۔۔ اپنی چیزوں سے دستبردار ہونے کی عادت نہیں میری۔ اب تک تم دیکھ بھی چکی ہو گی اور سمجھ بھی۔ مجھے نہ کوئی وضاحت دینا ہے نہ ہی کوئی تسلی۔ تم چیخ کر رونا چاہتی ہو تو ایسا بھد شوق کر سکتی ہو۔ میں تمہیں نہ رونے سے منع کروں گا نہ ہی چیخنے چلانے سے مگر تم اس دہلیز سے پار نہیں جاسکتیں۔ اس سے آگے نہیں۔ تم سے میرا کیا رشتہ ہے، یہ بات مجھے بار سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی جتانے کی۔ تم میری بیوی ہو اور ہمیشہ رہو گی۔ اسی طرح میں تم شوہر ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ نہ تم اس حقیقت کو جھٹلا سکتی ہو نہ ہی فراموش کر سکتی ہو۔ حتیٰ کہ تبدیل بھی کر سکتیں۔ جو بخت میں درج ہوتا تھا، ہو چکا۔ اور ہمارے ہاں بار بار بخت نہیں لکھے جاتے۔ سردار سبکدین حیدر لغاری بار بار باتیں دہرانے کا عادی نہیں ہے۔ جتنا عرصہ ساتھ رہی ہو اس میں اتنا تو سمجھ ہی گئی۔ مجھے دوبارہ یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہئے۔ اس گھر کے کچھ قاعدے قانون ہیں۔ اور پورا کرو۔ جو صرف تمہارے لئے وضع کئے گئے ہیں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ کیوں کروں میں ایسا؟۔۔۔۔۔ کس لئے؟۔۔۔۔۔ تم جیسے شخص کے لئے؟ کتنا بڑا؟ ہو تم۔۔۔۔۔ کیوں پابند کر رہے ہو تم مجھے اپنا؟۔۔۔۔۔ کس لئے؟“ میرب چیختی تھی۔

”میں نے کہا نا، کوئی وضاحت نہیں۔ تم اس چار دیواری کے اندر جو کرنا چاہتی ہو کر سکتی ہو۔ چلاؤ، روؤ، جو بھی تمہاری منشا ہے پوری کرو۔ مگر اس گھر سے باہر نکلنا تمہارے لئے ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں؟۔۔۔۔۔ باندی ہوں میں تمہاری؟۔۔۔۔۔ غلام ہوں یا پھر خریدا ہے تم نے مجھے؟۔۔۔۔۔ کیوں مانوں میں تمہاری؟ اور کس لئے؟“ وہ آنسوؤں کے درمیان چیختی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کی سمت دیکھا تھا اور بہت ملائمت سے مسکرا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر اس کے ہاتھ کا نشان اب بھی ثبت تھا۔

سردار سبکدین حیدر لغاری ایک لمحہ کو عجب مجرم سے انداز میں آگے بڑھا تھا اور اس کے چہرے کو تھام بغور توجہ سے دیکھتے ہوئے ملائمت سے چھوا تھا۔

میرب سیال آنکھیں میچ گئی تھیں۔

”مجھے خود پرختی پر مال مت کیا کرو، ہنی! تم ایک بات نہیں جانتی ہو، تم پر جبر کرنا مجھے اچھا نہیں لگا

”بچھتاؤں میں مبتلا کر دیتی ہو تم مجھے۔ جیسے اب، اس لمحے۔ سمجھتی کیوں نہیں ہو تم مجھے؟۔۔۔۔۔ کیوں نہیں سمجھتی ہو کہ۔۔۔۔۔“ مدہم لہجے میں کہتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا اور کسی قدر نفوس سے سرنفی میں ہلانے لگا تھا۔

”نظروں کے سامنے رہتی ہو تو اک آس بندھی رہتی ہے۔ دور چلی جاتی ہو تو اور بھی اجنبی سی لگتی ہو۔ کیوں نہیں سمجھتی ہو تم یہ ساری باتیں؟۔۔۔۔۔ کیا کیا سمجھاؤں میں تمہیں؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری اُنکھن بھرے انداز میں بولا تھا اور پھر اسے وہیں چھوڑ کر وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔

میرب سیال وہیں بیٹھتی چلی گئی تھی۔ آنسو اب بھی متواتر پلکوں سے بہ رہے تھے۔ بہت غلط جگہ پھنسی تھی وہ۔

فرار کی ساری راہیں مسدود تھیں۔

کوئی بہت بڑا دھوکا تھا یا پھر نظریہ فریب کھا رہی تھی!

مگر اب کسی شے کی کوئی گنجائش ہی کہاں تھی؟۔۔۔۔۔ سب کچھ تو صاف صاف تھا۔۔۔۔۔ اگر عقل یا نظر پر کوئی پردہ تھا بھی تو وہ اب ہٹ چکا تھا اور اس وقت نگاہ جو دیکھ رہی تھی اس میں کسی دھوکے یا فریب کا عنصر باقی ہی نہ تھا۔ جو تھا، سب کچھ سچ تھا۔ نہ کوئی غلط فہمی، نہ ہی کوئی اور تاویل۔

تو کیا اسے عقل کی مان لینی چاہئے تھی؟۔۔۔۔۔ اعتبار کر لینا چاہئے تھا اس نگاہ پر؟۔۔۔۔۔ شاید ہاں کہ اس کے علاوہ اب چارہ ہی کیا تھا۔ اور کس خوش فہمی میں رہتی وہ اور کتنے دھوکے کھاتی اور قیاس کرتی کہ سب ٹھیک ہے یا پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ بہت تھکے ہوئے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں واپس آ گئی تھی اور دروازہ بند کر کے بیڈ پر آن گری تھی۔



مگر انا بیہ نہیں رُکی تھی۔ چلتی ہوئی وہ کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

عفتان علی خان کی پیشانی پر کئی سلوٹیں ایک ساتھ واضح ہوئی تھیں۔ ایک جھٹکے سے اٹھا تھا وہ مگر فاطمہ نے بیٹے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور مصلحت سے دیکھا تھا۔

”عفتان! تمہیں اس کا خیال رکھنا ہے۔ اسے زچ نہیں کرنا ہے۔ جو اس کی مرضی ہے اسے پورا کرو۔ اگر وہ جانا نہیں چاہتی تو کوئی زبردستی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عفتان! اُسے تمہاری توجہ کی ضرورت ہے۔ وہ جس فیز سے باہر آئی ہے اس کے متعلق ہم سب بھی جانتے ہیں اور تم بھی جانتے ہو۔ یہ حقیقت سب پر منکشف ہے اور تمہیں اس پر غصہ ہونے کی یا شرمندہ ہونے کی ضرورت بالکل بھی نہیں ہے۔ ہم انا بیہ کی کیفیت سمجھ سکتے ہیں اور تم بھی اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم اسے نارمل حالات میں، نارمل طریقے سے پرکھنے کی اور برتنے کی کوشش کر رہے ہو۔ جبکہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ انا بیہ کو تمہاری نرمی اور توجہ کی خصوصی ضرورت ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔“ فاطمہ نے نرمی سے کہا تھا اور عفتان علی خان ان کی طرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”میرا خیال ہے تمہاری می ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تمہیں اس پر خصوصی توجہ دینی چاہئے۔ انا بیہ کو واقعی تمہاری بہت ضرورت ہے۔“

اور عفتان علی خان چیخ پڑا تھا۔

”نہیں ہے۔ نہیں ہے اُسے میری ضرورت۔ اُسے میری ضرورت بالکل بھی نہیں ہے۔ آپ سب کیوں نہیں سمجھ رہے؟“

ایک جذباتی لمحے کی رو میں بہہ کر وہ چیخا تھا مگر پھر یکدم لب بھینچ کر ملامت بھرے انداز میں پلٹ کر کمرے کی طرف آ گیا تھا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ انا بیہ ڈرینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی کہیں جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ خود کو آئینے میں دیکھتی ہوئی بھر پور توجہ سے اپ اسٹک لبوں پر پھیر رہی تھی۔ آئینے میں عفتان علی خان کے عکس کو دیکھا بھی تھا تو نظر انداز کر دیا تھا۔ عفتان علی خان کے لئے اس کے رویے کو برداشت کرنا جیسے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

وہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھا تھا اور ایک جھٹکے سے اسے کھینچ کر کھڑا کیا تھا۔ انا بیہ شاہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکی تھی اور نتیجتاً وہ اس کی ہانپوں میں، اس کے حصار میں تھی۔ خوشبو کا ایک جھونکا، ایک باؤصبا سا وجود اس لمحے عفتان کی دسترس میں تھا۔ یہ وہ قربت تھی جس کے متعلق اس نے کبھی سوچا تھا۔ یہ وہ خواہش تھی جو اس کے اندر چلتی رہی تھی۔ یہ وہ خواب تھا جو ہمیشہ اس نے دیکھا تھا۔

مگر اس گھڑی، اس لمحے میں جیسے سب کچھ بچ تھا۔ وہ کچھ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔ نہ وہ کپکپاتا ہوا جسم۔ نہ وہ ایک لمحے میں اٹھ کر جھکتی ہوئی گریزاں سی نظر۔ نہ وہ لرزتے لب۔ عفتان علی خان کو اتنی قربت میں اپنے قریب کھڑے اس سراپے میں کچھ کشش محسوس نہ ہوئی تھی۔ نہ لب و رخسار میں، نہ آنکھوں میں، نہ کیسوؤں میں۔ وہ خوشبو سا بدن۔ وہ بھر پور سراپا جیسے اس گھڑی اس کے لئے بے معنی تھا۔

بعض اوقات کمرے کی باتیں صرف کمرے تک محدود نہیں رہتیں۔ رشتوں میں دراڑ ہو تو خبر سب ہو جاتی ہے۔

عفتان علی خان نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اپنے طور پر وہ بات کو سمیٹنا چاہتا تھا۔ صرف اپنے تک محدود رکھا جاتا تھا۔ مگر یہ ممکن نہیں تھا اور بات کھل چکی تھی۔ اس کی زندگی کی شروعات کچھ خوشگوار نہ تھی۔ ایک بھرم تھا جسے وہ قائم رکھنا چاہتا تھا مگر ایسا شاید ناممکن تھا۔ اس کے لئے اس حقیقت پر پردہ رکھنا بہت دشوار ہو گیا تھا۔ کیونکہ دوسرا فریق مخالفت پر مائل تھا۔ دوسری سمت سے کوئی تعاون نہ تھا اور شاید اسے اس امید رکھنا بھی نہیں چاہئے تھی۔ شاید یہی اس رویے کی کوئی شکایت اس سے کی بھی نہ تھی۔ مگر انا بیہ کو اس بات کی مطلق پروا نہیں تھی کہ اس کے باعث کسی کو کون کون کون حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ درحقیقت وہ چاہتا بھی یہی تھی کہ کوئی ان حالات سے گزرے۔ وہ صرف سزا دینا چاہتی تھی۔ عفتان علی خان نے اس داغ کے بعد اس سے کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ایک بے نام رفاقت تھی۔ ایک ان چاہا سفر تھا اور بے نام و نشان راستے تھے۔ اور ان راستوں کوئی ساتھ ہو کر بھی ساتھ نہیں تھا۔

اس شام چائے پر پاپانے اس کے ہاتھ دو سوئٹزر لینڈ کے ٹکٹ پڑائے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”جاؤ۔ زندگی گزارو بھئی۔ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ تمہارے ہنی مون ٹریپ کے ٹکٹس ہیں یہ۔“ پاپانے وضاحت کی تھی اور فاطمہ، بیٹے کی طرف دیکھ کر رہ گئی تھیں۔ انا بیہ سر جھکا۔ چائے کے کپ کو دیکھتی رہی تھی۔

”اگر بچے اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تو ٹھیک ہے۔ ہمیں خواہ مخواہ اصرار نہیں کرنا چاہئے۔ زندگی کی شروعات کیسے ہونی چاہئے، اس بات کا اندازہ ان کو بھی خوب ہوگا۔ اب یہ اس اسٹیج پر تو یقیناً پہنچے ہیں کہ ہم انہیں زندگی کے مفہوم سمجھائیں اور غلط اور صحیح کی تمیز دیں۔“ فاطمہ نے بروقت بول کر چلے صورتحال کو سنبھالا تھا۔ ”کیوں انا بیہ بچے! ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟“ مسکراتے ہوئے انا بیہ شاہ کی طرف دیکھا تھا۔ انا بیہ نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا اور چیر گھبٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”انا بیہ!“ عفتان کو یہ لمحہ جھیلنا کسی قدر دشوار لگا تھا۔ کچھ بھی تھا، اپنی بے عزتی وہ سہہ سکتا تھا۔ مگر اپنے بزرگوں کے لئے انا بیہ کا یہ رویہ اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔

مگر میرب نے سنی ان سنی کر دی تھی۔ ہاتھ دوبارہ اس کی گرفت سے نکالنا چاہا تھا مگر گرفت دوسری طرف اب بھی اتنی ہی مضبوط تھی۔ وہ ایک بار پھر ناکام رہی تھی۔

”میں نے کہا، کچھ کھا کر جاؤ۔“ سردار سبٹنگٹن حیدر لغاری کا لہجہ نرم مگر انداز کسی قدر بارعب تھا۔ میرب سیال کی آنکھوں میں یکدم ہی آنسوؤں کا ایک طوفان اٹھ آیا تھا۔ سوچی سوچی سرخ آنکھوں سے اشک بہت خاموشی سے ٹوٹ کر گرے تھے اور اس کے ساتھ ہی جیسے اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

”کیا کیا چاہتے ہو اب تم؟“ کیا سبٹنگٹن حیدر لغاری؟ مجھے قید کر دینا؟ اس چار دیواری کے اندر دن کر دینا یا پھر اپنی عزت کے لئے میری آواز دبا دینا۔ بولو کیا؟ اب کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟ اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہاری کوئی جاگیر یا ریاست ہوں تو مجھے ایک بار ہی جلا کر خاکستر کر دو۔ ایک بار ہی مجھے زندہ دفن کر دو۔ یہ بار بار کامرنا، لمبے لمبے کی موت بہت تکلیف دہ ہے میرے لئے۔ ایک کام کرو تم، گلا گھونٹ دو میرا۔ تمہاری غیرت کا بھرم بھی رہ جائے گا اور تمہیں بھی کسی قدر تسلی ہو جائے گی۔ مار دو مجھے۔“ میرب چیختی تھی مگر سردار سبٹنگٹن حیدر لغاری پر جیسے اس کی چیخ و پکار کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ بہت تسلی، بہت اطمینان کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامے رکھا تھا اور اسے لے کر چلا ہوا ٹیبل کی طرف آ گیا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے کسی کھینچ کر اسے بٹھایا تھا اور پھر برابر والی کرسی کھینچ کر خود اس کے قریب بیٹھ گیا تھا اور ہاتھ بڑھا کر توں پر جیم لگا کر اس کی سمت بڑھایا تھا۔ مگر میرب بھیگی آنکھوں کے ساتھ چہرے کا رخ بھی پھیر گئی تھی۔

سردار سبٹنگٹن حیدر لغاری نے اس کی سمت لمحہ بھر کو بہ غور دیکھا تھا پھر ہاتھ بڑھا کر ہی اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف پھیرا تھا اور اپنے ہاتھ سے اسے زبردستی ناشتہ کروانے لگا تھا۔

میرب سیال کھانا نہیں چاہتی تھی۔ دو ایک بار اس کا ہاتھ بھی روکا تھا مگر سردار سبٹنگٹن حیدر لغاری نے سامنے کوئی بھی مزاحمت فضول تھی جیسے مسلسل بھیگتی آنکھوں آنکھوں کے ساتھ وہ بنا اس کی طرف دیکھے، لقمے زہر مار کرتی چلی گئی تھی۔

سبٹنگٹن حیدر لغاری کو جیسے اس کے آنسوؤں کی کوئی قدر نہ تھی۔ بنا توجہ دینے، بنا تسلی دیئے، بنا ان آنسوؤں کو صاف کئے وہ اسے ناشتہ کروا رہا تھا۔ جیسے اُسے مطلق پرواہ نہیں تھی کہ وہ روئے یا جو بھی کرے۔

میرب سیال کو اپنی بے بسی پر مزید رونا آ رہا تھا۔ آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ مگر سبٹنگٹن حیدر لغاری کی جانب سے کوئی دلاسا نہیں تھا۔ ناشتہ کروا کر دودھ کا گلاس اس کے لبوں کی طرف بڑھایا تھا۔ جسے میرب نے ہاتھ بڑھا کر خود پکڑ لیا تھا۔ جینا تو تھا۔ سہنا بھی تھا۔ تو پھر اپنے آپ سے یہ دشمنی کیوں؟ جب سارے حالات جھیلنے تھے تو پھر تو اتنا رہنا بھی تو اتنا ہی ضروری تھا۔ وہ نہ تو چپ کر کے بیٹھ سکتی تھی نہ وہاں مزید پڑاؤ کر کے بیٹھے رہنا چاہتی تھی۔ یقیناً اسے سوچنا تھا کسی اگلے اقدام کے بارے میں، کسی راستے، کسی موڑ کے بارے میں۔

یہ زندگی نہیں تھی۔ قید تھی۔ جبر تھا اور وہ یہ جبر مزید نہیں سہہ سکتی تھی۔

نہ ان گرم، دہکتی سانسوں کے زیروم نے کوئی قیامت اٹھائی تھی، نہ ان زلفوں کی خوشبو نے کہیں ہلچل مچائی تھی۔ عفتان علی خان اتنی قربت میں اسے عجب خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا تھا اور پھر لبہ کر ایک جھٹکے سے اس کے وجود کو اپنی گرفت، اپنے حصار سے آزاد کر دیا تھا۔

”انا بیہ شاہ!۔۔۔ زندگی کو اپنے زاویے سے دیکھو گی تو بہت پیچھتاؤ گی۔ میں تمہارے سر و ضاحتوں کے انبار نہیں لگا سکتا۔ تمہیں سو سوتا ویلیں نہیں دے سکتا۔ کوئی مشورہ بھی شاید نہیں کہہ بہت سمجھ دار ہو۔ مگر برائے مہربانی، زندگی کو دوسروں کے زاویہ سے دیکھنا بھی سیکھ لو۔۔۔ زندگی وہی نہیں جسے تم دیکھتی ہو۔ زندگی وہ بھی ہے جسے دوسرے دیکھتے ہیں۔۔۔ مجھے تم سے جب کوئی وا نہیں تو تمہاری سمت سے بھی کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے۔ یہی سوچ رہی ہو گی تم۔ مگر مجھے مطلب تم۔ تمہاری سوچ سے نہیں ہے۔ مجھے اگر کچھ خیال ہے تو صرف اپنے بہت اپنوں کا۔ میں انہیں کوئی زک ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے تم چاہے جتنے بھی کچھ کے لگاؤ، چاہے میرا کتنا بھی نقصان کرو۔۔۔ مجھے ا ہے۔ مگر میرے والدین کو اگر ذرا سی بھی تکلیف تمہارے کسی غلط رویے کے باعث پہنچتی ہے تو اعتراض ہے اور اس صورتحال میں تم سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ تم آج جو بھی ہو، جیسی بھی ہو، اگر میں اگر ہو تو صرف میرے حوالے سے۔ اور مجھے اس حوالے کو استعمال کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔ وہ کبھی اس طرح کی صورت حال پیش آئے تو اس کے متعلق ضرور سوچ لیتا۔“ ہاتھ اٹھا کر کسی قدر درز لہجے میں اسے وارننگ دیتے ہوئے وہ پلٹا تھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔

کوئی کتنی دیر سوگ مناسکتا ہے۔

کتنی دیر دھوسکتا ہے۔

کتنی دیر زندگی سے کٹ کر جی سکتا ہے۔

میرب سیال نے بھی دروازہ کھول دیا تھا اور اس بند کمرے سے نکل کر باہر آ گئی تھی۔ مگر زندگی سے کا انداز عجب گریز پائی لئے ہوئے تھا۔ وہ کیمپن جانے کے لئے تیار تھی۔ زینے کے آخری حصے قدم تھے جب نظر سردار سبٹنگٹن حیدر لغاری پر پڑی تھی۔ وہ نگاہ پھیر کر، اجنبی بن کر سوچے پھوٹا جھکائے قریب سے گزر جانا چاہتی تھی جب اچانک ہی سردار سبٹنگٹن حیدر لغاری نے اس کا ہاتھ گرد میں لے لیا تھا۔

کتنی عجب بات تھی۔ نہ کوئی حق بچا تھا۔ نہ کوئی استحقاق تھا۔ مگر وہ شخص اب بھی اس پر جتنا حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ اب بھی اسی طور پر حق جتار رہا تھا۔

میرب سیال نے اس کی سمت خاموشی سے دیکھا تھا اور اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے کھینچنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

”کچھ کھا کر جاؤ۔“ حکم صادر ہوا تھا۔

سجھوتہ بھی اصولوں کی بنیاد پر ہوتا ہے اور یہاں تو کوئی اصول تھا ہی نہیں۔ ایک ایک طرف کھیل بس۔ کوئی مسلسل کھیل رہا تھا اور وہ دیکھ رہی تھی۔
مسلسل ہار رہی تھی اور مسلسل رو رہی تھی۔

بالکل کسی بچے کی طرح۔ جو اپنے سے زیادہ شاطر شخص کے ساتھ کھیلتا ہے اور ہر بار ہارتا ہے اور سر پٹختا ہے۔ وہ بھی سر پٹخ رہی تھی۔ حالانکہ حل یہ نہیں تھا۔ حل یہ ہو بھی نہیں سکتا تھا اُسے کچھ اور کرنا چاہئے تھا۔ اُسے کچھ اور سوچنا تھا۔ وہ نہ تو مسلسل سر پٹخ سکتی تھی۔ نہ بار بار ہارنے کی سکت تھی اس میں۔ نہ ہی وہ روتے رہنا چاہتی تھی۔ اگر یہ سجھوتہ بھی تھا تو بہت حالت میں تھا۔ اُسے کوئی توجیہ قبول نہیں کرنا تھی۔ اسے جینا تھا اور زندگی سے اپنے حصے کا سکوار آرام، چین لینا تھا۔ وہ سب کچھ جو وقت نے اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا، اسے وہ سب واپس پا گیا تھا۔ وہ خود کو مزید سجھوتوں کی نذر نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بہت اپنوں نے اسے جس زندگی کے حوالے لے دیا تھا وہ کسی طرح سے قابل قبول نہ تھی۔ جھیل وہ رہی تھی۔ بھگت وہ رہی تھی۔ مسلسل رو بھی وہی رہی تھی۔ بے جب کسی کو اس کی کیفیت کا اندازہ ہی نہیں تھا تو وہ کسی حل کے لئے بھی کسی اور کی طرف کیوں دیکھتی؟ یا مزید سہتی بھی تو کیوں؟ وہ کسی ڈر کے خوف سے اپنے آپ کو، اپنی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی جبکہ اس کے بہت اپنے اس کے ساتھ ایسا کر چکے تھے۔ اسے مصلحتوں کی نذر کیا گیا تھا۔ رشتوں میں باندھ کر قربان گاہ پر لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا اور محبت کے نام پر اسے ذبح کر دیا گیا تھا۔ یہ تھے اپنے بہت اپنے۔ وہ سوچ رہی تھی تو سبھی کچھ سیاہ دکھائی دے رہا تھا۔ پاپا کو اپنے فرائض کی جلدی تھی زو بار یہ کو اسے نمنا دینے کی پڑی تھی اور نتیجتاً وہ گہری کھائی میں تھی۔ اور اس بات کا اندازہ کسی کو نہیں تھا پھر اگر تھا بھی تو کوئی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ صرف وہ جانتی تھی۔
وہ کہاں تھی اور کن حالات میں تھی۔

رشتے یوں نہیں باندھے جاتے۔ عمر بھر کے فیصلے بھی نہیں لکھے جاتے۔ اُس نے سر جھکا دیا اور زندگی بھر کا عذاب اپنے نام لکھو لیا۔
اگر دنیا بھر کے والدین یونہی بیٹیوں کی شادیاں کرتے ہوتے تو شاید آج کوئی بیٹی بھی خوش نہیں ہوتی۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے ایک بوجھ کی طرح بہت جلدی میں بغیر چھان چھنگ کے سر سے اتار دیا گیا تھا۔ نمشا دیا گیا تھا۔

ان کی بلا سے۔ اس کے ساتھ پھر کچھ بھی ہوتا۔ وہ کوئی بھی حالات چھلتی۔ کچھ بھی سہتی۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ کوئی اس شخص کے متعلق پہلے سے واقف نہ ہوتا جبکہ یہ زو بار یہ کے رشتے داروں میں سے تھا۔ اور یہ رشتہ بھی زو بار یہ نے ہی کروایا تھا۔ جب زو بار یہ ان لوگوں سے واقف تھی تو سردار سبکتگین حیدر لغاری کی طبیعت، اس کے مزاج سے کیسے نہ آشنا ہوگی؟ یقیناً وہ سب جانتی تھی اور پاپا کی بیماری ایک دلچسپ بہانہ تھا جو زو بار یہ کے ہاتھ لگا تھا اور میرب سیال کی تقدیر بدل گئی تھی۔
کتنے آنسو چپ چاپ آنکھوں سے بہ رہے تھے اور وہ ساکت نظروں سے سردار سبکتگین حیدر لغاری، ابا

دیکھ رہی تھی۔
تو یہ تھی اس کی سزا۔

ایک عمر بھر کی طویل جبری سزا جو اسے سہنا تھی اور صرف رونا تھا۔
کیا پایا جانتے تھے کہ وہ جلدی میں ایک غلط جگہ اعتبار کر کے اپنی اکلوتی بیٹی کو کھائی میں خود اپنے ہاتھوں دھکیل چکے ہیں؟
یقیناً نہیں۔
مگر وہ جانتی تھی اب اسے کیا کرنا تھا۔

ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو سختی سے رگڑ کر وہ اٹھی تھی۔ جب سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میرب سیال کو اپنے جسم کے اس حصے پر چوٹیاں رنگتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ ایک شدید ترین کراہت کا احساس ہوا تھا اور اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس سے چھڑا لیا تھا اور لب بھینچ کر سرفی میں ہلانے لگی تھی۔

”دوبارہ نہیں۔ کبھی بھی دوبارہ مجھے چھونے کی کوشش مت کرنا۔ بہت برا احساس ہوتا ہے مجھے۔ کراہت آتی ہے۔ گھن آتی ہے تم سے بھی اور۔۔۔ اپنے آپ سے بھی۔“ کتنا کچھ کہنا چاہتی تھی مگر شدت جذبات سے وہ کسی کمزور پتے کی طرح کانپ رہی تھی اس گھڑی۔ اور لفظ تھے کہ ساتھ ہی نہ دے رہے تھے۔ آنسوؤں کا کوئی پھندا اس گھڑی گلے میں تھا۔ دوبارہ کئی آنسو روانی سے چہرے کو بھگو گئے تھے۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری اٹھا تھا۔ اسے بنو ردیکھا تھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس کا نازک ہاتھ اپنی گرفت میں لیتے ہوئے اسے ایک جھٹکے سے خود کے قریب کر لیا تھا۔ چند ثانیوں تک اس کے بھیگتے چہرے کو دیکھتا رہا تھا۔ میرب سیال ساکت سی اسے دیکھ رہی تھی۔

”تمہارے قریب آنا، تمہیں چھونا میرا حق ہے۔ اور تم مجھے اس حق کو استعمال کرنے سے نہیں روک سکتیں۔ تمہارے کتنے قریب آ سکتا ہوں یا آنا چاہتا ہوں یا پھر نہیں اس کا فیصلہ اور یقین صرف مجھے کرنا ہے، تمہیں نہیں۔ اس سے متعلق نہ تو کوئی قیودم لگا سکتی ہو نہ ہی کوئی حدودم مقرر کر سکتی ہو۔ جو تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے، اس کے متعلق سوچ کر اپنی ازجی خالص مت کرو۔ تم صرف وہ سوچو جو تمہیں کرنا ہے۔ ایک اچھی بیوی بننے کی کوشش۔ ایک بہترین شریک سفر بننے کی تگ و دو اور مجھے سمجھنے کی خواہش اپنے اندر پیدا کرو سببئی اور نہ بہت مشکل ہو جائے گی۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری اس کی سمت فیصلہ کن انداز سے دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔ میرب سیال کے لئے وہ لمحہ ناپائیدہ ترین تھا۔ سانسوں سے نگرانی اس کی سانس بے حد ناگوار لگی تھیں اور وہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”خواہشوں کو مارنے کی عادت ترک کر دو ہنی!۔ تم جانتی ہو ابھی زندگی شروع ہونے کو ہے اور ختم ہونے کو ابھی عمر پڑی ہے۔ لاتعداد لمحے ہیں ہمارے پاس جو ہمیں صرف ایک دو بے کے ساتھ، ایک دو بے کی سنگت میں، ایک دو بے کی محبت کا دم بھرتے ہوئے اور قرب کی خواہش کرتے ہوئے بسر کرنے

”ایسا کیوں کیا ماہا؟ کیا مجھ پر اعتبار نہ تھا؟ اپنے بھائی پر یقین نہیں تھا؟۔ بہت برا ہوں تاہم۔ بھائی ہی کیا، میں شاید اچھا بیٹا بھی نہیں ہوں۔ اگر اچھا بیٹا ہوتا تو آج می اتنی بری زندگی بسر نہ کر رہی ہوتیں۔ اور تم ماہا!۔ گڑیا! یہ کیا چنگا نہ پن ہے؟۔ کوئی شکایت تھی، شکوہ تھا یا کوئی بات بری لگی تھی تو مجھ سے کہا ہوتا۔ یوں اچانک گھر چھوڑنے کی کیوں ٹھانی؟ کیا اعتبار نہیں تھا اپنے بھائی پر؟۔ تمہیں بھی لگا تھا میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکوں گا؟۔ جس طرح کہ می کے لئے کچھ نہیں کر سکا؟“ اذہان حسن بخاری کا مدہم لہجہ مجرمانہ سا تھا۔

ماہا نے سراٹھا کر بھائی کی طرف دیکھا تھا اور لٹی میں سر ہلا دیا تھا۔

”نہیں بھائی!۔ مجھے آپ پر بھی اعتبار تھا اور می پر بھی۔ مگر میں مزید کوئی ایسا ٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ ہمارا گھر، اس کا سکون اب پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ اور میں اس معاملے کو اٹھا کر گھر کی فضا کو مزید بوجھل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں آپ سے کہتی تو کیا ہوتا؟ آپ پھر پاپا کے مقابل تن جاتے اور پاپا کو پھر اپنی ایگو ہرٹ ہونی لگتی اور وہ آپ کے مخالف اور بھی تن کر کھڑے ہو جاتے۔ وہ آپ کو اپنے بیٹے کی نظر سے کم اور کسی حریف کی نظر سے زیادہ دیکھتے اور یہی میں نہیں چاہتی تھی۔“ ماہا نے اپنے خدشے کو بھائی کے سامنے رکھا تھا۔ اذہان نے بہن کو تھام کر ساتھ لگا لیا تھا اور سر پر پیار کیا تھا۔

”کبھی کبھی جس طرح ہم مسئلے کا حل سوچتے ہیں وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ جانتی ہو تمہاری اس نادانی کی وجہ سے می کتنی پریشان ہیں؟۔ چاچو کتنے پریشان ہیں؟ اور میں۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ کم از کم مجھے ہی بتادیا ہوتا کہ معاملہ یہ ہے اور مجھے اس سے اختلاف ہے۔ اور اختلاف کی بات بھی جب ہوتی جب ہم اس کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ می، چاچو، ہم تو خود اس کے مخالف تھے۔ تم کیا سمجھتی ہو، پاپا اگر تمہیں کسی کھائی میں دھکیلنا چاہتے تو ہم نہیں دھکیلنے دیتے؟“ اذہان بھرپور طریقے سے اسے سمجھانا چاہتا تھا۔

مگر ماہا بیٹگی آنکھوں کے ساتھ سرفی میں ہلانے لگی تھی۔

”میں نے یہ قدم بہت سوچ کر اٹھایا ہے۔ شاید اس طرح پاپا کو اپنی کسی غلطی کا اندازہ ہو جائے۔ بھائی! میں اجنبی جگہ پر نہیں ہوں۔ اپنی تخیال میں ہوں۔ نانی کے گھر ہوں۔ آپ فکر مند نہ ہوں، می کو بھی سمجھائیے۔ میں آپ سب سے بہت زیادہ دور نہیں ہوں۔ نہ ہی میں نے کوئی بغاوت کی ہے۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ پاپا کسی قدر جان سکیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کتنا غلط کر رہے ہیں۔ ہم سب کی زندگیوں سے کھیلنے کا انہیں کوئی حق نہیں ہے۔ پہلے میرے ساتھ، پھر ماہا کے ساتھ، پھر آپ کے ساتھ۔ اور اب پھر۔ بھائی! یہ ضروری تو نہیں کہ پاپا ہمیشہ وہ ہی ہوتے دیکھیں جو وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ پاپا کو وہ بھی تو دیکھنا چاہئے جو ہو رہا ہے اور وہ سمجھ نہیں پارے۔ بعض اوقات ہم کتنا غلط کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر ہمیں خود اندازہ نہیں ہوتا اور جب اس بات کا احساس ہمیں کوئی دوسرا لاتا ہے یا کوئی مختلف صورتحال دیکھ کر ہمیں خود جو اندازہ ہوتا ہے وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ہر دفعہ بچے ہی غلط نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی والدین بھی غلط ہوتے ہیں۔ اسی بات کا احساس

ہیں۔ سوا بھی سے ہاتھ مت کھینچو۔ ابھی تو سلسلہ شروع بھی نہیں ہوا اور تم اسے ختم کر رہی ہو۔“ لبوں پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔ جس کے بھید میرب سیال یقیناً نہیں سمجھ سکتی تھی۔

”مجھے اچھا نہیں لگتا خواہشوں پر پہرے بٹھانا۔ تم بھی یہ بیگانگی ترک کر دو۔ شرائط دلور تعلقات میں اچھی نہیں لگتیں اور جو رکھنا اور نہیں لگتا۔ سو یہ درمیان دیواریں اٹھانا بند کر دو اور صرف وہ جو مجھے اچھا لگتا ہے۔ جو ہم دونوں کو اچھا لگتا ہے۔ ایک شاندار کیل۔ ہمیں ایک اچھا شادی شدہ بنا ہے اور ابھی اس کے لئے کافی وقت پڑا ہے۔ ابھی تک تو میں نے تمہیں ڈھنگ سے دیکھا بھی نہیں تم.....“

سردار سبکدین حیدر لغاری نے مسکراتے ہوئے سرفی میں ہلایا تھا۔

”بہت بری ہوتی۔ بالکل بھی اچھی نہیں۔ ایک اچھی بیوی بنو۔ اگر نہیں ہو تو کوشش کر بن سکتی ہو۔ یہ بات تم بھی جانتی ہو اور میں بھی۔ شاباش، ادھر ادھر کی فضول باتوں کو سوچنا ترک کر دو۔ صرف اپنے اور میرے بارے میں سوچو۔“ لہجہ مدہم تھا اور انداز لگاؤ سے بھرپور۔

”زندگی ان اٹکھنوں کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ یقین کرو، بہت حسین اور دل فریب۔ سوچو، غور کرو۔“ کچھ نہیں کے علاوہ ”کچھ“ ہے۔ شاید بہت کچھ۔ جو شاید تم نہیں جانتی ہو یا جسے جانتا نہیں چاہتی ہو وہ رد کئے جانے کے قابل نہیں ہے۔ نظر انداز مت کرو۔ نہ خود کو، نہ مجھے، نہ اس زندگی کو۔ سب کچھ ضر ہے اور بہت ضروری ہے۔ اپنے دل کی انگلی تھامو اور صرف اس کے ساتھ چلو اور باقی سب بھول، عقل و خرد و رغلائے والے جزو ہیں اور آنکھ و دل حقیقت منکشف کرنے والے عضو۔ سو نگاہ سے دیکھ دل سے فیصلہ کرو، تمہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ یہ تمہاری آنکھیں بھی جانتی ہیں اور تمہارا دل بھی مدہم لہجہ کوئی بھرپور احساس رکھتا تھا۔ مگر میرب سیال ایک جھٹکے سے اس حصار سے نکل گئی اور بیگ کر چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ مگر گیت پر کھڑے چونکدار نے تب تک دروازہ نہیں کھولا تھا جب تک سبکدین حیدر لغاری بہ نفس نفیس خود باہر تشریف نہیں لائے تھے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دوسری طرف دروازہ اس کے لئے کھولا تھا اور میرب سیال کو مجبوراً پیش قدمی کرنا پڑی تھی۔

”یہ مت سمجھو کہ تم پر کوئی تہود لگائی جا رہی ہیں یا کوئی جبر کیا جا رہا ہے۔ یہ سب اس لئے ہے کہ انحال عقل سے کام نہیں لے رہی ہو۔ اطمینان سے سوچ نہیں رہی ہو۔ اس جذباتیت میں تمہیں خیال نہیں ہے، مگر مجھے ہے۔ اور یہ سارے اقدامات تمہیں محفوظ رکھنے کو ہی ہیں۔ ورنہ تم کسی قید میں ہو، صرف ایک پناہ میں ہو۔“ اس کے بیٹھنے پر سردار سبکدین حیدر لغاری نے واضح کیا تھا اور گاڑی ربا سیر میں ڈال کر گیت سے نکالی تھی اور راستے پر ڈال دی تھی۔

میرب سیال کیسپس آنے تک کچھ نہیں بولی تھی۔

اذہان حسن بخاری بہن کے سامنے بیٹھا تھا جو خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔

اذہان نے کچھ دیر تک یونہی اسے دیکھا تھا اور آہستگی سے تھام کر ساتھ لگا لیا تھا۔

میں پایا کو کروانا چاہتی ہوں۔“

”لیکن انہیں پتہ چل جائے گا کہ تم یہاں ہو۔ پھر اس سے کیا فرق پڑے گا؟۔ اس سے بہتر تم گھر چلو۔ اپنے گھر میں ہم سب کے درمیان تم زیادہ محفوظ ہو۔“

”بھائی! میں جانتی ہوں میں اپنے گھر میں زیادہ محفوظ ہوں۔ آپ سب کے درمیان زیادہ ہوں۔ مگر اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ پایا کو جانتے ہیں۔ وہ ایسے نہیں تھے۔ مگر یہ اچانک بلاؤ ان کے اندر آیا ہے، اس کو ختم کرنے کے لئے کسی ایسے ہی چونکا دینے والے واقعے کی ضرورت ہے۔ آپ بے فکر رہیے، میں محفوظ ہوں یہاں۔ مجھ پر اعتبار نہیں تو نانو سے پوچھ لیجئے۔ کتنے ہیں یہاں میرا خیال رکھے کے لئے۔“ ماہا بھائی کو مطمئن رکھنے کو مسکرائی تھی اور اذہان کی پشت پر کھڑی کو دیکھا تھا۔ اذہان نے گردن موڑ کر دیکھا تھا۔ نانی ملائمت سے مسکرائی تھیں اور اذہان کے شانے پر سے اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”ماہا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تمہیں یا فارحہ کو اس کے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کاہ رکھنے کو ہم سب ہیں۔ ماہا کسی غیر یا اجنبی جگہ پر نہیں ہے۔ تم یوں بھی تو سمجھ سکتے ہو کہ یہ اپنی چوڑا گرانے اپنی ماں کی ماں کے گھر آئی ہے۔ جس طرح کہ اور بہت سے بچے آتے ہیں۔ مسکرائیں۔ اذہان حسن بخاری نے سر اٹھاتے میں ہلا دیا تھا۔

”ٹھیک ہے نانو!۔ مگر می سے بات کر کے آپ نہیں سمجھا لیں گے۔ آپ کو پتہ ہے وہ کتنی پریشان ہو جاتی ہیں۔“

”ہاں، جانتی ہوں۔ اس کی ماں ہوں۔ کیا اس کو نہیں سمجھوں گی؟“ نانی مسکرائی تھیں اور اس سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا تھا۔ ”بچے! کبھی کبھی اُبھی ڈور کو سلھانے کے لئے بہت سے پاپڑ پیلنا پاپ ہیں۔ ماہا جو کہ رہی ہے اگرچہ اس سے پریشانی ہو سکتی ہے فارحہ کو بھی اور سعد کو بھی۔ مگر اُبھی ہوئی کتنی طریقے سے سلجھ سکتی ہے تو کوئی حرج نہیں۔“

اذہان نے کچھ سوچتے ہوئے سر اٹھا کر میں ہلایا تھا۔

”نہیں نانو!۔ مسئلے کا حل یہ نہیں ہے۔ ماہا شاید بہت خوفزدہ ہے اور ہم پر دوسری بار بھروسہ بھی نہیں چاہ رہی۔ شاید یہ ٹھیک ہے، حق پر ہے۔ اور میں واقعی نہیں چاہوں گا کہ یہ دوسری بھی اپنی زندگی کو ہمارے حوالے کرے۔ ایک تجربہ ہم بھگت چکے ہیں۔ تب نہ میں کچھ کر سکا کوئی اور۔ کم از کم دوسری بار ہم کسی پچھتاوے میں مبتلا ہونا نہیں چاہیں گے۔ میں تو بالکل بھی نہیں ہوں۔ لیکن جب اس بار ماہا کو اس کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ جو اسے مناسب لگتا ہے اسے وہ چاہئے۔ لیکن جب اسے کوئی خطرہ ہوگا، تب میں دور نہیں رہوں گا۔ اس کے قریب پہنچنے والا میں ہوں گا۔ مجھے اپنی گڑیا بہت پیاری ہے۔“ ماہا کے چہرے کو محبت سے تھپتھپایا تھا۔

”نانو! آپ خیال رکھئے گا اس کا۔ میں آتا جا رہا ہوں گا۔“ اذہان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”بیٹھو نا۔ کھانا کھا کر جانا۔“ نانو نے کہا تھا مگر وہ سر نہ فی میں ہلاتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔

زندگی ہر گھڑی ایک امتحان تھی اور کچھ نہیں تھا۔ ایک گہری سانس خارج کر کے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ تبھی اس کا سیل بجا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے میل فون کان سے لگایا تھا۔

”ہاں ساہیہ!۔ ایوری تھنگ اِزاو کے۔ سب کچھ ٹھیک ہے یہاں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”ماہا مل گئی؟۔ کہاں ہے وہ؟“

”یہیں۔ اسی شہر میں۔ نانو کے پاس۔ تم می کو بتا دو، پریشان نہ ہوں۔ ماہا نے پریشانی کو پتے طور پر حل کرنے کا پورا راستہ نکالا ہے جو اس کے خیال میں مناسب ترین ہے۔“

گاڑی کو سڑک پر ڈالا تھا۔

”اور تم اذہان؟۔ تم نے اسے اس کی مرضی کرنے دی۔ کیا یہ واقعی ٹھیک ہے؟“ ساہیہ دوسری طرف بہت فکر مند دکھائی دی تھی۔ اذہان نے سر نہ فی میں ہلا دیا تھا۔

”سچ کہوں۔ مجھے خود پتہ نہیں۔ مگر اس بار کوئی پچھتاوا اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔ کم از کم میں اپنے اتھ دھو لینا چاہتا ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ماہا سے لاتعلقی ہو گیا۔ میں اسے ہر ممکن طور پر سپورٹ کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”اذہان!۔ تم اپنا خیال رکھو۔ کسی طرح کی کوئی ٹینشن مت لو۔ خدا سب ٹھیک کرے گا۔ یہ معاملہ اتنا پیچیدہ نہیں ہوگا۔ یہ کہنا غلط ہوگا۔ سعد انکل شاید بہت غصہ کریں مگر تمہیں بہت قتل اور خوش مزاجی سے اس صورت حال کو سدھارنا ہے۔ ماہا کی زندگی کا معاملہ اس بار تمہارے اتھ ہے اور میں تمہیں شرمندہ دیکھنا نہیں چاہوں گی۔“ ساہیہ بہت کیس رنگ انداز میں تشویش کے ساتھ بولی تھی تو اذہان جانے کیوں مسکرا دیا تھا۔

”ساہیہ! شاید پایا اتنے برے نہیں ہیں جتنا ہم انہیں جان رہے ہیں۔ میں نے ہمیشہ انہیں رول ڈل کے طور پر لیا ہے۔ میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ ایک بیٹے کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہوتا ہے کہ وہ باپ کے نقش قدم پر چلے۔ اور میں نے یہ سارے مراحل طے کئے۔ مجھے پایا سے بڑھ کر اور پاپا کو مجھ سے بڑھ کر کوئی عزیز نہ تھا۔ مگر اچانک رشتوں میں ایک دراڑ آگئی اور سب کچھ پہلے جیسا نہیں رہا۔ مگر میں آج بھی پاپا کی اتنی ہی سپیکٹ کرتا ہوں۔ انہیں آج بھی اسی درجہ بلندی پر دیکھتا ہوں۔ میں اب بھی اپنے باپ سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں اور اب بھی انہی جیسا بننا چاہتا ہوں۔ مگر یقیناً سب توں میں نہیں۔ یہ لڑائی نظر پاتی نہیں، یہ اختلاف رشتوں میں اٹھا ہے اور جہاں پایا نے ہاتھ کھینچ لیا ہاں میں سب کچھ چھوڑ کر اجنبی نہیں بن سکتا۔ میں گھر پہنچ رہا ہوں، تم فکر مت کرو۔“ اذہان ملائمت سے مسکرایا تھا۔

”ٹھیک کیسے اذہان!“ ساہیہ نے دوسری طرف سے کہا تھا اور اذہان نے مسکراتے ہوئے سلسلہ منقطع کر لیا تھا۔

”کیسے کہوں تم سے کہ یہ خواب دکھانا بند کر دو مجھے۔۔۔ اب نہ ان کی ضرورت ہے نہ ہی خواہش۔“
مدہم لہجہ خود گلای کا ساتھ۔ انداز ایک اُلجھن بھرا تھا۔

انابییہ نے اس کی چوڑی پشت کو بغور دیکھا تھا۔ غالباً وہ کچھ سُن نہیں پائی تھی، عفتان کیا بولا تھا۔ وہ اسی طرح کھڑی تھی جب اچانک بجلی چمکی تھی اور لائٹ بھی چلی گئی تھی۔ انابییہ نے ایک لمحے میں بالکل غیر ارادی طور پر اپنے سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑے شخص کی جانب پیش قدمی کی تھی اور اس مضبوط وجود سے لپٹ گئی تھی۔ بڑی ہی فطری حرکت تھی یہ۔ ایک طرف تو وہ عفتان علی خان سے بدظن تھی۔ اس کے خلاف مجاز آرائیاں کر رہی تھی اور دوسری طرف وہ اس کے وجود میں پناہ تلاش کر رہی تھی۔ اس نے ایک لمحے میں عیاں کر دیا تھا کہ وہ کتنی بہادر تھی اور کتنی مضبوط۔

عفتان علی خان پلٹا نہیں تھا۔ جس طرح کھڑا تھا اسی طرح کھڑا رہا تھا۔ غالباً وہ اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا اور اسے سنبھلنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا، انابییہ زیادہ دیر تک اس کیفیت میں نہیں رہے گی اور جلد دوبارہ اپنے پہلے والے خول میں لوٹنا چاہے گی۔ جس میں وہ خود کو مضبوط بھی خبیہ گزرتی ہے اور محفوظ بھی۔ اور یہ بھی کہ یہ حرکت جتنی اچانک اور فطری طور پر سرزد ہوئی ہے انابییہ کے لئے وہ اسی قدر شرمندگی کا باعث ہوگی اور شاید وہ انابییہ کو اس لمحے شرمندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ سچی اسی طرح رخ پھیرے کھڑا رہا تھا اور انابییہ اس کی پشت سے سر ٹکائے گہرے گہرے سانس لیتی رہی تھی۔

عفتان نے جیب سے لائٹ نکال کر جلائی تھا اور اسی طرح کھڑے کھڑے، ہاتھ قدرے بلند کر دیا تھا کہ روشنی انابییہ تک پہنچ جائے اور اس کا خوف اس درجہ برقرار نہ رہے۔

انابییہ نے روشنی کی ایک لیئر اندھیرے میں پھونٹنے دیکھ کر بہت آہستگی سے سر اٹھایا تھا اور تب نگاہ اپنے سامنے کھڑے مضبوط شخص پر پڑی تھی جس کی چوڑی مضبوط پشت سے وہ اب تک سر ٹکائے کھڑی تھی۔ یقیناً غلطی سرزد ہوئی تھی اور اس گھڑی وہ شرمندہ بھی دکھائی دی تھی۔ بہت آہستگی سے اس مضبوط شانے پر اب تک رکھا ہوا اپنا نازک سا ہاتھ اٹھایا تھا اور دو قدم پیچھے سرک گئی تھی۔ مدہم لو میں چہرہ اور اس کے تاثرات چھپانا کسی قدر آسان تھا اور اس ضمن میں تو اور بھی جب کوئی آپ کی طرف متوجہ بھی نہ ہو۔

انابییہ کو اس شخص کا اپنی طرف نہ دیکھنا اس لمحے غنیمت لگا تھا۔ یعنی بھرم رہ گیا تھا، اس کی انا کا، وقار کا و خودداری کا۔

شاید یہ نہیں جانتی تھی کہ کوئی دانستہ اسے ان لمحوں سے بچا رہا تھا۔
انابییہ اس مدہم سی لوم میں اس شخص کی پشت کو کتنی سکت سی کھڑی تھی جب عفتان نے آگے بڑھ کر اس کی سمت متوجہ ہوئے سائیڈ ٹیبل سے کینڈل برآمد کر کے جلا کر ایسے مقام پر رکھ دیا تھا کہ کمرے میں روشنی کی ترسیل برابر ہو سکے۔ لائٹ بجاکر جیب میں ڈالتے ہوئے وہ پلٹا تھا۔ غالباً باہر نکل جانا چاہ رہا تھا مگر بھی غیر ارادی طور پر انابییہ نے اسے پکار لیا تھا۔

”عفتان۔۔۔“

عفتان علی خان رک گیا تھا۔ مگر منہ نہیں دیکھا تھا۔

کچھ بھی تھا، وہ یا پاپا کو اس حد تک غلط قرار نہیں دے سکتا تھا۔ ان کی غلطی ضرور تھی مگر پتہ نہیں کیا اور کیا صحیح۔۔۔ کبھی کبھی وہ بالکل سمجھ نہیں پاتا تھا۔ سوچتا بھی تھا تو ذہن الجھنے لگتا تھا۔ شاید وہ سب بخاری سے اس درجہ نفرت کر نہیں سکتا تھا، کر نہیں پاتا تھا۔

چاہنے کے باوجود۔۔۔!

یا پھر رشتوں میں آئی دراز صرف دکھاوے کو تھی اور یہ لڑائی صرف نظریاتی اور وقتی تھی۔

ازہان حسن بخاری خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا مگر ایک سکوت اپنے ارد گرد اسے محسوس ہو رہا تھا۔

باہر شدید بارش ہو رہی تھی۔ مگر عفتان علی خان کو اپنے اندر سکوت اور بہت بوجھل پن لگ رہا تھا حد جس اور گھٹن۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دیر تک آفس میں مصروف رہنے کے بعد کچھ فائلیں گھر پر بھی اٹھا اور اب جھکا انہی کو دیکھ رہا تھا۔

انابییہ ہاتھ لے کر فریش سی واش روم سے نکلی تھی۔ بالوں سے ٹاول ہٹا کر بالوں کو جھٹک کر پڑا تھا۔ ننھے منے پانی کے قطرے عفتان علی خان کے چہرے اور ناک پر آن پڑے تھے۔ عفتان اٹھا کر دیکھا تھا۔۔۔ نگاہ لہجہ بھر کو ٹپٹی تھی۔ ایک نئی نویلی دلہن کے بالوں کی شبنم فضا میں بکھری ہوئی اُس کا ڈھلا ڈھلا چہرہ بہت تروتازہ لگ رہا تھا۔ عفتان علی خان کے وجود میں ایک لمحے میں کئی خواہشات نے سراٹھایا تھا۔ فائلز ایک طرف رکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور چلتا ہوا انابییہ شاہ کے پاس جا رہا تھا انابییہ اُسے کسی قدر تذبذب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سمجھی تھی غالباً اس کی اس بے اختیاری حرکت عفتان کو ڈسٹرب کیا ہے یا پھر اس کے کام میں خلل واقع ہوا ہے یا پھر وہ واقعی کچھ سمجھ نہیں پائی تھی لئے سکتی سی، تکتی ہوئی چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ عفتان نے دو قدم کے اس فاصلے کو بہت آہستگی اور بھی سمیٹ دیا تھا۔ انابییہ شاہ کے لئے اس کا انداز، اس کے تیور کسی قدر تشویش کا باعث تھے۔

”آئی ایم۔۔۔ سوری۔۔۔ مجھے اندازہ نہیں تھا۔۔۔ پانی کے قطرے آپ پر اور۔۔۔“

پر۔۔۔ کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے وہ بولی تھی۔

عفتان علی خان نے بنا کچھ کہے اسے بغور دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو بہت سے چھوا تھا۔

انابییہ ایسا کچھ تصور نہیں کر رہی تھی۔ شاید اسی لئے اس لمحے کسی قدر کینفوژ ڈکھائی دی تھی۔ پلا لرش بہت واضح تھی۔ اُلجھن میں اس نے پردہ کھینچ دیا تھا۔ باہر بھینکتا ہوا منظر دُریب لگ رہا تھا۔ اس نے جانے کیوں کھڑکی کے شیشے بھی کھول دیئے تھے۔ تیز ہوا اور تیز بوجھاڑ آنے لگی تھی۔

”باہر بارش ہو رہی ہے۔“ جانے کون سا تاثر زائل کرنے کو وہ بولی تھی۔ عفتان علی خان جیتے لمحے میں بیدار ہو گیا تھا۔ ایک لمحے میں رخ موڑا تھا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے دونوں بالوں کی طرف لے گیا تھا۔

یہ وہ گھر تھا جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی، جہاں پاؤں پاؤں چلی تھی، جہاں ہنسی تھی۔ کھلی تھی۔ روٹی تھی۔ اور آج جب بہت شکستہ تھی تو اپنا نم ان درو دیوار سے بانٹنے چلی آئی تھی۔ اپنے گھر کی ہر ہر شے کتنا اپنا پن دے رہی تھی۔

”سردار سبکگین حیدر لغاری! تمہارے لئے میں نے کیا کچھ تیاگ دیا۔ کتنا کچھ گنوا دیا، چھوڑ دیا۔ تم نے اپنے نام کی مہر لگا کر میرے لئے میرے سارے حوالے پرائے اور غیر معتبر کر دیئے۔ سارے احساس مناد دیئے اور پھر بالآخر مجھے بھی منادا دیا۔ کیسے شخص ہوتی؟

اپنی ہی چیزوں کو توڑتے ہوئے تمہیں دکھ نہیں ہوتا۔ کوئی بچھتاوا نہیں ہوتا۔ کوئی تکلیف نہیں ہوتی تمہیں۔

کتنے بے درد شخص ہوتی۔ اور اس سے زیادہ بے حس میں ہوں جو تمہارے ساتھ ہوں۔“ اپنے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے ایک ایک شے کو چھو کر دیکھتے ہوئے وہ جیسے ضبط ہا رہی تھی۔

”کیوں۔ کیوں ہوں میں تمہارے ساتھ، جب میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں ہوں۔ کیوں چنا میں نے تمہیں اپنے لئے اگر تم غلط ترین انتخاب تھے۔ کیوں سر پھوڑ رہی ہوں متواتر اگر تم پتھر ہو اور تمہیں میری بات سمجھنا ہی نہیں۔ کیوں؟ کس لئے؟ کس لئے شب و روز کا یہ سفر ہے؟ جب ایسا گانی ہے تو میں کیوں رک نہیں جاتی؟ کیوں ہوں تمہارے ساتھ اگر تم میرے ہو ہی نہیں اور کبھی ہو بھی نہیں سکتے۔ تو پھر یہ میرے ایک طرفہ سمجھوتے بھی کیوں؟ کیوں رہوں میں تمہارے ساتھ جب تمہیں قدم قدم میرے ساتھ چلنا ہی نہیں؟ کس لئے یہ رشتہ بھی، جب ہمیں ایک ساتھ بسر ہونا ہی ہیں۔ کیوں۔ کس لئے۔؟“

وہ کھٹوں کے بل زمین پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ جانے کتنی دیر گزر گئی تھی اسی طرح بیٹھے۔ روتے روتے۔۔۔ سسکیاں مدھم پڑی تھیں تو اس نے تھک کر سر اٹھایا تھا اور اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری کی وہاں اس کے سامنے موجودگی یقیناً اس قدر حیرت کا باعث تھی۔ یقیناً یہ اس کا وہم تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری۔ اس کا خوف، اس پر اس درجہ سوار تھا کہ اسے ہر جا وہی لٹائی دے رہا تھا۔ حالانکہ وہ یہاں کہاں آسکتا تھا؟۔۔۔ اُسے تو خبر بھی نہیں تھی۔ جو وقت واپسی کے لئے اُسے دیا تھا، ابھی اس میں خاصی دیر تھی اور اسے تو کہیں سے ہی پک کرنا تھا!۔

ہاں، یقیناً یہ ہیولہ تھا۔ کوئی تصور تھا اُس کا۔ وہ با آواز بلند شکوے کر رہی تھی اس سے۔ اور اب سے لگا تھا وہ اس کے سامنے موجود تھا۔

میرب نے ہاتھ بڑھا کر اس ہیولے کو چھوا تھا اور اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی جب اس ہیولے میں کت ہوئی تھی اور اس کے نازک ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیا تھا۔ میرب سیال کی حیرت کی تھی کوئی حد نہیں رہی تھی۔ کس درجہ پاگل ہو رہی تھی وہ۔ کس درجہ ذہنی توازن بگڑ رہا تھا اُس کا۔ وہ

انابہ پکارنے کے فوری بعد کچھ کہنے کی ہمت اپنے اندر محسوس نہیں کر رہی تھی۔ عفنان علی خان کھڑا تھا جب بہت سی ہمت مجتمع کرتے ہوئے اظہارِ مدعا آخر کار کر دیا تھا۔

”عفنان!۔۔۔ پلیز، مت جاؤ۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔“ انداز کسی درجہ خوفزدہ اور آواز بیٹھی ہوئی تو عفنان علی خان پلٹا تھا اور بنا اس کی سمت دیکھے چلتا ہوا واپس کاؤچ پر آن بیٹھا تھا۔ پھر جب سے سیر برآمد کیا تھا اور کوئی نمبر ملا کر ہدایت کرنے لگا تھا۔

”جزیرن ان کروادو۔“ صرف ایک جملہ کہہ کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ انابہ اسی طرح وہیں کے پاس کھڑی تھی۔

”میراں آ کر بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر میں جزیرن آن ہو جائے گا۔“ اُسے کہہ کر دوبارہ فائل تھی اور مدھم کینڈل لائٹ میں فائل کو بخورد دیکھنے لگا تھا۔

انابہ نے ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا۔ چپ چاپ وہیں کھڑی کے ساتھ لگی اس کی سمت دیکھتی رہی۔ عفنان علی خان نے دوبارہ اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اس مدھم روشنی میں فائل پر جو تھا۔ انابہ اُس کی سمت تکتی رہی پھر اب بھینچ کر نگاہ پھیری تھی اور کھڑکی سے باہر برستی بارش کو بخورد لگی تھی۔

کلاسز کے بعد وہ خواہ خواہ لائبریری میں گھسی کتاب پر سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔ گھر کا کوئی تصور کے پاس نہ تھا اور واپسی کے راستے بے حد دشوار تھے۔

گھر۔ اپنا گھر۔ ایک خیال اس کے اندر لپکا تھا۔ اور وہ فوراً بیگ لے کر اٹھی تھی اور سے چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے وہ درو دیوار دیکھے۔ وہ گھر، وہ کمرہ، وہ والان دیکھے۔

کیب اس کے اپنے گھر کے باہر رکھی تھی اور وہ کتنی ہی دیر ساکت سی کھڑی گیٹ کو اور باہر کے دیوار کو تکتی رہی تھی۔ پھر بیگ سے چابی ڈھونڈ کر برآمد کی تھی جو ہر وقت اس کے پاس رہتی تھی۔ گیٹ کر اندر داخل ہوئی تھی تو ہر شے کو اسی طرح پایا تھا۔ گھر کی دیکھ بھال گارڈز اور نوکروں کے ذمے تھی ا یقیناً متواتر اس گھر کی دیکھ بھال بھی کر رہے تھے۔ لان میں سارے پودے تروتازہ تھے۔ ا ہموار اور برابر تھی۔ پودوں کو صبح ہی پانی دیا گیا تھا۔ گلاس ڈور تک جاتی راہداری صاف و شفاف تھی۔ و قدم چلتی اندر بڑھ آئی تھی۔

ایک شہر۔ ایک مقام اور اتنے دنوں کی دوری۔ وہ اپنے محور کے بغیر کتنے دن تک سرگرداں تھی۔ اتنی دوری نہ تھی اور پھر بھی وہ دور رہی تھی۔

یہ قصداً کئے گئے فیصلے بعض اوقات کتنا دکھ دیتے ہیں۔ اس نے خود اپنے ساتھ کس درجہ نا انصاف تھی۔ ایک ایک شے کو چھوتے ہوئے کتنی یادیں اس کے اندر جاگ رہی تھیں اور آنکھیں کتنی دھندلا تھیں۔

جو دیکھ رہی تھی اس پر یقین نہیں کر رہی تھی۔ اور جس پر یقین کر رہی تھی، اسے دیکھ نہیں رہی تھی۔ سبکتگین حیدر لغاری نے اس کی شخصیت کو کتنے انتشار سے دوچار کر دیا تھا۔ اور اب اس کے عین سامنے مگر یہ کیسے طرح ہوا تھا؟ باہر کا گیٹ تو وہ خود بند کر کے اندر آئی تھی۔ یا پھر یہاں بھی اگر کوئی غلطی ہوئی تھی۔ کس درجہ ذہنی توازن بگڑ رہا تھا اس کا۔ مسلسل ٹینشن۔ مسلسل چاگنا، دھونا اور سوچنا اور کوئی حل نہ پانا۔ یہ ذہنی انتشار سے کہاں لے جا رہا تھا۔ وہ آب حیران تھی۔ سبکتگین حیدر لغاری اس کے سامنے بیٹھا اسے بہ غور دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سردار سبکتگین حیدر لغاری مضبوط گرفت میں تھے اور وہ ساکت بیٹھی تھی۔

”کیوں جیسے نہیں دے رہے ہو مجھے؟۔۔۔ کس لئے؟۔۔۔ جب میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں پھر یہ سب کیوں؟۔۔۔ تم کیوں کر رہے ہو یہ سب؟ کوئی اچھی بات تو نہیں سارے ثواب اپنے میں لکھ لینا اور عذاب کسی اور کے خانے میں ڈال دینا۔۔۔ تم میرے نام وہ سزا میں کیوں لکھو۔ جن کے گناہ مجھ سے سرزد ہوئے ہی نہیں؟۔۔۔ کیا خود غرضی نہیں یہ؟ ہزار بار سوچا، شکوہ نہ کر سے۔۔۔ کوئی شکایت نہ کروں۔ چپ چاپ سمجھوتے کی چادر اودھ لوں۔ تمہارے ساتھ قدم چلوں۔ تمہیں سوچوں، تمہیں چاہوں اور بس تمہیں دیکھوں۔ اور میں نے ایسا کیا بھی۔ ایسا ہی کرنے نہیں چاہا تھا اگرچہ کبھی بھی نہیں چاہا تھا تمہیں۔ مگر خود کو مار دیا۔ تمہارے لئے فنا کر دیا۔ ڈھال دیا تمہارے سانچے میں خود کو۔ رنگ دیا تمہارے رنگ میں۔ تمہیں جو شے اچھی لگتی صرف دیکھتی، اسے سوچتی، پہروں تنہا بیٹھ کر۔۔۔ تمہاری اک اک شے کے متعلق غور کرتی۔ اٹھ مہینے؟ دن سات گھنٹے تمہارے ساتھ رہی۔ تمہارے نام کے ساتھ رہی۔ ایک ایک لمحہ لکھ دیا تمہارے ایک ایک پل۔ اور تم۔۔۔ تم نے کیا صلہ دیا مجھے؟۔۔۔ جانتی تھی، ہر جاتی ہو تم۔ وفاق نہیں ہے تم کبھی میرے ہو کر رہی نہ سکو گے۔ ہر رات تمہاری سنگت ایک نئے چہرے، نئے نام کے ساتھ بسر ہے۔ مگر اس طرح تو نہیں۔“ سر بہت آہستگی سے نئی میں ہلایا تھا۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری! میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم ایسا بھی کرو گے۔ پتہ نہیں میں تم پر اعتبار کرنے لگی تھی۔ حد درجہ اعتبار۔ مجھے لگنے لگا تھا میں تمہیں بدل سکتی ہوں اور میں آج کے دن بدل دوں گی۔ تمہیں نہ نئے چہروں سے آشنائی کا شوق رہے گا نہ نئے ناموں سے کچھ رہے گی۔ تمہاری زندگی میں ایک دن ایسا سورج ضرور طلوع ہو گا جب تمہاری تلاش صرف بچ شروع ہوگی اور صرف مجھ تک ختم ہوگی۔ میں کسی ایسے دن کی منتظر تھی، پر امید تھی میں۔ مگر تم۔۔۔ میرے سارے ارادوں کو ایک پل میں ڈھیر کر دیا۔ ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ تم نے جس کے متعلق میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ حالانکہ جیسے تم ہو، جیسے کھیل تم کھیلنے ہو اور جس طرح کے سرانجام دیتے ہو اسے دیکھ کر تو مجھے تم سے ہر بات کی امید رکھنا چاہئے تھی۔ مگر جانے کیوں، میں۔۔۔ کبھی نہیں سوچا۔ مجھے لگا تمہارے لئے زندگی کی حقیقی تلاش صرف میں ہوں۔ صرف میں۔ تم۔ بھی سلوک مجھ سے روا رکھا، جو بھی تم کرتے رہے، میں نے کبھی کسی بات کے لئے تمہیں مورد الزام

شہر لیا۔ کیونکہ میں جانتی تھی اگر یہ رشتہ میرے لئے سمجھوتہ ہے تو تمہارے لئے بھی یقیناً کسی خوشی کا باعث نہیں ہے۔ یہی جان کر میں نے تمہاری ہر غلطی معاف کی۔ ہر غلط سلوک درگزر کیا۔ ہر قصور کو بھلا دیا۔ مگر تم۔۔۔ تمہیں ذرہ برابر شرمندگی نہیں کہ تم نے کیا، کیا۔ ایک دوسری عورت کو اٹھا کر گھر میں لے آئے جب کہ تمہاری منکوحہ میں تھی۔ جب مجھے تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنا تھی اور تمہیں میرے خواب دیکھنے تھے تو پھر یہ سب کیونکر ہوا؟۔۔۔ تم نے اتنی بڑی غلطی کیسے کر دی؟۔۔۔ کیسے؟“ مدم تھکے ماندے لہجے میں پوچھتے ہوئے کتنے آنسو آنکھوں سے رواں تھے۔ کس درجہ شکستہ لگ رہی تھی وہ۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسوؤں کو اپنی پوروں پر لیا تھا اور پھر اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

میرب سیال اب بھی نہیں چونکی تھی۔ شاید اب بھی یہ کوئی خیال تھا اس کے لئے۔

”اگر یہ پناہ میری تھی۔۔۔ تو تم نے اس میں کسی اور کو کیوں حصے دار بنایا؟۔۔۔ تم تو عادی تھے نئی فضاؤں کے۔۔۔ نئی ہواؤں کے۔۔۔ نئی جہت۔۔۔ نئے خوابوں سے عشق تھا تمہیں۔ تمہاری ترجیحات جب یہی تھیں تو پھر مجھے خواب دیکھنا کیوں سکھائے تم نے؟ مجھے اپنے ساتھ کیوں کیا؟ جب ہمارے راستے جدا تھے۔۔۔ ہمیں ایک ساتھ چلنا ہی نہیں تھا تو پھر مجھے قدم قدم اپنے ساتھ چلنے کا عادی کیوں بنایا؟۔۔۔ کیوں سکھایا اپنے زاویے سے زندگی کو دیکھنا، پرکھنا اور برتنا؟۔۔۔ مجھے ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ ہم قدم کیوں کیا؟“ میرب کتنے مدم لہجے میں شکوے کر رہی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کے سر پر اپنا چہرہ جھکا دیا تھا۔ مگر یہ کیا، وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح ایک طرف لڑھک گئی تھی۔

”میرب!۔۔۔ میرب!“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے چھوڑا تھا مگر اس کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کے نازک وجود کو ایک لمحے میں اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھایا تھا اور تیزی سے لے کر گاڑی کی سمت بڑھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر اسے ڈال کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی اور گاڑی ہواؤں سے باتیں کرنے لگی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری کا چہرہ بے تاثر تھا۔



”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں خبر نہ ہو؟۔۔۔ فارحہ! تم یقیناً جانتی ہو کہ ماہا کہاں ہے مگر تم اسے صرف مجھ سے چھپانا چاہتی ہو۔ مگر تم نہیں جانتی ہو کہ تم ایسا کر کے کتنا غلط کر رہی ہو۔“ سعد حسن بخاری کس قدر درشت لہجے میں کہہ رہے تھے جب اذہان نے قدم اندر رکھا تھا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پاپا!۔۔۔ مئی ہی نہیں، میں اور چاچو، ہم سب جانتے ہیں کہ ماہا کہاں ہے اور کیوں ہے۔ بہتر ہوگا آپ بھی جان لیجئے کہ اگر ماہا نے ایسا کیا تو کیوں کیا۔ صرف اور صرف آپ کے خوف سے۔“

”مجھے یقین تھا۔“ سعد حسن بخاری نے سر ہلایا تھا۔ ”مجھے یقین تھا تم سب اس حقیقت سے واقف ہو گے۔ اور ماہا کو تم لوگوں نے جان بوجھ کر کہیں چھپا دیا ہے۔“

”چھاپا نہیں ہے پاپا! وہ نانو کے گھر ہے اور اپنی مرضی سے ہے۔ اسے وہاں سے ہم تو کیا شاید آپ بھی نہیں لاسکتے۔ عائلہ و بالغ ہے وہ اور ایک بالغ بچہ اپنی مرضی سے فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس کے لئے اسے قانون روک سکتا ہے نہ ہی ہم جیسے سوکا لڈر شتے۔ بجائے یہ جانچنے کے کہ ماہا کدھر ہے آپ یہ سوچ کر نہ ذرا سوچ کر دیکھیں؟“ ایک باپ کے خوف سے جو دوسری بار اس کی زندگی کو اپنے ایک غلط فیصلے کی نذر کرنا چاہتا ہے۔ پاپا! آپ کب یہ سمجھیں گے کہ ماہا آپ کی وہی تضحی پری ہے جس کی ایک ذرا سی تکلیف پر آپ خود بھی رو دیا کرتے تھے۔ اور آج۔۔۔ آج آپ کس درجہ سنگدل ہو چکے ہیں۔ کیا آپ وہی ایک لبرل باپ ہیں جنہوں نے اپنے بچوں کو ایک نئی سوچ کے ساتھ جینا سکھایا، سوچنا سکھایا اور جب وہ سوچنا اور جینا سیکھ گئے تو آپ ان کے پرکاش دینا چاہتے ہیں اور ان کے ذہن مفلوج۔ پاپا! یہ کیا ہے؟ کیا آپ نے ایمان داری سے خود ایک بھی بار سوچا ہے کہ آپ ماہا کے لئے یہ فیصلہ کیونکر لے رہے ہیں؟۔۔۔ صرف اس لئے کہ کوئی اور ایسا چاہتا ہے۔۔۔ پاپا! آپ اپنے بچوں کی زندگیاں کئی اور کے فیصلے کی نذر کر دینا چاہتے ہیں؟“ اذہان بہت حد تک جذباتی نظر آیا تھا۔

فیض چاچو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید بولنے سے جیسے روک دیا تھا۔ سعد حسن بخاری فارحہ کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

”تم سے صرف ایک مدعا بیان کیا تھا فارحہ! تم نے تو رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ میرے بچوں کو میرے خلاف کرنے میں تمہارا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ میں نے ماہا کا رشتہ طے نہیں کر دیا تھا، صرف ایک پروپوزل سامنے رکھا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ ہم ماہا کی شادی ہیں کرتے۔ مگر تمہاری عادت ہو گئی ہے داویلا کرنے کی۔“ سعد حسن بخاری کہہ کر کے نہیں تھے۔ وہاں سے نکلنے چلے گئے تھے۔ اذہان حسن بخاری نے ماں کی طرف دیکھا تھا اور پھر تڑپ جاکر انہیں اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

”ڈونٹ وری می!۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔ ماہا کے ساتھ اب میں کچھ غلط ہونے نہیں دوں گا۔“

”بیٹا! تم نے ماہا کو سیف کرنے کے لئے جو بھی کیا ٹھیک کیا۔ مگر بھائی کو سمجھانا ذرا مشکل ہے۔ وہ نظریاتی اختلاف کو دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت انہیں صرف یہ لگ رہا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں باقی سب غلط۔ جب وہ ذرا ٹھنڈے ہوں گے تو میں خود بات کروں گا۔ ماہا ہم سب کو عزیز ہے۔ مگر بہتر ہوگا ہم ماہا کو واپس اس گھر میں لے آئیں۔“ فیض چاچو نے صلاح دی تھی۔

”چاچو! آپ یہ کہہ رہے ہیں۔ جبکہ آپ پاپا کو اچھی طرح جانتے ہیں۔۔۔ جانے کیسے ہو گئے ہیں وہ۔ کتنا بدل کر رکھ دیا ہے اس عورت نے انہیں۔ انہیں اپنے بچے، اپنا گھر کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ سب غلط لگ رہا ہے۔ اور یہی ماہا کی بات، تو ماہا اپنی مرضی سے وہاں گئی ہے اور اسے وہاں سے نہ تو ملنا واپس لاسکتا ہوں نہ ہی آپ۔ کیونکہ وہ خود یہاں آتا نہیں چاہتی۔ اور چاچو! وہ حق پر بھی ہے۔ جس گھر میں رہنے والوں کو تحفظ نہ ملے اور انہیں باہر بھاگنا پڑے وہ گھر نہیں ہوتا۔ پاپا نے اپنے منہ سے اس گھر کو گھر نہیں، ایک اکھاڑ بنا دیا ہے۔ جہاں ہر روز ایک نئے اختلاف کو لے کر اپنے اپنے اصولوں کے موقف پر سختی سے ڈٹا رہا جاتا ہے اور بے قصوروں کی قربانی دی جاتی ہے۔ پاپا کو عادت ہو گئی ہے دوسروں

سے قربانی لینے کی۔ مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“ اذہان حسن بخاری کا لہجہ اور انداز دونوں ہی اٹل تھے۔

مسلل پریشانی اور سوچوں نے اُسے اس سچ پر لا کھڑا کیا تھا جہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس کا بی پی خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا جسے نارمل کرنے کے لئے ڈاکٹر مسلسل کوشش کر رہے تھے۔ سردار سبکگین حیدر لغاری اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے جانے کیا سوچ رہا تھا۔ ایک بار پہلے بھی اس کی یہی حالت ہوئی تھی۔ جب وہ نیویارک میں تھی اور اس کے پاپا کی سرجری ہوئی تھی۔ تب بھی سبکگین حیدر لغاری نے ہی اسے سنبھالا تھا اور اب بھی۔

”آپ ان کے ہزبینڈ ہیں؟“ تب سبکگین حیدر لغاری نے سراسنات میں ہلا دیا تھا۔

”کتنا عرصہ ہو گیا آپ کی شادی کو؟“

”آٹھ مہینے۔۔۔ چھیس دن۔۔۔ اور ساتھ گھنے۔ اندر کوئی مدد آواز اُبھری تھی۔“

”زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔۔۔ مگر تشویش کی بات کیا ہے؟۔۔۔ ہاؤ ازشی ناؤ؟۔۔۔ اب کیسی ہے وہ؟ کیا سب کنٹرول میں آ رہا ہے؟۔۔۔ بی پی کیسا ہے؟۔۔۔ نارمل ہے یا۔۔۔؟“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے کئی سوال ایک ساتھ کر دیئے تھے۔

ڈاکٹر مسکرا دیا تھا۔

”جب اتنا لوگ اینڈ کیئرنگ ہزبینڈ ہو تو پھر پرائلم کیا ہو سکتی ہے کہ بی پی اس حد تک پہنچ جائے؟“ ڈاکٹر کو تشویش ہوئی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے کچھ نہیں کہا تھا۔ خاموشی کے ساتھ میرب سیال کے چہرے کو دیکھنے لگا تھا۔ ڈاکٹر اس کا بی پی دوبارہ لینے لگا تھا۔

”آپ انہیں بروقت لے آئے۔ ورنہ بات اختیار سے باہر بھی ہو سکتی تھی۔ برین ٹیمبرج۔۔۔ بیبرالائزڈ۔۔۔ یا پھر ہارٹ فیل۔۔۔ اچھو کی اتنی سی عمر میں اتنا زیادہ بی پی ہونا خطرے سے خالی نہیں۔ اتنی کم عمری میں عموماً اتنا ہائپریشن ہوتا نہیں۔ مگر جب ہوتا ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ ہوتی ہے۔ مگر اتنے ہائی پریشر سے دل، گردے، دماغ کچھ بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ مجھے تو وجہ صرف وقتی ٹینشن اور اسٹریس ہی لگ رہی ہے۔ مگر ہو سکتا ہے وجہ کوئی اور بھی ہو۔ میں کچھ ٹیسٹ لکھ دیتا ہوں۔ آپ وہ کروا لیجئے۔ عموماً کڈنیز کے باعث بھی یہ پرائلم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے ان کے کڈنیز میں کوئی خرابی ہو۔“

”نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ یہ صرف وقتی اسٹریس ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے فوری طور پر جواب دیا تھا۔

”سمجھ دار ہیں آپ۔ مگر آپ کو اپنی وائف کی ایکسٹرا کیئر کی ضرورت ہے۔ بے حد خیال رکھنے کی۔ اگر انہیں کوئی پریشانی ہے بھی تو اسے فوری طور پر بانٹنے اور انہیں تھامت چھوڑیے۔ تنہائی میں ادھر ادھر کے خیال اور سوچیں زیادہ پریشان کرتی ہیں۔“ ڈاکٹر نے مخلصانہ رائے دی تھی۔ ”آپ دونوں کا بیئر بہت اچھا ہے۔ دعا ہے جوڑی سلامت رہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی وائف دوبارہ اگر ہاسپٹل

میں آئیں گی تو اس کا کاز یہ ہائرٹینشن نہیں ہوگی۔“ ڈاکٹر مسکرایا تھا۔ ”ویسے اب ان کی حالت پہلے بہت بہتر ہے۔ بی بی ازاٹر کٹروڈلڈ۔ میں کچھ ٹاکس اور دوائیں لکھ دیتا ہوں۔ انہیں ضرور دیا انشاء اللہ شی ول بی فائن۔“ ڈاکٹر نے پرچہ لکھ کر اس کی سمت بڑھایا تھا۔

میرب سیال نے بہت آہستگی سے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا۔

سردار سینگین حیدر لغاری فوری طور پر اس کی سمت بڑھا تھا۔

”میرب! اب کیسا محسوس کر رہی ہو تم؟۔ آر یو آل رائٹ؟“ کسی قدر تشویش سے دریافت تھا۔ مگر میرب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا اور پھر اسی آہ سے چہرے کا رخ پھیر لیا تھا۔

اس شام وہ لوگ ماہوش بخاری کے گھر تھے۔ اوزی چائے کے ساتھ مسلسل چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔

”کب تک بوریا بستر ڈال کر بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے؟۔ اپنی راہ لو۔ ورنہ شادی کر کے گھرا لو۔“ انابیہ نے اسے چھیڑا تھا اور اوزی ہنس دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔۔۔ بلکہ سوچ چکا ہوں۔ بس تم سے بات کرنا باقی تھا۔ لڑکی کی رضامندی لے لیتا۔ دراصل وہ مجھے بتانے سے گریزاں ہے شاید۔ مشرقی لڑکی ہے نا۔ شرما بہت ہے۔“ اوزی مسکرایا تھا۔ عفتان علی خان چپ چاپ بیٹھا تھا۔

”کون ہے وہ؟۔ کیا میں اُسے جانتی ہوں؟“ انابیہ نے دریافت کیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ بہت اچھی طرح۔“ اوزی مسکرایا تھا۔

”ایسیسکو زمی!۔۔۔“ عفتان علی خان اٹھا تھا اور چلتا ہوا دادا ابا کے پاس جا بیٹھا تھا۔ انابیہ نے او

بطور خاص اوزی نے اسے دیکھا تھا۔

”انابیہ! ایک بات بتاؤ گی؟“

”ہوں۔“

”سچ بچ۔۔۔ ایک اچھا دوست سمجھ کر۔۔۔“

”ہوں۔“

”تم عفتان کو جان بوجھ کر اگنور کر رہی ہونا؟“ اوزی نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ دھرا تھا۔ انابیہ چپ ہو کر ایک لمحے میں اجنبی ہو گئی تھی۔ جیسے وہ اس سوال کا کوئی جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔

”انابیہ! تم اب بھی عفتان کو قصور وار سمجھتی ہو۔ جبکہ اس نے تمہارے لئے اتنا کچھ کیا جتنا شاید ہم سب بھی نہیں کر سکے۔“ اوزی نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

مگر انابیہ جو اب ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔

”انابیہ! تمہیں لگتا ہے، عفتان جیسا شخص کچھ غلط کر سکتا ہے؟۔ وہ جو صرف ایک حساس دل رکھتا ہے اور صرف محبت کرنا جانتا ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ وہ کچھ ایسا بھی کر سکتا ہے جس کو نہ عقل تسلیم کرتی ہو اور نہ ہی

ل۔“ اوزان سید نے سنجیدگی سے بہن کی طرف دیکھا تھا اور انابیہ بے تاثر دکھائی دے رہی تھی۔

”انابیہ! یہ ٹھیک نہیں ہے۔ عفتان کو اس بات کی سزا مت دو جو اس نے کیا ہی نہیں۔ تم لامعہ کو لے کر کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہی ہو۔۔۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”تمہیں کیا پتہ کہ میں لامعہ کو لے کر جذباتی ہو رہی ہوں۔ میں نے تو تم سے ایسا کچھ نہیں کہا۔“ انابیہ نے اس کی سمت حیرت سے دیکھا تھا۔ اوزی نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور بغور توجہ سے دیکھا تھا۔

”انابیہ! تم مجھ سے کچھ بھی نہیں کہو گی تب بھی میں وہ بات جان جاؤں گا جو تمہارے دل میں ہے۔ تمہیں مجھے کچھ کہنے کے لئے لفظوں کے سہارے لینے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ بات میں اب سے نہیں جانتا ہوں، جب تمہاری شادی ہو رہی تھی تب بھی جانتا تھا تم عفتان کی طرف سے بدظن ہو۔ مگر میں سمجھا تھا وقت کے ساتھ تم اس حقیقت کو انڈر اسٹینڈ کر لو گی۔ مگر تم۔۔۔ انابیہ! اپنی زندگی کو کسی بے وقوفی کی نذر مت کرو۔ تم مانتی ہو نا یہ سب قسمت کے کھیل ہوتے ہیں۔ تم تو اتنی سمجھ دار تھیں۔ مجھے سمجھایا کرتی تھیں۔ پھر اب کیا ہوا؟۔ یاد ہے جب لامعہ حق نے مجھے رجسٹر کر دیا تھا تو تم نے مجھے سو سو دلا سے دیئے تھے اور آج۔۔۔ آج تم خود اس حقیقت سے منحرف ہو رہی ہو کہ تقدیر نامی کوئی شے اس دنیا میں کسی انسان کے پاس ہوتی بھی ہے۔ انابیہ! تم یہ کیوں نہیں سمجھ رہی ہو کہ عفتان، لامعہ کے لئے نہیں تھا۔ کروہ لامعہ کے لئے ہوتا تو اسی کے ساتھ رہتا۔ مگر تم جانتی ہو وہ اس کے ساتھ رہ کر بھی اس کے ساتھ نہیں رہا۔ کیوں؟۔ جانتی تھیں نا تم وہ تمہیں چاہتا تھا۔ بس یہی ایک غلطی ہوئی ہے اس شخص سے۔ اس نے بیماندراری سے تمہاری خواہش کی ہے۔۔۔۔۔۔“

”اوزی! تم اسے فیور مت کرو۔۔۔ یہ ٹھیک ہے وہ تمہارا بہترین دوست ہے مگر تم یہ مت بھولو کہ تم میرے بھی بھائی ہو۔“ انابیہ نے اسے جھٹلایا تھا۔

”ہاں۔۔۔ بھائی ہوں۔۔۔ تمہی تو چاہتا ہوں تم اپنے گھر خوش رہو، آباد رہو۔ سنو انابیہ! ماہوش نام کو پتہ چلے گا تو انہیں بہت دکھ ہوگا۔ اور لکھ کر رکھ لو تم۔۔۔ تم اس حقیقت کو زیادہ دنوں تک چھپا نہیں سکو گی اور آہستہ آہستہ یہ بات سب کو پتہ چل جائے گی۔“

”کیا بات سب کو پتہ چل جائے گی بھئی؟“ ماہوش شاہ ملازم کے ساتھ ٹرائی لئے اندر داخل ہوئی تھیں۔ اوزی مسکرا دیا تھا۔

”کچھ نہیں مانا!۔۔۔ یونہی انابیہ سے ہنسی مذاق کر رہا تھا۔ بہت دنوں بعد فرصت سے بیٹھے ہیں نا۔“

”ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔ مگر انابیہ! یہ کیا سن رہی ہوں میں؟۔ تم ہی مون پر نہیں جا رہی ہو؟ بری بات بنا!۔۔۔ فاطمہ سے بات ہوئی تھی۔ وہ بتا رہی تھیں کہ تم منع کر رہی ہو۔۔۔ جان! یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں زندگی میں اور پھر یہی دن تو ہنسنے کھیلنے کے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد تو ذمہ داریاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ بائے دی وے، یہ عفتان وہاں کیا کر رہا ہے؟۔ تم لوگ کہنی نہیں لے رہے ہو اسے؟“ ماہوش نے کہہ کر عفتان کو آواز دی تھی۔

”عفتان بیٹے! — یہاں آ جاؤ — اور اباجی! آپ بھی آجائے — چائے تیار ہے۔“
عفتان علی خان اٹھ کر اس طرف چلا آیا تھا۔ ماہ و ش جہان دیدہ تھیں۔ ایک عجب طرح کا کھنڈا دونوں کے بیچ محسوس کئے بنا نہیں رہ سکیں تھیں۔ مگر وہ جانتی تھیں قصور ان کی اپنی بیٹی کا ہوگا۔ تبھی ہدایت خا کرتے ہوئے اندر بڑھ گئی تھیں۔

”انا بیہ! چائے سے فارغ ہونے کے بعد مجھے ضرور ملنا۔ بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”جی۔“ انا بیہ نے سر ہلایا تھا۔ وہ جانتی تھی کیا بات ہوگی۔ اوزی کی طرح ماما بھی اس کی کلاس! جی۔ اسے سمجھائیں گی۔ جانے کیوں سب کو قصور اسی کا دکھائی دے رہا تھا۔ غلطی اسی کی لگ رہی تھی۔ حالانکہ اگر کوئی اس کی سنتا اور پوچھتا تو صاف صاف بتا سکتی تھی کہ غلطی کسی کی تھی۔ عفتان علی خان اس جانب متوجہ نہیں تھا۔ وہ اس کے پیرنٹس کے سامنے جتنا ہار ش بی ہو کرتی تھی وہ اتنا ہی رکھ رکھاؤ قائم ہونے تھا۔ وہ جتنا بات کو بگاڑتی تھی وہ اتنی ہی بات کو بنائے رکھنے کی کوشش میں تھا۔ انا بیہ نے اس سمت بنور دیکھا تھا۔ اگر ان کے درمیان سب کچھ ٹھیک نہیں تھا تو اس کی خبر یقیناً سب کو ہونا نہیں چاہتی تھی۔ عفتان اس معاملے میں سبقت لے گیا تھا اور وہ اس گھڑی شرمندہ دکھائی دے رہی تھی۔ مگر وہ غلطی ماننا نہیں چاہتی تھی۔ اوزان، عفتان سے بات چیت کر رہا تھا۔ انا بیہ اٹھ کر ماما کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

جب واپس لوٹی تھی تو عفتان اس کا منتظر تھا۔ انا بیہ ناچار اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔

دھیمی دھیمی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ پلٹے پلٹے چلتے چلتے اچانک لان میں رک گئی تھی۔ عفتان علی خان جو اس ایک دو قدم کے فاصلے پر تھا، یکدم مڑا تھا۔ وہ سر آسمان کی طرف اٹھائے بارش سے محفوظ ہوتی ہوئی بڑھتی گئی تھی۔ مگر یہ اتحقاق، یہ حقوق — شاید اس کے نام نہیں تھے۔ وہ دیکھتے رہنے کی خواہش کر رہے تھے۔ یہ سلسل اس کی سمت نہیں دیکھ سکا تھا اور چلنے کے لئے مڑ کر قدم اٹھا دیا تھا۔

”عفتان!“ ایک صدا باز گشت بنی تھی۔ عفتان علی خان کسی قدر حیرت سے چونک کر مڑا تھا۔ انا بیہ کی سمت متوجہ تھی۔

”کیا تھوڑی دیر رک نہیں سکتے ہو؟“ کیا تھا اس لہجے میں — کوئی درخواست، کوئی خواہش، یا پھر بس ایک رکھ رکھاؤ والی بات — صرف ایک جملہ —

”بارش تو تمہیں بھی اچھی لگتی تھی نا؟“ جانے کس زمانے کی بات یاد دلائی تھی۔ عفتان کو ایک بار پھر حیرت ہوئی تھی مگر وہ بے تاثر بن گیا تھا۔

”ہاں — مگر اب اچھی نہیں لگتی۔ تم ٹھہرنا چاہتی ہو تو ٹھہر جاؤ، میں انتظار نہیں کر سکتا۔ جانا ہے۔ وہ مڑا تھا۔ انا بیہ نے ایک لمحے کو دیکھا تھا — پھر چلتی ہوئی اس کے پیچھے آگئی تھی۔ عفتان گاڑی

دروازہ کھول رہا تھا جب وہ چلتی ہوئی گاڑی کے پاس جا رہی تھی۔

”میں تمہیں بتانا چاہتی تھی۔“

”کیا؟“ عفتان بے تاثر انداز میں گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا تھا۔ بارش تیز ہو رہی تھی۔ انا

بھی تیزی سے جھپکنے لگی تھی۔ تبھی دروازہ کھولا تھا اور فرنٹ سیٹ سنبھال لی تھی۔

”میں سوئزر لینڈ جانے کو تیار ہوں — مگر میری ایک شرط ہے۔“
عفتان نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”تم اپنی شرائط ماما کو بتا دینا — غالباً وہ پندرہ بیس دنوں میں سوئزر لینڈ جا رہی ہیں — اگر ان کو تمہاری شرائط منظور ہوں گی تو وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گی۔“
انا بیہ شا کڈ رہ گئی تھی۔

”کیوں — کیا ہم سوئزر لینڈ نہیں جا رہے؟“

”نہیں۔“ عفتان علی خان نے حتی انداز میں کہا تھا۔ ”تمہیں گھر جانا ہے یا کہیں اور ڈراپ کر دوں؟“
کچھ نیلی مجھے کہیں اور بھی جانا ہے۔“ عفتان کا رویہ عجب سرد مہر ہو رہا تھا۔
انا بیہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”اگر تمہیں زیادہ جلدی ہے تو میں کیپ لے لیتی ہوں۔“ ایک مشورہ دیا تھا۔ مگر عفتان علی خان نے ذرا اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”میرے خیال میں یہ زیادہ مناسب ہے۔“ گاڑی سائیڈ پر روک کر ایک کیب ہار کی تھی اور پھر اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا۔ انا بیہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔ عفتان اس حد تک غیر ذمے دار ہو سکتا تھا۔ رات کے اس لمحے وہ اسے اپنی بیوی کو تنہا — اکیلے ایک کیب میں سفر پر مائل کر رہا تھا۔ مگر — یہ تجویز تو خود اس کی اپنی تھی۔ عفتان علی خان کو دیکھا تھا، وہ اس کا منتظر تھا۔ تب وہ چپ چاپ گاڑی سے اتر کر کیب میں بیٹھ گئی تھی۔ عفتان علی خان اس درجہ بے مروت ہوگا، وہ نہیں جانتی تھی۔ عفتان علی خان کی گاڑی کو زن سے آگے بڑھتے دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔ اور پھر گاڑی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ جانے کیوں اپنی تدلیل کا احساس بھر پور انداز میں ہوا تھا۔ عفتان کیا جان بوجھ کر ایسا کر رہا تھا؟

اصولاً تو سردار بنگلین حیدر لغاری کو کوئی اقدام کرنے چاہئیں تھے۔ مگر میرب کو گھر لانے کے بعد اس میں کوئی پیش رفت دکھائی نہیں دی تھی۔ ہنوز اسی گھر میں موجود تھی اور سردار بنگلین حیدر لغاری اُسے نہ تو گور کر پارہا تھا اور نہ ہی اس کی طرف سے ہاتھ کھینچ پارہا تھا۔ اُس کی فراغت کے کسی لمحے اب بھی اس کے ساتھ ہی بسر ہوتے تھے۔ میرب سیال کو اس سے کچھ سروکار نہ تھا کہ سردار بنگلین حیدر لغاری کیا کچھ رو رکھتا تھا اور کیا کچھ نہیں۔ اُسے اس شخص سے بھی کوئی سروکار نہ تھا، وہ کجا اس کے ساتھ اپنی شامیں نانا یا پھر اپنی پوری لائف۔

اُسے اس سے مطلق کوئی سروکار نہ تھا۔

اُسے جو کرنا تھا، وہ سوچ چکی تھی۔ شام میں پایا سے بات ہوئی تھی پھر اس کے فوراً بعد مائی کا فون بھی آ گیا تھا۔ کتنے دنوں بعد ان سے بات ہوئی تھی۔ وہ اس کی طرف سے سخت تشویش میں تھیں۔ غالباً سردار

سبکتگین حیدر لغاری نے انہیں اس کی گزشتہ روز کی کیفیت کے متعلق مفصل رپورٹ دے دی تھی۔ اس بات کے انہیں مطمئن کر دیا تھا۔ ان کے آنے میں ابھی کچھ دن تھے مگر وہ میرب کو بار بار اپنا خیال رکھنے کی تلقین کر رہی تھیں۔ میرب جانتی تھی مائی اماں اس سے کس درجہ محبت کرتی تھیں۔ وہ ان کے لئے ایک بیٹی جیسی تھی۔ وہ بھی مائی اماں کو اتنا ہی مس کر رہی تھی۔

شاہور لے کر فریش ہونے کے بعد وہ الماری کھول کر اپنی تمام چیزوں کو نکال کر بیڈ پر ڈال رہی تھی ساتھ ہی دو تین ملازم خواتین کو متواتر ہدایت کر رہی تھی کہ کون سا سامان کس سوٹ کیس میں رکھیں۔ ریلیکسڈ موڈ میں اپنا سیل اٹھا کر سردار سبکتگین حیدر لغاری کو ”نیکسٹ“ کیا تھا اور اسی قدر اطمینان سے ہوئی دوبارہ الماری کے پاس آن رکھی تھی۔

”ارے۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو؟۔۔۔ یہ اور کوٹ اس بلیک سوٹ کیس میں رکھو اور یہ جوتے و گرے بیگ میں ڈالنے ہیں۔“ ہدایت دے کر وہ مڑی تھی جب سردار سبکتگین حیدر لغاری کو اپنے کھڑے پایا تھا۔ وہ اتنی جلد پہنچ جائے گا اسے اندازہ نہ تھا۔ بہت اطمینان سے ایک سانس خارج کر ہوئے پُر اعتماد نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری کی نظروں میں حد درجہ حیرت کا دہن رہی تھی۔ وہ اسے اور اس کے کمرے کے ماحول کو کسی قدر حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میرب کو بازو سے تھام کر کسی قدر غصے سے دریافت کیا تھا مگر میرب اپنا بازو کی گرفت سے چھڑائی ہوئی اطمینان سے مسکرا دی تھی۔

”پاپا کا فون آیا تھا۔ مائی سے بھی بات ہو گئی ہے میری۔ تم جانتے ہو میری طبیعت ٹھیک ہے۔ میں کچھ دنوں کے لئے ان تمام کاموں سے چھٹی لینا چاہتی ہوں۔ اگیزیز بھی نمٹ چکے ہیں اور سمسٹر ہو سکتا ہے میں ڈراپ کر دوں اور نیکسٹ سمسٹر جوائن کروں۔ خیر یہ سب بعد کی باتیں ہیں اور یقیناً اس میں کچھ خاص انٹرسٹ بھی نہیں ہو گا۔ خاص بات یہ ہے کہ میں تمام کاموں سے فرا لے کر چھٹیاں گزارنے پاپا کے پاس جا رہی ہوں۔ مائی نے بھی اس فیصلے کو خوشی خوشی قبول کیا ہے۔“

”کونسا نہیں میرا بہت خیال ہے۔ بیٹی ہوں نا اُن کی.....“

وہ ابھی کچھ اور بھی بول رہی تھی جب سردار سبکتگین حیدر لغاری اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا کہ سے باہر لے گیا تھا۔

”کیا..... یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟ ہوش میں تو ہو؟“ سردار سبکتگین لغاری کسی درجہ برہم دکھائی دیا تھا مگر میرب نے اس کا شانہ بجاتے ہوئے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا ”ریلیکسڈ۔۔۔ بی ریلیکسڈ۔۔۔ ٹینشن لینا تمہارے لئے اچھا نہیں۔ اور یہ تو یوں بھی ایک فری نیوز ہے تمہارے لئے۔ میرے جانے کے بعد غالباً تمہیں گی کے ساتھ اور بھی اچھا وقت گزار موقع مل جائے گا اور تم بھی اچھی طرح سے اس کا خیال رکھ پاؤ گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے غالباً کوئی رہی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری کے لئے اس لڑکی کا یہ روپ بہت نیا تھا۔ کل تک جو اس کی کیفیت اسے دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ وہ اس فیز سے باہر بھی نکلے گی اور کہاں وہ آج اچانک اتنے چیل (Chill)

تھی۔ تم نہیں جاسکتی ہو۔۔۔ میں نے کہا، تم نہیں جاؤ گی۔ مائی اماں تمہیں کیسے اجازت دے رہی ہیں؟۔۔۔ میں رد کرتا ہوں اسے۔ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔“ جنونی انداز میں اسے شانوں سے تھامتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا تھا مگر میرب مسکرا دی تھی۔

”لگتا ہے سردار سبکتگین حیدر لغاری! تمہیں اپنی بیوی سے محبت نہیں۔ اس کی اس درجہ خراب کیفیت، باوجود تم اسے یہاں دیکھنا چاہتے ہو۔ سنا نہیں تھا ڈاکٹر نے کہا ہدایت کی تھی۔ تمہیں میرا خیال بنا چاہئے۔ اور پاپا میں کون سا ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں۔ صرف چھٹیاں گزارنے جا رہی ہوں۔ تمہیں گی کو چھوڑ کر آنے میں کوئی پرابلم نہ ہو تو تم بھی میرے ساتھ چلو۔ دونوں مل کر انجوائے کریں گے۔ وہ باکتے ہیں۔ ایک سے بھلے دو۔“ وہ اطمینان سے مسکرائی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے رات سے دیکھا لہذا پھر شانوں سے پکڑ کر جھوڑ دیا تھا۔

”پاگل ہو گئی ہو تم۔۔۔ میں نے کہا نا، کہیں نہیں جاؤ گی تم۔ یہیں رہو گی میرے پاس۔“ حکم صادر کیا تھا مگر میرب مسکرا دی تھی۔

”تم نے وہ امر کی کہاوت نہیں سنی شاید، جس کے پاس کیک ہوتا ہے اسے چیریز بھی لازمی درکار تے ہیں۔ تمہارا بھی یہی پرابلم ہے۔“ عجب طنز تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے ٹٹی میں سر ہلا رہی تھی۔ ”میں فی جا رہی ہوں۔ اور یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ مجھے جانا ہی ہے۔ اگر کسی اور کو میرا کوئی خیال ہے تو ضروری نہیں کہ میں خود بھی اپنا کوئی خیال نہ کروں۔ میں نے اپنے سوچنے کا انداز بدل دیا ہے۔ اب میں زندگی کو اس طرح سے دیکھنے لگی ہوں جس طرح سے بہت سے دوسرے لوگ دیکھتے ہیں۔ اب میرے لئے کوئی شے زندگی سے بڑی یا بڑھ کر قطعاً نہیں ہے۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آرہی ہے“

”میرب نے کسی قدر توجہ سے سر اٹھا کر اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری عجب تذبذب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نظروں میں حیرت بے حد واضح تھی۔ وہ واقعی بے حد حیران تھا۔“

”تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ انڈر اسٹینڈ؟۔۔۔ تم میری بیوی ہو۔ اور تمہیں روکنے کے سارے تم میرے پاس ہیں۔ اس سے زیادہ نہ تم کچھ کہو گی نہ ہی میں سنوں گا۔ رائٹ؟“

دونوں شانوں سے اسے تھام کر یکدم وہ سختی سے بولا تھا جب میرب سیال مسکرا دی تھی۔ ”اوہ مسٹر ہز بنینڈ!۔۔۔ شاید آپ بھول رہے ہیں ابھی ہمارا صرف نکاح ہوا ہے، رخصتی نہیں۔ مشرق شادی کو صرف بھی شادی کہا جاتا ہے جب لڑکی دلہن بن کر اپنے ہز بنینڈ کے گھر آجائے۔ اور میں آپ کی منکوحہ ہوں۔ ہمارا صرف نکاح ہوا ہے، شادی نہیں۔“ اس کے خیال میں اس کی دلیل ٹی ٹھوس تھی۔ مگر سردار سبکتگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو بالکل ایسے تھپتھپایا جیسے اس گھڑی وہ اس کے سامنے کوئی بچی ہو۔

”سوئی!۔۔۔ یہ جو گز بھر کا فاصلہ ہے نا، اسے یونہی قائم رہنے دو۔ ورنہ یہ جو چھوٹی موٹی دیواریں

نے۔“ شاید بات کو کسی قدر ثقیل ہونے سے بچانے کے لئے وہ مسکرائی تھی۔ مگر میرب پر اس کی حس کا کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اسی طرح چپ چاپ کھڑی رہی تھی۔

”میرب! تم بہت خوبصورت ہو۔ یقیناً تمہارا دل بھی بہت خوبصورت ہوگا۔ مگر میں اس دل میں کی عجیب نش ہرگز نہیں ڈھونڈوں گی۔ نہ ہی ایسی کوئی اجازت طلب کروں گی۔ کیونکہ اس دل میں اگر کو رہنا ہے تو وہ صرف گین ہی ہے۔ میں نہ تو تم سے گین کو چھیننے آئی ہوں نہ ہی تمہیں خونخوردہ نے۔ اگر تمہیں میری وجہ سے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں اس کے لئے معذرت کروں گی۔ ساتھ ہی بات کا یقین بھی دوں گی کہ تمہیں مزید تکلیف نہیں اٹھانا پڑے گی۔ کیونکہ صبح میں یہاں سے چلی جاؤں اور.....“

”گی! تم کہیں نہیں جاؤ گی۔“ وہ بول رہی تھی جب سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کا ہاتھ اٹھام کر کہا تھا۔ انداز دو ٹوک تھا اور میرب جو اس لمحے سامنے کھڑی تھی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کی سمت دیکھا تھا اور پھر نگاہ پھیر کر دوبارہ گی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”دوبارہ ایسی بات مت کہنا۔ آئی کانٹ ہیئر دیٹ۔ تم یہیں رہو گی۔ تمہیں، میرے پاس۔ یہ یہ کسی کو اچھا لگے یا نہ لگے۔ آئی ڈونٹ کیئر۔“ اس قدر حتمی انداز۔ اس قدر حتمی ٹھوس لہجہ۔

میرب سیال نے کسی قدر بے یقینی سے سردار سبکتگین حیدر لغاری کو دیکھا تھا۔ خالی خالی آنکھوں میں ہی نمی تیرنے لگی تھی۔ اس کے قدم یکدم ہی اٹھے تھے اور وہ چلتی ہوئی وہاں سے نکلنے لگی تھی۔

اندر باہر۔۔۔۔۔ ہر طرف ایک سناٹا تھا۔ کتنی آوازیں اندر ہی اندر دم توڑ رہی تھیں۔ مگر وہ چپ چاپ چلتی جا رہی تھی۔ جانے کہاں جا کر یہ تم ہونا تھا۔



ہیں نا، ان کے گرنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی۔ نہ تو ابھی حوصلہ ہارا ہے نہ ہی ہمت۔ معمول۔۔۔۔۔ افریق آ رہا ہے فقط دانستہ ہے۔ ورنہ سردار سبکتگین حیدر لغاری کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔ ناممکن۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔“ مسکراتے ہوئے سرنئی میں ہلایا تھا۔ ”ایسا کوئی لفظ اس شخص کی زندگی میں نہیں ہے۔

لہجہ بہت کچھ باور کراتا ہوا تھا۔ میرب سیال کو اپنے حوصلے ایک لمحے میں پست ہوتے محسوس ہونے لگے۔

”تم میری کیا ہو؟ یہ بتانا تمہیں ضروری نہیں ہے۔ آئی نوٹ دیٹ۔۔۔۔۔ جانتا ہوں میں۔۔۔۔۔ میں ہو، میرے اختیار میں ہو، بار بار یاد دہانی کرانے کی ضرورت باقی ہے کیا؟۔۔۔۔۔ پاگلگی ہوتی ہے۔

سچ، بالکل پاگل۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں سمجھتی ہو۔ چھوٹی چھوٹی کبیروں کو ملانا دشوار نہیں ہوتا تھا! چھوٹی باتوں پر جلنا کڑھنا چھوڑ دو۔ بہت فکر رہتی ہے تمہاری۔ بہت ستاتی ہوتی۔“ مدھم مدھم سرگوشی میں عجب شاک تھی۔ میرب سیال متواتر اس کی طرف دیکھ نہ سکتی تھی۔ نظریں خود بخود جھکتی چلی گئی تھیں۔ سردار سبکتگین

لغاری نے اسے شانوں سے تھامتے ہوئے لغور دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر چہرے کو قدر لگے اور اٹھایا۔

”رشتوں کے بنانے میں اور رشتوں کے بنانے میں بہت فرق ہوتا ہے میرب!۔۔۔۔۔ اپنے اپنے استحقاق سے میں واقف ہوں۔ سو اپنی طرف سے تم بھی یہ یقین کر لو کہ تمہارے لئے تمہاری پہلی

آخری راہ میں ہی ہوں۔ نہ تم کو میرے علاوہ کہیں اور دیکھنا ہے نہ ہی سوچنا ہے۔ کیونکہ میرے اور تمہارے درمیان جو رشتہ بندھا ہوا ہے اسے میں نبھانا چاہتا ہوں۔ نہ کوئی اور راہ نہ کوئی تاویل۔ میرے پاس

کے علاوہ کوئی دلیل بھی نہیں ہے ہنی!۔۔۔۔۔ سو تم بھی خواہ مخواہ کی یہ میں مانیاں ترک کر دو۔ اچھا نہیں بار بار تم پر یہ جتنا کہ تم بے حد کمزور ہو اور میں کس قدر باختیار۔“ بچوں کی طرح اسے اچھپکارتے ہوئے

زری سے مسکرا رہا تھا۔ میرب سیال اپنے اندر بہت کچھ ٹوٹا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ بہت سی ہمتیں شاید چپ چاپ دے رہی تھیں۔

وہ چپ چاپ کھڑی تھی جب ارد گرد کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ میرب نے نگاہ اٹھ دیکھا تھا۔ قدرے فاصلے پر گی کھڑی تھی۔ جواب چلتی ہوئی قریب آگئی تھی۔

”آئی ایم سوری!۔۔۔۔۔ یہ سب میری وجہ سے ہے نا۔ دراصل مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم گین سے ناتے سے وابستہ ہو۔“ گی شستہ انگریزی میں کہتے کچھ لہجہ بھر کوری تھی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر میرب کے

پراپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ”تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔۔۔ اگر کسی کو جانا ہے تو شاید وہ میں ہوں۔ میں جانتی تھی کہ تمہیں میرے متعلق اس قدر دھچکا لگے گا۔ میں تو تم دونوں کے متعلق ٹھیک سے جانتی بھی

تھی۔ گین سے کبھی پوچھا بھی نہیں اور اس نے کبھی بتایا بھی نہیں۔ میں ہمیشہ سمجھتی تھی، تم شاید اس کی دوست ہو یا پھر کوئی ریلے ٹیو۔ دراصل رشتے کی اس سچ کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔ مگر کل رات جب

تو واقعی بہت افسوس ہوا۔ مزگین!۔۔۔۔۔ یومسٹ بی اے لکی گزل۔ تمہارے اختیار میں وہ بندہ ہے

کے اختیار میں آنے کے لئے کئی دل خود سے خواہش کرتے ہیں۔ ان کئی دلوں کے ساتھ خاصا برا کیا

اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے
تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم
ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے ہمارا کیا

کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے نگاہوں میں اضطراب کی کوئی خاص کیفیت تھی اور لہجہ بہت بجا بجا سا تھا۔
بل کے اس طرف بیٹھی لامعہ نے فوراً ٹوکا تھا۔

”خدا انخواستہ۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی؟۔۔۔ انا بیہ! دیکھو ذرا۔۔۔ تمہارے مسٹر ہز بیڈ کیسی باتیں
لرہے ہیں۔ اچھی اچھی باتیں کریں بھی۔ ابھی تو آپ کی زندگی کی شروع ہوئی ہے۔ ابھی تو آپ نے
دوہوں نہانا ہے اور پوتوں پھلنا ہے۔ میں نے مثال صحیح دی ہے انا بیہ؟“ لامعہ نے شرارت سے اسے
دیکھا تھا۔ مگر انا بیہ پر اس لطیف سی شرارت کا مطلق کوئی اثر نہ ہوا تھا۔
عفتان مسکرا دیا تھا۔ نظر خاص اس چہرے پر تھی۔ خدو خال پر تھی۔

”لامعہ! تمہاری یہی بات مجھے بہت پسند ہے۔ تم زندگی کو بہت لائٹ لیتی ہو۔ کاش میں نے تمہارا ہی
تھہ تھا ہوتا تو زندگی آج کسی اور ڈگر پر ہوتی۔“ دل میں اچانک جانے کیا آن سمائی تھی کہ مسکراتے ہوئے
ردگرد کے ماحول کو نظر انداز کرتے ہوئے لامعہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ لامعہ غالباً اس کے موڈ سے واقف تھی،
بھی کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

”انا بیہ! سنبھالو اپنے شوہر کو بھی۔ تمہاری نظروں کے سامنے یہ کیسی کیسی خواہشوں کا اظہار ہو رہا ہے۔
آئی تھنک یو ہڈ ٹیک نوٹس فرسٹ۔۔۔ یہ کوئی اچھا سا ن نہیں ہے۔“ لامعہ نے چھیڑا تھا۔ انا بیہ نے
ایک نظر بطور خاص اپنے مسٹر ہز بیڈ کو دیکھا تھا۔ نظریں تیر، تلوار شاید سبھی کچھ تھیں۔ مگر عفتان جیسے ہر بات
کو رد کرتا مسکرا دیا تھا۔

”اول ہوں۔۔۔ مذاق نہیں کر رہا ہوں میں۔ ڈونٹ ٹیک می روگ۔ مجھے واقعی اندازہ نہیں ہو رہا
ہے کہ زندگی میں جذباتی فیصلوں کے کیا نتائج ہوتے ہیں۔ آئی فیل گلیٹی۔۔۔ شاید میں نے تمہارے
ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ تمہارا دل ضرور دکھا ہوگا۔ تبھی تو۔۔۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ مگر عفتان کا لہجہ بہت
بجا بجا سا تھا۔

لامعہ نے مسکراتے لب بھینچ کر انا بیہ کی طرف دیکھا تھا اور پھر عفتان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکال لیا تھا۔
”میں چلتی ہوں۔“

”لامعہ! کچھ دیر تو اور بیٹھو۔ آج تمہاری وجہ سے مجھے بہت سی ناپسندیدہ چیزیں بھی اچھی لگ رہی
ہیں۔“ ایک نگاہ انا بیہ کی طرف دیکھا تھا۔

انا بیہ اس لمحے ایسے بیٹھی تھی جیسے اس سارے معاملے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ بالکل اجنبی ہو یا
بہر وہ واقعی بہت حیران تھی۔ عفتان جو کر رہا تھا وہ واقعی اس سے ایسا ایکسپکٹ نہیں کر رہی تھی۔

”عفتان! کم آن۔۔۔ بہت مذاق ہو گیا۔ تمہارا تو کچھ نہیں لیکن میں انا بیہ کو بہت اچھی طرح سے
جاتی ہوں۔ اس گھر میں میرا داخلہ سرے سے بند کر دے گی۔ ہے نا انا بیہ؟“ لامعہ نے مسکراتے ہوئے

اُس روز لامعہ گھر میں آئی ہوئی تھی۔
عفتان علی خان گھر میں داخل ہوا تو ماحول خاصا خوشگوار ملا تھا۔ انا بیہ کی ہنسی کی آواز کتنے دن
میں گونجی تھی۔

وہ سن کر رک گیا تھا۔ حالانکہ ارادہ اندر بڑھ جانے کا تھا۔
”کیسے ہوتی؟“ لامعہ نے اس کی سمت خاص توجہ سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ انا بیہ جو کہ
پر اب سے پہلے بہت کھلکھلا کر ہنس رہی تھی اس وقت اس کے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے میں
تھے۔ انوشے مہماں کی خاطر مدارات میں پیش پیش تھی۔

”بھائی! آپ چائے لیں گے؟“
”نہیں۔“ عفتان نے سرفہی میں ہلا دیا تھا اور بغور توجہ سے اس سامنے موجود چہرے کو دیکھا تھا۔
”میں ٹھیک ہوں۔ اور تم؟۔۔۔ بہت دنوں بعد چکر لگاوا۔ کہاں تھیں؟“ لامعہ سے بات
ہوئے انداز بہت عام تھا۔ لبوں پر وہی مسکراہٹ شاید کسی فطری کڑی کے باعث تھی۔ انا بیہ اس
کئی کتر رہی تھی۔ لامعہ حق کا قہقہہ بہت فطری تھا۔

”تو تم مجھے مس کر رہے تھے؟“
عفتان نے اسے بہ غور دیکھا تھا۔ نظریں اس سامنے بیٹھے چہرے سے کہیں زیادہ اس چہرے
رہی تھیں جو اس لمحے کسی قدر اجنبی بنا کئی کتر رہا تھا۔ عفتان علی خان اس لمحے کی گرفت سے باہر نہیں
تھا اور لبوں پر ایک دلغریب تبسم پھیلنے لگا تھا۔

”تیرے ایوانوں میں پُرزے ہوئے پیال کتنے

کتنے وعدے جو نہ آسودہ اقرار ہوئے

کتنی آنکھوں کو نظر کھا گئی بدخواہوں کی

خواب کتنے تری شہ راہوں میں سنگسار ہوئے

بلا کشانِ محبت یہ جو ہوا سو ہوا

مبارا جو کوئی ظالم ترا گریباں گیر

لہو کے داغ تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

ہم تو مجبور وفا ہیں مگر اے جانِ جہاں

انابیہ کی طرف دیکھا تھا۔ انابیہ کے چہرے پر بہت مردت بھری مسکراہٹ پل بھر کو ابھری تھی اور معدودہ گونگی تھی۔

عقنان مسکرا دیا تھا۔

”کیسی بات کہہ دی تم نے۔۔۔ دردیاد آگئے۔۔۔ پیٹ نہیں کتنے پرانے زخم ادھیڑ دیئے تم نے

آگے جو بلا آتی تھی، سو دل پہ تلی تھی

اب کے تو میری جان ہی پہ آن بنی ہے

اے درد! کہوں کس سے بتا، رازِ محبت

عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے“

عقنان علی خان جانے کس جذبے کے زیر اثر تھا۔ آج تو رنگ ہی الگ تھا۔ انابیہ کی نظریں

سے بھری تھیں مگر وہ اس کی جانب دیکھنے سے مکمل طور پر گریزاں تھی جبکہ لامعہ ہنس دی تھی۔

”عقنان! بہت ہو گیا۔۔۔ آج آفس اور میٹنگ کی جگہ مشاعرہ انینڈ کر کے آئے ہو۔ کبھی

کبھی درد۔۔۔ اس سے قبل کبھی ایسے رنگ تو نہ تھے تمہارے۔“

عقنان مسکرا دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ اس سے قبل ایسا درد بھی تو نہ ہوا تھا۔“

لامعہ سرفی میں ہلاتی ہوئی مسکراتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”انابیہ! اسے باندھ کر رکھو۔ بیویوں والے سارے گر آنا شروع کر دو۔ موصوف خاصے مشکوکر

رہے ہیں۔“ پرس شوٹڈر پر ڈالتے ہوئے لامعہ نے خاص ہدایت کی تھی۔

انابیہ تو کیا ہی کوئی رد عمل دیتی اس سے قبل ہی موصوف بول اٹھے تھے۔

”کل کا کیا پروگرام ہے تمہارا۔۔۔ فارغ ہو یا۔۔۔۔۔۔؟“

”عقنان! اب بس بھی کرو۔ دیکھو انابیہ کے چہرے کا رنگ بدل رہا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

اپنی دوست کا مکمل خیال تھا۔ عقنان علی خان نے اس چہرے کو بخورد دیکھا تھا۔

”یہ چہرہ کتنے رنگ بدل سکتا ہے یہ شاید تم بھی نہیں جانتی ہو ابھی۔ فقط صورت پر مت جاؤ۔

بھالی ادائیں کبھی کبھی بڑے گہرے وار کرتی ہیں۔“ لبوں پر بظاہر مسکراہٹ لئے، جانے وہ کون کون

بیان کر رہا تھا۔ لامعہ، انابیہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

”کم آن عقنان!۔۔۔ بہت ہو گیا۔ اب تم میری دوست کو زیادہ ٹیڑمت کرو۔ جانتے ہو

بیٹلے ہیں اسے حاصل کرنے کے لئے تم نے۔ کل تک تو تم ان لب و رخسار کی تعریف کرتے نہ تھکتے۔

آج۔۔۔۔۔۔ میرے سامنے اسے اس قدر ستا رہے ہو۔“ لامعہ نے مسکراتے ہوئے انابیہ کی بھرپور

داری کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔ ساتھ ہی ہاتھ اٹھا کر وارننگ دی تھی۔

”اگر تم نے انابیہ کو دوبارہ ستایا تو دوست میں تمہاری بعد میں بنوں گی، پہلے میں انابیہ کی ہوں۔

انابیہ کی میں دوست کم بہن زیادہ ہوں۔ بہن سمجھتے ہونا۔۔۔ میں آپ کی سالی۔ اور سالی بہت سخی

”ہاں۔۔۔ خطرناک بھی ہوتی ہے اور آدھے گھر کے حقوق کی مالک بھی۔ تو پھر کیا حرج ہے کہ

آدھے حقوق اسے سونپ بھی دیئے جائیں۔“

”دش اپ عقنان!“ لامعہ کا قہقہہ بہت فطری تھا۔ ”تمہارے مذاق میری پیاری سی انابیہ کی جان

یک دن ضرور لے لیں گے۔ میری بہن کا خیال رکھو، رائٹ؟ آئندہ شکایت نہیں سنوں گی۔“

انابیہ کے سر پر پیار کرتے ہوئے لامعہ ہاتھ ہلاتی ہوئی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔

انابیہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

کچھ کہنے۔۔۔ کچھ پوچھنے کی ہمت ناپید تھی۔

عقنان علی خان نے براؤنیز کا بیس اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے اسے بہ غور دیکھا تھا اور پھر اٹھ کر اندر

کی جانب بڑھ گیا تھا۔

انابیہ کی جھکی آنکھوں سے کتنے گرم گرم قطرے ٹیبل کی سطح پر گر رہے تھے۔



تمہا تھا۔۔۔

بے گل بے گل۔۔۔

میری راتیں پاگل پاگل۔۔۔

خالی دل ہے۔۔۔

خالی نظریں۔۔۔

موسم بھی چپ چاپ کھڑا ہے!

سینٹی کا فون تھا۔ مگر اس میں بات کرنے کی ہمت بالکل ناپید تھی۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ تمہارے پرنس آف ویلز نے کیا تمہاری زبان بندی کروا دی ہے؟“ سینٹی مسکرایا

نا۔ مگر میرب نے سرفی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔“ لہجہ بہت نیم جاں تھا۔

”نہیں۔۔۔ یہ تمہاری آواز بکری جیسی اتنی ممنماتی ہوئی سی کیوں ہو رہی ہے؟۔۔۔ کیا معاملہ

ہے؟۔۔۔ اپنے احکامات سے ان موصوف پرنس نے تمہیں بکری تو نہیں بنا دیا؟ یار! اگر ایسا ہوا ہے تو

ہت برا ہوا ہے۔ اب میں دیکھوں گا تو پیمانوں کا کیسے؟۔۔۔ اور بالفرض تمہیں پہچان بھی گیا تو تم سے

ت کیسے کروں گا؟ مجھے تو بکروں کی طرح میں، میں کرنے کا کوئی تجربہ نہیں۔“ سینٹی کی حس مزاح اس

قت کمال عروج پر تھی۔

میرب سیال کے لبوں پر ایک دھیسی سی مسکراہٹ اتری تھی۔

”سینی! تم بھی نا۔۔۔ اتنے دنوں بعد کیوں فون کیا؟۔۔۔ کہاں غائب تھے؟ نانو سے بات ہوئی

وقت

”تمہیں نہیں لگتا تم نے ایک غلط شخص کا انتخاب کیا؟“ مجھے چنا ہوتا تو آج ایسی نوبت نہ آتی۔“
 شاید اس کا موڈ بحال کرنے کو سیفی بولا تھا۔ مگر میرب مسکرائی نہیں تھی۔
 ”سیفی! میں رونا نہیں چاہتی۔ کمزور پڑنا بھی نہیں چاہتی۔ مگر میں کیا کروں، میں مضبوط نہیں ہوں۔“
 کوئی کوئی اپنا ایسا ہوتا ہے جس کے سامنے کوئی خول خود پر چڑھائے رکھنا اچھا نہیں لگتا۔ سیفی بھی شاید ایسا ہی کوئی اپنا تھا۔

”میں آجاتا ہوں میرب!“ سیفی نے حتی انداز میں کہا تھا۔

”نہیں۔ تم مت آنا۔“ میرب کسی خوف کے زیر اثر بولی تھی۔

”کیوں۔ تمہارا وہ حاکم وقت مجھے جادو سے کبھی بنوادے گا؟“ سیفی مسکرایا تھا۔ ”میرب! نہ تو تم اس کی قیدی ہو، نہ ہی میں کوئی رعایا ہوں۔ تم نے خواہ مخواہ اس شخص کو ہا بنا رکھا ہے۔ خواہ مخواہ ڈرتی رہتی ہو۔ اسے صرف ایک انسان سمجھو، تمہاری پرائیمر خود بخود ختم ہو جائیں گی۔“ سیفی نے سمجھایا تھا۔
 میرب نے سر ہلاتے ہوئے فون رکھ دیا تھا۔

پٹی تھی تو چونک پڑی تھی۔ پیچھے وہی ”حاکم وقت“ کھڑا تھا۔

میرب کو پتہ تھا، جانتی تھی وہ اس کی گفتگو سن چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کسی رد عمل کے لئے تیار کر رہی تھی مگر سردار سبکگین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔

”کیا محسوس کر رہی ہو اب؟“ ایک اچھا فیصلہ لے کر یقیناً تمہیں بہت اطمینان محسوس ہو رہا ہوگا نا۔“ کتنا ہمدرد بنا وہ دریافت کر رہا تھا۔ میرب خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

اس حقیقت کو سمجھنے میں لٹایا گیا کچھ

میرا دشمن، میرا غم خوار نہیں ہو سکتا

تیرگی چاہے ستاروں کی سفارش لائے

رات سے مجھ کو سردکار نہیں ہو سکتا

”کیا ہوا؟“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے ہاتھ بڑھا کر ملامت سے دریافت کرتے ہوئے اسے بھرپور توجہ سے دیکھا تھا۔ میرب نے اس کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے چہرے کا رخ پھیر لیا تھا۔

”آئی ہیٹ یو۔“ نفرت کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے سرفنی میں ہلایا تھا اور اگلے قدموں پیچھے ہٹنے لگی تھی اور دیوار سے جا لگی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری اس کے رد عمل پر یوں مسکرایا تھا جیسے کوئی بگن ہوئی کے روٹھے پر محظوظ ہوتا ہے۔ اس کی سمت پیش قدمی کی تھی۔

”بہت ضدی ہو تم۔ اتنی ضد اچھی نہیں ہوتی سو بیٹی! یو خڈ انڈرا شیٹڈ۔ سمجھ دار“

ضرورت ہے تمہیں صرف یہ خدشے، دوسوے، ادہام سب فضول ہیں۔ ایک دم بے، میں قیدی تھی۔ وہ سارا حقیقت ہے نہ ہی کوئی منطق۔ اگر کبھی ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو گی تو ساری بات کے سانس لے کر خود کو میں آجائے گی۔ تم تیار ہو جاؤ۔ اب یہ مت پوچھنا کہ کہاں جانا ہے۔ آف کور“

لامت سے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کو تھپتھپایا تھا۔

وقت

تھی، بتا رہی تھیں تم بزنس اسائنمنٹ پر بڑی ہو آج کل ماموں کے ساتھ۔ یہ اتنی جلد بزنس میں کیڑا ڈال دیا؟ فی الحال تو تمہیں اپنی اسٹڈی پر کونسلر بیٹ کرنے کی ضرورت ہے نا، اور تم.....“
 ”ہاں۔۔۔ مگر کونسلر بیٹ کرنے کی ضرورت تو تمہیں بھی کہیں اور ہے۔ لیکن خیر چھوڑو، تم سیفی نے مسکراتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

”اتنے روز سے ملنے کیوں نہیں آئیں؟“ سرال میں بہت جی لگ گیا کیا؟“ بھرپور تھا۔ میرب کی آنکھوں سے خاموشی سے پانی کے قطرے ٹوٹ کر گرے تھے۔

”سیفی! مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے۔“ بے ہمت آواز اور لہجہ اس کی کمزوری کا بھرپور ترجمان تھا۔
 ”کیا؟“ سیفی کو تشویش ہوئی تھی۔

”آئی ایم ناٹ پی۔“

”کیا؟“ کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”ہاں۔۔۔ میں واقعی خوش نہیں ہوں۔“

”کس سے؟“ سیفی سمجھ نہ سکا تھا۔

”اس زندگی سے۔۔۔ اپنے آپ سے۔۔۔ اور شاید کسی سے بھی نہیں۔“ میرب نے تمام ہر کو جمع کیا تھا۔

”اور مشر لغاری سے۔۔۔؟“ سیفی نے دریافت کیا تھا اور میرب کے گلے میں آنسوؤں کا پھنک اٹک گیا تھا۔

”بولو میرب! بتاؤ تو سہی، ہوا کیا ہے؟ تم رو کیوں رہی ہو؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟۔۔۔ اوکے، میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔ خود کو اتنا کمزور مت سمجھو۔ تم تنہا نہیں ہو۔“ سیفی حوصلہ بندھایا تھا۔

میرب نے ایک گہری سانس خارج کی تھی اور ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو رگڑ ڈالا تھا۔

”سیفی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آئی ایم اسٹریٹنگ۔ میں خود کو ڈی فنڈ کر سکتی ہوں اور سیف بھی تو پھر۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔“ یکدم سرفنی میں ہلا دیا تھا۔

”میرب! تم خوش نہیں ہو، تمہیں یہ بات کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب سے تم اس شخص تعلق میں بندھی ہو تمہارا چہرہ، تمہاری آنکھیں یہ کہانی صاف کہتے ہیں۔“

میرب کچھ نہیں بولی تھی۔ سیفی اس کا وہ دوست تھا جس سے شاید وہ کچھ بھی چھپا نہیں سکتی تھی۔

”میرب! میں یہ سن کر خوش نہیں ہوں کہ تم خوش نہیں ہو۔ مگر یہ اختیار میرے ہاتھ نہیں ہے۔ کاٹ تمہیں خوش رہنے کی کوئی ترکیب دے سکتا۔“ سیفی اس کے لئے افسردہ تھا۔ ”تمہیں لینے آؤں یہ کچھ دن یہاں رہو گی تو طبیعت بہل جائے گی۔“

”کیا فائدہ؟۔۔۔ واپس تو نہیں آتا ہے۔“ میرب کا لہجہ نیم جاں تھا۔

انابیہ نے نگاہ اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا اور پھر اپنی بھیگتی ہتھیلی کو سمیٹ لیا تھا۔ عفتان علی خان نے روں سے ہٹکتے اس چہرے کو بھر پور توجہ سے دیکھا تھا۔ اگرچہ وہ نظریں خاموش تھیں اور اس سے گریزاں تھیں مگر ان میں لکھی تحریر وہ واضح طور پر پڑھ سکتا تھا۔

”لامعہ بہت دنوں بعد آئی۔ کہیں گئی ہوئی تھی یا تم نے دانستے اسے فراموش کر دیا تھا؟“ بالآخر وہ بات ن زد ہوئی تھی جس کا چرچا اب تک ”پس پردہ“ چل رہا تھا۔ انابیہ اس ذکر پر چونکی ضرور تھی مگر کچھ بولی ن تھی۔

”اچھا لگا اس کا آنا۔“ عفتان نے برملا اظہار کیا۔ بہت مختلف لڑکی ہے وہ۔ بالکل اس کافی کے کپ ی۔“ عفتان اس کی تعریف کرتے ہوئے مسکرایا تھا۔ ”ایک سپ تلخ — ایک سپ شیریں۔“

انابیہ کے لئے یہ تعریف یقیناً حیران کن تھی۔
”یعنی تمہیں لامعہ سے مل کر واقعی اچھا لگا؟“ وہ کسی نتیجے پر پہنچی تھی۔

”ہاں — مگر میں اس سے پہلی بار تو نہیں ملا۔ ہم ایک عرصہ تک اچھے دوست رہ چکے ہیں اور ی بھی۔ مگر میں یہ بات تمہیں کیوں بتا رہا ہوں۔ میرا نہیں خیال کسی طرح کی کوئی وضاحت دینے کی ی کوئی ضرورت ہے۔“

انابیہ کچھ نہیں بولی تھی۔ چپ چاپ چہرے کا رخ پھیرے وہ کھڑی رہی تھی۔ وہ بارش کی بوندوں کو اس ی چہرے پر کہانی لکھتے چپ چاپ دیکھتا رہا تھا۔ پھر یکدم مسکرایا تھا۔
”تمہیں جیسی فیمل ہوئی؟“

انابیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور پھر یکدم سر نیلی میں ہلا دیا تھا۔
”مجھے جیسی کیوں فیمل ہوگی؟“

عفتان اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا مسکرایا تھا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتہ — یونیٹوں — شاید تم نادانستہ طور پر اپنے اور میرے رشتے کو لے کر اور یسیو ہو رہی ہو۔ تم سمجھ رہی ہو اگر تم بیوی ہو تو مجھ پر سارا کا سارا حق صرف تمہارا ہی ہے۔ ویری ٹیٹکل دوج۔“ لہجے میں افسوس سے زیادہ طنز شامل تھا۔ انابیہ کو اس شخص کے سامنے اس لمحے بہت سبکی محسوس ی تھی۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو کہ مجھے کوئی فرق پڑتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم چاہے جہ کو کوئی اہمیت دو یا پھر کسی اور کو — آئی ڈونٹ کیئر۔“ کسی قدر تمللا کر کہتی ہوئی وہ ہلٹی تھی مگر رے ہی لمحے وہ واپس مڑی تھی۔

”اور تم نے بھی غلط سمجھ رہے ہو کہ میں تم پر کوئی غاصبانہ حقوق جتا رہی ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جو تمہارے اور میرے مابین سرے سے ہے ہی نہیں اسے لے کر میں تم پر کیسا حق جتاؤں گی؟ جبکہ اس نئے کو رد بھی میں ہی کر رہی ہوں۔“ انتہائی زہر خند لہجے میں جتاتی ہوئی وہ کہہ کر مڑنے لگی تھی جب نان نے اس کا ہاتھ ایک لمحے میں تھام لیا تھا۔ نظروں میں کسی قدر غصہ تھا۔ انابیہ کی بات نے یقیناً اسے

کھڑکیاں بند ہیں، دیواروں کے سینے ٹھنڈے

پٹھ پھیرے ہوئے دروازوں کے چہرے چپ ہیں

میز کرسی ہیں کہ خاموشی کے دھبے جیسے

فرش میں دن آئیں سارے دن کی

سارے ماحول پہ تالے سے پڑے ہیں چپ کے

تیری آواز کی اک بوند جو مل جائے کہیں

آخری سانسوں پہ ہے رات

یہ بچ جائے گی!

عفتان علی خان ٹیس پر تھا۔ موسم پر لطف تھا۔ ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی اور تاریکی میں خاموشی کے ساتھ یہ تسلسل کی قدر بھلا لگ رہا تھا۔

شاید اس لئے بھی کہ یہ خاموشی اندر کی طویل خاموشی کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔ باہر کے ماحول کا کے ماحول کے ساتھ ٹرانزیشن تھا۔ انوشے بہن ہونے کے سارے فرائض یہ خوبی بنا رہی تھی۔ ابھی تھو یر قتل اسے کافی کا بھاپ اڑاتا کپ دینے کے ساتھ وہ اچھی خاصی کہنی بھی دے گئی تھی۔ مگر اس جانے کے بعد ماحول اسی سکوت میں گھر گیا تھا۔

اگر یہی تہائی اس کی ذات کا حصہ بنی تھی تو اس نے وہ راستہ چنایا کیوں؟ اپنے فیصلے پر از سر نو سو ہوئے کافی کا ایک سپ لیا تھا جب اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سے چونک گیا تھا۔ گردن کا رخ موڑ دیکھا تھا۔ انابیہ کچھ ہی فاصلے پر ہاتھوں میں دو کپ کافی کے لئے کھڑی تھی۔

عفتان کے مڑ کر دیکھنے پر قریب آگئی تھی۔

”اوہ — تو تم پہلے ہی کافی لے چکے ہو۔“ اس کے ہاتھ میں بھاپ اڑاتا کپ دیکھ کر انابیہ کوڑ زیادہ اچھا نہیں لگا تھا۔ عفتان مسکرایا تھا۔

”ہاں — تم نے دیر کر دی۔“ انداز ذومعنی تھا۔

انابیہ کی نظروں میں ایک گہرا سکوت آن رکا تھا۔

”شاید —“ لب بہت آہستہ سے وا ہوئے تھے اور پھر ایک دوسرے میں بیوست ہو گئے تھے

عفتان نے ایک نظر پھر پور انداز میں اس پر ڈالی تھی پھر دانستہ نگاہ پھیر گیا تھا۔
”تمہیں اچھا لگا شاید۔“ انابیہ نے گرم کافی کا سپ لیتے ہوئے اس کی جانب دیکھنے سے کھل کر بڑا تھا۔

”کیا —؟“ عفتان چونکا تھا۔ وہ یقیناً نہیں سمجھ پایا تھا کہ انابیہ کس بابت اس سے وہ سوال کر رہی ہے۔ انابیہ بجائے جواب دینے کے یا وضاحت دینے کے کافی کا سپ لے کر سر جھکا گئی تھی اور شاید ہم دانستہ طور پر اپنی ہتھیلی پھیلا کر اس پر پانی کے برستے قطرے جمع کرنے لگی تھی۔

”تمہیں برا لگا؟“ عفتان علی خان بنور اسے پڑھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

فیض بخاری مسکرا دیئے تھے۔

”یہ جو زندگی ہے نا، بہت عجب شے ہے یہ۔ کسی سے بھی پوچھ کر دیکھ لو۔ کوئی بھی یہاں زندگی سے خوش نہیں ہے۔ ہزار ہا شکوے شکایات ہیں سب کو مگر کبھی کسی نے زندگی سے نہیں پوچھا، وہ ہم سے کیا چاہتی ہے؟“ بہت الجھا ہوا سوال تھا۔

اذہان مسکرا دیا تھا۔

”چاچو! زندگی نے کبھی تو، کسی موقع پر تو کچھ ایسا دیا ہوگا جس نے دل کو راحت بخشی ہوگی۔“

”ہاں۔۔۔ مگر وہ جتنے حسین تھے، اسی قدر روح فرسا بھی ہیں۔ سوچنے بیٹھو تو کوئی ایک رنگ بھی ہاتھ نہیں لگتا۔ سب اس کے سنگ ہو گئے۔ جب موسم خواب ہو گئے تو پھر۔۔۔ پھر باقی کیا چتا ہے؟“

بہت کمزور سا انداز تھا۔ فیض بخاری نے مسکرا کر جیسے خود کو دھوکا دیا تھا۔

”چاچو! موسم کیا کبھی دوبارہ لوٹ کر نہیں آتے؟“

اذہان حسن بخاری نے مدہم لہجے میں عجب سوال داغ دیا تھا۔ فیض بخاری نے سرنئی میں ہلا دیا تھا۔

”پتہ نہیں۔۔۔ کبھی ایسا ہوتے دیکھا نہیں۔ صرف سنا ہے۔ جو موسم گزر گئے، جو اپنے ساتھ لے گئے، سولے گئے۔ واپس نہ لے آتے ہیں نہ ہی گزرے موسم۔“

”کوشش کریں تب بھی نہیں؟“ اذہان حسن بخاری کی سرگوشی سے عجب اضطراب بھلک رہا تھا۔

”پتہ نہیں۔“ فیض بخاری نے اس کی طرف سے چہرے کا رخ پھیرتے ہوئے سرنئی میں ہلا دیا تھا۔

اذہان حسن بخاری کچھ لمحے خاموش رہا تھا پھر اسی مدہم لہجے میں بولا تھا۔

”میں جانتا ہوں چاچو! ایسا کچھ ہونا ممکن نہیں۔ نہ تو موسم دوبارہ لوٹ کے آسکتے ہیں نہ ہی دل دھڑکنے لگتا ہے۔ مگر جانے کیوں سوچتا ہوں کبھی کبھی اگر ایسا ہو سکتے تو کیسا ہو۔ شاید۔۔۔ شاید ساری خلش مٹ جائے یا پھر کچھ اور بھی بڑھ جائے۔“ اذہان کا انداز کھویا کھویا تھا۔

”موسموں کا تسلسل شاید کل اور آج کی کہانی کو نہیں بدل سکتا۔ یہ المیہ سہی، مگر یہی سچائی ہے اور اسی سچائی کو میں قبول کرنا چاہتا ہوں۔“

”تم ہی نہیں اذہان! شاید ہم سبھی اس سچائی کو قبول کرنا چاہتے ہیں، مگر کر نہیں پاتے۔“ فیض بخاری یکدم مسکرا دیئے تھے۔ ”خیر چھوڑو تم اس فلاسفی آف لائف کو۔ تم نے سہیہ کے متعلق کیا سوچا ہے؟“

”سہیہ؟۔۔۔ اس کے متعلق کیا سوچنا ہے؟ جو سوچنا تھا سوچ لیا۔“ اذہان کاٹی کے کپ کی سطح پر

انگلی پھیرتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔ ”شی از اے ٹائٹل گرل۔ ویری انڈر اسٹینڈنگ اینڈ کیئرنگ۔“ تسلیم کیا تھا۔ فیض بخاری مسکرا دیئے تھے۔

”ہاں۔۔۔ وہ واقعی بہت اچھی ہے۔ اسے کبھی جانے مت دینا۔ زندگی میں رنگ بھرنے والے ہاتھ بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔“ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے جتایا تھا۔ اذہان لب بھینچ کر مسکرا دیا تھا۔ ”تھی مین گیٹ کھلا تھا اور پورچ میں گاڑی آ کر رکی تھی۔ سہیہ اور اگینے ایک ساتھ برآمد ہوئے تھے۔“

”لو۔۔۔ تمہاری زندگی کی بہار تو آگئی۔“ چاچو اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائے تھے۔ اذہان

مشتعل کر دیا تھا۔ بوند باندی تیز بارش کا روپ اختیار کرنے لگی تھی۔ دونوں بری طرح بھگنے لگے جیسے عفتان علی خان کو سرے سے پروا نہ تھی۔

”ردم نے مجھے نہیں کیا انا بیہ! ردتم نے اپنی خواہشوں کو کیا ہے۔ نہ تو تم مجھے کبھی رد کر سکی ہو نہ ہی گی۔ تمہاری آنکھوں میں اس لمحے کیا ہے؟۔۔۔ کیا میں نہیں جان سکتا؟ تم مجھ سے کیا چھپانا چاہ رہے کیا مجھے معلوم نہیں؟ انا بیہ! تم کیا چاہتی ہو؟ یہ بات تم خود اپنے آپ سے پوچھو، تا وہیں زمانے کو سے بہتر ہے۔ تم ایک بند کمرے میں خود اپنے آپ سے صرف ایک بات کی وضاحت مانگو۔ آسان سی ہے، تم یہاں ہو اور کس لئے ہو؟۔۔۔ اگر تم مجھے رد کر رہی ہو تو پھر کس ناتے سے یہاں ہو؟ ریزہ باقی چتا ہے پھر؟۔۔۔ کچھ نہیں جانتی ہو تم۔“ عفتان نے اس کے وجود کو ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا تھا۔

”کچھ نہیں جانتی ہو اور جاننا بھی نہیں چاہتی ہو۔“ اسے اسی بارش میں بھیکتا چھوڑ کر وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔

انا بیہ کتنی دیر تک اس بارش میں بھیکتی اس سمت خالی خالی نظروں سے نکلتی رہی تھی۔

ایک پرواز دکھائی دی ہے
تیری آواز سنائی دی ہے
آگ میں رات جلا ہے کیا کیا
کتنی خوش رنگ دکھائی دی ہے

”تو کیا سوچا ہے پھر تم نے؟“ فیض چاچو نے اسے کافی کا کپ تھماتے ہوئے اس کے قریب آ کر پر جگہ سنبھالی تھی۔ اذہان چونکا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

”کس کے متعلق؟“

فیض چاچو مسکرا دیئے تھے۔

”سوچنے کے لئے یہ بھی اچھا سوال ہے۔ مگر فی الحال جو ہے صرف اس کے متعلق سوچنا زیادہ بہتر ہے۔“ فیض چاچو کی بات پر وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”چاچو! آپ نے خود کبھی اپنے بارے میں نہیں سوچا؟“ سوال میں کئی معنی پنہاں تھے۔ مگر فیض بخاری مسکرا دیئے تھے۔

”کیا؟۔۔۔ کیا سوچوں؟“ اذہان کے لئے یہ سوال اگرچہ غیر متوقع نہیں تھا مگر وہ چند لمحوں کے چپ ہو کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔

”چاچو! کیا آپ اسے بہت چاہتے تھے؟“ اذہان حسن بخاری بولا تھا تو فیض بخاری کو سہکت کر تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی نظر پھیرے بیٹھے رہے تھے پھر مسکرا دیئے تھے۔

”کس کی بات کر رہے ہو تم؟“ ٹالنے کا انداز خوب تھا۔

”وہی جو آپ کے ساتھ ہے اور نہیں بھی ہے۔“ اذہان حسن بخاری نے ملامت سے کہا تھا۔

بھی مسکرا دیا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں؟ — آج کیا گھر والوں نے تم دونوں کو گھر سے باہر کر دیا ہے؟“ اگلی کی طرف آتی ہوئی مسکرائی تھی۔

”نہیں۔ ہم تو زندگی کے نکالے ہوئے ہیں۔“ فیض چاچو نے سخن وری کی حد کر دی تھی۔ اسکرادی تھیں۔

”زندگی کو الزام دینے والے ڈرپوک اور بزدل ہوتے ہیں۔ شاید سنا نہیں ہے آپ نے۔“ مجھے اختلاف نہیں ہے۔“ فیض چاچو مسکرا دیئے تھے۔

”سہاری باتیں یہیں کھڑے کھڑے ہوں گی یا ہمیں اندر بھی مدعو کریں گے؟“ اگینے نے شکوہ کیا تھا۔ ”آپ کا اپنا گھر ہے۔ کیا اجازت کی ضرورت ہے آپ کو؟“ فیض چاچو نے نہ صرف اگینے کے راستے چھوڑا تھا بلکہ بہ نفس نفیس خود انہیں لے کر اندر کی جانب بڑھ گئے تھے۔

ساہیہ مسکرائی ہوئی اس کی جانب دیکھنے لگی تھی پھر اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

”اگینے پھوپھو کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی زندگی میں کتنے بڑے کرائس جھیل رہی ہیں میرے خیال میں اگر ہمیں جینے کا ڈھنگ سیکھنا ہو تو ان سے رجوع کرنا چاہئے۔“

”کیوں، کیا ہوا؟ — میرا تو خیال ہے شی از پلمپلی اے وٹڈر فل وومن۔ خاصی خوش باش وہ۔ اور ایک اچھی زندگی بھی بسر کر رہی ہیں۔“

ساہیہ نے اس کی طرف دیکھا تھا پھر نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

”ایسا نہیں ہے اذہان! — شی از ناٹ اے پپی وومن۔ ان کو دیکھ کر مجھے زندگی سے کبھی کبھی لگنے لگتا ہے۔ یہاں کوئی بھی اپنی زندگی سے خوش نہیں ہے۔ مگر اگینے پھوپھو کی زندگی میں کہیں کوئی رنگ نہیں ہے۔ مگر وہ پھر بھی کوئی شکوہ نہیں رکھتیں۔ نہ اپنے آپ سے — نہ زندگی سے نہ ہی لوگوں سے۔ اذہان!

ان کی زندگی سفر کر رہی ہے۔ ان کے ہر بیٹہ انہیں چھوڑ چکے ہیں مگر وہ یہ بات صرف اپنے تک محدود رہے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کوئی اچھی میرج لائف نہیں گزاری۔ اس کے باوجود وہ نباہتے رہنا چاہتی تھیں۔

ایک دن یہ سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ وہ واپس لوٹ آئیں اور کسی سے کچھ نہیں کہا۔ کسی سے کوئی شکوہ نہیں انہیں اور وہ خوش ہیں۔ اذہان! بعض اوقات سب کو خوش رکھنے کے چکر میں خود کا کتنا نقصان ہو جاتا ہے۔ ساہیہ نے افسردہ لہجے میں کہا تھا اور اذہان اس کی سمت مسلسل دیکھتا نہ رہ سکا تھا۔

”اذہان! مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”کس بات سے؟“ اذہان نے اس کی سمت دیکھنے سے کھل کر بڑبڑایا تھا۔

”تم سے، خود سے اور شاید سب سے۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ اذہان اس کا دل رکھنے کو مسکرایا تھا۔

ساہیہ سرفنی میں ہلانے لگی تھی۔

”نہیں اذہان! میں غلط نہیں کہہ رہی۔ مجھے واقعی ڈر لگنے لگا ہے۔ کہیں میں خالی ہاتھ نہ رہ جاؤں۔“

ساہیہ جیسی زندگی سے بھرپور لڑکی ایسا خندہ ظاہر کرتی بہت عجیب لگی تھی۔

اذہان حسن بخاری نے اس کا ہاتھ تھامتا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

”لاؤ، دیکھو تو ذرا، اس ہاتھ میں بھلا کتنے رنگ ہیں۔“ اس کی ہتھیلی کو پھیلاتے ہوئے بغور دیکھا۔ ”فیض چاچو ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارا ذکر کرتے ہوئے بڑی مزیدار بات کہہ رہے تھے۔“ اذہان حسن

اری نے اس کا دھیان بنانا چاہا تھا مگر وہ کچھ نہیں بولی تھی۔

”پوچھو گی نہیں کیا؟“ اذہان مسکرا رہا تھا۔ مگر ساہیہ کچھ نہیں بولی تھی۔ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی تھی۔ اذہان مسکرا دیا تھا۔

”زندگی میں رنگ بھرنے والے ہاتھ ایسے ہوتے ہیں۔ سچ کہا تھا انہوں نے۔“

”اذہان! اگر میں تمہارہ لگی تو؟“ ساہیہ کے خدشات نہ ختم ہونے والے تھے۔ لمحہ بھر کو اذہان کچھ نہیں بہہ سکا تھا پھر سرفنی میں ہلاتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”پاگل ہوتی — یہ بھلا کیا سوچ ہوئی؟ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟“ براہ راست آنکھوں میں دیکھتے نے سوال کیا تھا۔ ساہیہ کچھ نہیں بولی تھی۔

”ساہیہ! ٹرسٹی۔ میں مانتا ہوں میرے پاس اتنے رنگ نہیں ہیں۔ نہ ہی اتنے خواب کہ تمہیں جو بابا سکوں۔ مگر میں اس اعتبار کی بنیاد ضرور رکھ سکتا ہوں جسے لے کر ایک اچھی اور بھرپور زندگی گزارنی جا نا ہے۔“ اذہان نے بھرپور انداز میں یقین دلایا تھا۔ ساہیہ اسے کچھ دیر یونہی دیکھتی رہی تھی پھر نظر رتے ہوئے بولی تھی۔

”ماہا کا کیا ہوا؟ — معاملہ کچھ سلجھا یا کہ نہیں؟“

”ہوں — کسی قدر — پاپا نے ضد وقتی طور پر چھوڑ دی ہے۔ مگر ماہانی الحال نانو کے ہاں ہی۔ شاید وہ کسی قدر خوفزدہ ہے۔ ساہیہ! امی کل انگیج منٹ کی بات کر رہی تھیں۔

”کس کی انگیج منٹ کی بات؟“ ساہیہ بالکل نہیں سمجھی تھی۔

”تمہاری اور میری انگیج منٹ کی بات۔“

ساہیہ خان کی آنکھوں میں کچھ خاص رنگ اترے تھے اور پلکیں خود بخود جھپکتی چلی گئی تھیں۔ اذہان نے کہا تھا تھام لیا تھا اور یقین دلاتے ہوئے بھرپور انداز میں بولا تھا۔

”مجھے یقین ہے تم میرے ساتھ خوش رہو گی۔ ٹرسٹی۔ میں تمہیں کبھی دکھی نہیں کروں گا۔“

سردار سینگین حیدر لغاری نے گاڑی سمندر کی گیلی ریت پر روک دی تھی اور اس کی طرف کا دروازہ لاکر اسے ہاتھ تھام کر باہر نکال لیا تھا۔

میرب سیال ایک میکانی انداز میں اس کے ساتھ کھینچتی چلی گئی تھی۔ اس شخص کے تیور ہمیشہ اس کی سمجھ نہ آنے والے تھے۔ وہ کبھی بھی اسے سمجھ نہیں پاتی تھی اور اب تو اور بھی سب کچھ الجھا الجھا ہوا نظر آ رہا

آسمان پر سیاہ کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ موسم کسی بھی وقت خطر صورت حال اختیار کر سکتا تھا۔ مون سون کی ہواؤں کا زور تھا۔ میرب کا آنچل دور تک لہرا رہا تھا۔ مو، واضح انداز میں خنکی تھی۔ وہ پکپا رہی تھی۔ مگر اتنی ہمت ناپید تھی کہ اس شخص سے کچھ کہہ سکتی۔

سردار سبکنگین حیدر لغاری نے لہروں کے بیچوں بیچ لے جا کر اسے اپنے سامنے کھڑا کیا تھا اور بخور دیکھنے لگا تھا۔ میرب سیال کے لئے اس کا یہ رویہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ قطعاً نہیں سمجھ پائی تھی ایساری ایکٹ کیوں کر رہا تھا۔ پیروں سے کئی لہریں آکر لگ رہی تھیں۔ ریت کئی بار پیروں کے نیچے سرکتی محسوس ہوتی تھی۔ تیز ہوائیں جسم کے آر پار ہو رہی تھیں۔ وہ واضح انداز میں پکپا رہی تھی۔ ہونٹ لرز رہے تھے۔ سردار سبکنگین حیدر لغاری اسے اس طرح دیکھتا رہا تھا۔ پھر ایک دم سے اسے ساتھ بھینچ لیا تھا۔

”کیوں کرتی ہو تم ایسا؟ کیوں کیا تم نے ایسا؟“ چاہتا ہوں، نہ کچھ کہوں تمہیں شکوہ نہیں، نہ شکایت۔ مگر تم۔۔۔۔۔ میں تمہیں سزا نہیں دینا نہیں چاہتا سوئی! پھر کیوں تم۔۔۔۔۔“ اس کے ہیکلے گیسوؤں پر اپنے لب رکھ کر وہ کتنے مدہم انداز میں کہہ رہا تھا اور میرب اس کے مقابل سا کہ کھڑی تھی۔

ان سنسناتی ہواؤں میں تنہا کھڑے وجود کو، وہ حرارت سے پر حصار کچھ عجب نہیں لگا تھا۔ اس میں ضم کر لینا نامعتبر نہ لگا تھا۔ اپنا بے حد کمزور ہونا برانہ لگا تھا۔ اس کا خود پر جارحانہ انداز میں حق بڑ نہ لگا تھا۔

شاید کچھ اچھا لگا تھا۔

شاید وہ موسم!

شاید وہ بارش!

شاید وہ چادو جو اس لمحے وہ اپنے ارد گرد پھیلتا محسوس کر رہی تھی۔ یا پھر وہ وسیع سمندر۔

وہ خاموش ماحول۔ جس میں نہ کوئی آہٹ تھی نہ کوئی دوجی آواز۔

دور تک خاموشی تھی اور اس خاموشی میں گونجتی ایک ایک آواز وہ اس گھڑی بخورن رہی تھی۔

شوریدہ سر سمندر کی آواز۔

لہروں کا شور۔

بارش کی آواز۔

بوندوں کی ایک انوکھی فنگسی۔

موسم میں رچا ایک الوہی احساس

اس پر تیش حصار میں سینے میں دھڑکتے دل کی آواز۔

ان دھڑکنوں کا شور۔ اور خود اس کے اپنے دل کا ارتعاش!

کتنا انوکھا تجربہ تھا۔ کس قدر نیا احساس۔ جو شاید اس سے قبل نہ تو اس نے محسوس کیا تھا نہ ہی اس

وہ

پہلے اس کو برتا تھا۔ وہ چند لمحوں پر محیط پل اسے کئی خواب دیکھنے پر آکسانے لگا تھا۔ وہ قہر تہوں کا پل دو پل ہانگیل اسے خود سے جدا کرنے کے جنن کرنے لگا تھا۔

وہ سارا شہر جیسے اس وقت ایک طلسم کدہ تھا اور وہ اس سحر سے جکڑے ماحول کا حصہ تھی۔ عجب فسوں از تھا وہ شخص۔ عجب بھید بھری چپ تھی۔

کتنی دوری پر تھی وہ۔ اپنے ساز و آہنگ سے جینے کی قائل۔ نہ دل کا پتہ نہ درون جاں کا۔ اور کیسے پل میں اس شخص نے سارے کے سارے منظر بدل ڈالے تھے۔ عجب حاشیے کھینچے تھے اس کے دگر دکہ سارے کے سارے زاویے بدل دیئے تھے۔

فسوں گری کی حد تھی۔

اس گری کی اٹھا تھی کوئی لمحہ دو لمحہ کو تو وہ بھی کھو گئی تھی۔ مگر نہیں۔

وہ یکدم جیسے اس خواب سے بیدار ہوئی تھی۔ بہت آہستگی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

جان میں پھیلا فسوں اپنا اثر کھونے لگا تھا۔

وہ رگوں میں دوڑتا اضطراب سننے لگا تھا۔ وہ ایک پل میں حقیقت کے کھلے آسمان تلے تھے۔ وہ ادوگری اپنے پیر سمیٹ چکی تھی۔

وہ سارا کا سارا پھونکا گیا جادو اڑن چھو تھا۔

وہ کھینچا گیا حصار بہت آہستگی سے اپنے گرد سے ہٹا چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ طلسم بھی ٹوٹ چکا۔ مگر جان میں دم توڑتی ایک ہلکی سی ہلچل اب بھی باقی تھی۔

گریزاں سی نظر ابھی تھی مگر قدم کچھ پرے سرک گئے تھے۔

سردار سبکنگین حیدر لغاری نے تیزی سے بوندوں سے بھگتے اس چہرے کو بخور دیکھا تھا۔

”میرب! پلیز، ڈونٹ ڈو دس ٹو می۔“ خاموش، ساکت فضا میں ایک مدہم سرگوشی ہوئی تھی۔ انداز باقی اٹھا۔

میرب سیال کا دل چاہا تھا وہ آنکھیں بہت زور سے میچے اور اس ماحول سے بھاگتی ہوئی کہیں دور جا لے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکی تھی۔ نہ تو قدموں میں اتنی ہمت تھی، نہ جاں، نہ کوئی اقدام بغاوت۔ وہ اسی

رج کھڑکی رہی تھی۔ سر جھکائے، کسی حکم کے پابند، کسی فٹا کے زیر۔

”تمہیں کہا تھا، مجھے اچھا نہیں لگتا تم پر رعب جماؤں، اپنا حق جتاؤں یا تمہیں مرعوب کروں۔ مجھے بار باتوں کو دہرانا بھی اچھا نہیں لگتا۔ پھر کیوں۔۔۔۔۔ کیوں کیا تم نے ایسا؟“ مسٹر سیال کو یہاں

نے کے لئے کیوں کہا؟ فون پر بات ہوئی ہے میری۔ پتہ چلا وہ تمہیں لینے آرہے ہیں۔ کہا تھا۔۔۔۔۔ منج کیا تھا تا کہ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ پھر کیوں؟۔۔۔۔۔ وائے میرب؟۔۔۔۔۔ وائے؟“

کس قدر سخت لہجے میں وہ دریافت کر رہا تھا۔

آسمان سے برستا ہوا پانی انہیں تیزی سے بھگونے لگا تھا۔ مگر سردار سبکنگین حیدر لغاری اس لمحے اس قدر ذنی ہو رہا تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔

طوفان بدتمیزی، بھانت بھانت کی بولیاں۔

”کیا ہو رہا ہے یہ؟“ اذہان حسن بخاری نے کسی قدر حیرت سے پہلے ان سب کی طرف اور پھر فارحہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ملاحت سے مسکرا دی تھیں۔ عزیز اس کا ہاتھ تھام کر بھنگڑے کے سے انداز میں اسے گھمانے لگا تھا۔

”مہندی کی خوشبو سے

سانسوں پہ چھا جائے

آجان من!

ہم آئے — تجھ کو لینے!

نذرانہ دل کا دینے

ہم تیرے ہو جائیں گے

یہی —!

ہے لیکن!“

اذہان حسن بخاری کی نظر جوم میں گھری بیٹھی سا بیہ پر پڑی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتی مسکرا رہی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اذہان اب بھی نہ سمجھا تھا۔

”سو سہیل یار! — تیری آزادی ختم ہونے کا جشن منایا جا رہا ہے۔“ دوست فاران نے ہاتھ سے ل کی گردن کے قریب چھری پھیرنے کی ایکٹنگ کی تھی۔

”یعنی خدا تمہارا حامی و ناصر ٹھہرے۔ کشتی طوفان میں گھرنے کو ہے۔“ ایک اور کزن نے چنگلا چھوڑا

”سیدھی سی بات ہے یار! ہم گرتی دیوار کو ایک دھکا اور دینے آئے ہیں۔“

”تجھے چبو چلانا تو آتا ہے نا؟ — ویسے اس سمندر میں کشتی چلانے کا کوئی لائسنس ابھی تک جاری

نہیں ہے۔ صرف کچھ سنس استعمال کرنے چاہئیں۔“ عبید نے انکشاف کیا تھا۔ زبردست تہقیر پڑا تھا۔

”ہاں — جیسے کاسن سانس، لائے سنس، سنس آف ہیومر اور اسی جیسے اور بہت سے سنس —

ماٹھے تھوڑا سا انڈر اسٹینڈنگ ہونا پڑے گا اور ساتھ ہی حاضر دماغ بھی۔“ عزیز نے ابھی سے وارننگ

دے دی تھی۔

”ماٹرا کیا ہے؟“ اذہان نے بہت سکون سے دریافت کیا تھا۔ کمرے میں تہقیروں کی بہار آگئی تھی۔

”یار! یہ اب بھی نہیں سمجھا۔“ نعمان نے اس کی عقل پر بھرپور ماتم کیا تھا۔

”کیسے سمجھائیں اسے اب؟“ عزیز سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”تُو نے تیسری جنگ عظیم کے متعلق کبھی سوچا ہے؟“ عبید نے اسے کرید ا تھا۔

”چلو، یہ تو دور کی بات ہے۔ یہ بتا دو، دوسری عالمی جنگ کے متعلق ضرور سنا ہوگا۔ بس سمجھ لے، تیری

گی میں بھی ویسا ہی انقلاب برپا ہونے والا ہے۔“ لبوں پر مسکراہٹ لئے نعمان شرارت سے بولا تھا۔

”میں خود نہیں جانتا میرب سیال! میں اتنا قدامت پرست بھی کبھی نہیں رہا۔ مگر تمہارے معاملے جانے کیوں دستبردار نہیں ہو سکتا۔ ڈونٹ گٹ می روگ۔ اوں ہوں۔“ بہت آہستگی سے ہاتھ اٹھا

میں ہلایا تھا۔

”میں تمہیں کسی قید کا پابند کرنا نہیں چاہتا۔ مگر تمہیں آزاد چھوڑ کر میں کوئی رسک بھی لینا نہیں

چاہتا ہوں میں، میری پناہ تمہیں اچھی نہیں لگتی۔ مگر کیا کروں، میری عادت نہیں ہے دستبردار ہو۔

چاہتا ہوں، ماننا ہوں، تم جیتا جاگتا وجود ہو۔ سانس لینا ایک حساس وجود۔ جو سوچتا ہے، دیکھتا ہے۔

مگر شاید وہ نہیں جو چاہئے۔ کسی قدر نادان ہو۔ اور اسی بات کا ملال ستاتا ہے مجھے۔ کہیں! میں اپنا کوئی عظیم نقصان نہ کر بیٹھوں۔ جانتا ہوں، تمہیں ناصح کی ضرورت نہیں۔ میں راہبر بھی بننا نہیں

چاہتا ہوں تو صرف وہ، جو تم شاید سمجھ ہی نہیں رہی ہو۔“

انداز کسی قدر انفسوس ناک تھا جیسے وہ اس کی عقل پر ماتم کر رہا تھا۔

”میری مجبوری دیکھ رہی ہوتی۔ اپنے اصولوں کے خلاف جا رہا ہوں۔ نہ بات دہرانے کا عادی

حکم عدولی سننے کا۔ مگر تمہارا معاملہ عجب ہے۔ رعایت دینا ضروری ہو گیا ہے۔ مجھے میرے اصولو

بغاوت پر اکسار ہی ہوتی۔ مگر کیا کروں، تمہارا کچھ نہیں کر سکتا میں۔ مگر پلیز، مجھے اور آزمانا بند کر دو

پر تو تم ہائل نہیں ہو، ستانا تو بند کر سکتی ہونا؟“ اس کا چہرہ اوپر اٹھا کر اسے بغور دیکھا تھا۔

”مستر سیال آئیں تو انہیں منح کر دینا۔ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ اس سے زیادہ نہ میں کچھ کہنا چاہتا

ہی سنتا۔“ یکدم دو ٹوک فیصلہ سنانا وہ پلٹا تھا اور چلتا ہوا گاڑی کی سمت بڑھ گیا تھا۔

میرب سیال کتنی دیر تک زمین کے مضبوط سینے پر چلتے اس بے حد مضبوط جسامت والے مضمر

شخص کو دیکھتی رہی تھی۔ دھند میں لیٹے منظر بہت پُر سکوت تھے۔

وہ بارش بھی بہت چپ چاپ سی تھی اور لہروں کی طغیانی۔ اور تو کچھ یاد نہ تھا۔ ہاں اندر

کسی علاقے میں کہیں، کسی قدر کچھ ارتعاش سا ضرور برپا محسوس ہوا تھا۔ وہ لمبا چوڑا شخص حتیٰ

فیصلہ سنا کر اس گھڑی گاڑی کا دروازہ کھولے اس کی جانب متوجہ کھڑا اس کا منتظر تھا۔ کتنی آہ

میرب نے اس کی سمت اپنے بے جان قدم اٹھائے تھے۔ کیسا میکانکی سا انداز تھا۔ وہ کچھ نہیں جانتی

قدم اٹھا رہی تھی یا قدم خود بخود اٹھ رہے تھے۔



اذہان حسن بخاری گھر میں داخل ہوا تھا تو ماحول خاصا مختلف ملا تھا۔ لمحہ بھر کو تو وہ ٹھنک کر رک

گھر اپنا ہی ہے نا؟ یقین کرنے کو اس نے ایک بار درو دیوار کو بغور دیکھا تھا۔

”کیا کر رہے ہو میاں! — چلے آؤ۔ یہ محفل جو آباد ہوئی ہے آپ ہی کے سبب ہوئی ہے۔

نے اسے دیکھتے ہی ہانک لگائی تھی۔

اذہان حسن بخاری نے کسی قدر حیرت سے اس غول کے غول کی طرف دیکھا تھا۔ ڈھولگی کا

آواز — گانا بجانا، انتہائی بے سُرے راگ الاپنا۔ اور وہ بھی اس کے گھر کے اندر۔ آیا

”اب تو سمجھ جا میرے یار!“
 ”میرے خیال میں اسے کچھ کچھ کے مزید لگانے ہوں گے۔ شاید فوری طور پر مدعا بیان کرنے
 دماغ پر تھوڑا اثر پڑا ہے۔“ عبید نے فتویٰ جاری کیا تھا۔ اذہان کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔
 ”ہٹو، ہٹو۔ میرے پیارے سے بھائی کو تنگ مت کرو۔ ابھی تو رات گئے تک یہ غل غپاڑا چلنا ہے
 ماہا نجوم کو چیرتی ہوئی اپیل جوس لے آگے بڑھی تھی۔

”بھائی! پلیز، آپ بیٹھ جاؤ۔“ ماہا نے محبت سے کہا تھا۔
 ”پکڑ میں مت آنا اذہان بابو! سرخے پر چھری پھیرنے سے پہلے کی تیاری ایسی ہی ہوتی ہے۔“
 نے جملہ اچھا لگا تھا۔

”مرغا نہیں، بکرا کہو بے وقوف! — دیکھا نہیں ہمارے اذہان میاں ماشاء اللہ سے کیا غصہ
 ڈیل ڈول رکھتے ہیں۔“ نعمان نے تصحیح کی تھی۔ تہمتوں کا طوفان آ گیا تھا۔
 اذہان نے جوس کا گلاس تمام لیا تھا اور مسکراتے ہوئے ان سب کی طرف دیکھا تھا۔
 ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ — یہ ساری ٹیم کیا آج ہی پاگل خانے سے باہر آئی ہے؟“
 ”ہاں — تجھے صرف یہ بتانے میرے بھائی! کہ بہت جلد تو بھی وہاں جانے والا ہے۔“ عزیز
 ایک آنکھ دبا کر کہا تھا۔ زبردست تہمتے پڑے تھے۔

”ارے میرے یار! — تیرے“ حضرت میاں“ بننے کی پہلی قسط ادا ہونے جا رہی ہے۔
 پہلی اسٹیج پر ٹونے بالآخر قدم رکھ دیا ہے۔ یار! خوش نصیب ہے۔ ہم تو نجومیوں کے پاس چکر ہی لگا
 گئے۔ نہ محبوب قدموں میں آیا نہ کوئی چاند کھڑکی سے طلوع ہوا۔ سر کا چاند ضرور طلوع ہو گیا۔“ عزیز
 اپنے تیزی سے کم ہوتے بالوں کا قلق ہوا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہا ہے یار! — ہم سب کا دکھ مشترک ہے۔ مگر تو وہ واحد خوش نصیب ہے
 نوجوانوں کی انجمن سے خارج ہونے جا رہا ہے۔“ عبید نے بھرپور رشک کیا تھا۔
 ”کم آن یار! ابھی صرف منگنی کی ڈیٹ فکس ہونے جا رہی ہے۔ ڈونٹ بی فی۔“ اذہان نے مس
 ہوئے جان چھڑائی تھی۔

”خوشیوں کے بل جتنے بھی ہاتھ لگیں انہیں مٹھی میں بند کر لینا چاہئے۔ اور یہ خوشی اتنی معمولی
 ہے۔ آخر کو میرے اکلوتے بھائی کی انگیج منٹ ڈیٹ فکس ہونے جا رہی ہے۔ اس آے گریٹ ٹائم
 بریٹ۔“ ماہا نے بھائی کے ساتھ لگتے ہوئے کہا تھا۔ اذہان نے مسکراتے ہوئے بہن کے گرد بازو
 اور اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”تو تم نے اس سارے غول کو یہاں اکٹھا کیا ہے؟“ بہن سے دریافت کیا تھا۔
 ”کیا بات کرتا ہے یار؟ — ہم آگے ہیں، احسان مان۔ ورنہ تو ہم اس کی بھی فیس چارج
 ہیں۔“ عبید نے مطلع کیا تھا۔

”اگر اجازت ہو تو مجی سے مل لوں؟“ اس گھیرے ہوئے غول کی طرف دیکھا تھا اور اجازت

ارحہ کی طرف چلا آیا تھا اور ساہیہ کے ماما پاپا، اکینے اور دیگر خاندان کی بڑی شخصیات کے ساتھ بیٹھی تھیں۔
 ارحہ نے اٹھ کر بیٹے کو گلے لگایا تھا۔ اذہان نے انہیں بہ غور دیکھا تھا۔
 ”آپ خوش ہیں نا؟“

”ہوں۔ بہت۔ اور تم؟“ محبت سے بیٹے کے بال بکھیرے تھے۔
 ”میں بھی۔“ اذہان مسکرایا تھا۔ ”مئی! — پاپا؟“ بہت مدہم لہجے میں دریافت کرنا چاہا تھا۔
 اس اہم ترین موقع پر یقیناً وہ اس اہم ہستی کو اپنی زندگی میں شامل دیکھنا چاہتا تھا۔ مئی نے چہرے کے
 اشارے سے اسے مڑ کر دیکھنے کو کہا تھا۔ اذہان مڑا تھا اور اپنے پیچھے سعد حسن بخاری کو کھڑے دیکھ کر حیران
 ہو گیا تھا۔

”مبارک ہو مائی سن!“ پاپا نے کہتے ہوئے اسے ساتھ بھینچا تھا۔ اذہان حسن بخاری کو اپنی زندگی کا یہ
 ٹولہ صورت ترین دن لگا تھا۔

”جینیکس، اینڈ.....“ اذہان لمحہ بھر کو ہیر میٹ ہو کر رکھا تھا۔ ”اینڈ آئی لو یو پاپا! — آئی لو یو سو
 ج۔“ مدہم لہجے میں کتنے عرصے بعد اظہار ہوا تھا۔

سعد حسن بخاری نے بیٹے کو دیکھا تھا اور پھر اسے دوبارہ اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا۔
 ”آئی لو یو مائی سن!“ مدہم لہجے میں کتنے دنوں کی تھکن تھی۔

فارحہ کی آنکھیں بھینکنے لگی تھیں۔
 ”سعد بھائی! پلیز، آئیے۔ وقت گزرا جا رہا ہے۔ بزرگوں کی مجلس تاریخ طے کرنے کو آپ کی منتظر
 ہے۔“ فیض بخاری نے آکر ان کو مطلع کیا تھا۔ سعد بخاری، فارحہ اور فیض کے ساتھ آگے بڑھ گئے تھے۔

اذہان حسن بخاری کتنی دیر وہاں کھڑا رہا تھا۔ اس کمرے میں اب بھی اتنا ہی ہنگامہ تھا۔
 اکھیاں ملا لے ساڑے نال گڑیے!
 بھنگڑا ٹو پالے ساڑے نال گڑیے!

عبید، نعمان، عزیز سبھی کزنز اور دوست پیش پیش تھے۔ لڑکیاں الگ ساہیہ کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ اذہان
 حسن بخاری چلتا ہوا اس کی سمت بڑھنے لگا تھا۔ ساہیہ خان اس کی سمت متوجہ تھی۔

عبید، نعمان، عزیز سبھی بھنگڑا کرنے میں مصروف تھے۔ لڑکیاں بھی تالیاں بجاتے ہوئے اپنا حق ادا کر
 رہی تھیں۔ اذہان حسن بخاری نے ساہیہ کے قریب رک کر مسکراتے ہوئے اس کی سمت ہاتھ بڑھایا تھا اور
 اسے اپنی طرف بھینچ لیا تھا۔

ساہیہ تو وزن بحال کرتی ہوئی اسے گھورنے لگی تھی۔
 ”مسٹر! ابھی رائٹس آپ کے نام ریزروڈ نہیں ہوئے۔ کچھ خیال کیجئے۔“ جتایا تھا۔

اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا۔
 ”خیال؟ — کس بات کا خیال؟“ یکسر انجان پن سے دریافت کیا تھا۔ ”ہم تو آپ کو صرف
 کس کہنا چاہتے ہیں۔“

”بہانہ اچھا ہے۔“ ساہیہ کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ اتری تھی۔ اذہان مسکرا دیا تھا۔
 ”یار! اس ناٹ اے جوک۔ یہ بات بھی تھی۔ مگر.....“ بات مکمل ہونے سے قبل ہی ساہیہ مگر
 تھی۔ اذہان چوری پکڑے جانے پر بنا جھل ہوئے مسکرا دیا تھا۔
 ”سو وہاٹ؟“ یارا فیانی ہونے جا رہا ہوں تمہارا۔ اب اتنا تو حق بنتا ہے میرا۔ میں واقعی
 تھینکس کہنا چاہتا ہوں۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے بغور اسے دیکھا تھا۔
 ”مگر کیوں؟“ ساہیہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”ساہیہ! تم نے مجھے زندگی کا وہ سکھ دیا ہے جس کے بارے میں، میں صرف سوچ سکتا
 یہ گھر، اس کی خوشیاں لوٹانے میں یقیناً سارا کا سارا ہاتھ تمہارا ہے۔ مٹی کے چہرے کی راحت اور
 میرے لئے زندگی کا سب سے بڑا چیلنج تھا، پایا کا فیملی کی طرف لوٹ آنا، تمہارے باعث، سب کچھ
 لوٹ آیا ہے۔ آئی ایم ریگلی پی ویو۔ تم نے مجھے بہت بڑی خوشی دی ہے۔“ اذہان اس کا ہاتھ
 عقیدت سے لبوں تک لے جاتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔ ساہیہ بہت دھی سے مسکرا دی تھی۔ پھر مد
 میں گویا ہوئی تھی۔

”اذہان! تمہاری خوشیاں، میری خوشیوں سے الگ نہیں ہیں۔ نہ ہی میری خوشیاں تمہاری خ
 سے۔ اب ہمیں اک دو جے کے لئے ہی جینا ہے۔ اور رہی بات یہ کہ یہ سب میرے باعث ہے
 صرف تم سوچتے ہو۔ ورنہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ میرے ہاتھ میں کوئی جادو نہیں ہے کہ
 گھماؤں اور سب اچھا ہو جائے۔“ ساہیہ مسکرائی تھی۔
 اذہان کے لبوں پر بھی دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی سمت سے نگاہ ہٹا گیا تھا۔ ساہیہ نے اسے
 دیکھا تھا۔

”اذہان!“
 ”ہوں؟“ وہ جیسے چونکا تھا۔
 ”تم خوش ہو؟“ بہت عجیب سوال تھا۔ اذہان چونکا تھا، پھر مسکرا دیا تھا۔
 ”آف کورس یار! بھور کے لڈو کھانے جا رہا ہوں۔ سنا ہے بہت لگی ہوتے۔“

لڈوؤں کو ٹیٹ کرتے ہیں۔“
 لبوں پر مسکراہٹ مطمئن کرنے کو کافی تھی۔ مگر ساہیہ اسے متواتر تشویش سے دیکھتی رہی تھی۔
 سب نکال کر کوئی نمبر ملانے لگا تھا۔
 ”پچھتاؤ گے تو نہیں؟“ خدشہ بر ملا تھا۔ ساہیہ کی تمام توجہ اس پر تھی۔
 ”کم آن یار! فضول کی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہوتی۔“
 ”ایٹیکسکو زمی۔“ اذہان کہتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

عزیر، فیض چاچو اور ماہا مٹھائی لے کر آن وارد ہوئے تھے۔
 ”مبارک ہو۔۔۔ تاریخ طے ہو گئی منگنی کی۔ یعنی آدھی قید کا آغاز ہوا ہی چاہتا ہے۔ ٹھیک بنا

”بجد۔“ ماہا نے کہتے ہوئے گلاب جامن اس کے منہ میں ٹھونس دیا تھا۔
 ”بھائی کہاں ہیں؟“
 ”وہاں، میسر پر۔ سیل پر کسی سے بات کر رہے ہیں۔“ ساہیہ کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔ ارد گرد جھوم نے
 اسے گھیر لیا تھا۔ کوئی اس کے اندر کا سکوت محسوس نہیں کر سکا تھا۔ ماہا بھی مٹھائی ہاتھ میں لئے بھائی کی
 طرف پیش قدمی کر گئی تھی۔

انا بیہ سیل پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ عفتان علی خان اندر داخل ہوا تھا۔ اور بھی اس نے وہ سلسلہ
 منقطع کر دیا تھا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔
 عفتان اس کی جانب مطلق کوئی توجہ دیئے بغیر جھک کر دراز میں سے کچھ تلاشنے لگا تھا۔
 ”عفتان!“ انا بیہ نے بہت آہستگی سے پکارا تھا۔

عفتان علی خان نے مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا مگر اس کے تلاشنے ہاتھ تھم گئے تھے۔ اندازہ کیا
 جاسکتا تھا کہ وہ اس کی بات سننے پر مائل تھا اور پوری توجہ اس لئے اس کی جانب مبذول کئے ہوئے تھا۔
 انا بیہ کو فوری طور پر مدعا بیان کرنا مشکل لگا تھا۔ شاید اسی لئے وہ رخ پھیر کر چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس
 جا کر کھڑی تھی۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ دھیما لہجہ کسی بھی طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ عفتان علی خان
 نے مڑ کر اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر پر خیال انداز میں سر ہلا دیا تھا۔
 ”مجھے بھی تم سے بات کرنی ہے۔“

انا بیہ چونکی نہیں تھی۔ صرف مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
 عفتان علی خان کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ غالباً وہ کسی اہم نقطے پر سوچ رہا تھا۔
 ”آؤ میرے ساتھ۔“ حکم صادر کرنا ہوا وہ چلتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔
 انا بیہ کچھ دیر تک اسی طرح کھڑی اس سمت بکتی رہی تھی پھر چلتی ہوئی اس کے پیچھے آگئی تھی۔

عفتان پورچ میں گاڑی کا لاک کھول رہا تھا۔ وہ بھی چلتی ہوئی گاڑی کے پاس جاڑی تھی۔ عفتان علی
 خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا۔

انا بیہ نے بیٹھ کر اپنی طرف کا دروازہ بند کیا تھا اور عفتان علی خان نے گاڑی آگے بڑھانے میں دیر
 نہیں لگائی تھی۔ گاڑی میں کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی تھی۔ نہ انا بیہ کچھ کہہ سکی تھی نہ ہی عفتان علی
 خان۔ شاید دونوں ایک دوسرے کی طرف سے بولنے کے منتظر تھے۔

”آپ کچھ کہنا چاہتی تھیں؟“ عفتان علی خان نے اس کی طرف دیکھے بغیر پہلا موقع اسے دیا تھا۔
 انا بیہ چونکی تھی مگر فوری طور پر کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

”آپ۔۔۔ آپ کیا کہنا چاہتے تھے؟“ انا بیہ جانے کیوں الجھن کا شکار نظر آئی تھی۔ عفتان علی
 خان کی قدر لا تعلقی سے ایک نگاہ اس پر ڈال کر دوبارہ وڈ اسکرین کی سمت متوجہ ہو گیا تھا۔ بھی اس کا سبیل

بچ اٹھا تھا۔ عفتان نے اسکرین پر چمکتا ہوا نام دیکھا تھا اور کال ریسیو کر لی تھی۔
 ”اوہ — آئی ایم سوری یار! میں بھول گیا۔ تمہارے ٹیکسٹ مورنگ میں ملا تو تھا۔ مگر پھر دن بھرا
 مصروفیت رہی کہ یاد ہی نہیں رہا۔ تم بتاؤ، اس وقت کہاں ہو؟ کہیں ریسنورٹ میں بیٹھی میرا انتظار تو نہیں
 رہیں؟“ مخاطب توجہ کا باعث بنا تھا۔

جواب پتہ نہیں دوسری طرف سے کیا کہا گیا تھا کہ عفتان علی خان کا ہتھہ گاڑی میں گونج گیا تھا۔
 ”کیا کروں — ایسا ہی ہوں۔ اگر انتظار نہیں کر سکتیں تو لوٹ جاؤ۔ میں یہ جھیل سکتا ہوں۔
 مسکراتے ہوئے مدعا بیان کیا تھا۔

اظہار یہ چہرے کا رخ پھیرے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔
 ”عفتان علی خان کے دل کو ابھی جانا ہی کہاں ہے آپ نے — نہیں، رنو گری کا کوئی اتنا زیادہ
 کام نہیں۔ معمولی مرمت اور ٹیوننگ کی ضرورت ہے۔ کوئی زیادہ ٹوٹ پھوٹ نہیں ہے۔“ مسکراتے ہو۔
 ایک دلچسپ وضاحت کی تھی۔ جانے کس سوال کے جواب میں۔
 اتنا بیہ رخ پھیرے مکمل لائق نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔
 موصوف کی گفتگو طویل پکڑتی جا رہی تھی۔

اتنا بیہ نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ پلیئر آن کر دیا تھا۔ سروساز چار اطراف پھیلنے لگے تھے۔
 بے بسی نہیں ہے یہ بے جواز!

خاموشی میرے دل کا ہے سوال!
 بے رخی ہی سہی پر ہے تو سہی بہار
 وہ نظر جو تھی اپنی مثال
 دل میرا کرتا ہے تمہیں تلاش

تم ضم ہو میرا سوال
 فاصلے — گر ہوں گے درمیان
 مل نہ سکیں گے ہم —
 فاصلے —!

گر ہوں گے درمیان
 مل نہ سکیں گے ہم —!

عفتان علی خان نے کسی قدر ناپسندیدہ انداز سے دیکھا تھا پھر ہاتھ بڑھا کر پلیئر آف کر دیا تھا۔ اتنا بیہ
 اس کی سمت متوجہ نہیں تھی۔ تبھی وہ اس کے چہرے کے ناپسندیدہ تاثرات نہیں جان پائی تھی۔ عفتان علی
 خان دوبارہ گفتگو میں مصروف ہو چکا تھا۔

”او کے یار! — غصہ ٹھنڈا کرو — اور آج کی ملاقات کا وقت کچھ آگے بڑھا دو۔ یار
 ٹائم آگے بڑھانے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ میٹنگ پوسٹ پونہ نہیں کر رہا۔“

”او کے — رائٹ۔“ دوسری طرف سے شاید گرم جوشی کا اظہار ہوا تھا۔ عفتان مسکرا دیا تھا۔
 ”او کے — سیم ہیئر! — سی یوسون۔“

عفتان علی خان نے سلسلہ منقطع کرتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا۔ اتنا بیہ اس کی سمت قطعاً متوجہ نہیں
 تھی۔

”کہئے، کیا کہنا تھا آپ کو؟“ ڈرائیونگ کرتے ہوئے خاطر خواہ توجہ اسے دی تھی۔ اتنا بیہ نے اس کی
 طرف دیکھنے سے مکمل اجتناب برتا تھا۔
 ”لامتہ تھی؟“ پتہ نہیں کیا سوچ کر سوال داغا گیا تھا۔

عفتان علی خان لمحہ بھر کو حیران ہوا تھا۔ پھر لائق کی طرف دیکھنے لگا تھا۔
 ”دیش ناٹ یور کنسرن۔ یہ آپ کا کنسرن نہیں ہے اتنا بیہ شاہ! — میرا نہیں خیال کہ مجھے کسی کو
 جواب دہ ہونا ہے یا میں کسی طور پر کسی کا پابند ہوں۔“ بہت کھردرے انداز میں جواب سے نوازا گیا تھا۔
 اتنا بیہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔

”کیوں؟ — اچھا نہیں لگا آپ کو؟ اس لئے، یہ میرا کنسرن نہیں؟“ جوابا کہا تھا۔ مگر عفتان نے
 جواب دینا ضروری خیال نہیں کیا تھا۔

”آخر کیا کر رہے ہیں آپ؟ — یہ کیا نیا چکر ہے؟ — اگر آپ سمجھ رہے ہیں کہ اس ٹیبل
 انداز سے آپ میرے دل میں کوئی جگہ پالیں گے تو یہ بالکل غلط ہے۔ خام خیالی ہے آپ کی۔ بالکل غلط
 سوچ رہے ہیں آپ۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بہت بوگس طریقہ ہے یہ کسی کی بھی توجہ پانے کا۔ آئی ایم
 ریٹل ناٹ امپورٹنٹ بایٹ۔“

عفتان علی خان نے گاڑی سڑک کے ایک جانب روک دی تھی اور بے حد جارحانہ انداز سے اس کی
 سمت دیکھنے لگا تھا۔

”کیا سمجھتی ہیں آپ؟ — میں صرف آپ کے لئے جیتا اور مرتا ہوں؟ — میری زندگی صرف
 آپ سے شروع ہو کر صرف آپ تک ختم ہوتی ہے؟ — صرف آپ ہی ایک اہم ترین ہستی ہیں اس
 دنیا میں؟ — اگر آپ ایسا سوچ رہی ہیں تو آپ خود کو بے حد اہمیت دینے کی عادی ہیں۔ ایسا کچھ نہیں
 ہے۔ کیونکہ مجھے آپ کی کوئی فکر نہیں ہے۔ آپ کچھ بھی سوچیں، کچھ بھی کریں، آئی ریٹل ڈونٹ کیئر۔ آپ
 عادی ہو چکی ہیں الزامات لگاتے رہنے کی۔ کبھی اپنے کڈ نیپ کا الزام، کبھی کسی اور سے انوالومنٹ کا دعویٰ۔
 مجھے تو سمجھ میں یہ نہیں آتا آپ میرے ساتھ بھی کیوں ہیں؟ جبکہ آپ پہلے ہی دن یہ باور کرا چکی ہیں کہ
 آپ سے زیادہ مجھ پر اگر کسی کا حق ہے تو وہ لامحد کا ہے۔ میں نے آپ کو اپنا کر غلطی کی ہے تو پھر مجھے اس
 غلطی کو سدھارنے کیوں نہیں دیتیں آپ؟ — میں واقعی کنفیڈر کرتا ہوں۔ ریٹلارڈ کیا ہے میں نے۔
 لیس، آئی میڈ مسٹیک — اے پگ مسٹیک۔ مگر اب میں اپنی غلطی کو واقعی سدھارنا چاہتا ہوں۔ لیس،
 آئی وانٹ ٹو بیک مانے لائف فرام یو۔“ عفتان علی خان قطعی انداز میں بولا تھا اور اتنا بیہ شاہ اسے ساکت
 کی دیکھتی رہ گئی تھی۔

”مجھے گھر نہیں جانا ہے۔“ انا بیہ نے جتانے والے انداز میں کہا تھا۔ مگر عفنان علی خان نے سنی ان سنی

کردی تھی۔ انا بیہ شاہ کا غصہ بڑھ گیا تھا۔

”آئی سیڈ، مجھے گھر نہیں جانا ہے۔“ وہ جیتی تھی۔ مگر عفنان علی خان پر اس کے غصے کا مطلق کوئی اثر

نہیں ہوا تھا۔ بہت اطمینان اور رسائیت سے اسے دیکھا تھا اور بہت مدہم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔ اس کے بعد تم جہاں چاہے چلی جانا۔ میں تمہیں ہرگز نہیں روکوں گا۔“

انداز حسی تھا۔ انا بیہ شاہ اس شخص کی سمت دیکھ کر رہ گئی تھی۔ پھر عجیب خفگی سے پُر انداز میں چہرے کا رخ

پھیر گئی تھی۔ عفنان علی خان کو غالباً اس خفگی کی پرواہ ہرگز نہیں تھی۔ سچی وہ بنا اس کی طرف دیکھے پوری توجہ

سے ڈرائیو کرتا رہا تھا۔

”تم مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی تھیں؟“ قدرے توقف سے گاڑی میں بھاری آواز ابھری تھی۔

مخاطب یقیناً وہی تھی۔ مگر وہ اس لمحے مکمل طور پر اچھی دکھائی دے رہی تھی۔ نہ تو پلٹ کر اس کی طرف دیکھا

تھا نہ ہی کوئی جواب دیا تھا۔

”بات اگر فیصلہ کن یا نتیجہ کن ہے تو تمہیں مجھ سے ضرور شیئر کرنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے ان

تمام الجھنوں کا اختتام ممکن ہو سکے جو میرے اور تمہارے درمیان بدستور بوہتی چلی جا رہی ہے۔“ عفنان

علی خان نے ایک معقول مشورہ دیا تھا مگر انا بیہ شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ چہرے کا رخ پھیرے

کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی تھی۔

عفنان علی خان نے اس کی جانب ایک نگاہ ڈالی تھی اور پھر کھڑکی پر کہنی ٹکا کر بھر پور توجہ کے ساتھ

ڈرائیو کرنے لگا تھا۔ چہرہ اگرچہ بے تاثر تھا مگر نگاہوں کی الجھن کسی قدر بڑھ رہی تھی جو اس بات کا پیش

خیہ تھی کہ اس کے اندر یقیناً بہت سے طوفانوں کی طغیانیوں کا ڈیرہ تھا۔ مگر اسے اپنے جذبات و احساسات

کو بھر پور انداز میں مخفی رکھنے پر گویا دسترس حاصل تھی۔



نہ مدعا یاد تھا اپنا۔۔۔ نہ کوئی سوال۔

کس قدر چنگ محسوس ہو رہی تھی اس گھڑی۔

اپنی غلطی کا بھر پور احساس ہوا تھا۔

اسے یقیناً عفنان علی خان سے ایسے سوال نہیں کرنے چاہئے تھے۔ شرمندگی سی شرمندگی تھی۔

دل چاہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں جا سائے۔ مگر افسوس، نہ اس وقت قدموں تلے زمین تھی

سر کے کو کوئی مہربان آسمان۔۔۔ وہ خالی ہاتھ تھی اور۔۔۔ گوانے کو شاید اس کے پاس کچھ تھا بھی نہیں۔

نہ کوئی حق جتانے کو تھا۔

نہ کوئی حرف منانے کو اور۔۔۔

چہرہ پھیرتے ہوئے اس نے یکدم ہی ہاتھ دروازے پر رکھتے ہوئے کھولنے کی سعی کی تھی۔ مگر تم

گاڑی کو تیزی سے بریک لگاتے ہوئے عفنان نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟“ پاگل پن دکھانے کی عادت ہو چکی ہے آپ کو۔“ ایک الزام بردار

دھرا تھا۔

انا بیہ شاہ کی جھکی آنکھوں سے بہت آہستگی سے نمکین پانی کے قطرے ٹوٹ کر ہاتھوں پر گرے

تھے عفنان علی خان نے بغور اس چہرے کو دیکھا تھا اور پھر کسی قدر احساس جرم سے چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔

”آئی ایم سوری!“ بہت آہستگی سے لبوں سے برآمد ہوا تھا۔ معذرت کے لفظوں میں کسی پچھتوانے

ہلکی سی بازگشت تھی۔ جیسے وہ اپنے کئے پر کسی قدر پشیمان تھا۔

انا بیہ بنا کچھ کہے، بنا اس کی طرف دیکھے چہرے کا رخ پھیرے بیٹھی رہی تھی۔ پھر یکدم ہاتھ بڑھا

دروازہ دوبارہ کھولنے کی سعی کی تھی مگر اب کے عفنان علی خان پہلے سے زیادہ مستعد تھا۔ ہاتھ بڑھا

سرعت سے اس کے نازک ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ انا بیہ شاہ نے بھیگی آنکھوں سے کسی قدر برہمی سے اسے

دیکھا تھا۔

”ہاتھ چھوڑیے میرا۔“ حکم صادر ہوا تھا۔ مگر عفنان علی خان نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی تھی۔ اس

بھاری ہاتھ جوں کا توں اس کے ہاتھ پر موجود رہا تھا۔

”میرا ہاتھ چھوڑیے۔“ برہمی کسی قدر بڑھی تھی مگر عفنان علی خان نے مطلق کوئی پرواہ کئے بغیر اسے

دیکھا تھا۔

”تمہیں جہاں جانا ہے، وہاں تمہیں میں چھوڑ دوں گا۔ بار بار بچوں والی حرکتیں مت کرو۔ تمہیں ہمیشہ

اپنی پرواہ ہوتی ہے۔ ہمیشہ اپنے بارے میں سوچتی ہو تم۔ ہر بات میں صرف اپنا فائدہ چاہتی ہو اور اپنا

فوری طور پر چاہتی ہو۔“ بہت سارے الزامات ایک ساتھ لگاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

انا بیہ شاہ نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔ اس کی نظریں غالباً کسی الزام کی وضاحت چاہ رہی

تھیں۔ مگر عفنان علی خان بنا کسی الزام کی تردید کئے وٹا اسکرین کی سمت نگاہ جمائے ڈرائیو کرتا رہا تھا۔

گاڑی کا رخ گھر کی جانب تھا۔

اور اگر وہ رات کہے تو مقابل موجود اسے رات کہے۔ یہی کیفیت حالت امن قائم رکھنے کی تھی۔ ورت دیگر نتیجہ اس کے برعکس ہو سکتا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری اس وقت اگر خوش پایہ اطمینان دکھائی رہا تھا تو صرف اس لئے کہ اس کے کہے پر بنا سوچے سمجھے مہر تقدیر ثبوت کر دی گئی تھی۔ میرب سیال اس لمحے وہ اپنے مقابل کھڑا شخص کسی قدر خود غرض دکھائی دے رہا تھا جسے صرف اپنی فکر تھی اور صرف اور فی اپنی غرض عزیز تھی۔

اس کی بلا سے کوئی جے یا مرے، اسے قطعاً کوئی پروا نہیں تھی اور اس نے اس شخص کو خوشی دی تھی۔ اسے اطمینان بخشا تھا۔ اس کی محکوم ہوئی تھی۔ بنا سوچے سمجھے، آنکھیں بند کر کے اس کی تائید کی تھی۔ کیوں کیا تھا اس نے ایسا؟ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

”غصہ تو نہیں ہوئے وہ؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے دریافت کیا تھا۔ میرب سیال نے سرنئی میں دیا تھا۔

”گڈ“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے سراہا تھا۔ ”دیش لائیک اے گڈ گرل۔“ بھر پور تعریف کی۔ مگر میرب سیال کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہ ابھرا تھا اس ستائش پر۔ اس کرم پر وہ کچھ خاص خوش دکھائی نہ دی تھی۔

”سواب کیا کرنا ہے؟“ میرا خیال ہے سب سے پہلے وہ پیک سامان کھولنا شروع کر دو جو تم نے اجانے کی تیاری میں باندھ کر اب تک رکھا ہوا ہے۔ وہ سامان کھل جائے گا تو ساتھ ہی اور بھی بہت سی ہیں کھل جائیں گی جو اب تک دکھائی بھی نہیں دے رہیں۔ بیلیو!“ سردار سبکتگین حیدر لغاری جانے بات کی یقین دہانی کرنا چاہتا تھا، میرب سیال نہیں جانتی تھی۔ شاید اسی لئے سرنئی میں ہلا دیا تھا۔

”پتہ نہیں، بعض گرہیں کھلیں گی یا اور بھی گہری پڑ جائیں گی۔“ خدشہ بلا جواز نہ تھا۔ مگر سردار سبکتگین لغاری مسکرا رہا تھا۔

”یہی بات تو سمجھنا چاہ رہا ہوں تمہیں۔ گرہیں کھولنا شروع کرو، باندھنا نہیں۔ باندھو گی تو ہر گرہ گہری مابلی جائے گی۔ اور پھر شاید تم سے وہ کبھی کھل ہی نہ سکے۔“ ملامت سے کہتے ہوئے اسے کسی قدر توجہ دیکھا تھا۔

”گرہیں کئی طرح کی ہیں سوئی! غور کرو تو ساری بات اپنے آپ سمجھ میں آ جائے گی۔ ابتداء اپنے باہر کرو۔ بہت سی گرہیں تمہارے ارد گرد بھی ہیں۔ خود کو ان سے آزاد کرانے کی چھوٹی سی کوشش کرو۔ ہنی! اتنا جانتا ہوں ابتداء اگر جلد کرو گی تو دل تک کا سفر بہت جلد طے ہو جائے گا۔ جو میں دیکھ رہا ہوں وہ تم ماکیر ہیں۔ جہاں تک میری نگاہ کی رسائی ہے شاید تمہاری نگاہ کا وہاں تک دیکھنا ممکن ہی نہیں۔“ مدہم میں بہت کچھ باور کرانے کی کوشش میں تھا۔

”تمہارا دل کئی طرح کی گرہوں میں مقید ہے سوئی! اسے آزاد کرو۔ دل کھلا ہو تو عاقل، بڑھا ہو تو تصور ہوتا ہے۔ آزاد ہو تو عاقل، قید ہو تو معمول کہلاتا ہے۔ تمہیں کس بات کی فکر ستاتی ہے؟ کیوں غمخوشوں میں گہری کھڑی ہو؟ دل ہی تو ہے، اڑنے دو۔ آزاد پیچھی سا، جائے گا کہیں نہیں۔ لوٹے گا تو

کسی کے حکم نامے میں اتنی تاثیر تھی یا وہ واقعی مرعوب ہو گئی تھی۔ اندر کی خوف کی لہر تھی کوئی انجانا ڈرا!

اُس شام وہ ریسیور کان سے لگائے پایا سے بات کرتے ہوئے انہیں یقین دہانی کر رہی تھی یہاں بہت خوش ہے اور انہیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ واضح طور پر تو انہیں منع نہیں تھی کہ یہاں مت آئیں مگر اپنی طبیعت کے متعلق کسٹرن ہو کر فی الحال انہیں آنے سے روک دیا تھا اس نے کیوں کیا تھا وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ تو وہ سردار سبکتگین حیدر لغاری کی اطاعت کرنا چاہتی اپنے کسی اقدام سے اسے خوش کرنا۔ مگر جانے کیوں، جیسے یہ عمل کسی میکانی انداز میں خود بخود ہی ایسا گیا تھا۔

نون رکھ کر وہ مڑی تھی تو سردار سبکتگین حیدر لغاری کو اپنے پیچھے کھڑا پایا تھا۔ وہ نہ تو چوکی تھی نہ ہی جی کا کوئی اظہار کیا تھا۔ چپ چاپ چلتے ہوئے اس کے قریب سے نکل جانا چاہا تھا مگر سردار سبکتگین لغاری کو شاید اسے داد دینا مقصود تھا جس نے بہت چپکے سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

میرب سیال نے پلٹ کر اس کی سمت دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ایسی لا تعلق سی کھڑی رہی تھی نگاہ اس کی سمت مائل تھی نہ کسی تیور میں کرم کا کوئی گمان تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے ایک قدر درمیانی فاصلہ عبور کرتے ہوئے اسے بغور دیکھا تھا اور ہاتھ بڑھا کر اپنی طرف سے گریزاں چہرہ جانب مائل بہ کرم کرنے کی ٹھانی تھی۔ مگر میرب سیال نے نگاہ اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

”کیا بات ہوئی مشر سیال سے؟“ بنا کسی تمہید کے وہ اصل مدعا پر آیا تھا۔ میرب سیال جانتی تھی سردار سبکتگین حیدر لغاری کے یہاں روکنے کا مقصد فقط یہی جاننا تھا جس نے اسے ثابت میں سر ہلا دیا تھا۔

”ہاں، میں نے منع کر دیا ہے۔“ مثبت جواب جان کر یقیناً سردار سبکتگین حیدر لغاری کی انا کوہ تسکین ملے گی، وہ جانتی تھی۔ اور یہی تاثر وہ اس لمحے اس شخص کے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔

”سردار سبکتگین حیدر لغاری کی آنکھوں کی چمک میں کسی قدر اضافہ ہوتا دکھائی دیا تھا۔ اس نے اسے اس کے مطابق نتیجہ دیکھ کر یقیناً اسے خوش ہی ہونا چاہئے تھا۔ نتیجہ میرب کی توقع کے بھی برعکس نہ تھا۔ دانستہ نادانستہ اس شخص کو خوشی سے ہمکنار کر چکی تھی۔ یہی وہ چاہتا تھا کہ اس کا بول بالا ہو۔ اسے اسے اس کو ٹھیک کہا جائے۔ جو حکم ہو، اس پر فوری طور پر عمل پیرا ہوا جائے۔

وہ دن کو دن کہے۔ تو کوئی دن کہے۔

دکور بلا وار کا کوئی تجربہ نہیں رکھتی، نہ ہی مجھے چھپ چھپ کر وار کرنا پسند ہے۔ میں ایسے مخفی کھیلوں کی ہیں جن کی شاد اور مات کا اندازہ بھی نہ ہو سکے۔“ میرب سیال کا جواب بہت دلیری کا ثبوت دے رہا۔
ردار سبکدین حیدر لغاری مسکرایا تھا۔

تو پھر کس بات کی قائل ہو تم؟“ پھر جواب کا انتظار کئے بغیر بولا تھا۔
میرب! تمہارے متعلق ایک بات ہمیشہ بہت دلچسپ اور چونکا دینے والی لگتی ہے مجھے۔ تم پر تدر ملتی ہو اور پھر بھی نہیں کھلتیں۔ تمہاری یہی بات مجھے مزید جاننے پر اکساتی ہے۔ سچ بتاؤ اور کتنے ہیں تمہارے جن کے متعلق میں اب تک سرے سے جانتا ہی نہیں؟۔ جن تک اب تک میری مکن نہیں ہو سکی؟۔ تمہارے اندر کی وہ دنیا کیسی ہو گی؟۔ سچ، تم بہت سویٹ ہو ہنی!“

ہانے کے جن کرنا ہوا وہ یکدم مسکرایا تھا۔
چلو، آج کی اس بحث کا انجام بغیر شاد اور مات پر کرتے ہیں۔ تم سے جیتنے کا دعویٰ یوں بھی یو دا ہو گا۔
سے آج تک کوئی جیت پایا ہے؟“ لبوں پر ابھرنے والی مسکراہٹ دلفریب تھی۔

رپور توجہ سے اس چہرے کو کتکتے ہوئے بہت آہستگی سے اس کا چہرہ تھپتھپایا اور چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔
رب سیال کے لئے اپنے قدموں کی متزلزل عمارت پر مزید کھڑا رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ وہ وہیں ا میں بیٹھ گئی تھی۔ کتنا عجیب تھا یہ شخص۔

ایروہ اسے کبھی سمجھ نہیں سکتی تھی۔ عجیب ریاضی کے سوالوں کی طرح الجھا ہوا سا شخص تھا۔
ب کیا چاہتا تھا اسے خود بھی خبر نہیں ہوتی تھی۔

یا، کیوں، کس لئے کرنا تھا شاید وہ خود بھی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ گجنگ سا شخص اس کی زندگی گجنگ کر رہا تھا۔



دیکھو، یہ سیٹ کیسا ہے؟“ سامنے میز پر زیورات کے بہت سے ڈبے پھیلائے فارحہ نے ایک سیٹ سے اذہان حسن بخاری کی توجہ چاہی تھی۔ وہ مسکرایا تھا۔ فیض چاچو اور ماہا ہنس پڑے تھے۔ اذہان ہو گیا تھا۔

م آن می! مجھے ان باتوں کی تمیز کہاں ہے؟“
یکھو گے تو آئے گی نا۔“ فارحہ نے مسکراتے ہوئے ڈبٹا تھا۔
کی ٹھیک کہہ رہی ہیں بھائی! بزنس کی تمام مصروفیات چھوڑ کر فوری طور پر می کے گھنٹے سے لگ کر بیٹھ۔ یہ سب یکھنا بہت ضروری ہے آپ کے لئے۔ آخر کو شادی کے بعد بھی تو یہ تمام کام آپ کو ہی کرنا امانے شراوت سے چھیڑا تھا۔

کیوں چاچو؟“
ان بھئی، ماہا کہہ تو ٹھیک رہی ہے۔ واقعی اگر کامیاب زندگی گزارنا ہے تو بھائی کی بات مان کر یہ یکھنا ہی پڑے گا۔“ فیض چاچو نے بھی تائید کر دی تھی۔ اذہان حسن بخاری مسکرایا تھا۔

واپس وپیں آئے گا جہاں آنا چاہئے مگر.....“ مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس ساکت سے چہرے سے چھوا تھا۔

”مان لوسوئی! یہ عرصہ اس کے ادراک کا لمحہ ہو گا۔ اس چھوٹی سی اڑان میں یہ ننھا سادل وہ بھیر آئے گا جو اس نے صدیوں میں بھی نہ جانے ہوں گے۔ ایک بار آزاد کر کے تو دیکھو، گرہیں کھولنے تو کرو، تیری تو پکڑو، پھر دیکھو کیسی کرشمہ سازیاں ہوتی ہیں۔ آزما لو، یقین کرنے کی یہ صورت بہر ثابت ہو گی۔ بہت سی الجھنیں اپنے آپ سلجھ جائیں گی۔ اڑان بھر کے آنے والا دل وہ اسم اعظم ساتھ لائے گا جس کے پڑھنے کی بھی نوبت نہیں آئے گی اور ہر در خود بخود وا ہو گا۔ حقیقتیں منکشف آسے سے زیادہ اچھا راز نہ کبھی ہاتھ لگا ہے نہ لگے گا۔ ٹرسٹ می۔“ لہجہ یقین کی آخری حدوں کو چھو رہا مگر میرب سیال اس شخص پر مزید اعتبار کرنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ بہت آہستگی سے میں ہلانے لگی تھی۔

”میں حقیقتوں اور سراہوں کے مابین فاصلوں کی لکیروں سے واقف ہوں سبکدین حیدر لغاری! فضاؤں میں اڑان بھرنے کے نقصانات بھی معلوم ہیں۔ مجھے چھپے ہوئے بھیدوں سے بھی کسی قدر ہے۔ مجھے درون جاں اور بیرون جاں کے معاملات سمجھانے کی کوشش مت کرو۔ میں جانتی ہوں کہ میں کھلنے سے کیا کرشمہ سازی واقع ہو سکتی ہے۔ مجھے نفع اور نقصان کا مکمل ادراک ہے۔ سوان، حقیقت ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے۔“ لہجہ دھیما مگر کسی قدر مدلل اور پراعتماد تھا۔

”دل کی، جذبات کی، احساسات کی باتیں آپ مت کیا کریں۔ بہت چھوٹی لگتی ہیں۔ لگتا دونوں پاؤں جوڑ کر جھوٹ بول رہے ہیں۔“ میرب سیال کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ تھا۔ مگر سردار سبکدین حیدر لغاری کا قہقہہ بہت برجستہ تھا۔

”اچھا۔ اتنے غور سے سننے لگی ہو مجھے کہ سچ اور جھوٹ ایک پل میں علیحدہ علیحدہ پانا بھر پور تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ بہت جینکس ہو تم تو۔ پل میں کیا سے کیا کرنے کے سارے گز تمہیں۔ جب نگاہ اتنی گہری ہے تو ڈر کس بات کا ہے؟“ اپنے طور پر چٹپٹن دیا تھا۔ میرب سیال نے کرسٹھی میں ہلایا تھا۔

”نہیں، ڈر نہیں ہے۔ اسے حفظ ما تقدم کہتے ہیں۔ ڈرنے سے ہاتھ کچھ نہیں آتا سوائے خوف حفظ ما تقدم کے تحت کئے جانے والے بہت سے اقدامات، ان خوف کے اثرات کو بہت حد تک آہیں۔“ میرب سیال کا ٹھوس لہجہ اس کے اندر کی بھر پور ترجمانی کر رہا تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”بہت سیانی ہو تم۔ ہار اور جیت کے سارے اسباب جانتی ہو، تم پھر بھی اتنی ابری ہنسید رہتی تو کھل کر کھیلنا چاہئے۔ یہ چھپ چھپ کر وار کرنا کچھ غیر مناسب نہیں لگتا؟“ سردار سبکدین حیدر سامنے کھڑی دھان پان سی لڑکی کی ذہانت سے یقیناً مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ لبوں کو بتا رہی تھی کہ وہ بہت مخلوط ہو رہا ہے اس لئے۔

رے آپ ساری تعریف خود ہی کئے جائیں گے یا کوئی اذہان بھائی سے بھی پوچھے گا؟“ ماہانے
زین فرد کی طرف توجہ مبذول کروائی تھی۔ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے اذہان کی طرف دیکھا تھا۔
براخیال ہے اب آپ بھی رائے دے ہی دیجئے۔ ساہیہ زبان سے پوچھ نہیں سکتیں۔ مگر ہم ان کی
ذکر سکتے ہیں نا۔“ ماہانے بھائی پر زور دیا تھا۔

مئی تم سب رائے دینے کی بات کر رہے ہو۔ تھوڑی دیر بعد کسی اور شے کی فرمائش کر دو گے۔ بھی
ان دوہا ہیں۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ دوہا بھی انسان ہوتا ہے۔“ عزیز نے
بیٹھا تھا۔ سب ہنس پڑے تھے۔ اذہان نے ایک ٹکا کھینچ کر اسے رسید کیا تھا جس سے بچاؤ کے
نے آگے کش کر دیا تھا۔

بے بھائی! اب رائے دے ہی دیں۔ ساہیہ پر یہ سیٹ کیسا لگ رہا ہے؟“

ٹی تھنک، پہلے والا زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔“

۔۔۔ سب نے ایک مشترکہ آواز کی تھی۔

مئی تو کہہ رہے تھے جناب کہ ہمیں ان باتوں کی کوئی تیز نہیں اور اب۔“ فارحہ نے خبر لی تھی۔

براخیال ہے میں چلتا ہوں۔“ اذہان اٹھنے لگا تھا۔ عزیز نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا دیکھا تھا۔

ہاں یار! یہ محفل کی رونق آپ کے ہی تو دم سے بنی ہے۔ بلکہ یہ ساری کی ساری محفل آباد ہی آپ
ہوئی ہے۔“ اذہان پھر بیٹھ گیا تھا۔

زیر چاچو! آپ مجھے نانو کے گھر چھوڑ دیں گے؟“ ماہانے بھائی کی خلاصی کرانے کا ایک حل یہ

۔

یوں نہیں یار! مگر یہ تمہیں صرف اپنے بھیا جان پر ترس آ رہا ہے یا واقعی جانے کا موڈ ہو رہا ہے؟“
اذہان کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

مل۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے واقعی چاہنا ہے۔ نانو انتظار کر رہی ہوں گی۔“ ماہا بھائی کی
کے باعث چکر ضرور لگا رہی تھی مگر قیام اب بھی نانو کے ہی گھر تھا۔

سا، ماہا ٹھیک کہہ رہی ہے عزیز! تمہارے پاس وقت ہو تو ذرا چھوڑ دو اسے۔ تمہارے آنے تک میں
بند کا فرم ٹرانسل بنانی ہوں۔“ فارحہ نے اس کا شانہ چھپتھاتے ہوئے کہا تھا۔

نیار شرت۔ بھائی! آپ سے ایسی امید نہیں تھی۔ آپ مجھے یہاں سے بھگانا چاہ رہی ہیں؟ بیٹا
بڑھ گیا، دیور نہیں؟“ شرارت بھرے انداز میں شکوہ کیا تھا۔ فارحہ اسے ایک چپٹ لگاتی ہوئی مسکرا

۔

ٹی بات مت کرو۔۔۔ مجھے تم دونوں ایک جتنے عزیز ہو۔ کوشش کر رہی ہوں کوئی لڑکی تمہارے
ساجائے انہی دنوں تو دونوں دوستوں کے معاملات ایک ساتھ منٹ جائیں۔“

بچے، آپ تو الٹا پھنسانے کی بات لے بیٹھیں۔۔۔ یہ دیکھیں۔۔۔ دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔
نالیال معاف ہی رکھیں۔ اس سے بہتر ہے میں ماہا کو چھوڑ آؤں۔ چلو ماہا! ہم چلتے ہیں۔“ عزیز

”اگر صرف انجی منٹ ہونے پر یہ حال ہے تو شادی کی تیاریوں میں تو مجھے تمام مصروف
ہمیشہ کے لئے گھر بیٹھنا پڑے گا۔“

”ان سب باتوں کو چھوڑو، یہ سیٹ دیکھ کر بتاؤ کیسا ہے؟“ مئی مدعا اسی جگہ پر واپس لائی
سیٹ دیکھتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”آئی تھنک، اچھا ہی ہے۔“

”صرف اچھا؟۔۔۔ بہت اچھا کیوں نہیں؟“ ماہانے چھیڑا تھا۔

”کیونکہ بہت اچھا یہ صرف تب ہو سکتا ہے جب اسے کوئی پسینے والا بھی موجود ہو۔“ اذہا
ماہا مسکرا دی تھی۔

”تو یوں کہتے نا کہ معاملہ یہ ہے۔ اتنی دیر سے مئی کو تنگ کیوں کر رہے تھے آئیں با
کے؟“ ماہا بولی تھی تو فارحہ کو یاد آ گیا تھا۔

”ساہیہ کو فون کیا تو تھا کہ آئے اور پہن کر دیکھ لے۔ ابھی تک آئی نہیں۔ ماہا! ذرا نورا
اذہان، بچے! وقت نکال کر تم ساہیہ کو انجی منٹ کی کچھ شاپنگ ہی کروادو۔ ہم تو کر رہے ہیں

کار خیر میں کچھ حصہ لو تا کہ تمہیں بھی پتہ چلے یہ کام کچھ اتنا آسان نہیں ہے۔“ مئی نے کہا تھا
بہت عجیب سا بنا تھا۔ فیض چاچو ہنس دیئے تھے۔

”بھور کے لڈو کھانے جا رہے ہو میاں! خوش نصیب ہو۔ تمہیں تو واقعی خوشی خوشی ان کا
لینا چاہئے۔“

ماہا ابھی نمبر ملا ہی رہی تھی جب ساہیہ، اگینے اور عزیز کے ساتھ وہاں آگئی تھی۔

”لیجئے، جس کا تھا انتظار، وہ شاہکار آ گیا۔“ ماہانے ساہیہ کو دیکھ کر بھائی کی طرف آکر شرت
لگایا تھا۔ اذہان حسن بخاری، ساہیہ کی سمت بغور دیکھتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”ارے بھائی! آپ تو پورا کا پورا بازار اٹھا لائیں۔ اتنے زیورات ایک ساتھ۔
حیران رہ گئی تھی۔

”ارے یہ تو کچھ نہیں۔۔۔ میں تو ابھی پانچ سیٹ مزید رکھوا آئی ہوں۔ ساہیہ، اذہا
کر خود منتخب کرے گی۔“ فارحہ نے کہا تھا۔ عزیز، اذہان کے پاس آن بیٹھا تھا۔

”کیوں اذہان میاں! تیاریاں ٹھیک چل رہی ہیں؟“ اذہان مسکرا دیا تھا۔
”یار! اب تم تو بخش دو۔ دوست ہو میرے۔ تم سے تو کم از کم ایسی کوئی امید نہیں تھی؟“

دیا تھا۔
”بھول جاؤ سب کچھ۔۔۔ اس وقت میں تمہارا سسرالی ہوں اور بس۔“ ساہیہ زیورا

دیکھنے لگی تھی۔
”ماشاء اللہ، بہت خوبصورت لگ رہا ہے۔“ فارحہ نے بھر پور تعریف کی تھی۔

اگینے نے بھی تائید کی تھی۔

اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”چارے ہوتو واپسی میں کھانے کو کچھ لیتے آنا۔ بھائی! گھر میں کیا پکا ہے؟“ اگینے نے روز اور ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”عزیز! دو لارج بیڑا ٹھیک رہیں گے۔ ذرا جلدی آنا۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔“

”ارے، پہلے کیوں نہیں بتایا؟ کھانا تو شاید بن رہا ہے۔ چلو میں پہلے تمہارے لئے کچھ فارحہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ فیض چاچو پہلے ہی اٹھ کر چاچکے تھے اور اب اگینے کے جانے دونوں وہاں کمرے میں اکیلے رہ گئے تھے۔ ساہیہ نے کلائی میں ننگن گھماتے ہوئے اذہان کا ہاتھ جو اس لئے ایک خاص توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا پہلی بار دیکھا ہے؟“ ساہیہ ہوئے ننھے منے سے نیکی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ ارادہ اتارنے کا تھا۔ مگر اذہان حسن بخارا ہاتھ یکدم ہی تھام لیا تھا۔

”اوہوں، ابھی نہیں۔ رہنے دو، اچھا لگ رہا ہے۔“

”کیا اچھا لگ رہا ہے؟“ ساہیہ نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ اذہان مسکرا دیا تھا۔

”سب کچھ اچھا لگ رہا ہے۔ تم اچھی لگ رہی ہو۔ یہ لمحے اچھے لگ رہے ہیں۔ آئی ریلف لگی۔ اس گھر میں بہت اچھا موسم محسوس کر رہا ہوں اور وہ موسم خوشی کا ہے۔ آئی

یونہی ٹھہر جائے اور اس کے بعد کوئی اور موسم نہ آئے۔“ بہت سے جملے تھے مگر ان جملوں میں

بھی پرستی ساہیہ کے لئے نہ تھا۔ وہ کنسرن تھا، صرف اپنی فیملی کے لئے یا پھر اپنے گھر کے

لئے شاید نہیں۔ پتہ نہیں کیا سوچ کر کلائیوں میں موجود ننگن واپس اتارنے کو کلائی پر ہاتھ دھر

کسی دوسرے ہاتھ میں آگیا تھا۔ ساہیہ نے سراٹھا کر دیکھا تھا۔ اس وقت اس کا ہاتھ اذہان

کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے بغور توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

”ساہیہ! تم میرے لئے اہم ہو۔ سب سے زیادہ اہم۔ کیونکہ تم نے مجھے راز

خواب دیئے ہیں۔ مجھے زندگی کا حقیقی مفہوم دیا ہے، مجھے جینا سکھایا ہے۔ جب میں بہت انا

تب مجھے تمہاری مسکراہٹ نے بتایا کہ زندگی روشنی بھی ہے۔ تمہاری آنکھوں نے بتایا کہ

ہے۔ تمہارے ان ہاتھوں نے مجھے رنگ دیئے۔ میری بے جان زندگی کو ایک نئی زندگی

راہ چھوکی۔ مجھے تم اچھی لگتی ہو۔“ مدہم لہجے میں بولتے بولتے بہت آہستگی سے سراٹھا کر ایک

کی تھی۔

”ہاں۔ مجھے تم بہت اچھی لگتی ہو ساہیہ! اس لئے نہیں کہ تم مجھے کچھ دے رہی ہو

کہ تم میرے ساتھ ہو اور میں یہ ساتھ ہمیشہ چاہتا ہوں۔ تمام عمر کے لئے۔“ انداز بھر پور

تھا۔ ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”مجھے تمہاری طرف سے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے اذہان!۔ ہم تب

بہیں لفظوں کے مفہوم بھی معلوم نہ تھے۔ جب ہمیں خبر ہی نہ تھی کہ جذبات کیا ہوتے ہیں۔ ہم تب بھی

ب دوسرے کی اتنی ہی کیز کرتے تھے۔ تمہیں یاد ہو گا جب تم بچپن میں کھیلتے کھیلتے گر جاتے تھے تو

ماتج بھی تمہاری اس چوٹ کو اسی شدت سے محسوس کرتی ہوئی اس پر مرہم رکھتی تھی۔ حالانکہ تب ہمیں نہ

غلوں کے معنی پتہ تھے نہ جذبولں سے کوئی روشناسی تھی۔ اور اب تو.....“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر جانے

پل مسکرا دی تھی۔

”اذہان! ہمارے درمیان جو ہے وہ کچھ اور ہے جسے جتانے کی یا بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ

بت نہیں ہے۔“ مسکراتے ہوئے سرنفی میں ہلایا تھا۔ ”میں جانتی ہوں یہ بات اور تم بھی جانتے ہو۔ یہ

بت واقعی نہیں ہے۔ مگر جو ہے وہ بہت خاص ہے۔ درحقیقت ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ ہمیں ایک

سرے کا بھر پور احساس ہے اذہان! ہم ایک دوسرے کی ہر طرح سے کیز کرتے ہیں، خیال رکھتے ہیں،

رپور توجہ دیتے ہیں، ایک دوجے کے کہے بنا ایک دوجے کی پراہمزا جان لیتے ہیں، ایک دوجے کا مورال

جاتے ہیں۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں ساتھ دیتے ہیں۔ جب اتنا کچھ ہے تو کسی اور شے کی

رورت کہاں باقی رہتی ہے۔ جو ہمارے درمیان ہے اگر اسے نکال دیا جائے تو ہمارے رشتے میں باقی کیا

بچے گا؟ کبھی سوچا ہے تم نے؟“ گداز لب بہت ہولے سے مسکرائے تھے۔ اذہان حسن بخاری اسے بغور

متا رہا تھا۔ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے سرنفی میں ہلا دیا تھا۔

”شاید کچھ نہیں۔ محبت اگر نہیں ہے تو نہ سہی۔ مگر جو محبت نکال کر باقی بچ رہا ہے وہ زیادہ اہم ہے۔

یونکہ فقط محبت کے نکل جانے سے وہ فرق نمایاں نہیں ہو رہا جو فرق باقی سب نکال دینے سے پڑ رہا ہے۔

بات کی اہمیت کا اندازہ مجھے خوب ہے اذہان! اس لئے میں اصل میں ان کی قدر کرتی ہوں۔ جو نہیں

ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مگر جو ہے وہ اہم ترین ہے۔ یقین کرو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑ رہا۔ جو

رے درمیان نہیں ہے، میں تم سے وہ مانگ بھی نہیں رہی۔ ہم میں دوستی ہے، ایک انڈر اسٹینڈنگ ہے۔

کہے جب ہم ایک دوسرے کے دل کی بات جانتے ہیں تو پھر اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟“ ساہیہ

، لہجے کا ٹھہراؤ بتا رہا تھا، اس کے اندر کتنی طمانیت تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی شفاف رنگ تھے

کی کے بھی اندر کو ظاہر کر سکتے ہیں۔

اذہان حسن بخاری بہت ہولے سے مسکرایا تھا۔

”آئی ایم سوچ لگی ساہیہ! اگر تم میری زندگی میں نہیں آتیں تو شاید بہت بڑی کمی رہ جاتی۔“

”میں تو تمہاری زندگی میں ہمیشہ سے تھی اذہان! میں کیسے تمہارے ساتھ نہ ہوتی؟“ ساہیہ کے گداز

ل پر بہت دلکش مسکراہٹ اتری تھی۔

”لوگ بل دوپل کو ملتے ہیں، پھٹ جاتے ہیں۔ ہم تو بچپن سے ساتھ ساتھ ہیں۔ کچھ عرصے کو دور

رہ ہوئے تھے مگر اس عرصے میں بھی دل شاید دور نہ ہوئے تھے۔ ورنہ آج میں تمہیں اتنے اچھے انداز

سے جان نہ رہی ہوتی۔ نہ تم مجھے سمجھ رہے ہوتے۔“ ساہیہ کی آنکھیں واقعی بہت شفاف تھیں۔ اس لمحے بھی

ناٹس جو چمک تھی وہ واضح سمجھ میں آرہی تھی۔

”تم بہت اچھی ہو ساہیہ!“ اذہان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو آہستگی سے چھوا تھا۔ ساہیہ مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔

”اذہان! اگر میں تم سے درمیانی عرصے میں دور نہیں جاتی تو مجھے یقین ہے تم صرف مجھ سے مجبور گرفتار ہوتے۔“ گھنگنتی سی بات اذہان حسن بخاری کے لبوں پر مسکراہٹ لے آئی تھی۔

”جب تم چھوٹی تھیں تو اتنی خوبصورت نہیں تھیں نا۔ ورنہ شاید میں تب بھی صرف تمہی سے محبت کر ساہیہ نے اس کے شانے پر ایک ٹکا مارا تھا۔ اذہان مسکرا دیا تھا اور اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

”تب تم واقعی خوبصورت نہیں تھیں۔ ہر وقت ریس ریس، بہتی ناک، ہر وقت بے وجہ ضد، بڑا آفت زیادہ تھیں۔ اور اس وقت تمہاری ناک بھی کتنی چمٹی تھی نا۔“ شرارت سے اسے دیکھا تھا۔ ساہیہ مسکراتے ہوئے اسے گھورا تھا۔

”اذہان! میں تب بھی بہت اچھی تھی۔ ورنہ نہ تمہیں جھیلنا تب آسان تھا اور نہ اب۔ مگر یہ میرا آسان ہے۔ کیونکہ مجھے مشکل کام ہمیشہ اچھے لگتے ہیں۔“

”اور تمہیں میں بھی اچھا لگتا ہوں۔“ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

بچوں جیسی بے فائدہ باتیں کرتے ہوئے شاید کسی قدر اچھا لگا تھا۔ ”بڑا ہونا شاید بہت نقصان دینے والا ہے۔“

ساہیہ مسکرا دی تھی اور پھر سر جھکا کر اقرار کرتی ہوئی بولی تھی۔

”ہاں۔۔۔ مجھے تم بھی اچھے لگتے ہو۔ اپنی بہت سی باتوں کی طرح۔“ اذہان حسن بخاری تک خاموشی سے اس کی سمت دیکھتا رہا پھر مسکرا دیا تھا۔

بڑھتی ہوئی خاموشیاں

جاگتی راتیں، لمبے دن

آنکھوں میں کچھ خواب اور صبر۔۔۔

ہونٹوں پر آدھی بات۔۔۔

آدھی بات بھی اُجھی سی۔۔۔

اُجھی باتوں کے بھید نرالے

سمجھے کون، بتائے کون

اُجھاؤں میں رستے گم ہوں

دل سے دل تک

آئے کون؟

انا بیہ شاہ تیزی سے اپنا سامان الماری سے نکال کر پیک کر رہی تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا بات

وہم

مگر اس لمحے اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اور ہونٹوں پر چپ تھی۔ عرفان علی کہہ اندازہ لگانے میں ماہر نہیں تھا مگر جب وہ اندر داخل ہوا تھا تو پہلی فرصت میں اس کے متحرک وجود کو مانتے ہوئے اس کے ہاتھ میں تمہا سامان پکڑا تھا اور بیڈ پر اچھا لیا تھا۔

”یہ کر کیا رہی ہو تم؟“ ڈپٹے ہوئے دریافت کیا تھا۔ مگر انا بیہ شاہ نے کوئی جواب دیے بغیر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرانا چاہا تھا۔

”لیوی۔۔۔“

مگر عرفان علی خان نے جیسے سنی ان سنی کر دی تھی۔

”آئی سیڈ، لیوی!“ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ انداز درشت تھا۔ مگر عرفان علی خان نے اس کے حکم پر کوئی عمل نہیں کیا تھا۔ اسی جارحانہ گرفت میں اسے تمام کر پہلے سے کچھ زیادہ قریب کر لیا تھا۔

قدام ایسا تھا کہ انا بیہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ایک خاص چمک ہو رہی تھی۔ اتنے دن کی لائقیت کے بعد یہ استحقاق عجیب تھا۔ جبکہ انا بیہ اس کی سمت سے ایسی کوئی توقع سرے سے کر ہی نہیں مانتی تھی۔ قبل از وقت کوئی حکمت عملی مرتب نہیں کی تھی۔ اس لمحے کی حیرت قابل دید تھی۔ نظریں خود بخود لٹی چلی گئی تھیں۔

”تم کیا سمجھتی ہو انا بیہ! میرے تم سے لائق رہنے میں تمہاری طرف سے کوئی قدغن ہے؟ یا میں صرف تک آنے کی کوئی سستی اس لئے نہیں کر پارہا ہوں کہ مجھے تم سے کوئی خوف لاحق ہے؟“ اس کا جھکا چہرہ مار کر بخورد دیکھتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

”انا بیہ! تم اندازے لگانے میں ماہر ہو۔ مگر ہر بار ہر انداز اکیورٹ رزلٹ دے، یہ ضروری نہیں۔ تم بھڑھ رہی تھیں اگر میں تم سے اس وقت بھی لائق رہوں گا تو ایسا نہیں ہوگا۔ آئی دل ٹیک ٹوکس۔ میں اس درتھال کو بس میں ضرور کر لوں گا انا بیہ! کیونکہ اگر اب بس میں نہ کیا تو شاید ہر شے پہلے سے زیادہ غیر ظم ہو جائے گی۔“ انداز جتانے والا تھا۔ انا بیہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی وہ کس بابت بات کر رہا تھا۔ شاید اسی لئے وہ اس کی طرف اس قدر حیرت سے دیکھتے ہوئے صورت حال کا اندازہ لگانا چاہ رہی تھی۔

”تم سمجھ رہی ہونا۔ میں تمہیں جانے دوں گا اور تم اب تک جو من مانی کرنی آئی ہو اب بھی کر سکو گی تو غلط ہے۔ جب تمہیں میری خوشیوں کی پرواہ نہیں ہے تو مجھے بھی تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہے۔ میری ریف سے اب تم نہ تو کسی رعایت کی امید رکھنا نہ ہی کسی ستائش کی۔ اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں جانے لے گا کہ تم جا کر اپنی زندگی اپنی پسند اور منتخب انداز میں گزار سکو تو ایسا بالکل نہیں ہوگا۔ جب میں اس زندگی کو ایک سمجھوتے کی طرح گزار رہا ہوں تو تمہیں بھی یہ سمجھوتہ اسی طور بھانا ہوگا۔ اس سمجھوتے میں نفع و نقصان برابر کا ہوگا۔ اگر میرا نقصان تو تمہارا بھی اتنا ہی نقصان۔ رائٹ؟“ دو ٹوک لہجے میں کہتا ہوا وہ اس لمحے کی قدر سفاک لگا تھا۔ کہیں سے بھی وہ پہلے والا محبت کرنے والا نہیں لگ رہا تھا یہ تیور ان تیوروں سے کتنے مختلف تھے۔ انا بیہ اسے سر اٹھائے کھڑی حیرت سے دیکھ رہی تھی اور وہ جیسے اس کی سوچوں کو مٹتے ہوئے بولا تھا۔

”تم کیوں سمجھتی ہو کہ تمہارے ہر رویے کے جواب میں مجھے پہلے جیسا ہی رہنا چاہئے؟“

پتھر پھینکو تو مجھے تمہاری طرف پھول پھینکنا چاہئے؟ میری محبت اور رعایت کی عادی ہو چکی ہو تم تمہیں یہ جتنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ وہ دور خواب ہوا جب عرفنان علی خان طرح صرف تمہارے نام کی بالا چا کرتا تھا اور دن رات خواب دیکھا کرتا تھا۔ میری نیند ٹوٹ چکا میں بیدار ہو چکا ہوں۔ مکمل طور پر۔ اب نہ تو نیند باقی ہے نہ ہی وہ پہلا سا شمار۔ میری آنکھیں کھل چکی ہیں اور ہر شے مجھے صاف صاف دکھائی دے رہی ہے۔ میں تمہیں چھوڑ دوں، یہی تم؟ تاکہ تم جا کر اس شخص کے ساتھ سہانے خواب دیکھ سکو جس سے تم محبت کرتی ہو۔ اوں ہوں، خان اب اتنا پاگل نہیں رہا اب یہ شاہ! اب یہ دل اس طور تمہارا بیمار نہیں رہا۔ اب نہ تو میں دیوانہ دور بند کر کے تمہارے لب و رخسار کی تعریف کر سکتا ہوں نہ کیسو اور پلکوں کی چلن کے لئے زمین و آسمان قلابے ملا سکتا ہوں۔ مگر میں ایک کام کر سکتا ہوں۔ تمہیں اس رشتے کی حقیقت سمجھا سکتا ہوں۔ میرا حق بنتا ہے، وہ بتا سکتا ہوں اور.....“ بات ادھوری چھوڑ کر بہت آہستگی سے نفی میں سر ہلایا تھا اور

تھا۔ چہرہ اس کے چہرے کے قدرے قریب کیا تھا۔

”تم نے ایک بار ٹھیک کہا تھا کہ میں تمہیں صرف پانا چاہتا تھا۔ صرف جسمانی طور پر چاہتا تھا تو اب ذہنی طور پر اس کی تیاری کر لو۔ میں اپنا یہ حق وصولنا چاہتا ہوں۔ تمہیں پانا اب بہت ہو گیا ہے۔ از حد ضروری۔“ اس کے ساکت چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے مسکرا کر بہت آہستگی سے پتھر اور پلٹ کر باہر نکل گیا تھا۔

انا یہ شاہ کے قدموں تلے سے جیسے زمین سرک گئی تھی۔ وہ چلنا ہوا فقط گیا نہیں تھا، ساتھ ہو سکون بھی سنگ لے گیا تھا۔

دھک۔۔۔۔۔ دھک۔۔۔۔۔ دھک!

دل کے دھڑکنے کی صدا شاید کہیں قریب سے ہی آرہی تھی۔ یہ شور بہت دور نہیں تھا۔

یہ ہنگامہ کہیں آس پاس ہی ہوا تھا۔

یہ طوفان زیادہ فاصلے پر تو نہ تھا۔ شاید کہیں اندر ہی اٹھا تھا۔ وجود کے سارے علاقے میں جواہر بلا جواز نہ تھی۔ یہ جواہر بائیں آگ سی جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی یہ سچ ہی تھا۔ الاؤ پورے علاقے چکا تھا۔ راستے اگر بند نظر آ رہے تھے تو یہ نظروں کا دھوکا نہ تھا۔ جاں واقعی مشکل میں گھر چکی تھی۔ وہ کسی بت کی طرح وہیں بیڈ پر گرنے والے انداز میں بیٹھی تھی۔ وجود اب بھی پتھر سا تھا اور کسی سکتے سے گویا پتھرائی ہوئی سی تھیں۔

دھڑکنوں کی رفتار کتنی تیز تھی۔ دل جیسے کان پھاڑ کر باہر آنے کو تھا۔ عرفنان علی خان کہہ گیا تھا واقعی بے بس تھی؟۔۔۔ دھڑکنوں کا ارتعاش اگر خوف کے پیش نظر تھا تو وہ اس خوف سے کیسے سکتی تھی؟

ذہن اس قدر مفلوج تھا کہ نہ تو کوئی سوچ ذہن میں تھی نہ ہی دوجی کوئی بات!

گویا عرفنان علی خان ایک پل میں اس کے لئے کھلے ہوئے تمام راستے بند کر گیا تھا۔ وجود کے رے علاقے کو جنگل بنا کر عجیب ایک الاؤ دکھایا تھا اور پل میں تپش جھلسانے کو تھی۔ کتنا مختلف سمجھتی تھی عرفنان علی خان کو۔ شاید کسی قدر فائدہ بھی اٹھایا تھا اس کی رعایتوں سے۔ مگر اب وہ کیسا سفاک نظر آ رہا کیا کر سکتی تھی، سوچ سوچ کر تھک گئی تھی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ عرفنان علی خان اسے واقعی مشکل سے دوچار کر گیا تھا۔ سارا سکون غارت کر گیا تھا اور خودہ یقیناً اسی قدر اطمینان میں تھ۔ سکون میں تھا۔

کتنے دنوں بعد وہ سیٹی سے ملی تھی۔ کتنی دیر تک بنا کچھ کہے اس کے شانے پر سر رکھ کر روتی رہی تھی۔ سیٹی نے اس سے کچھ دریافت نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اس کے کہے بغیر جانتا تھا کہ اس کے دل میں کیا کیا ہے۔ اسے لفظوں میں کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سیٹی واقعی اس کا ایک اچھا دوست تھا۔ سبھی تو وہ اس لئے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے چھیڑتا ہوا مسکرایا تھا۔

”ساری شرٹ خراب کر دی۔ اماں دھوئیں گی تو پھر باتیں سنائیں گی۔ ایریل کا خرچ ڈبل کروادو گی تم ذہ سارے پیسے میری جیب سے نکلیں گے۔“ اپنے سفید جیکے ہوئے شانے کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر اپنا رومال اس کے ہاتھ پر رکھا تھا۔

”لو۔۔۔۔۔ اب ناک بھی پونچھ لو۔ یا وہ بھی اسی شرٹ کی آستین سے صاف کر دو گی؟“ جیلے میں شگفتگی تھی اور وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

”تم نے انکل کو کیوں آنے سے روک دیا؟۔۔۔ تمہیں نہیں آنے دینا چاہئے تھا۔ مجھے لگتا ہے اس سب کچھ میں جو ہو رہا ہے، گین سے زیادہ غلطی ان لوگوں کی ہے۔ نہ وہ تمہیں اس طرح بے یار و مددگار اس کے حوالے کرتے نہ وہ اس طرح تمہیں ہرٹ کرنے کی کوشش کرتا۔ تم اگر آئیڈیز ہو رہی ہو تو صرف اپنے بیڑس کی غلطی کے باعث۔“ سیٹی نے کہا تھا اور وہ سر جھکا کر رہ گئی تھی۔

”سیٹی! میں نہیں جانتی کہ قصور وار کون ہے۔ مگر میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ میرا بہت نقصان ہو رہا ہے اور اس نقصان کا کوئی ازالہ نہیں ہے۔“

”تم نے اس شخص کی بات مانی کیوں؟۔۔۔ جب انکل نے کہا تھا کہ وہ آ رہے ہیں تو تم نے پھر فون کر کے انہیں منع کیوں کر دیا؟۔۔۔ تم اس قدر ڈرتی ہو اس شخص سے؟ اس قدر سوار ہے وہ تمہارے حواسوں پر؟“ سیٹی ڈپٹ رہا تھا۔

”میں خود نہیں جانتی سیٹی! کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟۔۔۔ میں اسے کوئی طمانیت یا خوشی دینا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ مگر اس شام پایا سے بات ہوئی تو میں اس شخص کے حسب نشاء کر گزری۔ پتہ نہیں کیوں؟“ انداز میں ایک پچھتاوا تھا اور سیٹی نے اسے بغور دیکھا تھا۔

”کیوں؟۔۔۔ کیوں کیا تم نے ایسا؟۔۔۔ کہیں محبت تو نہیں ہوگی تمہیں اس شخص سے؟“ میرب سیال نے چونکتے ہوئے سر اٹھایا تھا۔ سیٹی کے لبوں پر بہت شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔ میرب نے ہاتھ کانکا بنا کر اسے دے مارا تھا۔ سیٹی ہنس دیا تھا۔

نذر ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ کچھ نہ کہہ کر، کچھ نہ بتا کر بھی اسے بہت راحت ملی تھی۔
 ”سینی! شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ بعض اوقات اپنے ہاتھوں سے دی گئی رعایتیں بہت تکلیف دیتی
 ہیں۔ مگر وہ رعایتیں اس وقت کی ضرورت ہوتی ہیں سینی! میرے پاس بھی کوئی اور راستہ نہیں تھا۔“ کسی
 نذر تاسف سے کہہ کر وہ سر جھکا گئی تھی۔

سینی نے مسکراتے ہوئے اس کی ہمت بندھائی تھی۔
 ”کم آن یارا! انسان ہی ہے نا، اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کم از کم جتنی دیر یہاں ہوا اتنی
 دیر تو بے خوف محسوس کرو۔ ویسے تم اس سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟ دیکھنے میں وہ اتنا خوفناک دکھائی تو
 نہیں دیتا۔“ اس کا موڈ تبدیل کرنے کو وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔

”سینی! کسی کے خوفزدہ کر دینے کے لئے صرف ظاہری طور پر خوفناک ہونا ضروری نہیں ہے۔“

”میں بتانا ہوں تمہیں۔ تمہارا یہ خوف ختم ہو سکتا ہے۔ تم ایک کام کرو۔“

”کیا؟“ میرب چونکی تھی۔

”تم اس شخص سے محبت کرنا شروع کر دو۔“ سینی کا قہقہہ فطری تھا۔ میرب مسکرا دی تھی۔ پھر سر جھکائی
 ہوئی آہستگی سے بولی تھی۔

”اس سے محبت ممکن نہیں ہے سینی! جو شخص کسی سے محبت نہیں کرتا اس سے کوئی دوسرا محبت کیسے
 کر سکتا ہے؟ وہ محبت جیسے لفظ کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں۔ دل، جذبات، احساسات، اس کے نزدیک

سب فضول کی چیزیں ہیں۔ وہ صرف اصولوں سے بنا ہے۔ بلا کا خود پرست ہے، خود پسند ہے۔ اسے
 صرف وہ اچھا لگتا ہے جو اسے پسند ہے۔ دوسروں کی پسند، ناپسند کیا ہے یہ جاننے کی کبھی اس نے کوشش

نا نہیں کی۔ اسے دوسروں کو جاننے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ دوسرے اس کی پرواہ
 کریں۔ اسے خوش کرنے کے جتن کریں۔ وہ صرف دکھنا الا ڈ ہے جو صرف جھلانا جانتا ہے۔ جو اس کے

ریب جاتا ہے، اسے چھوئے کی کوشش کرتا ہے وہ خاک بن جاتا ہے۔ وہ نہ سمجھ میں آنے والا معمر ہے۔
 سے سمجھے والا سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے خود الجھ کر رہ جاتا ہے۔ وہ بہت عجیب ہے سینی! اتنا عجیب کہ اپنی

ہندیدہ چیزوں کو خود آپ رک پہنچاتا ہے۔ حاسد ہے بلا کا۔ ہواؤں سے بھی بھر ہے اُسے۔ اپنی شے کے
 تعلق اتنا تسرن ہے کہ پرایا سایہ بھی برداشت نہیں اور خود اپنے لئے اس کے قانون قاعدے سب بہت

شکاف ہیں۔ وہ سمجھتا ہے جینے کے راستے صرف اس کے پاس ہیں۔ باقی سب فضول ہے۔ مجھے وہ اس دنیا
 کا شخص لگتا ہی نہیں۔“ میرب کا لہجہ دھیما تھا۔

سینی مسکرا دیا تھا۔

”تم نے سر کو دیکھا ہے؟“

”تم سردار بیکینگین حیدر لغاری کے اقدامات کو سراہ رہے ہو؟ اُسے داد دے رہے ہو؟“ میرب
 سیال کو کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔

”نہیں۔“ سینی مسکرا دیا تھا۔ ”ایک بہت پرانی روسی کہانی ہے۔ سن لو، شاید کچھ کام کی شے ہاتھ لگ

”بھی اتنی تابعداری تو صرف محبت میں ہی ممکن ہے۔ تاریخ بھی گواہ ہے۔ ایک بار کا ذکر ہے۔
 سوہنی نے حضرت مینوال سے پھلی کھانے کی فرمائش کر دی۔ بے چارے حضرت مینوال سارا د

کوٹنگ کے لئے کاٹا لگائے بیٹھے رہے مگر قسمت بری تھی جو ایک پھلی بھی کانٹے میں نہ پھنسی۔ مگر
 نہ کرتا۔ کچھ محبت تھی کچھ مجبوری۔ سو حضرت مینوال نے تن وار دیا اور اپنی ران کا گوشت نکال کر

بی بی سوہنی کو نوش کرنے کے لئے پیش کر دیا۔ تو محبت تو ایسی ایسی کرشمہ سازیاں بھی دکھاتی ہے۔ ا
 دور میں کسی نے ایسا کیا ہوتا تو سرجیکلی بہت سی مشکلات درپیش آسکتی تھیں۔ اینٹی سپٹک ہو

خدا خواستہ حضرت مینوال اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو سکتے تھے۔ مگر کیا سہانا دور تھا کہ محبت کے ساتھ
 ہر شے بھی خالص اور پوری تھی۔ بالکل ماں کے پیار کی طرح۔“

سینی کی یہی بات اچھی تھی۔ وہ برے سے برے موڈ کو بھی لمحوں میں اچھا کرنا جانتا تھا۔ میرب
 جو چند لمبے قبل دھواں دھار رو رہی تھی اب کھل کر مسکرا رہی تھی۔

”ماں کا پیار تو اب بھی اتنا ہی خالص ہے ڈفر! ہاں، باقی محبتوں کی کوئی گارنٹی نہیں۔ جانے کون
 کہاں نظر بدل جائے یا راہ بدل جائے۔ آج کے دور میں اجنبی ہوتے دیر نہیں لگتی۔ محبت کا لفظ مترا

جا رہا ہے۔ بلکہ کسی قدر نایاب۔ مجھے یقین ہے اگلے کچھ دنوں میں یہ بالکل ناپید ہو جائے گا اور
 کوئی کوئیس بھی دریافت نہیں کر سکے گا۔ گمشدہ چیزیں کبھی کبھی بالکل واپس نہیں ملتیں۔“ میرب سیال

کارنگ غالب آنے لگا تھا۔ سینی ہنس دیا تھا۔
 ”دیش لائک اے گڈ گرل۔ لائک اے مائے فرینڈ۔ دنیا کو مارو گولی۔ ورنہ دنیا آپ کو جینے نہ

گی۔ جس کو جتنی ایمپورٹنس ملتی ہے وہ آپ کے لئے اتنا ہی بڑا خطرہ بنتا ہے۔ دوسرے معنوں کا
 اسے ایمپورٹنس نہیں خود کو رزک پہنچانے کا سرٹیفکیٹ جاری کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ کا دل ایک ا

ہے سو اس کی ایڈامن اور ڈین کو اس بات کا تعین آنکھیں کھول کر کر لینا چاہئے کہ کسی یہ مراعات دے
 اور کسے نہیں۔ کوئی اس اہلیت کے قابل ہے بھی یا نہیں۔ بعض اوقات بہت سے نامعقول اس ر

فائدہ اٹھا جاتے ہیں۔ کیونکہ دل کی ایڈامن بہت نرم واقع ہوئی ہے۔ مگر اب وقت آ گیا ہے کہ
 آنکھیں کھولے اور اپنے قاعدے قانون بدلے اور ایسے تمام دھوکے بازوں سے ہوشیار رہتے

”نواٹری“ کا بورڈ لگا دے۔ تم دل کی انتظامیہ کی اور ہو میرب! اپنے دل کے قاعدے قانون بنا۔
 رکھتی ہو تم۔ اپنا یہ حق استعمال کرو۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کو لاگو کر کے نقصان سے بچا جاسکتا ہے۔

رونے دھونے اور واویلا کرنے سے بہتر نہیں کہ پہلے اپنا قبیلہ کعبہ کو ہی دسترس میں رکھا جائے۔ ا
 سے شکایت کرنے کی بجائے دوسروں کو شکایت کا موقع فراہم ہی نہ کیا جائے۔“ مسکراتے ہو۔

انداز ہلکا پھلکا تھا۔ مگر بظاہر ان مذاق کی کئی باتوں میں بہت سے سوچ کے پہلو نکلتے تھے۔ سینی کی
 بات تھی۔ وہ ایک ایسا دوست تھا جو نہ اسے اس کی غلطیوں پر ڈپٹا تھا، نہ ناصح بن کر بھاری نقل

تھا۔ مگر وہ ہنستے ہنستے ایسی باتیں کہہ جاتا تھا جو ”Key“ کا درجہ رکھتی تھیں۔ ایسی Keys جو بہت
 تالوں کو بڑے آرام سے کھول سکتی تھیں۔ میرب سیال کا دل جو چند لمبے پہلے تک بہت بو جھل تھا،

بتگین اس جنگلی شیر سے بھی بڑا جنگلی ہے؟“ اس نے میرب کا چہرہ اوپر اٹھا کر مسکراتے ہوئے
نت کیا تھا مگر میرب مسکرائی نہیں سکتی تھی۔

جی شریل وہاں آ گیا تھا۔

”میرب! کوئی تمہیں لینے آیا ہے۔“

”کون؟“ میرب چونکی تھی۔ مڑ کر دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا تھا۔ قدرے فاصلے پر دروازے کے
پچ سردار بتگین حیدر لغاری کھڑا تھا۔

”لو۔ تمہارے حضرت شیر آگئے۔“ سینٹی نے مسکراتے ہوئے جھک کر مدھم سی سرگوشی کی تھی مگر
بتگین حیدر لغاری کے قریب جا کر کئی تھی۔ سردار بتگین حیدر لغاری نے اسے بغور دیکھا تھا۔

”چلیں؟“ توجہ قابل دید تھی۔ میرب کو جانے کیوں لگ رہا تھا کہ وہ شخص کافی دیر سے یہاں موجود تھا
راہیں بہت حد تک سن چکا تھا یا شاید بالکل بھی نہیں۔

میرب سیال نے سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔
”میں نانو سے مل کر آتی ہوں۔“ میرب اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئی تھی۔ سردار بتگین
حیدر لغاری نے بہ خور اس کی پشت کو دیکھا تھا۔



تم اس درد سے گزر رہے ہونا؟

وہ شب جس میں جل جاتی ہیں آنکھیں

تم پر بھی گزری ہے

وہ شب جو مہتاب سے بچے

آنسو آنسو، شبنم شبنم وہ شب

مجھ پر بھی اتری ہے

وہ دن جب گھڑیاں سو جائیں

لمبے پتھر کے ہو جائیں

وہ دن تم نے بھی کاٹا ہے

دونوں کے جسموں، روجوں میں

یکساں دکھ کا شاننا ہے

پھر کیوں مجھ سے پوچھتے ہو تم؟

سایہ بہت خاموش سی بیٹھی تھی۔ آنکھوں سے بہت چپکے چپکے آنسو ٹوٹ کر بنے وقعت ہو رہے تھے۔
لینے چلتی ہوئی اس کے پاس آن بیٹھی تھی۔ سایہ نہیں چاہتی تھی اس کے اندر کی خبر کسی کو ہو مگر یہ لمحہ تھا
اب کیلئے اس کے راز سے واقفیت حاصل کر چکی تھی۔ سایہ کسی قدر شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ نظریں اٹھائے

جائے۔ ایک خاتون تھی۔ بے حد خوبصورت، دل فریب، شائستہ، تہذیب یافتہ، بالکل تمہاری طرح
ہر بیٹھتا ہے تہذیب، اکھڑ، بالکل جنگلی، بالکل تمہارے میاں کی طرح۔ وانف اپنے اس ہر بیٹھنے سے

پریشان تھی۔ قریب ہی ایک جنگل میں ایک بہت پچھا ہوا عظیم بزرگ رہتا تھا۔ اس کی شہرت دور
تھی وانف کو بھی خبر تھی۔ وہ اپنے ہر بیٹھنے کو سدھارنے کی کوشش میں اس کے پاس جا پہنچی۔ بابا نے

رودادسی اور بہت سوچ بچار کے بعد حل تجویز کیا کہ اس کا علاج صرف ایک شیر کے بال سے ممکن
ہاں بھی مونچھوں کا۔ اب مونچھ کا بال حاصل کرنا آسان نہیں، وہ بھی حضرت شیر کا۔ خاتون کچھ پر

ہوئی مگر بابا کا حکم تھا کہ جب تک شیر کا بال نہیں آ جاتا، علاج ممکن ہی نہیں۔ وہ خاتون جائے اور
مونچھ کا وہ بال لے آئے۔ ساتھ ہی بابا نے یہ بھی بتا دیا کہ قریب ہی جنگل میں خاتون کو ایسا کوئی شیر
سکتا ہے۔ خاتون پریشان تو ہوئی مگر اٹھ کر گھر چلی آئی۔ بہت سوچ بچار کے بعد بابا کی بات ماننے

ٹھانی۔ اپنے ہاتھوں سے شیر کے لئے طعام تیار کیا اور جنگل کی راہ لی۔ شیر کے قریب جانا بہت مشکل
دوسرے معنوں میں اپنی موت کو خود دعوت دینا تھا۔ مگر خاتون اپنے شوہر کو سدھارنے کے لئے کچھ بھی

سکتی تھی۔ سو پہلے تو شیر کو دور بیٹھا دیکھ کر کسی قدر خوفزدہ ہوئی۔ قدم ٹھک کر رک گئے۔ مگر پھر جی کڑا کر
قدم آگے بڑھائے اور قدرے فاصلے پر طعام رکھ کر تیزی سے مڑی اور کسی قدر فاصلے پر محفوظ مقام
رک گیا جہاں سے وہ شیر کی حرکات و سکنات جانچ سکتی۔ حضرت شیر اٹھے اور اس طعام تک گئے جو خاتون

اپنے ہاتھوں سے ان کے لئے تیار کیا تھا۔ سوگھا اور پھر بیٹھ کر کھانے میں مصروف ہو گئے۔ خاتون
ڈھارس بندھ گئی۔ دوسرے روز پھر یہی ہوا۔ تیسرے روز بھی اور پھر اس سے اگلے روز بھی۔ خاتون ہر

کھانا لاکر کھتی رہی اور اس کے ساتھ ہی ہر قدم خود بھی آگے بڑھتی رہی۔ یعنی ہر نئے دن کے ساتھ
بھر ایک اور قدم آگے بڑھتا رہا۔ شیر اسے دیکھ کر نہ تو دھاڑتا، نہ اس کی طرف کوئی پیش قدمی کرتا۔ نگاہ
میں سختی کی جگہ نرمی ہوتی اور خاتون خوف کھانے کی بجائے ٹڈر ہو کر اس کے پاس بیٹھ کر اسے اپنے ہاتھ

سے کھانا کھلانے لگی۔ ساتھ ہی اسے محبت سے سہلاتی اور باتیں بھی کرتی۔ اور ایک دن وہ اس قابل
کہ باتوں ہی باتوں میں محبت سے اسے سہلاتے ہوئے حضرت شیر کی مونچھ کا بال ان کی اجازت
حاصل کر لیا اور فوراً بابا کی طرف رخ کیا۔ بابا خاتون کی اس ہمت اور دلیری کے قائل ہو گئے۔ بال
میں لیا تو گویا یقین نہ ہوا۔ مسکراتے ہوئے خاتون کو بھر پور داد دی۔

خاتون نے دریافت کیا۔ بابا! کیا اب میرے شوہر راہ راست پر آ جائیں گے؟ تو بابا مسکراتے ہو
بولے۔ کیوں نہیں۔ جب تم اتنا مشکل اور ناممکن کام کر سکتی ہو تو یہ کام کیسے ممکن نہیں ہو سکتا؟ تم نے

دونوں میں انتہائی خونخوار جانور کو اپنی توجہ اور محبت سے سنوارا اور سدھار لیا اور اس کی مونچھ کا بال حاصل
کر لیا۔ وہ جانور جس سے لوگ کوسوں دور سے ہی خوف کھاتے ہیں، تم نے اسے بخوشی اس کام کے لئے آ
کر لیا تو پھر تم اپنے شوہر کو کیسے نہیں سوار سکتی ہو؟ اسے بھی اسی توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔ تم اسے
محبت سے سنوار سکتی ہو۔ ایسا بابا نے کہا۔ میرب! میں بھی تمہیں یہ مشورہ دوں گا۔ تم ایسا کر سکتی ہو میرب
تمہیں اسے وہ کبیر دینا ہوگی، وہ توجہ دینا ہوگی۔ محبت سے جانور بھی سدھر سکتا ہے تو پھر انسان کیوں نہ

بغیر چہرے کا رخ پھیرا تھا اور ہاتھ اٹھا کر آنکھیں رگڑ ڈالی تھیں۔ اگینے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔
نہ فوری طور پر کچھ پوچھا تھا نہ کچھ کہا تھا۔ ساہیہ کمزوری کے ان لمحوں کا ادراک کسی کو دینا نہیں چاہتی تھی
اس لمحے وہ بے نقاب تھی اور پردہ سارے بھید چاک کر گیا تھا۔

”ساہیہ! تم خوش نہیں ہو نا؟“ اگینے نے بہت آہستگی سے دریافت کیا تھا۔ ساہیہ کچھ نہیں بولی
چپ چاپ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی تھی۔ اگینے نے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو محبت سے اپنے ہاتھ
میں لیا تھا۔

”ساہیہ! بچے ایہ کیوں؟ کس لئے؟ اگر تم خوش نہیں ہو تو.....“
ساہیہ نے بنا ان کی طرف دیکھے انکار میں سر ہلایا تھا۔
”نہیں۔۔۔ میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔“

اگینے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔
”خوش ایسے ہوتے ہیں؟“ انداز سوالیہ تھا۔
ساہیہ غالباً انہیں مطمئن کرنے کو مسکرا دی تھی۔

”پھوہو! آپ تو بس۔ آئی ایم ویری پی۔ میری زندگی میں ایسا کوئی جواز نہیں ہے جو..... ناخوش
سکے۔“

”تم یہ بات اب مجھ سے بھی چھپاؤ گی؟“ اگینے جیسے اسے سطر سطر پڑھ رہی تھی۔ ساہیہ سر جھکائے
رہی تھی۔ اگینے نے اسے تھام کر ساتھ لگا لیا تھا۔

”ساہیہ! جس کام کو کر کے آپ کا اندر مطمئن نہ ہو اسے کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ رشتوار
رشتوں کی طرح بنانا اور نباہنا چاہئے۔ انہیں بوجھ نہیں بنانا چاہئے۔ جو تعلقات بوجھ بن جاتے ہیں
انسان کو تھکا دیتے ہیں اور یہ ٹھکن بہت بری ہوتی ہے۔ میں جانتی ہوں تم بہت سمجھ دار ہو۔“ اسے خود
الگ کر کے اس کی آنکھوں کو پونچھا تھا۔

”تمہیں زندگی کا ادراک ہم سے زیادہ ہے۔ اسی لئے بھائی نے، بھابی نے اور ہم سب نے یہ فی
تمہارے سر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب بھی اگر تمہیں لگتا ہے کہ تم نے کوئی غلط قدم غلط سمت میں اٹھالیا ہے
ایسا کر کے خوش نہیں ہو تو تم اپنا وہ قدم واپس لے سکتی ہو۔ ابھی دیر نہیں ہوئی ہے۔“ بدھم لہجے میں۔

”میں نے دیکھا تھا۔ ساہیہ نے سرنئی میں ہلا دیا تھا۔
”نہیں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں واقعی بہت خوش ہوں۔ میں اس سے پہلے کبھی اتنی مطمئن نہ
تھی۔“ جھکا ہوا سر بہت سے بھید بنا کہے بتا رہا تھا۔
اگینے گہری سانس لے کر رہ گئی تھی۔

”ساہیہ! جب کوئی خوش اور مطمئن ہوتا ہے نا، اسے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مجھے لگتا ہے تم یہ فی
صرف اس لئے کر رہی ہو کہ اس سے اذہان حسن بخاری کو کچھ مثبت نتائج مل سکیں۔“
”نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔“ ساہیہ نے سرنئی میں ہلایا تھا۔

”کیا ہوا؟“ یہ تم دونوں اس طرح سر جوڑے کیوں بیٹھی ہو؟ اور ساہیہ! تم۔۔۔ تمہاری

”ایسا ہی ہے۔ ایسا ہی ہے ساہیہ! تم ایسا اس لئے کر رہی ہو کہ تم اذہان حسن بخاری کی بہترین
مت ہو۔ تم جانتی ہو وہ تم سے محبت نہیں کرتا۔ اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ تم اس سے کتنی شدید محبت کرتی
ہو۔“ ایک لمحے میں اگینے نے اسے بتایا تھا۔ ساہیہ ساکت سی تکتی رہ گئی تھی جب اگینے اس کا شانہ تھام کر
تھی۔

”ساہیہ! محبت کی ایک عادت بہت بری ہوتی ہے۔ کسی قدر خود غرض ہوتی ہے۔ یہ جتنا دیتی ہے
ب میں اتنا ہی ٹرن بھی مانگتی ہے۔ اور جب ایسا جوابا نہیں ہوتا تو بہت دکھ ہوتا ہے۔“

”نہیں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں اذہان سے کچھ بھی ری ٹرن نہیں چاہتی۔ میری نظر میں محبت
ف دینے والا ہاتھ ہے۔ پھیلا ہوا ہاتھ نہیں۔ محبت صرف نوازنا جانتی ہے۔ صرف دینا اور دینا جانتی ہے،
نہیں۔ واپسی کی امید نہیں رکھتی محبت۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ اذہان کی زندگی میں کون تھا۔
کے محبت کرتا تھا۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ میں اذہان سے بہت محبت کرتی ہوں۔ مجھے وہ اچھا لگتا
ہے۔ اس کے دکھ سکھ، سب مجھے اپنے لگتے ہیں۔ میں اسے خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں اگر اس
لئے کوئی زبردستی کا بوجھ ہوتی تو شاید میں بھی اس کی زندگی میں شامل نہ ہوتی۔ مگر اس کی زندگی میں اگر
ہوں تو صرف اس لئے کہ وہ میرا ساتھ چاہتا ہے۔ اسے میری ضرورت ہے۔“

”اسے تمہاری ضرورت ہے تو کیا تمہیں اس کی ضرورت نہیں؟“ ساہیہ! کبھی سوچا ہے تم نے، تم
بہت سے خانوں میں بٹے ہوئے شخص کے ساتھ کیسے چوگی؟ تمہاری یہ حالت، یہ آنسو۔ ایمانداری
ہے بناؤ ساہیہ! کیا تم نہیں جانتی ہو کہ وہ بھی تمہیں اسی طرح چاہے، تمہاری خواہش اسی طرح محسوس
رے؟ مان لو، یہ ٹھیک ہے، مان لو تم کچھ غلط نہیں کر رہی ہو اور مان لو یہ کوئی خود غرضی بھی نہیں ہے۔ تو کیا
بھی تم سوچتی ہو کہ تم جو کر رہی ہو وہ ٹھیک ہے۔“ اگینے نہیں چاہتی تھی جو خلا اس کی زندگی میں آیا دیا
کی خلا ساہیہ کی زندگی میں بھی آتا۔ وہ متشکری اسے دیکھتے ہوئے کسی سد باب کے متعلق سوچ رہی تھی
ب ساہیہ بولی تھی۔

”میں نے محبت کو دیکھا ہے۔ میں جانتی ہوں محبت کیا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے میں نے
۔۔۔ یہ اپنے سارے سد باب خود کرتی ہے۔ اپنے تمام خدشوں کا تدارک آپ کرتی ہے۔ اس کے درد کا
اسکی پاس ہے۔ اپنے ازالے یہ آپ کرتی ہے۔ یہ خلاؤں کو بھرتی ہے پھوہو! خلا پیدا نہیں کرتی۔
نا امید ہے یہ، میرا ایمان بھی یہی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ میں جو کر رہی ہوں وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔
ہمتان کی پروا نہیں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں محبت کا خسارہ بھی خسارہ نہیں ہے۔ اس خسارے میں کئی
نگل ہی آتے ہیں۔ اور میں تو اس معاملے میں بھی نفع میں ہوں کہ میں اس کے ساتھ ہوں گی ہر صورت
ا۔ چاہے وہ مجھے چاہے یا نہ چاہے، اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہوگا۔ چاہے میں اس کی سوچوں میں
ملنا نہ لگتی ہوں۔ ہم ساتھ ہوں گے۔“ ساہیہ کا یقین محکم تھا۔ اگینے خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی جب
ایسکی ہی کئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ یہ تم دونوں اس طرح سر جوڑے کیوں بیٹھی ہو؟ اور ساہیہ! تم۔۔۔ تمہاری

وہ کیسے معاف کرتی اس شخص کو جو اس کی نگاہ کے سامنے اپنی دنیا آباد کئے ہوئے تھا۔ اپنے ایک ناجائز
نہ کے ساتھ دھڑلے سے جی رہا تھا اور شرمندہ تک نہ تھا۔ اسے کیسے معاف کرتی وہ۔

اُسے محبت کرنا سکتھاتی؟

اس شخص کو جو شاید رشتوں کے احساس سے بھی واقف نہ تھا۔ اُسے تو محبت کے چچے بھی نہیں آتے تھے
وہ اس پر اپنی محبت صرف کرتی۔ اسے اپنے جذبات سوچتی تا کہ وہ اس کے دل کے ساتھ کھیل سکتا۔

پہلے تو وہ صرف اپنے احساسات کے ہرٹ ہونے پر روتی تھی۔ پھر شاید دل ٹوٹنے کا داویلا کرتی۔ اس
ماتے کیا بعید تھا۔ اور سنی کبہر رہا تھا اسے محبت کرنا سکھاؤ، اس سے محبت کرو۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی۔
بعد یقین تھا اسے۔ محبت سے کوئی جانور ضرور سدھر سکتا تھا مگر سردار سبکتگین حیدر لغاری ہرگز نہیں۔

کوئی خدشہ نہیں تھا یہ۔ کوئی خوف نہیں تھا۔ صرف ایسا ہونے کے صد فیصد چانسز تھے کہ وہ قدم بڑھاتی
کھٹھاتی۔ کیونکہ وہ شخص صرف دکھ دینا جانتا تھا۔

وہ سر اٹھائے ساکت ہی دیکھ رہی تھی جب سردار سبکتگین حیدر لغاری، گی کے ساتھ بات کرتے کرتے
کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ گی بھی غالباً بھی اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے
بندہ ہاتھ ہلایا تھا۔ میرب کوئی رد عمل نہیں دے سکی تھی۔ نہ تو مسکرائی تھی نہ ہی ہاتھ ہلایا تھا۔ اُس نگاہ ہٹا
تھی۔ اسے امید نہیں تھی دوسرے ہی لمحے سردار سبکتگین حیدر لغاری اس کے پاس ہوگا۔ وہ سوچوں کے
میں اُلجھی ہوئی پول کے شفاف پانی پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی جب سردار سبکتگین حیدر لغاری چلتا ہوا آیا تھا
پول کے پانی میں پاؤں ڈبو کر اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

”موسم اچھا ہے نا؟“ مسکراتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا باتیں کرنے کے
موسم کا تذکرہ کامیاب ترین گڑ ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا مگر میرب نے کوئی
جواب نہیں دیا تھا۔ شاید وہ گفتگو کے اس سلسلے کو آگے بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

”ہوا اچھی چل رہی ہے لیکن آسمان پر جتنے بادل ہیں، لگتا ہے بارش ضرور ہوگی۔“ سردار سبکتگین حیدر
لغاری کی گفتگو پہلے سے کہیں مختلف تھی۔ میرب اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

”میرب! تمہارا کزن بہت سمجھ دار لڑکا ہے۔ اس کی باتوں میں دم ہے۔ سچ کہوں، میں اسے بہت
ادب لڑکا سمجھتا تھا۔ مگر وہ حیران کن ہے۔ تمہیں اس کی باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مصالحت
راہ بہتر ہے۔ ماحول سازگار کرنے میں بھی بہت حد تک معاون ہو سکتا ہوں۔“

وہ حیران، ساکت ہی دیکھ رہی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری کے متعلق اس کا قیاس درست تھا۔ وہ ان
ماتین ہونے والی گفتگوں چکا تھا۔ تو یہ مصالحت کی کوشش تھی۔ یعنی وہ چاہتا تھا کہ وہ اس پر اپنا وقت
سکے۔ میرب خاموش تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر میرب کا
تھام لیا تھا۔

”میرب! اگر سمت صاف نظر آ رہی ہو تو قدم اٹھانے میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ دو چار قدم صحیح سمت
اٹھ جائیں، یہ زیادہ بہتر ہے اس کے کہ بے سمت چلتے ہوئے عمر گزار دی جائے۔“ اپنی دانست میں

آنکھوں کو کیا ہوا ہے؟ تم روئی ہو؟“ کسی قدر تشویش سے وہ آگے بڑھی تھیں جب اکیسے نے بات پورا
لیا تھا۔

”سایہ عام لڑکیوں کی طرح ہمیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہ رہی بھائی! اگرچہ فی الحال انگریج منٹ
ہے مگر بالکل پاگل ہو گئی ہے۔ بھلا ہم کون سا بہت دور ہیں۔ یہی قریب ہی تو ہوں گے۔ اور ا
شادی میں کافی عرصہ پڑا ہے۔“ ہنکراتے ہوئے کہا تھا۔ سایہ بھی مسکرا دی تھی۔ می کو کچھ اطمینان ہوا
”وہ نیچے اذہان آیا ہوا ہے۔ تم دونوں کو شاپنگ کے لئے جانا تھا نا۔“

”جی می!۔۔۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ آپ پلیز اسے بٹھائیے۔ میں تیار ہو کر تھوڑی دیر میں
ہوں۔“ سایہ کہہ کر اٹھی تھی اور واش روم میں گھس گئی تھی۔ می پلٹ گئی تھیں۔ اکیسے بھی ایک گہری
خارج کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

پتہ نہیں سنی نے ٹھیک بھی کہا تھا یا کہ نہیں۔ پتہ نہیں اسے ایسا کہنا بھی چاہئے تھا کہ نہیں۔
اس شخص کے ساتھ متواتر رہنا اور اس کی تمام اچھی اور بری باتوں کو قبولنا آسان تو نہ تھا۔ وہ ایک
معاف کر سکتی تھی، دوسری بار بھی۔ مگر کیا بار بار۔

اتنی رعایت تو کوئی محبت میں بھی نہیں دیتا۔
اور اسے تو شاید اس شخص سے محبت تھی بھی نہیں۔ پھر کس بل بوتے پر وہ اسے اتنے مواقع فراہم کر
اور پھر کیا گارٹی تھی کہ وہ واقعی سدھر جاتا اور دوبارہ ایسی غلطی نہ کرتا۔ اسے ہرٹ نہ کرتا۔ اور یہ سب
اپنے طور پر اخذ کر رہی تھی۔ اپنے طور پر سوچ رہی تھی۔ گیسز لانگ اے فول۔۔۔ اقدامات تو تہ
ہوتے جب سردار سبکتگین حیدر لغاری کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہوتا یا وہ معذرت طلب بھی کرتا۔ ایسا تو
تھا ہی نہیں۔

نہ تو سردار سبکتگین حیدر لغاری کو اپنی غلطی کا کوئی احساس تھا نہ ہی اس نے کبھی کوئی معذرت طلب
تھی۔ وہ تو صرف دھونس جمانے کا عادی تھا۔ یعنی ایک تو جو ری اس پر سینہ زوری۔ نہ تو اپنی غلطی تسلیم
تھا، نہ پھر، دہرانے کی گارٹی دیتا تھا۔ جب اسے کوئی احساس تھا ہی نہیں، کبھی کوئی ریگٹ محسوس ہی نہیں
تھی تو پھر اس کو رعایت دینے کا مطلب یہ تھا، آئیل مجھے مار۔

پول کے کنارے چلتے چلتے وہ رکی تھی۔ پھر جھک کر بیٹھی تھی اور پاؤں پول کے پانی میں ڈبوئے
تھی۔ سبھی اس لمحے نگاہ اٹھی تھی۔ اوپر ٹیرس پر سردار سبکتگین حیدر لغاری، گی کے ساتھ موجود تھا۔ دونوں با
ر رہے تھے۔ شاید اپنے آنے والے وقت کے لئے کوئی اسٹریٹیجی پلان کر رہے تھے یا پھر وہ گی کا
بڑھا رہا تھا۔ کچھ بھی تھا وہ دونوں قریب تھے۔

وہ دھیان ہٹا نہیں سکتی تھی۔

کیا سوچ رہی تھی وہ؟

اور اصل صورتحال کیا تھی؟

بہترین بات کی تھی۔ مگر میرب سیال نے سرائکار میں ہلا دیا تھا۔

”سردار سبکگین حیدر لغاری! آپ کی زبان سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ عجیب مضاد افہام آپ کا۔ آپ صرف دوسروں سے ہی کیوں امید رکھتے ہیں؟ خود تو آپ غلط کو بھی صحیح سمجھ کر کرنا عادی ہیں اور دوسروں سے مصالحت کی امید رکھتے ہیں۔“

”مصالحت بھی ہو سکتی ہے۔ اگر تم انڈرا شیڈ کر لو۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری غالباً آج خوش مزاج میں تھا۔ نہ صرف اس کی کڑوی کبلی باتوں کے جواب میں مسکرا رہا تھا بلکہ مزید گفتگو کا سلسلہ بھی رکھے ہوئے تھا۔

”میرب! آپ کی ایک بات اچھی نہیں ہے۔ آپ سوچتی اور سمجھتی بہت کم ہیں۔ یہ جو دماغ سمجھنے کی عادت ڈالیں۔ کچھ سوچنے کا کام سوچیں۔ فارغ مت چھوڑیں۔ فضول سوچنا شروع کرنا آپ کا پرابلم صرف یہ ہے کہ آپ ایک نقطے کے آگے سوچنا ہی نہیں چاہتی ہیں۔ نہ کچھ دیکھتی ہیں نہ ہیں۔ جو ذہن میں پہلی سوچ آتی ہے اسے لے کر آگے بڑھتی ہیں اور سوچ کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ ان بے لگام گھوڑوں کو روکنے اور بس کرنے کی عادت ڈالئے۔ فائدے ہوں نہ ہوں نقصان سے ضرورت چ جائیں گی۔ ضروری نہیں کہ کسی بات کی جانچ پڑتال کے بغیر اسے حتمی مان لیا صرف اس لئے کہ صرف آپ کا دل یا صرف آپ کا دماغ ایسا کہہ رہا ہے۔ کبھی کبھی دوسروں کی بات لینا بھی اچھا ہوتا ہے۔ ہمیشہ نقصان ہی ہوتا ضروری نہیں، دوسرے صرف آپ کے دشمن ہی ہوں۔ ہو سکتا ہے نا کہ دوسرے آپ سے کسی قدر مخلص ہوں۔ شاید آپ سے کچھ زیادہ مخلص۔ آپ یہ کیوں ہیں کہ سبھی کچھ آپ کے خلاف ہے اور کوئی بھی آپ کے ساتھ نہیں۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

میرب سیال کچھ نہیں سمجھ سکی تھی۔ چپ چاپ دیکھتی رہی تھی۔

”آپ یہ کیوں سمجھتی ہیں کہ میں آپ کی مخالف سمت پر ہوں؟ میں آپ کے ساتھ بھی تو ہو سکتا ہوں خفیہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ یہ تو پور کچھ نئے تھے۔ پہلے سے کچھ مختلف!

کیا پھر کوئی جھانکا؟

پھر کوئی نئی چال؟

میرب سیال اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔ اس شخص کی عادت ہو چلی تھی دھوکا دینے کی۔ وہ ناہر تھا۔ اور اس کے ہاتھ پھر سیفی کا انوکھا مشورہ بھی لگ چکا تھا۔ گویا ایک نیا طریقہ اسے اسکپ گوٹ بنانے کا اپنا دوست اس کے ہاتھ سوچ چکا تھا۔ ایک بار پھر وہ اس کے احساسات سے کھیلنے چلا تھا۔ ایک ایک قاتل منصف بننے چلا تھا۔

بہت آہستگی سے وہ سرفی میں ہلانے لگی تھی۔

”نرسٹ می!“ سردار سبکگین حیدر لغاری مدہم لہجے میں باور کراتے ہوئے بولا تھا۔ میرب سیال

دل میں اس کی سچائی جاننے کی کوشش میں اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”نرسٹ می!“ میرب سیال کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سردار سبکگین حیدر لغاری مدہم لہجے میں گویا نا انداز ایسا تھا کہ سننے والی سماعتیں ایک لمحے میں ہار جاتیں۔

آنکھوں میں وہ رنگ تھے، وہ چمک تھی کہ اعتبار کے سوا کوئی صورت نہ رہتی۔ وہ دل جیتنے کے فن سے تھا۔ اسے علم تھا تیرکب چلانا ہے اور کب وار کرنا ہے۔ کون سی گھڑی سود مند ہے اور کس لمحے حالات پنے بس میں کرنا ہے۔ اسے سب گرا آتے تھے۔ وہ تمام اسلوب سے واقف تھا۔ اسے توجہ سوچنی آتی۔ اپنا اسیر کرنا آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کب اسے لگاوت کا مظاہرہ کرنا تھا اور کب اجنبی بن جانا تھا۔

وہ جانتا تھا۔ اسے از بر تھے سارے ڈھنگ۔

وہ جیتنے کے سارے پہلو جانتا تھا سو وہ کبھی ہارا نہیں تھا۔

وہ کھیلا جانتا تھا۔ شاطر دماغ تھا۔ اسے معلوم تھا کہاں، کون سا ہنر آزمانا تھا۔ سو وہ اس گھڑی اس کے لئے تھا۔

”نرسٹ می!“ ہزار ہا ان کبھی باتوں کو جتاتے ہوئے وہ بھر پور زور دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بک رہا تھا اس وقت۔ وہ سدا کا ناقابل اعتبار شخص اس کا اعتبار چاہ رہا تھا۔

میرب سیال کچھ نہیں بولی تھی۔ فقط چپ چاپ اس کی آنکھوں میں تکتی رہی تھی۔ شاید وہ سچائی کے کچھ جانچنا چاہتی تھی ان آنکھوں میں۔ مگر وہ کچھ جان نہ پائی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔

”تمہیں مجھ پر اتنا اعتبار تو ہونا چاہئے کہ اگر میں کہوں کہ یہ دن نہیں رات ہے تو تم کہو ہاں رات ہے۔ ان تو میری بات پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرنا چاہئے۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس سے اس کا اندھا اعتماد چاہ نا۔ بلائٹڈ سٹ ماگ رہا تھا۔

واہ! کیا دیدہ دلیری تھی۔

میرب سیال چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری اس کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا تھا۔ ”تم سردار سبکگین حیدر لغاری پر اعتبار نہیں کر رہی ہو۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ دنیا کو دیکھنے کا میرا بہت زیادہ ہے۔ تمہاری نظر وہاں تک سوچ بھی نہیں سکتی جہاں تک میری نگاہ دیکھ سکتی ہے۔ تم اس لو جاتی ہی نہیں ہو جس سے میں زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ تمہارے ذہن کے شے دا ہی نہیں ہیں جہاں سے میں ایک جہاں کو کھوج سکتا ہوں اور تم مجھ پر ٹرسٹ نہیں کر رہی ہو۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری کسی قدر نرمی سے مسکرایا تھا۔ میرب سیال کی نظروں میں اعتبار کے رنگ پھر بھی نہ سے تھے۔ سردار سبکگین حیدر لغاری کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”اب یہ مت کہہ دینا کہ میں اعتبار کے قابل ہی نہیں ہوں۔ اگرچہ میں تمہاری طرف سے ایسی باتوں امید رکھتا ہوں۔ بہت سیانی ہو تم۔ اپنے فائدے کی باتوں کو خوب سمجھتی ہو۔ مگر کوئی رسک لینا نہیں نا ہو مگر رسک تو لینا پڑے گا۔ رسک تو لینا ہی ہوتا ہے سوئی!“ انداز جتانے والا تھا۔ ”دنیا میں یہ بہت آئی ہے۔ زندگی میں اس کے بغیر گزارا ممکن نہیں۔ کوئی نہ کوئی، کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی پر تو اعتبار کرتا ہی

ہے۔ اسی سے زندگی کی گاڑی آگے بڑھتی ہے۔ اعتبار نہ ہو تو ایک سکے کا بھی کاروبار ممکن نہیں۔ بات رشتوں کی کر رہے ہیں سوئی! سوچو، پرکھو، جانچو۔ زندگی یوں نہیں چلتی ہے۔ اس طرح نہیں اپنے دماغ کو کھولو۔ کام لینا سیکھو اس سے۔ تمہیں کیوں لگتا ہے کہ میں تمہارا مخالف ہوں، ساتھ نہیں آزما کر تو دیکھو، تم جان جاؤ گی کہ حقیقت کیا ہے، سچ کیا ہے۔“ اس کی نجد آنکھوں میں جھانکے سردار سبکتگین حیدر لغاری کہہ رہا تھا۔ یکدم موسم نے کروٹ لی تھی اور بادلوں سے بوندوں کا ایک شروع ہو کر زمین کی طرف آنے لگا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری کا تجربہ صد فیصد درست رہا تھا اندازہ درست تھا۔ پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ میرب سیال نے بے خوف سے یکدم اٹھ جانا چاہا تھا جب سردار سبکتگین حیدر لغاری نے یکدم اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا وہ فرار کے اس لمحے کو پانہیں سکتی تھی۔ بے بسی سے سزا اٹھا کر اس کی جانب دیکھنے لگی تھی۔ لبوں پر تبسم لے لے وہ جتانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”مان لو، میرا تجربہ تم سے بہتر ہے اور اندازہ تم سے کئی گنا درست۔ تمہاری نگاہ وہاں تک نہیں جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں۔“ لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو رہی تھی اور آنکھوں کی چمک دوگنی۔

”تجبی کہتا ہوں میرے تجربے سے کچھ سبق لو۔ کچھ سیکھو۔ میرا تجربہ تم سے کہیں زیادہ اور بھر پور نہ تو میرا مشاہدہ غلط ہو سکتا ہے نہ تجربہ۔ آزما کر دیکھ لو۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

میرب سیال نے برستی بارش میں اسے دیکھتے ہوئے سرنفی میں ہلایا تھا۔

”نہیں سردار سبکتگین حیدر لغاری! میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ بھلے ہی زندگی کے لئے تمہارا سے زیادہ بھر پور سہی مگر میں نے تمہیں دیکھ کر زندگی کو جانچنا سیکھا ہے۔ میری کیکولیشن کبھی غلط سکتی۔ تم پر اعتبار کا مطلب ہے خود اپنی شامت کو آواز دینا۔ اپنے نقصان کو خود آپ دعوت دینا۔ ہو چکا ہے اور اب ان سب باتوں کا وقت گزر چکا ہے۔ میں ایسا بارہا کر کے دیکھ چکی ہوں اور نہیں کر سکتی۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جو چٹ بھی اپنی چاہتے ہیں اور پٹ بھی۔ تمہیں جیتنے کا جو ہے بلکہ خبط۔ مگر صرف تمہاری انا کو تسکین دینے کے لئے میں اپنا بھر پور نقصان نہیں کر سکتی۔ تم بات کر رہے ہو، گی کو اپنے ساتھ رکھتے ہوئے؟۔ مجھے بتاؤ یہ اعتبار کی کون سی صورت ہے پول کھل چکی ہے۔ سارا معاملہ سامنے آچکا ہے اور تم بنا شرمندہ ہوئے اپنی ٹھونے جا رہے ہو۔ نہیں رہے کہ غلطی ہوئی ہے تم سے۔ قصور ہے تمہارا اور ایک بار بھی نہیں گئی بار۔ تم نے جو کیا، سے بتاؤ کیا وہ معاف کئے جانے کے قابل ہے؟“ بھر پور اعتماد سے اس کی جانب دیکھتی ہوئی وہ بارش کا زور بڑھ چکا تھا۔ دونوں تیزی سے بھیک رہے تھے مگر دونوں کو ہی پرواہ نہیں تھی۔

”ہاں۔۔۔ میں مانتا ہوں۔ سارا کا سارا قصور میرا ہی تھا۔ جو بھی غلط کیا میں نے ہی کیا تم کہیں کوئی غلطی نہیں رہی۔ ساری کی ساری غلطیاں مجھ سے سرزد ہوئی ہیں۔ سارا قصور میرا ہی کے جارحانہ انداز میں اس کا لہجہ ملائم اور ٹھہرا ہوا تھا۔ مگر میرب سیال کے انداز میں اعتبار کے کو تھے۔ وہ اب بھی اتنی ہی خشکی لئے ہوئے، برہم دکھائی دے رہی تھی۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ

ٹھیک تھی مگر میں اسی لمحے بارش کے پانی کی پھسلن کے باعث سنگ مرمر کے بنے اس فرش پر اس کے پاؤں کا توازن برقرار نہیں رہ سکا تھا اور دوسرے ہی لمحے وہ پول کے پانی میں تھی۔ سوئنگ تو درکنار وہ کبھی پانی کے قریب بھی نہیں جاتی تھی۔ آج بھی پتہ نہیں کون سی دھن تھی کہ چلتی ہوئی پول کے پاس آگئی اور پھر اس ڈیو کے پینڈے بھی گئی۔ اور اب وہ ڈوبتی ہوئی خود کو بچانے کی کوشش میں بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ وہ چیخ نہیں رہی تھی۔ غالباً وہ اس کی مدد لینے کو تیار نہیں تھی۔ مگر سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کے پیچھے کودنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ مگر پانی کے خوف کے باعث وہ ہاتھ پیر مارنا چھوڑ چکی تھی۔ اس کا وجود پول کی سطح کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا جب سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ اسے تیزی سے لے کر پول کی اوپری سطح پر آیا تھا اور اسے سائینڈ پر ڈالا تھا مگر اس کے اوچھلنے میں کوئی حرکت نہ تھی۔ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔

”میرب!“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کا چہرہ تھپتھپایا تھا مگر جواب نہ دیا تھا۔

”میرب!“ دیوانہ وار پکارتے ہوئے وہ اس پر جھکا تھا۔ نبض ٹٹولی تھی۔ اس سرد پڑتے وجود میں جیسے زارت کا ایک قطرہ نہ تھا۔ وہ ساکت پڑی تھی۔

”میرب!“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے چھوڑ دیا تھا۔



”یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟۔ ہم تو غالباً شاپنگ کے لئے جانے والے تھے نا؟“ ساہیہ نے کراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ گاڑی اذہان حسن بخاری کے پورچ میں رک چکی تھی۔ اذہان نے اتر کر اس کی طرف کا دروازہ کھولا تھا اور اسے لے کر اندر کی جانب بڑھنے لگا تھا۔

”ہاں۔۔۔ ہم شاپنگ پر جانے والے تھے۔ مگر اس کام سے ضروری بھی کوئی کام ہے۔ سوچا پہلے سے سرانجام دے لیا جائے۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”کیا؟“ وہ میڑھیاں چڑھتے ہوئے چوکی تھی۔

”ابھی بتاتا ہوں۔“ وہ بغور توجہ سے نکتا ہوا مڑا تھا۔ زینے کے اختتام پر فارحہ کھڑی تھیں۔

”تم لوگ شاپنگ کے لئے نہیں گئے؟“ آواز میں حیرت تھی۔ اذہان مسکرایا تھا۔

”نہیں می! دراصل مجھے کچھ ضروری کام یاد آ گیا تھا۔ دوسرے ساہیہ سے کچھ ضروری بات بھی کرنا تھی۔ سو ارادہ بدل دیا۔ ہم کل چلے جائیں گے۔“

”خیریت؟۔۔۔ ایسی کیا ضروری بات آن پڑی اچانک جو شاپنگ ملتوی کر دی؟“ فارحہ متشکر ہوئی تھی۔

”ارے می! ہم فیاضی تو اب ہونے جا رہے ہیں۔ اس سے قبل تو ہم اچھے دوست تھے اور اب بھی ہیں۔ ہزار باتیں ہیں، ہزار راز ہیں۔ اب کبھی کچھ تو نہیں بتایا جا سکتا نا۔ آپ چائے بھجوا دیجئے۔“

”ماہیہ اچائے لوگی یا کانی؟“

”کانی۔“ ساہیہ مسکرائی تھی۔ اذہان ماں کی طرف مڑا تھا۔

”مئی! دوکانی پلینز۔“

”ابھی تھوڑی دیر قبل تیری چوٹس چائے تھی۔“ مئی نے چھیڑا تھا۔ اذہان مسکرا دیا تھا۔

”ساری زندگی اب تو جھیلنا ہی ہے۔ سوچا ابھی سے اثر پذیری قبول کر لوں۔“ اذہان مسکرائے
مڑا تھا اور ساہیہ کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا۔

”کیا بات ہے؟ کوئی سیکرٹ ڈسکس کرنا ہے جو یہاں لے آئے ہو؟“ ساہیہ نے
ریلنگ کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو کر مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ اذہان مسکرا دیا تھا پھر آہستگی سے سر اٹھا
ہلا دیا تھا۔

”ہاں۔ وہ سیکرٹ جو تم سے ڈسکس کرنا ہے، بے حد ضروری ہے۔“

”کیا مطلب؟ تم واقعی کوئی سیکرٹ مجھ سے شیئر کرنا چاہ رہے ہو؟“ ساہیہ بار
میں ٹالتی ہوئی مسکرائی تھی۔ اذہان نے اس کی جانب ہنستے ہوئے اقرار میں سر تسلیم خم کیا تھا۔
”مجھے واقعی تم سے ایک بہت ضروری بات شیئر کرنا ہے۔“

”کون سی بات؟“ کہیں تمہیں مجھ سے پیار تو نہیں ہو گیا؟“ ساہیہ نے شرارت سے؟
اذہان حسن بخاری ہنس دیا تھا۔

”ہاں، یہ بھی۔ مگر کوئی اور بات بھی ہے۔“

”ارے کیا واقعی؟ قسم کھاؤ، کیا تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہو گئی ہے؟“ وہ شرارت سے
اذہان ہنس بخاری نے جواباً مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور بغور دیکھنے لگا تھا۔

”یہ تم ایسا کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ چونکی تھی۔ انداز سنجیدہ نہ تھا۔ وہ جیسے اس کی سب باتوں کو
ٹال رہی تھی۔ مگر اذہان مکمل سنجیدگی سے اسے اس گھڑی دیکھ رہا تھا۔ ساہیہ خان نے اس کے آڑ
کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

”اے اذہان! کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟“ وہ کسی قدر سنجیدہ ہوئی تھی۔ اذہان حسن بخاری
اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”بیٹا ہوا۔“ بہت آہستگی سے اس نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بغور دیکھا تھا۔
ہم زندگی کا اہم ترین سفر شروع کرنے جا رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں اس سے قبل کہ ہم اس
دھریں سب باتیں پہلے ہی طے پا جائیں۔ جو اچھن دیتی ہے، وہ فقط بات نہیں چھانسنی ہوتی ہے
نہیں چاہتا کہ کل کو اس پھانس کو لے کر تمہارا دم گھٹے یا تم جھ سے کوئی شکوہ کرو۔ میں تم سے اپنا
ایک ایک مخفی گوشہ ڈسکس کر دینا چاہتا ہوں۔ تمہیں ہر بات بتا دینا چاہتا ہوں۔ میں نے کب کیا
کیا، کس لئے کیا، سب کچھ۔ میری گزشتہ گزری ہوئی زندگی کا ایک ایک ورق، ایک ایک حرف
سامنے ہوگا۔ آج تم مجھ سے جتنے چاہو سوال پوچھ سکتی ہو مگر آج کے بعد صرف اعتبار ہوگا۔ تم
میرے بیچ صرف پیار ہوگا۔“ مدھم لہجے میں کی گئی بات کسی خاص سمت اشارہ کر رہی تھی۔ ساہیہ
تھی۔

”اس کی۔۔۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟“ لہجہ مدھم اور کمزور تھا۔ اذہان نے سر نیچی میں ہلا دیا تھا۔
”ضرورت ہے۔۔۔ ضرورت ہے ساہیہ! کیا تمہیں میرے پیار کی ضرورت نہیں؟“ براہ راست
آئی آنکھوں میں تکتے ہوئے پوچھا تھا۔ ”تم نہیں چاہنا چاہو گی وہ کون تھی، کیسا روپ تھا اس کا، میں کیسے
ہے چاہتا تھا، کیسے تکتا تھا، وہ کیسے رنگوں میں کھلتی تھی، کیسی دکھتی تھی، جاننا نہیں چاہو گی تم، وہ خواب سی
فت کیا ہوئی، وہ کیسے خواب سی ملی اور خواب سی جدا ہوئی، جاننا نہیں چاہو گی تم؟ میں اب اس کے
رے میں کیا سوچتا ہوں، میرا دل کیا چاہتا ہے، کیا کہتا ہے، کوئی راہ اب بھی نکلتا ہے یا کہ نہیں۔ میرے
میں ان دھڑکنوں کے لئے میرا پیار باقی ہے کہ نہیں۔ کیا جاننا نہیں چاہو گی تم؟ میں کیا چاہتا ہوں اب؟
سوچتا ہوں؟“ سرگوشی مدھم تھی۔ اس کے قریب رک کر اس کے جھکے چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے اسے
دیکھا تھا۔ ساہیہ اس کی جانب تکتے لگی تھی۔ ان آنکھوں کے رنگ بہت گہرے تھے۔

ملگنی سی شام میں عفتان علی خان نے کمرے میں قدم رکھا تو انا بیہ شاہ کی سانسیں اُلجھنے لگی تھیں۔
سننے میں دل نے ایسا شور مچایا تھا کہ وہ خود حیران رہ گئی تھی۔ ہر طرف ایک ارتعاش سا تھا۔ دھڑکنوں کا
کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ وہ سر جھکانے بیٹھی تھی مگر کان ان قدموں کی آہٹوں پر لگے ہوئے
بھاری قدم لہجہ لہجہ لہجہ اس کی طرف بڑھے تھے اور انا بیہ شاہ کے سننے میں موجود دل نے جیسے دھڑکنے کا
یدارادہ ملتی کر دیا تھا۔ دل جیسے بند ہونے کو تھا۔ عفتان علی خان نے قریب رک کر اسے بغور دیکھا تھا
شانوں سے تمام کر اسے مقابل کھڑا کیا تھا اور بغور اس چہرے کو تکتے لگا تھا۔ انا بیہ شاہ کی وہ حالت تھی
کہ کٹو تو بدن میں اہو نہیں۔ چہرہ اس کے قریب کر دیا تھا۔ نگاہ سے نگاہ کی دوری بہت مختصر سی تھی۔
اس کی نگاہوں کی تپش، اس کی گرم سانسوں کی حرارت، اس کی قربت۔۔۔ انا بیہ شاہ کے لئے کچھ
ناسہنا آسان نہیں تھا۔ نہ تو ان نگاہوں میں دیکھنے کا یا انا تھا نہ ان قیامتوں کو جھیلنے کا کوئی تجربہ۔
عفتان علی خان نے ہاتھ بڑھا کر اس چہرے کو چھوا تھا۔ انا بیہ کی جان جیسے ہوا ہونے لگی تھی۔ وہ ایک
م پیچھے کوسر کی تھی مگر عفتان علی خان نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

”کہا تھا، ذہنی طور پر خود کو تیار کرنا شروع کر دو۔ تم اپنے پاس میری امانت ہو اور امانت جتنی بھی دیر
لا جائے اسے بہر حال سونپنا ہی ہوتا ہے۔ آج کل یا برسوں تمہیں اپنا آپ میرے سپرد کرنا ہی ہوگا۔ ہم
بہنڈ واٹف ہیں۔ شادی ہوئی ہے ہماری۔ جب خدا نے ہمیں ایک کر دیا ہے تو پھر یہ فرضی لکیریں بھی
یمان کیوں رہیں۔ دوریاں اچھی ہیں، پاس آنے کی خواہشوں کو ابھارتی ہیں مگر اب وقت آ گیا ہے کہ
نا دوریوں کو سمیٹ دیا جائے۔“ اس کے گرد اپنے حصار تنگ کرتے ہوئے عفتان علی خان کہہ رہا تھا اور
بیہ شاہ کی جان نکلنے کو تھی۔

”تمہاری دوری مجھے اچھی لگتی ہے۔ یہ گریز اچھا لگتا ہے۔ تمہارا مجھ سے یوں نظر چرانا اچھا لگتا ہے۔ تم
میں لگتی ہو۔ مگر تم بالکل اچھی نہیں ہو۔“ مدھم سرگوشی میں شکوہ کرتے ہوئے اپنا سر اس کے سر کے ساتھ ٹکایا
ا۔ گرم سانسوں کی تپش سے انا بیہ شاہ کو اپنا چہرہ جھلستا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ آنکھیں زور سے میچ گئی تھی اور

رہنم

گزر نے پانی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی

مگر

یہ ہونہ سکا اور

اور اب یہ عالم ہے

کہ تو نہیں

تیری جستجو بھی نہیں!

چہرے کو چھوتے ہوئے لبوں پر بہت دھیماسا تمسم تھا۔ مدھم سرگوشی میں کوئی کک سی تھی۔ انا بیہ اس کی مت متوجہ نہیں تھی۔ نگاہ جھکی ہوئی تھی مگر وہ پُرتیش نگاہ اس چہرے پر بدستور پہرہ دے رہی تھی۔ تاثر بھر پور تھا۔ قربت تھی، پسپائی تھی۔

عفتان علی خان کا اس کے نازک شانے پر دھرا ہوا ہاتھ ہٹا تھا۔ نگاہ ایک دم بے تاثر ہوئی تھی۔ پھر بے گانہ ہو کر اس چہرے پر سے ہٹ گئی تھی۔ وہ یکدم پلٹا تھا اور چلتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا۔ انا بیہ شاہ اس اقدام پر ساکت سی اس جانب تکتی رہ گئی تھی۔

یہ اچانک کا یا پلٹ کیسے ہوئی تھی؟

الادسرد کیسے بڑا تھا؟

آتش تھا تو بجھ کیسے گیا تھا؟

وہ کچھ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ شاید یہ فقط اسے رنج کرنے کا انداز تھا یا پھر واقعی



عفتان علی خان سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ تم بالکل بھی اچھی نہیں ہو۔۔۔ میرا بالکل بھی کوئی خیال نہیں ہے تمہیں۔

نہیں سوچتی ہو تم میرے بارے میں۔ یہ ادراک، یہ ڈھنگ، یہ رنگ، سب سیکھ لو اب۔“

”عفتان۔۔۔!“ وہ کمزور سا احتجاج کرتی ہوئی تھی۔ آنکھیں پٹی ہوئی تھیں جیسے کسی ہکا

سے بچنا چاہتی ہو۔ عفتان اپنی دھن میں بول رہا تھا۔

”تم سیکھ لو ساری باتیں جو تمہیں مزید دکھائی دے سکیں۔ کئی ڈھنگ تو پہلے بھی ازبر ہیں؟

رنگ تو پہلے بھی نمایاں ہیں۔“

”عفتان!۔۔۔ عفتان! پلیز۔۔۔ مدھم لہجے میں جیسے مت کی تھی۔

فتان نے سنی ان سنی کر دی تھی۔ اس کی گرفت میں وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

”اپنی آنکھیں کھولو۔ دیکھو میری طرف۔ میں رنگ دیکھنا چاہتا ہوں آج ان کے۔ بنور پر

ہوں۔ آج ان آنکھوں کی سطر سطر میرے لئے ہوگی۔ میرے ذکر سے آباد ہوگی۔ ان دھڑکنوں کا

صرف میرے لئے ہوگا اور۔۔۔۔۔“ وہ اس کی سمت دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔

”عفتان!۔۔۔ پلیز میری بات سنو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ پلیز، پہلے میری بات

لو۔“ انا بیہ شاہ نے کپکپاتے لبوں سے کہتے ہوئے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالنا چاہا تھا۔

عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”کہنے سننے کو اب عمر بڑی ہے جان! یہ سب باتیں تو ہوتی رہیں گی۔“

انا بیہ شاہ کی جان پر بن آئی تھی۔

صورت حال بس سے باہر ہونے کو تھی۔ سب کچھ اختیار سے باہر ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ سب

ہوتا ہے، کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ فوری طور پر ذہن ماؤف تھا اور وہ شخص۔۔۔۔۔

کیسی پریشان کن صورتحال اس کے لئے پیدا کر چکا تھا۔ اس کی کیفیت وہ تھی کاٹو تو بدن میں

اس لمحے بہت خوفزدہ نظروں سے وہ عفتان علی خان کی سمت دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں پانیوں سے بھر

تھیں۔ اس کی حالت دگرگوں تھی۔ مگر مقابل کو اس پر ترس آتا تھا یا نہیں، اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔

اسی خوف زدہ انداز میں چلتی ہوئی وہ دیوار سے جا لگی تھی۔ عفتان علی خان نے اس کی جانب

قدمی کی تھی اور دیوار پر ہاتھ ٹکاتے ہوئے فرار کے سبھی راستے مسدود کر دیئے تھے۔

اس چہرے، ان آنکھوں کو بنور دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر چہرے پر آئے ہوئے ان گیسوؤں کو

کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا۔

کبھی کبھی

میرے دل میں خیال آتا ہے

کہ زندگی

تیری نرم زلفوں کی نرم چھاؤں میں

مگر اذہان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”مگر ری باتیں صرف دکھ دیتی ہیں اذہان! صرف دل دکھاتی ہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے اعتراف دیکھوں؟“ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے ملاحت سے مسکرائی تھی۔ اذہان نے سرفنی میں ہلا دیا تھا۔

”تو پھر اس معاملے کو ہمیں ختم کر دو۔ دبی راگھ میں چنگاریاں اگر بھی ہیں تو وہ مجھ جائیں گی اذہان! مگر اس راگھ کو کریدنے سے شاید دبی ہوئی چنگاریاں بھی شعلہ بن جائیں۔“

”تم خوف زدہ ہو ساہیہ؟“ پتہ نہیں وہ کیا سوچ کر بولا تھا۔

ساہیہ کے پاس اس سوال کے لئے کوئی جواب نہیں تھا۔ جہاں وہ خاموش رہی تھی، وہیں اذہان بولا

”ساہیہ! میں یہی ڈر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اسی خوف کو مٹانا چاہتا ہوں۔“

”مگر میرے اندر کوئی ڈر نہیں ہے اذہان!“ ساہیہ کے لبوں پر بہت دم توڑتا تبسم تھا۔ جیسے وہ اپنے اندر ہونے والے انتشار پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ایک بات پوچھوں اذہان؟“

”ہوں۔“

”کیا تم اب بھی اس سے محبت کرتے ہو؟“ ساہیہ نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دم لہجے میں دریافت کیا تھا اور اذہان حسن بخاری ایک لمحے میں ساکت رہ گیا تھا۔ کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس اس سوال کا۔ اور ساہیہ کو شاید اسی کی توقع تھی۔ اسی لئے وہ مسکرا دی تھی۔

”ایک مشورہ دوں اذہان! اپنے آپ کو کچھ وقت دو۔ اس دل کو کچھ وقت دو اور شاید اس محبت کو بھی۔ اس لمحے کا انتظار کرو جب محبت اپنی جڑیں تمہارے اندر سے نکال کر باہر کرے یا پھر اور پھیلا لے۔ شاید ایسا مشورہ تمہیں کوئی اور نہ دے سکے۔ مگر میں دے رہی ہوں۔ کیونکہ میں سب سے پہلے تمہاری دوست ہوں۔ اور اذہان! میں اس لمحے تمہاری آنکھوں کو پڑھ رہی ہوں۔ اس چہرے کو پڑھ رہی ہوں۔ مجھے کچھ اور جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ زندگی صرف ایک بار جینے کے لئے ہے اذہان! اسے فضول کے سمجھو توں کی اندرمت کرو جن کو کر کے تم خوش نہ رہ سکو۔“ ساہیہ بہت کچھ سمجھانا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ مسکرا دیا تھا۔

”نہیں ساہیہ! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس اس راہ پر واپس جانے کے لئے کوئی لمحہ نہیں ہے۔“

”تم ایسا اس لئے کر رہے ہو کہ تم اپنی فیملی کے لئے بہت زیادہ جذباتی ہو؟ خود سے زیادہ ان کے لئے سوچتے ہو؟“ وہ فوری طور پر بولی تھی اور اذہان کچھ بول نہیں سکا تھا۔

”اذہان! سچ بتاؤ۔ کیا تمہارا دل اب بھی وہ خواب نہیں دیکھتا؟ نظریں اس چہرے کو دیکھنے کی ضد نہیں کرتیں؟ یا یہ سب جھوٹ ہے؟ تمہیں اب بھی کوئی جادوئی چھڑی ہاتھ لگے تو کیا تم اس زندگی کو واپس موڑ کر وہیں سے شروع کرنا نہیں چاہو گے، پھر اسی موڑ سے اسی مقام سے؟“ ساہیہ اسے حیران چھوڑ گئی تھی۔ اذہان کچھ بول نہیں سکا تھا اور وہ کہہ رہی تھی۔

بعض اوقات جن سے محبت کی جاتی ہے وہ بہت گہرے دکھ سے دوچار کرتے ہیں۔ ساہیہ کے

اس وقت کوئی دوسری راہ نہیں تھی ماسوائے اس کے کہ وہ وہاں ر کے اور اذہان حسن بخاری کی ساری باتوں کو سنے۔ حالانکہ تو اس میں ہمت تھی نہ ہی حوصلہ۔ اس کے وجود کی عمارت گرنے کو تھی۔ مگر وہ کھڑی اور اذہان حسن بخاری کی سمت دیکھ رہی تھی، جیسے شاید اس کی کوئی پروا نہ تھی یا پھر بہت زیادہ تھی، تمام حقائق اس کے سامنے پیش کرنا چاہ رہا تھا۔ شاید وہ اس کی ضرورت بہت زیادہ محسوس کر رہا تھا۔ اسے کیسے سمجھاتی کہ وہ یہ سب سننا نہیں چاہتی ہے۔

وہ یہ سب نہیں سن سکتی ہے۔

اس میں حوصلہ نہیں ہے۔

اور شاید ہمت بھی نہیں۔

مگر یہ بات وہ کیوں نہیں سمجھ رہا تھا۔

کیوں نہیں سمجھ رہا تھا کہ دکھ کی گہرائیاں اتھاہ ہوتی ہیں اور نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہوتی۔

”ساہیہ! میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ.....“ ساہیہ نے ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا اور سرفنی میں ہلاتے ہوئے بولی تھی۔

”نہیں اذہان! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے کل سے مجھے کچھ سروکار نہیں ہے۔ اگر تمہارے میں کوئی غلش ہے تو اس کا سدباب کرو۔ مجھے ان وضاحتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ جو میرا نہیں وہ میں لے سکتی۔ جو میرا ہے مجھے وہ چاہئے۔ مجھے تمہارا کل نہیں، آج چاہئے اذہان! میں تمہارے آج کے دکھ باٹھنا چاہتی ہوں۔ جو کل تم نے پتا دیا وہ پتا دیا۔ میں نہیں جانتی تم ایسا کیوں چاہتے ہو۔ مگر مجھے اس سنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر مجھے فرق ضرور پڑے گا اگر تم اپنے کل سے کبھی آزاد ہی نہ ہو سکو۔“

”یہی تو ساہیہ! یہی تو میں نہیں چاہتا ہوں۔ میں خود کو اپنے کل سے آزاد کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ میرے کل کی پرچھائیاں کہیں تمہیں میرے آنے والے کل میں مجھ بدگمان نہ کر دیں۔ کہیں وہ دل جو آج میری چارہ گری کر رہا ہے، میری دل جوئی کر رہا ہے وہ کل کسی سے دوچار نہ ہو جائے۔ اسی لئے۔ اسی لئے میں چاہتا ہوں ساہیہ کہ تم سب باتیں جان لو۔“

ساہیہ بہت کرب سے مسکرائی تھی۔

”تم مجھے ایک خشکی لڑکی تصور کر رہے ہو؟“

”اذہان! کچھ وقت اور دو محبت کو۔ خود کو۔ اس حد تک کہ یا تو تم اسے بھول جاؤ یا پھر
 دائرے سے باہر آ جاؤ یا پھر اس تک پہنچ جاؤ۔“
 اذہان مسکرا دیا تھا پھر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا تھا۔
 ”تم غلط سمجھ رہی ہو ساہیہ!۔ بالکل غلط۔ اگر میں نے کوئی فیصلہ لینا ہوتا تو لے چکا ہوتا۔
 کرنا تھا میں کر چکا ہوں۔ تم اگر یہ سمجھ رہی ہو کہ میں اس رشتے کو نباہ نہیں پاؤں گا تو تمہارے یہ ہمارے
 قیاس بے بنیاد ہیں۔ میں نے تم سے بندھن باندھنے کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے اور اس کے لئے
 مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری انگلیج منٹ اپنے وقت پر ہی ہوگی۔“ اذہان حسن
 نے ایک لمحے میں فیصلہ لیا تھا اور پلٹ کر چلتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا۔
 ساہیہ اپنے خدشات کے ساتھ وہاں کھڑی اس خالی خالی منظر کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ یہ نہیں
 ٹھیک طور پر سمجھا بھی پار ہی تھی کہ نہیں یا وہ سمجھتے ہوئے نہیں سمجھ رہا تھا۔
 وہ اپنے لئے نہیں، صرف اور صرف اس کے لئے پریشان تھی۔ مگر یہ بات وہ اسے کیسے بتاتی کہ
 نقصان سہہ کر بھی صرف اس کا فائدہ چاہتی ہے۔



ردائے زخم تازہ

اوڑھ کر میں بھی

سر شہر تہنا

طاق دل پر

اک دیا اپنے لبوں سے

اور روشن کر رہا ہوں

سنا ہے غم گساری کا کوئی موسم

میری دلہیز تک بھی

آنے والا ہے

اُسے نہیں امید تھی کہ وہ بچ جائے گی یا وہ اسے بچالے گا۔ مگر ایسا ہو چکا تھا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا
 کہ سردار بستکین حیدر لغاری اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کو ہاتھ میں لئے، مکمل توجہ سے دیکھ رہا تھا
 ”میرب!۔ آر یو آل رائٹ؟“ میرب کے دیکھنے پر اس نے یوں دریافت کیا تھا جیسے اس
 بہت پرواہ ہو۔ کتنا بڑا ڈرامہ تھا یہ شخص۔ تاثرات بدلنا اس کے لئے مشکل نہ تھا۔ وہ کسی بھی سبب
 میں ڈھل سکتا تھا، کوئی بھی روپ اختیار کر سکتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ میرب سیال کے دل میں گھر نہیں
 سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اسے سمجھ گئی تھی۔ بارہا اعتبار کر کے دیکھ چکی تھی۔ اور اب۔۔۔ شاید مزید اعتبار کی
 صورت نہ تھی۔ وہ اس کے باعث کوئی اور نقصان نہیں اٹھا سکتی تھی، اس لئے اٹھنا چاہتا تھا مگر سر بری طم
 چکرایا تھا اور سردار بستکین حیدر لغاری نے اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا تھا۔ بھیکے ہوئے اس موسم

ہے شعلوں نے چھو لیا تھا۔ وہ ایک لمحے میں واپس پیچھے ہی تھی مگر سردار بستکین حیدر لغاری نے اسے
 آہنی حصار سے آزاد نہیں کیا تھا۔
 وہ بدستور ان بازوؤں کے گھیرے میں تھی۔
 دل کی دھڑکنوں کا ارتعاش کچھ بڑھا تھا۔
 دردن جان کوئی جادو سا پھیلا تھا۔
 کوئی ان جانا احساس۔
 یہ نہیں یہ جادو موسم کا تھا یا اس کے اندر ہی کوئی لہرا تھی تھی۔
 کوئی فسوں سا اس کے اندر دوڑتا بھاگتا محسوس ہوا تھا۔
 نگاہ ایک پل میں گریز پائی برتنے پر مجبور ہوئی تھی۔
 سردار بستکین حیدر لغاری نے اس کمزور پتے کی سی مانند کانپتے وجود کو بغور دیکھا تھا۔ نگاہ گرمی شوق
 ہونے لگی تھی۔ بارش انہیں تیزی سے بھگور رہی تھی مگر سردار بستکین حیدر لغاری کو جیسے احساس تک نہ تھا۔ وہ
 خ انداز میں کانپ رہی تھی مگر وہ جیسے کسی بے خودی کے زیر اثر تھا۔
 نہ کوئی دوسری بات سوچ رہا تھا نہ سمجھ رہا تھا۔ شاید وہ کسی ایسے ہی احساس کے زیر خود کو محسوس کر
 تھا۔ شاید کوئی جادو سا دبے پاؤں اس کے اندر بھی پھیل رہا تھا۔

شاید کوئی ان چھووا احساس اس کے دل کو بھی اپنے حصار میں لے رہا تھا۔ میرب سیال کی نگاہ اٹھ نہ
 پاتھی کہ مقابل دیکھنے والی نگاہ میں تیش ہی اس قدر تھی۔ اس بھگتے موسم کی خلتی بھی جیسے ایک لمحے میں
 ٹپھوٹی۔

سردار بستکین حیدر لغاری نے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو بہت آہستگی سے چھوا تھا۔ شاید وہ ان
 ہرے گھون میں کوئی نئی کہانی لکھنا چاہ رہا تھا یا پھر کوئی نیا تجربہ کرنے کے درپے تھے۔ وہ اس بات سے
 عا بے خبر تھا کہ مقابل کھڑی اس نازک سی لڑکی کی جان کس درجہ قیامت میں گھری ہوئی تھی۔ وہ مکمل طور
 بے خبر تھا شاید۔۔۔ یا پھر جانتے بوجھتے ان فسوں خیز لمحوں کی رفاقت کو بڑھانے کے درپے تھے۔ وہ
 رنی تیش نگاہ جیسے کچھ کہہ رہی تھی۔ خاموشی ہی جیسے بول رہی تھی۔ فضا میں عجب ایک آہنگ سا تھا۔ ہوا کا
 مٹی بر فسوں تھا۔

وصال موسم

تمہارے ابرو کے اک اک اشارے کا منتظر ہے

نظر اٹھاؤ

اور اپنے رستوں پہ کھلنے والے

گلاب دیکھو

ساعتوں سے کہو، غموشی

نگاہ اور آئینے کے مابین

خُن کا آغاز کر رہی ہے

ہوا سے پوچھو

وہ کس بدن کی مہک سے پیہم الجھ رہی ہے

سنو یہ موسم وصال کا ہے

سواں کو یوں رائیگاں نہ جانو

کچھ تھا

اس فضا میں

ہوا میں

کوئی الوہی احساس

شاید ننگی

یا پھر کوئی اسم

یا شاید نشہ

کچھ تھا۔۔۔ کہ سارا منظر خواب نگر کا سا تھا

نگاہ کو جو بھی۔۔۔ جہاں تک بھی دکھائی دے رہا تھا

حد نگاہ تک۔۔۔ صرف جاوہی جاوہی تھا

اس لمحے کے زیر شاید دل بھی تھے

صرف وہی نہیں

سردار سبکدین حیدر لغاری بھی غالباً اسی ماحول کے تابع تھا۔ اس کی خود کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

ان نگاہوں کی پیش اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ ان نگاہوں کی وارفتگی وہ دیکھ نہیں رہی تھی۔ مگر

سبکدین حیدر لغاری نے بے خودی کے احساس سے چور اس کے چہرے پر اپنا چہرہ بھکایا تھا۔

وہ لمحہ اس خواب سے جاگنے کا تھا۔ اس سارے طلسمی ماحول سے باہر آنے کا تھا۔ وہ ایک لمحے میں۔

بنے اس حصار کو توڑ کر باہر نکلی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ جاوہی لمحہ اپنے رنگین پرسمیت کر خواب

سمت واپس لوٹ گیا تھا۔ لٹے قدموں واپس چلتے ہوئے اپنے عین سامنے کھڑے اس لمبے چوڑے

دیکھا تھا جس کی گرم سانہوں کی پیش اب بھی وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔

جس کا لمس اس کے ارد گرد حصار بنا اب بھی لپٹا ہوا تھا۔

اور جو کھڑا اب بھی اس کی سمت اس ایک خاص تاثر سے متوجہ تھا۔

وہ یکدم پٹی تھی اور بھاگتی ہوئی اس ماحول سے دور نکلنے لگی تھی۔

یہ دنیا اس کی نہیں تھی۔

خواب بھی اس کے نہیں تھے۔

یہ نگر اس کے لئے نہیں تھا۔

سب کچھ بے پناہ دلکش تھا۔

دل فریب تھا۔

مگر فقط دھوکا تھا۔ صرف فریب۔۔۔

اور وہ بار بار یہ فریب کھانا نہیں چاہتی تھی۔

خواب کچھ بکھرے ہوئے سے خواب ہیں

کچھ ادھوری خواہش

تشہ لب آوارگی کے روز و شب

ایک قدموں سے تھکن لپٹی ہوئی

ایک گہری بے یقینی کے نقوش

جانے کب سے دو دلوں پر خبت ہیں

رات ہے اور دوسووں کی یورشیں

یہ اچانک

طاق پہ جلتے دینے کو کیا ہوا

صبح ہونے میں تو خاصی دیر ہے

آئیے اور عکس میں دوری ہے، کیوں

روح پیاسی ہے ازل سے

درمیاں تاخیر کا اک دشت ہے

ناگہاں پھر ناگہاں۔۔۔

یہ وہی دستک، وہی آہٹ تو ہے

ہاں! گلدان دوریوں، مجبور یوں کے درمیاں

کون آئے گا چلو پھر چلیں

شاید اس کو یاد آئے کوئی بھولی بسری بات

وہ درپچہ بند ہے تو کیا ہوا

چاند ہے اس بام پہ جاگا ہوا

عفتان علی خان سر جھکائے بہت چپ چاپ سا بیٹھا تھا جب لامع حق نے اس کے قریب آ کر رکھے

ہوئے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ بہت ڈسٹرب لگ رہے ہو؟“

عفتان علی خان نے بنا اس کی سمت دیکھے سرنفی میں ہلا دیا تھا اور لامع حق اس کی طرف دیکھتی ہوئی

جانے کیوں مسکائی تھی۔

لامعہ حق نے سرنئی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔ ہمارے درمیان کبھی کوئی ایسی بات ڈسکس نہیں ہوئی۔ انا بیہ نے مجھے غالباً کبھی نہیں یا کہ وہ کسی سے اس طور انوالو بھی ہے۔ حالانکہ میں اسے بچپن سے جانتی ہوں۔ اس کی زندگی کا کوئی دشتہ مجھ سے چھپا نہیں۔ مگر ہو سکتا ہے کہ یہ بات وہ مجھ سے ڈسکس کرنا مناسب نہ سمجھتی ہو۔ ہوتا ہے ایسا بھی۔ بعض اوقات بہت سی باتیں دوستوں میں بھی کھل نہیں پاتیں۔ اور محبت۔ شاید وہی ایسا ہی نجی معاملہ ہے۔“

”تو تم بھی اسے نہیں جانتی ہو۔“

عفتان علی خان سرنئی میں ہلاتا ہوا درمیان میں نظر پھیر گیا تھا۔ عجیب منتشر سا انداز تھا۔ لامعہ حق اس انداز سے سمجھ نہیں پاتی تھی کہ وہ کیا چاہ رہا تھا۔ اگر اسے اس شخص کے متعلق علم ہو بھی جاتا تو وہ کیا بات کیا اس کا جاننا ضروری تھا کہ وہ کون تھا؟

”تم یہ کیوں جانتا چاہتے ہو عفتان! کہ وہ کون ہے؟ کیا اس کا ہونا اتنا ہی ضروری ہے تمہارے لیے؟“

”اوں۔ ہوں۔ میرے لئے نہیں۔ انا بیہ شاہ کے لئے۔“ سرائکار میں ہلاتے ہوئے اوضاحت دی تھی۔ ”وہ جو کوئی بھی ہے، اس کا ہونا یا نہ ہونا انا بیہ کے لئے ضروری ہے۔“

”فرض کرو، تمہیں اس شخص کے متعلق پتہ چل جائے تو کیا تم انا بیہ کا ہاتھ اسے سوئپ دو گے؟“ لامعہ نے کریدتا تھا۔ عفتان علی خان ہنس دیا تھا۔

”گولی مار دوں گا اسے۔ ہماری زندگی کوئی فلمی کہانی نہیں ہے لامعہ! جس میں لوگوں کی ہمدردیاں بٹنے کو میں اپنی بیوی کا ہاتھ اس کے عاشق کے ہاتھ میں سوئپ دوں گا۔“ مسکراتے ہوئے سرنئی میں ہلایا اور دوبارہ ہنس دیا تھا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ زندگی کوئی فلم نہیں ہے۔ ریل لائف میں ریل پر اہلم ہے۔ مجھے تو یہ احساس بھی سونے نہیں دیتا کہ اس کے دل میں کوئی اور ہے اور وہ جن حالات سے بھی رہی، جس طرح بھی مجھ تک پہنچی، میرے لئے وہ قابل قبول ہے۔ مگر وہ کسی اور کو چاہتی ہے۔“

تاکرتی ہے۔ یہ قبول نہیں کر پارہا ہوں میں۔“ مدھم لہجے میں کاٹچ ٹوٹنے کی صدا تھی۔ سر جھکانے ابلوتا ہوا وہ اس لمحے بہت کمزور، پسا اور شکست خوردہ لگ رہا تھا۔

”میں ہار چکا ہوں۔ مکمل طور پر ہار چکا ہوں۔ میں تب بھی نہیں ہارا، جب وہ اچانک زینت ہو گئی۔ تب بھی نہیں ہارا جب وہ چوبیس گھنٹوں تک نہیں ملی۔ تب بھی نہیں ہارا جب اس کے زندگی سے خالی وجود کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر ہاسپل کی طرف بھاگا تھا۔ میں تب بھی نہیں ہارا۔ یہ وہ اپنی زندگی ہار چکی تھی، اس کی سانسیں ختم چکی تھیں۔ جب میں دل ہی دل میں گڑگڑا کر اس کے دیوانہ وار زندگی کی دعا مانگ رہا تھا۔ میں تب بھی نہیں ہارا جب وہ مسلسل مجھے رنجیکٹ کرتی۔ میری محبت کو نظر انداز کرتی رہی۔ میں تب بھی نہیں ہارا۔ مگر میں ہار گیا جب اس نے کہا کہ اس کے

”یکطرفہ محبت بہت تکلیف دیتی ہے نا؟۔ دردنا قابل برداشت ہوتا ہے نا؟۔ تو پھر پھر جاری کیوں رہتا ہے؟۔ ہم ایسا کرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“

اس کے قیاس پر عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”محبت یکطرفہ ہو یا دوطرف۔ دونوں ہی طرح سے تکلیف دیتی ہے۔ اس کا ہونا بھی تڑپ اور نہ ہونا بھی کک۔ یہ ہر طرح سے جلاتا، تڑپاتا احساس ہے۔ مگر۔ یہی راحت بھی ہے۔“

”ایک بات پوچھوں؟“ لامعہ حق نے بہت آہستگی سے دریافت کیا تھا۔ پھر اس کے جواب کا ان کے بغیر بولی تھی۔ ”اگر انا بیہ کے ساتھ وہ صورت حال پیش نہ آتی تو کیا تب بھی تم اسے اپنی زندگی شامل کر لیتے؟۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تم سے محبت نہیں کرتی؟“

لامعہ حق کا سوال بہت کڑوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود کڑوی کیسی اس کافی سے بھی زیادہ تڑپ اس میں حقائق موجود تھے۔ وہ حقائق جن سے شاید وہ خود بھی بھاگنا چاہتا تھا۔

انا بیہ شاہ اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔ کربھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی زندگی میں کوئی اور تھا۔ کوئی دوسرا۔ جس کی جگہ اس کے دل میں پہلے سے موجود تھی۔ جسے وہ پتہ نہیں کب سے چاہتی تھی؟

وہ۔۔۔ جانے وہ کیوں دیوانہ ہو گیا تھا۔

کیوں اسے دیکھتے ہی بے خود ہو گیا تھا۔

کچھ یاد ہی نہ رہا تھا۔

اور جب جاگا تھا۔۔۔ تو وہ نہ رہا تھا۔

اور تب کیا ہو سکتا تھا۔

اب بھی جو اس نے کیا تھا، وہ خود نہیں جانتا تھا اس نے کیوں کیا تھا۔ اس فیصلے کو لینے کی تمام ذمہ داری اس کے سر تھی۔ وہ اپنے خاندان کا اکلوتا بیٹا تھا اور اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلے کے لئے اسے صرف اپنی من مانی کی تھی ماں، پاپا نے یہ جان کر نہ ٹوکا تھا کہ شاید اس میں اس کی خوشی ہے۔ اور اس کو کہاں تھی؟

کیا وہ خوشی حاصل کر پایا تھا؟۔ اس تعلق کو جوڑ کر ایک دن بھی سکون سے سو پایا تھا؟

اس نے بہت آہستگی سے سرنئی میں ہلایا تھا۔

”پتہ نہیں، شاید میں نے ایسا کبھی سوچا نہیں۔“ عفتان علی خان کا لہجہ ایسا مدھم تھا جیسے آواز کسی نے آہنی ہو۔

”لامعہ! ایک بات پوچھوں؟“

”ہوں۔“

”کیا تم جانتی ہو وہ کون ہے؟“ نگاہوں میں عجیب ایک کرب سا تھا۔

”کون؟۔ کس کی بات کر رہے ہو؟“ لامعہ چونکی تھی۔

”وہی، جس سے انا بیہ محبت کرتی ہے۔“ جملہ میں شاید پھانس تھی جو حلق میں کہیں اٹکتا ہوا محسوس

دل میں کوئی اور ہے۔ اس کی ساری محبت کسی اور کے لئے ہے۔ میں ہار گیا، ایک دم میرے اندر کی تمام توانائیاں ایک لمحے میں ختم ہو گئیں اور مجھے لگا میں اب کبھی نہیں لڑ سکوں گا۔ جانتی لیکن اس نے میرے جینے کا جواز ختم کر دیا ہے۔ مجھے ختم کر دیا ہے۔ میں دن رات سوچتا ہوں ہے وہ شخص جسے وہ سوچتی ہے؟ جانتی ہے۔ چاہتی ہے۔ کیا وہ اسے مجھ سے زیادہ ہے؟ کیا مجھ سے زیادہ اس کی فکر کرتا ہے؟ کیا مجھ سے زیادہ پیار کرتا ہے؟ سوچتا ہوں اور کوئی جواب نہیں پاتا۔ شاید اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ اس کے پاس مگر وہ مجھے بتاتی نہیں ہے۔ اور میں اس سے سننے کا منتظر ہوں۔ کیونکہ یہ ہار بہت عجیب ہے۔ پسا کر دیا ہے مجھے اس نے۔ مگر اب بھی کہیں اندر سے اک آواز مجھے اُکساتی ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں جیت کر لوں۔ میں ہار نہیں ہوں۔ کیونکہ میں جی رہا ہوں ابھی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ جھوٹ ہے۔ اُس نے مجھے مار دیا ہے۔ مگر وہ جانتی نہیں۔ تم اسے بتاؤ نا۔ سمجھاؤ اسے۔ کہو کہ عفتنان علی خان کا جینا اور اس کے بغیر جینا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ اور میں واقعی جیت رہا ہوں۔ شاید واقعی ہار چکا ہوں۔ مگر ماننا نہیں چاہتا۔

یہ ہار عجیب سی ہوتی ہے

میں ہارا ہوں

پر مانوں کیوں؟

یہ ہار عجیب سی ہوتی ہے

جیسے اندر ٹوٹے کچھ

میں ہارا ہوں پر مانوں کیوں؟

یہ ہار عجیب سی ہوتی ہے

یہ ہار واقعی بہت عجیب ہے لامعہ حق! "لبوں پر ایک دم توڑنا تبسم تھا۔

محبت کیا واقعی اتنی عجیب اور انقلابی نوعیت کی ہوتی ہے؟ سدا کے زندگی سے بھر پور عفتنان نے دیکھتے ہوئے لامعہ حق سوچ رہی تھی۔ ایسا اور کیا تھا اس میں جس نے عفتنان علی خان جیسے شخص کو دیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی لیکن اپنے طور پر کوئی جواب نہیں پا رہی تھی۔ شاید محبت ایسے ہی کسی خاص ساکت لمحے میں وقوع پذیر ہوتی تھی۔ اتنی خاموشی سے کہ خود کو بھی خبر نہ ہو سکے۔ وہ خود بھی تو اسی کے زیر تھی۔ سامنے بیٹھا شخص اس لئے بھی حد درجہ اہم تھا۔ کیوں تھا؟ کس لئے تھا؟ کب سے کچھ نہیں جانتی تھی۔ مگر اس کے بناء کچھ دشوار سا تھا۔ اور یہ بات وہ اسے بتانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر شکست پر خود کو بھی اسی قدر شکست خوردہ محسوس کر رہی تھی۔ غالباً وہ اس کی وہ پسپائی، وہ تھکن چاہتی تھی۔ سچی ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔

عفتنان علی خان مسکرا دیا تھا۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟" کیا میری کہانیاں اتنی دردناک ہے؟" پھر یک دم ہنس دیا تھا۔

تمہاری یادوں کے نرم جھوٹے

اُداس شاموں کے زرد ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے

سفر سے لوٹے

تو میں نے دیکھا شکستہ گھر کا اجاز آنگن

ہمک اٹھا ہے

عذاب جاں کے جو سلسلے تھے وہ ٹل گئے ہیں

ہوائے ہجر اس سمٹ گئی ہے

درون دل پھر

تمہارے قدموں کی دھبی دھبی سی چاپ اُبھری

تو میں یہ سمجھا وصال کی شہ گھڑی

بس آیا ہی چاہتی ہے

مگر یہ وہ ہم وگماں کی رت ہے

عجب نہیں کہ تمہارے لمس بدن کا نشہ

جو میری آنکھوں کی نیم خوابی سے کھیلتا ہے

سراب نکلے

اور اس سے گہرا عذاب نکلے

جو میں نے اب تک نہیں سہا ہے

سے یہ راز دل میں دبائے بیٹھی ہو؟ — کب سے دلوں سے بوندیں سمیٹ رہی ہو اور ہواؤں پر خربک نہیں ہونے دے رہیں۔ مگر ایک بات کہوں۔ ”مدہم سرگوشی میں عجب جنوں خیزی تھی۔ نگاہ میں اڑتی سی تھی۔“

”تمہارے بنا کہے بھی میری نگاہ وہ بھید پانگی ہے — تمہارے دل کی دھڑکنوں نے جو راز اپنے درد بار کھے تھے وہ گہرے راز میرے دل تک پہنچ گئے ہیں۔ تمہاری ان کہی کے بھید میں پارہا ہوں۔ ان ہوں کو پڑھ رہا ہوں — تمہاری ان قربتوں کی مہک بھی تیار ہی ہے کہ تمہیں محبت ہو چکی ہے۔ بہت لاک ہونم — نظر بچا کے گزرنے لگی ہو، راہ بدلنے لگی ہو۔ مگر فضاؤں میں پھیلتے اس احساس کو چھپا نہیں روک سکیں۔ چھپاتیں بھی کیسے؟ — خوشبو ہی تھی۔ پھیلنا تھی، ہر سو پھیل گئی — میرے دل لپچھپچا تھی، سوچنے لگی۔“ اس کا مدہم لہجہ فضاؤں میں بھی الاؤ دہکا سکتا تھا۔ توجہ قابل دید تھی۔ دعوے بلا لے تھے۔

مگر میرب سیال کی منزل یہ نہیں تھی، وہ جانتی تھی۔ تمام تر دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے وہ جیبر کھینچ کر دم نہیں تھی۔ ارادہ وہاں سے فرار کا تھا۔ مگر سردار سبکدین حیدر لغاری اسے زنج کرنے کا کوئی لمحہ ہاتھ سے لے نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ شاطر تھا۔ جانتا تھا کون سا لمحہ وار کا ہے، کون سا لمحہ پسپائی دے سکتا ہے اور ان سا لمحہ فاتح بنا سکتا ہے۔ میرب سیال کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور ایک مدہم سرگوشی اس کے گرد لپچھپچا پنا حصار باندھ رہی تھی۔

”فکلت خوردہ ہو، پسپا ہو، دل اختیار سے باہر ہو رہا ہے، سننے کے لئے تیار ہوں۔“ اس لہجے میں پورے یقین تھا۔

”کہو کہ میرے بنا دل نہیں لگ رہا — دھڑکنوں میں پلپل ہے۔ کوئی خاص بات ہے، تم کہہ دو، آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گا۔ کیا کروں، اعتبار کے سوا کوئی چارہ جو نہیں۔ تم نے عجب اک حصار بچا ہے۔ فرار کی کوئی راہ چھوڑی ہی نہیں — آج اگر تم جو مشکلوں میں گھری قیامتوں کے زیر کھڑی تصور کر سکا ہے؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری کی سمت اس کا چہرہ نہ تھا اور وہ صد شکر کرتی ہوئی آنکھیں لپکتی تھی۔ مگر سردار سبکدین حیدر لغاری کو اسے مشکلات میں گھیر ڈالنا اچھا لگتا تھا۔ تبھی وہ چلتا ہوا اس کے سامنے آن رکھا تھا۔ نگاہ کی دیوانگی قابل دید تھی۔ وہ میرب سیال کو اس طرح پُرشوق انداز میں دیکھ رہا تھا، آج سے قبل کبھی نہ دیکھا ہو۔

”اس دل کا نا —؟“ بغور اسے دیکھتے ہوئے شہادت کی انگلی اس کے دل پر رکھی تھی۔ میرب سیال نے اس کی نگاہ اٹھا کر اس کی سمت تکتے لگی تھی۔

”یہی دل ہے نا — جو اب تمہارا نہیں رہا۔ پریشان ہو کہ پرایا ہو گیا۔“ مسکراتے ہوئے پتہ نہیں لاس نے سرنئی میں ہلایا تھا اور پھر یکدم ہنس دیا تھا۔ میرب سیال اس شخص کی بدلتی کیفیات کی عادی — مگر اس لمحے وہ اس سے اس قدر قطعاً ایکسپکٹ نہیں کر رہی تھی۔ تبھی بہت حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ”اوہ، تو وہ اس کی عقل پر ماتم کر رہا تھا۔ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس کے جذبات و احساسات کو

میرب سیال نے اپنی زندگی کا لائحہ عمل ایک دم ہی نئے طور پر مرتب کر لیا تھا اور وہ مصروفیات ترک کر دی تھیں جو اسے اس گھر میں انوالور کھنے پر مجبور کرتے ہوئے مزید زکرتھیں۔ اس نے اپنے طور پر نئی مصروفیات ڈھونڈ کر خود کو کچھ اس طرح مصروف کرنا چاہا تھا کہ نہ سے کوئی سامنا ہو، نہ واسطہ باقی رہے۔ کچھ اور اس کے بس میں نہیں تھا۔ مگر اس کے بس میں تھا طور پر اقدامات کر سکتی تھی۔ سو کر لئے تھے۔ ابھی بھی وہ کیمپس سے ٹولنے کے بعد ایک انفارمیشن کولیکٹ کر رہی تھی جب وہ چلتا ہوا اس کے سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔ اور وہ جو ایک مصروف تھی اس لمحے میں سارا کونفیڈنس سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ نظریں اسے متوجہ ضرور ہوئی تھیں مگر وہ اس کی طرف زیادہ دیر دیکھ نہیں سکی تھی۔

جانے کیا تھا — کیا ہوا تھا اسے۔

کیا تھا اس شخص کی نظروں میں — کہ وہ پہلی سی رہی ہی نہیں تھی۔

کیا تھا اس لمحے میں کہ — اس کا سارا اعتماد اڑ چھو ہو گیا تھا۔

وہ اس شخص سے کئی کترانے لگی تھی۔

نظر چرانے لگی تھی۔

راہ بدل کر گزرنے لگی تھی۔

کوئی نہ سمجھ میں آنے والا لمحہ تھا۔

وہ نظریں جھکائے، عجیب کنفیوژڈ انداز میں ہونق سی بیٹھی تھی۔ ٹیبل پر رکھے اس کے ہا سبکدین حیدر لغاری نے اپنا ہاتھ دھرا تھا اور اس کی جان ایک پل میں مشکلوں سے دو چار کر دی اٹھا کر اس شخص کی سمت دیکھ نہ سکی تھی۔ فرار کی متلاشی نگاہ ادھر ادھر بھٹک رہی تھی جب سردار لغاری نے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو تھاما اور اس کے چہرے کو قدرے اوپر اٹھا کر اسے متوجہ کرتے ہوئے پھر پورے دلچسپی سے دیکھا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

”یہ نگاہ اتنی گریزاں سی کیوں ہے؟ — محبت ہو گئی ہے کیا؟“ وہ اس کی کیفیت سے بھر پور لطف لے رہا تھا۔

”یہ جھکی جھکی سی پلکیں — یہ انداز بے نیازی — یہ چہرے کا تغیر — نگاہ کا اڈ جانا — دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھتا اور نہ دیکھتے ہوئے بھی برابر خبر رکھنا — یہ سارے والے ہی ہیں۔ کہیں دل تو نہیں ہار گئیں؟“ کتنی دلچسپی سے سردار سبکدین حیدر لغاری کی نگاہیں اس کے چہرے کو سطر سطر پڑھ رہی تھیں اور وہ حیران رہ گئی تھی۔ نظر اٹھا کر اپنے بے حد قریب کھڑے دیکھا تھا جو شاید محبت جیسے لفظ کے بچے بھی ٹھیک طرح سے نہ جانتا تھا۔ اور کیسے کیسے انکشافات ”محبت ہو گئی ہے نا؟ — مجھ سے محبت — دریاؤں، سمندروں سے بھی گہری، بہت تمہارا دل وہ گہرے سبز سمندر کی تہہ میں چھپا ہوا سیپ تھا نا جو بارشوں سے واقف تھا نہ موسموں سے، نہ لطف بہار کا تجربہ نہ خزاؤں سے واسطہ — تو پھر اس سبب میں گہر کیسے بنا سوئی؟ —

ٹھوکروں میں رکھ رہا تھا۔ مٹی میں رول رہا تھا، تو ٹھیک سوچا اس نے۔ اگر وہ یا اس کا دل ۔۔۔ ہو جائے
یقیناً اس کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کرتا۔ وہ اس کج ادا سے واقف تھی۔ بھرپور انداز میں جانتی تھی
تجھی اس لئے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا تھا۔
”تمہیں خوش فہموں میں جینے کی عادت ہو چلی ہے سردار سبکدین حیدر لغاری! — اگر تم
احقوں کی جنت میں خوشی خوشی رہنا چاہتے ہو تو شوق سے رہو کیونکہ نہ تو میرا تمہیں بیدار کرنے کا
ہے نہ ہی حقیقت حال سے آگاہ کرنے کی کوئی کوشش میں کرنے والی ہوں۔“ وہ کسی قدر کھردر
میں بولی تھی۔

اندازہ تھا کہ وہ اس خواب سے بیدار ہو جائے گا اور اس کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ مگر یہ کیلے
شخص تو ہنس پڑا تھا۔
”تو سو رہا ہوں میں، وہ بھی احمقوں کی جنت میں۔“ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا تھا۔ ”اس
سٹائش کا انداز خوب تھا۔“ تو خواب ہی دکھا دو کوئی۔“ ایک خاص پیشکش ہوئی تھی۔ ”دیوانہ ہوا
دیوانہ بنا دو۔۔۔ کچھ اور پاگل کر دو۔ کیا حرج ہے اگر کچھ لمحے اور عالم مدہوشی میں بسر ہو جائیں
تیزی کی حدوں کو چھوئے کی سستی تو کی جاسکتی ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ساجد کے پہلی ہی بار کے بعد
کو پالیں۔ ریاضتوں کو عمریں بھی تو درکار ہوتی ہیں۔ اگر بے صبری کا یہی عالم ہے تو ریاضتوں کے
جانے کا احتمال جینے نہیں دے گا۔ کیونکہ یہ نقصان فقط دل کا ہی نہیں جاں کا بھی ہو گا۔ سواتنا ہے
نہ رائیگاں جانو۔۔۔ کہ سو رہا ہوں تو سونے دو۔ اسی طور جینے دو۔“ اس شخص کے لبوں پر
مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں سے ہویدا چمک کوئی بیغام لئے ہوئی تھی۔ مگر میرب سیال نے ڈٹے
ٹھان لی تھی۔

تہاری یاد کے جگنو
پس شام خزاں
پھر جگگا اٹھے
دردول پر چراغ کے جلنے سے کچھ پہلے
گزشتہ عمر کے
کچھ بھولے بسرے وعدہ و پیمان
تمہارے بس کی پر چھائیاں اوڑھے
طواف دل کو آنکے
خیال و خواب کے درپن میں جھلکیں
تمہاری خواب ناک آنکھیں
تمہاری حشر ساماں مسکراہٹ
اور تمہارے قرب کی خوشبو
وہ اس خوشبو میں لودیتا ہوا
اک ادھورے وصل کا امکان
مگر میں تو بہت مدت سے
اپنی رنج ساماں اور بھورتی ہوئی
تمہائی کی زد پر
کتاب زیت کے سب منتشر اوراق جاں کو
اک نئی ترتیب دینے میں مگن تھا
کہ ایسے میں
تمہاری یاد کے جگنو
پس شام خزاں
پھر جگگا اٹھے!

”سردار سبکدین حیدر لغاری! بہت شاطر شخص ہو تم۔ تمہیں ڈور چھوڑ کر ڈھیل دینا بھی آتا ہے اور
ڈور کھینچنا بھی۔ تم ہزار ہا طریقوں سے واقف ہو۔ ہزار روپ ہیں تمہارے۔ کبھی سمجھ میں آئے
بالکل نہیں آتے۔ مگر ایک بات صاف میری سمجھ میں آتی ہے۔“
”کیا؟“ وہ مسکراتے ہوئے یک دم اس کی بات کاٹ کر براہ راست اس کی آنکھوں میں
اس کی جان مشکل میں ڈال گیا تھا۔
”یہ کہ تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔“ وہ پھر اسم گری آزار ہا تھا۔ اپنے ڈھنگ دکھا رہا تھا
سیال اس کی سمت سے نگاہ پھیر گئی تھی۔
”تم صرف دھوکا ہو سردار سبکدین حیدر لغاری! اور یہ بات میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں
کانے کی طرح چیخ دینا جانتے ہو۔ اور مجھے زخم زخم ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“
”اوں ہوں۔۔۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کا چہرہ ہاتھ بڑھا کر اپنی طرف
ہوئے سراٹکار سے ہلایا تھا۔
”میں اتنا برا نہیں ہوں۔ تمہارے قیاس بہت منفی انداز کے ہیں۔ بالکل تمہاری طرح



بعض چیزیں، بعض باتیں، بعض یادیں نہ کبھی زندگی سے خارج ہو پاتی ہیں نہ ہی دماغ چیزوں کے لئے کس کس خانے میں کوئی ”ٹریٹس“ بھی موجود ہیں جن میں دانستہ انہیں ڈال دیا جائے باقی ماندہ جگہ نہ گھیریں۔

اذہان حسن بخاری نے تجزیہ کیا تھا تو ہر شے کو اسی مقام پر پایا تھا۔
ساہیہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ اب کہیں بھی اس کے اندر بھی۔
مگر وہ غلط تھی۔

کہیں نہیں۔۔۔ وہ ہر جگہ تھی۔ وہ وقت دے بھی لیتا خود کو تو شاید وہ اس کے اندر سے باہر اس کی یادوں کے، باتوں کے رنگ بہت گہرے تھے۔ اس کے سبھی نقش بہت گہرے تھے۔۔۔ بعد بار بار بارشیں برسی تھیں۔ کئی لمحے دے پاؤں سر کے تھے مگر وہ معدوم نہیں ہوئی تھی۔

اور شاید ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔۔۔ اپنے اندر جھانکنے کے بعد اسے ایک بار پھر سب بات دکھائی دیا تھا۔ غالباً اب تک وہ بہت بڑا ”پری ٹنڈر“ رہا تھا۔ اپنے طور پر اخذ کرتا رہا تھا کہ ”صورت اختیار میں ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔

وہ ساہیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔۔۔ اسے تھانے کو ہاتھ بڑھا رہا تھا اور اس کے لئے اس کہیں جگہ ہی نہیں تھی۔ تو پھر کیوں تھی یہ جہت مسلسل۔

گروہ بھول نہیں سکتا تھا تو پھر کیوں تھی یہ زندگی بھی؟۔۔۔ جب وہ نہیں تھی، شب رائیگاں؟ سب رائیگاں ہی تھا تو پھر یہ مسلسل ہاتھ پیر مارنا کیا معنی رکھتا تھا۔

وہ کیا چاہتا تھا؟ شاید وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔۔۔ محبت نے اسے جس مقام پر چھوڑا تھا وہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ اب تک اسی تاریکی میں کھڑا تھا۔ نہ اس کے اندر روشنی تھی نہ کوئی نور۔ اس نے خود کو غور سے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ مگر شاید وہ پھر کا ہو چکا تھا۔ اس مقام سے آگے کیسے بڑھتا؟

سب بہلاوے تھے۔۔۔ دھوکا تھا۔۔۔ فریب تھا۔۔۔ جو وہ اب تک خود کو دیتا آیا تھا اسے خود سے بھی زیادہ ضرورت دوسروں کو یہ بتانے کی تھی کہ وہ جی رہا ہے۔ شاید ضرورت دوسروں کو جتانے کی تھی کہ وہ جی سکتا ہے اور اسی کوشش میں وہ مزید کلروں میں بٹ رہا تھا۔

وہ بہت دیر سے کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھ رہا تھا جب اس کے پیچھے آہٹ سی ہوئی تھی۔ پلٹ کر تھا۔ ساہیہ اس کے قریب کھڑی تھی۔ وہ چونکا نہیں تھا اور ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”مجھے لگا تمہیں میری ضرورت ہوگی۔ سو چلی آئی۔“

اذہان حسن بخاری ان تمام لمحوں سے واپس باہر آتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”ایسا تمہارے دل نے کہا؟“

”اوں۔۔۔ ہاں۔“ ساہیہ ہنس پڑی تھی۔ ”ویسے مزے کی بات بتاؤں۔۔۔ میرا دل اکثر سگنلز ہی دیتا ہے۔ اکثر پتہ نہیں چلتا کہ یہ چاہتا کیا ہے اور کیوں چاہتا ہے۔ خیر تم بتاؤ۔“ وہ مکمل

دستانہ انداز میں چھیڑتی ہوئی مسکرا رہی تھی اور اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔
”شاید۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے شانے اچکائیے تھے۔ ”اگر جھاڑ پر چڑھائیو امی خوبصورت لڑکی تم ہو۔“ جواب خلاف توقع تھا ساہیہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”تم ہاکی اور باسکٹ بال ایک ساتھ کھیل رہے ہو۔“ اطلاع دی تھی۔

”اچھا، ہنسی میں کہہ رہا تھا کہ گول ہونے میں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے۔ وہ چونکتا ہوا حیرت سے بھر پورا سگنل کرتا ہوا مسکرایا تھا۔ ساہیہ نے اس کے شانے پر اپنے نازک سے ہاتھ کاٹکا مارا تھا۔
”سدا کے ڈفر ہو تم۔۔۔ کھیلنا تمہیں بالکل بھی نہیں آتا۔“

”ہاں۔۔۔ شاید بھی ہار رہا ہوں۔“ اذہان کے لبوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ نے دم توڑا تھا۔ ساہیہ مسکرا دی تھی۔ پھر حوصلہ بندھاتی ہوئی بولی تھی۔

”تم جیت بھی سکتے ہو۔۔۔ اگر تم یہ تعین کر لو کہ تمہیں درحقیقت کھیلنا کیا ہے۔ ہاکی یا پھر باسکٹ بال؟“ لہجے میں شکستگی ناپید تھی مگر وہ اس کے باوجود کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ ”تمہیں یاد ہے تم جب چھوٹے تھے تو باسکٹ بال کے کتنے برے کھلاڑی تھے۔ تمہیں کھیلنا تب بھی بالکل نہیں آتا تھا۔ یاد ہے فیض چاچا اکثر تمہیں بال ہاتھ میں تھما کر بازوؤں میں اٹھا کر گول کروانے کے لئے اور دوسرے معنوں میں تمہارا دل خوش کرنے کے لئے بال باسکٹ میں ڈلوایا کرتے تھے۔“ ساہیہ نے یاد دلایا تھا اور اذہان نے ایک گہرا کاش لیتے ہوئے سر جھکا کر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ ساتھ ہی مسکرا دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ مجھے تب بھی کھیلنا نہیں آتا تھا۔“ کھلے دل سے تسلیم کیا تھا۔

”اور تمہیں اب بھی کھیلنا نہیں آتا۔“ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے بھر پور تجزیہ کیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ اب بھی نہیں آتا۔“ اذہان حسن بخاری نے ایک بار پھر کھلے دل سے تسلیم کیا تھا۔

”سو ہارنے کا یہ سلسلہ کب تک جاری رکھو گے؟“ ساہیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ اذہان چند ثانیوں تک پوں ہی اس کی سمت خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا دیا تھا۔

”ہوا آسگنل؟ مانی فرینڈ، اور فیائیسی؟“

”فرینڈ۔۔۔ جسٹ فرینڈ۔“ ساہیہ نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تم پھر باسکٹ بال اور ہاکی ایک ساتھ کھیلنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ ساہیہ جتاتی ہوئی کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ اذہان بھی ہنس دیا تھا۔

”ہاں شاید۔“ پھر قدرے توقف سے پوچھا تھا۔ ”تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ اس وقت میں تنہا ہوں اور مجھے کسی اچھے دوست کی ضرورت ہے؟“

”سچ کہوں؟“ ساہیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ ”میرے دل نے۔۔۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرا دل کبھی غلط سگنلز نہیں دیتا۔“ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس لمحے ساہیہ کے لبوں پر تھی اور اذہان

حسن بخاری اس کی جانب سے نگاہ پھیر گیا تھا۔

”اذہان!“ ساہیہ نے اس ساکت ماحول میں بہت آہستگی سے پتھر پھینکا تھا۔

”ہوں۔“

”اگر تمہیں اختیار دیا جائے تو تم اپنی زندگی کو کس رخ پر موڑنا چاہو گے؟ — آگے کی طرف یا پیچھے کی طرف؟“ پتہ نہیں کیا جانے کی خواہش میں وہ بولی تھی۔

اظہان مسکرا دیا تھا۔

”مجھے احمقوں کی جنت میں رہنے کا کوئی خاص تجربہ نہیں۔ ورنہ اس سوال کا جواب بہت پڑ بتاتا۔“ اس نے یکسر مذاق میں ٹالا تھا۔ وہ اس لئے کوئی ثقیل بات انورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اور ساہیہ غالا کی ہر بات کہنے سے قبل جانتی تھی۔ تبھی مسکرا دی تھی۔

”ساہیہ! چلیں؟“ اظہان نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”کہاں؟“ وہ چونکی تھی۔

”اُس کریم کھانے۔ کیوں، تمہارا موڈ نہیں ہے؟“ اس کی حیرت بھری آنکھوں میں جھانکا تھا۔ اگرچہ اس کا موڈ نہیں تھا مگر وہ مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ پتہ نہیں وہ ٹھیک کر رہی غلط نہیں جانتی تھی وہ۔ مگر اس کی دلجوئی کی ضرورت اس وقت ایک دوست کو تھی۔ اور وہ ہاتھ نہیں سکتی تھی۔

ایسا اس کے لئے ممکن بھی نہیں تھا۔

مائی اماں کا فون تھا۔ مگر وہ بہت محتاط انداز میں بات کر رہی تھی۔ غالباً مائی اماں سردار بسکٹین لغاری کے اس آنے والے ”مہمان“ سے آگاہ تھیں۔ اس نے اپنے طور پر کوئی تذکرہ نہیں چھیڑا تھا۔ مہمان کے انداز کی بات کی تھی۔ مائی اماں حسب معمول اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کر رہی تھیں اور اس نے اثبات میں ہلاتے ہوئے فون رکھ دیا تھا۔ چلتی ہوئی لاؤنج میں آ بیٹھی تھی۔ انداز اتنا کھویا کھویا تھا کہ وہاں آنے اور اپنے قریب بیٹھنے کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ جب دھیان پڑا تھا تو گی اس کی طرف دوستانہ انداز میں دیکھتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ میرب سیال کو اس کے ساتھ تعلقات کی نوعیت معلوم نہ تھی اس بات کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے ساتھ اس کے تعلقات کی بیج کیا ہونا چاہئے۔ شاید اس وہ کسی مروت کا مظاہرہ تک نہ کر سکتی تھی۔

”مائی اماں کا فون تھا؟“ گی نے شاید کوئی موضوع گفتگو ڈھونڈا تھا۔ مگر میرب کو اس کا اندازہ کیوں کسی پھر پور تفتیش کا سا لگا تھا۔

”ہاں — تم مائی اماں کے متعلق جانتی ہو؟“ میرب نے شستہ انگریزی میں دریافت کرتے ہوئے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔

گی مسکرا دی تھی۔

”ہاں — گین نے سب کے متعلق بتا رکھا ہے۔“

”سب کے متعلق؟“ حیرت قابل دید تھی۔

”ہوں۔“ گی نرمی سے مسکرائی تھی۔ میرب مکمل طور پر امپرسڈ دکھائی دی تھی۔ یعنی وہ سردار بسکٹین حیدر لغاری کے اس درجہ قریب تھی کہ —

”مگر تم غالباً میرے متعلق نہیں جانتی تھیں۔ ایسا تم نے خود کہا تھا۔“ میرب نے کھر درے لہجے میں مسکرا کر جیسے کوئی گہرا طنز کیا تھا۔ گی لب بلبھیج کر رہ گئی تھی۔ پھر قدرے تو قف سے بولی۔

”ہاں۔ میں واقعی نہیں جانتی تھی۔ مگر اس میں بھی تصور میرا نہ تھا شاید۔ نہ میں کوئی قیاس کر پائی۔ کبھی کوئی اندازہ اور.....“

”رشتہ اپنے اصل خدوخال میں نہ تھا نا؟“ میرب نے تیزی سے اس کی بات کاٹی تھی۔ گی نے اسے دیکھا تھا۔ اس کے لبوں پر بہت پھینکی سی مسکراہٹ تھی۔ شاید اس کی آنکھوں میں نمی بھی آن ٹھہری تھی۔ گی کو ”صورت حال“ کا کسی طور اندازہ ہوا تھا۔ گی بہت ملامت سے مسکرائی تھی۔

”تم گین سے محبت کرتی ہو؟“ کیسا عجب سوال تھا۔ ایک دوسری لڑکی اس کے رشتے کی وضاحت چاہ رہی تھی جو اس کے وابستہ رشتے سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ مگر شاید بہت خاص تعلق رکھتی تھی۔

میرب نے سرد مہری سے گردن پھیرتے ہوئے سر نہی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔ میں گین سے محبت نہیں کرتی۔ میں صرف اس سے وابستہ ہوں۔ کب تک، کتنے دنوں تک؟ — یہ نہیں جانتی۔ مگر اس رشتے کی معیاد کا تعین نہ ہوتے ہوئے بھی اتنا یقین ہے کہ اس کی عمر فقط چند روزہ ہے۔ کیونکہ ریت پر بنے گھر ناپائیدار ہوتے ہیں۔ اور ہمارے رشتے کی بنیاد بھی بہت گہری نہیں پڑی۔“ بہت سرسری انداز میں مطلع کرتے ہوئے میرب سیال یوں مسکرا رہی تھی جیسے کوئی معمول کی بات ہو رہی ہو۔ گی کو اس کے انداز پر کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔ یا تو اس کا حوصلہ بہت زیادہ تھا۔ یا پھر وہ واقعی ایک باہمت لڑکی تھی۔

”تم گین سے اس درجہ بدگمان ہو؟“

”بدگمان؟“ وہ حیرت سے چونکی تھی۔ پھر مسکرا دی تھی۔ ”بدگمان نہیں ہوں میں۔ بدگمانی تو غالباً وہاں ہوتی ہے نا جہاں کوئی تعلق اپنے اصل خدوخال کے ساتھ وقوع پذیر ہو رہا ہو۔ اور ہمارے درمیان رشتے کی تو کوئی ہیئت ہے نہ ہی کوئی وقعت۔ تمہیں پریشانی کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ میرب سیال یقیناً تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ مسکراتے ہوئے یقین دہانی کروائی تھی۔ گی فوری طور پر کچھ بولی نہیں تھی۔

خاموشی سے دیکھتی ہوئی نگاہ پھیر گئی تھی۔ شاید وہ کسی قدر شرمندہ ہو گئی تھی۔ مگر میرب اس درجہ لائق تھی کہ وہ اس طرح کی کسی بات کا اندازہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ خود جن حالات سے گزر رہی تھی اس کے ہوتے ہوئے وہ دوسروں کے احساسات کا خیال کرنا بھول رہی تھی۔ یا پھر اسے رشتوں کو برتاؤ آ رہا تھا۔ وہ ڈھنگ سیکھ رہی تھی، کس تعلق کو کس بیج پر کھنا چاہئے، آگیا تھا اسے۔ اور گی کے ساتھ غالباً اس کا رویہ اسی طرح ہونا چاہئے تھا۔

وہ اس سے حسد محسوس نہیں کر رہی تھی، نہ ہی کوئی خوف۔ حالانکہ وہ اس شخص کے انتہائی قریب واقع ہوئی تھی۔

وہ اس سے حسد محسوس نہیں کر رہی تھی، نہ ہی کوئی خوف۔ حالانکہ وہ اس شخص کے انتہائی قریب واقع ہوئی تھی۔

”میں یہاں قیام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر گین۔۔۔ وہ مانا ہی نہیں۔“ گی پتہ نہیں کیوں اسے وضاحت دے رہی تھی۔ حالانکہ میرب نے تو ایسا کوئی سوال دریافت بھی نہیں کیا تھا۔ شاید اسی لئے لمبے مسکرا دی تھی۔

”اگر گین ایسا چاہتا ہے تو کچھ سوچ کر ہی چاہتا ہوگا۔ اس کے فیصلے اکثر بہت استھنک ہوتے۔ وہ جانتا ہے اسے کیا کرنا ہے۔۔۔ شاید اسی لئے وہ نقصان نہیں اٹھاتا۔“ میرب نے اس کے کئی ایک ساتھ اس کے سامنے پیش کر دیئے تھے اور گی جانے کیوں مسکرا دی تھی۔

”تم گین سے بہت ناراض لگتی ہو۔“

”ناراض؟۔۔۔ نہیں، تم پھر غلط سمجھ رہی ہو۔ ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں کہ ہم دوسرے سے ناراض ہو سکیں۔“

”مگر گین تو کہہ رہا تھا کہ تم دونوں قانونی طور پر ہزبنڈ وائف ہو۔ اگرچہ عملاً تمہاری آمد اس گم نہیں ہوئی۔ مگر تم حق محفوظ رکھتی ہونا۔“ گی جانے اسے کیا جتنا چاہتی تھی۔ یا پھر وہ اس سے اس کے باعث کسی قدر خوفزدہ تھی۔

میرب کسی نتیجے پر پہنچتی ہوئی اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

”تو تم مجھ سے خوف زدہ ہو۔“ بہت اطمینان بھری مسکراہٹ اس کے لبوں پر تھی۔

مگر گی ہنس دی تھی۔

”نہیں۔۔۔ شاید نہیں۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔“ ایک لمحے میں گی کی مسکراہٹ اس کا مزہ چٹتی اور اس کا سارا بھرم ایک لمحے میں جاتا رہا تھا۔ بھلا اسے خوفزدہ ہونے کی ضرورت کیا تھی؟ سبکدین حیدر لغاری جب اس کے ساتھ تھا۔ غالباً خوفزدہ ہونے کی ضرورت تو اسے تھی اور وہ.....

وہ ایک دم اٹھی تھی اور چلتی ہوئی وہاں سے نکل آئی تھی۔ غالباً ان ماسا جہ حالات کا سامنا کرہمت اس میں نہیں تھی۔

گی سے ملنا۔۔۔ اس کے ساتھ بیٹھنا۔۔۔ بات کرنا۔

اسے تو یہ سوچ کر بھی گھن آتی تھی کہ سردار سبکدین حیدر لغاری اس سے اس طور وابستہ تھا۔ اس نے جانے کس کس سے۔۔۔ یہ ایک نشانی عملاً اس کے سامنے تھی۔۔۔ جانے اور کتنی دعوے دار بن کر آم اور وہ کس کس سے لڑتی۔ جس انداز سے سردار سبکدین حیدر لغاری راہ و رسم بڑھانے کا عادی تھا، اگر کئی ایسے ناقابل برداشت رشتے سامنے آسکتے تھے۔ فقط گی پر ہی کیا موقوف تھا۔ اور اگر گی یہاں سبب کون تھا؟

وہی شخص نا۔

اس کی اجازت تھی۔۔۔ اس کے باعث وہ یہاں تھی نا۔۔۔ اور یہی بات ثابت کرتی تھی تصور وار وہ تنہا نہیں تھی۔ کوئی اور بھی اس کے ہمراہ تھا۔

وہ جو ہر بات پر قادر رہتا تھا۔۔۔ وقت کی رفتار جس کے ہاتھ میں تھی۔۔۔ اور جو خود کو حاکم

کرنا تھا۔

”آئی ہیٹ یو سردار سبکدین حیدر لغاری!۔۔۔ نفرت ہے مجھے تم سے۔“ تمام تر غصہ کمرے کے زے پر نکالتی ہوئی وہ بیڈ پر گر گئی تھی۔



وہ آفس میں تھا۔ حالانکہ آفس ٹائم کب کا ختم ہو چکا تھا مگر وہ کچھ اور ٹائم وہاں قیام کرنا چاہتا تھا۔ مگر ماما زان آگیا تھا، مگر میں کچھ مہمان آگئے ہیں۔۔۔ وہ چلا آیا تھا کہ ماں کی بات ٹال نہیں سکتا تھا۔ مگر گھر آ پتہ چلا تھا کہ مہمان بھی اس سے وابستہ تھے جس سے وہ بھاگ رہا تھا۔۔۔ اوزی اور می۔۔۔ مگر وہ یہ شاہ کی بے حسی کا بدلہ ان لوگوں سے نہیں لے سکتا تھا۔ اس لئے وہ اسی طور ان سے ملا تھا۔ اوزی پور شکوہ کر رہا تھا۔

”پارا تم تو دوست ہی زیادہ بھلے تھے۔۔۔ یہ رشتہ کچھ زیادہ راس نہیں آیا۔ ہر روز دور سے دور تر تے جا رہے ہو۔ کہیں یہ انا ہیہ تو تمہیں منع نہیں کرتی؟ خود تو ادھر کارخ کرتی نہیں، تمہیں بھی آنے نہیں نا۔ بزرگ صد فیصد درست فرماتے ہیں کہ شادی کے بعد بندہ دوستوں سے تو جاتا ہی ہے، خود سے بھی نارہا ہے۔“

عفتان علی خان کے پاس مسکرانے کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ انا بیہ شاہ کچھ فاصلے پر بیٹھی اپنی ما سے کچھ بات چیت کر رہی تھی۔ عفتان علی خان کے متوجہ ہونے پر نگاہ لہ بھر کو اس سے ملی تھی۔ اور سرے ہی پل وہ اجنبی بن گئی تھی۔

ماہوش بخاری نے داماد کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا اور محبت سے بولی تھیں۔

”بیٹا! تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ پہلے تم فریش ہو جاؤ۔ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔“ انا بیہ شاہ نے بھکا تھا۔ وہ واقعی اس لمحے کسی قدر تھکن سے چور نظر آ رہا تھا۔ گویا اس لمحے ان کے گرد قیام پذیر ہونا فقط ل کی مروت اور کڑی ہی تھی۔ عفتان علی خان نے وہ احسان مندی سے جھکا ہوا سر دیکھا تھا اور سرانکار ل ہلا دیا تھا۔

”نہیں می! اس کی ضرورت نہیں۔ میں تو شرمندہ ہوں کہ اتنے روز تک آپ کی طرف آنہیں سکا۔“

”بس یارا! اب بہانے بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں ٹو کتنا مصروف ہے۔ اسی لئے ہم ڈوا گئے۔“ اوزی بولا تھا اور وہ مسکرا دیا تھا۔

”ٹو سنا۔۔۔ جا نہیں رہا واپس؟۔۔۔ سنا ہے کوئی لڑکی وڑکی دیکھ لی ہے۔ شادی کا ارادہ اٹھ لیا ہے کیا؟“ اوزی ہنس دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ سوچا تو تھا۔ مگر تیرا حال دیکھ کر ہمت نہیں پڑی۔ سوچ رہا تھا۔ مگر پھر کچھ مصروفیات آڑے آگئیں۔“

”مصروفیات آڑے آگئیں یا اس لڑکی نے ہری جھنڈی دکھا دی؟“ عفتان علی خان نے مسکراتے ہوئے چھینرا تھا۔ اوزی ہنس دیا تھا۔

”میں جانا چاہتی ہوں۔“

عفتان علی خان کچھ بولا نہیں تھا مگر آنکھوں میں تیرتی واضح حیرت یقیناً اس جملے کی وضاحت چاہتی تھی۔

”کچھ..... کچھ دنوں کے لئے..... می کے گھر۔“ انابیہ شاہ نے اپنا دم عابیان کیا تھا۔ عفتان علی خان چند ثانیوں تک خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر شرٹ اتار کر بیڈ پر اچھال دی تھی۔ انابیہ شاہ کے لئے یہ اقدام قدرے تشویش کا باعث بنا تھا۔

ایک..... دو..... تین۔ درمیان کا گز بھر کا فاصلہ ایک لمحے میں سمیٹا تھا اس شخص نے۔ اور انابیہ شاہ کی جان قیامتوں کی نذر کر دی تھی۔ ایک خوف سے بھری نگاہ اٹھی تھی اور دوبارہ جھک گئی تھی۔ عفتان علی خان نے ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تھا اور بغور دیکھتے ہوئے حسی انداز میں کہا تھا۔

”نو۔“

انابیہ شاہ نے کسی درجہ حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”لیکن.....“ کچھ بولا چاہا تھا مگر عفتان علی خان نے ہاتھ اس کے گداز لبوں پر رکھ دیا تھا اور سرفٹی میں ہلاتا ہوا بولا تھا۔

”آئی سیڈ نو..... نو مین جسٹ نو۔“ انداز فیصلہ کن تھا اور وہ استفسار کرنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی استفسار نہ کر سکی تھی۔ کرتی بھی کیسے۔ اس لمحے کیفیت ایسی تھی کہ کان تو بدن میں ابھونک نہیں۔ وہ شخص اس قدر قریب تھا..... بظاہر سردہر تھا مگر سردہر کی باوجود شعلوں کی ایک لپک جو آنکھوں سے ہو رہی تھی وہ دھڑکنوں میں زریو بم پھا کرنے کو کافی تھی۔ انابیہ شاہ کے لئے ان لمحوں کو جھیلنا مشکل ترین تھا۔

”اینی تنگ ابلیس.....؟“ بہت ہی گرم، دہکتی، پرتیش سانس اس کے چہرے پر چھوڑتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ انابیہ شاہ کی جان پر بن آئی تھی۔

یہ لمحے جو گزر رہے تھے..... ”عماتیوں سے بے نیاز“ گزر رہے تھے۔

اور جوان لمحوں پر کوئی ”کرم“ کی ”مہر“ ثبت ہو جاتی تو کیفیت کیا ہوتی۔

یہ تیش..... یہ الاؤ..... ابھی اس طور تھا تو ”نیاز مند“ کے موسموں کی کیفیت.....

”کچھ مزید.....؟“ مزید دریافت کیا گیا تھا۔ لہجہ اس قدر مدہم تھا مگر سرد مہری اسی طور غالب تھی۔

انابیہ شاہ نے نگاہ اٹھا کر اس ”بے نیاز“ شخص کو دیکھا تھا اور سرفٹی میں ہلا دیا تھا۔

”شیدو؟“ عفتان علی خان کو جانے کیوں اس کی یقین دہانی مقصود تھی۔ شاید وہ اس چہرے کو، ان آنکھوں کو بغور پڑھ رہا تھا۔ اور جانتا تھا کہ ایک الجھن متواتر اسے ستا رہی ہے۔ انابیہ شاہ نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا اور پلٹنا چاہا تھا۔ مگر عفتان علی خان نے اس سے قبل ہی ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے فرار کے راستے ایک لمحے میں مسدود کر دیئے تھے۔ انابیہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

”ہاں..... یہ وجہ بھی خاصی معقول ہے۔ مگر اس سے بھی بڑی وجہ پایا نے یہاں برسرِ داری سوئی کر پیدا کر دی۔ اب کچھ ہنر آوازوں تو پھر سوچتا ہوں۔ یوں بھی جب تک لڑکی رام گی، کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے سفید جھنڈی دکھانے کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”ایسی غلطی مت کرنا..... یہ انتظار بہت مہنگا پڑے گا تجھے۔ کیونکہ اس قوم کا کچھ پتہ نہیں چکر میں ٹونہ ہی پڑ تو بہتر ہے۔“ عفتان علی نے نادر مشورے سے نواز اٹھا اور اوزی ہنس پڑا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہا ہے ٹو۔ مگر کیا کروں کجنت اس دل کا..... مانتا ہی نہیں۔“

انابیہ شاہ ان کی گفتگو سے انجان نہ تھی۔

”منالو اے..... اسی میں تمہارا فائدہ ہے اور تمہارے اس دل کا بھی۔“ مسکراتے ہوئے سینے پر ایک محبت بھرا سچ مارا تھا اور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔ ایک سیکیوزی!“ وہ اٹھا تھا۔

”انابیہ بیٹا! دیکھو عفتان کو کسی شے کی ضرورت ہوگی۔“ ماہوش نے بیٹی کو جیسے گہری نیبڑے تھا اور انابیہ شاہ کے لئے اٹھنا جیسے ناگزیر ہو گیا تھا۔ وہ ناچار اٹھی اور قدم اس شخص کے تعاقب دیئے تھے۔ یہ مجبوریاں بھی کبھی کبھی کیا کر وائی ہیں۔ می اگر نہ کہتیں تو غالباً وہ اس شخص کا سامنا پاتی کہ وہ اس کے سائے سے بھی دور رہنا چاہتی تھی۔ آگے بڑھتے قدموں میں کچھ لرزش آ کرے میں پہنچی تو وہ کوٹ اتار کر ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کر رہا تھا۔ انابیہ شاہ دروازے کے پاس رک گیا تھا۔ اس شخص سے ملی ہی نہ تھی۔

وہ جیسے اس کی سمت دیکھنے کی ہمت بھی اپنے اندر نہیں پاتی تھی۔

عفتان علی خان نے اسے بت بنے کھڑا دیکھا تھا۔ شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے ہاتھ لہجہ بھرکا پھر جانے کیوں پیش قدمی کر دی تھی۔ وہ اس کی جان مشکل میں کرنا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر انابیہ شاہ کی جان ہوا ہو گئی تھی۔ سفید شرٹ کے کھلے بٹنوں کے باعث واضح دکھائی دے رہا تھا۔ انابیہ شاہ لرزتی جان سمیٹ کر ایک قدم الٹا ہٹاتی ہوئی پیچھے ہٹی تھی۔

”کیا ہوا؟..... اینی پراہلم؟“ عفتان علی خان اس کے خوف کے اسباب جانے بغیر اس دیکھنے لگا۔ انداز سرسری تھا۔ لگاؤٹ کا کوئی مظاہرہ نہ تھا۔ نہ توجہ قابل دید تھی۔ مگر انابیہ شاہ کو جا پھر بھی دوسری جانب سے ”خطرہ“ محسوس ہو رہا تھا۔

”میں نے پوچھا کوئی مسئلہ ہے؟“ عفتان علی خان نے اس کے جواب نہ دینے پر جھجلا

دریافت کیا تھا۔ انداز میں کسی درجہ اکتاہٹ سی تھی۔

انابیہ نے فوری طور پر سرانکار میں ہلاتے ہوئے ایک نگاہ اسے دیکھا تھا۔

”تو؟“ اس کے وہاں موجود ہونے پر جواز تلاش تھا۔ انابیہ شاہ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔ کوئی جواب پاس تھا نہیں۔ مگر وہ اپنی سبکی نہیں چاہتی تھی۔ یہی خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی تھی۔

نے کی عادت ڈالو۔ شاید اچھا لگے۔ تمہیں بھی اور مجھے بھی۔“ بہت سی باتوں کو باور کراتے ہوئے وہ کے چہرے پر جھکا تھا اور بہت سی گرم گرم پرتیش سانسوں کو اس کے چہرے پر چھوڑتے ہوئے واپس لیا تھا۔
نابیہ شاہ کی کیفیت کسی بُت کی سی تھی۔ غالباً نہیں۔۔۔۔۔ وہ اس لمحے حقیقتاً پتھر ہو چکی تھی۔

”کیا ہوا؟“ ساہیہ بتا رہی تھی کہ تم انگریج منٹ پوسٹ پون کرنا چاہتے ہو؟“ فارحہ نے دریافت نا اور وہ کسی قدر حیران رہ گیا تھا۔ ساہیہ اس وقت وہیں تھی اور ماما کے ساتھ فیشن سے متعلق میگزین لے کر غالباً تقریب کے لئے بنائے جانے والے ڈریسز کے لئے ہیلپ آؤٹ کر رہی تھی۔
اذہان حسن بخاری کی نگاہ اس پر ٹھہر گئی تھی اور وہ مسکرا دیا تھا۔ غالباً فارحہ کو یہ باور کرانے کے لئے کہ ت حال ”انڈر کنٹرول“ ہے۔

”ایسا آپ سے ساہیہ نے کہا؟“
”ہاں۔“ فارحہ نے مہرِ شبت کی تھی۔ ”کیوں، کیا واقعی اس میں صداقت ہے کوئی؟“ ساتھ ہی یقین بھی بنا۔

اذہان مسکرا دیا تھا۔
”بڑی عجیب ہے یہ لڑکی بھی۔ مجھے بھی کچھ ایسے ہی کہہ رہی تھی کہ وہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں اور یہ اذہان کی ڈیٹ پوسٹ پون کر دی جائے۔“ نظروں میں شرارت چمک رہی تھی۔
رحہ چوگی تھیں۔

ساہیہ؟۔۔۔۔۔ بھلا اُسے کیا پر اہلم ہے؟۔۔۔۔۔ ابھی پوچھتی ہوں۔“ پلٹ کر آواز دی تھی۔ ”ساہیہ!“
جی آئی۔۔۔۔۔“
ذرا ادھر آؤ۔“ فارحہ نے کہا تھا اور ساہیہ اٹھ کر چلتی ہوئی اس طرف آ گئی تھی۔ اذہان مسکراتے پھر پورا انداز میں ساہیہ خان کو دیکھ رہا تھا۔

یہ لما کی بیٹی بھی عجیب ہے۔۔۔۔۔ ایک طرف دیکھ کر پروانی سے آؤٹ فٹ ڈیزائن کر رہی ہے
ری طرف تم تم کے فیشن میگزین میں سر کھپا رہی ہے۔ یہ لڑکیوں کو بھی فیشن کا عجیب بخار چڑھا
کچھ سوچتا ہی نہیں۔“ وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے وہ خود تو اس تقریب سے کوئی واسطہ رکھتی ہو نہ
حصہ ہو۔ فارحہ ہی نہیں، اذہان بھی مسکرا دیا تھا۔

بنی!۔۔۔۔۔ آج کل کی بچیوں میں آپ بھی شامل ہوتی ہیں۔ بول تو آپ ایسے رہی ہیں جیسے دادی
پ ہی ہوں۔ سر جھاڑ۔۔۔۔۔ منہ پہاڑ۔۔۔۔۔ آج تک کسی ڈلہن کو اس طرح پھرتے ہم نے بھی
دیکھا۔

ذہان نے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اور ساہیہ اس ڈپٹ پر اسے گھورے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

فارحہ نے محبت سے اسے اپنے پاس بٹھایا تھا۔

کیا۔۔۔۔۔
کیا چاہ رہا تھا یہ شخص۔۔۔۔۔؟
ارادے کیا تھے اس کے۔۔۔۔۔؟

ایک حشر برپا تھا جان میں۔۔۔۔۔ ایک قیامت کے زیر تھی روح۔ مگر مقابل کھڑا وہ شخص
پُرسکون تھا۔ ایک بار پھر اس کا جھکا چہرہ اٹھا کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

”تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟“ پتہ نہیں وہ اس کی الجھنوں کو بڑھانا چاہتا تھا یا کہ گھٹانا۔ وہ قطعاً
رہی تھی۔ مگر وہ اس وقت نارمل کیفیات کے زیر قطعاً نہ تھی اور یہ بات وہ اسے سمجھا نہیں سکتی تھی۔
کے وہ اس لمحے اس کے مقابل تھا۔ اس کی اس کچھ باڈی نمایاں تھی۔ انا بیہ دیکھنا تو کجا، سانس تک نہیں
رہی تھی۔

”میں نے پوچھا تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟“ کسی قدر جھنجھلا کر اس شخص نے دوبارہ دریافت کیا
نے سرفی میں ہلا دیا تھا۔
”نن۔۔۔۔۔ نہیں۔“ اور اس کے انکار پر مقابل کھڑے شخص کو حیرت ہوئی تھی۔

”تو پھر مجھے کیوں لگ رہا ہے؟“ بغور تجزیہ کیا تھا۔
”کیا؟“ وہ جانتی تھی اس کی خاموشی سے اس کو وحشت ہو رہی ہے۔ غالباً انا بیہ نے بولا
خیال کیا تھا مگر لہجہ کا پتہ ہوا سا تھا۔ شاید آواز ہی نہیں، وہ خود بھی کسی شاخ کی مانند کانپ رہی
نہیں عفتان علی خان کو ”صورت حال“ کا اندازہ تھا کہ نہیں۔ وہ اس لمحے بہ غور اس کی جانب
بولا تھا۔

”کہ تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتی کہ تم اس رشتے کو نباتے بنا۔
چکی ہو اور مزید کوئی جبر نہیں سہہ سکتی؟“ اس کی گرم گرم سانسوں سے اپنے چہرے سے نکراتی
تھیں۔ وہ آنکھیں سختی سے میچ کر جیسے ان قیامتوں سے گزرنے کے جتن کر رہی تھی۔ مگر یہ جھپٹا
لے دشوار ترین تھا۔

”مگر ابھی تم نے کچھ جھپٹا ہی کہاں ہے۔۔۔۔۔ سہا ہی کہاں ہے کچھ؟۔۔۔۔۔ ابھی تو سلہ
نہیں ہوا۔ پھر انجام کیسے ممکن ہے؟۔۔۔۔۔ پہلے آغاز تو ہو لینے دو، پھر انجام کی بات بھی کر لیتا۔
قبل از وقت ہے۔ سوخذ نہ کرو۔ کوئی ایسی ضد جو میں پوری پنہ کر سکوں۔ تمہیں ملال ہو اور میں
ہوں کہ تمہاری خوشی کو مقدم نہیں جان سکا۔“ مدہم لہجے میں نہ سمجھ میں آنے والے عہد تھے۔ نگاہ
پرچی ہوئی تھی اور انا بیہ کا سارا وجود جیسے شعلوں کی پلپٹ میں تھا۔ وہ اسی طرز پر اظہار مدعا کر رہا
”تمہاری خوشی بھی پوری ہوگی۔“ سرگوشی ایک نئی نوید بنا رہی تھی۔ ”مگر۔۔۔۔۔ میری
ہونے کے بعد۔“ مضبوط لہجہ اتنا ہی بڑعزم تھا۔

”نہیں چاہتا کہ کوئی گلہ رہے تمہیں۔۔۔۔۔ تم بھی میرا پوری طرح خیال رکھو۔۔۔۔۔ جب
دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ رہنا شرط ہے بالکل جیسے کی طرح۔

اور اس کے اندر جھانک سکتی ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گی۔ اور شاید اس سے زیادہ کی بات بھی نہیں ہے۔ تم سمجھ دار ہو، میری توقع سے زیادہ۔ جاؤ۔۔۔ وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ جانے اس کی بات کا یقین کر لو، میرا یقین کامل ہے۔ تم بھی اپنا دل اس یقین سے بھر لو۔۔۔ جاؤ۔۔۔

ساتھ بچی تھی اور چلتی ہوئی اس شخص کی جانب بڑھنے لگی تھی جو غالباً اس وقت اس کا منتظر تھا۔ فارحہ ہی تھی کہ وہ اپنا دل یقین سے بھر لے۔۔۔ مگر وہ جانتی تھی فی الفور یہ ممکن نہیں تھا۔ در ممکن تو یہ بھی نہیں تھا کہ وہ یہ تعلق باندھ لیتی۔ کتنی مشکلوں سے نبرد آزما تھی وہ۔ مگر وہ ان سب کو کیسے سب کو اس سے تو قعات تھیں۔ مگر وہ اپنے اندر کا کیا کرتی۔۔۔ خود کا کیا کرتی۔

”مئی! ایک بات کہوں؟ آپ کو ڈانٹنا بالکل نہیں آتا۔ ابھی سے ہاتھ کھینچ کر کر کے شکایت مت کیجئے گا، بہو ہاتھ میں نہیں رہی۔“ وہ ملتی پرتیل چھڑک رہا تھا۔ فارحہ نے اس کا

”خیر تو مجھے تیری بھی لیتی ہے۔ مجھے میری بیٹی کے خلاف اکسا کر تو صاف بیچ لٹکانا چاہتا

نے محبت سے ڈپٹا تھا۔ اذہان نے ہنستے ہوئے سر ان کی گود میں رکھ دیا تھا۔

”سب چلے گا۔۔۔ مگر کبھی اپنی بہو کو برتری مت دیجئے گا اس بیٹے پر۔ ابھی سے جلنا

لگی ہے مجھے تو اس سے۔ کہیں یہ میری ماں نہ چھین لے مجھ سے۔“ مسکراتے ہوئے ایک آنکھ

کو دیکھا تھا۔ ساہیہ نے جواباً خطرناک تیوروں سے گھورا تھا۔ اذہان سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

”مئی! آپ بھول گئیں۔ اس سے پوچھئے نا، یہ کیا کہہ رہی تھی۔۔۔ وہ۔۔۔

بات۔“ یاد دلایا تھا۔

”میں پوچھ لوں گی اس سے۔ تم فی الحال جاؤ یہاں سے۔ مجھے بہت سی ضروری

اپنی بیٹی سے۔“ فارحہ نے ساہیہ کو ساتھ بھینچا تھا۔ اذہان مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جاتے

دینا نہیں بھولا تھا۔

”میں باہر گاڑی میں ہوں۔ مئی سے بات مکمل ہو جائے تو آ جانا۔ ورنہ پھر شکایا

کر بیٹھ جاؤ گی کہ کہیں لے کر نہیں جاتا۔“ کہہ کر فوراً پلٹ گیا تھا۔ فارحہ اور ساہیہ مسکرا دی تھیں

”تم خوش ہونا۔؟“ فارحہ نے محبت سے ساہیہ کے چہرے کو ہاتھوں میں لیا تھا۔

ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”ہاں۔“ سر جھکا کر جواب دیا تھا۔

”مجھے علم تھا۔ اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ یہ پوسٹ پون کرنے والی بات بھی صرف

اذہان ہی پھیلا رہا ہے۔ اس میں تمہارا کوئی عمل دخل نہیں۔ ایسا ہے نا؟“ فارحہ نے دریا

ساہیہ اس بار کوئی جواب نہیں دے سکی تھی اور فارحہ اس کے چہرے کو محبت سے سکتے ہوئے

”میں اذہان کی ماں ہوں۔ اور میں کہتی ہوں کہ میں نے آئینج سے قبل کبھی ات

دیکھا۔ وہ اپنے فیصلے پر مطمئن ہے اور قائم بھی۔ باقی سب تو ہنس مذاق ہے۔ جو چلا

ایک بات کا یقین ہے اور وہ یہ کہ تم وہ لڑکی ہو جو اذہان کو بہت خوش رکھ سکتی ہے۔ جو اسے

مگر اس کے باوجود وہ ان راستوں پر چل پڑی تھی۔ کبھی کسی کی خاطر۔۔۔ تو کبھی کسی کی۔۔۔

’کیا ہوا؟‘ کیا کہا مئی نے؟“ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں اپنی طرف کا دروازہ بند کر کے

لی جب اذہان نے اسے کسی قدر تشویش سے دیکھا تھا۔ وہ چونکی تھی اور مسکرا دی تھی۔

’نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔ تم گاڑی چلاؤ۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے نا۔۔۔ جیولر کی دکان بند ہو جائے

’اس کی بے خبری اور بات بنانے کی ادا پر اذہان نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ کسی قدر

اکھوٹی سی دکھائی دے رہی تھی، یا شاید کسی گہری سوچ میں تھی۔

’ہم جیولر کے پاس نہیں، ڈیزائنر کے پاس جا رہے ہیں۔ تمہاری انجج منٹ کی آؤٹ فٹ

نا کروانے۔ ہیو یو اپنی ڈاؤٹ؟“ بیدار کرتا ہوا وہ مسکرایا تھا۔

’آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ یاد آیا۔۔۔ غالباً ڈیزائنر کے پاس ہی۔۔۔ ہائے دی وے، ایگینے بھی

والی تھیں نا۔ مئی بتا رہی تھیں تمام ڈیزائنرز کی انفارمیشن تو انہی کے پاس ہے۔“ بات بناتے ہوئے وہ

انہی اذہان نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اسے ایک نظر بغور دیکھا تھا اور ایک دھیمسا سا تبسم اس

پر کھیل گیا تھا۔

ساہیہ!۔۔۔ تم جھوٹ بولنے کی صلاحیت سے واقف نہیں ہو۔ سو پلیز ٹرائی بھی مت کیا کرو۔

پکڑی جاتی ہو۔ تم دوست ہو میری۔ اور یہی سب سے بڑی خوبی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو حد سے

’سننے لیں۔“ جتانے کا انداز لا جواب تھا۔ ساہیہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ یعنی وہ صاف پکڑی جا چکی

شک لیں! پر زپان پھیرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

’ذہان! ان لکھوں کو روک دو اذہان!۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ سارے لمبے خواب سے لگ

ل۔ اور لگتا ہے جیسے ایک بل میں یہ سارا خوف ٹوٹ جائے گا۔ پلیز، ٹرائے ٹو اسٹاپ دیٹ آل

۔۔۔ جو ہو رہا ہے اسے روکنے کی کوشش کرو۔“ ساہیہ کی آواز میں خدشے تھے مگر اذہان مسکرایا تھا۔

اکت سامنظر۔۔۔ وقت بھی شاید حیراں تھا۔۔۔ لمحے مجسم تھے۔۔۔ مگر یہ کوئی طلسماتی کہانی نہیں
 تھی۔۔۔ یہ منظر حقیقت تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری ایک ہمدرد کی صورت اس کے سامنے تھا۔۔۔
 سب تھا۔۔۔ اور اس کی بھر پور دلجوئی کے حقن کر رہا تھا۔

تو کیا اسے احساس ہو گیا تھا؟

اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے آ گیا تھا وہ؟

کیا اپنے کئے پر پشیمان تھا؟

لیوں پر لفظ نہ تھے۔

لحون کی طرح وہ بھی خاموش تھا۔

بس ایک لمس تھا۔۔۔ ایک بھر پور تحفظ تھا۔۔۔ ایک بھر پور حصار تھا۔۔۔ ایک اختیار میں لینے

کی گرفت تھی۔ اور اندر تک سرشار کر دینے والی گرم جوشی۔

میرب سیال کی آنکھوں سے بہت آہستگی سے شفاف پانی کے قطرے ٹوٹے تھے اور سردار سبکتگین حیدر
 لاری کے کوٹ کے شانے میں کہیں جذب ہو گئے تھے۔ اس کے شانے پر اپنی مٹھی کی گرفت مضبوط کرتے
 رہے وہ آنکھیں سختی سے میچ گئی تھی اور سردار سبکتگین حیدر لغاری مدھم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”جب جانتی ہو پناہ یہی حصار ہے تو خود کو اس قدر اذیت کیوں دیتی ہو؟۔۔۔ جب علم ہے کہ کوئی

درستہ ہی نہیں تو پھر یہ راستہ بدل بدل کر چلنا بھی کیوں؟۔۔۔ جب اتنے سارے اسباب دل کے

اتھ ہیں تو پھر دل سے ہی دشمنی کیوں؟۔۔۔ بغاوت ہی کرنا چاہتی ہو تو اپنے اندر کے اس منفی احساس

سے کیوں نہیں کرتیں؟۔۔۔ جانتی ہو، جب وقت، یہ لمحے، یہ سارے بل تمہارے اختیار میں ہیں تو انہیں

پنے بس میں کیوں نہیں کرتیں؟۔۔۔ بھول کیوں نہیں جانتیں سب کچھ؟۔۔۔ کیوں فراموش نہیں کر

تیں؟۔۔۔ کڑوی باتیں جب دکھ دیتی ہیں تو تم ان میٹھی باتوں پر غور کیوں نہیں کرتیں جو تمہیں راحت

دے سکتی ہیں؟۔۔۔ ان میٹھے لحون کے متعلق کیوں نہیں سوچتیں جو تمہاری زندگی میں نئے ذائقے بھر سکتا

ہے۔ تمہیں رنگوں سے بیر کیوں ہو چلا ہے میرب؟۔۔۔ جب آس پاس اتنے پھول ہیں تو تم ان سب

سے ہٹ کر صرف کانٹوں کے متعلق ہی کیوں سوچتی ہو؟۔۔۔ تم شبنم سے تازم احساسات سے بھر پور

دلوں کو کس طرح نظر انداز کر پاتی ہو جو تمہارے شب و روز کو معطر کر سکتے ہیں۔ تم ان لحون کو کیسے پیچھے

دڑ دیتی ہو سوئی، جن کی انگلی تھام کر تم وقت کی بنصوں کو بھی روک سکتی ہو۔ تم چاہو تو کیا کچھ نہیں کر سکتیں

ما۔۔۔ تم خود کو بے اختیار کیسے کہتی ہو؟۔۔۔ کیسے سمجھتی ہو خود کو بے بس؟۔۔۔ چاہو تو تمہارے

نیار میں کیا نہیں۔

یہ وقت

یہ لمحے

یہ رنگ

یہ نوم

”پاگل مت بنو۔۔۔ ٹرسٹ می ڈیم اٹ۔۔۔ کسی اور پر نہیں تو ایک دوست پر تو اعتبار
 تا۔۔۔ ٹرسٹ می۔۔۔ آئی ول نیور لٹ یو ڈاؤن۔۔۔ اعتبار کرو میرا۔“ مدھم لہجہ اعتبار سے
 ساہیہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

اسے لگا تھا اس نے غلط کیا تھا۔

پاپا کو آنے سے اسے نہیں روکنا چاہئے تھا۔ تمام صورت حال ان کے گوش گزار کر دینا
 تھا۔ پھر وہ چاہے جو بھی فیصلہ کرتے۔۔۔ کم از کم اس کے دل پر جو ایک بوجھ سامنوں کے
 پڑا تھا، وہ تو بانی نہ رہتا۔

پاپا اس کے دشمن تو نہ تھے۔ کون باپ چاہے گا اس کی اولاد دوزخ کی آگ میں جلے۔

اس کا برا چاہ سکتے تھے؟۔۔۔ اگر انہیں تمام صورت حال پتہ چل جاتی تو شاید وہ اسے یہاں

بے یار و مددگار بھی نہ چھوڑتے۔ اس تعلق سے چھٹکارا ملتا یا نہیں، مگر وہ اپنوں کی پناہ میں تو چلے

یوں بے تحفظ تو نہ رہتی۔

تو کیا اسے واقعی پاپا کو سب بتا دینا چاہئے تھا؟

اس نے سوچا تھا۔

اب تک اگر وہ چپ تھی تو صرف ان کی بیماری کے خیال سے۔

وہ ہارٹ پیشنٹ تھے اور ان کے لئے یہ انکشافات یقیناً کسی دھچکے سے کم نہ تھے۔ اور

دھچکا کیا صورت حال دکھاتا۔

وہ سمجھی تھی کہ وہ حالات کو اپنی مرضی سے سدھار لے گی۔ مگر افسوس، اس کے ہاتھ جادو

نہ تھے اور وقت بھی اس پر مہربان نہ تھا۔ سو وہ سوکھی شاخ کی مانند ٹوٹی چلی گئی تھی۔

سوکھے۔۔۔ خزاں رسیدہ پتوں پر چلتے چلتے وہ سنگی بیخ پر بیٹھی تھی اور از سر نو حالات

ہوئے سد باب کے متعلق غور کرنے لگی تھی۔ وہ خود میں اتنی مگن تھی کہ کب سردار سبکتگین

ہوا وہاں آیا، کب اس کے پاس بیٹھا وہ جان ہی نہ پائی تھی۔ بیخ کی سطح پر رکھے اس نازک سے

آہستگی سے اس نے اپنا ہاتھ دھرا تھا اور وہ چونکتے ہوئے اسے یوں دیکھنے لگی تھی جیسے وہ کوئی

رہی ہو۔

”کیا ہوا؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری کا لہجہ ہی نہیں، انداز بھی ملائم تھا۔ بھر پور خیر

میرب کچھ نہیں بولی تھی۔ خالی خالی نظروں سے اسے یوں ہی دیکھتی رہی تھی۔ سردار سبکتگین

بہت آہستگی سے اسے شانوں سے تھاما تھا اور نرم لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ مجھے نہیں بتاؤ گی؟“ توجہ قابل دید تھی۔ کرم تھا تو انہا تھی کوئی۔ سردا

لغاری نے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے ساتھ بچھنے لیا تھا۔ محبت جتانے کا کوئی خاص اند

رنے کی کوئی ادا۔ میرب سیال کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ نہ ہی وہ بے پاؤں گزارتا وقت۔

ہاتھ کو غور دیکھتے ہوئے اپنے لبوں تک لے گیا تھا۔
 ”خدا آئی سے دیت۔ آئی نیڈو؟“ مدھم لہجہ فضاؤں کو اپنے ساتھ باندھ رہا تھا۔
 ”خدا آئی نیڈو ٹیٹل یو دیت ہاؤ جی آئی کیئر باؤٹ یو؟“ وہ کوئی بازی کرتا تھا۔ بہت آرام سے موسموں
 اپنے بس میں لے رہا تھا۔ میرب سیال کے اندر اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کی سمت نگاہ اٹھا کر دیکھ سکتی یا
 کر کوئی بات کہہ سکتی۔

بہت آہستگی سے ان آنکھوں سے آنسو ٹوٹے تھے اور چہرے پر پھسلنے چلے گئے تھے۔
 سردار سبٹگین حیدر لغاری نے بنا اجازت لئے ہاتھ مکمل استحقاق سے اس کے چہرے کی سمت بڑھایا تھا
 ان تمام موتیوں کو اپنی پوروں پر لے لیا تھا۔

”خوابوں سے نانا توڑ لوگی تو چیوگی کیسے؟“ اس کے چہرے کو غور تکتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔ مگر سر
 لائے کھڑی میرب سیال کے پاس اس وقت کوئی جواب نہ تھا۔

”کیسے چیوگی میرے بغیر؟“ اتنی دوریاں بڑھا دوگی تو یہ فاصلے سمیٹوگی کیسے؟“ مقابل کھڑے
 اس کے لبوں پر کئی سوال تھے۔ مگر وہ قطعاً اس کی سمت سے توجہ ہٹائے منہ پھیرے کھڑی تھی۔

”لک میرب! لک ایٹ می! دیکھو میری طرف۔ کس چیز سے بھاگ رہی ہو تم؟“ کس
 ت سے؟“ کس خوف سے؟“ اسے بغور دیکھتے ہوئے شانوں سے ہاتھ تھام کر اپنی جانب متوجہ کیا

”محبت کرنے لگی ہو مجھ سے، اس لئے؟“ اس کے چہرے پر نظریں گاڑھے وہ دھیسے لہجے میں
 بافت کر رہا تھا۔

”ہار رہی ہو تم۔ ہار جاؤ گی اس لئے جی نہیں پار رہی ہو۔ جی نہیں سکوگی میرے بن، اس لئے؟
 کس لئے؟ یہ محبت آسان نہیں لگ رہی اس لئے؟ مشکل میں گھر گئی ہے جان اس لئے؟“ بتاؤ
 اس لئے؟“ محبت ہو گئی تو کیا مر جاؤ اس خوف سے؟“ بتاؤ، کیا ہاں؟“ سردار سبٹگین حیدر

ارل نے اسے جھنجھوڑ دیا تھا۔ پھر عجب اک دیوانگی سے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا اور عجب ہارے ہوئے
 پھٹ میں بولا تھا۔

”تو کیا میرب! محبت ہی تو ہے۔ اگر ہو گئی ہے تو کیا؟ کب تک خود پر یہ جبر کرتی رہو گی؟
 ایک کام کرو، مار دو مجھے۔ تم مار دو۔ مگر یہ خوابوں سے بھاگنا ترک کر دو۔ محبت کوئی ناخوشگوار حادثہ ہے
 ناخوشگوار واقعہ۔ تجربہ کرو گی تو اتنا برا بھی نہ پاؤ گی۔ محبت یوں اچھی چیز نہیں ہے میرب! تم شراروں کو

زبردہوادے رہی ہو۔ دبانے سے یہ الاؤ مدھم نہیں پڑیں گے، الٹا تمہیں جلا دیں گے۔ اور میں ایسا نہیں
 ہاتا۔ نہیں چاہتا میں ایسا۔“ اسے اپنے ساتھ بھینچے وہ عجب دیوانگی سے گویا ہوا تھا۔

میرب سیال کی آنکھوں سے بہت چپ چاپ آنسو بہ رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا۔
 ”محبت ہو گی تو کیا میرب! کیا کرو گی تم؟“ اپنے آپ کو سزا میں دینا بند کر دو۔ اس طرح خود کو

مذکورہ ”دو“ کوئی خواب تھا، نہ کوئی خیال، نہ گمان، نہ کوئی وہم۔ وہ اس لمحے سے باور کرانے کے

یہ خواب
 سب تمہاری انگلی کے ایک اشارے کے منتظر ہیں ہنی!۔ انہیں فقط ایک اشارہ دو۔
 منتظر کو بدل دو۔ یہ تمہارے اختیار میں ہے۔ ٹرسٹ می۔ یہ سب تمہارے اختیار
 ہے۔“

اس کے شانے پر سر دھرے وہ چپ چاپ آنسو بہا رہی تھی اور وہ بول رہا تھا۔
 ”ادراک کا کوئی لمحہ گرفت میں لو سوئی! نئے رنگ، نئے خواب تمہارے منتظر ہوں گے۔ یہ تم
 تمہیں جلا رہی ہیں، فقط تمہارے اپنے سبب ہیں۔ تم ان تمازتوں سے نکل سکتی ہو تو نکل سکتی
 شبنموں، بارشوں سے تمہیں گلہ کیوں ہے؟ کچھ بھی تو تمہارے خلاف نہیں۔ جب سب تمہارا
 ہیں تو تم اتنا تنہا محسوس کیسے کر سکتی ہو؟“ مدھم سرگوشی میں کوئی بھر پور احساس تھا۔ ”یو آر ناٹ الون
 ناٹ الون۔“ بھر پور یقین دہانی تھی مگر میرب بہت آہستگی سے آنکھیں کھلتی ہوئی اس
 باہر نکلتی تھی۔ چند ثانیوں تک اس شخص کے سامنے بیٹھی اسے تکتی رہی تھی پھر ابھی تھی اور چلتی ہو
 قدموں سے اندر کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔
 گویا وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

اٹھتے قدم اس کے مضبوط ارادوں کو ظاہر کر رہے تھے۔
 سردار سبٹگین حیدر لغاری دور سگی بیٹج پر بیٹھا اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

وہ اس لمحے نہ سمجھ میں آنے والا معرہ تھی۔
 اس کے انداز، تیور سبھی پہلے سے بہت مختلف تھے۔

میرب سیال فیصلہ کر چکی تھی۔ حتیٰ فیصلہ۔
 تمام سلسلے کو وہیں ختم کر دینے کا فیصلہ۔ شان لی تھی اس نے، اب اور نہیں۔

تو پھر آنکھوں سے آنسو بھی کیوں بہ رہے تھے؟
 سوچ لیا تھا کہ نہیں جینا نہیں رہنا اس شخص کے ساتھ تو دور جاتے قدم اتنے تھکن سے چور

جب اقدامات صحیح تھے تو یہ بے کلی سی کیوں تھی؟
 اس نے پاپا سے بات کرنے کو فون اٹھایا تھا۔ مگر ریسپور کان سے لگانے سے قبل ہی ہا

مضبوط ہاتھ میں آچکا تھا۔
 دھندلائی آنکھوں سے اس نے دیکھا تھا۔ سردار سبٹگین حیدر لغاری اس کے سامنے کھڑا تھا

چپ کے تالے لگائے، خاموشیوں کے ساتھ وہ کون سے پیغام اس کی سمت فقط آنکھوں سے
 تھا اس کی نگاہوں میں جو اس سے قبل نہ تھا۔

میرب کی پانچوں سے بھری آنکھیں دھند میں لپٹا وہ چہرہ زیادہ دیر نہ دیکھ سکی تھیں۔ سردار
 لغاری کچھ کہے بغیر اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے ریسپور لے کر اس کے ہاتھ سے رکا

در پے تھا۔ وہ حقیقت جس سے وہ خود اب تک بچتا آیا تھا۔ وہ حقیقت جس کے لئے اس کی زندگی جگہ نہیں تھی۔

وہ سچ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سچ جسے وہ خود صرف بے وقوفی فرض کرتا تھا۔ بقول اس نے یہ بے وقوفی کبھی نہیں کی تھی۔ وہ خود ایسی بے وقوفی شاید کبھی کرنا بھی چاہتا تھا۔

میرب سیال نے اپنے گرد سے یکدم اس کے بازوؤں کا وہ گرم حصار ہٹا دیا تھا اور تقریباً بولی تھی۔

”نہیں ہے مجھے محبت۔۔۔ میں تم سے محبت نہیں کرتی۔ میں نے تم سے محبت کبھی بھی نہیں پل کے لئے بھی نہیں۔ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔“ بھگی آنکھوں انکار میں ہلاتے ہوئے وہ بولی تھی۔ ”نہیں کرتی میں تم سے محبت۔ بالکل بھی نہیں۔ کر میں ہوتم؟ ہاں؟۔۔۔ کس خوش گمانی میں گم ہو؟۔۔۔ کیا تم خود کو کسی محبت کا اہل سمجھتے ہو؟ کہ تم، محبت ایسے ہی ہو جاتی ہے؟ یونہی چلتے پھرتے؟ اور ہے کیا تم میں ایسا سردار سبکدین حیدر لقا سے محبت ہو سکے؟۔۔۔ بتاؤ مجھے، میں اگر محبت کروں تم سے تو تمہاری کس بات سے؟۔۔۔

کون سی عادت دل جیت سکتی ہے؟ اور سب سے بڑی بات کیا تم اس قابل ہو کہ تم سے محبت کر دھو کا ہوتم، صرف دھو کا۔ بہت کھو کھلے ہوتم۔ اور محبت کھو کھلے لوگوں کے اندر کبھی گھر نہیں کرتی۔ زمین درکار ہوتی ہے اور وہ تم نہیں ہو۔۔۔ سردار سبکدین حیدر لقا! جو شخص خود محبت جیسے لفظ نہ جانتا ہو اسے دوسروں سے اس کے متعلق بات کرنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ جتنے دن میں نے ساتھ گزارے ہیں ان میں ایک پل بھی ایسا نہیں رہا جب میں نے تم میں کوئی خوش آئند تبدیلی تم خود کو نہیں بدل سکتے، نہ بدلنا چاہتے ہو۔ مگر تم چاہتے ہو صرف ایک بات، تمہارے لئے سب پل میں بدل جائے۔ جیسا جیسا تم چاہتے ہو سب ویسا ویسا ہو جائے۔ سارے رنگ تمہارے خواب تمہارے، سارے فیصلے تمہارے۔ اور دوسروں کا کیا سردار سبکدین حیدر لقا! صرف دوسروں کی ہار سے کس طرح کا لطف لینا چاہتے ہو؟۔۔۔ صرف اس بات کا اطمینان کرنے۔ جیت گئے ہو، تم دوسروں کو خالی ہاتھ دیکھنا چاہتے ہو۔ اپنی مرضی، اپنے نظریے، اپنے فیصلے۔ اور کیا، تمہارا دل اہم ہے۔ اس کی مرضی اہم ہے۔ اور دوسروں کے لئے تم کیا سوچتے ہیں، وہ بے چارے بات تو یہ ہے کہ تم کہانی کو ختم کرنا چاہتے ہو تو صرف اپنے ڈھنگ سے۔ تمہیں دوسروں کا انجام ناپسند ہے تو صرف اس لئے کہ تم اپنا آپ عزیز رکھتے ہو۔ اس حد تک کہ انجام بھی اپنی مرضی کردہ چاہتے ہو۔ تمہیں پتہ ہے، تم نہیں بناہ سکتے یہ تعلق۔ تم نہیں بناہ سکو گے یہ قید و بند۔ نفرت ان بندھنوں سے۔ اُجھن دیتی ہیں تمہیں یہ رشتوں کی بیڑیاں۔۔۔ تم توڑنا چاہتے ہو، آزاد چاہتے ہو مگر اپنے طریقے سے۔ تمہیں کسی اور کا طریقہ ناپسند ہے۔ کسی اور کا فیصلہ قبول نہیں۔ دوں گی تمہیں، یہ ڈر تمہیں لاحق ہے۔ تم نہیں چاہتے میں جاؤں، تمہیں چھوڑوں۔ تمہاری اندر کہ ہو گی نا۔ تو اسے تسکین دینے کے لئے کیا کرو گے؟ میرا گلا دبا دو گے، میری جان لے لو گے؟۔۔۔

دوئم

لے لو۔ لے لو یہ جان بھی۔ مگر میں تمہاری مرضی کا کوئی انجام اپنی زندگی میں نہیں چاہتی۔“ سرانکار میں ہلاتے ہوئے وہ پُر عزم تھی۔ سردار سبکدین حیدر لقا اسے ساکت کھڑا دیکھ رہا تھا۔

”تم ہارنا نہیں جانتے۔۔۔ تم ہارنا چاہتے بھی نہیں۔ سو راہیں روکو گے میری، جانے نہیں دو گے۔ میں چھوڑ کر چلی بھی گئی تو حیلوں بہانوں سے واپس بلاؤ گے اور واپس بلا کر اپنی مرضی کا انجام لکھو گے۔ جاتی ہوں میں، چھوڑ دو گے ایک دن تم مجھے۔ مگر توڑنے کے بعد۔۔۔ چھوڑ دو گے مجھے۔ مگر انا کا چننا توڑنے کے بعد۔ میرا دقار، میرا غرور، میرا مان توڑنے کے بعد۔۔۔ چھوڑ دو گے مجھے جب تمہاری انا کا پرچم تمہیں سر بلند دکھائی دے گا۔ کوئی ملال نہیں ہوگا تب تمہیں کہ ہارے ہوئے نہیں ہو گے۔ اپنی ہار سے ڈر لگتا ہے تمہیں۔ اپنی ہار سے ڈرتے ہوتم۔ روک لو گے مجھے ہر ایک بار۔ روک لو گے ہر بار۔ میں رک بھی جاؤں گی مگر تمہیں جیتنے دینے کے لئے نہیں۔ کوئی چیلنج دے کر میں تمہیں جیت پر اکسانا نہیں چاہتی۔ تمہیں شاید جیتنا ہی ہے مگر اس طرح نہیں۔ پلیز، بند کرو ایسا کھیل۔“ میرب سیال کہہ کر پلٹی تھی اور وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لقا کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔



لیجے ایک خوف واضح دکھائی دیا تھا۔

ایک
دو
تین

جتنا فاصلہ درمیان تھا، عفتان علی خان کے قدم وہ فاصلہ سمیٹ چکے تھے۔

انابہ شاہ کے اندر ہمت ناپید تھی کہ اپنے اتنے قریب اس شخص کو نگاہ اٹھا کر دیکھ سکتی اس کے اندر کی حالت پہلے سے بھی زیادہ درگوں تھی۔ عفتان علی خان اس کے بے حد قریب کھڑا اسے چند ثانیوں تک یونہی بہوت سا نکتا رہا تھا۔ نظارہ کسی قیامت کا سا تھا۔ نظر کیسے نہ جمتی۔ توجہ کے کئی پہلو نکلتے تھے اس منظر سے کوئی بے خبر رہتا بھی تو کس درجہ؟۔۔۔ انابہ اس لمحے جیسے دم سادھے کھڑی تھی۔ عفتان علی خان نے بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو چھوا تھا۔ شہادت کی انگلی ایک صراط بناتی ہوئی اس کے گداز لبوں پر آن ٹھہری تھی۔ وہ کسی پتے کی طرح کانپ گئی تھی۔ اندر ایک قیامت سی اٹھی تھی جیسے۔ جھکتی نظر زمین میں گڑ جانے کو تھی۔ مگر مقابل جو نگاہ تھی اس قدر پر شوق تھی۔ نہ توجہ کم ہوئی تھی، نہ دیکھنے میں کوئی قفل واقع تھا۔

”پرہیز گاری کے سارے اصولوں سے واقف ہوں۔ مگر توجہ ٹوٹ جانے پر کوئی جواز پیش نہیں کر سکوں گا۔“ سامنے دیکھتی نگاہ جہاں بہوت تھی وہیں لہجہ بھی کھویا کھویا سا تھا۔

”کوئی گلہ کرو گی تو عبت ہوگا اگر دیکھ پاؤ تو جان جاؤ کہ اختیار قائم رکھنا آسان نہیں۔ اپنے قدموں پر کھڑا ہوں۔ خرد مندی کا دعویٰ کر رہا ہوں۔ عجب پاگل ہوں نا۔۔۔ حشر کا سا عالم ہے اور میں اب بھی انکاری ہوں۔ کتنا بے ایمان ہوں میں۔“ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ بڑی دل فریب تھی۔ انابہ شاہ کی جھکی نگاہ اٹھی نہ تھی۔ چہرے کی کیفیت وہ تھی کہ کالو تو بدن میں لہو نہیں۔ عجب بت بنی وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی جلتی نگاہوں کا سامنا آسان نہ تھا۔

”حسین، تراشیدہ خدو خال، یہ ایمان گنوانے پر مائل کرتے تیور، میں خود میں قائم ہوں تو شاید بھرم باقی رکھنے کی کوئی صورت ہی ہوگی۔ جو نام دینا چاہو دے لو۔“ مدہم سر گوٹی۔ اس کے سارے وجود کو جیسے کسی الاؤ کا سامنا تھا۔

شاید وہ نظر بہکی ہوئی تھی۔

وہ لہجہ بے راہ رو تھا۔

مقابل شاید اپنے آپ میں نہ تھا۔

شاید آج کچھ ہونے کو تھا۔

کوئی قیامت آنے کو تھی یا پھر آچکی تھی۔

وہ چاہتی بھی تو شاید روک نہ پاتی۔

قدم بڑھتے تو تعرض کی کوئی وجہ اس کے پاس نہ ہوتی اور.....

مجھ میں یہ انتشار خواب و خیال
اس کی باتوں کے پیچ و خم سے ہے
جز تمہارے بیاں کریں کس سے
وہ شکایت جو ہم کو ہم سے ہے

اندر ایک عجب انتشار تھا۔ کچھ بھی اپنی جگہ نہ تھا۔ بہت درگوں سی حالت میں وہ ششے کے سامنے تیار ہو رہی تھی۔

ابھی تھوڑی دیر قبل عفتان علی خان دروازے کے اندر سر ڈال کر اسے تیار ہونے کے لئے حکم دیا تھا۔ غالباً کہیں جانا تھا۔ وہ ٹھیک سے سن تک نہ پائی تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت سے شاید وہ واقف نہ ہو سکتی تھی۔ اس کی مدد کے لئے عریشہ کو اس کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ عریشہ نے اس کے لئے مناسب ترین آؤٹ کے ساتھ میچنگ سینڈل اور دیگر چیزیں نکال کر اس کے سامنے رکھ دی تھیں اور مسکراتی ہوئی اس کی تہمتیا کر وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔ وہ چلتی ہوئی اپنے لئے منتخب کردہ چیزوں کی طرف آئی تھی۔

سازھی۔ بڑی حیرت سے فان کلر کی اس شیٹوں کی سازھی کو دیکھا تھا۔ عفتان علی خان کی طرف اسے مشکل میں ڈالنے کا صرف ایک بہانہ تھا۔ اس نے کبھی سازھی نہیں پہنی تھی۔ ہاں، ممی کو پہننے دیکھا تھا مگر خود پہننا اور کیری کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ جانتی تھی۔ آج ضرور وہ اسے کسی مشکل میں گھرا چاہتا تھا۔

”بھابی! آپ کو کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہے؟“ عریشہ نے سر اندر ڈال کر جھانکا تھا۔ اس نے فی میں ہلا دیا تھا اور پلٹ کر سازھی باندھنے لگی تھی پوری سازھی زمین پر گرائے وہ چنٹ ڈال رہی تھی جب دروازہ پھر کھلا تھا۔

”کیا عریشہ! کہنا، تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔“ کسی قدر ناگواری سے کہتے ہوئے وہ مڑی۔

”میرے لئے یہ کام مشکل ہے نا.....“

باقی کا جملہ زبان پر ہی رہ گیا تھا۔ وہاں عریشہ نہیں، عفتان علی خان کھڑا تھا۔ جہاں وہ بت بنی وہیں نظر جھکتی چلی گئی تھی۔ فوری طور پر اتنی ہمت تک نہ تھی کہ زمین پر بڑی سازھی کا آچپل پکڑ کر خود پر لٹکتی۔ ہاتھ جہاں تھے وہیں تھم گئے تھے۔ وہ جہاں تھی، وہی جم گئی تھی۔ عفتان علی خان نے اس کی پیش قدمی کی تھی۔ وہ بت سا وجود اس لمحے فوری طور پر کوئی حرکت نہیں کر سکا تھا۔ مگر ان نظروں میں

انابہ شاہ قیامتوں کے اندر گھری کھڑی سوچ رہی تھی جب وہ جھکا تھا۔ انابہ شاہ کی نگاہ ساکت تھی۔ وہ اس کی ساڑھی کا آنچل اٹھا رہا تھا۔
شاید وہ گھڑی آنے کو تھی جب قیامت اس کے مقابل ہوتی۔ وہ لمحہ سر پر تھا جب شاید وہ نے
آخری حد پر کھڑی ہوتی۔ وہ پل اس کے سامنے کھڑا صاف دکھائی دے رہا تھا جو اس سے اس کا سکہ
سب کچھ چھین لینے کو تھا۔
وہ اس قیامت سے بچنے کو آنکھیں سختی سے میچ گئی تھی۔

شاید یہ لمحہ کبوتر بن جانے کا تھا۔ وہ خطرات سے نمٹنا نہیں جانتی تھی۔ نمٹ نہیں سکتی تھی سوان سے
کو وہ آنکھیں میچ گئی تھی۔ مگر۔۔۔

کسی ہاتھ نے اس کے شانے کو ہٹا ہٹا۔ ایک ہاتھ کا لمس اس کے شانے پر تھا اور وہ زیادہ دیر
لمحے کی گرفت میں نہ رہ سکی تھی۔ آنکھیں جھٹ سے کھولی تھیں۔ لرزتی پلکیں اٹھی تھیں۔ مقابل کھڑے
کو دیکھا تھا اور نظریں ساکت رہ گئی تھیں۔ وہ ہاتھ اس کے شانے پر آنچل رکھ رہا تھا۔ اس کے
ڈھانپ رہا تھا۔ وہ حیرت سے پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عفتان علی خان اس کی آنکھوں
جھاٹکتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”چیز اپنی ہو تو نہ چرانے کی نوبت آتی ہے نہ لوٹ کھسوٹ کی۔ مجھے جب حاصل کرنا ہو گا
سے مانگ کر، تمہاری اجازت سے حاصل کروں گا۔ تم خوفزدہ نہیں؟“ وہ جیسے مخلوظ ہوتا ہوا مسکرا
”مجھ سے خوفزدہ ہونے کی تمہیں ضرورت نہیں ہے۔ بہت اصول پرست اور حق پرست انسان ہوں
ایمانداری کی آج چھوٹی سی مشق تو دیکھ لی تم نے۔ آئی تھنک، کچھ زیادہ باور کرانے کی ضرورت با
رہی ہوگی۔“ ان چمکتی نظروں میں کوئی خاص بات تھی۔ انابہ شاہ کے اس طرح دیکھنے پر وہ جا
مسکرا دیا تھا۔

”یہ سچ ہے۔۔۔ میں فرشتہ نہیں ہوں۔ مگر انسان بننے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں۔ سچ کہوں
لمحہ بھر کو ڈمگایا ضرور تھا مگر قدم ثابت رہے۔ اس ثابت قدمی کی مثال بننے کو کتنی قیامتیں جان پر گز
یہ بات کوئی نہیں جانتا۔ آئندہ احتیاط برتنا۔ دوبارہ ثابت قدمی کا دعویٰ کر سکوں گا نہ ایمان کی مض
آخر کو بندہ بشر ہوں۔ دل بھی رکھتا ہوں اور جذبات بھی۔“ شاید اس کے تاثرات سے حظ اٹھانے کا
صورت تھی۔ وہ اس کیفیت سے حد درجہ مخلوظ ہوا تھا۔ انابہ شاہ کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔ اس سے قبل کہ
اس نے اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر پلٹنے کی سعی کی تھی مگر وہ سعی مزید گلے آن پڑی تھی۔ وہ
تھی۔ تو ازن برقرار نہ رہا تھا۔ بے ترتیب پڑا آنچل غالباً سب سے بڑی وجہ رہا تھا اور دوسرے
عفتان علی خان کی بانہوں میں تھی۔ عفتان اس چہرے کو بغور توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس لمحے میں
چمک کچھ بڑھی تھی اور وہ مسکرا دیا تھا۔ انابہ شاہ ایک لمحے میں تو ازن برقرار رکھ کر اپنے قدموں
ہوتی تھی۔

عفتان علی خان مسکراتا ہوا اسے دیکھتا ہوا پلٹا تھا اور چلتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ وہ جو

ن ہی کھڑی تھی، ایک عجب اثر دیتی ہوئی پلٹنے کو تھی جب وہ مڑا تھا۔
”جلدی تیار ہو جائیے۔۔۔ ورنہ مجھے سب کچھ منسوخ کرنا پڑے گا۔ آپ تیار ہو رہی ہیں نا۔۔۔؟“
اس کی جان قیامت میں ڈالنے کا وہ کوئی لمحہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔
انابہ شاہ نے تمام تر غصے کو اپنے اندر کہیں دباتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ اس کے پاس اس
کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔
”میری مزید کوئی ضرورت تو باقی نہیں؟ آئی مین اگر آپ کہیں تو عریشہ کو بھجوادوں، وہ آپ کی ہیلپ
رہے گی۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ نظروں کی مزید تاب نہ لا کر ہیل کو وہیں اتار کر ساڑھی کے تمام
انچل کو ہاتھوں سے سمیٹ کر پٹی تھی اور ڈریسنگ روم میں گھس گئی تھی۔
عفتان علی خان مسکراتا ہوا واپس پلٹ گیا تھا۔

”ایک بات پوچھوں اذہان؟“ آئس کریم کھاتے ہوئے ساہیہ خان مسکرائی تھی۔ اذہان حسن بخاری
نے اسے پیشگی اطلاع دیتے ہوئے دیکھا تھا۔

”شیورا۔۔۔ مگر بات ڈھنگ کی ہونا شرط ہے۔“

”کیا مطلب؟۔۔۔ ساری بے ڈھنگی باتیں ہی میں کرتی ہوں؟“ ساہیہ خان نے اسے گھورتے
ہوئے کہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ کچھ بے ڈھنگی باتیں میں بھی کرتا ہوں۔ کچھ ہم دونوں مل کر کرتے ہیں جیسا کہ ابھی
اس گھڑی کر رہے ہیں۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”اتنے خوبصورت لمحوں کو ضائع کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے، ہاں؟“

ساہیہ مسکرائی تھی۔

”تم مرد کثرت سے ڈائلاگ مارنے کے عادی کیوں ہوتے ہو؟۔۔۔ جانتے ہونا عورت بے
پاری ٹھہری سدا کی بے وقوف۔ دو چار چکنی چیزیں باتیں کر کے اسے رام کیا جاسکتا ہے تو پھر یہ گرا زمانے
میں دیر کیوں کی جائے؟“

اذہان کا قہقہہ بہت بے ساختہ تھا۔

”تم ایسا سوچتی ہو؟“ اس کے آئس کریم فلیور میں سے آئس کریم لے کر منہ میں رکھی تھی۔

”میں ایسا سوچتی نہیں ہوں بلکہ سمجھتی ہوں۔“ ساہیہ نے اپنی آئس کریم اس کے آگے سے ہٹاتے
ہوئے اسے گھورا تھا۔

”خود کو پوز کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے تمہیں۔ ہر جگہ خود کو ہر کوئیس ثابت کرنا چاہتے ہو۔ چھوٹی چھوٹی
باتوں میں خود کو تیس مارخان ظاہر کرنا چاہتے ہو۔ ایون آئس کریم فلیور لیتے وقت بھی۔ تمہیں اسٹراہری
درکار نہیں تھی نا تو اب کیوں؟“ ساہیہ خان تپ کر بولی تھی اور وہ ہنستا چلا گیا تھا۔

”یہ آج کیا ہو گیا ہے تمہیں ساہیہ؟ — یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ — تمہیں شکایتیں کیونکر ہو گئیں مجھ سے؟ — اذہان حسن بخاری سے؟“ لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔ ”ایم اے کیمپٹ پیچ آف ہز بیڈ۔ شکر کرو اتنے آرام سے دستیاب ہوں۔ ورنہ آج کل کے دور میں ہے اتنا او بیڈینٹ قسم کا ہز بیڈ۔“

ساہیہ خان نے کسی قدر شکایتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”ایکسکیوز می! تم اور او بیڈینٹ ہز بیڈ۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ اذہان نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”آئی تھنک، یہ اس صدی کا سب سے بڑا جوک ہے۔ گینز برگ آف ورلڈ ریکارڈ ہے۔“

”آپ نے واقعی اس صدی کا سب سے بڑا جوک مارا ہے۔“

اذہان ہنس دیا تھا۔

”یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا سارا بھگلا آج ہی کر لو گی؟“

پرفیکٹ وائف بننے کی پیشگی مشق تو نہیں کر رہیں؟“ اذہان بولا تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

”ڈونٹ ڈرائی ٹو ٹی اور اسٹارٹ ہاں۔ اب تم میرا موڈ ٹھیک کرنے کے لئے چکنی چڑی

استعمال مت کرو۔ اچھی طرح سمجھتی ہوں میں تم آدمیوں کی سائیکالوجی۔ بہت دنوں بعد وہ

ساہیہ لگ رہی تھی۔ ترکی بہ ترکی بولنے والی، نہ ڈرنے والی، نہ بھگنے والی۔ بے ساختہ ہر بات کہہ دے۔

اذہان اُسے بغور دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔

”اچھا، تو میں چکنی چڑی باتوں کا استعمال کر رہا ہوں۔ بائی دی وے، تم جانتی کیا ہو ہم

سائیکالوجی کے بارے میں؟ — بتاؤ، کیا خرابی ہوتی ہے ہم میں؟ اچھے خاصے وقادار ہونے

لوگ یار! تم لوگ دن کو دن کہنے کے لئے کہتے ہو تو ہم کہتے ہیں۔ جہاں کھڑا ہونے کے لئے

اچھے بچوں کی طرح گھنٹوں کھڑے رہتے ہیں۔ اور کیا کریں، بتاؤ؟ اپنی پوری زندگی اتنی لمبی طو

زندگی جسے مزید رنگین کر کے گزارا جاسکتا ہے، ہم تم لوگوں کے لئے، فقط ایک چہرے، ایک دل،

سے وابستہ ہو کر دن رات تمہیں دیکھتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ اور کیا ہاں؟ اور کیا ایکسپکٹ

خواتین ہم سے، بتاؤ۔“ اذہان حسن بخاری نے صورت حال سے بھرپور لطف لیا تھا۔

”ایکسکیوز می! کیا کہا آپ نے؟ — ایک چہرے کو، ایک دل کو، ایک نظر کو دیکھتے ہو۔

ساری زندگی گزار دیتے ہو۔ تم لوگ جو جنگل میں بھی منگل کرنا جانتے ہو، ان کونوں کھدروں میں

چھوٹی درزوں میں بھی تم انجوائے منٹ کے بہانے خوب ڈھونڈ لیتے ہو۔ ایک نظر کو دیکھتے ہو۔

نظروں کو اور بہ غور دیکھ لیتے ہو۔ چور چوری سے جاسکتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں۔ تم اپنی زندگی کو

بخوبی جانتے ہو۔ ورنہ آپ کا دم نہ گھٹ جائے۔ آپ مرنے جائیں؟“ ساہیہ کی طرف سے بھرپور

ہوا تھا۔

اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ کسی قدر خیرا

اگر وہ پوری توجہ سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا تھا۔

”ہاں۔ — واقعی، ہم تو مر جائیں اگر کوئی آپ جیسا ہماری زندگی میں نہ ہو۔ واقعی مر تو جائیں اگر

سہا تھ، ہاتھ میں نہ ہو۔“ اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے اس نے بہت بڑا ڈائیلاگ

تھا۔ ساہیہ نے اسے دیکھا تھا اور مسکرا دی تھی۔

”ہز آئے نا اپنی اصلیت پر۔ یہ تم لوگوں کا آخری حربہ ہوتا ہے۔ تیرا اچھا ہے اور بروقت بھی۔ مگر میں

ن کہے کروں اذہان حسن بخاری! جبکہ میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کی نظریں مجھے کم اور میرے پیچھے والی

پر پیشی لڑکی کو زیادہ دیکھ رہی ہوں۔ وہی کونوں کھدروں سے رنگ ڈھونڈنے والی بات ہو گئی نا۔“

تے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”تمہارا جواب نہیں ساہیہ! — سائنے ٹھیک کہتے ہیں۔ بے وقوف محبوبہ زیادہ بہتر ہوتی ہے بجائے

مخل مند بیوی کے۔ برٹ ٹرسٹ می، آئی ول بی آل ویز یور۔ پوری سچائی سے، ایمان داری سے۔ یقین

رلو۔ میرا سب کچھ تمہارا ہوگا۔ مجھ سمیت۔ ایمان، امید، محبت، سب کچھ۔ کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔

چار سالوں بعد جب تم اتنی خوبصورت بھی نہیں رہو گی تب بھی نہیں۔ اور دس سالوں بعد جب کچھ موٹی ہو

و گی تب بھی نہیں۔ اور کچھ سالوں بعد بھدی ہو جاؤ گی تب بھی نہیں۔“

ساہیہ نے اسے گھورا تھا اور وہ ہنس دیا تھا۔

”کم آن یار! شہر میں اتنے سارے سلنگ اور فٹنس کلب کس لئے ہیں؟ اور بیوٹی سیلون کس دن کام

میں گے؟“

”اذہان!“ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ ”اٹس ٹو لچ ہاں۔“ ہاتھ اٹھا کر اسے وارننگ

تھی مگر اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کو بہت گرم جوشی سے اپنے ہاتھ میں تھام لیا

اور اس کے چہرے کو بھرپور توجہ سے دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”ساہیہ! مجھے واقعی تمہاری بہت ضروری ہے۔ ایک دو قدم کے لئے نہیں، تمام عمر ساتھ چلنے کے لئے۔

دلوں کے لئے نہیں، تمام عمر ساتھ رہنے کے لئے۔ مجھے واقعی تمہاری ضرورت ہے۔“ لہجہ خالص اور

بھرپور تھا۔ یہ نہ تو کوئی مذاق تھا نہ کوئی روایتی جملے۔ وہ اس وقت واقعی دل سے یہ سب کہہ رہا تھا۔ ساہیہ

نہ اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور بہت دھیمے سے مسکرا دی تھی۔

”بہت ڈرنے لگی ہوں اذہان! — بہت زیادہ خوفزدہ رہنے لگی ہوں۔ سب خواب جیسا لگتا ہے۔

مٹی ہوں آنکھ کھلے تو خود کو کسی کمان میں نہ پاؤں۔ ابھی جو خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا، رُوئی کی طرح تیرتا

ہوئی کرتی ہوں، کل کہیں اپنے پیر پتی ریت پر نہ پاؤں۔“ مدہم لہجے میں عجب خدشے سے تنھے۔ جھکی نظر

اسنے کس خوف کے تحت کانپ رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری اسے دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔

”اوہ، کم آن یار! — ٹرسٹ می۔ ہماری زندگی میں کہیں دور تک بھی کوئی دن نہیں ہے۔ بلیوی،

اسے اپنی لوائسوری جو ایک اچھے اینڈ کے ساتھ ختم ہونے جا رہی ہے۔“ یقین دلانے کا انداز بہت

چسپ تھا مگر ساہیہ نے اسے گھورا تھا۔

”ختم ہونے نہیں، آغاز ہونے۔ ہماری پٹی لائف شروع ہونے جا رہی ہے۔“ اس نے حسن بخاری اس لمحے کھلکھا کر نہیں دیا تھا۔

کب تک بام و در سے اُبھیں
وشت ہے تو گھر سے نکلیں
جاگی ہوئی ان گلیوں میں
رات گئے تک تنہا گھومیں
بھولے بسرے سے دو دنیاں
آتے جاتے رستہ روکیں
پیار سے کوئی حال جو پوچھے
سر اس کے کاندھے پر رکھ دیں
ایسا نہ ہو جی بیٹھ ہی جائے
کب تک چڑھتے چاند کو دیکھیں

پاپا کا فون آیا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ کمزور پڑنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ مگر آنکھوں سے خود بخود آنسو بہتے تھے۔

”تم پریشان ہو میرا!“ پاپا جانے کیسے جان گئے تھے۔

”نہیں پاپا! بس آپ سب کو بہت مس کر رہی ہوں۔“ اس نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا تھا۔

”اب تمہیں ہمیں مزید مس نہیں کرنا پڑے گا۔ آئی ایم کمنگ۔“ پاپا نے اطلاع دی تھی۔

وہ اس لمحے خوش ہونے کی بجائے حیران ہوئی تھی۔

”کیا مطلب؟“ اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ کہیں سردار سبکدین حیدر لغاری نے تو کوئی شکایت نہیں لگا دی؟

سے قل فون کر کے ساری باتیں گوش گزار تو نہیں کر دیں کہ سارا الزام اگر آئے تو اس کے سر آئے اور

رد صاف بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔

میرب سیال نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری اس کے خیالوں کے برعکس بہت

نان سے اسٹیز راز تر رہا تھا۔ مگر میرب کی سوچ اور نگاہ اسی شخص سے بندھ گئی تھی اور پاپا کہہ رہے تھے۔

”میں تمہیں ابھی برنس کے جھیلوں میں الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ سو سارا برنس اور اس کی دیکھ بھال شمشی

جوالے کر دی تھی۔ مگر اس نے بہت سی جگہوں پر اس بات کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور ہماری کاروباری

ٹھکانہ خاصا دھچکا لگایا ہے۔ اس کی لوٹ کھسوٹ کی ایک لمبی فہرست ہمیں وقتاً فوقتاً ملتی رہی ہے۔ مگر اب

نہ برداشت سے باہر ہو چکی ہے۔ ہم نے اس پر اعتبار کر کے بہت بڑی غلطی کی۔“ پاپا بڑے افسوس

سے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”لیکن پاپا! شمشی انکل تو آپ کے بہت اعتماد کے بندے تھے۔ یوں وہ کئی بار مجھ سے بھی سائن

اسے تو مجھے ان کے رویے میں کہیں کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دی۔ پاور آف اٹارنی تو میرے نام تھا پھر

”ہاں۔ آغاز ہونے جا رہی ہے اور یہ تم ٹیمیکل وائف کیوں بننے لگی ہو ابھی سے؟“

کی طرح ٹرینٹ کرنے کا انداز ہوتا ہے تم عورتوں کا۔“

سایہ نے اسے دیکھا تھا۔ وہ اپنی مسکراہٹ دبا نہیں سکی تھی۔ تبھی جب وارننگ دینے کے

اٹھایا تھا تو لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”اذہان! ناٹ ایگین ہاں۔ ہم بہت فضول بحث کر چکے۔ اب اٹھو۔ بہت سے کام نمٹانے

سایہ نے حکم بھرے انداز میں کہا تھا۔

”کیا ہے یارا! تم بھی نا۔ کتنے دنوں بعد ہم ٹینشن فری ماحول میں مل کر بیٹھے تھے۔ بات کرنا

رہا تھا اور تم.....“ اذہان نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھتے ہوئے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا

آیا۔ اس نے والٹ سے پیسے نکال کر ٹیبل پر رکھے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر سایہ کی طرف دیکھا تو

”اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟“ اوکے یارا! شادی کے بعد گھر کا بجٹ تم بنایا کرنا۔ جب

آزاد ہوں، اپنے ڈھنگ سے جی لینے دو۔“

سایہ مسکرا دی تھی۔

”تم تو بعد میں آنے والی زندگی کا خاکہ اس طرح کھینچتے ہو جیسے تم بہت معصوم چوزے ہو اور

جلاد، ہاتھ میں خوفناک ہتھیار لئے میں تمہارے پیچھے ہوں گی اور تم میرے آگے آگے۔“

”بالکل ٹام اینڈ جیری کی طرح۔ ہے نا؟“ اذہان حسن بخاری نے اس کے کھینچنے گئے نقشے کو

اور ہنس دیا تھا۔ سایہ بھی مسکرا دی تھی۔

”انٹرسٹنگ نا۔ ویسے مجھے ٹام اینڈ جیری واقعی بہت پسند ہیں۔ اچھا شو ہرٹس ہوں یا نہیں مگر

ضرور ہوں گا۔ اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کارٹون دیکھا کروں گا۔ اگر تمہارا دل چاہے تو تم بھی

دے سکتی ہو۔“

سایہ نے اسے گھورتا چاہا تھا مگر وہ ایسا نہیں کر سکی تھی۔ بہت فطری انداز میں کئی رنگ اس

پر پھیل چکے تھے اور وہ گھورتا تو درکنار اس گھڑی ڈھنگ سے اس کی سمت دیکھ تک نہ سکی تھی۔ اگر

جان پاتی کہ اذہان حسن بخاری اسے کن نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ریٹورنٹ سے نکلنے سے گاڑی میں بیٹھنے تک وہ اپنا دھیان پھیرے رہی تھی۔

”دکتنی مزیدار لائف ہوگی نا۔ مجھے تو ابھی سے سوچ کر ایکساٹنٹ ہو رہی ہے۔“ چالی

لگاتے ہوئے اذہان حسن بخاری نے بدستور شرارت سے اسے دیکھا تھا۔

”ہم اپنے بچوں کے نام بھی ٹام اینڈ جیری رکھیں گے۔ لیکن اگر دو سے زیادہ ہوئے تو

خدشے کے پیش نظر اس نے سایہ کو دیکھا تھا۔

”شت اب اذہان! گاڑی چلاؤ۔ آئی ایم گینگ لیٹ۔“ اس کی سمت بنا دیکھے

یہ سب کیسے ہوا؟“ وہ حیران تھی۔

پاپا مسکرا دیے۔

”بیٹا! رشتوں کو ہمیشہ آنکھیں بند کر کے اور کاروبار کو ہمیشہ آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہئے۔ صورت سبھی نکل سکتی ہے۔ آپ ابھی بہت چھوٹی ہو۔ کاروباری الجھنیں اور داؤ پیچ نہیں سمجھ سکتیں۔ میں آ کر دیکھ لوں گا۔ جو نقصان ہو وہ اتنا بڑا پھر بھی نہیں ہے۔ مگر بروقت ہمیں اطلاع ملے۔ آسان ہے۔ اپنی ہاؤ، آپ اپنا خیال رکھو۔“

”جی پاپا!“ اس نے فون رکھتے ہوئے سردار بسکٹگین حیدر لغاری کی سمت دیکھا جواباً قریب پہنچ چکا تھا۔

”رشتوں کو ہمیشہ آنکھیں بند کر کے اور کاروبار کو ہمیشہ آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہئے۔ انتہائی تبہبی نکل سکتی ہے۔“ پاپا کی آواز اس کے اندر کہیں سے ابھری تھی۔ مگر اس نے سر جھٹک کر دیا۔ حیدر لغاری کی طرف دیکھا۔ وہ غائب نہیں، یقیناً آفس جانے کے لئے تیار تھا۔

”پاپا سے آپ کی بات ہوئی تھی؟“

سردار بسکٹگین حیدر لغاری نے اسے دیکھا تھا اور پھر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ہاں۔“

”تو آپ نے ان سے کیا کہا؟“

”میں نے؟۔۔۔ مجھے ان سے کچھ کہنا تھا کیا؟“ اکھڑے لہجے میں سردار بسکٹگین حیدر لغاری

اسی سے سوال کر دیا۔

”بننے مت۔ آپ نے ان سے کچھ تو کہا ہو گا۔“ میرب سیال اپنی بات پر سختی سے جمی تھی۔

اسے بہت اطمینان بھری نظروں سے دیکھا گیا۔

”کیا کہوں گا ہاں، کیا کہوں گا میں ان سے؟۔۔۔ تمہارے خلاف کان بھروں گا، کیا

ہی خلاف محاذ کھڑا کروں گا کیا؟ ہاں، بولو کیا؟۔۔۔ بقول تمہارے کوئی ایک گن بھی مجھ میں

کس بل بوتے پر قائل کروں گا؟ تم سمجھ کیا رہی ہو، میرے پاس اتنا فالتو وقت ہے، کوئی اور کام

تصور جاناں کے ہوئے تمہیں سوچنا رہا ہو یا پھر تمہارے خلاف محاذ آرائیاں کرتے ہوئے

کرتا رہوں۔ تم سمجھ کیا رہی ہو ہاں؟ کیا سمجھ رہی ہو تم خود کو۔۔۔ بہت اہم ہو تم؟۔۔۔

تمہیں دیکھنے، تمہیں سوچنے، تمہارے آگے پیچھے بھاگتے رہنے کے علاوہ میرے پاس کوئی

ایکسپٹ کر رہی ہو تم مجھ سے؟ میرے پاس تمہارے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے؟ چھوڑ دو

تمہارے گھنٹے سے لگ کر بیٹھ جاؤں؟ بولو کیا کروں؟“ وہ جیسے ایسے ہی کسی لمحے کی تلاش میں

اندر کے غبار کو باہر نکال سکتا۔ وہ اس لمحے پھٹ پڑا تھا۔

میرب حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ات تمہارے باپ سے بات کیا کر لی تم نے الزام لگانے شروع کر دیے۔ تم سو رہی

ی غلطی ہے؟ ان کا فون وہاں امریکہ سے آ گیا تو میری غلطی ہے؟ میرا گھر ہے، میرے گھر کا فون بجا، میں نے اٹھا لیا تو کیا جرم کر دیا؟ تم اس وقت موجود نہیں تھیں۔ خواب خرگوش کے مزے لوٹ کر تو کیا میرا قصور ہے؟ میں نے اپنے گھر کا فون اٹھایا۔ ان سے تیز سے بات کی۔ کہہ دیا کہ آپ سو کر تو کیا غلط کیا؟ کیا مجھے آپ کو اس وقت اٹھانا چاہئے تھا، بازوؤں میں لا کر یہاں فون پر کھڑا کرنا چاہئے تھا یا پھر آپ کے لئے کوئی اہم ترین میج ڈائری میں نوٹ کر لینا چاہئے تھا؟ مجھے کیا کرنا چاہئے تھا

میرب سیال صاحبہ؟“ انتہائی غصے سے وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

میرب سیال جواباً کچھ نہیں بول سکی تھی اور وہ ہاتھ اٹھاتا اسی درشت انداز میں گویا ہوا تھا۔

میں آپ کا ملازم نہیں ہوں۔ نہ ہی آپ کا بی اے ہوں۔ آپ کو حکم جمانے کا زیادہ شوق ہو تو آپ

لیجئے۔ یہ گھر اور اس کی ایک ایک اینٹ، ایک ایک چیز میری ہے۔ اس گھر میں جو بھی ہے وہ سب

اور اپنی چیزوں کو استعمال کرنے کا ڈھنگ میں بخوبی جانتا ہوں۔ نہ تو مجھے اس کے لئے کسی کی

ضرورت ہے نہ کسی مشورے کی اور نہ ہی کسی حکم نامے کی۔ آئی ایم دی آنر بائے مائی سیلف۔

یہی عادت ہے۔ سننے یا لینے کی نہیں۔ آئندہ مجھ سے بات کرتے ہوئے احتیاط برتنے گا۔ اپنی

سے مخالف سمت جاتے تمام راستوں کو اپنی سمت موڑنے کا ڈھنگ سردار بسکٹگین حیدر لغاری بخوبی

ہے۔ سردار بسکٹگین حیدر لغاری یقیناً وہ نہیں ہے جو تم اسے سمجھی ہو۔ کیپ دی لمٹ۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر

رنگ دے کر پلٹا اور چلتا ہوا وہاں سے نکلنا چلا گیا۔ صبح صبح اس کا لہجہ ایسی آگ اگل رہا تھا۔

پلک پذیری، وہ نرمی، وہ لہجے کی گرمی!

بنا پید تھا۔ ایک لمحے میں دوبارہ وہی سردار بسکٹگین حیدر لغاری تھا۔ ایک لمحے میں وہی دوری تھی اور

قنات۔

تائی نہ تھا کہ درمیان میں کوئی نرم موڑ آیا بھی تھا۔ لگتا ہی نہ تھا کہ کوئی ایک نہیں، کئی خوشگوار لمحے

دل کی ذور سے بندھے ان کے درمیان فاصلے سمیٹتے رہے تھے۔ لگتا ہی نہ تھا۔

بیر وٹل تھا۔

میرب سیال کے کل شام کے رویے کے بعد کا یہ نیا لائحہ عمل تھا۔

میرب سیال سر جھکائے کھڑی تھی۔ جانے کب گئی چلتی ہوئی اس کے پاس آن رکھی تھی۔ اک عجب سا

کے چہرے پر تھا۔ شاید وہ جنت اپنے قدموں میں لینے جا رہی تھی۔ یہ اسی بات کا اعجاز تھا۔ میرب

سیال کی دیکھا تھا مگر ان دنوں کی تازگی پہلے جیسی نہیں تھی، اس سے کچھ بڑھ کر تھی۔ مگر بات ایک

پر فائز ہونے سے بھی کچھ زیادہ کی تھی۔ شاید وہ گین کے قریب تھی۔ اس کے پاس تھی اور یہی خوشی

اندر کو بھگانے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا گھبراؤ بھی کر رہی تھی۔ میرب نے نگاہ اٹھا کر اپنے

لڑکی سے حد خود بصورت نظر آتی، دنیا کی سب سے زیادہ خوش نصیب عورت کو دیکھا تھا۔ وہ ایسا نہ

ناؤ ایک خاص احساس اس لمحے کی کو بہت خاص ثابت کر رہا تھا۔

حیرت چکا تھی۔

ن کو قائم رکھو۔ اس سے دوری پر چلی جاؤ۔ وہ تمہارے پیچھے پیچھے آجائے گا۔ شاید اپنا بھی لے۔ مگر امدت کے لئے نہیں۔ ایسا اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔ وہ ایسا ہی ہے۔ وہ گلابوں سے عشق کرتا ہے۔ اس کی توجہ کا مرکز ہیں۔ مگر خود وہ ایک تھیرون ہے۔ یس، ہی ازل لائک اے تھیرون! — وہ ایک ہے جو چھتا ہے اور صرف درد دیتا ہے۔“ آنسوؤں سے ترچہرے کے ساتھ وہ کہتی ہوئی ہلکی تھی اور ہاں پھلانگ گئی تھی۔

گی حیرت سے کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی۔ بہت کچھ اُردو میں اور ایک آدھ جملہ انگریزی میں۔ وہ منہوم تو نہیں جان پائی تھی مگر اس کا انداز اور کچھ جملے اسے سمجھا گئے تھے کہ وہ بہت ڈپر لیس ہے اور شاید گین کی حد تک فضا بھی اور یہ برہمی بھی شاید اس لئے تھی کہ وہ یہاں تھی۔ اب جب اس نے اس سے بات کی تو اسے لگا تھا کہ وہ ان دونوں ہزبینڈ وانف کے درمیان انٹرفیئر ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ اسی آگ کھڑی تھی جب اس کا سیل بجا تھا۔ اسکرین پر ”گین“ روشن تھا۔ اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔

”کہو گین!“

”میں نے تمہیں یاد دہانی کے لئے فون کیا ہے۔ آج تمہارا ریگولر چیک اپ ہے۔ ڈاکٹر رابعہ قمر کے پاس۔“

”تھینکس! میں جانتی تھی۔“ گی چونکتی ہوئی مسکرائی تھی۔

”تم تیار رہنا۔ میں چار بجے تمہیں پک کر لوں گا۔“ گین نے کہا مگر اس نے فوراً سرنفی میں ہلا دیا۔

”نہیں گین! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔“ اس نے تردید کیا۔ گین دوسری دستک دکھائی دیا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی مکمل توجہ گی کی سمت تھی۔

”آر یو شیور؟“

”یس! آئی ول پیچ۔“ گی نے اسے مطمئن کرنے کو کہا تھا۔

”پھر بھی اگر کوئی پرابلم ہو تو مجھے فون کر لینا۔ میں مینٹنگ میں ہوں گا مگر تمہاری کال ریسیو ہو جائے۔“ اس کے تعرض کے باوجود سیکنگین حیدر لغاری اس کے لئے متشکر دکھائی دیا۔

گی مسکرائی۔

”تم مگرمٹ کرو۔ بائی دی وے، تھینکس فور دی کیئر۔“

”میں نے ڈاکٹر رابعہ سے بات کر لی ہے۔ ان کے نزدیک کوئی کمپلی کیشنزنی الحال نہیں ہے۔ مگر پھر چیک اپ کے بعد مجھے کال کر کے ضرور بتا دینا۔ ورنہ ڈاکٹر رابعہ سے مجھے خود بات کرنا پڑے گی۔“ وہ اس کے لئے عمل طور پر کنسرن تھا۔ گی کے لئے اس کی فکر صاف دکھائی دے رہی تھی۔

”میں تمہیں بتا دوں گی۔“ گی نے اطمینان دلایا۔

”میں دوبارہ فون کروں گی۔“

گی نے مسکراتے ہوئے فون کا سلسلہ منقطع کیا اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

ایک خاص ترین شخص کا دل۔

وہ اس کے بچے کو جنم دینے جا رہی تھی۔

وہ شخص جو عورت کو ایک کھلونے سے زیادہ نہیں سمجھتا تھا، وہ گی کو ایک اہم ترین مسند پر کچھ تو خاص بات تھی اس میں۔ وہ اگر اس کے گھر میں تھی تو ضرور دل میں بھی تھی۔ اور وہ اپنی طرف آیا تھا۔

اس کے لئے اس کا پیار، محبت، توجہ، نرمی، پک پذیر سب دھوکا تھا۔ وہ ایک ساتھ دو یاب ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور اس میں کامیاب بھی ہونا چاہتا تھا۔

میرب اس کیلئے ایک چیلنج سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ وہ بھی نہیں ہارا تھا۔ شاید اسی لئے جنون بڑھ چلا تھا۔

کئی آنسو چپ چاپ بے قدر سے پلکوں کی باڑ پھلانگ کر چہرہ بھگو گئے تھے۔ گی نے ا دیکھا تھا۔

”کیا ہوں۔؟“ پوچھنے کے ساتھ بہت دوستانہ انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ پکڑا۔ اس کا دل بہت بڑا تھا یا پھر وہ سمجھوتہ کرنا چاہتی تھی یا پھر یہ بھی تھا کہ وہ اس کی حیثیت گین جانتی تھی۔

وہ جانتی تھی وہ گین کی زندگی میں کتنی جگہ رکھتی ہے اور کتنی وقعت!

گی یقیناً سمجھ دار تھی۔ اور وہ۔۔۔؟ اپنی آنکھیں سخت سے رگڑتی ہوئی میرب نے گی کو ”میرادل تمہاری طرح بڑا نہیں ہے گی! — آئی کانٹ ایکٹ لائک یو۔“ نفی میں

عجیب جھلک انداز میں بولی تھی۔ گی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ ”وہاٹ ڈز اٹ مین؟ وہاٹ آر یوسینگ؟“ وہ غالباً اس کے آنسو دیکھ کر پریشان ہو

”گین نے کچھ کہا؟ — تم رو رہی ہو؟“ شستہ انگریزی میں کہتے ہوئے گی نے گرد پھیلا لیا تھا مگر میرب نے اس کو کھلے سہارے کو دوسرے ہی لمحے جھٹک دیا تھا اور

طرف دیکھتی ہوئی درشت انداز میں بولی تھی۔

”مجھے تمہاری یا تمہارے اس گین کی کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ سنا تم۔ ہوں۔ نہ ہی کبھی کمزور پڑوں گی۔ تم ابھی گین کو نہیں جانتی ہو۔ میں جانتی ہوں۔ عمو

کھلونے سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ تم سے کھیل چکا ہے۔ کچھ دیر اور کھیلے گا اور بالآخر اپنا دے گا۔ وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ وہ ایسا ہی کرتا رہے گا۔ وہ کبھی نہیں بدلے گا۔ بندھن اتر

ہیں۔ رشتے اس کے لئے مذاق ہیں۔ تم جس حالت میں اس کے ساتھ رہ رہی ہو شاید وہ ہو۔ مگر جب تم رشتے کے متعلق کہو گی تو وہ تم سے کوئی بندھن نہیں باندھ سکے گا۔ کیونکہ

بندھنا بالکل پسند نہیں ہے۔ اس کی نفسیات یہی ہے۔ جو شے اس سے جتنی دوری پر ہے۔ جتنی قریب ہے، اتنی ہی بے وقعت ہے۔ اگر تم اس کی زندگی میں کوئی جگہ بانی

سمٹ جانے سے پہلے کچھ بکھر کے دیکھ لیتے ہیں
ہوا کی لے یہ رقص شام کر کے دیکھ لیتے ہیں
بہت دن آگئی کے نام پر دنیا نے بھٹکایا
سو کچھ دن کنج غفلت میں بکھر کے دیکھ لیتے ہیں
جہاں پر تھا غرور کج کلاہی کا بھرم ہم سے
اسی رہ سے شکستہ پا گزر کے دیکھ لیتے ہیں

بہت دن بعد وہ لامعہ کے ساتھ بیٹھی کسی بات پر بے ساختہ ہنس رہی تھی۔ لامعہ نے اس کے بغور دیکھا تھا اور مسکرا دی تھی۔

”کیا ہوا؟“ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ انابیہ شاہ نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا تھا پھر ہاتھ کی سمت بڑھا کر پانی کے وہ ننھے منے قطرے صاف کرنے لگی تھی جو کھلکھلا کر پینے کے باغیر آنکھوں میں جمع ہو کر خساروں پر بہہ نکلے تھے۔ وہ بہت کم کم ہنستی تھی۔ سو یہ مواقع بھی بہت کم میں میسر آتے تھے۔ اپنی طرف دیکھتے پا کر لامعہ نے سرفنی میں ہلا دیا تھا اور اس کے چہرے سے ہنسی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”بہت کم لوگ ہنسنے ہوئے خوبصورت لگتے ہیں۔“

”جھوٹ۔“ انابیہ شاہ نے بلاتر داسے دیکھا تھا۔ لامعہ نے چونک کر دیکھا تھا تبھی وہ مسکرا وضاحت دیتی بولی تھی۔

”ہنسنے ہوئے سبھی لوگ اچھے لگتے ہیں۔ ہاں، روتے ہوئے بہت کم لوگ خوبصورت لگتے ہیں۔“ انابیہ کی بات میں لاجک تھی۔ لامعہ مسکرا دی تھی۔

”یو آر ریگی اے نلی گرل۔“ عرفنان بہت محبت کرتا ہے تمہیں۔ شاید یہ بات تم نہیں جانتی ہو۔ بات پر انابیہ کے چہرے پر کھینچی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ لامعہ پر سے نگاہ ہٹانے کے ساتھ ہی کی سمت سے اپنا چہرہ بھی پھیر گئی تھی۔ انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس موضوع پر کوئی بحث نہیں کرنا لامعہ جانے کیوں بھند دکھائی دی تھی۔

”انابیہ! تمہیں برا لگے گا اور شاید لگنا بھی چاہئے۔ آئی ایم دی تھر ڈر پرسن۔ اور مجھے کوئی رائے تم لوگوں کے تعلق کو لے کر کچھ ڈسکس کرنے کا یا انٹرفیر کرنے کا۔ مگر انابیہ! میں تمہیں ایک بہ بات کہنا چاہتی ہوں۔ محبت جب دیکھیں دے تو اپنے دل کے دروازے وا کرنے میں دیا جائے۔ ورنہ دیکھیں کھو جاتی ہیں اور دل کے دروازے کی سمت آتے قدم اور ان کی آہٹیں خواب جاتی ہیں۔“

لامعہ کا لہجہ اس کے لئے مخلص تھا مگر وہ بہت سرسری انداز میں اس کی طرف دیکھ کر نگاہ ڈالتی تھی۔

”محبت۔۔۔ تم کیا جانتی ہو محبت کے بارے میں؟“ انابیہ کا لہجہ بہت سرسری سا تھا

فاواقعہ ڈسکس کر رہی ہو۔ لامعہ نے اس کی جانب دیکھا تھا اور بنا کوئی وضاحت یا جواب دیئے پھیر گئی تھی۔ انابیہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور بہت نرمی سے مسکرا دی تھی۔

نالیاہہ کسی کی بھی محبت ڈیزرو نہیں کرتا۔ تمہیں اس سے ہمدردی ہو رہی ہے۔ تم اسے فور کر رہی ہو۔ تم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی ہو یا پھر جان کر بھی نظر انداز کرنا چاہتی ہو۔ لامعہ! یہ جو محبت ہے، بری شے ہے۔ کبھی اپنی مخالف سمت سوچنے ہی نہیں دیتی۔ تم بھی عرفنان علی خان کی مخالف سمت میں پارہی ہو۔ شاید تم نے بھی تو محبت کی تھی نا اس سے۔ تمہیں عرفنان علی خان غلط نظر نہیں آئے۔ بلکہ تم اسے ٹھیک طریقے سے دیکھنا ہی نہیں چاہتیں۔ دل کی نظر سے ہٹ کر اگر صرف باہر کی آنکھ اچھ کر دیکھو تو وہ مجرم تو ہے۔“

”مجرم؟“ کیا، کیا ہے اس نے؟“ لامعہ چونکی تھی۔

”انابیہ شاہ مسکرا دی تھی۔“

”دل۔۔۔ دل توڑا ہے اُس نے۔ اور دل دکھانا سب جرموں سے بڑا جرم ہے اور وہ اس جرم کا پ ہوا ہے۔“

”دل؟“ کس کا دل؟“ کیا اس نے تمہیں ہرٹ کیا؟“ لامعہ اس لئے شدید ترین الجھن کا دکھائی دی تھی۔ شاید وہ تصویر کا ایسا رخ دیکھنے جا رہی تھی جو اس سے قبل اس نے نہیں دیکھا تھا یا پھر جا جاتا تھا۔

انابیہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”جانے دو لامعہ! بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میں جو کر رہی ہوں مجھے کرنے دو۔ جس دن ب کچھ صاف ہو جائے گا تمہاری سمجھ میں بھی آ جائے گا۔ فی الحال سب کچھ بہت الجھا ہوا بھی ہے اور پیہہ گی۔“ انابیہ شاہ کا اطمینان ہنوز قائم تھا۔

لامعہ نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔

”تم کر کیا رہی ہو؟“ پاگل ہو گئی ہو؟ اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں سے کمپلی کیڈ کر رہی ہو اور تمہیں اپنی حماقت کا اندازہ تک نہیں ہے۔ عرفنان علی خان تمہیں بہت چاہتا ہے۔ تم جانتی ہو یہ بات۔ میں جانتی ہوں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم ایک اُلجھی ہوئی زندگی گزارنے پر تکی ہوئی ہو؟“

”میں نے کہا نا تم نہیں سمجھو گی۔“ لامعہ نے اسے بغور دیکھا تھا۔

”انابیہ! تم نے کبھی محبت کی ہے؟“ لامعہ کا سوال شاید بہت غیر متوقع تھا۔ انابیہ کے چہرے کی مسکراہٹ ایک لمحے میں معدوم ہو گئی تھی۔ غالباً اب تک پوچھا جانے والا یہ ناپسندیدہ ترین سوال تھا جس کا جواب انابیہ دینا ضروری نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے چہرہ پھیر لینے پر غالباً لامعہ کو تو یہی لگا تھا۔

”لامعہ! تم مجھ سے کیا ایکسپکٹ کر رہی ہو؟ کیا لگتا ہے تمہیں، میں تمہیں کیا جواب دوں گی؟“ اس کی طرف سے چہرہ پھیرے انابیہ مسکرائی تھی۔ لامعہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرفنی میں ہلا دیا تھا۔

”پتہ نہیں انابیہ! بٹ آئی نوون تھنگ۔“

انہم سے نکل گیا تو سر پینٹی رہ جاؤ گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے انابیہ کی طرف دیکھا مگر انابیہ نے سوائے ماشی سے اس شخص کی جانب دیکھنے کے کوئی اور عمل سرانجام نہیں دیا تھا۔

عفتان علی خان نے اس کی طرف ایک نگاہ خاص کی تھی اور مسکرا دیا تھا۔

”تم اسے پٹیاں مت پڑھاؤ۔ وہ آل ریڈی جانتی ہے اسے کیا کرنا ہے۔ غالباً تم سے زیادہ سمجھ بوجھ ہے اس کے پاس اور تم سے زیادہ عقل ہے۔ لہجے میں ہی نہیں اس وقت اس کی نظروں میں بھی ایک کاٹ تھی۔ انابیہ نے اس کی طرف نگاہ نہیں کی تھی۔ لامعہ نے ان دونوں کے درمیان کشیدگی دیکھی تھی اور مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔“

”میں اب چلتی ہوں۔“ پھر انابیہ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی تھی۔ ”انابیہ! تم ایک چکر لگا لیتا۔ مام بہت دنوں سے تمہیں پوچھ رہی تھیں۔“

انابیہ نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”میری طرف سے بھی ان کو پوچھ لیتا۔“

”اوکے۔“ لامعہ مسکراتی ہوئی پلٹی تھی اور باہر کی طرف قدم بڑھانے لگی تھی۔ انابیہ اٹھی تھی۔ ارادہ وہاں سے نکل جانے کا تھا مگر عفتان علی خان اس کے سامنے آن رکھا تھا۔ انابیہ نے ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی اور ہر دھیان پھیر لیا تھا۔ غالباً اب وہ مدعا سننے کی منتظر تھی۔ عفتان علی خان اسے اسی طرح دیکھتا رہا تھا۔

ایک

دو

تین

کتنے ٹائیے چپ چاپ دبے پاؤں گزرے تھے۔ عفتان علی خان کی سمت سے عرض مدعا نہ ہوا تھا۔ انابیہ نے نگاہ دوبارہ ڈالی تھی۔ وہ اب بھی اس کی طرف اسی طرح بغور دیکھ رہا تھا۔ نگاہ میں کچھ تھا۔ وہ زیادہ دیر دیکھ نہیں سکتی تھی اور نگاہ پھیر لی تھی۔ عفتان نے بہت آہستگی سے ہاتھ اس کے شانوں پر دھرے تھے اور مدھم لہجے میں بولا تھا۔

”کیسا تھا وہ؟ کیا وہ تمہیں مجھ سے بھی زیادہ چاہتا تھا؟“

”مدم سرگوشی میں ایک گہرا شکوہ تھا۔ انابیہ شاہ کی جان یکدم ہی قیامتوں سے گھری تھی۔ وہ نگاہ اٹھا کر اس کی سمت دیکھ نہ سکتی تھی۔ عفتان نے ہاتھ بڑھا کر اس کا جھکا چہرہ اوپر اٹھایا تھا اور پھر پور توجہ سے دیکھتا ہوا بولا تھا۔“

”کیا مجھ سے زیادہ توجہ؟ مجھ سے زیادہ پیار؟ مجھ سے زیادہ اعتبار؟ کس معاملے میں وہ مجھ سے زیادہ بہتر تھا کہ تم اسے بھول نہیں پاری ہو؟ کیا مجھ سے زیادہ دیوانہ تھا وہ؟ کیا مجھ سے بھی کچھ زیادہ پاگل تھا؟“ عفتان علی خان کے مدھم لہجے میں کئی شکایتیں تھیں۔ مگر انابیہ کے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا نہ کوئی وضاحت۔

”میں نے تمہیں چاہا تو کوئی حد ہی نہیں چھوڑی۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بے حد، بے حساب، دیوانہ

”وہاٹ؟“ انابیہ مسکرائی تھی۔

”آئی جسٹ جینلس آف یو۔“ لامعہ بولی تھی اور انابیہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

”اگر یہ مذاق ہے تو اچھا ہے۔ لیکن اگر تم سنجیدہ ہو تو پھر مجھے سیریس ہونا پڑے گا۔ نہ سرز ہونا پڑے گا بلکہ کوئی نوٹس لینے کے ساتھ کوئی اسٹریجی بھی تمہارے لئے بنانا پڑے گی۔ صاف یہ ہے اگر تم میرے شو ہر پرنظر رکھو گی تو مجھے برا تو لگے گا۔ نہ صرف برا لگے گا بلکہ مجھے کچھ کچھ غم لگا۔“ وہ متواتر مسکرا رہی تھی۔ غالباً اس موضوع کو سرے سے مذاق میں اڑا دینا چاہتی تھی اور دیکھ کر رہ گئی تھی۔ انابیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور توجہ سے اسے دیکھتی ہوئی بولی تھی۔

”لامعہ! تم سب کے متعلق سوچ رہی ہو۔ کچھ اپنے متعلق بھی سوچا ہے؟“

”ہاں، سوچتی ہوں اپنے بارے میں بھی۔“ سر جھکا کر بچھے بچھے سے انداز میں جواب دیا تھا۔

”پھر؟“ انابیہ نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”کچھ اچھا نہیں لگتا انابیہ! بعض اوقات۔ جو بات کوئی نہیں جانتا وہ دل جانتا ہے۔ اور دل جینے نہیں

انابیہ اس کی جانب دیکھتی ہوئی سر نیلی میں ہلاتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”لامعہ! ایسے جیا نہیں جاتا۔“

”اور جو تم جی رہی ہو وہ جینے کا طریقہ ہے یا زندگی ہے؟“ لامعہ نے اس کی طرف جواباً

انابیہ کے پاس اس وقت شاید کوئی جواب نہ تھا۔ وہ سر جھکا گئی تھی۔ لامعہ کچھ نہیں بولی تھی۔ چند انابیہ گویا ہوئی تھی۔

”زندگی ایک مسئلہ ہے لامعہ! اور محبت ایک لائینسی مسئلہ ہے۔ محبت اور زندگی کے مابین آگ کا من ہے تو وہ صرف مسئلہ ہے۔ میں اسے سلجھانا چاہتی ہوں۔ کوشش کر رہی ہوں۔ جانتی نہیں اور.....“ بولتے بولتے سر اٹھا کر دیکھا تو عفتان علی خان نظروں کے عین سامنے کھڑا تھا۔ انابیہ گئی تھی جبکہ لامعہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”کہتے عفتان! کیسے ہو تم؟“

”پرفیکٹ۔ تم کیسی ہو؟ بہت دنوں بعد صورت دکھائی۔“

”ہاں۔ میں چاند پر تھی۔“ لامعہ مسکرائی تھی۔

”اچھا۔ بتایا ہوتا تو ہم بلوا لیتے یا خود چلے آتے۔“ عفتان نے مسکراتے ہوئے نظر اور

پینٹی انابیہ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک خوشگوار جملہ اچھا لایا تھا۔

لامعہ مسکرا دی تھی

”چاند پر لوکل ہز بیئڈ کا داخلہ ممنوع ہے۔“

”اوہ۔۔۔ تب تو میں بڑے آرام سے داخل ہو سکتا ہوں۔ اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔“ عفتان علی

کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں گہری شرارت۔ لامعہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

”انابیہ! کیا کرتی ہو یا؟ تم اپنے ہز بیئڈ پر قابو کیوں نہیں رکھتی ہاں؟ بی آسٹرونگ وومن یا رابندہ

دار، حد سے سوا چاہا تمہیں۔ چاہا تو کچھ اور نہ دیکھا۔ ہر طرف سے نگاہ بند کر لی۔ کان بند کر لئے۔ دیکھا صرف تمہیں۔ سنا تو صرف تمہیں۔ کہاں کی رہ گئی انابییہ! بتاؤ، کہاں کچھ کم رہا؟“ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے وہ اسے بغور تکتا ہوا دریافت کر رہا تھا۔ آنکھوں کی پیش انابییہ کے چہرے کو سرخ کر رہی تھی۔ مگر وہ اس کی طرف دیکھنے سے مکمل گریزاں تھی۔ عفتان اسے متواتر خاموشی سے دیکھتا رہا تھا۔ اطمینان کے ساتھ ہم کے ساتھ۔ اور پھر یکدم مسکرا دیا تھا۔

”دیوانہ ہوں نا۔۔۔ دیوانگی کی باتیں کرتا ہوں۔ ہنسی تو آتی ہوگی تمہیں۔ ہنسی بھی ہوگی اکیلے میں۔ ارے یار، کیسا بے وقوف بندہ ہے۔ اس کی بیوی ہوں، کسی اور کی طلب گار ہوں اور یہ پھر بھی اسی پاگل پان سے مجھے چاہتا چلا جا رہا ہے۔ ہے نا بدھو۔“ وہ ہنس دیا تھا۔

”ہاں، بدھو ہوں میں۔۔۔ بے حد بدھو۔۔۔ پاگل، تمہارا پاگل۔۔۔ تمہاری اس نگاہ کا دیوانہ جو تم نے مجھ پر کبھی ڈالی ہی نہیں۔ تمہاری اس بات کا دیوانہ جو میرے لئے تھی ہی نہیں۔“ سرفی میں ہلاتا ہوا وہ مسکرایا تھا۔

”کچھ نہیں تھا میرے لئے۔۔۔ مگر کچھ ہے جو میرے لئے ہے اور وہ تم سے میرا رشتہ ہے۔ کبھی بھڑ پھوڑوں گا تمہیں۔ اس رشتے سے کبھی آزاد نہیں کروں گا۔ مجرم ہو تم میری۔ اس دل کو بہت دکھایا ہے۔ تمہیں میرا نقصان سود سمیت پورا کرنا ہو گا۔“ اس کے وجود کو ایک جھٹکے سے چھوڑ کر وہ مڑا تھا اور چلا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ انابییہ لب بھینپے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

”اذہان! ایک بات بتاؤ۔“ ڈرائیو کرتے ہوئے اذہان حسن بخاری کو ساہیہ نے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ دونوں جیولر کے پاس انگیج منٹ رنگ لینے جا رہے تھے۔ اذہان اس کے سوال کی نوعیت کو سمجھنے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”تم مجھے کنجوس سمجھ رہی ہو۔ یارا تم جتنی مہنگی رنگ چاہو اپنے لئے منتخب کر سکتی ہو۔ میرے کرڈینا کارڈ میں خاصی بڑی رقم ہے۔ ٹرسٹ می۔“

ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”چھینٹس۔ اب میں سب سے قیمتی رنگ پر ہاتھ رکھوں گی۔ مگر اس وقت میری توجہ اس رنگ پر پائی کی پر اس پر نہیں تھی۔“

اذہان مسکرا دیا تھا۔

”تھینک گاڈ! ورنہ مجھے یقین ہو چلا تھا میری ساہیہ کی سائیکالوجی عام خواتین سے الگ ہرگز نہیں اسکتی۔ زندگی میں پہلی بار تم نے مجھے غلط ثابت کیا ہے ساہیہ! اور اس کے لئے مجھے کوئی افسوس بھی نہیں ہے۔“

”اذہان! ہم پہلی بار ممکنہ کرنے جا رہے ہیں۔“

”اچھا۔۔۔ لوگ کیا دو تین بار ممکنہ کرتے ہیں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ ساہیہ نے اسے گھورا ہوا مسکرا دیا تھا۔

”ساہیہ! تم دل کھول کر شاپنگ کر سکتی ہو۔ تمہارا ہونے والا ہر بیٹا کنجوس نہیں ہے۔ غالباً ٹوٹل فدا ضرور ہے تم پر۔“ ویڈ اسکرین سے نظر ہٹا کر اسے بھرپور توجہ سے دیکھا تھا۔

ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”اذہان! تم بات بدلنا بہت اچھی طرح جانتے ہو۔“

”ہماری سوچ اتنی ہلتی ہے کہ ہم ایک دو بے کے دل کی بات کہے بنا ہی جان جاتے ہیں۔ مجھے کاٹل یقین ہے کہ شادی کے دس سال بعد ہماری شکلیں بھی اس خطرناک حد تک ملنے لگیں گی کہ لوگ ہمیں دیکھتے ہی پہچان لیں گے اوہ، اچھا تو آپ دونوں ہر بیٹا وائف ہیں۔“

اذہان حسن بخاری نے دلچسپ بات کی تھی۔ ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”ازنٹ سو فی۔ تم تو ابھی سے اسٹریٹیجی پلان کئے بیٹھے ہو۔ مگر یہ سب کچھ ایسا دلچسپ نہیں ہے۔ شادی کے دس سال بعد اگر ہماری شکلیں نہ ملیں تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔“

”ایسا یقین نہیں کہتا ساہیہ! ایسا سبھی سمجھ دار لوگ کہتے ہیں۔ شادی کے دس سال بعد ہر بیٹا وائف کی شکلیں خطرناک حد تک ملنے لگتی ہیں۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”ہاں۔ ہوتا ہوگا۔ مگر ہمارے معاملے میں ایسا نہیں ہوگا۔ انڈر اسٹینڈ دیٹ۔“

”اچھا۔۔۔ تو کیا تمہارا ارادہ کا سٹیکس سرجری کا بھی ہے۔“ اذہان نے اسے بھرپور شرارت سے دیکھا تھا۔

”یار! تم تو بہت خرچہ کروادو گی۔“

”اذہان!“ ساہیہ نے اسے گھورا تھا۔

”کاس سنس کی بات ہے یار! شکلیں تو اسی صورت میں نہیں ملیں گی جب تم سرجری کروالو گی۔ کیونکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ خدا کا شکر ہے، خاصا پیئڈ سم ہوں میں۔ ہاں، تمہاری ناک بس ذرا چمٹی ہے۔ اسے ٹھیک کروالینا۔ میری ناک کے سامنے.....“ وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا تھا۔ ساہیہ نے اس کے بازو پر ایک ٹکا مارا تھا اور وہ ہنس دیا تھا۔

”سچ کہوں، مجھے اسٹیلینا جولی جیسی لڑکی درکار تھی۔ می سے بھی کہہ دیا تھا، ویسی کوئی ڈھونڈ لاؤ تو آنکھیں بند کر کے ہاں کر دوں گا۔ مگر ہائے یہ نصیب۔ آپ ہمارے نام لکھ دی گئی تھیں اور لکھا ہوا ہم جھٹلا نہیں سکتے۔“

”جھٹلا سکتے تو کیا اپنی زندگی سے خارج کر دیتے؟“ ساہیہ نے اسے آہستگی سے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ اذہان اس سوال کے اندر در پردہ سوال کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ کبھی لب بھینچ کر ویڈ اسکرین کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

”کیسی تھی وہ؟ کیا تم اسے بہت چاہتے تھے؟“ سوال نہیں، باؤنڈ تھا۔

”کڈنگ ساہیہ! آئی واز جسٹ کڈنگ۔“ اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت دیکھے بغیر مسکرا کر اس سوال کو ٹالا تھا۔ مگر ساہیہ نے اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹائی تھی نہ ہی نگاہ۔

”کوئی بات تو اچھی نہ ہوگی اس کی۔ شاید تمہیں ہر بات اچھی لگتی ہوگی اس کی۔ ہے نا؟“ بدستور اس

لہجے میں کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ساہیہ!“ مسکراتے ہوئے وہ بنا اس کی طرف دیکھے اس سوال سے صاف بچتا نظر آیا تھا۔ اندازاً الجھن نہ تھی مگر وہ مطمئن بھی دکھائی نہ دیا تھا۔

”ان بھاگتے دوڑتے دنوں میں اچانک ہی کسی روز یونہی اچانک وہ چلتی ہوئی تمہارے سامنے کھڑی ہوئی تو تم کیا کرو گے؟“

”ساہیہ!“ وہ بھرپور اطمینان سے مسکرانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ نگاہ اس کی سمت نہ تھی۔ ساہیہ دی تھی۔

”چلو فرض کرو وہ آجاتی ہے واپس تمہاری زندگی میں، یونہی چلتے چلتے۔ اچانک، کسی روز کیا کرو گے؟“

گاڑی کے نائریڈم چرچائے تھے اور گاڑی رک گئی تھی۔ ساہیہ غالباً اس کے تاثرات جاننے لے اس کی طرف بخور دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ بہت اطمینان سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”میں وقت کو روک دوں گا ساہیہ!“ مدہم لہجہ جوں سے پڑھا۔

ساہیہ ساکت سی اسے بکتی رہ گئی تھی۔ مگر اذہان کی آنکھوں کی چمک کچھ سوا ہو گئی تھی۔

”میں وقت کی نبضیں تھام لوں گا ساہیہ! مگر صرف تمہارے لئے۔“ مدہم سرگوشی میں جتانے سمجھانے کو بہت کچھ تھا۔ ساہیہ جواب تک دم سادھے خاموش بیٹھی تھی، مسکرا دی تھی۔

”تم جھوٹ بول رہے ہوتا؟“ ساہیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ بولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کم آن یار! شک مت کرو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو جہ سے میری زندگی میں تم ہو، صرف تم ہی ہو۔ کسی اور کے لئے جگہ ہی نہیں چھوڑی تم نے۔ تمہارا وزن زیادہ تیزی سے نہیں بڑھ رہا؟“

ساہیہ نے اسے ایک سچ رسیدا کیا تھا۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”آئی ایم کڈنگ ہاں۔ تمہارا وزن واقعی پہلے سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اب یہ مت کہنا ایسا خوشی مارے ہے۔ مجھے غور سے دیکھو، کتنا ہینڈس اور اوڈیشنگ ہوں نا۔ ایما نداری سے، خود بتاؤ میرے ساتھ غبارے کی طرح پھولی ہوئی کوئی لڑکی اچھی لگے گی؟“ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

”اذہان!“ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے اسے گھورنا چاہا تھا اور خود بھی ہنس دی تھی۔ اذہان نے مسکرا۔ ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”مجھے ایک ایسی ہی لڑکی چاہئے تھی۔ پیاری سی، اچھی سی۔ جس کا دل بھی اسی کی طرح صاف اور خوبصورت ہو۔ جو مجھے نظر سے نہیں دل سے دیکھے اور سمجھے۔ میری زندگی میں آئے تو یہاں سے وہاں تک روشنی سی بھر دے۔ تمہیں یاد ہے ساہیہ! جب تم مجھے پہلی بار ملی تھیں تو تم ٹیرس پر دیے جلا رہی تھیں۔ تم نہیں جانتی ہو مگر تب تمہارے ان خوبصورت ہاتھوں نے دیے اس تاریک ٹیرس پر ہی نہیں، بہت سے د۔

میرے دل میں بھی روشن کر دیئے تھے۔ ڈوبی اے فوراً! تم جیسی ہو، ہمیشہ ویسی ہی رہنا۔ خود کو مت بدلنا۔

”ہو، بہت اچھی ہو۔ میں آج سے دس سال بعد نہیں، بیس اور تیس سال بعد بھی تمہیں اسی طرح دیکھنا چاہتا ہوں گا۔“ وہ آنکھوں میں تپش لئے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے مدہم لہجے میں بولا تھا۔

ساہیہ اس کی طرف سے دھیان پھیرتی ہوئی اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”چھڑی چلاؤ اذہان!۔۔۔ غالباً ہم جیولر کے پاس اپنی آنکھ منٹ رنگ منتخب کرنے جا رہے تھے۔“

”یاد دلایا تھا۔ اذہان مسکرایا ہوا گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا تھا۔

”جتنی مشکل سے موڈ بنایا تھا مگر تم نے رومانس کا سارا بیڑہ غرق کر دیا۔ میرے اندر سے بھونٹی محبت کا نے ایک لمحے میں قتل عام کیا ہے۔ کہیں تم کسی زمانے میں ٹیچر تو نہیں تھیں؟“ اذہان نے مسکراتے اے اسے دیکھا تھا۔ ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”نہیں۔۔۔ ہم ملٹی جنوں تھے۔ تم شاید بھول رہے ہو، ہم اپنی داستان محبت دوبارہ مکمل کرنے آئے۔ کوئی ڈھنگ کی بات کرو۔“ ساہیہ اکتانے ہوئے انداز میں کہہ کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”دس، بیس، تیس سال کی چھوڑو، مجھے یقین ہے شادی کے دس روز بعد بھی میں مر گئی تو تم میری قبر پر ہر گز نہیں سکھانے والے پہلے شخص ہو گے۔ مردوں کی خصلت کو کون نہیں جانتا۔“

”نہیں، میں اے سی لگوا دوں گا۔“ اذہان ہنسا تھا۔ ”کم آن یار! کسی بری باتیں کر رہی ہو؟ ہم جے خوبصورت بندھن میں بندھنے جا رہے ہیں اور تم اچھا نہیں بول سکتی ہو تو برا بھی مت بولو۔ بتاؤ مجھے،

جے شکوے گلے کیوں ہیں تمہیں مجھ سے؟۔۔۔ اتنا بے چارہ سا بندہ ہوں میں۔ تمہارا اتنا خیال رکھنے کی کوشش بھی کر رہا ہوں۔ اور کیا کروں۔“

”محبت۔۔۔ اذہان!“ اس کی طرف پلٹتی ہوئی ساہیہ مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھی۔ اذہان نے ایک ناموش نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تھی اور دوبارہ وینڈ اسکرین کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ وہ اس لمحے یکسر بے تاثر دکھائی دیا تھا۔ شاید ساہیہ نے بہت اچانک وہ ذکر چھیڑا تھا اس لئے۔ ساہیہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی نگاہ پھیر گئی تھی۔

”دس، بیس یا شاید تیس برس۔۔۔ اور میں ان برسوں میں سے کسی ایک دن کے انتظار میں ہوں اذہان! جو تمہیں دل سے میرا کر دے۔“ ساہیہ کی طرف سے کی گئی خودکلامی تھی۔ جسے شاید اذہان نے نہیں سنا تھا۔ یا پھر اگر سنا بھی تھا تو اس کے پاس کوئی معقول جواب تھا نہ کوئی جواز۔

چاروں جانب بکھر رہی تھی

ایک ادھوری تنہائی

ہوانے رُک کر ہم دونوں کو

مڑتے دیکھا تو گھبرائی

بت جھڑکی دہلیز پر اُس نے

مٹائے کچھ سرگوشی کی

تین کے متعلق جانتی ہوں۔ سدا کا کیر لیس ہے۔ اس کی فکر تو خود مجھے کرنی پڑتی ہے۔ وہ کسی کا کیا خیال کھے گا۔ میں گین سے کہتی ہوں، وہ تجھے میرے پاس بھجوادے۔“ مائی اماں نے اس کی فکر کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رکابانی بہت خاموشی سے بند تو ذکر خساروں پر بہہ نکلا تھا۔ نگاہ پھر اس منظر پر تھی مگر وہ منظر خاموش تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ میرب نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو رگڑا تھا۔

”جی مائی اماں! میں سوچتی ہوں۔ پایا کا فون بھی آیا تھا۔ وہ بھی آرہے ہیں۔“ اطلاع دی تھی۔

ساری توجہ جانے کیوں اب بھی وہیں تھی۔ جانے کیوں وہ اپنی نگاہ اس منظر سے ہٹا نہیں پارہی تھی۔

”ہاں، منظر سیال صاحب کا ہماری طرف بھی فون آیا تھا۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ وہ صحت یاب ہو چکے ہیں اور کاروبار زندگی کو سنبھالنے واپس لوٹ رہے ہیں۔ انشاء اللہ اب ہماری مراد بھی پوری ہو سکے گی۔ بھائی صاحب کے آتے ہی تمہاری رحمتی کی بات سامنے رکھ دوں گی۔ اب میں اور دیر نہیں کروں گی۔ چاند کی اصل جگہ آسمان ہے۔ اور تمہاری جگہ گین کا دل ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم دونوں کو ایک کر دیا جائے۔“ مائی اماں دوسری طرف مسکرا رہی تھیں۔ یہ میرب کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھیج ڈالا تھا۔ وہ منظر دیکھ رہی تھی۔ گی غالباً افسردہ تھی۔ غمزدہ ہو کر رو رہی تھی۔ گین نے پوری توجہ سے اس کے آنسو اپنے ہاتھ سے پونچھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ بھیج لیا تھا۔ میرب نے آنکھیں سختی سے میچتی تھیں اور ساتھ ہی اپنا رخ بھی اس طرف سے پھیر لیا تھا۔ مائی اماں پتہ نہیں کیا سوچ رہی تھیں۔ انہوں نے جانے کیا کچھ مزید سوچ رکھا تھا۔ وہ کتنا کچھ سہہ رہی تھیں اور وہ خود۔۔۔ اپنی دگرگوں ہوتی کیفیت کو سنبھالنے کی اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی اور غالباً وہ سننے کی بھی جو مائی اماں اس گھڑی کہہ رہی تھیں۔

”میری بہت تمنا ہے اپنے گین کا گھر بسادہ دیکھ لوں۔ اس کے بچوں کو گود کھلا لوں۔ پھر چاہے مر جاؤں، غم نہیں ہوگا۔ میری جان ہے گین۔ مجھے اس سے بہت پیار ہے۔ وہ بھی جانتا ہے۔ سبھی میری کوئی بات رد نہیں کر سکتا۔ وہ جانتا ہے میں اس کے لئے سب سے بہتر سوچوں گی۔ سبھی آنکھیں بند کر کے اس نے شادی کا معاملہ بھی مجھ پر ڈال دیا اور میں نے اس کے لئے ایک ہیبرڈھونڈ نکالا۔ ایک چمکتا تارہ۔ جو اس کی پوری زندگی کو روشن کر دے گا اور.....“

”مائی! میں آپ سے بعد میں بات کرتی ہوں۔ میرے سہل پر پاپا کی کال آرہی ہے۔“ اس کے لئے مزید بات کرنا دشوار ہو رہا تھا اس لئے اس نے بروقت بہانہ کر کے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ مگر فرار کی راہیں تب مسدود ہوتی دکھائی دی تھیں جب سردار سبکتگین حیدر لغاری کی آواز نے اس کے اٹھتے قدم وہیں بانٹھ دیئے تھے۔

”مائی کا فون تھا؟“ میرب پلٹ کر دیکھنا چاہتی تھی نہ اس سے بات کرنا۔ مگر اس وقت یہ دونوں ہی باتیں ناممکن ہوتی دکھائی دی تھیں۔

”ہاں۔“ اس نے پلٹے بغیر جواب دیا تھا۔

”کیا کہہ رہی تھیں؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کی پشت کو بغور دیکھا تھا۔ انداز سرسری تھا۔

اس کے بعد اس راہ گزر پر
دور تک خاموشی تھی

”کیا ہوا؟“ تم ٹھیک تو ہو؟“ مائی اماں نے دوسری طرف سے دریافت کیا تھا۔ میرب بہت آہستگی سے اثبات میں ہلادیا تھا۔

”جی مائی اماں! میں ٹھیک ہوں۔“ آواز صاف چٹلی کھا رہی تھی۔

”ٹھیک ہو تو آواز ٹھیک کیوں نہیں؟“

”مجھے فلو ہے مائی! موسم کا اثر ہے۔“ میرب نے بہانہ گھڑا تھا۔

”یہ موا موسم بھی نا۔ خیال نہیں رکھ رہی ہوا پنا۔ اور یہ سبکتگین حیدر کہاں ہے؟“ وہ خیال رہا تمہارا۔ کتنی سختی سے ہر بار فون پر تاکید کرتی ہوں مگر اس کے باوجود وہ بے احتیاطی برت رہا۔ معاملے میں۔“ مائی اماں اس کے لئے فکر مند تھیں۔

”نہیں مائی اماں! وہ خیال رکھ رہے ہیں میرا۔“ نظر بھٹکتی ہوئی سامنے گئی تھی۔ کچھ فاصلے صاحب جانے کون سے راز و نیاز میں مصروف تھے۔

”بات کراؤ میری، ابھی کان کھینچتی ہوں۔“

”مائی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ میرا خیال رکھ رہے ہیں۔ اس وقت وہ کچھ بڑی ہیں۔ سکتے۔ میں انہیں کہہ دوں گی، وہ آپ سے بات کر لیں گے۔ آپ کیسی ہیں؟“ واپس ہیں؟ میں آپ کو بہت مس کر رہی ہوں۔“ نظر بھٹکتی ہوئی پھر اس منظر پر جاٹھری تھی۔

آسمان پر بادل تھا اور اس میں تارے سٹے تھے

ہم دونوں کے قدموں سے کچھ سوکھے پتے لپٹے تھے

سردار سبکتگین حیدر لغاری کی نگاہ بھی اس پر پڑی تھی۔ مگر بہت جلد وہ نظر اجنبی ہو گئی تھی۔ لظا تھی اور قریب پیشی گی پر سرکز ہو گئی تھی۔

”مائی! آپ کی واقعی بہت یاد آرہی ہے۔“ اس کا لہجہ بھلا بھلا سا تھا۔ اس شخص کے بیکم رویے پر دل جانے کیوں اتنا کٹ رہا تھا۔ حالانکہ وہ تو اس کی واقف تھی۔ اس کا مزاج جانتی تھی۔

وہ آوارہ بادل تھا۔

کس ویس کا تھا۔ کس زمین کا۔

شاید وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

پھر وہ کیوں اس کے متعلق سوچ کر اتنا ان فیئر فیئر فیئل کر رہی تھی۔

ساتھ جب نام کا تھا تو وہ سمجھ کیوں نہیں پارہی تھی۔

چند روزہ تھا تو وہ اندر تک اتنی کیوں کھڑی جا رہی تھی۔

”میرب! تم میرے پاس آ جاؤ۔“ دوسری طرف مائی اماں کہہ رہی تھیں۔ ”میں کوشش کر رہی ہوں۔“

میرب نے پلٹے بغیر جواب دیا تھا۔

”کیا کہہ رہی تھیں؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کی پشت کو بغور دیکھا تھا۔ انداز سرسری تھا۔

نگاہ میں بھی کوئی خاص تاثر نہ تھا۔ میرب سیال نے گردن موڑ کر تجھی نظروں سے اس شخص کو دیکھا تھا۔ ”آپ ان سے بات کر لیں۔ وہ غالباً آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔“ مائی کا پیغام مکمل طور پر نہ کر سکی تھی۔ مگر اطلاع پہنچا دی تھی۔

”کس سلسلے میں؟“ کہیں تم نے کوئی اٹلی سیدی بات تو نہیں کہہ دی؟“ سردار سبکتگین حیدر نے کڑے تیوروں سے اسے دیکھتے ہوئے کسی قدر درشت لہجے میں کہا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑی تھی۔ ”میں۔۔۔ میں کیا اٹلی سیدی کہوں گی ان سے؟ آپ جو کر رہے ہیں میں جانتی ہوں۔ سو کیوں غلط سلسلہ قیاس کر رہے ہیں؟“

”مائی سے رات کو میری بات ہوئی تھی۔ وہ تمہیں وہاں بلانا چاہ رہی ہیں۔ تم جانا چاہتی ہو تو جا ہو۔ میں تمہیں روکو گا نہیں۔ ویسے بھی میں کل رات کی فلائٹ سے نیویارک جا رہا ہوں۔“ سردار حیدر لغاری کی طرف سے دو اطلاعات ایک ساتھ آئی تھیں۔ میرب سیال اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔ ”آپ جا رہے ہیں۔۔۔ کیوں؟“ وہ اس کے اتنے اجنبی انداز کے باوجود پوچھنے بغیر نہ رہ سکی۔ ”کچھ کام ہے۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری کی نظریں ہی نہیں لب و لہجہ بھی سرد ترین ”تم مائی کے پاس جانا چاہتی ہو؟“ غالباً جانے سے قبل وہ اسے ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔ میرب فوری طور کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔

”ایسے کیا کھڑی ہو؟ تمہیں جانا ہے یا نہیں؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری کو غالباً اس کی خاموشی۔ درجہ الجھن ہوئی تھی۔ میرب سیال نے سرنئی میں ہلایا تھا۔

”ابھی نی الحال میں نے کچھ ڈیپائینڈ نہیں کیا۔ میرے پاپا آرہے ہیں اور ان سے میرا ملنا ضروری ہے۔ وہ آجائیں تو اس کے بعد سوچوں گی۔“ اس کی جانب سے نظریں بٹاتی ہوئی وہ بولی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے بے تاثر انداز میں شانے اچکا دیئے تھے۔

”تمہاری مرضی۔“ وہ پلٹا تھا اور چلتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا۔ میرب لب بھینچے کھڑی اس کی دیکھتی رہ گئی تھی۔ مضبوطی سے قدم اٹھاتا وہ شخص قدم چلتا ہوا اس سے دور جا رہا تھا۔



سرراتی ہواؤں کے بیچ کھلے آسمان کے نیچے اس تاریکی میں عفتان علی خان تہا کھڑا تھا۔ خنک موسم کے کئی رنگ اس کی آنکھوں سے جھانک رہے تھے۔ ٹیرس پر اس لمحے کھڑا وہ مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔

اس کا بے تاثر چہرہ، سرد نگاہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خزاں کے اس موسم میں اسے اپنا وجہ کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لگا تھا۔

اپنی مسافت اسے اتنی ہی بے وقعت اور اپنے خواب اتنے ہی دھواں دھواں دکھائی دیئے تھے۔ سارا قصور اس کا تھا شاید۔ اس نے ہی زندگی کو غلط رنگ اور غلط زاویے سے دیکھا تھا۔

انا بیہ کے ساتھ اس کا ملنا، ایک تعلق کا بندھنا۔

لمحے میں سوچا تھا تو سب ایک بودا مذاق لگا تھا۔ ایک یکطرفہ راہ۔۔۔ یکطرفہ سفر اور صرف خسارہ۔۔۔ آج اتنے سفر کے بعد اگر آج اپنے ہاتھ وہ پھیلا کر دیکھتا تو انہیں خالی پار ہا تھا۔ خسارہ۔۔۔ صرف

وہ خود کو ہارا ہوا پار ہا تھا اور یہی ہارا سے چبنے نہیں دے رہی تھی۔ اس کا سانس گھٹ سا رہا تھا۔ کئی دیر سر آسمان کی طرف اٹھائے بالوں کو مٹھیوں سے بھینچے وہ گہرے گہرے سانس لیتا رہا تھا مگر کچھ نہ ہوا تھا۔ اور تب وہ چلتا ہوا اندر آ گیا تھا۔ فرنج کھول کر سوٹ ڈریک کا کین نکالا تھا۔ کھول کر لبوں لٹایا تھا۔ سبھی دھیان اس کی طرف گیا تھا۔ وہ اس کی طرف سے رخ پھیرے لیٹی تھی۔

عفتان علی خان چلتا ہوا انا بیہ کی سمت بڑھنے لگا تھا۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔

درمیان کے جتنے قدم تھے وہ بالآخر لمحے ہو گئے تھے۔ فاصلہ ملتا تھا اور وہ اس کے قریب کھڑا نظر آیا۔ پھر لبوں تک اس کے قریب کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا پھر جھک کر اس کا شانہ بہت آہستگی سے ہلایا تھا۔ انا بیہ میں جانے کو تھی، ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

”تم۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔؟“ اس کی بے تاثر نظر سے وہ کچھ اخذ نہ کرتی ہوئی بولی تھی۔ عفتان علی خان اسی بے تاثر انداز میں اس کی طرف دیکھتا چلا گیا تھا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے لہ کو بہت ملاحت سے چھوا تھا۔

”ذراپ سین!“ لہجہ مدہم تھا۔ انا بیہ کچھ اخذ نہ کر سکی تھی اسی لئے کسی قدر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ ”کیا۔۔۔ کیا مطلب؟“

”ذراپ سین۔۔۔ میں اپنے اور تمہارے رشتے کو ایک حتمی موڑ دینا چاہتا ہوں۔ تمہیں اس روز بتا تھا جس روز حاصل کرنا ہوگا تمہیں تمہاری اجازت سے حاصل کر لوں گا۔ ٹوڈے آئی وانٹ میک لوٹو یو۔“ ”کیا۔۔۔؟“ وہ حیرت سے اپنی جگہ بت بن گئی تھی۔ شاید یہ کوئی خواب تھا۔ شاید وہ بدستور نیند میں

شاید وہ کسی بھولے جھٹکے خواب میں تھی اور۔۔۔ ہاتھ بڑھا کر عفتان علی خان کے چہرے کو چھوا تھا۔ ارادہ یقین کر لینے کا تھا۔ مگر عفتان شاید اس کی ست سے اس کو ”اجازت نامہ“ سمجھا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بغور توجہ سے ماسکے چہرے کو دیکھا تھا۔

آج اس کی نگاہ میں کوئی جنوں خیزی نہ تھی۔ اس کے سارے خواب جیسے سرد خانوں میں مقید سرد جامد پڑے تھے۔

کوئی گرم جوش اس کے رویے میں نہ تھی۔

انا بیہ شاہ حیرتوں سے بھری نظروں کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ کیا کرے؟

کیا ہونا چاہئے تھا؟

سدا باب کے طور پر کچھ ازبر نہ تھا۔

یہ کوئی حقیقت تھی یا وہ واقعی خواب میں تھی؟ ساکت نگاہ سمجھ نہ پائی تھی۔

زبان حسن بخاری نے گاڑی چلاتے ہوئے گھر سے آئی ہوئی کال ریسیو کی تھی۔

”بہتر می! کہئے۔“

”اڑہان! اماں کے ہاں سے ماہا کو لیتے آنا۔ کچھ شاپنگ کے لئے جانا ہے۔“ امی نے حکم دیا تھا۔ اس

اڑدسرا ثبات میں ہلا دیا تھا۔

”بہتر می! کچھ اور؟“

”نی الماں یہی۔ تم گھر آؤ پھر باقی بات کرتے ہیں۔“ امی نے مسکراتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

انے گاڑی تانی کے گھر جانے والے راستے پر ڈال دی تھی۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ

تھا۔ معمول کے مطابق ہارن دیا تھا۔ چونکہ رانے گیٹ کھولا تھا۔ اس نے گاڑی پورچ میں روکی تھی۔

ساہیہ کانوں آیا تھا۔ وہ بات کرتا گاڑی سے باہر نکلا تھا۔

”ساہیہ! میں آ رہا ہوں۔ بس یہاں سے ماہا کو لیتا ہے اور.....“ وہ اپنے دھیان میں بات کرتا ہوا

بڑھا تھا بھی کسی سے ٹکرا گیا تھا۔ سنبھل کر دیکھا تو نگاہ ساکت رہ گئی تھی۔

”ان بھاگتے دوڑتے دنوں میں اچانک ہی کسی روز یونہی اچانک وہ چلتی ہوئی تمہارے سامنے آن

لا ہوئی تو تم کیا کرو گے؟“ ساہیہ کا لہجہ اس کی سماعتوں میں گونجا تھا۔ وہ ساکت سا اپنے سامنے موجود

کو دیکھ رہا تھا۔

”پلو فرض کر دو وہ آ جاتی ہے واپس تمہاری زندگی میں، یونہی چلتے چلتے اچانک کسی روز، تب تم کیا کرو

ساہیہ بھند تھی۔

”ساہیہ! میں وقت کو روک دوں گا۔ میں وقت کی نبض تھام لوں گا۔“ اپنی آواز بھی اس کے کہیں آس

کی۔

وہ چہرہ خواب نہ تھا۔

خیال نہ تھا۔

جینا جاگتا احساس تھا۔

زندہ لمبے کے سینے میں دھڑکتے دل کی دھڑکنیں اس وقت بھی سن رہا تھا۔

لمبے اگرچہ ٹھہر چکے تھے۔ نظریں جم گئی تھیں۔



مگر سینے میں موجود دل اب بھی دھڑک رہے تھے۔

دھک۔۔۔ دھک۔۔۔ دھک۔۔۔

اذہان حسن بخاری کی نگاہ یوں ساکت تھی جیسے کوئی خواب کا سا عالم ہو۔ جیسے سارے اہل ہوں اور دکھائی دینے والا ہر منظر خواب خواب۔

اس کے سامنے کھڑے وجود میں بھی کوئی حرکت نہ تھی۔ اس کی طرف دیکھتی وہ نگاہ بھی اتر تھی۔ جیسے یقین اس طرف بھی نہ تھا۔

اذہان حسن بخاری نے اپنے قدم اس کی طرف بڑھائے تھے اور اس کے مقابل آن رکا تھ اس کی جانب تکتی نگاہ پانیوں سے بھر گئی تھی۔

”میرب!“ اذہان حسن بخاری نے جیسے یقین کرنے کو اسے آہستگی سے چھو کر دیکھا تھا۔ کے پتھر سے وجود میں حرکت ہوئی تھی اور وہ بے اختیاری میں اس کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگا۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا، کوئی اور لمحہ ہوتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔ مگر یہ وہ لمحے تھے سال بے حد شگفتگی کے عالم میں تھی۔ دل جس دور سے گزر رہا تھا اس میں اختیار رہ ہی نہ پایا تھ بھینکتی چلی گئی تھیں۔

اذہان حسن بخاری اپنے شانے پر دھرے اس کے سر کو دیکھتا ہوا اب بھی اسی قدر حیرانہ نے بڑھ کر اسے گرفت میں لیا تھا، نہ کوئی حصار باندھا تھا۔ وہ ایک عالم حیرت میں تھا اور سا کر وقت چپ چاپ دبے پاؤں گزر رہا تھا۔ لمحوں میں کوئی آہٹ نہ تھی۔ کوئی ہلچل نہ تھی۔ وہ وقت کی نبض کو نہیں تھام سکا تھا۔

میرب سیال اپنے اندر کا بہت سا غبار اس کے شانے پر بہا کر دور ہوئی تھی۔ چند لمے جھکائے چپ چاپ شرمندہ سی کھڑی رہی تھی۔ انداز میں ایک واضح جھجک مانع تھی۔ ایک بے گرفت کے بعد کا عالم تھا۔

اذہان چپ چاپ کھڑا تعجب بے بسی کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی بھی نہ ہوئی تھی۔

ابھی کل کی بات لگتی تھی۔

دل کا بے وجہ قیامت کرنا۔ ہلچل مچانا۔ شور کرنا۔

وہ ساری آوازیں آج اتنی دبی دبی سی کیوں تھیں؟ یا پھر سماعتوں کا ہی کوئی تصور تھا۔ دل دھڑک رہا تھا تو آواز کیوں نہ آ رہی تھی؟ یہ لمحے اتنے چپ چاپ، اجنبی بنے کیوں تھے؟ وہ جو آشنا تھا، آج اجنبیوں کی طرح ایک دو بے سے نگاہ پھیرے چپ چاپ سے کیوں آ میرب سیال بنا اس کی طرف دیکھے مڑی تھی غالباً وہ اس منظر سے چپ چاپ جدا ہونا چاہتا اذہان حسن بخاری نے اسے پکار لیا تھا۔

”میرب!“ پڑھنے والے نے جیسے کوئی اسم اعظم پھونکا تھا۔ میرب سیال کے قدم و پیر

وہ پلٹی نہیں تھی مگر وہیں اس جگہ جیسے جم گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے بہت آہستگی سے چلتے ہوئے ف۔۔۔ وہ پلٹی نہیں تھی اور چلتے چلتے اس کے مقابل جا رکھا تھا۔

ساکی جانب پیش قدمی کی تھی اور چلتے چلتے اس کے مقابل جا رکھا تھا۔ ایک چپ چاپ اس کے چہرے کو نکلتا رہا تھا۔ بہت کچھ کہنے کی خواہش کی تھی مگر کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ ایک ایسی ہی نہیں۔ چپ چاپ وہ نگاہ پھیر گئی تھی۔ انداز میں بے بسی ہی تھی۔

”کیسی ہوتی؟“ اذہان حسن بخاری کو اپنی آواز اجنبی لگی تھی۔ میرب سیال نے اس کی طرف چہرہ برتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا تھا اور مسکرا دی تھی۔ مگر بہت مصنوعی مسکراہٹ تھی۔

”اور تم۔۔۔ تم کیسے ہو؟“ نگاہ ملانے کی ہمت دونوں میں ناپید تھی۔ اذہان حسن بخاری کو اپنا آپ بحد شکستہ لگا تھا۔ مگر اس نے میرب کی تقلید کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں بھی ٹھیک ہوں۔“ مدہم لہجے میں کچھ ٹوٹنے کی صدا تھی۔ میرب اس کی طرف دیکھے نہیں رہ سکی تھی وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرب کے انداز میں ہی نہیں، نگاہ میں بھی گریز تھی۔

”خوش۔۔۔ خوش ہوتی؟“ اذہان کی نگاہوں نے اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ میرب اس کی طرف دیکھے بغیر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”اور تم؟“ جواباً پوچھنا جیسے اس کے لئے فرض ہو گیا تھا۔

اذہان حسن بخاری نے اسے دیکھا تھا اور پھر مسکرا دیا تھا۔

”تم سے بچھڑ کر جیتا ہوں!

تیری طرح میں بھی جھوٹا ہوں“

میرب اس کی طرف دیکھ نہیں سکی تھی۔ توجہ پھر بٹ گئی تھی۔

”منظر انکل کیسے ہیں؟۔۔۔ زو بار یہ آنٹی، فانی۔۔۔؟“

”سب ٹھیک ہیں۔“ میرب نے مدہم لہجے میں جواب دیا تھا۔

”نانو سے پتہ چلا تھا انکل منظر کے بارے میں۔ پوچھنا بھی چاہتا تھا مگر.....“ اس کے آگے وہ نہیں اسکا تھا۔

”فانہ آنٹی کیسی ہیں؟“ میرب نے خاموشی کے اس تسلسل کو ٹوٹے نہیں دیا تھا۔ شاید خاموشی میں رتے جو سوال تھے ان کا سامنا کرنے کی ہمت دونوں میں ناپید تھی۔

”ٹھیک ہیں وہ بھی۔ ماہانے تو یہیں ڈیرا جمایا ہوا ہے ان فیکٹ، حالانکہ گھر میں کئی کام ہیں مگر وہ نضدی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر روٹھ جائے تو منانا مشکل ہو جاتا ہے۔ پاپا سے اس کی کچھ باتی تھی۔ سو وہ.....“

”انگل منٹ ہو رہی ہے تمہاری؟“ وہ مسکراتے ہوئے بول رہا تھا جب میرب نے بول کر اس کا سارا اتر دیا تھا۔ وہ اس کی طرف سے نگاہ پھیر گیا تھا۔ لب بھینچ لئے تھے اور بہت آہستگی سے اس نے سر ت میں ہلا دیا تھا۔ عجب مجرمانہ سا انداز تھا۔

”جینے کی رسمیں نبھانا پڑتی ہیں میرب! سو رسم نبھار رہا ہوں۔“ وہ بہت آہستگی سے مسکرایا تھا۔
 رہی تھیں تمہاری رخصتی بھی عمل میں آنے والی ہے۔ مظہر انکل واپس آ رہے ہیں اور.....“
 ”ہاں، ٹھیک سنا تم نے۔ پایا واپس آ رہے ہیں۔ اینڈ آئی ایم سوچ چپی۔“ لیوں پر مسکراہے
 ”پری ٹنڈ“ کرنے کا انداز بہت خوب تھا۔

”ہپی؟“ انکل کے آنے کے لئے یا اپنی ریکل میرج کے لئے؟“ اذہان حسن بخا
 مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ میرب نے مسکراہٹ کا سہارا لیا تھا۔
 ”دونوں کے لئے۔ اپنی انگیج منٹ میں بلاؤ گے نہیں؟“ پتہ نہیں امتحان لینا مقصود تھا اس
 پُر اعتماد نظر آنے کی حتی الامکان کوشش کر رہی تھی۔ اذہان مسکرایا تھا۔
 ”کیسے بلاتا؟ تم خفا تھیں نا مجھ سے۔“ اذہان کی جان کی قیامتوں کے زیر تھی۔

”دبھی تعلق توڑ لئے۔ کیا اچھا کیا تم نے؟“ میرب سیال نے دوستانہ انداز میں شکوہ کیا تھا
 صورتحال کو یوں بس میں ظاہر کرنا چاہا رہے تھے جیسے سب کچھ اپنے اختیار میں ہو۔ مگر بکھرنے کا یہ
 واضح تھا۔

”اول، ہوں۔ اچھا نہیں کیا شاید۔“ مدہم سرگوشی میں افسوس نمایاں تھا۔ نگاہ بغور اس
 کو جو دیکھ رہی تھی۔ ”بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔ مگر کیا کروں، تم تو جانتی ہو مجھے۔ سدا کا ہلکلو ہوں
 حسن بخاری مسکرایا تھا۔

”مجھے بھول گئے؟“ میرب سیال کی آواز ہی نہیں، نگاہ بھی شکوہ کر رہی تھی۔
 اذہان حسن بخاری نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ جیسے اس لمحے اس کے پاس کوئی لفظ تھے نہ
 چپ چاپ نگاہ پھیر گیا تھا اور میرب سیال مسکرا دی تھی

”کیسے دوست ہو؟ کبھی یا نہیں آئی تمہیں میری؟ مجھے تو لگا تم مجھے بھولے ہی نہیں ہو گے۔“
 تھی نا میں تمہیں؟“

”ہاں، بہت۔“ عجب اک رکھ رکھاؤ میں وہ بھی مسکرایا تھا۔ ”مگر تم نے جاتے ہوئے منع کر
 تمہیں کبھی اپنی صورت نہ دکھاؤں۔“

”میں نے کہا اور تم نے مان لیا؟“ میرب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔
 ”تمہاری کوئی بات ٹالی ہے کبھی؟“ اذہان نے مسکرا کر خود کو معمول پر ظاہر کرنا چاہا تھا۔ بے
 نمایاں تھی اس کی آنکھوں میں۔ میرب مسکرا بھی نہیں سکی تھی۔

”اور تم۔؟“ اذہان نے اس کے خاموشی سے نگاہ پھیر لینے پر اسے بغور دیکھا تھا۔
 ”ہاں۔ بہت خوش ہوں۔“ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔ غالباً خود کو کبڑا
 مقصود نہ تھا۔ مگر اذہان مسکرایا تھا۔

”کس لئے؟“ شادی کر رہی ہو اس لئے؟“
 ”ہاں۔ اس کے لئے بھی۔ مگر پایا واپس آ رہے ہیں اس لئے بھی۔ بہت تنہا پڑ گئی۔“

تم نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں پوچھا۔ کتنے بے مروت رشتے دار ہو میرے۔ کتنے تعلق تھے ہمارے
 بن کر تم کوئی ایک بھی نہ بھا سکے۔“ مسکراتے ہوئے ایک مزید شکوہ ہوا تھا۔
 اذہان حسن بخاری مسکرا رہا تھا۔

”ڈر تھا۔“

”کس بات کا؟“ چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”تمہارا ہزبینڈ بہت برا بیٹنا نا مجھے؟“ اذہان مسکرایا تھا۔ ”سینٹی بتا رہا تھا، موصوف خاصے خوفناک
 اہم نے ہزبینڈ ہی ڈھونڈنا تھا تو ڈھنگ کا ڈھونڈا ہوتا۔ یہ جلاوڈھونڈنے کی کیا ٹھانی؟“ معمول پر ظاہر
 نے کے لئے کیسے کیسے ضبط درکار تھے، اس کا اندازہ اذہان کو ہو رہا تھا۔ نہ مسکرانا آسان تھا نہ اس کے
 نے کھڑے ہو کر ایسی معمول کی بات چیت کرنا۔ مگر اسے ایسا کرنا تھا۔ کیونکہ یہ منشا تھی اس وقت کی۔
 نہ کو وہ پہلے بھی نہیں ٹال سکا تھا اور اب بھی نہیں۔

میرب اس کے مذاق پر مسکرا دی تھی۔

”سینٹی نے اتنا کچھ بتا دیا تمہیں؟“

”نہیں۔ بہت کچھ اس نے نہیں بھی بتایا۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے لب بھینچ کر اسے دیکھا تھا۔

”کیا؟“ میرب نے بہت آہستگی سے دریافت کیا تھا۔

”یہی کہ تم بہت خوش ہو۔“ اذہان اسے بغور دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔ میرب زیادہ دیر مسکرا نہیں سکی تھی
 نگاہ پھیر گئی تھی۔ اذہان اسے دیکھتا ہوا دھیان پھیر گیا تھا۔

”تم کبھی آئی ہی نہیں۔ محی کو بھی اپنی بھانجی سے ملنے کا بہت اشتیاق رہا۔ کئی بار پوچھا بھی انہوں نے
“

”تم ٹال گئے ہو گے۔“ میرب نے اسے ٹوکے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں، بتایا تھا میں نے انہیں۔“ اذہان نے اقرار کیا تھا۔

”کیا؟“ اپنی آواز بہت مدہم اور نیم جاں لگی تھی میرب کو۔

”یہی کہ سارا تصور میرا تھا۔“ اذہان نے فرانخ دلی سے سارا الزام اپنے سر لیا تھا۔ میرب کچھ کہہ نہیں
 سکتی۔ وہ دونوں ایک دو جے سے نگاہ پھیرے چپ چاپ سے کھڑے تھے جب ماہانے وہاں آ کر
 نول کو متوجہ کیا تھا۔

”اذہان بھائی! کب آئے آپ؟“ میرب آپنی سے مل لئے۔ چلو اچھا ہوا۔ ورنہ مجھے یقین تھا اگر
 ناکے جانے کے بعد میں آپ کو بتاتی کہ میں نانو کے یہاں میرب آپنی سے ملی تھی تو یقیناً آپ بہت گلہ
 رستے کہ مجھے کیوں نہیں طویا۔“ وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ ان دونوں کی کیفیات سے قطع نظر۔

اس کی بات پر دونوں مسکرا دیئے تھے۔

”کتنی عجیب بات ہے نا۔ ہم کزن ہیں مگر اس کے باوجود اک دو جے کی حال احوال کی خبر تو دور
 ناہات، شکلیں بھی حادثاً اور اتفاقاً دیکھتے ہیں۔ جب کبھی وقت اچانک ہمیں ملا دیتا ہے۔ ہے نا میرب

آپی؟“ ماہانے مسکراتے ہوئے کسی قدر حقیقت بیان کی تھی۔ میرب نے سر اثبات میں ہلادیا تھا۔
”دلوں کی دوریاں ایسی ہی ہوتی ہیں ماہا! بعض اوقات دور ہو کر بھی کوئی متواتر یاد رہتا ہے۔
اوقات ایک شہر میں، ایک علاقے میں رہتے ہوئے کبھی یاد بھی نہیں آتا۔“

”ارے، یہ کیسی بات کر دی آپ نے۔“ مہی نے سنا تو انہیں بہت برا لگے گا۔ آخر کو سگی ماسی ہیں
کی۔ ماسی مین ماں۔۔۔ سی۔ ہم سے زیادہ آپ سے پیار کرتی ہیں وہ۔ مگر آپ بھی نا۔ آخری
شادی کی رسم تک میں شرکت نہ کی۔ مایوں والی شام آئیں بھی تو کھڑے کھڑے واپس لوٹ آ کر
اور ہمیں اپنے نکاح تک میں نہ بلایا۔ انکل بیمار پڑے، باہر چلے گئے، آپ نے بتایا تک نہیں۔ میرب
ٹوٹ گئی مگر آپ نے پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ ایسے ہی اجنبی ہو گئے تھے ہم آپ کے لئے؟ جانتے؟
آپ کے پاپا کو اپنی سسرال یعنی ہماری ساری فیملی سے پر اہلم ہے۔ نانو سے، ماموں سے، ہم سے،
آنٹی کے گزر جانے کے بعد تو انہوں نے بالکل ہی دور کر دیا ہم سے۔ اور اب تو خد ہو گئی۔ آپ کو
ہونے والی ہے یعنی شادی۔ اور ادھر اذہان بھائی کی انگیج منٹ۔ مگر نہ آپ کی ہمیں کوئی خبر ہے نہ
ہماری۔“ ماہا متواتر شکوہ کر رہی تھی۔ میرب بہت سی باتوں کے اسباب جانتی تھی اور بہت سی باتوں
نہیں۔ خاموشی ہی بہتر تھی۔ اس لمحے بہت سی باتوں کے عہد شاید تہی پردے کے پیچھے چھپے رہ سکتے
وہ آگے بڑھی تھی اور ماہا کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر ماتھے پر پیار کیا تھا۔

”فارحہ آنٹی کو میری طرف سے ضرور پوچھنا۔“ اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔ جب ماہا
ہاتھ تھام کر مسکرا دی تھی۔

”پھر کب ملیں گے ہم؟ کہیں پھر اتفاقاً آیا۔۔۔۔۔۔“ اس کی شرارت پر وہ مسکرا دی تھی۔

”لٹ سی ماہا! آئی ریٹلی ڈنٹ نو۔“ اسے محبت سے دیکھ کر اذہان کی طرف دیکھا تھا اور آہ
مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

”چلتی ہوں میں۔“

اذہان نے بھی رسمی سی مسکراہٹ کا تبادلہ کیا تھا۔ میرب سیال مزی تھی اور اپنی گاڑی کی طرف ہر
تھی۔ اذہان حسن بخاری کی نگاہیں بہت سے اضطرابوں سے بھر گئی تھیں۔ تا دیر اس منظر پر جمی رہی
جب تک گاڑی گیٹ سے باہر نہیں نکل گئی تھی۔ ماہا نے بھائی کی جانب بہ غور دیکھا تھا اور بہت دھیمے
مسکرا دی تھی۔

”بھائی! آپ نے وقت گنوا دیا نا۔“ اس ایک جملے میں جتانے کو بہت کچھ تھا۔ اذہان حسن بخاری
نہیں بولا تھا۔ بہت ہارے ہوئے انداز میں مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلادیا تھا۔ ماہا کا دل کٹ
گیا تھا۔

”بھائی! اگر آپ اس وقت کوئی اسٹینڈ لیتے تو آج میری آپی آپ کے ساتھ ہوتیں نا۔ آپ نے
کوئی اسٹینڈ کیوں نہیں لیا۔۔۔؟“ ماہا نے بھائی کی کیفیات کے پیش نظر کہا تھا اور وہ کچھ بھی کہے بغیر
پھیر گیا تھا۔

”آپ فیملی کرانسس میں الجھے رہے۔ مہی کا گھر بچانے کے جتن میں آپ نے اپنا دل نہیں دیکھا۔ اگر
دیکھ پاتے تو آج صورت حال مختلف ہوتی۔ کیا پایا بھائی! کیا پایا ہم دونوں بہن بھائیوں نے؟ وہ وقت ہم
دلوں سے بہت کچھ چھین کر لے گیا نا۔ آپ سے چپ چاپ اور مجھ سے واضح طور پر۔ آپ نے ہماری
بجائے خود اپنی فکر کیوں نہیں کی بھائی؟۔۔۔۔۔۔ میری مایوں کے روز جب میرب آپی گھر آئی تھیں تو وہ آپ
کا پوچھ رہی تھیں۔ بہت پریشان دکھائی دے رہی تھیں وہ۔ آنکھوں میں الجھن تھی۔ وہ آپ کے متعلق پوچھ
رہی تھیں۔ میں تب نہیں جانتی تھی، صورت حال ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ وقت انہیں لئے آپ سے اتنا دور بھی
لے جا سکتا ہے۔ میں اس روز نہیں جانتی تھی، آپ ان سے ملے یا نہیں۔ اگلے دو چار دنوں میں جو قیامت
ہمارے گھر پر ٹوٹی تھی اسے لے کر نہ ہم کچھ سوچ سکے نہ دیکھ سکے۔ مگر کچھ عرصے بعد جب مجھے سنی سے
میرب آپی کے نکاح کے متعلق پتہ چلا تو خوشی نہیں ہوئی مجھے۔ کیونکہ میں نے ہمیشہ انہیں اپنی بھائی کے
روپ میں دیکھا تھا۔ مگر..... بھائی! آپ کو پتہ نہیں احساس ہے یا نہیں مگر ہم دونوں کے محرم پایا ہیں۔
انہوں نے مہی کو ہی نہیں، اپنے بچوں کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ یہ مجھے آج پتہ چلا ہے کہ میرب
آپی اپنے اچانک طے کردہ رشتے کو لے کر اس وقت پریشان تھیں جب ہمارے گھر آئیں۔ وہ یقیناً کوئی
حل جانتی تھیں اور حل نکل بھی آتا اگر آپ نے اس وقت کو اپنی گرفت میں لیا ہوتا۔ پاپا کے گھر کو بچانے کی
بجائے اپنے دل کو دیکھا ہوتا۔ میرب آپی آپ کا ساتھ چاہتی تھیں نا۔ اس وقت اگر آپ نے ان کا ساتھ
دیا ہوتا تو آج آپ اتنے شکستہ اور ادھورے دکھائی تو نہ دے رہے ہوتے۔ آپ نے کیوں اسٹینڈ نہیں لیا
اس وقت؟ کیوں الجھے رہے ہمارے الجھاؤں میں؟ کیوں اپنے دل کو نہیں دیکھا؟ کیوں گنوا دیا اتنی اچھی
لڑکی کو؟ کیوں توڑ دیا اس کا دل جو آپ کا دل آباد کئے ہوئے تھی؟ آپ کو نہیں لگتا، خود کے ساتھ ساتھ آپ
نے اس کے ساتھ بھی برا کیا ہے۔ خود کو تو نقصان پہنچایا ہی ہے، اسے بھی تکلیف دی ہے۔ آپ کو کیا لگتا
ہے وہ خوش ہے؟“

ماہا کا دم لہجہ بہت سے سوالوں سے پڑ تھا۔ اس کی آنکھیں بہت آہستگی سے بیگ رہی تھیں۔ اذہان
حسن بخاری نے سر بہت آہستگی سے ہلاتے ہوئے اس کی آنکھوں کو پونچھا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

”ہم ایک دوسرے کے لئے نہیں تھے گڑیا!۔۔۔۔۔۔ ہم ایک دوسرے کے لئے نہیں تھے۔ تبھی وقت نے
ہماری مخالفت کی۔ میں نے کوئی قربانی نہیں دی۔ میں نے اس وقت جو بھی اپنی فیملی کے لئے کیا وہ اس
وقت کی ضرورت تھا۔ میری فیملی کو میری زیادہ ضرورت تھی ماہا! آج وہ بھی اپنی زندگی میں نئی خوشیاں سمیٹنے جا
رہی ہے اور میں بھی نئے راستوں کی سمت گامزن ہوں۔ جو ہو چکا ہے اس کا ملال کرنے کی ہم دونوں کو نہ
زمت ہے نہ ضرورت۔ پھر تم کیوں خود کو مجرم سمجھ رہی ہو؟ اور کیا ہم ساری باتیں آج یہیں کھڑے کھڑے
کر لیں گے؟ بھول گئیں تم، تمہارے اس ہینڈ سم سے، ڈشنگ سے بھائی کی انگیج منٹ ہونے جا رہی ہے
کل۔ تم تینوں ادھر ادھر کی سوچ کر وقت برباد کر رہی ہو۔ تیاری نہیں کرنا ہے؟ ویزا ز یور ایکسا منٹ ہاں؟
آئی ایم منگ دیٹ آن یور فیس۔“ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا تھا۔ ”مہی نے
مجھے نہیں لانے کے لئے کہا تھا۔ تم اپنا سامان لے آؤ۔ میں یہیں باہر گاڑی میں تمہارا انتظار کرتا ہوں۔“

”آپ اندر نہیں آئیں گے؟“ نانو کو خبر ہوئی کہ آپ یہاں پورچ میں ہی کھڑے ہو کر لوٹ گئے ہیں تو بہت خفا ہوں گی۔“ ماہا نے خدشہ بیان کیا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

”تم فکر مت کرو۔ میں سمجھا دوں گا انہیں۔ مئی انتظار کر رہی ہوں گی۔ جلدی سے سامان لے اے مہم لہجے میں کہہ کر اس کا گال تھپتھا کر وہ پلٹا اور گاڑی کی طرف چلا گیا تھا۔

ماہا نے بھائی کو بغور دیکھا تھا۔ ڈھند میں لپٹی اس خنک سی شام کے سارے منظر اسے بہت خفا اور جامد لگے تھے۔ وہ پلٹی تھی اور اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

اذہان حسن بخاری بے تاثر چہرے کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا بہن کا انتظار کرنے لگا تھا۔

اپنے کانپتے وجود کو سنبھالنا انا بیہ کو بے حد دشوار لگا تھا۔ عرفنان علی خان کی پیش قدمی پر وہ بہت سے قدم قدم پیچھے ہٹی تھی۔ سردی کے موسم میں اس کا چہرہ پسینے سے تر بہ تر تھا۔ آنکھوں میں خون تھا۔ مگر عرفنان علی خان کے اس کی جانب بڑھتے قدم نہیں رُکے تھے۔

”نہیں۔۔۔“ بہت آہستگی سے اس نے سرنفی میں بلایا تھا۔ مگر عرفنان علی خان نہیں رکا تھا۔

”نہیں۔۔۔“ وہ چیخنے کی خواہش میں چیخ نہیں سکی تھی۔ آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

اس کی آنکھ ایک دم کھلی تھی اور وہ اٹھ بیٹھی تھی۔

گہرے گہرے سانس خارج کرتی ہوئی وہ چند لمحوں تک اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔ پھر حواس پکڑے تھے تو ہاتھ بڑھا کر لیمپ جلایا تھا۔ کمرے کا منظر بے حد واضح ہو کر اس کے سامنے تھا۔ سا۔ گئی تھی جہاں عرفنان علی خان صوفے پر سویا ہوا تھا۔ اتنی بے خبر نیند تھی کہ اپنے اوپر سے کبل سرک رہی بھی احساس اسے نہ ہوا تھا۔ سردی کی شدت کا اسے کوئی احساس نہ تھا۔ انا بیہ کا ہاتھ اپنی پیشانی کی

گیا تھا۔ پیشانی ہی نہیں، سارا چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ ہاتھ پر کئی قطرے لے کر اس نے اپنے ہاتھ پھر عرفنان علی خان کو دیکھا تھا اور ساری حقیقت خود بہ خود واضح ہو گئی تھی۔ یقیناً خواب تھا وہ۔

مگر کس قدر دل دہلا دینے والا تھا۔

”تھینک گاڈ۔“ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے اپنے چہرے کو صاف کیا تھا۔

عرفنان علی خان اور اس کے درمیان تقاوت اسی طور قائم تھی۔ اور یہ بات دل کی تسلی کو کافی تھی۔ ہٹا کر اٹھی تھی۔ بیڈ سے نیچے اترتی تھی۔ چلتی ہوئی بے ساختہ ہی عرفنان علی خان کی سمت آئی تھی۔ نہ

گرے ہوئے کبل کو اٹھا کر بہت آہستگی سے اس پر ڈالا تھا اور اسی قدر آہستگی سے مڑ کر وائش روٹم پڑ گئی تھی۔ بہت سے پھیپھوں کے منہ پر مارنے کے بعد وہ ٹاول سے چہرہ پونچھتی ہوئی باہر آئی تھی۔

کلاک کی سمت گیا تھا۔ صرف دو بجے تھے ابھی۔ بستر میں جانے کی بجائے بیڈ کی طرف آ کر ڈائری رائٹنگ ٹیبل پر آگئی تھی۔ مگر اس سے قبل وہ کمرے کی لائٹ بند کرنا نہیں بھولی تھی۔ ٹیبل لیمپ کی روٹم نے ڈائری کو کھولا تھا اور پچھلے لکھے صفحات کو الٹ کر سرسری انداز میں دیکھا تھا اور پھر صفحے الٹنے آگے بڑھی تھی اور قلم کھول کر تیزی سے کچھ لکھنے لگی تھی۔ تنہائی تھی۔ سلوٹن تھا۔ آس پاس کے ہر

دوئم

اے افسون جاں، افسون انتظار کیا کہیں کہ بسر ہوتے ہیں روز و شب کیسے

کیسے نکلتی ہے روح میں قیامت کوئی! کیسے نکلتی ہے بارگراں سانس کوئی

کیسے آتا ہے کسی بیمار کو بے وجہ قرار اے افسون جاں، افسون انتظار

اذہان حسن بخاری نے گھر میں قدم رکھا تھا۔ ایک چہل پہل تھی۔ تیاریاں عروج پر تھیں۔ وہ تھکے ہاندے سے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ اسے یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ ”مجھے

ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“ فارحہ سے اس کا سامنا ابھی تک نہیں ہوا تھا اور فی الحال وہ ان سے سامنا کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کچھ وقت تنہائی میں خود اپنے ساتھ خاموشی میں گزارنا چاہتا تھا۔ سو وہ آنکھیں بند کر کے

چپ چاپ لیٹ گیا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو تم؟“ اس کی آواز اس کے اندر گونجی تھی۔

”ایک بات۔“ میرب سیال جو ابابہت دلکشی سے مسکرائی تھی۔

”کیا؟“ وہ چونکا تھا۔

”یہی کہ تمہیں اگر زندگی میں سے اور مجھ میں سے انتخاب کرنا پڑے تو تم کسے چنو گے؟“ وہ شرارت کے موڈ میں تھی۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

”یہ بھی کوئی سوچنے والی بات ہے؟“ میرے لئے تم زندگی سے زیادہ اہم ہو۔ ہر ایک شے سے زیادہ اہم ہو۔“

”اول، ہوں۔ بناؤ مت۔“

”تو پھر کیا کروں؟“ کوڈ جاؤں اس چیئر لفٹ سے؟“ وہ ہنسا تھا۔

”ڈونٹ بی اور اسارت۔ یہاں سے کوڈنا تم جیسے بندے کے لئے مشکل بھی نہیں ہے۔ کوئی بھی اسٹٹ آرام سے کر جاؤ گے تم۔ پھر میں تم سے ایسی کوئی فرمائش ہی کیوں کروں؟“

”تو پھر؟“ وہ مسکرایا تھا۔

میرب کچھ دیر تک اسے خاموشی سے دیکھتی رہی تھی، پھر مسکراتے ہوئے سرنفی میں ہلا دیا تھا۔

”کچھ نہیں۔“

”کچھ نہیں؟“ وہ حیران ہوا تھا۔

”ہوں۔“

”شیور؟“ اس کی اپنی تسلی نہ ہوئی تھی۔

”اذہان!“ وہ اسی طرح لیٹا ہوا تھا جب فارحہ نے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تھا۔
 ”اذہان! کیا ہوا؟“ اس طرح کیوں لیٹے ہوئے ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“ فکر مند
 ہجک کر اس کی پیشانی کو چھوا تھا اور اسی لمحے وہ آنکھیں کھولتا ہوا اٹھ بیٹھا تھا۔
 ”اذہان بیٹا! کیا ہوا ہے تمہیں؟ اس طرح اپنے کمرے میں کیوں آگئے؟“
 ”کچھ نہیں می! ٹھیک ہوں میں۔“ اذہان حسن بخاری نے مسکرا کر انہیں مطمئن کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ پھسکی
 مگر اٹ فارحہ کو زیادہ مطمئن نہیں کر سکی تھی۔
 ”کیا بات ہے؟“ اذہان رشتوں میں اتنی ایمانداری کا قائل تھا کہ کچھ بھی چھپا نہیں سکا تھا۔ فارحہ کی
 دیکھا تھا اور بہت آہستگی سے بولا تھا۔
 ”میں میرب سے ملا آج۔“
 فارحہ حیران رہ گئی تھیں۔

”کہاں؟“

”نانو کے گھر۔ وہ بھی غالباً ان سے ملنے آئی تھی۔ میں آپ کے کہنے پر ماہا کو لینے گیا تھا تبھی اچانک وہ
 نے سامنے آگئی۔“ کہہ کر وہ لب بلبھیج کر سر جھکا گیا تھا۔ فارحہ نے بیٹے کو بغور دیکھا تھا۔ اس کی کیفیت
 نے کے لئے فارحہ کے لئے اسے آنکھوں سے دیکھنا ضروری نہیں تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے بھی اسے
 ل تو جان سکتی تھیں اس کے دل میں کیا تھا۔ اس لمحے وہ کس کیفیت کے زیر تھا۔ وہ جانتی تھیں
 شاید وہ کچھ نہیں بولی تھیں اور وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

”میری زندگی کا بہت کڑا لمحہ تھا وہ۔ میں جی نہیں پایا۔ مر گیا، لمحہ بھر کو۔ میرا اندر میری روح سے
 ہو گیا اور میں خالی خالی آنکھوں سے چپ چاپ تکتا رہا ان آنکھوں کو، اس چہرے کو جو کبھی میرے لئے
 سے خالص تھا۔ اور آج شاید کچھ بھی نہیں۔“ اذہان حسن بخاری ماں کے سامنے وہ سب بول رہا تھا جو
 وہ دنیا میں کسی کے سامنے نہیں بول سکتا تھا۔ سر جھکائے اس لمحے وہ بے حد شکست خوردہ دکھائی دے
 ل اس کی آنکھوں سے آنسو چپ چاپ بہ رہے تھے۔ وہ دنیا میں اگر کسی کے سامنے کمزور پڑ سکتا تھا
 صرف اس کی ماں تھی۔ فارحہ چپ چاپ ساکت سی اسے دیکھ رہی تھیں۔

”ہم اجنبیوں کی طرح ملے۔ رسمی بات چیت کی اور بالکل اجنبی لوگوں کی طرح کئی کتراتے ہوئے
 دوسرے سے جدا ہو گئے۔ کہانی ختم ہو گئی۔ اس لمحے مجھے وہ سارے لمحے خواب لگے جب ہم ملے تھے
 رہا ملے تھے۔ تب اس لمحے کی پہچان مجھے لمحہ بھر کی لگی۔ شاید ہم کسی غلط وقت کے غلط لمحے میں ملے۔
 میں اب بھی نہیں ماننا چاہتے تھا۔ میں نہیں بتا سکتا آپ کو، اسے بھی نہیں اور شاید خود کو بھی نہیں۔ میں
 سے دل سے نہیں ماننا چاہتا تھا۔ کبھی بھی دوبارہ نہیں۔ میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہم دوبارہ کبھی
 ملیں گے بھی۔ مگر وقت نے ہمیں ایک بار پھر ایک دوسرے کے مقابل کر دیا۔ ہم ایک دوسرے سے
 مل کر رہے تھے۔ بول رہے تھے تو صرف جھوٹ بول رہے تھے۔ رسم دنیا بھارے تھے۔ مگر میری
 لانے اسے پڑھ لیا اور اس نے مجھے۔ میں جان گیا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں درج

”سٹ پریسٹ۔“ وہ مسکرائی تھی۔ ”میرے لئے تمہاری محبت سب سے اہم ہے۔“
 ”اور میرے لئے تم۔“ وہ مسکرایا تھا۔
 ”جانتی ہوں میں۔“

”تو پھر پوچھ کیوں رہی تھیں؟“ مصنوعی غصے سے گھورا تھا۔
 ”تسلی کر رہی تھی۔“ وہ ہنس دی تھی۔

”یقین کر لو۔ ہماری لوائسٹوری میں کہیں دور دور تک بھی کوئی ولن نہیں ہے جو ہمیں ملنے سے
 سکے۔ آج می کو انفارم کروں گا تو کل تم دلہن بنی میرے گھر پر ہوگی۔“ اذہان کا لہجہ یقین تھا۔
 ”اچھا۔ اتنا آسان ہے کیا سب کچھ؟“ میرب نے مسکراتے ہوئے اسے گھورا تھا۔ ”مگر
 باہر پڑی ہوں کیا، یا پھر بوجھ ہوں اپنے گھر والوں کے لئے؟“
 وہ ہنس دیا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ جانتا ہوں میں۔ مگر مجھے اپنی محبت کی سچائی کا یقین دلانے کے لئے کوئی بڑا
 تو مارنا تھی۔ سو.....“ مسکراتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ میرب مسکرا دی تھی۔ پھر سنجیدہ
 ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”اذہان! کیا تمہیں واقعی لگتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ٹھیک ہو جائے گا؟“
 ”کیوں، تمہیں نہیں لگتا؟“ وہ اس کے خدشے کو کوئی نام نہ دے سکا تھا۔

”پتہ نہیں۔“ اس نے شانے اچکا دیئے تھے۔ ”جب سے بڑے ماموں کی ڈرائیونگ سے می اڑ
 سے گئی ہیں پایا کارویہ می سے وابستہ ہر رشتے کے لئے سرد ہو گیا ہے۔ وہ بڑے ماموں کو اس حد
 ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ یہ بات صاف نظر آتی ہے۔ مگر کہیں کوئی اور بات بھی ہے اذہان! مجھے اس سے پہلے
 پایا کارویہ اپنی ننھیال کے لئے پُر جوش اور گرم جوش نہیں لگا۔ فارحہ آئی کے لئے تو کبھی بھی نہیں۔ مگر
 پایا کو میں کچھ نہیں سمجھ سکی۔ کبھی ان سے پوچھ بھی نہیں سکی۔ مگر ان کو کہیں نہ کہیں میری ننھیال سے کوئی بڑا
 ضرور ہے۔ می سے وہ بہت محبت کرتے تھے۔ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں مگر.....“

”کہیں کچھ نہیں ہے میرب۔“ اذہان نے اسے جھٹلایا تھا۔ ”سب کچھ ٹھیک ہے۔ اور رہی“
 انکل کی بات تو آئی ایم شیور، انہیں اپنی بیٹی کے لئے مجھ سے اچھا لڑکا کہیں نہیں ملے گا۔ وہ مجھے لونا
 ہرگز نہیں چاہیں گے۔“ اسے تسلی دینے کو وہ مسکرایا تھا۔ انداز مذاق میں اڑانے والا تھا۔ اور میرب با
 مسکرا دی تھی۔

”تم صرف میرے لئے ہو میرو؟ تمہیں نہ کوئی چرا سکتا ہے نہ چاہ سکتا ہے۔ اگر کوئی ہوا تو.....“
 مسکراتے ہوئے یقین دلانا چاہا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”کچھ زیادہ ہی بڑے ڈائلاگ نہیں مار رہے آپ اذہان صاحب؟“

”ہاں، تو پھر؟“ وہ جھل سا ہو کر مسکرایا تھا۔

میرب سیال ہنستی چلی گئی تھی۔

تھا۔ کتنی بے سکونی ہے اس کے اندر۔ مجھے گمان ہے میری آنکھوں نے بھی اسے وہ سب نہ بتا دیا ہو اس سے چھپانا چاہتا تھا۔ ”مدم لہجے بے حد کمزور تھا۔
فارحہ بیٹے کی کیفیت چپ چاپ دیکھ رہی تھیں۔ آنسو صرف اذہان کی آنکھوں سے ہی رواں، ان کی اپنی آنکھیں بھی چپ چاپ بھیگ رہی تھیں۔

”میں اپنا ہر رشتہ پوری ایمان داری سے نباہنا چاہتا ہوں۔ پھر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا وقت مجرم کیوں بنا رہا ہے؟ اب جبکہ میں ایک نئی زندگی میں قدم رکھنے جا رہا ہوں اور وہ بھی ایک۔ کی سمت گامزن ہے۔ ہم ایک دوسرے کے مقابل کیونکر آن رے؟ کچھ دن اور چپ چاپ کیوں گئے؟ ہم دنیا کے کسی کونے میں یونہی ایک دوسرے سے بے خبر ہو کر، انجان بن کر گزار لیتے تو آج وہ تو نہ کھلتا جو کھلا۔ وہ سب تو نہ ہوتا جو ہوا۔ ایسا کیوں ہوا؟“ اذہان بچوں کی طرح ان سے درپازہ تھا۔ فارحہ نے اسے تھام کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔

”جھوٹ ہیں۔ بہلاوے ہیں سبھی! جھوٹے دعوے ہیں۔ کچھ نہیں بھول سکا۔ مگر چاہتا ہوں اُسے۔ اُس سے وابستہ ہر بات کو۔ کیونکہ میں جانتا ہوں یہ ضروری ہے اس کے لئے۔ میرے لئے بھی۔“

اذہان حسن بخاری کا لہجہ شکستہ اور نیم جاں تھا۔ فارحہ بھیگتی آنکھوں سے بیٹے کے چہرے کو چپہ تکتی رہی تھیں۔

ساہیہ نے جو کسی کام سے وہاں آئی تھی، سب سنا تھا اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے دلہا واپس لوٹ گئی تھی۔

جاں مڑگاں میں جو جلتا ہے الاؤ کوئی۔!

دن نکلنے کی نکلنے نہیں صورت کوئی۔!

نگاہ پر شوق کا عالم ہے چاند ہاتھ میں ہو

اور سر طاق جاں نہیں جینے کا لمحہ کوئی

پھر اے میرے چارہ ساز بتا۔!

کوئی رات بسر کیسے ہو

نہ ہو آنکھ میں کوئی خواب تو بات کیسے ہو

”کیا ہوا؟“ دوائے آر پولکنگ سو آپ سیٹ؟“ سردار سبتگین حیدر نے ڈرنک کاسپ۔

کے چہرے کو بخور دیکھا تھا۔ گی شکر سی اسے دیکھتی ہوئی سرنئی میں ہلانے لگی تھی۔

”یہ ٹھیک نہیں ہے گین!“

سردار سبتگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”کیا؟“ کیا ٹھیک نہیں ہے؟“ استفسار عجب تھا۔

”دہی جو سب ہو رہا ہے۔ گین! پلیز، تم یہ سب مت کرو۔ مجھے گلٹی نہیں ہو رہا ہے۔ مجرم لگ ہی ہوں میں خود کو۔ میں تمہاری زندگی قطعاً بھی ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی گین! تم اگر میرے خیر خواہ ہو تو تمہاری زندگی سے کیسے کھیل سکتی ہوں؟“ گی اپنی جگہ عجیب مجرم سی دکھائی دے رہی تھی۔ سردار سبتگین حیدر لغاری ویٹر کو بلا کر ایک نیا آرڈر کرتا ہوا بہت اطمینان سے مسکرا دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ تو کیا کہہ رہی تھیں تم؟“

”چھوڑ دو سب گین!۔۔۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔“ گی کو سخت رنج تھا۔

”اور؟“ گین مکمل اطمینان سے مسکرایا تھا۔

”میں تم دونوں کی زندگی سے جاری ہوں۔ جو کچھ ہو رہا ہے اسے روکنا ضروری ہے گین! دیر ہو گئی تو کچھ باتی نہیں بچے گا۔“

”تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ دیش مانی آرڈر۔ یہیں رہو گی، جب تک کہ تمہارا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ تمہیں پورٹ میں کر رہا ہوں۔ جب مجھے ایسا کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے تو کسی اور کو کیونکر ہو گا؟“

”مگر ایسا ہونے سے جو ہو رہا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو گین؟“ وہ زنج ہو گئی تھی۔ سمجھانے کی ساری کوشش رائیگاں تھی۔ وہ اسی اطمینان سے مسکرا دیا تھا۔

”آئی ڈونٹ کیئر۔ جو ہوتا ہے ہو جانے دو۔ مگر تمہارے لئے جو ذمہ داری میں نے اٹھائی ہے وہ رہی کر کے رہوں گا۔ پراس کیا ہے تم سے، پورا کروں گا۔“ وہ ارادوں میں اٹل دکھائی دیا تھا۔ گی کی لہجھ بڑھ گئی تھی۔

”کیوں گین؟“ کیوں کر رہے ہو ایسا؟ سزا دے رہے ہو خود کو؟ محبت کرتے ہو نا اس سے؟“

”محبت؟“ وہ چونکا تھا۔ پھر ہنس دیا تھا۔ ”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا گی؟“ اس کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔ گی اسے دیکھنے لگی تھی۔

”کچھ غلط نہیں کہہ رہی میں۔ تمہاری آنکھوں میں صاف پڑھا جا رہا ہے، تمہارے لئے وہ کتنی خاص ہے۔ یہ بات کیا تم خود سے بھی چھپانا چاہتے ہو؟ جھوٹ بولنا چاہتے ہو خود سے بھی؟“ گی بھندھی۔

”ایسا کیونکر! ایسا کچھ نہیں ہے۔ گین ایسے ڈرامائی قصوں پر یقین نہیں رکھتا۔ یہ محبت کے کاغذی گھوڑے گین کی دنیا میں نہیں چلتے۔ خوابوں کے دیس کی باتیں کرنے والوں میں سے میں نہیں ہوں۔“ وہ سرنئی میں ہلاتا ہوا مسکرایا تھا۔ گی اس کی کیفیت پر مسکرا دی تھی۔

”ہاں۔۔۔ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ تم کس درجہ بے وقوفی کر سکتے ہو؟ تم محبت کو حماقت سے زیادہ تصور نہیں کرتے نا۔“

”محبت حماقت کے سوا کچھ ہے؟“ وہ محظوظ ہو کر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔

”ہمارے یہاں ایک بہت عظیم شاعر بیچا غالب ہوتے ہیں۔ ان کا فرمان ہے۔“ کہتے ہیں جس کو عشق، غل ہے دماغ کا۔“ تم سمجھتی ہو کہ سردار سبتگین حیدر لغاری کے دماغ میں ایسا کوئی خلل واقع ہو چکا ہے تو

آپنی حماقت کر رہی ہو۔ بہت پریکٹیکل بندہ ہوں میں۔ یہ پیار، محبت میرے لئے نہیں ہے۔ ایک

بھر پورا انداز میں جھٹلایا تھا۔

”ایسا ہے تو اسے خود سے دور جانے کیوں نہیں دیتے؟ تمہاری آنکھوں میں اتنی بے چینی بھر جاتی ہے جب وہ تمہارے سامنے نہیں ہوتی۔ اب اس لمحے تم خود کو کس بات کی سزا دے رہے ہو؟ اس سے دور ہو، اسے مدعا سنا نہیں پارہے ہو، بتائیں پارہے ہو تو کیا کیفیت ہے تمہاری؟ کیا کچھ غلط دکھ رہی ہوں یا غلط سمجھ رہی ہوں؟“

سردار سبکتگین حیدر لغاری ہنستا چلا گیا تھا۔

”یہ سب باتیں اس کے سامنے بھولے سے بھی مت کہنا۔ سچ مان جائے گی۔“ وہ باتوں میں اڑا دینا چاہتا تھا۔

”مان جائے گی تو کچھ غلط تو نہیں کرے گی۔ بیوی ہے وہ تمہاری۔ تم کیوں کر رہے ہو اس ساتھ ایسا؟ یقین دلانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے اسے؟“ گی نے اسے سمجھانے کی ٹھان لی۔

”کہتا ہوں، سب جھوٹ ہی لگتا ہے۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”یقین کہاں کرتی ہے وہ؟“ لہجے میں ایک انفسوس سا تھا۔ گی اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں عجب ایک ویرانی سی تھی۔ گی کے لئے اس کی یہ کیفیت ناقابل برداشت تھی۔

”اس بات کا یقین دلا دو اسے کہ اس کے بنا تمہاری آنکھوں میں کس درجہ ویرانی ہے۔“

”اور وہ یقین کر لے گی؟“ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا جیسے وہ اس کے مشورے پر

درجہ محظوظ ہوا تھا۔

”ہاں۔“ گی نے یقین کو پختہ کیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ کہہ دوں گا۔“ سعادت مندی کی حد تھی۔ گی جانتی تھی وہ سیریس نہ تھا۔

بات کو سنجیدہ نہیں لے رہا تھا۔

”گین! اسے سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ تم اگر ایسا نہیں کر سکتے تو میں کر دوں گی۔“ دھمکی

مگر وہ اسی اطمینان سے مسکرایا تھا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہے گی! وہ یقین نہیں کرے گی۔ اسے کسی بات کا یقین نہیں ہے۔ کچھ بھی کہہ کر

لو، وہ اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد سے باہر نکلنے والی نہیں۔ جہاں تک میری بات ہے، وہ بہت بدظن

سے۔ میری کہی کسی بات کا یقین کرنا ناممکن ہے اور تمہیں بھی میں اس حماقت کی اجازت نہیں دوں گا۔“

”تم میری خاطر خطرہ کیوں مول لے رہے ہو گین؟ اتنے سارے الزامات کیوں لے رہے ہو

سر؟ وہ اگر کچھ غلط بھی سمجھ رہی ہے تو غلط بھی دور کیوں نہیں کر دیتے اس کی؟ کیا یہ اتنا مشکل ہے؟ میں

غیر عورت ہو کر تم پر یقین کرتی ہوں تو پھر وہ کیوں نہیں؟ تم اس سے کہہ کر تو دیکھو۔“

”تم کیوں یقین کرتی ہو، اور وہ کیوں نہیں؟ یہ میں بالکل نہیں جانتا گی! ٹرسٹ می۔ بٹ آئی

تھنگ۔ یقین بہت اندر کی چیز ہوتی ہے اور یہ خود بخود جنم لیتا ہے۔ کوئی زبردستی اسے آپ کے اندر نہ

سکتا ہے نہ آپ کو گھول کر تعویذ کی طرح پلا سکتا ہے۔ یقین کے لئے کہیں کوئی جادو منتر نہیں ہے۔“

بادہ مجھ پر یقین نہیں کرتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ میں اسے صاف صاف بتا دیتی ہوں۔ شاید وہ کام میرا چ کر دے جو دنیا کی کوئی اور نہیں کر سکتا۔“ وہ پُر عزم تھی۔ گین مسکرا دیا تھا۔

”پاگل ہوئی ہو تم۔ سب بے کار رہے گا۔ مجھے پتہ ہے اس کا وہ یقین نہیں کرے گی۔ سوا سے کچھ بتا

رلفظ ضائع کرنے والی بات انتہائی فضول ہے۔“ گی کو سمجھانا بے کار گیا تھا۔ وہ سرنٹی میں ہلانے لگی تھی۔

”کل میں چلی جاؤں گی یہاں سے۔ میں یہ سب نہیں دیکھ سکتی۔ خود کو مزید مجرم تصور نہیں کر سکتی میں۔

نہاری زندگی کو مزید ڈسٹرب کر سکتی ہوں۔ کس بات کی سزا بھیلو تم جبکہ تمہارا مجھ سے نہ کوئی واسطہ ہے نہ

نہ تم اسے نہیں بتا سکتے تو میں تو بتا سکتی ہوں۔ آئی ایم پریکٹس اور یور کولڈ۔ یہی سمجھتی ہے نا وہ؟ میں

سے بتاؤں گی وہ کتنی غلط ہے۔ ضرورت پڑی تو میں اسے ڈی این اے ٹیسٹ سے بھی ثابت کر کے دکھا

ں گی۔ یور آرنٹ دی فادر آف مائی چائلڈ۔ ہاں، جو ہے اسے ڈھونڈنے میں تم میری مدد ضرور کر رہے

۔“ گی روانی سے بولی تھی اور وہ مسکرا دیا تھا۔

”کوشش کر کے دیکھ لو۔ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ بائے دی وے، ہم کچھ زیادہ امپورٹنس نہیں

دے رہے اب محترمہ کو؟ ذکر کچھ حد سے سوا ہو چلا ہے۔ بہت بور کر رہی ہو تم مجھے۔“ مسکراتے ہوئے اشارہ

کے ویٹر کو بلایا تھا۔ گی نے اس کی کیفیت کو دیکھا تھا اور ہاتھ اٹھا کر ویٹر کو متع کرتے ہوئے اس کا بازو

بکرا سے اٹھایا تھا اور زبردستی لے کر ریسٹورنٹ سے باہر نکلنے لگی تھی۔

”تم خواہوہ پریشان ہو رہی ہو۔ تم نے سارا موڈ خراب کر دیا۔“ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے

انکاں نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ گی کچھ نہیں بولی تھی۔

”تم اسے کچھ نہیں کہو گی۔ کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ اسے یقین کرنا ہو گا تو وہ خود کرے گی۔ اور جہاں

دراہن بات محبت کی تو مجھے اس سے کوئی محبت نہیں ہے۔ ہاں وہ میری بیوی ضرور ہے اور یہ ایک ساخہ

مرف یا پھر تم اسے حادثہ بھی کہہ سکتی ہو اور اتفاق بھی۔“ اسے باور کراتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

”میں سچا ہوں یا نہیں مجھے یہ باور کرانے کی نہ کسی کو ضرورت ہے نہ ثابت کرنے کی۔ سردار سبکتگین

لغاری کو کسی تائید کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ کسی اچھائی کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہے۔ میں اچھا ہوں یا

نہ خود اپنے لئے ہوں۔“ وہ بولا تھا اور گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

گی کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔ اسے صرف دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”بہت محدود سوچ ہے اس کی۔ بہت محدود سوچتی ہے وہ۔ اس کے لئے ساری باتوں کے مفہوم ایک

انڈل تم سے میرا تعلق نہ وہ کبھی سمجھی تھی، نہ سمجھے گی۔ سوچ رہنے میں ہی عافیت ہے۔ میری فکر مت

اسرا پنا کر لو میں آپ ہی کافی ہوں۔ تمہاری وجہ سے میری زندگی ڈسٹرب نہیں ہو رہی۔ نہ تمہارے

ٹپ سے کوئی انقلاب آئے گا۔ سو تم یہیں رہو۔ جب تک جانے کو میں نہ کہوں۔“ اس کی جانب دیکھے

اڑا ہو گئے کرتے ہوئے وہ بولا تھا اور گی خاموشی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

نہیں۔ وہ جھینپ کر رہ گئی تھی۔ فاطمہ نے اس کا چہرہ تھپتھپایا تھا۔
”تم ترفیش ہو کر آ جاؤ۔۔۔ میں ٹیبل لگاتی ہوں۔“

فاطمہ واپس بیٹھ گئی تھیں۔ انا بیہ کچھ دیر یوں ہی کھڑی دیکھتی رہی تھی۔ پھر چلتے ہوئے بیڈ کی سائڈ
کی طرف آئی تھی۔ دروازہ کھولا تھا اور ڈائری اس میں ڈال کر دروازہ بند کر دی تھی۔ جب عفتان علی
اداش روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ نگاہ اسے دیکھ کر کچھ چونکی ضرور تھی مگر وہ کچھ جتانے بغیر ٹاول
بال رگڑتا ہوا شیشے کے سامنے آن رکھا تھا۔

”رات ماما کا فون آیا تھا۔۔۔ دادا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے آنے کے لئے کہا
“اس نے بیٹ کر مطلع کیا تھا۔ عفتان نے اسے آئینے میں ایک نگاہ سرسری انداز میں دیکھا تھا اور جیل
ہالوں کو اسپاس لک دینے لگا تھا۔

”یعنی تم پارٹی میں جانا نہیں چاہتی ہو۔“ یوں پر خفیف سے تبسم میں ایک طنز تھا۔ انا بیہ کچھ نہیں بولی
۔ اپنی صفائی میں اسے کچھ کہنا مقصود نہ تھا۔
”پچھلی بار بھی جب گین نے انوائٹ کیا تھا تب بھی تمہارے ساتھ کچھ ایسا ہی پر اہلم تھا۔“ عفتان
نے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ صبح صبح کی یہ بد مزگی وہ نہیں چاہتی تھی۔ تبھی بہت رسائیت سے اس کی طرف
ہتے ہوئے بولی تھی۔

”آپ سمجھ رہے ہیں میں بہانے گھڑ رہی ہوں۔ جبکہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ فون کر کے ماما سے بات
سکتے ہیں۔“ اس کے شک کے پیش نظر کہا تھا۔
”مجھے کسی انویسی گیشن کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بے تاثر انداز میں کہہ کر اٹھ کر چلتا ہوا الماری کی
رف بڑھا تھا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں تیار ہو جاؤں گی۔ آپ پارٹی سے واپسی پر مجھے وہاں چھوڑ دیجئے گا۔“ انا بیہ
نے بغیر بلی تھی اور اداش روم میں گھس گئی تھی۔ عفتان علی خان اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔

میرب پارٹی کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ ابھی ابھی وہ دروازہ کھول کر اسے آرڈر دے گیا تھا۔ جب تک
انہاں تھی، اس کے ”احکامات“ کی تعمیل کرنا فرض تھا اس پر۔ وہ کوئی بات ٹال کر کوئی بد مزگی پیدا کرنا نہیں
چاہتی تھی۔ تیار ہونے کے بعد وہ کانوں میں ایئر رگنژ پہن رہی تھی جب اس کا پرسل سیل بجا تھا۔ میرب
نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ کوئی انجان مس نمبر وہ اٹھائی نہیں تھی۔ مگر اس لئے جانے کیوں کال ریسیو
کر کے فون کان سے لگا لیا تھا۔

”ہیلو۔۔۔“

”ہیلو میرب!“ دوسری طرف ازہان حسن بخاری تھا۔ وہ لمحہ بھر کو ساکت رہ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔
”کی کو تمہارے متعلق بتایا۔ بات کرنا چاہتی تھیں وہ۔۔۔ ماما نے تمہارا ڈیٹبٹ دیا۔ کسی ہو تم؟“
انصاف پیش کرتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

وہ لکھتے لکھتے وہیں ٹیبل پر سو گئی تھی۔
عفتان علی خان صبح اٹھا تھا تو اسے دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ کچھ کہنے کا ارادہ تو نہ تھا مگر
تو قدم خود بخود اس کی جانب اٹھ گئے تھے۔ بہت آہستگی سے اس کا زمین پر جھوٹا شمال اٹھایا تھا اور
شائوں پر دھرا تھا۔ جب اچانک وہ نیند سے بیدار ہو گئی تھی۔ بے حد چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔
درست کیا تھا اور ڈائری فوراً اٹھا کر ساتھ بھینچتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

عفتان علی خان نے پہلے اسے اور پھر اس کی ڈائری کو دیکھا تھا۔
”وہ۔۔۔۔۔ میں لکھتے لکھتے یہیں پر۔۔۔۔۔“ انا بیہ شاہ جانے کیوں وضاحت دینے لگی تھی۔ وہ اس کا

چپ چاپ کھڑا دیکھ رہا تھا جب فاطمہ خان نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تھا۔
”جاگ گئے تم دونوں؟“ مسکراتے ہوئے دونوں بچوں کو دیکھا تھا۔

”جی ماما!“ عفتان مسکرایا تھا۔ ”کوئی کام تھا تو مجھے بلوا بھیجا ہوتا۔“ ان کے زحمت کرنے پر
فاطمہ مسکرا دی تھیں۔

”ہاں۔۔۔ کام تھا۔ گین کا فون آیا تھا۔ شام میں انوائٹ کیا ہے اس نے۔ نیو یارک جا
وہ۔“ مطلع کیا تھا۔

”خیریت؟“ عفتان چونکا تھا۔ ”بھابی کے ساتھ یا۔۔۔ اور یہ پارٹی کس خوشی میں؟ کہیں
ہنی مون کی تیاری تو نہیں؟“ وہ مسکرایا تھا۔ فاطمہ بھی مسکرا دی تھیں۔

”نہیں۔۔۔ غالباً ایسا نہیں ہے۔ کوئی آفیشل پارٹی ہے۔ تمہارا سیل ٹرائے کر رہا تھا وہ۔ غائب
نہیں کر رہا تھا۔ تم نے سوچ آف کر دیا ہوگا۔ میں نے سوچا بتا دوں۔ کہیں تم کسی اور پلاننگٹ
جاؤ۔ آج کا وقت فارغ رکھنا۔ ورنہ گین کو تم جانتے ہو، وہ تمہیں آ کر اٹھالے جانے سے بھی
کرے گا۔“ فاطمہ نے مسکراتے ہوئے تبسم کی تھی۔ عفتان مسکرا دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ جانتا ہوں میں اسے۔ آپ فکر نہ کریں۔“ یقین دلایا تھا۔ مگر فاطمہ خان نے
ہوئے سرفنی میں ہلاتے ہوئے چپ کھڑی ہوئی انا بیہ کو دیکھا تھا۔

”ہاں، مگر تمہیں تنہا نہیں چاہتا ہے۔ انا بیہ کو بھی تمہارے ساتھ جانا ہے۔“ فاطمہ خان نے،
سے اپنی اکلوتی بہو کا چہرہ ہاتھ میں لیا تھا۔ انا بیہ مسکرا دی تھی۔ عفتان علی خان اس کی طرف اک لگا

ڈالتا ہوا مڑا تھا اور اداش روم میں گھس گیا تھا۔ فاطمہ بیٹے کو دیکھتی ہوئی مسکرا دی تھی۔ ”عفتان
لے کر اپ سیٹ مت ہوا کر۔ اسے جانتی ہوں میں۔ بہت چاہتا ہے وہ تمہیں۔ اس سے پہلے

اسے نہ کسی لڑکی میں انوالو دیکھانہ کسی کے لئے اتنا سنجیدہ دیکھا۔“ فاطمہ نے محبت سے اسے
کہا تھا۔ انا بیہ ایک بار پھر مسرت سے مسکرا دی تھی۔

”ارے میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ نیچے تمہارے پاپا ناشتے کے لئے کہہ رہے تھے اور میں
بالکل ہی بھول گئی انہیں۔۔۔ پہلے ہی شکوہ رہتا ہے، میں ان سے زیادہ عفتان کا خیال رکھتی

شکوہ تر سے کچھ سال بعد عفتان بھی کرے گا۔ باپ بیٹے میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔“ فاطمہ

میرب خود پر قابو پاتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

”ٹھیک ہوں میں۔ بات کراؤ آئی سے۔ بائے داوے، ایسا کیا بتا دیا تم نے؟“ میرے متعلق؟ کچھ اچھا ہی بتایا ہے نا؟“ وہ عام تاثر سے بات کرتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”تم بات کرو می سے۔“ اذہان حسن بخاری نے فون فارحہ کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”ہیلو میرب!۔۔۔ میری جان! کیسے ہو آپ؟“ فارحہ آئی نے بالکل محی والے انداز میں کہا تھا۔ میرب کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

”ٹھیک ہوں میں۔ آپ کیسی ہیں آئی؟“ آواز کوشش کے باوجود بھرا گئی تھی۔ فارحہ دوسری طرف کی کیفیت بھانپ گئی تھیں۔ ان کی خود کی آنکھیں بھٹکنے لگی تھیں۔

”ایسے غیر ہو گئے تھے ہم۔۔۔ پلٹ کر پوچھا تک نہیں۔۔۔ مظہر بھائی نے تو خیر کبھی بھی ہم نہیں سمجھا تم نے بھی پرایا کر دیا پل میں؟“ ان کا شکوہ بجا تھا۔ میرب کی آنکھوں سے چپ چاپ آنسو لگے تھے۔

”وقت اجنبی ہو گیا آئی!۔۔۔ پایا کی بیماری، پھر علاج کے لئے نیو یارک جانا، میرا نکاح۔۔۔ سب اس قدر اچانک ہوا کہ وقت ہی نہیں ملا۔“

”اور اس کے بعد؟۔۔۔ اس کے بعد بھی ہماری یاد نہیں آئی؟۔۔۔ آپا کے بعد تم نے بھی کیا لیا کہ ہم سے تمہارا ہر رشتہ ختم ہو گیا؟“ فارحہ کی بات کا اس کے پاس کوئی جواب تھا نہ وضاحت۔ آئی کہہ رہی تھیں۔

”میرب بیٹا! تم نے مجھ سے کچھ کیوں نہیں کہا؟۔۔۔ ماہا کی مایوں والے دن اگر تم مجھ سے شیز کر دیتیں کہ مظہر بھائی تمہارا رشتہ کہیں اور طے کر رہے ہیں تو میں کچھ بھی کر کے ان سے تمہارا لیتی۔ آج میرا بیٹا ایک ادھوری زندگی نہیں جی رہا ہوتا۔ پاگل ہے وہ تو۔۔۔ فیملی کے سوا اسے کچھ نہیں دیتا۔ اگر اس نے اپنی زندگی کو اہم جانا ہوتا تو آج مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔“ فارحہ آئی دوسری طرف رہی تھیں۔

”ان باتوں سے اب کوئی فائدہ نہیں ہے آئی!“ میرب کی آواز مدہم تھی۔ کہتے ہوئے اس نے آنکھوں کو پونچھا۔

”ہاں، شاید۔۔۔ ان باتوں سے اب کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ وقت گزرتا رہے تو اپنے پیچھے پیچھے تارے چھوڑ جاتا ہے۔ مگر ان پیچھے تاروں کے ساتھ جینا آسان نہیں ہوتا۔“

میرب جو اب کچھ نہیں بول سکی تھی۔

”کچھ فاصلے پر دوسرے لینڈ لائن پر مسلسل کوئی کال آرہی تھی۔ تیل ہو رہی تھی۔ مگر میرب آئی اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اٹھ کر دیکھ تک نہ سکی تھی۔ شاید اسے احساس تک بھی نہ تھا۔

”تم آؤ گی نہیں مجھے ملنے؟“ فارحہ نے پوچھا تھا۔

”آپ بلائیں گی تو ضرور آؤں گی آئی!“ اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

”تو آ جاؤ پھر۔“ فارحہ آئی نے فوری فرمائش کی تھی۔

”آج؟“ وہ چونکی تھی۔ ”آج تو ممکن نہیں ہے۔۔۔ گھر میں یہاں ایک پارٹی رکھی گئی ہے۔ میں رات نکال کر کسی روز آؤں گی۔ پایا اور زو بار یہ بھی آنے والے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ساتھ آئیں۔ اذہان کی آنکج منٹ ہونے جا رہی ہے۔ انوائٹ نہیں کریں گی آپ مجھے؟“ مسکراتے ہوئے وہ تمام حالات معمول پر ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

فارحہ دوسری طرف بہت دل گرفتہ دکھائی دی تھی۔ لبریز آنکھوں سے اذہان کی طرف دیکھا تھا جو کچھ اصل پر ماہ سے کوئی بات کر رہا تھا۔

”تمہاری آئی کے گھر کے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے ہیں بیٹا! جب چاہو آ جاؤ۔“

”تو ٹھیک ہے۔۔۔ پھر میں بتاتا ہے کسی بھی دن آ جاؤں گی مگر آپ کو می کی طرح مجھے آلو کے ہانے بنا کر اپنے ہاتھوں سے کھلانا ہوں گے۔“

”کھلاؤں گی۔“ وہ ہینگی آنکھوں کے ساتھ بولی تھیں۔ ”تمہارا ڈالہا کیسا ہے؟۔۔۔ ماہا بتا رہی تھی کہ ہماری بھی رخصتی ہو رہی ہے۔“

”ہاں۔“ وہ جھجھے جھجھے سے انداز میں بولی تھی۔

نئی دروازہ کھلا تھا اور سردار سیکٹین حیدر لغاری نے اندر قدم دھرا تھا اور چلتا ہوا اس کے مقابل آن لگا تھا۔ میرب نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔

”آئی!۔۔۔ میں آپ سے بعد میں بات کرتی ہوں۔“ سلسلہ منقطع کر کے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”کی قدر خشکی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”بہت ضروری کال تھی؟“ نظریں اس کے چہرے کو بندھ کر دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں۔“ میرب نے آہستگی سے جواب دے کر سیل ڈریسنگ ٹیبل پر دھرا تھا۔ سردار سیکٹین حیدر لغاری نے اسے ناپسندیدہ انداز سے دیکھا تھا اور بولا تھا۔

”کوئی اس سے ضروری فون کال اس لینڈ لائن پر بھی تھی۔۔۔ مائی تم سے بات کرنا چاہتی تھیں۔“

ماں دلایا تھا۔ وہ شرمندہ سی ہو کر سر جھکا کر کلائی میں قیمتی بریلٹ پہننے لگی تھی۔

”سوری!۔۔۔ مجھے دھیان نہیں رہا۔“ وہ دانستہ اپنی ہینگی پلکیں چھپا رہی تھی۔

”دھیان نہیں رہا۔۔۔ یا تم نے دھیان دینا ضروری نہیں سمجھا؟“ وہ وضاحت چاہ رہا تھا۔ مگر میرب نے اسے کوئی وضاحت نہیں دی تھی۔ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”کیا کہہ رہی تھیں وہ؟“

سردار سیکٹین حیدر لغاری کو شدید ترین حیرت نے آن گھیرا تھا۔ میرب نے اس سے الجھنا مناسب نہیں

پارٹی کے لئے مہمان آ گئے؟“ بات یکسر بدل دی تھی اور یہ بات سردار سیکٹین حیدر لغاری کو بہت

درازرسی تھی۔

عفتان مسکرا دیا تھا۔

”یہ پوچھو کس کو کس سے شکوہ نہیں ہے۔ مجھے تو تم سے بھی ہزاروں شکوے ہیں بھائی میرے کہ ایک شہر میں ہوتے ہوئے بھی مہینوں نہ شکل دکھاتے ہونہ دیکھتے ہو۔ بائے داوے کل شام تم اس ریٹورنٹ میں کیا کر رہے تھے ان خاتون کے ساتھ؟“

میرب نے چونکتے ہوئے سردار سیکٹین حیدر لغاری کی طرف دیکھا تھا مگر وہ بہت بے تاثر انداز میں اس کی طرف سے نگاہ پھیرتا ہوا پُرسکون لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”کون خاتون؟“ — گئی ہے وہ — شی ازمانے فرینڈ — آج کل وہ یہیں میرے پاس رہ رہی ہے۔“ مطلع کرتے ہوئے میرب کو بیکسر نظر انداز کیا تھا اور مسکراتے ہوئے اس جوڑے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”بائے داوے، تم ابھی تھوڑی دیر قبل ایک دوسرے سے کیا شکوے شکایات کرتے دکھائی دیر ہے تھے؟ انا یہ! جانتی ہوں، یہ بندہ پاگل ہے تمہارے لئے۔ تم نے اسے نہیں دیکھا — میں نے دیکھا ہے۔ جب کلنپ کے بعد تم ہسپتال میں تھیں اس وقت اس کی حالت دیکھنے والی تھی۔ مجھ جیسے شخص کو جسے پیار محبت پرے سے کوئی یقین ہی نہیں، ماننا پڑا کہ محبت شاید کہیں نہ کہیں ہے۔ اور بہت ٹھوس شواہد کے ساتھ موجود ہے۔ وہ جب چاہے اپنا آپ منوا سکتی ہے۔ میں اس لئے کوچیکر (Capture) کر سکتا تو تمہیں ضرور دکھاتا۔ پو آر رینٹی اے کبی کرل۔ تم نے اس کے اندر محبت چکائی۔ کوئی تو خاص بات ہوگی تم میں۔ اس لئے میں نے شدت سے تمہیں اس سے ملنے کی دعا مانگی تھی اور دیکھو وہ پوری بھی ہوگئی۔ آج تم دونوں ساتھ ہو۔ اینوی ایبل کپل۔ آئی مسٹ سے۔“ وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ انا یہ زبردستی مسکرائی تھی جبکہ عفتان ہنس دیا تھا۔ گین نے اس کے ہنسنے سے قطع نظر انا یہ کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے اسے صاف دی تھی۔

”سب لوگ عورت کو کمزور کہتے ہیں — سمجھتے ہیں۔ مگر میں تو اس مقولے کو سرے سے رد کرتا ہوں۔ عورت چاہے تو کچھ بھی کر سکتی ہے۔ جو مرد جیسی چیز کو ”کپلیٹ“ کرتی ہے، وہ خود کمزور کیسے ہو سکتی ہے؟ عفتان کی قدر کرتا — یہ صرف تمہارے خدو خال سے محبت نہیں کرتا۔ کوئی بھی مرد صرف ایک گزرت سے محبت نہیں کرتا۔ اس کے لئے اس کے خواص زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ بہت راز کی بات بتا رہا ہوں میں۔ ہاں یہ البتہ ہم مرد نہیں جانتے کہ ایک عورت مرد کی کس بات سے محبت کرتی ہے۔“ سردار سیکٹین حیدر لغاری نے کہا تھا اور انا یہ مسکرا دی تھی۔

”ایک عورت مرد کی محبت سے محبت کرتی ہے۔ یہ بھی ایک گہرا راز ہے جو میں آج کھول رہی ہوں۔“

”اوہ، رینٹی۔ ایک عورت مرد کی محبت سے محبت کرتی ہے؟ — ویری انٹرسٹنگ۔ یعنی اگر میں کی عورت سے محبت کرتا ہوں تو میری بیوی اس عورت سے محبت کرے گی — ہے نا؟ — یہی مطلب ہے نا تمہارا؟“ گین نے شرارت سے مسکراتے ہوئے پھینٹا تھا۔

انا یہ نے مسکراتے ہوئے سرانکار میں بلایا تھا۔ میرب چپ چاپ کھڑی تھی۔

”تمہارے لئے مائی کی بھی اب کوئی اہمیت نہیں ہے؟“

”پوچھو تو رہی تھی۔ آپ نے بتایا نہیں تو کیا کروں؟ — زبردستی تو آپ سے اُگلا نہیں سکتی۔ ایسا کوئی علم مجھے نہیں آتا کہ آپ کا دماغ پڑھ سکوں۔“ بے تاثر انداز میں کہہ کر فریوم خود پر افسوسا تھا۔

”تم میں ایسی کوئی صلاحیت اگر ہوتی تو صورت حال یقیناً اس سے بہت مختلف ہوتی میرب سیال! اور پوہا بلیم ہے۔ دماغ کا استعمال تمہیں کرنا بالکل بھی نہیں آتا۔“ وہ اس کی عقل پر افسوس کرتے ہوئے پوہا اور پلٹ کر چلتا ہوا دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ مگر دروازے کے پاس جا کر جانے کیوں دو باروا گیا تھا۔ پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

”مائی کا خیال تھا تم ان کے پاس کچھ دن گزار لو۔ مگر شاید اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پارلی بعد میں نیویارک فلائی کر جاؤں گا۔ تم یہاں رہنا چاہتی ہو یا کہیں اور، اس کا فیصلہ تم کر سکتی ہو۔“ بہت تاثر انداز میں کہتا ہوا وہ پلٹا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔ میرب سیال کچھ لمحوں تک اسی طرح بیٹھی اس سر رہی تھی پھر اٹھی اور چلتی ہوئی باہر آگئی تھی۔ عفتان اور انا یہ اسے رستے میں ہی مل گئے تھے۔

”واہ بھائی! یو آر لنگ سو فیلس۔ میں تو گین سے واقعی جلیسی فیمل کرنے لگا ہوں۔ آج پتہ لگا، میرج کے کتنے فائدے ہوتے ہیں۔“ کن انھیوں سے انا یہ کو دیکھا تھا۔ جلے دل کے پھپھولے پھوڑ انداز بہت خوب تھا۔ میرب سیال مسکرائی تھی۔

”لو، میرج ہو یا ارش میرج — شادی دونوں صورتوں میں ایک جو ہے عفتان! اس کا تمہیں ابھی نہیں، کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہوگا۔ ابھی تو نئی نئی رتوں کا خمار دلفریب ہوگا۔“ میرب مسکراتے ہوئے کچھ فاصلے پر سیل فون پر بات کرتے ہوئے گین کو دیکھ کر طنز کا تیرا اچھالا تھا۔ عفتان دیا تھا۔

”کاش ایسا کچھ ہوتا بھائی! بٹ آئی ایم ناٹ لکی۔ ان فیکٹ سب گین صاحب کی طرح کاٹا نہیں رکھتے نا۔“

انا یہ کوخت اُجھن ہونے لگی تھی۔ مگر وہاں ٹھہرنا اس کی مجبوری تھی۔

”شادی ایک جوا ہونہ ہو، ایک بلا ضرور ہے جو گلے پڑتے ہی گلا دبا دیتی ہے۔ بندہ مرض سے بچ سکتا ہے۔ کسی بہت بڑے خطرے سے بھی صحیح سلامت گزر سکتا ہے۔ مگر شادی امپائل۔“ عفتان نے تہیہ کر لیا تھا ساری کسر آج ہی پوری کر دے گا۔

میرب، انا یہ کو اپنے ساتھ لگاتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”اتنی تو خوب صورت واقف ہے تمہاری۔ تمہیں کس بات کا قلق ہے؟“

”کوئی ایک ہو تو بتاؤں بھی۔ یہاں تو ہزاروں شکوے ہیں۔ کیا کیا سناؤں؟“ عفتان مسکرا میرب بھی مسکرائی تھی۔ جی گین چلتا ہوا ان کے قریب آن رکھا تھا۔

”کیا ہوا؟ — کس کو کس سے شکوہ ہے یہاں؟“ مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”اچھا۔۔۔ میں تو یہی سمجھا تھا۔۔۔ ہے ناعفنان!۔۔۔ تم بھی یہی سمجھے تھے نا؟“ عصفان کو ہر خیال کرنا چاہا تھا۔ عصفان نے شانے اچکا دیئے تھے۔

”پتہ نہیں بھائی! وہاں امریکہ میں تو لڑکیاں جس مرد سے محبت کرتی ہیں اس کے کتے سے بھی محبت کرتی ہیں۔ انہیں ان کا کتا بھی اتنا ہی عزیز ہوتا ہے۔ مگر پاکستانی عورتوں کا کوئی پتہ نہیں۔“ عصفان بولا اور وہ دونوں بھائی ہنس دیئے تھے۔

میرب کو اپنا وجود وہاں بہت مس فٹ لگ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ جانے کو تھی جب گین نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک لیا تھا اور عصفان سے بات جاری رکھتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

”پاکستانی لڑکیوں کا واقعی کچھ پتہ نہیں۔۔۔ بہت گہرے راز جیسی گہری ہوتی ہیں یہ۔۔۔ نہ کھلتی ہیں، نہ کھلنے دیتی ہیں۔۔۔ اپنی ہاؤ۔۔۔ لٹس انجوائے دی پارٹی۔۔۔ آئی دل جو آن یولیر۔“ عصفان اور ادا سے کہا تھا۔ وہ دونوں مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ سردار بیکٹینگن حیدر لغاری مسکراتے ہوئے اٹھ جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔ میرب سیال کا ہاتھ اب بھی ہاتھ میں تھا۔ میرب سوالیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھتی ہوئی منتظر تھی اس کی جب وہ ان دونوں کو سراہتا ہوا بولا تھا۔

”گڈ کیل نا؟ انہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے، محبت کرنے والے بے وقوفوں کی دنیا میں کچھ کی نہیں اب بھی کثرت سے مل جاتے ہیں۔“ پتہ نہیں وہ کیا کہنے جا رہا تھا جو اس طرح کا انداز اختیار کر رہا تھا میرب اس کی طرف دیکھتی ہوئی چپ چاپ منتظر تھی۔

”تم نے ڈیسا ہیڈ کر لیا؟۔۔۔ مانی تمہیں لے کر بہت پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔ ان کا بس پتا تو اُڑ کر یہاں پہنچ جائیں۔ زیادہ دنوں کے لئے نہیں جا رہا۔ مگر ان کی فکر سمجھ میں آنے والی ہے۔ اتنی لڑکیاں انہوں نے کبھی میری بھی نہیں کی۔ تم تو میرے رشتوں کو بھی میرا نہیں چھوڑ رہی ہو۔“ شکوہ نہیں، غالباً طوا کوئی۔ میرب کچھ نہیں بولی تھی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے آزاد کرتے ہوئے وہ مزے سے بولا تھا۔

”منظر سیال صاحب سے بات ہوئی تھی میری۔ غالباً وہ آج کل میں آرہے ہیں۔ اگر وہ آج آجائے تو اچھی بات ہے۔ ورنہ تم مانی کے پاس چلی جانا۔ مسٹر چاولہ یہیں ہوں گے۔ وہ آپ کو مانی کے بارے میں بجزاف ظاہر پہنچانے کا بندوبست کر دیں گے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ مزید کچھ کہنے جا رہا تھا جب گی نے اسے پکارا تھا۔

”گین۔۔۔ ا“

سردار بیکٹینگن حیدر لغاری نے اس کی طرف دیکھا تھا اور بہت رکھ رکھاؤ سے ”ایکسیکیز می“ کہا ہوا اس کی جانب بڑھ گیا تھا۔ میرب کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔



عصفان علی خان انا بیہ کی خواہش کے پیش نظر اس کے میکے میں چھوڑ کر گھر آ گیا تھا۔ زیادہ دن تو نہیں ہوئے تھے اس کی سنگت کو مگر اس کے بنا اپنا یہ کمرہ بہت حد تک خالی سا لگا تھا۔ ہاتھ لے کر کتھی دیر تک کھڑا کمرے کے سنانے میں اسے ”مس“ کرتا رہا تھا۔ پھر قدم بہت آہستہ سے با

کی طرف بڑھائے تھے۔ آج بہت دنوں بعد وہ دوبارہ اپنے بیڈ پر تھا۔ ورنہ ”حفظ ما تقدم“ کے طور پر یہ ”علاقہ ممنوعہ“ ہو چکا تھا اس کے لئے۔ جب سے انا بیہ اس گھر میں تھی، وہ صوفہ ہی اس کا بیڈ تھا۔ نرم نرم بستر پر لیٹا تھا تو دن بھر کی تھکن کا احساس ہوا تھا۔ غالباً سر میں بھی درد تھا۔ اس نے سائیڈ دراز کھولا تھا ہینٹ ڈھونڈنے کے خیال سے۔ تبھی ہاتھ انا بیہ کی ڈائری سے لگرایا تھا۔ جانے کیوں اس کی ڈائری کو ہاتھ میں لے لیا تھا۔

تھا تو ”خلاف قانون“ مگر وہ اس لمحے رہ نہیں سکا تھا۔ آج تک کوئی ”بے ایمانی“ نہیں کی تھی مگر اس لمحے جانے کیوں کچھ بغاوت کرنا بھلا لگا تھا۔ فطری تجسس عود کر آیا تھا اور عصفان علی خان اس ڈائری کے صفحے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

18 جنوری

آج بہت افسوس ہوا۔ لیکن سب کچھ لامعہ کی بچی کی وجہ سے ہوا۔ ایک تو رات دیر تک اس کا اور پھر اپنا سائنٹ تیار کرنے میں لگی رہی۔ اور صبح جب کمپس میں پہنچی تو لامعہ نے رانڈاری میں روک کر ہی بتا دیا کہ آج کلاس نہیں ہو رہی۔ لٹس موڈ ٹو کینے۔۔۔ ہم دیر تک بیٹھے ٹھیل بجا کر گاتے رہے۔ اور جب باہر نکلے تو پتہ چلا کہ سر ہاشمی کلاس لے کر جا چکے ہیں۔ میں نے رضاحتی نظروں سے لامعہ کو دیکھا مگر وہ شانے اچکا کر بے نیاز بن گئی۔ مگر اس کی مسکراہٹ صاف بتا رہی تھی کہ وہ شرارت کر چکی ہے۔ انا بیہ، آج اس کی وجہ سے کلاس بھی مٹ کر پڑ گئی۔ لان میں وہ آگے آگے تھی اور میں پیچھے پیچھے۔ مگر میری خجالت دور نہیں ہو رہی تھی اور وہ ہنس رہی تھی۔ یہ پہلی شرارت نہیں ہے اس کی۔ ایسی شرارتیں وہ روز کرتی ہے۔ مگر۔۔۔ ایک بات ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ میں بہت اچھی طرح سے اسے جانتی ہوں۔ وہ بچپن سے ہی ایسی ہے۔

20 جنوری

آج دادا جی کا ریگولر چیک اپ تھا۔ مگر میں غازی کی وجہ سے اتنی اپ سیٹ تھی کہ انہیں ہسپتال لے کر جانا تو دور کی بات اپنے کمرے تک سے نہ نکل سکی تھی۔

کتنے برس ہو گئے غازی کو گئے۔ مگر میں آج بھی، جب اس کی برسی ہوتی ہے۔ اسے اپنے اس پاس محسوس کرتی ہوں۔ اپنے بھائی کی صورت میرے سامنے ہوتی ہے۔ اور مجھے وہ ایک ایک لمحہ یاد آتا ہے جب ہم دونوں ساتھ تھے۔ پتہ نہیں کیوں؟۔۔۔ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جو شے میری مطلوب ہوتی ہے تو مجھے اس سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ وہ شے میری دسترس سے دور ہو جاتی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔ اور مجھے اسے بھولنا شرط لگتا ہے۔ آج بھی حسب معمول می دارا کو ہاسپٹل لے کر گئیں اور ہمیشہ کی طرح اوزی کا فون بھی آیا۔ اوزی میرے لئے غازی جیسا ہے۔ مسکراتی ہوں تو وہ مجھے رونے نہیں دیتا۔ کہتا ہے میں تمہارا غازی ہوں۔ تمہارے دو بھائی تھے۔ ایک چلا گیا۔ ایک تمہارے پاس ہے۔ جو تمہارے پاس ہے تم اس کے بارے میں سوچا کرو۔ میں سوچ رہی ہوں۔ مگر میں اسے نہیں بتا سکتی۔ میں غازی کو نہیں بھول سکتی۔

لامعہ کی انگریج منٹ سیری منی اچھی رہی۔ اس کا ہونے والا ہر بیڈ اچھا ہے۔ مجھے جوڑی اچھی لگی ہے۔ خدا کرے لامعہ ہمیشہ خوش رہے۔

14 فروری

یہ محبت کرنے والوں کا دل بھی عجیب ہے۔ کوئی یادگار بناتے ہیں، کوئی یادگاریں مانتے ہیں۔ کوئی تجدید عہد و وفا کرتے ہیں۔ کوئی محبت سوچتے ہیں۔ حالانکہ محبت کرنے کے لئے نہ دن کی قید ہونا چاہئے نہ وقت کی۔ مجھے محبت کے متعلق کچھ خاص پتہ نہیں۔ مگر آج اوزی سے بات ہوئی۔ وہ بہت ڈسٹرب لگ رہا تھا۔ اسے اس کیفیت میں دیکھ کر مجھے اچھا نہیں لگا۔ وہ لامعہ کو مس کر رہا تھا اپنی زندگی میں۔ ایسا اس نے کہا نہیں۔ مگر میں اپنے بھائی کی آواز سے جان سکتی ہوں۔ میرا یقین ہے دنیا کی کوئی بھی سب سے اچھی لڑکی جہاں کہیں بھی ہیں وہ صرف میرے بھائی کے لئے ہے۔ خدا میرے بھائی کو بہت سی خوشیاں دے۔

آج لامعہ کے فیا کی سے بھی ملاقات رہی۔ میں باہر لان میں تھی جب وہ آیا۔ بہت دلچسپ گفتگو کرنے کا عادی ہے۔ اس کا سنس آف ہیومر کمال کا ہے۔ بالکل لامعہ کی طرح۔ خدا لامعہ کو بھی خوش رکھے۔ لامعہ میرے لئے بھڑکتی اور میں نے اسے لڑکا دیکھنے کے لئے کہہ دیا ہے۔ اسے مطمئن کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ ورنہ وہ جان کہاں چھوڑتی ہے!

عصفان علی خان نے کچھ صفحے تیزی سے پلٹے تھے۔ جتنا بڑا معمر وہ اسے ہمیشہ لگی تھی غالباً اتنی ہی تھی۔ اس کی پرسنل ڈائری میں کچھ بھی اس کا پرسنل نہ تھا۔ خود سے زیادہ لوگوں کی باتیں تھیں۔ دوسروں کے حوالے تھے۔ یعنی وہ زندگی میں خود کو اہمیت دینے کی کبھی قائل نہیں رہی تھی یا پھر اسے پتہ ہی نہیں تھا، خبر ہی نہیں تھی کہ وہ کس قدر اہم ہے۔ عصفان علی خان کو اب تک ایسا کچھ نہیں ملا تھا جو اسے حیران کر پاتا۔ یہ تمام باتیں وہ تمہیں جنہیں وہ جانتا تھا۔ جن کی اسے خبر تھی۔ کیا تھی اتنا یہ شاہ؟ کیا وہ واقعی اس کی کھونج میں تھا؟

25 مارچ

راہٹلوں میں۔ واسطوں میں ایک لاجیکل پوائنٹ ہوتا ہے۔ میں ٹھیک طور پر کچھ اخذ نہیں کر سکی مگر ایک رابطہ مجھے اچھا لگ رہا ہے اور وہ ہے عصفان علی خان کا مجھ تک آنا۔ مختلف حیلوں سے، بہانوں سے۔ اور زاویوں سے مجھے ٹکنا۔ میری طرف بڑھنا!

شاید وہ جانتا ہو جو وہ کر رہا ہے۔ میں صرف ایک بات جانتی ہوں۔ میں ایک لڑکی ہوں اور لڑکی کی حیات مرد سے بھی کہیں زیادہ شارب ہوتی ہیں۔ بہت سی مخفی باتوں کا ادراک مجھے بھی اس طور جلد ہو جاتا ہے جس طرح کہ عام لڑکیوں یا خواتین کو ہوتا ہے۔

عصفان علی خان کا مسلسل مجھ سے ٹکنا۔ حیلوں بہانوں سے مجھ سے ملنا۔ میرے گھر آنا۔ دادا جی سے دوستی گانٹھنا۔ بے معنی کچھ بھی نہیں۔ شاید وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ مگر مل جل جاتی ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔ لامعہ میری بہترین دوست ہے اور مجھے اسے کسی بھی طرح ہرٹ ہونے سے بچانا ہے۔

21 جنوری

لامعہ بہت عجیب ہے اور بد تمیز بھی۔ سمجھتی ہی نہیں۔ اوزی بہت چاہتا ہے اسے۔ اور یہ بات جانتی ہے۔ مگر مانتی نہیں۔ پتہ نہیں لامعہ کے دل میں کیا ہے مگر اوزی کے دل میں صرف لامعہ ہے۔ اپنے بھائی کے لئے وہ ”پرفیکٹ میچ“ لگتی ہے مگر بات ایسے تو نہیں بنتی۔ ایک نہیں۔ دو نہیں۔ کئی بار اوزی اپنی توجہ کا اظہار لامعہ سے کر چکا ہے۔ مگر لامعہ سنجیدہ نہیں۔ آج شاید دلبر داشتہ ہو کر اوزی واپس لوٹ گیا۔ اور سب سے زیادہ نقصان میرا ہوا۔ میرا دوسرا بھائی بھی مجھ سے دور ہو گیا۔ مگر یہ لامعہ کو اس کا قصور وار نہیں ٹھہرا سکتی۔ دل کے رشتے عجیب ہوتے ہیں۔ زبردستی نہیں جڑتے۔ میں یہ بات جانتی ہوں۔“

25 جنوری

لامعہ سوچتی ہے میں بے وقوف ہوں اور مجھے جیسی ایڈیٹ، اسٹوڈنٹ لڑکی اس ساری دنیا میں نہیں۔ اس کے خیال میں مجھ میں لڑکیوں والی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ جتنا۔ نہ سنورنا۔ نہ لڑکیوں کی طرح ڈھیر ڈھیر شاپنگ کرنا۔ نہ یہ، نہ وہ۔ مجھے اختلاف نہیں۔ مگر میں چاہ کر بھی جیسی نہیں ہو سکتی۔ وہ بہت پیاری ہے۔ ہم دونوں میں تضاد سہی مگر ہم دونوں ایک دوسرے سے اچھی نہیں۔ آج خلاف معمول یہ ہوا کہ لامعہ نے مجھے بہت سی شاپنگ کروائی۔ میری مہینے بھر کی پانٹ مٹی ایک دن میں اڑادی۔ مجھے بہت سے شوخ رنگوں کے ڈریسز دلائے اور پتہ نہیں کیا کچھ۔ پتہ نہیں ہوا یا برا۔ مگر مجھے ایک مہینے کی پاکٹ منی جانے کا واقعی افسوس ہے۔ مگر لامعہ کا کچھ نہیں کیا جاسکتا

28 جنوری

آج لامعہ نے اچھی خبر سنائی ہے۔ اس کی انگریج منٹ ہو رہی ہے۔ اس کی خوشی ہمیشہ مجھے بہت کرتی ہے۔ مگر دل میں جانے کیوں ایک خیال یہ بھی آیا۔ کیا ہوتا اگر لامعہ نے میرے بھائی کے لئے چنا ہوتا۔ خیر اتنی خوشی کے موقع پر مجھے کچھ عجیب نہیں سوچنا چاہئے۔ شاید اوزی کے لئے کہیں بہت خوب صورت لڑکی رکھی ہوگی۔ شاید ہم سب کے لئے کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی ہے۔ جیسے لاء من پسند جیون ساتھی ملنے پر خوشی ہے، ایک دن اوزی بھی خوش ہوگا۔ اور میں کس لئے ہوں۔ بھائی کے لئے بہت خوب صورت سی لڑکی ڈھونڈوں گی ایک دن! عصفان علی خان نے دو چار صفحے ایک ساتھ الٹ دیئے تھے۔

7 فروری

لامعہ نے اپنا ہم سفر چن لیا ہے۔ آج اس کی انگریج منٹ تھی۔ لامعہ کا خیال ہے اب مجھے بھگ لگ جانا چاہئے۔ مجھے بھی کسی کو ڈھونڈ لینا چاہئے۔ مگر میرا خیال ہے کہ جسے مجھے ڈھونڈنا ہوگا وہ بہت میں خود آئے گا۔ میں ایسے ترّدّد کرنے والی نہیں۔ لامعہ اگر اتنا یہ جیسی لڑکی سے ایسا کچھ ایسا کہتا ہے تو یقیناً وہ حماقت کے دہانے پر ہے۔ مجھے پتہ ہے اگر وہ یہ لائسنز پڑھے گی تو مجھے بے وقوف کی۔ مگر کیا کروں۔ میں ایسی ہی ہوں۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اپنی دوست کی مجرم کیسے بن گئی؟

و جون
باگل ہے وہ شخص۔ ادھر لامعہ سے انگریج منٹ توڑی ادھر مجھے پر پوز کر دیا۔ رشتے کیا ہیں اس کے لئے؟ تعلق کیا معنی رکھتے ہیں؟۔۔۔ محبت کرنے کا دعویدار ہے وہ۔ محبت ایسی نہیں ہوتی۔ اتنی خود غرض، اتنی بے درد۔۔۔ اس نے لامعہ کا دل توڑ دیا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ لامعہ نے اوزان سید کا دل توڑ دیا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتی تھی اور میں۔۔۔ میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے ہمیشہ سب کی خیر خواہی چاہی۔۔۔ بھلا چاہا۔۔۔ پھر ایسی مشکل صورت حال سے میرا واسطہ کبھی نہیں پڑا۔ شاید اس وقت میں ہی وہ واحد ہستی ہوں جو کوئی حتمی فیصلہ لے کر سب کچھ بدل سکتی ہوں۔ میں نے انکار کر دیا ہے اور دادا ابا اور می نے بھی میرے فیصلے کو سراہا ہے۔ میں عفتان علی خان سے کوئی واسطہ رکھنا نہیں چاہتی نہ ہی کوئی رشتہ استوار کرنا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ شدید ترین محبت میں مبتلا ہے مجھ سے۔ اس کا کہنا ہے محبت دیوانگی ہے اور وہ میرے لئے دیوانہ ہے۔ مگر میں جانتی ہوں، ایسا کچھ نہیں ہے۔ عشق دماغ کا صرف خلل ہے۔ اور بہت جلد وہ مجھے بھول جائے گا۔ محبت کسی بھی دیوانگی سے بڑھ کر نہیں ہوتی، کتنی بھی بے بس کر دینے والی اور شدید کیوں نہ ہو، کسی کو ڈکھ نہیں پہنچا سکتی۔ جو دوسروں کو تکلیف دے کر خود راتیں ڈھونڈے وہ محبت نہیں ہو سکتی۔ یہ بات مجھے عفتان علی خان کو باور کرانا ہے۔

23 اگست

سوچ سوچ کر تھک گئی ہوں۔ کیا کروں، فیصلہ نہیں ہوتا۔ لامعہ کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ شاید مجھے اسے سب کچھ بتا دینا چاہئے۔ وہ نہیں جانتی کہ وہ لڑکی کون ہے جس کے لئے عفتان علی خان نے اسے چھوڑا۔ مگر میں جانتی ہوں اور میں کوئی بوجھ دل پر لے کر جینا نہیں چاہتی۔

29 اگست

آج جب لامعہ مجھے گھر چھوڑنے آئی تھی، میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو شاید اس گلگت کے ساتھ ہی مر جاتی۔ میرا دل بند ہو جاتا۔ مجھے عفتان علی خان سے نفرت ہونے لگی ہے۔ اپنے آپ کو ایک تعلق کے بوجھ سے آزاد کرنے کے بعد وہ خود کو کسی قدر آزاد محسوس کرنے لگا ہے۔ اب وہ اور بھی دیدہ دلیری سے مجھ سے اپنی محبت کا دم بھرنے لگا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ میرا دل جیت لے گا اور میں جانتی ہوں وہ صرف اور صرف خوش نہیں میں جی رہا ہے۔ دل ایسے نہیں جیتے جاتے، یہ بات اس کی سمجھ میں بھی جلد آ جائے گی۔

1 ستمبر

ابھی توڑی دیر پہلے عفتان علی خان کا فون آیا تھا۔۔۔ پتہ نہیں کیوں، یہ شخص سمجھتا ہی نہیں کہ میں اس سے محبت نہیں کرتی۔ کربھی نہیں سکتی۔ لامعہ کے خوابوں کو مسرار کر کے میں ان پر اپنا عمل کھڑا نہیں کر سکتی۔ یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ میں دنیا میں کسی کے ساتھ بھی کوئی تعلق باندھوں گی تو اور کوئی بھی ہو،

15 اپریل

اوزی واپس آ گیا ہے۔ مجھے خوشی ہے، وہ کسی طور سنبھل گیا ہے اور زندگی کی طرف واپس لوٹا ہے۔ لامعہ کو بھولنا یقیناً اس کے لئے آسان نہیں رہا ہوگا۔ مجھے محبت سے کبھی واسطہ نہیں رہا۔۔۔ لئے شاید میں اس کی کیفیت اس طور نہیں سمجھ سکتی۔ مگر میں جانتی ہوں، سب کچھ بھول کر وہ اپنی زندگی کا معمول کی طرف لائے۔

15 اپریل

آج جو ہوا وہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ عفتان علی خان کی حوصلہ افزائی میں نے کبھی نہیں کی۔ گروہ بڑھتے ہوئے قدم کبھی نہ روک سکا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا میں اسے کیسے سمجھاؤں اور باز رکھوں۔ کئی بار سختی سے بات کر کے دیکھی۔ مگر وہ جب دیوانگی کے بخار میں مبتلا ہے۔۔۔ سمجھتا ہی نہیں اور آج تو حد ہو گئی۔ اس نے اپنی محبت کا برملا اظہار کر دیا اور میں ساکت رہ گئی۔ جانے کیوں کہہ سکی۔ کیا کروں اس شخص کا۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اس کی فارم ہاؤس کی اس پارٹی سرے سے جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ مگر می اور دادا ابا اور پھر اوزی کے ان سسٹ کرنے پر چلی گئی اور ساتھ ہو گیا۔

کیا کر رہا ہے وہ؟ کیا وہ نہیں جانتا؟۔۔۔ لامعہ سے اس کا رشتہ اور مجھ سے اس طرح کی حرکتیں اسے زیب نہیں دیتی ہیں۔ مجھے پریشان کر کے، اس طرح ڈسٹرب کر کے اسے کیامل رہا ہے؟ میری سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آ رہا۔ کیا کروں اس کا۔۔۔ اگر لامعہ کو ایسا کچھ پتہ چلا تو۔۔۔ میری کوئی غلطی کہیں نہیں۔ مگر کہاں میں گواہیاں دیتی پھروں گی۔ اس شخص کو اپنے منج کی کوئی نہیں مگر اسے میرا تو کچھ خیال کرنا چاہئے۔ مجھے اس شخص سے واقعی ڈر لگنے لگا ہے۔

زندگی میں کبھی میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ کوئی میرے قریب نہیں آیا۔ کبھی کسی کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ پھر اب کیسے؟ میری سختی، سرد مہری اور ہارٹ بی ہیویئر کے باوجود وہ کیوں دیوانہ بنا بیٹھا؟

30 مئی

”یہ کیا ہوا ہے؟۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ لامعہ کی انگریج منٹ ٹوٹ گئی ہے۔ آج وہ آتی تھی اور میرے شانے پر سر رکھ کر تادیر روتی رہی۔

عفتان علی خان نے اسے کہا ہے کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ اس لئے وہ اس کے ساتھ زندگی نہیں کر سکتا۔ رشتہ توڑ دیا ہے اس نے کہ رشتے کی کوئی وقعت نہ تھی۔ یہ کیا ہوا؟۔۔۔ ایسا تو نہیں چاہئے تھا۔ وہ لامعہ۔۔۔ میری عزیز دوست۔۔۔ میرے کانڈھے پر سر رکھ کر تادیر روتی رہی اور کے آنسو قطرہ قطرہ میرے دل پر گرتے رہے۔ میں جو کسی غیر، کسی اجنبی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی، چوٹی تک کو نہیں مار سکتی، اپنی دوست کا درد چپ چاپ سہہ رہی ہوں۔ اور درد بھی وہ جو اس کی ذات کا دیا ہوا ہے۔ میں نے کبھی عفتان علی خان کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ پھر میری سمجھ میں نہیں میری محبت کی جڑیں اس کے اندر اتنی گہری کیسے ہو گئیں کہ اس نے اتنا انتہائی قدم لے لیا۔ کیا کروں

عفتنان علی خان ہرگز نہیں ہوگا۔ لامعہ مجھے بے حد عزیز ہے اور میں اسے کوئی تکلیف نہیں دے سکتی۔ عفتنان علی خان اپنی محبت میں اندھا ہو سکتا ہے، میں نہیں۔ مجھے اس کی محبت کسی صورت قبول نہیں۔ وہ کہتا ہے وہ اپنی محبت میں سچا ہے۔ رشتے کا اونٹنی سے نہا نہیں پایا سو توڑ دیا۔ لامعہ کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا سو توڑ لیا۔ اس نے ایمان داری سے کام لیا۔ اچھا کیا۔ ایسا وہ سمجھتا ہے۔ جتنا وہ مجھے چاہتا ہے ساری دنیا میں، کائنات میں کوئی نہیں چاہ سکتا۔ ایسا وہ سمجھتا ہے۔ مگر میں کیا کروں؟ میں ایسا نہ سمجھتی ہوں خیال کرتی ہوں۔ میری زندگی میں میرا ہم سفر کوئی بھی ہو سکتا ہے، عفتنان علی خان نہیں۔

سو میں نے اسے کہہ دیا ہے، میں اس سے محبت نہیں کرتی۔ کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔ زندگی میں کوئی اور ہے جسے میں چاہتی ہوں۔ محبت کرتی ہوں۔ کون؟ یہ بات نہ اس کے لئے اہم ہے چاہئے نہ ضروری۔ میں جانتی ہوں اس بات نے اسے برہم کیا ہوگا۔ بہت زیادہ پیش دلایا ہوگا۔ یہ ضروری تھا اس کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے کے لئے۔ مجھ سے دور جانے کے لئے۔

بہت تھک چکی ہوں میں۔ صبح کی پیس جانے کا موڈ بالکل بھی نہیں۔ مگر لامعہ کا فون آیا ہے۔ بعد ہے کہ میں ضرور آؤں۔ ادھر اوزی جا رہا ہے۔ وہ بھی منع کر رہا ہے کہ میں کیسپس نہ جاؤں۔ مگر لامعہ میں نہیں ٹال سکتی۔ صبح ضرور جانا ہے۔ ہاں جلد لوٹ آؤں گی۔ اوزی کو بھی تو ناراض نہیں کر سکتی نا!۔ بھائی کی حیثیت اپنی جگہ ہے۔

21 ستمبر

زندگی میرے لئے اپنا مفہوم بدل چکی ہے۔ سب کچھ بدل چکا ہے۔ میں نے ایسا زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا جو میرے ساتھ ہوا۔ اپنی انا، اپنا وقار، اپنا چندار سدا عزیز رہا مجھے۔ کبھی وہ اقدار نہیں کیا جس سے کوئی حرف آئے۔ پھر میرے ساتھ ایسا کیونکر ہوا؟ میں، میں نہ رہی۔ میرا انا نہ رہی۔ میرا غرور نہ رہا۔ میرا سدا اٹھا ہوا سر جھک گیا۔

سوچتی ہوں تو یقین نہیں ہوتا۔ میں انخواء کر لی گئی۔ اس شہر میں، ان گلیوں سے۔ جن میں ساری زندگی چلی۔ اچانک کیسے ہو گیا یہ؟ سوچتی ہوں اگر لامعہ کے اصرار پر اس کی کیسپس نہ لگتی ہوتی تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ پھر سوچتی ہوں۔ ایسا ہونا ہوتا تو گھر پر بیٹھ کر بھی ہو جاتا۔ پتہ نہیں کون لوگ تھے۔ کس نے کیا یہ؟ میں سمجھ نہیں پائی۔ آنکھ کھلی تو میں ایک دیر الگ میں تھی۔ اور وہاں کوئی نہ تھا۔ میں چیختی رہی۔ روتی رہی۔ رات گئے کوئی آیا۔ میں کرسی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف قدموں کی آہٹ تھی۔

صورت تک نہ دیکھ سکی۔ میرے ناک پر ایک بار پھر کلورڈ فارم والا رومال رکھ دیا گیا۔ اور میں ہڈی خود سے اورا ہو گئی۔ پھر کیا ہوا؟ مجھے خبر نہیں۔ جب میں ہوش میں آئی تو میں ہاسپٹل کے پر تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ میں موت کو شکست دے کر لوٹی ہوں۔ اپنے کڈنیپ کے صرف چوتیس گرام میں، میں بازیاب کر والی گئی تھی۔ اور ایسا عفتنان علی خان نے کیا تھا۔ میری زندگی کو بچانے میں اس کیلیدی کردار ادا کیا تھا۔ کیونکہ وہ مجھ سے شدید محبت کرتا تھا۔ شدید ترین محبت!۔ سو اس نے مجھے

بہر میں جینا نہیں چاہتی تھی۔ اگر میں مر گئی ہوتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔ نظریں نہیں ملا پارہی تھی میں سب سے اور اپنے آپ سے۔ میری غلطی کہیں نہیں تھی۔ مگر میں اپنا سر بہت جھکا ہوا محسوس کر رہی ہوں۔ عفتنان میرے آس پاس ہے۔ اس نے عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے، مجھے بچایا ہے، میری زندگی بچائی ہے۔ مگر میرے دل میں اس کے لئے کچھ نہیں کہیں بھی نہیں!۔ اگر اس نے میرے دل میں جگہ حاصل کرنا چاہی تھی تو وہ ناکام رہا ہے۔ وہ ایسا کر کے بھی میرے دل میں جگہ نہیں بنا سکتا۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ دنیا کو دیکھتی ہوں تو سب کچھ اپنے مقام پر لگتا ہے۔ سب مجھے جینے پر اکساتے ہیں۔ زندگی کے مفہوم بتاتے ہیں، سمجھاتے ہیں۔ مگر کوئی میری نظر سے مجھے نہیں دیکھتا۔ میں پہلے جیسی

ابھی نہیں رہی۔ کوئی یہ بات کیوں نہیں سمجھتا!۔ عفتنان علی خان کی آنکھیں مجھے اب بھی ویسے ہی دیکھتی ہیں۔ ان میں اب بھی ویسی ہی دیوانگی ہے۔ مگر مجھے اس کی دیوانگی سے وحشت ہوتی ہے۔

کیسے چاہ سکتا ہے وہ مجھے اس قدر۔ اس طرح!۔ کیسے اس کا دل اتنا وسیع ہو سکتا ہے۔ ایک لڑکی جو کڈنیپ ہو چکی ہے اس کے لئے وہ اب بھی دیوانی سوچتا ہے۔ یا تو وہ بہت عظیم بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یا۔!

23 ستمبر

میرے پاس سے لفظ کھو چکے ہیں۔ کچھ بولنا نہیں چاہتی۔ کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔ کسی کو دیکھنا نہیں چاہتی۔ مگر وہ شخص۔ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس نے ایک بار پھر میری زندگی میں اپنل مچا دی ہے مجھے ایک بار پھر پر پوز کر کے۔

عفتنان علی خان اتنا وسیع القلب کیسے ہو سکتا ہے؟ کہیں یہ سب اس نے تو نہیں کروایا؟ مجھے حاصل کرنے کے لئے؟

جب ہر طرف سے میرا حصول ناممکن ہو گیا تو میرے لئے ایسی صورت حال کری ایٹ کر دی کہ انکار کی کوئی صورت ہی نہ رہے۔ نہ میرے لئے، نہ میرے گھر والوں کے لئے!۔ سب جس طرح مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں، مجھے عفتنان علی خان کا خواب سچ ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ یقین نہیں ہوتا، کیا کوئی اس قدر، اس طرح کر سکتا ہے؟ ایسا کچھ کر سکتا ہے؟ اس لڑکی کے لئے، جسے وہ بے حساب چاہتا ہو۔؟

29 ستمبر

میں نے ہاں کہہ دی ہے۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ دانستہ نادانستہ یا مجبوری سے۔ عفتنان علی خان کی خواہش پوری کر دی ہے۔ میں اس کی ہونے جا رہی ہوں۔ مگر میں خوش نہیں ہوں۔ مر رہی ہوں۔ مر چکی ہوں۔ شاید اس روز ہی مر گئی تھی جب میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوا تھا۔ میں مر

اس کے ساتھ ہوں اور اسے دیکھ رہی ہوں۔ وہ واقعی میرے لئے پاگل ہے۔ مگر میں اسے اب پاگل کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے ترس آتا ہے اس پر۔ میں ایسا نہیں کر سکتی عفتان صرف مجھ سے وابستہ فرد نہیں ہے، وہ اس گمراہ کا، اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اہم ترین ہے وہ۔ اس گھر کے لئے، اپنوں کے لئے۔ مجھے لگتا ہے میں اس کے ساتھ ایسا سب کر کے غلط کر رہی ہوں۔ صرف اپنے کڈنیپ کاری وینج (Revenge) لینے کو میں اسے پاگل نہیں کر سکتی۔ میرے لئے یہ بہت مشکل ہو رہا ہے۔ ہم ایک کرے میں۔ ایک ہاتھ رہ رہے ہیں۔ اس نے کبھی کسی موقع پر فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ چاہتا تو ساری ”دیواریں“ گرا سکتا تھا مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔

کیا چاہتا ہے وہ۔

کیا واقعی اس کے لئے میرا دل اہم ہے؟ میری محبت اہم ہے؟

29 نومبر

میں کمزور نہیں پڑ رہی۔ پڑنا بھی نہیں چاہتی۔ مگر وہ شخص مجھے زچ کر رہا ہے۔ مسلسل کمزور۔ بے بس کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور میں ہارنا نہیں چاہتی۔ میں اسے چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ چاہتی ہوں وہ لامعہ کو ہٹالے۔ اب تک جو بھی کیا میں نہیں جانتی وہ ٹھیک تھا یا غلط۔

مجھے اگر پچھتاوا ہے تو اس لئے نہیں کہ مجھے عفتان غلط نظر نہیں آتا یا میں اسے غلطی پر نہیں سمجھتی یا میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اگر ایسا کوئی پچھتاوا میں محسوس کر رہی ہوں تو صرف اس لئے کہ میں نے کبھی کسی کے ساتھ کچھ غلط نہیں کیا۔ میں کسی کے ساتھ کچھ برادرانہ نہیں رکھ سکتی۔

5 دسمبر

عفتان نے کتنا غلط کیا اس کا اندازہ ہر بار مجھے لامعہ سے مل کر ہوتا ہے۔ وہ روتی ہے تو اس کے آنسو برسے دل پر گرتے ہیں۔ عفتان کو اپنے کئے کا ازالہ کرنا ہوگا۔ اسے لامعہ کی طرف واپس لوٹنا ہوگا۔ ہر بورت میں۔

11 دسمبر

اول روز سے اب تک وہ اپنی محبت مجھ پر منکشف کر دینے کا متمنی ہے۔ چاہتا ہے میں یقین کر لوں۔ گمراہ کے لئے یہ ناممکن ہے۔ کل بھی تھا اور آج بھی۔ اور کل بھی یقیناً ایسا ہی رہے گا۔

میں اس قدر سنگ دل نہیں۔ کسی کا دل نہیں دکھا سکتی۔ ترس آتا ہے کبھی کبھی اس بندے پر۔ کوئی اس طرح بھی کسی کو چاہ سکتا ہے؟ اس قدر۔ اتنا زیادہ۔ اتنا بے حساب۔

تیار ہوا کسی کے ساتھ۔ پاگل ہے یہ بندہ۔ کیا کہوں اسے۔ میرے پاس نہ اس کو دینے کو کوئی سزا ہے نہ جزا۔ شاید اس کی دیوانگی کا میرے پاس کوئی حل بھی نہیں ہے کیونکہ میرے کہنے سے نہ وہ سنے چاہئے نہ خود کو روک سکے۔ نہ ہی روک سکے گا۔ نہ ہی کبھی بدل سکے گا خود کو۔ مگر میں چاہتی ہوں، دل سے بدل دے وہ خود کو۔ سوچے تو صرف لامعہ حق کے لئے۔ کیونکہ لامعہ اس کے لئے ضروری ہے۔ بہت ضروری۔

گئی تھی۔ عفتان علی خان اگر مجھے حاصل کرنے پر خوش ہو رہا ہے یا جشن منا رہا ہے تو میں اسے ام ہوں۔ صرف ایک لاش سے تعلق باندھ رہا ہے وہ۔ ایک سرد مردہ جسم سے جس کے اندر حرارت باقی نہیں۔ اس کی جنوں خیزی اسے کچھ نہیں دے گی سوائے پچھتاوے کے۔ میرے جو کچھ بھی ہوا، اسے اس کی قیمت چکانی ہوگی۔ میرے ساتھ اس کا ہر لمحہ عذاب ہوگا۔ میری عزت، میرے وقار کی قیمت اتنی کم نہیں۔ یہ احساس اسے میں دلا کر رہوں گی۔ پوزیو باؤٹ بی۔ میرے لئے جنوں خیر ہے وہ اور میں اس کی اسی جنوں خیزی کو اس کے خلاف کروں گی۔

127 اکتوبر

عفتان علی خان کا میرے ساتھ زندگی جینے کا خواب پورا ہو رہا ہے مگر وہ ان لمحوں میں نہ جی خوش ہے۔ میں نے اسے باور کرایا ہے کہ میں اس کے لئے نہیں ہوں۔ اس کی نہیں ہوں۔ میں چاہتی ہوں۔ یہ بات وہ برداشت نہیں کر پارہا۔ میں دن بہ دن نفسیاتی طور پر اسے کمزور کر رہی کمزور کر دوں گی۔ جیسے نہیں دوں گی اسے۔ اس نے مجھ سے میرا غرور چھیننا تھا۔ مجھے دہم نظر ملانے کے لائق نہیں رکھا تھا۔ میں بھی اسے خوشی کے نام سے اور زندگی سے بیزار کر دوں گی۔ کہیں کوئی نہیں میری زندگی میں۔ کہیں کوئی بھی نہیں۔ نہ میرے خوابوں میں۔ آج تک میری زندگی میں کیا خوابوں تک میں کسی کا گز نہیں ہوا۔ نہ میں نے نہ کوئی اور مجھے میری نظروں میں اس طرح چھا۔ مگر کوئی ہے جو اب میری زندگی میں ہے۔ ”کوئی“ عفتان علی خان کی جنوں خیزی کو بڑھاوا دینے اور اسے کمزور کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اسے نفد پر کمزور کرنے اور شکست خوردہ کرنے کے لئے یہ ”کوئی“ میرا خود کا تراشیدہ ہے۔

12 نومبر

میں صرف چاہتی ہوں۔ عفتان علی خان اپنی غلطی تسلیم کر لے۔ اس نے جو بھی کیا غلط کر میرے ساتھ اس طرح نہیں کرنا چاہئے تھا۔ نہ میرے ساتھ نہ لامعہ کے ساتھ۔ وہ جس روز اپنا اعتراف کر لے گا میں اسے چھوڑ دوں گی۔ میں دل سے چاہتی ہوں وہ لامعہ کو ہٹالے۔ لامعہ بہت محبت کرتی ہے اور میں عفتان کے ساتھ رہ کر خود کو لامعہ کا مجرم تصور کرتی ہوں۔ یہی عفتان کا گناہ۔ میں صرف اس قیمت پر اسے معاف کر سکتی ہوں۔

17 نومبر

عفتان علی خان سے میں اپنی نفرت برقرار نہیں رکھ پارہی۔ اس سے ہی کیا، میں کسی سے نہیں کر سکتی۔ یہ میرا مزاج نہیں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے عفتان بھی مجرم نہیں ہے۔ مگر میں ہٹ کر سوچ نہیں سکتی۔ اگر میرے کڈنیپ سے کسی کا فائدہ ہو سکا تھا تو۔ صرف عفتان تھا۔ یہ ایک گیم تھا جو اس نے میرے ساتھ کھیلا۔ صرف مجھے حاصل کرنے کے لئے۔ کوئی کسی سے اتنی دیوانہ بھی کر سکتا ہے، اتنی جنوں خیزی کے ساتھ؟ یقین نہیں ہوتا۔ مگر اب مجھے یقین کرنا پڑ رہا ہے۔

کیونکہ وہ لامعہ کے لئے ضروری ہے۔ مگر یہ بات مجھے اسے باور کرانے کو وقت لگے گا شاید۔
18 دسمبر

بہت برا خواب دیکھا ابھی کچھ دیر قبل۔ پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ عفتان علی خاں پانے کی خواہش کی تھی۔ اس کی اس بات نے مجھے جانے کیوں حد سے سوا خوفزدہ کر دیا۔ مجھے اڑ پر یہ تسلیم کرنا پڑا ہے یا شاید میں کر چکی ہوں یہ تسلیم کہ وہ صرف لامعہ کا ہے اور مجھے ہر قیمت پر وا کو لوٹانا ہے۔ میں اسے اپنے پاس صرف امانت کی طرح رکھنا چاہتی ہوں اور اس سے زیادہ کوئی واسطہ رکھنا نہیں چاہتی۔ اچھا ہوا وہ صرف خواب تھا۔ اس خواب میں عفتان کی خواہشوں ڈیرہ تھا اور شکر ہوا کہ آٹکھ بروقت ٹھل گئی اور سب خواب رہا۔ میں اٹھی تو وہ صوفے پر ہمیشہ کی طرح برقرار رکھے سو رہا تھا۔ مگر اس خواب نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد دیر تک میں سو نہیں سکی۔ خوف زدہ نہیں تھی میں اس سے۔ کبھی بھی خوفزدہ نہیں ہوئی۔ جانے کیوں اس سے بڑے خوف محسوس نہیں ہوا۔ اگر وہ برا ہے۔ اس نے کچھ برا کیا ہے تو مجھے اس سے خوف تو ضرور چاہئے تھا۔ مگر جانے کیوں، ایسا کچھ نہیں۔

اس نے اس روز کہا تھا۔ ”وہ مجھے جب بھی حاصل کرے گا، مجھے میری اجازت سے حاصل اگر اس کے لئے میری ”اجازت“، اہم ہے تو یقیناً اس کی خواہش اس پر غالب نہیں۔ اگر وہ اپنی سے اس درجہ مطلوب نہیں تو وہ یہ سب کیسے کر سکتا ہے؟

میں اس کے سامنے ہوں۔ روبرو ہوں۔ بے حد قریب ہوں۔ ہاتھ بڑھا کر وہ جب چاہے ”حاصل“ کر سکتا ہے۔ زور آور ہے وہ۔ پھر اس کے لئے میری اجازت ہی کیوں اہم ہے؟ کیا واقعی میں اس کی خواہشوں سے زیادہ زور آور ہوں؟
زیادہ اہم ہوں؟

اس سوال سے آگے کے کئی صفحات خالی تھے۔ یعنی یہ کل رات کی آخری روداد تھی جو اتنا ہی اور عفتان نے پڑھی۔ بہت آہستگی سے اس نے ڈائری بند کر دی تھی۔ کچھ دیریوں ہی خاموشی پھر ڈائری واپس اس جگہ پر رکھ دی تھی۔ ایک جرم اس سے سرزد ہوا تھا۔ مگر بہت سے رازوں ضرور ہٹ گیا تھا۔

اگر آج اس نے یہ چھوٹا سا جرم نہیں کیا ہوتا تو وہ اتنا ہی کو کبھی اتنے اچھے طریقے سے جان نہتا وہ اتنا کچھ جان کر اتنا ہی سے محبت کرنا بند نہیں کر سکتا تھا۔ شاید وہ محبت کہیں اندر اور بھی بڑھ گئی سے بھی کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔

سب سے بڑا طمینان یہ کافی تھا کہ اتنا ہی کی زندگی میں کہیں ”کوئی اور“ نہ تھا۔ جو سوالیہ نکتے اسے پریشان کرتا رہا تھا اب وہ باقی نہیں رہا تھا۔ اتنا ہی کی زندگی میں اب بھی کئی سوالیہ نشان باقی نہیں ختم کرنے کی کوشش بھی کرتا تو شاید ختم نہیں کر سکتا تھا۔

سنگین حیدر لغاری چلا گیا تھا اور جانے سے قبل اس سے مل کر بھی نہیں گیا تھا۔ مگر اس کے میل پر سردار ٹیکٹ کر کے تاکید ضرور کر گیا تھا کہ اسے مائی اماں کے پاس جانا ہے۔ مگر اس سوچ سے قبل نے سے قبل ٹیکٹ کر کے حکم کی تعمیل کرے یا نہ کرے، پایا کا فون آ گیا تھا۔ وہ لوگ پاکستان پہنچ چکے تھے۔
”پاپا!۔۔۔ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں، آپ لوگ آرہے ہیں؟ میں آپ کو ایئر پورٹ پر لینے آ رہا ہوں۔“ اس نے شکوہ کیا تھا۔

”سر پر اتر بیٹا!۔۔۔ سوچا تمہیں خوشی کے ساتھ کچھ حیران بھی کر دیا جائے۔ سنگین کا فون آیا تھا۔ وہ ایک چلا گیا ہے۔ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔“

”نہیں پاپا! میں خود آ جاتی ہوں۔ زو بار یہ اور فانی بھی آئے ہیں ساتھ؟“
”ہاں۔۔۔ گھر آباد ہو گیا ہے پھر سے۔ آ کر دیکھو۔ تمہیں سب کچھ پہلے جیسا لگے گا۔ اپنے بچے کے بغیر فیملی کچھ نامکمل لگ رہی ہے۔“ پاپا بولے تھے۔

اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ سب کچھ یقیناً پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ وہ ویسی نہیں رہی تھی۔ بڑی تبدیلی وقت نے یہی کی تھی۔

”میں آرہی ہوں پاپا! اپنی کمپلیٹ فیملی کے ساتھ، اپنے کمپلیٹ گھر کو دیکھنے۔“ اس نے فون رکھ کر اپنا مسلمان پیک کیا تھا اور ایک اختتامی نگاہ اس گھر پر ڈال کر چلتی ہوئی باہر نکلی تھی۔
لاڈل میں لگی اس کی تصویر نے لمحہ بھر کو قدم روکے تھے۔ وہ رک گئی تھی۔ مگر ڈبڈبائی نگاہ زیادہ دیر اس ٹر پڑھ نہ سکی تھی۔ آنکھیں رگڑتی ہوئی وہ پلٹی تھی اور آگے بڑھ گئی تھی۔

گھر میں واقعی سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ پاپا کے شانے پر سردھے وہ بہت رنگ روٹی رہی تھی۔

”خوشی کے موقع پر روتے نہیں میرب! ہم سب اکٹھے ہیں۔ ہمیں اس کے لئے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔“ زو بار یہ نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔
وہ آنکھیں پونچھتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”ہاں۔۔۔ ہم سب اکٹھے ہیں اور اب بہت جلد ہم دوبارہ میرب کو چلا کر دیں گے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔“ پاپا مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے تھے۔ مگر وہ مسکرائیں سکی تھی۔ جھک کر فانی کو گلے لگا کر پیار کرنے لگی تھی۔

”آپ کی آپا نے آپ کو بہت مس کیا فانی!۔۔۔ بہت زیادہ یاد آئی آپ کی۔ کیا آپ کو ہماری یاد نہیں آئی؟“ بیگنی آنکھوں کے ساتھ وہ پوچھ رہی تھی۔ فانی چھوٹا تھا مگر اس کی آنکھیں پونچھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

”اب میں آ گیا ہوں واپس۔ آپ کو نہ مجھے یاد کرنے کی ضرورت ہے نہ رونے کی۔ آپ کو پتہ ہے میں آپ کے لئے کیا لایا ہوں۔ ڈھیر سارے چاکلیٹ۔“ ہاتھ کے اشارے سے فانی نے بتایا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

اپنے گھر میں تھی۔ اپنوں کے درمیان۔
جس صورت حال سے وہ گزری تھی اسے مزید سب کو اس سے غافل نہیں رکھنا تھا۔ جو کچھ اس کے
اتھ ہوا تھا، جو کچھ زندگی نے اس کے ساتھ برتا تھا اسے سب کو بتانا تھا۔ اپنے ان اپنوں کو جو اس کے
جن کے لئے وہ اہم تھی۔

وہ کن پریشان کن تکیوں سے گزری۔ کیسے حالات سے نبرد آزما رہی۔ اگر پاپا کو پتہ چل
پاتا تو وہ کوئی بھی اقدام کرنے میں دیر تو نہ لگاتے۔ اس نے خود انہیں مطلع نہیں کیا تھا۔ وقت مناسب نہ تھا
کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو چکا تھا۔

پھر صورت حال بھی اختیار سے باہر کیوں رہتی۔
ایک گہری سانس خارج کرتی ہوئی وہ اطمینان سے پلٹی تھی۔ تبھی اس کا سیل بجاتا تھا۔
اس نے کال ریسیو کی تھی۔

”ہیلو۔ جی، میری ہی بات کر رہی ہوں کیا۔“



”میں بھی آپ کے لئے بہت سے چاکلیٹ لائی ہوں۔“ میرب نے بیک سے چاکلیٹ نکال کر
کے ہاتھ پر رکھے تھے۔ سچی زو بار یہ بولی تھی۔

”تم فریش ہو جاؤ میرو! میں ٹیل لگاتی ہوں۔ اور یہ آپ فون پر شروع بھی ہو گئے۔ کچھ دیر
لیجئے، پھر کام ہی کام کرنا ہے۔ میرو گھر آئی ہے۔ کتنے عرصے بعد ہم سب مل کر بیٹھے ہیں۔ کچھ تو
کیجئے۔“ زو بار یہ پاپا سے بولی تھی۔ وہ اپنے سیل پر کوئی نمبر ملاتے ہوئے مسکرا دیئے تھے۔

”میرو بچے!۔ میرا خیال ہے ایک کلاس مزید ہونے سے پہلے آپ فریش ہو کر آجائیے۔
ساتھ کھائیں گے۔ اس کے بعد باہر جائیں گے۔“ پاپا نے خیال ظاہر کیا تھا۔ مگر زو بار یہ کچن کی طرف
رک کر بولی تھی۔

”کوئی کہیں نہیں جائے گا۔ پہلے کھانا، پھر آرام۔ کل دیکھیں گے کسے کیا کرنا ہے۔
بعد گھر کا ماحول دیکھا ہے۔ کچھ محسوس تو کرنے دیں۔ ہم سب تو خیر ساتھ تھے۔ مگر میرب۔۔۔
بارے میں بھی تو سوچئے۔۔۔ وہ تو وقت گزارنا چاہتی ہوگی نا ہمارے ساتھ۔ اور میرب! تم اس
کیوں کھڑی ہو؟ کیا اپنے ہی گھر میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کر رہی ہو؟۔۔۔ بھئی وہی گھر ہے،
سب ہیں۔“ زو بار یہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”ہاں۔۔۔ مگر میں وہ نہیں ہوں۔ اس کے اندر سے آواز ابھری تھی مگر وہ بولی نہیں تھی۔
ہوئے اس سارے ماحول کو دیکھا تھا۔ ایک کپلیٹ ماحول تھا، کپلیٹ گھر کا۔ ایک کپلیٹ
کتنے عرصہ بعد وہ یہ سب دیکھ رہی تھی۔ یہ مسکراتے چہرے۔ بہت اپنے نظر آتے نظر آتے۔
سب کچھ کیسا خواب خواب سا لگ رہا تھا۔

وہ مسکراتی ہوئی پلٹی تھی اور اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ایک ایک شے وہیں تھی جہاں آج سے
نوا ماہ پہلے تھی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ ہر شے اپنے ٹھکانے پر ملی تھی اسے۔ مگر اسے جانے کیوں
کچھ بہت اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔ ایک ایک شے کو چھو کر وہ جیسے یقین کر رہی تھی۔ کہ وہ۔
بستر۔ الماری۔ آئینہ۔۔۔ سب اسے حیرت سے تکتے ملے تھے۔ اسے لگا جیسے سب
رہے ہوں۔

”میرو! تم پہلے جیسی کیوں نہیں لگ رہیں؟“

کتنا بدل دیا تھا اسے وقت نے۔ کتنی آزمائشیں لی تھیں وقت نے۔ اور وہ سردار سیکٹین حیدر لغاری
ایک عجیب سا رشتہ۔ ایک عجیب سا نام۔ نہ تعلق اسے سمجھ پایا نہ وہ اس تعلق کو۔ ایک سوچ
آکھیں نم کر گئی تھی۔ مگر اس نے ہاتھ کی پشت سے سختی سے آنکھوں کو رگڑ دیا تھا جیسے وہ اب مزید
چاہتی تھی۔

ارادہ کر لیا تھا اس نے اب اور نہیں روئے گی۔ پُر عزم تھی وہ۔ پاپا اس کے ساتھ تھے۔ اس کی
کے ساتھ تھی۔ اب تنہا نہیں تھی وہ۔
کسی کے رحم و کرم پر نہ تھی۔

میان رکھا، وہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی تم اپنا ضروری سامان پیک کر لو۔ ہو سکے تو بسکٹین سے کوئیکٹ کر کے اسے بھی بتاؤ۔ بیٹا! یہ چھوٹے چھوٹے لمبے ہوتے ہیں جو زندگی کو زندگی سے جوڑ کر رکھتے ہیں۔

میں پتہ چلتا ہے کہ ہم تنہا اور کمزور نہیں ہیں۔ تم سمجھ رہی ہونا میری بات؟“
 ”جی ہاں!“ وہ آہستگی سے بولی تھی۔ وہ سب اب بھی نہیں کہہ سکتی تھی جو کہنا چاہتی تھی۔ جو دل کی تھی، ل میں ہی تھی اب تک۔ نہ وقت ملا تھا نہ موقع اور نہ شاید ہمت تھی اس میں۔ پاپا کہنے کے بعد اس کی بیٹانی پر پیار کرتے ہوئے ”سوئیٹ ڈریم“ کہہ کر کمرے سے چلے گئے تھے اور میرب سیال اپنی سوچوں سے الجھنے کو اکیلی رہ گئی تھی۔

میرب سیال کے لئے خبر پریشان کن تھی۔ مائی کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ مسٹر چاولہ نے فوری نہیں ہاسپتال سز کروا کر اسے جردینا ضروری خیال کیا تھا۔

”مائی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ آپ کہیں تو آنے کے انتظامات کر دوں؟“ مسٹر چاولہ پوچھتے تھے۔ اسے فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ ابھی ابھی وہ اپنے گھر میں اپنوں کے بیچ آئی کیسے ممکن تھا کہ وہ اب فوراً ہی واپس بھی.....

”مائی کو بتا دوں کہ آپ نہیں آنا چاہ رہیں؟“ مسٹر چاولہ نے اس کی خاموشی پر دریافت کیا تھا وہ فوری طور پر بولی تھی۔

”نہیں۔۔۔ میں آ رہی ہوں۔“ وہ پلٹی تھی۔ پتہ نہیں اس نے درست فیصلہ کیا تھا یا کہ نہیں۔ اب اتنی الجھن میں نہیں تھی۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ کس کا فون تھا؟“ پاپا جو اس کے پیچھے کھڑے تھے اسے سوچ میں الجھا دیا۔

”مسٹر چاولہ کا۔۔۔ مائی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔“
 ”سو، واٹ ہپینڈ؟ تمہیں فوراً جانا چاہئے۔ جبکہ بسکٹین بھی یہاں نہیں ہے، انہیں تمہارا ضرورت ہے۔“ پاپا نے بلا تردد کہا تھا۔ اس نے سرانثبات میں ہلا دیا تھا۔

”جی۔۔۔ مجھے پتہ ہے۔ اس لئے میں نے اپنے آنے کے متعلق انہیں انفارم کر دیا ہے۔“
 ہوئے اس کا انداز الجھن سے پُر تھا۔

مظہر سیال نے مسکراتے ہوئے اس کے گرد بازو پھیل کر اسے دیکھا تھا۔
 ”بعض موقعوں پر کچھ ضروری کاموں کو کرنا زیادہ ضروری ہوا کرتا ہے۔ ہم یہاں ہیں، تمہارا ہیں۔ مگر بسکٹین کی مائی کو اس وقت تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔“ پاپا نے نرمی سے اسے سمجھایا تھا۔

دی تھی۔
 ”جانتی ہوں پاپا! لیکن طویل وقت کے بعد آپ سب کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا آپ سب کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہ رہی تھی۔“ دل کی بات کہی تھی۔ پاپا جانتے تھے۔ مسکرا دیئے تھے۔
 ”میں جانتا ہوں۔ مگر اب ہم سے زیادہ حق ان کا ہے تم پر۔ اب تم ان کی بیٹی زیادہ ہو۔ اور رکھتی ہیں وہ تمہارا۔ ہم سے تو زیادہ پیار کرتی ہیں تمہیں۔ ہم یہاں نہیں تھے تو انہوں نے جس طرح

”سٹر چاولہ کا فون آیا تھا۔۔۔ مائی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ انہوں نے کہا تم جانا نہیں چاہتیں؟“
 ”کچھ غلط سنا ہے آپ نے۔۔۔ میں جا رہی ہوں۔“ اس نے باور کرانے کو زور دیا تھا۔

اس نے باور کرانے کو زور دیا تھا۔

”کہاں؟“ وہ چونکا تھا۔

”مائی کے پاس“ میرب نے بتایا تھا۔

”مجھے تم پر زور زبردستی یقیناً روانہ نہیں لگتی۔ تمہیں اپنے معاملات میں الجھانا نہیں چاہتا۔ مائی کی داری کرنا یقیناً تمہارا دوسرا نہیں ہے۔ اس لئے اگر تم نہ چاہو تو تمہیں اجازت ہے۔“ وہ دوسری طرف اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

میرب سیال کو غصہ آئے بغیر نہیں رہا تھا۔ سو درشت لہجے میں بولی تھی۔

”اگر آپ سے اجازت طلب کرنا ہوتی تو مسٹر چاولہ کے فون کے بعد فوراً آپ کو فون کر لیا ہوتا اور میرے اختلافات کے سچ آپ مائی کو لانے کی کوشش مت کریں۔ میں جانتی ہوں اس وقت کتنا بڑا خطرہ ہے۔“

”بہت اچھی بات ہے، اگر آپ جانتی ہیں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ میرا مقصد صرف یہ باور کرانا ہے کہ آپ پر ذالنا نہیں چاہتا جسے آپ سہارہ سکیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں مائی میری ذمہ داری ہیں۔“ دوسری طرف وہ جتاتے ہوئے اجنبی لہجے میں گویا تھا۔ میرب جانتی واقف تھی اس کے مزاج سے۔ سو باور کراتے ہوئے بولی تھی۔

”آپ پر یقیناً کوئی احسان نہیں کر رہی۔ مائی میرے لئے بہت معتبر ہیں اور انہیں میں آپ حوالے سے ہٹ کر سوچتی اور دیکھتی ہوں۔ یوں بھی مائی میرے اور آپ کے درمیان حائل مسئلے کا حل ہیں۔ وہ میرے لئے بھی ماں جیسی ہیں۔“ میرب نے کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔

دوسری طرف موجود سردار سبکدگین حیدر لغاری ہاتھ میں موجود فون کو چند ثانیوں تک دیکھا رہا پھر خیال نظروں سے سیل فون کو دیکھتے ہوئے بہت اچھن سے بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا۔ پھر دوبارہ نمبر ملا دیا تھا۔ مگر پھر جانے کیا ہوا تھا کہ ایک دو تیل جانے کے بعد اچانک ہی سلسلہ منقطع کر دیا اس ایک لمحے میں گی کی آواز اس کے گرد گونجی تھی۔

”مجھت کرتے ہونا اس سے؟“

وہ چونکا تھا۔ بلکہ حد سے سوا حیران ہوا تھا۔ پھر ہاتھ میں پکڑا فون بچھنے والے انداز میں سائے رکھا تھا۔

”حماقت۔۔۔“ با آواز بلند ڈپٹا تھا۔

”مجھت حماقت کے سوا کچھ ہے؟“ اس کے احتجاج پر گی کی ایک اور سرگوشی ابھری تھی۔

”زبش۔“ با آواز جھٹلانے کا انداز بہت خوب تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے دوبارہ فون اٹھا لیا۔ مسٹر چاولہ سے بات کرنے کا تھا مگر اس سے قبل ہی فون بج اٹھا تھا۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف گی تھی۔

”بولو گی!“ تمام سوچوں کو جھٹکتے ہوئے وہ بولا تھا۔

”مائی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مسٹر چاولہ کا فون آیا تھا۔“

”مائی جاننا ہوں میں۔ مسٹر چاولہ نے مجھے اطلاع دے دی تھی۔ میں واپس آ رہا ہوں۔“

”مائی جلی جاتی ہوں مائی کے پاس۔ تم اپنا کام چھوڑ کر مت آؤ۔ مسٹر چاولہ بتا رہے تھے کہ اب اسے بہتر ہیں۔“

”مائی از مائے مدرگی!۔ ان کے لئے میں کسی قسم کی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ اور تم برف گرمیوں میں رہ کر آرام کرو۔ یہ تمہارے لئے زیادہ ضروری ہے۔ میرب سے بات ہوئی تھی میری۔ وہ جا رہی ہے۔ ان کے پاس۔“ اطلاع دی تھی۔

”مائی یقیناً ہے تمہیں اس پر؟“ دوسری طرف گی نے مسکرا کر جانے کیا جتنا چاہا تھا۔ وہ جواباً کچھ نہیں بولا تھا۔

”گھر بہت ٹونا ہو گیا ہے گین!۔ میرب کے یہاں سے چلے جانے کے بعد جو ویرانی یہاں آئی ہے شاید تم یہاں آؤ تو تم بھی اسے محسوس کرو۔“ گی مدھم لہجے میں کہتے ہوئے اسے خوابوں کی دنیا میں رہنے والی کوئی مخلوق لگی تھی۔

گی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی تھی۔

”سارا گھر جیسے اسے تلاش کر رہا ہے گین!۔ تم یہاں نہیں ہو، مجھے جانے کیوں یقین ہے تمہارا احساس، یہاں وہاں اُسے کہیں ڈھونڈ رہا ہے۔“ گی کی باتیں جیسے واقعی خیالی ہوائی تیز کروں سے بھری ہوئی تھیں۔ اتنی ٹینشن میں ہونے کے باوجود وہ ہنس دیا تھا۔

”تمہارا جواب نہیں گی ثیا نگ! باتیں واقعی دلچسپ کرتی ہو مگر تھوڑی بہت بے وقوفی سے بھری۔ سچ ہاؤں، تمہیں اس بندے نے اگر دھوکا دیا تو اس کا سبب صرف یہی تھا۔ تم حد سے سوار عایت دینے کی تامل ہو۔“

”گی ثیا نگ کو کسی نے کیوں دھوکا دیا، یہ ایک الگ معاملہ ہے گین! مگر اس وقت جو گی ثیا نگ کہہ رہی ہے وہ انور کئے جانے کے لائق نہیں ہے۔ تم جو کہہ رہے ہو وہ میں سمجھ رہی ہوں گین! جو تمہارے اندر ہے لٹا رہا بھی جانتی ہوں۔“ اسے جھٹلاتے ہوئے گی کہہ رہی تھی۔

”اسے جانے مت دینا گین!۔ جانے مجھے کیوں لگتا ہے کہ اگر وہ تمہاری زندگی سے چلی گئی تو تمہارا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔“

”اور تمہیں میرے نقصان کی اتنی پرواہ ہے کہ تم اپنے نقصان کو بھی نہیں دیکھ رہی ہو؟“ مسکراتے ہوئے جتا گیا۔ ”گی!۔ اگر تم اپنی زندگی کی فکر کرو تو یہ زیادہ ضروری ہوگا۔ مجھے، میری زندگی کو میرے مال پر چھوڑ دو۔ میرا ایمان ہے، جو ہوتا ہے سو ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا۔ مائی کے متعلق جاننا اور باخبر رہنا۔ فی الحال یہ زیادہ ضروری ہے میرے لئے۔ میں واپس آنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

کرار سبکدگین حیدر لغاری نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

”اسے جانے مت دینا گین!“ گی ثیا نگ کی سرگوشی اس کے آس پاس گونجی تھی۔

”جانے مجھے کیوں لگتا ہے کہ اگر وہ تمہاری زندگی سے چلی گئی تو تمہارا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔“

اس کے سامنے آرکتے تھے۔ قسمت کیسا کھیل کھیل رہی تھی اس کے ساتھ، وہ سمجھ نہیں پاتی تھی۔

ساہیہ خان چپ چاپ کھڑی تھی۔ اذہان حسن بخاری چلا ہوا اس کے پیچھے آن رکھا تھا۔ ساہیہ آہٹ یا ہون کی چاپ پر بیٹھی نہیں تھی۔ نہ مڑ کر اس کی طرف دیکھنا چاہا تھا۔ اذہان حسن بخاری فوری طور پر کچھ اس بول سکا تھا۔

خاموش نظروں سے اس کی پشت کو بس چپ چاپ دیکھا تھا، پھر ہاتھ بڑھایا تھا اور بہت آہستگی سے اس کے شانے پر رکھ دیا تھا۔ ساہیہ نے گردن موڑ کر اس مضبوط ہاتھ کو اپنے شانے پر دھر اصراف دیکھا تھا۔ دل تب بھی کچھ نہیں تھی۔

”ساہیہ! اذہان حسن بخاری نے بہت ہولے سے پکارا تھا۔ مگر ساہیہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

اذہان حسن بخاری نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر اس کے شانے پر رکھا تھا اور اس کا رخ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔ ”اس طرح چپ مت رہو ساہیہ! مجھے اپنے اور تمہارے بیچ یہ چپ بالکل اچھی نہیں لگتی۔ جب تم چپ ہوتی ہو تو فاصلے بہت بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ تم سے دور جانا نہیں چاہتا ساہیہ!“ اس کی آنکھوں میں بھر پورا اعتماد سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ مگر ساہیہ تب بھی کچھ نہیں بولی تھی۔

”ساہیہ! رشتوں میں ایک شے بہت ضروری ہوتی ہے، اعتبار۔ اعتبار بہت ضروری ہوتا ہے

ساہیہ! ایک بات پوچھوں؟ مجھ پر اعتبار کرتی ہو تم؟“ مدہم لہجے میں دریافت کیا تھا۔ ساہیہ کی آنکھوں میں یکدم بہت سا پانی ٹھہرا تھا اور ایک لمحے میں پلکوں کی باز پھلانگ کر باہر بہہ نکلا تھا۔

”اعتبار کرتی ہو مجھ پر ساہیہ؟“ اذہان حسن بخاری نے ٹھوڑی سے اس کے چہرے کو تھام کر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں دریافت کیا تھا۔ ساہیہ نے سر اٹھاتے میں ہلا دیا تھا۔

”ہاں۔“ پانیوں سے بھری آنکھوں سے اس شخص کی جانب دیکھا تھا۔

اذہان حسن بخاری نے ہاتھ بڑھا کر ان آنکھوں کی نمی کو اپنے ہاتھ پر لے لیا تھا۔

”اگر اعتبار ہے تو پھر یہ آنسو کیوں ہیں ساہیہ؟ جہاں اعتبار ہوتا ہے وہاں آنسو نہیں ہوتے ساہیہ!“ مدہم لہجے میں باور کرایا تھا۔

”ضروری تو نہیں ہے کہ جہاں اعتبار ہو وہاں کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔“ ساہیہ خان نے جواباً غصہ کیا تھا۔

”مگر یہ بھی تو نہیں ساہیہ! کہ بنا کچھ پوچھے الزام عائد کر دیے جائیں۔ کیا ٹھیک ہے یہ؟“ اذہان حسن بخاری نے کچھ زیادہ نہ کہہ کر بھی بات واضح کر دی تھی۔

”میں نے کوئی الزام عائد نہیں کیا اذہان!“

”تو پھر کیا، کیا ہے ساہیہ؟ اعتبار کیا۔ الزام نہیں لگایا تو پھر یہ آنسو بھی کیوں ہیں؟ تم اپنی باہر کی آزمائش کرنا چاہتی ہو؟“ اذہان حسن بخاری نے وضاحت چاہی تھی۔ ساہیہ نے سر انکار میں ہلا دیا

گی کے خدشے اس کے ارد گرد گونجتے رہے تھے۔ مگر وہ جیسے کان بند کر کے اٹھا تھا اور گاڑی کی چابی باہر آگیا تھا۔ کرنے کوئی ضروری کام اور بھی تھے۔

میرب سیال نے پیکنگ مکمل کی تھی اور مسٹر چاولہ کو فون کر کے پلٹی تھی جب پایا کو اپنے قریب دیکھا تھا۔

”میں جا رہی ہوں پایا!“

پایا نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ مظہر سیال نے بیٹی کے سراہا تھا مگر وہ مسکرائی نہیں تھی۔ چپ چاپ ان کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

”آپ مجھ پر ٹرسٹ کرتے ہیں پایا؟“

”یہ کیا سوال ہے؟“ پایا کچھ حیران ہوئے۔ ”آف کورس، آئی ٹرسٹ یو۔“ پایا نے اس کے ہاتھ رکھا تھا۔ وہ چند ثانیوں تک خاموشی سے ان کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

”کچھ کہنا چاہتی ہو تم۔ مجھے لگتا ہے بیٹا! کوئی بات ہے جو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔ اگر اب تو کہہ دو۔ ہو سکتا ہے اس بات کا کوئی حل ہاتھ لگ جائے۔ کبھی طبی بہت اچھی ہوتی ڈور کو جب دو لو

کر سلجھاتے ہیں تو وہ بڑے آرام سے سلجھ جاتی ہے۔“

”مگر کبھی کبھی وہ ڈور اور بھی الجھ جاتی ہے پایا!“ اس کے جواب نے پایا کو سونپے پر مجبور کر دیا تھا۔ ”کیا مطلب؟ کیا ہوا؟“ پریشانی سے پوچھا تھا۔ مگر میرب نے سرٹنی میں ہلا دیا تھا اور

مطلبہن کرنے کو مسکرا دی تھی۔

”کچھ نہیں پایا!۔ آپ سے دور رہی نہیں کبھی۔ بہت زیادہ مس کیا آپ کو۔ اور اب کوشش کے باوجود اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔ پایا نے تھام کر اسے ساتھ لگا لیا تھا۔

”میرا بچہ!“ محبت سے سر پر پیار کیا تھا۔ ”پایا آپ سے دور ٹھوڑی ہیں۔ آپ جب چاہیں۔ سے فون پر بات کر سکتی ہیں۔ فی الحال تو آپ اپنی مدد ان لاء سے ملنے جا رہی ہیں۔ جب سچ سچ ہوگی تو پھر کیا کریں گی آپ؟“ پایا نے مسکراتے ہوئے کسی قدر شرارت سے دیکھا تھا۔

وہ مسکرا دی تھی۔

”گڈ گرل۔“ پایا نے اس کی ہمت بندھائی تھی۔ ”پایا کے شیر بچے ہو۔ ایک دم اتنا کمزور

سکتے ہو؟“ پایا بولے تھے مگر اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتی، باہر گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ جو بات چاہتی تھی وہ دل میں ہی رہ گئی تھی۔

”مسٹر چاولہ آگے ہیں شاید۔“ وہ بولی تھی۔

”اپنا خیال رکھنا بیٹا!“

”جی پایا!“ اپنا سفری بیگ اٹھا کر وہ چل پڑی تھی۔ پھر ان ہی راستوں پر۔۔۔ اسی سے جانے ایسا کیوں تھا جب بھی وہ ان راستوں سے اپنے قدم اٹھاتی تھی۔۔۔ بھاگتی تھی۔

”ایسی بات نہیں ہے اذہان! مجھے تم پر اعتبار ہے۔ بس مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ سر جھکا کر کسی غمگین کی طرح وضاحت دی تھی۔

”ڈر؟۔۔۔ جہاں اعتبار ہوتا ہے وہاں ڈر ہوتا ہے ساہیہ؟“ اذہان نے کسی قدر چونکتے ہوئے نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال داغنا تھا۔ مگر ساہیہ اس کی طرف سر اٹھا کر نہیں دیکھ سکی تھی۔

”تم شاید نہ مانو اذہان! مگر کبھی کبھی کوئی خوف کہیں نہ کہیں سے نکل کر سامنے آ جاتا ہے تو بہت اچھا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اعتبار ختم ہو گیا۔ اس ڈر کا کوئی جواز ہو، یہ ضروری نہیں میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔ مگر میں واقعی ڈر گئی تھی۔“

”بتا نہیں سکتیں مگر جتا تو سکتی ہونا کہ تم کیا محسوس کرتی ہو۔“ اذہان حسن بخاری جتانے والے انداز بولا تھا۔ ساہیہ کچھ نہیں بولی تھی اور وہ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بھر پور توجہ سے دیکھ رہی تھی۔

”میرے لئے یہ جاننا سمجھنا بہت ضروری ہے ساہیہ! کہ تم کیا سوچتی ہو، کیوں سوچتی ہو۔ تمہیں بات سے خوشی ملتی ہے؟ کس بات سے تکلیف؟ میرے لئے یہ جاننا اہم ہے ساہیہ! بہت ضروری۔ میرے لئے۔ کیونکہ میرے لئے تم ضروری ہو ساہیہ!“ لہجہ بھر پور اعتماد دلانا ہوا تھا۔ نظریں بہت سا سوچتی ہوئی تھیں۔ اس کی قربت، احساس تحفظ دیتی ہوئی تھیں۔ تو پھر وہ کیوں ڈر رہی تھی؟۔۔۔ خان نے بیٹھی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا تو اپنے اندر کے سارے خدشات بے وجہ اور بے بنیاد لگے اور وہ کہہ رہا تھا۔

”اعتبار رشتوں کے لئے ضروری ہے ساہیہ! کیونکہ اعتبار رشتے بناتا ہے۔ جوڑتا ہے۔ مگر یقین سے بھی زیادہ ضروری ہے ساہیہ! کیونکہ یقین اس رشتے کی مضبوطی کو اور بھی بڑھاتا ہے۔ یقین مانا اور وسوسے مٹا دیتا ہے۔ ایک کام کرو ساہیہ! تم یقین کو دل میں جگہ دو۔ کوئی حکم نامہ نہیں ہے یہ۔ درخواست ہے۔ یقین کر کے دیکھو ساہیہ!۔۔۔ یہ آنسو جو آج تمہاری آنکھوں میں دکھائی دے رہے ہیں، دوبارہ کبھی نہیں آئیں گے۔ مجھ پر یقین کرو۔“ اذہان حسن نے بھر پور یقین دلانے ہوئے کہا تھا۔

”میرا تم پر یہ یقین کمزور نہیں ہے اذہان! اور یہ یقین کبھی کمزور پڑے گا بھی نہیں۔“ ساہیہ نے آنکھوں کو گڑ گڑتے ہوئے کہا تھا۔ ”جانتی ہوں۔۔۔ تمہیں اپنی چیزوں کو بہت سنبھال کر رکھنے کی عادت ہے۔ تم بچپن میں اپنے کھلونوں کے لئے بھی بہت کسرن تھے۔ کوئی ایک کھلونا بھی میں نے تمہیں توڑا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ سچی تو سب آج بھی اس چھوٹے سے کمرے میں موجود ہیں جسے تم بچپن میں استعمال کرتے تھے۔ جب تمہارے لئے چھوٹی چھوٹی، بے جان چیزوں کی اتنی وقعت ہے تو پھر میرا دل کچھ سکتے ہو؟ تم یقیناً ایسا نہیں کر سکو گے۔ کیونکہ میرا دل ان کھلونوں سے تو پھر بھی بہت قیمتی ہے۔“

”جب اتنا سب کچھ جانتی ہو تو پھر وہ پاگل پن کس لئے تھا؟ کیا تم ان باتوں پر اعتبار کرنے لگی“ آنسوؤں سے مردوں کا دل جیتا جا سکتا ہے؟“ اذہان حسن بخاری نے اس کی چھوٹی سی ناک دبائے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”تم ٹھیک سمجھیں ساہیہ! میں تمہارا دل واقعی نہیں توڑ سکتا۔ کیا کروں، میرا اپنا دل ٹوٹا ہوا ہے نا۔“ وہ گرا ہوا تھا۔ انداز میں کسی قدر تازگی تھی۔ یقیناً یہ مذاق کا کوئی انداز تھا۔ ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”کیا میں تمہارا دل جوڑ سکتی ہوں؟“ بہت دھیمے لہجے میں اجازت چاہی تھی۔

”ہوں۔“ اذہان حسن بخاری نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بائیں طرف بٹے پر عین دل کے اوپر رکھا تھا۔

”جوڑ دو۔“ اجازت ہی چاہی تھی۔

”تمہیں لگتا ہے میں ایسا کر سکتی ہوں؟“ ساہیہ نے کسی قدر حیرت سے گھورا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے بھر پور یقین ظاہر کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”کیسے؟“ اس طرف سے جواز طلب ہوا تھا۔ نازک ہاتھ بدستور اس کے فراخ سینے پر تھا۔ اس کے مضبوط ہاتھ کے نیچے دبا ہوا۔۔۔ اذہان حسن بخاری نے اس کے ہاتھ کو تھاما تھا اور اپنے ہاتھوں کو حرکت دینا ہوا چہرے کے قریب لے گیا تھا اور بہت آہستگی سے سر جھکا کر لب اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے تھے۔

”ایسے، بھر پور محبت سے، اپنے ہونے کے بھر پور احساس سے۔ اپنی حدت سے۔“ اذہان حسن بخاری جیسے ارادہ کر کے آیا تھا کہ آج یقین کی صورت بنا کر ہی لوٹے گا۔ ساہیہ خان اس کی سمت نکلتی رہ گئی تھی۔ نگاہوں میں حیرت حد سے سواتھی۔ اور وہ کہہ رہا تھا۔

”تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں ساہیہ!“ انداز سرسری تھا۔ ساہیہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس سے کیا کہنے جا رہا ہے۔

”کل میرب سے ملا تھا میں۔“ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبائے اس نے اقرار کیا تھا۔ اور اس اطلاع پر مزید حیران رہ گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری سمجھ گیا تھا کہ وہ اس کی طرف سے از خود ”اطلاع“ دیئے جانے کی امید نہیں رکھتی تھی۔ اس لئے مزید اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

”ہاں۔۔۔ ملا میں اس سے۔ مگر بہت عام سے موقع میں۔ بہت عام سے انداز میں۔ بہت سے عام لوگوں کی طرح۔ ایسے ہی جیسے کوئی اچانک سر راہ چلتے چلتے کسی دوسرے سے ملتا ہے۔ اس کی بھی رخصتی ہو رہی ہے۔ خوش تھی وہ بھی۔ اور میں بھی نئی راہوں پر قدم رکھنے جا رہا ہوں، سو میں بھی خوش ہوں۔ جب ہم دونوں ناخوش نہیں ہیں تو پھر باقی کیا بچتا ہے۔ ہم ملے، حال احوال پوچھا، دو چار باتیں کیں ادھر ادھر لگا۔ اور اپنی اپنی راہ پر چل دیئے۔ نہ گزرے وقت کی کوئی پرچھائیں ہمارے درمیان آئی نہ ہم نے اس کے وقت کو سوچا نہ اک دوسرے سے کوئی گلہ کیا۔ ہم نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا ساہیہ!“ اس نے بہت بوسلے سر نگی میں ہلایا تھا۔

”تم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔۔۔ شاید ہم دونوں جانتے ہیں کہ گزرے وقت کا پلٹ آنا ممکن نہیں۔ ہم اپنا اپنا زندگیوں میں اپنے اپنے نئے خوابوں کے ساتھ خوش ہیں ساہیہ! اور ہمیں وقت سے واقعی کوئی گلہ نہیں ہے۔“

”یرسب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو اذہان؟“ ساہیہ نے سوال کیا تھا۔

”اس لئے کہ میں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔“

”کیوں؟ — اعتبار دلانے کی یہ بھی کوئی شرط ہے؟“

”نہیں — یہ اعتبار دلانے کی ایک رسم ہے۔ میں رسم نباہ رہا ہوں۔ ساہیہ! میں تمام رسمیں ایمانداری سے نبھانے کا قائل ہوں۔ میں نہیں چاہتا ہمارے درمیان کبھی کچھ بھی غیر واضح اور چھپاوازا رہے۔“

”میں جانتی ہوں اذہان! اس شام جب تم فارحہ آئی کو سب بتا رہے تھے تو اتفاق سے میں نے سب سن لیا تھا۔“ اس نے اتر کر کیا تھا۔ اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”اور تم نے قیاس کیا تھا کہ میں یہ سب تمہیں نہیں بتاؤں گا۔“

”نہیں — ایسا میں نے کچھ نہیں سوچا تھا۔“

”تو پھر وہ آنسو کس لئے تھے؟“

”صرف اس لئے کہ میں ڈر گئی تھی۔“ بات بنائی تھی۔

”اور وہ ڈر یہ تھا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

”نہیں۔“ بہت آہستگی سے سرنئی میں ہلایا تھا اور بھر پور اعتماد سے بولی تھی۔ ”مجھے صرف یہ ڈر تھا اب میں تم سے قریب نہیں رہ سکوں گی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکا تھا۔ ساہیہ کچھ لمحوں کو چپ رہی تھی۔ پھر بھر پور اعتماد سے بولی تھی۔

”اذہان! زندگی کے راستے گم نہیں ہوتے۔ ہم ان لوگوں سے دوبارہ بھی مل سکتے ہیں جن سے کہیں پھٹ گئے تھے۔ حادثہ یوں ہی رونما نہیں ہوا اذہان! وقت کا ایک اشارہ ہے یہ۔ سمجھنے کی کوشش کرو وہ یوں ہی تمہارے سامنے دوبارہ نہیں آئی۔ یہ بات سرسری نہیں ہے کہ تم ایک موڑ پر اچانک لے دو بارہ ملنا معمولی بات نہیں ہے اذہان! مت پرواہ کرو۔ نہ میری، نہ دنیا کی، نہ کسی اور کی۔ اس موقع کو گنواؤ اذہان!“

اذہان حسن بخاری نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ پھر کسی قدر برہمی سے اسے شانوں سے دبوچاؤ ناگوار نظروں سے دیکھا تھا۔ مگر فوری طور پر کچھ کہہ نہ سکا تھا۔ اس کی گرفت میں کھڑی وہ کہہ رہی تھی۔

”کوئی دوبارہ نہیں ملتا اذہان! یہاں کوئی بھی دوبارہ نہیں ملتا۔ زندگی تمہیں موقع دے رہی ہے تو فو خواہ مخواہ کی رسوں کا پابند مت کرو۔ تم نے اسے کہا کہ تم خوش ہو۔ اس نے تم سے کہا کہ

خوش ہے۔ تم دونوں نے انک بار بھی نہیں سوچا کہ جو خوش ہوتے ہیں انہیں یہ بتانے کی نوبت کبھی نہیں آتی کہ وہ خوش ہیں۔ وہ خوش دکھائی دیتے ہیں اذہان! — کیا وہ تمہیں خوش دکھائی دی تھی؟“ ساہیہ

پوچھا تھا۔ مگر اذہان حسن بخاری نے اس ضمن میں کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر اسے خشکی نظروں سے دیکھتے ہوئے ڈپٹا ضرور تھا۔

”شٹ اپ ساہیہ!“

”شٹ اپ وہاٹ؟ — اذہان! تم کب تم دوسروں کے لئے جیو گے؟ کم از کم یہ میں نہیں چاہتا

”کی اس بار تم میرے لئے کوئی قربانی دو۔“

”ہاگل ہوگئی ہو تم؟“ اذہان حسن بخاری نے اسے شانوں سے تھام کر جھنجھوڑا تھا۔

”ہاگل میں تب ہوئی ہوتی جب میں اپنے انٹرسٹ کی، اپنے فائدے کی بات کرتی۔ یہی ٹھیک ہے اذہان! جو میں کہہ رہی ہوں۔“ وہ رسائیت سے بولی تھی۔

”شٹ اپ ساہیہ! تمہاری ہی کیا، مجھے کسی کی بھی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میری زندگی میں کب کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری ہے؟ اس کا فیصلہ مجھے کرنا ہوگا۔“

ساہیہ کی بات ہی ایسی تھی کہ اسے کسی قدر کھرا لہجہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ اپنے بہت سارے غصے کو باہر لے کر اس نے ساہیہ کو اپنی گرفت سے آزاد کیا تھا اور پلٹ کر وہاں سے نکل گیا تھا۔

ساہیہ بیٹگی آنکھوں سے اسے خود سے دور جاتا دیکھتی رہی تھی۔

”یہ ضروری ہے اذہان! — دوسری بار اتفاقاً ملی ہے وہ تمہیں۔ تیسری بار یقیناً نہیں ملے گی۔ اتنی بات تم سمجھ کیوں نہیں پارہے؟ — اپنی دوست پر اعتبار نہیں کر رہے ہو تم۔ کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں

نہارا برا چاہ رہی ہوں؟“ با آواز بلند وہ اس سے شکوہ کر رہی تھی۔ مگر اسے جواب دینے کو وہ پاس نہ تھا۔ بہت دور جا چکا تھا۔ اور وہ اسے خود سے اور بھی پرے دھکیل دینا چاہتی تھی۔

”یہ کیا سن رہی ہوں میں؟ — تم دونوں نے شادی اور رشتوں کو مذاق بنا لیا ہے؟ — کبھی تم انکار کرتے ہو تو کبھی وہ۔ شادی نہ ہوئی گڈے گڑیا کا کھیل ہو گیا۔“ فارحہ نے اس کی طرف آتے ہوئے

کی قدر سختی سے اسے ڈپٹا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے کچھ سمجھ میں نہ آتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تھا۔

”آئی ایم سوری۔ میں سمجھ نہیں پارا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ معذرت کرتے ہوئے جاننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ”کیا ہوا؟“

فارحہ نے فون صونے پر ہنستے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”تم نے کچھ کہا ہے ساہیہ سے؟“

”ساہیہ سے؟ — ساہیہ سے میں کیا کہوں گا؟“ وہ چونکا تھا۔

”یعنی تم اس سے نہیں ملے اب تک؟“

”نہیں۔ میں ملا ہوں آج شام اس سے۔“ کسی مجرم کی طرح وہ نظر پھیر گیا تھا۔

”اور کیا کہتا تم نے اس سے ایسا کہ اس نے آنیج منٹ سے انکار کر دیا ہے؟“

”ساہیہ نے آنیج منٹ سے انکار کر دیا؟“ وہ اگرچہ اس کی طرف سے ایسی ہی کسی حماقت کی توقع کر رہا تھا۔ مگر ایسا پھر بھی اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اس قدر جلدی ایسی بے وقوفی کا مظاہرہ کرے گی۔

”اس نے فون کیا تھا؟“ اذہان حسن بخاری نے دریافت کیا۔

”نہیں۔ میں نے فون کیا تھا۔ چوہدری کے کچھ سیٹ دکھانے تھے اسے کہ وہ کل کیا پہننا چاہتی

ہے۔ مگر وہاں سے سننے کو کچھ اور ہی ملا۔ اذہان! کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ تم نے اسے کیا کہا؟“

نے غصے سے دریافت کیا تھا۔

”کیا کہا میں نے؟ — آپ مجھ پر اعتبار نہیں کر رہی ہیں؟“

”میں تم پر اعتبار کرتی ہوں یا نہیں، یہ بعد کی بات ہے اذہان! اہم بات فی الحال یہ ہے کہ تیاریاں ہو چکی ہیں۔ کارڈ تک بٹ چکے ہیں۔ کل گیسٹ آئیں گے تو ہم کیا کہیں گے، کچھ سوچا ہے تم کیا مذاق ہے اذہان؟ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی، تم جیسا سمجھ دار لڑکا ایسا بھی کر سکتا ہے۔ اپنی لڑا رسیکٹ کا کچھ خیال ہے تم کو؟“

فارحہ نے بنا سوچے سمجھے سارا کا سارا الزام اس کے سر پر رکھا تھا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”واقعی می! مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ کوئی وضاحت میرے پاس نہیں ہے۔ صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں وہاں شام ساہیہ سے ملنے گیا تھا۔ اور میرا کسی بھی طرح اس انگیج منٹ کو ملتوی کرنے کا نہ تھا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھا باہر نکالتے ہوئے گاڑی اس کے گھر کے راستوں پر ڈال دی تھی۔

کچھ ہی لمحوں میں وہ اس کے سامنے تھا۔ ساہیہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”کیا ہوا؟“

مگر اذہان حسن بخاری نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر چلتا ہوا باہر آ گیا تھا۔

”اذہان! کیا ہوا ہے؟ — کیا تم مجھے بتاؤ گے؟“

”تم گاڑی میں بیٹھو۔ بتاتا ہوں تمہیں۔“ فرنت ڈور کھول کر اسے بیٹھایا تھا اور خود سرخرو ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی۔

”ہوا کیا ہے؟“

”تم چیپ ہو کر بیٹھ سکتی ہو؟“ ہمیشہ سے پُرسکون نظر آنے والا بندہ اس لمحے بہت مختلف لگا تھا نے غالباً اس سے پہلے اسے کبھی اس کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔ اس لمحے اس کے ذہن میں بالکل کہ یہ کسی طرح کا کوئی ری ایکشن ہے۔ شام میں جب وہ گیا تھا اس کے ذہن میں صرف وہ یا محفوظ تھی اور اس سے آگے کچھ نہیں تھا۔

”ہوا کیا ہے اذہان؟ — کیا تم مجھے بتاؤ گے؟ فارحہ آئی تو ٹھیک ہیں نا؟ انہیں تو کچھ نہیں اس نے تشویش سے دریافت کیا تھا۔ مگر اذہان حسن بخاری نے وڈ اسکرین سے نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔

”اذہان! کیا ہو رہا ہے یہ؟ کچھ بتاؤ گے تم مجھے؟“ وہ چیختی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا ہے۔ — کل ہماری انگیج منٹ ہے اور میں تمہیں بھگا کر لے جا رہا ہوں۔“

اسے اطلاع دی تھی۔ وہ چونک پڑی تھی۔

”وہاٹ؟ — وہاٹ آریوسینگ؟ کیا کہا تم نے؟“

”اور کیا کروں؟ — اس کے سوا تم نے کوئی راہ چھوڑی نہیں۔“ اذہان حسن بخاری کا اظہار

بزرگ تھا۔

”اذہان! — اُسے متوجہ کرنا چاہا تھا۔ مگر اس نے تب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

”اذہان! کیا تم میری طرف دیکھو گے ایک بار؟“ توجہ چاہی تھی۔

”کیا اپنا گرویدہ بنا لینا چاہتی ہو؟ — ارادہ کیا ہے؟“ جواب اس کے قیاس کے بالکل برعکس تھا۔

”چوکنی نہ تو اور کیا کرتی۔

”یہ بات تو مجھے تم سے پوچھنا چاہئے اذہان! کہ ارادہ کیا ہے؟ — آخر یہ سب کر کے تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ — کیا مذاق ہے یہ؟“ وہ درشت لہجے میں بولی تھی۔

”مذاق نہیں ہے کوئی۔ — میں واقعی تمہیں گھر لے جا رہا ہوں۔ اور کل کی تقریب تک تم وہیں اپنی سرال میں رہو گی۔ ہاں، انگیج منٹ کے بعد تم واپس آ سکتی ہو۔ اگر تمہارا دل چاہے تو۔“ وہ پہلی بار مسکرایا تھا۔

”تم دھونس بجا رہے ہو مجھ پر؟“

”اور کیا کروں؟ — تم نے دوسری کوئی راہ چھوڑی نہیں۔ می کو انکار کر کے تم نے توب کا جو رخ ری طرف موڑا ہے اس کے جواب میں اپنا دفاع مجھے ضروری لگا ہے۔ اگر تم زیادہ من مانی کرو گی تو مجھے ایصلہ بدلنا ہو گا۔“ ایک نئی دھمکی دی تھی۔

”کیسا فیصلہ؟ — یہ کیا دھمکیاں دے رہے ہو تم مجھے؟“ وضاحت چاہی تھی۔

”دھمکیاں نہیں ہیں۔ اتنا سب کچھ کیا۔ — عین موقع پر یہ سب ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ تو ٹھان لی ہے۔ اگر تم انگیج منٹ سے دوبارہ انکار کرو گی تو نکاح پکا۔ رخصتی ہم دو چار مہینوں بعد بھی کروالیں گے۔ یہ کیا خیال ہے، ڈائریکٹ شادی ہی نہ کر لیں؟ دو چار اچھے نکاح رجسٹرار لنک میں ہیں میرے گھر لے لے مانے تو کورٹ میرج بھی ہو سکتی ہے۔“

اگر یہ مذاق تھا تو سنگین ترین تھا۔ ساہیہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”تم ایک سمجھ دار آدمی ہو.....“ وہ کہنے جا رہی تھی۔ مگر اذہان حسن بخاری نے اس کی بات درمیان لٹھائی کاٹ دی تھی۔

”کیوں، سمجھ دار آدمی کا دل نہیں ہوتا؟“ وہ اطمینان سے مسکرایا تھا۔

”میں تم سے پوچھتی ہوں اذہان! کیا بچپنا ہے یہ؟“

”میں آں ساہیہ! شادی کا ڈی سی ٹن لینا صاف ظاہر کرتا ہے کہ میں کتنا سمجھ دار ہوں۔“ پتہ نہیں وہ بچپنی ظاہر کیوں نہیں کر رہا تھا۔ ساہیہ کو اس کے انداز سے بہت اچھن ہوئی تھی۔

”اذہان! گاڑی روکو۔ میں واپس جا رہی ہوں۔“ اس نے ایک لمحے میں اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ مگر اذہان حسن بخاری نے ایک لمحے میں بنا سوچے سمجھے اس کا فیصلہ رد کر دیا تھا۔

”میں واقعی مذاق نہیں کر رہا ہوں ساہیہ! — میں نے بچپن میں بچکانہ فیصلہ کبھی نہیں کیا تھا تو پھر اس عمل سندی کی اسٹیج پر کوئی اچھوڑی سی ٹن کیسے لے سکتا ہوں؟ — تم سے تعلق بنانے کا فیصلہ میرا

اپنا تھا اور ایسا میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔“
 ”مگر تم ایسا کیسے کر سکتے ہو اذہان؟ میں تم سے کوئی بحث کرنا نہیں چاہتی۔ مگر کم از کم تم
 وقت تو دو۔ اس لڑکی کے متعلق سوچو تو سہی۔ تم خود سے بھاگ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو اذہان؟“
 ”تمہیں لگتا ہے میں خود سے بھاگ رہا ہوں؟“ اذہان نے سنجیدگی سے وضاحت چاہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے ایسا ہی ہے۔ تمہیں ڈر ہے کہ تم ہار جاؤ گے۔“

”مجھے ایسا نہیں لگتا۔“ مضبوط لہجے میں کہتا ہوا وہ اس کی جانب بالکل بھی متوجہ نہ تھا۔

”مگر ایسا ہے اذہان! اور اب تم چپ چاپ گاڑی واپس موڑ دو اور مجھے میرے گھر چھوڑ کر آؤ۔“
 مذاق نہیں ہے یہ اذہان! میں تمہا نہیں ہوں۔ گھر ہے میرا۔ گھر سے وابستہ افراد ہیں میرے۔
 تمہیں میری فیملی پر سچ کا خیال کرنا چاہئے۔“

”مجھے اس کا بھرپور خیال ہے۔ احساس ہے۔ بے فکر رہو، میں نے اکیٹے اور آٹھا
 سے بات کر لی تھی۔ تمہی تو تمہیں جب بازو سے پکڑ کر لارہا تھا، کسی نے روکا نہیں۔“ وہ تمام منصوبہ
 پہلے سے کئے بیٹھا تھا۔ ساہیہ حیران رہ گئی تھی۔ پھر اسے سمجھاتے ہوئے نرمی سے بولی تھی۔

”اذہان!۔ ایسا مت خیال کرو کہ میں تمہاری دشمن ہوں۔ اگر تم سوچو گے تو تمہیں میں اس
 اپنی سب سے بڑی خیر خواہ لگوں گی۔ میں کہیں بھاگ نہیں رہی ہوں۔ میں ہوں تمہارے پاس۔
 رشتے مذاق نہیں ہیں اذہان!۔ میں نہیں چاہتی ہوں کہ کل تم کوئی ریگٹ فیملی کرو۔ اس وقت
 سچ پر نہیں سوچ رہے ہو۔ تمہیں گھر والوں کا خیال ہے، معاشرے کا خیال ہے، اپنی فیملی پر سچ کا خیال
 ان سب باتوں کے سچ تم خود کہاں ہو؟“

اذہان نے بہت اطمینان سے گاڑی گھر کے وسیع پورچ میں روکی تھی اور اتر کر دروازہ کھول کر
 ہاتھ سے تھام کر باہر نکالا تھا۔

”میں یہاں ہوں۔ تمہارے ساتھ۔“ جواب بہت دلکش تھا۔ مگر وہ محظوظ نہیں ہو سکی تھی۔
 الجھن کے ساتھ اسے دیکھتی رہی تھی۔

”تم یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہو اذہان!۔ ابھی بھی وقت ہے۔ کچھ دنوں کے لئے۔ عزا
 دنوں کے لئے یہ سب ملتوی کر دو۔ اپنے بارے میں سوچو اذہان!“ درخواست کی تھی۔

”سوچ لیا ہے۔“ تسلی سے کہہ کر اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام کر وہ اندر کی طرف بڑھتا
 ساہیہ خان کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ سوائے خاموشی کے ساتھ قدم اس کے ساتھ اندر کی
 بڑھانے کے۔

فارحہ انہیں دیکھ کر چوکی تھیں۔

”لیجئے، حاضر ہے آپ کی بہو۔ سنبھال لیجئے۔ اب کہیں مت بھاگنے دیجئے گا۔ اگر
 یہاں سے جاتی ہیں تو یقیناً ذمہ دار میں نہیں ہوں گا۔“ رسائیت سے کہتے ہوئے باقاعدہ اس کا ہاتھ
 کے ہاتھ میں دے دیا۔

فارحہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھا۔ مگر وہ بہت ملاحت سے مسکرایا تھا۔

”بہت تھک گیا ہوں۔ کچھ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اپنی بہو کے ساتھ ضرور پلاننگ کر
 لنی ہیں۔“ اطمینان سے کہتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ فارحہ نے ساہیہ کی طرف دیکھا تھا اور ساہیہ کچھ کہے
 نہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

دادا ابا کی طبیعت اب پہلے سے بہتر تھی۔ انا بیہ شاہ شام کی چائے انہیں اپنے ہاتھوں سے پلا رہی تھی۔
 زان سید قریب ہی بیٹھا مسلسل بول رہا تھا۔

”شادی سے پہلے کتنا داویلا مچا رہی تھیں نا تم۔ اور شادی کے بعد یکسر ہم سب کو بھول ہی گئی ہو۔
 نون کئے۔ کتنی بار کہا۔ تب کہیں جا کر آئی ہیں یہ محترمہ۔ ماں! دیکھ رہی ہیں آپ، کتنا بدل
 لیا ہے یہ؟“

ماہوش مسکرا دی تھیں۔ انا بیہ کان بند کئے اپنی ساری توجہ دادا ابا کی طرف مبذول کئے ہوئے تھی۔
 ”سرال میں جب زیادہ محبت ملتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“ ماہوش نے مسکراتے ہوئے بیٹی کے سر پر
 ہرکھا تھا۔

”تم یہ کہاں لوٹا۔ چکن کے بنائے ہیں۔ تمہیں میٹ، بیف پسند نہیں ہے نا۔“
 ”مئی کی! لے رہی ہوں میں۔“ انا بیہ نے جواب دیا تھا۔

”واہ۔۔۔ ان کے لئے اتنا خیال کیا جا رہا ہے اور ہماری کچھ پرواہ ہی نہیں ہے۔ ماں! آپ بھی لگتا
 ہر طرف بیٹی کی ہی ماں ہیں۔ بیٹے کا کچھ خیال نہیں۔ حالانکہ عمو ماں مائیں بیٹیوں سے زیادہ محبت کرتی
 اذہان سید نے شکوہ کیا تھا اور ماہوش مسکرا دی تھیں۔

”میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں۔ میرے لئے بیٹے بیٹیاں ایک جیسے ہیں۔ تمہارا بھی تو اتنا
 خیال رکھتی ہوں۔ اب ماں سے شکوے گلے ہو گئے تمہیں؟“

”اگرے میں تو مذاق کر رہا تھا۔
 ہاں، مذاق کر رہا تھا۔ جانتا ہے نا، لڑکی تو آخر ماں، بہن کو ہی دیکھتی ہے۔“ انا بیہ نے جوابا
 لیا تھا۔ اوزان ہنس دیا تھا۔

”اگرے یارا۔۔۔ کیا رستے زخم پر ہاتھ دھرا ہے۔ درد نازہ ہو گیا ہے۔ کبھی کچھ سنجیدگی سے سوچو نا
 کسی بہن ہو؟ لڑکی بتا دی، دکھا دی، نام تک بتا دیا اور اس پر بھی اتنی دیر؟۔ کیسی بہن ہو
 ”مگر اتے ہوئے تیر داغا تھا۔ انا بیہ مسکرا دی تھی۔

”لکسی ہی بہن ہوں میں۔ تم نے بھی تو توپ پسند کی۔ کوئی لڑکی پسند کی ہوتی تو کوئی بات بھی
 ”میں نے بھی تو توپ پسند کی۔ کوئی لڑکی پسند کی ہوتی تو کوئی بات بھی
 ”کیوں۔ تمہارے لئے بھی مشکل ہے یہ؟ بیٹھ فریڈ ہے وہ تمہاری۔“

”یعنی تم لامعہ کے لئے جگہ چھوڑنے والی واقعی نہیں ہو؟“ اوزان سید اس کی آنکھوں میں اعتماد سے دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔ چائے کا کپ لے کر اٹھی تھی۔ مگر پلٹتے ہی عفتان علی خان سامنے کھڑا دکھائی دیا تھا۔

”یہاں کون، کس کے لئے جگہ چھوڑنے والا ہے؟“ عفتان علی خان وہاں ہونے والی بات کی وضاحت کے ضمن میں گویا ہوا تھا اور وہاں موجود تمام افراد ماسوائے انابیہ کے چونکتے ہوئے مسکرا دیے تھے۔

”ارے عفتان! تو؟“ میرے یار! کیا لمبی عمر ہے تیری۔ ادھر نام لیا اور ادھر ٹو حاضر۔ جواب نہیں تیرا میرے دوست! اوزان سید نے اٹھ کر باقاعدہ اسے گلے لگا کر کھینچ کر پیار کیا تھا۔ عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”گویا مجھ سے زیادہ بہتر میرا ذکر ہے۔ میں غیر موجود ہوں مگر ذکر موجود ہے۔“ مسکراتے ہوئے انابیہ شاہ کو بخور دیکھا تھا۔ اوزی مسکرایا تھا۔

”ہاں۔۔۔ غائب دماغ لوگوں کی ہستی میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔“

”میری بیگم کو غائب دماغ کہہ رہے ہو تم؟“ عفتان نے اسے گھورا تھا اور آگے بڑھ کر دادا ابا اور ماہ ل سے سر جھکا کر پیار لیا تھا۔

”جیتے رہو بیٹا!“ ماہوش اور دادا نے عدا دی تھی۔ اوزان ہنس دیا تھا۔

”غائب دماغ تو غالباً آپ کہہ رہے ہیں۔۔۔ میری اطلاع میں ایسے لوگوں کو بدھو زیادہ کہا جاتا ہے جو لوگ آنکھیں بند کر کے اندھا دھند کسی پر اعتبار کرتے ہیں، انہیں غالباً بدھو کہنا بھی کچھ کم لگتا ہے تمہارا لیا خیال ہے؟“ اس نے عفتان سے رائے چاہی تھی۔ مگر اس سے قبل کہ عفتان علی خان کوئی جواب دیتا، انابیہ نے اسے ڈپٹ دیا تھا۔

”شٹ اپ اوزی!“

”آئی تھک ش از رائٹ۔ میں بھی پروٹیسٹ کروں گا اس کے خلاف۔ ایک ہر بیٹہ کے سامنے تمہیں لاکھوں دانف کی کمزوریاں گنوانے کا کوئی حق نہیں۔“ عفتان علی خان نے مسکراتے ہوئے سر جھکائے کھڑی انابیہ کو دیکھا تھا جو اس کی طرف دانستہ دیکھنے سے گریزاں تھی۔ عفتان علی خان بات جاری رکھتے ہوئے اٹھا۔

”ایک ہر بیٹہ کی کتنی بھی خاصی اچھی ہوتی ہے۔ ٹھیک ٹھاک گن سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بے بارہ دوسروں کے سامنے اسے گنوا نہیں سکتا۔“ مسکراتے ہوئے رائے زنی کی تھی۔ اوزان سید کا قہقہہ تادیر نکالنے کو ختم رہا تھا۔

”کیا مردوں والی بات کہی ہے۔ ہمت ہے میرے بھائی!۔۔۔ ایک شادی شدہ بندے کو اس ہمت بارہ دوسروں کا قہقہہ تادیر مانا انصافی ہوگی۔ ہے نا دادا ابا؟“ اوزی بولا تھا۔ دادا ابا مسکرا دیئے تھے۔

”بہن کو تنگ مت کرو اوزان سید!۔۔۔ مردوں کی لاج رکھنے کے کئی موقعے اور بھی آئیں گے۔ فی

”کس کی بات کر رہا ہے یہ؟“ ماہوش نے چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔

”اسی کی جس کے سحر سے یہ موصوف آج تک نکل نہیں پائے۔ لامعہ حق۔“

”لامعہ؟۔۔۔ تو کیا برا ہے اس میں؟۔۔۔ اچھی خاصی لڑکی ہے وہ تو۔ سب سے بڑی بات دراز کا تعلق ہے۔ یہ کون سی مشکل بات ہے۔۔۔۔۔۔؟“ ماہوش مسکرائی تھیں۔ مگر انابیہ نے درمیان میں ٹوک دیا تھا۔

”مشکل ہے مئی!۔۔۔ اوزی تو ریڈی ہے مگر لامعہ ریڈی نہیں ہے۔“ فوری طور پر وہ انہیں ہٹا سکتی تھی۔ نہ سمجھا سکتی تھی۔ اس لئے مختصر ا کہہ کر بات سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔

”اگر اوزان کو پسند ہے تو کیا حرج ہے؟۔۔۔ ہم لامعہ کی فیملی سے بات کر کے دیکھ لیتے کیوں ابا؟۔۔۔ ٹھیک کہا نا میں نے؟۔۔۔ آپ کو کیا لگتا ہے، اوزی نے ٹھیک سوچا ہے؟“ ا نے دادا ابا کی رائے چاہی تھی۔

”ہاں۔۔۔ سوچا تو بہتر ہوگا۔ یہ نہ ہوکل کو عامرہ ہم پر کوئی کلیم کر دے۔ آخر بیٹا تو اسی کا ہے اپنی بیٹی کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”آپ اس کی فکر مت کیجئے ابا جی!۔۔۔ عامرہ اور نوید بھائی سے بات میں کر لوں گی۔ پھر بات کی داد دینا پڑے گی۔ ہمارے اوزان سید کی پسند ہے اچھی۔ لامعہ بھی مان جائے تو بہتر جوڑی بن جائے گی۔ شاید یہی ہے خدا کا پوشیدہ فیصلہ۔ انابیہ کی شادی کے بعد میں خود بہت کچھ رہی تھی لامعہ کو لے کر۔ لیکن اگر میرے بیٹے سے اس کی شادی ہو جاتی ہے تو یہ ایک پرفیکٹ میچ ہوگا کہتے ہیں۔۔۔ خدا نے کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کو، کسی نہ کسی کے لئے ضرور رکھا ہے۔“ ماہوش خوش دی تھیں۔

”ہاں۔۔۔ مگر لامعہ کے معاملے میں فی الحال یہ قبل از وقت ہے۔ فی الحال وہ اس کے نہیں ہے۔“ انابیہ شاہ مسلسل انکاری تھی۔

”یہ تم بہن ہو کر کس قسم کی باتیں کر رہی ہو یار؟۔۔۔ کہیں تم اس کے لئے خود تو جگہ چھوڑ نہیں؟“ اوزان سید مسکرا دیا تھا۔

”شٹ اپ اوزی!“ انابیہ شاہ نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اسے گھورا تھا۔

چہرے کی کیفیت متغیر ضرور ہو گئی تھی۔ اس کے دل کی بات اوزان سید نے کیسے جان لی تھی۔

”کیسی باتیں کرتے ہو تم اوزان!۔۔۔ موڈ خراب کر دیا تم نے بہن کا۔ وہ روٹھ گئی تو آئے گی۔“ دادا ابا نے خندہ ظاہر کیا تھا۔

انابیہ نے سرفی میں ہلا دیا تھا اور مسکراتی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں دادا ابا!۔۔۔ آپ دیکھئے گا، میں اوزی کی جان کتنی مشکل میں کر ابھی بدلے لینے کے کئی موقعے میرے ہاتھ بھی آنے والے ہیں۔ بہن ہونے کے ناطے اس کی شاہ ڈے داریاں مجھ پر ہی ہوں گی نا۔ پھر پوچھوں گی۔“

بارہ جب آؤ گے تو انشاء اللہ نہ صرف نشست جے گی بلکہ جیس کا وہ ادھورا کھیل بھی کھیلیں گے جو ادھورا
ڈر دیا تھا۔“
عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”جی دادا جی! ضرور۔ آپ ٹھیک ہو جائیے۔ میں ہارنے کو تیار ہوں۔ اپنوں کے ہاتھوں لی جانے والی
میں ایک عجب لطف ہوتا ہے۔ جس کا اندازہ صرف ہارنے والا ہی کر سکتا ہے۔“ ایک نگاہ انا بیہ کی طرف
لیختے ہوئے مسکراتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا تھا۔ اوزان سید آگے بڑھ کر انہیں سہارا دے کر کمرے
طرف لے گیا تھا۔

اس وقت صرف اور صرف وہ دونوں مقابل تھے۔ عفتان علی خان نے اس چہرے کو بھر پور نظروں سے
لیختے ہوئے گرفت میں لیا تھا۔

”ماما کہہ رہی تھیں تمہیں لیتا آؤں۔ تیار ہو.....“ جملہ قصد ادھورا چھوڑ کر اسے دیکھا تھا۔ انا بیہ شاہ
نے پہلی بار ایک دانستہ نگاہ اس شخص پر ڈالی تھی۔ فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔ عفتان علی خان نے
اوشی سے چند ثانیوں تک اسے دیکھا تھا اور بولا تھا۔

”رہنا چاہتی ہیں آپ؟“ پھر بنا اس کے جواب کا انتظار کئے بولا تھا۔

”اگر آپ آج چلیں تو کل صبح میں آپ کو دوبارہ چھوڑ دوں گا اور شام کو پک کر لوں گا۔ اس طرح ماما بھی
وٹل رہیں گی اور شاید آپ بھی۔“

انا بیہ نے کچھ سوچتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”یہاں رہنے میں میری خوشی سے زیادہ میری ضرورت ہے۔ شادی کے بعد ایک لڑکی کی ذمہ داری
اپنی ٹہلی کے لئے ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ میرے اپنے ہیں۔“ جانے اس نے کیا جتاننا چاہا تھا۔ عفتان علی خان
نے زنی سے اس کی طرف دیکھا تھا اور گویا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ اگر آپ کی ذمہ داری یہاں رہنے سے کسی طرح پوری ہوتی ہے تو آپ شوق سے
لا لیجئے۔ میں ماما کو بتا دوں گا۔“ وہ اٹھا تھا جب وہ فوراً بولی تھی۔

”ٹھہریے۔۔۔ ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔“

عفتان علی خان نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا پھر سرانکار میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔ میرا مطلب ہے میں تیار ہوں۔“ انا بیہ زور دے کر کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

مدوش چائے لے کر آئی تھیں تو اسے اپنے کمرے کی طرف حیرت سے بڑھتا دیکھ کر بولی تھیں۔

”اسے کیا ہوا؟“

”انا بیہ ساتھ چلنا چاہتی ہے۔ حالانکہ میں نے تو منع بھی کیا ہے کہ.....“ مدوش مسکرا دی تھیں۔

”تو اس میں اس قدر پریشان ہونے والی بات کیا ہے؟ اسے اپنے گھر تو واپس جانا ہی ہے۔ میکہ تو
کرف چند لمحوں کے بڑاؤ کی جگہ بن جاتا ہے شادی کے بعد۔ میری بیٹی سمجھ دار ہے۔“

عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

الجال بھائی ہونے کا فرض بھانا زیادہ ضروری ہے۔“ ماہوش نے بھی تائید کی تھی۔

”میرا خیال ہے اباجی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم لوگ بیٹھو، باتیں کرو۔ میں عفتان کے لئے چاہ
کر آتی ہوں۔“

”آپ بیٹھے می!۔۔۔ میں جاتی ہوں۔“ انا بیہ نے انہیں منع کرنا چاہا تھا۔ درحقیقت وہ منظر
چاہتی تھی۔

مگر ماہوش نے اسے روک دیا تھا اور اس کا چہرہ پیار سے تھپتھپاتے ہوئے بولی تھیں۔

”تم عفتان کے پاس بیٹھو۔ وہ تمہارے لئے آیا ہے۔ یہ زیادہ ضروری ہے۔“ انداز کم از کم لفظ
زیادہ بات سمجھانے والا تھا۔ انا بیہ وہاں سے ہٹنے کا ارادہ کر رہی تھی، مجبوراً دوبارہ وہاں بیٹھ گئی تھی۔
”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی دادا جی؟۔۔۔ آئی ایم سوسوری۔۔۔ میں کل رات آنی

دراصل دن بھر کی مصروفیات کے بعد اتنا تھک گیا تھا کہ.....“

”کوئی بات نہیں بیٹا!۔۔۔ مجھے اندازہ ہے۔“ دادا ابا نے کوئی تعرض کئے بغیر کہا تھا۔

”دادا ابا تو اب ٹھیک ہیں۔۔۔ تمہیں کیا ہوا ہے؟ یہ آنکھیں اس درجہ سرخ کیوں ہو رہی
نہیں سکے کیا؟“ اوزان سید نے دریافت کیا تھا۔

عفتان علی خان، انا بیہ کی طرف ایک نگاہ حاصل ڈالتا ہوا بولا تھا۔

”ہاں۔۔۔ کچھ ضروری کام آن پڑے تھے۔“

انا بیہ مکمل بے نیاز نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ایسے کون سے ضروری کام تھے کہ نیند تک قربان کر دی؟“ اوزان نے وضاحت چاہی تھی۔
”تھے کچھ ایسے ضروری کام بھی۔ جو اس سے پہلے صرف التوا میں پڑے ہوئے تھے رات وقت

اور موقع بھی۔۔۔ سوا انجام دینے میں دقت نہیں آئی۔“ عفتان علی خان مخفی اشاروں میں بات کر
”نہیں بیٹا!۔۔۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ سب سے پہلے اپنی صحت ہے۔ اپنا خیال رکھ
ہوتے رہتے ہیں۔“ دادا ابا نے مسکراتے ہوئے تاکید کی تھی اور عفتان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”جی دادا جی!۔۔۔ اب ایسا ہی کروں گا۔“ سعادت مند کی حد تھی۔ نگاہ پورے اشتیاق
چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

”رات وہ موڑ نہ آنے دیتا تو آج زندگی کے مفہوم کو سمجھ نہ پاتا۔ بہت کچھ راز بن کر رہی رہ جا
ہمیشہ کے لئے۔“ وہ سمجھ میں نہ آنے والی باتیں کر رہا تھا۔

اوزی مسکرا دیا تھا۔

”ایسا کیا تیرا دیا؟۔۔۔ کہیں ڈی ٹیکٹیو تو نہیں بن گئے تم؟“ عفتان علی خان مسکرا دیا تھا
ابا بولے تھے۔

”اوزان! مجھے میرے کمرے تک چھوڑ دو۔ کچھ آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ پھر عفتان کے ہا
رکتے ہوئے مسکرا کر بولے تھے۔ ”معذرت چاہتا ہوں بر خور دار! تمہیں کچنی نہیں دے سکوں گا۔“

”تم بیٹھو۔ تب تک چائے تو پیو۔“ ماہوش نے لوازمات اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”جی۔۔۔“ وہ سعادت مندی سے کہتا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے خیال میں انا بیہ فرار چاہتی تھی۔ وہ اس سے وہ مل لیا تھا۔ ان کی طبیعت اتنی خراب نہ تھی کہ انا بیہ ڈیرہ جما کر وہاں بیٹھ جاتی۔ مگر وہ اسے مزید نرا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے مطابق انا بیہ کو وہاں ہونا چاہئے تھا۔ اُس کے گھر میں۔۔۔ اُس کی عقل کے بند دروازے کھولنے کے لئے یہ ضروری تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھی تھی، وہ بہت مطمئن دکھائی دے تھا۔ شاید اسی لئے ہاتھ بڑھا کر پلیئر آن کر دیا تھا۔

کہو اک دن۔۔۔

تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے

وہ ہمارا ہے

اگر یہ سب کچھ ہمارا ہے تو

ہمیں سوئپ دواک دن

تم اپنا ہاتھ۔۔۔ ہاتھ پر رکھ کے

روح بچھ لو اک دن

کہو اک دن۔۔۔

مغنی کی آواز میں دہلی وہ خواہش انا بیہ شاہ کو بالکل بھی پسند نہیں آئی تھی۔ تبھی تو ہاتھ بڑھایا تھا دوسرے ہی پل اس آواز کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ عفتان علی خان نے اس ”اقدام“ پر کوئی ”احتجاج“ نہیں کیا تھا۔ وہ بہت مطمئن اور پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ ہاں، اس اقدام پر ایک نگاہ اس چہرے پر ضرور آتی تھی۔ مگر فوری طور پر رد عمل دینا ضروری خیال نہیں کیا تھا۔

میرب سیال نے وہاں پہنچ کر فوری طور پر مائی اماں سے ملاقات کی تھی اور اسے لگا تھا کہ اس نے آ کر ٹھیک ہی کیا تھا۔ کیونکہ اسے دیکھتے ہی اماں کی کیفیت سنھلنے لگی تھی۔

”کیا ہو گیا؟۔۔۔ کیا کر لیا مائی؟۔۔۔ ایک دم اتنا تیز بخار اور اس پر اتنا ہائی بی پی؟ کیا پڑ لے لی؟“ مائی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے اسی لگاؤ سے دریافت کیا تھا جس کا مظاہرہ مائی اماں نے اس کے لئے کیا تھا۔

مائی اماں مسکرا دی تھیں۔

”اپنی بچی کے لئے اداس ہو گئی تھی۔ بہت دنوں سے تجھے دیکھا نہیں تھا نا۔“ مائی اماں نے اس کا محبت سے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ اور میرب سیال مسکرا دی تھی۔ لب بچھنے لگی تھی۔ پھر قدرے تو سے چہرہ دوسری طرف پھیر کر دوایاں دیکھتی ہوئی بولی تھی۔

”آپ دوایاں تو وقت پر لے رہی ہیں نا؟“

”اے دوایوں کو چھوڑو تم اب ان کی ضرورت مجھے نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ جب میں وہاں نہیں تھی، سبکدین حیدر نے خیال تو رکھا تھا تمہارا؟ تنگ تو نہیں کیا؟“ شاید وہ ماں ہونے کے ناطے واقف تھیں بیٹے کے مزاج سے۔ تبھی تو کہہ رہی تھیں۔

”سبکدین کے بارے میں اکثر لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مزاج نہ سمجھ میں آنے والا ہے۔ مگر وہ اس کی وجہ نہیں جانتے۔ میں جانتی ہوں۔ وہ اپنے دل کی بات کبھی کہنے کا قائل نہیں ہے۔ چاہتا ہے جو بھی ہے سب آپ سمجھ جائیں۔ اب سب تو ایسا کرنے سے رہے۔ غیب کا علم ہر ایک کے پاس تو نہیں ہوتا نا۔ مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ شروع سے ایسا ہی ہے۔“ مائی نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کو ایسے تمام کر اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا جیسے وہ چھوڑیں گی تو وہ فوراً وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے گی۔ میرب کو کسی قدر شرمندگی نے آن گھیرا تھا۔ کتنے دن سے وہ بلا رہی تھیں اسے۔ پیغامات پر پیغامات بھجوا رہی تھیں۔ مگر وہ سن نہیں رہی تھی۔ ایک لمحے کو تو وہ شاید خود غرض اور اپنے آپ کو دیکھنے والی بن گئی تھی۔ مائی غالباً واقعی اس سے بہت اٹیچڈ ہو گئی تھیں اور اتنا پیار کرنے لگی تھیں کہ وہ نظر نہیں آئی تو پیار بڑھ گئیں۔ کسی حد تک وہ مائی کی اس کیفیت کی ذمہ دار خود آپ لگی تھی۔

”جانتی ہو، جب وہ چھوٹا تھا تو تب بھی اپنے دل کی بات نہیں بتاتا تھا۔ اپنی پسند، ناپسند۔۔۔ سب دل میں رکھتا تھا۔ کوئی کھلونا اچھا لگتا یا کچھ چاہئے ہوتا تو جب چاہا جا کر اپنے کمرے میں بیٹھ جاتا۔ اور تب میں سمجھ جاتی کہ اسے کیا درکار ہے۔“ مائی اماں، سردار سبکدین حیدر لغاری کے بچپن کی یادیں تازہ کرتی ہوئی مسکرائی تھیں۔ ”ماں ہوں نا۔۔۔ ماں کا دل سب سمجھ جاتا ہے۔ وہ بھی جو کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔“

”آپ نے ٹھان لی ہے کہ ساری باتیں آج ہی کر لیں گی؟“ میرب نے محبت سے انہیں دیکھا تھا۔

”کچھ تو حالت سنھل چکی ہے۔ پھر بگڑ گئی تو؟“

”کہانا، اب کچھ نہیں ہو گا مجھے۔ ٹو ساتھ ہے نا میرے۔ تیری موجودگی میں بھلا کچھ ہو سکتا ہے مجھے؟“ کچھ سوچتے ہوئے وہ مسکرائی تھیں۔ پھر خود ہی بولی تھیں۔

”سبکدین دیکھ لے تو بہت جیسی فریبل کرے۔ اس سے زیادہ عزیز ہو گئی ہو مجھے۔ بچپن میں جب اس کے اور کزن میری گود میں گھس کر بیٹھ جایا کرتے تھے تو وہ برا مان جایا کرتا تھا۔“ مائی نے ایک یاد اور تازہ کی تھی۔ میرب مسکرا دی تھی۔

”آپ بے فکر رہیں۔ اس بار انہوں نے خود مجھے آپ کے پاس بھجوایا ہے۔ اصولاً انہیں بالکل بھی برا نہیں ماننا چاہئے کہ اب وہ اکیلے آپ کی محبت کے حق دار نہیں رہے، کوئی اور بھی آ گیا ہے۔“ محبت سے جنایا تھا میرب نے۔ مائی مسکرا دی تھیں۔

”سمجھتا ہے وہ۔ تبھی تو تجھے میرے پاس فوراً بھجوایا جب تم نہیں تھیں تو دنیا کے کسی بھی کونے سے بھاگا دوڑا چلا آتا تھا۔ اور اب دیکھو، کتنے اطمینان سے وہاں بیٹھا ہے۔ جانتا ہے، کوئی ہے اس کے علاوہ جس کو اس کی ماں کو اتنا ہی عزیز رکھتا ہے۔ اور حق بھی رکھتا ہے۔“ مائی نے محبت بھرے لہجے میں جنایا تھا۔

میرب نگاہ چراگئی تھی۔ ایسا یقیناً نہیں تھا۔ مائی کی غلط فہمی تھی یہ نقطہ۔ مگر وہ انہیں جتنا نہیں چاہتی تھی تبھی

خاموشی سے سامنے موجود ہٹو کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔ مائی کا دل بہت بولنے کو چاہ رہا تھا۔ سو وہ بول رہی تھیں۔

”کیسا لگا تجھے اپنے گھر جا کر؟“ مظہر میاں آگے نا؟ کسی طبیعت ہے اب ان کی؟“

”سب ٹھیک ہے مائی! پاپا آپ کو پوچھ رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر قبل بھی فون آیا تھا۔ مگر تب آپ رہی تھیں اور میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں خیال کیا۔“

”چلو پھر بات ہو جائے گی۔ چاہتی تو میں یہی تھی کہ کچھ دن جی بھر کے رہ لے تو وہاں۔ پھر تو مجھے ہمیشہ کے لئے میرے پاس آ جانا ہے۔ ٹھیک ہو جاؤں تو وہاں واپس جا کر مظہر میاں سے رخصتی کی بات کروں گی۔ ویسے بات تو ان کے کان میں تب ہی ڈال دی تھی جب وہ امریکہ میں تھے۔ اب تو میں باضابطہ تجھے یہاں لانے کی اجازت مانگنی ہے۔“ مائی اماں آنے والے دنوں کی منصوبہ بندی بیان کر رہی تھیں اور وہ جو زبردستی مسکرا رہی تھی، یکدم بچھ کر رہ گئی تھی۔ شاید وہ مائی اماں کو انڈر اسٹینڈ کرنا چاہتی تھی یا پھر جان کر نظر انداز کرنا چاہتی تھی۔

غالباً گی کے متعلق سردار سبکدین حیدر لٹاری نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ یا پھر اگر وہ جانتی بھی تھی۔ اس قصے کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دے رہی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ کیا سوچ رہی ہے تو؟“ مائی نے اسے گم صم دیکھ کر دریافت کیا تھا۔ میرب! چوتھے ہوئے سر آہستگی سے نفی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔“

”اب سو جائیے آپ۔ میں یہیں ہوں، آپ کے پاس۔“ یقین دلایا تھا۔

”اس طرح بیٹھی رہے گی تو تھک جائے گی تو۔ چاولد سے کہہ کر میں نے تیرے لئے کمرہ ترتیب دیا تھا۔ جا، تو بھی جا کر آرام کر لے۔ تھک گئی ہوگی نا۔ کتنی بری ماں ہوں، مجھے دھیان ہی نہیں رہا کراؤ دور سے سفر کر کے آئی ہے تو۔“

”اسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ سو جائیے۔ میں موجود ہوں۔“ مائی اماں دواؤں کے زیر اثر تھیں آ نکھیں بند کی تھیں تو نیند میں جانے میں دیر نہیں لگی تھی۔ بہت جدت کا قائل تھا یہ گھر انہ۔ اٹنے پہلا علاقے میں گھر ہونے کے باوجود جدید آرائش سے مزین تھا۔ گھر اگرچہ کچھ پرانا اور قدیم ضرور تھا مگر یہ مضبوط حالت میں تھا۔ غالباً گین یا پھر مائی اماں یہاں آتے جاتے رہتے تھے، اکثر قیام کرتے تھے، جدید ضروریات زندگی کی ہر شے یہاں موجود تھی۔ آرائش وزیبائش سب کسی ماہر انٹیریئر ڈیزائنر کے ہاتھ کمال لگتا تھا۔

مائی کے سونے کے بعد وہ اٹھی تھی اور یونہی چلتی ہوئی وسیع و عریض گھر کا جائزہ لینے لگی تھی۔ راہ سے گزر رہی تھی تبھی کسی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ مگر یہ آواز باتوں یا گفتگو کی نہ تھی۔ غالباً درد سے سسک رہا تھا۔ اسے گمان گزرا تھا، شاید مائی اماں۔ وہ اٹنے کے بعد موموں سرعت سے مڑی تھی اور کے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ مگر دروازے پر رک کر دیکھنے پر اطمینان ہوا تھا۔ مائی اماں بہت اطمینان

میری نیند سو رہی تھیں۔ تو پھر وہ آواز کس کی تھی؟۔۔۔ وہ یکدم چونکی تھی اور مڑ کر قدم واپس راہ داری میں ڈال دیے تھے۔ کچھ ہی قدم چل کر وہ آواز دوبارہ اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ اس نے کان لگاتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے رکھ کر ہاتھ پینڈل پر رکھ دیا تھا۔ دروازہ غالباً لاکڈ نہ تھا بھی کھلتا چلا گیا تھا اور اس کی نگاہ حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

کوئی خاتون زمین پر اوندھے منہ پڑی شدید ترین درد سے نبرد آزما ہوتے ہوئے بری طرح کراہ رہی تھی۔ میرب سیال نے ایک لمحے میں آگے بڑھ کر اسے سہارا دیتے ہوئے اٹھا کر سیدھا کیا تھا۔ اُس کے منہ سے غالباً بلڈنگ ہوئی تھی۔ لبوں سے نیچے تھوڑی اور نیچے کرنے کے باعث آدھا چہرہ اسی خون سے بھرا ہوا تھا۔

”کیا ہوا ہے آپ کو؟۔۔۔ یہ خون۔۔۔؟“

مگر وہ نحیف و لاغر جسم والی خاتون کچھ نہیں بول سکی تھیں۔ اک نگاہ سے اسے دیکھا تھا اور شدید ترین کھانسنے لگی تھیں۔ میرب سیال کے لئے انہیں اس طرح سنبھالنا دشوار ہوا تھا۔ بہت مشکل سے اٹھا کر اس نے انہیں بیڈ پر ڈالا تھا۔ ایسا کرنے میں اس کی سانس بری طرح پھول گئی تھی۔ مگر اس نے اپنی بے ترتیب ہونی سانسوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سرعت سے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے تھے۔ غالباً کمرے کی گھٹن بھی اس خاتون کی کھانسی کا سبب تھی۔ مگر ان کی کھانسی میں تب بھی کوئی خاطر خواہ فرق نہ پڑا تھا۔

میرب نے ساتھ والے لٹبل سے ٹشو نکال کر ان کا چہرہ صاف کیا تھا پھر اسی سرعت سے پانی گلاس میں اٹھایا تھا اور گلاس ان کے لبوں سے لگایا تھا۔ پانی سے ان کی کھانسی میں کچھ فرق پڑا تھا۔ مگر اب وہ بہت گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں۔

”کیا ہوا ہے آپ کو؟۔۔۔ ٹھیک ہیں آپ؟۔۔۔ کہیں پین ہو رہا ہے آپ کو؟۔۔۔ ٹھہریے، میں ڈاکٹر کو فون کر کے بلاتی ہوں۔“ وہ اٹھی تھی مگر اس کے کانپتے ہاتھ نے ایک لمحے میں اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میرب نے مڑ کر دیکھا تھا۔ نحیف، کمزور جسم والی خاتون سرنگی میں ہلا رہی تھیں۔

”نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیوں ضرورت نہیں ہے؟ اپنی حالت دیکھ رہی ہیں آپ؟“ یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہے، کیوں ہے، کس لئے ہے وہ اس کی فکر کرتی ہوئی بولی تھی اور پلٹ کر تیزی سے چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ ڈاکٹر ابھی ابھی اپنا نمبر اس کے پاس چھوڑ کر گیا تھا۔ اس خیال سے اس نے وہ نمبر اپنے سیل میں محفوظ کیا تھا کہ مائی کے سلسلے میں خدا نخواستہ ایمر جنسی میں ضرورت پڑے تو وہ فوری طور پر رابطہ کر سکے۔ مگر مائی کے سلسلے میں تو نہیں، البتہ کسی اور کے سلسلے میں اس کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اپنا سیل اٹھا کر اس نے تیزی سے نمبر ملایا تھا اور بولی تھی۔

”ہیلو ڈاکٹر!۔۔۔ یہاں آپ کی فوری ضرورت ہے۔“ کہہ کر وہ چلتی ہوئی دوبارہ اس کمرے میں آئی تھی۔ وہ خاتون اب بھی اسی طرح گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں۔ میرب آگے بڑھی تھی۔

”میں نے ڈاکٹر کو فون کر دیا ہے۔ کچھ ہی دیر میں آ جائیں گے وہ۔ آپ پلیز آرام سے لیجائیے۔ اپنا سٹیل فون وہاں اس کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اس نے دوبارہ گلاس اٹھایا تھا۔

”پانی اور دوں آپ کو؟“ وہ جھک کر اتنی اپنائیت سے دریافت کر رہی تھی جیسے وہ اس چہرے کو برسرِ سر سے جانتی ہو۔ اس خاتون نے منہ پر ٹشو پیپر رکھ رکھنا نیتے ہوئے سرانکار میں ہلادیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شکر یہ، میں پہلے سے بہتر ہوں۔“ اس خاتون نے ایک ناز سے اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا اور کہتے ہوئے آہستگی سے لیٹ کر آنکھیں موند لی تھیں۔ مگر اس کا چہرہ ایک تکلیف اور کرب کے احساس کو نمایاں کر رہا تھا۔ یقیناً وہ ٹھیک نہیں تھیں۔

میرب نے جھک کر دوسرا کٹن اٹھا کر گردن کے نیچے رکھ دیا تھا اور سر قدرے اوپر کر دیا تھا۔

”اس طرح آپ کو سانس لینے میں آسانی رہے گی۔ لیکن آپ نے اس طرح دروازے کھڑکیاں کیوں کئے تھے؟“ میرب نے دریافت کیا تھا۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ڈاکٹر آ گیا تھا۔ میرب نے اپنی گمرانی میں ان کا چیک اپ کروایا تھا اور ضروری ہدایات لی تھیں۔

”انہیں ہاسپٹلائز ہونے کی ضرورت ہے۔ یونوشی نیڈ اے سینی ٹوریم۔ ایک دوبار پہلے بھی میں ان کا چیک اپ کرنے آچکا ہوں اور میں نے ان کے درثناء کو تب بھی تلقین کی تھی مگر انہوں نے غالباً یہ ضروری خیال نہیں کیا۔ اپنی ہاؤس میں نے انہیں انجکشن دے دیا ہے۔ اب یہ کچھ دیر آرام سے سو سکیں گی۔“ ڈاکٹر نے اس کے ساتھ چل کر باہر آتے ہوئے کہا تھا۔ وہ چونکی تھی۔

”سینی ٹوریم کین۔۔۔؟“

”بالکل ٹھیک سمجھی ہیں آپ۔ ایسی بیماری اور کنڈیشن میں پیشدفت کو جس طرح کا علاج اور کیئر درکار ہوتی ہے وہ صرف سینی ٹوریم میں ہی پرووائیڈ ہو سکتی ہے۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے انہیں کچھ عرصہ وہاں رکھوایا تھا میرب سے کہنے پر۔ مگر جیسے ہی ان کی حالت سنبھلی یہ دوبارہ یہاں پائی گئیں۔ غالباً انہیں واپس لے آیا گیا۔ دیکھئے، اس بیماری میں بار بار علاج اور ٹریٹ منٹ ادھورا چھوڑ دینے سے مرض اور

بھی شدت اختیار کر لیتا ہے۔ اور پھر اس کا علاج اور بھی کمپلی کیٹڈ ہو جاتا ہے اور ان کے معاملے میں ایسا دو چار بار ہو چکا ہے۔ میں کانسٹیڈریکوسٹ کروں گا کہ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے میرا یہ فرض بنتا ہے کہ میں پیشدفت کا خیال کروں اور اس کے متعلق اس کے درثناء کو قائل کروں۔ فارگاڈ سیک، آپ انہیں ہاسپٹلائز کروائیں۔ جتنی جلدی ہو سکے۔ ورنہ ان کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ خدا نخواستہ وہ جان سے بھی ہاتھ دھو سکتی ہیں۔“ ڈاکٹر نے مکمل صورتحال اور اس کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا اور اس کی طرف دیکھا تھا۔

”میں چلتا ہوں اب۔ لیکن دوبارہ اگر میری ضرورت پڑے تو بلانے سے مت چوکے گا۔“ ڈاکٹر خندہ پیشانی سے کہہ رہا تھا۔ میرب نے سر ہلادیا تھا۔

”جی ضرور۔“

ڈاکٹر چلتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ مگر وہ فوری طور پر وہاں سے موو نہیں کر سکی تھی۔ قدم اٹھائی

وقت نے باندھ لئے تھے۔ اب تک جو نہیں سوچا تھا، ان سوچوں کی یلغار ہو گئی تھی۔

کون تھی وہ؟

کیا مائی کی رشتہ دار؟۔۔۔ کوئی بہن یا پھر۔۔۔

لیکن ڈاکٹر تو سردار سبکگین حیدر لغاری کا حوالہ دے رہا تھا؟

مگر وہ اس کے درثناء کی بات بھی تو کر رہا تھا۔ کون تھے اس کے درثناء جنہوں نے اسے اس طرح تکلیف میں یہاں لا ڈالا تھا۔

کون تھی وہ؟

اور کس بات کی سزا دی جا رہی تھی اسے؟

لیکن وہ جو کوئی بھی تھی، اس کا تعلق اس فیملی سے ضرور تھا۔ مائی اور گین سے ضرور تھا۔ کیا وہی اس کے درثناء تھے؟۔۔۔ اگر تھے تو وہ اس کے دشمن کیوں تھے؟ اس کی اس حالت کے ذمہ دار کیوں تھے؟ وہ آج

اس حال میں کیوں تھی؟۔۔۔ آخر کیا لگتی تھی وہ سردار سبکگین حیدر لغاری کی؟۔۔۔ وہ اتنا لبرل بندہ جو اپنی سوچ میں آزاد ترین تھا، اس سے وابستہ کون سا رشتہ تھا جو اس طرح بند کرے میں درد کی شدت سے

بڑھا حال خون تھوک رہا تھا؟۔۔۔ کتنی ساری سوچوں سے الجھتی وہ چلتی ہوئی اس کمرے میں دوبارہ آئی تھی۔ غالباً ڈاکٹر کی فوری دی جانے والی ٹریٹمنٹ کا اثر تھا جو اب وہ خاتون پُرسکون انداز میں سو رہی تھی۔ میرب نے آہستگی سے چلتے ہوئے آگے بڑھ کر سائیڈ ٹیبل سے اپنا فون اٹھایا تھا اور دبے پاؤں

واپس پلٹ کر دروازہ بند کرتے ہوئے باہر آ گئی تھی۔

رات لحد لحد بیت رہی تھی۔ مگر اب نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سوچ کے کئی زاویے اسے الجھاؤں میں ڈال رہے تھے۔ سو نے نہیں دے رہے تھے۔

آخر کون تھی وہ؟۔۔۔ اور اس کے متعلق اسے کیوں آگاہ نہیں کیا گیا تھا؟۔۔۔ وہ مسلسل ایک ہی نقطے پر سوچ رہی تھی۔

مصرفیت کے اہم ترین لمحوں میں سے وقت نکال کر سردار سبکگین حیدر لغاری نے اس کا سیل نمبر ملایا تھا۔

”ہیلو۔“ وہ دوسری طرف جاگ رہی تھی غالباً اس وقت۔

سردار سبکگین حیدر لغاری کو سوچ کر حیرت ہوئی تھی۔ وہاں پاکستان میں یقیناً یہ رات کا پہر تھا اور اب نکال کا جاگنا؟۔۔۔ کیا وہ اس کے معاملات اور تعلقات کے لئے واقعی اتنی کسرن تھی؟

”ہیلو۔“ میرب سیال نے اس کے نہ بولنے پر دوبارہ کہا تھا۔

”مائی کیسی ہیں اب؟“ اس نے بنا کسی تمہید کے دریافت کیا تھا۔

”ٹھیک ہیں۔“ دوسری طرف میرب سیال کا لہجہ پُرسکوت تھا۔ دوری کے باوجود وہ اس کا چہرہ نہ کہتے ہوئے بھی اس کی کیفیت پہچان گیا تھا۔

پہلی بار۔۔۔ پہلی بار میرب کو سردار سبکتگین حیدر لغاری بہت مختلف لگا تھا اس خاکے سے، اس پہلے سے بہت مختلف جو اس نے خود آپ اس کے متعلق اخذ کرتے ہوئے مرتب کیا تھا۔ کیا وہ واقعی کچھ تلف تھا یا صرف اسے اس وقت لگا تھا؟ سوچ رہی تھی۔ وہ بالکل نہیں سمجھ پائی تھی کہ سوچ یکدم اس کی انگلی نام اس نچ پر کیوں لے گئی تھی جہاں اس نے پہلی بار اس کے متعلق کچھ پازٹیو انداز میں سوچا تھا۔

”کیوں یو ڈوی اے لائل فیور؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے سوچوں سے بیدار کرتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”وہاٹ؟“ اس نے سوالیہ انداز اختیار کیا تھا۔ ”وچ کانڈ آف فیور؟“ دریافت کیا تھا سردار سبکتگین حیدر لغاری سے۔ چند ثانیوں تک جانے کیوں چپ سادہ گیا تھا۔ میرب سمجھی تھی کہ رابطہ منقطع ہو گیا تھی دلی تھی۔

”ہیلو۔۔۔!“

”لیس، آئی ایم دیئر۔“ وہ جیسے اپنی موجودگی ظاہر کرنے کو بولا تھا۔

”مائی کا خیال رکھنا میرب! شی از ویری امپورٹنٹ فوری۔ میری سب سے قیمتی شے ہیں جن کا خیال نہیں رکھنے کو کہہ رہا ہوں۔ میں آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اکیچوٹلی یہاں اتنا کام ہے کہ وقت نکالنا مشکل ہو رہا ہے۔ اور ادھر اور کام چھوڑ کر میں آن نہیں سکتا۔ مسٹر چاولہ بھی یہاں نہیں ہیں۔ اور اگر میں وہاں جا کر نہیں یہاں بھیجتا ہوں تو بہت نقصان ہوتا ہے۔“ کوئی خاص بات کہتے کہتے وہ یقیناً بات بدل گیا تھا۔ مگر یہ بات بھی یقیناً اہم تھی۔ وہ اسے ماں کا خیال رکھنے کی تاکید کر رہا تھا۔ وہ ماں جو اس کے لئے بہت زیادہ اہم تھی۔ یعنی وہ اپنی اہم ترین ذمہ داری اسے سونپ رہا تھا۔ وہ بھی درخواست کے ساتھ۔ کیا اتنا اعتبار کرتا تھا وہاں پر، اتنی دوری کے باوجود، اتنی مخالفت ہونے کے باوجود، سب سے بڑی اور اہم بات، دل اتنے دور لانے کے باوجود؟ میرب سیال واقعی اس لمحے حیران تھی۔ یہ رات کیسی تھی؟ اسے حیران سے سوا حیران کر رہی تھی۔ وہ سوچوں میں الجھی تھی اور وہ پوچھ رہا تھا۔

”تم رکھو گی نامائی اماں کا خیال؟“

”ہاں۔“ اس نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا۔

”ٹھیکس میرب!“ وہ جیسے مشکور ہوا تھا۔ وہ کچھ شرمندہ دکھائی دی تھی۔

”مجھے مائی کی کیفیت کے متعلق اتنا پتہ نہیں تھا۔ اگر معلوم ہوتا تو میں پہلے ہی یہاں آ جاتی جب وہ مجھے یہاں چاہ رہی تھیں۔“ اس نے برملا اعتراف کیا تھا اور پوچھا تھا۔ ”آپ نے مائی کے متعلق مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”کیا بتاتا؟۔۔۔ اس سے پہلے یہ ضروری بھی نہیں لگا تھا۔ شاید اس سے پہلے اس کی اتنی ضرورت نہیں تھی۔ میں جانتا ہوں وہ میرے لئے کتنی اہم ہیں اس لئے کبھی اپنی ذمہ داری کسی اور کو سونپنے کی بات ہی نہیں آنے دی۔“

تو اب مجھے کیوں سونپ رہے ہو؟ وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر پوچھ نہیں سکتی تھی۔

”وہاٹ، ہینڈ؟۔۔۔ ٹھیک تو ہوتی؟“ اس فکر کرنے کا جواز میرب سیال نہیں جانتی تھی۔ مگر اسے جیسے اس وقت جواب دینا فرض تھا۔

”ٹھیک ہوں میں۔“

”ٹھیک ہو تو جاگ کیوں رہی ہو اس وقت؟“ اس کے لئے یہ کوئی فکر تھی، کوئی کیسز تھی، کوئی کنسرن تھی پھر محض ایک ڈانٹ ڈپٹ تھی۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

”نینڈ نہیں آرہی تو کیا کروں؟“ اس نے شانے اچکا کر ضدی بچوں کی طرح جواب دیا تھا جیسے وہ وقت اس کے مد مقابل بیٹھا ہو۔

”نینڈ نہیں آرہی تو سونے کی کوشش کرو۔“ جیسا سوال تھا ویسا ہی جواب آیا تھا۔ اس شخص کا دل پہلے بھی کبھی زمین پر نہیں رہا تھا۔ پھر آج وہ اس سے کیا رعایت اخذ کرتی۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ کرتی ہوں کوشش۔“ اس نے بحث میں الجھنا ضروری خیال نہ کرتے ہوئے سعادت مندی سے کہا تھا۔ تبھی اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا تھا۔

”مائی سورہی ہیں کیا؟“

”ہاں۔“ میرب نے بھی مختصر جواب دیا تھا۔

”ڈاکٹر نے کیا کہا؟۔۔۔ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں؟“ دونوں فریقین کے لہجے ایک دوسرے کے لئے سرد تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ دونوں کے دلوں میں کچھ نہیں اور فاصلے بدستور قائم ہیں۔ مزید بڑھ رہے ہیں۔

”نہیں۔۔۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ مائی اب پہلے سے بہتر ہیں۔“ اس نے مطمئن کر کے اپنی کوشش کی تھی۔

”ڈاکٹر بتا رہا تھا بخار تیز تھا اور بی پی بھی ہائی تھا۔ اب کیا کنڈیشن ہے؟“ وہ تمام باتوں کی تفصیلاً سے یوں چاہ رہا تھا جیسے وہ اس وقت ڈیوٹی پر مامور کوئی نرس ہو۔

”بخار کم ہو گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بی پی لیا تھا میں نے۔ 130 تھا۔ اس کو آٹ نارل؟“ جواب وہ چاہ رہا تھا اس نے ویسا ہی جواب دیا تھا۔ مگر وہ اب بھی مطمئن نظر نہ آیا تھا۔

”ہاں۔ مگر ہائی بی پی ان کی محنت اور جان کے لئے سخت خطرہ ہے۔ ایک دو بار پہلے بھی انہیں اسٹرا ہو چکی ہیں۔“ وہ فکر مند دکھائی دیا تھا۔ اپنے کسی پرسنل انفر کو لے کر اس کی پہلی بات چیت تھی جو بچہ کے ساتھ انجام پا رہی تھی۔ پہلی بار وہ اسے بہت مختلف لگا تھا۔ اس کا الجھا ہوا لہجہ وہ صاف محسوس کر

تھی۔ شاید اسی لئے اتنی مخالفت ہونے کے باوجود پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”کیسی اسٹرائس؟“

”پیرالائسز اسٹرائس۔ ان اسٹرائس کے باعث پیرالائز ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ مائی کو یہ اسٹرا ہونا تب شروع ہوئے تھے جب پایا کی ڈیٹھ ہوئی تھی۔ حالانکہ اس وقت مائی کی عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔

وہ سوچتی بہت زیادہ ہیں۔“ وہ اسے اس طرح اپنائیت سے بتا رہا تھا جیسے وہ اس کی بہت اپنی ہو۔

وہ مزید ہدایات جاری کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”مائی کے لئے میں بہت پوزیو ہوں میرب! اور اس وقت بہت پریشان بھی ہوں۔ تم پلیز وقت سے ان کے متعلق مجھے آگاہ کرتی رہنا۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کر دوں گی۔ وہ ایسا کہنا چاہتی تھی مگر رک گئی تھی۔ بولی تھی تو الفاظ آتے تھے۔“

”ٹھیک ہے۔ کچھ اور؟“

”نہیں۔“ سردار سیکٹین حیدر لغاری نے ایک گہری تھکی ماندی سانس خارج کی تھی اور سلسلہ منقطع تھا۔ مگر فون بند کر کے بھی وہ اسی دائرے میں الجھا رہا تھا۔ اسے خود سمجھ نہیں آیا تھا، اس نے اس وقت کر کے میرب کو ہی کیوں یہ ذمہ داری سونپی تھی۔ کرنے کو یہ تاکید وہ مسٹر چاولہ کو بھی کر سکتا تھا۔ ہم ہی کیوں؟

”انتہا یقین ہے تمہیں اس پر؟“ گی کا کہا گیا ایک جملہ اس کے گرد گونجا تھا۔ لیکن جیسے وہ کان بند ہوئے ایک اہم ترین فائل نکال کر دیکھنے لگا تھا۔ پھر سیل پر ماتحت کا نمبر ملایا تھا۔

”مینگ کا وقت کتنے بجے کا تھا ہارون؟“

”سرا شام سات بجے کا۔“

”اور تم نے مجھے ری مائنڈ تک نہیں کروایا۔ ایجنڈا ریڈی ہے نا؟“

”جی سر!“

”رائٹ۔ کل کی پوسٹ پون ہوئی مینگ کا ٹائم بھی ری شیڈول کرو اور ایسا آج ہی ہو جانا چاہتا ہوں۔“

”ڈونٹ وری سر! آئی ول پیج دیٹ۔“ مطلوبہ جواب ملنے پر اس نے سلسلہ منقطع کیا تھا۔

”گھر بہت سوتا ہے گین! میرب کے یہاں سے چلے جانے سے جو ویرانی یہاں آئی۔“

جب تم یہاں آؤ تو تم بھی اسے محسوس کرو۔“ گی ٹیائنگ کے کہے گئے جملے بازگشت بن رہے۔

بہت اچھے ہوئے انداز میں اٹھا تھا اور دوبارہ نمبر ملا کر فون کان سے لگایا تھا۔

”ظفر! فنانس کی فائل دیکھ لی تم نے؟“ کل مینگ ہے اور میں نہیں چاہوں گا کہ

فیکرز کسی بھی طرح سے روٹک ہوں۔“ سوچوں کو جھٹلانے کا انداز خوب تھا۔ شاید وہ ان لمحوں کو جھٹلا

تھا اور فرار کے راستے اختیار کر رہا تھا مسلسل۔ مگر آوازیں تعاقب بن کر اس کے ارد گرد تھیں۔

”سارا گھر جیسے اسے تلاش کر رہا ہے گین! تم یہاں نہیں ہو لیکن مجھے جانے کیوں یقین

تمہارا احساس یہاں وہاں اسے کہیں ڈھونڈ رہا ہے۔“

سردار سیکٹین حیدر لغاری نے تنگ آ کر باہر کارخ کیا تھا اور چلتے ہوئے ہارون سے رابطہ کیا تھا

”ہارون! گاڑی تیار ہے؟“

”جی سر!“

”رائٹ۔ تم اپنے روم سے نکلو، میں آرہا ہوں۔“

”کہیں جانا ہے سر؟“ مینگ تو سات بجے ہے۔“ ہارون حیران ہوا تھا۔

”جاننا ہوں، مینگ کا ٹائم سات بجے ہے۔ مجھے اسٹاک اکچنج جانا ہے۔“

ہارون نے فون بند کر دیا تھا۔

سردار سیکٹین حیدر لغاری گاڑی کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا جب گی ٹیائنگ کی آواز اس کے

پاس آئی تھی۔

”اسے جانے مت دینا گین! جانے مجھے کیوں لگتا ہے کہ اگر وہ تمہاری زندگی سے چلی گئی تو

بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ اسے جانے مت دینا گین!“ وہ صدرا پھر بازگشت بن جانے کو تھی۔ مگر

سیکٹین حیدر تمام آوازوں سے جیسے کان بند کرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا تھا۔

”اسے جانے مت دینا گین!“ گی ٹیائنگ کی آواز بہت تھکی ماندی صدا میں بدل گئی تھی اور بالآخر وہ

تالے لگے قدموں واپس مڑ گئی تھی۔

پل شام اس نے کہا تھا کہ وہ اگلی صبح اسے وہاں چھوڑ دے گا۔ انا بیہ شاہ اس کے آفس جانے سے قبل

ہوئی کھڑی تھی۔

لامعہ کا فون آیا تھا۔ وہ بھی آرہی ہے وہاں۔ آپ مجھے چھوڑ دیجئے گا۔ می کو فون کر دیا ہے میں

وہ انتظار کرتی ہوں گی۔“ باقاعدہ آگاہ کیا تھا۔

فنانس علی خان نے ٹائی کی ٹاٹ باندھتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”نہیں۔“ وہ یوں اجازت چاہ رہا تھا جیسے اب تک سارے کام اسی کی اجازت سے کرتا

ایہ فوری طور پر اس طنز کو کبھی نہیں تھی۔ اس لئے بنا کوئی جواب دیئے پلٹ کر اپنے ہینڈ بیگ میں کچھ

لی گئی۔

”تمہارا آج جانا ضروری ہے؟“ عفتان علی خان نے کوٹ پہنتے ہوئے آئینے میں اسے بغور دیکھا

والا کمرے جیسے ترتیب پا چکا تھا۔

”آپ کو بتایا تھا اور آپ خود بھی تو مل کر آئے ہیں دادا ابا سے۔ آپ کو نہیں لگتا کہ میری کچھ ضرورت

ہے؟“ انا بیہ نے جتاتے ہوئے کہا تھا۔ عفتان علی خان نے کوئی رد عمل فوری طور پر ظاہر نہیں کیا

بے اطمینان سے خود پر پر فیوم اسپرے کیا تھا، بال سیٹ کئے تھے اور پلٹ کر بے سکون انداز سے اسے

دیکھتا تھا۔

”کیوں فرمایا آپ نے۔ غالباً آپ آزاد ہیں یہ فیصلہ کرنے میں کہ آپ کی زیادہ ضرورت کہاں ہے۔“

”میں نے کچھ برائی میں بھی تو چاہتا ہوں۔“ جانے کس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ بھی نہیں تھی۔

”میں نے کئی بات کر رہے ہیں آپ؟“ اب اس وقت بحث کا کون سا وقت ہے؟ کل شام

کیا تھا کہ آپ مجھے می کے ہاں دوبارہ چھوڑ دیں گے۔“ خالصتاً بیویوں والا انداز تھا۔

”بھول گئیں آپ؟“ آپ کی ایسی منٹ ہونے جارہی ہے۔“ ماہانے یاد دلایا تھا۔
 ”چہرہ؟“ وہ چڑچڑانے لگی مگر اپنا غصہ دباتے ہوئے مسکرا کر بولی تھی۔ ”ماہا سوئی! سمجھنے کی کوشش
 کیجئے ایک ضروری بات کرنی ہے ان سے۔“

”مگر اس طرح۔۔۔ اس وقت کیسے؟ آئی مین یہ کس طرح پاسیبل ہو سکتا ہے؟“

”کیوں۔۔۔ امپاسبل کس طرح ہے یہ؟“ ساہیہ نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ پھر نرمی سے
 فرمائی۔ ”دیکھو ماہا! ایک پرائلم ہے جو کسی اور سے نہیں کہہ سکتی۔ اچھی لگی یہ پرائلم صرف تمہارے بھائی
 کی سمجھ میں آئے گی۔ سو پلیرز، میرا بیچ انہیں کوئے کر دو۔“

”ٹھیک ہے۔“ ماہا فطری نرمی سے مسکراتے ہوئے باہر نکلتی ہوئی اپنے پیچھے دروازہ بند کر گئی تھی۔ ساہیہ
 بے حد الجھن محسوس کرتے ہوئے پانی کا گلاس اٹھا کر لیوں سے لگایا تھا۔

عجب گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ پورا گلاس پانی کا پی گئی تھی مگر حلق پھر بھی سوکھا ہوا لگا تھا۔ جھنجھلا کر اس
 بڑی کی طرف دیکھا تھا۔ ماہا کو گئے بھی کافی لمحے گزر چکے تھے مگر ماہا کے بھائی صاحب کا بدستور اب
 دلی پتہ نہ تھا۔ موصوف بدستور اب تک گدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب تھے۔ ساہیہ کو الجھن
 آتی۔ جانے وہ شخص کیوں نہیں سمجھ رہا تھا۔

بل اٹھا کر اس نے روانی سے ٹیکسٹ گھینٹا تھا۔

’کین آئی سی یو؟‘ مختصر جملہ لکھ کر روانہ کیا تھا۔ اب پتہ نہیں ماہا کے پیغام دینے کا اثر تھا یا اس
 ٹی ہی اتنا موثر تھا کہ اس کے اگلے ہی پل وہ اس کے سامنے تھا۔

کیا ہوا؟۔۔۔ ارادہ بدل لیا کیا تم نے؟۔۔۔ کیا براہ راست شادی کا پروگرام طے ہے؟ میں
 اسے بات کر لوں؟“ وہ سنجیدہ نہ تھا۔ اسے بغور دیکھا تھا اور سر تا پا دوبارہ دیکھا تھا۔

ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ چونکی تھی۔

ابھی خاصی لگ رہی ہو۔۔۔ سچ کہوں، بیچانی نہیں جارہی ہو۔ میں پہلی نظر میں تو یہی سمجھا کہ
 طبع آگیا ہوں۔ مگر مجھے یقین کرنا پڑا، میری ساہیہ جیسی بے وقوف لڑکی اس دنیا میں یقیناً دوسری
 نہ ہے۔ وہ اعتراف کرتے ہوئے بولا تھا۔ ساہیہ نے اٹھ کر اپنے بھاری لبتکے کو سنبھالتے ہوئے
 اکاسفر کیا تھا۔

یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ اپنی اور کسی اور کی زندگی سے مت کھیلو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

کیا ٹھیک نہیں ہے؟۔۔۔ ایسی منٹ تو بہت سے لوگ کرتے ہیں۔“ وہ قطعی سنجیدہ ہونے کو تیار نہ
 رہتا۔ وہ بول کر رہ گئی تھی۔ برہمی سے اسے دیکھا تھا۔

لن کی زبان سمجھو گے تم؟۔۔۔ کس طرح سمجھاؤں تمہیں؟۔۔۔ ابھی بھی وقت ہے، تم سمجھ
 لیا لیتے؟“

کیا سمجھوں؟۔۔۔ مجھے تو اس وقت کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے نہ سناٹی۔ سدھ بدھ گنوار ہی ہو
 تو ابھی کیوں لگ رہی ہو؟“ اس کے ہاتھوں کو تھام کر اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا تھا۔

ساہیہ آئینے کے سامنے بیٹھی تیار ہو رہی تھی۔ تیار کیا ہو رہی تھی، زبردستی کی دھونس کے مارا
 سنوارا جا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد ماہرین آرائش کا گھیراؤ تھا۔ جیسے ہی اسے موقع ملا تھا اس
 سے ایک ایمر جنسی ٹیکسٹ گھینٹ کر سینڈ کا بن دبا دیا تھا۔

”نیز ٹو ٹاک ٹو یو۔“ ایک لائن کا یہ ٹیکسٹ دوسرے ہی لمحے اذہان حسن بخاری کے سیل فون
 پر ابھرا تھا۔ مگر اس ٹیکسٹ کو خاطر خواہ اہمیت نہ دیتے ہوئے اس نے سیل کو دوبارہ کوٹ کی جو
 تھا اور اس موقع کی مصروفیت کا حصہ بن گیا تھا۔

ساہیہ جانتی تھی کہ وہ اس لمحے فرار چاہ رہا ہو گا۔ تبھی اگلے چند لمحوں میں کوئی جواب نہ پاتا
 رہ گئی تھی۔ ماہا اندر سے آئی تھی جب اس نے دریافت کیا تھا۔

”ماہا، سوئی! بھائی صاحب کہاں ہیں تمہارے؟“ حلق تک کڑواہٹ کھلی تھی مگر یہ شہد
 لمحے ضروری تھا۔ ماہا مسکرا دی تھی۔

”بھائی۔۔۔ وہ تو غالباً گیٹ کے ساتھ بڑی ہیں۔“

”گیٹ؟۔۔۔ گیٹ آنا شروع ہو چکی گئے؟“

”ہاں۔۔۔ وقت بھی تو ہو چلا ہے۔ مئی نے یہی وقت دیا تھا تقریب کے آغاز کا۔“ ما
 سے دیکھتے ہوئے بتایا تھا۔ ”کیوں، کیا ہوا؟ کوئی پرائلم ہے کیا؟“

ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”نہیں۔۔۔ کوئی پرائلم نہیں ہے۔ میں تو بس یونہی۔ تم ایک کام کرو گی؟“

”ہاں کروں گی۔ مگر ایک بات کہنے کے بعد۔“

”کیا؟“ ساہیہ چونکی تھی۔

”آج آپ بہت بہت خوب صورت لگ رہی ہیں۔ بھائی دیکھیں گے نا تو حیران رہ جائیں
 پاگل ہو جائیں گے۔“ ماہا مسکرائی تھی۔ اور مسکرانا ساہیہ پر بھی جیسے فرض ہو گیا تھا۔

”کاش میں اس شخص کا کچھ کر سکتی۔“ مدھ لمحے میں وہ دانت پیس کر ہولے سے بولی تھی
 آل ریڈی ہے۔ کاش! میں ان موصوف کا دماغ کچھ ٹھکانے لگا پاتی۔“

”کچھ کہا آپ نے؟“ ماہا کلیئر لی سن نہیں پاتی تھی، سو پوچھا تھا۔ مگر ساہیہ نے مسکراتے ہوئے
 ہلا دیا تھا۔

”میرے گھر سے آگئے سب؟“

”نہیں۔۔۔ ابھی مئی کی بات ہوئی ہے ان سے۔ غالباً نکل رہے ہیں سب۔“

”اچھا، پھر تم ایک کام کرو۔ چھوٹا سا کام۔ اپنے بھائی صاحب کو بلا کر لاؤ۔“ درخواست
 باقاعدہ کھلے منہ پر ہاتھ رکھ کر حیران ہوئی تھی۔

”ہا۔۔۔ اس وقت ملیں گی آپ بھائی سے؟“

”کیوں، اس وقت کیا ہے؟“ وہ چونکی تھی۔

”اوہ گاڈ! وہ بری طرح پریشان تھی۔ ابھی دکھائی دے رہی تھی۔“

”اذہان! یہ وقت مذاق کا نہیں ہے۔“

”یہی تو میں بتانا چاہتا ہوں۔ ابھی کسی نے اس طرح اس بند کمرے میں دیکھ لیا تو فسانے بنے لگے گی۔ لیکن اچھا ہی ہوگا۔ سب جان جائیں گے کہ ہم کتنے پیار کرنے والے ہیں۔“ وہ لب لہجہ مالک نہ تھا۔

”سایہ نے تھک کر اسے دیکھا تھا۔“

”دیکھو اذہان! سمجھو میری بات کو۔ میں غلط نہیں کہہ رہی۔ مجھ سے بڑا خیر خواہ تمہارا یقینا کوئی اور.....“ وہ بات مکمل نہیں کر پائی تھی۔ یکدم چکر سا آیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا دوسرے ہی پل وہ چکر کر اس کے بازوؤں میں تھی۔

”سایہ! — سایہ! اذہان نے پریشانی سے پکارا تھا۔“

سایہ خان کے وجود میں حرکت نہیں ہوئی تھی۔

”سایہ! — اذہان نے اس کے چہرے کو تھپتھا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ سایہ اسی طرح بس وحس و حرکت اس کے بازوؤں میں پڑی رہی تھی۔ تبھی فارحہ نے دروازہ کھجکا تھا اور چونک پڑی تھیں۔

”کیا ہوا ہے؟“

”پتہ نہیں۔ شاید ویکنس ہو جانے کے باعث.....“ اذہان کوئی مناسب جواز تلاش نہ کر سکی۔ ”تم اسے صوفے پر ڈالو۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔“ فارحہ بھی پریشان دکھائی دی۔ ”نے اپنے بازوؤں میں سایہ کے نرم و نازک وجود کو اٹھا کر صوفے پر ڈالا تھا۔ فارحہ ڈاکٹر کو تیزی سے اس کی طرف آئی تھیں۔“

”سایہ! — آنکھیں کھولو۔“ اس کے چہرے کو محبت سے تھپتھایا تھا۔ ”کیا ہوا تھا؟“ نہیں کہا؟“ فارحہ نے بیٹے کو الزام دیتی نظروں سے دیکھا تھا۔

اذہان نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے وفاقی انداز میں ماں کی طرف ”آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں؟“

مگر فوری طور پر اس الزام کے ضمن میں کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ فارحہ فکر مندی سے جھکی میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

رات بھر وہ سو نہیں سکی تھی۔ مگر صبح وہ مائی اماں کے خیال سے جلدی اٹھ گئی تھی۔ کسی ”تلقین“ کا اثر نہیں تھا۔ نہ وہ کوئی اچھا ”ہمپکٹ“ بنانا چاہتی تھی کسی کی نظر میں۔ وہ بس اپنا فرض نبھا رہی تھی۔ بیان میں جو رشہ تھا، اسے جھٹلا بھی دیتی تو اک احساس کا رشہ تو درمیان تھا نا۔

”اتنی صبح کیوں جاگ گئی تو؟ — سوتی رہتی نا۔ یہ کام دیکھنے کو نوکروں کی ایک فوج موجود ہے۔“ فیہ کام کرنے کو یہاں نہیں بلوایا تیری مائی اماں نے۔ ”وہ ناشتے کی ٹرے کے ساتھ ان کے کمرے میں اٹل ہوئی تھی جب وہ بولی تھیں۔“

میرب مسکرا دی تھی۔

”نوکروں کے ہاتھ میں وہ ٹیسٹ تو نہیں ہو گا نا، جو آپ کی بیٹی کے ہاتھ میں ہے؟ — اب کیسا سوس کر رہی ہیں آپ؟“ ہاتھ پیشانی پر رکھ کر چھو کر دیکھا تھا اور تسلی بخش انداز میں مسکرا دی تھی۔ ”ارے! — بخار تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گیا۔ لگتا ہے راتوں رات کا یا پلٹ گئی۔“

مائی مسکرا دی تھیں۔

”ایک ماں کے لئے سب سے زیادہ قیمتی احساس اس کے بچوں کا ہوتا ہے۔ تو میرے پاس ہے اور آج صبح ہنگامین سے بھی بات ہو گئی۔ اور کیا چاہئے۔“

وہ چائے میں چینی ملاتی ہوئی چونکی تھی۔

”ان کا فون آیا تھا؟“

”ہاں — صبح پہلی بات اسی سے ہوئی۔ بتا رہا تھا ساری رات جاگتی رہی ہو تم۔“ سونو کروں سے کہہ کر سخت تاکید کروا دوں کہ تمہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ اگر میرا خیال رکھتی ہوئی کہیں خود بیمار پڑ گئیں تو؟“

میرب زبردستی مسکرائی تھی۔

”رات جب فون آیا تھا تو میں جاگ رہی تھی۔ اس لئے انہوں نے کہہ دیا ہوگا۔“ اسے کچھ خاص حیرت نہیں ہوئی تھی۔ شاید ماں کو بہلانے کو وہ اسے ایسی توجہ دے رہا تھا۔ یا پھر اس کا ”احسان مند“ ہو رہا تھا۔ اگر ایسا تھا تو وہ اس پر کوئی ”احسان“ نہیں کر رہی تھی۔ نہ ہی کوئی ایسا تاثر وہ اس پر باقی چھوڑنا چاہتی تھی۔ اپنی ہی سوچوں سے الجھتے ہوئے اس نے چائے کا کپ مائی اماں کو تھمایا تھا۔ جب انہوں نے سگاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔



”بہت کیسٹرنگ ہو گیا ہے میرا بچہ۔ سچ پوچھو تو مجھے بھی حیرت ہوئی۔ ایسا نہیں ہے کہ اسے والیہ لوگوں کی فکر نہیں۔ دراصل وہ اس طرح ظاہری طور پر جتانے کا قائل نہیں — تم نے دار بنایا ہے میرب! تمہارے اس کی زندگی میں آنے سے اسے ایک احساس نے بیدار کر دیا۔ اپنے آپ کو اور ارد گرد کے حالات کو نئے زاویے اور نئے ڈھنگ سے سوچنے لگا ہے۔ تمہارا ایک نئی ذمہ داری کو نبھانے کی طرف پہلا باضابطہ قدم ہے۔“

مائی اسے جانے کیا جتنا چاہتی تھیں۔ مگر وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ ایک دھبی سی مسکراہٹ لبوں پر اس لمحے انہیں اس بات کا احساس بالکل بھی کروانا نہیں چاہتی تھی کہ جو آپ سوچ رہی ہیں وہ قیاس ہے۔ وہ انہیں جھٹلانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اگر وہ یہی سوچ کر خوش تھیں تو وہ انہیں اس میں رہنے دینا چاہتی تھی۔ بعد کا اسے نہیں پتہ تھا۔ مگر ”منی الحال“ کے لئے یہ ضروری تھا۔

”کتنی ست لگ رہی ہے تو — ناشتہ کرنے کے بعد آرام کر لے۔ میری فکر اب مزہ ٹھیک ہوں۔“ مائی اس کے لئے فکر مند تھیں۔

”آرام کی ضرورت مجھے نہیں، آپ کو ہے مائی اماں! ذرا طبیعت سنبھل گئی تو اس کا یہ مطلب کہ اب آرام نہیں کریں گی۔ ابھی ان کا فون آ گیا تو کان کھینچیں گے میرے۔ آپ کو تو کچھ کی نہیں ہوگی موصوف کی۔ لیکن توپ کا جو رخ میری طرف ہو گا اس سے بچنا مشکل ہو جائے گا۔“

مائی اماں مسکرا دی تھیں۔

”اس کی طرف سے ڈو فکر مت کر — میرے ہوتے ہوئے مجال نہیں اس کی جو تجھے کچھ میرب ان کی تسلی پر مسکرائی تھی۔ تبھی اس کا میل فون بجا تھا۔ میرب نے میل اٹھا کر اسکو نمبر کو دیکھا تھا۔

”کون ہے؟“

”شاہ جنات۔“ وہ مسکرائی تھی اور فون کان سے لگا لیا تھا۔

”ہیلو؟“ یہ سب کرنا دشوار تھا۔ مگر مائی اماں کے لئے اسے یہ کرنا تھا۔

دوسری طرف سردار بکنگٹن حیدر لغاری تھا۔

”مائی اماں کی طبیعت کیسی ہے اب؟“

”ٹھیک ہیں۔ اس وقت ناشتہ کر رہی ہیں — بات کرادوں؟“

”نہیں، بعد میں کر لوں گا۔ ٹیپر بیچ تو نہیں ہے اب انہیں؟“ یہ وہ معمولی باتیں تھیں جنہیں

اماں سے بھی پوچھ سکتا تھا۔ پھر اس سے دریافت کرنے کا کیا مطلب تھا؟ — سوال میرب —

اظہار ضرور تھا مگر کچھ بھی مزید سوچے بغیر وہ بولی تھی۔

”نہیں — اب ان کی طبیعت پہلے سے بہتر لگ رہی ہے۔ ابھی ڈاکٹر نہیں آیا۔ مگر میں

فون کے بعد انہیں کال کر کے بلوائی ہوں۔ آپ فکر مت کریں۔“

”نہیں — اب مجھے اتنی فکر نہیں ہے۔ تم ان کے پاس ہونا۔ مگر تمہیں بھی آرام کی اتنی

اگر تم خود ٹھیک ہوگی تو تبھی کسی اور کا خیال بھی رکھو گی نا۔“

میرب کے لئے اس کا انداز چونکا دینے والا قطعاً نہیں تھا۔ اگر ایسا کوئی کیسٹرنگ انداز اپنا رہا ہوں۔“

”میرب کہہ رہا تھا تو صرف اپنے مفاد کے ضمن میں۔

”کیسٹرنگ“ وہ ضرور تھا مگر صرف اپنی مائی اماں کے لئے — وہ اس وقت جو بھی کہہ رہا تھا، جو اس کیسٹرنگ کے لئے تھا۔ اس سے زیادہ نہ اس کی کوئی حقیقت تھی نہ کوئی وقعت۔ سو وہ رہ رہا تھا، وہ صرف انہی کے لئے تھا۔ اس کیسٹرنگ کیسٹرنگ کیسٹرنگ — دل ہمیشہ کی طرح خالی تھا اور اب وہ

”نہ تھی۔ نہ کوئی“ خوش فہمی“ پالی تھی نہ ”خوش گمانی“ — دل ہمیشہ کی طرح خالی تھا اور اب وہ کسی جھوٹے ”غریب“ سے بھرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس کی سوچوں کے برعکس وہ کہہ رہا تھا۔

”ٹھیک یو سوچ میرب! — مائی کا اس طرح خیال رکھ کر تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ہر کے لئے اس کی ماں کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مگر میں اپنی مائی اماں کے لئے کچھ زیادہ ہی

نی اور بچی ہوں۔“

”میں نے کوئی احسان نہیں کیا آپ پر۔ مجھے جو ٹھیک لگا میں نے وہی کیا۔ اور اس کے لئے آپ کو

اس کیسٹرنگ کی ضرورت بھی بالکل نہیں ہے۔“ میرب ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

سردار بکنگٹن حیدر لغاری اس کے کیسٹرنگ اور کھر درے انداز پر لہجہ بھر کو چپ سا دھ گیا تھا۔ پھر جیسے

ناز کو زائل کرنے کی کوشش میں فوری طور پر گویا ہوا تھا۔

”ایسی ہاؤ، اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو کچھ دن مزید مائی اماں کے پاس گزار لو۔ میں جانتا ہوں یہ تمہارے

مشکل ہوگا۔ مگر.....“ پہلے سے والی لگاوت دم توڑ رہی تھی۔ بجا بجا سا لہجہ — اپنائیت کی جگہ

یت کارنگ اوڑھنے کو تھا۔ یقیناً یہ اختیاری رد عمل تھا جو میرب کے رویے پر اختیار کیا گیا تھا۔

”آپ فکر مت کریں۔ میں یہیں ہوں۔ جب تک مائی کی حالت سنبھل نہیں جاتی، میں نہیں جاؤں

۔“ میرب سیال کا لہجہ سرد تھا۔ کسی بھی جذبات سے عاری۔ وہ اس کے ساتھ تعاون شاید نہیں کر رہی

احسان بھی جتنا نہیں چاہ رہی تھی۔ غالباً وہ مکمل طور پر ”لا تعلق“ رہنا چاہتی تھی۔

”ناٹ!“ سردار بکنگٹن حیدر لغاری نے جواباً ساٹ لہجے میں کہا تھا۔ ”کسی طرح کی کوئی مشکل پیش

ئے یا دشواری ہو، مجھے کال کرنا۔ آئی ایم دیر۔“ جملہ بہت ”معمولی“ نہیں تھا۔ غالباً خاصی حد تک

بیز معمولی تھا۔ مگر اس لمحے اس کا رنگ بہت پھیکا تھا۔ نہ میرب اس کی حقیقت سمجھنے کو تیار تھی نہ وہ جتانے

اٹل نظر آ رہا تھا۔

”اوکے۔“ میرب نے بلا تردد کہا تھا اور دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ میرب خاموشی سے

عمل فون لئے کچھ لمحوں تک اسی طرح اس جگہ پر کھڑی رہی تھی۔ پھر چلتی ہوئی دوبارہ مائی اماں کے

ل آگئی تھی۔ انداز واضح طور پر بجا بجا سا تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ وہ فوری طور پر اپنے اندر سے اٹھنے

سے اس تاثر پر قابو نہیں پاسکتی تھی۔ مگر اس لمحے جو ایک سناٹا سا اس کے اندر پھیل رہا تھا وہ اسے محسوس

رہا کر رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ مائی نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔

”نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔“ وہ ان کی طرف دیکھے بغیر سرنئی میں ہلاتی ہوئی ان کی میڈیئر دیکھنے لگی تھی۔

”میڈیسن لے لیجئے آپ۔“ پانی کا گلاس اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا تھا۔ مائی نے اسے غائب صرف دیکھا تھا۔ دریافت کچھ نہیں کیا تھا۔ میرب انہیں میڈیسن دینے لگی تھی۔

اسے حیرت زدہ ہونا نہیں چاہئے تھا۔ مگر وہ حیران تھی۔ حیران سے بھی سوا ساکت تھی۔ جو اس نے سوچا تھا۔۔۔ جو چاہا تھا۔۔۔ وہ ایسا ہی چاہتی تھی۔ مگر اب جب ایسا ہوا تھا تو: کیوں لگا تھا؟ اتنا برا کیوں لگا تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی۔

عفتان علی خان نے جو فیصلہ سنایا تھا، وہ ایسا ہی تو چاہتی تھی۔ یہی تو خواہش رکھی تھی اس کے کہ وہ لامعہ کو قبول کر لے۔ اسے اپنی زندگی سے نکال باہر کرے۔

یہی تو سوچا تھا اول دن سے۔۔۔ جب سے اس گھر میں۔۔۔ اس شخص کی زندگی میں آ تھا، وہ قطعاً اسے اپنا نہیں لگا تھا۔ ہر شے بہت غیر، بہت پرانی لگی تھی۔ تو پھر اب کس شے کے کھو ڈر اسے سانس بھی نہیں لینے دے رہا تھا۔

کیا بات ایسی تھی جو اندر ایک شدید تکلیف پہنچا رہی تھی۔

یہ کیسا درد تھا جو اندر جمیل رہا تھا۔

یہ کیسا احساس تھا جو وہ اتنی بے چینی، اتنی اضطرابیت اپنے خون کے اندر دوڑتی بھاگتی محسوس کر رہا ان ”قربتوں“ میں رہ کر بھی کبھی انہیں اپنا نہیں تھا۔ اپنا جانا نہیں تھا تو پھر اب کس بات کا

اس کے اندر بے چینی کو بڑھاوا دے رہا تھا۔

کیا بات تھی کہ کوئی بے خودی سر اٹھا رہی تھی۔

محبت نہیں تھی اسے۔۔۔

کرنے کا قصد بھی جب نہیں کیا تھا۔

ارادہ بھی کوئی نہیں تھا۔

تو پھر۔۔۔ اس شخص کو کیوں اتنا سوچ رہی تھی وہ۔

کیوں ایک ہی خیال سے ڈور بندھ گئی تھی اس کی سوچ کی۔

کئی اہم کام کرتے ہوئے، سب کے درمیان، سب کے ساتھ، مگر وہ خود اپنے ساتھ نہیں تھی۔

”انا بیہ۔۔۔!“ اوزان نے اسے گم صدمہ سا کام کرتے دیکھ کر پکارا تھا۔

دادا ابا کے لئے سوپ نکالتے اس کے ہاتھ واضح انداز میں کانپتے تھے اور سوپ چھلک گیا تھا۔

بے بسی سے بنا اس کی جانب دیکھے چہرہ پھیر گئی تھی۔

”انا بیہ!۔۔۔ کیا ہوا؟“ اوزی نے اسے شانوں سے تھام کر فکر مندی سے دریافت کیا تھا۔

انا بیہ نے نگاہ اس پر سے ہٹاتے ہوئے آہستگی سے سرنئی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔“

”ٹھیک تو ہو تم؟۔۔۔ یہ کس طرح روباٹ کی طرح بی ہو کر رہی ہو؟“ اس کی پیشانی کو چھو کر دیکھا ابو غنڈی ہو رہی تھی۔ اوزی اس کا ہاتھ تھام کر اسے کاؤچ کی طرف لے گیا تھا۔ دونوں شانوں پر ہاتھ کر کے بٹھا دیا تھا۔

”انا بیہ! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے اپنی؟۔۔۔ چہرہ دیکھ رہی ہو؟ ہوا کیا ہے؟ کیا تم ہمیں کچھ

دگی؟“

”کچھ نہیں ہوا ہے۔۔۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ اور اب پلیر ایسا ویسا کچھ می کو بتا کر انہیں بیان کرنے کی کوشش مت کرنا۔ وہاں دادا ابا سوپ کے لئے انتظار کر رہے ہوں گے اور یہاں تم نے ہنہ بٹھا رکھا ہے۔“ انا بیہ جانے کو اٹھی تھی جب وہ بولا تھا۔

”انا بیہ! تمہارا جھگڑا ہو گیا ہے عفتان سے؟“

”جھگڑا؟“ وہ چونکی تھی۔ پھر غالباً اسے مطمئن کرنے کو مسکرا دی تھی۔ ”ہم دونوں میں کوئی جھگڑا کیوں

رہا اوزی؟۔۔۔ تمہارا داغ خراب ہو گیا ہے۔ عجیب عجیب باتیں کر رہے ہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔

”نہیں تم مجھے بیمار ضرور کر دو گے۔ میں دادا ابا کو سوپ دے کر آتی ہوں۔“

”عفتان آئے گا تمہیں لینے؟“ اوزان نے اس کی پشت دیکھ کر کہا تھا۔

”پتہ نہیں۔“ وہ پلٹی تھی۔ شاید بھرم کھونا نہیں چاہتی تھی سو قدم آگے بڑھا گئی تھی۔ اوزی اس رویے کو

ظہاندار نہیں کر سکا تھا۔

عفتان علی خان خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ لامعہ حق کی نگاہیں اسے بغور دیکھ رہی تھیں۔

نابالواہ اسے پڑھنا چاہتی تھی مگر ایسا اس کے لئے ناممکن رہا تھا۔ عفتان علی خان اس کے چہرے کے

بازرات کو جیسے پڑھتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”کیا ہوا؟“

”تم بہت مضبوط اور مشکل انسان ہو عفتان!“ لامعہ حق نے مسکراتے ہوئے اعتراف کیا تھا۔

”مجھے پڑھنا چاہتی تھیں؟“ عفتان محظوظ ہوا تھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر پڑھ نہیں پائی۔ اب بتا دو، تم نے مجھے یہاں کیوں بلا یا؟ کوئی کام تھا؟“

”کام؟۔۔۔ ہاں، کام ہی تھا۔ تمہاری ضرورت تھی مجھے۔ آئی مین۔۔۔ ایک اچھی دوست کی

ضرورت تھی اس وقت مجھے سو تمہیں بلا لیا۔ کیا غلط کیا؟“

”نہیں، غلط تو نہیں کیا۔ لیکن انا بیہ سے بڑھ کر تمہیں کون سمجھ سکتا ہے؟“

”وہی تو نہیں سمجھ رہی۔“ وہ روالی سے بولا تھا۔

”کیا نہیں سمجھ رہی؟“ وہ چونکی تھی۔

عفتان نے سرفسوس سے ہلایا تھا۔

”وہی جو اسے سمجھنا چاہئے۔ بہت بے وقوف ہے تمہاری دوست۔“

”ایکسیو زمی! — میرے سامنے آپ میری دوست کو براہرگز نہیں کہہ سکتے۔“ لامعدہ نے ہونے باور کرایا تھا۔ عفنان مسکرا دیا تھا۔ پھر چند ثانیوں تک چپ سادھنے کے بعد گویا ہوا تھا۔
”لامعدہ! وہ واقعی بہت بے وقوف ہے۔ وہ ایسی غلطی کرنے جا رہی ہے جس کے متعلق تم سوچ سکتیں۔“

”کیا کرنے جا رہی ہے وہ؟“ لامعدہ حق نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”مجھے خود سے جدا کرنے جا رہی ہے وہ۔ بے وقوف ہے۔ مجھ پر اب تک اپنا کوئی حق نہیں مجھے اپنا نہیں سمجھتی — اسے لگتا ہے لامعدہ! میں اس کے پاس کسی اور کی امانت ہوں۔“
”کس کی؟“ لامعدہ کی آواز اسے خود اجنبی لگی تھی۔

”تمہاری —“ عفنان علی خان نے پرفسوس انداز میں خالی کین دور اچھالتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ ”لامعدہ! یور فرینڈ ازاے اسٹوڈنٹ گریجویٹ شہ گون میڈ۔ کوئی بات اس کی عقل میں نہیں آتی اسے تم۔ شادی کے پہلے دن سے باور کرایا ہے اس نے مجھے کہ میں اس کا نہیں ہوں۔ میں اس کا ایک جذباتی فیصلہ سمجھا تھا۔ مگر وہ لڑکی — جانتی ہو تم لامعدہ! وہ اس سب کا ذمہ دار بھی مجھے جو اس کے ساتھ ہوا۔ وہ سمجھتی ہے وہ سب میں نے اس لئے کروایا کہ اسے حاصل کر سکوں۔ پانٹا اور اب وہ مجھے اس لئے چھوڑنا چاہتی ہے تاکہ میں تمہیں اپنی زندگی میں جگہ دے

ایڈیٹ — نہیں جانتی، زندگی ایسے احمقانہ فیصلوں پر نہیں گزری جاسکتی۔“ وہ بول رہا تھا اور ساکت اسے دیکھ رہی تھی۔ عفنان علی خان نے رک کر اس کا ہاتھ تھاما تھا اور نرم لہجے میں بولا تھا۔
”وہ سمجھتی ہے لامعدہ! تم اب تک اپنی زندگی میں مجھے ڈھونڈتی ہو۔ وہ ایسا سمجھتی ہے لامعدہ! کہ

رائٹ پرسن۔ اس کے لئے نہ اپنی ذات اہم ہے نہ میری — بے وقوف ایک ہی ڈگر پر سوچ رہا ہے تم سے دوستی میں اتنی اندھی ہو گئی ہے کہ اسے نہ اپنی زندگی دکھائی دے رہی ہے نہ میری۔ وہ اپورٹس دینے کی قائل نہیں۔ مگر وہ یہ بھی بھول گئی ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں کیا سوچتا ہوں۔

لئے کیا اہم ہے — کیا ضروری ہے — اگر میرے لئے تم ضروری ہو تیں لامعدہ! تو میں تمہاری اپنی زندگی سے باہر نہیں کرتا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور وہ یہ بات آج تک سمجھ نہیں پائی۔
ہے اگر میں یہ بات اسے چیخ چیخ کر بھی کہوں گا تو وہ تب بھی نہیں مانے گی۔ کیونکہ وہ اتنی بہت

ضدی ہے کہ اپنی دوستی سے آگے اسے کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا۔ وہ صرف تمہاری آنکھوں میں چاہتی ہے۔ کیونکہ وہ خود کو تمہارا مجرم سمجھتی ہے۔ اسے لگتا ہے لامعدہ! اس نے تمہارے ساتھ اچھا مگر وہ نہیں جانتی، وہ خود اپنے ساتھ بھی اچھا نہیں کر رہی۔ اپنے ساتھ کیا، وہ میرے ساتھ بھی کچھ کر رہی —

ہ مجھے ایک انسان سے زیادہ ایک شے سمجھ رہی ہے۔ اس نے مجھ سے جھوٹ کہا۔ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ مجھے سزا دینا چاہتی تھی۔ تمہیں چھوڑنے کی بھی اپنانے کی بھی۔ تمہیں یہ سب اس لئے بتا رہا ہوں کہ اس معاملے میں تم بھی شریک ہو، مکمل طور پر

”میں — میں کہاں —؟“ لامعدہ نے حیرت سے ساکت چہرے سے اسے دیکھتے ہوئے مدہم لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”تم ہوا لامعدہ! — تم ہمارے قصے کا حصہ ہو — ہماری زندگی کا حصہ ہو۔ نہ چاہتے ہوئے بھی تم ہمارے درمیان ہو۔“

”اور کیا چاہتے ہو تم؟“ اس کی طرف دیکھے بغیر، نظریں چرائے وہ اتنے مدہم لہجے میں بولی تھی کہ خود اپنی آواز سے بہت دور سے آتی ہوئی لگی تھی۔ عفنان مسکرا دیا تھا۔

”تھنک گاڈ، تمہیں تو یہ یاد رہا کہ میں بھی کچھ چاہ سکتا ہوں۔ میری بھی کوئی مرضی ہو سکتی ہے۔ تم یہ پہچانی ہی بات اپنی اس مہمان دوست کو بھی سمجھانا۔ اسے بتاؤ یہ جو بے چارہ سانبندہ عفنان علی خان ہے نا، چاہے سے محبت کرنے کی گستاخی کر چکا ہے۔ مگر یہ قصور اتنا بڑا نہیں کہ تم اس سے فیصلہ کرنے کا حق بھی چھین دے۔ سوچنے کا حق تھوڑا سا اسے بھی دے دو۔ آخر اتنی رعایت کا حق دار تو ہوں میں۔“ عفنان علی خان کا لہجہ

بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنا غصہ کسی سمت تو نکالنا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے ضبط لازم سہی، مگر لامعدہ کے سامنے تو کوئی مدفن نہ تھی۔

لامعدہ کے جواب میں کچھ نہیں بولی تھی۔ نظریں پھیرے لاتعلق سی بیٹھی رہی تھی۔

”تم چاہتے ہو میں اسے سمجھاؤں؟“ عفنان کی سمت دیکھے بغیر کہا تھا۔

”تم ایسا کوئی کارنامہ سرانجام دے سکتی ہو؟“ وہ مسکراتے ہوئے بدستور طنز بھرے جملے کئے انداز میں گیا تھا۔ لامعدہ نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ عفنان علی خان نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔

”اگر تم یہ مجزہ کر سکتی ہو تو کر دو لامعدہ! کوئی ایسا کرشمہ اس زمین پر دیکھنا چاہتا ہوں میں جب وقت بڑے حق میں ہو جائے اور وہ مجھ پر مہربان ہو جائے۔ کچھ اور نہیں تو اعتبار ہی کر لے۔ اک ذرا سا غبار مگر وہ تو وہ بھی کرنے کو تیار نہیں۔ کتنا خالی شخص ہوں میں — کس قدر ہارا ہوا — آج تک

سے اس سے بھی نہیں جیت سکا۔ ہونا تو نہیں چاہئے، مگر جانے کیوں مجھے تم سے بہت حسد محسوس ہوتا ہے۔ تم پر بہت اعتبار کرتی ہے وہ۔ اس کی عظمت کی حد دیکھ لو، تمہیں اپنا شوہر انعام میں سوئپ دینا چاہتی ہے۔ دوستی کی کتنی اعلیٰ مثال قائم کرنا چاہتی ہے نا۔ کیا تم بھی اس کی اتنی ہی اچھی دوست ہو جتنی کہ وہ تمہاری؟“ عفنان علی خان بظاہر مسکراتے ہوئے مذاق سے گویا تھا۔ مگر لامعدہ حق کے چہرے کی کیفیت مختیر ہو گئی تھی۔

”ایکسیو زمی!“ غالباً برامانتے ہوئے وہ چہرہ پھیر گئی تھی۔ عفنان مسکرا دیا تھا۔

”آئی ایم سوری! — غالباً مجھے تم دونوں کی دوستی پر شک کرنے کا کوئی حق نہیں۔ مگر.....“

”اس اوکے۔“ لامعدہ کہتی ہوئی ابھی تھی۔ ”چلتی ہوں اب۔“

”میری مدد نہیں کرو گی؟“ عفنان نے اسے دیکھا تھا۔ نظروں میں جانے کیوں حیرت نہیں تھی۔ لامعدہ نے لوں پر زبان پھیر کر جیسے انہیں ترک کیا تھا پھر جیسے بمشکل بولی تھی۔



”تمہیں جس طرح کی بھی مدد درکار ہوگی، مجھے بتا دینا۔ میں ہر طرح سے تم دونوں کے ہوں۔ رک کر تم سے مزید بات کرتی، مگر میری ایک ضروری اپائنٹ ہے۔ آئی ایم سوری۔“
زیادہ وقت نہیں دے پائی۔ لیکن میں نے تمہیں بے توجہی سے نہیں سنا۔ دوبارہ جب مجھے ضرورت ہو، بلا لیتا۔“

وہ پلٹی تھی اور چلتی ہوئی وہاں سے نکل گئی تھی۔ عثمان علی خان گاڑی میں آن بیٹھا تھا۔



ساہیہ خان جلد ہوش میں آگئی تھی اور اس نے تقریب جاری رکھنے کا عندیہ بھی دے دیا تھا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد فارحہ نے اس کی طرف دیکھا تھا۔
”نہیں بیٹا!۔ اگر تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تو ہم ملتوی کر دیتے ہیں۔ کچھ بھی تم سے زیادہ نہیں۔“ فارحہ نے اس کے گرد اپنا بازو محائل کرتے ہوئے کہا تھا۔ ساہیہ نے جواباً اذہان کی طرف اور اپنا سر فنی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں آنٹی!۔ آئی ایم او کے ناؤ۔ کچھ ایسی بھی طبیعت خراب نہیں ہے میری۔ پلیر، میری ماما کو اس کے بارے میں کچھ مت بتائیے گا۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گی۔“
”میں دیکھ کر آتی ہوں، وہ لوگ آئے یا نہیں۔ اذہان! تم یہیں رہو اس کے پاس۔ خیال رکھا آتی ہوں۔“

”مئی! میرا خیال ہے کہ آپ اس منگنی کو ملتوی کر دیجئے۔“ اذہان نے ایک لمحے میں فیصلہ کرتے کہا تھا۔ ساہیہ نے حیرت سے اس شخص کو دیکھا تھا۔
”ڈونٹ بی اسٹو پڈ اذہان!۔ میں ٹھیک ہوں اب۔ ذرا سی بے ہوش کیا ہوگی تم نے تو حرا آئی! آپ جائیے، آئی ایم فیلنگ گڈ ناؤ۔“

فارحہ کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی تھیں۔ اذہان کچھ کہے بغیر چلتا ہوا فریج کے پاس جا رہا تھا۔
لئے جس گلاس میں نکالا تھا اور پلٹ کر دوبارہ چلتا ہوا اس کے پاس آن رکھا تھا۔
ساہیہ نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہ اس کی طرف بنا کچھ کہے، مخاطب کئے گلاس بڑھانے لگا۔
ساہیہ نے گلاس اس کے ہاتھ سے تھام لیا تھا۔
”بھینکس۔“

”یو آر ویلکم۔“ اذہان سعادت مندی سے کہہ کر اس کے پاس کاؤچ پر بیٹھ گیا تھا اور بنا اس کے متوجہ ہوئے جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کی سعی کرنے لگا تھا۔
”کتنا عجیب ہو رہا ہے نا سب کچھ۔“ بہت آہستگی سے وہ مسکرایا تھا۔ ”شاید زبردستی کا انجام ہے۔ مجھے کوئی حق نہیں تھا تم پر اس طرح دھونس جمانے کا۔ آئی ایم سوری ساہیہ!“
ساہیہ کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

”تم مجھے خود سے پرایا کر رہے ہو اذہان!“
”نہیں، تمہیں خود سے الگ رکھ کر سوچ رہا ہوں۔ اب درست زاویے سے دیکھ بھی رہا ہوں اور سمجھ بھی۔“ اذہان کا انداز بجا بجا سا تھا۔

”اوں ہوں۔“ مت کہو ایسے اذہان!“ ساہیہ نے اپنا سر دسا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔
اذہان نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں اذہان!۔ ہر قدم پر۔ ہر موڑ پر۔ جہاں تمہیں میری ضرورت پڑے۔ میں ساتھ ہوں۔ مگر میں صرف تمہیں خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ تمہیں وہ موقع دینا چاہتی تھی جو زندگی نے تمہیں دیا اور پھر چھین لیا۔ میں وہ نا انصافی تمہارے ساتھ دوبارہ دہرانے دینا نہیں چاہتی تھی اذہان! جو تم نے پہلے ایک بار اپنے ساتھ کی۔“
اذہان اس کی طرف دیکھے بغیر اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔ انداز بہت بجا بجا سا تھا۔

”مجھے نہیں پتہ ساہیہ! قسمت کیا ہوتی ہے۔ بنی ہوتی ہے، لکھی ہوتی ہے یا ہم خود لکھتے اور بناتے ہیں۔ میں واقعی کچھ نہیں جانتا۔ پتہ نہیں ان لکھروں کی کوئی حقیقت ہے بھی کہ نہیں۔ مگر میں ایک بات جانتا ہوں، زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے، یونہی نہیں ہوتا۔ ہر بات کا سبب ہوتا ہے ساہیہ! یہ الگ بات ہے کہ ہم وہ بات سمجھ جائیں یا نہیں۔ بعض اوقات نہیں سمجھ پاتے تو خود کو الزام دیتے ہیں۔ روتے ہیں، پٹیتے ہیں۔ مگر اس سے صورتحال بدل نہیں جاتی۔ بعض دفع سمجھ لیتے ہیں تو صبر کر لیتے ہیں۔ مگر ایک بات طے ہے، ہمیں کسی بات پر اختیار نہیں ہے۔ بہت سی چیزوں کو ہم ہونے سے نہیں روک پاتے۔ چاہتے ہوئے بھی نہیں۔ اور بہت سی چیزوں کے ہونے کی خواہشوں میں آسیں باندھتے پھرتے ہیں اور کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ساہیہ؟“ اذہان حسن بخاری کا لہجہ بے بسی سے چور تھا۔

”میں جانتی ہوں اذہان! ایسا ہوتا ہے۔ اور ایسا ہم سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ تم تنہا نہیں ہو، نہ میں تنہا ہوں۔ ہم میں سے ہر کوئی خواب دیکھتا ہے، ہر کوئی پانا بھی چاہتا ہے۔ مگر سب کے لئے سب کچھ حاصل کر لینا ممکن نہیں ہوتا۔ تم نے ٹھیک کہا۔ بہت کچھ ایسا زندگی میں ہوتا ہے جو ہم نہیں چاہتے۔ اور بہت کچھ وہ نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں۔ جب بہت سی تبدیلیاں ہماری مرضی کے بغیر ہماری زندگی میں آسکتی ہیں تو ہم کچھ تبدیلیاں ہماری اپنی مرضی سے کیوں نہیں، جب قسمت کے اچھے یا برے کو ہم تبدیل کر سکتے ہیں، تو اسے تبدیل کرنے میں تو پھر اپنے اچھے یا برے فیصلوں کو کیوں نہیں؟“ ساہیہ رکی تھی۔ مگر اذہان کچھ نہیں بولا تھا۔

”ایک بات کہوں اذہان!۔ میں اس لمحے شاید لگی ہوں۔ میرے ساتھ وہ ہونے جا رہا ہے جس کی میں نے خواہش کی تھی۔“ وہ سر جھکائے جس کی گلاس پر نظریں جمائے، مگر ماٹھ انداز میں اس گھڑی بول گیا تھا جیسے اس نے کوئی عظیم گناہ کر دیا ہو۔ اذہان نے اس کی طرف دیکھا تھا مگر وہ چونکا قطعاً نہیں تھا۔ وہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولی تھی۔

”تم سوچ رہے ہو گے میں یہ سب تمہیں کیسے بتا رہی ہوں؟ اذہان! تم میرے سب سے اچھے دوست

”اذہاں! اس ٹوچ ہاں؟“ وہ اپنے دفاع میں مسکراتے ہوئے اسے گھورنے لگی تھی۔ ”ویسے مادام تساؤ میوزیم اچھا ہے۔ وہاں موم سے بنے مجسمے رکھے جاتے ہیں۔ اور میں آل ریڈی موم سے بنی۔“ اذہاں نے مسکراتے ہوئے وہ کہیں سے بھی کچھ دیر قبل والی ساہیہ نہیں لگ رہی تھی جو بھانہت اور زردی کے باعث بے ہوش ہو گئی تھی۔ شاید وہ لڑکی بہت بہادر تھی۔ یا پھر اس موم کی لڑکی کا دل واقعی بڑا تھا۔ اذہاں اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا اور وہ اپنے ازلی شگفتہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

”فارحہ آئی بتا رہی تھیں تم نے انگریج منٹ رنگ بدلوا دی۔ کنجوس، ایک ہی بار تو انگریج منٹ ہونا تھی، روز تو نہیں۔ کتنا تنہا سادل ہے تمہارا۔ تم مردوں پر کبھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“

اذہاں مسکرایا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں نے رنگ چینیج ضرور کی ہے۔ مگر اس رنگ سے زیادہ مہنگی منتب کی ہے۔ وہ رنگ بلی تھی ساہیہ! تم ویٹ پٹ آن کرنا بند کرو گی تو اور بھی مشکلات ہوں گی۔“ شرارت سے چھیڑا تھا۔

”واہ۔۔۔ کیا جواز تلاش ہے۔ یعنی آج رنگ بدلی، کل مجھے ہی بدل دو گے۔ میں نے کہا تھا، تم دن کا کچھ اعتبار نہیں۔“ اس کے الزام کے باوجود اذہاں مسکرایا تھا۔

کچھ دیر بعد جب وہ اس کے ہاتھ کی انگلی میں انگریج منٹ رنگ پہنارہا تھا تو وہ مسکرا دی تھی۔

”تم نے اچھا کیا۔۔۔ وہ رنگ میری انگلی میں فکس نہیں تھی۔ اس مور کفر ٹیبل اینڈ بیوٹی فل۔“ پتہ ل کیوں وہ اتنا مسکرا رہی تھی۔ اتنا بول رہی تھی جیسے وہ کسی سنانے کا گلا گھونٹنا چاہتی تھی یا پھر وہ خوش تھی۔

اذہاں نے سب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ ہاتھ میں لیا تھا اور مسکرایا تھا۔

”تم میرے لئے دنیا میں سب سے زیادہ اہم ہو ساہیہ!“

مختصر سا جملہ اس کی سماعتوں کو سونپ کر وہ رسمی طور پر تقریب میں مدعو مہمانوں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ ساہیہ کی لمحوں تک اس جملے کے حصار سے باہر نہیں آسکی تھی۔



مائی اماں نے اسے سونے کی تاکید کی تھی مگر وہ ان کی ہدایت پر عمل نہ کرتے ہوئے باہر آگئی تھی۔ کچھ ہنگ میڑھوں پر خالی دماغ کے ساتھ بیٹھی رہی تھی۔ پھر یک دم رات کا خیال آیا تھا۔ تمام واقعات یاد آئے تھے۔ وہ تجحف تھا ماندہ چہرہ نظر آیا تھا اور وہ فوراً اٹھ کر اندر کی طرف چل دی تھی۔ دروازے کے باہر۔۔۔ اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تھا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ میرب نے اندر جھانکا تھا۔

وہ خاتون بستر پر اوندھی پڑی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ دستک دیئے بغیر اس کمرے میں داخل ہرگز نہیں ہوتی۔ مگر وہ رات جس طرح کی حالت میں انہیں دیکھ چکی تھی، وہ جانتی تھی کہ وہ اس وقت بھی یقیناً اسی حالت میں نہیں ہوں گی۔

اور اب کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے دیکھ بھی لیا تھا۔ وہ بنا مخاطب کے، بنا پکارے ان کی رن پرچی تھی اور ہاتھ سے ان کے چہرے پر سے بال ہٹاتے ہوئے انہیں سیدھا کیا تھا۔ خاتون غالباً بدستگ تھیں۔ اس کی اس حرکت پر بہت آہستگی سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا۔

ہو اور دوست سے کبھی کچھ چھپایا نہیں جاسکتا۔ جیسے تم مجھ سے کبھی کچھ نہیں چھپاتے۔“

”تو تم اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہو؟“ اذہاں نے اس کے موڈ کے خیال سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ غالباً وہ اس لمحے کی کثافت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ ساہیہ مسکرائی اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”تمہیں آزاد چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ مگر اب سوچتی ہوں، یہ مناسب نہیں ہوگا۔ وقت اگر دے رہا ہے تو مجھے فائدہ لینا چاہئے۔ سو فنی طور پر تمہیں اپنے پلو سے باندھ رہی ہوں۔ مگر تمہیں ہے، جب دل چاہے خود کو میرے اس پلو سے کھول کر آزاد کر لیتا۔“ وہ مسکرائی تھی۔

اذہاں بھی مسکرایا تھا۔

”یہ بھی صرف اس لئے کر رہی ہوں کہ تم کسی اور ہاتھ میں نہ پہنچ جاؤ جو تمہیں بعد میں آرا سکے۔ اب ہر کوئی ساہیہ جیسا تو نہیں ہو سکتا۔“

”ہاں واقعی۔“ وہ مسکرایا تھا۔ ”ٹھیک کہا تم نے۔۔۔ اب ہر کوئی ساہیہ جیسا تو نہیں ہو سکتا۔ ساہیہ جیسی بے وقوف تو دنیا میں ایک ہی آئی ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے مسکرایا تھا۔

اسے گھورا تھا۔ وہ بنا ٹوٹنے کے اس کا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر اسے بغور دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”تو تم نے طے کر لیا ہے، بعد میں جو بھی ہوگا، تم اسے قبول کرو گی۔ یعنی میں زندگی کی کوئی آرام سے اختیار کر سکتا ہوں، ٹھیک؟“

”ٹھیک۔“ ساہیہ مسکرائی تھی۔

”اور تم برائیں مانو گی؟“ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”بالکل بھی نہیں۔“ ساہیہ مسکرائی تھی۔

”کوئی واویلا بھی نہیں کرو گی؟“

”اوں ہوں۔“ ساہیہ نے یقین دلانے کو مسکراتے ہوئے سر انکار میں ہلایا تھا۔

”ہاؤ سوٹ۔۔۔ تم ایک مرد کو اتنی نرمی دینے والی دنیا کی پہلی لڑکی ہو گی ساہیہ!۔۔۔“

دنیا میں کوئی اور لڑکی واقعی ایسا نہیں کر سکے گی۔ آئی ایم امپریسڈ۔ آئی ایم ریٹیویری امپریسڈ۔ تمہیں میں کس میوزیم میں اٹھا کر رکھ آؤں؟“

”میوزیم کیوں؟“ ساہیہ نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”آپ جیسی چیزیں جو بہت نایاب ہوتی ہیں نا، انہیں ہمارے یہاں میوزیم نامی ایک جگہ رکھا جاتا ہے۔ اس لئے پوچھنا ضروری خیال کیا، آپ کو کس میوزیم میں رکھواؤں؟“ مسکرائی ہوا تھا۔

”تم مجھے عجوبہ کہہ رہے ہو؟“ ساہیہ مسکرائی تھی۔ بنا برامانے۔

”کہہ رہا ہوں؟ میں واقعی سمجھ رہا ہوں۔ ایک ونڈر کو اگر میں ونڈر نہیں کہوں گا تو مجھے خود اپنی دماغی کیفیت پر حیرت کرنا پڑے گی۔“

میر نے اپنے پتھر سے وجود کو بہ مشکل حرکت دے کر ملازم کی طرف دیکھا تھا۔

”ہم اس بریک فاسٹ کو وہاں ٹیبل پر لگا دو۔ اور بی بی سے پوچھ لیتا، انہیں کسی اور شے کی ضرورت تو نہیں؟“ میر سیال کے لئے وہاں مزید شہرنا محال ہو رہا تھا۔ وہ کہہ کر چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ وہ سینے سے رات کا بوجھ ہٹانے گئی تھی۔ اک اسرار، ایک بھید کو جاننے گئی تھی۔ مگر اک مزید بھید میں الجھ کر رہ گیا۔ اسے یہ تو ہرگز پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ کون تھی۔ مگر اس گفتگو نے اسے پتھر ضرور کر دیا تھا۔ دل پہلے کہ ”غذاب“ میں مبتلا نہ تھا۔ اب حالت حد سے سوا ہو گئی تھی اور اس تشویش ناک کیفیت میں وہ تباہی کے ساتھ اس کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

کیا تھا سردار سیکٹین حیدر لغاری؟

”حقیقت کیا تھا وہ؟“ کیوں سب اسے صرف اس زاویے سے دیکھتے تھے جہاں سے وہ صرف ”رف“ ”مہمان“ دکھائی دیتا تھا۔ اس زاویے سے سب اسے کیوں نہیں دیکھتے تھے جہاں کھڑی وہ اسے ہی تھی؟

وہ اس ”سمت“ میں کھڑی ”واحد فرد“ کیوں تھی؟

وہ سب رائٹ سمت پر تھے یا وہ ہی غلط سمت پر کھڑی تھی؟ وہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے مزید الجھتی رہا۔

”اپنے دہی کو کھٹا کوئی نہیں کہتا۔“ مثل مشہور تھی تو کچھ سچائی بھی تو ضرور تھی۔ مائی اس کی اپنی تھیں، وہ ناچکی کوئی قریبی رشتہ دار تھیں۔ پھر انہیں اس میں کوئی عیب کیسے دکھائی دے سکتا تھا؟

وہ غلط سمت پر نہیں، درست سمت پر کھڑی اسے دیکھ رہی تھی اور یہاں سے جو اسے دکھائی دے رہا تھا ”مل“ ”منظر نامہ“ تھا۔ یہی اصل سردار سیکٹین حیدر لغاری تھا۔

فون خاصی دیر سے بج رہا تھا۔ میر نے سیل اٹھا کر اسکرین پر نمبر دیکھا تھا اور پھر سیل سوچ آف کر لیا۔

”اٹھ بیٹے گئے۔ عفتان تمہیں لینے نہیں آیا؟“ ماہوش نے فکر مندی سے دریافت کیا تھا۔ مگر جواباً کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔

”کیا ہوا؟“ خیریت؟ کہیں تم دونوں میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟“ ماہوش بخاری نے فکر سے دریافت کیا تھا۔

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ انا بیہ نے فوری طور پر صحیح جواب دینا ضروری خیال کیا تھا۔ ”تو پھر فون کروا سے، ملاؤ۔ اتنا وقت ہو گیا ہے، آیا کیوں نہیں وہ اب تک؟“

ماہوش کی تشویش عروج پر تھی۔ انا بیہ حالات معمول پر ظاہر کرنے کو با مشکل مسکرائی تھی۔

”کیا! کیا اب میں بوجھ بن گئی ہوں آپ پر؟ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ صبح وہ مجھے خود چھوڑ کر گئے۔ انا بیہ نے فکر مندی کی بات کیا ہے؟“ اس نے اپنی دانست میں انہیں مطمئن کرنا چاہا تھا مگر ماہوش بخاری

کی زندگی میں بھی کوئی جگہ نہیں۔ ایسی فضول چیزوں کو ”ٹریلش“ کرنے میں دیر نہیں کرتا وہ۔ تمہیں تو نہیں کہ تم اس کی زندگی میں اہم نہیں ہو۔ کیا اس نے تمہیں کبھی بتایا نہیں کہ وہ تم سے کتنی محبت کر سوال دلچسپ ضرور تھا مگر میرب کا چہرہ اس گھڑی اتنا ہونق تھا کہ اس سوال سے محظوظ بھی نہیں ہوگا۔

”تم اس قدر حیران کیوں ہو؟“ کیا کبھی پوچھا نہیں تم نے اس سے؟“ زیادہ نہیں مگر میرب ہوگی اسے تم سے۔ کیا تم اس بات سے ناواقف ہو؟“ عورت تو محبت کے حوالوں کو جانتا ہے۔ کیا اس کی آنکھوں میں تمہیں کبھی رنگ دکھائی نہیں دئے؟ مجھے واقعی حیرت ہو رہی ہے۔ مگر

اپر دج والا بندہ دل کی دل میں دبانے کا قائل ہرگز نہیں ہے۔ نفرت ہو یا محبت، وہ برملا اس کا اقرار کرتے ہیں۔ وہ کب خوش ہے، کب ناخوش، کون سی بات اسے اچھی لگ رہی ہے، کون سی پر

بہت چھوٹے چھوٹے زاویوں سے بھی دیکھو تو وہ کھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حیرت ہے، تم نے اب غور سے نہیں دیکھا؟“

”ہماری لومیرج نہیں ہے۔“ میرب سیال نے بول کر ان کے سارے تاثر کو اور اب تک زائل کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ خاتون اس کا چہرہ ہاتھ میں لیتی ہوئی مسکرائی تھیں۔

”محبت کیا صرف شادی سے پہلے ہی ہوتی ہے؟“ ان خاتون کا سوال اسے چاروں شانے تھا۔ وہ جو بہت پر اعتماد انداز میں دور کی کوڑی لائی تھی، اب حیرت سے سوا انداز میں ان کی طرف تھی۔ اور وہ خاتون جیسے اس کی بے وقوفی کو جانتے ہوئے مسکرائی تھیں۔

”محبت دکھائی دینے والی شے نہیں ہے۔ پوشیدہ رازوں میں دہی بہت راز کی با

محبت۔ کان، کان سے نہ کہے۔ زبان بولے یا نہ بولے، اسے فرق نہیں پڑتا۔ مجھ

چپ میں بولتی ہے۔ کبھی سننا ہوتا تو چاروں طرف سے اپنی آنکھیں بھی بند کر لو اور کان بھی اور دھڑکنوں کو غور سے سنو۔ یہ تمہیں سنائی بھی دے گی اور دکھائی بھی۔ تب تم اسے ہاتھ بڑھا

سکوگی اور محسوس بھی کر سکوگی۔ محبت ایسی ہی انوکھی، عجیب کٹھا ہے۔ کبھی سمجھ میں آجاتی

بالکل نہیں آتی۔ مگر تم اس معاملے میں پھر بھی لگی ہو۔ تم اس کے ساتھ ہو جو تمہارے ساتھ ہے۔ اسے لگی کر ل۔“ پتہ نہیں وہ اس سے ایسی باتیں کیوں کر رہی تھیں۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی

سیال جو ساکت سی کھڑی تھی اس کے وجود میں حرکت ہوئی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تھا، نوکر کے لئے ناشتہ لے آیا تھا۔

”آپ کا ناشتہ آ گیا۔ آپ اب تک فریش نہیں ہوئیں۔“ کھوئے کھوئے سے لہجے تھی اور خاتون مسکرائی تھیں۔

”شاید کچھ غلط کہا میں نے۔ سیکٹین حیدر لغاری سمت بی اے لگی پرسن۔ تم اس کے ساتھ اس کی زندگی میں ہو۔ یوں تو کوئی خلا اس کی زندگی میں نہیں تھا۔ لیکن اگر ایسا کچھ تھا بھی تو تم اسے

کر چکی ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کا چہرہ چتپتہ کر واں روم کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

پہلے سے زیادہ تشویش سے بیٹی کو دیکھنے لگی تھیں۔

”انا بیہ! مینا زندگی کے لئے اتنا کیرلیس رویہ اچھا نہیں ہوتا۔ تمہیں سمجھنا چاہئے۔ رشتور لاطلقی اچھی نہیں ہوتی۔“ مہی نے دباؤ ڈالا تھا۔ انا بیہ مجبوراً اٹھ کر فون کی طرف آئی تھی۔ تبھی چہ تھی۔ سامنے وہ اوزان سید کے ساتھ آتا دکھائی دیا تھا۔ انا بیہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا خود بھی امید نہیں تھی کہ آج وہ آئے گا۔ صبح جو کچھ اس نے کہا تھا، اس کے بعد کیا جواز باقی بچتا یہاں آندا؟ کیا وہ بھی رکھ رکھاؤ کا اتنا قائل تھا کہ ”رسم“ نبھانے آ گیا تھا؟۔۔۔ انا بیہ بڑا ہاتھ میں لے اس کی طرف دیکھ رہی تھی جب وہ قریب آتا اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ اتنی پریشانی کس لئے؟۔۔۔ کیا میری فکر سنا رہی تھی؟“ وہ اپنا بیہ طرح گویا ہوا تھا جیسے ان کے درمیان کچھ عجب ہوا ہی نہ ہو۔ انا بیہ کی آنکھوں میں واضح حیرت تھی۔

”تم نے اپنا سیل سوچ آف کیوں کر رکھا تھا؟۔۔۔ میں کب سے ٹرائی کر رہا تھا۔ لینڈ لائن غالباً؟“ اسے کہہ کر وہ ماہوش کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”السلام علیکم می! کیسی ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ ابھی میں یہی کہہ رہی تھی انا بیہ سے کہ تمہیں فون کرے۔“

”جی بس، وہ ایک مینٹگ میں پھنس گیا تھا۔ انا بیہ! آریورڈی، چلیں؟“ عفتان نے اٹھ دیکھا تھا۔ انا بیہ اب اتنی بچی بھی نہیں تھی کہ اس کے حفظ ما تقدم کے تحت کئے گئے اقدام کو سمجھ یقیناً سمجھ چکی تھی۔ اس کی یہ توجہ، یہ لگاؤ اس کے لئے ضروری تھے۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا ”میں کپڑے پہنچ کر کے آتی ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی وہ پلٹ کر اندر کی جانب بڑھ گئی جگہ پر لاکھڑا کیا تھا وقت نے اسے؟

ہر شے اختیار سے باہر اور اپنا آپ ایک بے بسی میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر عفتان علی خان کے ساتھ واپسی کے سفر پر روانہ تھی تو وہ گویا ہوا تھا۔

”سمجھ میں نہیں آ رہا انا بیہ! جب سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے تو پھر تمہیں کیوں نہیں لگ رہا؟ یہی سب تو چاہتی تھیں تم۔ پھر اب کیا ہوا ہے؟“

”کیوں۔۔۔ کیا ہوا ہے؟“ وہ جواباً سوالیہ انداز میں پوچھتی ہوئی دریافت کرنے لگی تھی ”کیا کروں میں ایسا آپ کے لئے کہ آپ کو لگے کہ بہت خوش ہوں۔ آپ کو حقیقت

اشتیاق ہے؟“ انا بیہ شاہ نے اپنے اندر کا غبار اپنے اندر دبائے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دہرایا عفتان علی خان نے ڈرائیو کرتے ہوئے وڈ اسکرین سے نگاہ ہٹا کر اسے اک نگاہ خاص سے د

”یعنی تم خوش نہیں ہو؟“ وہ مسکراتے ہوئے گویا اس کے غصے کو ہوا دینا چاہتا تھا۔ غالباً شدید ترین ”ری ایکشن“ دیکھنے کا متنی تھا جو اب تک سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ خود کو بہت سے

کر رکھنے کی قائل تھی اور اب تک کے ”اقدامات“ سے کوئی ایک خول بھی نہیں چٹخا تھا۔

رہیں قید دکھائی دے رہی تھی۔

”خوش نظر آنے کی تشریح آپ کے یہاں کیا ہے؟ کیا مجھے ڈنٹونک کا اشتہار بن جانا چاہئے؟“ بہت دیر سے انداز میں اس نے وضاحت چاہی تھی۔ عفتان علی خان مسکرایا تھا۔ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا ہاتھ اس جواب نے اسے کسی حد تک محظوظ ضرور کیا تھا۔

”خوشی کا بہترین اظہار خوش نظر آنا ہی ہے۔ اور خوش نظر آنے کے لئے مسکرانا ضروری ہے۔“ ”میں صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے مسکرائی نہیں سکتی کہ میں آپ کو خوش نظر آؤں۔“ انا بیہ نے اس کی تکلے عام کی تھی۔

”یعنی تم واقعی خوش ہو؟“

”آپ مجھے خوش دیکھنے پر اتنا بضد کیوں ہیں؟۔۔۔ آپ جو کرنا چاہتے ہیں وہ کر کیوں نہیں لیتے؟ بہت سورا پنی ہر بات کا سرا مجھ سے جوڑے کیوں بیٹھے ہیں؟“ وہ جل کر بولی تھی۔ عفتان علی خان اسکے زین لہجے کے باوجود مسکرایا تھا۔

”کیا کروں؟۔۔۔ یو آر مائی وائف۔ تم ایک سرے کی بات کرتی ہو، یہاں تو پوری کی پوری زندگی تم جڑی ہوئی ہے۔“ اس کی طرف دیکھے بغیر باور کر لیا تھا۔ پتہ نہیں وہ افسوس کر رہا تھا یا کوئی طنز اس کے میں تھا۔ گھر کے پورچ میں گاڑی رکھی تھی اور انا بیہ کچھ بھی کہے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تھی اسی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔ فاطمہ اسے اندر داخل ہوتا دیکھ کر مسکرائی تھیں۔

”انا بیہ بیٹا! آگئیں تم؟“ اسے شانے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے دیکھا تھا۔

انا بیہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ تبھی عفتان چلا ہوا پیچھے آن رکھا تھا۔

”بہت بھوک لگی ہے ماما! کھانا لگوا دیجئے۔“

”تم دونوں فریش ہو کر آ جاؤ، میں ٹیبل لگواتی ہوں۔“ فاطمہ نے بیٹے کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا

”نہیں۔۔۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔ آپ صرف ان کے لئے کھانا لگوا دیجئے۔“ انا بیہ کا لہجہ بہت سرد فاطمہ کی کیفیت دیکھ چکی تھیں تبھی مصالحت سے مسکرائی تھیں۔

”ٹھیک ہے بیٹا! مگر تم سونے سے پہلے دودھ ضرور لے لینا۔ اب کیسی طبیعت ہے دادا ابا کی؟“ نرم اس نے دریافت کیا تھا۔

انا بیہ نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ٹھیک ہیں۔“

”ماؤش سے فون پر بات ہوئی تھی میری۔۔۔ دادا ابا سے بھی۔ مجھے آج جانا بھی تھا مگر پھر عروشہ کی ف سے فون آ گیا اس لئے جانیں پائی۔ لیکن کل ضرور جاؤں گی۔“ فاطمہ معذرت دیتے ہوئے بولی

لہذا انا بیہ کے لئے وہاں ٹھہرنا محال تھا۔ اس لئے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”اب اپنے کمرے میں جاؤں میں؟“ انداز بے حد سرد تھا۔ فاطمہ بچی تو نہیں تھیں کہ اصل بات نہ

دل

اسے بیڈ کی طرف لے آیا تھا۔

انا بیہ شاہ کے لئے اس کی یہ کیفیت، یہ حرکت عجب تھی۔ وہ حیرت میں مبتلا ہوئی تھی۔ دماغ میں فطرت کی کوئی کھٹی بجی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سوچتی، عفتان نے اسے بیڈ پر گرا کر ہاتھ بڑھا کر اپنی بھادی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری دن بھر خاصا مصروف رہا تھا۔ مگر جیسے ہی فراغت کے چند لمحے ہاتھ آئے تھے، ہاتھوں نے بے اختیار جانے کیوں اس کا نمبر گھما ڈالا تھا۔

”مائی کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر ہے۔“ اس کی طرف سے کچھ بھی پوچھے جانے سے قبل وہ مستعدی سے بولی تھی۔

”گڈ۔ ڈاکٹر نے کیا کہا اب؟“ انداز تسلی بخش تھا۔

”شام کو دیکھ کر گئے تھے۔ انہوں نے بھی کچھ ایسی پریشانی والی بات نہیں بتائی۔“ میرب سیال اس کے تمام سوال غالباً پہلے ہی سے جانتی تھی۔ سو بنا اس کے مزید گویا ہوئی تھی۔

”ابھی تھوڑی دیر قبل میں نے بی پی چیک کیا تھا۔ نارمل تھا۔ بخار بھی اب نہیں ہے۔ بس تھوڑی فطرت باقی ہے۔ اگلے چند دنوں میں وہ بھی نہیں رہے گی۔“

”گڈ۔ یعنی تم مائی اماں کا بہت اچھا خیال رکھ رہی ہو۔“ وہ متاثر ہوتا ہوا گویا ہوا تھا۔ ”دن بھر

بہت مصروف رہا، دھیان تک نہ رہا۔ مائی اماں سے بھی بات نہیں ہو سکی۔ مجھے اندازہ تھا وہ اس وقت سو رہی ہوں گی۔ تبھی انہیں ڈسٹرب کئے بغیر تمہارا نمبر ملا ڈالا۔ تم اب تک سوئی نہیں؟“ جانے کیوں وہ پوچھ رہا تھا۔ میرب سیال نے بنا اس کے لہجے اور انداز پر غور کئے سرانکار میں یوں ہلایا تھا جیسے وہ اس کے مقابل بیٹھا ہو۔ پھر خود ہی اپنی حماقت کا اندازہ کرتے ہوئے فوراً بولی تھی۔

”نہیں۔ مائی کی ہدایت پر دوپہر میں سو گئی تھی۔ سواب نیند نہیں آرہی تھی۔ آپ کب آرہے ہیں؟“ مائی کے خیال سے اس نے مردوتا دریافت کیا تھا۔ لہجہ اور انداز دونوں سرسری تھے۔ مگر دوسری طرف سے جو جواب آیا تھا وہ سرسری نہیں تھا۔

”کیوں؟“ آریو مسنگ می؟“ سردار سبکگین حیدر لغاری یقیناً اس لمحے کوئی لطیف سا مذاق ہی کر رہا تھا۔ انداز سے تو یہی ظاہر تھا۔ میرب سیال نے لہجہ بھر کو غور کرتے ہوئے اخذ کیا تھا۔ مگر حیرت پھر بھی آئی تھی کہ وہ کچھ بول نہیں سکی تھی۔ دوسری طرف سبکگین حیدر لغاری دوبارہ گویا ہوا تھا۔

”سو یو ڈونٹ بس می؟“ شکوہ کرتا لہجہ تھا۔ غالباً وہ مسکرا رہا تھا۔

”نہیں۔“ میرب نے فوراً سے پیشتر اسے رد کیا تھا۔

”بٹ آئی ایم مسنگ یو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ میرب سیال ششدر سی رہ گئی تھی۔ غالباً وہ دوبارہ مذاق کر رہا تھا۔ سنجیدہ نہیں تھا۔

”جسٹ کڈنگ۔۔۔ رادر آئی جسٹ وانٹ ٹو ٹرائی چیچینگ یور موڈ۔“ دوسرے ہی لمحے وضاحت آئی

بجھتیں۔ اتنا تو وہ جان ہی گئی تھیں کہ ان دونوں کے درمیان کچھ عجب چل رہا ہے۔ کیا؟ یہ پتہ چلتا جانتی تھیں۔ مگر ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو زنی سے تھپتھپایا تھا۔

”شیدور بیٹا!۔۔۔ تم تھک گئی ہو گی۔ آرام کرو۔“

انا بیہ بنا کوئی دوسری بات کئے تیزی سے زینے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ فاطمہ نے قدر سب سے رکے انا بیہ کی پشت کی طرف بنور تلخے عفتان کی طرف دیکھتے ہوئے پیش قدمی کی تھی۔

”کیا چل رہا ہے یہ سب؟ کیا میں پوچھ سکتی ہوں؟ یا تم لوگ بڑوں کو اپنے معاملات میں نا ضروری خیال نہیں کرتے؟“ فاطمہ کے دریافت کرنے پر وہ کچھ کھسیا سا گیا تھا۔

”کیسی باتیں کرتی ہیں آپ ماما؟۔۔۔ آپ کو حق ہے، آپ کچھ بھی پوچھ سکتی ہیں۔“

”پوچھ تو رہی ہوں۔ پھر بتا کیوں نہیں رہے، یہ کیا ہو رہا ہے؟ صبح جس طرح وہ گھر سے روانہ نکلی، اور اب..... عفتان! میں ماں ہوں، چہرے دیکھ کر اندر کے احوال پڑھ سکتی ہوں۔ تم لو اپنے معاملات خود بہتر طور پر نمٹا سکتے ہو تو ٹھیک ہے۔ مگر بات کو متاثر مت بناؤ۔ اس کا چہرہ دیکھو۔ تم۔ یہ کیسی محبت ہے تمہاری اس سے؟ اسے تکلیف دے کر تم کون سا سٹکھ ڈھونڈتے ہو؟۔۔۔“

لئے لائے تھے تم اسے اپنی زندگی میں؟ اس گھر میں؟“ فاطمہ کا لہجہ سخت تھا۔

”آئی ایم سوری ماما!“

”یہ سوری تمہیں مجھ سے نہیں، انا بیہ سے کرنا چاہئے۔“

”اس سے نہیں کر سکتا۔“ وہ چہرہ پھیرتے ہوئے مدغم لہجے میں بولا تھا۔

فاطمہ اس کے جواب پر حیران رہ گئی تھیں۔

”اگر تم نے غلطی کی ہے عفتان! تو تمہیں سوری بھی کرنا ہو گی۔ مجھے شرمندہ مت کرو۔ میں نے زندگی کے لئے کبھی غلط سبق نہیں پڑھایا۔ اپنی غلطی کو سدھارنے کی کوشش کرنا سکھایا ہے میں نے اپنی غلطی کو قبول کرنا سکھایا ہے ہمیشہ۔“

”میں قبول کرتا ہوں ماما! تبھی تو اسے سدھار بھی رہا ہوں۔“ عفتان کا جواب نہ سمجھ میں آ۔ ان کے حیرت سے دیکھنے پر وہ دباؤ دیتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

”سدھارنے کی ہی تو کوشش کر رہا ہوں۔ غلطی ہوئی مجھ سے۔ مگر اب کوئی مزید غلطی نہیں دو ٹوک لہجے میں کہہ کر وہ زینہ چڑھ گیا تھا۔ فاطمہ دیکھتی رہ گئی تھیں۔

عفتان علی خان دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ انا بیہ چونکی نہیں تھی۔ جس طرح ڈریسنگ سامنے کھڑی چوڑیاں اتار رہی تھی، اسی طرح کھڑی رہی تھی۔ عفتان علی خان نے دروازہ بند کر بنور دیکھا تھا اور پھر اس کی جانب پیش قدمی کر دی تھی۔ اس کے پیچھے رک کر اس کے شانوں پر اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا۔ انداز کچھ مختلف تھا۔

انا بیہ نے اس کی طرف چوکتے ہوئے کچھ حیرت سے دیکھا تھا۔ مگر عفتان نے بنا کچھ کہے کر بیڈ پر اچھالا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ سے چوڑیاں لے کر ڈریسنگ ٹیبل پر دھری تھیں اور اس کا

سبکدین حیدر لغاری نے ریوٹ اٹھا کر ٹی وی آن کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے ٹی وی اسکرین پر دیکھا تھا۔

”تم ہم مردوں کے بارے میں کیا کیا اول فول سوچتی ہوگی ڈیا نگ! مجھے یہ جان کر حیرت ہو رہی ہے۔“

”تمہیں یہ جان کر حیرت ہو رہی ہے اور مجھے تمہیں جان کر کوئی حیرت نہیں ہو رہی۔ تم بہت وقت سے رہے ہو گین!“

”کس بات کے لئے؟“ وہ چونکا تھا۔

”بہت کچھ ماننے کے لئے گین! تمہیں یقیناً یہ سب بہت مشکل لگ رہا ہے۔“

”کیا؟“ وہ غالباً اب بھی نہ سمجھا تھا۔

”محبت اتنا دقیق اور پیچیدہ معاملہ تو نہیں گین! بڑی چھوٹی سی، مختصر سی بات ہے۔ محبت ہے، نہیں ہے تو نہیں ہے۔“ گی ڈیا نگ نے بہت بڑی بات بہت چھوٹے سے پیرائے میں سمیٹ کر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری کا جوس لبوں تک لے جاتے ہاتھ رکا تھا۔

”محبت کو تسلیم کر گین!۔۔۔ جب تک تم خود تسلیم نہیں کرو گے، تم اور کسی کو بھی باور نہیں کرا سکو گے۔ محبت ایسا ہی دقیق معاملہ ہے۔“ گی ڈیا نگ پھر وہی داستان چھیڑے ہوئے تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ سبکدین حیدر لغاری نے چونک کر دیکھا تھا۔

”لیس۔“

ویٹر کھانا لے کر اندر داخل ہوا تھا اور ٹیبل پر کھانا لگانے لگا تھا۔

”میرا لُچ آ گیا ہے گی!۔۔۔ پھر بات کریں گے۔“ سبکدین حیدر لغاری نے کہہ کر بنا اس کے جواب کا انتظار کئے منقطع کر دیا تھا۔

عفتان علی خان کے انداز سے قطعاً کوئی ملامت یا پچھتاوا ظاہر نہ تھا۔ وہ بیکسر مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ گویا جو بھی اقدام اس سے سرزد ہوا تھا اس کا اسے کوئی ملال نہ تھا۔ وہ خود کو حق پر خیال کر رہا تھا۔

جبکہ انابیہ کی کیفیت بیکسر مختلف تھی۔ اس کی آنکھوں کی نمی سوکھنے میں نہ آ رہی تھی۔ جانے کس بات کا احساس جرم اسے سانس تک لینے نہ دے رہا تھا۔ وہ متواتر آنسو بہا رہی تھی۔

عفتان علی خان کوئی رد عمل ظاہر کئے بنا واٹش روم گیا تھا۔ فریش ہوا تھا۔ نیچے گیا تھا اور خلاف توقع ناشتے کی ٹرے لے کر واپس کمرے میں آ گیا تھا۔ انابیہ شاہ نے اس کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ گھٹنوں پر سر دہرے آنسو بہاتی رہی تھی۔ احتجاج پُر زور تھا اور اسی قدر عجیب بھی۔ عفتان علی خان نے دروازے کے قریب کھڑے اسے بغور دیکھا تھا۔ مگر اس کیفیت پر کوئی رد عمل دینے بغیر وہ پُر سکون انداز میں چلتا ہوا اس کے قریب آیا تھا۔ چند ثانیوں تک کھڑے ہو کر اس کے گھڑی سے بنے وجود کو دیکھا تھا۔

”میں اس کے سامنے رکھتے ہوئے خود بھی اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔“

اسے کوئی گناہ اس سے سرزد نہیں ہوا تھا۔ مگر اس گھڑی انابیہ شاہ کا احتجاج دیکھ کر اسے لمحہ بھر کو الجھن ہوئی تھی۔ مگر اس الجھن کو اس نے ظاہر کرنا ضروری نہیں خیال کیا تھا۔ بولا تھا تو انداز بہت پُر سکون رہا۔

”ہاشیہ کر لو انابیہ!“ اس کے خیال میں انابیہ کا احتجاج بہت فضول اور بچکانہ تھا۔ مگر فوری طور پر وہ اس حاسا سے نہیں کروانا چاہتا تھا۔

اس کے کہنے کا انابیہ کی طرف سے کوئی رد عمل نہیں آیا تھا۔ وہ جس طرح بیٹھی تھی، اسی طرح بیٹھی تھی۔

عفتان علی خان کو اس طرح کا اب تک کوئی تجربہ نہیں تھا۔ سو یہ ناز نخرے اٹھانا کچھ عجیب سا لگا تھا۔ مگر ہوا تھا، اس کے رد عمل کے طور پر اسے یہ سب تو اب فیس کرنا ہی تھا۔ اس کا اندازہ اسے ہو گیا تھا اس بڑی سے اس کے گھٹنوں کے گرد سے اس کے بازو ہٹاتے ہوئے اس کا چہرہ بھر پور توجہ سے اٹھا کر لگتا اور ملامت سے گویا ہوا تھا۔

”ہاشیہ کر لو شاہباش!۔۔۔ تم نے رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔“ ازالہ کرنے کو یہ اقدام اگرچہ کافی رہا۔ مگر اس سے زیادہ رعایت وہ اسے دے نہیں سکتا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایسی ہی رعایت دے کر پوچھا تھا۔

انابیہ بیگلی آنکھوں سے قائلانہ انداز میں اسے گھور رہی تھی۔ انداز جارحانہ اور غصے سے بھر پور تھا۔ مگر نانا جانے کیوں مسکرا دیا تھا۔

”مجھے نہیں، اس بریک فاسٹ کو کھانا ہے تمہیں۔ سو اس کی طرف توجہ دو انابیہ!“ ناشتے کی طرف توجہ دینا اشارہ کیا تھا۔ انابیہ کے انداز میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ غالباً وہ اس سے بات کرنے کے موڈ لگئی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ کوئی کرم کرنا تو دور کی بات تھی۔

”جوہو، اس کا فسوس بعد میں کریں گے۔ سوگ بھی منالیں گے۔ پہلے یہ بریک فاسٹ کر لیتے ہیں۔ ہمارے پکڑ میں، میں نے بھی رات کا ذر نہیں لیا تھا۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔ اور ناشتہ بھی ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ چلو شاہباش۔“ اسے بچوں کی طرح پچکارا تھا۔ انابیہ نے بنا اس کی طرف دیکھے چہرہ پھیر لیا تھا۔

انکھیں سوچی ہوئی تھیں۔ ناک، چہرہ سرخ ہو رہا تھا مگر وہ اب بھی اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ پھر والہ بنانے لگا تھا۔

”ناراض ہونا مجھ سے؟۔۔۔ میری طرف دیکھو گی بھی نہیں؟“ پتہ نہیں وہ واقعی توجہ پر مائل تھا یا پھر اس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کا مسکرانا مقابل کو یقیناً اس لمحے زہر ہی لگا تھا۔ عفتان علی خان کو اس بات کا اندازہ تھا غالباً تھی وہ لب بھینچ کر اسے دیکھتا ہوا تنجیدگی سے گویا ہوا تھا۔

”سوچنے، غور و خوض کرنے کو عمر بڑی ہے انابیہ!۔۔۔ بعد میں کریں گے۔ پہلے کچھ کھا لیتے ہیں۔ یہ زائد ضروری ہے۔“ نوالہ بنا کر اس کی طرف بڑھایا تھا۔ مگر انابیہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا اور پھٹ

پڑی تھی۔

”بات بھی مت کرو تم مجھ سے۔“ کہہ کر چہرہ پھیر لیا تھا۔ عفتان علی خان نے لمحہ بھر کو اس سے دیکھا تھا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔

”میں قطعاً بھی شرمندہ نہیں ہوں۔ میں نے کوئی جرم بھی نہیں کیا ہے۔ ٹیل می، وائے آئے آر یو این ویس روم؟۔۔۔ بی کوز یو آر مائے وائف۔۔۔ اپنی بیوی کے ساتھ اپنا رشتہ بنا کر میں کوئی جرم خیال نہیں کرتا۔ اگر تم کرتی ہو تو اس کا کوئی علاج میرے پاس نہیں ہے۔ برٹا سے۔۔۔ دیش ناٹ اے نارٹل بی ہیویئر۔ وہاٹ یو آر ڈونگ۔ بی آ میچور۔ یہی تمہارے لئے ہوگا اور میرے لئے بھی۔“ وہ دو ٹوک انداز میں کہہ رہا تھا اور انابییہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی تو فتح کب تھی اسے۔ ایک تو چوری، اس پر سینہ زوری۔ اس کی ہمت ہی تو تھی۔

”تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو؟۔۔۔ کیا خیال کرتی ہو؟ اس سے مجھے قطعاً کوئی پڑتا۔ کوئی وضاحت میں تمہیں دینا بھی نہیں چاہتا۔ تم مجھے ایک کمزور مرد خیال کرو، ہوں پرست ڈونٹ کیئر۔ ہوں ایک ہی رات میں ابھر کر سامنے نہیں آتی، یہ بات تم جانتی ہو۔ میں نے تمہیں دیا ہے۔ میرا تمہیں پانا دشوار کبھی بھی نہیں تھا۔ یہ ہوں پرستی پہلے بھی سامنے آسکتی تھی۔ مگر نہیں آئی اس کی وجہ تم خود سوچو تو جان سکتی ہو۔ سوچو مجھ پر کوئی بھی الزام عائد کرنے سے پہلے خود اپنے آپ انابییہ! وہاٹ یو ڈو؟“

کتنا بے ایمان شخص تھا۔ کتنے آرام سے سارا کا سارا الزام اس کے سر پر رکھ رہا تھا۔ سارے تھا وہ۔ جو الزام اس کے متعلق انابییہ کے دل میں تھے وہ ان سے بھی واقف تھا۔ پھر ایسا کیوں کر نے؟۔۔۔ اور ہمت یہ تھی کہ اس کے مقابل بیٹھان الزامات کی تردید بھی کر رہا تھا۔ انہیں ڈسکا رہا تھا۔ کیا وہ واقعی حق پر تھا؟۔۔۔ شاید نہیں۔

انابییہ کی ساکت آنکھوں سے بہت خاموشی سے بہہ کر رخساروں پر پھیلتے آنسو اس بات کا دلائل تھے۔ عفتان علی خان نے ان ہینگتی آنکھوں کو الجھن سے دیکھا تھا۔ پھر رد عمل کے طور پر نوالہ پٹہ دوبارہ رکھ دیا تھا اور بہت ضبط سے اسے دیکھتا ہوا گویا ہوا تھا۔

”تمہیں یہاں سے بڑے ہونے کی ضرورت ہے انابییہ شاہ!“ دماغ پر انگلی رکھ کر کچھ سخت لہے تھا۔ ”گروم اپ فرسٹ۔ دین ٹاک ٹومی۔“ اسے تلقین کرتے ہوئے وہ اٹھ گیا تھا۔ انابییہ شاہ اس کے جانے کے بعد بھی اسی پوزیشن میں بیٹھی آنسو بہاتی رہی تھی۔ چپ چاپ اسے کوئی سکون نہیں دے رہے تھے۔ مزید بے سکونی دے رہے تھے۔ اندر تک سناٹا پھیل رہا تھا اور ایک خوبصورت رات نوازی گئی تھی اسے۔

وہ باور کر رہا تھا کہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔

اس پر الزام رکھ رہا تھا کہ قصور کہیں نہ کہیں اس کا رہا ہے۔

وہ شرمندہ نہیں تھا۔

ہمت سے اس کے سامنے بیٹھابات کر رہا تھا۔

اپنے سر الزام بھی لے رہا تھا۔

مگر ان باتوں میں وہ ایک بات نہیں تھی۔

”رشتے“ کی ایک سمت کو واضح کرتی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ ایک بار بھی نہیں کہا تھا اس نے، اس رشتے کی اب سمت کیا ہوگی؟

اس کے خیال میں وہ بہک نہیں تھا۔ کوئی ہوس پرستی بھی نہیں تھی۔ اگر کوئی لسٹ نہیں تھی تو ایک بے سکونی وہ اپنے اندر کیوں محسوس کر رہی تھی؟۔۔۔ بہت کچھ نوازے جانے کے بعد بھی ایک خالی پن کا احساس اندریوں اٹھ رہا تھا؟

اس کی مرضی کے خلاف اسے حاصل کر کے اس نے ایسا کیا جرم کیا تھا اس پر؟

کل صبح وہ لامعا حق سے ایک نئے تعلق کے آغاز ہونے کی خبر اسے سنا رہا تھا تو پھر آج اس سے تعلق کی ڈور باندھنا کیا معنی رکھتا تھا؟

اذہان حسن بخاری کچھ اہم فائل دیکھ رہا تھا جب فارحہ کافی کا کپ ہاتھ میں لے اندر داخل ہوئی تھی۔

”یور کافی۔“ کپ ٹیبل پر رکھا تھا۔

”تھینک یومی!“ اذہان مسکرایا تھا۔

”یہ آفس کی فائلز گھر کیوں اٹھالائے؟۔۔۔ وہاں ٹائم کم تھا کیا؟“ ڈپٹا تھا۔

اذہان مسکرا دیا تھا۔

”کچھ اہم فائلز تھیں جن کا دیکھنا ضروری تھا۔ آپ کھڑی کیوں ہیں؟ بیٹھیں نا۔“ فائل پر سے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا تھا۔ فارحہ اسے بغور دیکھتی ہوئی مسکرا دی تھیں۔

”آپ ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟۔۔۔ میرے کسی اقدام سے خوش ہیں آپ؟“ اذہان نے اندازہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ فارحہ مسکرا دی تھیں۔

”ہاں۔۔۔ میں تم سے خوش ہوں۔۔۔ بہت خوش۔۔۔ ایسے بیٹے سے کون خوش نہیں ہوگا۔

لیکن میں ایک بات جانتا چاہتی ہوں۔“ فارحہ نے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”وہ کیا؟“ اذہان نے مسکراتے ہوئے کافی کا ایک کپ لیا تھا۔

”کیا تم خوش ہو؟“

”یہ کیسا سوال ہے؟۔۔۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں خوش نہیں ہوں؟۔۔۔ میں خوش ہوں۔“ اذہان نے ماں کے ہاتھ تھامے تھے۔ ”بہت خوش۔ آپ نے اتنی اچھی سی فیائی دی مجھے۔ اتنی اچھی زندگی دی۔ اور کیا چاہئے؟“ وہ مسکرایا تھا۔

فارحہ اس کے چہرے کو ہاتھ میں لے کر محبت سے دیکھنے لگی تھیں۔

”تم خوش ہوتے ہو تو مجھے زندگی خوبصورت لگنے لگتی ہے۔“

”اور آپ خوش ہوتی ہیں تو مجھے سب کچھ بہت اچھا لگنے لگتا ہے۔ میرب سے بات ہوئی کی؟“

”نہیں۔“ فارحہ اس اچانک ذکر پر کچھ حیران ہوئی تھیں۔ ”تمہاری بات ہوئی؟“

”نہیں۔ آپ نے انوائٹ نہیں کیا تھا انہیں؟۔۔۔ ساہیہ بھی پوچھ رہی تھی۔“

میں کہا تھا۔

فارحہ مسکرا دی تھیں۔

”نہیں۔ فون کیا تھا میں نے۔ مظہر بھائی صاحب سے تو بات نہیں ہوئی، ان کی بیگم

سے بات ہوئی تھی۔ میں نے انہیں اطلاع دے دی تھی۔ میرب کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ

نہیں ہے۔“

”پھر کہاں ہے؟“ اذہان نے سرعت سے دریافت کیا تھا۔

”غالبا شہر سے باہر کہیں گئی ہوئی ہے۔“

”تو آپ نے اس کے سیل پر ٹرائی نہیں کیا؟۔۔۔ کہیں شادی کر کے رخصت تو نہیں ہو گئی

انداز کو معمول پر رکھتے ہوئے بہت سرسری انداز میں وہ مسکراتے ہوئے یوں گویا تھا جیسے کوئی بہت

ذکر کر رہا ہو۔ فارحہ بیٹے کی کیفیات کو بخور چاچا رہی تھیں۔

”نہیں۔ وقت نہیں ملا۔ یہاں تمہاری انکچ منٹ کی تیاریاں اتنی زیادہ تھیں کہ بالکل بھی

نہیں رہا۔“

”ارے، آپ کو اپنی نیس یاد نہیں رہی؟ اسے خبر ہوگی تو شکوہ کرے گی۔ اس نے سختی سے تاکید کی

انوائٹ کرنا چاہئے تھا۔ آپ مجھ سے الگ تو نہیں۔ اور یوں بھی یہ ڈیپارٹمنٹ تو آپ کے ہاتھ تھا۔“

”ہاں۔ مگر غلطی ہو گئی۔“ فارحہ نے پُر افسوس انداز میں کہا تھا۔ پھر مسکرا دی تھیں۔ ”میں بات

کی۔ اس کا سیل نمبر تھانا تمہارے پاس؟“

”ہاں، غالباً سیل میں تو تھا۔“ وہ یوں سرسری انداز میں ذکر کر رہا تھا جیسے بہت ہی معمولی سا ذکر

ہو۔ پتہ نہیں واقعی ایسا تھا یا وہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا، خود کو بھی اور دوسروں کو بھی۔ فارحہ کچھ

تھیں۔

اذہان نے کافی کاسپ لے کر کپ ایک طرف رکھتے ہوئے سیل اٹھا کر ڈائریکٹری میں سے اس

نکالا تھا اور کالنگ کا بٹن پیش کر دیا تھا۔ سیل گئی تھی اور کال کنکٹ ہو گئی تھی۔

”ہیلو۔۔۔!“ ایک جانا بیچانا لہجہ سماعتوں میں گونجا تھا۔

”میرب!۔۔۔ اذہان ہیئر۔“

میرب فوری طور پر کچھ نہیں بولی تھی۔ پھر جیسے مردتا گویا ہوئی تھی۔

”اذہان! کیسے ہو تم؟“

میں ٹھیک ہوں۔۔۔ تم کیسی ہو؟“

”کیسے فون کیا؟“ اس کا لہجہ بہت تھکا سا تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کے باعث وہ اس وقت

میں زلزلہ نہیں تھی۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ آر یو آل رائٹ؟“ اذہان نے اس کی آواز کی

میں سن کر ہنسنے لگی۔ وہ لمحہ بھر کو چوکی تھی، پھر معمول کے مطابق جواب دیتی ہوئی

تھیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ آئی ایم رائٹ۔ تم سناؤ، انکچ منٹ کر لی، مجھے انوائٹ نہیں کیا

میں۔ مگر اس طرح چھوٹے ہی؟ اس کا اندازہ نہیں تھا۔

”مگر فون کیا تھا۔۔۔ مظہر انکل گھر نہیں تھے۔ مگر دوبارہ آئی نے بتایا کہ تم گھر نہیں ہو۔ پھر کیسے

میں آئے؟“ وضاحت دی تھی۔ مگر بہت ہی کمزور وضاحت تھی۔ میرب جانے کیوں مسکرا دی تھی۔

”اذہان! جو نمبر تم نے اس وقت ملایا ہے اس روز بھی ملا سکتے تھے۔ ایزی ویز۔ آئی کیسی ہیں؟“

اذہان لب بھینچ کر رہ گیا تھا۔ دونوں سمجھ رہے تھے کہ دونوں ایک دوسرے سے قصد ابھاگ رہے تھے۔

دونوں جانتے تھے تو پھر کسی وضاحت کی ضرورت بھی باقی کب بنتی تھی۔

”ہاں نہیں ہیں۔ انہی نے تمہارا نمبر بھی طوایا تھا۔ لو بات کرو۔“

اذہان نے ماں کو فون تھا دیا تھا اور خود سر جھکا کر فائلز دیکھنے کے ساتھ کیلی کافی کے سپ لینے لگا تھا۔

”ہاں میرب! بیٹا کیسی ہو؟“ فارحہ نے ایک نگاہ بیٹے کو بخور دیکھا تھا پھر چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھیں۔

پ سے بات کرتے ہوئے انہیں جو اندازہ ہوا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ دل جو بھل سا تھا۔ وہ لان میں نکل

گئی۔ لہذا یہ آسان بھی نہیں تھا۔ وہ اذہان کی کیفیت سمجھ رہی تھیں۔ مگر وہ اس کے لئے کچھ کر بھی نہیں

سکتی۔ وقت گزر چکا تھا۔ اور جو موجودہ دور میں ہو رہا تھا، وہی ٹھیک تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں اور میرب

کی۔

”آئی! آئی! ایم سوچ بیسنگ یو۔۔۔ بہت دل چاہ رہا ہے آپ سے ملنے کو۔“

فارحہ مسکرا دی تھیں۔

میرا دل بھی اپنی بیٹی کو دیکھنے کو بہت چاہ رہا ہے۔ جانتی ہو کتنے وقت سے تم نے صورت نہیں دکھائی۔“

میرب بہت بے بسی سے مسکرا دی تھی۔

”ہاں، جانتی ہوں۔“ آنکھیں نمی سے جانے کیوں بھرنے لگی تھیں۔

”آپ نے تو آنکھوں پر گن رکھے ہوں گے۔ مگر بھولی تو میں بھی نہیں ہوں۔ جانتی ہوں بہت سے دن

بھر کچھ نہیں۔“ مسکراتے ہوئے آنکھوں کی نمی انگلی کے پوروں پر لی تھی۔

”تو آج آ جاؤ نا۔“ فارحہ نے محبت سے کہا تھا۔ آخر کو عزیز ترین بھانجی تھی۔

”ہاں۔۔۔ جلد آ جاؤں گی۔“ میرب اپنی کیفیت کو دبانے کے لئے مسکرائی تھی۔ تبھی مائی اماں نے

میرب بولی تھی۔

بچہ عفتان بھائی خود ہی چلے آئے۔“ انوشے بولی تھی۔ فاطمہ اور عریشہ نے پلٹ کر دیکھا تھا۔
سکراتے ہوئے ان کی طرف پیش قدمی کر دی تھی۔

اگلے رہا نہیں گیا تا کرے میں۔ ہمیں معلوم تھا، اسی لئے ہم انا بیہ بھابی کو اٹھنے نہیں دے رہے
تھا۔ وہ انا بیہ کے عین سامنے بیٹھتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

بہار جمع رکھو۔ ابھی وقت نہیں آیا کہ کسی کے بہانے تم لوگوں کو کوئی مراعات نلے۔ مجھے
اپنے مقام پر رکھنا آتا ہے۔ اپنی ذمہ داریوں سے واقف ہوں۔ جانتا ہوں، کس رشتے کو کیسے
اپنی بہنوں کے لئے میرے پاس وقت ہمیشہ ہوتا ہے۔“ ہاتھ بڑھا کر عریشہ کے گپلو سے بیٹے کو
لوٹے لیا تھا۔ ہاتھ سے ہاتھ کرائے تھے۔ انا بیہ اس لمس سے جیسے سلگ اٹھی تھی۔

رہا۔

رہا۔

رہا۔

اس لئے اس جگہ سے اٹھ کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ جس لمحے سے بچنے کو تھی۔ جس کی قربت سے
بھی وہی اس لمحے اس کے سامنے تھا۔ وہ بے تاثر نظر آنے کی کوشش کرتی اس وقت بہت مضحکہ
خیز لگی۔

اب آپ کو کیا ہوا؟۔۔۔ برامان گئیں کیا؟ ہم تو مذاق کر رہے تھے۔“ عریشہ نے مسکراتے ہوئے

ابھی مسکرائی تھی۔

ہاں کی کوئی بات نہیں۔“ مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

ابھی کچھ بڑا نہیں ہو گیا؟“ بچے کو پیار کرتے ہوئے عفتان نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا
چونکہ بڑی تھی۔

مطلب بڑا ہو گیا؟“

نہاں کیا تھا۔

تم اس کی ڈائٹ پر دھیان دے رہی ہو۔ آئی مین تمہارے ہاں موٹا پا کچھ زیادہ ہے
سائز میں، ان کے پیرنٹس۔۔۔ اور شاید یہ ٹیو بھی اسی لئے اچھا خاصا صحت مند ہے۔“ عفتان
الٹا تھا کہ انوشے ہنستی چلی گئی تھی۔ فاطمہ بھی مسکرا دی تھیں۔ عریشہ نے بھر پورا احتجاج کیا تھا۔

کیا مطلب ہے آپ کا؟۔۔۔ ماشاء اللہ۔۔۔ ہاں ہے صحت مند میرا بچہ۔ اب کیا نظر
لگتا ہے؟“ اس کے دہائی دینے کا انداز خوب تھا۔ انوشے پیرٹ پکڑ کر ہنس رہی تھی۔ انا بیہ جیسے اس
حصہ کی ہنس گئی۔

ابھی کے بچے ہوں گے نا۔۔۔ پھر پوچھوں گی۔“ عریشہ نے بھائی کی گود سے اپنے صحت مند

”میں آپ سے بعد میں بات کروں گی آنٹی!“

”ٹھیک ہے بیٹا! مگر اپنا خیال رکھنا۔“

”جی، آپ بھی۔“ میرب نے دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ فارحہ کی نگاہ
اٹھی تھی۔ کھلی کھڑکی میں اذہان مضطرب سا کھڑا تھا۔ انداز بہت کھویا کھویا سا تھا۔

وہ جیسے اس ماحول کا حصہ نہیں تھا شاید اسی لئے اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ فارحہ
ہیں۔ فارحہ کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ مگر بیٹے کی کیفیت کا کوئی تدارک ان کے ہاتھ نہ تھا۔
انداز میں وہ اندر کی جانب چل پڑی تھیں۔

اب وقت وہ تھا کہ جہاں انا بیہ شاہ صورت حال سے بھی فرار چاہتی تھی اور ماحول
آسان نہیں تھا۔ عفتان علی خان نے ایک ہی پل میں اس کے سارے کے سارے راستے

تھے اور ایسا کر کے اس کی صورت حال اتنی مشکل کر دی تھی کہ وہ اپنا دم گھٹتا ہوا سانسوں کر
سارا دن وہ ماما اور انوشے کے ساتھ بڑی رہی تھی۔ عریشہ آئی ہوئی تھی۔ بلاوجہ ان

ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھی۔ بولنے کی وہ زیادہ عادی تو نہیں تھی مگر عریشہ اور انوشے
بولتی تھیں کہ اسے زیادہ مشقت کرنا نہیں پڑتی تھی۔ اس وقت بھی وہ عریشہ کے گول ٹیولر

میں بٹھائے انوشے کی بات سن رہی تھی جب فاطمہ نے اسے احساس دلایا تھا۔

”انا بیہ! بیٹا خاصا وقت ہو گیا ہے۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔“

”جی۔“ وہ سعادت مندی سے گویا ہوئی تھی۔

”ماما! رہنے دیں نا بھابی کو یہیں، اگر ان کا موڈ نہیں ہو رہا تو۔“ انوشے نے مسکرا
”یوں بھی بھابی اکثر تو اپنے کمرے میں ہی رہتی ہیں۔ کتنا مزہ آ رہا ہے نا۔۔۔ آپ

کہہ دیجئے، اگر وہ بھابی کو زیادہ مس کر رہے ہیں تو خود بھی یہاں آ جائیں۔“ انداز میں بھولی
ہنس دی تھی۔ انا بیہ جھینپ گئی تھی۔

”آئیڈیا برا نہیں ہے۔ ویسے عفتان بھائی کو بھی ہمیں جو انکرن کر لینا چاہئے۔“

”کوئی کسی کو جوائن نہیں کر رہا۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ اٹھو تم دونوں بھی۔ انوشے
بھی جانا ہے۔ آنکھ نہیں کھلے گی۔“

”آنکھ نہیں کھلے گی تو چھٹی کروں گی۔ کتنے دنوں بعد تو عریشہ آئی ہیں۔ اور ٹیو بھی
نہیں چاہ رہا جانے کا کیسے۔“ انوشے منمنائی تھی۔

”کچھ عرصہ انتظار کرو۔ انشاء اللہ بہت جلد ایسا کپلو سا بیٹا انا بیہ بھابی کی اپنی گود میں
شوق پورے کر لینا۔“ عریشہ مسکراتی ہوئی شرارت سے بولی تھی مگر انا بیہ کان کی لوں تک

اچھا ہوا تھا، وہ یہاں نہیں تھا۔ سوچتے ہوئے سر اٹھایا تھا، تبھی دل اچھل کر حلق میں آگ
ساتھ لگا دکھڑا تھا۔ جانے کب وہ یہاں آیا تھا۔ انا بیہ شاہ کو اپنی نظروں کو واپس موڑنا پڑا

بچے کو لے کر بھر پور پیار کیا تھا۔ عفتان، ہنس دیا تھا۔

”کیا پوچھو گی؟ — میرے بچے تمہارے ٹیپو کی طرح ہو سکتا ہے“ بہت زیادہ“ صحت مگر ”صحت مند“ ضرور ہوں گے اور خوبصورت بھی۔ اسپیشلی میرے بچوں کی آنکھیں بہت خوبصورت گی۔“ انابہ کی طرف اک نگاہ خاص ڈالتے ہوئے وہ گویا تھا۔ انابہ زمین میں گڑھ جانے کو ”باکی“ کی حد تھی۔

عریضہ مسکرا دی تھی۔

”ہاں کیوں نہیں ہوں گی۔ ان بچوں کی ماں کی آنکھیں جمیل سیف الملوک جیسی جو ہیں۔“

”ماں کیوں؟ تمہیں باپ کی آنکھیں کچھ کم خوبصورت لگتی ہیں؟“ اپنی شان میں قصیدہ گواہ تھی۔ حد تھی خوش فہمی کی بھی۔

انابہ متواتر اجنبی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ماحول اسے پھر بھی گھیر رہا تھا۔ مقابلہ نظر ملتی تھیں۔ وہ مکمل استحقاق سے اسے دیکھ رہا تھا اور اب تو گواہی کے طور پر اس کا ہاتھ بھی تھا۔ گواہی طلب کرتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

”انابہ! بتاؤ انہیں — کیا میری آنکھیں کم خوبصورت ہیں۔ تم بتاؤ، تم کیا سوچتی ہو؟ ہاں کی آنکھیں تم جیسی ہونی چاہئیں، سرمئی، ہری، نیلی، شریقی، یا پھر مجھ جیسی بھوری؟“ ڈھٹائی کی بھر پور انداز میں مسکراتا ہوا اس سے جواب چاہ رہا تھا۔ انوشے، عریضہ مسکرا رہی تھیں اور وہ اسے لے اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر وہاں سے بھاگ ہی سکتی۔ یہ گزرتے لمحے، دن اسے وہ تجربے تھے جن کی وہ پہلے عادی نہیں رہی تھی۔ شاید اسی لئے سب کچھ جھیلنا بھی بہت دشوار ہوا۔ لے وہ اس شخص کو جواب دینا تو درکنار، اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

”بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرے بھائی کی آئینز زیادہ خوبصورت ہیں۔ شفاف، چمکدار، انوشے نے بھائی کی بھر پور طرف داری کی تھی۔ عفتان مسکرا دیا تھا۔ انداز بھر پور فاتحانہ تھا۔

”دیکھا — آئی نیوٹ — جانتا تھا میں — دیکھو انابہ! تم پار گئیں۔“ ڈوڈو مسکراتے ہوئے گویا اس نے تیرا چھالا تھا۔ انابہ ایک لمحے میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”ایکسکوز می، مجھے نیند آ رہی ہے۔“ وہ کہہ کر بنا کسی کاررو عمل دیکھے وہاں سے نکل گئی تھی۔

بنور ہو کر دیکھا تھا۔ ان دونوں کے بیچ کا تناؤ ان کی نگاہ سے چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ عریضہ نے سے دیکھا تھا۔

”ناراض کر دیا نا بھائی کو؟“

”نہیں — وہ ناراض نہیں ہوتی۔ شی از ویری انڈر اسٹینڈنگ۔ وہ غالباً واقعی تنگ

کی غیر موجودگی میں بھر پور حمایت کی تھی اس کی۔ اور خود بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”تم لوگ سو جاؤ اب۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔ گڈ نائٹ۔“ عفتان چلا ہوا کمرے کی

تھا۔ اس کا اطمینان اس کی چال تک سے واضح تھا۔

میرب دن بھر مائی کے ساتھ مصروف رہی تھی مگر جیسے ہی اسے وقت ملا تھا وہ مائی کے سونے کے بعد اس طرف آگئی تھی۔ فطری طور پر وہ تجسس نہیں تھی۔ مگر پھر بھی جو تھا، وہ اپنے اندر اسرار ضرور لئے ہوئے تھی۔ وہ خاتون کچھ خاص تھی۔ سب سے بڑی بات، اب تک جو اس نے اس کے بارے میں قیاس کیا تھا وہ اسے نظر ثابت ہوا تھا۔ وہ کبھی تھی وہ ”وکلم“ ہے۔ جس کو یہاں اس حالت میں رکھ کر ”وکلمنا“ بنایا جا رہا ہے۔ مگر جس طرح وہ سردار سیکٹین حیدر لغاری کی قصیدہ گوئی کرتے ہوئے تقریفوں کے پل بانڈ رہی تھی اس سے قطعاً نہیں لگتا تھا کہ اسے یہاں پر کسی سے کوئی شکایت بھی ہے۔

بات تو حیرت کی تھی۔ جیسا اس نے سوچا تھا، ویسا نہیں تھا۔ دوسرا وہ اب تک نہیں جان پائی تھی کہ وہ کون تھی اور یہاں اس حالت میں کیوں تھی؟ دو ملاقاتیں ہوئی تھیں اس کی، اس چہرے سے اور وہ اس کا نام تک نہیں جان پائی تھی۔ کچھ تو تھا۔ مائی اماں نے کبھی سرسری انداز میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کئی ماں ان کے مابین ہوتی تھیں مگر کبھی اس بند کمرے کا ذکر نہیں آیا تھا۔ کبھی اس بند کمرے میں چھپے چہرے کا ذکر نہیں آیا تھا۔

کون تھی وہ؟

میرب سیال نے دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے اندر جھانکا تھا۔ وہ چہرہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ میرب بطور خاص ان کے لئے تازہ پھول لائی تھی جو اسے تھمائے تھے۔

”بھٹیکس۔“ وہ ایزی چیئر پر بیٹھی پھول تھامتھی ہوئی مسکرا دی تھی۔ میرب آگے بڑھ کر کھڑکی سے باہر سرکانے لگی تھی۔ جب وہ بولی تھی۔

”اس کی کیا ضرورت تھی؟“ پھولوں کو عجیب سے انداز میں دیکھتے ہوئے وہ بہت پھیکے سے انداز میں گرائی تھی۔ اور پھر ان پھولوں کو ایک طرف رکھ دیا تھا۔ میرب نے کھڑکیاں کھولتے ہوئے اس کے اس اندام کو چونکے بغیر دیکھا تھا۔

”آپ کو پھولوں سے لگاؤ نہیں؟“ اس کے لہجے میں حیرت نہیں تھی۔

”نہیں۔“ اس خاتون کا جواب قطعی تھا۔

”حیرت ہے۔“ میرب نے چونکتے ہوئے مسکرا کر انہیں دیکھا تھا۔

”کس بات پر؟“ وہ خاتون اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ غالباً ان دنوں وہ اپنا خیال رکھ رہی تھی۔ اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر لگ رہی تھی۔ بہت فریش تو نہیں مگر وہ کچھ بہتر لگ رہی تھی۔

”محبت کی باتیں کرنے والا لہجہ پھولوں کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے؟ — محبت کی گفتگو کرتی یہ آنکھیں پھولوں کو دیکھنا کیوں نہیں چاہتیں؟“ وہ لوجیکلی اس نقطے پر پہنچتے ہوئے بولی تھی۔

خاتون مسکرا دی تھی۔ انداز بہت بجا بجا سا تھا۔ وہ جیسے اس کے سوال کا مفہوم بہت واضح انداز میں سمجھ گئی تھی۔

”لفظ بولنا آسان ہے۔ مگر لفظ بھی ایک دن بچھ جاتے ہیں جیسے یہ آنکھیں بچھ جاتی ہیں۔ خوشبو کسی

شے میں باقی نہیں رہتی۔ یہ پھول بہت خوبصورت ہیں، جانتی ہوں میں۔ مانتی ہوں۔ مگر یہ بہت ہی نہیں رہیں گے۔“

”مگر آپ تو کہہ رہی تھیں محبت ہمیشہ آباد رہتی ہیں۔“ میرب نے انہیں گھیرا تھا۔

”ہاں۔۔۔ رہتی ہے۔ مگر ان کھنڈروں میں کوئی صدا سننے نہیں آتا۔ تم نے کسی کو مر جھائے ہو پھول اٹھاتے دیکھا ہے؟“ خاتون نے اپنی دانست میں اسے لاجواب کرنا چاہا تھا۔

میرب مسکرا دی تھی۔

”مگر ایسا نہ ہونے سے پھولوں کی وقعت تو کم نہیں ہو جاتی۔ پھول تو پھر بھی پھول ہی رہتے ہیں۔“

پھول ہی کہلاتے ہیں۔“ میرب سیال جیسے اسے قائل کرنے پر مائل تھی۔ وہ خاتون خاموش ہو کر چہرہ گئی تھی۔ میرب نے اسے مزید نہیں اکسایا تھا۔ قدرے توقف سے وہ خود ہی بولی تھی۔

”پھولوں کی تازگی اور خوشبو محبت کے اوائل کے موسموں جیسی ہے۔ مگر دونوں قائم رہنے والی چیزیں نہیں ہیں۔“ اس کا لہجہ ٹھہرا ہوا تھا جیسے بہت سے زمانے بول رہے تھے۔

”یعنی آپ خیال کرتی ہیں، محبت مر جاتی ہے؟“ میرب رسائیت سے مسکرائی تھی۔

”نہیں۔۔۔ محبت نہیں مرتی، یہ لہجہ مارتی ہے۔ مگر اس کے باوجود جینے پر اُکساتی ہے۔“ ننگی

سر ہلاتے ہوئے وہ حتیٰ لچھے میں گویا ہوئی تھی۔

”آپ محبت کے متعلق اتنے وثوق سے کیسے بول سکتی ہیں؟“ میرب کے ہاتھ ایک ایسا پہلو آیا تھا

سے بہت سے دروازے کھل سکتے تھے۔ سو اس نے موقع جانے نہیں دیا تھا۔

وہ خاتون مسکرا دی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے کبھی راگھ میں کئی چنگاریاں ہولے ہولے دہک رہی ہوں

”میں نے محبت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ قدم قدم چلی ہوں میں اس کے ساتھ۔ کیسے ڈوڈ

بات نہ کروں؟“ وہ صاف گوئی سے بولی تھی۔ میرب نے کسی قدر حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔ ایک

ان آنکھوں سے جھانک رہا تھا۔ میرب نے اس چہرے کے درد کو جانے کیوں اپنے بہت اندر

تھا۔ بہت آہستگی سے چلتی ہوئی وہ آگے بڑھی تھی اور اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنا نازک سا ہاتھ

ہاتھ پر رکھ تھا۔ انداز بہت ہمدردانہ تھا۔

”کون ہیں آپ؟“ اس طرح یہاں کیوں ہیں؟“

وہ خاتون مسکرا دی تھی۔ جیسے اس کی طرف سے اس سوال کی توقع پہلے سے کر رہی ہو۔

”تم نے یہ ایک سوال بہت دیر میں پوچھا۔“ اپنی حیرت واضح کی تھی۔ ”تمہیں یہ سوال غالباً

پہلے پوچھ لینا چاہئے تھا۔“

”کیا میں نے کچھ غلط پوچھا؟“ میرب نے نرمی سے دریافت کرتے ہوئے ان بھی آنکھوں

جھانکا تھا۔ اس خاتون نے کچھ ثانیوں تک خاموشی سے اسے دیکھا تھا پھر بہت نرمی سے مسکرائے

نئی میں ہلا دیا تھا۔

میرب نے مزید کچھ نہیں پوچھا تھا۔ غالباً وہ اسے خود کو کمپوز کرنے کا وقت دے رہی تھی۔

”تم یہاں میرے پاس کیوں آئی ہو؟“ خاتون نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”نہیں جانتی۔ مگر میں آپ کو اس کیفیت میں بھی نہیں دیکھ سکتی۔ یونیورسٹی آڈاکٹر۔۔۔ یونیورسٹی

ہاں۔ آپ چلیں یہاں سے۔ میں آپ کو اس قید سے نکالنا چاہتی ہوں۔“

وہ خاتون مسکرا دی تھی۔

”مگر میں قید میں نہیں ہوں۔“

”تو پھر؟“ میرب نے استفسار کرتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”اپنی مرضی سے یہاں ہوں۔“ خاتون کے لہجے میں اطمینان تھا۔

”کیوں؟“ میرب کو شدید ترین حیرت ہوئی تھی۔

”ہر سوال کا جواب نہیں ہوتا۔“ ایزبی چیئر کی پشت سے سرٹکا کر وہ اطمینان سے گویا تھی۔ میرب اس

لہجے سے بڑے لہجے پر حیران رہ گئی تھی۔

”اس طرح۔۔۔ خود اپنے ساتھ آپ کیسے کر سکتی ہیں؟ کون ہیں آپ؟ گین کی خالہ،

نیا۔۔۔“ میرب کا سوال ادھورا رہ گیا تھا۔

”رمدار بنگلین حیدر لغاری کی بیوی ہوں ہیں۔“ وہ خاتون اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی تھی۔ میرب

ہانگے جیسے پتھر ہو گئی تھی۔

”کیا؟“ اسے لگا تھا جیسے اس نے سننے میں کچھ غلطی کر دی تھی۔

”گین کی بیوی ہوں میں۔“ وہ خاتون باور کراتی ہوئی کہہ رہی تھی اور میرب کو لگا تھا جیسے اس کی

انٹل میں کسی نے پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو!

میرب کے اندر نہ بولنے کی سکت باقی تھی، نہ ہی اسے جھٹلانے کی یا کوئی سوال کرنے کی۔ وہ صرف

پیشانی سے پھٹی آنکھوں کے ساتھ اس چہرے کو دیکھ رہی تھی جو اس لمحے پُر اعتمادی سے کہہ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ گین کی بیوی ہوں میں۔ میں جانتی ہوں تمہارے لئے یہ شاک کا باعث ہو گا۔ لیکن

انڈر۔۔۔ شاید گین نے تمہیں اس بارے میں کچھ نہ بتایا ہو۔ یوں بھی جو رشتہ اپنے اصل خواص کے

تھوڑے قلم نہ ہو، اس کی حیثیت یوں بھی کا لحدم ہو جاتی ہے۔ رشتہ صرف بنانے کے لئے نہیں ہوتے،

پانپنے کے لئے بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ ہم نے یہ رشتہ ایک دوسرے سے کبھی نہیں نبھایا۔ ہم میں

کچھ صرف نام کا تھا۔ اس کے سوا اس کی کچھ حقیقت باقی نہیں۔“

لفظ ان کی طرح میرب سیال کے سینے میں کھب رہے تھے۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ وہ سننا

نہیں چاہتی تھی مزید ایک لفظ بھی۔

اس میں سکت نہیں تھی۔ حوصلہ بھی باقی نہیں تھا۔ مگر وہ اتنی بے بس تھی کہ وہاں سے ہل بھی نہ سکی تھی۔

مبارا وجود جیسے پتھر کا ہو چکا تھا۔ خاتون نے اپنے نحیف چہرے سے اسے کسی قدر پُر افسوس انداز سے

دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ آہستگی سے تھاما جو رخ سرد ہو رہا تھا۔

اسے اپنے سامنے کھڑی اس لڑکی کی اندرونی حالت کا اندازہ بخوبی تھا۔ مگر وہ کوئی چارہ گری کرنے

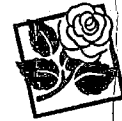
کے لئے جیسے خود کو مکمل طور پر بے بس پارہی تھی۔

”میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ آئی ایم سوری، اگر میری وجہ سے تم دل ہوئی ہو تو۔“ کمزور آواز دب گئی تھی۔ پڑمردہ لہجہ کھو گیا تھا۔ میرب کی ساکت آنکھوں سے نمکین چند قطرے بڑی خاموشی سے ٹوٹے تھے اور رخساروں پر بہہ گئے تھے۔

وہ رو رہی تھی، اس شخص کے لئے جس نے سوائے دکھ کے، تکلیف کے اسے کچھ نہیں دیا تھا کے لئے افسوس کر رہی تھی جو اس کا سرے سے کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ اس کے لئے سوگ منا رہی تھی باوقاف تھا ہی نہیں۔

”میں تمہارے بارے میں جانتی تھی۔ میں خوش تھی، تم گین کی زندگی میں ہو۔ مجھے تم سے نہیں، مجھے گین سے بھی کوئی شکوہ نہیں۔ ہم ایک دوسرے سے کوئی شکوہ کر ہی نہیں سکتے۔ قصور ہے۔“ وہ خاتون اس کی سمت دیکھتی ہوئی مدہم لہجے میں کہہ رہی تھی۔ کمرے میں اک ہو گا سنا صرف وہ کمزور آواز اس ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ صرف اس ماحول میں ہی نہیں، میرب کے اندر بھی۔

”قصور ہم دونوں کا نہیں ہے، ہماری روایتوں کا ہے۔ ہم روایتوں کے ڈسے ہوئے ہے روایتیں برتنے کے لئے ہوتی ہیں۔ مگر یہاں ہمیں ہماری روایتوں نے برتا ہے۔“ وہ مبرمانہ انداز میں یوں گویا تھی جیسے میرب کے تمام دکھ کو بھر پورا زائل کرنا چاہتی ہو مگر کرنہ پارہی ہو۔ میرب اب بھی اسی طرح پتھر بنی، ساکت وہ جامد کھڑی تھی۔



عفتان کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اور رخ پھیرے کھڑی انابیہ کی ساری حسین لمبے کے ہزاروں لمبے میں بیدار ہوئی تھیں۔ مگر وہ پلٹی نہیں تھی۔ دھڑکنوں میں اچانک لڈ آنے والا ارتعاش اتنا سنگین تھا کہ وہ ہاپوانے کی کوشش میں خود کو بالکل بے بس پارہی تھی۔

عفتان قدم آگے بڑھاتا ہوا اس کے قریب آن رکھا تھا۔ وہ تب بھی نہیں پلٹی تھی۔ شاید وہ اس وقت اس لمبے میں تھی جہاں وہ ”کبوتر“ بن کر آنکھیں تختی سے میچ لینا چاہتی تھی۔ مگر ایسا ہونے سے یقیناً خطرہ ٹل نہیں لگا تھا۔ سوس نے کوئی بے وقوفی بھی تاحال نہیں کی تھی۔ عفتان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے شولڈر پر رکھا تھا اور اس کا رخ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔

انابیہ کے اندر جیسے کئی قیامتوں نے ایک ساتھ سر اٹھایا تھا۔

”کوئی نہیں ہے۔“ بہت خوفزدہ سے لہجے میں اس نے وضاحت دی تھی جسے عفتان علی خان یکسر نہیں سمجھا تھا۔

”کہاں؟“ استفہامیہ انداز انابیہ کو اور بھی مشکل میں ڈال گیا تھا۔ انابیہ نے پانیوں سے بھرنی آنکھوں کے ساتھ بہت بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔ عفتان کو اس لمبے اس پر جیسے ترس سا آ گیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر نرمی سے اس کے چہرے کو چھوا تھا۔ انداز بھر پور ہمدردی لئے ہوئے تھا۔ مگر وہ ان نوازشوں کے زیر خود کو بہت ناتواں سمجھوس کر رہی تھی تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں میچی تھیں تو ساری نمی رخساروں پر آگئی تھی۔

”کہیں کوئی نہیں ہے۔“ مدہم لہجے میں ایک بار پھر وضاحت دی تھی۔ عفتان علی خان کے دل پر کئی لپکتوں نے ایک ساتھ بڑاؤ ڈالا تھا۔ وہ اپنی دانست میں اس سے بچنے کی سعی کر رہی تھی۔ مگر دوسری طرف صورت حال اتنی ہی مشکل ہو رہی تھی کہ کوئی بچنا چاہتا بھی تو نہ بچ سکتا تھا۔ عفتان علی خان نے اسے ٹانوں سے تھام کر بھر پور استحقاق جتاتے ہوئے اسے خود سے کچھ قریب کیا تھا۔

”میں ضبط باندھنے کے سارے جتن کر کے تھک جاتا ہوں انابیہ! تم ایک پل میں سب کچھ زبردستی کیے کر دیتی ہو؟“ اپنے سامنے موجود چہرے کو دیکھتے ہوئے بھر پور شکوہ کیا تھا۔ انابیہ جیسے اس لمبے سے بھر پور طور بچتا چاہتی تھی۔ وہ واقعی ”کبوتر“ بن گئی تھی۔ اور آنکھیں نہیں کھول رہی تھی۔

”کہیں کوئی نہیں ہے۔“ ایک ہی جملہ دہراتے ہوئے وہ اس لمبے بہت بے بس لگی تھی۔ وہ اس لمبے اس انداز میں کانپ رہی تھی۔

”تمہارے قریب آنے کی سعی کرنا نہیں چاہتا۔ مگر تم بے بس کر دیتی ہو۔ یہ تمہارا کمزور کا نپٹا وجود، مجھے

”مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ حیرت تب ہوتی جب تم ایساری ایکٹ نہیں کرتیں۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھا ہوا وہ کہہ رہا تھا اور انا بیہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں اس کی کوئی بات نہیں آتی تھی۔

”تمہارے لئے شاید یہ واقعی بہت بڑا راز ہے جس سے آج پردہ ہٹا تھا۔ مگر میں اسے راز نہیں کہوں گی۔ راز تو یہ تب ہوتا جب تمہیں اس کے بارے میں اس گھر کے باہر کے کسی فرد سے بھنگ پڑتی۔ یہ صرف ایک غیر اہم قصہ یا غیر ضروری بات تھی جسے تمہیں بتانا ضروری اس لئے خیال نہیں کیا گیا کہ ایسا ضروری نہیں تھا۔“

میرب سیال سر جھکائے کھڑی تھی۔ جب اس خاتون کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ اس بات سے وجود میں ایک لمحے کو حرکت ہوئی تھی اور اس نجیف و کمزور نظر آنے والے چہرے کو اس نے کچھ حیرت سے دیکھا تھا۔

”غیر اہم؟۔۔۔ غیر ضروری؟“

وہ خاتون اس قصے کو غیر ضروری کہہ رہی تھی۔ وہ بات جس نے اس کی ذات میں ایک بھونچال اٹھادیا تھا، وہ بات اتنی غیر اہم تھی؟

”میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتی ہوں۔“ خاتون اس کی حالت کا اندازہ کرتی ہوئی بولی تھی۔ ”کیا آپ کو لگتا ہے کہ مجھے آپ کی ہمدردی کی ضرورت ہے؟“ وہ اس لمحے چیخا چاہتی تھی مگر آواز حلق کے اندر ہی کہیں دم توڑ گئی تھی۔ خاتون کچھ ٹائمنوں تک کچھ نہیں بولی تھی۔ میرب سیال نے اس کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔

وہ ایک بڑھی لکھی خاتون تھی۔ اس کی گفتگو سے صاف ظاہر ہو رہا تھا، عمر میں وہ گین سے بڑی ضرور تھی مگر صاف لگ رہا تھا اس کی تربیت میں کہیں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی۔ ایک آزاد سوچ کی بھلک واضح ٹھوس ہو رہی تھی۔ وہ چہرہ اب بھی روشن تھا۔ اس بیماری کے باوجود آنکھوں میں چمک اب بھی باقی تھی۔ کیسے تو بخیر ہوا ہوگا یہ رشتہ؟۔۔۔ گین نے کیا اسے بھی رد کر دیا ہوگا؟

”سچ پوچھو۔۔۔ میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے ہی ماں کو منع کیا تھا کہ وہ تمہیں میرے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔“

”آپ نے ایسا کیوں کیا؟۔۔۔ آپ تو مجھے جانتی بھی نہیں تھیں۔ پھر یہ مہربانی کیسے ہو گئی؟“ سرد لہجے میں یہ پہلا سوال تھا جو اس نے دریافت کیا تھا۔ وہ خاتون مسکرائی تھی۔

”تم مجھے نہیں جانتی تھیں۔ مگر میں جانتی ہوں۔ مجھے تمہارے بارے میں پتہ تھا۔ مجھے اندازہ تھا تم لکھا ہی ہو گی۔“ میرب سیال کے لئے اپنا ذکر اس کے منہ سے سننا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔۔۔ سب کچھ بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ کیا کہتی کہ کیا خواب دیکھے تھے اس نے۔ اور یہ کہ وہ کیسے پھینکا چور ہو گئے!

لگتا ہے جیسے یہ کہہ رہا ہو، تھام لو مجھے، پناہ میں لے لو اپنی، میری نظریں دیکھنا بھی نہیں چاہتی تمہیں۔ تم۔۔۔ تم اپنی گرفت سے نکلنے ہی نہیں دیتیں۔“ بے بسی سے چور دم لہجے میں وہ اپنی کیفیت بیان کر رہا تھا۔

”کہیں کوئی نہیں ہے۔۔۔ سچ کہہ رہی ہوں میں۔“ وہ جیسے ان پناہوں سے دور بھاگ جانا چاہتا تھی۔ سارے حصار توڑ دینا چاہتی تھی۔

”جب کوئی نہیں ہے تو پھر کیوں دور بھاگتی ہو تم مجھ سے؟۔۔۔ کیوں ان فاصلوں کو ختم نہیں ہو دیتیں؟۔۔۔ دن رات کیوں بڑھاتی جا رہی ہو ان دائروں کو اپنے اور میرے بیچ؟“ آنکھیں سخی بیچھے، اس بھگتے چہرے کو اوپر اٹھا کر دیکھا تھا۔ مگر وہ سرنٹنی میں ہلنے لگا تھا۔

”کوئی نہیں ہے۔۔۔ کوئی نہیں ہے۔“ وہ یکدم چیختی تھی اور اپنے گرد کا وہ حصار توڑ کر باہر نکل رہی تھی۔

”جب کوئی نہیں ہے تو کیوں کر رہی ہو تم ایسا؟۔۔۔ کیوں کر رہی ہو تم یہ سب؟“ وہ بھی چہنچہا مگر انا بیہ بیٹھی آنکھوں سے خاموشی سے اسے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ عصفان کو جیسے اپنی عظیم احساس ہوا تھا۔ بہت اچھے ہوئے انداز میں اس کی طرف پیش قدمی کی تھی اور اسے شانوں سے تھام بے غور دیکھا تھا۔

”محبت دل، نظر سب کچھ پڑھ سکتی ہے انا بیہ!۔۔۔ مجھے غیب کے ان رازوں کو جاننے سے کچھ نہیں ہے۔ سو کچھ باور کرانے کی کوشش مت کرو تم۔“

انا بیہ نے اس کے ہاتھ اپنے شانوں پر سے ایک لمحے میں ہٹائے تھے۔

”تم اتنا کمزور کیوں سمجھ رہے ہو مجھے؟“

”میں تمہیں کمزور سمجھ رہا ہوں نہ ہی تمہاری کسی کمزوری سے کوئی فائدہ اٹھانے کا میرا ارادہ ہے۔ بات تم سمجھنا نہیں چاہتی ہو صرف وہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر میں جانتا ہوں، یہ سو مند منہ لگے گی۔ کوشش رازیں جانے کا افسوس مجھے پھر رہے گا۔“

”تو کس نے کہا ہے اپنا وقت ضائع کرو مجھ پر۔۔۔ جب اپنا آپ مجھ سے الگ کرنے کی ٹھان ہے تو پھر الگ کر بھی کیوں نہیں لیتے؟۔۔۔ شادی کرنا چاہتے ہو، یہی کہا تھا نا تم نے۔۔۔ پھر کیا تمہارا وہ فیصلہ؟ ہمت نہیں ہے نا تم میں؟“ وہ اس لمحے سخت لہجے میں بولتی ہوئی ہمیشہ سے مختلف انا بیہ تھی۔ مگر عصفان علی خان کو اس کے اس انداز پر غصہ نہیں آیا تھا، نہ ہی کسی قسم کا کوئی ٹپش۔ بہت اطمینان سے وہ اس کی سمت دیکھتا ہوا آگے بڑھا تھا۔ اور قریب آن رکھا تھا۔

انا بیہ اس کی جانب نہیں تھی۔ چہرہ موڑے کھڑی تھی۔ عصفان علی خان نے بنا اس کے غصے کی پروا اس کا چہرہ اپنی سمت موڑا تھا اور بغور دیکھتے ہوئے ہر سکون لہجے میں بولا تھا۔

”بس یہی۔۔۔ بس یہی انداز میں تمہارا دیکھنا چاہتا تھا۔“

انا بیہ شاہ نے اسے بے طرح چونک کر استعجابیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

کیا کہتی کہ ایک لمحے میں اسے سب بے معنی لگا تھا۔ سب کچھ۔

وہ اٹھی تھی اور چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس جارہی تھی۔ گھٹن اس کمرے میں ہی نہیں، اس کے اندر تھی۔ اس نے شیشے ہٹا دیئے تھے۔ باہر کا موسم یکسر مختلف تھا۔ یا پھر اس کے اندر جیسا۔ وہ کھینچ پائی تھی۔ سرد ہوا کے جھونکے نے اسے سانس لینے میں مدد دی تھی۔ اس کے سینے کی گھٹن کو کچھ راستہ ملا تو باہر بارش ہو رہی تھی۔

کتنی چپ چاپ تھی یہ بارش!

اسے خبر تک نہیں ہوئی تھی۔

”تمہیں بہت دکھ ہو رہا ہے نا؟“ میرب سیال چپ چاپ کھڑی باہر برسی بارش کو دیکھ رہی تھی۔ جب خاتون اس کی پشت کو دیکھتی ہوئی بولی تھی۔

”پتہ نہیں۔“ میرب سیال کا انداز، لہجہ سرد تھا۔

خاتون کو کچھ افسوس ہوا تھا۔ مگر فوری طور پر وہ کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔

”بارش اتنی چپ چاپ ہو رہی تھی کہ اندازہ نہیں ہوا۔۔۔ سب کچھ خاموشی میں کتنا چپ چاپ رہا تھا۔“ میرب سیال باہر کے منظر کو دیکھتی ہوئی بولی تھی۔ انداز، لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

”مگر مجھے اندازہ ہے۔“ خاتون نے مدہم لہجے میں جیسے قبول کیا تھا اور مجرمانہ انداز میں اسے دیکھی ہوئی بولی تھی۔

”مجھے افسوس ہے، میرے باعث تمہیں تکلیف پہنچی۔ مگر میں تمہارا دکھ سمجھ سکتی ہوں۔“

”میرا دکھ؟“ وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی تھی۔ ”میرا نہیں خیال کہ میرا دکھ اتنا بڑا ہے جتنا کہ آپ کا۔ گھٹی تو مجھے ہونا چاہئے۔ دکھ تو میں نے آپ کو دیا ہے۔ گین کی دوسری بیوی ہوں نا میں۔ آپ کا تو نام حق چھینا ہے میں نے۔“ طنز عجیب نہیں تھا۔ مگر وہ خاتون بہت نرمی سے مسکرائی تھی۔

”میرا نام نہیں پوچھو گی؟“

”کیا کروں گی جان کر؟“ بے تاثر انداز میں وہ چہرہ پھیر گئی تھی۔

”تمہارے لئے اتنی غیر اہم ہوں میں؟“ وہ خاتون دلچسپی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

میرب سیال نے پلٹ کر اسے بخور دیکھا تھا۔

ایزی پی چیز پر بیٹھا وہ نحیف وجود۔۔۔ وجود نہ تھا۔ ایک کہانی تھا۔ یہ بند کمرہ، اس کی گھٹن کا معنی تو نہ تھی۔ اس کا یوں قید تہائی میں عمر کا ثنا۔۔۔ خون تھو کتنا۔۔۔ بے معنی تو نہ تھا۔

تو کیا وہ میرب سیال سے بھی زیادہ بے بس تھی؟

”ایسے کیا دکھ رہی ہو؟“ وہ چہرہ اس کے دیکھنے پر مسکرایا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ میرب نے سرانکار میں ہلا دیا تھا۔ ”آپ یہاں کیوں ہیں؟“

”تمہیں عجب تو نہیں لگے گا اگر کہوں کہ سزا کاٹ رہی ہوں؟“

”کیا اس سزا کا تعلق گین سے ہے؟“ دل پر پھر رکھ کر وہ نام لیا تھا۔

”میرا تعلق تو گین سے بھی نہیں ہے۔“ وہ اس کے سوالوں کے جواب جانے کیوں اتنی غیر سنجیدگی سے برسی تھی۔

”آپ۔۔۔۔۔۔“ میرب کچھ بولنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں بول سکی تھی۔

”رومیسا۔۔۔۔۔۔“ رومیسا لغاری کہہ کر پکارنا چاہتا ہوتا پکار سکتی ہو۔“ وہ مسکرائی تھی۔ ”کتنی عجیب بات ہے۔ جو رشتہ ہم دونوں میں ہے اسے لے کر ہمیں ایک دوسرے سے نفرت کرنی چاہئے۔ مگر ہم ایک

کے نیچے کتنے ضبط سے پرسکون کیفیت میں ایک دوسرے کو چھیل رہے ہیں۔ چپ چاپ بارش شاید ہی ہوتی ہے۔“

میرب سیال نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا۔ گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

وہ خاتون کھانسنے لگی تھی۔ تبھی وہ اس کی سمت پلٹی تھی۔ ٹیبل سے جگ اٹھایا تھا اور پانی گلاس میں لیا کر اس کی سمت بڑھایا تھا۔ رومیسا لغاری نے دو چار سپ لئے تھے اور گہرے گہرے سانس لیتی

اسے دیکھنے لگی تھی۔

”ڈاکٹر کونوں کروں؟“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے سیل پر نمبر ملانا چاہا تھا مگر رومیسا لغاری نے اس کا رخا لیا تھا۔

”اس رات کی سرگوشیاں کہہ رہی ہیں میرب سیال! اسے یونہی گزر جانے دو۔ کوئی تردد مت کرو۔“

”آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟۔۔۔ خود اپنے ساتھ؟“

”کہا تو تھا۔۔۔ سزا کاٹ رہی ہوں۔“

”محبت کرتی تھیں آپ گین سے؟“ ایک الجھن کے ساتھ دریافت کیا تھا۔

وہ خاتون مسکرائی تھی۔ جیسے اس کا سوال بہت ہی غیر اہم اور بچکانہ ہو۔

”تمہیں کیا لگتا ہے؟“

”مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے۔۔۔ میں یہاں پہیلیاں بو جھنے یوں بھی نہیں آئی تھی۔ گین آپ سے

بت کرے یا آپ گین سے۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ اس کا بھجا بھجا سالا تعلق لہجہ رومیسا لغاری کو کمانے پر مجبور کر گیا تھا۔

”ان تھنک دی موسٹ ہرٹ۔۔۔ یونو واٹ؟“ رومیسا نے دریافت کیا تھا۔

میرب سیال نے صرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”اولی لو۔۔۔“ رومیسا لغاری کا جواب بہت مختصر مگر بامعنی تھا۔ میرب سیال کچھ نہیں بولی تھی۔ مگر رومیسا لغاری کہہ رہی تھی۔

”دیا میں صرف محبت ہی ایسا کر سکتی ہے۔ یہ سچ ہے، محبت دل جوڑتی ہے۔ مگر یہ اس سے بھی بڑا سچ ہے کہ محبت دل توڑتی بھی ہے۔ نفرت سے لوگ بلاوجہ خائف نظر آتے ہیں۔ نفرت کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ

کتا کر دوسرے کو محبت کرتی ہے۔“ اس کے الجھے جملے سمجھنے کی سکت میرب سیال کے اندر نہ تھی۔ مگر کئی کئی دفع وہ سچ ہی کہہ رہی تھی۔ اندر ایک دھواں سا جو پھیلا تھا وہ بے معنی تو نہ تھا۔ یہ گھٹن کس شے کا



”گلتا ہے وقت بالکل بھی نہیں ہوتا تمہارے پاس۔ کل سارا دن تمہارا سیل بجتا رہا۔ مگر تم نے کال پک کر لی۔“ گی نے فون پر شکوہ کیا تھا اور وہ کڑی والا بندہ اس لئے شرمندہ سا ہو گیا تھا۔

”آئی ایم سوسوری کی! پینک بڑی ودورک۔۔۔ سیل بھی سائلٹ پر تھا۔۔۔ دھیان نہیں رہا۔ تم کہی ہو؟۔۔۔ اپنی پراہلم؟“

”مجھے جب کوئی پراہلم ہو، کیا تبھی تمہیں فون کر سکتی ہوں؟ ایک تو تم مجھے اپنے اتنے بڑے کیسل میں چھوڑ گئے ہو۔ آئی رینی ڈونٹ نو کہ تمہاری دانف یہاں اپنا وقت کیسے گزارتی تھی۔ مگر مجھے دیواروں باتیں کرنا بالکل بھی نہیں آتا۔“ گی مسکراتے ہوئے بولی تھی اور وہ مسکرا دیا تھا۔

”آئی ایم سوری گی!۔۔۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں بابائی اماں میں سے کوئی وہاں ہوتا اور تمہارا پرخیاں رکھتا۔“

”میرا ارادہ ایسا نہیں تھا۔ تمہارا گھرا ب اتنا بھی برا نہیں ہے۔ ہاں، بہت بڑا ضرور ہے۔ بندہ اگر گم جائے تو کوئی دنوں تک اسے ڈھونڈ نہیں سکے گا۔“

”ایسا ہی کچھ میرب بھی کہتی تھی۔“ وہ غیر دانستہ روانی سے بولا تھا۔ پھر جیسے اپنی غلطی کا اندازہ ہوا تھا تو بات بدلتے ہوئے بولا تھا۔

”تم اپنا ریگور چیک اپ لے رہی ہونا گی؟“

”تمہیں مشکل کیا لگتا ہے گین؟“ گی نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”سر دار سینگین حیدر لغاری کو اندازہ تھا وہ کس ضمن میں کہہ رہی ہے۔ شاید اسی لئے وہ مسکرا دیا تھا۔“

”تھنگ۔۔۔ تھنگ۔۔۔ از امپائل ان دس ورلڈ۔۔۔ سب کچھ ممکن ہے یہاں۔“ انداز بے فکری تھا۔

”ممکن ہے تو پھر خود ہی ناممکن کیوں بنا رہے ہو؟“

”کیا ناممکن بنا رہا ہوں میں؟۔۔۔ اب تک تو سب کچھ میرے اختیار میں ہے۔ ہر ایک شے۔“

”میں ہر ایک شے کی بات نہیں کر رہی گین!“ تیزی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

”تو پھر؟“ گین قصداً چوڑکا تھا۔

”میں اس قصے کو دہرا رہی ہوں گین! جس سے تم دانستہ بھاگ رہے ہو۔“

”وہ نہیں دیا تھا۔“

”تمہیں ایسا لگتا ہے کہ میں بھاگ رہا ہوں؟“

”ہاں۔۔۔ مگر تم یہ نہیں دیکھ رہے کہ محبت تمہارے پیچھے بھاگ رہی ہے۔“ جانے وہ کیوں جتنا

نیکی سے۔۔۔ بظاہر اس بات میں کہیں کوئی مزاح کا پہلو نہیں نکلتا تھا۔ مگر سردار سینگین حیدر لغاری دل لہا کر رہا تھا۔

”میرا خفاق بنا لو گین!۔۔۔ جتنا تمہارا دل چاہے۔ مگر تم مجھے جھٹلا نہیں پاؤ گے۔ تمہیں یہی لگتا ہے نا،

بہت بے وقوفی کی باتیں کرتی ہوں؟“

باعث تھی۔

”تو آپ کو گین سے محبت تھی۔ اور گین نے آپ کو چھوڑ دیا۔“

”گین مجھے چھوڑتا تو تب جب وہ مجھے اپناتا۔ اس نے مجھے کبھی اپنا یا ہی نہیں تو پھر پھر بات درمیان میں کیسے آسکتی ہے؟“ وہ خاتون جیسے اس کی عقل پر ماتم کر رہی تھی۔ میرب سیال بچھے بچھے سے چہرے کو دیکھا تھا۔ اگر آج وہ اس حالت میں نہ ہوتی تو پُرکشش ترین عورت کہی جا سکتی۔ عمر میں وہ گین سے بڑی ضرور تھی مگر.....!

”میں گین سے عمر میں بڑی ہوں۔۔۔ قریباً چہرہ برس۔۔۔ ہماری شادی بے جوڑ تھی۔

سے ہمارا کوئی جوڑ تھا ہی نہیں۔۔۔ میرے بابا گین کے بابا کے بڑے بھائی تھے۔ اصولاً وہاں بڑے بھائی کی نسل کو منتقل ہوتی ہے۔ مگر لڑکی ہونے کے باعث ایسا ممکن نہیں تھا۔ گین بہت منتوں کے بعد اس گھر میں آیا تھا۔ خاندان بھر میں مہینوں جشن منانے گئے۔۔۔ وہ مجھے بھی بہت عزیز بنا

اس کی پیدائش پر میں نے قطعاً نہیں سوچا تھا کہ میرا اس سے کوئی ایسا رشتہ بندہ جائے گا۔ میں نے اپنی ان بازوؤں میں کھلایا تھا۔ چاچی کی گود میں اسے رہنے ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ میرے کرے جاتا تھا۔ میرے ساتھ۔ میں اس کا جھولا بھی اپنے کمرے میں اٹھالائی تھی۔ میں اس سے بہت محبت

تھی۔“ رومیصا لغاری ان دنوں کو اپنے اندر بھاگتا دوڑتا محسوس کر رہی تھی۔

میرب سیال کی سانسوں کی رفتار بہت مدہم ہو رہی تھی۔ کیسا اسرار تھا اس رات میں۔۔۔ رات کوئی راز، راز نہیں رہنا تھا۔

”تم نے ٹھیک کہا۔۔۔ میں گین سے محبت کرتی ہوں۔“ رومیصا لغاری اس سچائی کو بہت دلیرا ساتھ قبول کر رہی تھی۔ اور میرب سیال چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔

کیسا رشتہ تھا یہ؟

کیسا احساس تھا؟

”تیسری سمت“ سے پل کر آنے والی ہوائیں تک اس کج روکے احساس سے لبریز دکھائی دیتی تھیں۔

ایک استحقاق لہجے میں بولتا دکھائی دیتا تھا۔ پہلے گی اور اب رومیصا لغاری۔

کس کس کا تھا وہ؟۔۔۔ کس کس کے ساتھ اسے مزید بانٹنا باقی تھا ابھی؟۔۔۔ اگر وہ اس کا اتنا یقین، اتنا اعتماد اس کے لہجے میں کیوں نہ تھا؟۔۔۔ وہ اتنی چپ چاپ کیوں کھڑی تھی؟

”ہاں، گین سے کرتی ہوں میں محبت۔“ رومیصا لغاری کی آواز اس کو جھوڑنے لگی تھی۔

”ہزار حصوں میں بنا ہوا وہ شخص میرا بھی نہیں ہو سکتا۔“ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بڑبڑائی تھی۔

رومیصا لغاری نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔ غالباً وہ اسے بغور سن نہیں پائی تھی۔

”کچھ کہا تم نے؟“

میرب سیال نے بہت آہستگی سے سر نگی میں ہلا دیا تھا۔



”نہیں۔۔۔ تم اس دنیا میں غالباً محبت کی سب سے بڑی پیروکار ہو۔ مگر افسوس ہماری زمین رسم کے لئے کچھ خاص جگہ نہیں ہے۔ تم وینس پر واپس کیوں نہیں چلی جاتیں؟“ وہ مسکرا رہا تھا۔
 ”وینس پر؟“ وہ چونکی تھی۔

”محبت کا پلیٹ تو وینس ہی ہے۔“ مظلوظ ہونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔
 ”گین! تم سامنے ہوتے تو بتاتی۔“ وہ جل کر بولی تھی۔

”کیا؟۔۔۔ یہی کہ محبت مجھ سے کتنے فٹ کے فاصلے سے دوڑتی ہوئی پیچھا کر رہی ہے؟“
 سنجیدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”گین!“ وہ تنبیہ کرتی ہوئی بولی تھی۔ مگر وہ مسکرا دیا تھا۔
 ”آئی ایم ناٹ کڈنگ۔۔۔ تم نے میرا دن بنا دیا ہے گی!۔۔۔ ساری تھکن اڑ چھو ہوگی

اب خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں میں۔“
 ”تمہیں میری باتیں فضول لگتی ہیں، ہاں؟“ گی برامنتی ہوئی افسردہ لہجے میں بولی تھی۔

”نہیں۔۔۔ تم دنیا میں واحد ایسی دوست ہو جس کی باتوں سے میں سب سے زیادہ محظوظ ہوں۔ ویسے تمہاری باتیں سن کر مجھے ایک شعر یاد آ گیا ہے۔ پتہ نہیں تمہاری سمجھ میں آئے گا یا نہیں۔“
 ”جب تم جیسے مشکل بندے کو میں سمجھ سکتی ہوں تو تمہاری ہر بات بھی سمجھ سکتی ہوں۔ تم بتاؤ، کیا

بات؟“
 ”بات نہیں ہے، چھوٹا سا شعر ہے۔ میرے تانا سنا یا کرتے تھے۔ بات کچھ یوں ہے۔

کوئی تعویذ ہو رو بلا کا
 محبت میرے پیچھے پڑ گئی ہے

اس کا مطلب ہے گی!۔۔۔ کوئی جا دو ٹوٹا ایسا نہیں جو محبت کے پیچھے پڑنے کا علاج کر سکے۔“
 انگریزی میں اسے سمجھاتے ہوئے سردار سیکینگین حیدر لغاری بولا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”تو تم نے مان لیا گین!۔۔۔ اس بات کا کوئی حل نہیں۔“
 ”ہاں۔۔۔ مانتا ہوں۔۔۔ مگر میں اب بھی محبت سے کئی فٹ کے فاصلے پر دوڑ رہا ہوں۔“

تھا۔ انداز اب بھی غیر سنجیدہ تھا۔
 ”تم ہانوں گے گین! ایک دن ضرور مانو گے۔ اور میں دعا کرتی ہوں تب تک وقت، حالات

تمہاری گرفت میں ہوں۔“ گی ٹریا نگ نے اسے دعا دی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے لب پہنچ گیا تھا۔
 ”تمہارے معاملے کا کیا ہو گا؟۔۔۔ بات بنی یا نہیں؟“ اس کی بابت دریافت کیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ اب تک تو نہیں۔ محبت تلاشنا آسان تو نہیں گین!“ وہ عجب یاسیت سے مسکرا کر
 پہلے پیچھے پیچھے سر پٹ دوڑتی ہے۔ اور پھر جب پکڑ لیتی ہے تو اچانک ہی ہاتھ چھڑا کر آگے آگے

شروع کر دیتی ہے۔ مگر اسکا اپنے پیچھے دوڑانے کا عمل بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔“
 ”اسے ڈھونڈو کی ٹریا نگ! اس شخص کا ملنا ضروری ہے۔“ گین سنجیدگی سے بولا تھا۔

جانتی ہوں۔۔۔ تم کب آرہے ہو؟“
 ن جلد۔۔۔ کوشش کر رہا ہوں سارا کام جلد نمٹا لوں۔ پتہ نہیں کیوں۔۔۔ مگر اب کے دل

ارہا۔“ مذہم لہجے میں برملا کہا تھا۔
 ”کیس کر رہے ہو؟“ گی چھیڑنے سے باز نہیں آئی تھی۔

”نہیں۔“ سردار سیکینگین حیدر لغاری نے مسکراتے ہوئے شانے اچکا دیئے تھے۔ وہ جیسے کسی ان
 ہا کے درپے تھا۔

”یو، سی یو۔۔۔ جلد ملتے ہیں۔“ بروقت اس نے خود کو سنبھالا تھا اور سلسلہ منقطع کر دینا چاہا
 رو ذوری طور پر بولی تھی۔

”رے لئے کیا لاؤ گے گین؟“
 ہارے لئے؟۔۔۔ کیا لاؤں؟ تم بتا دو۔“ صورت حال کو جیسے آسان کرنا چاہا تھا۔

”نہ چھوڑو۔۔۔ جس کے لئے لانا ہے، لے آؤ۔ شاید اسے بھی کسی ایسی ہی بات کا انتظار ہو۔“ وہ
 نکلے پر تھی۔ گین مسکرا دیا تھا۔

”کی ٹریا نگ!“ ایک غیر اہم قصہ جانتے ہوئے اس نے سننا گوارا نہیں کیا تھا۔ گی ٹریا نگ فون
 لے اس شخص کے متعلق سوچنے لگی تھی۔

”یو ایسا کر رہے ہو تم گین؟۔۔۔ کیسے بتاؤں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنی جیسی کسی صورت
 ماد رکھنا نہیں چاہوں گی۔ مگر میں تمہیں سمجھا بھی تو نہیں پار ہی! ایک تھکن سے وہ چلتی ہوئی اپنے



میں آگئی تھی۔
 بہت ایسا دقیق معاملہ بھی نہیں ہے کہ سمجھ نہ آسکے۔ بہت آسان ہے یہ۔۔۔ بڑے آرام سے

ما آجاتی ہے اس کی زبان۔ مشکل ہے نا اس کے اسرار و بھید۔۔۔ مگر بات ماننے کی ہے۔“
 لغاری مذہم لہجے میں کہہ رہی تھی۔ میرب سیال نے کھڑکی سے باہر خاموشی سے دیکھا تھا۔

”بائزرک گئی ہے۔ شاید وقتی طور پر۔ موسم کی ٹھن بتا رہی ہے، یہ غبار دبا نہیں رہے گا۔“ وہ محض موسم
 نہیں کر رہی تھی۔

بھلا لغاری مسکرا دی تھی۔
 ”بائزرک جس جگہ، یہی اچھا ہوتا ہے۔ ورنہ بادلوں کے وجود بھی سرد پڑ جاتے ہیں۔ اولے جب

ٹپٹا تو اپنی ٹھنک نکال دیتے ہیں اور دوسروں کا بھی۔“ وہ غالباً اس کمرے کی کشافت کو کم کرنا چاہتی
 میرب چہرے سے کارخ پھرے چپ چاپ کھڑی رہی تھی۔

”میرب سیال نے نگاہ اٹھا کر سیاہ بادلوں کی طرف دیکھنا چاہا تھا مگر آنکھیں یک دم ہی پانیوں سے اٹی
 سارو زخماں بھیجتے چلے گئے تھے۔ وہ اپنی کیفیت پر خود آپ حیران تھی۔ اتنا کمزور نا تو اس

انٹے خود کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

مجھے جانتا ہے۔“

پھر یہ رشتہ آگے کیوں نہیں بڑھ سکا؟ — آپ نے نہیں چاہا یا.....“ بات ادھوری چھوڑ کر وہ کارخانہ پھیر گئی تھی۔ اپنی ضبط ٹوٹی آواز کا بھرم قائم رکھنے کو ایسا اذ حد ضروری لگا تھا۔ ”وہ آوارہ مزاج بیانی کر سکتا ہے۔ اس کے لئے دل اور دل سے وابستہ رشتے کوئی اپورٹنس نہیں رکھتے۔ بیڑیوں رہنے والا بندہ وہ نہیں ہے۔ اسے صرف آزاد فضاؤں میں رہنا اور سانس لینا اچھا لگتا ہے۔ رشتوں میں بندہ کر اس کا دم یوں ہی گھٹتا ہے۔“ میرب سیال کو کبھی بھی اس سے اچھی امید نہیں رہی اس کا زور و لہجہ اس کی بھرپور غمازی کر رہا تھا۔ آواز اتنی مدہم تھی کہ رومیصا لغاری واضح طور پر سن نہیں سکتی تھی۔

اس کے تاثرات سے وہ جان گئی تھی۔

نہیں بھی گین سے محبت ہے نا؟ — تم کتنی رعایت دے سکتی ہو اسے؟“

میرب سیال نے اسے چوکتے ہوئے دیکھا تھا۔

بت کرنے لگی ہونا مجھ سے.....؟ ایک بے خبر لمبے کا پرفسوں لہجہ اس کے گرد اپنا حصار باندھ گیا

بے رحم کج روش، کج اداس کے قریب تھا۔

نہیں.....“ میرب سیال نے اپنا سر نئی میں ہلایا تھا۔ ”مجھے اس شخص سے محبت نہیں ہے۔ وہ اس

ہاں ہے کہ اس سے محبت کی جا سکے۔ اس سے محبت کرنے کا مطلب ہے خود آپ اپنی شامت کو بلاوا

اور اے دکھ کے کچھ نہیں دے سکتا۔“

میرب سیال کی ساکت آنکھوں سے غبار ایک بار پھر اٹھنے کو تھا۔ رخسار بھیکتے چلے گئے تھے۔

صرف محبت دل توڑ سکتی ہے۔ دنیا میں اور کوئی ایسی طاقت نہیں جو آپ کا دل توڑ سکے اور آپ کو دکھ

لکے صرف محبت ہی دل توڑ سکتی ہے۔“ رومیصا لغاری اسے جیسے جتا رہی تھی۔ میرب سیال چپ

ہاتھ لٹکی تھی۔ اندر باہر بہت گھٹن تھی۔ اس نے گردن کا رخ موڑ کر دیکھا تھا۔ باہر ایک بار پھر

ادھر ہی تھی۔

”محبت آباد کاری کرتی ہے..... خالی جگہوں کو بھرتی ہے۔ مگر کبھی کبھی یہی محبت بہت سی جگہوں کو بخر

رہاتی ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے اذہان!..... کبھی کبھی بہت ڈر لگتا ہے۔“ ساہیہ خان نے اپنے خدشے کو

دہلی کی اور اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”رہنے کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں محبت ہوتی ہے۔ ہمارے درمیان کمزور کر دینے والا ایسا

ہو گیا۔“ ساہیہ خان نے اسے بے پروا دیکھا تھا۔

”ہاں.....“ ساہیہ خان نے اسے بے پروا دیکھا تھا۔

”کونسی کیا دیکھ رہی ہو؟“

”وہ کچھ کہنے کا ارادہ ترک کرتی ہوئی نگاہ پھیر گئی تھی۔“

”اے اذہان!..... اذہان نے جانے کیا اخذ کرتے ہوئے کہا تھا۔“

”محبت کرنے لگی ہونا مجھ سے؟“ ایک بانوس لہجہ اس کے ارد گرد گونجا تھا۔ اطراف کا شور مچا

”محبت ہو گئی ہے نا تمہیں؟“ سردار بسکٹین حیدر لغاری کا لہجہ اس لمحے بھی اتنا ہی تروتازہ اور

بے خبر پیل کی کتھا اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ اسے زچ کر رہی تھی۔

”جھوٹا ہے وہ شخص..... ایک دم جھوٹا.....“ وہ عجب بے بسی سے بڑبڑاتی تھی۔

رومیصا لغاری نے اس کی کیفیت کو بغور جانچا تھا۔

”مجھے خاموشی سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ خاموشی ہوتی ہے تو میرے اندر کی بیخ بنگلی اور بھی بڑھ

میں نے گین کو بھی بتایا تھا، وہی یہ میوزک سٹم میرے کمرے میں چھوڑ گیا۔ کہہ رہا تھا دل

بے وقوف ہے، نہیں جانتا، دل سننے تو پہلے نا..... اتنا نا سمجھ ہے کہ سمجھتا ہی نہیں۔“ رومیصا

عجب اک بے خودی کے زیر تھا۔ مگر اس کی آنکھیں ویرانیوں کے باوجود بے رنگ نہ تھیں۔ کبھی کبھی

کیا محبت ایسی ہی ہوتی ہے؟..... اپنے رنگ میں رنگنے والی!

سارے زمانے اپنے کرنے والی؟

میرب سیال بنا اپنی آنکھوں کو پونچھے، بنا بھگتے رخساروں کو صاف کے رومیصا لغاری کی

رہی تھی۔ وہ یہاں کیوں تھی، کس لئے تھی..... شاید وہ خود نہیں جانتی تھی۔ اتنا کچھ جان لینے

اور کیا جانتا باقی تھا۔ سوچا تھا۔ مگر اپنا سارا وجود پتھر کا پایا تھا۔

”سنگ دل ہے وہ..... بے رحم..... صرف دل توڑنا جانتا ہے یا پھر دلوں سے کھانا

آپ کا دل بھی توڑ دیا ہوگا۔“ اپنے دکھ کو بھول کر وہ اس لمحے خیر خواہی پر مائل تھی۔ رومیصا

پہلے چونک کر دیکھا تھا، پھر بات سمجھتے ہوئے جانے کیوں مسکرا دی تھی۔

”مجھے سردار بسکٹین حیدر لغاری سے کوئی گلہ نہیں ہے..... میں اس کے بارے

سوچتی.....“ رومیصا لغاری اسے حد درجہ رعایت دینے کی قائل دکھائی دے رہی تھی۔ میرب

جراحت

”آپ اسے رعایت دینا چاہتی ہیں؟“

”رعایت نہیں، مراعات۔“ رومیصا لغاری کا جواب اسے پاگل کر دینے والا تھا۔ اس کا

کی دھیمی مسکراہٹ۔ میرب سیال کا دل چاہتا اسے شانوں سے پڑے اور اس کے کمزور

جھنجھوڑ کر رکھ دے۔ مگر وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

”محبت اتنی اندھی نہیں ہوتی۔“ وہیں کھڑے اسے جھٹلایا تھا۔

”سردار بسکٹین حیدر لغاری سے میری انسیت تم نہیں سمجھ سکو گی۔“ رومیصا لغاری بہت

مسکرا رہی تھی۔ ”محبت اس سے بھی زیادہ رعایت دے سکتی ہے۔ دینے کے لئے اس

مراعات محبت کے پاس ہیں۔“

”سردار بسکٹین حیدر لغاری جانتا ہے آپ اس سے اس قدر محبت کرتی ہیں؟“ میرب سیال

کو خود آپ کھرچنے پر مائل دکھائی دے رہی تھی۔

”ہاں..... اپنے ان ہاتھوں سے میں نے اُسے کھلایا ہے۔ جیسے میں اس سے واقف

ساہیہ نے فوری طور پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

”تم کیا سوچ رہی ہو ساہیہ؟“

”کچھ نہیں۔ حیران ہو رہی ہوں۔“

”کس بات پر؟“

”محبت حیران کن شے ہے۔“ اس کی سمت دیکھے بغیر بولی تھی۔

”تمہیں یہ ادراک کیسے ہوا؟“ وہ بخور ساہیہ کو دیکھ رہا تھا۔

”اگینے کو دیکھ کر۔“ ساہیہ کا لہجہ مدہم تھا۔

”اگینے؟۔۔۔ اگینے کو کیا ہوا؟ ان کی ڈائیرس تو ہو گئی نا۔ کیا انہوں نے اب تک

ڈس کو نہیں کیا؟“

”اگینے کو اس بات کو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر وہ بہت محتاط ہیں۔ وہ کسی کو اپنی ذرا

دینا نہیں چاہتیں۔“

”بالکل تمہاری طرح۔“ اذہان حیران ہوئے بغیر بولا تھا۔ مگر ساہیہ سوائے اسے خاموش

کے کچھ نہیں بولی تھی۔

”تم بھی تو اتنی محتاط ہو کر اپنی ذات سے کسی کو کوئی دکھ دینا نہیں چاہتی۔ مگر یہ ٹھیک تو نہیں

طرح خود کو تو تکلیف پہنچتی ہے نا۔ اس تکلیف کا کیا؟“ لہجہ ہمدردانہ تھا۔ ساہیہ مسکرا دیا تھی۔

”محبت حیران کن شے ہے اذہان!۔۔۔ تم تو جانتے ہو گے۔۔۔ اس میں۔۔۔

نہیں رہتا۔۔۔ سب کچھ ”تُو“ ہی ”تُو“ بن جاتا ہے۔“

اذہان خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس لڑکی کا لہجہ اس کے اندر کی بھرپور غمازی کر رہا

کسی قدر احساس جرم نے گھیرا تھا۔

”ساہیہ۔۔۔؟“ اس کے ہاتھ پر آہستگی سے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ مگر وہ اس لمحے اتنا خالی تھا

نہیں سکا تھا۔

ساہیہ اسے دیکھنے لگی تھی۔

”تم بہت اچھی ہو ساہیہ! میں تمہارا دل کبھی دکھانا نہیں چاہوں گا۔“

”اور اگر دکھایا تو؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی مسکرائی تھی۔

”معاف کر دو گی؟“ اذہان کا لہجہ دھیما تھا۔

”ہاں۔“ قدرے توقف کے بعد وہ سوچ کر بولی تھی اور مسکرا دی تھی۔

”محبت کا دل بہت بڑا ہوتا ہے نا؟“ اذہان نے سرگوشی میں پوچھا تھا۔

”ہاں۔“ ساہیہ نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”آئی نیو دیٹ۔“ اذہان نے اعتراف کیا تھا۔

ساہیہ چند لمحوں کو چپ رہی تھی۔ پھر بولی تھی۔

”اذہان! میں اگینے کو لے کر پریشان ہوں۔ ان کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں ان

اپورس ہو گیا مگر کس وجہ سے ہوا، یہ ہم نہیں جانتے۔ انہوں نے اپنی میرڈلائف میں بہت سفر کیا ہے

یا اور اس میں کچھ حد تک تصور کی اور کا بھی ہے۔“

”کس کا؟“

”فیض چاچو کا۔“

”فیض چاچو؟۔۔۔ فیض چاچو کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟“

”تم نے کبھی ان سے پوچھا نہیں اذہان! انہوں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟“ ساہیہ نے اس

لمحوں میں بھرپور انداز میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جواباً کچھ نہیں بولا تھا۔ غالباً وہ معاملے کی تہہ تک

لیا تھا۔

”اگینے۔۔۔ تمہارا مطلب ہے؟“

”تم ٹھیک سمجھے ہو۔۔۔ اگینے فیض چاچو سے محبت کرتی تھیں۔“

”اور فیض چاچو؟“

”شاید نہیں۔۔۔ اگر کرتے ہوتے تو شاید صورت حال آج کچھ مختلف ہوتی۔“

”لیکن ساہیہ۔۔۔!“ اذہان نے کچھ بولنا چاہا تھا مگر جیسے سارے لفظ کھو گئے تھے۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ یہ تو میں بھی نہیں جانتی۔ مگر مجھے لگتا ہے اگینے کی محبت دن سائینڈ ڈر ہی ہو گی۔ تمہیں

لگتا ہے اذہان! فیض چاچو نے اب تک۔۔۔“ باقی کا جملہ ساہیہ کی زبان پر ہی رہ گیا تھا۔ اس نے سر

رد دیکھا تھا۔ فیض بخاری بہت قریب کھڑے تھے۔ ساہیہ فوری طور پر کوئی ری ایکشن نہیں دے سکی

۔ اذہان مسکراتے ہوئے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

”چاچو! آپ۔۔۔؟“

”کیا چل رہا ہے؟“ غالباً انہوں نے کوئی بات نہیں سنی تھی۔ ساہیہ تو کچھ نہیں بولی تھی البتہ وہ بات

الٹے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”ڈیوڈ پلاننگ نورلائف۔“

”ناٹ بیڈ۔“ فیض چاچو مسکرائے تھے۔ ”یہی دن پلاننگ کے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد تو سوچنے کا

وقت نہیں ملتا۔“

”چاچو! ایک بات بتائیں گے؟۔۔۔ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟“ ساہیہ کی سوتی وہی انکی ہوئی

اذہان، کو اندازہ ہو گیا تھا، اس نے فوراً اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے کچھ مزید کہنے سے باز رکھا

فیض چاچو حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”چاچو! آپ مانیچسٹر جانے والے تھے نا؟“ اذہان نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر سہ ماہی، وہ ٹرپ پوسٹ پون ہو گیا۔ بھائی دکھائی نہیں دے رہے۔“ فیض چاچو نے

سہ ماہی کہا تھا۔

جاننا ہی کوئی جواب دیا تھا۔

ہا کوئی تاثر ظاہر کئے وہ سر جھکانے بیٹھی رہی تھی۔ اس کی اس کیفیت پر عرفنان علی خان کو جیسے حد درجہ
پیش آیا تھا۔ بہت ہی جارحانہ انداز میں وہ آگے بڑھا تھا اور اسے بازو سے کھینچ کر اپنے مقابل کھڑا کر

”کیا جانتی کیا ہوتی؟“ کیا سمجھتی ہوتی ہاں؟ کیا اہم ہے میرے لئے؟“ یہ گوشت پوست کی

پیش غیر شدہ عمارت؟ اس سے آگے کچھ نہیں دیکھتی میری نظر؟ مجھے ان حدتوں کو پانے کا شوق ہے بس؟

یہی رفاقت جنون ہے میرا؟ وہاٹ انا بیہ؟ وہاٹ یو تھنک؟ کیا

پوشی ہوتی؟ زبردستی کی میں نے تمہارے ساتھ؟ تمہارا وقار مجروح کر دیا؟ تمہارا نسوانی

نقص نہیں کھنکھاتا؟ وہ پوچھو مجھ سے کیوں کیا میں نے ایسا؟ کس لئے؟ میرے اغراض کو کبھی تو

پانے کی کوشش کیا کرو۔ خواہشوں سے تو تمہیں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میرے خوابوں سے تو کچھ لینا دینا

کر لیں۔ جو کہتا ہوں، کرتا ہوں، کبھی اس کو سمجھنے کی کوشش کر لیا کرو۔ مجھے سمجھنے کی کوشش تو تم عمر بھر نہیں

کر لیں۔ مجھے کبھی کبھی پتہ ہے کیا لگتا ہے انا بیہ؟ شاید ایک دوسرے کے لئے نہیں بنے ہیں ہم۔“ اس کی

منہ دیکھتے ہوئے وہ صاف کوئی سے کہہ رہا تھا۔ انا بیہ خالی خالی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”اندازہ ہو رہا ہے مجھے اپنی بے وقوفی کا۔ بہت غلط کیا میں نے۔ بہت غلط کیا تم سے محبت کر کے

پہ۔ اس سے اچھا تھا میں کسی دیوار سے سردے مارتا۔ تم نے مجھے سوائے پریشانی کے کچھ نہیں دیا

ہے۔“ وہ شانوں سے پکڑ کر اسے جھجھوڑتے ہوئے بولا تھا۔ انا بیہ کی ساکت آنکھوں سے نمکین پانی کے

اسے بہت خاموشی سے ٹوٹے تھے اور رخساروں پر بہہ گئے تھے۔

”جاننا چاہتی ہو میں نے تمہارے ساتھ ایسا کیوں کیا؟“ جاننا چاہتی ہو؟ پریشان تھا میں

ہارے لئے۔ فکری مجھے اس رشتے کی۔ بچا کے رکھنا چاہتا تھا میں یہ تعلق۔ مجھے لگا پاگل ہوتی جا رہی ہو

ایک بہت اچھے سائیکازسٹ سے کنسلٹ کیا تھا میں نے۔ ہمارے اس رشتے کو بچانے رکھنے کے

لئے تمہیں یہ تاثر دینا ضروری تھا کہ تم تمام سیاہ و سفید کی مالک ہو۔ سب کچھ تمہارا ہے۔ تمہیں

بزدلی کا احساس سوچنا ضروری تھا۔ کوئی لسٹ نہیں تھی وہ۔ جانور نہیں ہوں میں، شکار بچانے اور چھپت

انے کا کوئی تجربہ نہیں ہے مجھے۔ میں صرف تمہیں راہ راست پر لانا چاہتا تھا۔ بتانا چاہتا تھا یہ کہ یہاں جو

کچھ ہے تمہارا ہے۔ کچھ کبھی کسی اور کا نہیں ہے۔ تمہارے اندر اپنی چیز پر حق جتانے کا ایلی منٹ سرے

سے موجود نہیں ہے۔ مجھے کیا کرنا ہے یہ تم مجھے نہیں سکھاؤ گی انڈر اسٹینڈ؟ جو ہو چکا ہے میں اس کو واپس

لے لیتا ہوں۔ مجھے اس سے کبھی کوئی غرض نہیں ہے کہ تمہاری زندگی میں کبھی کوئی تھا بھی کہ نہیں۔ تمہیں

کوئی کی طرح بے بس انداز میں صرف مجھے اپنے پاس آنے سے روکنے کے لئے یہ بودی وضاحتیں دینے

کی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہ چاہتی ہو نا کہ میں تم پر توجہ نہ دوں؟ تو ٹھیک ہے۔ آج کے بعد میں

تمہیں گھسیٹوں گا بھی نہیں۔“ لہجے میں بہت اشتعال تھا۔

”تمہیں لگتا ہے ہمارے اس رشتے کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو میں آج کے بعد تم پر اپنا کبھی کوئی حق

”مئی مارکیٹ گئی ہیں۔ کوئی کام تھا؟“

”نہیں۔ یوں ہی پوچھ رہا تھا۔ اپنی ہاؤ، تم لوگ انجوائے کرو۔ ڈریسنگ فور فوج۔ میں کپڑے

گیا ہوں۔ آرام کروں گا۔“ فیض چاچو کہہ کر آگے بڑھ گئے تھے۔ ساہیہ اب بھی ان کی پشت کو ہاتھوں

رہی تھی۔

”فیض چاچو ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں نا؟“ اس کے باوجود یہ کسی کا دل نہیں سمجھ سکے۔

بات ہے نا۔ اور میں حیرت کیوں کر رہی ہوں۔ دل توڑنے کے لئے ہارٹ اسپیشلسٹ ہونا ضروری

نہیں۔ دل تو کوئی بھی توڑ سکتا ہے۔“ ساہیہ بہت دل گرفتہ لگ رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری اس لئے

نہیں سمجھ سکا تھا۔ کوئی جملہ ہمدردی نہیں، کوئی دلاسا بھی نہیں۔

”اذہان! ایک طرف محبت یوں ہی ڈکھ دیتی ہے؟“ وہ سر جھکانے دھیمے لہجے میں دریافت کر رہی

اذہان حسن بخاری کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا اور وہ بول رہی تھی۔

”مجھے ہمیشہ لگتا ہے اذہان! محبت دونوں طرف سے ہونی چاہئے۔ یہ دن سائیڈ ڈلو بالکل بھی

نہیں ہے۔ دکھ کے سوا کچھ نہیں دیتا۔“ شاید پہلے وہ اس سچ پر سوچتی بھی نہیں تھی۔ مگر اب اس پہلو پر

سے سوچ رہی تھی۔

”اذہان! کیا ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے؟“ ساہیہ خان کی آنکھوں میں نئی واضح انداز میں تیرہ

اذہان حسن بخاری نے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔

”ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔“ بہت مدہم لہجے میں وہ اسے باور کراتے ہوئے بولا تھا۔ مگر انداز بہتر

ساتھا۔



”ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ میں نے تمہارا، تمہاری ذات کا ہمیشہ احترام کیا ہے۔“

عرفنان علی خان کا انداز دھیما مگر شکوہ بر ملا تھا۔

انا بیہ شاہ سر جھکانے بیٹھی رہی تھی۔ ایک بار بھی اس کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

”مجھے تو کبھی یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ تم چاہتی کیا ہو آخر؟“ کیا کچھ کروں میں تمہارے

عرفنان علی خان نے جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ آج سارے حساب بے باک کر دے گا۔ اس کا ضبط

دے چکا تھا۔

”کیا کروں؟“ تمہارے قریب آنا چھوڑ دوں؟ تمہیں دیکھنا چھوڑ دوں؟“

محبت کرنا چھوڑ دوں؟ کیا چاہتی ہو تم؟ تمہاری خواہشوں کی لسٹ تو بے حساب

کیا کچھ کروں میں تمہارے لئے؟ تمہیں خوش کرنے کے لئے اپنا آپ اٹھا کر تمہاری اس دولت

دوں؟ کتنی بچکانہ باتیں ہیں تمہاری۔ اس پر بھی کہتی ہو کہ تمہارے ساتھ نا انصافی ہوئی ہے۔“

لفظ اور اتنا سخت لہجہ عرفنان علی خان کی طرف سے کبھی استعمال نہیں ہوا تھا۔ غالباً وہ ٹھانے بیٹھا

انا بیہ شاہ کے چودہ طبق روشن کر دے گا تھا۔ مگر انا بیہ ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔ نہ سر اٹھا کر اس

نہیں جتاؤں گا۔ تمہیں لگتا ہے اس کمرے میں میرے آنے سے تمہیں ان سیکورٹی فیل ہونی چاہئے ہے، آج کے بعد ہمارے کمرے الگ ہوں گے۔ تمہیں اور جو جو لگتا ہے، مجھے بتا دو۔ مگر فائل ہونی چاہئے مجھے یوں فالٹو چیز سمجھ کر لوگوں میں بائٹا ترک کر دو۔ میں تمہارے پاس تمہاری کوئی بے فائدہ فائل نہیں ہوں۔ میں کس سے کیا تعلق بناتا ہوں اور کیا توڑتا ہوں، دیش نائٹ یور کنسرن، رائٹ۔ مگر اس سے کسی طرح کی رعایت کی تمنا رکھنا ترک کر دو۔ تھک چکا ہوں میں تم سے۔ اور اپنے اس لئے زبردستی کے رشتے سے۔ سوائے ریگٹ کے کچھ نہیں ملا ہے مجھے۔ مگر میں اور مزید چھینا چاہتا ہوں۔ تمہیں مجھ سے ڈرنے کی یا خوفزدہ ہو کر دیواروں میں کونوں کھدروں میں چھپنے کی ضرورت ہے۔ کیوتی کی طرح آنکھیں میچنے کی عادت ترک کر دو اب۔ کیونکہ عصفان علی خان نے آج سے اپنے کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ آئندہ یہ نہ کوئی مشکل اپنے لئے کری ایٹ کرے گا نہ ہی تمہارے لئے۔ اس کا کہو تو یہ بات میں تمہیں لکھ کر بھی دے سکتا ہوں۔ میرا ڈرائے اندر سے ختم کر دو۔ میرا ارادہ تھا احساس کو جگانے کا تھا۔ تمہیں خوفزدہ کرنا کبھی میرا مشن نہیں رہا۔ اگر میری محبت تمہیں خوفزدہ کر دے ٹھیک ہے، آج سے میں اپنی محبت کا ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔ میری طرف سے اب تمہیں مزید کوئی فائل نہیں رہے گی۔ جینا بہت ضروری ہے۔ سو جینے کے قاعدے پڑھنا آج ہی سے شروع کر دو۔ دوسروں کا خواہش کا جنوں تمہارے سر پر سوار ہے۔ مگر خود پہلے آپ کو بھی تو دیکھو۔ مگر مجھے تمہاری پرواہ کیوں ہے؟ تمہاری زندگی ہے یہ۔ فیصلے بھی تمہارے ہونے چاہئیں۔ میں احترام کرنا ہوں تمہارے فیصلوں کا میں کر رہا ہوں اس سے بہتر تدارک اور سد باب شاید کوئی نہیں ہے۔“

انابیر شاہ ساکت بُت سی بنی اب بھی ویسے ہی چاپ چاپ کھڑی اسے بھگتی آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ عصفان علی خان نے اس کے شانے پر سے اپنا ہاتھ بہت آہستگی سے ہٹایا تھا۔ مڑا تھا اور چلا ہوا نکل گیا تھا۔

انابیر شاہ کے پتھر وجود میں تب بھی کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح چپ چاپ کھڑی اور سے آنکھیں میچ گئی تھی۔ آنکھوں کی تمام نمی رخساروں پر آگئی تھی۔ گرم گرم کھولتے پانی جیسے آنسو رونا جیسے جلاتے چلے گئے تھے۔

میرب سیال کی ساکت نگاہیں کھڑکی سے باہر کی برستی ہوئی بارش کو متواتر دیکھ رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر رو میصا لغاری ایزی چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔

دونوں خاموش تھیں۔ اور کمرے کی فضا بہت بوجھل تھی۔ مگر کوئی بھی اس بوجھل پن کو توڑنے کا ارادے میں دکھائی نہ دے رہا تھا۔ میرب سیال کو اس بوجھل، گھٹے گھٹے ماحول میں مزید رہنا بے لگا تھا۔ وہ چلتی ہوئی آگے بڑھی تھی۔ ارادہ اس کمرے سے نکل جانے کا تھا۔ مگر رو میصا لغاری نے ہاتھ تھام لیا تھا۔

”بات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے میرب سیال! سننے کو ابھی بہت کچھ باقی ہے۔“ رو میصا لغاری نے کہا۔

میرب سیال نے کہا۔ ”میرب سیال نے کہا۔ بہت کچھ باقی ہے۔“

میرب سیال نے کہا۔ ”میرب سیال نے کہا۔ بہت کچھ باقی ہے۔“

میرب سیال نے کہا۔ ”میرب سیال نے کہا۔ بہت کچھ باقی ہے۔“

اور وہ کھانسی چلی گئی تھی۔

میرب نے ایک بار پھر گلاس میں پانی اٹھیل کر گلاس اس کی طرف بڑھایا تھا۔
رومیا لغاری نے چند سپ لئے تھے اور گلاس واپس اس کی طرف بڑھادیا تھا۔

”آپ نے میڈ بسن نہیں کی تھی نا؟“ میرب سیال اب بھی خیر خواہی پر مائل دکھائی دے رہی تھی۔
رومیا لغاری مسکرا دی تھی۔

”تم مجھے جینے پر کیوں اُکسار ہی ہو؟“

”اُکسا نہیں رہی۔ میں نہیں چاہتی.....“ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

”کیا نہیں چاہتی؟“ رومیا لغاری نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ میرب کچھ نہیں بولی تھی۔
”تمہیں زندگی خوبصورت لگتی ہے؟“ رومیا لغاری اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی تھی۔

نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”زندگی اچھی ہو یا بری، جینا شرط ہے۔ کوئی نا انصافی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جینا بھرا جائے۔“

رومیا لغاری جیسے محظوظ ہوئی تھی۔

”زندگی سے بھاگنا اور کیا کہلاتا ہے؟“ میرب نے الٹا سوال کر دیا تھا۔ مگر رومیا لغاری جواب دہ کی بجائے کھانسنے لگی تھی اور کھانسی چلی گئی تھی۔ میرب کے لئے اسے سنبھالنا دشوار ہو گیا تھا۔ اس

دروازہ کھول کر ملازم کو آواز دی تھی۔

”ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔“ کہہ کر وہ دوبارہ اس کی طرف آئی تھی اور اس کی پیٹھ سہلانے تھی۔ ایک ہاتھ سے سیل پر ڈاکٹر کا نمبر ملاتے ہوئے، دوسرے ہاتھ سے پانی کا گلاس آگے بڑھایا تھا۔

کھانتے ہوئے اتنی بے ترتیب ہو رہی تھی کہ پانی کا گلاس فرش پر جا پڑا تھا۔ رومیا لغاری کی حالت، طرح بگڑ چکی تھی۔ جانے اس رات میں اور کیا کیا ہونا باقی لکھا تھا۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری ایک اسٹور میں گی ثیانگ کے لئے کچھ دیکھ رہا تھا۔ جب اس کا خیال تھا۔ اُس نے بہت خوبصورت سائیکلس اٹھا کر دیکھا تھا۔ لمحہ بھر کو وہ چہرہ نگاہ کے سامنے جھلملا گیا۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس سائیکلس کو پیک کروانے کا آرڈر دیا تھا اور ماتحت کو ہدایت دے کر چلا باہر نکل آیا تھا۔ بے اختیاری میں ہی سیل فون پر ایک نمبر ملا یا تھا اور سیل فون کان سے لگا لیا تھا۔ مگر

طرف مخالف موبائل سالنٹ تھا۔ مسلسل بیپ جا جا کر سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری کو کسی قدر تشویش ہوئی تھی۔ بے اختیار ہی نمبر ڈائل کیا تھا۔ تیل پھر گڑا اب کے کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

”ہیلو! گین بات کر رہا ہوں۔ وہاٹ ہینڈ؟“ کال کیوں نہیں پک کی؟ وہاں سے تو ہے؟ مائی کیسی ہیں؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے دریافت کیا تھا۔

میرب سیال ہاسپٹل کے لاؤنج میں کھڑی تھی، اس وقت اس شخص کی کال ریسیو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر جب کبھی لی تھی تو بات کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔

”ہائی بالکل ٹھیک ہیں۔ گھر پر سو رہی ہیں۔ آپ کو بات کرنا ہے تو وہاں کا نمبر ملا لیجئے۔“ اس کا بڑا گرم جوش تو کبھی نہیں رہا تھا۔ مگر اس لئے تو سرد مہری کی حد ہو گئی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری کو اس بات کی امید نہیں تھی۔

”کیوں، کیا ہوا؟ تم کہاں ہو؟ ہو یو بیک؟“

”نہیں، میں یہیں ہوں۔ مگر اس وقت میں گھر پر نہیں ہوں۔“

”گھر پر نہیں ہوتو پھر کہاں ہو؟“ رات کے اس وقت وہ کہاں ہو سکتی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری کو تو یقین نہ ہوتی تو حیرت ہوتی۔ اس لمحے اس کا انداز بہت پُر استحقاق تھا۔ حالانکہ فاصلے درمیان صدیاں

ہاں چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ بہت دھڑلے سے اس پر اپنا حق جتا چکا تھا۔

”میں اس وقت بات نہیں کر سکتی۔ کڈیو کال می لینے؟“ میرب سیال کا انداز اور لہجہ بہت مختلف تھا۔ اس لمحے وہ دبی دبی سی میرب کی جگہ بہت مضبوط میرب دکھائی دے رہی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری کے

لے چوٹنے کا لمحہ تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، وہ فون کا سلسلہ منقطع کر چکی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری کو اس بات کی امید نہیں تھی۔ برہم انداز میں دوبارہ کال کیا تھا۔

”کہاں ہو تم اس وقت؟ کیا چل رہا ہے یہ سب کچھ؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری کا انداز سخت گیر تھا۔

میرب جس معاملے پر بات کرنا نہیں چاہتی تھی وہ اسے اسی پر بولنے پر اُکسار رہا تھا۔

”میں اس وقت ہاسپٹل میں ہوں۔“

”ہی تو پوچھ رہا ہوں، ہاسپٹل میں کیوں ہو؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اپنا لہجہ سخت گیر ہونے سے رکھا تھا۔ ”دیکھو۔۔۔ تم مجھے نہیں بتاؤ گی تو مجھے پتہ نہیں چلے گا۔ آریو اوکے؟“

اس لہجے کو پڑھا جاتا تو اس میں کچھ آہنگ تھا، کچھ خاص تھا۔

وہ لہجہ وہ انداز اس کے بارے میں کنسرن تھا۔ مگر میرب سیال ایسا کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ نہ تو وہ اس کے کونڈ کر رہی تھی نہ ہی اس انداز کو۔

”مجھے کیا ہوتا ہے؟ میں ٹھیک ہوں۔ کوئی اور ٹھیک نہیں ہے۔“ ترکی بہ ترکی جواب دیا گیا تھا۔

الانداز، اس دلیری پر مقابل حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”تم مجھے پہیلیاں کیوں بھجوا رہی ہو؟“ بتا کیوں نہیں رہی ہو کون ہے اس وقت ہاسپٹل میں؟“

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے حتی الامکان ضبط کرتے ہوئے اپنے غصے پر اور لہجے کی سختی پر قابو پایا تھا۔

”رومیا لغاری۔“ میرب سیال نے کہہ کر ایک بار پھر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری اس طرف ساکت کھڑا تھا۔ اس لہجے کی سرد مہری کی وجہ اب پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ گاڑی میں بڑا گرم جوش واضح طور پر کسی گہری سوچ سے آئی تھیں۔ مگر اس سب میں ایک غصے کا عنصر اور ضبط بہت

بہن آکھوں کے ساتھ وہ کھڑی دھندلے منظر دیکھ رہی تھی۔ اندر ڈاکٹر، رومیسا کوٹلی امداد دے رہے۔ وہ آہستہ روی سے چلتی ہوئی باہر آگئی تھی۔ تبھی فون دوبارہ بجاتا تھا۔

میرب سیال نے بنا سوچے سمجھے، دیکھے کال ریسیو کی تھی اور زہر خند لہجے میں بولی۔
”اب اور کیا باقی ہے؟“ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“ وہ عجب ہذیبانی انداز میں تھی۔

”میرب! کیا ہوا؟“ دوسری طرف اذہان حسن بخاری تھا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ طرف اس لمحے کوئی دوسرا ہوگا۔

”ہیلو میرب! — آر یو دیئر؟“ اس کے خاموش ہونے پر اذہان حسن بخاری دوبارہ بولا تھا۔
میرب سیال کی آنکھوں سے نمکین سمندر نکلنے کا سلسلہ تھا نہیں تھا۔ مگر اب کے اس نے بہت سختی سے آنکھوں پر ڈبکا تھا۔

”بس — آئی ہیز۔“ آنسو کے کئی پھندے حلق میں تھے۔ آواز اپنی صبح پر نہیں تھی اور بوجھل واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت کسی سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اذہان کا اس لمحے کال کرنے کا مقصد کچھ خاص رہا ہوگا۔ تبھی وہ کڑی سے بولی تھی۔

”کو — اس وقت کیسے فون کیا؟“ اپنی حالت کو سنبھالنا آسان تھا، نہ اس کیفیت سے باہر آنا۔ مگر اب آپ کو کمانہ حد تک رد کر دینا چاہتی تھی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟ — وہاٹ ہپینڈ؟ — ٹھیک تو ہوتم؟“ اذہان حسن بخاری دوسری طرف ہالکے لہجے پر حیران تھا۔

میرب سیال کے لئے بولنا دشوار تھا۔
”اذہان! ہم بعد میں بات کریں گے۔ آئی ایم سوری مگر میں ابھی بات نہیں کر سکتی۔“ وہ سلسلہ منقطع کرنے کے ارادے سے بولی تھی۔ مگر تبھی اذہان روانی سے بولا تھا۔

”بہن! تو پوچھ رہا ہوں۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟ — تم رورہی ہو؟“ دوسری طرف وہ اس کے اندر کے اطمینان کو پڑھ رہا تھا۔ مگر اس طرف میرب کچھ نہیں بولی تھی۔ تیزی سے بہتے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے ایک بار پھر تیزی سے رگڑ دیا تھا۔

”بہن! — کمزور لہجے کو مضبوط بنانے کی حتی المقدور کوشش کی تھی۔ مگر وہ پھر بھی چھپ نہیں سکتی تھی۔
”تم رورہی ہو؟“ اذہان حسن بخاری جتاتے ہوئے بولا تھا۔

”آئی سیڈ — آئی ایم سوری! — آئی کانٹ ٹاک ٹو یور رائٹ ناؤ۔“ کانٹولی کال میر لیئر۔
لئے، موسم، خیال، احساسات وہ سب رد کر رہی تھی۔

سب کچھ تباہ کر رہی تھی۔ صرف اس کج ادا کے لئے۔ اس بے وفا کے لئے۔
فون کا سلسلہ منقطع کر کے وہ چلتی ہوئی اندر آگئی تھی۔

دوسری طرف اذہان حسن بخاری اس کی کیفیت پر پریشان سا بیٹھا تھا۔ مگر اس تشویش کا کوئی بروقت اظہار نہ تھا۔

میرب سیال سے اسے کبھی کوئی سمجھ داری کی امید نہیں رہی تھی اور اس لمحے وہ کیا سوچ رہی تھی سوچنا چاہتی تھی اور کرنا چاہتی تھی وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

دھیان سیٹ پر دھرے اس کے گفٹ پر گیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اٹھایا تھا، لمحہ بھر کو دیکھا تھا اور پھر ہاتھ کچھ سوچے کھڑکی کھول کر اسے باہر اچھال دیا تھا۔

”ڈیم اٹ —“ لہجے میں غصے کا واضح عنصر موجود تھا۔
”نیاز مندی“ کا دروازہ پھر بند ہو چکا تھا۔

”نوازش“ پھر اپنے پرسیٹ چکی تھی۔
سرد مہری پہلے سے زیادہ گہری ہو چکی تھی۔

میرب سیال ہسپتال کے لاؤنج میں چپ چاپ کھڑی تھی مگر آنکھوں سے سیال مادہ بہت روانی بہ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی سب کچھ۔

اس شخص کی رگ رگ سے واقف تھی۔
تو پھر ہر بار نئے سرے سے اعتبار کیسے کر لیتی تھی؟
وہ خود سمجھ نہیں پاتی تھی۔

ہر بار رعایت کیسے دے دیتی تھی جبکہ وہ جانتی تھی وہ ”وفا“ کے لئے بنا ہی نہیں۔ اور وہ رورہی تھی! کج ادا کے لئے؟

اپنے قیمتی آنسو ضائع کر رہی تھی اس ”بے وفا“ کے لئے، جس کی سرشت صرف دھوکا دہی اور فریب تھا۔ صرف فریب تھا وہ شخص — صرف یہی سچائی تھی اس کی۔

پہلے کئی چہرے، کئی نام — قطار در قطار — کئی رابطے، کئی واسطے بنا شرمندہ ہوئے، بنا خا کے وہ اپنی رواداریاں نبھاتا رہا تھا۔ بلا خوف — بلا خطر۔

کتنا ٹڈر تھا وہ — کس قدر دلیر — سردار سیکٹین حیدر لغاری نے تو دیدہ دلیری کی حد کر دی تھی۔ اپنا کوئی بھی ناجائز رشتہ وہ بہت دلہ سے نبھاتا تھا۔ نکاح کے پہلے دنوں سے لے کر اب تک — وہ کبھی بھی اس ایک ”رشتے“ کے

”کسٹ“ نہیں ہوا تھا۔ اور وہ پھر بھی اس سے امیدیں لگانے بیٹھی تھی۔
ہر بار نیا سلسلہ — امید بنانا — بڑھانا —

اور پھر ہر بار — چکنا چور ہوتے دیکھنا۔
وہ خود سوچ رہی تھی تو حیرت ہو رہی تھی اپنی بے وقوفی پر — اُسے غالباً سردار سیکٹین حیدر لغاری

پہلے ہی سمجھ لینا چاہتے تھا۔ گی کے ساتھ اس کے ”رینیشن شپ“ کی حد تھی۔ وہ ناجائز طور پر باپ بنے رہا تھا اور حد تھی کہ شرمندہ تک نہ تھا۔

وہ حیران تھی، اس سے زیادہ دلیر شخص اس نے زندگی بھر نہیں دیکھا تھا۔

میرب چلتی ہوئی رومیصا لغاری کے پاس آئی تھی۔ اس کے چہرے پر آکسیجن ماسک لگا تھا۔ وقت وہ آنکھیں بند کئے پرسکون انداز میں غالباً سو رہی تھی۔

تکلیف کا احساس اس کے چہرے سے قدرے کم ہوا تھا۔ مگر اس کے اندر ایک نہ تھمنے والی بڑھتی جا رہی تھی۔

”کیا لگتی ہیں یہ آپ کی؟“ بہت کسرن ہو رہی ہیں آپ ان کے لئے۔ اتنی پریشانی خزا کے لئے بھی اچھی نہیں۔ آپ پلینز، وہاں لاؤنج میں جا کر بیٹھ جائیے۔ یا ڈرائیور کے ساتھ واپس لے جائیے۔ انہیں ابھی مزید آبروریشٹن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ بائے دی وے، بتایا نہیں آپ نے کیا رشتہ ہے آپ کا ان سے؟“ ڈاکٹر اس سے دریافت کر رہا تھا۔ مگر وہ کوئی جواب دینے کے قابل نہیں پارہی تھی۔ کیا کہتی؟ کیا تھی وہ اس کی؟ کیا رشتہ تھا!

وہ اپنی سوتن کے لئے اتنی پریشان تھی؟
اس کے لئے اتنا کسرن دکھا رہی تھی؟
اسنے آنسو بہا رہی تھی۔

زمانہ کیا کیا دیکھتا ہے اور کیا کیا سمجھتا ہے۔ مگر اصل کیفیت تو وہی جانتا ہے جو ان حالات سے اڑتا ہے۔ میرب سیال نے سر بہت آہستگی سے نئی میں ہلا دیا تھا۔

”آپ یہ بتائیے، یہ کب ہوش میں آئیں گی؟“ بائے دی وے، وی آر ریٹیلے ٹیو۔

”کچھ دیر لگے گی۔ فی الحال تو یہ دواؤں کے زیر اثر ہیں۔ سوئیں گی۔ اور یہی ان کے بہتر بھی ہے۔ آپ شہر سے آئی ہیں۔ سردار سیکٹین حیدر لغاری کی کچھ لگتی ہیں؟ پہلے آپ کو کبھی یہاں دیکھا؟“ ڈاکٹر اس فیملی کو جانتا تھا شاید تبھی دریافت کر رہا تھا۔ مگر میرب سیال نے اب کے ان سوالوں کو مکمل نظر انداز کر دیا تھا اور بولی تھی۔

”میں یہیں لاؤنج میں ہوں۔ کسی شے کی ضرورت ہو تو جلیز جھے بتا دیجئے گا۔ اپنی میڈیسن..... ڈاکٹر اس کی بات کا شاک ہوا مسکرا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ اس کی فی الحال ضرورت نہیں۔ اور میں تو یہ بھی کہوں گا کہ آپ گھر چلی جائیں۔ اس وقت آپ کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ لغاری خاندان کی روایتوں کو اچھی طرح سے جانتا میں۔“ وہ ڈاکٹر بہت کچھ جانتا تھا جیسے۔ مگر شاید وہ سب کچھ پھر بھی نہیں جانتا تھا جو وہ جانتی تھی۔ وہ سر ہلاتی ہوئی پلٹی تھی اور چلتی ہوئی باہر آگئی تھی۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔

اور ایک بارش تو متواتر اس کے اندر بھی ہو رہی تھی۔ وہ چلتی ہوئی گاڑی کی طرف آئی تھی۔ ڈرائیور نے موب انداز میں دروازہ کھولا تھا۔ وہ بیٹھی تھی گاڑی اس حویلی کی سمت بڑھنے لگی تھی۔ کیا تھیں یہ روایتیں؟ روایتوں کے نام پر استحصال کا کب تک باقی رہنا تھا؟ دنیا بھر میں ہیومن رائٹس وائلیشن پر کئی سینما ہوتے ہیں۔ تقریریں

عمران کا بلاواسطہ کوئی اثر اس سٹم پر کیوں نہیں پڑتا جس پر پڑنا چاہئے۔؟
جلے ہوئے دماغ کے ساتھ وہ کچھ بھی سوچ رہی تھی جو سوچنا ضروری بھی نہیں تھا۔

فاصلے بڑھے تھے۔

کچھ اور پھیلے تھے۔ اور پھیلتے چلے گئے تھے۔

سردہری کی دبیز تہہ موسم پر ہی نہیں آنکھوں اور لہجے پر بھی جمی تھی۔ نظر سے نظر کو کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔

ہاتھ کو ہاتھ سے کچھ رابطہ باقی نہیں رہا تھا۔

کرے کا سکوت بتا رہا تھا کہ تنہائی کتنی بڑھ چکی ہے اس کرے کی۔

کتنے دنوں کے لئے۔۔۔ مہمان بننے آگئی ہے۔

ابا بیہ شاہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جب دروازہ کھلا تھا اور فاطمہ خان چائے اور دیگر لوازمات لے کر رے میں داخل ہوئی تھیں۔

جو چل رہا تھا، پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ مگر وہ اس میں غلط کسی ایک کو نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔ غلطی شاید فریقین کی۔ مگر یہ لمحہ جتانے کا نہیں تھا۔ فاطمہ خان جانتی تھیں سوزنی سے مسکراتے ہوئے ابا بیہ شاہ کے سامنے کی نہیں اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے محبت سے دیکھا تھا۔

”چائے لے لو۔۔۔ ساتھ میں، میں نے اپنے ہاتھوں سے تمہارے لئے چکن کے کباب بنائے۔ تم بیف، مٹن نہیں لیتی ہونا۔“ وہ مسکراتی ہوئی بالکل اسی طرح بات کر رہی تھیں جس طرح اس کی اپنی ایا کرتی تھیں۔ وہ بھی می کی طرح جانتی تھیں کہ اسے مٹن، بیف پسند نہیں ہے۔ اس گھر کے افراد سے ابا بیہ تھے؟ اس حد تک سمجھتے تھے؟

اسے واضح طور پر حیرت ہوئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ تم اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟ میری بچی ہو، کیا مجھے تمہاری پسندنا پسند کا پتہ

لگا ہوگا؟ عریضہ، انوشہ، عفنان۔۔۔ اس گھر میں میرے بچوں کو کیا پسند ہے، کیا ناپسند میری

اسے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ ماں ہوں نا۔ جانتی ہوں کس وقت میرے بچے کیا چاہتے ہیں، کیا

پتے ہیں۔ تم یہ چائے لے لو۔ صبح کا بریک فاسٹ تم نے منع کر دیا تھا۔ دوپہر کا لچ بھی گول کر گئیں۔

بہرا کہا مت نالو۔ ورنہ بہت پٹائی لگاؤں گی۔“ فاطمہ شاہ مسکراتی ہوئی بھرپور محبت سے بولی تھیں اور

لب لٹا کر اس کے منہ کی طرف بڑھایا تھا۔

کیا تھے یہ لوگ۔۔۔؟

کسے تھے؟

دوٹھ اسے جانتا تھا۔

یہاں تک ٹھیک تھا۔ لاجک بنتی تھی۔ وہ محبت کا دعویدار بنتا تھا۔ اسے جانتا بھی

پہنچتا تھا۔ مگر یہاں تو پورے گھر کو اس کے اندر کے موسموں کی خبر تھی۔ کیسے تھے یہ لوگ۔۔۔؟

اتنی اور بھی تلخ ہو جائے گی۔ اس زندگی میں محبت سے زیادہ ایک دوسرے کو انڈر اسٹینڈ کرنا ضروری
 تم فریش ہو جاؤ۔ پھر کہیں باہر چلتے ہیں۔ میں تمہاری بھی اتنی ہی ماں ہوں جتنی کہ عثمان
 ہوں۔ تم کسی مقام پر مجھے ایک ماں سے کم نہ پاؤ گی۔ ایک بات میں چاہوں گی۔ تم ماہوش سے یا
 اس بارے میں کوئی بات نہ کرو تو بہتر ہے۔ ایسا میں اس لئے نہیں کہہ رہی کہ میں اپنے بیٹے کے
 پروردہ ڈالنا چاہتی ہوں۔ میں تمہاری خیر خواہ ہوں بیٹا! تمہارے لئے ایک ماں کی طرح سوچ
 ہوں۔ دادا کی طبیعت ابھی ابھی سنبھلی ہے۔ اور ماہوش بخاری کے لئے پہلے بھی پیچیدہ صورت حال
 رہ چکی ہے۔ تم فریش ہو جاؤ، ہم ماں بیٹی کہیں باہر چل کر ڈنر بھی کریں گے اور بہت سی اچھی اچھی
 بھی۔ عثمان علی خان کے کان کیسے کھینچنے ہیں یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“ دھیسے سے مسکراتے
 رہو اس کا چہرہ تھپتھا کر باہر نکل گئی تھیں۔

ابھی شاہ بخیتی ہوئی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

السنن ایک الجھن میں کمرے میں ادھر سے ادھر چکر کاٹتی رہی تھی۔ پھر رکی تھی اور کمرے کی ساری
 مانگا اٹھا کر پھینک لی تھی۔

”اکی ہیٹ یو انائیہ! آئی ہیٹ یو۔ نفرت کرتی ہوں میں تم سے۔“ عجب ہڈیانی انداز
 ڈالی تھی۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں انتہائی شدت کی کیفیت تھی۔

”نفرت ہے مجھے تم سے، نفرت۔ نہیں ہو تم میری دوست۔“ کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں
 رہا جسے وہاں سے باتیں کر رہی تھی۔ انداز میں ایک پاگل بن صاف دکھائی دے رہا تھا۔

ایک ایک کر کے اس نے کمرے کی کتنی ہی چیزیں توڑ ڈالی تھیں اور پھر تھک کر زمین پر بیٹھ کر پھوٹ
 مار دئے گئی تھی۔

”کے کر کتنی ہو تم میرے ساتھ ایسا؟ کیسے؟ نفرت ہے مجھے تم سے۔ بالکل بھی
 نہیں گئی ہو تم مجھے۔ بہت عظیم بننے کا شوق ہے تمہیں۔ ہمیشہ اپنا ہاتھ اوپر ہی کیوں رکھنا
 ہوتا ہے؟“ کیوں؟“ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی وہ چیختی ہوئی کہہ رہی تھی۔ انداز عجب جنونی تھا۔

ادھت ہار چکی تھی۔

شام میں عثمان کی آنے والی کال کے الفاظ اب بھی سماعتوں میں گونج رہے تھے۔

”تمہاری کرو گی تم مجھ سے؟“ جملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ حیران رہ گئی تھی۔ عثمان علی خان بنا کسی تمہید
 کے دریافت کر رہا تھا جیسے روزمرہ کی کوئی معمول کی بات کر رہا ہو۔ نہ انداز خاص تھا نہ لہجہ۔

”ہاٹ یو مین؟“ وہ بھو بھوکا رہ گئی تھی۔

”عثمان علی خان کا لہجہ کسی بھی طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ مگر وہ لفظ
 ”ہاٹ یو مین“ کی ایسی کسی بات کی؟ اس نے تو تب بھی اس لہجے کو سننے کے بارے میں نہیں سوچا تھا
 اس سے وابستہ تھی۔ اور اب تو پھر بھی۔

اتنی محبت، اتنی کیر کرنا کیسے جانتے تھے؟
 وہ بھی اس کی اتنی سرد مہری کے جواب میں؟
 اس کی مسلسل بخ بنگلی کے جواب میں؟
 انابیہ نے منہ کھول دینے میں کوئی عار نہیں جانی تھی۔

”گڈ۔ تم یہ سارے کباب ختم کر لو۔ اور فریش ہو کر نیچے آ جاؤ۔ ہم ماں بیٹی آج باہر
 چلیں گے۔ بہت سی شاپنگ کریں گے۔ آخر اس گھر کے مردوں کو کچھ تو پتہ چلے کہ ہم بھی خاص ہیں
 میں ہر وقت دیکے رہنا ہماری ڈیوٹی میں نہیں ہے۔“ فاطمہ شاہ مسکراتے ہوئے مسلسل بھر پور اپنا نسیات کا
 اختیار کر رہی تھی۔ انابیہ شاہ کی آنکھوں کی اداسی خود کرائی تھی۔

”کیا ہوا؟ تم رورہی ہو؟ نہیں جانا، تو ٹھیک ہے ہم نہیں جاتے۔ مگر تم یہ
 فریش تو ہو جاؤ۔ کہو تو میں تمہارے سر میں تیل ڈال دوں؟“ ٹھہرو، میں تیل لے کر آتی ہوں۔

جانے کو اٹھی تھیں جب انابیہ نے سرعت سے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا اور شرمندہ ہوتی ہوئی بولی تھی۔
 ”نہیں، آپ رہنے دیں۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ضرورت نہیں ہے؟ اس کا اندازہ تمہیں کیسے ہو گیا؟ بیٹا! کیا تم ہمیں اپنا بچہ
 سمجھتی ہو؟ کیا میں تمہاری می جیسی نہیں ہوں؟“

”ایسی بات نہیں ہے۔“
 ”تو پھر؟“ فاطمہ نے اپنے عزیز ترین بیٹے کی عزیز ترین ہستی کا چہرہ محبت سے تھاما تھا۔

”میں صرف اپنے بیٹے سے محبت نہیں کرتی بیٹا! مجھے اس سے وابستہ ہر شے سے محبت ہے۔
 مجھے تم بہت عزیز ہو۔ کیونکہ تم اسے عزیز ہو۔“ سارے حوالے کتنے معتبر کر دیئے تھے۔ انابیہ کی آنکھوں
 بہت سی نمی ایک ساتھ جمع ہو گئی تھی۔

”آپ کو بھی یہی لگتا ہے کہ میں پاگل ہوں؟“ ان کی جانب دیکھے بغیر شکوہ کیا تھا۔
 فاطمہ نے سر ٹٹی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔ مجھے ایسا نہیں لگتا۔ اور کسی اور کو بھی ایسا نہیں لگتا۔“ محبت سے اس چہرے کو دیکھا
 لہجہ ممتا سے بھر پور اور نرم تھا۔

انابیہ کی آنکھوں کے سمندر چھلک گئے تھے۔
 ”اگر ایسا نہیں سمجھا گیا ہوتا تو کسی سائیکاطرسٹ سے بودر نہیں کیا گیا ہوتا۔“ اس کے مدھم لہجے

ایک کرب کا احساس تھا۔
 فاطمہ نے کچھ دیر خاموشی سے اس چہرے کو دیکھا تھا، پھر ملامت سے بولی تھیں۔

”دیکھو بیٹا! یہ شادی کے بعد کی زندگی آسان نہیں ہے۔ شاید ہی کوئی ایک ہوس کو شادی
 بعد پراہمز فیس کرنی نہ پڑتی ہوں۔ ورنہ سب کے ساتھ کوئی نہ کوئی پراہمز ہوتا ہی ہے۔ بات ساری
 داری کی ہے۔ سمجھ داری سے ہینڈل کرنے کی ہے۔ تم اسے الزام دیتی رہو گی اور وہ تمہیں غلط ٹھہراتا ہے۔“

سامنے ہوتی تو یقیناً وہ اسے تہس نہس کر چکا ہوتا۔ مگر اس کی خیریت تھی تو صرف اس لئے کہ سردار سمنڈروں کے فاصلے حائل تھے۔ یہیں میرب سیال کی بچت ہو گئی تھی۔ پہلی بار پر کال پک نہیں بیڑ جا کر کال ختم ہو گئی تھی۔ تب سردار سمنڈرین حیدر لغاری نے دوبارہ وہی نمبر ملایا تھا۔ اگر اسکا ہوتا تو وہ اس وقت فون اٹھا کر میرب کے کان پر لگا دیتا۔

ایک — دو — تین —

”ہیلو!“ میرب کی آواز اچانک دوسری طرف سے ابھری تھی۔

”کہاں تھیں تم؟“ سردار سمنڈرین حیدر لغاری نے تشویشی انداز اختیار کیا تھا۔ مگر دوسری طرف سیال کی ہٹ دھرمی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

”ہواؤں میں گرہ نہیں ہوں — کہئے، آپ کو کیا کہنا ہے؟“

دوسری طرف سردار سمنڈرین حیدر لغاری کے ضبط کی حد جیسے ختم ہونے پر آن پہنچی تھی۔

”ٹھیک کہا آپ نے — ہواؤں میں نہیں ہیں آپ — آسمانوں میں ہیں

آپ کو صرف یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ میں واپس آ رہا ہوں۔“

”تو؟“ میرب کی طرف سے سردہری کی حد تھی۔ سردار سمنڈرین حیدر لغاری ضبط کے

کر رہ گیا تھا۔

”رائٹ — آپ کو پرواہ ہونی بھی نہیں چاہئے۔ لیکن اگر آپ کے اختیار میں ہو یا آپ

یہ آسان ہو تو یہ خبر مائی اماں تک پہنچا دیجئے۔ میں نے ان کا نمبر لٹائی کیا تھا، مگر غالباً وہ سو

بتانے کے ساتھ ہی سلگتے ہوئے لہجے میں وضاحت بھی دی تھی۔

”ٹھیک ہے — میں بتا دوں گی۔“

”اس وقت کہاں ہیں آپ؟“

”ہاسپٹل میں۔“

”حویلی کے باقی لوگ کہاں ہیں جو تیمارداری کا کام آپ نے سنبھال لیا ہے؟“

”میں نہیں جانتی۔“

”نہیں جانتیں تو پھر یہاں کیوں ہیں؟“

”ٹھیک ہے، میں واپس گھر چلی جاتی ہوں۔“

”کہیں نہیں جائیں گی آپ — جب تک میں واپس نہ آ جاؤں، وہیں رہیں گی آپ“

تھا۔

”یہ آپ کا حکم ہے؟“

”تم جو بھی سمجھ لو۔“

”میں کسی ایسی حاکمیت کی پابند نہیں ہوں۔“ وہ منمنائی تھی۔

”آپ کس حاکمیت کی پابند ہیں اور کس کی نہیں، یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ فی الحال آپ“

”سچے اور حویلی واپس جائیے۔“ رشتے کا استحقاق لہجے میں بول رہا تھا مگر دوسری طرف میرب یہ بات بولنے کا اختیار نہیں تھی۔

”آپ رعب نہیں جھاسکتے مجھ پر۔“

”میں کیا کر سکتا ہوں، یہ آپ بہت جلد جان جائیں گی۔ ڈونٹ چلیج می — رائٹ۔ جو آپ سے

اپار ہے آپ وہ کیجئے۔“ وہ حق جتانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھ رہا تھا۔

”کس کے حوالے چھوڑ کر جاؤں رومیصا لغاری کو؟ — یہاں کوئی اور نہیں ہے۔“

”تم کس کے ساتھ یہاں آئی ہو؟“

”ڈرائیور کے سوا کسی اور کو بھی آپ نے ڈیوٹی سونپ رکھی تھی؟“ وہ اسے پیش دلانے میں کسر نہیں

رازی تھی۔ سردار سمنڈرین حیدر لغاری نے بہت ضبط سے دوسری طرف لب بھینچے تھے پھر مضبوط لہجے میں

پا ہوا تھا۔

”لیکن میرب! تم سے جو کہہ رہا ہوں، صرف وہ کرو۔ تم ڈرائیور سے کہو وہ تمہیں گھر چھوڑ دے

جوئی سے کسی ملازمہ کو پیشدستی کے ساتھ چھوڑ دو۔“

”ہٹ پیشدستی ازری لیٹ ٹویسوردار سمنڈرین حیدر لغاری! — ہاؤ کڈ یونگلکٹ دیٹ؟“ طنز کا تیر

انفا۔

”آئی ڈیٹاٹ نگلکٹ اپنی تھنگ — اچھی طرح سمجھتا ہوں، کون سا رشتہ کتنا اہم اور ضروری ہے۔

اڈری طور پر نکلو یہاں سے۔ اور مزید مجھے تم رومیصا لغاری کے قریب نہیں چاہئے ہو۔“

”کیوں — ڈرتے ہیں آپ، آپ کے دبے راز کھل جائیں گے؟ — کوئی بات دینی نہیں رہے

لہ؟“ طنز کی حد تھی۔ دوسری طرف لہجہ زہر خند تھا۔ سردار سمنڈرین حیدر لغاری کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔ غالباً وہ

الامال کو ایک پکٹ کر رہا تھا بھی بہت ٹھوس لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”مجھے کچھ بھی ڈرنہیں ہے۔ آئی ڈونٹ کیئر — اگر تمہیں کچھ جاننے کا شوق ہے تو شوق سے جان

اڈر کرتے میں ہی صلاحیت نہیں ہے میرب سیال! تم رازوں سے پردہ ہٹانا نہیں جانتی ہو۔“ لہجہ بہت کچھ جتانے

انفا۔ ”اس وقت کوئی بحث نہیں چاہتا میں۔ گھر واپس جاؤ اور مائی سے میری بات کراؤ۔“

”تھکانا انداز میں کہہ کر اس نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ میرب حیرت زدہ سی کھڑی رہ گئی تھی۔

”ایک تو چوری، اس پر سینہ زوری۔ شرمندہ ہونے کی بجائے وہ مزید اگڑ رہا تھا۔ کیا کہتی وہ اس

نہت پر آہستگی سے چلتی ہوئی لاؤنج میں نکلی تھی۔ تبھی ڈاکٹر نے بتایا تھا۔

”آپ کے ساتھ جو پیشدستی ہیں ان کی حالت اچانک بگڑ گئی ہے۔ نہیں آئی سی یو میں منتقل کیا جا رہا

ہے۔ پھر آپ آئیے۔“

”سردار سمنڈرین حیدر لغاری کا حکم نامہ ایک طرف دھرا رہ گیا تھا اور وہ اس پر عمل پیرا ہوئے بغیر روکتی

نہت رومیصا لغاری کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

”رومیصا لغاری کی حالت واقعی بہت بگڑ چکی تھی۔“

اسے سانس لینے میں انتہائی وقت ہو رہی تھی۔

”رومیسا! — رومیسا! آریو او کے؟“ اس کے قریب آکر وہ بہت اپنائیت سے اس کا ہاتھ ہوئی بولی تھی۔ مگر دوسری طرف سے رومیسا لغاری کچھ نہیں بول سکی تھی۔

”رومیسا! — رومیسا!“ اس کی بگڑتی سانسوں پر ہر اسالی ہی ہو کر میرب نے اسے پکارا اور ”آپ پیلیز باہر جائیے۔“ ڈاکٹر نے اسے باہر کر دیا تھا۔

”میرب! —“ رومیسا لغاری نے اپنی اُلجھی سانسوں کے سچے اسے پکارا تھا۔ وہ سرعت تھی۔ ایسا کیا خاص بتانے لائق باقی بچا تھا۔ میرب سیال واقعی نہیں سمجھ سکی تھی۔ مگر اس نے اپنا کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔

میرب سیال کچھ سننے کی منتظر تھی۔ اس کی آنکھیں بغور اس عجیب و کمزور چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ رومیسا لغاری بولنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی کچھ بول نہیں سکی تھی۔ اس کی سانسوں کے اتار چبھے اسے بے بس کر دیا تھا۔

ڈاکٹر نے نرس کو اشارہ کیا تھا۔ نرس نے اسے بازو سے پکڑ کر رومیسا لغاری سے دور ہٹا کر زور و حیث ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹا چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر مستعدی سے اسے ٹریٹمنٹ دینے لگے تھے۔

”کیسے ہوا۔۔۔؟“

بہنگین حیدر لغاری پہلی فرصت میں پاکستان میں تھا اور گھر پہنچتے ہی بنا ریٹ کے میرب کی لڑ جانے کی تیاری کرنے لگا تھا۔ صورت حال کی کوتاہی تھی۔ گی کی تشویش بڑھ گئی تھی۔ مگر سردار بہنگین حیدر لغاری نے جواباً کوئی جملہ نہیں کہا تھا۔ شرٹ کے بٹن تیزی سے بند کرتے ہوئے گی کی لڑنا ایک نگاہ بھی نہیں کی تھی۔ گی کا دل اس کی کیفیت کو جیسے گہرائی سے سمجھ رہا تھا۔

”بہت عجیب کیفیت ہے نا یہ۔۔۔ بہت مشکل لگ رہی ہوگی نا محبت؟“

”گی۔۔۔!“ وہ اپنی کیفیت سے نکلنے ہوئے ایک پل میں مسکرایا تھا۔ مگر اس مسکراہٹ میں

لب پھیکا پن تھا۔

”کچھ غلط کہا میں نے؟“ گی نے نرسی سے دریافت کیا تھا۔

سردار بہنگین حیدر لغاری نے سرنٹھی میں ہلا دیا تھا۔ پھر اس کی طرف دیکھے بغیر بیڈ کے کنارے پر بڑکھڑو پھینتے ہوئے بولا تھا۔

”یہ جو تمہاری محبت ہے نا، بہت بے وقوفی والی چیز ہے۔ بہت ہی عجیب شے۔“ لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی ایک طنز سا اُتر آیا تھا۔ اس کے اندر کی جلن اس کے لہجے کا حصہ بن گئی تھی۔ گی کو یقیناً بہت اُٹس ہوا تھا۔

”بہت مشکل ضرور ہے گین! مگر اس میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔“ اس نے باور کرایا تھا۔

”ہاں۔۔۔ احمقوں کی جنت میں کبھی کچھ ناممکن نہیں ہوتا۔“ وہ اٹھ کر بالوں میں برش کرنے لگا۔

”گین! ایک بات کہوں؟“ اجازت چاہتی تھی۔

گین نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”میں جانتی ہوں تم ایک سمجھ دار اور مصلحت پسند شخص ہو۔ جلد باز ہرگز نہیں ہو۔ مگر پھر بھی اتنا کہنا بالوں کی کہ کسی بھی مقام پر کوئی فیصلہ بہت جلدی مت کرنا۔ محبت وقت چاہتی ہے گین! اور توجہ بھی۔“

”کچھ نہیں چاہتی محبت۔ بہت فضول ہے یہ تمہاری منطق گی! بہت اسٹو پڈ ہے یہ تمہاری محبت۔“ گین نے اس کی بات تیزی سے کاٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ ”اس میں کچھ بھی ویسا نہیں ہے جیسا تم بتاتی



بہر پابند کر دو۔ اس کی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ جتنی ہے اسے سکون سے جینے دو۔ تمہیں جب کسی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو پھر یہ سب جاننے سے فائدہ؟ — جو ہے، جیسا ہے اسے اس کے پانچ چھوڑ دو۔“ سر دار سیکٹین حیدر لغاری مڑا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔ میرب سیال ساکت کھڑی اسے دیکھتی تھی۔

سائے پھلنے میں اتنی دیر نہیں لیتے جتنی تیزی سے فاصلے بڑھتے ہیں۔ سایوں سے زیادہ تیزی سے ملے پھلتے ہیں۔

فاصلے یہاں بھی بڑھ چکے تھے۔ مگر اس کا اندازہ فی الحال انا بیہ کو نہیں تھا یا پھر وہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ باپھر دونوں اس سے منہ پھیرے کھڑے تھے۔ سچ جیسے ایک سورج تھا، جس کی طرف وہ دونوں اڑنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی جب عرفان علی خان کمرے میں داخل ہوا تھا اور بنا ہاکی طرف دیکھے الماری کے سامنے جا رکھا تھا اور اپنا ضروری سامان نکالنے لگا تھا۔ انا بیہ نے اسے ارد گرد دیکھا تھا پھر آہستگی سے بولی تھی۔

”آپ کو اپنا سامان کہیں لے جانے کی ضرورت نہیں ہے — آپ چاہیں تو میں..... میں اس سے چلی جاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ الماری کی طرف بڑھ گئی تھی اپنا سامان لینے کے لئے۔ مگر تب بارہ پلٹا تھا اور وہ بری طرح سے اس شخص سے ٹکرا گئی۔ ایک پُر تپش لمس نے وجود کو چھوا تھا۔

عرفان علی خان نے غالباً اس کے گرنے کے خیال سے اسے تھام لیا تھا۔ قربت کا یہ لمحہ کہنے کو بہت لمبوں تھا۔ مگر جس طرح انا بیہ شاہ اپنی آنکھیں شدت کے احساس کے ساتھ بھینچ کر رہ گئی تھی، اس پر عرفان علی خان نے اسے دوسرے ہی پل بہت آہستگی سے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور نگاہ پھیر گیا۔

”سوری۔“ وہ یوں شرمندہ دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی بہت سنگین جرم سرزد ہو گیا ہو۔ انا بیہ سر اٹکائے کھڑی تھی۔ نہ اس کی طرف دیکھ سکتی تھی، نہ ہی کچھ کہہ سکتی تھی۔

عرفان علی خان مڑا اور پھر تیزی سے اپنی چیزیں نکالنے لگا۔

”آپ پلیز.....“ انا بیہ اسے ایسا کرنے سے باز رکھنا چاہتی تھی۔ تب ہی آہستگی سے بولی تھی۔

”کیا چاہتی ہو تم؟ — اب اور کیا؟“ عرفان علی خان نے ایک دم مڑ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ نے صرف خاموشی سے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔

”انا بیہ شاہ! تم چیزوں کو صرف اپنے رنگ میں کیوں دیکھنا چاہتی ہو؟ — پراہلم کیا ہے تمہارا؟“ اس نے جو چاہا ہے میں نے کیا ہے۔ میری بھی کوئی زندگی ہے۔ میں بھی کچھ چاہ سکتا ہوں۔ میری بھی لکڑی مرضی ہو سکتی ہے۔ مگر تم یہ سب کیوں سمجھو گی؟“ سلگتے ہوئے لہجے میں کہتا ہوا وہ پلٹا تھا اور دوبارہ اٹکائے الماری کے اندر سے نکالنے لگا تھا۔

”میں چلی جاتی ہوں یہاں سے۔“ وہ بہت اطمینان سے بولی تھی۔ عرفان علی خان نے اسے دیکھا

”تو بہت سے رازوں کے بھید پا گئی ہیں آپ؟“ سوال غیر متوقع تھا نہ غیر واضح۔ اس کے میرب سیال اسے خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔ سر دار سیکٹین حیدر لغاری کا انداز اس لئے سپان اس کی سر دمہری سے بیزار قطعاً نہیں ہوا تھا۔

”کیسا لگ رہا ہے آپ کو؟ — ٹھیک ٹھاک ہیں آپ؟“ انداز میں نرمی کے باوجود ایک سی تھی۔ میرب خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ بولی کچھ نہیں تھی۔ سر دار سیکٹین حیدر لغاری نے پراہلم کی طرح بھی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”بہت اطمینان بخش لگ رہا ہو گا سب آپ کو، ہے نا؟ — کچھ نیا یا انوکھا جان کر پیر حیرت ہوتی ہے۔ حیرت تو ضرور ہوئی ہو گی؟“

وہ مسلسل طنز فرما رہا تھا۔ میرب کے لئے چپ رہنا دشوار ہو گیا تھا۔

”مجھے ایسا کچھ نہیں لگا۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”میں یہاں آپ کی جاسوسی کرنے نہیں آئی تھی نے خود ہی اجازت دی تھی۔“

”آں..... اچھا، واقعی..... اجازت تو میں نے ہی دی تھی۔“ وہ معمول کے اندر بات چیت کر رہا تھا جیسے کوئی اہم واقعہ وقوع پذیر ہوا ہی نہ ہو۔

”شاید پھر میں نے خود ہی چاہا ہو گا کہ آپ کو یہ سب پتہ چل جائے۔ کیا ایسا بھی نہیں ہے۔“ میرب نے تیر چلانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ جتنا غصہ اس کے اندر تھا وہ اسے بہت اطمینان سے رہا تھا۔

”مجھے نہیں پتہ آپ نے کیا چاہا تھا اور کیا نہیں۔ مجھے نہ آپ سے کوئی غرض ہے نہ ہی آزادی کی کسی دلی سچائی سے۔ اور نہ ہی کسی انوکھے راز سے۔“ وہ سرعت سے بولی تھی۔ جب آ

سکٹین حیدر لغاری نے ایک لمحے میں اسے جارحانہ انداز میں تھام کر خود سے قریب کیا تھا۔ اتنا اچانک تھا کہ وہ حیران رہ گئی تھی۔ ساکت نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ سر دار سیکٹین لغاری اس کی سمت بنور دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں ایک نہ سمجھ میں آنے والا اسرار تھا۔

وہ اسی طرح ساکت کھڑی تھی۔ سر دار سیکٹین حیدر لغاری نے بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کے چہرے کو ہولے سے چھوا تھا۔

”تمہاری سمجھ بہت چھوٹی ہے۔ اور اس کا کوئی علاج میرے پاس نہیں ہے۔ اگر تم میں صلاحیت ہوتی تو تم.....“ انداز تلملایا ہوا تھا۔ لہجہ بلند نہیں مگر سخت ضرور تھا۔

”کسی راز کو جاننے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے میرب سیال!“ ایک جھٹکے سے اس کے وجود حصار سے آزاد کر دیا تھا۔ میرب سیال دم بخود تھی اور وہ اسی سرد انداز میں کہہ رہا تھا۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم نے کیا جان لیا ہے اور کیا جانتا باقی ہے۔ میں چھو کر نہ وار کرنے کا قائل ہوں نہ پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا عادی۔ مجھے جو کرنا ہوتا ہے وہ دیدہ دلیر کرتا ہوں۔ تمہیں جاننے کا جنون ہو تو کچھ ہمت تم بھی دکھاؤ۔ مگر اس طرح رومیصا لغاری

”جلن، جیسی، حد محسوس کرنا۔“ سردار بکتگین حیدر لغاری نے بہت پُر سکون انداز میں

واضح کئے تھے جیسے وہ قطعاً نابلد ہو۔ میرب سیال کا سارا ضبط جواب دے گیا تھا۔ آنسو سے آنکھوں پر اب تک جو ایک اختیار تھا ایک لمحے میں وہ بند ٹوٹا تھا اور سارا نمکین پانی رخساروں پر

تھا۔ مگر وہ بنا شرمندہ ہوئے، بجل ہوئے پُر اعتماد نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”جلن؟۔۔۔ مجھے جلن کیوں محسوس ہوگی؟ کس لئے؟“ اگر نگاہوں سے کوئی نقل کر سکتا تو سردار بکتگین حیدر لغاری کو آج نقل کر چکی ہوتی۔

”کیا رشتہ ہے میرا آپ سے؟۔۔۔ کیا لگتے ہیں آپ میرے؟“ تک کر پوچھا تھا۔ انداز

ایک جلن بہت واضح تھی۔ سردار بکتگین حیدر لغاری نے بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس رخساروں پر سے نمکین پانی کا ایک قطرہ اپنی انگلی کی پور پر لیا تھا۔ اسے بغور دیکھتا دھیمے انداز میں

دیا تھا۔

”نہیں جانتی ہو۔۔۔؟“ مدہم لہجے میں جیسے کوئی ایک شکوہ سرخ رہا تھا۔ میرب سیال سلگ کر پھیر گئی تھی۔

”نفرت ہے مجھے آپ سے۔“

”محبت کب ہوئی تھی۔ بتایا نہیں تم نے۔“ شکوہ در شکوہ۔ انداز دلچسپ تھا۔ وہ جیسے اپنے سکون اسے زچ کر رہا تھا۔ میرب سیال کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے سامنے کھڑے اس لہجے جوڑے

تہس نہس کر کے رکھ دے۔

”محبت۔۔۔ محبت کے معنی جانتے ہیں آپ؟“ وہ پھنکاری تھی۔ مگر سردار بکتگین حیدر لغاری چہرے کو بغور دیکھتا رہا تھا۔

”تم سمجھا دو۔“ مدہم لہجے میں کوئی درخواست تھی۔ کوئی دھیما دھیما لاؤ تھا۔ مگر میرب سیال کجا دیکھ رہی تھی۔ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

”محبت کے سچے بھی نہیں آتے آپ کو۔ محبت کی ”میم“ کی بھی خبر نہیں ہے۔ اور.....“ وہ اس طرف دیکھے بغیر زہر خند لہجے میں بولی تھی۔

”اور؟“ سردار بکتگین حیدر لغاری اس چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ لہجہ نرم بھی تھا اور پک دار نکلنے کو بہت سی عجائبات نکل سکتی تھی۔ مگر یہاں کوئی ماٹ نہیں تھا۔

میرب چہرے کا رخ پھیرے کھڑی تھی۔ تب ہی اس ساکت ماحول میں سردار بکتگین حیدر لغاری کی مدہم آواز دوبارہ ابھری تھی۔

”اور.....؟“ وہ اس ادھوری بات کو مکمل کر دینے کے درپے تھا۔ مگر میرب سیال یک دم غما تھی اور وہاں سے نکل جانا چاہا تھا۔ بھی سردار بکتگین حیدر لغاری نے ایک بھر پور انتہا قی سے اسے تازک کلانی کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔

”ادھوری باتیں، ادھورا پن دیتی ہیں میرب سیال! ادھورا پن اچھا نہیں ہوتا۔ مکمل کر دو۔“

بات کا حوالہ دیئے بغیر یہ تذکرہ خاص، ایک خاص مفہوم رکھتا تھا۔

”مکمل کرو۔“ درخواست گزار انداز کسی قدر لبتی بھی تھا اور دھیما بھی۔ مگر میرب سیال نے مڑ کر نہیں

اٹا۔ وہ جیسے اپنی ذات کی بات کر رہا تھا۔

”بہت جلد ختم ہو جائے گا یہ سب۔۔۔ بہت جلد آپ کو پتہ چل جائے گا۔“ وہ کچھ سمجھے بغیر اس بات دیکھے بنا ہاتھ چھڑا کر باہر نکل گئی تھی۔ سردار بکتگین حیدر لغاری وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

”کیسی ہیں اب آپ؟“

پچھلے روز سے رومیصا لغاری آئی سی یو میں تھی۔ ابھی کچھ حالت سنبھلی تھی تو اسے پرائیویٹ روم

نٹ کیا گیا تھا۔ میرب نے جیسے ہی قدم رکھا تھا، رومیصا لغاری اسے اپنائیت سے دیکھتے ہوئے

دشمن سے مسکرائی تھی۔ چہرے پر نقاہت اب بھی تھی۔

”کیا محسوس کر رہی ہیں اب آپ؟“ تازہ پھولوں کا لکے اس کے قریب رکھتے ہوئے میرب نے اپنائیت سے دریافت کا تھا۔ رومیصا لغاری نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”تم۔۔۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟“ رومیصا لغاری نے شکوہ کیا تھا۔ میرب سیال جیسے اس لمحے

اسے مسکرائی تھی۔

”آپ نے مجھے مس کیا؟“ انداز بہت پھیکا سا تھا۔ رومیصا لغاری نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بابا سے بھی پوچھا تھا۔ بتا رہے تھے کہ تم گھر پر ہو۔ گین آیا ہوا

نقاہت سے پُر آواز میں پوچھا تھا۔

میرب سیال نظریں چرا گئی تھی۔

”ہاں۔“ مختصر جواب دے کر اس کی دواؤں کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

”کیسا لگ رہا ہے اب آپ کو؟۔۔۔ پہلے سے بہتر محسوس کر رہی ہیں نا؟ دوائیں تو وقت پر لے

لائیں نا آپ؟“ وہ جیسے اس موضوع پر آنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

رومیصا لغاری نے اسے بہ غور دیکھا تھا اور پھر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا۔

میرب سیال چند ثانیوں تک کھڑی اس خالی ہاتھ کو دیکھتی رہی پھر بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر

اسے خالی ہاتھ پر رکھ دیا۔

”میرب! ایک خالی ہاتھ کو جانتی ہو کیا شے بھر سکتی ہے؟“ رومیصا لغاری نے جیسے اسے سمجھانا چاہا

میرب سیال نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”کیا؟“ انداز میں کوئی لگاوت نہ تھی۔

”صرف ایک محبت بھرا ہاتھ میرب!“ رومیصا لغاری نے مدہم لہجے میں جیسے بہت کچھ بتایا تھا۔

صرف محبت بھرا ہاتھ ایک خالی ہاتھ کو بھر سکتا ہے میرب! اور کچھ نہیں۔ پتہ نہیں مجھے یہ بات تمہیں

کہانی چاہئے کہ نہیں۔ مگر جب ایسا کوئی لہجہ یا ہاتھ، ہاتھ میں آئے تو اسے جھٹکنا نہیں چاہئے۔“

رومیسا لغاری اسے پتہ نہیں کیا سمجھانا چاہتی تھی۔ مگر وہ اسی طرح خاموش سی کھڑی رہی تھی۔
بولی تھی۔ رومیسا لغاری دوبارہ بولی تھی۔

”وہ ہاتھ تمہارا ہے میرب! اُسے اس طرح انگور مت کرو۔“ رومیسا لغاری اُسے جتا رہی تھی
شے کے بارے میں جو اس کی تھی ہی نہیں۔ وہ ایک عجیب طنز سے مسکرا دی تھی۔
”رومیسا! آپ.....“ وہ کچھ بولتے بولتے رہ گئی تھی۔

”میں جانتی ہوں میرب! — میں جانتی ہوں۔ بے خبر لمحوں کی خبر تمہیں دینا چاہتی ہوں
سے تم واقف نہیں ہو۔“ رومیسا لغاری کو اس کی بے وقوفی پر جیسے انوس ہوا تھا۔
میرب سیال مسکرا دی تھی۔

”رومیسا! مجھے ایک بات بہت عجیب لگتی ہے۔“
”کیا؟“

”شاید آپ بھی جانتی ہیں، ہم دونوں جس رشتے میں ہیں اس میں ایسی دل جوئی کہیں نہیں
مگر ہم ایک دوسرے کی دل جوئی بھی کرتے ہیں اور خیر خواہی بھی۔“ میرب سیال نے پھلکے
مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔ رومیسا لغاری بھی مسکرا دی تھی۔

”ایسا کیا ہے میرب؟ — کیا ہم میں واقعی کوئی دشمنی ہونی چاہئے؟“
”پتہ نہیں۔ میں نے آج تک کسی سے نفرت نہیں کی۔ کسی سے عداوت نہیں رکھی۔ مجھے پتا
کیا ہوتا چاہئے اور کیا نہیں۔ مگر میں کسی سے بھی نفرت نہیں کر سکتی۔“ اس کا انداز بے بس تھا۔
”تمہارا دل بھی کوئی دکھا دے تب بھی نہیں؟“

”نہیں۔ میں خود کو ہرٹ کرنے والے سے بھی نفرت نہیں کر سکتی۔“ وہ بالکل بجز
میں سر جھکا کر بول رہی تھی۔ اسے جیسے اپنی بے وقوفی پر غصہ آ رہا تھا۔ رومیسا لغاری نے ا
دیکھا تھا۔

”تم دنیا کی بہت انوکھی لڑکی ہو میرب! اور تب ہی شاید بہت اچھی بھی لگی ہو۔ تم جیسی لڑکی
کوئی ہرٹ کرنا نہیں چاہے گا۔“

”پتہ ہے، آپ کے بابا سے ملاقات ہوئی تھی اس روز۔“ میرب سیال نے بات یک د
دی تھی۔ رومیسا لغاری کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی، وہ اس موقع سے، اس موقع
فرار کیوں چاہتی ہے۔ مگر وہ بہت قلیل لمحوں میں اسے قائل کرنا چاہتی تھی۔ جیسے یہ سب اس
بہت ضروری تھا۔

”میرب!“ اسے دیکھتے ہوئے بہت آہستگی سے پکارا تھا۔

میرب نے سرنئی میں ہلا دیا تھا۔

”پلیز رومیسا! مجھے یہ سننا بہت محال لگتا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ یقین کرنا۔ میں کسی
دیکھنے پر یقین نہیں رکھتی۔ جو میری نگاہ دیکھتی ہے میں اس پر اعتماد کرتی ہوں اور میری نگاہ نے

نہیں دیکھا رومیسا!“

انگار کرد میرب! تم جس لمحے میں زندہ ہو، وہ لمحہ تمہارا ہے۔ اپنے اس لمحے کو جی لو۔“
کے جی لوں؟ — کیا یہ اتنا آسان ہے؟ آپ..... آپ کیسے کہہ سکتی ہیں یہ سب؟ جبکہ

”.....“
میں کیا میرب؟ — تم رک کیوں گئیں؟ بولونا۔“

کچھ نہیں۔“ میرب سیال چہرہ پھیر گئی تھی۔

میں نہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں میرب!“ رومیسا لغاری نے مدہم لہجے میں کہا تھا۔
رومیسا! پلیز۔ میں آپ کے پاس کسی راز کی انفارمیشن گیت کرنے نہیں آئی۔ مجھے کچھ جاننے
دکار نہیں ہے۔ آپ پلیز خود پر بردن مت ڈالئے۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ آپ آرام

نہیں گین نے کچھ کہا ہے میرب؟“

نہیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھنے سے مکمل گریز کر رہی تھی۔ ”انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا۔“
ہے جیسے بے فکر کر دینا چاہتی تھی۔ رومیسا لغاری اس کے متح کرنے کے باوجود اس موضوع سے
تار نہیں تھی۔

”لیکن اتنا مشکل نہیں کہ سمجھ میں نہ آسکے۔“

میرب سیال اس ذکر سے، اس نام سے جتنا بچتا چاہتی تھی وہ نام، وہ ذکر اسے اتنا ہی زیادہ گھیرتا
لڑوہ کچھ نہیں بولی تھی۔ نہ اسے رد کیا تھا، نہ چپ کرایا تھا۔ غالباً اس کا احترام کر رہی تھی۔ شاید
فی کہ اس کے پاس جینے کے لئے لمحے تھوڑے ہیں اور وہ اسے اس کی خواہش سے چھینے دینا
آئی۔

”اس کا دل بہت خوبصورت ہے میرب! — اس کے دل میں جھانکو، اتر کر دیکھو۔ وہ جتنا
طاہتتا اسٹرونگ دکھائی دیتا ہے، اندر سے وہ اتنا ہی نرم اور سوفا ہے۔ وہ اندر سے ادھورا ہے
پالے مکمل کر دو۔“

”مکمل کر دو۔“ ایک بازگشت جیسے اس کے اندر ہوئی تھی۔ ابھی کچھ لمحوں پہلے کہا گیا ایک
نہ، دھیمالہجہ اس کے اندر گونجا تھا۔ میرب نے چونک کر رومیسا لغاری کو دیکھا تھا۔
”اس کا دل جو ہوتا ہے اسے وہ کہنے کا فن نہیں آتا میرب! وہ جو محسوس کرتا ہے اسے بیان نہیں کر
سکتی۔ کبھی بھی اس طرح نہیں بتا پائے گا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اسے تمہاری کتنی ضرورت ہے۔“

”ب باتیں اس کے لئے جیسے بے معنی تھیں۔ وہ رومیسا لغاری کو صرف اس لئے سن رہی تھی کہ
اسے بولنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ ورنہ اسے نہ ان باتوں کی وقعت کا کوئی اعتبار تھا نہ ہی کوئی یقین
اسے اندر سناٹا رہا تھا۔ وہ خالی دل، خالی نظروں کے ساتھ اس لمحے چپ چاپ اس کے سامنے
رہی۔“

”اسے مکمل کر دو میرب سیال!“ رومیصا لغاری اسے کہہ رہی تھی اور وہ چپ چاپ دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟ — کیا سوچ رہے ہو تم؟“ ساہیہ نے دریافت کیا تھا۔

اذہان حسن بخاری جو کسی سوچ سے چونکا تھا، سرنئی میں ہلانے لگا تھا۔

”تم کچھ ڈسٹرب ہو؟“

”نہیں — وہ، میرب کو فون کیا تھا — کچھ عجیب سانی ہو کر رہی تھی۔“

”اس نے تمہیں نہیں بتایا؟“ ساہیہ حیران ہوئے بغیر پوچھنے لگی تھی۔ اذہان نے اس کی طرز

تھا جیسے اس کو ساہیہ کے انداز پر حیرانی ہوئی تھی۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میرب کے نام پر وہ کچھ اڑ

ری ایکٹ کرے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

”کیا ہوا؟ — ایسے کیا دیکھ رہے ہو تم؟“

”کچھ نہیں۔“ اذہان نے سرنئی میں ہلا دیا تھا۔

”میں جانتی ہوں — مگر میں نہیں پوچھوں گی۔“ ساہیہ مسکرا دی تھی۔ وہ لڑکی اپنی جگہ

تھی۔ اذہان حسن بخاری کو اس بات کو ماننا پڑا تھا۔ اس کا دل واقعی بہت گنجائش رکھتا تھا۔

”تم میرب کے بارے میں بتا رہے تھے؟“ اس کے خاموشی سے دیکھنے پر ساہیہ نے اسے

تھا۔ اذہان نے سر ہلا دیا تھا۔

”بات نہیں ہوئی اس سے۔“

”تو کیا پراہلم ہے؟ — بات کر لو اس سے۔ کیا وہ تم سے بات کرنا نہیں چاہتی۔“

انداز میں یوں بات کر رہی تھی جیسے وہ میرب سیال کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہو۔ اذہان حسن

نے اسے بغور دیکھا تھا۔

”تم کیا سوچ رہی ہو ساہیہ؟“

”میں کیا سوچ رہی ہوں؟“ وہ پُر خیال انداز میں سوچتے ہوئے مسکرائی تھی۔ ”میں سوچ رہی

کہ دنیا آخر گول ہی کیوں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی تھی۔ عجیب غیر سنجیدہ انداز تھا جیسے وہ اس

مذاق میں اُڑانا چاہتی تھی۔

”ساہیہ!“ اذہان نے اسے بہت آہستگی سے پکارا تھا۔

”تمہیں ڈر لگتا ہے نا؟“ بہت عجیب سوال نہیں تھا۔ مگر وہ چونکی تھی اور مسکرائی تھی۔

”ڈر؟ — مجھے ڈر کیوں لگے گا؟ ہاں لگتا تھا کبھی — مگر اس وقت میں بہت چھوٹی تھی

نہیں لگتا۔ کیونکہ اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے اسے بتا رہی تھی جیسے اس کا

نہ جانتا ہو۔ اذہان مسکرا دیا تھا۔

”ڈر صرف بچوں کو ہی نہیں لگتا ساہیہ! بعض اوقات بڑوں کو بھی لگتا ہے۔“ اور ڈر

کمزوری والی بات نہیں ہے۔ وہ ہنسر تھا نا، وہ بھی ڈرتا تھا۔ اور وہ جو نیولین تھا نا، وہ بھی ڈرتا تھا۔

لکے مقام پر اسے شکست ہوئی تھی تو وہ رو یا بھی تھا۔ کیونکہ وہ اس ہار کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ اور وہ

ہری پار تھی۔ ہار جانے کا ڈر صرف بچوں کو ہی نہیں ہوتا ساہیہ! یہ ڈر بڑوں کو بھی لگتا ہے۔“ وہ نرمی

بتا رہا تھا اور وہ ہنس دی تھی۔

ہنے سے اس کی آنکھوں میں پانی کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے تھے جو بالآخر آنکھوں سے باہر آ

ئے۔ ساہیہ نے کناروں پر سے آنکھوں کی اس نمی کو اپنی پوروں پر لیا تھا اور مسکرا دی تھی۔

”یہ واٹر لو والی کیا داستان ہے؟ اس روز ایکنے بھی بتا رہی تھیں۔ کیا بہت بڑی ہار تھی وہ؟ —

ابا ہار چھوٹی بڑی ہوتی ہے؟“ وہ مسکراتے ہوئے معمول کی ساہیہ لگی تھی۔ اذہان اسے دیکھتے

ہزنی سے مسکرایا تھا۔

”ہاں، ہار ہوتی ہے ساہیہ! چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی۔ ہار کو جھیلنا آسان نہیں ہوتا۔“

”اور ہم پھر بھی اس ہار کو جھیلنے اور سہتے ہیں۔“ اذہان کی بات کو اس نے بہت نرمی سے مسکراتے

ہلکے لکھا کیا تھا۔ اذہان نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اس لمحے جیسے کسی فرار کی تلاش میں تھی۔ اس

رف متوجہ نہیں تھی۔ شاید ایسا وہ جان بوجھ کر کر رہی تھی۔ مسلسل اپنی پوروں پر اس نمی کو دیکھ رہی

اذہان کچھ بول نہیں سکا تھا۔ تبھی وہ مسکرا دی تھی۔

”دل کی ہار بہت بری ہوتی ہے نا اذہان! اس واٹر لو سے بھی بہت بڑی۔ یا پھر اس واٹر لو کی

بیچھی ہی۔“

”تمہیں کیا لگتا ہے ساہیہ؟“

”مجھے؟“ وہ مسکرائی تھی۔ انداز بالکل سرسری اور غیر سنجیدہ تھا۔ ”مجھے دل کی ہار اس واٹر لو کے مقام

لا بڑی ہار لگتی ہے اذہان! نیولین اس کا اندازہ کبھی نہیں لگا سکتا۔ کیونکہ نیولین کا دماغ صرف اس

میں لگا تھا۔ صرف دماغ انوالو تھا، دل نہیں۔ وہ اس جنگ کی ہار کو صرف دماغی طور پر جھیل سکا۔

سے کبھی وہ اس ہار کو محسوس نہیں کر سکتا۔ اگر وہ دل سے ہارا ہوتا تو شاید اسی لمحے میں مر گیا ہوتا۔ دل

انداز سے اندر جینے کا حوصلہ ختم کرتی ہے اذہان! ڈائریکٹ دل کو مارتی ہے۔ نیولین کبھی اس بات

ازہ نہیں لگا سکا ہوگا۔ دل کی ہار شاید واٹر لو کی اس ہار سے بھی بہت بڑی ہوتی ہے۔ اسے جھیلنے

زیادہ انعام کے حق دار ہونے چاہئیں۔ حیرت ہے، انہیں کوئی خراج تحسین تک پیش نہیں کرتا۔“

سنجیدہ بات کہنے کے بعد غیر سنجیدگی سے مسکرائی تھی۔ اذہان اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

”م خود کو اتنا بے فکر ظاہر کیوں کرتی ہو ساہیہ؟“

”میں، میرا فکر مندا ظاہر کرنا میرے لئے کون کون سے فائدے لاسکتا ہے؟“ وہ بدستور اسی طرح

بتا رہی تھی۔ اذہان کو وہ لمحہ بہت مشکل لگا تھا۔

”میں ڈر رہے نا؟“

”ڈر کے نہیں ہوتا اذہان! — میں بھی انسان ہوں۔ میرے سینے میں بھی ایک دل ہے۔ اور وہ

بڑی ہی ہے۔ تو ڈر تو مجھے لگے گا نا۔ ویسے ابھی سے بتا دوں، مجھے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا

”ہاں، وہ سی ہے۔ اور زیادہ ضروری بھی ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں کسی سے کہہ کر بت کروا دیتی ہوں۔ تم اپنا سامان پیک کر لو۔ مگر.....“ مائی اماں کسی الجھن میں دکھائی دی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری لائق سنا بیٹھا تھا۔

”مگر کیا مائی؟ کوئی پراہلم ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھ سے کہئے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے لئے کچھ کر سکوں۔“ میرب کا انداز مائی کے ساتھ بہت الگ تھا۔

”وہ تو ہے بیٹا! لیکن تم خود ہی کہہ رہی تھیں کہ تمہیں جانا ہے۔“

”تو آپ چاہتی ہیں کہ میں رک جاؤں؟“ سوالیہ نظروں سے مائی اماں کو دیکھتے ہوئے وہ اس لئے رہینگین حیدر لغاری کو مکمل طور پر انکوری کر رہی تھی۔ اور شاید وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی تھی۔

”میں نہیں بیٹا! رومیسا لغاری۔ صبح میں ہسپتال گئی تھی۔ اس کے ڈاکٹر سے بھی بات ہوئی تھی۔ اس پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر ممکن ہوتا تو میں اس کے لئے کچھ کرتی۔“ مائی کی آنکھیں آبدیدہ ہو

گئیں۔ میرب خاموشی سے کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ مائی کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ وہ ان کی تیار داری کرنے نہیں آئی تھی۔ نہ ہی وہ کوئی مسیحا تھی۔ پھر یہ لوگ کیا چاہ رہے تھے اس بارے میں وہ سوچ رہی تھی۔ اور کیا کیا کچھ۔

”آپ کو لگتا ہے کہ میرے یہاں رہنے سے رومیسا لغاری کی حالت سنبھل سکتی ہے؟“

”نہیں، خود رومیسا نے ایسا کہا ہے کہ تم اس کے قریب رہو۔ بیٹا! مرنے والی کی آخری خواہش اس کی ہوتی ہے۔ مگر میں تم پر کوئی قدغن پھر بھی نہیں لگاؤں گی۔ اگر تم جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔ میں تمہیں کوئی سروکار نہیں ہو گا۔ میں تمہیں پابند بھی نہیں کرنا چاہتی۔ میں تو کسی قدر شرمندہ ہوں کہ تمہیں اس رشتے سے لاعلم رکھا اور تمہیں اس کے بارے میں خود سے پتہ چلا۔“ مائی شرمندہ لگتی رہی تھیں۔

”میرب میں اب اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ انہیں اس شرمندگی سے کچھ کہہ کر نکال پاتی۔ ہاں اسے بہت دکھ ہوا تھا اور اس کا ازالہ صرف یہ کہہ دینے سے ممکن نہیں تھا۔“

”میرب بیٹا! تم تیاری کر لو۔ میں تمہارے جانے کا بندوبست کروا دیتی ہوں۔“ مائی بولی تھیں اور خاموشی سے چلتی ہوئی باہر آ گئی تھی۔ یہ دیکھے بغیر کہ کوئی اور بھی اٹھ کر اس کے پیچھے آ گیا تھا۔

”میرب! باقاعدہ آواز دے کر پیچھے سے پکارا گیا۔ یہ وہ صدا نہیں تھی کہ اس کے قدموں کو منجھ لیا وہ پتھر ہو جاتی۔ مگر اس کے باوجود اس میں اتنی کڑسی تھی کہ وہ رک گئی تھی۔ اگرچہ پلٹ کر پھر مائی نے نہیں دیکھا تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری چلتا ہوا اس کے سامنے آن رکھا تھا۔

”اچھا، ٹھیک ہے۔ واپس تو مجھے بھی جانا تھا اور گین کو بھی۔ اگر تم ہمارے ساتھ ہی ہمیں اطمینان بھی رہتا اور خوشی بھی ہوتی۔“ مائی اماں نے مروت سے کہا تھا۔ سچی وہ جوابا بولی تھی۔

”میں ایسا ضرور کرتی مائی! مگر۔۔۔۔۔ بابا کا فون آیا تھا۔ وہ بھی مجھے مس کر رہے ہیں۔“

”وہ مسکرائی تھی۔“ یاد ہے تمہیں، اس روز جب اچانک لائٹ چلی گئی تھی تو۔۔۔۔۔ اور وہ اس میں کتنی موٹی کالی بلی تھی نا۔“

”ہاں، میں جانتا ہوں۔ تم لڑکیوں کو اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔“

”اور تم مردوں کو یہ بات پتہ ہے، اس کے باوجود میرے آواز دینے کے پانچ منٹ پہلے پہنچے تھے۔ کتنے افسوس کی بات ہے نا۔“ اس نے مصنوعی خشکی سے دیکھا تھا اور اذہان مسکرا دیا تھا۔

”وہ تو میں کینڈل ڈھونڈ رہا تھا۔“ وضاحت پیش کی گئی تھی اور ساہیہ ہنس دی تھی۔

”تم مردوں کے پاس ہر بات کا جواز موجود ہوتا ہے۔“

”اور تمہیں ڈر نہیں لگتا۔“ وہ اسی نقطے پر واپس آیا تھا۔

”لگتا ہے۔۔۔ بہت لگتا ہے۔“ وہ ایک پل میں سنجیدہ ہوئی تھی۔ ”مجھے ڈر لگتا ہے اذہان کبھی کبھی واقعی بہت لگتا ہے۔ مگر میں خوفزدہ ہونا نہیں چاہتی۔ نہ ہی میں ڈرنا چاہتی ہوں۔“

”تم خیال کرتی ہو کہ ڈرنا منج ہے۔“ وہ مسکرا رہا تھا اور وہ ہنس دی تھی۔

”نہیں۔۔۔ میں نہیں سمجھتی ہوں کہ ڈرنا ضروری ہے۔“

”ساہیہ! اذہان نے اسے سنجیدگی سے پکارتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ ”ساہیہ اللہ!۔۔۔ اور کیا کیا کچھ۔“

”آپ کو لگتا ہے کہ میرے یہاں رہنے سے رومیسا لغاری کی حالت سنبھل سکتی ہے؟“

”نہیں، خود رومیسا نے ایسا کہا ہے کہ تم اس کے قریب رہو۔ بیٹا! مرنے والی کی آخری خواہش اس کی ہوتی ہے۔ مگر میں تم پر کوئی قدغن پھر بھی نہیں لگاؤں گی۔ اگر تم جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔ میں تمہیں کوئی سروکار نہیں ہو گا۔ میں تمہیں پابند بھی نہیں کرنا چاہتی۔ میں تو کسی قدر شرمندہ ہوں کہ تمہیں اس رشتے سے لاعلم رکھا اور تمہیں اس کے بارے میں خود سے پتہ چلا۔“ مائی شرمندہ لگتی رہی تھیں۔

”میرب میں اب اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ انہیں اس شرمندگی سے کچھ کہہ کر نکال پاتی۔ ہاں اسے بہت دکھ ہوا تھا اور اس کا ازالہ صرف یہ کہہ دینے سے ممکن نہیں تھا۔“

”میرب بیٹا! تم تیاری کر لو۔ میں تمہارے جانے کا بندوبست کروا دیتی ہوں۔“ مائی بولی تھیں اور خاموشی سے چلتی ہوئی باہر آ گئی تھی۔ یہ دیکھے بغیر کہ کوئی اور بھی اٹھ کر اس کے پیچھے آ گیا تھا۔

”میرب! باقاعدہ آواز دے کر پیچھے سے پکارا گیا۔ یہ وہ صدا نہیں تھی کہ اس کے قدموں کو منجھ لیا وہ پتھر ہو جاتی۔ مگر اس کے باوجود اس میں اتنی کڑسی تھی کہ وہ رک گئی تھی۔ اگرچہ پلٹ کر پھر مائی نے نہیں دیکھا تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری چلتا ہوا اس کے سامنے آن رکھا تھا۔

”اچھا، ٹھیک ہے۔ واپس تو مجھے بھی جانا تھا اور گین کو بھی۔ اگر تم ہمارے ساتھ ہی ہمیں اطمینان بھی رہتا اور خوشی بھی ہوتی۔“ مائی اماں نے مروت سے کہا تھا۔ سچی وہ جوابا بولی تھی۔

”میں ایسا ضرور کرتی مائی! مگر۔۔۔۔۔ بابا کا فون آیا تھا۔ وہ بھی مجھے مس کر رہے ہیں۔“

”کیا ہوا؟“ تم اس طرح اندھیرا کئے کیوں بیٹھی ہو؟“
 بیہوش شاہ سیدھی ہو بیٹھی اور سر فنی میں ہلا دیا تھا۔
 انہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔“

اپنے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے کو محبت سے چھتھایا تھا۔
 میں نہیں یہ بتانے آئی تھی کہ کل گھر میں ایک تقریب ہے۔ بہت سے گیٹ آر ہے ہیں۔ سب
 رلی، ہو سے ملنے کا بھی شوق ہے۔ اس لئے تم اٹھو اور سیلون جا کر کچھ فریش ہو جاؤ۔“
 اس کا موڈ بحال کرنے کو وہ مسکرائی تھیں۔ وہ بھی مسکرا دی تھی اب اتنی تو کرسی باقی تھی اس میں۔
 ”کبھی باتیں کرتی ہیں آپ می؟“ آپ کا زمانہ اب اتنا پرانا بھی نہیں ہے۔ میں نے شاد کی
 پس دیکھی ہیں آپ کی۔ اچھی خاص ماڈرن خاتون تھیں آپ۔“ انا بیہ بولی تھی۔

”اچھا۔۔۔ تو کیا اب نہیں ہوں؟“ وہ اس کا چہرہ ہاتھ میں لے کر ہنس دیں۔ ”چلو اچھا ہوا،
 لہری کی کئی بات نے ہی سہی، خوش تو کیا۔ ہمارے بچے کے چہرے پر مسکراہٹ تو نظر آئی۔“
 بیان نے اسے کہا تو وہ جیسے زبردستی مسکرائی تھی۔ تبھی فاطمہ شاہ محبت سے بولی تھیں۔

”بیٹا! زندگی کے دروازے اس طرح بند نہیں کرتے۔ یہ عمر جیسے کی ہے۔ اسے زندہ دلی سے بسر
 لہنہاری عمر کے جب ہم تھے نا، ہم اس طرح کمرہ بند کر کے بیٹھنا تو درکنار، ہم گھر پر بھی مشکل
 رکھنا دیتے تھے۔ ہماری اماں ہماری خبر گیری کو پیچھے پیچھے ہوتی تھیں اور ہم آگے آگے۔ مگر بیٹا!
 اٹھا ہے، کھل کر جینا۔ لڑکیاں بڑی نرم دل ہوتی ہیں۔ بہت دلکش۔ انہیں رنگوں سے، موسموں سے
 اٹل رہنا چاہئے۔ تمہیں پتہ ہے اس وقت باہر کتنا خوبصورت موسم ہے۔ انوشے اور عریضہ ٹیرس پر
 ہلکا ٹائٹ اٹھو۔ ٹیرس پر چلو۔ میں گرم گرم چائے کے ساتھ گرم گرم پکڑے بنا کر بھیجتی ہوں۔ اور
 پھول صبح تم عصفان کے ساتھ اٹلی جا رہی ہو۔“ جاتے جاتے انہوں نے دھماکا کیا تھا۔

”کیا؟“ وہ بھر پور حیرت سے انہیں دیکھنے لگی تھی مگر وہ سرسری انداز میں مڑ کر اس کی طرف دیکھتی
 مسکرائی تھیں۔

”وہ جا رہا تھا۔ میں نے سوچا تم اس طرح کمرے میں بند کیوں رہو۔ اس لئے کہہ دیا کہ ایک کی
 ٹوک لے آئے۔ تم جلدی سے اٹھو۔ باہر چلو۔ چائے کے بعد عریضہ تمہیں پارلر لے جائے گی۔
 کی پارٹی میں سب کو نظر آنا چاہئے کہ میری بہو کتنی خوبصورت ہے۔“ وہ مسکرائی ہوئی یہ کہہ کر باہر
 نکل گئی۔ وہ کچھ دیر تک یوں ہی بیٹھی رہی تھی۔ پھر اٹھی اور چلتی ہوئی ٹیرس پر آگئی تھی۔ موسم خوب
 تھا۔ یونہی باندی ہو رہی تھی۔ بوندوں نے اس کے تن کو چھوا تھا۔ کچھ تر و تازہ سا احساس ہوا تھا۔
 ”کسے واہ بھائی! آگئیں؟“ انوشے اسے دیکھ کر خوشی سے چلائی تھی۔

”اور بھائی بھی آگئے۔“ عریضہ اس کے پیچھے آتے عصفان کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ انا بیہ کے قدم ایک
 ٹوک لے کر رک گئے تھے۔ عصفان علی خان چلتا ہوا، جنوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔

”کیا ہوا ہے بھتی؟“ آتے ہی ٹیپو کو پیار کیا تھا۔

”ہاں۔“ اس نے بلا تردد جواب دیا تھا۔ انداز سرد تھا۔
 ”میں نہیں جانتا تھا تم اتنی بے حس ہو۔ اتنی پتھر ہو۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے پُر انہما
 میں کہتے ہوئے ایک الزام اس کے سر کیا تھا۔ اسے اس الزام پر واضح حیرت ہوئی تھی۔

”کیا کہا آپ نے؟“ بے حس ہوں میں؟“ میں بے حس ہوں؟“ اگر
 حس ہوتی تو یہاں پر نہ ہوتی۔ مجھ پر الزام لگا کر آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟“ وہ پُر اعتماد
 دریافت کر رہی تھی۔

”ثابت کچھ نہیں کرنا چاہتا۔ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمہیں رومیصا کی خواہش کا کچھ تو
 چاہئے۔“

”کیوں۔۔۔ کیوں کروں میں احترام؟“ کیا لگتی ہیں وہ میری؟ اور آپ۔۔۔
 الزام لگانا باقی ہو تو وہ بھی لگا دیجئے۔ پہلے راز جاننے کا، کچھ کھوج داری کا الزام لگایا اور اب
 اور کس لئے رکوں میں تاکہ آپ کو یقین ہو سکے کہ میں واقعی کسی راز کی کھوج میں یہاں آئی
 ہے اس روز آپ نے ہی مجھے رومیصا لغاری سے ملنے سے باز رکھنا چاہا تھا نا۔ اس کے قریب
 سے بھی منع کیا تھا۔ صرف اسی وجہ سے تاکہ آپ کو لگتا ہے میں ان کے قریب جا کر ان سے
 رہی ہوں۔ تو پھر اب کیوں روک رہے ہیں آپ مجھے؟“ وہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی پُر اعتماد
 دریافت کر رہی تھی۔ سردار سبکگین کو اس کی ہمت نے ایک بار پھر دونوں شانے چت کر
 بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ مگر اس لمحے وہ اس کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ تبھی بہت جا
 میں اسے شانوں سے تھاما تھا اور بولا تھا۔

”مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ تم کیا سوچتی ہو۔ کس لئے سوچتی ہو۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ
 تمہاری عقل میں بات کیوں نہیں آتی؟ اتنی بند عقل کی لڑکی کیوں ہو تم؟“ وہ
 کب لوگی تم؟ عقل کو استعمال بھی کرنا ضروری ہے۔ کس روز پتہ چلے گا تمہیں؟“ وہ
 ذرا سی ہمدردی چاہتی ہے۔ تمہاری ذرا سی توجہ اور تم۔“

”تو کیوں دوں میں اسے توجہ؟“ کیوں دوں ذرا سی ہمدردی؟“ متوازن انداز
 ہوئے اس نے اپنے شانوں پر سے سردار سبکگین کے ہاتھ ایک لمحے میں جھٹک دیئے تھے۔
 ”کوئی نرس نہیں ہوں میں۔ نہ ہی کو انیڈرنٹ۔“ آپ کی سمجھ یہ بات نہیں آ
 ہیں آپ مجھے۔ بیوی ہوں آپ کی تو سب کی غلام بھی ہو گئی؟“ اس کا لہجہ معمول
 تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری کا ہاتھ جانے کیسے اس لمحے میں اٹھا تھا اور اس کے چہرے پر
 گیا تھا۔ وہ ساکت سی، بھر پور حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ مگر سردار سبکگین حیدر لغاری
 مڑا اور چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ میرب سیال بت بنی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

وہ کمرے میں چپ چاپ دیکھی بیٹھی تھی۔ جب فاطمہ شاہ اندر آئی تھیں۔

”بھائی! آپ اس وقت کیسے؟ اتنی جلدی؟“ عریشہ مسکرائی تھی۔ ”کہیں ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ موسم میں بھائی کی یاد اس شدت سے ستائی ہو کہ آپ رہ ہی نہیں سکے۔“ انداز میں ایک خاص لہجہ سے عفتنان علی غالباً مروتا مسکرایا تھا۔ پلٹ کر اپنے پیچھے کھڑے وجود پر ایک نگاہ غلط انداز سے مڑا تھی۔

”ارے بھائی! آپ وہاں کیوں رک گئیں؟ آگے آئیے نا۔“ انوشے خود آگے بڑھ کر ہاتھ تھام کر اسے گھید لائی تھی۔ وہ اس ماحول میں خود کو بہت اچھی محسوس کر رہی تھی۔ اگرچہ اسے ارد گرد کے لوگ متواتر لگاؤت دکھا رہے تھے۔

”کل کی پارٹی کی کچھ خاص تیاریاں باقی تھیں۔ یہ تم لوگوں کو بارش میں بھیگنے کا کیا شوق بارش بھی کوئی انجوائے کرنے والی شے ہے؟ تم لڑکیاں بھی عجیب بدبو ہوتی ہے۔“

”اچھا۔۔۔ صرف ہم لڑکیاں۔ اور آپ جو اس موسم میں رہ ہی نہیں سکے اور بھانے سے دوڑے چلے آئے۔“ عریشہ نے بھائی کی خبر لی تھی۔

وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔ مگر ہنسنے کا یہ انداز بڑا کھوکھلا تھا۔

رسم دینا بھانا آسان نہ تھا۔ مگر کرنا پڑ رہا تھا۔

انا بیہ شاہ سر جھکائے اس سے کچھ اونچ کے فاصلے پر کھڑی بوند باندی میں متواتر بھیگ رہی عریشہ نے اسے بغور دیکھا تھا۔

”یہ آپ کو کیا ہوا بھائی؟ کہیں آپ دونوں میں کوئی ان بن تو نہیں ہو گئی؟“

رومانک موسم میں اس طرح خاموشی سے کھڑے رہیں، ہو ہی نہیں سکتا۔ ضرور کچھ گڑبڑ ہے بھائی! بتائیے، کیا ہوا بھلا؟“

انا بیہ کے لئے یہ لمحہ اتنا مشکل ہو گا، اگر اسے یہ پتہ ہوتا تو وہ باہر اس طرح اٹھ کر کبھی نکلے تھی انوشے بولی تھی۔

”کیا ہوا؟“ کیا سوچ رہی ہیں آپ؟ کہیں آپ یہ تو نہیں سوچ رہیں کہ ہم دونوں کا اچھی خاصی ہڈیاں ہیں اور ہمیں یہاں سے پہلی فرصت میں آؤٹ ہو جانا چاہئے۔ تاکہ اے رومانک سے موسم کو مل کر انجوائے کر سکیں۔“ اس کا انداز شرارت سے بھر پور تھا۔ مگر انا بیہ نے سے مسکرائے بغیر سرفنی میں ہلا دیا تھا۔

”میں پکڑے لے کر آتی ہوں۔“ انوشے نے شرارت سے آنکھ دباتے ہوئے وہاں سے اٹھا۔ مگر عفتنان نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور سرد انداز میں بولا تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کس کی ضرورت نہیں؟“ عریشہ نے مسکراتے ہوئے ہنوز شرارت سے بھائی کو دیکھا تھا۔

”ہمیں کسی پرائیویسی کی ضرورت نہیں۔“

”ہاں۔۔۔ تو کیا آپ لوگ ہماری موجودگی میں۔۔۔“ عریشہ نے شرارت سے ہنستے ہوئے انوشے کو چھیڑا تھا۔ عفتنان نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر چیت لگا دی تھی۔

”تمہارا بیٹا پہلے سے بھی کچھ زیادہ صحت مند ہو گیا ہے۔ کچھ خیال کرو۔ یہی حال رہا تو تمہیں اسے ملنگ سینٹر میں ڈلوانا پڑے گا۔“ ٹیپو کو پیار کرتے ہوئے وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ جہاں عریشہ نے لہجہ گھورا تھا وہیں انوشے کھلکھلا کر ہنستی چلی گئی تھی۔

”ارے واہ۔۔۔ آپ کو میرا بچہ ہی نظر آتا ہے۔ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں آپ۔ نظر لگا کر ہی پوڑیں گے۔“ ایک جھکے میں ٹیپو کو اس کی گرفت سے کھینچ کر اپنے سینے سے بھینچا تھا۔ ٹیپو معصومیت سے امان کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا تھا۔ عفتنان ہنس دیا تھا۔

”ہاں ہوں۔۔۔ پیار کرتا ہوں بھئی۔ اتنا تو میرا حق ہے۔“ اس نے ٹیپو کے گال کو چھوا تھا۔

”اب بیہ شاہ لاطعلق ہی کھڑی ان بوندوں میں چپ چاپ بھیگ رہی تھی۔

”یہ آپ دونوں کو ہوا کیا ہے؟“ عریشہ نے پھر انہیں بغور دیکھا تھا۔ ”اس طرح دو ڈیفرنٹ پول لگا لگ ستوں میں انجان بنے کیوں کھڑے ہیں؟“

”م غور و خوض کر رہے ہیں۔“ عفتنان بات سنبھالتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”کس بات کے متعلق؟“

”فنی پلاننگ کے متعلق۔“

ایک زبردست قہقہہ فضا میں بکھرا تھا اور وہ ہنستا چلا گیا تھا۔ انا بیہ چہرے کا رخ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔ عفتنان نے ایک نگاہ دانستہ اس پر بڑے بے خبر انداز میں ڈالی تھی اور بولا تھا۔

”ہم سوچ رہے ہیں کہ ہمیں اور کتنا کچھ جھینانا باقی ہے۔ کتنا ہم اپنے حوصلوں کو آزما سکتے ہیں۔“

بات اگرچہ سچ تھی اور بہت کڑوی کیلی اور گہری تھی۔ مگر انداز ایسا تھا کہ مذاق لگے۔ مگر عریشہ پھر لہجہ کے بغیر ہنس رہی تھی۔

”خدا نخواستہ، کیسی بری باتیں کر رہے ہیں آپ۔ ابھی ابھی تو شادی ہوئی ہے آپ لوگوں کی۔ ہنسنے کیلئے کے دن ہیں اور آپ۔۔۔ ابھی تو ماشاء اللہ آپ کو پوری زندگی ساتھ گزارنی ہے۔ دو دھوں نہانا ہے، پتوں کھیلنا ہے۔ ایسی بری باتیں تو نہ کریں آپ۔“ عریشہ نے تنبیہ کی تھی۔ باقاعدہ ڈانٹا تھا۔ وہ

مگر دیا تھا۔ انا بیہ کی طرف دیکھنے کی گستاخی اب بھی نہیں کی تھی۔ وہ اپنے کہے کو بھانے کا عادی تھا۔

ناگنا انا بیہ کی دل چاہا تھا کہ وہ وہاں سے بھاگتی ہوئی کہیں نکل جائے۔ سانس لینا محال ہو رہا تھا اس

دماغ میں۔ اس کی ہمت تھی کہ وہ وہاں کھڑی تھی۔ عجب مجرمانہ سا انداز تھا۔ جیسے اس نے کوئی بہت

مذاہم کر دیا ہو۔ آخر کب تک اسے اس طرح دنیا دکھاوے کی زندگی جینا تھی۔ جب یہ تعلق کوئی نام

نشانہ رکھتا تھا۔ کوئی اہمیت ہی نہ رکھتا تھا۔

”دوسرے جھکائے بوندوں میں بھیگتی ہوئی چپ چاپ کھڑی تھی۔ اسی وقت انوشے آگے بڑھی تھی اور

اس کا ہاتھ تھام کر ایک پل میں بھائی کے قریب لے جا کر اس کا ہاتھ ہوا ہاتھ عفتنان کے ہاتھ میں دے

وہم
 ”ایک بات پوچھوں؟“ انابیہ نے سر جھکا کر دریافت کیا تھا۔
 ”کیا؟“
 ”کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے چلی جاؤں؟“ لہجے کی سردی نے فضاؤں کو بھی ٹھنڈ کر دیا

تھا۔
 ”تمہاری مرضی ہے۔“ کچھ سوچے سمجھے بغیر دوسرے ہی لمحے دوسری طرف سے جواب آیا تھا۔
 انابیہ شاہ نے سراٹھا کر اس شخص کو دیکھا تھا۔ آنکھوں کے اندر نئی یک دم ہی بڑھنے لگی تھی۔
 بخ بستگیوں کے موسم میں الاؤ دہکا بھی تھا تو اس موسم میں جب برف بہت زیادہ جم چکی تھی۔ بھینکنے
 کی حد گزر چکی تھی۔ اس نختے نے الاؤ سے اب کیا ہونا تھا۔
 عفنان نے اس کی جانب چونکے بغیر دیکھا تھا۔ پھر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ انابیہ جیسے کسی ایک
 لمحے کی منتظر تھی۔ جیسے اسی ایک اجازت کی طلب گار تھی۔ بنا کوئی دوجی بات سوچے وہ آگے بڑھی تھی
 اور اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا تھا۔

قطرہ — قطرہ —

کتنے آنسو چپ چاپ اس شانے میں جذب ہونے لگے تھے۔
 عفنان اس کے سامنے ایک برف کی سیل کی مانند کھڑا تھا۔ نہ ہاتھ پھیلا کر اسے کوئی حصار دیا تھا نہ
 ہی اس کا حوصلہ بڑھانے کو اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کے سر کو سہلایا تھا۔

کتنے سارے حق محفوظ رکھتا تھا وہ —

لیکن اس نے ایک حق بھی استعمال نہیں کیا تھا —

کوئی ایک حق بھی نہیں جتایا تھا —

انابیہ شاہ کتنی دیر اس کے شانے پر سر رکھے اپنے اندر کا الاؤ ابھارتی رہی تھی۔

قربتوں کے موسم کیسے تھے۔

حدتوں کے ساتھ —

حدتوں سے پرے —

قربتوں کے ساتھ۔ قربتوں کے موسموں سے بے خبر!!!

انابیہ شاہ نے اپنے اندر کا سارا درد اس کے شانے پر پیمانے کے بعد اپنا سر اس کے شانے پر سے
 ہٹایا تھا اور بنا شرمندہ ہوئے دو قدم دور ہٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔

”تھینک یو۔“ ایک لمحے میں کہا تھا اور دوسرے ہی لمحے وہ پلٹی تھی اور چلتی ہوئی اس منظر سے نکلتی
 چلی گئی تھی۔ عفنان کتنی دیر اس بارش میں تنہا بھینکا رہا تھا۔

کتنے لمس جل رہے تھے اس وجود پر —

شانے پر وہ سر جیسے اب بھی دھرا تھا —

کتنی قربت تھی وہ۔ پردگی کے بھر پور احساس کے ساتھ —

دیا تھا۔ پھر عفنان کا دایاں بازو پکڑا اور انابیہ کے گرد شولڈر پر رکھ دیا۔ یہ سب اتنا اچانک اور غریب
 ہوا تھا کہ دونوں حیران رہ گئے تھے۔ اور ایک دوسرے کو ساکت نظروں سے دیکھنے لگے۔
 انوشے نے دونوں کی حیرتوں پر ان کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بھر پور انداز میں سراپا تھا۔ پھر
 نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا تھا اور وہاں سے نکلنے کی ٹھانی تھی۔ کہا۔
 مزید ہڈی بنے بغیر۔

”آپنی! میں دیکھ کر آتی ہوں، یہ ابھی تک پکوڑے بنے یا نہیں۔“ انوشے کہہ کر ایک
 سیڑھیاں پھلانگ گئی تھی۔

”میں بھی دیکھتی ہوں کہ چائے بنی کہ نہیں۔“ عریشہ بھی دوسرے ہی لمحے وہاں سے غائب
 اب وہاں اس ساکت جلد ماحول میں دو وجود کھڑے رہ گئے تھے۔

بالکل ساکت جلد انداز میں۔ برف کی مانند سرد — گلئیشیر کی طرح ٹھنڈے، بخ بڑ
 ایک دوسرے کے ساتھ — ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔

قربتیں تھیں مگر حدتوں کی رمت دور دور تک نہ تھی۔

جذبوں میں کمی واقع ہوئی تھی یا دل ہی محسوس کرنے کا ہنر کھو چکا تھا۔ دونوں ایک دو۔
 گریزاں، نگاہ پھیرے کھڑے تھے۔

انابیہ شاہ ایک قدم دور ہوئی تھی۔ عفنان علی خان بھی گریز پائیوں کے زیر تھا۔ اپنا ہاتھ اس
 سے ہٹا کر وہ کب کا نکال چکا تھا۔ شاید اجنبی بن کر آگے بھی بڑھ جانا چاہا تھا۔ مگر انابیہ نے پکارا
 ”وہ.....“ بات کرنے کو لفظ جیسے کہیں کھو گئے تھے۔ نہ حرف باقی رہے تھے اور نہ
 موضوع۔ تعلقات کی بیخ پر یہ بیخ بستگی نئی تو نہیں تھی۔ مگر پہلے سے کچھ قوی ضرور تھی کہ جان
 روح تک میں ایک قیامت کی سی ہلچل تھی۔

”کچھ کہنا چاہتی ہیں آپ؟“ عفنان علی خان نے دوریوں کو کچھ اور سوا کیا تھا۔ بوندوں
 بڑھ رہا تھا۔ دونوں تیزی سے بھگ رہے تھے۔ مگر دل اتنے ہی بچر تھے دونوں کے۔

”ہاں، وہ.....“ انابیہ کے حلق میں جیسے آنسوؤں کا پھندا آن پڑا تھا۔ دل یک دم ہی
 بہت رونے کو چاہا تھا۔ عفنان علی خان نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ اسے خود کو کپوز کرنے کا
 اور موقع فراہم کیا تھا اور اطمینان سے اس کے سامنے کھڑا رہا تھا۔

”مئی بتا رہی تھیں — کل — کل پارٹی ہے گھر میں؟“ انابیہ نے بات بامشکل مکمل
 انداز میں ایک گہرا نکتوت تھا۔

”ہاں — آپ جاہیں تو شرکت نہ کریں۔ ایسا ضروری نہیں ہے کچھ۔“ کتنا برف سا
 شخص کا۔ جیسے حدتوں سے کبھی کوئی واسطہ رہا ہی نہ ہو۔ انابیہ شاہ کے دل پر ایک برجھی سی چلی

تھا اندازہ ایسے رویوں کا؟ — کب تھا تجربہ جھیلنے کا؟ — ایسی بیخ بستگیوں کو سہنے کا۔
 اب تو سارا منظر ہی تبدیل تھا۔

لحہ دو لہجہ — پل دو پل!

نہ اقرار — نہ اظہار —

نہ وہ لمس — نہ وہ شانے پر دھر اس کا سر — نہ اس کی آستین میں جذب ہوئے اس کے
بے معنی تو شاید کچھ بھی نہیں تھا —

وہ بنا کچھ کہے اپنے اندر کا سارا درد اس کے شانے پر بہا گئی تھی۔ دوسرے معنوں میں اپنا
اسے سوچ گئی تھی۔

کیسی تھی یہ محبت —

کیسا تھا یہ تعلق —

ادھورا ادھورا — آدھا آدھا تھا سب کچھ۔

وہ اپنے کمرے میں تھی جب نوکرنے آکر اطلاع دی تھی۔

”بی بی! مائی فرما رہی ہیں آپ کے جانے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ باہر گاڑی تیار کھڑی ہے۔
تیار ہو کر آجائیے۔“

”جا کر کہہ دو مائی سے، نہیں جانا مجھے۔“ اس نے سرد لہجے میں جواب دیا تھا۔ نوکرنے
انداز سے سر ہلایا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔

وہ رومبصا کے پاس ہاسٹل جانے کی غرض سے کپڑے نکالنے کے لئے الماری کی طرف
جب آنا فانا کمرے میں سردار سیکٹین حیدر لغاری داخل ہوا۔

”جب کہا تھا جانا ہے تو اب کیا ڈرامہ ہے یہ؟“ وہ اپنی گزشتہ غلطی پر شرمندہ ہونا تو دور
رتی بھر پڑمال تک نہ تھا۔

میرب سیال نے مڑ کر دیکھا تھا تو اسے اس شخص کے ظرف پر حیرت ہوئی تھی۔

”یہ ڈرامہ نہیں ہے۔ ڈرامہ وہ ہے جو آپ کرتے ہیں۔ اور آپ مجھ سے اس لہجے میں بان
سکتے۔ آپ کا مجھ پر کوئی حق باقی نہیں ہے۔“ وہ بجائے مصلحت پسندی اختیار کرنے کے اس
کے لاؤ کو اور دہکا رہی تھی۔

مگر سردار سیکٹین حیدر لغاری نے اسے حد درجہ اطمینان سے دیکھا تھا۔

”میرا آپ پر کتنا حق باقی ہے، اس کا فیصلہ میں ایک پل میں کر سکتا ہوں۔ چاہوں تو پونڈ
بھی دکھا سکتا ہوں۔ مگر چھوڑیے، آپ کی سمجھ میں یہ ساری باتیں نہیں آئیں گی۔“

”کیسے انسان ہیں آپ؟ — آپ کو افسوس تک نہیں کہ کس طرح کے جنگلی پن کا
چکے ہیں آپ۔ ہاتھ تک اٹھالیا تھا آپ نے مجھ پر۔ عورت کو کتنا کمزور جانتے ہیں آپ۔ ایک
زیر کرنے کا بس ایک ہی فن ازبر ہے آپ کو؟ — ایک کو وہاں قید خانے میں ڈال کر تڑپ
مرنے کو باقی چھوڑ دیا اور دوسری کو.....“ وہ اپنے اندر کا سارا زہر جیسے نکال دینا چاہتی تھی۔

”دوسری کی عقل بالکل کام نہیں کرتی۔ دماغ ٹھکانے لگانے کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔“

”آپ آپ اس طرح دماغ ٹھکانے لگائیں گے میرا؟ — اس طرح ٹارچہ کر کے؟ —

بچہ ہے ایک دن آپ مجھے بھی اٹھا کر کسی اندھیرے کمرے میں بند کر دیں گے۔ آپ کے یہاں
بائٹھکانے لگانے کا یہی ایک بہترین طریقہ ہے۔ محکوم تو م سمجھتے ہیں نا آپ اس عورت کو۔ آواز
ٹھکانے نہیں اور آپ کی تضحیک ہوئی نہیں۔ ویسے تو لبرل ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور دوسری
لڑنا۔“ آنسوؤں نے سارا اعتماد پل میں ڈھیر کر دیا تھا۔ وہ تھپڑا ب تک بھولا نہ تھا۔

سردار سیکٹین حیدر لغاری نے اس کے وجود کو بغور دیکھا تھا۔

”جب اتنی نالاں ہیں تو دور جانکنے میں اتنی دیر کیوں لگا رہی ہیں آپ؟ — بھاگنے کا موقع
زادہم تو ہو رہا ہے آپ کو۔ اگر آپ کو کسی اندھیری کال کوٹھڑی میں بند نہیں ہونا تو آپ چلی کیوں نہیں
ہائیں؟ اتنی انسیت کس خوشی میں ہو گئی ہے آپ کو اس گھر اور اس کے کینوں سے؟“ وہ سلگتے ہوئے
انداز میں گویا تھا۔

”میں یہاں پر آپ کے لئے نہیں ہوں۔ پہلے والی میرب سیال میں اور اس میرب سیال میں بے
مدت بدلی واقع ہو چکی ہے۔“ یہ جو سامنے تھی، کوئی لگی لپٹی رکھنے کی قائل نہیں لگ رہی تھی۔ بے حد پڑ
انہار ہو چکی تھی وہ۔ اس کی حقیقت جان لینے سے جیسے اس میں کوئی عجیب سی طاقت آگئی تھی کہ اب وہ
اسے بڑے آرام سے زیر کر سکتی تھی۔

”لگتا ہے کہ میری کمزوری تمہارے ہاتھ آگئی ہے۔“ سردار سیکٹین حیدر لغاری نے اس انداز میں
روایت کیا تھا جیسے وہ اس گھڑی سطر سطر پڑھ رہا تھا۔ میرب چوگی تھی۔ پھر سرفی میں ہلا دیا تھا۔

”میں کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے والی ہرگز نہیں ہوں۔ بہت بزدل ہوتے ہیں ذہ لوگ جو
کئی کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔“

”اور وہ کون ہوتے ہیں جو کسی کو اپنی کمزوری بنا لیتے ہیں؟“ بات کچھ خاص تھی مگر لہجے میں ایک
عجیب سی چھین تھی۔ سردار سیکٹین حیدر لغاری کا لہجہ اتنا سخت نہیں تھا جتنا کہ ہونا چاہئے تھا۔ غالباً وہ
السنہ میرب سیال کو رعایت دے رہا تھا۔

”میں نہیں جانتی، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں کے تاثر کو سمجھ بغیر اسی کڑے تیور
سے بولی۔

”تم نہیں جانتی ہو۔ مگر تم کسی کی کمزوری کو اپنی طاقت بنانا ضرور جانتی ہو۔“ لہجہ ہی نہیں انداز بھی
نڈھکی تھا۔ مگر وہ قطعاً نہیں سمجھ پاتی تھی کہ اس کا مفہوم کیا تھا اور اس شخص کی کمزوری درحقیقت کیا تھی۔

”اس نچ پر سوچ ہی نہیں رہی تھی۔

”سردار سیکٹین حیدر لغاری کی جاسوسی کرنا مقصود ہو تو آئندہ اسٹریٹیجی کچھ مختلف پلان کرنا۔“

وہ کسی قدر تسلی بخش لہجے میں بولا تھا۔ میرب سیال نے اسے چونک کر کسی قدر حیرت سے دیکھا
نار مگر مفہوم اب بھی جاننے سے قاصر رہی تھی۔

”ہرٹ کرنا یا کسی کو نقصان پہنچانا تو بہت چھوٹی بات ہے فضا! میں نے کسی کے اعتماد کو قتل کیا ہے۔ بہت بری ہوں میں۔ بہت برا کیا ہے میں نے۔“ وہ اپنا سر ہاتھوں پر گرا کر بے آواز رونے لگی تھی۔
 فضا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ سبھی وہ بولی تھی۔
 ”مجھے تنہا چھوڑ دو فضا! — اس وقت میں کسی سے بھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ اس کی لطف دیکھے بغیر بولی تھی۔ فضا چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری نے اندر قدم رکھا تھا اور رومیسا لغاری نے اسے چونک کر دیکھا تھا اور پھر بہت ملامت سے مسکرا دی تھی۔
 ”گین! تم —“

سردار سبکگین حیدر لغاری نے قدم آگے بڑھا دیئے تھے اور چلتا ہوا اس کے قریب جا رہا تھا۔ رومیسا لغاری اسے چستی نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔
 ”اتنی دیر لگا دی آنے میں؟“
 ”میں یہاں کافی دیر سے آچکا تھا۔“ وہ باور کراتا ہوا بولا تھا۔

”پھر اتنی دیر مجھ تک آنے میں کیوں لگا دی؟“ رومیسا لغاری نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ جواباً کچھ نہیں بولا تھا۔ مگر اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ رومیسا لغاری نے اسے بغور دیکھا تھا مگر کچھ بھی دریافت کئے بغیر مسکرا دی۔

پھر بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھایا اور پھیلا کر اس کے سامنے کر دیا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے اپنا ہاتھ بہت آہستگی سے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔
 ”مجھے پتہ تھا، تم ضرور آؤ گے۔“

”کیسے نہیں آتا؟ — آپ نے یاد ہی اتنا کیا تھا۔“
 ”جھوٹے!“ رومیسا لغاری مسکرائی تھی۔ ”میں نے تو تمہیں پہلے بھی کئی بار یاد کیا تھا۔ تب تو تم نہیں آئے۔ میں جانتی ہوں تم یہاں کس کے لئے آئے ہو۔“ اسے بھی بتایا کہ نہیں؟“ رومیسا لغاری بہت دوستانہ انداز میں اسے چھیڑ رہی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری مسکرا دیا۔ پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔
 ”آپ نے اپنا خیال نہیں رکھا نا — ایک نہیں مانی — بہت ضدی ہیں آپ۔“
 ”مگر وہ آپس دی تھی۔“

”گین! — اب تم تو ایسے مت کہو — میں نے تمہاری ہر بات مانی ہے۔ تم نے جو بھی کہا، جب بھی کہا ہے میں نے کیا ہے۔“ ان دونوں کی باتوں میں ایک عجیب سی آشنائی جھلک رہی تھی۔
 ”ہمیشہ نہیں۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے جتایا تھا۔

”ہاں — ہمیشہ نہیں — مگر مانا تو ہے نا — تمہارا کہا کبھی ٹالا تو نہیں۔“ رومیسا لغاری

”بڑے ناقص رہے ہیں آپ کے ہتھیار اور بہت ناقص العمل رہا ہے آپ کا پلان۔“ سبکگین حیدر لغاری کی کمزوری کے متعلق رتی بھر بھی جان نہیں پائیں۔ جان پائیں تو اس کی طرح حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے میرے سامنے نہ کھڑی ہوتیں۔“ وہ محظوظ ہو رہا تھا اور دماغ و تاب کھا کر رہ گئی تھی۔

”مجھے آپ سے یا آپ کی کسی کمزوری کو جاننے سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ سمجھے؟“

تھا۔
 ”اوہ ریلی؟“ وہ دھیسے سے مسکرایا تھا۔ انداز آگ پر تیل چھڑکنے والا تھا۔ میرب سبکگین نظر اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”اگر آپ کو نہیں جانا یا جانے کا دل نہیں چاہ رہا تو اتنا دوایلا کرنے یا حیلے بہانے کر ضرورت ہے؟“ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔ ”ابنی ہاؤ — اگر آپ واقعی نہیں چاہیں اور میرب یہاں قیام کرنا چاہتی ہیں تو اپنا سامان واپس کھول سکتی ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ وہ سکون کیفیت میں کہہ کر پلٹا تھا جب کہ وہ سسکتے ہوئے انداز میں بولی تھی۔
 ”میں یہاں آپ کے لئے نہیں رہ رہی۔ سنا آپ نے؟“ وہ چیخی تھی۔

”سامان کھول کر واپس اس کی جگہ پر لگا دیجئے۔“ وہ پلٹے بغیر ہدایت جاری کرتا ہوا واپس گیا تھا۔ انداز اطمینان بھرا تھا۔ میرب سیال پاؤں سٹج کر رہ گئی تھی۔

لامعہ حق خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی جب اس کی دوست فضا اس کے پاس آئی تھی۔
 ”تم کب تک اسی طرح بیٹھی رہو گی؟ کم آن — چلو باہر چلتے ہیں کہیں۔“
 ”فضا! پلیز، تم جاؤ یہاں سے۔“

”تم نے ایسا کیا کر دیا ہے کہ تم مجھ سے سانس تک نہیں لے پا رہی ہو؟ آئی تک پریشان کر کے رکھا ہوا ہے۔ اگر تمہیں کچھ چاہئے تو اپنی بات منوانے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟ کی ساری چیزیں توڑ دینا، بھوک ہڑتال کر دینا.....“ فضا بول رہی تھی۔ جب اس نے نورنا بات کاٹی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے فضا! پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں ہے۔“
 ”تم چاہتی کیا ہو آخر؟“

”میں..... میں اس وقت کچھ نہیں چاہتی ہوں۔ میں نے کسی کو ہرٹ کیا ہے، اسے نقصان ہے۔“ لامعہ کا انداز پُر افسوس تھا۔

فضا چونکی تھی۔
 ”کسے؟ — کسے ہرٹ کیا ہے تم نے؟“

لامعہ نے سر نیچی میں ہلا دیا تھا۔

”کوئی اس طرح بھی کرتا ہے رومیصا؟۔ اس طرح؟“
”آپ مجھ سے اس طرح کی امید قطعاً نہیں تھی۔ وہ باپ ہیں آپ کے۔ اور کتنی سزا

آپ انہیں؟“

”کیا پلینز، کوئی اور بات کرو۔ میں یہ سب سننا نہیں چاہتی۔“

”رومیصا!۔“ قطعی انداز میں پکارا تھا۔ مگر وہ چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”رادر سبکگین حیدر لغاری نے آگے بڑھ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ لایا اور اسے بخور دیکھنے لگا تھا۔

”آپ بات نہیں مانتی ہیں نا۔۔۔ سب سے بری بات یہی ہے آپ کی۔“ انداز پلک دار تھا۔
”رومیصا نے تب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ تب سردار سبکگین حیدر لغاری نے بہت آہستگی سے
ہلکا کرک اس کی پیشانی پر رکھ دیئے تھے۔

”بیرب سیال جو وہاں آئی تھی وہ کافی حد تک ان کی گفتگو بھی سن چکی تھی۔ اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

”ہی کیڑا واؤٹ یورومیصا!۔۔۔ آل ویز۔۔۔ آپ جانتی ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ اپنے مضبوط
دہلیز لے کر ہاتھ اور رومیصا لغاری اس کی طرف دیکھتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”ہیں آرمایچے آخری ہتھیار بھی۔۔۔ بہت کلیور ہوتم۔“ رومیصا لغاری کے انداز میں ایک خاص
دل تھی۔

گین مسکرا دیا تھا۔

بیرب سیال کے لئے وہ منظر مزید دیکھنا محال ہو گیا تھا۔

”ادایک دم ہی پلٹی اور وہاں سے نکلتی چلی گئی۔ پلکیں خمی سے یک دم ہی بھاری ہونے لگی تھیں۔

کسی عجیب تھی یہ کیفیت۔

”وہ کچھ کھنے سے قاصر تھی۔

مگر اسے یقین تھا، جو دیکھا تھا وہ دھوکا نہ تھا۔ نہ نظر کا فریب۔ سب سچ تھا۔ سردار سبکگین حیدر
لغاری اس رشتے سے انسیت رکھتا تھا۔ یہ بات جانے کیوں اندر کا سارا سکون ایک پل میں ڈھار ہی
لگا۔

”اور سردار سبکگین حیدر لغاری کہہ رہا تھا۔

”رومیصا! ٹھیک نہیں ہے یہ۔۔۔ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کسی چھوٹی سی غلطی کی سزا اتنی بڑی
کھا ہو سکتی۔“

”تم اسے چھوٹی سی غلطی کہتے ہو گین؟۔۔۔ یہ آکا جان کی چھوٹی سی غلطی تھی؟۔۔۔ چلو مان لیا
پہلے کی چھوٹی سی غلطی ہی تھی، میں روایتوں یا رسوں، رواجوں کو بھی کوئی الزام نہیں دیتا۔ مگر میں یہ
کھا چاہتی تھی کہ ایسا کسی اور کے ساتھ بھی ہو۔ کسی اور کی بیٹی کو یہ خمیازہ بھگتنا نہ پڑے اس لئے۔“

”نہیں۔۔۔“ اس کا انداز اور لہجہ یک دم ہی قطعی ہو گیا تھا۔ وہ نرمی، وہ
غائب ہو گئی تھی۔

نے مانتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ لیکن اگر ہمیشہ مانی ہوتیں تو آج آپ ٹھیک ہوتیں اس طرح یہاں تو نہ
مند لہجے میں کہا تھا۔

”اب کیا کروں اگر یہاں ہوں تو۔۔۔ چلو کہیں بھاگ چلتے ہیں۔ زمانے سے
لوگوں سے رہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

سردار سبکگین بہت دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔

”میں یہی مسکراہٹ تمہارے چہرے پر دیکھنا چاہتی تھی۔“

”اور میں آپ کو کس طرح اور کیا دیکھنا چاہتا تھا، کبھی سوچا آپ نے؟۔۔۔ ہمیشہ اپنی
ہے۔ ہمیشہ اپنی ضد منوائی ہے۔ ہمیشہ، ہر بار صرف اپنی بات پوری کی ہے۔“ سردار سبکگین

کا لہجہ پُر افسوس تھا۔

”آپ کو بالکل بھی احساس نہیں کہ آپ نے اپنا کتنا بڑا اور کتنا بھاری نقصان کیا ہے۔
کس طرح دیکھنا چاہتا تھا اور آپ۔۔۔“

”گین۔۔۔!۔“ وہ مسکراتے ہوئے کسی قدر اکٹا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ ”مگر آن، کو
کرو نا۔۔۔ مجھے چھوڑو، اپنی بات کرو۔۔۔ میری کہانی تو ختم ہو گئی۔۔۔ دی اینڈ

سوچنے سمجھنے، کہنے سننے کو باقی کچھ نہیں بچا۔۔۔ نہ افسوس کرنے کو، نہ ہی ہاتھ ملنے کو۔
کرنا چاہتی تھی وہ میں نے کر دیا ہے۔ میں ایک Lesson اپنے پیچھے چھوڑ کر جا رہی ہوں

ہو پ کہ اب ہماری روایتوں کو دہرانے سے پہلے کوئی ایک بار ضرور سوچے گا۔ میں اپنا بار
دلانا چاہتی تھی۔ جو غلط ہے سو غلط ہے۔ اس غلطی کو سدھارنے کا اس سے بہتر طریقہ

نہیں تھا۔ کسی کو غلط ثابت کرنے کے لئے مجھے یہ طریقہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا
لغاری بہت اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری کو شدید ترین اختلاف ہوا تھا۔

”میں نہیں مانتا۔۔۔ آپ نے دوسروں کو سمجھانے کے لئے خود اپنے آپ کو دا
خود اپنی قربانی دی ہے۔ بے وقوفی کی ہے سراسر آپ نے۔ دیکھئے گا آپ، کچھ

گا۔ سب دیئے کا دیا رہے گا۔ صرف آپ اپنے آپ کو اس طرح برباد کر کے جا چکی ہوں
اس کے جارحانہ انداز پر وہ بہت بڑ سکون انداز میں مسکرا دی تھی۔

”گین! تم جانتے ہو بحث میں تم مجھ سے جیت نہیں پاؤ گے۔ نہ ہی ضد میں
کیا۔ اسے بھول جاؤ۔ اب نہ بچھتاوے کا کوئی وقت باقی ہے نہ افسوس کا۔“

”آکا جان ملنا چاہتے ہیں آپ سے۔۔۔ ایک بار تو مل لیجئے۔“
”نہیں۔۔۔“ اس کا انداز اور لہجہ یک دم ہی قطعی ہو گیا تھا۔ وہ نرمی، وہ
غائب ہو گئی تھی۔

ایسا سمجھ داری سے اسے سمجھانا چاہ رہی تھی۔
 مائی مگر آپ نہ کریں۔ اس لڑکی کے دماغ کی کل یوں بھی ڈھیلی ہے۔ بات بہت دیر
 کی سمجھ میں آتی ہے۔
 ہم اتنی دیر کیوں کر رہے ہو؟
 دیر۔۔۔ نہیں، میں دیر نہیں کر رہا۔ میں زندگی کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں

بہت چل رہے ہو تو کچھ بول کر اپنی موجودگی کا احساس بھی دلا دو۔ خاموشی میں کیا پتہ چلے گا
 اتھ ہو بھی کہ نہیں۔“ وہ بہت کچھ جتا رہی تھی۔ گین یقیناً سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ اس نے سنجیدگی
 بات میں ہلا دیا تھا۔ بنا کوئی آرگومنٹ کئے۔ مگر اس کی آنکھوں میں سوچوں کی واضح لہریں
 رہی تھیں۔ وہ اس لئے ایک گہری سوچ میں تھا۔



ایسا کیا۔ میری خود کو دی گئی سزا اگر کسی کے کام آسکتی ہے تو میں سمجھوں گی کہ میں کامیاب
 تمہاری بیٹی اگر ان روایات سے کٹ کر ایک اچھی زندگی بسر کرتی ہے تو مجھے خوشی ہوگی
 بات سننے پر مائل نہ تھی۔ گین چپ ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔
 ”مجھے کوئی نئی راہ اختیار کرنی ہوتی تو تب بھی کر سکتی تھی گین! جب میرے سامنے
 اور گئی راستے میرے سامنے تھے۔ مگر میں نے اس وقت میں بھی کوئی دوسری بات
 چاہتی تو بغاوت بھی کر سکتی تھی۔“

”میں تو آپ کو کہہ رہا تھا رومیصا! آپ کو میری کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت
 ہوں۔ مگر آپ ہی نے.....“

”ہاں، یاد ہے مجھے۔ میں نے ہی تمہیں منع کر دیا تھا۔ مجھے تم سے کوئی
 تم میرے سب سے بڑے خیر خواہ ہو اور ہم ہی وہ دو ہیں جو ان روایتوں کا
 ہیں۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو اور میں بھی۔“

”تو پھر تب آپ نے طلاق کے ان پیپرز پر سائن کرنے سے منع کیوں کر دیا تھا؟
 اپنی زندگی کا رخ نہیں موڑ دیا تھا؟ یہ آج کا اتنا بڑا سبق دینا ضروری تھا کیا؟۔۔۔ جب
 تھیں کہ میں اور آپ وہ ہیں جو تمام روایتوں کا گلا گھونٹ سکتے ہیں۔۔۔ تو پھر کیوں رو
 پھر کیوں؟“ وہ اسے اس حالت میں دیکھ کر جیسے خوش نہیں تھا۔
 مگر رومیصا لغاری مسکرا دی تھی۔

”تمہارے اور میرے بیچ رشتے کی نوعیت دنیا کے سامنے کچھ اور ہے۔ اسے دنیا
 سے دیکھتی ہے گین! مگر تم اور میں جانتے ہیں کہ درحقیقت ہم ایک دوسرے کے کیا ہیں
 رشتہ نبھانا تھا اسے ہم ایمپان داری سے نبھانے کے ہیں۔ اور وہ رشتہ خیر خواہی اور ایک
 کیئرنگ اور شیئرنگ کا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی سالمیت کو بنا نقصان پہنچانے بہت سچائی
 خواہی کے اس تعلق کو نبھانے کے ہیں۔ ہمارے درمیان کی فصلیں کچھ بھی رہی ہوں مگر
 ایک خاص ڈھنگ سے ساتھ چلنے اور ایک دوسرے کا ساتھ دینے سے کبھی نہیں روکا۔ تم
 اور میرا تم سے کیا رشتہ ہے؟۔۔۔ یہ ہر کوئی نہیں جان سکتا۔“

اسی کے تھکن زدہ لہجے میں جیسے بہت سے زمانے بول رہے تھے۔ گین اس کا ہاتھ
 اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے سر ہلانے لگا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔“

”تم نے میرب کو بتایا؟“

”کیا؟“ وہ چونکا تھا۔

رومیصا لغاری نے خاموشی سے اسے دیکھا، پھر مسکرا دی تھی۔

”گین! چپ رہنے سے بھید کبھی نہیں کھلتے۔ اس کے لئے بولنا پڑتا ہے۔ ورنہ غلط

آکا جان کو زندگی کے اس موڑ پر اپنی غلطی کا بھرپور احساس تھا۔ جب ہی وہ فوری طور پر سردار سبکتگین کی فنی نہیں کر سکے تھے۔ بولے بھی تھے تو ان کا انداز پہلے سے کمزور تھا۔

”ہاں۔۔۔ مانتے ہیں ہم۔۔۔ غلطی ہوئی ہم سے۔ مگر اب اس کا ازالہ ممکن نہیں ہے۔ اس غلطی جی سزا ہم نے بھگتی ہے شاید کسی نے نہیں بھگتی۔ ہم نے ساری زندگی اپنی بچی کا چہرہ نہیں دیکھا۔ انہیں خود سے محروم کر دیا۔ خود اپنے آپ کو وہ سزا دی کہ ہم۔۔۔ نہیں افسوس اس بات کا ہے رات نے ہمیں اتنا پیچھے چھوڑ دیا کہ ہم تدارک تک نہ کر سکے۔“ وہ کہہ کر چپ ہوئے تھے۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری خاموشی سے کھڑا نہیں دیکھتا رہا۔

بڑی وضاحت دی تھی نہ انہیں مورد الزام ٹھہرایا تھا۔

”دیکھ! تم کہو اس سے۔۔۔ وہ ایک بار مل لے ہم سے۔ ایک بار ہمیں اپنا چہرہ دیکھ لینے دے۔ لی عمر اس نے ہمیں سزا دی ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ ہم نے لمحہ لمحہ کتنی اذیت میں کاٹا ہے۔ وہ ناپسند کرے میں سانس لے رہی ہوتی تھی تو ہم سے اس کھلی فضا میں سانس لینا محال ہو جاتا تھا۔ نے اسے جو قفس دیا تھا وہ دکھائی نہ دینے والا تھا۔ مگر اس نے جو اپنے لئے قفس چنا۔۔۔ اسے دیکھ ہم کو لمحہ اندر ہی اندر مرتے رہے۔ ہم مانتے ہیں ہم سے غلطی ہوئی مگر۔۔۔ وقت اگر ہماری مٹھی دوبارہ آجائے تو ہم کبھی اس غلطی کو دہرانا نہیں چاہیں گے۔ روایات انسانوں کے لئے بنی ہیں، ہم بات کے لئے نہیں بنے۔ ہمیں خود کو ان کا پابند نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں اب اس کا اندازہ ہو گیا ہے۔“

جان شرمندہ تھے۔ مگر سردار سبکتگین حیدر لغاری جواباً کچھ نہیں بولا تھا۔

”تم کہو اس سے گین! وہ تمہاری بات مانتی ہے۔ دوست ہونا تم اس کے۔ کہو اس سے ایک بار اپنے باپ کا چہرہ دیکھ لے۔ معاف نہیں کرنا چاہتی تو مت کرے۔ لیکن مجھے ایک بار خود کو دیکھ لے۔ میں اپنی بچی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کے ہونے کا احساس کرنا چاہتا ہوں۔ وقت کی طرح ہماری مٹھی سے سرکتا جا رہا ہے۔ بہت سا وقت ہم گنوا چکے ہیں۔ مزید گنوانا نہیں اپنے۔ جو بچے کچھ لمحے ہاتھ میں ہیں، ان میں ہم کوئی تدارک تو خیر نہیں کر پائیں گے۔ مگر اس ماؤ کی قدر راحت تو نصیب ہوگی نا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں آکا جان!“ اس نے ان سے اختلاف کرنے کی جرأت کبھی نہیں کی تھی۔ نڈا ماحول کا پروردہ سبھی مگر اپنے بڑوں کا احترام کرنا اس نے اب بھی نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اب بھی انہیں ٹانگیں سلکتا تھا، اگرچہ وہ جانتا تھا کہ وہ کتنے غلط ہیں۔

”میں رومیہ سے بات کرتا ہوں۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔ چہرے پر عجب سوچوں کے جال بنے تھے۔

نہال سے آنے کے بعد میرب کسی سے کچھ نہیں بولی تھی۔ پاپا نے مائی اماں کا احوال دریافت کیا تو نہال نے مطلع کر دیا تھا اور وہ مطمئن بھی ہو گئے تھے۔ حالات کے ساتھ چلتے چلتے اب اسے اتنا ہنرتو

میرب نے واپس آ کر بنا کچھ کہے سنے اپنا سامان بیک کیا تھا اور مائی اماں کو اطلاع دی تھی۔

”مائی اماں! مجھے واپس جانا ہے۔۔۔ آج ہی۔“

مائی نے اسے خاموشی سے دیکھا تھا اور پھر بلا تردد سر ہلاتے ہوئے بولی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ تم تیاری کر لو۔ میں ڈرائیور سے کہہ دیتی ہوں۔“

”بہتر، شکریہ۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گئی تھی

گین کا سامنا وہ دانستہ دوبارہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر جب جانے کے لئے باہر نکلی تو سبکتگین حیدر لغاری سے سامنا ہو گیا تھا۔

پوربچ میں کچھ فاصلے پر کھڑا وہ اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اپنے لئے تیار کھڑی گاڑی کا بڑھنے کے لئے اس کے پاس سے گزرتا تھا۔ ایک لمحے میں وہ اسے دیکھ کر رکی تھی۔ وہ بھی اس کا بخور دیکھ رہا تھا۔

میرب سیال نے نگاہ اس پر سے ہٹائی تھی اور اس کے قریب سے ہو کر نکلتی ہوئی آگے بڑھ گئی سردار سبکتگین حیدر لغاری بنا اس کی طرف پلٹ کر دیکھے، توجہ دینے چلتا ہوا اندر کی طرف ہٹا تھا۔ چہرے پر کوئی تاثر واضح نہ تھا۔ جیسے اسے اپنے مزاج کے موسموں پر مکمل کنٹرول تھا۔

میرب سیال نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس شخص کی پشت کو دیکھا تھا اور پھر چہرہ پھیرنے ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کا حکم دیا تھا۔

زمانے پیچھے چھوٹنے لگے تھے۔

وقت پیچھے چھوٹنے لگا تھا۔

اور جانے اس کے ساتھ اور کیا کچھ!

مگر میرب سیال جیسے اس کے متعلق نہ سوچنا چاہتی تھی نہ کوئی مزید فکر کرنا۔ سر بیٹھنے سے نکلیا اور آنکھیں موند لیں۔ آنکھیں۔۔۔ دماغ۔۔۔ سب جل رہا تھا۔

مگر وہ مزید کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

”میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا آکا جان! کہ آپ غلط تھے یا غلط ہیں۔ مگر جو ہوا شاید وہ چاہئے تھا۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری آکا جان کے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔

آہی گیا تھا کہ وہ اپنے احساسات پر کچھ قابو پانے کے قابل ہو گئی تھی۔ مگر خاموشی میں اندر ہی اندر کچھ جل رہا تھا وہ سہنا بھی کسی قدر دشوار سا تھا۔ اتنا غبار سا بھرا تھا کہ سارے مناظر دھواں دھواں سے ہو رہے تھے۔

اسے وہ وقت جیسے کسی خواب کا قصہ لگ رہا تھا۔ اس کا اس شخص سے رشتہ، اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک خواب سے ہو کر گزری ہو۔ اور حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔

وہ سب حقیقت تھا۔ اور ایک کڑوی کیسی حقیقت۔

وہ کسی سے کہہ سن نہیں سکتی تھی مگر اندر ہی اندر بہت کچھ جل رہا تھا۔

اس شام زو بار یہ اور پاپا، فانی کے ساتھ باہر جا رہے تھے۔ اسے بھی بہت فورس کیا تھا مگر اس نے منع کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں تھی جب اطلاع ملی کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ اس نے بے ہوش انداز میں ملازم کو اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا کہا تھا۔ ملازم نیا تھا۔ سو رشتے داروں سے واقف نہیں تھا۔

وہ اٹھی تھی اور شانوں پر دوپٹہ پھیلا کر باہر نکل آئی تھی۔

مگر جس شخص کو سامنے دیکھا تھا، اسے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو وہیں جم ہی گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری اس کے سامنے موجود تھا۔ اسے اس کی موجودگی کا احتمال نہیں تھا مگر فوری طور پر وہ اپنے آپ پر قابو پانے ہوئے آگے بڑھی تھی۔ راہ و رسم نبھانے کو ایک مجلسی تبسم زبردستی لبوں پر سجایا تھا اور مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”کیسے ہو تم؟“

اذہان حسن بخاری نے اسے بغور دیکھا اور سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔ تم۔۔۔ تم کیسی ہو؟“

میرب سیال نے اس کی طرف خاموشی سے دیکھا تھا۔ جانے کیوں ایک لمحے میں آنکھوں میں ہنس سیئی آن ٹھہری تھی۔ وہ اندر سے اتنی کمزور پڑ چکی تھی یا اندر کا غبار ہی اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ خود پر ایک لمحے میں قابو نہ رکھ سکی تھی۔ اور دوسرے ہی بل اس شخص کے شانے پر سر رکھتے ہوئے بے آواز رونے لگی تھی۔

اذہان حسن بخاری اس کی کیفیت پر حیران نہیں ہوا تھا۔ اسے جیسے اندازہ تھا، ایک لمحے کو دل چاہا کہ اس وجود کے گرد اپنا حصار باندھ دے۔ مگر دوسرے ہی بل ہاتھ رک گئے تھے۔ وہ جس طرح ہوا تھا، اسی طرح کھڑا رہا۔ میرب سیال نے اپنے اندر کا سارا غبار اس کے شانے پر سر رکھ کر دھویا تھا۔ اس سے الگ ہو گئی تھی۔ کچھ شرمندہ سی۔ کچھ بے بس سی۔ وہ اس سے نگاہ نہیں ملا پاتی تھی! زندگی کی ملیح کاری ایک لمحے میں اتنی دکھائی دی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے اس پہلو کی سچائی کو اس سے چھپا کر نہیں رکھ سکتی تھی۔ اگرچہ وہ کسی پر کبھی کچھ واضح کرنا یا کھولنا نہیں چاہتی تھی۔

بھاری نے اسے شانوں سے تھام کر بٹھایا اور خود اس کے سامنے بیٹھ کر اسے بغور دیکھنے لگا۔ ”مجھے معلوم تھا تم خوش نہیں ہو۔“ وہ اس لمحے کچھ جتنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر دل ایک لمحے میں اس کے آنکھ سے نکل رہا تھا۔ ان آنسوؤں کی نمی اس کے شانوں پر اب بھی جلتے انگاروں کی مانند تھی۔ وہ جیسے اس کے درد سے کٹ کر نہیں جی سکتا تھا۔

”میں خوش ہوں۔“ میرب سیال نے ہمت کر کے اسے اس بل میں جھٹلایا تھا مگر آواز رندہ گئی تھی۔ ان آنکھوں میں پھر آن رکی تھی اور وہ چہرہ پھیر گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ میرب سیال نے بنا اس کی طرف دیکھے اپنی آنکھوں کے ان بھید کھولتے آنسوؤں کو اپنی بدنوں پر لیا تھا اور سر نئی میں ہلاتے ہوئے بنا اس کی طرف دیکھے بولی۔

”بہت خوش ہوں میں۔۔۔ آئی ایم پی۔۔۔“ اس نے اپنے ارد گرد ایک حصار کھینچنا چاہا تھا۔ مگر تب اس شخص سے نگاہ ملی تھی اور وہ کچھ کہے بغیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ ”تم جانتی ہو میرب!۔۔۔ تم میرے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ کیونکہ مجھے سننے کے لئے لائیں درکار۔ میں تمہیں تمہارے اندر سے پڑھ سکتا ہوں۔“

”پڑھ سکتے تھے تو پھر پڑھ کیوں نہیں لیا؟۔۔۔ کیوں چھوڑ دیا مجھے ان حالات کے سر پر؟ کیوں ہا کر دیا مجھے تم نے؟۔۔۔ جھوٹے ہو۔۔۔ تم بھی اوروں جیسے ہو۔“ میرب سیال آنسوؤں کے اندر سے رد کرتی ہوئی بولی تھی۔ اذہان حسن بخاری کچھ نہیں بولا تھا مگر اس کی بے بسی اس کی آنکھوں کو واضح دکھائی دے رہی تھی۔

کتنے لمحے اسی چپ میں گزر گئے تھے۔ بالآخر اذہان ہمت کر کے بولا تھا۔

”میں جانتا ہوں مرد کو کبھی کمزور نہیں پڑنا چاہئے۔ مگر کبھی کبھی حالات کے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔ یا رعالات انسان کے بس میں ہی نہیں ہوتے۔“ مدھم لہجے میں کئی لمحوں کا سکوت بول رہا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ ایسا ہوتا ہے۔ اپنی عادت سی ہو چکی ہے وقت کے سر سب کچھ ڈال کر اذہان اللہ ہو جانے کی۔ مگر میں تمہیں کوئی الزام نہیں دینا چاہوں گی۔ نہ تمہیں، نہ خود کو۔ میں بھی بات کے لکھے کو اسی طرح الزام دیتی ہوں جس طرح اور بہت سے لوگ دیتے ہیں۔“

اذہان حسن بخاری خاموشی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ پھر نئی میں سر ہلاتے ہوئے گویا ہوا تھا۔ ”بہت مشکل ہے یہ میرب!۔۔۔ بہت اذیت ناک۔ تمہیں اس کیفیت سے گزرتے دیکھنا مشکل ہے میرے لئے۔ سچ کہوں، جھیل نہیں پارہا ہوں میں۔ کیا تم مجھے بتاؤ گی، اصل واقعہ کیا ہوا؟ جب میرب سیال نے اسے اس کے شانے پر سر رکھ کر دھویا تھا، اس نے اس کے شانے پر سر رکھ کر دھویا تھا۔

”کیا تم مجھے بتاؤ گی، اصل واقعہ کیا ہوا؟ جب میرب سیال نے اسے اس کے شانے پر سر رکھ کر دھویا تھا، اس نے اس کے شانے پر سر رکھ کر دھویا تھا۔

”کیا تم مجھے بتاؤ گی، اصل واقعہ کیا ہوا؟ جب میرب سیال نے اسے اس کے شانے پر سر رکھ کر دھویا تھا، اس نے اس کے شانے پر سر رکھ کر دھویا تھا۔

”اگر!“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے پلٹ کر آواز دینا چاہی تھی مگر رومیصا لغاری نے اس کا ہاتھ راس روکا تھا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر نہی میں ہلا دیا تھا۔
مجھے مجھے بابا سے ملنے دو گین!“ اس کا انداز مٹی تھا۔

سردار سبکدین حیدر لغاری نے پلٹ کر چلتے ہوئے جا کر آکا جان کو بلایا تھا اور خود دانستہ وہاں سے ہٹا تھا۔

آکا جان نے سرعت سے اس کی طرف قدم بڑھائے تھے۔
”میری بچی!“

”اب!“ رومیصا لغاری ان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی تھی۔ آکا جان نے آگے بڑھ کر اسے اپنے پیچ لیا تھا۔ کتنے عرصے بعد بیٹی کا چہرہ دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ اب تک اس نے صرف ضد میں دن تھے۔ ایک عمر کاٹ دی تھی۔ ایک غلطی کی سزا دیتے میں حد کر دی تھی۔ مگر اب! —
میری بچی! — ہم آپ کی صورت دیکھنے کو ترس گئے۔ کوئی یوں بھی کرتا ہے۔ کتنی بڑی سزا دی نے اپنے بابا کو۔ ہمیں آس رہی کہ ہماری بچی اب ہمیں معاف کرے گی اور ایک لاجپار باب کی دکھو گی مگر.....“

بابا! — مجھے یہاں پیار کرو بابا! — جیسے آپ ہمیشہ کرتے تھے۔“ رومیصا لغاری نے اپنی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا تھا۔ آکا جان کتنا کچھ کہنا چاہتے تھے۔ ایک عرصے کے ترسے ہوئے کیفیت جیسی ہوسکتی تھی، اس لمحے ان کی کیفیت ویسی تھی۔ وہ بے بس باپ لگ رہے تھے۔ بوڑھی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ انہوں نے چہرہ آگے بڑھا کر لب اس کی جلتی ہوئی پیشانی پر رکھے۔
بہی رومیصا لغاری کا وجود اپنی گرفت میں انہیں کچھ ڈھیلا پڑتا محسوس ہوا تھا۔

”میرا! میری بچی!“ انہوں نے اسے دیکھا تھا مگر وہ ساکت آنکھوں سے انہیں اپنی طرف دیکھتی

”لین! — ڈاکٹر! — گین! ڈاکٹر کو بلاؤ۔“ رومیصا! میری بچی! — رومیصا!“ وہ لڑکھارہے تھے مگر ان کی اس آواز کو سننے کے لئے رومیصا لغاری اب وہاں نہیں تھی۔
ناتجربہ سے چلتا ہوا اندر آیا تھا۔ اس کے پیچھے ہی ڈاکٹر بھی تھے۔ گین نے ان ساکت آنکھوں کا رخ کر بند کیا تھا۔ کسی طرح کی تصدیق کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی مگر غالباً آکا جان کی تسلی لانے ڈاکٹر کو رومیصا کو چیک کرنے کے لئے کہا تھا۔

گین نے چیک کیا اور رومیصا لغاری کی موت کی تصدیق کر دی تھی۔
آکا جان جیسے شخص دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اتنے مضبوط شخص کو ٹوٹنے دیکھنے کا عمل یقیناً نداشت تھا اور کئی الزامات بھی تو باقی تھے۔ شاید تب ہی سردار سبکدین حیدر لغاری چلتا ہوا باہر نکل

سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اس عرصے میں جو جھیل اوہ سب کچھ بتا دیا تھا۔
وہ سن کر خاموشی سے اسے تکتا چلا گیا تھا۔
وقت نے عجب دورا ہے پر اسے لاکھڑا کیا تھا۔

رومیصا لغاری کی حالت رات کے پچھلے پہر کچھ بگڑنا شروع ہو گئی تھی۔
ڈاکٹر نے گین کو فون کر کے مطلع کیا تھا اور وہ پہلی فرصت میں اس کے پاس تھا۔ آکا جان! — ساتھ گئے تھے۔ مگر باہر ہی رک گئے تھے۔

”کیا ہوا ہے آپ کو؟ — کل شام تک تو ٹھیک تھیں آپ۔ یہ اچانک کیا کر لیا ہے خود کو۔ بالکل بھی خیال نہیں ہے آپ کو اپنا۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر پرتشویش لہجے میں بولا تھا اور وہ مگرا تھی۔ اس کیفیت میں اس کے لئے مسکرانا یقیناً دشوار تھا۔ مگر وہ جیسے حالات کو قابو میں ظاہر کرنے قائل تھی۔

”میرب کہاں ہے؟ — اسے نہیں لائے تم؟“ رومیصا لغاری نے دریافت کیا تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اسے دانستہ نہیں بتایا تھا کہ وہ واپس جا چکی ہے۔ وہ جانتا تھا اسے دکھ ہو گا اس لئے اسے لہجے بھی کوئی واضح جواب دیئے بغیر بولا تھا۔

”عجب خاتون ہیں آپ — میرب کی پڑی ہے آپ کو، اپنی نہیں۔ میں آپ کے سامنے ہوا کوئی اچھی سی بات مجھ سے کہنے۔“ وہ جیسے اس کا ہر تاثر زائل کر دینا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نے آئے ہی اس کی کیفیت کے متعلق بتا دیا تھا۔ رومیصا کے پاس یقیناً زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں کی بو بچھ رہی تھی۔

”منع کیا تھا میں نے اسے۔ وہ پھر بھی چلی گئی۔“ رومیصا لغاری کو جیسے اس کے چلے جانے کا افسوس ہوا تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری اس موضوع پر کچھ بولنا نہیں چاہتا تھا، تب ہی لب خاموشی سے ہٹا تھے۔ رومیصا لغاری مسکرائی تھی۔

”بہت اچھی لڑکی ہے وہ گین! — اسے خوش رکھو۔ وہ تمہاری زندگی کے سارے غلام بھروالی ہے۔ بس ذرا بھولی ہے۔ اسے یقین دلانے کی کوشش درکار ہے۔ سمجھ دار ہے، سمجھ سکتی ہے۔ دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں ہمیشہ۔“ شاید یہ اس کی آخری خواہشیں تھیں۔ سردار سبکدین حیدر لغاری لب تختی سے بچھنے بنا کوئی تاثر دینے رومیصا لغاری کے سامنے تھا۔

میرب سیال نے جو کیا تھا اسے وہ یقیناً نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مرنے والے کی آخری خواہشات احترام ہر کوئی کرتا ہے اور اس نے میرب سیال کو کئی بار رکنے کے لئے کہا تھا مگر وہ لڑکی بے حس تھی جیسے اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ پہلے کبھی سمجھی تھی جو اب سمجھتی۔

”گین! — بابا کو بلا دو۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔“ رومیصا کی آنکھوں میں ویرانی بکچھ اور تھی۔ سانسوں کی رفتار بتا رہی تھی اس کی حالت بگڑ رہی ہے۔

دورک گیا تھا۔ پھر پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ چند ثانیوں تک کچھ نہیں بول سکی تھی۔
 ”کیا بات ہے؟“ عفتنان علی خان نے سرد انداز میں دریافت کیا تھا۔ انا بیہ شاہ نے لمحہ بھر کو سوچا
 پھر بولی تھی۔

”لامعہ کا فون تھا۔“
 ”تو؟“ وہ بلا تردد بولا تھا۔ انداز انتہائی لائق تھا جیسے اسے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔
 ”تو؟“ انا بیہ کو سمجھ نہیں آیا کہ کیا کہے۔ مگر دوسرے ہی پل اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے
 پاپا ہے کہ لامعہ کا فون اس کے لئے تھا تب ہی وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”لامعہ کا فون آپ کے لئے تھا۔“ وہ پُر اعتماد انداز سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی تھی۔ عفتنان
 خان اس کے الزام پر کسی قدر حیران ہوا تھا اور اس حیرت کا اس نے بھر پور طور پر اظہار بھی کیا تھا۔
 ”اوپہ واقعی؟“ میری فون کا زمیرے سیل کی جگہ اس لینڈ لائن پر کیسے آنے لگیں؟“ اس کے
 کا لٹری کی طرح بھی چھپا ہوا نہ تھا۔ انا بیہ شاہ کو بہت سبکی محسوس ہوئی تھی۔ غل سی ہو کر وہ چہرہ پھیر گئی
 اندر ایک الاؤ دہکتا ہوا تو پہلے بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اس لئے تو یوں لگا تھا جیسے سارا شہر کا شہر جل رہا
 غنے سے فون ٹھٹھتے ہوئے وہ مڑتی تھی۔ چلتی ہوئی آگے بڑھی تھی۔ دم گھٹ سا رہا تھا۔ وہ چلتی ہوئی
 اضا میں نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر عین اسی وقت وہ چکرائی اور وہیں گر گئی تھی۔ عفتنان علی خان نے
 بہت اطمینان سے دیکھا تھا۔

گھر میں کوئی اور نہ تھا۔ سو مدد کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ وہ چلتا ہوا آگے بڑھا۔ اپنا بیگ صوفے پر ڈالا
 اس کے قریب آن رکھا تھا۔

انداز میں کوئی بے قراری تھی نہ کوئی فکر مندی۔ جیسے وہ ہر طرح کے جذبے سے عاری ہو چکا تھا۔
 اطمینان سے جھک کر اسے سیدھا کیا تھا۔ بظاہر کہیں کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ کوئی اندرونی چوٹ
 بھی تو اس کا اندازہ وہ فی الحال نہیں کر سکا تھا۔ اس کا جسم جل رہا تھا۔ غالباً اسے بخار تھا۔ ہمدردی
 اور پُر پھر انسانیت کے طور پر اسے بازوؤں میں اٹھایا اور میڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے کمرے
 آگیا تھا۔

اس کے کمرے میں جو کبھی ان دونوں کا مشترکہ کمرہ تھا۔
 اس کے نرم وجود کو اپنے بازوؤں میں بھرے کوئی احساس اسے چھو نہ رہا تھا۔ اتنی قربت اس پر رتی
 اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ اسے جھک کر بیڈ پر لٹایا تھا۔ اور پھر جیب سے سیل فون نکال کر
 ڈکڑن کرنے لگا تھا۔

نہت اب شاید کہیں نہیں تھی۔
 کہیں بھی نہیں۔
 نہ کوئی چاپ باقی تھی، نہ کوئی آہٹ۔
 اگر عفتنان علی خان اسے باہر لاؤنج سے یہاں اٹھا کر اپنے کمرے تک لایا بھی تھا تو صرف اس لئے

پتہ نہیں۔

محبت اب رہی بھی تھی کہیں۔۔۔ یا پھر نہیں۔۔۔

محبت کے اتنے بھر پور احساس کے بعد اچانک اتنے گریز کی سرد چادر کے تن جانے سے
 باتوں کا مفہوم یک دم ہی بدل گیا تھا۔ انا بیہ شاہ نے اس سادگت و جامد ماحول میں خود کو بہت تیز
 اٹھ کر باہر آگئی تھی۔
 گھر کے باقی لوگ جانے کہاں تھے۔

اس کے حلق میں جیسے کانٹے سے اگے تھے اور سارا وجود جلتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔
 وہ اوزان کو فون کرنے والی تھی کہ آ کر اسے کچھ دنوں کے لئے لے جانے، فوری طور پر اس سے
 فیصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ یہ جگہ، یہ مقام ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا چاہئے۔
 پھر۔

وہ ابھی نمبر ملا ہی رہی تھی جب لامعہ کا فون آگیا تھا۔
 ”ہیلو لامعہ!۔۔۔ کیسی ہو تم؟۔۔۔ کتنے دن سے غائب ہو؟۔۔۔ عجب دوست ہو
 پلٹ کر خبر تک نہیں لیتی ہو۔“ وہ شکوہ کرتی ہوئی بولی تھی۔ مگر دوسری طرف لامعہ حق خلاف توڑ
 ٹھکھلا کر ہنسی تھی نہ ہی مسکرائی تھی۔

”بس وقت ہی نہیں ملا۔ تم کیسی ہو؟“ لامعہ حق کا انداز سرد تھا۔ جسے وہ محسوس کئے بغیر نہیں
 تھی۔ تب ہی چونکتے ہوئے بولی تھی۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ تم ٹھیک تو ہو؟“ اگرچہ وہ خود ٹھیک نہیں تھی مگر اس کے باوجود اس نے
 سے دریافت کیا تھا۔ مگر دوسری طرف لامعہ کچھ نہیں بولی تھی۔

”لامعہ۔۔۔!“
 ”میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں انا بیہ!۔۔۔ تم برا مت ماننا۔۔۔ فی الحال میں
 ہوں۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی لامعہ نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔
 وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

لامعہ کا اس طرح خود فون کرنا اور پھر خود ہی بات نہ کر کے سلسلہ منقطع کر دینا۔ ا
 اسرار رکھتا تھا؟
 اوہ۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ لامعہ اس وقت کسی اور سے بات کرنا چاہتی تھی۔ غالباً۔
 عفتنان علی خان سے۔۔۔ اور اسے نہ پا کر سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

وہ اسی شش و پنج میں فون ہاتھ میں لئے کھڑی تھی جب عفتنان اندر داخل ہوا تھا۔
 وہ لائق انداز میں نگاہ جرا گئی تھی۔ عفتنان نے بھی اسے دیکھا تھا مگر انداز سرسری سا تھا۔
 ہوا آگے بڑھ گیا تھا جب اچانک انا بیہ نے اسے پکار لیا تھا۔
 ”عفتنان!“

کہ اس کے اندر ”ہمدردی“ کا عنصر اب بھی باقی تھا۔
انا بیہ ہر بات سے بے خبر بیڈ پر پڑی تھی۔

نہ اسے یہ پتہ تھا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر قبل اس کے کتنے قریب رہ چکی تھی۔ نہ اسے اس قدر
کا کوئی اندازہ تھا نہ اس حدت کا۔۔۔ آج شام ماما کے مطابق انا بیہ شاہ کو اس کے ساتھ اٹلی جانا تھا
کہ اب ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ غالباً اس حالت پر اسے کوئی خاص افسوس نہ تھا۔ اندازہ خاصاً اٹلی
دکھائی دے رہا تھا۔

ڈاکٹر کے آنے تک وہ وہیں کمرے میں موجود رہا۔ ڈاکٹر کے آنے پر بھی وہ وہیں رہا۔ چیک اپ
کے بعد کچھ خاص نہیں، ڈاکٹر نے فقط معمولی بخار اور نشاہت ہی وجہ بتائی تھی اس کے اس طرح بے ہوش
ہو جانے کی۔ کچھ دوائیں اور ٹانک لکھ کر دیئے اور پھر اپنی راہ لی تھی۔ جب تک وہ ہوش میں نہ آجائے
عفتان کا وہاں رکنا محال تھا۔ سو ماما کا نمبر ڈائل کرتا ہوا وہ باہر نکل آیا تھا۔

”ماما! آپ واپس آ سکتی ہیں؟“

”کیوں بیٹا! کیا ہوا؟“

”مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔۔ آپ کی بہو کی طبیعت خراب ہے۔ تیز بخار ہے اور غالباً کچھ کمزوری
بھی۔ گر کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اٹھا کر ان کے کمرے تک پہنچایا ہے انہیں۔۔۔ ڈاکٹر کو بلا کر بھی
دکھایا ہے۔ آپ آجائیں تو ان کے پاس ٹھہریں۔۔۔ مجھے اٹلی جانے کی تیاری کرنی ہے۔“
”تو تم اس کے بغیر جاؤ گے؟“ ماما کو تشویش ہوئی تھی۔

”ماما!۔۔۔ اس کے ساتھ جانے کا کوئی پروگرام یوں بھی میرا نہیں تھا۔“ اس نے بیزاری سے
یوں کہا تھا جیسے اس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

”عفتان!۔۔۔ وہ تمہاری بیوی ہے۔ وہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ تم اس طرح لاطلق کیسے ہو سکتے
ہو؟ بھول گئے تم کہ اس گھر میں اسے بیاہ کر لانے والے تم ہی ہو۔“ ماما نے اس کے نون پر ہی کان
کھینچے تھے۔

”سو وہاٹ۔۔۔ آپ بتائیں، میں کیا کر دوں؟ اپنا یہ وزٹ کیسے ملتوی کر دوں؟“ صورت
حال کے سامنے وہ ایک لمحے میں بے بس نظر آیا تھا۔

”میں واقعی نہیں جانتی بیٹا!۔۔۔ مجھے اندازہ ہے یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ تم
اسے کس طرح نہاچتے ہو اس کا فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ اس وقت میرا آنا تو مشکل ہے۔ میں انوشے کو لانا
کرتی ہوں۔ غالباً وہ اپنی کسی دوست کے ہاں ہے۔“

”نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سنبھال لوں گا۔“

فون کا سلسلہ منقطع کر کے وہ کچھ دیر اسی طرح کھڑا رہا تھا۔ یہ ماما کو کیا ہو گیا تھا۔۔۔ اس سے
پہلے تو انہوں نے بھی اس طرح کی لاتعلقی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر اب اچانک۔۔۔
وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ مگر غالباً ماما ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ وہ اب اس کی ذمہ داری تھی۔ خواہ وہ اسے

اچھڑ دینا۔۔۔ یا پھر۔۔۔

”اوپ۔۔۔“ اس کے ذہن میں انا بیہ کی کیفیت آئی تھی تو وہ دوسرے ہی پل خاصے تھکے تھکے سے
میں اس کے کمرے کی طرف قدم بڑھانے لگا تھا۔

”کیا تھا۔۔۔؟ تو اب اسے ان محترمہ کی تیمارداری کے لئے اپنے اہم ترین امور بھی چھوڑنا تھے؟
یہ پروف کرنے کے لئے کہ وہ اس کی ذمہ داری تھی اور وہ اس کا خیال رکھ سکتا تھا؟۔۔۔ غیر
ارٹو فز وہ نہیں تھا۔ مگر ان حالات میں یہ خاصا بڑا ”سانحہ“ لگ رہا تھا۔ اور اسے سرانجام دینا اور
بادہ مشکل۔ مگر جب کوئی راہ نہیں تھی تو اپنی ذمہ داری تو نباہنا ہی تھی۔ فون کر کے اس نے اپنی ٹکٹ
اٹ کر واپس آئی اور پھر چلتا ہوا اس کے کمرے کی طرف آ گیا تھا۔

وہ اب بھی بدستور اسی طرح لیٹی تھی۔ اس نے چلتے ہوئے پاس آ کر اسے بغور دیکھا تھا۔ غالباً وہ
ہالے بھی رہی ہے یا کہ نہیں۔۔۔ وہ یہی دیکھنے کے لئے اس پر جھکا تھا۔ مگر عین اسی لمحے انا بیہ
اپنا آنکھ کھل گئی تھی۔ عفتان علی خان کو اس لمحے اپنے اس قدر قریب دیکھ کر وہ کچھ ساکت سی رہ گئی

عفتان علی خان کچھ نکل سا ہوا تھا اور پھر سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟“ بے تاثر لہجے میں دریافت کیا تھا۔

انا بیہ نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”گڈ۔۔۔“ وہ اطمینان ظاہر کر کے باہر نکل گیا تھا۔ نوکر کو جا کر اسے کچھ کھلانے کی ہدایت کی
۔۔۔ ساتھ ہی اس کی میڈیسن کے متعلق بھی کہہ دیا تھا کہ یاد سے لے لے۔ اپنی ”ذمہ داری“ کسی
بلا کر وہ فریش ہونے کے لئے اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔

ایسا لغاری کے آخری امور انجام دے کر وہ واپس آ گیا تھا۔

کی کو معلوم ہوا تو اسے بہت افسوس ہوا تھا۔

”سر دار! تمہارے ساتھ نہیں آئی؟“

سر دار سیکٹین حیدر لغاری کی پیشانی پر کئی سلوٹیں ایک ساتھ نمودار ہوئی تھیں اور وہ کوئی جواب دینے
بہرہ پھر گیا تھا۔ گی کو تشویش ہوئی تھی۔ اپنے سامنے بیٹھے شخص کے چہرے کو بغور پڑھنا چاہا مگر یہ
ٹھیک تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ سر دار سیکٹین حیدر کا چہرہ ساٹھا تھا۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔۔۔ تم بتاؤ، تم ٹھیک ہو؟“ سر دار سیکٹین حیدر لغاری جیسے اس موضوع پر کوئی بات کرنا
نہ چاہتا تھا۔ اس نے یکسر بات ہی بدل دی تھی اور اسی پر گی کو اندازہ ہوا تھا کہ بات یقیناً معمولی
لگا۔ اس نے بھی تب اس موضوع پر اسے مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور رومیضا لغاری کے
سائل افسوس کرتی ہوئی بولی تھی۔

”پھر؟ پھر کیا ہوا تھا؟“
 ”نی الحال چھوڑو۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری اٹھ کھڑا ہوا تھا اور
 ہاں سے نکل گیا تھا۔

”تم نے انکل کو بتایا ہے کہ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ پیش آتا رہا ہے یا آ رہا ہے؟“ اذہان نے
 ہان کا سپ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس لمحے اس کا چہرہ کسی بھی جذبات سے قطعاً عاری تھا۔ یا تو وہ اپنے
 میرب نے سرنفی میں ہلا دیا تھا۔

”ان کی طبیعت خراب تھی اذہان! تم تو جانتے ہو، میں نے کبھی ان سے کوئی بات نہیں کی۔
 یہاں بھی صرف ان ہی کی ایما پر کیا کہ وہ اپنی زندگی میں مجھے پروٹیکٹو دیکھنا چاہتے تھے۔“
 ”اوہ، آئی سی۔“ وہ آہستگی سے بولا تھا۔

”کبھی کبھی ہم نے اپنی زندگی کے لئے جو سوچا ہوتا ہے وہ نہیں ہوتا اذہان! سب ویسا ویسا
 ہوتا ہے جیسا ہم نے سوچا نہیں ہوتا۔“ میرب ٹیبل کی سطح پر انگلی پھیرتے ہوئے مدہم لہجے میں بولی تھی۔
 ”ایسا ہم سب کے ساتھ ہوتا ہے میرب!“

”ہاں، شاید۔“ وہ عجب پھیکے انداز میں مسکرائی تھی۔ ”زندگی دوسرا موقع نہیں دیتی۔ موسم
 دوبارہ لوٹ کر نہیں آتے۔ ورنہ شاید کوئی شکوہ باقی نہ رہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی
 تھی۔

”ہم میں سے کوئی خوش نصیب نہیں ہے میرب! میں بھی اکثر یہ سوچتا ہوں اگر زمانے واپس
 آجائیں تو میں کیسے جینا چاہوں گا اس زندگی کو۔ اس طرح جس طرح کہ میں چاہتا ہوں؟۔ یا کہ
 اس طرح، جس طرح کہ دوسرے چاہتے ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ میرب مسکرا دی تھی۔
 ٹھانسی کے موسموں کی کہانی بہت مدہم لہجے میں اپنی بولیاں بول رہی تھی۔

دونوں کو کسی قدر افسوس تھا۔ دونوں ہی خود کو معمول پر ظاہر کرنا چاہ رہے تھے اور دونوں ہی خوش نہیں
 تھے۔ دونوں کے انداز میں ایک خاص گریز تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے مگر بات
 کرنے کو جیسے لفظ ہی نہیں مل رہے تھے۔

کل کے زمانوں کے قصے اس لمحے خواب سے لگ رہے تھے۔ کئی دیر دونوں کے درمیان خاموشی
 رہی تھی۔ پھر وہ اس کی طرف اور میرب اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

”کتنا عجیب لگ رہا ہے اتنے عرصے بعد۔ اس طرح۔!“
 ”ہاں۔ عجیب ہی لگ رہا ہے۔ ہم نے زمانوں کو صدیوں پر محیط کر دیا۔ ایک شہر میں
 رہے مگر.....“ اذہان نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

”اذہان! وقت مٹھی سے ریت کی طرح پھسل جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“ وہ مسکرائی تھی۔
 ”ایک بات پوچھوں میرب؟“ وہ آہستگی سے بولا تھا۔

”مجھے رومیسا لغاری کے بارے میں سن کر واقعی بہت افسوس ہوا۔ تمہاری انیسیت تو پھر اس سے
 سے کہیں زیادہ تھی۔“

”ہاں۔ زندگی میں عجب ایک خلا کا احساس ہو رہا ہے۔ جانے یہ خلا کسی غیر معمولی
 گا کہ نہیں۔ میں نے اپنی ایک بہت اچھی دوست اور خیر خواہ کو کھو دیا ہے۔ میرا نقصان بہت بڑا ہے۔
 وہ سپاٹ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس لمحے اس کا چہرہ کسی بھی جذبات سے قطعاً عاری تھا۔ یا تو وہ اپنے
 محسوسات پر قابو رکھنا اچھی طرح جانتا تھا یا پھر وہ ہر ایک پر انہیں ظاہر ہی نہ کرنا چاہتا تھا۔
 ”گیں! میرب، رومیسا کو لے کر ہی تم سے کچھ بدظن ہوئی ہے نا؟“ اس نے بہت
 سے اندازہ کرتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

وہ چند لمحوں تک کچھ بول نہیں سکا تھا۔ غالباً وہ فی الحال اس موضوع پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔
 ”جو شے میری زندگی میں اہم ہے، مجھے اسے اپورٹس دینا ہوگی۔ اور اس کے لئے مجھے کسی کا
 پرواہ نہیں ہے کہ کوئی کیا سوچتا ہے اور کیا نہیں۔ زمانہ تمہیں لے کر بھی کچھ کم بدظن نہیں ہے۔ مگر
 سبکدین حیدر لغاری زمانے سے زیادہ اپنے دل کی ماننے اور سننے کا قائل ہے۔“ وہ بڑے آرام سے
 اسے عام لوگوں میں شمار کر گیا تھا۔ گی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ بات کچھ زیادہ ہی سنگین نوعیت کی ہے۔

”تم ٹھیک ہونا گی؟۔ آریو اے؟“ وہ اس موضوع سے ایک بار پھر ہٹا ہوا بولا تھا۔ گی نے
 سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”تم میرب کو وہ سب کیوں نہیں بتاتے گین! جو سچ ہے، جو وہ جانتا چاہتی ہے؟“ گی نے ایک
 کوشش پھر کی تھی۔ وہ اس کی بے وقوفی پر غالباً مسکرایا تھا۔

”مجھے وضاحتیں دینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی ضرورت۔ مجھے وضاحتیں دینا آتا ہے
 نہیں۔ اور جہاں تک ان محترمہ کی بات ہے، وہ کھوج لگانا اچھی طرح جانتی ہیں۔ تمہیں اس سے
 طرح کی ہمدردی کرنے کی ضرورت قطعاً نہیں ہے۔ وہ اتنی مظلوم نہیں ہے جتنا تم اسے سمجھ رہی ہو۔“
 ”تم بتا رہے تھے، رومیسا کسی سے ملنا چاہتی تھی مگر نہیں مل سکی۔ کون ہے وہ؟“ اچانک یاد آئے؟
 گی نے دریافت کیا تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے سر ہلا دیا تھا۔

”ہاں۔ ڈاکٹر بخاری تھے کوئی۔ ان دنوں آؤٹ آف ٹاؤن تھے۔ مجھے بہت افسوس رہا
 رومیسا کی آخری خواہش پوری نہیں کر سکا۔ انہوں نے جتنی کٹھن زندگی گزاری اس کا اندازہ کوئی نہیں
 سکتا۔“

”ہاں شاید۔“ گی نے پُر خیال انداز میں سر اثبات میں ہلایا تھا۔ ”اور رومیسا محبت کرنا
 تھیں اُن سے؟“

”ہاں۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے مختصر جواب دیا تھا۔ ”انہوں نے اپنی زندگی کے
 سارے دروازے اپنے ہاتھ سے بند کئے تھے۔ ڈاکٹر بخاری شادی کرنا چاہتے تھے رومیسا سے۔ رومیسا
 بھی ان سے محبت کرتی تھیں۔“

”تمہیں افسوس ہوتا ہے؟“ عجب سوال تھا۔

وہ لمحہ بھر کو اس کی طرف دیکھتی ہوئی کچھ بول نہیں سکی، پھر مسکرا دی تھی۔
”تمہیں نہیں ہوتا؟“

اذہان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب ہی وہ عجب پھیکے انداز سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”شاید نہیں۔۔۔ شاید ہاں۔۔۔ پتہ نہیں۔۔۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔۔۔ زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب اندازہ نہیں ہو پاتا کہ جو ہوا اور بہتر تھا۔۔۔ ٹھیک تھا۔۔۔ یا جو ہو رہا ہے وہ بہتر ہے اور ٹھیک ہے۔ ایسا ہم سب کے ساتھ ہوا ہے۔“ اذہان نے اس کی بات کی وضاحت کے طور پر کہا تھا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے چونکی تھی۔

”تم نے اپنی فیاضی کے متعلق نہیں بتایا۔۔۔ کیسی ہے وہ؟“ ٹھیک ہے؟“

”ہاں۔۔۔ شی از ویری پر بیٹی گرل۔“ وہ ساہیہ کے متعلق بتاتے ہوئے مسکرایا تھا۔ ”بہت سچا اور لڑکی ہے۔“

”اور تم اس کے ساتھ خوش ہو۔“ وہ مسکرائی تھی۔ ”تم بہت لگی ہو۔“ وہ بظاہر مسکراتے ہوئے بول رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری فوری طور پر کچھ نہیں بول سکا تھا۔

”ایک بات کہوں میرب!“ اس کا دم لہجہ اسے چونکا گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔“ عجب نیم جاں انداز میں وہ بولی تھی۔

”ہم سب جینے کے لئے سمجھوتے کرتے ہیں۔۔۔ ایک سمجھوتہ تم نے کیا۔ ایسے ہی ایک سمجھوتہ میں نے بھی کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت اچھی ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ مجھے اس سے محبت نہیں۔ شاید کبھی مجھے اس سے محبت ہو جائے۔ مگر میں اب نہیں مانتا کہ جینے کے لئے محبت کے ساتھ

رہنا ہی ضروری ہے۔ اور محبت ایک بار ہی ہوتی ہے۔“

”کیا محبت دوبارہ بھی ہو سکتی ہے؟“ وہ وضاحت چاہتی ہوئی بولی تھی۔

”پتہ نہیں۔۔۔ ابھی تک نہیں ہوئی۔ ایک بار کی تھی۔ وہی عجب جاں گسل واقعہ رہا۔“
مسکرایا تھا۔ مگر میرب سیال مسکرا بھی نہیں سکی تھی۔ ذہن میں ایک لمحے کو سردار سیکنگٹین حیدر لغاری کا چہرہ آیا تھا۔

”اور تم۔۔۔؟“ اذہان نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ”تم کیا سوچتی ہو؟“

”پتہ نہیں۔۔۔ کسی بات کی کچھ خبر رہی نہ احساس۔ عجب خلاؤں میں معلق ہے وجود۔۔۔ اپنے ہونے کا گمان نہیں رہا۔ کبھی خود کو دیکھوں بھی تو سب بکھرا بکھرا سا اور اپنی جگہ سے ہٹا ہٹا سا لگتا ہے۔“

”ہم میں سے کوئی بھی اپنے مقام پر نہیں ہے میرب!“ اذہان حسن بخاری نے ایک بل میں اس کی نفی کی تھی۔

”ہاں، شاید۔“ وہ مسکرائی تھی۔ ”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔“

”ہاں۔۔۔ مگر شاید تم بھی ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔“

”تم پلٹ کر دیکھتے ہو؟“

”ہاں۔۔۔ بارہا۔۔۔ پھر آگے دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ سوچتا ہوں اور ان لمحوں سے نکل نہیں سکتا۔ کوئی راہ محبت چھوڑتی ہی نہیں۔“ سنجیدہ انداز میں کہتے کہتے یک دم وہ مسکرایا تھا اور میرب نگاہ پھیر

”اور تم۔۔۔؟“

”میں۔۔۔؟“ میرب چونکی تھی۔ ”میں۔۔۔ میرے پاس پیچھے مڑ کر دیکھنے کا وقت ہی نہیں ہے۔“ عجب طنز خود پر کرتے ہوئے وہ مسکرائی تھی۔

”سردار سیکنگٹین سے محبت ہو گئی ہے تمہیں؟“ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے چھیڑا تھا مگر وہ مسکرائی نہیں تھی۔ ہاں، ان لمحوں میں یک دم ہی کوئی بازگشت سی چاروں اطراف ہونے لگی تھی۔

”محبت کرنے لگی ہو مجھ سے؟“

”مکمل کر دو۔۔۔!!“

ادھر سے، آدھے جملے اس کی سماعتوں میں گونجنے تھے۔۔۔ پتہ نہیں ان لفظوں کا کوئی مفہوم تھا مگر کہ نہیں۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ ابھی تک کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔

”میرب!“ وہ عجب کھوئے کھوئے سے انداز میں ایک جانب دیکھ رہی تھی جب اذہان نے اسے بلایا تو اس نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور پھر مسکراتے ہوئے بیگ شوولڈر پر ڈالنے لگی تھی۔

”گوناؤ۔“

اذہان حسن بخاری کی جان ایک لمحے میں مٹھی میں آئی مگر وہ مسکرا دیا تھا۔

”رائٹ۔۔۔ چلو میں چھوڑ دیتا ہوں تمہیں۔“

”نہیں۔۔۔ میں انتظام کر لوں گی۔“ اس نے تعرض سے کام لیا تھا۔ مگر اذہان مسکرا دیا۔

”انجینی ہو گیا ہوں تمہارے لئے۔ مگر اس قدر بھی نہیں۔ چلو۔۔۔!“

میرب سیال مزید تردد کے بغیر اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔

جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی تب ہی سردار سیکنگٹین حیدر لغاری نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ لہجے کی زلف سے آیا تھا۔ گاڑی پارک کر رہا تھا۔ مگر۔۔۔ نگاہوں میں یک دم ہی الاؤ سے دیکھنے لگے تھے۔

”انہاں حسن بخاری گاڑی آگے بڑھا لے گیا تھا۔“

وہ لمحہ مرک گیا تھا۔ آگے بڑھ گیا تھا۔ مگر سردار سیکنگٹین حیدر لغاری کے اندر آگ لگا گیا تھا۔

کون تھا وہ۔۔۔؟

کس کے ساتھ تھی وہ۔۔۔؟

تو کیا اس کے سامنے کوئی نئی راہ تھی۔۔۔؟

تب ہی وہ اس کے ساتھ کبھی چل ہی نہیں سکی تھی۔۔۔؟

بڑھ چلنے کی انگاروں پر وہ لوٹنے لگا تھا۔ لہجے کا ارادہ منسوخ ہوا اور وہ گاڑی واپس موڑتا ہوا وہاں

سے نکل گیا تھا۔

لامعہ حق عجب صورت حال سے گزر رہی تھی۔

اضطرار بیت حد سے سوا تھی۔

وجود جیسے قیامتوں کے زیر اثر تھا۔

مگر وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

وہ اتنا بیہ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر ہزار ہا کوشش کے باوجود خود میں ہمت نہیں پا رہی تھی۔ کل ہفتہ بھی فون کیا تھا۔ خود کو تیار کیا تھا۔ مگر ایک لمحے میں ہمت جواب دے گئی تھی۔ شاید سچ کہنے کے لئے واقعی بہت ہمت درکار ہوتی ہے۔ کچھ دیر وہ مضطرب سی کمرے میں ادھر سے ادھر ہلکتی رہی تھی۔ پھر فون اٹھا کر اس کا نمبر ملایا۔ تیل خاصی دیر جاتی رہی تھی۔ وہ دواؤں کے زیر اثر سو رہی تھی اور اس کا نمبر فون عرفنان نے سائیکٹ پر کر دیا تھا۔ وہ فون بند کرنے والی تھی جب دوسری طرف عرفنان نے فون اٹھا لیا تھا۔

”ہیلو!“ بھاری آواز ابھری تھی۔

دوسری طرف لامعہ میں بولنے کی ہمت نہیں تھی۔

”ہیلو۔ لامعہ! میں جانتا ہوں دوسری طرف تم ہو۔ تم بول کیوں نہیں رہی ہو؟“

تم ٹھیک تو ہو؟“

”آں۔ ہاں۔ ٹھیک ہوں میں۔“ لامعہ نے جس ہمت سے کہا تھا یہ وہی جانتی تھی۔

”اتنا بیہ کہاں ہے؟“

”اتنا بیہ تو سو رہی ہے۔ تم نہیں جانتی شاید۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ماہی،

اسلام آباد میں ہیں۔ سو تیار داری کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ہی آن پڑی ہے۔ تم کیسی دوست

ہو؟ آ جاؤ نا۔“ وہ دانستہ مدہم آواز میں بول رہا تھا کہ کہیں وہ ڈسٹرب نہ ہو اور بیدار نہ

جائے۔

لامعہ دوسری طرف کچھ بول نہیں پائی تھی۔ اسی لئے وہ بولا۔

”لامعہ! انتظار کرو۔ میں تمہیں کال بیک کرتا ہوں۔ یا تم میرے سیل پر فون کر لو۔ ادھر اٹھو

کی کوئی کال ہے۔“

اتنا بیہ نے تب ہی آنکھ کھول کر دیکھا تھا، کچھ اور تو سمجھ میں نہیں آیا تھا، صرف لامعہ کا نام سنا لیا

تھا۔ عرفنان علی خان کی اس کی طرف پشت تھی۔ وہ اسی طرح چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

”لامعہ۔ یہ لامعہ کیا بات کرنا چاہتی ہے عرفنان سے۔“ اس نے الجھ کر سوچا تھا۔

میرب نے بہت سوچا تھا اور اسے لگا تھا کہ اسے کم از کم پاپا سے کچھ نہیں چھپانا چاہئے۔ اب پاپا

ہورت حال مختلف تھی۔ پاپا اب تندرست تھے۔ بات اتنی اثر پذیر نہیں ہوئی تھی۔ اور اگر ہو بھی جانی

۔ وہ اپنی زندگی کے اتنے بڑے سچ سے انہیں لاعلم کیسے رکھ سکتی تھی۔

”کیا ہوا؟“ کیا سوچ رہی ہو؟“ زوباریہ نے اسے خاموش دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ مگر

نے سرٹلی میں ہلا دیا تھا۔

”پاپا جاگ رہے ہیں؟“

”ہاں۔ کیوں، کوئی کام ہے؟“

”ہاں۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“ وہ چلتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ پاپا لیٹ کر

بڑھ رہے تھے۔

”آؤ۔ میرب بیچے!“ اسے دیکھ کر پاپا نے کتاب ایک طرف رکھ دی تھی۔

”مجھے آپ سے بات کرنا ہے پاپا!“

”ہاں، تو کرو بیچے! سن رہا ہوں میں۔“ پاپا مسکراتے ہوئے بولے تھے۔

”وہ کوئی کیفیت میں کچھ دیر یوں ہی کھڑی رہی۔ پھر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”پاپا!۔ میں آپ سے وہ شیئر کرنا چاہتی ہوں جو میں نے اب تک آپ سے پوشیدہ رکھا۔“

”ہاں بیچے! کہو۔ میں سن رہا ہوں۔“

”پاپا!۔“ اسے قصہ بیان کرنا دشوار ترین لگ رہا تھا۔ ہمت ناپید تھی۔ مگر بیان تو کرنا ہی تھا۔

”ابنی پراہلم؟“ پاپا اس سچ پر یقیناً نہیں سوچ رہے تھے جس سچ پر وہ سوچ رہی تھی۔ اس نے سرٹلی

ہلا دیا تھا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی تھی۔

”پاپا!۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری ویسے قطعاً نہیں ہیں جیسا آپ سوچتے ہیں۔“

”کیا؟“ کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“

”کچھ لمحے وہ یوں ہی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔ آنکھوں سے بہت خاموشی سے آنسو

نکرنے لگے اور پھر بالآخر اس نے ہمت کر کے ساری داستان پاپا کے گوش گزار کر دی تھی۔

پاپا نے سنا تو گنگ رہ گئے تھے۔

ان کی اکلوتی بیٹی کا نصیب ایسا ہو گا۔ ایسا تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ، جسے انہوں نے

ان کی طرح پالا تھا، وہ اس قدر اذیت میں تھی۔ وہ بھی اس شخص کے باعث جس کے ساتھ اسے اپنی

مادر بنانی تھی۔

”میں آپ کو بتانا نہیں چاہتی تھی پاپا!۔ مگر۔۔۔“ وہ عجب مجرم سے انداز میں بولی تھی۔ پاپا

نے اپنے ساتھ بھیج لیا تھا۔

”مجھے لاعلم رکھو گی تو پھر تمہاری خوشیوں کا خیال اور کون رکھے گا میری بیٹی؟“ مگر تم نے مجھے

میرب کیوں بتایا؟“

میرب سیال کچھ نہیں بول سکی تھی۔ مظہر سیال بھی اس لمحے کسی گہری سوچ میں ڈوبے دکھائی دیئے

”تو پھر؟“
 ”انا بیہ! تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں میں۔ کوئی بہت ضروری بات۔“
 ”تو کرنا۔۔۔ سن رہی ہوں میں۔ لیکن وہ کون سی بات ہے جو تمہیں اتنا پریشان کر رہا
 میں بھی جاننا چاہتی ہوں۔ فریڈ شپ شیرنگ اور کیرنگ کا نام ہے اور.....“
 ”مگر میں اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں ہوں۔“ لامعہ نے اس کی بات کو کاٹا تھا۔
 ”غلطی؟“ انا بیہ چونکی تھی۔ ”کیسی غلطی؟“

لامعہ کے لئے اس لمحے کچھ کہنا دشوار ترین ہو گیا تھا۔ وہ اس سے نگاہ پھیر گئی تھی۔ انا بیہ شاہ
 بولنے کی منتظر اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی تب وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بہت آہستگی سے بولی
 ”میں تمہارے ساتھ مخلص نہیں ہوں۔“

”وہاٹ۔۔۔؟“ انا بیہ شاہ چونکی تھی۔ مگر لامعہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر ثابت کر
 لیا۔
 ”مجھے کہہ لینے دو انا بیہ!۔۔۔ نہیں کہوں گی تو شاید میرا دم گھٹ جائے گا۔ بہت سا بوجھ
 دل پر محسوس کر رہی ہوں۔ سانس تک لینا محال ہو رہا ہے۔ میں اب اس بوجھ کے ساتھ مزید
 سکتی۔“

”کہنا کیا چاہتی ہو تم؟“ انا بیہ شاہ اب بھی کچھ نہیں سمجھی تھی۔ بہت مدہم لہجے میں کہتے ہوئے
 دیکھا تھا۔ لامعہ حق جیسے خاموش رہ کر خود کو تیار کر رہی تھی۔
 ”انا بیہ! میں تمہاری اچھی دوست نہیں ہوں۔۔۔ نہیں ہوں میں تمہاری بالکل بھی اچھی دوست
 لامعہ کی آنکھوں سے جھر جھر نمکین پانی بہنے لگا تھا۔
 اور انا بیہ شاہ اسے ساکت سی دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ کچھ دیر کے بعد وہ ہمت کر کے صرف یہی کہہ سکی تھی۔ ”کیسے کہہ سکتی ہو کہ
 اچھی دوست نہیں ہو؟۔۔۔ اچھی دوست ہو تم میری۔ ہم بچپن سے ساتھ ساتھ ہیں۔ ہم نے
 اچھا وقت ساتھ گزارا ہے۔ ایک دوسرے کے کھلونوں سے کھیلے ہیں ہم اور.....“
 ”اور میں وہ سب بھول گئی انا بیہ!۔۔۔ سب کچھ بھول گئی۔“ وہ آنسوؤں کے ساتھ
 ہلانے لگی تھی۔ انا بیہ کی سمجھ میں اب بھی اس کی کوئی بات نہیں آئی تھی۔ مگر وہ اس کے بتانے کا
 چاہتی تھی۔ تب ہی اسے کریدے بغیر اس کے سامنے بیٹھی رہی۔

”انا بیہ! بچپن میں ہم ایک دوسرے کے کھلونوں سے کھلتے تھے اور اب۔۔۔ اب
 کے احساسات و جذبات سے کھلا ہے۔ میں کتنی بری ہوں، تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو۔ بہت
 تھی تا تم مجھ پر۔ مگر میں نے تمہارے اس اندھے اعتماد کے پرچے اڑا دیے۔ توڑ دیا میں نے
 یقین۔ میں تو دوست کہلانے کے لائق بھی نہیں ہوں۔“
 ”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟۔۔۔ ایسا کیا، کیا ہے میں نے؟“ دھیان عصفان علی خان کی طرف

”تو پھر؟“
 ”انا بیہ! تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں میں۔ کوئی بہت ضروری بات۔“
 ”تو کرنا۔۔۔ سن رہی ہوں میں۔ لیکن وہ کون سی بات ہے جو تمہیں اتنا پریشان کر رہا
 میں بھی جاننا چاہتی ہوں۔ فریڈ شپ شیرنگ اور کیرنگ کا نام ہے اور.....“
 ”مگر میں اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں ہوں۔“ لامعہ نے اس کی بات کو کاٹا تھا۔
 ”غلطی؟“ انا بیہ چونکی تھی۔ ”کیسی غلطی؟“

لامعہ کے لئے اس لمحے کچھ کہنا دشوار ترین ہو گیا تھا۔ وہ اس سے نگاہ پھیر گئی تھی۔ انا بیہ شاہ
 بولنے کی منتظر اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی تب وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بہت آہستگی سے بولی
 ”میں تمہارے ساتھ مخلص نہیں ہوں۔“

”وہاٹ۔۔۔؟“ انا بیہ شاہ چونکی تھی۔ مگر لامعہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر ثابت کر
 لیا۔
 ”مجھے کہہ لینے دو انا بیہ!۔۔۔ نہیں کہوں گی تو شاید میرا دم گھٹ جائے گا۔ بہت سا بوجھ
 دل پر محسوس کر رہی ہوں۔ سانس تک لینا محال ہو رہا ہے۔ میں اب اس بوجھ کے ساتھ مزید
 سکتی۔“

”کیا؟“ اسے اپنی آواز کونکوں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”ہاں۔۔۔ وہ سب میں نے کیا۔۔۔ بہت بری ہوں میں۔ میں نے کہا تھا، تم مجھ سے لڑنے لگو گی۔ دوست کہلانے کے لائق نہیں ہوں میں۔ تمہیں اتنا بڑا دھوکا دیا۔ تمہیں اتنا زک پہنچا۔ صرف اس لئے کہ میں عفتان سے محبت کرتی تھی اور وہ تم سے۔۔۔ نہیں برداشت کر سکتی تھی کہ بہت جلن ہوتی تھی مجھے۔ بہت حسد محسوس ہوتا تھا۔ اور جب تم نے بتایا کہ تم ہی وہ لڑکی ہو جس کے لئے اس نے مجھ سے اپنی انگریج منٹ ختم کر دی تو میں پاگل ہو گئی۔ نفرت ہونے لگی مجھے تم سے۔ تب بھی میرے ساتھ مخلص تھیں۔ مجھ سے اتنی ہی محبت رکھتی تھیں، اتنی ہی خیر خواہی سے ملتی تھیں کہ میں۔۔۔ میں تمہارے حق میں اچھا نہیں سوچ رہی تھی۔ بہت خود غرض ہو گئی تھی میں اتنا۔۔۔ میں نے تمہیں ایک طرح جان سے ہی مار دیا تھا۔ وہ تو عفتان نے تمہیں موقع پر پہنچ کر بچا لیا۔ اور وہاں وقت پر نہیں پہنچتا تو تم آج میری کوئی غلطی سننے کے لئے میرے سامنے نہیں ہوتیں۔“ لائو آنکھوں سے تیزی سے آنسو بہ رہے تھے اور انا یہ شاہ اسے ساکت سی دیکھ رہی تھی۔

اس کی نظروں میں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔

وہ جس کام کے لئے عفتان علی خان کو الزامات دیتی رہی، اسے برا بھلا کہتی رہی تھی اس لئے سرے سے اس کا کبھی تھا ہی نہیں۔

اس نے ایسا کچھ کبھی کیا ہی نہیں تھا۔

کتنا برا سلوک روارکھا تھا اس نے اس سے۔

کتنا برا بھلا کہا تھا اسے۔

مگر وہ کبھی اپنی صفائی میں ایک لفظ نہیں بولا تھا۔ اور اس کی یہی خاموشی اسے مجرم ثابت کرتی تھی۔ وہ بدستور اسے ہی مورد الزام ٹھہراتی رہی تھی۔ اسے ہی قصور وار مانتی رہی تھی۔

اور حتیٰ کہ خود کو بھی!

اس نے آج تک اپنا گھر آباد ہونے نہیں دیا تھا۔

اپنا دل آباد ہونے نہیں دیا تھا۔

صرف اپنی دوست کے لئے۔

عفتان علی خان جو اس کا شوہر تھا۔ جس کے تمام حقوق صرف وہ محفوظ رکھتی تھی، اسے اس نے اس لئے کبھی اپنا نہیں جانا تھا کہ وہ اس پر اپنی دوست کا حق تصور کرتی تھی۔ اور وہ دوست۔۔۔

”تم مجھے برا بھلا کہنا چاہتی ہو تو کو انا یہ!۔۔۔ میں سننا چاہتی ہوں۔ پلیز تم لڑو، جھگڑو۔ مجھے مارو۔۔۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا۔ میں دوست کہلانے کے لائق نہیں ہوں۔ تمہاری ایک اچھی دوست نہیں رہی۔“ لامعہ حق کہہ رہی تھی اور وہ اسے دھندلائی آنکھوں سے دیکھتی تھی۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ کچھ پریشان لگ رہے ہیں آپ؟“ زوباریہ نے منظر سیال سے دریافت کیا تھا۔

”پریشانی کی بات بھی ہے زوباریہ!۔۔۔ میرب کے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں ہوا ہے۔“

”کیا؟۔۔۔ کیا ہوا ہے میرب کے ساتھ؟“ وہ چونکی تھی۔

”وہ خوش نہیں ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی، وہ خوش نہیں ہے۔۔۔ اس سے پہلے تو ایسا اس نے کبھی نہیں کہا۔ اور سبکدین حیدر لغاری۔۔۔ وہ تو بہت کیئرنگ، لونگ پرسن ہے۔ میرا نہیں خیال وہ میرب کو کبھی۔۔۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے زوباریہ! وہ تصویر کا ایک دوسرا رخ تھا جو ہم دیکھتے رہے۔ سیدھی بات تو یہ ہے کہ سردار سبکدین حیدر لغاری ویسا بالکل بھی نہیں ہے۔ میں نے یہ رشتہ صرف تمہارے کہنے پر کیا تھا زوباریہ! مجھے تم پر اعتبار تھا۔“

”کیا مطلب اعتبار تھا؟۔۔۔ تو میں نے کیا غلط کیا؟ کیا اب آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں رہا؟۔۔۔“

آپ سمجھتے ہیں میں میرب کی خیر خواہ نہیں تھی؟ اگر سبکدین میں کچھ عیب ہے یا اس نے کچھ برا کیا ہے تو

ان میں میرا کیا قصور؟ ہم کسی کے باطن کے بارے میں کتنا قیاس کر سکتے ہیں؟“ زوباریہ صاف گوئی سے وضاحت دیتی ہوئی بولی تھی۔ تب ہی منظر سیال کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ معذرت کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

”آئی ایم سوری زوباریہ!۔۔۔ مگر میں اپنی بیٹی کے لئے بہت پریشان ہوں۔“

”تو کیا میں اس کے لئے پریشان نہیں ہوں گی اگر مجھے پتہ چلے کہ اس کے ساتھ کچھ غلط ہوا ہے؟“

مگر مجھے پتہ بھی تو چلے۔“

”زوباریہ! سردار سبکدین حیدر لغاری نے ہماری میرب کو بہت دکھ دیا ہے۔ لیکن اب مزید میں اپنی بیٹی کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں گویا ہوئے تھے۔

”کیسا فیصلہ؟“ زوباریہ چونکی تھی۔ ”دیکھیں منظر! کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ لیں کہ یہ

شے بچوں کا کھیل نہیں ہیں۔ اتنی جلد بازی کا مظاہرہ ہمیں قطعاً نہیں کرنا چاہئے۔ چھوٹی موٹی پرابلم تو

بات چیت سے بھی حل ہو سکتی ہے۔ آپ جانتے ہیں، نکاح ہوا ہے اس کا۔۔۔ اور اگر

غلطی ہوئی۔۔۔ آپ جانتے ہیں، ایک نکاح کا ٹوٹ جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ ایک شادی کا ٹوٹ

ہانا۔۔۔“

”تو کیا کروں میں؟ جھوٹک دوں اسے اس جہنم میں جہاں وہ نہ خوش ہے نہ ہی مطمئن؟۔۔۔“

جہاں لڑکھو اسے اذیت سے گزرتا پڑ رہا ہے؟“ منظر سیال برہمی سے بولے تھے۔

”ایسا میں نے نہیں کہا۔ لیکن کیا میرب ایسا ہی چاہتی ہے جیسا کہ آپ؟۔۔۔ آپ نے پوچھا

ہاں سے، کیا وہ علیحدگی چاہتی ہے سبکدین حیدر لغاری سے؟“

”وہ بے چاری کیا کہے گی؟۔۔۔ وہ تو بچی ہے۔ ہمارے یہاں کی بچیاں اپنے منہ سے کبھی کچھ

کہتی ہیں؟ ہم بھیڑ بکریوں کی طرح انہیں جس گھونٹے سے چاہیں باندھ دیتے ہیں۔ لاشی سے چاہیں ہانک دیتے ہیں بنا ان کی رضا پوچھے، بنا ان کی مرضی جانے۔ وہ بھی بھلا کئی کئی اعتراض کرتی ہیں؟ اور میرب کے بارے میں کیا میں نہیں جانتا کہ اس نے یہ شادی کس لئے کی؟ اگر میں اپنی بیٹی کو نورس نہیں کرتا تو وہ کبھی بھی اس نکاح کے لئے ہاں نہیں کرتی۔ سرسراہ قمر میرا بھی ہے۔ میں نے ہی کوئی چھان بین نہیں کی۔ اس وقت جیسے وہ میرے لئے بھی بوجھ بن گیا تھی۔ میں بھی ایک خود غرض باپ بن گیا تھا۔ مگر اس وقت مجھے خود پتہ نہیں تھا کہ صورت حال کیا کر لے گی۔ مجھے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ یقین نہ تھا۔ میں اپنی زندگی میں اسے سنبھالی اور اپنے گمراہ دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ....." ان کے لہجے میں پچھتاوا ہی پچھتاوا تھا۔ زو بار یہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

"ایک بات کہوں۔۔۔ جتنے خیر خواہ آپ ہیں میرب کے، اگر آپ سمجھیں تو میں بھی اتنی ہی ہوں۔ میں آپ سے اب بھی یہی کہوں گی کہ اتنی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کریں۔ ایک بار جلدی پہلے میں نے کی تھی اس رشتے کو بنانے میں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسری جلدی اب آپ کریں اور پچھتائیں۔" زو بار یہ نے مشورہ دیا تھا۔ مگر مظہر سیال کچھ نہیں بولے تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے دکھائی دیتے تھے۔

"تم۔۔۔ لیکن تم ایسا کیوں چاہتی تھیں؟ کیوں چاہا تم نے ایسا لامعہ؟ میرے ساتھ ایسا کر کے تمہیں کیا ملنا تھا؟" انابہ شاہ ایک گہرے کرب سے گویا ہوئی تھی۔ اسے اب بھی یقین نہ تھا کہ اس کے ساتھ لامعہ اس قدر برا کر چکی تھی۔

"تم کیا اب بھی نہیں سمجھی انابہ؟ کیا تم اتنی ہی بھولی ہو؟" لامعہ کے لہجے میں ایک عجیب طر سا تھا۔ انابہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"میں تمہیں عفتان علی خان کی نظروں میں گرانا چاہتی تھی۔ اس دنیا کی نظروں میں چھوٹا ثابت کرنا چاہتی تھی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ عفتان اس کے باوجود بھی نہ تم سے نفرت کر سکا نہ تمہیں چھوڑ سکا۔ انہاں نے تم سے شادی کر لی۔ اور میں۔۔۔ انابہ! تم مجھ سے نفرت کرو۔ میں بہت بری ہوں۔ بہت بری ہوں میں۔۔۔ کبھی تم سے مخلص نہیں رہی۔ کبھی تمہارا بھلا نہیں چاہا۔ ایک دوست ہو کر تم سے سب سے بڑا دھوکا کیا۔" لامعہ حق صاف گئی سے اسے بتا رہی تھی۔

"اتنا کچھ تھا تو تم نے مجھ سے چھپایا کیوں لامعہ؟ پہلے کیوں نہیں بتایا؟ یہ پچھتاوا تمہیں آنا کیوں ہوا؟۔۔۔ یہ گلٹ تمہیں آج ہی کیوں ستانے لگا؟" انابہ نے اہل سے جواز مانگا تھا۔

"اس لئے کہ تم اپنے بڑے پن کا یہ ہنر چھوڑنے کو قطعاً تیار ہی نہ تھیں۔ تمہیں عادت ہو چکی ہے انابہ! خواہواہ اپنی برتری ثابت کرتے رہنے کی۔ اپنا ہاتھ ہمیشہ اوپر رکھنے کی۔ تمہیں ہمیشہ دینے والا ہاتھ بننا پسند ہے اور دنیا تمہارے لئے بہت چھوٹی اور ادنیٰ ہے۔ تم صرف خود کو نوازنے والا ثابت کر

م بننا چاہتی ہو اور ایسا ہی تم نے اب بھی کیا۔ تم نے عفتان علی خان کو پا کر مجھے لوٹانا چاہا۔ اسے ان کرنا چاہا۔ یہ عظمت کا بہت بڑا ثبوت تھا تمہارا۔ مگر میں تم سے نفرت کرتی ہوں انابہ! نفرت نے تم سے۔ نفرت ہے مجھے تمہاری اس نوازی کی عادت سے اور خواہواہ بڑا بننے کی عادت سے۔ ایک انابہ! انسان بن کر جینا شروع کر دو۔ خدا نہیں ہو تم۔ اتنے بڑے مرتبے پر بیٹھنے کی کوشش نہ کر دو۔ ورنہ تمہارے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ خالی ہاتھ رہ جاؤ گی تم۔" لامعہ حق آنسوؤں کا تھکا ہوا ہے کہہ رہی تھی اور وہ ساکت، دھندلائی سی آنکھوں کے ساتھ اپنی اس دوست کو دیکھ رہی تھی۔ کیا صلہ دے رہی تھی وہ اسے؟ کیا کرنا چاہتی تھی وہ اس کے لئے اور۔۔۔

"میں تمہیں صرف یہ سمجھانا چاہتی ہوں، میں نے ایسا کیا کیوں کہ میں خود غرض تھی۔ میری طرح اور بارے لوگ خود غرض ہوتے ہیں۔ تم خود غرض نہیں ہو، یہ غلط ہے۔ آئی ایم سوری انابہ! اس کے لئے پچھتاوا ہے۔ تمہارے ساتھ میں نے جو بھی کیا اس نے کبھی مجھے چین سے رہنے نہیں دیا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے افسوس ہے۔" لامعہ حق ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو گرتی ہوئی اٹھ کر اٹھ گئی۔

"کل تم مجھ پر نیکی کرنے چلی تھیں، مجھے اپنا شوہر نواز کر۔۔۔ آج میں ایک احسان تم پر کرتی ہوں۔ تمہارا وہی شوہر تمہیں واپس لوٹا کر۔۔۔ رشتے کھیل یا کھلوانے نہیں ہیں انابہ! ان سے بڑا کبھی نہ کرو۔ عظیم بننے کا یہ شوق بہت برا ہے۔ اگر میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید وہ تمہارا دان کیا دیا ہوا نہیں کرتی۔ دوسروں سے شکوے شکایات کرنے سے بہتر یہ ہے انابہ! کہ تم اپنی غلطیاں کو نہ ضروری نہیں کہ ہر بار دوسرے ہی غلط ہوں۔ کبھی کبھی آپ بھی غلط ہو سکتی ہیں۔" وہ مٹری اور بڑا ہوا کسی طرح ساکت چھوڑ کر باہر نکلتی چلی گئی۔

انابہ دھندلائی آنکھوں سے اس خالی خالی منظر کو دیکھ رہی تھی۔

کیا ہاتھ آیا تھا اس کے۔۔۔؟؟

کیا۔۔۔؟؟؟

میرب کا دل مائی سے بات کرنے کو بہت چاہ رہا تھا۔ اس نے نمبر ملایا تھا، بات کی تھی تب ہی مائی کے بارے میں پتہ چلا تھا۔ وہ شرمندہ ہو کر ان کی طرف چلی آئی تھی

"مائی! آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔" اگرچہ شکوہ کرنے کا کوئی حق وہ نہیں رکھتی تھی مگر اتنے تھوڑے دنوں میں جو انیسیت اسے رومیا لغاری سے ہوئی تھی اس پر اس کی آنکھیں بھیک گئی تھیں۔

"میں سچے! خدا کو جو منظور۔ اور پھر اس کی موت کچھ اتنی غیر متوقع بھی نہیں تھی۔ ہم ہاتھ دے تھے کہ وہ زیادہ دنوں کی مہمان نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے تو تمہارے ہوتے ہی جواب دے دیا۔ مائی! انہاں نے وضاحت سے بتایا تھا۔ وہ جیسے زمین میں گڑھ گئی تھی۔

”آئی ایم سوری مائی! — میں وہاں سے اچانک چلی آئی۔“ شرمندگی سے بولتے ہوئے مائی کو دیکھا تھا تب ہی عین سامنے سے سردار بکنگین حیدر لغاری آتا دکھائی دیا تھا۔ وہ دائیں بائیں گئی تھی۔

”خبر ہے بچے! — جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ کسی کے رکنے سے یا جانے سے رومیصا کو بچاؤ نہ تھا۔ وہ بے چاری تو تھی ہی بد نصیب۔ ساری زندگی اس نے ایک عذاب میں مبتلا رہ کر گزار دی۔ صلہ ملا، نہ سکون — وہ خالی ہاتھ آئی تھی اور خالی ہاتھ ہی چلی گئی۔“ مائی اماں پھر آبدیدہ ہو رہا اور آنکھوں سے آنسو تو اس کے بھی رواں تھے۔

”تم ذرا بیٹھو بچے! میں نماز پڑھ کے آتی ہوں۔“ مائی کہتے ہوئے اٹھ گئی تھیں۔ میرب سرب بیٹھی تھی جب سردار بکنگین حیدر لغاری چلتا ہوا اس کے قریب آن رکا تھا۔

میرب نے سراٹھا کر بھیگی آنکھوں سے اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔ سردار بکنگین حیدر لغاری اگرچہ سیاٹ تھا مگر اس کی نظروں میں اسے اپنے لئے آج پہلی بار ناگواری کا تاثر صاف ابھرا دکھا تھا جس کی وجہ وہ جانتی تھی۔ مائی نے خشکی کا اگرچہ اظہار نہیں کیا تھا مگر گین کی طبیعت سے وہ واقف تھی۔

”آئی ایم سوری — رومیصا کے بارے میں سن کر —“

”وائے؟“ اس سے قبل کہ اس کی بات مکمل ہوتی، سردار بکنگین حیدر لغاری نے اس کا جھلکا کہتے ہوئے خشکی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

اتنی خشکی —؟

اتنی بے اعتنائی —؟

انتا غصہ —؟

اس کا درشت انداز — اگرچہ وہ یہاں جھیلے نہیں آئی تھی۔ مگر کسی قدر قصور اس کا تھا۔ وہ اس کا قصور وار سمجھتی بھی تھی۔

رومیصا نے اسے رکنے کے لئے خود کہا تھا۔ خود درخواست کی تھی مگر وہ اس کے باوجود وہاں سے آئی تھی۔

”میں مانتی ہوں غلطی میری تھی — مجھے وہاں سے اس طرح نہیں آنا چاہئے تھا مگر — وضاحت دے رہی تھی۔“

”آپ یہ وضاحتیں کس لئے دے رہی ہیں؟ — کون تھی وہ آپ کی؟ — کچھ نہیں۔ رشتہ نہیں تھا اس کا آپ سے۔ اور آپ کو تو اس کی موت کا کوئی افسوس ہونا بھی نہیں چاہئے۔“

انہنی سفاکی سے کہتا ہوا وہ پہلے سے بہت مختلف سردار بکنگین حیدر لغاری لگا تھا

میرب سیال کے لئے حیرت کا باعث نہیں ہونا چاہئے تھا۔ رشتے جس بیچ پر چل رہے تھے سب کچھ ممکن تھا۔ کچھ بھی عجب نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ ساکت سی اسے بنا کچھ بولے بیٹھی آئی تھی۔

سے تکتے لگی تھی۔ اگر یہ لمحہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس لمحے کی تقدیر کچھ مختلف ہوتی۔

شاید یہ ایک لمحہ سردار بکنگین حیدر لغاری کے دل پر کئی بجلیاں لمحے کے ہزاروں حصے میں گرا چکا تھا۔ مگر اس لمحے کی کہانی بہت مختلف تھی۔

یہ تو ان بھیگی پلکوں کا کوئی اثر اس دل پر ہوا تھا نہ اس کی سمت سے کسی ”عنایت“ کی پیش قدمی ہوئی تھی۔

”آپ کے یہ آنسو بہت بے کار ہیں میرب سیال! انہیں کسی اور وقت کے لئے سنبھال کر رکھئے۔ ان کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ سلگتے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

اتنی سختی — اتنی بے اعتنائی — اس شخص کے لہجے میں تو کبھی نہیں تھی۔

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ — کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑتی بی پر اعتماد انداز سے اسے تکتے لگی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ آپ بہتر طریقے سے سمجھ سکتی ہیں مس میرب سیال! بچی نہیں ہیں آپ کہ آپ کو بیک وقت ایک شے انگلی پکڑ کر سمجھائی جائے۔“ سردار بکنگین حیدر لغاری کے پاس تیروں کی جیسے کی نہیں تھی۔

”کیا سمجھانا چاہتے ہیں آپ مجھے؟“ میرب سیال نے پر اعتماد انداز میں کہتے ہوئے سراٹھا کر سردار بکنگین حیدر لغاری کو دیکھا تھا۔ ”کھل کر کہئے — کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“ وہ وضاحت ہتی ہوئی بولی تھی۔ مگر جو اب سردار بکنگین حیدر لغاری کی نظروں نے اسے جس طرح دیکھا تھا وہ انداز بے سے کہیں زیادہ سلگتا ہوا تھا۔

میرب اس شخص کے انداز پر حیران تھی۔ کچھ بھی رہا ہو، اس کا انداز ایسا کبھی نہیں رہا تھا۔

انتا درشت۔

انتا سرد۔

آنکھیں آگ برساتی ہوئی تھیں جیسے وہ اسے ایک پل میں جلا کر خاکستر کر دینا چاہتی ہوں۔ میرب کی سمت سے کچھ بولے جانے کی منتظر تھی۔ کوئی الزام تھا تو وہ سننا چاہتی تھی۔ کوئی طعنہ بھی تھا تو وہ ہانا چاہتی تھی۔ مگر سردار بکنگین حیدر لغاری خاموش تھا۔ کچھ نہیں بولا تھا اسے بس دیکھا تھا اور چلتا ہوا اسے نکل گیا تھا۔

میرب سیال وہاں بیٹھی، ساکت سی اس جانب تکتی رہی تھی۔



بہتر تھی۔ عفنان نے اس کی کیفیت کو چپ چاپ دیکھا تھا۔
وہ رنجیدہ تھی۔

مگر اسے پرواہ تک نہ تھی۔ انا بیہ نے خود اپنا حوصلہ آپ بندھاتے ہوئے ایک لمحے کو خود کو بولنے کے
اہل بنایا تھا۔

”اس۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔“

عفنان علی خان نے بنا کچھ کہے اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔ نہ کوئی تفصیل طلب کی تھی نہ ہی کوئی
نمانت چاہی تھی۔ جیسے اسے ان آنسوؤں کے اسباب جاننے کی سرے سے کوئی فکر ہی نہ تھی۔ وہ مڑا تھا
اور چلا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

انا بیہ شاہ چہرہ پھیرے پھیکے چہرے کے ساتھ، خالی خالی آنکھوں سے خالی خالی منظر کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

”کیا ہوا؟ کیا سوچ رہے ہو تم؟“ اذہان کو کسی قدر خاموش دیکھ کر ساہیہ نے دریافت کیا تھا۔
”ہونکا تھا۔ پھر مسکراتے ہوئے سر سرفی میں ہلا دیا تھا۔“

”نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔“

”رہی؟“ ساہیہ نے بہت سرسری انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”ہوں۔۔۔“ اذہان نے کافی کاسپ لیتے ہوئے سر اثبات میں بلایا تھا۔ ساہیہ کچھ کہے بغیر اس کی
اب سے نگاہ ہٹا گئی اور اذہان مسکرا دیا تھا۔

”تمہیں کیا لگا، میں کیا سوچ رہا ہوں؟“ انداز میں کسی قدر شکفتگی تھی۔ ساہیہ نے اسے بھرپور اعتماد
دے دیکھا تھا اور مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”مجھے۔۔۔!“ انداز اعتماد سے بھرپور تھا۔ اذہان مسکرا دیا تھا۔

”مضمہرو۔۔۔ میں آنے والی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں اپنا ہی مون پلان کر رہا تھا۔“
الہا وہ اسے مطمئن کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ لانا چاہ رہا تھا۔ مگر جانے کیوں وہ مسکرا نہیں
سکتی تھی۔

”اچھا۔۔۔؟“ وہ جیسے یقین کرنا چاہ رہی تھی۔

”بائے دی وے، ہم شادی کب کر رہے ہیں؟“ اس کے خاموش رہنے پر ایک عجیب طہر سے وہ
کرائی۔ مگر وہ دوسرے ہی پل مسکرا دیا تھا۔

”تم جب کہو۔۔۔ ابھی۔۔۔؟“ وہ شرارت کے موڈ میں دکھائی دیا تھا۔

”کم آن اذہان!“ وہ مسکراتے ہوئے کسی قدر اکتائے ہوئے انداز میں چہرہ پھیر گئی جیسے اس کے
لب پر ایک فیصد بھی اعتبار نہ ہو۔

”کیا تمہیں مجھ پر یقین نہیں؟“ اس کے چہرے کو بخور دیکھتے ہوئے اذہان نے دریافت کیا تھا۔ وہ
اتکے ہوئے سے انداز میں جیسے زبردستی مسکرائی تھی۔

صبح آفس جانے سے پہلے وہ اس کے کمرے میں آیا تھا۔

انا بیہ جاگ رہی تھی۔ نگاہ اس پر پڑی تھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ نگاہ پھیر گئی تھی۔ نہ ہمت تھی نہ

حوصلہ۔ کیا کیا نہ سوچ لیا تھا اس نے۔ کیا کچھ نہ کہہ دیا تھا۔ اور اب۔

”میں صرف یہ پوچھنے آیا تھا آپ نے ناشتہ کر لیا ہو تو دو الے لیجئے۔“ عفنان علی خان نے کہا تھا اور
اس کے لئے اس سے نظریں پچائے رکھنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

مگر اس بار انداز میں کچھ مختلف نہ سہی، مگر آنکھوں میں موجود تاثر کچھ الگ ضرور تھا جو شاید پہلے کبھی
نہیں تھا۔ وہ شرمندہ تھی۔ رنج زدہ تھی۔ رنجور تھی۔ کوئی بھید نہ کھل پایا تھا۔ بس وہ نگاہ ابھی تھی اور اس شخص پر
ساکت ہو گئی تھی۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ اپنی پرابلم؟“ اس کے اس طرح یک تک دیکھنے پر عفنان علی خان نے دریافت کیا
تھا۔ لہجے میں کوئی ہمدردی تھی نہ انسیت۔

مگر وہ جانے کیوں پھر بھی اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

عفنان اس کی کیفیت سے یقیناً واقف نہیں تھا۔ تب ہی اسے کسی قدر تشویش سے دیکھا تھا۔
”یواو کے؟“

انا بیہ کی آنکھوں میں ایک لمحے میں پانی جمع ہوا تھا اور جانے کیوں فوراً ہی آنکھوں سے باہر بھی چھلک
پڑا تھا۔ ضبط ہار گیا تھا یا وہ واقعی کمزور لمحہ تھا۔ یا پھر وہ اب اپنے آنسوؤں سے چھپانا نہیں چاہتی تھی۔ رخصت
بھیلتے چلے گئے تھے۔

عفنان نے اسے صرف خاموشی سے دیکھا تھا۔ کوئی سبب دریافت نہیں کیا تھا۔

”میں رشیدہ کو بھجوا دیتا ہوں۔۔۔ وہ آپ کو ناشتہ بھی کرا دے گی اور دو ابھی یاد سے دے دے گی۔“

دوسری طرف اس کے لئے جیسے سب کچھ بہت سرسری تھا۔ وہ ڈھنگ سے ٹوٹس تک نہ لے رہا تھا۔ جیسے
اس رشتے کی وقعت اس کے لئے واقعی ختم ہو گئی تھی۔ جیسے وہ تعلق اس کے لئے اب کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔

جیسے وہ اب اس کی کچھ نہیں رہی تھی۔

وہ عجلت سے کہہ کر پلٹنے لگا تھا جب وہ بول پڑی تھی۔

”نہیں۔۔۔“ گلے میں آنسوؤں کا پھندا سراٹمک گیا تھا۔ بولنا چاہا تھا مگر وہ بے بسی کے انداز میں

یہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی تھی۔

بڑی کے ساکت ماحول میں سردار سبکگین حیدر لغاری خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ گی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ مگر اس میں اس سے پوچھنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ اپ سیٹ تھا۔ یہ وہ جانتی تھی۔ کیوں تھا، پانتی تھی۔ کس کے باعث تھا، یہ بات بھی اس کے علم میں نہیں تھی۔

ابن۔ "ا۔" وہ اسے پکارنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن باز نہیں رہ سکتی تھی۔

ابن۔ "ا۔" وہ ایک لمحے میں چونکا تھا۔

مجھے میرب سے ملنا ہے۔ تم اس کی طرف گاڑی لے جا سکتے ہو؟

ابن۔ "ا۔" وہ اس کے سوال پر چونکا تھا۔

ابن۔ مجھے میرب سے ملنا ہے۔" وہ اسی قدر اطمینان سے گویا ہوئی تھی۔

کیوں؟ کس لئے؟" استفہار کیا تھا۔ لہجہ بے تاثر تھا۔ گی نے اسے تشویش سے دیکھا تھا۔

ابن۔ "ا۔" اسے اس سے نہیں مل سکتی؟" الٹا سوال کر دیا تھا۔ گین کوئی

بے غیر وڈ اسکرین سے اسے پار دیکھنے لگا تھا۔

گی۔ "ا۔" مجھے تمہارا بہت خیال ہے۔ بہت پرواہ کرتا ہوں میں تمہاری۔ پلیز مجھے ایسا کرنے کو

پروا میں تمہارے لئے نہ کرنا چاہوں یا نہ کر سکوں۔" اس کی طرف دیکھے بغیر سردار سبکگین حیدر لغاری

الٹا لہجہ اتنا قطعی تھا کہ گی اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

اتنے غوطی مت ہو گین! وہ تمہاری اپنی ہے۔ وہ تمہاری بیوی ہے۔" گی نے اسے اس کی لاپرواہی کا

لہلاٹا چاہا تھا۔

"ا۔" جاننا ہوں میں گی! مجھے ری مائنڈ کروانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اچھی طرح پتہ ہے

لاشتوں میں بندھا ہوں اور کس کس بات کا پابند ہوں۔"

اگر تم پابند ہو گین! تو پھر اس طرح کیوں کر رہے ہو؟" گی نے بے یقینی سے کہا تھا۔

ابن۔ "ا۔" ایک طنز یہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی تھی۔

گی جواباً کچھ نہیں بولی تھی۔ وہ اس کی کیفیت کو کس قدر سمجھ رہی تھی۔ فوری طور پر وہ کچھ بھی بول کر

اپنا اپ سیٹ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس کی دوست تھی۔

فرخاہ تھی۔

اچھہ کھڑکی کی طرف کے چپ چاپ بیٹھی تھی جب گین اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

گی۔ "ا۔" مجھے رشتوں کو بنانا بھی آتا ہے اور انہیں نباہنا بھی۔ میں اپنے رشتوں کے لئے بے خبر رہ سکتا

ہرگز پرواہ۔"

اس جانتی ہوں گین! تم ایسے نہیں ہو۔ مگر پلیز رشتوں کو سمجھنا بھی سیکھو۔ یہ ایسی ڈور ہے جو

"ہے۔" اس نے بلا تامل کہا تھا۔

"پھر۔" اذہان نے استفہار کیا تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ ٹالتے ہوئے مسکرا دی تھی۔ "کچھ نہیں۔ تم کچھ بتا رہے تھے۔" وہ جیسے اس

موضوع سے ہٹنا چاہتی تھی۔

اذہان نے اسے بخور دیکھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو تم؟"

"کچھ نہیں۔ صرف یہ کہ اعتبار کرنا شاید اتنا آسان نہیں۔"

"اعتبار کرنا آسان ہے۔ مگر اس کے بعد کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ آسان نہیں۔ ڈر لگتا ہے۔" لولو

خوف میں بسر ہونے لگتا ہے۔"

"کیوں۔" اذہان نے دھیمے لہجے میں دریافت کرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ "جب اعتبار

تو پھر ڈر کیسا؟"

"پتہ نہیں۔"

"کیا لہجہ لہجہ تجوید وفا کرنا ضروری ہے؟" اذہان نے مدہم لہجے میں وضاحت چاہی تھی۔

"ہاں۔" ساہیہ نے بلا تامل کہا تھا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسا ضروری نہیں؟"

"نہیں۔" میرے خیال میں یہ سب بہت ضروری ہے۔ سو میں بھی یہی چاہوں گا۔" باربا

ہر بار یہی کہتا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" سوئسٹ می۔" اذہان نے مدہم

میں اسے یقین دلایا تو وہ مسکرا دی۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ مسکرائی تھی مگر انداز بہت پھیکا تھا۔ "تم میرب کی طرف گئے۔ کیا ہوا؟"

اس نے ایک دم ہی موضوع بدل دیا تھا۔

"کیا مطلب، کیا ہوا؟" وہ چونکا تھا۔

"وہ ٹھیک ہے نا؟" ساہیہ نے مسکراتے ہوئے وضاحت دی تھی۔ "تم ہی تو بتا رہے تھے وہ

پریشان تھی۔"

"ہاں۔" نہیں، میں اس کی طرف نہیں گیا۔ فون پر بھی بات نہیں ہوئی۔ کچھ مصروفیت زیادہ رہی

دھیان ہی نہیں رہا۔" چلو میں تمہیں چھوڑ دوں۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں چلی جاؤں گی۔" وہ مروت سے مسکرائی تھی۔ اٹنے

کوشش کی تھی جب اذہان نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

ایک انوکھے سے احساس نے جیسے اسے چھوا تھا۔ نگاہ اٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا تھا۔ اس

چہرے یا آنکھوں میں کوئی خاص آہنگ نہ تھا۔

"میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔" اعتبار کرنا سیکھ لو ساہیہ! میں دل توڑنے کا عادی نہیں۔" کہتا ہوا

اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

کھینچو تو ٹوٹ جاتی ہے۔ خود کو نہیں، اپنے دل کے معاملات سنوارنے کا موقع دو۔ تمہارا دل کبھی نہیں کہے گا۔ دل کے معاملات دل پر چھوڑ دو۔ عقل کو اپنے کام کرنے دو اور دل کو اپنے۔“

”گین! دل کو اپنا باند بنانا چھوڑ دو۔“

”نہیں چھوڑ سکتا گی!۔ بہت من مانی کرتا ہے یہ۔ مانے گا نہیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بہت اچھے ہوئے انداز میں بولا تھا۔

گی اس کے چہرے کو پڑھنے کے جتن میں چہرہ پھیر گئی تھی۔ اس کی پیشانی کی رگیں تپتی ہوئی تھیں آنکھیں بالکل بے تاثر تھیں۔ مگر وہ جانتی تھی اس وقت اس کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔

گاڑی ایک نامعلوم جگہ پر رکھی تھی۔ گی نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔ تب ہی وہ اس کی طرف بغیر دھیسے لہجے میں بولا۔

”تم میرب سے مل لو۔۔۔ میں کچھ دیر بعد واپس آ کر تمہیں یہاں سے پک کر لوں گا۔“

تو اس نے گاڑی کو میرب کے گھر کے سامنے روکا تھا؟۔۔۔ وہ خود اتنا سپاٹ اور بے تاثر دے رہا تھا کہ جیسے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ جیسے اس سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ وہ اتنا بے تاثر کیا رہا تھا؟

جہاں تک وہ جانتی تھی، سردار سبکگین حیدر لغاری محبت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ تو پھر اب یہ اتنی سزا اچانک کہاں سے آگئی تھی؟۔۔۔ گی بالکل بھی نہیں سمجھ پائی تھی۔ مگر اس نے بنا کوئی آرگومنٹ کے لئے اپنی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا۔

”تم اندر نہیں آؤ گے؟“

”نہیں۔۔۔ مگر تمہیں واپس لینے ضرور آؤں گا۔“ بے تاثر لہجہ سرد ترین تھا۔ وہ سر ہلاتی ہوئی سے نکل گئی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری گاڑی زن سے آگے بڑھالے گیا تھا۔

ایسا اچانک کیا ہوا تھا؟

گی بالکل سمجھ نہ پائی تھی۔



”اذہان! ساہیہ بتا رہی تھی تم ہنی مون کے لئے جگہ کا انتخاب کر رہے ہو۔ تو کیا تم شادی کر رہے فارحہ کے ساتھ بیٹھی اگینے نے دریافت کیا تو اس نے نیوز پیپر سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔

”آف کورس۔۔۔ شادی تو ہمیں کرنا ہی ہے۔“

”کب؟۔۔۔ تم نے مجھے بھی نہیں بتایا؟“ فارحہ نے بھی حیرت کا اظہار کیا تھا۔ وہ پاس سے کہنے لگا۔

”ماہا! مجھے چائے مل سکتی ہے؟“

”جی بھائی۔“ وہ فوراً اٹھی تھی۔

”ذرا جلدی۔۔۔ سر میں تھوڑا درد ہے۔“

سر میں درد ہے تو ڈاکٹر کو فون کرو۔ یہ تم آج کل کے بچے بھی نا۔۔۔ چھٹی کا ایک دن ہے، یہی آرام کرتے ہوئے نہیں گزار سکتے۔ کیا ضرورت تھی رات گئے تک باہر رہنے کی۔“ فارحہ نے

بھائی! کرنے دیں انجوائے۔ شادی کے بعد تو ساری کسر نکل جاتی ہے۔ بندہ کسی اور طرف لائن بھی نہیں رہتا۔ کیوں اذہان! ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟“ اگینے نے مسکراتے ہوئے اسے

بھائی اگینے!۔۔۔ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔ میں واقعی آنے والے خطرات سے پہلے ہی اقدامات کر رہا ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا تھا۔ آنکھوں کے پونے کچھ بھاری سے تھے۔ وہ

اپنی طرف رکھ کر ہاتھ سے کپٹی کو دبائے لگا تھا۔ ماہا چائے لے کر آگئی تھی۔

شاہاش گریا!۔۔۔ جب تم بیاہ کر اپنی سسرال چلی جاؤ گی تو میں سب سے زیادہ تمہاری اس کو نیک بس کروں گا۔ بہنیں دنیا کی وہ واحد مخلوق ہوتی ہیں جو بھائی کی آواز پر سب سے پہلے اوز بہت جلد

نا ہیں۔“ وہ مسکرایا تھا۔

مسکرائی تھی۔ چہرے پر کچھ رنگ بکھر گئے تھے۔

لیکن نہیں چھوڑ کر جارہی میں آپ کو۔۔۔ محبت سے کہتے ہوئے بھائی کے سر کو دبانا شروع کر دیا تھا۔

رہے نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں۔ تم رہنے دو۔ تمہارے ہاتھ کی چائے میں ہی اتنا جادو ہے

اپنی میں سارا درد رفع کر دے گی۔“ بہت محبت سے بہن کو منع کیا تھا۔ ماہا اس کے کہنے کے باوجود

رہی تھی۔

نہیں کتنی اچھی ہوتی ہیں، اس کا احساس تمہیں ماہا کے چلے جانے کے بعد ہو گا۔“ اگینے نے

نہوئے کہا تھا۔

ا۔۔۔ مگر یہ چائے کی تو میں اس کی بھائی لے آؤں گا۔ بس یہ جلدی سے اپنے گھر کی ہو

مسکراتے ہوئے بہن کو چھیڑا تھا۔

اے، آپ مجھے نکال کر بھائی کو لائیں گے؟“

ا۔۔۔ ورنہ تم اپنی بھائی سے جھگڑا جو کرو گی۔“

اے واہ۔۔۔ ابھی سے اپنی دلہن کا اتنا خیال ہے اور میری معصوم بچی۔“ فارحہ نے محبت سے

وہ مسکرایا۔

لذبات ہے اذہان!۔۔۔ بہن کتنی اچھی ہوتی ہے، اس کا احساس تمہیں اس کی شادی کے بعد ہو

نے بھی مسکراتے ہوئے ڈپٹا تھا۔

اے واہ۔ کوئی ساہیہ کی سائینڈ لینے کو تیار ہی نہیں۔ اگر میں اسے ڈی فنڈ نہیں کروں گا تو کون کرے

ا کے انداز میں شرارت تھی جسے محسوس کرتے ہوئے سب ہی مسکرا دیئے تھے۔

ا تباہ شادی کب کر رہے ہو؟۔۔۔ کیا واقعی تم تیار ہو؟“ اگینے نے پوچھا تھا۔

میرے راستوں کو باندھ لے
مجھے اپنے سنگ لے کر چل
میں تیرا شہرا وقت ہوں
میں تیرا گیا وقت ہوں
آ قریب آ

مجھے اپنی ٹٹھی میں تھام لے
تُو نظر ملا
میری روح کو تن سے کھینچ لے
میری نگاہ کو خود سے باندھ لے
میری اضطرابیوں کو قرار دے
مجھے اک نئی بہار دے

میری جلتی بجھتی خواہشوں کو
اپنے لہس سے زندہ کر
آ چھو لے مجھے
پھر اک بار مجھے زندہ کر
میں تیرا شہرا وقت ہوں
میرے ساتھ رہ
میرے ساتھ چل
آ قریب آ

”اذہان! وہ کھویا کھویا سا کھڑا تھا جب میرب نے اسے پکارا تھا۔ اس کی ساکت نظروں میں
لڑکت ہوئی تھی۔ جامد لبوں میں جنبش ہوئی تھی۔ وہ ایک لمحے میں خود سے ہاتھ چھڑا کر باہر کی دنیا میں آیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں یہاں ہوں۔ کیا کہہ رہی تھیں تم؟“

”میں کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔ تم ہی چپ تھے۔“ وہ دوسری طرف مدھم لہجے میں بولی تھی۔

”ہاں۔۔۔ شاید ہم دونوں ہی چپ تھے۔“ اذہان کا لہجہ کھویا کھویا تھا۔

”ہاں شاید۔۔۔!“ میرب نے بھی اسی کا کہا دہرایا تھا۔

”باہر بارش ہو رہی ہے۔“ میرب نے قدرے توقف سے اطلاع دی تھی۔

”ہاں۔۔۔ یہاں بھی۔“ اذہان نے تائید کی۔

”فارحہ آئی کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہیں۔۔۔ سب مس کر رہے ہیں تمہیں۔ ایک عرصے سے چکر نہیں لگایا تم نے۔“ دونوں کے

الفاظات کرنے کو جیسے کوئی موضوع نہ تھا۔

”ہاں۔۔۔ تیار ہوں۔ مگر کچھ کام نمٹانے کے بعد۔“

”ارے، میں تو خوش ہو رہی تھی۔ ایک اچھی خبر ہاتھ لگی تھی اور تم انکاری بھی ہو گئے۔“ فارحہ نے

تشویش سے بیٹے کو دیکھا تھا۔

”میں مکر نہیں رہا مئی!۔۔۔ یہیں ہوں۔ اگر میں نے منگنی کی ہے تو شادی بھی کروں گا۔ اس رشتہ

میں نے خود بنایا ہے۔ کیسے توڑ سکتا ہوں؟“

”ہم جانتے ہیں اذہان! تم کبھی کوئی کام غلط کر ہی نہیں سکتے۔ ساہیہ خوش قسمت ہے کہ اسے تم میرا

سچھ دار لڑکا ملا ہے۔“ اگینے بولی تھی۔ اور وہ ایک کرسی سے مسکرا دیا تھا۔ تب ہی اس کا سیل فون نائٹ

ایک جانے بیچانے نمبر کو دیکھ کر وہ قصداً وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

”ایکسیو ز می۔“ وہ چلتا ہوا باہر آ گیا تھا۔

کوئی گناہ نہیں کر رہا تھا وہ۔ مگر جانے کیوں اندر ایک عجیب سا احساس اُبھرا تھا۔

”بیلو میرب!۔۔۔ کیسی ہو تم؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو؟ پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔“ میرب نے شکوہ کیا تھا۔ وہ فوری طور پر کھڑکی

کھسکا تھا۔ دل عجیب سا کھینچ رہا تھا۔ اضطرابیت کچھ بڑھ رہی تھی۔

آ قریب آ

تجھے دیکھ لوں

تجھے جان لوں۔۔۔ تجھے باندھ لوں

اک ان دیکھی بیگی ڈور سے

آ قریب آ

میرے دل کا خالی کمرہ

ہے ایک دیے کا منتظر

تُو قریب آ

تجھے چھو لوں میں

میری تمازتوں کو سکون ملے

آ قریب آ

اک دیا جلا

میرے ویرانے ہیں منتظر

میرے دل کے کونے یہاں وہاں

ہیں تیرے قدموں کے منتظر

میرے زاویے، میرے حاشیے

ہیں تیری ایک نگاہ کے منتظر

”ہاں، ٹھیک کہہ رہے ہوتے۔“ وہ بھی مروت سے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مکرانی تھی۔

”آج آ جاؤ۔۔۔ مئی بھی تمہیں پوچھ رہی تھیں۔“

”تم نے بتایا تھا انہیں؟“ وہ چونکی تھی۔

”نہیں، سب کچھ نہیں۔ صرف یہ کہ تم ملی ہو۔“

”رائٹ۔۔۔ پلیز، انہیں کچھ مت بتانا انہاں!۔۔۔ میں جانتی ہوں انہیں دکھ ہوگا۔ وہ مجھے

بہت پیار کرتی ہیں۔“

”ایک بات پوچھوں؟“ انہاں نے مدہم لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”کیا؟“ وہ دوسری جانب چونکی تھی۔

”تمہیں لگا کہ میں تم سے جیت نہیں کرتا؟“ ایک مدہم سرگوشی ہوئی تھی۔

”کیا۔۔۔؟“ وہ بھونچکی رہ گئی تھی۔

”کچھ نہیں۔۔۔ تھنک۔۔۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہم اپنا اور دہی سے بانٹتے ہیں جس سے

ہم سب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔“ انہاں نے بات کو بہت آہستگی سے سنبھالا تھا۔

وہ دوسری جانب کچھ نہیں بولی تھی۔

وقت ان کے درمیان بہت خاموشی سے ایک کہانی لکھ رہا تھا۔

پھر ساکت تھے۔

”انہاں! میں چکر لگاؤں گی وقت نکال کر۔ تم فارحہ آئی کو میرا سلام کہنا۔ اور سابیہ کیسی ہے؟“

ایک لمبے میں اسے جتاتے ہوئے اس کو موجودہ وقت میں کھینچ لائی تھی۔

”شی از ازل رائٹ۔ میں تمہیں پھر کال کروں گا۔“

”بائے انہاں!“ دوسری طرف آواز کا سلسلہ منقطع ہوا تھا اور اس طرف الجھنیں کچھ اور بڑھ گئیں۔

آقرب آ

تجھے دیکھ لوں

تجھے اپنے دل میں رکھ لوں

آقرب آ

کیسی کیسی خواہشیں اندر سر اُبھار رہی تھیں۔

وہ متواتر خود کو جھک رہا تھا۔ باور کر رہا تھا۔

مگر دل جیسے ضدی بچہ بن گیا تھا۔

”کل وہ جولائی آئی تھی، وہ کیا لگتی ہے بیگین کی؟“ کھانے کی ٹیبل پر مظہر سیال نے دریافت کیا تھا

میرب سیال چونک پڑی تھی۔

”وہ۔۔۔۔۔۔ بابا!۔۔۔۔۔۔ وہ کی ڈانگ ہے۔ سردار بیگین حیدر لغاری کی دوست۔“

”یہ وہی دوست ہے جو اس کے ساتھ رہ رہی ہے؟“

”جی ہاں!۔۔۔ وہ سر جھکا کر حرم انداز میں ایسے کہہ رہی تھی جیسے سارا قصور اس کا ہو۔“

”وہ یہاں کیوں آئی تھی؟“

”اے آپ بھی بات کا بیگن بنا لیتے ہیں۔ کیا حرج ہے اگر وہ یہاں آگئی۔“ زوباریہ مداخلت کرتی

دلی بولی تھی۔

”زوباریہ ٹھیک کہہ رہی ہیں بابا! آپ کو خود کوریلیکس رکھنا ہے۔ یوں بھی وہ یہاں صرف مجھ سے ملنے

آئی تھی۔ اور میری خبریت دریافت کرنے۔“ میرب نے مدہم انداز میں کہا تھا اور کھانے کا تیج پیٹ میں

کڑا تھا۔

”ایکلیکڑی۔“ وہ بولی تھی اور اٹھ کر چلتی ہوئی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔

زوباریہ اور مظہر سیال ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے تھے۔

بارش کی بوندوں کو اس نے چپ چاپ ہاتھ پر لیا تھا۔ سارا اندر جیسے جل رہا تھا۔ مگر ان بوندوں کے

لے لے اس احساس کو کچھ اور بھی سوا کر دیا تھا۔

وہ کھڑکی میں چند منٹوں تک یوں ہی ساکت سی کھڑی رہی تھی۔ پھر زوباریہ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی

تھی۔

”زوباریہ! میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ پاپا سے کہنا پریشان نہ ہوں۔“

”ہاں، ٹھیک ہے۔۔۔ مگر ذرا جلدی واپس آ جانا۔ موسم اچھا نہیں ہے۔ جانے کب یہ بوندا

اندلی تیز بارش کی صورت اختیار کر لے۔“ زوباریہ نے نصیحت کی تھی۔ وہ سر ہلاتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

عجب اضطراب اس کے اندر سر اٹھا رہے تھے۔ مگر وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی ہے۔

سر کو جھٹک کر جیسے تمام سوچوں سے نکلتی ہوئی وہ چل پڑی تھی۔

اس طرح بوندوں میں پھینکتے ہوئے چلنا اچھا لگ رہا تھا۔

”کھل کر دو۔۔۔“

ایک مدہم سرگوشی۔ اچانک اس کے اندر کے سناٹوں میں اُبھری تھی۔ میرب سیال کی دھڑکنوں

کا ایک بلبل میں انتشار برپا ہوا تھا۔ اور گرد گرد لوگ تھے۔ راستہ ویران نہ تھا۔ کئی اور لوگ بھی واک کر

رہے تھے۔ موسم سے حظ اٹھا رہے تھے۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ بوندیں تیزی سے برسنے لگی تھیں مگر وہ

لپٹ لپٹ میں گم صم ہی تیز قدموں سے چلتی چلی گئی تھی۔ جیسے وہ اپنے آپ سے بھاگ رہی ہو۔

”تجھت کرنے لگی ہو مجھ سے؟“

اس کے اندر کے سناٹے میں ایک اور سرگوشی اُبھری تھی۔ اس نے تیزی سے قدم اٹھائے۔ جب ہی

لاطرح کسی سے ٹکرائی تھی۔

”کھل کر دو۔۔۔“ ایک بازگشت بنی تھی اس کے اندر۔

نہ عمر بھر کی رفاقت

نہ دوستی

نہ محبت

پتہ نہیں قصور اس کا تھا یا قسمت ہی اس کے ساتھ ایسی چال چل رہی تھی۔

لامعہ نے کہا تھا، وہ غلط ہے۔ ایک طرح سے لامعہ نے تمام کا تمام ذمہ دار اسے ٹھہرایا تھا۔ اور تب سے وہ اپنا محاسبہ کرنے میں لگی ہوئی تھی کہ سارے رشتے اس سے بدلن ہو گئے تھے۔

سارے دل کے تعلق دور دور ہو گئے تھے۔

وہ محبت کی جنوں خیزی نہ رہی تھی۔

وہ پہیلی سی محبت نہ رہی تھی۔

وہ دوستی بھی باقی نہ رہی تھی۔

لامعہ کے الفاظ اب بھی اسے برہمیوں کی طرح کاٹ رہے تھے۔

غلطی اس سے ہوئی تھی۔ وہ فقط اتنا یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دل بہت بوجھل سا ہو رہا تھا۔

عفتنان کے کہنے پر وہ تیار ہو کر باہر آئی تو بارش ہو رہی تھی۔ وہ کسی قدر حیران تھی۔ جانے ارد گرد

اتنی بے خبر کیسے ہوئی کہ کچھ خبر ہی نہ رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں، وہ وہیں بیٹھ کر بارش کو دیکھنے

تھی۔ سارا لان بھیگ رہا تھا۔

عفتنان باہر آیا تو اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہ سر جھکائے کچھ بکھری بکھری سی دکھا

دے رہی تھی۔

کیا ہوا تھا؟ یہ تو وہ نہیں جانتا تھا مگر اس گھڑی اس کی سرد مہری ایک لمحے میں ٹوٹی اور اس کے ذہن

وہیں بیٹھیں پر بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا...؟“ مدہم لہجے میں دریافت کیا گیا۔ مگر وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ اسی طرح خاموشی

بارش میں بھیگتے منظر کو دیکھتی رہی۔

”آپ پریشان ہیں؟“ عفتنان نے دوبارہ دریافت کیا۔

”نہیں۔“

”تو پھر؟“ اس نے استفسار کیا۔

”پتہ نہیں۔“ وہ عجب بکھرے بکھرے سے لہجے میں اس کی طرف دیکھے بغیر بولی تو عفتنان نے

اس کی طرف دیکھا۔

”دیکھیں اس پریشانی کا سبب یہ رشتہ یا میں تو نہیں ہوں؟“ سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ اچانک

پڑی تھی۔ اس کی الجھنوں میں کچھ اور اضافہ تھا اس گھڑی وہ شخص۔ وہ ابھی سنسنیلی بھی نہیں تھی جب

ہوا تھا۔

”اگر میری طرف سے کوئی پرابلم ہے تو.....“

”اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ بول پڑی تھی۔ جیسے اسے خدشہ تھا کہ وہ شخص جو

وہاں سے نہ سن پائے گی نہ جھیل پائے گی۔ اس کے متصل سے انداز پر عفتنان نے اسے خاموشی

یا ایک عرصے بعد وہ دونوں ساتھ بیٹھے تھے۔ بہت دنوں بعد وہ دانستہ اس کے قریب ہوا تھا۔

بڑھا کر دیکھا جاتا تو یہ فاصلہ ایک لمحے میں سمٹ سکتا تھا۔ مگر دونوں جانب ایک سرد مہری

تمشی۔

”اس کی خاموشی دیکھ کر عفتنان نے سر اثبات میں ہلا دیا۔“ ”میرا مقصد آپ کی پریشانیوں

کا ہے، کم کرنا ہے۔ آپ جب بھی، جو بھی چاہیں میں آپ کی خواہش کا احترام کروں گا۔ جہاں،

کہاں آپ کو یہ رشتہ نبھانا یا ساتھ لے کر چلنا بوجھ لگے، بنا دیجئے گا۔ میں آپ کی پریشانی کم کرنے

کا گمانے کی پوری کوشش کروں گا اور ضروری اقدامات بھی۔“ وہ کیا کہہ رہا تھا، وہ سچی نہیں تھی کہ

وہ اس رشتے کو کتنی آسانی سے ختم کرنے کی بات کر رہا تھا۔

اس کی طرف بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ بنا اس کی طرف دیکھے، بنا اس کی پرواہ کے اٹھ کھڑا

تھا۔ صبح آفس بھی جانا ہے۔“ یہ اس نے رات کے پہر زیادہ وقت ہونے کے خیال سے کہا تھا۔

آپ کو صبح جلدی اٹھنا ہو تو رہنے دیتے ہیں۔ میرا جانا اتنا ضروری بھی نہیں کہ آپ کی نیند

رہ جائے۔ میں صبح ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“ انا بیہ نے کہا۔ مگر وہ چلتا ہوا گاڑی

یا۔

ابن صرف انا بیہ کے چہرے پر ہی نہ تھیں، عفتنان کے چہرے پر بھی ان الجھنوں کی لکیریں صاف

دکھائی تھیں۔ انا بیہ کے لئے اٹھنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ وہ اٹھی اور پتلی ہوئی گاڑی کی طرف آگئی۔

نے اس کے لئے فرنٹ ڈور پہلے سے کھول دیا تھا۔ وہ بیٹھی تو اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔

اس کے ماحول میں سکوت سا تھا۔ مگر دونوں ہی اس سکوت کو توڑنے کو تیار نہ تھے۔

تین دنوں تک تم ہم سے دور رہیں۔ کوئی ایسے بھی کرتا ہے؟“ فارحہ آٹھی نے اسے اپنے ساتھ

لے گیا۔ ایسا کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نمی سے اٹ گئیں۔ اور بھیگ تو میرب سیال کی آنکھیں

میں۔ صرف ایک رشتہ اسے کتنے رشتوں سے دور لے گیا تھا۔

”کم آن می! اتنے خوشی کے لمحوں میں بھلا کوئی روتے ہیں؟ میرب آپنی اتنے دنوں بعد آئی

پاکو تو خوش ہونا چاہئے۔“ ماما نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

ایک کہہ رہی ہے می! اذہان نے میرب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

یہ تو ہے۔ اتنے عرصے بعد میری بیٹی نے اس گھر میں قدم رکھا ہے۔ میرا تو دل خوشی

یا ہے۔ تمہیں دیکھ کر، تمہارا چہرہ دیکھ کر آپا کی یاد آتی ہے۔“ انہوں نے اپنی آنکھوں کو رگڑا اور

لا دی۔

”پاپا بھی جی کہتے ہیں کہ میں اپنی ماما کی مشابہت رکھتی ہوں۔“

”ہاں، منظر بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔ تم واقعی آپا سے ملتی ہو۔ اماں بتا رہی تھیں تم ان کی طرف جی گئیں۔ پاپا سے مل کر سب رشتے بھول گئے۔“ فارحہ نے مسکراتے ہوئے شکوہ کیا تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔
”آئی ایم سوری۔ مگر مصروفیت ہی اتنی رہی۔ میں نانو کو فون کر دوں گی۔ لیکن آپ کی بات کب ان سے؟ آپ گئی تھیں ان کی طرف؟“

”ہاں، گئی تھی۔ اور وہ سب بھی آئے تھے۔ اپنی ماما کے رشتے کی بات چل رہی ہے نا۔“ فارحہ مسکراتے ہوئے کہا تو وہ چونک پڑی۔
”رشتے کی بات؟ کس کے ساتھ؟“

”سیف کا پروپوزل آیا ہے ماما کے لئے۔ کیا سیف نے تمہیں نہیں بتایا؟“

”نہیں۔ بڑا اینڈ تیز قسم کا بندہ ہے وہ۔ حالانکہ دوست ہے میرا۔ مگر اپنی زندگی کی اتنی بڑی بات اس مجھے نہیں بتائی۔ فون کر دوں گی تو خوب کان کھینچوں گی۔“ میرب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کتنا کچھ ہو اس کے ارد گرد اور وہ کتنی بے خبر تھی۔ اپنے اندر سے، اپنے آپ سے نکل ہی نہ پا رہی تھی کہ کسی اور بھی دھیان دے پائی۔ وہ جیسے واقعی کسی خلا میں معلق ہو۔

”ضرور کان کھینچنا۔ مگر ان دنوں وہ غالباً برنس ٹور پر ہے۔ تمہیں شاید پتہ ہو۔ اس نے بھائی حاد کبھی جوائن کر لی ہے۔“ فارحہ آئی نے بتایا تھا۔

”ہاں۔۔۔ یہ بات تو میں بھی جانتی ہوں۔ مگر یہ شادی کے پروپوزل والی بات میں نہیں جانی خبر اچھی ہے اور خوشی کی بھی۔ مبارک ہو ماما! اب تو آپ ہمیں اور بھی عزیز ہونے جا رہی ہیں۔ کیونکہ آپ کے ہونے والے حضرت ہیں نا، وہ ہمیں بہت عزیز ہیں۔“ میرب بہت دنوں بعد ریلیکس انداز بڑی ہوئی دل سے مسکرائی تھی۔ اذہان اسے چپ چاپ دیکھا رہا۔

”تمہارا کیا ہوا؟ کب ہو رہی ہے تمہاری رخصتی؟“ فارحہ نے دریافت کیا۔

میرب سیال کے چہرے کی کیفیت ایک پل میں خمیر ہوئی مگر اس سے اگلے ہی لمحے وہ مسکرائی۔
”جی۔۔۔ بس۔۔۔ اس نے بولنے کے لئے لب کھولے تھے مگر اس سے قبل ہی اذہان ہوا تھا۔

”مہی! آپ ساری باتیں آج ہی پوچھ لیں گی؟ میرب بھی ہماری مہمان ہے۔ کوئی عداوت نہیں ہوگی؟“

”ارے ہاں، میں تو بھول ہی گئی۔ ایک تو تم آئی بھی اچانک ہو۔ بنا مطلع کئے۔ ورنہ میں؟ ساری فورٹ ڈشز بنا کر رکھتی۔ ہا! اچلو، ذرا میری ہیلب کر دو۔“ فارحہ کہتے ہوئے انہیں۔
”جی جی؟“ ماما نے بھی ماں کی تقلید کی تھی۔

”سہرا انگل کیسے ہیں؟ دکھائی نہیں دے رہے۔ اور ڈاکٹر انگل، چاچو ٹھیک ہیں؟ شادی ہو گئی ان کی؟“ وہ مسکراتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی تھی۔

مسکرایا۔

ٹھیک ہیں۔ اور چاچو بھی آؤٹ آف ٹاؤن ہیں۔ جلد لوٹ آئیں گے۔ شادی انہوں نے نہیں اور اپنے دل کی انگلی اب تک تمام کر چل رہے ہیں۔ کچھ مشکل ہوتا ہے یہ مگر فیض چاچو محبت کی ناسے بننا رہے ہیں۔“

”ہوئی تھی انہیں بھی؟“ میرب نے یوں ہی بات کی تھی۔

”بھی مطلب؟“ اذہان ہنس دیا تھا۔ وہ نکل سی ہو کر سر جھکا گئی تھی۔ تب ہی وہ خیال کرتے۔
”شاید۔ کبھی بتایا نہیں انہوں نے۔“ اذہان کا لہجہ مدہم تھا۔

”انگل تم لوگوں کے ساتھ نہیں رہتے اب؟“

”آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کا گھر ہے۔ یہ می بتا رہی تھیں، وہ اپنی دوسری وائف کو ڈائیورس ہیں۔ اس کے بعد شاید وہ دوبارہ ہم سب کے ساتھ رہنے لگیں۔“

”اس اے گڈ ٹیوز۔ فارحہ آئی کسی قدر مطمئن ہو گئی ہوں گی۔ میں نے سنا تو مجھے اچھا بہت ناس دو من ہیں آئی۔ میں نے آج تک انہیں ماتھے پر تیوری ڈالے نہیں دیکھا۔ سب سے والی خاتون کی زندگی میں اچانک ہی کوئی موڑ ایسا آئے گا، کون جانتا تھا۔ جانے کیوں خوب ان کے نصیب اچھے نہیں ہوتے۔“ بہت بچھے سے لہجے میں کہہ کر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔
”اے معصومی تنگی سے گھورا۔“

”ہوں۔۔۔ ایسے نہیں کہتے۔“ وہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ لانے کو بولا تھا۔ پھر ہنس دیا۔
”لے مسکراتا جیسے شرط ہو گیا تھا۔“

”آئی رائٹ؟“ اس کی جانب مکمل توجہ سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ پھر اس کے جواب کا نر بولا۔
”بس، آئی تو۔۔۔ اذہان اذرا رائٹ۔“

”انداز پر وہ ہنس دی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔
”لوٹس ہے۔۔۔ کرتی رہا کرو۔ ہنسی رہا کرو۔“ مدہم لہجے میں ایک خواہش کا اظہار کیا

کچھ بولے بغیر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر مسکرائی۔

”اپنی تنگی کی تصویریں مجھے نہیں دکھائیں۔“

”نہ بھی تو اپنے نکاح کی اسپنکس مجھے نہیں دکھائیں۔“ اذہان نے جواباً شکوہ کیا تھا۔ وہ چپ آئی تھی۔

”پاپا اس موقع کی کوئی یادگار نہیں ہے۔“

”ل رہی ہو۔“ اذہان مسکرایا۔

”وہ جوگی۔“

”پاپا اس واقعے کی یادگار ہے۔“

”ہاں۔“ آنکھوں سے پانی باہر چھلک آیا تھا۔ اس نے ایک لمحے میں ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو

”میرا سبکدوش حیدر لغاری۔“ اذہان نے برملا کہا تھا اور اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا مگر جھکائے ایک الجھن سے ٹھیل کی سطح پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچتی رہی تھی۔

”اتنی الجھن میں کیوں ہو میرب؟۔“ کہیں تمہیں محبت تو نہیں ہو گئی؟“ اذہان نے اس

جائزہ لیتے ہوئے کہا اور وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

”محبت ہو گئی ہے تمہیں مجھ سے؟“ ایک سرگوشی کہیں اندر اُبھری اور وجود کے سارے علاقے بے

چلی گئی۔

”مکمل کر دو۔“

”ہاں۔“ انا بیہ! تم مجھے کچھ بتاؤ گی؟“ اوزان نے الجھن سے بہن کو دیکھا۔

”لامعہ۔“ لامعہ جتنی ہے میں نے اس کے ساتھ ہمیشہ نا انصافی کی ہے۔ تم جانتے ہو اوزی!

”ساتھ جو کچھ بھی ہو اس کے پیچھے ہاتھ کس کا تھا؟“ لامعہ کا۔“

”تمہیں یہ بات کسے پتہ چلی؟“ اوزان نے اسے بغور دیکھا۔

”اس گڑھی بہت بکھری سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے پاس ہمت تک ناپید تھی یہ سب کچھ

نے کی اور کسی اور کو بتانے کی۔“

”اس نے خود۔“ بہت دیر کے بعد وہ ہمت کر کے بولی۔ مگر اوزان سید اس کے بتانے پر قطعاً بھی

ہائیں ہوا۔

”تم یہ بات نہیں جانتی تھیں؟“ رسانیت سے پُر لہجے میں وہ قدرے توقف سے بولا۔

”تم جانتے تھے؟“ انا بیہ نے حیرت سے سراٹھا کر اوزی کی طرف دیکھا۔

”اوزی نے سر بہت آہستگی سے اثبات میں ہلا دیا تھا۔“

”ہاں۔“ مجھے معلوم تھا۔“

”کیسے؟۔“ تم نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی؟ کیوں نہیں بتایا مجھے سب کچھ؟“

”تمہیں بتانے سے کیا فرق پڑتا؟۔“ اور یوں بھی جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ جب تمہارے کیس کی

لکیریں ہو رہی تھی تب ہی یہ بات سامنے آگئی تھی۔ لامعہ نے تمہیں کڈنیپ کے بعد جس گھر میں

باکر رکھا تھا، وہ عرصہ دراز سے بند اور کسی کے استعمال میں نہ تھا۔ وہ گھر لامعہ کے کزن کا تھا۔ لامعہ

بے کچھ رہی تھی کہ وہ اس سے صاف بچ نکلے گی اور اس کا نام تک نہیں آئے گا۔ مگر سب سامنے آ جاتا

اور انویسٹی گیشن سے یہ بات بھی سامنے آگئی۔ اس کے کزن سے رابطہ کرنے پر معلوم ہوا کہ لامعہ

کی ٹیلی اس گھر کو استعمال کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کی غیر موجودگی میں اس پر اپرٹی کی

مال کی ذمہ داری ان ہی کے پاس ہے۔“

مگر تم نے بھی۔۔۔ اوزان! تم نے بھی اتنا کچھ چھپایا مجھ سے؟“ انا بیہ نے بے یقینی سے بھائی کو

”کیا؟“

”سردار سبکدوش حیدر لغاری۔“ اذہان نے برملا کہا تھا اور اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا مگر جھکائے ایک الجھن سے ٹھیل کی سطح پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچتی رہی تھی۔

”اتنی الجھن میں کیوں ہو میرب؟۔“ کہیں تمہیں محبت تو نہیں ہو گئی؟“ اذہان نے اس

جائزہ لیتے ہوئے کہا اور وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

”محبت ہو گئی ہے تمہیں مجھ سے؟“ ایک سرگوشی کہیں اندر اُبھری اور وجود کے سارے علاقے بے

چلی گئی۔

”مکمل کر دو۔“

”ہاں۔“ انا بیہ! تم مجھے کچھ بتاؤ گی؟“ اوزان نے الجھن سے بہن کو دیکھا۔

”لامعہ۔“ لامعہ جتنی ہے میں نے اس کے ساتھ ہمیشہ نا انصافی کی ہے۔ تم جانتے ہو اوزی!

”ساتھ جو کچھ بھی ہو اس کے پیچھے ہاتھ کس کا تھا؟“ لامعہ کا۔“

”تمہیں یہ بات کسے پتہ چلی؟“ اوزان نے اسے بغور دیکھا۔

”اس گڑھی بہت بکھری سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے پاس ہمت تک ناپید تھی یہ سب کچھ

نے کی اور کسی اور کو بتانے کی۔“

”اس نے خود۔“ بہت دیر کے بعد وہ ہمت کر کے بولی۔ مگر اوزان سید اس کے بتانے پر قطعاً بھی

ہائیں ہوا۔

”تم یہ بات نہیں جانتی تھیں؟“ رسانیت سے پُر لہجے میں وہ قدرے توقف سے بولا۔

”تم جانتے تھے؟“ انا بیہ نے حیرت سے سراٹھا کر اوزی کی طرف دیکھا۔

”اوزی نے سر بہت آہستگی سے اثبات میں ہلا دیا تھا۔“

”ہاں۔“ مجھے معلوم تھا۔“

”کیسے؟۔“ تم نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی؟ کیوں نہیں بتایا مجھے سب کچھ؟“

”تمہیں بتانے سے کیا فرق پڑتا؟۔“ اور یوں بھی جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ جب تمہارے کیس کی

لکیریں ہو رہی تھی تب ہی یہ بات سامنے آگئی تھی۔ لامعہ نے تمہیں کڈنیپ کے بعد جس گھر میں

باکر رکھا تھا، وہ عرصہ دراز سے بند اور کسی کے استعمال میں نہ تھا۔ وہ گھر لامعہ کے کزن کا تھا۔ لامعہ

بے کچھ رہی تھی کہ وہ اس سے صاف بچ نکلے گی اور اس کا نام تک نہیں آئے گا۔ مگر سب سامنے آ جاتا

اور انویسٹی گیشن سے یہ بات بھی سامنے آگئی۔ اس کے کزن سے رابطہ کرنے پر معلوم ہوا کہ لامعہ

کی ٹیلی اس گھر کو استعمال کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کی غیر موجودگی میں اس پر اپرٹی کی

مال کی ذمہ داری ان ہی کے پاس ہے۔“

مگر تم نے بھی۔۔۔ اوزان! تم نے بھی اتنا کچھ چھپایا مجھ سے؟“ انا بیہ نے بے یقینی سے بھائی کو

”کیا ہوا؟۔“ عفتان نے کچھ کہہ دیا؟“ اوزان سید کو تشویش ہوئی تھی۔

دیکھا۔

”کیا کر لیتیں تم انابیہ؟ کیا کر لیتیں تم؟“ لامعہ کو سزا دلواتیں؟ تم ایسا تو اب بھی کرنا ہو۔ مگر خود سے پوچھو، کیا تم ایسا کر پاؤ گی؟“ انابیہ! تم ایسا کچھ نہیں کر سکتیں۔ وہ تمہارے ساتھ کچھ بھی کر لے تم اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کر سکتیں انابیہ! یہ بات تم بھی جانتی ہو اور میں بھی۔“

انابیہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

”اور کون کون جانتا ہے یہ بات؟“

”کیا فرق پڑتا ہے انابیہ! اس بات سے کہ اسے کتنے لوگ جانتے ہیں۔ تم خوش نصیب ہو جب اچھی زندگی گزار رہی ہو، مطمئن ہو تو پھر یہ سب بے معنی ہو جاتا ہے۔ لامعہ نے جو بھی کیا وہ اس کا اپنا تھا۔ تم کیا کرو گی، تمہارا ظرف ہوگا۔“ اوزان اپنی بہن کو اچھی طرح جانتا تھا۔

”ہاں۔۔۔ ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ میں جب خوش بھی ہوں اور مطمئن بھی۔“ کیسے درد اندر رہے تھے۔ کیسی کک تھی جو سانس تک نہ لینے دے رہی تھی اور لوگ سمجھ رہے تھے وہ خوش تھی۔ مطمئن تم؟

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔۔۔ جب میں خوش ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔“ اس نے آنکھیں رگڑ ہوئے جیسے خود کو بہلایا تھا اور دوسری طرف اوزان کو باور کرایا تو اوزان نے اسے خاموشی سے دیکھا

مزید نہیں کہا۔

”تم نے ٹھیک کہا۔۔۔ میں لامعہ کو چاہوں بھی تو سزا نہیں دے سکتی۔ مگر میں اسے کوئی سزا دینا،

بھی نہیں۔ اس نے جو کیا وہ اس کا ظرف ہے۔ اور جو میں نے کیا یا جو میں کروں گی وہ میرا ظرف، مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے اور میں کبھی کوئی شکایت اس سے کروں گی بھی نہیں۔ وہ میری دوسرے

اور ہمیشہ دوست ہی رہے گی۔ مجھ سے دوستی نبھائی نہیں گئی، میں دشمنی کیسے نبھاؤں گی؟۔۔۔ مجھے محبت کرنا آتی ہے اور انابیہ! مجھے نہیں پتہ نفرت کیسے کرتے ہیں۔ کیونکہ میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا۔

کام نہ کیا ہوا سے کرنے کی نہ عادت ہوتی ہے نہ خواہش۔۔۔ مجھے لامعہ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“ تھی اور پھر اٹھ کر وہاں سے نکل چلی گئی تھی۔

اوزان چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

”مائی اماں! آپ؟“ انہیں اپنے مقابل دیکھ کر وہ کچھ حیران رہ گئی تھی۔

مائی نے آگے بڑھ کر اسے اسی لگاؤ سے ساتھ لگا کر پیار کیا تھا۔

”کیسی ہے میری بچی؟“ میں نے سوچا اگر تجھے ماں بھول گئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں

بھی اپنی بیٹی بھول جائے گی۔“

”آپ تنہا آئی ہیں یا.....“ میرب نے جانے کیوں پوچھ لیا تھا۔ وہ مسکرا دی تھیں۔

”گین چھوڑ کر گیا ہے۔ میں نے کہا اندر آ جاؤ مگر وہ مانا نہیں۔ کہہ رہا تھا، ضروری کام ہے۔“

نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر محبت سے دریافت کیا تھا۔

ان باتوں کو چھوڑ، یہ بتاؤ ٹھیک ہے؟“

”مائی اماں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ نے کیوں زحمت کی؟ مجھے بلوا بھیجا ہوتا۔ ایک ال کر دیتیں، میں آن حاضر ہوتی۔“ میرب نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا تھا۔

لی مسکرا دی تھیں۔

”کیا فرق پڑتا ہے، ماں بچے کے پاس جائے یا بچہ ماں کے پاس آئے۔ بہت اُداس تھی۔ رہا نہیں

پنی دن سے گین سے کہہ رہی تھی، اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ ایک دم ہی بڑی ہو گیا ہے وہ۔

ی نہیں رہا اس کے پاس۔ کچھ بچھا بچھا سا بھی ہے۔ رومیصا کی موت نے اسے بہت چپ سا کر دیا

مائی کا انداز سرسری تھا۔ مگر وہ سارے مفہوم خاص پا گئی تھی۔

نوردار سبکگین حیدر لغاری کو اتنی انسیت تھی اپنی سز سے کہ وہ.....

”تم ٹھیک تو ہو بیٹا؟“ کیسی شکل نکل آئی ہے۔“ محبت سے اس کا چہرہ چھوتے ہوئے کہا۔ وہ

بزدلی مسکرائی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں مائی!“

”تھکتا مند رکھے۔ میرے بچوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔ زور یہ اور مظہر میاں کہاں ہیں؟“

”یہ وہ کام سے گئے ہیں۔“

”مجھے تو مظہر میاں سے ضروری بات کرنا تھی۔“

”آپ کہیں تو فون کر دوں، وہ جلد لوٹ آئیں۔ کوئی اہم اور ضروری بات تھی؟“

”مائی اماں مسکرا دی تھیں۔“

”ہاں۔۔۔ بہت اہم اور ضروری بات۔ تجھے ہمیشہ کے لئے اپنے گھر لے جانے کی بات کرنا تھی

بلان سے۔ اپنی بچی کو مانگنے کی بات کرنا تھی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ رخصتی ہو جائے۔ یہی اس وقت کا

ہا اقدام ہوگا۔ گین کی حالت بھی کچھ سنبھل جائے گی اور گھر میں خوشی آ جائے گی۔“ مائی اس کی

مائی گینت سے بے پرواہ کہہ رہی تھیں اور وہ سر جھکائے خاموشی سے بیٹھی اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ

لگا گھبراہٹ ہے میرا تم سے۔ پھر اتنی گہرائی دکھائی کیوں نہیں دیتی؟ تمہاری آنکھوں میں

”میں تو گہرائی کی جگہ ایک سرد مہری کیوں دکھائی دیتی ہے؟“

”کیا سوچ رہی ہو تم؟“ مائی نے اسے خاموش دیکھ کر پکارا۔

”میں۔۔۔ کچھ نہیں۔ آپ بیٹھیں۔ میں آپ کے لئے کچھ لاتی ہوں۔“

”میں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں۔ بس تم میرے پاس بیٹھو۔ میں صرف اپنی بچی سے ملنے آئی

”مائی تمہاری دیر میں گین آ جائے گا تو جلدی مچا دے گا۔“

”مائی بولی ہی تھیں کہ نوکرنے آ کر اطلاع دی۔“

”مائی۔۔۔ باہر کوئی سبکگین صاحب آپ کو لینے آئے ہیں۔“

”لو، وہ آگیا۔“ مائی اماں مسکرا دیں۔

میرب کے اندر ایک خاص آہنگ ہوا تھا۔ ایک ایسی کیفیت جسے وہ کوئی نام نہ دے پائی تھی۔
”آپ انہیں اندر بلا لیں مائی! — آپ کو بنا خاطر جانے نہیں دوں گی۔“ اس نے مدہم لہجے میں کہا تو مائی مسکرا کر رہ گئیں۔

”جاؤ، صاحب سے کہہ دو اندر آ جائیں۔“

”جی بہتر۔“ مائی کے حکم پر ملازم واپس پلٹا۔ میرب سر جھکائے اپنے دل کی منتشر کیفیتوں کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی۔ جب ملازم نے آکر اطلاع دی۔

”صاحب کہہ رہے ہیں آپ جلد آ جائیں۔ وہ اندر نہیں آ سکتے۔ انہیں کہیں اور بھی جانا ہے۔“

میرب کی دھڑکنوں میں ایک لمحے میں سکوت آیا تھا۔

”چلو ٹھیک ہے۔۔۔ میں چلتی ہوں۔ پھر چکر لگاؤں گی۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ مظہر میاں سے ملنا
پر بات کروں گی۔“ مائی اماں نے اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے کہا اور اس نے سر ہلا دیا۔

”میں نے ایک وکیل سے بات کر لی ہے۔“ مظہر سیال نے کہا اور زوباریہ نے کسی قدر حیرت۔

انہیں دیکھا تھا۔

”کس لئے؟ — آئی مین کس کام کے لئے؟“

”میرب کی ڈائیورس کے لئے۔“

”وہاٹ؟“ زوباریہ بھونچکی رہ گئی تھی۔ ”آپ نے فیصلہ کر بھی لیا کہ آپ کو کیا کرنا ہے؟
میرب سے پوچھنے بغیر؟ — اس کی مرضی جانے بغیر؟“ زوباریہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

”میرب کی مرضی کیا ہوگی زوباریہ! کیا تم یہ چھوٹی سی بات سمجھ نہیں پا رہی ہو؟ — اگر وہ خوش
تو کیا مجھے یہ سب بتاتی؟ وہ خوش نہیں ہے زوباریہ! یہ بات تم بھی جانتی ہو اور میں بھی۔ میری ہانگی
مصوم اور سعادت مند ہے کہ اگر اب بھی میں اسے وہاں جا کر زندگی گزارنے کے لئے کہوں تو وہ
دے گی۔ مگر اس میں اس کی خوشی شامل نہیں ہوگی۔ یہ بات میں جانتا ہوں۔ سو میں اسے اس جنم
جانے کے لئے نہیں کہوں گا۔“

”مظہر! ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ مگر ایک بار میرب سے اس کی مرضی بھی تو جان
اتنی جلد بازی کس لئے؟ وہ ہم سے زبردستی میرب کو لے جاتا تو نہیں رہے۔ پھر آپ انہماکی اقدام
کیوں کر رہے ہیں؟ — زندگی بھر کا معاملہ ہے یہ۔ پلیز کچھ سوچ کر فیصلہ کریں۔“

”زوباریہ! تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”ہاں۔۔۔ میں جانتی ہوں۔ آج اگر میری جگہ میرب کی اپنی ماں بھی ہوتی تو وہ بھی یہی کہتی
میرب کو کیوں ضروری نہیں سمجھ رہے؟ — اس نے صرف آپ کو یہ بتایا کہ اس کے ساتھ کیا
حال پیش آرہی ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ وہ اب کیا چاہتی ہے۔ آپ اتنی جلدی کیوں کر رہے؟

”میرب کی ضرورت نہیں۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے مدہم لہجے میں کہا۔ ساہیہ نے اس کی
”شکر ہے کی ضرورت نہیں۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے مدہم لہجے میں کہا۔ ساہیہ نے اس کی

”میرب کی ضرورت نہیں۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے مدہم لہجے میں کہا۔ ساہیہ نے اس کی

”اس آپ کے لئے کوئی متعی نہیں رکھتی؟ اس بے چاری لڑکی کی ساری زندگی بدل جائے گی، کیا آپ
یا جانتے؟ دنیا کو اسے فیس کرنا پڑے گا، نہ کہ آپ کو۔“ زوباریہ مسلسل انہیں قائل کرنے کی کوشش کر
رہی تھی۔

”تو پھر تم ہی بتاؤ، کیا کروں میں؟ — انتظار کروں؟ ادھر سے آکر کوئی مجھ سے رخصتی کی بات
لے اور میں اپنی بیٹی کو رخصت کر دوں؟“ مظہر سیال نے جل کر پوچھا۔

”میں نے ایسا نہیں کہا۔ مگر کچھ سکون اور تسلی سے بھی تو سوچ کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اتنی جلد بازی
لی۔“

”میرب بتا رہی تھی، آج سیکٹنگین کی والدہ آئی تھیں۔“ مظہر سیال نے کہا۔ زوباریہ نے چہرے کی
ڈنگ کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”ہاں، سنا تو میں نے بھی تھا۔ غالباً وہ میرب سے ملنے آئی تھیں۔ آف کورس، اس رشتے سے ان کی
وانسیت میرب سے ہوگئی ہے تو اس میں اتنی تشویش کی بات کیا ہے؟“

”میں اپنی بیٹی کے ساتھ اب کچھ غلط ہونے نہیں دوں گا۔ اب میں اس کی خوشی کے لئے وہ سب
دن گا جو مجھے بہتر لگے گا۔“ مظہر سیال حتمی لہجے میں بولے تھے اور زوباریہ انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔

”اذہان! اگینے بتا رہی تھی تم شادی کے لئے فی الحال تیار نہیں ہو؟“

”ہاں، اگینے ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ ماہا کی شادی سے پہلے نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے رسائیت
بے جواب دیا۔ وہ کینڈل لائٹ ڈنر اس لمحے کچھ پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا۔ ساہیہ اس کی خاموشی صاف
ہل کر رہی تھی۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر یہ وہ نتیجہ نہیں تھی جہاں کچھ کہنے سننے کی ضرورت رہتی۔ وہ
سے آنکھوں سے پڑھ سکتی تھی۔

”یو او کے؟“ تشویش سے اذہان کی طرف دیکھتے ہوئے مدہم لہجے میں دریافت کیا۔

”ہاں۔۔۔ ٹھیک ہوں میں۔“ مسکراتے ہوئے سارا الزام اس کے سر تھوپ دیا تھا۔ وہ جانے کیوں
گرا دی تھی۔

”میں۔۔۔ شاید میں ہی چپ تھی۔ اذہان! اگر تم بہتر محسوس نہیں کر رہے تو آج کا یہ ڈز کینسل کر
بچے ہیں۔ کیا ضروری ہے یہ سب؟ ہم کبھی بھی دوبارہ پروگرام بنا سکتے ہیں۔“ اس کے خیال سے وہ
گراتے ہوئے بولی تو اذہان مسکرا دیا۔

”نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ آج میرے پاس وقت بھی تھا اور اچھا موڈ بھی۔ تمہیں
بے کے لئے اچھا دن بھی۔ غالباً وہ اسے مطمئن کرنے کے خیال سے ایک ”خاص“ جملہ اچھا لگایا تو وہ

”میرب کی ضرورت نہیں۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے مدہم لہجے میں کہا۔ ساہیہ نے اس کی
”شکر ہے کی ضرورت نہیں۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے مدہم لہجے میں کہا۔ ساہیہ نے اس کی

”میرب کی ضرورت نہیں۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے مدہم لہجے میں کہا۔ ساہیہ نے اس کی

ایک بہترین واقف۔۔۔ ابن آئی نیڈ دیٹ آل۔ مجھے اپنے بچن کے لئے ایک بہترین قسم کا شیف بھی اپنے اپنے بچوں کے لئے ایک اچھی لک آفر کرنے والی ماں بھی اور ایک اچھی، بہت خیال کرنے والی ایک سفر بھی۔۔۔ وہ مسکرایا۔ انداز میں کسی قدر شرارت تھی۔
ساہیہ بھی مسکرا دی۔

”اور تم میں یہ ساری خوبیاں ہیں ساہیہ!“
”بہت کنجوس ہوتی۔ اپنا اتنا خرچ بچا رہے ہو۔“ مصنوعی خشکی سے گھورا گیا۔ ”اور یہ شیف والی بات بھی تمہیں سوچ کر تو نہیں کر رہے کہ میں اپنا ریٹائرمنٹ پنڈل کر رہی ہوں؟“

اذہان ہنس دیا تھا، پھر شانے اچکا دیئے تھے۔
”شاید۔ لیکن میں جانتا ہوں تم مجھے ایک مکمل گھر دو گی۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔ ساہیہ اسے ہوشی سے دیکھ رہی تھی۔ مگر اندر کئی سوال چل رہے تھے۔ کئی تمنائیں سر اٹھا رہی تھیں۔
”مگر میں تمہیں مکمل کرنا چاہتی ہوں اذہان!“ وہ بولنا چاہتی تھی مگر کچھ نہیں بول سکی تھی۔ اسے دیکھا اور ہنس مسکرا دی۔



”کتنے چھپے رستم ہوتی۔۔۔ چپ چاپ میدان مار لیا اور ہمیں بتایا تک نہیں۔“ میرب نے سیف کا لہان کھینچتے ہوئے کہا اور وہ مسکرا دیا۔

”کیا برا کیا؟۔۔۔ سوچا جب سب ٹھکانے لگ گئے ہیں، ہم بھی کوشش کر دیکھیں۔ ہاتھ پیر ہلائے، کت کی، کوشش کی۔ جذبوں میں کچھ صداقت تھی۔ خدا نے ہاتھ تھاما اور کامیاب کر دیا۔ اور کیا؟“ سیفی کا ہالیک انداز تھا۔ وہ ہنس دی۔

”کتنے بد تیز قسم کے دوست ہوتی۔ کم از کم بتا تو دیتے۔“
”کیا بتا دیتا؟۔۔۔ میں سمجھا تھا، تم کچھ کوشش کرو گی۔ مگر تم نے تو بے مروتی کی حد کر دی۔ خود ٹکانے لگ گئیں تو سب پرانے دوست بھول بھال گئے اور میں ان چوں پر تکیہ کیا کرتا؟ کرنا تو یقیناً ہارتا۔ میں نے خود کوشش کر لی۔“ وہ اس کے ایک منکار رسید کرنے پر اپنا بازو سہلاتے ہوئے بولا تھا۔ پھر ہنس پاتا تھا۔

”خوشی نہیں ہوتی تمہیں؟۔۔۔ اب ہم دونوں دوست خیر سے اپنے اپنے گھروں کے ہو جائیں گے۔“
”اے اپنی ایک تک تھی۔ میرب بے اختیار ہنسی۔ تب ہی وہاں نانا آ گئیں۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ کس بات پر خوش ہیں میرے بچے؟“
”نانا! میں اس نالائق کی خبر لے رہی تھی کہ اس نے مجھے بے خبر رکھا اور یہ نانا مجھے لتاڑ رہا ہے۔“

میرب نے اسے گھورا تو سیف مسکرا دیا۔

”لتاڑ کیا رہا ہوں، ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔ خیر سے اب ہم دونوں دوست اپنے اپنے گھروں کے ہو جائیں گے۔ دادی! آپ بتائیں، میں نے کچھ غلط کہا؟“ سیف نے مسکراتے ہوئے نانی کی طرف دیکھا۔

آنکھوں میں جھانکا مگر اسے وہ پیش وہاں دکھائی نہیں دی جو وہ اپنے چہرے پر محسوس کرنا چاہتی تھی۔
”کیا ہوا؟۔۔۔ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟“ اذہان نے اس کے دیکھنے پر دریافت کیا تھا۔ مگر وہ کچھ بھی مزید کہے بغیر اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتی ہوئی بولی۔

”رہی؟“ اس کی آنکھیں ایک یقین چاہ رہی تھیں۔ اذہان بچہ نہیں تھا کہ اس کا مطلب نہ جانتا۔ وہ مسکرایا اور سر اثبات میں ہلا دیا۔ مگر اس انداز میں بہت کڑی تھی۔ ساہیہ جانتی تھی مگر کچھ بولی نہیں۔ صرف مسکرا دی۔

”کیا ضرورت تھی یہ سہانے خواب دکھانے کی؟“ وہ اس کی طرف سے نظر ہٹا کر موضوع بدلنے ہوئے بولی۔ جب وہ چونک پڑا۔

”کیا مطلب؟“
ساہیہ مسکرا دی۔

”مطلب یہ کہ ہنی مون کے پلان بنا کر خواب دکھانے کی کیا ضرورت تھی جب کہیں جانا ہی نہیں تھا تو؟“ وہ ماحول کے پُرسکون تاثر کو بدلنا چاہتی تھی تب ہی اپنی فطری خوش گفتاری سے بول رہی تھی۔
وہ مسکرا دیا۔

”وہ خواب بے کار نہیں ہیں ساہیہ! سب سچ ہیں اور سچ ہوں گے۔ ہم ہنی مون کے لئے جائیں گے۔ مگر ماہا کی شادی کے بعد۔“

”آئی نو۔۔۔ یوں ہی مذاق کر رہی تھی۔ ماہا کی منگنی کی بات چلی؟“ اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ ہنس دیا۔ پھر بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔

”اپنی اور میری بات کرو ساہیہ! یہاں وہاں کے قصے چھوڑ دو۔ نی الحال میں کچھ اور سننا نہیں چاہتا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہوں۔ ان لحوں کی حقیقت کو سمجھو۔“ وہ جانے اسے کیا جتا گیا تھا۔ وہ ساکت سی اسے بکتی رہ گئی تھی۔

”کیا بات کروں اذہان؟“ مدہم کھوئے ہوئے لہجے میں کہتی ہوئی وہ اس کی طرف سے نگاہ ہٹا گئی تھی۔ اذہان نے ٹیبل پر گلدان میں لگی ایک سرخ گلاب کی ٹہنی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

”ساہیہ! ارد گرد کے ماحول کو دیکھو۔ اس آرکسٹرا کی دھن کو سنو۔ کیا یہ رومانٹک سا ماحول اب بھی تمہیں کوئی اچھی سی بات کہنے پر نہیں اکسارہا؟“ اذہان نے اس کے ہونٹوں پر اس کے ہونٹوں کو دیکھتے ہوئے چھبڑاؤ وہ مسکرا دی۔ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے وہ سرخ گلاب لے لیا۔

”تھینکس۔ اذہان! مجھے تمہاری ایک بات بہت اچھی لگتی ہے۔ ہمیشہ۔ تم بہت انڈر اسٹینڈنگ ہو۔“
ساہیہ نے مدہم لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیا۔

”اور تمہاری سب سے اچھی بات یہ ہے کہ تم بہت اچھی ہو ساہیہ!“ اذہان نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”تم واقعی بہت اچھی ہو ساہیہ! تمہیں اپنی زندگی میں پا کر میں خوش ہوں۔ تم وہ لڑکی ہو جو میرے بچن میں ایک بہترین شیف ہو گی۔ میرے بچوں کے لئے ایک بہترین ماں ہو گی اور میرے لئے

میں متوجہ ہو گئی تھی۔

میوزک بھی اپنے جیسا رکھا ہوا ہے۔ کوئی ایک ڈھنگ کا نہیں۔ ”وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی تھی۔ اس نے دیکھے بغیر۔

میں نے پوچھا، کچھ کھانا ہے آپ کو؟“

میا تو اس نے صبح سے کچھ نہیں تھا۔ اس شخص کی مہربانی پر کچھ حیرت بھی تھی۔ درمیانی دیوار اتنی بڑی اس کا جواب یقیناً نہیں ہی ہوتا۔ مگر جانے کیسے اس نے نگاہ اس شخص کی جانب کی تھی اور سر خود بخود ہی مل گیا تھا۔ پھر نگاہ پھیر کر اس نے ساری توجہ اس میوزک سسٹم پر مرکوز کر دی تھی۔

نشاہ و سحر یہاں وہاں

دھڑا دھڑا کئے تیرے نشاں

رے بیا!

رے بنا

جائے نہ

نشاہ و سحر یہاں وہاں

دھڑا دھڑا کئے تیرے نشاں

ذی کی آواز ماحول کی ترجمانی کرنے لگی تھی۔ میرب نے دوسرے ہی پل ہاتھ بڑھا کر پلیئر آف کر دیا۔ سبکگین حیدر نے اس کے اس اقدام کو بہت سرسری انداز میں دیکھا تھا اور بنا کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا۔ لیکن ٹورنٹ کے سامنے روک دی تھی اور اس کے اترنے کا منتظر ہو کر اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔

لے پوں تاثر دیا تھا جیسے وہ قطعاً نابلد ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”میرب نے آپ؟“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے اسے یاد دلایا تھا کہ یہاں گاڑی روکنے کا مقصد کیا

آپ نے ہی تو کہا تھا، ڈاکٹر نے بیڈ ریٹ کے لئے کہا ہے۔“ میرب نے ری مائنڈ کروایا تھا۔ وہ پوکرہ گیا تھا۔

لو سوچ کر سردار سبکگین حیدر لغاری نے شانے اچکائے تھے۔ میرب سیال نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ جو آیا وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور گھوم کر اس کی طرف آیا۔ دروازہ کھولا اور میرب نے کھینے کا موقع دینے بغیر جھک کر اسے بازوؤں میں لیا اور اٹھا کر چلتے ہوئے ریٹورنٹ میں داخل ہوا۔ ایسا کرتے ہوئے سردار سبکگین حیدر لغاری کو کیسا لگا تھا، وہ نہیں جانتی تھی۔ مگر وہ اتنی سبکی محسوس کر رہی تھی کہ اس کی آنکھیں خود بخود چوڑھ گئی تھیں۔

لام اتنا اچانک تھا کہ وہ سنبھل تک نہ سکی۔

مادریوں کے بعد قریب، اتنی بڑھیں گی وہ سوچ تک نہیں سکتی تھی۔ اور وہ بھی اس پر ہجوم مقام پر۔ مانی پناہوں میں خود کو پانا ایک دل فریب احساس تھا۔ دل ساتویں آسمان پر اڑنے کو تھا۔ کتنا محفوظ

وقت کے ہاتھوں میں جیسے اس وقت، اس گھڑی سب کچھ تھا۔ جو چاہتا کہانی لکھ دیتا۔ مگر موبی کی گھڑیاں تھیں وہ۔ کچھ عجیب اسم پھونکنے والی۔

وہ دونوں خاموش تھے۔ اپنی اپنی جگہ چپ تھے۔ مگر شاید دونوں ہی اس کیفیت کے زیر اثر تھے دونوں ہی نگاہ چرا رہے تھے۔ وقت سے آنکھیں پھیر رہے تھے۔

میرب نے دانستہ اس پر نگاہ کی تھی۔ اس شخص کو دیکھا تھا۔ دل چاہتا تھا، کوئی بات ہو۔ دل میں کئی خواہشوں کا پھرہ تھا مگر وہ لمحے چپ چاپ گزر رہے تھے۔

بنا کوئی کہانی لکھے۔

”آپ نے خواہواہ زحمت کی۔ میں ٹھیک تھی۔“ اس نے ٹرینٹ کے بعد ہسپتال سے نکلنے کہا تھا۔

سردار سبکگین حیدر لغاری نے جواباً اسے خاموشی سے ایک نگاہ دیکھا تھا۔ پھر گردن دوبارہ موڑا۔ قدرے توقف سے بولا تھا۔

”ڈاکٹر نے دو ہفتے کے بیڈ ریٹ کے لئے کہا ہے۔ پلٹے چلنے سے بالکل منع کیا ہے۔ کسی نئی ممت نکل جائے گا۔“ انداز عجیب ڈپٹے والا تھا۔ میرب سیال کے لئے یہ نیا پن تھا۔ مگر اس وقت اس کچھ غنیمت لگا تھا۔

”ہاں، ماؤنٹ ایورسٹ تو مجھے ہی سر کرنا ہے نا۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی تھی۔ ”آپ ماؤنٹ ایورسٹ سے کم تو نہیں۔“ آواز بہت کم تھی۔ وہ غصہ نکالنے کو منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی تھی۔

سبکگین حیدر لغاری کے کانوں تک کچھ آواز پھر بھی جیسے پہنچ گئی تھی۔

”کچھ کہا آپ نے؟“ ایک نگاہ سرسری انداز میں اس پر ڈال کر دریافت کیا تھا۔

”نہیں۔“ میرب نے بڑے ہی لائق انداز میں اس کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا۔ سردار سبکگین لغاری نے ڈرامائی رنگ کرتے ہوئے ایک نگاہ پھر پورا انداز میں اس پر ڈالی تھی۔

”کچھ کھانا ہے آپ کو؟“

میرب سیال اس سے قطع نظر ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے میوزک کلائیکشن کو چیک کر رہی تھی۔ کچھ چوٹا سا ضرور تھا مگر وہ زیادہ حیرت ظاہر کئے بغیر صرف ایک نظر اس شخص

محسوس کر رہی تھی وہ خود کو۔ کتنا متغیر۔

اچانک اسے اپنا آپ بہت بلند یوں پر لگا تھا۔

اس کے کان بکنگین حیدر لغاری کی دھڑکنوں کے کتنے قریب تھے۔ کاش وہ دل اس کے لیے
سکتا۔ دھک، دھک کی اس آواز میں کوئی صدا اس کے نام کی بھی ہوتی۔

حسرتوں نے اپنے پاؤں ایک دم سیٹھے تھے۔ سردار بکنگین حیدر لغاری نے اس کے نرم و نازک
چیز پر بٹھایا۔ اس کی پناہوں میں بدستور موجود میرب نے آنکھیں کھول دیں۔ کتنے لوگ دیکھ رہے
اس نے آنکھیں ایک لمحے میں دوبارہ میچ لیں۔ سردار بکنگین حیدر لغاری کی گردن میں اس کی نازک
ایک تک موجود تھی جیسے وہ اس کی پناہ سے کلٹنا نہیں چاہتی ہو۔ اس خواب کو توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

”مکمل کر دو۔“

اس کا جملہ اس کے اندر ابھرا تھا اور بازگشت دور تک گئی تھی۔

”مکمل کر دو۔“

اس کے لب بہت بے خودی میں، بہت آہستگی سے بلے تھے۔ اسے احساس تک نہ ہوا تھا
کرتھے کے ہونے کا اس لمحے یقین نہیں کر رہی تھی۔ اسے گمان بھی نہ تھا۔ نہ کوئی خوش فہمی۔

مگر سردار بکنگین حیدر لغاری کے اس سے یک دم دور ہو جانے پر اس نے آنکھیں کھول کر
دیکھا جیسے کسی خواب سے بیدار ہوئی ہو۔ سردار بکنگین حیدر لغاری کا انداز معمول پر تھا۔ جیسے کوئی دا
ہو، کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی ہو۔

اس ایک بات کی بالکل سردار بکنگین حیدر لغاری کی دنیا میں کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ تو
سردار بکنگین حیدر لغاری کے کانوں تک نہ پہنچی تھی؟

اس کی دھڑکنوں کا ارتعاش ایک لمحے کو تھا۔

تو وہ آواز صرف اس کے اندر گھٹ کر رہ گئی تھی۔

وہ فسون ساز لمحے گزر چکے تھے۔

جان کا فسون ختم چکا تھا۔

وہ ایک لمحے کا طلسم جاہد ہو چکا تھا۔

کیا ہوتا جو وہ آواز لبوں تک آپاتی۔

اس کی سماعتوں تک چا پاتی۔

تو کیا پھر کوئی کرتھے ہو جاتے۔

وہ فسون کچھ کام کر جاتا۔

وہ سوچنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی زیادہ سوچ نہیں پاتی تھی۔ سردار بکنگین حیدر لغاری
سامنے پھیلائے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ کچھ دریافت بھی کر رہا تھا۔ میرب نے کچھ
بغیر سراثتہ میں ہلا دیا تھا۔ سردار بکنگین حیدر لغاری نے خاموش ہو کر اس کا جائزہ لیا تھا۔ پھر

ے دیا تھا۔ میرب اس کی سمت اپنی پوری جاں سے متوجہ تھی۔ دل جانے کیوں ٹھہر جانے کو تھا۔
لی ساہو رہا تھا۔ ان لمحوں کو روک لینے کا خواہاں تھا۔

آئی ایم سواری۔“ سردار بکنگین اچانک اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تو وہ چونکی۔ اچانک ایک
انگلیں اندر ابھری تھی۔

”دہاٹ؟“

سائیکلٹنٹ کے لئے۔ آپ کو یہ درد میری وجہ سے ملا۔ کوئی پوچھے گا تو آپ کیا کہیں گی؟“ وہ
نایا لہجہ کچھ اجنبی لگا تھا۔ میرب کو ایک لمحے میں سارے منظر انہی سرد خانوں میں سٹپ لپٹے نظر

لی صرف آپ کی ہی نہیں ہے۔“ نگاہ اس پر سے ہٹا کر وہ آہستگی سے تسلیم کرتے ہوئے بولی تھی۔
ری بھی تھی۔“ یہ نہیں کس ضمن میں وہ بول رہی تھی۔ سردار بکنگین حیدر لغاری نے اسے کسی قدر
نے دیکھا تھا۔ مگر وہ نگاہ دوسرے ہی لمحے سرسری انداز میں تبدیل ہو چکی تھی۔

ڈوں بعد کچھ لمحے ساتھ گزارنے کو ملے تھے۔

لمحے بھی بہت غنیمت لگے تھے۔ وہ ان لمحوں کے تاثر کو زائل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بھرپور طور پر
چاہتی تھی۔ مگر دوسری طرف کی خاموشی کا وہ کیا کرتی۔

ہوا؟ — آپ کچھ کھان نہیں رہیں؟“ سردار بکنگین حیدر لغاری نے اسے دیکھا۔ وہ سر جھکائے
کی بکنگین کی نگاہ اس کی بینڈج والی کلائی پر گئی تھی۔

”وہ انڈر اسٹینڈ کرتے ہوئے اپنا چیچ اپنی پلیٹ میں رکھ کر اس کی جانب متوجہ ہوا اور اس کا چیچ
کھلانے لگا۔

ایسا لہجہ تھی بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ یہ لمحے کیا کر رہے تھے اس کے
— کیا اسم پھونک رہے تھے؟

باضد کر رہا تھا۔

نوازشوں نے اس کے گرد اپنے پر پھیلائے تھے۔

احترت کدے میں کھڑی تھی۔ وہ اس کے رو برو تھا، ساتھ تھا۔

گی اس قدر دور دکھائی کیوں دے رہا تھا؟

ناسے پُر آنکھوں سے چپ چاپ اسے بھرپور توجہ سے کھانا کھلاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

ان جگہوں لائے
مورے ساجنا
ان جگہوں لائے
مورے پیارے ساجنا

منقطع کر دیا تھا۔

وہ جہا گھر میں ڈرنہیں رہی تھی مگر وہ اپنے ارد گرد کسی کو چاہ ضرور رہی تھی۔

دل پتہ نہیں کیوں چاہ رہا تھا کہ اسے آس پاس ہونا چاہئے۔

کیسی خواہش تھی یہ؟

کیسی لگن تھی؟

وہ جان نہیں پائی تھی۔

وہ ہمیشہ اس سے دور جانے کے اقدامات کرتی رہی تھی۔ پھر اب یہ خواہش کیوں سر اُبھار رہی تھی۔ اس

نے ہر طرف سے دھیان ہٹا کر پھر سیل فون ہاتھ میں لیا اور اس کا نمبر اب کے ملایا۔

ایک — دو — تین —

”ہیلو!“

تیسری بیل پر کال ریسیو ہو گئی تھی۔ اور عفنان علی خان کی بھاری آواز اس کی سماعتوں میں تھی۔ انا بیہ

ل طرف فوری طور پر کچھ بول نہیں سکی تھی۔

”ہیلو!“ عفنان اس کے چپ رہنے پر اُلجھن سے دوبارہ بولا تھا۔

”ہیلو — میں بات کر رہی ہوں۔“ انا بیہ نے ہمت کر کے بمشکل کہا۔ وہ لمحہ بھر کو چپ ہو گیا پھر

مانیت سے بولا تھا۔

”ہاں، بولو۔“

”وہ..... میں.....“ سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا، کیا بولے۔

”ڈر لگ رہا ہے؟“ عفنان نے دریافت کیا تھا۔

”نہیں..... وہ.....“ انا بیہ کچھ بول نہیں سکی تھی۔ ”وہ میں چاہ رہی تھی میں لامعہ کی طرف ہو آؤں۔“

”اس موسم میں؟“ عفنان کو حیرت ہوئی تھی۔

”ہاں — اکیلی گھر پر اور کیا کروں؟“

”کس کے ساتھ جائیں گی؟“

”پتہ نہیں۔“ بے خبری ہی بے خبری تھی۔

”اگر جانا اتنا ضروری نہیں اور آپ میرا انتظار کر سکتی ہیں تو کر لیجئے۔ میں تھوڑی دیر میں کام ختم کر کے

گھر آ رہا ہوں۔“ کوئی بھی دوسری بات نے بغیر دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا تھا۔ انا بیہ ہاتھ میں سیل

فون لے کر کھڑی رہ گئی تھی۔

”کیسے چوٹ لگوائی یہ تم نے؟“ فارحہ کو پتہ چلا تو وہ نہیں سکیں۔ بہت عرصے بعد وہ اسی بہانے ہی

کا، اس گھر میں آئی تھیں۔ آخری بار وہ تب آئی تھیں جب ماما کی موت کا سانحہ گزرا تھا۔ میرب، فارحہ

ملائے پر خوش تھی۔

”یہ خواہش حسرت ہی نہ بن جائے کہیں۔“ وہ بے تاثر لہجے میں کہتی ہوئی راستوں پر نگاہ ڈالتی بولی تھی۔ پھر اس کی طرف دیکھا تھا

”اور یہ تم پھر میرب کی طرف نہیں چل رہے۔ اگر تم مجھے اس سے ملوانا نہیں چاہتے تو ٹھیک ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے کہ میں تمہیں اس سے ملوانا نہیں چاہتا۔“

”پھر کیا وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی؟“

”نہیں۔۔۔ ایسا بھی نہیں ہے۔“

”یوں بھی ہے۔ تم خود ضرور اس سے مل لینا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکا تھا مگر وہ کچھ کہے بغیر چہرہ پھیر گئی تھی۔

”تم مجھ پر شک کرنا چاہتی ہو؟“

”نہیں۔“

”پھر؟“

”محبت کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ اس کی تمام تر ٹینشن ایک پل میں رفع کرتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”ساہیہ! تم —“ وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”اذاہان! تم جتنے سیدھے نظر آتے ہو، ہوں نہیں۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ اچھا خاصا بے وقوف بنا سکتے ہیں۔“

”ریل؟“ وہ وینڈ اسکرین سے نگاہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔

”ہاں۔“ ساہیہ مسکراتے ہوئے نگاہ ہٹا گئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اذاہان نے اسے بغور دیکھا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ ساہیہ نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

ساہیہ اس لمحے اس کی طرف نہیں دیکھ سکی تھی۔ اس کی طرف سے رخ پھیرے پھیرے سرفٹی میں ہا

تھا۔ اذاہان کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ شاید اسی لئے وہ مزید کچھ نہیں بولا تھا۔

باہر بارش ہو رہی تھی۔

انا بیہ ویران گھر میں تنہا کھڑی تھی۔ کھڑکی سے باہر کا منظر کچھ خاص اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اچھا تو

ان دنوں کچھ بھی نہیں لگ رہا تھا۔

عمر کیسے کئے گی ساری

جی نہیں لگ رہا محبت میں

اس نے سیل اٹھا کر یوں ہی اس کا نمبر ڈائریکٹری سے نکالا تھا۔ انگلی پیش کے بلن پر تھی۔ دل چاہا

مگر اس نے ہاتھ کو کوئی حرکت دینے بغیر۔۔۔ صرف اس نمبر کو بغور دیکھا تھا اور پھر اینڈ کا بلن پیش کر

”بس آئی! لگ گئی۔ آپ پریشان نہیں ہوں۔ زیادہ بڑی چوٹ نہیں ہے۔ معمولی سی ہے۔ جلوس ٹھیک ہوں جاؤں گی۔ اذہان نہیں آیا؟“

”ہاں۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا آنے کو۔ مگر پھر شاید کوئی ضروری کام آن پڑا۔ آئے گا وہ۔ تمہاری سرال والوں کو پتہ چلا کہ کیا ہوا ہے؟“

”کیا؟“ وہ چونکی تھی۔

”اس ایکسڈنٹ کے متعلق پوچھ رہی ہوں۔“ فارحہ آئی نے اس کے حیران ہونے پر وضاحت دی تھی۔

”اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔“ میرب کو قدرے اطمینان ہوا تھا۔ ”شاید کسی نے بتا دیا ہو۔“ اس نے سرری انداز میں بات سمیٹی تھی۔

”کیا مطلب؟۔۔۔ تم نے انہیں نہیں بتایا؟“

”نہیں۔ مگر زوباریہ نے شاید بتا دیا ہو۔“ اس نے چائے کی ٹرالی لئے اندر آتی زوباریہ کو سکرانے ہوئے دیکھا۔

”کیا۔۔۔؟“ زوباریہ نے دریافت کیا۔

”فارحہ آئی پوچھ رہی ہیں، آپ نے لغاری کے گھر والوں کو اس ایکسڈنٹ کے بارے میں بتایا کہ نہیں؟“

”ہاں، بات ہوئی تھی میری لغاری کی مائی سے۔ بتا دیا تھا میں نے انہیں۔ آپ کیسی ہیں؟“

میرب کی آئی ہیں آپ، پھر بھی اتنا کم آتی ہیں۔“ زوباریہ نے سکرانے ہوئے اپنائیت کا بھرپور احساں دیا تھا۔

”بس، وقت ہی نہیں ملتا۔“ فارحہ نرمی سے سکرادیں۔

”اپنوں سے ملنے کے لئے وقت نکالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔“

”ہاں۔۔۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔“ فارحہ نے مکمل اتفاق کیا۔

”اب آتے رہنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ مظہر بھائی کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں۔“ زوباریہ نے جواب دیا اور چائے کا کپ انہیں تھما دیا۔

”کافی عرصہ گزر گیا ان کو دیکھیے، ان سے ملے۔ میرب کی رخصتی کب کر رہے ہیں آپ؟“ فارحہ۔

دریافت کیا تھا۔

”بس دیکھیں۔۔۔ مظہر کیا کرتے ہیں۔ اس کی سرال نے تو جلدی چھائی ہوئی ہے۔“

”ہاں، اتنی پیاری ہو کون نہیں چاہے گا۔“ فارحہ نے اس کے چہرے کو چھوا تھا۔

”آپ نے بھی تو بیٹے کی منگنی کی ہے نا۔“ زوباریہ نے دریافت کیا تھا۔

میرب کو اس وقت وہ ذکر کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ دھیان اس طرف سے زیادہ اس طرف تھا۔ کل۔۔۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ کیا سوچ رہی ہو تم؟۔۔۔ کوئی پریشانی ہے؟“ زوباریہ کے جانے کے بعد فارحہ نے اس سے دریافت کیا تو میرب نے سرانکار میں ہلا دیا۔

”نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔“

”شیڈر؟“ فارحہ نے جاچتی نظروں سے اسے دیکھا۔

میرب نے نگاہ پھیرتے ہوئے سر ہلا دیا۔

”تم اس شادی سے خوش ہونا؟“ فارحہ کو جانے کیوں تشویش ہوئی تھی۔

”جی آئی!۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔“

”سب ٹھیک ہے تو پھر تم خوش دکھائی کیوں نہیں دے رہیں؟“

”میں خوش ہوں۔“ وہ ایک لمحے میں جیسے زبردستی مسکرائی تھی۔

”تم نے بتایا نہیں، یہ ایکسڈنٹ کیسے ہوا؟“

”وہ بس اچانک۔۔۔ نانو کے گھر سے واپسی پر۔“ وہ کوئی واضح جواب نہیں دے سکی تھی۔ ”ماہا کی ہاڑی کی بات کہاں تک پہنچی؟“ میرب نے بات بدل دی تھی۔

”ہاں، بس چل رہی ہے۔ دعا کرو سب اچھا اچھا ہو جائے۔ بچوں کی خوشیوں کی فکر ان سے زیادہ ملتی ہوتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں ہم کچھ سمجھتے نہیں۔ انہیں یہ نہیں خبر ہم ان کے دل کی جان رہے ہوتے ہیں۔“

ادھر نے پتہ نہیں کیا جتنا چاہا تھا۔ وہ بس پھیکے سے انداز میں مسکرا دی تھی۔

”آئی! مجھے امید ہے سب اچھا ہو جائے گا۔ ماہا کی شادی دھوم دھام سے ہوگی۔“

”ہاں۔۔۔ خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ تمہاری بھی اتنی ہی دھوم دھام سے ہو۔ ہم والدین لاپے بچوں کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”ہم بھی۔“

”یہ مظہر بھائی کب تک آتے ہیں؟ سوچا آج آئی ہوں تو ان سے بھی ملتی چلوں۔“

”پتہ نہیں۔۔۔ شاید دیر لگے۔ آپ آتی جاتی رہنے گا نا اب۔ آپ کا ناتا مجھ سے جڑا ہوا ہے نا۔ یا انکی ختم ہو گیا؟“ میرب بولی تو انہوں نے سکرانے ہوئے اس کا چہرہ ہاتھ میں لیا۔ پھر پیشانی پر پیار لگاتے ہوئے بولیں۔

”یہ رشتہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ میں نے تو اس رشتے کے اور بھی گہرا ہونے کا خواب دیکھا تھا مگر۔۔۔۔۔۔“

لہجہ خوش ہوں اور اپنی پیاری سی بیٹی کے خوش رہنے کی دعا کرتی ہوں۔ خدا تمہارا نصیب اچھا کرے۔“

”آئی! کی دعاؤں کو جانے قبول ہونا تھا یا کہ نہیں، وہ نہیں جانتی تھی۔ بس وہ اتنا جانتی تھی کہ اس وقت لہجے کے اندر ایک اضطرابیت کے سوا کچھ نہ تھا۔



”آپ تیار نہیں ہوئیں؟“ وہ میزبوں پر بیٹھی تھی جب وہ چلا ہوا اس کے پاس آن بیٹھا تھا۔ انا بیہ ہنس کی طرف دیکھا تھا۔

”میں نے سوچا آپ آجائیں تو۔۔۔“

”آپ کو لگا نہیں آؤں گا میں؟“ عفتنان نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا جیسے وہ اس سے؛ طرح کی توقع رکھتا تھا۔

”نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر مدہم لہجے میں بولی۔

”تو پھر؟“ عفتنان علی خان نے استفسار کیا۔

”دل نہیں چاہ رہا۔“ بہت کمزوری وضاحت آئی تھی۔

”کیا مطلب؟“ عفتنان چونکا۔

”مطلب یہ کہ اب موڈ نہیں۔“ اس نے ایک نگاہ اسے دیکھ کر کہا۔ عفتنان علی خان کو کچھ حیرت اور بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بس خاموشی سے اسے دیکھا۔

”پھر۔۔۔؟“ قدرے توقف سے وضاحت طلب کی گئی۔

”مطلب؟“ انا بیہ سمجھی نہیں تھی۔

”پھر کیا کرنا ہے؟“

”پتہ نہیں۔“

”کہیں جانا ہے؟“

”پتہ نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔“

”بات کا پتہ ہے آپ کو؟“

”نہیں۔“

”تو پھر پتہ کیجئے۔“

”رائٹ۔“

”آپ بہت۔۔۔۔۔۔“

”کیا؟“

”کچھ نہیں۔“ عفتنان نے مزید کچھ بولنا مناسب خیال نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر خاموشی سے بیٹھا تھا پھر

کرکڑا ہو گیا۔ اسی لمحے وہ بولی۔

”گاڑی کی چابی ل سکتی ہے مجھے؟“

وہ چونکا تھا۔

”کس لئے؟“

”کیا میں اپنی مرضی سے کہیں جا بھی نہیں سکتی؟“

”موسم دیکھ رہی ہیں آپ؟۔۔۔ اس موسم میں اکیلی کہاں جائیں گی؟“

”دیکھیں بھی۔“ وہ سر جھکا کر منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔

”کہا کہا آپ نے؟“ عفتنان نے وضاحت چاہی تھی۔

”گھٹن ہوتی ہے مجھے۔ گھٹن ہو رہی ہے۔ دم گھٹ رہا ہے میرا اندر، آپ کے اس قید خانے میں۔“

بلی دیواروں کو دیکھتے دیکھتے تھک چکی ہوں میں۔“ انا بیہ کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ عفتنان نے کچھ دیر خاموشی سے دیکھا تھا پھر اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کیا اور لے کر چلتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ پڑا طینان دکھائی دے رہا تھا۔

انا بیہ اس کے اقدام پر حیران تھی لیکن فوری طور پر کچھ بول نہیں سکی تھی۔

”کہاں جانا ہے؟“ عفتنان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے پوچھا مگر وہ کچھ نہیں بولی۔

عفتنان علی خان نے ایک لمحے کو انتظار کیا پھر بنا کچھ مزید دریافت کے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”آپ مجھے نہیں بتائیں گی تو میں بھی یوں ہی چپ چاپ گاڑی چلاتا رہوں گا۔“

”کیوں کریں گے آپ ایسا؟۔۔۔ اتنا فائدہ وقت ہے آپ کے پاس؟“ انا بیہ نے جیسے جل کر

بیانت کیا تھا۔

عفتنان نے کچھ کہے بغیر صرف ایک نگاہ خاموشی سے اس پر ڈالی۔

”ہمیشہ وہ مت سوچا کریں جو آپ کے دماغ میں آتا ہے۔ کبھی وہ بھی سوچ لیا کریں جو آپ سوچنا

نہیں چاہتی ہیں۔“ اس کی طرف دیکھے بغیر بھرپور انداز میں شکوہ کیا گیا تھا۔

وہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ کیا شکوہ تھا؟۔۔۔ کیا طنز تھا؟

کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا؟

”آپ کو لگتا ہے کہ غلطیاں صرف ایک ہی فرد کر سکتا ہے؟“ اس نے کسی قدر جل کر پوچھا۔ وہ جانے

کہاں طینان سے منہ پھیر کر مسکرا دیا۔

”اب آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ میں آپ پر الزام لگا رہا ہوں۔“ اس نے اپنے طور پر نتیجہ اخذ کیا۔

”نہیں۔۔۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔“

”تو پھر آپ نے کیا کہا؟“

”آپ لڑنے کے موڈ میں ہیں؟“ وہ اطمینان سے پوچھ رہا تھا۔

”صرف میں؟“ انا وہ پوچھنے لگی تھی۔

”تو آپ کا کیا خیال ہے، میں بھی؟“

”آپ کا نہیں لانے کا موڈ تھا تو سیدھے سے منع کر دیتے۔۔۔ اس طرح سب کرنے کی کیا

کڑت تھی؟“ وہ جل کر بولی۔ بڑے دنوں بعد درمیان کی خاموشی ٹوٹی تھی۔ جھگڑ رہی تھی مگر وہ اس سے

بات تو کر رہی تھی۔ جھگڑے کا یہ انداز خالصتاً گھریلو تھا۔ رشتے کی پہچان لمحے میں ہو رہی تھی۔

”اگر میرا موڈ نہیں ہوتا تو میں آپ کو کبھی نہیں لاتا۔“

”مجھے ساتھ لا کر مجھ پر احسان کیا کیا؟“

”اب آپ بیویوں کی طرح لڑیں گی؟“ وہ بولا تو وہ ایک لمحے میں چپ ہو گئی۔ نظریں صرف اس شخص کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔ ایک لمحے میں پتہ چلا تھا ان کے درمیان رشتہ کیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے کیا لگتے تھے۔ اس رشتے میں کتنا کچھ سہا جاسکتا ہے۔

وہ جانے کیوں چپ ہو کر چہرہ پھیر گئی تھی۔ گاڑی میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ عفتنان علی خان نے کون اٹھیوں سے اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر معمول کے انداز میں دریافت کیا تھا۔

”آپ نے سوچ لیا ہمیں کہاں جانا ہے؟“

”نہیں۔۔۔ مجھے نہیں پتہ۔“ وہ چہرہ پھیر کر بارش کو دیکھنے لگی تھی۔

”سی دیو۔۔۔؟“ اس کے چہرے کو نکلتے ہوئے دریافت کیا گیا۔

”پتہ نہیں۔“ وہ لالچ ہو گئی تھی۔

عفتنان نے گاڑی سمندر کے کنارے روک دی تھی۔ وہ پہلی فرصت میں دروازہ کھول کر باہر نکلے۔

عفتنان نے چپ چاپ اس اقدام کو دیکھا پھر اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ اس سے بے خبر چلتی ہوئی لہروں کے پاس جا رہی تھی۔ پھر اچانک سر اٹھا کر آسمان کی طرف نکتی ہوئی ان بارش کی بوندوں کو اپنے چہرے پر عسوس کرنے لگی تھی۔ وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے چپ چاپ کھڑا سے نکلتا رہا۔

ایک عالم اپنی جگہ ٹھہر گیا۔

دونوں بارش میں بھگ رہے تھے۔ وہ سوچ نہیں پایا تھا، اسے کیا سوچنا چاہئے۔ وہ صرف اسے دیکھ رہا

تھا۔

جو لمحے اس کی گرفت میں تھے وہ صرف ان کو دیکھ رہا تھا، ان کو سوچ رہا تھا۔

ایک لمحے میں کئی خواہشوں نے اسے تھاما تھا۔

کئی خواب اس کے اندر جا گئے تھے۔ وہ اس ہاتھ کو تھامے اور چلنا ہوا دور تک نکل جانے یا پھر اس بھیکے آنچل کا ایک کونا چپکے سے چھو لے اور اسے خبر تک نہ ہو۔

وہ چپ چاپ کھڑا دیکھ رہا تھا۔

مگر اچانک جانے کیا ہوا کہ قدم اٹھے اور وہ چلنا ہوا اس کے قریب جا رہا۔ وہ چونک کر یکدم مڑی اور اس کے ساتھ آن ٹکرائی۔ فاصلے صدیوں کے تھے اور لمحوں میں سمٹ گئے۔ محبت کی گرفت میں جیسے سارا

زمانہ آ گیا ہو۔

وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

عفتنان نے جانے کیوں بہت آہستگی سے اس کے گرد اپنا مضبوط بازو پھیلا دیا تھا۔ نگاہوں میں ایک تپش تھی۔ اتنا یہ اس اتفاق پر کچھ حیران تھی۔ یہ بے وقت کا ”کرم“ کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ وہ نوازش کچھ لے

نہیں پڑی تھی۔ مگر ایک پل میں اس کے اندر سب زبر و زبر ہوا تھا۔ ایک لمحے میں سارے وجود میں ایک قیامت سی مچ گئی تھی۔ ساری جان جیسے مٹھی میں آ گئی تھی۔

پل میں یہ کیا ہوا؟۔۔۔ وہ جان نہیں پائی۔ وہ اسے بخورد دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں میں کچھ تھا۔

اتنا یہ کو اپنا چہرہ جھلستا ہوا محسوس ہوا۔

عفتنان نے اسی توجہ سے اسے دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے پر سے بارش کی ان ٹھہری بوندوں کو چٹا تھا۔ تب ہی اتنا یہ نے چہرہ پھیر لیا۔

لمحے ایک پل میں ایک طلسم سے جا گئے تھے۔

عفتنان علی خان نے ایک لمحے میں اس کے گرد سے اپنا حصار ختم کیا تھا اور اسے جیسے ہر تاثر سے آزاد پاتا تھا۔

وہ دور ہٹی تھی اور پھر دوسرے ہی پل رخ پھیر کر سمندر کی دستوں کو دیکھنے لگی تھی۔ عفتنان علی خان نے اسے نگاہ اس منظر سے پھیر گیا۔

”اچانک بیٹھے بیٹھے کیا کر لیا؟“ فون کے اس طرف اذہان حسن بخاری نے ڈپٹتے ہوئے دریافت کر رہ گئی۔

”قسمت کی چوٹ کو کوئی روک نہیں پاتا۔ مگر پریشانی کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ چوٹ کچھ اتنی بڑی نہیں ہوتی سا ایک سیڈنٹ تھا۔ تم سب کیوں اتنا پریشان ہو رہے ہو؟“ میرب نے دھیسے سے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ ”جو اہم ہوتے ہیں ان کے لئے پریشان ہونا پڑتا ہے۔ جو اہم ہو اس کی فکر بھی رہتی

”اذہان جتا رہا تھا۔ وہ بہت پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔

”یہی؟“ آنکھوں میں ایک چہرہ آ کر ٹھہر گیا۔

”ہاں۔“ اذہان نے باور کرایا۔ ”ایسا ہوتا ہے۔۔۔ اگر محبت درمیان ہو تو۔“

”ٹھیک۔“ وہ بے یقین سی دکھائی دی تھی۔ اس کا بات کرنے کا اپنا دائرہ تھا اور اذہان کا اپنا زاویہ۔

لاڈلی اپنی استوں میں کھڑے اپنے اپنے دائروں میں قید تھے۔

”ٹھیک نہیں، یقیناً۔۔۔ رشتہ کوئی بھی ہوا اگر محبت ہے تو وہ اہم ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میرب کا لہجہ اب بھی یقین سے کچھ خالی تھا۔

”کیا ہوا؟“ اذہان نے اس طرف اس کی آواز کے موسموں کو جانچا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ میرب نے سر اٹھا کر میں یوں ہلایا جیسے اس گھڑی وہ اس کے سامنے بیٹھا

میرب! تمہارے لہجے میں ایک تبدیلی آئی ہے۔ تم جیسی لڑکی کو اتنا بے یقین دیکھ کر مجھے حیرت ہو

”بات کی حیرت؟“ وہ بہت کھلے انداز میں مسکرائی تھی۔ ”وقت کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے

میں اس بات پر تو حیرت نہیں ہوتی۔۔۔ پھر میرے بدلنے پر کیوں؟“ وہ بہت پھیکے انداز میں

”نہیں۔ میں حیران نہیں ہو رہا۔ صرف یہ چاہتا ہوں تم اپنا خیال کرو۔“

”تم بھی اذہان! تم ٹھیک ہو؟“

”ہاں۔“

”کیا ہوا؟ کچھ تھکے لگ رہے ہو؟“

”ہاں۔ کچھ مصروف تھا۔“

”کچھ وقت خود کو بھی دیا کرو اذہان!“

”ہاں۔ وہ مسکرا دیا تھا۔“

”ایسے کیوں مسکرا رہے ہو؟ آئی ایم سیریس۔“

”ہاں، جانتا ہوں۔ آئی دل ڈو۔“

”سایہ ٹھیک ہے؟“

”ہاں۔“

”تم آئے نہیں؟“

”ہاں، آؤں گا۔ مجھے آنا تھا۔ مگر بڑی اتنا تھا کہ.....“

”اب تمہارے پاس میرے لئے بھی وقت نہیں رہا؟“ اس نے مسکراتے ہوئے شکوہ کیا۔ وہ مسکرا دیا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔ میں آؤں گا۔ اور.....“ وہ بول رہا تھا اور ملازمہ دروازہ کھول کر اندر

داخل ہوئی تھی۔

”بی بی جی! گین صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

”اچھا۔ ملازمہ کو جواب دے کر اس نے فوراً اذہان کو دوبارہ مخاطب کیا تھا۔ ”اذہان! میں کچھ دیر باہر

تمہیں کال کروں گی۔ ٹیک کیئر۔ ٹھینکس فار کالنگ۔“ سلسلہ منقطع کیا تھا۔ دل جانے کیوں بہت تیز

سے دھڑکنے لگا تھا۔

شاید یہی وہ ایک پیغام تھا جسے سننے کو اس کے کان منتظر تھے۔ سردار سبکدین، حیدر لغاری اندر داخل ہوا

میرب دیکھنے کی خواہش کے باوجود اس کی طرف دیکھ نہیں سکی تھی۔

”کیسی ہیں آپ؟“

نہ ہاتھ میں کوئی بکے، نہ لبوں پر کوئی جھمی سی اپنائیت بھری مسکراہٹ۔

میرب نے سر اٹھا کر دیکھا تو کچھ دل بچھ سا گیا۔

”ٹھیک ہوں۔“ مدھم لہجے میں بولی تھی۔ ”آپ بیٹھے نا۔“

سردار سبکدین حیدر لغاری جیسے نہ چاہتے ہوئے مجبوراً بیٹھ گیا۔

”اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟“ سردار سبکدین پوچھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔“

”زخموں میں کوئی درد وغیرہ تو نہیں؟“

”زخموں کی بات کر رہا تھا وہ؟ زخم تو کئی تھے۔ وہ کن زخموں کا مداوا کرنے آیا تھا؟“

”ہاں۔ ٹھیک ہوں۔ درد ہے۔ مگر زخموں میں درد تو ہوتا ہی ہے۔“ وہ کہنے سے باز نہیں رہ سکی

انداز میں ایک شکوہ سا تھا۔

”کیا سردار سبکدین حیدر لغاری کو پرواہ تھی؟“

”کیا وہ چارہ گر بن کر آیا تھا؟“

”اگر زیادہ درد ہے تو آئی کین کال ٹو ڈاکٹر۔ اگر وہ کہیں تو ہاسپتالز کروا دیجے ہیں۔“ وہ بیٹا سمجھے، غور

بچاوری کہہ رہا تھا۔

”آہ۔ کیا تھا یہ چارہ گر۔ کیا تھا بے خبر؟“

اس کی نگاہ صرف بیرونی زخموں پر تھی جو صرف اس نے بیرونی طور پر دیئے تھے۔

”نہیں۔ ٹھیک ہوں میں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے سیل فون اٹھایا

ب اس نے منع کر دیا۔

”رائٹ۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کے کہنے پر موبائل دوبارہ رکھ دیا تھا۔ جیسے وہ بہت

ات مند ہو۔

”سووازاپ؟“

”ناٹ ناٹ۔ آپ ٹھیک ہیں؟“

”ہاں۔ کل جرمنی جا رہا ہوں ایک ہفتے کے لئے۔ پھر نیویارک، پھر پیرس، اس سے اگلے آٹھ

لاکے لئے کینیڈا۔“

”اثر ہونے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔“

”ہاں پوچھ رہی تھیں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس لئے وہ آ نہیں سکیں۔“

”کیا ہوا آپس؟“

”کچھ زیادہ نہیں۔ کچھ بی بی ہائی تھا۔“

”اؤہ۔ میری طرف سے انہیں پوچھ لیجئے گا۔“

”رائٹ۔ سب ٹھیک ہے نا؟“ وہ غالباً مروتا پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔“ (سب کچھ ٹھیک نہیں بھی ہو تو کیا؟) میرب نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ چلتا ہوں میں۔ کچھ چاہتے ہو تو.....“ وہ کوئی نوازش کرنے کے موڈ میں تھا کیا؟

”نہیں۔“ اس نے سر نہی میں ہلا دیا تھا۔

”اؤکے۔ چلتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میرب نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”کیا گڈ بائے بھی نہیں کہیں گے؟“ وہ مڑا تو وہ بولی تھی۔ کہنا تو نہیں چاہا تھا مگر زبان سے لفظ پھسل

اُڑا۔

”اُڑا۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری مڑا۔ اسے دیکھا۔ نگاہ بھر پور تھی۔ شاید کوئی خاص تاثر بھی رکھتی تھی۔ میرب

خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ٹیک کیئر سی آ۔۔۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ مڑا اور چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ اور ایک خواب جیسے وقت کی مٹھی سے آزاد ہو گیا ہو۔

کیا تھی ملاقات۔۔۔

لمحوں پر محیط۔۔۔

دو چار سی جملوں سے بھری۔

اندر کی بے چینی کچھ بڑھ گئی تھی۔ سکون تو پہلے بھی نہیں تھا۔ اب تو اور بھی رخصت ہو گیا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟۔۔۔ تم نے اس سے کچھ نہیں کہا؟“ گی ثریا نگ نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

”کیوں؟۔۔۔ کیا کہنا تھا مجھے اسے؟۔۔۔ گی! تم بہت بے وقوف لڑکی نہیں؟“

”نہیں۔۔۔ میں بے وقوف نہیں ہوں گین! میں زندگی کو سنجیدگی سے لینے کی عادی ہوں۔“

”زندگی کو سنجیدہ لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ زندگی کو بندے کو سنجیدہ لینا ضروری ہے۔“ سردار سبکتگین حیدر

لغاری نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”سردار سبکتگین حیدر لغاری! زندگی کی فلاسفی کو سمجھنے سے کہیں بہتر زندگی کو سمجھنا ہے۔ اس زندگی کو سمجھنے

کی کوشش کرو۔ جو تمہارے سامنے ہے۔“ گی ثریا نگ نے اسے سمجھانا چاہا۔ مگر وہ مسکرا دیا تھا۔

”تم یہ بات مجھے سمجھا رہی ہو؟۔۔۔ میرا تجربہ تم سے بہت زیادہ ہے۔ میں نے زندگی کو اس سے

بھی قریب سے دیکھا ہے۔ سو میری کیلکولیشن کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔“

”گین! اتنا قطعی ہونے کی کوشش مت کرو۔ ضروری نہیں کہ زندگی تمہارا فرض کیا ہوا مفروضہ ہی ہو۔

زندگی کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔ وہ جو تم نے نہ فرض کی ہو نہ ہی کیلکولیشن۔“ گی نے اپنی دانست میں بڑا

بات کہی تھی۔ مگر وہ مسکرا دیا تھا۔

”گی! زندگی کی سمجھ اب تمہیں آنے لگی ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ شاہاش! اچھی بات ہے۔ اتنے

سمجھنے کی کوشش کرتی رہو۔ ایک دن تم بھی میری طرح اچھا کیلکولیشن کرنے لگو گی۔“ گی کو اس سے ایسے

جواب کی توقع قطعاً نہیں تھی۔ اسی لئے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا مگر وہ ہنس دیا۔ گی کے لئے یہ نیا تھا

وہ بہت کم ہنستا تھا۔ عموماً اس کا مسکرانا ہی ایک ”گلدستہ“ ہوتا تھا۔ لیکن اب اگر وہ ہنس رہا تھا تو یقیناً کا

بات تھی۔

شاید وہ خود کو دھوکا دے رہا تھا یا پھر بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ اپ سیٹ تھا اور اپنے اس نا

سے باہر آنا چاہتا تھا اور اسی لئے یہ کھوکھلے قہقہے اسے اپنا بہترین سہارا محسوس ہو رہے تھے۔

”گین! محبت ایسے نہیں اچھی۔“ گی نے اسے دیکھتے ہوئے سرنئی میں ہلایا تھا۔ ”بالکل بھی نہیں اچھی

گین!۔۔۔ ٹرسٹ می۔ محبت ایسے نہیں ہوتی۔ اسے راہ دو گین! یہ تمہارے اندر اپنی جگہ خود بخود بنا۔

گی۔“ گی ثریا نگ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

بہت کوئی عملی تجربہ یا فرض کی ہوئی بات نہیں ہے۔ یہ کوئی کیلکولیشن بھی نہیں ہے گین! محبت یہ سب

ہے جو تم اسے سمجھ نہیں پا رہے ہو۔ سود اور خسارے کی بات مت کرو۔ مت کیلکولیشن کرو۔ یہ جمع

ہائی بات نہیں ہے۔ یہ فرض کرنے والی بات بھی نہیں ہے۔ اسے دل کے حوالے کرو۔ دل کو اپنے

کرنے کی عادت ڈالو گین!“

گی! میں نے کیا کہا ہے یا؟ یہ اتنا دھواں دھار قسم کا لیکچر کس لئے دیا؟ تمہیں خبر ہے کہ اتنے

بڑی شیڈول میں تمہارے لئے وقت نہیں نکال پاؤں گا۔ سو تم ساری باتیں آج ہی کر لینا چاہتی

اور بات ہنسی میں اڑا دینا چاہ رہا تھا۔ گی اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

تم سمجھ رہی ہو مجھے کوئی بہت بڑی قسم کا، خطرناک سا کوئی غم لاحق ہے تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آئی

ان لو۔ میں اس پیار و محبت میں بالکل بھی نہیں ہوں۔ نیور۔۔۔ آئی نیور بین ان لو۔ ان سب

کے ہنسنوں میں وہ پڑتے ہیں جنہیں کوئی اور کام نہیں ہوتا۔ اور میرے لئے دنیا میں اور بھی کئی کام

ہیں۔ میں نہ مجنوں بن سکتا ہوں نہ کچھ اور۔ میں جذباتی عمر کے کسی لمحے میں نہیں ہوں۔ میں جس عمر

اس میں دل سے نہیں صرف عقل سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں سب کچھ صرف زندگی کی ضرورت

ہاں جس شے کی ضرورت پڑے وہ لے لینا چاہئے۔“ گین نے کہا تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

اچھی جب مجھے خود کو جھٹلانا ہوتا ہے تو میں بہت زیادہ بول لیتی ہوں گین! مگر اس سے مجھے کچھ

ہیں ملتی۔“ وہ ایک لمحے میں اسے جھٹلا گئی تھی۔

سبکتگین حیدر لغاری اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

نہا یہ تمہاری زندگی ہے۔ تمہاری اپنی زندگی۔ اسے اوروں کی طرح دور سے بے خبری دیکھ کر مت

تمہارے معاملات ہیں۔ ان میں انٹرسٹ لو۔“ وہ ناصحانہ انداز میں بولی تھی۔

سبکتگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

جاننا ہوں۔ مجھے اپنی زندگی کو کس طرح ہینڈل کرنا ہے گی! یہ معاملات مجھ سے چھپے ہوئے قطعاً

تم فکر مت کرو۔ سب جلد۔۔۔ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹرسٹ می۔“

اگلا تم میرب کو بتانے جا رہے ہو کہ تم اس سے کتنی محبت کرتے ہو؟“ وہ اسے طش دلاتی ہوئی

رہے ہنس دیا تھا۔

تم بالکل پاگل ہو۔“

محبت کرنے سے کوئی پاگل ہو جاتا ہے؟“

انڈیا میں رہتی ہو تم؟۔۔۔ بالکل اپنے جیسی فضول سی دنیا بنا رکھی ہے تم نے یہ۔ جو تم سوچنا

اگر وہ سوچتی ہو۔“

بے وقوفی تو نہیں ہے۔“ گی نے زلفی میں سر ہلایا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اسے جھٹلانا چاہا تھا۔

”کرتا ہوا بولا۔

بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اپنے دماغ کو اس ٹین اتج سے نکالو۔ تم اب بچی نہیں رہی

ہو۔ وہ بات ختم کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
گی کو ایک لمحے میں سب محنت بے کار جاتی نظر آئی تھی۔

انا بیہ رہ نہیں سکی تھی۔

لامعہ کو اس سے کتنے بھی گلے سہی۔

وہ اس کے سامنے آئے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔

اس لمحے وہ اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی جیسی وہ بولی۔

”شاید تم مجھ سے بہت زیادہ نفرت کرتی ہو۔۔۔ شاید تم میری صورت دیکھنا بھی نہ چاہو مگر میں انا بیہ نے آہستگی سے چلتے ہوئے قدم اس کی طرف بڑھائے تھے اور اس کے مقابل جا کر رک گئی لامعہ جس خاموشی سے دیکھ رہی تھی، اس کے چہرے پر کوئی تاثر واضح نہ تھا۔

”لامعہ! میں بہت دنوں سے تم سے ملنا چاہ رہی تھی۔ مگر اپنے اندر ہمت نہیں پا رہی تھی۔ اس لئے کہ میں نے کوئی غلطی ایسی کی ہے جس پر میں شرمندہ ہوں۔ صرف اس لئے کہ۔۔۔ میں تمہاری نگرانی سامنا نہیں کر سکتی۔ میرے لئے یہ مشکل تھا۔ شاید میں نے واقعی غلطی کی ہے۔ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی ہوئی ہے۔“ وہ سارا الزام اپنے سر لے رہی تھی۔

مگر لامعہ بنا کچھ بولے چپ چاپ کھڑی تھی۔

انا بیہ نے ہاتھ بڑھا کر آہستگی سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”آئی ایم سوری لامعہ! اگر تمہارا دل میری وجہ سے دکھا ہوتا تو.....“

”تم پھر۔۔۔ انا بیہ! کس قسم کی لڑکی ہو تم؟ تم پھر یہاں آ گئی ہو، مجھے اس بات کا احساس دلا میں نے تمہارے ساتھ کتنا غلط کیا ہے۔“ اس کا لہجہ زہر خند تھا۔

مگر انا بیہ کو کچھ حیرت نہیں ہوئی۔

”لامعہ! مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ تم مانویا نہ مانو مگر میں تمہیں کہیں قصور وار نہیں سمجھتی۔“

”اوہ۔۔۔ تو تم پھر یہ بتانے آئی ہو کہ تم مجھے کتنا نواز سکتی ہو۔“ لامعہ بدستور زہر اگل رہی تھی۔

میں ایک طنز تھا۔ مگر انا بیہ کا حوصلہ جیسے بہت بڑا تھا۔

”لامعہ! تم کچھ بھی کہو، میں تم سے بات کئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ چاہے تم دھکے

اس گھر سے نکال دو مگر پھر بھی۔۔۔ میں تم سے بات ضرور کرنا چاہوں گی۔“

”اوہ۔۔۔ اب تم مجھے اتنا برا ثابت کرنا چاہتی ہو کہ میں تمہیں دھکے دے کر اس گھر سے

سکتی ہوں۔ ہاں، اچھائی کا کام آپ نے جوڑے لیا ہوا ہے۔“

”لامعہ! تم مجھ سے اس حد تک خائف ہو؟“ انا بیہ کو حیرت ہوئی تھی۔ ”میں تو سمجھی تھی وہ تمہارا

ہوگا اور جب میں دوبارہ تمہارے سامنے آؤں گی تو.....“

”انا بیہ! کس مٹی سے بنی ہو تم؟۔۔۔ تم کیوں فرشتہ بننے پر تلی ہو؟ میں نے تمہارے ساتھ

”۔۔۔“

”معاذ! اگر میں تمہیں قصور وار سمجھتی تو یہاں نہیں آتی۔“

”مجھے کچھ بھی سمجھو، آئی ڈیم کیئر۔ مجھے پتہ ہے تم یہاں صرف آئی ہو تو اس لئے کہ تم ایک بار پھر وہ حاصل کر سکو جو تمہیں کسی کو خود سے نیچے ثابت کر کے ملتی ہے۔“

”معاذ! شٹ اپ۔ تمہارے اندر میرے لئے اتنا زہر بھرا ہوا ہے۔ اتنا، اس قدر برا سوچتی ہو تم۔

ہم ساتھ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے کھلونوں سے کھیلے ہیں ہم۔ اور تم۔۔۔ لامعہ! میں نے

ج تک تم سے کوئی برا رویہ رکھا، کبھی تمہیں لٹ ڈاؤن کرنے کی کوشش کی؟“ انا بیہ نے وضاحت

۔

”میں۔۔۔ تم نے ایسا کچھ کبھی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر تم نے ہمیشہ وہ کیا جس نے تمہیں اور

ہم کو ہمیشہ بڑھا دیا۔ انا بیہ! مجھے نہیں لگتا کہ ہم کبھی اچھے دوست بھی تھے۔“ لامعہ زہر خند لہجے میں

۔

”تم کہہ رہی ہو لامعہ؟“ انا بیہ کو سراسر حیرت ہوئی تھی۔

”ہاں، پلیز انا بیہ! اب اتنا اچھا بننے کی کوشش مت کرو۔ کچھ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں کیا تم نے۔ مگر میں

بڑھ چکا ہے اور وہ تمہیں بھی پتہ ہے۔ تم ایک بار پھر اپنا ہاتھ اوپر کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اتنی

ت، ہو کہ جیسے تمہیں کچھ خبر نہیں اور اتنی فرشتہ بننے کی کوشش بھی مت کرو کہ تم سب آسانی سے بھول

باعاف کر سکتی ہو۔“

”معاذ! تم۔۔۔ تم اس طرح کیسے بول رہی ہو؟ اتنا بدل سکتی ہو تم۔۔۔ اندازہ نہیں ہوتا

رہی لامعہ۔۔۔ میری اپنی لامعہ اتنی بدل سکتی ہے۔ چلو ٹھیک ہے، میں فرشتہ بننے کی کوشش نہیں

کرتم۔۔۔ لامعہ! جو تم نے کیا، کیا تم اس پر ایک بار بھی گلٹی نہیں ہو؟“ اس کی آنکھوں میں دیکھتے

چھا تو لامعہ مسکرا دی۔

”ایہ! یہی بات میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ تمہیں اس احساس میں ایک بار ضرور مبتلا دیکھنا

ہا کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا اس کا کوئی ایک الزام، کوئی ایک رد عمل میں تمہارے چہرے پر دیکھنا

ہا تمہارے لہجے میں محسوس کرنا چاہتی تھی اور وہ میں نے دیکھ لیا۔ تم نے محسوس کیا، تم نے پہلی بار

دلی الزام اچھالا ہے۔ ہاں، ٹھیک کہتا مں نے۔ بالکل ٹھیک پوچھا۔ جو کچھ بھی میں نے کیا، میں اس

گلی ہوں۔ لیس، آئی ایم گلٹی۔ دین۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔۔۔ تم تو اب بھی نہیں

اب بھی ویسی ہی ہو۔“ اس کے لہجے پر انا بیہ کو حیرت ہی حیرت تھی۔

”معاذ! مجھے یقین نہیں آتا تم اس حد تک جاسکتی ہو۔ مگر میں اب بھی تمہیں اپنا دوست مانتی ہوں۔“

”کبھی؟“ لامعہ مسکرائی۔ انداز عجب استہزائیہ تھا۔

”نہ اپ لامعہ!۔۔۔ اگر اب تم نے کچھ بھی مزید کہا تو۔۔۔ میں تم پر اب بھی اتنا ہی حق سمجھتی ہوں۔

مکوئی شکوہ نہیں۔ ہاں، کچھ غلطیاں مجھ سے ہوئی ہیں۔ مگر میں انہیں بھی سدھار سکتی ہوں۔ اگر تم

”ہاں کیسی ہیں؟“ میرب نے مدھم لہجے میں دریافت کیا تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے اس کی بوند دیکھا۔ اونچا لمبا، سوئڈ بوٹڈ سامنے کھڑا کتنی تمکنت رکھتا تھا اپنے اندر۔ جیسے وہ سارا جہاں فتح کر

آپ بیٹھیں نا کھڑے کیوں ہیں؟“ میرب نے اسے جیسے یاد دلایا تھا کہ وہ کتنی عجلت میں ہے۔

جیسے چونکا تھا۔ پھر کاؤچ پر بیٹھ گیا تھا۔

کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ سبکگین نے حال احوال پوچھا تھا۔

ٹھیک ہوں۔“ میرب نے آہستگی سے کہا تھا۔ ”آپ کیسے ہیں؟“

ٹھیک ہوں۔ مانی کہہ رہی تھیں کس شے کی ضرورت ہو تو بتادیں۔“

ضرورت تو ہے مگر.....“ میرب بولتے بولتے رہ گئی تھی۔

کس شے کی؟“ وہ چونکا تھا۔ میرب نے خاموشی سے اسے دیکھا تھا، پھر سر نہی میں ہلا دیا تھا۔

نہیں۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔ سب کچھ ہے میرے پاس۔“

سب کچھ؟“ سبکگین حیدر لغاری نے جانے کیا جانتا چاہا تھا۔ میرب نے بنا سوچے سمجھے سر اثبات باتھا۔ غور تک نہ کیا تھا کہ اگلا بندہ کس ضمن میں دریافت کر رہا تھا۔ وہ اگر جاننے کی کوشش کرتی تو ناپاتی۔

کی کو میری طرف سے شکریہ کہنے گا اور بتائیے گا میں انہیں بہت مس کر رہی ہوں۔“ میرب نے کی سے کہا تھا۔

ار سبکگین حیدر لغاری نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

نانکی طبیعت پہلے سے بہتر ہے؟“ میرب نے خاموشی اور سکوت کے ڈر سے پہلے سے پوچھی گئی راویہ بدل کر دوبارہ پوچھی تھی۔

ہاں پہلے سے بہتر ہے۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری کچھ عجیبہ تھا۔

ابو؟“ آپ اس طرح چپ چاپ سے کیوں دکھائی دے رہے ہیں؟“ وہ شاید بالکل نہ اس شخص کی صورت سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی بات ضرور ہے۔

ما۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری جیسے کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

پہتانا نہیں چاہتے؟“ وہ صاف گوئی سے بولی تھی۔

آپ کے لائیک طرف سے ایک نوٹس ملا تھا۔“

میرا کون سا لائیک ہے؟ کس قسم کا نوٹس۔“ وہ جتنا حیران ہوتی کم تھا۔

ار سبکگین حیدر لغاری زیادہ بولنے پر مائل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بتائیں گے مجھے کچھ؟“ وہ جل کر بولی۔

نوہ بولا تھا۔

ار۔۔۔ کیا آپ نہیں جانتیں؟“

سمجھتی ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی نا انصافی کی ہے تو میں اس کے لئے عفتان کو بھی چھوڑ سکتی ہوں مگر پلیز تم مجھ پر یہ طنز کرنا بند کر دو۔ غلطیاں تم سے بھی ہوئی ہیں۔ اگر میں ان کی طرف نشانہ ہی نہیں رہی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم بے قصور ہو۔ شیم آن یو۔ تم نے اپنی دوست کے ساتھ جو کیا وہ کوئی گنہہ سکتا۔ مرجاتی میں، تمہیں تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ کوئی ملال نہ ہوتا۔ کتنی بے حس لڑکی ہو تم، یہ مجھے آرزو چلائے۔ اور اب بھی تم سب کچھ جانتی ہو کہ تم نے کتنا کچھ کہاں کہاں غلط کیا ہے تو تم شرمندہ تک نہیں کس قسم کی لڑکی ہو تم؟۔ تمہیں میں اپنا دوست کہتی ہوں۔۔۔۔۔ تم جیسی لڑکی کو۔۔۔۔۔ جو اس روز ڈی زد بھی نہیں کرتی۔ جو دوست یا دوستی کے معنی تک نہیں جانتی۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ میں اس کو توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ جو کچھ بھی ہوا، اسے بھول جانا چاہتی تھی مگر تم۔۔۔۔۔ لامعہ! تم کسی بھی بات کو نہیں چاہتی ہو۔“ وہ مڑی اور وہاں سے نکلتی چلی گئی۔

آنکھیں دھواں دھواں سی تھیں۔

لامعہ چپ چاپ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔



کتنا عجیب شخص تھا وہ۔

میرب نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ عجیب شخص نہیں دیکھا تھا۔ اتنا وقت اس کے ساتھ گزارا وہ اسے سمجھ نہیں پاتی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

پتہ نہیں اس شخص کے لئے جذبے، احساسات کوئی معنی رکھتے بھی تھے یا کہ نہیں۔

ہمیشہ کتنے اعتدال میں دکھائی دیتا تھا وہ شخص۔

ایک بینس لائف گزارنے کا اتنا عادی تھا کہ۔۔۔۔۔

اور اب کتنے بہت سے دنوں کے لئے اسے چلے جانا تھا۔

یہاں۔۔۔۔۔ وہاں۔۔۔۔۔ کتنی جگہوں پر جانا تھا اسے۔

کتنا لمبا جوڑا شیڈول بتایا تھا اس نے اسے۔ اسے تو یاد تک نہ رہا تھا۔ یاد رہا تھا تو بس اتنا کہ اور جانا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں نیم دراز کیا کچھ سوچ رہی تھی مگر سوچوں کا تسلسل اسی کے نام تھا۔

منسوب تھا۔

پتہ نہیں کیوں ان دنوں وہ شخص بھولتا نہیں تھا۔ کچھ بھی ہوتا، نام ذہن سے نکلتا تک نہ تھا۔ کچھ ہو رہا تھا ان دنوں۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کیوں؟

وہ ایسا محسوس کر رہی تھی۔ سب کچھ بہت نیا تھا۔

وہ بالکل سمجھ نہیں پاتی تھی یہ کیوں تھا اور کیسے تھا؟

ہاں، مگر اس لمحے بہت اچھا سا لگا تھا جب وہ شخص وہاں آ گیا تھا۔

”آپ۔۔۔؟“ وہ حیران رہ گئی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ جا رہا تھا۔ مانی نے کہا تمہارا حال احوال پوچھ لوں۔“

”وہاٹ۔ ڈائورس؟۔ کس کی؟“ وہ قطعاً نہ سمجھ سکی تھی۔

”آپ اتنا انجان بننے کی کوشش کیوں کر رہی ہیں؟۔ اگر آپ اپنے سر کوئی الزام لیں؟ چاہئیں تو کوئی جھوٹ بول دیجئے۔ کیا ضرورت ہے اس طرح دامن بچانے کی۔ یا پھر۔۔۔“

”آپ۔۔۔ آپ مجھے ہی کیوں الزام دینے پر بھند دکھائی دیتے ہیں؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے خاموشی سے بغور دیکھا۔

”کیا واقعی کچھ نہیں جانتیں آپ؟“ آواز میں یقین بہت کم تھا۔ جیسے سردار سبکتگین حیدر لغاری کو اعتبار نہ ہو۔ میرب سیال نے بہت بے یقین سے لہجے میں سرانکار میں ہلایا تھا جیسے جو ہوا ہوا اس پر یقین نہ ہو۔

”آپ مجھے کچھ بتائیں گے؟“

”جو مجھے معلوم تھا آپ کو بتا دیا۔ اس سے آگے آپ کو لائز ہی بتائے گا۔“ وہ حتمی انداز میں بولا تھا۔ وہ کچھ اچھ کر رہ گئی تھی۔

”کیا مطلب۔۔۔؟“ بات قطعاً سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”مطلب یہ کہ اب آپ اتنی بھی بچی نہیں ہیں۔ اچھی طرح سمجھتی ہیں معاملات کو۔ کیا بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے سخت لہجے میں کہا تھا پھر خود اندازہ ہوا دوبارہ بول نہیں سکا تھا۔

میرب سیال کو اپنی سامعوں پر اب تک یقین نہ ہوا تھا۔ ایسا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہاں ہوا گیا تھا۔ اور کس نے کیا تھا یہ؟ اس کی اجازت کے بغیر ایسا کون کر سکتا تھا؟

صرف پاپا۔۔۔

تو کیا پاپا اس سے پوچھنے بغیر اتنا آگے تک جاسکتے تھے؟

میرب سیال یوں ساکت بیٹھی تھی جیسے اس کے سر پر آسمان آن پڑا ہو۔

وہ رشتہ جو ہمیشہ اس کے لئے درد سر تھا، جو ہمیشہ بوجھ معلوم ہوا تھا، ہمیشہ سے نالاں دکھائی دے رہا تھا۔ جس رشتے سے بھاگتی تھی آج وہی رشتہ بہت اہم لگا تھا۔ آج اس رشتے کے ٹوٹنے کے خیال کی جان رکنے کو تھی۔ اس کے وجود میں جیسے کوئی بھونچال آچکا تھا۔ مگر سردار سبکتگین حیدر لغاری حالت سے بے خبر اسے کہہ رہا تھا۔

”آپ کو یہ سب کرنا تھا تو پہلے بتا دیتیں۔ اس طرح عدالتوں میں خواری کی نوبت نہیں آئی۔ کے سارے بکھیڑوں سے بچ جائیں۔ آپ کو ہر کام کی جلدی ہوتی ہے اور آپ ہر کام کا غلط طر

آغاز کرتی ہیں۔“

کس کام کی بات کر رہا تھا؟

کیا غلط آغاز کیا تھا اس نے۔۔۔؟

اس کی زندگی میں ہی تو داخل ہوئی تھی۔

اور وہ بھی اپنی مرضی سے کہاں؟

اپنی رضامندی سے کہاں؟

اس میں تو سراسر مصلحت تھی۔

کیا میں اس کے دل میں گھر کر چکی ہوں؟۔ کس بات کا ملال ہے آپ کو؟۔ وہ دریافت چاہتی تھی مگر شاید لفظ حلق میں انک جا تے۔ وہ بولتی تو شاید بولا نہ جاتا۔

کیا غلط سوچ رہا تھا وہ شخص؟

کیا غلط سمجھ رہا تھا؟

مارا کا سارا الزام اس کے سر رکھ دیا تھا۔

مگر وہ اس پوزیشن میں قطعاً نہیں تھی کہ اپنے متعلق کوئی وضاحت دے سکتی۔ وہ ساکت سی اس کی دیکھ رہی تھی۔

”آپ جو چاہتی ہیں وہ بہت جلد ہو جائے گا۔ کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔ آپ نے خواہ مخواہ کوشش کا سہارا لے کے چکر دوں میں پڑیں۔ آپ آرام سے بیٹھ کر بات کر لیتیں تو اس سب کی نوبت بھی نہیں آتی۔“

امات کی بارش کر رہا تھا۔

چھابرا سب اس کے سر کر رہا تھا۔ میرب دھندلی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔ کیا وہ اس کا بھنا چا بھئی تھی؟ کیا وہ پُر ملال تھا اس رشتے کے ختم ہونے پر؟ کچھ دکھ اسے بھی تھا؟ کیا وہ بھی اتنی ہی

سوس کر رہا تھا؟

وہ اسے پڑھنا چاہتی تھی۔ اسے پڑھنے کی خواہش میں اس کی طرف دیکھا تھا۔

مگر وہ نہیں پڑھ پائی تھی۔

ہا نظر ہمیشہ کی طرح بے تاثر اور نہ سمجھ میں آنے والی تھی۔

’مائی کو اس بات کی کچھ خبر نہیں۔۔۔ اگر خبر ہوئی تو وہ بہت شاکزدہ جائیں گی۔ ہماری فیملی وقار کا پیالہ کیا ہوتا۔ اتنا نام مقام اور یوں کوشش کی خوریاں۔۔۔ ہم ایسے اسکینڈلز انورڈ نہیں کر سکتے۔

نک ایسا نہیں ہوا۔ آپ نہیں جانتیں شاید، آپ کے لئے یہ معمولی ہو مگر ہمارے لئے یہ بات بہت ہے۔ اگر ایک بار آپ پہلے سے بات کر لیتیں تو بیٹھ کر کچھ مصالحت ہو سکتی تھی۔ بات کورٹ میں بغیر فیصلہ آپ کے حق میں ہو سکتا تھا۔ بس بات طریقے اور سلیپ سے کرنے کی تھی۔ بات اس طرح

پر اور میڈیا میں نہ جاتی۔ آپ نہیں جانتیں لیکن آپ کی ذرا سی غلطی کی وجہ سے اب ہمیں اور ہماری سچ کو کتنا سفر کرنا پڑے گا۔ یہ معاملات جتنے آسان ہو سکتے تھے آپ نے اب اتنے ہی الجھا دیئے

’کتنے الزامات تھے۔

’اس شخص کے حد درجہ خلاف رہی تھی۔ کبھی بھی اسے دل سے قریب نہیں لگا تھا یہ سب۔

’وہ رشتہ، نہ وہ شخص۔ مگر اب جب اسے ختم کرنے کی خبر سنی تھی تو ایک لمحے میں جان وجود سے نکلتی

’کیوں ہوئی تھی؟

وہ ہمیشہ دور بھاگی تھی اس شخص سے۔

پھر یہ اچانک کیا ہوا تھا؟

کچھ کچھ اسواہ کیوں محسوس کر رہی تھی؟ — پلٹ کر ایک لمحے کو دیکھا تھا تو سب کچھ بندھا کیسے دکھائی دیا تھا؟ — دل کا کوئی کونسا رشتے سے ایک کر کیوں رہ گیا تھا؟ کیوں ہوا تھا ایسا؟

پھر یہ احساس کیوں ہوا تھا کہ اس سے اس کا سب کچھ چھن رہا ہو۔

”میرب! آپ ہمیشہ جلد بازی کی قائل رہی ہیں۔ بہت بچپنا ہے آپ میں — آپ ایک بچہ میں معاملے کو سلجھانا چاہتی ہیں۔ مگر اس طرح نہیں ہوتا۔ زندگی میں ہر بات کا اسٹنٹ حل کوئی نہیں ہو

یہاں فوری طور پر کچھ نہیں ہوتا۔ آپ اپنا بچوں جیسا مزاج بدل لیں۔ اس طرح گزارا نہیں چلتا۔ ہر فائدہ ہو، ایسا ضروری بھی نہیں۔ ذرا سی عقل استعمال کرنے سے بندہ بہت بڑے نقصان سے بچ جاتا۔

آپ کو تو سوچ ہی لیتا چاہئے تھا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی کہ اس کے لئے اتنے بڑے خطرے میں لے جاتے۔ مجھے اتنا تو جان گئی ہوں گی آپ اس عرصے میں — میرے لئے کیا اہم ہے اور کیا

غیر اہم اور غیر ضروری۔ اس بات کا اندازہ ہو گیا ہو گا آپ کو — میں آپ جیسی نا سمجھداری کی عمر نہیں ہوں۔ نہ ہی بچکانہ انداز میں فیصلوں کو الجھانے کا عادی ہوں۔ جو بات آپ کو تکلیف دے، اسے

کر دینا بہتر ہے اور یہ سب اگر سکون سے ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ پرسکون حالت کے فیصلے زیادہ پائیدار ہوتے ہیں اور بہتر بھی۔ میں حالت سکون میں رہنے کا قائل ہوں اور اس میں فیصلے کرنے کا بھی۔ میر

لئے خود سے زیادہ اہم فیملی پرستج ہے۔ مجھے میڈیا میں پاپولر ہونے یا نام بنانے کا کوئی خاص شوق نہیں۔

آپ نے غلط سمت میں قدم اٹھایا۔ جو بات دو فریقین کے درمیان میں کمرے میں بیٹھ کر حل ہو سکتی

اسے اس طرح دنیا کے سامنے لانے کی کیا ضرورت تھی؟“

کتنا سرد، لا تعلق اور بے تاثر انداز تھا اس کا۔ جیسے وہ اپنے تئیں کسی اور کے معاملات کی بات کہتا ہو۔ کتنا شہراؤ تھا اس کے لہجے میں جیسے اس سب سے اسے کوئی فرق ہی نہ پڑتا ہو۔ جیسے یہ سب اس

لئے معمول ہو۔ کوئی اہمیت ہی نہ رکھتا ہو۔

تو کیا وہ رشتہ سردار سبکتگین حیدر لغاری کے لئے واقعی کوئی مفہوم نہ رکھتا تھا؟ — کیا وہ واقعی اس

لا تعلق تھا؟ — اس رشتے کی اسے کوئی پروا نہیں تھی؟

کیا واقعی؟

وہ اس کا چارہ بن کر آیا تھا۔ اس کا احوال پوچھنے اور کیسے کیسے زخم نگار ہا تھا اسے۔

وہ خار خار ہے شاخ گلاب کی مانند میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اسے

میرب کی آنکھوں میں بہت خاموشی سے نمکین پانی کے قطرے ٹوٹے تھے اور بڑی ہی بے قدراً

رخساروں پر بہہ گئے تھے۔

ان الزامات کے جواب میں اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ کسی ایک الزام کی وضاحت ہی

تھی۔ کسی ایک بات کے جواب میں بھی نہیں بول سکتی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے ایک پل میں

ہاں کا سارا وجود پتھر کا کر دیا تھا۔

اساکت، بے یقین آنکھوں سے صرف اس شخص کو دیکھ رہی تھی — چپ چاپ۔

دنگاہ ساکت تھی۔ نگاہ میں حیرت تھی۔

جو سامنے تھا، بے حس تھا، بے مروت تھا، سنگ دل تھا۔

دل نہیں تھا اس کے سینے میں — تب ہی تو برچیوں سے وار کر رہا تھا۔

دل زخم زخم تھا۔

اور وہ۔ اب بھی اس سے منہ موڑ نہیں پارتی تھی۔

اس کے اتنے ٹھوس الزامات کے نتیجے میں وہ کتنی پزمرہ تھی۔

ایک بار بھی اپنا ٹھیک سے دفاع نہیں کر پائی تھی۔

سرنگی میں ہلاتی ہوئی بولی بھی تھی تو انداز بہت کمزور سا تھا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“ اس نے اپنے دل میں کہا تھا۔ مگر دوسری طرف وہ قطعاً نہ مانا تھا۔

”میرب! تمہیں اپنی صفائی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے اقدام ہی تمہاری سب سے بڑی

گناہ ہیں۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری کا لہجہ سرد تھا۔

داؤں فریقوں کے لئے رشتوں کی وقعت کتنی مختلف تھی۔

وہ اس کے سامنے تھا۔ اتنے الزامات عائد کرنے کے باوجود اتنے سرد لہجے کے باوجود وہ اسے اجنبی

مان رہا تھا۔ بس نگاہ میں حیرت لئے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ جو دل سے کچھ خاص فریب تھا۔ مگر دل کو

ایک نہ رہا تھا اور کس قدر اجنبی تھا۔ جیسے اس سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ اس کے لئے اس تعلق

کا کتنے مختلف تھے۔ اس تعلق کو تو زردینا کتنا آسان تھا۔ جیسے وہ تعلق اس کے لئے کچھ نہ تھا۔

”کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں ایسا کر سکتی ہوں؟“ میرب نے اپنی صفائی چاہی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے لمحہ بھر کو دیکھا تھا۔

ظہروں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا تھا جب وہ ریٹورنٹ سے اس شخص کے ساتھ نکل رہی تھی۔

”گئے والی کوئی بات نہیں ہے میرب! جو ہے صاف ظاہر ہے۔“

”آپ یہ بات کیوں نہیں مان لیتے کہ میں.....“ زج ہو کر وہ چپ ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

میرب کے جسم سے جیسے جان نکلنے لگی تھی۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“ وہ چیختی تھی۔ ”آپ مان کیوں نہیں رہے؟ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔

میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“ جملہ زبان پر ہی رہ گیا تھا۔ سردار

لغاری حیدر لغاری چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

لگتا سا منظر میں وہ تنہا رہ گئی تھی۔

لہجہ کو اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھا تھا پھر بہت زور سے چیختی تھی۔

”محبت تھی مجھے تم سے۔۔۔ کیوں کرتی میں ایسا؟۔۔۔ محبت کرتی ہوں میں تم سے۔۔۔ کیوں کروں گی میں ایسا؟۔۔۔ ہوگئی تو کیا کروں؟۔۔۔ کیا کروں اب جب محبت ہوگئی تو.....؟“ عجب بے بس سا لہجہ تھا۔ لیکن اس خالی خالی منظر میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔
صرف وہ تھی۔
اور اس کی محبت۔۔۔ کچھ آنسو اور تہائی۔

”مائی! آپ نے اتنی ڈھیر سی شاپنگ کر لی۔ خیریت؟“ گی نے کسی قدر حیرت سے پوچھا تھا۔ مائی
زادگی تھیں۔

”ہاں۔۔۔ خیریت ہی ہے۔ اپنے بیٹے کی شادی کی تیاریوں میں ہوں۔ اپنی بہو کو لانے کی تیاری
رہی ہوں۔“
”رہی؟“ گی چونکی تھی۔

”کوئی بات ہوئی آپ کی میرب کے والدین سے؟“
”نہیں۔۔۔ ابھی تو نہیں ہوئی۔ مگر وہ بھی ہو جائے گی۔ صرف رسم ہی تو باقی ہے۔ اور سب تو ہو چکا
ب سے بڑا کام ہے بندھن جڑنا۔ وہ تو جڑ چکا۔“ مائی اماں بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

”شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں آپ۔“ گی مسکرا دی تھی۔
”یہ دیکھو نا۔ میری میرب پر یہ کلر سوٹ کرے گا نا؟۔۔۔ پتہ نہیں وہ ایسے بھرے پرے کپڑے پسند
کرتی ہے کہ نہیں۔ آج کل کے بچوں کا کچھ پتہ بھی تو نہیں۔ ہمارے زمانے میں تو.....“ مائی تشویش
بولی تھیں اور وہ مسکرا دی تھی۔

”نہیں مائی! میرب پر یہ رنگ سوٹ بھی کرے گا اور اسے اچھا بھی لگے گا۔“
”لے بھلا۔۔۔ اپنے ساتھ لگا کر دکھ۔“ مائی نے اسے تھما دیا تھا۔ گی مسکرا دی تھی۔
”میرا بھلا اس سے کیا مقابلہ؟ مگر میرب پر یہ رنگ بہت سوٹ کرے گا۔ آپ نے گین سے بات کر
کی قدر تشویش سے دریافت کیا تھا۔“

”لے بھلا۔ اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ بچہ تو نہیں۔ پتہ ہے اسے، نکاح ہوا ہے۔ اب تو
رف میرب کو باضابطہ اس گھر میں لانے کی ہے۔ مجھے پتہ ہے وہ بھی خوش ہوگا۔ آخر ماں ہوں۔
بچے کے دل کی خوشی جانتی ہوں۔ میرب اس کی زندگی میں ہو، وہ بھی یہ چاہتا ہے۔ اسی لئے تو میں
“

”ہاں، ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک سوچ رہی ہیں آپ۔“
”کل تم میرے ساتھ تو چلنا۔ ہم کچھ زیورات کی خرید کر لیں گے۔ جتنے کام ہیں، ابھی سے نمٹا لوں۔
ما تو وقت تک نہیں گا اور بہت سے کام ہوں گے کرنے کے لئے۔“ مائی ابھی سے ہنسنے دکھائی دے
تھا۔ گی نے سر ہلا دیا تھا۔



تب ہی سردار سبکتگین حیدر لغاری وہاں آیا تھا۔ ماں کی تیاری کو سرسری انداز میں دیکھا تھا۔
”کیا ہو رہا ہے یہ؟“

”تمہاری دلہن کو اس گھر میں لانے کی تیاریاں۔ میں نے سوچا، ڈھیروں کام ہوں گے۔ پھر وقت بچے
ملے گا۔ سو تیاری ابھی سے شروع کر دوں۔“ ماں امان سرور دکھائی دے رہی تھیں۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری کچھ نہیں بولا تھا۔ چہرے کی پیشانی کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔
”تجھے کیا ہوا؟“ ماں نے اس کا چہرہ بغور دیکھا تھا۔ مگر اس نے سرٹھی میں ہلا دیا تھا۔
”نہیں، کچھ نہیں۔ آپ کو بتایا تھا کہ میں رات کی فلائٹ سے نیویارک جا رہا ہوں۔“

”ہاں۔ لیکن تجھے ہوا کیا ہے؟۔۔۔ ٹھیک تو ہے تو؟۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ سائے پھیلا
ہوئے کپڑے ایک طرف رکھ کر ماں امان تشویش سے اٹھی تھیں۔ باقاعدہ اس کی پیشانی پر ہاتھ لگا کر
تھا۔ گی خاموشی سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری کی نظریں دھواں دھواں تھیں۔ کچھ تو تھا۔ گی جانتی نہیں تھی مگر سمجھ ضرور گی
کوئی بات تو تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری اس وقت چپ چاپ کھڑا تھا۔

”کیا ہوا؟“ ماں نے دوبارہ دریافت کیا تھا۔ مگر سردار سبکتگین حیدر لغاری نے بے تاثر انداز میں
میں ہلا دیا تھا۔

”کتنی بار کہا ہے اتنا کام مت کیا کر۔ اپنی صحت کا بھی کچھ خیال رکھا کر۔ اور اب تو اس طرف،
ٹور پر چلا جائے گا۔ تجھے اپنی کوئی فکر ہے کہ نہیں؟۔۔۔ کچھ میرا ہی خیال کر۔“

”ماں! آپ کا خیال ہے۔۔۔ بہت خیال ہے۔ اپنا خیال رکھئے گا۔ میں فون کرتا رہوں گا۔
سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ چہرہ اور انداز بے تاثر تھا۔

”کوئی نیویارک نہیں جا رہا۔ تو آرام کر۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔ صورت دیکھی ہے تو نے
ایسے پردیس جائے گا؟“

ماں کو بہت فکر ہوئی تھی۔
”کچھ نہیں ہے ماں! ٹھیک ہوں میں۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

اپنے آپ پر حیرت ہوئی تھی۔ وہ اس کیفیت میں تھا کہ اپنے جذبات و احساسات پر کنٹرول نہیں
تھا۔ اس کی نگاہ پڑھی جا رہی تھی۔

احساسات اتنے حاوی تھے اس پر۔ ایک لمحے میں بہت حیرت ہوئی تھی۔
”میں تجھے جانے سے منع نہیں کر رہی۔ تجھے جانا ہے، چلے جانا۔ مگر آج نہیں۔ فون کر۔“

کینسل کرا دے۔ تو اس طرح چلا گیا تو مجھے فکر رہے گی۔“ ماں امان فکرمندی سے کہہ رہی تھیں۔
سبکتگین حیدر لغاری نے خاموشی سے انہیں دیکھا تھا پھر سائیڈ پر بکھرے ہوئے انواع و اقسام کے

دیکھے تھے۔
”یہ کس بات کی تیاری ہے؟“ سپاٹ لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”میری دلہن کو لانے کی۔ لیکن تو اسے چھوڑنی امان، چل آرام کر۔ میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔“ ماں امان
بندی سے بولی تھیں مگر اس نے منع کر دیا تھا۔

”نہیں ماں! اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر پلٹا تھا اور چلتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ ماں امان
اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

عجب لڑکی ہو تم۔ اچھا خاصا شوہر ملا ہے مگر اس کے باوجود جب بھی ملو، منہ پر بارہ ہی بچے ہوتے
”اوزان نے اسے دکھ کر کہا تھا مگر وہ مسکرائی نہیں تھی۔

”کیا ہوا ہے؟۔۔۔ تمہارا چہرہ اترا ہوا کیوں ہے؟“ می نے دریافت کیا تھا۔
”ہاں۔۔۔ کچھ کمزور لگ رہی ہے میری بچی۔“ دادا ابانے بھی کہا تھا لیکن اوزان مسکرا دیا تھا۔

”آپ لوگوں کو محبت نے اندھا کر دیا ہے۔ اچھی خاصی تو ہے۔ بلکہ مجھے تو پہلے سے کچھ موٹی بھی لگ
لا ہے۔ ہے نا۔ انا بیہ! تم نے ویٹ پیٹ آن کیا ہے نا؟“

وہ اچھے موڈ میں نہیں تھی مگر اس لمحے وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ اگر اس کا ارادہ یہی تھا کہ وہ
رائے تو وہ مسکرا دی تھی۔

”اوزی! تم بھی نا۔“ انا بیہ نے اس کے شانے پر مٹکا مارا تھا۔
وہ مسکرا دیا تھا۔

”تم تو اپنے گھر خوش ہو۔ اب اپنے اس بے چارے سے بھائی کی بھی کچھ فکر کرو۔“
”کیا فکر؟“ وہ چونکی تھی۔

”کیا فکر مطلب؟ میری شادی نہیں کراؤ گی؟“
”شادی۔۔۔“ اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ دھیان اس طرف بالکل بھی نہ تھا۔ جو کچھ بول رہی تھی،
نخانی دماغ سے تھا۔ اس کا اندازہ اسے ہوا تھا۔ تب ہی چونک کر چہرہ پھیر گئی تھی۔ پھر قدرے توقف
بھر ہلاتی ہوئی بولی تھی۔

”ہاں، سوری انا مجھے یاد نہیں رہا۔ اپنے بھائی کی شادی تو مجھے ہی کروانا ہے۔“ وہ زبردستی مسکرائی تھی۔
انہ نے اس کی کیفیت کو پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ تب ہی اس لمحے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی
بکھرا دیا تھا۔

”دادا ابا! آپ ٹھیک ہیں؟۔۔۔ اپنی دوائیں وقت پر لے رہے ہیں؟“ اس نے دادا ابا کی طرف
بٹکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ وہ اپنا دھیان پھیر کر دوسری طرف لگانا چاہتی تھی۔ بالکل بھی اس طرح نہیں
ہنا چاہتی تھی۔ مگر وہ کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اندر بہت کچھ بکھرا بکھرا سا تھا۔

”ہاں بیٹا! ٹھیک ہوں۔۔۔ وقت پر دوائیں بھی لے رہا ہوں۔ اوزی بہت خیال رکھتا ہے میرا۔“ دادا
کراتے ہوئے بولے تھے۔

”دیکھا۔۔۔ دیکھا۔ تمہیں یہاں کوئی مس نہیں کرتا۔ تمہاری کسی اس گھر میں کوئی بھی محسوس نہیں
کرتے تھے۔“

”یہ کس بات کی تیاری ہے؟“ سپاٹ لہجے میں دریافت کیا تھا۔

کرتا۔ تم اگر یہ سوچ کر دکھی ہونا چاہتی ہو تو ہو سکتی ہو۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”اوزی! بکواس مت کرو۔“ وہ چلتی ہوئی دادا ابا کے قدموں میں گھٹنوں کے بل جا بیٹھی تھی۔

”دادا ابا ٹھیک ہیں؟“ مدغم لہجے میں دریافت کیا تھا۔

دادا نے محبت سے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”ہاں بیٹا! ٹھیک ہوں۔ یہ اوزان کی مت سن۔ تو جانتی ہے اس کی عادت ہے۔ تجھے چھیڑتا ہے۔

یہاں تجھے ہم بہت مس کرتے ہیں۔ یہ جو گدھا ہے نا، یہ بھی تجھے بہت مس کرتا ہے۔“ دادا ابا نے مطلع کیا

تھا۔ اوزی ہنس دیا تھا۔

”دادا ابا! آپ بھی نا۔ جھوٹ بولنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟“

”میں جانتی ہوں، میرے دادا ابا کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ چپ رہو تم، مجھے پتہ ہے، تم سب مجھے

بہت مس کرتے ہو۔“ کہہ کر اس نے دادا ابا کی گود میں سر رکھ دیا تھا۔

آنسو خود بخود آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

”میں جانتی ہوں، تم سب مجھے بہت مس کرتے ہو۔“ آواز بھرا گئی تھی۔

”یار! اب زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ عفتان ساتھ کیوں نہیں آیا؟ تم دونوں میاں

بیوی آگے پیچھے کیوں آتے ہو؟ ساتھ ساتھ کیوں نہیں؟“ اوزی نے موضوع بیکسر بدل دیا تھا۔

”وہی چھوڑ کر گئے ہیں مجھے۔“ انا بیہ نے باقی کے آنسو اندر ہی کہیں مدغم کئے تھے اور اپنی آنکھوں

ہاتھ کی پشت سے رگڑتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”دادا ابا! آپ اپنا خیال رکھا کریں۔ اور اگر یہ اوزی آپ کا خیال نہ رکھے تو آپ مجھے فون کر

کریں۔ میں اس کے کان بہت زور سے کھینچوں گی۔“

اوزی ہنس دیا تھا۔

”؟ بس کان ہی کھینچتا۔ میرا ہاتھ اور ذمہ داریاں بانٹنے والی کوئی نہ لانا۔“ اوزی نے شکوہ کیا تھا۔ دادا

مسکرائے تھے۔ وہ بھی مسکرائے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

”دادا ابا! دیکھ رہے ہیں آپ، کیا زمانہ آ گیا ہے۔ موصوف اپنے منہ سے کہہ رہے ہیں۔“

”ہاں تو کیا بھلا غلط کہہ رہا ہوں؟ جب بہن کو ہی احساس نہیں تو پھر مجھے ہی احساس دلانا پڑے گا؟

کیوں دادا جی! میں نے کچھ غلط کہا؟“ اس نے فوراً دادا ابا کو وکیل کیا تھا۔

”کہہ تو اوزی ٹھیک رہا ہے۔“ دادا ابا مسکرائے تھے۔

”دادا! آپ۔۔۔ آپ اوزی کی سائیڈ لے رہے ہیں؟“ وہ بے یقینی سے بولی تھی۔

دادا ابا مسکرا دیئے تھے۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ دیکھتی ہوں کوئی لڑکی تمہارے لئے۔“ انا بیہ نے ہار مانتے ہوئے کہا تھا۔

”کوئی لڑکی نہیں۔۔۔ صرف ایک لڑکی۔“ اوزان نے باور کرایا تھا۔

”کون؟“ انا بیہ چونکی تھی۔

دادا ابا اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”بچو! تم لوگ بیٹھو، باتیں کرو۔ میں نماز پڑھ لوں۔“

”یہی ابھی تک کچھ کھانے کو نہیں لائیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ انا بیہ جیسے دانستہ منہ موڑ کر اس

سے پچنا چاہتی تھی۔

”تم لامعہ کی طرف گئی تھیں؟“ اوزی نے دریافت کیا تھا۔

اس نے قدرے توقف سے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ہاں ملی تھی۔ بات بھی کی تھی مگر۔“

”وہ اب تک اسی طرح بی ہو کر رہی ہے؟“

”پتہ نہیں۔“ انا بیہ نے بہت آہستگی سے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

”وہ میری دشمن نہیں ہے۔ نہ میں اس کی۔ مگر ہم دونوں ایک دوسرے کو کچھ نہیں پارہے فی الحال۔“

اوزی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

”اوزی! وہ اب بھی ویسا ہی سوچتی ہے۔ میں سمجھی، اس کا وقتی غبار ہے، دھل گیا تو اب اس کے بعد وہ

ہے اس بات کو لے کر برہم نہیں ہوگی۔ مگر وہ۔“ انا بیہ کی آنکھوں میں بہت سی نمی آن رہی تھی۔ اوزان

لی کے لئے بہن کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم سیریس مت لو۔“

”اوزی! یہ سب بہت زیادہ ناقابل برداشت ہے۔“

”انا بیہ! زندگی میں ہر شے کے لئے ہمیشہ تیار رہو۔ یہ ایسا کچھ نہیں ہے کہ ٹھیک نہ ہو سکے۔ یہ رشتے

اہم ہیں۔ لیکن تمہاری پہلی ترجیح تمہارا شوہر ہے۔ اس وقت تمہارے اس رشتے کو تمہاری سب سے

ضرورت ہے۔ ان سب کو لے کر اپنے اس ایک رشتے کے ساتھ کوئی نا انصافی مت کرو۔ کوئی غفلت

ماتو۔ یہ چھوٹی چھوٹی غلطیاں بعض اوقات بہت بڑا المیہ بن جاتی ہیں۔ پھر حل کرتے بھی رہو تو حل

ہوئیں۔“ اوزی اسے سمجھا رہا تھا۔

”اوکھ بولی نہیں تھی۔“

”انا بیہ! محبت اور دوستی میں فرق ہوتا ہے۔ دونوں کو الگ الگ خانوں میں رکھنا سیکھ لو۔“ وہ جیسے ایک

اہل تیار ہا تھا۔ مگر وہ اسے کیا بتاتی کہ اب بات اس سے نکل کر بھی کچھ اور تھی۔ عفتان علی خان، اس

ات اب سرد پڑتا الاؤ تھا۔

کسانے نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ سامنے عفتان علی خان کھڑا تھا۔

مادر کوئی جوت نہیں جاگی تھی۔ وہ اسی طرح دیکھتی رہی تھی۔

باقی تھی وہ اسے لینے آ گیا ہے۔ اور اب وہی معمول کی زندگی ہوگی۔ معمول کے انداز میں۔ کچھ نیا

بھی انوکھا۔

لڑے عفتان! تم؟“ اوزی نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

”آؤنا۔۔۔ وہیں کیوں ٹھہر گئے؟“ اوزی بولا تھا۔

انا بیہ چپ چاپ سر جھکا گئی تھی۔ عفتان آگے بڑھ آیا تھا۔

”اور سناؤ، کیا ہو رہا ہے؟“ اوزان نے دریافت کیا تھا۔

”سب ٹھیک ہے۔ کیا راز و نیاز چل رہے ہیں دونوں بہن بھائیوں میں؟“ عفتان نے مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھا تو اوزی مسکرا دیا۔ انا بیہ چہرہ پھیر کر بے تاثر بن گئی تھی۔

”راز کیا چلنے ہیں یارا!۔۔۔ بس ایک درخواست کر رہا تھا۔“

”کیا؟“ عفتان چونکا تھا۔

اوزان ہنس دیا تھا۔

”ایک عدد گھر والی لانے کے لئے۔“ اوزان نے کہا تھا۔ عفتان مسکرا دیا تھا۔

”اوہ۔۔۔ اچھا۔“

”کیا کروں؟“

”کوئی ڈھنگ کا کام کر لو مگر شادی مت کرو۔“

”زینلی؟“

”ہاں۔۔۔ شادی کے بڑے عذاب ہیں یارا! پتہ جب چلتا ہے جب بھگتنا پڑتا ہے۔“ عفتان

مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ دونوں نے ہاتھوں پر ہاتھ مارا تھا اور ہنستے چلے گئے تھے۔

”اچھا۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا کہ یہاں ایک تجربہ کار انسان موجود ہے جس کے تجربے سے آ

سبق لیا جاسکتا ہے۔“ اوزان ہنسا تھا۔ انا بیہ اسے بہت تنقیدی نظروں سے گھور رہی تھی۔

”ایسا کیا عذاب میں مبتلا کیا میں نے آپ کی زندگی کو؟“ اس نے بھرپور استحقاق سے دریافت

تھا۔ عفتان علی خان اس کے اچانک مخاطب پر چونکا تھا۔ مگر وہ بول کر وہاں سے نکل گئی تھی۔ اوزان

دیا تھا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں۔ تمہارے تجربات سے مجھے ضرور سبق لینا چاہئے۔“

عفتان مسکرا دیا تھا۔

”اور سناؤ۔۔۔ ٹھیک گزر رہی ہے نا؟“ قدرے توقف سے اوزی نے دریافت کیا تھا۔ عفتان

خان نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ہاں، بہت اچھی۔ جب ہی تو تمہیں باز رکھ رہا تھا۔“ وہ مسکرا دیا تھا۔ اوزان بھی مسکرا دیا تھا۔

”وہ تو خیر۔ مذاق کی بھی اپنی ایک حد ہوتی ہے۔ تم خوش تو ہونا؟ وہ سارے وعدے، عہدے،

پورے کئے یا نہیں؟۔۔۔ تمہیں یاد ہے جب ہم ہاسٹل میں انا بیہ کو آخری سانس لیتے دیکھ رہے

تم اس وقت کتنے ڈپرے تھے۔ اب بھی اتنی ہی محبت کرتے ہو اس سے؟“ سرسری انداز میں دریافت

تھا۔

عفتان علی خان کچھ نہیں بولا تھا۔

بس خاموشی سے اس شخص کو دیکھا تھا۔

شاید وہ اس کے سوال کا مطلب اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا۔

”ہاں، مجھے سب یاد ہے۔“ اس نے بہت دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ انداز صرف ایک سرگوشی لگا تھا۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ اذہان نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا

وہ خالی خالی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔

وہ صرف گزشتہ زخموں کی بات کر رہا تھا، جو معمولی تھے۔ اس کے بعد کے زخم کتنے گہرے تھے، وہ ان

تعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔

”ہاں، ٹھیک ہوں میں۔“ وہ سر جھکا کر مدہم لہجے میں بولی تھی۔ اس کے لہجے میں اس لمحے بہت کچھ

نہ رہا تھا۔

اذہان حسن بخاری نے اسے بغور دیکھا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس کے چہرے کو جانچتی نظروں سے دیکھا تھا جیسے وہ اسے پڑھ لینا چاہتا ہو۔

میرب نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ آنکھیں پھرائی تھیں۔

آنکھوں کی نمی چھپانے کے لئے وہ سر جھکا گئی تھی۔

”کیا ہوا میرب؟“ اذہان نے ایک بار پھر دریافت کیا تھا۔ مگر اس نے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

اذہان اس کے سامنے بیٹھا اسے چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ جب یک دم میرب نے اس کے شانے پر

برکھ دیا تھا اور آنسوؤں پر کچھ اختیار نہ رہا تھا۔ اذہان حسن بخاری کی روح جیسے لمحوں میں قیامتوں کی

نبی۔

تیرے بن میں یوں

کیسے جیا

کیسے جیا تیرے بن

تیرے بن میں یوں کیسے جیا

کیسے جیا تیرے بن

برب سیال کے گرم گرم آنسو اس کے شانے کو جلانے لگے تھے۔ اذہان حسن بخاری کے وجود میں کوئی

نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح ساکت سا اس کے سامنے تھا۔ بہت سی دہلیزوں میں چنگاریاں سی جل

ل اس لمحے۔

لے کر یادیں تیری

اتنی میری کٹیں

سے باتیں تری

رتی ہے چاندنی

تہا ہیں تجھ بن راتیں میری
دن میرے دن کے جیسے نہیں
تہا بدن
تہا ہے روح
نم میری آنکھیں رہیں
آ جا میرے اب رو رو
جینا نہیں بن تیرے
تیرے بن

ایک لمحے میں محبت نے اندر سر اٹھایا تھا۔ ایک لمحے میں اندر ایک قیامت مچی تھی۔ اذہان خود حیران رہ گیا تھا۔ ایک لمحے میں پتہ چلا تھا، وہ کتنا کمزور تھا اور محبت کتنی مضبوط۔ ایک پل میں سارا سمیٹا ہوا پھر ریزہ ریزہ تھا۔ ایک لمحے میں اسے اپنا وجود زیر و زبر ہونا دکھائی دیا تھا۔ ایک لمحے میں اس کا سارا وجود کھٹا۔ بے اختیاری کیا ہوتی ہے، اس ایک لمحے میں پتہ چلا تھا۔ اس کی ساری جان جیسے اس لمحے ایک ٹم میں تھی۔ میرب سیال کا سر بدستور اس کے شانے پر تھا۔ اس کے آنسو اس کے شانے پر تھے۔ اذہان حیرت بخاری نے ایک لمحے کو دل کی مانی تھی اور اس کے گرد اپنا بازو پھیلا دیا تھا۔

میرب سیال دل گرفتہ سی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے بہت آہستگی سے اپنا حصار اس کے گرد باندھا تھا۔
”کچھ نہیں سمجھتا وہ۔ کچھ نہیں جانتا۔“ بے خودی کے عالم میں وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔ ”مجھ۔ اتنا بدگمان ہے وہ۔ میری کسی بات کا یقین تک نہیں کرتا۔ اسے لگتا ہے میں.....“ ایک دم حیات بنا ہوئی تھیں اور وہ چپ ہو کر چہرہ پھیر گئی تھی۔

اذہان حسن بخاری چپ چاپ اس کے جھکے سر اور ہنگی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔
میرب سیال اپنے اس ایک لمحے کے اقدام پر کسی قدر شرمندہ نظر آ رہی تھی اور اذہان اسے شرمندگی میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اٹھا تھا اور چلنا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا۔ میرب سیال نے اذہان کے اس طرح اٹھ کر چلے جانے کا قطعاً کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ اپنی سوچوں کے ساتھ اتنی الجھی ہوئی کہ اس کے لئے باہر کے سارے منظر ایک لمحے میں بالکل غائب ہو کر رہ گئے تھے۔
”سبکیٹین! کس موڑ پر لا کھڑا کر دیا ہے تم نے مجھے؟“

”آئی لو یو گین!“ ایک مدھم سی سرگوشی کرے میں اُبھری تھی۔
”میں تم سے محبت کرتی ہوں گین! کبھی سمجھنے کی کوشش کی تم نے؟ کتنا بے بس کر دیا ہے تم نے؟“
خود سے جتلا کیا ہے اور میرے لئے سارے راستے بند کر دیئے ہیں۔ جس سے آگے نہ مجھے کچھ دکھائی دے رہا ہے نہ سنائی۔ کیوں کیا ہے تم نے ایسا؟“
وہ چیختی تھی مگر وہاں ان تمام سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔



”گین! کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا سب میرب نے خود کیا ہے؟“ گی نے بے یقینی سے کہتے ہوئے اپنی طرف دیکھا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ گی کی نظروں میں ایک بے یقینی تھی۔
”تم واقعی ایسا کرو گے؟“ سوال میں حد درجہ حیرت تھی۔ ”تم واقعی میرب کو اپنی زندگی سے نکال باہر لانا کرو گے؟“

اس کے کئی سوالوں کے جواب میں بھی وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ مکمل طور پر خاموش تھا۔
”تمہیں لگتا ہے تم ایسا کچھ کر لو گے؟“ اب کے پہلے سے سوا حیرت لہجے میں تھی۔ مگر سردار سبکیٹین حیدر اپنی خاموش بیٹھا تھا۔

”سبکیٹین حیدر لغاری! تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ کیسے کر سکتے ہو ایسا سب؟“
”وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔“ اس کی اتنی باتوں کے جواب میں وہ پہلی بار بولا تھا اور گی چپ کی پارہ لگی تھی۔

”اسے مجھ سے محبت نہیں۔ تالی دو ہاتھوں سے بچتی ہے گی! ایک ہاتھ سے بچے تو طمانچہ کہلاتا ہے۔ اس کو انجام نہیں ہوتا۔ اور مجھے بھی اس سے کوئی محبت و حبت نہیں تھی۔ یہ صرف تمہاری سوچ ہے۔ اسے دماغ کی خرافات ہیں۔ میرے پاس فضول کا اتنا وقت نہیں ہے کہ میں ادھر ادھر صرف کرتا رہوں۔ میرے پاس کوئی غیر ضروری بات سوچنے کے لئے وقت نہیں ہے.....“
”وہ تمہیں بھولتی نہیں ہے۔“ اس کی بات کاٹ کر وہ بولی تھی۔

ادھیرت سے اسے نکلتا رہ گیا تھا۔
”اور وہ تمہیں بھولتی نہیں ہے۔ رات؟“ گی نے اپنی بات کی وضاحت چاہی تھی۔ گین نے اسے ناگوار پھر اس پر سے دھیان ہٹاتے ہوئے آہستگی سے بولا تھا۔
”پاگل ہو تم۔ بالکل پاگل۔ فضول کی باتیں کرتی ہو۔ فضول کی باتیں ہونے پر یقین رکھتی ہو اور.....“

”محبت کرتے ہو اس سے تو بتا کیوں نہیں دیتے اسے؟ تمہارے دل میں جو بھی ہے وہ اس کا ہونپ دو اسے۔ آزما کر دیکھ لو، اسے تمہاری تم سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ صرف ایک بار۔“
سایک بار گین! اس کی طرف ایک قدم بڑھا کر تو دیکھو۔ وہ تمہارے قریب ہے۔ اسے کیوں خود سے نکل رہے ہو؟ کیوں فاصلوں کو صدیاں بنانے پر تلتے ہو؟ سمجھنے کی کوشش کرو گین! تم اس کی ضرورت مانو۔ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔ تمہیں تمہاری زندگی میں اس کی بہت ضرورت ہے۔ اسے خود سے نکل دیکھو۔ تم سے وابستہ ہے وہ۔ وہ تمہارا وقت ہے۔ اسے کیوں گنوار ہے ہو تم؟“ گی اس کے بہانے ہوئی تھی۔

مگر سردار سبکیٹین نے بہت رسائیت سے سرنفی میں ہلا دیا تھا۔
”جو بھی سوچ رہی ہو، وہ غلط ہے گی! ایسا کچھ نہیں ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ سردار سبکیٹین حیدر نے کہا تھا۔ ”ان باتوں کو چھوڑو تم۔ یہ بتاؤ تمہارا چیک اپ کیسا رہا؟“

”مجھ سے اہم یہ ٹاپک ہے گین! اس لڑکی کو کس بات کی سزا دے رہے ہو تم؟ اور خود کو؟ اس کے بغیر کیسے چلو گے؟“ گی نے دریافت کیا تھا۔ مگر وہ جواباً کچھ نہیں بولا تھا۔ اٹھا اور چلتا ہوا چپ چاپ باہر نکل گیا تھا۔

”تم نے میرے ریسٹورنٹ کے لئے جو جگہ دیکھنا تھی، وہ دیکھ لی؟“ ساہیہ نے دریافت کیا تھا۔ مگر اذہان حسن بخاری نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ کسی قدر الجھا اور کھویا کھویا سا دکھائی دیا تھا۔

”اذہان! ساہیہ نے اسے دوبارہ پکارا تھا۔

”ہاں؟“ وہ چونکا تھا۔

”کیا ہوا اذہان؟“ ساہیہ نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”کچھ نہیں۔ تم کچھ کہہ رہی تھیں؟“ اذہان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”ہاں۔ میں نے ریسٹورنٹ کے لئے جگہ دیکھنے کے لئے کہا تھا مگر تم.....“

”ہاں۔ میں نے بات کی تھی۔ جلد ہی۔“ الجھے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ ساہیہ نے اسے بڑھ

دیکھا تھا۔

”کیا ہوا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔ میں تمہیں لے جاؤں گا۔ تم دیکھ لینا، جگہ اچھی ہے۔ تمہیں پسند آجائے گی۔“

اسے جواب تو دے رہا تھا مگر انداز بہت الجھا ہوا تھا۔

”مجھے جگہ سے زیادہ تمہاری فکر ہے اذہان!“

وہ مسکرا دیا تھا مگر وہ مسکراہٹ بہت چھپکی تھی۔

”آئی ایم گڈ۔ تھینکس۔“

”آر یوشیور؟“ ساہیہ نے اسے بغور دیکھا تھا۔

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”کوئی پریشانی ہے؟“

”نہیں۔“

”پھر؟“

”کچھ نہیں۔“

جواب قطعی تھا۔ اس کے بعد ساہیہ کچھ نہیں بولی تھی۔ کریدنا اسے بھی اچھا نہیں لگا تھا لیکن اتنا وہ

گئی تھی کہ کوئی بات ہے جو اسے پریشان کر رہی ہے۔

بہت دیر وہ خاموش رہی تھی۔ کچھ بول نہیں سکی تھی۔

سردہری فضا میں اتنی زیادہ تھی کہ اندر کے سارے لفظ جیسے کہیں کھو گئے تھے۔

”کسا ہوا؟ تم اس طرح چیپ کیوں ہو گئیں؟“ اذہان نے دریافت کیا تھا۔

ہدایات کروں؟“

”کچھ بھی۔“ اذہان حسن بخاری جیسے اپنے ارد گرد کی خاموشی کوئی الغور توڑنا چاہتا تھا۔

ہاتھ براٹھا کر اسے خاموشی سے دیکھنے لگی تھی۔ پھر دھیمے سے مسکرا دی تھی۔ بڑا مجلسی سا تمسم تھا۔

مسکراتا مجھے بھی اچھا لگتا ہے اور بات کرنا بھی۔ مگر بولنے کو اور مسکراتے کو کچھ بھی ہوگی تو۔“

”ہمارا کیا خیال ہے؟ ہمارے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں ہے؟“ اذہان حسن بخاری بولا تھا تو اس کا اپنا

پہلو تھکا۔ ساہیہ نے آہستگی سے مسکرا کر سرٹٹی میں ہلا دیا تھا۔

”ایسا میں نے نہیں کہا۔ ہمارے پاس باتیں کرنے کو بہت کچھ ہے ابھی۔ تم میرب کی

گتھے؟“ ساہیہ نے کہا تھا اور ساتھ ہی ایک نیا موضوع تلاش کیا تھا۔

”ہاں کچھ دیر تک بول نہیں سکا تھا۔ پھر بولا تھا۔

”شہزادو کے۔“ کہتے ہوئے میرب کی وہ کیفیت نگاہ کے سامنے آگئی تھی۔

اب تک اس لمحے کے حصار سے نکل نہیں سکا تھا۔

میرب کی اس کیفیت کا سبب کیا تھا، وہ نہیں جانتا تھا۔

مگر ایک بات جان گیا تھا کہ وہ خوش نہیں تھی۔

بت دہی تھی۔

”اس کے کسی دکھ کا کوئی مداوا نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے شانے پر آنسو بہا کر شاید کسی قدر مطمئن ہو گئی ہو مگر اذہان حسن بخاری کی روح میں کمی

ہاں کو بھر دیا تھا۔

”کہاں ہو تم؟“ ساہیہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تھا۔

”ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔ میرب کی طرف گیا تھا میں۔ وہ بھی ٹھیک ہے۔“

”ہاں میں اگر تمہارے پاس ٹائم ہو تو پلیز مجھے بھی لے چلنا۔ میں بھی اس کی خیریت دریافت کرنا

ہوں۔“

”ہاں کچھ نہیں بولا تھا۔

”میں طبیعت ہے اب اس کی؟“

”کی کی؟“

”میرب کی۔“

”ہاں۔ تمہیں بتایا تو ہے۔ شہزادو کے ناؤ۔“

”ہاں حسن بخاری ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب لگ رہا تھا۔

بہتر بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ منہ سے کچھ نہیں بولی تھی۔ اذہان اس

”دیکھنے لگا تھا۔ اتنا یہی کی نظروں میں بنا کچھ کہے کہہ دینے والے احساس تھے۔ اس کے لئے کیہ تھی۔

”اصول بخاری کو لہجہ بھر کسی قدر شرمندگی سی ہوتی تھی۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

”کیا ہوا۔؟“

”اوں، ہوں۔“ وہ سرفی میں ہلانے لگی تھی۔

”تمہیں کوئی پرائلم ستاری ہے؟“ ساہیہ نے دھمے لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“

”بس پتہ چل گیا۔۔۔ بتاؤ، شیئر کرنا نہیں چاہتے ہو تو الگ بات ہے۔ مگر میرا خیال ہے تم پریشان

ہو۔ پلیز بی ریلیکس۔“ ساہیہ کے انداز میں اس کے لئے محبت بول رہی تھی۔

اذہان نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ پتہ نہیں کیا جتانے کو وہ بولا تھا۔ ساہیہ نے اس کی طرف دیکھا تھا؛

مسکرا دی تھی۔

”تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں تم میرے ساتھ ہو۔“

اذہان فوری طور پر کچھ نہیں بول سکا تھا۔

”تمہیں نہیں لگتا میں تمہارے ساتھ ہوں؟“ قدرے توقف سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو

بولا تھا۔

”میں نے ایسا نہیں کہا۔“

”اذہان! لڑکی کے لئے یہ اظہار کرنا آسان نہیں ہوتا۔ نہ یہ درخواست کرنا۔ تمہیں یاد ہے میں۔

سے کہا تھا تم آزاد ہو۔ چاہو تو کوئی بھی راہ اختیار کر سکتے ہو۔ جب چاہو، جیسے چاہو چل سکتے ہو۔

سوچتی ہوں مجھ میں کتنا حوصلہ تھا جو میں نے وہ سب تمہیں کہہ دیا۔ خود کو دیکھتی ہوں تو ایک پل بھی تمہارے

بغیر کا شامال لگتا ہے۔ کہاں میں ساری زندگی کے لئے تمہیں خود سے دور بھیج دینا چاہتی تھی۔“ وہ بولی

پھر یک دم ہنس دی تھی۔

”یہ مت سوچو، میں بہت ایسوشل ہو رہی ہوں۔ شاید ایسا ہوتا ہے۔ میں نے تب نہیں سمجھا تھا؛

جانا تھا مگر اب میں اتنی جنونی نہیں ہوں۔ نہ تمہارے لئے اتنی پاگل ہوں۔ تم جب چاہو، جہاں چاہو

راستے اختیار کر سکتے ہو۔ میں یا میرا تعلق کبھی تمہارے لئے زنجیر نہیں بنے گا۔“

اذہان نے بغور اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی۔ زندگی کو ایک

میں جی لینے کی ایک رمت تھی۔ ایک اطمینان تھا۔ کیسی تھی یہ محبت۔

”تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟“ اس کو اطمینان دلانے کی کوشش میں وہ اپنے اندر کی بے اطمینانی بولا

بولا تھا۔ ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”میں ایسا سوچتی نہیں ہوں، بولتی ہوں۔ محبت کو باندھ کر رکھنے والے بے وقوف ہوتے ہیں۔

پابند بنا کر رکھنا انصوف ہے۔ محبت کو آزاد چھوڑ دینا چاہئے۔ اگر یہ تمہاری ہے تو واپس پلٹ کر تمہارے

آئے گی۔ اگر نہیں تو اسے بھول جاؤ۔“ جب بے فکری سے اس نے شانے اچکائے تھے۔ اذہان

میں حیرت لئے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

”محبت اتنی آسان ہو سکتی ہے؟“

”پتہ نہیں۔۔۔ مگر میرے لئے تو ہے۔“ وہ ہنس دی تھی۔ انداز صاف بتا رہا تھا وہ مذاق کر رہی تھی۔

لڑاس کی آنکھوں میں کئی موتی چمک رہے تھے۔ نئی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے

بڑھا کر اس کی آنکھوں کے کناروں پر سے پانی کے ننھے قطرے کو لیتے ہوئے اس کی جانب دیکھا

اذہان کے ہاتھ کی انگلی کی پوروں پر وہ اپنی آنکھ کی اس نمی کو دیکھ نہیں سکتی تھی۔ نظر جھکا گئی تھی۔

”تم بتا رہے تھے وہ رٹورنٹ کی جگہ کافی اچھی ہے۔“ ساہیہ نے یک دم فرار کے راستے اختیار کرتے

یے موضوع بدل دیا تھا۔

”ساہیہ!“ اپنے ہاتھ پر اس نمی کو دیکھتے ہوئے اذہان نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ساہیہ بنے خاموش

رک اس کی طرف ایسے دیکھا تھا جیسے کوئی چور چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے۔

”سب اتنا آسان ہے ساہیہ؟“ ایک لمحے میں جتانے ہوئے وہ دریافت کر رہا تھا۔ وہ لہجہ بھر کو چپ

کئی تھی۔ کچھ نہیں بول سکتی تھی۔ پھر بہت آہستگی سے سر انکار میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ مگر محبت میں جبر نہیں ہے۔ ایسا سوچنے سے سب کچھ اپنے آپ آسان لگنے لگتا ہے۔ اپنے

رے میں سوچو تو بندہ خود غرض ہونے لگتا ہے۔ سو جب بھی سوچو، کسی دوسرے زاویے سے سوچو، کسی اور

زاویے سے دیکھو، چانچو، پھر محبت صاف سمجھ آتی ہے۔ محبت صرف اپنی ذات کا مسئلہ نہیں ہے۔ اسے

رف اپنی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ اگر میں اپنی نظر سے دیکھتی ہوں تو مجھے صرف اپنا آپ دکھائی دے گا

یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔“ ساہیہ اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

اور اذہان حسن بخاری کو کچھ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اگر وہ ایسا کہہ رہی تھی تو وہ ایسا کر بھی سکتی تھی۔ اس

رے میں یقین تھا اسے۔ ساہیہ سے واقف تھا وہ۔ جو اس کے دل میں تھا، وہ چھپا بھید نہ تھا۔ وہ شفاف

کئی اور وہ خود۔

لہجہ کو اپنے آپ پر نگاہ گئی تھی اور وہ اس کی طرف سے دھیان پھیر گیا تھا۔

”محبت شاید اپنا اپنا زاویہ ہے۔“ بہت دھمے لہجے میں وہ بولا تھا۔ تب ہی وہ مسکرا دی تھی۔

”محبت اپنا اپنا نظریہ ہے۔“

”فرق کیا ہے؟“ وہ اپنی خفت مٹانے کو بولا تھا۔

”بہت زیادہ فرق ہے۔ زاویہ، نظریہ بدل دیتا ہے۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”نظریہ زاویہ بھی تو بدل سکتا ہے۔“ وہ اپنی جگہ اڑ گیا تھا۔

”آزمالو۔“ ساہیہ نے اسے ایک پل میں بہت اطمینان کے ساتھ اپنے سحر سے آزاد کر دیا تھا۔ اذہان

اوشی سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔



سردار سیکین حیدر لغاری سیاہ کول تار کی سڑک پر نگاہ جمائے گاڑی دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ نگاہ راستوں

کی ذہن الجھا ہوا تھا۔ پیشانی پر کئی سلوٹس تھیں۔ سرخ آنکھیں اس بات کی غماز تھیں کہ کتنی راتوں کی

بیداری دیکھی تھی۔

جانے کیا سوچ کر سردار بنگلین حیدر لغاری نے گاڑی اس کی طرف جانے والے راستوں پر ڈال دی تھی۔

محبت الجھاؤں میں الجھی ہوئی تھی اور وہ غالباً اُسے سلجھانے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ اس شام وہ دوبارہ اس کے سامنے تھا۔

”اذہان، پلیز! میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں ہے۔“ میرب نے تیسری بار انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

”میرب! تم کیوں اپنے اندر کی گھٹن میں گھٹ کر مر جانا چاہتی ہو؟“ اسے تقریباً ڈپٹے ہونے اذہان بولا تھا۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو اذہان! بالکل ٹھیک ہوں میں۔“ سب سے مشکل پوزیشن وہ ہوتی ہے جب بار کرانا پڑے کہ سب کچھ انڈر کنٹرول ہے۔

”میرب!۔۔۔ کبھی کبھی ہم ساری دنیا سے جھوٹ بول کر بھی خود کو مطمئن نہیں کر پاتے۔ یہاں وہاں، سب کی فکر کر لو گی۔ سب کو خوش کر دو گی اور خود آپ؟۔۔۔ کبھی خود اپنے بارے میں سوچا ہے تم نے؟“ اذہان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”لہجہ بھر کو وہ کچھ بول نہیں پائی تھی۔ قدرے توقف سے بہت آہستگی سے سرانکار میں ہلاتے ہوئے بولی تھی۔

”مجھے ایسا کوئی پرابلم نہیں ہے اذہان! تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ میرب نے اسے جھٹلایا تھا۔

اذہان براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میرب کے لئے جھوٹ بولنا محال ہو گیا تھا اور نظر ملانا بھی۔ وہ نگاہ آہستگی سے جھکا گئی تھی۔

”تم سمجھ نہیں رہے ہو اذہان! یہاں کچھ بھی غلط نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں اور بہت خوش بھی۔ تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو؟“ وہ زچ ہو گئی تھی۔

اذہان حسن بخاری نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھجھوڑ دیا تھا۔

”تو کیا ہوا کہ تمہیں کوئی دکھ لاحق نہیں ہے۔ تم خوش بھی ہو۔ فرض کر لیتے ہیں، ہمیں کسی بات کا کوئی ملال نہیں ہے۔ ہمیں کوئی وہم بھی نہیں ستاتا۔ فرض کر لیتے ہیں، تم اور ہم دونوں خوش ہیں تو بھی۔ جن اور تفریق کے درمیان کوئی نقطہ ایسا پختا ہے جہاں پھر بھی خسارہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ کس بات کے لئے؟

آخر کیوں؟ میں نے تم سے کسی بات کی وضاحت چاہی؟ تم نے اپنا سارا دکھ یہاں میرے شانے پر سر رکھ کر بہا لیا۔ میں نے تم سے کوئی ایک بھی وضاحت چاہی؟ ایک ذرا سی بھی وضاحت؟۔۔۔ نہیں نا؟ تو پھر

تم کس بات پر اتنی خوف زدہ ہو؟ کس بات کا ڈر ہے تمہیں؟ لفظوں کے معنی تمہارے لئے بدلے ہلے ہلے میرب! بدلا سب کچھ تمہارے لئے ہے۔ چلو مان بھی لیا، سب کچھ بدل گیا ہے تو بھی کیا سب کچھ ختم؟“

ہے؟ تمہارا میرا احساس ختم ہو جاتا ہے یا پھر وہ ایک رشتہ؟۔۔۔ چلو ہر شے ایک طرف رکھ دیتے۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ سب کچھ فنا ہو چکا۔ تو کیا میں تم پر اتنا بھی حق نہیں رکھتا کہ تمہارے چہرے پر اس

ناکوجن سکوں؟۔۔۔ ان آنکھوں میں تیرتی اس نمی کو چراسکوں؟ اور یہ سب بھی رہنے دو۔ کیا مجھے اتنا حق نہیں کہ تم سے تمہارا ان کہا درد بانٹ سکوں؟۔۔۔ سچ کہو، کیا نہیں ہے مجھے یہ حق؟ کیا ایسا کوئی

میں محفوظ نہیں رکھتا؟“ عجب جارحانہ انداز میں کھڑا وہ بول رہا تھا۔

میرب سیال کے بہت قریب۔ مد مقابل۔ اتنا سچ بولتا ہوا کہ وہ چاہتی بھی تو اس کی کسی بات کو رد نہیں لیتی تھی۔ کسی ایک بات کو بھی جھٹلا نہیں سکتی تھی۔

بھگی، پانیوں سے تیرتی آنکھوں سے اُسے دیکھا تھا اور پھر بہت آہستگی سے سر نئی میں ہلا دیا تھا۔ اس شانوں پر رکھی اس کی گرفت ایک لمحے کو کمزور پڑ گئی تھی۔ مگر وہ کہہ رہی تھی۔

”ہاں لیا، سب کچھ سچ بھی ہے تو؟ کیوں بانٹوں میں تم سے اپنا سب کچھ؟۔۔۔ اگر میں مان بھی کہ ہم اچھے دوست ہیں تب بھی۔ میرے پاس جو بھی ہے، وہ میں تم سے بانٹ نہیں پاؤں گی۔ بالکل نہیں۔“

اذہان حسن بخاری کے ہاتھ بدستور اس کے شانوں پر تھے۔ کس قدر قریب کھڑا تھا وہ اس لمحے اس اور اسے چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔

کھلے دروازے سے یہ منظر سردار بنگلین حیدر لغاری نے دیکھا تھا اور وہ اُلٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ دل اور دماغ دونوں سلگ رہے تھے۔ اندر کہیں جیسے الاؤ دکھ اٹھے تھے۔ پورا وجود جلنے کو تھا۔ وہ تیزی

باہر نکلا تھا جب زو بار یہ نے اسے دیکھ کر پکارا تھا۔

”گین۔۔۔“

مگر اُس نے سنا نہیں تھا، نہ ہی دیکھا تھا۔ سرعت سے چلتا ہوا وہ گاڑی کی طرف آیا تھا اور اشارت کر لہرا گاڑی باہر نکال لی تھی۔ زو بار یہ یہ اس آنا فانا ہونے والے اقدام پر کچھ حیرت زدہ سی ہو رہی تھی۔

”جاری ہے ہو تم؟“

”جی۔“ اذہان نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تھا۔

”بیٹھے۔ کافی پی کر جاتے۔ ایک تو یہ میرب بھی عجیب ہے۔ آئے گئے کو پوچھتی تک نہیں۔ پہلے بنگلین طرح آیا تھا، اسی طرح واپس گیا اور اب تم۔“ اذہان چونکا تھا۔

”بنگلین یہاں آیا تھا؟“

”ہاں۔ میں نے پکارا بھی مگر اس نے سنا نہیں۔ اپنی ہاؤ، تم فارحہ آپا کو میری طرف سے سلام دینا۔“

”جی ضرور۔“ اذہان متشکر سا آگے بڑھا تھا۔ زو بار یہ اس اچانک کیفیت پر آپ حیران تھی۔ چلتی ہوئی

ب کی طرف آئی تھی۔

”میرب! کیا ہوا؟۔۔۔ گین آیا تھا؟“

وہ اپنی جگہ پتھر بنی ساکت کھڑی تھی۔ عفتنان کا لمس اس کے چہرے پر تھا۔ اس کی سانسوں کی پیش سے سارا چہرہ سلگتا ہوا سامحوس ہوا تھا۔ عفتنان کا انداز بھرپور استحقاق والا تھا۔ جیسے وہ سارا اختیار رکھتا ہو۔ جیسے سارے حقوق محفوظ رکھتا ہو۔ اور سچ بھی تھا مگر!

ایک لمحے میں وہ اس حصار کو توڑتی ہوئی باہر نکلتی تھی اور اگلے قدموں چلتی ہوئی دور جا کھڑی ہوتی تھی۔ عفتنان اسے حیرت سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔

انا بیہ نہیں جانتی تھی، اس نے کیا، کیا تھا۔

عفتنان علی خان کو ایک لمحے میں کتنی تذلیل محسوس ہوئی تھی، وہ قطعاً سمجھ نہیں سکتی تھی۔ کسی مرد کی مراد انا کو کتنی چوٹ پہنچ سکتی ہے۔ وہ اس لمحے قطعاً اخذ نہیں کر سکتی تھی۔ عفتنان علی خان سرخ آنکھوں سے جس طرح غصے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کو خوفزدہ ہو گئی تھی۔ عفتنان علی خان چلتا ہوا آگے بڑھا تھا۔ انا بیہ کا دل کسی بچے کی مانند لرز گیا تھا۔ عفتنان علی خان آگے بڑھا تھا۔ اس کی طرف۔ وہ اس نے کسی بھی اقدام کی اب توقع رکھتی تھی۔

ایک دو تین۔۔۔

قدم کچھ اور قریب آئے تھے۔ انا بیہ کی جان پرین گئی تھی۔ اسے لگا تھا اب کچھ کام نہیں آسکے گا۔ نہ اس کا تعرض، نہ کوئی جبری فاصلہ۔ وہ شخص جتنا برہم تھا وہ اس سے کچھ بھی توقع کر رہی تھی۔ مگر۔۔۔ وہ پہلا ہوا دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ دروازہ کھولا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔ انا بیہ کو اس لمحے اگرچہ کچھ مطمئن ہونا چاہئے تھا۔ وہ جتنی ”حد بندیاں“ لگا کر رکھنا چاہتی تھی، وہ قائم رہی تھیں۔ عفتنان علی خان نے زبردستی اس کے بتائے ہوئے حاشیے کو توڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ ”محفوظ“ رہی تھی۔ دھڑکنوں کو معمول پر آنا چاہئے تھا۔ اب کوئی ڈر باقی نہیں رہا تھا۔ مگر دل بچھا بچھا سا لگا تھا۔ ایک لمحہ قبل جتنی ہلچل تھی، اب اتنی ہی خاموشی تھی۔ ایک لمحے میں اتنا ہی سکوت دکھائی دیا تھا۔

اپنے دل کے اندر بھی اور باہر کی دنیا میں بھی۔ کیا ہوا تھا ایسا؟ وہ جان ہی نہیں پاتی تھی۔ اس نے جو چاہا تھا، وہ ہوا تھا۔ اس نے جو کرنا چاہا تھا، وہ کیا تھا۔ تو پھر اب۔۔۔ ایک بے گلی نے اندر سر کیا ابھارا تھا؟ وہ ساکت رہ گئی تھی۔ اپنی خواہشوں پر وہ خود حیران رہ گئی تھی۔ لفظوں کے معنی کیسے بدلے تھے وہ جان نہیں پاتی تھی۔ زاویے۔۔۔ حاشیے۔۔۔ کیسے بدلے تھے وہ جان نہیں پاتی تھی۔

خواہشوں نے کب نئے معنی پہنے تھے، وہ جان نہیں پاتی تھی۔ اس کا انداز خود اسے حیران کر رہا تھا۔ ساکت سی کھڑی اپنے اندر کی آواز کو سننے کے لئے سماعتیں لگائے کھڑی تھی۔ اتنی خاموشی تھی کہ دھڑکنوں شور تک صاف سنائی دے رہا تھا۔ ایک ایک سانس میں کتنی ہزار خواہشیں پہنچاں تھیں۔ وہ حیران رہ گئی۔ یہ تبدیلی کیسے آئی تھی۔

انقلاب کیسے برپا ہوا تھا۔



عجیب سايوں سی ہے۔ جب اس کے پاس سب کچھ تھا، سارے منظر اس کے تھے تو وہ ان مناظر بھاگ رہی تھی۔ اور اب جب کہ سارے منظر اس سے دور جا رہے تھے تو وہ ان مناظر کو اپنی منگھی میں بند کر لینا چاہتی تھی۔ مگر سائے ایک دم لمبے ہو رہے تھے۔ وہ پکڑنا چاہتی تھی مگر پکڑ نہیں پار رہی تھی۔ عجب اب چھاؤں کا سا کھیل تھا۔

کبھی وقت خود اس کے اختیار میں تھا اور کبھی وہ خود اس وقت کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

پیشگی آنکھوں کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی تھی۔ مائی نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔

”کیا ہوا میرا!۔۔۔ میری بچی؟“

مگر وہ کچھ بول نہیں سکتی تھی۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“ اس نے بہتے آنسو دیکھ کر دریافت کیا تھا۔ وہ کیا کہتی؟۔۔۔ سرنئی میں ہلا دیا تھا۔

”کچھ بتاؤ تو سہمی۔۔۔ ہوا کیا ہے؟“ مائی اصرار کر رہی تھیں۔

مگر میرب نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے سرنئی میں ہلا دیا تھا۔

”منظر میاں تو خیریت سے ہیں؟“ مائی اماں کا دھیان جس طرف گیا تھا اسی طرف کا دریافت کیا تھا۔

ران کی اس تشویش پر بھی اس نے سرنئی میں ہلا دیا تھا۔

”تو پھر کیا ماجرا ہے؟۔۔۔ بتائے گی مجھے کچھ؟“ مائی نے کسی قدر ڈپٹتے ہوئے کہا تھا۔

اُس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ مگر وہ مائی سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ مائی کی طبیعت کے متعلق وہ جانتی تھی۔

اس طرح کی کوئی کھٹانے کا مطلب یہ تھا کہ ان کی جان کے خطرے کو خود مدعو کیا جائے۔ اگر ایسا

ہو جاتا تو گین اسے ساری زندگی معاف نہ کرتا۔ وہ جانتی تھی۔ یہی سزا نکال میں ہلاتے ہوئے بولی۔

”گین کہاں ہیں؟“

”وہ تو گھر پر نہیں ہے۔ مگر تو اس طرح رو کیوں رہی ہے میرے بچے! مجھے بتا، خیریت تو ہے نا؟“ مائی

الچیہ منہ کو آ رہا تھا۔

”سب خیریت ہے مائی! بس یوں ہی۔“ اس نے بات بنانا چاہی تھی۔ مگر ذہن اس قدر بلینک تھا کہ

الچیہ بوج نہیں سکتی تھی۔

کوئی ایک معقول جواز بھی نہیں۔

اس کا ذہن اس قدر ماؤف تھا کہ فوری طور پر اس میں کچھ نہیں آیا تھا۔

”میرا!۔۔۔ تو مجھے کچھ بتائے گی یا کہ نہیں؟“ مائی نے اب کے اسے ڈپٹا تھا۔

اس نے بہت آہستگی سے سران کے شانے پر رکھ دیا تھا اور بہت مدد لہجے میں بولی تھی۔

”آپ کی بہت یاد آ رہی تھی۔“

”پاگل!۔۔۔ تو یہ کون سا سبب ہے رونے کا؟ اور تم گین کے بارے میں کیوں پوچھ رہی تھیں؟“

لالاں کو مطمئن کرنا آسان نہیں تھا۔ اور اس کے پاس دینے کو زیادہ وضاحتیں بھی نہیں تھیں۔

”ان کی یاد بھی آ رہی تھی۔“ وہ سر جھکا کر بولی تھی۔ جھوٹ بولنا آسان نہ تھا۔ اسے گمان تھا اب وہ

اس سے آگے کی زندگی کے بارے میں اسے سوچ کر بھی ہول آتے تھے۔ اس گھر میں شادی کی اپن چل رہی تھیں اور —!

پاپا! — یہ آپ نے کیا کر دیا؟ اس نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے مائی کی طرف دیکھا تھا۔
 مائی! چلتی ہوں میں — پھر آؤں گی۔

”لو، ایسے کیسے؟ — اتنے دنوں بعد میری بچی میرے گھر آئی ہے۔ ایسے کیسے جانے دوں گی؟“
 اماں اس پر اپنی محبت لٹا رہی تھیں۔ مگر اس نے سرفی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں مائی! بالکل بھی کسی شے کا موڈ نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو میں کہہ کر مانتی۔ میرا اپنا گھر ہے۔ میں ان یہاں تو نہیں ہوں۔“ اس نے پھیکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ دل اندر خون کے آنسو رو رہا اور باہر سے وہ مسکرا رہی تھی۔

کتنا مشکل تھا یہ۔
 مگر وہ مائی اماں کو مطمئن کرتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ تبھی عین سامنے پورچ میں کھڑی گین کی گاڑی کی نظر پڑی تھی۔

”یہاں کیا تھا تو اس کو بھی اس گاڑی کے اندر پایا تھا۔ اس کے اندر ایک لمبے میں ایک قوت سی آگئی۔ سرعت سے چلتی ہوئی اس کی گاڑی کے قریب جا کر کئی تھی۔ دروازہ کھولا تھا اور اس کے ساتھ فرنٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

برادر سبکدین حیدر لغاری اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک دریا کے بعد ایک اور دریا کا سامنا یہ وہ نہیں جانتی تھی۔
 سوچ کر نکلی تو تھی۔

مگر اب! —
 کیا کہے گی اس شخص سے؟
 کس طرح بیان کرے گی؟

کچھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ایک لمبے میں سب کچھ ہاتھ سے نکلتا ہوا سا محسوس ہوا تھا۔
 سارا منظر — بہت فاصلے پر اور پرایا پرایا سا لگا تھا۔
 وہ شخص اسے کھل سر دھری سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”کیا ہے یہ سب؟“ انداز لاطعلقی لئے ہوئے تھا اور لہجہ سرد۔ وہ جواتا کچھ طے کر کے آئی تھی، ایک اٹل مٹی میں ملتا دکھائی دیا تھا۔ سارے ارادے ریت کی دیوار ثابت ہوئے تھے۔
 اہل لڑنے نکلی تھی۔ ہمت بھی کر لی تھی۔ مگر یہ اجنبی انداز — یہ سرد مہر تیور۔

حالات کو بس میں کرنا پوانے کا کوئی خواب لگا تھا۔
 ”کیا ہے یہ سب کچھ؟“ گین نے کسی قدر برہمی سے دریافت کیا تھا۔ ”کیوں آئی ہو تم یہاں؟ — لائے؟ — تم نے مائی کو تو نہیں بتا دیا؟ — اگر میری مائی کو کچھ ہو گیا تو — میں اپنا —

صاف پکڑی جائے گی۔ مگر تبھی اس نے مائی اماں کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرب کچھ حیران رہ گئی تھی۔
 ”آپ مائی —“

”بے وقوف — اس سے جی اُداس تھا تو اس میں اس طرح رونے کی کیا ضرورت تھی؟“ مائی نے اس کے چہرے کو ہاتھ میں لیتے ہوئے محبت سے کہا تھا۔
 وہ سر جھکا گئی تھی اور ایک جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔

”مجھے ان کی یاد واقعی بہت آ رہی تھی مائی اماں! — مجھے لگا وہ مجھ سے ملے بغیر چلے جائیں گے اور.....“

کتنا جھوٹ وہ مزید کہتی۔
 سب کچھ اسے بہت مشکل لگا تھا۔
 ”گین تو اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ آئے گا تو اس کا دو کانوں کے بیچ میں سر کر دوں گی۔ ہلا

تجھ سے ملنے کیوں نہیں گیا۔ جانے سے پہلے اسے تجھ سے ملنا تو چاہئے تھا۔“ مائی اماں تسلی سے کہتی ہوئی مسکرا رہی تھیں۔

میرب کو کچھ اطمینان ہوا تھا۔
 ”جی مائی اماں! — مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ مجھ سے ملنے نہیں آئے۔ اور مجھے لگا وہ کل اچلے گئے ہوں گے۔“

”ہاں جانا تو اسے کل ہی تھا۔ مگر اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے ہی منع کر کے ٹکٹ لینے کروا دی تھی۔ اب نئی ٹکٹ کچھ دن بعد کی کفرم ہوئی ہے۔ تسلی سے مل لینا اُسے — اب یہیں ہے مائی اماں مسکرائی تھیں۔

اسو لانا اسے شرمنا چاہئے تھا مگر وہ ذہنی طور پر اتنی ڈسٹرب تھی کہ شرمنا، گھبرانا کچھ یاد نہیں تھا۔
 یاد تھا تو بس اتنا کہ وہ شخص اس سے بہت دور جا رہا ہے — فاصلے بڑھ رہے ہیں۔ اور ایک سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ رشتہ، اس کی ساری حقیقت ایک لمبے میں مٹ جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ وہ

چاہتی تھی۔ دل کی آواز کو اس نے بہت دیر سے جانا تھا۔
 مگر ایک لمبے کی غفلت سے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔
 ”آؤ بیٹھو — تمہیں بری کے کپڑے دکھاؤں۔ آج کل میں مظہر میاں سے بات کرنے آئے

ہوں۔ اس کے بعد میری بچی نیر سے اس آنگن میں ہوگی۔“ مائی نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔
 بے جان سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر رہ گئی تھی۔
 ایسا کچھ نہیں ہونا تھا۔ پاپا نے جو بھی کیا تھا، غلط کیا تھا۔ ہمیشہ اس کی خواہشوں کا احترام کرنے

پاپا ایک لمبے میں کیسے سفاک بن گئے تھے۔ ایک لمبے کی بات تھی — اور اگر بات ختم ہو سارا منظر پل میں رکھ بن جاتا تھا۔
 پھر کیا ہونا تھا۔

نقصان برداشت کر سکتا ہوں۔ مگر مائی۔ بتا دیا تھا میں نے تمہیں مگر تم.....“

”میں نے مائی سے کچھ نہیں کہا۔“ میرب نے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

”اوہ، رینکی؟“ ٹھیکس۔ آپ نے مجھ پر بڑا احسان کر دیا۔ چلو، ڈیل کرتے ہیں۔ لیس ڈیلر، طنز یہ لہجے میں اچانک سردار سبکدین حیدر لغاری نے ایک آفر دی تھی۔ میرب سیال حیران رہ گئی تھی۔

”کیسی ڈیل؟“ سوالیہ نظروں سے اپنے سامنے موجود شخص کو دیکھا تھا۔

سردار سبکدین حیدر لغاری کے چہرے پر کھل سکون دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے وہ بہت مطمئن تھا۔ میرب سیال کی جان جیسے سولی پر اٹکی ہوئی تھی۔

دل ایک لمحے کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

پتہ نہیں وہ شخص کیا سوچے بیٹھا تھا۔ کیا فیصلہ کیا تھا اس نے۔ وہ نہیں جانتی تھی۔

کیا تھا اس کے دل میں؟۔۔۔ میرب کو علم نہیں تھا۔ اس کا دل رکنے کو تھا۔

مگر وہ شخص بدستور سکون دکھائی دے رہا تھا۔ دل نہیں، جیسے پتھر تھا اس کے سینے میں۔

”کیسی ڈیل؟“ میرب نے آہستگی سے دہرایا تھا۔

جو اب سردار سبکدین حیدر لغاری نے اسے کھل سکون انداز سے دیکھا تھا پھر گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

میرب سیال اس کے بولنے کی منتظر تھی۔ چپ کے یہ لمحے کا ثابہ حد محال تھے۔ اس کی چپ بہت کھل تھی مگر وہ اسے بولنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ سوچ چپ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ ایک ایک

دل پر بھاری تھا۔ اس کی چپ بری طرح کاٹ رہی تھی۔

”آپ مائی کو کچھ نہیں بتائیں گی۔ آپ کو جو چاہئے وہ آپ کو میں دوں گا۔ لیکن اس بات کا نیا پتہ مائی کو نہیں لگنا چاہئے۔ رائٹ؟“ کتنے بے حس انداز میں وہ اس کے دل پر بر چھیاں چلا رہا تھا۔

میرب چپ چپ دیکھتی رہی تھی۔

کتنا بدظن تھا وہ اس سے۔ اس پر اعتبار تک نہ تھا۔ کتنا بدگمان تھا وہ۔

”آپ یہ بات پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ باتوں کو دہرانے کی عادت ہو چکی ہے آپ کو۔“ میرب آواز بہت ہمت کے باوجود بھرائی ہوئی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری عجب پتھر ہو رہا تھا۔ اس کی جانب دیکھ تک نہ رہا تھا۔

”دہرا نہیں رہا۔ دوبارہ کہنا نہیں چاہتا۔ لیکن انہوں کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“ لہجے میں کئی گئی بات میں ایک بے گانگی تھی۔

انہوں کے معاملے میں۔ یعنی وہ اسے بڑے آرام سے اپنے معاملات سے الگ کر رہا تھا۔

میرب سیال کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا پانی ایک لمحے میں چھلکا تھا مگر آنسو بڑی بے قدر رخساروں پر بہہ گئے تھے۔ کسی کو ان آنسوؤں کی کوئی خاص پروا نہ ہوئی تھی۔

جان ٹھم جانے کو تھی۔

روح جسم سے نکل جانے کو تھی۔

یہی آنکھوں سے اسے اب بھی بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

”آپ کو لگتا ہے کہ ہمارے درمیان اب ہر رشتہ بے معنی ہے؟“ اس نے صاف دکھائی دینے کے دل کی تسلی کے لئے پوچھا تھا۔

”آپ رشتوں کی بات مت کیجئے۔ آپ کے منہ سے رشتوں کی باتیں عجیب لگتی ہیں۔“ سردار سبکدین لغاری نے لائق لہجے میں کہا تھا۔

”یہ آپ کہہ رہے ہیں؟“ میرب کو یقین اب بھی نہ ہوا تھا کہ وہ شخص اس حد تک جاسکتا ہے۔ وہ بے حس سے دیکھ رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔

”مجھے نہیں پتہ، آپ یہاں کیا بات کرنے اور کون سے رشتوں کو ڈبی فنڈ کرنے آئی ہیں۔“

”کون سے رشتوں کو ڈبی فنڈ کرنا چاہئے مجھے؟۔۔۔ کون سا رشتہ رکھا ہے آپ نے مجھ سے؟“ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ مگر سردار سبکدین حیدر لغاری نے نہ اس کی طرف دیکھا

بلکہ جواب دیا۔

گاڑی سیاہ تارکول کی سڑک پر بھاگتی جا رہی تھی۔ درمیان میں کھل خاموشی تھی۔ میرب سیال کی دل سے آنسو تیزی سے بہ رہے تھے۔ چہرہ بیگم رہا تھا۔ مگر دوسری طرف کسی پر کوئی اثر دکھائی نہیں

تھا۔ کتنا کچھ تھا دل میں۔۔۔ کتنا کچھ کہنے کا ارادہ تھا۔ مگر وہ کچھ کہہ نہیں پاری تھی۔ وہ سننا بھی کہاں

تھا۔ ”گاڑی روکئے۔“ ہر شے بے توجہ دیکھ کر وہ بولی تھی۔ مگر سردار سبکدین حیدر لغاری نے نہیں سنا تھا۔

”آپ گاڑی روکئے۔“ آنسوؤں سے بھری آواز میں ایک بار پھر کسی قدر برہمی سے کہا تھا۔ سردار حیدر لغاری نے کوئی حکم نہیں مانا تھا۔

سردار سبکدین حیدر لغاری کا ہاتھ اس کی طرف ضرور بڑھا تھا۔ نظریں بدستور سامنے وٹا سکریں پر میرب نے بھیگی آنکھوں سے اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹا کر اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا تھا

دل دیکھ کر کچھ حیران ہوئی تھی۔ پھر ایک دم غصے سے اس ہاتھ کو جھٹک دیا تھا۔

دوبارہ سبکدین حیدر لغاری نے قطعاً برمانے بغیر ہاتھ دوبارہ آگے کر دیا تھا۔ میرب سیال نے برہمی کے ہاتھ جھٹک دیا ساتھ ہی چیخ پڑی تھی۔

”نہیں چاہئے آپ کی یہ ہمدردی۔ رکھئے اپنے پاس۔“

آنسو پونچھے۔ اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کہا تھا۔

”نہیں پونچھوں گی۔ اور آپ کو اس سے کیا؟۔۔۔ فضول کی کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں مجھے۔ آپ الٹے۔“

پہلے یہ رومال لو اور اپنے آنسو پونچھو۔“

”نہیں پونچھوں گی۔ آپ کو اس سے کیا ہے؟“

ہان میں کیا تھا، اب بھی سمجھنا مشکل تھا۔ کبھی کچھ واضح ہوا ہی نہیں تھا۔
 ہی کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔

ب کا دل چاہتا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اس شخص کو کہے کہ وہ کتابے جس ہے۔
 ناسخ رو ہے۔

کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔

راتنا غبار تھا کہ کچھ کہہ ہی نہیں سکی تھی۔

ختم ہوا تھا۔

سبکدین حیدر لغاری نے گاڑی روکی تھی۔

ب اس کی طرف دیکھے بغیر چپ چاپ اتر گئی تھی۔ اور اس شخص کی طرف دیکھے بنا آگے
 لی۔

ان نے چپ چاپ اس کی پشت کو دیکھا تھا۔ پھر گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔



”آئی دل ناٹ اسٹاپ دی کاروین۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کی طرف بن دیکھے اپنا ہاتھ
 صادر کر دیا تھا۔

”اتنے اچھے مت بنے۔ اگر آپ اتنے اچھے ہوتے تو.....“ آواز بھرا گئی تھی۔ وہ ڈمک
 شکوہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری کا ہاتھ بدستور اس کی طرف تھا۔ وہ اس کی ضد سے واقف
 تھی۔ ہاتھ کی طرف بھیگی نظروں سے دیکھا تھا اور پھر خاموشی سے رومال پکڑ کر آنکھیں پونچھ لی تھیں۔
 مگر آنکھوں میں اسی تیزی سے پھر پانی اٹھ آیا تھا۔

”بس؟“ دھندلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھرائی آواز میں کہا تھا۔

سردار سبکدین حیدر لغاری نے ایک لمحے کو اس چہرے پر نگاہ کی۔ پھر دوبارہ وینڈ اسکرین کی طرف ر
 لگا مگر گاڑی پھر بھی نہیں روکی تھی۔

میرب سیال بے بسی کے ساتھ چہرہ پھیر گئی تھی۔ پانیوں سے بھری آنکھیں پھر چھلک پڑی تھیں۔
 سردار سبکدین حیدر لغاری نے ایک نگاہ اس چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ میرب اس نگاہ سے بے
 ڈھندلے پانیوں سے بھری آنکھوں سے راستوں کو دیکھ رہی تھی جو اس کے گھر کی طرف جارہے تھے
 شخص ثابت کر رہا تھا کہ اسے اس کا کتنا خیال تھا۔

انتا کہ اُسے آنسو دے رہا تھا۔

اُسے زلزلہ ہوا تھا۔

دھکے دے کر اپنی زندگی سے نکال رہا تھا۔

خود سے دور کر رہا تھا۔

کیسی تھی یہ محبت۔ !!!

کیسی تھی یہ انسیت۔ !!!

کیسا تھا یہ پیار۔ !!!

پل پل مار بھی رہا تھا جو۔ اور اُس کا خیال بھی کر رہا تھا۔

”آپ ایک بات بالکل بھی سمجھتیں۔ جو کام آرام اور سکون سے ہو سکتا ہے اس میں اتنا
 کرنے کی ضرورت نہیں۔“ بہت رسائیت سے سمجھانے والے انداز میں وہ کہہ رہا تھا۔

مگر میرب سیال نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

اب باقی کیا بچا تھا سمجھانے کو؟

کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا وہ؟

کیا سمجھانا چاہتا تھا؟

درمیان میں کتنا کچھ انجانا سا تھا۔

ان کہا۔ ان سنا۔

واضح اب بھی کچھ نہیں تھا۔

”آپ سمجھتے ہیں اس طرح کچھ کر کے آپ اپنی غلطی سدھار رہے ہیں تو یہ غلط ہے۔“
 ”غلط نہیں ہے۔ غلط وہ تھا جو پہلے کیا۔ اور یہ اس کی مرضی کے خلاف بھی نہیں ہو رہا۔ پیمبر ز میرب کے
 بجائے تھے۔ اس کی مرضی سے ہوا ہے یہ۔“

”کیا؟“ زوباریہ حیران رہ گئی تھی۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“
 ”ایسا ہے۔ اور اب میں کچھ بھی اپنی بیٹی کے خلاف نہیں ہونے دوں گا۔“ مظہر سیال نے دو
 انداز میں کہا تھا۔ زوباریہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

یہ نہیں اس نے ٹھیک کیا تھا یا نہیں۔

مگر اسے وہ گریز ہی مناسب لگا تھا۔

وہ کچھ برہم لگا تھا۔

مگر صبح ناشتے کی ٹیبل پر وہ برہم تو نہیں لیکن ”لا تعلق“ ضرور تھا۔ کچھ ”انیدت“ تو اس سے قبل بھی زیادہ
 آگئی تھی۔ مگر اب تو لائق کچھ بڑھ گئی تھی۔

انابییہ نے چپ چاپ اس کے سامنے چائے رکھی تھی۔

”ٹھینکس۔“ ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک کنکر بڑا تھا۔ سکوت میں لمحہ بھر میں ہلچل ہوئی تھی اور سارا

پھر سے ویسا ہی تھا۔

انابییہ کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ حالانکہ اب تو اسے عادی ہو جانا چاہئے تھا۔

”آپ گاڑی بھجوادیں گے؟“ شام میں مجھے کہیں جانا ہے۔“ دانستہ طور پر بات کا آغاز کیا تھا۔

”کہاں جانا ہے تمہیں؟“ اس سوال کی امید نہیں تھی۔ اتنی ”سرد مہری“ کے موسم میں ایسا کوئی سوال، وہ

انہیں کر رہی تھی۔ شاید تبھی اس کے پوچھنے پر کچھ حیرت ضرور ہوئی تھی۔

”لامعہ کی طرف۔“ اس نے سر جھکا کر توس پر بٹر لگاتے ہوئے کہا تھا۔ عصفان نے چند لمحوں تک

دُش سے اسے دیکھا تھا پھر اخبار سامنے پھیلا کر چائے کے سپ لینے لگا۔

”وہاں کیا ہے؟“ اتنی وضاحتیں طلب کی جائیں گی، وہ جانتی نہیں تھی۔

”ضروری ہے کچھ ہو تب ہی جاؤں؟“ انابییہ نے الٹا دریافت کیا تھا۔

”اوزان کے لئے جارہی ہو؟“ ایک چھوٹے سے معاملے پر اتنی ”بات چیت“ ہوگی اسے علم نہ تھا۔

ناک کی قدر حیرت ہوئی تھی۔

لگا لگا اٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا تھا جو انجان بن کر بھی انجان نہ تھا۔

”نہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

”پھر۔۔؟“

”آپ چاہتے ہیں میں نہ جاؤں؟“ تک کر پوچھا گیا۔

”ایسا میں نے نہیں کہا۔ لیکن مجھے اچھا نہیں لگے گا اگر کوئی میری بیوی کی بے عزتی کرے۔“

اپنا دل کھول کر ماں کے سامنے رکھ رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ یہ سب سن کر اس کی ماں کے دل پر کیا گزر رہا
 ہے۔

اپنے بیٹے کے غم میں وہ کتنی دکھی ہو رہی ہے۔

”آپ یہ مت سمجھئے گا میں کوئی ضد کرنے والا ہوں۔ مجھے چاند نہیں چاہئے۔ مجھے پتہ ہے۔“

ایک بے بس کر دینے والے لمحے کے حصار میں ہوں اور اس سے باہر نہیں آ پا رہا ہوں۔ مگر دل جلد
 جائے گا۔“

ازہان حسن بخاری نے سراٹھایا۔ ہاتھ بڑھا کر ماں کے آنسو پونچھے۔ اور پھر چپ چاپ

باہر نکل گیا۔

فارغہ بیٹھی دیکھتی رہ گئی تھی۔

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ زوباریہ نے مظہر سیال کے سامنے کھڑے ہو کر دریافت کیا تھا۔

”کیوں۔ کیا ہوا؟“

”میرب کی طلاق کا معاملہ آپ نے اٹھایا؟“

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”کیوں۔ مجھے جو بہتر لگا میں نے وہی کیا۔ شی از مائی ڈاٹر۔ اس کی زندگی برباد ہونے

سکتا۔“ مظہر سیال نے جواب دیا تھا۔

”آپ کو لگتا ہے کہ ایسا کر کے اس کے ساتھ کچھ بہتر کیا ہے؟“ زوباریہ نے الٹا دریافت کیا تھا۔

”آپ کو نہیں لگتا کیا؟“ مظہر سیال نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”یہ میری بیٹی کی زندگی کا معاملہ ہے۔ اس کے لئے جتنا بے چین میں ہو سکتا ہوں، کوئی

ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہونے والی نا انصافی کا دکھ مجھے زیادہ ہے۔“

ایک لمحے میں زوباریہ کو اپنے معاملات سے الگ کر دیا تھا۔

”اور جو آپ کر رہے ہیں وہ کیا ہے؟“ زوباریہ نے دریافت کیا۔

”آپ کو لگتا ہے یہ غلط ہے؟“ مظہر نے پوچھا۔

”آپ پتہ نہیں کیا سمجھ رہے ہیں۔ لیکن آپ کو کچھ بھی کرنے سے پہلے میرب سے ایک

چاہئے تھا۔ ایک بار اس کی مرضی بھی معلوم کر لینی چاہئے تھی۔ آپ پھر وہی غلطی کرنے جا رہے

پہلے بھی کر چکے ہیں۔ آپ اسے دہرانے کی کوشش مت کیجئے۔“ زوباریہ نے سمجھانا چاہا۔

”میں جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ ایک غلطی ہوئی تھی، اس کو سدھارنے کی

ہوں۔“

تمہاری کوئی عزت ہو نہ ہو، مگر میری ہے۔ اگر تمہیں کوئی کچھ کہتا ہے تو اس سے میری حیثیت پر حرج ہے۔“ کتنے آرام سے وہ بول گیا تھا۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ یعنی اس کی اچھی حیثیت ہی نہیں تھی۔

حیرت سی حیرت تھی۔

مگر عفتان اس کی حیرت کی مطلق پرواہ کئے بغیر چائے کے سب لینے لگا تھا۔

”کیا کہا آپ نے؟“ آپ کو لگتا ہے میری کوئی عزت نہیں؟“ بات جتنی پرسکون دکھائی رہی تھی اب ”فضا“ ویسی نہیں رہی تھی۔

عفتان علی خان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”آپ کو لگتا ہے میری خود کی کوئی حیثیت نہیں؟“

”میں نے ایسا نہیں کہا“ عفتان نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ لہجہ بے تاثر تھا۔

انا بیہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

اس ایک جیلے میں پنہاں معنی خاص وہ سمجھ ہی نہ سکی تھی۔

”میری اپنی بھی کوئی شناخت ہے۔ کوئی ویلیو ہے۔“ اس نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہو۔

کرایا تھا۔

”ضرر ہوگی۔ مگر جو میں کہہ رہا ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ عقل استعمال کرنے۔“

ہوتی ہے۔ اگر آپ استعمال کریں گی تو آپ کے لئے بھی آسانی ہوگی اور میرے لئے بھی۔“ انداز ڈپٹنے والا تھا۔

انا بیہ کچھ بول نہ سکی تھی۔

”جب تک اس گھر میں ہیں، آپ میری ذمہ داری اور عزت ہیں۔“

”تو؟“

”تو؟“ عفتان نے اس کے شانے اچکانے پر اسے دیکھا تھا۔

”آپ چاہتے ہیں کہ میں لامعہ سے ملنا جھلنا بند کر دوں؟“

”آپ فضول کی بحث کیوں کر رہی ہیں؟“

”فضول کی بحث میں کر رہی ہوں؟“

”نہیں۔ آپ کی نیمہ کر رہی ہیں۔“ عفتان علی خان نے اخبار ایک طرف رکھا اور اٹھ کھڑا۔

”اس کا مطلب ہے کہ میرا دنیا میں آنا جانا، ملنا جھلنا بند؟“ انا بیہ کو سوچ کر ہی دھچکا لگا تھا۔ ”قی

میں؟“ کیونکہ میں آپ کو.....“ ایک بات زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ عفتان علی خان نے

کردیکھا۔ پھر پلٹ کر اس کی طرف آگیا۔ کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر ا

آہستگی سے چھوا تھا۔

”میرے لئے کچھ مشکل نہیں ہے انا بیہ!۔ اگر میں کچھ حاصل کرنا چاہوں تو کر سکتا؛

بازی حد بندیاں اگر ہیں تو صرف اس لئے کہ۔۔۔۔۔ چھوڑو۔۔۔۔۔ تم نہیں سمجھو گی۔ مگر ایک بات اب لی وہی ہے کہ آپ ان لوگوں سے نہیں ملیں گی جو آپ پر فضول الزامات لگاتے ہیں۔“ بہت مدہم لہجے زادہ کہہ رہا تھا۔

”تم ایسا اس لئے نہیں چاہتے کہ لامعہ تمہاری ایکس بھی رہ چکی ہے؟“

”ایکس رہنے سے کیا ہوتا ہے؟ تم چاہتی ہو سب۔۔۔۔۔ تم سے تو کچھ چھپا نہیں ہے۔ اگر میں تم کو

لامعہ سے روکنا چاہوں تو اس میں میرا راز نہیں چھپا۔ اگر مجھے لامعہ سے کوئی لگاوت ہوتی تو آج تم

بہن وہ میری زندگی میں میرے ساتھ ہوتی۔ وجہ اب تم خود ڈھونڈو۔ الزامات سے زیادہ حقائق پر نگاہ

لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آنکھیں کھول کر اپنے ارد گرد کی دنیا کو دیکھو۔ سب سمجھ میں آ جائے گا۔“

عفتان علی خان نے اسے چھوڑ دیا تھا اور چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

انا بیہ وہیں کھڑی دیکھتی رہ گئی تھی۔

ساری صورت حال اس کے لئے نئی تھی اور تعجب نیز بھی۔

اس شخص کے انداز میں Possiveness تھی۔ جو اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

محبت ہوتی تو کوئی بات بھی تھی۔

درمیان میں کچھ نہ تھا۔

اگر ہوتا تو شاید لفظوں کے، باتوں کے معنی مختلف ہو بھی سکتے تھے۔

اگر محبت ہوتی۔

اور محبت نہیں تھی۔ تبھی صورت حال اتنی پیچیدہ بھی تھی۔

میرب سیال کو لگ رہا تھا، قدموں تلے سے زمین سرک رہی ہو۔

ایک بار پہلے زندگی اس کی اجازت مانگے بغیر اس کی دنیا میں ایک عجب انقلاب لے آئی تھی۔ وہ

اب جسے نہ اس کی عقل نے تسلیم کیا تھا نہ دل نے۔

اور آج پھر اس کی زندگی اسے وہ دکھانے جا رہی تھی جس کے لئے وہ تیار نہیں تھی۔

وہ تبدیلی جسے وہ اپنی زندگی میں نہیں چاہتی تھی۔

وہ بے جان، ساکت سی بیڈ پر لیٹی تھی جب فون کی بیل اچانک بجی۔ اس نے کوئی دھیان نہیں دیا۔

فون بجتا رہا تھا۔

ایک۔۔۔۔۔

دو۔۔۔۔۔

تین۔۔۔۔۔

کئی بار۔۔۔۔۔

”ہیلو۔۔۔۔۔!“

نے کھڑا تھا۔

”آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں؟“ اس نے ساری جان سے سلگ کر دریافت کیا تو وہ چونک پڑا۔
”کیا مطلب؟“ سردار سیکٹین حیدر لغاری کا انداز سوالیہ تھا۔

”مطلب یہ کہ آپ اس دنیا کے سب سے زیادہ خود غرض اور بے حس شخص ہیں۔ آپ صرف ظاہر
نے ہیں کہ آپ کو کسی کی پرواہ ہے۔ مگر درحقیقت ایسا کچھ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ صرف
ہمارے میں سوچتے ہیں۔ صرف اپنی پرواہ کرتے ہیں۔ آپ کی بلا سے دنیا جائے بھاڑ میں۔ صرف
جو چاہتے ہیں وہ ویسا ہونا چاہئے۔“ میرب سیال نے اپنے اندر کا غبار کسی قدر نکال دیا تھا۔ دوسری
سردار سیکٹین حیدر لغاری کچھ نہیں بولا تھا۔

”بہت زعم ہے آپ کو خود پر؟ اپنے پیسے پر؟ آخر سمجھتے کیا ہیں خود کو؟ جب
ان، جو بھی چاہیں خرید سکتے ہیں؟ دنیا کبھی میں ہے آپ کی؟ آپ چاہیں تو سانس لے
آپ چاہیں تو سانس لینا بند کر دے گی۔ آخر کیا کیا چیز ہیں آپ؟“ میرب سیال روانی
بولی تھی۔

”جی وہ گویا ہوا تھا۔
”ایک لبرل شخص ہوں۔ خود کو بھی آزاد دیکھنا چاہتا ہوں اور دوسروں کو بھی۔ جبر پسند نہیں ہے
میرب سیال نے اسے ایک لمحے میں رد کر
نہیں ہیں آپ ایسے۔ آپ بالکل بھی ایسے نہیں ہیں۔“ میرب نے اسے ایک لمحے میں رد کر
لا۔

”تو پھر؟ کیا ہوں میں؟“ سردار سیکٹین حیدر لغاری نے سوال پوچھ کر اناس کی جان مصیبت
زال دی تھی۔

”بہت برے ہیں آپ۔“ میرب سیال نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔
سیکٹین حیدر لغاری ہاتھ میں فون لئے دیکھتا رہ گیا تھا۔
کیا ہو گیا اس لڑکی کو؟ اتنا ہائپر کیوں ہو رہی تھی وہ؟ وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔
سب کچھ تو اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ جیسا وہ چاہ رہی تھی، ویسا ہی ہو رہا تھا۔ پھر
وہ اتنی ہائپر کیوں ہو رہی تھی؟

”کہاں جا رہی ہو تم؟“ گی کو جاتا دیکھ کر سیکٹین حیدر لغاری نے دریافت کیا تھا۔
”ایک ضروری کام سے۔ اور تم تمہیں کیا ہوا؟ اب تک کوئی حل نہیں نکالا تم نے
کے لگا؟“ اسے بکھرا سا دیکھ کر دریافت کیا تھا۔ اس شخص کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ صرف اپنا
انگ رکھنا چاہتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ گی کو اس کی حالت پر بہت افسوس ہوا تھا۔
”میں! اپنے اوپر فضول جبر کیوں کر رہے ہو؟ جبکہ تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے لئے بھی یہ آسان نہیں

”تم فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھیں؟“ دوسری طرف سردار سیکٹین حیدر لغاری کچھ متفکر دکھائی دے رہا
تھا۔

”بس نہیں اٹھا رہی تھی۔“ اس نے بولنے کی کوشش کی تھی۔ مگر آواز کہیں اندر ہی دب گئی تھی۔
”یو او کے؟“ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ کچھ مضطرب دکھائی دیا تھا۔ کوئی مجزرہ ہونے جا
رہا تھا کیا؟

”ہاں۔۔۔ ٹھیک ہوں میں۔“ میرب نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔
”ٹھیک تھیں تو فون اتنی دیر سے کیوں اٹھایا؟“ دوبارہ سوال وہی تھا۔
”آپ نے کس لئے فون کیا؟“ وہ تپ گئی تھی۔ ”یہ جاننے کے لئے کہ میں مر گئی یا پھر زندہ ہوں؟“
میرب سیال نے درشت لہجے میں کہا تھا۔

”سٹ اپ!“ جواب اس کی برہم آواز سنائی دی تھی۔ ”مائی کو تم سے بات کرنا تھی۔“ بروقت ایک جواز
آیا تھا۔

”اچھا۔۔۔ تو پھر دیں فون انہیں۔ آپ کیوں بات کر رہے ہیں؟“ میرب سیال نے لائق
کی حد کر دی تھی۔

”میرب تم۔۔۔ وہ جیسے یک دم سلگ اٹھا تھا۔
”کیا میں؟“

مگر سردار سیکٹین حیدر لغاری نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔
”آپ کی طرح قتل عام نہیں کرتی۔ دوسروں کے احساسات کی بھر پور پرواہ ہے مجھے۔ اگر آپ
نے اس لئے فون کیا ہے کہ میں مائی کو کچھ نہ بتا دوں تو آپ غلط ہیں۔ میں اس بات پر قائم ہوں۔ آپ
پاتے ہیں یا نہیں، اس کے بارے میں، میں نہیں جانتی۔ مگر مجھے پورا احساس ہے اس بات کا۔“

”کس بات کا؟“ سردار سیکٹین حیدر لغاری نے دریافت کیا تھا۔
”کہ مائی اماں کو کسی بات کا پتہ نہ چلے۔ نہ ہی انہیں کوئی تکلیف پہنچے۔“

”رائٹ۔۔۔ گڈ۔۔۔ تو آپ ڈیل پر قائم ہیں۔“ سردار سیکٹین حیدر لغاری نے کہا تھا۔
میرب سیال ایک لمحے کو دنگ سی رہ گئی تھی۔

وہ شخص بدلنے والا نہیں تھا۔
ایک لمحے کو سارے قیاس ڈھیر ہوئے تھے۔

ساری خوش فہمیاں بھی ایک طرف دھری رہ گئی تھیں۔
زندگی کی سُوئی پھر اس جگہ پر اٹک گئی تھی۔

اُسے اپنی عقل پر ایک بار پھر ماتم کرنے کو دل چاہتا تھا۔ اس کی عقل ہمیشہ اس شخص کو رعایت دیتی تھی
مگر وہ شاید اس قابل تھا ہی نہیں۔

اس کی تو قعات ایک بار پھر اوندھے منہ پڑی تھیں۔ اور سردار سیکٹین حیدر لغاری اسی ممکنیت سے

ہے۔ پھر یہ بھرم قائم رکھنا کیوں چاہتے ہو؟ تم شرمندہ کیوں ہو؟ تم دنیا میں پہلا شخص تو نہیں ہو جو اپنے ایموشن کے ہاتھوں ہار رہا ہے۔ پھر کیوں گین؟ تم نارمل ری ایکٹ کیوں نہیں کرتے سر کچھ نارمل کرنے کے لئے؟ یہ بہت ضروری ہے گین! تمہیں اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔“ گی ٹیباگ نے اسے ڈپٹا تھا۔ مگر وہ جواباً کچھ نہیں بولا تھا۔

”یہ ٹھیک نہیں ہے گین!“ پُر افسوس انداز سے کہا تھا۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ وہ جیسے اپنے موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”خود سے نظریں ملانا نہیں چاہتے ہو گین! خود اپنے لئے اہم نہیں ہو تم؟ اپنے دل، اپنے ایموشن کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تم؟ کس بات سے ڈرتے ہو تم؟ آخر سمجھ کیوں نہیں لیتے تمہارے لئے کیا اور کتنا ضروری ہے۔“

”مجھے مت سمجھاؤ گی! میرے معاملات کو مجھ پر چھوڑ دو۔ تم اپنی بات کرو۔“

”میری بات۔۔۔ مسٹر بخاری نے رات مجھے کہیں سے نمبر ڈھونڈ کر خود کال کی ہے۔ وہیں جا رہی ہوں۔“

”اوہ۔۔۔ دیش اے گلڈ نیوز۔ تم جسے اتنے عرصے سے ڈھونڈ رہی تھیں بالآخر وہ تمہارے سامنے آ گئے۔ چلو کچھ تو اچھا ہوا۔“ سردار سبکگین حیدر نے کہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر میں اتنی خوش نہیں ہوں۔ مجھے خوشی تب ہوگی جب تم اپنے لئے وہ ایک فیصلہ کر لو گے جو تمہارے دل کی خوشی کے لئے ہو۔ خود کو یوں اس طرح ضائع کرنا بند کر دو گین!۔۔۔ بہت تکلیف دہ ہے یہ۔ تمہارے لئے تو ہے ہی۔ مگر ہم دوسرے جو تمہارے ارد گرد ہیں، ان کے لئے بھی یہ جیلانا آسان نہیں ہے۔ پلیز خود کو یہ فضول کی سزائیں دینا بند کر دو۔“ گی نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

”ساتھ چلو تمہارے؟“ سبکگین حیدر لغاری نے دانستہ بات بدل دی تھی۔ گی نے کچھ سوچ کر مر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”میں بھی تم سے یہی کہنے والی تھی کہ تم ساتھ چلو۔“

گین گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔

گی اس کے پیچھے چلتی ہوئی آئی تھی۔

”مجھے عجیب سا لگ رہا ہے گین!۔۔۔ زندگی اتنی اچھ گئی تھی۔ اور اب جب اچانک ہی سلینجے جا رہے تو۔۔۔ اور پتہ نہیں سلینجے جا رہی ہے کہ نہیں۔ مگر سب عجیب سا لگ رہا ہے۔ یقیناً نہیں آ رہا۔ کتنا عرصہ لگا دیا میں نے اسے ڈھونڈنے میں۔ اور آج اچانک وقت نے اسے سامنے لا کھڑا کیا۔ زندگی یوں بھی ہوتی ہے گین!۔۔۔ ایسی بھی۔ یقیناً نہیں آتا۔“ گی نے کہ سردار سبکگین حیدر لغاری جواباً کچھ نہیں بولا تھا۔

”گین! ایک بات مانو گے؟“ گی نے سردار سبکگین حیدر لغاری کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“

”اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے چلانے کی بجائے اپنے دل پر چھوڑ دو۔ اپنے دل کی مرضی کو ایک بار دے کر دیکھو۔ صورت حال خود بخود بدل جائے گی۔“ گی نے کہا تھا مگر وہ مسکرا دیا تھا۔

بہت بچھا بچھا سا انداز تھا۔

انداز میں ایک طنز صاف واضح تھا۔

”گی! تم تھکتی نہیں ہو ایک ہی طرح کی باتیں کر کے؟“

”ایک ہی طرح کی باتیں تمہارے لئے کتنی اہم ہو سکتی ہیں۔ کبھی سوچا ہے تم نے؟“ گی نے الٹا کر دیا تھا۔

”ایسا نہیں ہوتا گی!۔۔۔ تم فضول کی باتیں کرتی ہو۔ اور فضول کی باتوں پر زندگی نہیں گزرتی۔ میں کھول کر حقائق کو دیکھنا پڑتا ہے۔ اور حالات میرے حق میں اچھے نہیں ہیں۔“

”تم یہ کیوں سوچتے ہو گین؟۔۔۔ حالات تمہارے ہاتھ میں اور تمہارے حق میں ہو بھی سکتے ہیں۔“

”گی! میں احمقوں کی دنیا میں نہیں رہتا۔ مجھے معلوم ہے کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے کو ہے اور کیا ہونا ہے۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے اسے بری طرح رد کر دیا تھا۔

”تم صرف اپنی طرح سوچتے ہو۔ کبھی دوسروں کی طرح بھی سوچ کر دیکھ لیا کرو۔“ گی کو کچھ لگا گیا تھا۔

”دوسروں کی طرح سوچ کر کیا ہوگا، یہ مجھے معلوم ہے۔ سو میں اپنی طرح سے ہی سوچتے رہنا چاہتا ہوں۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے مسکراتے ہوئے خود کو معمول پر لٹا ہر کیا تھا۔

”ایک بات بتاؤ۔۔۔ تم جی لو گے میرب کے بغیر؟“ گی نے ایک ٹھوس بات پوچھی تھی۔

سردار فوری طور پر کچھ نہیں بولا تھا۔

گی کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔

اس کی خاموشی میں وہ ممتنی پنہاں تھے۔

گی کو کچھ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ تبھی وہ بھر پور یقین سے بولی تھی۔

”سردار سبکگین حیدر لغاری! وہ لڑکی تمہاری زندگی کا اہم اور ضروری ترین حصہ ہے۔ اور اس بات کا برا احساس تمہیں بھی ہے کہ وہ تمہارے لئے کتنی اور کس قدر ضروری ہے۔ تم خود بھی یہ بات جانتے ہو۔ لاشعور سے نگاہ چرانا چاہتے ہو۔ اپنے دل کو خود آپ رد کرنا چاہتے ہو۔ اس آواز کو سننے کی کوشش نہ کر رہے ہو۔“

مطلوبہ ریٹورنٹ کے سامنے سردار سبکگین حیدر لغاری نے کچھ بولے بغیر گاڑی روک دی تھی۔ اور گی اُسے کا منتظر ہو کر اسے خاموشی سے دیکھنے لگا تھا۔

”میرے ساتھ اندر نہیں آؤ گے؟“

”نہیں۔۔۔ کچھ مناسب نہیں لگتا۔ تم چلی جاؤ۔ میں تمہارا یہاں باہر انتظار کرتا ہوں۔“ سردار لغاری نے کہا تھا۔

”یہاں تک کہ میں نے گی کے لئے جو بھی کیا وہ میرا فرض تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اپنی ماؤ، لوگ باتیں کیجئے، مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔“ گی! میں تمہیں پک کر لوں گا۔ تم ٹائم بتا ایک گھنٹے بعد لے لوں؟“ سوالیہ نظروں سے گی کو دیکھا تھا۔ تبھی فیض بخاری بولے تھے۔

”میں واپسی پر چھوڑ دوں گا۔“

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے پُر خیال انداز میں سر ہلایا پھر پلٹ کر چلا ہوا ریٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔



دل بہت بوجھل تھا۔

مٹی یاد آ رہی تھیں۔

جی میں پتہ نہیں کیا آیا کہ وہ فارحہ آئی کی طرف آگئی تھی۔ گلے ملی تو کتنی دیر تک چپ چاپ بے آواز آ رہی تھی۔

فارحہ نے اس سے کچھ دریافت نہیں کیا تھا۔

جیسے وہ بہت سے اسباب پہلے سے جانتی تھیں۔

کتنی دیر تک میرب روٹی رہی تھی۔ فارحہ چپ چاپ اس کا سر تھکتی رہی تھیں۔ جی کا غبار دھل گیا تھا تو بے سراشا کران کی طرف دیکھا اور نکل ہی ہو کر بولی۔

”آپ کی یاد بہت آ رہی تھی۔ آپ نے تو بالکل ہی بھلا دیا۔“ شکوہ لبوں پر آ گیا تھا۔

فارحہ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

”میں آنا چاہتی تھی مگر مظر بھائی۔۔۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کیا کھاؤ گی؟ اتنی ازبجی ویسٹ کر اور رو کر۔۔۔ اتنی یاد آ رہی تھی تو فون کر دیا ہوتا۔۔۔ میں آ جاتی۔“ اس کے لئے فریج میں سے لانا کین نکالتی ہوئی وہ بولی تھیں۔

”آپ واقعی پاپا کی وجہ سے گھر نہیں آتیں؟“ میرب نے کسی قدر حیرت سے سراشا کر فارحہ کو دیکھا۔

”اب کچھ نہیں بولیں اور کین اس کی طرف بڑھاتے ہوئے نرمی سے مسکرا دی تھیں۔

”اپنی نانو کی طرف گئی تھی ٹو؟“

”نہیں۔۔۔ بہت دنوں سے نہیں گئی۔ کسی کو میری یاد نہیں آتی۔ کسی کے لئے میری کوئی اپورٹس لیا۔ سوچ لیا ہے۔ اب میں بھی کسی سے ملنے نہیں جاؤں گی۔ آپ کی طرف بھی آخری بار لائوں۔“ بچوں کی طرح خفا سی وہ شکوہ کر رہی تھی۔

فارحہ مسکرائیں۔

”صرف یہی بتانے آئی تھی؟“

”پاپا کو آپ سے کیا الجھن ہے آئی؟“

فارحہ جو مسکرا رہی تھیں، یک دم ہونٹ بھنج گئیں۔

”الجھن تو انہیں ہم سب سے ہے۔ بتایا تو تھا کہ وہ آپا کی موت کے بعد ہم سے ملنا پسند نہیں

”ایسا کچھ نہیں ہو رہا۔۔۔ آپ میرے ساتھ اندر چل رہے ہیں۔ سچ میں گین! بہت عجیب لگ رہا ہے۔ یوں اس طرح۔۔۔ مجھے اپنا سارا جسم بے جان سا لگ رہا ہے۔ پلیز تم میرے ساتھ اندر چلو۔“ گی بولی تھی اور وہ چپ چاپ اس کے ساتھ آ گیا تھا۔

”مجھے نہیں پتہ گین! کیا ہوگا؟“ ریٹورنٹ میں سردار سبکتگین حیدر لغاری کے ساتھ داخل ہوتے ہوئے وہ بولی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کا حوصلہ بندھانے کو بہت ہولے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ چونکی پھر مسکرا دی تھی۔

”دیکھیں گین! تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ تم نے واقعی بہت ساتھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ تم نے میرے لئے اپنی زندگی تک کو خطرے میں ڈال لیا۔ اگر آج تمہاری زندگی اس قدر الجھی ہوئی ہے تو اس میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ مگر تم نے کبھی مجھے اس بات کی وضاحت میرب کو دینے نہیں دی۔ نہ خود کچھ اسے بتاتے ہو نہ مجھے بتانے دیتے ہو۔۔۔ بہت عجیب ہو تم۔“ گی نے شکوہ کیا تھا۔

تبھی وہ آہستگی سے بولا تھا۔

”گی! زندگی میں ساتھ رہنا، ساتھ جینا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ ایک دوسرے کی خواہش کرنا، ایک دوسرے کے لئے جینا بھی اہم نہیں ہوتا۔ اہم ہوتا ہے ایک دوسرے کو سمجھنا۔ اگر ایک گزار کر بھی کوئی کسی کو سمجھ نہ سکے تو سب فضول ہے۔ اپنی ماؤ، تمہارے مسٹر بخاری دکھائی نہیں دے رہے شکل تو یاد ہے نا تمہیں ان کی؟“ سردار سبکتگین نے ایک چھوٹا سا مذاق کیا تھا۔

گی نے اسے مصنوعی خفگی سے دیکھا تھا۔ پھر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔ اور بالآخر ان کی نگاہ ایک شخص پر رک گئی تھی۔

”وہ رہے۔۔۔!“ گی نے ہاتھ کے اشارے سے کہا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس نظروں کا تعاقب کیا تھا اور نگاہ لمحہ بھر کو ساکت رہ گئی تھی۔

”ازبجی مسٹر بخاری۔۔۔؟“ کسی قدر حیرت سے وہ بولا تھا۔

گی اتنی مگن تھی کہ کسی قسم کی حیرت کی پرواہ کئے بغیر سر اثبات میں ہلا گئی تھی۔

”آؤ۔“ گی آگے بڑھنے لگی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری کچھ دیر تک یوں ہی کھڑا رہا تھا پھر آہستگی سے آگے بڑھادیئے تھے۔

”کیسے ہیں آپ بخاری؟“ گی نے مسکراتے ہوئے اس شخص کو دیکھا تھا۔

بخاری صاحب مسکرا دیئے تھے۔ گی، گین کے آنے کی منتظر تھی۔ وہ آ رہا تھا۔ تبھی اس کا تعارف کرا ہوئے بولی تھی۔

”گین! ابی از مسٹر بخاری۔ ڈاکٹر فیض بخاری۔ اور بخاری! ابی از سردار سبکتگین حیدر لغاری۔ میسٹ فرینڈز۔“ گی نے تعارف کرایا تو گین۔ نہ ہاتھ ملایا۔ تبھی فیض بخاری بولے تھے۔

”گی بتا رہی تھی، آپ نے بہت ہی سچ کی اس کی۔ اس کے لئے میں آپ کو ٹھیکس کہوں گا۔“

کرتے۔ کیونکہ وہ آپا کی موت کا ذمہ دار نہیں سمجھتے ہیں۔“ فارحہ نے بتایا تھا۔

”بس۔۔۔ صرف یہی وجہ ہے؟“ میرب نے سراٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

فارحہ کچھ دیر تک خاموش رہیں، پھر آہستگی سے بولیں۔

”ابھنوں کو بڑھانے کے لئے جواز ضروری نہیں۔ تم بتاؤ، اتنا روکیوں رہی تھیں؟“ فارحہ اس کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔

”بس یوں ہی۔۔۔ دل چاہ رہا تھا۔“ میرب نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

”ایسے ہی کیوں؟“ فارحہ نے جواب چاہا تھا۔

”بس دل عجیب سا ہو رہا تھا۔“ دردا بتا بڑھا تھا کہ سنبھالنا مشکل تھا۔ میرب کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔

”آئی! آپا میری شادی ختم کر رہے ہیں۔“

”کیا۔۔۔؟“ فارحہ حیران رہ گئی تھیں۔ ”لیکن وہ ایسا تمہاری مرضی کے بغیر کیسے کر سکتے ہیں؟“

”انہیں لگتا ہے کہ میں خوش نہیں ہوں۔“

”اور تم؟“ فارحہ آئی نے اس کی طرف دیکھا تو میرب سر جھکا گئی تھی۔

”آئی! میرے ساتھ بہت عجیب ہوا۔۔۔ زندگی نے میرے ساتھ سب کچھ عجیب کیا۔ پہلے میں

اس رشتے کے لئے تیار ہی نہیں تھی۔۔۔ وقت نے مجھے پابند کر دیا۔۔۔ میں اس رشتے کو بوجھ سمجھتی

تھی۔ اتار کر پھینک دینا چاہتی تھی۔ اور پھر۔۔۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ معنی بدل گئے۔۔۔ کب اس

رشتے سے مجھے آنسیت ہوئی۔۔۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی۔۔۔ پتہ ہی نہیں چلا۔۔۔ خبر اب ہوئی جب

میں اس رشتے سے علیحدہ ہو رہی ہوں۔۔۔ اب میں علیحدگی نہیں چاہتی۔ میں آنکھیں بند کر کے جی رہی

تھی آئی!۔۔۔ محبت کا کہیں ذکر نہیں تھا۔۔۔ اور سردار سبکدین حیدر لغاری کے لئے تو بالکل بھی نہیں۔

مگر حوالے کب چینیج ہوئے مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ کیسے ہوئی یہ محبت۔۔۔ آہستہ آہستہ۔۔۔ وہ سر جھکا لے

مدھم لہجے میں کہہ رہی تھی۔ فارحہ چپ چاپ اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔ نظروں میں کچھ حیرت تھی۔

اور حیرت تو اذہان حسن بخاری کی آنکھوں میں بھی تھی جو قدرے فاصلے پر کھڑا تھا۔

غافلگاہ اسی ساعت وہاں آیا تھا۔ مگر چہرے کا ری ایکشن بتا رہا تھا، وہ سب کچھ سن چکا تھا۔

فارحہ کی نگاہ بیٹے پر گئی تھی۔

تجلی نظروں کے تقاب میں میرب نے دیکھا تھا۔ مگر کچھ بولی نہیں تھی۔

اذہان چپ چاپ آگے بڑھ آیا تھا۔

اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

”کیسی ہو تم؟“ کچھ دشوار ہو رہا تھا خود کو سنبھالنا۔ مگر وہ اتنا کمزور ہرگز نہیں تھا۔

میرب مسکرائیں سکی تھی۔

”ٹھیک ہوں۔“ بہت مدھم لہجے میں بولی تھی۔ ”اور تم۔۔۔؟“

اذہان مسکرایا تھا۔

”بس فٹ فاٹ۔۔۔ اپنی رخصتی کا دعوت نامہ دینے آئی ہو کیا؟“ وہ ہر شے معمول پر ظاہر کرنا چاہتا

کسی قدر بے تاثر بھی۔ تجھی مذاق کرتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”نہیں۔۔۔ میں فارحہ آئی سے ملنے آئی تھی۔“ میرب آہستگی سے بولی تھی۔

”صرف فارحہ آئی سے؟ ہم سے نہیں؟“ اذہان حسن بخاری نے شکوہ کیا تھا۔

”مجھے کیا پتہ تھا تم اچانک آ نکلو گے۔“ میرب نے دوستانہ انداز میں کہا تو اذہان مسکرایا۔ مگر انداز

پھینکا تھا۔

”ہاں۔۔۔ مجھے بھی خبر نہیں ہوئی تھی کہ گھر میں تم آ چکی ہو۔“ اذہان نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ

مسکرا دی تھی۔

”تم دونوں بیٹھ کر باتیں کرو۔ میں چائے لے کر آتی ہوں اور ساتھ میں کچھ کھانے کو بھی۔“ فارحہ کے

ہاں منظر کو دیکھتے رہنا مشکل تھا شاید۔ تجھی وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ میرب سر جھکا لے بیٹھی تھی۔

اذہان اس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔

”اور کیا چل رہا ہے؟“ مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

میرب نے سراٹھا کر اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ اپنے میاں سے جھگڑا ہو گیا ہے تمہارا؟“ وہ مسکرایا تھا۔ صورت حال کو اپنے اختیار

ظاہر کرنا چاہ رہا تھا اور دوسرے معنوں میں وہ میرب کو بھی اس شرمندگی سے بچانا چاہتا تھا جو اسے فیمل

اس صورت حال میں کہ وہ اس کے متعلق سب جان چکا ہے۔

”تم جان چکے ہو نا سب؟“ میرب نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ جو مسکرا رہا تھا، چہرے

بازاں ایک دم بدل گئے تھے۔ لب بھینچے ہوئے اسے دیکھا تھا اور نگاہ پھیر گیا تھا۔

”تم اپنے ذمہ بھی اب مجھ سے بائٹنا نہیں چاہتی ہو تو میں کیا کروں؟۔۔۔ تم نے تو ایک دم ہی پرایا

پایا۔“ اذہان نے شکوہ کیا تھا۔

میرب کچھ نہیں بول سکی تھی۔

”تمہیں لگتا تھا اب میں تمہیں تسلی بھی نہیں دے سکوں گا؟“

”نہیں۔۔۔ مجھے ایسا کچھ نہیں لگا تھا۔“ میرب نے اس کی طرف دیکھے بغیر نفی میں سر ہلایا تھا۔

”تو پھر؟۔۔۔ تمہیں لگا تھا۔۔۔ تمہارا مان ٹوٹ جائے گا۔۔۔ یا پھر تم خود کو کمزور ثابت کرنا

چاہتی تھیں۔“ اذہان نے جواز تلاشے تھے مگر میرب نے سرنفی میں ہلا دیا تھا۔

”اذہان! ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ بس میں بہت پریشان تھی اور تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

یہ تھا تم سن کر اپ سیٹ ہو جاؤ گے۔“

اور تم جو اتنی پریشان ہو، اس کا کیا؟“

میری پریشانی تو ختم ہونے جا رہی ہے اور.....“

تم ایسا نہیں چاہتی نا؟“ اذہان نے اسے دیکھا تھا۔

پ کی مرضی، آپ کا چاہنا اپورٹ نہیں ہوتا۔ زندگی میں پہلی بار میں خود کو اتنا بے بس محسوس کر
 دل اور وہ۔۔۔ وہ تو یہ تک نہیں مانتا کہ ایسا میں نے نہیں کیا۔ میں اس سے دوری نہیں چاہتی۔ وہ
 نہ اس حد تک بدظن ہے کہ اسے لگتا ہے، میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔ جو بھی ہوا ہے اس میں میری
 مثال ہے اور یہ سب میں نے ہی کیا ہے۔ تم جانتے ہو اذہان! میں کتنی بے بس ہوں؟۔۔۔ اتنے
 سے سو نہیں پائی میں اور.....“

بہت بدتر شخص ہے وہ۔۔۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ایک رسید کرتا اس کے۔ انتہائی بے وقوف
 ہے وہ۔۔۔ محبت ہے یا نہیں۔۔۔ اس کے لئے بتانا ضروری نہیں ہوتا۔ ایسی باتیں خود بخود سمجھ
 نائیں۔ اور اگر وہ شخص اتنا ہی زیادہ بے وقوف ہے اور سمجھنے کو تیار نہیں تو آپ انہیں بتادیں۔ بات
 نے پھر ان کی ضرورت نہیں۔ سیدھا ان کے پاس جائیے اور صاف کہہ دیجئے۔ پھر جو ہوسو ہو۔۔۔
 تم آپ کے دل میں کوئی ملال تو نہیں رہے گا۔ اور یوں بھی ایسا کرنے کے بعد جو بھی ہوگا،
 پہلے والی کیفیت سے پھر بھی بہتر ہوگا۔ تم اس سے جا کر کہہ دو۔“ اذہان نے مشورہ دیا تھا۔
 سے جوتا آسان اور سیدھا دکھائی دے رہا تھا، درحقیقت تھا نہیں۔ میرب بھیگ آنگھوں سمیت
 آئی تھی۔

ان آنگھوں سے آنسو بہانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے میرب! اس طرح رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔“
 نے جیب سے رومال نکال کر اس کے سامنے کر دیا تھا۔

رب سیال کی نظروں میں وہ منظر گھوم گیا تھا۔ جس میں وہ تھی۔ اور سردار سیگلین حیدر لغاری!
 آنسو نہیں دیکھ سکتا وہ میرے۔۔۔ اور مجھے اتنا درد دے رہا ہے۔“ دل کی بات لبوں سے بے
 میں پھسل پڑی تھی۔

ہان حسن بخاری نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔

رب کو بھی ایک دم احساس ہوا تھا۔

رٹھانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

بدم ایک شرمندگی نے آن گھیرا تھا۔

انگل سی ہو گئی تھی۔

ماٹھس کو ترچھی نظروں سے دیکھا تھا۔

ہان حسن بخاری اس کی طرف سے دانستہ نگاہ پھیر گیا تھا۔ پھر اٹھا۔ اور چلتا ہوا اندر کی جانب

رب سیال کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔



دار سیگلین حیدر لغاری نے رومیا لغاری کی کئی سال پرانی ڈائری الماری سے نکالی تھی۔ اسے یقین
 پھر بھی ایک بار اپنی تسلی کر لینا چاہتا تھا۔

میرب جو سر جھکائے بیٹھی تھی، سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا، پھر سرنگی میں ہلا دیا تھا۔
 ”اگر ایسا نہی چاہتی تو پھر ایسا ہونے کیوں دے رہی ہو؟۔۔۔ یو کون میڈ؟“ اذہان حسن بخاری نے
 اسے برہمی سے دیکھا تھا۔

”یہ اتنا آسان نہیں ہے اذہان!“ وہ بے بسی سے بولی تھی۔

”کیا آسان نہیں ہے، تم میں ہمت نہیں ہے؟۔۔۔ بچی ہو؟۔۔۔ ادو، کم آن میرب! یہ بچو پانچ
 کہیں چھوڑ دو تم۔ اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنا سیکو۔ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو تم۔ کیا مشکل۔
 تمہارے لئے؟“ اذہان نے اسے ڈپٹا تھا۔

”تم نہیں سمجھو گے اذہان!“ وہ بے بس دکھائی دی تھی۔

”کیوں نہیں سمجھوں گا؟۔۔۔ تم سمجھاؤ تو۔۔۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں کوئی بہترین حل تمہیں نہیں
 دے سکوں گا؟“ وہ بولا تھا۔

میرب نے اسے کسی قدر خشکی سے دیکھا تھا۔

”تم ہر شے اٹنی لے رہے ہو اذہان!۔۔۔ میں نے تمہیں نہیں بتایا تو اس کا مطلب ہرگز نہیں یہ
 تھا کہ تم میرے ساتھ سینئر نہیں ہو یا مجھے کوئی اچھا مشورہ نہیں دے سکتے۔ تم صرف یہ سمجھ نہیں پا رہے ہو
 مشوروں کی ضرورت تو مجھے تب ہو جب میرے ہاتھ میں کچھ ہو۔۔۔ اور میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے
 میں اس معاملے میں کسی اور طرح کی ہوں۔۔۔ دور سے کھڑی صرف دیکھ رہی ہوں اور بے بس ہوں
 مجھے نہیں پتہ اس سے آگے کیا ہوگا۔“ میرب نے بے بسی سے کہا تھا۔ آواز بھرا گئی تھی۔

”تمہیں ایسا اس لئے نہیں پتہ کیونکہ تم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑی رہنا چاہتی ہو۔۔۔ تم یہ سمجھنا
 دو کہ یہ معاملہ کسی اور کا ہے۔ یہ سوچو گی تو پھر تم دور بے فکر رہ کر صرف دیکھتی نہیں رہو گی، اس معاملے
 کو دو گی اور اپنا معاملہ حل بھی کر دو گی۔“ اذہان نے اسے اکسایا تھا۔

مگر اس میں کوئی تحریک دکھائی نہیں دی تھی۔

”اذہان! تم ایسا کہہ رہے ہو۔۔۔ کیونکہ تم اب بھی وہ سب کچھ نہیں دیکھ رہے جو میں دیکھ
 ہوں۔“

”معاملہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟۔۔۔ چاہتی کیا ہو تم؟“ اذہان نے تنک آ کر کہا تھا۔

”اسے چاہتی ہوں۔۔۔ آئی لوہم۔۔۔ مگر وہ مجھے نہیں چاہتا۔۔۔ وہ شخص میرے لئے ضرور
 ہے۔ کیونکہ وہ میری زندگی میں ہر طرف ہے۔۔۔ ہر جگہ ہے۔۔۔ مگر میں اس کی زندگی میں کہیں
 ہوں۔ میری جگہ کہیں بھی نہیں ہے۔ ایک فضول شے کی طرح ہوں میں اس کی زندگی میں۔ میرے ہو۔
 نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔“ آنگھوں میں رکا سارا سنگین پائل
 توڑ کر باہر نکل آیا تھا۔

اذہان حسن بخاری اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے پہلی بار پتہ چلا اذہان! کہ سب کچھ ہونا اور کچھ نہ ہونا کیا ہوتا ہے۔ اور۔۔۔ اور یہ کہ

ڈائری کھولی تھی۔

ڈاکٹر فیض بخاری کی ایک تصویر ڈائری سے پھسل کر نیچے کارپٹ پر جا پڑی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے جھک کر تصویر اٹھائی تھی اور بغور دیکھا تھا۔
فیض بخاری ہی وہ شخص تھا جو رومیسا لغاری کی زندگی میں کبھی موجود رہا تھا۔ جس کا انتظار رومیسا لغاری نے ساری زندگی کیا تھا۔

رومیسا لغاری کی یہ چند دی ہوئی چیزیں اس لئے تھیں کہ وہ ان چیزوں کو آگے پہنچا سکے۔ اس مضمون تک۔ لیکن اسے نہیں لگتا تھا کہ اب ان کی ایسی کوئی ضرورت باقی رہی تھی۔
”کیا ہوا؟“ کیا کر رہے ہو تم؟“ گی اس کے کمرے میں کھٹکا کئے بغیر آگئی تھی۔ وہ اس تصویر کو چھپا بھی نہیں سکا تھا اور شاید چھپانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

گی قریب آ چکی تھی اور اس کے ہاتھوں میں بدستور وہ تصویر موجود تھی۔
”کیا ہے یہ؟“ دکھاؤ۔ میرب کی تصویر ہے؟“ ارے، یہ تو مسٹر بخاری ہیں۔
ان کی تصویر تمہارے پاس کیسے آئی؟“ گی کچھ حیران ہوئی تھی۔
سردار سبکگین حیدر لغاری بہت آہستگی سے گویا ہوا تھا۔
”یہ تمہارے مسٹر بخاری ہی ہیں مگر.....“
”مگر کیا؟“ گی چونکی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری چند لمحوں کو چپ ہوا تھا پھر قدرے توقف سے بولا۔
”شاید یہ بات تمہیں کچھ دکھ دے۔ مگر جو فیض بخاری آج تمہاری زندگی میں اہم ہیں انہیں یہ بخاری کل کسی اور کی زندگی میں اہم رہ چکے ہیں۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری کا لہجہ مدہم تھا۔
”کس کی زندگی میں؟“ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ گی قطعاً سمجھ نہیں پائی تھی۔
”آؤ۔۔۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے اس کے ہاتھ سے تصویر اٹھائی اور اسے لے کر چلتا ہوا باہر آ گیا تھا۔

”بات زیادہ طویل نہیں ہے۔“ اسے لے کر بیرونی اسٹیئر ز پر بیٹھتے ہوئے وہ گویا ہوا۔ خزاں کے درختوں پر سے ٹوٹ کر گرتے ہوئے بھلے لگ رہے تھے۔
گی اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ اس کے بولنے کی منتظر تھی۔

”رومیسا کے بارے میں جانتی ہوتا تم۔ فیض بخاری واز بی لونگ ٹوہر۔۔۔ رومیسا جس شخص سے محبت کرتی تھی، وہ فیض بخاری تھے۔ یہی فیض بخاری۔ ساری بات یہ۔ کسی کا بھی کل کیا ہو سکتا ہے۔ آج اہم ہوتا ہے۔ کل نہیں رہتا۔ سوکل نہیں رہا۔ کل تھی۔ ختم ہوگئی۔ مگر فیض بخاری تمہارا آج ہیں۔ وہ تم سے جو بھی رشتہ یا تعلق بناتے ہیں وہ آج ہوگا۔“

سردار سبکگین حیدر لغاری نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”مجھے یہ سب چیزیں رومیسا نے اس لئے دی تھیں کہ میں انہیں فیض بخاری کو دے دوں۔ مگر شاید ان کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جب ایک نئی زندگی نئے حوالوں سے شروع ہوورہی ہو تو پھر باقی کسی لے کی یاد کر کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ مگر اس نے سر اثبات میں ہلانے کی بجائے انکار میں ہلا دیا تھا۔
سردار سبکگین حیدر لغاری نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہے ہو۔“ اس کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ بڑا رسمی سا انداز تھا۔
”کیا مطلب؟“ اب کے سردار سبکگین حیدر لغاری چونکا تھا۔
وہ دھیسے سے مسکرائی۔ پھر رسائیت سے بولی۔

”ہم میں ایسا کچھ نہیں ہے گین!“

”کیا۔۔۔؟“ وہ چونکا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ سب جو ہوا، وہ بس جذباتی لمحوں کی ایک چھوٹی سی کہانی تھی۔ ت میں بھی جانتی تھی اور فیض بخاری بھی۔“

”تو پھر تم فیض بخاری کو اس طرح ڈھونڈ کیوں رہی تھیں؟“ سردار سبکگین حیدر لغاری بول رہا تھا جب نے بات درمیان میں کاٹی تھی اور بولی۔

”آئی ڈونٹ سے ریٹ آئی لوہم۔۔۔ آئی ڈونٹ سے ریٹ ایور۔“ وہ رسائیت سے مسکرا رہی

”تو پھر وہ سب؟“

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔ مجھے فیض بخاری سے محبت کبھی نہیں رہی۔ میں صرف انہیں اس لئے تلاش ہی کی کہ انہیں بچے کے بارے میں بتا سکوں۔ ایسا نہیں تھا کہ میں اس بچے کی اکیلے ذمے داری نہیں لے لیا اسے پال نہیں سکتی۔ مگر میں صرف اس بچے کو ایک نام دلوانا چاہتی تھی۔ معاشرے میں وہ مقام جو اجازت حق ہے۔ دوسرے فیض بخاری کو بھی اس بات سے آگاہ کرنا چاہتی تھی کہ ان سے وابستہ شے اس دنیا میں آ رہی ہے۔ ان سے مل کر، انہیں بتا کر میں ایک ذمے داری سے آزاد ہونا لگا۔ ایک فرض پورا کرنا چاہتی تھی۔ اور وہ میں نے آج کر دیا۔ میں اگر انہیں تلاش کر لوں اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے ان سے محبت تھی۔ یا مجھے ان سے شادی کرنا تھی۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔“

لہذا ان سے کہتی ہوئی پراعتقاد انداز میں مسکرا رہی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری نے اسے بغور حیرت سے دیکھا تھا۔

”کی عجیب لڑکی تھی وہ۔“

”محبت کی بات کرتی تھی۔“

”محبت کا ذکر اس کے لبوں پر رہا تھا۔“

”محبت کو ڈی فنڈ کیا تھا اس نے۔“

سردار سبکتگین حیدر لغاری کے مقابل تک وہ محبت کے لئے لڑتی رہی تھی۔

اور آج!

سردار سبکتگین حیدر لغاری اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ اسے سطر سطر پڑھ رہا ہے اور وہ شرمندہ ہوئے بغیر مسکرا دی تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا اچانک بدل گئی ہوں میں؟“ دریافت کیا تھا۔ مگر سردار سبکتگین حیدر لغاری نے سرائکار میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ بدلی نہیں ہو۔ سمجھ میں اب آئی ہو۔“

”تم حیران ہو رہے ہو میں یہاں کیوں تھی؟۔۔۔ کیوں آئی تھی؟۔۔۔ کیوں اتنا عرصہ رہی؟“ بولی تھی۔

”نہیں۔۔۔ مجھے ایسی کوئی حیرت اب نہیں ہو رہی گی!۔۔۔ ایسی کوئی حیرت مجھے نہیں ہے۔ سردار سبکتگین حیدر اس کی بات کاٹ کر بولا تھا۔

”محبت صرف اپنے بارے میں سوچنا نہیں ہے گین!۔۔۔ محبت دوسروں کے بارے میں بھی طرح سوچنے کا نام ہے۔ اگر میری طلب اہم ہے، میری ضرورت اہم ہے تو کسی دوسرے کی طلب بھی اہم اور خاص ہے۔ اس کی ضرورت بھی اسی قدر شدید ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی بات سمجھ لینے سے مجہ خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے اور۔۔۔!“

سردار سبکتگین حیدر لغاری اس کی طرف دیکھے بغیر اٹھنے لگا تھا۔ جب گی نے اس کے ہاتھ پر اپنا بہت آہستگی سے رکھ دیا تو اس نے کسی قدر حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

مگر وہ بہت دھیمے انداز میں مسکرا دی تھی۔

”تمہیں یاد ہے گین! جب ہم پہلی بار ملے تھے۔۔۔ اس وقت بھی درختوں سے چتے یوں رہے تھے۔۔۔ یہی موسم تھا اور۔۔۔ اور میں نے تمہارے قریب رک کر تم سے یہی کہا تھا کہ مجہ موسم بہت اچھا لگتا ہے۔۔۔ مجھے آج بھی یہ موسم اچھا لگتا ہے گین! میں اس موسم میں جی سکتی ہوں۔“

خوشی۔۔۔ کیونکہ میرے نزدیک محبت صرف بڑھا ہوا ہاتھ نہیں ہے۔ محبت نوازنے والا ہاتھ ہے۔ دہاتھ ہے۔ دے کر کبھی کبھی اتنی خوشی ہوتی ہے کہ اتنی کچھ لے کر بھی نہیں ہوتی۔۔۔ اور میں میرے پاس تو یوں بھی دینے کو کچھ نہیں۔“ آہستگی سے ہاتھ پھیلا کر بغور ہاتھوں کو دیکھا تھا۔

”میں کل بھی خالی ہاتھ تھی۔۔۔ وقت نے مجھے کچھ دیا ہی نہیں تھا کہ کسی کو تو ازنی۔ ایسا کیا نہیں جس سے دستبردار ہوتی۔ کسی شے پر میرا حق کبھی تھا ہی نہیں۔“

”اور اس کے باوجود تم یہ سوچتی ہو کہ محبت پھیلا ہوا ہاتھ نہیں ہے۔ محبت صرف دینے کا نام ہے۔۔۔ میں ایسا سوچ کر خوش ہوتی ہوں۔۔۔ مجھے خوشی محسوس ہوتی ہے یہ سوچنے ایک شے پر میرا حق ہو بھی سکتا تھا۔ مگر ہوا نہیں۔ کیونکہ میں نے ایسا چاہا نہیں۔“ وہ یک دم ہنس

انسانہ تھا وہ بات کو مذاق میں اُڑا دینا چاہتی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری اسے اب بھی متواتر دیکھ رہا تھا۔ گی اس کے لئے نہ سمجھنے والا عمرہ رہی تھی۔

وہ یہاں محبت کے لئے آئی تھی۔

اُسے محبت کی تلاش تھی۔۔۔ اور۔۔۔!

اگر فیض بخاری کبھی اس کی محبت رہا ہی نہیں تھا تو پھر؟۔۔۔ پھر کون تھا اس کی محبت؟

کس کی خاطر یہ جنوں کا سودا ہوا تھا۔۔۔؟؟

کس کی خاطر یہ اضطراریاں تھیں۔۔۔؟؟

یہ نگاہیں کس کی پیاسی تھیں۔۔۔؟؟

سردار سبکتگین حیدر جیسے شخص نے سمجھنے میں اتنی دیر کیوں کر دی تھی؟۔۔۔ وہ کیوں سمجھ نہیں سکا تھا۔

”گین! بعض اوقات انسان بالکل بھی سمجھ نہیں پاتا کہ اسے کس شے کی ضرورت ہے۔ نگاہ کے اٹنے کچھ اور ہوتا ہے اور وہ تلاش کچھ اور کر رہا ہوتا ہے۔ مگر تمہارے معاملے میں، میں ایسا نہیں

اٹتی۔“ گی نے اپنا خدشہ بیان کیا تھا۔

وہ سردار سبکتگین حیدر لغاری کی سمت دیکھ رہی تھی۔ بھر پور توجہ سے۔ انداز خیر خواہی لئے ہوئے تھا۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ سردار سبکتگین حیدر لغاری کی خیر خواہ تھی۔ اس کی بھلائی چاہتی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری بھی یہ بات جانتا تھا۔

کئی بار وہ اسے میرب کے لئے قائل کر چکی تھی۔

اس کا دل شفاف تھا۔

شفاف آئینے جیسی تھی وہ۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری کو ایک لمحے میں اس چہرے پر بہت ترس آیا تھا۔

ایک لمحے میں اس سے گہری ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔

محبت کا ایک روپ تھی وہ۔۔۔ اور۔۔۔!!!

”محبت کرتی ہو مجھ سے؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے دریافت کیا تھا۔

گی نے اسے بھر پور حیرت سے چونک کر دیکھا تھا۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اپنی بات دہرائی تھی۔

”محبت کرتی ہو مجھ سے۔۔۔؟“

لفظوں میں بازگشت سی تھی اور گی اس شخص کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

کچھ لمحوں تک وہ واقعی ساکت رہ گئی تھی۔

پھر اس تاثر کو زائل کرنے کو دوسرے ہی پل مسکرا دی تھی۔

”یا گل ہو گئے ہو گین؟“ بہت پھینکی سی مسکراہٹ تھی۔

یہ کیسی فضول کی باتیں کر رہے ہو تم؟۔۔۔ تم میرب کی طرف گئے تھے، کوئی بات ہوئی ہے

اُس سے؟“

محبت

ایک ان کبھی سی چپ

اور اس ایک چپ میں

جلتے ہوئے کئی خواب!

سردار سبکدین حیدر لغاری کچھ نہیں بولا تھا۔ اُسے چپ چاپ دیکھتا رہا تھا۔

جبھی وہ دوبارہ مسکرا دی تھی۔

”گین! ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں میں، سنا نہیں؟“

گین نے سر نگی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔ دیکھ رہا ہوں۔“ لہجہ مدہم تھا۔

”کیا؟“ بہت دھیمی آواز میں وہ بولی تھی۔

”محبت۔“ جواب مختصر سا تھا اور مدلل بھی۔

”محبت؟“ وہ چونکی تھی۔ پھر مسکرا دی تھی۔ انداز نالنے والا تھا۔ ”کہاں ہے محبت؟“ جیسے وہ جان بوجھ

کر نظر انداز کر رہی تھی۔

”کچھ خواب بھی ہیں!“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کی بات کا جواب دیئے بنا آگے کہا تھا۔

”خواب؟“ وہ چونکی تھی۔

”ہوں۔ کچھ جلتے بچتے خواب۔ اتنا کچھ چھپانا کب سے آگیا گی؟“ وہ وضاحت

طلب کر رہا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم گین؟ اسنو پڑ ہو۔ میں کیوں چھپانے لگی کسی سے کچھ؟“

میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے؟ میرب سے ملے یا نہیں؟ اس سے کچھ کہا یا نہیں؟“

دانستہ نگاہ چرا رہی تھی۔

جیسے اس کا بہت بڑا تصور ہو۔

خود پر قابو پانا جانتی تھی وہ۔ بہت بہادر لڑکی تھی یقیناً۔

سردار سبکدین حیدر لغاری اسے بغور تکتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”گی!“ پھر کچھ مزید بولے بنا اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ”تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں

ہے گی!۔ محبت کوئی گناہ نہیں۔ اس اے ٹرو فیلنگ۔ اس پر زور نہیں ہوتا۔“

گی اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔

محبت ان کے لفظوں میں

چھپا ایک راز ہے گہرا!

جیسے گہرے سمندر میں

اچھا ایک قیمتی موتی

لفظوں سے عیاں نہ ہو۔!

لفظوں میں بیاں نہ ہو۔!

کہانی مضطرب سی اک

قصہ لایمان سا اک

سمجھنے کو، سمجھانے کو

دل کا ہونا ضروری ہے!!

”گین!۔ تمہیں زندگی کو سنجیدہ لینے کی عادت اب تک نہیں ہوئی؟“

”نہیں۔“ اس نے سعادت مندی سے اقرار کیا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے تم سے پوچھا میرب سے ملے یا نہیں؟ بات ہوئی یا نہیں

۔“

”میں تمہارے بارے میں بات کر رہا تھا گی!“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اسے ایک لمحے میں چپ

پا تھا۔

”ٹٹ اپ گین!۔ تمہاری اپنی بھی کوئی زندگی ہے۔ اس کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے؟

لے بارے میں سوچو۔“

اور تم۔ تم دوست ہو میری گی!۔ یو آر آلسوا اپورٹنٹ فورمی۔“

ہاں۔ مگر تمہاری زندگی سے زیادہ نہیں۔ یو ہیو ٹو نیڈ جسٹ کونسٹریٹ آن یور لائف۔“ گی نے

ٹورہ دیا تھا۔

لرہہ جواباً کچھ نہیں بولا تھا۔



کیا تھی محبت! —

کیا یہی —؟

کسی کی لگن میں جلتے ہوئے!

اس کے آنسو پونچھنا!

اس کے دکھ کو اپنی پوروں پر لینا!

اذہان حسن بخاری ساکت سا کھڑا تھا۔ اور وہ اس کے شانے پر سر دھرے اپنے آنسو بہا رہی تھی۔

اذہان کی آنکھوں کے موسم پر سکوت تھے — ٹھہرے ٹھہرے، رُکے رُکے!

محبت کو میں نے دیکھا ہے! —

چپ چاپ چلتے ہوئے

اپنی ہی آگ میں جلتے ہوئے

کچھ کہتے ہوئے

نہ سنتے ہوئے

محبت کو میں نے دیکھا ہے! —

چپ چاپ ہاتھ ملتے ہوئے

خواب سجا کر آنکھوں میں

کسی کی راہ تکتے ہوئے!

بس اپنی لگن میں جلتے ہوئے!

میں نے دیکھا ہے! —

محبت کو بہت قریب سے دیکھا ہے!

”میرب! — سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔ اس بار تم وقت سے نہیں بارو گی۔“ ار

کے آنسو پونچھتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

میں نے دیکھا ہے محبت کو

شب بھر جاگتے ہوئے

روتے ہوئے! —

محبت کو میں نے دیکھا ہے!

”اذہان! میں اسے جانتی ہوں — وہ جو سوچتا ہے، وہ کر کے رہتا ہے۔ شان لی تو بس شان

لی۔ بہت اتنا پرست ہے وہ۔ بہت زیادہ ایگولنسٹ — دوسری بات، اذہان! ہی ڈونٹ لومی —

اسے محبت نہیں ہے۔ سو وہ اس رشتے کو لے کر میری طرح نہیں سوچتا۔ اس کے لئے

کچھ نہیں ہوں — کچھ بھی نہیں — یہ رشتہ اس کے لئے توڑنا بہت آسان ہے اذہان! —

کیونکہ یہ رشتہ ہمیشہ اس کے لئے ایک بوجھ جیسا رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ رہی — اور اے

بھی رہی — بہت پاس رہی — اور کبھی پابھی نہیں سکی — قریب رہ کر بھی بہت دور رہا وہ

ہے۔ وہ کبھی میرا نہیں رہا — جانتی ہوں میں، اس کی توجہ ہزار راستوں میں — ہزار سمتوں

ہائی ہوئی ہے — اس کی کوئی سمت بھی میری سمت نہیں آتی۔ میں اس کے راستوں میں نہیں

ن اذہان! — نہ میں اس کی منزل ہوں — جانتی ہوں میں — سب جانتی ہوں۔ مگر دل

کہ.....“ آنکھیں چھلکی تھیں اور اس نے سر انکار میں ہلا دیا تھا۔

”دل نہیں مانتا — وہ پل پل مارتا ہے — مگر پھر بھی اس کی حمایت کرتا ہے۔ میں کبھی اس

خلاف نہیں سوچ سکی — سوچ بھی نہیں سکتی اور — جی بھی نہیں سکتی — کانٹ —

ن لیو وڈ آؤٹ ہم —! —“ عجب اک بے بسی۔ یک دم سے آنسوؤں کے درمیان وہ بولی تھی اور

پلتی ہوئی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔

اذہان حسن بخاری چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

دلوں کے درمیان اب

کچھ رہا تو نہیں لیکن

محبت اک مسئلہ بن گئی ہے

الٹھکتی ہے نہ سلجھتی ہے

اک بچی ڈور بن گئی ہے

اسے یہ ضد کہ اب میں بلاؤں

مجھے یہ ضد کہ وہ دور کیوں گئی ہے

دل یہ کہتا ہے فون کر لوں

مگر اتنا درمیان میں کھڑی ہے۔

”سینکٹین! — بچے! کوئی کام نہیں تو گاڑی نکالو۔“ مائی نے سیڑھیاں اتر کر اس کی طرف آتے

ئے کہا تھا۔ وہ جو چائے کے ساتھ سگریٹ کے گہرے کش لیتے ہوئے بڑے ریلیکسنگ انداز میں

پڑھ رہا تھا، چونکا تھا پھر سگریٹ فوراً الیش ٹرے میں مسل دی تھی۔ مائی کا اتنا احترام تو تھا۔

مائی نے سگریٹ مسلنے والی حرکت کو نہیں مگر اُسے بخور دیکھا تھا۔

”کیا ہوا؟ — آپ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں مائی؟“

”یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے اپنی؟ — ٹھیک تو ہے تو؟“

”میں ٹھیک ہوں مائی! — آپ کہیں جانے کا کہہ رہی تھیں؟“ گین نے اپنی طرف سے توجہ

لے ہوئے اصل مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی تھی۔

”ہاں — میرب کی طرف جانا تھا۔ رخصتی کی بات کرنے۔ لیکن یہ تم اتنے اُلجھے اُلجھے سے

ناکھائی دے رہے ہو؟ — کیا مسئلہ ہے؟“ مائی نے اُسے جاچتی نظروں سے دیکھا تھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ اتنی صبح سویرے کیوں جا رہی ہیں؟ — آئی مین شام میں چلی جائے گا۔ پھر آج چھٹی ہے۔“ گین نے اپنی دانست میں خاصا معتقول جواز دیا تھا۔

”دونج رہے ہیں گین! — یہ صبح نہیں ہوتی۔ اور پھر کس نے کہا یہ کہ چھٹی والے دن کسی کے گھر جانا منع ہے؟ — اور میں کسی غیر سے نہیں، اپنی بہو سے ملنے جا رہی ہوں۔ تم مجھے اس کے لئے منع نہیں کر سکتے۔ اٹھو اور گاڑی نکالو۔ — ورنہ ڈرائیور سے کہہ دو۔“ مائی نے دونوک کہا تھا۔

گین کے پاس جیسے کوئی راہ نہیں تھی۔
چپ چاپ اٹھا تھا۔ — سلپیر پاؤں میں اڑ سے تھے اور ان کے ساتھ چل پڑا تھا۔
”چلیں۔۔۔؟“

مائی نے ایک بار اس کے حلیے کو دیکھا تھا پھر تنقیدی نظروں سے دیکھ کر اس کے ساتھ ہو لی تھیں۔
وہ ڈرائیو کرتے ہوئے پہلے سے زیادہ الجھا دکھائی دیا تھا۔

”آج تو منظر میاں سے رخصتی کی بات ضرور کروں گی۔ میرب کو جلد سے جلد اپنے گھر لانا چاہتی ہوں۔ اور اب تیری بھی کوئی سن مانی نہیں چلے گی۔“ مائی نے مکمل سنجیدگی سے کہا تھا۔ سبکتگین حیدر لغاری نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”کیا ہوا؟ — اس طرح چپ چپ کیوں ہے؟ — کسی بات کا جواب کیوں نہیں دے رہا؟“ مائی نے پوچھا تھا۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری کے لئے بولنا ناگزیر ہو گیا تھا۔
”کچھ نہیں مائی! — آپ بھی پتہ نہیں کیوں۔“ انداز الجھا سا تھا۔
”کیا، پتہ نہیں کیوں؟ — کیا سوچ رہا ہے تو؟ — چاہتا کیا ہے؟“ مائی نے ڈپٹے ہوئے پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ ان کی طرف دیکھے بنا بولا تھا۔
”تُو یہ رخصتی نہیں چاہتا؟“ مائی نے اسے دیکھا تھا۔
”آپ کو اتنی جلدی کیوں ہے مائی؟ — آخر کس بات کی جلدی ہے؟“

”یہ جلدی ہے؟ — سال ہونے کو آیا ہے۔ اور کتنا عرصہ؟“
”مجھے نہیں پتہ مائی! — مگر یہ جلد بازی ہے۔“
”تُو نہیں چاہتا کہ میں رخصتی کی بات کرنے منظر میاں کے پاس جاؤں تو ٹھیک ہے۔ موڑ۔“

گاڑی نہیں کرنی کوئی بات۔“ مائی غصے سے بولی تھیں۔
سبکتگین حیدر لغاری کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا تھا کہ کیسے سمجھائے۔ گاڑی بھی نہیں روکی تھی۔
”تم گاڑی نہیں موڑ رہے؟“

”نہیں۔“
”مجھے بتاؤ گے پر ابلم کیا ہے؟“ مائی نے اسے تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا، جسے

جال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”کچھ نہیں ہے۔ یوں ہی کہہ رہا ہوں۔ ابھی اس کی کیا ضرورت ہے؟“ سبکتگین حیدر لغاری ہمہری سانس خارج کی تھی۔ معاملہ کب تک چھپاتا۔

کس طرح چھپاتا۔

سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

آج یقیناً بات کھل ہی جانا تھی۔

اور وہ ایسا بالکل نہیں چاہتا تھا۔ تبھی کچھ الجھا الجھا دکھائی دیا تھا۔ گاڑی اس کے گھر کے سامنے لڑی تھی۔ مائی اُتری تھیں اور اس کی طرف دیکھا تھا۔

”اندر نہیں آؤ گے تم؟“

”نہیں۔۔۔ آپ ہو آئیں۔ میں یہیں ہوں۔“

”باہر ڈرائیوروں کی طرح انتظار کرو گے؟ — گھر واپس چلے جاؤ۔ میں کیب کر کے آ جاؤں۔“ مائی نے اپنی دانست میں شرم دلائی تھی اور چلتی ہوئی اندر چلی گئی تھیں۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری گاڑی میں بیٹھا دیکھتا رہ گیا تھا۔

محبت اک واقعہ ہے جو

وقت کے ساتھ رونما ہوا

اور وقت کے ساتھ ہی

ایہ دھندلا جائے گا

نہ یاد رکھنے کو کوئی

بات ہوگی!

نشے

نہ کوئی بات ہوئی

ہاں پھنسی ہے اک پھانس سی دل میں!

مگر!

محبت اک واقعہ ہی تو ہے! —

وقت کے ساتھ یہ گرد ہو جائے گا تو

یاد بھی نہ رہے گا کہ —

محبت خواب موسم میں

دلوں کی سرزمین پر کچھ

خواب لائی تھی!

سردار سبکتگین حیدر لغاری گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا اور پھر چلا ہوا اندر داخل ہو گیا تھا۔

عین سامنے ہی وہ اسٹیرز پر بیٹھی دکھائی دی تھی۔

قدم جانے کیوں من من بھر کے وزنی ہو گئے تھے۔

میرب نے جو اپنے دھیان میں بیٹھی تھی، سر اٹھا کر سردار بکتگین حیدر لغاری کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں لمحوں تک خاموش رہے تھے۔ کوئی بات نہ کی تھی۔

”تمہیں اندازہ ہے اندر کیا چل رہا ہوگا؟“ سردار بکتگین حیدر لغاری نے بالآخر پوچھا تھا۔ میرب نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ آنکھیں یکدم ہی نمی سے اٹنے لگی تھیں۔ اس نے سرفنی میں ہلا دیا تھا۔

”یوہڈ گوان سائیڈ گین!“ میرب نے کہا تھا۔

سردار بکتگین حیدر لغاری اس کے پاس وہیں بیٹھ گیا تھا۔

”تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی تھی۔ ”میرا گھر ہے۔“ کہیں بھی بیٹھ سکتی ہوں۔“

”تو پھر اندر جا کر کیوں نہیں بیٹھتیں؟ جہاں وہ سب چل رہا ہے۔“ سردار بکتگین حیدر نے مدعا بیان کیا تھا۔

میرب سیال دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”چاہتے کیا ہیں آپ؟ کیا کروں میں؟ جیسے میرے ہاتھ میں تو سب کچھ ہے۔“ آنکھوں کی نمی چھلکی تھی۔ مگر اس نے سردار بکتگین حیدر لغاری کی طرف دیکھے بغیر سختی سے آنکھیں رگڑ رہی تھیں۔

”آپ کے ہاتھ میں جو تھا، وہ تو آپ نے کر دیا۔“ عجب اک طنز ہوا تھا۔

میرب سیال دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس بات کی صفائی مجھے آپ کو کتنی بار دینا پڑے گی؟“ وہ تنک کر بولا تھا۔

سردار بکتگین نے سپاٹ چہرے سے اسے دیکھا تھا۔

”میں نے منع کیا تھا تا کہ آپ ہائی سے کچھ نہیں کہیں گی؟“ سردار بکتگین حیدر لغاری نے بتایا تھا۔

”میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ آپ کیوں سارا الزام میرے سر دکھ رہے ہیں؟“

”یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا، ہائی مجھے بہت عزیز ہیں۔“

”مائی مجھے بھی عزیز ہیں۔ تو پھر میں کیا کروں؟ آپ کیوں لائے انہیں؟“ سمجھا دیتے۔

”میرب نے اپنا دفاع کیا تھا۔

”کیا سمجھتا؟“ وہ اتنی ضد کر رہی تھیں کہ میں کچھ کہہ ہی نہیں پایا۔“ سردار بکتگین حیدر لغاری نے اپنی بے بسی بیان کی تھی۔

دونوں آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

کسی ایک میں بھی ہمت نہ تھی، اٹھ کر اندر جاتا اور مسئلے کو نمٹاتا یا کچھ ہونے سے روکتا۔

اس میں ایک دوسرے کو الزامات دے رہے تھے۔

”ہائی کو بہت اعتبار ہے تم پر۔ انہیں کیا پتہ کہ تم.....“ سردار بکتگین حیدر لغاری نے جملہ ادھورا زرد دیا تھا۔

”میں کیا؟“ آخر کہنا کیا چاہتے ہیں آپ؟“

”آپ یہی چاہتی تھیں۔“ ایک اور الزام۔

”کیا چاہتی تھی میں؟“ میرب نے واضح الزام پر کسی قدر حیران ہو کر اسے دیکھا۔ ”آپ مجھ پر

م لگانے سے بہتر ہے خود اپنے بارے میں غور کریں۔“

”میں اپنے بارے میں کیا غور کروں؟“ کہنا کیا چاہتی ہو تم؟“ گین نے وضاحت چاہی

یہ مسئلہ اتنا کھلا، واضح انداز میں ڈسکس ہو گا، وہ نہیں جانتی تھی۔

”آپ کبھی بھی اس رشتے کو بنانا نہیں چاہتے تھے۔ کبھی بھی نبھانا نہیں چاہتے تھے۔“ میرب نے

اطور پر کہہ دیا تھا۔

”ہا۔۔۔“ سردار بکتگین حیدر لغاری نے غصے کو فوری طور پر دبا دیا تھا۔ ”تمہیں جو سمجھنا ہے، سمجھ

بوجھ کرنا ہے کہ لو۔۔۔ میں اس بارے میں کوئی صفائی نہیں دوں گا۔ نہ ہی مجھے کوئی ضرورت

ہوتی ہے کہ کوئی وضاحت کروں۔“ سردار بکتگین ایک لمحے میں بری الذمہ دکھائی دیا تھا۔ میرب

نارہ گئی تھی۔ وہ شخص اسے کچھ کے لگانے سے باز نہیں آتا تھا۔

بے رحمی سے دار کرتا تھا۔

”ٹھیک۔۔۔ آپ کو جیسا لگتا ہے ویسے سمجھئے۔ مجھے بھی کوئی صفائی دینے یا وضاحت دینے

ضرورت نہیں ہے۔“ میرب نے بھی دو ٹوک کہہ دیا تھا۔

سردار بکتگین حیدر لغاری اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

اس سے مکمل طور پر دھیان ہٹانے وہ بہت الجھی ہوئی سی دکھائی دی تھی۔

”ٹوٹ جائے گا یہ رشتہ بھی۔ آپ خوش ہو جائیے۔ یہی چاہتے تھے آپ۔“ میرب

سے کہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ ہو جاؤں گا خوش۔ آپ کو میری خوشی کی پرواہ ہی کب رہی ہے۔“ دونوں صرف ایک

بے پر الزامات دے رہے تھے۔ صفائی دینے کی فکر کسی کو نہیں تھی۔

”جنتا میں نے برداشت کیا، کوئی برداشت نہیں کرتا۔“ میرب نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ کہا تھا۔

”کیا برداشت کیا آپ نے؟“ آپ تو اپنے آپ سے باہر کبھی نکل ہی نہیں سکیں۔ اپنی دنیا

ہٹنے کی عادت رہی آپ کو۔ وہی تنگ نظری، وہی چھوٹا سا آسمان۔۔۔ کبھی کھلے آسمان کو آنکھیں

کر دیکھا ہی نہیں آپ نے۔ کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ کرتی تو شاید آج ایسی کنڈیشن ہم فیس نہ کر

وتے۔“ گین اپنی غلطی ماننے کو قطعاً تیار نہ تھا۔

”میں تک نظر تھی یا آپ ہی آزادی کے بہت زیادہ قائل تھے؟ — آپ نے تو آزاد خیالی کی حد کر دی تھی۔ اتنا تو کوئی بھی نہیں کرتا۔“

”ٹھیک — میں نے جو بھی کیا، مانتا ہوں — آپ کو اب مجھ پر انگلی اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ جیسا چاہتی تھیں سب ویسا ویسا ہو رہا ہے۔ اب تو کوئی ایٹھ نہیں رہا — نو ایٹھ ایریڈ دی موٹ — سووائے وی آر فائنگ؟ — جیسا آپ نے چاہا آپ کو مل رہا ہے۔ جیسا میں نے چاہا مجھے مل رہا ہے۔ جب دونوں کی مرضی پوری ہو رہی ہے تو جھگڑا نہیں ہونا چاہئے۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے مصلحت پسندی سے کہا تھا۔

وہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔

کتنا کٹھن تھا وہ —

کتنا بے رحم —

کتنا سنگ دل —

”دل نہیں ہے آپ کے سینے میں — پتھر ہیں آپ۔“ میرب نے واضح طور پر منہ پر کراہے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ وہ جواباً دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے سر ہلاتا ہوا بولا تھا۔

”فائن — ہاں، نہیں ہے — دل نہیں ہے، پتھر ہے میرے سینے میں، پتھر؟ — آپ نے اپنے ڈل ہونے کا جتنا ثبوت دیا ہے، صاف دکھائی دے رہا ہے۔ ایک معاملے تک کو تو آپ ہاتھ میں رکھا نہیں گیا، دل کی بات کرتی ہیں۔ آپ کو پتہ تھا — مائی کی کنڈیشن ایسی نہیں کہ وہ سب سہہ سکیں۔ مگر آپ نے پتھر بھی صبر نہیں کیا۔“

”میں نے مائی اماں کو کچھ نہیں بتایا — نہ ہی انہیں یہاں انوائٹ کیا کوئی میسٹر ڈسکس کر کے لئے۔ آپ اپنی غلطی ماننے کو کیوں تیار نہیں؟ — سارا الزام میرے سر کیوں رکھ رہے ہیں؟ وہ بھیگتی آنکھوں کے ساتھ بولی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری جانے کیوں کچھ کہے بنا اس چہرے کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

میرے ہم راہی سنو

آؤ چلیں چاند کے پار

ایسی دنیا میں کہیں دور

جس میں نہ غم ہو نہ آنسو ہوں

نہ آپ ہیں ہوں کہیں

اور کچھ ہو —

میرا پیار ہو —

تیرے آس پاس

میرے آس پاس

وہ سر ہٹائے آنسو بہا رہی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری کو جانے کیا ہوا تھا — اس کی طرف بچا چلا گیا تھا۔ پھر ہاتھ بڑھایا تھا اور بہت آہستگی سے اس کے چہرے کو اوپر اٹھایا تھا۔

وہ اپنی پوروں سے اس کے آنسوؤں کو پونچھنے لگا تھا

میرب سیال ساکت سی رہ گئی تھی۔ مگر اس حیرت سے قطع نظر وہ اس کے آنسو پونچھ رہا تھا۔

کبھی تنہا جو ہوئی تم

کسی جیون کے سفر میں

میری آواز سنو گی

کہیں میری دھڑکن میں

زندگی مجھ کو کبھی

تجھ سے جدا بھی کر دے

بند آنکھوں کے دریچوں میں

تجھے دیکھوں گا — !

میرے سائے کی طرح

تم تو رہو گی ہر پل میں

میرے آس پاس —

میرے پاس پاس —

میرب کی نگاہ میں بھر پور حیرت تھی۔ مگر وہ اس حیرت کی کوئی پرداہ کئے بنا اٹھا تھا — اور چلا

ابا ہر نکل گیا تھا۔

کیا تھا یہ شخص؟

کیا تھا؟

کیا چاہتا تھا؟

کیا تھا دل میں اس کے؟

انتانہ سمجھ میں آنے والا کیوں تھا؟

آخر سمجھ میں کیوں نہیں آتا تھا؟

وہ بھیگی پلکوں سے اس شخص کی پشت کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

یقین ہے مجھ کو

تم بھی اک دن

چلے ہی آؤ گے

میں جی اٹھوں گی

اک جہاں کی

میرے آس پاس
تیرے پاس پاس
تیرے آس پاس
میرے پاس پاس!
کتنے ارناں تھے۔۔۔ کتنے خواب!۔۔۔ سب اس شخص سے جڑے تھے۔۔۔
اور وہ سمجھنے کی کوشش تک نہیں کرتا تھا۔

”کہاں ہو ان دنوں؟۔۔۔ کتنے دنوں سے گھر کا چکر بھی نہیں لگایا۔ میں نے سوچا فون کر کے پوچھ لوں، میری بہن ٹھیک تو ہے۔“ اوزان نے اس کے فون اٹھاتے ہی کہا تھا۔
عفتان علی خان کچھ ہی فاصلے پر بیٹھائی وی پر نیوز دیکھ رہا تھا۔ انا بیہ کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ اور کہہتی، جل کر بس یہی کہہ سکی تھی۔
”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔۔۔ بس یونہی چکر نہیں لگایا۔ وقت نہیں ملا۔۔۔ گھر میں سب ٹھیک ہیں؟ دادا ابا۔۔۔ مئی۔۔۔؟“ انا بیہ اپنے اندر سے اٹھنے والی غصے کی لہر کو دباتے ہوئے کسی قدر پُرسکون انداز میں بولی تھی۔

عفتان دانستہ بے فکر اور لاطعن نظر آیا تھا۔ ورنہ پورا دھیان اسی طرف تھا۔

”کہیں تمہارے میاں نے کرنیو تو نافرمان نہیں کر دیا؟“ اوزان نے چھیڑا تھا۔

”ہاں۔۔۔ کرنیو ہی لگایا ہوا ہے۔ تم لوگ آ جاؤ۔“

”سوچ رہا تھا میری بہن، میری شادی میں پیش پیش ہو۔ مگر تمہیں تو کوئی فکر ہی نہیں۔“ وہ ہلکھو کر

تھا۔

”لڑکی دیکھ لی؟“

”لڑکی دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ لڑکی دیکھی ہوئی ہے۔ بس اسے منانا ہے۔“

”کون؟“ وہ چونکی تھی۔

”تم جانتی تو ہو۔“ اوزان نے یاد دلایا تھا۔ ”ایک ہی لڑکی تو تمہارے بھائی کی زندگی میں آئی تھی۔“

اب بھی وہی ہے۔ اس کو منانا ہے۔ اب بھول مت جانا۔“

”لامعہ کو؟“ وہ عفتان علی خان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ ”میں کیسے مل سکتی ہوں اُس سے؟۔۔۔“

آئی مین، یہاں فی الحال گھر میں بہت کام ہیں نا۔ پھر مئی پاپا بھی ابھی تک واپس نہیں آئے۔“ اس نے

دانستہ بہانہ کیا تھا۔ اور اس شخص کا دفاع کر دیا تھا۔

عفتان علی خان سن رہا تھا۔

دل کو کچھ حد تک تو سکون ملا تھا۔

وہ اس کی بات مان رہی تھی۔

کچھ تو سمجھتی تھی۔

رہنے کی ڈور اتنی اُلجھی ہوئی تھی تو کچھ سلجھی ہوئی تھی۔ کسی ایک نقطے پر تو ڈور اتنی کھینچی ہوئی نہیں

دل کو یہ اطمینان کچھ اچھا لگا تھا۔

بڑی آنکھوں میں رات جلتی ہے

ات میں کئی خواب جلتے ہیں

بے جلتے نہیں!

سے یہ کیسے بتاؤں کہ

ان جلتی ہے۔۔۔!

ب پکھلتی ہے!

دل سلگتا ہے!

بے جلتے نہیں!

ننان علی خان کچھ مسرور تو ہوا تھا۔

قیدی بنا رکھا ہے۔۔۔ جیسے میری کوئی اپنی مرضی ہی نہیں۔۔۔ جو کہیں گے، وہی کروں گی۔

دوقوف ہوں نا۔“ وہ فون بند کر کے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

رہا۔۔۔ بندوق کا رخ مڑ گیا تھا۔

نا اس کا بھگڑا کرنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔

ب کچھ ”ہوائی فائر“ ہوئے تھے۔

یہ بھی سہی۔۔۔ اُس کے بچن میں چلے جانے سے وقتی طور پر کچھ سکون ہو گیا تھا جس پر عفتان

ہی کیا تھا۔ اس کے مسلسل بولنے سے جو نیوز سننے کا کونسنٹریشن ٹوٹ رہا تھا۔ اب پھر سے بحال

آ۔ کچھ ہی دیر میں وہ کچن سے دوبارہ نکلی تھی۔

نا اس بار کوئی فائر نہیں تھا۔

ما سکون تھا۔ اور چائے کے دوگ اس کے ہاتھ میں تھے۔ وہ مکمل خشکی سے چلتی ہوئی اس کی

نا تھی۔ اور چائے کا گگ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

ان علی خان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ خفا خفا سی بنا اس کی طرف دیکھے چائے کا کپ

کھڑی تھی۔ عفتان علی خان نے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ پھر ایک ہاتھ سے اس سے گگ

ئے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی کو تھاما تھا۔ وہ اس سائے کے لئے قطعاً بھی تیار نہیں تھی۔

اچونکی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑا کپ یکدم ہی چھٹک گیا تھا گرم چائے عفتان علی خان

ا پر گری تھی۔

ا ہے؟۔۔۔ دیکھ کر نہیں پکڑ سکتے تھے چائے؟“ وہ فوراً گگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس پر جھکی

کف کھولا تھا اور آستین اوپر چڑھائی تھی اور اس کی کلائی دیکھی تھی جو گرم گرم چائے گرنے

سے سرخ پڑ گئی تھی۔ وہ خالصتا بیویوں والے کیرنگ انداز میں بولی تھی۔ وہ بنا چوکنے بنا کچھ نہ دیکھتا رہا تھا۔

اس کا چہرہ اس کے چہرے کے کچھ قریب تھا۔
اس کی خوشبو کی احساسات جگا رہی تھی۔

”رکے۔۔۔ میں دو لاتی ہوں۔ یہاں بیٹھے گا۔ واپس آتی ہوں۔“ وہ جانے کو پلٹی تھی۔ مگر ہاتھ و پین گرفت میں رہ جانے کے باعث دوسرے ہی پل واپس مڑی تھی۔

نگاہ اس شخص کی نگاہ سے ملی تھی

ایک لمحے میں اپنا آپ جلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔
اور نگاہ جھکتی چلی گئی تھی۔

اناہیہ کے لئے اس لمحے کی گرفت سے فرار جیسے ممکن نہیں رہا تھا۔ عفنان اس لمحے بے خودی کے اثر تھا۔

کچھ سوچنے، کچھ سمجھنے کو تیار نہ تھا۔

اس کا ہاتھ اس طرح تھا ہے وہ کھڑا ہوا تھا۔

اس کے جھکے ہوئے چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے بنور دیکھا تھا۔

اناہیہ کی وہ کیفیت تھی کہ کاتو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ اس لمحے بت بنی ساکت سی کھڑی تھی۔

سانس جیسے رُکی رُکی سی تھی۔ مگر چہرہ سرخ پڑا ہوا تھا۔

وہ شخص سارے حق محفوظ رکھتا تھا۔۔۔ وہ چاہتی بھی تو اسے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔

مگر دھڑکنوں کے ارتعاش کا کیا کرتی؟۔۔۔ دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا جیسے سینہ توڑا بھی باہر آ جائے گا۔

عفنان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے پر آئے ہوئے بالوں کو پیچھے ہٹایا تھا۔

اس کا لمس اناہیہ کے اندر پل میں کئی احساس جگا گیا تھا۔

تجھی فون بجا تھا۔

اناہیہ چونکی تھی۔۔۔ ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑانا چاہا تھا۔ مگر عفنان علی خان کی گرفت اکر

کلائی پر کمزور نہیں پڑی تھی۔

فون بچتا چلا گیا تھا۔

عفنان اس لمحے عجب دیوانگی کے حصار میں تھا۔

اناہیہ کو ”فون“ ہی فرار کی صحیح راہ دکھائی دیا تھا۔ تجھی کمزور سے لہجے میں بولی تھی۔

”فون..... فون ہے۔“

کلائی ایک بار پھر چھڑانے کی کوشش کی تھی۔

مگر عفنان علی خان نے کچھ بھی سنے بغیر اسے بازوؤں میں اٹھالیا تھا اور لے کر بیڈروم کی طرف

لے لگا تھا۔

اناہیہ کے حواس خطا ہو گئے تھے۔ دھڑکنوں کی آواز اُسے کانوں میں گھسٹی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

عفنان علی خان کی دیوانگی کے سامنے وہ جیسے بے بس تھی۔ اس شخص کے ساتھ قربتوں کا ایسا لمحہ

بچ گیا۔۔۔ اس کے بارے میں اس نے سوچا تک نہ تھا۔

وہ نوازشوں پر اتنا مائل ہو گا۔۔۔ وہ نہیں جانتی تھی۔

ایسے کسی کرم کے بارے میں اس نے نہیں سوچا تھا۔ فرار کے سارے راستے ایک لمحے میں مسدود

مانیے تھے۔

اس کی خواہشوں کے سامنے وہ کوئی دیوار نہیں اٹھا سکی تھی۔

سارے ”دائرے“ ایک ہی لہر سے منٹے دکھائی دیے تھے۔ وہ کوئی تعرض نہیں کر سکی تھی۔

فون متواتر اب بھی بج رہا تھا۔!

”کتنے دنوں بعد ملے نا۔۔۔ لانگ ہانگ! کہاں ہوتے ہو؟“ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے اس کی

ل ریکھا تھا۔ وہ قصداً مسکرایا تھا۔

”یار سوری!۔۔۔ کچھ بڑی رہا۔“

”اوہ۔۔۔ رائٹ۔“ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے ہونٹ سکڑے تھے۔ ”ایک دم سے کچھ زیادہ

ناگین ہو گئے آپ؟“ ساہیہ نے کوئی طنز نہیں کیا تھا۔ کوئی جواز نہیں چاہا تھا۔

مگر وہ خود ہی اپنی جگہ شرمندہ سا ہو گیا تھا۔

”آئی ایم سوری ساہیہ!“

”اس اوکے۔۔۔ آئی کین انڈر اسٹینڈ۔ اتنا تو سمجھ سکتی ہوں۔ شاہ گروپ آف انڈسٹریز کے ایم

ایو۔۔۔ تھوڑے سے بڑی ہونے کا حق تو تمہیں ہے۔“ وہ بدستور خوشگوار موڈ میں تھی۔ ”کئی بار

مانی مگر آپ کا سیل بھی منج پر لگا ہوا تھا۔ آپ تو واقعی بڑے بڑی ہو گئے۔“

”آئی ایم سوری ساہیہ!۔۔۔ تمہیں اتنا وقت نہیں دے سکا۔ مگر پچھلے کچھ دنوں سے میں واقعی

بڑی تھا۔

”اوکے، اوکے۔۔۔ اب یہ بڑی والا گیم کلوز کرتے ہیں۔ آپ کے پاس بھی وقت ہے اور

مے پاس بھی۔ چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔“ ساہیہ نے کہا تھا۔

”ساہیہ! میں چلوں گا۔ مگر یو ہوٹو ویٹ فور آؤر۔۔۔ ایک میٹنگ ہے۔ اس کے بعد فوراً۔“

”اوہ، رائٹ۔“ ساہیہ کا چہرہ ایک لمحے میں بچھ سا گیا تھا۔

اس کا چہرہ ایک کتاب تھا جیسے۔۔۔ سارے تاثرات ایک پل میں واضح تھے۔

انہاں کو ایک لمحے میں گہرے ملال نے گھیرا تھا۔

وہ اپنی سیٹ سے اٹھا تھا اور چلتا ہوا اس کے پاس آن رکھا تھا۔ ساہیہ اس کی طرف بالکل بھی متوجہ

کہ وہ مسکرا دی تھی۔

اذہان نے اسے بغور دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور بہت آہستگی سے لبوں سے لگا لیا تھا۔
”ساہیہ! تم پاس ہوتی ہو تو سب بہت اچھا لگتا ہے۔ پلیز آل ویز بی دیز فور می۔ آل بی
ار اوڈ“ اذہان نے جیسے ایک درخواست کی تھی۔

ساہیہ نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

کانچ کے تھے سارے وعدے

رشتے یا کچے تھے دھاگے

دل کے تاروں کو چھو کر

تم کہاں چل دیے

سرہانے میرے تو آ کے

بانہوں میں مجھے لٹا کے

خواب سہانے دکھا کے

تم کہاں چل دیے!

اب اس پل میں جینا

تم بن مشکل ہے!

موسم یہ پھر اب آئے نہ

جس میں ہم تھے!

جس میں ہم تھے!

”زوباریہ! مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔“ زوباریہ کچن میں کام کر رہی تھی جب وہ چلتی ہوئی اس
کے پاس آن رکی تھی۔

”ہاں پوچھو۔“ زوباریہ بولی تھی۔

”اُس روز مانی آئی تھیں۔“

”ہاں۔۔۔ پھر؟“

”آپ مجھے بتا سکتی ہیں، کیا بات ہوئی تھی؟“

”نہیں۔۔۔!“

”کیوں۔۔۔؟“ وہ چونکی تھی۔

”کیونکہ مجھے بھی پتہ نہیں کہ کیا بات ہوئی۔ مظہر نے مجھے وہاں سے جانے کے لئے کہہ دیا تھا۔ اور
میں بالکل نہیں جان پائی تھی کہ ان کے درمیان کیا ڈکس ہوا۔ کیوں، کیا ہوا؟“ زوباریہ نے اس کی
طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ”تم اتنی پریشان کیوں ہو؟“

اذہان نے لمحہ بھر کو سوچا تھا تو بہت شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی۔

”چلو۔۔۔“ مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ ”کہیں دور۔۔۔ لمحوں کو اپنا کرنے۔“

”اگر تم اپنے ہو تو لمحے پر اے نہیں۔“

”مگر اور اپنا کرنے۔۔۔ جتنے لمحے اچھے ہوں سب ہمارے ہوں۔ یہ چاہتا ہوں میں۔“ وہ مذم

لمحے میں بولا تھا۔ ”تم ایسا نہیں چاہتی؟“ اس کی طرف بھر پور توجہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

وہ چند لمحوں تک اس طرح خاموشی سے دیکھتی رہی تھی، پھر مسکرا دی تھی۔

”چاہتی ہوں۔۔۔ بہت چاہتی ہوں۔“ سر ہلایا تھا۔

”تو پھر؟۔۔۔ پراہلم کیا ہے؟“ وہ ہنسا تھا۔

”پراہلم؟۔۔۔ اوں، ہوں۔۔۔ شاید کچھ نہیں۔۔۔ ایک بات بتاؤ گے؟“

”ہاں، پوچھو۔“

”کس بات کا ازالہ کرنے کے لئے یہ سب کر رہے ہو؟۔۔۔ اتنا زیادہ بولنے کے عادی تو تم

کبھی بھی نہیں رہے۔ پھر اب؟“

وہ جو سمجھ رہا تھا وہ اپنی جگہ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے اور چھپائے ہوئے ہے، ایک لمحے میں

حیران ہوا تھا۔

یعنی وہ نگاہ اُسے جان گئی تھی۔

ساہیہ نے اُسے پکڑ لیا تھا۔

دراصل یہ تھا دل کا تعلق!

وہ اُسے دل سے سمجھ رہی تھی۔

دل سے جان رہی تھی۔

دل سے پڑھ رہی تھی۔

سطر سطر۔

وہ مسکرا دیا تھا۔

”میں نے ٹھیک کہا تھا ساہیہ!۔۔۔ کسی ڈپین لڑکی سے محبت ضرور کر لو۔۔۔ مگر شادی مت

کرو۔ بڑی پراہلم ہو جاتی ہے یارا!۔۔۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر پکڑ لیتی ہے۔“ وہ ہنس دیا تھا۔ ساہیہ

بھی مسکرا دی تھی۔

”تمہیں جتنے مزے کرنے ہیں کر لینا، میں تمہیں نہیں پکڑوں گی۔ اگر میں تمہاری بیوی ہوئی تو۔“

”تو؟۔۔۔ اب یہ تو بیچ میں کہاں سے آ گیا؟۔۔۔ کم آن یارا! گینج منٹ ہو چکی ہے ہماری

آئندہ چند برسوں میں شادی بھی ہو جائے گی۔“ وہ مسکرا دیا تھا۔

”چند برسوں میں؟“ ساہیہ نے اسے گھورا تھا۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”بہت جلد۔۔۔ واژ کڈنگ۔۔۔ جسٹ واٹوڈ ٹو میک یو لاف۔“ وہ اتنی معصومیت سے بولا

اگینے نے سر اثبات میں بلا دیا تھا۔
شیقون کی فیروزی سازھی میں، اونچی لمبی، دھان پان سی فارحہ بہت خوش اور بہت مطمئن لگ رہی
تھی۔

”کیا ہوا؟“ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ اس کے دیکھنے پر فارحہ چونکی تھیں۔ تبھی اگینے مسکرا دی
تھی۔

”آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں بھائی! — ایک بار پھر سے مکمل۔ بہت دنوں بعد آپ کو خوش
دیکھا ہے اور بہت اچھا لگ رہا ہے۔ خدا آپ کو خوش ہی رکھے۔“

”تمہیں بھی اگینے! — یہ زندگی جو بے نا، بہت عجیب شے ہے۔ اس کو اپنے ساتھ رکھنے کے
لئے اس کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ ایک قدم پیچھے چلوگی تو لمبے سائے بننے لگیں گے۔ دو قدم آگے
چلوگی تو وقت تمہیں دبا دے گا۔ سو میانہ روی یہی ہے کہ زندگی کا ہاتھ تھام کر اس کے ساتھ ساتھ چلو۔

اب ایک لمحے میں زندگی سے کوئی ایک قدم پیچھے رہ گئی تھی اور وقت نے مجھے چھوڑنے میں دیر نہیں لگائی
تھی۔ آج بہت عرصے کی محنت کے بعد میں اس وقت سے دوبارہ مل پائی ہوں۔ قدم سے قدم دوبارہ ملا
ہوا ہوں۔ اور اب میں نے ٹھان لی ہے، ہمیشہ وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر ہی چلوں گی۔ آج
بہت دنوں بعد سعد شام میں اس گھر واپس آ رہے ہیں اور گھر کو میں اس طرح سجا سناور رہی ہوں۔“

فارحہ واقعی خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

”بھائی! — کسی کو معاف کر دینا اتنا آسان ہے کیا؟ — کیا واقعی دل اتنا بڑا ہو سکتا ہے؟“
اگینے کچھ اُلجھی ہوئی سی دکھائی دی تھی۔

فارحہ نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا، پھر بولی تھیں۔

”اگینے! — عورت کا دل بہت بڑا ہوتا ہے۔ ایک بار نہیں، کئی بار معاف کر سکتی ہے۔ یہ بڑی
سے بڑی خطاؤں کو نظر انداز کر سکتی ہے۔ مگر مرد کے لئے یہ سب کرنا کچھ مشکل ہے۔“

”آپ نے سعد بھائی کو واقعی معاف کر دیا؟“

”ہاں — کیونکہ میں صرف اپنے آپ کو نہیں دیکھ رہی اگینے! — اپنے گھر کو دیکھ رہی
ہوں۔ اپنے بچوں کو دیکھ رہی ہوں۔ میرا وہ بکھرا بکھرا اپن میرے گھر کے سکون میں غفلت ڈال رہا تھا
میرے بچے مطمئن نہیں تھے۔ سب سے بڑھ کر میں مطمئن نہیں تھی۔ سب کہتے ہیں ایک مرد
ایک عورت کو کمپیٹ کرتا ہے، غلط کہتے ہیں۔ ایک عورت ایک مرد کو کمپیٹ کرتی ہے۔ آدھا ادھورا ہوتا
ہے وہ ہمیشہ۔ اسے مکمل صرف ایک عورت کرتی ہے۔ ناقدر ہے کچھ — قدر نہیں کرتا — مگر
ہانتا ہے، میں کس طرح کمپیٹ ہوں اور کس قدر کمپیٹ ہوں۔“ فارحہ بہت لائٹ انداز میں گہری
انس کر رہی تھیں۔ اگینے مسکرا دی تھی۔

”ہاں — ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔“ وہ مکمل ہم خیال ہوئی تھی۔

فارحہ نے اسے جاچتی نظروں سے دیکھا تھا۔

”آپ کو لگتا ہے کہ یہ بات اتنی آسان ہے اور مجھے اس کے لئے بالکل بھی پریشان نہیں ہونا
چاہئے؟“

”نہیں — ایسا میں نے نہیں کہا۔“
”تو پھر؟ — زو بار یہ! میری زندگی کی اتنی بڑی بات ہے یہ — اتنا بڑا فیصلہ اور مجھ ہی سے
ہر بات چھپی ہوئی ہے۔“ اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”ریلیکس — تمہیں اس سب کے بارے میں یا تو اپنے پاپا سے بات کرنی چاہئے یا پھر مائی
سے۔ کل ان کے بیچ جو بھی ڈسکس ہو اوہ دونوں ہی جانتے ہیں اور کوئی نہیں۔ تم ٹھیک کہتی ہو —
تمہاری زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ ہے یہ اور تم ہی اس کے بارے میں نہیں جانتی۔ یو ہونیڈ ٹو ٹاک ٹو
یور فادر — اپنے پاپا سے بات کرو۔ انہیں لگتا ہے وہ تمہارے سب سے بڑے خیر خواہ ہیں۔ انہیں
کم از کم یہ تو بتا دو کہ وہ کتنا غلط سوچ رہے ہیں۔ تم جاؤ اور انہیں سب کچھ بتاؤ۔ ان سے پوچھو یہ جو
درمیان اتنا زیادہ گیپ ہے نا، اس ناٹ گڈ۔ تمہیں یہ ڈسٹنس کو ختم کرنا ہوگا۔ میں حیران ہوں تم اتنی
بزدل کیسے ہو؟ — اب تک بات کیوں نہیں کی؟ ہی از یور فادر — حق ہے تمہارا ان سے بات
کرنا۔ ان سے ڈسکس نہیں کرو گی تو اور کس سے کرو گی؟“

زو بار یہ نے اسے سمجھایا تھا۔ زو بار یہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ وہ ٹھیک سمجھا رہی تھی۔

اس نے ہی مروت اور لحاظ میں اتنی دیر کر دی تھی۔

وہ پلٹی تھی اور باہر نکل گئی تھی۔

پاپا تو گھر پر نہیں تھے۔

اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی تھی اور باہر نکل آئی تھی۔

تینکا تینکا جڑ کر میں نے
گھر بنایا تھا جو وہ
بکھر گیا تھا لیکن! —
میں نے ہواؤں کو اب
اپنے بس میں کر لیا ہے!
اب اس گھر کو
آندھیوں کا کوئی
ڈر نہیں رہا! —

”کتنا بکھر گیا تھا نا سب — مجھے لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ سب ٹھیک ہوگا — مگر آج ایک بار
پھر سب کچھ اپنی جگہ پر ہے۔ رشتوں کی ڈور کچھ الجھ ضرور گئی تھی مگر وقت نے اسے ٹوٹنے نہیں دیا۔“

فارحہ گلدان میں پھول سجائی ہوئی بولی تھیں۔

”کیوں، کیا ہوا اکیسے؟ — اپنی بھائی کو نہیں بتاؤ گی؟“
”کچھ نہیں ہے بھائی! — بس یونہی۔“

”کیا یونہی؟ — کہیں ٹو فیض کو لے کر تو پریشان نہیں ہو رہی؟“ بھائی تہہ تک پہنچی تھیں۔
”فیض کے ساتھ میرا ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ اکیسے نے جھٹلایا تھا۔

جو اب فارحہ نے اسے بغور دیکھا تھا۔

”تم اب بھی یہ بات چھپانا چاہو گی؟“ فارحہ نے جیسے اسے ایک لمحے میں پکڑا تھا۔

اکیسے ایک پل میں ساکت تھی۔ اپنے پکڑے جانے پر حیران تھی۔ فارحہ چلتی ہوئی اس کے قریب آئی تھیں پھر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ بہت آہستگی سے رکھ دیا تھا اور مسکراتے ہوئے ملاحت سے بولتیں۔

”اکیسے! — ایک عرصے سے تم خود سے بھاگ رہی ہو اور اب بھی — محبت اتنا بڑا گم ہے کیا کہ اسے خود سے بھی چھپانا چاہتی ہو اور سب سے بھی؟“

”پتہ نہیں بھائی! مگر محبت کرتے رہنے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دوسروں کو بتاتے بھی رہو کہ آہ اسے کتنا چاہتے ہو۔“

”محبت کی یہ کون سی لاجب ہے اکیسے! جسے چاہا جائے، اسے ہی نہ بتایا جائے؟“ فارحہ نے پوچھا۔

”بتانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا بھائی!“

”ہو بھی سکتا ہے۔“

”میں ایسا نہیں سمجھتی کہ ایک طرف محبت کسی کام آتی ہو۔ میں کل بھی اس کے قریب تھی — اس نے زندگی سے مجھے اپنے لئے نہیں چنا تھا — اور آج بھی — وہ مجھے چننا نہیں چاہے؟

میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر کیوں کہوں کہ پلیرز چوز می فاریور لائف جبکہ میں اس کی زندگی میں نہیں ہوں ہی نہیں۔ نہ کل تھی نہ آج ہوں — اگر اسے مجھے چننا ہو گا تو وہ مجھے خود چننے لگا۔

نہ چل کر اس کی زندگی میں داخل نہیں ہونا پڑے گا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر خود مجھے اپنی زندگی میں شامل کر چاہے گا۔ محبت بتانے والی شے نہیں ہے — محسوس کی جانے والی بات ہے — اگر کسی کو نہیں

ہوتی تو بتائی نہیں جاسکتی۔“ اکیسے سر جھکائے بول رہی تھی۔

فارحہ ملاحت سے مسکرا دی تھیں۔

”تم صرف ایجوکیٹ ہو رہی ہو اکیسے! — بتاؤ گے نہیں تو کسی کو کیسے پتہ چلے گا؟“

”محبت بڑھا ہوا یا پھیلا ہوا ہاتھ نہیں ہے بھائی! — آئی کانٹ ڈو دیٹ — اور آپ با میری فکر نہ کریں۔ آئی ایم پی۔ مجھے زندگی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ آئی ایم پی وڈ مائے لائف

اگینے مسکرا دی تھی۔ فارحہ نے سر لٹی میں ہلا دیا تھا۔

”جس کے لئے اتنی محبت ہے جب اسی کو نہ بتایا جائے تو پھر کیا فائدہ؟“

”اور بتانے سے کیا فائدہ ہو گا؟ — کوئی فائدہ نہیں ہو گا بھائی!“

”ایسا نہیں ہوتا اکیسے! — بتانا پڑتا ہے۔ بتانا بھی چاہئے۔ محبت اتنی ہی ایجوکیٹ ہوتی ہے اور.....“

سعد بھائی آگے تھے۔ اکیسے بولتے بولتے یک دم چپ ہوئی تھی۔ بہت دنوں بعد سعد بھائی کے میں بکے تھا جو یقیناً وہ فارحہ بھائی کے لئے لائے تھے۔ اگینے جانے کے لئے فوراً اٹھی تھی تبھی

نے بہت آہستگی سے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور پھر اٹھتے ہوئے بولی تھی۔

”محبت پلٹ آتی ہے اکیسے! — ایک بار ہاتھ بڑھا کر تو دیکھو۔“

سعد چلتے ہوئے وہیں آ گیا تھا اور مسکراتے ہوئے یکے فارحہ کی طرف بڑھایا تھا۔
”کیسی ہو اکیسے؟“

”ٹھیک ہوں بھائی! — آپ آج ہماری بھائی کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہے ہیں؟“ چھیڑا تھا۔
سکرا دیئے تھے۔

”اپنی بھائی سے پوچھ لو، کہاں جانے کے لئے تیار ہے۔ تم کہاں جا رہی ہو؟ تم بھی چلو نا۔ آج ہاتھ کرتے ہیں۔ میں نے ٹیبل بک کروا دی ہے۔“ سعد بھائی ہمیشہ سے مختلف دکھائی دیئے تھے۔

اگینے مسکرائی تھی۔ پھر فارحہ بھائی کی طرف دیکھا تھا۔

”نہیں بھائی! — آپ بھائی کے ساتھ جائے۔ ہم پھر کبھی چلے جائیں گے۔ چلتی ہوں!“ گلے ل کر وہ فوراً ہی پکٹی تھی اور چلتی ہوئی باہر نکلتی چلی گئی تھی۔

”محبت پلٹ آتی ہے اکیسے! — ایک بار ہاتھ بڑھا کر تو دیکھو۔“

فارحہ بھائی کی مدد سے سرگوشی اس سے جانے کیوں کان میں گونجی تھی۔

ناصلے دلوں میں ہوں تو مٹنے میں صدیاں لگتی ہیں۔

تابیہ نے ہاتھ لے کر باہر نکلنے ہوئے سوچا تھا۔

تئی قریبوں کے باوجود —

اصلے بدستور قائم تھے —

عی گریز درمیان تھا۔

یڈ کے دوسرے کنارے پر سوئے ہوئے اس بندے کو اس نے بغور دیکھا تھا۔

رد کی اور عورت کی ضرورتوں اور خواہشوں میں واضح فرق ہے۔ عورت من کی خواہش کرتی ہے۔ سے خواہش کرتی ہے۔ اور مرد —

تابیہ نے کلاک دیکھا تھا۔ دن خاصا چڑھ آیا تھا اور وہ شخص —

ناید یہ غیند سکون کی تھی! — جو ٹوٹنے میں دیر لے رہی تھی۔

کسی ایک کی حیت تھی!

شاید!

اپنے اندر ایک لمحے میں بہت کچھ ٹوٹا ہوا محسوس کرتے ہوئے وہ کھڑکی تک آئی تھی۔

اندر یک دم ہی بہت بھجا بھجا سا دکھائی دیا تھا۔ اس نے پردے کھینچ دیئے تھے۔ بہت سی روشنی آگئی تھی۔ وہ پلٹ کر سائیز دروازے میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔ یہ سائیز دروازے اس شخص کی طرف تھا۔ جھکنے کے باعث گیلے بال جھک کر یکدم ہی نیچے آئے تھے۔ بالوں سے چپکتی کئی بوندیں اس شخص کے چہرے پر جا پڑی تھیں۔

ایک لمحے میں وہ بیدار ہوا تھا۔

وہ بھجک کر رہ گئی تھی۔ نگاہ اس شخص پر پڑی تھی۔

اس کی توجہ کا مرکز بھی وہی تھی!

انابیہ نے نگاہ ہٹاتے ہوئے بہت آہستگی سے دروازے بند کی تھی اور واپس مڑنے لگی تھی جب اس شخص کی گرفت میں کلائی آگئی تھی۔ وہ چونکی تھی۔

پلٹ کر دیکھا تھا۔

دل کے اندر کوئی احساس بیدار نہیں ہوا تھا۔

عفتنان اس کی طرف بنور دیکھ رہا تھا۔

نگاہ میں کچھ خاص تھا۔

مگر انابیہ کا انداز سرد برف جیسا تھا۔

عجب برف سی لگی تھی وہ۔

جھکی جھکی پشیمان سی نگاہ۔ جیسے وہ کوئی بہت بڑی خطا کر چکی ہو۔ عفتنان نے ا

لمحے میں اس چہرے کو پڑھا تھا۔

پھر بہت آہستگی سے وہ کلائی چھوڑ دی تھی۔ انابیہ پلٹی تھی اور چلتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔

مرد اور عورت کبھی ایک جیسا نہیں سوچتے۔

کبھی ایک جیسا نہیں سوچ سکتے۔

مرد کی خواہشات مختلف ہیں اور عورت کی مختلف!

عورت کی خواہشوں میں ”دل“ بھی شامل ہے اور ”روح“ بھی۔ مگر کوئی مرد کبھی یہ چھوٹی سی بات نہیں سمجھتا۔

اپنی خواہشوں کے آگے وہ ایک چھوٹی سی بات کو بھول جاتا ہے!

عورت تن سے نہیں۔ من سے سیراب ہوتی ہے!

یکن میں وہ چپ چاپ کھڑی اُبلتے ہوئے دودھ کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی جا رہی تھی۔

اُبل۔ باہر جا رہا تھا اور۔!

یہ دم ہی احساس ہوا تھا!

اور انابیہ نے چولہا بند کر دیا تھا۔

محبت!

اس کے میرے درمیان!

اک فاصلہ ہے۔!

(چو صدیوں تک ہے پھیلا ہوا)

محبت!

اس کے میرے درمیان!

اک انا کا مسئلہ ہے!

مسائل دل طے کرنے کو

اک لمحہ ضروری ہے

اسے یہ کون بتلائے

بنا کتنا ضروری ہے!

پوریج میں گاڑی روک کر وہ باہر آئی تھی۔ یہاں تک آتے ہوئے سب کچھ جتنا آسان لگ رہا تھا، اتنا ہی مشکل تھا۔

مگر وہ کی نہیں تھی۔ چلتی ہوئی آگے بڑھی تھی اور گلاس ڈور کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ نوکر نے بے انداز میں سلام کیا تھا۔

میرب نے سر ہلایا تھا۔

”مائی کہاں ہیں؟“

”مائی تو کسی نام سے باہر گئی ہیں۔ آپ بیٹھیں۔ تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گی۔ گین صاحب بنادوں انہیں؟“ کی، بی بی کے ساتھ کہیں باہر جا رہے ہیں۔ میں بتاتا ہوں انہیں۔“ خادم

پ تھا۔ پلٹا تھا۔ مگر میرب نے اسے ایک دم ہی روک دیا تھا۔

”نہیں، رہنے دو۔ میں مائی کا انتظار کر لیتی ہوں۔ کتنی دیر پہلے گئی تھیں؟“

”ایک گھنٹہ ہو گیا۔“

اُدھ۔ پھر تو انہیں شاید ٹائم لگے گا۔ میں چلتی ہوں پھر۔“ وہ ایک دم ہی پلٹی تھی۔ تبھی اپنے لہڑے شخص کو، کیچہ کر نگاہ جم گئی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے بھی اسے بنور دیکھا تھا۔

مگر میرب نے دوسرے ہی پل بے تاثر بن کر قریب سے نکل جانا چاہا تھا۔ انداز میں عجب ایک فی۔

یہ نہیں کوئی حق تھا کہ نہیں۔

مگر سردار سبکگین حیدر لغاری نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ میرب سیال چونکی تھی۔ نگاہ اٹھا کر اس شخص

کو دیکھا بھی تھا۔ مگر اس کا چہرہ ساٹھا تھا۔

”واپس کیوں جا رہی ہو؟“

”مائی سے ملنے آئی تھی۔ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ سو۔۔۔“

”انتظار کر لو۔۔۔ کچھ ہی لمحوں میں واپس آ جائیں گی۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے مش

تھا۔

اس نے کوئی جواب دیئے بنا خاموشی سے اس شخص کو دیکھا تھا۔ سوئڈ بوٹڈ، نک سک

تیار کی کچھ خاص لگ رہی تھی۔ غالباً وہ گی کے ساتھ ڈنر کے لئے جا رہا تھا۔

میرب کو اندازہ ہوا تھا اور دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

”کیا ہوا؟ کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“ اسے خیالوں میں کھوئے دیکھ کر پوچھا تھا۔

”نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔“ میرب نے سزا نکار میں ہلا دیا تھا۔

”کوئی ضروری بات تھی۔۔۔؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کی بات کی بابت پوچھ

وہ کرنے آئی تھی۔

”نہیں۔۔۔ کچھ خاص نہیں۔ آپ کو دیر ہو رہی ہوگی۔“ ایک بے تاثر پن سے کہا تھا۔

بے تاثر انداز میں بھی کئی حوالے چھپے تھے۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس کے چہرے کو بونو

تھا۔

”مجھے اپنے معاملات کو نمٹانا آتا ہے۔ آپ کو کیئر کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ بیٹھ جائیں

انتظار کر لیں۔ وہ آئیں گی تو انہیں اچھا نہیں لگے گا کہ آپ آئیں اور اس طرح واپس بھی لوٹ

پھر مجھ سے ڈسکس کر لیں۔ کیا کہنے آئی تھیں آپ؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے تفصیل چاہی

میرب کو اس بات کا گمان نہیں تھا۔ سبھی کچھ چونک کر دیکھا تھا۔

”آپ کو دیر ہو رہی ہے۔ آپ میری فکر نہ کریں۔۔۔ میرے پاس کافی ٹائم ہے انتظار

کے لئے۔“ وہ کہہ کر خادم کی طرف مڑی تھی۔

”خادم! میں باہر گاڑی میں مائی اماں کا انتظار کر رہی ہوں۔ آئیں تو بتا دینا۔“ وہ کہہ کر جا

لئے یکدم ہی مڑی تھی جب سردار سبکتگین حیدر لغاری نے جارحانہ انداز میں اس کی کلائی کو پکڑ

اپنی طرف کھینچا تھا۔ حملہ اتنا اچانک ہوا تھا کہ وہ سنبھل نہیں پائی تھی۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی سردار سبکتگین

لغاری کے سینے سے جا لگی تھی۔ ابھی ہوئی کئی سانسون کے ساتھ سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

وہ شخص خشکتگین نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا تماشا بنا رہی ہیں آپ اس رشتے کو لے کر؟“ آپ باہر کھڑی ہو کر مائی کا انتظار

گی؟ اس گھر میں اتنی جگہ بھی نہیں کہ آپ یہاں بیٹھ کر انتظار کر سکیں؟“

مجھے جگہ اس گھر میں نہیں، تمہارے دل میں چاہئے سردار سبکتگین حیدر لغاری! میرب

سکی تھی، کہہ نہیں سکتی تھی۔ عجیب ایک بے بس سا انداز تھا۔

عیب بے بسی نظروں میں تھی۔

عین کو اس چہرے پر بے طرح ترس آیا تھا۔

اسے اپنے حصار سے آزاد کیا تھا۔

ابھی اسی طرح کھڑی رہی تھی۔ سر جھکائے۔

اب سردار سبکتگین حیدر لغاری نے یکدم ہی اس کا ہاتھ تھاما تھا اور لے کر چلا ہوا صوفے کی طرف آ

نا۔ اسے بٹھایا تھا۔ پھر خود اس کے عین پاس بیٹھ گیا تھا۔

اب بولو۔۔۔ کیا بات ہے؟“ وہ شخص سارے حوالے ختم کر رہا تھا۔ سارے رشتے مٹا رہا تھا تو

اس کی، اس کے موڈ کی اتنی فکر کیوں تھی؟

اس کے لئے تو بے تاثر بن جانا بہت آسان ہونا چاہئے تھا۔ اجنبی بن کر۔۔۔ بنا نگاہ ملائے

بڑھ جانا بہت معمولی سا واقعہ ہوتا چاہئے تھا۔ پھر وہ چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں کو بھی اتنی اہمیت

دے رہا تھا؟

میرب سیال اسے جانچنا چاہتی تھی۔

بھنا چاہتی تھی۔

ابھی وہ ابھی ابھی نگاہ اٹھی تھی تو بہت خالی خالی سی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرب کی نگاہ

نے کہاں سے اور کیونکر نی اترتی تھی۔ جسے چھپانے کو وہ نگاہ پھیر گئی تھی اور چہرہ بھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری کو اس نگاہ کی ابھینیں کچھ اور بڑھتی دیکھ کر کچھ خاص خوشی نہیں ہوئی تھی۔

اب کیا ہوا؟“ اس نے جواز چاہا تھا۔

میرب نے اس کی طرف دیکھے بغیر سزا نکار میں ہلا دیا تھا۔

آپ چاہتی کیا ہیں؟“ بتائیں گی آپ؟ خواہ مخواہ خود بھی پریشان ہونے کی عادت ہے اور

کو پریشان کرنے کی بھی۔“

اب آپ سے کس نے کہا کہ آپ پریشان ہوں۔ میں یہاں آپ کو پریشان کرنے پا لکل نہیں آئی

پ جائے جہاں آپ جا رہے تھے۔ میں نے آپ کو نہیں روکا۔“ جواباً وہ بولی تھی اور سردار

حیدر لغاری خاموشی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

میرب وہ بولی تھی جو وہ سننا نہیں چاہتا تھا۔

معنی۔۔۔ بے تاثر۔۔۔!

بھر کو غصہ آیا بھی تھا مگر دوسرے ہی پل قابو پاتے ہوئے اس نے میرب کی طرف دیکھا تھا اور

سے بولا تھا۔

کی ٹولڈ یو۔۔۔ آئی کین ہینڈل مائے پرائمز ویری ویل۔ مجھے اپنے معاملات کو نمٹانا بہت

م سے آتا ہے۔ اب آپ بتائیے، آپ یہاں کیا کہنے آئی تھیں؟“ پھر کوئی نئی شکایت

لے کر، نیا شکوہ لے کر؟ — آپ روز روز کے ان جھگڑوں سے تنگ نہیں آ جاتیں؟ ہمیشہ سلامت اور بڑ کی طرح کیوں کھینچتی ہیں؟ انہیں سمیٹتی کیوں نہیں؟ — چھوٹی چھوٹی باتوں کو پھیلانے بہت شوق ہے آپ کو۔“ میرب نے حیرت سے اس شخص کو دیکھا تھا۔ وہ بالکل نہیں سمجھ پائی تھی کہ کیا کہنے والا تھا یا کیا کہنا چاہتا تھا۔

”کیا — کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ — آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ وضاحت نہ چاہتے ارادہ رکھتے ہوئے بھی وہ بولی تھی۔

”گیں! تیار ہو گئے تم؟ — چلو — آئی ایم ریڈی۔“ یک دم گی کی آواز آئی تھی۔ میرب نے آواز کی سمت چہرہ موڑا تھا اور گی کو دیکھا تھا۔

وہ تک سب سے تیار کھڑی سردار سبکدین حیدر لغاری کی منتظر تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے — آپ کو جتنا انتظار کرنا ہے، یہاں بیٹھ کر کیجئے، جب تک مائی واپس نہیں جاتیں۔ چلو گی!“ اسے کھنور انداز سے کہہ کر وہ گی کی طرف بڑھا تھا۔

میرب حیرت زدہ سی رہ گئی تھی۔

وہ نگاہ حیرت لئے ہوئے تھی۔

مگر سردار سبکدین حیدر لغاری مطلق پرواہ کئے بغیر چلتا ہوا گی کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا۔

ایک لمحے میں محبت اور بھی الجھ گئی تھی۔

میرب کا دل چاہا تھا، وہاں سے اٹھے اور بھاگتی ہوئی نکل جائے اور پھر کبھی پلٹ کر نہ اس طرف دیکھے نہ اس طرف نگاہ کرے۔ مگر یہ سوچنا آسان تھا، اس پر عمل کرنا مشکل تھا۔ مگر وہ یہ بات اس شخص کو بتا نہیں سکتی تھی۔

مائی اماں کے آنے تک وہ یوں ہی سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں میرب — بچے؟“ مائی اماں چلتی ہوئی اس کی طرف آئی تھیں۔ مگر میرب نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ پورا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ شاید وہ اپنی کمزوری کا پتہ کسی کو دینا نہیں چاہتی

مگر یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا، اب اس شخص کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر وہ سچائی کا پتہ پھر بھی لینا چاہتی تھی۔

”ایسے بیٹھی کیوں رو رہی ہے تو؟ — کیا ہوا؟“ مائی اماں نے اس کا چہرہ اٹھایا۔

”اماں! آپ مجھے ایک بات بتائیں گی؟“

”کیا؟“

”وہی جو آپ کے اور پاپا کے بیچ میں ہوئی۔“ میرب نے دو ٹوک پوچھا تھا۔

”کیا مطلب، کیا ہوا؟“ مائی اماں نے اس کے آنسو پونچھے تھے۔ ”تم اس طرح رونا بند کرنا

آرام سے بات کرو۔ اگر کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ۔“

”آپ یہ سب چھوڑیے، پہلے مجھے بتائیے، آپ میں اور پاپا میں کیا کیا باتیں ڈسکس ہوئیں؟ — ہاں انہوں نے آپ سے؟“ میرب نے ضدی بچوں کی طرح کہا تھا۔

”چل ٹھیک — تو رونا بند کر، پھر بتاتی ہوں تمہیں۔“ مائی نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کے پونچھے تھے۔



المسجد

المسجد

عفتان نے نیوز پیپر لیٹ کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔
”آپ جھگڑے کے فکل موڈ میں ہیں تو جھگڑ لیجئے۔“

”جھگڑے کے موڈ میں، میں ہوں اور آپ جو کرتے ہیں؟“

”کیا کرتا ہوں؟ — آپ خواہ مخواہ بات کو بڑھانا چاہتی ہیں۔ می اور دادا ابا سے ملنے کو میں نے کبھی نہیں روکا آپ کو۔ آپ بتائیے، کبھی منع کیا میں نے آپ کو ان سب سے ملنے کو؟ — منع میں نے آپ کو کیا تھا مگر صرف.....“ وہ بولتے بولتے ایک دم رُک گیا تھا۔ نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا

”مجھے آج می کی طرف جانا ہے۔ جا سکتی ہوں۔“ انابیہ نے ناشتے کی ٹیبل پر کہا تھا۔

عفتان علی خان نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔

”یہ آپ مجھے اطلاع دے رہی ہیں یا اجازت چاہ رہی ہیں؟“

”آپ کو کیا لگا؟“ انابیہ نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

عفتان نے شانے اچکا دیئے تھے۔

”آف کورس — آپ سے پوچھ رہی تھی، کیا میں جا سکتی ہوں؟ یہ نہیں کہا کہ میں جا رہا

ہوں۔“ انابیہ نے باور کرایا تھا۔

”سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟ —“ عفتان علی خان نے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا

”اوہ، رائٹ — اس میں طنز — میں نے اُس روز جو منع کیا تھا۔“ لکھ بھر کو چپ رہ کر کچھ سو

تھا۔ پھر کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہا تھا۔

”جب جانتے ہیں تو پوچھ کیوں رہے ہیں؟“ وہ تنک کر بولی تھی۔

عفتان نے اس کے پھرے کو لکھ بھر کو دیکھا تھا۔ وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”آپ سمجھتے کیا ہیں خود کو؟ شوہر بن گئے تو ساری دنیا ہاتھ میں آگئی آپ کے؟“ انابیہ جج جج لڑا

کے موڈ میں لگ رہی تھی۔

مگر عفتان علی خان بہت مطمئن انداز میں چائے کے سپ لیتے ہوئے سر جھکا کر نیوز پیپر دیکھنے

تھا۔

”ابھی تک بیوی تو مٹھی میں آئی نہیں — ساری دنیا کیا خاک ہاتھ میں آئے گی؟“ وہی مصر

سا، شوہروں کا انداز تھا اور انابیہ اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

اس وقت انابیہ کو اپنا آپ انتہائی ظالم بیوی والا لگا تھا۔

”ہاں — بہت مصحوم ہیں آپ تو۔“ انابیہ مکمل لڑائی کے موڈ میں تھی۔

”آپ نے طے کر لیا ہے، آپ جھگڑاوائف کا کیریئر بھر پور طریقے سے نبھائیں گی؟“ عفتا

علی خان نے پوچھا تھا۔ انداز نرم تھا۔

”اور آپ نے طے کر لیا ہے کہ آپ ظالم شوہر بن کر رہیں گے۔“ انابیہ نے ترکی بہ ترکی جواب

تھا۔

عفتان نے نیوز پیپر لیٹ کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔
”آپ جھگڑے کے فکل موڈ میں ہیں تو جھگڑ لیجئے۔“

”جھگڑے کے موڈ میں، میں ہوں اور آپ جو کرتے ہیں؟“

”کیا کرتا ہوں؟ — آپ خواہ مخواہ بات کو بڑھانا چاہتی ہیں۔ می اور دادا ابا سے ملنے کو میں نے کبھی نہیں روکا آپ کو۔ آپ بتائیے، کبھی منع کیا میں نے آپ کو ان سب سے ملنے کو؟ — منع میں نے آپ کو کیا تھا مگر صرف.....“ وہ بولتے بولتے ایک دم رُک گیا تھا۔ نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا

”مجھے آج می کی طرف جانا ہے۔ جا سکتی ہوں۔“ انابیہ نے ناشتے کی ٹیبل پر کہا تھا۔

عفتان علی خان نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔

”یہ آپ مجھے اطلاع دے رہی ہیں یا اجازت چاہ رہی ہیں؟“

”آپ کو کیا لگا؟“ انابیہ نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

عفتان نے شانے اچکا دیئے تھے۔

”آف کورس — آپ سے پوچھ رہی تھی، کیا میں جا سکتی ہوں؟ یہ نہیں کہا کہ میں جا رہا

ہوں۔“ انابیہ نے باور کرایا تھا۔

”سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟ —“ عفتان علی خان نے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا

”اوہ، رائٹ — اس میں طنز — میں نے اُس روز جو منع کیا تھا۔“ لکھ بھر کو چپ رہ کر کچھ سو

تھا۔ پھر کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہا تھا۔

”جب جانتے ہیں تو پوچھ کیوں رہے ہیں؟“ وہ تنک کر بولی تھی۔

عفتان نے اس کے پھرے کو لکھ بھر کو دیکھا تھا۔ وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”آپ سمجھتے کیا ہیں خود کو؟ شوہر بن گئے تو ساری دنیا ہاتھ میں آگئی آپ کے؟“ انابیہ جج جج لڑا

کے موڈ میں لگ رہی تھی۔

مگر عفتان علی خان بہت مطمئن انداز میں چائے کے سپ لیتے ہوئے سر جھکا کر نیوز پیپر دیکھنے

تھا۔

”ابھی تک بیوی تو مٹھی میں آئی نہیں — ساری دنیا کیا خاک ہاتھ میں آئے گی؟“ وہی مصر

سا، شوہروں کا انداز تھا اور انابیہ اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

اس وقت انابیہ کو اپنا آپ انتہائی ظالم بیوی والا لگا تھا۔

”ہاں — بہت مصحوم ہیں آپ تو۔“ انابیہ مکمل لڑائی کے موڈ میں تھی۔

”آپ نے طے کر لیا ہے، آپ جھگڑاوائف کا کیریئر بھر پور طریقے سے نبھائیں گی؟“ عفتا

علی خان نے پوچھا تھا۔ انداز نرم تھا۔

”اور آپ نے طے کر لیا ہے کہ آپ ظالم شوہر بن کر رہیں گے۔“ انابیہ نے ترکی بہ ترکی جواب

تھا۔



”محبت پلٹ آتی ہے۔“

فارحہ نے ایک جملہ کہا تھا اور اس کی بازگشت کتنے ہی دنوں تک اس کے ارد گرد گونجتی رہی تھی۔

”آپ نہیں جانتیں بھابی! کبھی کبھی محبت نہیں بھی پلٹی۔ بہت کچھ لے کر بھی نہیں۔ طویل انتظار کے بعد

می نہیں۔“ اپنے ہی دھیان میں چلتی ہوئی وہ پلٹی تھی جب فیض بخاری کو اپنے سامنے دیکھ کر کچھ حیران رہ

گئی تھی۔

”آپ کی خود سے اُلجھنے اور باتیں کرنے کی عادت ختم نہیں ہوئی؟“ فیض بخاری نے مسکراتے

وئے کہا تھا۔

مگر اگینے مسکرائیں سکی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے — آپ یہاں کیسے؟ — خیریت؟“

”ہاں — بس یہاں سے گزر رہا تھا۔ تمہارا خیال آ گیا۔ سوچا ملتا چلوں۔“ فیض مسکرا دیئے

تھے۔

”اوکے“ اگینے کچھ زیادہ نہیں بول سکی تھی۔

”اور کیا کر رہی ہیں آپ آج کل؟“

”کچھ خاص نہیں — بھابی کیسی ہیں؟ — اور بیٹے؟“

”سب ٹھیک ہیں۔“ فیض نے کہا تھا۔ ”بھابی بتا رہی تھیں تم نے بوتیک کھول لیا ہے۔“

”ٹھیک۔ ٹھیکس۔“ اگینے مروتا مسکرائی تھی۔ ”آپ کھڑے کیوں ہیں؟ — بیٹھے نا۔“

فیض بخاری نے اسے دیکھا تھا، پھر مسکرا دیئے تھے۔

”تمہیں نہیں لگتا ہم پہلی دوسری بار ملے ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ کیوں، کیا ہوا؟“ اگینے نے نگاہ اٹھا کر فیض کو دیکھا تھا۔

”مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ وقت ہے؟“

”ضروری بات؟“ اگینے چونکی تھی۔

”ہوں۔۔۔ وقت ہے؟“ فیض بخاری نے دوبارہ پوچھا تھا۔

اگینے کچھ دیر تک یوں ہی اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔ پھر سر اٹھاتا میں ہلا دیا تھا۔

کمرے میں بہت خاموشی تھی۔ لامعہ حق اس سے کچھ فاصلے پر خاموشی سے کھڑی تھی۔

انا بیہ شاہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”کھڑی کیوں ہو؟۔۔۔ بیٹھ جاؤ۔“

اگرچہ اسے قطعاً پتہ نہیں تھا کہ وہ یہاں کس لئے آئی ہے مگر اس کے باوجود کڑی اس کے انداز میں واضح تھی۔ جیسے ان کے درمیان کوئی برا موڑ آیا ہی نہ ہو۔

لامعہ اسی خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

کچھ دیر تک وہ کچھ نہیں بول سکی تھی۔

”چائے پیو گی؟“ انا بیہ جو کچھ لچھوں پہلے تک بہت ہاتھ دکھائی دے رہی تھی، اب بہت پُر سکون تھی۔

لامعہ نے سر ٹپٹی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ لچھ فطی تھا۔“

انا بیہ مزید کچھ نہیں پوچھ سکی تھی۔

”میں کچھ کہنا چاہتی ہوں انا بیہ!“ لامعہ حق مدہم لچھ میں بولی تھی۔ انا بیہ نے سوالیہ نظروں سے اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔

”آئی ایم سوری۔“ لامعہ حق کی آواز ابھری تھی اور انا بیہ اسے حیرت سے ہنسی رہ گئی تھی۔

”مجھے اندازہ ہے انا بیہ! میں نے تمہارے ساتھ سب غلط کیا۔ پلیز مجھے اس کے لئے معاف کر دو۔ میں جانتی ہوں ان سب کے لئے معافی کا لفظ بہت چھوٹا ہے اور شاید تم مجھے معاف کر بھی نہ سکو۔ مگر میں اپنے دل سے ایک بوجھ اتارنے یہاں چلی آئی۔“

لامعہ حق کہہ رہی تھی اور انا بیہ اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔

”انا بیہ! میں شرمندہ ہوں۔ شاید یہ لفظ بھی بہت چھوٹا ہے۔ لیکن یہ سچ ہے۔“

انا بیہ کو یقین نہیں تھا۔ لامعہ حق کو واقعی اپنی غلطی کا اندازہ ہو گیا تھا یا پھر وہ کوئی نیا جال بن رہی تھی۔

تھی۔

انا بیہ ساکت سی اپنی جگہ پر بیٹھی تھی۔

لامعہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”انا بیہ! آئی ایم سوری۔۔۔ رینگی ویری سوری۔“ لامعہ کا لچھ مدہم تھا۔

انا بیہ اسے خالی خالی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی۔

ج پر یقین کیسے نہ کرتی۔ لامعہ حق کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

یہی کیا بات تھی جسے کہنے کے لئے تم مجھے یہاں لے آئے؟“ اگینے نے ریٹورنٹ کے ماحول کو نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

تھی ایک بات۔“ فیض بخاری بولے تھے۔ وہ اس وقت گہری سوچ میں دکھائی دیئے تھے۔ اگینے کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔

کوئی پریشانی ہے؟“ اگینے نے دریافت کیا تھا۔

نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“

پھر۔۔۔؟“

اگینے۔۔۔!“

جی۔۔۔“

تھ سے شادی کرو گی؟“

لیا۔۔۔؟“ سوال اتنا غیر متوقع اور اچانک تھا کہ وہ لچھ بھر کو ساکت رہ گئی تھی۔

تم اپنی زندگی کا بہت سا وقت گزار چکے ہیں اگینے!۔۔۔ بہت سال۔۔۔ شاید اب اتنے بے ہاتھوں میں باقی بھی نہیں ہیں کہ گنوا سکیں۔“ فیض بخاری کا لچھ اُسے حیران کر رہا تھا۔ مگر

جیسے ایک تمہید جیسی تھیں۔ درحقیقت وہ کوئی اور بات کہنا چاہ رہا تھا۔

لینے! تمہارے اور میرے بیچ کسی نئے رشتے کے آغاز سے پہلے میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ کے بعد کے سارے فیصلے تمہارے اپنے ہوں گے۔ اس کے بعد تم جو بھی کہنا چاہو کہہ سکتی ہو۔“

ا کہنا کیا چاہتے ہو؟“ اگینے نے پوچھا تھا۔

لینے! بات بہت مختصر سی ہے مگر اتنی آسان نہیں ہے۔“

بھصا کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟“ اگینے نے پوچھا۔

انے سر اٹکار میں ہلا دیا تھا۔

ن۔۔۔ رومبھا ایک گزر جانے والا واقعہ ہے۔ جس پر بہت سے کربوں کی گرد بھی جم چکی۔ سوچوں بھی تو وہ لڑکی ایک خواب جیسی لگتی ہے۔ شاید خواب ہی تھی وہ۔۔۔ مگر۔۔۔ میں

اسے کرنا چاہتا ہوں وہ کچھ مختلف ہے۔ قصہ یہ ہے کہ۔۔۔ کچھ عرصہ قبل میں ایک لڑکی سے نا بھی فرشتہ نہیں تھا۔ سو ہم نے کچھ اچھا وقت ساتھ گزارا۔ وہ کسی اور کے ساتھ جذباتی وابستگی

کے ساتھ تو شاید ایسا نہیں ہوتا مگر کسی کسی کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ میرے اندر کا خالی پن تھا جس نے مجھے ایسا سب کرنے پر اکسایا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید آج صورت حال ایسی نہ ہوتی۔ ان کو نشیون کی ضرورت پیش نہ آتی اور ہماری دوستی اسی طرح برقرار ہوتی۔ ایک دراز بیچ میں نہ لامعہ بولی تھی۔

کوئی دراز بیچ میں نہیں ہے لامعہ! تم ایسا مت سوچو۔ ایسا سب لکھا ہوتا ہے۔ تمہارے میرے بیچ تھا، وہ بھی لکھا ہوا تھا۔ سو ہو گیا۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ سب کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی بھول ضرور کرتے ہیں یہاں اس دنیا میں۔ ہم سب انسان ہیں، فرشتے نہیں۔ سو ہمیں ایک دوسرے کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہئے کہ ہم کوئی فرشتوں جیسے کام کریں گے۔ اگر ہم میں سے ہر کوئی یہ لے لے تو آدھے پر اہل ہمیں ختم ہو جائیں۔“ انابییہ بولی تھی اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ بہت آہستگی دیا تھا۔

اب سوچنا بند کرو۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے ہم کریں۔ تم میں تو پھر بھی حوصلہ ہے کہ مان رہی ہو۔“
آئی ایم سوری انابییہ! تم اتنی اچھی نہیں اور میں تمہیں.....“
اِس اوکے لامعہ! تم بھی بہت اچھی ہو۔“ انابییہ مسکرائی تھی۔ ”میری ہونے والی بھابی بری کیسے ہو ہے۔“
”مسکرائی تھی۔“

فضول قسم کا بندہ ہے وہ۔۔۔ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں اس کے ساتھ زندگی گزار سکوں گی؟“
خراوزان کا آ گیا تھا۔

بیرا بھائی؟۔۔۔“ انابییہ نے وضاحت چاہی تھی۔ ”میرا بھائی اس دنیا کا سب سے اچھا بندہ نہیں ساری دنیا گھوم لینے کے بعد بھی کوئی اس جیسا نہیں ملے گا۔ آزما لو۔“ انابییہ مسکرائی تھی۔
دنیا میں کوئی ایسا دل والا نہیں ہو گا جو ایک دو بار رنجیکت ہونے کے بعد بھی دوبارہ اسی ذوق و سے لڑکی کو پروپوز کرے۔“

بے وقوف! وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ تم بہت لگی ہو۔“ انابییہ نے باور کرایا تھا۔
آئی ڈونٹ نو۔“ لامعہ نے مسکراتے ہوئے سرائکار میں ہلایا تھا۔ ”مجھے نہیں پتہ کہ میں لگی ہوں میں۔“

تم ہو لامعہ!۔۔۔ محبت تمہارے تعاقب میں برسوں سے ہے تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔ تم لگی ہے، محبت کی لاجک کیا ہے؟“
ول، ہوں۔۔۔ نہیں پتہ۔ تم بتا دو۔“ لامعہ مسکرائی تھی۔

محبت کی لاجک یہ ہے کہ مرد عورت کی خوبصورتی سے محبت کرتا ہے اور عورت مرد کی محبت کی ہے۔ یوں بھی کہتے ہیں، محبت کو اپنے پیچھے آنے دو۔ اس کے پیچھے مت بھاگو اور تم نے

رکھتی تھی۔ اسی کا انتظار بھی شاید وہ کر رہی تھی۔ سو ہم میں کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہوئی۔ بس ہم نے وقت ساتھ گزارا اور ہم اپنی اپنی راہ پر ہو گئے۔ مگر اب وہ یہاں میری تلاش میں آئی تھی اور مجھے! پتہ بھی چل گیا تھا۔ آئی فاؤنڈر، ہر میٹ ہر، دین شی ٹولڈ می دیٹ۔۔۔ شی از پر گلیٹ وڈ مانے لڈ وہ مجھ پر اس بچے کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالنا چاہتی۔ نہ ہی مجھ سے کوئی رشتہ چاہتی ہے۔ اس کا ہے اس کے لئے اس کی تھوڑی سی محبت پوری زندگی گزارنے کے لئے کافی ہے اور محبت کو شاید زیادہ کی خواہش ہوتی بھی نہیں۔ میرا تمہاری طرف آنا، اُسے رنجیکت کیا جانا نہیں ہے! کہیں! میں بہت عرصہ پہلے دانستے کی ایک لائن پڑھی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ شادی اور محبت دو الگ الگ چیز ہیں۔ میں بھی یہی مانتا ہوں۔ محبت سراسر دل کا معاملہ ہے جسے تم کسی قدر جذباتی معاملہ بھی کہو ہو۔ مگر شادی دماغ کا فیصلہ ہے اور میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

فیض بخاری کا لہجہ دھیما تھا۔

اور وہ چپ چاپ ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

دونوں کتے لحوں تک ایک دوسرے کے کانہوں پر سر دھرے روتی رہی تھیں۔ لمسے چپ چاپ کے درمیان جیسے ٹھہرے گئے تھے۔
”میں نے کبھی نہیں سوچا تھا انابییہ! ہم میں اتنی اور اس قدر دوری آجائے گی۔“ کچھ دیر بعد اس نے اس کے کانہہ پر سے سرائکار اس کے آنسو پونچھے تھے۔

انابییہ نے سرائکار میں ہلا دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں نے بھی یہ کبھی نہیں سوچا تھا مگر.....“

”انابییہ! میں مانتی ہوں جو بھی ہو وہ اتنا معمولی نہیں تھا۔ مگر کیا تم اسے بھلا کر سب پہلے جو سکتی ہو؟ میں جانتی ہوں میں نے جو بھی کیا وہ بہت غلط تھا۔ مگر میں اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنا ہوں۔ میں شرمندہ بھی ہوں۔ بہت بری ہوں نا میں۔“ لامعہ سر جھکا کر بولی تھی۔

”نہیں۔۔۔ تم بری نہیں ہو لامعہ! شاید ہم سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ سب اتنے ہی ہوتے ہیں۔ ہماری خواہشیں بری ہیں جو ہمیں برا بناتی ہیں۔ کچھ برا کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ تم بھی کیا میں تمہیں اس کے لئے قصور وار نہیں مانتی۔“ انابییہ ٹری سے بولی تھی اور بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”چلو، بھول جاتے ہیں سب کچھ۔ پھر سے دوستی کرتے ہیں۔ اس بار رشتوں کے نام دیتے ہیں۔۔۔ میری بھابی ہونگی؟“ انابییہ نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

لامعہ نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا، پھر مسکرا دی تھی۔

”تھینکس انابییہ! تم بہت اچھی ہو۔ مجھے تمہارے اتنے اچھے ہونے پر ہمیشہ بہت غصہ آتا تھا اب۔۔۔ اب نہیں آتا۔ سارا خالی پن اندر سے اٹھتا ہے اور اندر کا خالی پن سکون نہیں لینے دیتا

محبت کو اپنے پیچھے بھی آنے دیا اور اسے اپنے سنگ باندھ بھی لیا۔ وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔“ انہ نے مسکراتے ہوئے بھائی کی دکالت کی تھی۔
لامعہ مسکرا دی تھی۔

”میں جانتی ہوں انابیہ!۔۔۔ بہت سی غلطیوں میں سے ایک غلطی یہ بھی ہے۔ میں نے اوز سید کو، اس کی محبت کو کبھی سمجھا ہی نہیں۔ کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اگر میں پہلے ہی یہ سمجھ جاؤں آج یہ سب نہ ہوتا۔ اوزان، اوزان کی محبت میرے لئے تھی۔ میرے ساتھ تھی اور میں بھاگتی جا رہی تھی۔ انابیہ! میں ایک بات سمجھ نہیں پائی تھی۔ محبت دل میں خود گھر کرتی ہے، اس کے لئے زبردستی نہیں آتی۔ زبردستی چھین لینے کی خواہش سے خواہشیں مرنے لگتی ہیں۔ ایسا مجھے بہت دیر میں پتہ چلا میرے اندر کی خواہشیں بھی ایک ایک کر کے مر گئیں۔ صرف خود غرضی تھی وہ۔ میں غلط تھی، سوا کھڑی رہ گئی۔ اور سچ کبھی تنہا نہیں ہوتا انابیہ! تم خوش ہونا؟“ لامعہ نے پوچھا تھا اور انابیہ جواب تلخ خود کو کیسے بھولے بیٹھی تھی، چونک پڑی تھی۔

”میں؟۔۔۔ ہاں، میں۔۔۔ میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔“ بہت پھینکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر تھی۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے انابیہ؟۔۔۔ وہ بندہ تم سے اتنی محبت کرتا ہے، یہ تم بھی جانتی ہو۔ دوسروں کی محبت کی حقیقت سمجھانے والی لڑکی محبت سے اتنی خائف رہے، اچھا نہیں لگتا۔“ لامعہ نے اسے ڈنڈا تھا۔ انابیہ خاموشی سے سر جھکا گئی تھی۔

”عفتنان علی خان تمہیں کس قدر اور کتنا چاہتا ہے انابیہ! یہ بات صرف میں ہی نہیں، پورا جہان جانتا ہے۔ کس قدر پاگل ہے وہ تمہارے لئے۔ پھر یہ بے یقینی کیوں؟“

”نہیں لامعہ!۔۔۔ بعض اوقات جو نظر آتا ہے ویسا ہوتا نہیں۔ شاید عفتنان کو مجھے پانے کی ایک لگن تھی۔ اگر یہ لگن پوری نہ ہوتی تو شاید وہ اب تک اسی دیوانگی سے میری تمنا کرتا رہتا۔ مگر کسی شے کے حصول کے بعد، اسے پالنے کے بعد اس کی اٹریکشن ختم ہو جاتی ہے سو.....“

”شٹ اپ انابیہ!۔۔۔ تم عفتنان کو سمجھنے میں ضرور کوئی غلطی کر رہی ہو۔ خواہ خواہ اپنی دنیا سکون بر باد مت کرو۔ تم جانتی ہو وہ تم سے محبت کرتا ہے اور بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اب یہ ادھر ادھر کی فضول باتیں جانے دو۔ تجھ پر وفا کی طرح تجدید محبت بھی ضروری ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اعتبار ہی اٹھ جائے۔ تم تو جان بوجھ کر آنکھیں بند کر رہی ہو۔ سب جانتے ہیں اور تم بھی جانتی ہو وہاں روٹنگ وڈیو؟“ لامعہ نے ڈنڈا تھا۔

دونوں دوستوں کے درمیان ویسا ہی دوستی کا ماحول تھا۔ جیسے کوئی دراڑ درمیان میں آئی ہی نہ ہو۔ ”میں بھی ایسا سوچتی تھی لامعہ! مگر ایسا واقعی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں محسوس بھی کر

مگر.....“

انابیہ نے سر ہلاتے ہوئے ایک الجھن میں بات ادھوری چھوڑ دی اور لامعہ سمجھ گئی، ان دونوں۔

ان کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہ انابیہ ان فاصلوں کو اور بھی بڑھا رہی ہے۔



”ماہا کی انگلیج منٹ ہو جائے تو اذہان کی شادی کی طرف آجائے۔“ سعد حسن بخاری ٹائی کی ٹائٹ ہتے ہوئے بولے تھے۔

فارحہ نے بالوں میں برش کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ مگر آپ کو نہیں لگتا، ماہا کی شادی پہلے ہونی چاہئے؟“

”نہیں۔۔۔ وہ ابھی ایم بی اے کر رہی ہے۔ اسے کرنے دو۔ میں نے ایک بار پہلے اپنے بچوں کو، خواہشوں کو کوئی امید نہیں نہ دے کر انہیں خود سے پرے دھکیل دیا تھا۔ اب ایسا نہیں ہو گا۔ کوئی بتی نہیں ہو گی۔ میرے بچے جو کرنا چاہیں گے انہیں ویسا کرنے کی اجازت ہو گی۔“ سعد بولے اور فارحہ انہیں دیکھنے لگی تھیں۔

ایک بار پھر وہی پرانا سعد ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک پل کو تو لگا ہی نہیں تھا کہ کوئی گزرا ہوا برا درمیان آیا بھی ہو۔ ایک لمحے نے ایک جادوئی چھڑی گھما کر جیسے سارا منظر بدل دیا تھا۔

”ایسا ہوتا ہے؟“ فارحہ سوچ رہی تھیں جب سعد بولے تھے۔

”کیا ہوا؟۔۔۔ یہ آپ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟“

”نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔“ وہ مسکرا دی تھیں۔

”کچھ تو ہے۔ بتاؤ؟“

”سوچ رہی تھی۔“

”کیا؟“

”ایک پل میں سب پہلے جیسا کیسے ہو گیا۔“ اس کے لہجے میں حیرت تھی اور ایک اطمینان بھی۔

سعد چلتے ہوئے ان کے پیچھے آن رکے تھے۔ جھک کر ان کے گرد اپنے بازوؤں کا حصار پھیلایا تھا اور اپنے میں ان کے گس کو دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

”تم میں ایک جادو ہے فارحہ!۔۔۔ بس سمجھ لو، اسی جادو سے تم نے یہ سب ٹھیک کر دیا ہے۔“

”جادو۔۔۔؟“ وہ چونکی تھیں۔

”ہاں۔۔۔ خود سے دور نہیں جانے دیتیں۔ کیا تھا کچھ دنوں کے لئے مگر۔۔۔ جی لگا نہیں۔“

فارحہ ہنس دی تھیں۔

”مذاق مت کیجئے۔“

”مذاق نہیں۔ ٹرسٹ می۔ میں واقعی نہیں رہ سکا۔ بس ایک عادت سی پڑ گئی تھی تمہاری۔ اور کچھ محبت لگتی۔ جو کچھ میں نے کیا وہ تو بس ایک ضد سی تھی جو مجھے ہو گئی تھی۔ لیکن میں غلط تھا۔ اور اب اس کا

لازمہ مجھے ہو چکا ہے۔“ سعد نے مدہم لہجے میں کہا تھا۔

”غلط آپ نہیں تھے سعد! — غلط شاید وقت تھا۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ آپ اس طرح، اتنی دوری پر مجھ سے جا کھڑے ہوں گے۔ اور وہ بھی کسی دوسرے کے ساتھ۔ اپنی ہاؤس اب جب سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے تو اس بات کا ذکر بھی کیوں کریں۔“

”ٹھیک — تمہاری ایک بات بہت اچھی ہے فارحہ! بہت جلد معاف کر دیتی ہوں۔ میں سوچتا ہوں، دو چار گناہ اور کر لوں۔“ سعد شرارت سے کہتے ہوئے ہنس دیتے تھے۔

فارحہ نے پہلے گھورا، پھر مسکرا دی تھیں۔

”ہماری عمر تمام ہوئی سعد! — اب تو وقت ہمارے بچوں کا ہے۔ ہمیں ان کے پراہلو کو حل کرنا چاہئے، نا کہ اپنے پراہلو سے انہیں الگ جھانا چاہئے۔ آپ نے نہیں دیکھی، میں نے دیکھی ہے وہ اسٹریس۔ وہ فرسٹیشن۔ بہر حال، وہ سب گزر گیا سواب ہمیں اس کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہئے۔“ فارحہ نے بات سمیٹ دی تھی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ آئی ایم ریڈی۔ میں باہر دیکھتا ہوں۔ گیٹ آنا شروع ہو گئے ہیں۔ آپ بھی تیار ہو کر آجائیے۔“

”ٹھیک — لیکن اپنی بیٹی سے ملنا مت بھولنے گا۔ کچھ نروس ہوگی وہ۔ پوچھ لیجئے گا اُسے۔“

فارحہ نے لبوں پر لپ اسٹک لگاتے ہوئے کہا تھا۔ سعد نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”تمہاری آٹھی فارحہ کا فون آیا تھا۔ ماہا کی انگیج منٹ ہے آج۔ تم نے جانا نہیں کیا؟“ وہ بیڈ پر آدھی ترچھی لیٹی ہوئی تھی جب زوباریہ نے اس کے کمرے کی کھڑکی کے پردے کھینچتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں — موڈ نہیں۔“ اس نے بہت مدہم لہجے میں کہا تھا۔

زوباریہ نے چند لمحوں تک اسے خاموشی سے دیکھا تھا، پھر چلتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی تھی۔

”جیا ایسے نہیں جاتا میرب! — جینا سیکھو۔ میں تمہارے لئے کافی بنا کر لاتی ہوں۔“ زوباریہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر چلتی اور چلتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

”میں نہیں جانتی جیا کیسے جاتا ہے۔ نہیں جینا آتا مجھے۔“ میرب نے سر بیڈ پر پٹچا تھا۔ مائی۔

اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ جیسے پایا کے اور ان کے درمیان کوئی بات ہوئی ہی نہ ہو۔

مائی جھوٹ تو نہیں بول سکتی تھیں۔ وہ ان پر اعتبار کرتی تھی۔ جب وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھیں یقیناً سچ ہی تھا کہ ان کی اور پایا کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

اب باقی بیچتے تھے پایا۔ ان کے آنے تک اسے انتظار تو کرنا ہی تھا۔ وہ ایک دن کے — جرمنی گئے تھے اور جب تک وہ واپس آجائے، اسے یوں ہی سوچتے رہنا تھا۔ پتہ نہیں کیا کر رہی اس کے ساتھ زندگی۔

وہ اسی طرح اوندھے منہ پڑی تھی جب اس کا سیل فون بجا تھا۔ اُس نے بے دھیانی سے دیکھے پتے فون کان سے لگا لیا۔

”نتیجے مروت لڑکی ہوتی — اس دنیا کی سب سے خود غرض لڑکی۔“ سیفی نے کوئی لگی لہجے کے بغیر کہا تھا۔

”اوہ — سیف الرحمن! تم؟“ اس کے ہوش ایک منٹ میں ٹھکانے آئے تھے۔

”سیف الرحمن کی بچی — کہاں غائب ہو تم؟ — اتنی منتوں مرادوں کے بعد خدا خدا کر کے میری انگیج منٹ ہو رہی ہے اور تم غائب ہو۔“ سیف نے گلہ کیا تھا۔

اسنے برے موڈ کے باوجود وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”سیفی! تم بھی نا۔“

”آج واقعی میری انگیج منٹ ہونے جا رہی ہے۔“

”ہاں — جانتی ہوں میں۔ پتہ ہے مجھے۔“ وہ مدہم لہجے میں بولی تھی۔

”پتہ ہے اور پھر بھی غائب ہو۔“

”غائب نہیں ہوں سیف! دراصل میری طبیعت خراب ہے۔ زوباریہ بھی یہی کہہ رہی تھی۔“

”تو تم نہیں آ رہی ہو؟“ سیف الرحمن کو حیرت ہوئی تھی۔

”میں آئی تو پھر بھی تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا سیفی! — میرا موڈ بہت خراب ہے۔“

”شٹ اپ میرب! — تمہیں صرف اپنی پرواہ ہے، میری نہیں۔ کیسی لڑکی ہو تم؟ — ٹھیک ہے، مت آؤ۔ آرام کرو۔ بائے۔“ سیف الرحمن نے فون بند کر دیا تھا۔

میرب سیل فون ہاتھ میں لے رہ گئی تھی۔

کیوں سمجھ نہیں رہا تھا سیفی۔

وہ اس موڈ کے ساتھ کیسے شرکت کر سکتی تھی؟ — اس موڈ کے ساتھ شرکت کرنے کا مطلب کسی رکا موڈ بھی خراب کرنا تھا۔ مگر سیفی یقیناً سمجھ نہیں رہا تھا۔ ناراض ہو گیا تھا وہ۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اسے منانے کی، کوشش فوری طور پر کرتی مگر اس وقت تو وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھی تھی۔ تب ہی بارہ سیل فون بجا تھا۔

”ہیلو سیفی! آئی ایم سوری۔ تم۔۔۔۔۔“

”ہیلو، اِس ناٹ سیفی۔ اذہان میر۔ وہاٹ ہپینڈ؟“ اذہان نے پوچھا تھا۔

اس نے تھکے ہوئے انداز میں ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے سر دوبارہ بیڈ پر رکھ دیا تھا۔

”ہائے اذہان! — کیسے ہو؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے سیفی کا فون آیا تھا۔ وہ مجھے آنے کے لئے کہہ

ا تھا۔ لیکن میں نہیں آنا چاہتی۔“

”کیوں — اب کیا ہوا؟“ اذہان نے اس کی بات سن کر مکمل رسائیت سے پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں — تم کہاں ہو اس وقت؟“

”میں اس انگیج منٹ وینو میں ہوں۔ تم ریڈی ہو؟“

”نہیں۔“ میرب کو صاف لگا تھا اب اس کا انکار کوئی معنی نہیں رکھے گا۔ تب ہی تھکے ہوئے لہجے

میں بولی تھی۔

”تو ٹھیک ہے۔ تم آدھے گھنٹے میں ریڈی ہو جاؤ۔ میں پیک کر لیتا ہوں۔“

”اذہان!۔۔۔ موڈ نہیں ہے۔ پھر کبھی سہی۔ آج نہیں۔“ اس نے کمزور لہجے میں انکار کیا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔ موڈ بن جائے گا۔ اور جب موڈ خراب ہو تو اسے ٹھیک کرنے کے لئے وہ کرنا چاہئے جس کے لئے دل نہ چاہ رہا ہو۔ ایسا کرنے سے خراب سے خراب موڈ بھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ شاباش، تیار ہو جاؤ۔“ اذہان نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور تب میرب کے پاس کوئی اور راہ نہیں بچی تھی ماسوائے اٹھنے اور تیار ہونے کے۔

گی چپ چاپ الماری کے اندر سے کپڑے نکال کر سوٹ کیس میں ڈال رہی تھی جب سردار بیکٹگین حیدر لغاری اندر داخل ہوا تھا۔

”یہ کیا کر رہی ہو تم؟“

”کچھ نہیں۔۔۔ پیکنگ کر رہی ہوں۔ تمہاری نلکٹ کفرم ہو گئی جانے کی؟“

”نہیں۔۔۔ میں نے ٹرائی نہیں کیا۔ یہ پیکنگ کس لئے؟۔۔۔ خیریت؟“

”ہاں۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔ بہت اچھا لگا۔ بہت مزہ آیا۔ بہت سارا اچھا وقت گزارا میں نے یہاں۔ اور اب واپسی۔“

”واپسی؟۔۔۔ تم کہاں جا رہی ہو؟“

”واپس۔۔۔ بھول گئے تھے؟ میں تو یہاں کچھ دنوں کے لئے ہی آئی تھی۔“ گی بہت اطمینان سے مسکرائی تھی۔

”ہاں، مگر.....“

”مگر کیا؟۔۔۔ جب پتہ ہے تو واپسی شرط ہے۔ آئی ہو پ کہ تم اپنی اس اچھی سی دوست کو مگر ضرور کرو گے۔“

”شٹ اپ گی!۔۔۔ تم یہاں سے صرف اس لئے بھاگ رہی ہو کہ.....“

”ہاں۔۔۔ بھاگ رہی ہوں۔“ گی اپنا کام جاری رکھتے ہوئے مسکرائی تھی۔ ”میں یہاں ایک کام سے آئی تھی گین! کام ختم اور میرا واپس جانا ضروری ہو گیا ہے۔“ گی بولی تھی اور سردار بیکٹگین حیدر لغاری اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”تم صرف اس لئے واپس جا رہی ہو کہ.....“

”نہیں گین!۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے تو واپس جانا ہی تھا۔ اور اب وہ مقصد بھی پورا ہو گیا ہے۔ میں چلی بھی جاؤں گی مگر میں چاہتی ہوں گین! تم اپنی زندگی بہت اچھی طرح سے گزارو اور اس کے ساتھ گزارو جس کے ساتھ تم گزارنا چاہتے ہو۔ اختلافات بہت معمولی ہیں گین! بھلا دو سب کچھ۔ یہ یاد رکھو کہ کوئی ضروری ہے اور اس کے ساتھ زندگی کتنی ضروری ہے۔“

نے ہمیشہ کی طرح ایک ہی بات پر زور دیا تھا۔

سردار بیکٹگین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”اچھا بولتی ہو۔۔۔ تمہاری باتیں بھی اچھی لگتی ہیں۔ مگر زندگی تمہاری خوب صورت باتوں کی طرح نہیں ہے۔ زندگی بہت الگ ہے گی!“ سردار بیکٹگین حیدر لغاری کا لہجہ مدہم تھا۔

”کچھ بھی الگ نہیں ہے گین! تم ایک بار قدم بڑھاؤ۔ سب ایک جیسا ہو جائے گا۔ یہ منظر بدل جائے گا۔ تم ہاتھ بڑھا کر تو دیکھو۔“ گی جانے سے پہلے جیسے سب چیزوں کو ان کی جگہ پر دیکھنا چاہتی تھی۔

”یہ سب باتیں تم ہزاروں بار کہہ چکی ہو گی!“ سردار بیکٹگین حیدر لغاری نے باور کرایا تھا۔ ”میں چاہتا تھا تم یہاں رہو۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھو مگر تم.....“ کچھ سوچ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ گی مسکرا دی تھی۔

”یہ گھر کسی اور کا ہے گین! اور جس کا ہے اسے اس کے اندر آنے کی اجازت دو۔ میں تو تمہاری بھئی دوست ہوں۔ آتی جاتی رہوں گی۔ جسے ہمیشہ یہاں رہنا ہے تم اس سے کیوں نظریں چرا رہے؟“ گی نے بات کا رخ ایک بار پھر اسی طرف موڑا تھا۔ سردار بیکٹگین حیدر لغاری اسے دیکھ کر رہ گیا۔ پھر قدرے توقف سے بولا تھا۔

”تم جانتی ہو گی! میں بہت پر یکے نکل قسم کا بندہ ہوں۔ زندگی کو دیکھنے کی اور برتنے کی لاج بہت ٹلف ہے میری۔ میں زندگی کو تمہاری نظر سے نہیں دیکھتا۔ تم جو باتیں کرتی ہو، دنیا کے دو پرسنٹ لوگ ہی ان باتوں پر یقین نہیں کرتے۔ تم ایک جذباتی لڑکی ہو اور میں تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ ٹی ڈو بٹ۔۔۔ زندگی ان باتوں کے سہارے آباد نہیں ہوتی۔ تم اس طرح تنہا کھڑی ہو تو اس میں پور تمہاری اپنی سوچوں کا ہے۔“ وہ روانی سے کہہ گیا تھا۔

گی جو تیزی سے سامان رکھ رہی تھی، ایک لمحے میں اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔ وہ پلٹ کر سردار بیکٹگین حیدر لغاری کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ سردار بیکٹگین حیدر لغاری کو گمان تک نہیں گزرا تھا کہ وہ کچھ غلط کہہ رہی ہے۔

”میں اگر تنہا ہوں تو اس میں قصور میری سوچوں کا نہیں ہے گین!۔۔۔ ایسا طے شدہ تھا۔ میری بات ہے یہ۔۔۔ اور میں اسے قبول کرتی ہوں۔“ وہ بہت مضبوط لہجے میں بولی تھی۔ آنکھوں میں تیرتی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا اس حالت میں اتنا اسٹریس لینا اور اتنی دیر کھڑے رہنا سب نہیں تھا۔

سردار بیکٹگین حیدر لغاری کو خیال آیا تھا اور اس نے گی کو شانوں سے تھام کر بیڈ پر بٹھا دیا تھا۔ ”ریلیکس گی!۔۔۔ سوری، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ لکھایا طے شدہ کچھ نہیں ہے۔ ہم جو سوچ لیتے، جو کرتے ہیں اسی سے ہمارے آگے والی، آئندہ آنے والی زندگی بنتی ہے۔“ نرمی سے سمجھایا تھا۔ ”بات اپنے اپنے سوچنے کی ہے گین!۔۔۔ جیسا تم سوچتے ہو ویسا میں نہیں سوچتی۔ اور جیسا

میں سوچتی ہوں ویسا تم نہیں سوچتے۔ بعض اوقات کسی کو پائی لینا کافی ہوتا ہے اور بعض اوقات پائی لینا کافی نہیں ہوتا۔ اور تمہیں تو یہ بھی نہیں پتہ کہ میں تنہا ہوں بھی یا کہ نہیں۔ مگر میں تمہاری طرح سوچوں تو شاید مجھے مجھے بھی لگے کہ میں خالی ہاتھ ہوں اور تنہا ہوں مگر۔۔۔ میں ایسا سوچتی ہی نہیں۔ میرے ہاتھ خالی ضرور ہیں گین! مگر میرا دل بھرا ہوا ہے اور جب دل بھرا ہوا ہو تو پھر کسی اور شے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ میرے پاس آدمی ادھوری ہی آسکی، محبت ضرور ہے۔ اور میں اس پر شرمندہ بھی نہیں ہوں۔ کچھ یادیں بھی ہیں اور ان کے ہونے پر بھی بڑے ملال نہیں ہوں۔ میں جو بھی ہوں، جیسی بھی ہوں اپنے آپ کو قبول کرتی ہوں اس لئے میں دوسروں کو بھی اتنی آسانی سے قبول کر سکتی ہوں۔ شاید دوسروں کو میں بہت غلط لگتی ہوں۔ مگر میں صحیح ہوں۔ یہ بات میں جانتی ہوں۔“ گی کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ایک پُر اعتماد، دھیمی سی مسکراہٹ۔ جیسے وہ اپنی سوچ سے ہی سردار بیکٹگین حیدر لغاری کو شکست دے رہی ہو۔

سردار بیکٹگین حیدر لغاری نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ پھر گھٹنوں کے بل اس کے سینے سے بیٹھا ہوا نرمی سے بولا تھا۔

”گی! تم غلط نہیں ہو۔ میری اتنی اچھی دوست غلط ہو ہی نہیں سکتی۔ کیا تم مجھے بھی ایسے جیسا سوچنا سکھا سکتی ہو؟“ وہ اس کا موڈ درست کرنے کو مسکرایا تھا۔ گی کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آگئی تھی۔

”سچ میں گی! تم بہت اچھی ہو۔ اتنی اچھی کہ اگر میری زندگی میں میری اس سوکالڈ وانگ کی جگہ بن چکی ہوتی تو شاید میں تم سے شادی بھی کر لیتا۔“ وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔ گی کھل کر مسکرا دی تھی۔

”اس کو مانو گے تب ہی تو اسے زندگی میں جگہ دے پاؤ گے۔ ویسے مان تو تم جیکے ہو۔ بس یہ پانچ انا پرستی کی دیواریں بھی گرا دو۔“

”تمہارا خیال ہے، میں انا پرست ہوں اور وہ جو فیسی ازم میں قید ہے، اس کو کیا کہو گی تم؟“ سردار بیکٹگین حیدر لغاری ایک بل میں سنجیدہ ہوا تھا۔ ”مسئلہ جہاں نہیں بھی ہوتا ان محترمہ کو خود مسئلہ کھڑا کر اچھا لگتا ہے۔ جہاں غلطی نہیں ہوتی، وہاں بھی غلطیاں تلاش کرتی ہیں وہ۔“

”نہ تم یہ میں ایگو ازم توڑنے کو تیار ہونہ وہ اپنے فیسی ازم سے باہر آنے کو تیار ہے۔ تو پھر باہر کیسے بنے گی؟“ گی کو تھوٹھیں تھیں۔ وہ صحیح معنوں میں ان دونوں کی خیر خواہ تھی۔

”بات اب بنے گی نہیں گی! ختم ہوگی۔ اس آل ریڈی ڈن۔ بات ختم ہی ہونے جا رہی ہے۔ محترمہ نے آغاز کر دیا ہے۔ بلکہ بہت دیر پہلے آغاز کر دیا تھا۔ وہ اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہیں تو رشتہ ختم ہو جائے گا۔ میں تو صرف ان کی خواہشوں کو پورا کر رہا ہوں۔ تم کس بات کی فکر کر رہی گی؟“

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا بھی گین! وہ نا سبھی میں کر چکی ہے تو کیا تم بھی؟“ تم تو دار بنو۔ کم از کم کلیئر کرنے کی کوشش کرو۔“

”کسا کلیئر کرنے کی کوشش کروں؟“ وہ مٹا رہی ہے سب کچھ اور تم بات کرتی ہو کلیئر کر

کی۔ کلیئر بیکٹگین کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں کچھ باقی بچتا ہو اور اس کے اور میرے درمیان سب ختم ہونے کو ہے اور میں اپنی صفائیاں آپ پیش نہیں کر سکتا۔ اس سب کے لئے ”معافی نامہ“ دار نہیں کر سکتا جو میں نے کبھی کیا ہی نہیں۔ مجھے سمجھوتہ نہیں کرنا ہے۔ اور ایسے حالات میں تو قطعاً ہی نہیں۔ اگر وہ اپنی فضول کی سوچوں میں زندہ رہنا چاہتی ہے تو رہے۔ میں اسے کسی بات کی کوئی وضاحت نہیں دوں گا۔“ سردار بیکٹگین حیدر لغاری کا لہجہ اور انداز دونوک تھا۔

”تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا گین؟“ گی نے نرمی سے پوچھا تھا۔ ”اس کے ایسا کرنے سے دور جانے سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا؟“ چلو مان لو، وہ غلط کر بھی رہی ہے۔ جو بھی کر رہی ہے وہ غلط کر رہی ہے مگر تم نے کیا، کیا اس رشتے کو بچانے کو؟“ کوئی ایک بھی اسٹیپ لیا؟ اگر کبھی لیا ہوتا تو آج تمہارا یہ رشتہ اس طرح ٹوٹ نہیں رہا ہوتا۔ اس بے چاری لڑکی کو سارے الزام مت دو گین! غلطیاں آپ کی بھی ہیں۔ اگر آپ بہت اچھے ہیں تو اسے غلط ثابت کیوں نہیں کر دیتے؟ وہ صرف غلط فہمیوں کا شکار ہے تو اس کی غلط فہمی دور کر دو نا۔ سارا اعتبار اسی کی طرف سے کیوں؟

تم بھی تو کچھ اعتبار کر سکتے ہو اس پر۔ تھوڑا اعتبار سوچ سکتے ہو اسے۔ تم اتنا کچھ اس کی طرف سے کیوں امید کرتے ہو؟ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ کچھ امیدیں اس کی بھی ہو سکتی ہیں۔ وہ بھی تو ایسا سوچ سکتی ہے کہ پہلے تم ہاتھ بڑھاؤ، اسے تمام، سہارا دو۔ کیا غلط چاہتی ہے وہ گین؟ لڑکیاں عجیب ہوتی ہیں گین! ان کی خواہشات بھی عجیب ہوتی ہیں۔ انہیں سمجھنا اتنا مشکل نہیں۔ بس دل چاہئے۔ بے وقوف ہوتی ہیں کچھ۔ دل سے سوچتی ہیں۔ جو بھی کرتی ہیں دل سے کرتی ہیں۔ سو انہیں دماغ والے نہیں سمجھ سکتے۔“ گی نے میرب کا بھر پور دفاع کیا تھا۔

”ٹھیک کہتی ہو تم۔ لڑکیوں میں عقل تھوڑی ہوتی ہے۔“ سردار بیکٹگین حیدر لغاری نے حتمی طور پر کہا تھا۔ گی کا دل سر پیٹ لینے کو چاہا تھا۔

”سردار بیکٹگین حیدر لغاری! کبھی سوچیں گے کہ لڑکی بھی کوئی احساس یا جذبات رکھتی ہے۔“

”میں لہرل ہوں گی! میرے لئے لڑکی یا لڑکے سے فرق نہیں پڑتا۔ مرد ہو یا عورت، اپنی غلطیوں کو اٹانا چاہئے۔“

”تم مانتے ہو؟“ گی اس کی بات کا تکی ہوئی بولی تھی۔

”کیا؟“ سردار بیکٹگین حیدر لغاری نے بنا سمجھے کہا تھا۔

”گین! غلطیاں تو تم سے بھی ہوئی ہیں۔ پھر سارا الزام اسی پر کیوں؟ ٹھیک ہے، اگر آپ اسے کچھ نہیں بتا سکتے تو میں بتا دیتی ہوں۔“ بہت اطمینان سے کہا تھا۔

سردار بیکٹگین حیدر لغاری چونک پڑا تھا۔

”کیا بتاؤ گی تم اُسے؟“

”سب۔“ گی کا اطمینان ہنوز برقرار تھا۔

”سب کیا؟“ گی کے کہنے پر سردار بیکٹگین حیدر لغاری نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ”گی! میں تم

سے یہ بچوں جیسی باتوں کی امید نہیں کرتا۔ کم از کم تم تو اس طرح کی باتیں نہ کرو۔“ سردار سیکٹین حیدر لغاری بولا تھا۔

”یہ بچوں جیسی باتیں نہیں ہیں گین!“

”پھر بھی تم کسی سے کچھ نہیں کہو گی۔“ حکم جاری ہوا تھا۔

”تو پھر تم کیا کہو گے؟“ گی نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ سردار سیکٹین حیدر لغاری کچھ نہیں بولا تھا۔ چپ چاپ اٹھا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔

بہت ہی گہما گہمی ہو رہی تھی۔ لوگ تھے۔ جھوم تھا۔ مگر وہ اس بھڑ میں بھی تباہی کھڑی تھی۔ اپنے ہی دھیان میں۔ ادھر ادھر کی کچھ پرواہ تھی نہ مگر۔

اذہان اُسے یہاں لے ہی آیا تھا مگر یہاں کے ماحول نے موڈ پر کچھ زیادہ اثر نہیں ڈالا تھا۔ اس کا موڈ جوں کا توں تھا۔

”کیا ہوا؟“ آپ چپ چاپ کیوں کھڑی ہیں؟“ ایک دوستانہ لہجہ اس کے قریب ہی ابھرا تھا۔

میرب نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ سامنے بلیو شیفون کی ایمبرائیڈڈ ساڑھی میں نازک سی لڑکی کھڑی تھی۔ میرب کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

”ساہیہ؟“ میرب نے مدغم لہجے میں پکارا تھا۔

”اب پوچھنے میں نے آپ کو کیسے پہچانا؟“

میرب اس کی بات پر بھی کچھ نہیں بولی تھی۔ تب ہی وہ مسکراتی ہوئی اسی شکفتگی سے بولی تھی۔

”دنیا کی سب سے اچھی اور خوبصورت لڑکی کو پہچانا کچھ اتنا مشکل بھی نہیں۔“ ساہیہ کے لبوں پر بڑی دوستانہ سی مسکراہٹ تھی۔

میرب کے لئے مسکراتا ضروری ہو گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں ہی میرب ہوں۔ میرے لئے بھی تمہیں پہچانا مشکل نہیں رہا۔ میں بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہی تھی۔“

ساہیہ ہنس دی تھی۔

”ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کافی اچھا سوچتے ہیں۔ لیکن آپ اس قدر چپ کیوں کھڑی تھیں؟“ ساہیہ نے پوچھا تھا۔

”نہیں۔۔۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ میں تو آنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ مگر سینی نے بہت ضد کی۔ سو آنا پڑا۔ وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میں اس کی بات نہیں ٹال سکتی۔ سو چلی آئی۔“

میرب نے ایک مروت بھری مسکراہٹ لبوں پر سجا کر کہا تھا۔ ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”اپنی ہاؤ۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ ساہیہ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔

”تم سے مل کر بھی بہت خوشی ہوئی۔ تمہارے بارے میں اذہان سے بہت سنا تھا۔ دیکھا تو پتہ چلا، ن غلط نہیں تھا۔“ میرب مسکرا دی تھی۔

”ارے آپ اس کی باتوں پر یقین کرتی ہیں؟“ اُسے تو عادت ہے بے پر کی اڑانے کی۔

”اس نے آپ کے بارے میں غلط نہیں کہا تھا۔“ ساہیہ اپنے شکفتہ سے انداز میں مسکرائی تھی۔

”آپ کھڑی کیوں ہیں؟“ آپ کی تو طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ آپ پلیز، بیٹھ جائیے۔ ابھی ہی ہی دیر میں منگنی کی پارٹی شروع ہو رہی ہے۔ آپ سینی سے ملنا چاہیں گی، اس لئے آپ یہاں بیٹھی۔“ ساہیہ نے ایک قریب پڑی چیز کی طرف اشارہ کیا تھا۔

میرب کو نجوم سے یوں بھی اُلٹھن سی ہو رہی تھی۔ عجیب مردہ سادل ہو رہا تھا۔ تب ہی اس نے سرٹی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

”آپ کی سگی خالہ کا گھر ہے اور آپ پھر بھی اتنی فارل ہو رہی ہیں۔“ ساہیہ نے مسکراتے کہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔ اس گھر میں بھاگتے دوڑتے بڑی ہوئی ہوں میں۔ پھر یہ گھر میرے اکیسے ہو سکتا ہے؟“ میرب پر اعتماد انداز میں گویا ہوئی تھی۔

”میرب مسکرا دی تھی۔“

”ہاں۔۔۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔“

”کیا؟“ میرب چونکی تھی۔

”یہی کہ آپ اس گھر کی بہت پیاری سی بیٹی ہیں۔ فارحہ آئی واقعی آپ سے بہت پیار کرتی ساہیہ کا انداز شفاف تھا۔“

”ال۔۔۔ ایسا ہی ہے۔ اذہان بہت کئی ہے اسے تم جیسی لڑکی ملی۔“

”یہ ہنس دی تھی۔“

”اس سے پوچھ کر دیکھئے گا۔ اسے لگے گا میں کئی ہوں جسے اس جیسا لڑکا ملا۔ آپ کو پتہ ہے کتنی بار اس سے آپ سے ملوانے کو کہا مگر وہ ہر بار ٹال گیا۔ مجھے تو لگا وہ چاہتا ہی نہیں ہے کہ میں آپ۔“

”ساہیہ مسکرائی تھی۔ اس کے انداز میں کہیں کوئی طنز نہیں تھا۔ کوئی تجسس بھی نہیں تھا۔“

”ب کے دل میں بھی کہیں کوئی چور نہیں تھا۔ سو اعتماد سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی مسکرائی تھی۔“

”ما میں اذہان کے ساتھ اس کا کوئی بھی رشتہ رہا ہو، اب اس کی کوئی حقیقت نہیں رہی تھی اور ایسا دل جانتا تھا۔ مگر شاید ساہیہ کہیں اس حقیقت سے بے خبر تھی۔ شاید اس کی یادداشت کے کسی ل اب بھی وہ رشتہ زندہ تھا اور میرب اس بات کی حقیقت پا گئی تھی۔ تب ہی بہت نرمی سے ف دیکھتی ہوئی مسکرائی تھی۔“

”کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟“

”کچھ نہیں۔۔۔ صرف محبت تلاش کر رہی ہوں۔ جو اذہان تم سے کرتا ہے اور تم اذہان سے کرتے ہو۔“

ساہیہ مسکرا دی تھی۔

”تو پھر کیا نظر آیا آپ کو؟“ ساہیہ نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔

”محبت۔“ میرب دھیسے سے لہجے میں بولی تھی۔

”محبت؟“ ساہیہ چونکی تھی۔

”ہاں، محبت۔ محبت زندگی میں کئی زاویے بدل کر آتی ہے ساہیہ! کئی رنگوں میں نظر آتی ہے اور بار رنگ نیا ہوتا ہے۔ اذہان نے شاید تمہیں نہ بتایا ہو مگر اس کی زندگی میں تم بہت اہم ہو۔۔۔“

سب کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ہمارے لئے بہت اہم ہوتا ہے۔ جیسے میرے لئے کوئی اہم ہے۔ اتنا میں اس کے بنا جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ وہ میرا شوہر ہے۔ میری دنیا اس کے گرد گھوم رہی ہے۔ آج وہ یہ بات نہیں سمجھ رہا مگر ایک دن ضرور سمجھ جائے گا۔ ایسے ہی اذہان کی دنیا میں تم ہو۔“ میر نے ایک لمحہ ہاتھ میں آتے ہی ساہیہ کی سوچ کا رخ بدل دیا تھا۔

ساہیہ اسے ساکت سی دیکھ رہی تھی۔ جب اذہان وہاں ان کے درمیان آن رکھا تھا۔

”یہ تم دونوں خواتین کیا سازش کر رہی ہو؟“

”کچھ خاص نہیں۔ ہم بس آپ کی برائیاں کر رہے تھے۔“ ساہیہ مسکرائی تھی۔

”اوہ، آئی سی۔ میرب! تم بھی اس کے ساتھ مل گئیں۔ کم از کم مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔“

اذہان نے شکوہ کیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ میں صرف اپنے شوہر کی برائیاں کر رہی تھی۔“ میرب نے مسکراتے ہوئے جنایا

اذہان نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ لمحہ بھر کو آنکھیں کچھ بھیجی تھیں۔

”چلو۔۔۔ منگنی پارٹی شروع ہو رہی ہے۔ باقی کی برائیاں آپ دونوں خواتین کسی اور وقت

سکتی ہیں۔ فی الحال یہ کام بھی اہم ہے۔“ اذہان بولا تھا اور ساہیہ مسکراتی ہوئی میرب کا ہاتھ تھا

آگے بڑھنے لگی تھی۔

”مئی کا فون آیا تھا صبح۔ اوزی کے لئے لامعہ کا ہاتھ مانگنے جانا ہے۔ آج شام آپ جلدی آؤ

گا تو ہم چلیں گے۔“ صبح کی معمول کی روٹین کے ساتھ انابییہ نے اطلاع دی تھی۔

عفتنان نے شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے اسے ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھا تھا۔ وہ الما

پٹ کھولے غالباً اس کے لئے میچنگ کی ٹائی نکال رہی تھی۔ سب کچھ تھا مگر درمیان کی وہ سرا

بدستور پھر بھی قائم تھی، وہ ختم نہیں ہو رہی تھی۔ عفتنان اس کی وجہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ایک

برقرار تھا تو کیوں تھا؟

”اگر آپ کے پاس وقت نہ ہو تو بتا دیجئے۔ میں چلی جاؤں گی۔“ خالصتا بیویوں

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے خدو خال میں ڈھل رہی تھی۔ انابییہ بننے کے باوجود مکمل طور پر انجینی

بیں پارہی تھی۔ ایک ٹائی برآمد کر کے پٹی تھی۔

”یہ ٹھیک ہے؟“ ٹائی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

عفتنان نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”دوستی ہوگی؟“ ٹائی تھامتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

انابییہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا جیسے وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ کس کی بابت دریافت کر رہا

وہ قریب تھی۔

ایک خواہش اندر ابھری تھی۔

اسے تمام کر قریب کر لینے کو دل چاہا تھا۔

مگر وہ ہاتھ صرف ٹائی تمام کر بے خیر ہو گیا تھا۔

”آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟“ انابییہ نے پلٹ کر الماری بند کرتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

عفتنان مسکرا دیا تھا۔

”خوشی کی بات ہے؟“ انداز میں ایک خفیف سا طنز تھا۔

انابییہ نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

”خوشی کی بات تو ہے۔ دلوں میں میل رکھنا اچھی بات تو نہیں۔“ اطلاع دی تھی۔

”اچھا۔۔۔ یہ بات آپ کہہ رہی ہیں؟“ عفتنان علی خان نے ٹائی کی ٹاٹ باندھتے ہوئے

سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں ہی کہہ رہی ہوں۔“ اس کی کوئی پرواہ کئے بنا وہ بولی تھی۔

”میں نے کبھی کسی کے لئے میل دل میں نہیں رکھا۔ آپ کو کیا لگتا ہے؟“ اس کے طنز کو محسوس

تے ہوئے وضاحت دے کر پوچھا تھا۔ عفتنان علی خان نے اس کی طرف دیکھا تھا پھر شانے اچکا

تھے۔

”آپ کا اشارہ پھر میری طرف کیوں ہوا؟“ انابییہ نے نشاندہی کی تھی۔

”میں نے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ آپ تو چور کی داڑھی میں تنکے والی بات کر رہی ہیں۔“ وہ بڑے

نا سے پرفیوم اسپرے کرتا ہوا مسکرایا تھا۔

انابییہ کی حیرت کی حد رہ گئی تھی۔

”کیا؟۔۔۔ میں سمجھی آپ ڈھکے چھپے انداز میں طنز فرما رہے ہیں۔ آپ تو کھلے عام الزامات لگا

ڈیں۔“

”لو۔۔۔ ہوگی شروع جنگ دوئم۔“ وہ اکٹا کر بولا تھا۔

آپ منہ ہی منہ میں بڑ بڑ کیا کر رہے ہیں؟۔۔۔ کچھ سنانا ہے تو اونچی آواز میں سنا دیجئے۔“

انابیہ نے کبل تہہ کرتے ہوئے کہا تھا۔
”کچھ نہیں سنانا مجھے آپ کو۔ سنایا وہاں جاتا ہے جہاں کوئی اثر بھی ہو۔ یہاں کچھ کہنا، نہ کہنا۔
کار ہے۔“ بات ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔

انابیہ اس قطعی انداز پر اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ سوئڈ بوئڈ وہ شخص ایک پل میں بہت پرانا لگا تھا۔ پچھلے
اس کے اور انابیہ کے بیچ کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ انابیہ کو ایک لمحے میں اپنا آپ بہت خالی لگا تھا۔ ہاتھوں
کی گرفت کبل پر کمزور پڑی تھی۔ اس نے کبل وہیں چھوڑ دیا تھا اور چلتے ہوئے اس کے قریب۔
گزر کر باہر نکل جانا چاہا تھا۔ تب ہی عفتان علی خان نے اس کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا
انابیہ نے سوالیہ نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا تھا مگر عفتان کے لبوں پر چپ تھی۔
”بیویوں والے سارے تیور آتے جا رہے ہیں آپ میں۔“ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ لے وہ بو
تھا۔

”یہی بتانے کے لئے آپ نے راستہ روکا ہے؟“ وہ نظریں پھیرتی ہوئی بولی تھی۔

”راستہ کہاں روکا ہے؟“ میں نے ہاتھ تھاما ہے۔ ہاتھ تھامنے والے ساتھ چلتے ہیں، راہ
رکاوٹ نہیں بنتے۔ اگر آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ کے راستے کی کوئی رکاوٹ ہوں تو ہاتھ چھڑا کر آؤ۔
بڑھ جائیے۔ آپ ٹویو۔“ بہت بامعنی بات بہت ہی سرسری انداز میں کہتے ہوئے عفتان علی خان۔
دھیان اس کی طرف سے رہنایا تھا اور ساتھ ہی اس ہاتھ کو بہت آہستگی سے چھوڑ دیا تھا۔
انابیہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔

ایک پل میں اس شخص نے ساری بات ختم کر دی تھی۔ وہ کیوں نہیں سمجھتا تھا کہ جو باتیں اس نے
لئے بہت معمولی تھیں وہ انابیہ کے لئے غیر معمولی بھی ہو سکتی تھیں۔ وہ پلٹ کر اس ہاتھ کو تھام نہیں سکا
تھی۔ وہ ہاتھ خود اس نے چھڑا لیا تھا اور وہ۔۔۔ وہ تو اب تک اس کے ساتھ صرف اپنی مرضی۔
تھی۔ اس شخص کی مرضی اس میں کہیں نہیں تھی۔

یعنی اس کا یہاں رہنا یا نہ رہنا صرف اس کا فیصلہ تھا۔ اس شخص کو اس سے کوئی سروکار ہی نہ تھا
کوئی فرق پڑتا ہی نہ تھا۔ وہ چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

عفتان علی خان نے اسے خود سے دور جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے اور اپنے درمیان فاصلے
بڑھتے دکھائی دیئے تھے۔ پہلے سے بھی کہیں زیادہ۔ اس تعلق کا انجام کیا ہونا تھا؟ وہ نہیں سمجھ سکا تھا۔



زواریہ نے بتایا تھا کہ اس سے کوئی ملنے آیا ہے۔

وہ سمجھی شاید ساہیہ ہوگی۔ وہ نیچے آئی تھی مگر وہاں گی کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

”آپ؟“

گی بہت اطمینان سے مسکرائی تھی۔

”کیسی ہو تم؟“ مجھے یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے؟“

”ٹھیک ہوں۔۔۔ مائی سے صبح بات ہوئی تھی۔ بتا رہی تھیں آپ واپس جا رہی ہیں۔“ میرب
نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ گی نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ مائی نے تمہیں ٹھیک بتایا۔ میں واقعی واپس جا رہی ہوں۔“

”مگر کیوں؟“ گین نے روکا نہیں آپ کو؟“ میرب نے پوچھا تھا۔ گی اس جملے کا مفہوم اچھی
روح سے سمجھتی تھی تب ہی بولی تھی۔

”ہاں، گین نے روکا مجھے۔ جانے سے منع بھی کیا مگر۔۔۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“

”کیوں؟“ میرب نے دریافت کیا تھا۔

”کیوں سے کیا مطلب؟“ آف کورس، مجھے واپس جانا ہی ہے۔ گین نے شاید تمہیں بتایا
میں، میں یہاں ایک ضروری کام سے آئی تھی۔ وہ کام پورا ہو گیا تو بس اب واپسی کے سوا کوئی چارہ
نہیں بچا۔ یوں بھی کوئی کتنی دیر کہیں رہ سکتا ہے؟۔۔۔ میں یہاں صرف ایک گیسٹ تھی۔ گین بہت
جا ہے۔ بہت خیال رکھا اس نے میرا۔ بہت ساتھ دیا۔ بہت اچھا دوست ہے وہ میرا۔ ان فیکٹ اس
نے یہ ثابت بھی کر دیا۔ میں بہت دنوں سے تم سے ملنا چاہتی تھی مگر نکلنا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ آج ساری
نگ ملل ہوئی تو فوراً تمہاری طرف چلی آئی۔ میرب! میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔“

”آپ اتنی جلدی کیوں جا رہی ہیں؟“ اگر سردار بیکٹین حیدر لغاری چاہتے ہیں، آپ رکھیں تو
پ رک جائیں۔“ میرب نے مشورہ دیا تھا۔ ”آپ کو مجھ سے کیا بات کرنی تھی؟ کوئی ضروری کام؟“
کا انداز بہت الجھا الجھا اور عجیب سا تھا جیسے وہ گی کو فیس نہیں کر پارہی تھی۔ گین کی مکمل توجہ کا مرکز
ماوہ۔ پھر وہ کیوں چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے جب کہ اب اس کا اور گین کا رشتہ بھی
ریا اختتام پر تھا۔

گی اس کے سامنے بہت بڑا اعتماد انداز سے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر مکمل سکون تھا۔ مگر میرب
اندر کہیں بھی سکون نہیں تھا۔

”تم پریشان لگ رہی ہو۔ کیا ہوا؟“ گی اس کی طرف سے متشکر ہوئی تھی۔

میرب نے سر ہلا دیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔۔۔ اگر گین چاہتا ہے آپ رک جائیں تو آپ کو رک جانا چاہئے۔ یوں بھی
کی حالت ایسی نہیں کہ آپ سفر کر سکتیں۔ نیچے کی ڈیوڑھی تک تو آپ کو رکنا چاہئے۔“ میرب
شورہ دیا تھا۔

”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ اور ابھی تو بہت سا عرصہ پڑا ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔ میں اپنی کیرئیر خود
لتی ہوں۔“ گی نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور میرب کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ بہت نرمی سے
تھا۔

”آپ کو مجھ سے کیا بات کرنا تھی؟“ میرب نے پوچھا تھا۔

”تم مجھ سے ناراض ہو؟“ گی نے ملاحت سے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

تھی۔

”میرب! — گے کو دیکھو، کیا ہو گیا؟“ زوباریہ کی آواز آئی تھی۔ وہ سرعت سے اٹھی تھی۔ بھاگی ہوئی زوباریہ کی آواز کی طرف پہنچی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ! — یہ کیا ہو گیا؟“ میرب کی جان ایک پل میں فنا ہونے کو تھی۔

”گی! — تمہیں کچھ نہیں ہو گا گی!“

گی درد سے تڑپ رہی تھی جب اس نے اسے تسلی دی تھی۔ مگر گی دوسرے ہی پل آنکھیں موند گئی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی۔ گی کا پاؤں پتہ نہیں کیسے اسٹیز سے پھسلا تھا۔ مگر اس وقت وہ بہت تکلیف میں تھی۔

زوباریہ کے ساتھ مل کر اس نے اسے ہسپتال پہنچایا تھا۔

پتہ نہیں اب کیا ہونا تھا۔ مگر میرب کا دل بہت ڈر رہا تھا۔

اس نے سردار سینگین حیدر لغاری کو بھی فون کر دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہسپتال میں تھا۔

”کیسے ہوا یہ سب؟“ سردار سینگین حیدر لغاری نے پوچھا تھا۔

میرب کو لگا تھا اس سب کا ڈرے دار اب اُسے ہی ٹھہرائے گا۔ اُسے سب سے زیادہ فکر گی اور ار کے بچے کی تھی۔

”جی جھ سے ملنے آئی تھی۔ واپسی پر جب وہ جا رہی تھی اس کا پاؤں اسٹینڈ سے جانے کیسے پھسل گیا اور وہ —“

”یہ گی بھی نا — میں نے اسے منع کیا تھا۔ مگر وہ —“ الزام براہ راست اس پر تو نہیں لگا گیا تھا مگر اس کا انداز ایسا ہی تھا کہ قصور کی باری وجہ وہی دکھائی دی تھی۔

وہ ہسپتال لاؤنچ میں جیسے اپنا کوئی نیا جرم سناے جانے کی منتظر کھڑی تھی۔



”کیا ہوا؟ — آپ اس طرح گم صم سی کیوں کھڑی ہیں؟“ ساہیہ نے اگینے کو کھڑے دیکھ کر

چھا تھا۔

اگینے نے کچھ بھی کہے بغیر سر نئی میں ہلا دیا تھا۔

”آپ پریشان ہیں کچھ؟“ ساہیہ نے اسے بخور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”نہیں — ایسی بات نہیں ہے۔“

”تو پھر؟“

”فیض نے مجھے پروپوز کیا ہے۔“ مدھم لہجے میں بتایا تھا۔

”واؤ — اس اے گریٹ نیوز۔ وائے آر یو سو سیڈ دین؟“

”نہیں — میں سیڈ نہیں ہوں۔“

”تو پھر؟“ ساہیہ نے اگینے کی طرف دیکھا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ اگینے بے طرح اُجھی دکھائی دی تھی۔

ساہیہ نے اس کے شولڈر پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے تھے۔

”زندگی سلجھ رہی ہے تو اسے سلجھنے دیں۔ آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟“

اگینے کچھ نہیں بول سکی تھی۔

”مئی پاپا کو بتایا آپ نے؟“ ساہیہ نے پوچھا تھا۔

”نہیں۔“

”کیوں نہیں بتایا؟ — یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ کو بتانا چاہئے۔“

”ہاں، مگر —“ اگینے کچھ تذبذب کا شکار نظر آئی تھی۔

”آپ پریشان ہیں نا؟“ ساہیہ کسی نتیجے پر پہنچتی ہوئی بولی تھی۔

”فیض چاچو بہت اچھے ہیں پھپھو! مجھے یقین ہے وہ آپ کو بہت خوش رکھیں گے۔ آپ کو اس

ویوزل کو قبول کر لینا چاہئے۔ فیض چاچو ازاے ناس گائے — اینڈ ہی از ہینڈ سم ٹو — آپ

و تو خوش ہونا چاہئے، ایک موسٹ ایلی جیل پیپلر آپ کو پروپوز کر رہا ہے۔ مذاق میں چھیڑا تھا۔

اس کی کوشش کامیاب رہی تھی۔ اگینے مسکرا دی تھی۔

”مذاق ایک طرف پھپھو! لیکن فیض چاچو واقعی بہت اچھے ہیں۔ مجھے لگتا ہے وہ آپ کو بہت خوش

رکھیں گے۔“ ساہیہ پُر یقین لہجے میں بولی تھی۔ اکینے بہت نرمی سے مسکرا دی تھی۔

”میری بات چھوڑو۔ اپنی بناؤ۔ تم دونوں کب شادی کر رہے ہو؟“

”ہماری باری تو بعد میں آئے گی۔ پہلے آپ بڑے تو کر لیں۔“ ساہیہ نے بات مذاق میں ٹال دی تھی۔ دونوں ہنس پڑی تھیں۔

”میں آپ کے لئے کافی بنا کر لاتی ہوں۔“ ساہیہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔ اکینے دوبارہ اسی بچ پر سوچنے لگی تھی۔

گی کا بے بی ابارٹ ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی جان بچ گئی تھی۔

سر دار بیکٹلین کا تو پتہ نہیں مگر میرب اس سب کے لئے خود کو ذمہ دار سمجھ رہی تھی۔ اس کے مس کیج کی وجہ اس کو وہ خود لگی تھی۔ بہت مجرمانہ سے انداز میں وہ سر جھکائے گی کے پاس آئی تھی۔ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور بہت آہستگی سے بولی تھی۔

”آئی ایم سوری گی! — یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ اگر تم میرے پاس نہیں آتیں تو شاید آج تمہارا مس کیج نہیں ہوتا۔“

”ایسا مت سوچو میرب! میں ایسا نہیں سوچتی۔ یہ سب بھی طے تھا۔ بہت سی نہ ہونے والی اور ہونے والی باتوں کی طرح یہ بھی طے تھا سو ہو گیا۔ میری قسمت میں یہ خوشی بھی نہیں تھی۔ سو میں ماں بھی نہیں بن سکی۔ لیکن اس سب کی ذمہ دار تم نہیں ہو۔“ گی بہت نرمی سے بولی تھی۔

میرب وضاحت میں مزید کچھ نہیں بول سکی تھی۔

”تم نے ایسا کیوں سوچا؟ — گین نے تمہیں ایسا کچھ کہا؟“

”نہیں — مگر میں جانتی ہوں۔“ سر جھکائے وہ مجرمانہ انداز میں بولی تھی۔

”کیا جانتی ہو؟“

”یہی کہ غلطی میری ہے۔“

”ڈونٹ بی اسٹو پیڈ میرب! غلطی تمہاری کہاں ہے؟ — میں اسٹیٹرز پر سے پھسل گئی تھی۔ دیٹ واژ جسٹ این ایکسیڈنٹ۔ یہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہر شے کی ذمہ دار خود کو مت سمجھا کرو۔“ گی بول رہی تھی اور میرب کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

”گی! تم بہت اچھی ہو۔ آئی ایم سوری، میں نے تمہیں غلط سمجھا۔“ وہ صاف گوئی سے بولی تو گی مسکرائی تھی۔

”ہماری عادت ہوتی ہے میرب! ہم اپنی مرضی سے کچھ بھی سمجھ لیتے ہیں — ایک بات میں نے بھی سمجھی تھی تمہارے لئے۔“

”کیا؟“ میرب نے بیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”وہ یہ کہ — تم بہت اچھی ہو — اور میں غلط نہیں تھی۔ تم واقعی اچھی ہو میرب! —“

”اچھی۔“ گی بولی تھی اور میرب مسکرا دی تھی۔

”مجھ سے دوستی کریں گی آپ؟“

”میں تو تمہاری دوست ہوں۔“

”ہاں، وہ تو ہیں۔ مگر ایک اچھی دوستی کی ابتدا کریں گی آپ؟“

”ہاں۔“ گی نرمی سے مسکرا دی تھی۔ ”ہم اپنی سوچوں میں کہاں کتنے غلط ہوتے ہیں، یہ وقت سمجھا ہے ہمیں۔“

میرب نے سر ہلا دیا تھا۔

”ہاں — ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔“

”اگر تمہیں مجھ پر اتنا یقین آ گیا ہے تو ایک بات مانو گی تم؟“ گی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے نرمی سے کہا تھا۔

میرب نے خاموشی سے صرف اس کی طرف دیکھا تھا۔

اس شخص کو اب مزید سمجھنے کی غلطی بھی مت کرو۔ جیسا بھی ہے جو بھی ہے، یونو دیٹ ہی لوز یو۔

آل اٹس لائف۔ فور آل لائف۔“

ناکی بات میں سچائی تھی یا نہیں مگر اس نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا۔

ت اپنی ڈگر پر لوٹ آیا تھا۔

را منظر پھر سے پہلے جیسا تھا۔

ا بچن میں چائے کے ساتھ لوازمات بنا رہی تھیں۔

ابا عفنان کے ساتھ شطرنج کی بازی کھیل رہے تھے۔

یہ بہت دنوں بعد کھلکھا کر رہی تھی۔

اس ہنسی میں لامعہ کی ہنسی بھی شامل تھی۔

گی اپنی ڈگر پر تھی اور مطمئن تھی۔

اس زندگی میں کچھ کمی اب بھی تھی۔

یہ نے قدرے فاصلے پر بیٹھے ہوئے عفنان علی خان کو دیکھا تھا جو دادا ابا کے ساتھ شطرنج کھیلنے ف تھا۔

اس طرف جا کر اچھ گئی تھی۔

تم اس طرح چوری چوری کیوں دیکھ رہی ہو ان موصوف کو؟ — تمہارے ہز بینڈ ہیں بھی۔

کر دیکھو۔“ لامعہ نے اس کی چوری پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

ما ہو کر مسکرا دی تھی۔

عہ اشٹ اپ۔ تم اپنی شادی کے لئے تیار ہو جاؤ اب۔“

”ہاں۔۔۔ میں تیار ہوں۔ مگر کوئی ڈھنگ کا لڑکا بھی تو ملے۔“ لامعہ شرارت سے مسکرائی تھی۔
 ”کیا مطلب؟۔۔۔ میرا بھائی تمہارے خیال میں ڈھنگ کا لڑکا نہیں؟۔۔۔ اوزی! دیکھ رہے ہو تم؟ تمہیں یہ کسی ڈھنگ کے لڑکے میں کاؤنٹ ہی نہیں کرتی اور تم ہو کہ عشق میں ڈبلے ہوئے رہے ہو۔“ انابیہ نے مسکراتے ہوئے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ اوزان ہنس دیا تھا۔
 ”تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے میری پیاری بہنا! کیونکہ آپ کی ایسی دوست کو کوئی ڈھنگ کا لڑکا ملنے والا نہیں ہے۔ خدا نے ان کے لئے کوئی چوٹس نہیں رکھی۔ شادی تو یہ مجھ ہی سے کرے گی۔“ انداز میں شرارت ٹھہری۔

”ایویں۔۔۔ میں کیوں کرنے لگی تم سے شادی۔ لولی لنگڑی ہوں کیا؟۔۔۔ یا اندھی کا ہوں؟ میں تو شادی کروں گی اپنے خوابوں کے شہزادے سے۔“
 ”ہاں تو وہ میں ہی تو ہوں۔“ اوزان برجستگی سے بولا تھا۔ انابیہ ہنس دی تھی۔
 لامعہ بھی جھینپ سی گئی تھی۔

تجھی اوزان اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتا ہوا کچھ اس کی طرف جھکا تھا اور آہستگی سے بولا تھا۔
 ”شادی تو آپ کی مجھ ہی سے ہوگی۔ لکھ کر رکھ لو۔ ساری دنیا گھوم پھر آؤ، کہیں کوئی نہیں ہے آپ کو اتنا اور اس قدر پیار دے سکے۔ آپ نہیں جانتیں مگر آپ ہمارے نصیب میں لکھ دی گئی ہر ماننے یا نہ ماننے مگر بات سچ تو یہی ہے کہ۔۔۔

لے جائیں گے، لے جائیں گے۔
 دل والے دہنیا لے جائیں گے۔“
 انابیہ نے بھی بھائی کا ساتھ دیا تھا اور دونوں باقاعدہ گانے لگے تھے۔ لامعہ کے چہرے پر،
 سے رنگ بکھر رہے تھے۔

عفتنان نے گردن موڑ کر اپنا پیہ کو خوشی سے گاتے ہوئے دیکھا تھا۔
 بہت دنوں بعد اس کے چہرے پر ایک اطمینان دیکھ کر اسے برا نہیں لگا تھا۔
 ہاں مگر وہ اس چہرے سے نگاہ ہٹا بھی نہیں پایا تھا۔
 ”کیا ہو گیا ہے؟۔۔۔ کیوں تنگ کر رہے ہو میری بچی کو؟“ ممی چائے اور دیگر لوازمات۔
 نوکر کے ہمراہ اندر داخل ہوئی تھیں۔

”مام! دیکھئے نا، یہ مجھے کتنا تنگ کر رہے ہیں۔“ لامعہ نے فوراً شکایت کی تھی۔
 ”مت تنگ کرو میری بچی کو۔۔۔ انابیہ! اٹھو بچے!۔۔۔ دادا اور عفتنان کو یہ کباب سرو کرو۔“
 انابیہ ماں کے کہے پر سعادت مندی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
 دادا ابا کو کباب سرو کر کے وہ اُس کی طرف مُڑی تھی۔
 نگاہ پل بھر کو ملی تھی۔

عفتنان علی خان کا انداز خاص تھا۔

نگاہ عام نہیں تھی۔
 وہ چونکے بنا پلٹی تھی۔
 ”انابیہ۔۔۔! پیچھے سے آواز آئی تھی۔
 انابیہ کو حیرت ہوئی تھی۔ وہ شخص اتنا بے صبر اور ہاتھ کا دادا ابا کا بھی کچھ لحاظ نہ تھا۔
 بادل ناخواستہ وہ پلٹی تھی۔
 ”کیوں آئی ہو آکانی پلینز؟“ اس کو غالباً چائے درکار نہیں تھی۔ نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔
 انابیہ نے سرنئی میں ہلا دیا تھا اور فوراً ہی پلٹ کر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ دھڑکنوں کا ارتعاش کچھ گیا تھا۔

”کیسی ہو اب تم؟“ گین چلنے ہوئے اس کے قریب آن رکھا تھا۔ گئی تکیے کے سہارے بیٹھی تھی۔
 لاطرف دیکھنے بغیر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”یوہڈ تھنک۔۔۔ ایوری تھنگ اِزدی پارٹ آف لائف۔“ بہت زری سے سمجھانا چاہا تھا۔
 مگر اتنی مضبوط لڑکی اس چھوٹے سے ہمدردی کے جملے پر کھل کر رہ گئی تھی۔

آنسو آنکھ سے چھلک پڑے تھے۔

گین نے آگے بڑھ کر اس کے شولڈر پر ہاتھ رکھا تھا۔

نبھی اچانک گی اس کے ساتھ لگ کر دھواں دھارو پڑی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری نے تسلی دینے کی غرض سے اس کے گرد اپنا بازو پھیلا دیا تھا۔

کتنی دیر وہ اس طرح روتی رہی تھی۔

ندر کا غبار کچھ ڈھلا تھا۔

گی اس سے دور ہٹ گئی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری نے جیب سے اپنا رومال نکال کر پیش کر دیا تھا۔ پھر سائینڈ ٹیبل پر سے

جگ اٹھا کر اس کے لئے گلاس میں پانی نکالا اور گلاس اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

گی نے خاموشی سے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

نی کے چند سپ لئے تھے اور پھر گلاس اس کی سمت بڑھا دیا تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے

لے کر ٹیبل پر رکھا تھا۔

راس کی طرف مڑا تھا۔

گی! تم۔۔۔

سردار سبکدین حیدر لغاری نے اسے دلا سہ دینا چاہا تھا مگر اس سے پہلے ہی وہ بول پڑی تھی۔

بات یہ نہیں ہے گین! کہ میں خالی ہاتھ رہ گئی۔ آج میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ دکھ اس بات کا

میں نے۔۔۔ میں نے اپنا بچہ کھو دیا گین! اس کے چھوٹے سے ننھے منے وجود کو لے کر کتنے

نہنے سنے، چھوٹے چھوٹے خواب بُن لئے تھے میں نے۔۔۔ وہ گیا ہے تو۔۔۔ وہ سارے خواب ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں۔ یہ درد میرے اس آدھے ادھورے رہ جانے والے درد سے بہت بڑا ہے گین! گی کی آواز اس کے درد کی غمازی کر رہی تھی۔

گین جو اسے دلا سہ دینے کی غرض سے آیا تھا، کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

”گی! ایسا سب کے ساتھ زندگی میں ہوتا ہے۔ اُس ٹرو۔ دکھ ہوتا ہے۔۔۔ بہت زیادہ ہوا ہے۔ مگر ہم جینا چھوڑ تو نہیں سکتے۔ تمہیں بھی جینا ہے گی! یو ہو ٹو بیک ٹو لائف۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو تمہارے لئے یہ مشکل نہیں ہونا چاہئے۔“

”ہاں۔۔۔ میں ایک بہادر لڑکی ہوں۔ سب کچھ سہہ سکتی ہوں۔ سب کچھ۔“ گی کے لبوں پر ایک شکوہ تھا۔

اور سردار سبکگین حیدر لغاری کچھ نہیں بول سکا تھا۔

”گی کتنی بہادر لڑکی ہے نا۔“ زوباریہ بولی تھی۔

”ہاں۔“ میرب نے بلاتر دسر ہلا دیا تھا۔ ”بہت اچھی لڑکی ہے وہ۔“

”مجھے تو بہت دکھ ہوا۔ اس کے ساتھ بہت برا ہوا۔ لیکن خدا کا شکر ہے اس کی جان بچ گئی۔“

”ہاں۔۔۔ خدا کا شکر ہے وہ بچ گئی۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو شاید میں خود کو کبھی معاف نہ

پاتی۔ ملال تو مجھے اب بھی ہے مگر.....“ وہ بہت مدغم لہجے میں بولی تھی۔ زوباریہ قدرے فاصلے

ہونے کی وجہ سے اسے مکمل طور پر سن نہ سکی تھی۔ لیکن میں کام کرتے ہوئے پلٹ کر اسے لمحہ بھر کو دیکھا

تھا۔

”کچھ کہا تم نے؟“

”نہیں۔“ میرب نے سرانکار میں ہلا دیا تھا۔

”آج شام کی فلائٹ سے تمہارے پاپا واپس آ رہے ہیں۔“ زوباریہ نے مطلع کیا تھا۔

”اچھا۔!“

”ہاں۔۔۔ اب زوباریہ نے ایک بار پھر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ ”کہیں جارہی تھی۔“

”تم؟“

”ہاں۔۔۔ گی کی طرف۔ آج وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو رہی ہے نا۔“

”اچھا۔۔۔ میری طرف سے بھی پوچھ لیتا۔“

”جی ضرور۔“ میرب کہتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

وہ راستے میں تھی جب مائی نے اسے فون کر کے بتایا تھا۔

”ہم گی کو لے کر گھر آ گئے ہیں۔ لہذا تم ہسپتال مت جاؤ، گھر آ جاؤ۔“

”اوکے۔ بہتر۔“ اس نے فون منقطع کر کے گاڑی گھر کی طرف موڑ لی تھی۔ اتنا کچھ ہوا تھا کہ

وہ سردار سبکگین حیدر لغاری کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مگر وہ جانتی تھی ایسا ناممکن ہی ہوگا۔

وہ گی کو سہارا دے کر نیکے کے سہارے بٹھا رہا تھا جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

ایسا دیکھ کر وہ چونکی نہیں تھی۔ نہ ہی اُسے کوئی حیرت ہوئی تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری کو تو پہلے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

گی اُس کی طرف متوجہ ہوئی تھی اور ملائمت سے مسکرا دی تھی۔

”آؤ میرب!“

میرب بھی ملائمت سے مسکرا دی تھی۔

”کیسی ہو تم؟“

”ٹھیک ہوں۔۔۔ میرب! تم وہاں کیوں کھڑی ہو؟ یہاں آؤ نا۔“

میرب اس کے کہنے پر آگے بڑھ آئی تھی۔

سردار سبکگین اس سے اور وہ سردار سبکگین حیدر لغاری سے گریزاں تھے۔

”گی! ٹیک کیئر۔ آئی ول سی یو لیئر۔“ سردار سبکگین حیدر لغاری پلٹا تھا اور وہ چلتا ہوا باہر نکل گیا

تھا۔

یعنی وہ اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

دل پر ایک گھونسا سا پڑا تھا۔ مگر وہ چلتی ہوئی گی کی طرف آگئی تھی۔

”کیسا فیل کر رہی ہو تم؟“ میرب نے زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر پوچھا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔۔۔ تم کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھو نا۔ کتنا عجیب لگتا ہے۔ گھر تو یہ تمہارا اپنا ہے اور بول

نہیں میں رہی ہوں۔“

”نہیں۔۔۔ تم غلط سمجھی ہو۔۔۔ یہ گھر۔۔۔ میرا کبھی نہیں رہا۔ اپنی ہاؤ۔ سب کچھ بھول کر وہ

بل لے کر مسکرائی تھی۔ ”ڈاکٹر نے کیا کہا؟“

”تھنک۔۔۔ صرف بیڈ ریٹ۔ لیکن میں فوراً واپس جانا چاہتی ہوں۔ اب اور اسے نہیں کر

تی۔“

”تمہیں رکتا چاہئے۔ جب تک کہ تم بہتر محسوس نہ کرو۔“

”نہیں۔۔۔ میں ایسا نہیں سوچتی۔“

”مائی کہاں ہیں؟“ میرب نے بات بدلتے ہوئے پوچھا تھا۔

”شاید نیچے ہیں۔ تمہاری گین سے ملاقات ہوئی؟“ گی نے پوچھا تھا۔ وہ سر جھکا گئی تھی۔ پھر

تہمت کر کے سرانکار میں ہلا دیا تھا۔

”میں مائی سے مل کر آتی ہوں۔“ وہ یک دم اٹھنے لگی تھی۔

”میرب!“ گی نے اُس ایک لمحے میں پکارا تھا۔

گاڑی گھر کے پورچ میں رکی تھی اور وہ چپ چاپ چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف آگئی تھی۔ رات اگرچہ بہت ہوگئی تھی۔ مگر عفنان علی خان وہیں بیٹھ کر گیا تھا۔ غالباً وہ ٹی وی پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ ٹی وی کی آواز یہاں تک آرہی تھی۔ وہ میزہیاں چڑھتی ہوئی اوپر آئی تھی۔ کانوں کے جھمکے اتارتے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔ لائٹ آن کی تھی اور حیران رہ گئی تھی۔

پورا کمرہ پھولوں سے بھرا تھا۔

فرش میں یہاں وہاں —

پھول ہی پھول —!

وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔ حیرت زدہ سی یکدم پیچھے ہٹتی تھی۔

اور اپنے پیچھے عفنان علی خان سے ٹکرائی تھی۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ — کچھ سمجھ نہ آیا تھا۔

سراٹھا کر حیرت زدہ سے انداز میں عفنان علی خان کو دیکھا تھا۔

ان نگاہوں میں تاثر خاص تھا۔

کچھ پیش تھی۔

کچھ اور بھی تھا۔

وہ دیکھ نہیں سکتی تھی — نگاہ جانے کیوں جھک گئی تھی۔

”یہ — یہ — سب!“ وہ ابھی پوچھنے ہی والی تھی جب وہ بول پڑا تھا۔

”مینی مینی پٹی ریٹرنز آف دی ڈے۔“

”مطلب —؟“ وہ چونکی تھی۔

”یور برتھ ڈے۔“ عفنان علی خان نے یاد دلایا تھا۔ وہ حیران سی رہ گئی تھی۔

ایگنے نے فیض چاچو کے پروپوزل کو ایکسپٹ کر لیا تھا۔

گھر میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

”کتنا مزہ آئے گا نا۔۔۔ فیض چاچو کی شادی ہوگی۔“ ماہا ایکسٹنٹ سے بولی تھی۔

”ہاں — خوشی کی بات تو ہے۔ کتنی خواہش تھی فیض ہاں کرے اور میں ایک اچھی سی دیورانی

لمر میں بیاہ کر لاؤں۔ مگر یہ مانتا ہی نہیں تھا۔ خدا کا شکر ہے، بالآخر عقل آگئی۔ فارحہ بولی تھیں اور

ٹی مسکرا دیئے تھے۔

”ہاں بھی، اب سب میں ہم جیسی ہمت تو نہیں ہوتی۔ شادی کرنا اور پھیلنا آسان کام تو نہیں۔“

ہر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ فارحہ ہنس دی تھیں۔

”ساتم نے فیض! تمہارے بھائی صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟“

وہ جانتی تھی بات کیا ہوگی۔ شاید اسی لئے وہ ان لمحوں سے دامن چھڑا لینا چاہتی تھی۔ نگاہ بچا لینا چاہتی تھی۔

”میرب! تمہیں گین سے بات کرنی چاہئے۔ اگر وہ آگے بڑھنے میں — بات کرنے میں پہل نہیں کر پارہا ہو تو — تم —“

”کیا کروں گی میں گی؟“ وہ یک دم سراٹھا کر بے بسی سے بولی تھی۔ ”اور سب کی طرح تمہیں بھی اب یہ مان لینے کی ضرورت ہے کہ ہمارے درمیان اب کچھ نہیں رہا۔“ میرب کا لہجہ بچھا بچھا سا تھا۔ مگر وہ دانستہ خود کو مضبوط ظاہر کرنے کو مسکرا رہی تھی۔

”نہیں — ایسا نہیں ہے۔ میں ایسا نہیں سمجھتی۔“

”تم نہیں سمجھتی گی! لیکن ایسا ہے۔“ میرب مسکرائی تھی جیسے سب ختم ہو چکا ہو۔ ”اپنی دے، تم آراہ کرو۔۔۔ میں مائی سے مل کر آتی ہوں۔“ وہ یک دم اٹھی تھی اور چلتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ گی اے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

میرب ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو رگڑتی ہوئی راہداری میں جا رہی تھی۔ سارے منظر جیسے ڈھندا رہے تھے۔

جانے وہ کب، کیسے سردار سیکنگٹین حیدر لغاری سے ٹکرائی تھی۔ توازن بگڑا تھا۔

مگر اس مضبوط سہارے نے اسے گرنے سے بچا لیا تھا۔

قربتوں نے کوئی جادو نہیں کیا تھا۔

ان لمحوں میں کوئی فسوں نہیں تھا۔

وہ سراٹھا کر خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ وہ بھی فوری طور پر کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ لمس خاص کوئی نیا احساس بھی جگا نہیں پایا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ تنہا ہوئی اس حصار سے باہر تھی۔

”میرب!“ اپنی اپنی راہ پر جانے سے قبل ایک آواز اس کی سمت آئی تھی۔ وہ چونکی تھی۔

نگاہ اٹھا کر اس شخص کی سمت دیکھا تھا۔

”اگر وقت ہے تو مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ آؤ۔۔۔!“

درخواست نہیں تھی۔ حکم تھا۔ اور وہ جیسے ایک ”معمول“ تھی۔

میرب چپ چاپ اس کے ہمراہ چلتی ہوئی باہر آگئی تھی۔

وہ اپنی می کے گھر اس رات ٹھہرنا چاہتی تھی۔ مگر عفنان علی خان نے اسے عین موقع پر منع کر

تھا۔

اس نے کوئی آرگيومنٹ نہیں کیا تھا۔

”موسموں کا تو کام ہی بدلنا ہے۔ ان پر ایسا چونکنا کیسا؟“
 ”ہاں، مگر.....“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکرا دی تھی۔ ”ہم بھی کیا فضول کی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔“

”نہیں۔۔۔ کچھ ایسی فضول باتیں بھی نہیں ہیں یہ۔ یوں بھی کبھی کبھی فضول باتیں بھی کر لیتی ہیں۔ اچھا لگتا ہے۔“ اذہان مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ ”تم وہاں سے اچانک اٹھ کر کیوں آ گئی ہیں؟“

”نہیں، بس یونہی۔“ ساہیہ کوئی وضاحت نہیں دے سکی تھی۔

”شیور؟“ اذہان حسن بخاری نے اس کی طرف بھرپور توجہ سے دیکھا تھا۔

”ہاں۔“ ساہیہ نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

اذہان کچھ نہیں بولا تھا۔ خاموشی سے اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

رومیسالغاری کی تصویر کو وہ چپ چاپ دیکھ رہے تھے۔ جب اگینے چلتی ہوئی ان کے پیچھے آن رکی۔

فیض بخاری نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ جیسے وہ جانتے تھے کہ ان کے پیچھے کون ہے۔

اگینے جو وہیں رک گئی تھی۔ چلتی ہوئی آگے بڑھ آئی تھی۔

”اگر تمہیں کسی بات پر کوئی اعتراض ہے تو تم۔۔۔ تم اپنا فیصلہ بدل بھی سکتے ہو۔“ اگینے نے تکرار کے کہا تھا۔

”انسان اگر پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ اپنی زندگی کے کسی فیصلے پر پشیمان ہے یا نہیں۔۔۔ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر اس لئے بھی دیکھا جاتا ہے کہ ہم نے کیا پایا اور کیا گوا دیا۔“

اگینے نے انہیں دیکھا تھا پھر ان کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

”میں اپنے گزرے کل کو دیکھ رہا ہوں اگینے! کیونکہ یہ میری زندگی کا حصہ ہے۔ اور میں اسے بھی نہیں سکتا۔ یہ ہمیشہ اسی طرح میری زندگی کا حصہ رہے گا۔۔۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں

نہ آج سے خوش نہیں۔“

فیض بخاری نے تصویر ایک طرف رکھتے ہوئے اگینے کا ہاتھ تھاما تھا۔

اگینے خاموشی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”یہ سچ ہے اگینے! میں ایک عرصہ تک ایک حصار میں قید رہا۔ کبھی نکل ہی نہیں پایا اس دائرے

۔ رومیسالغاری کی محبت میرے گرد کچھ ایسی ہی تھی کہ اس کے جانے کے بعد بھی میں اس میں قید کبھی دھیان آیا ہی نہیں اس دائرے سے باہر نکل کر چینے کا۔

میں خوش تھا، رومیسالغاری کے ساتھ، اس کی یادوں کے ساتھ۔۔۔ اور شاید ساری زندگی یونہی گزر رہی

۔ میں کبھی اس خواب سے جاگتا بھی نہیں۔۔۔ مگر تم۔۔۔ اگینے! تم وہ لڑکی ہو جس نے مجھے

”ہاں، سنا۔ اور بھائی صاحب کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہے۔ شادی واقعی ایک مشکل معاملہ ہے۔ ایک میرٹھ شخص سے زیادہ مظلوم شخص کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔“ فیض نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اگینے نے ترجیحی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

”چاچو!۔۔۔ کم آن۔ آپ احسان مانئے، ہماری اگینے پیپھو نے ہاں کر دی ورنہ آپ تو یونہی کنوارے رہ جاتے۔“ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”ایکسکوز می۔۔۔ میرے چاچو کے لئے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ تو فیض چاچو کا کچھ دل آ گیا تھا اگینے پر ورنہ۔۔۔“ اذہان نے کہا تھا اور سب ہنس دیئے تھے۔

”فیض چاچو! ٹھیک کہانا میں نے؟“ اذہان نے دریافت کیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ کہا تو ٹھیک ہے۔ مگر آئی گیس اس اے رائٹ ٹائم نور میری۔ اگر میں اس ٹائم کو بھی

ضائع کرتا تو پھر۔۔۔ شاید۔۔۔ کوئی لڑکی بھی نہ ملتی۔“ فیض چاچو آنکھوں میں شرارت لئے بولے تھے۔ سب ہنسنے لگے تھے۔

”کتنا اچھا لگ رہا ہے نا۔ اتنے عرصے بعد میرے گھر کے آنگن میں خوشیاں اتری ہیں۔ اے خدا! میرے گھر کی خوشیاں یونہی قائم و دائم رکھنا۔“ فارحہ نے دل ہی دل میں دعا مانگی تھی۔

”سعد! کیا خیال ہے؟ چاچو کے ساتھ ساتھ بیٹیجے کی شادی بھی نہ کر دیں؟“ مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

اذہان نے ایک لمحے میں ساہیہ کی طرف اور ساہیہ نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

ساہیہ کو لگا تھا ابھی وہ کچھ کہے گا۔ کوئی انکاری جملہ۔ مگر وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ کوئی تعرض نہیں ہوا تھا۔

اور ساہیہ کو اس پر حیرت ہوئی تھی۔

”آئی انی اللال اگینے پیپھو اور چاچو کی شادی پر اکتفا کریں۔ ہماری شادی کوئی اتنی ضروری نہیں ہے۔“ وہ مسکراتی ہوئی بالآخر بولی تھی۔

اذہان اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ ریلنگ کے پاس اپنا کافی کا مگ لئے کھڑی تھی وہ چلتا ہوا اس کے پاس آن رکا تھا۔ ساہیہ نے اس کی طرف دیکھا تھا اور غالباً مروتا مسکرا دی تھی۔

اذہان بھی مسکرایا تھا۔

”سردی اچانک ہی کتنی بڑھ گئی ہے نا۔۔۔ موسم اچانک ہی کتنا بدل گیا ہے۔“

”ہاں۔“ اذہان نے کہا تھا پھر اپنا کوٹ اتارا تھا اور آگے بڑھ کر اس کے شانوں پر ڈال دیا تھا۔

ساہیہ کچھ حیران ہوئی تھی۔

چونکی تھی۔

لیکن وہ مسکرا دیا تھا۔

اس دائرے سے باہر نکالا اور زندگی کو نئے سرے سے جینا سکھایا۔!

اگینے! میں تو جینا جیسے بھول ہی چکا تھا۔ اپنے آپ کو بھول چکا تھا۔ مگر تم — تم نے مجھے جینا سکھایا۔ ایک نئی راہ دی جینے کی۔ میں نے تمہیں پروپوز کیا تھا تو اس لئے نہیں کہ مجھے صرف زندگی کو آگے بڑھانا تھا بلکہ اس لئے کہ مجھے واقعی ایک ہم سفر کی ضرورت تھی جس کے ساتھ میں قدم قدم چل پاتا۔ جس سے اپنے منگھ ڈھک شیز کر پاتا۔ جس سے پیار کر سکتا۔ دل کی بات کر سکتا۔ سو میں نے تم سے کہہ دیا۔ کہہ دیا کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اگینے! جو دل میں ہو کہہ دینا چاہئے۔ دل کی دل میں نہیں رکھنی چاہئے۔ میرے دل میں تمہارے لئے جو بھی تھا میں نے کہہ دیا۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟“ فیض بخاری نے پوچھا تھا۔

”مجھے لگا ہے فیض! اگر ہم زندگی کی راہ پر نل کر چلیں تو زندگی کچھ اور بھی خوبصورت ہو سکتی ہے اور.....“

”اور.....؟“ فیض بخاری نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”اور میں — آپ کا ہاتھ تھام کر اس زندگی کی راہ پر ضرور چلنا چاہوں گی — میں جانتی ہوں کہ ہر زندگی کے پیچھے ایک بند دروازہ کھلتا ہے اور اس بند دروازے سے پیچھے ایک Past بھی ہوتا ہے۔ جو بند دروازہ کھلنے پر چھانکتا ہے۔ ایسا ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے فیض! میں حقیقت پسند ہوں۔ ہم اب اس عمر میں نہیں ہیں فیض! جہاں ہاتھ بڑھا کر جگنو پکڑے جاتے ہیں اور بچوں کی طرح خوش ہوا جاتا ہے۔ ہم اس وقت سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ اب اگر ہم ایک دوسرے کو نہیں سمجھ پاتے تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔“ وہ ملامت سے بولی تھی۔

فیض بخاری مسکرا دیئے تھے۔ پھر آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

”آئی نو۔ ہمارے اس نئے سفر میں کہیں کوئی ملال دور دور تک نہیں ہوگا۔“

”ہاں۔“ اگینے نے کہا تھا اور مسکرا دی تھی۔

فیض بھی مسکرا دیئے تھے۔

دونوں خاموشی سے بیٹھے تھے۔

سنگی بیچ کے ایک کونے پر وہ تھی۔ اور دوسرے کونے پر سردار سبکتگین حیدر لغاری۔ وہ اس سے

کیا کہنا چاہتا تھا، وہ نہیں جانتی تھی۔

اس کے دل میں کیا تھا وہ نہیں جان پاتی تھی۔

خاموشیاں کیا کہہ رہی تھیں، اس کے لئے یہ جاننا بھی مشکل تھا۔

مگر وہ اس کے ہمراہ وہاں موجود تھی اور اس کے بولنے کی منتظر تھی۔

”میرب! جو کچھ بھی ہمارے بیچ ہو رہا ہے، اس کی اب بھی کوئی خبر نہیں ہے۔ اور میں چاہوں کہ — اس کی خبر انہیں نہ ہی ہو تو بہتر ہے۔“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے سگریٹ کے گہر-

ش کے ساتھ بات کا آغاز کیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ ”جو کچھ ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہے۔ مرضی کے عین مطابق ہے۔“

”کس کی مرضی کے عین مطابق ہے؟“ میرب پوچھنا چاہتی تھی مگر باوجود خواہش کے وہ نہیں بول سکی تھی۔

”اِس آل رائٹ۔ سب ٹھیک ہو رہا ہے۔ اور کچھ ہی دنوں میں معاملہ سولو بھی ہو جائے گا۔ بٹ آئی وونٹ دیٹ — میں اس طرح نہیں چاہتا۔ اِس لٹل بٹ امپور اینڈ کڈی۔ آئی وانٹ اے پچور سولوشن۔ اس کا اس سے بہتر حل بھی ہو سکتا ہے اور ہے بھی۔ میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ کورٹ پچہری ہمارے لئے نہیں ہے۔ ہماری فیملی پریسج کے لئے یہ ٹھیک نہیں۔ لغاری خاندان کو یہ سب زیب نہیں دیتا۔ سو اس کا متبادل حل بھی نکالا جا سکتا ہے۔ اینڈ آئی فاؤنڈ دیٹ۔ وہاٹ ہاؤٹ آؤٹ آف کورٹ سیٹل منٹ؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری مکمل سپاٹ لہجے میں بولا تھا اور وہ تیران رہ گئی تھی۔

وہ اس قدر سفاک ہو سکتا تھا۔

انتاسنگ دل ہو سکتا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی۔

اس کا انداز مکمل طور پر کاروباری تھا۔ جیسے وہ کوئی بزنس ڈیل کر رہا ہو۔

”کتنا حق مہر تھا تمہارا؟“ ڈڈ پوری ممبر؟“ اس کے احساسات کی پرواہ کئے بغیر وہ اسی سپاٹ لہجے میں گویا تھا۔ ”ایز فار ایز آئی ری ممبر فائیو کروڈ۔ رائٹ؟ سو وہاٹ یوتھنک اگر ہم اس کو دس کروڈ

لریں اور بات یہیں کی یہیں ختم ہو جائے۔ ہم مزید کورٹ پچہری میں جائیں ہی نہ۔ آؤٹ آف کورٹ سیٹل منٹ۔ سیف اینڈ سیکور میٹھڈ۔ نہ آپ کا وقت برباد ہو نہ میرا۔ بات سکون سے طے پا جائے۔ وہاٹ یوتھنک؟“ اگر آپ کہیں تو ہم آفر کو بڑھا بھی سکتے ہیں۔ پانچ کی جگہ ہاں دس ہوا، وہیں پندرہ یا بیس بھی ہو سکتا ہے مگر.....“

سردار سبکتگین حیدر لغاری کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی جب میرب کا ہاتھ اٹھا تھا اور ترازخ سے سردار سبکتگین حیدر لغاری کے چہرے پر تھا۔ جانے کیسے اس میں اتنی ہمت آگئی تھی۔

سردار سبکتگین حیدر لغاری قطعاً بھی ایسا کچھ ایکسپیکٹ نہیں کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

مگر وہ اس کی بالکل بھی پرواہ کئے بغیر بولی تھی۔

”رشتوں پر سودے بازی پہلی بار کرتے سنا ہے میں نے کسی کو سردار سبکتگین حیدر لغاری! — پ تو بہت ہی بڑے بزنس ٹائیکون ہیں۔ اپنے ہی رشتوں پر سودے بازی کر رہے ہیں آپ اور کمال لاسودے بازی کر رہے ہیں۔“ میرب کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

سارا ضبط ٹوٹ گیا تھا۔

”بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے آج۔ بہت افسوس۔ بہت غلط سوچتی رہی میں آپ کے لئے۔“

”تم تو مکمل 100 فیصد پرمٹ وائف بن چکی ہو۔ کوئی شکایت کرو تو اپنے ہزبینڈ کو ڈی فنڈ کرنا ہی آ گیا ہے۔“

”نہیں۔۔۔ میں انہیں ڈی فنڈ نہیں کر رہی۔“ انا بیہ مسکرا دی تھی۔ ”ان فیکٹ، سچ بتا رہی ہوں نہیں۔“

”ہاں۔۔۔ اس چار دیواری میں بند کر کے، تم سے یہ گھر کے کام کرا کے کہاں کی محبت ہو رہی ہے۔ مجھے تو تم دونوں میں ایسی کوئی افلاطونی محبت دکھائی نہیں دیتی۔“

”افلاطونی محبت کا وقت نکل گیا۔ اب تو پریکٹیکل لائف اشارت ہے۔ اور پریکٹیکل لائف تو ایسی بنا ہوتی ہے۔ جب تمہاری شادی اوزان کے ساتھ ہوگی تب پوچھوں گی۔“

”خدا نہ کرے اوزان تمہارے ان سوکالڈ ہزبینڈ جیسا ہو۔“ لامعہ اُس کی کیفیت پر تپ کر بولی تھی۔

”کم آن لامعہ!۔۔۔ ان کا کوئی تصور نہیں۔ مگر خود کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔“

”اوہ، پلیز! ان حضرت کو ڈی فنڈ کرنا بند کرو۔ کیا سمجھتی ہو تم، کسی کو بتاؤ گی نہیں تو کسی کو پتہ بھی میں چلے گا؟ آپ کے چہرے پر صاف بڑھا جا رہا ہے کہ آپ خوش نہیں ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہے لامعہ!“ وہ کمزور سے لہجے میں سرٹنی میں ہلاتی ہوئی بولی تھی۔

لامعہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”تم پلیز۔۔۔ ایسا کچھ می، دادا یا پھر اوزان سے مت کہنا۔ وہ فضول میں پریشان ہوں گے۔ تمہیں بھی پتہ نہیں کیوں یقین نہیں ہو رہا کہ سب ٹھیک ہے اور کہیں کچھ غلط نہیں ہے۔“ وہ متواتر پری بڑھتے ہوئے بولی تھی۔ جب اچانک دھیان عرفنان علی خان کی طرف گیا تھا۔

جانے کب سے تھا وہ وہاں۔

کیا سنا تھا۔۔۔ کیا نہیں۔

انا بیہ سر جھکا کر رہ گئی تھی۔

تیسری وہ اندر بڑھ آیا تھا۔

”کیا پروگرام ہے؟“ جوں کی ٹرے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا تھا۔ لامعہ قریب ہی ٹری دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ انا بیہ نہیں چاہتی تھی ایسا کچھ بھی لامعہ کے سامنے ہو جس سے پتہ چلے کہ اس کے درمیان کہیں کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تیسری خوشگوار سی مسکرا دی تھی۔

”کیسا پروگرام؟۔۔۔ فی الحال تو ڈرنک سرو کر رہے ہیں۔ آپ بتا دیجئے، کیا کرنا ہے؟ ڈنر گھر پر کروں ہاں۔۔۔!“

”نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ عرفنان ان کے ہاتھ سے جوں کی ٹرے لیتے ہوئے بولا۔

”میں نے ٹیبل بک کروا دی ہے۔ ہم ڈنر باہر کریں گے۔“

وہ حیرت میں تھی۔ جب لامعہ بولی تھی۔

”عرفنان! یہ کسی برتھ ڈے ہے جو کیک کے بغیر ہے؟“

وہ میل بند کرتے ہوئے ساہیہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”میرب کو ہماری ضرورت ہے ساہیہ!۔۔۔ ہمیں ابھی اس کی طرف جانا ہو گا۔“ وہ بولا تھا۔

ساہیہ کوئی تعرض نہیں کر سکی تھی۔

یہ سچ تھا۔۔۔ اُسے یقین نہیں آیا تھا۔

عرفنان علی خان کی محبت اس کے لئے اب بھی باقی تھی یا نہیں، وہ نہیں جانتی تھی۔ مگر یہ اقدامات کیا کہہ رہے تھے، وہ نہیں جان پائی تھی۔

اگر وقت کے پاس اس کے کانوں کے لئے کچھ سرگوشیاں تھیں بھی تو فی الحال اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

وہ صرف وقتی کیر شو کر رہا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

محبت اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔

اور شاید وہ محبت تھی بھی نہیں۔

وہ زیادہ سوچ کر الجھنا نہیں چاہتی تھی۔

شام میں سب گھر آئے تھے۔ می، دادا ابا، اوزی، لامعہ۔۔۔ اس کے برتھ ڈے کو وہ سب کیسے بھول سکتے تھے؟ وہ خوش تھے۔ مگر وہ خود خوش کیسے دکھائی دے؟ یہ بھول بیٹھی تھی شاید۔ یا پھر وہ خود کو دھوکا دے رہی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ وہ جوں گلاسوں میں انڈیل رہی تھی جب لامعہ نے اس کے قریب رکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ وہ چونکی تھی، پھر مسکرا دی تھی۔

”کچھ نہیں۔۔۔ کیوں، کیا ہوا؟“

”منہ پر بارہ بج رہے ہیں۔“ اطلاع آئی تھی۔

”اچھا۔۔۔!“ وہ برامانے بغیر ہنس دی تھی۔

”مذاق نہیں ہے یہ۔۔۔ تمہیں واقعی کیا ہوتا جا رہا ہے؟۔۔۔ تمہارا ہزبینڈ تمہارا کوئی خیال نہیں رکھتا؟ ابھی جا کر پوچھتی ہوں۔ بیوی ہو، کوئی غلام تو نہیں۔ یہ سارے ملازم کیوں نکال باہر کئے؟ فاطمہ آئی کے ہوتے ہوئے تو دس ملازم تھے۔“ لامعہ نے خبر گیری کی تھی۔

مگر انا بیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا تھا۔

”پاگل ہو گئی ہو؟۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے؟۔۔۔ اور می پاپا کے جانے کے بعد یوں بھی زیادہ کام کارج نہیں رہا۔ ہم دو تو افراد ہیں۔ تھوڑا سا کام ہے۔ میں تو چنگیوں میں کر لیتی ہوں۔ یوں بھی اس اتنے بڑے گھر میں، اتنے لمبے چوڑے دن میں میرے پاس کرنے کے لئے ہوتا بھی کیا ہے۔“ وہ بہت پُرسکون انداز میں کہتی ہوئی مسکرائی تھی۔

لامعہ اُسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔



”کیا ہوا تھا؟“ اذہان نے پوچھا تھا۔

”سہیہ بھی میرب کو بغور دیکھ رہی تھی۔ مگر اس نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے سرانکار میں ہلا دیا۔“

”بس یونہی، میں کچھ پریشان تھی۔“

”ہاں، وہی تو پوچھ رہے ہیں۔ کیا پریشانی تھی؟ تم اتنی ڈسٹرب لگ رہی ہو تو اس کی کوئی وجہ تو ہو۔“ اذہان حسن بخاری نے پوچھا تھا۔

مگر غالباً وہ سہیہ کے ہونے کے باعث کچھ بھی شیئر نہیں کر رہی تھی۔ سہیہ کو اندازہ ہو گیا تھا۔ تبھی دیدہ اٹھنے لگی تھی۔ مگر میرب نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور نرمی سے بولی تھی۔

”تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے سہیہ! تم بھی میری اتنی ہی اچھی دوست ہو جتنا اذہان! اُن کوئی بات نہیں ہے جو میں صرف اذہان سے شیئر کر سکتی ہوں اور تم سے نہیں۔“ سہیہ مسکرائی تھی۔

”تم دونوں بہت پرانے دوست ہو میرب! میں نئی ہوں۔ اور نئے اور پرانے دوست کا فرق میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ یوں بھی مجھے نہیں لگتا میرے ہوتے ہوئے تم کفر ٹیل ٹیل کرو گی۔“ وہ ملاحت سے مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے سہیہ! میرے لئے نئے یا پرانے دوست ایک جیسے ہیں۔ میں سردار سیکنگین حیدر لغاری کی طرف گئی تھی۔ بہت دنوں سے ہمارے درمیان کچھ بھی ٹھیک نہیں۔ بس اسی کو لے کر کچھ زیادہ ڈسٹرب ہو گئی تھی۔“ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بہت سا پانی آن ٹھہرا تھا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو رگڑا تھا۔

”کبھی کبھی زندگی اتنی اُلجھ جاتی ہے کہ اسے سلجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میرے معاملے میں محبت کچھ اُلجھی ہوئی ہے فی الحال۔ پتہ نہیں کیا ہو گا۔ مگر میں اس تعلق کو توڑنا نہیں چاہتی۔ آئی لوہم۔“ میرب بولی تھی اور اذہان کے ارد گرد بیٹھے یہ جملہ بازگشت ہو گیا تھا۔ چونگی تو سہیہ بھی تھی۔ اور وہ اذہان کو اس لئے دیکھے بنا نہیں رہی تھی۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ دیش ٹرو۔ آئی لوہم۔ میرے لئے اس کے بنا زندگی کا کوئی مطلب ہی نہیں رہا ہے کہ یہ بات سمجھتا ہی نہیں۔ میرے ایوشن، میری فیئنگو جیسے اس کے لئے کوئی میٹنگ ہی نہیں تھی۔ میں جانتی ہوں، آئی ٹوٹ دیٹ۔ ہی لوزی۔ سبھی تو جب چاہتا ہے، اتنے آرام سے ہرٹ کرنا ہے۔ دنیا میں صرف ایک شخص ہوتا ہے جو ہمیں درد دے سکتا ہے۔ جو جانتا ہے کہ ہم اس سے اور وہ اسے محبت کرتا ہے اور سردار سیکنگین حیدر لغاری اس بات سے انجان نہیں ہے۔ ہی کپین ہرٹ می۔ اکل ویز ہرٹ می۔ بی کوز آئی لوہم۔“

میرب بولی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اپنے آپ بہ رہے تھے۔ اگر وہ کوئی صورت حال ان

وہ مسکرایا تھا۔

”کس نے کہا کہ ایک نہیں؟۔۔۔ ان فیکٹ تم اپنی دوست کے لئے چھری پر ریڈرین باندھ کر لے آؤ۔ ایک کٹنے کے لئے تیار ہے۔ اتنا یہ!۔۔۔ تم سچچ کر لو۔“ وہ مکمل ذمہ دار شوہر لگ رہا تھا۔

غالباً وہ جو پروف کرنا چاہتا تھا اس میں کامیاب بھی رہا تھا۔

اگر اس کا مقصد صرف لامعدہ لوگوں کو اطمینان دلانا تھا تو یہ کوشش کارگر رہی تھی۔

مگر اس کے اندر کتنی خاموشیاں پھیل رہی تھیں۔ یہ صرف وہ جانتی تھی۔

وہ ٹرے لے کر باہر جا چکا تھا اور وہ خاموشی سے وہاں کھڑی تھی۔

”تم اس طرح کیوں کھڑی ہو؟۔۔۔ کم آن یار! ریڈی ہو جاؤ جا کر۔ میں باقی سب کو ریڈی کرتی ہوں۔“ لامعدہ بولی تھی۔ تبھی وہ مسکراتی ہوئی سر ہلاتی باہر نکل گئی تھی۔

مگر اس کے اندر کہیں بھی، کچھ بھی مکمل طور پر اپنی جگہ پر نہ تھا۔

محبت اتنی اُلجھی ہوئی ہو سکتی ہے، وہ نہیں جانتی تھی۔

اُلجھی اُلجھی

بکھری بکھری

تھوڑی حیران

تھوڑی سلجھی

محبت کو میں نے دیکھا ہے

کچھ خوش گمان

کچھ بد گمان

کچھ چارہ گر

کچھ رہنما

محبت کو میں نے دیکھا ہے

چپ چاپ، تنہا چلتے ہوئے

خود اپنی آگ میں جلتے ہوئے

کچھ کہتے ہوئے نہ

سننے ہوئے

محبت کو میں نے دیکھا ہے

اسے کچھ معلوم نہیں تھا، زندگی اب کس کروٹ بیٹھے گی؟۔۔۔ آخر کیا ہو گا؟

یا پھر کوئی نیارخ ہو گا بھی یا کہ نہیں۔

مگر زینہ طے کرتے ہوئے وہ بہت اُلجھی ہوئی سی تھی۔

اوزان کی کسی بات پر مسکراتے ہوئے عرفان علی خان نے اسے بغور دیکھا تھا۔

دونوں پر واضح کرنا چاہتی تھی تو وہ کامیاب رہی تھی۔

ساہیہ نے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا تھا، پھر اس کے ساتھ بیٹھنے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

اذہان اس منظر کو صرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”تم کیا کر رہی ہو۔۔۔؟“ گی کو نئے سرے سے پینگ کرتے دیکھ کر گین نے دریافت کیا تھا۔

”دیکھ تو رہے ہو تم۔۔۔ پینگ کر رہی ہوں۔“ وہ لائق لہجے میں بولی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”خفا ہو تم مجھ سے؟“ گی نے سب کام چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”کس قسم کے آدمی ہو تم گین!۔۔۔ تم اتنے کھنور ہو سکتے ہو، مجھے اندازہ تک نہیں تھا۔ ہمیشہ کتنا سمجھایا بھجھایا تمہیں لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم صرف دل دکھانا جانتے ہو۔ تم اتنے سگ دل ہو اس بات کا اندازہ نہیں تھا مجھے۔ تمہارا سب سے بڑا پر اہلم یہ ہے کہ تم خود نہیں جانتے، تم زندگی سے کب چاہتے ہو۔ زندگی تمہارے قریب ہے، پاس ہے اور تم اسے پرے دھکیل رہے ہو۔ کتنا سمجھایا تھا میں نے اُسے۔ کتنا پوزیٹو کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر تم نے ان تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ عجیب آدمی ہو تم۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تمہاری۔ اتنی اچھی لڑکی کو درد دے رہے ہو تم۔ کیوں کر رہے ہو تم ایسا میں نہیں جانتی گین! بت آئی ایم ناٹ پئی۔ مجھے دکھ ہے۔ کیونکہ تم اُسے دکھ دے رہے ہو۔“ گی بولا تھی۔

سردار سبکگین حیدر لغاری فوری طور پر کچھ نہیں بولا تھا۔

”سردار سبکگین حیدر لغاری!۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو تم، خود اپنی زندگی کے ساتھ؟۔۔۔ کیا لگا ہے، خوش رہ پاؤ گے؟“ گی نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ قطعاً نہیں خوش رہوں گا اگر تم یہاں سے جاؤ گی تو۔ گی! فی الحال میں کسی طرف نہیں دیکھ رہا۔ میری نظر کسی معاملے پر نہیں۔ تم میری بہت اچھی دوست ہو اور میں تمہیں اس طرح کھ نہیں چاہتا۔“ وہ مطمئن انداز میں بولا تھا۔

”میں۔۔۔ میری دوستی گین؟۔۔۔ اینڈ ویز از پورا اون لائف؟۔۔۔ یو گون میڈ؟ کیا ہو گا ہے تمہیں؟۔۔۔ پاگل ہو گئے ہو تم؟۔۔۔ کیوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا تمہیں؟ کیوں کچھ دکھائی نہیں دیتا؟ تم ہر لمحہ اسے اپنی زندگی سے باہر دھکیل رہے ہو اور تمہیں اس بات کا اندازہ تک نہیں ہے۔

نے اپنی ساری زندگی میں تم سے زیادہ بے وقوف شخص نہیں دیکھا۔ پلیز، فار گاڈ سیک سردار سبکگین حیدر لغاری! اپنی زندگی کو سمجھو۔ کب سمجھ آئے گی تمہیں؟ محبت کرتے ہو اُس سے تو اُسے بتاتے کیا نہیں؟“

”گی! میں کیا کر رہا ہوں، کیوں کر رہا ہوں؟ میں جانتا ہوں۔ آئی ایم ناٹ اے فول۔“ وہ پوزیس (Poses) کرتا ہوا بولا تھا۔

”کچھ نہیں جانتے تم گین!۔۔۔ سچ میں بہت بے وقوف ہو تم۔“ گی نے اس کی سختی پر افسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”سردار سبکگین! میں کھونے کا درد جانتی ہوں۔ مجھے احساس ہے، جب کچھ کھویا جاتا ہے تو کتنا درد ہوتا ہے۔ تم پلیز، یہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ خدا نہ کرے تم اس حد سے گزرو۔ میں کبھی بھی تمہیں اس درد سے گزرتا نہیں دیکھنا چاہوں گی۔“ گی بولی تھی اور سردار سبکگین حیدر لغاری اسے چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔

ذہن سے واپس لوٹنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں جانے والی تھی جب عفتان علی خان نے اُسے پارا تھا۔

”سنو۔۔۔!“

وہ زینہ چڑھتے چڑھتے یک دم جیسے بت بن گئی تھی۔

عفتان چلتا ہوا اس کے پیچھے آن رکھا تھا۔

”گھر کی باتیں گھر میں رہیں تو زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اگر تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہو تو مجھ سے کہو۔ میں اس کا ازالہ کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ مگر اس طرح۔۔۔!“

اُسے اندازہ تھا۔ ایسی ہی کوئی بات ہوگی۔ اور وہی ہوا تھا۔

عفتان علی خان اپنے طور پر اخذ کی گئی باتیں کر رہا تھا۔ وہ بہت سکون سے پلٹی تھی۔

”میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ گھر کی یا ہماری آپس کی کسی بھی بات کو اس گھر سے باہر نہیں کیا۔ رآپ لامعدہ کی بات کر رہے ہیں تو میں اس سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں کر رہی تھی۔ میں صرف ناحت دے رہی تھی کہ میں۔۔۔۔۔۔“

”کہ آپ کو یہاں نوکر بنا کر رکھا جا رہا ہے اور آپ کا کوئی خیال نہیں رکھا جا رہا۔“ عفتان نے ت مکمل کی تھی۔

”مجھ پر کسی طرح کا کوئی ظلم نہیں ہو رہا اور نہ ہی میں مظلوم بننا چاہوں گی۔ آپ نے جو بھی سنا وہ جی ادھوری باتیں تھیں۔ یوں بھی کسی کی باتیں چھپ چھپ کر سننا اچھی بات نہیں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

عفتان علی خان اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”مجھے نہیں پتہ کہ آپ اتنا کچھ کیوں سہہ رہی ہیں۔ اگر میں آپ کی زندگی میں ان چاہا حصہ ہوں تو ما باہر کیجئے۔ پلیز، یو اینڈ لٹ لیو۔“ وہ بولی تھی۔

عفتان علی خان کا ہاتھ اٹھا تھا اور تراخ سے اس کے چہرے پر تھا۔

وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

”آج کا دن اچھا رہا نا۔۔۔“ انا بیہ کی برتھ ڈے پرنٹرن کے بعد اوزان لامعہ کو چھوڑنے جا رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ اچھا رہا۔ عرصے بعد ہم اس طرح مل کر کہیں بیٹھے۔ مجھے اچھا لگا۔“ لامعہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”انا بیہ خوش ہے نا؟۔۔۔ مجھے جانے کیوں آج وہ کچھ بھی سمجھی سی لگی۔“ بھائی کی نگاہ اُسے پڑھ گئی تھی۔

لامعہ چونکی تھی۔ پھر فوراً سرائکار میں ہلا دیا تھا۔
”نہیں۔۔۔ وہ خوش ہے۔ خوش کیسے نہیں ہوگی۔ عفتان اُسے سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔ اُس کی ہر خوشی کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دیکھا نہیں آج تم نے۔“ لامعہ نے اس کا زاویہ نظر موڑنے کی کوشش کی تھی۔

”ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔ مگر اس کے باوجود مجھے وہ کچھ اُداس لگی۔ اپنی ہاؤ، کوئی آج بہت اچھا بھی لگ رہا تھا۔“ وہ ایک نظر اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا تھا۔

لامعہ مسکرا دی تھی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ بکھرتے دیکھ کر اوزان کو اچھا لگا تھا۔
”میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر مسکراتی ہوئی بولی تھی۔

”کیا۔۔۔؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ ”تم اپنی زندگی میں مجھے ایکسیپٹ نہیں کرتی تھیں؟“
”نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں۔ مگر زندگی میں اتنے سارے ٹونسٹ آئیں گے، اس کے بارے میں

میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وقت کب، کہاں، کس طرح بدلا کچھ پتہ نہیں چلا۔ کتنی خود غرض ہو گئی میں۔ کیسے اتنا سب کر دیا، سمجھ نہیں آ رہا۔ مگر آج جب سوچتی ہوں تو میرے اپنے روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حسد اور جلن میں، میں بہت آگے نکل گئی تھی۔ وہ تو اچھا ہوا ہر وقت میری آنکھیں کھل گئیں۔ ورنہ

آج جانے میں کہاں کھڑی ہوتی۔ یہ تم۔۔۔ یہ ایک اچھا سا احساس۔۔۔ یہ چھوٹے چھوٹے سے خواب۔۔۔ شاید یہ سب جو آج میرا ہے، میرا نہ ہوتا۔“

”لامعہ! جو ہوتا ہوتا ہے وہ ہوتا ہے۔ اور جو ہوتا ہے اچھا ہوتا ہے۔ بھول جاؤ سب۔ جو وقت زندگی کا حصہ نہ رہے اسے زندگی کی کتاب میں سے نکال دینا چاہئے۔ اور دوبارہ اس کا ذکر بھی نہیں کرنا

چاہئے۔“
”ہاں۔۔۔ ٹھیک کہہ رہے ہو تم اوزان! مگر کتنے بہت لمحے میں نے گنوا دیئے۔ تم میرے

ساتھ تھے، قریب تھے، میرا ساتھ چاہتے تھے اور میں تم سے ہی بھاگتی رہی۔ جب ہمیں ملنا ہی تھا تو ہم اتنی دیر میں کیوں ملے۔ میں نے وہ لمحے کیوں گنوائے؟ اس بات کا ملال کبھی کبھی بہت ستاتا ہے۔“ وہ

اُداس لہجے میں بولی تھی۔
وہ مسکرا دیا تھا۔

”یہ اچانک اتنا کرم کیسے؟۔۔۔ خیر تو ہے؟“ انداز میں کچھ شرارت تھی۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”اوزان! تم رینکی بہت اچھے ہو۔ مجھے اس بات کا احساس بہت دیر سے ہوا۔“

”تم بھی بہت اچھی ہو لامعہ! اینڈ آئی واٹھ ٹو سے یوں تھنک آل ویز۔۔۔!“

”کیا۔۔۔؟“ وہ چونکی تھی۔

”آئی لو یو لامعہ!۔۔۔ آئی رینکی لو یو سوچ۔ میری زندگی میں تمہارے نہ ہونے سے کہیں کچھ کی

نا۔ ہر طرف بہت زیادہ کمی تھی۔ میں نے تمہاری بہت زیادہ خواہش کی تھی۔ مگر میں نہیں جانتا تھا تم

میرا زندگی میں آ پاؤ گی۔ مجھے کبھی نہیں لگا تھا میں کبھی تمہیں پاسوں گا۔ جب تم نے پہلی بار

میرے پر پوزل کو رینکٹ کیا تھا، مجھے لگا تھا میرے لئے زندگی ختم ہو گئی ہے۔ میں چلا گیا تھا اور سوچا

بہسی واپس نہیں آؤں گا۔ مگر دیکھو، زندگی مجھے تم تک کھینچ لائی۔ ہم ایک دوسرے کے لئے تھے، اس کا

ازہ مجھے آج ہوا ہے۔ ٹھیکس ٹو بی مائے مارٹ لامعہ! آج تم میری زندگی کا حصہ ہو اور ہم ایک

نہ عمر گزارنے جا رہے ہیں۔ میں خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں۔ آئی لو یو لامعہ!۔۔۔ تم اگر میری

ٹی میں نہیں آتیں تو میں مرتا نہیں۔ مگر کبھی اس طرح جی بھی نہیں پاتا۔“ وہ مکمل سچائی سے بولا تھا۔

لامعہ مسکرا دی تھی۔
اندر ایک اطمینان دور تک پھیلتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس کا نازک ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ میں

در زندگی بہت دلکش لگ رہی تھی۔
لامعہ کی آنکھوں میں جگنو سے چمک رہے تھے۔
وہ خوش دکھائی دے رہی تھی۔

”تمہاری زندگی میں آنے سے خود کو بہت Complete فیل کر رہی ہوں۔ مگر ڈرتی ہوں، یہ سب

بہ نہ ہو۔ آنکھ کھلے تو کہیں کچھ بھی نہ ہو۔“ لامعہ کو یک دم ہی اندیشے گھیرنے لگے تھے۔

اوزان مسکرا دیا تھا۔
”ایسا کچھ نہیں ہے محترمہ! یہ جو آپ لیا جوڑا ایک پینڈم سا بندہ دیکھ رہی ہیں نا، یہ بہت جلد آپ

نے چا رہا ہے۔ بالکل قانونی طور پر، 100 فیصد آپ کا۔ اب تو آپ کو کوئی ڈاؤٹ نہیں ہونا

۔ اور ہمارے مشرقی قسم کے بے چارے شوہروں کو تو جانتی ہیں آپ، کتنے معصوم ہوتے ہیں۔

ارے چاہئے ہوئے بھی ایک سے زائد شادی نہیں کر سکتے۔“ وہ بولا تھا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی

تو آپ کا پلان ہے، ایک کے علاوہ بھی شادی کرنا؟“ لامعہ نے مصنوعی خشکی سے گھورا تو وہ مسکرا

ایک بہت مشکل سے ہو رہی ہے۔ دوسری کے لئے کیا سوچوں؟۔۔۔ ایک لڑکی سے غلطی سے

رہی تھی۔ اس نے اتنا تنگ کیا کہ اب اور کی ہمت ہی نہیں۔ تم ایک مجھے بہت ہو۔“

ان اسے محبت سے دیکھتا ہوا بولا تھا۔

”ہمیشہ اسی طرح چاہو گے نا؟“ لامعہ نے پوچھا تھا۔
 ”ہوں — سوچ تو رہا ہوں۔“ وہ مسکرایا تھا۔
 ”کیا؟“ وہ چونکی تھی۔

”کہہ آئی خڈ کیپ لوئنگ یو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ ”مگر اس کے ساتھ ہی مجھے بھی کچھ چاہئے۔“
 ”کیا؟“

”تمہارا ساتھ — تمہارا پیار۔“

”آئی ول ڈو۔“ وہ سر جھکا کر مدہم لہجے میں اپنی مکمل رضامندی سے بولی تھی۔
 ”وہاٹ ہاؤٹ ناؤ۔“ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ لامعہ نے اس کی طرف دیکھا تھا مگر ان نگاہوں میں اتنی پیش تھی کہ وہ زیادہ دیر دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ نظر خود بخود جھکتی چلی گئی تھی۔ اور بالآخر وہ چہرہ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ اوزان مسکرا دیا تھا۔

”تو تم نے طے کر لیا ہے؟“ سردار سبکتگین نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے بخور دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

گی بہت اُلجھی اُلجھی دکھائی دی تھی۔ اس کی سمت دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

”کیا ہے یہ سب گی؟“ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اُلجھ کر اُسے دیکھا تھا۔

”اوں، ہوں — کچھ نہیں۔“ گی نے سرانکار میں ہلایا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں یک دم ہی نئی شہر نے لگی تھی۔

”گی! — بھر پور توجہ سے دیکھتے ہوئے سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے مدہم لہجے میں پکارا تھا۔

گی کا ضبط ایک لمحے میں ٹوٹا تھا۔ آنکھوں سے پانی باہر چھلک رہا تھا۔ مگر وہ پھر بھی مضبوط نظر آتا۔
 گی کو شش کر رہی تھی۔

”گی! — وہاٹ دی ہیل اٹ ایز؟“ گی کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سردار سبکتگین حیدر لغاری نے کہا تھا۔

”جیسی وہ محبت سے گندھی لڑکی اپنا ضبط ہار بیٹھی تھی۔ اس کے شانے پر سر رکھا تھا اور پھوٹ پھوٹا کر رو دی تھی۔

”کتنا مشکل ہے یہ سب میرے لئے، کوئی نہیں جانتا — کانٹوں پر لوٹ رہی ہوں میں۔ لہجہ! جان قیامت میں ہے میری — کوئی نہیں جان سکتا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور کس قدر سہہ رہا ہوں — میرا دل کیا چاہتا ہے اس بات کی خبر صرف مجھے ہے، کسی دوسرے کو نہیں — دل چاہا ہے کوئی میرا ہاتھ تو تھامے اور ہولے سے کہے۔“ ”ڈے — ڈے — گی!“ (مت)

گی) — میں ایک سرگوشی اپنے کانوں میں سننا چاہتی ہوں — مگر وہ سرگوشی کہیں نہیں ہے۔ مگر سننے کے جتن میں کان لگاتی ہوں تو صرف میرے اندر کا سکوت مجھے سنائی دیتا ہے۔ اس سکوت کے ساتھ میں کیسے جیتی ہوں اور کیسے پل پل مرتی ہوں، یہ بات کوئی نہیں جانتا — کوئی بھی نہیں —!“

گی آج وہ کہہ رہی تھی جو اس نے کبھی پہلے نہیں کہا تھا۔ اس کے لبوں پر اس کے اندر کی آواز تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اس لہجے کا درد اندر تک محسوس کیا تھا۔ مگر وہ ایک چھوٹی سی بات نہیں کہہ سکا تھا۔ جوگی اُس سے سننا چاہتی تھی۔

اُسے پہلی بار اندازہ ہوا تھا، وہ اندر سے کتنا بندھا ہوا تھا۔

اندر کیسے رنگ پھیلے تھے۔

اور ان رنگوں کے اسباب کیا تھے۔

وجود کے پورے علاقے پر کسی کا قبضہ محسوس ہوا تھا۔

پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اپنا آپ اپنا نہیں ہے۔ اور سردار سبکتگین حیدر لغاری حیران رہ گیا تھا۔



مناسب لگا۔ اور کوئی بھی بیٹریں اپنی اولاد کے حق میں کچھ غلط نہیں چاہتے۔ آپ کو میرے حق میں وہ مناسب لگا سو آپ نے کیا۔ مگر تقدیر میں کیا لکھا ہوتا ہے یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ پلیز، آپ کچھ بھی ایسا ویسا سوچ کر اسٹریس مت لیں۔ جو بھی ہونا ہو گا، ہو جائے گا۔ مجھے آپ سے یا آپ کے کسی بھی فیصلے سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔“

میرب مکمل سعادت مندی سے بولی تھی۔
مظہر سیال نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا تھا۔



”کیا ہوا؟۔۔۔ رات سوئے نہیں کیا؟“ سبکیگین ناشتے کی ٹیبل پر تھاجب مائی اماں نے دریافت کیا تھا۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

”اماں! اب بس آپ اس کے لئے لڑکی لے ہی آئیے۔ آج ہی میرب کے گھر جائیے اور شادی کی ڈیٹ فکس کر دیجئے۔“ گی نے مشورہ دیا تھا۔

”مجھے اس کی شادی کا مشورہ دے رہی ہو اور خود جا رہی ہو؟“

”مجھے تو جانا ہی تھا۔ مگر آپ وہ کریں جو ضروری ہے۔“ گی مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ ”سو، کیا ڈیٹائیڈ کیا آپ نے گین؟“

”مجھے کچھ ڈیٹائیڈ کرنا تھا؟“ سردار سبکیگین حیدر لغاری نے الٹا سوال داغ دیا تھا۔

”گین کی شادی کے بارے میں تو میں بھی سوچ رہی ہوں۔ مگر اتنی جلدی کیوں جا رہی ہو؟ گین کی دوست ہو۔ اس کی خوشی میں شامل نہیں ہوگی؟“ اماں نے گی سے شکوہ کیا تھا۔

”اماں! میں ضرور شامل ہوتی۔ مگر آل از ڈن ناؤ۔ آئی ہوپ سو، اب جب میں واپس آؤں گی تو گین کے دو تین بچے ہو چکے ہوں گے۔“ وہ ماحول کو خوشگوار کرنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی تھی۔

مگر گین پر اس بات کا قطعاً کوئی اثر ہوتا دکھائی نہیں دیا تھا۔
مائی اماں مسکرا دی تھیں۔

”انشاء اللہ۔۔۔ میری تو دیرینہ خواہش ہے گین کے بچوں کو گود میں کھلانے کی۔ پتہ نہیں کب وہ دن آئے گا جب میں اپنے پوتوں کو کھلاؤں گی۔ خدا پتہ نہیں یہ موقع دکھائے گا بھی کہ نہیں۔“ اماں کی آواز میں حسرت سی دکھائی دی تھی۔

”ایسا مت کہیں اماں! آپ ضرور دیکھیں گی۔“ گی نے خاموشی سے چائے انڈیلنے گین کی طرف دیکھا تھا۔

”گین!۔۔۔ مائی کتنی پریشان ہیں، تم دیکھ رہے ہو؟“

”ہاں۔۔۔! بہت مختصر سا جواب آیا تھا۔

ناشتے کی ٹیبل پر صبح بہت ثقیل گفتگو کا آغاز ہو چکا تھا جو کسی بھی طرح ٹھیک نہیں تھا۔ گین یقیناً اس سے بچنا چاہتا تھا۔

پہلے جہاں وہ پاپا کے واپس آنے کا بے تابی سے انتظار کر رہی تھی، اب ان کے آنے پر جیسے ان سے بات کرنے کا سارا جواز ختم ہو گیا تھا۔

زویا ریہ نے شاید انہیں مطلع کر دیا تھا کہ وہ ان سے کوئی بات کرنا چاہ رہی ہے اور ان کا انتظار بھی کر رہی تھی۔ اس لئے انہوں نے اسے شام میں طلب کر لیا تھا اور میرب خالی ذہن اور خالی نظروں کے ساتھ ان کے سامنے جا بیٹھی تھی۔

اب کہنے کو، پوچھنے کو کچھ نہیں تھا۔

وہ کیا کہتی؟۔۔۔ سر جھکائے بیٹھی تھی جب پاپا بولے تھے۔

”سبکیگین کی والدہ اس روز آئی تھیں اور ہم نے تمام باتیں ڈسکس کی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں بچوں کو ایک موقع دینا چاہئے۔ اتنی آسانی سے گھر نہیں بنتے۔ اور بچے ناسمجھ ہوتے ہیں۔ مجھے ان سے پورا اتفاق ہے۔ اسی لئے میں نے وکیل سے بات کر کے اس کیس کو وہیں کلوز کروا دیا تھا۔“

پاپا کہہ رہے تھے اور وہ حیران نہیں ہوئی تھی۔ حیران ہوتی شاید اگر کوئی اور وقت ہوتا۔ وہ یہی جاننے کے لئے تو بے تاب تھی کہ ان کے درمیان کیا کیا ڈسکس ہوا ہو گا۔ یہی جاننے کی کوشش میں تو

تھی اور اب جب جانا تھا تو۔۔۔!

اندر کہیں کوئی اُمگ نہ تھی۔

جیسا چاہا تھا۔ ویسا ہوا تھا۔

سب حسب منشا تھا۔ مگر وہ خوش نہیں تھی اب۔

”زویا ریہ نے بات کی تھی مجھ سے بیٹا!۔۔۔ مجھے اندازہ ہوا میں جلدی میں بہت کچھ گاڑ۔ جلا تھا۔ بہت غلطی پر تھا میں۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟۔۔۔ ایک بار بتایا تو ہوتا۔ میں اپنے۔۔۔ کے خلاف تو نہیں جاسکتا تھا۔“ پاپا اس کی طرف دیکھتے ہوئے محبت سے کہہ رہے تھے۔

مگر وہ کچھ نہیں بول رہی تھی۔

”آئی ایم سوری بیٹا!۔۔۔ میں تمہارے خلاف گیا۔ میں نہیں جان سکا کہ میرے بچے کے د میں کیا ہے۔ میں نے کوشش بھی نہیں کی آپ کو جاننے کی۔ میری وجہ سے آپ کو جتنی تکلیف سہنا پڑا اس کے لئے میں شرمندہ ہوں۔“

”نہیں پاپا!۔۔۔ آپ ایسا مت کہئے۔ آپ نے کچھ غلط نہیں کیا۔ آپ نے وہی کیا جو آپ

سارا اندر الجھا ہوا تھا۔
مگر
”گین! کیا سوچا ہے تم نے؟“ مائی اماں کی آواز ابھری تھی اور گین زیادہ دیر بے تاثر نہیں رہ سکا تھا۔

”کس بارے میں مائی؟“

”تیری شادی کے بارے میں گین!“

”مائی! مجھے آفس کے لئے دیر ہو رہی ہے۔ کیا ہم یہ بات شام میں کر سکتے ہیں؟“

”شام میں تو گی کو جانا ہے۔ تم بھول رہے ہو یہ بات۔ آج کام سے چھٹی کیوں نہیں لے لیتے؟“
مائی نے کہا تھا۔

”نہیں مائی! کچھ ضروری کام ہے۔ میں جلد واپس لوٹ آؤں گا۔“ وہ چائے کا کپ میز پر رکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”چلتا ہوں مائی! گی! اپنی پیکنگ کمپلیٹ کر لینا۔ میں جلد واپس آ جاؤں گا۔“ وہ بول پڑا تھا۔

”بڑو گین!“ گی اٹھ کر اس کی طرف آئی تھی۔

گین رُک گیا تھا۔

گی نے مسکراتے ہوئے اُسے دیکھا تھا۔

”گین! شاید تم سے شام میں بات کرنے کا موقع مل سکے۔ اور مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔ کیا تم مجھے آغا پیر مارکیٹ تک ڈراپ کر سکتے ہو؟ اسی بہانے میں تم سے کچھ بات بھی کر لوں گی۔“

گی اپنی سی ایک آخری کوشش کرنا چاہتی تھی۔

اور سردار سبکدین حیدر لغاری نے سر اٹھاتے میں ہلا دیا تھا۔

”اذہان بیٹا! کیا سن رہی ہوں میں یہ؟“ ساہیہ کینیڈا جا رہی ہے؟“

”ہاں۔۔۔ میں نے بھی یہی سنا ہے می! مگر میں نے ساہیہ سے فی الحال کوئی بات نہیں کی۔“

اذہان نے ٹی وی کا والیم کم کرتے ہوئے کہا تھا۔

”کیوں نہیں پوچھا؟“ می نے پوچھا تھا۔

”آپ کو لگتا ہے یہ سچ ہوگا؟“ اذہان مسکرا دیا تھا۔ ”اُس لڑکی کی عادت ہے می!۔۔۔ مذاق کر رہی ہوگی۔“

”تم ایسا سمجھ رہے ہو اذہان؟“ می نے اُسے چانچتی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ کچھ ارٹ ہو گیا تھا۔

”اذہان! آئی ڈونٹ تھک سو کہ تمہیں اس معاملے کو اتنا لائٹ لینا چاہئے۔ بیٹا! اِس ناٹ اے

جوک۔۔۔ میں نے خود فون کیا ہے۔ ساہیہ واپس جا رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے، یہ میں نہیں جانتی۔ شاید شاہینہ کے گھر والے بھی نہیں جانتے۔ مگر تم ایک ایسے انسان ہو جو یہ بات جانتے ہو۔“

”میں۔۔۔؟ مگر می! مجھے تو خود کچھ پتہ نہیں۔ ساہیہ نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“
”مگر وہ تو کہہ رہی ہے تم جانتے ہو!“

”جانتا ہوں؟۔۔۔ ہاں۔۔۔ ایک بار بتایا تھا اُس نے۔ بٹ آئی سپورڈ شی مسٹ کڈنگ

۔۔۔ اور اُسے جانے کی ضرورت کیا ہے؟ ہو سکتا ہے وہ کسی کام سے جا رہی ہو کچھ دنوں کے لئے۔“
اذہان نے وضاحت دی تھی۔

”میں نہیں جانتی۔“ فارحہ نے شانے اچکا دیئے تھے۔

”لیکن اذہان بیٹا! اِس یور سپاٹلیٹ ناؤ۔۔۔ تمہاری زندگی کا حصہ ہے وہ۔ اُس کا خیال رکھو۔“
فارحہ نے اس کے شوٹڈر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ پھر چلتے ہوئے وہاں سے نکل گئی تھیں۔

اذہان کئی لمحوں تک اس ٹرانس سے نکل نہیں پایا تھا۔

”گین!۔۔۔ کبھی کبھی بہت سی چیزوں کو سمجھنے میں ہم بہت دیر کر دیتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی تم

پسا کرو۔۔۔ یا تمہارے معاملے میں ایسا ہو۔“ گی بولی تھی اور سردار سبکدین حیدر لغاری ڈرائیو کرتے دئے اطمینان سے مسکرا دیا تھا۔

”گی ہنی!۔۔۔ کبھی کبھی معاملات کو ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہئے۔ حل زیادہ بہتر انداز میں

ماننے آ جاتے ہیں۔“ لہجہ کی قدر پڑ اطمینان تھا۔
”زندگی کو اس طرح چھوڑ دینے سے کبھی کبھی کوئی حل نہیں نکلتا۔ مسائل اور بھی الجھ جاتے ہیں

لین!“
”یا۔۔۔ آئی نو۔۔۔ میں جانتا ہوں یہ۔ مگر کبھی کبھی حل نکل بھی آتا ہے۔ تم اس طرح پریشان

ت ہو، گی! مجھے لگتا ہے کوئی بہتر حل ضرور نکل آئے گا۔“ یہ گین نے اُسے یقین دلایا تھا۔
”گین! تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ اگر تمہاری زندگی میں کچھ بھی غلط ہوتا ہے تو مجھے اس کا

ت دکھ ہوگا۔“ گی نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔
سردار سبکدین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”یقین رکھو۔۔۔ میری زندگی میں کہیں کچھ غلط نہیں ہوگا۔ اگر کہیں کچھ غلط ہوا بھی تو میں تم سے

رع کر لوں گا۔ تم ہونا۔“ بات مذاق میں اڑائی جا رہی تھی۔
گی گہری سانس خارج کر کے رہ گئی تھی۔
”گین! اِس تمہارا سر پھوڑ دوں گی اگر تم میرے پاس کچھ بھی مانگتے آئے۔“
”ایون جائے کی پتی بھی نہیں؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے پُر خیال انداز میں سوچتے ہوئے کہا

”اسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا گی! مگر آسان بنایا تو جا سکتا ہے۔ تم اگر کچھ بدلنے کے بارے میں سوچو گی ہی نہیں تو کچھ کیسے بدلے گا؟“

”سبکدین! مجھے وہ سب مت سمجھاؤ جو میں تمہیں سمجھا چکی ہوں۔ تم جاننے ہو میں ہر بات کو پہلے سے جانتی ہوں۔“

”تو پھر مجھے کیوں اتنا سمجھاتی ہو؟ کیا میں نا سمجھ ہوں؟“

”نہیں۔۔۔ تم نا سمجھ نہیں ہو گین! بس میں تمہیں کسی نقصان میں نہیں دیکھ سکتی۔“

”اور کیا میں تمہیں کسی نقصان میں دیکھ پاؤں گا.....“

”نہیں دیکھ سکتے تو روک لو مجھے۔“ اس کی بات کاٹتی ہوئی گی اطمینان سے بولی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری بھونچکا رہ گیا تھا۔

”روک سکتے ہو مجھے؟“ گی پوچھ رہی تھی اور سردار سبکدین حیدر لغاری کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

گی بہت اطمینان سے مسکرا دی تھی۔

”سردار سبکدین حیدر لغاری! جانتے ہو تم مجھے کیوں نہیں روک پائے؟ کیونکہ مجھے اپنی زندگی میں نہیں لے پائے۔ کیونکہ تم اپنی زندگی میں کسی اور کو رکھتے ہو اور اس کے وجود کو مانتے بھی ہو۔ یہ جو تمہاری آنکھوں میں ایک وحشت سی ہے نا، یہ محبت ہے۔ محبت کرتے ہو تم میرب سیال سے۔ ورنہ تمہارے لئے کوئی بھی راہ اختیار کر لینا اتنا مشکل نہیں ہوتا۔“

سردار سبکدین حیدر لغاری کچھ نہیں بولا تھا۔ چپ چاپ ڈرا بھونچتا رہا تھا۔

”کوئی بھی فیصلہ لینا صرف اس وقت مشکل ہوتا ہے سردار سبکدین حیدر لغاری! جب آپ اندر سے کہیں بندھے ہوئے ہوں۔ اگر آج آپ میرب کے ساتھ دل سے بندھے ہوئے نہیں ہوتے تو کوئی بھی نیا قدم آرام سے اٹھا چکے ہوتے۔ آپ بالکل بھی ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ محبت ہے!“

گی پُر یقین تھی۔

”محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ کچھ پُر یقین، کچھ بدگمان۔۔۔ بٹ آئی نو، آپ کی یہ بدگمانی بہت جلد دور ہو جائے گی۔ اور پھر آپ کو کوئی شکایت نہیں رہے گی۔“

گی کی منزل شاید آگئی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے گاڑی روکی تھی اور وہ چپ چاپ اتر گئی تھی۔

”گی!۔۔۔ تم بھی اپنے نئے راستوں کو تلاشو گی اور ایک مکمل زندگی بسر کرو گی۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کی طرف دیکھے بنا کہا تھا جیسے مزید دیکھے گا تو رہا سہا مان بھی جاتا رہے گا۔

گی کچھ نہیں بولی تھی۔ خاموشی سے چلتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی۔

سردار سبکدین حیدر لغاری نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

گی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”تم اتنی دور جھ سے چائے کی پتی مانگنے آؤ گے؟“

”تم نمبر ہو گی نا میری۔ ہمارے گھر میں جب بھی چائے کی پتی ختم ہو جایا کرے گی ہم تم سے مانگنے آ جایا کریں گے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

غالباً اُسے برے موڈ کے ساتھ رخصت کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”تمہیں تو بالکل بھی نہیں دوں گی۔ ہاں، اگر تمہاری وائف آئے گی تو انکار نہیں کروں گی۔“ گی نے مسکراتے ہوئے کسی قدر تسلی بخش انداز میں جواب دیا تھا۔

وہ مسکرا دیا تھا۔

”مجھے کیوں نہیں؟۔۔۔ اور میری وائف کو کیوں؟“

کیونکہ میرب تم سے زیادہ اچھی ہے اور مجھے زیادہ پیاری ہے۔ اسے تو میں کبھی بھی انکار نہیں کر سکتی۔ کسی صورت بھی نہیں۔“

”ٹھیک، آپ کی مرضی۔ آپ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے سعادت مندی سے آزاد قرار دے دیا تھا۔ گی مسکرا دی تھی۔

”گی! تم بہت اچھی ہو۔۔۔ میں تم سے یہ بات کہنا چاہتا تھا شاید۔ مگر کبھی کہہ نہیں پایا۔ تم پلیز! اپنی زندگی کو کبھی نئے راستے پر موڑنے کی کوشش کرنا۔ جس طرح تم مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہو، اسی طرح میں بھی تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”میں خوش ہوں گین!۔۔۔ تمہیں کس نے کہا میں خوش نہیں ہوں؟“ وہ مسکرائی تھی۔

”اس طرح نہیں گی! میں تمہیں اندر سے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی ہو گا جب تم اپنی زندگی پھر سے اشارت کرو گی۔ پراس ٹومی یو ول ڈو ڈیٹ۔“

سردار سبکدین حیدر لغاری بولا تھا۔ مگر وہ فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔

”گی! تم جیسی سمجھدار لڑکی سے میں کوئی فضول بات ایکسپیکٹ نہیں کرتا۔ کوئی بے وقوفی نہیں کرو گی۔ تم اپنی زندگی کو بہت اچھی طرح گزار دو گی۔ ورنہ۔۔۔“ سردار سبکدین نے دھمکی دی تھی۔

”ورنہ کیا؟“ گی نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ورنہ میں تمہارا نمبر کبھی نہیں بنوں گا۔“

”اچھا۔۔۔“ وہ ہنس دی تھی۔

”انس ناٹ کڈنگ یار۔۔۔“ سردار سبکدین نے اُسے ڈنچا تھا۔

”ہاں۔۔۔ جانتی ہوں میں۔ مگر فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میرے پاس فی الحال کوئی خواب نہیں ہے۔ میرے پاس جتنے بھی خواب تھے وہ بکھر چکے ہیں۔ پتہ نہیں میں ان بکھرے ہوئے خوابوں کو سمیٹ پاؤں گی یا نہیں۔ یا پھر نئے خواب دیکھ پاؤں گی یا نہیں۔ میں نہیں جانتی۔ میں تم سے کوئی جھوٹا وعدہ بھی نہیں کر سکتی۔ یہ زندگی اتنی آسان نہیں ہے۔“

انابیہ نے چائے کا ایک کپ لاکر سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔ موصوف جاگ رہے تھے اور نیوز پیپر دیکھ رہے تھے۔ سنڈے کی روٹین اشارت تھی۔

”مئی کا فون آیا تھا۔ اگلے سنڈے واپس آرہے ہیں وہ لوگ۔“

”ہاں جانتا ہوں میں۔ اور ان کے آتے ہی ان کی ضد شروع ہو جائے گی، میں تمہیں کہیں باہر لے جاؤں کچھ عرصے کے لئے۔“ وہ اخبار سے نظریں اٹھائے بغیر بولا تھا۔

انابیہ نے کسی قدر ناگواری اور برہمی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”آپ انکار کر دیجئے گا۔ آپ سے ایک انکار نہیں ہوتا۔“ انداز میں جلن بہت واضح تھی۔ مگر وہ مسکرا دیا تھا۔

”انکار ہی تو نہیں ہوتا۔ مئی کو خوش کرنے کے چکر میں ہی تو اتنا کچھ کر رہا ہوں۔ ورنہ.....“ اس ادھورے جھلے میں ایک الاؤ تھا جو انابیہ کو جلا کر ایک پل میں خاکستر کر گیا تھا۔

”تو بے۔ اتنا کچھ ماں کو خوش کرنے کے لئے تھا۔“

”کیا مطلب آپ کا؟۔ وضاحت دیں گے آپ مجھے؟“ انابیہ نے جل کر پوچھا تھا۔ مگر وہ مسکرا دیا تھا۔ نگاہیں اس پر نہیں، نیوز پیپر پر تھیں۔

”کس بات کی وضاحت چاہتی ہیں آپ؟۔ آف کورس، شی از مدر۔ ان کی بات نہیں مانوں گا تو پھر کس کی بات مانوں گا؟“

”تمہارا مطلب ہے تم نے اُن کی بات مان کر.....“ انابیہ سے آگے کچھ بھی کہا نہیں گیا تھا۔ ایک لمبے میں سب کچھ بہت تارک لگا تھا۔

وہ قرتبیں۔

وہ احساس۔

وہ مروّت۔

جسے وہ حق سمجھ رہی تھی، درحقیقت وہ ایک احسان تھا۔

اوہ۔!

اپنا آپ ایک لمحے میں بہت پست لگا تھا۔

چہرے پر ایک تاریک سایہ تھا۔ جب وہ مڑنے لگی تھی، عقنان علی خان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ غالباً موڈ میں تھا۔ مگر وہ مڑی نہیں تھی۔ پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

عقنان علی خان نے اسے ایک جھٹکے سے بیڈ پر گرا لیا تھا۔

وہ اسے کچھ لمحے پھر نوازنے کے درپے تھا۔ مگر وہ یک دم ہی جھٹک کر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”مجھے مئی کی طرف جانا ہے۔ اوزان کی شادی کے کئی کام پڑے ہیں۔ آپ ڈرائیور سے کہہ کر چھوڑوا دیں گے؟“ لائٹس سے انداز میں بولی تھی۔

عقنان علی خان کچھ نہیں بولا تھا۔

انابیہ نے دروازہ کھولا تھا اور باہر نکل گئی تھی۔

ایک پل میں۔

فاصلے صدیوں سے بڑھ گئے تھے۔

خاموشیاں تھیں کہ ٹوٹ نہیں رہی تھیں۔

”پھپھو! کتنا مزہ آئے گا نا آپ کی شادی پر۔ ڈھیر سارے چمکیلے کپڑے بنوائیں گے ہم۔ یہ بیڑک دار۔۔۔!“ ساہیہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اکینے مسکرا دی تھی۔

”بھائی۔۔۔ بھائی کونوں کرو۔ پوچھو کب آرہے ہیں وہ۔“

”ہاں، وہ تو میں کر لوں گی۔ مگر آپ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مت بیٹھیں اب۔ آپ برا بیڈ ب۔ سیلون جائیں، کوئی ٹریٹمنٹ لیں۔ رُکیں میں آپ کے لئے فون کر کے اپائنٹ منٹ لیتی ہوں۔“

ساہیہ نے خوشی کا بھر پور اظہار کرتے ہوئے فون اٹھایا تھا۔

”ڈھیر ساری کچھرز لے کر جاؤں گی آپ کی۔ اپنے کمرے میں یہاں وہاں، ہر جگہ لگا دوں گی۔ بول کی، مہندی کی، شادی کی، ولیہ کی اور پھپھو.....“

”ساہیہ! تم واپس کیوں جا رہی ہو نیچے؟“ اگینے نے پوچھا تھا اور وہ جو روانی سے بول رہی تھی اپنے کے پوچھنے پر یک دم ہی چپ ہو گئی تھی۔

”ماما پاپا سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے پھپھو! سچ میں بہت دل اُداس ہے۔ آپ کو یاد نہیں آتی کیا ان کا؟“ وہ دوسرے ہی پل مسکرائی ہوئی بولی تھی۔

”دو ماہ پہلے تک تو وہ یہیں تھے ساہیہ! اور جہاں تک مجھے لگتا ہے اس ٹاٹ دی ریزن۔ ہو سکتا، تم اُداس ہو۔ مگر دیر آر لاس آف دی ری سورسز۔ نیٹ ہے، فون ہے، یکم ہے۔ تم انہیں دیکھ سکتی بات کر سکتی ہو۔ پھر جانا کیوں ضروری ہے؟“

”تھک گئی ہوں کام سے۔۔۔ تھک گئی ہوں پھپھو! کچھ دنوں تک ریٹ لینا چاہتی ہوں ہر سے۔ ہر طرح کی ٹینشن سے فری ہونا چاہتی ہوں۔ یہ بھاگ دوڑ، یہ افراتفری، سب باتوں نے

ن تھکا دیا ہے مجھے۔ سچ میں، بہت تھکن فیل ہو رہی ہے۔ اگر آپ کی شادی کی بات سچ میں نہ آ

ا تو میں کب کی نکل چکی ہوتی۔ دل تو بہت چاہتا ہے رُکوں، ساری رسموں میں شرکت بھی کروں۔۔۔“ وہ مسکرا دی تھی۔

”تم نہیں جاؤ گی ساہیہ!۔۔۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ کم از کم میری شادی تک تو رُکو۔“ بولی تھی۔

وہ کچھ بھی بولے بغیر مسکرا دی تھی۔

ڈور تیل ہوئی تھی۔ دونوں چونکی تھیں۔

”ساہیہ!“ اگینے بولی تھی۔

”لگتا ہے پھپھو! آپ کا مایوں کا جوڑا آگیا ہے۔“ ساہیہ مسکراتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ دروازہ کھولا تھا اور سامنے اذہان حسن بخاری کو دیکھ کر کچھ حیران رہ گئی تھی۔

اذہان مسکرا دیا تھا۔

”حیران ہو۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔“ وہ پیچھے ہٹی تھی۔

”ہوتو۔۔۔“ وہ اندر بڑھ آیا تھا۔

اگینے غالباً یکن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

”کون ہے ساہیہ؟“ وہیں سے آواز دے کر پوچھا تھا۔

”پھپھو! اذہان ہیں۔۔۔ میں سمجھی تھی، پھپھو کا مایوں کا جوڑا آیا ہے اُن کی سسرال سے۔“ وہ بے

تاثر بنی ہوئی بولی تھی۔

”سسرال سے جوڑا تو نہیں آیا۔ مگر سسرال خود حاضر ہے۔ جوڑ بھی بن چکا ہے۔ اب آگے کیا

مرضی ہے؟“ اذہان حسن بخاری مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کسی قدر خوشگوار انداز میں

بولتا تھا۔ وہ فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔

”جوڑے تو آسانوں پر بنتے ہیں۔ یونو میڈان ہیوں۔ زمین پر تو صرف بات بنتی ہے۔ آپ کچھ

کنفیوژ دکھائی دے رہی ہیں۔ خیریت؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“

”ٹھیک ہوں میں۔ ایک دم پرفیکٹ۔ آپ کی باتوں پر کچھ حیران تھی۔“ وہ دھیسے سے مسکرائی تھی۔

”کیوں۔۔۔ ایسا کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟“ اسے بازوؤں سے تھام کر اپنے مقابل کیا تھا اور

بخور دیکھا تھا۔

”نہیں، کچھ غلط نہیں کہا۔ مگر آپ کا موڈ۔۔۔ یوسیس ویری چیئر فل اینڈ پی ٹوڈے۔ خیریت؟“

”کیوں؟۔۔۔ پہلے بھی میں اچھے موڈ میں نظر نہیں آیا کیا؟“ وہ مسکرایا تھا۔

”بہت کم۔“ وہ صاف گوئی سے بولی تھی۔

وہ مسکرا دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ مگر یہ تمہارے ساتھ ہونے سے ہے۔ تم ساتھ ہو تو سب اچھ

لگتا ہے۔ برے سے برادان بھی۔ خراب سے خراب موسم بھی۔!“

”کیا بات ہے؟۔۔۔ آج واقعی آپ اچھے موڈ میں ہیں۔ کہیں یہ خوشی میرے یہاں سے جا۔

کی تو نہیں؟“ وہ مسکرائی تھی۔

اذہان حسن بخاری کے مسکراتے لب یک دم ہی سکڑ گئے تھے اور اس کے کاندھوں پر اس۔

ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

”ساہیہ!“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

ساہیہ کی روم روم حس سماعت بن گئی تھی۔

سارا اندر اس کی آواز کے زیر بندہ گیا تھا۔

”ساہیہ!۔۔۔ سب کچھ جانتی ہو تم، مجھے آج تک ایسا لگتا تھا۔ مگر تم۔۔۔ تم مجھ سے اس حد

تک برہم ہو، میں نہیں جانتا تھا۔ تم جانتی ہو، میں نے کبھی تم سے کسی طرح کا کوئی جھوٹ نہیں کہا۔ کہیں

لوٹی کوتاہی نہیں برتی۔ پھر بھی جانے کیوں۔“ وہ غالباً بری طرح ہرٹ ہوا تھا۔

ساہیہ کو بری طرح افسوس ہوا تھا۔ مگر وہ فوری طور پر کوئی ازالہ نہیں کر سکی تھی۔

”ارے اذہان! تم آئے ہو۔ بیٹھو نا، کھڑے کیوں ہو؟۔۔۔ فارحہ بھابی کیسی ہیں؟ اور سعد

مائی؟“ وہ معمول کے انداز میں مسکراتی ہوئی بولی تھی۔

”سب ٹھیک ہیں اگینے!“ اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

”ساہیہ!۔۔۔ اذہان کے لئے چائے بناؤ بیٹا۔“

”نہیں اگینے! اس کی ضرورت نہیں۔ میں بس یہاں سے گزر رہا تھا۔ سوچا ملتا چلوں۔ چائے پھر

بھی سہی۔ چلتا ہوں۔ سی یو۔“ وہ بولا تھا اور مڑ کر فوراً ہی وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔

ساہیہ کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

اگینے نے اُسے جانا ہوا حیرت سے دیکھا تھا۔

”اسے کیا ہوا؟۔۔۔ اتنی جلدی کیوں چلا گیا؟“

”پتہ نہیں پھپھو! شاید کوئی کام ہو۔“ ساہیہ بولی تھی اور وہاں سے نکل گئی تھی۔

”اتنا کچھ ہوا اور تم نے کسی کو کچھ نہیں بتایا؟“ سیفی نے اس کے پاس بیٹھے ہوئے پوچھا تھا۔

رب فوری طور پر کچھ نہیں بولی تھی۔

”میرب! اسے بے وقوفی کہتے ہیں جو تم کر رہی ہو۔ مجھے تو حیرت ہے تم ہو کس انتظار میں؟ تمہیں

تاپے کوئی کرشمہ کہیں اچانک سے ہو گا اور سب کچھ بدل جائے گا؟“

”نہیں، مجھے ایسا کچھ بھی نہیں لگتا۔ اور ایسا کچھ ہو گا بھی نہیں۔ مجھے لگتا ہے، پایا جو بھی کر رہے تھے

زیادہ ٹھیک تھا۔ اگر اس رشتے کو ختم ہوتا ہے تو یوں ہی سہی۔ مگر آئی کانت بیئر اٹ اپنی مور۔ میرے

بچے یہ سب سہنا بہت مشکل ہے سیفی! بیچ میں دم گھٹنے ہا لگا ہے۔“ میرب تھکے ہوئے سے لہجے میں

ناتھی۔

”محبت سب سے بڑی بے وقوفی ہے میرب! اور تم یہ بے وقوفی کر چکی ہو۔ اب تمہیں کیا لگتا ہے تم

ماسٹر ہنلر کو بھول پاؤ گی؟ اب کیا ڈیسا اینڈ کیا ہے تم نے؟“

”مجھے نہیں پتہ سیفی! میں نے اب سب کچھ وقت پر چھوڑ دیا ہے۔ اگر سردار سبکدین حیدر لغاری کو یہ

تہ توڑنا ہے تو یوں ہی سہی۔ مگر اب میں مزید نہیں چلوں گی۔“

”فیصلہ تم نے بہت دیر میں کیا ہے میرب! تم بھول رہی ہو۔ اب یہ تمہارے ہاتھ میں بھی نہیں

”تم اپنا خیال رکھنا گی! اور جیسا میں نے تمہیں صبح کہا تھا، ویسا کرنے کی کوشش کرنا۔ اگر تم میری توں پر عمل کرو گی تو مجھے خوش ہو گی۔“ اُسے تاکید کرتے ہوئے وہ بولا تھا۔

”اور مجھے بھی خوش ہو گی گین! اگر تم اپنے دل کی مانو۔ پلیز، خود سے بھاگنا، بچنا، نگاہ چرانا ترک ر دو۔ محبت اگر زندگی کے لئے ضروری ہے تو اسے ہو جانے دو۔ تمہیں اگر لگتا ہے تم ایسا کوئی اعتراف رکے ہار جاؤ گے تو مان لو، یہ کوئی ہار نہیں۔ محبت میں ہارنے والا ہارنا نہیں۔ محبت میں جو ہار مانتا ہے اس کی جیت ہوتی ہے۔“ وہ جاتے جاتے بھی اس کے رشتے کو ایک سچ پر لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے پتہ نہیں سنا تھا کہ نہیں۔

”گی! اناؤنس منٹ ہو رہی ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔“

”رکھو گی گین! — تم پر اس کرو، میرب کو لے کر ایک بار مجھ سے ملنے ضرور آؤ گے۔“

”بائے گی! — ٹائم ٹو گو۔“ اُس کی بات کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے سردار سبکگین حیدر اری بولا تھا۔

”میری باتوں کو نظر انداز مت کرو گین! ایش امپورٹنٹ۔“ گی نے اسے ہگ کرتے ہوئے کہا تھا۔ سردار سبکگین حیدر لغاری بولا تھا۔

”پر اس تمہیں پورا کرنا ہے گی!“ سردار سبکگین حیدر لغاری نے یاد دلایا تھا۔

”گی کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی جواباً۔ بس آنسو پونچھے تھے اور پلٹ کر چلتی لی آگے بڑھ گئی تھی۔“

سردار سبکگین حیدر لغاری کھڑا اُسے دیکھتا رہا تھا۔

”تم شام میں ناراض ہو کر گئے تھے؟“ ساہیہ نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر پوچھا تھا۔ اذہان نے اپنے کی طرف بڑھ رہا تھا، رک گیا تھا۔

”نہیں۔“ مختصر جواب دیا۔

”پھر مجھے ایسا کیوں لگا کہ تم ناراض ہو کر گئے ہو؟“ وہ دھیسے سے مسکراتی تھی۔ غالباً اس کے موڈ کو دل پر لانا چاہتا تھا۔ مگر اذہان مسکرایا نہیں تھا۔

”آثار تو سارے ناراضگی والے ہی تھے۔ اب بھی چہرہ صاف بتا رہا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ تھی۔

”نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ میں تم سے ناراض کیوں ہوں گا؟“ وہ لائق سے بولا تھا۔ وہ کچھ اموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی، پھر مسکرا دی تھی۔

”ہاں، تم بھلا مجھ سے تھا کیوں ہو گے؟“ ایک شکوہ سا تھا لہجے میں۔ اذہان اُسے کسی قدر ناگواری کیلئے لگا تھا۔

”تم غلط سمجھ رہی ہو ساہیہ! — ایک بار پھر غلط۔ میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں تم سے

رہا۔ اور تم آسانی سے خود کو وقت کے حوالے کر رہی ہو۔ تم نے ان محترم ہٹلر کو خود سے اس طرح کھینے کا حق ہی کیوں دیا؟“ سیفی ناگواری سے بولا تھا۔ وہ سر جھکا گئی تھی۔

”مجھے نہیں پتہ سیفی! مگر شاید محبت بہت سے چانس دے سکتی ہے۔ یہ میری اس کے لئے محبت ہی تھی جس نے اسے اتنے مواقع دیئے۔ پتہ نہیں کس بات کے انتظار میں تھی میں۔ سمجھ ہی نہیں آیا مجھ کو۔ آنکھیں، عقل سب بند تھا جیسے۔ آج سوچا تو پتہ چلا سب خسارہ تھا۔ آج سوچتی ہوں، پلٹ کر پیچھے دیکھتی ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کیا کیا گنوا دیا میں نے۔ کل میں اس رشتے کو بنانے کے حق میں نہیں تھی۔ اور آج اس سے دامن نہیں چھڑا پار ہی ہوں۔“

سیفی نے اس کے شو لڈر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”آئی نو۔ تمہارے لئے یہ سب مشکل ہے میرب! مگر ٹیک اٹ ایزی۔“ سیفی نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ مگر یہ بہت بودا تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

”پاپا کو لگتا ہے سیفی! وہ اس سب کے ذمہ دار ہیں۔ اگر انہوں نے تب میرا نکاح سردار سبکگین حیدر لغاری کے ساتھ نہ کیا ہوتا تو صورتحال آج کچھ مختلف ہوتی۔ مگر مجھے ایسا نہیں لگتا کہ اس میں ان کوئی قصور ہے۔ یہ میرے نصیب میں درج تھا، لکھا تھا ایسا، سو پورا ہوا جیسے اب تک ہوتا آیا ہے۔ میڈ آگے بھی معاملات کو وقت پر ڈال دینا چاہتی ہوں۔ جن معاملات کا حل ہم نہیں نکال پاتے، ان کا حل خدا بہتر نکالتا ہے۔“ میرب کو جیسے اب کوئی شکوہ نہیں رہا تھا۔ کسی سے نہیں۔ نہ وقت سے، نہ حالات سے، نہ سردار سبکگین حیدر لغاری سے۔

وہ بہت پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔

”مجھے اُمید ہے میرب! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مجھے اب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا سیفی! — کچھ ٹھیک ہو یا نہ ہو، اب میں اپنی زندگی کو اسے ضائع نہیں کروں گی۔ مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ یہ شادی زندگی کی منزل نہیں ہے صرف۔“ وہ پُر عزم لہجے میں بولی تھی۔

”تمہیں ضرورت ہے میرب! اپنا دھیان کسی اور طرف لگانے کی اور خود کو پوزیٹو سمت کی طرف لانے گی۔ ایش بیٹرفار یو۔“ سیفی نے ایک دوست ہونے کے ناتے سراہا تھا اُسے۔

”میں پاپا کے ساتھ ان کا بزنس دیکھوں گی سیفی! — آئی رینل گاٹ فیڈ اپ ناؤ۔“ میرب ا لہجہ پر مسکرتی تھی۔

اور سیفی اس کا بھر پور حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

”میں میرب سے ملنا چاہتی تھی گین! مگر نہیں مل پائی۔ پلیز تم اس سے ملو تو میری طرف سے سوز کر دینا۔“ گی نے ایئر پورٹ پر کھڑے ہوئے سردار سبکگین حیدر لغاری سے کہا تھا۔

سردار سبکگین حیدر لغاری کچھ نہیں بولا تھا جیسے یہ ذکر ایک فضول ذکر ہو۔

ناراض نہیں ہو سکتا۔“ اذہان نے باور کرایا تھا۔ ساہیہ مسکرا دی تھی۔ پھر بولی تھی۔

”تم بڑی تو نہیں ہو؟“

”اس وقت؟“ چوکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ ”نہیں۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔“ سر نفی میں ہلا دیا

تھا۔

”تو چلو پھر آکس کریم کھانے چلتے ہیں۔“ وہ بولی تھی۔

”اس وقت؟“ وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”ہاں۔ اس وقت۔“ وہ منہ لگاڑتے ہوئے بولی تھی۔ ”میرا دل چاہ رہا ہے اذہان! کتنے دن سے

تمہارے ساتھ کہیں نہیں گئی۔ اور یوں بھی آئی وانٹ ٹو کلکٹ سم کڈ میموریز۔ چلو نا۔“ وہ بولی تھی۔

اذہان حسن بخاری خاموشی سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

مگر اسے انکار کرنا ممکن نہیں تھا۔ سو تھوڑی دیر بعد ہی وہ اس کے ساتھ آکس کریم پارلر میں تھا۔

”تمہیں یاد ہے اذہان! جب میں یہاں آئی تھی تو تم کیسے غصیلے بلے جیسے تھے۔ یہ غصہ ہر وقت

ناک پر دھرا تھا تمہاری اور مسکرائے تو تم کبھی نہ تھے۔ مگر کتنا ستایا تھا میں نے تمہیں۔ ہر وقت کسی نہ کسی

بہانے تمہارے سر پر سوار رہتی تھی تاکہ تمہارے اس موڈ کو چنچ کر سکوں۔ کتنا اری ٹیٹ کرتی تھی تاہم

تمہیں۔“ وہ یاد کرتے ہوئے ہنسی تھی۔ اذہان مسکرا دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ تم مجھے بالکل بھی اری ٹیٹ نہیں کرتی تھیں۔ میں بالکل بھی اری ٹیٹ نہیں ہوتا تھا

مجھے اچھا لگتا تھا جب تم میرے آس پاس ہوتی تھیں۔ اور اب بھی اچھا لگتا ہے۔ تم جب پاس ہوتی

مجھے ہر شے بہت کمپلیٹ سی لگتی ہے۔“ وہ کیسے کیسے انکشاف کر رہا تھا مگر ساہیہ پر کسی شے کا کچھ اثر نہیں

ہوا تھا۔ وہ اس بات کو، اس موقع کی بچ کو بالکل نہیں سمجھ رہی تھی۔

”کل میں گھر آؤں گی۔ تمہارے کمرے سے تمہاری پیکرز اگر غائب ہو جائیں تو سمجھ لینا میں انہیں

چرا کے لے جا چکی ہوں۔ میرے پاس تمہاری کوئی تصویر نہیں ہے۔ مگر کینیڈا خالی ہاتھ تھوڑی جاؤں

میں۔ تمہاری بہت سی یادوں کے ساتھ تھوڑی سی پیکرز بھی چرا کر لے جاؤں گی۔“ وہ اسی خوشگوار انداز

میں کہتے ہوئے مسکرائی تھی۔

”تم واقعی جارہی ہو؟“ اس کے لہجے کی مکمل خوشگوار کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ دھیسے لہجے:

بولتا تھا۔

ساہیہ چونکی تھی، پھر ہنس دی تھی۔

”ہاں نا۔۔۔ مجھے ہنس کرو گے؟“ اک آس سے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

”تم واقعی جارہی ہو؟“ اس کا سوال بدستور تھا۔

ساہیہ جو مسکرا رہی تھی، چپ ہوئی تھی۔ ہونٹ سکڑے تھے۔ پھر مسکراتے ہوئے سر اثبات میں

دیا تھا۔

”کیوں جارہی ہو؟“ وجہ جاننا چاہی تھی۔

”کیا مطلب کیوں جارہی ہو۔“ وہ ہنس دی تھی۔ ”دل چاہ رہا ہے۔“ وہ بالکل بھی سنجیدہ نہیں تھی۔

”مذاق کی بات نہیں ہو رہی ساہیہ! تم مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہو ہمیشہ۔ مگر اس وقت میں کچھ سیریس

یئرڈ سکس کرنا چاہتا ہوں۔ کانسڈلی بے یور اٹینشن۔“ وہ بولا تھا۔ لہجے میں سنجیدگی تھی۔

ساہیہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ اذہان نے بھی اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔

”اب بتاؤ، کیوں جارہی ہو؟“ جاننا چاہا تھا۔ مگر ساہیہ خاموشی سے سر جھکا گئی تھی جیسے اس کے

اس فوری طور پر کوئی جواز نہیں تھا یا پھر وہ اسے کہنا نہیں چاہتی تھی۔

”ہر تعلق توڑ کر جارہی ہو؟“ ایک سوال مزید ہوا تھا۔ مگر ساہیہ خاموش تھی۔



سردار بیکٹین حیدر لغاری تنہا ہوا تھا تو بہت سی باتوں کو از سر نو سوچا تھا۔ نگاہ میں ایک چہرہ در آیا تھا۔ وہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔
وہ چپ رہتا۔ کچھ نہ کہتا۔ کسی کو نہ بتاتا۔ مگر گی جان گئی تھی۔ اور یہی سچ بھی تھا۔
اس کی زندگی میں بہت عرصے سے کوئی شریک ہو چکا تھا۔ اس کا حصہ بن چکا تھا۔ اور اب وہ بھی اس کا عادی ہو چکا تھا۔

کتنا بدل چکا تھا وہ خود کو اس کے لئے پہلے دن سے اب تک۔ کتنا زیادہ! پرامس تو اس نے نہیں کیا تھا گی سے مگر وہ خود کو میرب کے بارے میں سوچنے سے نہیں روک پارہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا ایسا مگر جیسے سوچیں اس سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔
جب سے وہ گئی تھی ہر طرف ایک ویرانی ہی ویرانی بکھر گئی تھی۔ اپنے پیچھے کے سارے منظر وہ فانی اور بے جان کر گئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی، اس بات سے واقف بھی نہیں تھی۔ مگر سچ تھا اس کے بغیر اس کی زندگی میں تھوڑی نہیں، بہت زیادہ کمی واقع ہو چکی تھی۔ ایک خلا سا اُبھر آیا تھا۔ وہ سر جھکائے سموٹنگ کر رہا تھا جب مائی چلتی ہوئی اس کے قریب آن رکی تھیں۔

”تم سوئے نہیں اب تک گین؟“

”بس مائی ایند نہیں آرہی تھی۔“ اس نے سگریٹ مسلے ہوئے کہا تھا۔

”گی کے چلے جانے سے اس گھر کا سونا پن اور بھی بڑھ گیا ہے نا۔“

”ہاں۔۔۔ مگر گی کو تو چلے ہی جانا تھا۔“

”ہاں۔۔۔ سچ کہتے ہو۔ گی کو تو جانا ہی تھا۔ آخر کوئی کتنی دیر کہیں رکتا ہے۔ مہمان کو تو ایک دن جانا ہی ہوتا ہے مگر.....“ مائی نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

سردار بیکٹین بچہ نہیں تھا جو کچھ نہ سمجھتا۔ ساری بات سمجھ میں آگئی تھی، مائی کیا کہنا چاہ رہی تھیں اور کس کے متعلق۔

”مجھے میرب بہت یاد آ رہی ہے گین بیٹا! وہ اس گھر میں تھی تو اس گھر کے ویرانے جیسے ختم ہو گئے تھے۔ مگر ایک عرصے بعد پھر وہی سکوت ہے اس گھر میں۔ وہ اس گھر میں آئی تھی تو رونق لائی تھی۔ اپنے قدموں کے ساتھ کئی خواب باندھ لائی تھی۔ میری بوڑھی آنکھوں نے کیسے کیسے خواب بٹنے شروع کر دیئے تھے مگر.....“

مائی کے لہجے میں ایک حسرت بول رہی تھی۔

اور سردار بیکٹین حیدر لغاری اس حسرت کو صاف محسوس کر رہا تھا۔

”گین بیٹا! آج شام منظر میاں کا فون آیا تھا۔ میرب کے سلسلے میں بات کر رہے تھے وہ۔ مارے درمیان طے پایا تھا کہ یہ رشتہ ختم نہیں ہوگا۔ سوانہوں نے کیس واپس لے لیا۔ مگر اب ہماری رلف سے کوئی پیش رفت نہ پا کر وہ کچھ متفکر سے ہیں۔ مجھے نہیں پتہ بیٹا! تمہارے دل میں کیا ہے۔ لر میں سمجھتی بھی ہوں تو شاید اس طور پر نہیں سمجھ پاتی۔ کیونکہ میں اس بچی کو لے کر زیادہ پریشان ہوں۔“

اوزان کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ عفتان کو معلوم تھا، اسے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہو گی مگر وہ منہ سے کچھ نہیں کہے گی۔ سوائے طور پر ہی اس کی بہت سی شاہنگ کر کے آگیا تھا۔ اندازہ تو نہیں تھا اُسے کیا کیا چاہئے۔ مگر اپنے طور پر اس نے ہر شے کافی کوائٹی میں لے لی تھی۔ جیولری کے دس بارہ سیٹ، دس بارہ قیمتی ساڑھیوں، میچنگ جوتے۔ کوشش کی تھی کوئی کسر باقی نہ رہے۔ اب اُسے پسند آتا تھا یا نہیں، وہ نہیں جانتا تھا۔ مگر اسے بتائے بغیر اپنے طور پر یہ سب اسے لے کر Present کرنا چاہتا تھا۔

وہ ہاتھ لے کر باہر نکلی تھی تو ہر شے یہاں سے وہاں بکھری دیکھ کر کچھ حیران رہ گئی تھی۔

”کیا ہے یہ؟۔۔۔ یہ سب کہاں سے آیا؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

عفتان نے اسے بغور دیکھا تھا۔ ہیکے ہیکے کیسو چہرے کے ارد گرد دکھڑے ہوئے تھے۔ پانی کی کئی بوندیں چہرے پر تھیں۔ وہ نگاہ نہیں ہٹا سکا تھا۔

”یہ سب تمہارے لئے ہے۔“

”میرے لئے؟“ وہ مزید حیران ہوئی تھی۔ ”مگر کس لئے؟“

”تمہیں ان چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ ایسا مجھے لگا۔“

”آپ کو لگایا میں نے فون کر کے کہا؟“ وہ طنز کرتی ہوئی بولی تھی۔

عفتان کا سارا اشتیاق دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ وہ لب سکڑ گیا تھا۔

”آپ کو لگتا ہے کہ انہوں نے مجھے فون کر کے کہا ہوگا بھی میں نے ایسا کیا؟“ لہجے میں کچھ ناگواری تھی۔ اس کے لئے یہ سب کر کے جو خوشی اس کے چہرے پر دکھنا چاہتا تھا، نہیں دیکھ پایا تھا۔

”آپ سے کچھ بھی ایکسپیکٹ کر سکتی ہوں میں۔ کہیں یہ سب ایک ”قیمت“ تو نہیں؟“ وہ طنز میں بچھے تیر چلا رہی تھی۔

”انا بیہ۔۔۔!“ وہ دھاڑے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ہاتھ اٹھا مگر وہ اسے مار نہیں سکا تھا۔ وہ اپنی نادانی میں کیا کہہ گئی تھی، وہ شاید خود بھی نہیں جانتی تھی۔

عفتان علی خان پلٹا تھا اور چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ انا بیہ کھڑی دیکھتی رہ گئی تھی۔

تم میرے بیٹے ہو۔ شاید کہیں تم اس سے اتنے خوش نہیں ہو جتنا ایک شوہر کو ہونا چاہئے اس رشتے کو لے کر۔ مگر میں اپنے بیٹے کی کوئی کوتاہی نظر انداز نہیں کر سکتی، صرف یہ سوچ کر کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ میں جانتی ہوں تمہیں اب اس کی ضرورت اپنی زندگی میں محسوس ہونے لگی ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح ہمیں اس گھر میں اس کی محسوس ہوتی ہے۔ ہم چاہیں تو اسے اپنے گھر میں بیاہ کر لے بھی آئیں اور تم انکار بھی نہ کر سکو۔ مگر اس سے قبل میں چاہتی ہوں اس بچی کو جتنا سہنا پڑا ہے تم اس کا ازالہ کر دو۔ دل سے۔ کسی زور زبردستی سے نہیں۔ تم نے اس کے ساتھ کہیں نہ کہیں نا انصافی کی ہے۔ تم سے یہ نا انصافی ہوئی ہے۔ تم اس رشتے کو اتنی ایمانداری سے نبھانے پائے جس طور تمہیں نباہنا چاہئے تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ تم بے وفائی کے مرتکب ہوئے۔ مگر تم نے اس کا دل دکھایا ہے گین! ایک شوہر کو اپنی بیوی کی خوشیوں کا ہر طور خیال رکھنا چاہئے اور تم اس کا خیال نہیں رکھ پائے۔ سردار سیکٹیکن حیدر لغاری! میں چاہتی ہوں تم میرے اپنی خوشی سے ملو۔ اور اس بات کا ازالہ کرو۔“

مائی بہت نرمی کے ساتھ اس کو حکم نامہ جاری کر رہی تھیں۔ سردار سیکٹیکن حیدر لغاری خاموشی سے انہیں سن رہا تھا۔

بات کچھ عجیب یا انوکھی نہیں تھی۔

دل بھی تو کچھ ایسا ہی بول رہا تھا۔

اگر مائی کی نہیں بھی سنتا تو دل تو کہہ ہی رہا تھا۔

ہاں وہ اس کے لئے ضروری تھی۔

تھوڑی نہیں کسی قدر نہیں۔

بہت زیادہ۔

مگر یہ بات وہ اس سے کیسے کہتا۔۔۔؟

کس طرح کہتا۔۔۔؟

اس بات کا حل وہ نہیں ڈھونڈ پایا تھا۔

مگر حل چاہئے تو تھا۔

اگر یہ مسئلہ تھا تو اسے حل تو کرنا ہی تھا۔

مائی اپنی بات کہہ کر کب کی جا چکی تھیں اور وہ اب تک اسی نچ پر سوچ رہا تھا۔

اب تک سو نہیں پایا تھا۔

دل اس کے ساتھ کس طور، کس قدر بندھ چکا تھا، اس کا پتہ اتنی دیر سے کیوں چلا تھا۔

یا پھر اس نے ہی آج تسلیم کیا تھا۔ اپنی کوتاہی کا بھرپور احساس ہوا تھا۔

”انابہ! تمہیں وہ سب چیزیں پسند آئیں بیٹا؟“ مائی نے فون کر کے پوچھا تھا۔

انابہ چونک پڑی تھی۔ ایک تو بہت عرصے بعد مائی اماں سے بات ہو رہی تھی۔ دوسرا وہ ان کا بہت

ادب بھی کرتی تھی۔ جس طرح کہ عفتان کرتا تھا۔

”جی مائی! — آپ کو کیسے پتہ چلا کہ.....“

”لو۔۔۔ وہ میرے ہی پاس تو آیا تھا پریشان حال سا۔ بولا تمہارے بھائی کی شادی ہے اور

تمہیں وہ بہت سے تھکے تھکے دینا چاہتا ہے۔ اس میں اس کی مدد کروں۔ کیونکہ فاطمہ تو وہاں ہے

نہیں۔ سو میں ساتھ چل دی۔ مگر ایک ایک شے میں مرضی عفتان کی ہی رہی۔ بہت پیار کرتا ہے وہ تم

سے۔ بہت پریشان تھا کہ پتہ نہیں تمہیں یہ سب پسند بھی آتا ہے کہ نہیں۔ میں تو کہتی رہی بھلا پسند

کیوں نہیں آئے گا۔ بیوی کے لئے تو شوہر ایک چھوٹی سی شے بھی اپنی مرضی اور شوق سے لے آئے تو

وہ لاکھوں روپے سے زیادہ قیمت لگتی ہے۔ اور تمہارے لئے تو اس نے روپیہ پانی کی طرح بہا دیا۔ بیٹا!

عفتان کی محبت کی قدر کرنا۔ ایک اچھی بیوی کی یہی نشانی ہے۔ عموماً شرتی بیویاں بڑی وقا شعرا ہوتی

ہیں۔ اپنے شوہروں کی بڑی آؤ بھگت کرتی ہیں۔ مگر شوہر پلٹ کر پوچھتا تک نہیں۔ اگر شوہر اس

خدمت اور محبت کا کوئی انعام اپنی مرضی اور خوشی سے دے تو اس سے منہ نہیں موڑنا چاہئے۔ ہمارا زمانہ

ذگزر گیا۔ یہ تم لوگوں کا زمانہ ہے۔ مگر کچھ باتیں تو اب بھی پرانی ہی ہیں بیٹا!“ مائی محبت سے کہہ رہی

تھیں۔

انابہ نے سر ہلا دیا تھا۔

”جی مائی! — ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔“

”اچھا، یہ بتاؤ ساس کب واپس آ رہی ہیں تمہاری؟ کچھ زیادہ لمبا ٹور نہیں ہو گیا ان لوگوں کا؟“

”میسکرائی تھیں۔“ ہاں بھئی، جب گھر سنبھالنے کو ایک اچھی بہو موجود ہو تو پھر ساس کو فکر کرنے کی کیا

رورت ہے۔ میری بہو میرے گھر میں آجائے تو میں بھی سب ذمہ داریوں اور کاموں سے

بچتی لے کر لیے عرصے کے لئے نکل جاؤں گی۔“ مائی مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ”بیٹا! وقت نکال

لر ایک چکر مائی اماں کی طرف بھی لگاؤ۔“

”جی مائی! ضرور۔ اوزان کی شادی منٹ جائے تو پھر بس چکر لگاتے ہیں۔ آپ سنائیے، کب رخصتی

رہا رہی ہیں سیکٹیکن بھائی کی دلہن کی؟“

”بس بیٹا! جلد ہی۔“ مائی نے کہا تھا۔ ”اچھا بیٹا! میں فون رکھتی ہوں۔ پھر بات کرتے ہیں۔ اپنا

دل رکھنا۔“

”جی مائی! —“ وہ سعادت مندی سے بولی تھی۔

فون ہاتھ میں لئے وہ کتنی دیر ساکت سی بیٹھی رہی تھی۔

گاڑی گھر کے پورچ میں رکھی تھی۔ ساہیہ دروازہ کھول کر باہر نکلی تھی۔

”ساہیہ!“ وہ چلتی ہوئی آگے بڑھ جانے کو تھی جب اذہان گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا اور

سرعت سے پکارا تھا۔ وہ رک گئی تھی۔

تھا۔ یہی تیاری کچھ دل سے ہوئی تھی۔ فان کلر کی ساڑھی میں بہت بچ رہی تھی۔ مگر عفتان نے ایک نگاہ غلط انداز بھی نہ ڈالی تھی۔ انا بیہ کو اپنی تیاری ضائع ہو جانے پر ملال تو ہوا تھا مگر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی تھی۔ وہ چلتی ہوئی اس کی طرف بچتی تھی۔ وہ متوجہ نہیں ہوا تھا۔

”آپ سامان پیک کر لیتیں۔“ اس کی طرف دیکھے بغیر کہا گیا تھا۔

”کس لئے؟“ وہ چونکی تھی۔

”آپ کے بھائی کی شادی ہے۔ پھر کہیں گی ظلم کر دیا آپ پر۔ آپ کو اس گھر اور چار دیواری میں قید کر دیا گیا۔ مجھے تو ڈر ہے دہائی دے کر کہیں دو چار این جی اوز کو نہ بلایا جائے کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی یہیں ہو رہی ہے۔ ہومن وائلیشن والی تنظیمیں تو مفت میں دھر لیں گی مجھے۔“ وہ طنز کے تیر تا بڑ توڑ برسا رہا تھا۔ انا بیہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ پھر بولی تھی۔

”بری لگتی ہوں نا آپ کو؟“ ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر کھڑا کیوں نہیں کر دیتے پھر آپ؟“ آنکھوں میں بھر پور نمی تھی۔

عفتان علی خان کو اپنے لہجے کی سختی کا اندازہ ہوا تھا۔

”آئی ایبم سوری۔۔۔ آئی ڈڈ ناٹ مین ٹو ہرٹ یو۔“ جب میں ہاتھ ڈال کر رومال والا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ مگر انا بیہ نے وہ ہاتھ ایک جھٹکے سے جھٹک دیا تھا۔

”بہت بری لگتی ہوں نا آپ کو۔۔۔ جینا دو بھر کر دیا ہے نا آپ کا۔ دم گھٹتا ہے نا آپ کا میرے ساتھ ایک چھت تلے رہتے ہوئے۔ تو ختم کر دیجئے سب۔ کیا ضرورت ہے زبردستی کا بوجھ ڈھونے کی؟ کس بات کا انتظار کر رہے ہیں آپ؟۔۔۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں خود چلی جاؤں تو ٹھیک ہے۔ میں ہی چلی جاتی ہوں۔“ ایک پل میں فیصلہ لیتی ہوئی وہ پلٹی تھی جب ہاتھ عفتان کے ہاتھ میں ہی رہ گیا تھا۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ عفتان ایک قدم آگے بڑھا کر اس کے مقابل آن رکھا تھا۔ اس کے چہرے کو چند ثانیوں تک خاموشی سے تکتا رہا تھا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا اور اپنے چہرے کے قریب کر کے ان ہلکوں کی ساری نمی چن لی تھی۔

اس کی آنکھیں بتاؤ کیسی ہیں؟

جھیل سیف الملوک جیسی ہیں

”ان آنکھوں کی نمی کبھی نہیں دیکھ سکتا میں۔۔۔ ان آنکھوں میں نمی کبھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ کیونکہ یہ آنکھیں آج بھی مجھے اس دنیا میں ہر شے سے زیادہ پیاری ہیں۔“ بہت مدہم لہجے میں سرگوشی ہوئی تھی اور انا بیہ بُت سی بن گئی تھی۔ نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی صرف۔ حیرت سے سوا حیرت تھی۔

”آئی لو یو انا بیہ!۔۔۔ لیس، آئی اسٹل ڈو۔۔۔ وہاٹ اباؤٹ یو؟۔۔۔ میں آج بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں۔ میری جنوں خیزی اب بھی وہی ہے۔ تمہارے لئے میری محبت کبھی نہ کم ہوئی تھی نہ کبھی ہوگی۔ اظہار کو زبان نہ ملے تو محبت مز نہیں جاتی۔ محبت ختم نہیں ہوتی انا بیہ! اگر میں تم سے نہیں کہہ سکا، کچھ حالات ایسے رہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اب تم سے محبت نہیں کرتا۔ کرتا

وہ چلتا ہوا اس کے قریب آن رکھا تھا۔

”اپنے اور میرے بچ کے رشتے کو ان خاموشیوں کی نذر مت کرو۔“

”سامبیہ! آئی دونائسن یور پلائے۔ آئی دونائسن دی ریزن۔ ٹیل می۔“ اُسے شانوں سے تھام کر اپنے سامنے کھڑا کرتے ہوئے وہ بولا تھا۔ سامبیہ خاموشی سے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

”میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے اذہان!۔۔۔ آئی ایم ٹائڈ۔ ہم صبح بات کریں گے۔ گڈ نائٹ۔“ وہ کہہ کر سرعت سے پلٹی تھی جب اذہان نے ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ وہ اس کے سینے سے آن لگرائی تھی۔

اذہان نے اسے اپنے حصار میں باندھ لیا تھا اور اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”آئی نیڈ یو۔ ڈیم اٹ۔ آئی نیڈ یو۔ فور مائی ہول لائف۔ ایک دن کے لئے، دو چار دن کے لئے بھی نہیں، پوری عمر کے لئے ضرورت ہے مجھے تمہاری۔ آئی مین اٹ۔ تمہارے بنا میں بہت ادھورا ہوں۔ پلیز مجھے اس طرح ادھورا مت چھوڑو۔ یو کپیٹ می بے بی! سو ڈونٹ گو۔ پلیز اسٹے۔“ مدہم سرگوشیوں میں کیا کیا کچھ نہ تھا۔

وہ سر اٹھائے نگاہ ساکت کئے اسے دیکھ رہی تھی۔ کتنی قریب تھی وہ۔ اسے کس طرح نگاہ چرانا چاہئے تھی۔ سب بھول گئی تھی وہ۔ اپنے، اس کے تعلقات میں اتنی، اس درجہ قربت پہلی بار محسوس کی تھی۔ اس کی نگاہوں کی وہ پیش پہلی بار محسوس کی تھی۔ وہ سانسوں کی تپش جو اس گھڑی اس کے چہرے کو جھلسا رہی تھی، وہ پہلی بار محسوس کر رہی تھی۔

یہ سب بہت نیا تھا۔ اور شاید پہلی بار تھا۔ اس سے پہلے اذہان نہ اس کے اتنا قریب آیا تھا نہ اس طرح اس سے اظہار بیاں کیا تھا۔ وہ حیران نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔

اس کی نگاہ اسی طرح ساکت تھی۔ جب اذہان نے سر جھکا کر اس کی پیشانی پر بڑی عقیدت سے اپنے لب رکھ دیئے تھے۔

”آئی نیڈ یو۔۔۔ آئی ریٹلی نیڈ یو سامبیہ۔۔۔!“ وہ اسے خود سے بھینچے بہت مدہم لہجے میں کہہ رہا تھا اور سامبیہ کو وہ پل ساکت لگے تھے۔ کسی خواب جیسے۔

جیسے وہ وقت کوئی خواب تھا۔ حقیقت کا جس سے دور تک واسطہ نہ تھا۔

اپنی غلطی کا کچھ اندازہ تو تھا۔ مگر وہ اس طرح فوری طور پر اسے ایکسپیکٹ نہیں کر سکتی تھی۔ قصور سارا اس کا نہیں تھا۔ کچھ قصور تو عفتان علی خان کا بھی رہا تھا۔ سو پھر وہ کیوں جھکتی۔ اور پھر وہ پیہ پیہ پانی کی طرح بہا دینے سے کہیں سے بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ کون کتنی محبت اب بھی کرتا ہے۔ اور کرتا جو ہے کہ نہیں۔ گو تجھے تحائف ہیں تو محبت کی ہی نشانی مگر۔ وہ ماننے کو اب بھی تیار نہیں تھی۔

سو شام میں لامعہ اور اوزان کی مایوں کے لئے وہ اس کی لائی گئی بیش قیمت جدید تراش خراش کا ساڑھی زیب تن کئے اور جیولری پہنے زینہ اتاری تو وہ بالکل بھی نہ چونکا۔ حالانکہ اسے چونکنا تو چاہتا

ہوں۔ بے حد، بے حساب کرتا ہوں۔ میں تو آج بھی اتنا ہی پاگل ہوں۔ تم جن بدگمانیوں میں سانس لیتی رہیں میں انہیں کبھی اس طور ختم نہیں کر سکا۔ مگر تم نے یہ کیسے جان لیا کہ میں تم سے تنگ آچکا ہوں۔ یا اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔“

اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا وہ کہہ رہا تھا۔ اور انابیہ کی سماعتیں سراب ہوتی جا رہی تھیں۔

محبت کو اظہار کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے

چاہے کتنی بھی پرانی ہو جائے

اس کی جڑیں چاہے دور تک پھیل جائیں

مگر ضرورت رہتی ہے کہنے کی

مجھے تم سے محبت ہے۔!

اگر آج عفتان اس طرح نہ کہتا تو وہ اپنے طور پر کیا کیا سبھی بیٹھی تھی۔ اس کی سانسوں کی تپش اس کے چہرے پر تھی۔ وہ اپنا بھرپور استحقاق استعمال کر رہا تھا۔ اس کے گرد اپنے بازوؤں کا حصار باندھے وہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور وہ نگاہ اٹھ نہیں رہی تھی۔ وہ اندر تک سرشار ہو گئی تھی۔ محبت کی بارش پور پور اُسے بھگو گئی تھی۔

”انابیہ!۔۔۔ میں ہمیشہ سننا چاہتا تھا تم سے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو مگر میں بھی تو بدگمان ہو سکتا ہوں نا۔ میں بھی سننا چاہتا ہوں انابیہ! تم نے کبھی مجھ سے محبت کی یا نہیں؟“ وہ ان لمحوں کو خوشبوؤں میں باندھ رہا تھا۔

انابیہ سر جھکائے مسکرا دی تھی۔

”آپ جانتے ہیں۔۔۔ پھر کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ وہ نگاہ بارحیا سے جھکی جاتی تھی۔

”کیا جانتا ہوں میں؟۔۔۔ میں تو کچھ نہیں جانتا۔ ہاں جانتا ضرور چاہتا ہوں۔“ اس رنگوں بھرے چہرے کو بھرپور دلچسپی سے دیکھتے ہوئے وہ بولا تھا۔ انابیہ سر جھکائے مسکرا دی تھی۔

”آپ جانتے ہیں۔ کوئی خود کو کسی کو یونہی نہیں سوچ دیتا۔“

”اوہ، آئی سی۔“ وہ ہونٹ سکڑ کر مسکرا دیا تھا۔ ”تو یہ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی یعنی۔ بڑی گھسی ہیں آپ۔ کبھی خبر ہی نہیں ہونے دی۔“ وہ مسکرا دیا تھا۔

”جھوٹ مت بولیں۔ خبر تو آپ کو تھی۔“ وہ اسے پکارتے ہوئے بولی تھی۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”میں بھی بندہ بشر ہوں۔ سمجھ سکتا ہوں کہ اب آپ کو مجھ سے محبت نہیں رہی۔“ آنکھوں میں

شرارت بھرے وہ بولا تھا۔

”نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہے عفتان!۔“ وہ بولی تھی۔

”پھر کیسا ہے انابیہ؟“ وہ شرارت پر مائل تھا۔

”مجھے بھی آپ سے محبت ہے۔ اتنی نہ سہی، مگر ہے ضرور۔ تبھی تو میں اس گھر سے کہیں نہ جا سکی۔

ہمیشہ آپ سے شکوے کرتی رہی۔ اگر محبت نہیں ہوتی تو کوئی کمپلین کیوں کرتی۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”اوہ۔۔۔ تو کمپلینز کا مطلب محبت ہوتا ہے۔ اوہ، رائٹ۔ یہ بات مجھے نہیں پتہ تھی۔“ وہ مسکرایا تھا۔ ”تو ٹھیک ہے۔۔۔ اب آپ جتنی زیادہ کمپلینز کریں گی، میں اتنا ہی سمجھوں گا کہ آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ مجھے یونہی فضول میں اتنے دنوں تک لگتا رہا کہ میں زبردستی کوئی حق وصول کر رہا ہوں۔ اگر وہ خود سپردگی تھی تو اس کے بارے میں مجھے اتنی دیر بعد کیوں بتایا گیا؟“ وہ شرارت پر مائل تھا۔

انابیہ نے مسکراتے ہوئے اس کے حصار سے خود کو نکالا تھا۔

”جلدی چلیں۔۔۔ وہاں مایوں کی رسم شروع نہ ہو چکی ہو۔ مئی نے مجھے پہلے آنے کا کہا تھا اور میں لیٹ ہوں۔“

عفتان نے اسے تھام کر ایک بار پھر قریب کر لیا تھا۔

”سچ کہوں۔۔۔ بالکل بھی موڈ نہیں ہے اب کہیں جانے کا۔ ایسا کرتے ہیں ہم فون کر کے منع کر دیتے ہیں، ہم نہیں آرہے۔ آج ہمارا موڈ محبت کرنے کا ہے۔!“ شرارت سے کہتے ہوئے جیب سے سیل فون نکالا تھا۔ جب انابیہ نے مسکراتے ہوئے اس کا سیل والا ہاتھ نیچے کر دیا تھا۔

”اس کام کے لئے بہت سادقت ہے ہمارے پاس۔ مگر فی الحال وہاں اوزان اور لامعہ ہمارا ویدٹ کر رہے ہوں گے۔“ وہ خالہتا بیویوں والے اندز میں ڈپٹے ہوئے بولی تھی۔ وہ مسکرایا تھا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن تم وہاں رات نہیں رہو گی۔ میرے ساتھ گھر واپس آؤ گی۔ رائٹ؟“ وہ آگے بڑھی تھی اس کا ہاتھ تھام کر جب وہ رک کر وہیں پر جم کر شرط رکھتے ہوئے بولا تھا۔

انابیہ ہلش ہو کر رہ گئی تھی مگر پھر دیر ہونے کے خیال سے فوراً سر ثابت میں ہلا دیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ چلئے اب۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے آگے بڑھنے لگا تھا۔

انابیہ کو پہلی بار سب کچھ بہت دلکش لگا تھا۔ اس اونچے لمبے شخص کا اپنے قدموں سے قدم ملا کر چلنا۔ اسے ایک لمحے میں اپنی دنیا بہت مکمل لگی تھی۔

اس کی بانہوں کی گرفت میں ہی نہیں وہ اس کی نظروں کی تپش سے بھی پکھل رہی تھی۔

”کوئی داریزن ساہیہ!۔۔۔ وائے یو لوی می؟۔۔۔ صرف ایک بار کہو، تم کیوں چھوڑ کر جانا چاہتی ہو مجھے؟“

ساہیہ کو اپنا آپ ایک لمحے میں بہت ہارتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

وہ کبھی تھی ”تعلق خاص“ نہیں۔ اس کی کوئی اپورٹنس نہیں۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ سمجھتی تھی انہاں کو اس کے دور جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا تو وہ غلط تھی۔

”اذہاں! بہت کوشش کی تھی میں نے۔ مگر مجھے لگتا تھا میں ہار رہی ہوں۔ کہیں کوئی شے تمہارے میرے درمیان ہے۔ وہ جو ہونا چاہئے تھا، وہ نہیں ہے۔ وہ احساس، وہ فیٹنگو میں تھا نہیں جگا سکتی تھی

جو اس رشتے کی ضرورت ہیں۔ سو میں نے ڈیسا بیڈ کیا کہ تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں۔ میں نے کبھی

”ہاں۔۔۔ بالکل صحیح فیصلہ کیا تم نے۔ تمہیں یہ بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔ بیٹی ہو یا بیٹا، آخر کو والدین کے بازو ہوتے ہیں۔“ زوباریہ نے مسکراتے ہوئے اسے اپری شیٹ کیا تھا۔

میرب خوش خوش ناشتہ کرنے لگی تھی جب گھر کے پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تھی اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ملازم اندر داخل ہوا تھا۔

”صاحب! سردار سبکدین حیدر لغاری آئے ہیں۔ میرب بی بی سے ملنا چاہتے ہیں۔“

منظہر سیال ہی نہیں، وہ بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ انہیں اندر بلاؤ۔“ منظہر سیال نے کہا تھا۔ میرب کی دھڑکنیں ٹھہرنے کو تھیں۔ تو کیا فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی؟ فیصلہ ہو گیا تھا؟۔۔۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے طے کر لیا تھا جو آج اس کو مطلع کرنے آن پہنچا تھا؟۔۔۔ وہ اپنے ایک نئے دن کی شروعات کرنے چلی تھی۔ ایک نئی اُمّت اور حوصلے کے ساتھ بیدار ہوئی تھی اور وقت اس کے لئے کیا طے کرنے چلا تھا۔!!!

”صاحب کہہ رہے ہیں، بی بی صاحبہ باہر آ جائیں۔ وہ ان کا انتظار کر رہے ہیں۔“ تھوڑی ہی دیر بعد ملازم دوبارہ سر پر تھا۔

میرب کی دھڑکنیں بند ہونے کو تھیں۔ قسمت اس کے لئے جانے کیا لکھ چکی تھی۔ کیا طے کر چکی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی۔

”جاؤ بیٹا!“ پاپا بولے تھے۔

وہ ہمت کر کے اٹھی تھی اور چلتی ہوئی باہر آ گئی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری گاڑی میں اس کا منتظر تھا۔

وہ دروازہ کھول کر اس کے برابر بیٹھی تھی۔

”گڈ ڈے!“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے کہا۔

”گڈ ڈے!“ وہ مردوتا بولی تھی۔

”ہاؤ آر یو؟“ احوال پوچھا گیا تھا۔

میرب نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ جواباً پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ سو نہیں پوچھا تھا۔ مگر سردار سبکدین حیدر لغاری کا مطمئن انداز اسے بتا رہا تھا کہ وہ کوئی فیصلہ کر کے آیا تھا۔

”سو اپنی پلان فورٹو ڈے؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری اس سے سوال پوچھ پوچھ کر کسی حد تک تو یزان کر رہی رہا تھا۔

”کچھ خاص نہیں۔ پاپا کے ساتھ آفس جارہی تھی۔“

”واؤ۔۔۔ ہاؤ ونڈر فل از دیٹ۔ تو کب سے یہ کام سنبھالا تم نے؟“

”آج ہی سے۔“

”گڈ۔۔۔ لیکن تم اگر آفس سنبھالو گی تو پھر میرا گھر کون سنبھالے گا؟“

”کیا۔۔۔؟؟“ مطمئن لہجے میں کہا گیا ایک جملہ اسے حیرتوں میں ڈال گیا تھا۔ بے حد چونک

چاہے کچھ بھی کہا ہو مگر میں ایک لڑکی ہوں۔ اندر سے میری فیلنگو بھی کچھ مختلف نہیں ہیں۔ میں تمہیں مکمل طور پر اپنا دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر آئی واز فیلنگ مائے سیلف مکمل ڈاؤن۔ سیم تھنگ واز مکمل ان سائیڈ۔ اور وہ سہنا میرے لئے آسان نہیں تھا۔ سو میں نے سوچا اگر کوئی رشتہ ورک نہیں کرتا تو اسے چھوڑ دینا بہتر ہے۔ کیونکہ میں نے اپنا سو فیصد میٹ اس رشتے کے لئے دیا تھا اور۔۔۔!“

اور تم سمجھتی ہو میں نے سو فیصد نہیں دیا؟“ اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ کوئی جواب دینے بغیر نگاہ جرا گئی تھی۔

”سایہ۔۔۔!“ اس کے چہرے کو بھر پور توجہ سے دیکھتے ہوئے اوپر اٹھایا تھا۔

”ہنی! میں نے بھی اپنا میٹ دیا ہے۔ سو فیصد۔ آئی ایم یورس۔ میں تمہیں اپنا آپ سونپ رہا ہوں۔ اور اس دن کے لئے میں نے تم سے وقت چاہا تھا جب میں کہہ سکوں کہ میں تمہارا ہوں۔ اور آج کا ایک ایک لمحہ مجھے بتا گیا کہ اگر تم میری زندگی سے جاتی ہو تو میں بالکل خالی ہاتھ رہ جاؤں گا۔ کچھ نہیں رہے گا میرے پاس۔۔۔ تم مجھے ادھورا کر جاؤ گی۔ کیا تم مجھے ادھورا کرنا چاہتی ہو؟“

براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔ سایہ کچھ دیر تک خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ پھر یک دم اس نے سر اٹکا میں ہلا دیا تھا اور اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا تھا۔

”یو کپلیٹ می اذ بان! اینڈ آئی ڈونٹ وائٹ ٹو گوائی ویز ناؤ۔“ بہت مدہم لہجے میں وہ اپنا اقرار اسے سونپتے ہوئے بولی تھی۔

اذ بان مسکرا دیا تھا۔

پہلی بار اس نے خود کو بہت پرسکون پایا تھا۔

اور مکمل بھی۔۔۔!

وہ بہت فریٹس ہی اٹھی تھی۔ کسی طرح کی کوئی ٹینشن اب اس کے چہرے پر نہ تھی۔ وہ ریلیکس تھی۔ تیار ہو کر ناشتے کی ٹیبل پر آئی تھی۔ زوباریہ نے ناشتہ لگا دیا تھا۔ فانی بیٹھا تھا اور پاپا بھی۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”گڈ مارننگ۔۔۔!“

”گڈ مارننگ بیٹا!۔۔۔ سو یو آر ریڈی ٹو ڈو ورک ایٹ یور آفس۔“ پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”نیں پاپا۔۔۔ آئی ایم۔۔۔!“

”اوہ۔۔۔ تو بیٹی آج آفس سنبھالنے جارہی ہیں۔ دیش اے گڈ ڈی سی ٹن۔“ زوباریہ اس کے لئے چائے انڈ بیٹتی ہوئی مسکرائی تھی۔

”تھیکس زوباریہ!۔۔۔ خود کو ناکارہ کرنے سے بہتر ہے میں پاپا کے ساتھ ان کے کام میں کسی قدر ہاتھ بٹاؤں۔“

بہت زیادہ آفتد کیا ہے میں نے تمہیں۔ آئی ڈونٹ نو، وہاٹ آئی ڈیزرو۔ بٹ اِن یوتھنک آئی ڈونٹ ڈیزرو دین یو کیکن ٹیک یور سیلف بیک۔ فیصلہ میں تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں میرب! میں نے تم پر ہمیشہ اپنی مرضی توہنی ہے۔ مگر اب میں ایسا نہیں چاہتا۔ تمہیں لگتا ہے میں تمہارے لئے بہتر ہوں تو یو کیکن کم الونگ وڈی۔ میں فیصلے کا حق تمہیں دے کر تمہیں آزاد چھوڑتا ہوں۔ میں فطری طور پر حکم دینے کا عادی رہا ہوں مگر اپنی زندگی کے اس فیصلے کے لئے میں تم پر کوئی زبردستی نہیں چاہتا۔ مگر یہ بات سچ ہے کہ آئی ایم اِن لو وڈ یو۔ بیڈلی اِن لو وڈ یو۔ میں نے کبھی کسی کے لئے اپنی نیند برباد نہیں کی۔ مگر تمہارے لئے جانے کتنی راتوں تک جاگا ہوں میں۔ میں نے کبھی کسی کے لئے لمحے نہیں گئے مگر تمہارا انتظار کرتے ہوئے میں نے لمحوں کو شمار کیا ہے میرب! تم نے مجھے بدل دیا۔ میرے سوچنے کے انداز کو بدل دیا۔ اگر تم میری زندگی میں نہیں آتی تو شاید میں بہت ہی بے معنی سی زندگی گزار رہا ہوتا۔ مائی کو لگتا ہے تم میرے لئے بہترین انتخاب ہو۔ مجھے اپنی ساری زندگی تمہارے ساتھ بسر کرنی چاہئے۔

گی بھی یہی سوچتی ہے کہ تم سے زیادہ بہتر لڑکی میری زندگی میں نہیں آ سکتی۔ اور میں میرب! میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ تم سے زیادہ بہتر مجھے کوئی نہیں مل سکتی۔ مگر تم کیا سوچتی ہو، یہ بات زیادہ اہم ہے میرے لئے۔ میں سیلفش نہیں ہونا چاہتا۔ اگر میں صرف اپنے بارے میں سوچ کر ہی فیصلہ صادر کر دوں تو یہ نا انصافی ہوگی۔ سو اس بار فیصلے کا حق تمہارے پاس ہے۔ میں نے تم سے تم تک کا سفر طے کیا ہے۔ میں نے ہمت کی ہے۔ میں تم تک آیا ہوں۔ مگر تمہارے راستے کا راہ اختیار کریں گے یا تمہارے راستوں کی کیا سمت ہونی چاہئے یہ تم طے کرو گی۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو؟“ اس نے تمام باتیں کر کے فیصلے کا حق اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ میرب کے لئے یہ لمحہ اتنا مشکل نہیں تھا مگر اتنا کچھ سہا تھا اور اب اتنا کچھ سنا تھا کہ آنکھیں پھلکے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔

وہ اس کی سمت سے نگاہ ہٹائے ہوئے اپنی آنکھوں کو مئی کی راہ دینے لگی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری اسے چپ چاپ دیکھنے لگا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے ٹشو نکال کر ہاتھ اس کے سامنے کر دیا تھا۔

”میرب! تمہاری آنکھوں میں آنسو میں کبھی بھی نہیں دیکھ سکا۔ بہت مشکل لمحہ ہوتا ہے یہ میرے لئے۔ اس کے باوجود کہ میں نے تمہیں بہت بہت زلا دیا ہے، میں تمہیں کبھی بھی زلا نا نہیں چاہتا تھا۔ مگر کبھی کبھی، بہت کچھ نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کے خلاف ہو جاتا ہے۔ سو میں بھی وقت کو کبھی اپنے حق میں نہیں کر پایا۔ آج جب سب کچھ میرے اختیار میں ہے تو تب بھی میں خود کو بہت زیادہ بے اختیار محسوس کرتا ہوں۔ تم کیا سوچتی ہو میرب! پلیز، اپنے بارے میں بات کرو۔ میں کیا سوچتا ہوں، کیا اہتا ہوں یہ اہم نہیں ہے۔ تم کیا سوچتی ہو، کیا چاہتی ہو، یہ اہم ہے۔“

اتنے اہم موڑ پر ایک مشکل ترین فیصلے کا حق اسے سوچ رہا تھا وہ۔ دریا دلی سی دریا دلی تھی۔ بھلا ہو تیراؤ نے مجھ کو

رہائی تو دی اور پتہ کاٹ ڈالے

وہ فیصلہ کرتی بھی تو کیا کرتی۔ سوچتی بھی تو کیا سوچتی!

کر سردار سبکدین حیدر لغاری کی طرف دیکھا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ خلاف معمول!!!

”سوری۔۔۔!!!“ وہ جیسے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی تھی۔

”آفس کی ذمہ داریاں سنبھالنا اچھی بات ہے میرب! مگر میں چاہتا ہوں میری وانف میری اور میرے گھر کی ذمہ داریاں سنبھالے۔“ اتنی بڑی تبدیلی کی امید میرب کو نہیں تھی۔ یہ صبح اس کے لئے کیا لے کر آئی تھی۔ اس نے وقت کو خود کے حوالے کیا تھا اور۔۔۔!

سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور بہت آہستگی سے بولا تھا۔

”آئی ایم سوری میرب! اِن ایور ہرٹ یو۔ بٹ اِن ڈز ناٹ میٹ ٹو اوٹینڈ یو۔“ بہت انکساری سے وہ بولا تھا۔

میرب سیال اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

ایسے پتھر صفت انسان سے اس بات کی امید نہیں تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔

”میں نے زندگی میں کبھی کسی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے لگتا تھا کوئی کہیں بھی ضروری نہیں ہے۔ تم نے دیکھا، مجھے واقعی رفاقتوں پر اعتبار نہیں تھا۔ یہ ٹھہرنا، رکنا مجھے نہیں آتا تھا مگر..... پھر مجھے رکنا اچھا لگا۔ میں رُک گیا۔ ٹھہر گیا۔ اور میرا دل ان لمحوں کو روکنے کو چاہنے لگا۔ میں وقت کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ شاید تبدیل ہو رہا تھا۔ اس ساتھ کو ایکسپٹ کر رہا تھا۔ مگر میں مان نہیں رہا تھا۔ بڑا آئی کنسیڈر اٹ ناؤ۔ یو پیچڈ می میرب!۔۔۔ دیٹ واژ یول۔۔۔ وہ تم تھیں جس نے میری زندگی کے نئے زاویوں پر موڑا۔ مجھے نئے طریقوں سے سوچنا سکھایا۔ مجھے بتایا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ کسی کے لئے سوچنا کیوں اچھا لگتا ہے۔ جاگنا کیوں اچھا لگتا ہے۔ یہ تم نے مجھے سکھایا۔ میں ہار چکا تھا میرب شاید بہت پہلے۔ مگر میں ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ہمیشہ تمہارے خلاف رہا میں۔ ہمیشہ تمہارے خلاف بات کی۔ تمہارا دل دکھایا۔ بہت برا ہوں نا میں۔ تم چاہو تو مجھے کوئی بھی سزا دے سکتی ہو۔ آئی ول ایکسپٹ دیٹ۔ بٹ بی فور دیٹ لٹ می سے۔ آئی ڈو ہیئر اباؤٹ یو۔ پلیز گومی آچانس ٹو ٹیک کیئر آف یو۔ فور ہول مائی لائف۔۔۔ لٹ می پروٹیکٹ یو۔۔۔ لٹ می لو یو۔۔۔!

میں اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک سانس تمہارے ساتھ جٹانا چاہتا ہوں میرب! مجھے سوچ دو کہ میں تمہیں اپنا آپ پروف کرا سکوں۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لئے بہت کچھ ہے۔ بہت سی محبت ہے میرب! بہت سی محبت سوچنا چاہتا ہوں میں۔ مجھے چانس دو۔ اک عمر گزار کر مجھے احساس ہوا ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اور اس محبت کے رنگ کے کچے نہیں میرب!“

بہت مدہم لہجے میں بولا تھا۔ اس کے لہجے میں صفائی تھی۔ ایک یقین تھا۔ میرب سیال اس کی طرف خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں، یقین تھا کہ وقت اس کے لئے اتنا بدل سکتا ہے۔ یہ شخص اتنا بدل سکتا ہے، اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کیا واقعی بدل چکا تھا وہ۔

کل تک جو اسے کیسی کیسی آفر زدے رہا تھا اور آج۔۔۔!

”تم مجھ سے بدگمان ہو میرب! دیٹ آئی نو۔ تم مجھ سے خوش نہیں ہو، یہ بات چاہتا ہوں میں۔“

اس کی زندگی کی سمت تو بہت عرصہ پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔ وہ تو بس راہ پر چل رہی تھی۔ اس کی سمت سفر کر رہی تھی۔ اور وہ۔۔۔!

”گین! تمہارے لئے زندگی چاہے کچھ بھی رہی ہو، مگر میرے لئے زندگی کا مفہوم ہمیشہ سے تم تھے۔ میرے ہر راستے پر، ہر منزل پر میں نے تمہیں کھڑا پایا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں اگر میں ہاتھ بڑھاتی تھی تو تم کہیں نہیں تھے۔ مگر میرے خوابوں میں، میرے خیالوں میں، میری زندگی میں، میری انگلی تمہارے ہر سمت تم تھے۔

تم سے ہمیشہ دور بھاگنا چاہتی تھی میں۔ مگر جب بھی تم سے دور بھاگنا چاہتی تھی، کھلتا یہی تھا کہ درحقیقت تمہاری ہی سمت بھاگ رہی ہوں۔ میرا سفر تو ہمیشہ سے تمہاری ہی سمت تھا اور یہ بات میں تمہیں بتا بھی چکی ہوں۔ کہہ رہی ہوں کہ تم میرے لئے کیا ہو۔“

وہ مکمل توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔

اور میرب کہہ رہی تھی۔

”تم اور مجھ میں سب سے بڑا فرق ہے گین! تم بہت اگونیٹ ہو۔ اپنی غلطی نہیں مانتے۔ مانتے بھی ہو تو بہت دیر سے۔ جبکہ میں۔۔۔ میں بہت جلد کسی بھی بات کے لئے ایکسکوز کر سکتی ہوں۔ تم نے اتنی چھوٹی سی بات کو ماننے میں اتنی دیر کر دی۔ اتنے زیادہ دن۔۔۔ گین! تم جیسا شخص جس کے لئے اپنی پوزیشن، اپنے اسٹیٹس کے لئے ایک ایک لمحہ اہم ہے، ایک ایک منٹ حتیٰ ہے تم نے اتنے دن ایک چھوٹی سی بات کو تسلیم کرنے میں لگا دیئے۔

صرف اتنی چھوٹی سی بات کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔

گین! یہ سچ ماننا تمہارے لئے اتنا مشکل تھا کہ لوگوں کو تمہیں فورس کرنا پڑا۔ آج اگر تم میرے سامنے ہو تو اس لئے کہ مائی اماں نے کہا کہ آئی ایم سوگڈ فور یو۔ تم آج مجھ سے یہ بات کہہ رہے ہو۔ صرف اس لئے کہ گی نے تم سے کہا کہ میں تمہارے لئے بہترین ہوں۔ مگر گین! تم۔۔۔ تم خود۔۔۔ تمہاری مرضی کیا ہے؟ تم جیسا برنس ٹائیکون، کروڑوں کی برنس ڈیلز کرنے والا بندہ خود اپنا نفع نقصان نہیں جان پایا۔ اسے خود معلوم نہیں کہ اس کے لئے کیا اچھا ہے اور کیا بر۔۔۔“

”سنو میرب!۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔۔“

”میری بات کمپلیٹ نہیں ہوئی ابھی سردار سبکگین حیدر لغاری! پلیز لسن ٹوی۔ تم نے مجھے بولنے کا اختیار دیا ہے تو میری سنو بھی۔ تم خود کیوں جان نہیں پائے کہ میں تمہارے لئے کتنی ضروری ہوں۔“

میرب بولی تھی۔ اُسے لگا تھا کہ سردار سبکگین حیدر لغاری کی برداشت جواب دے جائے گی اور وہ غصے میں اسے گاڑی سے باہر نکال دے گا اور خود گاڑی دوڑاتا واپس گھر چلا جائے گا۔ مگر اس کے اندازوں کے برعکس وہ مسکرا دیا تھا۔

وہ شخص مسکرا رہا تھا اور اس کے لئے یہی باعث حیرت تھا۔ یعنی وہ شخص بہت حد تک واقعی بدل چکا تھا۔

”میرب!۔۔۔ ہنی!۔۔۔ میں اگر تمہارے سامنے ہوں تو اس کے کئی ریزن تمہیں بتا چکا ہوں۔ سب سے بڑا ریزن محبت ہے میرب! اور محبت کا کوئی ریزن نہیں ہے۔ کیونکہ محبت کسی ریزن کے بغیر ہوتی ہے۔ اور آئی لو یو وڈاؤٹ اینی ریزن۔۔۔!“

بہت مدلل اور ٹھوس بات کہتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ تھاما تھا اور بہت آہستگی سے لیوں کے قریب لے گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اتنی ہی نرمی سے بولا تھا۔

”آئی لو یو میرب!۔۔۔ آئی ریٹلی لو یو۔ میرے پاس اس سے بڑا ریزن کوئی نہیں ہے۔ اور اس بات کے لئے مجھے کسی نے فورس نہیں کیا۔ میں خود یہ بات کہہ رہا ہوں۔ کیا تم اپنی ساری لائف میرے ساتھ گزارنا چاہو گی؟“ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ بولا۔

میرب کچھ لمحوں تک اُسے خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔ پھر بہت آہستگی سے اپنا سر ہلا دیا تھا۔

سردار سبکگین حیدر لغاری نے اسے تھاما تھا اور اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ بہت عقیدت سے اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھے تھے اور پھر دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

”میرب! آئی لو یو ہنی!۔۔۔ اینڈ آئی ول نیور لٹ یو ڈاؤن۔ تمہیں زندگی میں کسی بھی مقام پر میں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ لیکن کہیں پھر بھی کوئی کوتاہی ہو جائے تو تم کمپلین کر سکتی ہو۔ میں اپنی غلطیوں کو سدھارنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے تم سے دُور رہ کر زندگی کو جانا ہے۔ اس کے بعد میں تم سے دُور کبھی نہیں رہنا چاہوں گا۔ سو میں نے مائی سے کہہ دیا ہے کہ فوراً تمہاری بات کر لیں۔ ناؤ آئی ڈونٹ وائٹ ویسٹ ٹائم اینی مور۔ پہلے ہی بہت سادقت گنویا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا اور میرب سیال کے چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے تھے۔

سردار سبکگین حیدر لغاری نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور آگے بڑھادی تھی۔

”کہاں جا رہے ہیں ہم؟“ میرب نے پوچھا تھا۔ اندر ایک اطمینان سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا بازو اس کے گرد پھیلا تھا اور اس کا سر بدستور اس کے شانے پر تھا۔ مگر گاڑی ریورس گیر میں باہر نکلتے دیکھ کر اس کی پوزیشن یک دم ہی تبدیل ہوئی تھی۔ سردار سبکگین حیدر لغاری نے اس کے گرد سے اپنے بازو کا حصار نہیں ہٹایا تھا مگر اس نے اپنا سر ہٹا لیا تھا اس کے شانے پر سے۔

”ہم مائی سے ملنے جا رہے ہیں میرب! اپنی بہو سے بہت اداس ہے ان کا جی۔ اور وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ ہم آج ایک اچھی نوز کے ساتھ ان کی مورنک بھی اچھی بنا دیں گے۔ ان کے خیال سے بس ان کا ایک نالائق بیٹا ہوں جو اب تک انہیں ایک عدد بہو اور چار پوتے نہیں دے سکا۔ بٹ ناؤ آئی اسپاؤنڈ۔ اُس ڈن۔ ہم فوراً ہی ہنی مون پر جائیں گے اور اس مشن پر کام شروع کر دیں گے۔“ وہ مسکرا رہا تھا اور میرب سیال کا چہرہ کان کی لوڈس تک سرخ پڑ چکا تھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟۔۔۔ بچے کتنے ہونے چاہئیں؟“ وہ معمول سے ہٹ کر بول رہا تھا اور

یرب میں قطعاً ہمت نہیں تھی اس کا کوئی جواب دینے کی۔

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی تھی۔

وہ ہنس دیا تھا۔

”پتہ تو مجھے بھی نہیں۔۔۔ لیکن جتنے بھی ہوں اچھے ہونے چاہئیں۔ گرنز لائیک یو اینڈ گائز لائیک

می۔۔۔!“

”گین۔۔۔!“ وہ ڈبٹی ہوئی بولی تھی۔ وہ ہنس دیا تھا۔ اس طرح ہنستا ہوا وہ اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی اور اس کے خود کے اندر بھی اطمینان ہی اطمینان تھا۔

گاڑی سیاہ کول تار کی سڑک پر بھاگ رہی تھی اور وہ اس کے کان کے قریب سرگوشی کرتے ہوئے

کہہ رہا تھا۔

”آئی ول بی لونگ یو فور ایور۔“

جملے کی صداقت پر اُسے اعتبار تھا۔ تبھی وہ بھی مسکرا دی تھی۔

(تمت بالخیر)

طُبات طام

میرب کی آنکھوں میں بے بسی کی تحریر صاف پڑھی جا رہی تھی۔ سردار سبتگین حیدر لغاری پلٹا تھا میرب نے پکارا تھا۔ وہ رک گیا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے پلٹ کر بھر پور توجہ سے اسے دیکھا تھا۔ میرب مدعا بیان کرنا انتہائی دشوار لگا تھا۔ کسی قدر ہیزی ٹیٹ ہو کر وہ نگاہ جھکا گئی تھی۔ سردار سبتگین حیدر پوری توجہ سے منظر کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا۔ میرب نے بالآخر ہمت کر کے سر اٹھایا تھا۔

”سبتگین!“

”اوں، ہوں، گین۔۔۔ صرف گین تمہارے لبوں سے اچھا لگتا ہے۔“ سرگوشی بہت دلربا تھی جاو اور گرد پھیلا تھا۔ اس کے دھیمے لبوں کی مسکراہٹ ایک اسرار رکھتی تھی۔ میرب کی ساری ہمتیں ابا پھر ڈھیر تھیں۔

”تم کچھ کہہ رہی تھیں۔“ سردار سبتگین حیدر لغاری کے پاس جیسے فرصت ہی فرصت تھی۔ مگر میرب نہیں کہہ سکتی تھی۔ آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں اور وہ بے ہمت سی سر جھکا گئی تھی۔ سردار سبتگین لغاری کو جیسے اس پر رحم آ گیا تھا۔ آگے بڑھا تھا اور اس کے چہرے کو بھر پور وارنگی سے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

”معاملہ کیا ہے سوئی؟۔۔۔ کس بات کی اُلجھن ستا رہی ہے تمہیں؟“ مدہم لہجے میں جیسے کو تھا۔ میرب کو اپنا سارا وجود اس کے زیر اثر لگا تھا۔ وہ سراٹھا کر اس انتہائی مضبوط جسامت کے مالک پانیوں سے بھری آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی۔ کتنا بھر پور سراپا تھا۔ کیسا گھنا سا یہ تھا۔ اور وہ پھر بھی جلتی دھوپ میں کھڑی تھی۔

شدت کرب سے وہ آنکھیں میچ گئی تھی۔ پانی کے کئی قطرے ان بند پلکوں سے ٹوٹ کر رخسار بہہ نکلے تھے۔ سردار سبتگین حیدر لغاری کے لیے منظر انتہائی توجہ کا باعث تھا۔ نظر جیسے بندھ کر رہ گئی۔ سردار سبتگین حیدر لغاری کی زندگی میں گرفت میں لینے والے لمحے بہت تھوڑے آئے تھے۔ ایسا ہوا تھا کہ وہ اپنے جذبات کے زیر اثر ہوا ہو۔ اک جادو سا جیسے فضا میں گھلا تھا یا پھر وہ چہرہ پر گھڑی ایسی کشش لئے ہوئے تھا کہ سارا عالم عجیب فسوں ساز ہو رہا تھا۔ ہر شے اسی رنگ میں رنگی گئی۔ سردار سبتگین حیدر لغاری نے بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس پیکر کو ہاتھاتھا اور تمام تر استحقاق ہوئے اس کے رخساروں پر سے وہ موتی چن لئے تھے۔ میرب سیال کو جیسے شعلوں نے چھو لیا تھا۔ آ دیکھا تھا، نظر تحریر میں گھر گئی تھی۔

تعلق میں با نامہربان، بے مہرماں، اس لمحے کس درجہ عنایت پر مائل تھا۔ آنکھوں میں وارنگی تھی۔ میرب کچھ آہوا لگا تھا۔ وہ نظر جھکا گئی تھی۔ گین نے اس چہرے کو ہاتھ بڑھا کر قدرے اوپر اٹھایا۔

”میرب! میرا۔۔۔ تمہیں خوش رہنے کاوش میں اس چہرے کو کل علم اور بھیدوں سے پڑھا پاتا۔ کاش اس نگاہ کو پڑھنا کچھ دن یہاں رہو گی انہم انہم سے واقفیت ہوتی میری تو شاید اس چہرے پر سوچوں کا یہ پہرہ کیا فائدہ؟۔۔۔ تے پانی مجھے صاف بتا دیتے کہ کہانی کیا ہے؟۔۔۔ کیسی کیسی خواہشیں

میں۔۔۔ کیسے کیسے خواب!“

کیسی مدہم سرگوشیاں تھیں۔ ماحول ساکت تھا۔

”کاش میں جان پاتا تو شاید تمہاری فکر میں اس قدر بڑھنے نہ پائیں۔

کاش جان پاتا کہ تمہیں کیا شے ستاتی ہے تو شاید کبھی اس کی نوبت نہ آنے دیتا۔ کچھ اور نہیں تو۔۔۔ جگنو ہی دیتا۔ ان پانیوں کی جگہ کچھ اپنے سے وابستہ خواب! مجھے خبر تو کر دینی کہ تم کیا سوچتی ہو، کیا چاہتی

وہ، میں اس قدر انجان تو نہ رہتا۔“

سارے منظر میں عجب اک نغمگی سی تھی۔ جیسے سارے رنگ اسی ایک رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ سردار سبتگین حیدر لغاری نے کیا اسم پھونکا تھا یکدم کہ سب کچھ اپنی مٹھی میں کر لیا تھا۔

”سچ کہوں، مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔“ مدہم لہجے میں وہ اعتراف کر رہا تھا۔ ”ٹرسٹ می۔۔۔ مجھے اتنی کوئی ہنر نہیں آتا۔ آج تک کبھی ایسا لمحہ گزرا ہی نہیں کہ سیکھ پاتا۔ مگر اب دل چاہتا ہے سیکھوں، وہ تمام لڑ، وہ تمام اسلوب جو دل کو دل سے قریب کر سکیں۔ کچھ اور نہیں تو دستکوں کا ہنر ہی سیکھ لوں۔“ سرگوشی کرتے ہوئے اس چہرے کو بہت آہستگی سے چھوا تھا۔

”سچ بتاؤ۔۔۔ تمہیں آتا ہے وہ ہنر؟۔۔۔ میں تو کورا ہوں۔۔۔ سچ، بالکل کورا۔ تمہیں تو آداب محبت آتے ہوں گے۔ کبھی سوچا نہیں، قرینے بڑو اور اپنے بس میں کر لو۔ کوئی وار کر دو اور ہوش اڑا دو۔ کچھ ذہن کچھ تو ایسا آتا ہوگا۔ سکھا نہیں سکتی ہو مجھے؟۔۔۔ جانتی ہو تو پڑھا دو وہ سبق۔ سچ کہتا ہوں، ان آنکھوں کی تمام روشنی کی قسم کھا کر۔ جو چاہو گی تمہارا ہوگا۔ جیسا چاہو گی سب ویسا۔ ویسا ہوگا۔ مجھے اپنے جادو کے زیر کر لو۔ جیت لو۔ میں ہار جانا چاہتا ہوں۔“ مدہم لہجے میں کسی کہانیاں تھیں۔ میرب سیال کی نگاہ ساکت تھی۔ وہ کچھ سمجھ نہ پا رہی تھی۔

”بیلیوی!۔۔۔ شکست و ریخت کا لطف کبھی نہیں چکھا میں نے۔ مجھے سکھا دو یہ سارے اسلوب۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں اس خواب سے آگے کا سفر کیا ہے۔ جو اک موڑ ہے، اس موڑ سے آگے کیا ہے؟ تمہاری آنکھوں کی تمام تر روشنی و لفریب ہے۔ اس روشنی سے آگے کا سفر کیا ہے؟۔۔۔ اس کے آگے کے منظر کتنے دل پذیر ہیں۔ جاننا چاہتا ہوں میں۔ بتاؤ گی تم مجھے؟“ سردار سبتگین حیدر لغاری کی گرفت جنونی تھی اور انداز بے خودی کے زیر۔

میرب سیال کا سارا وجود کسی پتے کی طرح کا پھینے لگا تھا۔ یکدم وہ اس گرفت سے نکلی تھی اور چلتی ہوئی تیزی سے وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔

دھڑکنوں میں ایک ارتعاش تھا۔

وہ اس خواب خواب موسم کی گرفت سے نکلنے کے بعد بھی جیسے انہی لمحوں کی گرفت میں قید تھی۔ وہ سارا علم اور ہنر بھی اسے اپنے اندر باہر دوڑتا بھاگتا محسوس ہو رہا تھا۔ کتنی دیر وہ گہرے گہرے سانس لے کر خود کو مل جانے کے حتمن کرتی رہی تھی۔